UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224147

UNIVERSAL
LIBRARY

GUP—552—7-7-66—10,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٧٥٢/٨٩١٤٣٠٥ Accession No. ٢٢٧٠٧

Author

Title الزوال

This book should be returned on or before the date last marked below.

کے ـــــ اسلامی لٹریچر میں

دینی روح اور علمی افادات سے بھرپور ـــــ ایک

یعنی اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ ـــــ احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب



جس میں عوام اور خواص سب کے ذوق اور اپنی اپنی سطح کے مطابق بہترین احادیث چنی گئی ہیں

زمانے کی نفسیات کا لحاظ ـــــ ہر طرح کے فہم و فکر کی رعایت ـــــ اور حدیث کی اصل مقصدیت پر زور

یہ اس کتاب کے نمایاں خصوصیات ہیں جو اس کے ہر حصے کے اہم خصوصیات ہیں

اور تشریحات کے علاوہ ہر باب کے شروع کے تمہیدی نوٹ، شریعت کے نظام حکمت پر

"ماقبل و مابعد" کی ایک مثال کہے جاسکتے ہیں

سائز ۲۶×۲۰ ۸

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی

خود ملاحظہ کریں (مفت ارسال کمپنی کے ذمہ)

جلد اول ـــــ ایمان اور آخرت کے بیان کی حدیثیں ـــــ قیمت ـــــ مجلد ۵/ غیر مجلد ۴/

جلد دوم ـــــ تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں ـــــ قیمت ـــــ مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/

جلد سوم ـــــ طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں ـــــ قیمت ـــــ مجلد ۸/ غیر مجلد ۶/

مکتبہ معارف القرآن کی چند دیگر کتابیں

سیرت مصطفیٰ ۲ جلد ۲۰/	آسان نحو ۲ جلد ۲۰/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
قرآن کی آیات ۲۰/	آسان حج گائیڈ ۲۰/	آسان فقہ ۲۰/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
آسان نماز ۲۰/	آسان زکوٰۃ ۱۵/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/

ملنے کا پتہ: مکتبہ معارف القرآن، کھوڑ

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

(فی کاپی ۱۰ پیسے)

سالانہ چندہ
دیگر ممالک سے ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے ایک پونڈ

پوسٹل آرڈر بغیر کراس کئے
کرنا چاہیے

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۵ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ (۱) ۱۱

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمن سنبھلی	۲
۲	مکتوب حجاز	مولانا محمد منظور نعمانی	۵
۳	حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ اور اُن کے خاندان سے	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۹
۴	تحقیق کے نئے گوشے	جناب وحید الدین خاں صاحب	۲۵
۵	دربار عالمگیری	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی	۳۲
۶	مجاہد کبیر حضرت مولانا محمد یوسفؒ	مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف	۳۹
۷	اللہ والوں کا اجتماع	محمد اسلم صاحب	۴۵
۸	ہندوستان کا لسانی مسئلہ	مدینہ بجنور	۵۲

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مئی تک [illegible] کا سادہ لفافہ بھیجنا نہ بھولیں ورنہ پرچہ بند کر دیا جائیگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین لاہ کے نام بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں روپیہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیجئے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کوئی صاحب نہ ملے تو فوراً مطلع کریں انکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے نویدیہ میں چھپوا کر دفتر واقع مکان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

سال ۳۳ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — شمارہ نمبر ۱

زکاۃ اوّلین

عتیق الرحمٰن سنبھلی

آج کے ہندوستان میں کوئی مسلمان، خواہ وہ کتنا ہی پکّا اور پرانا مسلمٹ کیوں نہ ہو، اگر وہ عملاً دین سے کچھ بھی تعلق رکھتا ہو یا کم از کم مسلمانوں کے دکھ درد میں ملّی جذبے کے ساتھ شریک ہوتا ہو، وہ اکثریت کے اہل سیاست کی نظر میں بلاشبہ مسلمان "پہلے" ہو اور ہندوستانی "بعد" میں۔ ایسے مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور ان کے مختلف حلقائے فکر سیاسی نظریات کے لحاظ سے آپس میں اگرچہ کتنے ہی مختلف الخیال ہوں لیکن ہیں ایک ہی کشتی میں سوار۔ وہ آپس میں جتنا چاہیں تفریق کریں مگر جن دوسروں کے واسطے سے اُن کی نظر میں کوئی فرق ان سب میں حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے۔

یہ بات کوئی راز نہیں ہے جسے ہم پہلے پہل فاش کر رہے ہوں بلکہ مذکورۂ بالا خصوصیات رکھنے والا جو طبقہ پکّا اور پرانا مسلمٹ ہے اس کا دل اس حقیقت کو سب سے زیادہ جانتا ہے لیکن پھر یہ کونسی ہوشمندی ہے کہ پہلے جس مشترم کی کوئی قیمت نہیں اس میں ایک دوسرے سے فائق تر ہونے کے دعووں کی بساط بچھائیں۔ اور ایک جماعت دوسری جماعت کی طرف انگلی اٹھائے کہ

"فکر و عمل کے لحاظ سے وہ متحدہ قومیت اور سیکولرازم کی مخالف ہے"۔

اور ــــ "آج اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں متحدہ قومیت اور سیکولرازم کا دم بھرنے لگی ہے"۔

ہمیں بہت ہی افسوس ہوا جب ہم نے ایک جماعت کی طرف سے یہ شکایت پڑھی کہ ایک دوسری جماعت کے انتہائی ذمہ دار عہدیدار نے اپنے ایک بیان میں (یہ بتانے کیلئے کہ ان کی جماعت ہی کا راستہ صحیح ہے) اس طرح کے جملے اس جماعت کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ اور پھر یہ سرکلر اپنے اخبار میں بھی شائع کیا گیا ہے البتہ یہ غنیمت ہے کہ سرکلر میں اس جماعت کا صاف نام نہیں لیا گیا تھا جس کے بارے میں یہ باتیں کہی گئیں ملکہ وہ اشاروں پر اکتفا کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس رجحان کو ہر حال اچھا نہیں کہا جا سکتا ہے ان معاملات میں دبا دبا انداز کی باتیں اشاروں میں بھی کسی طرح مناسب نہیں کسی جماعت کے ذمہ دار

اگر اپنے ارکان کے سامنے یہ باتیں اشارات کی زبان میں [illegible] کے ذہنوں سے اس کی شرح بھی ہو گی اور پھر اس کا نقصان اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ اس ایک جماعت تک محدود رہے گا تو یہ اس کی بھول اور بڑی نادانی ہو ایک جماعت تو بڑی چیز ہو کسی فرد واحد کو بھی اگر آپ ہندستان کے موجودہ حالات کے اندر اس قسم کے خیالات میں مطعون کرتے ہیں تو نتیجۃً آپ سارے مسلمانوں کے مطعون کیے جانے کا سامان کرتے ہیں یہاں تضاد کی فضا نہیں ہو کہ ایک کی بات ایک ہی کے سر ثبت ہو ثبوت سے کسی پیمانہ ایک کے [illegible] سیکڑوں اور ہزاروں کو بھگتنا پڑتا ہو کیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہو دن رات ہم [illegible] دیکھ رہے ہیں آخر کیسی نادان رقابت ہو کہ اتنا خطرناک انجام بھی نظر انداز ہو جائے ایک [illegible] ایک دوسرے کی [illegible] ہونہ یہ کہ ایک دوسرے کیلئے مشکلات پیدا کریں نظریات کا کچھ [illegible] ہو تو ہر ایک شخص کے [illegible] ہوئے ایک دوسرے کو [illegible] کی کوشش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ [illegible] آپ اپنے زعم میں کتنا ہی فرق آپس میں کر لیجئے مگر حالات نے سب کو اس ایک [illegible] کی کوشش و [illegible] کے سوا کچھ نہیں ہے یہ بات ان لوگوں کے لیے ہم سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہو جو مسلمانوں کی کسی جماعت کی قیادت کر رہے ہوں

اس ناخوشگوار تقسیم سے قطع نظر، جہاں تک متحدہ قومیت اور سیکولر ازم کا تعلق ہے ملک کے سیاسی حالات میں جو مرتبہ بھی ان چیزوں کا ہو اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں سے کسی بات کا بھی قابل ہونا قابل قبول حالات میں نہیں اور نہ ہی اس دین کی کسی جماعت کیلئے زیبا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو اس باتوں کے قائل ہونے پر مطعون کرے۔ ہندستان کے اہل دین میں جن لوگوں نے بھی ان سیاسی تصورات کی حمایت کی ہو تو صرف اس بنا پر کہ موجودہ دور کے اندر ہندستان جیسے ملک میں شرعاً مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ ان تصورات پر قائم ہونے والے سیاسی نظام پر راضی ہو جائیں۔ نہ یہ کہ اسے کوئی قابل فخر آئیڈیل بنا لیں! اس لحاظ سے ہمیں انتہائی کبیدہ خاطر ہو کہ ان بزرگوں کے جانشین کسی مسلمان گروہ کے اس معاملے میں مختلف خیال ہونے پر اس طرح طعن کریں جیسے یہ کوئی بڑا پاپ ہو اور اسی کے ساتھ اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہو کہ جن لوگوں پر طعن کیا گیا ہو انھیں صمان صمات یہ سمجھنے میں کیا پس و پیش ہو کہ ہندوستان کے سیکولر نظام ریاست کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہو توقف کیا ہے ہمارے نزدیک وہ اگر اور مگر کا انداز اختیار کر کے خواہ مخواہ اپنے آپ کو غلط پوزیشن میں ڈال رہے ہیں۔ رائے دینے

دو ہیں کہ یا تو انھیں جرأت سے کہنا چاہیے کہ ہم بیشک مخالف تھے مگر حالات نے ہماری رائے بدل دی ہے اور یا پھر صفائی سے یہ کہنا چاہیے کہ ہم آج بھی سیکولر ریاست کے تصور کے علی الاطلاق مخالف ہیں۔ سیکولر ریاست کے تصور کی کچھ بھی تعبیر کی جائے" اجتماعی معاملات میں خدائی احکام سے بے نیازی" کے عنصر کو اس کے مفہوم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً ہندوستان کے سیکولرزم کی تعبیر اگر کوئی شخص یہ کرتا ہے کہ "گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے" تو اس میں بھی یہ عنصر پوری صفائی کے ساتھ موجود ہے۔ جس گورنمنٹ کا کوئی مذہب ہی سرے سے نہیں ہوگا اس کے متعلق یہ تصور بھی کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اجتماعی معاملات میں خدائی رہنمائی کی قائل ہوگی۔ پس اس تعبیر پر اگر آپ کا جواب یہ ہو کہ "ہم اس معنی میں سیکولرزم کے ہرگز مخالف نہیں ہیں" تو پھر اس کے بعد یہ کہنا بالکل بے کار ہے کہ

"لیکن اگر اس کے معنی الحاد کے ہوں تو یقیناً ہم اس کے خلاف ہیں"

کیونکہ جب آپ اجتماعی معاملات میں خدائی احکام سے بے نیازی کو بھی "الحاد ہی کی ایک قسم" قرار دے رہے ہیں تو الحاد کی یہ قسم تو مذکورۂ بالا تعبیر میں بھی موجود تھی۔ لہٰذا اقرار ہو تو اقرار ہی ہے اور انکار ہو تو انکار ہی ہونا چاہیے۔ معنی اور حقیقت ایک ہوتے ہوئے محض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اگر اور مگر کا استعمال کوئی بھی معنی نہیں رکھتا، بات صاف ہونی چاہیئے اور اس میں ضرورت ہو کہ مسئلہ کی صحیح نوعیت سامنے رکھی جائے۔ مسئلہ صرف یہ ہو کہ ملک کا دستور ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے یا جو فیصلہ کن پوزیشن رکھتے ہیں (اور وہ غیر مسلم ہیں) وہ کسی بھی مذہب کی رہنمائی سے آزاد رہ کر اگر ریاست کا نظام چلانا چاہیں تو کیا اس پر راضی ہو جانا اور ضرورت کی حد تک اس نظام سے تعاون کرنا کوئی گناہ ہے؟

ہمارا خیال ہو کہ اگر سیکولرزم کے معنی کے ساتھ ساتھ یہ صورت مسئلہ بھی سامنے رکھی جائے تو شاید دو ٹوک جواب کا مرحلہ آسان ہو جائے۔

موتمر عالم اسلام نمبر امسال مکہ معظمہ کی اسلامی کانفرنس بہت غیر معمولی پیمانہ کی تھی۔ جولائی ۱۹۶۵ء کا الفرقان ان شاء اللہ اس کانفرنس کے اہم مقالات اور تقاریر پر مشتمل ہوگا۔ ۔منیجر۔

مکتوب حجاز

از: ـــــــــــــــــــ مولانا محمد منظور نعمانی

(حضرت مولانا اسماں رابطہ عالم اسلامی (حجاز) کی مجلس تاسیسی کے رکن کی حیثیت سے حجاز تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے مناسک حج سے فراغت کے بعد جو پہلا مفصل مکتوب موصول ہوا ہے اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے ـــــــــ حقیق)

یہاں مکہ معظمہ پہنچے آج بیسواں دن ہے، الحمد للہ پوری صحت و سلامتی نصیب ہے ہر سے چلتے وقت دانت کے درد اور بازو کے زخم کی جو تکلیفیں تھیں اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ یہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں رہی، احرام کے زمانہ میں سر کھلے رہنے سے مجھے بڑا خطرہ تھا مگر جیسا کہ ذکر کیا جا چکا اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور کوئی تکلیف نہیں پیدا ہوئی، مکہ معظمہ کے قیام میں ہر قسم کی راحتیں اللہ تعالیٰ نے نصیب فرما رکھی ہیں اگر حج کے ایام بھی انھی راحتوں کے ساتھ گزرتے تو حج کے مجاہدہ کا کوئی حصہ نہ ملتا، اللہ تعالیٰ کے کرم نے اس سے بھی محروم نہیں رکھا اپنی موٹر ساتھ ہوئے اور اسی طرح ضرورت و راحت کے سارے دوسرے سامان موجود ہوتے ہوئے اتفاقی اور اضطراری طور پر مجاہدہ بھی خوب حصہ میں آیا خاص کر مزدلفہ سے منیٰ آتے ہوئے بڑا حصہ تیز دھوپ میں پیدل طے کیا قربانی بھی بہت تعب اٹھا کر اور پہاڑیوں کو عبور کر کے کی جا سکی، پھر کل جب مکہ معظمہ سے واپسی ہونے لگی تو کافی دور پیدل چلنا ہوا اور خاص اسباب کی وجہ سے میں نے اور مولانا نے نہ صبح کو ناشتہ کیا تھا اور نہ دوپہر کو کھانا کھایا تھا، اسی وجہ سے انتہائی ضعف تھا جب حالت

یہ ہوگئی کہ خاص کر مولانا کو خشکی اور ضعف کی وجہ سے ایک ایک قدم اٹھانا مشکل تھا تو ملا ایک موٹر ملی لیکن راستہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے حرم شریف سے قریباً آدھا میل پہلے اس کو بھی چھوڑ کر پیدل حرم شریف آئے۔

الحمد للہ مناسک سے تواب فراغت ہوگئی مؤتمر جو پہلے پروگرام کے مطابق آج ۱۵ اپریل سے شروع ہونے والی تھی دو دن تاخیر سے ۱۷ اپریل شنبہ کے دن سے شروع ہوگی اور ۲۴ اپریل تک چلے گی اس کے بعد دو تین دن رابطہ کی نشستیں ہوں گی، اس حساب سے مدینہ طیبہ روانگی اخیر اپریل میں ہوسکے گی کم از کم ہفتہ عشرہ وہاں قیام رہے گا اس کے بعد انشاء اللہ واپسی۔

اس مرتبہ حجاج کی تعداد سال گزشتہ سے بھی زیادہ ہوگئی ابھی خود سعودی عرب کے حجاج کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہوئے، بیرونی ممالک کی تعداد تین لاکھ سے کچھ ہی کم تھی اندازہ یہ ہے کہ سعودی عرب کے حجاج کی تعداد آٹھ دس لاکھ کے لگ بھگ رہی ہوگی معلوم نہیں کیوں ٹریفک وغیرہ کے انتظامات میں بہت ڈھیل دیکھنے میں آئی۔

حجاج کی بے عنوانیاں دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ یہ صحیح اور برحق ہے کہ حج کے موسم بلکہ اسکے ایک ایک دن میں یہاں اللہ کا جتنا نام لیا جاتا ہے اور جتنی اس سے دعائیں کی جاتی ہیں اور جس طرح کی جاتی ہیں اتنی ساری دنیا میں نہ ہوتی ہوں گی۔ مگر حجاج کی عام عملی اور اخلاقی حالت بہت ہی مایوس کن ہے یہ باتیں خواہ مخواہ زبان پر اس وقت آگئیں اس طرح خطوط میں ان باتوں کے لکھنے سے بظاہر کوئی فائدہ نہیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ دل میں اس کا فکر اور درد پیدا ہو، اور اسکی اصلاح کے لئے اخلاص کے ساتھ دعائیں اور امکان بھر کوششیں ہوں۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے حادثہ کی اطلاع

یہاں دوسرے دن یعنی سنیچر کی شام کو ہم لوگوں کو ملی تھی لیکن ذریعہ اس وقت تک قابل وثوق نہیں تھا اور یہاں موسم حج میں اس طرح کی سنسنی خیز خبریں معلوم نہیں کیوں اکثر اڑا کرتی ہیں اس لئے ہم لوگوں نے یقین نہیں کیا، اتوار کے دن ظہر کی نماز کے لئے جب ہم لوگ حرم شریف گئے تو اتفاق سے میری نظر ڈاکٹر اسمٰعیل صاحب پر پڑگئی یہ خبر انہی کے نام کے حوالہ سے گشت کر رہی تھی یہ ہمارے دوستوں میں سے ہیں کراچی کے رہنے والے ہیں کئی سال سے سعودی عرب کے محکمہ صحت سے وابستہ ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر ان سے ملا۔ انھوں نے بتایا کہ میں پرسوں جمعہ کے دن کراچی تھا اور اسی دن مجھے یہاں کے لئے روانہ ہونا تھا، پانچ بجے شام کے مجھے ایک دوست نے فون سے بتایا کہ لاہور میں حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کا اچانک وصال ہوگیا پھر کراچی کے تبلیغی مرکز مکی مسجد سے بھی اسکی تصدیق ہوگئی۔ میں کراچی سے اسی شب میں روانہ ہوکر کل شب میں جدہ پہنچا اور آج ہی مکہ معظمہ پہنچ سکا ہوں، خبر صحیح اور مصدق ہے۔ اس وقت ہم لوگوں کو بھی یقین کرنا پڑا، پورے عالم اسلامی کے لئے اور خاص کر ملت اسلامیہ ہند یہ کے لئے یہ بہت ہی بڑا حادثہ ہے جو لوگ نہیں جانتے وہ شاید مبالغہ سمجھیں گے لیکن یہ بالکل واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت میں دینی حرکت اور فکر آخرت پیدا کرنے کا کام جتنے وسیع پیمانہ پر صرف بیس سال کی مدت میں مولانا مرحوم سے لیا اسکی نظیر قریب کی پچھلی صدیوں میں تلاش کرنے سے بھی مشکل سے ملے گی کم از کم میرے علم میں تو نہیں ہے۔ اللہ کی شان ہے ہندوستان میں اللہ کا ایک بندہ ایک مسجد میں بیٹھکر لاکھوں بندوں کو، حقیقۃً لاکھوں بندوں کو دین کی فکر اور کوشش میں متحرک کئے ہوئے تھا دنیا کے دور دراز ملکوں میں جماعتوں پر جماعتیں بھیج رہا تھا ہزاروں غریب ملک بملک اسکے حکم سے پیدل پھرتے تھے سفروں میں ہر قسم کی تکلیفیں اٹھاتے تھے دین سیکھتے سکھاتے تھے اور دوسروں کو اسی کی دعوت دیتے اور اسی کے لئے اٹھاتے تھے اسی طرح ہزاروں صاحب استطاعت ریلوں اور موٹروں سے اسی مقصد کے لئے جماعتوں کے ساتھ مہینوں اور چلوں کے لئے نکلتے تھے، بہت سے لوگ ہوائی جہازوں

سے دور دراز ملکوں کا سفر اسی کام کے لئے کرتے تھے امت میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کے لئے اتنی وسیع حرکت اور جدوجہد صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی اللہ تعالیٰ نے یہ کام ہندوستان سے کرکے دکھایا اور اپنے ایک بندہ کو اس کا ذریعہ بنایا ــــــ

ھوالذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ وھو الولی الحمید۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کے وقت تک کام بہت محدود اور ابتدائی درجہ میں تھا لیکن اس وقت یہ بھی امید نہ تھی کہ جس درجہ میں اب ہو رہا ہے یہ بھی باقی اور جاری رہ سکے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ذریعہ سینکڑوں درجہ آگے بڑھا دیا اسکی رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے بلکہ ہمیں یہی امید کرنی چاہیئے کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کے بعد بھی اسکی قدرت و رحمت اسی طرح اپنا کام کرے گی۔

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی کے

چند مخصوص تجربات

سفوف ذیابیطس: اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جیسی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیئے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ 3/8/0 پانچ تولہ 2/-

شربت جدام۔ جذام میں یہ دوا بے حد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ 5/-

شربت کند۔ پتہ کی پتھریوں کا درد بیقرار کر دیتا ہے جگر۔ ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے۔ ایک پونڈ 5/-

شربت درد گردہ۔ پنجاب میں بکثرت کرنا یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے جن کی شکایت پرانی ہو اور پچریاں پڑ چکی ہوں انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ قیمت ایک پونڈ 5/-

مرہم سرخ: پھوڑوں مخصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں کیلئے کارگر ہے۔ اس کے استعمال سے سڑن کافور ہو جاتی ہے۔ پورا پھپھے صاف ہو جاتا ہے۔ قیمت 3/50

(منیجر) حسنی فارمیسی ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



شربت نشاط افروز



گرمیوں کا بہترین تحفہ تازے پھلوں کے رس پھولوں کے جوہر اور قیمتی دواؤں سے تیار کیا جاتا ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دوسری قسط

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ کے روابط

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

از ـــــــــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی مرادابادی

مکتوب حضرت شاہ اہل اللہ[1] پھلتیؒ برادر خرد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بنام شاہ ابوسعید حسنیؒ

بخدمت حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ سیدنا سید ابوسعید جیو سلمہم اللہ والبقاء ہم ـــــ از فقیر اہل اللہ بعد از سلام ملتمس است کہ خط بہجت بخط

---

[1] الشیخ الکبیر اہل اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری الحسنی البھلتی احد علماء ربانیین و عباد اللہ الصالحین آپ نے اپنے بڑے بھائی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے اخذ علوم دین کیا۔ طب بھی پڑھی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ آپ کی کئی تالیفات و تصنیفات ہیں ان میں سے ایک مختصر ہدایۃ الفقہ ہے جو کہ ہدایہ کا انتخاب ہے (۲) مختصر تفسیر قرآن (۳) چہار باب (در فقہ و عقائد) (۴) تکملہ ہندیہ (در علم طب) غالباً ۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ایک مکتوب (محررہ ۱۱۸۰ھ) سے واضح ہوتا ہے۔ ماخوذ از حصہ اخبار علماء۔ (مزار حیات غیلع مظفر نگر میں ہے۔ احقر نے زیارت کی ہے)

رسید آنچہ از راہ مہربانی و شفقت کہ دربارۂ این فقیر مبذول میدارند عنایات و توجہات ظاہری و باطنی مصروف فرمودند شکر آں بکدام زبان بیان نمودہ آید.....

حضرت سبحانہ و تعالیٰ ترقیات دارین و کمالات کونین نصیب آں باذل نفسہ فی مرضات اللہ گرداند چنانچہ این نیازمند را از فکر معاش نجات بخشید ندا و جل و علا از جمیع حاجات از دین و دنیا ذات سامی را خلاص و نجات عنایت فرماید ــــ توقع آنست کہ این دردکہ بہ بخشی رام حوالہ شدہ است بوضع جریان دادہ شود کہ اینجا یا بردیگر پرگنہ کہ بلا کلفت میسر آمدہ باشد ماہ بماہ بلا دقت بدست می آمدہ باشد زیادہ چہ ۔ دہر چہ صلاح دید صاحب بود بہتر است ۔ بخدمت میاں محمد عتیق جیو سلام رسد ۔ حسب الایمائے خط شکر گذاری بنجان رفعت نشان مرقوم شدہ اگر مناسب دانند بگزرانند ــــ

ترجمہ ــــ حقائق و معارف آگاہ، فضیلت و کمالات دستگاہ سید ناسید ابوسعید صاحب سلمہم اللہ والبقاء ہم ــــ کی خدمت میں فقیر اہل اللہ کی طرف سے بعد از سلام نیاز عرض ہے کہ خط بہجت نمط پہونچا ــــ از راہ مہربانی و شفقت ــــ جو کہ اس فقیر پر مبذول فرماتے رہتے ہیں ــــ جو کچھ ظاہری و باطنی عنایات و توجہات آپ نے کی ہیں اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے ..... اللہ تعالیٰ آپ کو کہ آپ اس کی مرضیات میں اپنی جان کو خرچ کرنے والے انسان ہیں ــــ ترقیات دارین اور کمالات کونین نصیب فرمائے ــــ آپ نے جس طرح اس نیازمند کو فکر معاش سے نجات دی اللہ جل شانہ آپ کو بھی دین و دنیا کی جمیع حاجات سے بے فکر فرمائے ــــ امید یہ ہے کہ یہ وظیفہ جو کہ بخشی رام کے حوالے کیا گیا ہے اس طور پر برابر جاری رہے گا کہ اس جگہ (پہلت) یا کسی دوسرے پرگنے میں ماہ بماہ بلا دقت حاصل ہو جایا کرے گا ــــ زیادہ کیا لکھوں۔ جو بھی آپ کی صوابدید ہو بہتر ہے ــــ میاں محمد عتیق صاحب کی خدمت میں سلام پہونچے۔ آپ کے حسب الایما رخان رفعت نشان (ابراہیم خلیل خاں) کو بھی خط شکر گذاری مرقوم کر دیا گیا ہے اگر مناسب سمجھیں تو (آپ ہی) اس کو وہاں پہونچا دیں۔

ایک مکتوب گرامی میں حضرت شاہ اہل اللہؒ حضرت رائے بریلوی کو تحریر فرماتے ہیں۔

احوال یومیہ کہ از توجہ وجیہہ صورت گرفتہ است بفضل الٰہی تا حال تحریر جاری است و ایں نیازمند باد یگر کس و کوئے خود رطب اللسان شکر گزاری است اللہ تعالیٰ دیر گاہ سلامت دارد فقیر زادہ محمد مقرب اللہ سلام نیازمی رساند ۔ زیادہ چہ نویسد ۔

احوال یومیہ جو آپ کی توجہ سے درست ہو گئے ہیں تادم تحریر ہذا ٹھیک چل رہے ہیں۔ یہ نیازمند اپنے متعلقین سمیت آپ کی شکر گذاری میں تر زبان ہے۔ اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کو سلامت رکھے فقیر زادہ محمد مقرب اللہ سلام کہتا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

مکتوب حضرت شاہ اہل اللہ بنام شاہ ابو اللیث[1] حسنی ملقب بہ ابو العیش فرزند حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ

عزیز القدر سیادت مرتبت سید ابو العیش سلمہ ربہٗ بعد از سلام شوق الیام مطالعہ نمایند کہ شوق دیدار ایشان از استماع سعادت مندی شان زبانی والد بزرگوار بحد کمال است اللہ سبحانہٗ تعالیٰ بعافیت طرفین و خیریت جانبین ملاقات سرت آیات میسر فرماید ۔ یقین است کہ باشتغال علوم ظاہری و تحصیل سلوک باطنی از جناب قبلہ گاہ خود کہ مجمع کمالات دارین اند مشغول خواہید بود کہ بزرگ زادۂ خاندان عالیہ را

---

[1] السید الشریف ابو اللیث بن ابی سعید بن محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شیخ الکبیر علم اللہ النقشبندی البریلوی احد الرجال المعروفین بالفضل والصلاح ۔ آپنے اپنے والد سے علم حاصل کیا اور انھیں سے طریقہ اخذ کیا اور ارشاد و تلقین میں اپنے والد ماجد کے جانشین ہوئے۔ سفر حرمین میں اپنے والد کے ہمراہ تھے مدراس میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ایک زمانہ تک وہاں رہ کر روحانی فیض پہونچایا اسی علاقے میں انتقال ہوا۔ آپ کی قبر بندرگاہ کوڈیال میں ساحل سمندر پر ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) آپ کا لقب ابو العیش تھا۔ ان مکتوبات اکابر کے جامع آپ ہی ہیں۔

ازیں ہر دو چیز ناگزیر است۔ زیادہ بجز شوق و دعا چہ نویسد۔

ترجمہ ـــــ عزیز القدر سیادت مرتبت ..... بعد از سلام شوق مطالعہ کریں۔ مجھے تمہارے دیکھنے کا اشتیاق بحد کمال ہے اس لیے کہ میں نے تمہارے والد بزرگوار کی زبانی تمہاری سعادت مندی کی باتیں سنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ طرفین و جانبین کی خیر و عافیت کے ساتھ ملاقات میسر فرمائے ـــــ یقین ہے کہ تم اپنے والد کی خدمت میں ـــــ جو کہ جمع کمالات دارین ہیں ـــــ اشتغال علوم ظاہری اور تحصیل سلوک باطنی کے اندر مشغول ہوگے اس لیے کہ خاندان عالی کے ایک بزرگ زادے کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ زیادہ بجز شوق و دعا اور کیا لکھوں۔

مکتوب مولانا نور اللہ[1] بڈھانویؒ بنام حضرت شاہ سید ابو سعید حسنیؒ

مجمع حمائد و فضائل معدن محاسن و فواضل، سعادت و کرامت مآب معارف و کمالات انتساب مکرمی مہربان میر سید ابو سعید جیو سلمہ اللہ المجید ـــ ازیں فقیر نور اللہ بعد سلام نیاز مطالعہ فرمایند۔ ملاطفت نامہ وصول فرمودہ ابتہاج و سرور بخشید یاد آوری بزرگان بشارت سعادت است الحمد للہ علیٰ ذلک ـــ اکثر اوقات بذکر اخلاق و اشتیاق

---

[1] الشیخ العالم الکبیر المحدث نور اللہ الصدیقی البرہانوی احد فحول العلماء ـــ آپ قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی بچپن ہی سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے۔ تحصیل علم ہی کے لیے دہلی کا سفر کیا اور شیخ الکبیر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ طویل زمانے تک حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت سے مستفیض ہوئے ـــ آپ کا شمار اپنے استاد معظم کی حیات ہی میں اکابر علماء میں ہونے لگا تھا ـــ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے آپ سے کتب علم فقہ پڑھیں۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ آپ کے داماد تھے۔ غالباً ۱۱۸۶ھ میں انتقال ہوا جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ایک مکتوب گرامی سے اندازہ ہوتا ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۷) حضرت مولانا شاہ عبد الحیٔ ابن عبد اللہ بڈھانویؒ (رفیق حضرت سید احمد شہیدؒ) انھیں مولانا شاہ نور اللہ بڈھانویؒ کے پوتے تھے۔

رطب اللسان است اللہ تعالیٰ بجمعیت قلبی و قالبی محفوظ دارد و از نامرضیات محفوظ ـــ
از مژدۂ عزم قدوم میمنت لزوم اشتیاق دیدار فرحت آثار دوبالا شد ـ او تعالیٰ زود بوجہ احسن مشتاقان را بملاقات سامی مسعود سازد ـ بالجملہ فقیر بدعائے خیر مشغولی دارد انہٗ قریبٌ مجیب ـــ دنام شخصے کہ از اقربائے اینجانب است محمد راجی است اگر آنجا باشد البتہ پیش خود طلبیدہ فرمایند کہ خیر خیریت بنویسد ـ نیازمند عطاء اللہ مع برادران و قاضی جید و میاں سراج الدین و دیگر اعزہ سلام نیاز میرسانند ...
ترجمہ ـــ مجمع حامد و فضائل ..... مکرمی مہربان میر سید ابو سعید صاحب سلمہ اللہ اس فقیر نور اللہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ فرمائیں ـــ الطاف نامہ وصول ہوا۔ مسرت بخشی ۔ بزرگوں کی یاد آوری بشارت سعادت ہوتی ہے ۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ـــ اکثر اوقات آپ کے اخلاق و اشفاق کے ذکر میں رطب اللسان رہتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جمعیت ظاہری و باطنی کے ساتھ محفوظ رکھے اور اپنی نامرضیات سے محفوظ ـــ آپ کی تشریف آوری کے قصد کا مژدہ پڑھ کر اشتیاق دیدار دوبالا ہوگیا ـــ اللہ تعالیٰ بلد بوجہ احسن مشتاقوں کو ملاقات گرامی سے سعادت اندوز فرمائے ـــ بالجملہ فقیر دعائے خیر میں مشغول ہے ـ انہٗ قریب مجیب ـــ اور اس شخص کا نام جو میرے اقربا میں سے ہے محمد راجی ہے اگر وہاں ہو تو اپنے پاس بلا کر فرمائیں کہ (کم از کم) اپنی خیریت تو لکھ کر بھیج دے ـــ عطاء اللہ مع برادران ، قاضی صاحب اور میاں سراج الدین نیز دیگر اعزہ سلام پہونچاتے ہیں .....

مکتوبات حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ[1] بنام حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ

مکتوب (۱) ۔ سیادت و نقابت مرتبت خلاصۂ دودمان (نجابت) حقائق و معارف آگاہ فضائل دستگاہ میر ابو سعید جیو سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ بعد از سلام اشواق التیام از

---

[1] الشیخ العالم الکبیر المحدث محمد عاشق بن عبید اللہ بن محمد الصدیقی البھلتیؒ ـــ بچپن ہی سے آپ نے علم سے
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

فقیر محمد عاشق مشہود ضمیر معارف تحمیر باد کہ الحمد للہ علی العافیۃ ونسئل اللہ تعالیٰ ان یدیم لنا ولکم ایاھا ـــــ اشفاق نامہ کہ بنام میاں شاہ نور اللہ جید و فقیر ارقام فرمودہ بودند ورود تودد نمود ـــــ الحال کہ فقیر بجہت تحصیل شرف ملاقات ملازمت حضرت قبلۂ کونین مدالہ ظلہم العالی رسیدہ عرضی ایشانرا کہ بجناب حضرت ارسال داشتہ بودند مطالعہ نمود و مواجید خاصہ کہ بفضل الٰہی نصیب ایشاں شدہ ملاحظہ کردہ و ایں معنیٰ موجب نہایت خوشی و شادی گردید و حمد الٰہی و شکر وے تعالیٰ بجا آورد اللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ شعر زد ـــ ان شاء اللہ تعالیٰ بعد وصول وطن نیاز نامہ بخدمت خواہد نوشت اُمید کہ بدعائے خیر یاد دارند ـــ زیادہ چہ التماس نماید والسلام ـــ میاں محمد عتیق جید سلام مطالعہ نماید از محمد فائق سلام مطالعہ باد ـــ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اشتغال رکھا اور حضرت شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلویؒ کی خدمت میں تکمیل کی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے ماموں زاد بھائی تھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے آپنے علم و معرفت کو اخذ کیا۔ حرمین شریفین کے سفر (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۵ھ) میں آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ حرمین کے جو اساتذہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہیں وہ آپکے بھی ہیں جن میں سب سے بڑے حضرت شیخ ابو طاہر محمد ابن ابراہیم کردی مدنیؒ ہیں۔ حضرت شیخ ابو طاہر کردیؒ نے بھی آپ کو اجازت حدیث دی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ اور خلفاء میں سب سے اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحب السر تھے جیسا کہ شیخ ابو طاہر کردیؒ نے اپنے اجازت نامے میں اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے اور آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کا آئینہ کمال قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اپنے عربی اشعار میں آپ کو کمالات عالیہ کی خوشخبری دی ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ جیسے باکمال مشائخ اور ایک خلق کثیر نے آپ سے اخذ فیض کیا ہے۔ آپکے مصنفات میں سے ایک کتاب سبیل الرشاد ہے جو فارسی زبان میں سلوک کے اندر ایک مبسوط کتاب ہے القول الجلی فی مناقب ولی اللہ بھی آپ کی کتاب ہے جس میں اپنے شیخ و مربی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات و مناقب لکھے ہیں۔ ایک کتاب شرح دعا الاعتصام ہے۔ حبل کتاب پیر و مرشد کی ہے جو حقائق و معارف کے بیان میں ہے۔ اور آپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے مصفیٰ شرح موطا للشیخ ولی اللہ المحدثؒ کا مبیضہ تیار کیا۔ حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف زیادہ تر آپ کے ذریعہ محفوظ اور اشاعت پذیر ہوئے۔ مکتوبات شاہ صاحب کو بھی آپنے اور آپکے صاحبزادے شیخ عبد الرحمٰن مرحوم نے جمع کیا تھا۔ آپ کی وفات غالباً ۱۱۸۶ھ میں ہوئی جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ایک مکتوب گرامی سے ظاہر ہوتا ہے۔ (ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ۶)

ترجمہ مکتوب (۱) ـــــ سیادت و نقابت مرتبت ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ بعد از سلام اشواق الیٰ الدوام فقیر محمد عاشق کی طرف سے واضح ہو کہ الحمد للہ عافیت سے ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ـــــ اشفاق نامہ جو میاں شاہ نور اللہ (بڈھانوی) اور فقیر کے نام (مشترکہ طور پر) ارقام فرمایا تھا پہونچ گیا تھا ـــــ اس وقت فقیر شرف ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے حضرت قبلہ کونین مدالہ ظلہم العالی (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کی خدمت میں شاہجہان آباد (دہلی) آیا ہوا ہے ـــ آپ کی وہ عرضداشت جو حضرت والا کو آپ نے بھیجی ہے نظر سے گذری اس میں آپ کے اذواق و مواجید خاصہ جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کو نصیب ہوئے ہیں مطالعہ کیے ـــ اس سے بڑی مسرت حاصل ہوئی اور حمد الٰہی اور اس کا شکر بجا لایا ـــ اے اللہ اس ذوق کو زیادہ اور زیادہ اور زیادہ کر ـــــ اللہ نے چاہا تو وطن (پہلت) پہونچنے کے بعد آپ کی خدمت میں (دوسرا) نیاز نامہ لکھوں گا ـــ امید کہ دعائے خیر میں یاد رکھیں گے ـــ زیادہ کیا لکھوں ـــ والسلام ـــ میاں محمد عتیق صاحب سلام مطالعہ کریں ـــــ محمد فائق کی طرف سے سلام قبول فرمائیں ـــ

مکتوب (۲) ـ فضائل و کمالات دستگاہ میر ابو سعید صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ ـــــ فقیر محمد عاشق کان اللہ لہ بعد سلام نیاز تمام میرساند کہ الحمد للہ تعالیٰ جمیع احوال این نیازمند مستوجب حمد و شکر ایزد متعال است جمعیت صوری و باطنی و استقامت امور ظاہری و باطنی آں کرم فرمائے من از جناب مجیب الدعوات مسئول و مامول است ـــ شوقے کہ بملاقات فیض آیات ایشانست بر عالم الغیب والشہادۃ نیک روشن است آنرا بزبان قلم دادن خلاف طریقۂ اہل دل میداند لہذا ..... بدعائے دیگرمی پردازد ـــ عنایت نامہ مشتمل بر شکایت ایذائے بعض الاقارب کا لعقارب وسعی خلل اندازی دمکار دیدہ کہ بفضل الٰہی تبازگی در تصرف آمدہ رسیدہ ـــ مطالعہ آں موجب تشویش خاطر فاتر گردید دل بے اختیار طبعی است کہ بفضل الٰہی خویش مخالف را آفت ارا ایذا نہ بخشد و توفیق وفاق را

کرامت فرماید و مساعیٔ مخالف را بمراد نرساند۔ بالفصل خطے در باب بذل مساعیٔ جمیلہ درشد و مد خیال ایذاء مخالف در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بسجان ذی شان سید تہور علی خاں کہ بخدمت ایشاں ہم غالب است کہ رابطۂ اخلاص داشتہ باشد۔ نوشتہ ارسال نمودہ است۔ غالب است کہ توفیق ایں امر خیر بیابد۔ و بانجیب الدولہ فقیر را چندان نوشت و خواند نیست مع ہذا از مقدور در یغ نیست۔ دیگر آنکہ از مرحمت نامہ، وعدۂ توجہ بامنصوب قبل رمضان یا بعد آں واضح شدہ بود۔ وعدۂ قبل رمضان خود رفت و بعد بہ قریبۂ رمضان ہم تمام شد باید دید کہ تمنائے وصال کے رو نماید۔ حق سبحانہٗ زود میسر آرد امید از خدمت گرامی آنکہ دعائے در حق ایں نیازمند مبذول شود تا حق سبحانہٗ از آفت ہستی و خود پرستی نجات کرامت فرماید۔ زیادہ بجز شوق ملاقات فیض سمات چہ نگارد والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔ فقیر زادہ محمد فائق سلام نیاز خود فرا باد میدہد۔ حاجی بلال و محمد سلیم سلام نیاز میرسانند۔ دیگر التماس آنکہ خطے کہ حضرت میاں صاحب بایشاں نوشتند نقل آں برداشتہ باں فقیر عنایت فرمایند و ہمچنیں نقل خطوط سابقہ نیز مرحمت فرمایند و دریں باب ہرگز تقاعل تجویز نہ نمایند۔

ترجمہ مکتوب (۲) ـــــ فضائل و کمالات دستگاہ میرا ابو سعید سلمہم اللہ تعالیٰ ـــــ فقیر محمد عاشق کان اللہ لہٗ ـــــ بعد سلام لکھتا ہے کہ الحمد للہ تمام احوال اس نیازمند کے لائق حمد و شکر ایزد تعالیٰ ہیں ـــــ مجیب الدعوات سے آپ کے لیے جمعیت صوری و معنوی اور استقامت امور ظاہری و باطنی کی درخواست ہے۔ شوق ملاقات کا جو عالم ہے اُس کو عالم الغیب والشہادۃ خوب جانتا ہے۔ اس شوق کو زبان و قلم کے حوالے کرنا خلاف طریقۂ اہل دل سمجھتا ہوں لہذا..... دوسری بات لکھتا ہوں ـــــ عنایت نامہ جو بعض اقارب کی تکلیف دہی اور جائداد ـــــ جو آپ کے تصرف میں ابھی آئی ہے ـــــ کے کاموں میں خلل اندازی کی شکایات پر مشتمل تھا۔ پہونچا ـــــ اس کے مطالعے سے دل کو تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے میرا دل بے اختیار التجا کرتا ہے کہ وہ محض اپنے فضل و کرم سے مخالفت کو ایذا کی قدرت نہ دے اور موافقت

کی توفیق عطا فرمائے۔ نیز مخالف کی مساعی کو کامیاب نہ کرے۔ مخالف کی ایذا کا اندیشہ کرتے ہوئے سرکار شجاع الدولہ بہادر میں خان ذی شان سید تہور علی خاں کو ایک خط لکھ دیا ہے غالباً وہ آپ سے بھی رابطۂ اخلاص رکھتے ہوں گے امید کہ وہ امر خیر کی توفیق پائیں گے۔ نجیب الدولہ سے فقیر کی چنداں خط و کتابت نہیں ہے اس کے باوجود ممکن کوشش سے دریغ نہ ہوگا۔ ایک بات یہ لکھنا ہے کہ آپ کے مرحمت نامے سے اس طرف قبل رمضان یا بعد رمضان آنے کا وعدہ واضح ہوا تھا۔ وعدۂ قبل رمضان تو ختم ہوا ہی تھا اب رمضان کی بعدیت قریبہ بھی ختم ہوگئی دیکھا چاہیے کہ تمنائے وصال کب پوری ہو۔ اللہ تعالیٰ جلد ملاقات میسر کرے۔ آپ کی ذات گرامی سے یہ امید ہے کہ اس نیازمند کے حق میں دعا کرتے رہیں گے کہ اللہ تعالیٰ آفت خودی و خودپرستی سے نجات دے۔ زیادہ بجز شوق ملاقات کے اور کیا لکھوں۔ والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً فقیر زادہ محمد فائق بھی اپنا سلام یاد دلا رہا ہے۔ حاجی بلال اور محمد سلیم اپنا سلام پہونچاتے ہیں۔ دیگر التماس یہ ہے کہ وہ خط جو حضرت میاں صاحب (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) نے آپ کو لکھا ہے اس کی نقل کرکے اس فقیر کو عنایت فرمائیں۔ اسی طرح خطوط سابقہ کی بھی نقل مرحمت فرمائیں اس بارے میں تغافل کو ہرگز جائز نہ رکھیں۔

مکتوب (۳) ــــ حق سبحانہٗ ذات مجمع کمالات آں عارف المکاشف صاحب الاذواق والمواجید (را) مصدر فیوض ظاہری و باطنی گرداناد آمین برب العباد ــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہ (بعد از) تبلیغ سلام و اظہار شوق و غرام بملاقات فیض آیات مشہود ضمیر منیر میگرداند کہ مدتے مدید و عہدے بعید برآمدہ کہ سوائے یک مکتوب کہ مشحون حقائق و معارف جلیلہ بود نرسیدہ ــــ بنابرآں دل ایں مہجور بالضرور مشتاق لقائے بہجت افزائے و شوق مند مطالعۂ کلمات معارف سمات می باشد ــــ اللہ تعالیٰ بمحض عنایت خویش لطیفہ انگیزد کہ حجاب بُعد صورت از میاں برخیزد و تمنائے دلی بوجہ احسن میسر آید ــــ معلوم نیست کہ دریں ایام بکدام مقام تمکن دارند ــــ امید کہ بدست آئندہ از اسرار و آثار آں اطلاع بخشند تا مشتاقاں ہم ازاں لحظے و لذتے حاصل نمایم ــــ دیگر آنکہ الحمدللہ کہ

بفضل اللہ سبحانہ فقرائے باب اللہ دریں ایام فتن کہ بخصوصیت دریں ملک از دست رفتہ..... حادثہ رو دادہ کہ تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت و تضع کل ذات حمل حملھا ــــ حکایت ازاں میتواند شد ــــ بہمہ وجوہ محفوظ ماندیم ــــ ۵

گر برتن من زباں شود ہر موئے
یک شکر تواز ہزار نتواں کرد

اُمید کہ ایں فقیر را مع الاولاد والاحباب والاصحاب بدعائے ظہر الغیب یاد فرمائند تا در فتن صوریہ و معنویہ محفوظ مانیم و بر صراط مستقیم ثابت قدم باشیم ــــ زیادہ بحد استدعائے یاد آوری چہ اظہار نماید والسلام علیکم اولاً و آخراً ــــ مخدوم زادہ میر ابو العیش سلمہ اللہ سلام و شوق مطالعہ نمایند ــــ فقیر زادہ محمد فائق و وحید الزماں و محمد احسان و محمد نعمان و ابو الفتح و عبد السلام سلام نیاز میرسانند حاجی بلال نیز ــــ

بخدمت گرامی میاں سید علی[1] جیو صاحب کہ فقیر غائبانہ مشتاق ملاقات فیض آیات ایشان است سلام رسانند و استدعاء دعا نمایند کہ حق سبحانہ بمیمن آں از آفت خودی و خود پرستی نجات کرامت فرماید و حاجی میر محمد نعمان جیو سلمہ اشواقیہ مطالعہ نمایند، میاں آل محمد و میاں محمد ہمام و قائم خاں سلام شوق مطالعہ نمایند ــــ

---

[1] حضرت سید محمد عدل عرف سید علی بن سید محمد بن حضرت شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی آپ نے اپنے بھائی سید محمد مکی سے اخذ علوم کیا پھر اپنے والد سے طریقۂ نقشبندیہ حاصل کیا اور رشد و کمال کو پہونچے اور اپنے والد کے جانشین ہوئے ــــ سرزمین اودھ میں اپنے زمانہ کے یگانۂ روزگار بزرگ تھے آپ سے مولانا انوار الحق فرنگی محلی، مولانا ذوالفقار علی دیوی، قاضی عبد الکریم جورسی، مولانا احمدی بن محمد نعیم کرسوی، شیخ محمد یحییٰ بن محمد ضیاء جائسی، سید محمد نعمان ابن محمد نور نقیر آبادی وغیرہم کثیر التعداد علماء و مشائخ نے فیض حاصل کیا ۱۰۹۲ھ میں انتقال ہوا بگیچۂ شاہ علم اللہ حسنی میں مزار ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) مؤلف آئینۂ اودھ نے صفحہ ۲۹۹ پر آپ کو حضرت شاہ علم اللہ حسنی کی پانچویں پشت میں بتلایا ہے جو غلط ہے ــــ درحقیقت آپ حضرت شاہ علم اللہ قدس سرہٗ کے ابن الابن ہیں ــــ یعنی دوسری پشت میں ہیں۔

ترجمہ مکتوب (۳) ـــــ اللہ تعالیٰ آں عارف مکاشف، صاحب اذواق ومواجید کو مصدر فیوض ظاہری وباطنی بنائے آمین ـــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہ تبلیغ سلام اور اظہار شوق ملاقات کے بعد لکھتا ہے کہ ایک مدت دراز ہوگئی کہ سوائے ایک مکتوب کے جو کہ حقائق ومعارف جلیلہ سے بھرا ہوا تھا اور کوئی مکتوب نہیں پہونچا اس بنا پر اس مہجور کا دل شتاق دیدار اور شوق سند مطالعہ کلمات معارف سمات ہے اللہ تعالیٰ محض اپنے کرم سے ایسی صورت پیدا کرے کہ یہ ظاہری پردہ دوری درمیان سے اٹھ جائے اور تمنائے دلی بوجہ احسن میسر آئے ـــــ معلوم نہیں کہ ان دنوں آپ کون سے مقام سلوک پر فائز ہیں، مجھے امید ہے کہ کسی آنے والے کے ہاتھ اپنے موجودہ احوال وآثار سے اطلاع بخشیں گے تاکہ ہم مشتاق بھی اس سے حظ ولطف حاصل کریں ـــــ دوسری بات یہ ہے کہ الحمدللہ ہم آسانۂ خداوندی کے فقیران ایام فتن میں کہ خصوصیت کے ساتھ اس علاقے میں سکھوں کے ہاتھ سے حادثہ رونما ہوا اور جو قیامت کا نمونہ تھا ـــــ بہمہ وجوہ محفوظ رہے ـــــ اگر جسم کے تمام رونگٹے زبان بن جائیں تب بھی اللہ تعالیٰ کا ہزار میں سے ایک شکر ادا نہیں ہوسکتا ـــــ امید ہے کہ اس فقیر کو اور اس کی اولاد، احباب اور اصحاب کو غائبانہ دعا سے یاد کرتے رہیں گے تاکہ ہم ظاہری وباطنی فتنوں سے محفوظ اور صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں ـــــ زیادہ بجز التماس یاد آوری اور کیا لکھوں ـــــ والسلام علیکم اولاً وآخراً ـــــ مخدوم زادہ ابوالعیش سلمہٗ سلام وشوق مطالعہ کریں، فقیر زادہ محمد فائق کے علاوہ، وحیدالزماں، محمد احسان، محمد نعمان، ابوالفتح، عبدالسلام سلام کہتے ہیں اور حاجی بلال بھی ـــــ میاں سید لعل صاحب کی خدمت گرامی میں ـــــ کہ فقیر غائبانہ ان کا مشتاق ملاقات ہے ـــــ سلام پہونچادیں ـــــ اور دعا کی التماس کریں تاکہ حق تعالیٰ اس دعا کی برکت سے مجھے آفت خودی وخود پرستی سے نجات بخشے ـــــ حاجی میر محمد نعمان سلمہٗ اور میاں محمد ہمام اور قائم خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔

مکتوب (۴) ـ بگرامی خدمت حقائق آگاہ ومعارف دستگاہ سلالۂ سادات عظام

نقاوۂ دودمان سلف کرام میر ابو سعید جیو سلمہم اللہ تعالیٰ ـــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہٗ بعد اہدائے سلام و اشواق و طمع میگرداند کہ عنایت نامہ، منبی از قدوم بہجت لزوم در اسعد ساعات ورود نمود بمطالعۂ آں ابواب خوشی و شادی ہر چہ تمام تر بر روئے دل مستہام کشود ـــ از روزیکہ شقۂ شریف مشعر از توجہ بایں دیار و تشریف آوری تا بلشکر رسیدہ بود ہمیشہ انتظار قدوم مسرت لزوم میداشت خصوصاً دریں روزہا کہ لشکر بایں سمت متوجہ شدہ، شب و روز گوش بر آواز مژدہ میداشت ـــ الحمد للہ کہ آں نوید فرحت جاوید رسید اشواق دل مقتضی آں بود کہ بمجرد اصغائے ایں مژدہ بتعجیل ہر چہ تمام تر خود را بخدمت رساند لیکن بعضے مخلصان کہ دلدارئ شاں نیز از اہم مہمات است سد راہ تعجیل شدند پس جہت ضرورت توقف بمیان آمد ـــ ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب میرسم بخاطر جمع در آنجا کہ خانۂ ایشاں است تشریف دارند و در دل صفا منزل، تشویش را راہ ندہند ان شاء اللہ تعالیٰ زود ایں فقیر را رسیدہ دانند و از مژدۂ آنکہ مکاتیب فیض اسالیب حضرت قبلہ ام رضی اللہ عنہٗ ہمراہ شریف آوردہ اند بغایت شادی روئے آورد ـــ شکر ایں عنایت بکدام زبان نمودہ آید کہ از احصائے خارج است ـــ زیادہ بجز التماس اینکہ بخاطر جمع در آنجا تشریف دارند ایں فقیر زود میرسد ـــ چہ اظہار نماید والسلام از فقیر زادہ محمد فاں سلام نیاز مطالعہ نمایند ـــ حاجی ہلال وغیرہ سلام نیازمی رسانند ـــ بعالیجناب شاہ اہل اللہ آداب و تسلیمات ملتمس است، محمد مقرب اللہ و میاں محمد شاہ و رحم علی و ہمہ یاران سلام مطالعہ نمایند ـــ فقط

ترجمہ مکتوب (۴) ـــــ حقائق آگاہ معارف دستگاہ..... میر ابو سعید صاحب سلمہم اللہ کی خدمت میں فقیر محمد عاشق عفی عنہٗ بعد ہدیۂ سلام و شوق فراواں واضح کرتا ہے کہ عنایت نامہ جو قدوم بہجت لزوم کی اطلاع دینے والا تھا سعید ترین ساعت میں وارد ہوا اس کے مطالعے سے مسرت (خوشی) کے دروازے کامل طریقے سے دل پریشاں پر کھل گئے ـــ (اس سے پہلے) اس روز سے جبکہ آپ کا رقعہ اس علاقے کی طرف توجہ فرمانے اور لشکر تک تشریف لانے کا پہونچا تھا ہمیشہ انتظار قدوم

مسرت لزوم تھا ـــ خصوصاً ان ایام میں کہ لشکر اس طرف متوجہ ہوا ہے۔ شب و روز اپنے کانوں کو آپ کی تشریف آوری کی خوشخبری سننے کی طرف متوجہ رکھتا تھا ـــ الحمدللہ کہ وہ نوید فرحت[1] جاوید پہونچی ـــ شوق دل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس خبر کو سنتے ہی ممکن تعجیل کے ساتھ خود کو آپ کی خدمت میں پہونچا دوں لیکن بعض مخلصین کہ اُن کی دلداری بھی بہت ضروری ہے تعجیل سے مانع ہوئے ـــ پس ضرورت کی وجہ سے چند روز کا توقف ہوگیا اللہ نے چاہا تو جلد پہونچ رہا ہوں ـــ اطمینان کے ساتھ وہاں (پہلت میں) تشریف رکھیں وہ گھر آپ ہی کا ہے ـــ دل صفا منزل میں کسی قسم کی تشویش کو راہ نہ دیں ـــ ان شاءاللہ تعالیٰ جلد اس فقیر کو وہاں پہونچا ہوا جانیں ـــ اس خوشخبری سے کہ آپ حضرت قبلہ رضی اللہ عنہ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے مکتوبات بھی اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ بہت ہی خوشی رونما ہوئی آپ کی اس مہربانی کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے کہ احاطۂ بیان سے خارج ہے ـــ زیادہ بجز اس کے کہ ملتماس کے کہ اطمینان کے ساتھ وہاں تشریف رکھیں فقیر جلد پہونچ رہا ہے ـــ اور کیا اظہار کروں ـــ فقیرزادہ محمد فائق کی طرف سے سلام مطالعہ فرمائیں۔ حاجی بلال وغیرہ بھی سلام پیش کرتے ہیں ـــ بعالیخدمت شاہ اہل اللہ (پہلتی) سلام عرض ہے، محمد مقرب اللہ ـ میاں محمد شاہ اور رحم علی نیز (پہلت کے) تمام احباب سلام مطالعہ فرمائیں۔

مکتوب (۵) ..... الحمدللہ تا حالت تحریر کہ بست و دوم شہر ذی قعدہ سن ہشتاد بعد الالف و المأئہ است، احوال ایں فقیر مع صغیر و کبیر موجب شکر و ثنائے حق جل و علا

---

[1] اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ جب پہلت ضلع مظفر نگر پہونچے تو شاہ محمد عاشق پہلتی مع اہل و عیال دہلی میں تھے تشریف آوری حضرت شاہ ابوسعیدؒ کی خوشخبری آپ کو دہلی میں ملی ـــ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا وصال ہو چکا ہے ـــ پچھلے مکتوب میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مکتوبات کا مطالبہ حضرت شاہ محمد عاشقؒ نے کیا تھا اب وہ اس تقاضے کے مطابق مکتوبات ہمراہ لائے ہیں۔ یہ مکتوبات وہی ہیں جن کا پہلی قسط میں اندراج ہو چکا ہے ـــ کتنی خوشی ہو مکتوبات کے ہمراہ لانے کی۔ درحقیقت اسی شوق و ذوق نے بزرگوں کے قلمی تبرکات کو ہم تک پہونچانے میں مدد دی ہے۔

است ..... گاہ گاہ مصحوب آمدگان انیصوب از کوائف عافیت و از اذواق و مواجید خاصۂ خویش شرف اطلاع بخشیدہ باشند ــــ واشتیاق بوصال فیض مالامال چہ نویسد کہ بہ تحریر نمی گنجد ..... ؎

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دلِ من
دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

بعد ازاں آنکہ فقیر بحسب قسمت در موضع نوگانواں سادات کہ قریب بلدۂ امروہہ است رسیدہ بود در آنجا معلوم شد کہ پسر غلام انبیاء کہ عاشق علی نام دارد بے رخصت از خانہ ہمراہ دو یک اطفال دیگر عزم آں دیار کردہ و از مدتے از حال وے خبرے نرسیدہ ازیں جہت پدر و مادر وے اضطراب تمام دارند و پدر وے شنیدہ است کہ مشارٌ الیہ بخدمت شریف رسیدہ بود و چند روز اقامت نمودہ ــ بنابراں ازیں فقیر استدعائے کردہ کہ بخدمت گرانی خطے متضمن استفسار احوال وے نویسد لہذا متصدع اوقات شریف گردیدہ ــ اگر آں سیدزادہ در آنجا بودہ باشد یا از احوال وے اطلاع باشد البتہ اطلاع بخشند زیادہ بجز ذکر دعائے ظہر الغیب چہ التماس نمودہ آید ــ والسلام مع الاکرام ــ میر ابو النعیش سلام شوق مطالعہ نمایند، میر محمد نعمان سلام مطالعہ فرمایند ــ از میاں آل محمد، و میاں رحم علی و میاں غلام امام و محمد قاسم سلام مطالعہ باد ــ دیگر آنکہ صاحبزادہائے مع قبائل باخیر و خوبی در بڈھانہ تشریف می دارند ــ میاں اہل اللہ صاحب و شاہ نور اللہ جیو بخیریت اند ــ محمد فائق و محمد مقرب اللہ و وحید الزماں و محمد احسان و میاں محمد جواد و حاجی بلال و جمیع خورد و کلاں بخیریت اند و بخدمت شریف سلام می رسانند ــ

ترجمہ مکتوب (۵) ..... الحمد للہ اس وقت تک کہ ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ ہے ــ اس فقیر کے حالات مع صغیر و کبیر لائق شکر و ثنائے حضرت حق ہیں ..... کبھی کبھی اس طرف کے آنے والوں کے ہاتھ اپنے کوائف عافیت اور اذواق و مواجید خاصہ سے مطلع فرماتے رہا کریں ــ شوق ملاقات کا سوال کیا لکھوں کہ احاطۂ تحریر میں نہیں سما

سکتا ۵

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و دانند دل من

اس کے بعد تحریر ہے کہ فقیر بحسب قسمت موضع نوگانواں سادات جو کہ شہر امروہہ کے قریب ہے گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ (سید) غلام انبیا کا لڑکا جس کا نام عاشق علی ہے گھر والوں کی اجازت کے بغیر دو ایک لڑکوں کے ساتھ اس طرف (اودھ) کو چلا گیا ہے اور ایک مدت سے اس کے حال کی کوئی خبر نہیں آئی اس وجہ سے اس کے ماں باپ بہت مضطر ہیں۔ اس کے باپ نے کہا ہے کہ عاشق علی مذکور آپ کی خدمت میں بھی ہو چکا تھا اور چند روز (آپ کے پاس) اقامت کی تھی اس بنا پر انھوں نے (سید غلام انبیا نے) مجھ سے استدعا کی کہ میں ایک خط آپ کو اس کے احوال کے استفسار میں لکھوں اسی وجہ سے میں آپ کے اوقات شریف میں مخل انداز ہوا ہوں۔ اگر وہ سیدزادہ وہاں ہو یا اس کے احوال سے اطلاع ہو تو مفصل و مبسوط تحریر فرمائیں ۔ زیادہ بجز عافیت دعائے خیر کے آپ سے اور کیا التماس کیا جائے والسلام مع الاکرام میر ابو العیش سلام شوق مطالعہ کریں اور میر محمد غفران بھی سلام مطالعہ کریں میاں کمال محمد میاں رحم علی میاں غلام امام اور محمد قاسم کی طرف سے آپ سلام مطالعہ فرمائیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ (اس وقت) صاحبزادگان حضرت شاہ صاحب مع متعلقین خیر و عافیت قصبہ

عہ کتنا دلچسپ انگیز اور کیف آور شعر ہے ۔ یہ اُن اشعار میں سے ہے جن کا ترجمہ کرنا اصل کیفیت کا زائل کرنا اور بے ذوقی کا ثبوت دینا ہے ۔

عہ نوگانواں سادات امروہہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود قدس سرہ کے داماد سید بدر الدین اسحٰق کی اولاد میں یہاں کے اکثر باشندے ہیں مگر ایک دو گھر چھوڑ کر سب شیعہ ہو گئے ہیں۔ اب تقریباً دو سال پیشتر سکاس بستی کے اندر اکیس خانقاہیں تھیں آج ایک کا بھی نشان نہیں ۔

عہ اللہ تعالیٰ نے سید غلام انبیا اور ان کے صاحبزادے عاشق علی اور عاشق علی کی نسل کو اہلسنت و جماعت کے مسلک پر قائم رکھا۔ حاجی سعادت علی بن عاشق علی کا ذکر خیر انوار العارفین اور تذکرۃ الکرام میں بحیثیت ایک اہل دل درویش کامل کے موجود ہے۔ عاشق علی کا سفر حج سے واپسی میں انتقال ہوا تھا۔ (انوار العارفین)

بڑھانہ ضلع مظفر نگر میں تشریف رکھتے ہیں۔ میاں اہل اللہ صاحب اور شاہ نور اللہ صاحب بخیریت ہیں۔ محمد فائق، محمد مقرب اللہ، وحید الزماں، محمد احسان، میاں محمد جواد، حاجی بلال اور تمام خرد و کلاں بخیریت ہیں اور آپ کی خدمت میں سلام پہونچاتے ہیں۔

مکتوب (۶) بنام سید ابو اللیث ملقب بخواجہ ابو العیش صاحبزادہ حضرت شاہ سید ابو سعید حسنی رائے بریلوی

سلالۂ سیادت، خلاصۂ نجابت خواجہ ابو العیش عاشق سعید آ و حمید آ از فقیر محمد عاشق عفی عنہ بعد سلام و ادعیۂ درویشاں مطالعہ نمائید کہ اطوار سعادت آں نقاوۂ سفوت و شوق ملاقات ایں فقیر مسموع گردید ازیں معنی نہایت فرح و سرور بدل رسید حق سبحانہ ملاقات باحسن وجوہ میسر کناد و سعادت مند کونین را بترقیات کمالات صوری و معنوی باقصی الغایات رساناد و از علم و فضل بہرۂ وافی بخشاد و در شریعت و طریقت تقویٰ و طہارت رسوخ کمال کہ موروث خاندان حضرت میر صاحب قدس سرہٗ است کناد و در سیر حقیقت باعلیٰ المراتب فائز گرداناد والسلام علیکم اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔ از فقیر زادہ محمد فائق سلام مشتاقانہ مطالعہ نمائید۔

ترجمہ ــــ سلالۂ سیادت خلاصۂ نجابت ..... فقیر محمد عاشق عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام اور درویشانہ دعاؤں کے مطالعہ کریں۔ تمہاری سعادتمندی کا طور طریق اور اس فقیر سے تمہارا شوق ملاقات سننے میں آیا اس بنا پر دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ باحسن وجوہ تم سے ملاقات میسر کرائے اور سعادتمند کونین کو (یعنی تمھیں) کمالات صوری و معنوی میں ترقی عطا کر کے انتہائی درجے پر پہونچائے نیز علم و فضل سے بہت کچھ حصہ عنایت کرے اور شریعت و طریقت، تقویٰ و طہارت میں ــ جو کہ حضرت شاہ میر علم اللہ قدس سرہٗ کی میراث ہے۔ کمال نصیب کرے اور سیر حقیقت میں اعلیٰ مرتبے پر فائز فرمائے۔

والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔

فقیر زادہ محمد فائق کی طرف سے سلام مشتاقانہ مطالعہ کریں۔

(تصحیح متعلق قسط اول۔ ص ۱۶ سطر ۷ میں لفظ "فاطر" کو "فاتر" بنا لیا جائے۔)

تحقیق کے نئے گوشے

(از :- جناب وحید الدین خاں صاحب)

علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "الغزالی" کے دوسرے حصہ میں "معاد یا حالات بعد الموت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں ــــــــ "مذہب کی روح دو روال جو کچھ کہو، معاد کا اعتقاد ہے۔ مذہب میں جو کچھ تاثیر ہے اور افعال انسانی پر مذہب کا جو اثر پڑتا ہے، وہ اسی اعتقاد کی بدولت ہے۔ لیکن جس قدر وہ مہتم بالشان ہے اسی قدر عسیر التصور ہے۔ ایک بدوی شاعر الحاد کے لہجہ میں کہتا ہے :-

أموتُ ثم بعثُ ثم نشرُ	مزا، پھر زندہ ہونا، پھر چلنا پھرنا!
حدیثُ خرافةٍ یا أمّ عمرو	میری بیگم! یہ تو خرافات کی باتیں ہیں

اس مرحلے میں جو مشکلیں ہیں ان میں پہلا اور سب سے مشکل بقائے روح کا مسئلہ ہے۔ یعنی یہ ثابت کرنا کہ روح جسم سے جدا کوئی چیز ہے۔ مادیین کا خیال ہے کہ روح کوئی جداگانہ چیز نہیں، بلکہ جس طرح دواؤں کی ترکیب دینے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے یا تاروں کی خاص ترکیب سے خاص خاص راگ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح عناصر کی خاص طور پر ترکیب پانے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے جو ادراک اور تصور کا سبب ہوتا ہے اور اسی کا نام روح ہے۔

روح کے ثابت کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کی بقا کا ثابت کرنا ہے۔ یعنی یہ کہ جسم کے فانی ہونے پر وہ باقی رہ سکتی ہے۔" (صفحہ ۱۷۰-۱۷۱)

اس کے بعد مفسرون صغیر اور مفسرون کبیر سے امام غزالی کے خیالات ان مباحث

پر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔ " امام صاحب نے روح کی جو حقیقت بیان کی اور اس پر جو دلائل پیش کئے، یونانیوں سے ماخوذ ہیں۔ ارسطو نے اثولوجیا میں بعینہ یہی تقریر کی ہے۔ اور بوعلی سینا نے اس کو مختلف پیرایوں میں آب و رنگ دے کر ادا کیا ہے، لیکن یہ امر بظاہر تعجب انگیز ہے کہ جو سب سے مقدم امر تھا یعنی روح کا اثبات، امام صاحب نے اسی کو چھوڑ دیا۔ روح کا جوہر ہونا، غیر جسمانی ہونا، یہ فرعی امور ہیں۔ پہلے یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ روح کوئی شے بھی ہے یا نہیں" (صفحہ ۱۷۴)

اس کے بعد اپنی طرف سے لکھتے ہیں ـــــ " اصل یہ ہے کہ روح کا وجود ایک وجدانی امر ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک و تعقل محض مادہ کا کام نہیں۔ مادہ ایک بے حس، بے جان اور لایعقل چیز ہے۔ دقیق خیالات اور علوم و فنون مادہ سے انجام نہیں پا سکتے۔ بلکہ کوئی اور جوہر لطیف ہے جس سے یہ کرشمے سرزد ہوتے ہیں اور اسی کا نام روح ہے، لیکن یہ استدلال وجدانی ہے۔ (بوعلی سینا نے روح کے اثبات پر اشارات میں لمبی چوڑی دلیل پیش کی ہے۔ لیکن وہ یونانیوں کے عام دلائل کی طرح صرف لفظوں کا کھیل ہے) اگر کوئی منکر، انکار پر آمادہ ہو اور کہے کہ ـــــ " تم نے جو کچھ کہا محض دعوے کا اعادہ ہے، دلیل نہیں۔ ممکن ہے مادہ ہی ایک خاص ترکیب یا کران نیرنگیوں کا مظہر ہو۔ کلوں سے جو عجیب و غریب حرکتیں ظاہر ہوتی ہیں، ارغنون سے جو دلکش اور موثر نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں روح کا کون سا شائبہ ہے" تو ہم دلیل سے اس کی زبان بند نہیں کر سکتے۔ یہی سبب تھا کہ امام صاحب نے روح کے ثبوت پر کوئی منطقی دلیل نہیں پیش کی" (صفحہ ۱۷۵)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اس بحث کو یہیں ختم کر دیا ہے اور ایک عالم کی ۱۹۰۱ء کی تصنیف میں شاید اتنا ہی کہا بھی جا سکتا تھا۔ مگر میں اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے واقعات و حقائق کے کچھ ایسے نئے گوشے کھولے ہیں جس کے بعد ایک حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ روح کا جسم سے الگ ایک مستقل وجود ہونا یا جسم کے فنا ہونے کے بعد روح کا باقی رہنا محض وجدانی چیز نہیں رہا۔ بلکہ ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جس کو تجرباتی دلیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

جسم کے بارے میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے خلیوں (CELLS) کا مرکب ہے جن کی تعداد ایک متوسط جسم میں ایک ہزار ارب کے قریب ہوتی ہے۔ یہ خلیے ہر آن ٹوٹ کر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ غذا ہضم ہو کر ہمارے جسم کے لئے وہ خلیے مہیا کرتی ہے جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہر روز درکار ہوتے ہیں۔ گویا جسم نام ہے ایک ایسی عمارت کا جو کھربوں اینٹوں سے مل کر بنا ہو اور ہر آن اپنی اینٹوں کو بدلتا رہتا ہو۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک مظہر ہے تو جس طرح مشین کا ایک پرزہ ٹوٹنے سے پوری مشین متاثر ہو جاتی ہے اور باجے کا ایک تار خراب ہونے سے اس کی آواز پر اثر پڑ جاتا ہے اسی طرح جسم کے مرکبات بدلنے یا ضائع ہونے سے روح میں بھی تبدیلیاں ہونی چاہئیں مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح جسم سے الگ ایک چیز ہے جو بذات خود اپنا وجود رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک سائنسداں نے انسانی ہستی کو اس کے جسم کے مقابلے میں ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے جو مسلسل تغیرات کے اندر غیر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:۔

PERSONALITY IS CHANGELESSNESS IN CHANGE

اس خیال کی مزید تصدیق نفسیات کے اس انکشاف سے ہوتی ہے جس کو تحت شعور یا لاشعور کہا جاتا ہے اور جو انسانی ذہن کا نسبتاً زیادہ بڑا حصہ ہے۔ لاشعور کے بارے میں اب یہ تقریباً مسلمہ طور پر مان لیا گیا ہے کہ جو خیالات اس کے اندر جگہ پاتے ہیں وہ تاحیات بالکل یکساں حالت میں باقی رہتے ہیں۔ فرائڈ اپنے اکتیسویں لکچر میں کہتا ہے:۔

"منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور کے اوپر حاوی نہیں ہوتے مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں ..... لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام دماغی افعال وقت اور خاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں۔ لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو۔ لاشعور میں

وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت کے گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسے خیالات (CONATIVE IMPULSES) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے، بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں۔ اور دسیوں سال تک اس طرح سے محفوظ رہتے ہیں گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں۔"

NEW INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS (LONDON 1949) P. 99

لاشعور کے عمل کا وقت کی گرفت سے آزاد ہونا، ظاہر کرتا ہے کہ لاشعور جسم سے الگ اپنا کوئی وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ جسم کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہے اور انھیں حدود کے اندر اسکے تمام مظاہر واقع ہوتے ہیں۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک ظہور خاص ہوتی تو جسم کی طرح اس کو بھی لازماً وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہونا چاہیئے تھا اور جبکہ تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ روح اپنی نوعیت میں جسم سے مختلف ایک چیز ہے جو اس سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ جسم سے روح کا تعلق مشین اور حرکت یا باجے اور راگ کا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح حرکت اور راگ پر بعینہ وہی قوانین مرتب ہوتے ہیں جو مشین اور باجے پر مترتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح روح پر بھی یقیناً انھیں قوانین کا ترتب ہوتا جو جسم کے اوپر اثر انداز ہوتے ہیں۔

دوسری چیز جس کا میں یہاں حوالہ دینا چاہتا ہوں وہ سائیکیکل تحقیقات (PSYCHICAL RESEARCH) کے نتائج ہیں جو خالص تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر موت کے بعد زندگی کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ اس میں ہمارے نقطۂ نظر سے مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ بقائے محض کو ثابت نہیں کرتے بلکہ عین اس شخصیت کی بقا کو ثابت کرتے ہیں جس سے ہم موت سے پہلے واقف تھے۔

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذات خود تو پہلے سے موجود تھیں مگر ان پر سائنسی انداز سے غور و فکر نہیں ہوا تھا۔ مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے۔ مگر جدید دور میں خواب کے مطالعہ سے جو نفسیاتی حقائق معلوم کئے گئے ہیں، ان سے قدیم دور کے لوگ ناآشنا تھے۔ اسی طرح کچھ اور مظاہر ہیں جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعداد و شمار جمع کیے گئے اور سائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا۔ اس طرح جدید مطالعہ کے ذریعہ ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اسی میں سے ایک سائی کیکل ریسرچ ہے جو جدید نفسیات کی ایک شاخ ہے اور جس کا مقصد انسان کی مافوق العادت صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کے لئے سب سے پہلا ادارہ ۱۸۸۲ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور ۱۸۸۹ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کرکے دنیا بھر پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کر دیں۔ یہ اب بھی مطالعۂ نفسیات کا ادارہ (SOCIETY FOR PSYCHICAL RESEARCH) کے نام سے موجود ہے اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے دوسرے ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پراسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکہ) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آرڈر نوٹ کر رہا تھا کہ "یکایک" وہ لکھتا ہے "مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو صاف طور پر مجھے نظر آیا کہ وہ میری بہن ہے"۔ اس کی یہ بہن نو سال پہلے مر چکی تھی۔ کچھ دیر بعد بہن کا یہ پیکر اس کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ مگر اس واقعہ سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کے بجائے وہ دوسری ٹرین سے اپنے وطن سینٹ لوئی (ST. LOUIS) واپس ہو گیا۔ گھر آکر اس نے واقعہ کی پوری تفصیل اپنے اعزہ کو بتائی۔ جب وہ کہتے کہتے اس جگہ پر پہنچا کہ "میں نے بہن کے چہرے کے دائیں طرف سُرخ رنگ کی ایک روشن خراش دیکھی"۔ تو اس کی ماں یکایک کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور اس نے بتایا کہ "لڑکی کی موت کے بعد

ایک اتفاقی سبب سے مجھ سے یہ خراش اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی۔ اس بدنمائی کا مجھے سخت احساس ہوا اور فوراً پاؤڈر لگا کر میں نے خراش کے تمام آثار اس کے چہرے سے مٹا دیئے اور پھر کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

HUMAN PERSONALITY AND ITS SURVIVAL OF BODILY DEATH, BY F.W. H. MYERS, N.Y. 1903, VOL. II, 27-30

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو مرنے کے بعد شخصیتوں کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو وہم و خیال نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چہرے کی خراش کا علم یا تو ماں کو تھا یا مردہ لڑکی کو۔ تیسرا کوئی بھی شخص اس کو قطعاً نہیں جانتا تھا۔

دوسرے قسم کے واقعات جو زندگی بعد موت کا تجرباتی ثبوت فراہم کرتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جن کو خود کار (AUTOMATISTS) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مرد یا عورتیں ہیں جن سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کسی مرنے والے کی روح اس کے اندر رہتی ہے۔ ایسا شخص اپنے تجربہ کرنے والوں کے سامنے چند ایسے جزئی واقعات پیش کرتا ہے جن کو صرف ایک مرا ہوا آدمی جانتا ہے اور جو چند دن بعد صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح مثلاً دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص سے بات کر رہا ہے اور اسی کے ساتھ ہاتھ میں پنسل لئے ہوئے بالکل دوسرے موضوع پر لکھ رہا ہے جس کے مضمون کی اسے خود بھی اس وقت تک اطلاع نہیں ہوتی جب تک وہ لکھنے کے بعد اسے پڑھ نہ لے۔ گویا اس کے اندر اس کے سوا کوئی اور شخصیت ہے جو اس کے ہاتھ سے لکھوا رہی ہے۔

A PHILOSOPHICAL SCRUTINY OF RELIGION, 407-10

اس استدلال کو قبول کرنے میں بہت سے جدید ذہنوں کو تامل ہے۔ سی۔ ڈی براڈ (C. D. BROAD) لکھتا ہے:-

"سائی کیکل ریسرچ کے مشتبہ استثناء کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں سے کوئی شاخ زندگی بعد موت کا ادنیٰ امکان بھی ثابت نہیں کرتی۔"

RELIGION, PHILOSOPHY AND PSYCHICAL RESEARCH

(LONDON 1953) P.236

مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ "سوچنا" ایک شتیہ فعل ہے۔ کیونکہ انسان کے سوا کوئی ایسا وجود اس کائنات میں ہمارے تجربے میں نہیں آیا جو "سوچنے" کے مظہر کی تصدیق کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا باقی رہنا یا باقی نہ رہنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس لئے نفسیات ہی سے اس کا ثبوت یا عدم ثبوت ملے گا۔ کسی اور سائنس میں اسکی تصدیق ڈھونڈنا ایسا ہی ہے جیسے سوچنے کے فطری مظہر کو سمجھنے کے لئے نباتات اور غلریات سے تصدیق طلب کی جائے۔ یہی نہیں، بلکہ خود انسان کے جسمانی حصے کے مطالعہ کو بھی اسکی تصدیق یا تردید کے لئے بنیاد بنایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ جس چیز کی بقا کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہ موجودہ مادی جسم نہیں، بلکہ وہ روح ہے جو جسم سے ماسوا جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ فلسفۂ نفسیات کے بہت سے علماء جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ براؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر سی، جے، ڈوکاس (C. J. DUCASSE) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اُخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کر کے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں وہ سائیکیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں جن میں صرف بقائے روح کا فرضیہ ——— (SURVIVAL HYPOTHESIS) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے۔ ان کی دوسری کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے

چند کے نام یہ ہیں:-

(ALFRED RUSSEL WALLACE)	الفرڈ رسل ولیس
(SIR WILLIAM CROOKES)	سر ولیم کروکس
(F. W. H. MYERS)	ایف، ڈبلیو، ایچ، میرس
(CESARE LOMBROSO)	کیسر لومبراسو
(CAMILLE FLAMMARION)	کیمل فلیمیرین
(SIR OLIVER LODGE)	سر اولیور لاج
(DR. RICHARD HODGSON)	ڈاکٹر رچرڈ ہاگسن
(MRS. HENRY SIDGWICK)	مسز ہنری سڈوک
(PROFESSOR HYSLOP)	پروفیسر ہسلوپ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کو تجرباتی دلیل (EMPIRICAL PROOF) سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو تو قطع نظر اس سے کہ گھڑ ہٹ کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کر لی ہے، قطعی معلومات بالآخر اسکے بارے میں حاصل ہو سکیں گی مگر ایسی صورت میں اسکی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔"

A PHILOSOPHICAL SCRUTINY OF RELIGION: P 412

یہاں تک پہنچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلق مذہبی عقیدے کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں بات کر لیں۔ اس کے بعد اس کے ایک عزیز کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کر کے ریسور اس کے کان پر لگا دیا جائے۔ مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے ــــ "کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو، ہو سکتا ہے کوئی مشین بول رہی ہو۔"

دربارِ عالمگیری

(از مولانا مصطفےٰ حسن علوی۔ ایم اے پی ایچ ڈی)

(۲)

ملا جیون کی تصانیف یوں تو عام طور پر مشہور معلومات یہی ہیں کہ ملا جیون نے نور الانوار اور تفسیر احمدی یہ دو کتابیں لکھی تھیں لیکن یہ واقعہ کے خلاف ہے، غالباً یہ شہرت اس بنیاد پر ہے کہ نور الانوار مطبوع ہو کے درسِ نظامیہ کے نصاب میں عام طور پر مدارسِ عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور عموماً تذکرہ نویس تفسیر احمدی کا بھی ذکر کر دیتے ہیں لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ آپ کی عمر ابھی ۱۲ سال سے قدرے متجاوز ہی تھی کہ آپ نے اسرار و سلوک میں آدابِ احمدی لکھی عیدین اور جمعہ کے خطبات بکمالِ فصاحت و بلاغت ترتیب دیے۔ اپنے جد امجد شیخ عبید اللہ اور شیخ علیم اللہ کی کتابوں کو ایڈٹ کیا اور ایک رسالہ علم تجوید و قرأت میں لکھا۔ بزرگوں کے حالات میں مناقب لاولیا کے نام سے فارسی میں کتاب لکھی۔ غلبۂ سکر و محبت میں مولانا رومی کے طرز پر ایک مثنوی بھی فارسی میں لکھی جس میں چھ دفتر اور ۲۵ ہزار اشعار تھے۔ حافظ شیرازی کے رنگ [illegible] ہزار اشعار لکھے قصیدہ بردہ کی روش پر تقریباً ۲۲۰ اشعار کا ایک قصیدہ اس کے علاوہ ہے۔ اس پر مستزاد جدہ پہونچتے ہی اس کی شرح بھی عربی میں لکھ ڈالی[1]۔ اور غلبۂ شوق و اشتیاق عربی میں تقریباً ۲۹ قصائد مزید لکھے اور علماء حرمین شریفین سے ان کی داد لی۔ مدینہ کے دورانِ قیام میں ایک رسالہ سوانح پر مجازات لوائح جامی علم تصوف میں بھی ان کے قلم سے نکلا۔

---

[1] سوانح خود نوشت ملا جیون۔ قلمی

علم اصول الفقہ اور نور الانوار (ملا جیونؒ)

آج بالخصوص ہندوستان کے مدارس عربیہ کا کون منتہی اور فاضل ہے جو ملا جیونؒ کے اس شاہکار سے واقف نہیں۔ خاصکر جس نے فقہ حنفی پڑھی اور اس کی درسیات میں یہ موضوع داخل تھا درس نظامیہ کے عنوان سے جو نصاب شائع ذائع ہے اس کا پڑھنے والا کتاب الاصول الشاشی پڑھ کے اصول فقہ سے فی الجملہ روشناس ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نور الانوار میں اسے اجنبیت کا شکوہ نہیں ہوتا نہ اسے غیریت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے مختلف مطابع میں چھپی ہے اور اس کے حواشی صاحب قمر الاقمار مولانا عبد الحلیم کی توضیحات اور تشریحات سے مزین ہیں۔ یہ کتاب ایسی کچھ ہر دلعزیز ہوئی کہ اس کا خلاصہ مولانا رستم علی نخودی نے بنایا اور اس کا اردو میں مولانا عبد الجبار نے ہدایۃ الابصار کے نام سے ترجمہ بھی کر دیا۔ نور الانوار در اصل امام ابو البرکات عبد اللہ ابن احمد حافظ الدین نسفی المتوفی ۷۱۰ھ کی کتاب منار الانوار کی شرح ہے ابو البرکات رحمہ اللہ احناف کے ایک جلیل القدر عالم گزرے ہیں اور جن کی کتاب کے متعلق حاجی خلیفہ کشف الظنون میں یوں رقم طراز ہیں۔

متن متین جامع مختصر نافع و	عبارت ٹھوس اور قوی ہے مختصر ہے
هو فی این کتبه المبسوطة و	جامع ہے اور نفع بخش ابو البرکات کی
مختصرة من المضبوطة اکثرها	مختصر اور مطول تمام کتابوں میں یہ
تداولا واقربها تناولا۔	ہی زائد پڑھی جاتی ہے اور سہل الحصول
لکنه مع صغر حجمه وجازة	بھی ہے۔ ہے تو چھوٹا سا رسالہ اور
نظمه بحر محیط بدر الحقائق[1]	عبارت میں مصنف نے ایجاز سے کام
الخ۔	لیا ہے لیکن حقائق کے موتیوں کا ایک بڑا
	سمندر ہے۔

اس منار الانوار کی ایک شرح خود مصنف نے لکھی اور دوسری ہندوستان کے ایک عالم

---

[1] کشف الظنون حاجی خلیفہ جلد دوم صفحہ ۵۱۹

سعدالدین ابوالفضائل دہلوی المتوفی ۸۹۱ھ نے افاضۃ الانوار فی اضاءۃ اصول المنار کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ سید یوسف جمال ملتانی نے کتاب توجیہ الکلام میں بھی اسی کی شرح کی تھی۔ ملا عبدالسلام دیوی مضافات بارہ بنکی اودھ نے بھی ایک شرح لکھی۔ کتاب نورالانوار کیا ترتیب مضامین کیا قوت استدلال کیا استنباط مسائل کتاب سنت اجماع قیاس وغیرہ کے مباحث ضروریہ سے مالا مال ہے۔ طرز بیان دلکش اور اس کے افہام کے طریقے آسان اور سہل تر ہیں۔ عبارت میں ثقل نہیں کہ پڑھنے والے کو بوجھل ہو جائے سطروں میں غموض نہیں کہ الجھن پیدا کرے ادبیت کا وہ رنگ نہیں کہ طالب علم اسی میں کھو جائے اور کتب لغات اور قاموس کی طرف مراجعت کی اسے ضرورت لاحق ہو۔ ایک متوسط استعداد والا دقیق مباحث اور نکات کو سمجھے نہ سمجھے تاہم ترجمہ سمجھ لے گا۔

ملا صاحب نے یہ کتاب مدرسہ نبوی میں بیٹھ بیٹھ کے لکھی تھی اور تائید ایزدی اور مدد غیبی آپ کے شامل حال تھی کہ اس کی تالیف میں صرف دو ماہ ربیع الاول اور ربیع الثانی ۱۱۱۲ھ صرف ہوئے اور جب عرب اور عجم کے حلقۂ علماء میں پہونچی تو مقبول اور نہایت مقبول ہوئی۔

جہاں تک معلومات کا تعلق اور تحقیق کی رسائی ہے ارباب علم و تحقیق امام شافعیؒ کو اصول فقہ کا موجد اور بادا آدم سمجھتے ہیں اور بقول امام رازی رحمہ اللہ امام شافعی نے ہی سب سے پہلی اینٹ اس عمارت کی رکھی تھی چنانچہ فرماتے ہیں۔

اعلم ان نسبۃ الشافعی الی	علم اصول فقہ کا امام شافعیؒ کے ساتھ
علم الاصول کنسبۃ ارسطا	وہی تعلق ہے جو علم منطق کا ارسطا
طالیس الی علم المنطق وکنسبۃ	طالیس اور علم عروض کا خلیل بن احمد
الخلیل بن احمد الی علم العروض	کے ساتھ۔

یہ واقعہ ہے کہ علم منطق کو ارسطا طالیس کی تنظیمی شکل میں لانے سے پہلے لوگ اپنی اپنی سلامتی طبع کو ہی دلائل اور براہین کے لیے کام میں لاتے۔ لیکن شایان شان ترتیب نہ ہوتی اور نتائج نکالنے اور اخذ کرنے میں اضطراب بے ڈھنگا پن ظاہر رہتا اور جب ارسطا طالیس نے

حدود اور مصطلحات قائم کردیں اور غور و فکر کے بعد قوانین وضع کر دیے تو ان کا تتبع آسان ہوگیا۔ ایسے ہی جیسے کہ شعراء عرب و جاہلیت اشعار لکھتے اور وہ موزوں ہوتے۔ لیکن لاقانونیت کے تحت۔ اور جب خلیل نے تتبع اور استقرا سے علم عروض کے نام سے اوزان شعری کے قوانین وضع کر دیے تو شعراء کی طبائع نے فی الجملہ گویا اسی کی تقلید شروع کر دی۔ اور بالکل اسی طرح فقہاء اسلام استدلال لانے اور مخالف کے سامنے معارضہ کرنے میں اپنی طبائع سلیمہ کو کام میں لاتے جو افہام اور تفہیم کے لیے معاون اور مددگار ہوتیں۔ لیکن اللہ جزائے خیر دے امام شافعیؒ کو کہ انھوں نے غور و فکر تتبع استقرا سے ان امور کو ایک قانونی اور آئینی شکل دے کے مدون کر دیا اور ان قوانین کو شرعی دلائل سمجھنے اور سمجھانے میں معاون اور مساعد بنا دیا۔ عام و خاص ناسخ منسوخ اجماع رائے اجتہاد قیاس کی اصطلاحیں قائم کر کے ان کی جامع اور مانع تعریفیں مدون کر دیں۔ اور ان کے دائرے متعین کر دیے بہرکیف بقول علماء اسلام اصول فقہ سے امام شافعی کو وہی نسبت ہے جو علم عروض کو خلیل اور علم منطق کو ارسطاطالیس سے۔ کہتے ہیں کہ امام شافعی نے اس فن پر ایک رسالہ بغداد کے قیام کے دوران لکھا تھا جو گو مختصر تھا مگر اس میں قواعد و قوانین ضروریہ سب ہی آگئے تھے۔ ان سے ہی متاخرین علماء نے اس میں اضافات کیے۔ جو بھی کیے لیکن ابن ندیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن حسن شیبانی نے بھی ایک رسالہ اسی فن پر لکھا تھا۔ لیکن امام شافعی کا رسالہ اب بھی موجود ہے اور امام محمد کے رسالہ کا کہیں بھی کتب خانوں میں سراغ نہیں ملتا واللہ اعلم۔ کاش یہ رسالہ مل جاتا تو اس کو سامنے رکھ کے علماء اور اہل تنقید و تحقیق کو اس کے مواقع حاصل ہوتے کہ معلوم کر لیں کہ امام شافعی نے اس پر کیا کیا اضافات کیے ان سے کیا کیا استفادے اور کہاں تک ان کی خود طبیعت نے معقول اختراعات کیے اس لیے کہ ان اختراعات کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ مخترعہ قواعد کے تحت ہی قرآن حدیث اجماع اور قیاس سے مسائل شرعیہ کا استنباط آسان تھا۔ اور انھیں اصول کے تحت فروع کی تفریع اور استخراج سہل۔ امام شافعی نے ان اصول اور قواعد کو اپنے رسالہ ہی میں لکھ کے انھیں پر اکتفا نہیں کی بلکہ

اپنی کتاب "کتاب الام" میں بھی موقع موقع سے کچھ مزید فصلیں لکھیں اور نئے قواعد تحریر فرمائے[1]

امام شافعیؒ کی اس فن میں اسبقیت کے متعلق سطور بالا میں روشنی ڈالی جا چکی لیکن امام ابوالہلال عسکری نے لکھا ہے[2] کہ اس فن کا بانی اور موجد واصل ابن عطا ہے۔

وھو اول من قال الحق یعرف	واصل ہی پہلا شخص ہے جس نے یہ
من وجوہ اربعۃ کتاب ناطق	بتایا کہ شرعی احکام کے استنباط کے
وخبر مجتمع علیہ وحجۃ عقل	چار ذرائع ہیں۔ کلام اللہ، حدیث صحیح
واجماع من الامۃ۔	اجتہاد اور اجماع امت۔

لیکن ان بیانات میں تطبیق اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ مشہور فقہاء اسلام میں اس فن کو منصۂ تحریر میں لانے کا سہرا اور ایک خاص تنظیم کا امتیاز امام شافعیؒ کو ہی حاصل ہوا، گو اس سے پہلے بھی اس کی بنیادی الحمایہ قائم ہو چکی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدتوں امام شافعی نے ابوالہذیل العلاف معتزلی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ طریقہ استنباط و استدلال کے انداز انھیں سے سیکھے تھے اور یہ ابوالہذیل عثمان بن خالد الطویل کے شاگرد تھے اور خالد الطویل واصل بن عطاؒ کے بہرکیف شہرت اسی کو ہے کہ امام شافعی اس کے موجد اور مخترع[3] تھے اور وہ بھی اس شکل موجودہ کے ساتھ اور ان کے بعد علماء انھیں کے نقش قدم پر چلے اور شاید ابوالہذیل وغیرہ کے طرز انشاد کی جھلک اس میں کہیں کہیں پائی بھی جاتی ہو، اس لیے کہ اصول فقہ میں علم کلام کے کچھ انداز بیان ملتے جلتے ہیں۔

علماء اصول فقہ نے اپنی کتابوں میں دو مسلک اختیار کیے تھے۔ ایک متکلمانہ اور دوسرا فقیہانہ۔ متکلمانہ مسلک میں زیادہ تر توجہ قواعد، قوت استدلال اور رفع اعتراضات وغیرہ پر

---

[1] الرازی صفحہ ۱۰۔ و ما بعد و کتاب الشافعی و منبع اصول الفقہ" مصنفہ استاد مصطفےٰ عبدالرزاق [2] کتاب الاوائل (مخطوطہ) ندوۃ العلماء [3] المنیۃ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل امام مہدی لدین اللہ مرتضیٰ الیمانی مطبوعہ دکن۔ [4] کشف الظنون جلد اول صد ۱۱۴۔

کی جاتی ہے اور فقیہانہ مسلک میں قواعد کے ساتھ امثلہ اور نظائر بھی پیش کردی جاتی ہیں۔ نیز فقہی نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی مسائل کی تصریح کردیتے ہیں۔ انھیں متکلمانہ انداز میں لکھنے والوں کی دو جماعتیں اور دو علیحدہ علیحدہ گروپ ہوئے ہیں۔ ایک تو معتزلہ اور دوسرے اشاعرہ۔ اور چونکہ بقول شخصے کہ اس فن کی عمارت خشت اول معتزلہ ہی نے رکھی یا داغ بیل انھیں نے ہی ڈالی اس لیے معتزلیوں میں اس کا لٹریچر بھی بہت زائد اور خاصی تعداد میں کتابیں بھی لکھی ہوئی ملتی ہیں چنانچہ حاجی خلیفہ بھی اس حقیقت کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوگیا وہ لکھتا ہے

واکثر التصانیف فی اصول الفقہ لاھل الاعتزال[1]	اصول فقہ پر زیادہ تر کتابیں معتزلیوں نے لکھیں۔

انھیں معتزلیوں کی کتابوں میں دو کتابوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی ایک تو کتاب العہد ہے جو قاضی عبدالجبار معتزلی نے اور دوسری کتاب العہد کی شرح ہے جو ابوالحسن بصری نے لکھی تھی۔ اسی طرح اشاعرہ کی دو کتابیں خاص الخاص اہمیت سے متصف ہیں۔ ایک کا نام کتاب البرہان جو امام الحرمین کی تصنیف ہے اور دوسری امام غزالی کی المستصفیٰ۔ امام رازی نے انھیں چار کتابوں کا ایک خلاصہ بنایا تھا جو کتاب المحصول کے نام سے مشہور ہے پھر ان چار کتابوں یعنی کتاب العہد شرح کتاب العہد کتاب البرہان اور مستصفیٰ الاصول کا بھی سیف الدین آمدی کتاب الاحکام کے نام سے تلخیص تیار کیا تھا اسی کتاب المحصول اور آمدی کی کتاب الاحکام کو سامنے رکھ کے امام بیضاوی نے منہاج الاصول ایک کتاب تیار کی۔

علماء احناف میں سے امام ابوزید دبوسی نے تقویم الادلہ اور اس کے کچھ زمانہ بعد امام فخر الاسلام بزدوی نے کشف الاسرار یہ دو کتابیں اصول فقہ میں لکھیں۔

(باقی)

---

[1] کشف الظنون جلد اول صـ۱۱۴

مجاہد کبیر مولانا محمد یوسفؒ

از مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف (مدیر المنبر لائل پور)

آج سے شاید ۳/۴ سال قبل کا ذکر ہے۔ محترمی مختار احمد صاحب انجینیر شیلی خان، لائلپور میں تھے، ایک رات ان کا فون آیا کہ صبح لاہور کا پروگرام ہے، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی تقریر نماز فجر کے بعد ہوگی۔ ہم تین بجے (سحری کے وقت) یہاں سے روانہ ہوں گے اگر آپ ہمارے ساتھ چلیں تو آپ کو گھر سے لیتے جائیں، ہم حسب پروگرام لائلپور سے چلے فجر کی نماز غالباً "بھکی" میں ادا کی، بلال پارک پہونچے تو مولانا کا خطاب ہو رہا تھا حسب معمول مولانا پورے جوش سے خطاب فرما رہے تھے۔ دنیا کی حقیقت کو بے نقاب کرنے اور آخرت کی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے بے پناہ دلائل دیے چلے جا رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک لاوا ہے جو پورے جوش و خروش کے ساتھ پھوٹ رہا ہے۔ اور ماحول کو گرمائے بلکہ پگھلائے جا رہا ہے۔ ۸ بجے خطاب ختم ہوا، حسب حکم مولانا مفتی زین العابدین صاحب کی عنایت خاص سے ناشتہ کرنے کے بہانے حضرت مرحوم مغفور کی معیت کا شرف حاصل ہوا اور قریب سے یہ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا کہ شرق و غرب میں پھیلنے والی اس دعوت کا داعی کس انداز سے سوچتا ہے۔ اسے اپنی دعوت سے کس قدر لگاؤ ہے اور اس کی اپنی ذات پر یہ اجتماعی جدوجہد کس قدر غالب ہے۔

اللہ اللہ! انہماک محیر العقول تھا، اور اللہ کے اس بندے کا دل صحیح معنوں میں اس بات کے لیے تڑپ رہا تھا کہ جو شخص بھی انھیں مل جائے وہ اس کے دل و دماغ

کو دستک دیں، موثر سے موثر انداز میں اپنی دعوت اس کے سامنے رکھیں اور مدلل ترین طریق سے اسے یہ سمجھائیں کہ اسلام کا وہی مفہوم و معنی اور وہی ماحول عنداللہ مقبول اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے جو سید الکونین باباً سنا ہوا اتنا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت میں لوگوں نے سنا اور دیکھا تھا۔

مولانا محمد یوسف نور اللہ مرقدہ نے، باشتہ کے دسترخوان پر بیٹھتے ہی گفتگو شروع فرمادی اور اس انداز سے فرمانے لگے کہ کوئی شخص ان کی گفتگو کے زور، استدلال کی ندرت اور مطالب کی آمد کا مشاہدہ کرکے یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہیں جو ابھی تین گھنٹے کے زوردار خطاب سے فارغ ہوئے ہیں ——— یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک تازہ دم خطیب ہیں، ایک ایسے واقعی مصروف گفتگو ہوئے ہیں تاریخ کے صفحات جن کے سامنے کھلے پڑے ہیں اور وہ ایک ایک واقعہ سے عہد رسالتؐ کی تصویر کشی اس انداز سے کر رہے ہیں کہ سننے والے کا دماغ ہی نہیں دل بھی یقین کر رہا ہے کہ آپ درست فرما رہے ہیں۔

اس یادگار صحبت میں مولانا علیہ الرحمۃ اس عنوان پر گفتگو فرما رہے تھے کہ بعض لوگ اپنے موجودہ ماحول میں رہتے ہوئے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اسلام فلاں مشکل کو کیسے حل کرتا ہے اور فلاں پیچیدگی کو کس طرح دور کرتا ہے۔ مثلاً یہ پوچھا جاتا ہے کہ عہد حاضر کی معاشی مشکلات کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟

مولانا نے فرمایا:-

"جب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو جن چند افراد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ایمان کو قبول کیا۔ حضورؐ نے ان کے معاشی مسئلے کے بارے میں جو رد یہ اختیار فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے سب سے پہلی بات، توبہ فرمائی کہ تم جتنے اوقات معاش کے لیے وقف کیے ہوئے ہو، ان کا بیشتر حصہ اسلام کے لیے فارغ کردو، دوسرا ارشاد یہ ہوا کہ فلاں ذریعہ کو ترک کردو، یہ ناجائز ہے فلاں معیشت سے دستکش ہو جاؤ، یہ تمہارے رب کو ناپسند ہے ——— معیشت پر ان دو حملوں کے بعد تیسرا وار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ جو کچھ تم کماتے

ہو۔ یہ صرف تمہارا حق ہی نہیں ہے اس میں تمہارے ان بھائیوں کا بھی حق ہے جو وسائل معیشت سے تہی دامن ہیں اور جو تھی بات آپ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جو کچھ تم کماؤ، اس میں سے بہت سا دین کی خدمت، خدا کے لیے کلمۃ الحق کی سربلندی اور بنی نوع انسان تک اپنی دعوت کو پہونچانے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے میں صرف کرو ——— گویا حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یہ کہ صحابہؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے جو کچھ کماتے تھے اس کا دائرہ محدود کیا، جتنے اوقات کمانے پر صرف کرتے تھے ان کی مقدار کم کر کے ان اوقات کو دین کے لیے وقف فرمانے کا حکم دیا، جو کچھ کماتے تھے اس میں دوسروں کا حصہ مقرر فرما دیا اور اس کے بعد بھی جو بچا اس کے بارے میں بھی یہ حکم دیا کہ اس کا ایک حصہ اسلام پر خرچ کرو ——— یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس زندگی کے مسائل و مشکلات حل کرنے کا۔"

راقم مولانا ممدوح کی یہ گفتگو سن رہا تھا اور محوِ حیرت تھا کہ یہ معاشی فلسفہ ہے کس کتاب میں؟ اور پھر خود ہی اپنے آپ کو جواب دیا کہ بلاشبہ قرآن، سنت اور تاریخ عہد نبوت تو اس فلسفہ معیشت کو پیش کرتے ہیں۔ البتہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

اس کے ساتھ جس بات کا گہرا اثر راقم الحروف نے اس مجلس میں لیا وہ یہ تھی کہ مولانا محمد یوسف تغمدہ اللہ برحمتہ تین گھنٹے کے خطاب کے بعد اس کمرے میں (آہ! یہ وہ کمرہ تھا، جہاں آپ نے اس حیات ناپائیدار کے آخری لمحات گزارے) تشریف تو لائے تھے ناشتے کے لیے مگر آپ اپنی دعوت کے ایک پہلو کی وضاحت میں اس قدر مستغرق تھے کہ نہ صرف یہ کہ انھیں ناشتے کی جانب کوئی توجہ نہیں تھی بلکہ ہوا یہ کہ ایک رفیق نے چائے کی پیالی پیش کی تو آپ نے پکڑ لی۔ دس پندرہ منٹ تک، وہ یونہی پیالی ہاتھ میں پکڑے رہے اور پھر ایک شریک مجلس کے توجہ دلانے پر آپ نے وہ چائے جو اب پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی، حلق میں انڈیل لی۔ دوسری پیالی یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ حضرت یہ گرم ہے، پی لیجیے اور یہ بسکٹ بھی تناول فرمائیے تو اللہ کے اس بندے نے اس پیالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا، گفتگو میں مستغرق رہے اور ۱۰۔ ۱۵ منٹ بعد اسے

بھی پانی کی طرح پی لیا۔

اس کے بعد اٹھے، اور ایک دوسرے اجتماع میں تقریر کے لیے تشریف لے گئے، اور یہ پہلے سے معلوم تھا کہ دوپہر سے قبل ایک تیسرا خطاب بھی آپ کو فرمانا ہے۔

یہ مجاہدہ ـــــ ٹھیک عملی شہادت تھی۔ اس تصور مجاہدہ کی جو حضرت مرحوم مغفور اپنی تقریروں میں پیش فرمایا کرتے تھے ـــــ گویا قول و عمل دونوں میں وہ صادق بھی تھے اور یکساں بھی (رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً)۔

مولانا علیہ الرحمۃ سے ملاقات اور بالمشافہ آپ کے خطابات سننے سے پہلے راقم اس سوءِ فہمی کا شکار تھا کہ تبلیغی جماعت کے اکابرین کا فکر صرف ان ہی چھ باتوں، یا چھ اصولوں تک ہی محدود ہے جو حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ نے پیش فرمائے تھے ـــــ

ـــــ اسی طرح یہ پریشانی بھی اس کو لاحق تھی کہ تبلیغی جماعت تو اپنے کام اور افراد کی تعداد کے اعتبار سے بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کے ذمہ دار حضرات اس جماعت کی ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کا کوئی مداوا نہیں کر رہے ـــــ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خیال تھا کہ وہ ان کمزوریوں کو محسوس ہی نہیں کر رہے ـــــ جو اس قسم کی بڑھنے اور پھیلنے والی جماعتوں میں ہمیشہ پیدا ہوا کرتی ہیں اور جماعتیں ان ہی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے ہی ختم ہو جایا کرتی ہیں ـــــ اس پریشانی کو بیک وقت دو چیزوں نے بڑی حد تک کم کیا۔ ایک تو محب مکرم مولانا مفتی زین العابدین صاحب کی شخصیت اور اس عنوان پر ان کے احساسات نے اور دوسرا سہارا اس پریشانی کو مغلوب کرنے کے لیے میسر آیا۔ مولانا محمد یوسف (برد اللہ مضجعہ) کی چند مختصر مجلسوں اور چند مفصل خطابات کے [illegible] مولانا علیہ الرحمۃ ان تمام نفسیاتی امراض سے کما حقہ آگاہ تھے جو تبلیغی جماعت کی طرح پھیلنے والی جماعتوں اور داعی و مبلغ کی حیثیت سے دوسروں کو نصیحت اور تبلیغ کرنے والے افراد میں پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ میں نے دیکھا کہ مولانا رائے ونڈ کے اجتماعات میں نفسیت سے، دنیا کی محبت، شہرت کی ہوس، دین کے نام پر کام کرنے والوں کی طمع و حرص اور آپس میں مسابقت منافست اور بالآخر مشاجرت و نفاق اور اسی طرح نمازوں کا اہتمام

کرنے والوں میں، غرور نفس، بے جا زعم، اپنے کام پر فخر اور اسی قسم کے دوسرے عنوانات بڑی وضاحت سے بیان فرماتے، بڑے موثر اور مدلل انداز میں فرماتے اور حق یہ ہے کہ ایک ایسے قائد کی حیثیت سے فرماتے جو ایک جانب تو کام کی توسیع کے لیے اپنی تو انائیوں کو دادوں پر لگانے کا فیصلہ کر چکا ہو اور دوسری طرف وہ اس غم سے پگھلا جا رہا ہو کہ جو قافلہ وہ تیار کر رہا ہے کہیں وہ ان بیماریوں کا شکار نہ ہو جائے، جو اس سے پہلے اس قسم کے قافلوں کو ناکام و نامراد بنانے کا باعث بن چکی ہے۔

اللہ کی راہ میں بے پناہ محنت، اپنی دنیا سے یکسر غافل ہو کر، ہر وقت دین کا فکر اور امت کی بہی خواہی کا کرب رکھنے والا یہ انسان، اس دنیا میں بلاشبہ اللہ کی ایک حجت تھا اور اللہ رب العزت حقیقی نے اپنے اس بندے کو بیک وقت، قول، عمل، قلبی نور، ایمان و یقین اور جہاد و اجتہاد ہر قسم کی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ وہ سفر و حضر میں یکساں رہتا تھا، نوافل، ذکر، دعا، خطاب، گفتگو، غرض ہر کام میں وہ دوسروں پر فائق رہتا تھا اور بیسیوں اہل علم و اصحاب رشد گواہ ہیں کہ جس غیرت و جوش ایمانی سے ہزاروں انسانوں کو اپنے رب کی جانب، دین کی عظمت رفتہ کو واپس لانے اور امت کی اصلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کرنے کی دعوت دیتا تھا، وہ جب خلوت میں اپنے رب سے مناجات کرتا اور جب اسے اپنے رب کے گھر میں حاضری کا موقع ملتا، تو وہ غلاف کعبہ کو ہاتھ میں تھامے، بچوں کی طرح بلبلاتا، روتا، "یارب البیت یارب البیت" کہہ کر ڈھاڑیں مار مار کر روتا اور کفر کے باہمی ٹکراؤ، اسلام کی سربلندی اور خاتم النبیین صلی اللہ وسلم کی امت کی ہدایت و رفعت کی دعائیں اس انداز سے کرتا کہ سننے دیکھنے والوں کو اس کی آہ و زاری پر ترس آنے لگتا۔

آہ! ہم اس عظیم المرتبت، داعی اور رفیع المنزلت مجاہد سے اس کی معرفت بھری تقریروں سے اور اس آہ سحر گاہی اور بیت اللہ کے دروازے پر رو رو کر اس کے دعا کرنے کی برکت و رحمت سے محروم ہو گئے، یقیناً آج مولانا محمد یوسف علیہ الرحمۃ کی والدہ ماجدہ مستحق ہیں کہ ملت کے کروڑوں افراد ان سے اظہار ہمدردی کریں کہ اس

پیرانہ سالی میں انھیں یہ عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ آج حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نفعنا اللہ بطول حیاتہ۔ لائق تعزیت ہیں کہ ان کا قابل فخر داماد اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور آپ کو ضعیفی کے عالم میں ان کی جدائیگی کا زخم سہنا پڑا۔ آج مولانا محمد ہارون بلاشبہ مستحق ہیں کہ ان کے بلند مرتبہ باپ کی رحلت پر ان سے تعزیت کی جائے لیکن حق یہ بھی ہے کہ آج ہر وہ شخص ان تینوں شخصیتوں کی طرح تعزیت کا مستحق ہے جس نے مرحوم کو پہچانا، ان سے محض اللہ کے لیے تگاؤ پیدا ہوا اور اس دور زوال میں اس نے مرحوم و مغفور مولانا محمد یوسف کو اسلام کی خدمت کے لیے قابل اعتماد پایا۔

مولانا کی رحلت اگر صدمہ ہے تو سب مسلمانوں کے لیے اگر نقصان ہے تو پوری امت کا۔ اللھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔ (فقیر ابن الفقیر الکھنوی)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶)

کیا جائے۔ (مغربی بنگال)

۴۔ انگریزی اور ہندی دونوں کو سرکاری زبان بنایا جائے (وزیر اعلیٰ مدراس)

۵۔ ہندوستان کی کوئی بھی زبان ہو مگر انگریزی کو ختم کیا جائے (ڈاکٹر رام منوہر لوہیا)

۶۔ مشترکہ زبان کا درجہ صرف انگریزی کو دیا جائے اور دستور کے سترھویں حصہ کو ختم کیا جائے (راجہ جی)

۷۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان سنسکرت تسلیم کی جائے اور جب تک سنسکرت انگریزی کی جگہ لینے کے قابل ہو انگریزی کو سرکاری زبان رکھا جائے اور اس غرض کے لیے دستور میں تبدیلی کی جائے۔ (اکھل بھارتیہ سنسکرت بھاشا سمیلن کلکتہ)

مرکزی حکومت نے تامل ناڈ کے مظاہرین کو یقین دلایا ہے کہ پنڈت نہرو کی اس یقین دہانی کو لسانی ایکٹ میں ترمیم کر کے قانونی شکل دے دی جائے گی جب تک غیر ہندی علاقوں کے لوگ چاہیں گے اس وقت تک سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کے ساتھ انگریزی باقی رہے گی۔ لسانی ایکٹ میں ترمیم کا مسودہ ابھی تک عام نہیں کیا گیا ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اسی لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مجوزہ ترمیم کا مسئلہ کا حل ثابت ہو سکے گی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی مستقل حل نہیں ہے بلکہ عارضی ہے۔ (باقی)

"اللہ والوں کا اجتماع"

آنکھوں دیکھا حال

از جناب _____ محمد اسلم صاحب

[مندرجہ بالا عنوان کے ساتھ ذیل کا یہ مضمون جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی وفات سے صرف ایک ہفتہ پیشتر کے ایک ایسے تبلیغی اجتماع کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے جس میں حضرت مرحوم نے خطابات فرمائے۔ معاصر شہاب لاہور کے شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے _____ ادارہ]

کافی دنوں سے شہر کی اکثر مساجد میں یہ دیکھنے میں آتا رہا کہ عصر یا مغرب کی نماز کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوتے اور بڑی نرمی سے یوں گویا ہوتے۔

"بھائیو! دعا کے بعد تشریف رکھئے دین کی بات ہوگی"

کہنے والے کی اتنی سی بات میں جو سادگی اور خلوص ہوتا، وہ سب کو مجبور کر دیتا کہ سن کے جائیں۔ اس کے بعد امام صاحب دعا کرتے اور پھر انہی کہنے والوں میں سے کوئی ایک اللہ کا بندہ کھڑا ہو جاتا اور بغیر کسی تصنع کے ۱۰-۱۵ منٹ نہایت سادہ الفاظ میں کچھ بیان کرتا جس کا خلاصہ یہ ہوتا کہ اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، اس طرح کے کام کریں کہ حشر کے میدان میں رسوائی سے بچ جائیں۔ بات واقعی دل کو لگتی اور جی چاہتا کہ یہ اس طرح بولتا رہے تاکہ سنتے سنتے شاید اس دنیا کی بے ثباتی کا یقین آجائے۔ آخر میں یہ کہا جاتا کہ اس مہینہ کی ۲۱، ۲۲، ۲۳ کو لاہور کے قریب رائیونڈ میں ایک اجتماع ہو رہا ہے جس میں آخرت

کی زندگی کے بارے میں باتیں ہوں گی۔ آخر ۲۰ تاریخ بھی آن پہونچی، شوق ابھرا کہ چلو دیکھیں آخرت کی زندگی کے کیا نقشے بنائے جاتے ہیں۔ کچھ دوستوں کو آمادہ کیا، شام کو چلتے وقت کچھ بزرگوں سے تذکرہ کیا انھوں نے بروقت ہی اطلاع دینے کا گلہ کیا۔ ندامت ہوئی کہ اس دنیا کے جھمیلوں میں لگے رہے اور پہلے سے کیوں نہ حاضر ہو سکے۔

رات ۱۰ بجے اسٹیشن پہنچے، ٹکٹ خریدنے لگے دیکھا کہ ہزاروں لوگ کھڑے ٹکٹ لے رہے ہیں۔ اپنی باری آئی ۱۳ آنے نکال کر "بابو" کو دیئے۔ ٹکٹ دیکھا ۹ پیسے کا تھا۔ حساب سے دو پیسے واپس ملنے چاہئیں تھے۔ شاید ان دو پیسوں کی کوئی حیثیت نہ جانتے ہوئے واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ ارد گرد کے لوگوں سے پوچھا سبھی سے ۱۳ آنے (۸۱ پیسے) لیے جا رہے تھے۔ اندازہ لگائیے صرف ان دو تین دنوں میں کیا کچھ جمع ہوا ہوگا۔ اور آخر کیوں نہ ہو ریلوے کے محکمے کو ۹ پیسے دینے کے بعد ان "خدمت" کرنے والوں کو بھی تو دو پیسے بچ جانے چاہئیں۔

کراچی ایکسپریس ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ پر چلی، کوئی ٹوٹہ ایسا نہ تھا جو اندر اور باہر بھرا نہ ہو۔ بڑے اطمینان سے سفر گزرا، کوئی تو تکار نہ ہوئی، کوئی دھکم پیل نہ ہوئی۔ دوسرے کے لیے جگہ خالی کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ سوا گیارہ بجے رائے ونڈ اسٹیشن پر اترے گئے کوئی تین فرلانگ پر اجتماع گاہ تھی، سادہ سی مسجد، باہر صحن میں شامیانے تنے ہوئے اور قنات گھرنے کو جگہ نہیں۔ ایک طرف بیسیوں لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں، دوسری طرف تین چار بسیں، معلوم ہوا کہ بیلی کالج اور چیف کالج کے طالب علم اکٹھے ہو کر بسوں میں آئے ہیں۔ مسجد کے فرش پر، جو جس کے پاس تھا بچھایا گیا اور چند گھنٹے آرام کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

---

۲۱ کی صبح نماز فجر کے بعد دہلی سے تشریف لائے ہوئے مولانا محمد یوسف صاحب کا (جو اس جماعت کے امیر ہیں اور مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے بھی) خطاب ہوا۔ تین گھنٹے تک لوگ ہمہ تن بیٹھے سنتے رہے۔ باتوں میں وزن تھا حقیقت تھی، خلوص تھا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول کی باتوں میں یہ سب کچھ کیوں نہ ہوتا۔ مولانا نے فرمایا۔

"بھائیو! انسان اس دُنیا میں دو چیزوں پر محنت کرتا ہے ایک اس دنیا کی چیزوں پر دوسرے اپنی ذات پر، اس دُنیا کی چیزوں پر ـــــ مثلاً مکان، دوکان، زمین، تجارت، کارخانے، ملازمت، غرضیکہ جس چیز پر بھی محنت کی جائے گی پورا دھیان اس طرف ہوگا۔ دل انہی چیزوں میں اٹکا رہے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنی ذات کی تکمیل رہ جائے گی۔ مرنے پر ان چیزوں پر کی گئی محنت ساری کی ساری دھری رہ جائے گی اور انسان اس دُنیا سے بالکل خالی جائے گا اور جب حشر کے میدان میں اپنی ذات پر محنت کرنے والوں کو دیکھے گا تو اپنے آپ پر روئے گا، اتنا روئے گا کہ آنسوؤں کے دریا بہہ نکلیں گے۔"

پھر فرمایا:۔

"اپنی ذات پر محنت کرنے (یعنی اپنی زبان پر محنت، اپنے کانوں پر محنت، اپنی آنکھوں پر محنت، اپنے دل پر محنت، غرض ہر حصۂ جسم پر محنت کرنے سے) اس درجہ تک پہونچ جائے گا کہ صرف پلک جھپکنے سے اس پوری کائنات سے کروڑوں درجے زیادہ قیمتی جنت عطا کی جائے گی۔ آپ جا رہے ہیں سامنے سے غیر محرم عورت پر نگاہ پڑی، رہا نے کہا بس اب اگر آنکھ اٹھائی تو برباد ہو جاؤ گے [illegible] وہ کچھ عطا فرمائیں گے تصور ناممکن، ان عطا کی جانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اگر اس دُنیا میں آجائے تو پوری دُنیا حاصل کرنے کے لیے لڑ مرے۔"

باتیں دل میں اُترتی چلی گئیں، اپنے آپ ندامت ہوئی کہ زندگی یوں ہی گزر گئی جس طرح اب تک گزری تو کیا ہوگا؟ آٹھ سے دس ہزار کا مجمع، جس طرف نظر اٹھی انسان ہی نظر آئے وہ انسان جو محض اللہ کی خاطر اتنی دور دراز سے سفر کر کے صعوبتیں جھیل کر اس ویرانے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

مولانا نے فرمایا:۔

"محض اللہ کی خاطر یوں جمع ہونے والوں پر اللہ کے فرشتے آسمان سے زمین تک حلقہ بناتے اور سلامی بھیجتے ہیں، اللہ کرے آج دنیا میں صرف اللہ ہی کی خاطر لوگ جمع ہوا کریں تاکہ اللہ کی رحمتیں اس زمین پر اتریں اور انسان سکون قلب سے ہمکنار ہوں۔"

اس مجمع میں امیر بھی تھے، غریب بھی، چھوٹے بھی تھے، بڑے بھی، بچے بھی تھے، بوڑھے بھی، پنجابی بھی تھے، سندھی بھی، سرحدی بھی تھے بنگالی بھی، عرب سے آئے ہوئے بھی تھے، ہندوستان سے بھی، ملوں ڈلے بھی تھے اور خوانچہ فروش بھی، دینی مدارس کے طلبا بھی تھے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے محض خدا کی خوشنودی کی خاطر جمع ہو گئے تھے۔ جس کو مسجد میں جگہ نہ مل سکی وہ باہر ہی بیٹھ گئے، خواہ امیر تھا یا غریب۔ کوئی نمائش گاہ نہ تھی۔ کوئی تین تین چار چار رنگے بڑے بڑے پوسٹر نہ تھے کوئی پچھلی کارگزاریوں کے بیان نہ ہوئے بس ایک ہی تڑپ تھی کہ ہم سدھر جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کو اپنی ذات کی کوتاہیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کا احساس تھا۔ دوپہر کو الگ الگ حلقوں میں بٹ کر تعلیم ہوئی۔ سنا گیا کہ نماز کیا ہے، دعا کیا ہے، نمازیں پڑھنے سے کیا ملے گا اور جن لوگوں نے یوں پڑھی انھوں نے کیا پایا۔ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ جس طرح دعا مانگنے کا حق ہے اس طرح مانگی جائے تو کیا ملتا ہے۔ اور اس طرح جنھوں نے مانگی کیا پایا۔ پچھلوں کے تذکرے تھے۔ دولت والوں کا تذکرہ آیا تو قارون و ہامان کی دولتوں کے نقشے بتائے گئے، غربت کا ذکر ہوا تو صحابۂ کرام کی زندگیوں کے واقعات بتائے گئے۔

فاقوں کا ذکر چھڑا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بتلائی گئی۔ خدا کو خوش کرنے والوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ معلوم ہوا۔ دو گھنٹے کی تعلیم کے بعد کھانے اور نماز کا وقت ہوا۔ ایک طرف کھانے کا انتظام کیا گیا تھا دوکان داروں نے دوکانیں بھی لگائی ہوئی تھیں۔ جس کا جہاں جی چاہا کھا لیا۔ اجتماع والوں کی طرف سے کھانے کا کوئی پیسہ نہ لیا جاتا۔ عصر کے بعد لائل پور کے مفتی زین العابدین صاحب کا بیان ہوا۔ تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سمجھا دیا گیا۔ خدا نے بولنے کا خوب ملکہ دیا ہے سن کر وجدانی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ بتایا گیا کہ

"انسان جب اپنے آپ سے محنت کرتے کرتے اس درجہ پر پہونچتا ہے جس پر اللہ راضی ہو کر اس کے صرف ہاتھ اٹھنے پر ہی فیصلے فرما دیتے ہیں تو دنیا میں کیا ہوتا ہے دنیا کس طرح اسکے پیچھے آتی ہے۔ آج ہم لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں اور وہ ہے کہ ہاتھ ہی نہیں آتی"۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے واقعات سنائے گئے اور کچھ اس انداز سے کہ ایمان تازہ ہوگیا۔ بتایا گیا کہ

"انسان جب بستر پر ہے تو اس ڈر سے کہ اس کے مرنے کے بعد کہیں فرشتے اسے غسل اور دفن نہ کرنے لگ جائیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلت سے غسل دیتے اور جلدی جنازہ لے جاتے ہیں۔ اللہ کے پاک رسول جنازہ کے ساتھ پنجوں کے بل چلتے ہیں اور پوچھنے پر فرمایا جاتا ہے کہ اتنے فرشتے آسمان پر سے اتر کر ساتھ ہولیے ہیں کہ پورا پاؤں رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

مغرب کے بعد عرب سے آئے ہوئے اللہ کے ایک بندے کا بیان شروع ہوا، زبان عربی تھی لہجہ انتہائی خوبصورت، جی چاہتا اللہ اور اس کے پیارے رسول کی زبان بولتا رہے۔ مترجم صاحب ساتھ بیٹھ گئے پون گھنٹہ دین کے مختلف پہلوؤں پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالتے رہے، عدل و انصاف، معاشرت و معیشت اور دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلام کی دعوت کے پھیلاؤ پر معلوماتی تقریر کی۔

رات کے خطاب میں مولانا محمد یوسف صاحب کا بیان ہوا۔ لاہور اور قریب ہر شہر کے مختلف حلقۂ فکر کے علمائے کرام موجود تھے۔ مولانا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔ کھانسی اور نزلہ کا زور رہا لیکن دین کی محبت کچھ اس طرح غالب ہے کہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلسل بولتے ہیں۔ عام اجتماع ہو یا خاص، شہری حضرات کے اجتماع میں بولنا ہو یا میواتی حضرات میں، اس بولنے اور پوری قوت سے بولنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی، بتایا جا رہا ہے کہ

"نمرود کی خدائی پوری قوت سے اس کوشش میں لگی رہی کہ آج کی رات کسی بچے کے وجود کی بنیاد نہ پڑنے پائے، تمام ملک کے مرد الگ اور عورتیں الگ کر دی گئیں۔ پہرے دار بٹھا دیے گئے۔ لیکن ہوا کیا۔ خدا کے حکم کے بموجب جو کام ہونا تھا ہو کے رہا۔ دشمن کے گھر ابراہیم علیہ السلام پل رہے ہیں۔ تو خدا جب کرنے پر آتا ہے دنیا کی کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی۔"

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات بتائے جاتے رہے۔ ایک طرف اس دنیا

اور اس کے اندر کی تمام چیزوں کی بے بسی، دوسری طرف خدائے بزرگ و برتر کی عظمت، دل میں یہ سب کچھ یوں نقش ہوتا رہا جیسے ہونے کا حق ہے۔ زبان کیوں نہ ہو کہنے والا پورے یقین سے کہہ رہا ہے، زبان کے ساتھ دل کی گہرائیوں کی آواز شامل ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ

"اگر کوئی فاسق اور جھوٹا شخص تمہارے پاس اس قسم کی خبر لائے کہ کوئی گروہ یا فرد تمہارے مال اور جان کے بارے میں برے ارادے کر رہے ہیں تو اس امر کے باوجود کہ اس کا جھوٹا ہونا تمہارے نزدیک مسلم ہے تم اپنے مال اور جان کی فکر میں لگو گے۔ لیکن جس اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا یہ ایمان ہے کہ سچے نبی ہیں، اگر اس ایمان میں کچھ بھی کمی ہے تو ہم مسلمان ہی نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اے لوگو! اس دنیا کی حقیقت کچھ نہیں اللہ کے نزدیک اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں، مردہ بکری کے بچے کے برابر بھی نہیں، جو کچھ بھی ہے آخرت کی زندگی ہے۔ اس کے لیے کچھ کرلو ورنہ اس نہ ختم ہونے والی زندگی میں تڑپو گے لیکن یہ سن کر ہمیں یقین نہیں آتا۔ کیوں؟ اس دنیا کے مال و اولاد ہمارے مشاہدے میں ہیں اور آخرت کی زندگی غیب میں۔ بس اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ جب دیکھ لیا تو غیب کہاں رہا۔"

"رات گیارہ بجے تک یوں ہی دین و ایمان کی باتیں ہوتی رہیں، نماز پڑھی گئی، ایک ہی صف میں ہر درجے، ہر زبان، ہر عمر اور مختلف رنگ و نسل کے دینی بھائی اللہ کے حضور میں یوں کھڑے ہوئے جیسے ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ چاروں طرف ایک سناٹا۔ امام صاحب ان سب کی طرف سے اللہ کے حضور عرض گزار رہے ہیں۔ بارہ بجے کچھ آرام کی فکر میں لگ گئے کچھ اللہ سے باتیں کرنے میں، ۴ بجے آنکھ کھلی، آگے پیچھے دائیں بائیں، بہتوں کو کھڑے پایا۔ اللہ اکبر۔ کیا سرور ہے اس کھڑے ہونے میں۔

۲۲ کی صبح نماز کے بعد پھر تقریر ہوئی، دوپہر کو تعلیمی حلقے بنائے گئے، عصر کے بعد ہندوستان سے آئے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور پھر علم دین سے پورے واقف مولوی محمد عمر صاحب کی تقریر ہوئی۔ خوب سلیقے سے بیان فرماتے ہیں۔ تھوڑے سے وقت میں ہر انداز کا خوب مواد ذہنوں میں لیا، زبان اللہ کی عظمت کے ترانے خود بخود گانے لگی۔

غرض اس طرح یہ تین دن کا روح پرور اجتماع چلتا رہا۔ احساس دلایا جاتا رہا کہ سب بگاڑ اپنی ذات میں ہے اگر یہ درست ہو جائے تو سب درست ہو جائے گا۔

آخری روز اللہ کے راستے میں اپنی ذات پر محنت کرنے کے لیے جن لوگوں نے وقت دیئے اُن کی تشکیل جماعتوں کی شکل میں ہوئی۔ ہر جماعت میں سے بارہ تک اللہ کے بندے جمع کر دیئے گئے۔ سو کے قریب جماعتیں بن گئیں جن کو ملک کے کونے کونے میں بھیجا گیا۔ تاکہ ان فانی چیزوں سے کچھ دیر کے لیے کٹ کر آدمی اپنی ذات پر محنت کر سکے۔ ہر جماعت کا ایک امیر مقرر کر دیا گیا۔ اپنے اپنے بستر، اپنا اپنا خرچ اور اپنی اپنی ذات پر محنت کرنے کا جذبہ اور دوسرے بندگانِ خدا تک اللہ کی بات پہونچانے کی فکر۔ یہ سب نظر اس قدر روح کو بالیدگی بخشتے رہے کہ سینکڑوں وعظ بھی یہ نہ کر سکیں۔ اختتام پر دعا ہوئی۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے دعا کی اپنے گناہوں کی توبہ، مغفرت، آخرت کی سرخروئی، دین کی خدمت، تمام انسانوں کے لیے ہدایت طلبی، یہ سب باتیں اللہ سے طلب کی گئیں۔ دعا یوں لگی جیسے طلب لگنے کا حق ہوتا ہے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو روئی نہ ہو، کوئی زبان نہ تھی جو ہلی نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو پھٹ پڑنے پر نہ آیا ہو، بس ایک ہی احساس تھا کہ اتنی زندگی جو گزری ناکامی میں گزری، میں ہی سراپا معصیت ہوں سب برائیاں مجھ ہی میں ہیں، اے اللہ ان سب کوتاہیوں کو معاف فرما اور میری زندگی کو اپنے راستے پر لگا دے۔

اس طرح ۲۲ کی دوپہر کو یہ مبارک اجتماع ختم ہو گیا۔

ضروری بات

۱۔ دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان سے جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر صرف منیجر کے نام سے فرمائیے کسی شخص کا نام نہ لکھئے۔

۲۔ ادارتی امور میں براہ راست اڈیٹر کو لکھئے۔ دفتری خطوط کے اندر ان امور کے بارے میں کچھ نہ لکھا جائے ——— منیجر

حالات حاضرہ

ہندوستان میں زبان کا مسئلہ

ایڈیٹر صاحب "مدینہ" بجنور

ہندوستان کا دستور بننے سے پہلے طے تھا کہ مرکز کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جو ناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ ہندوستانی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ جو زبان شمالی ہندوستان کے عوام بولتے ہیں اور جسے اردو اور ہندی دونوں ناموں سے پکارا جاتا ہے وہ ہندوستانی ہے۔ یہ فیصلہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی ہر دوسری زبان کے مقابلہ میں ہندوستانی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور اپنی اس خصوصیت کی بنا پر ہندوستان کی قومی زبان بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہندوستان فی زمانہ قومی زبان کی نعمت سے محروم ہے سوائے ہندوستانی کے یہاں کی سب زبانیں علاقائی ہیں۔ قومی زبان وہی ہو سکتی ہے جسے ہندوستان کی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہو اور جس میں اپنے روزمرہ کے کام انجام دیتی ہو۔ ہندوستان مختلف مذہبوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف کلچروں کا گہوارہ ہے۔ اس لیے یہاں کی قومی زبان میں ان سب کے اظہار کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ جو زبان بھی اس صلاحیت سے محروم ہوگی وہ ہندوستان کی قومی زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کا دستور بننے سے پہلے ہندوستان کے لیڈروں نے اور کانگرس نے ہندوستانی کے حق میں نہ صرف فیصلہ ہی کیا تھا بلکہ اس فیصلہ کی عام اشاعت بھی کی تھی مگر دستور سازی کے وقت یہ فیصلہ طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا اور صرف ہندی دیوناگری رسم الخط میں مرکزی حکومت کی سرکاری زبان تسلیم کی گئی۔ یہ بات جاننے والوں کے لیے انوکھی نہ تھی کیونکہ بقول علامہ دتاتریہ کیفی لوگ جانتے تھے کہ حکومت کے نیتاؤں کو مہاتما جی کے اس فارمولے کی ذرا پروا نہیں ہے کہ ہندوستان

کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جو اردو اور ناگری حروف میں لکھی جائے گی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے جب صوبوں میں کانگرسی حکومتیں قائم ہوئی تھیں تو کئی صوبوں میں حکومت کے اطوار سے معلوم ہو گیا تھا کہ پوری آزادی ملنے پر ان کا طرز عمل زبان کے بارے میں کیا ہوگا؟ بہر حال دستور کا سترھواں حصہ سرکاری زبان سے متعلق ہے جس کے دو باب ہیں۔ پہلا باب یونین (مرکز) کی زبان سے متعلق ہے اور دوسرے باب کا تعلق علاقائی زبانوں سے ہے۔ باب اول کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دستور سازوں نے ناگری رسم الخط میں ہندی کو یونین کی سرکاری زبان تسلیم تو کر لیا ہے مگر انھیں اپنے اس فیصلہ کی صحت کا یقین نہیں ہے چنانچہ انھوں نے یہ بات بہت صاف طور پر کہدی ہے کہ آئندہ پندرہ برس تک یونین کی سرکاری زبان انگریزی رہے گی مگر ہندی کے مکمل نفاذ کے لیے کوئی میعاد یا تاریخ مقرر نہیں کی ہے بلکہ اس کے بتدریج نفاذ کی راہ کو بھی طرح طرح کی رکاوٹوں سے ناہموار بنا دیا ہے، یہ صورت حال اس حقیقت کی غماز ہے کہ ہندی کے حق میں جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ بادل نخواستہ کسی مجبوری یا مصلحت کی بنا پر کیا گیا ہے۔

۱۹۳۷ء کی بات ہے کہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے اپنے سننے والوں سے پوچھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کریں گے۔ جواب ملاحظہ ہو۔

ہندوستانی (اردو) ۲۵۶۷، انگریزی ۲۲ ۲۵، گجراتی ۲۴۲۱، مرہٹی ۵۹ ۱۵، ہندی صفر۔

احاطۂ بمبئی کے پانچ ہزار ریڈیو سیٹ رکھنے والوں میں سے سات فیصدی اردو کے یعنی ہندوستانی کے حق میں تھے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں براڈ کاسٹ کیا جائے تو کون سی زبان کو ترجیح دی جائے گی۔ جواب ملاحظہ ہو۔

ہندوستانی (اردو) ۲۶۵، انگریزی ۱۷۴، گجراتی ۹۲۰، مرہٹی ۳۵۸، ہندی صفر

یہی سوالات کلکتہ، مدراس اور دہلی والوں سے بھی پوچھے گئے تھے۔ جواب ملاحظہ ہوں۔

کلکتہ:۔ ہندوستانی (اردو) ۳۵۵۹، انگریزی ۱۷۵۴، بنگالی ۳۹۹، ہندی صفر۔

مدراس:۔ ہندوستانی (اردو) ۲۵ ۲۵، انگریزی ۱۸۱۱، تامل ۳۸۴۴، تیلگو ۲۲۹، ہندی صفر۔

دہلی:۔ ہندوستانی (اردو) ۳۸۴۰، انگریزی ۱۷۳۶، ہندی صفر۔

[نوٹ:۔ ابتدائی سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے پیش نظر ہندوستانی کو اردو کا نام دینا اور ہندی کو ہندوستانی سے خارج سمجھ لینا عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن جس زمانے کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں اس زمانے کے ہندوستانی اور آج کے ہندی نشریات کی زبان کے فرق کو اگر سامنے رکھ لیا جائے تو پھر تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہندوستانی نشریات اردو نشریات ہی تھے۔ دوسرے جس زمانے کا ذکر ہے اسی زمانہ میں مسٹر آر ایس۔ شکلانے "آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی" نام کی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ہندوستانی نشریات کو اردو کی نشریات بتا کر ہندی کا کیس پیش کیا تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ سمپورنانند جی نے لکھا تھا اور اسے ہندی ساہتیہ سمیلن یوپی نے شائع کیا تھا۔]

مذکورہ بالا اعداد و شمار جہاں ہندی کی کل ہند حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں وہاں اردو کی مقبولیت کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ ان حالات میں ہندی کو یونین کی زبان تسلیم کرتے وقت دستور سازوں کے سامنے اگر کچھ خدشات اور خطرات نمایاں ہونے لگے تھے اور وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ بہرحال ہندی یونین کی سرکاری زبان قرار پا گئی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندی کو قومی زبان بنانے کی کوشش کا آغاز کیا جاتا لیکن ہوا اس کا بالکل الٹا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندی کو عام فہم بنایا جاتا دوسری علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل کیے جاتے اور بالخصوص ہندوستانی یا اردو کے سرمایہ سے فائدہ اٹھایا جاتا مگر ہوا یہ کہ ہندی کو سنسکرت کے نامانوس اور ثقیل الفاظ سے لادا جانے لگا اور اسے اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ اس کے عوامی زبان بننے کے سارے امکانات ختم ہو گئے۔ مستزاد یہ کہ دوسری علاقائی زبانوں اور خاص کر اردو کے وہ الفاظ نکال کر پھینک دیے گئے جو زبان زد عوام و خواص تھے اور ان کی جگہ سنسکرت کے وہ الفاظ اپنی اصلی شکل میں استعمال ہونے لگے جن سے کسی کے کان آشنا نہ تھے۔ ہندی کا اپنا سرمایہ بہت قلیل تھا اس کی عمر ہی کیا تھی۔ تقریباً سو برس ہوئے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اس کا جنم ہوا تھا۔ سو برس کا زمانہ ایک نئی زبان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک زبان سو برس میں کیا بنے گی ہزار برس کے بعد بھی اس میں نئے نئے الفاظ، نئی نئی اصطلاحیں، نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے شامل ہوتے رہتے ہیں بلکہ یہ عمل زبان کی زندگی کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ ہندی والوں نے اپنی زبان کو سرکاری حیثیت دلا کر یہ سمجھ لیا کہ ان کی زبان ہندوستان کی اور دنیا کی تمام زندہ زبانوں سے بے نیاز ہے بلکہ اسے ایک مردہ زبان کا سہارا

کافی ہے جیسے سنسکرت کہتے ہیں مگر اس طرح انھوں نے ہندی کو قومی زبان بن جانے سے محروم کر دیا دوسری ایسی ہی غلطی ان سے یہ ہوئی کہ ہندی ریاستوں میں اردو کو نیست و نابود کرنے کی مہم شروع کر دی کبھی ارشاد ہوا کہ اردو کوئی جداگانہ زبان نہیں ہے بلکہ ہندی ہی کا ایک روپ ہے جبکہ اسی دستور نے جس نے ہندی کو سرکاری حیثیت عطا کی ہے اردو کو ہندی سے علیحدہ ایک زبان تسلیم کیا ہے کبھی کہا گیا کہ اردو ملکی زبان نہیں ہے غیر ملکی ہے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ پاکستان کے علاوہ جو کل تک ہندوستان ہی میں شامل تھا اردو کس ملک کی زبان ہے؟ کبھی فرمایا گیا کہ اردو عوامی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں "ہے" اور "نہیں" کے علاوہ تمام الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں جبکہ بقول فراق گورکھپوری اردو میں دو چار ہزار الفاظ عربی اور فارسی کے اور پچاسوں ہزار خود ہندی کے مشامل ہیں مختصر یہ ہے کہ اردو کے خلاف بے سروپا اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور ساتھ ہی ہندی ریاستوں نے اردو کے دستوری حقوق بھی دینے سے انکار کر دیا۔ مثال کے طور پر حکومت ہند نے ۱۴ جولائی ۱۹۵۵ء کو لسانی پالیسی کے متعلق ایک بیان شایع کیا جس پر ہندی ریاستوں نے ہر تصدیق ثبت کر دی۔

اس اعلان میں اردو سے متعلق اکثر غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے ساتھ تسلیم کیا گیا تھا کہ جن علاقوں اور خطوں میں اردو زبان رائج ہے ان میں مندرجہ ذیل سہولتیں مہیا کی جائیں (۱) پرائمری درجوں میں ان طلبا کو جن کے والدین یا سرپرست یہ بیان کریں کہ ان کی مادری زبان اردو ہے۔ اردو میں تعلیم حاصل کرنے اور امتحانات دینے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ (۲) اردو کے اساتذہ کی تربیت اور اردو میں موزوں نصابی کتابیں مہیا کرنے کے انتظامات کیے جائیں (۳) ثانوی درجوں میں بھی اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں (۴) تمام دفاتر اور عدالتیں اردو میں دستاویز قبول کریں۔ ان کے ترجمہ یا کسی دیگر زبان کے رسم الخط میں ان کو منتقل کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ دفاتر اور عدالتیں اردو میں عرضیاں اور درخواستیں بھی قبول کریں۔ (۵) جن علاقوں میں اردو رائج ہے اور جن کو اس غرض کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ وہاں اہم قوانین، قواعد و ضوابط اور اعلانات اردو میں جاری کیے جائیں۔ اعلانیہ میں اس دفعہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "یہ ضروری نہیں کہ مجالس قانون ساز اردو میں قوانین پاس کریں۔ یا ہر ایک قانون اردو میں جاری کیا جائے بلکہ اہم قوانین، قواعد

وضوابط اور اعلانوں کو مشتہر کرنے کی غرض سے مخصوص علاقوں میں ان کو یا ان کے بعض مضامین کو اردو میں جاری کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اگر دو ریاستوں کے درمیان کوئی سرحدی علاقہ دو زبانوں والا خیال کیا جاتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ حکومت ان اعلانوں کو اردو زبان میں شائع کرے۔" خاص سہولتوں کے ضمن میں مذکورہ بالا دفعات کے بعد چھٹی دفعہ میں تاکید مزید کے طور پر کہا گیا ہے: "ہندی کو نہ صرف ہمارے آئین میں ممتاز مقام حاصل ہے بلکہ یہ اتر پردیش اور بہار نیز ہندوستان کی کچھ دیگر ریاستوں میں بھی سرکاری زبان ہے۔ ہندی اور اردو کے درمیان کسی رقابت کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لازمی طور پر ان ریاستوں میں ہندی کو بلند ترین مقام حاصل ہے لیکن آئین کی دفعات کے منشاء کے مطابق ہندوستان کی ایک زبان کی جسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد بولتی اور استعمال کرتی ہے، حوصلہ افزائی کے خیال سے، جو لوگ اسے استعمال کرنے کے عادی رہے ہیں اور جو اپنی مادری زبان خیال کرتے ہیں ان کو اردو استعمال کرنے میں آسانیاں مہیا کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا مناسب ہے۔ اس کا اطلاق خاص طور پر اتر پردیش اور بہار نیز دہلی پر ہوگا جو سینکڑوں برس سے اردو کے اہم مراکز رہے ہیں۔"

مرکزی حکومت کے اعلانیہ اور اس پر ہندی ریاستوں کی مہر تصدیق کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ چند معمولی احکام جاری ہوئے جن پر عملدرآمد کی ضرورت برائے نام سمجھی گئی اور اردو کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ یہی حال سہ لسانی فارمولے کا ہوا کہ اس کے فائدے سے اردو کو محروم کر دیا گیا۔ یہ تمام حالات غیر ہندی ریاستوں سے بھی پوشیدہ نہ تھے اور نہ آج ہیں ہندی ریاستوں نے اردو کے ساتھ جو غیر منصفانہ برتاؤ کیا ہے وہ ہندوستان کے غیر ہندی علاقوں کی نگاہوں میں ہے۔ ان کے ذہن میں یہ حقیقت رچ بس گئی ہے کہ ہندی نے مسند اقتدار پر بیٹھ کر جو سلوک اردو کے ساتھ کیا ہے اس سے دوسری زبانیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ لسانی مسئلہ از سر نو پیدا ہو گیا ہے اور طرح طرح کی تجویزیں سامنے آ رہی ہیں مثلاً

۱۔ ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنایا جائے (ہندی ریاستیں)

۲۔ انگریزی کو مشترکہ زبان کی حیثیت سے باقی رکھا جائے (مدراس)

۳۔ دستور میں جو ۱۴ زبانیں درج ہیں ان سب کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
سمندر شاہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بحری ڈاک سے ..... ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے ..... ایک پونڈ
پوسٹل آرڈر وغیرہ کراس کیے
آنا چاہیے

جلد ۲۳ | بابتہ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۵ھ مطابق جون سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ (۲)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن منعمانی	۲
۲	قرآن پاک کی ابدیت	محمد منظور نعمانی	۵
۳	حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے	... ...	...
۴	کائنات میں خدا کی گواہی	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۱۳
۵	دربار عالمگیری	جناب وحید الدین خان صاحب	۳۲
		ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی	۴۲

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۱۵ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمن اصفہانی

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یونہی کیا کم مسائل تھے کہ ایک مجسم مسئلہ مسٹر جناح لگاتار بن گئے ہیں۔ بمبئی ہائی کورٹ کی چیف جسٹسی سے سبکدوش ہو کر جب وہ برطانیہ میں ہندوستانی ہائی کمشنر کی حیثیت سے متعین ہوئے تھے تو انہی دنوں جلیانوالہ وغیرہ کے دلدوز حادثات پیش آئے اور ایک خاص اتفاق کے ماتحت برطانی اخبارات میں ان حادثات کا ہیت چرچا ہوا۔ اسوقت مسٹر جناح لگاتار نے اپنی زندگی میں ہندوستانیت اور قوم پرستی کا سب سے پہلا ثبوت پیش کرتے ہوئے ایک مراسلہ بعض اخبارات کو دیا جس میں بڑی قطعیت کے ساتھ یہ اعلان تھا کہ ایسے تمام حادثات کے ذمہ دار خود ہندوستانی مسلمان ہیں جو ہمیشہ سے ہندوستان کی قومی زندگی کے دھارے میں ضم ہونے سے انکار کرتے آئے ہیں اور آج بھی علیحدگی پسندی کی راہ پر ہی چلنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ مصائب ان کے سر آتے ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد مسٹر جناح لگاتار مرکزی وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز ہو کر ہند آگئے اور اس عہدے کے ذریعے ہندوستان کی جس سب سے بڑی خدمت کا انھوں نے اپنے دل میں عزم کیا وہ شاید یہی تھی کہ یہاں کے مسلمانوں کی زندگی سے علیحدگی پسندی کا زہر نکال کر انھیں قومی دھارے میں غرق کر کے ہی دم لیں گے۔ ظاہر ہے وہ وزیر اعظم نہیں وزیر تعلیم تھے۔ اس لیے اپنے خاص میدان کار ہی میں اپنے اس عزم کو جامۂ عمل پہنانے میں کوئی موثر دلدار کر سکتے تھے چنانچہ اس میدان میں ان کی نگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف گئی کہ یہ مسلمانان ہند کی "علیحدگی پسندی" کا ایک بہت بڑا مظہر ہی نہیں اس کا سرچشمہ بھی ہے۔ اور پھر یہ نگاہ اپنی تمام توجہات کے ساتھ اس پر مرکوز ہی کیوں نہ ہو گئی۔

سب سے پہلے جو چیز اس نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکی وہ یونیورسٹی کے نام میں "مسلم" کا لفظ تھا۔ اور اس لفظ کو ہٹانے کے لیے مسٹر جناح لگاتار نے اپنے ارادوں کا اظہار شروع کر دیا لیکن یونیورسٹی کی خوش قسمتی تھی کہ ان ایام میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی تھے۔ وہ آئے تھے تو خود ان کی ذات سے اندیشہ تھا کہ وہ یونیورسٹی کے مسلم کیریکٹر کو فنا کر دینے کے خواہش مندوں کا آلۂ کار بنیں گے لیکن وہ اقبال کی زبان میں

یاساں لگے کیے کو صنم خانوں سے

کا مصداق ثابت ہوئے اور اس سستی تیشلزم کے سامنے مضبوطی سے کھڑے ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی نبض ٹوٹتے ہوئے دلوں کی قوت مزاحمت مشل کر دینے کے جس انداز میں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے یہ بات اٹھائی جا رہی تھی چلتے چلاتے بھی نہایت بے باکی سے اس کے بارے میں کہہ گئے کہ

"یونیورسٹی کے نام کے مسئلے پر یہ آنکھ مچولی لب بند ہو جانی چاہیئے"

افسوس ہو کہ طیب جی کو بہت جلد جلا وطن ہونا پڑا ورنہ وہ وزیر تعلیم سے اس کھلے ہوئے اختلاف کے بعد آسانی سے وہ بھی کچھ نہ کر سکتے تھے) اور ابھی وہ نکلے ہی تھے کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ساتھ طلبا کی نہایت نامناسب حرکت کا وہ واقعہ پیش آگیا جسے ۲۶ اپریل کے واقعے سے یاد کیا جا رہا ہے۔ یہ افسوسناک واقعہ گویا ایک سنہرا موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر مسٹر چھاگلا یونیورسٹی کے ساتھ جو چاہیں کر گزریں اور کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔ چنانچہ مسٹر چھاگلا جتنا زہر اس یونیورسٹی کے خلاف اگل سکتے تھے وہ سب کا سب اس موقع پر انھوں نے اگل دیا اور پھر اس زہریلی سے ایسی فضا بنانے میں بھی وہ کامیاب ہو گئے کہ یونیورسٹی کی آئینی نوعیت کو صدر جمہوریہ کے ایک آرڈی ننس کے ذریعہ معطل کر کے رکھ دیں۔

ہمیں نہ اس آرڈی ننس پر اس وقت کوئی تبصرہ کرنا ہے اور نہ مسٹر چھاگلا کی زہر چکانی پر۔ ہمارے سامنے اس وقت سوال یہ ہے کہ کیا وہ اقلیت باعزت زندگی کا کوئی حق رکھتی ہے جس کے نام کی دھاریں ایسے لوگوں کو الاٹ ہوں جو اس اقلیت کو بدنام کرنے اور اس کی ہستی کے ایک ایک نشان کو مٹا کر ڈالنے کی دھن میں اکثریت کے تنگ دل عناصر میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے ہوں اور یہ اقلیت ایک آواز ہو کر کھڑی نہ ہو سکتی ہو کہ حکومت میں ہماری نمائندگی کا حصہ ایسے لوگوں کو دیا جانا ناقابل برداشت ہے؟

کہنے کو یہ بات ٹھیک ہے کہ حکومت میں نہ کوئی ہندو ہندوؤں کا نمائندہ ہے اور نہ مسلمان مسلمانوں کا نمائندہ بلکہ سب مشترکہ نمائندگی کا رکھتے ہیں۔ کیونکہ واقعی چھاگلا صاحب یا کسی اور کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر حکومت میں نہیں بھیجا ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلمان یا دوسری اقلیتوں کے افراد کو حکومت میں لیے جانے کا اصل منشا یہی ہوتا ہے کہ حکومت میں ان اقلیتوں کی حصہ داری کا اظہار ہو۔ اور کسی حد تک یہ بھی کہ اقلیتوں کے معاملات میں خود اُن کے افراد کے ذریعے زیادہ بہتر معلومات حاصل ہو سکیں۔ بیرونی ممالک میں ہمارے سفارت خانے مسلم وزرا اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں کی فہرستیں اخبار اور کیا دکھانے کے لیے شائع کرتے ہیں؟ خصوصاً شری چھاگلا کے بارے میں تو یہ خصوصی واقعہ اتنی جلدی ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ گزشتہ سال جب وہ اطلاعِ اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کی پرزور وکالت کر کے آئے اور پھر دہلی میں ایک جلسہ گویا اُن کے اعزاز میں ہوا تو وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے اسی جلسۂ عام میں انھیں یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اپنا پورا نام واضح طور سے محمد علی کریم بھائی چھاگلا لکھا کریں تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ وہ ایک مسلمان ہیں۔

ظاہر ہے کہ شری چھاگلا کے اسلامی نام کی نمائش تنہا اُن کی ذات کی بنیاد پر تو کوئی فائدہ نہیں دے سکتی تھی اس کا فائدہ تو صرف اس نسبت کی بنیاد پر ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ حکومت ہند میں پانچ کروڑ مسلمانوں کے حصے کی نمائندگی کرنے والے ایک وزیر ہیں۔ پس اسی بنیاد پر مسلمانوں کو پورا پورا حق ہے کہ وہ حکومت

میں اپنے حصے کی نمائندگی کرنے کے لیے شری جپا گلا کے وجود پر سخت سے سخت اعتراض اور احتجاج کریں کیونکہ وہ مسلمانوں سے برسرپیکار ہونے کے بعد نہ تو اُن کے نام سے کچھ پانے کا استحقاق رکھتے ہیں اور نہ ایسی صورت میں مسلمانوں کے کسی مسئلے میں اُن سے کوئی متوازن رہنمائی کا مینہ کو مل سکتی ہے۔ وہ اگر مسلمانوں کو برسرغلط سمجھتے ہیں اور اُن کی اصلاح کے لیے اُن سے جنگ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ مسلمانوں کے نام سے پائی ہوئی وزارت کی کرسی نہیں ہے، یہ کام وہ راجیہ سبھا کے محض ایک ممبر کی حیثیت سے راجیہ سبھا میں کریں یا اور زیادہ ہمت ہو تو پبلک میدان میں نکل کر آئیں۔ لیکن وزارت کی کرسی پر رہتے ہوئے نہ صرف اُن کے لیے اس کا کوئی جواز نہیں ہے بلکہ کسی غیر مسلم وزیر کے لیے بھی اس وقت تک اس کا کوئی حق نہیں تسلیم کیا جا سکتا جب تک ہندوستان کی حکومت کو ایک مشترک اور جمہوری حکومت کہا جاتا ہے۔

مسئلے کی یہ نہایت صاف اور واضح تصویر ہمیں اس بات کا سوفی صدی حقدار بناتی ہے کہ وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ ہند سے مسٹر جپا گلا کی حکومت ہی سے علیحدگی کا مطالبہ کریں۔ اور یہی نہیں بلکہ اس تصویر میں ہمارے لیے ہر پہلو سے اس بات کا بھی جواز موجود ہے کہ ہم اس مطالبہ کو حکومت سے تعاون اور عدم تعاون کی شرط بنالیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمہ داری اُن لوگوں کی ہے جو بالفعل بالواسطہ طور پر حکومت یا حکمراں پارٹی کو کسی بھی قسم کا سیاسی تعاون دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کے دل ملت کے درد سے بیگانہ نہیں ہو گئے ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کا اس وقت کوئی جرأت مندانہ قدم مسلمانوں کے ہاتھ بے حد مضبوط کر سکتا ہے لیکن اگر ہماری بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی اس جرأت قلبی رانہ کا حامل نہیں نکل سکتا، تب بھی مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی تنظیم کا فرض ہے کہ وہ مسٹر جپا گلا کی حکومت سے علیحدگی کے مطالبے کو منظم کریں اور تمام مؤثر آئینی ذرائع سے چند دن کے لیے اپنی ساری طاقت اس مطالبے پر لگا دیں ۔۔۔

ہم اپنی اس گزارش کو پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ اگر ہم ہندوستانی جمہوریت میں اپنے ایک ایسے صاف اور واضح حق پر بھی اصرار کرنے کے لیے بے تابانہ کھڑے نہیں ہو سکتے جس میں ملک کے کسی دوسرے طبقے سے ٹکراؤ کا سوال نہیں ہے یعنی یہ کہ ہمارے نام سے ان لوگوں کو شو (Show) کیا جائے، وہ کم از کم ہمارے کھلے دشمن نہیں ہونے چاہئیں، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اس ملک میں کسی ادنیٰ درجہ کی باعزت زندگی کے بھی حقدار نہیں ہیں۔ اور ہمارے وہ حقوق تو اچھی ہی طرح پامال ہونے چاہئیں جن میں اس ملک کے اندر ہمارا کوئی حریف طبقہ بھی پایا جاتا ہے! ۔۔۔ جو لوگ مسٹر جپا گلا سے جانی کے مطالبے پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں ہمارے نزدیک وہ صحیح نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتے کہ خود مسٹر جپا گلا سے استعفے کا مطالبہ کیا جائے۔ ہمارا مقدمہ ایک اصول کو منوانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو منوانے کی شکل صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم سے مطالبہ ہے۔

حرمین پاک کی حاضری

محمد منظور نعمانی

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمت بائے تو
عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

اب سے دو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے حرمین پاک کی حاضری نصیب فرمائی تھی، حج کے متعلق جو قانون ہمارے ملک میں کئی سال سے نافذ ہے اس کے ہوتے ہوئے ہم جیسوں کے لیے پانچ سال تک تو حاضری کا بظاہر کوئی امکان ہی نہیں تھا، لیکن رب کریم نے محض اپنے فضل سے ایک شکل پیدا فرمائی اور اس سال پھر حاضری نصیب فرمائی ـــــ چونکہ اس سفر کے تذکرہ میں ذکر کرنے والے کے لیے بھی لذت و سرور کا سامان ہو اور سننے اور پڑھنے والوں کے لیے بھی اس لیے کچھ باتیں حوالۂ قلم کی جاتی ہیں۔

محمد منظور نعمانی

رمضان مبارک سے چند دن پہلے دسمبر کی آخری تاریخوں میں اچانک مجھے اطلاع ملی کہ "رابطہ عالم اسلامی" (مکہ مکرمہ) نے مجھے اپنی مجلس تاسیسی کا رکن منتخب کر لیا ہے (اس مجلس کا اجلاس سال میں کم از کم ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے) ـــــ انتخاب کی اس اطلاع کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ رابطہ کا اجلاس حج سے کچھ پہلے مکہ مکرمہ میں ہوگا۔ نیز رابطہ ہی کی دعوت پر پورے عالم اسلام کی ایک مؤتمر بھی اس سال حج کے بعد متصلاً مکہ مکرمہ میں منعقد ہوگی اور عنقریب ان دونوں کا دعوت نامہ بھی مجھ کو مل جائے گا۔

میرے پاس چونکہ ہندوستان سے باہر سفر کے لیے پاسپورٹ نہیں تھا اور بعض تجربوں

کی بنا پر آسانی سے اور جلدی ملنے کی امید بھی نہیں تھی اس لیے میرا ارادہ ہوا کہ میں رابطہ کی رکنیت قبول کرنے سے شکریہ کے ساتھ معذرت کر دوں۔ لیکن رفیق محترم مولانا علی میاں نے (جو رابطہ کی تاسیس کے پہلے دن سے اس کے رکن ہیں) اور دوسرے دوستوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا، اور سب کی یہ رائے ہوئی کہ رکنیت قبول کر لینی چاہیے اور پاسپورٹ کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیئے ـــ مجھے چونکہ طبعاً ایسے کاموں سے بہت بُعد ہے جن کے لیے سرکاری دفاتر میں جانا پڑے اور ارباب اقتدار سے عرض معروض کرنی پڑے، اس لیے ان سب باتوں کے بعد بھی میری طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آخر ایک دوست نے ذمہ داری لی کہ اس سلسلے میں جو کچھ کرنا ہوگا وہ خود کریں گے اور مجھے صرف درخواست پر دستخط کرنے ہوں گے۔ اس بات نے میرا خاص عذر تو ختم کر دیا لیکن رکنیت کے قبول کرنے میں بعض دوسری وجوہ سے بھی مجھے تردد تھا، چنانچہ میں نے کئی دن استخارہ کیا اور بالآخر آخر رمضان میں میں نے رابطہ کو منظوری کی اطلاع دے دی۔

اسی درمیان اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہماری حکومت کی وزارت خارجہ نے یہ طے کیا ہے کہ جن لوگوں کو رابطہ کی طرف سے مدعو کیا جائے گا حکومت اُن کے لیے پاسپورٹ وغیرہ میں سہولت فراہم کرے گی ـــ وسط شوال میں میری طرف سے پاسپورٹ کی درخواست دی گئی اور جن مخلص دوست نے ذمہ داری لی تھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے انھوں نے ہی ساری کوشش اور دوڑ دھوپ کی اور خلاف توقع چند ہفتوں میں مجھے نیا پاسپورٹ مل گیا۔

رابطہ کی مجلس تاسیسی کا اجلاس مکہ مکرمہ میں ۲۷ مارچ سے شروع ہونے والا تھا، ہم لوگ (رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور یہ عاجز) ۲۲ مارچ کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۲۳ کی صبح دہلی پہونچے، پی فارم کی کارروائی (جس کے بغیر ملک سے باہر کا سفر نہیں کیا جا سکتا) ۲۴ تک اس کی تکمیل ہو سکی اس لیے ہم ۲۵ مارچ کی شام کو دہلی سے جدہ کے لیے روانہ ہو سکے، راستہ کراچی اور بحرین ہو کر اختیار کرنا پڑا اور ان دونوں جگہ ہوائی جہاز بدلنے کے لیے کافی ٹھہرنا پڑا جس کی وجہ سے جدہ ۲۶ اور ۲۷ کی درمیانی شب میں پہونچ سکے۔

ہمارے بہت ہی عزیز دوست ارشد صاحب مرحوم جو ہمارے اس سفر سے ۴ ہی مہینے پہلے ایک تبلیغی سفر میں حالت احرام میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان موٹر کے ایک حادثہ میں شہید ہو گئے تھے، ان کے اہل وعیال جدہ ہی میں مقیم ہیں۔ ۲۰ مارچ کی صبح سب سے پہلے مرحوم کی تعزیت میں اُن کے گھر گئے (ان کے سب گھر والے مولانا علی میاں سے بہت ہی خاص تعلق رکھتے ہیں) پھر ظہر کی نماز جدہ ہی میں پڑھ کے اور اپنے خاص عنایت فرما الحاج عبدالقادر نوروی صاحب کے ہاں کھانا کھا کے اور تھوڑی دیر آرام کر کے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ اور ایسے وقت وہاں پہونچے کہ حرم شریف میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔

اس رب کریم کا شکر کس طرح ادا کیا جائے جس نے پھر اپنے حرم پاک کے در و دیوار دکھائے اور حاضری کی توفیق دی۔ اندر داخل ہونے کے بعد بیت اللہ شریف پر نظر پڑی اور دل و زبان نے کہا

اللّٰھم زد بیتک ھذا تشریفاً	(اے اللہ اپنے اس مقدس بیت کی تشریف
وتعظیماً وتکریماً ومھابۃ وزد	وتکریم اور تعظیم و ہیبت میں اضافہ فرما اور
من شرفہ وکرمہ ممن حجہ او	حج و عمرہ کرنے والے جو بندے اسکی تعظیم و
اعتمرہ تشریفاً وتکریماً وبرّاً	تکریم کریں اُن کی بھی تشریف و تکریم اور ان کے
اللّٰھم انت السلام ومنک السلام	ساتھ احسان میں مزید اضافہ فرما، اے اللہ
فحینا ربنا بالسلام	تو سراپا سلامتی ہے اور سلامتی کا تو ہی
(اس کے علاوہ اور بھی جن دعاؤں کی توفیق ملی۔	سرچشمہ ہے۔ تو ہمیں سلامتی کا تحفہ دے۔)

اللہ کے ہزاروں بندے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے پورا مطاف گویا بھرا ہوا تھا اس لیے حجر اسود کے قریب جانے کا ارادہ بھی نہ کر سکے دور ہی سے استلام پر قناعت کی اور عمرہ کا طواف شروع کیا۔ بار بار اپنے قلم سے لکھنے اور پچاسوں سیکڑوں دفعہ دوسروں کو بتانے کے باوجود طواف شروع کرتے وقت میں خود رمل کرنا بھول گیا۔ مولانا علی میاں یا مولانا معین اللہ صاحب نے یاد دلایا تو رمل شروع کیا ــــ سات چکر پورے کر کے طواف ختم کیا اور رکعتین طواف پڑھیں۔ طائفین کے اس سمندر ہی میں کسی طرح باب کعبہ اور حجر اسود کے درمیان ملتزم تک پہونچنا

بھی نصیب ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے ہاتھ میں بندوں کے قلوب ہیں طواف میں بھی پھر رکعتین طواف میں بھی اور اس کے بعد ملتزم پر بھی دعا نصیب فرمائی۔ اس کے بعد زمزم شریف پر آکر اس کا تازہ تازہ پانی پیا اور الحمدللہ خوب پیا اور دعا کی۔ اس سال دیکھا کہ زمزم شریف کے اوپر والی عمارت ختم کردی گئی ہے اور زمزم شریف میں مشین لگا کے اوپر پائپ کے ذریعہ دور تک اس کا پانی دوڑا کے اور پھر دو طرفہ سیکڑوں ٹونٹیاں لگا کے ایسا انتظام کردیا گیا ہے کہ سیکڑوں حجاج بیک وقت ان ٹونٹیوں کے ذریعہ زمزم کا تازہ تازہ پانی پی سکتے ہیں اور اپنے برتنوں میں بھر سکتے ہیں۔ ایک جانب کی ٹونٹیاں مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور دوسری جانب کی خواتین کے لیے۔ یہ انتظام بلاشبہ بہت اچھا کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حجاج میں جو ایک بڑی تعداد ناتربیت یافتہ اور بے سلیقہ لوگوں کی ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہاں بھی ہر وقت کشمکش کا سماں رہتا ہے۔

اس کے بعد ہم حجر اسود کا استلام کرکے سعی کے لیے صفا پر آئے، پہلے دعا کی، پھر "اَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ" کہہ کے سعی شروع کی اور سات پھیرے پورے کیے، ہر پھیرے کے خاتمہ پر صفا اور مروہ پر دعا کا اہتمام نصیب ہوا۔ آخری شوط کے بعد مروہ پہ دعا کرکے سعی سے فارغ ہوئے اور حلق کے لیے قریب ہی کی حجام کی ایک دکان پر آگئے اور حلق کرایا ——— الحمدللہ عمرہ پورا ہوا۔ جس رب کریم نے یہ عمرہ نصیب فرمایا وہی قبول بھی فرمائے۔

تبلیغی اخوان و احباب حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحب، بھائی فضل کریم صاحب اور قاری سلیمان صاحب وغیرہ کو ہماری آمد کی اطلاع ہوگئی تھی وہ حضرات ہماری تلاش میں حجام کی اس دکان ہی پر آگئے ——— برسوں کے بچھڑے ایسے باخدا دوستوں کا ملنا اور اللہ کے ایسے نیک اور مقبول بندوں کی زیارت اور ان کی دعاؤں سے مستفیض ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

رابطہ کے ارکان اور مدعوین کے قیام وغیرہ کا انتظام رابطہ کی طرف سے عام طور سے سرکاری مہمانوں کی طرح ہوٹلوں میں ہوتا ہے لیکن مولانا علی میاں ہمیشہ اپنے طور پر مولانا

عبداللہ عباس ندوی کے یہاں قیام کرتے ہیں اور ان ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ مولانا کی رفاقت اور معیت کی وجہ سے ہم لوگوں نے بھی یہی طے کیا تھا اور بلاشبہ مولانا عبداللہ عباس کے مخلصانہ تعلق کا یہی حق ہے۔ انھوں نے اس سال حرم شریف کے بالکل قریب "عمارۃ الاشراف" میں ایک پورا بلاک قریباً ۵۰ ہزار ریال کرایہ ادا کر کے لے رکھا تھا۔ یہ مکہ معظمہ کی جدید طرز کی نہایت عظیم الشان دس گیارہ منزلہ ایک عمارت ہے اور اپنی وسعت کے لحاظ سے گویا ایک مستقل آبادی ہے۔ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے پاس اس کے ۵۰ کمرے تھے ان میں سے پورے دو کمرے انھوں نے ہم لوگوں کے لیے خالی کر رکھے تھے۔ ہمارا سامان وہاں پہنچ چکا تھا۔ عمرہ سے فارغ ہو کر مغرب سے کچھ پہلے ہم لوگ مکان پر پہونچے۔ اسی وقت غسل کیا اور کپڑے پہن کر مغرب کی نماز کے لیے حرم شریف آ گئے۔

رابطہ کا پہلا افتتاحی اجلاس آج بعد مغرب اس کے دفتر "قصر ملکی" میں ہونے والا تھا۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر مولانا علی میاں اور یہ عاجز "قصر ملکی" پہونچے ——— رابطہ کے اجلاس میں شرکت کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا اور میں اس کی نوعیت اور ہیئت ترکیبی سے اسی دن واقف ہوا ——— اس دن تو صرف ابتدائی کارروائی ہوئی۔ پھر اس کے بعد ایک ہفتہ تک رابطہ کی نشستوں کا سلسلہ جاری رہا۔

رابطہ کی ان مجالس، اس کی کارروائیوں اور پھر مؤتمر کے اجلاسوں کے متعلق تو انشاء اللہ مستقلاً "الفرقان" کی ایک مخصوص شناعت میں کسی قدر تفصیل سے آئے گا۔ اس صحبت میں تو اس مبارک سفر کے سلسلے کی کچھ دوسری باتیں ذکر کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

(۲)

اس سفر مبارک کی سب سے بڑی نعمت اور برکت تو حج و زیارت اور بیت اللہ کا طواف ہے، اور اس کے بعد دنوں اور راتوں کے وہ سارے اوقات ہیں جو مسجد حرام اور مسجد نبوی میں اللہ کی عبادت، اس کی کتاب پاک کی تلاوت اور اس کی یاد اور دعا و استغفار میں گزریں، اور بڑے مبارک ہیں وہ بندے جو ان نعمتوں کی قدر شناسی کے ساتھ ان سے بھرپور حصہ لیں۔ لیکن اس کی ضمنی برکات و منافع میں سے ایک بڑی برکت اور منفعت ساری نسلی

و لسانی تفریقوں اور جغرافیائی، سیاسی حد بندیوں کو توڑ کر مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پورے عالم اسلامی کے اہل ایمان خصوصاً ان کے اکابر داعیان اور علماء و صلحاء کا اجتماع اور ان کی باہم ملاقاتیں و صحبتیں ہیں، جو امت مسلمہ کی عالمی برادری کے باہم ربط و تعارف اور ملت اسلامیہ کے بین الاقوامی کردار کی حفاظت و ترقی کا خداوندی انتظام ہے ــــ سوچیے تو ترکی، مصر، شام، الجزائر، مراکش اور مشرق میں چین، جاپان، انڈونیشیا ملایا، دلی اور لکھنؤ سے کس قدر دور ہیں، اور پاکستان اور افغانستان بھی نسبتاً کم دور ہونے کے باوجود درمیان کی سیاسی دیواروں کی وجہ سے کس قدر دور ہو گئے ہیں، اور ان کے رہنے والوں سے ملنا جلنا اور افادہ و استفادہ اب کتنا مشکل ہو گیا ہے لیکن حج کے موقع پر یہ سارے ملک اور ان کے رہنے والے مسلمان بلکہ دنیا بھر کے مسلمان مکہ معظمہ میں بلکہ خاص مسجد حرام میں اس طرح یکجا ہو جاتے ہیں جیسے ایک ماں کے بچے اس کی آغوش میں۔

(۳)

حج کا مجمع اس وقت کی امت محمدیہ کا پورا پورا نمونہ ہوتا ہے۔ اللہ کے ایسے بندے بھی نظر پڑتے ہیں جن کا چہرہ اور جن کی آنکھیں بتا دیتی ہیں کہ ان کا دل اللہ کی خشیت و محبت سے لبریز ہے۔ اور یہ "اینہا می سوزند دمی گدازند" کے پورے مصداق ہیں لیکن جس طرح آج امت محمدیہ میں یہ عنصر کمیاب ہے اسی طرح حج کے مجمع میں بھی اللہ کے ایسے بندے کچھ زیادہ تعداد میں نظر نہیں پڑتے۔ بڑی تعداد ایسوں کی ہوتی ہے جن کو اسلام کا اچھا اور معیاری نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور افسوس ہے کہ خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جن کا حال دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ بے چارے اسلام سے بالکل ناواقف اور حرم پاک کے ابتدائی ادب سے بھی ناآشنا ہیں۔ امت میں اس عنصر کا ہونا اور اچھی خاصی تعداد میں ہونا کوئی نیا انکشاف نہیں ہے لیکن حج کے مجمع میں اور خاص کر حرمین شریفین میں ان نمونوں کو دیکھ کر بڑی دردناک اذیت ہوتی ہے۔ قریب قریب ہر ملک سے آنے والوں میں اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ طبقے ہوتے ہیں جو مسلمان خاندانوں میں پیدا ہوئے لیکن دین کی حقیقت جاننے اور اس کی تربیت حاصل کرنے کا انھیں

کبھی موقع نہیں ملا۔ اور حج کے لیے چلے آئے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں بنیادی ضرورت تو اس کی ہے کہ ملک یہ عوامی پیمانہ مسلمانوں میں اسلامیت کا صحیح شعور اور ان کی دینی تربیت کی جدوجہد ہو لیکن خاص موسم حج میں حکومت حجاز یا حکومت کے پورے تعاون سے کوئی دینی و اصلاحی ادارہ اگر صحیح طریقہ پر ایک منصوبہ بنا کر اس کے لیے کام کرے اور معلمین کو اس کے لیے استعمال کرے، اور پہلے خود معلمین کو تربیت کے ذریعہ تیار کیا جائے تو بہت بڑا کام ہو سکتا ہے۔ اور یہ کام پورے عالم اسلامی کی دینی اصلاح کا ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے۔ بعض حضرات نے اس کے لیے ایک مفصل اسکیم بنا کر پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

قادیانی، سعودی حکومت کی نظر میں۔

اب کے ایک قابل ذکر واقعہ یہ پیش آیا کہ کلکتہ کے قادیانیوں کی ایک جماعت نے حج کو جانے کا پروگرام بنایا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس حج کے ذریعہ کلکتہ اور اسکے نواح میں قادیانیت کی تبلیغ کے لیے زمین ہموار کر سکیں گے۔ وہاں سے واپس آکر وہ مسلمان عوام کو بتائیں گے کہ عقائد کی بنیاد پر ہماری مخالفت بس یہ ہندوستان ہی کے مولوی کرتے ہیں۔ مکہ مدینہ میں کسی نے ہماری کوئی مخالفت نہیں کی اور ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو ایمان والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ الغرض وہ اس حج کو اپنے لیے ایک سند اور سرٹیفکیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس کا اچھا خاصا پروپیگنڈا بھی کیا تھا ــــ کلکتہ کے چند حساس اور بیدار مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور ایک خط ملک حجاز شاہ فیصل کو لکھا کہ قادیانیوں کی ایک جماعت اس طرح حج کے موقعہ پر حجاز مقدس پہونچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ اپنے کو مسلمان بتا کر سفر کریں گے۔ حالانکہ یہ قادیانی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی اور رسول مانتے ہیں۔ ان کے یہ نام ہیں اس خط کی ایک کاپی مملکت سعودیہ عربیہ کے مفتی اکبر کو، ایک رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری کو اور ایک ہندوستان کے سعودی سفارت خانہ کو بھی بھیجی گئی ــــ

اس کوشش کے نتیجہ میں ان لوگوں کو ویزا نہ دیئے جانے کا حکم آگیا۔ چنانچہ بمبئی کے ویزا آفس نے سو کے آدمیوں کی اس پوری جماعت کو ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ ان کی سیٹیں ہوائی جہازوں میں ریزرو تھیں۔۔۔ لیکن "ہبلی" (جنوبی ہند) کے بعض قادیانی خفیہ طور پر حجاز مقدس پہونچ گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک نوجوان فاضل مولانا ریاض احمد صاحب نیف آبادی (جو جنوبی ہند میں قادیانی فتنہ کا مقابلہ کر رہے ہیں) وہ بھی اس سال حج میں تھے۔ انھوں نے حجاز مقدس میں "ہبلی" کے ان قادیانیوں کا تعاقب کیا، اور حکومت حجاز کو اطلاع دی کہ اس طرح چند قادیانی خفیہ طور پر آگئے ہیں۔ حکومت کی جانب سے ان کی تلاش ہوئی، ان میں سے صرف دو کا پتہ چلا اور وہ گرفتار کیے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ابتدائی بیان میں قادیانی ہونے سے قطعی انکار کیا لیکن جب ان کی ڈائری وغیرہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ واقعۃً یہ قادیانی ہیں تو بعد میں انھوں نے اقرار کر لیا۔ اس کے بعد اتمام حجت کے لیے ان کو تبلیغ کی گئی اور توبہ کے لیے کہا گیا، انھوں نے توبہ کی اور تحریری توبہ نامہ داخل کیا۔

اس سال کے ان واقعات کے بعد یہ بات بالکل صاف ہوگئی ہے کہ حکومت حجاز قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانتی۔ اور اس بنا پر ان کو حج کے لیے حجاز مقدس پہونچنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان میں سے جو لوگ جاتے ہیں وہ چوری چھپے جاتے ہیں۔

اعتذار اور اعلان

الفرقان کا یہ شمارہ وقت پر کاغذ نہ مل سکنے کی وجہ سے ۱۰-۱۲ دن کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔

آئندہ اشاعت، جس میں صرف حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مضامین ہوں گے انشاء اللہ اپنے وقت پر یعنی جولائی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا۔

اس کے بعد

اگست و ستمبر کا مشترک شمارہ "**الرابطہ عالم اسلامی نمبر**" ہوگا جو مکہ مکرمہ کی مؤتمر عالم اسلامی کی کارروائی، قراردادوں اور اہم مقالات اور تقاریر پر مشتمل ہوگا۔

ادارہ

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

از ـــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوبات حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ بنام حضرت شاہ بریلویؒ

مکتوب (۱) بسم اللہ الرحمن الرحیم ـــــ حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ السید الحسیب النسیب نقیب السید ابوسعید حسنی سلمہ اللہ و اوصلہ الی فوق مناہ آمین ـــــ الحمد للہ الذی فتح السنۃ اولیائہ لمعارف لا تعد ولا تحصی و کشف عنہم عوارف لا عدھا یحصی والصلوٰۃ والسلام علی سید الاولیاء محمد ن المصطفیٰ و احمد المجتبیٰ و علی آلہ و اصحابہ بدور الدجیٰ و نجوم الھدیٰ ـــــ امابعد ـــــ از فقیر حقیر عبدالعزیز عفا اللہ عنہ، والحق بسلف الصالحین فی المکارم و المآثر مطالعہ فرمایند ـــــ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من جنابہ الکریم ان یعافینا و ایاکم آمین ـــــ ہرچند بذکر جمیل اشیاء پیوستہ رطب اللسان

بودیم و در پیشِ ارباب بصیرت دفترِ مناقب و احوالِ ایشاں میکشودیم لیکن بحسبتِ عدمِ وصولِ مکاتیب بہجت اسالیب کہ بمنزلۂ نصف الملاقات است بلابل شوق در بساتین ارواح بنغمات یا آسنی علی یوسف چوں ہزار داستان در ترنم می آمد و نیز از ان اشتیاق در کانونِ سراپۂ شعلہ بری زود عساکر اندوہِ فراق بہ ولایاتِ قلوب میتاخت و طائرِ جان را بلجامِ انکار در ریاضت می انداخت ـــــ الحمد للہ کہ صحیفۂ شریفہ متضمن معارفِ حقہ و وجدانیات مطابقِ خاطرِ فاتر را گل گل شگفانید و از قیدِ انتظار رہانید ـــــ

نقلتُ لہ اہلاً وسہلاً و مرحبا بخیر کتاب جاء من خیر کاتب فان کان حسنی فی العیان مغیبا فلیس لدی صدری و قلبی بغائب ـــ ہذا وقد طالعتُ معارفکم المکتوبۃ فی ذیل الصحیفۃ فوجدتہا صحیحۃ المعانی راسخۃ المبانی زاد اللہ فی عرفانکم و رفع شانکم ـــــ الا آنکہ دریں معارف بفصلِ دیگر کہ از مذوقاتِ حضرتِ ولی نعمت قدس اللہ سرہ، داز مدرکات ایں فقیر است نیز فہم باید کرد و آن آنست ..... ایں حالت عجب حالت است کہ بہ سبب غلبۂ ..... سکمہ و مرہٹہ و جٹ بر بلادِ مسلمین و نہب اموالِ ایشاں و انتہاکِ حرمتِ ایشاں دل و جاں آسائش را فراموش نمودہ چنانچہ فقیر نیز مع قبائل بمراد آباد انتقال نمودہ است و تمام میانِ دو آب زیر و زبر بر فعالِ فرسانِ ایں بدکیشاں شد لیکن الحمد للہ کہ ایں فقیر و قریۂ بہجت و برادر صاحب کلاں ہمہ با بردہ و ناموس جان و مال بسلامت ماندیم و السلام ـــ از طرف ہمہ صغار و کبارِ اینجا خصوصاً والدہ صاحبہ و میاں رفیع الدین و عبد القادر و خواجہ محمد امین بجمیع دساکر یاراں سلام شوق خوانند ـــــ

ترجمہ ـــــ بسم اللہ الرحمن الرحیم ـــــ حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ ..... السید ابو سعید حسنی ـــ اللہ تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے اور اس درجہ پر پہنچائے جس کی وہ تمنا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبے پر فائز کرے آمین ـــــ

اللہ کی حمد ہے کہ اس نے اپنے اولیاء کی زبانوں کو بے شمار معارف کے ساتھ کھولا اور ان پر وہ عوارف ظاہر فرمائے جن کو گنا نہیں جا سکتا ـــــ صلوٰۃ و سلام سید الانبیاء

والا ولیا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ پر اور ان کے آل و اصحاب پر جن میں سے ہر ایک بدر الدجیٰ اور نجم الہدیٰ تھا ـــــ بعد حمد و صلوٰۃ ـــــ فقیر حقیر عبد العزیز کی طرف سے مطالعہ فرمائیں ـــــ اللہ تعالےٰ اس کے گناہ معاف کرے اور اس کو مکارم و مآثر میں سلفِ صالحین سے لاحق فرمائے ـــــ الحمد للہ عافیت سے ہوں اور ربِ کریم سے یہی درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو عافیت سے رکھے آمین ـــــ چند کہ آپ کے ذکرِ جمیل سے ہم ہمیشہ رطب اللسان رہتے تھے اور ارباب بصیرت کے سامنے آپ کے دفترِ مناقب و احوال کھولتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ کے مسرت آمیز خطوط نہیں آ رہے تھے جو کہ نصف ملاقات کی مانند ہوتے اس لیے ہم سب کے عنادلِ شوق باغات ارواح کے اندر غم جدائی میں چہچہا رہے تھے اور اشتیاق کی آگ دلوں کی بھٹی میں بھڑک رہی تھی نیز اندوہِ فراق کے نشکر ممالکِ قلوب پر چڑھائی کر رہے تھے اور ہم کو افکار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ الحمد للہ کہ (ایسی حالت میں) صحیفۂ شریفہ پہونچا جو کہ معارفِ حقہ اور وجدانیات مطابقہ پر مشتمل تھا اور جس نے دلِ غمگین کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیا اور قیدِ انتظار سے رہائی دی ـــــ میں نے کہا کہ مرحبا اچھے کاتب کے پاس سے اچھا خط آیا ہے اگرچہ وہ کاتب میری نظر سے غائب ہے مگر میرے سینے اور قلب سے غائب نہیں ہے ـــــ میں نے آپ کے لکھے ہوئے معارف کا مطالعہ کیا جو اس مکتوب کے ذیل میں تھے ـــــ میں نے ان کو معارف کو صحیح اور پختہ پایا۔ اللہ تعالےٰ آپ کے عرفان کو اور بڑھائے اور آپ کی منزلت کو بلند فرمائے ـــــ مگر اتنی بات ہے کہ ان معارف میں ایک اور تفصیل بھی سمجھ لینی چاہیے جو حضرت ولی نعمت قدس اللہ سرہٗ (حضرت شاہ ولی اللہؒ) کے ذوق کی چیز ہے اور اس فقیر کے مدرکات میں سے ہے ـــــ (آگے وہ تفصیل ہے جو یہاں پر رقم ہونے کی بنا پر پیش نہیں کی گئی) .....

اس وقت عجیب عالم ہے کہ بلادِ مسلمین پر غلبۂ سکھ و مرہٹہ و جٹ کے باعث اور ان کے اموالِ مسلمین کو لوٹنے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرنے کی وجہ سے دل و جان نے آسائش و آرام کو فراموش کر دیا ہے چنانچہ فقیر بھی مع تمام اہل و متعلقین مراد آباد

آگیا ہے۔ دوآبے کی تمام سرزمین مذکورہ بالا قوموں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زیر و زبر ہو گئی ہے۔ الحمد للہ فقیر اور قریہ کہلت (کے ساکنین اور بڑے بھائی و شیخ محمد قصبہ بڈھانہ میں) بعزت و آبرو اور جان مال کی سلامتی کے ساتھ ہیں ـــــ والسلام ـــ یہاں کے تمام خرد و کلان کی طرف سے خصوصاً والدہ ماجدہ کی جانب سے اور میاں رفیع الدین، عبدالقادر اور خواجہ محمد[2] امین صاحب نیز تمام دوستوں کی طرف سے سلام پہونچے۔

مکتوب (۲) سلالہ دودمانِ نجابت دخلاصۂ خاندانِ کرامت، مجمع المحاسن میر ابوسعید اسعدہم اللہ تعالیٰ بعد تحیات اشتیاق مرتسمات از فقیر عبدالعزیز واضح باد ـــــ الحمد للہ علی العافیہ والسلامتہ منہ، والمسئول من اللہ سبحانہ، ان یزیدکما فادکم ـــــ قبل ازیں دو مرتبہ مکاتیب محبت اسالیب رسید متضمن دقائق عجیبہ و

---

[1] الشیخ العالم المحدث محمد بن ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی احد رجال العلم والطریقہ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے صاحبزادے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زوجہ اولیٰ کے بطن سے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد بزرگوار سے مکمل تعلیم حاصل کی اور ان کے انتقال کے بعد قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۲۰۱ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔ بڈھانہ کی جامع مسجد میں آپ کا مزار ہے (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

[2] الشیخ العالم الکبیر الخواجہ محمد امین الولی اللہی الکشمیری ـــــ آپ اصل کے لحاظ سے کشمیری اور سکونت کے لحاظ سے دہلوی ہیں۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے خلفاء میں سے ہیں (آپ پہلے وہ شخص ہیں جو حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف نسبت کر کے ولی اللہی کہے جاتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ان سے بھی اخذ علم کیا ہے جیسا کہ عجالۂ نافعہ سے واضح ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان کے لیے بعض رسائل تصنیف فرمائے ہیں۔ ان کی وفات غالباً ۱۱۸۷ھ میں ہوئی ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اگلے مکتوب گرامی سے واضح ہے (نزہۃ الخواطر جلد ۶)

کشوف صحیحہ بود خیلے مسرور گردانید حق تعالےٰ در ترقیات مراتب عالیہ افزائش کناد۔ تو تن کہ ہموارہ یاد فرمودہ بر احوال سعادت مآل مطلع فرمودہ باشند کہ باعث زیادت اطمینان خواہد بود۔ مزاج فقیر از مدت یکساں بلکہ زیادہ بسبب عارضہ بود دت در طوبت [illegible] للہ در ایں ایام اکثر عوارض زائل شدہ طبیعت رو بصحت گلی آورد۔ مگر گاہ گاہ اندک اثرے ظاہر میشود تدارک آں بادویۂ مجربہ نمودہ می آید۔ خاطر جمع دارند۔ برادران عزیز القدر سلمہم اللہ تعالےٰ سلام می رسانند۔ رفیع الدین بفضل الٰہی از تحصیل علوم فارغ شدہ در مجلس ..... کہ مجمع علماء و فقراء بود دستار تبرک بستہ اجازت درس دادہ شد۔ الحمد للہ مردم بسیارے از تعلیم وے مستفید اند۔ عبد القادر ہم اکثر کتب تحصیل را خواندہ است بمرتبۂ فضیلت رسیدہ ان شاء اللہ ببرکت ارواح طیبہ عنقریب فارغ التحصیل خواہد شد۔ عبد الغنی قرآن را ختم نمودہ در رمضان مبارک گزشتہ در محراب استادہ شد باہتمام تمام در حفظ قرآن شریف اہتمام نمود۔ الحال کتب فارسی شروع کردہ است بعد ماہ مبارک آئندہ قصد ہست کہ شروع در صرف نحو کنائندہ خواہد شد والسلام۔ میر ابو اللیث و دیگر فرزندان را سلام ہمہ ہا رسانند برادر صاحب بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق می رسانند۔ والدہ صاحبہ نیز سلام و دعا گفتہ اند فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلام شوق ابلاغ می نماید۔

ترجمہ ـــــ سلالۂ دودمان نجابت، خلاصۂ خاندان کرامت، مجمع المحاسن میر ابو سعید اسعد ہم اللہ تعالےٰ فقیر عبد العزیز کی طرف سے بعد سلام واضح ہو کہ میں عافیت و سلامتی کے ساتھ ہوں اور اللہ تعالےٰ سے درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ـــــ اس سے پہلے دو محبت آمیز مکتوب ملے جو دقائق عجیبہ اور کشوف صحیحہ پر مشتمل تھے، انھوں نے بہت مسرور کیا۔ حق تعالےٰ مراتب عالیہ میں مزید ترقی عطا فرمائے ـــــ امید ہے کہ (اسی طرح) ہمیشہ یاد فرمارہ کر احوال سعادت مآل سے مطلع فرماتے رہیں گے تاکہ زیادت اطمینان کا موقع ملے ـــــ فقیر کا مزاج ایک سال سے بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے عارضۂ بردوت

و رطوبت کے سبب کسلمند رہتا ہے۔ الحمد للہ ان ایام میں اکثر عوارض زائل ہو گئے ہیں اور طبیعت صوبِ کلی کی طرف متوجہ ہے مگر کبھی کبھی تھوڑا بہت (بیماری کا) اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس کا تدارک مجرب دواؤں سے کیا جاتا ہے۔ خاطر جمع رکھیں ـــــ رفیع الدین بفضلِ الٰہی تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے ہیں ..... مجمع علماء و فقراء میں دستار تبرک ان کے سر پر باندھ کر اجازت درس دے دی گئی ہے۔ الحمد للہ بہت سے لوگ ان کی تعلیم سے مستفید ہوئے ہیں۔ عبدالقادر نے بھی اکثر کتب درسیہ کو پڑھ لیا ہے اور وہ بھی فضیلت و مولویت کے درجے کو پہونچ گئے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو اوراد و اوراد طیبہ کی برکت سے عنقریب وہ بھی فارغ التحصیل ہوں گے ـــــ عبدالغنی نے قرآن شریف ختم کر لیا ہے۔ گزشتہ رمضان المبارک میں انھوں نے پہلی محراب سنائی۔ کامل استعداد کے ساتھ حفظ قرآن میں انھوں نے اہتمام کیا ہے ـــــ اب انھوں نے کتب فارسی پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ اگلے ماہ مبارک (رمضان) کے بعد قصد ہے کہ صرف و نحو شروع کرا دی جائے۔ والسلام ـــ میر ابو اللیث اور دیگر فرزندوں کو سب کا سلام پہونچائیں۔ برادر بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق پہونچاتے ہیں۔ والدہ صاحبہ بھی سلام و دعا فرماتی ہیں۔ فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلام شوق پہونچاتا ہے۔

مکتوب (۳) بہ زبان عربی ..... السید الجید والشریف الاید طُرّۃ ناصیۃ السیادۃ غُرّۃ جبہۃ السعادۃ۔ بنوی الاخلاق والمآثر علوی الاعراق والمفاخر سید ابوسعید اکرمہ اللہ بشہودہ وافاض علیہ برکات ابائہ وجدودہ الفقیر عبدالعزیز یرفع علیکم التحیات الوافیہ والدعوات الذاکیہ بکرۃً وعشیًا ویذکرہمکارمکم السنیہ و مناقبکم العلیہ اناء الصباح واطراف المساء ..... هذا وقد مضیٰ زمانٌ طویل لم نطّلع علیٰ خبرٍ من اخبارکم ولم نعرف اثرًا من آثارکم ولا اکرمتمونا فی هذہ المدۃ المدیدۃ بصحیفۃ وما کان ذلک ظنّنا بکم فالمرجو منکم ان لا تنسونا من لطیف مکاتیبکم فانّ

المکاتیب نوع مواصلۃ۔ والسلام

الشیخ الکبیر محمد و رفیع الدین و عبدالقادر و عبدالغنی و شیخ محمد عاشق و مولانا نوراللہ و بابا فضل اللہ و خواجہ محمد امین و شیخ محمد جواد و شیخ محمد فائق کلہم یُسلّمون علیکم ویُقبّلون یدیکم والسلام۔

ترجمہ ـــــ ..... السید المجید والشریف الاید ... سید ابوسعید اللہ تعالےٰ ان کو اپنے شہود سے مکرم کرے اور ان پر ان کے آباد اجداد والے فیوض و برکات برسائے

فقیر عبدالعزیز صبح و شام آپ کے لیے دعاہائے فراواں اور رات دن آپ کے مکارم اخلاق اور مناقب عالیہ کا تذکرہ کرتا رہتا ہے ..... ایک طویل زمانہ گزر گیا کہ آپ کی کوئی خیر خبر نہیں ملی اور آپ کے آثار میں سے کوئی اثر معلوم نہ ہوسکا اور نہ آپ نے اس مدتِ مدیدہ میں اپنے مکتوب گرامی سے سرفراز فرمایا۔ آپ سے ایسی امید نہ تھی آپ سے تو یہ امید ہے کہ ہمیں اپنے مکاتیب سے فراموش نہ فرمائیں گے اس لیے کہ مکاتیب ایک قسم کی ملاقات ہوتے ہیں ـــ والسلام ـــ برادر بزرگ شیخ محمد، رفیع الدین، عبدالقادر، عبدالغنی، شیخ محمد عاشق، مولانا نوراللہ، بابا فضل اللہ، خواجہ محمد امین، شیخ محمد جواد اور شیخ محمد فائق (ابن شیخ محمد عاشق) یہ سب کے سب آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی دست بوسی کرتے ہیں۔ والسلام۔

مکتوب ۔ میر ابوسعید رائے بریلوی بنام صاحبزادگان شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

(بہ زبان عربی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــــ الحمد للہ الذی جعل المحدثین المجتبین والعلماء ورثۃ الانبیاء وعلمہم اسرار شیوناتہ وتنزلاتہ فی مدرستہ الازلیہ..... وعزّزہم بالعزّۃ القدسیۃ حیث قال ذوالعظمۃ والکبریاء انما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ والصّلوٰۃ والسّلام علی افضل الرُّسُل والانبیاء وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ الّذین ھُم نجوم الاھتداء وعلیٰ مشایخنا الکرام والنقباء ـــ امّا بعد فتح الکلام بمفاتح التحفۃ التحیر والاکرام فیسلم

علیکم ویسئل احوالکم الکریمہ المحب المخلص الداعی الی جناب العالی ابوسعید ..... مولانا ومخدومنا الشیخ عبد العزیز وشیخ محمد وشیخ رفیع الدین وشیخ عبد القادر وشیخ عبد الغنی سلمکم اللہ تعالی بالبرکات واممکث اللہ وجودکم فی الدنیا بالحفظ والامان ویسرکم فی الدار الآخرۃ باعلی الجنان وصانکم اللہ من الآفات والعاھات بحرمۃ النبی آخر الزمان وبعد فان سألتم عن احوالی فللہ الحمد والمنۃ شرفنا اللہ تعالی بزیارۃ الحرمین الشریفین زادھما اللہ شرفا وتعظیما ودخلنا فی شھر ربیع الثانی فی مکۃ الشریفۃ فی آخر ثلث اللیل وکان الوقت مبارکا منورا بجذبا الیھا حتی دخلنا من باب السلام مع ابنی ورفقائی بین یدی الکعبۃ المبارکۃ وشفنا ھا ودعونا فی حقنا وفی حق مشایخنا واصولنا وفروعنا وجمیع المؤمنین والمؤمنات ما کان ینبغی لھم وادینا العمرۃ وسعینا بین الصفا والمروۃ ولثنا فیھا ..... واعطانا اللہ فیھا برکۃ معنویۃ ـــــ یوما کنت فی منزلی مضطجعا متیقظا متفکرا فی سر الکعبۃ الشریفۃ وطوافھا وخصوصیتھا فی ھذا المکان المخصوص دون مکان آخر ـ تبادر الی اللہ تعالی حقیقۃ الکعبۃ وسر طوافھا وھی الخ ..... والملتمس من حضرتکم اذا وصل ھذا الورق الی جنابکم الاعلی ان تلاحظوا مضمونھا وتدعون ما کان الخیر فی حقنا ان اللہ لا یضیع اجرکم کتبت عجلۃ لا تنظروا الی قصورنا فی العلم ـ العاقبۃ بالعافیۃ والسلام والاکرام ـ

ترجمہ مکتوب شاہ ابوسعید حسنی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ..... بعد الحمد والصلوٰۃ ..... دعا گو ابوسعید آپ حضرات کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے ..... "آپ حضرات" سے میری مراد .....

مولانا و مخدومنا شیخ عبدالعزیز، شیخ محمد، شیخ رفیع الدین، شیخ عبدالقادر اور شیخ عبدالغنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو برکات کے ساتھ سلامت رکھے اور دنیا میں آپ کا وجود حفظ و امان کے ساتھ قائم رکھے نیز آخرت میں اعلیٰ جنت نصیب فرمائے اور (اس جہان میں) آفات و بلیات سے محفوظ رکھے بحرمۃ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ....

... اللہ کی حمد ہے اور اس کا احسان ہے کہ اس نے ہم کو حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف فرمایا۔ زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً۔ ہم مکہ معظمہ میں ربیع الثانی کے مہینے میں رات کے آخری ثلث میں پہونچے تھے۔ وہ وقت بڑا ہی مبارک اور منور تھا اور اس وقت ایک خاص کشش خانۂ کعبہ کی طرف تھی ـــــ چنانچہ ہم اپنے لڑکے (میر ابواللیث) اور اپنے رفقاء کے ساتھ باب السلام سے (مسجد الحرام میں) داخل ہوئے اور کعبۂ مبارکہ کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی اور اپنے حق میں اور اپنے مشائخ، اصول و فروع اور جمیع مومنین و مومنات کے حق میں دعائے خیر کی۔ پھر ہم نے عمرہ ادا کیا اور (طواف کے بعد) صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ـــــ مکہ معظمہ میں ہم کئی دن عمرے اللہ تعالیٰ نے ہم کو مکہ معظمہ میں برکتِ معنویہ عطا فرمائی ـــــ وہاں ایک دن میں اپنی قیام گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ جاگ رہا تھا اور کعبۂ شریفہ کی حقیقت کے سلسلے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے طواف میں کیا مصلحت ہے اور دوسرے مقامات کو چھوڑ کر اسی مکان مخصوص کی کیا خصوصیت ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مجھے حقیقتِ کعبہ اور اس کے طواف کی مصلحت و خصوصیت سے آگاہ فرمایا اور وہ یہ ہے ..... [یہ ایک دقیق اور خالص الہامی مضمون ہے اس لیے اس کو یہاں درج نہیں کیا گیا] (آخر میں ہوا) آپ حضرات سے التماس ہے کہ جب یہ رقعہ آپ کی خدمت عالی میں پہونچے تو اس کے مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمالیں اور ہمارے حق میں جو خیر ہو اس کی دعا فرمائیں ـــ اللہ تعالیٰ آپ کا اجر ضائع نہیں فرمائے گا ـــــ میں نے یہ خط عجلت میں لکھا ہے ـــــ ہمارے قصور علمی پر نظر نہ فرمائیے گا ـــــ انجام عافیت کے ساتھ ہو ـــ والسلام والاکرام ـــــ

جواب از طرف حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (بہ زبان عربی)

مکتوب (۴) ـــــ بسم اللہ الرحمن الرحیم ـــــ الحمد للہ الذی کشف اسرار العوالم صغیرھا وکبیرھا وکلھا وجزءھا وغیبتھا وشھادتھا وارواحھا ومثالھا علی من یشاءُ ـــــ لاسیماً النبی الأمّی الھاشمی البالغ الغایۃ القصوی فی الاعتلاءِ صلّی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ ما دامت الارض والسماء ـــــ الی السیّدِ الحسیبِ النسیبِ العارف اللبیبِ صاحب الکمالاتِ العالیہ والمعارف السنیّہ ـــ حاج الحرمین الشریفین زائر المکانین المحترمین وارث الاسرار بالاستحقاق، مصداق السعید من سعد فی بطنِ اُمّہ بلاخلاف وشقاق سلمہ اللہ تعالیٰ وعجّل لنا بالخیر والسلامۃ لُقیاہُ من الفقیر عبد العزیز وسائر اخوانہ المشتاقین الی لقائکم الراغبین الی اللہ فی طولِ بقائکم ـــ امابعد ـــ فقد وصلتِ الرقیمہ الکریمہ منبئۃً عن سلامۃِ ذاتکم مخبرۃً عن تفاصیل حالاتکم مُبشّرۃً بحصول الحج الشریف والزیارۃ المنیف لکم ولولدکم الارشد ورفقائکم وانکم قد دعوتُم فی ذلک المکان المعظم والمکرم المجسم فی تلک الساعۃ المیمونۃ المبارکۃ المفخمۃ لجمیع المومنین والمومنات ولذوی الحقوق منکم علی التخصیص المرجوانّ دعائکم ان شاء اللہ مستجابٌ بلاشکٍّ ولاارتیاب جزاکم اللہُ تعالیٰ احسن الجزاء ورزقکم حُسن المآب ـــــ فحمدنا اللہ تعالیٰ علی کُلّ ذلک وشکرناہ وغبطنا لانفسنا وتمنیناہُ إنّ اللہَ تعالیٰ علی تحصیلہ لنا قدیر ..... وامّاما اشرتم الیہ مِن حصول البرکات المعنویہ فی تلک الاماکن العالیہ فذلک ھو الیقین والصّواب وقرّۃُ عین الاحباب ادام اللہ لکم الترقیات وشرّفکم العوالی التجلیات وامّاما کتبتُم

فی سرّ الکعبۃ وطوافھا فھو امر مطابق لکشف الکبار من الاولیاء رضوان اللہ علیھم اجمعین ..... وبالجملۃ تمکشوفکم حق وصواب ھنیئاً لکم امثال ھذہ المعارف الحقّیہ والعلوم العمیقۃ الدقیقۃ واما ما التمستم من الدعاء فنحن نلتمس منکم اضعافہ ولا نغفل عن الدعاء فی حقّکم وفی حق ولدکم وکل من توسّل بکم طرفۃ عین ــ تقبّل اللہ منّا ومنکم ورزقنا وایّاکم سعادۃ الدارین والسّلام۔ وقد توفّی الی رحمتہ من اصحاب سیّدنا وشیخنا قُدّس سرّہٗ الشیخ اھل اللہ والشیخ محمّد عاشق والشیخ نور اللہ وخواجہ محمد امین وحاجی محمّد سعید البریلوی فادعوا اللہ تعالیٰ فی حقّھم ــــ

ترجمہ ــــ یہ خط عبدالعزیز اور اس کے تمام بھائیوں کی طرف سے ہے ــــ جو مکتوب الیہ کی ملاقات کے مشتاق اور ان کی طول عمر کے اللہ تعالےٰ سے خواہاں ہیں۔ ــــ اور حبیب ونسیب عارف لبیب صاحب کمالات ومعارف عالیہ حاجی حرمین شریفین زائر مکانین محترمین ..... (میر ابوسعید) کی طرف لکھا جارہا ہے ــــ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور خیر وعافیت کے ساتھ ہم کو جلد ان کی ملاقات میسر کرائے ــــ ــــ بعد حمد وصلوٰۃ واضح ہو کہ مکتوب گرامی ملا جو آپ کی سلامتی کی اطلاع اور آپ کے تفصیلی حالات کی خبر دینے والا تھا ــــ اس میں حصول حج وزیارت کی خوشخبری بھی تھی اس خط سے معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے (میر ابواللیث) اور آپ کے رفقاء کو بھی یہ سعادت حج وزیارت نصیب ہوئی ــــ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے اس مقام معظم ومکرم (مسجد الحرام) میں ساعت سعید کے اندر تمام مومنین ومومنات کے لیے عموماً اور اہل حقوق کے لیے خصوصاً دعا فرمائی۔ امید تو یہی ہے کہ آپ کی دعا ان شاء اللہ تعالےٰ بے شک وشبہ مستجاب ہوگی ــــ اللہ تعالےٰ آپ کو بہترین جزا دے اور آخرت کی بھلائی عطا کرے ــــ ہم نے آپ کا خط پڑھ کر مندرجہ مکتوب باتوں پر اللہ کی حمد کی اور اس کا شکر ادا کیا۔ ہم کو آپ کی اس کامیابی پر غبطہ ورشک ہوا اور اس

کامیابی کی اپنے لیے بھی تمنا کی ـــــ اللہ تعالیٰ اس سعادت و کامیابی کے حاصل کرانے پر قادر ہے ..... آپ نے ان مقامات مقدسہ میں حصولِ برکاتِ معنویہ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ بالکل حق و صواب اور احباب کی آنکھوں کا نور ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ترقیات کو دائماً برقرار رکھے اور آپ کو تجلیات سے مشرف فرمائے ـــــ آپ نے کعبہ اور طوافِ کعبہ کی حقیقت پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی صحیح اور کبار ادلیاء رحمہم اللہ کے مکشف کے مطابق ہے ـــــ ..... حاصل کلام یہ ہے کہ آپ کا مکشوف بالکل صحیح و درست ہے۔ آپ کو اس طرح کے معارفِ حقیہ اور علوم دقیقہ مبارک ہوں ـــــ اور آپ نے دعا کا جو التماس کیا ہے تو ہم بھی آپ سے زیادہ سے زیادہ دعا کی درخواست کرتے ہیں اور آپ کے اور آپ کے صاحبزادے اور آپ کے متوسلین کے حق میں دعا کرنے سے ایک لمحہ غافل بھی نہیں ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی دعا قبول کرے اور ہمیں اور آپ کو سعادتِ دارین نصیب فرمائے ـــــ سیدنا و شیخنا قدس سرہٗ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے اصحاب میں سے یہ حضرات وفات پاکر جوارِ رحمتِ خداوندی میں پہونچ گئے ہیں ـــــ

(۱) شیخ اہل اللہ (۲) شیخ محمد عاشق (۳) شیخ نور اللہ (۴) خواجہ محمد امین (۵) حاجی محمد سعید بریلوی ـــــ ان حضرات مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت فرمائیں ـــــ

لہ الشیخ العالم الصالح محمد سعید بن محمد شریف بن خان محمد بن یار محمد ابن خواجہ احمد الافغانی الدہلوی ـــــ آپ افغانستان میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ تحصیل علم کے لیے دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر کمالاتِ علمیہ سے مالا مال ہوئے۔ آپ بھی سفرِ حجاز میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ اپنے شیخ کی حیات میں برابر خدمتِ اقدس میں رہے۔ بعد وفاتِ شاہ صاحبؒ آپ دہلی سے بانس بریلی تشریف لے آئے۔ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں نے آپ کو اپنے صاحبزادے عنایت خاں کا معلم مقرر کیا۔ چنانچہ آپ نے بریلی ہی میں اقامت کر لی۔ اور وہیں ۱۲۸۵ھ سے کچھ پہلے انتقال فرمایا۔ آپ کے پوتے مولانا نجم الغنی نے صاحب نزہۃ الخواطر

(باقی بر صفحہ ۳۵)

مکتوب سید محمد نعمان حسنی بنام حضرت شاہ ابوسعید حسنی رح

[جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے آخری حالات اور دیگر نادر معلومات پر مشتمل ہے۔]

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ شانہٗ۔ الحمد للہ علی النعماء والرضا علی القضا والصبر علی المصیبۃ والبلا۔ والصلوٰۃ والسلام علی سید الشاکرین وزبدۃ الراضین وقدوۃ الصابرین شفیع المذنبین ورحمۃ للعلمین محمدٍ وآلہٖ وصحبہ الطیبین الطاہرین وعلی ورثتہ علماء الراسخین واولیاء المرشدین الی یوم الدین بعد ھذا۔ اگر شرح سوگواری ... واقعۂ ارتحال امام سنت وجماعت ومقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زماں سرآمد اولیائے جہاں، قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا ومرشدنا ولی اللہ فاروقی مجددی ثانی دوم الف ثانی رضی اللہ عنہ ازیں عالم پُر ملال بصوب دار الافضال بوصال ذوالجلال بر صفحہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴)
کو یہی سن وفات بتایا ہے مکتوب حضرت شاہ عبدالعزیز رح سے بھی قریب قریب یہی سن وفات معلوم ہوتا ہے ــــ
ــــ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) ــــ تاریخ کا یہ زبردست سانحہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رح سے کامل رکھنے والی پانچ اہم اور باکمال شخصیتیں ایک سال کے اندر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اس کا انکشاف حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے مکتوب گرامی سے ہوا ــــ حضرت شاہ ابوسعید حسنی ۱۱۷۳ھ میں حجاز کو روانہ ہوئے اور ۱۱۷۴ھ میں واپس آئے ہیں۔ واپسی پر ۱۱۷۵ھ میں حضرت شاہ عبدالعزیز رح نے ان کو یہ مکتوب لکھا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۷۵ھ میں ان سب حضرات کا انتقال ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۱۷۴ھ سب کا سال وفات ہو یا بعض کا ۱۱۷۴ھ میں اور بعض کا ۱۱۷۵ھ میں وصال ہوا ہو لیکن مولانا نجم الغنی نے اپنے دادا کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ ۱۱۷۴ھ سے کچھ پہلے یعنی ۱۱۷۳ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے جس سے حاجی محمد سعید رح کے لیے ۱۱۷۴ھ متعین ہے۔ مگر دوسرے چار حضرات کے متعلق پھر احتمال ۱۱۷۵ھ کا بھی ہے۔ اسی وجہ سے صاحب نزہۃ نے احتیاطاً ان بقیہ چار بزرگوں کی تاریخ وفات کو ان الفاظ میں لکھا ہے "قد توفی الخ وسنۃ سبع وثمانین ومائۃ والف" نزہۃ الخواطر جلد ۶ میں حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے جس مکتوب گرامی کا کئی جگہ ذکر ہے وہ یہی مکتوب (۴) ہے ــــ

لہ مولانا سید محمد نعمان بن سید محمد ابن سید محمد ہدی ابن عارف باللہ سید محمد علم اللہ حسنی رائے بریلوی قدس سرہم۔

روزگار شبت یادبہر آئینہ ماند حال ما غریباں سر دسے

چہ خاطر رسید باد مرا کہ بہجراں کشید کار مرا

وا مصیبتاہ ـــــ ایں چہ بے نیازی ..... است کہ ہمچیں روح مقتدائے ما در کمتر وقت بعر شصت و دو سالگی نداء ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیہ دادند و اصحاب بدع و ضلال را عشرت آگیں نمودند و اصحاب دین را اندوہگیں کردند یعنی بتاریخ سلخ محرم الحرام ۱۳۱۶ھ یک ہزار و یکصد و ہفتاد و شش یوم السبت وقت الظہر بامر داعی برحق روح مطہر آنحضرت از قالب عنصری مفارقت نمودہ باوج علیین نشیمن ساختہ ..... حالت تمام اصحاب احباب از مفارقت آنجناب چناں تباہ و خراب بود کہ از حیز تحریر بیرون ست ..... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔ رحمۃ اللہ علیہ وعلی من یجنازتہ یتوصلون آمدیم بر اینکہ از فضل الٰہی و تصدق جناب حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم جاذبہ حضرت ایشاں علیہ الرحمۃ ایں عاصی را بسوئے خود کشید بشہر ذی قعدہ در بڑھانہ رفتہ بتقبیل آستانہ منیر کہ استعداد یافتہ و ملازمت جناب قدسی القاب مشرف گردید و بہ حالات خود و توجہات عالیات بیش از بیش یافتہ از انجا کہ حضرت ایشاں بہت تمادی و تدابیر در راہ ذی حجہ تا رسیدن بشہر دہلی بمکان با فضل اللہ در مسجد روشن الدولہ بمحلہ سعد اللہ خاں نزول فرمودند از فرزندان گرامی میاں محمد صاحب و میاں عبد العزیز و میاں رفیع الدین مدظلہم العالی ـــــ و میاں محمد عاشق صاحب و میاں اہل اللہ صاحب و میاں محمد فائق و میاں محمد جواد و محمد امین وغیرہ یاران حاضر خدمت بودند و این غلام و میر محمد عتیق و میر قاسم علی کہ در وقت آخرین شرف انتساب بیعت یافتہ ـــ ہر روز بشرف حضور پر نور خدمت گاری وسیلہ حضور و حضور سعادت اندوز میشدیم۔ مشفقانہ ایں مجلس آخرین عجب مجلسے بود پر فیض و انما مہبط ملائکہ ملکوت و نزول ارواح علیہ ارکان عالم ناسوت میگردید و نفحات انس و رحمت و رشحات قدس و برکت بمثال نزول غیث می بارید۔ اکثر یاران اہل نسبت بوجدان صحو خود می دریافتند ـــ و احسرتا اہل اللہ و عرفا لازال در ہر زمان می باشند اما ایں چنیں مرد با جمعیت اوصاف حمیدہ اعلم بکتاب و سنت با اجتہاد مطلق و در حقائق و

و معارف بحر مواج و دریٔ علوم دیگر محض فیاض پس از صدہا سال می آید ؎

دور ما باید کہ تا یکدم صاحبدل شود باز بیند در خراسان یا سمیل اندر یمن

یاراں می باید کہ مصاحبت و شکیبائی ورزیدہ نسبت رابطۂ حضرت شیخ را بمجامع ہمت و تصور نہادہ بمراقبات معلومہ مشغول باشند ان شاء اللہ تعالیٰ فیض صحبت در رابطہ برابر خواہد بود کما یفیض من بعض رسالاتہ رحمۃ اللہ علیہ ــــ والحمد للہ رضامندیٔ حضرت صاحب قدس سرہ از انصاحب و توجہات عالیات بر حال ایشاں زیادہ از حد بیان یافتہ اکثر اوقات استفسار احوال سامی می فرمودند ما جرائے غارتگریٔ ابدالیاں و رسیدن آنصاحب در عین ریزیدن و انطفاء یافتن التہاب نہیب بسبب قدوم گرامی از زبان دُرفشاں موذی ساختند و شاید کہ نشنود ۔ لقائے آخرین بضمیر منیر بودہ باشد مرۃً فرمودند کہ "میر ابو سعید ارادۂ آمدن دارند اگر زود بروند بہتر باشد" صاحب من ظاہر صحبت ایشاں را دریاستہ کشیدہ تصنیفات آنحضرتؒ قریب تموّل زیادہ در علوم دین از تفسیر و اصول و فقہ و کلام و حدیث مثل حجۃ اللہ البالغہ و اسرار فقہ و منصور و ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا و ترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب ہشتاد و نود جزو کلاں بحجم خواہد بود و دیگر رسائل در حقائق و معارف مثل الطاف القدس و نہجات و فیوض الحرمین و انفاس العارفین وغیرہم کہ نشان از صحبت و برکت خدمت می دہند می باید کہ عزیمت بر ایں آرند کہ ہمہ را نویسانیدہ رائج نمایند تا ندک توجہات سرانجام خواہد یافت و مثل ایں تصنیفات واللہ اعلم در اسلام تصنیف شدہ باشد یا نہ ۔ چنانچہ ارباب بصیرت عبرت یافتہ اعتراف دارند در کلام ایشاں و ہر باب کہ نوشتہ اند اصول است ..... و یقین این فقیر و دیگر صاحبزادہا و یارانِ حضرت بملاحظۂ فرط محبت سامی بجناب حضرت ۔ انیست کہ بحضور و شنیدن ایں حادثۂ عظیمہ ہمت فاتحۂ ردحانیت و زیارت مرقد مطہر راہی انیعوب خواہند شد ــــ لہٰذا منتظر قدوم ہستم اگر زود تشریف بیارند بارے بملاقات سامی مسرور الوقت شوم و اگر توقف در آمدن باشد اعلام نمایند کہ فقیر ہم عزم مراجعت وطن دارد ــــ و دیگر آنکہ میاں محمد عاشق صاحب بعد سلام فرمودہ اند کہ میر ابو سعید جیو را بنویسید کہ ہر مکاتیب

حضرتِ ایشان کہ بجانب آنصاحب شرف صدور یافتہ باشد نقل آنہا البتہ بفرستند کہ داخلِ مکاتیب نمودہ شود از حضرت میاں اہل اللہ صاحب و دیگر یاراں و صاحبزادہا سلام اسم باسم مطالعہ فرمائید ــــ و کیفیت ارتحال و وصالِ مرحوم و مغفور غفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ..... بجناب عالی حضرت صاحبؒ قبلہ در مقام بڈھانہ عرض کردم فاتحہ برو حاینت خواندند و تاسفہا نمودند ــــــ

ترجمہ ــــ باسمہ سبحانہ و تعالیٰ شانہٗ ــــ اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اس کی نعمتوں پر نیز جذبۂ رضا بالقضا کے حصول پر اور مصیبت و بلا میں صبر کے حاصل ہونے پر اور درود و سلام سید الشاکرین، زبدۃ الراضین، قدوۃ الصابرین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ پر اور (آپ کے ضمن میں) آپ کے آل و اصحاب پر جو کہ طیب و طاہر تھے اور آپ کے وارثین یعنی علماء راسخین اور اولیاء مرشدین پر تا قیام قیامت ــــــ

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ امام سنت و جماعت، مقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زمان، مرکزِ اولیاء جہان، قطبِ زمانی، محبوبِ سبحانی سیدنا و مرشدنا ولی اللہ فاروقی مجددی قدس اللہ سرہ کے انتقالِ پُر ملال کا واقعہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہم جیسے غمزدہ لوگوں کے مناسب حال ہے ــــ ہمارے دوست کے دل میں کیا آیا کہ ہمیں فراق و مہجوری میں مبتلا کر گیا ــــ وامصیبتاہ ــــ اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا عجیب نمونہ ہے کہ ایسے مقتدا کی روح کو صرف ۶۲ سال کی عمر میں ارجعی الیٰ ربکِ راضیۃ مرضیہ (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہو کر رجوع ہو جا) کی ندا دے دی گئی اور بدعت و ضلالت والوں کو خوش اور اصحاب دین کو اندوہگین کر دیا گیا ــــ یعنی محرم الحرام ۱۳۸۶ھ کی آخری تاریخ میں ہفتے کے دن ظہر کے وقت حکم خداوندی کے مطابق حضرتِ اقدس کے طائر روحِ مطہر نے اوج علیین پر اپنا نشیمن بنالیا .....

اصحاب و احباب کی حالت، آنجنابؒ کی مفارقت سے ایسی خراب و خستہ تھی کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی ..... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ــــــ

اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ پر اور آپ کے متوسلین پر نازل ہو ــــــ

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں ــــ فضلِ الٰہی سے اور درگاہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم کے صدقے میں اس عاصی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کشش نے اپنی طرف کھینچا چنانچہ ذی قعدہ (۱۱۷۵ھ) کے مہینے میں بڈھانہ ضلع مظفر نگر جاکر آستاں بوسی کی سعادت حاصل ہوئی اور جناب قدسی القاب (حضرت شاہ صاحبؒ) کی صحبتِ اقدس سے مشرف ہوا۔ بڈھانہ سے حضرتِ ایشاں ۹ ذی الحجہ (۱۱۷۵ھ) کو بغرض علاج شہر دہلی تشریف لے آئے اور وہاں بابا فضل اللہ کے مکان پر مسجد[1] روشن الدولہ کے احاطے میں جو چوک سعد اللہ خاں میں واقع ہے ــ فروکش ہوئے ــــ فرزندانِ گرامی قدر میں سے میاں محمد میاں عبد العزیز، میاں رفیع الدین مدظلہم العالی (اور اقربا و متوسلین میں سے) میاں محمد عاشق صاحب، میاں اہل اللہ صاحب، میاں محمد خالق، میاں محمد جواد (پہلتی) اور خواجہ محمد امین وغیرہ حاضرِ خدمت تھے۔

یہ غلام اور میر محمد عتیق نیز میر قاسم علی (ساکنانِ رائے بریلی) جو کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے آخری ایام میں شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے تھے۔ ہر روز حاضری اور خدمتگاری سے سعادت اندوز ہوتے رہتے تھے ــــــ

مشفقِ من! یہ آخری مجلسیں بھی عجیب پُر کیف اور پُر فیض تھیں ..... نفحاتِ اُنس و رحمت اور رشحاتِ قدس و برکت بارش کی طرح برستے تھے۔ اکثر اہل نسبت حضرات اپنے وجدانِ صحیح سے اس کو محسوس کرتے تھے ــــ ..... اہل اللہ اور عارف تو ہمیشہ ہر زمانے میں ہوتے ہیں مگر ایسا مردِ حقانی جو جمیع اوصافِ حمیدہ کا حامل ہو اور جو

---

[1] مسجد و مدرسہ روشن الدولہ ــــ شاہجہاں آباد (دہلی) میں یہ عمارتیں دریبے کے اندر نواب؟ روشن الدولہ کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ۱۷۲۲ء میں نواب موصوف نے بنوائی تھیں ــــ مسجد کے برج سنگ مرمر زرد کے بنے ہوئے ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں۔ بڑے در کی پیشانی پر کتبہ کندہ ہے مدرسہ کا مکان ۱۸۵۷ء سے کوتوالی کے متعلق ہو گیا ہے (مزارات نگار مولفہ عبد الحق دہلوی)

کتاب وسنت کا اجتہادی شان سے بہترین عالم ہونیز حقائق ومعارف میں بحر مواج ہو اور دیگر علوم میں دریائے زخار ہو ـــــ صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہو (مگر بڑی مشکل سے ہوتا ہو جہاں میں دیدہ ور پیدا) ..... دوستوں کو چاہیے کہ صبر وشکیبائی کو اختیار کر کے حضرت شیخ کی نسبت رابطہ کو ہمت کے ساتھ تصور میں لاکر مراقبات معلومہ میں مشغول رہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو فیض صحبت در رابطہ برابر باقی رہے گا جیسا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض رسائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے ـــــ یہ امر بھی لائق حمد ہے کہ حضرت صاحب قدس سرہ کی آپ سے رضامندی اور آپ پر ان کی توجہات عالیہ کو میں نے حد بیان سے زیادہ پایا۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے ـــــ ابدالیوں کی جنگ کا واقعہ اور آپ کا عین اس ہنگامۂ قیامت خیز میں پہونچنا اور آپ کے قدوم گرامی سے آتش فتنہ کا فرو ہو جانا۔ ان باتوں کو حضرت قدس سرہ اپنی زبان دُرفشاں سے بیان فرمایا کرتے تھے ـــــ شاید آپ سے آخری ملاقات کی تمنا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تھی چنانچہ ایک مرتبہ یوں فرمایا "میر ابوسعید آنے کا ارادہ کر رہے ہیں اگر وہ جلدی آجائیں تو اچھا ہو" ـــــ

صاحب من! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آسکتی البتہ علوم دینیہ میں ان کی تصنیفات نو[1] کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں ـــــ تفسیر، اصول فقہ، کلام اور حدیث میں ـــــ جیسے حجۃ اللہ البالغہ، اسرار فقہ، منصور، ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا جن میں سے ہر ایک کی کافی بڑی ضخامت ہے ـــــ ان کے علاوہ دیگر رسائل ہیں جو حقائق ومعارف پر مشتمل ہیں۔ جیسے الطاف القدس، لمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہا۔ یہ کتابیں آپ کے فیوض وبرکات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ قصد اس امر کا کریں کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج فرمائیں۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پاسکتا ہے ـــــ معلوم نہیں کہ ایسی تصنیفات گزشتہ دور میں ہوئی ہیں یا نہیں؟ واللہ اعلم ـــــ ارباب بصیرت ان کتابوں کی افادیت کا اقرار کرتے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] یہ دونوں کتابیں ان کی کی فہرست تصانیف میں موجود نہیں ہیں۔

کا کلام ہر باب میں اصولی حیثیت رکھتا ہے۔ ..... اس فقیر کو اور صاحبزادگان نیز تمام یارانِ حضرتؒ کو آپ کی محبت کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ جیسے ہی آپ اس حادثۂ عظیمہ (وفات حضرت شاہ صاحبؒ) کی خبر سنیں گے (فوراً) فاتحہ پڑھنے اور مرقد منور کی زیارت کرنے کے لیے دہلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں منتظر قدوم ہوں اگر جلدی تشریف لائیں تو میں ملاقاتِ سابق سے مسرور الوقت ہو جاؤں ــــ اگر تشریف لانے میں کچھ دیر ہو تو مطلع فرما دیں کیونکہ فقیر بھی وطن کو واپس جانے کا قصد رکھتا ہے ــــ دوسری بات یہ ہے کہ میاں محمد عاشق صاحب (جو آپ کے) بعد سلام فرماتے ہیں کہ میر ابو سعید کو لکھو کہ حضرت اقدسؒ کے جتنے مکتوبات بھی ان کے نام صادر ہوئے ہیں ان کی نقول ضرور بھیجیں تاکہ ان کو داخلِ مکاتیب کیا جائے۔ حضرت میاں اہل اللہ صاحب اور دیگر متوسلین نیز صاحبزادگان کی طرف سے نام بنام سلام صادر فرمائیں۔ میں نے بدھانہ میں حضرت اقدسؒ کی خدمت میں مرحوم و مغفور غفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روح کو ایصال ثواب کیا تھا اور بڑا افسوس ظاہر فرمایا تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے ایک عربی مجلے کا اجراء

سہ ماہی مجلّہ "دعوۃ الحق" دیوبند

دارالعلوم دیوبند ملت کا وہ عظیم الشان مذہبی علمی اور ثقافتی مرکز ہے جس پر برصغیر کے مسلمانوں کو بجا طور پر ناز ہے مدت سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اس مرکز کی آواز عالم اسلام تک پہونچائی جائے اور اس کے فکر و مسلک کو اس کی اپنی روایات کی روشنی میں عرب ممالک سے متعارف کرایا جائے۔

چنانچہ "دعوۃ الحق" کے نام سے ایک سہ ماہی عربی مجلے کا اجراء کیا گیا ہے جس میں اکابر علماء دیوبند کے علوم اور انکی تحقیقات عربی کے قالب میں پیش کی جائیں گی، نیز وقت کے اہم موضوعات پر بصیرت افروز مقالات کے علاوہ دنیائے اسلام کے ممتاز اہل قلم کے علمی و دینی مقالات بھی شامل اشاعت ہوں گے۔

شوال ۱۳۸۴ھ میں پہلا شمارہ منظر عام پر آچکا ہے جس نے ملک کے ارباب علم و اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ــــ سال کے چار شماروں کے لیے زر اشتراک مبلغ چار روپے اس پتہ پر روانہ فرمائیں۔

منیجر مجلّہ "دعوۃ الحق" دارالعلوم دیوبند

کائنات میں خدا کی گواہی

(جناب وحیدالدین خاں صاحب)

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لیے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہو کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہو جائیں۔ اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کے باوجود وہ ہمارے تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجیے۔ اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی۔ مثلاً یہ کرہ زمین اگر چاند اتنا چھوٹا یعنی اس کا قطر موجودہ کی نسبت سے ½ ہوتا تو اس کی کشش ثقل زمین کی موجودہ کشش کا ¼ رہ جاتی۔ کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہو جاتا کہ وہ پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے۔ چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے۔ ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے اور دن کے وقت تنور کی مانند جلنے لگتا ہے۔ اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اسی بنا پر ایک سائنسداں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ GREAT BALANCE WHEEL[1] کہا ہے۔

[1] MAN DOES NOT STAND ALONE P. 28

کا نام دیا ہے۔ اور ہوا کا موجودہ غلاف اٹھ کر فضا میں گم ہو جاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی۔ کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی۔ اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہو جاتا جس کا ردِ عمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوتا۔ اور اگر زمین سورج سے اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی۔ ہوا کے غلاف کی بازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہونچتا۔ اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشو و نما ممکن نہ رہتا۔ ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا۔ انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ کیوں کہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لیے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں۔ زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں۔ کوئی شخص ہندستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے اور امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندستان اس کے نیچے ہوگا۔ پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہوا کا انجام وہی ہونا چاہیے جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھما دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ زمین کے اندر غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے۔ اس دو طرفہ

عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ۔ آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے۔ دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے اسی لیے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا۔ جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا۔

وائٹ ہیڈ (A. N. WHITEHEAD) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے تو وہ ہم کو توجیہہ نہیں دے سکتی۔ ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا۔ تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں۔ جبکہ مردہ کائنات میں کسی مقصد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

THE AGE OF ANALYSIS P. 85.

وائٹ ہیڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحب شعور کے زیر انتظام نہیں ہے تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے۔ فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے۔ گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دیگا۔ اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا۔ سورج جو اس وقت

ہمارے لیے زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے۔ مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہو جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آباد کاری کے قابل ہو گیا ہے اور مختلف قسم کی نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا۔ سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان۔ اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا۔

اگر سائنسدانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداءً زمین کا درجہ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے۔ یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجہ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے۔ اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا۔ اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ غالباً ایک بلین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی۔ زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا

ایک بڑا حصہ خلا میں چلا گیا، ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے۔ یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے ——— کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں۔ یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار زیادہ ہوتی۔ دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشو و نما پا سکے۔

زمین کی دوہری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں۔ اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے۔ یہ شہابیے چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے۔ شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نو گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی۔ مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیاوی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (ACTINIC RAYS) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہونچتی ہیں جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لیے ضرورت ہے۔ جس سے مضر بکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن ہے۔ باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ اس

فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے۔ موجود آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے اور وہ دنیا کے تمام پانی کا ۸/۹ حصہ بناتا ہے۔ آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لیے سانس لینے کا ذریعہ ہے اور اس مقصد کے لیے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لیے ضروری تھا۔ مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲۱ فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جزو ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا۔ اسی طرح اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہو زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر زندگی قائم ہے۔ اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں۔ ایک عالم طبیعات کے الفاظ میں:

SCIENCE HAS NO EXPLANATIONS TO OFFER FOR THE FACTS, AND TO SAY IT IS ACCIDENTAL IS TO DEFY MATHEMATICS (P. 33)

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہہ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (DENSITY) پانی سے کم ہوتی ہے۔ پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بقائے حیات کے لیے زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے اور دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کی تہہ میں بیٹھ نہیں جاتا۔ ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے۔ یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے۔ اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے برف فوراً پگھل جاتا ہے۔ اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب امریکہ میں انڈوتھیا (ENDOTHIA) نام کی بیماری شاہ بلوط (CHESTNUT) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا "یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے۔" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا۔ اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لیے خاص تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا۔ اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پُر ہو گئے۔ کچھ دوسرے درخت (TWIN TREES) اپنی نشوونما کے لیے شاید انہیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے۔ شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی جزو تھے اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے۔ لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں۔ یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں۔ اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تختوں کے کام آسکتی ہے ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے۔ ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لیے بوئی گئی ہے۔ آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی۔ وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کر دیا۔ اور زراعت کو ناممکن بنا دیا۔ کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی۔ ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لیے نکلے۔ یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی۔ وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پا لیا اور اب وہاں سے اس معیبت کا خاتمہ ہو گیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط و توازن (CHECKS AND BALANCES) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہے۔

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی تعلیت پائی جاتی ہے۔ یہ جامد بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے۔ "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہوگا ——— ایک ایسا مرکب جس میں ۱۱ فیصد ہائیڈروجن اور ۸۸ فیصد آکسیجن۔

ایک سائنسداں جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ ہے جبتک ہوا کا دباؤ (ATMOSPHERIC PRESSURE) ۷۶۰ ایم۔ ایم رہے۔ اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لیے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے۔ اس طرح نقطۂ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر ہوا کا دباؤ ۷۶۰ ایم ایم سے زیادہ ہو تو نقطۂ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو جائے گا۔ یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جا سکتا ہے کہ

پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے۔ اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لیے کوئی بنیاد نہ ہوتی۔ کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعات کے لیے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریقِ عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نو وارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے وہ عناصر میں نظم اور دوریت ہے۔ سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا مینڈلیف (MENDELEEV) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دوری نقشہ (PERIODIC CHART) کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پُر ہو گئے۔ ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کیے جاتے ہیں۔ جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں PROTONS کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے۔ یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے، اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے۔ ہیلیم میں دو اور یورینیم میں تین۔ مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لیے ممکن ہو سکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے۔ نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر ۱ کی شناخت محض اس کے ۱ پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی۔

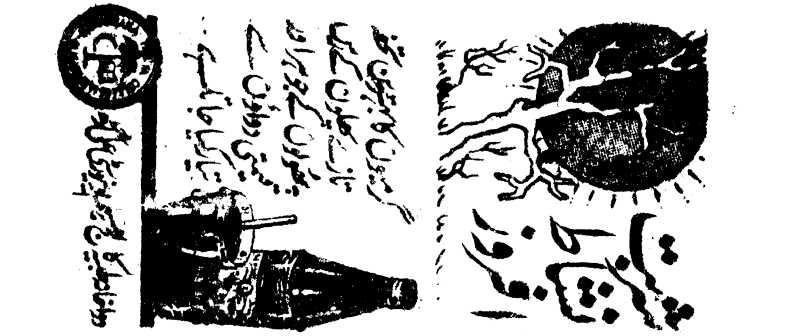
قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (PERIODIC CHANCE) نہیں کہتے بلکہ اس کو دوری ضابطہ (PERIODIC LAW) کہتے ہیں۔ مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کر یگی۔

"۱۱ اگست ۱۹۹۹ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا۔ جو کارنوال (CORNWALL) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا" ——— یہ محض ایک قیاسی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ

علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے۔ جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جارہی ہے۔ وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جانے، وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک متعین المثال نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریہ کشش فلکیاتی گردش کی توجیہ کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں (J. C. ADAMS) اور لاویریے (U. LEVERRIER) کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کرسکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۸۴۶ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے جس کو اب ہم نپچون (NEPTUNE) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں بیرریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہوگئی ہے



دربارِ عالمگیری

(از جناب مولانا مصطفےٰ احسن صاحب ملیحی ایم اے پی ایچ ڈی)

(۳)

تفسیر احمدی۔ ان چند الفاظ کو چھوڑ کے جو دوسری زبانوں کے ہیں یہ واقعہ ہے کہ پورا قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو الفاظ عربی نہیں ان کو معرب کر کے اُن پر بھی عربی کے ہی قاعدے اور قوانین کا عمل درآمد ہوا۔ اس کا اسلوب بیان سب عربی کنایہ، تشبیہ، استعارہ، مجاز حقیقت کے مفاہیم سب عربوں کے نہج اور طریقے کے۔ اور پھر باوجود عربی ہونے کے یہ ضروری نہیں کہ اہل عرب ان کو سب کا سب سمجھتے ہی ہوں شیکسپیر کے ڈرامے، ملٹن کی نظمیں انگریزی میں ہیں مگر ایسا نہیں کہ انگریزی جن کی مادری زبان ہے وہ اس کے مفہوم اور معنی سمجھ ہی لیتے ہوں غالب کا کلام اردو میں ہے اور سودا کے قصائد بھی اُردو میں ہیں مگر یہ اردو دانوں کو بھی سبقاً سبقاً پڑھائے ہی جاتے ہیں۔ جب وہ اسے سمجھ پاتے ہیں۔ اگر کسی کو الفاظ کے معنی آتے ہیں یا وہ لغت دیکھ کے معنی معلوم کر لے تب بھی اس کا مطلب ہاتھ نہیں لگتا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ صحابۂ کرامؓ باوجود عرب ہونے کے پھر بھی اکثر قرآن کے مفاہیم اور معانی ان کی سمجھ سے باہر نہ ہوتے "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" میں فجر کے معنی ان کو معلوم تھے لیال کے معنی بھی ان کو معلوم تھے اور عشر کے بھی لیکن اس محل پر اس کا مفہوم بغیر پوچھے ان کے ہاتھ نہ لگا۔ سورۃ انعام کی آیات بیشتر مکی ہیں اور ان میں اصول دین اور اصول احکام بتلائے گئے ہیں۔ ان کے مفاہیم میں غموض نہیں ان کو سب سمجھتے تھے لیکن

قرآن میں وہ آیات بھی ہیں جن میں ابہام ہے جن میں غموض ہے اور جنھیں آیات متشابہات کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ ہر زبان میں بعض جملوں اور فقروں کے مفہوم قرائن سے معلوم ہوتے ہیں اگر قرائن نہوں تو انکے مفاہیم ہاتھ نہیں لگتے۔ ایک شخص کسی سے ملنے آتا ہے کواڑوں پر دستک دیتا ہے اندر سے آواز آتی ہے "آجایئے پڑھ ہے" دوسرا شخص آکے یہی عمل کرتا ہے اندر سے آواز آتی ہے "نہ آیئے پڑھ ہے" یہ پڑھ ہے کی دونوں مرادیں قرائن ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ صحابہ سفر حضر جلوت و خلوت میں ساتھ رہتے اور سبب نزول اُن کے علم میں ہوتا اس لیے مفہوم قرآنی کو بھی آسانی سے سمجھ جاتے لیکن پھر بھی تفاوت فہم کی وجہ سے بہتوں کے ہاتھ صحیح مراد نہ لگتی۔ ایک شخص عبداللہ بن مسعود کے پاس آکے خبر دیتا ہے کہ ایک شخص مسجد میں بیٹھا قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے بتا رہا ہے، اور "یوم تاتی السماء بدخان مبین" کے معنی اور مفہوم یہ بتاتا ہے کہ قیامت میں ایک دھواں سا اُٹھے گا اور لوگوں کے نفس پر اس کا اثر پڑے گا انھیں زکام ہوجائے گا یہ سُن کے عبداللہ بن مسعود نے فرمایا جسے رسالتمآب کے ذریعہ معنی کا پتہ چل گیا ہو وہ تو بیان کردیا کرے ورنہ اللہ کے علم پر چھوڑ دے۔

من علم علما فلیقل بہ ومن لم	جسے اگر معلوم ہو تو بیان کردے ورنہ یہ
یعلم فلیقل اللہ اعلم	کہدے کہ اس کا مفہوم اللہ جانے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کو وہ ماحول معلوم تھا جب یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ اپنی بدکرداری کی بدولت قریش ایک بار سخت قحط سے دوچار ہوئے تھے کہ انھوں نے اس حالت میں ہڈیاں تک چبا کے بسر کی۔ پریشان ہو ہو کے آسمان کی طرف دیکھتے تو انھیں دھواں سا ہی نظر آتا۔[1]

وہ صحابہ جو عادات اور رسوم سے بخوبی واقف تھے کہ ایام جاہلیت میں عرب کس کس طرح حج کرتے اور کیا کیا رسمیں ان میں شائع ذائع تھیں۔ بتوں کو کس طرح پوجتے اور اُن سے کس کس انداز سے مرادیں مانگتے وہ اس صنف کی قرآنی آیات کو خوب خوب سمجھ لیتے جن میں ان ان چیزوں اور ان کے ان ان کرداروں کا ذکر آیا ہے۔ مرور ایام کے ساتھ واعظوں اور قصہ گوؤں نے آیات قرآنی کی عجیب عجیب تفسیریں اور توضیحیں اپنے دل سے پیدا کرکے بیان کردیں ورنہ صحیح تفسیریں وہی ہیں جن کو صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کے بیان کیا

[1] موافقات شاطبی

اور شاید یہی وجہ ہو کہ امام احمد بن حنبل جیسی باخبر ہستی نے یہاں تک فرما دیا۔

ثلثة ليس لها اصل التفسير والملاحم والمغازي	تین موضوع ایسے ہیں تفسیر ملاحم اور مغازی کہ جن کی کوئی اصلیں نہیں۔

اور اس قول کی ان کے شاگردوں کو یوں توجیہ اور تاویل کرنا پڑی کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ

ان الغالب ان ليس له اسانيد صحاح متصلة[1]	اس صنف کی اکثر حدیثوں کی سند متصل اور صحیح نہیں ہیں

ہاں بہت سے الفاظ اور آیات ان کے سامنے ایسی بھی آئیں جن کے مفاہیم کو صحابہ اپنی قوت اجتہاد سے حل کرنے سے عاجز ہوئے اور فوق کل ذی علم علیم حضرت ابن عباس ایک مخصوص پیاڑ لیتے اور کوئی بکھرے ہوئے اور منتشر پہلو بیان کرتے ہیں، اسی کے ساتھ تابعین کیا بلکہ صحابہ تک جہاں تک ہوتا رائے اور اجتہاد سے گریز ہی اختیار کرتے تھے۔

قرآنی تفسیر خاص کر بنی اسرائیل اور پچھلی اقوام کے حالات میں مفسرین کو ان نو مسلم یہود و نصاریٰ سے جو تورات اور انجیل کے عالم تھے بہت کچھ سرمایہ ہاتھ لگے اور واقعات معلوم ہوئے لیکن ان کے بیانوں میں اختلافات تھے انھیں کی جھلکیاں تفسیروں میں بھی دکھائی دینے لگیں، احکام شرعیہ کی تفسیروں اور مدلولات کو چھوڑ کر جن میں انھوں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ باقی امور کی تفسیروں میں اختلافات موجود ہیں۔ تفسیر قرآن کے بارے میں ایسے صحابہ کی جن کے اقوال نے شہرت حاصل کی تعداد تھوڑی ہی ہو حضرت علی کرم اللہ وجہہ عبداللہ بن مسعود عبداللہ بن عباس وغیرہ وغیرہ یہ چند ہستیاں ایسی تھیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جلوت و خلوت میں اختلاط اور اپنی عربیت کی قوت حوادث اور واقعات سے واقفیت اور فہم ذاتی کی بدولت آیات قرآنیہ کو بہت کچھ حل کیا ان میں بھی عبداللہ بن عباس کو امتیت حاصل ہے اور بہت کچھ مشکلات انھیں سے حل ہوتی رہیں اس لیے کہ کاشانۂ نبوت کے یہ ایک فرد رہے تھے اور اسی کا نتیجہ ہو کہ ارباب غرض کو ان کی طرف منسوب کرنے کے بہت کچھ مواقع ہاتھ لگے، حضرت علی بھی

[1] اتقان جلد ۲ صفحہ ۲

فرد خاندان تھے وہاں بھی شیعیان علی کو ان کے مراتب کی بلندی کے لیے اس کی ضرورت داعی ہوتی رہی تاکہ ان کی علمی پوزیشن کو غیر معمولی انداز سے بڑھاتے ہی رہیں، عباسیوں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو حضرت عباس کی اولاد اور اخلاف میں تھے ہی اُن کو خوش کرنے اور ان کے خلفاء کی خوشنودی کے لیے کیا کچھ انتساب ان کی طرف نہ ہوا، اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ اگر حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس کی طرف ان تشریحوں اور تفسیروں کا انتساب صحیح نہ تھا تو وہ علمی نقطۂ نظر سے بھی گری ہوئی تھیں۔

عہد تابعین آیا تو اسرائیلیات اور نصرانیات کا تفسیروں میں اور بھی اضافہ ہو گیا ابن جریر کی تفسیر ایسے زاد سے کیا کچھ کم مالا مال ہے۔ انھیں اسرائیلیات کے بیان کرنے والوں میں ابن جُرَیج کا نام بار بار آتا ہے اور کیوں نہ آتا اس لیے کہ یہ نسلاً نصرانی ہی تھے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس جس عہد میں جن جن علمی تحریکات اور جن مذاہب اور شاخوں کے چرچے رہے اس عہد کی تفسیروں پر بھی رنگ غالب ہے۔

عہد صحابہ اور پچھلے تابعین کے وقت کی تفسیروں میں آیات کے لغوی مفاہیم کا رنگ زائد نظر آتا ہے زائد از زائد اسباب نزول پر بھی بڑی ہوئی رد و قبول ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کے دور میں یہود و نصاریٰ کے واقعات اور حوادث لیتے ہیں۔ پھر قضا و قدر کی بحثیں چھڑیں اور صفات کے ازلی اور ابدی ہونے کی باتیں نکلیں جبر و اختیار کے مباحث زبانوں پر آئے پھر اس کے بعد جب فقہ اور فقہا کا دور آیا اور فقہی احکام نکالنے کی ضرورتیں لاحق ہوئیں تو فقہا نے ان آیات کی تفاسیر پر زور دیا جن سے فقہی احکام و قوانین کا استنباط ہوتا ہے۔ ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ جب قواعد نحوی اور صرفی بلاغت اور اخلاقیات وغیرہ وغیرہ پر توجہات رہی ہیں تو اس عہد کی تفاسیر میں بھی یہی رنگ غالب رہا ہے۔

یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خواہ موضوع دینی کچھ بھی ہو خواہ تاریخ ہو خواہ احکام دینی ہوں اور خواہ تفسیرات اور توضیحات قرآنیہ سب کا منبع اور سرچشمہ حدیث ہی رہا ہے۔ ایک محدث حدیث کے ذریعہ فقہی حکم ہی نہیں پہونچاتا، غزوات اور حروب اسلامیہ کا ہی ذکر نہیں کرتا، تاریخ ہی بیان نہیں کرتا، بلکہ اس زمانہ کی معاشرت، اجتماعی حالات

اور دوسرے واقعات بھی بیان کرتا رہا ہے اور اس زمانے کے ذخائر احادیث میں سب کچھ ایک مخلوط شکل میں ملتا ہے، پھر ایک دور آیا جب احکام دینیہ کی احادیث کو الگ کیا گیا سیرت کو الگ فقہ کو الگ چنانچہ محمد بن اسحاق نے وہ احادیث الگ کرلیں جن کا تعلق سیرت سے تھا۔ امام مالک نے مؤطا میں وہ حدیثیں جمع کردیں جن کا تعلق احکام دینیہ اور فقہ سے تھا وغیرہ وغیرہ۔ فنون گو الگ الگ مدون ہوگئے اور ہر فن سے متعلق احادیث الگ الگ بیان کی جانے لگیں پھر بھی محدثین نے اگر کتابیں ترتیب دیں تو عام احادیث کے ساتھ تفسیر کو بھی شامل رکھا۔ بخاری اور مسلم میں تفاسیر کے مستقل ابواب ملتے ہیں جن میں تفسیری حدیثیں شان اور آن کے ساتھ منسوب نظر آتی ہیں۔ سورتوں کے فضائل، آیات اور الفاظ کی تفسیریں سلسلوں اور اسناد کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ ملتی ہیں۔ یہ بات ذہن سے نہ جائے کہ ابن جریج کی بیان کردہ تفسیری احادیث سب کی سب صحیح ہی ہیں نہیں بلکہ ان میں سقیم اور صحیح دونوں ہیں۔

ان ابن جریج لم یقصد الصحة	ابن جریج نے اسکا ارادہ ہی نہیں کیا کہ وہ تفسیر کے
وانما روی ما ذکر فی کل ایة	باب میں صحیح حدیثیں ہی بیان کریں بلکہ ہر آیت کے
من الصحیح والسقیم[1]	بارہ میں جو صحیح اور سقیم چیزیں ذکر کی گئی ہیں انھوں نے
	وہ سب روایت کردی ہیں۔

سدی اور اسباط ابن نصر کے واسطوں کا تو کہنا ہی کیا ان پر اکثر محدثین کو اعتماد ہی نہ تھا[2] بعض مفسرین کے یہاں یہ اہتمام ملتا ہے کہ سب کی نہیں بلکہ مشکل الفاظ اور جملوں کی تفسیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ سے ملیں اُن کو لکھتے گئے۔ مرور زمانہ کیساتھ ساتھ کل تک جن الفاظ میں غموض نہ تھا ان میں بھی غموض معلوم ہونے لگا، لوگوں میں وہ عربیت نہ رہی نہ وہ ادبیت۔ انکو آگے چل کر تابعین نے حل کیا اور ان کے آسان کرنے میں بڑی بڑی محنتیں صرف کیں۔ یہ کام بڑی ہی ذمہ داری کا تھا۔ شعبی نے تو یہاں تک احتیاط برتی کہ کہدیا۔

ثلاث لا اقول فیھن حتی اموت	تین موضوع وہ ہیں کہ میں تاحیات

---

[1] الاتقان جلد ۲ صفحہ ۲۲۴ [2] تذہیب التہذیب ابن حجر

القرآن الروح والرای[1] ان کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہوں گا قرآن روح اور رائے۔

اصمعی نے باوجود اتنے بڑے لغوی ہونے کے یہ ہی کہا

العرب تقول معنی ھذا کذا اولا اعلم المراد منہ فی الکتاب والسنۃ ای شی ھو[2]

اہل عرب اس لفظ کے یہ معنی کہتے ہیں لیکن میں جزماً نہیں کہہ سکتا کتاب اللہ اور سنت میں کیا مراد لی گئی ہے۔

تفسیر پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ نحوی اور صرفی بحثوں غیر مانوس لفظوں، بلاغت اور فصاحت کے معیاروں کو متعین کرنے میں لوگوں کا مستدل صرف قرآن کریم ہی رہ گیا تھا۔

پھر بعض کی توجہ اس کی طرف ہوئی کہ وہ آیات لکھیں اور ان کی تفسیر ظاہر کریں جن کا تعلق مسائل فقہیہ سے ہے چنانچہ فقہ حنفی کے مسلک کو ظاہر کرنے اور آیات قرآنیہ سے تطبیق دینے میں امام ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی، امام شافعی نے لکھی اور داؤد ظاہری نے بھی۔ ادھر امام مالک کے مسلک پر بھی احکام قرآنیہ کے نام سے کتاب تیار ہوئی۔ متکلم مفسروں کی تفسیروں میں عقلی اور فلسفی توحید، عدل، صفات باری تعالیٰ جبر و اختیار کے عناصر تو ممیز و ممتاز شکلوں میں ملتے ہیں لیکن احادیث تفسیر میں حدیثوں کی ایک معمولی سی جھلک ہی ہیں۔ معتزلیوں نے تفسیریں لکھیں تو اپنے مسلک کے مطابق اور شیعوں اور دوسرے فرقوں نے لکھیں تو اپنے مذہب کی تقویت کی نظر سے۔ "طلعھا کانہ رؤس الشیاطین" کی تفسیر ایک بدشکل گھاس سے کی گئی جو یمن میں پیدا ہوتی تھی کسی نے سانپ کے پھن سے کی لیکن حاظ نے یوں کی۔

لیس ان الناس راٰوا شیطانا قط علی صورۃ ولکن لما کان اللہ قد جعل فی طبائع جمیع الامم استقباح جمیع صور الشیاطین... وکراھتہ

ایسا نہیں ہے کہ لوگوں نے شیطان کو کسی شکل میں دیکھا ہو بلکہ جب باری تعالیٰ نے تمام قوموں کی طبائع میں شیطان کو ہر پہلو سے نہایت ہی مکروہ شکل ہی میں

---

[1] ابن جریر [2] ابن خلکان جلد ۱ صفحہ ۴۰۹

واجری علی السنۃ الناس جمیعہم	ظاہر کیا اور بدشکلی میں اس کو سب کے لیے
ضرب المثل فی ذلک ورجع بالایحاش	ضرب المثل بنا دیا تو اسی بنیاد پر اس سے ڈرانے
.... والاخافۃ [1]	اور وحشت دلانے کا کام لیا۔

چنانچہ عربوں میں دیو بھوت کا تصور بھی ایک ڈراؤنی حقیقت رکھتا اور خوف و دہشت دلانے اور ہراساں کرنے کے لیے اس کو حقیقت واقعیہ کے انداز سے پیش کرتے اور تہدید کے موقعوں پر اس سے کام لیتے ایام جاہلیت کا شاعر دشمن کو ڈراتا دھمکاتا ہے تو اس رنگ سے کہ اس کا مجھ پر بس نہیں چل سکتا اور وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے شمشیر براں میرے پاس ہے اور بھوتوں جیسے ڈراؤنے دانتوں کی شکل کے نیزے میرے پہلو میں۔

ایقتلنی والمشرفی مضاجعی	ومسنونۃ زرق کانیاب اغوال

ابن جریر طبری کی تفسیر کا یہ ممتاز رنگ ہے کہ وہ پچھلے مفسروں کے اقوال اور تفسیریں نقل کرنے کے بعد جو قول ان کے نزدیک مرجح ہے اس کو ظاہر کر دیتے ہیں اور مزید وجوہ سے اس کی تائید بھی اور توثیق بھی۔ (باقی)

[1] کتاب الحیوان جاحظ جلد ۴ ص ۱۳

لکھنؤ کے مشہور مسائح و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابطیس: اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتہ کے استعمال سے خون میں اتنی شکر وہ جاتی ہے جیسی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑنے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت: دس تولہ ۵/- یا پانچ تولہ ۳/-

شربت جذام: جذام میں یہ دوا بے حد مفید ہے پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ ۵/-

شربت کمند: پتھر کی پتھریوں کا درد، یرقان، درد جگر ان تینوں مقاموں میں اس شربت کا استعمال بے حد مفید ہے۔ ایک پونڈ ۵/-

شربت درد گردہ: پیشاب میں جلن، پیشاب کا رکنا یا درد کے دورے اٹھنا یہ شربت استعمال کیجیے جتنی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں اتنے کئی ماہ پینا چاہیے ——— قیمت ... ایک پونڈ ۵/-

مرہم سرخ: پھوڑوں خصوصاً ہیضہ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کارنکل میں یہ مرہم بے حد مفید ہے اس کے استعمال سے جلن کافور ہو جاتی ہے۔ پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے ——— قیمت ... ۳/۵۰

منیجر حسنی فارمیسی، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ

جلد ۹۶ ماہ ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۵ء عدد ۱

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲ - ۴/۲

مقالات

انسانی عظمت و شرف اور مرد مومن کی ذمہ داریاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	۵ - ۲۸
ہندوستان میں فارسی کا مطالعہ اور اس کا مستقبل	جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی	۲۹ - ۴۱
ادب کی تاریخی لغوی اور اصطلاحی ماہیت	جناب وقار احمد صاحب رضوی ایم اے	۴۲ - ۶۰
ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ	جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۶۱ - ۷۰

باب التقریظ والانتقاد

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ	جناب حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی	۷۱ -

مطبوعات جدیدہ

"م ج"		۷۵ - ۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے خلاف جو آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے وہ طاقت کا نہایت غلط استعمال ہے، اس لیے اس کے خلاف جس قدر بھی احتجاج کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن آرڈیننس بہرحال عارضی ہے، یونیورسٹی کے مستقل نظام پر اس کا اثر نہیں پڑتا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیندہ حکومت اس کے دستور میں کیا تبدیلی کرتی ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے، دوسرے اس حیثیت سے وہ اسلامی بھی ہے کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ اسلامی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تربیت کیجائے جس کو موجودہ بحث میں اسلامی کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو لوگ اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں وہ قلبیتی کردار سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کردار مسلمانوں کا مسلمہ دستوری حق ہے، اس لیے حکومت کو یونیورسٹی میں کسی ایسی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے جس سے اس کے کردار اور خود مختاری میں فرق آئے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی کردار سے مراد کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں؟ چھاگلہ صاحب کے نزدیک جیسا کہ ان کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مراد اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات ہے یعنی مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات کو اہمیت دیجائے، لیکن یہ اسلامی کردار نہیں بلکہ ریسرچ یا علمی تحقیق ہے جس کو یورپ کی بہت سی یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں اور انھوں نے اسلامیات پر جتنا کام کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کو ایک مدت درکار ہوگی،

اگر اسلامی کردار اسی کا نام ہے تو پھر یہ ساری یونیورسٹیاں مسلم ہیں، ان میں اور مسلم یونیورسٹی میں فرق کیا ہوا؟

اصل میں جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں یا انکی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ اس کو نام نہاد ترقی پسندی اور قومی وحدت کے انضمامی تصور کے منافی سمجھتے ہیں ان کو اسلامی کردار کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے، ان کو اس کا تو حق ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے اسلامی کردار کی ضرورت اور اہمیت ہی سے علانیہ انکار کردیں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں، اس لیے وہ اس کو فرقہ پروری، رجعت اور علیحدگی پسندگی کی آڑ لے کر مسخ کرتے رہتے ہیں، اس کی تعبیر و تعیین کا حق ان ہی لوگوں کو ہے جو اسلامی کردار کو مسلمانوں کا سرچشمۂ حیات اور تعمیر ملت کی بنیاد سمجھتے ہیں،

اس کے لئے تنہا اسلام کے بعض ظاہری مظاہر مثلاً دینیات کی رسمی تعلیم، ہوسٹلوں میں نماز کا انتظام، رمضان میں ڈائننگ ہال کی نمائشی بندش، اسلامی تقریبات کا انعقاد، میلاد کے جلسے، اور اسی قبیل کی دوسری ظاہری چیزیں کافی نہیں ہیں، بلکہ اس سے وہ اسلامی روح مراد ہے جس سے مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، ان کی عظمت، اور ملی غیرت و حمیت کا جذبہ بیدار رہے، یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر اس کے کسی متوسل کو اسلامی عقائد و تصورات کی علانیہ مخالفت کی اجازت نہ دی جائے، اسلامی علوم و فنون کی تحقیقات اور دینی تعلیم کو خاص اہمیت دی جائے، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں، یا انتظامی مسلمانوں کی نمایاں اکثریت ہو، اور ان کا اقتدار ہو، انتظامی مجالس کے ارکان کی اکثریت کا انتخاب جمہوری طریقہ پر کیا جائے، حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کئے جائیں، جو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے واقف اور یونیورسٹی کے ہمدرد و خواہ ہوں، ایسے غیر مسلموں کی آج بھی کمی نہیں ہے، اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار قائم نہیں رہ سکتا،

یہ چیز نہ رجعت پسندی ہے، اور نہ فرقہ پروری، اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف ہے، بلکہ اقلیتوں کا ایک تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو نہ حکومت سلب کر سکتی ہے، اور نہ کسی ترقی پسند کو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے، خود ہندوستان میں ہندو یونیورسٹی ہندو کردار کا اور عیسائی مشنریوں کے بعض کالج عیسائی کردار کا نمونہ موجود ہیں، درحقیقت اُن کو ان کے کردار کے ساتھ قائم رکھنا ہی سیکولرزم اور جمہوریت ہے، مسلم یونیورسٹی اس معنی میں یقیناً سیکولر اور قومی ہے، کہ اس کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت سب فرقوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، اور آج سے نہیں، بلکہ علی گڑھ کالج کے قیام کے زمانہ سے لے کر اب تک ہر زمانہ میں یہاں غیر مسلم طلبہ کی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں بعض نامور لوگ بھی ہیں، لیکن اس معنی میں یقیناً مسلم ہے کہ اس کی فضا اور اس کا کردار اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور اس کا اقتدار ہونا ضروری ہے، یہی حقوق ہندو یونیورسٹی کو بھی حاصل ہیں،

اسلامی کردار کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں، یہ چیز قومی وحدت وہمدردی کے قطعاً منافی نہیں، علیحدگی پسند گی مسلمانوں کے قومی مزاج کے خلاف ہے، انھوں نے کبھی کسی قوم اور کسی تہذیب سے چھوت نہیں کی، جہاں گئے ملکی باشندوں میں گھل مل گئے، اور اُن کی اور اپنی تہذیب کو ملا کر تہذیبی یکرنگی پیدا کرنے کی کوشش کی، خود ہندوستان میں ایک مشترک تہذیب اور مشترک زبان پیدا کی جس میں دونوں تہذیبوں کے یکساں عناصر ہیں، اور ہندوستان کی احیائی ذہنیت سے پہلے یہ زبان اور یہ تہذیب ہندو مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی مشترک تہذیب وزبان سمجھی جاتی تھی، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحدہ ملک بنایا، قومی وحدت کا تصور پیدا کیا، ان سے پہلے ہندوستان مختلف طبقوں اور

فرقوں میں بٹا ہوا تھا، اور اُن میں باہم اتنا ہی بغض و عناد تھا، جتنا دشمنوں میں ہو سکتا ہے، اس لئے ہندوستان کی وحدت اور قومی یکجہتی کے پہلے معمار مسلمان ہی ہیں۔ اور علیحدگی پسندی کے وہ لوگ مجرم ہیں، جو وحدت کے ان آثار کو مٹانے کے درپے ہیں۔

آزاد مشرب ترقی پسندوں بلکہ تخریب پسندوں کا ایک طبقہ عرصہ سے مسلم یونیورسٹی کے روایات اور خصوصیات کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن وائس چانسلر صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو پشتہا پشت سے اسلامی تہذیب و روایات کا حامل رہا ہے، اور وہ خود اسی تہذیب کے پروردہ ہیں، ان سے بڑھ کر ان کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، اس لئے ان سے توقع یہی ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اُن کے سامنے اُن کے پیشرو بدرالدین طیب جی کی مثال موجود ہے، جن کو اسلامی تہذیب و روایات سے اتنا گہرا تعلق نہ تھا، جتنا موجودہ وائس چانسلر صاحب کو ہے، اس لئے ان پر اُن سے زیادہ اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ابھی حال میں معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کے ایک صاحب احسان بی اے نے سیرۃ النبی کی پہلی اور دوسری جلد کا خلاصہ کیا ہے، اور دبستان لاہور نے اس کو شائع کیا ہے، پاکستان کے لوگوں کو معلوم ہو گا کہ دارالمصنفین کی واردِ مدار کتابوں کی تجارت پر ہے، اس کو نہ حکومت سے کوئی مستقل ملتی ہے اور نہ اُس نے کبھی چندہ کیا، اب اگر ارض پاک والوں نے اس کی تجارتی آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا، تو وہ کس طرح چل سکتا ہے، اُن کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اس کی مشکلات میں مدد کرتے نہ کہ اُلٹے وہ اس کے ذرائع آمدنی پر قبضہ کر کے اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، جو پاکستان کے لئے انتہائی شرم و غیرت

کی بات ہے بعض اور کتابیں بھی پاکستانی ناشروں نے چھاپ لی ہیں، مگر وہ چنداں اہم نہ تھیں، اس لئے ہم نے خاموشی سے کام لیا لیکن سیرۃ النبی دارالمصنفین کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کو کسی صورت میں بھی چھاپنا اس کو نقصان پہونچانا ہے، اس سے پہلے بھی ایک ناشر نے سیرۃ النبی جلد اول شائع کی تھی، اس وقت سردار عبدالرب نشتر مرحوم زندہ تھے ان نے دباؤ ڈال کر اس کی اشاعت رکوا دی تھی، پاکستان کے اخبارات نے بھی اس ناشر کو آڑے ہاتھوں لے لیا، اس لئے اس نے مجبور ہو کر طباعت کے معاہدہ نامہ کو کتابیں دارالمصنفین کے حوالے کر دی تھیں، ہم یہاں سے متفکر کیا کر سکتے ہیں؟ فرض پاکستانی اخبارات کا ہے کہ وہ خود غرض ناشروں کو ایسا سبق دیں کہ آئندہ کوئی اس قسم کی جرأت نہ کر سکے، نوائے وقت اور چٹان سے ہم کو خاص طور سے اسکی توقع ہے،

ہمارے رفیق سید صباح الدین عبدالرحمن کی دو کتابوں پر اس سے پہلے یو پی گورنمنٹ سے انعام مل چکا ہے، اس سال بھی اُن کی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تمدنی جلوے" پر انعام ملا ہے، اس سال انشاء اللہ چھ نئی کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے، دین رحمت، محدثین اسلام، تبع تابعین جلد دوم، صاحب مثنوی، مقالات سلیمانی جلد اول، عہد مغلیہ ہندوستانی مورخین کی نظر میں، دارالمصنفین کی جبلی کی روداد کے لئے شائقین کا بڑا تقاضہ ہے، اس کی مختصر روداد معارف میں لکھی جا چکی ہے تفصیلی روداد بھی انشاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے،

مقالات

انسانی عظمت و شرف
اور
مرد مومن کی ذمہ داریاں

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

انسانی عظمت و شرف | اسلام سے پہلے انسانیت کا تصور بہت پست تھا، انسان پیدائشی گنہگار اور اپنے اعمال کے لحاظ سے ادنیٰ ترین مخلوق سمجھا جاتا تھا، وہ ہر طاقت کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا، اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کا درجہ تمام مخلوق میں بلند کیا اور اسکو اشرف المخلوقات قرار دیا، وہ خالق عالم کی صناعی کا شاہکار ہے، خدا نے اس کو حسین ترین خلقت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم (تین) — اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا

حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی شکل میں پیدا کیا،

خلق اللہ آدم علی صورتہ (بخاری کتاب الاستیذان) — خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اس کو پیدائشی طور پر بے داغ ہر نقش سے پاک اور دین فطرت پر قرار دیا، پیدائش کے بعد ماحول

اور سوسائٹی اس پر اچھے برے نقش و نگار بناتی ہے۔

ان الانسان یولد علی الفطرۃ	انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسکے
فابواہ یھودانہ او ینصرانہ	والدین اسکو یہودی یا نصرانی بناتے ہیں

حسن ظاہری کے ساتھ جمال معنوی یعنی علم و ادراک اور عقل و دانش کی دولت عطا فرمائی،

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق)	انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنکو وہ نہیں جانتا تھا،
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (بقرہ)	اور خدا نے آدم کو سارے اسماء (حقایق اشیاء) سکھائے،

اس کو خیر و شر کی تمیز عطا فرمائی،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا	اور قسم انسان کی اور اس ذات کی جس نے
وَتَقْوٰھَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا	اس کو درست بنایا پھر اس کو بدکاری اور نیکوکاری
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا	کی باتیں سمجھائیں جس نے اپنی روح کو پاک کیا؟
(شمس)	کامیاب ہوا اور جس نے اسکو دبایا وہ گھاٹے میں رہا
وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (بلد)	اور ہم نے (اسکو نیکی اور بدی) دونوں کے راستے دکھائے۔

اعلیٰ درجہ کی عقلی و ذہنی قوتوں سے آراستہ کیا، چنانچہ کلام مجید میں بکثرت انسانی عقل سے خطاب کیا گیا ہے، اور اس کو کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، (افلا یتدبرون۔ افلا یتفکرون اور افلا یعقلون) اتنی آیتوں میں آیا ہے کہ انکا شمار مشکل ہے،

اس کو ساری مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ	اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری عطا فرمائی
فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ	اور اس کو دریا اور خشکی میں سوار کیا اور پاکیزہ
الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی	چیزیں اس کو کھانے کو دیں اور اس کو بہت سی

كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل) مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس کے سر پر خلافت اور نیابت الٰہی کا تاج رکھا، وہ مسجود ملائکہ قرار پایا اور اس کی عظمت سے انکار پر ابلیس ہمیشہ کے لیے مردود قرار دیا گیا،

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰئِكَةِ إِنِّي	اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا	کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا
أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا	ہوں تو فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے شخص
وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ	کو نائب بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ	اور خونریزی کرے اور ہم تیری حمد و ثنا
إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَّمَ	کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں
آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ	خدا نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے
عَلَى الْمَلَٰئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي	اور آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے،
بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ	پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش
قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا	کر کے فرمایا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو
إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ	ان چیزوں کے نام بتاؤ، فرشتے بولے تیری
الْحَكِيمُ ۔ قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم	ذات پاک ہے جو تو نے ہم کو بتایا ہے
بِأَسْمَائِهِمْ، فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ	اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک
قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ	تو ہی جاننے والا اور مصلحت کا پہچاننے والا
غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ	ہے، تب خدا نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں
مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ	کو ان چیزوں کے نام بتاؤ پھر جب آدم نے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ	فرشتوں کو ان کے نام بتاؤ تو خدا نے فرشتوں سے فرمایا کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کی سب مخفی چیزیں ہم کو معلوم ہیں، اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب ہم کو معلوم ہے اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے جھکو تو شیطان کے سوا سب جھک پڑے، اس نے نہ مانا اور غرور میں آگیا اور نافرمان بن گیا۔
(بقرہ ۴)	

اقبال نے تخلیق آدم کے واقعہ سے انسانی عظمت کے بڑے لطیف پہلو پیدا کیے ہیں لکھتے ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد	حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل	حذرائے پردگیاں پردہ دری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور	خودگرے خود شکنے خودنگرے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوش حیات	چشم وا کرد و جہانے دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر	تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

اس سے بڑھ کر انسانی عظمت تصور میں نہیں آسکتی، اس سے پہلے انسان بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا تھا، وہ چاند، سورج، سمندر، پہاڑ، شجر و حجر بلکہ ادنیٰ ادنیٰ جانوروں تک کی پوجا کرتا تھا، اسلام نے بتایا کہ یہ چیزیں اس کی پرستش کے لیے نہیں بلکہ اس کی خدمت اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا	زمین میں جو کچھ ہے سب خدا نے تمہارے لیے بنایا،
(بقرہ)	

پوری کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی	کیا تم نہیں دیکھتے کہ روئے زمین میں جو کچھ ہے
الْاَرْضِ (ج)	سب کو تمھارے لیے مسخر کر دیا۔

حتی کہ آفتاب و ماہتاب بھی جس کی انسان پوجا کرتا ہے، اس کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَ	اور خدا نے رات اور دن، چاند اور سورج
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ	کو تمھارے کام میں لگا دیا اور ستارے اسکے
بِاَمْرِہٖ (نحل)	حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اقبال نے اس کو بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں نظم کیا ہے

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کیلئے	جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلئے
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں	یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں	تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ	

اسلام سے پہلے مادی طاقت و قوت، دولت و وجاہت اور نسلی و قومی برتری کی پرستش ہوتی تھی، ہر کمزور طاقتور کا اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام نے یہ سارے امتیازات ختم کر کے حسن عمل اور حسن کردار کو عزت و شرف کا معیار قرار دیا،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ	تم میں خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے
	جو سب سے زیادہ پاکباز ہے۔

آزادی و مساوات کا مسئلہ جو انسانی عظمت کا ایک اہم پہلو ہے، اسلام کی نگاہ میں اس درجہ اہم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو آخری خطبہ دیا تھا، اس میں انسانی مساوات

یہ بھی زور دیا تھا آپ کے الفاظ یہ ہیں :

ایھا الناس ان ربکم واحد	لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے تمہارا باپ بھی
وان اباکم واحد کلکم لآدم واٰدم	ایک ہے تم سب اولاد آدم ہو اور آدم
من تراب ان اکرمکم عند اللہ	مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں
اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی	سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے،
فضل الا بالتقویٰ	کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

ایک دوسری روایت ہے جس میں تصریح کے ساتھ نسل و قومیت اور حسب و نسب پر فخر و غرور کو مٹایا گیا ہے،

ان اللہ اذھب عنکم عبیۃ	اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے غرور اور آباء و
الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء	اجداد پر فخر کو ختم کر دیا، انسان یا مومن
انما ھو مومن تقی او فاجر شقی	پاکباز ہے یا بدکار شقی تم سب اولاد
الناس کلکم بنو آدم وآدم	آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔
خلق من تراب (ابو داؤد)	

یہ اعلان، آزادی و مساوات کا وہ چارٹر ہے جس نے انسانوں کو انسانی غلامی سے آزاد کر کے، ملک و ملوک، نسل و قومیت، حسب و نسب، دولت و وجاہت اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا اور کوئی انسان کسی انسان کا بندہ و غلام باقی نہیں رہ گیا۔

عظمت و شرف کی ذمہ داریاں لیکن اس عظمت و شرف کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی بڑی کٹھن ہیں، یہ فطری قانون ہے جس پر ساری دنیا کا عمل ہے کہ منصب جس قدر جلیل ہوتا ہے اسی قدر اس کی

ذمہ داریاں بھی عظیم اور پابندیاں بھی سخت ہوتی ہیں، صاحب منصب کی ذاتی حیثیت بہت کم باقی رہتی ہے، اس کے اعمال و افعال اور زبان تک پر پابندی عائد ہوجاتی ہے، وہ محض اپنے عہدے اور منصب کے فرائض کا نقیب اور ترجمان بنجاتا ہے، اس کے خلاف ایک لفظ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا، چنانچہ دنیاوی حکومتوں کے سربراہ، وزراء اور سفراء وغیرہ بھی صرف اپنی حکومت کے ترجمان ہوتے ہیں، ان کی ہدایات اور پالیسی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔

مرد مومن کا مقام اور اس کے فرائض اسی طرح ایک مومن جو خلیفۃ اللہ فی الارض[1] اور دنیا میں احکام الٰہی کا مبلغ اور ترجمان ہے، خود مختار نہیں، بلکہ احکام خداوندی کا پابند ہے، اس کے خلاف ایک قدم

---

[1] انسانی عظمت و شرف میں پیدائشی طور پر سارے انسان برابر ہیں، اور خلیفۃ اللہ فی الارض بننے کی صلاحیت تمام انسانوں میں مشترک ہے لیکن اس کا وعدہ انہی انسانوں کیلئے ہے جنھوں نے اپنے ایمان و عمل سے انسانی شرف و عظمت کو قائم رکھا ہے اور اپنے کردار سے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مستحق ہونے کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ کلام مجید میں ارشاد ہے

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ	میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	ہوں گے تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور
لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ	نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو وہ زمین کی
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	خلافت ضرور عطا کرے گا۔

یہی وہ مرد مومن ہے جس کو دنیا میں سربلندی کی بشارت دی گئی ہے،

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ	اور (عارضی حالات سے) تم ہمت نہ ہارو اور غمزدہ
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ	نہ ہو اگر تم سچے مومن ہو تو تمھارا بول بالا ہوگا۔

غیر مومن اور بے کار خدا کا باغی ہے، وہ کس طرح نیابت الٰہی کا فرض انجام دے سکتا ہے، اس لیے وہ اس منصب جلیل کا اہل نہیں۔

نہیں اٹھا سکتا، اسلام کے معنی ہی اپنے کو مکمل طور پر خدا کے حوالے کر دینے کے ہیں، اس کی بڑی اچھی تمثیل حدیثوں میں ہے کہ "دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ اس حدیث کے مختلف معنی بیان کیے جاتے ہیں لیکن سب سے دلنشین معنی یہ ہیں کہ قید کی زندگی میں انسان کو اپنے افعال کا مختار نہیں بلکہ دوسرے کا پابند ہو کر رہنا پڑتا ہے، اور ایک مومن اپنے ہر عمل میں احکام الٰہی کا پابند ہے، اس لیے دنیا گویا اس کے لیے قید خانہ ہے، اس کے مقابلہ میں جنت میں کوئی پابندی نہ ہوگی، ہر شخص اپنے عمل میں خود مختار ہوگا، اور کافر بھی احکام الٰہی کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ اپنے افعال و اعمال میں آزاد ہوتا ہے، اس لیے دنیا اس کے لیے جنت ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت ایک مومن نہ صرف خود احکام الٰہی کا پابند ہے، بلکہ وہ دنیا میں اس کا مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری سے گرانبار ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جس قدر امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے
(آل عمران)	کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى	اور تم میں ایک جماعت ایسی رہنی چاہیے
الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	جو لوگوں کو نیک کاموں کی طرف بلائیں
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ	اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے
هُمُ الْمُفْلِحُونَ	منع کریں۔

حدیثوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہاں تک تاکید ہے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
بالمعروف ولتنھون عن المنکر	تم لوگ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے رہو اور برے
اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم	کاموں سے روکتے رہو، ورنہ خدا اپنا عذا
عذابا من عندہ ثم تدعوا	تم پر نازل کرے گا، اور پھر تم دعا کرو گے
ولا یستجاب لکم (ترمذی)	اور تمھاری دعا قبول نہ کیجائے گی
ایک دوسری روایت میں ہے	
قال من رای منکم منکرا فلیغیرہ	تم میں سے جو شخص کوئی بری بات دیکھے تو اس کو
بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ	چاہیے کہ اپنی قوت سے مٹادے، اگر اسکی
فان لم یستطع فبقلبہ وذلک	طاقت نہ ہو تو زبان سے کہکر مٹائے، اگر
اضعف الایمان (مسلم)	اسکی طاقت بھی نہ ہو تو کم سے کم دل سے
	اسکو برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے

نیکی اور خیر کی تبلیغ اور اس کے قیام ونفاذ اور بدی اور شر کے انسداد پر دنیا کا سارا نظام قائم ہے، اس کے بغیر سارا کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے گا، انبیاء علیہم السلام بھی اسی کی تبلیغ اور قیام کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اور دنیاوی حکومتوں کے قوانین کا مقصد وہ بھی وہ حقیقت خیر کا قیام اور شر کا انسداد ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنیاوی قانون کا دائرہ انسانوں کے مادی معاملات تک محدود ہوتا ہے، ان کو انسانوں کے اخلاقی اور روحانی معاملات سے صرف اسی حد تک علاقہ رہتا ہے جس حد تک عوام کے نفع ونقصان سے ان کا تعلق ہوتا ہے لیکن احکام الٰہی اور حکومت الٰہیہ کا دائرہ انسانوں کے دینی و دنیاوی اور مادی و روحانی جملہ ضروریات تک وسیع ہے، اس لیے خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریاں دنیاوی حکومتوں سے زیادہ اہم ہیں۔

وہ انسانوں کے جملہ معاملات میں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اخلاقی ہوں یا روحانی، احکام الٰہی کا ترجمان و مبلغ بھی ہے، اور اس کے قیام و نفاذ کا بھی ذمہ دار ہے، اس اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن کا فریضہ ہے۔

اس راہ کے شدائد | درحقیقت یہی وہ بار امانت ہے جس کے اٹھانے کی ہمت زمین و آسمان نہ کر سکے اور انسان کی ہمت مردانہ نے ان کو اٹھا لیا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمینوں
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ	اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب اس بار امانت
اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ	اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ
ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب - ۹)	اپنے حق میں بڑا ظالم اور نادان ہے۔

ع آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا

کہ اس بار امانت کے اٹھانے کے معنی خدا کی راہ میں جان و مال کی بازی لگا دینے کے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ	ان کا مال خرید لیا ہے کہ اس کے بدلے میں
لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ)	ان کو جنت ملے گی۔

اس راہ میں طرح طرح کے شدائد سے آزمایش ہوتی ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ	اور ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور
وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ	بھوک سے اور جان و مال اور پیداوار کی
وَالثَّمَرٰتِ (بقرہ ۱۹)	کمی سے آزمائیں گے۔

چنانچہ بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کو ایسی سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا کہ وہ بھی بعض اوقات تقاضائے بشریت سے گھبرا اٹھے۔ مسلمانوں کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ بس جنت میں
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ	داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم کو ان لوگوں کے
مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ	جیسے حالات نہیں پیش آئے جو تم سے پہلے
وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ	گذر چکے ہیں کہ ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور
وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ	تکلیفیں بھی پہنچیں اور جھڑ جھڑائے بھی گئے
أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ	یہاں تک کہ پیغمبر اور جو ایمان والے ان کے
	ساتھ تھے پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئیگی
	(اور ہم نے ان کو تسلی دی) کہ بس خدا کی
(بقرہ - ۲۶)	مدد قریب آگئی۔

اس کے نتائج | خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور دوسرے ارباب عزیمت مومنوں کو کیسے کیسے صبر آزما حالات سے گذرنا پڑا مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، ان کی قربانیوں اور جانکاہیوں نے خفتہ انسانیت کو بیدار، مری ہوئی قوموں کو زندہ اور گم کردہ راہ قافلوں کو راہ راست پر لگا دیا، اور ایک ایسی امت پیدا کردی جو اپنے اعمال و اخلاق میں دنیا کے لیے نمونہ تھی، اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہا

"میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث ہوں گے، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو روئے زمین کی خلافت (حکومت) ضرور عطا کرے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت دی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

اور مسلمانوں کو روے زمین کی سب سے زیادہ وسیع اور طاقتور سلطنت عطا کی گئی جس کا ایک سرا سندھ تھا اور دوسرا فرانس کی سرحد سے ملتا تھا، اس زمانہ میں انھوں نے اقوام عالم کی قیادت اور رہنمائی کی اور ان کے ذریعے دنیا میں دین و ایمان، علم و عرفان اور اخلاق و روحانیت، اور تہذیب و ثقافت کی روشنی پھیلی، وہ جس صحرا میں نکل گئے اس کو گلشن بنا دیا، دوسری قومیں ان کے علوم اور تہذیب فخریہ سیکھتیں اور اختیار کرتی تھیں، مگر یہ اسی وقت تک تھا جب تک وہ پیغام الٰہی کے علمبردار رہے، اور اعلاء کلمۃ اللہ ان کا شعار رہا، جب سے اس کا سررشتہ انکے ہاتھ سے چھوٹا، اس وقت سے وہ خود ان قوموں کی غلامی میں مبتلا ہو گئے جن کے وہ حاکم و رہنما اور مربی و معلم تھے، اور آج تک ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا اور افراد سے لیکر جماعتیں اور حکومتیں تک مغربی تہذیب کے سحر میں گرفتار اور اس کے نقش قدم پر گامزن ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی اور نصرت نے بھی ان سے منہ پھیر لیا اور وہ اس قوت سے محروم ہو گئے جس پر ان کی توانائی کا دار و مدار تھا۔

مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ساٹھ کروڑ کے درمیان ہے، اور ان کی بیس پچیس حکومتیں ہیں، اس کے باوجود ان کی کوئی آواز نہیں، اور وہ ایک پس ماندہ قوم بنکر رہ گئے ہیں، ان کی حکومتوں تک میں کوئی جان باقی نہیں ہے، چنانچہ پوری عرب دنیا ملکر بھی اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے اوپر ہے لیکن ان کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے کہ وہ زندگی کی اس قوت سے محروم ہیں جس کے بغیر انسانوں کی حیثیت جانوروں کے گلے اور خس و خاشاک سے زیادہ نہیں، جس کو ایک معمولی چنگاری جلا کر خاکستر کر سکتی ہے،

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

ایک مغالطہ کا ازالہ مغربی قوموں کی تقلید اور اس کے فوائد کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ مذہبی قیود سے آزادی اور مادی نظام حیات ہی کی بدولت بام عروج پر پہنچی ہیں، اگر مذہب ترقی میں مانع نہ ہوتا تو مسلمان جو مغربی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی ہیں، کیوں پستی اور تنزل کا شکار ہوتے، لیکن یہ سراسر مغالطہ ہے۔ نہ مغربی قوموں نے محض مذہبی آزادی اور مادی تصور حیات کے بدولت ترقی کی اور نہ مسلمان مذہب کی پابندی سے تنزل میں مبتلا ہیں، اور نہ یہی قابل بحث ہے کہ جس مادی ترقی کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے کیا وہ واقعی انسانیت کی صحیح اور متوازن ترقی ہے؟ اور اس سے انسانیت کی ضروریات اور اس کے مطالبات پورے ہو جاتے ہیں، اور کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں؟

مغربی قوموں کی ترقی کے حقیقی اسباب مغربی قوموں کی ترقی کا سبب محض مذہب سے آزادی اور مادی تصور حیات نہیں، بلکہ قوموں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بھی کچھ اصول مقرر کیے ہیں، جو قوم بھی ان پر عمل کرے گی وہ ضرور دنیا میں سربلندی حاصل کرے گی، خواہ وہ مومن ہو یا کافر اور جو قوم ان کو چھوڑے گی خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو تنزل کا شکار ہوگی، فطرت کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں، ان میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں، جس طرح صحت اور تندرستی کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جو بھی ان کی پابندی کرے گا وہ بیماری سے محفوظ اور تندرست رہے گا، اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ امراض کا شکار ہوگا اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جائے گی، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک کافر صحت کے اصولوں کی پابندی کے باوجود محض اپنے کفر کی بنا پر تندرست نہ رہے، اور ایک مومن ان اصولوں کی خلاف ورزی کے باوجود محض اسلام سے انتساب کی بنا پر امراض و ہلاکت سے محفوظ رہے، یہی حال قوموں کی صحت اور توانائی اور بیماری اور ہلاکت کے اصولوں کا ہے،

قوموں کی موت وحیات اور ترقی وتنزل کے عناصر

قوموں کی موت وحیات قوموں کی ترقی اور تنزل اور موت وحیات کے بہت سے عناصر ہیں، مثلاً نصب العین کا تعین، ان کی صحت پر ایمان اور یقین واثق، اس کے حصول کی جد وجہد، اس کے لیے جانبازی وجانفروشی، قومی وحدت، اجتماعی مفاد کے لیے ایثار و قربانی، ہمدردی ومواسات وغیرہ، جن قوموں میں بھی یہ اوصاف ہوں گے وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، اگر اس معیار سے مسلمانوں اور مغربی قوموں کا موازنہ کیا جائے تو مسلمان ان کے مقابلہ میں ہیچ نظر آئیں گے، مغربی قومیں اپنے بعض اخلاقی عیوب اور مادی تصورات کے باوجود ان اصولوں پر سختی سے عامل ہیں، انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین، مادی ترقی، سیاسی سربلندی اور دنیاوی عیش وتنعم کو بنالیا ہے، اور اس کے لیے ان کو مال کیا جان تک دینے میں باک نہیں ہوتا، یورپ کے بڑے بڑے فضلا، اور سائنٹسٹ اس راہ میں اپنی جانیں قربان کرچکے ہیں، جب قومی اور اجتماعی مفاد کا سوال آتا ہے تو ہر فرد اپنا پورا خانماں قومی مفاد کے لیے لٹا دیتا ہے، سلاطین اور امراء اپنے لڑکوں کو بلا تامل میدان جنگ میں بھیجدیتے ہیں، وہ مادی ترقی اور محدود قومی مفاد کے لیے جتنی قربانیاں کرتے ہیں، آج کے مسلمان اپنے دین وملت کے لیے اتنی قربانی نہیں کرسکتے، انھوں نے اپنی زندگی کے لیے جو اصول بنالیے ہیں ان پر سختی سے ان کا عمل ہے، اور ان کی پابندی ان کی فطرت میں داخل ہوگئی ہے، اس لیے ان کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی نہیں بلکہ مادی اور قومی ترقی کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اور یہ بھی کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہب سے مطلق آزاد ہیں، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

محض مادی ترقی انسانیت کی ترقی نہیں ہے

لیکن یہ ترقی درحقیقت انسانیت کی نہیں بلکہ صرف مادی ترقی ہے، جس سے انسانیت کے مطالبات پورے نہیں ہوتے، انسانوں کو صرف مادی سرسامان ہی کی احتیاج نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس کو اخلاق، روحانیت کی بھی ضرورت ہے۔

اس کے بغیر محض مادی طاقت انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔ جو طاقت بھی اخلاق اور انسانیت کے اصولوں کی پابند نہ ہوگی وہ انسانیت کے لیے وبال جان بنجائے گی، اسی لیے آج مغربی قوموں کی ساری طاقتیں اور علم و سائنس کی تمام ترقیاں انسانوں کے لیے سکون و راحت کا سامان فراہم کرنے سے زیادہ اس کی ہلاکت اور تباہی و بربادی کے سامان فراہم کرنے میں صرف ہو رہی ہیں، ان میں اقتدار اور سیاسی برتری کی ایک جنگ برپا ہے، ایسے ایسے اسلحے ایجاد ہو رہے ہیں کہ اگر ان کے استعمال کی نوبت آگئی تو عالم انسانیت کا خاتمہ یقینی ہے، اس ہلاکت آفرینی کو دیکھکر خود یورپ کے بڑے بڑے مفکرین مضطرب ہیں اور انسانیت کے نام پر اخلاق و روحانیت اور عالمگیر انسانی اخوت و ہمدردی کی صدا بلند کر رہے ہیں،

اگر انسان نے فلک شگاف راکٹ ایجاد کر لیے، چاند پر پہنچکر اپنا جھنڈا گاڑ دیا، بلکہ اس سے بھی اونچا اڑا تو اس سے مادی طاقت کے اظہار کے سوا کیا حاصل ہوا۔ انسانیت کی ترقی اور اس کی صحیح خدمت تو یہ ہوتی کہ اس ترقی کے ساتھ قوموں میں خدا شناسی، اخلاق فاضلہ اور انسانی ہمدردی و مواسات پیدا کیجاتی، اس کے بغیر محض مادی طاقت ایک شتر بے مہار اور مست ہاتھی ہے جو انسانیت کو کچل کر رکھ دیگی اس لیے یہ ترقی درحقیقت انسانیت ترقی نہیں بلکہ صرف مہلک مادیت کی ترقی ہے۔

کیا مسلمان مذہب کے پابند ہیں اب دوسرے سوال کو لیجئے، کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں، اور انکی مذہبیت ہی ان کے تنزل و پستی کا سبب ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ مسلمانوں میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں مذہب کے ظاہری رسوم کی پابندی زیادہ ہے، لیکن وہ مذہب کی اصل روح یعنی اخلاص، خشیت الٰہی، رجوع الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اس کے لیے ایثار و قربانی کے جذبہ سے خالی ہیں اور ان کی مذہبیت مذہب کا محض ظاہری خول ہے، اس لیے اس سے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں، جن کا خدا نے وعدہ کیا ہے، اور وہ اخلاق فاضلہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جو دنیا و دی سربلندی کے لیے

ضروری ہیں۔

مسلمانوں نے مذہب کے ایک اہم پہلو یعنی قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے اصولوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، اسلام محض روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کا نام نہیں ہے، اور اس کے بھی کتنے مسلمان پابند ہیں، بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور شوکت و عظمت کے لیے جد و جہد ایثار و قربانی، انفاق فی سبیل اللہ، قومی وحدت، اسلامی اخوت اور اس قبیل کے دوسرے اصول کو بالکل فراموش کر دیا ہے، جو عبادات ہی کی طرح ضروری ہیں اور جن پر قوموں کی موت و حیات کا دارومدار ہے، بلکہ جہاد یعنی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی افضل العبادات ہیں، اس جد و جہد میں سائنسی علوم کی تحصیل، ان کی ایجادات و اختراعات، مضبوط نظام حکومت فوجی قوت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو موجودہ دور میں کسی قوم کی بقا و استحکام کے لیے ضروری ہیں۔ خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے، اور خلفائے راشدین کا اس پر عمل رہا ہے، علم و فن کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے، کلام مجید کی جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کی عظمت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

اسلام میں علم و سائنس کی اہمیت

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، قرآن پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہیں۔

هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (زمر)

کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے دونوں برابر ہیں (ایسا نہیں ہے)

بلکہ علما اور اصحاب علم کا درجہ بلند ہے

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ) — تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنکو علم دیا گیا ہے اللہ انکے درجے کو بلند کرے گا۔

علم ہی کی ایک قسم حکمت ہے اور حکمت کو قرآن مجید میں خیر کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ) — اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دیگئی اس نے بڑی دولت پائی۔

حکمت کے جو معنی بھی لیے جائیں اس میں علم و تجربہ اور عقل و دانش کی باتیں ضرور داخل ہونگی۔

دینی نقطۂ نظر سے دنیاوی علوم کی ضرورت اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے علم و حکمت کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، عام طور پر علم و حکمت سے مراد وحی الٰہی، علم دین اور دین کی سمجھ لیجاتی ہے لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں جب کہ اس کے الفاظ میں عموم ہے، یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ سب سے مقدم دینی علوم اور تفقہ فی الدین ہے، اور ان کو دوسرے تمام علوم پر اولیت اور فضیلت حاصل ہے، لیکن دوسرے علوم خصوصاً ان علوم کو خارج کر دینے کوئی وجہ نہیں جو دین کی خدمت اور اسلام اور مسلمانوں کی شوکت و عظمت کے قیام کے لیے اس زمانہ میں ضروری ہیں، اور جن کے بغیر کوئی قوم طاقتور نہیں ہوسکتی بلکہ زندہ نہیں رہ سکتی، خود قرآن مجید کی آیات اس پر شاہد ہیں کہ دنیاوی علوم نہ صرف دنیاوی طاقت کے حصول کے لیے ضروری بلکہ عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں، مثلاً کلام مجید میں جا بجا کائنات کی تخلیق، اس کے مظاہر، آسمان و زمین، چاند، سورج، پہاڑ اور سمندر، بارش اور ہوا، زمین کی روئیدگی اور انسان کی خلقت پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک مومن کے عرفان کے لیے تو ان کی خلقت اور اس کے ظاہری فوائد ہی کافی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا کمال، اس کی صناعیاں اور اس کے اسرار و حکم ایک محقق اور سائنٹسٹ پر زیادہ منکشف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ظاہر بین کے لیے انسان کا ظاہری

حسن و جمال، اللہ تعالیٰ کے کمال تخلیق کے ثبوت کے لیے کافی ہے لیکن تشریح الاعضاء کے ماہر ڈاکٹروں کو انسانی جسم کے ہر عضو میں اللہ تعالیٰ کی بے نظیر صناعی کی ایک پوری کائنات نظر آتی ہے، اسی طریقہ سے آسمان کی رفعت، سیاروں کی گردش، آفتاب کی حرارت اور روشنی، چاند کی ٹھنڈی چاندنی کو ایک عامی بھی دیکھتا اور خدا کی قدرت کو محسوس کرتا ہے، لیکن ایک ہیئت داں کو خلا کی لامحدود وسعتوں، سیاروں کے عظیم الشان نظام اور محیر العقول عجائبات میں خدا کی حقیقی عظمت اور اس کا جلال نظر آتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ امام غزالی کا مقولہ ہے کہ جو شخص ہیئت سے واقف نہیں وہ معرفت الٰہی میں عنین ہے، اس لیے سائنسی علوم عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں۔

خلافت ارضی کے لیے مادی طاقت ضروری ہے | اس مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیے، حکومت اور دنیاوی اقتدار کے لیے خود قرآن مجید نے علم کی طاقت اور مادی قوت کو ضروری قرار دیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل نے اس وقت کے موجود پیغمبر سے کسی کو بادشاہ بنانے کی درخواست کی تو انھوں نے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا، بنی اسرائیل نے عذر کیا کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے، وہ ہم پر کس طرح حکومت کر سکتے ہیں، ہم ان کے مقابلہ میں حکومت کے زیادہ اہل ہیں، پیغمبر نے طالوت کے استحقاق حکومت کی یہ دلیل دی

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ	اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ	انکو علم اور جسم میں زیادہ وسعت عطا کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت و اقتدار کے لیے علم کی قوت اور جسمانی یا مادی طاقت ضروری ہے اس طرح مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے حکم دیا گیا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (انفال)

اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت اور پلے ہوئے گھوڑے جمع کر سکتے ہو، ان سے پوری طرح تیار رہو تاکہ انکے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر اپنی دھاک بٹھا سکو

یہ آیات اس کا ثبوت ہیں کہ اُس زمانہ میں حکومت کے استحکام اور دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جس قسم کی طاقت کی ضرورت تھی اس کی تیاری کا حکم دیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں جس قسم کی طاقت کی ضرورت ہے، اس کے لیے بھی وہی حکم ہے، اور اس میں علم و سائنس کی ایجادات، فوجی قوت اور ہر قسم کے جدید اسلحہ سب داخل ہیں، اور ان کے لیے مغربی علوم خصوصاً سائنس کی تحصیل اور اس میں کمال پیدا کرنا ضروری ہے

مسلمانوں کی علم دوستی اور خدمت علم مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے دور عروج میں دوسری قوموں کے علوم سے پورا استفادہ کیا، ان کو ترقی دی، سیکڑوں نئے علوم ایجاد کیے، اور علمی میدان میں پوری دنیا کی امامت کی، اگر اس زمانہ میں انھوں نے علم کا پایہ نہ سنبھالا ہوتا تو بہت سے پرانے علوم جن پر موجودہ علمی ترقی کی بنیاد قائم ہے، مٹ گئے ہوتے، اور آج دنیا علم کی روشنی سے محروم رہتی، انہی نے مغربی قوموں کو یونانی علوم سے آشنا کیا۔ طب، فلسفہ، ہیئت، ریاضیات وغیرہ میں مسلمانوں کی تصانیف کے لاطینی تراجم صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہے، یورپ کی نشاۃ ثانیہ انہی کی رہین منت ہے، انہی علوم کی بنیاد پر اس نے علوم و فنون کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا، اس لیے مفید علوم کی تحصیل اور ان کی خدمت و اشاعت خواہ وہ کسی قوم کے ہوں مسلمانوں کا خاص ورثہ رہا ہے، جدید علوم خصوصاً سائنسی فنون کی تحصیل نہ صرف مسلمانوں کی دنیاوی ترقی

اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہیں، بلکہ ان کے بغیر اس زمانہ میں دین کی پوری خدمت بھی نہیں ہوسکتی، لیکن اس بارہ میں نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت ہے، علم و سائنس کی قوت کے لیے اخلاقی حدود کی پابندی ضروری ہے، اس کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت ہونا چاہیے۔ محض مادی طاقت کا حصول، سیاسی اقتدار، قومی افتخار اور سربلندی اور سامان تعیش کی فراہمی نہیں اگر سائنسی علوم کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ سراسر خیر ہیں، ورنہ سراپا شر، مولانا روم آج سے صدیوں پہلے کہہ گئے

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

اور اس کے لیے سب سے مقدم شرط خداشناسی، خشیت الٰہی اور مواخذہ کا خوف ہے، اس کے بغیر یہ دیو قابو میں نہیں آسکتا۔

مغربی قوموں اور مغربی تہذیب کی خوبیاں | مغربی قومیں اور ان کی تہذیب محض برائیوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں قابل تقلید خوبیاں بھی ہیں، ان کی مادہ پرستی کے باوجود ان میں مذہب کا بھی اثر باقی ہے، چرچ اور مشنری کا پورا نظام قائم ہے، جس پر حکومتیں کروروں روپئے صرف کرتی ہیں، مذہب کی تبلیغ، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت اور رفاہ عام کے کاموں اور انسانوں کی خدمت کے سیکڑوں ادارے قائم ہیں، عیسائی مبلغین اخلاق و انسانیت کا پیکر ہوتے ہیں، اور انسانی ہمدردی اور انسانیت کی خدمت میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سی چیزوں میں مذہب کی روح اور اس کے مقصد پر ہم سے زیادہ انکا عمل ہے، ان کی دوسری نمایاں خوبی ان کی اصول پرستی اور ان کا ضبط و نظم ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے، سیاست کو چھوڑ کر جس میں وہ چنگیز و ہلاکو بنجاتے ہیں، عام زندگی میں اخلاقی اوصاف میں ان کا قدم مسلمانوں سے بہت آگے ہے۔

مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی لیکن ان کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی جس نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، ان کا مادی تصور حیات ہے، اس کی بنیاد تمام تر مادیت اور لادینیت پر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اثر ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہے، ایک طرف مذہب کا پورا نظام قائم ہے، دوسری طرف مادی ترقی اور عیش و تنعم مقصد زندگی بن گیا ہے، اور مغرب کی تمام قومیں عیش و تنعم کی سرمستی میں اور حکومتیں مادی ترقی، سیاسی اقتدار اور قومی برتری کے جنون میں مبتلا ہیں، سیاست میں دین و اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، اور عیش پرستی حد سے گذر کر بدمستی تک پہنچ گئی ہے، اس کے نتائج سے خود یورپ کا سنجیدہ طبقہ اور بڑے بڑے مفکرین جن میں اخلاقی احساس باقی ہے، مضطرب ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں نے صرف انکی برائیوں کی تقلید کی مسلمانوں نے مغربی تہذیب کی تقلید بھی کی تو انکی برائیوں میں، مغربی قوموں کے اچھے اوصاف اور کمالات میں ان کی تقلید کی توفیق ان کو بہت کم ہوئی، زیادہ تر ان کے عیوب اور ان کی برائیاں ان کے حصہ میں آئیں، اس لیے وہ ان دنیاوی فوائد سے بھی محروم رہے جو مغربی قوموں کے اوصاف کا نتیجہ ہیں، اس طرح دین بھی ان کے ہاتھ سے گیا اور دنیا بھی ان کو حاصل نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے اپنے عقائد و تصورات ہیں، اپنا نظام حیات ہے اپنی تہذیب و روایات ہیں، ان کی زندگی کا خاص نصب العین اور مقصد حیات ہے، اس کے مطالبات اور ذمہ داریاں ہیں، اگر وہ ان سب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر مادی ترقی کے اوج کمال پر بھی پہنچ گئے تو وہ خیر امت کہاں باقی رہے، جن کو نیابت الٰہی اور اقوام عالم کی ہدایت و رہنمائی کا منصب سپرد کیا گیا تھا، اس کے بجائے وہ خود انہی کی برائیوں میں مبتلا ہو کر دوسری مادہ پرست قوموں کی طرح ایک قوم بن گئے، جن کی دنیا میں کمی نہیں ہے،

مسلمانوں کا منصب اور اس کی ذمہ داری

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آج پوری دنیا ہدایت الٰہی کو فراموش اور انسانیت کا اصل مقام کھو چکی ہے، ہر قوم مادیت کے سیلاب میں غرق اور مادی ترقی کے جنون میں مبتلا ہے مسلمان بھی اسی سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ خیر امت ہیں، جن کو اقوام عالم کی ہدایت کا منصب سپرد کیا گیا تھا،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جتنی امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں
(آل عمران)	سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،

وہ اس منصب کو فراموش کر کے "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بن گئے ہیں، لیکن اب بھی من حیث القوم انکا تصور حیات نہیں بدلا ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں موجود ہے، اس لیے اس بجھے ہوئے خاکستر میں بھی ابھی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اس لیے آج بھی ان پر حق کا پیغام پہنچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے عمل سے خیر امت ہونے کا ثبوت دیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت، ان کے ہاتھوں میں ہدایت الٰہی کی مشعل، ان کے اعمال و اخلاق میں اسلام کی تصویر، ان کی نگاہ میں حقیقت بینی اور ان کے بازوؤں میں علم و سائنس کی طاقت ہو، اس وقت دنیا ان کی طرف توجہ کرنے اور ان کی باتیں سننے پر مجبور ہوگی، ورنہ محض کھوکھلی نقالی سے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور ان کی داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں،

ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل

ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مادیت اور لادینیت کے علاوہ ایک بڑا خطرہ اکثریت میں ضم ہو جانے یا کم سے کم انکی تہذیب کے رنگ میں

رنگ جانے کا ہے، گو ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، اور مسلمانوں کو بھی دستور میں وہی حقوق حاصل ہیں جو دوسری قوموں کے ہیں لیکن جمہوریت میں اقتدار ہمیشہ اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے، اور اسکی فطرت جارحانہ ہوتی ہے، ہر اکثریت اقلیت کو اپنے میں ضم یا کم سے کم اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتی ہے جس کی کوشش ہندوستان میں بھی جاری ہے، اس سے بچنے کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ اپنے دلوں میں ایمان کی حرارت اور عمل میں اسلامی کردار پیدا کریں، ایک طرف ان کے ایمان میں آتش رسوخ اور دین میں اس قدر صلابت ہو کہ وہ کسی ایسے اثر کو قبول نہ کریں جو انکے مذہب اور انکی تہذیب و روایات کے خلاف ہو، دوسری طرف اپنے اعمال و اخلاق سے دلوں کو تسخیر کریں، اور ہندوستان کی تعمیر میں ایسا موثر حصہ لیں کہ دوسری قومیں انکی اہمیت ماننے پر مجبور ہوں ہندوستان کو مسلمانوں نے محض تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کیا تھا، ورنہ اتنی طویل مدت تک انکی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا اور ہندوستانیوں کے دلوں پر اپنے عدل، مساوات اور ملک کی محبت و خدمت کا سکہ جمایا اور اپنی ساری دماغی و ذہنی صلاحیتیں ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں صرف کردیں، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحدہ ملک اور علم و فن، تہذیب و تمدن، ہر لحاظ سے اس صحرا کو گلشن بنادیا، اسلام کی تازہ دم قوت نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں ایک نئی روح پھونکی، اس کو توحید خالص سے آشنا کیا، انسانی مساوات کا سبق دیا، بوسیدہ رسوم و روایات اور اوہام و خرافات سے آزاد کرکے حقیقت شناس بنایا، اسلام کے اثر سے ہندو مذہب اور ہندو معاشرہ میں تجدید و اصلاح ہوئی، مسلمانوں نے ہندوستانی علوم سے جسقدر استفادہ کیا اس سے زیادہ انکی خدمت کی، ان کو پنڈتوں کے سینوں اور ہندوستان کی چہار دیواری سے نکال کر دنیا میں ان کا تعارف کرایا، نئے علوم سکھائے، ہر شعبۂ زندگی میں نفاست اور ایک ایسی مشترک تہذیب

پیدا کی جو اپنے حسن و لطافت اور خوبی و پاکیزگی میں مشرق کی تہذیبوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔

مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں آج بھی رہنمائی کی طاقت ہے، اور وہ دنیا کو بہت کچھ دے سکتا ہے، ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے، مگر آج اس کے وہ نتائج نہیں نکلتے جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حاملین اسلام خود اسلام کے محاسن سے تہی دامن ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ دوسروں پر کیا اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان کے اسلاف اپنے عمل سے اسلام کی تصویر پیش کرتے تھے، اس کو دیکھکر دوسری قومیں اس کی طرف کھنچتی تھیں، اگر سلاطین تلوار سے ملک کو فتح کرتے تو اپنے عدل و مساوات سے اس کو مضبوط کرتے تھے، مبلغین اسلام اور صوفیائے کرام اپنے اخلاق و کردار سے دلوں کو تسخیر کرتے تھے، مختلف اصناف کے اصحاب علم و کمال اپنے علوم و کمالات اور اپنی تخلیقی قوت اور تعمیری صلاحیتوں سے ملک کو سنوارتے تھے، اس لیے مفتوحہ قومیں ان کی قابلیت اور ضرورت ماننے پر مجبور ہو جاتی تھیں، اگر آج بھی مسلمان اس کا عملی نمونہ پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے وہی نتائج نہ نکلیں جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، اور نہ محض زبانی دعویٰ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں دینی صلابت و پختگی نہ ہوگی تو وہ رفتہ رفتہ اکثریت میں ضم ہو جائیں گے، اور اگر وہ ہندوستان میں اجنبی بن کر رہے، اپنے عمل و کردار سے دلوں کو مائل نہ کیا، اور ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ نہ لیا تو ملک کا اعتماد حاصل نہ کر سکیں گے اور احساس کمتری کا شکار ہو کر پسماندہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستان میں فارسی کا مطالعہ اور اس کا مستقبل

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

(یہ مقالہ دارالمصنفین کو لڈن جبلی کیلئے لکھا گیا تھا)

اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی اور فارسی دونوں نے اس ملک میں جگہ لی، مگر ان زبانوں کے مصرف الگ الگ رہے ہیں۔ مذہبی تعلیم و تدریس اور دینی علوم کیلئے زیادہ تر عربی سے کام لیا گیا۔ اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے ارتقا میں جن زبانوں کو سب سے زیادہ دخل ہے، ان میں سے ایک فارسی بھی ہے، جو سینکڑوں برس تک اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے، اور بغیر تفریق مذہب و ملت سب نے اس کو اپنایا، چنانچہ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ بغیر فارسی ماخذوں کے ناممکن ہے۔ اس طویل اور صدیوں کی مدت میں فارسی زبان و ادب نے ہندوستان میں جو ترقی کی اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایرانی محققین نے فارسی ادب کو جن تین سبکوں میں تقسیم کیا ہے، ان میں سے ایک کا نام سبک ہندی ہے۔

شعر، نثر، تاریخ، تذکرہ، انشا، سلوک، منطق، فلسفہ، اخلاق، سیاست، طب، قصص، ترجمہ، تفسیر، جغرافیہ، قواعد، لغت، بلاغت، عروض و قافیہ، ریاضی، حدیث، کلام، فقہ، قرأت و تجوید، سفرنامہ، ملفوظات، ہیئت، مناظرہ، فتاوی، زیج، ہندسہ، معادن، موسیقی، علم الحیوان، کیمیا، نجوم، رمل، جفر، شعبدہ بازی و طلسمات، ادعیہ، اسمائے تیراندازی، صید، شروع، فال، شطرنج، گنجفہ، خطاطی، تعبیر الرویا، صنعت و حرفت،

طبابت، مواعظ، نحو، کشکول، قانون و دستور العمل، فرامین، کتبہ جات، آداب الحرب وغیرہ فنون میں ہندوستان میں جس قدر کتابیں اور رسالے فارسی میں لکھے گئے، ان کا شمار کرنا اور ان کی فہرست بنانا مشکل ہے، ان میں سے جو کتابیں چھپ گئی ہیں ان کا بھی احصا نہیں کیا جا سکتا، اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ایران کے مقابلہ میں یہاں فارسی کتابیں زیادہ شائع ہوئی ہیں، تو غالباً غلط نہ ہوگا۔

گذشتہ زمانہ میں فارسی زبان و ادب میں جو کچھ کام انجام پایا، اس میں ہمارے تخلیقی آرٹ کو بہت زیادہ دخل ہے، اب ہندوستان میں فارسی کے مستقبل کا سوال ہے، اس میں تحقیق و انتقاد کو سب سے زیادہ جگہ ملنی چاہیے، اس دور کا آغاز علامہ شبلی سے ہوتا ہے، ان ہی جیسی ہستیوں کے لیے حافظ نے کہا ہے

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ ارباب جہاں خواہد بود

اس سرزمین کو فخر ہے کہ اس نے علامہ شبلی جیسی شخصیت کو جنم دے کر صرف ہندوستان کے ادب کو دولت مند نہیں بنایا، بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اس نے استفادہ کا موقع دیا، فارسی کا کونسا ایسا عالم ہوگا جو اس بلند ہستی کو نظر انداز کر سکے اور اس سے واقف نہ ہو، فارسی ادبیات میں نہ صرف ہندوستان بلکہ اس سے باہر ایران، افغانستان، تاجیکستان، وغیرہ کے لوگ اور یورپ کے مستشرقین تک ان کے آثار سے برابر استفادہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اور کوئی فارسی ادب پر کام کرنے والا انکی تصانیف سے مستغنی نہیں ہو سکتا، ایران میں شعر العجم کی پانچوں جلدوں کا فارسی ترجمہ شائع ہو چکا ہے، سب سے پہلے چوتھی جلد شائع ہوئی اور سب سے آخر میں تیسری، اس وقت میں خود وہاں موجود تھا اور مجھے

فخر ہے کہ گو میں علامہ شبلی کی زیارت نہ کر سکا، مگر ان کی کتابوں کے مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی سے مل چکا ہوں جن کی عمر ۱۹۵۵ء میں اسی برس کے قریب تھی، فخر داعی تیسری جلد کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "چونکہ میں اس ترجمہ کے وقت درد کمر اور وجع مفاصل میں مبتلا تھا، اس لیے اس کام میں کافی زحمت اٹھانی پڑی"۔ استاد سعید نفیسی اس جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "اس مفید اور پُر مغز کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جسے ایک دانشمند اور روشن بین انسان نے ادبیات فارسی جیسے لافانی خزانہ کے قیمتی موتیوں کے تجزیہ اور تحلیل میں لکھا ہے اور "الفضل للمتقدم" کی بنا پر شبلی کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سے قبل افغانستان میں بھی شعر العجم کی جلدوں کے ترجمے ہوئے تھے، مگر یہ ترجمہ ایرانیوں کے ذوق کے موافق نہ تھا"۔

چونکہ میں بھی علامہ شبلی کے وطن کا ایک حقیر ذرہ ہوں، اس لیے مجھے اس بلند شخصیت سے جذباتی لگاؤ بھی ہے لیکن میرے جیسے انسانوں کا مطالعہ، جن کا نقطۂ نظر محدود ہے، حضرت شبلی کے مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے، اگر مختلف مذاق کے لوگ ملکر ان کا مطالعہ کریں تو شاید اس کا احاطہ کر سکیں، ہمیں چاہیے کہ علامہ شبلی کے نقش قدم پر چل کر اپنی دیرینہ روایات اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ فارسی کی تمام مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی مکمل فہرست بنائی جائے اور ان میں سے اہم چیزوں کو پھر سے ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں اور اس سے باہر فارسی کی بیشمار اہم قلمی کتابیں جو اب تک منظر عام پر نہ آسکیں، اور نفائس المآثر، مجمع النفائس، نظم گزیدہ، باغ معانی، گلدستۂ معانی، ریاض الشعراء، ریاض الافکار، ہمیشہ بہار، نشتر عشق،

طبقات شاہجہانی، جہانگیر نامۂ طالب آملی، پنجاکیانہ، سیر المنازل، فتحنامۂ نور جہاں بیگم، رزم نامۂ حسرت، حکایت پادشاہاں، شاہجہاں نامۂ امین قزوینی، یحییٰ کاشی، عنایت خاں، ابوطالب کلیم، جلال الدین طباطبائی، قدسی مشہدی، چارچمن برہمن، جنگ نامۂ اسلام خاں، آثار شاہجہانی، شش فتح کانگڑہ، تاریخ شاہ شجاع، عرفات عاشقین، خلاصۃ الاشعار، خلاصۃ الکلام، تذکرۃ الشعراء، تذکرۂ کاتب، تکملۃ الشعراء، سفینۂ عشرت، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب، ید بیضا اور صبح صادق جیسی اہم کتابیں اور تذکرے ابھی تک چند قلمی نسخوں تک محدود ہیں جن تک عام طور سے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی، ضرورت ہے کہ یہ مآخذ ایڈٹ کرکے شائع کیے جائیں، تاکہ محققین تک آسانی سے پہنچ سکیں،

ہمارے ملک میں کثرت پبلک اور شخصی کتبخانے ہیں جن میں سے اکثر کتب خانوں کو عام طور سے لوگ نہیں جانتے اور نہ ان تک آسانی سے ان کی رسائی ہوتی ہے، مثلاً مہاراجہ بنارس کا کتب خانہ، بنارس یونیورسٹی کا سرسیرام کلکشن، لکھنؤ میں آغا ابو صاحب اور تقی صاحب کے کتب خانے، لکھنؤ کے ایک کتب خانہ کو گورنمنٹ سے ہر طرح کی امداد ملتی ہے، اور ابن حبیب بغدادی کی المنمق کا واحد قلمی نسخہ اسی کتب خانہ میں ہے، چونکہ نظام حیدرآباد کے یہاں سے اس خاندان کو وظیفہ ملتا تھا، اس لیے اس قلمی نسخہ کی نقل دائرۃ المعارف کو مل گئی تھی، مگر ابھی حال میں جب ایک صاحب دائرۃ المعارف کی جانب سے اس کتاب کو ایڈٹ کرنے کے سلسلہ میں لکھنؤ گئے تو کتب خانہ کے مالکوں نے ان کو اصل نسخہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی، جو بڑا علمی اور اخلاقی جرم تھا، اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے اداروں کو مجبور کرے کہ وہ علمی کاموں میں رکاوٹ پیدا نہ کرسکیں۔

ایسے کتب خانے بھی ہیں جو مشہور ہیں، اور اس میں استفادہ کرنے والوں کو ہر طرح کی

سہولت ملتی ہے، مگر بدقسمتی سے ان کی فہرستیں ابھی تک نہیں چھپ سکیں، رضا لائبریری جیسے اہم کتب خانہ کی مکمل فہرست ابھی تک رامپور سے باہر دستیاب نہیں ہوسکتی۔

اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے تمام رسمی اور غیر رسمی کتب خانوں کی مکمل فہرست تیار کیجائے، تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان سے روشناس ہوسکیں، پھران کی محققانہ فہرستیں مرتب کیجائیں تاکہ محققین غلطیوں کا شکار نہ ہوسکیں، ابھی الورمیوزیم کی فہرست چھپی ہے، جس میں دیوان سرمد کا ذکر ہے لیکن درحقیقت یہ سرمد کا دیوان نہیں ہے، جب میں نے ۱۹۶۱ء میں الورمیوزیم کو دیکھا تھا، اس وقت بھی وہاں کی قلمی فہرست میں یہ غلطی موجود تھی، جو مطبوعہ فہرست میں منتقل ہوگئی ہے، مجھکو وہاں ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو فارسی کا کیا ذکر اردو سے بھی واقف ہو، اس لیے یہ کام بھی اہم ہے، اس قسم کے خزانوں کی نگرانی ایسے لوگوں کے سپرد کی جائے جو علمی طریقہ سے ان کی نگرانی اور خود بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہوں۔

کتب خانوں کی تنظیم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام مخطوطات کا مطالعہ کیا جائے جو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ و تہذیب اور آثار قدیمہ کے مطالعہ میں مدد دے سکتے ہوں، ان کے مطالعہ سے بہت سے ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن سے ابتک لوگ ناواقف ہیں، رفتہ رفتہ کئی نامور کتابیں تلاش سے نکل رہی ہیں۔

پنچتنتر کا تقریباً دنیا کے تمام متمدن ممالک میں بار بار ترجمہ ہوچکا ہے، اس کے تقریباً ساٹھ زبانوں میں دو سو ترجمے موجود ہیں، اور جاوا سے لیکر آئس لینڈ تک اس کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، علماء و محققین نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے، اور تقریباً تمام ترجموں کا پتہ لگایا ہے، پھر بھی ایک بیحد اہم ترجمہ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ گیا، ابھی حال میں اس ترجمہ کا پتہ چلا ہے جس کا نام ہنچا کیانہ ہے، اور جسے مصطفیٰ خالقداد عباسی نے شہنشاہ اکبر

کے حکم سے براہ راست سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کا واحد قلمی نسخہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی میں موجود ہے۔ (نمبر ۶۲.۱۰۰۵)

ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے تاریخی اور تہذیبی مطالعہ کے لیے کچھ محدود کتابیں جنکو لوگ پہلے اصل زبان میں پڑھا کرتے تھے، لیکن اب زیادہ تر ان کے ترجموں سے کام نکالا جاتا ہے، اس سے مطالعہ کرنے والے کتاب کی اصل روح سے دور ہوتے جارہے ہیں، ترجموں میں غلطیوں کے امکانات بھی ہوتے ہیں، جسنے غلط نتیجے نکل سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیشمار ایسی کتابیں اور تذکرے ہیں، جن کا ابتک کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے، اور ان کے ماخذ سے عام طور پر لوگ محروم رہتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی اہم کتابوں کا زیادہ سے زیادہ ترجمہ کیا جائے، اور ان کے متن کو معیاری طریقہ سے شائع کیا جائے اور لوگ اصل متن کے پڑھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

پھر یہ غلط خیال ہے کہ صرف تاریخ کی کتابوں سے مورخین کے لیے مواد مل سکتا ہے، مجھے ڈاکٹر اشرف مرحوم کا کہنا کبھی نہیں بھولتا کہ تاریخ و تہذیب کے مطالعہ کے لیے ادبیات کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس سے بڑا مواد مل سکتا ہے۔

چندائن یا داستان مینا و لورک کو مولانا داؤد نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندی میں نظم کیا تھا، اور مخدوم شیخ تقی الدین واعظ، بانی دہلی میں اس کے بعض حصوں کو منبر پر پڑھا کرتے تھے جس سے سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی، اس زمانہ کے بعض علما نے اس نظم کے پڑھنے کا سبب پوچھا، تو جواب دیا کہ یہ کتاب صاحبان عشق کے وجدان اور آیات قرآنی کے مطابق ہے، مولانا داؤد کی چندائن سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ فارسی نظم میں اس کا ترجمہ کر دیا، بدقسمتی سے اب اس فارسی مثنوی کے صرف سات شعر لطائف قدوسی

میں محفوظ رہ گئے ہیں، عہد جہانگیری میں یہ داستان "عصمت نامہ" کے نام سے منظوم ہوئی ہے۔

اسی طرح نوعی خبوشانی کی ایک مختصر مثنوی "سوز و گداز" ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک حسین و لعبن کا شوہر بارات آتے آتے ایک کہنہ مکان کے گرنے سے مرجاتا ہے، وہ ستی ہونا چاہتی ہے، شہنشاہ اکبر کو معلوم ہوتا ہے، تو اسے بلاکر اپنے تخت پر بٹھاتا ہے، اسے رانی کا خطاب دیتا ہے، اور سوائے تخت شاہی کے دنیا کی ہر نعمت اس کے سامنے پیش کردیتا ہے، مگر وہ کسی طرح ستی ہونے سے باز نہیں آتی، اس وقت بادشاہ شہزادہ دانیال کو حکم دیتا ہے کہ وہ خود جاکر شاہزادیوں کی طرح اس کی ستی کا انتظام کرے، اور جب وہ پیسی کرب و بیچینی کے ستی ہوجاتی ہے تو شاہزادہ روتے روتے غش کھا جاتا ہے، اکبر بھی اس واقعہ سے بیحد متاثر ہوتا ہے، اور نوعی کو بلاکر کہتا ہے کہ تم لوگ کب تک گل و بلبل کے پارینہ افسانے دہراتے رہوگے، اور اس سچے واقعہ کو نظم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دیوان ہجری کا ایک عمدہ نسخہ انڈیا آفس میں ہے، خواجہ ہجری ہمایوں کے ہمعصر مداح اور درباری شاعر تھے، جب اکبر تخت نشین ہوا تو ہجری نے اس نوجوان بادشاہ کو قصیدوں میں نصیحتیں کرنا شروع کیں، ایک قصیدہ میں اکبر کو غلہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی طرف متوجہ کیا ہے، ایک قصیدہ میں اس کی تزلیدہ باتوں پر متنبہ کیا ہے، اور ان کو سلیقہ سے رکھنے کی تعلیم دی ہے، دیوان ہجری میں بہت سے مطالب و جزئیات میں جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ ہیں۔[1]

ہندوستان کی بہت سی داستانیں دنیا کے ادب کا حصہ بن چکی ہیں، بلوہر و بوذاسف کا قصہ جو اصل میں بھگوان بدھ کی ستوا ہے، دوسری زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی

---

[1] معارف۔ ہجری پر مضمون نگار نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جو آئندہ کسی نمبر میں شائع ہوگا۔

کئی مرتبہ ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس قصہ کو "اخوان الصفا" جیسی اہم کتاب میں جگہ ملی ہے، ملا محمد باقر مجلسی نے عین الحیات میں اس قصہ کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

فارسی نے خاص طور سے اس قسم کے قصوں کی مقبولیت میں مدد پہنچائی ہے۔ اور اس زبان میں ہمارے بیشمار ملکی قصے لکھے جا چکے ہیں، جن میں سے نل دمن، مہا بھارت، رامائن، طوطی نامہ، سنگھاسن بتیسی، ہیر رانجھا، پدماوت، کام روپ کام لتا، سسی پنوں، منوہر و مدھومالتی، مدھانل و کام کندلا، سوہنی مہیوال، منکا و منوہر، مہیار و چندر بدن، چترکرن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح سے بہت سے ہندوستانی قصے مولانا روم کی مثنوی اور دوسری کتابوں میں ملتے ہیں، ہمارے محققین کے لیے ان میں بڑا خزانہ موجود ہے، جس سے علمی اور تہذیبی دقتائق گرانبہا اضافہ ہو سکتا ہے، اور بہت سے ایسے واقعات اور نکتے ہیں جو صرف ادبیات کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

شعر کی مناسبت سے فارسی شعراء کے تذکروں میں ہمیں بہت سے حظاطوں، عمارتوں، موسیقی دانوں، جامہ بافوں، مہر کنوں، قصہ خانوں، تاجروں، کلالوں، اقوکشوں، کلچہ پزوں، زعفران فروشوں، مصوروں، طبیبوں، دلالوں، سماروں، حکاکوں، بیشمازوں، خشت پزوں، روغن گروں، زرکشوں، سپاہیوں، مدرسوں، خیاطوں، جوہریوں، نقاشوں، دلالوں، طباخوں، عطاروں، کیمیاگروں، رباب نوازوں، معماروں، نقارچیوں، بقالوں، رفوگروں، واعظوں، حلوہ فروشوں، درویشوں، تعزیہ خوانوں، سیاحوں، کاسہ گروں، منشیوں، حجاموں، حلاجوں، کمانگروں، شاہنامہ خوانوں، تبلہ بانوں، حافظوں، متصدیوں، شطرنج بازوں، مہندسوں، تاجروں، ابریشم کشوں، منجموں، مفردہ نویسوں، سجادہ نشینوں، دلگیریزوں، بتخانہ پرستوں وغیرہ کے بھی حالات معلوم ہو جاتے ہیں جن میں سے بعض کو اس لیے کہ وہ

معمولی پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہم کسی اور ماخذ سے معلوم نہیں کر سکتے۔

فارسی کی فرہنگیں اور گرامر وغیرہ زیادہ تر ہندوستان میں لکھی گئیں، اور آج ایرانیوں کو ضرورت ہوئی کہ ان کو شائع کریں۔ برہان قاطع، فرہنگ آنند راج وغیرہ ایڈٹ کر کے شائع اور ہماری چیزیں ایران کے مطبعوں میں چھپکر وہاں کے بازاروں میں فروخت کی جارہی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی بنیادی چیزیں بھی زیادہ سے زیادہ ایڈٹ کر کے شائع کیجائیں، جن کی ہمیں اور دوسروں کو ضرورت ہے۔

فارسی کا رشتہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی بڑا گہرا ہے۔ ان زبانوں کے مطالعہ کے لیے بھی فارسی میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بیشتر بڑے کلاسیکی اردو کے شعراء کا یہ اہم پہلو اپنی کمزوری اور کم علمی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ مستقل فارسی کے شاعر اور نثر نویس تھے، غالب نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فارسی بیں تا ببیں نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

نظیر اکبر آبادی کی علمیت میں لوگوں کو شک تھا، اور جب باطن نے کہا کہ انھوں نے فارسی میں نو رسالے لکھے اور صاحب دیوان تھے، تو لوگوں کو اس کا یقین نہیں آیا تھا، یہ رسالے اسقدر نایاب تھے کہ خود باطن سات بتا سکے۔ شہباز کو ان میں سے صرف پانچ اور نیاز صاحب کو تین رسالے مل سکے، ابھی حال میں مجھے آٹھ رسالے مل گئے ہیں، جن میں سے دو رسالے "مجمع مضامین" اور "انشای محفل" بھی ہیں جن کا نام بھی آجتک کسی کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال اردو کا صحیح مطالعہ بغیر فارسی کے ناممکن ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موجودہ فارسی شاعری اور ادب تھی ایہ ہے، جس کی شکایت اکثر حضرات کرتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ نئے سانچے سے ایوس نہیں ہیں، اگر ہمارے

اسلاف سعدی و حافظ، عرفی و نظیری وغیرہ سے استفادہ کر سکتے تھے، تو آج کے شعرا نیما یوشیج اور شہریار جیسی عظیم شخصیتوں سے استفادہ کر کے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر سکتے ہیں،

کچھ دنوں پہلے فارسی کو زیادہ تر ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا، اب گو اسکے طلبا کی تعداد کم ہو گئی ہے، مگر تحقیق و انتقاد کے لحاظ سے فارسی میں جو کام ہو رہا ہے اس سے کافی ہمت افزائی ہو رہی ہے، آزادی کے بعد ہندوستان کے پرانے اداروں میں توسیع ہوتی جا رہی ہے، اور نئے نئے تحقیقی ادارے قائم ہوتے جا رہے ہیں، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز علی گڈھ، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، ادارۂ مخطوطات حیدر آباد، ریسرچ اینڈ پبلک ڈویژن سرینگر وغیرہ جیسے ادارے روز بروز ترقی کرتے جا رہے ہیں، جن میں نہایت مفید کام ہو رہا ہے۔

ایران و افغانستان وغیرہ سے ہمارے روحانی اور معنوی رشتے قدیم زمانہ سے بڑے مستحکم رہے ہیں، ہمیں ان قدیم اور جدید دونوں رشتوں کو استوار کرنا ہے۔

ایران کو ہندوستانی فلسفہ سے اتنا گہرا لگاؤ رہا ہے کہ ستر ہویں صدی عیسوی میں وہاں کے ایک بڑے فلسفی میر ابوالقاسم فندرسکی "جوگ بشست" کا فارسی ترجمہ یہاں سے لے گئے اور اس پر حاشیہ لکھا، فرہنگ درست کی اور اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس میں فرماتے ہیں

چوں ز قرآں گذشتی و اخبار
نیست کس را بدیں نمط گفتار

سمرقند و بخارا وغیرہ کو بھی ہندوستان سے بڑا تعلق رہا ہے، ابھی حال ہی میں تاجکستان میں "منتخبات ملا عبد الرحمٰن مشفقی" شائع ہوئی ہے۔ صدالدین عینی، عبد الغنی میرزا یف، ترسون زادہ اور دوسرے تاجکستانی محققین اور علمائے مشفقی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، جن کا یہ مصرع

ضرب المثل ہے:

از بام خانہ تا بثریا از ان تو

مشفقی دو مرتبہ ہندوستان آئے اور جب ۱۵۷۸ء میں شہنشاہ اکبر پاک پٹن شریف شیخ فرید گنج شکر کے مزار مبارک کی زیارت کو گئے تو مشفقی کی رسائی ان تک ہوئی۔ وہاں کے محققین نے صرف اپنے یہاں کے منابع سے کام لیکر مشفقی کا تعارف کرایا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ آئین اکبری، اکبرنامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ وغیرہ کی مدد سے اس شاعر کا تعارف کرایا جائے جو ہندوستان اور تاجیکستان کو جوڑنے والی ایک بڑی کڑی ہے۔

افغانستان اور ہندوستان قدیم زمانہ سے ایک رہے ہیں، اس زمانہ میں ان دونوں ملکوں کی وحدت کا پتہ اصل سنسکریت کی کتابوں کے علاوہ ان کے ترجموں سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جوگ بشست کے فارسی ترجمہ میں جہاں بہت سی فلسفیانہ، روحانی اور اخلاقی داستانیں ہیں، وہاں ہندوستان کے راجہ سورگھ (Suraghha) کا بھی قصہ ہے، جو کبھا (Kubha) یعنی کابل کے راجہ پرگھ (Praghha) یا پرناد (Pranada) کا دوست تھا، اور جب راجہ پرگھ کے ملک میں قحط پڑا تو یہاں کا راجہ اس سے ملنے گیا تھا، رگ ویدا (Rig - Vada) کے سات دریاؤں میں سے ایک کا نام کبھا (Kubha) ہے۔

مہاتما بدھ کے دو عظیم مجسمے سرخ بدھ اور خاکستری بدھ ابتک بامیان میں پرانی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

بلخ کو زرتشت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی بلخ میں بدھ مذہب کا بہت بڑا مندر نوبہار (Nau Vihara) تھا۔ جہاں کابل، ہندوستان اور چین کے زائر جایا کرتے تھے۔ برمک جو اصل میں پرمکھ (Pramukh) ہے، یہاں کا سب سے بڑا پجاری تھا جس کے

خاندان کا اسلامی تہذیب کے سنوارنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ کنشکا اور یونانی بادشاہ مینندر (Menander) دونوں بدھ مذہب کے پیرو تھے، ایران و ہندوستان کے تصوف نے خصوصیت سے بودائی اور ہندی فلسفہ کے زیر اثر نشو ونما پائی ہے۔ اور یہاں کے فنا (Nirvana) نے وہاں فنا کی شکل اختیار کی ہے، یہ تصوف مدتوں سرزمین بلخ میں پروان چڑھا جو صدیوں بدھ مذہب کا مرکز رہ چکا تھا، نیز ایرانی تصوف کے بڑے بڑے پیشوا ابو اسحٰق ابراہیم بلخی، ابو علی شقیق بلخی اور عبدالرحمٰن بلخی جیسی شخصیتیں رہی ہیں، سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا رومی اسی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے۔

مغل مصوری کا اصل مسکن ہرات ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں خواجہ عبداللہ انصاری اور ملا عبدالرحمٰن جامی جیسی ہستیاں آرام کر رہی ہیں، غرض ان تمام گوشوں پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے، جن میں فارسی ادب کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

اب فارسی کو صرف ایک مردہ یا کلچرل زبان کی حیثیت سے نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اس لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ زندہ ملکوں کی زبان ہے، جن سے ہمارے تعلقات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، اس لیے اگر ایک طرف ہمیں گذشتہ تاریخ و تمدن کے مطالعہ کے لیے کلاسیکی ادب کی ضرورت ہے تو دوسری طرف ہمیں ایسی فارسی بھی سیکھنی ہے جو ہمیں ہمسایہ اور دوست ملکوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دے سکے۔

دہلی یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کلاسوں کے علاوہ جدید فارسی کے ایسے سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس بھی کھولے گئے ہیں جن سے لوگوں کو فارسی بولنے، لکھنے اور جدید لب ولہجہ کے سمجھنے میں مدد مل سکے اور وہ ریڈیو، وزارت، سفارت وغیرہ میں بغیر غیر ملکی امداد کے اپنا کام خود چلا سکیں، آل انڈیا ریڈیو کے فارسی شعبہ میں پہلے بیرونی لوگ کام

کہتے تھے اور انھیں پر ہمارا دار و مدار تھا، مگر اب رفتہ رفتہ ہندوستانی ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں فارسی کے لسانی مطالعہ کا رواج نہیں تھا، فارسی زبان دوسری زبانوں سے نکلی ہے، اس لیے فارسی کا صحیح مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان زبانوں کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے جنھوں نے اس زبان کے بننے اور سنورنے میں مدد دی ہے، سنسکرت اور اوستا کی ماں ایک اور زبان تھی جس کا اب وجود نہیں ہے لیکن ان کی مشابہت اور یگانگت بتلاتی ہے کہ ان کی ماں کیسی رہی ہوگی، اسی طرح فارسی باستان، پہلوی، سغدی وغیرہ بھی اوستا اور سنسکرت سے بہت قریب اور آریائی زبانیں ہیں، اس لیے فارسی کے سائنٹفک مطالعہ کے لیے سنسکرت اور اوستا وغیرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں ابتک سنسکرت اور فارسی کو ساتھ ساتھ نہیں پڑھایا جاتا حالانکہ ان دونوں کے ساتھ تعلیم دینے سے دونوں کے مطالعہ میں مدد ملے گی، پارسیوں کے یہاں اوستا اور پہلوی کا مطالعہ مذہبی حیثیت سے ضروری ہے، اس لیے بمبئی کے اطراف میں ان زبانوں کا رواج تھا لیکن اب شمال میں بھی ان کی طرف توجہ کی جا رہی ہے، دہلی یونیورسٹی میں چند برسوں سے فارسی باستان، اوستا اور پہلوی کو بھی نصاب میں داخل اور ان کے پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندوستانی محققین اس نکتہ سے غافل نہیں ہیں۔ S.K. Sam کی کتاب Old Persian اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مگر اب اس کی طرف باقاعدہ اور منظم طریقہ سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ادب کی تاریخی لغوی اور اصطلاحی ماہیت

از جناب وقار احمد صاحب رضوی، ایم، اے

ادب کائنات کا علم بھی ہے اور اس کا عرفان تمام بھی، وہ علم اور تہذیب کی دولت کو عام کرتا ہے، مادی اور جسمانی دنیا میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ اور زندگی کی مادی جدلیت کو اقدار اعلیٰ سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ فنی تجربات کی نفسیاتی تشریح کرتا ہے۔ ماورائیت کی لاشعوری توجیہ بھی ہے اور تاریخی روایت پرستی اور انفرادیت کا شعوری امتزاج بھی۔ حیاتیاتی تصور ادب کی نوعیت کو قدر و قیمت کا اندازہ عطا کرتا ہے۔ ادب تحلیل نفسی میں، جبلتوں کے سہارے عمل اور زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ ماضی بعید سے بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم راستے سے سفر کرتا ہے اور اپنے خوش آیند نغموں سے فضا کو ترنم کر دیتا ہے۔

ادب ایک ایسا عمل ترکیب ہے جو ہیت نامیہ کے منتشر رجحانات میں، ربط قائم کرتا ہے، سماجی قدروں اور انسان کی فطری خواہشوں کا تصادم فنکار کو فنی اظہار و ابلاغ کی طرف لیجاتا ہے۔ ابلاغ تخلیقی ادب کا ایک شعبہ ہے، ادب، اظہار کا ایک ڈھنگ ہے۔ وہ ادیب کے احساس کی نمایندگی بھی کرتا ہے اور حسن، لطافت اور رنگینی کو اثر اندازی کی طاقت بھی دیتا ہے۔ وہ فطرت کا اظہار بھی ہے اور خارجی حقایق کے شعور و ادراک کا نتیجہ بھی ہے۔

ادب نفس انسانی میں شائستگی، افکار و خیالات میں روشنی، احساسات میں نزاکت، زبان میں سلاست اور زور پیدا کرتا ہے۔ ادب کا اطلاق ان تصانیف پر بھی ہوتا ہے

جو کسی علمی یا ادبی تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ اور ان کتابوں پر بھی جو فکر و فن میں باہمی تاثر اور انشاء و اسلوب نگارش کی بہترین مثال تصور کیجاتی ہیں۔

ادب کی ابتدائی تاریخ اور آغاز کے بارے میں کوئی نص صریح یا برہان قاطع ایسی نہیں ہو جو اس کلمے کی تاریخی حیثیت سے بحث کرے۔ یہ ایک ایسی خبر ہے جس کی ابتدا کا سرا غ نہیں ملتا۔ اس لفظ کا وجود نہ سامی زبانوں میں ملتا ہے اور نہ عربوں کی جاہلی شاعری میں۔ عہد جاہلی کی تاریخوں میں کچھ اقوال ایسے ضرور ملتے ہیں، جن کے مطالعہ سے اس سلسلے میں مدد ملتی ہے۔

اس ذیل کا ایک قول تو وہ ہے جو حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر نے کسریٰ کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

وقد اوفدت ایها الملک	اے بادشاہ! میں عرب کے ایک گروہ کو آپ کے
وفدا من العرب لهم فضل	پاس وفد بنا کر بھیج رہا ہوں۔ جو حسب و نسب
فی احسابهم واسنابهم و	میں فضیلت رکھتے ہیں، یہ لوگ دانشور ہیں
عقولهم وآدابهم[1]	اور صاحب اخلاق و آداب ہیں۔

اور دوسرا قول وہ ہے جو علقمہ بن علاثہ نے کسریٰ کے سامنے کہا:

فلیس من حضرک منا بافضل	ہم میں جو لوگ آپ کے پاس آئے ان کو
ممن غرب عنک، بل لو قست	ان لوگوں پر فضیلت حاصل نہیں ہے جو
کل رجل منهم وعلمت منهم	نہیں آئے، اگر آپ ان کا باہم موازنہ
ما علمنا لوجدت له فی آبائهم	کریں اور جتنا ہم کو ان کے بارہ میں
ابتداءً واکفاءً کلهم الی الفضل	علم ہے، اتنا آپ بھی جان لیں تو آپ انکو

---

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۷ (۱۹۴۳ء)

منسوب بالشرف والسؤدد	ہمارے ہم سر ہم مرتبہ پائیں گے، وہ سب
موصوف بالرای الفاضل	صاحب فضل و شرف ہیں، ان میں سیادت ہے
والادب معروف[1]	اور وہ اصابت رائے سے موصوف اور ادب سے آراستہ ہیں۔

یہ روایات اور اقوال ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے بعد میں وضع کیگئی ہوں، ان روایات سے جہاں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جاہلی عربوں کا تصور، ادبی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے متعلق کیا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ عرب نژاد ہے، دخیل نہیں ہے۔ اس لفظ کے عربی الاصل ہونے کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جو حروف مادہ میں کلمۂ ادب سے مناسبت رکھتے ہیں اور صوتی اعتبار سے قریب المخرج اور قریب المعنی ہیں، جیسے بَدَأَ، أَبْدَ، دَأَبَ۔ ان الفاظ میں جنسی معنی سب میں مشترک ہیں، کیونکہ تعلق بالشی اور ارتکاب عادت کا مفہوم سب میں پایا جاتا ہے۔

بعض محققین (جرجی زیدان اور زیات وغیرہما) کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی اور دوسری سامی زبانوں میں سُمیریوں کی زبان سے آیا، جو قدیم زمانے میں جنوبی عراق میں آباد تھے۔ ان سے حملہ آوروں (سامیوں) نے اس لفظ کو اڑا لیا۔ سُمیریوں کے یہاں اس لفظ کے معنی انسان تھے۔ سامی زبانوں میں یہ لفظ ادب سے أُدم اور ادم سے آدم ہو گیا۔ لیکن عربوں نے اس لفظ کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھا۔ عرب صحرائی زندگی بسر کرتے تھے، ان کی زبان دوسری زبانوں سے خلط ملط نہیں تھی، انھوں نے اس لفظ کو آدمیت یا انسانیت کے معنی میں استعمال کیا۔ اور لازم بول کر ملزوم مراد لیا۔ اس میں

---

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۸ (۱۹۳۵ء)

فضائل حمیدہ اور شرافت کا مفہوم پیدا کیا، مگر یہ ایک مفروضہ ہے، حقیقت علمیہ نہیں۔

قریش کی زبان اسلام کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زبان ہے۔ قریش کی زبان نے عرب کی دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا اور خود بھی ان سے متاثر ہوئی۔ قرآن مجید اسی زبان میں نازل ہوا ہے ادب کے معنی تہذیب و تادیب کے لیے جاتے ہیں، یہ کلمہ سبک اور فصیح ہونے کے باوجود اگرچہ قرآن شریف میں بعینہ نہیں آیا ہے لیکن ادب کا معنوی وجود قرآن میں ملتا ہے، قرآن معلم اخلاق ہے، تہذیب نفس اور اخلاق کا مبلغ ہے، اس اعتبار سے قرآن مجید میں الفاظ کی بلاغت یعنی ادب کا لفظی مفہوم اور تہذیب اخلاق کی تعلیم یعنی ادب کا معنوی مفہوم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ سے عربی زبان میں، لفظ ادب کے وجود کی تائید ہوتی ہے، مشہور حدیث ہے:

ادّبنی ربّی فاحسن تادیبی	میرے پروردگار نے میری تربیت کی اور خوبی کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان ھذا القرآن مادبۃ اللہ فی	بیشک قرآن اس دنیا میں ایک خوان الٰہی ہے
الارض فتعلموا من مادبتہ[1]	پس اس خوان سے تم لوگ استفادہ کرو۔

مادبۃ: ادب سے بطور تشبیہ اسم مکان ہے۔

حضرت علیؓ کا قول روایت میں آیا ہے:

اما اخوانا بنی امیۃ فقادۃ	ہمارے بھائی بنی امیہ دسترخوان والے
ادبۃ[2]	لیڈر ہیں۔

اس روایت میں اَدَبَۃ، آدِبٌ کی جمع ہے، جیسے کاتب کی جمع کَتَبَۃٌ۔ آدب:

---

[1] ابن الاثیر: النہایۃ، مادۂ ادب۔ [2] ایضاً

اس شخص کو کہتے ہیں جو دسترخوان کی طرف بلاتا ہے، مادۂ مأدبۃ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دعوت کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس تشریح سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی کھانا" ہیں، جیسا کہ بعض علمائے لغت کا خیال ہے، ان احادیث اور اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عہد رسالتؐ، عہد صحابہ اور خود ایام جاہلیت میں جانا پہچانا تھا، صدر اسلام میں اس کے جو معنی تھے، اس میں وسعت پیدا ہوئی، اور وہ اخلاق کریمہ اور ان سے زندگی پر پڑنے والے اثرات کے معنی میں بولا جانے لگا، دعوتِ طعام ہو یا دعوتِ تہذیب جنس بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔

ادب کے لغوی معنی دعوتِ ولیمہ اور اصطلاحی معنی دعوتِ تہذیب نفس ہے، جنس کے اشتراک اور فصل کے امتیاز سے دونوعیں بنیں۔ چونکہ یہ لفظ عہد جاہلیت اور صدر اسلام میں کھانے اور تہذیب و تربیت کے مفہوم میں تھا، اور اب بھی یہی معنی ہیں، اس لیے یہ لفظ منقول ہے، مُرتجل[1] نہیں ہے۔

"لسان العرب" میں ادب کے لغوی معنی دعوت: بلانا ہے، وہ کھانا جس کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے، اس کو مدعاۃ اور مأدبۃ کہتے ہیں، وہ لٹریچر جس سے ادیب، متأدب ہوتا ہے اس کو ادب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

"المحیط" میں الأدُبُ (متحرک الاوسط) کے معنی لطافتِ طبع اور خوش اطواری کے ہیں۔ ادّبہ: علمہ۔ سکھایا۔ تأدّبَ بہ: تعلّمہ۔ سیکھا۔ الأدُب (بسکون العین) کے معنی تعجب کے ہیں۔ جیسا کہ الأدبۃ (بالضم) کے معنی تعجب اور پسندیدگی کے ہیں۔ اور ادب (البحر کے معنی پانی کی زیادتی ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لغوی اور مستعمل فیہ معنی میں جنسی اشتراک ہے، کیونکہ ادب محامد و محاسن کی طرف بلاتا ہے۔

---

[1] معنی موضوع لہ اور مستعمل فیہ میں مناسبت ہو تو منقول ہے، جیسے صلوٰۃ اور اگر مناسبت نہیں ہے تو مرتجل ہے

اس کے علاوہ مادۂ ادب کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے، اس کو اٹلی کے مشہور مستشرق کارلونالینو (متوفی ۱۹۳۸ء) نے بیان کیا ہے، مستشرق مذکور کی رائے یہ ہے کہ ادب، دأب سے نکلا ہے، جس کے معنی عادت ہے، یہ لفظ مفرد سے نہیں بنا بلکہ جمع سے مشتق ہے، دأب کی جمع ادأب تھی، قلب مکانی سے آداب ہوگیا، جیسے بئر اور رئم کی جمع أبآر سے اور آءر تھی، قلب مکانی کے بعد آبار اور آرام ہوگئی۔ پروفیسر نالینو نے اس سے آگے لکھا ہے:

وکثر استعمال الآداب جمعا للدأب	واب کی جمع آداب کا استعمال اسقدر زیادہ
حتی نسی العرب اصل هذا الجمع و	ہوا کہ عرب اس کی اصل ہی کو بھول گئے، نہ انکو
ما کان فیه من قلب فخیل الیهم	یہ یاد رہا کہ اس میں قلب مکانی ہوا ہے،
انه جمع لا قلب فیه۔ فاخذوا منه	ان کو اس بات کا خیال رہا کہ یہ لفظ جمع ہے
مفردا ادبا لا دأبا وجری	اس میں قلب مکانی نہیں ہوا ہے، انھوں نے
استعمال هذه الکلمة بمعنی	اس کا مفرد داب کے بجائے ادب سمجھا
العادة ثم انتقل من هذا	داب کا استعمال عادت کے معنی ہی میں
المعنی الطبیعی القدیم الی معانیه	رہا، پھر وہ اس قدیم طبعی معنی سے دوسرے
الاخری المختلفة[1]	مختلف معنی کی طرف منتقل ہوا ہے۔

لفظ ادب کی اصل تاریخ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے، یہ لفظ بنی امیہ ہی کے زمانے میں رائج اور شائع ہوا، اسی زمانے سے اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے تعلیم و تربیت کے معنی میں ہوا عہد بنی امیہ میں اساتذہ کی ایک ایسی جماعت تھی جو امراء کے لڑکوں کو تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھی، اس جماعت اور اشعار کے راویوں اور تاریخی واقعات بیان کرنے والوں کو "مؤدب"

---

[1] تاریخ الادب العربیہ تالیف کارلونالینو، ص ۱۱

کہا جاتا تھا۔ اس جماعت "مؤدبین" میں سے کچھ نام یہ ہیں: (۱) ابو عبید الجہنی (۲) عامر الشعبی۔

(۱) ابو عبید الجہنی (۲) عامر الشعبی۔ یہ دونوں خلیفہ عبد الملک بن مروان کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔

(۳) صالح بن کیسان: خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے لڑکوں کا مؤدب تھا۔

(۴) حمید بن درہم: آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کا مؤدب تھا۔

اس دور کی تحریروں میں جا بجا لفظ ادب کا تذکرہ ملتا ہے، زیاد بن ابیہ اپنے خطبہ "البتراء"[1] میں کہتا ہے:

فادعوا اللہ بالصلاح لائمتکم	تم خدا سے اپنے ائمہ کیلئے راستی اور خیر کی
فانھما ستکوا المودبون لکم	دعا کرو، کیونکہ وہ تمہارا انتظام کرنیوالے
اما واللہ لاؤدّ بنکم غیر	اور ادب سکھانے والے ہیں، خدا کی قسم
ھذا الأدب اولتستقیمن	میں تم کو اس طرز ادب کے سوا ادب
	سکھاؤں گا، ورنہ تم اپنی روش درست کر لو۔

کسی فراری شاعر نے لفظ ادب کو اپنے اشعار میں اس طرح استعمال کیا ہے،

اکنیہ حین اناديہ لاکرمہ	ولا اُلقبہ والسوءۃ اللقبا

میں اس کو از راہ احترام اسکی کنیت سے پکارتا ہوں، لقب سے یاد نہیں کرتا کیونکہ لقب بری چیز ہے۔

کذاک اُدّبت حتی صار من خلقی	انی وجدت ملاک الشیمۃ الادبا

میری تادیب و تربیت اس طور پر کیگئی ہو کہ ادب میری سرشت بن گئی ہو اور میں نے اپنی خصلت کا مدار ادب کو بنا لیا ہے

---

[1] جس خطبے کو حمد و ثنا سے شروع نہ کیا جائے اور جس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے نہ ہو اس کو "البتراء" کہتے ہیں، بتر کے معنی دم کٹے، لاولد کے ہیں، اور جس خطبے کو قرآن مجید کی آیات اور درود سے مزین نہ کیا جائے اسکو "شوھاء" کہتے ہیں، شوھاء کے لغوی معنی بدصورت عورت کے ہیں ۲ حماسہ: باب الادب۔

بنی امیہ کے زمانے میں اس لفظ کا اطلاق اس قسم کے علوم پر ہوتا تھا جن کا مذہب اور دینیات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے شاعری، کہانی، انساب، ایام عرب، اخبار و احوال، شرافت اور حسن اخلاق بھی اس سے مراد لیے جاتے تھے۔ پھر جب لغت مدون ہوا تو وہ بھی ادب میں شامل ہو گیا۔

لفظ ادب کا مادہ نہ قریشی زبان میں ملتا ہے، نہ عبرانی اور سریانی میں۔ قرآن مجید نے تمام لغات قرشیہ کا استیعاب نہیں کیا تھا، اس لیے یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ عہد بنی امیہ میں قریش کی زبان میں کسی ایسی عربی زبان سے منتقل ہو کر آیا ہو جو خود برباد ہو چکی تھی۔

"لسان العرب" نے مادۂ ادب سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الادب ادبان: ادب النفس وادب الدرس۔ ادب دو ہی چیزوں کا نام ہے۔ ایک تہذیب نفسی اور دوسرے تعلیم شعر و نثر۔ تہذیب نفس۔ بردباری، عالی ظرفی، شجاعت، سچائی جیسی خصائل حمیدہ اور اجتماعی خوبیاں پیدا کرنے کی تلقین کو کہتے ہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ابن مقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے اپنی کتاب کا نام "الادب الصغیر والادب الکبیر" رکھا، ادب کے دوسرے معنی تعلیم کے ہیں، اس کا تعلق شعر اور نثر سے ہے، پہلی صدی ہجری سے اب تک مادۂ ادب انہی دو معنوں پر دلالت کرتا رہا ہے۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکوں کے مودب سے کہا:

علّمهم الشعر يمجدوا وينجدوا[1] انکو اشعار کی تعلیم دو تاکہ یہ شرف حاصل کریں اور دلیر بنیں

یہاں تادیب کے معنی تعلیم و تہذیب یا درست کرنے کے ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے مؤدب سے پوچھا

---

[1] نقد النثر ص ۷۰

کیف کانت طاعتی ایاک و	جب آپ مجھے تعلیم دیتے تھے تو میں آپ کی
انت تؤدّبنی؟ قال: احسن	کس طرح اطاعت کرتا تھا، مودب نے جواب دیا
طاعة، قال: فالمعنی الآن	بہترین اطاعت، عمر بن عبدالعزیز نے کہا
کنت اطیعک[1]	تو اب تم میری ویسی ہی اطاعت کرو
	جیسی میں تمھاری اطاعت کرتا تھا،

بنی امیہ ہی کے عہد سے ادیب یا مودب، شاعر اور نثر نگار کے درمیان فرق قائم ہوا۔ جس شخص پر ادب اور اس کی تعلیم کا غلبہ ہوتا تھا، اس کو ادیب کہتے تھے، اور جس کا رجحان شاعری کی طرف ہوتا تھا، وہ شاعر کہا جاتا تھا، اور نثر کا مطالعہ کرنے والے کو نثر نگار کہا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں جب عربی علوم، لغت، نحو، صرف کا نشو و نما ہوا تو ان ناموں نے اصطلاحی شکل اختیار کرلی، اور یہ علوم "ادب تعلیمی" میں داخل ہوگئے، ادب تعلیمی کا مفہوم وسیع ہوگیا۔ لفظ ادب کا اطلاق۔ نثر و نظم، انساب، اخبار، لغت، نحو، صرف اور نقد پر ہونے لگا۔ یہ حالت زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، کیونکہ یہ عباسیوں کے زمانے میں سوسائٹی کے اجتماعی ہیئت میں تغیر اور ثقافتی گوشوں میں تنوع پیدا ہوا۔ عباسی تمدن کے ساتھ ساتھ علوم عربی کی ایک ایسی طاقت آئی جس نے مادۂ ادب کو متاثر کیا۔

تیسری صدی ہجری میں ادب پھر اپنے اسی مفہوم کی طرف واپس لوٹا جو پہلی صدی ہجری میں تھا، یعنی ادب فنی اور تہذیب نفس کے معنی دینے لگا۔ اس تعریف میں شعر و نثر اور ان سے متعلقہ علوم۔ اخبار، انساب، ایام عرب اور احکام نقد داخل ہیں، البتہ اس میں فنی نثر اور ادبی تنقید کا اضافہ ہوگیا۔

---

[1] عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ۱ ص ۳۰۱ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

اس صدی میں اعلیٰ ادب تصنیف ہوا، جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی "البیان والتبیین" ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی "الشعر والشعراء" اور "کامل" للمبرد (متوفی ۲۸۵ھ) جو عربی ادب کی امہات الکتب تسلیم کیجاتی ہیں، اسی صدی میں لکھی گئیں۔

اس صدی میں لفظ ادب کے تہذیب نفس والے معنی میں وسعت پیدا ہوئی، اور اس موضوع پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، امام ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) کی "ادب القاضی" ابن قتیبہ کی "ادب القراۃ"۔ ابو العباس سرخسی (متوفی ۲۸۶ھ) کی "ادب النفس" اور کتاب جمل نشاع (متوفی ۲۵۰ھ) کی "آداب الندیم" اس سلسلے کی اہم کتابیں ہیں۔ صحیح بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کا "باب الادب" اور حماسۂ ابی تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کا "باب الادب" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۲ھ) کی مشہور کتاب "طبقات الشعراء الجاہلیین والاسلامیین" ابو الحسن الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی "ادب الدنیا والدین" اور نیشاپوری (متوفی ۴۴۵ھ) کی "آداب الصوفیہ" اور "آداب البحث والمناظرہ" کا ذکر بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

جاحظ نے لفظ ادب کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

قال عتبۃ بن ابی سفیان لعبد الصمد۔ مودب ولدک: لکن اول ما تبدأ بہ من اصلاح بنی، اصلاح نفسک[1]	عتبہ بن ابی سفیان نے اپنے لڑکے کے مؤدب سے کہا کہ پہلی چیز جس سے تم میرے لڑکوں کی اصلاح کرو، خود تمھارے اپنے نفس کی اصلاح ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے:

وزدنی فی تادیبھم، ازدک فی برہم انشاء اللہ تعالیٰ[2]	ان کو ادب سکھانے میں زیادتی کرو میں حسن سلوک میں زیادتی کرونگا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

---

[1] البیان والتبیین ج ۲ ص ۵، [2] ایضاً

چوتھی صدی ہجری میں لغت، نحو اور صرف ادب سے الگ ہو گئے، نقد، بلاغت، اور بدیع ادب میں شامل رہے، لیکن اس ادب میں تنقیدی اور فنی زاویۂ نگاہ سے بحثیں ہوئیں۔ اس صدی میں بحتری (متوفی ۲۸۴ھ) اور ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کے ادبی معرکوں اور بعد میں متنبی (متوفی ۳۵۴ھ) کے مخالفین اور موافقین کے مباحث نے فن نقد کو فائدہ پہنچایا، آمدی (متوفی ۳۷۰ھ) نے اپنی "الموازنہ بین الطائیین" اور ابو الحسن جرجانی (متوفی ۳۹۲ھ) نے "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" انہی واقعات سے متاثر ہو کر تصنیف کیں، اس طرح تنقید نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنا شروع کی۔ اور اس کا شمار علیحدہ ایک علم اور ادبی فن میں ہونے لگا۔

چوتھی صدی ہجری میں جن کتابوں نے فن نقد کو فروغ دیا، اور اس کو مستقل ایک فن کا درجہ دیا، ان میں قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۳۱ھ) کی "نقد الشعر" اور "نقد النثر" کے نام سرفہرست ہیں، قدامہ نے سب سے پہلے عربی نقد کے اصول استخراج کیے، ان کے بعد ابو ہلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) نے "الصناعتین"[1] میں اور ابن رشیق القیروانی (متوفی ۴۵۶ھ) نے "کتاب العمدہ" میں انہی کے نقش قدم کی پیروی کی۔ ابو الفرج الاصبہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کی "الاغانی" اور ابن عبد ربہ (متوفی ۳۲۸ھ) کی "العقد الفرید" کے نام بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں، "رسائل اخوان الصفا" نے بھی تنقید اور علوم بلاغت کے لیے راستہ ہموار کیا۔

کہا جاتا ہے کہ فن نقد نے علم بلاغت کے ضمن میں مستقل فن کی شکل اختیار کی، اس استقلال کی مظہر شیخ عبد القاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) کی دونوں کتابیں "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغت" ہیں۔

---

[1] اس کتاب میں مصنف نے شعر و نثر سے بحث کی ہے، اور جگہ جگہ ان محاسن کی نشاندہی کی ہے جن سے فنی حسن میں اضافہ ہوتا ہے، اس میں فنی تجزیے کے علاوہ تنقیدی بحث بھی ہے۔ مصنف کی دوسری کتاب "دیوان المعانی" بھی اسی طرز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس میں روایتی انداز غالب ہے۔

ان کتابوں کا اثر یہ ہوا کہ ادب بمعنی الخاص سے نقد اور بلاغت کا تعلق نہیں رہا۔ اور ادب محض نثر و نظم کے سرمایہ کو کہنے لگے۔

اس استقلال سے فن تنقید کو یہ نقصان پہنچا کہ اس کے بعد فن تنقید یا علم بلاغت میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی، اگرچہ ابن رشیق القیروانی کی "العمدۃ" اور "قراضۃ الذہب فی نقد اشعار العرب" شیخ کے زمانۂ حیات ہی میں تصنیف کی گئیں۔

پانچویں صدی ہجری کے اختتام تک اہم ادبی علوم نے مستقل علوم کی حیثیت اختیار کر لی، شاید اسی وجہ سے زیات نے لکھا ہے کہ عہد اخوان الصفا کے بعد لفظ ادب کا اطلاق فنون، صنعت و حرفت اور تمام غیر شرعی علوم پر نہیں رہا، لیکن عربی زبان کے علوم جیسے معانی، بیان، صرف، نحو اسکے دائرے میں داخل رہے لیکن اس قسم کی کوئی تجدید نہیں کی گئی۔[1]

غرض اس صدی میں ادب بمعنی الخاص کی تعریف کو مقبولیت حاصل ہوئی، یہ تجدید اس معنی سے قریب ہے جو قرن اول میں مستعمل تھے۔ اس تعریف سے وہ علوم الگ ہیں جو قرن ثانی میں ادبی تعریف کے جزو تھے۔ اس صدی میں علماء کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی، جس نے قرن ثانی سے زیادہ ان ادبی علوم کی طرف توجہ دی جو ادبی ثقافت کی تعمیر کرتے ہیں۔ ادبی علوم سے مراد کیا ہے؟ وہ کون سے علوم ہیں جو ادب کی تعریف میں شامل ہیں؟ اس بارے میں علماء کا سخت اختلاف ہے۔ گذشتہ صدیوں سے اب تک ان ادبی علوم کے حصر و تحدید میں بڑے بڑے علماء نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کے نزدیک علم بارہ ہیں۔[12] سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "مفتاح العلوم"، یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "معجم الادباء" اور شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ)

---

[1] اصول الادب ص ۱۱

نے "مقدمۂ شرح المفتاح" میں ان ادبی علوم سے بحث کی ہے، ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی رائے زنی کی ہے لیکن اس بارے میں ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کی رائے کو اہمیت حاصل ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمے میں ایک "فصل" فی علوم اللسان العربی" کے عنوان سے قائم کی ہے، اس میں علوم بلاغت۔ بیان، لغت، نحو پھر ادب سے بحث کی ہے۔ اور ادب کو زبان عربی کے علوم میں ایک مستقل علم تسلیم کیا ہے، اور اس کو نحو، لغت، معانی، بیان اور بدیع کا حریف ٹھہرایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے جس میں اس کے عوارضِ ذاتیہ کے سلب وثبوت سے بحث کی جاتی ہے جیسے طب کا موضوع جسم انسانی ہے، اس حیثیت سے کہ امراض، جسم انسانی کو لاحق ہوتے ہیں اور علاج کے ذریعہ ان کا تدارک کیا جاتا ہے، اسی طرح نحو کا موضوع کلمہ ہے، علم نحو، کلمے کے ان عوارض واحوال سے بحث کرتا ہے جو اس کو باعتبار معرب ومبنی پیش آتے ہیں، اسی ضمن میں نواسخ (عوامل) ضمیر عائد پر فتحہ یا کسرہ کے مقامات کا ذکر آتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ ابن خلدون ادب کو علم تو مانتا ہے، مگر اس کا موضوع نہیں بتاتا، اور اس کی غرض وغایت سے بحث کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ ہر علم کی ایک تعریف، ایک موضوع، اور ایک مقصد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے، ادب کے موضوع سے انکار کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

هذا العلم لا موضوع له ينظر	علم ادب کا کوئی موضوع نہیں جس کے
فی اثبات عوارضه او نفیها	عوارض واحوال سے اثبات ونفی میں
وانما المقصود منه عند	بحث کی جائے۔ اہل زبان کے نزدیک

اهل اللسان ثمرته و هی	ادب کا مقصد ادبی صلاحیت ہے، وہ
الاجادة فی فنی المنظوم والمنثور	یہ کہ نثر و نظم کے ذریعہ مافی الضمیر کا اظہار
علی اسالیب العرب و مناحیهم[1]	عرب کے اسلوب اور طریقوں پر کیا جائے،

جب ابن خلدون نے علوم لسانی کی طرح ادب کا کوئی موضوع نہیں پایا تو اس کے موضوع ہی سے انکار کر دیا اگر وہ ادبی نسبت کا اطلاق تمام علوم لسانی پر کرتا تو بات آسان ہو جاتی اور وہ اس اضطراب میں مبتلا نہ ہوتا، جو اس کی حیرانی کا باعث ہوا، اس کا یہ فیصلہ منفرد رائے کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے تحیر و اضطراب کا سبب یہ ہے کہ اس نے ادب کو علوم لسانی ہی میں سے ایک علم سمجھا، جو دراصل ادب کوئی علم نہیں ہے، بلکہ ایک کلامی فن ہے، جو ادیب سے صادر ہوتا ہے۔

ابن خلدون کا ادب کو علوم نظری میں شمار کرنا، اس کو طبیعت یا فطرت سے خارج کرنا ہے۔ ادب کا ایک موہبت فنیہ ہے، اس کا براہ راست تعلق طبیعت سے ہے، اس فن کی تحصیل، ادب پاروں، اشعار، نثر، لغوی اور نحوی مسائل کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ادب کا بھی ایک موضوع ہے، اور وہ ہے طبیعت یا فطرت، طبیعت یا فطرت سے مراد و ارادات (داخلیت) اور تاثرات (خارجیت) ہیں جن سے انسان اس مادی دنیا میں متصادم ہوتا ہے، انسان خارجی حقایق کا مظہر ہے، اور طبیعت داخلی کیفیات کی، ان پر تنقید و تبصرہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے، داخلی یا خارجی عوامل کی ترجمانی کا نام طبیعت یا فطرت ہے، یہی ادب کا موضوع ہے،

داخلیت اور خارجیت میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ خارجی اشیا یا مدرکات حسیہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۷ مطبوعہ مصر

کا تعلق انسان کے حواس ظاہری سے ہے، وجدان سے نہیں۔ انسان خارجی دنیا میں ان کا تجربہ کرتا ہے، اور ان حسیات کو اپنے وجدانی تاثرات یا وجدان سے الگ رکھتا ہے، اس کے برخلاف باطنی اشیا کے کہ وہ تجربوں، ضابطوں اور قاعدے قانون کی پابند نہیں، اندرونی احساسات بدلتے رہتے ہیں، ان کا تعلق طبیعت انسانی اور وجدانی تاثرات و انفعالات سے بلاواسطہ ہے، آج ایک چیز کو دیکھکر دل پر خوشی کا اثر ہوتا ہے، کل اسی چیز کو دیکھکر خوشی نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ داخلیت (قلبی کیفیات) بھی تغیر پذیر ہے۔

ادب کی تعریف کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

ثم انهم اذا اراد واحدّ هذا	جب انھوں نے اس فن کی تعریف
الفن قالوا: الادب هو حفظ	کرنا چاہی تو کہا کہ ادب نام ہے اشعار
اشعار العرب واخبارها	اور ادبی تاریخ کے حفظ اور ہر علم سے
والاخذ من كل علم بطرف	تھوڑا تھوڑا حصہ حاصل کرنے کا، وہ
يريدون من علوم اللسان	لوگ علم سے مراد لسانی یا شرعی
او العلوم الشرعية [1]	علوم لیتے ہیں۔

اس عبارت میں ابن خلدون ادب کو فن تسلیم کرتا ہے، اس سے پہلے اسی ادب کو علم سے تعبیر کرچکا ہے، قطع نظر اس بات کے کہ ابن خلدون کے نزدیک ادب علم ہے یا فن۔

اس عبارت پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ ادب کی مذکورۂ بالا تعریف جسکو ابن خلدون نے اس طرح لکھا ہے، جیسے وہ کسی سے نقل کررہا ہے، ثم انهم اذا اراد واحدّ هذا الفن قالوا: ادب کی ہے یا آدب کی۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۱

اگر اس سے مراد ادب اور ادبی کتابیں ہیں، جو ہم پڑھتے ہیں اور ادیبوں اور شاعروں سے سنتے ہیں تو یہ تعریف مکمل نہیں، اور اگر اس تعریف سے ان وسائل کا ذکر کرنا مقصود ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے ذوق ادبی کی جلا کرتا، انشاء پردازی کی طاقت کو اجاگر کرتا اور تنقید و تبصرہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، تو یہ تعریف تادب کی ہے۔ ادب کی نہیں۔ کیونکہ تادب ادب سیکھنے کو کہتے ہیں، جس کا بہترین وسیلہ کتاب ہے، ادب سیکھنے والا، لازمی ثقافت کی تحصیل جن وسائل سے کرتا ہے۔ انکا ذکر ابن خلدون نے اس تعریف میں کیا ہے۔ یہ ثقافت متادب کی زبان درست کرتی ہے اور اس کے ذوق ادبی کو نکھارتی ہے، اس لحاظ سے یہ تعریف ادب کے بجائے تحصیل ادب کی ہوئی۔

آرٹ (جمال)، شعر، خیال اور ادب ایسی اصطلاحات ہیں کہ انکی صحیح منطقی تعریف اسوقت تک نہیں کیجا سکتی، جب تک ذہن میں ان کا مفہوم واضح نہ ہو، اسکے برعکس اشیائے حسیہ جیسے مثلث (جیومیٹری)، جزیرہ (جغرافیہ)، ٹھوس یا سیال اجسام کی تعریف ممکن ہوتی ہے، ابن خلدون کے تحیر اور اضطرابی کیفیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے ذہن میں ادب کا مفہوم واضح نہیں، یہی وجہ ہے کہ ادب کی کوئی منطقی حد قائم نہیں کر سکا، اور نہ تعریف بالعوارض کرنے میں کامیاب ہوا، جس سے ادب کی وضعی شکل سامنے آجاتی۔ اس نے جو کچھ تعریف کی ہے وہ جزئی ہے کلی نہیں۔

حاصل اس بحث کا یہ ہے کہ ادب ایک فن کلامی ہے۔ جو عقل کی تعبیر اور ادراک و شعور انسانی کی ترجمانی کرتا ہے، وہ ایک مدلول عرضی ہے، اس کا تعلق تہذیب نفس اور انسانی خصائل سے بھی ہے، اور انفرادی اور سماجی زندگی سے بھی۔

ادب کی بنا جذبہ ہے، جو ادب میں خلود پیدا کرتا ہے، اس جذبہ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک کا تعلق خلود ادب سے ہے، دوسری کا شخصیت ادیب کی ترجمانی سے۔ مادی اجسام کے مقابلہ میں ادبی عبارتیں قائم بالذات ہوتی ہیں، ان میں باقی رہنے کی ایک ایسی صفت خلود ہوتی ہے کہ زمانہ فنا کر سکتا ہے اور نہ وہ

تحریریں جو بعد میں اس موضوع پر لکھی جاتی ہیں، پڑھنے والے ہر عہد میں ان کو پڑھتے ہیں، ان سے کبھی مستغنی نہیں ہوسکتے، عقل انسانی ترقی پذیر اور دیدنے والی شے ہے، تغیرات، جذبات کی ابدیت میں تبدیلی پیدا نہیں کرسکے، اس لیے ادب فی نفسہ بقائے دوام کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جذبہ جلد زائل ہونے والی چیز ہے، اس لیے وہ ادب کی بقا کا باعث نہیں ہوسکتا، لیکن یہ تناقض وہمی ہے، دراصل جذبے کا زوال ہی ادب کی بقا ہے، وہ عاطفہ ہی کی سرعتِ زوال ہے، جو ادبی اثر کو خلود اور انفعالاتِ ادبی کو دوام بخشتی ہے،

اس بات کو کلی کے جذبۂ شگفتگی سے سمجھا جاسکتا ہے، جو ایک سادہ خارجی مثال ہے، غنچہ، جذبۂ شگفتگی ہے، وہ ایک لمحۂ مختصر جس میں کلی مسکرائی، کلی کے بقائے دوام کا سبب بنا، اثارتِ جذبہ نے کلی کو پھول بننے پر مجبور کیا، کلی پھول بنکر کھلکھلائی، پھول زینت انجمن اور محو چمن آرائی ہوا، اگر کلی پھول نہ بنتی تو ہزار تنگیٔ داماں کی شاکی ہوتی، کلی کا کلی رہنا اس کی موت تھا، جذبۂ شگفتگی نے اسکو جمال آگہی دیا لو جہانِ آب وخاک و باد میں لباسِ زندگی سے مزین کیا۔

تاثرات کی تعبیر کے وقت ہی ادیب کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ادب، فن کی شکل اختیار کرتا ہے، اور ادیب کی مزاجی ہیئت اور طرز ادا کی بھی ترجمانی کرتا ہے، تاثر نفسی کو ادبی خلود اور ادیب کی شخصیت کی ترجمانی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس سے ادب اور زندگی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے، جو جذبات و واردات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو اشعار میں منظوم کرتا ہے، وہ جذبات ہم کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح خود شاعر نے محسوس کیے، اس تعریف کا اطلاق صرف شاعری پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ تمام ادب کا یہی حال ہے، ادب تنقید حیات ہے، وہ زندگی کا شعور بھی ہے اور تفسیر حیات بھی، ادیب کے لیے سماجی شعور کے بغیر تفسیر حیات مشکل ہے، ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیات و کائنات کا مشاہدہ کرکے اپنے اندر سماجی شعور پیدا کرے۔

ادبی تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب خارجی یا داخلی حسیات جمال کی عکاسی اس طور پر کرے کہ تصویر کا حقیقی رخ پڑھنے والے کے سامنے آجائے، اس سے دل متاثر ہو اور ایسا ہی محسوس ہو جیسا کہ اصل تصویر میں ہے۔ وہ قوت جو اس تصویر کشی کی تکمیل کرتی ہے، اسکو قوتِ خیالیہ کہتے ہیں۔

جذبہ اور خیال کی طرح فکر بھی ادب کا ضروری عنصر ہے، ادبی موسیقی، جذبہ و فکر کی آمیزش سے نغمے جنم دیتی ہے، اور سروں کو لفظ و معنی کا لباس پہناتی ہے، جو عبارت دل پر اثر کرے وہ ادب ہے اور وہ افکار و حقایق جو ممتزج بالعواطف ہوں وہ بھی ادب ہیں۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخی کتابیں کب ادب بنتی ہیں۔

صحیح افکار، جذبے کو خلود دیتے ہیں، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم تنقید کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، جذبہ نام ہے تاثیر عملی کا۔ شعور، وجدان جس علم جزئی ہیں تمام جزئیات سے ایک مشترک مفہوم اخذ کرنے کا نام فکر ہے، شعور جزئی ہے اور فکر کلی۔ اس لیے شعور اور فکر کے درمیان اتصال عین حقیقت ہے، خواہ یہ اتصال کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔

جذبہ، فکر اور خیال کی طرح اسلوب بھی عناصر ادبی میں داخل ہے، اسلوب ایک حقیقت خارجیہ ہے جو مواد اور صورت کے امتزاج سے ادب کے خوبصورت مرقعے تیار کرتا ہے، وہ تخیل کو حقیقت اور واقعیت کی طرف لے جاتا ہے، ادب میں صورت و معنی کی ہم آہنگی ہی سے مرحلۂ شوق کی دشوار گذار راہ آسان بنجاتی ہے۔

اسلوب، جذبات کو برانگیختہ کرنے کا کام دیتا اور افکار کو لباس جمیل سے آراستہ کرتا ہے۔ اگر معانی متوسط اور خیالات فرسودہ ہوں لیکن اسلوب جاندار ہو تو عبارت میں موسیقی اور دلکشی آجاتی ہے، اسلوب ہی عبارت کو موثر اور خوبصورت بناتا ہے، اسلوب عارضی یا اتفاقی چیز نہیں فطری چیز ہے، جو ذوق سے حاصل ہوتا ہے۔

ہیئت۔ غایتِ ادبی نہیں۔ وہ ادائے معانی یا حقایق کی تعبیر کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے نہ تنہا مواد سے کام چل سکتا ہے اور نہ شکل وصورت سے۔ ان دونوں میں تناسب ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے۔ اسلوب ایک سماجی عمل ہے۔ اچھا اسلوب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہیئت اور اظہار کی سماجی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادیب اور قاری کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے۔ جمالیاتی اسلوب۔ نثر میں خیال کا آہنگ اور شعر میں جذبے کا ترنم بن جاتا ہے۔ فنکار اپنے جمالیاتی تجربے یا جذبے کے اظہار میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔

انسان لاشعور، علامتوں اور تمثالوں کا سرچشمہ ہے۔ علامتی اظہار، حسن کاری کو وجدان اور لاشعور سے قریب کرتا ہے۔ لاشعور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، جسے اشاریت کہتے ہیں، دروں بینی اور اشاریت اظہار کو ماحول کا داغ اور تہذیب وتمدن کی زبان دیتی ہے، مادی کشمکش سے فنکار کا احساس جمال متاثر ہوتا ہے۔

اشاریت ایک بے ساختہ ذریعۂ اظہار ہے۔ جو رسمی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس اعتبار سے ایمائی طرزِ فکر ایک فطری طریقہ ہے۔ وہ نفس کی گہرائیوں سے امنڈ کر نمودار ہوتا ہے۔ اشاریت، احساس کی ارتقائی منزل ہے، وہ الفاظ کو تصورزائی کی طرف لے جاتی ہے۔ تصورزائی ایک لازوال عطیۂ فطرت یا ناقابلِ اعتبار انتقال اسلوب ہے، جو کتاب یا ادبی عبارت کو قیمتِ خالدہ عطا کرتا ہے۔

شعر الہند حصہ اوّل

اسمیں قدماء کے دور سے لیکر دورِ جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل کیگئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ ومقابلہ کیا گیا ہے۔

(مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم) ضخامت ۴۹۴ صفحے۔ قیمت :- ۸ عہ

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۸)

چنتامن | چنتامن (चिंतामन) تکوان پور (کانپور) کے باشندہ رتناک ترپاٹھی کے بیٹے تھے، بھوشن مت رام اور جٹا شنکر ان کے بھائیوں کے نام تھے، علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد است و دو برادر او بھوکن و مترام نیز شاعر خوش فکر مشہور اند ..... در علم سنسکرت سرآمد اقران بود و در سرکار شاہ شجاع بن شاہ جہان بادشاہ باعزت بسری برد۔"[1]

یہ غالباً عرصہ تک ناگپور میں سوارج بنسی بھونسلہ راجہ کرند شاہ کے یہاں مقیم رہے، اور ان ہی کے حکم پر انھوں نے اپنی تصنیف پنگل تلمبند کی جیسا کہ ان کی تحریر سے واضح ہے۔

سوارج بنسی بھوسلا سست ساہ مکرند	مہاراج دگپال جم بھال سمد سبھ چند
چنتامن کو کہ حکم کیو ساہ مکرند	کرو کچھ پچھن سہت بھاشا پنگل چھند

چنتامن کا سنہ پیدائش ۱۶۰۹ء تسلیم کیا جاتا ہے، ان کی چھ تصانیف کا پتہ چلتا ہے جنکے نام کا بیہ ببیک، کوی کل کلپترو، کا بیہ پرکاش، رس منجری، پنگل اور رامائن ہیں، انکے علاوہ کتب خانہ دتیہ میں نمر گنتا منجری نام کی ان کی ایک اور تصنیف ملی ہے لیکن یہ کتاب دراصل شاہ اکبر

---

[1] علامہ آزاد بلگرامی - سرو آزاد، ص ۶۶ - ۶۵

کی آندھرا بھاشا میں لکھی ہوئی تصنیف ہے، جس کا ترجمہ سنسکرت سے ہو کر ہندی میں چنتامن کے ذریعہ ہوا، رامائن کو چھوڑ کر بقیہ سبھی تصانیف کا بیہ شاستر سے متعلق ہیں، ان کا سب سے زیادہ مشہور ومقبول گرنتھ کوی کل کلپترو (कविकल कल्पतरु) ہے۔

چنتامن کا شمار شرنگار کال کے اساتذہ میں ہوتا ہے، انھوں نے کیشو کی طرح بھامہ اور دنڈی کی تقلید نہیں کی، بلکہ ممٹ اور وشوناتھ کے راستے پر چلے، اور اس کے بعد ریتی کال کے مختلف آچاریوں نے چنتامن کی تقلید کی، رام چندر شکل ایک مقام پر رقم طراز ہیں:

"ہندی ریتی گرنتھوں کا سلسلہ چنتامن ترپاٹھی سے چلتا ہے۔ اسلیے ریتی کال کی ابتدا ان سے سمجھنی چاہیے"[1]

لیکن ڈاکٹر نگیندر شکل جی کے اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"چنتامن کو بھی یہ فضیلت عطا کرنا ظلم ہے، کیونکہ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے بعد ریتی کال کا دھارا بغیر کسی رکاوٹ کے بہہ نکلا" (ڈاکٹر نگیندر۔ ریتی کاویہ سنگرہ، صفحہ ۲۲-۱۹)

چنتامن کے کلام کے بارے میں ڈاکٹر جگدیش گپت کا یہ خیال ہے کہ آچاریہ ہونے کے باوجود شعریت کے لحاظ سے چنتامن کا مقام کافی بلند ہے، رس وادی شاعر ہونے کی بنا پر ان کے کلام میں شرنگار رس کا بیان تفصیل سے ہے، لیکن اس میں مترام اور دیو جیسے شعرائے متاخرین کی جیسی معنویت نہیں پائی جاتی، البتہ تخئیل کی سادگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے یہ مترام کے مقابلہ میں ضرور لائے جاسکتے ہیں، ان کا کلام مجموعی طور سے نہایت صاف ستھرا ہے، اس میں ایک ترنم اور نغمگی پائی جاتی ہے، (ڈاکٹر جگدیش گپت، ہندی ساہتہ کوش صفحہ ۱۷۳)

نمونہ کلام یہ ہے:

کیسر بارہ بار اتارت کیسر انگ لگاون لاگی — آئی ہو نین نچلاتا درگ نچل آپ چھپاون لاگی
دولھ کے اولکن کو واٹ ان جھوکن آون لاگی — دوس دو تنیک تھے بتیا من بھاون کی من بھاون لاگی

---

[1] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۵۹

دیو | دیو کا پورا نام دیودت تھا، سنہ پیدائش ۱۶۷۳ء ہے، یہ اٹاوہ کے باشندے تھے جس کا ذکر انھوں نے بھاو ولاس میں کیا ہے،

دیو سریا کوی دیو کو نگر اٹاوا باس جو دن نول سبھاو رس کیھو بھاو ولاس

اس دوہے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کانیہ کبج (कान्यकुब्ज) برہمن تھے کیونکہ دیو سرما کانیہ کبج برہمنوں کو کہتے ہیں۔ دیو کی زندگی کا ابتدائی حصہ مالی اعتبار سے اچھا نہیں تھا، ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والا یہ فنکار فکر معاش میں مختلف درباروں کی خاک چھانتا پھرا، کبھی اس نے اعظم شاہ کے سنگ در پر سجدہ کے لیے جہین نیازنامہ کی اور بھاو ولاس اور راشٹ بام جیسی تصانیف حصول انعام کے خاطر نذر کیں، کبھی راجہ سیتا رام کے بھتیجے سیٹھ بھوانی دت کے لیے بھوانی ولاس لکھی کبھی ریاست پھپھوند کے راجہ کشل سنگھ کی دلجوئی کے لیے کشل ولاس تصنیف کی کبھی سیٹھ بھوگ لال کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور کبھی راجہ ادیوت سنگھ کے نام پر پریم چندر کا پیش کی، کبھی ولی کے رئیس پالی رام کے بیٹے سجان من کیلئے سجان دنود لکھی اور کبھی بہانی کے حاکم اکبر علی خاں کی خدمت میں سکھ ساگر ترنگ پیش کیا،

دیو کی تصانیف کا دائرہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، ان کی تعداد کوئی ۵۲ بتاتا ہے اور کوئی ۷۲۔ ان میں سے ۱۸ کتابوں کے قلمی نسخے حاصل ہو چکے ہیں۔ شعر و نگار کا کے کسی اور شاعر نے اتنی تعداد میں اور اس قدر وسعت نظر کے ساتھ تصنیف نہیں کی، دیو در اصل ایک رومان پرور اور عاشق مزاج شاعر تھے، رومانیت اور تعشق ان کے کلام کا نمایاں حصہ ہے، ان کی منظومات میں سے جس شعر کو بھی اٹھا لیجئے وہ محبت کی چاشنی، رومان کی لذت سے خالی نہ ہوگی۔

دیو کے کلام میں تخیل کو بڑا دخل ہے، وہ تخیل کے سہارے ایسے مجسمے تراشتے ہیں جو حسن کے اعتبار سے بے نظیر ہیں، دیو کی شاعری تاثراتی ہے، اس لیے پرکشش اور پرکیف بھی ہے، جذبات کے مطابق زبان میں لوچ پیدا کرنا دیو کا خاص حصہ ہے، قواعد کے اعتبار سے دیو کی زبان میں کچھ کمی ضرور نظر آتی ہے لیکن کسی محبوبہ

کے تحت ایسا کیا ہے، اس سے اس کی صلاحیتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نمونۂ کلام یہ ہے،

دیو میں سیس بسا یو سنیہ کے بھال مرگمی بنھی کے بھاکھیو کنچکی میں چر پوکر چر دا لگائی لیو ارسوں اجلا کھیو
کے مکھنول گئے گئے رس موتی دن سنگار کے چاکھیو سانورے لال کو ساتوں دروپ میں کو کجرا کر راکھیو

مترام | مترام کی پیدائش سمبت ۱۹۲۳ء میں ضلع کانپور کے ایک گاؤں تکوان پور میں ہوئی، ڈاکٹر بھگیرتھ مصر نے اس گاؤں کا نام ٹیکا پور لکھا ہے جو صحیح ہے، مترام، چنتامن اور بھوشن کے بھائی تھے، ان کا کلام شیرینی اور حسن کے لحاظ سے بہت خوبصورت ہے، مترام کی طبیعت کا جھکاؤ رس کی طرف زیادہ ہے ان کی مشہور تصانیف میں للت للام، رس راج، پھول منجری، چھند سار سنگل، ست سئی، ساہتیہ سار لکچھن سرنگار اور النکار پنچاشکا ہیں، ان تصانیف میں للت للام اور رس راج زیادہ مقبول ہیں

للت للام (ललित ललाम) النکار سے متعلق ہے، اور بوندی کے حاکم بھاؤ سنگھ کی تعریف میں ہے، اس میں چتر کے علاوہ باقی سب النکاروں کو صنعت معنوی یا آرتھ النکار تسلیم کیا گیا ہے۔ انھیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صنعتوں کی تعریف میں شاعر نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اس کی پیش کردہ مثالیں بیشتر مقامات پر صنعتوں کی تعریف سے میل نہیں کھاتیں۔ اہم بعض مقامات پر شاعر نے صنعت کی تعریف اور اس کی مثالیں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہیں، مثلاً اپہ نکار یا صنعت تشبیہ کی تعریف وہ یوں کرتا ہے۔

جا کو ورڑن کیجئے سوا پمیئہ پرمان جا کی سمتا دیجئے تاہ کہت پرمان
جہاں برنئے دھن کو سم چھپ کو اللاس پنڈت کب مترام تہہ اپا کہت پرکاس

اور اس کی مثال پیش کرکے اس کو اور واضح کر دیا ہے۔

مترام کی دوسری مقبول تصنیف رس راج ہے جس میں تشبیہ کے ذیل میں نائیکاؤں کے اقسام پر تفصیل سے لکھا ہے، مترام کے نزدیک نائیکا وہ ہے جس کو دیکھکر قلب کی گہرائیوں میں انبساط یا

رس پیدا ہو ؎

ایکت جاہ ولوک کے چت بیچ رس بھاو

لیکن یہ تعریف ناقص ہے، حریف کو دیکھکر اگر دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو تو حریف کو نائیکا نہیں کہہ سکتے، رس راج اصلاً کا یہ گرنتھ ہے، شاستر گرنتھ نہیں، شاستریہ کی کسوٹی پر اس میں کمی پائی جاسکتی ہے، شرنگار اور نائیکا بھید کے بیشتر گرنتھ اسی نوعیت کے ہیں، سکھ دیو مصرکا 'رسارنو' بھی نائیکا بھید کا ہی گرنتھ ہے، اس کے علاوہ رام جی کا نائیکا بھید گوپال رام کا رس ساگر لبراہم کا رس ویویک کلیان داس کا رس چند وغیرہ گرنتھ بھی اسی طرح کے ہیں۔

نائیکا کے بیان میں مترام کا ذیل کا سوپا بہت مقبول ہے،

کندن کو رنگ پھیکو لگے جھلکے ات انگن چار گرائی — آنکھن میں السان چتونی میں نیچ ولاس کی سرسائی
کوبن مونی بکات نہیں مترام لہے مسکان مٹھائی — جیوں جیوں نہارے تیرے ہوت تیوں تیوں کھری کرے سی کمائی

مترام کے نائیکا بھید میں اکبر شاہ کی رس منجری کی ہی تقلید کی گئی ہو، سو کیا یعنی عنیفہ کی تین قسمیں مگدھا (صغیرہ) مدھیا (متوسط) اور پرودھا (کبیرہ)۔ صغیرہ کی قسموں میں نوودھا یعنی نازہ اور نشرنہ نوودھا یعنی راغبہ، مدھیا یا متوسطہ کی قسموں میں دھیرا (صابرہ) ادھیرہ (غیر صابرہ) اور دھیرادھیرا (صابرہ غیر صابرہ) اولاسی طرح پرودھا کی بھی دھیرا، ادھیرا۔ اور دھیرا دھیرا قسمیں۔ اور پرکیا یعنی بتیہ کی قسموں میں گپتا (مخفیہ) بدگدھا (فاطنہ) کلٹا (فاسقہ) انوشیانا (فاحشہ) لکچھتا (مسترہ) متا (معلنہ) انوڑھا (باکرہ) اور اوڑھا (ثیبہ) کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ پریم گرہتا، روپ گرہتا اور مان گرہتا نائیکاؤں کا بیان مترام نے کیا ہے۔ اس کے بعد پرشت پتکا، کھنڈتا، کلہنترتا، پریپھا، اکنٹھتا، واسک سجا سوادھین پتکا، ابھسارکا پروتسیت پرسی اور آگت پتکا کا بیان ہے۔ نایک کے اقسام میں مترام نے پتی، اپ پتی،

اور ویسک تین قسمیں درج کی ہیں، اس کے بعد چار طرح کے نایک۔ انوکول، دکھن، شٹھ اور دھرشٹ کا بیان ہے، یہ اقسام پتی بھید کے ذیل میں ہیں، اُپ پتی اور ویسک کی قسمیں علٰحدہ بیان کی گئی ہیں۔

مدھنایک | مدھنایک کا ذکر بھکتی کال کے شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے لیکن مدھنایک چونکہ اصلاً ریتی اور شرنگار کے شاعر ہیں، اسی لیے یہاں ان کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے، بلگرام کے ہندی شعراء میں مدھنایک کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے، کابیہ شاستر اور موسیقی کے آچاریہ مدھنایک شرنگار کال کے ہندی شعراء کی محفل کا ایک بیش قیمت جوہر ہیں، مدھنایک ایک ہی وقت میں ایک بے مثال موسیقار، ایک کامیاب شاعر، ایک عظیم آچاریہ اور ایک سچے عاشق ہیں۔

مدھنایک (मधुनायक) کے تخلص کو ہندی کے محققین نے مختلف انداز سے لکھا ہے، ڈاکٹر بھگیرتھ مصرا سے مدنایک (मदनायक) لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر برج کشور مصر کے یہاں یہ لفظ میرزا مدنایک ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر شتو لعل جوشی نے اسے مدھونایک (मधुनायक) لکھا ہے اور شری گوپال چند رستگھ اسے مدھنایک لکھتے ہیں۔ مدھنایک کا تخلص در اصل مدھنایک ہی تھا، مدھونایک یا مدھنایک نہیں، چنانچہ شاعر بلگرامی خلف میر عبدالجلیل بلگرامی تبصرۃ الناظرین میں لکھتے ہیں:

"اما مدھنایک لفظے است ہندی معنی آں واسطۃ العلاوہ یعنی جوہر میانہ جمیل کہ بسیار خوب دگذیدہ تر می باشد، چوں سید مشار الیہ تخلص در شعر ہندی ہمی لفظ می کرد ند لہذا بہ ایں نام اشتہار یافتند۔" (قلمی جیب گنج فارسی ۳۳ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مدھنایک نے بھی ایک دوھے میں اپنے اس تخلص کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مکٹ ھول مَن لال دُتِ ادے ٹیک مَن جوت برن چنی جم اردھی مدھنایک مدھ ہوت

مدھنایک نے اپنی پوری شاعری میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ پڑھنے والا انکی نغمگی میں کھو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، مدھنایک کے اشعار موسیقی کو ساتھ لیکر چلتے ہیں، ذیل میں شاعر نے دھیمار ٹیکا

کو خوبصورت سیج پر محو خواب دکھایا ہے، شاعر کے انداز بیان اور منظر کشی میں کتنی دلکشی ہے۔

سووت سروج کھی سکھ سمیپ سیج ہت اتھکارن سدن سکھ پالی کے

ڈھانکی پٹ آنچر لپیٹ نکھ سکھ ہوتیں پت پیاری نرکھ للچا تی کے

پڑھ ڈھگ سم بھرم سکچ آن ہت جان پاوے نہ چپل چھل چھدن چھپاتی کے

چھاتی لائی لائی ہانتی بھانوتی اپندی کینھیں جیئی پیہ چاہیں لیس سوت جگائی کے

سرے پاؤں تک باریک ڈوپٹہ میں لپٹی ہوئی نائیکا کو دیکھکر اس کا محب مچل اٹھتا ہے، اور آہستہ آہستہ جگاوتا ہے، جگانے کا انداز بھی خوب ہے، ذیل کے چھند میں نایک کرشن کو زرد رنگ کی پچھوری لپیٹے ہوئے آتا ہوا دیکھکر نائیکا کی آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کی زبانی شاعر نے جانے کیا کچھ کہدینا چاہا ہے

چندن چیر نوتن سانورے کا چھن ھو ہت آوت سو ہن

پیت پچھوری پچھا ہن چھاجت نیہن رنگ رچیورت چھو ہن

کنڈل منڈت منچل منجری نوتن نوت لتا کری جو ہن

آنسن کی اولی اچھے مدھنا یک بال بلوکت مو ہن

مدھنا یک جی نے اپنی تصنیف مدھنا یک شتکار میں رس کے بیان اور نائیکا بھید کو اپنا موضوع قرار دیا ہے، مدھنا یک جی کا نائیکا بھید قدیم روایتوں کی تقلید کے باوجود انوکھا اور نرالا ہے، انکی شاعری میں کہیں کہیں فطرت کے خوبصورت مناظر بھی ہیں لیکن فطرت کا آزاد تصور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ برسات کا ایک منظر یہ ہے:

برکھت بوندن اکھنڈ دھارا دھارا دھر جھوں دھان دمنی لیٹ دام دامنی

بھرے نیر ساگر امنڈ چلے ندی ندا ری کھوری سیت کھیت پنک پانی جامنی

اور ٹھور لبسکو نیم امیو پریم کہا موسے آن بھونن نہ بھائے بھوری جامنی

آیئے ہیں جو پریمی تو کھی کالی نیمی سجنی لے ہوئی ہیں نئی ناگ نولی کام کامنی

رسلین بلگرامی رسلین ہندی کے ایک مقبول شاعر ہیں، ان کا اصل نام سید غلام علی اور تخلص رسلین تھا، انھوں نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن ہندی کے شاعر کی حیثیت سے ان کا جو مقام ہے وہ فارسی میں نہیں ہے، ہندی کا ایک مشہور دوہا جسے اکثر حضرات بہاری کا سمجھتے ہیں، درحقیقت رسلین جی کا نتیجۂ فکر ہے، وہ دوہا یہ ہے

امی ہلاہل مدبھرے سیت سیام رتنار — جیت مرت جھک جھک پرت جو چوت اک بار

اس کا اردو منظوم ترجمہ یہ ہے

آب حیات زہر ہلاہل شراب ناب — چھلکے ہے چشم سرخ و سیاہ و سپید سے
جی اٹھے جاں ہلاک کرے کھوئے عقل و ہوش — اک بار جو بھی تیری نگاہوں میں دیکھ لے

رسلین جی سید باقر بلگرامی کے بیٹے تھے، ان کی ولادت بلگرام میں ۱۱۱۱ھ میں ہوئی تھی، ان کی تاریخ ولادت علامہ عبدالجلیل بلگرامی نے یہ تحریر کی ہے

نور چشم میر باقر گفت با من — چوں گل خورشید در عالم دمیدم
سال تاریخ تولد خود بگفتم — نور چشم باقر عبدالحمیدم ۱۱۱۱ھ

رسلین کی تصانیف میں رس پُرلودھ، انگ ورپن اور متفرق کتابیں ہیں، رس پرلودھ ۱۱۵۴ھ میں اور انگ ورپن ۱۱۹۰ھ میں ہے، میر آزاد بلگرامی نے انگ ورپن کے دوہوں کی تعداد ۷۷ اکھی ہے، غالباً انھوں نے آخر کے تین دوہے جو تصنیف کے خاتمہ سے متعلق ہیں، شمار نہیں کیے ہیں، ان کی کتابوں کی ابتدا شاعر نے حمد و نعت سے کی ہے، اسکے بعد بغیر کسی ترتیب کے نائکاؤں کا بیان ہے۔

رسلین سے متعلق عام ہندی محققین کی طرح ڈاکٹر محمد حسن حقانی لکھتے ہیں:

"رسلین نے اپنے کو صرف دوہوں تک ہی محدود رکھا ہے اور اس میں بھی انکی توجہ لفظی صناعی اور اظہار کمال پر زیادہ رہی ہے، داخلی جوش اور سوز و گداز پر نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے غالباً سروآزاد کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اگر وہ اس کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو یہ غلط فہمی نہ ہوتی کہ رسلین کی شاعری صرف دو ہوں تک محدود ہے، میرآزاد و ملگرامی نے سروآزاد میں رسلین کے کئی کتب درج کیے ہیں، البتہ لفظی صناعی اور اظہار کمال پر ان کی زیادہ توجہ کا خیال ایک حد تک درست ہے، لیکن یہ کہنا کہ ان کی توجہ داخلی جوش اور سوز و گداز پر نہیں تھی، بے بنیاد ہے۔ رسلین کے داخلی جوش اور سوز و گداز کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے: نایک نے پردیس جاتے وقت نائیکا سے اپنے واپس آنے کا ایک وقت معین کر دیا تھا، جو گذر چکا ہے، اور نائیکا بالکل مایوس ہو چکی ہے کہ اچانک نایک آجاتا ہے اور رات بھر نائیکا کے ساتھ رہنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے علی الصباح چلا جاتا ہے، اس موقع پر رسین جی نائیکا کی قلبی کیفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں کہ جیسے مشعل ایک مرتبہ روشن ہو کر گل ہو گئی اور دوبارہ اس کو کسی نے تیل میں ڈبو کر روشن کر دیا ہو۔

اودھ گئے ہر کے رسلین سو بیتے ہیئے دھن آک نئی ہے
تا سمے ہر آئی اچانک دیکھت ہیں سیراتی گئی ہے
بھور ہیں پھیر چلے تن کے اب تو گت ایسی بچا لئی ہے
نو مسال بھی بر کے پھر نیہ میں بور چڑھائی دلی ہے

ویل کے کبت میں مجبور نائیکا کہتی ہے کہ جب وقت سے پیتم پردیس گئے ہوئے ہیں ایک پل کیلئے بھی خوشی میسر نہیں ہوئی، جدائی کے لمحات قصاب کی طرح جان لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں، ایسی حالت میں درد دل کس سے بیان کیا جائے، اس وقت کام دیو بھی کمان میں تیر چڑھا کر مسلسل حملہ کر رہا ہے، اے راہ گیر تیرا بڑا احسان ہوگا اگر تو نول کشور یعنی کرشن جی سے صرف اتنا جا کر کہہ دے کہ ان کی عدم موجودگی میں جو مظالم مجھ پر ڈھائے جا رہے ہیں انھیں میں کس طرح برداشت کر سکوں گی۔

جب تیں سدھارے پردیس رسلیں پائے تب تیں تنک اس سکھ کو نہ لہے
برہ کسائی دکھدائی بھیو آوے نت میرو پران لین یہ کا سوبھا کہے
ایتے پر پنچ بان بان میں گھے کمان مارے تک تک بان کیسے کے نبہے
پتھک نہور کھو نول کسور جو سوں تم بن جور کون کون کون سہے

ریتی عہد کے عظم شاعروں کا سلسلہ رسلین پر ختم ہو جاتا ہے۔

شر نگار کال کے ساتھ سیاسی اور سماجی حیثیت سے ہندوستان کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آچکا تھا، نئی سیاسی قوتیں پرانے نظام حیات اور قدیم طرز تمدن کی بساط تہہ کر رہی تھیں، ہندی ادب بڑی تیزی کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا، وہ ایک ایسے باب میں داخل ہو رہا تھا جسے بہت وسیع معنوں میں دور جدید کہا جا سکتا ہے۔

(باقی)

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتداء، عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے،

ضخامت ۳۶۸ صفحے قیمت للعہ

منیجر

باب التقریظ والانتقاد

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری

از سید محمد الحسنی، صفحات ۲۴۴، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، قیمت ۷ر

جناب مولوی حافظ محبوب اللہ صاحب ندوی

تحریک ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن اور اسکے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری کی مفصل سوانحعمری ہے، جسے دارالعلوم ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے، اس میں مولانا کی ابتدائی زندگی سے لیکر وفات تک کے حالات بڑے شستہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی پاکیزہ زندگی کے واقعات پڑھنے سے آج بھی اللہ کی محبت، اتباع سنت کا جذبہ اور دردمندی اور دلسوزی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مولانا محمد علی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے اجل خلفاء اور ہمعصر علماء وصلحاء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، انکے ذریعہ ہزاروں آدمیوں کو توبہ وانابت کی سعادت نصیب ہوئی، زہد واتقاء کے ساتھ وہ ایک وسیع النظر داعی، مفکر اور کامیاب مصنف بھی تھے، انھوں نے چھوٹی بڑی پچاس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، خاص طور پر روعیسائیت اور قادیانیت پر انکی کتابیں بہت ہی مقبول ہوئیں، ان ہی خصوصیات کی بنا پر تحریک ندوۃ العلماء کے محرکوں نے جن میں مولانا خود بھی شامل تھے، ان کو اسکا پہلا ناظم مقرر کیا، جس پر وہ عرصہ تک رہے کئی برس بعد بعض داخلی اور خارجی حالات کی وجہ سے وہ اس سے مستعفی ہوگئے، اسلیے ضرورت تھی کہ مولانا کی ایک مفصل اور پُرمعلومات سوانحعمری شائع کیجاتی، اس کتاب سے یہ ضرورت بدرجۂ اتم پوری ہوگئی، کتاب میں کل سات ابواب ہیں، جن میں مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر کئی وجوہ سے کتاب کا سب سے زیادہ قابل توجہ اور جاذب نظر تیسرا اور چوتھا باب ہے، خصوصیت کے ساتھ اہل ندوہ کے لیے۔

مولانا کی زندگی اور اسکے مختلف گوشوں کے بارے میں بعض جزئیات کو چھوڑکر دوسرا مشکل سے ہوسکتی ہیں، مگر ان دونوں ابواب میں جن مسائل کو چھیڑا گیا ہے، ان سے نہ صرف کتاب کے بارے میں بلکہ ان سے متعلق جو افراد بھی

زیر بحث آگئے ہیں حتی کہ خود مولانا کی ذات کے بارے میں بھی دو رائے کا ہونا یقینی ہے، ان ابواب میں جن زاویوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ندوہ کی وسیع النظری اور واقعیت ہی نہیں بلکہ خود مولانا کی سیرت کی افادیت بھی قدرے مجروح ہوجاتی ہے، ان ابواب میں واقعات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دیکر تحریک ندوۃ العلما اور تاریخ دارالعلوم ندوۃ العلما کے سلسلے میں بعض ایسے نئے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کیگئی ہے جو نہ حیات شبلی کے مصنف کے علم میں تھے اور نہ ندوہ کے سالانہ جلسوں کی رُوداد میں ہی ان کا ذکر ملتا ہے، ان ابواب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص مزعومات و احساسات کو واقعات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ سازی ہے، اس بدعت کی ابتدا انگریزوں نے کی تھی، جسے سیاسی تاریخ نویسوں نے اپنالیا، اور اب مذہبی حلقے بھی ان ہی نقش قدم پر چل رہے ہیں، تاریخ سازی کی سب سے بڑی خصوصیت مبالغہ آمیزی (تعریف و مدح میں یا قدح میں) اور جذباتیت ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے حقیقت اور واقعیت مسخ ہوجاتی ہے، خوب، ناخوب اور ناخوب خوب بنجاتا ہے، ادھر ندوہ سے جتنا لٹریچر نکل رہا ہے اس میں اس طرح کے عناصر کی کارفرمائی بہت نظر آتی ہے، اور اسی کا ایک مظہر اس کتاب کے دو ابواب بھی ہیں،

تحریک ندوۃ العلما کے کارفرماؤں نے اردو کے افسانوی ہمہ گیر اور جذباتی لٹریچر میں الندوہ اور دوسرے ذرائع سے جو انقلاب برپا کیا تھا، اس سے علم و ادب اور فکر و نظر کے تمام گوشے متاثر ہوئے تھے، الندوہ کی روش کو چھوڑنا تحریک ندوہ کی علمی حیثیت اور تاریخیت کی طرف سے ایک گمانی کی فضا پیدا کرنے کے مرادف ہے، یوں تو ان ابواب میں بہت سی باتیں قابل بحث ہیں لیکن بخصوصیت سے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان ابواب کے مطالعہ کے دوران میں سب سے پہلی بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ تحریک ندوۃ العلما کو ایک مخصوص ذہن کی پیداوار قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ یہ تحریک کسی ایک ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ایک اجتماعی احساس زیاں تھا، جو انفرادی طور پر بہت سے دلوں میں پیدا ہوا، اور اس نے مدرسہ فیض عام کے جلسۂ دستار بندی میں ایک اجتماعی شکل اختیار کرلی، سید صاحب حیات شبلی میں مدرسہ فیض عام کے جلسہ میں شریک علماء کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مشرق و مغرب کے بھی دونوں مطلع تھے جس سے ندوۃ العلما کا آفتاب طلوع ہوا۔" (ص ۳۰۷)

پھر آگے لکھتے ہیں:- "اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ ابھی مشورہ سے علما کی ایک مجلس قائم کیجائے۔" (ص ۳۰۸)

پہلی روداد میں مولانا محمد علی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔

"جب بہت سے نامور علما، بسبب فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اس وقت "بعض دوراندیش" علما نے تحریک کی کہ ایک انجمن علما کی قائم کیجائے، اس تحریک کو تمام علما موجودین نے پسند فرمایا۔" (ص)

مولانا خود دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ یہ کسی ایک یا دو چار مخصوص ذہن کی پیداوار نہیں ہے

"ندوۃ العلما، ایسی انجمن نہیں جو کسی ایک شخص کے خیال سے یا دو چار آدمیوں کے مشورہ سے بغیر سمجھے بوجھے قائم کر لی گئی ہو۔" (ص ۳۰۸)

"بعض دوراندیش" سے ظاہر ہے کہ مولانا نے اپنی ذات تو مراد نہیں لی ہوگی، بلکہ صورت یہ ہوئی کہ موجود علما میں بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا، چونکہ یہ سب کے دل کی آواز تھی اور بہت سے دلوں میں پہلے سے اس کے لیے اضطراب موجود تھا، اسلیے اس پر اتفاق ہو گیا، اور وہ مجلس قائم ہو گئی، مولانا محمد علی اسکے صف اول کے موسسین میں تھے، اس کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے، پھر دوسرے سال جلسۂ دستار بندی کے موقع پر تشریف لائے، اور اسی کے ساتھ ندوہ کا اجلاس بھی کیا، مولانا نے روداد میں یہ بھی لکھا ہے کہ بہت دنوں تک واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر مدرسہ فیض عام کے جلسہ کی وجہ سے آنا پڑا۔

اس حصہ کو مصنف کتاب بالکل نظر انداز کر گئے ہیں

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ تحریک کسی ایک شخص کے جیسا کہ خود مولانا محمد علی نے تحریر فرمایا ہے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ بہت سے دردمند اور مضطرب دلوں کی آواز تھی جس نے ایک اجتماعی تحریک کی صورت اختیار کر لی،

مولانا اسکے پہلے ناظم ضرور مقرر ہوئے، مگر اس سلسلہ میں مولانا کا کوئی ایسا انقلابی اور انفرادی کارنامہ نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ندوہ کا ان کو بانی قرار دیا جائے، اسلیے کہ کسی تحریک یا ادارہ کے بانی کا طرز عمل ایک داعی کا سا ہوتا ہے، وہ ایسے کام کرنے والے کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسکو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، وہ اسکی ساری دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے، وہ اسی کی خاطر سوتا اور اسی کی خاطر جاگتا ہے، علم و تقویٰ کے تمام امتیازات کے باوجود یہ چیزیں ہمیں مولانا کی عملی زندگی میں نظر نہیں آتیں، اور نہ کتاب میں کوئی واقعی دلیل فراہم کی گئی ہے، بلکہ مولانا کا بار بار استعفیٰ پیش کرنا اس دعویٰ کے خلاف دلیل ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خط کا جو جملہ نقل کیا گیا ہے اسکی تردید خود مولانا کے مذکورۂ بالا بیان ہی سے ہوتی ہے پھر یہ بات خود قابل بحث ہے کہ کسی تحریک یا ادارہ کا بانی قرار دینے کے لیے اسکے انفرادی کارناموں اور بنیادی لٹریچر کے بجائے دستاویزوں کے ذاتی خطوط سے دلیل فراہم کیجائے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں ہیں، مگر انھوں نے جب اسکا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو بس اسی کے ہو رہے، اس سلسلہ میں انھیں بہت کچھ سرد و گرم سہنا پڑا مگر اس سے کسی آن جدا نہیں ہوئے، اسلیے انھیں بانی قرار دیا گیا، اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بزرگوں سے کسی ادارہ کی نسبت اس کے اعتماد کی بڑی سند ہے، مگر اس کو کسی مخصوص طبقہ کے اعتماد کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا نفسیاتی کمزوری ہے۔

دوسری بات جو ان ابواب میں پڑھنے والے کو کھٹکی ہے وہ یہ کہ کتاب میں قصداً علامہ شبلی کی خدمات کو نظر انداز کرنے اور انکی ذات کو دینی اعتبار سے مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، زہد و اتقا کے اعتبار سے دونوں میں تفاوت ضرور تھا مگر وہ درجہ دونوں میں تھا جسے ہر اور گوہر لتماشاکن اور خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہوا تھا کہنے والا بھی خدا کے یہاں کچھ کم مرتبہ نہ ہوگا۔ جہاں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کی طبیعتوں میں موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں انکے خاندانی اثرات کا ذکر کرکے انکی سیمابیت اور انتہا پسندی کا جو بھیانک نقشہ پیش کیا گیا، اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ شائستگی قلم کے بھی منافی ہے، غیرت و حمیت کے نتیجہ میں ان کے دادا کا قبول اسلام اگر ایسا عیب ہے کہ کئی پشت تک اسکا اثر نہیں گیا، تو پھر بعض صحابہ جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، کے اسلام کے بارے میں کیا رائے قائم کیجائے گی۔

ندوہ کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا جسمیں علامہ شبلی نے ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فعال اور سرگرم عنصر کی حیثیت سے حصہ لیا، انھوں نے مدرسہ کے اجلاس کی صدارت کی تحریک کی، پھر ندوہ کے جلسہ کی تحریک صدارت کی بلکہ روداد کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "کارروائی کا کاغذ پڑھکر سنایا"۔ آخر میں ندوۃ العلماء کیلئے دستور کا مسودہ پیش کیا، روداد میں ہے:

"اسکے بعد شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے جناب صدر سے اجازت لیکر دستور العمل پیش کیا اور مولوی فتح محمد صاحب نے تائید کی"

اس اجلاس میں نصاب تعلیم کی کمیٹی بنی، اس میں ان کا نام موجود ہے، دستور کے مطابق انہی نے مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی

تجویز رکھی، غرض اس اجلاس کے سارے اہم کاموں میں انھوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ متعدد کام انہی کی وجہ سے انجام پائے، اس اجلاس کی جو رُوداد اس کتاب میں بیان کیگئی ہے، وہ "حیات شبلی" اور ندوہ کی رُوداد سے جو خود مولانا محمد علی مونگیری کی مرتب کردہ ہے مختلف ہے، علامہ شبلی کا صرف اتنا ذکر ہے کہ وہ اس جلسہ میں شریک تھے انکی کارروائیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتے رہے (ص ۱۲۷) دستور کے سلسلہ میں حیات شبلی اور رُوداد کے بیان کے خلاف لکھا گیا ہے کہ دستور پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی نے مولوی عبدالحق حقانی کے سپرد کیا تھا لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لاسکے، چنانچہ مولانا شبلی نے صدر جلسہ کی اجازت سے پیش کیا (ص ۱۲۸) معلوم نہیں کہ ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے، پھر مولانا حقانی کا نہ آنا اور علامہ شبلی کا بروقت دستور پیش کر دینا بالکل سمجھ میں نہیں آتا، اگر مولانا حقانی نے اپنا مسودہ پہلے سے بھیج دیا تھا تو اس کا ذکر روداد میں کیوں موجود نہیں ہے،

مولانا شبلی کو نظر انداز کرنے اور ان کو مجروح کرنے کا جو منصوبہ نوجوان مصنف نے بنایا تھا، اسکی تکمیل کی یہی صورت تھی، کہ ندوہ کے سلسلہ میں ان کی تصویر کا صحیح رخ سامنے نہ آنے پائے۔

ندوہ کی پہلے سال کی رُوداد اور حیات شبلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن مقاصد کی تکمیل اور جن علمی، تعلیمی اور معاشرتی تبدیلیوں کیلئے تحریک ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا تھا ان میں سے کسی ایک کی تکمیل کو لانا محمد علی کے عہد نظامت اور مولانا عبدالحی صاحب کی نیابت یعنی ۱۸۹۶ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک نہیں ہوسکی، ان حضرات کے دلوں میں یہ خواہش ضرور تھی جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، مگر ان سب کی تکمیل اور ندوہ کو اسکے علمی و تعلیمی معیار مطلوب سے قریب تر قریب کرنے میں جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ علامہ شبلی کی ذات ہے، بلکہ آٹھ برس تک قریب قریب حالت تنہائی ندوہ کا دفتر تک گردش میں رہا، وہ کبھی لکھنؤ میں تھا اور کبھی شاہجہانپور میں، اور کبھی کسی اور جگہ اسکے لیے امن تلاش کرنے کی کوشش کیگئی، مولانا محمد علی کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ

> ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانہ پر ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی اور مولانا نے اسکا ایک واضح خاکہ تیار کرکے ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور اسکے بعد یہ خاکہ "مسودہ دارالعلوم" کے نام سے شائع کرکے اسکو اصلاح و استصواب کیلئے ممتاز علماء اکابرین اور اہل علم حضرات کو ارسال کیا گیا، (ص ۱۴۷)

اس بیان کے مقابلہ میں آپ حیات شبلی کے مصنف کا بیان جو اس تاریخ کے بڑا راست چشم دید راوی ہیں ملاحظہ کیجئے، اس سے پہلے ندوہ کے دستور کا ذکر آچکا ہے کہ اسے مولانا شبلی نے پیش کیا، اب نصاب تعلیم کی تبدیلی، دارالعلوم کی تجویز اور دوسرے امور کے

بارے میں سید صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

"اسکے بعد بارہ علماء کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لیے مقرر کیگئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے رسالے لکھے، اور مولانا نے دارالعلوم کے نصاب کے بجائے دارالعلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے"۔ (حیات شبلی ص ۳۰۱)

سید صاحب آخری جملہ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم کے وسیع تصور کے مطابق اگر اسکا نصاب کوئی تجویز کرسکتا تھا تو وہ مولانا شبلی کی ذات ہی جو عرب و ترکی کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لے چکے تھے، اور جنھوں نے حیدرآباد اور دوسرے کئی اداروں کا دینی نصاب تیار کیا تھا۔

مصنف کتاب نے لکھا ہے کہ ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو سب سے پہلے مولانا محمد علی نے دارالعلوم کی تجویز مجلس انتظامیہ میں رکھی، اور سید صاحب کا بیان ہے کہ اس سے دو سال پہلے مولانا شبلی نے دارالعلوم کا خاکہ مرتب کر دیا تھا۔

مجوزہ نصاب کے مطابق ایک الگ دارالعلوم کی تجویز کے بارے میں مصنف کتاب نے یہ اثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا محمد علی کا پیش کردہ ہی مگر روداد اور حیات شبلی کے بیان سے اسکی تردید ہوتی ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب کا پورا بیان ملاحظہ ہو:۔

"۱۰ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کانپور میں نصاب کا جلسہ ہوا .... اور مولانا شبلی نے شرکت کی اور کئی روز کے مباحثہ کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا" (حیات شبلی ص ۳۶۱)

روداد میں مولانا محمد علی اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھکو بھی اس میں حاضر ہونے کی عزت حاصل تھی"۔ (ص ۴۲)

یہی مسودہ ہے جس کو علماء کی مخصوص کمیٹی نے طے کیا تھا جو اجلاس بریلی سے پہلے دوسرے علماء کے یہاں بھیجا گیا تھا، اور اس کو پھر اجلاس خاص نے تجویز کی شکل دی، پھر وہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی، اس اجلاس کی تفصیل کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا (شبلی) نے اسکے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دارالعلوم کی تجویز منظور ہوئی"۔

"دوسرے دن ۲ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۸۹۶ء کو ندوہ کے اجلاس عام میں مولانا عبدالحی حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی (وہی تجویز جو جلسۂ خاص میں منظور ہو چکی تھی جس کا خاکہ علامہ شبلی نے دو سال پہلے بنایا تھا) اور مولانا شبلی مرحوم نے اسکی تائید کی اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کیجائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے" (حیات شبلی ص ۳۱۲)

ندوہ کے بنیادی مقاصد دو تھے، ایک موجودہ نصاب تعلیم کی تبدیلی، دوسرے نزاع باہمی خاتمہ پہلے مقصد کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ایک درسگاہ کا قیام تھا، اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لیے جدید و قدیم دونوں طبقوں میں اعتماد کی ضرورت تھی، نئی درسگاہ کے قیام کا مقصد محض ایک نئی عربی درسگاہ کا اضافہ نہیں تھا، بلکہ اس میں نئے نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم تھی، درسگاہ تو ۱۸۹۶ء میں قائم ہوگئی، مگر اس کے قیام کے آٹھ برس یعنی ۱۹۰۴ء تک اس میں وہی نصاب تعلیم پڑھایا جاتا رہا جو عام درسگاہوں میں پڑھایا جاتا تھا، نصاب میں جدید علوم کے ساتھ انگریزی کا داخلہ بھی پیش نظر تھا جیسا کہ مولانا محمد علی کے سیرت نگار نے لکھا ہے، مولانا بھی اسکے حامی اور موید تھے، مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اور انکے رفقاء کار اپنے عہد نظامت و نیابت یعنی ۱۹۰۰ء کی مدت میں کسی ایک جز میں نہ کوئی تغیر فرما سکے اور نہ کوئی تجویز عملی صورت اختیار کر سکی، مولانا شبلی نے انگریزی کی تجویز کوئی بار مجلس انتظامیہ اور مجلس عام میں رکھا، وہ منظور ہوئی، مگر اس پر عمل نہ ہو سکا، مولانا شبلی اس کو نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انکو کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہیں تھی، اسلیے وہ بار بار ارکان ندوہ کو اسکی طرف توجہ دلاتے تھے، مگر اس وقت جو لوگ دارالعلوم ندوہ میں داخل تھے وہ اس کیلئے آمادہ نہیں تھے، بلکہ یہ حضرات تو دارالعلوم کی ایک الگ مجلس بھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھے، اسی وجہ سے مولانا شبلی کی شرکت انکو اور زیادہ گراں تھی، غرض یہ کہ مولانا شبلی کی آمد سے پہلے تک ندوہ کے قائم کردہ دارالعلوم اور دوسرے عربی مدارس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، علامہ شبلی نے اس کے بارے میں سیکڑوں خطوط دوستوں، بزرگوں اور اپنے خوردوں کو لکھے جو آج بھی مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں :-

"آج ایک نقشۂ نصاب جاریہ دارالعلوم ندوہ آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں: ملا جلال، شرح جامی، فصولی اکبری، میبذی، شافیہ، مکری! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا.....

پھر انھوں نے مولانا شروانی کو دوسرا خط لکھا کہ میں (یعنی مولانا شبلی نے) اسی کے متعلق مدرس اول کو لکھا تھا، انکا جواب آیا ہے:

"جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھایا تک نہیں گیا۔" (ص ۳۹۳)

جب عربی کتابوں میں تبدیلی کا یہ حال تھا تو انگریزی کے اجرا میں انکو کیا کیا قیمتیں نہ اٹھانی پڑی ہونگی، اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے، دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں،

"جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کیجائے.... لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے۔"

اس کے جواب میں مولانا شروانی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو لکھتے ہیں:

"بات تو کچھ نہیں لیکن مولوی عبدالحی کی بہانہ جوئی اور آپکے خارق العادۃ بھولنے پر تعجب آتا ہے جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی سے کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپنے فرمایا کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا، میں ہوں، اور میرا نام لکھا جائے، مولوی لیاقت خاں نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔"

ان کوششوں کے باوجود دو سال تک پھر یہ معاملہ ملتوی رہا، مولانا شبلی نے بار بار اسکی طرف توجہ دلائی، ایک خط میں مولانا شروانی کو دوستانہ انداز میں لکھتے ہیں: "ایک ہمارے روشن خیال مولانا شروانی ہیں..... انکا حال یہ ہے کہ انگریزی کے نام سے انکو لرزہ آتا ہے۔ بڑی مشکل سے مسلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں۔" (ص ۴۱۷)

غرض یہ کہ عربی نصاب کی طرح جدید علوم اور انگریزی کا اجرا بھی باقاعدہ اس وقت ہوا جب مولانا شبلی ۱۹۰۹ء میں دارالعلوم کے مہتمم تعلیم ہوکر آئے، انھوں نے شدید موانع اور رکاوٹوں کے باوجود اس نصاب کو جاری کیا جس کیلئے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔ اس تفصیل کا مقصود یہ ہرگز نہ تھا کہ دارالعلوم کے اجرا کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ مولانا شبلی کا حصہ دوسرے حضرات سے کم نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ شبلی نے جو نمونے بھی پیش کیے اگر ان میں انکی روح کارفرما نہ ہوتی تو اسکو اور اسکے مضمار عمل پر کوئی تفوق نہ ہوتا، خصوصیت سے دارالعلوم کے معاملات میں تو دوسرے حضرات کا طرز عمل نہ تو ندوہ کے مقصد سے میل کھاتا اور نہ اس میں کوئی ایسی بلندی نظر آتی کہ علامہ شبلی کو ندوہ کی تاریخ میں کوئی درجہ نہ دیا جائے، اور دوسرے حضرات سارے امتیازات کے مستحق گردانے جائیں، اس دعوے کے علاوہ اس کے بعض اور مندرجات اور بعض دوسرے ایسے واقعات ہیں جو قابل بحث ہیں، مگر مقصود انکا احاطہ نہیں ہے بلکہ تاریخ سازی و ہیئت کی نشاندہی ہے۔

مطبوعات جدیدہ

علاجِ خوف و حزن ۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دینیہ، دیوبند، قیمت ؟

رنج و غم اور حزن ملال انسانی زندگی کا لازمہ ہیں، آج کوئی انسان خالی نہیں ہے، ان سے نجات کی بہت سی صورتیں فلاسفہ، حکماء اور نفسیات کے ماہرین نے بتائی ہیں، مگر اس کا ایک علاج توبہ و انابت اور دعا و عبادت بھی ہے، امام غزالی نے صحیح لکھا ہے کہ جس طرح جسمانی امراض کے لیے معالجات ہوتے ہیں، اسی طرح اس روحانی مرض کا عام علاج بھی دعا و عبادت کے ذریعہ کیا جائے تو اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے"، اس موضوع پر بہت سے علماء نے کتابیں لکھی ہیں، ان ہی میں امام ابن ابی الدنیا کا رسالہ الفرج بعد الشدۃ بھی ہے، اسی رسالہ کو ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اور جا بجا اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں حواشی لکھے اور اضافے بھی کیے ہیں، اس کتاب کے بعض مندرجات سے اختلاف کی گنجائش ضرور ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے۔

روحِ اسلام اقبال کی نظر میں ۔ از ڈاکٹر غلام عمر خاں، صفحات ۱۱۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد، آندھرا۔

علامہ اقبال نے اسلامی تہذیب کے بارہ میں اپنے کلام اور بعض دوسری تصانیف میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کی روشنی میں ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب میں کل پانچ مباحث ہیں، جس میں بدھ مت، عیسائیت، اسلام، مغرب جدید اور اسلام اور مسلک تصوف

کے مابین جو اختلاف ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے، اقبال تصوف کے مخالف نہیں ہیں، مگر انھوں نے رہبانیت اور بدھ مت کے سنیاس سے جو اختلاف کیا ہے اس سے بعض لوگ ان کو تصوف کا مخالف سمجھ جاتے ہیں، خود مصنف بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں، ان کے بعض اشعار میں رہبانیت اور تصوف وغیرہ کا جو تقابل اور توافق نظر آتا ہے اس سے وہ تصوف مراد ہے جس کی تمام صوفیائے محققین نے مخالفت کی ہے جس کا پنجاب اور سندھ میں رواج عام ہے، ان جزئیات کو چھوڑ کر کتاب میں اقبال کے نقطۂ نظر سے قریب پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تھوڑی ویر اہل حق کیساتھ - از یونس نگرامی ندوی، صفحات ۸۴، کتابت وطباعت بہتر، ناشر مکتبہ طیبہ سی ۲۰۵/۳ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنو۔

اس کتابچہ میں بہت سے اہل حق کے سبق آموز واقعات مختلف کتابوں سے جمع کر دیے گئے ہیں، ان میں موضوع کے اعتبار سے کوئی ترتیب نہیں ہے، مگر ان واقعات کو پڑھکر عبرت وبصیرت دونوں پیدا ہوتی ہے، ان ہی بزرگوں کا طفیل ہے کہ دین اپنی اصلی صورت میں آجتک زندہ ہے، یہ کتاب کا دوسرا حصہ ہے پہلا حصہ اس سے پہلے شائع ہوکر مقبول ہوچکا ہے اگر جناب مصنف اس میں کچھ اپنا درد وسوز بھی شامل کرلیتے تو اس کی افادیت میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا۔

صور اسرافیل - از حبیب پانپوری، صفحات ۲۹۸، کتابت وطباعت عمدہ، پتہ ادارہ اشاعت دینیات، نظام الدین اولیاء، نئی دہلی ۱۳، قیمت ۳ے

یہ ایک گجراتی شاعر حبیب پانپوری کا مجموعہ کلام ہے جسمیں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں، غالباً پہلی بار ان کا مجموعہ کلام سامنے آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں قدرت نے شاعری کی تمام صلاحیتیں جمع کر دی ہیں، انکے کلام میں علامہ اقبال کے ذوق تکمیلیانہ اور عندلیب عاشقانہ کی جھلک ملتی ہے، امید ہے کہ مجموعہ اہل ذوق میں ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔

م ۔ ح

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

بابتہ ماہ ربیع الاولیٰ، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ

(جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۶۵ء)

اشاعتِ خاص

بیادِ حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۸۴ھ)

قیمت -/۲

فہرست

(۱) افتتاحیہ ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی (۳)

(۲) خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود ——— مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (۹)

(۳) حضرت مولانا محمد یوسف — چند تجربے اور مشاہدے ——— محمد منظور نعمانی (۱۹)

(۴) کان مملوکی فاضحی مالکی ——— شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہم (۳۵)

(۵) حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی چند خصوصیات ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی (۴۱)

(۶) حضرت جیؒ ارشادات کی روشنی میں ——— مولانا مفتی زین العابدین لائلپوری (۵۳)

(۷) صدیق وقت و یوسف اقلیم دین و دعوت ——— مولانا محمد اشرف ایم۔اے (پٹنہ) (۵۹)

(۸) مہد سے لحد تک ——— مولانا محمد ثانی حسنی (۸۱)

(۹) مکتوبات ——— حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ (۹۷)

تقریریں

(۱۰) کامیابی اور ناکامی کی حقیقی بنیاد ——— " " " " " (۱۳۹)

(۱۱) مدینہ کی محنت کا نقشہ ——— " " " " " (۱۴۵)

(۱۲) راہِ خدا میں نکلنے والوں کو ہدایات ——— " " " " " (۱۵۲)

(۱۳) دُعا ——— " " " " " (۱۶۱)

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تعویذ پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا

افتتاحیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عتیق الرحمن سنبھلی

"حضرت مولانا محمد یوسف نمبر" آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا کی شخصیت، انکے مجاہدات و کمالات علوم و معارف اور بیس سالہ دعوتی زندگی پر نظر کی جائے تو یہ مجموعہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن جن حالات میں یہ نکلا ہے اور جس انداز سے اس شکل تک پہنچا ہے اس سب کو دیکھتے ہوئے اسے مولانا کی کرامت یا مرضی الٰہی کا ظہور کہنا بھی شاید بجا ہو۔

حضرت مولانا کا وصال ہوا تو اس خاص تعلق کی بنا پر جو الفرقان کو اس سلسلۂ دعوت سے رہا ہے راقم سطور کے دل میں تقاضہ ہوا کہ اس موقع پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جائے جیسا کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر ایک خاص اشاعت الفرقان نے پیش کی تھی، اور وہ آج تک بھی اس تحریک سے الفرقان کے تعلق کی ایک زندہ علامت ہے۔ لیکن یہ فیصلہ میرے کرنے کا نہیں تھا، اُن دو بزرگوں کے کرنے کا تھا جن کے اس تحریک کے ساتھ تعلق پر الفرقان کے اس خاص تعلق کا انحصار رہا ہے۔ یعنی والد ماجد اور مخدومنا مولانا علی میاں مدظلہم۔ اور یہ دونوں بزرگ اس وقت حجاز مقدس میں تھے۔ چنانچہ اپنا یہ خیال وہاں کو اس طرح لکھ بھیجا کہ وہیں سے کچھ لکھ کر بھیجدیجئے اس لئے کہ واپسی میں تو ابھی بہت دیر ہے اور اُمید تھی کہ جواب تحسین و تائید میں ہوگا، اس بنا پر ناظرین الفرقان کو بھی کچھ ملکی سی اُمید دلادی گئی۔ مگر وہاں مولانا کے سانحہ ارتحال کی اچانک خبر نے کچھ اس طرح کا اثر کیا تھا کہ جیسے دونوں

اوس پڑ گئی ہو اور طبیعتیں لکھنے لکھانے پر اُٹھائے نہ اُٹھتی ہوں۔ چنانچہ جو جواب آیا اُسکے بعد یہ خیال ذہن سے نکال دینا پڑا حتیٰ کہ ہر دو بزرگوں کی واپسی ہو گئی۔ اور وہاں سے مؤتمر اسلامی نمبر کا خیال ساتھ آیا، جس کی بنیاد وہ اہم مقالات تھے جو اس مؤتمر میں عالم اسلام کے منتخب فضلا نے پیش کئے تھے۔ اور اس نمبر کا اعلان بھی کر دیا گیا ——— مگر اس سے پہلے ربیع الاول (مطابق جون ۱۹۶۵ء) کا جو شمارہ نکلنا تھا اُسکے لئے والد ماجد نے ایک مضمون مولانا مرحوم پر قلمبند فرمایا اور قریب تھا کہ یہ شمارہ اس مضمون کے ساتھ نکل جائے کہ بعض معاصر اہنامون میں مولانا کی شخصیت اور اُن کی دعوت سے متعلق ایسے مضامین سامنے آئے جنھوں نے ایک بار پھر تقاضہ پیدا کیا کہ مولانا کی دعوت اور اُن کی شخصیت کو اُسکی صحیح صورت میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ پوری طرح واقفیت کا موقع نہ پانے والے نہ تو خود اپنی ناواقفی یا غلط فہمی سے مولانا اور انکی دعوت کی غلط اور ناقص صورتیں سامنے رکھ کر گفتگو کریں اور نہ اُنکی غلط فہمیاں دوسروں کو اس دعوت کے بارے میں غلط تصورات دیں۔ کیونکہ معاملہ صرف مولانا کی ذات کا نہیں ایک عالمگیر دعوت اور دینی جد وجہد کا ہے جس کے بارے میں لوگوں کا صحیح یا غلط فیصلہ بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مگر اب ایک طرف تو مسئلہ یہ تھا کہ "مؤتمر اسلامی نمبر" کا اعلان کیا جا چکا تھا اور دوسری طرف جن حضرات کا تعاون اس کوشش کی تکمیل کے سلسلے میں ناگزیر محسوس ہوتا تھا اُن سے تعاون ملنے کے آثار نہیں تھے۔ چنانچہ ایک درمیانی راستے کے طور پر صرف ایک ماہ کی اشاعت کو حضرت مولانا مرحوم کیلئے خاص کر دینے کا فیصلہ کیا گیا، اور جو ایک مضمون اس سلسلے میں تیار ہوا تھا وہ اسی اشاعت کے لئے روک لیا گیا۔

یہ اشاعت جولائی میں نکلنا تھی اور کتابت مکمل ہو کر طباعت کا مرحلہ بھی شروع ہونے لگا تھا کہ دل نے کہا کہ یہ تو دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش ہو گئی۔ مگر کامیاب نہیں۔ یہ چند قطرے تو اہل طلب کی پیاس بھڑکائیں گے، اور پھر تشنہ لبی کا شکوہ بجا ہوگا۔ دیر بھلے ہی ہو جائے مگر اس ظرف کی وسعت میں اضافہ چاہیئے۔ چنانچہ اب جو جو کمی محسوس کی گئی اس کی تکمیل کے لئے پھر سے جد وجہد شروع ہوئی۔ بعض پہلو اب بھی چھوٹ گئے جن کی بڑی اہمیت نظر میں تھی۔

مگران کے ماسوا بالکل تائید غیبی کا سا سماں ہوا۔ مولانا کے مکاتیب کے لئے خصوصی جد وجہد تھی اور کسی طرح کامیابی نہیں ہو رہی تھی کہ بالکل مایوسی کے مرحلہ پر جناب افتخار فریدی صاحب نے یکایک نشاندہی کی کہ مکاتیب کا بڑا وسیع ذخیرہ اُن کا جمع کیا ہوا ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اُسے جا کے دیکھا تو ساری پریشانی دور ہوگئی۔ بہت سے خط ملے اور اُن میں سے کئی ایک دیئے جا رہے ہیں۔ مگر سب سے نادر چیز مولانا کا وہ خط ملا جس کا حوالہ مرکز نظام الدین سے ملا تھا کہ مولانا نے ایک دفعہ ایک بہت ہی مبسوط خط اس تبلیغی کام کی اہمیت اور اسکے اصول وضوابط پر بعض رفقاء کو لکھا تھا جو اس سلسلے میں تفصیل و جامعیت کے لحاظ سے مولانا کی واحد تحریر ہے۔ اس خط کو پاکر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سب کچھ ملگیا اور اس نمبر میں اور کچھ بھی نہ ہوتا تو مقصد کے لحاظ سے یہ تنہا کافی تھا۔

خطوط کے علاوہ ایک خاص ضرورت کسی ایسے مضمون کی تھی جو اس کام سے گہرا علمی تعلق رکھنے والے کسی صاحب کے قلم سے ہو۔ اور وہ مضمون سیر حاصل بھی ہو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو لوگ فکری اور عملی اعتبار سے اس تبلیغی کام میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کے یہاں مضمون نگاری کا کوئی خانہ نہیں۔ کیونکہ اس کام ہی میں اس کا کوئی خانہ نہیں ہے۔ ہمارے علم میں صرف ایک صاحب ہیں جو اس عموم سے مستثنیٰ ہیں (یعنی محترم مولانا محمد اشرف صاحب ایم۔اے۔ صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور) ہماری خواہش تھی کہ اُن کا مضمون ضرور اس نمبر کے لئے مل جاتا اور یہ کوئی مشکل بات نہ تھی، چنانچہ اُن سے درخواست کی گئی۔ مگر کوئی جواب نہ آیا، پھر لکھا گیا پھر جواب ندارد حتیٰ کہ تار دیا گیا اور پھر مایوسی ہوگئی۔ کہ یکایک ایک دوسرے مقام سے اُن کا تار ملا اور پھر خط آیا کہ وہ ایک ماہ سے تبلیغی دورے میں تھے رائے ونڈ (لاہور) میں اُن کو ہمارا تار پشاور سے اہل خانہ نے بھیجا ہے اور اب ہمارا دیا ہوا وقت ختم ہوگیا ہے، ورنہ وہ ضرور لکھتے بلکہ اُن کو افسوس رہے گا کہ وہ اس بزم یوسفی میں شریک نہ ہوسکے۔ چنانچہ اُن کو وقت بڑھانے کا تار دیا گیا اور اس طرح ان کا مضمون بھی آگیا۔ جو بلاشبہ قلم برداشتہ ہے مگر ہماری توقع کے مطابق۔

بہرحال جن جن مراحل سے یہ نمبر گزر کر اپنی موجودہ شکل میں آیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے

ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام اللہ ہی کو کرانا منظور تھا ورنہ اس کی بات تو شروع ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ اور اس احساس کے ماتحت اُمید یہی ہے کہ خدا نے چاہا تو اس سے مرتب کرنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں ہی کو فائدہ پہنچے گا۔

اوپر جو کہانی اس نمبر کی بیان کی گئی اُسکے بعد اسکے مقصد و مدعا کے بارے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش تو نہیں رہتی، پھر بھی اچھا ہے کہ صراحت کے ساتھ یہ بات کہدی جائے کہ اس نمبر کا مقصد خراج عقیدت پیش کرنا یا مولانا کی شخصیت کو منوانا نہیں، کہ یہ کام اگر کسی کے کرنے کا تھا تو اس کے حقدار مولانا کے وہ رفقاء کار ہو سکتے ہیں جنھوں نے اپنا دامن مولانا کے دامن سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ صرف موت ہی انھیں جدا کر سکی۔ لیکن یہ مولانا سے جتنے زیادہ قریب تھے اتنے ہی دنیا کی اس عام ریت سے دور ثابت ہوئے کہ اپنے محبوب و مقتدا کی وفات کے بعد کچھ وقت اسکی مدح و ثنا اور اُسکے تذکرہ و توصیف کی نذر کریں۔ اور حق یہ ہے کہ یہ اُن کے ایک نادرۂ روزگار امتیاز کا سخت ترین امتحان تھا جس میں وہ کامیاب ثابت ہوئے۔ تبلیغی تحریک جہاں اور بہت سی باتوں میں زمانے سے جُدا انداز رکھتی ہے وہاں اُس کا ایک اہم امتیاز یہ بھی ہے کہ رہنما شخصیتوں کی اہمیت اگرچہ عملاً سب جگہ سے زیادہ، مگر اندرونی وابستگی تمام تر دعوت کے ساتھ۔ اور اس کا اندازہ صرف اس چھوٹی سی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی تبلیغی اجتماع میں کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی آرہی ہو تو نہ اُسکے نام سے لوگوں کو بلایا جاتا ہے اور نہ اسکی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ کہ خطاب سے پہلے اُسے مجمع سے متعارف کرا دیا جائے۔ بس دعوت ہی سے اجتماع کا آغاز اور دعوت ہی پر ختم۔ کس نے دعوت دی اور کس نے تقریر کی اسکو اگر کوئی جاننا چاہے تو اپنے آپ جانے۔ اس تحریک کا یہی وہ خالص دینی اور مقصدی مزاج ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مولٰنا جیسی شخصیت گزر گئی اور اپنی عملی اہمیت کے لحاظ سے دلوں میں زخم چھوڑ گئی، مگر عین اس وقت بھی جبکہ اُن کا جنازہ لاہور سے آیا ہوا ان رفقاء کے بیچ میں رکھا تھا ذکر و فکر صرف اُس دعوت کا تھا جس پر مولٰنا نے اپنی زندگی نثار کی، نہ کہ مولٰنا کے

کمالات و مجاہدات کا!۔

رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ
فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ
وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝

آیندہ اشاعت

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی بعض تقریریں وغیرہ وقت اور صفحات کی تنگی کی وجہ سے اس نمبر میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ جنھیں اسی نمبر کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں انشاء اللہ الفرقان کی آیندہ اشاعت (اکتوبر) میں دی جائیں گی۔ اور اس طرح آیندہ اشاعت کی حیثیت اس نمبر کے ضمیمہ کی ہوگی۔

مدیر

پاکستان و ہندوستان کے نامی گرامی مطابع کے

اعلیٰ، دیدہ زیب ــــ معرّیٰ و مترجم

قرآنِ مجید

اور

مستند و معیاری، مذہبی، علمی، ادبی، درسی اور غیر درسی

کتابوں کا بہت بڑا مرکز

علوی بک ڈپو - محمد علی روڈ - بمبئی ۳

فہرست کتب مفت طلب فرمائیے



دورِ جدید کا بھاتر ین تحفہ

عطرِ مجموعہ

جو ہر موسم میں استعمال کیا جاتا ہے اس کی
خوشبو نہایت روح پرور اور دیرپا ہوتی ہے

تین ماشہ کا پیکنگ - دو روپے
چھ ماشہ کا پیکنگ - چار روپے
فی تولہ
آٹھ روپے

فہرست مفت طلب فرمائیے

حافظ محمد زکریا برادرس پرفیومرس، بمبئی ۳

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

آنچہ قدر ایشاں ما مردم می دانیم شما چہ دانید، احوال مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است و بلاد عرب را نیز دیدہ ایم، و سیر نمودہ، احوال مردم ولایت از ثقات آنجا شنیدہ ایم، و تحقیق کردہ کہ عزیزی کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہمچنیں استوار و مستقیم باشد، و در ارشاد طالبان شانی عظیم و نفس قوی دارد، دریں جزو زمان مثل ایشاں در بلاد مذکور یافتہ نمی شود مگر در گذشتگان، بلکہ در ہر جزو زمان وجود ایں چنیں عزیزان کمتر بودہ است، چہ جائے ایں زمان کہ پر فتنہ و فساد است[1]۔

ہم لوگوں کی نگاہ میں ان کی جو قدر و منزلت ہے، اس کو تم کیا جانو؟ ہندوستان کے لوگوں کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں، کہ ہمیں کی پیدائش ہے، اور یہیں عمر بسر ہوئی، ملک عرب کو خود دیکھا ہے، اور اس کی سیاحت کی ہے، افغانستان اور ایران کے لوگوں کے حالات وہاں کے معتبر لوگوں کی زبانی سنے، اس سب کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوا کہ کوئی ایسا بزرگ جو جادۂ شریعت اور طریقت پر، اور کتاب و سنت کی پیروی میں انکی طرح استوار و مستقیم ہو، اور طالبین کی رہنمائی میں اس کا پایہ اتنا بلند، اور اس کی توجہ اتنی قوی ہو، ہمارے اس دور میں ان ملکوں میں سے کسی ملک میں جن کا اوپر ہم نے

---

[1] کلمات طیبات ص ۱۶۴-۱۶۵

تذکرہ کیا، پایا نہیں جاتا، دور ماضی اور بزرگان
سلف میں جھانک ہو سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھئے
تو ہر زمانہ میں ایسے باکمال بزرگ زیادہ تعداد
میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ
میں جو فتنوں اور فساد سے پُر ہے۔

ان الفاظ میں حکیم الامت، امام وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نامور معاصر حضرت میرزا مظہر جان جاناں کے متعلق شہادت دی ہے، جس وقت یہ الفاظ کہے گئے ہوں گے، کتنے اہل علم اور واقفین حال کو استعجاب ہوا ہوگا، اور کتنے ابنائے زمانہ نے اس کو مبالغہ اور غلو پر محمول کیا ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ معاصرت بہت بڑا حجاب ہے اور جب ذوق اور طریق کار کا اختلاف بھی شامل ہو جائے، اور وضعی و رواجی طریقوں کے حجابات بھی درمیان میں حائل ہوں تو پھر حجاب نہیں بلکہ ایک سنگین دیوار بیچ میں آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس شخصیت کے متعلق کتنے ہی خلوص و صداقت اور کتنے ہی احتیاط اور احساس ذمہ داری سے کہا جائے، اس کو مبالغہ یا خوش عقیدگی پر محمول کیا جاتا ہے۔

راقم سطور کو اپنی بے بضاعتی اور کم فہمی کا پورا احساس ہے، لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اس کو ممالک اسلامیہ کی سیاحت اور عالم اسلامی سے واقفیت کے ایسے ذرائع اور مواقع میسر آئے جو (بلا کسی تنقیص و تحقیر کے) اس کے ہم وطنوں اور ہم عمروں میں سے بہت کم اشخاص کو میسر آئے ہوں گے، دنیائے اسلام اور بالخصوص ممالک عربیہ کے دینی، علمی اور روحانی حلقوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور برتنے کا اتفاق ہوا۔ دور حاضر کی مشکل سے کوئی تحریک اور کوئی عظیم شخصیت ہوگی جس سے ملنے اور تعارف حاصل کرنے کی سعادت نہ حاصل ہوئی ہو۔ اس وسیع واقفیت کی بنا پر (جو کسی کا ذاتی کمال اور سرمایۂ فخر نہیں) یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ ایمان بالغیب کی دعوت، دعوت کے شغف اور انہماک اور تاثیر کی وسعت و قوت میں اس ناکارہ نے اس دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا کوئی ہمسر اور مقابل نہیں دیکھا، یوں ان کی نادرۂ روزگار شخصیت میں بہت سے ایسے

کمالات پائے جاتے تھے، جن میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، ان کی ایمانی قوت، ان کا اعتماد و توکل، ان کی ہمت و جرأت، ان کی نماز اور دعا، صحابۂ کرام کی زندگی سے ان کی گہری واقفیت اور ان کے حالات کا استحضار، اتباعِ سنت کا اہتمام، فہم قرآن اور واقعات انبیاء سے عظیم نتائج کا استخراج، دعوت و تصنیف کے متضاد مشاغل کو جمع کرنے کی قوت، اور آخر میں ان کی غیر معمولی محبوبیت اور مقبولیت، یہ سب ان کی زندگی کے وہ پہلو اور نمایاں صفات ہیں جن کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور جس کے لفظ لفظ کی تصدیق وہ سب لوگ کریں گے جن کو ان کی خدمت میں کچھ دن رہنے کی سعادت، یا کسی سفر میں رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہے اور ان کی تعداد ہزاروں کی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب اور ان کے ماسوا اور بہت سے پہلو اُن کی سوانح اور سیرت کا موضوع ہیں، اور ان میں سے بعض کمالات و امتیازات وہ ہیں جن میں ان کے سہیم و شریک مل سکتے ہیں، اور بعض تخصیصیں ان میں ان سے فائق بھی ہو سکتی ہیں، لیکن راقم نے ان کے جن امتیازات کا یہاں انتخاب کیا ہے اُن میں اپنے محدود واقفیت و علم میں) ان کا کوئی سہیم و شریک، اور ان کا کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔ والغیب عند اللہ۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے ہم نے غیبی حقائق، اللہ کے وعدوں اور انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اطلاعات پر ایمان لانے اور ان کے اعتماد و یقین پر اپنی زندگی کی کشتی کو چھوڑ دینے کی ایسی داستانیں طاقتور اور بے لاگ دعوت کسی دوسری جگہ نہیں دیکھی، جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی قدرت کن فیکون اس کے بلاشرکت غیرے پورے نظام عالم کو چلانے، اسباب کی بے حقیقتی، خواص اشیاء اور انسانی تجربات کی بے اعتباری، محسوسات و مشاہدات کی تحقیر و نفی، احکام الٰہی اور نظام تشریعی کے سامنے نظام تکوینی کی سپر اندازی و مغلوبیت، ایمانی صفات و اخلاق اور اطاعت و عبودیت کے سامنے وسائل و ذخائر کی بے حقیقتی، حاملینِ نبوت، اور اہل ایمان و دعوت کا ارباب اقتدار، اہل حکومت اور سرمایہ داروں کے مقابلہ میں فتح و غلبہ، خدا کے وعدوں کی ابدی صداقت اور سنۃ اللہ کی ہمہ گیری کا مضمون اپنی پوری ایمانی قوت اور اپنے والہانہ انداز بیان میں بیان فرماتے تو سننے والے اتنی دیر کے لیے اس حواس و مادہ پرستی کی دُنیا سے منتقل ہو کر ایمان بالغیب کی دُنیا میں پہونچ جاتے

اور اسباب و مسببات کا سلسلہ اور مقدمات و نتائج کا ربط و تعلق اتنا بے کار و بے حقیقت نظر آنے لگتا تھا کہ ہم جیسے مدرسی لوگوں کو بعض اوقات اس کی فکر پیدا ہو جاتی تھی کہ کہیں یہ دعوت سننے والوں میں ترک اسباب اور تجرد و رہبانیت کا رجحان نہ پیدا کر دے، لیکن اس دور ہدایت میں جہاں "اسباب" نے "ارباب" کی شکل اختیار کر لی ہے اور ایک عالم کا عالم اپنی قسمت کو مادی اسباب، اور اپنی ذاتی کوشش و قابلیت کے ساتھ وابستہ کر چکا ہے، اور کسی دینی دعوت و تحریک کو وہ قلندر صفت افراد نہیں مل رہے ہیں جن کا عشق "آتش نمرود" میں بے خطر کود کر عقل کو "محو تماشائے لب بام" کر دے، بلکہ اس تھوڑے سے ایثار و قربانی کی جنس بھی نایاب ہو گئی ہے، جس کے اندوختہ کے بغیر کسی تحریک کی گاڑی دو قدم بھی نہیں چل سکتی مادی ترقی اور مادی اقدار کی اہمیت و تقدیس کی مسلسل اور پرجوش تبلیغ و تلقین نے خود اس امت کو متاثر کر لیا ہے جس کی ساری طاقت، اور جس کی فتح کا راز ایمان بالغیب کی قوت رضائے الٰہی کی طلب اور جنت کے شوق میں مضمر تھا، مسلمان نے ذرائع معاش کو اپنا رزاق سمجھ لیا ہے، مادیت کی اس وبائے عام کے دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایمان بالغیب کی اس دعوت سے بعض اوقات سینکڑوں سامعین کے دل ایمان کے جذبہ سے معمور اور قربانی کی لذت سے مخمور ہو جاتے تھے اور وہ اس کے اثر سے ایثار و قربانی کے ایسے نمونے پیش کرنے لگتے تھے جن کو عقل و دلائل حکمت و مصلحت، اور علم و خطابت کی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جن کی بنیاد پر یہ تحریک دنیا کے دور دراز گوشوں میں پہونچ گئی، ہزاروں آدمیوں نے جن میں ہر طبقہ کے لوگ تھے مہینوں کے لیے گھر بار چھوڑ کر دوسرے براعظموں کا سفر کیا، اور دعوت و تبلیغ کے راستہ میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کیں، انھوں نے بڑی دریا دلی اور عالی ہمتی کے ساتھ اپنا وقت اور اپنا مال راہ خدا میں خرچ کیا، اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کی زندگی وفا کرتی، تو وہ ایمان بالغیب کی اس طاقت سے (جو اس دور میں مشکل سے کسی اور جماعت کو میسر آئی ہوگی) معاشرہ کی اصلاح و انقلاب اور دنیا کے حالات میں تبدیلی کا اور زیادہ وسیع و عمیق کام لیتے، اور افراد کی یہ قوت ایمانی اجتماعی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی، ان کی ان مجالس میں کبھی کبھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

کے مجالس وعظ کی جھلک نظر آنے لگتی تھی جن کی (غیر اللہ کی نفی سے لبریز) تقریروں نے ہزاروں دلوں اور دماغوں پر گہری چوٹ لگائی، جس وقت آدمی ان کے ان مواعظ کو جو فتوح الغیب اور دوسرے مجموعوں میں محفوظ ہیں پڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص پوری بے باکی اور قوت کے ساتھ گرج چلا رہا ہے اور اس کی ضرب سے مادیت کے ہزاروں بت پاش پاش ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جیسے لوگ جن کا دماغ اسباب و مسببات کے باہمی تعلق سے کبھی آزاد نہیں ہونے پاتا، اور جو مادی سعی و جہد کو بھی دین و شریعت میں ایک مقام دیتے ہیں اور انسان کو اپنی سعی کا مکلف و ماموں سمجھتے ہیں، اور جو اس عالم اسباب میں مسلمانوں کی پست ہمتی اور بے عملی کو ان کے زوال کا ایک سبب قرار دیتے ہیں، وہ کبھی مولانا کے اس طرز کی کامیابی کے ساتھ نقل نہیں اتار سکے اور ان کے ذہن نے عین ان مجالس وعظ میں بھی اپنا کام کرنا نہیں چھوڑا لیکن ہم کو اس کا صاف اعتراف ہے کہ ان کی اس دعوت ایمانی نے وہ نتائج پیدا کیے جن سے ہماری "متوازن و معتدل" دعوتیں (جن کی عصر حاضر کے حقائق پر نظر ہے) قاصر رہیں، اور صاف اندازہ ہوا کہ

لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

ان کا دوسرا امتیاز اپنی دعوت کے ساتھ ان کا ایسا شغف و انہماک تھا جس کی مثال نہ صرف یہ کہ دینی دعوتوں اور تحریکوں کے میدان میں نظر نہیں آتی بلکہ جہاں تک اس کوتاہ نظر کی نظر (واقفیت) کا تعلق ہے کسی مادی و سیاسی تحریک کے داعیوں میں بھی وہ استغراق، خود فراموشی والہیت، اور جذب کی کیفیت نظر نہیں آئی، ان کا یہ پہلو اتنا نمایاں اور اتنا حیرت انگیز تھا کہ جب تک کسی شخص کو کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہنے اور کسی سفر میں ان کی معیت کا موقع نہ ملا ہو وہ بہتر سے بہتر تصویر کشی اور واقعہ نگاری کے بعد بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، چند دن رہ کر آدمی ان کی مشغولیت و انہماک اور ان کے جذب و استغراق کو دیکھ کر بہوت رہ جاتا تھا، اور اس کی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی قوت و تازگی کہاں سے آتی ہے، اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ عام حالات میں "عشق" اور خاص حالات میں تائید الٰہی اور نصرت غیبی

کے سوا اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی، معمولی بات یہ ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد سال کے بارہ مہینے اور مہینہ کے تیس دن تقریر فرماتے، یہ تقریر ڈھائی تین گھنٹے سے کم نہ ہوتی، اس میں موسم کی سختی، دھوپ کی گرمی، صحت کی خرابی، مجمع کی کمی و زیادتی قطعاً اثر انداز نہ ہوتی، یہ مجاہدہ رمضان مبارک میں بہت بڑھ جاتا، جبکہ فجر کے بعد لوگوں کے سونے کا عام معمول ہے، رمضان میں ان کی رات کا بڑا حصہ شب بیداری اور دعوت کے کام میں صرف ہوتا۔ اس کے باوجود وہ فجر کی نماز کے بعد پوری قوت، تازگی اور نشاط کے ساتھ تقریر فرماتے، اور اسی قوت کے ساتھ آخر میں دعوت دیتے، عام دنوں میں چائے کے دوران اور چائے کے بعد پھر گفتگو اور تقریر کا سلسلہ شروع ہو جاتا، عام طور پر وہ جاعتوں کو رخصت کرنے کا وقت ہوتا، وہاں تشریف لے جا کر پھر اسی طرح تقریر فرماتے اور ہدایات دیتے کہ معلوم ہوتا کہ ابھی تک خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی، اور وہ اب ٹوٹی ہے، پھر اسی جذبہ اور طاقت کے ساتھ دعا کرتے کہ معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے نہ اس کے بعد کریں گے، سب کچھ اسی دعا میں مانگ لینا ہے، اور سب کچھ اسی دعا میں کہہ دینا ہے، اس کے بعد بھی مختلف تقریبوں سے گفتگو اور خطاب کرنے کا سلسلہ جاری رہتا، پھر کچھ دیر تصنیف و تالیف کا کام کرتے، پھر کھانے کا وقت ہو جاتا، ظہر کے بعد پھر کوئی سبق پڑھاتے یا تصنیف و تالیف کا کام کرتے، ملنے جلنے اور ڈاک دیکھنے کا بھی سلسلہ جاری رہتا، کبھی بعد عصر اور بعد مغرب بھی کوئی تقریر ہو جاتی، اور اس میں بھی تازگی اور جوش کا وہی عالم ہوتا، عشاء کے بعد (جو اکثر بڑی تاخیر سے ہوتی) سیرت کی کوئی کتاب یا صحابۂ کرام کے حالات کا کوئی مجموعہ سنانے کا معمول تھا، کتنا ہی تھکے اور جگے ہوئے ہوں اور کیسی خستہ اور شکستہ حالت ہو، اس معمول میں حتی الامکان فرق نہ ہوتا، دیر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا، سننے والے کو محسوس ہوتا کہ اس شخص نے دن بھر آرام کیا ہے، ہم جیسے پست ہمتوں کے لیے نظام الدین کا دو روز کا قیام بھی سخت آزمائش اور مجاہدہ تھا، میرا خود حال یہ تھا کہ اکثر اپنے دل سے خطاب کر کے کہتا کہ بے ہمت! مولانا کے لیے ساری زندگی کا معاملہ ہے، تیرے لیے صرف دو دن کا معاملہ ہے، لیکن بہانہ جو اور سہولت پسند طبیعت اپنی صحت کی کمزوری اور مولانا کی عالی ظرفی کا سہارا لے کر کوئی گوشۂ عافیت تلاش کر لیتی، اس وقت اگر کوئی تلاش کرنے والا تلاش کرتا تو خود زبانِ حال سے اس کو اپنا پتہ نشان اس طرح دیتا کہ

لہ جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے رمضان مبارک کی راتوں میں مولانا بالکل نہیں سوتے تھے ۱۲ قمانی

ہو گا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

سفر میں تو یہ انہماک اور استغراق بہت بڑھ جاتا، پھر تقریروں کی تعداد، ان کی مقدار اور ان کے اوقات کی کوئی تحدید نہیں تھی، بعض دوستوں نے اندازہ لگایا ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے بولنے کی نوبت آتی اس میں بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا اسی وقت بولنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا اب اسی موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے، یہی ہر وقت کی دعا کی کیفیت ہوتی، مجھے حجاز کے آخری سفر میں حاضری کا موقع نہیں ملا لیکن میں نے بالتواتر سنا ہے کہ وہاں یہ جوش و خروش اور یہ جذبہ و انہماک اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ چکا تھا، مسجد نبوی میں صحن مسجد میں فجر کی نماز کے بعد تقریر شروع ہو جاتی اور دن چڑھ آتا، اور جن خوش قسمت آنکھوں نے تقریر کے آغاز میں گنبد خضرا پر چاندنی دیکھی ہوگی وہ دھوپ چڑھی ہوئی دیکھتے، مجھے یاد ہے، کہ بھوپال کے ایک اجتماع میں مولانا نے مغرب کے بعد پوری قوت اور اپنی تقریر کے عام پیمانہ کے مطابق بسیط تقریر کی، تقریر کے بعد تشکیل ہوئی پھر دعا ہوئی، مجھے اطمینان تھا کہ اب اس تقریر کے بعد آرام فرمائیں گے، کہ خدا جانے کہ کیا کی تقریب ہوا کسی اور تقریب سے پھر کچھ بولنا شروع کیا، طبیعت مطمئن تھی کہ چند منٹ میں اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوا کہ مولانا میں نئی تازگی اور جوش آگیا، پھر اس طرح تقریر فرمائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دن بھر خاموش رہے ہیں اور طبیعت جوش پر ہے۔

یہی حال دعا کا تھا، مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور جوش و خروش، اس کی رقت انگیزی، اور اس کی تاثیر، مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آئی، جب دعا کرتے حاضرین کا عجیب حال ہوتا، خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا، دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں، اس کی مثال ماضی قریب میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور اُن کے ایک جانشین مولانا سید نصیر الدینؒ کے حالات میں نظر آئی۔ کہ بیان کرنے والوں نے

لہ یہ اندازہ صرف تقریروں کا ہے مجلسی گفتگوؤں کے اوقات اسکے علاوہ ہیں ۱۲۔ نعمانی

بیان کیا کہ دعا کے وقت رحمت الٰہی جوش میں آتی نظر آتی، لوگوں پر ایک وارفتگی اور بے خودی کی کیفیت ہوتی، اور بعض لوگ دیوانہ وار جنگل کو نکل جاتے، واقعہ یہ ہے کہ دعا کے وقت جو کیفیت لوگوں پر طاری ہوتی اور جو اثرات اُن کے دلوں پر ہوتے، اگر کچھ دیر بھی باقی رہ جاتے تو لوگ دنیا کے کام کے نہ رہتے، اور معلوم نہیں حالات میں کیا تبدیلی ہوتی، لیکن نظام عالم اسی طرح سے چل رہا ہے، اور ہم ضعیف البنیان ہر چیز کا اثر وقتی طور پر لیتے ہیں۔

ان کی تیسری امتیازی خصوصیت جس میں ان کی تنظیم طبعی مشکل ہے ان کی تقریروں اور صحبت کا وہ اثر ہے جو سامعین و حاضرین پر پڑتا، خاص طور پر ان سلیم طبیعتوں پر جن کا دل و دماغ دوسرے اثرات سے آزاد اور ان کی طبیعتوں میں تسلیم و انقیاد کا مادہ غالب ہوتا، ان کی کیمیا اثر صحبت اور ان کی انقلاب انگیز تقریروں نے اتنی زندگیوں میں تبدیلیاں پیدا کیں، اور اتنے دلوں اور دماغوں کو متاثر کیا جن کا شمار کرنا ممکن نہیں، ان صحبتوں اور تقریروں کے اثرات اتنے گہرے ہوتے کہ صورت سیرت زندگی معاشرت یہاں تک کہ چلنے اور بولنے کا طریقہ بھی بدل جاتا۔ سینکڑوں آدمی ہیں جو ان کی زبان بولنے لگے اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور جملے ان کو حفظ ہو گئے۔ کتنے اشخاص ہیں کہ جن کی دعاؤں میں ان کی دعاؤں کا رنگ آگیا، کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امیرانہ زندگی رکھنے والے لوگ ہیں جن کی زندگی اور معاشرت سرتاپا مغربی اور رئیسانہ تھی اور وہ اب ایک درویش صفت مبلغ اور ایک فقیر منش، اور جفاکش مجاہد نظر آتے ہیں۔ اور جن کی گرانقدر تنخواہوں اور آمدنیوں کا بڑا حصہ تبلیغ و دعوت، رفقاء کی امداد و اعانت، اور جماعت کی نصرت پر خرچ ہوتا ہے، اور ان میں ان کے گھر والوں کا اور ان کا اپنا بھی حصہ ہے، ایک متوسط ملازم یا ایک اوسط درجہ کے تاجر کا ہے، کتنی بڑی تعداد ان رفقاء اور نیازمندوں کی ہے جن کی زندگی، جن کا ذوق عبادت، جن کا جذبہ خدمت اور جن کی خشیت و انابت، اور جن کی بے نفسی اور تواضع دیکھ کر اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے۔ حقیقی علم تو علام الغیوب کو ہے، لیکن ان کے خلوص و اخلاق کو دیکھ کر ان کی دینی ترقی اور بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، جو زندہ ہیں (خدا ان کی زندگی میں برکت دے) ان کے متعلق کچھ کہنا خلاف احتیاط ہے فان الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ[1] لیکن جانے والوں میں سے

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

متعدد اصحاب کے نام لیے جا سکتے ہیں، جو ہمارے دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہونچ گئے، اور ان کے حالات اتنے رفیع ہو گئے جن کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان میں سے میں یہاں صرف اپنے محبوب و عزیز دوست حاجی ارشد صاحب مرحوم کا ذکر کروں گا جن کا زمانے اعلیٰ عہدہ اور ذمہ داریوں کے ساتھ، اخلاص و للّٰہیت، تعلق مع اللہ، دعوت کے کاموں میں انہماک و استغراق، ایثار و قربانی کی کیفیت، تواضع و انکسار، خدمت کا جذبہ، اور پھر اسی راہ کی قابل رشک موت اور شہادت، برسوں دل کو تڑپاتی اور ان کی یاد تازہ کرتی رہے گی جاپان میں اشاعت اسلام کے کام کا افتتاح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر فرمایا تھا، اہل حجاز ان کو عرصہ تک یاد رکھیں گے، دنیا کے دور دراز ملکوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو مولانا کی چند روزہ صحبت اور دو ایک تقریروں کے سننے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی بدل گئی اور ان کے اندر ایک خاص طرح کے ایمان و یقین کی کیفیت، دعوت کی سرگرمی، دعا کا سلیقہ، نمازوں میں کیفیت، اور ایثار کی عادت پیدا ہو گئی، ایسے لوگ ہندوستان اور پاکستان کے باہر امریکہ، یورپ اور افریقہ کے براعظموں میں بھی ملیں گے[۵]

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

مولانا کی دعوت اور شخصیت اپنے پورے شباب اور عروج پر تھی، ان کی ہمت کا طائر بلند پرواز کسی بلند سے بلند شاخ پر بھی آشیانہ بنانے کے لیے تیار نہ تھا، کوئی دور سے دور جگہ ان کو دور اور کوئی مشکل سے مشکل کام ان کو مشکل نہیں معلوم ہوتا تھا، انھوں نے اپنی تیز رفتاری، بلکہ برق رفتاری اور اپنی طبیعت کی بے چینی اور بیتابی سے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں میں اور دنوں میں کر لیا، اپنے والد بزرگوار کے بعد نئے ملکوں میں جماعتوں کے جانے کا افتتاح کیا اور ساری دنیا کو گھر کا آنگن بنا لیا، حج کا مسئلہ اٹھایا[۵] اور اس میں ایک نئی روح پھونک

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے الفاظ ہیں۔ فرمایا کہ دنیا سے چلے جانے والوں کی اقتدا کرو۔ اس لیے کہ جو زندہ ہے اس کے بارہ میں فتنہ سے اطمینان نہیں۔

۵۔ فریضۂ حج میں روح پیدا کرنے اور اس کو تبلیغ و دعوت کا ذریعہ بنانے کا مسئلہ۔

دی، اور دیکھتے دیکھتے حجاج کی تعداد، اور ان کی کیفیات میں عظیم فرق پیدا ہو گیا، اجتماعات، میوات کے محدود پیمانے سے نکل کر اتنے عظیم و وسیع بن گئے کہ بڑی بڑی سیاسی کانفرنسیں اور بڑے بڑے پبلک جلسے (مجمع کی کثرت میں بھی) ان کے سامنے ماند پڑ گئے، اور ان کی وہ کثرت ہوئی کہ مولانا کے لیے نظام الدین کا قیام مشکل ہو گیا، تبلیغی تقریروں میں غیر مسلموں سے خطاب، حالات حاضرہ پر تبصرہ، موجودہ مادی زندگی پر تنقید اور فساد کے سرچشمے کی نشاندہی کے باب کا افتتاح کیا، اور ان میں ایسی کشش پیدا کر دی کہ سینکڑوں کی تعداد میں غیر مسلم شریک ہونے لگے، اور متاثر ہوئے، یہ سب کام بڑی طویل عمر چاہتے تھے، لیکن مولانا نے پچاس برس سے کم عمر، اور اپنی ذمہ داری اور دعوت کے صرف بیس سال کے اندر انجام دیئے، اور یہ سب منزلیں طے کر کے اپنے خالق سے جا ملے۔

کام تھے عشق میں بہت، پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

امت پر جو قحط الرجال کا دور طاری ہے، اس میں اس کی کیا امید ہے کہ جلد ان کی سی شخصیت اور تاثیر کا کوئی داعی الی اللہ پیدا ہو گا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟

غفر اللہ لہ و رفع درجاتہ۔

انیسِ نسواں ـــــ فیصلہ کن مناظرہ

کتب خانۂ الفرقان کی یہ دو کتابیں جو عرصہ سے نایاب تھیں بحمد اللہ اسی مہینے میں دوبارہ طبع ہو گئی ہیں ـــــ قیمت انیس نسواں ۷۵/- مناظر ۱/۷۵

منیجر کتب خانۂ الفرقان (کچہری روڈ) لکھنؤ

حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

چند تجربے اور مشاہدے

محمد منظور نعمانی

(۱)

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی حیات میں :-

طلب و استفادہ کی نیت سے اور عقیدت مندی کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں اس عاجز کی پہلی حاضری ان کے وصال سے تقریباً ۱۴، ۱۵ مہینے پہلے ہوئی تھی اس کے بعد بعض تبلیغی سفروں میں حضرت کی رفاقت بھی نصیب ہوئی تھی اور نظام الدین آمد و رفت کی توفیق بھی ملتی رہی، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت کی شخصیت کی عظمت اور محبت بھی نصیب فرمائی، اور انکی دینی دعوت کے ساتھ دل کو کچھ تعلق بھی نصیب ہوا۔

چند ہی مہینے کے بعد آپ کی آخری علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس علالت کے آخری چار مہینوں میں یہ عاجز زیادہ تر حضرت کی خدمت میں نظام الدین ہی مقیم رہا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کے دیباچہ میں میں اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت کی خدمت میں میں نے قیام مخدومی و مرشدی حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے ایما و بلکہ ارشاد سے کیا تھا۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ابتدائی واقفیت اس قیام کے زمانہ میں ہوئی اس وقت مولانا موصوف کی زیادہ توجہ کتابی مطالعہ اور تصنیف و تالیف کی طرف تھی،

فن حدیث کی معرکۃ الآرا کتاب امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کی شرح لکھنے کا کام وہ شروع کر چکے تھے[1] ان کے اوقات کا بڑا حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا۔ اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی سراسر علمی اس دینی دعوت سے جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی روح کو تحلیل کر دیا تھا اس زمانہ میں زیادہ دلچسپی ان کو نہیں تھی، گویا ان دنوں ان کا ذوق وہ تھا جو ان کے دوسرے مربی اور استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ، کا تھا اور ہے ——— دعوت و تبلیغ کے کام میں بھی وہ کچھ حصہ تو لیتے تھے لیکن یہ ان کے لئے دوسرے درجہ کا کام تھا۔ اصل شغف اور انہماک حدیث نبوی کی علمی اور تصنیفی خدمت سے تھا ——— بعد میں خود حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے اس عاجز سے بارہا اس واقعہ کا ذکر کیا کہ اس زمانہ میں تبلیغی کام اور اس سلسلہ کی بے پناہ نقل و حرکت کے بارہ میں ان کو ذہنی طور پر بھی پورا شرح صدر نہیں تھا، وہ جتنا کچھ ان دنوں اس سلسلہ میں کرتے اور حصہ لیتے تھے وہ اپنے والد ماجد اور شیخ و استاذ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے حکم کی تعمیل میں اور ان کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے ——— تقویٰ اور تعلق باللہ تو ان کو باپ دادا سے میراث میں ملا تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ انکی فطرت میں تھا۔ اس ناچیز کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ تبلیغی کام کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جو ہر طرح کے آدمیوں سے اکرام کے ساتھ ملتے تھے، جن میں بہت سے غیر متشرع بھی ہوتے تھے اور اسی طرح کے بعض معتقدین و محبین کی کار وغیرہ بھی استعمال فرما لیتے تھے، مولانا محمد یوسف صاحب کو اس سے انقباض ہوتا تھا اس زمانہ میں کبھی کبھی انھوں نے ادب کے ساتھ تنہائی میں حضرت سے عرض بھی کیا کہ آپ اس پر غور فرمائیں کہ یہ رویہ کہاں تک صحیح اور اکابر کے طریقہ کے مطابق ہے ——— بہرحال اس زمانہ میں مولانا موصوف کا طرز عمل اور طرز فکر یہ تھا، لیکن حضرت والد ماجد کی علالت کے بالکل آخری ایام میں ان کے حال میں کچھ تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی اور پھر تو اس ابتدا کی وہ انتہا ہوئی جس کو

---

[1] اسکی دو جلدیں چھپ بھی چکی ہیں اور اہل علم اس کے مطالعہ سے مولانا کے علمی مقام کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔

ایک دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(۲)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد :-

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی علالت وصال سے دو تین مہینے پہلے سے اگرچہ بہت نازک شکل اختیار کر چکی تھی، لیکن حضرت کے بعض خاص حالات کی وجہ سے خدام کو انکی زندگی اور صحت کے بارہ میں اچھی اُمیدیں تھیں، مگر دو ہفتہ پہلے سے حالت اتنی نازک اور سقیم ہوگئی کہ بظاہر اسباب صحت کی اُمید کے لئے گنجائش نہیں رہی۔ یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا علی میاں بھی حضرت کے دوسرے بیسیوں خدام اور محبین کی طرح وہیں مقیم تھے۔ ہم لوگوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ حضرت کی دینی دعوت سے بھی اچھا خاصا تعلق ہوگیا تھا اس لئے قدرتی طور پر حضرت کی زندگی کے مسئلہ کے ساتھ ہم ان کے بعد انکی دعوت کے انجام کے بارہ میں بھی فکرمند تھے۔ ہمارا احساس یہ تھا کہ جتنے لوگ اس وقت اس دعوت کے کام سے جڑے ہوئے ہیں ان کا تعلق اور انکی نسبت دراصل حضرت کی شخصیت سے ہے۔ دعوت سے ان کا تعلق آپ کی اس ذاتی محبت کی وجہ سے ہے۔ اس لئے یہ امید نہیں ہے کہ حضرت کے بعد بھی یہ کام اسی طرح چلتا رہے اور جس طرح لوگ حضرت کے سامنے اس کام کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں وہ آپ کے بعد بھی اسی طرح دیتے رہیں گے۔

ایک رات کو اس ناچیز اور رفیق محترم مولانا علی میاں نے اس بارہ میں دیر تک غور و فکر اور باہم مشورہ کیا۔ اور ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر حضرت کے بعد یہاں اس دعوتی کام کے مرکز نظام الدین میں کسی ایسی شخصیت کا قیام رہے جس کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور انکی دعوت سے تعلق و محبت رکھنے والے پورے حلقہ کو عقیدت و محبت ہو تو پھر انشاء اللہ یہ کام اسی طرح چلتا رہے گا، اور ایسی شخصیت اس وقت ہماری نظر میں صرف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کی تھی اور ممدوح کی بے انتہا عنایت و شفقت نے ہم لوگوں کو انتہائی محبت و عقیدت کے

باوجود کسی قدر بے تکلف بھی کر دیا تھا، اس لئے ہم نے یہ طے کیا کہ ہم اس بارہ میں حضرت موصوف سے صاف صاف بات کریں، اور اصرار کریں کہ وہ ابھی یہ فیصلہ فرمالیں اور ہمیں اس بارہ میں مطمئن کر دیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد اُن کے جانشین کی حیثیت سے وہ نظام الدین میں مستقل قیام فرمائیں گے۔ ہم نے طے کیا کہ آج صبح ہی حضرت ممدوح سے وقت لے کر ہم تنہائی میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔

صبح صادق ہوئی، فجر کی اذان ہوتے ہی میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ نماز کے بعد آپ سے ایک خاص معاملہ میں کچھ عرض کرنا ہے، اسکے لئے وقت مقرر فرما دیجئے، فرمایا کہ نماز کے بعد متصلاً قاری سید رضا حسن (مرحوم) کی درسگاہ میں بیٹھ جائیں گے۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت شیخ وہاں تشریف لے آئے اور یہ عاجز بھی حاضر ہو گیا، اور اس ناچیز نے مختصر تمہید کے بعد اپنی اور مولانا علی میاں کی طرف سے وہ بات عرض کی جو رات کے مشورہ میں ہم دونوں نے طے کی تھی، میں نے عرض کیا کہ حضرت مولانا کے مرض و ضعف کی رفتار دیکھتے ہوئے اب اُمید ٹوٹتی جاتی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ دل میں یہ فکر اُبھر رہی ہے کہ حضرت کے بعد اس دینی کام کا کیا ہوگا۔ ہم لوگوں کا اندازہ ہے اور غالباً جناب والا کو بھی اس سے اتفاق ہوگا کہ اس وقت جتنے عناصر کام میں لگے ہوئے ہیں ان سب کا اصل تعلق حضرت کی ذات سے ہے، اور اس ذاتی تعلق کی وجہ سے وہ اس کام میں جڑے ہوئے ہیں، اس کا کافی اندیشہ ہے کہ حضرت کے بعد آہستہ آہستہ یہ شیرازہ منتشر ہو جائے گا، اور یہ امت کا بہت بڑا خسارہ ہوگا، ہمارے نزدیک اس کا صرف ایک حل ہے اور وہ یہ کہ حضرت کے بعد جناب یہاں قیام کا فیصلہ فرمالیں اور یہ کام جناب کی رہنمائی اور سرپرستی میں ہو، ہمارا اندازہ ہے اور اپنے اس اندازہ پر ہمیں پورا اعتماد ہے کہ اگر ایسا ہوا تو یہ سب عناصر اسی طرح جڑے رہیں گے، کیونکہ ان سب کو جناب کے ساتھ

بھی الحمد للہ عقیدت و محبت کا خاص تعلق ہے ـــــ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ اور اگر ایسا نہ ہوا تو تھوڑے دنوں کے بعد یہ سارا مجمع منتشر ہو جائے گا اور ہم خود اپنے بارے میں بھی صفائی سے عرض کرتے ہیں کہ ہم بڑے سخت "وہابی" ہیں ہمارے لئے اس بات میں کوئی خاص کشش نہیں ہو گی کہ یہاں حضرت کی قبر مبارک ہے، یہ مسجد ہے جس میں حضرت نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ حجرہ ہے جس میں حضرت رہا کرتے تھے ـــ اور اگر جناب نے یہاں قیام فرمایا تو انشاء اللہ ہم سب کا تعلق اس کام سے اور اس جگہ سے ایسا ہی رہے گا جیسا آج ہے۔

حضرت شیخ الحدیث نے میری یہ بات پوری خاموشی سے سُنی، اور جب میں اپنی بات عرض کر چکا تو فرمایا:۔

مولوی صاحب! حضرت چچا جان کی حالت دیکھ کر جو فکر آپ کو ہو رہی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ وہ یہاں سب کو ہو رہی ہے، اور سب اس سوچ میں ہیں، لیکن یہ بات ایسی نہیں ہے کہ ہم اور آپ اس کا کوئی انتظام کر لیں اور وہ ہو جائے ـــ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے ان خاص بندوں کے ساتھ جو اس کے لئے مرتے مٹتے ہیں یہ ہے کہ وہ انکی چیز کو ضائع نہیں فرماتا، ان کے بعد بھی ان کے کام اور ان کے فیض کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اکثر و بیشتر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں کچھ لوگ ان کی محنت اور تربیت سے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں، اور ان سے امید ہوتی ہے کہ اس بندہ کے بعد انشاء اللہ اس کا سلسلہ اور فیض ان کے ذریعہ جاری رہے گا ـــــ مشائخ کے ہاں خلافت و اجازت کا سلسلہ دراصل اسی کی ایک علمی اور انتظامی شکل ہے خلافت اور اجازت کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کو شیخ کی نسبت کچھ حاصل ہو گئی ہے اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے کا جو کام شیخ سے لیا جا رہا ہے وہ انشاء اللہ ان سے بھی لیا جائے گا۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بندہ کی عمر بھر کی محنت اور تربیت سے ایک آدمی بھی ایسا بنتا ہوا نظر نہیں آتا جس سے توقع کی جاسکے کہ اس کے ذریعہ اس بندہ کا جلایا ہوا چراغ روشن رہے گا، لیکن اس بندہ کا وصال ہوتے ہی چانک اسکے لوگوں میں سے کسی ایک میں غیر معمولی تبدیلی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جانے والے کی نسبت دفعۃً اس کی طرف منتقل ہوگئی ـــــ ایسا بہت کم اور شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، لیکن جب ہوتا ہے تو نسبت کا یہ انتقال بہت غیر معمولی خارق عادت قسم کا ہوتا ہے ـــ حضرت چچا جان کے لوگوں میں میں کسی کے متعلق نہیں سمجھتا کہ وہ تیار ہو چکا ہے، وہ ان کے اس کام کو وہ جاری رکھ سکے گا، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے اسکی پوری امید ہے کہ وہ ان کے کام کو ضائع نہیں فرمائے گا، اسلئے مجھے توقع ہے کہ غالباً یہاں دوسری شکل واقع ہونے والی ہے، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو کسی کو یہ دولت مل جائے گی، پھر اسکو تم بھی دیکھ لوگے اور میں بھی دیکھ لوں گا، اور پھر انشاء اللہ یہ کام اسی سے لیا جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ میرے بارہ میں ہوا تو مجھ سے کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں، پھر میں خود یہاں رہوں گا بلکہ اگر تم سب مل کر مجھے نکالنا چاہو گے جب بھی نہیں ہوں گا، اور اگر کسی اور کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا تو تم بھی اسکو دیکھ لوگے اور میں بھی دیکھ لوں گا، پھر اللہ تعالیٰ اسی سے یہ کام لے گا بس انتظار کرو اور اللہ سے دعا کرو ـــــ اور اگر دیکھو کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی تو مولوی صاحب! میں خود تم سے بڑا "وہابی" ہوں، میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ حضرت چچا جان کی قبر اور حضرت کے حجرہ کے در و دیوار کی وجہ سے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس عاجز کو اب دن تاریخ تو یاد نہیں، لیکن اتنی بات یقین کے ساتھ یاد ہے کہ حضرت شیخ الحدیث سے یہ گفتگو حضرت کے وصال سے ٹھیک بارہ دن پہلے ہوئی تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ حضرت شیخ کا جواب سننے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اطمینان نصیب فرما دیا تھا اور فکر کا سارا بوجھ دل و دماغ سے اتر گیا تھا۔

بارہ دن بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا۔ وصال سے چند گھنٹے پہلے مخدومنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کے آنے اور توجہ دلانے پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چند خاص متوسلین پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا اور ان کو اجازت دی اور حضرت رائے پوری نیز حضرت شیخ الحدیث کے مشورہ ہی پر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے لئے خلافت کا فیصلہ فرمایا جیسا کہ حضرتؒ کی تاریخ میں تفصیل سے اسکا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

حضرت کا وصال صبح صادق کے وقت ہوا اور فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی خلافت اور جانشینی کا باقاعدہ اعلان ہوا۔

میں بدقسمتی سے دو دن پہلے ایک خاص ضرورت سے اسوقت کے اپنے مستقر بریلی آگیا تھا اور وہیں اس وقت واپس پہونچا جب لوگ حضرت کے دفن سے فارغ ہوکر واپس ہو رہے تھے، خلافت و جانشینی کا واقعہ میں نے وہاں پہونچ کر سنا۔ چونکہ اس وقت اپنی ناقص نگاہ میں مولانا محمد یوسف صاحب میں کوئی خاص امتیاز سوائے صاحبزادگی کے نہیں تھا، اور اپنے علم و اندازہ کے مطابق تبلیغی کام سے تو اُن کو گہری دلچسپی بھی نہیں تھی بلکہ اس لحاظ سے قاری داؤد صاحب وغیرہ حضرت کے بعض پرانے خادم اور رفیق ان سے بہت آگے تھے، اس لئے مجھے اس واقعہ کو سُنکر کوئی خوشی نہیں ہوئی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے بارہ میں بھی دل میں طرح طرح کے وسوسے آئے، اور میں ان وساوس سے اتنا مغلوب ہوا کہ انکی تاریکی میں بارہ دن پہلے کی حضرت شیخ الحدیث والی عارفانہ بات بھی بالکل یاد نہیں آئی، دن کا باقی حصہ اور پوری رات اسی حالت میں گزری، اگلے دن صبح کو جب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے فجر کی نماز پڑھائی اور نماز کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معمول کے مطابق تقریر شروع فرمائی تو تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ تو مولانا محمد یوسف صاحب کی زبان سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ بول رہے ہیں۔ اس وقت حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی وہ بات یاد آئی، اور اس تقریر کے ختم ہونے سے پہلے یہ یقین ہوگیا کہ حضرت شیخ نے جو کچھ فرمایا تھا یہ اس کا ظہور ہے، اور اللہ تعالیٰ نے وہ دولت مولانا محمد یوسف صاحب کی طرف منتقل فرمادی ہے ——— "وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَاءُ"

"انقال نسبت" کا لفظ تو بھی تھا اور کتابوں میں بھی پڑھا تھا، لیکن اس کا

مشاہدہ اس دن پہلی دفعہ ہوا۔

(۳)

اس عاجز نے اور غالباً ہر دیکھنے والے نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں تین باتیں بہت غیر معمولی درجہ میں دیکھیں ـــــ ایک دین کا درد و فکر ـــــ دوسرے اللہ تعالیٰ پر اعتماد و یقین ـــــ تیسرے معارف و حقائق کا فیضان۔

دین کے درد و فکر کے لحاظ سے اُن کا حال بلا مبالغہ اس باپ کا سا تھا جس کا اکلوتا باکمال بیٹا جس سے اس کی بڑی امیدیں اور آرزوئیں وابستہ ہوں سخت بیمار اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو، اور اسکی زندگی اور صحت کی فکر نے تمام دوسری فکروں اور ذاتی مسئلوں کو بالکل دبا دیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اور اسکی مدد پر ان کو ایسا اعتماد و یقین تھا گویا قضا و قدر کے فیصلوں کو انھوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بارہ میں آخرت کے بارہ میں، دین کے بارہ میں جب باتیں فرماتے تو اہل علم اور اصحاب درس بھی محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلب پر حکمت کا فیضان ہوتا ہے۔ اور "وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" کی تفسیر سامنے آجاتی۔

پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہر دیکھنے والے نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ یہ تینوں باتیں دفعۃً حضرت مولانا محمد یوسف صاحب میں آگئیں، اور ان تینوں میدانوں میں وہ بہت تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری سے بڑھتے رہے ـــــ آگے درج ہونے والے بعض واقعات سے کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں تک پہونچایا۔

(۴)

آخر ۱۳۴۶ھ یا شروع ۱۳۴۷ھ کا واقعہ ہے، یہ عاجز ہفتہ عشرہ کے قیام کی نیت سے نظام الدین حاضر ہوا۔ اہلیہ بھی اس سفر میں میرے ساتھ تھیں۔ ان دنوں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی پہلی اہلیہ محترمہ حضرت شیخ الحدیث کی بڑی صاحبزادی اور مولوی محمد ہارون کی والدہ مرحومہ مرض دق میں مبتلا تھیں۔ ان کے علاج، دوا کے اہتمام کی ذمہ داری حضرت

حافظ فخر الدین صاحب[1] نے لے رکھی تھی (رحمۃ اللہ علیہ) وہ روزانہ شہر دہلی سے اسی ضرورت سے تشریف لاتے ـــــ میں نے ایک دن حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ان کا حال پوچھا اور مرض کی نوعیت کی تفصیل معلوم کرنی چاہی، ان کے جواب سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ زیادہ باخبر نہیں ہیں۔ مجھے تعجب سا ہوا لیکن میں نے کچھ کہا نہیں ـــــ چار پانچ دن کے قیام کے بعد میری اہلیہ نے مجھ سے کہا کہ مولانا کی بیوی اس درجہ کی مریض ہیں کہ مجھے ان کے بچنے کی بھی امید نہیں ہے اور میں چار پانچ دن سے دیکھ رہی ہوں کہ حضرت مولانا ان کا حال پوچھنے کے لئے بھی کسی وقت ان کے پاس نہیں آتے، وہ عورت ذات ہیں ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، ان کا بھی تو کچھ حق ہے۔ میں نے پوچھا کیا انھوں نے تم سے خود بھی اسکی شکایت کی ہے؟۔ انھوں نے کہا نہیں، انھوں نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا لیکن ان کے دل پر اس کا اثر ضرور ہوگا، آپ اسکے لئے مولانا سے ضرور کہیں۔ میں نے اگلے دن مولانا سے تنہائی میں گفتگو کی اور عرض کیا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کی اہلیہ ایسی مریض ہیں اور آپ کئی کئی دن مزاج پرسی کے لئے بھی ان کے پاس نہیں جاتے۔ رشتۂ زوجیت کے علاوہ وہ حضرت شیخ کی صاحبزادی بھی ہیں، ہماری سمجھ میں آپ کی یہ بات بالکل نہیں آئی، آپ کو روزانہ کچھ وقت ان کے پاس ضرور صرف کرنا چاہیئے۔

مولانا نے بڑی معصومیت سے فرمایا کہ "ہاں یہ بات تو بالکل صحیح ہے، اور میں نے خود اُن سے اس بارہ میں بات کی تھی، مگر انھوں نے میرے حال اور میری مصروفیت کو دیکھکر خود ہی مجھ سے یہ کہہ دیا ہے کہ آپ اپنے کاموں میں مشغول رہیں، میری فکر بالکل نہ کریں، دوا علاج ہو رہا ہے، اگر زندگی ہے تو اچھی ہو جاؤں گی اور اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ جلدی اٹھانے

---

[1] حضرت حافظ فخر الدین صاحبؒ اس عہد کے ہمارے اکابر مشائخ میں سے تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے خلیفۂ مجاز یعنی حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے پیر بھائی تھے اور ان حضرات سے بڑا گہرا تعلق رکھتے تھے، علاوہ دوسرے معمولات کے روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرنا ان کا مستقل معمول تھا ـــ ۱۲

کا ہے "ان شاء اللہ جنت میں اطمینان سے ملاقات ہوگی"۔ ــــ میں نے کہا مجھے تو یہ شبہ ہے کہ انھوں نے یہ بات آپ کی بے فکری اور بے پروائی دیکھ کر کہی ہوگی ۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ تحقیق کریں اگر ایسی بات ہوگی تو میں ان کے لئے وقت نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تم ان سے اس بارہ میں اس طرح کی جذباتی باتیں کرو کہ ان کے دل کی بات زبان پر آجائے ــــ چنانچہ میری اہلیہ نے مرحومہ سے بات کی انھوں نے مولانا کی طرف سے خود مراجعت کی اور کہا کہ وہ دن رات دین کی فکر اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں اپنا بھی ہوش نہیں ہے، میں نے ہی خود اُن سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری فکر نہ کریں، وہ اصلاح ہو ہی رہا ہے، اگر اللہ نے جنت میں جمع فرما دیا تو وہاں اطمینان سے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا ــــــــ چند مہینوں کے بعد اسی علالت میں خاص نماز کی حالت میں مرحومہ کا انتقال ہوگیا۔ اللھم اغفرلہا وارحمہا

(۵)

تبلیغی کام کے مرکز نظام الدین میں جس پیمانہ پر کھانے کا لنگر جاری رہتا ہے اور روزانہ سیکڑوں آدمی دونوں وقت جس طرح دسترخوان پر وہاں کھاتے ہیں وہ بلاشبہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں عجائب اور خوراق میں سے ہے، ہمیشہ سے وہاں کا دستور یہ ہے کہ جب پیسے پاس نہیں ہوتے تو سارا غذائی سامان قرض، ادھار آتا رہتا ہے، جب پیسے آتے ہیں ادا کر دیا جاتا ہے ــ بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے ــــــ تقریباً چودہ پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قرض کی رقم کچھ زیادہ دنوں تک ادا نہیں کی جاسکی، غلہ وغیرہ جس دکاندار کے یہاں سے آتا تھا اس نے ان صاحب سے تقاضا کیا جو سامان لینے جایا کرتے تھے اور باورچی خانہ کا انتظام جن کے سپرد تھا، اور آگے کے لئے مزید سامان قرض دینے سے معذرت کر دی۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے اس سلسلہ میں کوئی تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور ہمیشہ پیش آسکنے والی اس مشکل کو مستقل طور سے حل کرنے کے لئے یہ تجویز سوچی کہ وہ چار اپنے مخلص صاحب استطاعت حباب راز دارانہ طریقہ پر ایک مناسب رقم امانت کے طور پر آپس میں جمع کریں تاکہ جب ایسی ضرورت پیش آئے تو اس میں سے

لنگر خانہ کے سلسلہ کا قرضہ ادا کر دیا جایا کرے اور جب رقم اپنے پاس آئے تو وہ امانت فنڈ میں واپس کر دی جایا کرے۔ اور چونکہ یہ اندازہ تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب اس کو کبھی پسند نہیں فرمائیں گے اس لئے پوری رازداری کے ساتھ انھوں نے بالا بالا اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ دہلی کے پانچ باتوفیق دوستوں نے پانچ پانچ ہزار روپیہ دیکر پچیس ہزار کی رقم اپنے ہی میں سے ایک کے پاس جمع کر دی اور آپس میں عہد معاہدہ ہو گیا کہ حضرت مولانا سے کوئی اس کا ذکر نہ کرے بلکہ بات بالکل راز میں رہے اور ہم چھ آدمیوں کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔

معلوم نہیں کس طرح دوسرے یا تیسرے ہی دن مولانا کو اسکی اطلاع ہو گئی۔ انھوں مطبخ کے ان منتظم صاحب اور اپنے ان پانچوں مخلصوں کو جنھوں نے وہ رقم جمع کی تھی بلوایا اور تنہائی میں بٹھا کر پوچھا کہ مجھے اس طرح کی اطلاع ملی ہے سچ سچ بتائیے کیا آپ لوگوں نے ایسا کیا ہے؟ ان بیچاروں کو اقرار کرنا پڑا۔ اس کے بعد مولانا نے ان کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں فرمایا کہ آپ لوگوں نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا ہے لیکن ہمارے ساتھ یہ ایک طرح کا ظلم ہے۔ جب اس طرح کے انتظام آپ لوگ کریں گے تو پھر ہم اللہ کی مدد کے قابل نہیں رہیں گے۔ اللہ کی مدد کے قابل ہم اسی وقت تک ہیں جب تک دنیا میں ہمارا کوئی سہارا نہ ہو اور ہماری نظر بس اسکے خزانہ اور اسکی مدد پر ہو اور ہم مضطر ہوں ——— اس کے بعد مولانا نے حکم دیا کہ ہر ایک اپنی اپنی رقم واپس لے لے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ——— یہ واقعہ اسی زمانہ میں مجھ سے حسن صاحب نے بیان کیا وہ خود اسکے شرکا میں سے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ اس دن کی تقریر میں حضرت مولانا خود بھی روئے اور ہم سب کو بھی خوب رُلایا۔ اور ہم سب نے توبہ کی اور معافی مانگی۔

(۶)

اب سے ۷۰ سال پہلے مولانا کی اہم تصنیف "حیاۃ الصحابہ" جب مکمل ہوئی اور اسکی طباعت کے بارہ میں طے ہوا کہ "دائرۃ المعارف حیدرآباد" میں چھپوائی جائے۔

توحیدرآباد کے مخلص دوستوں نے طباعت کے اہتمام وانصرام کی ذمہ داری لے لی، اور بالا بالا اپنے طور پر یہ بھی کوشش کی کہ اسکے مصارف کا انتظام بھی وہ خود ہی کرلیں، اس مقصد کے لئے انھوں نے بمبئی وغیرہ کے حضرت مولانا کے بعض مخلصین اور معتقدین سے بات بھی کی۔ اور اس رقم کا بڑا حصہ (غالباً ۸۔ ۱۰ ہزار کے قریب) فراہم بھی کرلیا ـــــ حضرت مولانا کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپنے وہ ساری رقم واپس کرادی، اور کاغذ وطباعت وغیرہ کے لئے جتنی رقم درکار تھی وہ خود ہی بھیجی۔

(۷)

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے غالباً چند ہی مہینے بعد مراد آباد میں پہلا بڑا تبلیغی اجتماع ہوا۔ اس وقت تک تبلیغی کام کے سلسلہ میں بڑے اجتماعات اور جلسے میوات میں تو ہوتے تھے لیکن میوات سے باہر بڑے اجتماعات کا رواج ابھی نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک اس ناچیز کو یاد ہے مراد آباد کا یہ اجتماع اپنی قسم کا پہلا بڑا اجتماع تھا۔ باہر کے قریباً سات سو آدمیوں نے اس میں شرکت کی تھی۔ تبلیغ کے لئے اوقات دینے کا رواج بھی اس وقت تک میوات سے باہر بہت ہی کم ہوا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے تقریر شروع فرمائی اور حسب عادت تقریر میں گویا کلیجہ نکال کے رکھدیا۔ اسکے بعد اوقات کا مطالبہ شروع ہوا، بہت ہی کم نام آئے۔ حد یہ ہے کہ بجنور، چاندپور اور رامپور جیسے بالکل قریبی مقامات کے لئے دس دس آدمیوں کی جماعتیں بھی نہیں بن سکی تھیں۔ ہم کئی آدمی لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے۔ اور اپنا پورا زور لگا رہے تھے۔ لیکن نامیں اضافہ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب جو تقریر فرمانے کے بعد مسجد کی اندرونی محراب میں تشریف فرما تھے، لوگوں کی یہ سرد مہری دیکھ کر ان کو جلال آگیا۔ ایکدم اٹھکر تشریف لائے اور میکروفون میرے ہاتھ سے لے کر فرمانا شروع کیا آج تم بجنور، چاندپور اور رامپور جیسے قریبی مقامات کے لئے اور صرف تین تین دن کا وقت دینے کے لئے تیار

تیار نہیں ہو رہے ہو، ایک وقت آئے گا جب تم شام جاؤ گے، مصر جاؤ گے، عراق جاؤ گے لیکن اس وقت اس کام کا عام رواج ہو چکا ہوگا اس لئے اجر گھٹ جائے گا۔ مولانا کی اس پُرجلال دعوت پر چند نئے نام اور آگئے۔ لیکن میرا خام اور ظواہر کا اسیر ذہن چونکہ ماحول سے اثر لینے کا عادی ہے، اس لئے مولانا کی شام و عراق اور مصر جانے والی بات کا مجھ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا، میں محسوس کر رہا تھا کہ جب لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ چاندپور اور رامپور کے لئے تیار نہیں ہو رہے ہیں تو اس حالت میں شام و عراق اور مصر جانے والی بات بہت بے موقع ہے۔ مگر اللہ کی شان تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا کی وہ بات واقعہ بن کر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اور ان ممالک عربیہ میں غالباً پہلی جماعت مراد آباد ہی سے گئی۔

۸

اس عاجز نے پڑھنے کے زمانہ میں خدا کے فضل سے محنت سے پڑھا اور پڑھانے کے زمانہ میں محنت سے پڑھایا۔ ذہن اور حافظہ کی نعمت سے بھی اللہ تعالیٰ نے محروم نہیں رکھا تھا، لکھنا پڑھنا اور مطالعہ ہی اصل مشغلہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے اتنا ذ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کبھی کسی کے علم سے مرعوب و متاثر نہ ہو سکا۔ لیکن حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جب حاضری نصیب ہوئی تو محسوس ہوا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک علم عطا ہوا ہے (جو مدرسہ اور کتب خانہ کا علم نہیں ہے) اس لئے حسب توفیق ان کے بہت سے ارشادات اپنے لئے قلمبند بھی کئے۔ بعد میں ان کا ایک حصہ کتابی شکل میں بھی مرتب کیا (جو شائع ہو چکا ہے) ــــ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی تقریروں میں بھی صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہی علم ان کو بھی عطا ہوا ہے، اور قوت بیان مزید برآں ہے۔ اس لئے ان کی تقریر لکھنے کو بھی جی چاہتا تھا، مگر دیکھتا تھا کہ اللہ کی توفیق سے بہت سے حضرات انکی تقریریں لفظ بہ لفظ قلمبند کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اس لئے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ پھر بھی اپنے لئے انکے خاص خاص معارف اشاروں میں نوٹ کیا کرتا تھا۔ اس عاجز کو پوری بصیرت کے ساتھ یقین

ہے کہ یہی وہ علم ہے جس کے بارہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ " وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا "

ان کی تقریر کے پھیلاؤ میں بعض وقت ایسی باتیں بھی آجاتی تھیں جو ہمارے زمانہ کے بعض طبقوں کے ایمان کے لئے آزمائش بن سکتی تھی۔ یہ اسی قسم کی چیزیں ہوتی تھیں جن کے بارہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے زمانہ کے بعض علماء کو تنبیہ فرمائی تھی کہ " أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللهُ وَرَسُولُهُ " لیکن مولانا کی اندرونی ایمانی قوت اور بنیادی دعوت کی طاقت اس طبقہ کو بھی تھام لیتی تھی ——— لیکن ہر ایک کے پاس تو یہ اکسیر اور تریاق نہیں ہے۔

۹

جن خوش نصیبوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں اور ان کو اس دولت سے کچھ مناسبت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اہل ایمان کو ملتی ہے ان سب کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ مولانا کی تقریر سے ایمان میں جان پڑتی تھی اور کھلی ترقی محسوس ہوتی تھی اور قرآن مجید کی جن آیتوں میں ایمان کی زیادتی اور اضافہ کا ذکر کیا گیا ہے ان کی صحیح تفسیر سمجھ میں آتی تھی ———

——— زمانہ اور ماحول کے فرق کے ساتھ ان کی تقریروں کو بے ساختہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے مواعظ سے بڑی قریبی مشابہت تھی۔

۱۰

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے اللہ کے لئے اور اس کے دین کے لئے اپنے کو کلی طور پر وقف کر دیا تھا۔ اپنی ساری توانائیاں اور اپنی ہر چیز اسکی راہ میں اس طرح لگا دی تھی کہ اس میں سے کچھ بھی اپنی ذات کے لئے بچا کے نہیں رکھا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ہزاروں بلکہ لاکھوں بندوں کو ان کے لئے مسخر کر دیا۔ اس کے کہنے میں انشاء اللہ کچھ بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کی دنیا کے کسی بڑے سے بڑے سرمایہ دار، بڑے سے بڑے مقبول اور با اثر لیڈر یا ڈکٹیٹر، کسی جمہوریہ کے محبوب صدر یا وزیر اعظم کی حکومت اتنے دلوں پر نہ

ہوگی۔ جتنے دلوں پر مولانا مرحوم کی حکومت تھی۔ انھوں نے کوئی پارٹی نہیں بنائی۔ اپنے کام یا پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے کوئی اخبار یا رسالہ جاری نہیں کیا (بلکہ دوسروں سے چاہتے اور امکان بھر اسکی کوشش کرتے تھے کہ دوسرے اخبارات ان کا اور ان کے کام کا کوئی ذکر نہ کریں۔ وہ اپنے مقصد کے لئے اسی کو مفید سمجھتے تھے) انھوں نے کبھی کوئی فنڈ جمع نہیں کیا۔ بس خود قربانی دی اور اللہ کے بندوں کو قربانی کے لئے پکارا، اللہ تعالیٰ نے پہلے ہزاروں پھر لاکھوں بندوں کو اُن کے گرد جمع کر دیا اور اسلام کی اس غربت کے دور میں چشم فلک نے یہ تماشا دیکھا کہ چٹائی پر بیٹھنے والے ایک درویش عالم دین اور اللہ کے داعی کی ترغیب دعوت اور محنت کے نتیجہ میں اللہ کے ہزاروں لاکھوں بندے یورپ۔ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور جزیروں میں شہروں اور قصبوں میں اور دیہاتی آبادیوں میں ہر وقت پھر رہے ہیں۔ ان میں اُردو بولنے والے بھی ہیں اور عربی بولنے والے بھی، فارسی بولنے والے بھی ہیں اور ترکی بولنے والے بھی، بنگالی بولنے والے بھی ہیں اور پنجابی یا پشتو بولنے والے بھی، انگریزی بولنے والے بھی اور فرانسیسی اور جرمنی بولنے والے بھی۔

ـــــــ ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اور ان سے بھی پہلے خادمان دین اور داعیان حق کی طرح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بھی اٹھائے گئے۔ لیکن جو اللہ سب کچھ کرنے والا ہے وہ حی قیوم ہے، اور ازل سے اس کا ایک ہی قانون و دستور ہے۔ اگر اسی خلوص وللہیت کے ساتھ اور انہی اوصاف اور اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے قربانیاں دی جاتی رہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہی تعلق رہا جس کا نمونہ ہمارے اس زمانہ میں ان دونوں باپ بیٹوں نے پیش کیا تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی ہوتا رہے گا جو اب تک ہوتا رہا ہے۔

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً۔

تاریخ و سوانح پر عمدہ کتابیں

مخدوم جہانیاں جہاں گشت :-
محمد ایوب قادری 7-00

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات :-
اعجاز الحق قدوسی 10-00

سید عطاء اللہ شاہ بخاری :-
شورش کاشمیری 3-00

حیات امام ابن حزمؒ :- پروفیسر ابوزہرہ (مصر)
ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری 16-00

حیات وحید الزماں :-
مولانا محمد عبدالحلیم چشتی 4-00

تجلیات عثمانی :- (علامہ شبیر احمد عثمانی)
پروفیسر محمد انوار الحسن (انور) 10-50

حیات امداد (شرح حاجی امداد اللہ صاحبؒ)
پروفیسر محمد انوار الحسن انور شیر کوٹی 4-00

شمائم امدادیہ (از حضرت تھانویؒ) قیمت -/-/2

تذکرہ علمائے ہند :- تالیف مولانا رحمن علی صاحب
ترجمہ محمد ایوب قادری 15-00

حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی :-
سید علی احمد عباسی 10-00

حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی :-
از علامہ مناظر احسن گیلانی 12-00

حیات حضرت امام ابوحنیفہؒ :- تالیف
محمد ابوزہرہ (مصر) ترجمہ غلام احمد حریری 15-

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ :- تالیف
محمد ابوزہرہ (مصر) ترجمہ سید رئیس احمد جعفری 21-00

امام مالکؒ :- تالیف محمد ابوزہرہ (مصر)
ترجمہ عبیداللہ قدسی 10-00

الغزالی :-
از علامہ شبلی نعمانی 5-25

الفاروق :-
از علامہ شبلی نعمانی 6-00

بزم تیموریہ :-
سید صباح الدین عبدالرحمن 7-00

بزم مملوکیہ :-
سید صباح الدین عبدالرحمن 5-50

محل دور حکومت :-
از خانی خان نظام الملک (کامل) 39-50

عبرت دنیا :-
نجف عزالدین ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین 12-00

تاریخ غرناطہ (کامل) لسان الدین ابن الخطیب
ترجمہ سید احمد اللہ ندوی 21-75

تاریخ فاطمیین مصر (کامل) :-
ڈاکٹر زاہد علی بی اے ڈی فل (آکسن) 17-50

اقبال نامہ جہانگیری :-
از مرزا محمد عرف معتمد خاں 6-75

مختصر تاریخ ہند :-
مولانا سید ابوظفر ندوی 3-00

مولانا محمد علی (بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے)
محمد سرور صاحب 8-00

سفینۃ الاولیاء :- از شہزادہ دارا شکوہ 6-75

کان عملو کی خاضعی مالکی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کے

دو گرامی نامے

(۱)

ہفتہ وار رسالہ "خدام الدین لاہور" نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ان کے تذکرہ پر مشتمل ایک مستقل نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی سے بھی مضمون کی درخواست کی، اور چند متعین باتیں بھی دریافت کیں — حضرت ممدوح نے حسب معمول مضمون لکھنے سے تو معذرت کر دی لیکن سوالات کے جواب لکھا دیے — سہارنپور کی حاضری کے موقع پر اس گرامی نامہ کی نقل حضرت کے بعض خدام سے حاصل ہو گئی تھی — اس میں مولانا مرحوم کے حال اور مقام کے بارہ میں جو چند سطریں ہیں در حقیقت وہ بجائے خود ایک دفتر ہیں — رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے مقالہ میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اور اس عاجز نے سابقہ اوراق میں اپنے جن تجربوں اور مشاہدوں کا ذکر کیا ہے ان کے پڑھنے کے بعد حضرت شیخ مدظلہ کے اشارات کو سمجھنا انشاء اللہ آسان ہو گا — محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عنایت فرمائم سلمہ۔ بعد سلام مسنون ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس ناکارہ کو اس قسم کے مضامین لکھنے کی بالکل عادت نہیں، اور نہ اس قسم کے

مضامین سے مناسبت ہو حضرت اقدس مدنی اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہما کے وصال پر بہت سے احباب کے اصرار ہوئے اسی طرح دوسرے اکابر کے انتقال پر احباب کے اصرار ہوتے رہے مگر یہ ناکارہ انکار کرتا رہا۔ اس ناکارہ کے حوالے سے ان اکابر کی سوانحوں میں جہاں کہیں مضامین چھپے ہیں اس کی صورت یہ رہی کہ تالیف کرنے والے احباب آکر ان کے احوال دریافت کرتے رہے۔ اور یہ ناکارہ اپنی معلومات سے جواب عرض کرتا رہا۔ عزیز مولانا محمد یوسف مرحوم کی ولادت ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ ۲ مارچ ۱۹۱۷ء شنبہ کو ہوئی تھی۔ ۲ جمادی الثانی دوشنبہ کو عقیقہ ہوا تھا اس کے بعد اس کے سوا کیا لکھوں۔

کان ھذا من اعاجیب الزمن ان ھذا

ابتدا میں وہ میرا چچیرا بھائی تھا، شاگرد تھا، زیر تربیت تھا۔ وہ میری نالائقی سخت مزاجی کی وجہ سے اپنے اللہ صاحب یعنی میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی بہ نسبت اس ناکارہ سے بہت زیادہ ڈرتا تھا چچا جان کے احکام کو وہ پدرانہ ناز کی وجہ سے اور اپنے بچپن کی وجہ سے کبھی ٹال دیتا تھا لیکن اس ناکارہ کی سخت مزاجی کی وجہ سے میرے کہنے کو نہیں ٹالتا تھا چچا جان کو بسا اوقات یہ فرمانا پڑتا کہ یوسف سے خلاں کام لینا ہے تمہارے کہنے سے جلدی کر دے گا۔ دہلی کے حضرات کا چچا جان پر بہت اصرار ہوتا کہ صاحبزادے سلمہٗ کو شادی میں ضرور ساتھ لاویں۔ مگر مرحوم اپنے طلب علم میں اس قدر منہمک تھا کہ اس کو یہ حرج بہت ناگوار ہوتا بسا اوقات اس کی نوبت آئی کہ ان اوقات میں اگر اس ناکارہ کا دہلی جانا ہوا تو عزیز مرحوم مجھ سے جاتے ہی وعدہ لے لیتا کہ بھائی جی فلاں جگہ جانے کو آپ نہ کہیں۔ اور جب چچا جان مجھ سے یہ ارشاد فرماتے کہ یوسف کو بھی ساتھ لے لو۔ تو میں یہی معذرت کرتا کہ اس نے آتے ہی مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ میں نہ کہوں۔ یہ تو ابتدا تھی۔ اس کے بعد مرحوم نے ہوائی جہاز سے وہ پرواز کی کہ وہ آسمان پر پہونچ گیا اور یہ ناکارہ زمین ہی پر پڑا رہا۔ اس کی بلندی کو دیکھتا رہا چچا جان کے وصال کے بعد بھی ایک پرواز اس نے کی جس کے متعلق اس ناکارہ کا اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا یہ خیال ہوا کہ چچا جان نور اللہ مرقدہ کی نسبت خاصہ منتقل ہوئی ہے اور ہر بات میں اس کا خوب مشاہدہ ہوتا۔ اس کے بعد اس کی ترقیات

کو دیکھتا رہا۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد سے مرحوم میں ایک جوش کی کیفیت پیدا ہوئی اور کسی بڑے سے بڑے ذی وجاہت شخص کے سامنے بھی اپنی بات کو نہایت جرأت اور بے خوفی سے کہنے کا ظہور ہوا اور وہ بڑھتا ہی رہا۔ اسکے بعد حضرت اقدس نے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد انکی گفتگو اور تقاریر میں انوار اور تجلیات کا ظہور پیدا ہوا۔ کیا عجیب ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی خصوصی توجہات اور مرحوم کے ساتھ شفقت اور محبت کا یہ ثمرہ ہوا نہیں چیزوں کا یہ اثر ہوا جو اس ناکارہ نے شروع میں شعر میں ظاہر کیا کہ پھر یہ ناکارہ اس سے محروم ہونے لگا کہ اس کے اصرار پر مجھے حج کی تکلیف دشوار ہو گئی اس کا اثر تھا کہ گزشتہ سال اپنی انتہائی معذوری اور مجبوریوں امراض کی شدت کے باوجود جب مرحوم نے اس پر اصرار کیا کہ تمہیں حج کو میرے ساتھ ضرور چلنا ہے تو میری انکار کی ہمت نہ پڑی اور جب میں نے اپنے امراض کا اظہار کیا اور کہا کہ میرے اعذار کو نہیں دیکھتے ہو تو مرحوم نے کہا کہ خوب دیکھ رہا ہوں مگر میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ضرور چلیں۔ اخیر میں اللہ جل شانہ نے اپنے لطف و کرم کی وہ بارش فرمائی کہ مجھ جیسے بے بصیرت کو بہت سی چیزیں کھلی محسوس ہوتی تھیں۔ اس قسم کی باتیں نہ کہنے میں آتی ہیں اور نہ لکھنے کو دل چاہتا ہے صرف ایک عورت کے خواب پر اس عریضے کو ختم کرتا ہوں۔ خواب تو مرحوم کے حادثہ کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب دیکھے اور لکھے لیکن یہ خواب چونکہ اس ناکارہ کے نزدیک لفظ بلفظ واقعہ ہے۔ اس لیے لکھوا رہا ہوں۔ اس حادثہ پر اپنے تعلقات کے موافق نیز اپنے قلبی ضعف و تحمل کے موافق اثرات تو بہت ہی عام ہوئے لیکن ایک عورت کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ کسی وقت بھی چین نہ لیتی تھی۔ ہر وقت روتی تھی بار بار وضو کرتی تھی اور تسبیح لے کر بیٹھ جاتی۔ وہ اسی حالت میں ایک دفعہ وضو کر کے تسبیح لے کر بیٹھی تھی کہ اس کو غنودگی ہو گئی سنے عزیز مرحوم کو دیکھا وہ فرما رہے ہیں کہ کیوں پاگل ہو گئی؟ مرنا تو سب ہی کو ہے تعلق مالک سے پیدا کیا کریں بندے سے نہیں۔ اس پر اس نے والہانہ انداز سے یوں کہا حضرت جی آخر یہ ایک دم ہی ہو گیا کیا؟ مرحوم نے کہا کہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ دنوں سے جب میں تقریر کیا کرتا تھا تو مجھ پر تجلیات الٰہیہ کا خاص ظہور ہوتا تھا۔ اس مرتبہ جب میں رات کو تقریر کر رہا تھا تو ان کا اتنا زیادہ ظہور ہوا کہ میرا قلب ان کا تحمل نہ کر سکا اور دورہ

پڑ گیا اس کے بعد ایک بہت بڑا گلاب کا پھول سنگھایا گیا اسکے ساتھ میری رخ کل گئی بس اتنی ہی سی بات ہوئی فقط۔

عزیز مرحوم کی پہلی شادی میری سب سے بڑی لڑکی سے ۳ محرم ۵۴ھ کو بظاہر علوم کے سالانہ جلسے میں ہوئی تھی حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ نے نکاح پڑھا تھا چونکہ پہلے سے کوئی تجویز نہ تھی عین وقت پر چچا جان نے فرمایا کہ نکاح پڑھانے کا ارادہ ہے اس لیے اس وقت رخصت نہ ہوئی تقریباً ایک سال بعد چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی ایک آمد پر اسی طرح فوری طور پر بغیر سابقہ تجویز کے رخصت ہو گئی ۲۳، ۲۴ رمضان ۵۸ھ دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب میں۔ ۱ بجکر ۴۰ منٹ پر عزیز ہارون سلمہٗ کی ولادت ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل و کرم سے اس کو اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ فقط والسلام۔

زکریا

محرم الحرام ۱۳۸۵ھ تعلم محمد عاقل غفرلہٗ

(۲)

مندرجہ بالا گرامی نامہ میں مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ مولوی محمد ہارون کی والدہ مرحومہ کا انتقال اور عبد الحی کی دوسری بہن کے ساتھ مولانا مرحوم کے دوسرے عقد کا تذکرہ نہیں تھا، ناچیز (محمد منظور نعمانی) نے ایک عریضہ لکھ کر دونوں کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت شیخ مدظلہ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

بعد سلام مسنون .....

عزیز یوسف کی پہلی اہلیہ یعنی والدہ ہارون تقریباً ایک سال تک تپ دق میں مبتلا رہ کر ۵۴ھ کے ہنگامہ میں نظام الدین ۲۹ شوال ۵۴ھ شب دوشنبہ کی مغرب کی نماز کے سجدہ میں جبکہ وہ اشارہ سے نماز پڑھ رہی تھی اور سجدہ کے لیے اشارہ سے سر جھکا رکھا تھا دفعۃً انتقال کر گئی ــــ اس کے انتقال کے بعد میں نے عزیز مرحوم کو حکماً منع کر دیا تھا کہ تم دوسرا نکاح نہ کرو کیونکہ اس لیے کہ تمہارے شمائل کا، جو تمہیں حقوق کی ادائیگی کی اجازت نہیں دیتا ہے اس وقت تو اس نے بڑی خوشی سے قبول کیا مگر چند سال بعد اس نے ضرورت کا اظہار کیا تو میں نے کہا بڑے شوق سے جہاں تمہاری رائے ہو وہاں تحریک کروں مرحوم نے کہا اگر کروں گا

تو آپ کے ہاں کر دیں گے اور گنگا کہیں اور گئے کا ارادہ نہیں ہے اس پر اس ناکارہ نے بڑے شوق سے قبول کیا اور نکاح ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ بروز چہارشنبہ بعد نماز عصر مدرسہ کی مسجد میں اس ناکارہ کی دوسری لڑکی سے ہوا جو بیوہ تھی اور اس کا پہلا نکاح مولوی لطیف الرحمٰن کاندھلوی مرحوم کے لڑکے سعید الرحمٰن مرحوم سے ہوا تھا جس کا انتقال ۱۳۶۷ھ کے ہنگامہ ہی کے زمانہ میں ایک طویل علالت کے بعد ہو گیا تھا ــــ اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

ان واقعات کے ساتھ طویل قصے ہیں جو زبانی تو سنائے جا سکتے ہیں تحریر میں ان چیزوں کا آنا معلوم نہیں مناسب ہوگا یا نہیں .....

پہلا نکاح والدہ بارون سے ۳۲ محرم ۱۳۵۲ھ مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ میں چچا جان کے ارشاد پر بلا کسی سابقہ تجویز کے فوری ہو گیا تھا اسی طرح رخصتی بھی ایک سال بعد جب چچا جان جو مظاہر علوم کے سرپرست بھی تھے جلسہ سرپرستان میں تشریف لائے اس وقت عزیزان یوسف و انعام ابوداؤد دوبارہ پڑھنے کے لیے سہارنپور آئے ہوئے تھے یہاں موجود تھے جلسہ سرپرستان میں جس میں حضرت اقدس رائے پوری بھی تشریف فرما تھے چچا جان نے فرمایا کہ ان بچوں کی رخصتی بھی کر دو اسی دن رات کو میرے ہی گھر میں عزیزان یوسف انعام کی رخصتی بھی کر دی اور دوسرے دن صبح کو مختصر دعوت ولیمہ ہو گئی۔

گفتگو آئین درویشی نبود ورنہ با تو ماجرا ہا داشتیم

والسلام

زکریا عفی عنہ سہارنپور

قلم احسان ۲۳ صفر ۱۳۸۵ھ

ایک ضروری بات یہ ہے کہ بعض اخبارات میں مولوی یوسف کی پیدائش نظام الدین میں لکھ دی گئی ہے ان کی پیدائش کاندھلہ میں اپنے جدی مکان میں ہوئی تھی اس وقت چچا جان نور اللہ مرقدہ مظاہر علوم میں مدرس تھے۔



ایجنسیاں (۱) لکھنؤ - اودھ جنرل اسٹورس اسٹور امین آباد - (۲) کانپور - چمن گنج (۳) کوپاگنج - دیسی دواخانہ (۴) گھوسی - حافظ نذیر احمد (۶) امراوتی بندوق والا شاب جوہر گیٹ (۷) اعظم گڑھ - محلہ گرد ٹولہ محمد ولی اللہ (۸) بہرائچ چوک بازار جمال بہ آئیل کمپنی - (۹) بنارس - دال منڈی (۱۰) مئوناتھ بھنجن - صدر بازار

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی
اور
اُن کی چند خصوصیات

(مولانا نسیم احمد فریدی امروہا)

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی مگر نظر میں سما رہے ہیں

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی جن کے نام کے بعد چند ماہ پہلے ہم مدظلہ لکھتے اور بولتے تھے آج رحمۃ اللہ علیہ اور نور اللہ مرقدہٗ کہہ اور لکھ رہے ہیں۔ دُنیا سے گزرنا سب کو ہے، موت سب کو آنی ہے، سب کو اس عالم فانی سے رخصت ہونا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

اس عالم ناپائدار میں جو بھی آیا ہے یہاں سے مقررہ مدت کے بعد ضرور جائے گا، موت کا آہنی چنگل سب کو اپنی گرفت میں لے گا ؎

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی
جان ٹھہری جانے والی جائے گی (نشتر سندیلوی)

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اپنی حیات مستعار میں ایسے کارنامے چھوڑ جاتی ہیں جن سے اُن کا نام نیک باقی رہتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسفؒ بھی اُن مبارک شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے زندہ و پائندہ علمی و دینی کارناموں کے ذریعے جریدۂ عالم پر اپنی نیک نامی کو ثبت کرا دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس نصیب فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے معمور کرے (آمین)

مجھے اکیس سال سے حضرت مولانا مرحوم سے یک گونہ تعلق و ربط تھا۔ وہ اپنے اخلاق عالیہ کے تقاضے سے احقر کا بڑا اکرام فرماتے تھے جس سے بعض اوقات اپنی بے عملی اور کم حیثیتی کے پیش نظر مجھے شرمندگی محسوس ہوتی تھی ـــــ میں بھی ان سے جذبۂ عقیدت مندی سے ملتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ان کی شخصیت میں اکابر ملت کے اخلاق کی جھلکیاں اور مشائخ کاندھلہ کی اداؤں کا عکس نظر آتا تھا۔ یہ حقیقت تو بعد کو معلوم ہوئی کہ حضرت مولاناؒ عمر کے لحاظ سے مجھ سے چار پانچ سال چھوٹے تھے ـــــ میں ان کی حیات میں اپنے تقابلے میں عمر کے لحاظ سے بھی ان کو بڑا سمجھتا تھا ـــــ سچ پوچھیے تو وہ ہر حیثیت سے بڑے ہی تھے۔ ان کی تھوڑی عمر میں بھی کام کے لحاظ سے بڑی برکت ہوئی۔ ہم جیسوں نے سو سال میں بھی وہ اہم کام انجام نہیں پا سکتے جو انھوں نے ۴۹ سال کی عمر پاکر صرف اکیس سال میں انجام دے لیے۔ یہ محض انعام ربانی تھا کہ ان کے کارکردگی کے مختصر سے زمانے کا ہر دن دینی اعتبار سے کامیاب تھا اور ہر رات نور در آغوش تھی۔

حضرت مولانا محمد الیاس نور اللہ مرقدہٗ کو میں نے جہاں تک یاد پڑتا ہے صرف دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ ریل میں جب وہ سہارنپور سے دہلی جا رہے تھے اور میں دیوبند سے سہارنپور جا رہا تھا ـــــ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا ـــــ دوسری مرتبہ ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے بھرا ہی حضرت مولانا نعمانی مدظلہٗ دہلی جاکر ـــــ غرضیکہ میں اپنی محرومی کی بنا پر حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی شخصیت سے ان کی زندگی میں کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اور نہ مجھے کوئی موقع ملا کہ ان کے کارناموں اور مساعیٔ حسنہ سے واقفیت پیدا کرتا ـــــ فائدہ تو اپنے زمانے کے کسی بزرگ سے بھی آج تک نہ اٹھا سکا، اپنی سیہ بختی کی یہ داستان چھیڑنی مقصود نہیں مجھے تو عرض یہ کرنا ہے کہ میں نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے جانشین اور اکلوتے باکمال صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسفؒ کو قریب سے دیکھا، دور سے دیکھا، سفر

میں دیکھا حضر میں دیکھا خلوت میں دیکھا جلوت میں دیکھا، عمومی اجتماعوں میں دیکھا، خصوصی محافل و مجالس میں دیکھا، ان کی روح پرور باتیں سنیں، ان کی پرشکوہ تقریریں سنیں ان کے کچھ مکتوبات بھی احقر کے نام صادر ہوئے جو عرائض کے جواب میں تھے یا از خود ازراہ کرم فرمائی تبلیغی نقل و حرکت کے سلسلے میں ارسال فرمائے گئے تھے۔ وہ تین مرتبہ امروہہ بھی تشریف لائے۔ ایک مرتبہ تبلیغی اجتماع میں اور دو مرتبہ مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ کے جلسۂ دستار بندی اور اجتماع ختم بخاری کے موقع پر ـــــ امروہہ کے متعلق فرماتے تھے کہ "یہ ہمارے بزرگوں کی بستی ہے" ـــــ سلسلہ صابریہ امدادیہ رشیدیہ کے تین اکابر طریقت اس سرزمین پر ابدی نیند سو رہے ہیں ـــــ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے بعض خدام سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس زمانے میں جبکہ ان کا یہاں کوئی تعارف نہ تھا اپنے ان اکابر طریقت کے مزاروں پر حاضری دینے تشریف لایا کرتے تھے۔

الغرض حضرت مولانا محمد یوسفؒ سے واقفیت کے اسباب مجھے حاصل ہوئے میں ان کی شخصیت سے متاثر تھا، اس اکیس سال کے عرصے میں میرے قلب کا تعلق ان سے بڑھتا ہی رہا ـــــ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ منجملہ دیگر اکابر کے میں نے اپنے عہد میں حضرت مولانا محمد یوسفؒ جیسی یادگار سلف و جانشین شخصیت کو بھی دیکھا ہے اور ان سے واقفیت پیدا کی ہے ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی زیادہ قربت حاصل نہ کر سکا اور فیض صحبت سے زیادہ مستفیض نہ ہو سکا۔ مولانا اپنے بعض خطوط میں تو کبھی کبھی مجھے میری عدم نقل و حرکت پر اشارۃً تنبیہ بھی فرما دیتے تھے مگر جب کبھی حاضر ہوا تو اس "کوتاہی ذوق عمل" کو نظر انداز فرمایا۔ اگر کبھی فرمایا تو مرکز میں کچھ دنوں قیام کرنے کے لیے اور اس کا عنوان بھی اس قدر دلربا ہوتا تھا کہ جی چاہنے لگتا تھا کہ کچھ عرصہ مرکز میں قیام کروں۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم ایک کتاب صحابہ کے حالات پر لکھ رہے ہیں۔ آپ نے اس کو دیکھ لیا ہوتا۔ یہ عنوان میرے ذوق و شوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اختیار فرمایا گیا تھا جس سے اپنی نا قابلیت کو سامنے رکھ کر شرمندگی ہوئی اور اس سے مسرت

ہوئی کہ اس نااہل کو اس قابل سمجھا گیا کہ وہ ان کے افادات سے استفادہ کر سکے گا۔ بعد کو جب حیات صحابہ جلد اول شائع ہو گئی تو ازراہ لطف و کرم اس کا ایک نسخہ ہدیۃً میرے حاضر ہونے پر عطا فرمایا۔ ایک مرتبہ حاضر ہو کر ایک دو دن کے بعد رخصت ہونے لگا تو بڑی محبت کے ساتھ فرمایا کہ میوات میں ایک اجتماع ہو رہا ہے آپ اس کو دیکھ کر جائیں۔ تمام عمر میں میوات کا وہی ایک اجتماع دیکھ سکا تھا۔ اس اجتماع کی یاد بھی عمر بھر دل سے نہ جائے گی ـــــ وہ اجتماع میواتیوں کے دینی شعور اور دینی احساس کا آئینہ دار تھا۔ میواتیوں کا جوق در جوق ایک بڑی تعداد میں یہ نیت ثواب اور بارادۂ تفریغ وقت اجتماع میں شرکت کرنا، مہمانوں کی مدارات اور خاطر تواضع، سینکڑے کے ساتھ جلسے کا نظم و نسق، توجہ کے ساتھ ارشاداتِ یوسفی کا سننا اور سادگی کے ساتھ اسی اجتماع کے موقع پر اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کا نکاح کرانا، یہ تمام مناظر دینی نقطۂ نظر سے انتہائی مسرت انگیز تھے۔ مجھے رہ رہ کر مولانا کی یاد آتی ہے ـــ افسوس کہ وہ اتنے جلد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی تقریریں کانوں میں گونج رہی ہیں ـــ مرادآباد، رحیم آباد، علی گڑھ، لکھنؤ، ڈاسنہ اور نہٹور ضلع بجنور کے اجتماعات کے پرکیف روحانی جلوے آنکھوں میں گھوم رہے ہیں جہاں مولانا اپنے رفقاء مرکز کے ہمراہ شریک ہوئے تھے۔ جہاں ایمان و یقین کی باتیں مولانا کی زبان سے ایمان و یقین کی فضاؤں میں احقر کو بھی سننی نصیب ہوئیں اجتماعوں میں ان کی اندرونی کیفیات کی تاثیر کے اور اضافہ ہو جاتا۔ مصروفیات بڑھ جاتی تھیں۔ ارشادات و کلمات طیبات کا سلسلہ دراز ہو جاتا تھا۔

یوں مرکز کی مصروفیات بھی کچھ کم نہ تھیں نماز فجر کے بعد سے لے کر رات کے بارہ بجے تک (قبل ظہر کے ایک دو گھنٹہ چھوڑ کر) عمومی و خصوصی مجالس میں برابر رشد و ہدایت کے دریا بہاتے اور حکمت و معرفت کے دُرِ نایاب تقسیم کرتے رہتے تھے۔ نماز فجر کے بعد سے اشراق تک تقریر، چائے پینے اور کھانا کھانے کے وقت تقریر اور بڑے دلچسپ انداز میں۔ اس کے بعد تھوڑا سا آرام کر کے ظہر کی نماز کے لیے مولانا مرکز کے حجرے سے باہر تشریف لے آتے، کھڑے کھڑے دینی گفتگو فرما رہے ہیں۔ اب تکبیر ہو گئی۔

صفوں کو درست فرما رہے ہیں۔ اب نماز پڑھا رہے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر تقریر فرما رہے ہیں۔ تقریر سے فارغ ہو کر دعا میں مشغول ہیں۔ اب حجرے کے اندر تشریف لے گئے۔ باہر کے آئے ہوئے وفود کے نمائندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سکوت کا عالم طاری ہے۔ ہمہ گوش ہمہ آنکھ ہیں۔ مولانا نے ان کے سامنے توحید و معرفت، ایمان و یقین کی تقریر شروع فرما دی ہے ——— دین کی نصرت پر نصرت خداوندی کو بیان فرمایا جا رہا ہے۔ عصر کی نماز کے بعد آکر کے حاضرین اور آنے والے وفود کے سامنے پھر تقریر فرما رہے ہیں۔ مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہتا مغرب کے بعد خصوصی مجلس میں اپنے ارشادات خصوصی سے فیض فرما رہے ہیں۔ عشاء کے بعد کتاب سنا رہے ہیں۔ احادیث و آثار کی تشریح فرما رہے ہیں۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہو رہی ہے۔ سیرت کے نازک نازک گوشے واضح فرمائے جا رہے ہیں۔ صحابہ کرام کے ایمان و یقین کی پیدا ہو رہی ہے [illegible] کے نقوش [illegible] ہیں بعض کا [illegible] واضح ہو رہی ہیں [illegible] کی [illegible]

صبح سے رات تک پورے وقت [illegible] کہ [illegible] بیحد سادگی تھی، پسینے پر پسینے آتے تھے سیدھا [illegible] کے عالم میں [illegible] پیغام دیے چلے جاتے تھے۔ آواز کی خستگی میں ایک عجیب دلکشی ہوتی تھی۔ ان کا تکلف میں بسا اوقات ایک ہی دن میں آدمی کا کایا پلٹ ہو جاتی تھی۔ علم سے تعلق رکھنے والوں کو بہت ہی فائدہ محسوس ہوتا تھا۔ ان کے یہاں کی ایک دن کی حاضری کا کیف و سرور مہینوں باقی رہتا تھا۔ نماز بڑے سوز و گداز اور تعلیم کی تڑپ کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ الحاکا اللہ اکبر کہنا جو فضا کو مرتعش کر دیتا تھا کانوں میں گونج رہا ہے ——— ان کا دعا کے وقت سراپا تضرع بن جانا اور دل کی پوری توجہ سے اللہ تعالیٰ سے مانگنا امت مسلمہ کو دعا مانگنے کا سلیقہ سکھاتا تھا اور دعا کے اہتمام کی طرف متوجہ کرتا تھا

میں جب کبھی حاضر خدمت ہوتا اپنا غم غلط کرنے اور اپنے جذبات پژمردہ میں تازگی پیدا کرنے اور دعاؤں کی برکات حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتا۔ مجھے مولانا کے

مستجاب الدعوات ہونے کا تجربہ اور پورا یقین تھا۔

مولانا کے بعض وہ ارشادات بھی یاد آرہے ہیں جو احقر کی موجودگی میں احقر کو خطاب کرتے ہوئے فرمائے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں حاضر ہوا تو پورے وثوق اور یقین کامل کے ساتھ فرمایا:

"یہ حالات باقی نہیں رہیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اس ہندوستان میں پردۂ غیب سے کوئی نہ کوئی ایسا انتظام ہوگا جس سے دین حق کو ترقی ہو اور مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہو۔"

ایک مرتبہ حاضر ہوا تو فرمایا — "آج خیر و شر، نیکی و بدی کا امتیاز تک باقی نہیں رہا۔ اگر آج کے دور میں ہم سب مل کر یہ کام انجام دے لیں کہ امت، خیر و شر میں امتیاز کرنے لگے تو بڑا کام ہو جائے — نمازوں کی تشکیل، زکوٰۃ کا نظام، روزۂ رمضان کا اہتمام، فریضۂ حج کے آداب کی تکمیل اور تمام اخلاقی اور معاشی سدھار کا مسئلہ آگے کا مرحلہ ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ "ہم یہ چاہتے ہیں کہ بازار سے مسجد تک کا نظام اور مسجد سے بیت اللہ تک کا نظام درست ہو جائے۔ پھر اس کی تشریح فرمائی اور — نماز و حج کو صحیح ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی۔

ایک مرتبہ نظام مسجد اور مسجد کے ذریعے امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل کی تشکیل پر سیر حاصل گفتگو فرمائی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور صحابہ کے زمانۂ پُر سعادت کے واقعات عجیب ترتیب کے ساتھ بیان فرمائے —

ضلع بجنور کا گزشتہ سال کا اجتماع یو۔پی کے اجتماعوں میں ایک بڑا اجتماع تھا اس میں حضرت مولانا اپنے تمام رفقاء کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ عقیدت مندوں کے ہجوم نے بڑی دشواری پیدا کر دی تھی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مولانا سے مصافحہ کر لوں۔ انتظامی قیام گاہ پر بعض میواتیوں کا پہرہ لگانا پڑا پھر بھی قیام گاہ کے دروازے کی چوکھٹ، داخلے کی بے محابا کوشش کرنے والوں کے ہاتھوں اکھڑ گئی تھی۔ جب مولانا قیام گاہ سے جلسہ گاہ میں تشریف لاتے تھے مجمع آپ کے ارد گرد سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا نظر آتا تھا جس سے انتشار پیدا ہو جاتا تھا اور ضعیفوں کو تکلیف پہونچنے بلکہ کچل جانے

کا بھی اندیشہ ہوتا تھا۔ اجتماع کے دوسرے دن حضرت مولانا رات کے جلسے میں بہزار دقت اسٹیج تک تشریف لائے تو بعد خطبہ مسنونہ تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ "کیا تم مجھ ... (بخار کا ٹمپریچر بندی تربیہ) کو دیکھنے کے لیے آئے ہو؟ دیکھو میں یہ کھڑا ہوں۔ اگر میری بات سننے آئے ہو تو میری بات سنو۔" پھر جو تقریر فرمائی تو مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ بیس پچیس ہزار کا مجمع خاموشی سے مولانا کی تقریر سن رہا تھا۔ غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں آپ کی تقریر سننے آئے تھے۔ مولانا نے خالص انسانیت کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ جس سے ہر ایک متاثر ہوا۔ انصاف و عدل کی صفت پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ انصاف و عدل کے سلسلے میں مذہب یا پارٹی کا سوال پیدا کر کے ناحق کسی کی جنبہ داری اور طرفداری نہیں کی جائے گی۔ بڑی تفصیل سے اس موضوع پر تقریر فرمائی۔

مراد آباد میں آخری تشریف آوری کے موقع پر وہاں مدارس میں پہونچ کر علماء و طلباء کو جو پیغامات دیئے وہ بھی یاد رہیں گے۔ مدرسہ شاہی کا اجتماع عوام اور علماء و فضلاء کے مجمع کے لحاظ سے اتنا عظیم تھا کہ حضرت شیخ الاسلام (مولانا سید حسین احمد مدنی) رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے آج تک وہاں اتنا بڑا اجتماع نہ ہوا تھا۔ حضرت مولانا سید فخر الدین محدث مدظلہ نے بخاری شریف ختم کرائی اس کے بعد مولانا نے تقریر فرمائی اس تقریر میں علماء و طلباء کو بصد احترام ان کے فرائض منصبی کی طرف متوجہ فرمایا اور درس و تدریس کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہاں کی تقریر اس قدر جامع اور بصیرت افروز تھی کہ اگر ہمارے مدارس عربیہ اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو ان میں دوبارہ بہار تازہ آجائے۔ اس موقع پر مولانا نے ان بعض شبہات اور اشکالات کا جواب بھی دیا جو بعض اصحاب مدارس کی زبان پر نیک نیتی کے ساتھ تبلیغی کام کی نقل و حرکت کے سلسلے میں آتے رہتے ہیں۔

مراد آباد سے امروہہ تشریف لائے وہاں مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد میں ختم بخاری کے بعد علماء و طلباء اور شہر کے باشندوں کے سامنے موضوع علم پر سیر حاصل تقریر فرمائی۔ آغاز کلام میں جو بات فرمائی۔ اس کا مفہوم تقریباً یہ تھا کہ ایک علم کا صحیح ہونا ہے اور ایک صحیح علم کا استعمال صحیح ہونا ہے۔ اگر علم صحیح ہوا اور اس کا استعمال صحیح

نہ ہو تو یہ بھی خسارے کی بات ہے۔ یہ ایک الہامی اور معرکۃ الآرا تقریر تھی جس نے تمام حاضرین کو بڑا فائدہ پہونچایا۔ یہ آخری تقریر تھی جو میں نے حضرت مولانا کی زبان سے سنی تھی۔ پھر اس کے بعد موقع ہی نہ ملا کہ حضرت مولانا کے ارشادات سے مستفیض ہوتا۔

باتیں تو بہت سی یاد آتی ہیں مگر میں انتخاب ہی پر اکتفا کرتے ہوئے آخر میں چاہتا ہوں کہ حضرت مولانا کی چند صفات کا ذکر کرکے اپنے اس مقالے کو ختم کردوں۔

۱۔ بغیر کسی [illegible] مخالفت کے ساتھ [illegible] فرماتے تھے۔ اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔ بار بار فرماتے تھے کہ [illegible] ہوتا ہے چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ چیزیں نفع و نقصان پہونچانے میں [illegible] اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ کلمہ طیبہ کی تفسیر و تشریح و اجاگر انداز میں بیان فرماتے تھے ـــــ اتباع رسولؐ کی اور نقش قدم صحابہؓ پر چلنے کی پرزور ہدایت دیتے تھے۔ ان کی تقریر میں ایک مدت دعسر ایک صوفی درویش ایک متکلم مورخ کا حسین انداز ہوتا تھا۔

۲۔ مایوسی کو کبھی اپنے اندر نہیں آنے دیا۔ عالی حوصلگی اور [illegible] اسمین کی بلندی کی طرف رہنمائی فرماتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی دھارس بڑھانے والے چند اکابر میں حضرت مولانا کی ذات عالی بھی تھی۔

۳۔ دعاؤں کا خاص اہتمام تھا ـــــ دعا مانگتے وقت گم دعا بن جاتے تھے۔ مولانا نے اپنے اہتمام دعا سے دعا کی اہمیت و عظمت کی بے شمار دلوں میں قائم کرنے کی صورت پیدا کی حضرت مولانا کے دعا مانگتے وقت قلب پر عجیب سکون طاری ہو جاتا تھا۔

۴۔ مولانا قدیم و جدید دونوں حلقوں میں مقبول تھے۔ ان کی معلومات کا حلقہ بہت وسیع تھا ـــ ان کی تقریر سے ایک عالم اور عامی کا شتکار و دستکار اور ایک سائنس داں اور انجینیر مساوی مستفیض ہوتے تھے۔ آپ نہ صرف مذہبی و روحانی تقریر کرتے تھے بلکہ سیاسی موقع خصوصی مجلسوں میں اقتصادیات، معاشیات تعلیمات اور سیاسیات کے مسائل بھی حل فرماتے تھے اور اس کے نقشے اور خاکے بتلاتے جاتے تھے۔ مگر یہ سب مضامین اسلام کی تعلیمات سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور

کر دارِ صحابہؓ کی روشنی میں بیان ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور ذہنی اعتبار سے علوم جدیدہ سے متاثر اشخاص آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ اور بالآخر دلی اطمینان کے ساتھ دینی کام میں نمایاں حصہ لینے لگتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بہت سے طلبا کی اخلاقی و روحانی ترقی میں مولانا کے اس کمال کا بہت بڑا دخل ہے۔

۵۔ مولانا دوسروں ہی سے دینی نقل و حرکت کرنے اور باہر نکلنے کے لیے نہیں فرماتے تھے خود بھی حسب ضرورت مرکز سے باہر رہتے تھے اور مہینوں باہر گزارتے تھے حالانکہ مرکز میں ان کی موجودگی کی ضرورت کچھ کم نہ تھی۔ ہندوستان و پاکستان کے متعدد شہروں، قصبوں دیہاتوں میں عام اجتماعوں اور مدارس و مراکز کے خصوصی مجمعوں میں اپنا دینی پیغام پہونچاتے رہے۔ چنانچہ مسافرت اور غریب الوطنی کے عالم ہی میں دین کی جدوجہد کرتے ہوئے ان کی روح اعلیٰ علیین کو سدھاری ــــ حج کا فرض کئی بار ادا کر چکنے کے بعد نفلی حج اور عمرے کے لیے جماعتیں لے کر کئی مرتبہ حجاز مقدس پہونچے اور وہاں عالم اسلامی کے اجتماع سے دینی فائدہ اٹھایا۔ ملکوں کے لیے جماعتیں وہاں سے روانہ کیں۔ مقدس مقامات میں دنیا کے مسلمانوں کے لیے عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے خصوصاً خیر و عافیت اور دینی و روحانی ترقی کے لیے دعائیں کیں۔ اپنی جدوجہد کے ذریعہ عالم اسلامی سے ایک خاص رابطہ پیدا کیا۔

(۶) اپنے اکابر کے ساتھ والہانہ اور خادمانہ انداز رکھتے تھے۔ بالخصوص حضرت شیخ الاسلامؒ حضرت اقدس رائے پوریؒ سے انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی جدائی سے مولانا کو جو صدمہ ہوا تھا اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ سلامت رکھے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کو ان سے قریبی رشتے داری کے علاوہ جو قلبی اور روحانی تعلق تھا۔ اس کی نظیر موجودہ زمانے میں مشکل سے ملتی ہے۔ آج کے دور میں بزرگوں کے ساتھی یہ محبت، یہ سعادت مندی، یہ خلوص اور یہ جذبۂ تعظیم و تکریم بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

(۷) مولانا اپنے والد ماجد سے تعلق رکھنے والے تمام حضرات کا اور پرانے کارکنوں

کا بڑا احترام اور اعزاز فرماتے تھے۔ نیز مرکز کے تمام رفقاء اور بیرون مرکز کے تمام کام کرنے والوں سے جن میں امیر بھی تھے غریب بھی۔ عالم بھی تھے عوام بھی۔ تاجر بھی تھے کاشتکار بھی۔ یونیورسٹی، کالج اور اسکولوں کے اساتذہ بھی تھے اور طلباء بھی اسلامی مدارس کے معلمین بھی تھے اور متعلمین بھی۔ دفتر کے ملازمین بھی تھے اور ڈاکٹر انجینیر بھی۔ سب سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ سب کام کرنے والوں کی طرف سے اپنا سینہ اور دل صاف رکھتے تھے۔ اور اس کا اہتمام کرتے تھے، اگر کسی کی کوتاہی معلوم بھی ہوگئی تو حکمت عملی سے اس کا تدارک فرماتے تھے۔

مختلف مزاج اور مختلف کاروبار کے لوگوں کو یوں جوڑے رکھنا بغیر روحانیت اور نفسیات کی مہارت کے مشکل ہے۔

(۸) مولانا نے تبلیغی کام چلانے کے لیے کبھی مادی ذرائع اور روپے پیسے کا سہارا تلاش نہیں کیا۔ بزرگان ملت کے طریقے اور اپنے خاندانی متوکلانہ درویشانہ روایات پر قائم رہے۔ فتوحات کے طور پر بھی جو کچھ آیا اس میں سے اپنے اور اپنے اہل وعیال پر بہت کم اور صرف بقدر کفاف اور دینی جدوجہد کی ضروریات اور تحقین پر بہت زیادہ صرف کیا۔ ان کے لنگر کا خرچ اتنا تھا کہ کسی ریاست کا خزانہ بھی اس کے لیے کفایت نہ کرتا سب کام غیب سے ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے۔

(۹) سیاسی اور فروعی اختلافات کی وجہ سے اہل سنت وجماعت میں جو تفریق ہو گئی ہے اس کو اپنی حکمت عملی سے کم سے کم کرنے کی کوشش فرمائی۔ تبلیغی کام پر معاندین نے سخت سے سخت تنقیدیں کیں۔ اور چھوٹے بڑے رسالے لکھے مگر مولانا نے ان پر کبھی توجہ نہ کی نہ جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ بلکہ اختلافات کی وسیع خلیج کو پاٹنے کی متواتر کوشش فرماتے رہے جس میں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔

(۱۰) ہند اور بیرون ہند میں کام کی اتنی اشاعت ہو جانے اور آپ کی شخصیت اتنی معروف ومشہور ہو جانے کے بعد بھی کبھی آپ نے خود تو کیا کسی دوسرے کو بھی اجازت نہ دی کہ ان کی شخصیت کی طرف دعوت دی جائے اور لوگوں کو ان کے حلقۂ بیعت میں

داخل کیا جائے۔ آپ نے سب حلقوں کا اکرام کیا سب مشائخ کا اعزاز کیا سب مدارس کو اپنا سمجھا سب علماء کی تعظیم و تکریم کی اپنے معاصرین سے چاہے وہ دین کے کسی شعبے میں کام کر رہے ہیں اچھے تعلقات رکھے اپنے طرز عمل سے کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ عام و خاص مسلمانوں کے حسن اکرام کی اور امت کے مختلف طبقات کو باہم قریب کرنے کی وہ مسلمانوں کو جو تعلیم دیتے تھے خود ان کی ذات اس کا بہترین نمونہ تھی۔

دعا ہو کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور ان کے صاحبزادے میاں محمد ہارون سلمہٗ اور ان کے جانشین حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی مدظلہ اور دیگر رفقاء کو صحت و عافیت کے ساتھ دینی کام کرنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ کو نیز تمام اکابر کو تا دیر ہمارے سروں پر قائم رکھے (آمین)

درس قرآن

گھر بیٹھے بغیر استاد کے قرآن حکیم کے معنی اور مطالب سمجھنے اور سمجھانے کے لیے درس قرآن کا سلسلہ حاصل کریں۔ درس قرآن سات منزلوں میں چھپ رہا ہے۔ اس کی پہلی پانچ منزلیں تیار ہو چکی ہیں۔

ہدیہ: منزل اول (سوا پانچ پارے) مجلد دس روپے، منزل دوم (۵½ سے ۹ پاروں تک) مجلد دس روپے منزل سوم (۹½ سے ۱۴ پاروں تک) مجلد نو روپے (۱۴ سے ۱۸½ پاروں تک) منزل چہارم مجلد نو روپے۔ منزل پنجم (۱۸½ سے ۲۲½ پاروں تک) مجلد آٹھ روپے۔ چھٹی اور ساتویں منزلیں عنقریب تیار ہو رہی ہیں۔ درس قرآن کی زبان نہایت سادہ اور آسان ہے۔ درس قرآن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر روز کے لیے ایک صفحہ پر ایک سبق اور ہر سبق کا ایک علیحدہ عنوان ہے۔

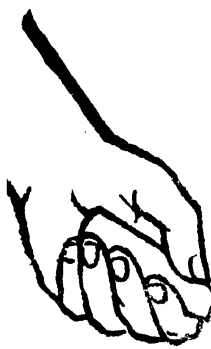
دائیں جانب تحت اللفظ ترجمہ، بائیں جانب بامحاورہ ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نیچے مشکل الفاظ کی تشریح، اس کے بعد آیت کی مختصر جامع تفسیر

مذکورۂ بالا ہدیہ کے علاوہ محصول ڈاک بذمۂ خریدار، نمونے کے صفحات مفت طلب فرما سکتے ہیں۔

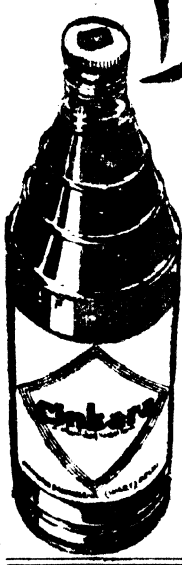
سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور

نوٹ:۔ ہندوستان میں درس قرآن کی جلدیں کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

صحت مند
اور
توانا جسم
کی
مضبوط تعمیر کے لیے



سنکارا
استعمال کیجیے



زندگی کو صحت مند بنیادوں پر استوار کیجیے۔ صحت مند اور خوش و خرم رہنے کے لیے سنکارا استعمال کیجیے سنکارا روزمرہ کے کاموں میں صرف ہونے والی توانائی کو بحال کرتا ہے اور چست بناتا ہے۔ سب کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

ہمدرد دہلی ، کانپور ، پٹنہ

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ
ارشادات کے آئینے میں

از حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب (الٰہ آباد)

[ہمارے بہت سے ناظرین حضرت مفتی صاحب سے شاید واقف نہ ہوں، آپ پاکستان کے معروف علما، و اصحاب فتویٰ میں سے ہیں، تبلیغی کام سے آپ کا تعلق بہت عمیق اور قدیم ہے، اس کام ہی کے سلسلہ میں چند سال آپ کا قیام حجاز مقدس میں بھی رہا ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص معتمدین میں سے تھے اور حجاز مقدس کے سفروں اور پاکستان کے دوروں میں عموماً حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔]

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ۔

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ "کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کا اُس ذات پر یقین قائم ہو جائے جس کے کرنے سے کام ہوگا، یعنی اللہ جل جلالہٗ کی ذات پر اور اس کی حیثیت کام کرنے والے پر ایسی منکشف ہو کہ اپنی ذات اور کوئی دوسری ذات دکھائی نہ دے دوسرا یقین یہ ہو کہ جب میں ظاہر و باطن سے حضورؐ کے طریقوں پر آجاؤں گا تو رب العزت دُنیا و آخرت میں اچھے حالات لائے گا۔"

حضرت جی رحمۃ اللہ کی ذات میں یہی یقین اتنا نمایاں نظر آتا تھا کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی محسوس کر لیتا تھا کہ اس خدا کے بندے کے نزدیک حکومت، مال و دولت، اکثریت اور کسی بھی طاقت سے قطعاً کچھ نہیں ہوتا۔

ایک دن ڈھاکہ میں وہاں کے خواص کے ایک اجتماع میں فرمانے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں اتنا فرمایا تھا کہ کل بتاؤں گا۔ اس پر وحی آئی "وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ" (۱) اور تمہاری زبان پر ہر وقت یہی رہتا ہے کہ ہم نے یہ کیا، ہم یہ کر رہے ہیں اور ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تم اگر مرنا چاہو تو اپنے ارادے سے مر بھی نہیں سکتے۔ خَلْقٌ کی صفت صرف خالق میں ہے، پوری مخلوق اپنی پیدائش، تربیت اور بقا میں ہر ہر مرحلہ پر خالق کی محتاج ہے۔

ایک دفعہ تقریر کے بعد ایک صاحب نے کہا حضرت یہ کام تو اچھا ہے مگر عالم میں پھیلا ہوا بگاڑ اس سے کیسے درست ہوگا؟ اس پر فرمایا، اگر میرے آپ کے یا جماعت کے کرنے پر ہوتا تو سوچنے کی بات تھی۔ جب خدا کے کرنے سے ہونا کہہ رہا ہوں تو پھر اشکال کیا ہے، کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام خدا کیسے کرے گا؟۔

ایک دفعہ فرمایا تم حضورؐ کے نمونہ پر بننا شروع کر دو جتنا بننا ہوگا بن جائے گا، اور جو بننے والا نہیں ہوگا اور بننے والوں کے لیے رکاوٹ بنے گا خدا اسے اس طرح توڑ دے گا جیسے انڈے کے چھلکے کو توڑ دیتا ہے، تم جن کو بڑی طاقتیں کہتے ہو خدا کے نزدیک اُن کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس دُنیا میں پاکیزہ انسانوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لگ گئے تھے جب حضورؐ کی سعی سے پاکیزہ انسان بن گئے تو خدا نے عذاب کی ایک جھاڑو سے روم و فارس کے جالے صاف کر دیئے تھے، بالکل یہی صورت روس و امریکہ کی ہوگی۔

ایک دفعہ فرمایا ایٹم سے ڈرنا ایسا ہی ہے جیسے مشرکین اپنے پتھر کے بُتوں سے ڈرتے اور امید رکھتے تھے، ایٹم اور ایٹم والوں کی گردنیں قدرت کے ہاتھ میں ہیں، ایٹم سے وہ ہوگا جو خدا چاہے گا، فرعون بھی "وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ" کہا کرتا تھا، مگر خدا نے اسی پانی کو اُس کے غرق و بربادی کا سامان بنا دیا۔

---

(۱) ترجمہ۔ اور کسی چیز کے لیے ہرگز یہ نہ کہو کہ میں یہ کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ یعنی یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ نے چاہا تو کروں گا۔ الفرقان

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے دل کی گہرائیوں میں خدائے ذوالجلال کی صمدیت کا یقین اتنا بھرپور معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک ہر زمانے کے کائناتی اسباب کا وجود و عدم برابر تھا۔ فرماتے تھے جب کچھ نہ تھا خدا نے سب کچھ بنا دیا اور آخر میں کچھ نہیں رہے گا اور پھر سب کچھ بنائے گا۔ وہ پیدا کرنے میں ماں باپ کا محتاج نہیں ہے۔ آدم علیہ السلام، حوا علیہا السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اس کی دلیلیں ہیں۔ نیز قیامت کے دن بارش ہوگی اور انسان زمین سے انگوریوں کی طرح نکلتے چلے آئینگے۔ وہ چاہے تو سامان ہلاکت و ذلت کو ہی سامان تربیت و عزت بنا دے۔ ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو، یونس علیہ السلام کے لیے مچھلی کے پیٹ کو، اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے زندگی کے اسباب سے خالی تنگ و دق بیابان کو، یوسف علیہ السلام کے لیے جیل کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غار ثور کو حفاظت، عزت اور تربیت کا سامان فرما دیا۔

فرماتے تھے، میں دنیا کو دارالاسباب مانتا ہوں مگر انسانوں کی اجتماعی انفرادی کامیابی، سکون، تمکن، محبوبیت، مرجعیت، قوت اور تمام اچھے حالات کا واحد سبب حضور کی آمد کے بعد صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود اطہر سے صادر ہونے والے اعمال ہیں۔ جب کسی فرد، خاندان، طبقہ، جماعت، قوم یا ملک میں حضور والے اعمال آجائیں گے خدا ان کو دارین میں کامیاب کرے گا چاہے ان کے پاس کائناتی اسباب ہوں یا نہ ہوں۔

برہمن بڑیا میں مدرسہ میں بخاری کے ختم پر فرمایا۔ "بھائیو آپ نے بخاری ختم کی، علم حاصل ہوا، اب اسی علم پر تین مقصدوں کے لیے محنت ضروری ہے۔ اس علم کے مطابق اپنے اندر کا یقین، اس علم کے مطابق عمل۔ اور اس یقین و عمل کو عالم میں پھیلانا۔ حضور کے لائے ہوئے علم پر ان تین پہلوؤں پر ابتدا میں محنت کی گئی تو اس زمانہ کے کائناتی نقشوں پر چلنے والا باطل ردم و فارس پاش پاش ہوگیا اور آخر میں دجال اپنی ذات سے اتنی بڑی طاقت کا مظاہرہ کرے گا کہ اس کے مقابلہ میں موجودہ طاقتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس وقت مہدی علیہ السلام زمین سے اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے آئیں گے اور من و عن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق اس علم پر محنت کریں گے اس پر اللہ جل جلالہ اس دجالی طاقت کو ہلاک کردے گا۔ اور جب پہلے یہ ہو چکا اور آخر میں بھی یہ ہوگا تو پھر یہ وسوسہ کیوں ہو کہ درمیان میں کیسے ہو سکے گا، آج بھی وہ سب کچھ ہو سکتا ہے،

بشرطیکہ ایک معتدبہ طبقہ اس علم پر حضورؐ اور صحابہ کی طرح محنت کرڈالے، حضورؐ سے صادر ہونے والے اعمال کو خدا نے اتنم سے زیادہ طاقتور بنایا ہے اور ایک ایک عمل کو عالم میں تغیر کا ذریعہ بنایا ہے۔ صلوٰۃ الاستسقاء زمین کے حالات میں تغیر کا ذریعہ ہے۔ صلوٰۃ الکسوف اور صلوٰۃ الخسوف چاند و سورج کے حالات بدلنے کے لیے ہے۔ دعا اور صلوٰۃ الحاجہ ہر قسم کے انفرادی اجتماعی ناموافق حالات بدلنے کے لیے ہے۔ حضورؐ کی انگلی کے اشارہ سے چاند کو دو ٹکڑے کرکے یہی ظاہر کیا گیا کہ حضورؐ سے صادر ہونے والا عمل اتنا طاقتور ہے اور یہ اشارہ حضورؐ کا تکوینی عمل تھا۔ تشریعی عمل اس سے بھی طاقتور ہیں۔ اس وقت حکومتی نقشوں والوں کی منت خوشامد ہو رہی ہے کہ ہمارا علم چلا دو، میں کہتا ہوں قرآن و حدیث ان کی تثبیت کرنے نہیں آیا، قرآن تو ان نقشوں والوں کے وجود و عدم اور ذلت و عزت کے فیصلے کرنے آیا ہے۔

اسی کے ساتھ حضرت جیؒ کی ایک ایک بات سے اس کامل یقین کا بھی ظہور ہوتا تھا کہ حضورؐ والے اعمال کے بغیر کبھی بھی دنیا و آخرت میں کامرانی نصیب نہیں ہو سکتی چاہے کائناتی اسباب کتنے ہی ہاتھ آجائیں، بلکہ کائناتی اسباب حکومت، تجارت، زراعت وغیرہ میں جب تک حضور والے اعمال کی روح نہ آجائے یہ اسباب مردہ ہیں۔ اور یہ بھی فرماتے تھے کہ جو انسان خالق کائنات اور اصل کائنات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جانے اور مانے بغیر کائنات کی چیزوں میں گھستے ہیں اُن کی حیثیت چوروں اور ڈاکوؤں کی ہے انھیں مال و دولت تو مل سکتے ہیں۔ مگر سکون و محبوبیت ہرگز ہرگز نہیں مل سکتی ——— اور یہ بھی فرماتے تھے کہ خود کائنات کی بقا صرف اسی وقت تک ہے جب تک اس میں حضورؐ کے اعمال موجود ہیں۔ جب اُن کے اعمال میں سے کوئی بھی عمل نہ رہے گا اُس وقت اس مُردہ کو دفن کر دیا جائے گا اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ۔ الآیہ

اور اسی بنیادی یقین کی بنا پر فرماتے تھے کہ نماز صرف اعمالِ نبوت کا مجموعہ ہے اسے تمام کائناتی اعمال کو چھوڑ کر بلکہ ان سے دور ہو کر مسجد میں ادا کرنے کا حکم ہے اور نماز میں کائناتی اعمال تجارت وغیرہ کو صرف چھوڑنے کا حکم نہیں، بلکہ نماز میں ان کا خیال کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا اور پوری کائنات سے یکسوئی والے عمل کی طرف "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحْ" سے پکارا گیا، یہ عمل گویا اس یقین کی مسلسل مشق کراتا ہے کہ کامیابی کا دارومدار صرف اعمالِ نبوت پر ہے اور اعمالِ نبویؐ کے

ساتھ اس درجہ یقین رکھنے والے کو جو شغف اور اہتمام علوم نبویؐ کے ساتھ ہو سکتا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔

ایک دفعہ علماء کے تعلیمی حلقے کے ختم پر فرمایا جس میں حضرت مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ بھی موجود تھے، کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ بخاری پڑھانے والوں کو التحیات یاد کرانے پر لگا دیں، مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ التحیات یاد کرانے کی بخاری پڑھانے والوں کے نزدیک بھی انتہائی اہمیت ہو۔ اسلیے کہ یہ بھی حضورؐ کے علوم میں سے ایک علم ہے۔ اسے غیر اہم سمجھنے والا کہیں کا نہ رہے گا۔ اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ تعلیم کا یہ درجہ بھی ماہرین بخاری کی نگرانی میں ہو۔ اسی بنا پر حضرت جیؒ انتہائی اہتمام سے تمام چھوٹوں بڑوں سے چاہتے تھے کہ تعلیم کے حلقوں میں بیٹھیں، اور انتہائی احترام و توجہ سے سنیں۔

ایک دفعہ فرمایا کہ جب قرآن پڑھنے یا سننے بیٹھو تو یوں سمجھو خدا مجھ سے مخاطب ہے اور جب حدیث پڑھنے یا سننے بیٹھو تو یوں سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے مخاطب ہیں۔

ایک یہ بات بھی حضرت جیؒ کے لیے آفتاب نیمروز کی طرح ظاہر اور بدیہی اور ناقابل شک تھی کہ جب تک مذکورۂ بالا یقین اور علم نبوت کے مطابق عبادات درست نہ ہو جائیں اخلاق نہیں آتے اور جب تک ہم میں اخلاق نہیں آئیں گے دوسروں میں دین نہیں پھیلے گا۔ اور فرماتے تھے اغراض کے لیے کسی سے کوئی سلوک کرنا اخلاق نہیں ہے، بلکہ کوئی کام بھی جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اس کی قطعاً کوئی قیمت نہیں ہے۔ ایک دن ایک مجلس سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا، نفسی صاحب عمل اخلاص کے بغیر مُردا ہی تو ہے اور دیکھو گھروں، بازاروں، دفتروں، یہانتک کہ مدارس و مساجد میں کیسے مردادوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔

۱۴ مارچ ۶۵ء (چہارشنبہ) کی صبح وصال سے صرف دو دن پہلے فرمایا۔ اللہ کی رضا کے علاوہ کسی بھی نیت سے کرنا نفسانیت ہے۔ مال مل جائے، مال بڑھ جائے، لوگ تعریفیں کریں، بڑا بن جاؤں، شہرت مل جائے، عہدہ مل جائے، مرجع بن جاؤں، میری بات چلنے لگے، میری حیثیت مانی جائے، میری رائے پوچھی جائے، ان اغراض کے لیے عمل کرنا ہرگز اخلاص اور للّٰہیت نہیں ہے، یہانتک کہ مخلصین خدا کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے اس موعود کے لیے بھی عمل نہیں کرتے اس لیے کہ یہ موعود موعود ضرور ہے مگر مقصود نہیں، اور جو موعود کو مقصود بنا کر کرتے ہیں وہ موعود ہی میں

پھنس جاتے ہیں اور جو لوگ صرف رضاء الٰہی کو مقصود بنا کر چلتے ہیں اُن پر جب خدا کے مواعید پورے ہوتے ہیں اور مال و ملک کی نعمتیں ملتی ہیں تو وہ اُن کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے دین کی اشاعت اور مخلوق خدا پر محض رضاء الٰہی کے لیے خرچ کر دیتے ہیں۔ جیسے صحابۂ کرام نے کیا تھا۔

ادھر کئی سال سے حضورؒ کی معاشرت پر نہایت اچھوتے اور محبت بھرے انداز میں تفصیلی گفتگو فرماتے تھے اور اس کے مقابل جب موجودہ معاشرت کا ذکر آتا تو معلوم ہوتا کہ اس معاشرت کی ایک ایک چیز میں انھیں کھلے مفاسد نظر آتے ہیں۔ اور بعض چیزیں ایسی غلاظت ہیں کہ ان سے انھیں گھن آ رہی ہے۔

ایک دفعہ فرمایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کی بنیاد پاکیزگی، سادگی اور حیا پر ہے اور یہود و نصاریٰ کی لائی ہوئی معاشرت کی بنیاد بیحیائی، اسراف اور تعیش پر ہے۔ تمھیں ان کی معاشرت پسند آنے لگی جنھوں نے تمھارے اسلاف کے خون بہائے، عصمتیں لوٹیں، ملک چھینے، اور اب بھی تمھیں امداد دیکر اسطرح پال رہے ہیں جسطرح تم مرغیاں پالتے ہو (یعنی ذبح کرنے کیلئے) اور جنھوں نے تمھارے لیے خون بہایا، دانت شہید کرائے، حمزہ جیسے چچا شہید کرائے، تمھارے لیے راتیں جاگتے گزاریں اُنکی معاشرت تمھیں پسند نہ آئی۔ دیکھو حضورؐ کی معاشرت بھی قیامت تک کیلئے ہے جیسے انکی نبوت قیامت تک کیلئے ہے۔ جب تم میں نور ایمان آئے گا تو تمھیں حضورؐ کی معاشرت کی ایک ایک چیز پیاری لگے گی۔

دعوت کے عمل کو حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ تمام اعمالِ نبویؐ میں زیادہ طاقتور اور انبیاء کا مقصدِ حیات یقین کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ انبیاء کا خاص الخاص عمل ہے، انبیاء والی مدد میں اسی عمل کے ساتھ ہیں، بشرطیکہ یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو۔

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ اس عمل کیلئے ہر طرح کی انتہائی قربانیاں چاہتے تھے اور تدریجاً بڑھنے کی دعوت دیتے تھے اسوقت عام دعوت یہ تھی کہ وقت کا تہائی حصہ یعنی ہر سال میں چار مہینے بیرونی نقل و حرکت میں صرف کیے جائیں۔ باقی آٹھ مہینے اپنے مقام پر اسطرح گزارے جائیں کہ آدھا وقت مسجد اور اسکے اعمال میں صرف ہو اور باقی آدھا وقت گھر اور اسکی ضروریات کو دیا جائے ـــــ ایک دفعہ برازوں سے فرمایا اس کام کو اصل کام بناؤ، اور بقیہ کاموں کو اسکی سلوٹوں میں کرنا سکھلوا دیا چاہتے تھے کہ ہر گھر، ہر محلہ، ہر شہر، ہر ملک اس دعوت کا میدان بنے۔ خدا کا احسان ہے انکی دعوت کے کچھ حصوں پر کچھ لوگوں نے لبیک کہا، رب کریم مرحوم و مغفور کی وہ ساری آرزوئیں پوری فرمائے جو ان کے پاکیزہ دماغ میں آئیں۔ آمین وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

صدّیق وقت یُوسفِ اقلیمِ دین و دعوتؒ

(نوّر اللہ مرقدہ)

(از جناب مولانا محمد اشرف خاں صاحب ایم۔اے، صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور)

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں ترکش ما را خدنگ آفریں

عالم کی سب سے بڑی متاع انسان ہے، لیکن ہر زمانہ میں "انسان" کی یافت و معرفت ہی بنی آدم کے لیے سب سے مشکل مسئلہ بنی رہی ہے۔ وہ مخلوق جو انسان کے نام سے موسوم ہے لیکن انسان کے جواہر اصلیہ سے محروم ہے، انکا تذکرہ نہیں، بات اس انسان کی ہے۔ جو خلیفہ الٰہی، نائب حق، مظہر صفاتِ الٰہیہ، عبدیت و اخلاق کا پیکر، احکام ربانی کا حامل اور اپنی ذات و صفات و اعمال کے لحاظ سے عالم کے لیے سراپا رحمت و ہدایت، باعثِ برکت و خیر ہو، جس کی زندگی عالم کی حیات اور جس کی موت عالم کی موت ہو، جو خدا کا ہو، جس کا دل جمال و کمال الٰہی کے نور سے روشن اور جس کی پیشانی تلہیت، انابت الی اللہ اور معیتِ ربانی سے منور ہو جس کی صحبت ہدایت کا نور بکھیرتی ہو، جس کا دل دلوں کو زندگی بخشتا ہو جس کی روح سے روحیں زندہ ہوتی ہوں، جس کا اُسوہ اپنے اندر صحبت نبوت کا پرتو لئے ہوئے ہو جس کی زندگی "ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذالک امرتُ وانا اول المسلمین" کا عملی ثبوت ہو، جو مخلوق کا نہ ہو، خالق کا ہو، خلوق کا طالب نہ ہو، مخلوق سے اپنے نفع و ضرر کو حقیقتاً

لہ یہ عجالہ، ناگزیر حالات کی بنا پر انتہائی رواروی میں قلم برداشتہ املا کرایا گیا ہے اس لیے جیسے لکھنا چاہتا تھا، وہ صورت نہ ہو سکی تاہم جو ہوا۔ خدا کی توفیق سے ہوا والحمد للہ علی ذالک ؎

طوفان اشک لانے سے اے چشم فائدہ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

متعلق نہ سمجھتا ہو، وہ ہر غیر سے قطعاً بے نیاز اور صرف ایک ذاتِ الٰہی کا نیاز مند ہو، اس کی امنگیں، امیدیں، تمنائیں، آرزوئیں، آہیں، نالے، سوز و گداز، بے چینیاں اور بے قراریاں کوشش و محنت، سعی و جستجو، سوچ و فکر، سکوت و تکلم، قول و عمل، صرف ایک ذاتِ پاک و بے ہمتا خالق و مالک کے لیے ہو کر رہ گئی ہو، اس کا حال لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کی عملی تصویر ہو، اور اس کا دل ابراہیم خلیلؑ کی طرح خلعتِ ربانی کا ذوق آشنا، اس کا یقینِ محکم و ایمانِ کامل شک و ریب، بے یقینی اور نفاق کے تو بر تو پردوں کو چاک کرنے والا، بے یقینوں کو یقین دلانے والا، بے راہوں کو راہ بین بنانے والا اور دلوں کی ظلمتوں کو کافور کرنے والا ہو وہ اپنی راہ نبوت کی بتائی ہوئی روشنی میں طے کرتا ہو، زمان و مکان اسے متاثر نہ کرتا ہو۔ وہ تفرید و تجرید کے اس مقام پر فائز ہو، جہاں غیر کلی طور پر مضمحل و محجوب ہو جاتا ہے اور جہاں ہر چیز اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہوتی نظر آتی ہے۔ اس کے لیے مخلوق اور مخلوق پر وارد ہونے والے احوال و تصرفات ایک ہی مصرّف الامور اور مکوّن السمٰوٰت والارض کی مختلف تجلیات و افعال کا ظہور و صدور ہوں، وہ عالم کے ہر تصرف اور کائنات کی ہر حرکت و سکون میں خالق و آمر حقیقی کا غیر مرئی ہاتھ کارفرما پاتا ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کے نظام تشریعی و تکوینی کی مصلحتیں اور حقیقتیں اس پر (بقدر عطاء رب) کھل چکی ہوں، نظام تشریعی کی حقیقت نے اس پر واضح کر دیا ہو، کہ تکوینیات کے اوامر تشریعات کے متعلقہ امور کے نتائج و ثمرات ہوتے ہیں، اس لیے شریعت مطہرہ کی عظمت اور انبیاء علیہم السلام خصوصاً افضل الانبیا سید الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اعمال کے جزو کل کی قیمت و اہمیت اس پر اس طرح منکشف ہو چکی ہو، کہ چھوٹی سے چھوٹی سنت اور حیات نبوی کے معمولی سے معمولی عمل کو وہ پوری کائنات سے زیادہ وقیع و قیمتی سمجھتا ہو، جس کے لیے ایک سنت کا ٹوٹنا قیامت ہو، جان دینا گوارا ہو لیکن طریقۂ نبوت کا اضمحلال برداشت نہ ہو سکے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح وہ قولاً و عملاً پکار رہا ہو "اینقص الدین وانا حیّ" ایسی شخصیت کا ملنا (بقول شاہ ولی اللہؒ) کبریت احمر اور اکسیر اعظم سے کم نہیں، ایسے انسان کی جستجو کے متعلق عارف رومی نے کہا ہے ؎

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

ایسے انسان کامل کی یافت دل کا چین، روح کا سکون، اور سربیماری کا علاج ہے اس کا ملنا ہی شکوک وریب کے اندھیروں کو اُجالے سے بدل دیتا ہے اور دل میں یقین وایمان کی قندیل روشن کردیتا ہے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال — مشکل از تو حل شود بے قیل و قال
در علاجش سحر مطلق را ببین — در مزاجش قدرتِ حق را ببین

ایسے "انسان" کی یافت وحصول میں تو بڑے حجابات حائل ہوجاتے ہیں، اور اس سے استفادہ واستفاضہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں وہ خود شہرت ونمود کا طالب نہیں ہوتا ومعاصرت کے حجاب اکبر کے علاوہ اعمال کا ظاہری تشابہ، اس کی اپنی بے نفسی، فنائیت، تواضع، خلق کی مدح وذم سے بے پروائی وغیرہ اس کے جمال وکمال کو چھپائے رکھتی ہے۔ بے بصر اشخاص اسے اپنے پر قیاس کرلیتے ہیں اور اس کے فیض وبرکت سے بے پروا اور محروم ہوجاتے ہیں اسی کی طرف عارف رومیؒ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر
شیر آں باشد کہ انسان می خورد — شیر آں باشد کہ انسان را درد
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے زابدال حق آگاہ شد
اشقیارا دیدۂ بینا نبود — نیک وبد در دیدہ شان یکساں نمود
ہمسری با انبیاؑ برداشتند — اولیارا ہمچو خود پنداشتند
گفتہ اینک ابشر انیاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانشتند ایشاں از عمی — ہست فرقے درمیاں بے منتہی
ہر دو صورت گر بہم ماند رواست — آبِ تلخ و شیریں را صفا است

جو اشخاص اور جو طبقہ ایسے انسان تک پہنچ بھی جاتا ہے، تو اس کی معرفت وپہچان اور ان سے استفادہ اپنے احوال وظروف کے مطابق کرپاتا ہے۔ اور اس جہل مرکب میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ میں نے اسے جان لیا، پہچان لیا، اور جو میں نے اس سے اخذ کیا، گویا اس انسان کامل اور

عبقری شخصیت کا وہی سرمایہ اور فضل و کمال تھا، حالانکہ بقول سید الملۃ قدس سرہٗ

فیضِ ساقی ہے باندازۂ ظرف میخوار دل حریفِ مے بسیار کہاں سے لاؤں

افادہ بقدر صلاحیتِ استفادہ ہوتا ہے، علوم خاصہ بھی اپنا محرم تلاش کرتے ہیں نسبت باطنی بھی اپنے محل و جائے استقرار کی طلب میں ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے کامل انسان ہم جیسے مستفید دل کو ہمیشہ یوں ہی کہتے رہے،

من بہر جمعیتے نالاں شدم جفتِ بدحالاں و خوش حالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یار من از درونِ من نجست اسرار من
محرم ایں ہوش جز بیہوش نیست ہم زباں را مشتری جز گوش نیست
ہیچ کس را زہرہ ایں جوش نیست باکہ گویم در جہاں یک گوش نیست

پچھلے دور کے ایک حکیم شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جو رختِ خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت با کہ گفت و از کجا بود

غرض 'انسان' کا ملنا مشکل، اس کا جاننا و پہچاننا، اور اس کی صفات و کمالات، فضائل و مزایا کی معرفت مزید دقت طلب اور گراں ہوتی ہے، اب ایسے انسانوں کے پہچاننے کا کیا دعویٰ و اظہار کیا جائے کہ

خود ثنا گفتن زمن ترکِ ثنا است کیں دلیل ہستی و ہستی خطا است

بہرحال ہر شخص اپنے ظرف و استعداد، فہم و دانش، علم و بصیرت کے بقدر جانتا اور تعارف کرا سکتا ہے لیکن ناواقفوں کے لیے یہ تعارف بھی اکثر 'باور کرانے' کے مرادف نہیں ہو سکتا۔ مبالغہ اور عقیدت کی اس دنیا میں حقیقت کو بھی افسانہ سمجھ لیا جاتا ہے اور شخصیت نگاری کو شاعری قرار دیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ایسے باکمال انسانوں کے خد و خال اور جمال و کمال کو کسی حد تک پیش کرنا افادیت سے خالی نہیں، کہ

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب بوئے گل را از کہ جویم، از گلاب

اللہ تبارک و تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے کہ اس عالم میں انسانوں کی ہدایت کے لیے

نفوسِ کاملین کو پیدا فرماتا رہتا ہے اور انھیں اپنی ہدایت کا آلہ بنا کر اس عالم کے انسانوں پر اپنی ذات تک پہنچنے کی راہیں کشادہ اور اپنی ذات عالی سے استفادہ کی صورتوں کو استوار فرماتا رہتا ہے۔ یہ نفوس کاملین اصلاً انبیاء علیہم السلام کی ذوات عالیہ ہوتی ہیں اب جبکہ ہمارے آقا امام الرسل سید الانبیا خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دائمی نبوت اور ابدی رسالت کے ساتھ تشریف لے آئے اور حکمت الٰہیہ نے یہ مقدر فرما دیا کہ دورۂ نبوت محمدیہ اعلان نبوت محمدیہ سے لے کر تا قیام ساعت مستمر رہے گا۔ اس عہد میں جتنے اصحاب دعوت و ارشاد اور نفوسِ قدسیہ پیدا ہوں گے وہ رسالت محمدیہ کے آب زلال سے سیراب، آپ کے علوم و انوار سے فیضیاب آپ کے یقین و ایمان، توکل و تفویض، تلہیت و انابت، درد و سوز اور غافلوں، ناواقفوں پر ترس و ترحم اور آپ کی دیگر باطنی صفاتِ کمال سے متصف ہوں گے ایسی ذواتِ قدسیہ عالم کی ہدایت کا سبب اور نظام ہدایت کی اس عالم میں ظاہری کڑیاں ہوتی ہیں۔ ان کے مجاہدات اور دعاؤں کی برکت سے دین کے فروغ کی غیبی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

غربت کدۂ ہند میں اسلام کا قافلہ صحابہ کے عصر سعادت ہی میں پہنچ گیا تھا، اس عہد سے لیکر دسویں صدی ہجری تک علماء و دعاۃ، صلحاء و صوفیہ کی ایک کثیر جماعت کفرستانِ ہند و پاک کو اسلام کے نور سے منور کرتی رہی لیکن سیدنا امام ربانی مجدد سرہندیؒ کے دورۂ تجدید سے اس سرزمین کے لیے وہ عہدِ برکت شروع ہوتا ہے جب ہدایت و ارشاد کا خاص مرکز اس سرزمین کو قرار دیا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے زمانہ سے لیکر آج تک علماء و محدثین، اکابر صوفیہ و اصحاب دعوت و عزیمت جس قدر ہندوستان خصوصاً مضافات دہلی و دوآبہ کی سرزمین سے اٹھے، اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی اور ان سے جو خیر پھیلا اس کے اثرات و نقوش عالمگیر ہیں، اسی سلسلۃ الذہب کی آخری سنہری کڑی

العارف باللہ، المجاہد فی اللہ، الداعی الی اللہ، المؤید من اللہ، معدن الیقین والایمان، لسان الحق والدعوۃ، وارث علوم النبوۃ، قطب الارشاد صدیق وقتہ خلیل عصرہ العلامۃ الشاہ محمد یوسف الکاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی ہے۔

حضرت جیؒ قدس سرہ معرفت و نسبت، ایمان و یقین، دعوت و عزیمت، مجاہدہ و فنائیت کے جس مقام پر فائز تھے اس کا ادراک بھی مجھ جیسوں کی پرِ پرواز سے بالا ہے تاہم یہ بات بے محابا اور برملا کہی جاسکتی ہے کہ حضرت جیؒ اس دور میں ایمان و یقین کے امام، دعوت الی اللہ کے سب سے بڑے قائد، حکمت تشریعی کے رمز آشنا، اور علوم و معارفِ نبوت کے وارث کامل تھے مادیت کے اس دور میں جس کا خاصہ روحانی اقدار اور غیبی حقائق سے انکار ہے آپ کا وجود روحانیت کی سب سے بڑی قندیل تھا، روحانیت اور ایمانی حقائق آپ کے لیے ایک نظری و فکری عقیدہ نہیں تھا بلکہ صدیقیت کا وہ مقام آپ کو عطا فرمایا گیا۔ جہاں حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ مغیبات پر یقین شہود کی کیفیت حاصل کر لیتا ہے اور معاملہ عین الیقین سے گزر کر حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے جس کے بعد دلائل کی ضرورت نہیں رہتی کہ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

بات یہ ہے، کہ اللہ تبارک و تعالیٰ عز اسمہ و عم نوالہ کی حکمت بالغہ جن اشخاص کو صدیقیت کے مقام سے نوازنا چاہتی ہے ان کے قلوب پر اپنے بعض خاص اسماء کی خصوصی تجلی اس شان سے فرماتی ہے کہ ان کا قلب متجلی و مزکی ہو کر غیر سے غافل اور ملاءِ اعلیٰ کے فیضان کے لینے کے قابل ہو جاتا ہے، اس وقت اسم ہادی کی وہ تجلی (جس کا سب سے بڑا مظہر اس عالم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی ہے) ان قلوب کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور نظام تشریعی کے وہ حقائق و معارف جسے اللہ تبارک و تعالیٰ اس بندہ پر کھولنا چاہتے ہیں کھل جاتے ہیں اس وقت نسبت الٰہیہ کا ایک خاص القا ان قلوب پر ہوتا ہے۔ اور اس عالی نسبت کی برکت سے انھیں اپنے نبیؐ سے مناسبتِ تامہ نصیب ہو جاتی ہے اب جو علوم و احوال نبیؐ کی ذات لے کر آتی ہے، صدیق کا قلب بغیر کسی دلیل کے وجدانی طور پر اس کی اسی طرح تصدیق کرتا ہے جس طرح ایک انتہائی فاقہ زدہ شخص اپنی بھوک کو محسوس کرتا ہے اور اس وجدان و احساس کے خلاف کسی دلیل سے قائل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے شنید دید، اور قال حال ہو جاتا ہے، نبوت کی ہر قول و فعل، پر عمل اس کے لیے الٰہی روشنی ہوتا ہے اس کا ماننا اس کا فطری خاصہ طبعی جذبہ اور قلبی داعیہ بن جاتا ہے اسے نبوت سے ایسی مناسبت بخشی جاتی ہے کہ نبوت کا باطنی فیضان اس کے قلب

منور اور حقائق سے آشنا کر کے شریعت کو اس کی فطرت بنا دیتا ہے اس کے لیے نبیؐ کی ہر ادا حقیقت و نور، ہر قول و فعل دلیل و روشنی بن جاتا ہے۔ اس بنا پر اس کا دل یقین کا مستقر اور حقائق و معارفِ ایمانیہ کا مہبط بن جاتا ہے ایمان کا یہی درجہ اس میں تفویض و توکل علی اللہ تفرید و تجرید، اخلاص و رضا، تسلیم و قربانی صبر و شکر اور توحید کے جملہ مظاہر کا سبب بن جاتا ہے۔ حضرت حی قدس سرہ خود ایک جگہ اپنے خاص انداز میں ارقام فرماتے ہیں:

"مبدأ فیض تو خدا کی ذات ہے اور ضابطہائے فیوض حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور صفات ہیں، لیکن کاغذ کے نقوش سے حقیقت تک پہونچکر اس کو اپنے میں حاصل ہونے کے لیے محنت کر لینا اور اس حقیقت کا حامل بن جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اس لیے حق تعالیٰ شانہ اپنے فیوض کے فیضان کے لیے کچھ ہستیاں اس عالم میں وقتاً فوقتاً ایسے عام انسانوں کے سلوک و محنت کے لیے کھڑی کر دیتے ہیں کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کی حامل ہوتی ہیں، اور ذات باری تعالیٰ سے اکتساب فیوض اور اور ان کی رحمت و انعامات کے حصول کے لیے ان صفات کا اختیار کرنا سبب و ذریعہ بن جاتا ہے ..... ایسے ہی انسانوں میں دربارِ الٰہی و دربارِ رسالتؐ سے انوارات و روحانیت کا فیضان ہو کر عام مخلوق کی فیضیابی کا ذریعہ بنتا ہے ایسے ہی انسانوں کا وجود انبیاء کرام اور سلف صالحین کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبتِ عالیہ ایسے مبارک انسانوں کی ریاضات و مجاہدات کے ذریعہ وقتاً فوقتاً اس عالم میں اپنی برکات و انوارات کے ساتھ ظہور پذیر ہو کر بندگان خداوند قدوس جلّ و علیٰ مجدہ کے اللہ رب العزت کی طرف رجوع کا ذریعہ بن کر عمومی رحمت و انعامات کے دروازے کھلوانے کے ذریعہ اس عالی نسبت کی عظمت و وقعت و محبت کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ اللہ رب العزت کے ساتھ تعلق رکھنے والے سعادت مند انسان اس عالی نسبت کے حصول کی طرف متوجہ ہو کر بے نہایت دارین کی ترقیات حاصل کریں ..... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نسبت عظیمہ و عالیہ، روحانیہ و نورانیہ اپنے دونوں مظاہر (انفرادی و اجتماعی) کے ساتھ اس عالم میں ظاہر ہوتی رہی، محنت کرنے والے مبارک انسانوں کے ذریعہ اس نسبت عالیہ کا ظہور بھی ہوتا رہا۔" (الجمعیۃ دہلی شیخ السلام نمبر تقدیم و تاخیر)

اس درازِ نفسی کا مقصد یہ ہے، کہ فقیر کے نزدیک حضرت جی قدس سرہ کا مقام صدیقیت، ان کے باقی کمالات و جواہر کا منبع و منشأ تھا، آپ کے یقین کی دولت، آپ کی ایمانی قوت، آپ کا سوز دروں، آپ کی ربانیت و للہیت، آپ کی خشیت و محبت الٰہی، آپ کا زہد و ورع، آپ کا تقویٰ، آپ کی انابت الی اللہ، و التجا و دعا کی کیفیت، یہ جملہ صفات اسی مقام صدیقیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جامعہ و کاملہ اپنے مختلف الوان میں اشخاص متعلقہ کے ظرف و استعداد کے لحاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت جی قدس سرہ کی نسبت باطنی کے متعلق کلام تو کوئی دیدہ ور ہی کر سکتا ہے اس بے بصر کے نزدیک تو آخری دور میں نسبت یوسفیؒ مختلف الوان نسبت کا ایک عجیب اور نہایت ہی جامع گلدستہ بن چکی تھی جو جمال و جلال ربی کی تجلیاتِ خاصہ کا بوقلموں مرقع تھا جن کا پورا ادراک و بیان اس کوردنگاہ کا مقام نہیں لیکن ایک بات زبان قلم پر آئے بغیر نہیں رہتی، فقیر نے قلب یوسفیؒ پر نسبت شیخین رضی اللہ عنہما کا ترشح پایا ہے اپنے آخری سفر میں جب ٹل میں حضرتؒ نے ازراہ عنایت صافحہ فرمایا تو حضرت جی قدس سرہ کی قوتِ باطنی اور نسبت عالیہ کا ادراک کچھ اس شدت سے محسوس ہوا۔ کہ کئی دن تک یہ کیفیت رہی،

نگاہوں سے بھر دی رگ و پے میں بجلی نظر کردہ برق تپاں ہو رہا ہوں

بہرحال عرض یہ کر رہا تھا کہ نسبت شیخینؓ سے مناسبت بھی اسی صدیقی نسبت کا نتیجہ تھی جس سے حضرت جیؒ کو نوازا گیا تھا،

موجودہ دور جس کا سب سے بڑا مرض بے یقینی، ارتیاب و شک، مغیبات کا انکار، الٰہی حقائق اور نبویؐ معارف کا اتخفاف ہے۔ ضرورت تھی کہ حکمت الٰہیہ اس دور کے "قائد دعوت" کو حقائق ایمانیہ کے اس غیر متزلزل یقین سے نوازتی جو نبوت کی خاص میراث اور صدیقین کا خاصہ ہے بلکہ صدیقیت اسی کا عنوان ہے۔

"صدیقیت" کا یہ مرتبہ بلند اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات عالیہ کے کمال عرفان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حضرت جیؒ پر صفات الٰہیہ جس تفصیل و وضوح سے کھلی تھیں اس کی مثال کم دیکھنے میں آئی ہے اور وہ یقیناً صوفیا، کاملین اور محقق عارفین ہی کا حصہ ہے، توحید افعالی آپ کا مقام بن چکی

تھی۔ اور توحید کامل کا رسوخ دل کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ چکا تھا، نتیجہ ہر غیر سے برأت اور خلت کا وہ مقام تھا، جہاں کسی دوئی کا ادنیٰ شائبہ نہیں برداشت کیا جا سکتا اور یہ مقام سید الانبیا حضرت محمد رسول اللہ علی اللہ علیہ وسلم کے اس مقام کا ظل ہے جس کا اظہار لسان رسالت نے ان الفاظ میں فرمایا تھا،

لو کنت متخذا خلیلا من الناس	اگر میں اپنی امت میں کسی کو اپنا خلیل بناتا
لاتخذت ابا بکر۔	تو ابوبکر کو بناتا (لیکن اس لیے نہیں بنا سکتا کہ
(جامع ترمذی ابواب المناقب)	خلت کے تعلق میں اللہ کے سوا کسی کی گنجائش
	نہیں رہی۔)

حضرت جی نور اللہ مرقدہٗ کا وصال سے کچھ لمحات پیشتر یہ فرمانا کہ "میرے ساتھ کون ہے" اور ساتھیوں کے جواب پر یہ ارشاد کہ "میرے ساتھ کوئی نہیں میرے ساتھ میرا اللہ ہے" اسی مقام خلت کا عکس تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

توحید کے اس ارفع و اعلیٰ مقام کی بنا پر حضرت جیؒ دعوت بھی توحید افعالی کی ہی دیتے تھے، جن خوش نصیبوں کو حضرت جیؒ کے قریب رہنا نصیب ہوا اور جنھوں نے حضرت کی تقریریں اور مجلسی ارشادات سنے اور اللہ نے ان کا فہم بھی نصیب فرمایا ان کو بقدر اپنی استعداد کے اس کا ضرور اندازہ ہوا ہوگا کہ اس باب میں ان کا کیا مقام اور حال تھا۔ حق یہ ہے کہ ان کا وجود "لا الٰہ الا اللہ" کی مجسم تفسیر اور تصویر تھا۔

نسبت محمدی اور اتباع نبوی

توحید کامل، تعلق مع اللہ اور رضا و قرب حق کا واحد ذریعہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت و عظمت، محبت و اتباع (ظاہری و باطنی) ہے حضرت جی قدس سرہٗ جس طرح عظمت و محبت نبوی میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کا اندازہ ان کے ہر قول و عمل سے ہوتا تھا۔ آپ کی معرفت و عظمت کا نتیجہ تھا، کہ آپ کی ذات، آپ والے اعمال اور آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز انتہائی عزیز تھی، اور آپ کے طریقۂ عالیہ ہی کو دارین کی فلاح و کامیابی کا واحد و یکتا ذریعہ اور آپ کے والے

اعمال کو خداوندی خزائن سے استفادہ کی الٰہی جا بیاں یقین کرتے تھے، اسی بنا پر چھوٹی سے چھوٹی سنت چھوٹ جانے کو خداوند قدوس کے خزائن رحمت سے محرومی کا باعث سمجھتے تھے۔ آپ یہاں تک فرماتے تھے کہ محقق صوفیہ نے کہا ہے کہ سنت کے مطابق بیت الخلا یعنی فراغت واستنجا میں جو انوارات ہیں، وہ بعد میں دین کی خدمت کے لیے پیدا ہونے والے بڑے بڑے شعبوں میں نہیں یہی مفہوم ملا علی قاری نے مرقاۃ میں حدیث نبوی "فعلیك بسنة خیر من احداث بدعة" کی شرح میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے "ای (سنة) صغیرة او قلیلة کاحیاء ادب الخلاء مثلاً علی ما ورد فی السنة خیر من احداث بدعة ای افضل من سنة عظیمة کبناء رباط ومدرسة (حاشیہ مشکوٰۃ ص۳۱)

حضورؐ کی سنتوں کے مٹنے کا غم آپ کے سینہ کا مستقل ناسور تھا، آپ کی جگر دوز اور پُرسوز آہوں میں نہ معلوم کس قدر حصہ اعمال محمدیہ کے مٹ جانے کا تھا، آخری حج کے بعد ایک دعاء انتہائی سوز ورقت کی کیفیت میں اکثر فرمایا کرتے تھے "اللّٰھم اخرج الیھود والنصاریٰ والمشرکین من جزیرۃ الحبیب صلی اللہ علیہ جزیرۃ العرب" غرض حب نبوی اتباع نبوی حضرت جیؒ کا نفس ناطقہ بن چکا تھا، اسی طور پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی محبت ان کا اتباع اور ان کی پاکیزہ زندگیوں کے حالات سے شغف حضرت جی کی زندگی کا حاصل تھا، اور اگر کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ وہ اپنے انداز فکر ونظر احساسات وجذبات، عواطف ومیلانات میں صحابہ کا نمونہ تھے، ؏

صحابی گو نہیں لیکن نمونہ تھا صحابی کا،

مخدومی المکرم حضرت علی میاں نے خوب لکھا ہے اور حق لکھا ہے کہ

قد خالط حب الصحابة لحمه ودمه واستولى على مشاعره وتفكيره، وقد عاش فى اخبارهم واحاديثهم زمناً طويلا..... (حیاۃ الصحابہ کا پیش لفظ ص۱)

علومی امتیاز اور اس کا سرچشمہ

حضرت جیؒ کے علوم پر گفتگو کرنا مستقل وقت چاہتا ہے، صرف حیاۃ الصحابہ کی تین ضخیم مجلدات مصنف کے وسعت مطالعہ، کتب حدیث ورجال پر نظر اور احوال صحابہ کے مختلف گوشوں پر گہری نگاہ کا بیّن

ثبوت ہیں، گو عربی میں مستقل کتابیں اس فن میں لکھی گئی ہیں، جن میں سے متداول اُسد الغابہ، اصابہ و استیعاب وغیرہ ہیں ابن کثیر نے البدایہ میں بھی وفیات الاعیان کے ذیل میں التزاماً صحابہ کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ لیکن حضرت جیؒ کی حیاۃ الصحابہ محدثانہ ترتیب اور داعیانہ طرزِ فکر کے لحاظ سے صحابہ کی زندگی و کردار، سوانح و اخلاق کا نہایت مؤثر اور اچھوتا مجموعہ ہے۔

"أما فی الاحیاء" حضرت کی فقاہت و معرفتِ حدیث کی شاہد ہے لیکن ان علمی و تحریری دینی خدمات کے علاوہ جو کہ ایک مشغول ترین زندگی کی زندہ کرامت ہیں، فقیر کے نزدیک حضرت جیؒ کے وہبی علوم خاصہ حضرت جیؒ کے بیانات و ملفوظات ہی میں بکھرے ہوئے ہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت جیؒ گھنٹوں مسلسل بیان کرتے رہتے تھے، بندہ نے خود ایک دن میں حضرت کے پانچ بیان سنے ہیں جن میں ایک ساڑھے پانچ گھنٹے کا تھا، یہاں علوم اندر سے پھوٹ کر نکلتے تھے، صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہیں کہہ رہے ہیں کہلوایا جا رہا ہے، علوم الٰہیہ کا فیضان موسلا دھار بارش کی طرح حضرت کے قلب پر ہوتا رہتا تھا اور فقیر کا گمان غالب یہ ہے کہ ذکر دائم کی طرح حضرتؒ کا یہ حال بن چکا تھا کہ ہر وقت و ہر حال میں سوتے جاگتے، بیٹھتے اُٹھتے علوم کا القا جاری رہتا تھا، ملاءِ اعلیٰ کی توجہات خاصہ کا مرکز آپ کی ذات بن چکی تھی، اور معارف ربانیہ، دقائق احسانیہ، اور سب سے بڑھ کر حقائقِ نظامِ تشریعی کا ورود و فیضان ہوتا رہتا تھا۔ حضرت حکیم الامۃ امام تھانوی قدس سرہ کا ملفوظ ہے کہ "بعض بزرگ جن کے علوم کی اشاعت ان سے کما حقہ نہیں ہو پاتی اللہ تعالیٰ انھیں 'لسان' عطا فرما دیتے ہیں، جیسے شمس تبریزؒ کی زبان مولانا رومؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی زبان حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ ہیں" (او کما قال) فقیر سمجھتا ہے کہ مامور من اللہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ان کی ذات سے کما حقہ اشاعت پذیر نہ ہو سکے، کام اجمال کی صورت میں رہا اور حضرت اشاروں پر قناعت فرماتے رہے، حضرت جی مولانا محمد یوسف قدس سرہٗ کی طرف جب حضرت مولانا الیاسؒ کی کامل نسبت منتقل ہوئی تو وہ علوم جو اجمالاً حضرت مولانا الیاسؒ کے سینہ میں تھے ان کی "زبان" حضرت جیؒ کو بنا دیا گیا۔ اور مفیضِ حقیقی نے آپ کی باطنی ترقیات کے ساتھ ان علوم کو خوب وضاحت و تفصیل سے آپ سے کہلوایا، یہاں تک کہ حضرت مولانا الیاسؒ کے زمانہ میں جو باتیں محض

اشارات تھیں، وہ تفصیلی رنگ میں سامنے آگئیں اور الیاسیؒ علوم کا چشمہ بڑھ کر نکرنا پیدا کنار ہوگیا۔ یہاں یہ بات واضح کردینی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کہ اہل اللہ پر جن علوم و معارف کا فیضان ہوتا ہے وہ کتاب و سنت کی ہی تبیین و تشریح ہوتی ہے، جسے ذات الٰہی اہل زمانہ کی سہولت کے لیے ان کی زبان سے کھول کھول کر بیان کروا دیتی ہے۔

حضرت جیؒ اور بیعت طریقت

حضرت جیؒ نور اللہ مرقدہٗ شیخ طریقت بھی تھے، بیعت چاروں سلسلوں میں اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے واسطے سے کرتے تھے، پہلے بیعت کی حقیقت و اہمیت اور اس کے آداب و ذمہ داریاں تفصیل سے بیان فرماتے اس کے بعد سلسلہ امدادیہ کے معروف طریقہ سے بیعت لیتے تھے اور بیعت میں خاص طور پر دین سیکھنے سکھانے اور دین کی دعوت کے لیے جان و مال کی قربانی دینے کا عہد بھی لیتے تھے، حضرتؒ کی بیعت کا منظر عجب رقت انگیز اور پر اثر ہوتا تھا، ایک مرتبہ رائے ونڈ میں ایک کثیر مجمع نے بیعت کی، بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں میں پگڑیاں اور چادریں وغیرہ تھیں اور اتنا کثیر مجمع تھا، کہ کئی حضرات مکبر کی طرح پکار پکار کر الفاظ بیعت کو بیعت کرنے والوں تک پہنچا رہے تھے عجیب دلکش منظر تھا، میرے ایک عزیز کہنے لگے کہ آج تو حضرت جیؒ نے امام شہید (سید احمد صاحب رائے بریلویؒ) کی یاد تازہ کردی،

یہ تو بیعت سلوک کے عام طرز کا تذکرہ تھا، لیکن ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ تبلیغی طریقۂ دعوت، خود ایک مستقل "سلوک" کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے جس میں سلوک صحابہ اور قرب بالفرائض کے طرز کو خاص اہمیت حاصل ہے،

حضرت جیؒ کا اصل امتیاز اور کارنامہ

خیر یہ تو حضرت جیؒ کے بعض کمالات کا سرسری تذکرہ تھا، حقیقتاً آپ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے، حافظ، قاری، مدرس، محدث، فقیہ، صوفی، مصنف، مبلغ سب ہی کچھ تھے لیکن سب سے زیادہ جس عمل پر آپ نے جان کھپائی اور جو عمل آپ کی زندگی کا مقصد بنا وہ اللہ کی طرف دعوت تھی، گویا اللہ تعالیٰ نے یہ تمام علمی و عملی صلاحیتیں انھیں اسی لیے ودیعت کی تھیں کہ دعوت علی منہاج النبوۃ کا جو طریقہ مندرس ہوچکا تھا، اسے اپنی وہبی صلاحیتوں سے

پوری طرح سمجھیں، سنبھالیں، زندہ کریں اور آگے بڑھائیں۔ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ پر دعوت کا یہ طریقہ جسے وہ 'قرن اول کا ہیرا' کہا کرتے تھے موجودہ دور میں اولاً کھلا، اور انھوں نے اپنے مجاہدات، مقبولیت عند اللہ اور توفیق ربانی سے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا فَبَلَّغَ اَحْسَنَ الْبَلَاغ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً، ہمارے حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا الیاسؒ تو مامور من اللہ تھے، ایک مرتبہ اُن کے فضائل و کمالات کا تذکرہ فرما کر عجب وجد آفریں انداز میں دو تین مرتبہ فرمایا "سلام علیٰ الیاسین" حضرت مولانا الیاسؒ کی یہ دعوت موجودہ دور کی تمام دعوتوں اور دینی تحریکوں میں منہاج نبوت سے زیادہ قریب و اشبہ ہے، حضرت مولانا الیاسؒ کی زندگی اور دعوت پر حضرت مولانا ابوالحسن علی نے اپنی کتاب "حضرت مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت" میں جو لکھا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ ان سے جو لکھا یا گیا ہے۔ دعوت کے طریق کو سمجھنے کے لیے اس کا اور اس کے مقدمہ کا سمجھنا بنیاد کا درجہ رکھتا ہے، حضرت سید الملۃؒ کا مولانا مرحوم کے متعلق مضمون بھی خاص چیز ہے۔

بہرحال حضرت جیؒ نے اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے جانشین کی حیثیت سے اس کام کو سنبھالا اور اس پر اپنی جملہ صلاحیتوں اور استعدادوں کو اس طرح کھپایا، گویا یہ دعوت ہی ان کی زندگی کا مقصد تھی، وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے، کسی مقصد میں اپنے آپ کو فنا کر دینے کی ایسی مثالیں تاریخ میں بھی شاذ و نادر ہی ملتی ہیں، شب و روز میں شاید مشکل چار پانچ گھنٹے آرام کے ملتے ہوں، دیکھنے والوں کو رحم آجاتا تھا، لیکن اللہ کا یہ مقبول اور فنا فی الدعوۃ بندہ دینی تقاضوں پر مجاہدات کی چکی میں مسلسل اپنے کو پیستا رہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو اسی محنت و دعوت کے لیے پیدا کیا تھا، حضرت امام ربانی مجدد سرہندیؒ کا یہ قول ان پر بھی اس کام کے بارے میں صادق آتا تھا کہ

"اے فرزند باوجود این معاملہ کہ تعلقت من مربوط بودہ است، کار خانہ دیگر عظیم بمن حوالہ فرمودہ اند، برائے پیری و مریدی مرا نیاوردہ اند، مقصود از خلقت کمن تکمیل وارشاد خلق نیست معاملہ دیگر است، و کار خانہ دیگر، درین ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت والا لا، معاملہ تکمیل وارشاد نسبت باآں کار خانہ امرے است بچوں مضروح

فی الطریق، دعوت انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات نسبت بمعاملات باطنیہ ایشاں ہمیں حکم دارد، ہرچند منصب نبوت ختم یافتہ است اما از کمالات نبوت و خصائص آں بطریق تبعیت و وراثت کمل تابعان انبیاء را نصیب است"

(مکتوب ۷۶ دفتر دوم حصہ ششم ص ۲۲)

حضرت جیؒ کے اخلاص عمل، مسلسل مجاہدات، طریق دعوت کی درستگی اور دعاؤں کا یہ اثر تھا کہ وہ کام جو حضرت مولانا الیاسؒ کے وصال کے وقت ہندو پاک کے صرف چند خاص خاص مقامات تک محدود تھا، وہ بڑھا، پھیلا اور دیکھتے دیکھتے یورپ و امریکہ جاپان و افریقہ، اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک پہنچ گیا۔ جماعتوں اور دینی قافلوں کی ہندو پاک اور بیرونی ممالک میں نقل و حرکت سے لاکھوں فیضیاب ہوئے، ہزاروں نے راہ پائی، سینکڑوں متقی کامل بنے، سوتے جاگے، بے طلبوں میں طلب پیدا ہوئی، بے دینوں میں احساس دین آیا، سونی مسجدیں آباد ہوئیں، اللہ کے دین کی آواز گلی گلی کوچہ کوچہ، قریہ قریہ ملک بہ ملک گونجی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنوں نے اس دعوت و محنت سے فیض پایا، اور کتنے بھٹکے ہوئے انسان راہ پر آئے کتنی مردہ سنتیں زندہ ہوئیں، کتنے فرائض میں جان پڑی، کتنی نئی مساجد تعمیر ہوئیں، کتنے غافل و بے بہرہ دینی علوم کے طالب بنے، کتنے ذاکر و شاغل بنے، کتنوں میں دین کا درد و فکر پیدا ہوا کتنے لذت و حقیقت دعا سے آشنا ہوئے، اس کام کے ثمرات عاجلہ کا بھی سچی بات یہ ہے کہ احاطہ نہیں کیا جا سکتا، آخرت ہی میں معلوم ہوگا، کہ اس کام کے چالو ہو جانے سے عالم میں کتنی خیر کی صورتیں پھیلیں،

دعوت تبلیغ کی فکری اساس (یا بنیادی ایمان و یقین)

دینی دعوت کے اس طرز کے متعلق جو نہیں جانتے اور جاننا نہیں چاہتے انھیں تو جانے دیجیے خود بہت سے تعلق رکھنے والے اور اس کی افادیت کے قائل حضرات بھی اس کی اصل حقیقت کو بہت کم جانتے ہیں۔

حضرت جیؒ کے سامنے یہ دعوت اپنی پوری ترتیب کے ساتھ منکشف تھی اور اس کا نقشہ بالکل مرتب تھا، اور یہ ترتیب و خاکہ ان کا کوئی ذہنی اختراع یا کسی انسانی دماغ کی کاوش

کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اٹل قوانین تشریعی اور نظام ہدایت کی معرفت و یافت سے حاصل ہوا تھا، اس وجہ سے یہ نظام حضرت حقؒ کے عقیدہ کا لاینفک جزو بن چکا تھا اس اجمال کی تفصیل کے سمجھنے کے لیے چند باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت نے جیسے اس کائنات کے نظام کو قائم فرمایا ہے اور گو اس کی قدرت اسباب کی قطعاً پابند نہیں تاہم اس کی حکمت نے اس کی قدرت کو عادی طور پر اسباب وعلل سے اس عالم میں ظاہر فرمایا ہے۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے نظام تشریعی میں بھی اسباب وعلل رکھے ہیں، نظام تشریعی مقصود ہے، نظام تکوینی نظام تشریعی کے بعض مقاصد کی تکمیل کے لیے پیدا فرمایا گیا، گویا نظام تشریعی اصل ومقصد ہے، اور نظام تکوینی اس کا ذریعہ اس وجہ سے نظام تشریعی کے قوانین میں انفکاک وتغیر وتبدل نہیں ہوتا لیکن نظام تکوینی کے عادی علل واسباب کو نظام تشریعی کی حکمتوں ومصالح کی بنا پر جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ چاہتی ہے توڑ دیتی ہے اور ان علل واسباب تکوینیہ کے ارادۂ الٰہیہ سے توڑ دینے کا نام معجزہ، خرق عادات یا کرامت ہے۔ حضرت سید الملۃ قدس سرہ نے سیرت النبی (۳۷۹/۳ وما بعد) میں اس پر قابل دید بحث فرمائی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل واسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے۔ اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے۔ کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو کس طرح پیش کرتا ہے انکار ومزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے۔ اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام وخاسر اور اہل ایمان فلاح یاب وکامیاب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنۃ اللہ کا لفظ آیا ہے، لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام وترتیب کی

طرف اشارہ ہے۔

فلسفۂ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار کے اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے۔ بعینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصول و قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں (سیرت النبی جلد پنجم ص ۲۸۹)

دوسری جگہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں سنت الٰہی کا ایک خاص مفہوم ہے اور اس اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند و موعظت ان کے لیے موثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اُن قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔ اور وہ بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلہ کی تھرتھراہٹ آندھی کی گھڑگھڑاہٹ دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک اور برباد ہو جاتی ہیں، یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی، اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے، اسی مفہوم میں آیا ہے ..... (اس کے بعد سید صاحبؒ نے وہ تمام آیتیں لکھ دی ہیں تاکہ کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے ہم نمونۃً صرف ایک آیت نقل کرتے ہیں) حدیبیہ کے موقع پر کفار قریش کو تنبیہ اور مسلمانوں کو تسکین دی جاتی ہے۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا. سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فتح ۳)	اور اگر یہ کافر تم سے لڑتے، تو پیٹھ پھیر دیتے، پھر وہ کوئی حامی نہ پاتے، اور نہ مددگار، اللہ کا دستور یہ پہلے سے چلا آتا ہے۔ اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پاؤ گے (تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت النبی ج ۳ ص ۲۷۹ تا ۲۸۱)

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت میں اس کا ایک اٹل قانون اور سنۃ اللہ جاری ہے کہ نبیؑ آتا ہے۔ اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے، جو خوش نصیب اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں وہ دارین کی فوز و فلاح اور کامیابی پاتے ہیں اور جو اس بات کو نہیں مانتے، اور نبیؑ کی امکانی کوششوں کے باوجود ایمان نہیں لاتے، بلکہ اس کے دشمن بن کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ آخر اللہ تعالیٰ کی قدرت خاصہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایسا قانون ہے جس میں تغیر کا کوئی امکان نہیں، ہر زمانے میں یوں ہی ہوا اور ہمیشہ یوں ہی ہوگا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا یہ غیر متبدل دستور اور اٹل قانون انبیاء علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں (مومنین) کے لیے عام ہے۔ کہ ان کی کامیابی اور نجات ہوگی۔ اور اُن سے ٹکرانے والے ہلاک ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ (یونس - ۱۰)

کیا یہ کافر گذشتہ قوموں کی طرح واقعہ ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں، کہدے کہ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں، پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں، اور ایسے ہی ایمان لانے والوں کو۔ ہم پر فرض ہے ہم نجات دیں گے ایمان والوں کو،

خدا تعالیٰ کا قطعی وعدہ ہے کہ وہ مومنین کی مدد فرمائے گا۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ

اور ایمان والوں کی مدد ہم پر فرض ہے۔

(روم)

اسی قاعدہ کے تحت سورۃ المومن میں ارشاد ہے:

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ (المومن ع ۶)

یقیناً ہم ضرور بالضرور مدد فرمائیں گے اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جس طرح امم ماضیہ میں جاری اور سارئی تھی۔ اسی طرح اب جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین بن کے تشریف لے آئے اور آپ کی امت تمام اُمتوں کی جانشین بن کر اس عالم میں آئی ارشاد رسالت ہے۔

نحن اٰخر الامم (کنز ج ۱ ص ۲۳۳ بحوالہ ابن ماجہ) ہم آخری امت ہیں۔

تو جیسے پہلی امتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ چلن اور سنۃ اللہ جاری تھی اس اُمت میں بھی تا قیامت جاری رہے گی۔ کیونکہ ختم نبوت نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے زمانہ کو قیامت تک مستمر کر دیا ہے۔ اب اس زمانہ میں (یعنی بعثت محمدیہ سے لے کر تا قیام ساعت) اللہ کی وہ تمام نصرتیں اور مددیں جو طریقۂ محمدیہ اور دین حق اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص ہیں، باقی اور قائم ودائم ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ فرما لیا لیکن آپ کے فیوض وبرکات باقی اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت لینے کے طریقے اور قدرت خاصہ سے استفادہ کی صورتیں اُمت میں آپ کے احکام اور سنن کی شکل میں موجود ہیں۔ امت اپنی ذات میں مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ اپنے نبیؐ کی نائب اور خلیفہ ہے اور اس عالم میں اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوارح کی حیثیت سے کام کرنا ہے، اب اس میں جتنے جواہر نیابت وخلافت موجود ہوں گے اور اپنے نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ دعوت اور طریقوں میں جس قدر یہ ان کی شریک ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مددوں سے نوازی جائے گی اور اس کے اعمال پر قوموں کے لیے خیر وشر کا فیصلہ ہوگا۔

(۴) اُمت محمدیہ مرحومہ یوں تو امم سابقہ کی طرح جملہ احکام واعمال میں اپنے نبی کے طریقے پر ہوگی لیکن اس کا خصوصی امتیاز اس کی داعیانہ حیثیت ہے، جس کی وجہ سے اسے دوسری امتوں پر فوقیت اور فضیلت بخشی گئی۔ اور حقیقتاً یہ دعوت ہی اصلاً انبیا علیہم السلام کے زمانے میں خدا کی خصوصی مددوں کو متوجہ فرماتی تھی، اسی وجہ سے انبیاء کی دعوت کے ماننے والے کامیاب اور نہ ماننے والے ناکام اور خاسر وخائب ہوتے تھے۔ اسی بنا پر اس اُمت کی نصرت کو دین کی نصرت کے ساتھ مشروط کر دیا۔ اور دین کی نصرت کرنے والوں کو اپنی مدد کا پختہ یقین دلایا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد-۷)
وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحج-۶)

اے ایمان والو اگر تم مدد کرو گے اللہ کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور جمادے گا تمہارے قدم،
اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور مدد کرے گا اس کی جو اس کے (دین کی) مدد کرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے زور والا ہے۔

اس بنا پر جب اُمت اپنے فریضہ دعوت الی الحق والخیر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں غفلت برتے گی تو اللہ تعالیٰ کی مدد سے محروم ہو جائے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے (مدد کی) جو دعائیں مانگیں گی وہ بھی قبول نہیں ہوں گی جیسا کہ احادیث میں آتا ہے (دیکھو کنز العمال ص۴۲۶ ج۲ ومشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

اُمت کی اس خاص داعیانہ حیثیت اور نیابت نبوت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی نصرتوں کے آنے اور دارین میں عافیت و فوز و فلاح کے پانے کا طریقہ اپنے اس فریضہ (دینی دعوت) کو مقصد قرار دے کر اس کی راہ میں اپنی جانوں کا کھپانا اور مال کا انفاق ہے۔ باقی اعمال ذاتی اور اخروی نجات تو دلادیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی وہ نصرتیں جو عالم کو ہدایت کی طرف پلٹادیں اور دشمنانِ ہدایت کو تباہی کے گھاٹ اتاردیں وہ دین کی دعوت کی محنت پر منحصر ہیں۔

(۵) پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دعوت بالکل منہاج نبوت کے مطابق ہو، کتاب اللہ صحیفۂ نظام ہدایت اور راہنمائے طریقۂ دعوت بھی ہے، یعنی قرآن پاک صرف دعوت ہی نہیں بلکہ طریق دعوت بھی سکھاتا ہے۔ اسی طرح اسوۂ نبوی صرف شخصی اور انفرادی اعمال کے لیے ہی نمونہ نہیں ہے بلکہ آپ کا طرز دعوت و تربیت بھی تا قیام الساعۃ ہدایت رسانی خلق کا افضل و اکمل اور موثر ترین طریقہ ہے۔

(۶) امت جب منہاج نبوت کے مطابق دعوت کو مقصد بنا کر احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے محنت و کوشش اور جہد و مشقت اور ایثار و قربانی کو پیش کرے گی تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت خاصہ سے سعید روحوں کو ہدایت کی طرف پلٹادیں گے، اور دعوت کے مقابل میں

آنے والی طاقتوں کو خود پاش پاش کر دیں گے۔ کہ سنۃ اللہ اسی طرح ہی جاری ہے لیکن خداوند قدوس کی یہ نصرت مختلف کی ایک خاص سطح پر آتی ہے۔

(۷) اُمّت مسلمہ پورے عالم کی طرف مبعوث ہے۔ یہ قعود و عزلت کی زندگی نہیں بسر کر سکتی، اس کی رہبانیت اور درویشی دین کی محنت ہے۔ اس لیے اُمّت کو مختلف احوال و ظروف میں ہجرت و نصرت اور نفر و جہاد کے احکام دیے گئے۔

ان اساسی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ان کے خلف الصدق اور خلیفۂ ارشد حضرت جی نور اللہ مرقدہٗ کی دعوت پر غور کریں گے تو کسی درجہ میں یہ بات سمجھ سکیں گے کہ یہ خاصانِ خدا اس کام کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے تھے، وہ یقین کے ساتھ سمجھتے تھے بلکہ گویا آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ یہ غیر متبدل سنۃ اللہ اور اللہ تعالیٰ کا اٹل دستور اور فیصلہ ہے کہ اس اُمّت کے لیے بلکہ سارے عالم انسانی کے لیے خیر و شر کے فیصلہ کا انحصار اب اُمّت محمدیہ کے عملِ دعوت اور اس راہ کی محنت و قربانی پر ہے اگر اس نے دعوت کے کام کو اور اس کی راہ میں ٹھوکریں کھانے کو نہیں اپنایا تو وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور مددوں سے محروم ہوگی اور سارے انسانی عالم کی بھی ہدایت و رحمت سے محرومی کا باعث بنے گی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور سینوں کو اس یقین سے بھر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے امت کے لیے اور عالم کے لیے خیر اور ہدایت کے فیصلے کرانے کا راستہ یہی ہے کہ اُمّت میں منہاج نبوی پر دعوت اور قربانی زندہ ہو اس کے سوا سب دروازے بند ہیں۔

حضرت جی قدس سرہٗ پر اللہ تعالیٰ نے ان تمام حقیقتوں اور سنۃ اللہ کے ان جملہ پہلوؤں اور نظام ہدایت کے دقیق رخوں کو پوری طرح منکشف کر دیا تھا اس وجہ سے وہ سمجھتے تھے، کہ امت محمدیہ، اگر آج حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم والے مقصد کو اپنا کر اور اپنے کو صفات نبویہ سے مزین کرتے ہوئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے میدانِ دعوت میں (جو کہ پورا عالم اور ساری نسل انسانی ہے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والے طریقوں اور صحابہ والی قربانیوں کے ساتھ اُتر آئے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، رحمت واسعہ اور ان کے تشریعی اٹل قوانین کی بنا پر اللہ تعالیٰ ہدایت کا فیضان فرما دیں گے، ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار اور قبضہ میں ہے، اور ہدایت لینے کا ضابطہ

اعمال محمدیہ کو اپناتے ہوئے منہاج نبویہ کے مطابق دعوت کے میدان میں ابراہیمی اور محمدی قربانیوں کو پیش کرنا ہے۔ امت محمدیہ کا جب ایک معتد بہ طبقہ صحیح رُخ سے دین کے لیے قربانی پیش کردے گا، اور وہ قربانی عند اللہ مقبول ہوجائے گی تو اللہ تبارک وتعالیٰ عالم کے لیے ہدایت کا فیصلہ فرمادینگے ہدایت کے لیے ایمان واعمال صالحہ اور دعوت اور قربانی اور دعائیں شرط ہیں ملک ومال شرط نہیں، اس لیے جس وقت اُمّت صحیح رُخ سے ہدایت کی محنت کرنے والی بن جائیگی اور اس کی قربانیاں اور دعائیں اللہ تعالیٰ سے مدد کا فیصلہ کروالیں گی، اُس وقت باطل کی قوتیں اللہ کی غیبی طاقت سے پارہ پارہ کردی جائیں گی۔ یہ محنت جس قدر نسبت محمدیہ کو اپنے اندر لیے ہوئے ہوگی اسی قدر اس کے اثرات عالمگیر ہوں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت عالمی ہے آپ والے اعمال کا اثر پورے عالم پر پڑتا ہے۔ آپ والے اعمال اگر اپنی حقیقت کے ساتھ ایک طبقہ میں بھی زندہ ہوجائیں اور وہ طبقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم والی محنت کو اخلاص اور جملہ اصولوں کے ساتھ اپنالے تو ان کی دعوت و دعاء پر اللہ تعالیٰ کی قدرت خاصہ پورے عالم کے باطل نظاموں کو توڑ دے گی جیسے امم ماضیہ میں فرعون ونمرود وشداد، وقوم عاد وقوم ثمود، اصحاب الایکہ اور دوسری متمرد اور باغی اقوام کو اپنی قدرت کاملہ سے ختم فرمایا تھا، ـــــ بات یقین کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین ہو، اور اس کے قوانین تشریعی پر ایمان ہو، تو یہ بات بعید نہیں دکھائی دے گی،

بہرحال حضرت جی رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت کے اٹل قوانین اور غیر متبدل سنۃ اللہ کی بنا پر دعوت وہدایت کا ایک خاص خاکہ ونقشہ تھا، جس پر ان کا ویسا ہی ایمان ویقین تھا جیسا کسی بدیہی سے بدیہی چیز پر ہوسکتا ہے۔ اس خاکہ ونقشہ کا ہر خط وخال انبیاء علیہم السلام کے قصص، قرآن حکیم کی ہدایات، سنن نبویہ اور صحابہؓ کے احوال سے مرتب کیا گیا تھا۔ ان کے سامنے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی تھی، اور وہ ہر قدم خدا کی توفیق سے اسے دیکھ دیکھ کر اُٹھاتے تھے، یہ دعوت محض چند اعمال کی دعوت نہ تھی، بلکہ پورے دین کے احیاء کی پورے عالم میں کوشش تھی بعض ناواقف جو صورت حال سے واقف نہیں اسے سطحی دعوت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کی کم نگہی اور سطحیت

کی دلیل ہے، کاش وہ حضرات جنھیں اللہ تعالیٰ نے علمی وعملی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس کام کو سمجھتے اور اپنا لیتے، چند اعمال کے احیاء کا سوال نہیں، بلکہ ایک نئی قوم پیدا کرنی ہے، جو اپنے مقصد، عقائد وایمان، احوال واعمال، عبادات وللّٰہیت، افکار واحساسات، اخلاق ومعاشرت میں صحابہ کا نمونہ ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمت وقدرت سے امید ہے کہ جس طرح اس نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں اسے اُٹھایا، بڑھایا، چمکایا، اور اس سطح پر پہنچا دیا، آئندہ بھی اس کے فروغ کی صورتیں پیدا فرمائے گا وما ذلک علی اللہ بعزیز، ممکن ہے حضرت جی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وصال سے پیشتر بار بار ان کلمات کو پڑھنا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ صَدَقَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ" اسی طرف اشارہ ہو، (واللہ اعلم وعلمہ اتم)

حضرت جیؒ کی شخصیت سازی

کسی کامل شخصیت کا صرف یہی کمال نہیں ہوتا کہ وہ خود کامل ہے بلکہ شخصیت کے کمال کا ایک بڑا ثبوت شخصیت سازی میں اس کا کمال اور اس کی تاثیر ہوتی ہے حضرت مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی تاثیر قلبی، فیض صحبت اور باطنی اثر نے ہزاروں اشخاص کو تقویٰ اور دینی زندگی کا قابل رشک مقام عطا کر دیا، آج ہمیں ایسے سینکڑوں اشخاص معلوم ہیں جن کی زندگی کی کایا یکسر پلٹ گئی، کل جو ناز ونعمت اور تعیش کی گودوں میں پلے تھے آج ان کے زہد وقربانی کو دیکھ کر مصعب ابن عمیرؓ کی قربانی کی یاد تازہ ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ زندگی کے ظاہری وباطنی خاکے پلٹے بلکہ حضرت جیؒ کی یہ بڑی کرامت ہے کہ گئی ایسے اشخاص جن کا دین سے خاص تعلق نہ تھا حضرتؒ کے کام کو ایسا اپنا چکے ہیں، اور حضرتؒ کے علوم ومعارف ان کی زبانوں سے اس طرح جاری ہیں، گویا حضرت جیؒ ہی بول رہے ہیں گویا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہ اللہ تعالیٰ کی خاص موہبت اور انعام تھا، جو اس دور کے یوسفؑ کو عطا ہوا، یہ بے بصر یوسفؑ زمانہ کے کون کون سے جمال وکمال کو بیان کرے ؎ دامن نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار

وہ مجموعہ کمال تھے، دین کا ایسا ہمدرد وغمخوار قرنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دعوتِ حق کا ایسا شیدائی اور اس کی راہ میں مرمٹنے والا صدیوں میں وجود میں آتا ہے ؎

سالہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

مہد سے لحد تک

از مولانا سید محمد ثانی حسنی ایڈیٹر ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ

ولادت حضرت مولانا محمد یوسفؒ کاندھلہ میں سہ شنبہ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاسؒ اس وقت مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) میں مدرس تھے۔

۲ جمادی الثانی دوشنبہ کے دن عقیقہ ہوا اور نام محمد یوسف رکھا گیا۔

ماحول اور بچپن مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی اس میں مرد تو مرد عورتیں تک دین داری اور تقوے میں ممتاز تھیں، خاندان میں قرآن مجید کا حفظ کرنا معمول سا بن گیا تھا، بچے، بوڑھے، مرد و عورت عام طور پر حافظ ہوتے تھے، گھر کی بیویاں تلاوت، ذکر و تسبیح اور نوافل وغیرہ کا بڑا اہتمام کرتیں، ہر طرف علم و تقویٰ کا چرچا تھا، خاندان اور خاندان کے باہر کئی بزرگ ہستیاں موجود تھیں جن کی دعائیں اور شفقتیں مولانا محمد یوسفؒ کے ساتھ تھیں

اسی کا نتیجہ تھا کہ سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا، اس وقت بستی نظام الدین اولیاءؒ میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں تھے۔

والدین کی تربیت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ ایک معزز اور صالح بزرگ مولانا رؤف الحسن صاحب کی بیٹی تھیں اور والد ماجد خود ایک بڑے بزرگ اور شیخ طریقت نرم و گرم پر نظر رکھنے والے تھے، اس لیے ان دونوں نے اپنے ہونے والے نامور فرزند کی خوب اچھی طرح تربیت کی، اور چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا خیال رکھا مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے ایک مجلس میں خود فرمایا۔ "ہماری اماں جی نے ہماری تربیت اس طرح کی کہ کوئی مہمان بیوی مٹھائی

یا کیلے وغیرہ تحفہ میں، لاتیں اور میں ان کی طرف دیکھ لیتا تو مہمان کے جانے کے بعد اماں جی میری پٹائی کر دیتیں کہ تم نے مٹھائی کی طرف گھور کر کیوں دیکھا"۔۔۔ ایک بار فرمایا "میں نے سوا ایک دفعہ کے بازار سے ایک آنہ کی بھی مٹھائی خرید کر نہیں کھائی، یہ وجہ نہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہ ہوتے تھے بلکہ بات یہ تھی کہ میں نے پیسے جمع کرنے کا ایک ڈبہ بنا لیا تھا اور اس میں جو پیسے مجھ کو ملتے ڈال دیا کرتا تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں خریدوں گا۔ (۱)

بستی نظام الدین میں مہمانوں کی کثرت رہتی۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ مہمانوں ہی کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تھے۔ مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۱۲-۱۳ سال کی رہی ہوگی۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے مہمانوں کو ناشتہ کرانے، کھانا کھلانے اور اس سلسلہ کی اور دوسری خدمتیں اسی کم عمری میں مولانا محمد یوسفؒ صاحب کے سپرد کر دی تھیں۔ مولانا روزانہ اندر سے کھانا لاتے اور فارغ ہونے کے بعد برتن لے جاتے۔

مدرسہ کاشف العلوم (بستی نظام الدین) میں پڑھنے والے طلباء کے وظائف اور کھانے پینے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، طلباء کی ٹولیاں باری باری سارے طلباء کا کھانا پکاتیں اور اس سلسلہ کے چھوٹے بڑے سارے کام خود ہی کرتیں۔ مولانا محمد یوسفؒ ان کے ان کاموں میں بھی شریک رہتے، ان کے ساتھ آٹا گوندھتے، مسالہ پیستے اور جنگل سے جلانے کے لیے جھاڑ جھنکاڑ گھسیٹ کر لاتے۔

تربیت کا اثر والدین کی اسی تربیت کا اثر تھا کہ عام لڑکوں کی طرح وہ اپنے فرائض سے غافل نہیں رہتے تھے، لہو ولعب میں اور بیکار وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے تعلیم کا شوق تھا صحابہ کرامؓ کے تذکرے اور خدا کی راہ میں ان کی جانبازی اور قربانی کے واقعات سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ فتوح الشام کا اردو منظوم ترجمہ صمصام الاسلام جس میں صحابہ کرام کے جہاد اور فتوحات کا تذکرہ ہے، بچپن ہی میں ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ (۲)

ابتدائی تعلیم ابتدائی تعلیم میں قاری معین الدین صاحب نے تجوید کھائی۔ گیارہ سال کی

(۱) روایت مولوی شبیر احمد حیدرآبادی (۲) روایت حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ

عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے مدرسہ کاشف العلوم (بستی نظام الدین) میں عربی شروع کی۔ سب سے پہلے میزان الصرف پڑھی اور ۱۵ - ۲۰ دن میں ختم کردی، اس وقت مولانا مرحوم کے ساتھی قاری سید رضا حسن صاحب مرحوم اور مولانا محمد ادریس صاحب انصاری اور بعض دوسرے حضرات تھے، طلباء کی یہ مختصر جماعت تھی جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے پڑھ رہی تھی۔ میزان الصرف کے بعد منشعب، اس کے بعد صرف میر پڑھی پھر پنج گنج دوسرے استاد سے پڑھی۔ پنج گنج کے بعد پھر خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے نحو میر پڑھائی۔ اس کے بعد قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی چہل حدیث حفظ کرائی۔ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تعلیم میں حافظ منیر الدین صاحب نے بھی حصہ لیا اور متعدد کتابیں پڑھائیں فقہ کی کتابیں کنز الدقائق تک حافظ مقبول حسن گنگوہی سے پڑھیں۔

اعلیٰ تعلیم اوپر کی کتابیں زیادہ تر خود حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ سے پڑھیں، ۱۳۵۱ھ میں حضرت مولاناؒ سفر حج پر تشریف لے جانے لگے تو مولانا محمد یوسف کو مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخل کردیا۔ وہاں اس سال آپ نے ہدایہ اولین اور میبذی وغیرہ پڑھیں۔ حضرت مولاناؒ کی حج سے واپسی کے کچھ مدت بعد مولانا محمد یوسف صاحب پھر بستی نظام الدین میں آگئے اور آگے کی کتابیں مشکوٰۃ جلالین وغیرہ وہیں پڑھیں۔ ایک سال کے بعد ۱۳۵۴ھ میں دوبارہ مدرسہ مظاہر علوم میں آکر صحاح اربعہ پڑھیں۔ صحیح بخاری شریف حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے، صحیح مسلم مولانا منظور احمد خاں صاحب مرظلہ سے، سنن ابوداؤد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ سے جامع ترمذی حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کیملپوری سے، مولانا انعام الحسن صاحب بھی ساتھ اور ہم سبق تھے۔ مولانا ممدوح ہی نے ذکر فرمایا کہ ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کرلیا تھا کہ رات کے ابتدائی آدھے حصہ میں ہم میں سے ایک مطالعہ کرے گا اور دوسرا سوئے گا، اور آدھی رات ہوجانے پر مطالعہ کرنے والا چائے بنائے گا اور دوسرے ساتھی کو اٹھا کر اور اس کے ساتھ چائے پی پا کر سو جائے گا اور اس دوسرے کے ذمہ ہوگا کہ فجر کی جماعت کے لیے سونے والے ساتھی کو اٹھائے۔ ایک دن

حضرت مولانا مرحوم شروع رات میں مطالعہ کرتے تھے اور میں سوتا تھا اور دوسرے دن اسکے برعکس ترتیب رہتی تھی، لیکن تعلیمی سال ختم ہونے سے پہلے ہی مولانا مرحوم کی علالت کی وجہ سے مظاہر علوم سے نظام الدین آجانا پڑا۔ مولانا انعام الحسن صاحب بھی ساتھ ہی آئے اور صحاح اربعہ کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا وہ اور صحاح ستہ کی باقی دو کتابیں ابن ماجہ، نسائی اور انہی کے ساتھ شرح معانی الآثار طحاوی اور مستدرک حاکم بھی اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے نظام الدین میں پڑھیں۔

نکاح ۲ محرم ۱۳۵۴ھ کو جس دن کہ مدرسہ مظاہر علوم کا سالانہ جلسہ تھا، شیخ الحدیث مدظلہ کی بڑی صاحبزادی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کا اور اُن سے چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ مولانا انعام الحسن صاحب کا نکاح ہوا۔ مجلس نکاح میں مظاہر علوم اور دار العلوم دیوبند کے اکابر علماء اور دوسرے مشائخ شریک تھے۔ نکاح حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا۔

صاحبزادہ مولانا محمد ہارون کی پیدائش ۲۳-۲۴ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ دوشنبہ و سہ شنبہ کی درمیانی شب میں اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایک فرزند عنایت فرمایا، محمد ہارون نام رکھا گیا جو الحمد للہ اس وقت ۲۸ سال کے ہیں اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر ہیں۔

پہلی اہلیہ کا انتقال اور دوسرا نکاح پہلی اہلیہ محترمہ مولانا محمد ہارون کی والدہ مرحومہ نے طویل علالت کے بعد ۲۹ شوال ۱۳۶۶ھ (ستمبر ۱۹۴۷ء) بروز دوشنبہ ایسی حالت میں کہ مغرب کی نماز اشارہ سے ادا کر رہی تھیں اور سجدہ کا اشارہ کر کے گویا سجدہ میں جا چکی تھیں، جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اللّٰھم اغفر لھا وارحمھا۔

تقریباً تین سال کے بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ہی کی دوسری صاحبزادی کے ساتھ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ کو عقد ہوا۔ یہ اہلیہ محترمہ بحمد اللہ بقید حیات ہیں، لیکن ان سے اولاد کوئی نہیں ہوئی۔

بیعت و ارادت حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مدظلہ جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ہم زلف بھی ہیں اور بچپن اور تعلیم کے ساتھی بھی اور آخر تک مشیر کار و دست راست رہے

اور اس وقت حضرت مرحوم کے جانشین اور تبلیغی کام کے نگراں و امیر ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ مدظلہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگ ابھی تک حضرت سے بیعت نہیں ہوئے ہیں تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ تم لوگ چچا جان (مولانا محمد الیاسؒ) سے بیعت ہو چکے ہو، بہر حال اب دیر نہ کرو۔ ہم لوگوں نے حضرت مولانا سے بیعت کی درخواست کی حضرت نے منظور فرمایا۔ خود غسل فرمایا اور بڑا اہتمام فرمایا اور پھر خوشی کے ساتھ بیعت فرمایا اور فرمایا اللہ مبارک کرے اور انشاء اللہ مبارک ہی ہے۔

پہلا حج اور دعوت کا کام حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دیرینہ خواہش تھی کہ تبلیغ و دعوت کا جو کام ہندستان میں چل چکا ہے اور کچھ علاقوں میں اللہ کے فضل سے جم بھی گیا ہے وہ اب باہر بھی پہنچنا چاہیئے، خصوصاً دیارِ عرب میں جہاں سے یہ کام چلا تھا، ۱۳۵۶ھ میں آپ کے دل میں اس کا داعیہ بڑی شدت سے پیدا ہوا۔ آخر کار ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ میں حج کیلئے روانہ ہو گئے۔ ہمراہی میں مولانا احتشام الحسن صاحب (۲) حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ (۳) مولانا انعام الحسن صاحب (۴) مولانا نور محمد صاحب میواتی (۵) حاجی عبدالرحمٰن صاحب (۶) مولانا ادریس صاحب اور دوسرے حضرات بھی تھے۔ حجاز میں تبلیغی کام کی ابتدا ہوئی، عربوں کے ایک اجتماع میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے عربی میں ایک تقریر بھی فرمائی جس کا سامعین پر اچھا اثر پڑا۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی عمر اس وقت تقریباً اکیس ۲۱ سال تھی، یہ حج مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا آخری حج تھا اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا پہلا حج۔ دوسرا حج بیس ۲۰ سال کے بعد ۱۳۷۶ھ میں کیا۔ اور تیسرا آخری حج ۱۳۸۴ھ

خلافت و نیابت ۱۲ر جولائی ۱۹۴۴ء کو بروز چہار شنبہ جب کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سفر آخرت کی تیاری فرما رہے تھے گویا کہ زندگی کا یہ آخری دن تھا نظام الدین میں علماء اور مشائخ جمع تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی اور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کو یہ پیام پہنچا کہ مجھے اپنے آدمیوں میں سے ان چند پر اعتماد ہے آپ لوگ جسے مناسب سمجھیں اس کے ہاتھ پر ان لوگوں کو بیعت کرا دیں، جو مجھ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں (۱) حافظ مقبول حسن صاحب (۲) قاری داؤد صاحب (۳)

مولوی احتشام الحسن صاحب کاندھلوی (۴) مولوی یوسف صاحب (۵) مولوی انعام الحسن صاحب (۶) مولوی سید رضا حسن صاحب۔

ان حضرات نے دوبارہ مشورہ کرکے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ مولوی یوسف صاحب ماشاءاللہ ہر طرح اہل ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے خلافت کے لیے "القول الجمیل" میں جو شرائط لکھے ہیں وہ سب بحمداللہ ان میں پائے جاتے ہیں، عالم ہیں، متورع ہیں اور علوم دینیہ سے اشتغال رکھتے ہیں۔ فرمایا — اگر تم نے یہی انتخاب کیا ہے تو اللہ اسی میں خیر و برکت فرمائے گا مجھے منظور ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ پہلے مجھے بڑا کھٹکا اور بے اطمینانی تھی اب بہت اطمینان ہوگیا ہے امید ہے کہ انشاءاللہ میرے بعد کام چلے گا۔

رات کے پچھلے پہر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا اکرام الحسن صاحب کو یاد فرمایا۔ مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا "یوسف آ مل لے ہم تو چلے" اور صبح کی اذان سے پہلے جان، جاں آفریں کے سپرد کردی اور عمر بھر کا تھکا مسافر جو شاید کبھی اطمینان کی نیند سویا ہو منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سو گیا ؎

رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

صبح کی نماز کے بعد بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی جانشینی عمل میں آئی اور مولانا کا عمامہ ان کے سر پر باندھا گیا۔

اب دعوت و تبلیغ کا پورا بوجھ حضرت مولانا محمد یوسف کے کاندھوں پر آگیا اور دعوت و تبلیغ کے قافلہ کے سالار بن کر دنیا کے سامنے آئے۔

نظام الدین کے شب و روز حضرت مولانا محمد یوسف صاحب جب تک بستی نظام الدین میں قیام کرتے تو شب و روز کا نظام اس طرح رہتا، صبح کی نماز اکثر خود پڑھاتے بعد نماز دعا فرماتے عموماً نماز خوب اسفار میں ہوتی، دعا کے بعد تقریر فرماتے جو تقریباً دو گھنٹہ تک رہتی۔ بعض اوقات دھوپ کافی نکل آتی اور لوگ دھوپ میں بصد شوق تقریر سنتے، مولانا کبھی بیٹھ جاتے اور جوش آتا تو کھڑے ہوجاتے۔ دھوپ کی تیزی کی بنا پر کوئی خادم یا طالب علم چھت سے لمبائی کی طرف سے دری (جس پر نماز پڑھی جاتی تھی) لٹکا دیتا تاکہ حضرت مولانا کو دھوپ سے

تکلیف نہ ہو۔ اس کے بعد جماعتوں کی تشکیل ہوتی۔ اس کے بعد حضرت مولانا اپنے حجرہ میں آنے والے مہمانوں کو ناشتہ کراتے اور یہاں بھی مولانا کی گفتگو جاری رہتی اور موضوع اور مرکزی نقطہ اس گفتگو کا بھی دین کے لیے محنت و قربانی ہی ہوتی، کبھی جماعتوں کی سرگزشت اور مختلف علاقوں سے آنے والے مہمانوں سے کام کے متعلق دریافت حال، اکثر اسی مجلس میں اجتماعات کی تاریخیں بھی طے ہوتیں، پھر مہمان رخصت ہوتے تو ان کو ہدایات دیتے، اس کے بعد ۱۱ بجے کے قریب جماعتوں کی روانگی کے وقت حضرت مولانا رخصتی تقریر فرماتے جس میں اصول، طریقہ کار اور نظام الاوقات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے، پھر تمام مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اس کے بعد ظہر تک قیلولہ، نماز ظہر کے بعد مطالعہ اور درس حدیث جو قریب عصر تک جاری رہتا، بعد عصر خطوط کے جوابات لکھاتے، مہمانوں سے ملتے، اور کبھی کبھی اس وقت بھی تقریر فرماتے، بعد نماز مغرب سورہ یٰسین کا ختم ہونا ختم پر دعا ہوتی، کبھی خود دعا کراتے، کبھی صرف شرکت فرماتے، کبھی کسی کی تقریر بھی ہوتی، اس کے بعد مہمانوں کو کھانا کھایا جاتا جن کی تعداد عموماً سیکڑوں ہوتی، اسکے بعد نماز عشاء ہوتی۔ عشاء کی نماز کے بعد عہد نبوی اور عہد صحابہؓ کے واقعات کا کتابی درس ہوتا پہلے تو یہ کام اکثر البدایہ والنہایہ سے لیا جاتا تھا لیکن جب سے خود مولانا کی ترتیب دی ہوئی حیات الصحابہ تیار ہوگئی تھی وہی سامنے رہتی، ادھر چند سالوں سے بعد نماز عشا کا یہ درس دوسرے حضرات کے سپرد ہوگیا تھا۔

دین کے لیے محنت و قربانی کی دعوت مولانا کی روح بن گئی تھی، ہر تقریر اور گفتگو کا موضوع یہی ہوتا تھا، شروع میں تو تین چلوں اور سات چلوں کی دعوت دی جاتی تھی لیکن آخر زمانے میں عمر اور ہر سال ۸-۸ مہینے کی دعوت دیتے تھے۔ مولانا کی دعوت اور اس کی کیفیت میں مسلسل ارتقا جاری تھا اور گزشتہ سال جب مولانا نے اپنے رفقاء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ آخری حج کیا اس حج میں اور حج کے بعد مولانا پر اپنے کام اور اپنی دعوت کا اور زیادہ غلبہ ہوگیا تھا۔

آخری حج آپ نے ذیقعدہ ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۶۴ء ذریعہ ہوائی جہاز اپنی زندگی کا آخری حج کیا، اس حج کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس سفر میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ بھی ہمراہ تشریف لے گئے تھے اور تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے خواص کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی

خود حضرت مولانا اور حضرت شیخ الحدیث اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب اور مولانا محمد ہارون صاحب اور چند اور رفقا تو ہوائی جہاز سے گئے تھے۔ باقی حضرات بحری جہازوں سے گئے تھے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر صبح و شام حضرت مولانا کی تقریریں شروع ہوگئیں حرم شریف میں اور اُس کے علاوہ بھی مختلف مقامات کے خصوصی اجتماعات میں خطاب فرماتے۔

۲۷ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے، نصف یوم اور ایک شب راستہ میں بدر ٹھہرے۔ ۲۸ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ پہنچے، مدینہ منورہ میں بھی صبح و شام اجتماعات ہوتے۔ ہر ہر طبقہ میں خطاب فرمایا۔ ہندستانی مجمع، بخاری مجمع، عربی مجمع، الغرض کوئی وقت ایسا نہ تھا جس میں مولانا کا خطاب نہ ہوتا ہو۔ حرمین پاک میں عموماً فجر کی نماز غلس میں (یعنی اندھیرے میں) ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کا خطاب نماز کے جلد ہی شروع ہو جاتا اور سورج خوب بلند ہونے تک جاری رہتا، لوگ ہمہ تن گوش ہو کر خطاب سُنتے اور پہلو نہ بدلتے، اس مبارک سفر میں طالبین حق کا ایسا رجوع عام ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مولانا کی دعوت پر لمبی لمبی مدت کے لیے ۲۶ جماعتیں نکلیں، جن میں سے اٹھارہ[۱۸] یورپ وغیرہ کے دُور دراز ممالک فرانس، مغربی جرمنی، انگلستان وغیرہ کے لیے، اور آٹھ جماعتیں مختلف ممالک عربیہ کے لیے۔

مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ واپسی ہوئی اور سولہ[۱۶] دن وہاں پھر قیام فرمایا۔ پھر وہاں سے کراچی تشریف لائے اور پہونچتے ہی وہاں کے تبلیغی مرکز کی مسجد میں تقریباً تین گھنٹے تقریر کی، تین دن کراچی میں قیام رہا اور عادت و معمول کے مطابق دعوتی تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا ــــ کراچی سے لائل پور تشریف لائے راستہ کے قریب قریب ہر اسٹیشن پر اللہ کے لیے محبت کرنے والے زائرین کا مجمع ہوتا تھا۔ جہاں وقت میں گنجائش ہوتی آپ اپنی کچھ بات فرماتے اور دعا ہوتی۔ لائل پور سے سرگودھا۔ سرگودھے سے ڈھڈیاں (جہاں حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ آرام فرما ہیں)

اس کے بعد راولپنڈی، رائے ونڈ، لاہور۔ ان تمام مقامات پر کم وبیش قیام فرمایا، ہر جگہ صبح وشام گھنٹوں خطاب فرماتے رہے، بولتے بولتے گلے میں سوجن ہوگئی، ڈاکٹروں نے اصرار سے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے بولنا چھوڑ دیا جائے۔ مگر حضرت مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے حسب عادت تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا اور مرض ترقی کرتا گیا۔

پاکستان کا آخری سفر حضرت مولانا فروری ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتہ میں براستہ لاہور ڈھاکہ کے اجتماع میں تشریف لے گئے، وہاں کے اجتماع سے فارغ ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کے اہم مقامات پر اجتماعات ہوئے اور تقریروں کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد پھر مغربی پاکستان تشریف لائے۔ کراچی، میرپور خاص، ملتان، کنگن پور، ٹل (کوہاٹ) اور راولپنڈی کے اجتماعات ہوئے، جن میں حسب معمول حضرت مولانا تقریریں فرماتے رہے، اسکے بعد رائے ونڈ کے اجتماع میں رونق افروز ہوئے، یہاں آخری دن (۲۳ مارچ کو) تقریباً ستر جماعتیں رخصت کیں، اس پورے دورہ کے اجتماعات میں دو مستقل تقریریں صبح اور شام کو ضرور فرماتے، اس کے علاوہ عصر سے مغرب تک خصوصی مجلس میں بیان ہوتا، ناشتہ اور کھانے کے وقت بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ——

رائے ونڈ کے اجتماع کے بعد لاہور تشریف لے آئے، پھر وہاں سے نارووال کے اجتماع میں تشریف لے گئے، اندرونی طور پر کچھ تکلیف محسوس کرتے رہے مگر ان کے بے مثل ضبط و تحمل نے اس کو ظاہر نہ ہونے دیا، احباب کو وقت آخر جاکر علم ہوا کہ وہ کتنی تکلیف میں مبتلا رہے ہیں، وہاں دو دن کے بعد جمعۃ المبارک کی ادائگی کے لیے گوجرانوالہ رُک گئے اور اس تکلیف کے باوجود جمعہ سے قبل اور اس کے بعد وہاں تقریر بھی فرمائی، عصر کے قریب لاہور بلال پارک چلے آئے اور یہاں بھی اُس تکلیف کے باوجود بیانات برابر جاری رہے۔ ہفتہ کی شام کو دو گھنٹہ تک تقریر فرمائی اور اگلی صبح اتوار کو جماعتوں کو رخصت کرنے سے پہلے ہدایات سے نوازا، پونے دس بجے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ مولانا ٹیلیفون کمپاؤنڈ میں چلے گئے وہاں دس بجے عورتوں کا اجتماع تھا اور مولانا کا بیان ہونا تھا۔ (۱)

دوشنبہ کو پھر رائے ونڈ تشریف لے آئے تین دن یعنی جمعرات تک پھر قیام فرمایا روزانہ صبح کو خواص سے خطاب فرماتے، ان تینوں دنوں میں بڑی اہم ہدایتیں اور نصیحتیں کام کرنے والوں کو فرمائیں۔

---

(۱) سید ذوالفقار حسین بخاری، حضرت جی نمبر غلام الدین لاہور

لاہور کا ورود اور انتقال ۲ اپریل جمعہ کے دن ٹرین سے سہارن پور کے لیے روانگی طے تھی، جمعرات کے دن رائے ونڈ سے فارغ ہو کر لاہور تشریف لے آئے، ایک دن پہلے (بدھ کے دن) گلے سے معدے تک سانس کی نالی میں چبھن محسوس فرماتے تھے، لاہور پہنچکر طبیعت میں تقریر کے لیے آمادگی نہیں تھی۔ حضرت مولانا کے لیے یہ بالکل غیر معمولی اور نئی بات تھی اور طبیعت کے اس حال کا اظہار بھی فرما دیا تھا، بلال پارک میں (جہاں لاہور کا تبلیغی مرکز ہے اور وہیں مولانا کا قیام تھا) حسب معمول بعد مغرب جمعرات والا اجتماع شروع ہوا اور چونکہ عام طور سے یہ اطلاع تھی کہ حضرت مولانا کل جمعہ کو ہندستان تشریف لے جائیں گے اور لوگوں کا خیال تھا کہ آج کے اجتماع میں مولانا کے اس سفر پاکستان کی آخری تقریر ہوگی اس لیے مجمع زیادہ آگیا اور کچھ ایسے حضرات بھی آگئے جو عام طور سے تبلیغی اجتماعات میں آیا نہیں کرتے، اس لیے بعض مخلصین نے عرض کیا کہ کچھ ضرور فرماویں، مولانا نے ارادہ فرمالیا اور طبیعت کے انتہائی احساس ضعف کے باوجود ہمت اور قوت ارادی استعمال کر کے کھڑے ہوگئے اور سوا گھنٹے تک تقریر فرمائی، صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مولانا زبردستی تقریر فرما رہے ہیں، پیشانی تک سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور آواز میں بہت نقاہت تھی، تقریر کے بعد تشکیل شروع ہوئی، اس وقت بھی طبیعت پر جبر کر کے بیٹھے رہے، اس کے بعد ایک نکاح پڑھانا تھا وہ بھی پڑھایا لیکن اس موقع پر تقریر نہیں فرمائی اور دعا بھی مختصر فرمائی جو ان کے عمر بھر کے معمول اور طریقہ کے لحاظ سے بالکل نرالی بات تھی، اس لیے خاص ساتھیوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے، مجلس نکاح سے اٹھ کر قیام گاہ کی طرف چلے جو بالکل برابر میں تھی، چلتے ہوئے فرمایا مجھ کو سنبھالو، سعید ابن صدیق صاحب اور ریاض لاہوری نے گلے اور کمر کو ہاتھوں سے سہارا دیا۔ چند قدم بڑھتے ہی لڑکھڑا گئے اور غشی طاری ہوگئی، اٹھا کر کمرہ میں لایا گیا اور اسی بیہوشی کی حالت میں لٹا دیا گیا، ایک حکیم صاحب جو سفر میں ساتھ تھے اُن کے پاس جواہر مہرہ تھا انھوں نے دودھ میں گھول کر چمچہ سے پلایا، چند منٹ کے بعد کچھ ہوش آگیا، ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے تھے، نبض بہت ہی ضعیف تھی، لاہور کے نامور ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب کو بلایا گیا، انھوں نے دیکھ کر کہا کہ قلب پر ایسا شدید حملہ ہوا تھا کہ اس سے بچ جانا بس ایک کرامت ہے انھوں نے مشورہ دیا

کہ مولانا کو اسی وقت ہسپتال میں داخل کر دیا جائے لیکن اس پر عمل نہیں ہو سکا اور ڈاکٹر صاحب کی تجویز کردہ دواؤں کا استعمال شروع ہوا۔ آدھی رات گزرنے کے کافی بعد حضرت مولانا نے عشاء کی نماز ادا کی، صبح تک طبیعت ایسی سنبھل گئی کہ کرنل ضیاء اللہ صاحب نے جب آکر دیکھا تو انھیں سخت حیرت ہوئی، سب لوگ ایک دم جیسے مطمئن ہو گئے۔ اسی اثناء میں مولانا نے کچھ ضروری باتیں بھی کیں۔ اس سلسلہ میں مولانا انعام الحسن صاحب سے یہ بھی فرمایا کہ میری کتابوں کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ بہر حال دوپہر تک طبیعت بہت قابل اطمینان رہی۔ لیکن جمعہ کی نماز کے وقت پھر ایک دم طبیعت بگڑی اور سانس بے قابو سا ہو گیا، فرمایا مجھے مختصر سی نماز پڑھا دو۔ مولانا انعام الحسن صاحب نے بہت مختصر نماز پڑھا دی۔ مسجد میں جمعہ کی نماز بھی مولانا مفتی زین العابدین صاحب نے بہت مختصر پڑھائی، ڈاکٹر اسلم صاحب نے آکر دیکھا تو کہا مرض کا دوبارہ حملہ ہو گیا ہے فوراً ہسپتال لیجانا چاہئے تاکہ وہاں آکسیجن دیا جائے۔ حضرت مولانا نے سنا تو فرمایا وہاں نرسیں بھی ہونگی مفتی زین العابدین صاحب نے فرمایا کہ اسکا پورا انتظام کر لیا جائے گا کہ کوئی نرس اور عورت قریب نہ آئے تو لے چلنے کی اجازت دے دی۔

آخری وقت موٹر میں حضرت مولانا کو لٹا دیا گیا اور وہ ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ حضرت مولانا انعام الحسن، مولوی الیاس میواتی اور ڈاکٹر اسلم ساتھ بیٹھے، اس وقت سانس زیادہ اکھڑنے لگی اس وقت زبان پر تھا رَبِّیَ اللّٰہُ رَبِّیَ اللّٰہُ۔ مولوی الیاس صاحب میواتی کا بیان ہے کہ اسی کے ساتھ حضرت مولانا نے شام کے وقت کی ماثورہ دعائیں پڑھنی شروع کر دیں اور کلمہ شریف پڑھنے لگے، گڑھی شاہو کے چوک کے قریب جب موٹر پہنچی تو دریافت فرمایا کہ ہسپتال کتنی دور ہے؟ عرض کیا گیا ابھی آدھا فاصلہ ہے۔ اس کے بعد زبان صحیح طور سے اپنا کام کرنے کے لائق نہیں رہی، آنکھوں میں بھی تغیر آگیا۔ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے یٰسین شریف شروع کر دی اور بس چند لمحوں میں حضرت مولانا نے کلمہ شریف پڑھتے ہوئے متبسم چہرہ کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دی، یعنی ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲ اپریل ۱۹۶۵ء جمعہ کے دن، دو بجے کے قریب، ۲۱ برس تک مسلسل اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے جان کھپانے والی یہ بابرکت ہستی اس فانی دنیا سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰ یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ۰

نماز جنازہ نعش مبارک بلال پارک واپس لائی گئی، جو سنتا تھا حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا

تھا، جیسے جیسے خبر پھیلتی گئی، مجمع بڑھتا گیا، عشا ہوتے ہوتے ہزاروں کا مجمع ہوگیا۔ نماز جنازہ ہوئی، جو حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے پڑھائی، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی (خلیفہ خاص حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ) سرگودھا سے ایک قافلہ کے ساتھ اس وقت پہنچے جب نماز جنازہ ہوچکی تھی۔ حضرت ممدوح نے دوسری دفعہ نماز جنازہ پڑھائی۔

اگرچہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ کی رائے یہ تھی کہ حضرت مولانا کو وہیں دفن کردیا جائے لیکن حافظ صدیق صاحب وغیرہ میواتی حضرات کے شدید اصرار پر اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے فون کے ذریعہ استصواب کے بعد ہوائی جہاز سے دہلی جنازہ لانے کا فیصلہ ہوا۔ جنازہ کے ساتھ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری، حافظ صدیق صاحب تاری رشید صاحب، مولوی الیاس صاحب میواتی، میاں جی اسحاق صاحب اور حاجی اسمٰعیل صاحب پالن پوری بھی ساتھ بیٹھے، جنازہ ڈیڑھ بجے رات لاہور سے روانہ ہوکر ۳ بجے دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترا، اور ساڑھے تین بجے کے قریب نظام الدین لے آیا گیا، تھوڑی دیر کے بعد سہارنپور سے حضرت شیخ الحدیث تشریف لے آئے۔ خبر دہلی اور اطراف میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی اقتدا میں نماز جنازہ صبح ۹ بجے پڑھی گئی، جس میں دہلی اور اس کے قریبی علاقوں اور میوات کے قریباً اسی ہزار مسلمانوں نے شرکت کی اور حضرت مولانا مرحوم اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن کردیے گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پسماندگان حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کی جو خاص نوعیت تھی اس کی بنا پر بلاشبہ ساری امت مسلمہ اور بالخصوص ان کے لاکھوں عقیدت مند اور محبین جن کو ان کے ذریعہ دین اور ایمان ویقین کی دولت ملی ان کے پسماندگان میں ہیں، لیکن شرف عام اور قرابت و عزیزداری کے لحاظ سے ان کے پسماندگان میں ایک[1] صاحبزادہ مولانا محمد ہارون صاحب ہیں جو الحمدللہ مولانا کے نقش قدم پر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو خاص خاص ترقیات سے نوازے

دوسری حضرت کی والدہ ماجدہ اماں جی ہیں، جن کے بارہ میں اپنی معلومات کی بنا پر لکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اپنے وقت کی رابعہ ہیں۔ تیسری حضرت مرحوم کی اہلیہ محترمہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی صاحبزادی ہیں۔ چوتھے محترمہ ہمشیرہ صاحبہ ہیں جو حضرت شیخ الحدیث کی اہلیہ محترمہ ہیں جن کے صاحبزادے مولوی محمد طلحہ ہیں۔ پانچویں حضرت مولانا انعام الحسن صاحب ہیں جو خاندانی قرابت کے علاوہ ہم زلف بھی ہیں اور ساری عمر حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ دو قالب ایک جان ہو کر رہے، عام طور سے محسوس کیا جاتا تھا کہ تبلیغ کے نام سے جو دینی جد وجہد چل رہی ہے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد سے حضرت مولانا مرحوم اس کا قلب ہیں اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب اس کا دماغ۔ حضرت مولانا کے وصال کے بعد ان کے جانشین خاص کی حیثیت سے اس دینی جد وجہد کی سب سے بڑی ذمہ داری اب انھیں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی پوری مدد فرمائے اور امت کو ان سے ویسا ہی نفع پہنچائے جیسا کہ حضرت مرحوم سے پہنچا یا وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

چھٹے ان کے برادر معظم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم ہیں جو چچا زاد بھائی اور خسر ہونے کے علاوہ والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے بعد ان کے استاد اور مربی بھی ہیں۔ حضرت شیخ کو حضرت مولانا مرحوم سے جو مشفقانہ تعلق تھا اور حضرت مولانا مرحوم حضرت شیخ کے ساتھ عقیدت و نیازمندی کا جو رابطہ رکھتے تھے اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ حضرت شیخ کے لیے یہ حادثہ کسی باکمال اور صاحب فیض سگے بیٹے کے حادثہ سے کم نہیں ہے۔ حضرت شیخ اس دور کے شیخ المشائخ اور مرجع خلائق ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ دیر تک قائم رکھے اور امت کو استفادہ کی توفیق دے۔ ان حضرات کے علاوہ کاندھلہ میں پورا خاندان ہے۔ جن میں حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب بھی ہیں جو حضرت مولانا مرحوم کے حقیقی ماموں ہیں، بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے علاوہ مولانا انعام الحسن صاحب کے والد ماجد مولانا اکرام الحسن صاحب، مولانا صوفی افتخار الحسن صاحب، مولانا اظہار الحسن صاحب، مصباح الحسن صاحب وغیرہ قریبی اعزہ اور متعلقین ہیں اللہ تعالیٰ

ان تمام حضرات کو اپنی رضا و محبت کے اونچے مقام تک پہنچائے۔

وما مات من کانت بقایاہ مثلھم
شباب تسامی للعلیٰ وکھول

حضرت مولانا کی دو اہم تصنیفیں

اس کو حضرت مولانا کی صرف کرامت ہی کہا جا سکتا ہے کہ دن رات اپنی دعوت میں منہمک رہنے کے باوجود مولانا مرحوم نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ان سیکڑوں مکاتیب کے علاوہ جن کی حیثیت مستقل رسائل و مقالات کی ہے۔ دو ضخیم تصنیفیں چھوڑیں، ذیل کی سطروں میں ان کا بہت مختصر اور اجمالی تعارف کرایا جا رہا ہے۔

اماني الاحبار مولانا مرحوم نے ۱۳۵۵ھ میں اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی دوسری کتابوں مستدرک حاکم وغیرہ کے علاوہ امام طحاوی کی معرکۃ الآرا کتاب شرح معانی الآثار بھی پڑھنی شروع کی، پڑھنے کے ساتھ ساتھ مولانا نے اس کی شرح بھی لکھنی شروع کی جس کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اس کی دو جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، پہلی جلد بڑے سائز کے ۳۷۶ صفحات پر ختم ہے۔ ہر صفحہ میں ۳۵-۳۶ سطریں ہیں ـــــ دوسری جلد ۴۴۲ صفحہ پر ختم ہوئی ہے ـــــ تیسری جلد کی تصنیف معلوم ہوا ہے کہ مکمل ہو چکی تھی لیکن چھپنے کی نوبت ابھی نہیں آئی پہلی جلد کے شروع میں طحاوی کے اسماء الرجال کی فہرست اور قریباً چالیس صفحے کا مقدمہ فن حدیث میں مولانا کے علمی مقام کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

حیات الصحابہؓ اس کا نام تو حیات الصحابہ ہے لیکن دراصل یہ عہد نبوت اور دور صحابہؓ کا عربی زبان میں ایک مستند اور مکمل مرقع ہے، اس کی تین ضخیم جلدیں ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد میں اس کی طباعت ہوئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ ہے۔ پہلی جلد ۶۱۲ صفحات پر ختم ہوئی ہے، دوسری جلد ۷۱۴ صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ تیسری جلد کی ضخامت بھی اتنی ہے وہ بھی چھپ چکی ہے لیکن ابھی پریس سے مکمل کرشائقین کے ہاتھوں تک نہیں پہونچ سکی ہے راقم الحروف نے بھی نہیں دیکھی ہے۔ گویا پوری کتاب کے صفحات دو ہزار سے زیادہ ہیں، محدثین کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ پہلی

دونوں جلدیں جو چھپ کر شائع ہو چکی ہیں ان کا اردو ترجمہ بھی ادارۂ اشاعت دینیات دہلی سے شائع ہو چکا ہے، مولانا کی ان دونوں کتابوں کو دیکھ کر ان لوگوں کو انتہائی حیرت ہوگی جو مولانا کے نظام الاوقات اور دن رات کی مصروفیات کو آنکھوں سے دیکھتے تھے، مولانا کی یہ دونوں کتابیں اس لائق ہیں کہ پوری تفصیل کے ساتھ ان پر تبصرہ کیا جائے اور اہل علم سے ان کا تعارف کرایا جائے لیکن "الفرقان" کی اس خاص اشاعت کے لیے مجھے جو سوانحی مقالہ لکھنا ہے اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت تو مقصد صرف ان دونوں کتابوں کا اجمالی تعارف تھا، راقم الحروف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان خوش نصیبوں میں ہے جنھوں نے حضرت مولانا مرحوم کی دن رات کی مصروفیتوں کو سفر و حضر میں بار بار دیکھا ہے ان مصروفیات میں ایسی ضخیم کتابوں کی تصنیف کو حضرت مولانا مرحوم کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل علم کو ان کتابوں سے وہ فائدہ پہنچائے جس کی امید پر مولانا مرحوم نے یہ کتابیں لکھی تھیں، اور ان کو پوری طرح قبول فرمائے۔

سراپا میانہ قد، خوش رو، رنگ کھلتا ہوا، بدن دوہرا، گھنی سیاہ ڈاڑھی بھرا ہوا چہرہ، آنکھوں میں بلا کی چمک اور کشش، خندہ پیشانی، سر پر عام طور سے رومال باندھتے اور دوپلی ٹوپی بھی پہنا کرتے، تہبند اور لانبا کرتا عام لباس ہوتا کبھی کبھی پاجامہ بھی پہنتے پہلی نظر ڈالو تو معلوم ہو کسی گہری سوچ میں ہیں۔ اول اول ہیبت طاری ہوتی لیکن ذرا ہی دیر میں اُنس پیدا ہو جاتا، ہر ایک سمجھتا کہ سب سے زیادہ تعلق اس سے ہے۔ دین کے علاوہ نہ کچھ کہتے اور نہ سُننا گوارا کرتے، ذہن صاف، سینہ یقین سے بھرا ہوا، معلومات خاص کر عہد نبوی اور قرن صحابہؓ و تابعین سے متعلق وسیع سے وسیع تر لبوں پر مُسکراہٹ، مگر دل میں آگ لگی ہوئی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے ایسے ہی مردانِ خدا کے لیے کہا ہے ؎

تو اے افسردہ دل زاہد کجے در بزم رنداں شو،
کہ بینی خندہ بر لب ہا و آتش پارہ در دلہا

بات کرتے کرتے آستین چڑھاتے پھر اُتارتے، تھوڑی دیر بعد ایک آہ بھرتے

جو درد و اثر میں ڈوبی ہوتی، اضطراب و بے کلی نے ایک سیمابی کیفیت پیدا کر دی تھی جنھوں نے قریب سے نہیں دیکھا، ان کے لیے سمجھنا مشکل ہے اور جنھوں نے دیکھا انھوں نے یقین کیا کہ وہ اس دور میں اللہ کی ایک نشانی تھے۔ انھیں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے درد و فکر کو سمجھنا آسان ہو جاتا تھا۔

سوانح یوسفی کی تیاری

مولانا سید محمد ثانی حسنی ایڈیٹر "رضوان" لکھنؤ اور مولانا سید محمد حسنی ایڈیٹر "تعمیر حیات" لکھنؤ نے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی رہنمائی اور نگرانی میں حضرت جیؒ کی سوانح مرتب کرنے کی ذمہ داری لے لی ہے اور ابتدائی کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ جو حضرات مستند معلومات اور مفید مشوروں سے مدد دے سکتے ہوں وہ پتہ ذیل پر مراسلت فرمائیں:-

۳۷ گوئن روڈ - لکھنؤ - یو - پی

حیات امام اعظم ابو حنیفہ رح

آج کی دنیا میں تین چوتھائی مسلم آبادی امام اعظم ابو حنیفہؒ کے فقہ کی مقلد ہے، دنیا کی دستور ساز اسمبلیوں میں آج بھی امام صاحبؒ کے دستور سے روشنی حاصل کی جاتی ہے آخر کیوں؟ اگر آپ امام صاحبؒ کے کمالات اور ان کے مستند تاریخی حالات، ان کے فقہ، حدیث، کلام اور تمام علوم سے واقف ہونا چاہتے ہیں، اگر آپ موجودہ دستوری پریشانیوں کا حل چاہتے ہیں تو ہماری کتاب حیات امام اعظم ابو حنیفہؒ ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے محصول ڈاک بذمہ خریدار

ایک مرد مومن کی داستان حیات
تذکرہ شیخ الہندؒ

حضرت شیخ الہندؒ اسی دور کے اولیاء اللہ اور مجاہدین میں سے ہیں، ان کی زندگی سے ہندستان کی آزادی کی تاریخ وابستہ ہے۔ وہ تحریک ریشمی خطوط سے کیا چاہتے تھے؟ اسکا تفصیلی جواب اس کتاب میں موجود ہے حضرت شیخ الہندؒ کے غیر مطبوعہ خطوط، تاریخ ترجمہ قرآن، اسارت مالٹا کے اسباب، حضرت کو کس نے گرفتار کرایا، دار العلوم دیوبند کا بانی کون ہے، غرضکہ وہ ابتدائے سلسلہ اس کتاب میں آگئے ہیں جو کبھی منظر عام پر نہیں ہوئے تھے۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ:- مدنی دار التالیف بجنور (یو-پی)

مکتوبات

حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے اہم دعوتی مکاتیب اور ہدایت نامے
جو مختلف اوقات میں دینی کام کرنے والی جماعتوں کو اور
اس کام کے ذمہ دار افراد کو لکھے گئے۔

ہم نے جب اس خاص اشاعت کا ارادہ کیا تو ہماری سب سے بڑی خواہش اور فکر یہ تھی کہ ہم کو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب مل جائیں کیونکہ ان کی دعوت اور ان کے درد و سوز اور اُن کے یقین کے جاننے سمجھنے کا سب سے مستند ذریعہ اُن کے بعد اُن کے خطوط ہی ہو سکتے ہیں ـــــ اسکے لئے ہم نے دہلی کا ایک سفر بھی کیا لیکن وہاں ایک مکتوب کی نقل بھی محفوظ نہیں مل سکی ـــــ اسکے بعد اللہ نے مدد فرمائی اور ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مرحوم کے خطوط کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ خود ہمارے پاس یعنی دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جس کو اب سے کئی سال پہلے ہمارے محترم دوست افتخار فریدی صاحب نے مختلف علاقوں کے حضرات سے حاصل کر کے اور ایک باقاعدہ فائل بنا کے حفاظت ہی کی نیت سے یہاں محفوظ کرا دیا ہے۔ ہم نے اس کو جا کر دیکھا اور اسے بڑا قیمتی ذخیرہ پایا ـــــ اگلے صفحات میں حضرت مولانا مرحوم کے جو مکاتیب قارئین کرام پڑھیں گے اُن میں کے پہلے چھ مکتوب اسی ذخیرہ سے انتخاب کئے گئے ہیں ـــــ اس کے بعد ایک مکتوب جناب مولانا عبد العزیز صاحب کھلنوی سے حاصل ہوا، مکتوب نمبر ۱۲ ہی ہے ـــــ اسکے بعد میاں محمد عیسیٰ کی عنایت سے اُنکی مجلد بیاض ہم کو مل گئی جس میں انھوں نے حضرت مولانا مرحوم کے بہت سے اہم مکاتیب اور ہدایت نامے محفوظ کر رکھے ہیں نمبر ۱۳ کے بعد جو مکاتیب درج کئے گئے ہیں وہ اس بیاض سے لئے گئے، البتہ مکتوب نمبر ۱۲ گجرات کے ایک مولوی صاحب کا بھیجا ہوا ہے۔ ان مکاتیب کی دستیابی کو ہم اس فقیر کی تیاری کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم سمجھتے ہیں فلہ الحمد ولہ الشکر ـــــ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے ان کو محفوظ رکھا اور جنکی عنایت سے یہ ہم کو ملے۔

حضرت مولانا مرحوم کے حال و کیف کی طرح انکی زبان اور تعبیر بھی بالکل نرالی تھی، جو حضرات اُن کی دعوت، اُن کے درد اور اُن کی خاص زبان سے واقف و آشنا ہیں وہ انشاء اللہ ان مکاتیب کی قدر و قیمت سمجھیں گے۔

صفحات میں مزید گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے کچھ مکاتیب ہم اس میں شامل نہیں کر سکے انشاء اللہ وہ آئندہ وقتاً فوقتاً الفرقان کی عام اشاعتوں میں شائع کئے جاتے رہیں گے۔

(ادارہ)

(۱)

[ذیل میں سب سے پہلے جو مکتوب درج کیا جا رہا ہے، یہ تبلیغ کے مقصد، اصول، طریق کار، متوقع منافع و برکات اور اس راہ کی ضروری ہدایات پر بہت جامع ہے، حضرت مولانا مرحوم نے اس قدر تفصیل اور وضاحت سے شاید ہی کبھی کوئی مکتوب اس موضوع پر لکھا یا لکھایا ہو۔

تبلیغی کام سے خاص تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے بتلایا (اور خود خط کے بعض اجزاء سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے) کہ یہ مکتوب عمرہ کے لئے حجاز مقدس جانے والی ایک جماعت کیلئے حضرت مولانا مرحوم نے لکھا تھا جس کا ارادہ حجاز مقدس سے بعض دوسرے ممالک میں جانے کا بھی تھا تاکہ اسکی روشنی میں دوسرے ملکوں میں کام کی بنیاد صحیح پڑے۔]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمین و مکرمین بندہ زادنا اللہ وایاکم جھداً وسعیاً فی سبیلہ والھمنا وایاکم مراشد امورنا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خداوند کریم سے امید ہے کہ آپ حضرات بعافیت ہوں گے۔ آپ حضرات کی دینی ساعی کی اطلاعات باعث مسرت اور باعث تقویت ہوتی ہیں۔ اللہ جل شانہٗ قبول فرماویں۔ بارآور فرماویں، ترقیات عطا فرماویں۔ صحیح نہج پر آپ حضرات کی حفاظت فرماویں اور پوری ترکیب و ترتیب کی سمجھ عطا فرماویں۔ آمین۔

اللہ رب العزت جل جلالہٗ وعم نوالہٗ نے انسانوں کی تمام کامیابیوں کا دارومدار انسان کے اندر دفنی مایہ پر رکھا ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے۔ باہر کی چیزوں کے نقشے کا نام کامیابی و ناکامی نہیں، عزت، ذلت، آرام، تکلیف، سکون و پریشانی، صحت و بیماری انسان کے اندر کے حالات کا نام ہے ان حالات کے بننے یا بگڑنے کا باہر کے نقشوں سے تعلق بھی نہیں، اللہ جل شانہٗ ملک و مال کے ساتھ انسان کو ذلیل کرکے دکھا دیں اور فقر کے نقشے میں عزت دے کر دکھا دیں۔ انسان کے اندر کی مایہ اس کا یقین اور اس کے اعمال ہیں۔ انسان کے اندر کا یقین اور اندر سے نکلنے والے عمل اگر ٹھیک ہوں گے تو اللہ جل شانہٗ اندر کا کامیابی کی حالت پیدا فرما دینگے خواہ چیزوں کا نقشہ کتنا ہی پست ہو۔ اللہ جل شانہٗ تمام کائنات کے ہر ذرّے کے اور ہر فرد کے خالق و مالک ہیں۔ ہر چیز کو اپنی قدرت سے بنایا ہے، سب کچھ ان کے بنانے سے بنا ہے وہ بنانے

والے ہیں خود بنے نہیں اور جو بنا ہوا ہے اس سے کچھ بنتا نہیں۔ جو کچھ قدرت سے بنا ہے وہ قدرت کے ماتحت ہے۔ ہر چیز پر ان کا قبضہ ہے۔ وہ ہی ہر چیز کو استعمال فرماتے ہیں۔ وہ اپنی قدرت سے ان چیزوں کی شکلوں کو بھی بدل سکتے ہیں اور شکلوں کو قائم رکھ کر صفات کو بدل سکتے ہیں۔ لکڑی کو اژدھا بنا سکتے ہیں اور اژدھے کو لکڑی بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر شکل پر خواہ ملک کی ہو یا مال کی، برق کی ہو یا بھاپ کی ان کا ہی قبضہ ہے اور وہ ہی تصرف فرماتے ہیں۔ جہاں سے انسان کو تعمیر نظر آتی ہے وہاں سے تخریب لاکر دکھا دیں اور جہاں سے تخریب نظر آتی ہے وہاں سے تعمیر لاکر دکھا دیں۔ تربیت کا نظام وہی چلاتے ہیں۔ ساری چیزوں کے بغیر ریت پر ڈال کر پال دیں اور سارے ساز و سامان میں پرورش بگاڑ دیں۔

اللہ جل شانہٗ کی ذات عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور انکی قدرت سے براہ راست استفادہ ہو اسکے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے طریقے لے کر آئے ہیں جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہٗ ہر نقشے میں کامیابی دیکر دکھائیں گے، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں اپنے یقین اور اپنے جذبے اور اپنے طریقے بدلنے کا مطالبہ ہے۔ صرف یقین کی تبدیلی پر ہی اللہ پاک اس زمین و آسمان سے کئی گنا زیادہ بڑی جنت عطا فرمائیں گے۔ جن چیزوں میں سے یقین نکل کر اللہ کی ذات میں آئے گا۔ ان ساری چیزوں کو اللہ پاک مسخر فرما دیں گے۔ اس یقین کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے ایک تو اس یقین کی دعوت دینی ہے۔ اللہ کی بڑائی سمجھانی ہے، ان کی ربوبیت سمجھانی ہے۔ انکی قدرت سمجھانی ہے۔ انبیاء اور صحابہ کے واقعات سنانے ہیں۔ خود تنہائیوں میں بیٹھ کر سوچنا ہے دل میں اسی یقین کو اتارنا ہے جس کی مجمع میں دعوت دی ہے یہی حق ہے اور پھر رو رو کر دعا مانگنی ہے کہ اے اللہ اس یقین کی حقیقت سے نواز دے۔

اللہ جل شانہٗ کی قدرت سے براہ راست فائدے حاصل کرنے کے لئے نماز کا عمل دیا گیا ہے۔ سر سے لے کر پیر تک اللہ کی رضا والے مخصوص طریقے پر پابندیوں کے ساتھ اپنے کو استعمال کرو۔ آنکھوں کا، کانوں کا، ہاتھوں کا، زبان کا، پیروں کا استعمال ٹھیک ہو۔ دل میں اللہ کا دھیان ہو، اللہ کا خوف ہو۔ یقین ہو کہ نماز میں اللہ کے حکم کے

مطابق میرا ہر استعمال تکبیر و تسبیح، رکوع و سجدہ ساری کائنات سے زیادہ انعامات دلانے والا ہے۔ اسی یقین کے ساتھ نماز پڑھ کر ہاتھ پھیلا کر مانگا جائے تو اللہ جل شانہٗ اپنی قدرت سے ہر ضرورت پوری کریں گے۔ ایسی نماز پر اللہ پاک گناہوں کو معاف بھی فرمادیں گے۔ رزق میں برکت بھی دیں گے۔ طاعت کی توفیق بھی ملے گی۔ ایسی نماز سیکھنے کے لئے دوسروں کو خشوع خضوع والی نماز کی ترغیب و دعوت دی جائے۔ اس پر آخرت اور دنیا کے نفع سمجھائے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کی نماز کو سنا سنا کر خود اپنی نماز کو اچھا کرنے کی مشق کرنا۔ اہتمام سے وضو کرنا۔ دھیان جمانا، قیام میں، قعدہ میں، رکوع میں، سجدے میں بھی دھیان کم از کم تین مرتبہ جمایا جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ نماز کے بعد سوچا جائے کہ اللہ کی شان کے مطابق نماز نہ ہوئی۔ اس پر رونا اور کہنا کہ اے اللہ ہماری نماز میں حقیقت پیدا فرما۔

علم سے مراد یہ ہے کہ ہم میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ میرے اللہ مجھ سے اس حال میں کیا چاہتے ہیں، اور پھر اللہ کے دھیان کے ساتھ اپنے آپ کو اس عمل میں لگا دینا یہ ذکر ہے۔ جو آدمی دین سیکھنے کے لئے سفر کرتا ہے اس کا یہ سفر عبادت میں لکھا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے چلنے والوں کے پیروں کے نیچے ستر ہزار فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ زمین و آسمان کی ساری مخلوق ان کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہے۔ شیطان پر ایک عالم ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ دوسروں میں علم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ فضائل سنائے جائیں۔ خود تعلیم کے حلقوں میں منجھا جائے۔ علماء کی خدمت میں حاضری دی جائے۔ اس کو بھی عبادت یقین کیا جائے اور رو رو کر مانگا جائے کہ اے اللہ جل شانہٗ علم کی حقیقت عطا فرمادیں ہر عمل میں اللہ جل شانہٗ کا دھیان پیدا کرنے کے لئے اللہ کا ذکر ہے۔ جو آدمی اللہ جل شانہٗ کو یاد کرتا ہے اللہ جل شانہٗ اس کو یاد فرماتے ہیں جب تک آدمی کے ہونٹ اللہ کے ذکر میں ہلتے رہتے ہیں اللہ جل شانہٗ اسکے ساتھ ہوتے ہیں۔ اللہ پاک اپنی محبت و معرفت عطا فرماتے ہیں۔ اللہ کا ذکر شیطان سے حفاظت کا قلعہ ہے۔ خود اللہ جل شانہٗ کا دھیان پیدا کرنے کے لئے دوسروں کو اللہ کے ذکر پر آمادہ کرنا۔ ترغیب دینا۔ خود دھیان

جاکر کہ میرے اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ذکر کرنا اور رو رو کر دعا مانگنا کہ اے اللہ مجھے ذکر کی حقیقت عطا فرما۔

ہر مسلمان کا بحیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہونے کے اکرام بھی کرنا ہے، ہر امتی کے آگے بچھ جانا۔ ہر شخص کے حقوق کو ادا کرنا اور اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرنا جو آدمی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ جل شانہٗ اسکی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ جب تک آدمی اپنے مسلمان بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے اللہ جل شانہٗ اسکے کام میں لگے رہتے ہیں جو اپنے حق کو معاف کردے گا اللہ جل شانہٗ اس کو جنت کے بیچ میں محل عطا فرمائیں گے۔ جو اللہ کے لئے دوسروں کے آگے تذلل اختیار کرے گا اللہ جل شانہٗ اس کو رفعت و بلندی عطا فرمائیں گے اسکے لئے دوسروں میں ترغیب کے ذریعہ اکرام مسلم کا شوق پیدا کرنا ہے مسلمان کی قیمت بتانی ہے حضورؐ اکرم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق، ہمدردی اور ایثار کے واقعات سنانے ہیں۔ خود اسکی مشق کرنی ہے اور رو رو کر اللہ جل شانہٗ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی توفیق مانگنی ہے۔

ہر عمل میں اللہ جل شانہٗ کی رضا کا جذبہ ہو، کسی عمل سے دنیا کی طلب یا اپنی حیثیت بنانا مقصود نہ ہو۔ اللہ کی رضا کے جذبے سے تھوڑا سا عمل بھی بہت انعامات دلوائے گا اور اسکے بغیر بہت بڑے بڑے عمل بھی گرفت کا سبب بنیں گے۔ اپنی نیت کو درست کرنے کے لئے دوسروں میں دعوت کے ذریعہ تصحیح نیت کا فکر و شوق پیدا کیا جائے۔ اپنے آپ پر عمل سے پہلے اور ہر عمل کے دوران نیت کو درست کرنے کی مشق کی جائے۔ میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ عمل کر رہا ہوں، اور عمل کی تکمیل پر اپنی نیت کو ناقص قرار دیکر توبہ و استغفار کی جائے اور رو رو کر اللہ جل شانہٗ سے اخلاص مانگا جائے۔

آج امت میں کسی حد تک انفرادی اعمال کا رواج ہے گو ان کی حقیقت نکلی ہوئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے طفیل پوری امت کو دعوت والی محنت ملی تھی اسکے بندوں کا تعلق اللہ جل شانہٗ سے قائم ہو جائے اسکے لئے انبیاء علیہم السلام والے طرز پر اپنی جان و مال کو جھونک دینا اور جن میں محنت کر رہے ہیں ان سے کسی

چیز کا طالب نہ بنا اسکے لئے محبت بھی کرنا اور نصرت بھی کرنا۔ جو زمین والوں پر رحم کرتا ہے آسمان والا ان پر رحم کرتا ہے جو دوسروں کا تعلق اللہ جل شانہ سے جوڑنے کے لئے ایمان و عمل صالح کی محنت کریں گے اللہ جل شانہ ان کو سب سے پہلے ایمان و عمل صالح کی حقیقتوں سے نواز کر اپنا تعلق عطا فرمائیں گے، اس راستے میں ایک صبح یا ایک شام کا نکلنا پوری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے (باعتبار اعمال کے بھی اور باعتبار چیزوں کے بھی) اس سب سے بہتر ہے۔ اس راستے میں ہر مال کے خرچ اور ہر اللہ کے ذکر و تسبیح اور ہر نماز کا ثواب، لاکھ گنا ہو جاتا ہے۔ اس راستے میں محنت کرنے والوں کی دعائیں بنی اسرائیل کے انبیاء علیہ السلام کی دعاؤں کی طرح قبول ہوتی ہیں یعنی جس طرح ان کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ نے ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کو استعمال فرما کر ان کو کامیاب فرمایا اور باطل خاکوں کو توڑ دیا اسی طرح اس محنت کے کرنے والوں کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کے مظاہرے فرمائیں گے اور اگر عالمی بنیاد پر محنت کی گئی تو تمام اہل عالم کے قلوب میں انکی محنت کے اثر سے تبدیلیاں لائیں گے۔ دین کے دوسرے اعمال کی طرح ہمیں یہ محنت بھی کرنی نہیں آتی۔ دوسروں کو اس محنت کے لئے آمادہ کرنا ہے اسکی اہمیت اور قیمت بتانی ہے، انبیاء اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات سنانے ہیں، خود اپنے آپ کو قربانی کی شکلوں اور ہجرت و نصرت والے اعمال میں لگانا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہر حال میں اللہ کی راہ میں نکلے ہیں، نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت، گھر میں ولادت کے موقع پر اور وفات کے موقعہ پر، سردی میں، گرمی میں، بھوک میں، فاقے میں، صحت میں، بیماری میں، قوت میں، ضعف میں، جوانی میں، بڑھاپے میں بھی نکلے ہیں اور رو رو کر اللہ جل شانہ سے مانگا ہے کہ ہمیں اس عالی محنت کے لئے قبول فرمالے۔

ان چیزوں سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ہر شخص سے خواہ کسی شعبہ سے متعلق ہو چار ماہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اپنے مشاغل ساز و سامان اور گھر بار سے نکل کر ان چیزوں کی دعوت دیتے ہوئے اور خود مشق کرتے ہوئے ملک بہ ملک اقلیم بہ اقلیم قوم بہ قوم قریہ بہ قریہ پھریں گے۔ حضور اقدس صلعم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال

دئے تھے۔ ان اعمال سے مسلمانوں کا زندگی میں امتیاز تھا، مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں۔ اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں۔ عملوں کے ٹھیک کرنے کے لئے تعلیمیں ہوتی تھیں۔ ایمان و عمل صالح کی دعوت کے لئے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیلیں بھی مسجد سے ہی ہوتی تھیں۔ اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ یہاں تعاون، ایثار، ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے۔ ہر شخص حاکم محکوم، مالدار غریب، تاجر، زارع، مزدور، مسجد میں آکر زندگی سیکھتا تھا اور باہر جاکر اپنے اپنے شعبہ میں مسجد والے تاثر سے چلتا تھا آج ہم دھوکے میں پڑ گئے کہ ہمارے پیسے سے مسجد چلتی ہے۔ مسجدیں اعمال سے خالی ہوگئیں اور چیزوں سے بھر گئیں حضور صلعم نے مسجد کو بازار والوں کے تابع نہیں کیا۔ حضور صلعم کی مسجد میں نہ تجلی تھی نہ پانی تھا نہ غسل خانے تھے، خرچ کی کوئی شکل نہ تھی۔ مسجد میں آکر داعی بنتا تھا۔ معلم اور متعلم بنتا تھا۔ ذاکر بنتا تھا، نمازی بنتا تھا مطیع بنتا تھا۔ متقی زاہد بنتا تھا۔ خلیق بنتا تھا، باہر جاکر ٹھیک زندگی گزارتا تھا۔ مسجد بازار والوں کو چلاتی تھی۔ ان چار ماہ میں ہر جگہ جاکر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں مسجد والے اعمال کو سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لئے تین چلوں کے واسطے آمادہ کریں۔

واپس اپنے مقام پر آکر اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ گشت کے ذریعہ بستی والوں کو جمع کرکے انہی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا اور مشق کے لئے فی گھر ایک نفر تین چلوں کے لئے باہر نکلنا ہے۔ ایک گشت اپنی مسجد کے ماحول میں اور دوسرا گشت دوسری مسجد کے ماحول میں کریں۔ ہر مسجد میں مقامی جماعت بھی بنائیں۔ ہر مسجد کے احباب روزانہ فضائل کی تعلیم کریں۔ اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے اسکے لئے ہر مسجد سے تین یوم کے لئے جماعتیں پانچ کوس کے علاقے میں جائیں، ہر دوست مہینے میں تین یوم پابندی سے لگائے۔ "اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا" کے مصداق تین دن پر حکماً تیس دن کا ثواب ملے گا پورے سال ہر مہینے تین دن لگائے تو سارا سال اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔ اندرون

ملک کے تقاضے پورے ہوتے رہیں اور اپنی مشق قائم رہے اور جاری رہے اسکے لئے ہر سال اہتمام سے چلہ لگایا جائے عمر میں کم از کم تین چلے، سال میں چلہ، مہینے میں تین یوم ہفتہ میں دو گشت، روزانہ تعلیم، تسبیحات، تلاوت یہ کم سے کم نصاب ہے کہ ہماری زندگی دین والی بنتی رہے، اگر ہم یوں چاہیں کہ ہم سب بنیں اجتماعی طور پر پوری انسانیت کی زندگی کے صحیح رُخ پر آنے اور باطل کے ٹوٹنے کا تو اسکے لئے اس نصاب سے بھی آگے بڑھنا ہوگا۔ ہمارے وقت اور ہماری آمدنی کا نصف اللہ کی راہ میں لگے اور نصف کاروبار اور گھر کے مسائل میں یا کم از کم یہ کہ ایک تہائی وقت و آمدنی اللہ کی راہ میں اور دو تہائی اپنے مشاغل میں۔ یعنی ہر سال چار ماہ کی ترتیب بٹھائی جائے۔

آپ حضرات عمر میں کم از کم تین چلوں کی دعوت خوب جم کر دیں، اس میں بالکل نہ گھبرائیں اسکے بغیر زندگیوں کے رُخ نہ بدلیں گے۔ جن احباب نے خود ابھی تین چلے نہ دیئے ہوں وہ بھی اس نیت سے خوب جم کر دعوت دیں کہ اللہ جل شانہ اسکے لئے ہمیں قبول فرمالے۔

گشت کا عمل اس کام میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر یہ عمل صحیح ہوگا قبول ہوگا تو دعوت قبول ہوگی۔ دعوت قبول ہوگی دعا قبول ہوگی۔ دعا قبول ہوگی ... ... ہدایت آئے گی۔ اور گشت قبول نہ ہوا تو دعوت قبول نہ ہوگی۔ دعوت قبول نہ ہوئی دعا قبول نہ ہوگی۔ دعا قبول نہ ہوئی ہدایت نہیں آئے گی۔

گشت کا موضوع یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہماری دنیا اور آخرت کے مسائل کا حل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر زندگی گزارنے میں رکھا ہے۔ ان کے طریقے ہماری زندگیوں میں آجائیں اسکے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اس محنت پر بستی والوں کو آمادہ کرنے کے لئے گشت کے لئے مسجد میں جمع کرنا ہے۔ نماز کے بعد اعلان کرکے لوگوں کو روکا جائے، اعلان کوئی بستی کا باثر آدمی یا امام صاحب کریں تو زیادہ مناسب ہے، وہ ہم کو کہیں تو ہمارے ساتھی کر دیں۔ پھر گشت کی اہمیت ضرورت اور قیمت بتائی جائے اسکے لئے آمادہ کیا جائے جو تیار ہوں ان کو اچھی طرح آداب سمجھائیں۔ اللہ کا ذکر کرتے

ہوئے چلنا ہے۔ نگاہیں نیچی ہوں۔ ہمارے تمام مسائل کا تعلق اللہ جل شانہٗ کی ذات سے ہے، ان بازار میں پھیلی ہوئی چیزوں سے کسی مسئلے کا تعلق نہیں۔ چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، دھیان نہ جائے۔ اگر نگاہ پڑ جائے تو مٹی کے ڈلے معلوم ہوں۔ ہمارا دل اگر ان چیزوں کی طرف پھر گیا تو پھر ہم جن کے پاس جا رہے ہیں ان کا دل ان چیزوں سے اللہ کی طرف کیسے پھرے گا۔ قبر کا داخلہ سامنے ہو۔ اسی زمین کے نیچے جانا ہے۔ مل جل کر چلیں۔ ایک آدمی بات کرے۔ کامیاب ہے وہ بات کرنے والا جو مختصر بات کرکے آدمی کو مسجد میں بھیجدے۔" بھائی ہم مسلمان ہیں۔ ہم نے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا ہے۔ ہمارا یقین ہے اللہ پالنے والے ہیں۔ نفع و نقصان۔ عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے اگر ہم اللہ کے حکم پر حضرت محمدؐ کے طریقے پر زندگی گزاریں گے اللہ راضی ہو کر ہماری زندگی بنا دیں گے۔ ہم سب کی زندگی اللہ جل شانہٗ کے حکم کے مطابق حضرت محمدؐ کے طریقے پر آجائے اسکے لئے بھائی مسجد میں کچھ فکر کی بات ہو رہی ہے۔

نماز پڑھ چکے ہوں تو بھی اٹھا کر مسجد میں بھیجدیں۔ ضرورت ہو تو آگے نماز کو بھی مسجد میں فوری جانے کا عنوان بنالیں۔" اللہ کا سب سے بڑا حکم نماز ہے نماز پڑھیں گے اللہ روزی میں برکت دیں گے، گناہوں کو معاف کردیں گے۔ دعاؤں کو قبول فرمالیں گے۔ بشارتیں سنائی جائیں وعیدیں نہیں۔

نماز کا وقت جا رہا ہے مسجد میں چلئے۔

امیر کی اطاعت کرنی ہے۔ واپسی میں استغفار کرتے ہوئے آنا ہے۔ اب آداب کا مذاکرہ کرنے کے بعد دعا مانگ کر چل دیں۔ گشت میں دس آدمی جائیں۔ مسجد کے قریب مکانات پر گشت کرلیں، مکانات نہ ہوں تو بازار میں کرلیں۔ جماعت میں زیادہ آدمی ایسے ہوں جو گشت میں اصولوں کی پابندی کرلیں۔ مسجد میں دو تین آدمی چھوڑ دیں نئے آدمی زیادہ تیار ہو جائیں تو ان کو بھی سمجھا کر مسجد میں مشغول کردیں۔ نئے آدمی تین چار ساتھ ہوں۔ مسجد میں ایک ساتھی اللہ جل شانہٗ کی طرف متوجہ ہو کر ذکر و دعا میں مشغول رہے۔ ایک آنے والوں کا استقبال کرے۔ ضرورت ہو تو وضو کروا کر نماز پڑھوا دے اور ایک ساتھی

آنے والوں کو نماز تک مشغول رکھے۔ اپنی زندگی کا مقصد سمجھائے۔ پونے گھنٹے گشت ہو۔ نماز سے سات آٹھ منٹ پہلے گشت ختم کر دیں۔ سب تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔ جس ساتھی کے بارے میں مشورہ ہو جائے وہ دعوت دے۔ یہ سمجھائے کہ اللہ جل شانہ کی ذات عالی سے تعلق قائم ہوا تو دنیا اور آخرت میں کیا نفع ہوگا۔ اور اگر اللہ جل شانہ کی ذات عالی سے تعلق قائم نہ ہوا تو دنیا اور آخرت میں کیا نقصان ہوگا۔ جیسے اس خط کے شروع میں چھ نمبروں کا تذکرہ کیا ہے اس طرز پر ہر نمبر کا مقصد اس کا نفع اور قیمت اور حاصل کرنے کا طریقہ بتایا جائے۔ سادے انداز میں بیان ہو۔ اس سے انشاء اللہ مجمع کی سمجھ میں کام آئے گا اور اسکی ضرورت بھی محسوس کرے گا اور سمجھے گا کہ ہم بھی سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھی بھی دعوت میں اہتمام سے جم کر بیٹھیں۔ متوجہ ہو کر محتاج بن کر سنیں جو بات کہہ رہے ہیں اپنے دل میں کہیں کہ حق ہے اس سے دل میں ایمان کی لہریں اٹھیں گی اور عمل کا جذبہ بنے گا۔ تین چلوں کی بات جم کر رکھی جائے نقد نام لئے جائیں اسکے بعد چلوں کے لئے وقت لکھوائے جائیں اور پھر جو جس وقت کے لئے تیار ہو اسکو قبول کر لیا جائے۔ مطالبہ اور تشکیل کے وقت محنت ساری دعوت کا مغز بنتا ہے۔ اگر مطالبوں پر جم کر محنت نہ ہوئی تو پھر کام کی باتیں رہ جائیں گی اور قربانی وجود میں نہ آئے گی تو کام کی جان نکل جائے گی۔ دعوت دینے والا ہی مطالبہ کرے۔ ایک آدمی کھڑے ہو کر نام لکھے۔ نام لکھنے والا مستقل تقریر شروع نہ کرے، ایک دو جملے ترغیبی کہہ سکتا ہے۔ پھر آپس میں ایک دوسرے کو آمادہ کرنے کو کہا جائے فکر کے ساتھ اپنے قریب بیٹھنے والوں کو تیار کریں۔ اعذار کا دل جوئی اور ترغیب کے ساتھ حل بتائیں۔ نبیوں اور صحابہ کی قربانیوں کے قصوں کی طرف اشارے کریں اور پھر آمادہ کریں۔ آخر میں مقامی جماعت بنا کر ان کے ہفتے کے دو گشت روزانہ تعلیم، تسبیحات، مہینے کے تین یوم وغیرہ کا نظم طے کرائیں۔

دعوت میں انبیاءؑ اور صحابہؓ کے ساتھ اللہ جل شانہ نے جو مدد میں فرمائی ہیں وہ تو بیان کی جائیں اور جو ہمارے ساتھ مدد میں ہوئیں ان کو بیان نہ کیا جائے۔ دعوت میں فضاء حاضرہ کی باتیں نہ کی جائیں۔ امت میں جو ایمانی، عملی، اخلاقی کمزوریاں آچکیں

ان کے تذکرے سے بہتر ہے کہ اصلی خوبیوں کی طرف یعنی جو بات پیدا ہونی چاہیئے اسکی طرف متوجہ کریں۔

تعلیم میں دھیان عظمت، محبت، ادب اور توجہ کے ساتھ بیٹھنے کی مشق کی جائے۔ سہارا نہ لگایا جائے۔ باوضو بیٹھنے کی کوشش ہو۔ طبیعت کے بہانوں کی وجہ سے تعلیم کے دوران نہ اٹھا جائے، باتیں نہ کی جائیں اگر اس طرح بیٹھیں گے تو فرشتے اس مجلس کو ڈھانک لیں گے۔ اہل مجلس میں طاعت کا مادہ پیدا ہوگا۔ عظمت کی مشق سے حدیث پاک کا وہ نور دل میں آئے گا جس پر عمل کی ہدایت ملتی ہے۔ بیٹھتے ہی آداب اور مقصد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارے اندر دین کی طلب پیدا ہو جائے۔ فضائل قرآن مجید پڑھ کر تھوڑی دیر کلام پاک کی ان سورتوں کی تجوید کی مشق کی جائے جو عموماً نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ التحیات، دعائے قنوت وغیرہ کا مذاکرہ و تصحیح اجتماعی تعلیم میں نہ ہو۔ انفرادی سیکھنے سکھانے میں ان کی تصحیح کریں۔ اللہ پاک توفیق دیں تو ہر کتاب میں سے تین چار صفحے پڑھے جائیں۔ تعلیم میں اپنی طرف سے تقریر نہ ہو۔ حدیث شریف پڑھنے کے بعد دو تین جملے ایسے کہہ دیئے جائیں کہ اس عمل کا جذبہ و شوق ابھر آئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی تالیف فرمودہ فضائل قرآن مجید، فضائل نماز، فضائل تبلیغ فضائل ذکر، فضائل صدقات حصہ اول دوم، فضائل رمضان، فضائل حج (ایام حج و رمضان میں) اور مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی دام مجدہ کی (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) صرف یہ کتابیں ہیں جن کو اجتماعی تعلیم میں پڑھنا اور سننا ہے اور تنہائیوں میں بیٹھ کر بھی ان کو پڑھنا ہے۔ کتابوں کے بعد چھ نمبروں کا مذاکرہ ہو۔ ساتھیوں سے نمبر بیان کرائے جائیں۔ جب تعلیم شروع کی جائے تو اپنے میں سے دو ساتھیوں کو تعلیم کے گشت کیلئے بھیج دیا جائے۔ ۱۵۔۲۰ منٹ بعد وہ آجائیں تو دوسرے دو ساتھی چلے جائیں۔ اسطرح بستی والوں کو تعلیم میں شریک کرنے کی کوشش ہوتی رہے۔ باہر نکلنے کے زمانے میں روزانہ صبح اور بعد ظہر دونوں وقت تعلیم دو تین گھنٹے کی جائے اور اپنے مقام پر روزانہ اسی ترتیب سے ایک گھنٹے تعلیم ہو یا ابتداءً جتنی دیر احباب جڑ سکیں۔ کام کے تقاضوں کو سوچنے انکی ترتیب

قائم کرنے، ان تقاضوں کو پورا کرنے کی شکلیں بنانے میں اور جو احباب اوقات فارغ کریں انکی مناسب تشکیل میں اور جو مسائل ہوں احباب کو مشورہ میں جوڑا جائے۔ اللہ جل شانہ کے دھیان اور فکر کے ساتھ دعائیں مانگ کر مشورہ میں بیٹھیں۔ مشورہ میں اپنی رائے پر اصرار اور عمل کرانے کا جذبہ نہ ہو اس سے اللہ کی مدد یں ہٹ جاتی ہیں جب رائے طلب کی جائے امانت سمجھ کر جو بات اپنے دل میں ہو کہہ دی جائے۔ رائے رکھنے میں نرمی ہو۔ کسی ساتھی کی رائے سے تقابل کا طرز نہ ہو میری رائے میں میرے نفس کے شرور شامل ہیں یہ دل کے اندر خیال ہو۔ اگر فیصلہ کسی دوسری رائے پر ہو گیا تو اس کی خوشی ہو کہ میرے شرور سے حفاظت ہو گئی اور اگر اپنی رائے پر فیصلہ ہو جائے تو خوف ہو اور زیادہ دعائیں مانگی جائیں۔ ہمارے ہاں فیصلے کی بنیاد کثرت رائے نہیں ہے، اور ہر معاملہ میں ہر ایک سے رائے لینا بھی ضروری نہیں ہے۔ دلجوئی سب کی ضروری ہے۔ امیر کو اس بات کا یقین ہو کہ ان احباب کے فکر اور مل کر بیٹھنے کی برکت سے اللہ جل شانہ صحیح بات کھول دیں گے امیر اپنے آپ کو مشورہ کا محتاج سمجھے رائے لینے کے بعد غور و فکر سے جو مناسب سمجھ میں آتا ہو وہ کہہ دے بات اس طرح رکھے کہ کسی کی رائے کا استخفاف نہ ہو۔ اگر طبیعتیں مختلف ہوں تو اس بات پر شوق و رغبت کے ساتھ آمادہ کرلے، اور ساتھی امیر کی بات پر ایسے شوق سے چلیں جیسے کہ ان کی ہی رائے طے پائی ہے، اسی میں تربیت ہے اگر اسکے بعد عملاً ایسی شکل نظر آئے کہ ہماری رائے زیادہ مناسب تھی پھر بھی ہرگز طعنہ نہ دیا جائے یا اشارہ کنایہ بھی نہ کیا جائے اسی میں خیر کا یقین کیا جائے جو امیروں کو طعنہ دے اسکے لئے سخت وعید آئی ہے۔

جب محلوں کی مساجد میں ہفتوں کی دو گشتوں کے ذریعہ فی گھر ایک آدمی تین چلے کے لئے نکلنے کی آواز لگ رہی ہوگی، تعلیموں اور تسبیحات پر احباب جڑ رہے ہوں گے، ہر مسجد سے تین دن کے لئے جماعتیں نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہوں گی تو شب جمعہ کا اجتماع صحیح نہج پر ہوگا اور کام کے بڑھنے کی صورتیں بنیں گی۔ جمعرات کو عصر کے وقت سے محلوں کی مساجد کے احباب اپنی اپنی جماعتوں کی صورت میں بستر

اور کھانا ساتھ لے کر اجتماع کی جگہ پر پہنچیں۔ مشورے سے ایسے احباب سے عموماً دعوت دلوائی جائے جو محنت کے میدان میں ہوں اور جن کی طبیعت پر کام کے تقاضے غالب ہوں بہت ہی فکر و اہتمام سے تشکیلیں کی جائیں۔ اگر اوقات وصول نہوں تو رات کو بھی محنت کی جائے، رو رو کر مانگا جائے، صبح کو جماعتوں کی تشکیل کر کے ہدایات دیکر روانہ کیا جائے تین دن کی محلوں سے تیار ہو کر آئی ہوئی جماعتیں عموماً سات آٹھ میل تک بھیجی جائیں۔ ہر شب جمعہ سے تین چلوں اور چلوں کی جماعتوں کے نکلنے کا رُخ پڑنا چاہیئے اگر شب جمعہ میں خدانخواستہ سب تقاضے پورے نہوسکے تو سارے ہفتے اپنے محلوں میں پھر اسکے لئے کوشش کی جائے اور آئندہ شب جمعہ میں محلوں سے تقاضوں کے لئے لوگوں کو تیار کر کے لایا جائے۔

بھائی دوستو یہ کام بہت نازک ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک محنت فرمائی۔ اس محنت سے سارے انسانوں کی ساری زندگی کے کمانے، کھانے، بیاہ شادی میں ملاقات عبادات معاملات وغیرہ کے طریقوں میں مکمل تبدیلیاں آئیں تو آپ نے خود اس محنت کے کتنے طریقے تبلائے ہوں گے، ہمیں ابھی یہ کام کرنا نہیں آتا اور نہ ابھی حقیقی کام شروع ہوا ہے۔ کام اس دن شروع ہوگا جب ایمان و یقین، اللہ کی محبت، اللہ کے دھیان، آخرت کی فکر، اللہ کے خوف و خشیۃ، زہد و تقویٰ سے بھرے ہوئے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی اخلاق سے مزین ہو کر اللہ کی رضا کے جذبے سے مخمور ہو کر اللہ کی راہ میں جان دینے کے شوق سے کھنچے کھنچے پھریں گے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "اللہ رحم کرے خالدؓ پر اسکے دل کی تمنا صرف یہ تھی کہ حق اور حق والے چمک جائیں اور باطل اور باطل والے مٹ جائیں اور کوئی تمنا ہی نہ تھی"۔ ابھی جو ہم کو کام کی برکتیں نظر آرہی ہیں وہ کام شروع ہونے سے پہلے کی برکتیں ہیں۔ جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت سے ہی برکتوں کا ظہور شروع ہوا تھا لیکن اصل کام اور اصل برکتیں چالیس سال بعد شروع ہوئیں۔ ابھی تو اس کے لئے محنت ہو رہی ہے کہ کام کرنے والے تیار ہو جائیں۔ اللہ جل شانہٗ کام ان سے لیں گے اور ہدایت پھیلنے کا ذریعہ ان کو بنائیں گے جن کی زندگی اپنی دعوت کے مطابق بدلے گی۔

جن کی زندگیوں میں تبدیلی نہ آئے گی اللہ جل شانہٗ ان سے اپنے دین کا کام نہ لیں گے، یہ نبیوں والا کام ہے۔

اس کام میں اگر اپنے آپ کو اصول سیکھنے کا محتاج نہ سمجھا گیا اور اصولوں کے مطابق کام نہ ہوا تو سخت فتنوں کا خطرہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب باہر ملکوں میں کام شروع کرنے کا ارادہ فرمایا تو پہلے تمام صحابہ کو تین دن تک ترغیب دی اور پھر فرمایا کہ جس طرز پر یہاں کام ہوا ہے بالکل اسی طرز پر باہر جا کر بھی کرنا ہے اس کام کی نوعیت یہی ہے مقام زبان معاشرت موسم وغیرہ کے اعتبار سے اس کام کے اصول نہیں بدلتے اس کام کی نہج اور اصولوں کو سیکھنے اور ان پر قائم رہنے کے لئے اُس فضا میں آنا اور بار بار آتے رہنا انتہائی ضروری ہے جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جان کھپائی تھی اور ان کے ساتھ اختلاط بھی بہت ضروری ہے جو اس جد و جہد میں حضرتؒ کے ساتھ تھے اور جب سے اب تک اس فضا میں اور کام میں مسلسل لگے ہوئے ہیں اسکے بغیر کام کا اپنے نہج اور اصولوں پر قائم رہنا بظاہر ممکن نہیں۔ اس لئے اپنے کام کرنے والے احباب کو ایسی فضا میں اہتمام سے نوبت بہ نوبت بھیجتے رہیں۔

تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں کسی نہ کسی نقشے کے مقابلہ پر آئے اور بتایا کہ کامیابی کا اس نقشے سے بالکل تعلق نہیں ہے۔ کامیابی کا تعلق براہ راست اللہ جل شانہٗ کی ذات عالی سے ہے۔ اگر عمل ٹھیک ہوں گے اللہ جل شانہٗ چھوٹے نقشے میں بھی کامیاب کر دیں گے اور عمل خراب ہوں گے اللہ جل شانہٗ بڑے سے بڑے نقشے کو توڑ کر نا کام کر کے دکھائیں گے۔ کامیاب ہونے کے لئے اس نقشے میں عمل ٹھیک کرو۔ ہر نبی نے اپنے رائج الوقت نقشے کے مقابلے پر محنت کی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام اکثریت، حکومت، مال، زراعت اور صنعت کے نقشوں کے مقابلہ پر تشریف لائے۔ آپکی محنت ان نقشوں سے نہیں چلی آپکی محنت مجاہدوں اور قربانیوں سے چلی ہے۔ باطل تعیش کے نقشے سے پھیلتا ہے تو حق تکلیفیں اٹھانے سے پھیلتا ہے، باطل ملک و مال سے چمکتا ہے تو حق فقر و غربت کی مشقتوں میں چمکتا ہے جتنے فتنے ملک و مال اور تعیش کی بنیاد پر لائے جا رہے ہیں ان کا توڑ حق کے لئے فقر و غربت

اور تکالیف برداشت کرنے میں ہے۔ اب اس کام کے ذریعہ امت میں مجاہدہ اور قربانی کی استعداد پیدا کرنی ہے۔ اس کام کے لئے بہت بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس کو نقشوں پر منحصر کر دیا جائے۔ اس سے کام کی جان نکل جائے گی اس کام کی حفاظت اس میں ہے کہ کام کرنے والے اس کام کے لئے تمام میسر نقشوں کو بھی قربان کرتے ہوئے مجاہدے والی شکلوں کو قائم رکھیں اور کسی صورت میں مجاہدے والی شکلوں کو ختم نہونے دیں۔ غریبوں میں اپنی محنت کو بڑھایا جائے۔ پیدل جماعتیں چلائی جائیں۔ لوگ آئیں گے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہمارا پیسہ دین کے کام میں خرچ کر لیجئے، پھر نقشہ کی قربانی دینی ہو گی۔ کہہ دیجئے کہ جناب یہاں اس کام میں خرچ کرنے کا صحیح اور پاک طریقہ وجذبہ سکھایا جاتا ہے پھر محل تلاش کر کے خود خرچ کر دیجئے گا۔ یہاں تو طریقہ سیکھ لیجئے۔

اس کام کی تعمیم کے لئے رواجی طریقوں اخبار اشتہار پریس وغیرہ اور رواجی الفاظ سے بھی پورے پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ کام سارا غیر رواجی ہے۔ رواجی طریقوں سے رواج کو تقویت پہنچے گی اس کام کو نہیں۔

اس کام کی شکلیں دعوت، گشت، تعلیم، تشکیل وغیرہ ہیں۔ مشوروں کی ضرورت ہو مناسب دوستوں کو الگ کر کے مشورہ کر لیا جائے ایسا نہو کہ مشورہ کرنے والوں کا کسی موقعہ پر عمومی اعمال سے جوڑ نہ رہے۔

کالجوں کے طلبا میں اس کام کو اٹھایا جائے۔ ہاسٹلوں میں مقامی کام کے لئے جماعتیں بنائی جائیں۔ ایک گشت ہوسٹل والے اپنے ہوسٹل میں کریں اور ہفتہ کا دوسرا گشت باہر کسی محلہ میں یا کسی دوسرے ہوسٹل میں کریں۔ قریب کے محلوں کی جماعتیں بھی ہوسٹلوں میں جا کر گشت کریں۔ ہاسٹل والے احباب اپنی روزانہ تعلیم اور مہینہ میں تین یوم کی بھی ترتیب اٹھائیں۔

مستورات میں کام کی نزاکتیں اور بھی زیادہ ہیں۔ جب کہ بے پردگی کا احتمال ہو، عام اجتماعات میں مستورات کو بالکل نہ لایا جائے۔ اپنے اپنے محلہ میں کسی پردہ دار مکان میں قریب قریب کے مکانات سے عورتیں کسی روز جمع ہو کر تعلیم کر لیا کریں۔ اسکی ابتدا اس

طرح کریں کہ مرد جو بات اجتماعات، دعوت، تعلیم وغیرہ سے سُن کر جائیں اپنے گھر والوں کو سُنائیں۔ اس سے انشاء اللہ تھوڑے عرصہ میں ذہن بننا شروع ہو جائے گا پھر محلوں میں تعلیم شروع ہونے کے بعد ایسا ہو سکتا ہے کہ سارے شہر کی مستورات کا ہفتہ میں ایک ایسی جگہ اجتماع ہو جہاں پردہ کا اہتمام ہو۔ وہاں تعلیم کے بعد پھر کوئی آدمی پردے کے ساتھ بیان کرے۔ کبھی کبھی ایک یوم یا تین یوم کے لئے قرب وجوار کے لئے جماعتیں بنائی جائیں۔ مستورات کی جماعت کے ساتھ ان کے خاوند ہوں ورنہ ہر عورت کے ساتھ اس کا شرعی محرم ساتھ ہو۔ پردے کے ساتھ جائیں۔ پردہ دار مکان میں ٹھہریں۔ مرد مسجد میں ٹھہر کر کام کریں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مقامات سے محنت اٹھائی تھی انہی مقامات کے لوگوں کو اس محنت پر اٹھانے اور انہی راستوں سے اللہ کی راہ کی ملکوں والی نقل و حرکت کے زندہ ہونے کا ذریعہ یہ عمرے کا سفر بن سکتا ہے۔ ہر جگہ کے پرانوں سے اختلاط اور اس کام میں پختگی پیدا ہونے اور اصولوں کے تفصیل سے سامنے آنے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔ محترمی حاجی حنیفہ صاحب اور بھائی محمد ادریس صاحب کی عمرے کے سفر کی تیاری کا حال معلوم کر کے بہت زیادہ مسرت ہوئی۔ اللہ جل شانہٗ قبول فرمائے۔ دگر پرانے احباب کو بھی ہمراہ لانے کی سعی فرمائیں۔

یہ خط کچھ اصول لکھنے کی کوشش میں طویل ہو گیا آپ حضرات اس کے ہر جز اور ہر لفظ کو غور سے پڑھنے کی کوشش فرمائیں گے تو انشاء اللہ بہت زیادہ نفع کی توقع ہے آپ حضرات اپنے یہاں کے حالات سے ہر پندرھویں روز مطلع فرما دیا کریں تو ہمیں تقویت ہوتی رہے۔ تمام احباب کو سلام مسنون۔

فقط والسّلام

بندہ محمد یوسف غفرلہ

(۲)

(ایمان کی جدوجہد کے لیے دن کے اوقات میں ٹھوکریں کھانا اور رات کی اندھیریوں میں رونا عالم کے احوال کی درستی کا وسیلہ ہے)

(ذیل کا مکتوب تبلیغی کام کے ایک ذمہ دار کو "مکی مسجد" کراچی کے پتہ پر لکھا گیا تھا۔)

مکرم و محترم بندہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط کے ذریعہ احوال خیر و مساعی مبارکہ کی خبروں سے مسرت ہوئی حق تعالیٰ شانہٗ مساعی کو قبول اور بارآور فرمادیں۔

میرے عزیز! اس عالم کے احوال کی سرسبزی و فروغ کا تعلق براہ راست اللہ رب العزت کے احکامات سے ہے اور تمام احکامات الٰہیہ کی سرسبزی و فروغ کا تعلق ایمان کے لیے جانیں کھپانے اور عالم میں ٹھوکریں کھانے کے ساتھ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے احباب کو ان عالی احکامات کی تعمیل کی صورت مرحمت فرمائی جس میں ایک طرف اللہ رب العزت کے تمام احکامات کی سرسبزی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو عامۂ مخلوق کی بے انتہا پریشانیوں اور مصائب و بلایا کے وقت اپنی زندگیوں کے جذبات کو قربان کرکے اللہ رب العزت کی رضا کے جذبہ پر اپنے کو نثار کردیں اور خوشنودی باری تعالیٰ کے حصول کے ذریعہ اس عالم کے احوال کی درستگی کا ذریعہ بنیں۔

میرے عزیز! دین جیسی عظیم امانت کی سرسبزی کے لیے چلوں جیسے حقیر وقت کے فارغ کرنے کا رواج ایک معمولی سی بات ہے اور اس کا وجود جبکہ حق تعالیٰ شانہٗ کے قبضہ میں ہے اور ان سے وجود چاہنے کا طریق انبیا انبیاء کرام کے ذریعہ ہمیں بتادیا گیا تو پھر یہ بھی مشکل نہیں۔ البتہ عمل کے صحیح رخ کے ساتھ انہاک کو بڑھاتے ہوئے ان سے اس کا وجود حاصل کرنے کے لیے راتوں کی بے قراری والی دعائیں اور دنوں کو راتوں کو رُلا دینے والے مساعی کا انہاک مطلوب ہے۔ آپ احباب کو اس طرف پوری طرح متوجہ فرمادیں۔

بندہ محمد یوسف غفرلہ

۱۴ ربیع الاول ۸۳ھ

(۳)

[ایک جماعت جو مرکز سے گئی ہوئی تھی اور ایک علاقہ میں کام کر رہی تھی اس کے ذمہ داروں کے ایک خط

کے جواب میں ذیل کا اہم مکتوب لکھا گیا جو بہت اہم ہدایات اور انتباہات پر مشتمل ہے۔]

مکرمین ومحترمین۔ وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

خط کے ذریعہ احوال معلوم ہوئے اور آنے والوں کی زبانی بھی تفصیل معلوم ہوئی حق تعالیٰ شانہٗ آپ کی مساعی کو قبول اور بارآور فرمادیں میرے عزیز دوستو! شیطان کی طاقت حق ہے اور اللہ رب العزت نے اس کو بنایا ہے اور صرف اس لیے بنایا ہے کہ ان کی طرف بڑھنے والوں کے راستہ میں ابتلاء و امتحان و آزمائش کی گھاٹیں کھڑی کر کے کچے اور پکوں کا امتحان لیا جائے اور جو لوگ ان گھاٹیوں کو پار کر جائیں اور ان میں نہ الجھیں ان کو اپنی ذات کے تقرب و رضا سے عالی عالی انعامات و درجات سے ہمیشہ کے لیے نوازیں۔

شیطان کی بھرپور مسلسل کوشش ہو کہ اس راہ پر چلنے سے بچلایا جائے اور اگر اس رخ پر پڑ ہی جائے تو پھر اس کی پوری کوشش ان اصولوں سے بچلانے کی ہو جس سے رحمت و نصرت تائید خداوندی یہ متوجہ ہو کر ترقیات پر پہونچنے کے بجائے خذلان و محرومی کی شکلیں قائم ہوں میرے دوستو! آپ کے لیے بڑی زبردست گھاٹیں ہیں اور شیطان ان میں پچلانے کے لیے تجربہ کار و پرانا گھاگ مستعدی کے ساتھ اپنی تدابیر میں مشغول ہے۔ اس کے مکر سے تحفظ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ جتنی بھی عالی صورتیں اللہ رب العزت اپنے فضل سے پیدا فرمادیں اپنے انکسار و تواضع کی مشق کو بڑھایا جائے۔ ایک دوسرے کی قدردانی و اکرام و اعزاز کی پوری پابندی کی جائے۔ اپنے کو خادم اور دوسروں کو اصل کرنے والا یقین کر کے ہر عزت کے موقع پر دوسرے کو اور ذلت کے موقع پر اپنے کو بڑھایا جائے اور آپس میں مشوروں کا اہتمام اور ایک دوسرے کو مشورہ کی دعوت دی جائے اور ایک دوسرے کی دلجوئی کی پوری پوری سعی کی جائے۔ اس راہ کی تکالیف کو بالذات محبوب یقین کیا جائے۔ غیر باکے انتظاط اور ان میں کام کی شکل کو قوت عمل یقین کیا جائے۔ ذکر تعلیم و دعوات کا پورا اہتمام کیا جائے۔ بڑوں سے چھوٹا بننے کی مشق کے لیے ملا جائے اپنے عیوب پر ہر وقت نگاہیں ڈالی جائیں۔ اگر آپ احباب نے ہمتیں کر کے اللہ رب العزت کے لیے اپنے کو جوڑ کر جما لیا تو دوسروں کے لیے بھی انشاء اللہ العزیز اٹھنے کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ مولانا ضیاء الدین میں نفر کی جماعت کے ساتھ آج ہی آئے ہیں۔ مولوی عبد العزیز ابھی مقیم ہیں۔ دو آبہ کے دوسرے شہروں اور قصبات میں پھر کی ضرورت ہے۔

بندہ محمد یوسف غفرلہ یکشنبہ ۲۱ محرم ۷۳ھ

(۴)

۱۹۴۵ء میں ایک جماعت مراد آباد سے مرکز نظام الدین ہو کر پنجاب اور اس وقت کے صوبہ سرحد کی طرف گئی تھی اس کے ذمہ دار نے لدھیانہ سے کارگزاری کا خط حضرت مولانا کو لکھا جس میں دعا کی بھی درخواست کی گئی تھی۔ حضرت مولانا نے اس کے جواب میں ذیل کا مکتوب لکھوایا۔

..... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ۱۰ مارچ شنبہ کو کارگزاری لدھیانہ سے مطلع فرما کر مسرور فرمایا، آپ ایسے کام کے لیے نکلے ہوئے ہیں جس کے اندر اسلام کی سرسبزی ہو اور بڑے خیر کی توقعات ہیں اس لیے آپ کے لیے ہر چیز دعا کو ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خانقاہوں اور علمی مراکز میں اپنے کام کی بہت مختصر سی کیفیت کے بعد دعا کی درخواست خط کے ذریعہ کرتے رہیے اس کا ضرور اہتمام کیا جائے۔ آپ کی جماعت میں جو افراد مراد آبادی یا غیر مراد آبادی اپنا وقت ختم کر کے واپس جائیں۔ ان سے ترغیب کے بعد یہ ضرور کہا جائے کہ باہر نکل کر جن چیزوں کی تم سے مشق کرائی گئی ہے اور جو ایک طرز کی زندگی تم نے دیکھی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اب اسی زندگی کو اپنے گھر رہتے ہوئے اختیار اور پیدا کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ گھر جا کر اپنے مشاغل میں پہلے ہی کی طرح الجھ کر رہ جاؤ اور مقامی کام اور اس زندگی کو بالکل بھول جاؤ اور جو تاثرات ان میں پیدا ہوئے ہیں ان سے فائدہ اس طرح اٹھایا جائے کہ جانے والے کے ذہن میں یہ خوب بٹھا دیا جائے کہ اس نے جو وقت دیا وہ بہت کم ہے، اب اس کے بدل میں اور تاثر کو باقی رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ افراد کو تیار کر کے بھیجیے۔

..... والسلام بندہ محمد یوسف غفرلہ

(۵)

(رمضان ۱۳۶۱ھ میں ایک جماعت حجاج میں دینی کام کرنے کے لیے بھیجی گئی ہوئی تھی اس کے ذمہ داروں کو حضرت مولاناؒ نے ایک خط لکھا تھا، ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جا رہا ہے)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ..... آپ حضرات کے خطوط موصول ہوئے۔ آج کل طبیعت پر بہت زیادہ فکر اس بات کی غالب ہے کہ یہ ہزاروں عازمین حج جو اپنی بنیادی اور ابتدائی زندگی سے بھی خالی ہیں اگر ان کے اندر دینی جذبات کی پیداوار نہ کی گئی تو بلاشبہ سفر تو ہو جائے گا لیکن یہ ایک نادر موقع تھا کہ بیت اللہ کی طرف عاشقانہ طور پر جانے کی صورت پیدا ہوتی مگر وہ ہماری

کم ہمتی اور بے بضاعتی کی وجہ سے نہ ہوگی۔ اس کے لیے آپ جتنے بھی اس مقام پر پہنچ گئے ہیں اپنی انتہائی کوششوں میں کمی نہ کریں قلوب تو اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہیں نہ جانے کون سی ساعت کی محنت اللہ رب العزت کو پسند آجائے اور وہ اپنے الطاف سے کوئی رُخ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے زندہ ہونے کا پیدا فرمادیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۶)

[بمبئی میں مقیم حجاج میں کام کرنے والی ایک جماعت کی طرف سے حضرت مولانا کو صورت حال اور کارگذاری کی اطلاع دی گئی جس میں یہ بھی تھا کہ کچھ حجاج الحمد للہ اس پر آمادہ ہوگئے ہیں کہ وہ حجاز مقدس میں دین سیکھنے کے لیے دو دین کی نکر لے کر پیدل پھریں گے۔ حضرت مولانا نے اس کے جواب میں ذیل کا مکتوب لکھایا۔]

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خطوط کے ذریعہ مساعی خیر وصلاح کی خبریں موصول ہو کر باعث مسرت ہوئیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے لطف وکرم سے ان حقیر کوششوں کو اس اجتماعی طرز کے ایمان کے لیے جدوجہد اور نقل وحرکت کے منہاج محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پورے عالم میں سرسبز ہوجانے کا ذریعہ فرمائیں جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو چھوڑا تھا۔ سابقہ عملی کو اس کے مقابلہ میں ایک گناہ تصور کرتے ہوئے اس پر توبہ استغفار کی مقدار کا حق ادا کر کے آئندہ کے لیے اس سے زیادہ اونچی شکلوں کو سامنے رکھ کر اپنی بساط کے مطابق جہد وحمت بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ جن حجاج کرام کو دین کی شکلوں کے سیکھنے پر اور صحابہ کرام کے طرز پر پیدل پھرنے پر آمادہ کر کے آپ حضرات نے بھیجا ہے سبب کے طور پر اگر ان سے خط وکتابت کے ذریعہ تحریض وترغیب وتاکید کا اجراء ہوسکے تو اس کو اختیار کرتے ہوئے ورنہ بغیر اس کے پوری طرح حق تعالیٰ شانہٗ سے گڑگڑا کر اور بلبلا کر ان کی راہ کے جو وعدے ہوچکے ہیں ان کے وجود میں آنے کے لیے حد سے زیادہ دعائیں کی جائیں اور مخصوص اکابر کی خدمات میں اس کی دعاؤں کے لیے لکھا جائے ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمارے کام کرنے والوں کی اتنی زیادہ غیبوبت مناسب نہیں معلوم ہوتی، حافظ مسکین صاحب کو بمبئی گئے بہت دن ہو گئے۔ کچھ دن کے واسطے ضرور بالضرور انھیں یہاں بھیجدیا جائے۔

فقط والسلام

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

بقلم بشیر احمد عفی عنہ ۲۵ر شوال ۶۹ھ

(۷)

[مندرجہ ذیل مکتوب پاکستان کے تبلیغی احباب نقا کے نام چند سال پہلے ماہ رمضان میں لکھا گیا تھا یہ ہم کو جناب مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی سے حاصل ہوا جس کے لیے ہم مولانا موصوف کے بہت ممنون ہیں]

مکرمی و محترمی بندہ ادام اللہ مجدکم و وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حق تعالیٰ شانہ کا بہ ہی لطف وکرم ہے اپنے احباب پر کہ اس دور انحطاط میں جبکہ اللہ رب العزت کے اعمال کے ذریعہ ان کی ذات عالی سے استفادہ کی راہیں بند ہوتی جارہی ہیں اور اس حقیر و فانی دنیا پر جانیں کھپا کر اس کے ذریعہ وقتی زندگی بنانے پر قناعت کا رواج پڑ چکا ہے ایسے عالی و افضل طریق گشت و مجاہدہ کی طرف رہبری فرمائی جس کی قدر دانی کر لینے پر اور جان و مال کی حقیر سی پونجی جھونک دینے پر صرف محنت و مجاہدہ کرنے والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عام امت مسلمہ محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و تحیۃ اور عام انسانوں تک کے لیے ہدایت کے دروازے کھل جانے کی پوری توقعات اور امیدیں ہیں۔ میرے عزیز دوستو! دونوں جہان کی ساری نعمتوں اور کامل کامیابیوں کے حاصل کرنے کے لیے حق تعالیٰ شانہ جل جلالہ وعم نوالہ نے پورا دین عطا فرمایا ہے جس کا تعلق ہماری پوری زندگی کے سارے اعمال سے ہے اب اگر حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف وکرم سے ہدایت سے نوازدیں اور یہ بات جی میں پیوست ہو جائے کہ پرورش کرنے والے حالات میں تغیر و تبدل کرنے والے صرف رب العزت ہیں اور اس دنیا میں پھیلا ہوا سارا نقشہ اور

چیزوں کی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی شکلیں ان کے استعمال کرنے سے استعمال ہوتی ہیں وہ اُن سب سے جو چاہے کرکے دکھلادیں اور اُن سب کے بغیر بھی جو چاہیں اپنی قدرت سے کرکے دکھلادیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو سیکھ کر کے اس کے مطابق اپنی زندگی گذارنے پر اللہ رب العزت اپنی قدرت سے جس طرح چاہیں گے زندگی کے حالات کو درست فرما دینگے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے خلاف زندگی گزارنے پر جو بھی چاہے حاصل کر لیا جائے اللہ رب العزت زندگی کے حالات کو بگاڑ دیں گے اور جس طرح چاہیں گے بگاڑ دیں گے سو اگر یہ ہدایت نصیب ہو جائے تو پورا دین بہت ہی آسان اور محبوب بن جاتا ہے اور تھوڑی سی محنت سے زندگی میں چالو ہو جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس ہدایت سے انسان کا دل خالی ہو جائے اور اپنی محنت اور مساعی اور اس دنیا کے دھوکے کے نقشوں اور شکل وصورت سے زندگی کے حالات کے سدھر جانے کا غلط اور بے بنیاد تصور دل میں بیٹھ جائے تو پھر دین پر چلنا اور اس کا سیکھنا مشکل ترین بن جاتا ہے اب حق تعالیٰ شانہ نے اس عالی دولت کے حاصل کرنے کے لیے محنت بھی عطا فرمائی اور دعائیں بھی عطا فرمائیں اور ان اعمال کی محنت کے لیے جن کی حیات پر دعائیں قبول ہو کر ہدایت کی دولت نصیب ہوا اور سارا دین آسان بنے مساجد بنائی گئیں اور بازاری نقشوں کے اختیار کرنے کو وہاں کے تذکروں کو وہاں کے تصورات کو یہاں ممنوع قرار دیا گیا اور مساجد کی آبادی وتعمیر بازاری نقش ونگار اور ساز وسامان میں قرار نہیں دی گئی بلکہ گھنٹوں ایمان بالغیب والی مجالس میں بیٹھنا اور علم الٰہی کے حلقوں کا پابند بننا اور ذکر ودعا کی نفائیں قائم کرنا نماز وعبادت کی فضا قائم کرنا اور امور آخرویہ پر رونا پیٹنا اور ایک دوسرے کی زندگی بنانے میں ہاتھ بٹانا وغیرہ امور کے مساجد میں وجود میں آجانے کو ان کی تعمیر قرار دیا گیا اور مساجد کو ان اعمال سے آباد کرنے والوں کے مومن ہونے کی خوشخبریاں سنائی گئیں اور انھیں کی دعاؤں کے قبول کرنے کے وعدے کیے گئے اور انہی مبارک انسانوں کے لیے ہدایت دینے کے فیصلے کیے گئے، اب جو مبارک انسان اپنی جان ومال لیکر اٹھیں اور ان اعمال کے امت مرحومہ محمدیہ میں رواج پا جانے کے لیے ملک بملک اقلیم بہ اقلیم مارے مارے پھریں

اپنی کمائی اور پرورش کے ظاہری نظام میں تغیر و تبدل گوارا کریں اور ہر طرح کی تکالیف اپنی جان پر برداشت کریں سو ایسے مبارک انسان اس راہ کے خواص میں ہیں ان کی دعائیں اپنے حق میں، اپنے متعلقین کے حق میں، عام امت محمدیہ کے حق میں اور سارے انسانوں کے حق میں اس طرح قبول ہوتی ہیں جس طرح انبیاء علیہم السلام کی عالم کے حالات میں اس طرح تغیر و تبدل آتا ہے جس طرح انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں، اس مبارک راستہ کی ہر زمانہ میں بہت زیادہ قیمت ہے مگر بعض حالات اور زمانے ایسے ہوتے ہیں کہ اس راہ کی قیمت مالک الملک کی طرف سے بہت ہی زیادہ بڑھادی جاتی ہے اور کام کرنے والوں کے لیے ترقیات کے بہت زیادہ دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جن حالات انحطاط دین سے ہم گزر رہے ہیں اس میں محنت کی قیمت دین کے استقبال کے زمانہ کی محنت سے لاکھوں گنی زیادہ ہے خصوصاً رمضان المبارک کے زمانہ میں جس زمانہ میں حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہدایت کی تقسیم کا غیبی نظام قائم کیا جاتا ہے، شیاطین بند کر دیے جاتے ہیں جو ہدایت سے ہٹانے والی غیبی طاقتیں ہیں، فرشتے بھیلا دیے جاتے ہیں جو ہدایت کی طرف بلانے والی غیبی طاقتیں ہیں، وہ مبارک روحانیت و نور والی وحی لانے والا فرشتہ جبرئیل علیہ السلام جس کے گھوڑے کی ٹاپ تک کی روحانیت سے ریت پر سبزہ پیدا ہو جائے جن کی اس عالم میں آمد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بند ہو گئی اور ان کی والی برکت سے اہل عالم محروم ہو گئے اس مبارک مہینے میں ان کی آمد بھی اس زمین پر کی جاتی ہے گویا ان کی نسبت والی برکات کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور حور و کو بجایا جاتا ہے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں خیر کی طرف پکار اور شر سے روکنے کی آوازیں ہر طرف بلند کرائی جاتی ہیں اور تھوڑا سا بھی متوجہ ہونے والوں کو بھی ہدایت سے نواز دیا جاتا ہے اب اگر اس محنت کے میدان کو جس پر ہدایت کا فیضان ہادی کی ذات عالی سے اپنی مخلوق کے لیے عمومی طور پر ہوتا ہے ایسے مبارک مہینے میں قائم کیا جائے جس میں ساری ہی امت محمدیہ مرحومہ کے لیے ہدایت کی تقسیم کا عام نظام قائم کیا جاتا ہے اور امت میں دین کی طرف رجوع کی عمومی شکلیں قائم کی جاتی ہیں تو معلوم نہیں کہ ہدایت والے اعمال کے ہدایت والے مکانات یعنی مساجد میں

زندہ کرنے کے لیے ہدایت دلانے والی نقل وحرکت وریاضت ومجاہدہ پر ہدایت والے مہینے میں کتنی ہدایت کا فیضان کتنی دین کی سرسبزی اور حالات دارین کی سرسبزی وفلاح کتنی مخلوق خدا کے لیے قائم ہوجائے اور یہ محنت کرنے والے کتنی خصوصیت کے حامل اور کتنے نہ تصور میں آنے والے درجات واجور وانعامات کے حاصل کرنے والے بن جائیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیارے صحابہ کرام کی مساعی مبارکہ پر قدسی وغیبی طاقتوں کا نزول اسی مہینہ کی مبارک مساعی پر شروع ہوا یعنی غزوۂ بدر والی ریاضت ومجاہدہ والا سفر اور اس پر اللہ رب العزت کی مدد یں اس مہینہ میں ہوئیں اور آپ کی مساعی والے اسفار کی انتہا یعنی سارے عرب کے سارے قبائل کا اسلام میں داخلہ کرنے والا سفر یعنی فتح فتح مکہ اسی مبارک مہینہ میں ہوا اس مبارک ماہ میں اللہ رب العزت کی راہ کی نقل وحرکت اور صحیح اصول کے اتباع تمام کے ساتھ محنت ومجاہدہ، راتوں کی دردبھری دعائیں عام قلوب کے حق وہدایت کی طرف پلٹ جانے اور دین متین کے سرسبز ہوجانے کا اعلیٰ ترین سبب اور اکمل ترین ذریعہ ہے۔ آپ حضرات ہمت فرما کر اللہ رب العزت کے راستہ میں شوق وحوصلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے زیادہ سے زیادہ خرچ کے ساتھ دور سے دور کے لیے اپنی ذاتوں سے نکل کھڑے ہوں، دوسروں کو تیار کریں اور ہر طرف قریب وبعید میں چلوں اور تین چلوں کے لیے جماعتوں کو نکالیں کیا ہی اچھا ہو کہ اس مبارک زمانہ میں تین تین چلوں کے لیے نشکیلیں کرکے جماعتیں روانہ کی جائیں تاکہ ارکان اسلام کی حیات والی محنت کا حساب اس ماہ میں قائم ہو اور اس ماہ میں چلہ کے لیے نکلنے کی برکت سے زیادہ وقت کے لیے اللہ رب العزت کے راستہ میں رواج پڑ جائے کیونکہ جو خیر کا عمل اس مبارک ماہ میں شروع کردیا جاتا ہے وہ اس ماہ کی برکات سے چل پڑتا ہے، مقامی گشتوں کو بڑھائیں۔ روزانہ کی تعلیم کے حلقوں کو بڑھائیں اور ذکر ودعا کی مقدار بڑھائیں، حق تعالیٰ شانہ ہم کو آپ کو سب احباب کو اس راہ کی ترقیات حاصل کرنے کے لیے قبول فرمائے اور اپنے دین کو اپنی قدرت اور فضل وکرم سے چمکائیں اور اس کی برکات سے دارین میں ہمیں نوازیں آمین یارب العالمین آمین

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۸)

[حج کو جانے والوں میں دینی محنت کی ضرورت و اہمیت اور اس کا نظام]

۱۰ شوال ۱۳۸۵ھ

مکرمین و محترمین بندہ ادام اللہ سعیکم و زاد کم اللہ جداً فی سبیلہ
و تقبل عنا و عنکم و تجاوز عن سیئاتنا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ انسانی زندگی کی دارین کی کامیابی یہاں حاصل کرنے کے لیے حق تعالیٰ شانہ نے طریقۂ زندگی عطا فرمایا جس کا تعلق انسان کی ۲۴ گھنٹہ کی زندگی سے ہے۔ اس کے لیے یقین بھی خاص تجویز فرمایا، علم بھی خاص عطا فرمایا، نیت بھی خاص عطا فرمائی، تأثرات بھی خاص تجویز کیے، جان خرچ کرنے کے لیے خاص طریقے بتلائے اور مال خرچ کرنے کے لیے بھی تفصیل تجویز کی۔ ان خصوصیات کو اپنی زندگی کے طریقوں میں حاصل کرنے کے لیے نماز عطا فرمائی اور مساجد میں حاضری کا حکم دیا۔ تاکہ مساجد میں مجالس ایمانیہ کے ذریعہ یقین کی خصوصیت حاصل کریں، اور مجالس علمیہ کے ذریعہ جان و مال کے خرچ کرنے کے طریقوں کو اپنی زندگی کے شعبوں میں داخل کریں، اور ذکر کی مجالس کے ذریعہ اپنے تاثرات اور توجہات کو کائنات سے خالق کائنات کی طرف اور بازاری یقینوں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اعمال کی طرف جوڑ لیں انہی خصوصیات کے حاصل کرنے کے لیے رمضان المبارک کا مہینہ عطا فرما کر رات دن اسی محنت کا مطالبہ فرمایا اسی کی مشق کے لیے زکوٰۃ کا فریضہ عطا فرمایا اور ان خصوصیات کی تکمیل کے لیے حج کا مبارک ترین عمل عطا فرمایا۔ اب جو انسان اعمال کے انہماک کے ذریعہ اپنی زندگی گذارتے ہیں ان خصوصیات کو حاصل کرلیں تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات عالی کے لامحدود بے نہایت خزانوں کے ہمیشہ کے لیے عطایات اور انعامات کے دروازے کھل جاتے ہیں اور بازار کے نقشوں سے اساس زندگی ہٹ کر دعاؤں پر آجاتی ہے اور بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل مرحلہ خداوند قدوس کی قدرت کاملہ سے آسان سے آسان بن جاتا ہے اور دونوں جہاں کی کامیابیوں سے نوازدیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے

جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خاص طرح کی عبادات عطا فرمائیں وہاں ان خصوصیات کے زندگیوں میں پیدا ہونے کے لیے محنت کے بھی خاص طریقے عطا فرمائے۔ جن کے اختیار کرنے پر اعمال کی خصوصیات زندہ ہو کر دعاؤں کی قبولیت کے عام دروازے کھل جاتے ہیں اور ان خاص محنت کرنے والوں کو دارین کی اعلیٰ نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ اور ان کی دعاؤں کی قبولیت میں انبیاء علیہم السلام کی دعوات کی قبولیت کی جھلک حق تعالیٰ شانہٗ نصیب فرما دیتے ہیں۔

میرے عزیز دوستو! فرائض خداوندیہ میں جو سا بھی فریضہ اُمت کی طرف متوجہ ہوتا ہے دو لائن کی محنت اُمت پر عائد ہوتی ہے۔ ایک اس فریضہ کو اپنی خصوصیات کے ساتھ اپنی ذات سے ادا کرنا۔ دوسرے اس فریضہ کے صحیح نوعیت کے ساتھ قائم ہونے کے لیے محنت کے میدان قائم کرنا فریضہ کی صحیح نوعیت کے ساتھ ادائیگی ثمرہ کا درجہ رکھتی ہے ۔ اور وہ محنت و مجاہدہ جس سے فریضہ کی صحیح نوعیت قائم ہو جڑ اور بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر جڑ وجود میں نہیں آئے گی ثمرہ کا ترتب نہیں ہوگا۔ اور بقدر جڑ کے وجود میں آنے کے ثمرات کا ترتب ہوگا ۔ حج کا فریضہ اور اس کی صحیح نوعیت قائم کرنے کے لیے محنت کا فریضہ امت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اب اگر محنت کر کے جانے والے حجاج میں ان خصوصیات اعمال کے زندہ ہونے کی محنت کر لی جائے جو حج کے ثمرات کے مرتب ہونے کے لیے شرائط کا درجہ رکھتی ہیں تو جانے والے حجاج کی اور ان محنت کرنے والوں کی دعائیں اپنے اپنے درجہ کے مطابق قبول ہو کر رحمتہائے خداوندیہ اور نصرتہائے الٰہیہ کے دروازے کھلنے کی صورتیں پیدا ہوں۔ حج کے فریضہ کا تعلق صرف حج کرنے والوں سے نہیں بلکہ پوری امت کے دین اور محنت کا جائزہ خداوند قدوس اپنے اس گھر پر لیتے ہیں جس کے اثرات پورے نظام عالم پر پڑتے ہیں۔ وہاں کی زندگی میں پاک طریقوں کے اختیار کرنے پر سارے عالم پر رحمت و انعامات کے اثرات پڑتے ہیں اور وہاں کی زندگیوں کی خرابیں سارے عالم پر پریشانیوں کے اثرات ڈلواتی ہیں۔ آپ حضرات ہمت فرما کر جانے والے حجاج کا تفقد کر کے ان کو نمازوں کا عادی بنائیں ،

مساجد میں ایمان کی مجلسوں میں بیٹھنے کی عادت ڈلوائیں، علم کے حلقوں میں کتابوں کے سننے اور سیکھنے سکھانے کا مزاج پیدا کریں، گشتوں کی اور دعوت دینے کی مشق کرائیں، اللہ رب العزت کے راستہ میں نکلنے اور دین کے لیے محنت کرنے پر آمادہ کریں اور اس کی عملی مشق جتنی کرا سکیں ضرور کرائیں خدمت گذاری کی، تواضع کی، اکرام مسلم کی، ذکر و دعوت کے اہتمام کی پابندی پر خوب ابھاریں اور عملی مشق بھی جتنی کرا سکیں ضرور کرائیں اپنے مقام پر بھی اس کی محنت کریں، ماحول میں بھی اس کے لیے جماعتیں بھیجیں، بیرونگاہوں پر جماعتیں روانہ کرنے کی سعی کریں اور جہاں جہاں حجاج جمع ہو کر روانہ ہوتے ہیں ان سب جگہوں کے لیے جماعتیں روانہ کریں تاکہ حجاج میں عمومی محنت کے ذریعہ حرمین مبارکین اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اولیائے امت رحمہم اللہ کے پھرے ہوئے علاقوں کے فیوض و برکات امت میں عام ہوں، مساجد والے اعمال سرسبز ہوں اور امت کی روحانی و نورانی، ایمانی و اخلاقی ترقیات زندہ ہوں اور بازاری پھسلنوں اور دھوکوں سے امت کی حفاظت ہو اور آپ حضرات کے لیے اس کے صلہ میں قرب خداوندی کے وہ درجات حاصل ہوں جو تصور میں نہ آسکیں۔

اللھم وفقنا لما تحب وترضیٰ من القول والعمل والجد والنیۃ والھدیٰ آمین یا رب العالمین۔

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۹)

[حرمین پاک میں حجاج کو دین کی محنت پر لگانے کی اہمیت و ترغیب اور اس کا نظام]

۷۸۶

مکرم و محترم بندہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ — آپ حضرات کے خطوط موصول ہو کر کاشف احوال ہوئے — حجاج میں دینی زندگی کے زندہ ہو جانے کی جد و جہد کی شکلوں سے بہت مسرت ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کو پورے عالم میں دین کی سرسبزی

کے لیے جان کھپاتے ہوئے آنے اور جانے کے زندہ ہو جانے کا ذریعہ فرمائیں تاکہ آتے ہوئے دین کے لیے جان کھپانے کے ذریعہ حرمین کے فیوض سے استفادہ کی استعداد پیدا ہو۔ اور واپسی کی جد و جہد میں حرمین کے افادہ کی شکلیں زندہ اور سرسبز ہوں۔

میرے عزیزو! اس عالی مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے جتنے بھی اس عمل کے جذبات پیدا کر کے اس کی اجتماعی شکلوں پر قابو پا لیا جائے اتنا ہی آنے والے دور میں حج کا معیار بلند ہو کر نہ معلوم اس وقت کے جان کھپانے والوں کے لیے کتنے بے نہایت اجر و درجات کے حصول کا ذریعہ ہو گا۔ جانے والے حجاج خصوصاً میوات کے حجاج میں اس بات کی پوری سعی ہو کہ مروجہ طریقہ پر جانے کے انتشار سے اپنی پوری طرح حفاظت کرتے ہوئے اس طریق سے حجاز میں سفر اختیار کیا جائے جس سے وہاں کے علاقہ میں دین کا شیوع و فروغ ہو اور جانے والوں کو وہاں کی ترقیات ایمانیہ و روحانیہ میں سے پورا حصہ نصیب ہو، پیدل اسفار کی عملی شکلیں قائم ہونے پر ابھی سے قابو پانے کی کوشش کی جائے۔ اپنے احباب پیدل کے لیے متعین کر کے ان کے رفقاء کے بڑھانے کی ابھی سے سعی ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں بھی تشریف لے گئے ان سب جگہوں کے لیے جماعتوں کے جانے کی تشکیلوں پر قابو پایا جائے، اور صحابہ کرامؓ نے جہاں دین کی حیات کے لیے ٹھوکریں کھائیں وہاں کے لیے بھی پوری طرح جماعتوں کے روانہ کرنے کی سعی کی جائے۔ تعلیم و تعلّم و اذکار کے اہتمام پر پوری طرح آمادہ کیا جائے۔ حجاج کرام و اہل عرب کے حقوق کی ادائیگی کی طرف پوری طرح متوجہ کیا جائے۔ ایک گروہ اللہ رب العزت کا مہمان ہے اور مہمان کے ساتھ کی ذرا سی بھی بے عنوانی ناگواری کا باعث بن جاتی ہے۔ اور دوسرا گروہ حرمین کا پڑوسی ہے ان کے ساتھ کی بے عنوانی بھی غضب الٰہی کی داعی ہے ـــــ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کی تخریب و بربادی و موت کا منظر سارے عالم میں بکھرا ہوا ہے مگر حج کے موقعہ پر ساری اُمت محمدیہ کی زندگیوں کا طریقہ سمٹ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ حیات کی موت کا (عالمی) منظر سب کے سامنے آجاتا ہے۔ اب دردمند اور اللہ اور ان کے محبوب رسول کے

ساتھ ذرا سا بھی تعلق رکھنے والوں کا اعلیٰ ترین تقرب و محبوبیت اور اطاعت و عبدیت کا عمل یہ ہے کہ اس منظر کی تبدیلی کے لیے اپنی جانوں کو پوری طرح جھونک دیں۔ دین کے لیے جان کھپانے کے اعمال پر ان کے ڈالنے کے لیے پوری طرح سعی کی جائے۔ ان کو اپنے ساتھ لیکر اس مبارک علاقہ میں ٹھوکریں کھانے کے ذریعہ اس کے اصولوں کے اخذ کی کوشش پوری طرح کی جائے۔ جزیرہ عرب کو دین کی حیات کے لیے جان کھپانے کا مرکز قرار دے کر اس میں طریقہ جہد کے سیکھنے اور سکھانے کا رواج ڈال کر ہر طرف دین کی حیات کے لیے ٹھوکریں کھانے کے لیے مقامی احباب کے ساتھ مل کر روانہ کرنے کا رخ ڈالا جائے، اگر میواتی حجاج میں سعی کے ذریعہ ان میں ان شکلوں پر عمل میں مسابقت پیدا کر لی جائے تو انشاء اللہ العزیز دوسرے علاقہ والے بھی ان شکلوں کو اختیار کرنے لگیں گے۔ اپنے احباب کو اس معاملہ میں پوری سعی کرنا انتہائی ضروری ہے۔ الحمد للہ یہاں تھوڑی سی عملی اجتماعی صورتیں پیدا کر لینے پر ان میں بہت ہی عالی جذبات پائے جا رہے ہیں خدا کرے آپ کی مساعی اس کے ازدیاد و ترقی کا ذریعہ بنیں۔

میرے عزیز دوستو! اس وقت کے احوال کی درستگی کے لیے پوری طرح اس عمل کے لیے جانیں کھپاتے ہوئے گڑگڑا کر بلبلا کر مواقع اجابت میں دعاؤں کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ حق تعالیٰ شانہ نے طبعی اعمال کی فضاؤں سے آپ حضرات کو نکال کر عبدیت کے اعلیٰ ترین عمل کے لیے اعلیٰ ترین عمل کے موقعہ پر جمع فرما دیا اب استعانت باللہ کی قوت کے بقدر ہی رحمت و انعامات و نصرت کے دروازے انشاء العزیز کھلیں گے، جس کے سارے ہی اہل عالم خصوصاً امت محمدیہ مرحومہ اور اہل ہند آج پوری طرح محتاج ہیں۔ آپ حضرات خصوصیت کے ساتھ عمل کے پورے انہماک کے ساتھ انتہائی دعوات کا اہتمام فرمائیں۔ مولوی داؤد و حافظ نصیب خاں و حاجی حنیف بھی انشاء اللہ آ رہے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں بھی گفتگوئیں اور مشورے جاری ہیں البتہ اپنی آمد کے بارہ میں موجودہ احوال کی بنا پر اشکال ہے اور بظاہر امسال ناممکن ہے۔

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ الرشوال ۸۵ھ

(۱۰)

[اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل اور اصول کی پابندی کی تلقین]

۱۸ر شوال ۵۶ھ ۲۹ر مئی ۵۶ء

مکرمین ومحترمین زادکم اللہ وایانا جداً وسعیاً فی سبیلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ — آپ حضرات کے خطوط مسرت کے باعث ہوئے۔ حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف وکرم سے آپ کی اپنی ترقیات کے ساتھ دین کی سرسبزی وفروغ کا آپ کی مساعی اور اس سفر کو ذریعہ فرما دیں اور ہر طرح کی مدد دیں اور نصرتیں دونوں جہان میں شامل حال فرماویں اور ہر موقع وحال کی حوائج کا اپنے فضل وکرم سے بندوبست فرماویں۔

میرے عزیزا کرنے والے صرف اللہ رب العزت ہیں اور ان کے لیے کوئی سی بھی حالت سخت نہیں ہے۔ جونسی حالت ضلالت کو، جونسی حالت ہدایت کے ساتھ جس وقت چاہیں بدل دیں۔ بندوں کی محنت ومساعی صرف اختیارِ سبب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اب سبب میں جتنی صفات قبولیت ہوں گی خداوند قدوس کی رحمت متوجہ ہوکر سخت سے سخت خراب احوال بہتر سے بہتر احوال سے منجانب اللہ تعالیٰ ان کے تصرفات خاص سے مبدل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اپنے کام کرنے والے احباب کو ان احوال سے نہ متاثر ہونا چاہیے نہ ناامید ہونا چاہیے بلکہ اللہ رب العزت کی عظمت وقدرت وقوت کو سامنے رکھ کر ان سے مدد میں حاصل کرنے کے لیے دین کی حیات وسرسبزی کے لیے جہد ونفر کے عالی اوامر کی تعمیل ان کی اعلیٰ شکلوں کے ساتھ کرتے ہوئے بارگاہ الٰہیہ میں گڑگڑا کر اور بلبلا کر دعاؤں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں ہی ان سب احوال کی تبدیلی مضمر ہے حق تعالیٰ شانہ محنت کی صحیح شکل اپنے کو اور اپنے سب احباب کو نصیب فرمائیں۔ جماعت کے لانے کی بہت سعی فرماویں۔ تین تین چلّہ کی جم کر دعوت دیں۔ تعلیم وتعلم کے حلقوں کے قیام کا پورا پورا اہتمام فرمائیں اگرچہ تھوڑی ہی مقدار میں ہو سکے۔ اللہ کے ذکر کی کثرت کریں، اصول کا مذاکرہ رکھیں، دنیا کے تعیش کی رغبت پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ زندگی کی اپنے میں رغبت پیدا کرنے کی سعی کریں، ایک دوسرے کی خدمت گذاری کی عادت

ڈالیں۔ اخلاق کے سیکھنے کو بہت اہم سمجھیں اور دعاؤں کا اپنے لیے اور ہمارے لیے بہت اہتمام فرمائیں اور غرباء و کس مپرس طبقات میں کام کا ضرور بھیر ڈالیں کہ ان میں کا کام بہت سے رذائل سے حفاظت کا اہم سبب ہے۔ سب احباب کی خدمت میں سلام مسنون عرض کر دیں۔

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۱۱)

[اصولوں کو مضبوطی سے پکڑنے اور رواجی طریقوں سے بچنے کی تاکید]

مکرم و محترم بندہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ـــــ آپ صاحبان کے خطوط یکے بعد دیگرے تقریباً روزانہ ہی موصول ہوئے۔ وہاں کے کام سے جتنی خوشی حاصل ہوئی اسی قدر بے انتہا فکر بھی ہوئی جس کا اندازہ آپ حضرات کے خطوط سے بھی ہوتا رہا کہ آپ حضرات کو بھی حق تعالیٰ شانہٗ نے فکر عطا فرمائی ہے۔ حقیقت میں یہ کام رواج کے بالکل خلاف ہونے کی بنا پر مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑی سی محنت اور مجاہدہ کے بعد اس کے سارے اصولوں کی رعایت کرنے پر بہت ہی آسان ہے بلکہ رواجی طریقوں سے کرنے پر بے انتہا مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اگرچہ بظاہر رواجی طریق میں سہولت نظر آتی ہے۔ اس بنا پر اس بات کی اجتماعی طریق سے پوری کوشش فرمائی جائے کہ کام منہاج نبوت سے ہٹنے نہ پائے اور اپنی سادگی کے ساتھ دن کی محنتوں اور رات کی دعاؤں کی مقدار بڑھتی چلی جائے۔ اس کام میں اجتماعات نہ بنیاد ہیں نہ مقصود۔ بلکہ اپنے نہج سے نہ ہونے کی بنا پر مضر ہیں اس لیے ماہانہ اجتماعات بالکل ختم کیے جائیں ہر جگہ مقامی اجتماعات ہفتہ واری اجتماعات اپنی نوعیت کے ساتھ یعنی پوری شب گذارتے ہوئے اوراد و اوقات کا مطالبہ کرتے ہوئے کیے جائیں۔ اور جتنے آدمی اس وقت موجود ہیں ہر کام کو اجتماعی کریں حتیٰ کہ سفر میں بھی یکجا رہنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ جو لوگ ادھر (دہلی) ہو کر جا چکے ہیں ان سب کو جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ غرباء و مساکین میں کام کی مقدار بڑھائی جائے اگرچہ شروع میں مشکلات سامنے آئیں اور محنتیں کرنی پڑیں۔ ڈیڈیگل میں زیادہ نہ ٹھہرا جائے بلکہ پوری جماعت خود نمبروں کی پابندی کرتے

ہوئے غربا کی بستیوں کا سفر کرے۔

فقط بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

۲ رجب ۷۱ھ

(۱۲)

[مندرجہ ذیل مکتوب تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے علاقہ گجرات کے ایک مولوی صاحب کو ان کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے خط میں اپنے یہاں کے کام کے بارہ میں کچھ لکھا تھا، یہ ہم کو خود مکتوب الیہ نے بھیجا جس کے لیے ہم اُن کے ممنون ہیں]

مکرم بندہ وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خط سے حالات دکو الف معلوم ہوئے جس سے از حد مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ شانہ قبول فرمائے۔

میرے بھائی یہ کام بہت اونچا اور گہرا ہے اس میں ہزاروں اصول و قواعد ہیں اور اس کا ایک خاص نہج اور خاص مزاج ہے۔ اگر ان کو اپنا کر اس کام کو کیا گیا تو بہت زیادہ خیروں کی اُمید ہے اور دوسری صورت میں شرور و فتن کا خطرہ ہے اس لیے آپ جیسے کام کرنے والے حضرات کے لیے بہت زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علاقوں سے جماعتیں لے کر یہاں آئیں اور پرانوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کے ذریعہ اس کام کو صحیح نہج کے ساتھ اپنائیں، اس سے آپ حضرات کے علاقہ میں صحیح اصولوں کے ساتھ کام چلے گا اور چمکے گا اور کام کرنے والے احباب خطرہ سے محفوظ امن میں رہیں گے اور لوگوں میں عمومی طور پر تواضع، کسر نفسی، دوسروں کے محاسن دیکھنا، اپنے عیوب پر نظر ڈالنا پیدا ہوگا، جس سے دل جُڑیں گے اور محبت و اتفاق پیدا ہوگا۔ جب تک یہاں نہ آسکیں اپنے حالات سے تفصیلاً اطلاع دیتے رہیں۔۔۔۔۔

تمام احباب کو سلام مسنون، خدا تمام مدارس دینیہ کو ترقی نصیب فرمائے۔ والسلام

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۱۳)

[شادیاں کس طرح کی جائیں اور زندگی کا یہ شعبہ دین کے فروغ کے لیے کس طرح استعمال ہو ذیل کا مکتوب ایک صاحب کو لکھا گیا جنھوں نے اللہ کی توفیق سے سنت کے مطابق شادی کی تھی۔]

مکرم و محترم بندہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ — آپ کے اس مبارک جذبہ کو معلوم کر کے حد سے زیادہ مسرت ہوئی کہ آپ کے ہاں شادی سنت کے مطابق وجود میں آئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ آپ کے اس مبارک عالی جذبہ کو پوری طرح قبول فرماتے ہوئے اپنے لطف و کرم و فضل سے اس میں برکتیں و رحمتیں پوری طرح شامل حال فرمائیں — میرے بزرگ! اس شعبہ کا سنت کے مطابق ہونا بس اسی پر موقوف ہے کہ اس فعل پر جو پیسوں کے خرچ اور کھانے پینے کی مجلس پر اجتماع ختم ہو جاتا ہے۔ اور مجالس کا موضوع کھانے پینے کی دلچسپیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ان آنے والوں کو دین پر جان و مال خرچ کرنے اور تبلیغ کے ذریعہ دین سیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہونے پر آمادہ کیا جائے۔ اور اپنی جتنی رقم نکاح کی فضولیات پر آج خرچ کرنے کا رواج ہے اتنی مقدار مال کو لیکر لڑکا لڑکی کے والد وغیرہ اللہ رب العزت کے راستہ میں دین کی سرسبزی کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ اور اپنے اس جذبہ و شوق کو جس کو وہ شادی پر خرچ کرتے اللہ کے دین کی سرسبزی کے لیے جد و جہد پر صرف کریں اور دوسرے شادی میں شریک ہونے والوں کو بھی اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ مسلم کی جان و مال کا موضوع و مقصد خواہشات پر خرچ ہونا نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی حیات و سرسبزی پر خرچ ہونا ہے۔ جتنا ہماری جانوں اور مال کا خرچ دین کی حیات کے درد و فکر و جہد و سعی پر آنا چلا آئے گا دین کے سارے شعبے سنت کی شکل پر زندہ ہوتے چلے جائیں گے

آپ کے اس اقدام کو حق تعالیٰ شانہٗ پوری طرح قبول فرمائیں اور اس شعبہ کی اصلاح کا اس شادی کو ذریعہ فرما کر اس شعبہ سے متعلق رحمت و نصرت، انعامات و برکات کے دروازے جمیع اہل عالم کے لیے پوری طرح کشادہ فرمائیں۔ بندہ اس شادی کے مقبول با برکت ہونے کے لیے پوری طرح دعا گو ہے.....

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ ۱۸ رجب ۱۳۸۵ھ

تاج آفس — بمبئی ۳

کا

تیار کردہ

قرآن مجید حوالہ نمبر ۹۹۹

بچوں کی

ابتدائی تعلیم کے لیے نہایت مفید ہے

خریدار حضرات

"حوالہ نمبر ۹۹۹ — اور — تاج آفس بمبئی ۳"

قرآن مجید کی جلد ہی پر سنہری، سفید یا روپہلی ڈائی میں لکھا ہوا پائیں گے

اطمینان کرلیں — اور خریدیں

نمونہ کا صفحہ طلب کرنے پر بذریعہ ڈاک بھجوایا جائے گا

تاج آفس، محمد علی روڈ، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۵۸ بمبئی ۳

زیارتِ حج بیت اللہ پر دو اہم کتابیں

تجلیاتِ کعبہ

مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی

تجلیاتِ مدینہ

ان کتابوں کے پڑھنے سے حج کا روح درست ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قلب و روح میں وہ جذبات و کیفیات و تاثرات پیدا ہوتے ہیں جو دراصل حج کی روح ہے، حاجی حضرات کو ان کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے، اور جو حضرات گھر بیٹھے ان کا مطالعہ کریں گے انھیں بالکل ایسا محسوس ہوگا کہ حج و زیارت کے روح افزا مناظر اور مکہ معظمہ مدینہ منورہ کے روحانی جلوے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

تجلیاتِ کعبہ صفحات ۳۱۲، سائز ۲۰×۳۰ کاغذ طباعت گلیز سفید رنگین ٹائیٹل قیمت -/۳

تجلیاتِ مدینہ صفحات ۲۵۰، سائز ۲۰×۲ کاغذ گلیز سفید " " قیمت ۲/۵۰

مسنون دعائیں

مؤلفہ مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری

بارگاہ خداوندی میں پیش کرنے کے لیے رحمۃ للعالمین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریباً ہر وقت اور ہر موقع کی مقبول دعائیں جن کا ورد رکھنا دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ ان کے معانی میں غور و فکر سے توحید کے بلند مقامات پر رسائی ہو سکتی ہے ان دعاؤں کے پڑھنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے جو خدا تعالیٰ کا محبوب و مقبول اور مقرب بارگاہ بندہ بننے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس ایڈیشن میں آخر میں خاص دعائیں کے نام سے حضرت شاہ مولانا محمد الیاسؒ نور اللہ مرقدہٗ کا اہم ملفوظ دعا مانگنے کا طریقہ درج کیا گیا ہے۔ کتابت و کاغذ اعلیٰ، طباعت عکسی بذریعہ آفسٹ مشین، ضخامت ۱۶۸ صفحات خوشنما ٹائیٹل سہ رنگا، جیبی سائز قیمت ۶۰/- ساٹھ پیسے

مکاتیب حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ ۱/۵۰، اسلام تلوار سے نہیں پھیلا ۷۵/-، مفتاح التبلیغ مولانا احسن خاں میواتی ۱/۵۰، اسلامی زندگی ۲۵/- اسلامی نام ۲۵/- ارشاد الملکین۔ مولانا عبدالباطن جونپوری ۱/۵۰، حرکت آفاق، مولانا حبیب اللہ پالن پوری ۲/۵۰، تبلیغی کام کرنے والوں کے لیے چالیس سبق مولانا سعید الدینؒ ۲۵/-

پتہ:- کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ۶

تقریریں

قارئین کرام آئندہ صفحات میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی تقریریں پڑھیں گے ـــــ اجتماعات میں حضرت مولانا کی تقریریں سننے والوں نے خود آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ جب وہ تقریر فرماتے تھے تو اُن کی تقریروں کو قلمبند کرنے کے لئے بہت سے قلم چلتے رہتے تھے ـــ جو تین تقریریں الفرقان کی اس اشاعت خاص میں درج کی جارہی ہیں ان میں سے آخری تو خود اچیز مدیر الفرقان کی لکھی ہوئی ہے، پہلی دو تبلیغی کام سے خصوصی تعلق رکھنے والے ایسے حضرات کی لکھی ہوئی ہیں جن پر اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

الفرقان کی یہ خاص اشاعت جن حضرات تک پہنچے گی ان میں شاید ہی کچھ ایسے اصحاب ہوں جنھیں کبھی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سننے کا اتفاق نہ ہوا ہو ـــــ حضرت مرحوم کا طریق بیان بالکل نرالا تھا بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ انکی تقریر کی ایک مستقل زبان تھی اور خاص اصطلاحی الفاظ تھے جن کے گویا وہ خود ہی موجد تھے۔ پچھلے صفحات میں ناظرین نے انکے مکاتیب پڑھے ہیں بس جو زبان ان کے مکاتیب کی ہے قریب قریب یہی زبان انکی تقریر و بیان کی تھی۔

یہ واقعہ ہے کہ زبان و بیان کی جن خوبیوں کی وجہ سے کسی مقرر کی تقریر کامیاب سمجھی جاتی ہے مولانا مرحوم کی تقریروں میں ان میں سے ایک بات بھی نہیں ہوتی تھی بلکہ سامعین کے بڑے طبقہ کے لئے انکی تقریروں کا کافی حصہ نامفہوم ہوتا تھا اور اچھے پڑھے لکھوں اور سمجھنے والوں کے لئے بھی ان کے الفاظ اور انکی ترکیبیں بالکل نامانوس ہوتی تھیں لیکن کشش اور تاثیر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ پچاس پچاس ہزار کا مجمع اس طرح ہمہ تن گوش ہو کر ان کا بیان سنتا تھا کہ گویا ہر لفظ ہر سننے والے کے دل میں اتر رہا ہے اور وہ اس سے بھرپور مستفید ہو رہا ہے۔ یہ کشش اور یہ تاثیر دراصل اس قلبی کیفیت اور توجہ الی اللہ کی ہوتی تھی جس کے ساتھ وہ تقریر فرماتے تھے۔

خود راقم سطور نے اکثر محسوس کیا کہ وہ تقریر شروع فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور مراقب ہوتے تھے اور اسکے بعد تقریر شروع فرماتے تھے۔ اور پھر ان کو خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی تھی ـــــ ایسے تقریباً ۴۰ ـــ سال پہلے کا واقعہ ہے بھوپال میں اجتماع تھا ان دنوں حضرت مولانا مرحوم کی ران میں ایک بہت بڑا زخم تھا جس حال یہ تھا کہ حرکت کرنے سے اور زور سے تقریر کرنے سے اس میں سے خون جاری ہو جاتا تھا، مولانا اسی حال میں بھوپال تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق اجتماع میں تقریریں بھی فرمائیں ـــــ زخم کی تکلیف کافی بڑھ گئی، بھوپال سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے ۴۰ ـــ ۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور اجتماع طے تھا حضرت مولانا وہاں

بھی تشریف لے گئے، لیکن طے یہ ہوا کہ یہاں مولانا تقریر نہیں فرمائیں گے بلکہ فلاں ساتھی کی تقریر ہوگی۔ مگر ساتھی کی تقریر کے بعد جب مولانا نے دیکھا کہ دعوت قوت سے نہیں دی گئی تو اپنے اندرونی داعیہ سے مغلوب ہوکر خود تقریر کے لئے اصرار فرمایا، اُس دن بیٹھنے کے لائق بھی نہیں تھے لیٹ، کے فرمانا شروع کیا، زخم میں سے خون جاری ہوگیا اور حالت یہ ہوگئی کہ ایک کپڑا لگا دیا جاتا جب وہ بالکل تر بتر ہو جاتا تو دوسرا کپڑا لگا دیا جاتا اس طرح کئی کپڑے خون سے بھر گئے اور مولانا نے عادت کے مطابق پوری تقریر فرمائی۔ اس ناچیز کا اندازہ ہے کہ اس تقریر کے دوران کم از کم آدھا سیر خون مولانا کے زخم سے ضرور نکل گیا ہوگا۔ لیکن اللہ کے اُس بندے کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال اس عاجز کے نزدیک اُن کی تقریروں کی تاثیر کا راز ان کی اس قلبی کیفیت اور فنائیت میں تھا۔

آئندہ صفحات میں حضرت مولاناؒ کی صرف تین تقریریں درج کی جارہی ہیں، دو تقریروں کی کتابت اور بھی ہو چکی تھی لیکن صفحات میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے ان کو روک لینا پڑا، وہ انشاء اللہ آئندہ الفرقان کی عام اشاعتوں میں شائع ہوسکیں گی ——— جو تین تقریریں اس اشاعت میں شائع ہو رہی ہیں ان میں ناظرین کی سہولت فہم کے لئے وہ لفظی تبدیلیاں کرلی گئی ہیں جو اس قسم کی تقریروں کو کاغذ پر لانے کے لئے ضروری اور ناگزیر ہوتی ہیں اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مقصد و مضمون میں ذرا بھی فرق نہ پڑے۔

محمد منظور نعمانی

(۱)

کامیابی اور ناکامی کی حقیقی بنیاد

ذیل کی تقریر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آخری سفر میں خواص کے ایک اجتماع میں فرمائی تھی، جس کو حضرت کے ایک خاص رفیق سفر نے قلمبند کیا تھا، انہی کی عنایت سے یہ ہم کو حاصل ہوئی ہے — ہم نے ناظرین کی سہولت فہم کے لیے کہیں کہیں لفظی تبدیلیاں کی ہیں۔ (ادارہ)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

بھائیو دوستو! کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوتا ہے اُس کے دو رُخ ہیں ایک رُخ ظاہر کا ہے اور وہ یہ ہے کہ چیزوں میں سے چیزیں نکل رہی ہیں اور چیزوں میں سے اثرات اور خواص ظاہر ہو رہے ہیں جیسے مٹی سے غلّہ، غلّہ سے غذا، غذا سے پیٹ کا بھرنا پھر اس کا خون بننا، خون سے منی کا یعنی نطفہ کا بننا، پھر اُس سے خون کا لوتھڑا بننا پھر اُس میں اعضا کا اور شکل انسانی کا بننا (اور اسی پر قیاس کر لیجیے دنیا کی ساری چیزوں کو) — یہ وہ رخ ہے جو انسان پر بحیثیت انسان ہونے کے کھولا گیا ہے یعنی ہر انسان اس کو دیکھ رہا ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے — دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے اور اُس کے حکم سے ہو رہا ہے اور یہ سب اللہ کا نظر نہ آنے والا ہاتھ کر رہا ہے — یہ رُخ انسانوں پر بحیثیت انسان ہونے کے نہیں کھولا گیا اس لیے ہر انسان اس کو دیکھ نہیں پاتا۔ بلکہ یہ رُخ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسانوں پر کھولا گیا ہے، یعنی یہ بات انبیاء علیہم السلام نے بتائی ہے کہ جو کچھ چیزوں سے بنتا ہوا اور ظاہر ہوتا ہوا نظر آتا ہے یہ چیزوں سے نہیں بنتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور امر سے بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہیں کہ جس شکل سے جو چیز چاہیں بنا دیں یا بلا کسی شکل کے محض قدرت اور حکم سے چیز بنا دیں اسی طرح وہ قادر ہیں کہ جس چیز سے جو اثر چاہیں ظاہر کر دیں۔ پانی سے چاہیں تو ڈبا دیں اور چاہیں تو تیرا دیں، آگ سے چاہیں تو جلا دیں اور چاہیں تو

نہ جلائیں، غذا سے چاہیں تو پیٹ بھریں اور چاہیں نہ بھریں، موت کی جگہ سے چاہیں تو زندگی نکالدیں اور زندگی کی جگہ سے چاہیں تو موت نکالدیں ـــ معجزوں سے یہی بات ظاہر کی جاتی ہے کہ چیزوں میں کچھ نہیں ہے، اللہ جس چیز سے جو چاہے نکال سکتا ہے۔ وہ چاہے تو حکومتوں کی اسکیموں (اور منصوبوں) کو فیل کردے اور محکوموں کی اسکیمیں چلادے، اُس نے نمرود کی اسکیم کو فیل کردیا اور ابراہیم علیہ السلام کی اسکیم چلادی ـــ فرعون کے ارادۂ قتل کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کو خود اس کے گھر میں پلوادیا اور اُس کو سارے لاؤلشکر سمیت سمندر میں ڈبادیا۔ ابراہیم علیہم السلام سے بیوی بچہ کو ایسے میدان میں ڈلوا کر جہاں کوئی آبادی نہیں تھی، زندگی کا کوئی سامان نہیں تھا، پینے کے لیے پانی تک بھی نہیں تھا اُن کی یہ اسکیم چلادی کہ اس بچے کی اولاد یہاں دالی ہدایت (کی دعوت) لیکر سارے عالم میں جاوے اور سارے عالم سے لوگ یہاں حج کو آویں۔ خود اسکیم والا وہاں تھا بھی نہیں ملک شام میں تھا لیکن اس کی اسکیم چل گئی اور جس بچہ کے کھانے پینے کا اور حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں تھا اس کی اولاد اقیموا الصلوٰۃ کو لے کر دنیا میں جانے لگی اور ساری دنیا سے لوگ آج تک حج کو وہاں آرہے ہیں۔ سارے حکومتیں حج میں کتنے روڑے اٹکا رہی ہیں لیکن حج کی حرکت برابر بڑھ رہی ہے اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی چلائی ہوئی اسکیم اب تک کیسے زور سے چل رہی ہے۔

آدمی سمجھتے ہیں کہ کھیتی اور باغات سے زندگی بنتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے قوم سبا کو کھیتی اور باغات کے باوجود ہلاک کردیا اور اسماعیل علیہ السلام کو ایسے جنگل میں جہاں کھیتی اور باغات کا نشان بھی نہ تھا پال دیا ـــ آج دنیا کا یقین فوج پر ہے اللہ تعالیٰ نے ابرھہ کی فوج کو حقیر پرندوں سے ہلاک کرا کے اس یقین کو غلط ثابت کردیا۔ الغرض معجزات سے ظواہر کے عام انسانوں والے یقین کی پوری نفی ہوتی ہے۔ معجزات ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ میں یہ قدرت ہے کہ وہ عصا کو اژدہا بنادیں، نار کو باغ بنادیں، ہاتھ میں روشنی اور چمک کی صفت پیدا کردیں ـــ دنیا کی ساری چیزیں اور ساری شکلیں گھاس کے تنکوں سے لیکر ایٹم اور راکٹ تک اور اسی طرح ساری طاقتیں اور ساری حکومتیں قدرت خداوندی کے تحت ہیں ـــ یہ چیزیں خود قدرت نہیں ہیں بلکہ قدرت ان پر تصرف کرتی ہے یہ سب چیزیں فانی ہیں اور قدرت غیر متبدل اور غیر فانی ہے۔ اللہ تعالیٰ چیزوں

سے زندگی بناتے بھی ہیں اور بگاڑتے بھی ہیں۔ کامیاب بھی کرتے ہیں اور ناکام بھی کرتے ہیں، غرض جو کچھ بھی ہوتا ہے چیزوں سے نہیں ہوتا اللہ کے حکم اور اس کی قدرت سے ہوتا ہے۔

کائنات کا یہ وہ رخ ہے جو انبیاء علیہم السلام پر کھولا جاتا ہے اور انہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور وہی قدرت کے اعتبار سے استفادے کے طریقے لے کر آتے ہیں۔

عالم کی چیزوں پر نظر رکھ کر اور ان میں نفع نقصان سمجھ کر ان کو استعمال کرنے یا ان میں اپنے کو لگانے کا طریقہ ہر شخص خود تجویز کر سکتا ہے کیونکہ چیزیں نظر آتی ہیں اور ہر شخص ان کو دیکھتا ہے لیکن اللہ کا حکم اور اس کی قدرت جو چیزوں میں کام کرتی ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتی اس لیے اس سے استفادہ کا طریقہ انسان خود تجویز نہیں کر سکتا، یہ علم اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام پر کھولتے ہیں اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے انہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے انسانوں کو نکموں اور چیزوں سے ہٹایا نہیں بلکہ یہ بتایا کہ اللہ کی قدرت اور اس کے حکم کو اصل سمجھتے ہوئے ان چیزوں میں لگو اور یہ یقین بنا لو کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے تشریعی اوامر کی تابعداری کرتے ہوئے ان شعبوں میں لگو گے اور ان چیزوں کو استعمال کرو گے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے انہی چیزوں سے تم کو نفع پہنچائے گا اور یہ نفع آخرت تک چلے گا بلکہ وہیں بھرپور حاصل ہوگا یہی ہے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا منشا کہ اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں ہوگا اور کچھ نہیں ملے گا سب اللہ ہی کے کرنے سے ہوگا اور ملے گا اور ان کا فضل و کرم جب ہوگا جب ہماری زندگی اور چیزوں میں ہمارا لگنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہوگا۔

اب دو کام ہیں ایک اپنے میں لا الٰہ الا اللہ والے یقین کا پیدا کرنا اور دوسرا ہر عمل اور ہر شعبہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنے کا عادی بننا اور اس کی مشق کرنا — یہ دونوں باتیں پیدا کرنے کے لیے نماز دی گئی اور ایک محنت دی گئی اور مسجد کو ان دونوں کا مرکز بنا دیا گیا۔

مسجد سے دن رات میں پانچ دفعہ اعلان کرایا جاتا ہے جس میں سب سے پہلے چار دفعہ کہلوایا جاتا ہے — اللہ اکبر اللہ اکبر — اللہ اکبر اللہ اکبر — اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ عناصر اربعہ سے یعنی مٹی، پانی، ہوا اور آگ سے بنا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا یہ حال کہ ان میں سے ایک ایک ساری دنیا کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔ مٹی یعنی زمین اگر آدھے

دن کے لیے زلزلہ سے ہلادی جائے تو ساری دنیا ختم ہوجائے ـــ اسی طرح اگر پانی چھوڑ دیا جائے تو نوح علیہ السلام کے زمانہ کی طرح ساری دنیا غرق ہوکر فنا ہوجائے ـــ اسی طرح اگر قوم عاد کی طرح آندھی چھوڑ دی جائے تو ساری دنیا کا خاتمہ ہوجائے ـــ اسی طرح اگر آگ کو جلاڈالنے کا حکم ہوجائے تو ساری دنیا راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ تو اذان میں سب سے پہلے چار دفعہ کہا جاتا ہے "اللہ اکبر اللہ اکبر" اللہ سب سے بڑا ہے آسمان وزمین اللہ کے سامنے کچھ بھی نہیں، عناصر اربعہ اور اُن سے جو کچھ بنا ہے وہ سب اللہ کی مخلوق ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، خدا کی ہستی کے سامنے ہر چیز حقیر اور بے حقیقت ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ روس وامریکہ اور دنیا کی ساری طاقتوں اور حکومتوں کی اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں اللہ کی ہستی سب سے بڑی ہے "اللہ اکبر اللہ اکبر

اس کے بعد دوسری بات یہ کہلوائی جاتی ہے "اشہدان لا الٰہ الا اللہ" بناؤ بگاڑ والا اللہ کے سوا کوئی نہیں، بتکلوں اور چیزوں سے کچھ نہیں ہوگا اللہ ہی کے کرنے سے ہوگا "اشہدان لا الٰہ الا اللہ" اس کے بعد کہلوایا جاتا ہے "اشہدان محمداً رسول اللہ" اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑے ہیں اور جن کے ہاتھ میں بناؤ وبگاڑ اور کامیابی وناکامیابی ہے اُن کی قدرت سے استفادہ کا طریقہ ہم خود نہیں جانتے، ہم اس راستہ میں نابینا ہیں، اس کے راہ نما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ اللہ کے رسول ہیں، اُن کے طریقے پر چل کر ہی اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم حاصل کیا جاسکتا ہے "اشہدان محمداً رسول اللہ"

اس کے بعد کہلوایا جاتا ہے "حَیَّ علی الصلوٰۃ، حَیَّ علی الفلاح" یہ باتیں اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے نماز کے لیے یہاں آؤ۔ کامیابی یہاں والے اعمال سے ملے گی۔

اللہ والے اعمال میں (یعنی عبادات میں) کچھ تو وہ ہیں جن کے ساتھ چیزوں میں بھی لگ سکتے ہیں، چیزوں سے کلی انقطاع ضروری نہیں۔ حج روزہ، زکوٰۃ کا حال یہی ہے روزہ میں کھانا کھا تو نہیں سکتے مگر کھانا پکا سکتے ہیں، دوسروں کو کھلا سکتے ہیں تجارت اور زراعت وغیرہ کے کام کرسکتے ہیں ان کی باتیں کرسکتے ہیں اسی طرح زکوٰۃ دیتے وقت کھانا پینا دوسرے کاموں میں لگنا منع نہیں ہے۔ حج میں بھی دوسرے کاموں کی ممانعت نہیں ہے، یہاں تک کہ سلا کپڑا پہننے کی ممانعت ہے لیکن پہننے

کے لیے کپڑا سینے کی ممانعت نہیں ہے ـــــ لیکن نماز وہ عبادت ہے جس میں آدمی تمام چیزوں سے کٹ کر لگتا ہے۔ نہ کھانا کھائیں گے، نہ کھلائیں گے، نہ پکائیں گے، نہ کپڑا سئیں گے، نہ کسی سے کوئی بات کریں گے، دھیان بھی ہر چیز سے ہٹا کر اللہ پر لگانے کی کوشش کریں گے ـــــ تو اذان کے ذریعہ مسجد سے پہلے تو "اللہ اکبر اللہ اکبر" اور اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اور اشہد ان محمداً رسول اللہ کی آواز لگوا کر یقین درست کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اس کے بعد نماز کے عمل کے لیے بلایا جاتا ہے جس میں چیزوں سے کٹ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر اللہ تعالیٰ سے وابستگی کی مشق کی جاتی ہے اور اس میں کامیابی بتائی جاتی ہے۔

بھائی دوستو! جو کوئی مشین بناتا ہے وہی اُس کے چلانے کا طریقہ اور بناؤ بگاڑ کی بات بھی جانتا ہے جو مشینیں باہر سے آتی ہیں اُن کے ساتھ بنانے والوں کی طرف سے چلانے کے طریقہ کے بارے میں ہدایات بھی آتی ہیں ـــ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے بنایا ہے ماں کے پیٹ میں رکھ کر بنایا ہے جہاں کسی دوسرے کا ہاتھ بھی نہیں لگ سکتا بلکہ نظر بھی نہیں جا سکتی، وہی اللہ جانتا ہے کہ انسان کی مشین کس طرح استعمال ہونے میں اس کا بناؤ اور تعمیر ہے اور کس طرح استعمال ہونے میں اس کا بگاڑ اور تخریب ہے۔ اُس نے پیغمبروں کو یہی بتانے کے لیے بھیجا اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، اب جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق اپنے کو استعمال کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اُن کے طریقہ کے خلاف اپنے کو استعمال کرے گا وہ ناکام ہوگا اور اس کی یہ ناکامی پوری طرح آخرت میں ظاہر ہوگی۔ جو انسانوں کے لیے اصلی اور دائمی عالم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف طبقوں میں بانٹ دیا ہے حاکم، محکوم، امیر، غریب، کالے، گورے وغیرہ وغیرہ۔ اب ان کی تعمیر اور کامیابی ان مختلف طبقات کے جوڑ میں ہے، جوڑ والے طریقے قرآن مجید نے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ اگر ساری دنیا کے خزانے خرچ کر کے کوئی جوڑ پیدا کرنا چاہے تو پیدا نہیں ہو سکتا اللہ والے اعمال میں لگنے سے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے جوڑ پیدا کر دیتے ہیں لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (اے محمد آپ ساری

دنیا کے خزانے خرچ کر کے ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، ہم نے اپنی قدرت سے جوڑ دیا ہے)
انسان کا مزاج ہے جو اُس سے فائدہ کھینچے اُس سے کٹتا ہے اور جو اُس کو فائدہ پہنچائے اُس سے جُڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور اس کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ طریقہ بتایا جس پر چل کر ہر ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والا بنے کوئی کسی سے فائدہ کھینچنے والا نہ بنے۔ غریبوں کو بتایا کہ مال والوں کے پاس جو کچھ ہو اس سے فائدہ اُٹھانے کا خیال دل سے نکال دیں اور خود اپنی ذات سے ہر غریب، امیر کو فائدہ پہنچانے والے بن جاویں۔ مثلاً وہ راستہ نہ جانتے ہوں تو خود چل کر اور تکلیف اُٹھا کر ان کو راستہ بتا دیں، میت ہو جائے تو اُس کے اُٹھانے اور دفن وغیرہ میں مدد دیں خود قبر کھودنے میں لگ جائیں، بیمار پڑ جائیں تو عیادت کریں محض اللہ کے لیے ان کا بوجھ اٹھا دیں اور اگر ان کے پڑے ہوئے پیسے کہیں مل جائیں تو پتہ چلا کر اُن تک پہنچا دیں، کوئی خطرہ ہو تو ان کی حفاظت کریں، پہرہ دیں، راستہ میں اگر ان کی موٹر کہیں پھنس جائے تو نکالنے میں مدد کریں اور ضرورت ہو تو اپنے جھونپڑے میں ان کو ٹھہرائیں اور جو میسر ہو کھلائیں۔ اور جب وہ ان خدمتوں کے عوض میں پیسے دینے لگیں تو کہدیں کہ میں نے جو کچھ کیا تھا خدا کے راضی کرنے کے لیے اور اُس سے ثواب لینے کے لیے کیا تم سے کچھ لینے کے لیے نہیں کیا تمہارے پیسے تم کو مبارک ـــــ یہ غریبوں کو بتایا گیا ـــــ اور مال والوں کو بتایا گیا کہ اپنے مال کی ہر جنس اور ہر قسم غریبوں پر لگائیں، پیسے بھی خرچ کریں کھانے میں بھی ان کو شریک کریں کپڑے بھی ان کو لا کر دیں۔ اپنی موٹر اور سواری بھی ان کے استعمال کے لیے دیں اور جب اس کے عوض میں غریب اپنی جانی خدمت کے لیے پیش کریں تو یہ مالدار اُن سے کہدیں کہ ہم تم سے کوئی جزا نہیں چاہتے خدا سے لے لیں گے۔ جب یہ طریقہ چالو ہوگا تو غریبوں سے امیر اور امیروں سے غریب جڑ جائیں گے۔

ایسے ہی حاکموں اور محکوموں کو بتایا گیا کہ وہ ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والے بنیں فائدہ کھینچنے والے نہ بنیں۔ حاکموں سے کہا گیا کہ حکومت کے جو اختیارات اور جو وسائل اُن کے پاس ہوں وہ اُن سے محکوموں کو فائدہ پہنچائیں اور اُن کو سہولتیں پہنچانے کی کوشش کریں، ان کی تجارتوں اور زراعتوں میں ان کی مدد کریں اُن کے لیے قانونی مشکلیں پیدا نہ کریں، اُن سے لینے

اور کھینچنے والے نہیں بلکہ اُن کو دینے والے اور نفع پہنچانے والے بنیں ۔ جب اہل حکومت ایسا کریں گے تو پبلک کے عوام اُن کو بدلنا ہی نہ چاہیں گے الیکشن کے ہنگاموں کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اسی طرح محکوم عوام سے کہا گیا کہ وہ حکومت والوں سے لینے کی نہ سوچیں بلکہ ان کو اپنے جان و مال سے فائدہ پہنچانے والے بنیں اور اُن کے مسائل میں ان کی مدد کریں اُن کے لیے مشکلات پیدا نہ کریں، اُن سے اگر کوتاہیاں ہوں تو درگزر کریں اور اللہ کے حوالہ کریں۔

الغرض ہر طبقہ کو دوسروں کی نفع رسانی کے طریقہ پر لگایا گیا اور بتایا گیا کہ اپنے جان و مال اور درد و فکر کا زیادہ حصہ دوسروں کے بنانے پر لگاؤ ـــــ یہ اسلام کا بتایا ہوا طریقہ ہے اگر اس پر چلا جائے تو ہر طبقہ کا دوسرے سے پورا جوڑ ہوگا اور ہر کام دیانت داری سے اور ٹھیک ٹھیک ہوگا، کوئی بے ایمانی سے روپیہ اور جائداد پیدا کرنے کی فکر نہیں کرے گا اور اگر اس کے برعکس ذہن فائدہ اُٹھانے کا ہوا تو پھوٹ ہی پھوٹ ہوگی اور لوگوں کی نیتیں خراب ہوں گی۔ پھر یہ ہوگا کہ پچاس لاکھ کے ٹھیکے والے پل پر صرف دس لاکھ کی لاگت لگائی جائے گی جس کی وجہ سے پل کمزور بنے گا، کوئی سڑک ٹھیک نہیں بنے گی، کوئی کام ٹھیک نہ ہوگا ـــــ خوب سمجھ لو لینے والے ذہن سے کوئی تعمیر نہیں ہوسکتی، تعمیر نفع رسانی اور دوسروں کو دینے والے طریقہ سے ہوسکتی ہے ـــــ اور نفع رسانی کا ذہن جب ہی بن سکتا ہے اور اپنے پاس والی چیز دوسروں پر لگانے کا طریقہ جب ہی چالو ہوسکتا ہے جب یہ یقین دل میں اتر جائے کہ دینے والے تو بس اللہ ہیں، چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے اور میں جب اس کی رضا کے مطابق استعمال ہونگا تو اللہ میرے سب کام بنا دیں گے اور نعمتوں کے دروازے کھول دیں گے ـــــ اس کی مشق نماز میں ہوگی۔

آج کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام چلنے والا نہیں ہے، صحیح ہے! لینے کا ذہن رکھنے والوں میں دینے کا طریقہ کیسے چلے، اسلام کو اپنی خواہش اور اپنی حالت کے مطابق بنا کے چلاؤ گے تو وہ اسلام رہے گا ہی نہیں وہ تو تمہاری بنائی ہوئی ایک نئی چیز ہو جائے گی۔

کسی نے اپنے بدن پر گودنے والے سے شیر کی تصویر بنوانی چاہی جب وہ سوئی سے گودنے لگا اور تکلیف ہوئی تو گودنے والے سے کہا کہ کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے کہا کہ پہلے شیر کی

دُم بنا رہا ہوں، اس آدمی نے کہا کہ دُم چھوڑ دو بے دُم کے تو بھی شیر کی تصویر بن سکتی ہے، اُس نے دُم چھوڑ دی اور دوسری طرف سے بنانا شروع کیا۔ اب اُس نے کہا کہ اب کیا بنا رہے ہو، اُس نے کہا کہ کان بنا رہا ہوں اُس نے کہا کہ بے کان کے بھی شیر بن سکتا ہے تم کان نہ بناؤ بے کان کا شیر بنا دو ـــــ تو بھائی دوستو! یہی اسلام کے ساتھ ہو رہا ہے کہ اپنے مزاج کے بدل جانے کی وجہ سے اسلام پر چلنا مشکل ہو رہا ہے تو اسلام کی قطع برید کی جا رہی ہے اور اُس کو اپنی خواہش کے مطابق بنایا جا رہا ہے اس لیے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے مزاج کو اسلام کے مطابق بنا لیا جائے اور یہ جب بنے گا جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائے کہ کسی مخلوق سے کچھ نہیں ہوتا سب اللہ سے ہوتا ہے اور حالات کا بناؤ بگاڑ اور تعمیر و تخریب اور کامیابی ناکامی چیزوں کے ہونے نہ ہونے سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بنانے اور جھکانے کا فیصلہ جب کریں گے جب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر آجاؤں گا ـــــ تو اس راستہ پر چلنے کے لیے خارجی نہیں بلکہ داخلی دولتیں چاہئیں، خدا کا یقین ہو، خدا کا دھیان ہو، خدا کا خوف ہو ـــــ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر خدا کے خزانوں سے ملنے کا اور نعمتوں کے دروازے کھلنے کا یقین ہو ـــــ اِن اندرونی تبدیلیوں کے لیے کچھ کرنا پڑے گا، چیزوں سے کامیابی کا یقین ہٹانے کے لیے اور اللہ سے کامیابی کا یقین جمانے کے لیے کچھ مدت کے لیے چیزوں میں سے نکلنا ہوگا، ایمان کی مجلسوں میں بیٹھکر ایمان کی باتیں سننا سنانا ہوگا، نماز کے فضائل اور اُس کے برکات معلوم کر کے اس یقین کے ساتھ نماز میں لگنا ہوگا۔ کہ ہم خدا میں لگیں گے تو خدا ہم کو نوازیں گے، اسی طرح اذکار و تسبیحات کے فضائل معلوم کر کے اُن کے یقین کے ساتھ اُن میں لگنا ہوگا۔ دوسروں کے ساتھ اچھے سلوک اور خدمت کی مشق اس یقین کے ساتھ کرنی ہوگی کہ ہم جتنا اچھا سلوک اللہ کے بندوں کے ساتھ کریں گے ویسا ہی اچھا سلوک اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق ہمارے ساتھ کریں گے۔ خلاصہ ایمان کی نسبت سے ہر مسلم کے اکرام کی اور اپنے کو حقیر و کمتر سمجھنے کی مشق کرنی ہوگی ـــــ اِن باتوں کی دوسروں کو بھی دعوت اپنی حاجت سمجھکر اس یقین کے ساتھ دینی ہوگی کہ جب میں اللہ کے دوسرے بندوں میں اس کے لیے کوشش اور محنت کروں گا اور اس راستہ میں تکلیفیں اور ذلتیں اُٹھاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اِن چیزوں سے

محروم نہ رکھیں گے ـــ اس کی بھی مشق کرنی ہوگی کہ یہ سارے کام صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوں ـــ اس طرح کچھ مشق کر لینے سے انشاء اللہ سب طبقوں میں جوڑ کی شکل پیدا ہو جائے گی۔

امریکہ والوں نے سب کچھ بنا لیا لیکن کالوں اور گوروں کو جوڑنے میں وہ بالکل ناکام رہے۔ اس طرح انھوں نے شراب بند کرنے کے لیے کروروں روپیہ خرچ ڈالا اور ساری کوششیں کر لیں لیکن بجائے کمی کے اُس میں اور زیادتی ہوئی، الحمد للہ اس تبلیغ کے عمل سے لاکھوں ایسے آدمیوں کے جرائم چھوٹ گئے جن کا جرائم چھوڑنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

الحمد للہ اس کام میں سارے ہی طبقات لگ رہے ہیں، جو طبقہ اس پر محنت کرے گا اور یہ باتیں اپنے اندر پیدا کر لے گا اُس سے سب نوک جڑ جائیں گے، ہم اگر اپنے ہی ساتھ جوڑنا چاہتے تو جوڑنے کی یہ ترکیب آپ کو نہ بتاتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اب اس طریقہ پر کچھ محنت کر لیں پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ ہی کے ذریعہ کتنی آسانی سے سب طبقوں کو جوڑتا ہے۔

آج ہر طبقہ میں ہر جگہ جوتا چل رہا ہے اور مسائل بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ میں ہے ـــ جو جتنا کرے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اتنا پالے گا۔

ہم نے اس کام کے لیے کوئی انجمن نہیں بنائی نہ اس کا کوئی دفتر ہے نہ رجسٹر ہے نہ فنڈ ہے۔ یہ سارے ہی مسلمانوں کا کام ہے، ہم نے مروجہ طریقہ پر کوئی علیحدہ جماعت بھی نہیں بنائی ہے ـــ جس طرح مسجد میں نماز کے عمل پر مختلف طبقوں اور مشغلوں والے مسلمان آکر جڑ جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں اور مشغلوں میں چلے جاتے ہیں، اس طرح ہم آپ سب سے کہتے ہیں کہ کچھ وقت کے لیے اپنے گھروں اور مشغلوں سے نکل کر یہ محنت اور مشق کر لیجیے اور پھر اپنے گھروں اور مشغلوں میں آکر ان اصولوں کے مطابق لگ جائیے ـــ آپ نے اگر یہ چیز محنت کر کے حاصل کر لی تو دنیا بھر کے سائنس والے آپ سے یہ طریقہ سیکھنے آئیں گے اور خدا نے چاہا تو آپ دنیا کے امام ہوں گے۔

عہدِ نبوی میں دینی محنت کا نقشہ

دینی محنت کرنے والے رفقاء سے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خطاب

عطیۂ افتخار فریدی صاحب (مراد آباد)

یوں سمجھیے کہ ایک دینی محنت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے ایک خاص نقشے کے ساتھ کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس محنت کو ان کے طریقے پر سیکھیں اور کریں۔

الحمد للہ احباب نے چند مقامات میں تھوڑا تھوڑا اس محنت کو سیکھنا شروع کیا ہے لیکن کسی جگہ کی محنت کامل نہیں ہے بلکہ ابتدائی درجوں میں ہے۔ اب اگر ہر جگہ کے محنت کرنے والے یہ سمجھیں کہ پوری محنت یہی ہے جو ہو رہی ہے تو پھر اصل شکل پر کوئی نہیں پہونچ پائے گا۔ اب جو انسان بھی محنت شروع کرے وہ یوں سمجھے کہ میری محنت ابتدائی شکل پر ہے اس کو کرتے کرتے اس شکل پر پہونچنا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے ساتھیوں نے کی تھی۔ جب وہ اصل محنت ہے تو انسان اپنی محنت کو اس کے مقابلے میں بالکل ادنیٰ سمجھے۔ لہٰذا اصل محنت کو سامنے رکھ کر نیت کرے کہ انشاء اللہ مجھے ترقی کر کے انتہا تک پہونچانا ہے۔

اب ایک تو یہ سوچنا ہے کہ اس محنت کا فائدہ کیا ہے؟ دوسرے یہ سمجھنا ہے کہ وہ محنت کیا ہے؟ اس محنت کا فائدہ یہ ہے کہ محنت کرنے والوں کو اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے انسانوں کو ہدایت مل جائے اور انسان دین پر اتنا ہی چلیں گے جتنی خدا کی طرف سے ہدایت ملے گی۔

تو اب محنت کی سطح جتنی بلند ہوتی جائے گی اتنی ہی خدا کی طرف سے ہدایت کی تقسیم عام ہوتی جائے گی وہ محنت جب ختم ہو جاتی ہے تو ہدایت مسلمانوں میں سے نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے ہدایت کاروبار اور معاشرت میں سے نکلتی ہے کہ کاروبار میں جو دین کے احکامات ہیں ان کو چھوڑ کر دوسرے طریقوں سے کاروبار چلانے لگتے ہیں پھر فرائض نکلتے ہیں اور پھر مختلف برائیاں داخل ہونے لگتی ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان دین سے نکلنے لگتے ہیں اور جب یہ دین کی محنت کی جاتی ہے تو ہدایت خدا کی طرف سے آنی شروع ہوتی ہے۔ پھر جس درجے میں محنت ترقی کرتی جائے گی ہدایت پھیلتی جائے گی۔

ہدایت کی ایک سطح یہ ہے کہ نماز پڑھنے لگیں۔ دوسری یہ ہے کہ روزے زکوٰۃ حج ادا کرنے لگیں تیسرے یہ کہ مال کمانے اور خرچ کرنے میں احکامات شرعیہ کی تعمیل ہونے لگے۔ اس سے آگے یہ ہوتا ہے کہ خدا تمام انسانوں کو ہدایت دینے لگے۔ ہدایت کے بقدر دین زندہ ہوگا اور ہدایت محنت کے بقدر آئے گی۔ تو اب ہم جو یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ دین پر نہیں چل رہے ہیں بلکہ اس سے نکل کر بے دینی میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ محنت نکل چکی ہے۔ اب جتنی جہاں کے بندوں نے دین کی محنت شروع کر دی ہے اتنی خدائے پاک نے ہدایت دینی شروع کر دی ہے اور بقدر ہدایت کے دین زندہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جہاں نمازی نہیں تھے وہاں کچھ نمازی ہو گئے جہاں روزے نہیں تھے وہاں کچھ روزے زندہ ہو گئے۔ جہاں حج نہیں تھا وہاں کچھ حج قائم ہو گیا۔ جہاں تعلیم کا رواج نہ تھا وہاں تعلیم ہونے لگی۔ لیکن ہدایت اس سطح کی ابھی نہیں ملی کہ کمائیوں کے اندر کے احکام پورے کریں اور کھانے پینے، کمان بنانے میں اور لین دین میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والی راہ اختیار کریں تو ابھی ہم مسلمان بھی اس کے محتاج ہیں کہ محنت کی سطح بلند ہو تاکہ پوری زندگی میں اسلام پر چلنے کی سعادت حاصل ہو اور دوسرے انسانوں کو بھی اسلام کے سمجھنے کی ہدایت ملے۔ اب اس محنت میں دو نوعیتیں ہیں۔ ایک تو محنت کرنے والوں کی تعداد بڑھانا، دوسرے یہ محنت جو لوگ کر رہے ہیں ان کا مقدار محنت کی شکلوں میں بڑھنا۔ یہ دو علیحدہ لائنیں ہیں۔ اگر لاکھوں محنت کرنے والے بن جائیں مگر محنت تھوڑی تھوڑی کریں تو ہدایت تھوڑی تھوڑی آئے گی۔ اگر خدا ایسی صورت کر دے کہ جو محنت کر رہے ہیں ان کی مقدار محنت بڑھ جائے تو مسلمانوں کو بھی ہدایت ملے گی اور تمام انسانوں

کو بھی ملے گی۔

ابھی تک جو ہماری محنت کی نوعیت ہے وہ یہ ہے کہ مشغول لوگ اپنی مشغولیتوں میں سے تھوڑا تھوڑا وقت اس طرح نکال رہے ہیں کہ ان کے دنیوی مشاغل میں فرق نہ پڑے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے دین کے لیے قربانیاں دلوائیں ہیں تو اب محنت کرنے والوں میں جتنی حضورؐ والی قربانی پیدا ہوں گی۔ محنت کی سطح بلند ہوگی۔ اب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی محنت بتلانا چاہتا ہوں جس سے ابھی ہم بہت دور ہیں۔ لیکن اگر اس محنت کو سامنے رکھ کر چلتے رہیں گے تو خدا وہاں تک پہونچا دیگا۔ تو ہر کام کرنے والے کو محنت کے اس انتہائی نقشہ کو سامنے رکھ کر وہاں تک پہونچنے کی نیت کرنی چاہیے یہ بات تو آپ لوگ جانتے ہیں کہ سارے عرب میں مدینہ والوں کی محنت سے دین پھیلا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا عرب کا رتبہ چھوٹا نہیں تھا۔ ہندوستان کے برابر نہیں تو اس سے بہت کم بھی نہ تھا۔ اس وقت دنیا میں کمائیوں کے جو طریقے رواج پذیر تھے وہ بھی نہ تھے۔ پورے ملک میں کوئی حکومت قائم نہ تھی جس کے دفاتر وغیرہ کی نوکریوں کے ذریعہ بھی رزق کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ اس زمانے میں بیت اللہ پر آنے والے حجاج سے بھی وہاں کچھ وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حجاج کی مدارات میں ہر ایک کچھ خرچ کرتا تھا۔ لہٰذا حج کا شعبہ بھی اس زمانے میں کمائی کا شعبہ نہیں تھا۔ کھیت اور باغات بھی گویا نہیں تھے۔ تجارتی نظام بھی مکہ معظمہ وغیرہ کے علاوہ نہ تھا۔ کہیں کہیں کھجور انگور اور انار کے کچھ باغات تھے۔ چند مقامات تھے جہاں چھوٹے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ غرض کہ پورا عرب عام طور سے ننگا بھوکا پیاسا عرب تھا۔ نہ سب کے پاس کپڑے تھے نہ مکانات تھے۔ پانی اور کھانا بھی پورے عرب کو نہیں ملتا تھا۔ بھوک کی شدت میں کیڑے مکوڑے بھی کھا جاتے تھے۔ یہاں تک کہ زمین پر پڑا ہوا خون بغیر تحقیق کے کہ کس چیز کا ہے کس جگہ کا ہے چاٹ جاتے تھے۔ اکثر علاقے کمائی سے خالی اور بھوک سے بھرے ہوئے تھے۔ بادشاہوں تک کی ہمت نہیں تھی کہ اس ملک پر حکومت کریں۔ حکومت کرنے کے لیے بھی اخراجات کی ضرورت ہے اس وقت نہ پٹرول تھا نہ سونا۔ عرب کے کنارے پر قیصر و کسریٰ کی حکومتیں فوجی نظام رکھتی تھیں کہ عرب ان پر کسی وقت بھی چڑھائی نہ کر دیں۔ ورنہ کوئی نظام حکومت پورے عرب بھر میں نہ تھا۔ تو جس ملک میں نظام چلانے کے لیے حکومتوں تک کی ہمت نہ پڑتی ہو اس ملک میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کی

یہ جو مقامات تجارت و زراعت کے مراکز تھے وہ سب ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آگئے سوائے مدینہ پاک کے آدمیوں کے سارے ملک کے خوشحال قبائل مخالف تھے۔ سارا عرب منتظر تھا کہ مکے والے اسلام لائیں تو ہم بھی لائیں اور مکہ والوں نے آپ کی زندگی کے آخری دو تک مقابلہ کیا۔ اب ایسے حالات میں جتنا کام ہوا تمام کا تمام مدینہ کی بستی سے ہوا۔ جہاں بھی کوئی ایمان لاتا اسے مدینہ بلا لیا جاتا۔ تو مدینہ ایسی بستی بن گیا۔ جہاں لوگ خاندان اور برادریاں چھوڑ چھوڑ کر آکر بستے رہے۔ اور جب قوم سے نکل کر آتے تھے تو اپنا مال بھی لے کر نہیں آسکتے تھے۔ مدینہ والوں کو ان کے رہنے کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اب یہ ایسی بستی بن گئی جہاں مہاجر اور مقامی برابر ہو گئے۔

آنے والوں میں کچھ تو تھے ہی فقیر، کچھ کے روزگار لٹ گئے، کچھ کے اموال مقام والوں نے چھین لیے غرضیکہ مدینہ میں آنے والے سب ہی فقیر بن کر آئے۔ ان فقیروں اور مدینہ کے انصار کو لے کر آپ نے دین کی محنت کا کام شروع کیا۔ باہر سے آنے والوں کو کاروبار کرنے سے نہیں روکا گیا جب تک کمائی کی شکلیں وجود میں آئیں مقامیوں نے سب کی ضروریات مہیا کیں، غرض کہ مدینہ میں بسنے والوں پر اتنا بوجھ پڑ گیا تھا اور ان کے حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کم از کم دس سال تک اپنے کاروبار جمانے یا زیادہ اخراجات مہیا کرنے کے سبب ان کو کہیں باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ کمائی والے نظام کا یہی تقاضا تھا، انصار پر چونکہ سب آنے والوں کا خرچ بھی پڑ گیا تھا۔ اس لیے کھیتوں اور باغات کے کام میں بھی زیادہ انہماک کی اور زیادہ وقت لگانے کی ضرورت تھی تاکہ آنے والوں کے اخراجات پورے کر سکیں کیونکہ مدینہ کے انصار کے بہت سے گھروں پر کئی کئی خاندان ٹھہرے ہوئے تھے۔ الغرض ان ضرورتوں کے اعتبار سے باہر نکلنے کا بالکل موقع نہیں تھا۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ والوں کو کمائی کی چھٹی دینے کی بجائے دین کی پوری محنت اسی دس سال میں کی اور کمائی اور دین کی محنت کا ایک ایسا تفقہ قائم کیا کہ انسانی زندگی میں جو تقاضے ہیں گھر والوں کی پرورش (دیکھ بھال)، مال و دولت کمانے کا عمل ان دونوں عملوں کو بار بار چھوڑ کر دین کی محنت کے عمل کو آگے بڑھایا اور صحابہ کرام کو ایسی تربیت دی کہ جس وقت اللہ کے راستے میں نکلنے کو کہا جائے اور جتنوں کو کہا جائے اور جہاں کے لیے کہا جائے سب تقاضوں کو چھوڑ کر نکل جائیں۔ یہاں تک کہ جن کو مغرب کے وقت نکلنے کو کہا انھیں مدینہ میں سونے نہیں دیا، جس طرح پکے نمازی اذان کی آواز سن کر تمام کام چھوڑ

کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مدینہ والے خدا کے راستے میں نکلنے کی آواز پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جس وقت اللہ کے راستے میں ایمان و دین کے تقاضوں پر آواز لگتی۔ یہ آواز سودے خریدتے وقت سنیں یا دوکان کھولتے وقت کان میں آئے یا خرید و فروخت کے انتہائی انہماک کے وقت سنی جائے۔ یہ آواز کھجور کے باغوں میں کھجوروں کے توڑنے کے وقت لگے نکاح ہونے کے وقت لگے یا رخصتی ہونے کے وقت لگے۔ عورتوں کے بچہ پیدا ہونے کے وقت لگے یا بیماری کے وقت لگے یا عزیزوں اور گھر والوں کی موت کے وقت لگے۔ اس کی مشق کرلی تھی کہ جس وقت آواز سنیں سب چھوڑ چھاڑ کر نکل جائیں جو پاس ہو لیں۔ جہاں ضرورت ہو چلے جائیں جتنے وقت کا تقاضا ہو وہاں گزار دیں جو جان پر بیتے اسے جھیلیں۔ یہ مزاج بن گیا تھا خدا کے راستے میں نکلنے والوں کا ــــ مدینہ پاک کے دس سال کے قیام میں ڈیڑھ سو جماعتیں نکالیں جن میں سے ۲۵ سفروں میں آپ خود تشریف لے گئے۔ کسی میں دس ہزار آدمی نکلے کسی میں پچاس نکلے کسی میں تیس یا چالیس ہزار نکلے کسی میں تین سو یا سو نکلے کسی میں دس کسی میں پندرہ کسی میں سات یا آٹھ نکلے۔ مدت کے اعتبار سے کسی میں دو ماہ خرچ ہوئے کسی میں تین ماہ کسی میں بیس دن کسی میں پندرہ دن خرچ ہوئے۔ بقیہ جو سو اسو جماعتیں نکالیں ان میں بھی ہزار نکلے، پانچسو اور چھ سو بھی کم و بیش سب طرح کے نکلتے رہے۔ مدت بھی چھ ماہ چار ماہ سب طرح کا وقت لگا۔ اب حساب لگاؤ کہ ہر آدمی کے حصے میں باہر گزارنے کا کتنا وقت پڑا۔ اور سال میں کتنے سفر کیے اگر سب سفروں کو جوڑ کر تخمینہ کر دگے تو سال میں چھ ماہ یا سات ماہ ہر آدمی کے حصہ میں آئیں گے اب اس نقل و حرکت کی کوشش سے مختلف مقامات کے انسانوں کو مدینہ آنے کی دعوت میں ملیں کہ اسلام مدینہ میں آکر سیکھو۔ چوں کہ اسلامی زندگی ماحول سے آئے گی۔ اس زندگی کا ماحول صرف مدینہ میں تھا۔ تو باہر نکلنے والوں کو مدینہ منورہ کے قیام کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کو دین سکھانا پڑتا تھا۔ پھر مدینہ والوں کو اپنے لیے بھی علم حاصل کرنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا تھا۔ مدینہ کے قیام کے زمانہ میں مسجدوں کے لیے وقت مانگا جاتا تھا۔ تاکہ سیکھنے سکھانے کا نظام مسجدوں میں قائم رہے اور آنے والوں کو سنبھالا جا سکے جب ان لوگوں نے روزانہ کی زندگی ایسی بنالی کہ اگر دو آدمیوں نے مل کر تجارت شروع کی تو باری لگالی ایک دن کی کوئی کسی وقت کوئی کسی وقت، کوئی کما کر پہونچ جاتا۔ کوئی شام کو پہونچتا اور رات کو رہتا، عشاء بعد سے عبادت میں لگا رہتا پھر سوتا۔ کچھ عشاء پڑھتے ہی سو جاتے اور پچھلے وقت میں تہجد ادا کرتے۔ اس طرح چوبیس گھنٹے مسجد میں مقامی مسلمان موجود رہتے۔ اب جو باہر سے جس

وقت پہونچتے آدمی مسجد میں ان کو سنبھالنے کو موجود ملتے، کبھی تعلیم کے حلقہ ہو رہے ہیں۔ تو آنے والوں کو اس میں بٹھاتے۔ نماز ہو رہی ہے تو اس میں شامل کر رہے ہیں۔ ذکر اذکار جس وقت ہو رہا ہے اس میں جوڑ رہے ہیں اس طرح آنے والے بھی اپنے کو خالی کسی وقت نہیں سمجھیں گے۔ اب حساب لگاؤ چھ سات ماہ تو باہر خرچ ہوئے مسجدوں کی باری میں بھی دو ڈھائی ماہ نکل گئے۔ اب دنیاوی ضرورتوں کے لیے کتنا وقت رہ گیا ہر شخص کا وقت بیرونی نقل و حرکت میں بہت سا لگ گیا اور کافی وقت مدینہ آنے والوں کے سنبھالنے میں لگ گیا۔ ذرائع آمدنی تو عام حالات سے بھی کم ہو گئے اور اخراجات کئی گنا زیادہ بڑھ گئے۔ باہر کی نقل و حرکت کا خرچ، اپنا اور گھر والوں کا خرچ جو دوسرے باہر سے مدینہ میں آئیں تو ان کا خرچ جو مدینہ کے غربا باہر نکل رہے ہیں ان کا سفر خرچ، سواری، لباس، کھانا، باہر والے نجھ شمال آئیں ان کی بھی دعوتیں کرنا، پھر جن علاقوں میں قحط ہوتا وہ بھی مدینہ پاک آتے انکی بھی مدد کرنا غرضیکہ خرچ تو نقل و حرکت کے زمانے میں بھی اور قیام کے زمانہ میں بھی بہت بڑھ گیا اور کمائی کی شکلیں ٹوٹ گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ باہر بھی اور مقام پر بھی فاقے جھیلنے پڑے سردی بھی سہنی پڑی، گرمی بھی برداشت کرنی پڑی۔ غرض کہ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر مقامی اور بیرونی خاکوں کو چلایا۔ تو جب ایمان کا کام کرنے والوں نے ایمان کے تقاضوں کو کمائیوں اور گھر کے تقاضوں پر مقدم کر دیا تو حق تعالیٰ شانہٗ نے اس نقشہ سے خوش ہو کر تمام عرب کی بسنے والی قوموں کو اسلام میں داخل کر دیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی قربانی کی برکت سے ان تمام انسانوں کی تربیت ہو گئی جن کی تربیت کی حکومتوں کو بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آپ ایسی حالت میں دنیا سے تشریف لے گئے۔ جب سارا عرب اسلام سے منور ہو چکا تھا اور مدینہ کا ایک ایک گھر مال سے خالی ہو چکا تھا۔ پھر حق تعالیٰ شانہٗ نے قیامت تک کے آنے والوں کو یہ دکھانے کے لیے کہ اسلام ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی محنت سے پھیلا ہے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد اکثر عرب قبائل کو پھر مرتد بنا دیا تاکہ قیامت تک کے آنے والوں کو پتہ چل جائے کہ جب بھی ہم اس محنت کو لے کر اٹھیں گے تو سارے عالم کے خاکے درست ہو جائیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوتے ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو بیٹھنے نہیں دیا بلکہ ایک دم سب کو خدا کے راستے میں نکال دیا۔ اسی بھوک اور پیاس میں اسی غم کی حالت میں نکالا۔ یہاں تک کہ تین دن اور تین راتیں مدینہ پر ایسی گزریں کہ ہر وقت حملے کا خطرہ تھا اور مدینہ

پاک بالغ مردوں سے گویا بالکل خالی تھا۔ اکثر تو ملک شام کے رخ پر جہاد میں بھیج گئے۔ بقیہ ڈیڑھ سو قریب دیہات میں نکلے ظاہر کے اعتبار سے نکلنے کا موقع بالکل نہ تھا محض حکم کی تعمیل کے جذبے سے نکل گئے۔ اللہ رب العزت نے اس محنت کی پوری دنیا کو قیمت دکھائی! ایک قلیل عرصہ میں سارا عرب اسی نقشہ پر آگیا ایک عرب گھرانہ بھی اسلام سے باہر نہیں رہا اور اسمیں صرف ایک ماہ لگا۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمان بن گئے بلکہ ایمان کی پوری محنت پر لوٹ آئے۔

تو اصل ایمان کی محنت کا نقشہ یہ ہے کہ ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ جس کو جس وقت جہاں کے لیے کہا جائے سب مشاغل چھوڑ کر راہِ خدا میں چلا جائے اور جب باہر کے آدمی دین سیکھنے کی لیے اس کے مقام پر آئیں تو یہاں بھی ان کے ساتھ لگ جائے تو اب آپ غور کیجیے کہ آج کی محنتوں میں اور اس محنت میں کتنا فرق ہے۔ تو اصل سمجھو اس نقشے کو اور یہ سمجھو کہ ہماری والی محنتیں ابتدائی ہیں اور یہیں ان جیسی محنت کرنے والا بننا ہے۔ پوری پوری جان لگانے والا بننا ہے۔

مختصر سی زندگی ہے اس میں سے تھوڑا سا وقت ضروریات کے لیے کمانے پر لگائیں گے اور بقیہ تمام وقت دین کی محنت پر صرف کریں گے۔ اب ذہن میں یہ رکھیں کہ چونکہ یہ قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے اندر دن سے نکلی ہے اس لیے ان کے بدن اور روح کے انوار اس قربانی میں موجود ہیں لہٰذا جتنی یہ قربانیاں کام کرنے والوں میں بڑھیں گی اتنی ہی ہدایت حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے آئیگی۔

دین مالوں سے نہیں پھیلے گا بلکہ دین کی محنت سے کمیوں کے نقطے میں جو نقصانات اور کمیاں آئیں گی اس قربانی سے پھیلے گا اور جب یہ قربانیاں کمال تک پہونچیں گی تو ان قوموں کو آپ کے ذریعہ ہدایت ملے گی جو آسمان پر اڑ رہی ہیں اور ہم غریبوں کی طرف دیکھتی بھی نہیں اور وہ مسلمان جو زندگی کے کسی شعبے میں اسلام کی بات سننے کو تیار نہیں وہ اپنے تمام کاموں کو اسلام کے احکامات کے موافق بنانے لگا۔ اور آپ حضرات کی قربانیوں کا بدلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر پر کھڑے ہو کر دلوائیں گے جہاں آپ نے انصار سے ملنے اور ان کی قربانیوں کا صلہ دلوانے کا وعدہ فرمایا ہے بشرطیکہ سیٹے کر لو کہ خدا جو کچھ ان محنتوں کے بعد دے گا۔ وہ حاصل کر کے دوسروں کو دیں گے اور خود نہ لیں گے ایسا کرنے میں حضورؐ کی جھلک پائی جائیگی کیونکہ آپ قربانیوں کے دور میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ تھے اور جب نعمتیں ملنے کا وقت آیا تو آپ تشریف لے گئے۔ اس طرح جو حضرات اپنی جان و مال کی قربانی کریں گے اور دنیا میں کچھ لینا نہیں چاہیں گے اور صرف آخرت پر نگاہ رکھیں گے وہی حضرات آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

راہِ خدا میں نکلنے والے قافلوں کے لیے حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ہدایات

محمد منظور نعمانی

[تبلیغی اجتماعات کا پروگرام عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک دو دن پورے زور و قوت کے ساتھ حاضرین کو اس کی دعوت اور ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ ایمان و یقین اور ایمان والے اعمال اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے کچھ مدت کے لیے اپنے ماحول اور روزمرہ کے مشاغل سے نکلیں اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی ان کی دعوت دینے کے لیے ایک خاص پروگرام کے مطابق وہ محنت و مجاہدہ کریں ــــ اللہ کے جو بندے اس دعوت کو قبول کرلیتے ہیں اُن کی جماعتیں ترتیب دے دی جاتی ہیں اور اجتماع کے اختتام پر ان کو ہدایات دے کر اور دعا کر کے رخصت کر دیا جاتا ہے ــــ اپریل ۱۹۶۲ء میں کلکتہ کے قریب گراہاٹ میں ایک اجتماع ہوا تھا، راقم سطور بھی اس میں شریک تھا، پہلے دو دن کی دعوت و ترغیب کے نتیجہ میں ایک ہزار سے کچھ اوپر بندگانِ خدا نے اپنے نام لکھائے جن کو قریباً سو جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا، آخری دن حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے جماعتوں کو رخصت کرتے وقت جو تقریر فرمائی تھی وہ اس عاجز نے اشارات میں قلمبند کر لی تھی۔ وہی ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ اس میں جو کچھ ہے وہ مضمون کی حد تک حضرت مولانا مرحوم کا ہے، لیکن الفاظ کے بارہ میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی]

خطبۂ مسنونہ کے بعد مولانا نے فرمایا۔

آفتاب نورانی ہے۔ اس کے اندر نور ہے۔ وہ اپنے اس نور کے ساتھ چمکتا ہے تو دُنیا میں نور پھیلاتا ہے۔ اگر بجائے نورانی کے وہ خود ظلمانی ہوتا اور اس میں نور کے بجائے ظلمت ہوتی تو وہ دنیا میں ظلمت پھیلنے کا ذریعہ بنتا ـــــ آپ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور دور قریب کی دنیا میں پھریں گے۔ اگر آپ میں نور ہوگا تو آپ کے ذریعہ نور پھیلے گا۔ اور اگر آپ کے اندر ظلمت ہوگی تو وہی ظلمت پھیلے گی، اس لیے آپ کو کوشش کرنی ہے کہ آپ کے اندر نور ہو اور آپ خود نورانی بنیں ـــــ کسی انسان کی ذات میں نور نہیں ہے۔ نور والے اعمال سے انسان میں نور آتا ہے اس لیے آپ لوگوں کو نور والے اعمال کرتے ہیں تاکہ آپ کے اندر نور آئے اور آپ کے ذریعہ نور پھیلے، اور ظلمت والے اعمال سے اپنے آپ کو بچانا ہے تاکہ آپ ظلمت پھیلنے کا ذریعہ نہ بنیں۔

نور والے اعمال وہ محمدی اعمال ہیں جو اللہ کی رضا کے لیے کیے جائیں، ان اعمال کو اتنی کثرت سے اور تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے کہ آپ ان کے نورانی رنگ میں رنگ جائیں ـــــ وہ نورانی اعمال یہ ہیں:۔

(۱) اخلاص کے ساتھ ایمان و یقین حاصل کرنے کی دعوت جو انبیاء علیہم السلام کی خاص میراث اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔

(۲) نماز اور جملہ عبادات جس میں ذکر و تلاوت، دعا و استغفار سب شامل ہیں۔

(۳) علم میں مشغولیت۔ خاص کر وہ علم جس میں انسانوں کے اعمال و افعال کے آخرت میں ظاہر ہونے والے نتائج کا بیان ہو۔ یعنی ترغیب و ترہیب۔

(۴) اچھے اخلاق جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق تھے اور جن کی آپ نے تعلیم دی۔ جس کا خلاصہ اور حاصل ہے اللہ کی رضا کے لیے اس کی مخلوق کی خدمت اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ۔

یہ ہیں وہ نورانی اعمال جن کے مسلسل اور کثرت سے کرنے سے نور پیدا ہوتا ہے اور زندگی نورانی بنتی ہے، آپ کو انہی اعمال میں مشغول رہتے ہوئے پھرنا ہے۔

یاد رکھیے آپ صرف اپنے گھر اپنے گھر والوں، اور اپنے خاص ماحول کو چھوڑ کر جا رہے ہیں نفس اور شیطان کو چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں۔ یہ دونوں دشمن ہر قدم پر اور دن رات آپ کے ساتھ رہیں گے۔ آپ کی بُری عادتیں بھی آپ کے ساتھ جا رہی ہیں، یہ سب چیزیں آپ کو ان اعمال کی طرف کھینچیں گی جن سے آپ میں ظلمت آئے اور آپ خدا سے دور اور اس کی رضا سے محروم ہوں، آپ ان دشمنوں کے شر سے صرف اس طرح بچ سکتے ہیں کہ اس بات کا پورا اہتمام کریں کہ سونے کے چھ سات گھنٹوں کے علاوہ دن رات کے تمام اوقات میں اپنے کو ان نورانی اعمال میں مشغول رکھیں ـــــ یا آپ ایمان کی اور ایمان والے اعمال کی دعوت دیتے ہوں، یا نماز اور ذکر و تلاوت وغیرہ کسی عبادت میں مشغول ہوں، یا تعلیم اور تعلّم میں لگے ہوں، یا کوئی خدمت والا کام انجام دے رہے ہوں۔

نفس اور شیطان کے شر سے بچنے کی صرف یہی صورت ہے کہ آپ کا وقت ان کاموں سے فارغ اور خالی نہ ہو۔ "خانۂ خالی را دیو می گیرد"

پھر یہ اعمال بھی نور حاصل ہونے کا ذریعہ اسی صورت میں بنیں گے جبکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور آخرت کے ثواب پر نگاہ رکھتے ہوئے کیے جائیں۔ اگر خدانخواستہ نیت خالص نہ رہی تو یہی اعمال جہنم میں کھینچ لے جائیں گے ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں سب سے پہلے تین آدمیوں کے بارے میں جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور جہنم میں سب سے پہلے انہی کو پھونکا جائے گا، ان میں ایک وہ عالم دین اور عالم قرآن ہوگا جو عمر بھر قرآن سیکھنے سکھانے میں مشغول رہا۔ دوسرا ایک دولت مند سخی ہوگا جس کو دنیا میں اللہ نے خوب دولت سے نوازا تھا، اور وہ اللہ کی دی ہوئی دولت نیکی کے کاموں میں خوب کشادہ دستی سے خرچ کرتا تھا اور تیسرا شخص ایک شہید ہوگا جو جہاد کے میدان میں دشمن کی تلواروں سے شہید ہوا ہوگا ـــــ لیکن ان تینوں آدمیوں نے یہ اعمال خالصاً لوجہ اللہ نہیں کیے تھے، بلکہ دنیا میں ناموری اور شہرت و عزت حاصل کرنے کے لیے کیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب یہ تینوں قسم کے آدمی اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے

تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہم دلوں اور نیتوں کا حال جانتے ہیں۔ تم لوگوں نے یہ اچھے اور نورانی اعمال ہماری رضا کے لیے نہیں کیے تھے، بلکہ دُنیا میں ناموری اور شہرت کے لیے کیے تھے اور یہ چیز تمھیں دُنیا میں مل چکی، اب تمھارے لیے یہاں کچھ نہیں۔ اس کے بعد ان کو ان کے انہی اعمال کی وجہ سے گھسیٹ کے جہنم میں پھینکوا دیا جائے گا۔ بلکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ یہ پہلے وہ جہنمی ہوں گے جن کے لیے سب سے پہلے جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ (العیاذ باللہ)

سوچیے تو کس قدر لرزا دینے والی ہے یہ حدیث، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو روایت فرماتے تو کبھی کبھی مارے خوف کے ان کی چیخیں نکل جائیں اور ان پر بیہوشی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ اور ایک دفعہ جب ایک تابعی نے یہی حدیث حضرت ابوہریرہ سے سُن کر حضرت معاویہ کے سامنے نقل کی تو حضرت معاویہ اتنے روئے کہ لوگوں کو ان کی جان کا خطرہ ہو گیا۔ بہت دیر کے بعد ان کی حالت ٹھیک ہوئی اور انھوں نے فرمایا۔

صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سچ فرمایا ہے اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی بات بالکل صحیح پہنچایا ہے کہ جو کوئی اپنے اعمال سے دنیا اور دنیا کی زیب و زینت چاہے گا اسکو اسکے اعمال کا پورا نتیجہ دنیا میں ہم دے دینگے اور ان کیلئے اسمیں بالکل کمی نہیں کیجائیگی۔ ان لوگوں کیلئے آخرت میں سوائے دوزخ کی آگ کے اور کچھ نہ ہوگا اور جو عمل انھوں نے کیے تھے وہ ضائع جائیں گے اور بے کار و لاحاصل ہوں گے ان کے اعمال۔

بہرحال نورانی اعمال نور پیدا کرنے کا ذریعہ اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جبکہ وہ خالصتاً اللہ کی رضا کیلئے اور آخرت کیلئے کیے جائیں، اسلیے آپ کو ایک طرف تو اپنے تمام اوقات انہی اعمال میں مشغول رکھنے ہیں اور دوسری طرف اس کا بھی اہتمام کرنا ہو کہ نیت صحیح رہے شیطان جب کسی بندہ کو اچھے عمل سے ہٹا نہیں سکتا تو اسکی نیت میں فساد ڈالنے کی کوشش کرتا ہو۔ اللہ والے اعمال اگر غیر اللہ کیلئے کیے جائیں تو ان میں اللہ والی نسبت نہیں رہتی۔

اور اگر اللہ کی رضا کیلئے وہ اعمال کیے جائیں جو درحقیقت رضا والے اعمال نہیں ہیں تو ان میں اللہ کی نسبت نہیں آتی اور وہ رضائے الٰہی کا وسیلہ نہیں بنتے۔ اس لیے دونوں کوششیں ضروری ہیں۔ ایک اللہ کی رضا والے اعمال میں مشغولیت، ہمہ دم ایسی مشغولیت کہ ان کا رنگ چڑھ جائے اور نیت کی صحت کا اہتمام، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل سے مقصد اللہ کی رضا ہو۔ ساری کامیابی بس اللہ کی رضا میں ہے، اور اس کی ناراضی میں تمام ناکامی اور نامرادی ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ اس نکلنے کے زمانہ میں بس چار کاموں میں اپنے آپ کو مشغول رکھنا ہے۔ سب سے پہلی چیز ہے۔ ایمان و یقین کی اور ایمان والے اعمال کی دعوت۔ اس دعوت کے لیے عمومی گشت ہوں گے خصوصی گشت ہوں گے۔ جن کے اصول و آداب گشت کے لیے نکلنے وقت بتلائے جائیں گے ان کو دھیان سے سنا جائے۔ پھر جب آپ دعوت کے لیے گلیوں اور بازاروں میں نکلیں گے تو شیطان آپ کو وہاں کے نقشوں کی طرف متوجہ کرے گا۔ اس لیے سب سے پہلے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ شیطان و نفس کے شر سے بچائے، اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی توفیق دے پورے گشت میں اس کا اہتمام رہے کہ بس اللہ کے جلال اور جمال پر اور اس کی صفات عالیہ پر نظر رہے۔ نگاہیں نیچی رہیں اور اپنا مقصد نگاہ کے سامنے رہے جس طرح جب کسی مریض کو اسپتال لے کر جاتے ہیں تو خود مریض اور اس کے ساتھی اسپتال کی عالی شان عمارتوں کو اور وہاں کے نقشوں کو دلچسپی سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کے سامنے بس مریض کا علاج ہوتا ہے۔

خصوصی گشت میں اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب جن سے آپ ملنے گئے ہیں اس وقت توجہ سے بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو مناسب طریقہ سے جلدی بات ختم کر کے ان کے پاس سے اٹھ آنا چاہیے، اور ان کے لیے دعا کرنی چاہیے اور اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب متوجہ ہیں تو پھر پوری بات ان کے سامنے رکھنی چاہیے اور وقت فارغ کرنے کے لیے بھی کہنا چاہیے

خصوصی گشت میں جب دینی اکابر کی خدمت میں حاضری ہو تو ان سے صرف دعا کی درخواست کی جائے۔ اور ان کی توجہ دیکھی جائے تو کام کا کچھ ذکر دیا جائے۔ عمومی گشت کر کے لوگوں کو مسجد میں جمع کیا جائے۔ اور ان کے سامنے ایمان و یقین، نماز، ذکر اللہ، علم دین، اخلاق اور دینی جدوجہد کی بات رکھی جائے اور تشکیل کی کوشش کی جائے۔ پھر تشکیل کر کے مطمئن

نہ ہو جائیں بلکہ جن لوگوں نے وعدے کیے ہیں اور نام لکھائے ہیں ان کو اللہ کے راستہ میں نکال دینے کی اور وعدوں کو عمل میں لے آنے کی پوری کوشش کریں اور اپنے امکان بھر اس کا انتظام کریں کہ ان کا وقت اچھی طرح گزرے ـــ جو لوگ اسوقت نکلنے کا فیصلہ نہ کر سکیں ان کو مقامی گشت مقامی اجتماع، تعلیم، نماز، ذکر کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اور ان کاموں کا نظام بنا دیا جائے۔

جب دعوت کے سلسلہ کی یہ ساری محنت کر چکیں تو اس کسان کی طرح جو زمین میں بیج بکھیر دیتا ہے اور پھر اللہ سے لو لگاتا ہے پورے الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں وہی تقلب القلوب ہے، وہی جس کو چاہے ایمان اور ایمان والے اعمال دیتا ہے۔ اور جس کے لیے نہیں چاہتا اس کو محروم رکھتا ہے۔

دعوت کے بعد دوسرا کام تعلیم کا ہے جب تعلیم کیلئے بیٹھیں تو ادب سے بیٹھیں، دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے علم کی عظمت سے دبا ہوا ہو، فضائل کا مذاکرہ ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمائی ہوئی دعائیں یاد کی جائیں۔

جو وقت دعوت اور تعلیم سے خالی ہو اور کوئی دوسرا ضروری کام بھی اس وقت نہ ہو اس میں نوافل پڑھے جائیں، یا قرآن مجید کی تلاوت کی جائے یا ذکر و تسبیح میں مشغول کیا جائے۔ یا اللہ کے کسی بندہ کی خدمت کی جائے۔

جس طرح نماز میں آدمی یا قیام میں ہوتا ہے، یا رکوع میں یا سجدہ میں یا قعدہ میں اسی طرح اللہ کے راستہ میں نکلنے کے بعد آدمی یا دعوت میں لگا ہو، یا تعلیم اور تعلم میں، یا ذکر عبادت میں، یا اللہ کی کسی مخلوق کی خدمت میں ـــــ یہ چار کام اس پورے زمانے میں بطور اصل مقصد کے کیے جائیں گے اور اتنے کیے جائیں گے کہ یہی عادت و مزاج بن جائے۔ یہ اجتماعی بھی کیے جائیں گے اور انفرادی بھی۔ اجتماعی سے مطلب وہ ہے جو جماعتی نظام کے تحت ہو، جیسے خصوصی گشت اور عمومی گشت میں دعوت اور جماعت کی تعلیم کے وقت میں تعلیم اور جماعت کے ساتھ فرض نمازیں اور ان کے آگے پیچھے کی سنتیں اور جماعتی تقسیم کار کے مطابق کھانے وغیرہ کے انتظامات کی دوڑ دھوپ، یہ سب اعمال اجتماعی ہیں۔ انفرادی دعوت، انفرادی تعلیم، انفرادی عبادت، انفرادی خدمت وہ ہوگی جو جماعتی پروگرام کے

کے علاوہ کوئی شخص اپنے اس خالی وقت میں کرے جس میں کوئی اجتماعی کام نہیں ہے۔ مثلاً دوپہر کے کھانے کے بعد ظہر تک کوئی جماعتی کام دعوت یا تعلیم وغیرہ کا نہیں ہے۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اس میں آرام کرے۔ اب اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے اس وقت میں آرام کرنے کے بجائے کسی شخص کے پاس جاکر دعوتِ ایمان کی باتیں کرے یا کسی اللہ کے بندہ کو کوئی دعا یاد کرائے یا اس کی نماز صحیح کرائے یا مسجد کے کسی کونہ میں کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے لگے یا کسی ساتھی کی کوئی خدمت کرنے لگے تو یہ سب صورتیں انفرادی عمل کی ہوں گی۔

بہرحال اللہ کے راستہ میں نکلنے کے زمانہ میں یہ چار کام اصل مقصد کے طور پر کیے جائیں۔ اور حاجات بشری کے علاوہ اپنے کل اوقات ان ہی کاموں میں مشغول رکھے جائیں، تب ان کے ذریعہ زندگی میں نور آئے گا اور پھر انشاء اللہ وہ نور متعدی ہوگا اور پھیلے گا۔

ان چار کاموں کے علاوہ چار ہی کام ناگزیر ضرورت کے طور پر کیے جائیں گے اور صرف بقدر ضرورت ہی کیے جائیں گے۔ وہ چار یہ ہیں۔

۱۔ کھانا پینا ۲۔ قضاء حاجت ۳۔ سونا ۴۔ باہم بات چیت کرنا۔

یہ ناگزیر ضرورتیں ہیں ان کو بس اتنا ہی وقت دیا جائے جتنا ضروری اور ناگزیر ہو، سونے کے لیے دن رات میں بس چھ گھنٹے کافی ہیں۔

۴ باتیں وہ ہیں جن سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے۔

۱۔ کسی سے سوال نہ کیا جائے بلکہ کسی کے سامنے اپنی کوئی ضرورت ظاہر بھی نہ کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا سوال ہی ہے۔ ۲۔ اشراف سے بھی بچا جائے۔ اشراف یہ ہے کہ زبان سے تو سوال نہ کرے لیکن دل میں کسی بندہ سے کچھ حاصل ہونے کی طمع ہو، گویا بجائے زبان کے دل میں سوال ہو۔ ۳۔ اسراف سے بچا جائے۔ اسراف یعنی فضول خرچی ہر حال میں معیوب اور مضر ہے، لیکن اللہ کے راستہ میں نکلنے کے زمانہ میں اس کے نتیجے اپنے حق میں بھی بہت برے ہوتے ہیں اور دوسرے ساتھیوں کے حق میں بھی۔ ۴۔ بغیر اجازت کسی ساتھی کی بھی کوئی چیز استعمال نہ کی جائے۔ بعض اوقات دوسرے آدمی کو اس سے بڑی ایذا پہونچتی ہے۔ اور شرعاً یہ قطعاً حرام ہے۔ ہاں اجازت لے کر استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

بس یہ ہیں ضروری ضروری باتیں جن کی پابندی اس راستہ میں نکلنے والوں کے لیے ضروری ہے۔ آپ لوگوں کے ۲۴ گھنٹے ان پابندیوں کے ساتھ گزرنے چاہئیں۔ ان اعمال کی پوری پابندی کرتے ہوئے آپ اللہ کی زمین میں اور اللہ کی مخلوق میں پھریں اور اپنے لیے اور پوری امت مسلمہ کے لیے اور عام انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگیں۔ بس یہی آپ کا عمل اور آپ کا وظیفہ ہو۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ جو ارحم الراحمین ہے ہرگز محروم نہیں رکھے گا۔

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابیطس اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے۔ چند ہفتہ کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جیسی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے۔ چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت سے دس تولہ کی ایک یا پانچ تولہ

شربت جذام۔ جذام میں یہ دوا بے حد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ -/5

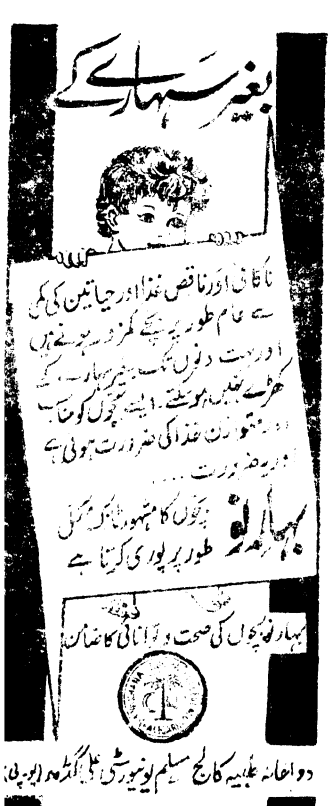
شربت کنر۔ پتہ کی پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر، ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے۔ ایک پونڈ -/5

شربت درد گردہ۔ پیشاب میں کھبری ریت آنا یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے جن کی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ قیمت ایک پونڈ -/5

مرہم سرج۔ پھوڑوں مخصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے۔ اس کے استعمال سے ملین کافور ہو جاتی ہے۔ قیمت 3/50

منیجر **حسنی فارمیسی**

۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



فون نمبر
332280

تار کا پتہ
CUBCATLLE



بہترین چائے
کے لیے
یہ ٹریڈ مارک
یاد رکھیے



ہوٹلوں میں
ہماری چائے استعمال کیجیے تاکہ گاہک خوش ہوں

ہمارے یہاں
نیل گری سے لے کر آسام تک کے تمام مشہور باغات کی چائے
مناسب نرخ پر فراہم کی جاتی ہے ، تجربہ شرط ہے



عباس علاء الدین اینڈ کمپنی
۱۴۴ ، حاجی بلڈنگس ، ایس ، ڈی پٹیل روڈ
نل بازار ، بمبئی ۳

چائے کے تھوک اور خوردہ بیوپاری

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی

دُعا

جن لوگوں نے حضرت مولانا مرحوم کو دُعا کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہیں سُنا وہ بالکل اندازہ نہیں کر سکتے کہ کسی کا دُعا میں یہ حال بھی ہوتا ہے اور کوئی اس طرح مجسم دُعا بن کے بھی، اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو جن نعمتوں سے نوازا تھا اُن میں سے ایک عظیم ترین نعمت حقیقتِ دعا تھی ——— ہماری بڑی آرزو تھی کہ اللہ کے کسی بندہ نے کسی اجتماع میں مولانا کی دعا کو لفظ بلفظ لکھا ہو اور وہ ہم کو مل جائے لیکن اس کی امید اس لیے نہ تھی کہ اُن کی دعا کے وقت ہر شخص اپنے امکان کی حد تک ظاہر و باطن سے ان کی دعا میں شریک ہونا چاہتا تھا اس لیے جو حضرات تقریروں کا لفظ لفظ لکھنا چاہتے تھے وہ دعا کا ایک لفظ بھی نہیں لکھتے تھے ——— لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ آرزو اس طرح پوری فرمائی کہ ہمیں معلوم ہوا کہ مراد آباد کے آخری اجتماع میں آپ کی دعا کے وقت ایک صاحب نے خفیہ طور پر ریکارڈ نعیں لگا کر آپ کی دعا کا ریکارڈ کر لی تھی، اُس کی مدد سے آپ کی دعا لفظ بلفظ قلمبند کر لی گئی اور وہ بالکل حضرت مولانا مرحوم کے الفاظ میں ایک لفظ کی کمی بیشی کے بغیر ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مراد آباد کے ان احباب کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے اس کو اہتمام اور محنت سے قلمبند کر کے مرحمت فرمایا۔ دعا میں جو الفاظ مکرر سہ کرر ہیں وہ اصل دعا میں اسی طرح تھے۔ (درود شریف کے بعد بالجہر دعا اس طرح شروع فرمائی)

اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم، الم اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم وعنت الوجوہ للحی القیوم لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظٰلمین، یا احد الصمد الذی لم یلد ولم یولد

ولم یکن لہ کفوا احد۔ یا ارحم الرحمین، یا ارحم الراحمین، یا ذا الجلال والاکرام یا ربنا یا سیدنا یا مولانا و یا غایۃ رغبتنا یا خالق انفسنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔ ربنا اغفر لنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔ رب اغفر وارحم وتجاوز عما تعلم انک انت الاعز الاکرم۔ اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک۔ اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک، اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک، یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک اللھم ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملک منہا شیئا فاذا فعلت ذلک بنا فکن انت ولینا واھدنا الی سواء السبیل، اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ اللھم ارزقنا حبک وحب رسولک وحب من ینفعنا حبہ عندک والعمل الذی یبلغنا حبک اللھم اجعل حبک احب الاشیاء الی واجعل خشیتک اخوف الاشیاء عندی۔ اللھم لا سھل الا ما جعلتہ سھلا وانت تجعل الحزن سھلا اذا شئت لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب العرش العظیم الحمد للہ رب العلمین اسئلک موجبات رحمتک وعزائم۔ مغفرتک والغنیمۃ من کل ذنب والغنیمۃ من کل بر والسلامۃ من کل اثم لا تدع لی ذنبا الا غفرتہ ولا ھما الا فرجتہ ولا کربا الا نفستہ ولا ضرا الا کشفتہ ولا حاجۃ ھی لک رضی الا قضیتہا یا ارحم الراحمین۔ الیک رب تحببنا وفی النفسنا فذللنا وفی اعین الناس فعظمنا ومن سیئ الاخلاق فجنبنا وعلی صالح الاخلاق فقومنا وعلی الصراط المستقیم فثبتنا وعلی الاعداء اعداء ائک اعداء الاسلام فانصرنا اللھم انصرنا ولا تنصر علینا اللھم اکرمنا ولا تھنا اللھم آثرنا ولا تؤثر علینا اللھم زدنا ولا تنقصنا اللھم امکر لنا ولا تمکر علینا اللھم ارحمنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا اللھم اشرح صدورنا للاسلام اللھم حبب الینا الایمان وزینہ فی قلوبنا وکرہ الینا الکفر والفسوق والعصیان، اللھم اجعلنا من الراشدین اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء

والصالحین وحسن اولئک رفیقا۔ اللھم اھد امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللھم سلمھم الکتاب والحکمۃ اللھم افھمھم مراشد امورھم، اللھم اجعلھم دعاۃ الیک وال رسولک اللھم ثبتھم علی ملۃ رسولک اللھم اوزعھم ان یشکروا نعمتک التی انعمت علیھم وان یوفوا بعھدک الذی عاھدتھم علیہ اللھم افرغ علیھم صبرا وثبت اقدامھم علی عدوک وعدوھم الہ الحق امین اللھم اھد ھذہ البلدۃ اللھم اھد ھذا الملک اللھم اھد ھذہ الحکومۃ اللھم اھد الناس جمیعا اللھم اھد الناس جمیعا اللھم اھد الناس جمیعا۔ اللھم علیک بصنادید الیھود والنصاری والمشرکین اللھم علیک باشداءھم علی الاسلام والمسلمین اللھم اقطع دابرھم اللھم خذ ملکھم واموالھم اللھم مزق اسلحتھم اللھم اھلکھم کما اھلکت عادا وثمود اللھم فذھم اخذ عزیز مقتدر اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھودیۃ والنصرانیۃ والمجوسیۃ والشیوعیۃ والشرک عن قلوب المسلمین یا مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شئ قدیر اللھم ایّد المسلمین فی مشارق الارض ومغاربھا یا الامام العادل والخیر والطاعات واتباع سنن سید الموجودات اللھم وفقھم لما تحب وترضی واجعل اٰخرتھم خیرا من الاولی۔ اللھم انصر الاسلام والمسلمین فی مشارق الارض ومغاربھا اللھم اعز الاسلام والمسلمین فی العرب والعجم اللھم اعل کلمۃ الاسلام والمسلمین فی المملکۃ الھندیہ وغیرھا من الممالک المحققۃ اللھم ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار اللھم انا نسئلک العفو والعافیۃ والفوز فی الدنیا والاخرۃ اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاخرۃ اللھم ارحمنا بترک المعاصی ابدا ما ابقیتنا اللھم اعنا علی تلاوۃ القرآن وذکرک

وشکرك وحسن عبادتك اللّٰھمّ جنّبنا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن اللّٰھمّ جنّبنا واولادنا و احبابنا واقاربنا وجمیع المبلغین والمعلمین والمتعلمین عن الفواحش ما ظھر منھا وما بطن وجنّبنا الحرام حیث کان واین کان وعند من کان وحُل بیننا وبین اھلہ۔ اللّٰھمّ انا نسئلك من خیر ما سئلك منہ نبیّك محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونعوذ بك من شر ما استعاذ بك منہ نبیّك محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھمّ انا نسئلك رضاك والجنۃ اللّٰھمّ انا نسئلك الجنۃ وما قرب الیھا من القول والعمل۔ اللّٰھمّ انا نعوذ بك من عذاب جھنم ونعوذ بك من عذاب القبر ونعوذ بك من فتنۃ المسیح الدجال۔ ونعوذ بك من فتنۃ المسیح الدجال و نعوذ بك من فتنۃ المسیح الدجال ونعوذ بك من فتنۃ المحیا والممات ونعوذ بك من الماثم والمغرم ونعوذ بك من ان نموت فی سبیلك مدبرا اللّٰھمّ تثبیتاً کتثبیت موسیٰ علیہ السلام اللّٰھمّ تثبیتاً کتثبیت موسیٰ علیہ السلام اللّٰھمّ تثبیتاً کتثبیت موسیٰ علیہ السلام اللّٰھمّ واقیۃ کواقیہ الولید اللّٰھمّ واقیۃ کواقیہ الولید اللّٰھمّ نصراکما نُصِرَ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونصر اصحابہ اللّٰھمّ نصراکما نُصِرَ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونصر اصحابہ اللّٰھمّ نصراکما نُصِرَ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونصر اصحابہ اللّٰھمّ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔

اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما یا اللہ ہماری لغزشوں کو معاف فرما۔ اے اللہ ہم قصوروار ہیں ہم خطاکار ہیں ہم گنہ گار ہیں ہم مجرم ہیں۔ ہماری ساری زندگی خواہشات کی اتباع میں گذر گئی اے خداوند قدوس ہم دنیا کو سامنے رکھ کر اس سے متاثر ہوئے اور اسی کے یقین میں جذب ہو گئے اور اسی کے طالب بن گئے اور اسی کے اندر اپنی ساری صلاحیتوں کو ہم نے ضائع کر دیا۔ اے خدا ہماری محنت کے بگڑ جانے کے اس جرم عظیم کو معاف فرما جس جرم عظیم سے ہزاروں خرابیاں ہم میں پیدا ہو گئیں اور ہزاروں ہمارے اندر کی دولتیں لٹیں اے خدا اس محنت کا بدلنا یہ ہمارا جرم عظیم ہے ساری اُمّت کے اس جرم عظیم کو معاف فرما اے خدا ساری اُمّت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جرم کو معاف فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس محنت پر ڈال کر گئے اس محنت کو چھوڑ کر ان محنتوں میں الجھ گئے جن محنتوں سے

نکال کر وہ گئے تھے اے خدا اس محنت کا بدلنا یہ ہمارا سب سے بڑا جرم ہے اس کو خصوصیت کے ساتھ معاف فرما اور اس محنت کو چھوڑ دینے کی بنا پر پھر جتنے جرائم میں ہم مبتلا ہوئے ایک ایک جرم کو اپنے کرم سے معاف فرما اور ایک ایک عصیاں کو معاف فرما ایک ایک گناہ کو معاف فرما اے اللہ کمائیوں کی لائن کی ہماری عصیاں اور خرچ کی لائن کی ہماری عصیاں اور معاشرت کی لائن کی ہماری عصیاں اے اللہ ہر لائن میں ہم عصیاں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں اے اللہ نکلنے کی ہمارے لیے کوئی صورت نہیں ڈوبا ہوا خود کہاں نکل سکتا ہے جو ڈوبا نہیں ہے وہی نکال سکتا ہے، اے خدا ہم سب ڈوبے ہوئے ہیں اور تو ہی نکالنے والا ہے، اے اللہ عصیاں کے دریاؤں میں سے ہم کو نکال لے اپنے فضل سے نکال دے اپنے کرم سے نکال دے اے کریم نافرمانیوں کے دریاؤں میں سے اپنے کرم سے نکال دے اے اللہ اپنی رحمت کی رسی ڈال اور ہمیں کھینچ لے اور ہمیں عصیاں کی دریاؤں میں سے نکال دے اور ہمیں طاعت کی سڑکوں پر ڈال دے اے اللہ ہمیں قربانیوں کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہونچا دے۔ اے اللہ ہمیں دین کی محنت کے لیے قبول فرما، ہم سب کو دین کی محنت کے لیے قبول فرما۔ اور اے اللہ سو فیصد اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کی محنت کے لیے قبول فرما لے۔ علم کی محنت کے لیے ایمان کی محنت کے لیے عبادت کی محنت کے لیے ذکر کی محنت کے لیے اخلاق کی محنت کے لیے نمازوں کی محنت کے لیے حج کی محنت کے لیے روزوں کی محنت کے لیے زکوٰۃ کی محنت کے لیے ان سارے فرائض و عبادات کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے پر آجانے کے لیے ہم سب کو اس کی پوری پوری توفیق و محنت نصیب فرما۔ اے اللہ اے اللہ ہماری زندگی کے شعبوں کی بدعملیوں کو بھی دور فرما کمائی کی بدعملیوں کو دور فرما اور کمائی کے اعمال صالحہ کو زندہ فرما، گھر کی زندگیوں کی بدعملیوں کو دور فرما اور اعمال صالحہ کو گھریلو زندگیوں میں زندہ فرما، معاشرت کی بدعملیوں کو ختم فرما، اے اللہ عدل و انصاف والے اعمال کو ہماری معاشرت میں زندہ فرما، اے اللہ ہمیں نیک اعمال سے آراستہ فرمادے اور بُرے اعمال سے ہم کو نکال دے، اے خداوند قدوس جس قسم کے زمانے میں تو نے اس تبلیغ کے ذریعہ اس کلمہ و نماز و محنت کی صورت پیدا فرمادی اور ہمارے تمام دوستوں کو اس پر جمع ہونے کی اور کہنے سننے کی اور اپنی راہ میں نکلنے کی توفیق دی۔ اے اللہ جب تو نے اپنا کرم فرما کر اس کام کے کہنے سننے کا رخ پیدا فرمادیا، اور اس کی کام کی نقل و حرکت کا رخ پیدا فرمادیا اے کریم اپنے کرم سے سب کو قبول فرمالے اور ان سب کی ایسی تربیت فرما کہ یہ نقل و حرکت تجھے پسند آجائے تو ہی اپنے کرم سے اس ترتیب کی اور نقل و حرکت کی تربیت فرما تو ہی مربی ہے

تو ہی تربیت کرنے والا ہے تو ہی تزکیہ کرنے والا ہے اور تو ہی پاک وصاف کرنے والا ہے، اے اللہ اس نقل وحرکت کو قبول فرما اے اللہ اس نقل وحرکت کو قبول فرما اے اللہ اس نقل وحرکت کو قبول فرما انتہائی رقت کے ساتھ) اے خدا ان کو اخلاص نصیب فرما، اے اللہ ان کو اخلاص نصیب فرما، اے اللہ ہم سب کو اخلاص نصیب فرما، اے اللہ ہم سب کو اپنی قدرت پر یقین نصیب فرما، ہم سب کو یقین نصیب فرما ہم سب کو اپنے وعدوں پر یقین نصیب فرما، یا اللہ ہمارے عقیدوں کو درست فرمادے اور اس محنت کے لیے ہمارے اندر وہ جذبات پیدا فرمادے، اے خدا جن قربانیوں سے اے اللہ یہ مٹی کے گندے قطرے کا بنا ہوا انسان تیرا دوست بن جاتا ہے اور جن قربانیوں سے تیرا محبوب بن جاتا ہے اے خدا ان قربانیوں کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے! اے اللہ جس کرم سے تو نے یہ کام اٹھایا اب اس کام کو تکمیل کو پہونچادے[1]، اس کام میں لگنے والوں میں دنیا کی رغبت ان کے دلوں سے نکال دے، ملک ومال کی رغبت ان کے دلوں سے نکال دے، اقتدار کی ہوس ان کے دلوں سے نکال دے، دنیا کے نقشے کے بارے میں بے رغبتی ان کے دلوں میں پیدا فرمادے، موت کی حقیقت ان کو عطا فرما، قناعت کی دولت ان کو نصیب فرما، اے اللہ صبر واخلاص، مجاہدے کی طاقت ان کو نصیب فرما، اے خدا جس مجاہدے پر انسان اندر سے تیرے انوارات سے جگمگا جاتا ہے اور تیرے صفات اخلاق ان اعلیٰ مجاہدوں پر اے اللہ ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اخلاق کی چوٹیوں پر انسان پہونچ جاتا ہے اے اللہ وہ مجاہدے کی دولت ہم سب کو نصیب فرما۔ اے اللہ جس طرح تو نے یہ کام اٹھایا اس کام کو ہدایت کے پوری دنیا میں آجانے کا اس کام کو سو فیصد ذریعہ قرار دیدے اے اللہ سارے انسانوں کے لیے اور سارے ملکوں کے لیے اور سارے مسلمانوں کے لیے ہدایت ملنے کا سبب اس کو قرار دیدے، سارے زمانوں قوموں ملکوں میں اس محنت کے پہونچنے کے لیے قبول فرمالے! اور یا اللہ ہدایت عام فرما، ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو ہمارے رشتہ داروں کو اور اس کام میں لگنے والوں کو ان کے متعلقین اور رشتہ داروں کو اور ان سے تعلق ومحنت رکھنے والوں کو اس ہدایت میں سے نصیب فرما جو تو مجاہدین کو ہدایت دیا کرتا ہے اور تو داعیوں کو ہدایت دیا کرتا ہے اور جو تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو ہدایت نصیب فرمائی تھی اور تو نے انبیاء سابقین کو اور اولیاء اللہ کو ہدایت وقربانی عطا فرمائی تھی، اے اللہ اس ہدایت سے ہم سب کو بھرپور حصہ نصیب فرما۔ اے اللہ ان خالی ہاتھوں کو اپنے کرم سے بھردے اور ان خالی دلوں کو اپنے کرم سے بھردے، اپنے عشق سے اور اپنی محبت سے ہدایت کا فرمان ہمارے لیے فرمادے۔ یا اللہ پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اے اللہ، اے اللہ جو انھیں ضلالت کی طرف کھینچے ان کے ہاتھوں سے

---

[1] یہ جملہ تین دفعہ فرمایا۔

انھیں چھوڑ دے اور جو انھیں ہدایت کی طرف کھینچے ان کے ہاتھوں کی طرف ان کو منتقل کر دے، اے خدا اس امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود و نصاریٰ مشرکین و ملحدین کے ہاتھوں سے چھڑا دے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادوں پر ان کو کھڑا کر دے، اے اللہ ان کے یقینوں کو ٹھیک کر، ان کو ہدایت نصیب فرما، ان کو ایمان کی قوت نصیب فرما، ان کو علوم نبویہ کا استقبال نصیب فرما، اسلام کی دولت ان کے سینوں میں اتار دے اور انہیں ذکر ان کے دلوں کو نصیب فرما دے اور دنیا کی بے رغبتی نصیب فرما کر علم دین سیکھنے کے مطابق زندگی گذارنے کی ہدایت نصیب فرما عام انسانوں کو ہدایت نصیب فرما، اس ملک کے بسنے والوں کو ہدایت نصیب فرما، اے اللہ اس ملک کے حاکم و محکوم کو یہاں کی اقلیت و اکثریت کو، اے اللہ اس راستے کی ہدایت نصیب فرما! اے اللہ درندوں کی اور انسانوں کی قسم سے جتنے انسان اور درندے انسان ہیں اور جن کو تجھے انسانیت سے نوازنا ہی نہیں اے خدا ایسے ایسوں کو چن چن کر ہلاک فرما، ایسوں کو زمینوں کو اس کے لیے پھاڑ دے ایسوں کے مکانوں کو ان پر توڑ دے، ایسوں سے نعمتوں کو اپنی چھین لے، ایسی عبرت ناک سزائیں عطا فرما کہ دنیا دیکھ لے کہ جو اپنی انسانیت کو بگاڑتا ہے خدا اس کی صورتوں کو اس طرح بدلتا ہے اے خدا ظالم ترین مفسد ترین انسانوں کو چن چن کر ہلاک فرما، جن ناکوں کی ہدایت سے قوموں اور ملکوں میں ہدایت آجائے ان کو ہدایت نصیب فرما، اور جن ناکوں کی اے اللہ ہلاکت سے قوموں اور ملکوں کے ضلالت و فساد ختم ہو جائیں اے اللہ اس کو چن چن کر ہلاک فرما دے اے خدا لوٹ و کھسوٹ کے ماحول کو ختم کر، ظلم و ستم کے ماحول کو ختم کر، عدل و انصاف کے ماحول کو قائم کر، علم و ذکر کے ماحول کو قائم کر، خدمت خلق کے ماحول کو قائم کر۔ تعاون و ہمدردی و محبت کے ماحول کو قائم کر، اے اللہ ہماری دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما، ہمارے مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی فرما ہمارے محتاجوں کی حاجتوں کو پورا فرما، ہمارے بیماروں کو تندرستی عطا فرما۔ جو آنکھ کے بیمار ہیں ان کو آنکھ کی شفا عطا فرما، اے اللہ جو معدے کے بیمار ہیں ان کو معدے کی شفا عطا فرما اور بقیہ جتنے آدمیوں نے اس جلسے میں ہم سے دعاؤں کے لیے کہا یا آج تک اس سے پہلے ہم سے دعاؤں کو کہا یا آئندہ ہم سے وہ دعاؤں کو کہیں اے اللہ سب کی حاجتوں کو پورا فرما اور سب کی پریشانیوں کو ختم فرما اے اللہ اس جلسے کو سارے ہی انسانوں کے لیے اور سارے ہی مسلمانوں کے لیے اس جلسے کو انتہائی باعث خیر و برکت باعث رشد و ہدایت، باعث لطف و رفعت اور باعث فلاح و فوز اپنے لطف و کرم سے فرما ہماری دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔ ان نکلنے والوں کو اپنے کرم سے قبول فرما۔ آمین

MISWAK

مسواک

ٹوتھ برش
استعمال کیجئے

اس میں کسی جانور کے بال نہیں ہیں

دینی نظر سے درست

دنیوی نقطۂ نظر سے تندرست

ہر جگہ ملتا ہے



ہم آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ آئندہ صفحات میں

کتب خانۂ الفرقان کی مختصر فہرست

پر ایک نظر ضرور ڈال لیں!

کتب خانۂ الفرقان

ایک مقصدی ادارہ ہے

اس سے جو کتاب شائع کی جاتی ہے وہ وقت کے تقاضے، دورِ حاضر کی دینی ضرورت اور لوگوں کے دینی فائدہ ہی کی غرض سے ——— شائع کی جاتی ہے ———

کتابیں طلب کرنے والے حضرات

(۱) اپنا پتہ صاف اُردو میں لکھیں اور ہو سکے تو انگریزی میں بھی۔

(۲) اگر کسی کتاب کے بھیجنے میں یا بل میں ہم سے غلطی ہو جائے تو فوراً اطلاع دیجائے تلافی کی جائے گی۔

(۳) پاکستان کے حضرات کتابیں منگوانا چاہیں تو پہلے خط لکھ کر ہم سے دریافت کر لیں کہ ان کی مطلوبہ کتابیں ہم بھیج سکیں گے یا نہیں، اور طریقۂ کار کیا ہوگا۔

منیجر کتب خانۂ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ، یوپی

کتب خانۂ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے

قیمت ۳۷/-

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

دوسری دفعہ نظر ثانی اور معتدبہ اضافہ و ترمیم کے بعد بھلا نیا اڈیشن

(انگریزی اور ہندی اڈیشن بھی تیار ہو چکا ہے)

اس کتابچے کو دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے۔ اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل انشاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر، کتابت و طباعت اعلیٰ اور معیاری مجلد ۲/۵۰

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد -/۳، انگریزی ایڈیشن ۵/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اور اپنی نماز میں خشوع کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

کلمۂ طیبہ کی حقیقت کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ..... -/۱

معارف الحدیث

یعنی احادیث نبویؐ کا ایک جدید مجموعہ مع ترجمہ و تشریح

جو دور حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری حالت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے، احادیث نبویؐ کی جو اصل غرض و غایت اور روح ہے یعنی اصلاح و ہدایت اور تزکیہ و تربیت مؤلف نے پوری کوشش کی ہے کہ یہی غایت و روح اس کتاب کی بھی رہے، اور ارشادات نبویؐ کے جو اثرات صحابۂ کرامؓ پر پڑتے تھے ان کا کوئی عکس اس کتاب کے ناظرین پر بھی پڑے اسی کے ساتھ ہر حدیث سے متعلق سوالات کے علمی و تحقیقی جوابات عام فہم انداز میں۔

ابھی تک تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔

جلد اوّل۔ ایمان اور آخرت کے بیان کی حدیثیں

قیمت مجلد -/۵ غیر مجلد -/۴

جلد دوم۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں

قیمت مجلد ۵/۵۰، غیر مجلد ۴/۵۰

جلد سوم۔ طہارت اور نماز کے ابواب کی حدیثیں

قیمت مجلد -/۸، غیر مجلد -/۷

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن صوم رمضان اور ماہ رمضان اور اسکے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور انکی مدلل تاریخ کا نہایت مؤثر و شوق انگیز بیان اور حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن

قیمت ..... -/۷۵

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اسکے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔

شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے

قیمت ..... -/۷۵

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

از مولانا محمد منظور نعمانی

قرآن پاک نے نوع انسانی کو جن چیزوں کی طرف خاص طور سے دعوت دی ہے یہ کتاب قرآن پاک کی اس دعوت و پکار کی ترجمان ہے ۳۰ ابواب میں متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے

مجلد ..... -/۴

دین و شریعت

از: مولانا محمد منظور نعمانی

یہ "اسلام کیا ہے؟" سے اونچی سطح کی کتاب ہے جس میں توحید، آخرت اور رسالت، نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر اسی تحقیقانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان، ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں، بڑے بڑے ارباب نظر نے اسکو اسلام پر ایک علمی بحث اور جامع و مانع کتاب قرار دیا ہے۔ کتابت و طباعت معیاری قیمت مجلد -/۳

دین و شریعت کا انگریزی اڈیشن بھی تیار ہو گیا ہے مجلد -/۵

آپ حج کیسے کریں؟

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

(مفید اضافات کے ساتھ حدید اڈیشن)

حج و زیارت کے موضوع پر اب تک اردو میں بیشمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب پچھلی تمام کتابوں سے اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اس کا پورا طریقہ بھی بہت آسان اور دلنشین طریقہ پر بتایا ہے اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی روح اور جان ہے قیمت مجلد -/۲

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت

تالیف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت مجلد -/۳

غیر مجلد ۲/۵۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی ۱/۵۰

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ قیمت -/۱

آسان حج

اسے آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ سمجھئے۔ کم تعلیمیافتہ حضرات کیلئے حج کا بہترین معلم اور رہنما ہے۔ جیبی سائز آفسٹ کی بہترین طباعت۔ حدید اڈیشن قیمت -/۶۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ان الزامات کا تحقیقی جواب

قیمت -/۷۵

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تعیین و تفصیل جس کی وجہ سے امت نے آپ کو بجا طور ایک صدی کے بعد ایک ہزارے کا مجدد مانا۔ اس کے علاوہ آپ کی سوانح حیات اور دین کی راہ میں قربانیاں اور اسلام میں مقام تجدید کی حقیقت (یہ الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کا کتابی اڈیشن ہے)

قیمت مجلد -/۴

ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ حجاز

آج سے ایک سو پچاسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد، ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی مرزا الدین صاحب مراد آبادیؒ نے حرمین شریفین کا سفر تڑپتے ہوئے عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفر عشق کی مکمل روئداد قلم بند کر کے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی، تاریخی اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفر کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہندوستان کے بہت ہی نادر حالات اور معلومات اسکے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی روحانی کیفیات کا تو یہ عجیب و غریب ہی مرقع ہے۔

قیمت: ۱/۷۵

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد آپ کی مسند اصلاح و ہدایت کو آپکے خلیفہ اور صاحبزادہ خواجہ محمد معصومؒ نے سنبھالا اور آپکے کام کو تکمیل تک پہونچایا۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کو تخت حکومت پر مجاہدانہ سہیل اللہ اور زاہدانہ زندگی اور معاشرہ میں فقیرانہ بسر کرنے والا بنایا۔ آپکے مکتوبات کا جو ذخیرہ فارسی میں تھا اس کو تلخیص کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد -/۴

معرکۃ القلم

اکابر علماء دیوبند پر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب، مولانا نعمانی کے قلم سے

قیمت ۱/۵۰

اسلام و کفر کے حدود اور قادیانیت

از مولانا نعمانی قیمت /۵۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

از مولانا نعمانی قیمت /۵۰

دوسرے اداروں کی قابل مطالعہ کتابیں

قرآن پاک سے متعلق

درس قرآن
قرآن پاک کی عام فہم تفسیر ایک ایک صفحے کے درس کی شکل میں مع ترجمہ تحت اللفظ و با محاورہ ۴ جلدیں تیار ہو چکی ہیں جلد اول (منزل اول) مجلد ۱/ جلد دوم (منزل دوم) مجلد ۱/ جلد سوم (منزل سوم) مجلد ۸/ جلد چہارم (منزل چہارم) مجلد ۸/ ہر گھر میں رہنے کے قابل شائع کردہ ادارہ صلاح و تبلیغ، لاہور۔

قصص القرآن
از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم قرآن مجید میں جیا علیہم السلام اور انکی قوموں کے جو عبرت آموز واقعات بیان ہوئے ہیں علمی تاریخی اور جغرافیائی بحث کے ساتھ انکی پوری تحقیق۔ مکمل چار جلدوں میں جلد اول ۸/ جلد دوم ۸/ جلد سوم ۵/ جلد چہارم ۸/ مجلد کے لئے فی جلد ۱/ کا اضافہ

قرآنی شخصیتیں
از مولانا عبدالماجد دریابادی قرآن مجید میں جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں انکا تحقیقی تعارف ۱/۴

حیوانات قرآنی
از، مولانا دریابادی۔ قرآن پاک میں مذکورہ حیوانات کا تذکرہ اور ضروری معلومات۔ ۲/

جغرافیہ قرآنی
قرآن مجید میں مذکور مقامات و بلاد کا جغرافیائی تعارف قیمت ۱/۴۵

بشریت انبیاء
قرآن مجید سے بشریت انبیاء ۴ کا قابل دید اثبات۔ از مولانا دریابادی قیمت ۲/۴۵

قصص و مسائل
از مولانا دریابادی۔ قیمت ۲/

فہم قرآن
از مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ جس میں مایل طور سے بتایا گیا ہے کہ تفسیر حدیث کے قرآن پاک کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ قیمت ۲/۲۵

وحی الٰہی
از مولانا اکبرآبادی قیمت ۱/۲

قرآن اور تعمیر سیرت
از ڈاکٹر سید ولی الدین ایم اے پی ایچ ڈی حدیث تعلیمیات حضرات ضرور مطالعہ کریں۔ مجلد ۸/ غیر مجلد ۵/

قرآن اور تصوف
از ڈاکٹر ولی الدین قیمت ۳/

لغات القرآن
اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی مفصل تشریح۔ جلد اول ۵/ دوم ۵/ سوم ۵/ چہارم ۵/ (مجلد کے لئے فی جلد ۱/ کا اضافہ)

المفوز الکبیر
اصول تفسیر پر شاہ ولی اللہ کے بے نظیر محققانہ رسالہ کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۱/

حدیث پاک سے متعلق

بخاری شریف کامل (اردو)
تین جلدوں میں۔ مجلد ۲۵/

زبدۃ البخاری
اسانید اور مکررات حذف کر کے بخاری شریف کی احادیث کا ترجمہ ۱۲/

ترمذی شریف (اردو)
دو جلدوں میں۔ مجلد ۱۶/

مشکوٰۃ شریف (اردو)
دو جلدوں میں۔ مجلد ۱۷/

مؤطا امام مالک
(اردو ترجمہ مع متن عربی) متداول کتابوں میں یہ حدیث نبوی کا سب سے قدیم مستند مجموعہ ہے قیمت۔ مجلد ۸/

انتخاب صحاح ستہ
(اردو ترجمہ مع متن عربی) قیمت ۵/

مشارق الانوار
بخاری و مسلم کی ۲۲۰۲ قولی حدیثوں کا اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ از مولانا حشم علی خان مجلد ۱۲/

حصن حصین
(عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول متعدد مقبول دعاؤں کا مجموعہ مجلد ۸/

مختصر شعب الایمان
از امام بیہقی۔ ترجمہ اردو قیمت ۱/

بستان المحدثین
کتب حدیث کا تعارف اور آئمہ حدیث کا تذکرہ۔ از شاہ عبدالعزیز صاحب۔ قابل دید کتاب ہے مجلد ۵/

شرح شمائل ترمذی
از، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا ظلہ علی، تحقیقی ہونے کے ساتھ بڑی تبحر انگیز کتاب ہے۔ قیمت ۶/

ترجمان السنہ
از حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہتمم مدینہ طیبہ اردو میں حدیث کی نہایت محققانہ شرح ہو ابھی صرف ۳ جلدیں تیار ہوئی ہیں جلد اول ۱۰/ جلد دوم ۹/ جلد سوم ۱۰/ مجلد کے لئے فی جلد ۲/ کا اضافہ

تدوین حدیث
از مولانا سید مناظر احسن گیلانی تدوین حدیث کی نہایت مفصل اور محققانہ تاریخ جس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ حدیث نبوی کا جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقہ پر پہنچا ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں ہے۔ قیمت مجلد ۶/۵۰

لغات الحدیث
(اردو) مشہور خادم حدیث مولانا وحید الزماں خاں صاحب کی مرتب کردہ لغات حدیث جو اپنے موضوع پر اپنا سا تہ اور طلبہ کیلئے بالکل کافی وافی ہے۔ چھ ضخیم جلدوں میں۔ قیمت مکمل ۷۲/

مختصر خصائل نبوی
قیمت ۱/

تاریخ و سیرت

رحمۃ للعالمین (کامل) ۳ جلد
از قاضی سلیمان منصور پوری رح
سیرت پر بے نظیر مقبول اور بہت آخر میں
کتاب ہو تعارف سے بے نیاز ہے۔
قیمت کامل ۷/۰

اسلام (آغاز دارتقا)
(از حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)
قیمت ۶/

اصح السیر
مولانا عبدالرؤف دانا پوری مرحوم
کی تالیف کردہ نہایت محققانہ اور
مستند سیرت نبوی۔ قیمت ۱۰/-

خطبات مدراس
حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں
پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خطبات
جو مرحوم کی علم و تحقیق کا نچوڑ
ہیں ——— قیمت ۳/-

رحمت عالم
از مولانا سید سلیمان ندوی رح
یہ کتاب خاص طور سے مدارس
اور سکولوں کے طلبہ کیلئے لکھی گئی
تھی ——— قیمت ۱/۷۵

سیرت محمدیہ
از، سر سید احمد خاں مرحوم
صوبہ یوپی کے ایک انگریز گورنر نے سر ولیم
میور نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک
کتاب "لائف آف محمد" لکھی تھی جو
زہر افشانیوں اور افترا پردازیوں
سے بھری تھی، سر سید مرحوم نے لندن
میں بیٹھ کر اسکے جواب میں "سیرت محمدیہ"
لکھی "تاریخی و معرکۃ الآرا کتاب ہے"
قیمت مجلد ۱۲/-

زاد المعاد (اردو)
از حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات
طیبہ پر جو کتابیں گزشتہ صدیوں
میں لکھی گئی ہیں ان میں علم و تحقیق
کے لحاظ سے زاد المعاد کا خاص
مقام ہے یہ ۴ جلدوں میں ہو اس کا
اردو ترجمہ اردو داں طبقہ کے لئے
بڑی نعمت ہے۔ ترجمہ بھی ۴ جلدوں
میں ہے۔ قیمت مکمل مجلد ۸/۴

ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم
از، ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری۔
ترجمہ۔ از شاہ حسن عطا ایم اے
حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا زمانہ
خلافت دراصل عہد نبوی کا نتیجہ تھا
ان ۱۲ سالوں میں وہ ہوا جس نے
دنیا کا رخ بدل دیا، اور جو بلاشبہ
تاریخ انسانی کا ایک معجزہ ہے پوری
تفصیل اس کتاب میں دیکھی جاسکتی
ہے۔ قیمت مجلد ۶/۷۵

صدیق اکبر
از، مولانا سعید احمد اکبر آبادی
مولانا شبلی مرحوم کے "الفاروق"
کے بعد اردو زبان میں سیرت صدیق اکبر
کا جو خلا محسوس ہوتا تھا اسکو اس
کتاب کی حد تک پر کر دیا ہے ندوۃ المصنفین
کی شائع کردہ ہے۔ قیمت ۷/-

حضرت ابوبکر کے سرکاری خطوط
بڑی فاضلانہ قابل مطالعہ
کتاب ہے۔
قیمت ——— ۵/-

فاتح خیبر
از، رئیس احمد جعفری ندوی
قیمت مجلد ۵/۵۰

فاتح مصر
فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ
کی شخصیت اسلام لانے سے پہلے بھی
اور بعد میں بھی سیاسی بصیرت و کردار
کے لحاظ سے بہت ممتاز تھی، وہ
کامیاب ترین جنگی قائد اور غیر معمولی
قسم کے سیاستدان تھے۔ انکی مفصل
سوانح مصر کے ایک فاضل استاد
محمود زہران نے لکھی ہے اس کا کامیاب
اردو ترجمہ شیخ محمد احمد نے کیا ہے۔
قیمت ۷/۵ ۱۰/

تاریخ اسلام
(مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)
کامل تین حصوں میں
حصہ اوّل۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ
حصہ دوم۔ خوانین و بنو عباس کا عہد
حصہ سوم۔ اندلس، دولت معاویہ،
سلجوقیہ، عثمانیہ، خوارزم شاہیہ،
اور اس وقت کی تمام مسلمان حکومتوں
کے تفصیلی حالات جو اپنے اندر بڑی عبرتیں
اور بصیرتیں لئے ہوئے ہیں۔
قیمت مکمل ہر سہ حصہ ۳۶/-

تاریخ ملت
شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی
عہد رسالت سے سلاطین ہند تک
گیارہ حصوں میں
قیمت ——— مکمل ۔/سٹ
غیر مجلد ۳۱/۵ مجلد ۳۴/

ترجمہ تاریخ الخلفاء (سیوطی)
خلافت راشدہ سے مصر کے فاطمی
خلفاء تک کی تاریخ قیمت ۱۲/-

خلافت بنو امیہ
امام ابن الاثیر جزری کی تاریخ کامل کا
اردو ترجمہ از سید اطہر ندوی خلافت
بنو امیہ کے بارہ میں سوچنے والوں کے
لئے اس کا مطالعہ ضروری ہو دور بینی
امیہ کا سا رایا و سعید آپ کو اس
میں ملے گا حصہ اوّل سنہ ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ
تک قیمت ۹/۷۵ حصہ دوم سنہ ۱۳۲ھ
سے ۱۳۲ھ تک۔ قیمت ۱۰/۷۵

فتوح البلدان (اردو)
احمد بن یحیی البلاذری متوفی ۲۷۹ھ
کی فتوح البلدان تاریخ اسلام
کی قدیم مستند کتابوں میں سے ہے اردو ترجمہ
از ذبیر احمد صدیقی۔ قیمت ۱۵/-

تاریخ فاطمیین مصر
از، ڈاکٹر زاہد علی (اکسفورڈ) مصنف
نے یہ کتاب خود فاطمی مصنفین کی قلمی
کتابوں سے اخذ کر کے لکھی ہے۔
حصہ اوّل ۸/۷۵ حصہ دوم ۸/۷۵

تاریخ فیروز شاہی
آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستانی
بادشاہ فیروز شاہ تغلق کی مکمل
سوانح حیات اور اسکے پرشکوہ عہد
حکومت (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) کا
قابل اعتماد تذکرہ جو اسی دور کے
ایک مصنف نے قلمبند کیا۔
(اردو ترجمہ)
قیمت ——— ۸/۲۵

خلفائے راشدین اور اہلبیت کے باہمی تعلقات

مترجمہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی
قیمت ۱/۷۵

دعوت اسلام

مصنفہ سر تھامس آرنلڈ
ترجمہ از مولوی عنایت اللہ دہلوی
سر تھامس علامہ اقبال کے استاد تھے ان کی کتاب سرپیچ آف اسلام کا یہ ترجمہ سید احمد خاں مرحوم نے کرایا تھا۔ پڑھنے کے قابل کتاب ہے ۹/

تاریخ فلاسفۃ الاسلام

تصنیف محمد لطفی جمعہ
ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین پی ایچ ڈی کنڈی، فارابی، بوعلی سینا، امام غزالی ابن رشد، ابن خلدون جیسے فلاسفہ اسلام کے حالات اور انکے خاص افکار و نظریات اور دنیا پر انکے اثرات قیمت ۶/۷۵

ہزار سال پہلے

از، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا احسن گیلانی، چچ پھپھی اور ہارپر ایچ صدی ہجری کے سیاحوں نے جو کچھ اپنے سفرنامہ میں لکھا مولانا گیلانی مرحوم نے ان سے اخذ کر کے یہ مرتب کیا تھا۔ قیمت ۲/۲۵

البرامکہ

مصنفہ مولانا عبدالرزاق کانپوری ۱/۲

نظام الملک طوسی

قیمت ۱/۲

حیات انور

سوانح حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری — قیمت ۲/

مغلیہ دور حکومت

چار حصوں میں
یعنی خافی خان نظام الملک کی "منتخب اللباب" کا اردو ترجمہ
از محمود احمد فاروقی
حصہ اول۔ بابر سے جہانگیر تک ۷/۵
حصہ دوم۔ دور شاہجہانی ۸/۲۵
حصہ سوم۔ دور عالمگیری ۱۱/-
حصہ چہارم۔ شاہ عالم سے محمد شاہ تک ۱۲/

اقبال نامہ جہانگیری

جہانگیر کے دور حکومت کی مکمل تصویر
تصنیف معتمد خاں بخشی ترجمہ محمد کریم
مائل۔ قیمت مجلد ۶/۷۵

شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب

مصنفہ ڈاکٹر برنیر (فرانسیسی)
ترجمہ خلیفہ محمد حسین۔ قیمت ۱۲/-

مآثر عالمگیری

اس کا مصنف ساقی خاں وقائع نگار کی حیثیت سے زندگی بھر اورنگ زیب کے ساتھ رہا۔ اسکے مطالعہ سے حیات عالمگیری کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے
ترجمہ۔ مولوی فدا علی طالب قیمت ۹/۷۵

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

از۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔
قیمت مجلد ۹/ غیر مجلد ۸/

سفینۃ الاولیاء

از۔ دارا شکوہ، ترجمہ اردو ۶/۷۵

مقدمہ ابن خلدون

فلسفۂ تاریخ پر قدیم انتظیر کتاب کا اردو ترجمہ
متعلقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین۔ قیمت ۱۵/-

تاریخ غزنا طہ

یہ کتاب لسان الدین محمد الخطیب الغرناطی کی کتاب "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ یہ ایک شہر کی ایک سلطنت کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک دور کی اور اسکے پورے تمدن کی تاریخ بھی ہے۔ ترجمہ از حکیم احمد اللہ مدنی۔ قیمت ۱۱/-

خلیفہ عبدالرحمن الناصر

اندلس میں اسلامی حکومت کی صحیح درخشاں طارق اور موسیٰ ابن نصیر سے طلوع ہوئی تو عبدالرحمن الناصر اس صبح کا نصف النہار تھا ۵/

سفرنامہ ابن بطوطہ

ترجمہ، رئیس احمد جعفری ابن بطوطہ نے جب دنیا کی سیاحت کے لئے مکہ معظمہ سے باندھی تو وہ ۲۵ سال کا نوجوان تھا اور جب یہ سیاحت ختم کی تو ۵۰ سال کا بوڑھا ہو چکا تھا۔ محمد تغلق کے زمانہ میں وہ ہندوستان بھی آیا اور اس کا سفیر بن کر چین بھی گیا۔ ہر تعلیمیافتہ کو یہ سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ ترجمہ کی تہذیب و ترتیب نے اس کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ قیمت ۱۵/-

آئینہ حقیقت نما

از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ انگریزوں کے سیاسی اغراض کے تحت مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم کی جو داستانیں تاریخ کا جزو بنا دی گئیں جنھوں نے ہندوؤں کو آج تک مسلمانوں کا دشمن بنا رکھا ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ان سب پر پردہ چاک کیا ہے ۱۲/

امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی

(از، مولانا گیلانی)
قیمت مجلد ۱۲/-

سیرۃ النعمان

(از، علامہ شبلی نعمانی)
قیمت مجلد ۴/ غیر مجلد ۳/

امام اعظم ابوحنیفہ

از، مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری
قیمت ۱/۷۵

تاریخ دعوت و عزیمت

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مشہور کتاب جو مجدد دین و مصلحین امت کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ جلد اول پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک جلد دوم آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہ نیز ان کے تلامذہ کی خدمات و حالات جلد سوم حضرت نظام الدین اولیاء و خواجہ نصیر الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات و اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی تفصیل میں قیمت جلد اول ۹/ جلد دوم ۵/۵۰ جلد سوم ۵/

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی

از پروفیسر خلیق نظامی۔ مجلد ۷/-

تذکرہ مسیح محمد طاہر پنی

قیمت ۱/۵۰

تذکرۃ الرشید

(کامل ۲ جلد) از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ قیمت ۸/-

سوانح قاسمی

(کامل ۳ جلد) از مولانا گیلانی۔ قیمت ۱۵/-

تذکرہ شیخ الہند

از مفتی عزیز الرحمن بجنوری قیمت ۲/۵۰

حیات امام ابن القیمؒ

بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبدالعظیم شرف الدین کے قلم سے۔ مترجم پروفیسر رشید احمد ارشد۔ قیمت -/۱۲

سوانح حضرت رائے پوری

امام ارشاد و معرفت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی سوانح حیات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے قیمت مجلد -/۵

سوانح حضرت مولانا محمد الیاسؒ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قیمت مجلد -/۳ غیر مجلد -/۲/۵

تذکرہ حضرت شاہ فضل رحمنؒ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قیمت -/۲/۵۰

سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ

مولانا مونگیریؒ کی سیرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رہنمائی میں مولانا سید محمد حسنی اڈیٹر "تعمیر حیات" نے لکھی ہے۔ قیمت مجلد -/۶

علمائے ہند کا شاندار ماضی

مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند کی شہرہ آفاق کتاب کا آخری اڈیشن۔ قیمت -/۶/۵۰

علمائے صادقپور

از، مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ قیمت -/۲

مسلمانوں کا عروج و زوال

از مولانا سعید احمد اکبر آبادی قیمت مجلد -/۵

تذکرہ شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ کا سیاسی ماحول اور اُن کی علمی و تجدیدی خدمات مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ -/۴/۵

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

مصنفہ سید خورشید مصطفےٰ رضوی ایم اے اس میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں اہل وطن کا جذبۂ ایثار و قربانی اور اسکی عملی تصویر پیش کرنے میں یہ کتاب بے نظیر ہے۔ قیمت -/۷

۱۸۵۷ء کا تاریخی و زنامچہ

قیمت مجلد -/۴/۵ غیر مجلد -/۵/۵

نقش حیات

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح عمری جو حضرت شیخ الہندؒ کی مجاہدانہ سرگزشت کا بھی آئینہ ہے۔

جلد اوّل -/۵ جلد دوم -/۵۰

مکتوبات شیخ الاسلام

حضرت مولانا مدنیؒ کے مکاتیب جلد اوّل -/۶ دوم -/۶ سوم -/۵۰

ارشادات

حضرت مولانا مدنیؒ کے اہم مضامین و خطبات کا مجموعہ۔ قیمت -/۵۰

مختلف موضوعات پر

قابل مطالعہ کتابیں

مقالات احسانی

تصوف و سلوک کے موضوع پر مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے مقالات کا ضخیم مجموعہ، ہر مقالہ قیمتی علمی تحقیق ہے۔ قیمت مجلد -/۶/۵

فقہ الاسلام

تصنیف حسن احمد الخطیب ترجمہ سید رشید احمد ارشد ایم اے اس میں اسلامی شریعت کے اصول اور فقہی قوانین کو جدید انداز میں پیش کیا گیا ہے اور قرآن و حدیث اور آئمہ مجتہدین کے اصول اور طرز عمل کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی قوانین میں اس قدر وسعت و لچک ہے کہ وہ ہر زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ نیز اسلامی قوانین کا مغربی قوانین سے مقابلہ کر کے انکی برتری ثابت کی گئی ہے۔ قیمت مجلد -/۱۲

اسلام کا نظام حکومت

قیمت غیر مجلد -/۶ مجلد -/۷

مسلمانوں کا نظم مملکت

قیمت غیر مجلد -/۶/۵۰ مجلد -/۵/۵۰

اسلام کا اقتصادی نظام

از مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم۔ مجلد -/۷/۵

اسلام کا زرعی نظام

قیمت غیر مجلد -/۴/۵ مجلد -/۵/۵

اسلام کا نظام عفت و عصمت

قیمت -/۴/۵

اسلام کا نظام مساجد -/۲/۵

اسلام کا نظام اراضی -/۵/۵۰

دو اہم کتابیں

"الطبقات الکبریٰ" کا ترجمہ "طبقات الاولیاء"

امت محمدیہ کے اولیاء کرام کے حالات میں سولہویں صدی ہجری کے عارف شیخ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب "طبقات کبریٰ" مستند اور جامع ترین کتاب ہے جس میں مصنف نے حضرت صدیق اکبرؓ سے لیکر اس کتاب کے زمانہ تصنیف (۹۵۸ھ) تک کے اولیاء کا کافی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، ترجمہ مولوی عبدالغنی صاحب ارشدی مرحوم نے کیا ہے جو دولت آصفیہ حیدرآباد کے سابق اکاؤنٹنٹ جنرل تھے۔ قیمت مجلد -/۱۶

انسان کامل

تصنیف سید عبدالکریم الجیلی، ترجمہ مولانا فضل میراں تصوف کے حقائق و معارف اور اسرار و رموز پر معرفت انگیز اہم تصنیف ہے عام اُردو داں حضرات اس سے مستفید ہو سکیں گے صرف خواص کے لئے قابل استفادہ ہے۔ قیمت -/۱۰

بچوں کے لئے سیرت و تاریخ کی درسی کتابیں

از، مولانا سید ابوالوحید

رسول عربی۔ قیمت -/۱۲ خلافت و شیدہ اول -/۱ خلافت راشدہ دوم -/۱

مختلف موضوعات پر مختلف اداروں کی مطبوعات

حدیث نبویؐ

الادب المفرد (ترجمہ اردو)
امام بخاریؒ کا مرتب کردہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کا قابل دید مجموعہ ۱۲/-

کتاب الآثار (مترجم اردو) ۸/-
موضوعات کبیر۔ موضوع حدیثوں کے بیان میں ملا علی قاریؒ کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ۸/-

فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ
حدیث سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ ۱۵/-

فتاویٰ

فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ کامل ۱۵/-

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل مرتبہ حضرت مولانا محمد تنقیع صاحب مدظلہ، ۴ ضخیم جلدوں میں۔
قیمت کامل مجلد ۲۰/-

فتاویٰ رشیدیہ کامل ۸/-

تصوف

الرسائل القشیریہ (عربی) ۱۰/-

عبقات (عربی) از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ
قیمت ۴/۵۰

ترجمہ عبقات (اردو) از مولانا گیلانیؒ
قیمت ۱۰/۵۰

انتخاب مکتوبات امام ربانی ۴/-
شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات۔ قیمت ۱۰/-

تاریخ وسوانح

محسن اعظم اور محسنین ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے تذکرہ میں قابل دید کتاب ہے ۵/-

سیرت ائمہ اربعہ ۷/۵۰

حیات طیبہ۔ (سوانح حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) ۵/۵۰

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۴/-

آپ بیتی (از ظفر حسن ایبک)
مولانا سندھی مرحوم اور ان کے جانباز رفقاء کی ہجرت کابل کی انتہائی سبق آموز سرگذشت ۵/-

حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہؒ مع ترجمہ اردو از مولانا عبدالحق حقانیؒ مجلد دو جلدوں میں ۲۴
تبلیغ دین امام غزالیؒ کی اہم تصنیف کا ترجمہ ۳/۵۰

مجلس تحقیقات ونشریات کی مطبوعات

اسلام اور مغربیت کی کشمکش
مولانا علی میاں کی معرکۃ الآرا کتاب ۵/-

ہندوستانی مسلمان ۳/۵۰

طوفان سے ساحل تک ۵/-

جزیرۃ العرب (جغرافیہ) ۵/-

تصانیف شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مدظلہ

فضائل درود شریف۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی بالکل جدید تصنیف ہے مطالعہ کرکے عشق ومحبت کا ذائقہ حاصل کیجئے ..... قیمت ... ۱/۷۵

حکایات صحابہ ۱/۵۰ فضائل نماز ۷۰/-
فضائل قرآن مجید ۶۰/-
فضائل رمضان شریف ۵۵/-
فضائل تبلیغ ۲۰/- فضائل حج ۲/۵۰
فضائل صدقات (مکمل مجلد) ۷/۵۰
خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی ۶/-

بعض تصانیف حضرت حکیم الامتؒ

تعلیم الدین مجلد ۱/۷۵
حیات المسلمین مجلد ۱/۷۵
اصلاح الرسوم مجلد ۱/۷۵
اعمال قرآنی ۱/۶۰
صبر وشکر (مواعظ اشرفیہ) ۱/۵۰
کرامات صحابہ ۱/۵۰
بہشتی زیور ۱۲/۵۰

تصانیف مولانا عبدالباری ندوی

تجدید دین کامل ۶/- تجدید معاشیات ۵/-
تجدید تصوف وسلوک ۵/-
تجدید تعلیم وتبلیغ ۳/-

اردو دینیات کا کامیاب نصاب تیار کردہ :- مکتبۃ دین ودانش لکھنؤ
اچھا قاعدہ ۱۹/- اچھی باتیں کامل (۵ حصے) ۲/۹۴، اللہ کے رسول ۲۲/- حضرت ابوبکرؓ ۴۴/- حضرت عمرؓ ۴۴/- حضرت عثمانؓ ۴۴/- حضرت علیؓ ۴۴/- اچھے قصے ۲۴/- حضرت خدیجہؓ ۵۰/- حضرت سمیہؓ ۲۵/- حضرت عائشہؓ ۶۲/- آسان فقہ ۴۴/-

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

تالیف ۔ مولانا محمد منظور نعمانی

بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دُنیا اس سے ناآشنا ہے، یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے

یہ کتاب

اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔

- یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
- جس میں ۳۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور موقع پر شرحیات کیساتھ جمع کیا گیا ہے۔
- خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔

نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۔/۴

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

ہندوستان سے سالانہ چندہ ۷ روپے
" " ششماہی ۴ "
پاکستان سے سالانہ چندہ ۹ روپے
" " ششماہی للعہ ۴ "

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ۶۰ نئے پیسے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد (۴۳)	بابتہ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۵ء	شمارہ (۶)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اوّلیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	جدید عصری رجحانات کے مقابلہ میں دعوت اسلامی کا صحیح طریق کار	[illegible] ابوالحسن علی ندوی	۶
۳	سلسلۂ ولی اللہی کا ایک گمنام متبع شریعت درویش	مولانا نسیم احمد صاحب فریدی	۱۶
۴	ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا واحد حل (حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی ایک تقریر)		۲۷
۵	مسلمانوں کو "امت" بننے کی دعوت (ایک تقریر)	تتمہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ نمبر	۱۰۱ (۱۲)
۶	مولانا کا طرز فکر (چند جھلکیاں)	[illegible] منظور نعمانی	۴۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۱ تاریخ تک پہونچ جانی چاہئے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے اپنی تالیف "تذکرۃ الخلیل" میں ایک جگہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تذکرہ کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

"ایک مرتبہ بندہ حاضر تھا آپنے سر اٹھایا اور فرمایا، مولوی عاشق الٰہی ایک بات کہوں! ہم نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ ہندوستان میں علم کی اتنی کمی تھی کہ دور کیوں جاؤ خود ہمارے اجتماع میں بھی جنازہ کی نماز پڑھانے والا مشکل سے ملتا تھا۔ اور آج علم کی کثرت کا یہ حال ہو کہ شہر تو شہر کوئی قصبہ بلکہ شاید کوئی گاؤں بھی ایسا نہو جہاں کوئی مولوی نہ مل جائے۔ اسکے بعد ذرا دوسرا پہلو دیکھو کہ عندر کا زمانہ گزرے کچھ مدت نہیں ہوئی، کہ ابھی اسکے دیکھنے والے بھی زندہ ہیں۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہو کہ پھانسی گڑی ہوئی تھی اور ان ناکردہ قصوروں کا پابندھا ہوا تھا جن کو پھانسی کا حکم دیا جا چکا تھا وہ لوگ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک نعش کو اتارا جا رہا ہو اور دوسرے زندہ کو چڑھایا جا رہا ہے۔ اس طرح پر موت اُن کی نظر کے سامنے تھی اور ان کو عین الیقین تھا کہ چند منٹ بعد یہ اسی مُردوں میں ہوا چاہتا ہو۔ باایں ہمہ کوئی جھوٹوں بھی ان کے متعلق ضعفِ ایمان کا یہ الزام نہیں لگا سکتا ہو کہ کسی نے بھی موت سے ڈر کر اسلام سے انحراف یا تبدیل مذہب کا خیال کیا ہو۔ باوجود قلتِ علم اور غلبۂ جہالت کے اُن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ مرنا قبول تھا مگر مذہب پر حرف آنا قبول نہ تھا۔ اور آج باایں کثرتِ علم ضعفِ ایمان کا یہ حال ہو کہ ذرا ڈنڈے کا خوف یا روپے بلکہ دو حرف انگریزی کے عطیہ کی طمع دلا کر جو چاہے کہلا لو اور جو چاہے کرا لو۔ عجیب بات ہو کہ قلتِ علم کے وقت ایمان میں

اتنی قوت اور کثرتِ علم کے زمانے میں ایمان کی اتنی کمزوری! ـــــ اسکے بعد فرمایا سچ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک جگہ علامت قیامت بیان کیا علم کا کم ہونا اور دوسری جگہ فرمایا کہ قیامت کے قریب علم زیادہ ہو جائے گا۔ اہل باطن نے بغیر دیکھے تو یہ فراست سے تطبیق دی تھی۔ مگر ہم بدنصیبوں نے اس وقت کو آنکھوں سے دیکھ لیا کہ صورتِ علم کثیر ہو گئی مگر حقیقتِ علم قلیل ہو گئی، اور یہی خاص علامت ہے قربِ قیامت کی۔"

(تذکرۃ الخلیل ص۱۱۴، مطبوعہ الخلیل مشین پریس، میرٹھ)

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ ارشادِ گرامی یوں تو ہر مسلمان کے لیے قابلِ توجہ ہے کیونکہ اس میں کسی خاص مسلک کی نقطۂ نظر کی بات نہیں ایمان و اسلام کی ایک عمومی بات ہے لیکن اُن لوگوں کے لئے تو یہ خصوصی طور پر توجہ طلب ہے جو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے انتساب کو فخر اور آپ کے عقیدت کو سرمایہ سعادت سمجھتے ہیں۔ اور پھر جو اس سلسلۂ علم دین و اشاعت دین کے وارث بھی ہوں جس کی ایک تابناک کڑی اپنے وقت میں شیخ الہندؒ کی ذاتِ گرامی تھی، اُن کے لئے تو یہ ارشاد گویا ایک مستقل تنبیہ ہے اور سب سے زیادہ اسکے مخاطب وہی ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے اس ارشاد میں اس مغالطے کی کوئی گنجائش نہیں ہو کہ مصائب اور آزمائشوں سے ڈر کر مکمل تبدیل مذہب کر لینا اور اسلام کو چھوڑ جانا ہی ایمان کی کمزوری ہے۔ یہ درجہ ایمان کی کمزوری کا نہیں ایمان کے خاتمے کا ہے۔ ایمان کی کمزوری کا اطلاق تو اس سے کم درجے ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اسلام سے کلیتہً انحراف تو نہو بلکہ کسی معمولی خوف یا معمولی لالچ سے آدمی اسلام کی مکمل پیروی اور اسکے ساتھ کامل وابستگی میں کمزوری دکھائے۔ اور کسی معاملے میں اسلام کی تعلیمات کے خلاف کرنے یا کسی مسئلے میں شریعت کے حکم کے خلاف کہنے پر تیار ہو جائے۔ یہی وہ ایمانی کمزوری ہے جس کا ذکر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے بارے میں فرما رہے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس کمزوری کا ذکر اور اس پر افسوس کا اظہار صرف دینی اور ایمانی خسارے کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ اور کم از کم علماء دین کی نظر میں تو اس کمزوری کا یہی پہلو سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ دینی خسارے کا سودا اگر آدمی اپنی کسی ذاتی منفعت یا شخصی تحفظ و عافیت کے لئے نہیں کرتا بلکہ ملی مفاد و مصلحت کے خیال سے کرتا ہے اور قوم و ملت کو بھی اسی راستے پر چلنے کی دعوت دیتا ہے

تو اس سے دنیا میں کبھی کم از کم قوم کی کوئی بات بننے والی نہیں ہے۔ یہ قوم کے اندر اس بدترین بزدلی اور اخلاقی پستی کی تخم ریزی ہو جس کے تحت کسی دباؤ کے موقع پر قوم اپنے دین و ایمان کا سودا کرنے پر بھی تیار ہو جائے۔ یہ کسی قوم یا جماعت کی بزدلی اور اخلاقی کمزوری کا آخری درجہ ہے کہ وہ کسی دباؤ کے موقع پر نہ صرف یہ کہ اپنے اصول و معتقدات کے اظہار سے کترانے لگے بلکہ انکے بالکل برعکس اصولوں پر اپنے اعتقاد کا اطمینان دنیا کو دلانے لگے۔ ایسی قوم اور ایسے لوگ درحقیقت صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں دنیا ان کے بارے میں کسی دھوکے میں نہیں آتی۔ ہاں صرف ایک بات اس سے دنیا پر ظاہر ہو جاتی ہو کہ یہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں اور انھیں جب اور جس طرح چاہے دبایا جا سکتا ہے۔

اپنے اصول و نظریات میں پختگی کسے کہتے ہیں، یہ بات مسلمانوں کے لئے کہیں اور سے سیکھنے کی نہیں ہے۔ خود حضرت شیخ الہندؒ نے دور غدر کے جس عام ابتلا کا حوالہ دیا ہو وہی اس لحاظ سے مسلمانان ہند کی تاریخ کی ایک حیات آفریں مثال ہے۔ لیکن ایک بالکل اس وقت کی مثال ہمارے سامنے ہے جو اگرچہ اصطلاحی "ایمان والوں" کی نہیں بلکہ دہریوں اور منکرین خدا کی ہو۔ وہ اگرچہ ہمارے لئے قابل تقلید نہو لیکن سبق آموز تو ہو ہی سکتی ہے۔

یہ مثال ہندوستان کی بائیں کمیونسٹ پارٹی کی ہے جو چین سے ہندوستان دشمن سازباز کے الزام میں پورے ہندوستان میں معتوب ہو۔ سوائے ایک بڑے لیڈر کے اسکے تمام اہم افراد جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ لیکن اس تنہا لیڈر (مسٹر نمبودری پد) نے عین اس موقع پر جبکہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ کی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ اور پاکستان سے چین کا گٹھ جوڑ بالکل کھلا ہوا تھا، وزیر اعظم ہند مسٹر لال بہادر شاستری کی اس اپیل کے جواب میں کہ اس وقت تمام ہندوستانی بلا کسی اختلاف کے حکومت ہند کی حمایت کریں ذرا بھی لچک اپنے نظریات کے معاملے میں نہیں دکھائی اور پوری صفائی کے ساتھ یہ چند باتیں کہیں کہ

(۱) اگر وزیر اعظم سنجیدگی کے ساتھ مخالف پارٹیوں کا تعاون چاہتے ہیں تو وہ مخالف پارٹیوں کو کچلنے کی پالیسی مدلیس ڈیفنس آف انڈیا رولز کو ختم کریں اور شہری آزادیاں مکمل طور پر بحال کریں۔

(۲) ملک کے دفاع اور خارجہ پالیسی کے بارے میں ہمارے اپنے نظریات ہیں۔ ہم اس

طریق کار کے خلاف ہیں جو چین اور پاکستان سے ہمارے تنازعات کے بارے میں حکومت اختیار کئے ہوئے ہے۔ حکومت کی پالیسی سے متعلق ہم اپنے اس موقف کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

(۳) داخلی پالیسیوں کے سلسلے میں بھی حکومت کا موقف ایسا نہیں ہے جو تمام لوگوں کو پوری طرح حکومت کی پشت پر لا سکے اسکے برخلاف بعض طبقات اور درجات کے عوام اس طرح کی فکروں میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ حکومت کے لئے اُن کے قومی جوش کو اُبھارنا ناممکن ہوگا۔ حکمراں پارٹی کا یہ سوچنا غلط ہے کہ عوام کی یہ بے چینی مخالف پارٹیوں کے شرارت پسندانہ اقدامات کا نتیجہ ہے ..... اس بے چینی کی ایک خاص وجہ، جس کا تعلق کشمیر سے خاص طور پر ہے۔ یہ ہے کہ ملک میں آباد مختلف لسانی و ثقافتی گروہوں کو متحد کرنے کے سلسلے میں حکومت ناکام رہی ہے۔ ہمارے ملک کا مطمح نظر "تنوع میں اتحاد" ہونا چاہیئے اس بات کو محسوس کرنے میں ناکامی کے نتیجے میں حکومت نے ایسی پالیسیاں بنائیں جن کی وجہ سے مختلف لسانی و ثقافتی اکائیوں میں جن میں کشمیر کے عوام بھی شامل ہیں بے اطمینانی پیدا ہوگئی۔

مسٹر نبودری پد کا بیان طویل ہے۔ ہم نے صرف چند نقاط لئے ہیں۔ ان سے اتفاق اور عدم اتفاق ایک الگ بات ہے۔ دیکھنے کی چیز اپنے موقف پر پختگی اور بے لوثی ہے اور اس لحاظ سے اپنا مسلسل حال دیکھتے ہوئے یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

حضرت مولانا محمد یوسف رح نمبر

کا پہلا ایڈیشن شائع ہوتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ دوسرے ایڈیشن کی طباعت تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ رکی ہوئی فرمائشوں کی تعمیل فوراً شروع کی جارہی ہے۔ (مینیجر)

جدید فکری رجحانات کے مقابلہ میں
دعوت اسلامی کا صحیح طریقۂ کار

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

[یہ مقالہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور سال گزشتہ کی موتمر اسلامی کے شعبۂ دعوت اسلامی میں پڑھا گیا۔ ذیل میں اس کا ترجمہ مولانا عبدالماجد صاحب ندوی استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے پیش کیا جا رہا ہے۔ الفرقان]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام ایک عرصۂ دراز سے اپنی ان خصوصیات کی بنا پر جو اللہ تعالیٰ نے اسکے اندر ودیعت فرمائی ہیں زندہ اور پائندہ ہے۔ اسلام خود اپنے اندر دوام کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسکے اندر کشش اور جاذبیت کی بے نظیر طاقت ہے، یہ اپنے بلند ترین نصب العین اور اعلیٰ پیغام کے سہارے ہی جی رہا ہے اور جیتا رہے گا سلیم الفطرت طبیعتوں کو اپیل کرنے کی جو صلاحیت اسکے اندر ہو اسکی بنا پر یہ اپنا راستہ خود نکالتا ہے بغیر اسکے کہ کوئی حکومت اسکی سرپرستی کرے یا کوئی معاشرہ اس کا کامل نمونہ اور نمائندہ ہو، ماضی میں جس طرح یہ انفرادی کوششوں شخصی اور متفرق جدوجہد سے پھیلتا اور بڑھتا رہا ہے

وہ آج بھی مورخین کے لئے حیرت و استعجاب کا موجب بنا ہوا ہے۔ پھر حال میں افریقہ امریکا اور ایشیا کے اندر نئے منطقوں میں جس طرح یہ اثر و نفوذ کر رہا ہے اس سے اسکی اثر انگیزی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی اور جاپان کے نئے ملکوں میں بھی اس کے لئے نیا میدان کھل سکتا ہے اور اسکی رگ حیات کے لئے ان قوموں سے نیا اور تازہ خون فراہم ہو سکتا ہے اور اسکی غیر معمولی صلاحیتوں میں جس کی بنا پر علم و تمدن کا قافلہ کبھی آگے بڑھا تھا، مزید اضافہ ممکن ہے، بشرطیکہ اسے اپنی دعوت و پیام کے لئے ایسے افراد اور جماعتیں مل جائیں جو اسلاف کی صفات کی حامل ہیں اور اپنے اندر اسکی صلاحیت بھی رکھتے ہوں کہ وہ مذکورہ بالا دونوں قوموں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان کے فکری انتشار کو جس سے یہ دونوں قومیں دوچار ہیں اچھی طرح سمجھ سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جرمنی اور جاپان کی پھر سے ابھرتی ہوئی یہ دونوں قومیں زندگی سے بھرپور اور عظیم صلاحیتوں کی حامل ہیں۔ اگر اسلام کی روشنی انھیں مل جائے تو یہ اپنی بلند حوصلگیوں اور غیر معمولی صلاحیتوں سے تاریخ کا دھارا بدل دیں اور یہ کوئی مستبعد امر نہیں۔ تاتاریوں اور ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے اور پھر اسی طرح سے اپنے اپنے زمانہ میں ایرانیوں اور افغانیوں نے اسلام قبول کیا۔ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

اسلام اس حیثیت سے کہ وہ ایک دین اور شریعت ہے واقعہ یہ ہے کہ اب کوئی دین اور مذہب اس کا مدمقابل نہیں رہا، تمام ادیان اس سے علمی مقابلہ میں میدان ہار چکے ہیں اور مصاف زندگی سے اب دور جا پڑے ہیں۔ اسکے اور دوسرے ادیان و مذاہب کے مابین علمی اور کلامی کشمکش اور نزاع کی کہانی پرانی ہو چکی ہے، اسلام اور دوسرے مذاہب کے موازنہ کا دور گذر چکا۔ اب اس قسم کے موازنوں سے بہت کم لوگوں کو دلچسپی رہ گئی ہے۔ چند مستشرقین کو چھوڑ کر جو اپنی تحریروں میں یا ان کے مبلغین جو اپنی تقریروں میں اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مہم انجام دیتے رہتے ہیں اور جن کا دائرہ علمی حلقوں تک محدود ہے اب کسی کو ان کلامی اور مناظرانہ مباحث سے دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک میں اب کوئی مذہب بحیثیت مذہب کے علمی میدان میں اسلام کے خلاف صف آرا نہیں۔ اب اسلام وہ واحد مذہب ہے جو مادہ پرستی اور الحاد کے مقابلہ میں نبرد آزما ہے اور

جس کے پیروؤں میں تبلیغی جوش ہے اور جس کو معاشرہ پر اپنا اقتدار قائم رکھنے اور زندگی کی رہنمائی پر اصرار ہے۔ اس میدان میں کوئی مذہب اور کوئی دینی دعوت اسکی حریف اور مدمقابل نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ دوسرے ادیان کو اسلامی معاشرہ پر کتنی فتوحات حاصل ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کی کتنی تعداد کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں وہ کامیاب ہو رہے ہیں تو یہ محض افسانہ ہی ہے۔ اس میں اگر ایک طرف بہت زیادہ مبالغہ ہے تو دوسری طرف کچھ قنوطیت اور فریب خوردگی کو بھی دخل ہے۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت پر پورا یقین ہے کہ اندلس کا المیہ اب کبھی دہرایا نہیں جاسکے گا اور نہ کوئی مسلم معاشرہ مجموعی طور پر اعتقادی ارتداد کا شکار ہوگا اور کسی دین و مذہب کو قبول کرے گا اس اعتماد کا باعث صرف یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی اور مخالف دھاروں کے مقابلہ میں اپنی جگہ جمے رہنے کی صلاحیت کچھ زیادہ ہوگئی ہے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان مخالف مذاہب کے علمبردار اب عقائد کے میدان کو چھوڑ کر دوسرے میدانوں کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں اور انھوں نے جنگ کی حکمت عملی بدل دی ہے۔ لیکن خطرہ کی بات دراصل یہی ہے اور اسی کی طرف ہم آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

امت مسلمہ کے لئے اس وقت سب سے بڑا خطرہ ذہنی وفکری ارتداد کا ہے جس کا بیج جدید فکری رجحانات اور فلسفے پھیلا رہے ہیں اور مسلم معاشرہ میں پوری آزادی کے ساتھ اس کی آبیاری کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ جدید فلسفے مخالف مذاہب کے کسی درجہ میں بھی کم خطرناک نہیں۔ امت مسلمہ کو اسکے اپنے اسلامی عقیدہ اسلامی زندگی اور اسلامی مزاج سے برگشتہ کرنے میں یہ تحریکیں اور فلسفے بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں اس لئے کہ جو بھی ان کے دام میں آتا ہے وہ اس کو دین کا باغی اور اخلاقی قدروں کا دشمن بنا دیتے ہیں۔ اسکی بغاوت میں شدت اور دشمنی میں جوش وخروش پیدا کرتے رہتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ارتداد پر اسلامی معاشرہ میں کسی قسم کی بے چینی اور اضطراب اب بھی نہیں پیدا ہونے پایا بلکہ لوگ اس کا نوٹس تک نہیں لیتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اسلام سے نکل کر کسی دوسرے

مذہب کو اختیار کر لینے کا اعلان نہیں کرتا اور نہ وہ کسی گرجا اور کسی مندر میں داخل ہوتا ہے اور نہ مسلم معاشرہ سے کٹ کر وہ کسی دوسری برادری میں ضم ہو جاتا ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اسکی طرف ہو۔

ارتداد کا یہ فتنہ مسلم معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے، اور ہر طرف سے اس پر حملہ آور ہے، پورا عالم اسلام اس فتنہ کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ اس دین کی بقا اور اس کے ابدی اور سرمدی پیغام اور امت مسلمہ کی نصرت کے سلسلہ میں ہے اگر اس پر پورا اعتماد اور بھروسہ نہ ہوتا تو ان حالات کو دیکھ کر یہ پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ آئندہ چل کر اس امت پر بھی مغربی اقوام یا جاپانیوں کی طرح مادیت، ایسکولرزم کی چھاپ غالب آجائے گی، اور اسلام کا اثر معاشرہ، حکومت، ادب و ثقافت، فکر و فلسفہ سے زائل ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں یہ امت خدانخواستہ زندگی اور تاریخ میں اپنی قدر و قیمت اور مرکزی حیثیت کھو بیٹھے گی اور اس طرح ایمان و روحانیت کا آخری چراغ بھی گل ہو جائے گا اور انسانیت اپنی اصلاح کی آخری امید سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی، اور یہ انسانیت کے تمام المیوں میں سے سب سے بڑا المیہ ہوگا۔

دعوت اسلامی کو ان تمام تحریکات سے جنگ کرنے کے لئے سب سے پہلے تعلیم و ثقافت کا میدان منتخب کرنا چاہیئے کہ یہیں سے ان کو غلبہ و سیادت کے لئے جادو کی وہ کنجی بھی ملتی ہے جس سے ہر طلسم کا قفل کھلتا ہے، اور پھر اس طرح سیادت و فرمانروائی کی وہ کرسی ملتی ہے جہاں قوموں اور جماعتوں کے افکار اور نظریات پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔

اسکے بعد دوسرا میدان ادب، لٹریچر، پریس، صحافت، علم و فلسفہ اور سیاسیات و معاشیات کا ہے جن پر یہ تحریکات قابض ہیں اور ان پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے، دوسری طرف دینی دعوتوں اور دینی تحریکات کے قائدین اپنی کمزوری کوتاہ ہمتی اور غلط اندیشی کی بنا پر اس سے دست بردار ہو چکے ہیں حالانکہ اسکے برعکس اس سے پہلے ان کی زمام کار دینی تحریکوں کے قائدین ہی کے ہاتھوں میں تھی اور وہی اس میدان کے شہسوار تھے انھیں کی قیادت میں علمی اور ادبی تحریکات چل رہی تھیں اور

انہی کی رہنمائی میں علوم و ادب پھل پھول رہے تھے، نئی نسل کی رہنمائی دینی قائدین کے ہاتھ میں اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک فکری قیادت کی زمام کار ان کے ہاتھوں میں نہیں آجاتی۔ اس لئے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ علمی ادبی اور فکری میدانوں میں اس عہد کے مجتہدانہ کمالات کا اظہار ہو اور جدید اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان میں اترا جائے، زندگی کے میدان میں اسلام کوئی اہم پارٹ نہیں ادا کرسکتا اور نہ دور جدید میں وہ اپنی مرکزی حیثیت کی نمائندگی کرسکتا ہے جب تک کہ مدارس اور نظام تعلیم کا ڈھانچہ از سر نو بدل کر اسکو پورے اسلامی رنگ میں نہ رنگا جائے اسکی بنیاد اگر ایک طرف ایمان و عقیدہ روحانیت اور اسکے اعلیٰ پیغام اور دعوت پر ہو تو دوسری طرف ان ترقیات اور تبدیلیوں کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا جائے جو حالات و زمانہ تاریخی عوامل اور فکر انسانی کے ارتقاء اور زندگی کی پیچیدگیوں سے پیدا ہو چکی ہیں۔

ان تحریکات کا مقابلہ خالص علمی انداز میں کیا جانا چاہیئے۔ علم و عقل تجربہ اور واقعات کی روشنی میں ان کا توڑ کیا جائے۔ اسلام کے داعیوں دین کے علماء اور اسلامی محققین کو اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے اس طرح کھڑا ہو جانا چاہیئے جس طرح امام ابوالحسن اشعری امام غزالی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے اپنے دور میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے لئے انھوں نے اپنے دور کے فکری رجحانات کا مطالعہ کیا اور نقد و تحقیق سے کام لے کر ان سب پر اسلام کی برتری ثابت کی۔ ضروری ہے کہ اس کام کے لئے علمی مجالس (اکیڈیمیز) قائم ہوں جن میں ہمارے علماء و محققین اور ماہرین فن (اسپشلسٹ) جمع ہو کر بحث و تحقیق کا کام کریں اور ان موضوعات پر اس انداز کی محققانہ کتابیں اور علمی مقالے لکھیں جن میں مطالعہ کی گہرائی بحث کی پختگی رائے کا وزن، استدلال کی قوت اور ادب کا حسن موجود ہو اور جو مخالف کیمپ کی کتابوں اور لائبریریوں کا مقابلہ کرسکیں۔ ساتھ ہی ان کی نشر و اشاعت کا کام جدید وسائل کے ذریعہ اعلیٰ پیمانہ پر ہونا چاہیئے ورنہ اگر کام اس ڈھنگ اور انداز سے نہیں ہوا تو نئی نسل کو ہم اضطراب اور پراگندگی کے اس گرداب سے نہیں نکال سکتے جس میں

موجودہ ثقافتی دھاروں یا صلیبی تھپیڑوں نے ان کو ڈال دیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری نظر رابطہ عالم اسلامی پر جاتی ہے رابطہ اگر چاہے تو نہایت عمدگی کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکتا ہے، اسکے اس کام کی ایک حیثیت اور قدر و قیمت بھی ہوگی۔ رابطہ اس غرض کے لئے ایک اعلیٰ علمی اکیڈمی قائم کرسکتا ہے اور اس میں عالم اسلام کی چیدہ اور منتخب شخصیتوں کو مناسب موقعوں پر جمع کرسکتا ہے پھر ان کی علمی تصنیفات اور تحقیقی مقالات کو عالم اسلام کی مختلف زبانوں اور بعض یورپین زبانوں میں ترجمے کراکے شائع کرسکتا ہے۔ رابطہ کو ان خطوط پر کام کرنے کے لئے غور و فکر کرکے ایک طریقۂ کار متعین کرنا چاہیئے اسکے بعد اس کے لئے ایجابی اور عملی اقدام کرنا چاہیئے۔

دعوت اسلامی کی دوسری اہم ضرورت ان تحریکات کے مقابلہ کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اسے کچھ ایسے مخلص داعی میسر آجائیں جو دعوت کے تمام ضروری صفات سے متصف ہوں۔ دعوت اسلامی کو سیاسی طریقۂ کار اور مسیحی انجمنوں کے نقشۂ عمل پر قیاس نہ کیا جانا چاہیئے کہ ان کا انحصار زیادہ تر علمی نقشے، سوچے سمجھے اور لگے بندھے پروگرام اور مالیات پر ہوتا ہے۔ اسکے برعکس اسلامی دعوت کا دارومدار ہر جگہ اور ہر دور میں جس چیز پر رہا وہ اخلاص عمل، انسانیت کے لئے سچی ہمدردی، دنیا کی دلفریبیوں سے بے رغبتی، گہری روحانیت اور پختہ للّٰہیت ہے۔ اس وقت دنیا میں اگر کوئی خلا ہے تو یہی ہے کہ ایسے ربانیین کی غیر معمولی کمی ہے۔ مادیت کے کچلے ہوئے بیمار دلوں کا اگر کوئی مداوا بن سکتا ہے تو وہ یہی ربانیین ہیں یہ دلوں کی اس گہرائی تک پہونچ جاتے ہیں جہاں ایکسرے اور باریک سے باریک خوردبینوں کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ ربانی ان گہرائیوں میں اتر کر اپنی انگلیوں سے مرہم کا پھایہ رکھ دیتے ہیں، یہ ربانی اس بات کی استطاعت رکھتے ہیں کہ باطل کے ہر پرفریب داؤں اور مسحور کن کشش سے دامن بچالے جائیں اور اہل اقتدار کے دام برنگ زمین سے کترا کر دنیا پر یہ ثابت کردیں کہ یہاں ایک دوسری دنیا بھی ہے جو اس مادی دنیا سے رونق جمال حسن اور دلفریبی میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے یہاں کچھ ایسی حقیقتیں اور غایتیں بھی ہیں جو اپنے اندر دنیوی لذات سے کہیں زیادہ کشش رکھتی ہیں

اور اگر بات ایسی نہ ہوئی تو آجل کو عاجل پر اور راہ دھار کو نقد پر وہ کبھی ترجیح نہ دیتے۔

یہی وہ امر ہے جس نے جبار بن سلمی کو اس دین کے بارے میں تحقیق و سوال پر آمادہ کیا اور بالآخر ایمان لانے پر مجبور کر دیا، انھوں نے ایک مسلمان پر نیزہ کا وار کیا، نیزہ سینہ سے پار ہو گیا۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا اور خاک و خون میں تڑپنے لگا اور اسی عالم میں بیاختگی کے ساتھ اسکی زبان سے نکلا "فزت ورب الکعبہ" کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا جبار بن سلمی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ بھلا یہ کون سی کامیابی ہے؟ جب اس کا رشتہ حیات منقطع ہو چکا تو وہ خسارہ ہی خسارہ میں رہا پھر وہ اپنی کس کامیابی پر مسرور ہو رہا ہو اس سوال اور جستجو کے نتیجہ میں جبار بن سلمی پر یہ راز کھلا کہ فوز و فلاح کے اس شعور کا اصلی سرچشمہ کیا ہے چنانچہ وہ اسلام لے آئے اور پھر ان کا اسلام معیاری ثابت ہوا۔

عالم اسلام کے جس خلا کا ہم ذکر کر رہے تھے اسے پُر ہونا چاہیئے اسی ایمان اور انہی پاکیزہ صفات کے ساتھ جن میں حرص و طمع کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ ہو ہم ان دھاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ دھارے دراصل اسی حرص و طمع اور اسی حب مال اور حب جاہ اور ہوس اقتدار کی پیداوار ہیں ان مادی تحریکوں کے رہنما پرلے درجے کے موقع پرست اور خود غرض ہیں۔

تیسری چیز جس کی دعوت اسلامی کو بڑی ضرورت ہے وہ ایک ایسے اسلامی معاشرہ کا قیام ہے جہاں اسلام مجسم شکل میں نظر آئے اور چلتا پھرتا جیتا جاگتا دکھائی دے۔ ماضی میں اسلام کی تبلیغ اور اسکی اشاعت کا سب سے قوی ذریعہ ایسے ہی معاشرہ کا وجود تھا۔ مضطرب اور پریشان دل اور حقیقت کی جویا روحیں اسی کے سایہ میں پناہ لیتی تھیں جس طرح کوئی ڈوبنے والا شخص ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کا سہارا لیتا ہے۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والے اور روحانی اور اخلاقی قدروں کی طرف بلانے والے اپنی دعوت و پیام میں اثر آفرینی اور سحر بیانی میں طاقت اسی معاشرہ سے حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی پشت پر ایک جیتا جاگتا اور مثالی معاشرہ موجود تھا جس سے ان کی ہر اس بات کی تصدیق ہوتی تھی جس کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے تھے۔ اور جس کی عظمت کے وہ گیت

گاتے تھے۔ جسے انسانی سعادت اور خوش بختیوں کا وہ ضامن قرار دیتے تھے چنانچہ ہر وہ شخص جس کو اسلام کی دعوت پہونچتی یا جو اس کے نام اور صفت سے آشنا ہوتا وہ اس معاشرہ کے آئینہ میں اسلام کی اصلی اور واضح شکل وصورت دیکھ سکتا تھا۔

پس ان باطل دھاروں کا مقابلہ کرنے کی سب سے بہتر صورت ایک ایسے اسلامی معاشرہ کا قیام ہے خواہ وہ مختصر پیمانہ پر اور ایک محدود دائرہ کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ دعوتی کام کے لئے ایک ایسے اسلامی معاشرہ کو وجود میں لانے کی سخت ضرورت ہے جہاں اسلامی تعلیمات عملی شکل میں پائی جائیں، جہاں اسلام کا اخلاقی روحانی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام قائم ہو، جہاں اسلامی تعلیمات پر عمل کے نتیجہ میں ان اجتماعی اور اقتصادی مشکلات کا وجود تک نہ ہو جن کی گتھیاں سلجھانے میں یورپ کے مفکرین اور اسکے دانشور ناکام رہے ہیں۔

پھر جب دنیا دیکھے گی کہ ان مشکلات کا جو حل اسلام پیش کرتا ہے اس سے کس طرح ساری گتھیاں خود بخود سلجھتی چلی جاتی ہیں اور کس طرح اس معاشرہ میں تقوی وطہارت، پاکیزگی و امانت، محنت ومردانگی، ہمدردی وغمخواری، محبت وغمگساری اور عدل وانصاف کی روح جاری وساری ہے جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے اور جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اور آپ کے بعد خلفائے راشدین اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین عمل کرتے آئے جب لوگ یہ سب کچھ دیکھیں گے تو یہی امر اسلام کی طرف متوجہ کرنے اور اسکے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ بنے گا اور ہم کو پروپگنڈے کے ہر اس ذریعہ سے بے نیاز کرے گا جس میں خرچ تو بہت زیادہ کرنا پڑتا ہے مگر فائدہ کم حاصل ہوتا ہے۔

اس اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے جو سب سے بہتر جگہ ہوسکتی ہے وہ یہی ملک (حجاز مقدس) ہے جہاں ہم لوگ اس وقت جمع ہیں اس مقام اور ملک کو جسے قرآن مجید میں "البلد الامین" کہا گیا ہے ایک ایسا مثالی اور اسلامی شہر بننا چاہیئے جو ہر دور میں حیات اسلامی کی صحیح تصویر کشی کرے اور اس کے تمام خدوخال کو نمایاں اور اسکی ساری خوبیوں کو اُجاگر کرکے دکھائے۔ یہاں تک کہ ہر آنے والا خواہ اس کی مدت قیام کتنی ہی مختصر

کیوں نہ ہو پہلی ہی نظر میں اسکی خوبیاں محسوس کرلے اور اسکی حلاوت سے لذت آشنا ہوجائے۔ اس شہر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا ہے کہ آخر زمانہ تک یہ حج کا مرکز رہے گا اور عالم اسلامی کے مسلمان سمٹ سمٹ کر ہر سال اسکی طرف آئیں گے۔ چنانچہ آنے والے وفود اس بات کے یقین کرنے میں بڑی حد تک حق بجانب ہوں گے کہ وہ ایک ایسے شہر کا رُخ کر رہے ہیں جہاں ہر طرح پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے جو دین کا مولد اور اسلام کا روحانی دارالسلطنت ہے اس لئے ہر وہ چیز جس کا یہاں رواج ہو اور ہر وہ بات جس کا یہاں مشاہدہ کریں اس کو اسلامی سمجھیں اور اسکو حجت مانیں چونکہ وہ خود گہوارۂ اسلام سے دور رہتے ہیں اس لئے ان کو حق ہے کہ یہاں کی ہر چیز کو اپنے عمل کے لئے حجت قرار دے لیں۔ عامۃ المسلمین کے نزدیک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا عمل آخری درجہ رکھتا ہے۔ اگر خدانخواستہ اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی یہیں سے ہونے لگی تو پھر اسلام کی کہاں امید کی جاسکتی ہے۔ ع چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

یہ کچھ انسانی طبیعتوں کا خاصہ ہے کہ مرکز میں رہنے والوں کے عمل کو دلیل بناتے ہیں، ان کے اس طرز استدلال کے خلاف آپ کتنا بھی زور خطابت صرف کردیں آپ ان کو مطمئن کرنے سے قاصر رہیں گے یہی عُرف تہذیب و آداب، زبان و محاورے اور فقہ کے بارے میں رہا ہے چنانچہ عربی زبان کے سلسلہ میں قریش کی زبان کو ہمیشہ ٹکسالی سمجھا جاتا رہا ہے اسی طرح فقہ کے معاملہ میں اہل مدینہ کا عمل مذاہب اربعہ میں ایک جلیل القدر مذہب (مذہب مالکی) میں حجت اور مستند سمجھا جاتا رہا ہے اور قرطبہ والوں کا عمل ان کے دور عروج میں مغرب کے بہت سے فقہا مالکیہ کے نزدیک حجت رہا ہے اسی طرح آداب و تہذیب کے معاملہ میں بھی لوگ دارالسلطنت اور مرکزی مقامات کے طور طریقوں کو سند مانتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دینی مصلحین اور دعوتی کام کرنے والوں کو بسا اوقات بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ بعض حجاج یہاں کے بعض ان مشاہدات کو جو شریعت اسلامی سے میل نہیں کھاتے بطور حجت اور دلیل کے پیش کرنے لگتے ہیں۔

پورے عالم اسلام کے طویل و عریض رقبہ میں اسلامی معاشرہ کا عملی قیام ایک ناگزیر ضرورت

ہے۔ کمیونزم کی اپنی ایک دعوت ہے اور اسکی اپنی ایک سوسائٹی ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام کی بھی ایک دعوت اور اپنا ایک معاشرہ ہے بلکہ مادیت بھی اپنے وسیع معنوں اور متنوع شکلوں میں اپنی ایک دعوت اور اپنا معاشرہ رکھتی ہے پھر کیا اسلام ہی ایک ایسا مسلک زندگی ہے جس کی اپنی دعوت تو ہے مگر اسکے مطابق کوئی معاشرہ دنیا میں موجود نہیں۔ ہمارے لئے یہ بڑے ننگ و عار کی بات ہو۔ اگر ہم کوئی ایسا معیاری اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ تاریخ کے واقعات میں سے ایک اہم اور غیر معمولی واقعہ ہوگا اور یہ اسلام اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ جو ملک بھی اس آرزو کی تکمیل کرے گا اسے دنیا کے موجودہ نقشہ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہوگا۔ اس ملک کو اتنی اہمیت حاصل ہوگی جو کسی بڑے سے بڑے اور طاقتور سے طاقتور ملک کو میسر نہیں۔ اقصائے عالم کے بڑے بڑے علما، محققین اور مفکرین اس ملک کو دیکھنے کے لئے شد رحال کرینگے اور وہاں کے قیام کو اپنی بڑی سعادت سمجھیں گے۔ محققین کو تحقیق کے لئے سب سے بڑا موضوع ہاتھ لگے گا پھر اس حکومت کو جو ان بنیادوں پر قائم ہوگی اسے دوسری بڑی حکومتوں کے مقابلہ میں وہ عظمت کا مقام حاصل ہوگا کہ اس کا دسواں حصہ بھی سفارتی تعلقات اطلاعات و نشریات اور پروپگنڈے کے دیگر ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ مغربی کی اندھی تقلید سے یہ عزت حاصل ہوسکتی ہے۔

یہ چند کلمات ہیں جو اس رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش کی تعمیل میں وقت کی کمی، سفر کی صعوبت اور اپنی معذوری کی حالت میں املا کرائے گئے ہیں۔ یہ چند معروضات جن کے پیچھے ایک درد مند دل، فکر مند دماغ اور بے تاب روح ہے اگر آپ کی توجہ کو وقت کی اس اہم ترین ضرورت پر مبذول کرا سکیں اور عظیم الشان فرض منصبی کی ادائیگی پر آپ کو آمادہ کر سکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش کامیاب ہے اور میری یہ دراز نفسی رائیگاں نہیں گئی۔

سلسلۂ ولی اللہی کا ایک گمنام متبع شریعت درویش

حضرت شاہ عبدالقادر خالصپوریؒ

(از: مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

حضرت شاہ ابوسعید حسنی قطبی رائے بریلویؒ کے مختصر حالات اور اُن کے تعلقات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور اُن کے خاندان سے ـــــ مراسلات کی روشنی میں ـــــ ناظرین الفرقان ملاحظہ فرما چکے ہیں ـــــ اب میں اُن کے ایک خلیفہ مجاز کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ بہت کم مشہور بلکہ گمنام ہیں اور علمی حیثیت سے بھی معروف نہیں لیکن اتباع شریعت اور روحانیت میں اُن کا مقام بہت اونچا ہے ـــــ اُن کی یہ خصوصیت ہی کیا کم ہے کہ وہ صرف دو واسطوں سے (بلکہ ایک حیثیت سے ایک واسطے سے) حضرت محدث دہلویؒ کے حلقۂ طریقت میں شامل ہیں حضرت سید احمد شہیدؒ نے اُن کی پابندیٔ اوقات کی خاص طور پر اپنی زبان مبارک سے تعریف فرمائی ہے ـــــ میں نے یہ حالات ایک قلمی رسالے سے اخذ کئے ہیں جو حضرت شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ کی مختصر سوانح پر مشتمل ہے اور جس کے مطالعہ کا موقع مجھے لکھنؤ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم کی عنایت سے ملا ـــــ یہ رسالہ حضرت خالص پوریؒ کے صاحبزادے مولوی عبدالغفار خانؒ نے ۱۲۷۷ھ میں مرتب کیا ہے اور غالباً ان کے ہاتھ

کا ہی لکھا ہوا ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون کے اندر اس رسالے کے مضامین میں سے اپنے ذوق کے مطابق ضروری مضامین اختصار کے ساتھ لئے ہیں اور حسب ضرورت مولف کے مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے ترتیب اور انداز نگارش میں تبدیلی کی ہے۔ کہیں کہیں مولف کے الفاظ بھی نقل کر دیئے ہیں۔ رسالے کی زبان اُردو ہے اور قدیم طرز تحریر کا نمونہ ہے۔ میرے نزدیک یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ کسی اور تاریخ یا تذکرے میں مجھے حضرت خالصپوریؒ کے حالات نہیں ملے۔ البتہ مولانا حاجی محمد احسن صاحب نگرامی مرحوم نے وفیات الاخیار میں آپ کا نام تاریخ وفات اور مقام مزار درج کیا ہے۔ اور خالصپور کے کے متعلق لکھا ہے "ضلع لکھنؤ میں بڑا موضع ہے اور پٹھانوں کی بستی ہے۔"

خاندان اور آبائی وطن

حضرت شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ خورجہ میں پیدا ہوئے والد کا نام غازی خاں تھا آپکے پردادا نعمت اللہ خاں نے سب سے پہلے خورجے میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ عبداللہ خاں رئیس خورجہ کے یہاں رہتے تھے نعمت اللہ خاں کے پانچ لڑکے تھے جن میں سب سے بڑے حاتم خاں رسالدار تھے جو شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ کے دادا تھے۔ حاتم خاں الہ آباد میں سکونت پذیر ہوگئے وہاں انھوں نے ایک پختہ سرائے بنوائی تھی جو بعد میں ایک سڑک کی تعمیر میں کھُد گئی۔ حاتم خاں شہید ہوئے تھے ان کو الہ آباد ہی میں دفن کیا گیا۔ حاتم خاں کے بعد ان کے اہل وعیال پریشان حال ہوگئے۔ الہ آباد سے فرخ آباد پھر علی گنج آگئے ذوالفقار خاں نے ان کی کفالت کی۔ غالباً شاہ صاحب کے والد نے خورجہ ہی میں اپنی سکونت کا تعلق باقی رکھا۔ شاہ صاحب قوم سے ترین پٹھان تھے آپ کی والدہ سیدانی تھیں۔

عہد طفولیت

آپنے بچپن میں کچھ نہیں پڑھا، بس نماز سیکھ لی تھی۔ ہوش سنبھالا تو جنگل میں بکریاں چرانے لگے۔ جو تنخواہ دار معلم آپکے بھائیوں کے پڑھانے پر مقرر تھا وہ آپکے گھر کی مالی حالت کمزور ہوجانے کی وجہ سے دوسرے محلے میں ملازم ہوگیا۔ آپ اتنا کرتے تھے کہ اپنے بھائیوں کو اپنی نگرانی میں معلم کے پاس لے جاتے اور واپس لاتے تھے۔ خود نہیں پڑھتے تھے ایک دن آپنے معلم سے دریافت کیا کہ اگر میں پڑھنا شروع

کروں تو کیا مجھے پڑھنا آجائے گا؟ معلّم نے کہا کیوں نہیں۔ اچھی طرح پڑھنا آجائے گا، شوق ہوگا تو خوب پڑھ لوگے ـــــ بعدازاں آپ نے اپنے چچا شاہ نور صاحبؒ (جو شاہ حبیب اللہ قنوجیؒ کے مرید تھے) عرض کیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کچھ پڑھ لوں۔ چچا نے فرمایا کہ اس سے اچھی کیا بات ہے؟ چنانچہ آپ نے بکریاں چرانا موقوف کرکے پڑھنا شروع کر دیا۔ اوّل کلام اللہ ختم کیا پھر کریما بامعنی پڑھا ـــــ اسکے پڑھنے سے جذبۂ شوق بیدار ہوا ـــــ دو شعر بامعنی پڑھتے اور جنگل میں جاکر اُن شعروں کو یاد کرتے اور رویا کرتے تھے ـــــ اس کے بعد کچھ کتابیں فارسی کی اور مسائل دین کی پڑھیں ـــــ اس زمانے میں تو اتنی ہی تحصیل علم کا پتہ چلتا ہے۔ پھر مرشد کامل سے تعلق ہونے کے بعد بلکہ مرشد کے وصال کے بعد چالیس سال کی عمر میں مشکوٰۃ شریف پڑھنے کا ذکر آپکے صاحبزادے نے کیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

درمیان میں عربی کس سے پڑھی کون کون سی کتابیں پڑھیں اس کا کچھ علم نہ ہوسکا۔

اکل حلال اور مرشد کامل کی تلاش

آپ فارسی کی تعلیم حاصل کرکے مرشد کامل کی تلاش اور اکل حلال کی فکر میں مصروف ہوگئے۔ اکل حلال حاصل کرنے کی غرض سے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ معلّمی اس انداز سے کی کہ کسی سے کچھ تنخواہ نہیں ٹھہرائی۔ جو دیدیا وہ لے لیا۔ تنخواہ کا تقاضہ بھی نہیں کرتے تھے بہت دنوں تک معلّمی کی پھر کچھ عرصے سپاہ گری اختیار کرلی اور اس میں بہت سی مشقتیں برداشت کیں ـــــ پیر کامل کی تلاش برابر جاری رہی جہاں کہیں کسی بزرگ کو سنا اس سے جاکر ملاقات کی ـــــ طبیعت میں شریعت کی پابندی بے انتہا تھی جب کسی کو ذرا خلاف شریعت دیکھا اس سے اعتقاد ہٹ گیا۔

حضرت شاہ ابوسعیدؒ سے تعلق بیعت

رائے بریلی کے کچھ لوگوں نے آپکے حضرات تکیہ کی تعریف و توصیف کی اور یہ بتایا کہ وہ پابندیٔ شریعت میں ممتاز ہیں وہاں اُس وقت حضرت شاہ علم اللہ قدس سرہٗ کی اولاد میں یہ چار بزرگ شریعت و طریقت میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

(۱) حضرت سید محمد عدل عرف سید شاہ بعلؒ

(۲) حضرت سیّد شاہ ابوسعیدؒ
(۳) حضرت مولانا سیّد محمد واضحؒ
(۴) حضرت میر محمد نعمانؒ

ان میں سب سے زیادہ تعریف حضرت شاہ ابوسعیدؒ کی لوگوں کی زبانی سُنی وہ اس وقت حج بیت اللہ کے سفر میں تھے۔ جب سفرِ حج و زیارت سے واپس آئے تو آپ رائے بریلی حاضر ہوئے ــــ پہلے حاجی مراد خاں کے تکیے میں اُترے وہاں حضرت شاہ ابوسعیدؒ کا حال سُنا کہ اُن کا ہزاروں روپے کا خرچ ہے۔ داد و دہش کا بازار گرم ہے ایک زبردست لنگر خانہ ہے اور ایک عجیب رئیسانہ شان ہے۔ یہ باتیں سُن کر آپ کو خیال ہوا کہ یہاں تو بظاہر درویشی کا کارخانہ معلوم نہیں ہوتا بنا بریں اُن کا قصد بغیر ملاقات واپس جانے کا ہوا ــــ حاجی مراد خاں نے جو حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے فیض یافتہ تھے آپ کو سمجھایا کہ میاں اتنی دور سے آئے اور بغیر ملاقات جا رہے ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے ــــ جاکر ملاقات تو کر لو پھر جیسا تمھارا جی چاہے ویسا کرنا۔ اور یہ بھی کہا کہ حضرت کو اللہ تعالےٰ نے دین و دنیا دونوں بھرپور دیئے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ میں ہزارہا روپیہ خرچ کیا ہے للّٰہ فی اللّٰہ خرچ کرتے ہیں، غرض حاجی صاحب کے کہنے سننے سے آپ خدمتِ شاہ ابوسعیدؒ میں حاضر ہوئے چند روز رہ کر بھی حضرت رائے بریلویؒ کی شانِ امارت دیکھ کر ان کا اعتقاد نہ جما۔ واپس جانے کا ارادہ کیا۔ حضرتؒ نے اپنی روشن ضمیری سے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا اور فرمایا ــــ میاں عبدالقادر! تم کو پیر کی تلاش کرتے کرتے پچیس سال ہو گئے ابھی تک تمھیں موافق طبیعت پیر نہیں ملا! سن لو قیامت تک تم کو تمھاری طبیعت کے موافق پیر نہیں ملے گا اس لئے کہ تم بے عیب پیر ڈھونڈھ رہے ہو حالانکہ بے عیب ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تم اس طرزِ عمل سے راہِ سلوک کی برکات سے محروم رہ جاؤ گے۔ بہتر یہ ہے کہ جس میں دس نیکیاں اور دو برائیاں ہوں اُسی کو غنیمت جان لو ــــ یہ طریقہ بغیر پیر کے حاصل نہیں ہوتا اگر پیر کامل نہ بھی ہو اور شوق، کامل ہو تو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو پیرانِ طریقت کا سلسلہ ہے وہ ذریعۂ فیض بن جائے گا۔ حضرتؒ کی یہ بات آپ کے دل میں*

* نوٹ:- آگے کے دو صفحوں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ ناظرین پہلے صفحہ ۲۱-۱ کے بعد صفحہ ۱۲ اور اس کے بعد صفحہ ۲۲ پڑھیں (مرتبہ)

ہی کے سلسلے میں ہوگا۔ خیر دار تم لوگ ان سے کچھ نہ بولنا چاہے وہ مجھے زدوکوب ہی کیوں نہ کریں۔ یہ سُن کر ہم سب مجبور ہوگئے اور تشویش تھی کہ کیا صورت بنے گی۔ اتنے میں میاں صاحب ظہر کے وقت تشریف لے آئے۔ آپ نے ان کو اپنے مصلے پر بٹھایا: وہ مصلے پر نہ بیٹھے، پھر آپ نے فرمایا میاں صاحب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے انھوں نے فرمایا حضرت میں سب سمجھ گیا اور میں نے مان لیا۔ آپ کی خدمت میں توبہ کرکے آیا ہوں اور اس امر کی دعا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ مجھ کو توفیق نیک دے اور اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلائے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی آپکے بارے میں رائے

امام المسلمین حضرت سید احمد شہیدؒ جب حج بیت اللہ سے واپس ہوئے تو اپنی محفل میں فرمایا کہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گیا راستے میں اور ان مقامات مقدسہ میں بہت سے بزرگوں سے ملاقات کی مگر میں نے شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ جیسا پابند اوقات اور سید محمد جامع جیسا کلام اللہ پڑھنے والا نہیں پایا ــــ حضرت سید شہیدؒ خالص پور تشریف لائے تو وہاں بھی یہی فرمایا کہ آپ کی سی پابندی اوقات میں نے کسی میں نہیں پائی اس کو سن کر ازراہ تواضع آپ نے فرمایا کہ "میاں مجھ جیسا ناکارہ تم نے نہ دیکھا ہوگا"۔

حضرت سیّد احمد شہیدؒ خالص پور میں

آپکے صاحبزادے لکھتے ہیں کہ جب امام المسلمین حضرت سید احمد شہیدؒ سفر حج سے واپس آئے تو یہ عاصی ملاقات کو گیا سید صاحبؒ نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ خان جی! ہمارے حضرت کا کچھ حال بیان کرو، میں نے عرض کیا حضرت ان کا عجیب حال ہوگیا ہے کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں اور اشعار بھی بہت پڑھتے ہیں ــــ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے ان کی ملاقات کا بہت اشتیاق تھا اور یہ حال سن کر اور زیادہ اشتیاق ہوگیا مگر اس وقت چونکہ دہلی کے چند علماء میرے یہاں مہمان ہیں اسلئے ابھی نہیں جاسکتا ان حضرات کے تشریف لے جانے کے بعد جلد حاضر ہوں گا۔ فی الحال میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ میں نے اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے صدہا آدمیوں کے ساتھ حج کیا، اللہ تعالےٰ نے بہت سی ایسی ظاہری و باطنی نعمتیں مجھے عنایت فرمائیں کہ میں اُن کو بیان نہیں کرسکتا۔ میاں عبدالغفار خاں بیان کرتے ہیں کہ میں نے

چم گئی۔ اسکے بعد آپ نے عرض کیا کہ اب میں آپ ہی سے بیعت کرتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ خلاف شریعت کوئی عمل نہ کروں گا۔ خدمت آپ مجھ سے جو چاہیں لیں حتیٰ کہ بیت الخلا کی صفائی پر متعین فرمادیں اس خدمت سے بھی گریز نہیں ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا "بھائی میں تم سے کیا خدمت لوں گا میں تو خود ہی تمھاری خدمت کروں گا" شاہ عبدالقادر فرمایا کرتے تھے کہ عنایت الٰہی اور حضرت مرشدؒ کی توجہ سے میرا مطلب آٹھ دن میں حاصل ہوگیا۔ بعد حصول مقصود آپنے وطن جانے کی اجازت چاہی تو حضرتؒ نے اور حضرت کے صاحبزادے میاں سید ابواللیث صاحبؒ نے روک لیا، چنانچہ آپ آستانۂ مرشد پر عرصہ تک رہے۔

شادی

آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ پیر و مرشد کی وفات کے بعد چالیس سال کی عمر میں جب کہ مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے اس میں نکاح نہ کرنے پر تہدید کی حدیث آئی تو خوف کھا کر قصد نکاح کیا۔ نکاح کے لئے یہ شرط لگائی کہ کوئی رسم خلاف شرع نہ ہونے پائے اور عورت کا سب خاندان نمازی ہو ——— حضرت مولانا سید محمد واضحؒ نے ان شرطوں کو ملحوظ رکھ کر اپنے ایک مرید لعل خاں سے فرمایا کہ وہ اپنی لڑکی شاہ عبدالقادر کو منسوب کردیں، چنانچہ لعل خاں کی صاحبزادی سے آپکا نکاح ہوگیا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ

مولوی عبدالغفار خاں صاحب نے لکھا ہے کہ پیرزادہ میاں کلّم صاحب جو بانس بریلی کے رہنے والے اور حضرت سید محمد معصوم قدس سرہٗ کی اولاد میں تھے بڑے صاحب جلال اور غصہ ور تھے۔ ان کا مزاج تو درویشانہ تھا مگر ظاہری شکل وصورت بالکل خلاف شرع تھی ——— میاں صاحب موصوف والد صاحب کے اوصاف سن کر باشتیاق تمام ملاقات کے لئے لکھنؤ سے خالص پور آئے۔ میں نے والد صاحب سے از راہ احتیاط عرض کیا کہ میاں کلّم صاحب آپ سے ملاقات کرنے تشریف لا رہے ہیں ان کی ظاہری شکل وصورت خلاف شرع ہے آپ ان سے باخلاق پیش آئیے اور کچھ نصیحت نہ فرمائیے ان کے مزاج میں غصہ بہت ہے۔ آپنے فرمایا۔ میاں کہہ چکے؟ سنو ان شاء اللہ تعالےٰ میرا پہلا کلام نصیحت

خالصپور آکر سلام و پیام عرض کر دیا مگر اتفاق کی بات اسکے چند روز بعد آپ کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ بالکل خاموش رہتے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد امام المسلمین حضرت سید احمد شہیدؒ کثیر التعداد رفقاء کے ہمراہ خالص پور بغرض ملاقات تشریف لائے، مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ میں نے اس وقت والد صاحب کا جو حال بیان کیا تھا اب وہ حال نہیں اب تو خاموش رہتے ہیں کسی سے کلام نہیں فرماتے اور جو کوئی عرض کرتا ہے تو اس سے یہ فرما دیتے ہیں "میاں چپ رہو"۔ میاں تم نے سنا نہیں کہ "جو بولا سو مارا گیا" جب سید صاحبؒ نے آپ کو سلام کیا آپ نے وعلیکم السلام کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور یہ مشہور عارفانہ رباعی پڑھی۔

ہنگس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

پھر فرمایا اے سیدؒ!

خدا دارم، ہمہ دارم دگر ہیچ نباید

پھر یہ پڑھا ــــ رب بن مجھ کو کچھ نہ سہائے ؛ آگ لگے سب جل بل جائے

ایک سو چالیس آدمی حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمراہ آئے تھے اور ان کے علاوہ خالصپور کے باشندے بھی اس وقت موجود تھے ان کلمات کو سن کر سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لکھنؤ کے ایک پیرزادے بھی ہمراہی میں تھے انھوں نے فرمایا سید صاحب آپ پر قربان جائیے آپنے ایسے اچھے بزرگ سے ملاقات کرادی۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی درخواست دعا اور استفادۂ باطنی

اسکے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ نے سب صاحبوں کو وہاں سے رخصت کیا صرف میاں عبد الغفار خاں سے فرمایا کہ تم یہاں رہو۔ پھر فرمایا کہ حضرت میرے تین مقاصد ہیں ایک تو میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا جان و مال، اسباب، تن بدن اور جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف ہو اور اللہ تعالیٰ مجھ کو قبول فرمالے ــــ آپ کے اس کے لئے دعا کا طالب ہوں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے کچھ وصیت کریں تاکہ میں اس پر عمل کروں آپ نے فرمایا میاں میری وصیت کی کیا ضرورت ہے تم پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے سید صاحبؒ نے فرمایا حضرت کچھ تبرکاً ہی فرما دیجئے اس وقت حضرت سید شہیدؒ آپ کی چارپائی کے نیچے آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، آپ از راہ شفقت و محبت سید شہیدؒ کے سر مبارک پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور اُن کی داڑھی میں خلال کر رہے تھے ۔ یکایک آپ نے مشرق کی طرف ٹکٹکی لگائی پھر تھوڑی دیر بعد سید صاحبؒ کی طرف منھ کر کے نصیحت و وصیت کے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"میاں! استقامت اور پر شریعت کے"

ان الفاظ کو تین مرتبہ فرمایا:۔

تیسرا مقصد سید صاحب نے یہ پیش کیا کہ آپ مجھے توجہ دیجئے۔ آپ نے فرمایا میاں میں اس لائق نہیں ہوں ۔ آپ کے صاحبزادے لکھتے ہیں کہ حضرت سید صاحبؒ نے مجھ کو اشارہ کیا کہ میں اس سلسلے میں سفارش کروں میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو صاحبزادوں کو بہت مانتے ہیں اور سب سے زیادہ محبت آپ کو سید صاحب سے ہے لہٰذا آپ اگر کسی کو توجہ نہ بھی دی ہو تب بھی سید صاحب کو توجہ دیجئے اور توجہ تو آپ اوروں کو دیتے رہے ہیں۔ اس کو سن کر آپ نے اپنے صاحبزادے کو ڈانٹا اور فرمایا "ارے تو کیوں بولتا ہے"۔ اور سید صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا "میاں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے"۔ پھر فرمایا اچھا میاں تمھاری خوشی یہی ہے تو بیٹھو چنانچہ گھڑی بھر توجہ دی ۔ توجہ سے فراغت کے بعد حضرت سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اس وقت نسبت قادریہ تھی میں نسبت نقشبندیہ کا بھی مشتاق ہوں فرمایا کل فجر کو ۔ دوسرے روز حسب وعدہ نسبت نقشبندیہ کی توجہ دی ۔ اس موقع پر میاں عبدالغفار صاحب یہ لکھنے کے بعد کہ سید صاحب والد صاحب کے پیر و مرشد کے نواسے تھے اور والد صاحب کے شاگرد بھی تھے ۔ یوں رقمطراز ہیں۔

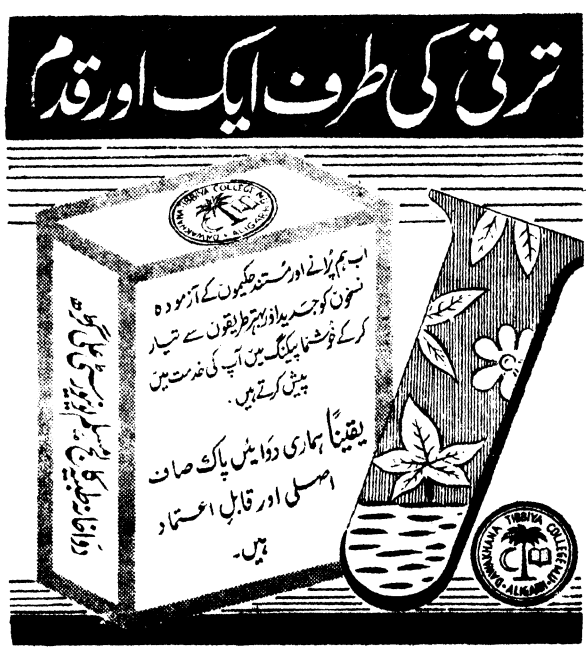
"سبحان اللہ سید صاحبؒ کیا عاشق اللہ کے تھے ۔ کچھ اپنی غرض نہ تھی نہ فتح کی نہ ملک کی فقط رضامندیٔ مالک حقیقی (مطلوب تھی) ویسے ہی مقبول ہوئے کہ

لاش بھی تصدیق ہوگئی اس کا بھی پتہ نہ لگا اور ہزار ہا آدمی دین اسلام سے فیض یاب ہوئے اس حاصی نے سید صاحب سے عرض کی تھی کہ آپ جہاد کو..... تشریف لیے جاتے ہیں یہاں پہلے مسلمانوں کو اسلام پر پکا کیجئے پھر تشریف لیجائیے آپ کی ذات سے ہزاروں کلمہ گو (پکا) مسلمان ہوا ہے ۔ غرض ان کو شوق، جہاد کا ایسا تھا، اور شہادت (بھی) جلد منظور الٰہی ہوئی ۔"

وفات حضرت شاہ عبدالقادر خالصپوریؒ نے ۱۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۰ھ بروز یکشنبہ قریب صبح صادق وفات پائی۔ خالصپور میں مزار ہے۔ مولوی محمد علی صاحب کوئی بزرگ ہیں انھوں نے تاریخ وفات اس طرح لکھی۔

چو جستم سال تاریخ وفاتش
خرد گفتا، "بجنت شد مقامش"

سنہ ۱۲۴۰ھ



ضمیمہ

حضرت مولانا محمد یوسف نمبر

سنہ ۱۳۸۵ھ
۱۹۶۵ء



"حضرت مولانا محمد یوسفؒ نمبر میں وعدہ کیا گیا تھا کہ حضرت مولانا مرحوم کی بعض تقریریں وغیرہ جن کو "نمبر" ہی میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مگر وقت اور صفحات میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں کی جاسکیں، آئندہ شمارہ میں ہدیۂ ناظرین کی جائیں گی ـــــ اسی وعدہ کے مطابق آئندہ صفحات میں حضرت مولانا مرحوم کی دو اہم تقریریں اور متعدد تقریروں کے منتخب اجزاء اور اقتباسات درج کیے جارہے ہیں ـ ان میں سے پہلی تقریر میاں جی عیسیٰ کی اُس بیاض سے لفظ بہ لفظ لی گئی ہے جس کا ذکر "نمبر" میں کیا جاچکا ہے ـــــ دوسری تقریر حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کی آخری اہم تقریر ہے جو بعض خاص محرکات کی بنا پر تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے خواص کے ایک مجمع میں، وصال سے تین ہی دن پہلے آپ نے فرمائی تھی ـــــ مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور حلقوں میں شعوری اور غیر شعوری طور پر جو طبقہ وار یا علاقائی عصبیت پیدا ہو رہی ہے جو مسلمانوں کے "اُمت واحدہ" ہونے کی صفت کے لیے سمِ قاتل ہے ـ مولاناؒ کی یہ اہم تقریر اسی خطرناک مرض سے متعلق تھی اور جن لوگوں نے یہ تقریر سُنی تھی انھوں نے بتایا کہ اس تقریر کے وقت حضرت مولانا مرحوم پر تأثر اور رنج والم کی عجیب کیفیت طاری تھی ـ

ان دو تقریروں کے بعد چند مختلف تقریروں کے اہم اجزاء اور اقتباسات ہیں جن سے حضرت مولانا مرحوم کے مخصوص طرزِ فکر اور اس کی خاص بنیاد کو سمجھا جاسکتا ہے"۔

ادارہ

سارے انفرادی و اجتماعی مسائل کا ایک حل

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایک تقریر

{یہ تقریر میاں جی محمد عیسیٰ کی اس بیاض سے لفظ بہ لفظ نقل کی گئی ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے}

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

بھائی دوستو! بڑی دقت کی بات یہ ہے کہ اپنی غلط کاری کی بنا پر ہمارا ذہن انفرادی بن چکا، دین کے بارہ میں بھی اور دنیا کے بارہ میں بھی، یہاں کے بارہ میں بھی اور آخرت کے بارہ میں بھی۔ ذہن یہ بن گیا کہ بس اپنی ذات والے حال میں لگا رہے، خواہ دین کا حال ہے یا دنیا کا کام اس سے اپنا مسئلہ درست ہو جائے گا، حالانکہ شخصی احوال پر طاقت خرچ کرنے سے بلا مصیبت کم نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے، اجتماعی احوال کو جب تک ٹھیک نہ بنایا جاوے اسوقت تک شخصی حالات درست ہونا مشکل ہے۔ اگر اجتماعی زندگی کی خرابی پر کوئی اجتماعی مصیبت آپڑے تو پھر ہر کسی کی شخصی بھی بگڑتی چلی جاوے گی، اور اس کے برعکس اگر اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کی سعی کی جا رہی ہو گی، تو ایک ایک شخص کا انفرادی مسئلہ بھی بہتر ہوتا چلا آوے گا، جب کسی قوم، ملک یا امت کا اجتماعی مسئلہ بگڑا ہوا اور طاقت اسکی درستگی پر لگائی جائے تو وہ اجتماعی بھی درست ہو جاتا ہے اور ہر کسی کا شخصی بھی درست ہو جاتا ہے۔ ہمیں غلط فہمی ہوتی ہے کہ فلاں تدبیر کے نہ کرنے کی وجہ سے معاملہ بگڑا ہے، حالانکہ ہمارے ایک ایک مسئلہ کا بگڑنا اور بننا اجتماعی مسئلہ کے ساتھ ہے۔ ہاں اگر تھوڑے سے آدمی اجتماعی مسئلہ پر طاقت لگا دیں تو سب کے مسائل اجتماعی اور انفرادی درست ہو جاویں گے اور

اگر کچھ لوگ بھی پوری قوم میں سے اس کا فکر رکھنے والے نہ ہوئے تو اجتماعی کے ساتھ ہر کسی کا شخصی مسئلہ بھی بگڑ جائے گا اور سوائے حسرت و یاس کے کچھ حاصل نہ ہوگا ـــــ اجتماعی مسئلہ کے بگڑنے کی صورت میں اگر قوم کے اولیاء اللہ اس کے سدھار کے لیے راتوں کو رو رو کر بھی دعائیں کریں گے تو ان کی دعائیں بھی حالات کو بہتر نہیں بنا سکتیں ـــ اگر خدا تعالیٰ کے ہاں سے فیصلہ ہو جاوے کہ کسی ملک کے انسان بھوکے مریں تو اگر بھوک سے بچنے کے لیے ایک ایک شخص پوری طرح جان بھی کھپا رہا ہوگا تب بھی ایک ایک کر کے بھوک سے ہلاک ہو جاویں گے اپنی ذات کے مسئلہ میں لگ جانا ہی تو اجتماعی کے بگاڑ کا ذریعہ ہے۔ جوں جوں اپنی ذات کیلئے جان کھپاوے گا اسی قدر اجتماعی حالات بگڑتے جائیں گے اور یہاں تک بگڑیں گے کہ احادیث میں آتا ہے کہ لوگ قبروں پر سے گزرتے ہوئے حسرت کریں گے کہ کاش ہم بھی قبروں میں ہوتے، آدمی آدمی کو کاٹ کر کھا جاوے گا، یہ جب ہوگا کہ ہر کسی کا جذبہ جانوروں کی طرح صرف اپنی ہی ذات کے لیے ہو، ایسے انسان انسانوں کے جامہ میں درندے ہوتے ہیں، ساری پریشانی اس وجہ سے ہے کہ وقت تو اجتماعی مسائل کے لیے قربانی دینے کا ہے اور کوشش اس بات کی کر رہے ہیں کہ اچھا جب تک دوکان چلتی رہے چلاؤ یا زمین میں لگا جاوے لگے رہو۔ محض اپنے لگنے سے مسائل درست نہیں ہوتے بلکہ اللہ پاک ہی بگاڑتے ہیں اور وہ ہی بناتے ہیں۔

یقین اس بات پر جمانا ہے کہ جس چیز پر اللہ پاک طاقت لگوانا چاہتے ہیں اس میں لگنے سے تو مسائل ٹھیک ہوتے ہیں اور جن مخلوقات پر انسان از خود طاقت خرچ کرتا ہے اس سے مسائل بگڑتے ہیں۔ انفرادی بھی بگڑتے ہیں اور اجتماعی بھی۔ طاقتیں جب مخلوق پر خرچ ہونے لگیں تو خدا کا غضب نازل ہوتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو ایک دوسرے کے ہمدرد ہوتے ہیں وہ جان لیوا ہو جاتے ہیں، جس طرح چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں اسی طرح حالات بھی اللہ کی مخلوق ہیں، سورج مخلوق ہے، چاند مخلوق ہے، زمین و آسمان مخلوق ہیں، اور سارے جانور بھی مخلوق ہیں، حالات چیزوں کی مخلوق نہیں ہیں، حالات مستقل طور پر اللہ کی مخلوق ہیں، یہ بات نہیں کہ اگر کسی نے چاہا تو امن کر دیا اور چاہا تو فساد کر دیا۔ نہیں بلکہ یہ احوال

اللہ پاک کے لانے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جس طرح سورج اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح وہ روشنی جو اس میں سے نکل رہی ہے وہ بھی اسکی مخلوق ہے۔ جب چاہتے ہیں سورج سے روشنی نکالتے ہیں اور جب چاہتے ہیں سلب فرما لیتے ہیں کسی متحیر سے آدمی نہیں مرجاتا بلکہ جس طرح وہ آدمی اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح اس کی موت بھی اللہ کی مخلوق ہے، جب اللہ پاک مارنا چاہتے ہیں تو موت وقوع میں آتی ہے، اسی طرح عزت و ذلت، فقر وفاقہ وغیرہ سب اللہ پاک ہی کی مخلوق ہیں، ہمیں غلہ سے پیٹ کا بھرنا نظر آتا ہے اور اسی طرح سے دوسری چیزوں میں ہم غلط طور پر احوال کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور غلط تخیل قائم کرتے ہیں حالانکہ قرآن پاک میں صاف صاف ارشاد ہے کہ پانی ہم اُتارتے ہیں، کھیتی ہم اُگاتے ہیں، ایک عورت اگر خدا کی مخلوق ہے تو اس کے اندر میں جو بچہ ہے وہ بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے، مخلوق کسی وقت خالق نہیں بن جاتی، جو اوّل چیز کو بنانے والا ہے دوسری کو بھی وہی بناوے گا، کسی مخلوق کو مخلوق میں (سے ظاہر ہوتا) دیکھ کر (اس مخلوق پر) طاقت خرچ ہو گی تو مسئلہ بگڑے گا۔ روٹی کھانے میں پیٹ بھرنا (یعنی پیٹ بھرنے کی لازمی خاصیت) نہیں ہے۔ حضرت معاویہؓ فرماتے تھے کہ کبھی میری یہ حالت تھی کہ روٹی کھاتے کھاتے میرا جبڑا دُکھ جاتا تھا اور پیٹ نہیں بھرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جو کچھ بھی ہے زمین سے لے کر آسمان تک اور جو اس وقت موجود ہے اور جو آگے آنے والا ہے ساری ہی چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں اور سارے احوال بھی اس کے مخلوق ہیں تو بس جب کچھ لینا ہو اس کے لینے کے لیے اللہ ہی پر طاقت صرف کی جائے، اگر خوف سے گھبراہٹ ہے تو بھی رابطہ اللہ پاک سے ہی پیدا کیا جاوے، جس خوف کو اللہ پاک سے ہٹواؤ گے وہ ہمیشہ کے لیے ہٹ جاوے گا۔ اگر مخلوق پر طاقت صرف کر کے کوئی چیز حاصل کی تو وجود تو اس کا بھی اللہ ہی کے پیدا کرنے سے ہوگا تاہم مخلوق کے واسطہ سے آنے کی صورت میں وہ فانی ہوگی، جو شخص اللہ سے نہ لے بلکہ مخلوق سے لے تو بہت ہی پچھتانا پڑے گا اس لیے کہ جو مخلوق مخلوق میں سے آئے گی وہ فانی ہوگی اور اسکے فنا پر حسرت وافسوس ہوگا اور جو چیز اللہ سے آئے گی وہ ہمیشہ کے لیے ہو گی۔ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہی ہے کہ تمام مسائل کو ایک ذات باری تعالیٰ سے ہی حل کرانا ہے، لہٰذا وہ تدبیر اختیار کرو جو اس سے لینے کی ہیں۔ اگر

خدا تعالیٰ سے لینے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی تو دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ غیر خدا پر طاقت لگا کر ہم جو سمجھ رہے ہیں کہ چیزوں سے کچھ پیدا ہو رہا ہے تو اسمیں شرک کی بُو آتی ہے۔ کوئی مخلوق اللہ پاک کے حکم کے بغیر کچھ دے نہیں سکتی۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ بتلایا گیا ہے کہ مخلوقات میں کچھ نہ سمجھے بلکہ عقیدہ رکھے کہ اللہ ہی کرنے والے ہیں۔ اسی کو توحید کہتے ہیں جس طرح مخلوق سے فائدہ اٹھانے کی تدابیر ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ سے لینے کی بھی تدابیر ہیں سارے احکامات بعد کو آتے ہیں۔ پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ پاک پر یقین پیدا ہو جائے اور اسی کے پیدا کرنے کے لئے افسانوں میں کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں اگر تھوڑا سا یہاں خوف برداشت کر لیا جائے گا تو ہمیشہ کے خوف سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ تھوڑی سی بھوک و پیاس برداشت کر لی جائے گی تو ہمیشہ کی بھوک سے نجات مل جاوے گی، تھوڑا وقت بیوی بچوں کی جدائی میں گزر گیا تو ہمیشہ کا ساتھ نصیب ہوگا۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے تھوڑے دن بھوک پیاس برداشت کی تو اس دنیا میں بھی بڑی بڑی سلطنتوں کے دبے ہوئے خزانے تک ان کے پیروں میں آپڑے، ضرورت ہے کہ ذاتی تاثر کسی چیز کا نہ رہے تب ہی ملک مال کے فتنوں سے بچاؤ ہو سکتا ہے اور اللہ کے لیے ہر کسی سے معاملہ کرنا آجاوے۔ جب روپیہ نہ ہو تو بھی متاثر نہ ہو اور جب روپیہ آجائے تو اس سے بھی متاثر نہ ہو۔ ایسے ہی لوگ مسائح ہیں جو مخلوق کا تاثر ختم کر دیں۔ غرض یہ کہ اسوقت کے بگاڑ کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم سب جو اللہ پاک کے حکموں پر جان کھپانے والے ہوتے۔ وہ مخلوق پر جان کھپانے اور اسی سے لینے کے غلط تصور کے عادی ہو گئے، اللہ پاک کے حکموں پر جان کھپانے پر جس قدر اللہ کی مددوں کا یقین ہوگا اسی قدر غیب سے دروازے کھلتے جاویں گے، اگر خدا کے دین کے لیے جان کھپانے والوں کی مقدار بڑھے اور اس پر یقین ہو تو چونکہ ساری مخلوقات اللہ کی ذات سے وابستہ ہے۔ ہماری مرغوبات ہوں یا مکروہات اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو دنوں کو پوری طرح مخلوق میں اللہ پاک کا یقین پیدا کرنے کے لیے ٹھوکریں کھائیں اور راتوں کو اس کی جناب میں پوری طرح گریہ وزاری سے دعائیں مانگیں تو انشاء اللہ ہر طرح اجتماعی وانفرادی احوال درست اور موافق ہو جائیں گے۔

مُسلمانوں کو اُمّت بننے کی دعوت

{ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وصال سے تین دن پہلے یعنی ۲۶ ذیقعدہ (مطابق ۳۰ مارچ) منگل کے دن، بعد نماز فجر رائیونڈ (ضلع لاہور) میں ایک اہم تقریر فرمائی تھی (یہ آپ کی زندگی کی اہم آخری تقریر تھی۔) ہمیں یہ تقریر مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے ـــــ یہ پوری تقریر ۲۶ صفحہ کی تھی، صفحات میں گنجائش کی کمی اور ناظرین کی سہولت فہم کے لیے ہم کسی قدر اختصار اور لفظی ترمیم کے ساتھ اس کو ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ ہم نے اسکی کوشش کی ہے کہ اس کا کوئی اہم حصہ چھوٹنے نہ پائے۔ حضرت مولانا مرحوم نے حمد و صلوٰۃ کے بعد خلاف عادت تقریر اس طرح شروع فرمائی }

"دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ اس کے باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں، جو سمجھ کے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اسے نپکائے گا ورنہ اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارے گا"

اس کے بعد فرمایا:-

"یہ اُمت بڑی مشقت سے بنی ہے اس کو امت بنانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے بڑی مشقتیں اُٹھائی ہیں اور ان کے دشمنوں یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اسکی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک اُمت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اب مسلمان اپنا امت بنا (یعنی اُمت ہونے کی صفت) کھو چکے ہیں، جب تک یہ اُمت بنے ہوئے تھے چند لاکھ ساری دنیا پر بھاری تھے، ایک پکا مکان نہیں تھا، مسجد تک پکی نہیں تھی، مسجد میں چراغ تک نہیں جلتا تھا، مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے۔ سب سے پہلا چراغ جلانے والے تمیم داریؓ

ہیں وہ ۹ سنہ ھ میں اسلام لائے ہیں ـــ اور ۹ سنہ ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک اُمت بن چکے تھے تو جب یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس وقت مسجد نبوی میں چراغ جلا، لیکن حضور جو نور ہدایت لیکر تشریف لائے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور امت بن چکی تھی، پھر یہ امت دنیا میں اُٹھی جدھر کو نکلی ملک کے ملک پیروں میں گرے .... یہ امت اسطرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا، مال و جائداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ و رسول کیا فرماتے ہیں، امت جب ہی بنتی ہے جب اللہ و رسول کے حکم کے مقابلہ میں سارے رشتے اور سارے تعلقات کٹ جائیں۔ جب مسلمان ایک اُمت تھے تو ایک مسلمان کے کہیں قتل ہو جانے سے ساری اُمت ہل جاتی تھی اب ہزاروں لاکھوں کے گلے کٹتے ہیں اور کانوں پہ جوں نہیں رینگتی۔

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے آگے آپ نے فرمایا۔

اُمت کسی ایک قوم اور ایک علاقہ کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سیکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جُڑ کر اُمت بنتی ہے جو کوئی کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ اُمت کو ذبح کرتا ہے اور اُس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ کی اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے ـــ امت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی اُمت کو کاٹا ہے ـــ اگر مسلمان اب پھر امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم اُمت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے آگے آپ نے فرمایا:۔

مسلمان ساری دنیا میں اس لیے پٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اُس نے امت پنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے میں یہ دل کے غم کی باتیں کہہ رہا ہوں، ساری تباہی اس

جیسے ہے کہ اُمت اُمت نہ رہی بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ اُمت کیا ہے اور حضورؐ نے کس طرح امت بنائی تھی۔

اُمت ہونے کے لیے اور مسلمانوں کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو، ذکر ہو، مدرسہ ہو، مدرسہ کی تعلیم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ابن ملجم ایسا نمازی اور ایسا ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اسکی زبان کاٹنی چاہی تو اس نے کہا سب کچھ کر لو لیکن میری زبان مت کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا ہے کہ علی کا قاتل میری اُمت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہوگا، اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھ دی، حالانکہ انھوں نے ہی اکبر کو گمراہ کرکے دین کو برباد کیا تھا۔ تو جو باتیں ابن ملجم اور ابوالفضل فیضی میں تھیں وہ اُمت بننے کے لیے اور خدا کی غیبی نصرت کے لیے کیسے کافی ہوسکتی ہیں۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے آگے حضرت مولانا نے فرمایا:۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھی دینداری کے لحاظ سے بہترین مجموعہ تھے، وہ جب سرحدی علاقے میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنالیا تو شیطان نے وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ یہ دوسرے علاقے کے لوگ اپنی بات یہاں کیوں چلائے۔ انھوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی، ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کردیے گئے اور اس طرح خود مسلمانوں نے علاقائی بنیاد پر امت بننے کو توڑ دیا، اللہ نے اسکی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا ــــ

یاد رکھو میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب امت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارہ میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجہ میں انصار اور مہاجرین میں تفریق ہوجاتی۔) اُس کا نتیجہ حضرت سعد کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑا۔ روایات میں یہ ہے کہ ان کو جنات نے قتل کردیا اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی اور بولنے والا کوئی نظر نہ آیا۔

قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہ (۱)

رمیناہ بسہم فلم یخط فؤادہ

اس واقعہ نے مثال قائم کردی اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقہ کی بنیاد پر اُمت بننے کو توڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا۔

اُمت جب بنے گی جب اُمت کے سب طبقے بلا تفریق اُس کام میں لگ جائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے کے گئے ہیں۔ اور یاد رکھو اُمت بننے کو توڑنے والی چیز ہیں معاملات اور معاشرت کی خرابیاں۔ ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرتا ہے اور اُس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف پہنچاتا ہے یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور اُمت بنا ٹوٹتا ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے اُمت نہیں بنے گی، امت معاملات اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لیے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کرکے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اس اُمت کو امت بنایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپے آئے اُن کی تقسیم کا مشورہ ہوا، اس وقت اُمت بنی ہوئی تھی، یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلہ یا ایک ہی طبقہ کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے جو حضور کی صحبت کے اعتبار سے بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے، انھوں نے مشورہ سے باہم طے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضورؐ کے قبیلہ والوں کو دیا جائے۔ اسکے بعد حضرت ابوبکرؓ کے قبیلہ والوں کو، پھر حضرت عمرؓ کے قبیلہ والوں کو۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آتے ــــ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپ کے صدقے میں مل رہا ہے، اس لیے بس حضورؐ ہی کے تعلق کو معیار بنایا جائے جو نسب میں آپ سے زیادہ قریب ہوں ان کو زیادہ دیا جائے

(۱) ہم نے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو ہلاک کردیا ہم نے اس کو تیر کا نشانہ بنایا جو ٹھیک اس کے دل پر لگا۔

جو دوم سوم چہارم نمبر پر ہیں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے، اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے اس کے بعد بنی عبد مناف کو پھر قصی کی اولاد کو، پھر کلاب کی، پھر کعب کو، پھر مرہ کی اولاد کو، اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑ جاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہو جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلہ کو اتنے پیچھے ڈال دیا ــــ اس طرح بنی تھی یہ اُمت!

اسی سلسلہ میں آگے فرمایا:

اُمت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو پھوٹ نہ پڑے ــــ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج، تبلیغ سب کچھ کیا ہوگا مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا کیونکہ اسکی کسی بات نے اُمت میں تفریق ڈالی ہوگی، اُس سے کہا جائے گا پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا بھگت لے جس کی وجہ سے اُمت کو نقصان پہنچا، اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس نماز روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور وہ خدا کے عذاب سے بہت ڈرتا ہوگا، مگر اسکو بہت ثواب سے نوازا جائے گا، وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے اسکو بتایا جائے گا کہ تو نے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے اُمت میں پیدا ہونے والا ایک فساد رُک گیا اور رجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہو گیا۔ یہ سب تیرے اسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

اُمت کے بنانے اور بگاڑنے میں جوڑنے اور توڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے، یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے زبان سے ایک بات غلط اور فساد کی نکل جاتی ہے اور اس پر لاٹھی چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کر دیتی ہے اور پھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے ــــ اس لیے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبانوں پر قابو ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے جب بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اور اسکی ہر بات کو سُن رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں آگے فرمایا کہ:

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج ان میں پشتوں سے عداوت اور

لڑائی چلی آرہی تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے اور انصار کو اسلام کی توفیق ملی تو حضور کی اور اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہوگئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اسکیم بنائی کہ کسی طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں دونوں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے اُن کی پرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کر دیا۔ پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ حضورؐ سے کسی نے جا کر کہا، آپ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کرو گے، آپ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا، دونوں فریقوں نے محسوس کر لیا کہ ہمیں شیطان نے ورغلایا، دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں " یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ..... الخ

اے مسلمانو خدا سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنا چاہیئے اور مرتے دم تک پورے پورے مُسلم اور خدا کے فرمانبردار بندے بنے رہو ـــــ جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا اس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اسکی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اُسے نہیں بہکا سکے گا ـــــ اور اُمت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔

آگے فرمایا:-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ـــــ اور اللہ کی رسّی کو یعنی اسکی کتاب کو اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رہو یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور اُمت ہونے کی صفت کے ساتھ سب مل جُل کر دین کی رسّی کو تھامے رہو اور اُس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقہ کی بُنیاد پر یا زبان کی بنیاد پر، یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور اللہ کے اس احسان کو نہ بھولو کہ اُس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پُشتوں سے تم میں چلی آرہی تھی تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی

بنا دیا اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے بس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچا لیا۔

اس کے آگے فرمایا کہ :-

شیطان تمہارے ساتھ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی کی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر برائی اور فساد سے روکنا ہو۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

اُمت میں ایک گروہ وہ ہو جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلائے۔ ایمان کے لیے اور خیر اور نیکی کے راستہ پر چلنے کے لیے محنت کرتا رہے، نمازوں پر محنت کرے، ذکر پر محنت کرے، حضورؐ کے لائے ہوئے علم پر محنت کرے، برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لیے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے اُمت ایک اُمت بنی رہے ——— آگے فرمایا :

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ ——— جو لوگ ان ہدایتوں کے بعد بھی شیطان کی پیروی کر کے اور الگ الگ راہوں پہ چل کے اختلاف پیدا کریں گے اور اُمت کے امت پنے کو توڑیں گے تو ان پر خدا کی سخت مار پڑے گی (أُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ)

دین کی ساری تعلیم اور ساری چیزیں جوڑنے والی اور جوڑنے کے لیے ہیں نماز میں جوڑ ہے روزہ میں جوڑ ہے، حج میں قوموں اور ملکوں اور مختلف زبان والوں کا جوڑ ہے تعلیم کے حلقے جوڑنے والے ہیں، مسلمانوں کا اکرام اور باہم محبت اور تحائف کا لین دین یہ سب جوڑنے والی اور جنت میں لے جانے والی چیزیں ہیں اور قیامت میں ان اعمال کے لیے محنتیں کرنے والوں کے چہرے نورانی ہوں گے اور ان کے برخلاف باہم بغض، حسد، غیبت، چغل خوری، توہین تحقیر اور دل آزاری یہ سب پھوٹ ڈالنے والے اور توڑنے والے اور دوزخ میں لیجانیوالے اعمال ہیں اور ان اعمال والے آخرت میں روسیاہ ہوں گے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ

اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝
وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جنھوں نے پھوٹ ڈال کے اور پھوٹ ڈالنے والے اعمال کر کے اُمت کو توڑا ہوگا وہ قیامت کے دن تیروں سے کالے منھ اُٹھیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان و اسلام کے بعد کفر والوں کا طریقہ اختیار کیا، اب تم یہاں دوزخ کا عذاب چکھو اور جو ٹھیک راستہ پر چلتے رہے ہوں گے، ان کے چہرے نورانی اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں اور جنت میں رہیں گے۔

میرے بھائیو دوستو! یہ سب آیتیں اس وقت اُتری تھیں۔ جب یہود نے انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی، اور ان کے دو قبیلوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ ان آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی پھوٹ اور لڑائی کو کفر کی بات کہا گیا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے ——— آج ساری دنیا میں امت بنا توڑنے کی محنت چل رہی ہے اس کا علاج اور توڑ یہی ہے کہ تم اپنے کو حضورؐ والی محنت میں لگا دو، مسلمانوں کو مسجدوں میں لاؤ، وہاں ایمان کی باتیں ہوں۔ تعلیم اور ذکر کے حلقے ہوں۔ دین کی محنت کے مشورے ہوں۔ مختلف طبقوں کے اور مختلف برادریوں کے اور مختلف زبانوں والے لوگ مسجد نبوی کے طریقہ پر ان کاموں میں جُڑیں۔ جب امت بنا آئے گا۔ ان باتوں سے نجیب جن سے شیطان کو پھوٹ ڈالنے کا موقع ملے جب تین بیٹھیں تو اس کا خیال رکھیں کہ چوتھا ہمارے ساتھ اللہ ہے، چار پانچ بیٹھیں تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ پانچواں یا چھٹواں اللہ ہمارے ساتھ ہی موجود ہے، اور وہ ہماری ہر بات سُن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ ہم امت بنانے کی بات کر رہے ہیں یا امت پنا توڑنے کی۔ ہم کسی کی غیبت اور چغلخوری تو نہیں کر رہے، کسی کے خلاف سازش تو نہیں کر رہے۔

——— یہ امت حضورؐ کے خون اور خاکوں سے بنی تھی، اب ہم اپنی معمولی معمولی باتوں پر امت کو توڑ رہے ہیں، یاد رکھو نماز جمعہ چھوڑنے پر بھی اتنی پکڑ نہیں ہوگی جتنی امت کے توڑنے پر ہوگی ——— اگر مسلمانوں میں امت پنا آجائے تو وہ دنیا میں ہرگز ذلیل نہ ہوں گے، روس اور امریکہ کی طاقتیں بھی ان کے سامنے جھکیں گی، اور اُمت پنا جب آئے گا جب اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ پر مسلمانوں کا

عمل ہو یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں چھوٹا بننے اور ذلت و تواضع اختیار کرنے کو اپنائے تبلیغ میں اسی کی مشق کرتی ہے۔ جب مسلمانوں میں "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ" والی صفت آجائے گی تو وہ دنیا میں "اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" یعنی کافروں کے مقابلہ میں زبردست اور غالب ضرور ہوں گے چاہے وہ کافر یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔

میرے بھائیو دوستو! اللہ و رسول نے ان باتوں سے شدت اور سختی سے منع فرمایا ہے جن سے دلوں میں فرق پڑے اور پھوٹ کا خطرہ بھی ہو، دو دو چار چار الگ کانا پوسی کریں اس سے شیطان دلوں میں بدگمانی پیدا کرسکتا ہے اس سے منع فرمایا گیا اور اس کو شیطانی کام بتایا گیا۔ "اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" اسی طرح تحقیر اور استہزاء اور تمسخر سے منع فرمایا گیا "لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ" اس سے بھی منع فرمایا گیا کہ دوسرے کی کوئی برائی جو معلوم نہ ہو اس کو تجسس کرکے معلوم کیا جائے اور جو برائی کسی کی معلوم ہوگئی ہو اس کو دوسروں کے سامنے ذکر کرنے سے منع فرمایا گیا، اور غیبت کو حرام کیا گیا، غیبت اس کا نام ہے کہ جو واقعی برائی کسی کی معلوم ہو اس کا ذکر کسی سے کیا جائے "وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا" یہ تحقیر اور تمسخر اور تجسس اور غیبت سب وہ چیزیں ہیں جو آپس میں تفرقہ پیدا کرکے اُمت بننے کو توڑتی ہیں، ان سب کو حرام قرار دیا گیا ــــ اور ایک دوسرے کا اکرام و احترام کرنا جس سے اُمت جڑتی بنتی ہے اس کی تاکید فرمائی گئی اور دوسروں سے اپنا اکرام چاہنے سے منع کیا گیا، کیونکہ اس سے امت بنتی نہیں بگڑتی ہے۔ امت جب بنے گی جب ہر آدمی یہ طے کرے کہ میں عزت کے قابل نہیں ہوں اس لیے مجھے عزت لینی نہیں، بلکہ دوسروں کی عزت کرنی ہے اور دوسرے سب لوگ اس قابل ہیں کہ میں ان کی عزت کروں، ان کا اکرام کروں۔

اپنے نفسوں اور اپنی ذاتوں کو قربان کیا جائے گا تو امت بنے گی اور امت بنے گی تو عزت ملے گی، عزت اور ذلت روس اور امریکہ کے نقشوں میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور اُس کے ہاں اُصول اور ضابطہ ہے۔ جو شخص یا قوم، خاندان طبقہ جمکانیوالے اصول اور اعمال لاوے گا اس کو چمکا دیں گے جو مٹنے والے کام کرے گا اس کو مٹا دیں گے۔ یہود

نبیوں کی اولاد ہیں اصول توڑے تو اللہ نے ٹھوکر مار کے اُن کو توڑ دیا۔ صحابہ کرامؓ بُت پرستوں کی اولاد تھے، انھوں نے چمکانے والے اصول اختیار کیے تو اللہ نے ان کو چمکا دیا، اللہ کی خانہ زادی کسی سے نہیں ہے اس کے ہاں اصول اور ضابطہ ہے۔

دوستو! اپنے کو اس محنت پر جھونک دو، حضور کی امت میں امت بنا آجائے۔ امیں ایمان ویقین آجائے، یہ ذکر و تسبیح اور تعلیم والی، خدا کے سامنے جھکنے والی، خدمت کرنیوالی، برداشت کرنے والی، دوسروں کا اعزاز واکرام کرنے والی امت بن جائے، بخوبی نہ کرنے والی، نافرمانی نہ کرنے والی، اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کی تحقیر و تمسخر اور تجسس و غیبت نہ کرنے والی امت بن جائے ـــــ اگر کسی ایک علاقہ میں بھی یہ محنت اس طرح ہونے لگے جس طرح ہونی چاہیے تو ساری دنیا میں بات چل پڑے۔

اب اس کا اہتمام کرو کہ مختلف قوموں، علاقوں اور طبقوں اور مختلف زبان والوں کو جوڑ جوڑ کر جماعتوں میں بھیجو اور اصول کی پابندی کراؤ۔ پھر انشاء اللہ امت بننے والا کام ہوگا اور شیطان اور نفس خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے

اس کے بعد حضرت مولانا نے دیہات میں محنت کرنے اور فضا بنانے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ـــ اور سب معمول دُعا پر تقریر ختم ہوئی۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ

اور

اُن کی دینی دعوت

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

اس کتاب میں حضرت مولاناؒ کے ذاتی حالات، کمالات اور سوانح کے علاوہ اُنکی اس دینی دعوت کے اُصول اور فکری بنیادوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو ہمارے اس عہد کی بلا شبہ سب سے وسیع و عمیق دینی و اصلاحی دعوت ہے، شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کا فاضلانہ اور عارفانہ مقدمہ ہے۔

قیمت ۲/۵۰ ـــــ مجلد ۳/۰

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ۔ لکھنؤ

مولانا کا طرزِ فکر

چند جھلکیاں

[اس عاجز کے پاس حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مختلف تقریروں کے کچھ منتشر نوٹس تھے۔ یہ سارے نوٹس صرف اشارات میں تھے جو دراصل خود اپنے استفادہ اور اپنی یادداشت کے لیے نوٹ کیے گئے تھے۔ ان میں سے چند ٹکڑے مرتب کرکے ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ ہر ٹکڑے کے مضمون کے متعلق پورا اطمینان ہے کہ وہ حضرت مولانا ہی کا ہے لیکن الفاظ کی ذمہ داری ناقابل اس عاجز پر ہے۔ اسی طرح آیات قرآنی کے جو ترجمے کیے گئے ہیں ان کا ذمہ دار بھی یہ ناچیز ہی ہے۔

یہ مختلف تقریروں کے الگ الگ اجزاء ہیں، اب یہ بھی پتہ نہیں کہ ان میں سے کون تقریر کس زمانہ میں کی گئی تھی۔ بعض لوگوں نے مولانا کی تقریریں سنی ہیں اور ان کی دینی دعوت کو بنیادی طور پر سمجھا ہے۔ امید ہے کہ یہ ٹکڑے انھیں بہت کچھ یاد دلائیں گے اور وہ ان میں اپنے لیے رہنمائی کا کافی سامان پائیں گے۔

محمد منظور نعمانی]

---

(۱)

یہ خیال غلط ہے کہ ملک و مال ہاتھ میں آجانے سے اسلام چمکے گا۔ ملک و مال والے تو اسلام کو زندہ درگور کر رہے ہیں۔ آج جن کے ہاتھوں میں حکومت اور اس کے خزانے ہیں وہ ابوبکر و عمر کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ قیصر و کسریٰ اور شداد و قارون کے نمائندے ہیں۔ ان سے حیات اسلامی کی توقع بالکل غلط ہے ان کے ہاتھوں اسلام کا جو حال ہے اس کو دیکھ کے تو دل کہتا ہے۔

"اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" ——— (اللہ اس مردے میں اب کیسے جان ڈالیگا)

اسلام جب بھی چمکا ہے قربانیوں سے چمکا ہے آج بھی قربانیوں ہی سے چمکے گا۔ اسلام کے لیے اگر قربانیاں ہوں تو یہ دشمنوں کے گھیرے میں بھی چمکتا ہے اور جب قربانیاں نہ ہوں تو اپنی بادشاہت میں مٹ جاتا ہے۔

جو لوگ اخلاص کے ساتھ قربانیاں دیتے رہیں گے۔ ان کی طرف ملک و مال والے ایک دن خود رجوع ہوں گے، وہ وقت بڑی آزمائش کا ہوگا۔ اگر نظر ان کی حکومت اور دولت پر ہوگئی اور یہ سمجھا گیا کہ اب ان کی دولت اور حکومت سے دین کا کام چلے گا تو سب کیا دھرا برباد ہو جائے گا اور اگر ان کے ملک و مال سے نظر ہٹا کے ان کو بھی قربانی کے راستہ پر لگایا گیا تو پھر ان سے بھی بڑے آئیں گے۔ ان کے ساتھ بھی یہی کرنا ہوگا یہاں تک کہ حکومتوں کے صدور اور وزرائے اعظم آئیں گے ان کو بھی اسی راستہ پر لگانا ہوگا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ دعوت اور قربانی کا راستہ ہے ملک و مال کا راستہ نہیں ہے۔

ایسوں کی ضرورت ہے جو روس اور امریکہ کی مادی فضاؤں میں بھی اسی یقین پر جمے رہیں کہ دین صرف دعوت کے راستہ کی قربانیوں سے اور قربانیوں کے بعد کی دعاؤں سے چمکے گا اور اس یقین پر دعوت کے راستہ میں قربانیاں دیتے رہیں، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہر اور کن فیکونی شان پر نگاہ رکھتے ہوئے امید و یقین کے ساتھ ہدایت کی اور جن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور ان کی وجہ سے ہدایت کا راستہ رک رہا ہے ان کی بربادی کی دعائیں کریں۔ پھر یا تو ہدایت کے دروازے کھلیں گے یا وہ ہوگا جو شداد و نمرود اور فرعون و ہامان کے ساتھ ہوا۔

(۲)

تم دنیا میں سورج کی طرح نور کے ساتھ پھرو گے تو تم سے دنیا میں نور پھیلے گا اور نور تمہارے اندر ایمان سے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال و اخلاق سے اور اخلاص کے ساتھ دین کی دعوت سے آئے گا ——— سورج میں تین باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نور کے ساتھ پھرتا ہے، دوسرے مسلسل پھرتا ہے، تیسرے یہ کہ جن کو روشنی پہونچاتا ہے ان سے خود کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ تمہارا حال بھی یہی ہونا چاہیے، نور کے ساتھ پھرو، مسلسل پھرو

اور "لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا" کو اپنا اصول بناؤ، دعوت کے عمل سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ

(۳)

آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو ترقیاں نظر آ رہی ہیں وہ مادہ پر محنت کا نتیجہ ہے انبیاء علیہم السلام کا راستہ روح پر محنت اور روحانی ترقی کا راستہ تھا۔ وہ اللہ کی رضا والے اعمال پر محنت کر کے اور قربانیاں دے کے اللہ کی طاقت سے اپنے مسائل حل کراتے تھے ـــــ فرعون کے پاس فوج تھی، لشکر تھا اور ہر قسم کی مادی طاقت تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بس روح کی ترقی والے اور اللہ کی رضا والے اعمال کے لیے تیار کیا ان سے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم نے ایمان والا راستہ اختیار کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ کرو اور پورے ایمان و یقین اور اعتماد کے ساتھ اس سے مدد مانگو۔ (یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝)

قوم نے کہا ہم نے آپ کی بات مان لی اور اللہ پر یقین و توکل کا راستہ اختیار کر لیا اور ہم اپنے اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ فرعون اور فرعونی حکومت کے ظلم و ستم سے ہماری حفاظت فرمائے اور اس کافر قوم کی غلامی کی مصیبت سے ہمیں نجات دلائے۔ (رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝)

اس کے بعد قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون کو حکم دیا کہ اپنی قوم کی ایمانی تربیت کے لیے مصر میں خاص مرکز اور عبادت خانے قائم کرو اور اقامت صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق جوڑو اور ان کی زندگی کو اللہ کی فرمانبرداری والی زندگی بناؤ اور ساتھ ہی فرمایا گیا کہ جب یہ باتیں عمل میں آجائیں تو قوم کو بشارت سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور اللہ کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ (وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝)

حضرت موسیٰ اور ہارون اللہ کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کی تربیت میں لگ گئے اور بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ کا عمل اور تبلیغ کی محنت شروع کر دی تو حضرت موسیٰ اور ہارون نے دعا کی کہ خداوندا تو نے فرعون اور

فرعونیوں کو دنیا کے جو ساز و سامان دے رکھے ہیں وہ ان کے ذریعہ تیرے بندوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اے مالک تو ان کے مال و دولت کو ملیامیٹ کر دے۔ اور بھاڑ پھیرے (وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ دہاروں کی دعا قبول فرمائی۔ ان کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ وہ نکل گئے۔ اللہ نے ان کیلئے سمندر میں راستہ بنا دیا جس سے وہ صحیح سلامت پار ہو گئے۔ فرعون نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور وہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ اسی میں غرق کر دیا گیا۔ یہ جو کچھ ہوا براہ راست اللہ کی طاقت سے ہوا۔

انبیاء علیہم السلام کا راستہ یہی ہے۔ وہ اپنے کو اور اپنے ساتھیوں کو بس اللہ کے حکموں پر ڈال دیتے ہیں اور اللہ کے راستے میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں، قربانیاں دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی طاقت سے ان کے مسائل حل کرتا ہے ـــــ قرآن پاک میں اس کو "سنۃ اللہ" کہا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ازلی ابدی قانون ہے۔

فلن تجد لسنة الله تبديلا ولن تجد لسنة الله تحويلا

(۴)

آج کل اس دنیا میں چیزوں کے حاصل کرنے کے لیے براہ راست چیزوں پر محنت کرنے کا رواج ہے، کھیت والے کھیت سے غلہ حاصل کرنے کے لیے بس کھیت ہی پر محنت کرتے ہیں، تجارت اور سوداگری والے اور کارخانوں والے بس دوکانوں اور کارخانوں پر محنت کرتے ہیں، یہی محنت آج کل عام ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ محنت و مجاہدہ کر کے اپنے اندر تقویٰ پیدا کیا جائے اور پھر اللہ تعالیٰ انعام کے طور پر اپنے خزانۂ غیب سے چیزیں نصیب فرمائے اور برکت فرمائے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ"

اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اسکے واسطے راستے پیدا کریں گے اس کو وہاں سے روزی عطا فرمائیں گے جہاں سوائے وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

اور فرمایا گیا ہے۔

"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا"

اور جو تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے کاموں کو آسان کر دیں گے۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ"

اور اگر ان لوگوں میں ایمان اور تقویٰ کی صفات ہوتیں تو ہم ان پر زمین و آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ان آیتوں میں تقویٰ پر جو کچھ وعدہ فرمایا گیا ہے اس کا تعلق اسی دنیا سے ہے۔

اور یہ بات کہ تقویٰ کیا ہے اس کی تفصیل اس آیت سے معلوم ہوگی۔ اس آیت میں تقویٰ کی ساری شرطیں بیان کر دی گئی ہیں۔

"لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ

نیکی کا معیار یہ نہیں ہے کہ تم مشرق کی طرف رخ کر دیا مغرب کی طرف بلکہ اصل نیکی ان کی ہے (اور اللہ کی نگاہ میں نیکوکار ہیں) جو ایمان رکھتے ہوں اللہ پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر اور اس کے نبیوں پر اور دیویں اپنا مال اس کی چاہت کے باوجود اہل قرابت کو اور یتیموں مسکینوں کو اور (ضرورتمند) مسافروں کو اور سائلوں کو اور غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ اور وفا کرنے والے اپنے عہد کے جب عہد کریں اور صبر و برداشت سے کام لینے والے تنگی اور تکلیف میں اور ثابت قدم رہنے

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

والے، جنگ کے وقت یہی بندے ہیں سچے اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کے متقی ہونے کے لیے یہ چند باتیں ضروری ہیں۔

ایک ایمان باللہ۔ یعنی اس حقیقت کا پورا یقین کہ سب کچھ اللہ کی ذات سے ہوتا ہے اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے بس اسی کو راضی کرنے کی فکر کرنی چاہیے اور اسی کے لیے مرنا مٹنا چاہیے۔

دوسرے ایمان بالیوم الآخر۔ یعنی اس حقیقت کا یقین کہ یہ زندگی اصل زندگی نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے خاتمہ کے بعد ایک دوسری زندگی اور دوسرا عالم ہے اور وہی اصل عالم اور اصل زندگی ہے اور یہ چند روزہ زندگی بس اس کی تیاری کے لیے ہے اور انسان کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اسی اخروی زندگی کی کامیابی اور ناکامی پر ہے۔

تیسرے ایمان بالملٰئکہ یعنی اس بات کا یقین کہ یہ عالم جن ظاہری اسباب سے چلتا ہوا نظر آتا ہے دراصل ان اسباب سے نہیں چل رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے باطنی نظام کے ذریعہ اس سارے ظاہری نظام کو چلا رہا ہے۔ مثلاً ہمیں نظر آتا ہے کہ بارش بادلوں سے اور ہواؤں سے ہوتی ہے اور زمین کی چیزیں بارش کے پانی سے اگتی ہیں۔ ملائکہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات کا یقین کریں کہ اللہ تعالیٰ یہ سارے کام دراصل فرشتوں سے کرا رہا ہے۔ گویا ان ظاہری اسباب کے پیچھے فرشتوں کا نظر نہ آنے والا نظام ہے، اور اس کے پیچھے اللہ کی ذات اور اس کا حکم اور اس کی مشیت ہے۔

چوتھے ایمان بالکتاب والنبیین۔ یعنی اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں کے بارہ میں یقین کہ یقینی علم وہی ہے جو اللہ کی کتابوں میں ہے اور جو نبیوں کے ذریعہ انسانوں کو ملا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ غیر یقینی ہے اور ناقص ہے مثلاً انسانوں کی فلاح اور کامیابی کا راستہ وہی ہے جو اللہ کے نبیوں نے اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں نے بتایا ہے، اگر دنیا بھر کے فلسفی اور دنیا بھر کے لیڈر اس کے خلاف کہتے ہیں اور سوچتے ہیں تو غلط ہے اور ان کا جہل ہے۔

یہ چار باتیں ایمان و یقین کی لائن کی تھیں یعنی متقی ہونے کی پہلی شرط یہ بتلائی گئی کہ ان چار باتوں کے بارہ میں یقین صحیح ہو۔ اس کے بعد فرمایا گیا "وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ" یعنی ایمان و یقین کی درستی کے ساتھ وہ مالیات کو بھی اس یقین کے مطابق بنائیں، مال کی طبعی چاہت اور اس سے دل چسپی اور محبت کے باوجود اپنا کمایا ہوا مال وہ اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے نبیوں اور کتابوں کی تعلیم کے مطابق اپنے ماحول کے ضرورت مندوں پر خرچ کریں، قرابت داروں پر خرچ کریں، یتیموں مسکینوں پر خرچ کریں بے چارے پردیسیوں کا بندوبست کریں، حاجت مند سائلوں کو دیں، غلاموں کو آزاد کرانے پر خرچ کریں۔ غرض اپنی کمائی دوسروں پر لگائیں اور اس سے دوسروں کو آرام اور نفع پہونچائیں۔

اس کے بعد تیسری شرط تقویٰ کی یہ بتائی گئی کہ نماز قائم کریں جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے اہتمام سے اچھی سے اچھی نماز پڑھنے کی کوشش کریں۔

چوتھی شرط یہ بتائی گئی کہ زکوٰۃ بھی اہتمام سے ادا کریں۔

آخر میں اخلاقیات کی درستی کی شرط بیان کی گئی "وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ" یعنی ان میں وفائے عہد ہو، اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا کریں اور تنگیوں اور تکلیفوں میں اور جنگ اور قربانی کے میدانوں میں صبر اور برداشت سے کام لینے والے ہوں، حالات کیسے ہی مخالف ہوں مگر ان کے پاؤں میں لغزش نہ آئے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ "أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ" کہ یہی اللہ کے سچے بندے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ان سب رخوں پر محنت کرنی ہوگی۔ ایمان و یقین کے لیے محنت، مالیات کے درست کرنے پر محنت، نماز پر محنت، زکوٰۃ پر محنت، اخلاق کی درستی پر محنت، جب یہ سب چیزیں صحیح ہو جائیں گی اس وقت آدمی متقی ہوگا اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ

غریب اس کے مسائل حل کرے گا، اس کے لیے پر کتوں کے دروازے کھلیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقویٰ پر جو انعامات اس دنیا میں ہوتے ہیں اور متقی بندوں کے مسائل جو حل کیے جاتے ہیں ان کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔

اکثر تو ایسا ہوتا ہے کسی متقی بندے کو کسی چیز کی ضرورت پیش آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کے دل میں ڈالا اور اس نے وہی چیز ہدیہ کے طور پر پیش کر دی یہ بہت عام اور متعارف طریقہ ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت پیش آئی اور اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی واسطہ سے اپنے فضل سے اس کو حل فرما دیا۔ مثلاً ایک بندہ بیمار ہوا، اسے بیماری کی تکلیف شروع ہوئی اس نے اللہ سے شفا کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر حکیم، ڈاکٹر اور بغیر دوا کے شفا عطا فرما دی۔

کبھی کسی بندہ کی ضرورت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ اپنے کسی دوسرے بندہ کو خواب میں بھی مطلع فرماتے ہیں۔ حسن ابن سفیان ایک بزرگ ہیں، ان کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ اور ان کے دو ساتھی علم حدیث اور دین کی طلب میں نکلے ایک شہر میں قیام کیا، جو تھوڑا بہت اپنے پاس تھا سب ختم ہو گیا اس کے بعد جب فاقوں پر فاقے آنے لگے تو انھوں نے طے کیا کہ اب ہم ایسی حالت میں ہیں کہ ہمارے لیے سوال جائز ہے۔ مشورہ سے طے ہوا کہ حسن ابن سفیان جائیں اور کسی سے کچھ مانگ کے لائیں، یہ بے چارے نکلے لیکن انہیں شرم آئی کہ کسی مخلوق سے سوال کریں، تنہائی کا کونا گوشہ تلاش کیا اور صلوٰۃ حاجت پڑھ کر اللہ سے دعا کی۔ اور واپس آگئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میں تو کسی سے سوال نہیں کر سکا۔ میں نے بھی دعا کی ہے اور تم بھی بس اللہ سے دعا کرو۔ اسی رات کو شہر کے امیر نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص اس کو آسمان کی طرف سے بڑے جلال کے انداز میں پکار رہا ہے، نگاہ اٹھا کے دیکھا تو نظر آیا کہ ایک شخص غصہ میں بھرا ہوا ہے اور نیزہ اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ نیزے کا رخ امیر کی طرف کر کے ڈانٹ کے کہہ رہا ہے

ادرك الحسن سفيان واصحابه قبل ان يموتوا۔

حسن ابن سفیان اور ان کے ساتھیوں کی خبر لے قبل اس کے کہ ان بیچاروں کا خاتمہ ہو جائے

خواب ہی میں یہ بھی اشارہ ملا کہ وہ شہر کی کسی مسجد میں ہیں۔ امیر نے اٹھتے ہی شہر میں ان کی تلاش شروع کرائی اور جب حکومت کے بعض کارندوں نے ان لوگوں کو تلاش کر لیا اور پا لیا اور امیر کی طرف سے کچھ اشرفیاں ان کو پہونچائیں اور ان سے کہا کہ امیر آپ سے ملنا چاہتے ہیں تو یہ اللہ کے بندے خاموشی کے ساتھ شہر سے غائب ہو گئے تاکہ لوگوں پر ان کا راز نہ کھلے ——— تو اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کے مسائل کبھی اس طرح بھی حل کرا تا ہے۔

اور سب سے زیادہ عجیب واقعہ تو مشہور صحابی حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کا ہے جو حدیث کی کتابوں میں مروی ہے۔ واقعہ یوں روایت کیا گیا ہے کہ وہ اور ان کے گھر والے سخت فقر و فاقہ کی حالت میں تھے گھر میں کچھ نہ تھا بس اللہ سے دعائیں کرتے تھے اسی حال میں ایک چوہا حضرت مقداد کے سامنے سے گزرا آپ نے اس پر اپنی چادر ڈال کر یا کسی طرح اس کو پکڑ کر بند کر لیا تھوڑی دیر میں اس کا جوڑا آیا اس نے اپنے ساتھی کو گرفتار دیکھا وہ اپنے بل میں گیا اور ایک دینار اپنے منھ میں لے کر آیا اور حضرت مقداد کے سامنے ڈال دیا اور دور بیٹھا دیکھتا رہا کچھ دیر کے بعد پھر بل میں گیا اور ایک دینار اور اسی طرح لا کر اس نے سامنے ڈال دیا اس طرح یکے بعد دیگرے سو دینار اس نے بل سے نکال کے حضرت مقداد کے سامنے ڈال دیئے وہ گویا اپنے اس طرز عمل سے اور زبان حال سے حضرت مقداد سے عرض کرتا تھا کہ یہ اشرفیاں بطور فدیہ کے قبول کر لو اور میرے ساتھی کو چھوڑ دو۔ آخر میں وہ ایک دینار اور لایا اور اس کے ساتھ ایک بیٹھا ہوا کپڑا ابھی بل میں سے لایا۔ اس طرح گویا اس نے حضرت مقداد کو بتایا کہ اب کچھ نہیں رہا جو کچھ تھا وہ سب میں نے حاضر کر دیا حضرت مقداد نے اس چوہے کو چھوڑ دیا اور دونوں چوہے خوشی خوشی اچھلتے کودتے اپنے بل میں چلے گئے۔ اور ان سترہ اشرفیوں کو حضرت مقداد نے اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھا۔ اور اپنی ضرورتوں میں ان کو استعمال کیا ——— تو کبھی ایسے غیر معمولی اور حیرت انگیز طریقوں سے بھی متقی بندوں کی مدد کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے فضل کے طریقے بے شمار ہیں۔ اللہ کے سوا ان کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

اب دنیا میں صرف مادہ پرستی اور مادی چیزوں پر محنت کا رواج ہے۔ تقویٰ پیدا کر کے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق قائم کر کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے لینے کا راستہ لوگ

بالکل بھول گئے ہیں۔ حالانکہ یہی راستہ ہے جس کی دعا ہر نماز کی ہر رکعت میں کی جاتی ہے۔

ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس میں سب سے پہلے اس یقین کو تازہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے، وہی سب کا پروردگار اور کارساز ہے، وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ دنیا کے علاوہ عالم آخرت کا مالک بھی وہی ہے، اور اس کی ذات وصفات سے اور اس کی ربوبیت اور رحمت سے استفادہ کا طریقہ یہ ہے کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کو بس اس کی عبادت ہو اور اس سے دعا ہو، یہی صراط مستقیم ہے جو انبیاء اور صدیقین، شہداء اور صالحین کا راستہ ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنے دشمنوں کی بے پناہ اکثریت کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل کی اسی راستہ سے حاصل کی، حضرت ابراہیمؑ کو جو کامیابی نمرود کی حکومت کے مقابلے میں حاصل ہوئی اسی راستہ سے حاصل ہوئی، حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو فرعون اور اس کی فوج کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ اسی "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے راستہ سے حاصل ہوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا راستہ بھی یہی تھا، اسی راستہ کی ہدایت کی دعا ہر نماز کی ہر رکعت میں اس طرح کی جاتی ہے "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ہ"

بہر حال اللہ کے سارے نبیوں، رسولوں اور ان کی راہ پر چلنے والے سب مقبول بندوں کا راستہ یہی ہے۔ اور اس کے برعکس جو لوگ اللہ کی ہدایت سے محروم ہیں اور جن پر خدا کا غضب ہے ان کا راستہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی ذات وصفات کے یقین اور عبادت واستعانت سے بالکل بے پروا اور بے فکر ہو کر صرف مادی اسبابوں پر محنت کرتے ہیں۔

(۵)

انبیاء علیہم السلام کا پیغام اور تجربہ یہ ہے کہ مسئلوں کا حل اور کامیابی نہ مال میں ہے، نہ حکومت میں، نہ اکثریت میں، بلکہ اللہ کے امر سے وابستہ ہو جانے میں اور اس کی راہ میں مجاہدہ کرنے میں ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو واقعات بیان فرمائے گئے ہیں ان سب کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا واقعہ، حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم اور نمرود کا واقعہ، اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور فرعون وقارون کا واقعہ قرآن مجید میں پڑھیے اور غور

کیجئے۔ ان سب واقعات کی روح یہی ہے کہ اکثریت اور دولت اور حکومت کچھ نہیں اصل چیز اللہ کا فیصلہ اور اس کی مدد ہے اور وہ ان بندوں کے ساتھ ہے جو اس کے ہو جائیں اور اس کی راہ میں قربانیاں دیں۔

(۶)

اللہ تعالیٰ کی مدد ذاتوں اور شخصیتوں کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ ان کے اعمال اور اخلاق اور اوصاف کی وجہ سے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مدد فرمائی اسی طرح آپ کے صحابہ کرام اور بعد میں اولیاء کرام پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوئے اور ان کی جو مدد کی فرمائی گئیں وہ ان کی شخصیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے اعمال اور خاص کر اللہ کے لیے ان کی قربانیوں اور دین کے راستہ کی ان کی محنتوں کی وجہ سے فرمائی گئیں آج بھی جو کوئی اللہ کی وہ مدد چاہے وہ ان کے والے اعمال اور ان کی والی قربانی اور محنتوں کے راستہ پر پڑ جائے۔ وہ اللہ کی مدد کو آتا ہوا خود آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

اللہ کی نصرت اور غیبی مدد کا استحقاق اسی وقت تک رہتا ہے جب تک نظر بس اللہ پر ہو اور یقین ہو کہ ہم سے یا کسی سے کچھ نہ ہو سکے گا، جو کچھ ہوگا صرف اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے ہوگا ـــــ غزوہ بدر اور خندق میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ اللہ کے سوا کوئی سہارا اور کوئی پناہ کی جگہ ان کے سامنے نہیں تھی، اپنی کسی چیز پر ذرا بھی اعتماد نہیں تھا اس لیے نظر صرف اللہ کے کرم اور اس کی نصرت پر تھی، تو پوری نصرت اور بھرپور مدد ہوئی۔ اور اس کے برخلاف غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں جب اپنی تعداد اور تیاریوں پر بھی کچھ اعتماد پیدا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا ہاتھ کھینچ لیا گیا۔

(۷)

مسلمانوں میں دین کی رسم اور صورت موجود ہے۔ اس تبلیغی جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ ان میں دین کی روح اور حقیقت آجائے۔ ان میں دین کے منتشر اجزاء موجود ہیں تبلیغ کا مقصد یہ ہے کہ ان میں پورا دین اپنی صحیح ترتیب کے ساتھ آجائے ـــــ یہ چھ نمبر جن پر تبلیغ میں زور دیا جاتا ہے اور جن کی مشق کرائی جاتی ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان صحیح ترتیب کے ساتھ

دین پر پڑ جائیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور آخرت کے ثواب و عذاب پر نظر رکھ کے زندگی گزارنا ان کا مزاج بن جائے۔

(۸)

آج دین کے جن احکام پر مسلمان عمل نہیں کر رہے ہیں خواہ وہ احکام کسی شعبہ کے ہوں ان پر عمل کرنے سے یا تو مسلمانوں کے مال پر زد پڑتی ہے یا جان و جسم پر یا خواہشات پر اس لیے ان احکام پر عمل کرنا ان کے لیے سخت مشکل ہو رہا ہے اور وہ اسلام کے ماننے کے باوجود اس کے احکام کے خلاف زندگیاں گزار رہے ہیں ـــــ ہماری یہ جدوجہد جس کا نام تبلیغ ہے اور اس کے چھ نمبر اس مشکل کو حل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ ان نمبروں میں مسلسل مشغولیت اور ان کی مشق کے ذریعہ مسلمانوں کی زندگی کا رخ ان چیزوں کی طرف سے مڑ کر جن کی طرف پڑ گیا ہے اللہ کے اوامر اور احکام کی طرف ہو جائے اور پھر وہ اس کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں تکلیفیں اور نقصانات برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۹)

ہمارے اس تبلیغی کام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے احکام کی پابندی والی زندگی گزارنے لگیں۔ چھ نمبروں کی پابندی اور مشق سے ان میں یہ بات آسکتی ہے ـــــ لیکن ان نمبروں کے الفاظ سے جو مطلب عام لوگ سمجھتے ہیں اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کا جو مطلب ہم سمجھتے ہیں اور بتاتے ہیں اس کے مطابق کرنے اور لگنے سے ان شاء اللہ وہ بات پیدا ہو جائے گی کہ جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانوں کے باوجود اور نفس کی خواہشات کے خلاف ہونے کے باوجود لوگ اللہ کے احکام پر چلیں گے۔

(۱۰)

اسلام میں جن اعمال کا حکم دیا گیا ہے اور جن کے عوض ثواب کا اور جنت کا وعدہ کیا گیا ہے یہ وہ چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ کی نیابت ہو مثلاً رحم کا حکم ہے، احسان کا حکم ہے، سخاوت اور فیاضی کا حکم ہے، عدل و انصاف کا حکم ہے، مجرموں کو سزا دینے کا حکم ہے۔ ان اعمال اور اخلاق کی حیثیت یہ ہے کہ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی صفات

اور اس کے افعال ہیں اور بندوں کو یہی حکم ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق یہ اعمال کریں اور یہ صفات پیدا کریں (تخلقوا باخلاق اللہ)

دوسری قسم کے وہ اعمال ہیں جو دراصل نبیوں کے کرنے کے ہیں اور امتی ان کو نبیوں کی نیابت میں کرتے ہیں، جیسے دین کی دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اعلاء کلمۃ اللہ کی کوششیں اور اس کے راستہ میں قربانی وغیرہ وغیرہ۔ یہ دراصل نبیوں والے اعمال ہیں اور نبی ان ہی کے کاموں کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ امتی ان کے کاموں کو کر کے نبی کے مقصد کی خدمت کرتے ہیں اور ان نبی کی نصرت اور نیابت میں ان راستوں پر محنت کرتے ہیں۔

تیسری قسم وہ اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی عبدیت اور بندگی ظاہر کرنے کے لیے اور اس کے ذریعہ اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ یہ شان عبادات کی ہے۔ نماز، روزہ، حج، قربانی، ذکر و تلاوت وغیرہ عبادات اس قسم کے اعمال ہیں۔

چوتھی قسم وہ اعمال ہیں جو دراصل اپنی خواہشات اور بشری تقاضوں کے لیے کیے جاتے ہیں لیکن ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے احکام دیے ہیں کہ ان کو اس طرح کرو اس لیے یہ بھی دینی اعمال ہو گئے، مثلاً نکاح کرنا، بیوی بچوں کو کھلانا، پلانا، کپڑے پہنانا ان کو پیار کرنا، یا خرید و فروخت، اسی طرح کا شتکاری یا کارخانہ داری یا محنت مزدوری یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق دراصل ہماری خواہشات اور بشری ضروریات سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق احکام دیے کہ ان کو اس طرح کیا جائے اور ان میں بھی ثواب رکھ دیا، اب یہ بھی دینی اعمال ہو گئے، لیکن ان کے دینی اعمال اور قابل ثواب ہونے کی ایک شرط تو یہ ہے کہ یہ اللہ کے دیے ہوئے احکام اور اس کے مقرر کیے ہوئے ضابطوں کے مطابق ہوں اور دوسری شرط یہ ہے کہ ان کی وجہ سے وہ اعمال ضایع نہ ہوں جو ان سے مقدم اور زیادہ اہم ہیں، اب اگر ایک شخص اپنے کاروبار میں اور بیوی بچوں میں اس طرح مشغول ہوتا ہے کہ اس مشغولیت کی وجہ سے دین سیکھنے

کے لیے اور ایمان و یقین حاصل کرنے کے لیے اور اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے کے لیے اور خدا سے اپنے تعلق کو صحیح کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا، تو اس کا بیوی بچوں کو پالنا اور کاروبار میں مشغول رہنا ہرگز دینی عمل نہیں ہے بلکہ سراسر وبال ہے اور "اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" کا مصداق ہے۔

(۱۱)

محنت کے دو میدان ہیں۔ ایک زمین اور زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں، دوسرے ایمان اور ایمان والے اعمال۔

پہلی محنت کا معاوضہ دنیا میں ملتا ہے، لیکن ایسا نہیں ملتا کہ محنت کرنے والے اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔

دوسری محنت کا معاوضہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ بھرپور دے گا۔

یہاں جو کچھ نظر آتا ہے وہ بہت ناقص ہے، بیچاری آنکھ کا حال یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی صرف صورت کو دیکھ سکتی ہے حقیقت کو نہیں، کسی جسمانی چیز کی صرف اوپر سے نظر آنے والی سطح اور شکل کو دیکھ سکتی ہے اس کی روح کو نہیں دیکھ سکتی، حد یہ ہے کہ خود اپنے کو نہیں دیکھ سکتی، اللہ کا غیبی نظام جو نظر نہیں آتا وہ لاکھوں کروروں درجہ زیادہ وسیع ہے، — پھر آنکھ نہ کسی چیز کا اول دیکھتی ہے نہ آخر، صرف اس کا حال دیکھتی ہے، ہر چیز شروع میں مٹی تھی، آخر میں پھر اسکو مٹی ہونا ہے۔ آنکھ نے نہ اسوقت دیکھا جبکہ وہ پہلے مٹی تھی نہ وہ اسوقت کو دیکھ رہی ہے جب وہ پھر مٹی ہوگی، بلکہ صرف اس کو موجودہ شکل میں دیکھا ہے جب کسی چیز کو دیکھو تو سوچو کہ کچھ نہیں، یہ پہلے مٹی تھی اللہ کی قدرت سے اس کی یہ شکل بن گئی ہے، اور پھر ایک دن اس کو مٹی ہو جانا ہے۔ اپنے بارہ میں بھی یہی سوچو۔

قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے "مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى"

نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے رکھے گئے ہیں، اس کی یہ بھی ایک حکمت ہے کہ جب پہلے سجدے میں جائے تو یاد کرے کہ میں اسی زمین کی مٹی سے بنایا گیا ہوں، پھر دوسرے سجدے میں یاد کرے کہ زندگی کی میعاد ختم کرکے مجھے پھر اسی زمین کا پیوند ہو جانا ہے اور پھر اس سے اٹھ کر اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور اپنی زندگی کا حساب دینا ہے۔

مولانا محمد یوسف نمبر کا پہلا ایڈیشن ستمبر کے پہلے ہی ہفتے میں ختم ہو گیا تھا۔ اب دوسرا ایڈیشن ہو گیا ہے۔ (منیجر)

ان اہم کتابوں کے صرف دو دو تین تین نسخے ہمارے ہاں ہیں

تاریخ عالم کا انسائیکلو پیڈیا

مشہور مغربی فاضل ولیم لینگر کے زیر اہتمام دنیا کے ستر مشہور و معتمد مؤرخوں نے تاریخ عالم کی یہ انسائیکلوپیڈیا مرتب کی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے نئی ترتیب اور تہذیب کے ساتھ اس کو اردو میں منتقل کیا اور بڑی عالمانہ عرق ریزی سے نہایت اہم معلومات کا حواشی میں مستقل اضافہ بھی کیا ـــــ ماضی اور حال سے پوری طرح باخبر رہنے کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ہے کہ تھوڑی سی مدت میں امریکہ میں اس کے تین ایڈیشن قریباً دس لاکھ کے نکل چکے ہیں تین ضخیم جلدیں ہیں

جلد اوّل ـــ تاریخ اسلام

جو ابتداء اسلام سے ہمارے اس زمانہ تک کے مسلمانوں کے مدوجزر اور دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں کے احوال کا نہایت جامع مرقع ہے۔ گویا پوری چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کا خلاصہ

جلد دوم ـــ ابتداء سے عہد نپولین کے آخر تک کی پوری دنیا کی عام تاریخ۔

جلد سوم ـــ عہد نپولین کے بعد سے ۱۹۵۹ء تک

قیمت مکمل مجلد ۳۶/-

سیرۃ الرسول

تصنیف محمد حسین ہیکل (مصر) ترجمہ محمد عارف کامل

سیرۃ نبوی کے موضوع پر ہمارے اس دور کی نہایت اہم اور معرکۃ الآراء تصنیف ہے

قیمت ۱۲/-

کرامات صحابہؓ

حدیث و سیرت کی مستند روایات میں صحابہ کرامؓ کی کرامات کے جو واقعات منقول ہیں اس کتاب میں ان کو اردو ترجمہ کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ ایمان تازہ کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے ـــ قیمت ۱/۵۰

حیات امام ابو حنیفہؒ

تالیف شیخ ابو زہرہ (مصر)

ترجمہ غلام احمد حریری ـــ قیمت ۱۵/-

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی معرکۃ الآراء فاضلانہ تصنیف ـــ قیمت ۱۲/-

حیات امام مالکؒ

تالیف محمد ابو زہرہ (مصر)

ترجمہ عبید اللہ قدسی ـــ قیمت ۱۰/-

امام شافعیؒ

تالیف محمد ابو زہرہ (مصر) ترجمہ رئیس احمد جعفری قیمت ۱۲/-

حیات امام ابن حزمؒ

از پروفیسر ابو زہرہ (مصر)

ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری قیمت ۱۸/-

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

تالیف استاد ابو زہرہ (مصر) ترجمہ رئیس احمد جعفری ۲۱/-

حیات امام ابن القیمؒ

بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب، قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ محمد العظیم شرف الدین کے قلم سے۔

ترجمہ سید رشید احمد ارشد ـــ قیمت ۱۲/-

تذکرہ شاہ ولی اللہؒ

شاہ صاحبؒ کا سیاسی ماحول اور ان کی تجدیدی خدمات، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے قلم سے۔ ۴/۵۰

حیات طیبہ

سوانح حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ـــ قیمت ۵/۵۰

مولانا محمد علیؒ (بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے)

از: محمد سرور صاحب ـــ قیمت ۸/-

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

از شورش کشمیری ـــ قیمت ۳/-

آپ بیتی

(از ظفر حسن ایبک) اب سے پچاس سال پہلے (پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور ان کے چند جانباز رفیقوں نے مجاہدانہ جذبہ سے اور منصوبہ کے تحت ہندوستان سے کابل ہجرت کی تھی یہ آپ بیتی اسی بڑی بیش بہا مہم سرگزشت ہے۔ قیمت ۵/-

کتب خانہ الفرقان بحری روڈ۔ لکھنؤ

مغلیہ دورِ حکومت

چار حصوں میں

یعنی خافی خاں نظام الملک کی "منتخب اللباب" کا اردو ترجمہ

از محمود احمد غازی

حصہ اول - بابر سے جہانگیر تک ۶/

حصہ دوم - دورِ شاہجہانی ۷۵/

حصہ سوم - دورِ عالمگیری ۸/

حصہ چہارم - شاہ عالم سے محمد شاہ تک ۱۲/

اقبال نامہ جہانگیری

جہانگیر کے دورِ حکومت کی مکمل تصویر

تصنیف محمد خاں کشمی ترجمہ محمد زکریا

اول - قیمت مجلد ۷۵، ۶

شاہجہاں کے ایام سیری اور عہد اورنگ زیب

مصنفہ ڈاکٹر برنیر (فرانسیسی)

ترجمہ خلیفہ محمد حسین - قیمت ۱۲/

آثار عالمگیری

اس کا مصنف ساقی خاں کتابخانہ کار کی حیثیت سے زندہ بھی اور رنگ ریب کے ساتھ رہا، اسکے مطالعہ سے جہانگیری کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے - ترجمہ مولوی فدا علی طالب - قیمت ۹/۵

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

از پروفیسر خلیق احمد نظامی

قیمت مجلد ۹/ غیر مجلد ۸/

سفینۃ الاولیاء

از داراشکوہ، ترجمہ اردو ۶/۵

مقدمہ ابن خلدون

فلسفۂ تاریخ پر عدیم النظیر کتاب اردو ترجمہ، تعلیقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین - قیمت ۱۵/

تاریخ غرناطہ

یہ کتاب لسان الدین محمد الخطیب الغرناطی کی کتاب "الاحاطۃ فی اخبار غرناطۃ" کا سلیس اردو ترجمہ ہے - یہ ایک شہر کی ایک سلطنت کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک دور کی اور ایک پورے تمدن کی تاریخ بھی ہے -

ترجمہ از علیم احمد منشی ندوی - قیمت ۱۱/

عبرت نامہ اندلس

مکمل ۴ جلد

تصنیف - پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی

ترجمہ - مولوی عنایت اللہ دہلوی مرحوم

مرحوم اسپین پر انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں تو ایک درجن کتابیں ہیں عربی میں بھی کافی لکھا گیا ہے اور ان دونوں زبانوں سے خلاصہ یا ترجمہ کے طور پر اردو میں بھی بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن مغربی مصنفین میں پروفیسر ڈوزی کی یہ کتاب عالمانہ تحقیق و جامعیت کے علاوہ اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ اس سے بہت سی ان غلط اور شرمناک باتوں کی پوری تردید ہوجاتی ہے جو اس سے پہلے اکثر مغربی مصنفین نے اندلس ہی کے سلسلہ میں مسلمانوں اور مسلمانوں کے خلاف لکھی ہیں اور جنھوں نے اہل مغرب کی ذہنیتوں کو مسموم کر رکھا ہے -

اسکے مطالعہ سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں مغربی مصنفین اور مستشرقین کی غلط فکری کی خاص وجہ کیا ہے؟

قیمت کامل مجلد ۳۰/

خلیفہ عبدالرحمن الناصر

اندلس میں اسلامی حکومت کی صبح درخشاں طارق اور موسیٰ ابن نصیر سے طلوع ہوئی تو عبدالرحمن الناصر اس کا نصف النہار تھا

قیمت ۵/۵۰

سفرنامہ ابن بطوطہ

ترجمہ مسیو احمد جبرئی، ابن بطوطہ نے جب دنیا کی سیاحت کے لیے کمر ہمت باندھی تو وہ ۲۵ سال کا نوجوان تھا اور جب یہ سیاحت ختم کی تو پچاس سال کا بوڑھا ہوچکا تھا محمد تغلق کے زمانہ میں وہ ہندوستان بھی آیا اور اس کا سفیر بن کر چین بھی گیا - ہر تعلیم یافتہ کو یہ سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیئے - ترجمہ بہت عمدہ و ترتیب سے اسکو اور زیادہ دلچسپ بنادیا ہے - قیمت ۱۵/

آئینۂ حقیقت نما

از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

انگریزوں نے سیاسی اغراض کے تحت مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم کی جو داستانیں تاریخ کا جزء بنادی تھیں جنھوں نے ہندوؤں کو آج تک مسلمانوں کا دشمن بنا رکھا ہے مولانا نے اس کتاب میں ان سرکاری پردہ پاک کیا ہے - بڑی محققانہ کتاب ہے - قیمت ۱۲/

عروسِ دنیا

(مصنفہ نسیمہ تاج الدین -

ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین -

اس کے آئینہ میں پوری عرب دنیا دیکھی جاسکتی ہے قیمت مجلد ۱۲/

المنجد (اردو)

عربی لغت کی معروف کتاب اضافات کے ساتھ اردو قالب میں قیمت ۴/

تہذیب و تمدن اسلامی

از رشید احمد ندوی مسلمانوں نے انسانی دنیا کو کیا دیا، اسکی تفصیل اس کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے ۶/



الفرقان لکھنؤ

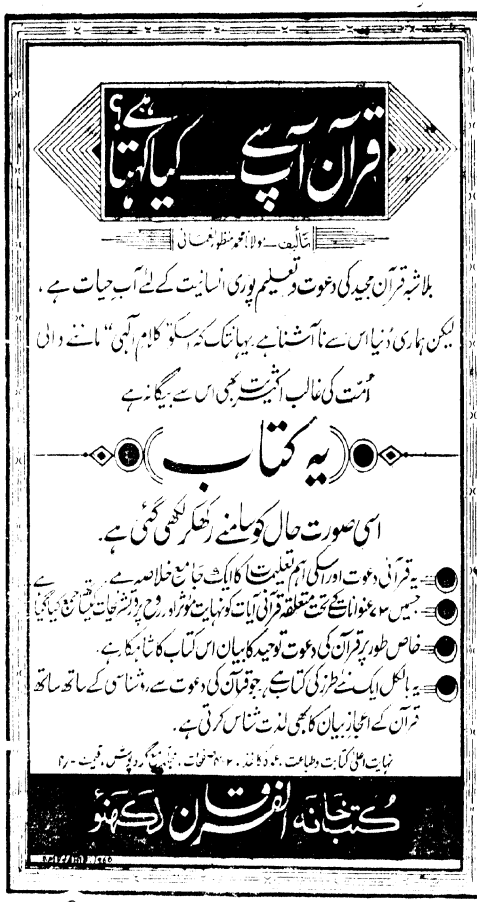
مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے



مولانا محمد یوسف صاحب [illegible]

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲..... شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق فروری ۱۹۶۶ء | شمارہ ۵

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	نگاہ اوّلین	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	کائنات کا خالق ۔ خدا یا اتفاق ؟	جناب وحید الدین خاں صاحب	۵
۳	مقالات طریقت	جناب محمد عضد الدین خاں ایم اے	۱۳
۴	اسلام میں اور مسلمانوں کے مسائل	شیخ محمد العبودی رجسٹرار مدینہ یونیورسٹی	۳۰
۵	دربار عالمگیری	جناب ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی	۴۰
۶	حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی	محمد منظور نعمانی	۵۵

تصحیح :- گزشتہ شمارہ پر غلطی سے ستمبر کا مہینہ اور نمبر ۶ چھپ گیا ہے، اسکو اکتوبر اور نمبر ۷ پڑھا جائے۔

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو، تو

اسکا مطلب ہوگا کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری :- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت :- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمن سنبھلی

یہ محض خدا کا فضل ہے کہ وہ خطرات جو ہندوستان و پاکستان کے کسی تصادم کی شکل میں مسلمانانِ ہند کے لئے مضمر تھے وہ تین ہفتے کے بھرپور تصادم کے باوجود واقعات کی صورت نہ اختیار کر سکے، لیکن پھر بھی ان حالات میں مسلمانوں کے لئے جو نزاکت پیدا ہو گئی ہے اس سے شاید کوئی دیوانہ ہی انکار کر سکے، اور کم از کم ان لوگوں کو تو اس سے انکار ہو ہی نہ چاہیئے جو اگرچہ اپنی نسبتوں کے لحاظ سے تخمۂ وارِ پر حق [illegible] اور اس پر فخر ان کا سب سے بڑا سرمایہ ہو، مگر اس نزاکت احساس نے انھیں مجبور کیا کہ اس جنگ میں اپنے وطن کی حمایت کو مسلمانانِ ہند کا وطنی اور سیاسی فریضہ قرار دینے ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ ایک مذہبی فریضہ اور شریعت مقدسہ کا تقاضا بھی قرار دیں، اور اسکے باوجود قرار دادیں کہ ملک کے لیڈر بار بار مسلمانوں سے کہہ رہے ہوں کہ یہ کوئی مذہبی جنگ نہیں خالص سیاسی جنگ ہے، لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ مذہبی لوگ جن کے موجودہ حالات کی نزاکتوں کے احساس کا ایک طرف یہ عالم ہے دوسری طرف وہ ان نزاکتوں سے اس قدر بیگانہ بھی ہیں کہ اپنی جماعتی مصلحتوں کے تحت کسی مشترک قومی پلیٹ فارم کو چھوڑنا ہو تو اسکے اعلان کے لئے بھی انھیں حالات کو منتخب کریں! اور پھر اعلان بھی بجز قطع تعلق کا نہ ہو بلکہ اور بہت سی جدال انگیز باتوں کے ساتھ ساتھ یہ فروگزاشت بھی اس اعلان کا جزو ہے، کہ اس قومی پلیٹ فارم نے ہندوستان و پاکستان کی جنگ کے دوران نہایت بے تعلقی اور سرد مہری کا رویہ رکھا حتیٰ کہ اس کی کوئی میٹنگ تک اس سلسلے میں نہیں بلائی گئی، جبکہ پہلے ذرا ذرا سی باتوں پر اسکی میٹنگیں ہوتی رہیں!۔

ہم یہ سطریں بہت ہی ناخوشگواری کے احساس کے ساتھ جمعیۃ علما ہند کے جنرل سکریٹری جناب مولانا اسعد مدنی کے اس بیان پر لکھ رہے ہیں جو مسلم مجلس مشاورت سے استعفے کے طور پر اخبارات میں شائع ہوا ہے اور جس میں ڈاکٹر سید محمود صاحب (صدر مجلس) کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :-

"ہند و پاکستان کی جنگ کے دوران آپ نے اگرچہ ذاتی طور پر اپنی خدمات محاذ جنگ کے لئے پیش فرمائیں، مگر مجھے تعجب اور حیرت ہے کہ اس سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت نے معمولی توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اور اس اہم اور نازک موقع پر مجلس کا کوئی اجلاس بھی طلب نہیں کیا گیا، حالاں کہ اس سے پہلے معمولی معمولی باتوں پر اجلاس طلب کئے گئے ہیں"

الجمعیۃ (دہلی ایڈیشن) ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۵ء

راقم حروف کو مولانا اسعد صاحب سے بہر حال نسبت ہے، اور شاید ہمعصری کی بھی تعلق بھی ان کی محبت و عنایت سے برادرانہ رہا ہے لیکن وہ جس عظیم ہستی کی یادگار ہیں اس کے اٹھ جانے کے بعد سے برابری کے بجائے ان کو بڑائی کے مقام پر رکھ کر دیکھنا ہی دل کو پسند رہا۔ علاوہ ازیں وہ جس جماعت کے جنرل سکریٹری ہیں وہ ہمارے بزرگوں کی جماعت ہے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی ذات عالی نے اسکی بنیادوں کو عظمت بخشی، حضرت مولانا انور شاہؒ کے تقدس اور پاک نفسی سے بھی اس نے فیض پایا، حضرت علامہ مفتی کفایت اللہؒ کی سرپرستی میں ایک طویل مدت اس نے گزاری اور پھر شیخ عرب و عجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی مدتوں سربراہی کا طغرائے امتیاز بھی اسکے حصے میں آیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اگرچہ اس خاص صف کے نہ تھے مگر انھوں نے جمعیۃ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۶۲ء تک کے پرآشوب دور میں مسلمانان ہند کی جس قدر وسیع پیمانے پر خدمت کی اور جس بجا و بانہ انداز میں وہ ہر موقع پر اس ستم زدہ ملت کے لئے سینہ سپر ہوئے، یہ چیز ان کی شخصیت کو بھی جمعیۃ کے لئے ان بزرگوں ہی کی طرح موجب احترام اور باعث اکرام بنا دیتی ہے۔ اس لئے مولانا اسعد صاحب کی ذاتی حیثیت کا سوال ہو یا جمعیۃ کے جنرل سکریٹری ہونے کی حیثیت کا طبعی طور پر دونوں ہی صورتوں میں بڑا مشکل کام ہے کہ ان پر کسی بیباک تنقید کا مرحلہ

سر کیا جائے۔ اور مرحلہ بھی ایسا جس میں اُن کے نازک جذبات کی رعایت بھی ممکن نہ ہو! ــــــ ــــــ لیکن افسوس ہو کہ زیر نظر بیان پر کسی بھی نسبت اور کسی بھی حیثیت کا لحاظ کر کے خاموشی کی گنجائش نہیں، یہ جماعتی اور قیادتی رقابت کا رفرمائیوں کا ایسا نمونہ ہو جو محترم اسعد میاں کی بلند و بالا نسبتوں کے لحاظ سے ہی افسوسناک نہیں پوری ملت کے مفاد اور مستقبل کے لحاظ سے بھی بے پناہ خطرناک ہو۔

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں کہ نیشنلزم اور سیکولرزم کے نام پر مسلمانوں کی ایک جماعت کو (جس سے ہمیں بھی سخت اختلاف رہتا ہو) مولانا اسعد میاں کی طرف سے مطعون کئے جانے پر ہم نے بلا نام لئے انھیں ٹوکا تھا کہ یہ باتیں ان کے شایان شان نہیں۔ نہ تو دینی لحاظ سے یہ دونوں ازم کسی فخر و مباہات کا میدان بننے کے لائق ہیں اور نہ ملی مصلحت کے لحاظ سے ہندوستان کے موجودہ حالات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ مسلمان علی الاعلان ایک دوسرے کے سیکولرزم اور نیشنلزم کی پیمائش کریں، لیکن یہ گزارش رائیگاں ہی گئی۔ اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر آرچ کے جیسے نازک حالات میں مولانا اسعد میاں کسی ایک جماعت نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کے برسر اقتدار گروہ کے سوا مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں اور مختلف حلقوں کے مشترک پلیٹ فارم کی حب الوطنی کو پیمائش میں لاتے ہوئے اظہار حیرت فرما رہے ہیں کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران کرونٹ بھی نہیں لی! ــــــ لیکن اسعد میاں کو یہ بات بھولنی نہ چاہیئے کہ انھیں ابھی وطن کی راہ میں کچھ جھیل کر دکھانے کا موقع نہیں ملا ہو جبکہ جس شخص (ڈاکٹر سید محمود صاحب) کو وہ حب الوطنی کا سبق پڑھا رہے ہیں، اسکے بال ہی اس راہ میں وہ سب کچھ جھیلتے ہوئے سفید ہوئے ہیں، جو پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اس صف کے دوسرے اشخاص نے جھیلا تھا جمعیۃ علماء کی قیادت بیشک بڑا مرتبہ ہو مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہونا چاہیئے کہ آدمی فرق مراتب کو بھی یکسر بھول جائے! مولانا اسعد صاحب اگر جمعیۃ علماء کے بزرگوں کی روایات کا پاس فرماتے تو اُن کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر کسی مسلمان میں کوئی واقعی کمزوری بھی ہوتی تو وہ اُسکی پردہ پوشی فرماتے نہ یہ کہ ڈاکٹر سید محمود جیسے بزرگ محب وطن کی حب الوطنی کو بھی مشکوک قرار دینے کی سعی کی جائے۔ کاش! اسعد میاں محسوس کر سکیں کہ وہ کدھر جا رہے ہیں!

کائنات کا خالق ـــــ خدا یا اتفاق

(از جناب وحید الدین خاں صاحب)

کائنات کے اندر جو حیرت انگیز نظم اور جو غیر معمولی حکمت و معنویت پائی جاتی ہے، مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں مگر اس میں انھیں کسی ناظم و مدبر خدا کا اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اس کی دوسری توجیہہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ محض "اتفاق" سے ہو گیا ہے۔ ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروڑوں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کیے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیر کی ایک نظم (SONNET) نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کی اندھا دھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی۔

THE MYSTERIOUS UNIVERSE, 3-4.

یہ بیان اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے۔ کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور ایسا مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے۔ بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں۔ مثلاً ہوا کا ایک جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (POLLEN) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزوی اور اتفاقی واقعہ کی توجیہہ کرتا ہے۔ وہ گلاب کے پورے وجود، کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ "اتفاقی واقعہ" کے لفظ میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے۔ پروفیسر

ایڈون کانکلن (EDWIN CONKLIN) کے الفاظ میں "زندگی کا بذریعہ حادثہ (ACCIDENT) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پریس میں دھماکہ ہوجانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P.174.

کہا جاتا ہے کہ اتفاق کے حوالے سے کائنات کی توجیہہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے، بلکہ سر جیمز جینز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (PURELY MATHEMATICAL LAWS OF CHANCE) پر مبنی ہے[1]۔ ایک مصنف لکھتا ہے:۔

"اتفاق (CHANCE) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کسی حد تک ممکن ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P.23

اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہو گیا اور پھر یہ بھی فرض کر لیں کہ اس میں عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہو گیا ـــــ اگرچہ ان مفروضات کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے ـــــ جب بھی کائنات کی توجیہہ حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذہب کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانون اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کر رہی ہے کہ قانون اتفاق موجودہ کائنات کا خالق ہو سکتا ہے، کیونکہ سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر زیادہ سے زیادہ کیا ہے اور جو عمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

---

[1] THE MYSTERIOUS UNIVERSE, P.3

"اگر تم دس سکے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگا دو۔ اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دو۔ اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ کو نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو ــــ یہ امکان کہ نمبر ایک کا سکہ پہلی بار تمھارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمھارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں، دس ہزار میں ایک ہے۔ یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے۔"

یہ مثال نقل کرنے کے بعد کریسی مارسن (ACRESSY MORRISON) لکھتا ہے:۔

THE OBJECT IN DEALING WITH SO SIMPLE A PROBLEM IS TO SHOW HOW ENORMOUSLY FIGURES MULTIPLY AGAINST CHANCE.

MAN DOES NOT STAND ALONE, P.17

یعنی یہ سادہ مثال اس لیے دی گئی تاکہ یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہو گیا ہے تو اس کے لیے کتنی مدت درکار ہو گی۔ ذی حیات اشیاء کی ترکیب زندہ خلیوں (LIVING CELLS) سے ہوتی ہے۔ خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم خلیہ (CYTOLOGY) میں کیا جاتا ہے۔ ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں ان میں سے ایک پروٹین ہے۔ پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے ــــ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک۔ پروٹینی سالمہ (MOLECULE) ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جوہر (AT IMS) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سب سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔

اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے، جو مادے کی وہ مقدار ہے۔ مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، اب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے ایک ریاضی داں، پروفیسر چارلس ایوجین گائی (CHARLES EUGENE GUYE) نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۰^۱ کے مقابلہ میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے (۱۰^۱ کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ایک کے آگے ایک سو ساٹھ صفر، ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔[1]

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ۱۰^۱ سال بعد ہے۔

پروٹین، امینو ایسڈ (AMINO ACIDS) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے۔ بی۔ لیدز (J.B. LEATHES) نے حساب لگایا کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں (۱۰^۱) طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے محض اتفاق سے اکٹھا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے۔ دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے باوجود کبھی بھی کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے

---

[1] واضح ہو کہ ۱۰^۱ کے انتہائی عدد۔ ۱۰^۱ میں ایک کے آگے ۱۹ صفر لگتے ہیں۔

کے خلیہ کا جزو بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا جواب اس توجیہ میں نہیں ہے پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جزو۔ پروٹین ــــ کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہ ہو جبکہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہاسنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامنٹے ڈونوائے (LECOMTE DU NOUY) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لیے جس وقت جس مقدار مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابل یقین حد تک زیادہ ہو۔ اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی ۱۰ہزار سال نور (ایک کے آگے ۲۲ صفر) سفر کرکے اس کو پار کرسکتی ہو۔ یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن کے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے وہ اس عمل کے لیے قطعاً ناکافی ہے پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سو ترپن حرکت فی سکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ اور اس سارے عمل کے لیے جس مدت کی ضرورت ہے وہ ۱۰،۳۲۰،۰۰۰ (ایک کے آگے ۲۴۳ صفر) بلین سال ہے ــــ مگر ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے" ڈونوائے لکھتا ہے کہ "زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جبکہ زمین ٹھنڈی ہوئی"

HUMAN DESTINY, 30-34

سائنس نے اگرچہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے ناکافی ہے۔ مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی، اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کرلی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازہ کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی بڑے ستارے کی کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا۔ اس وقت زمین سورج کی مانند ایک مجسم

شعاعیں جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی۔ اس انجماد کے بعد ہی یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر، جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی، مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے، ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (RADIO-ACTIVE ELEMENTS) کی دریافت سے حاصل ہوا ہے۔ تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں اور اسی لیے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں۔ اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یورنیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے۔ وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی۔ ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ یورنیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں، اور بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزو ہیں جبکہ یہ چٹان منجمد ہوئی۔ یورنیم کے ساتھ ہم سیسہ پاتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورنیم کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ یورنیم کے انتشار (DISINTEGRATION OF-URANIUM) سے وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ یورنیم سے بنا ہوا سیسہ، عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے۔ اس لیے سیسے کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورنیم سے بنا ہے یا نہیں۔ اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورنیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے اور چونکہ یورنیم چٹان میں اس وقت سے ہے جبکہ چٹان منجمد ہوئی اس لیے ہم اس کے ذریعہ سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں۔ یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قدیم ترین چٹانیں ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا اور تگنا ہو۔ مگر ارضیاتی مطالعہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ جے۔ ڈبلیو۔ این سولیوان نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے[1]۔ اب ظاہر ہے کہ جب صرف

[1] LIMITATIONS OF SCIENCE, P. 78

ایک غیر ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لیے سنکھ مہاسنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آگئیں۔ اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات پیدا ہو کر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے۔ اور پھر انھیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیاء سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کیسے وجود میں آگئی جبکہ نظریۂ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے۔ ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہے کہ ماہر ریاضی پاچو (PATAU) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے۔[1] اس سے اندازہ کیجئے کہ اگر محض اتفاق کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے بداعجوبہ کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہو، تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔ بی۔ کریڈر (MARLIN BOOKS KREIDER) کے یہ الفاظ کس قدر صحیح ہیں:-

THE MATHEMATICAL PROBABILITY OF A CHANCE OCCURRENCE OF ALL THE NECESSARY FACTORS IN THE RIGHT PROPORTION IS ALMOST NIL.

THE EVIDENCE OF GOD, P. 67

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہو جانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کی لغویت واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "اتفاق" سے نہ کوئی ایٹم یا مالیکیول وجود میں آسکتا ہے اور نہ وہ ذہن پیدا ہو سکتا جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ خواہ اس کے لیے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے۔ یہ نظریہ نہ صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ یہ ایسی ہی لغو بات ہے جیسے

---

[1] THE EVIDENCE OF GOD, P. 71

کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہو سکتا ہے ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لیے فرش، کشش ارضی، گلاس اور پانی کہاں سے وجود میں آ گئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (HAECKEL) نے کہا تھا: "مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا۔" مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لیے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ بہت خوب کہا ہے مارٹین نے:۔

"ہیکل نے یہ کہتے ہوئے کہ ہیین (GENES) اور خود زندگی کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا۔ انسان کو وجود میں لانے کیلئے اسکو سب سے پہلے ناقابل مشاہدہ ٹیم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر ہیین بنانا ہوگا اور اسکو زندگی دینی ہوگی۔ پھر بھی اسکی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروڑوں میں ایک کا ہے۔ اور بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہو جائے تو اسکو وہ اتفاق (ACCIDENT) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (INTELLIGENCE) کا نتیجہ قرار دے گا۔"

MAN DOES NOT STAND ALONE, P. 87

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبیعیات جارج ارل ڈیوس (EARL DAVIS) کے الفاظ پر ختم کروں گا:۔

"اگر ایک کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے۔ اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی۔ میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزو نہیں۔ بلکہ اس کا فرماں روا اور ناظم و مدبر ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P. 71

مقالات طریقت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حالات میں ایک نامانوس تذکرہ

از، محمد عضدالدین خانصاحب ایم اے ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمد شاہ کی دلی ہے، لوٹ مار، قتل وغارتگری کا دور دورہ ہے، رکھ، جاٹ اور مرہٹے ہر طرف تباہی مچائے ہوئے ہیں، نادر شاہ کا قتل عام اسی سرزمین میں ہو چکا ہے، ابدالی و تورانی امراء نے بادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں کھلونا بنا لیا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے جس دور کی ابتدا محمود غزنوی، ایبک اور التمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی آج وہ بہادر شاہ اول اور محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے ناؤ نوش میں ختم ہو رہا ہے اور فلسفۂ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اس سیاسی بدامنی اور معاشرتی پستی کا اثر مذہبی زندگی پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ اگر اللہ کے چند برگزیدہ بندے اس ضلالت اور توہم پرستی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے کمربستہ نہ ہو جاتے اور ان تیز و تند ہواؤں میں مذہب و ثقافت کے چراغوں کو نہ بچاتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا۔

ان جواں مرد سپاہیوں میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اسلام کی وہی خدمت کی جو قرون اولیٰ

کے اکابر نے پوری دنیائے اسلام کی انجام دی تھی، افسوس کہ اسلامی ہند کے اس عظیم فرزند کا صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ ابتک نہ کیا جا سکا، کسی نے ان کو اپنے ذاتی فلسفے کے لئے آلۂ کار بنایا، کسی نے ان پر صرف عقیدت و محبت کے باسی پھول چڑھائے، کسی نے سب و شتم کی بارش کی، کسی نے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے، آجکل بعض اشخاص اور اداروں نے کام شروع کیا تو وہ بھی ان کی کتابوں کے ترجمے یا ان ہی پرانی ٹیڑھی ترچھی تصویروں کو دوبارہ سامنے لانے تک محدود رہے۔

متقدمین نے شاہ صاحب کے جتنے بھی تذکرے لکھے، ان میں سے اکثر کا یہی حال ہے، نہ ان میں واقعیت ہے نہ تاریخیت، اس لئے ان کے اکثر بیانات دل کو نہیں لگتے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے نہیں آتا، ان تذکروں میں ایک تذکرہ "مقالات طریقت" معروف بہ فضائل عزیزیہ ہے، جسے عبدالرحیم ضیا حیدرآبادی نے لکھا ہے، یہ کتاب طبع تو آج سے تقریباً سو سال پہلے ہوئی تھی، مگر ایک طویل عرصے سے نایاب تھی، اور اس کے والے بھی بہت کم ملتے تھے، اسلئے اسکے متعلق کسی طرح کا خیال نہیں ظاہر کیا جا سکتا تھا، اتفاق سے یہ کتاب راقم کو حیدرآباد کے ایک ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہو گئی، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ تذکرہ قدیم ہونے کے باوجود کسی بھی جدید، مفصل اور محققانہ تذکرے سے کم نہیں ہے۔

یہ کتاب تین سو بیس صفحات پر مشتمل شاہ صاحب کے انتقال کے باون سال بعد ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد میں لکھی گئی اور اس کے دو سال یعنی ۱۲۹۳ھ میں حیدرآباد ہی سے شائع ہوئی، تذکرے کے مصنف محمد عبدالرحیم ضیا حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے خلفاء سے قریبی تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ اسحٰق صاحب (خلیفہ و نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب) کے خلیفہ اور شاگرد سید شاہ محی الدین صاحب قادری ٹیلوری کے مرید بھی تھے، فاضل تذکرہ نگار اسکے علاوہ اور کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر بھی ہیں وہ اس کتاب کے ماخذ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اکثر روایات اہل ہند ثقات سے کہ بعض ان میں صحبت یافتہ حضرت کے ہیں جمع کر کے جو الواب کہ اس طریق سے حاصل نہ ہوئے، ان کو بذریعہ تحریر جناب فضیلت مآب....

.....مولانا حافظ حاجی محمد عبدالقیوم صاحب دہلوی سلمہ اللہ العزیز القوی داماد و شاگرد حضرت مولانا محمد اسحاق علیہ الرحمہ سے بعد دیافت و تحقیق کے اس کتاب میں لکھا ہے[۵]

یہ کتاب چھ مقالات (ابواب) اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالے میں مصنف نے شاہ صاحب کے مفصل حالات از ولادت تا وفات درج کئے ہیں، یہ باب چوالیس[۴۴] صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا سب سے اہم اور پر از معلومات باب ہے۔ دوسرا باب امور متعلق بعلوم ظاہر و باطن اٹھاون صفحات میں ہے تیسرا باب شاہ صاحب کی "تعبیر رویا" سے متعلق سترہ صفحات میں ہے، چوتھا باب جو تیس صفحات کا ہے۔ شاہ صاحب کے "اجوبہ مسائل" سے متعلق ہے، پانچویں باب میں ان کے مختلف سلاسل طریقت کا ذکر بہ تفصیل ہے پینتالیس[۴۵] صفحات میں کیا گیا ہے، آخری باب میں شاہ صاحب کے اجل و ارشد خلفاء کے تفصیلی حالات ساٹھ صفحات میں ہیں، خاتمے میں اپنے پیر و مرشد سید شاہ محی الدین قادری دلپوری کے حالات چوالیس صفحات میں لکھے ہیں، کتاب کے ضمیمے میں مولانا محمد زمان شہید کا تذکرہ جو شاہ صاحب کے خاندان کے مشہور خلفاء میں ہیں، ۲۴ صفحات میں ہے۔

اس اجمالی تعارف کے بعد اس پر تفصیلی نگاہ ڈالی جاتی ہے، تاکہ اسکی افادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے سلسلۂ نسب اور آبا و اجداد کے مولد و مسکن وغیرہ کا حال لکھا ہے، اسکے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات کسی قدر تفصیل سے دیے ہیں، اسکے بعد رقمطراز ہیں:۔

"حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اول اپنے ماموں کی دختر سے نکاح کیا تھا ان سے مولوی محمد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، آپ بڑے ولی کامل تھے، آپ پر جذب بہت غالب تھا..... مزار آپ کا مع دونوں فرزند کے بوڈھانہ کی مسجد میں واقع ہے، بعد انتقال والدہ ماجدہ مولوی محمد صاحب کے شاہ صاحب موصوف

---

[۵] مقالات طریقت ص ۴

نے دختر نیک اختر سید ثناء اللہ صاحب ساکن قصبہ سونی پت مسماۃ بی بی ارادہ رحمۃ اللہ علیہا سے شادی کی۔ ان سے چار فرزند پیدا ہوئے، اولین مولانا شاہ عبدالعزیز دوم میں شاہ رفیع الدین، سوم شاہ عبدالقادر، چہارم مولوی عبدالغنی اور ایک دختر مسماۃ بی بی امۃ العزیز، دختر مذکورہ کو مولوی محمد خالق بن مولوی محمد عاشق ابن شاہ عبداللہ بن شیخ محمد بھلتیؒ سے شادی کردی، ان کا سلسلہ ابتک باقی ہے۔"

اس کے بعد شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب کی زندگی کے اہم واقعات لکھے ہیں، جو دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں، مگر اس مضمون میں اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات سے بحث ہے، اس لئے طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے، مگر اس سلسلہ میں ایک اہم بات فاضل مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بیعت کے معاملہ میں عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے وقت شاہ عبدالعزیز کے تینوں بھائی کم عمر تھے، اس لئے جس طرح شاہ عبدالعزیز صاحب ان حضرات کے ظاہری مربی تھے، اسی طرح باطنی مرشد بھی وہی ہوں گے، مگر عبدالرحیم ضیاء کے بیان کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب شاہ محمد عاشق پھلتی صاحب سے بیعت و اجازت رکھتے تھے اور شاہ عبدالقادر صاحب شاہ عبدالعدل دہلوی سے بیعت تھے، جن کا مزار حضرت خواجہ باقی باللہ کے احاطے میں ہے۔

کتاب کا اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات بیان کرنا ہے، ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ ..... دراز قد، لاغر اندام گندم رنگ، کھلتا ہوا شگفتہ، صاف بشرہ تھے، گو داڑھی چہرے کے لحیہ مبارک خوشنما باعتدال تھی، اکثر چغہ اس کے نیچے انگرکھہ اور پائجامہ شرعی، دستار کشمیری کلاہ پنجہ دار رومال بڑی پاک نیلا اور پاپوش نری اور ہاتھ میں عصائے زبردست رکھتے تھے، اخلاق میں تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق تھے، مزاج میں نہایت خوش طبعی

اور ہر ایک بات کا مذاق تھا۔"

"ولادت آپ کی شب جمعہ بست و پنجم ماہ رمضان ۱۱۵۹ھ میں ہے، اور نام تاریخی آپ کا غلام حلیم ہے، کہتے ہیں کہ اسی شب شب قدر بھی تھی، اور آپ ختم قرآن شریف بھی اسی شب کو کرتے تھے، اور ختم میں شیرینی قسم ریوڑی سے تقسیم فرماتے تھے، آپ کی عمر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے وقت سولہ برس چھ مہینے کی تھی، فاتحۂ سوم شاہ ولی اللہ صاحب کا خاں دوران خاں کے محل کلاں میں ہوا۔"

"رسم دستار بندی میں تین چار چیچ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے سر مبارک پر باندھے۔ جناب مرزا مظہر جانجاناں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے، آپ نے علوم ظاہر و باطن اپنے پدر والا قدر سے پڑھا، اور مولوی شاہ عاشق صاحب پھلتی سے اسکی تکمیل کی۔ اور بابا فضل کشمیری سے جو منجملہ ارشد تلامذۂ شاہ ولی اللہ صاحب تھے، بعض کتب حدیث کی سند لی، اور علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ صاحب جد مولوی محمد عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے پڑھا، اور اکثر فیوض ظاہر و باطن مزار پر انوار پدر بزرگوار سے حاصل کرتے تھے، تھوڑے وقت انکی قبر شریف پر مراقب رہتے تھے، کوئی علم و فن ایسا نہ تھا کہ جس میں آپ کو دستگاہ کامل نہ ہو۔ خط نسخ و شکستہ خوب لکھتے تھے، علم موسیقی میں ملکہ راسخ تھا کہ استاد ان فن زانوے ادب تہہ کرتے تھے، تیر اندازی خلیفہ محمد شاکر سے گھوڑے کی سواری ملک بیرا افسر چابک سواران محمد شاہ بادشاہ سے سیکھی، تمام ہنروں میں برتر اور شاہوری میں سب سے بڑھ کر، غرض آپ کی ذات جامع کمالات معاصرین پر فائق بلکہ یکتائے روزگار تھی، اور فیض باطن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آپنے پایا ہے....."

"اور تین موضع آپ کی جاگیر تھی، ان کی سند عالم بادشاہ اور دولت، اوندیہ نے گزارنی تھی حسن پور اور مراد آباد پرگنہ سکندرآباد سے چاروں بھائیوں میں مشترک اور ایک موضع یعنی محل جنہ پرگنہ بوڈھانہ سے بلا شرکت آپ کے تصرف میں تھا،

چنانچہ وہ موضع اپنے دونوں نواسے مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کو عطا کیا تھا، ابتک جاری ہے، مولوی نصر اللہ خاں صاحب کہتے ہیں کہ میری عملداری میں محل جنہ کے سالانہ بارہ سو روپئے کلدار ہوتے تھے اور اب بھی وہی ہے سوا اسکے اکثر جاے فتوحات بلا قید سال وماہ اللہ تعالیٰ پہنچاتا تھا، جو شخص کچھ گذرانتا تو قبول فرماتے اور نہ دیتا تو ذکر تک بھی نہ لاتے۔ خدمت طلبا اور فقرا وغیرہ کی بہت کرتے تھے، گویا جود وکرم آپ کا سرشت تھا، جو سائل آتا تھا بے نیل مرام نہ جاتا تھا"

اس کے بعد شاہ صاحب کے درس وتدریس، تربیت باطن اور تصنیف کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"جاننا چاہئیے کہ دنیا میں فیض بخشی کے بہت طریقے ہیں، مگر ان میں تین طریقے مشہور معروف ہیں، ایک تدریس دوسرا تربیت باطن جسے مریدی کہتے ہیں، تیسرا تصنیف اور یہ ابواب سنجمہ بہترین باقیات الصالحات ہیں۔ ان امور میں حضرت کا پایہ بلند اور رتبہ ارجمند تھا، تدریس کا یہ حال کہ ہندوستان وغیرہ میں کوئی عالم کم نکلے گا جس کو حضرت سے واسطہ نہ ہو، کہتے ہیں کہ ایک بدایوں کے عالم نے حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ کیا، مگر اس کو نادانی سے یہ خیال آیا کہ اس شخص سے پڑھے کہ جس کے سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نہ ہوں، تمام ہندوستان پھرتے پھرتے حیران ہوا، جہاں گیا وہاں حضرت ہی کا فیض پایا، کوئی ایک واسطے سے کوئی دو یا تین واسطے سے حضرت کا شاگرد نکلا، یہ بات ایسی ہے کہ جیسے کسی نے انسانوں میں اپنی نسبت کرنی چاہی مگر یہ قید لگائی کہ اس خاندان میں ہو جس میں حضرت آدم علیہ السلام نہ ہوں"

"مگر آپ نے متقل بجز چار پانچ شخص کے اور دن کو بہت کم پڑھایا ہے یعنی اپنے تینوں بھائیوں کو کہ رفیع الدین صاحب والد کے انتقال کے وقت میندی اور عبدالقادر صاحب صرف میر پڑھتے تھے، اور عبدالغنی صاحب قرآن شریف

حفظ کرتے تھے، تمام علوم پڑھایا اور اپنے داماد مولوی عبدالحی صاحب کو، مولوی عبدالقیوم صاحب، مولانا اسحٰق صاحب علیہ الرحمہ سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا صاحب مجھ سے فرماتے تھے، میں نے کسی کو نہ دیکھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ بعد غلبۂ آشوب چشم کے بھی پڑھائے ہوں مگر تمھارے والد مولانا عبدالحی صاحب کو اور جناب غلام علی شاہ صاحب نقشبندی علیہ الرحمہ بھی شاگرد ہیں، بخاری شریف پڑھی ہے[1]۔ ان حضرات کے سوا اگر کسی کو پڑھایا ہے تو تین چار سبق سے زیادہ نہیں پڑھایا۔

"اور صبح کو جو ایک رکوع قرآن شریف کا قریب طلوع آفتاب ہر روز ایک تقریر کے ساتھ سنا کرتے تھے، یہاں تک کہ بروز وفات بھی سنا ہے، اسکے قاری خاص مولانا اسحٰق صاحب ہوتے تھے، ..... اور آپ کے برادروں کے ساتھ مولوی مفتی الٰہی بخش صاحب ساکن کاندھلہ اور مولوی قمرالدین صاحب منت تخلص وغیرہ سامع تھے، اسی طریق سے انھوں نے تحصیل کی۔"

شاہ صاحب کے درس اور شاگردوں سے متعلق اس کتاب کی روایت انوکھی اور عجیب سی ہے، مصنف لکھتے ہیں:۔

"مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں، میں نے مولانا اسحٰق صاحب سے پوچھا کہ حضرت اکثر لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، شاہ صاحب نے ہمیں تعلیم کی ہے، اسکی کیا حقیقت ہے، آپنے فرمایا کہ بعد نابینا ہونے کے شاہ صاحب پڑھنے کی دو صورتیں تھیں، ایک تو میں صبح کو قرآن شریف کا رکوع پڑھتا تھا، اس میں لوگ سامع رہتے تھے، دوسرے یہ کہ علماء و فضلاء اور بڑے بڑے بزرگوار اطراف سے حاضر ہو کر حصول اجازت تبرکاً چاہتے تو حضرت شاہ صاحب فرماتے کہ چہل قدمی کے وقت پڑھیں میں سنوں گا، اس وقت کچھ بیان بھی کرتے تھے، اس قسم کے شاگرد بے شمار ہیں۔ سوا اسکے جمعہ اور منگل کو قرآن شریف کا درس

---

[1] ان حضرات کے علاوہ تذکرہ نگار نے شاہ ابوسعید صاحب کو بھی شاہ صاحب کا شاگرد بتلایا ہے۔

بطور وعظ کے ہوتا تھا، اسکی کیفیت مرزا اعلیٰ شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرحوم کی زبانی جو حضرت کے شاگردوں میں سے تھے، یوں بیان کرتے ہیں کہ آپکے وعظ میں ہزارہا آدمی رہتے تھے، ان میں جو پڑھے لکھے تھے وہ لوگ ایک ایک تفسیر اپنی اپنی استعداد کے موافق عربی ہو یا فارسی لے کر بیٹھے رہتے، جب کوئی آیت شروع کرتے تو حضرت ہر ایک سے پوچھتے کہ امام رازی کیا معنی کرتے ہیں، اور شیخ محی الدین ابن عربی کیا فرماتے ہیں اور قاضی بیضاوی کیا لکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس کے پاس جو تفسیر ہوتی وہ اپنا بیان کرتا، جب سب تفسیریں ہو جاتیں تب آپ فرماتے، خیر یہ سب بیان ہو چکا، اب جو خدائے تعالیٰ نے اس فقیر کے دل پر القا کیا ہے بیان کرتا ہوں، پھر وہ وہ معنی بیان فرماتے کہ کسی مفسر کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ سب لوگ کتابیں بند کر کے حضرت کا منہ تکتے رہتے اور ششدر رہ جاتے ..... مولوی یار محمد صاحب علیہ الرحمہ مدتوں خدمت فیض درجت میں رہے ہیں اور کئی دورے قرآن مجید کے ان کے روبرو ہوئے ہیں، ان دوروں کا قرآن مجید شروع سے آخر تک محشیٰ ان کے فرزند مولوی محمد اسحٰق صاحب کے پاس موجود ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی طرح درس فرماتے تھے۔ اخیر درس ان کا اعلم واھو اقرب التقویٰ تھا، وہاں سے حضرت نے شروع کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور حضرت کا آخری درس آیۃ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم تھا، حضرت کے بعد وہاں سے مولانا اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا۔"

شاہ صاحب کے درس و تدریس کی کیفیت سننے کے بعد ان کے تصوف اور طریقہ تربیت باطن کا بھی کچھ حال تذکرہ نگار کی زبانی سنیئے، یوں تو انھوں نے اس کا ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے مگر اس باب میں بھی مختصراً رقمطراز ہیں۔

"تربیت باطن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ کو تمامی آداب سلوک اور اشتغال طریقت میں دستگاہ کامل اور ملکۂ راسخہ تھا، جیسا چاہتے ویسا طالبوں کو خدا تک

پہنچاتے تھے، کوئی طریقے کے مقید نہ تھے، کیونکہ اپنے عزیز و اقارب برادروں کی اولاد یعنی مولوی محمد اللہ صاحب اور مولوی اسمٰعیل[1] صاحب اور مولوی یعقوب صاحب اور مولانا اسحٰق صاحب وغیرہ سے قادریہ طریقہ میں بیعت لی تھی، اور امراؤ کو سلسلۂ چشتیہ میں اور دوسروں کو سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید کرتے تھے، چنانچہ جناب سید احمد صاحب طریقۂ نقشبندیہ میں مرید تھے مگر مولانا عبدالحی صاحب کو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت تھی، اور شاہ صاحب خود صاحب طریقہ ہیں، کیونکہ آپ نے بعد تکمیل سلوک راہ ولایت اور سلوک راہ نبوت کے خاص ایک طریقہ سلوک راہ ولایت کا برعایت طبائع ابنائے روزگار استخراج کیا ہے، وصول الی اللہ کے واسطے نہایت آسان و سہل ہے، اس نیچریز نے اس خاص سلوک طریقہ علیہ عزیزیہ کو مقالۂ پنجم میں..... لکھا ہے..... اور حضرت کی توجہ وغیرہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، اگر کوئی خواہاں ہوتا تو فرماتے کہ تم غلام علی شاہ صاحب کے پاس جاؤ کہ وہ صاحب طریقہ ..... اور اس کام کے ذمہ دار ہیں، یہ فقیر طریقۂ تعلیم علوم ظاہری رکھتا ہے، اس پر بھی کوئی بہت خواہش اور الحاح کرتا اور آپ کے ذہن عالی میں آتا تو اس کے واسطے ایک وقت معین فرماتے اور جائے مقرر کرتے، مثلاً کسی کو بعد نماز مغرب اور کسی کو بعد نماز ظہر یا دوسرے وقت جو مناسب جانتے تعین کرتے، جیسے جناب سید احمد صاحب اور سید اللہ دیا صاحب برہان پوری اور مولانا یعقوب صاحب اور شیخ غلام جیلانی صاحب باغ پتی اور حافظ قطب الدین صاحب پھلتی، یہ اکابر حضرت سے توجہ لئے ہیں اور تکمیل کو پہنچے ہیں.....“

---

[1] مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی صاحب کے شاہ صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت ہونے میں راقم کو اختلاف ہے۔ عام روایت کے مطابق یہ بزرگ سید احمد شہید سے بیعت تھے ممکن ہے ان میں سے کسی ایک نے تبرکاً بیعت کی ہو اور باقاعدہ تعلیم بعد میں سید احمد شہید سے حاصل کی ہو، بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں بھی اس کتاب کی دو باتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں اس سے ان کی بہت سی تصانیف کے بارے میں شبہات اور ابہام دور ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:۔

"خود تصانیف کی تمام زمانے پر ظاہر و باہر ہے، بیان کی احتیاج نہیں، تفسیر فتح العزیز، عجالہ اثنا عشریہ، سر الشہادتین، بستان المحدثین، عجالہ النافعہ، حواشی قول الجمیل، یہ تمام کتابیں مشہور و مطبوع ہیں، سوا ان کے علم معانی میں ایک رسالہ ہے، سوانح کے حصہ دوم میں اس کا بھی حواشی ہیں، حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ، مولوی نور اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر فارسی تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ بھی نہیں، تفسیر فتح العزیز کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ آپ کی ایام جوانی میں عادت تھی کہ بعد نماز عصر تشریف رکھتے، اخبار دیار و امصار کے گوش زد ہوتے، دوسرے سخن و قصص بھی درمیان آتے اور اشخاص اسی قسم کے جمع ہوتے تھے، چنانچہ ایک کابستھ بھی درباریوں سے بادشاہ عالم کے اسی وقت حاضر ہو کر قصص دیار عرض کرتا، آخر کار وہ کابستھ فیض صحبت سے مسلمان ہو کر شیخ مصدق الدین نام پایا، اور کمال کو پہنچا، ان ہی کے سبب استدعا ۱۲۰۸ھ میں تفسیر شروع ہوئی، چنانچہ خود بدولت فرماتے ہیں تفسیر کی یہ کیفیت مفصل تحریر فرمائے ہیں، شیخ مصدق الدین کے فرزند مولوی کرم اللہ صاحب بڑے فاضل اور ولی کامل خلف سے غلام علی شاہ صاحب کے ہوئے ہیں۔"

"مرزا علم علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرقوم الصدر سے روایت کرتے ہیں، تفسیر کے ناتمام رہنے کی یہ وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے خواب میں جناب شاہ صاحب کو فرمایا کہ تم تفسیر لکھنا موقوف رکھو، اگر تمام کرو گے تو اور تمام مفسروں کی محنت بے فائدہ ہو گی، کوئی کسی کی تفسیر نہ دیکھے گا، تمہاری اتنی ہی تفسیر کوئی سمجھے تو تمام قرآن کے مضامین پر حاوی ہو گا۔"

آپنے حسب الحکم موقوف کیا، سورۂ بقرہ ناتمام رہا، واقعی ایسی ہی تفسیر نادر ہے کہ اسکے وصف میں زبان قاصر ہے، باوجود ضوابط علم تفسیر کے صحت روایات، و آداب سلوک و اسرار حقایق و نکات معارف ایسے ہیں کہ اور تفاسیر میں کم ہونگے۔ جناب امام رازی قدس سرہٗ نے آیت کا ربط آیت سے دیا ہے، حضرت نے سوا اس کے سورہ کو سورہ سے مربوط کیا ہے، اسکی تحریر کا یہ حال تھا کہ مسودہ کا اتفاق نہ ہوا، اور جو لفظ فرمایا پھر دوبارہ وہ زبان پر نہ آیا، مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت کے آخر وقت کے مستفیضوں میں سے ہیں، حسب خواہش سکندر بیگم مغفورہ والیۂ بھوپال تفسیر مذکور کا تکملہ تا میں جلدوں میں کیا ہے، راقم نے دیکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے، اس عصر میں ایسی استعداد و لیاقت کی فرد نایاب ہے دوسرے کا منہ نہیں جو یہ ہمت کر سکے، مگر دونوں کا فرق کرنے والا اپنے حوصلے کے مطابق سمجھ سکتا ہے[۱]

"تحفہ اثنا عشریہ بھی آپ کی زندگی میں یعنی ۱۲۱۵ھ میں طبع ہو کر مشہور ہوئی اور وہ بھی ایسی ہی بے ساختہ لکھی گئی[۲]، کہتے ہیں کہ جب تحفہ اثنا عشریہ چھپ کر شہرت پائی تو ایک کلکتہ کا کوئی نواب شیعہ مذہب تھا، اس کو نہایت شاق گذرا، اس نے وہ کتاب اور بہت سے روپے ایران کو روانہ کر کے وہاں کے فضلاء اور بلغا کو لکھا کہ یہاں سینوں کو اس کتاب کی عبارت اور مضمون پر ناز ہو۔ چاہیے کہ دونوں کا رد ہو دے۔ ایران میں تمام فضلاء اور ارباب انشا نے جمع ہو کر مدت دراز

---

[۱] شاہ صاحب کی تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں بہت سے شواہد اور نادر و معتبر روایات راقم کو فراہم ہوئے ہیں جنکی روشنی میں مختلف اور حیرت انگیز نتائج برآمد ہوتے ہیں، چونکہ یہ بحث طویل ہے اس لئے اسے الگ مقالے کی شکل میں عنقریب پیش کیا جائے گا۔

[۲] تحفہ کا یہ نسخہ بہت ہی اہم ہے، یہ پہلی بار تین سو کی تعداد میں ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا، راقم کی نظر سے اسکے دو نسخے گذرے ہیں۔

تک تمام کتاب بکرات ومرات دیکھی، کچھ نہ ہو سکا، آخر کو وہ روپے سب چکھ چکھا کر اس کے جواب میں ایک نامہ لکھ کر روانہ کیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ صاحب تحفہ نے جو اپنے مذہب کی قدیم کتابوں کا حوالہ دیا ہے، اس ملک میں وہ مذہب صدہا سال سے اٹھ جانے کے سبب سے وہ کتابیں ہدست نہیں ہو سکتیں اور جو ہمارے مذہب کی قدیم کتابیں اس میں مذکور ہیں ہم نے ابتک دیکھا نہیں، مضمون کا رد تو کتابوں کی قدرت پر موقوف ہے، رہی عبارت ایسی صاف اور بے تعقید کس منشی کا منہ ہے جو لکھ سکے، سبحان اللہ"

"آپ سے نظم ونثر بھی بہت یادگار ہے، اس محل پر برکتاً فقط ایک بیت ایک قطعہ اور ایک قصیدے پر اکتفا کیا"[1]

فاضل تذکرہ نگار نے شاہ صاحب کی وفات کے بھی جو کیفیت بیان کی ہے، اسکی تفصیلات موجودہ روایات میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ ان سے اصل واقعات کی تمام کڑیاں مل جاتی ہیں، مصنف رقمطراز ہیں:۔

"آپ بہت قلیل الغذا اور کثیر الامراض تھے، جب وقت قریب آیا تو چند روز سے غذا ترک کی، مرض کی شدت تھی، وعظ کا دن آیا، آپنے فرمایا مجھ کو کپڑے پہنو، جب بیان شروع کروں تو چھوڑ دینا، ویسا ہی کیا، یعنی قوت روحانی اور فیض ربانی کا غلبہ ہوا، آپ کو چھوڑ دیا، وعظ فرمانے لگے، ہزاروں آدمی جمع تھے اس حال میں بھی جیسا دور والے سنتے تھے ویسا ہی نزدیک والے بھی سنتے تھے، بعد ازاں آیۂ شریفہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل کا بیان کیا، اسکے مطابق نقد اور اسباب سب تقسیم فرمایا، من بعد قریب لاکھ روپئے کے نقد اور

---

[1] اس کتاب میں جو اشعار ہیں وہ اور ان کے علاوہ دیگر مخطوطات ومطبوعات سے جو اشعار مل سکے ہیں، انکی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے جو راقم کے پاس موجود ہیں۔ اسکے علاوہ بعض نادر ادبی مرقعے وتشریحات ایک الگ مضمون کی شکل میں پیش خدمت ہوں گے۔

نوٹ:- اوپر کے مضمون کی ترتیب غلط ہوئی ہے، براہ کرم مرتب کو بھیج کر پڑھ لیجئے۔

اصل میں کوشک انور اس جائے کا نام تھا، اب زبان زد عوام خوش نرد کا چھتہ مشہور ہے، اور شیخ عبدالرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب مولوی عبدالغنی صاحب اور مولوی مخصوص اللہ صاحب وغیرہ قدس اللہ اسرارہم، ان سب کے مزار وہیں ایک ہی احاطے میں ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب کی تاریخ وفات کے شاہ رؤف احمد مجددی، ارتضا علیخاں صاحب گویا موی اور حکیم مومن خاں مومن وغیرہ کے قطعات تاریخ درج کئے ہیں، جس سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا تھا، نہ کہ ۱۲۴۰ھ میں، اصل میں موخرالذکر سال سب سے پہلے مرید نے شاہ صاحب کے تذکرے میں آثار الصنادید میں غالباً غلطی سے لکھ دیا تھا، اسکے بعد سے متعدد تذکرہ نویسوں، مثلاً رحمان علی[1]، رحیم بخش[2] دہلوی اور اسماعیل گودھروی وغیرہ نے، یہی سنہ سرسید سے نقل کر کے لکھا ہے، حالاں کہ سرسید کی اس روایت کے خلاف بہت سارے شواہد قلمی خطوط اور تذکرے کی شکل میں موجود ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ قدیم تذکرہ اور اس کے ساتھ مختلف معصروں کے قطعات تاریخ وفات سرسید اور ان سے نقل کرنے والے حضرات کی تردید ہوتی ہے۔

تذکرہ نگار نے اسکے علاوہ اور بہت ساری باتیں اس کتاب میں ایسی درج کی ہیں جو کسی اور تذکرے میں اب تک نہیں ملتیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے اور صرف انکی موسیقی کے سلسلے کی چند روایتیں ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں[3]

"روایت ہے حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سے وہ روایت کرتے ہیں مولوی وحیدالدین صاحب پھلتی سے کہ "وہ شاگرد ہیں مولانا اسمٰعیل شہید کے اور خلیفہ ہیں سید احمد صاحب قدس سرہٗ کے اور تیرہ سال حضرت شاہ صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲ [2] حیات ولی ص ۶۲۴ [3] شاہ عبدالعزیز صاحبؒ موسیقی کے بہت اچھے عالم تھے، تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ایک نایاب تصنیف" معارف، دسمبر ۱۹۶۴ء۔

قدس سرہ کی خدمت میں رہے ہیں، کہا انھوں نے کہ نواب نصراللہ خاں والئی رامپور کے یہاں ایک قوال مسمی ہمت خاں بڑا صاحب کمال تین سو روپے ماہوار کا نوکر تھا، تمام گویئے اسکو مانتے تھے، ثانی تان سین جانتے تھے، ایک دن اسکو خیال آیا کہ اگر مجھ کو تمام لوگ بڑا کمال والا جانتے ہیں، اس کا کچھ اعتبار نہیں، میں اپنے ہنر کو جب تک حضرت کے محک امتحان پر عرض نہ کروں اور ان کی زبان سے سند نہ لوں تو کیونکر اپنے کو کچھ چیز سمجھوں کس لئے کہ اس زمانے میں اس ذات جامع الکمالات کی جیسی کوئی ذات نہیں اور کمال وہی معتبر ہے جو اہل کمال پسند کریں اور داد دیں ..... اسی آرزو میں دلی کو آیا وہ حضرت کا آخر زمانہ تھا کہ بنیائی سلب ہوگئی تھی اور تمام حواس میں ضعف طاری تھا، روبرو حاضر ہو کر سلام کیا، آپنے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ آؤ ہمت خاں اچھے تو ہو، سنتے ہی نہایت حیران و ششدر ہوا، اور تمام حضار متعجب ہوئے کہ یہ شخص تو کبھی یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی حضرت نے اسکی آواز سنی اور نہ صورت دیکھی، یہ کیا بات ہے کہ اس کا نام لے کر پکارا، اس نے بھی استفسار کیا تو فرمایا کہ تمھارے گانے کا لوگ ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کی آواز میں یہ بات ہے اور اس طرح کا اتار چڑھاؤ ہے، وہ بات صاف تمھارے تکلم سے پائی گئی تو میں نے جانا کہ اس انداز کا تمھارے سوا کوئی نہیں ہے، جب اس نے اپنا مدعا عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں اپنا جوہر حضرت کے روبرو عرض کروں، ارشاد ہوا کہ مناسب، پھر حضرت نے ایک دن حضرت شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب وغیرہ بڑے بڑے کملاء کو جمع کیا اور کوئی اغیار سے نہ رہا تب اسکی یاد ہوئی، اور وہ گانے لگا، جو جو چیزیں اس کو یاد تھیں سب سنا دیں، تمام حضار کو رقت ہوئی، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کہ نہایت مستغل مزاج تھے، ان کے بھی اشک جاری ہوئے، چادر منہ پر ڈالے ہوئے بیٹھے رہے، اور حضرت بھی کھنڈولے پر جبناں تھے، جب وہ سب گا چکا

دوسرا اسباب بیش قیمت جو رہا تھا اس میں سے چند ہزار روپے واسطے زادِ راہ سفر حجاز اور ادائے مناسک حج وعمرہ وغیرہ کے اپنے نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہما کو عنایت کئے اور چند ہزار روپے مصارف مراسم وفات وتعزیت کے لئے دیئے، بعد ازاں کچھ اشعار عربی اور فارسی پڑھے، اور بہت شعر ایسے کہ ایک مصرع دوسروں کا اور ایک مصرع اپنا، چنانچہ یہ شعر مشہور قدسی علیہ الرحمہ کا[1]

روز قیامت چوں شود ہر کس بگیرد دامنے
من نیز حاضر میشوم تصویر جاناں در بغل

بجائے مصرع ثانی آپ نے فرمایا:-

من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآں در بغل

پھر فرمایا کہ میرا کفن ایسے کپڑے کا ہو جو میں پہنے ہوں، کرتا آپ کا ادھوتر کا اور پائجامہ گاڑھے کا ہوتا تھا اور فرمایا کہ جنازے کی نماز باہر شہر کے ہو، اور بادشاہ میرے جنازے پر نہ آوے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ساتویں تاریخ ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ وقت طلوع آفتاب کے روح پرفتوح اس عالم گذران سے جانب عالم جاوداں روانہ ہوئی، جس جائے آپ کو غسل دیا گیا تھا وہ خاک معطر ہوئی تھی، بہت لوگوں نے اپنے مکان میں اس کو رکھا تھا، اول بار دروازہ ترکمان دہلی کے باہر مولانا محمد اسحٰق صاحب نے امام ہو کر نماز پڑھائی، بعد ازاں نصیر الدین صاحب لکھنوی شافعی کے مقبرے میں جماعت سے نماز ہوئی، یہانتک کہ پچپن[55] بار جنازے کی نماز پڑھی گئی جوق در جوق آتے تھے اور پڑھتے تھے، بعض مقامات میں غائبانہ بھی نماز ہوئی ہے، مزار پر انوار آپ کا شاہجہاں آباد کے باہر دہلی دروازے کی سمت ہندوؤں کے قریب خوش زدہ کے چھتے میں واقع ہے[1]

---

[1] یہ جگہ میرور دہ وڈ کے سامنے جیل خانہ اور مولانا آزاد میڈیکل کالج کے پیچھے واقع ہے اور اب قبرستان ہندوؤں کے نام سے مشہور ہے، اسی قبرستان میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم کو بھی دفن کیا گیا ہے۔

نے بیان کئے ہیں جن کو نقل کرنے کی گنجائش اس مقالے میں نہیں ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے بہت سے تلامذہ کے تفصیلی حالات جواب بالکل نایاب ہیں، اس تذکرے میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسحٰق، مولانا یعقوب اور مولانا سراج احمد خورجوی کے حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس مختصر سے تعارف سے ناظرین اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

آپ حج کیسے کریں؟

مفید اضافات کے ساتھ جدید ایڈیشن

حج و زیارت کے موضوع پر اب تک اردو میں بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اسکا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی رُوح اور جان ہے۔ مجلد ۲/

آسان حج

اسے آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ سمجھئے۔ کم تعلیم یافتہ حضرات کے لئے حج کا بہترین معلم اور رہنما ہے۔ جیبی سائز آفسٹ کی بہترین طباعت۔ جدید ایڈیشن ـــــ قیمت ۶۰/-

ہندوستان کا سب سے پہلا

سفرنامۂ حجاز

آج سے ایک سو پچاسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد، ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی رفیع الدین صاحب حیدرآبادیؒ نے حرمین شریفین کا سفر بڑے ہی عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفر عشق کی مکمل روئداد قلم بند کر کے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی، تاریخ کے اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفر کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہندو حجاز کے بہت ہی نادر حالات اور معلومات اسکے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی ایمانی کیفیات کا تو یہ عجیب غریب ہی مرقع ہے۔

قیمت :- ۷۵/

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان۔ کچہری روڈ، لکھنؤ

نے بیان کئے ہیں جن کو نقل کرنے کی گنجائش اس مقالے میں نہیں ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے بہت سے تلامذہ کے تفصیلی حالات جواب بالکل نایاب ہیں، اس تذکرے میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسحٰق، مولانا یعقوب اور مولانا سراج احمد خورجوی کے حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس مختصر سے تعارف سے ناظرین اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مرتبہ
مولانا محمد منظور نعمانی

آپ حج کیسے کریں؟

مفید اضافات کے ساتھ
جدید ایڈیشن

حج و زیارت کے موضوع پر اب تک اردو میں بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اسکا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے اور ذوق و شوق و عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی روح اور جان ہے۔ مجلد ۲/

آسان حج

اے آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں؟" کا مکمل خلاصہ سمجھئے۔ کم تعلیم یافتہ حضرات کے لئے حج کا بہترین معلم اور رہنما ہے۔ جیبی سائز آفسٹ کی بہترین طباعت۔ جدید ایڈیشن ——— قیمت ۶۰/-

ہندوستان کا سب سے پہلا

سفرنامۂ حجاز

آج سے ایک سو پچاسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد، ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی رفیع الدین صاحب مراد آبادیؒ نے حرمین شریفین کا سفر پورے ہی عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفر عشق کی مکمل روداد قلم بند کر کے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی، تاریخ کے اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفر کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہندو حجاز کے بہت ہی نادر حالات اور معلومات اسکے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی ایمانی کیفیات کا تو پھر کہنا ہی مرجع ہے۔

قیمت :- ۷۵/

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مؤتمر اسلامی ؎

افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل

از شیخ محمد ابن الصبوری ، رجسٹرار جامعہ اسلامیہ ، مدینہ منورہ
(ترجمہ: مولانا سعید الرحمن اعظمی ، ندوۃ العلماء ، لکھنؤ)

جناب صدر ، اور معزز دوستو!

آپ کی اس موقر کانفرنس کے جنرل سکریٹریٹ نے مجھ سے ایک ایسا تفصیلی مضمون لکھنے کی فرمائش کی جس کا موضوع ہو "براعظم افریقہ میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کی سیاسی و سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز" تاکہ کانفرنس اس مسئلے پر غور کرکے کوئی عملی قدم اٹھا سکے۔ میں یہ مختصر مضمون اس فرمائش کی تعمیل میں پیش کر رہا ہوں جو حسب ذیل مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔
۲۔ اسلام اور مسلمانوں کی مخالف طاقتیں
۳۔ مسلمانوں کی بہبودی میں رکاوٹ ڈالنے والے حالات
۴۔ موجودہ سیاسی مسائل اور ہمارا موقف۔
۵۔ اسلامی عنصر کو تقویت پہونچانے کے لیے ضروری اقدامات۔

۱۔ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن

براعظم افریقہ کی مجموعی آبادی میں مسلمان ایک بڑی اکثریت ہیں۔ اس لیے کہ وہاں کی پوری آبادی (۲۵ کروڑ) میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ کروڑ سے بھی متجاوز ہے۔ مسلمانوں کے اس مجموعہ کی

؎ مؤتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں پڑھے گئے مقالات میں سے پہلا مقالہ اکتوبر کے الفرقان میں دیا جا چکا ہے یہ دوسرا ہے۔ یہ تمام اب اسی طرح الفرقان میں شائع ہوتے رہیں گے۔ مرتب۔

اہمیت جو دینی اور ثقافتی اعتبار سے متحد ہے اس لیے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ افریقہ کے غیر مسلم باشندوں کی اکثریت بت پرست قبائل سے تعلق رکھتی ہے جہاں ابھی تک کسی آسمانی مذہب کی رسائی نہیں ہو سکی ہے اور اس لیے ان کے اندر اسلامی دعوت کو پیش کرنے کے لیے ایک بڑا میدان موجود ہے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس براعظم میں اسلامی دعوت کے پھلنے پھولنے کے جتنے مواقع ہیں سارے عالم میں شاید کہیں نہ ہوں، لیکن افسوس یہ مواقع بھی محدود ہوتے جا رہے ہیں، اسلام دشمن طاقتیں ان کو ختم کرنے کے لیے اڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں اور جب تک ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسلامی اور عربی کوششیں وسیع پیمانہ پر ایک دوسرے کا ہاتھ نہ بٹائیں اس وقت تک ان سے فائدہ اٹھانے کا امکان نہیں ہو بلکہ بہت ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہ مواقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں..... اس بنا پر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ آئندہ بیس سال اس براعظم میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن مدت ہوگی اور اگر مطلوبہ کوششیں وسیع پیمانہ پر وجود میں آجائیں تو یہ امید ذرا بھی خوش فہمی پر مبنی نہیں ہوگی کہ افریقہ ایک اسلامی براعظم بن جائے۔

اس براعظم میں مسلم اکثریت کی کوششوں کے باوجود (جو بعض علاقوں میں ۹۰ فی صدی سے بھی اوپر ہے) یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان عام طور پر غیر مسلم اقلیتوں کے زیر حکومت ہیں۔ جن کی سیاسی پالیسیاں اسلامی اخوت سے ٹکراتی ہیں۔ یہ غیر مسلم اقلیتیں مسلمانوں پر ایسے نظام عائد کرتی ہیں جو نہ صرف اسلامی فکر کے منافی ہیں بلکہ دعوت اسلامی کی کامیابی کے مواقع کو بھی پوری طرح ختم کر دیتے ہیں۔

یہ حالات کئی باتوں کا نتیجہ ہیں:-

۱۔ جدید تعلیم سے مسلمانوں کی بالعموم محرومی اور دوری، جس میں کچھ تو نوآبادیاتی سیاست کے قصد و ارادہ کو دخل تھا تاکہ مسلمان حکمرانی کے قابل نہ ہو سکیں۔ دوسرے خود مسلمانوں نے اپنی اولاد کو بے دینی کے اندیشے سے عیسائی اسکولوں میں داخل ہو کر تعلیم پانے سے باز رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام کلیدی عہدوں اور زندگی کے اہم شعبوں پر غیر مسلموں کو چھا جانے کا موقع مل گیا ــــ مزید برآں یہ کہ نوآبادیاتی تسلط نے جب ان ممالک کو آزادی دینے کا

ارادہ کیا تو اس کی مخصوص طور پر کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے زمام حکومت غیر مسلم لیڈر شپ کے حوالے کی جائے اور پھر مختلف معاہدوں اور اقتصادی امداد کے ذریعہ ان کی پشت پناہی کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اس کی مثال سنغال، تشاد، تنجانیکا، یوگنڈا، اور جابیا ہیں جن میں مسلمانوں کا تناسب ۷۰ سے لے کر ۹۸ کے درمیان ہے لیکن اس کے باوجود ان تمام ملکوں میں حکومت عیسائی اقلیت کے ہاتھوں میں ہے جس کے دل میں اسلام سے بغض و عناد بھرا ہوا ہے اگرچہ انتہائی عیاری کے ساتھ اس کو چھپانے کی کم و بیش کوشش کی جاتی ہے۔

۲۔ اسلامی بنیاد پر اسلامی جماعتوں کے متحد ہونے کا تصور اب تک غیر واضح ہے جس کی وجہ سے مسلمان مختلف سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں بلکہ کچھ اس بنیاد پر بھی آپس میں اختلافات کھڑا کرتے ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں سے دین کا کوئی تعلق ہی نہیں، حالانکہ یہ اختلاف اس کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ مسلمان بحیثیت اکثریت کے جن حقوق کے حقدار ہیں عملاً وہ ان سے فائدہ نہ اٹھائیں اور ایک بے اثر اکثریت بن کر رہیں۔ اس اختلاف و انتشار کے افسوسناک نتائج کی مثالیں افریقہ کے ان ممالک میں بکثرت ہیں۔

۳۔ بعض اسلامی جماعتیں اسلام کا ایسا غلط تصور اور اس کی ایسی بگڑی ہوئی تصویر پیش کرتی ہیں جو باطل اور خرافات کا مرقع ہوتی ہے۔ اور جس کی وجہ سے نئی نسلیں اسلامی رشتہ سے ٹوٹ کر عصر حاضر کے نئے فلسفوں اور نئے نظریوں کی طرف دیکھتی ہیں اور اس میں زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھتی ہیں، اسلامی اکثریت کی طاقتوں کو یہی چیز قدیم و جدید کے دو مکاتب فکر میں تقسیم کرتی ہے، قدیم مکتب فکر عصر حاضر کی روح اور زندگی کے تقاضوں سے بالکل الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو جدید مکتب فکر قدیم کو ناقابل اعتناء تصور کرتا ہے۔ اور خالص جدید افکار کو اپنی ترقیوں کا ذریعہ اور اسی کو اپنے مسائل کا حل تصور کرتا ہے۔ گو یہ دونوں مکتب فکر ہر جگہ حتیٰ کہ بلاد عربیہ میں بھی موجود ہیں، لیکن افریقہ میں جہاں اسلام کے خلاف زبردست معرکہ آرائی ہے اور جہاں اسلام کا مستقبل ایک مضبوط متحدہ اسلامی محاذ پر موقوف ہے، یہ تقسیم بہت خطرناک ہو جاتی ہے۔

۴۔ افریقہ میں بہت سی آزاد مسلم حکومتیں موجود ہیں جن میں اس بات کی پوری صلاحیت

ہو کہ اس برِ اعظم میں اسلامی لہر کو مضبوط کرنے میں ایک مؤثر رول ادا کریں لیکن وہ اپنے داخلی مسائل میں اس طرح پھنسی ہوئی ہیں کہ اس اہم کام کی طرف کوئی توجہ نہیں کر پاتیں۔ یہ مسائل بیرونی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہوں یا اندرونی اختلافات کا بہرحال ان حکومتوں کی اس میدان میں سرگرمی اور اثر اندازی کے لیے سمِ قاتل ہیں۔ مثال کے طور پر سوڈان کے لیے جنوبی سوڈان کا مسئلہ، زنجبار کا اندرونی جھگڑا اور مراکش و الجزائر کا سرحدی قضیہ۔ اسی طرح سلم افریقہ میں وہ تمام عیوب و اختلافات موجود ہیں جو عام طور پر عربی اور اسلامی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو اسلامی تربیت کی کمزوری اور سامراج کے پیدا کردہ سیاسی اور اقتصادی احوال کا نتیجہ ہیں، جیسے کہ قومیت و وطنیت اور اشتراکیت وغیرہ کے نعرے بھی افریقہ میں ابھر رہے ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک صورت حال یہ ہے کہ ان لیڈروں کے اردگرد اسلامی ذہن رکھنے والے ایسے افراد یا جماعتوں کا بھی فقدان ہے جو انھیں صحیح رہنمائی دیں اور اس غلط بہاؤ کو روکنے یا کم سے کم اس کو سست کرنے کا راستہ انھیں بتائیں۔ بعض جگہ اگر خوش قسمتی سے ایسے حکمراں پائے جاتے ہیں جو اپنے ملکوں کی سیاست و معیشت کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنا اور اسلامی دنیا سے خود کو مربوط رکھنا چاہتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ سامراج نے ایک طرف ان کو ایسے حالات میں چھوڑا ہے کہ بیرونی امداد کے بغیر ان کا کام کسی طرح نہیں چل سکتا اور دوسری طرف تخریب کاری کے ایسے جال پھیلا دیے گئے ہیں جو وقت ضرورت سامراج کے ادنیٰ اشارے سے اس کے کام آسکتے ہیں۔

افریقہ کے ایک ایک ملک کے تفصیلی حالات کو نظر انداز کر کے اگر پورے برِ اعظم پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ افریقہ کے بارے میں بڑی طاقتوں کی پالیسی بھی اس کی وحدت کے تصور ہی پر مبنی ہے اور اس نقطۂ نظر سے وہ افریقہ کی غیر مسلم قیادتوں کو ہر ممکن طریقے پر اس رجحان کو مضبوط اور مؤثر بنانے کے لیے کوشاں ہیں کہ دنیا کی نظر میں یہی قیادتیں افریقہ کی ترجمان اور اس کے سیاہ و سفید کی مختار بن جائیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان بڑی طاقتوں نے افریقیوں کے اندر اتحاد و یکجہتی کے رجحان کا اندازہ کر کے اس بات کا مکمل منصوبہ بنایا ہے کہ کس طرح اس متحدہ افریقہ کی حکمرانی غیر مسلم عناصر کے

ہاتھ میں آجائے۔ اور اس کا تقاضہ ہے کہ ہم ہر افریقی ملک کے حالات کا جدا جدا جائزہ لینے کے ساتھ عملی پالیسی کا مدار اس کی وحدت کے تصور ہی پر رکھیں، جہاں جہاں اسلامی قیادتیں موجود ہیں اُن سے واقفیت حاصل کریں اور جہاں یہ قیادت مفقود ہے وہاں اسے وجود میں لانے کی کوشش کریں تاکہ افریقہ کے مسلمان پورے براعظم میں اپنا صحیح رول ادا کر سکیں۔

۲۔ اسلام اور مسلمانوں کی مخالف طاقتیں

۱۔ عیسائی مشنریاں۔ آج سے قریباً ڈیڑھ صدی پیشتر جب عیسائی مشنریوں نے افریقہ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اُن کے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ افریقیوں کو عیسائی بنائیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا بت پرست۔ مسلمانوں کے معاملے میں ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے عقائد گاڑ دینا اور سیاسی و اجتماعی لحاظ سے ان کو کمزور کر دینا، اسلام کے آغوش سے ان کو نکالنے ورنہ کم سے کم ان پر سے اسلام کی گرفت کو کمزور کر دینے کی طرف ایک مؤثر قدم ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ اپنی اجتماعی زندگی کی اساس کمزور پڑ جانے پر وہ بے وزن اور بے اثر گروہوں کی شکل میں رہ جائیں جن کے ہاتھ میں کوئی طاقت نہ ہو۔

ہم اگر یہ سمجھ لیں کہ عیسائی مشنریوں کا یہ حملہ بالکل ناکام رہا تو یہ بڑی غلطی ہوگی کیونکہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ عیسائی اقلیتیں کس طرح بعض اُن افریقی ملکوں تک پر قابض ہیں جن کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔ مشنریوں کے کچھ خاص طریقے اور بھی ہیں جو افریقیوں کے لیے بڑے مؤثر ہیں اور اُن سے کام لینے میں یہ برابر لگی رہتی ہیں۔ وہ طریقے کیا ہیں۔ اسکول، شفاخانے اور پناہ گزیں کیمپوں جیسے رفاہی کاموں کے ذریعے عوام میں نفوذ۔ اور پھر انھیں اڈوں سے وقت ضرورت اسلامی ممالک میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور اندرونی کشمکشوں کو ہوا دینے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن اب جبکہ افریقہ آزادی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے عیسائی مبلغین کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ان کے مشن کا گزشتہ سامراج سے تعلق آزاد افریقہ میں ان کے لیے بڑی پریشانیوں اور دشواریوں کا باعث بن گیا ہے اور افریقہ کے عوام مسیحت کو اُن سفید فاموں کے مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں جنھوں نے صدیوں ان کا

خون چوسا ہے۔ اس صورت حال نے ان مشنریوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ جگہ جگہ کانفرنسیں کرکے اپنے اور سفید سامراج کے تعلق کو دبا دینے کی اسکیمیں تیار کریں۔ اور جو افریقی ملک ابھی تک سامراج کے شکنجے میں ہیں اُن کی آزادی کے مطالبات کی تائید کریں، بلکہ مختصر یہ کہ ہر ممکن کوشش سے مسیحیت کو سیاہ فاموں کا مذہب بنا کر پیش کریں۔

اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ اور جنوبی رھوڈیشیا کے کلیسا کا رویہ ایک مثال کی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہے جہاں کانفرنسیں منعقد کرکے نسلی امتیاز کی مخالفت کی گئی اس طرح اب یہ بھی مشاہدہ میں آنے لگا کہ کلیسا کے عہدے بھی افریقی عیسائیوں کو دیے جانے لگے ہیں۔ یہ تمام باتیں اس وسیع منصوبے کا ایک جزو ہیں جو افریقہ کی آزادی سے پیدا شدہ نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت اونچی سطح پر تیار ہو رہا ہے اور جس کا ایک اشارہ عیسائی دنیا کے موجودہ پوپ کی ایک حالیہ تقریر سے بھی ملتا ہے جس میں موصوف نے افریقہ کو "مسیح کی نئی سرزمین" کے نام سے یاد فرمایا۔

اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عیسائیت کی تبلیغ کو سامراج سے الگ کرنے کے اقدامات محض دکھاوا ہیں جس سے ایک زوال پذیر طاقت اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتی ہے، اور یہی کیا سامراج اس وقت اپنی پالیسیوں کو ہر پہلو سے بدلنے اور نئی شکلیں اختیار کرنے میں لگا ہوا ہے جس سے افریقی دھوکے میں آسکیں۔ جیسے کہ اقتصادی اور ثقافتی تعاون جس کا مقصد ایک نئے انداز سے تسلط برقرار رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ٹھیک جس طرح استعمار اور سامراج اپنا لبادہ بدل رہا ہے اس طرح اس کی دست راست عیسائی مشنریاں بھی ایک نیا روپ دھارنا چاہتی ہیں۔ اگرچہ دونوں کا مقصد بدستور ایک ہے اور دونوں ایک دوسرے کے معاون و مددگار!

عیسائیت کا تبلیغی نظام اپنے ان نئے طور طریقوں کے ساتھ ساتھ افریقہ میں اپنی کچھ مددگار طاقتیں بھی رکھتا ہے اور وہ وہاں کی وہ حکومتیں ہیں جن میں عیسائیت کا پورا غلبہ ہے۔ اس چیز نے عیسائیت کو افریقہ میں کامیابی کا پورا موقع فراہم کر دیا ہے۔ اور اسی چیز نے ہم پر یہ لازم کر دیا ہے کہ افریقہ میں دعوتِ اسلامی کے مضبوط مرکز قائم کریں۔ ورنہ

ہم اگر اس بارے میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت کے اس منصوبے کو کامیابی کی پوری آزادی دے رہے ہیں کہ وہ افریقہ میں اسلام کو باہر سے لاکر تھوپے ہوئے مذہب کی شکل میں پیش کرے اور یہ وہ شکل ہوگی جسے آزاد افریقہ کا ذہن قبول کرنا کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔ ہمیں اس خطرہ کی پیش بندی کے لیے پوری حکمت سے کام لینا ہے۔ منجملہ اس کے یہ بھی ہے کہ یہاں اسلامی دعوت کا کام اہل افریقہ ہی کے ذریعہ سے ہو جن میں خود اسلام کی گہری جڑیں موجود ہیں۔

۲۔ سامراج۔ عیسائی مشن اور سامراج جس طرح ساتھ ہی ساتھ افریقہ میں داخل ہوئے تھے اسی طرح ان کی سرگرمیوں میں بھی حالات کے مطابق کہیں کھلے طور پر اور کہیں چھپے طور پر اتحاد قائم رہا۔ ایک طرف مشن کا کام یہ تھا کہ وہ اہل افریقہ کے دین و مذہب اور ثقافت و روایات کی بیخ کنی کرے اور ان کی قومی خودداری کے سوتے خشک کردے، دوسری طرف سامراج کا کام یہ تھا کہ وہ اس خلا سے فائدہ اٹھاکر ان قوموں کو غلام بنائے اور یہاں کی دولت سے اپنی قوم کو مالا مال کرے۔ یہ افریقہ کے دور غلامی کی بات تھی۔ اور اب جبکہ افریقہ آزاد ہو رہا ہے تو سامراج عیسائی مشنریوں کے کام سے ایک دوسرے انداز میں فائدہ اٹھا رہا ہے۔ افریقہ جب آزادی کے مرحلہ تک پہونچا تو عیسائی مشن کی وسیع جدوجہد کی بدولت قیادت و حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے ان کے رنگ میں رنگا ہوا ایک طبقہ تیار ہو چکا تھا۔ اب سامراجی طاقتیں ہر ممکن طریقے سے اس طبقہ کو اپنی جگہ دلا رہی ہیں اور امداد کی جو صورت بھی ان کے بس میں ہے (حتیٰ کہ بعض وقت فوجی مداخلت بھی) اس کے ذریعہ اس نوخیز طاقت کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ قریب ہی کے گزشتہ سالوں میں دیکھئے کہ مشرقی اور مغربی افریقہ کی ریاستوں کینیا، یوگنڈا، تنجانیکا، جابون، تشاد اور داہومی میں حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لیے کس تیزی سے بیرونی فوجیں اتاری گئیں اور اس کے مقابلہ میں زنجبار کی بغاوت کو کس لاپروائی کے ساتھ نظر انداز کیا گیا اسلیے کہ یہاں بغاوت اسلامی قیادت کے خلاف تھی۔

آج سامراجی طاقتیں اپنے اثر کی چھوٹی چھوٹی افریقی ریاستوں کے ذریعے افریقی اتحاد کے نام پر عیسائی قیادت کو مضبوط کرنے اور اسلامی قیادتوں کو ابھرنے سے روکنے میں انتہائی سرگرمی کے ساتھ منہمک ہیں اور اسلیے اسوقت انتہائی افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مسلم حکومتیں بھی ان کے جال میں پھنس گئی ہیں۔

اور سیاسی تعاون کی راہوں سے دانستہ یا نادانستہ اسلامی تیاریوں کیخلاف عیسائی تیاریوں کی مددگار بن رہی ہیں۔

۳۔ اسرائیل۔ تیسری اہم طاقت جو افریقہ میں سرگرم عمل ہے وہ اسرائیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل سامراج اور عیسائی مشنریوں سے الگ رہ کر کوئی کام نہیں انجام دے رہا ہے بلکہ انھیں کے دوش بدوش ایک ہی اسکیم کے ماتحت عمل پیرا ہے۔ افریقہ میں اسرائیلی سرگرمیوں کا موضوع ایک مستقل بحث چاہتا ہے جسکو ہم مختصراً درج ذیل نقاط میں بیان کر رہے ہیں۔

(الف) تاریخی پہلو۔ (ب) دینی پہلو۔ (ج) سیاسی پہلو۔ (د) اقتصادی پہلو۔ (ہ) پروپیگنڈا۔

(الف) اسرائیلی سرگرمیوں کا تاریخی پہلو۔

سامراج نے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلی ہے کہ عرب ہی وہ قوم ہے جس نے اسلام کو براعظم افریقہ تک پہونچایا اور وہ اب بھی اپنے افریقی بھائیوں کی قوت کا سرچشمہ اور ان کیلئے مرکز تقویت ہیں۔ نیز یہ بھی کہ افریقی براعظم کا مستقبل اور سامراج کے علی الرغم اسکی ترقی کے امکانات بڑی حد تک عرب افریقہ کے ہم آہنگ تعلقات پر موقوف ہیں اسلیے سامراج کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ افریقیوں کو عربوں سے متنفر کرنے کے تمام وسائل استعمال کرے چنانچہ اُسنے عربوں کو غلاموں کی تجارت اور ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیلئے مطعون کیا اور اس سلسلہ میں بعض ایسی انفرادی اور شاذ مثالوں کا پروپگنڈہ کیا گیا جن سے کسی بھی معاشرہ کا دامن پاک نہیں کہا جاسکتا۔ یہ پروپگنڈہ اگرچہ افریقی مسلمانوں میں کامیاب نہیں ہوسکا، لیکن یہاں کے غیر مسلم لیڈروں اور قائدین پر اس نے برا اثر ڈالا اور عربوں کی نسبت مخالفانہ فضا پیدا کرنے کا سبب بن کر رہا ہی وہ فضا تھی جس کو اسرائیل نے اپنے پروپگنڈے کے لیے استعمال کیا، چنانچہ آج افریقہ میں غلامی کا موضوع اسرائیلی پروپگنڈے کا ایک اہم باب بن چکا ہے، اسی طرح اسرائیلی پروپگنڈہ اس "ظلم ونا انصافی" کی تصویر کشی میں بہت حد تک کامیاب رہا جس سے اسرائیل کو اپنا فطری حق واپس لینے اور اپنے "اصلی وطن" واپس جانے میں دوچار ہونا پڑا پھر اسرائیل نے اپنے بارے میں اس نام نہاد ظلم ونا انصافی" کی تصویر کو اس ظلم ونا انصافی کے ساتھ ملا کر پیش کیا جسمیں خود افریقی ایک عرصہ تک استعمار پسند قوموں کے ہاتھوں مبتلا رہے ہیں اور اسکے بعد یہ نعرہ بلند کیا کہ اسرائیلی اور افریقی دونوں نسلی اور مذہبی امتیاز کے سبب مظلوم قومیں ہیں اسلئے انکو دنیا سے ظلم ونا انصافی کا قلع قمع کرنے کیلئے متحد ہوجانا چاہیئے۔

یہ دلائل حد درجہ بودے اور ناقابل اعتنا ہیں اور تاریخی اعتبار سے ان کا رد کرنا بالکل آسان ہے لیکن عربی و اسلامی ذرائع نے اس کا اہتمام بالکل نہیں کیا اور اسکو ایک بدیہی اور آسان چیز سمجھ کر چھوڑ دیا، حالانکہ یہ پروپگنڈہ تمام افریقی ممالک میں زہر کی طرح سرایت کر رہا ہے اور عربی افریقی تعاون و اتحاد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔

(ب) اسرائیلی سرگرمیوں کا دینی رُخ

افریقہ کے اندر اسرائیلی سرگرمیوں میں ایک دینی عنصر بھی شامل ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودی وہاں کے عیسائیوں کے مذہبی جذبہ کی تائید حاصل کرنے کے لیے اپنے معاملہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اسرائیلی حکومت کا قیام دراصل ان پیشین گوئیوں کا ظہور ہے جو تمام عیسائی فرقوں کے مقدس صحیفوں "عہد نامہ قدیم" اور "عہد نامہ جدید" میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اس بنیاد پر عربوں کے ہاتھوں اس حکومت کا سقوط خود مسیحی عقیدے کے لیے ایک چیلنج اور حکم الٰہی کی شکست ہے۔ اسرائیل کے لیے ایک بڑی پریشانی یہ تھی کہ عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں صاف صاف مذکور تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھوانے کے تمام تر ذمہ دار یہودی تھے اور اس لیے یہ کتابیں یہودیوں پر لعنت سے بھری ہوئی بھی ہیں۔ یہ چیز عیسائی اور اسرائیلی اتحاد کی راہ میں، بالخصوص عوامی سطح پر اتحاد و مفاہمت کی راہ میں ایک سخت رُکاوٹ تھی اور عرب یا کسی بھی یہود دشمن طاقت کو اسرائیل پر حملہ آور ہونے اور اس کے قلع قمع کر دینے کا بہترین موقع فراہم کرتی تھی۔ لیکن اسرائیل کی یہ مصیبت دنیائے عیسائیت کے مرکزی ادارے کے اس حالیہ فیصلے نے دور کر دی کہ یہودی من حیث القوم حضرت مسیح کے خون سے بری ہیں۔ اور اس لیے اسرائیلی پروپیگنڈا اس فتوے کا اب جتنا بھی سہارا لے وہ کم ہے۔ اس کے ساتھ اسرائیل کو ایک اور چیز سے بھی فائدہ پہنچ رہا ہے اور وہ یہ کہ افریقہ کے عیسائی بالخصوص اور دنیا بھر کے ارباب کلیسا بالعموم افریقہ میں اشاعت اسلام کے اندیشے سے بہت خائف ہیں اور اس لیے کسی ایسے تیسرے فریق کے خواہاں ہیں جو اس میدان میں عرب مسلمانوں کے ایک ازلی دشمن کی حیثیت سے ان کا حلیف بن کر رونما ہو۔

اسرائیل ایک طرف ان بنیادوں پر عیسائیوں کا تعاون حاصل کر رہا ہے اور دوسری طرف اُس کی یہ کوشش بھی ہے کہ فلسطین کے معاملہ میں مسلمانوں کی یکجہتی کو توڑ کر ایک بالواسطہ تائید حاصل کر لے۔ اس سلسلے میں اس کے پروپیگنڈے کا رُخ یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں، خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ یہ پانی کی تقسیم یا سرحدوں کی تعیین کا معمولی جھگڑا ہے وغیرہ وغیرہ افسوس ہے کہ افریقہ کی بعض اسلامی قیادتیں اپنی کم نظری اور اسلامی شعور کی خامی کی بنا پر اسرائیل کی اس چال سے متاثر بھی ہو رہی ہیں اور اسی کے ساتھ ہم اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ

بعض عرب سیاسی قیادتیں بھی اپنی جہالت یا حماقت سے اس اسرائیلی فریب کو مدد پہنچا رہی ہیں۔ وہ بار بار یہ آواز بلند کرتی ہیں کہ فلسطین کا مسئلہ عرب قومیت کا مسئلہ ہے نہ کوئی اسلامی مسئلہ۔ اور پھر اس پر مستزاد اُن کا طرزِ عمل ہے کہ ایسے ہی متعدد مسئلوں میں وہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی ہمنوائی کرتی نظر آتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افریقہ میں اگر کمیونسٹ دنیا یا سیاسی مسلم لیڈرشپ کو اسرائیل کی تائید پر مطعون کیا جاتا ہے تو وہ فوراً ان عرب مملکتوں اور اُن کے قائدین کے بیانات و طرزِ عمل ہی سے اپنے حق میں دلیل لاتے ہیں اور پھر برملا کہہ دیتے ہیں کہ قوم و وطن کا مفاد ہر چیز پر مقدم ہے۔

(ج) اسرائیلی سرگرمیوں کا سیاسی پہلو

افریقہ میں اسرائیلی سرگرمیوں کے پس پشت در اصل سامراجیوں کی شاطرانہ سیاست بھی کارفرما ہے۔ اس سیاست کا خلاصہ یہ ہے کہ افریقہ میں اسرائیل کے نفوذ کی سرپرستی کرکے اس علاقے میں عرب سیاست کا بہت اچھا توڑ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس شکل میں جو افریقی ریاستیں اسرائیل سے تعلقات استوار کریں گی ان سے عرب حکومتیں دشمنی مول لے لیتی ہیں تو اس طرح عرب افریقی اتحاد کے امکانات میں وہ زبردست رخنہ پڑ جائے گا جو عین مطلوب ہے اور اگر یہ حکومتیں اس مسئلہ پر سمجھوتے کی روش اختیار کرتی ہیں اور افریقی ریاستوں کو اسرائیل کے وجود کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے کی اجازت دیتی ہیں تو اسرائیل کا کام پھر یہ ہوگا کہ عرب افریقی تعلقات میں مستقل زہر چکانی کرے اور سامراج کا آلۂ کار بن کر ان ریاستوں کو سامراجیوں کے حلقۂ اثر میں لائے۔ اور اس سلسلے میں جو طریقے مفید مقصد ہو سکتے ہیں مثلاً اقتصادی اور فنی امداد یا پروپیگنڈہ اور اُس سے بھی آگے رشوت و فریب دہی ان سب میں یہ مانی ہوئی بات ہے کہ یہودی اپنا جواب نہیں رکھتے اور خود بھی انھیں بڑا شوق ہے کہ اس میدان میں شہسوار دہی ہوں گے۔

اسی طرح خود افریقی سیاست کا ایک پہلو بھی اسرائیل کے لیے مددگار ہو رہا ہے اور وہ ہے افریقی اتحاد کے سلسلے میں افریقہ کی عرب اور غیر عرب قیادتوں میں رقابت کا جذبہ۔ کچھ خاص افریقی قیادتیں جن کی سامراج دشمنی شک و شبہ سے بالاتر ہے وہ اس خلوص کے باوجود اسرائیل کی پشت پناہ بھی ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ وہ بعض طاقتور عرب قیادتوں کے

اثر و رسوخ سے خائف ہیں اور افریقہ میں عربی اور اسلامی اثرات کے نفوذ کے فرضی خطرہ کے مقابلہ کے لیے اسرائیل کو ایک مؤثر رکاوٹ سمجھتی ہیں۔

(د) اسرائیلی سرگرمیوں کا اقتصادی پہلو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ افریقہ کی اکثر نوآزاد ریاستیں سامراج کی چھوڑی ہوئی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بیرونی اقتصادی امداد اور فنی تعاون کی سخت محتاج ہیں۔ ان ریاستوں کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسرائیل اپنا بھرپور تعاون پیش کرتا ہے اور کچھ خاص اسباب ہیں جن کی بدولت اسرائیل کو اس مہم میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

(۱) یہ کہ قومی لحاظ سے دنیا کی کوئی قوم اقتصادی فراست اور فنی مہارت میں یہودیوں کا مقابلہ نہیں کرتی اور اسی طرح دنیا بھر میں یہودی سرمایے کا تسلط بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہ دوہری طاقت اسرائیل کو پورا موقع فراہم کرتی ہے کہ افریقہ پر چھا جائے۔

(۲) یہودیوں کی عالمی کمپنیاں غیر یہودی کمپنیوں میں بھی مختلف طریقوں سے دخیل ہیں اور اس طرح بین الاقوامی تجارت و صنعت پر اُن کا پورا اثر ہے

(۳) اقوام متحدہ کے ماتحت بین الاقوامی اداروں مثلاً یونسکو اور یونیسیف یا بڑی طاقتوں کے قائم کردہ ایسے اداروں کے اکثر ارکان یہودی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ افریقی ریاستوں میں اپنے فرائض اسرائیلی پالیسی کے ماتحت انجام دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک مزید بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ افریقہ میں اسرائیل کے اقتصادی نفوذ میں ایک بڑی حد تک ان حالات کا بھی دخل ہے جو مسئلۂ فلسطین کے سلسلے میں رونما ہو چکے ہیں، مثلاً خلیج عقبہ اور آبنائے تیران پر۔ اسرائیل کے قبضے نے مشرقی اور وسطی افریقہ میں اسرائیل کے حق میں بڑا نفسیاتی اثر ڈالا ہے۔

(ہ) اسرائیلی سرگرمیوں میں پروپیگنڈے کا عنصر

گزشتہ اوراق میں اسرائیلی سرگرمیوں کے دینی، تاریخی یا اقتصادی پہلوؤں کی جو تفصیل پیش کی گئی ان سب سے مل کر اسرائیلی پروپیگنڈہ مشینری کی تکمیل ہوتی ہے جو براعظم افریقہ پر چھائی ہوئی ہے اور مزید برآں ہر شہر میں اسرائیل افریقہ دوستی کی انجمنیں قائم کی

جارہی ہیں جو اسرائیل سے آنے والے مہمانوں کے لیے لیکچروں کا انتظام کرتی ہیں اور یہودی کارندوں اور اہم افریقی شخصیتوں کے درمیان تعارف کے لیے جلسے منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تحفے تحائف پیش کرنے اور صحافتی نمائندوں، ریڈیو کے نامہ نگاروں اور کالجوں یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے لیے سفروں کا انتظام کرنے میں گراں قدر رقمیں خرچ کی جاتی ہیں اور اسرائیل کے تعلیمی اور فوجی اداروں میں تعلیم پانے والے افریقی طلباء کی خبریں افریقی اخبارات میں نمایاں طور سے شائع کرا کے یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسرائیل ہر علم و فن کا مرکز اور افریقہ کا بہترین دوست ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی کہنا چاہیئے کہ اسرائیلی پروپیگنڈے کو ماضی میں جس چیز نے بیحد فائدہ پہنچایا ہے وہ عرب ملکوں کے باہمی اختلافات تھے۔ اسرائیلی ذرائع بڑی پابندی سے اُن الزامات کو نشر کرتے تھے جو ایک عرب فریق دوسرے کے خلاف عائد کرتا تھا۔ ان باتوں کی مدد سے اُس نے افریقیوں کے سامنے عربوں کی یہ تصویر پیش کی کہ وہ ایک منتشر اور باہم متحارب قوم ہیں جن میں کوئی کلمہ اشتراک یا اتحاد رائے نہیں اور اس لیے ان سے تعاون اُن پر تکیہ بالکل فضول ہے۔ اسی کے ساتھ اسرائیلی پروپیگنڈہ عربوں اور یہودیوں کے نزاع کی حقیقت سے ناواقف افریقیوں کو یہ باور کرانے میں بھی کامیاب ہوتا رہا کہ اسرائیل ہر مناسب قیمت پر عربوں سے اپنا جھگڑا طے کرنے اور اُن سے مصالحت کرنے پر راضی ہے مگر عرب اُسے مٹا کر دم لینے کے سوا کسی بات پر راضی نہیں۔

(۴) بین الاقوامی کمیونزم

کمیونزم کا تمام مذاہب کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے اُسکے اتحت اسلام کے بارے میں بھی کوئی اور متصور ہو سکتا کہ اس کو نیست و نابود کر دیا جائے اور حقیقت اس بات سے نہیں بدل سکتی کہ بعض جگہ وہ سامراج کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موجودہ حالات میں کمیونزم اسلام کے لیے براہ راست کوئی خطرہ نہیں ہے اسلیے

کہ اس وقت اسے خود اپنے موجودہ دشمنوں سے فرصت نہیں ہے۔ لیکن واقعات و حالات کا طبعی انقلاب کسی سخت ٹکراؤ کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ آج کمیونسٹ کوشاں ہیں کہ مزدوروں اور طالب علموں کی تحریکوں اور کسانوں اور مختلف پیشے وروں کی نمائندہ انجمنوں پر قابض ہو جائیں اگر ان کو اس مہم میں کامیابی ہو جاتی ہے تو لازماً یہ طبقے اسلام کے ہاتھ سے نکل جائیں گے جیسا کہ روسی اور چینی درسگاہوں سے تعلیم پاکر آنے والے طلباء کا حال یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی روایات کا ادنیٰ احترام تک اپنے دل میں نہیں رکھتے۔

افریقہ میں اسلام کے لیے کمیونزم کا خطرہ اس لیے اور زیادہ قابل فکر ہے کہ وہاں دینی تنظیمیں اور اسلامی شعور کمزور ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ وہاں کی اسلامی جماعتیں بین الاقوامی کمیونزم سے کافی قریب بھی ہیں۔

(۳) مسلمانوں اور عربوں کے لیے موافق حالات

افریقہ میں مسلمانوں اور عربوں کے لیے صرف ناموافق اور مخالف حالات ہی نہیں ہیں بلکہ کچھ موافق اور سازگار حالات بھی پائے جاتے ہیں اور بشرط کوشش ان سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مثلاً (الف) جنوبی افریقہ اور رہوڈیشیا میں افریقی عوام اور وہاں کی نسل پرست اقلیتی حکومتوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اسکی وجہ سے افریقیوں میں ایک بڑی جماعت عرب اور اسلامی حکومتوں کی طرف دیکھتی ہے اور ان کو ہر جگہ ایک طاقتور عنصر تصور کرتی ہے۔ خواہ اقوام متحدہ کا دائرہ ہو یا اس کے باہر یہ صورت حال عربی اور اسلامی مسائل میں اہل افریقہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے اور افریقہ میں اسلامی اخوت کو مضبوط کرکے وہاں کے مسائل میں سرگرم کرنے کا بھی!

(ب) عیسائی مذہب افریقہ میں اب تک اس تہمت سے بری نہیں ہو سکا کہ وہ سفید فام سامراج کا دین ہے۔ کلیسا نے اس الزام کی تردید میں ہر طرح کی کوشش کر ڈالی مگر وہ لوگوں کے ذہن سے اس تصور کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ اس لیے ابھی کچھ وقت تک ضرور عیسائی مذہب کے پھیلنے اور مقبول ہونے میں یہ تصور آڑے آتا رہے گا۔ اس زریں موقع سے اگر مسلمانوں نے

فائدہ نہ اُٹھایا تو وہ ہمیشہ اپنی اس غلطی پر کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔

(ج) تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بُت پرست آبادیاں افریقہ میں اسلامی دعوت کو قبول کرنے میں سب سے آگے ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی بھی منظم کوشش کی جائے تو ان کی بہت بڑی تعداد کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا جاسکتا ہے۔

(د) اسلامی ملکوں کی آزادی کے ساتھ ہی عربوں اور دوسرے مسلمانوں سے بہتر تعلق قائم کرنے کا طبعی رجحان، ان حکومتوں کا تعاون حاصل کرنے اور انکی جغرافیائی پوزیشن سے فائدہ اُٹھاکر کسی بھی وسیع اسلامی منصوبے کو بروئے کار لانے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔

(ہ) افریقہ میں بھی حسب فطرت اسرائیل سے ایسی حرکتیں سرزد ہونا شروع ہوگئی ہیں جن سے ہمیشہ ہی دوسری قوموں میں نفرت کا جذبہ بھڑا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ جذبہ اُبھر رہا ہے اور یہودیوں کے دھوکے، فریب اور رشوت کے ذریعہ لوگوں کو ہمنوا بنانے کی مذموم عادتیں جوں جوں ظاہر ہو رہی ہیں۔ افریقہ میں ان سے نفرت پیدا ہوتی جارہی ہے اور وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

(۴) ضروری اقدامات

(الف) سیاسی میدان میں:۔

سیاسی پہلو سے عرب اور دیگر اسلامی حکومتوں کے درمیان ایک مشترک لائحہ عمل تیار ہونا چاہیے جس میں تمام حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے اور اس میں اسرائیل سمیت تمام سامراجی اور نسلی طاقتوں کے خلاف افریقی حکومتوں سے تعاون کے امکانات کا سنجیدہ جائزہ بھی شامل ہو۔ اس سیاسی لائحہ عمل کو تیار کرنے میں زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ہمارے سیاسی موقف میں اگر کوئی خامی رہ گئی تو اس کے نتیجہ میں ہمارا بڑے سے بڑا پروپگنڈہ اور موثر سے موثر اقتصادی تعاون بھی بے کار جاسکتا ہے

(ب) پروپیگنڈے کے میدان میں۔

ایک ایسی پروپگنڈہ تنظیم جس کا تعلق صرف افریقہ سے ہو، ناگزیر ہے، اس کے ذریعہ

ان تمام الزامات کی تردید کی جائے جو سامراج نے عربوں پر لگائے ہیں اور جن کی نشر و اشاعت برابر مشنریوں اور صیہونی مرکزوں کی طرف سے ہوتی رہتی ہے، اسی طرح کچھ ملکوں میں مسلم صحافت (پریس) قائم کرنے کے متعلق غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں نوجوان طبقہ کو صحافت اور نشر و اشاعت کے کاموں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پورا تعاون دیا جائے تاکہ وہ تدریجی طور پر نشر و اشاعت کے ذرائع سے سامراجیوں کی اجارہ داری کو ختم کر سکیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس عداوت کو کم کرنے کی کوشش بھی کی جائے جو عرب اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے دل میں موجود ہے۔

(ج) ثقافتی میدان میں

ثقافت کی راہ سے افریقی حکومتوں کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنانے کے لیے عرب اور دیگر مسلمانوں کے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں مسلمانوں کی موجودہ تعداد اور اسلامی عربی ثقافت کی طرف ان کا طبعی رجحان اس مہم کو بہت زیادہ سہل بنا دیتا ہے۔ بشرطیکہ منظم اور مسلسل طور پر اس کیلئے کوشش کی جائے۔ ہم اس کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں:۔

(۱) جس علاقے میں بھی مدرسین اور واعظین کی ضرورت ہو برابر اور فوراً فراہم کیے جائیں۔

(۲) عربی اور اسلامی تعلیم کے لیے ایسا نصاب تیار کیا جائے جو افریقی ماحول اور حالات سے میل کھا سکے، نیز اس کے لیے نصاب کی کتابیں طبع کرائی جائیں۔

(۳) عرب اور دیگر اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے افریقی طلباء کے لیے تعلیمی وظائف جاری کیے جائیں اور مذہب و زبان کی تعلیم کے ساتھ دوسرے علوم کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا جائے۔

(۴) افریقہ کے تمام موجودہ مدارس اور کالجوں کو ہر ممکن امداد کے ذریعہ مستحکم بنایا جائے اور حسب ضرورت مزید مدارس کھولے جائیں۔

(د) اقتصادی میدان میں۔

گزشتہ سطور میں ہم نے تفصیل کے ساتھ افریقہ کے لیے اقتصادی امداد اور فنی تعاون کی کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ یہی وہ خلا ہے جس سے سامراج اور صیہونیت کو فائدہ

اٹھانے کا موقع مل رہا ہے، اس لیے عرب اور دیگر مسلم حکومتوں پر لازم ہے کہ وہ اس مقصد کے پیش نظر کوئی خاص پروگرام تیار کریں۔ مثال کے طور پر ہماری یہ تجویز ہے:۔

(۱) قرض دینے کے لیے ایک مالی ادارہ کا قیام، اور افریقی ممالک میں مسلمانوں کے سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی، اور ان تمام سرکاری اور پرائیوٹ کمپنیوں کا استحکام جن کے مالک مسلمان ہیں۔

(۲) ایک سرمایہ کار کمپنی کا قیام، جس میں افریقی اور غیر افریقی لوگ شریک ہوں۔

(۳) مسلمان اور عرب مدرسوں، انجینیروں اور ڈاکٹروں کے افریقہ جانے کی حوصلہ افزائی، اور ترقی و خوشحالی کے تمام منصوبوں میں افریقیوں کے ساتھ تعاون۔

(۴) ان تمام مسلمان اور عرب حکومتوں کو جو افریقہ کی مسلم نو آزاد حکومتوں کی مالی امداد کر سکیں اسکی ترغیب دی جائے

(۵) افریقہ میں غیر افریقی اسلامی ملکوں کے جو باشندے آباد ہیں اُن کی متعلقہ حکومتوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ان باشندوں میں تنظیم کی صورت پیدا کریں۔ نیز کوشش کریں کہ یہ لوگ افریقہ کی اسلامی جماعتوں سے قریب ہوں اور اسرائیلی سرگرمیوں پر خصوصی نظر رکھیں۔



دربارِ عالمگیری

(گذشتہ سے پیوستہ)[1]

(جناب ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی ایم اے)

عربی اُصول و قواعد کے مطابق قرآن پاک کے مطالب اور مفاہیم کے بیان کرنے کا نام علم تفسیر ہے۔ ایسی استعداد اور مشق و مہارت پیدا ہونا جس کے واسطے سے احکام شرعیہ کا باحسن وجوہ اور صحیح طریقہ پر استنباط ہو سکے اور معانی قرآن تک رسائی۔ اس فن کی غرض و غایت سمجھی جاتی ہے، کلام الٰہی اس کا موضوع ہے جو بلاشبہ سراسر حکمتوں اور اسرار سے مالا مال ہے۔

پچھلے اوراق اُلٹئے اس میں گزر چکا ہے کہ عہد صحابہ میں تفسیر اور آیات قرآنیہ کے افہام و تفہیم کا خاصا رواج تھا اور وہ اجلۂ علماء اور صحابہ جن کو مفسرین کا شیوخ کہا جائے حضرت علی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، ابی بن کعب اور زید بن ثابت سمجھے گئے اور سمجھے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی مرویات کا شمار حضرت علی کی مرویات سے زائد ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کو ترجمان القرآن، حبر الامۃ اور رئیس المفسرین کے القاب سے یاد رکھا گیا۔ اور یہ ان کا ایک امتیازی وصف گن گیا۔ ابی بن کعب کو سید القراء کا لقب دیا گیا۔

یہ دور ختم ہوا ہی تھا کہ تابعین کا دور آیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ میں حضرت مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، عکرمہ، طاؤس بن کیسان، حضرت عطاء علماء مکہ میں آتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں علماء کوفہ زائد ہیں اور ان میں علقمہ بن قیس اور ابراہیم نخعی

---

[1] سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت ماہ صفر ۱۳۸۵ھ۔

ممتاز ہوئے۔ حسن بصری، عطاء بن ابی سلمہ ضحاک بن مزاحم اور قتادہ بن دعامہ بھی فن تفسیر میں پیشوا ہی سمجھے گئے۔ علاوہ ازیں عہد تابعین کے بعد مفسرین کے ایک طبقہ نے صحابہ اور تابعین کے اقوال پر مشتمل تفسیریں لکھیں اور سفیان بن عیینہ، وکیع، شعبہ بن حجاج اور اسحٰق بن راہویہ کا شمار اسی طبقہ میں کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک طبقہ اور پیدا ہوا اور اس نے تفسیری احادیث و اقوال سے اسناد کا حذف کرنا شروع کیا ابو اسحٰق زجاج ابو علی فارسی ابو بکر نقاش اور جعفر بن نحاس اسی میں مشہور ہوئے اور واقعہ یہ ہے کہ تفسیر میں خارجی اور نامانوس عناصر کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اسناد کے حذف کے ساتھ ساتھ مفسروں نے سلف کے ناتمام اور مختصر اقوال بیان کرنا شروع کر دیے۔ اس پر مستزاد آگے چل کے علماء سلف کے اقوال نقل یا ترک ہوئے اور رطب و یابس سے تفسیریں پر ہوئیں، اپنے اپنے ذوق کے مطابق اگر اقوال نقل ہوئے تو خوش فہمی کے شعور کے ساتھ یہ پھیلوں کی باتیں آنکھیں بند کر کے صحیح سمجھی جانے لگیں اور اسی طرح نقل ہوئیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تک جو کچھ بھی تفسیری سلسلہ میں کام ہوا اور تصانیف کی گئیں ان میں نقل کو زائد دخل رہا۔ لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں جب مختلف علمی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ صرف و نحو بلاغت معانی بیان فقہ منطق فلسفہ کلام تصوف کے موضوعوں نے رواج پایا اور ان میں سے ہر فن کے ماہرین نے تفسیریں لکھیں تو اپنے فن کا پورا مظاہرہ کر دیا۔ کلام پاک کے الفاظ اور آیات کو اپنے فن کے زاویۂ نظر سے دیکھا اور اسی اعتبار سے اس کی توضیح اور تفسیر پر زائد زور دیا۔ زجاج واحدی ابو حیان وغیرہم نے اپنی تفسیروں میں لفظی تناسب اور وجوہ اعراب کی بحثیں کیں۔ ثعلبی نے مورخ کی شان سے قصص و حکایات کا اضافہ کیا اور قرطبی نے فقہی نقطۂ نظر کو بالاتر رکھا۔ امام رازی نے متکلمانہ بحثیں جس شان سے چھیڑیں اور اس طوالت کے ساتھ کہ تفسیر رازی کے مطالعہ کرنے والے یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ تفسیر رازی میں تفسیر کے سوا سب کچھ موجود ہے۔

سلسلۂ کلام یوں ہی دراز ہو گیا اب اگر تمام اقسام و انواع تفسیر کو روشنی میں لایا جائے تو بات کہاں تک پہونچے اس لیے علماء احناف کی تفسیروں ہی کے اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں

امام زمخشری نے تفسیر کشاف لکھی اور اس کے متعلق خود فرمایا

ان التفاسیر فی الدنیا بلا عدد	تفسیروں کا اگرچہ کوئی شمار نہیں ہے لیکن
ولیس فیھا لعمری مثل کشاف	ان میں میرے نزدیک کشاف جیسی کوئی نہیں
ان کنت تبغی الھدیٰ فالزم قرأتہ	اگر تم ہدایت کے جویا ہو تو اس کا مطالعہ
فالجھل کالداء والکشاف کشاف	رکھو، جہالت بیماری ہے اور کشاف
	اس کا علاج۔

وہ ممتاز علماء احناف جنھوں نے تفسیریں لکھیں ان کے اسماء گرامی بہ ترتیب سنہ یہ ہیں:۔

(۱) تفسیر وکیع۔ امام وکیع بن جراح کوفی شاگرد امام اعظم المتوفی ۱۹۷ھ

(۲) تفسیر النسفی۔ قاضی امام حافظ ابراہیم بن معقل المتوفی ۲۹۵ھ

(۳) تفسیر الماتریدی۔ امام محمد بن محمد بن محمود امام المتکلمین المتوفی ۳۳۳ھ

(۴) تفسیر ابی اللیث۔ نصر بن محمد فقیہ سمرقندی المتوفی ۳۸۳ھ

(۵) تفسیر کشاف۔ ۲ جلد۔ علامہ ابو القاسم محمود بن عمر زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ

(۶) تفسیر الخوارزمی۔ ابو الحسن علی بن عمران المتوفی ۵۳۹ھ

(۷) تفسیر العلائی۔ ۱۰ مجلدات۔ علامہ محمد بن عبد الرحمن بخاری زاہد المتوفی ۵۴۶ھ

(۸) تفسیر العتابی۔ امام ابو نصر احمد صاحب فتاویٰ عتابیہ المتوفی ۵۸۶ھ

(۹) تفسیر الکبیر۔ ۳۰ مجلدات۔ شمس الدین ابو المظفر یوسف سبط بن جوزی المتوفی ۶۵۴ھ

(۱۰) تفسیر ابو المعالی۔ ۷ مجلدات۔ برہان الدین بن ناصر حسین المتوفی ۶۸۹ھ

(۱۱) تفسیر البیری۔ سعید الدین عبد العزیز بن احمد المتوفی ۶۹۳ھ

(۱۲) تفسیر مدارک التنزیل۔ ۴ مجلدات حافظ الدین نسفی صاحب کنز الدقائق و منار المتوفی ۷۱۰ھ

(۱۳) تفسیر سراج الدین۔ علامہ ابو حفص عمر بن اسحاق محدث ہندی المتوفی ۷۷۳ھ

(۱۴) تفسیر البابرتی۔ علامہ اکمل الدین محمد صاحب عنایہ المتوفی ۷۸۶ھ

(۱۵) کشف التنزیل۔ ۲ جلد ابو بکر بن علی مصری فقیہ المتوفی ۸۰۰ھ

(۱۶) تفسیر الزھراوین۔ علامہ سید شرف الدین علی بن محمد جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ

ھ۔ زھراوین سے مراد سورۂ البقرہ اور آل عمران لی جاتی ہے۔

(۱۷) تفسیر تیسیر الرحمٰن۔ ۲ جلد۔ علی بن احمد گجراتی المتوفی ۸۳۵ھ

(۱۸) تفسیر بحر مواج۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین جون پوری المتوفی ۸۴۸ھ

(۱۹) تفسیر ابن الصفیار۔ علامہ شیخ محمد بن احمد مکی المتوفی ۸۵۴ھ

(۲۰) تفسیر ذخیرۃ الفقہ۔ شمس الدین محمد حلبی بن امیر حاج شارح منیہ المتوفی ۸۷۶ھ

(۲۱) تفسیر الجانی۔ فی تفسیر سورۃ العصر نور الدین عبد الرحمٰن المتوفی ۸۹۸ھ

(۲۲) تفسیر سورۃ الفاتحہ۔ مولانا معین الدین صاحب معارج النبوۃ المتوفی ۹۰۰ھ

(۲۳) تفسیر ابن کمال پاشا۔ علامہ شمس الدین احمد بن سلیمان رومی المتوفی ۹۴۰ھ

(۲۴) تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم۔ شیخ الاسلام مفتی ابو السعود عمادی۔ المتوفی ۹۸۲ھ

(۲۵) تفسیر سواطع الالہام شیخ فیض اللہ حنفی شاعر دربار اکبری المتوفی ۱۰۰۱ھ

(۲۶) تفسیر القرآن جامی ثانی۔ علامہ یعقوب المتوفی ۱۰۰۳ھ

(۲۷) تفسیر عقد الجواہر، تفسیر سورۂ کوثر۔ شیخ عمر بن نجیم صاحب بحر الرائق المتوفی ۱۰۰۵ھ

(۲۸) تفسیر القاری۔ ملا علی قاری علی بن سلطان محمد مکی المتوفی ۱۰۱۴ھ

(۲۹) تفسیر روح البیان۔ ۹ مجلدات۔ علامہ شیخ اسماعیل آفندی المتوفی ۱۱۱۷ھ

(۳۰) تفسیر لاجیون، یعنی تفسیر احمدی جس کا پورا نام ہے التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیۃ۔

لاجیون ابھی علوم متداولہ کی تحصیل سے تمام فارغ نہیں ہوئے، عمر کا صرف سولھواں سال تھا جب اس کو لکھنا شروع کیا اور اکیسویں سال میں پہونچے تھے کہ اس سے فراغت حاصل کرلی اور بقول ملا صاحب یہ زمانہ وہ تھا جب کہ علوم عقلیہ کی طرف لوگوں کی توجہ عام تھی اور منقولات سے ان کو کم کم ہی سروکار تھا۔ زمانہ محی الدین محمد اورنگ زیب کا تھا ہی۔ شرع اور احکام شرعیہ کا دور دورہ تھا، حدود شرعیہ کا قیام اور رسوم کفریہ کا زوال ہو رہا تھا۔ باوجود مصنف کی کم عمری کے پھر بھی یہ کتاب ایک معیاری کتاب تیار ہو کے سامنے آگئی۔

ع۔ یہ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے حاشیہ پر مصر میں طبع ہو گئی ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ ملّا صاحب کی اس طرف باوجود صغر سنی توجہ کیوں ہوئی، باوجودیکہ مال وزر کی تمنا تھی نہ شاہی انعام واکرام کی آرزو دل میں، اس کا عہد عالمگیری کے ذکر اور عالمگیر کی واجبی مدح و ستائش کے بعد ایک موقع پر اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

ولیس هذا المدح مناطمعا للدنیا	میں نے جو ستائش کی وہ دنیا کی لالچ میں
وطلبا للاثمان والتمین بل	نہیں کی نہ گراں قدر انعام کی تمنا میں
حسبة لله وحرصا لازدیاد	بلکہ خدا واسطے اور دین کی بڑھوتری کی
الدین اذ لم اکن من اهل	لالچ میں اس لیے کہ میں اس طرح کے
هذا الشان ولا من فرسان	لوگوں میں نہیں ہوں اور نہ اس میدان کا
هذ المیدان۔	سوار ہوں۔

اور اس موضوع پر قلم اٹھانے کی توجیہ ملّا صاحب نے اپنے قلم سے یہ کی ہے۔

وقد کنت قدیما اسمع من	عرصہ سے میں بڑے لوگوں کی زبانی سنتا
افواہ الرجال الکرام ان الامام	آیا تھا کہ امام غزالی نے جو اسلام کے
الغزالی الذی هو من اجلة	بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں انھوں نے
علماء الاسلام قد جمع آیات	اپنی طاقت اور استعداد بھر وہ آیتیں
الاحکام بحسب الطاقة والامکان	ایک جا کر لی تھیں جن سے احکام شرعیہ کا
حتی بلغت خمس مأة بلا زیادة	استنباط ہوتا ہے، ایسی آیات کا شمار
ولا نقصان	پانچ سو سے متجاوز نہیں نہ کم ہے۔

اور شاید انھیں اس کتاب تک رسائی نہ ہوئی چنانچہ نفس موضوع کا اشارہ وہاں سے ملتے ہی خود کمر ہمت باندھی اور یکام شروع کر دیا۔

فامرت بلسان الالهام.....	لسان غیبی کے حکم پر میں نے اللہ کی مدد اور
ان استنبطها بعون الله تعالی و	توفیق کو سہارا بنا کے احکام کا استنباط
توفیقه..... فاخذت اجمع	کرنا شروع کر دیا۔ میں نے وہ آیات جمع
الآیات التی استنبطت عنها	کرنا شروع کر دیں جن سے میں نے قواعد

الاحکام الفقهیه والقواعد الاصولیة والمسائل الکلامیة ..... ثم شرحتها باحسن وجه من التقریر وشرحتها بالکل جهة من التحریر۔

اصول عقائد اور مسائل فقہیہ کا استنباط کیا پھر میں نے بہترین طریقہ پر ان کی تقریر اور شرح لکھی تو مکمل طرز بیان کے ساتھ۔

تفسیر احمدی لکھتے وقت ملا صاحب کے پیش نظر مختلف فنون وعلوم کی کتابیں تھیں مثلاً تفسیروں میں انوار التنزیل اور مدارک التاویل۔ اس کے علاوہ اتقان فی علوم القرآن، شرح وقایہ ہدایہ معہ شرح فتاوی حمادیہ۔ حسامی، توضیح تلویح، شرح عقائد تفتازانی اور حاشیہ خیالی وغیرہ وغیرہ، اپنی تفسیر میں ملا صاحب نے یہی نہیں کیا کہ جو کچھ ان کتابوں میں لکھا ہے اسی کو نقل کر دیا، بلکہ ان میں اپنی طرف سے اور اضافے بھی کیے۔

وقد الحقت الیها بعض ما ذکر فی کتب السیر والمحدثین فضلا علی ما اورده بعض المفسرین وضممت الیها من الابحاث الشریفة والنکت اللطیفة ما لم اظفر فی کلامهم بالتصریح بها ولم اجد الاشارة الیها۔

بعض مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اس کے علاوہ سیر کی کتابوں اور محدثین کی لکھی باتوں میں سے بھی میں نے اس میں اضافے کیے ہیں اور بعض اونچی اونچی بحثیں اور لطیف لطیف نکتے بھی میں نے بڑھا دیے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ میں نے دوسروں کے بیان میں اس طرح کھل کر لکھے ہوئے نہ پائے اور میں نے ان کے اشارے بھی نہ دیکھے۔

علوم قرآنیہ اور ما یتعلق بالقرآن پر مقدمہ میں اجمالی بحث کی ہے اور بہت ہی جامع ہے۔ احکام قرآنیہ کے استنباط میں ترتیب قرآنی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ان کی رائے میں مسائل کی تخصیص اور تعیین نہیں ملتی، ہاں اس میں کچھ احکام فقہیہ مسائل کلامیہ اور توحید وغیرہ وغیرہ کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے بعد سورۂ بقرہ ہے۔ اس سے یہ مسائل مستنبط ہوتے ہیں کہ تمام اشیاء میں اصل اباحت ہے، نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا پتہ ملتا ہے عصمت انبیاء

عدم امامت کفار اور اجماع کی حجیت فضائل شہدا، ایمان مفصل، وجوب قصاص یا عفو وغیرہ کے مسائل کا مختلف آیتوں سے استخراج کیا جاتا ہے

ایک آیت ملا صاحب سامنے لاکے اس پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں، حالانکہ بظاہر عنوان کا آیت سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا لیکن اپنے انداز بیان اور فکر رغوہ سے اپنا مدعا ظاہر کر لے جاتے ہیں اور سننے اور سمجھنے والا مطمئن ہو جاتا ہے۔ بیشتر مسائل میں علماء کے اختلافات کی پہلے تصریح کرتے ہیں ان کی آرا نقل کرتے ہیں۔ ان پر عالمانہ بحث کے بعد مرجح بات کو شرح وبسط کے ساتھ مدلل اور مبرہن کر دیتے ہیں۔ کہیں پہلے آیت اور اس کا شان نزول بیان کیا پھر مختصر الفاظ میں اس کی تفسیر کی اور دوسری آیات کو سامنے لاکے اس کے مطلب کی وضاحت کہیں نسخ اور انسا کے معانی کی وضاحت کی، پھر دونوں میں فرق ظاہر کیا، پھر کتاب کے سنت سے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کی بحث کی پھر حنفیہ کا مسلک کہ سنت سے کتاب کا نسخ جائز ہے اور شوافع کے نزدیک نہیں اس کی تصریح کی اور آخر میں لکھ دیا۔

ولحن نقول ان النسخ ليس	ہم کہتے ہیں کہ واقعۃً نسخ سے تبدیل
بتبديل في الواقع بل هو	نہیں ہوتی بلکہ وہ محض بیان ہوتا ہے
بيان محض فجاز ان يبين الله	اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے کلام کی انتہا
مدة انتهاء كلام رسوله او رسوله	بیان کرے اور اس کا رسول اپنے رب کے کلام
مدة انتهاء كلام ربه	کی انتہا ظاہر کر دے اس میں کیا حرج ہے۔

نور الانوار اصول فقہ کی کتاب ہے اس میں حنفیت کو جس طرح مستحکم اور مضبوط کیا گیا ہے اسی طرح تفسیر احمدی میں بھی احناف سے قیاس ہی قیاس کی سکمرانی کا اعتراض رفع کر کے قرآن اور سنت رسولؐ کو حنفیت کا نشا اور مولد بنانے کی پوری پوری مساعی جمیلہ شامل ہیں۔

تفسیر احمدی میں کئی مقامات پر ملا جیون علیہ الرحمہ کے کچھ تفردات بھی ہیں۔

تفسیر میں آیات

وقالوا هذه انعام وحرث حجر لا يطعمها الا من نشاء بزعمهم وانعام حرمت ظهورها وانعام لا يذكرون اسم الله عليها افتراء

علیہ سیجزیھم بما کانوا یفترون"

کی مکمل لفظی تحقیق اور تفسیر کے بعد عام علماء نے جن جن مسائل کا ان سے استخراج کیا ہے اس کو ظاہر کرنے کے بعد خصوصی اور اور مسائل کا ملا صاحب استنباط کر کے لکھتے ہیں۔

ولعمری ان ما اخبر اللہ تعالیٰ بشناعۃ حال الکفار فی ذلک اصدق دلیل علی بطلان ھذہ الرسوم التی اشتھرت بین بعض الانام وتفرد بھذا خاطری و ھو اعلم بحقیقۃ الحال۔

بقسم کہتا ہوں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کفار کی بدحالی اور بدکرداری کا ذکر کیا ہے اُن سے کفار کی ان مروجہ رسوم کا بالکل ٹھیک ٹھیک ابطال ہو جاتا ہے جن کا بعض لوگوں میں چلن اور رواج ہے اور اس بات کے بیان میں عمر میرے ہی ذہن کی رسائی ہوئی ہے اور اللہ حقیقت حال سے زیادہ واقف ہے۔

مُلّا عبدالسّلام

قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ وہاں ہی پیدا ہوئے لیکن تحصیل علوم متداولہ کی اپنے نانا ملا عبدالکریم کے پاس قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں رہ کے کی۔ ان کا سلسلۂ نسب امام زین العابدین بن امام حسین بن علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تحصیل علوم کا کچھ زمانہ ملا عبدالسلام لاہوری تلمیذ فتح اللہ شیرازی ملقب بہ عضد الملک کے پاس بھی گذرا ہے۔ عہد شاہجہانی میں مؤخر الذکر مدرسۂ شاہجہانی میں مدرس تھے۔ اپنے استاد کی وفات کے بعد ان کی جگہ انھوں نے لی۔ ملا عبدالحکیم والد ملا قطب الدین سہالوی ملا دانیال چوربہی اور ملا عبدالقادر فاروقی ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہوئے ہیں اور شاید مبالغہ نہ ہو کہ اس عہد میں ہندوستان بھر کا سلسلۂ تلمذ انھیں شخصیتوں پر منتہی سمجھا گیا ہے۔ شاہ تراب علی کشف المتواری میں لکھتے ہیں:۔

ملا عبدالسلام مرحوم کہ شاگرد مخدوم شیخ عبدالکریم و پرورش کردۂ آنحضرت

بودند در عہد سلطنت شاہجہان اولاً مدرس مدرسہ لاہور بعدہٗ مفتی لشکر بادشاہی گشتند از علمائے قول آں وقت بودند ..... در قصبہ دیوہ حویلی کہ واقع محلہ ست محل سکونت شان بود نیز صبیہ خود را بہ کردہ بودند مع قدرے زمین مزروع چک بستہ از موضع ادھیا سو دیہ معافی و زمینداری خود چنانچہ نوشتہ اولاد بر آن قابض اند۔[1]

ان کو عہد عالمگیری میں فخر علما سمجھا گیا۔

در عہد خویش نظیر نہ داشت بادشاہ بسبب استعداد بیش و تبحر علوم بسیار اکرام او میکرد و نزد خود می نشاند و اقتدائے او در وے معلّٰی بنام ملا بود چنانچہ تا عرصۂ محمد خدمت مذکور از و تعلق میداشت۔[2]

یہ صاحب تصانیف بھی تھے، تہذیب اور منار الاصول کی شرحیں انھوں نے لکھیں اور ایک کتاب فن حکمت و منطق میں بھی انشراحات معالیہ کے نام سے کتب خانۂ انوریہ کاکوری میں قلمی موجود ہے۔ یہ کتاب آپ نے اپنے فرزند شاہ ابو المعالی کے لیے ان کے زمانۂ درس میں لکھی تھی۔ ان کا مزار قصبہ دیوہ میں ہے۔ راقم السطور کو اس کی زیارت کا موقعہ ملا ہے۔

(باقی)

---

[1] کشف المتواری صفحہ ۱۳۶۔ [2] رسالہ باغ و بہار شیخ خیر الزماں صدیقی لکھنوی۔

الفرقان کی اشاعت خاص

بیاد حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

جو

حضرت مولانا مرحوم کی تبلیغی دعوت کے فکری اور عملی پہلوؤں کو سمجھنے

کا ایک مستند ذریعہ ہے۔

دوسروں کے مضامین کے علاوہ خود مولانا کی تقریروں اور مکتوبات سے مزین۔

دوسرا ایڈیشن۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک -/۲ روپیہ

ایک سانحہ

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مدینہ طیبہ کی وفات

آج ہی ۳ر نومبر کو عصر و مغرب کے درمیان اس عظیم سانحہ کی خبر ملی کہ شیخ وقت اور جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم مدینہ طیبہ) کا وصال ہو گیا ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ اللھم اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ والحقہ بسلفہ الصالحین من عبادک الذین رضیت عنھم ورضوا عنک۔

اس دنیا میں کسی آدمی کا پیدا ہونا اور اٹھ جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ روزانہ ہزاروں انسان اس دنیا میں آتے ہیں اور اسی طرح ہزاروں موت کے راستے سے چلے جاتے ہیں لیکن وہ بندے جو اپنے احوال و اوصاف اور فیوض و برکات کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں اُن میں سے کسی کا اٹھ جانا بلاشبہ انسانی دنیا کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے جس سے زمین و آسمان بھی متاثر ہوتے ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے۔

یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر والتمر لایبالیھم اللہ بالۃ۔

اللہ کے نیک بندے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے اور ایسے لوگ رہ جائیں گے جو اُن کی نسبت ایسے ہوں گے جیسے جَو کی بھوسی یا سوکھی کھجوروں کے چھلکے جن کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

یہ گنہگار راقم السطور اپنے شعور کے گزشتہ قریباً چالیس سالوں میں یہ منظر برابر دیکھتا رہا ہے۔ حضرت شیخ العند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہما کی تو صرف زیارت نصیب ہوئی، ان کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی، حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد الیاس اور مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری (قدس اللہ اسرارہم) کا کچھ قرب تعلق بھی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا۔ ان سب کی وفات پر بھی محسوس ہوا کہ دین اور علم و معرفت کا بڑا ذخیرہ دنیا سے اٹھتا جا رہا ہے اور ظلمت اسکی جگہ لے رہی ہے۔ ہمارے ان اکابر و مشائخ کی کچھ یادگاریں باقی تھیں اور باقی ہیں ان میں ایک بڑی صاحب فیض شخصیت حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ نے اسی سال ہم میں سے اٹھا لیا اور وہ ہمارے اس سال کا بہت بڑا دینی سانحہ تھا، حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کی وفات بھی ہماری دینی دنیا کا بڑا عظیم سانحہ ہے۔

مولانا موصوف شیخ وقت بھی تھے اور اس دور کے جلیل القدر عالم دین بھی، عصر حاضر کی خصوصیات اور اسکے تقاضوں کو سمجھنا اور علوم نبوت کی تشریح اس طرز سے کرنا جس سے اس دور کے پیدا شدہ مسائل بھی حل ہوں ان کا خاص امتیاز تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "ترجمان السنہ" ان کے اس کمال کی آئینہ دار ہے۔ افسوس کہ ابھی صرف ۴ جلدیں مولانا لکھ سکے جو شائع بھی ہوگئی ہیں۔ (چوتھی جلد حال ہی میں پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔)

مولانا مرحوم حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، پہلے دورۂ حدیث مظاہر العلوم میں پڑھ چکے تھے، اسکے بعد صرف حضرت شاہ صاحب سے علمی استفادہ کی غرض سے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیکر دوبارہ دورۂ حدیث یہاں پڑھا، پھر چند سال تک دار العلوم میں مدرس بھی رہے۔ بعد میں حسب قضا و قدر کے ایک فیصلہ نے حضرت شاہ صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ کو جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل، سورت) بھیجا تو مولانا بدر عالم صاحب بھی جامعہ کے ایک استاذ کی حیثیت سے ان حضرات کے ساتھ یہاں آگئے اور یہاں کئی سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحبؒ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے دری افادات تقلیند کرتے رہے جنکو بعد میں عربی میں مرتب کیا اور فیض الباری کے نام سے وہ چار جلدوں میں مصر میں چھپ کر شائع ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں مولانا مہاجر ہندوستان سے پاکستان چلے گئے اور ۴ سال کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہاں سے حجاز مقدس آگئے اور جنت البقیع میں دفن ہونے کی آرزو کے ساتھ مدینہ طیبہ میں قیام کرلیا۔

کئی سال ہوئے موٹر کے ایک ایکسیڈنٹ میں ایسے مجروح ہوگئے تھے کہ بچنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ابھی زندہ رکھنے کا تھا، زندہ رہے لیکن اسکے بعد صرف لیٹے رہ سکتے تھے بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھے مگر دینی و علمی افادہ و افاضہ کا سلسلہ الحمد للہ جاری رہا۔ لیٹے لیٹے درسی اور اصلاحی گفتگو ہر وقت فرماتے رہتے تھے۔

عام مسلمانوں کے افکار و خیالات اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کیلئے "جواہر الحکم" کے نام سے آسان زبان میں احادیث نبویہ کی شرح کا ایک سلسلہ جاری فرما رکھا تھا، اسے ۲ مہینے پہلے جب یہ عاجز مدینہ طیبہ حاضر ہوا، تو اس کا دوسرا حصہ عنایت فرمایا تھا، آج خبر وفات ملنے پر اسکو اٹھا کر دیکھا تو بسم اللہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد مولانا نے اس میں لکھا تھا:۔

"اسوقت عالم کے انقلابات کا ہولناک نقشہ اور علماء و صالحین کا بڑی تیزی سے اٹھتے چلے جانے کا عبرتناک سماں میری آنکھوں کے سامنے ہے اس لیے اس سلسلہ کی چند احادیث اس حصہ میں بے اختیار درج ہوگئی ہیں تاکہ اہل فہم و سعادت اپنی قلیل فرصت کو بے کار ضائع نہ کریں اور جتنی جلد ممکن ہو اعمال خیر میں ہمت سے کام لیں"۔

عجب نہیں کہ مولانا پر اپنی وفات کا قرب منکشف ہوا ہو، اور یہی اُن کے لیے اس سلسلہ کا باعث اور محرک ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے دینی و علمی فیض کو تا قیامت جاری رکھے اور مسلسل ترقیات اور رفع درجات کا اس کو ذریعہ بنائے اور اپنی رحمت و رضا سے ان کو نوازے اور پسماندگان و متعلقین کو صبر جمیل اور احتساب کی توفیق بخشے اور ان کی پوری سرپرستی و نگرانی فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

سنہ آغاز
۱۹۳۶ء

الفرقان لکھنؤ

Maulana Azad Library
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی

بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دُنیا اس سے ناآشنا ہے۔ یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے

یہ کتاب

اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔

- یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
- جسمیں ۳۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور موثر پر تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
- خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجازِ بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔

طباعت اعلیٰ، کتابت وطباعت عمدہ، کاغذ، ۲۰۰ صفحات، مجلد، سرورق دلکش، قیمت -/۴۰

کتب خانہ انوار القرآن، کھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۵ء | شمارہ ۸

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولین	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	معارف الحدیث	محمد منظور نعمانی	۹
۳	اسلام اور اجتماعی انصاف	استاذ احمد زکی یمانی	۱۹
۴	حضرت شاہ ابو الرضا دہلویؒ	مولانا نسیم احمد فریدی	۳۲
۵	دربار عالمگیری	ڈاکٹر مصطفےٰ احسن علوی	۴۲
۶	لبرل اسلام (ترجمہ)	جناب وحید الدین خاں	۴۸

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو تو

اسکا مطلب ہو کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کبھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر، الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

۱۹ اگست ۱۹۶۴ء کو مسلمانانِ ہند کی مختلف جماعتوں اور مختلف حلقوں کے نمائندوں میں ملت کے مشترک مسائل اور مشترک مقاصد کے لئے اشتراکِ عمل کی جو ہلکی سی شکل رونما ہوئی تھی، افسوس ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں اس میں پہلا شگاف بھی نمودار ہو گیا!

اتحاد و اشتراک کی یہ شکل "آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت" کے قیام سے بنی تھی جس میں ذاتی طور سے ملت کا اعتماد کا رکھنے والی متعدد نمایاں شخصیتوں کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی ہند، اور مسلم لیگ وغیرہ کے اعلیٰ عہدیداران شامل تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ شکل کچھ بہت پائیدار بنیادوں پر قائم نہیں تھی۔ اور ایسے جھول موجود تھے جن سے نہ صرف اسکی معنویت بہت کچھ متاثر ہو سکتی تھی بلکہ اس کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ مثلاً اس کا بنیادی نقص تو یہ تھا کہ مختلف جماعتوں اور کارکن حلقوں کا ایک وفاق بنے اور ملک کے مخصوص حالات سے پیدا ہونے والے مشترک ملی مسائل جو مشترک جد و جہد اور متحد نمائندگی چاہتے ہیں ان میں سارا کام اسی کے ماتحت یا کم از کم اس سے مربوط ہو کر ہو۔ لیکن مجلس کی تاسیسی قرارداد میں اس تخیل کی بالکل وضاحت نہیں آئی، بلکہ اسکے برعکس مجلس میں بعض جماعتی حضرات کی شرکت اس مفروضے کے ماتحت ہوئی کہ اس سے کسی جماعت کے سر کوئی پابندی نہیں آتی، چنانچہ انھوں نے مجلس کی تاسیس میں اس صراحت ہی کے ساتھ حصہ لیا کہ اُن کی شرکت ذاتی اور انفرادی حیثیت میں ہے، جماعتی حیثیت میں نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مجلس کا قیام بالکل بے معنی کر دیتی تھی اور کم سے کم مدت ہی

میں مجلس کو انتشار کا حادثہ پیش آسکتا تھا، کیونکہ مجلس کسی ایسے کام کے لئے قائم نہیں کی جارہی تھی جو ان جماعتوں کے دائرہ کار سے باہر ہو۔ اس کا تو بنیادی کام وہی مسائل تھے جن میں یہ سب جماعتیں الگ الگ کم و بیش کام کر رہی تھیں۔ مجلس کا کام یہ تھا کہ ان میں مشترک لائحہ عمل اور مشترک جد و جہد وجود میں لائے۔ اور یہ کام جماعتوں کے پابندی قبول کئے بغیر ایک دن بھی کیونکر ہو سکتا تھا؟ ——— اس لئے اس ناقص شکل میں مجلس کا قیام کوئی بہت امید افزا چیز نہیں تھی ——— مگر جمعیۃ علماء کے حضرات اسی ذہن کے ساتھ آئے تھے کہ وہ ذاتی حیثیت میں شریک ہو رہے ہیں اس لئے جماعتی حیثیت سے کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، لہٰذا اس ناقص شکل ہی کو غالباً اس اندیشے سے گوارا کیا گیا کہ ۱۵ اگست ۱۹۶۴ء کا نمائندہ مشاورتی اجتماع اگر اتحاد و اشتراک کی کسی ظاہری شکل سے بھی خالی ہاتھ اٹھا تو یہ مضطرب قوم کی امیدوں کے لئے ایسا دھچکا ہوگا جس کی پھر شاید تلافی نہ ہو سکے۔ دوسری طرف شاید یہ امید بھی کارفرما تھی کہ جب مرحلہ اطمینان سے بیٹھ کر عملی تفصیلات طے کرنے کا آئے گا تو ان حضرات پر خود ہی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مجلس اپنے اصل مقاصد میں کوئی ایک قدم بھی ان لوگوں کی شرکت کے ساتھ اس وقت تک نہیں اٹھا سکتی جب تک یہ جماعتی طور پر مجلس کے قیام کو منظور نہ کرلیں۔ اس لئے جو نقص اور جھول تاسیسی قرارداد میں رہا جا رہا ہے وہ آگے خود ہی دور ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور مجلس کا جو دستور پاس ہوا اس میں بھی تاسیسی قرارداد کا یہ نقص دور نہیں ہو سکا، جس میں مجلس کو ٹوٹ پھوٹ کا حادثہ پیش آجانے یا بے معنی و بے مصرف ہو کر رہ جانے کے امکانات پوشیدہ تھے۔

ہمارے یہ خیالات آج نکات بعد الوقوع کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے الفرقان اکتوبر ۱۹۶۴ء کے انہی صفحات میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور پھر دسمبر ۱۹۶۴ء کے اداریہ میں بہت کھول کر یہ بات لکھی تھی کہ اگر مجلس کو باقاعدہ جماعتی وفاق کی حیثیت نہیں دی جاتی تو پھر یہ انتشار کے حادثے سے نہیں بچ سکتی۔ بہرحال یہ مسئلہ دستور سازی کے مرحلے میں بھی صاف نہیں ہو سکا۔ اور اسی اثنا میں مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ خیز مسئلہ آکھڑا ہوا۔ مجلس نے اس پر ایک

اہم قرارداد منظور کی جس میں مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کا اعلان کرتے ہوئے دیگر ضروری اقدامات کے علاوہ قانونی چارہ جوئی کا بھی فیصلہ کیا۔ اور اس کے لئے ایک سب کمیٹی نامزد کر دی۔

منطقی اعتبار سے مجلس کی اس قرارداد کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جن جماعتوں کے ذمہ دار مجلس میں شریک تھے وہ جماعتیں اس مسئلے میں جداگانہ اقدامات سے پرہیز کرتیں۔ مگر قانونی اعتبار سے ان جماعتوں پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں تھی، کیونکہ ان کے ذمہ داروں نے اپنے جماعتی حقوق مجلس کو تفویض نہیں کئے تھے۔ یہی وہ مبہم اور جھول دار پوزیشن تھی جس میں ایک طرف جمعیتہ علماء نے جائز سمجھا کہ وہ مجلس کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر مسلم یونیورسٹی کے لئے قانونی چارہ جوئی کرے۔ اور دوسری طرف مجلس سے تعلق رکھنے والے کچھ دوسرے افراد کو یہ بات سخت قابل اعتراض معلوم ہوئی کہ جمعیتہ کے ذمہ دار مجلس میں بھی شریک ہیں اور اُسے نظر انداز بھی کر رہے ہیں۔

جمعیتہ کا اقدام قابل اعتراض ضرور تھا۔ مگر صرف منطقی طور پر تھا، دستور مجلس کے اعتبار سے قانونی طور پر اس میں کوئی گرفت کی بات نہیں تھی۔ اس لئے مجلس کے ذمہ داروں کو تو حق تھا کہ وہ معاملے کے منطقی پہلو کو اٹھائیں اور اندرونی طور پر ارباب جمعیتہ سے یہ دریافت کریں کہ اس طرح مجلس کے کیا معنی رہ جائیں گے؟ مگر مجلس کی طرف سے کسی دوسرے فرد کو نہ تو اندرونی طور سے اس پر اعتراض کا حق تھا اور نہ علانیہ، لیکن معاملے کے الجھاؤ نے جس طرح جمعیتہ کو اس غلط اقدام کا موقع دیا اسی طرح کچھ دوسرے افراد سے اس دوسری غلطی کا ارتکاب کرا دیا۔ اور بجائے اسکے کہ مجلس کے یہ شرکاء مجلس کے کسی جلسے میں بیٹھ کر اس مسئلہ پر بات چیت کرتے باہر ہی باہر دست و گریباں ہو گئے۔ اور اس کا انجام ہوا مجلس سے جمعیتہ کا اظہار بیزاری اور جنرل سکریٹری جمعیتہ کا استعفےٰ۔

ہمارے اس نقطۂ نظر سے، اس بد انجامی کی بنیادی طور پر ذمہ دار، مجلس کی وہ تاسیسی قرارداد ہے جس کے ابہام نے اس بات کی اجازت دی کہ جماعتی ارکان اگر چاہیں تو کسی بھی مسئلے پر مجلس کو نظر انداز کر کے اپنی جماعت کے پلیٹ فارم سے آزادانہ کام کریں۔ اور خود مجلس

ہی کو ایک حریف اور رقیب کی جگہ پر رکھ لیں ۔۔ اس شکل میں یہ بات ناگزیر ہی تھی کہ جو لوگ معاملے کے اس الجھاؤ سے فائدہ اٹھانا چاہیں وہ بالآخر ایک دن الگ ہی ہو جائیں۔ کیونکہ یہ واسطہ علٰحدگی ہی کا واسطہ تھا۔ مگر ارباب جمعیتہ نے اس طرز عمل کے ساتھ جس طریقے سے علٰحدگی اختیار کی[1] ——— وہ بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ مجلس کو اُن سے شکایت ہوتی کہ یہ آپ حضرات کیا کر رہے ہیں اور اس طرح مجلس میں آپ کی شرکت کی کیا معنویت رہتی ہے؟ مگر ہوا یہ کہ مجلس نے تو اس طرح کی کوئی شکایت نہ کر کے ان حضرات کو باقاعدہ علیحدگی کا سرے موقع ہی نہ دیا۔ البتہ ان حضرات نے اُلٹی کچھ شکایات مجلس ہی پر قائم کر دیں۔ اور پھر مجلس کو صفائی کا کوئی موقع دئے بغیر اس سے علٰحدگی اختیار کر لی۔ اور اس طرح یہ ثابت کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ مجلس ان کے لئے ایک نہایت کڑوی گولی تھی جسے پتہ نہیں انھوں نے کس طرح اب تک نگلے رکھا تھا۔

کم از کم راقم سطور کو تو اس ہونے والی بات کا اس طرح انتظار تھا جیسے شام کے بعد صبح کا اور صبح کے بعد شام کا۔ اور اسکی ایک وجہ تو وہ تھی جس کا اظہار دسمبر ۶۴ء کے اس اداریہ میں کیا گیا تھا جس کا ابھی حوالہ گزرا ہے، اس اداریہ میں اس بات سے بحث کرتے ہوئے کہ مجلس مشاورت جس تخیل اتحاد و اشتراک پر قائم کی گئی ہے وہ کس قدر مشکل ہے، یہ چیز سامنے لائی گئی تھی کہ برسہا برس گزر گئے، سب اس تخیل کے مطابق کام کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور اُدھر پوری قوم بیچین ہے کہ یہ چیز ہو، مگر ہو کسی طرح نہیں پاتی۔ اور پھر اسکی وجہ یہ عرض کی گئی تھی کہ :-

"ہمارے نزدیک اس عجیب و غریب صورت حال کا، کہ سب اشتراک و اتحاد چاہتے ہیں، کوئی عذر بھی کسی کی زبان پر نہیں اور پھر بھی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھتی، خاص سبب یہ ہے کہ جن مسائل کو آج مشترک مسائل کہا جاتا ہے جن جماعتوں

---

[1] ہمارے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ جمعیتہ کے صرف ایک صاحب علیحدہ ہوئے ہیں دوسرے (جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی) اس سے متفق نہیں ہیں مگر پھر بھی ہم نے اس مضمون میں اس علٰحدگی کو جمعیتہ ہی کی علٰحدگی سے تعبیر کیا ہے آخر مضمون میں اسکی وجہ سے بھی سامنے آجائے گی۔

کا اصل دائرہ کار یہی مسائل ہیں، اور انہی میں اپنی سرگرمیوں کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو تھوڑا بہت اپیل کرتی ہیں، یہ جماعتیں اگر انہی مسائل میں اپنی جداگانہ سرگرمیاں ترک کر کے سارا کام مشترک پلیٹ فارم سے کریں تو اپنے انفرادی وجود کے لیے عام مسلمانوں کی ہمدردیاں آخر کس بنیاد پر حاصل کر سکیں گی؟ یہ ہے وہ نفسیاتی گرہ جو آج تک مشترک پلیٹ فارم کے قیام کا راستہ روکے رہی ہے اور جب تک یہ گرہ نہیں کھلے گی صحیح معنی میں کوئی مشترک پلیٹ فارم وجود میں نہیں آسکے گا۔"

(الفرقان دسمبر ۶۴ء۔ نگاہ اولیں)

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ وجہ موجودہ جماعتوں میں سے جمعیۃ علماء پر سب سے زیادہ چسپاں ہوتی تھی۔ اور اسی وجہ سے مجلس کے ساتھ شروع دن سے اس کا طرز عمل دیکھ کر ہمارے لئے یہ بات گویا بالکل یقینی تھی کہ وہ زیادہ دن مجلس کے ساتھ ظاہر داری بھی نہیں نبھا سکے گی۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ جمعیۃ علماء مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے ساتھ ہندو مسلم یا مسلمان اور حکومت سے متعلق سوالات میں اشتراک عمل کر کے، اپنا کیریر خراب کرلے، یہ بہت اہونی بات تھی۔ پتہ نہیں کیسے یہ بات ہوگئی تھی کہ اسکے ذمہ داروں نے ان دو جماعتوں کے ساتھ مجلس میں شرکت منظور کرلی، ورنہ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی نہیں۔ جون ۶۷ء کا مسلم کنونشن جو دہلی میں جمعیۃ کے زیر اہتمام ہوا تھا اس میں یہ دونوں جماعتیں اسی لئے شریک نہیں کی جاسکیں، اور پھر مجلس مشاورت میں شرکت منظور کرنے والے ارباب جمعیۃ نے دو یا تین مہینے بعد جو جمہوری کنونشن منعقد کیا اس میں بھی ان دونوں جماعتوں کو دعوت بہرحال نہیں مل سکی پس یہ بات واقعی بڑی حیرت انگیز تھی کہ ان دو کنونشنوں کے درمیان میں ایک وقت ارباب جمعیۃ کیسے ان دونوں جماعتوں کے ساتھ معاہدہ اشتراک کرنے پر تیار ہوگئے۔ اور اسکے برعکس یہ بات ذرا بھی حیرت انگیز نہیں کہ مجلس سے استعفے میں ان دونوں جماعتوں سے اپنے نظریاتی بُعد کے سوال پر بہت زور دیا گیا۔ واقعہ دراصل یونہی ہے اور ہم اس میں جمعیۃ کو ذرا بھی خطاوار نہیں گردانتے۔ حیرت انگیز بلکہ قابل اعتراض جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ جو کام بعد میں کرنا ہی تھا وہ پہلے ہی کیوں نہ کیا گیا۔ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے نظریات کے بارے میں چند دن کے لئے کوئی ذہول ہوجانے

کا تو سوال تھا نہیں اور نہ ہی ایسا تھا کہ ان کے اندر کسی تبدیلی کا یقین حاصل کیا گیا ہو، پھر اس بنیاد پر شروع ہی میں مجلس کے اندر آنے سے معذرت کیوں نہ کر دی گئی؟ اس میں کوئی برائی نہ تھی، ایک نظریاتی بات تھی! لیکن اس وقت شرکت کرنے کے بعد آج یہ کہہ کر الگ ہونا کہ جمعیتہ کے اور ان دو جماعتوں کے درمیان سیکولرزم وغیرہ کے مسائل پر ہم آہنگی نہیں ہے، بڑی ستم ظریفی کی بات ہے۔ اسی طرح اگر مسلم یونیورسٹی کی رٹ کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے اخبارات سے کچھ مناقشہ ہو گیا تھا تو وہ اسکی شکایت مجلس سے کر سکتے تھے، کوئی الیکشن لڑے جانے کا معاملہ کر سکتے تھے، مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ شکایت ہوئی جماعت اسلامی سے اور استعفیٰ دے دیا گیا مجلس سے .....

..... جماعت اسلامی کا تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا البتہ مجلس کو نقصان پہونچ گیا۔ خود مجلس سے اگر کوئی شکایت کی گئی ہے تو وہ یہ ہے کہ مستقل دستور اور تنظیم اُس وعدے کے خلاف ہے جو صدر مجلس نے ان حضرات سے کیا تھا! لیکن یہ جاننے کے بعد کہ جو دستور بنا ہے اور اس میں جو تنظیمی اصول منظور کئے گئے ہیں وہ ان حضرات کی رضامندی سے اور ان کی ترمیمات قبول کر کے بنا ہے، کون اس شکایت کو کوئی وزن دے سکتا ہے؟

اس سارے تجزیے کو مختصر کیا جائے اور بات چند لفظوں میں کہی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارباب جمعیتہ پتہ نہیں کیسے مجلس میں شامل ہونے کی غلطی کر بیٹھے تھے۔ اور پھر اسکی تلافی کے لئے انھوں نے پہلے ہی دن سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ خود مجلس ہی انھیں علیحدگی کا کوئی موقع دیدے۔ لیکن جب مجلس نے انھیں اس طرف سے بالکل ہی مایوس کر دیا تو مجبوراً خود ہی پیش قدمی کرنا پڑی اور جیسے تیسے اس غلطی کی تلافی کر لی ـــــ ہمارا یہ تجزیہ یقیناً ان حضرات کو بہت ناگوار گزرے گا۔ مگر ہم ایمانداری کے ساتھ اسکے علاوہ کوئی دوسری رائے قائم نہیں کر سکے ـــــ مجلس نے اس استعفے پر اپنے ۱۶، ۱۷ نومبر کے جلسے میں منظوری کی جو قرارداد پاس کی ہے وہ یقیناً اسکے ابتک کے رویہ سے بہت مختلف ہے، مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی، اگر اس استعفے میں غیر ضروری طور پر "حب الوطنی" کی نمائش کے لئے مجلس کی وطن دوستی کو ناپنے کی کوشش نہ کی جاتی۔ یقیناً یہ ایک ناقابل فہم بات تھی اور اس پر نرمی غلط فہمیوں کا دروازہ

معارف الحدیث

نفلی روزے

[معارف الحدیث کے اس سلسلہ میں "کتاب الصوم" کی احادیث کی تشریح اب سے دو سال پہلے الفرقان کی چند اشاعتوں میں کی گئی تھی اس میں وہ حدیثیں درج ہونے سے رہ گئی تھیں جن کو محدثین "صیام التطوع" (نفلی روزے) کے زیر عنوان درج کرتے ہیں اور جن میں مختلف مہینوں اور مختلف دنوں میں نفلی روزے رکھنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے یا نفلی روزوں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خاص ہدایت مروی ہے۔ آج کی صحبت میں وہی حدیثیں پیش کی جا رہی ہیں۔]

نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزوں کا ایک نصاب اور کورس تو اسلام کا رکن اور گویا شرط لازم قرار دی گئی ہے جس کے بغیر کسی مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی اور وہ رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت اسلام میں روحانی تربیت اور تزکیہ کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا خاص تقرب حاصل کرنے کے لیے دوسری نفلی عبادات کی طرح نفلی روزوں کی بھی تعلیم دی گئی ہے، اور بعض خاص دنوں اور تاریخوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان فرما کے ان کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبانی تعلیم و تلقین کے علاوہ اپنے عمل سے بھی امت کو ان نفلی روزوں کی ترغیب دیتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ اس کی بھی پوری

معارف الحدیث

نفلی روزے

[معارف الحدیث کے اس سلسلہ میں "کتاب الصوم" کی احادیث کی تشریح اب سے دو سال پہلے الفرقان کی چند اشاعتوں میں کی گئی تھی اس میں وہ حدیثیں درج ہونے سے رہ گئی تھیں جن کو محدثین "صیام التطوع" (نفلی روزے) کے زیر عنوان درج کرتے ہیں اور جن میں مختلف مہینوں اور مختلف دنوں میں نفلی روزے رکھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے یا نفلی روزوں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خاص ہدایت مروی ہے۔ آج کی صحبت میں وہی حدیثیں پیش کی جارہی ہیں۔]

نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزوں کا ایک نصاب اور کورس تو اسلام کا رکن اور گویا شرط لازم قرار دی گئی ہے جس کے بغیر کسی مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی۔ اور وہ رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت اسلام میں روحانی تربیت اور تزکیہ کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا خاص تقرب حاصل کرنے کے لیے دوسری نفلی عبادات کی طرح نفلی روزوں کی بھی تعلیم دی گئی ہے، اور بعض خاص دنوں اور تاریخوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان فرما کے ان کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبانی تعلیم و تلقین کے علاوہ اپنے عمل سے بھی امت کو ان نفلی روزوں کی ترغیب دیتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ اس کی بھی پوری

احتیاط فرماتے تھے کہ لوگ نفلی روزوں میں حد اعتدال سے آگے نہ بڑھیں اور ان کا اہتمام اور پابندی فرض روزوں کی طرح نہ کریں بلکہ حدود اللہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو فرائض کی طرح ادا کریں اور نوافل کو نوافل کے درجہ میں رکھیں ـــــ اس مختصر تمہید کے بعد اس سلسلہ کی حدیثیں ذیل میں پڑھئے!۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِکُلِّ شَیْءٍ زَکٰوةٌ وَ زَکٰوةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ۔

ـــــــــ ـــــــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر چیز کی کوئی زکوٰۃ ہے (جس کے نکالنے سے وہ چیز پاک ہو جاتی ہے) اور جسم کی زکوٰۃ روزے ہیں۔ (سنن ابن ماجہ)

ماہ شعبان میں نفلی روزوں کی کثرت:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَصُوْمُ حَتّٰی نَقُوْلَ لَا یُفْطِرُ وَیُفْطِرُ حَتّٰی نَقُوْلَ لَا یَصُوْمُ وَمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَکْمَلَ صِیَامَ شَهْرٍ قَطُّ اِلَّا رَمَضَانَ وَمَا رَاَیْتُهُ فِیْ شَهْرٍ اَکْثَرَ مِنْهُ صِیَامًا فِیْ شَعْبَانَ ـــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور (نفلی روزوں کے بارہ میں) یہ تھا کہ آپ کبھی کبھی) مسلسل بلا ناغہ روزے رکھنے شروع کرتے یہاں تک کہ ہمیں خیال ہوتا کہ اب ناغہ ہی نہیں کریں گے، اور (کبھی اس کے برعکس ایسا ہوتا کہ) آپ روزے نہ رکھتے اور مسلسل بغیر روزے کے دن گزارتے یہاں تک کہ ہمیں خیال ہوتا کہ اب آپ بلا روزے کے ہی رہا کریں گے۔ ـــــ اور فرماتی ہیں حضرت صدیقہ رضؓ کہ ـــــ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے علاوہ کسی پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں، اور میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کسی مہینے میں شعبان سے زیادہ نفلی روزے رکھتے ہوں۔ (اسی حدیث کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ شعبان کے (قریباً) پورے مہینے ہی کے روزے رکھتے تھے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے پہلے جزء کا مطلب تو یہ ہے کہ نفلی روزوں کے بارے میں آپ کا کوئی لگا بندھا دستور و معمول نہیں تھا، بلکہ کبھی آپ مسلسل بلاناغہ روزے رکھتے تھے اور کبھی مسلسل بغیر روزے کے رہتے تھے، مقصد یہ تھا کہ اُمت کے لیے آپ کی پیروی میں مشکل اور تنگی نہ ہو، بلکہ وسعت کا راستہ کھلا رہے۔ اور ہر شخص اپنے حالات اور اپنی ہمت کے مطابق آپ کے کسی رویہ کی پیروی کر سکے۔ دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ آپ پورے اہتمام سے پورے مہینے کے روزے صرف رمضان کے رکھتے تھے (جو اللہ نے فرض کیے ہیں) ہاں شعبان میں دوسرے مہینوں کی بہ نسبت زیادہ روزے رکھتے تھے ـــــ بلکہ اسی حدیث کی ایک روایت میں ہے کہ قریب قریب پورے مہینے شعبان کے روزے رکھتے تھے اور بہت کم دن ناغہ فرماتے تھے۔

ماہ شعبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ نفلی روزے رکھنے کے کئی سبب اور کئی حکمتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے بعض وہ ہیں جن کی طرف بعض حدیثوں میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت اسامہ بن زید کی ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارہ میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اسی مہینے میں بارگاہ الٰہی میں بندوں کے اعمال کی پیشی ہوتی ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ جب میرے اعمال کی پیشی ہو تو میں روزہ سے ہوں۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان میں بہت زیادہ روزے اس لیے رکھتے تھے کہ پورے سال میں مرنے والوں کی فہرست اسی مہینے میں ملک الموت کے حوالہ کی جاتی ہے۔

آپ چاہتے تھے کہ جب آپ کی وفات کے بارہ میں ملک الموت کو احکام دیئے جارہے ہوں تو اس وقت آپ روزے سے ہوں۔

اس کے علاوہ رمضان کا قرب اور اس کے خاص انوار و برکات سے مزید مناسبت پیدا کرنے کا شوق اور داعیہ بھی غالباً اس کا سبب اور محرک ہوگا۔ اور شعبان کے ان روزوں کو رمضان کے روزوں سے وہی نسبت ہوگی جو فرض نمازوں سے پہلے پڑھے جانے والے نوافل کو فرضوں سے ہوتی ہے، اور اسی طرح رمضان کے بعد شوال میں چھ نفلی روزوں کی تعلیم و ترغیب جو آگے درج ہونے والی حدیث میں آرہی ہے۔ اس کو رمضان کے روزوں سے وہی نسبت ہوگی جو فرض نمازوں کے بعد والی سنتوں اور نفلوں کو فرضوں سے ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے:۔

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَہٗ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد ماہ شوال میں چھ نفلی روزے رکھے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہوگا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) رمضان کا مہینہ اگر ۲۹ ہی دن کا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ۳۰ روزوں کا ثواب دیتے ہیں اور شوال کے ۶ نفلی روزے شامل کرنے کے بعد روزوں کی تعداد ۳۶ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے کریمانہ قانون "الحسنۃ بعشر امثالھا" (ایک نیکی کا ثواب دس گنا) کے مطابق ۳۶ کا دس گنا ۳۶۰ ہو جاتا ہے اور پورے سال کے دن ۳۶۰ سے کم ہی ہوتے ہیں ——— پس جس نے پورے رمضان مبارک کے روزے

رکھنے کے بعد شوال میں ۶ نفلی روزے رکھے وہ اس حساب سے ۳۶۰ روزوں کے ثواب کا مستحق ہوگا پس اجر و ثواب کے لحاظ سے یہ ایسا ہی ہوا جیسے کوئی سبزہ سال کے ۳۶۰ دن برابر روزے رکھے۔

ہر مہینے میں تین نفلی روزے کافی ہیں:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ فَقُلْتُ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَیْنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَیْكَ حَقًّا۔ لَاصَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ صَوْمُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهٖ صُمْ كُلَّ شَهْرٍ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ وَاقْرَءِ الْقُرْاٰنَ فِیْ كُلِّ شَهْرٍ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ صُمْ اَفْضَلَ الصَّوْمِ صَوْمَ دَاوٗدَ صِیَامُ یَوْمٍ وَاِفْطَارُ یَوْمٍ وَاقْرَءْ فِیْ كُلِّ سَبْعِ لَیَالٍ مَرَّةً وَلَا تَزِدْ عَلٰی ذَالِكَ ——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ تم ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نوافل پڑھتے ہو (کیا واقعہ ایسا ہی ہے؟) میں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت! میں ایسا ہی کرتا ہوں، آپ نے فرمایا یہ طریقہ چھوڑ دو، روزے بھی رکھا کرو اور ناغہ بھی کیا کرو، اسی طرح رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو، کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے (تمہیں اسکی اجازت نہیں ہے کہ جسم پر حد سے زیادہ بوجھ ڈالو اور اس کے ضروری تقاضے بھی پورے نہ کرو) اسی طرح تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے (کہ تم اس کو سونے اور آرام لینے کا موقع دو) اسی طرح تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتیوں مہمانوں کا بھی تم پر

حق ہو، (تم کو جائز نہیں کہ ان کی حق تلفی کر کے اللہ کی عبادت کرو، سنو) جو ہمیشہ ناغہ روزہ رکھے اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں، ہر مہینے میں تین دن کے نفلی روزے رکھ لینا ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے اس لیے تم ہر مہینے میں تین روزے رکھ لیا کرو اور مہینے میں ایک قرآن پاک (تہجد میں) ختم کر لیا کرو۔ (عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں) میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں (اس لیے مجھے زیادہ کی اجازت مرحمت فرمائیے۔) آپ نے فرمایا تو پھر تم داؤد علیہ السلام کے روزوں کا طریقہ اختیار کر لو اور وہ یہ کہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار یعنی روزہ کا ناغہ، اور تہجد میں سات راتوں میں ایک قرآن ختم کر لیا کرو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا ذوق عبادت بہت بڑھا ہوا تھا، وہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے اور رات بھر نوافل پڑھتے اور اس میں روزانہ پورا قرآن مجید ختم کر لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کو وہ ہدایت فرمائی جو حدیث میں مذکور ہوئی اور ان کو عبادت میں اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم پر اپنے جسم و جان اور اپنے اہل تعلق کی بھی ذمہ داریاں ہیں اور ان کی بھی رعایت اور ادائیگی ضروری ہے۔ آپ نے پہلے انہیں مہینے میں تین نفلی روزے رکھنے اور تہجد میں پورے مہینہ میں ایک قرآن پڑھنے کے لیے فرمایا، اور جب انھوں نے عرض کیا کہ میں بآسانی اس سے زیادہ کر سکتا ہوں لہٰذا کچھ زیادہ کی مجھے اجازت دیدی جائے تو آپ نے ان کو صوم داؤدی (یعنی ہمیشہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کی) اور ہفتہ میں ایک قرآن مجید رات کے نوافل میں پورا کر لینے کی اجازت مرحمت فرمادی اور اس سے زیادہ کے لیے منع فرمادیا۔ لیکن اس حدیث ہی سے یہ بات ظاہر ہو کہ آپ کی ممانعت کا منشاء یہ نہیں تھا کہ زیادہ عبادت کرنا کوئی بری بات ہے، بلکہ یہ ممانعت بربنائے مشقت تھی (جس طرح چھوٹے بچوں کو زیادہ بوجھ اٹھانے سے منع کیا جاتا ہے) یہی وجہ ہو کہ ان کے یہ عرض کرنے پر کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپ نے ان کو مہینہ میں صرف تین روزوں کے بجائے صوم داؤدی یعنی ۱۵ دن روزہ اور ۱۵ دن افطار کی اور مہینہ میں قرآن ختم کرنے کے بجائے ہفتہ میں قرآن ختم کرنے کی اجازت دیدی، بلکہ ترمذی کی روایت کے مطابق بعد میں صرف پانچ دن میں قرآن پاک ختم کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔ اور بعض صحابہ کو حضورؐ نے

تین دن میں قرآن ختم کرنے کی بھی اجازت دی ہے[1]

عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ اَنَّ رَجُلاً اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ کَیْفَ تَصُوْمُ؟ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِہٖ فَلَمَّا رَاٰی عُمَرُ غَضَبَہٗ قَالَ رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُوْلِہٖ فَجَعَلَ عُمَرُ یُرَدِّدُ ھٰذَا الْکَلَامَ حَتّٰی سَکَنَ غَضَبُہٗ فَقَالَ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ الدَّھْرَ کُلَّہٗ قَالَ لَاصَامَ وَلَا اَفْطَرَ اَوْ قَالَ لَمْ یَصُمْ وَلَمْ یُفْطِرْ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمَیْنِ وَیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ وَیُطِیْقُ ذَالِکَ اَحَدٌ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمًا وَیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ ذَالِکَ صَوْمُ دَاوٗدَ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمًا وَیُفْطِرُ یَوْمَیْنِ قَالَ وَدِدْتُ اَنِّیْ طُوِّقْتُ ذَالِکَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مِّنْ کُلِّ شَھْرٍ وَرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ فَھٰذَا صِیَامُ الدَّھْرِ کُلِّہٖ وَصِیَامُ یَوْمِ عَرَفَۃَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَۃَ الَّتِیْ قَبْلَہٗ وَالسَّنَۃَ الَّتِیْ بَعْدَہٗ وَصِیَامُ یَوْمِ عَاشُوْرَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَۃَ الَّتِیْ قَبْلَہٗ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپ روزے کس طرح رکھتے ہیں؟ (یعنی نفلی روزے رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا معمول و دستور ہے؟) اسکے اس سوال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی (یعنی چہرۂ مبارک پر تکدر اور برہمی کے آثار ظاہر ہوئے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (جو حاضر تھے) جب آپ کی ناگواری کی کیفیت کو محسوس کیا تو کہا۔

رضینا باللہ ربًّا وبالاسلام دینا و بمحمّد نبیًّا نعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسولہ۔	ہم راضی ہیں اللہ کو اپنا رب مان کر اور اسلام کو اپنا دین بنا کر اور محمد علیہ السلام کو نبی مان کر اللہ کی پناہ اسکی ناراضی سے اور اسکے رسول کی ناراضی سے۔

حضرت عمر بار بار اپنی یہی بات دُہراتے رہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] مجمع الزوائد میں احمد اور کبیر طبرانی کے حوالے سے سعید بن مسند الانصاری رضؓ کو اس کی اجازت مروی ہے ۱۲۔ (مجمع الزوائد ص ۲۶۹ جلد دوم)

مزاج مبارک میں جو ناگواری پیدا ہوگئی تھی اس کا اثر زائل ہوگیا، تو حضرت عمر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ شخص کیسا ہو جو ہمیشہ بلاناغہ روزہ رکھے اور اسکے بارہ میں کیا ارشاد ہے؟ آپ نے فرمایا نہ اُسنے روزہ رکھا نہ افطار کیا، پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا اور اس آدمی کے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو دو دن روزے رکھے اور ایک دن ناغہ کرے یعنی بغیر روزہ کے رہے؟ آپ نے فرمایا کیا کسی میں اسکی طاقت ہے؟ (یعنی یہ بہت مشکل ہے ہمیشہ روزہ رکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے اسلئے اس کا ارادہ نہ کرنا چاہئے) حضرت عمرؓ نے عرض کیا اور اسکے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو ہمیشہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن ناغہ کرے؟ آپ نے فرمایا یہ صوم داؤد ہے، یعنی حضرت داؤد علیہ السلام جن کو اللہ نے غیر معمولی جسمانی قوت بخشی تھی اُن کا معمول یہی تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن ناغہ کرتے تھے) حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اس آدمی کے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن ناغہ کرے؟ (اور اس طرح اوسطاً ہر مہینہ میں دس دن روزہ رکھے) آپ نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے اسکی طاقت عطا فرمائی جائے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر مہینے کے تین نفلی روزے اور رمضان تا رمضان یہ (اجر و ثواب کے لحاظ سے) ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہے (لہٰذا جو صوم دہر کا ثواب حاصل کرنا چاہے وہ اس کو اپنا معمول بنالے) اور یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) کے روزہ کے بارہ میں میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے کرم سے کہ وہ صفائی کردے گا اس سے پہلے سال کی اور بعد کے سال کی (یعنی اسکی برکت سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کی گندگیاں دھل جائیں گی) اور یوم عاشوراء (۱۰ محرم) کے روزے کے بارہ میں میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے کہ وہ صفائی کردے گا اس سے پہلے سال کی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا اصل مضمون و مقصد تو ظاہر ہے لیکن چند ضمنی باتیں وضاحت طلب ہیں انہی کے بارہ میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

حدیث کے بالکل شروع میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ کس طرح روزے رکھتے ہیں، یعنی نفلی روزوں کے بارہ میں خود آپ کا معمول اور طریقہ کیا ہے؟ آپ کو اس سوال پر ناراضی اور ناگواری ہوئی ـــــ یہ ناراضی اور ناگواری ایسی ہی تھی جیسی تعنیف استاذ اور

مربی کو کسی شاگرد اور زیر تربیت طالب و مرید کے غلط اور نامناسب سوال سے ہوتی ہے۔ سوال کرنے والے کو اصل بات دریافت کرنی چاہیئے تھی یا یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ میرے لیے نفلی روزوں کے بارے میں کیا طرز عمل مناسب ہے؟ اُس نے بجائے اس کے حضورؐ کا معمول دریافت کیا تھا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے بہت سے شعبوں میں اُن بہت سے اسباب کی بنا پر جو آپ کے منصب نبوت اور مصالح امت سے تعلق رکھتے تھے ایسا طرز عمل بھی اختیار فرماتے تھے جس کی تقلید ہر ایک کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس لیے سائل کو آپ کا معمول دریافت کرنے کے بجائے اصل مسئلہ دریافت کرنا چاہیئے تھا، ـــــ استاذ اور مربی کی اس طرح کی ناگواری بھی دراصل تربیت ہی کا ایک جزو ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سوال سے حضور کی ناگواری کو محسوس کر کے کل مسلمانوں کی طرف سے عرض کیا "رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُوْلِہٖ" ـــــ اس کے بعد آپ نے نفلی روزوں ہی کے بارہ میں سب طرزیہ سوالات کئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات مرحمت فرمائے۔

جو شخص ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھے اس کے بارے میں آپ نے جو یہ فرمایا کہ "لَا صَامَ وَلَا اَفْطَرَ" (نہ اس نے روزہ رکھا نہ افطار کیا) اس سے آپ کا مقصد ناپسندیدگی کا اظہار ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ غلط ہے، نہ صوم ہے نہ افطار ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوالات کے جوابات کے بعد آپ نے اپنی طرف سے جو مزید فرمایا اُس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کے باب میں عام مسلمین کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ رمضان کے فرض روزے رکھا کریں، اس کے علاوہ ہر مہینے میں تین نفلی روزے رکھ لیا کریں جو "الحسنۃ بعشر امثالہا" کے حساب سے ثواب میں تیس روزوں کے برابر ہوں گے اور اس طرح ان کو "صوم دہر" کا ثواب مل جائے گا ـــــ مزید نفع مندی اور کمائی کے لئے یوم عرفہ اور یوم عاشورا کے دو روزے بھی رکھ لیا کریں، حضور نے امید ظاہر فرمائی کہ رب کریم کے کرم سے مجھے امید ہے کہ یوم عرفہ کا روزہ ایک سال پہلی اور ایک سال بعد کی خطا کاریوں کا اور یوم عاشورا کا روزہ پہلے سال کی غلط کاریوں کا کفارہ بن جائے گا۔

واضح رہے کہ عرفہ کے دن جو در اصل حج کا دن ہے روزہ کی یہ فضیلت اور ترغیب غیر حاجیوں کے لئے ہے، حاجیوں کی اس دن کی خاص الخاص اور مقبول ترین عبادت میدان عرفات کا وقوف ہے جس کے لئے ظہر و عصر کی نماز مختصر اور ایک ساتھ پڑھ لینے کا حکم ہے اور ظہر کی سنتیں بھی اس دن چھوڑ دینے کا حکم ہے اگر حاجی لوگ اُس دن روزہ رکھیں گے تو اُن کے لئے عرفات میں وقوف اور آفتاب غروب ہوتے ہی مزدلفہ

کو چل دنا مشکل ہو گا اس لئے حاجیوں کے لئے عرفہ کے دن روزہ رکھنا پسندیدہ نہیں ہے (بلکہ ایک حدیث میں ممانعت بھی وارد ہوئی ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے عمل سے اس (۱) کی تعلیم امت کر دی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے عرفہ کے دن ٹھیک اس وقت جب کہ آپ میدان عرفات میں اپنے اونٹ پر تھے اور وقوف فرما رہے تھے سب کے سامنے دودھ نوش فرمایا تاکہ سب دیکھ لیں کہ آج آپ روزہ سے نہیں ہیں۔

غیر حاجیوں کے لئے یوم عرفہ کا روزہ دراصل اس دن کی ان رحمتوں اور برکتوں میں شریک اور حصہ دار ہونے ہی کے لئے ہے جو عرفات میں حجاج پر نازل ہوتی ہیں اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اللہ کے جو صاحب ایمان بندے حج میں شریک نہیں ہیں وہ اس پورے دن روزہ رکھ کر اس دن کی خاص رحمتوں اور برکتوں میں کسی درجہ کا حصہ لے لیں، اسی طرح یوم النحر یعنی بقرعید کے دن غیر حاجیوں کو قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا راز بھی یہی ہے، واللہ اعلم۔

یوم عاشوراء کا روزہ نفلی روزوں میں اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ رمضان مبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے وہی فرض تھا، جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی اور صرف نفلی درجہ رہ گیا۔ اس کے بارہ میں احادیث آگے مستقل عنوان کے تحت انشاء اللہ درج ہوں گی۔



مؤتمر اسلامی

مقالہ سوم

اسلام اور اجتماعی انصاف

جناب احمد ذکی یمانی

(وزیر پٹرول و معدنیات مملکت سعودی عرب)

آج سے چودہ سو سال پہلے عالم بشریت پر خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا، جس میں انسان کا نہ کوئی احترام تھا اور نہ اسے آزادی کی نعمت میسر تھی۔ جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا اور نفسانی خواہشات اور استبداد کا سکہ چلتا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی بہتری منظور ہوئی اور اس نے اس خطۂ ارض کو جو سب سے زیادہ تاریک تھا، اس غرض کے لیے منتخب فرمایا کہ وہاں ایک ایسی شمع ہدایت روشن کرے، جس سے ساری دنیا نور حاصل کرے اور اس طرح وہ انسان کو اس کی عزت و آزادی واپس لوٹائے اور عدل و انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر ایک اچھا معاشرہ وجود میں لائے۔

غرض ایک معجزہ بروئے کار آیا۔ سرزمین مکہ اور اس کے گرد و پیش کے معاشرے، جہاں نسب پر عزت و شرافت کا مدار تھا اور عیش و عشرت میں غرق آقاؤں کی خدمت میں غلام مشقتیں اٹھاتے تھے، ایک نئے معاشرہ کی شکل اختیار کرلی جس میں انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر تھے۔ اور وہ سب مل کر اس طرح ایک جسم بن گئے کہ اگر اس کے ایک حصے کو کوئی شکایت ہوتی تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا۔

ہماری آج کی دنیا ایک مہلک حیرت و اضطراب اور گھپ اندھیرے میں زندگی گزار رہی ہے، صنعت و حرفت کی تمام روشنیاں ان اندھیروں کو دور کرنے سے عاجز اور اہل دنیا کو اطمینان قلب اور حقیقی آزادی واپس دلانے سے قاصر ہیں۔ کینہ ور شیوعیت (کمیونزم) کی افراط اور

مستبد سرمایہ داری کی تفریط کے درمیان انسان اپنا احترام کھو چکا ہے۔ اور اقوام عالم اصلاح احوال کے لیے جو بھی تجربے کرتی ہیں، ان سے حالات اور بھی خراب اور بدتر ہو جاتے ہیں، آج عقلا اور دانش مند اسی نازک صورت حال پر غور کرنے میں مصروف ہیں۔ اور ان کے سامنے معاشرے کے ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے اور متضاد گروہوں کی باہمی طبقاتی کشمکش کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اجتماعی ظلم کا ہمہ گیر مسئلہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے فرض کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس ضمن میں لوگ اپنے منافع دیکھیں اور باہم مل کر اپنے مشکلات کے بارے میں صلاح و مشورہ کریں۔ ہم سب کے سب اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں کہ اس اجتماعی ظلم کے مسئلے پر غور کریں جس کی جڑوں نے ہر جگہ پھیل کر سرطان کی شکل اختیار کر لی ہے، اور اس کی جو بھی دوا کی جاتی ہے اس سے مرض اور بڑھتا ہے۔

ہم یہاں مکہ میں ہیں جو منبع ہدایت اور مصدر نور ہے۔ اس لیے یہاں ہم سے یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ ہم دوسروں کی طرح ان تجربوں کی طرف رجوع کریں جو ناکام ہو چکے ہیں۔ یا کم از کم ان کی کامیابی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی۔ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے کہ انہی چیزوں کو باہر سے درآمد کریں اور ان کے اجنبی ہونے اور ان کے نقصانات کے باوجود یہاں انھیں نافذ کرنے لگ جائیں۔ دراں حالیکہ ہمارے پاس ایک کامیاب تجربہ موجود ہے جس کا ہم سے قریب ترین تعلق ہے۔ یعنی ہم اس کے ہیں اور وہ ہمارا ہے "کِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ مِنْ لَّدُنْ عَزِيْزٍ حَكِيْمٍ (یہ کتاب ہے جس کی محکم آیات ہیں اور زبردست اور حکمت والے کی طرف سے نازل ہوئی ہے) اور وہ شریعت ہے جس نے ایسا نظام عدل و انصاف قائم کیا جو فرد کے احترام و آزادی کا محافظ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے جماعت کا سرگرم خادم بناتا ہے۔ اس نظام میں نہ فرد جماعت پر مسلط ہوتا ہے اور نہ جماعت میں اس کی ذات فنا ہوتی ہے۔ البتہ جب جماعت کی مصلحتوں سے اس کی ٹکر ہو تو اس وقت بے شک فرد کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک آج ہمارے لئے اس مسئلہ سے بڑھ کر جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے کوئی اور مسئلہ نہیں اور کسی دوسرے مسئلے کا حل تلاش کرنا اس سے زیادہ ضروری نہیں۔ لیکن یہ حل ہمارے دین اور ہماری تاریخ سے اخذ ہونا چاہیے۔ ہم نے اگر یہ نہ کیا تو جو امانت ہمیں دی گئی ہے وہ گویا ہم نے ضائع کردی اور مسلمان اقوام کو طوفان کے حوالے کردیا کہ وہ انھیں بہا کرلے جائے۔ اور مچھلیاں ان کو نگل جائیں۔

مگر اس سلسلے میں صرف اتنا کافی نہیں کہ ہم لوگوں سے یہ کہہ کر کہ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اسلام کو عملی جامہ پہنایا جائے اور اس کے اوامر و احکام کی پیروی کی جائے، اپنے ملکوں کو لوٹ جائیں۔ جہاں پریشاں حال انسانوں کی چیخیں اور بھوکوں کی آہیں ہمارے کانوں سے آآ کر ٹکرائیں اور ہمارے پاس کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہ ہو جسے ہم اپنی قوموں کی مشکلات کے حل کے طور پر پیش کرسکیں۔ ان حالات میں ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام سے ایسے احکام کا استنباط کریں، جن سے موجودہ مشکلات کا علاج ہوسکے۔ اس کے بعد احکام کی تطبیق کے لئے عملی نظر سے غور و فکر کیا جائے پھر ہم خود کو ان احکام الٰہی پر عملدرآمد کے لئے کمربستہ کریں۔ اور اس راہ میں نہ ہمیں جانوں کی پروا ہو اور نہ مال کی۔

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ اسلام نے اجتماعی ظلم دفع کرنے اور عدل کو وجود میں لانے کے لئے، جو وسائل تجویز کئے ہیں میں ان پر اس قدر سیر حاصل بحث کرسکتا ہوں کہ جس سے آپ کے سامنے ان مشکلات کا پورا حل اپنی عملی شکل میں سامنے آسکے یہ چیز میری وسعت سے باہر ہے اور میری حقیر معلومات اس سطح تک پہونچنے سے قاصر ہیں۔ لیکن مجھے جب اس اہم موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو یہ بھی پسند نہ ہوا کہ اسے قبول نہ کروں۔ میں شاید اس میں حصہ لے کر اتنا تو کرہی سکتا ہوں کہ جن حضرات کو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم اور لوگوں کی مشکلات کا تجربہ ہے ان کے سامنے غور و فکر کا ایک دروازہ کھول دوں۔ تاکہ ان امور پر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ گفتگو ہوسکے۔ پس میں مسئلہ کو اور صرف اس کے بنیادی پہلوؤں کو پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں اور اس کے بعد عمل کی طویل گفتگو آپ کے لئے چھوڑتا ہوں

زیر بحث موضوع

اجتماعی ظلم کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک ظلم تو وہ ہے، جس کا نشانہ فرد بنتا ہے یہ ظلم فرد کی شخصیت کو ختم اور اس کی آزادی و احترام کی نفی کردیتا ہے۔ اور یہ سب جماعت کے نام اور مصلحت عامّہ کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرد کی طاقت

مل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں مردہ اور اس کا جوش پژمردہ ہو جاتا ہے اور وہ جماعت کے لئے سی کام کا نہیں رہتا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو آج انتہا پسند اشتراکی نظاموں کے زیر سایہ پائی جاتی ہے اسی طرح غیر اشتراکی نظاموں میں بھی فرد کو رنگ، مذہب اور قومیت کی بنیاد پر عزت و آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور جماعت اپنے ایک جزو کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے، اس کی صلاحیتوں اور نوتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور فرد اس امتیازی سلوک اور محرومی کے مصائب اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کے برعکس یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ جب فرد کی ہوسناکیاں جماعتی مصالح سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں تو خود جماعت ہی ظلم کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس نظام میں اجارہ داری کا دور دورہ ہوتا ہے مزدوروں کا خون چوسا جاتا ہے۔ لوگوں سے ان کی روزی چھین لی جاتی۔ اور یوں دولت چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہو جاتی ہے۔ غالب اکثریت مصیبتیں اٹھاتی اور اقلیت عیش کرتی ہے۔ معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور آئے دن کی شورشوں اور انقلابوں کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو استحصال پسند اور غیر متوازن سرمایہ دارانہ نظاموں میں سامنے آتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں ہی بیک وقت اجتماعی ظلم کا نشانہ بن جاتے ہیں جبکہ جماعت پر کوئی ایسا فرد مسلط ہو جاتا ہے جو اپنی ہوا و ہوس پر جماعتی مصلحتوں کو قربان کرے اور اس کی خاطر لوگوں کی عزت و آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اجتماعی ظلم کا مبدا و مصدر مال ہے۔ اور یہ کیفیت اس وقت رونما ہوتی ہے جب فرد اور جماعت حریف ہو کر تراز و کے دو پلڑوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور پلڑا کسی ایک طرف جھک جاتا ہے۔ اس مفروضہ پر جو جو علاج بھی اس سلسلے میں تجویز کئے جاتے ہیں وہ نہایت تنگ اور خالص مادی نقطۂ نظر پر مبنی ہوتے ہیں۔ انھیں علاج نہیں بلکہ ہنگامی عمل کہنا چاہیے کہ علم کا تو طوفانی ظلم سے اور حرص و طمع کا علاج کینہ پروری سے کیا جاتا ہے۔

اس بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے بھی بے شک مال و دولت کو خاص اہمیت دی ہے۔ اور اس پہلو سے اپنی خصوصی توجہ اس پر مبذول کی ہے کہ اجتماعی ظلم کا ایک بڑا سبب مال ہی ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ سے مختلف طریقوں سے نمٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے پیش نظر سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ فرد اور جماعت کے یہ جو دو پلڑے ہوتے ہیں، ان کو برابر رکھا جائے۔ اور اگر دونوں

کسی ایک کا جھکنا ناگزیر ہو، تو وہ پلڑا اجماعت کا ہو۔ اسلام کے نزدیک اجتماعی عدل و انصاف کے معنی صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو مساوی حیثیتیں ملیں اور اس طرح اقتصادی ناہمواری نہ پیدا ہو سکے، جیسا کہ کمیونزم کا تصور ہے، اور جو اس تصور کی تطبیق میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام ایک ایسی انسانی مساوات چاہتا ہے، جو بہت سی قدروں کی جامع ہو۔ اور ظاہر ہے ان قدروں میں سے یقیناً ایک قدر خالص اقتصادی بھی ہوگی۔ جس کے مطابق سب کو ایک سے مواقع حاصل ہوں اور سب افراد اپنی عملی صلاحیتوں کے اظہار میں آزاد ہوں۔

اسلامی عدل اجتماعی کے اسی وسیع نقطۂ نظر کی بنا پر صرف جماعت اور افراد کے حقوق کی حفاظت کرنے والے قوانین کا نافذ کر دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے پہلے اور پھر اس کے ساتھ اس پرجوش اسلامی دعوت کی ضرورت ہے، جس سے معاشرہ کا انداز فکر عادلانہ بنے اور محبت و اخوت کی گرمی جاری و ساری ہو جائے۔ کیوں کہ ہمہ جہت عدل و انصاف صرف اسی طاقت سے وجود میں آسکتا ہے۔

بہر حال میں اس مقالے میں اولاً "حق ملکیت" سے بحث کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ عدل اجتماعی کی بحث میں یہ سب سے پہلا اہم مسئلہ ہے۔ پھر "مساوات" کے بارے میں اسلام کا موقف پیش کروں گا۔ اس کے بعد تیسری بحث "اجتماعی کفالت" کی ہوگی اور پھر "خاتمہ" میں اس بحث کے نتائج آپ کے غور و فکر کے لئے پیش کرنا چاہوں گا۔

۱۔ مال

حق ملکیت اور افراد کے حقوق دولت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بڑا عادلانہ اور دانش مندانہ ہے۔ سب سے پہلے تو وہ انفرادی ملکیت کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اس ملکیت کو اتنا ہی قابل احترام سمجھتا ہے، جتنا انسانی جان کو (۱)۔ وہ صاحب مال کو مال کی حفاظت کا ہر طریقہ سے حق دیتا ہے جس میں قتال بھی شامل ہے۔ اگر مال کا مالک اس کی حفاظت کرتا ہوا جان دے دے، تو شہید ہوگا (۲)، اگر اس کے مال پر چور دست درازی کرے، تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا (۳)، یا اگر کوئی شخص اس کے مال کو غصب کرے تو وہ

اللہ کے غضب کا مستحق ہوگا (۴)۔

ایک فرد اگر شرعاً جائز طریقوں سے مال حاصل کرتا ہے۔ تو وہ اسے بلا کسی روک ٹوک کے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے (۵) تاکہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے آثار ظاہر ہوں (۶) بلکہ اس بارے میں کنجوسی ممنوع ہے اسی قدر جس قدر فضول خرچی (۷)، وہ اس مال کو شرعاً جائز طریقوں سے افزائش مال کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے جماعت کے مفادات و مصالح پر زد نہ پڑے جب صاحب مال کا انتقال ہو جائے تو اس کی متروکہ ثروت اس کے عزیزوں اور وارثوں پر تقسیم ہوگی۔ اور دولت کو ایک جگہ جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (۸)

اسلام میں ملکیت کا تصور اسلام کی نگاہ میں "ملکیت" ایک نیابت، اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اسلام نے انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور اسے ہر طرح کی ضمانت دی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس نے مال کے مالک کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس دینی اساس کو اچھی طرح سے سمجھ لے، جس پر کہ اس کی ملکیت قائم ہے اور اس اہم مقصد کو جانے جس کی بنا پر اسے ملکیت میں تصرف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ صاحب مال کے اندر ایسی نفسیاتی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ طمع و حرص سے بچ کر اس اجتماعی فریضہ کو ادا کر سکے، جو بحیثیت مال کے مالک کے اس پر عائد ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ مال کا اصلاً مالک اس کا دنیاوی مالک نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت تو محض ایک نائب اور وکیل کی ہے اصل مالک تو اللہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے للہ ما فی السموات وما فی الارض (۹) (جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، وہ سب اللہ کا ہے) اللہ نے اپنے بندوں کو اس ملکیت کے استعمال کے لئے نائب بنایا ہے۔ "امنوا باللہ و رسولہ و انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ" (۱۰) (ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جس مال میں اس نے تم کو نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو) قرآن مجید میں جہاں غلاموں کی مکاتبت کا ذکر ہے، وہاں فرمایا گیا ہے۔ "واتوھم من مال اللہ الذی اتاکم" (۱۱) (اللہ کے مال میں سے جو اس نے تمہیں دیا ہے، انہیں دو) گویا جن کے پاس مال ہے ..... وہ محض واسطہ ہیں۔ مال تو اللہ کا ہے۔ اور انہیں اللہ نے اس مال پر اپنا نائب و وکیل بنایا ہے

یہ ہے اسلام کے نزدیک ملکیت کی دینی اساس۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چیز مالک کے حق تصرف میں عملاً کوئی رکاوٹ بنے۔ ہاں اس حالت میں یہ چیز ضرور رکاوٹ ہے جبکہ فرد شرائط وکالت کی خلاف ورزی کرنا چاہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ملکیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملکیت شئے اور ایک ملکیت منفعت۔ اب مذکورۂ بالا اصول پر شئے کا مالک تو حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ ہوگا۔ اور منفعت کی ملکیت مالک کو حاصل ہوگی یعنی وہ مال و دولت میں آزادی کے ساتھ تصرف کرے جیسے کہ وقف کے متولی کو اختیار ہوتا ہے الا یہ کہ وہ واقف کے شرائط کی خلاف ورزی کرنے لگے۔

حق ملکیت کے استعمال پر پابندیاں شریعت اسلامی پہلا قانون ہے جس نے انفرادی حقوق کے استعمال پر ایسی پابندیاں عائد کی ہیں کہ اس سے دوسروں کو نقصان نہ پہونچے اور اس طرح صاحب مال کے اختیار کو محدود کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے بہت سے مقامات میں اس سلسلے میں اور دیگر حقوق کے معاملات میں زیادتیوں کے ارتکاب سے بچا ہے۔ خاص طور سے وصیت، طلاق اور دوسروں سے اپنا حق طلب کرنے جیسے معاملات میں زیادتی کرنے کی سخت ممانعت آئی ہے (۱۲)

حنفی اور مالکی مذہب اس سلسلے میں فقہ اسلامی کے دو مذہبوں (حنفی اور مالکی) نے جو احکام و قواعد بیان کئے ہیں ان سے ظلم و زیادتی اور عدل و انصاف کے درمیان ایسی واضح حد بندی ہو جاتی ہے جو دوسرے قانونی نظام میں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی دور حاضر کی قانونی فکر کو اس کی باریکی تک رسائی ہوئی ہے۔ ان دونوں مذہبوں میں حسب ذیل تین اصولوں کو بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔

۱۔ نہ خود نقصان اٹھایا جائے نہ دوسرے کو پہونچایا جائے۔

۲۔ دو برائیوں میں ایک برائی اختیار کرنا ناگزیر ہو تو کمتر برائی کو اختیار کیا جائے۔

۳۔ جماعتی مصلحت کو انفرادی مصلحت پر مقدم رکھا جائے۔

ہم دونوں مذہبوں کے احکام کی روشنی میں انفرادی حقوق پر تین پابندیاں ضروری قرار دے سکتے ہیں

۱۔ کسی حق کو صرف اسی غرض کے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہے جس غرض کے لئے وہ حق ملا ہے۔ امام مالک نے اسی اصول کو احوال شخصی کے مسائل پر منطبق کیا ہے۔ خاص کر نابالغ اولاد

کے مال پر باپ کی تولیت کے مسئلے میں (۱۴) اور باپ کے اس حق میں کہ وہ نابالغ لڑکی کا نکاح اسکی اجازت کے بغیر کرسکتا ہے (۱۵) نیز اس حق میں کہ وہ بالغ لڑکی کے نکاح پر معترض ہوسکتا ہے (۱۶) امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ ولی کے ان حقوق سے زیر ولایت افراد کی مصالح کا تحفظ مقصود ہے پس اگر ولی ان کی مصلحت کے خلاف کام کرتا ہے تو وہ قابل رد ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) نے اسی بنیادی اصول کو نابالغ پر حق ولایت اور نکاح کے لئے کسی وکیل کی ولایت عامہ کو محدود کرنے میں بھی استعمال کیا ہے۔ اگرچہ اس ذیل میں نکاح کے لئے وکالت عامہ کی بعض شکلوں میں امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اس اصول کے انطباق میں اختلاف بھی واقع ہوا ہے۔ جیسے امیر کسی شخص کو حکم دے کہ کسی (غیر متعین) عورت سے اس کا (امیر کا) نکاح کردیا جائے اور وہ شخص اس حکم سے فائدہ اٹھاکر کسی کی باندی کو امیر کے عقد میں دیدے تو امام صاحب کے نزدیک یہ جائز ہوگا۔ لیکن صاحبین کے نزدیک عورت کا کفو ہونا ضروری ہے (۱۷)

۲۔ کسی حق کا استعمال اگر عام عادت کے خلاف دوسروں کے لئے باعث ضرر ثابت ہو تو اُسے غیر قانونی قرار دیا جائے گا۔

امام مالک نے اس اصول کو عمومی حیثیت سے پڑوس کے تعلقات کی تنظیم (۱۸) مکانوں کی کھڑکیاں کھولنے سے پیدا ہونے والے مخصوص تنازعات کی بندش (۱۹) مشترک اموال کی تقسیم (۲۰) اور غیر آباد زمینوں پر قبضہ گیری (۲۱) کے مسائل میں استعمال کرتے ہوئے فیصلہ دیا ہے کہ ان معاملات میں جائز حقوق کے استعمال سے اگر عام عادت کے خلاف کسی کو ضرر پہونچے تو صاحب حق کو اپنے حق کے استعمال سے روکنا واجب ہوگا۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین نے اسی اصول سے کئی منزلہ مکانات کے مالکوں کے حقوق و فرائض کی تعیین، موکل کی غیر موجودگی میں وکیل کو اس کی وکالت سے دست بردار ہوجانے کی ممانعت اور کسی آجر کے اس حق کو مشروط کردینے میں کام لیا ہے کہ وہ اجیر سے کیا ہوا معاملہ فسخ کرسکتا ہے (۲۲) ان کے نزدیک یہ حق کسی عذر ہی پر مبنی ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی معقول عذر نہیں ہے تو اس حق کا استعمال ظلم قرار دیا جائے گا۔

۳۔ کسی ایسے حق کے استعمال کی اجازت نہیں دی جا سکتی جس کا مقصد خود کوئی فائدہ اٹھانا نہ ہو بلکہ دوسرے کو نقصان پہونچانا ہو۔

امام مالک نے اس اصول کو خاص طور پر پڑوسیوں کو اپنی ملکیت کے کسی ایسے استعمال سے باز رکھنے میں استعمال کیا ہے جس سے محض دوسرے پڑوسی کو ضرر ہو خود کو کوئی نفع نہ ہو (۲۳)، امام ابو حنیفہ نے بھی اس سے ایسے ہی مسائل میں کام لیا ہے۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، اس اصول کی تطبیقات (مثالوں) سے بھری ہوئی ہے جن میں سب سے اہم چیز یہ ملتی ہے کہ امام ابو یوسف غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کے معاملے میں عام افراد کے علاوہ حکومت کو بھی اس شرط کا پابند کرتے ہیں کہ اس حق کے استعمال سے کسی دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ (۲۴)

اوپر جو کچھ مذکور ہوا، اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حقوق اور ان کے استعمال کے متعلق حنفیہ اور مالکیہ کا نقطۂ نظر آپس میں ملتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر حق سے ایک غرض اور مقصد وابستہ ہوتا ہے جسے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر صاحب حق اس مقصد کی خلاف ورزی کرتا ہے اور وہ اپنے اس حق کو دوسروں کی ضرر رسانی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا ایسا کرنا ظلم اور زیادتی سمجھا جائے گا اور اس حق کا کوئی قانونی جواز نہیں رہے گا۔ مگر امام شافعی اس نظریہ کے کلی الاطلاق حامی نہیں ہیں۔

امام شافعی کا مسلک امام شافعی کے نزدیک صاحب حق اپنے حقوق میں علی الاطلاق مختار ہے وہ جیسے چاہے، اسے استعمال کر سکتا ہے خواہ اس میں اسے کوئی فائدہ نہ ہو، یا دوسروں کو اس سے نقصان پہونچے۔ لیکن بعض قرآنی احکام اور مستقل عادات کے آگے وہ بھی مجبور ہوئے کہ اپنے اس اصول کو مطلق نہ رہنے دیں (۲۵)، اور ان کے بعد انکے جو شاگرد آئے، انھوں نے امام صاحب کی اس رائے سے بہت زیادہ اختلاف کیا اور اس بارے میں حنفیہ اور مالکیہ کے مسلک پر چلے۔ امام شافعی کی اس رائے کے خلاف جو افراد ہیں سے جن حضرات نے لکھا ہے ان میں اہم ترین شخصیت امام غزالی ہیں۔ انھوں نے نکاح، طلاق، معاہدہ اور پڑوسی غیرہ کے حقوق پر ان کے اجتماعی مقاصد کی روشنی ہی میں بحث کی ہے۔ (۲۶) متاخرین میں سے اس نظریہ کے قواعد وضوابط کے اثبات میں ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے

امام شافعی کی رائے کی مخالفت کی کیونکہ یہ رائے ظلم کی موجب اور عدل وانصاف کے منافی ہے (۲۷) چنانچہ نویں صدی ہجری کے فقہاء کے ہاں تقریباً یہ رائے عام طور پر تسلیم کی جانے لگی کہ حق کے استعمال میں دوسروں پر ظلم وزیادتی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے (۲۸)۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ کی اکثر دفعات میں اس نظریہ کی تطبیقات ملتی ہیں (دفعات ۱۱۹۸ - ۱۲۱۲)۔ اسی طرح قدری پاشا مرحوم نے اپنی کتاب الاحوال العینیہ میں اس نظریہ کی بعض تطبیقات بیان کی ہیں (دفعات ۵۷-۵۹)۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے حق کے استعمال میں ظلم وزیادتی کے ارتکاب کے اس نظریہ کو جیسا کہ وہ شریعت میں ہے، مصر میں داخل کیا گیا ہے

اسلام کا نظریہ ملکیت اور یورپی ماہرین قانون

یورپ کے ماہرین قانون میں سے جو لوگ اسلام کے نظریہ ملکیت، اس کے مقاصد اور انفرادی حقوق کے استعمال پر اس کے عائد کردہ قیود سے متاثر ہوئے، ان میں سے ایک، فرانسیسی پروفیسر دوجی ہیں۔ موصوف ایک عرصہ تک قاہرہ میں لا کالج کے پرنسپل رہے تھے۔ اور ظاہر ہے اس دوران میں ان کا مصر کے علماء وفقہاء سے ملنا جلنا رہا۔ پروفیسر دوجی نے اپنا "تکافل اجتماعی" (اجتماعی کفالت) کا مشہور نظریہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ملکیت کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ ایک اجتماعی عمل ہے۔ بعد ازاں انھوں نے اس کی بالکل اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تشریح کی ہے۔ پروفیسر موصوف کا یہ نظریہ مغرب میں خوب مقبول ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں "انقلاب اکتوبر" ہوا، تو ملکیت کے بارے میں بالشویکوں کے اپنے جو نظریے تھے، وہ حقیقت واقعی کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور وہ انھیں روس کے اس وقت کے حالات میں منطبق کرنے میں ناکام رہے۔ انقلاب کے پانچ سال بعد لینن مجبور ہو گیا کہ وہ بعض بورژوائی قوانین ملکیت کو بحال کرے تاکہ ان کو شیوعت کی منزل تک پہونچنے سے پہلے کے عبوری دور میں نافذ کیا جائے۔ اسے N.E.P. (نیو اکنامک پالیسی) کا نام دیا گیا۔ لینن نے اپنی اس پالیسی کی تشکیل میں پروفیسر دوجی کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ اس کا خود بہت سے روسی ماہرین قانون نے اعتراف کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے ان تحریروں سے پھر گئے ہیں (۲۹)۔ لینن کے اس قانون کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ یہ قانون شہری حقوق کی حفاظت کرتا ہے، سوائے ان حالات کے جب کہ انھیں اجتماعی واقتصادی اغراض کے خلاف استعمال کیا جائے

لیکن اس سب سے قطع نظر جس کی بنا پر اسلامی شریعت اور سوویت روس کے قانون کی اس دفعہ میں مشابہت پائی جاتی ہے اس سے جو نتائج نکلے وہ ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کی بالشویک سرزمین اسلامی فکر کے لئے سازگار نہیں ہے جیسے کہ وہ زاویۂ نظر جس سے روس معاملے کو دیکھتا ہے، شریعت اسلامی کے زاویۂ نظر سے مختلف ہے مسلمانوں کے ہاں اصل نقطۂ نظر یہ ہے کہ ملکیت کی کامل حفاظت کی جائے جبکہ بالشویک نظریہ بالکل علی العکس ہے۔ وہ سرے سے ملکیت کا ہی انکار کرتے اور اسے اصلاً باطل قرار دیتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب انھیں حقائق واقعی مجبور کرتے ہیں، تب وہ ملکیت کو اس شرط کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا استعمال اجتماعی و اقتصادی اغراض کے لئے ہو۔

بہرحال یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۲۳ء میں پیش کی ہوئی لینن کی عارضی اسکیم اب ایک مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ لینن کے بعد روسی لیڈروں نے اس میں اور بھی توسیع سے کام لیا ہے اور اس طرح ہر نئے سال میں بالشویک نظام کی ناکامیوں سے پردہ جلد اٹھتا جا رہا ہے۔ آج ایک شخص پورے وثوق کے ساتھ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ اس وقت کا عملی روسی نظام مارکس کے بالشوزم سے بے حد جدا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں ہے جب شیوعیت کے خواب کو آخری شکست نصیب ہوگی کیسے خبر ہے کہ یہ بعید ترین راہ سے گزرتا ہوا قافلہ ان ناکامیوں کے نتیجے میں اس اسلامی طرز فکر ہی کو نہ اپنا لے جس کا بیج بہرحال اس کے ذہن میں پڑ چکا ہے اگر ایسا ہوا تو یہ اسلام کے معجزوں میں سے کوئی انوکھا معجزہ نہ ہوگا۔ ——— باقی

حوالے

مضمون میں حاشیوں کے نشانات (ہندسے) حوالوں کیلئے ہیں۔ اس قسط کے حوالے درج ذیل ہیں

۱۔ ایھا الناس ان دماءکم واموالکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم ھذا وکحرمۃ شھرکم ھذا۔ (اے لوگو بے شک تمھارے خون اور تمھارے اموال تم پر تا قیامت حرمت ہیں یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملو ایسے ہی قابل حرمت جیسے یہ دن اور جیسے یہ مہینہ) ۲۔ من قتل دون مالہ فھو شھید (اخرجہ النسائی) (جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے) ۳۔ والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا۔ نکالا من اللہ (القرآن: المائدۃ) (چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دو یہ سزا ہے اللہ کی طرف سے ان کے اس فعل کی جو انھوں نے کیا)

۴۔ من اقتطع مال امری مسلم بغیر حق لقی اللہ عزوجل وھو علیہ غضبان۔ (مسند امام احمد) (جس نے

کسی مسلمان کا بغیر حق کے مال لے لیا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس پر ناراض ہوگا ۵۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق (القرآن الاعراف) (اے نبی کہہ دو کس نے اللہ کی قائم کردہ زینت چیزوں کو جو اس نے بندوں کیلئے پیدا کیں اور روزی کی اچھی چیزوں کو حرام ٹھہرایا) یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد (القرآن الاعراف) اے بنی آدم ہر نماز کے وقت زینت اختیار کرو۔ ۶۔ اذا اتاک اللہ مالا فلیرا ثرتہ اللہ علیک وکرامتہ (ابوداؤد ونسائی) جب اللہ تعالیٰ تمہیں مال دے تو اللہ کی نعمت اور تکریم کا تم پر اثر دیکھا جانا چاہیے۔ ۷۔ ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا (القرآن، الاسراء) اور نہ اپنا ہاتھ گردن سے ہی باندھ لینا چاہیے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے ورنہ الزام خوردہ اتھی دست ہو کر بیٹھ رہو گے ۸۔ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔ (القرآن: النساء) ماں باپ اور قرابت دار جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں سے مردوں کیلئے حصہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے جو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں ۹۔ للہ ما فی السموات وما فی الارض (القرآن) اللہ ہی کیلئے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمینوں میں ۱۰۔ القرآن سورۃ الحدید ۷۔ ۱۱۔ القرآن سورۃ النور ۳۳۔ ۱۲۔ .....

۱۳۔ وصیت کے بارے میں آیت ہے:۔ من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین غیر مضار وصیۃ من اللہ واللہ علیم حلیم۔ (البقرہ) طلاق کے حق کے بارے میں آیت ہے:۔ الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان، (ناحق طلب کرنے کے بارے میں آیت ہے:۔ ولا تاکلوا اموالکم بالباطل وتدلوا بہا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ۱۴۔ المدونۃ الکبریٰ للامام مالک (امام عبدالرحمن بن القاسم سے امام سحنون کی روایت۔ جزو ۱۴ ص ۱۹۹) ۱۵۔ المدونۃ الکبریٰ جزو ۴ ص ۵۔ ۱۶۔ ایضاً ص ۱۴۔ ۱۷۔ کتاب الخراج، امام ابو یوسف وہامشہ الجامع الصغیر محمد حاشیہ ص ۳۳۔ ۱۸۔ المدونۃ الکبریٰ جزو ۴ ص ۲۳۵۔ ۱۹۔ ایضاً جزو ۱۵ ص ۱۹۷۔ ۲۰۔ ایضاً جزو ۴ ص ۲۳۱ ۲۱۔ ایضاً جزو ۱۵ ص ۱۹۵۔ ۲۲۔ کتاب الخراج حاشیہ ۱۰۲، ۱۰۳۔ ۲۳۔ المدونۃ الکبریٰ جزو ۱۵ ص ۱۹۴، ۱۹۵ ۲۴۔ کتاب الخراج ص ۵۳۔ ۲۵۔ کتاب الام، امام شافعی جزو ۵ ص ۱۸۹، ۲۰۱، ۲۱۱۔ ۲۶۔ احیاء علوم الدین، امام غزالی، جزو ۲ ص ۱۴، ۲۵، ۳۵، ۳۶، ۴۸، ۲۱۳۔ ۲۷۔ اعلام الموقعین، امام ابن القیم جزو ۳ ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ ۲۸۔ ابن عابدین۔ رد المحتار علی الدر المختار پر حاشیہ الزیلعی (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق)

صرف مسائل کا مشترک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان مسائل کے لئے جدوجہد کے بارے میں سب کا انداز فکر بھی ہم آہنگ ہونا چاہیئے تو یہ ایک معقول بات ہوتی، اور اس بنا پر جمعیۃ اگر عہدہ کر دیتی تو اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس نے اس جرأت اور صاف گوئی کے بجائے یا اس لئے کہ رہنمایان جمعیۃ کے ذہن میں یہ نظریاتی بات اس وقت مضبوط شکل میں تھی ہی نہیں (اس صاف گوئی کے لئے معاف رکھا جائے) ایک مذموم شکل اختیار کی۔ اس نے دل میں عدم اشتراک کا تہیہ رکھا اور اس پر عمل کیا، لیکن اوپر سے اشتراک پر رضامندی کا لبادہ بھی اوڑھ لیا اور کوشش یہ کی کہ اس لبادے کو اس پر اتارنے کی ذمہ داری دوسرے اپنے سر لے لیں، لیکن جب یہ نہوا تو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے یا اسے نباہنے کے بجائے اس انداز سے اپنا دامن چھڑایا کہ نہ تو ملت کے اندرونی مصالح کی کوئی پرواہ کی اور نہ خارجی نزاکتوں کا کوئی لحاظ!

بہرحال جمعیۃ نے مجلس سے علیحدگی اختیار کرلی، اور چاہے اسے صرف برسراقتدار گروہ کی علیحدگی کہا جائے لیکن جب تک وہ گروہ برسراقتدار ہے، جو آج ہے، یہ جمعیۃ ہی کی علیحدگی کہلائے گی اور اس صورت میں مجلس کی وہ "کل ملت نمائندہ" حیثیت باقی نہیں رہ جائے گی جو اس کا بنیادی تخیل تھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ارکان مجلس معاملہ پر از سر نو غور کریں۔ مجلس جو تمام مسلم جماعتوں میں اشتراک عمل کا پلیٹ فارم بننے کے عنوان سے قائم ہوئی تھی، اس کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہوگا کہ کوئی جماعت اسے حریف کی نظر سے دیکھے، جیسا کہ جمعیۃ کی طرف سے یہ صورت پیدا ہو چکی ہے اب یا تو مجلس اپنے بنیادی تخیل میں ترمیم کر کے اسے محض اپنی موجودہ محدود حیثیت کے مطابق بنانے پر اکتفا کرے۔ یا بالکل کسی نئے تخیل پر اسکی از سر نو تنظیم کی جائے۔ یہ تخیل کیا ہو؟ یقیناً یہ مسئلہ بہت قابل غور ہے۔ مگر دونوں میں سے ایک بات بہرحال ہونا ضروری ہے۔

حضرت شاہ ابوالرضا محمد فاروقی دہلوی رح

حالات ـــ ملفوظات ـــ مکتوبات

(از ـــــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

پچھلے دنوں مجھے مکتوباتِ شاہ ابوالرضا محمد کا ایک قلمی نسخہ برائے مطالعہ دستیاب ہوا ـــ اس مجموعہ میں ۱۴۵ مکتوبات ہیں ـــ ان میں سے اکثر مکتوبات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میرا اولاً ارادہ تو یہ تھا کہ ان مکتوبات پر ہی ایک مقالہ لکھوں، بعدہٗ مناسب یہ معلوم ہوا کہ پہلے حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے حالات لکھوں ـــ حالات کے بیان کرنے میں اختصار کا لحاظ رکھنے کے باوجود اتنے صفحات ہو گئے جتنے صفحات میں مکتوبات پر تبصرہ کرنے کا قصد تھا ـــ اچھا ہوا کہ اس بہانے اس عظیم شخصیت کے ذکرِ خیر کی سعادت نصیب ہو گئی جس نے میدانِ تسلیم و رضا میں گامزن ہو کر اور راہِ فقر و درویشی اختیار کر کے ایک مثالی نمونہ قائم کیا۔ جس نے اپنے نفسِ گرم سے محفلِ فقر اور بزمِ تصوف کو گرما دیا، جس نے اپنی تمام عمر، توکل و استقامت کے ساتھ ساتھ اتباعِ سنت میں گزار دی جس نے دہلی اور اطرافِ دہلی کے تشنگانِ معرفت کو مسجد فیروز شاہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر سیراب کیا ـــ سچ پوچھئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی بزرگانہ روایات اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر بالواسطہ اس ذاتِ ستودہ صفات کے فیوض و برکات کا نمایاں اثر پڑا اور ان دونوں شخصیتوں کی تعمیر میں اس درویشِ حق آگاہ کی سیرت کو بھی بہت کچھ دخل ہے ـــ میں نے یہ حالات انفاس العارفین، نزہۃ الخواطر جلد (۷) حیاتِ ولی اور مقاماتِ اولیاء دہلی سے اخذ کر کے

ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔

حضرت شاہ ابوالرضا محمد دہلویؒ، حضرت شیخ وجیہ الدین فاروقی شہیدؒ کے صاحبزادے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے برادر کلاں تھے۔ آپ غالباً ۱۰۴۵ھ یا ۱۰۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ایک مستقل رسالہ شوارق المعرفۃ اپنے عم بزرگوار کے حالات میں لکھا ہے جو باریک قلم سے ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور انفاس العارفین میں شامل ہے۔ اس میں حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے حالات، ملفوظات، کرامات، کچھ مکتوبات اور بعض مسودات درج ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے عم محترم کا زمانہ نہیں پایا، اس لیے کہ وہ آپ کی پیدائش سے بارہ سال پہلے اس عالم فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے عم مکرم کے سوانح و ملفوظات لکھنے سے پہلے تصریح فرما دی ہے کہ مجھے یہ واقعات ایک دو واسطوں سے پہونچے ہیں، چنانچہ شوارق المعرفۃ کو اس عنوان سے شروع فرمایا ہے۔

"قسم ثانی در احوال معارف مآب امام الطریقۃ والحقیقۃ ..... مخدومنا مولنا الشیخ ابوالرضا محمدؒ"

قسم اول میں اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے وہ احوال و ملفوظات تحریر فرمائے ہیں جن کو اکثر و بیشتر براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔

تعلیم شوارق المعرفۃ میں شیخ ابوالرضا محمدؒ کی تعلیم کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ہے۔ جس سے ان کے تمام اساتذہ اور تمام کتب درسیہ کا پتہ چلتا، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حافظ بصیر دہلویؒ سے (جو عہد شاہجہانی کے بڑے جید عالم تھے) اور حضرت خواجہ عبیداللہ عرف خواجہ خردؒ ابن حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے تعلیم حاصل کی۔

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

"فی الحقیقۃ علوم ایشان ہمہ وہبیہ بودند" یعنی درحقیقت ان کے تمام علوم وہبی اور لدنی تھے۔

تجرید و توکل تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصے اپنے والد ماجد شیخ وجیہ الدین شہیدؒ کے حکم سے ایک امیر کبیر کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ وہاں آتے جاتے رہے۔ آخر کار تجرید تام اور توکل کلی کا غلبہ ہوا اور یہ ملازمت چھوڑ دی۔ بعد ازاں مسجد فیروز آباد کے ایک حجرے میں رہ کر پوری زندگی گزار دی۔

رفیقۂ حیات کی بے نظیر قربانی حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے شہرت و تواتر کے ساتھ یہ بات پہونچی ہے کہ عم بزرگوار نے جب راہ فقر کو اختیار کیا تو اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ "اے رفیقۂ حیات ہم نے جس راستہ کو اختیار کیا ہے وہ ایک دشوار گزار راستہ ہے، یقیناً اس راہ میں جو تکالیف جھیلنی پڑیں گی وہ سخت جگر خراش اور جاں گسل ہوں گی۔ مگر ہم نے تو اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس راہ کو مصائب و تکالیف کی وجہ سے نہیں چھوڑیں گے ــــ اب تمہارا مسئلہ رہ جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ ہماری حالت فقر و درویشی کے باوجود، لذیذ غذاؤں اور عمدہ لباسوں سے قطع نظر کر کے اگر ہماری رفاقت منظور کرو تو بہتر، ورنہ تمہیں اختیار ہے"۔ اس نیک بخت دیندار اور وفا شعار بیوی نے یہ سن کر اپنے تمام زیورات اتار دیئے اور معمولی لباس پہن کر اپنے شوہر کی رفاقت کا عہد کیا۔

پیر و مرشد آپ نے راہ سلوک کو کس کی رہنمائی میں طے کیا؟ اور آپ کے پیر و مرشد کون تھے؟ اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان سے جو معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اویسی المشرب تھے، براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی فیوض حاصل کیے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ عم بزرگوار خود یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ ایک درویش تھے جو حضرت شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے خلیفہ تھے اور حضرت خواجہ خردؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ان کے حالات بہت اونچے تھے، ایک دن حضرت خواجہ خردؒ نے اپنی ایک مجلس میں یہ فرمایا تھا کہ جو شخص طالب معرفت ہو اسے چاہیے کہ اس درویش سے تعلق بیعت پیدا کرے میں بھی اس مجلس میں موجود تھا جب میں نے یہ بات سنی تو میرے دل میں ان بزرگ سے

بیعت ہونے کا تقاضہ پیدا ہوا ــــ مگر میں نے ان سے بیعت نہیں کی۔

عسر کے بعد یسر جیسا کہ لکھا جا چکا مسجد فیروز آباد کے ایک تنگ حجرے میں آپ کی رہائش تھی۔ ابتدا میں اکثر ایسا ہوا کہ دو دو تین تین فاقے متواتر آئے۔ فاقوں کے بعد جو کی چند روٹیاں میسر آجاتیں تھیں اور کچھ چھاچھ نصیب ہو جاتی وہ روٹیاں محمد جان طحان اور دوسرے غریب معتقدین لے آتے تھے۔ ان روٹیوں کو آپ فقراء اور مستحقین پر مساوی تقسیم فرما دیتے اور بطور رسد رزق خود بھی کچھ تناول فرما لیتے تھے۔

کچھ عرصے تک آپ کے گھر میں چولھا، ہنڈیا، چکی وغیرہ کچھ نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ برکت تمام ظاہر فرمائی اور اپنے بندوں کے قلوب کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ ایک وسیع حویلی آپ کے اہل و عیال کے لئے تعمیر کرائی گئی اور منجانب اللہ توسیع رزق کا انتظام بھی ہو گیا۔

استغناء اُمراء و سلاطین سے کنارہ کش رہتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عالمگیرؒ جیسے دیندار بادشاہ کو بھی باوجود اُن کی درخواست کے اپنی ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ غرضکہ اُمراء و رؤسا کی طرف اُن کو بالکل التفات نہ تھا ان کے ہدایا بھی بڑی مشکل سے قبول فرماتے تھے۔ البتہ مخلص غرباء کے معمولی ہدایا جلد شرف قبولیت حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ کفش دوزی کرنے والے اور آٹا پیسنے کی محنت کرنے والے یا اسی قسم کی محنت مزدوری کرنے والے غریبوں کے چار یا پانچ پیسے بھی بڑی خوشی سے قبول فرما لیتے تھے۔

سیرت و صورت حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کے مطابق آپ قوی العلم، فصیح اللسان عظیم الورع، وسیع المعرفۃ اور نرم زبان بزرگ تھے ــ آپ کا قد لانبا، بدن بھرا ہوا تھا، رنگ میں سرخی و سپیدی کے ساتھ ایک قسم کی ملاحت بھی تھی۔ ڈاڑھی گنجان نہیں تھی۔ رخساروں پر گوشت اس قدر کم تھا کہ چہرے کی تمام رگیں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔

وعظ و درس آپ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ وعظ فرمایا کرتے تھے وعظ کا طریقہ یہ تھا کہ شروع میں تین حدیثیں زبانی پڑھتے تھے۔ خوب ٹھہر ٹھہر کر ــــ

اُن احادیث کے پڑھتے وقت مجلس و مجمع کی ہر جانب نگاہ رکھتے تھے، پھر ان حدیثوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ بعدہٗ اس زمانہ کی اردو میں بھی ترجمہ فرماتے تھے اور ان احادیث سے متعلق جو مناسب اور ضروری تشریحات ہوتی تھیں ان کو بھی بیان فرماتے تھے مگر اعتدال کے ساتھ۔ یعنی تشریحات میں نہ زیادہ طوالت ہوتی تھی اور نہ بہت زیادہ اختصار و ایجاز ہوتا تھا۔ (حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ تصریح نہیں فرمائی مگر قرینے کی دلالت سے گمان غالب یہ ہے کہ کل تقریر اردو ہی میں ہوتی ہوگی)

شروع شروع میں ہر علم کا درس دیتے تھے اور طالبانِ علوم حوق در حوق آپکی اعلیٰ استعداد اور خوبیٔ تقریر کی وجہ سے آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے تھے ــــ آخر میں فقط دو کتابوں کا درس دیتے تھے بیضاوی اور مشکوٰۃ المصابیح۔ باقی زیادہ وقت توجہ الی اللہ اور خاص مریدین سے معارف بیان کرنے میں گزرتا تھا ــــ وحدت وجود کے قائل تھے اور اس مضمون میں بقول حضرت شاہ صاحبؒ "تحقیق عظیم" رکھتے تھے ــــ اپنی مجالس میں صوفیائے کرام کی باریک باریک باتوں کی تشریح و وضاحت بھی فرمایا کرتے تھے۔

جذبۂ اتباع سنت غلبۂ عشق اور مسلک توحید وجودی کے ساتھ ساتھ اتباع سنت کا بھی انتہائی خیال رکھتے تھے ــــ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جب آپ مسجد میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے مسجد کے باہر کھڑے ہو جاتے پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالتے اور دائیں جوتے پر بایاں پاؤں رکھ کر پھر دایاں پاؤں مسجد میں رکھتے تھے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ ان دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے جن سے یہ طریقہ ثابت ہوتا ہے ــــ ایک مقام پر حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں "حضرت ایشانؒ چنداں مقید بودند کہ ہیچ ادب و سنت از ایشاں ترک نمی شد الیٰ آخر العمر" یعنی آپ شریعت کے اتنے پابند تھے کہ آخر عمر تک کوئی مستحب عمل اور سنت طریقہ آپ سے ترک نہیں ہوا۔

غلبۂ ورع و احتیاط حضرت شاہ صاحبؒ، شیخ مظفر بہکیؒ کی زبانی بیان فرماتے

ہیں کہ اوائل میں جب میں رہتک سے حضرتؒ کی خدمت میں آتا تھا تو مصری کے کچھ کوزے ہدیے کے طور پر لے آتا تھا۔ حضرتؒ ان کو قبول نہیں فرماتے تھے صرف اس احتیاط کی بنا پر کہ دیہات وقصبات کے رؤسا کی بیع وشرا قانون شرعی کے مطابق نہیں ہوتی ــــ اسکے بعد میں نے یہ کیا کہ یہ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا موقوف کر دیا، البتہ آپ کے بچوں کو مصری کے کوزے لاکر دے دیتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے حسب معمول بچوں کو کوزے دیئے بچے ان کوزوں کو لے کر آپ کی خدمت میں چلے گئے، آپ نے ان میں سے کچھ تناول فرمالیا، پھر ایک دن میری طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے تمھاری لائی ہوئی مصری کھالی تھی۔ اب ہم نے تورعات زائدہ سے دست کشی کر لی ہے آئندہ جو ظاہر شرع کا حکم ہوگا اسی پر عمل کریں گے۔

کرامات روشن ضمیری حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کی کرامات بڑی تفصیل سے لکھی ہیں اور روشن ضمیری کے بھی کئی واقعے بیان فرمائے ہیں۔ یہاں ان سب کا احاطہ مقصود نہیں، صرف ایک واقعہ اس سلسلے میں لکھا جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ عنایت اللہ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک شخص ــــ جو بڑا جید فاضل تھا اور مجادلہ ومناظرہ میں بھی پوری مہارت رکھتا تھا۔ (اور جس کی سکونت غالباً دہلی کے باہر کہیں کی تھی) ــــ مجھ سے ایک دن کہنے لگا کہ میں نے شہر دہلی کے علماء وفضلاء کو آزما لیا، یہاں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس پر میں غالب نہ آیا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ کبھی تم مجلس شیخ ابوالرضا محمد میں بھی حاضر ہوئے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے کہ شیخ ابوالرضا محمد عوام کے سامنے تفسیر حسینی کا وعظ بیان کیا کرتے ہیں اور اس سے زیادہ ان کا مبلغ علم نہیں ہے۔ میں نے کہا ایسی بات نہ کہو ان سے ملاقات تو کر لو، چنانچہ وہ جمعہ کے دن مجلس وعظ میں آیا، وعظ کے بعد اس کے دل میں یہ آیا کہ ان سے مناظرہ کروں، حضرت نے اس وقت اس کی جانب ایک خاص توجہ فرمائی، اس توجہ کا ہونا تھا کہ اس کا عجیب حال ہو گیا، صرف ونحو کا کوئی قاعدہ تک اس کے حافظے میں نہ رہا دیگر علوم کا تو کیا ذکر ہے ــــ اس نے جب اپنا یہ حال دیکھا تو ندامت کے ساتھ اظہار نیازمندی

کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا بھائی میں عالم نہیں ہوں میں تو صرف تفسیر حسینی کا وعظ عوام کے سامنے بیان کیا کرتا ہوں اس نے کہا کہ اب میں اپنے قول و اعتقاد سے توبہ کرتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہو جاؤں۔ حضرتؒ نے اس کو بیعت نہیں کیا اور یوں فرمایا کہ جن تختیوں پر نقوش قائم ہو جاتے ہیں پھر وہ کام میں نہیں آتی ہیں۔

ملفوظات آپکے بہت سے ملفوظات حضرت شاہ صاحبؒ نے نقل فرمائے ہیں جو آپ کی علمی و روحانی بلندی کو ظاہر کرتے ہیں ان میں سے چند ملفوظات یہاں لکھتا ہوں۔

(۱) فرمایا ـــــ سب سے اچھی ریاضت، کھانے پینے میں توسط و اعتدال اختیار کرنا ہے ـــــ دوام توجہ کے ساتھ ـــــ یہاں تک کہ دوام توجہ ملکہ بن جائے۔

(۲) فرمایا ـــــ جب حضوری کی کیفیت جاگزیں ہو جاتی ہے تو پھر وہ گفتگو کرنے یا اسی طرح کے مشاغل سے زائل نہیں ہوتی ہاں اگر علوم دقیقہ کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہوگا تو ایک خفیف سا حجاب ضرور واقع ہو جائے گا۔

(۳) فرمایا ـــــ ایک عارف کو یہ بات نہ چاہیے کہ دوسرے عارف کے مرید کو اپنی طرف مائل کرے اور اس کی توجہ اپنے شیخ کی طرف سے پراگندہ کرے، وہ مرید خوشامد و اصرار کرے تب بھی اسکو اپنے شیخ کے سپرد کر دے۔ لیکن اگر اس کا شیخ وفات پا چکا ہو یا کہیں (دور دراز علاقے میں) چلا گیا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۴) فرمایا ـــــ کہ ائمہ اہل بیت کی طرف سے اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی انکار اور رد ثابت نہیں ہے، یہ بات (کہ اہل بیتؓ نے صحابہؓ کا انکار کیا ہے) محض (بدعقیدہ) لوگوں کا) افترا ہے۔

(۵) فرمایا ـــــ نجات، تقلید انبیاء علیہم السلام میں مضمر ہے۔ انبیاءؑ کی تقلید عقائد کے اندر بغیر زیادت و نقصان کے ہونی چاہیے ـــــ جیسا کہ قدماء اہل سنت کا مذہب ہے ـــــ ہاں اگر کوئی کسی صاحب کشف سے فیض پائے ہوئے ہو اور وہ ان عقائد کی تفصیل و تحقیق کر کے دوسروں کو آگاہ کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۶) فرمایا ــــ اگر کسی کو امرِ منکر کا مرتکب دیکھو تو جان لو کہ یہ بھی ارادۂ الٰہی کے بغیر نہیں ہے۔ ــــ لیکن اُس شخص کو نصیحت و تذکیر بھی ضرور کرنی چاہیے۔ فانّ الذکریٰ تنفع المومنین اس لیے کہ نصیحت و تذکیر مومنین کو نفع پہونچاتی ہے۔ اب چاہے سو میں سے ایک کو نفع پہونچے ــــ بالکل ایسا سمجھو کہ کسی کی کنیز کھو جائے اور وہ ہر کوچہ و بازار میں آواز لگائے ــــ اگرچہ کنیز کسی ایک جگہ موجود ہو اور اس کی خبر بھی ہزاروں سننے والوں میں سے کوئی ایک ہی لائے

(۷) فرمایا ــــ ایک فاضل نے ایک صوفی سے دریافت کیا کہ صوفیاء اتنی ریاضات اور اتنے مجاہدات کیوں کرتے ہیں؟ صوفی نے جواب دیا کہ اگر تجھ سے کہا جائے کہ اتنی محنت کرے گا تو تجھے سلطنت مل جائے گی یا بادشاہ تیرے پاس آئے گا ــــ پھر تو محنت و مجاہدہ کرے گا یا نہیں؟ فاضل نے کہا کہ ایسی صورت میں تو ہر کوئی محنت و مجاہدہ کرے گا۔ صوفی نے کہا کہ بسبب ریاضات و مجاہدات حضرت حق باعظمت الوہیت خانۂ قلوب صوفیاء میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں، پھر وہ ریاضات و مجاہدات کیوں نہ کریں؟ ــــ

(۸) اذا تحیّرتم فی الامورِ فاستعینوا باصحاب القبور۔ (یعنی جب تم امورِ دنیا میں متحیر و پریشان ہو جاؤ تو اصحاب قبور سے استعانت کرو) اس مقولے کے بارے میں فرمایا کہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ احوال موتیٰ کو یاد کرنا اور اُن سے عبرت حاصل کرنا ــــ امورِ دنیا سے توجہ کو ہٹا دیتا ہے اور فکرِ معاش کو مضمحل کر دیتا ہے (لہذا قبر کا دھیان فکرِ دنیا کو کمزور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے) ــــ

(۹) فرمایا ــــ لوگوں کے اولیاء سے انکار کا ایک بڑا سبب شرکتِ مکان ہے کہ ایک محلے میں یا ایک شہر میں سکونت رکھتے ہوں اور شرکتِ زمان بھی ایک سبب ہے کہ ہمعصر و معاصر ہوں ــــ اور شرکتِ نسبت بھی ایک سبب ہے کہ وہ ولی عزیزوں میں سے ہو ــــ عوام اکثر اُس شخص کے معتقد ہوتے ہیں جو خدام بہت رکھتا ہو اور عبادت بھی بہت کرتا ہو اگرچہ وہ عبادت ریا و عُجب کے ساتھ ہو۔

(۱۰) فرمایا ــــ علم الیقین ــــ دھواں دیکھ کر آگ کے وجود پر استدلال کرنا ہے۔

عین الیقین براہ راست آگ کو دیکھنا ہے۔ اور حق الیقین اپنے اندر آگ کا علم ہونا ہے۔ مشاہدہ، عین الیقین میں ہوتا ہے اور وصول و شہود، حق الیقین میں ——

تالیفات علاوہ مجموعہ مکتوبات کے آپ کا ایک رسالہ ہے جس کا نام اصول الولایۃ لاھل العنایۃ ۔ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ احقر کے مطالعہ سے گزرا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے انفاس العارفین میں اس رسالے کے بھی کچھ اقتباسات درج فرمائے ہیں۔

وفات حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ مظفر رہتکی ذکر کرتے تھے کہ حضرت ایشانؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہوگی۔ جب حضرتؒ کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہوگئی تو مجھے برابر آپ کی وفات کا اندیشہ لگا رہا۔ جب آپ کی عمر پچپن سال کی ہوگئی تو مجھے ایک تقریب میں شرکت کے لیے رہتک جانا ہوگیا۔ چلتے وقت میں نے ہمت کر کے اپنا اندیشہ ظاہر کیا اور اس سلسلے میں استفسار کیا۔ حضرتؒ نے تبسم فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تم کو وطن جانا چاہیئے۔ اس فکر میں مت پڑو۔ میں رہتک چلا گیا، میرے پیچھے حضرت کا انتقال ہوا۔ جب رہتک سے واپس آیا تو شاہ سعداللہ گلشن دہلویؒ نے (جو حضرت شیخ عبدالاحدؒ کے مشہور خلیفہ اور ہندوستان کے معروف شاعر ہیں) مجھے حضرتؒ کے اواخر ایام حیات کا ایک واقعہ سنایا جس میں حضرت شیخ عبدالاحدؒ نبیرہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وفات سے کچھ دن پہلے ملاقات کے لیے تشریف لانا اور دیگر تمام باتیں تفصیل سے بیان کیں[1]

پیر بھائیوں نے اس طرح بیان کیا کہ حضرت چند روز پیشتر کچھ کسل اور کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ دو ایک دن پیشتر سے کھانے کی طرف بالکل رغبت نہیں رہی تھی، نیز چیزوں سے پہلے سے بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی۔ کسی چیز کی طرف التفات نہیں فرماتے تھے۔ وفات کے دن جب، نماز عصر کے لیے مسجد میں جانا چاہتے تھے تو اہل خانہ سے ملنے گئے اور

---

[1] شوارق المعرفۃ (مندرجہ انفاس العارفین) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کی اہلیہ محترمہ حضرت شیخ عبدالاحدؒ کی قریبی رشتے دار تھیں۔

وہاں سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے کہیں سفر پر جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ نماز عصر پڑھنے کے بعد مقامات حضرت خواجہ نقشبند کو مطالعے کے لیے طلب کیا۔ ایک مرید نے اُس وقت حضرت کے سامنے (تھالی میں) پان پیش کئے۔ ایک دو پان اس میں سے لے کر کھائے۔ پھر خنداں و شاداں اپنے تکیہ سے ٹیک لگائی بس اتنی ہی دیر میں دیکھتے دیکھتے آپ کی روح مائل پرواز ہو گئی ——

نزع کے عالم میں اپنے بھائی سیدنا حضرت شیخ عبدالرحیمؒ کی طرف اشارہ کیا کہ ان کو بلاؤ۔ کچھ لوگ ان کو بلانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور کچھ لوگ یہ گمان کر کے کہ آپ پر غشی طاری ہو گئی آپ کو اُٹھا کر گھر تک لائے اس وقت حضرت شیخ عبدالرحیمؒ آ گئے۔ دریافت فرمایا کیا بات ہے؟ جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ رُوح مبارک پرواز کر چکی ہے —— یہ واقعہ ۱۷ محرم الحرام ۱۱۰۱ھ[1] کا ہے۔

مزار مزارات اولیاء دہلی میں ہے کہ آپ کا مزار بی بی فاطمہؒ کے مزار سے آگے جو نو محلہ کو راستہ جاتا ہے وہاں ہے اور بی بی فاطمہؒ کا مزار قلعہ کہنہ کے سامنے سڑک سے دائیں طرف جو مسجد و مدرسہ سنگ سُرخ سے بنا ہوا ہے اُس کے برابر سے کچے راستے جا کر تھوڑی دور گنجان درختوں میں ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ (مزارات اولیاء دہلی صفحہ ۲۲ و ۲۳)

اولاد ملفوظات کے ضمن میں شیخ مظفر وہتکیؒ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کئی صاحبزادے تھے۔ مگر نام صرف ایک صاحبزادے شیخ محمد فخر العالم کا ملتا ہے جو سب سے بڑے تھے اور جنھوں نے اپنے والد ماجد کے مکتوبات کو جمع کیا ہے ——

—— (باقی)

---

[1] انفاس العارفین ہی میں ہے کہ بعض مریدین نے آپ کی تاریخ وفات، آفتاب حقیقت —— سے نکالی ہے۔ مگر اس مادے سے ۱۱۰۱ھ برآمد ہوتے ہیں —— واللہ اعلم بالصواب

دربارِ عالمگیری

(از جناب ڈاکٹر سید مصطفےٰ حسن علوی ایم اے (پی ایچ ڈی)

(۵)

ملا عبدالسلام دیوی مذبور الذکر کو تلمذ اپنے والد بزرگوار سے بھی تھا اور دربارِ عالمگیری سے الحاق کے قبل دربار شاہجہانی سے ان کے تعلقات رہے ہیں، اور وہی زمانہ تھا کہ جب غالباً منار وغیرہ کی شرح کے قبل یا اس کے ہی دوران میں افضل الدین خاقانی شروانی کی کتاب تحفۃ العراقین کی شرح لکھی تھی، اسی میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد وجہ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے نام سے پہلے

خوشہ چین خرمن دانائی عبدالسلام و شیخ کبیر

لکھنے کے بعد یوں رقمطراز ہوئے ہیں کہ بعضے

دوستان و یاران ارجمند

کے پیہم اصرار سے

دریں اوان فرخندہ زمان سعید کہ ہزار و پنجاہ و ہفت ہجری است موافق سنہ جلوس بست میمنت مانوس سلطان سلاطین جہان خاقان خواقین قطب سپہر سلطنت آفتاب آسمان خلافت شہنشاہ دیں پناہ شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ در مدت پانزدہ روز از مکمن بطون بمعرض ظہور جلوہ داد۔

تھے تو عالم بڑے پائے کے اور ان کی موت "موت العالم موت العالم" کی مصداق بنی ہوگی لیکن تذکرہ نویسوں نے سنہ وفات کہیں لکھا نہیں، مآثر الکرام میں علامہ سید غلام علی بلگرامی نے بس صرف یہ لکھ دیا کہ دیوی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، لاہور تشریف لے گئے تو اپنے ہم نام ملا عبدالسلام لاہوری سے علمی استفادے کیے اس کے بعد بہ عہد شاہجہانی

چندے بہ منصب افتا عسکر نامور گردید

عہد عالمگیری سے اتصال اور مشاغل کا تذکرہ نہیں کیا۔

شیخ عظمت اللہ کاکوروی

ملا عظمت اللہ ان کے والد ملا عزیز اللہ یہ قصبہ کاکوری مضافات لکھنؤ کے رہنے والے تھے، ان کو دربار عالمگیری میں خاص تقرب حاصل رہا، یہ اپنے عہد کے ممتاز علما میں شمار ہوتے رہے۔ خداداد ذہانت اور قوت حافظہ میں ان کی نظیر کم ہی تھی، علوم دینیہ اور خاص کر فقہ اور جزئیات فقہ میں ایسے حاوی تھے کہ عالمگیر نے اپنی بیٹی زیب النساء کو فقہ کی تعلیم انھیں سے دلائی۔ کتاب چشمہ فیض میں منشی فیض بخش ان کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

ملا عظمت اللہ کہ فضیلت برجستہ می داشت نواب زیب النساء بیگم بنت عالمگیر را مسائل فقہی تعلیم می فرمود ایں حویلی موسومہ بہ پرانی حویلی کہ سابق از خشت پختہ بود جانی خان در عہد آصف الدولہ خشتہائے آں را بردہ بعد ازاں شیخ طفیل علی آنرا خام درست کردند و بلا شرکت در تصرف فرزندان شیخ غلام نبی مرحوم ست احداث کردۂ ملا عظمت اللہ بود۔

اس کے علاوہ جواہر الانشا میں شیخ غلام مرتضیٰ کے ان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔

" ملا عظمت اللہ توسل از سرکار زیب النساء صبیۂ عالمگیر بادشاہ گرفتہ بود نواب محمد یار خاں پسر بہمن یار کہ از عظماء دربار شاہی بود بس شفقتہا و عطوفت بملا مرحوم می کرد چنانچہ خدمت فوج داری و امانت سرکار خیر آباد و معاملات دیگر تو جہاتش بنام پسر شان جاراللہ مقرر و معوض گشت"۔

ملا جار اللہ

ان کی تعلیم و تربیت علاوہ دیگر سرآمد روزگار علما و فضلا کے اپنے والد بزرگوار ملا عظمت اللہ استاد زیب النساء دختر عالمگیر سے ہوئی اور ان کی نشو و نما شاہان دہلی کی درباری فضاؤں کی منت کش ہے، قسمت کے بڑے یاور تھے سن رشد ہی سے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انھیں منتظم الملک کا خطاب عالمگیر نے دیا اور شاہی مصالح کی دیکھ بھال کے صلہ میں ہفت ہزاری کے منصب پر فائز رہے، ان کو ترخانی پوزیشن بھی حاصل ہوئی اور اس پوزیشن کی بدولت یہ مختلف ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے اور انھیں خلعت اور طرح طرح کے انعام اور ایک وافر سالانہ رقم برابر خزانۂ شاہی سے ملتی رہی "ترخان" قدیم ترکوں کا ایک اعزازی لقب تھا۔ ترکو کے لفظی معنی امان نامہ یا سند امارت کے تھے[1] یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عالمگیر اپنے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف خطابات دینے میں بہت ہی سخت اور محتاط تھا اور چھان بین کی جائے تو پتہ چل سکتا ہے کہ اس کے زمانے میں سوائے غیر معمولی خدمات والوں کے دوسروں کے لیے یہ عنایتیں خال خال ہی ہوئی ہیں لیکن ملا جار اللہ کی رفعت شان کی یہ ایک دلیل ہے کہ ان کو سب طرح کے خطابات و انعامات سے نوازا گیا، کشف المتواری میں میر شاہ تراب علی لکھتے ہیں:-

"شیخ جار اللہ منصب دار بادشاہی و رسالہ دار صاحب فیل و سوار شدند۔ و زیادہ تر از پدر خود صاحب اقتدار و نامدار شدند"۔

انھیں جاگیر میں قصبۂ مہونہ ملا تھا اور وہاں ہی جار اللہ نگر نام سے ایک بستی بسائی تھی جب چلتے اور سفر کرتے تھے تو توپوں کی سلامی دی جاتی اور ایک بڑی تعداد خدم و حشم کی ہوتی تھی، چنانچہ "چشمۂ فیض" میں منشی فیض بخش کا بیان ان کے متعلق یہ ہے۔

قصبۂ مہونہ کہ متصل باڑی ست در جاگیر او بود..... حالا ویران ست..... چہار

---

[1] تاریخ تجارا دیمیری

زنجیر فیل و چہار ضرب توپ باخود می داشت و دہ ہزار سوار و پیادہ ملازم رکاب او بودند ..... افاغنۂ ملیح آباد..... کہ نواب می گویانیدند و افاغنۂ روسا رام نگر و عالم نگر ہمیشہ رفیق و نوکر او بودند۔

اثاث البیت کی وہ فراوانی تھی کہ اپنے گھر پر اس کے رکھنے کی گنجائش نہ پاکے دوسری حویلی تعمیر کرائی۔

چوں در حویلی گنجائش خود و سامان خویش نیافت حویلی دیگر در مقابل آں معہ برج ارجمند و اندرون آں حویلی و دیوان خانۂ وسیع و رفیع مشتمل بر امکنۂ متعددہ و دروازۂ بزرگ کہ فیل باعماری در آید و بالائے آں بارہ دری خوبصورت خوش ترکیب و پائین آں طویلہ اسپان و بیرون آں جلو خانہ و بازار بادو کا نہائے پختہ بکمال استحکام بنا نہادہ۔

یہ بڑے صاحب دل مخیر اور فیاض تھے جواہر الانشا میں منشی غلام مرتضیٰ سے ان کی فیاضی پر یہ ریمارک ہیں۔

شیخ فیاضے بود کہ باخویشان و اقارب علی قدر مراتب سلوک و مراعات می نمود اسپان و زرہا بر قوم و مردم برادری تقسیم می نمود..... و مردم برادرانش از کوچک و بزرگ محروم نگذاشت..... مردم بفیاضیش منصبہا برداشتند و خوش زندگانی کردند۔

اس صاحب حشمت شخصیت اور اس ذات پر شکوہ کی یاد چند زبانوں پر ہے یا چند صحیفوں میں، اس کے علاوہ ان کے بنا کردہ قلعہ کے کچھ حصے بارہ دری محل اور ایک مسجد سے باقی ہے، باقی رہے نام اللہ کا۔ اس کے علاوہ ایک قبر دلی جس کے دستہ پر جواہرات جڑے ہیں اور میان پر اعلیٰ قسم کی میناکاری موجود ہے۔ ان کی قبر قصبۂ کاکوری کے تکیہ بے نواشاہ میں اسپتال کی عمارت کے مضافات میں اب تک ہے اور زبان حال سے اپنی ویرانی کا مرثیہ پڑھ رہی ہے اور گویا گزرنے والوں سے کہہ رہی ہے ؎

فاتحہ پڑھتے چلیں تربت ترخاں پہ ذرا ان سے عقدہ بھی ہو فرصت بھی ہو دستور بھی ہو

لیکن بایں ہمہ لوگ پاس سے گزرتے ہیں اور کسی کو توفیق نہیں ہوتی، یہی شخصیت وہ شخصیت تھی کہ بقول صاحب جواہر الانشا۔

"در عہد عالمگیر بادشاہ ہیچ کار بے ضابطہ از خطاب وسواری فیل و پالکی جھالردار وعطائے سرپیچ مرصع نمی شد واحدے را مجال دیارائے نہ کہ از مرکز اعتدال و مرتبہ خود پا بیروں گذارد وکارے خلاف ضابطہ نماید لیکن شیخ (جیارالله) از حضور بادشاہ بہ منصب وجاگیر سرفرازی می داشت وعطائے پالکی جھالردار وسرپیچ مرصع شدہ ماموریہ سواری فیل بود وہم ہفت ہزار سوار و پیادہ بدستخط خود نوکر گرفتہ عمل محالات متعلقہ می نمود وسامان کاری داد

مولوی حکیم عبداللہ

عہد عالمگیر کی نامور شخصیتوں میں سے ہوئے ہیں، دربار سے تعلق بھی ان کا رہا انھوں نے عمر سو سال سے بھی زائد پائی اور عالمگیر کے بعد کے دربار بھی انھوں نے دیکھے کہتے ہیں کہ ان کے مزار پر پانی چھڑک کے دعائیں لوگ لیتے اور باران رحمت کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو بارش ہو جاتی۔ ان کا مزار قصبہ کاکوری کے ایک محلہ ولی نگر میں ہے۔ اہل قصبہ ان کے دوران قیام وطن میں آئے اور ان کے ملفوظات سے مستفید ہوتے یہی جواہر الانشا کے مصنف جن کا ذکر صفحات ماقبل میں ہوا ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہوئے ہیں۔ فن طب میں کمال رکھتے اور ریاضی میں شہرہ آفاق انھیں حاصل ہوا، بڑے بڑے امراء اور نواب زادے مزمن اور مہلک بیماریوں میں ان کا علاج کر کے فائدے اٹھاتے اور انھیں جاگیروں سے نوازتے، یہ اکیس سال محض علم طب کے حصول میں وطن سے باہر رہے اور جب وطن اس مدت مدید کے بعد آئے تو اعزہ واقربا کو ان کی شناخت کرنے میں دشواری ہوئی، ان کی فراست اور رسائی دماغ کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص ان کے سامنے سے گزرا جو بظاہر اچھا خاصا تھا آپ پاس والوں سے اس کو دیکھ کے کہنے لگے کہ آپ لوگ اس متحرک مردے کو دیکھ لیں اس میں قوت اور سکت نہیں مگر چل پھر رہا ہے، اس کے مرنے کے دن قریب ہی ہیں، چنانچہ ایسا ہوا کہ ایک ہی ہفتہ میں

مرض کا بحران ہوا اور وہ چل بسا، اکثر تشخیص مرض کے لیے نبض اور قارورہ بھی نہ دیکھتے اور صورت دیکھ کے مرض کو تاڑ لیتے۔ ان کا بیشتر وقت یاد الٰہی اور کتب حکمت کے مطالعہ میں گزرتا۔ ذات الجنب تپ دق اور اسہال کبدی کے بڑے بڑے پیچیدہ علاج کیے اور مریضوں کو شفا ہوئی، ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ خواہ کیسے ہی ذی ثروت لوگ ان کو علاج کے لیے گھر پر بلاتے مگر وہ کہیں نہ جاتے، ان کے تحفہ تحائف قبول کرنے سے بھی احتراز کرتے، بڑے قانع اور بڑے صابر و ضابط تھے۔ شروع شروع شیخ ثناء اللہ لکھنوی کی ہمراہی میں دلی گئے اور بعد چندے منصب دار شاہی ہو گئے۔ زمانہ طفولیت ان کا اپنے والد امجد کی نگرانی میں گزرا خوش نویسی کی مشق حاصل کی اور وقت کے بڑے بڑے خوش نویسوں پر فوقیت حاصل کر لی۔ فارسی پڑھی تو ایسی کہ اس میں ید طولیٰ انھیں حاصل ہو گیا۔ نیز نثر نویسی اور شعر گوئی میں انھیں پورا پورا امتیاز حاصل تھا ان کے اکثر معاصرین ان کی شاگردی کا دم بھرتے، دست کاری میں بھی امتیاز حاصل تھا۔ لوگ ان کی دست کاری کا لوہا مانتے۔ جب یہ سب کچھ حاصل کر چکے والد امجد کے حکم سے علوم عربیہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ ابھی متوسطات تک پہونچے تھے کہ والد ماجد کا سایہ اٹھ گیا۔ انھیں کے مضافات میں کسی راجہ کے یہاں نوکری کر لی اور ۱۲ برس تک اس راجہ کی مصاحبت میں عیش و عشرت سے گزرا وقات کی۔ اتفاق سے راجہ علم موسیقی کا بڑا شائق تھا اس فن سے خود تو واقف تھا ہی اسکے دربار میں بڑے بڑے موسیقی کے ماہر جمع رہتے ان کی دیکھا دیکھی مولوی حکیم عبداللہ کو بھی شوق دامنگیر ہوا اور ۱۴ سو روپے جمع کر کے آلات موسیقی خریدے، خود نہایت ہی خوش گلو، خوش لحن اور خوش آواز تھے یہ اس کے بعد ہوا کہ ملازمت سے برداشتہ خاطر ہو کے گل سامان عیش اٹھا نہ اور گھوڑا بیچ ڈالا اور اس کو بیچ کے فن طب کی کتابیں خرید لیں کبھی کبھی اس عہد کے حکماء سے درس لیتے اور ادھر ادھر کچھ پڑھتے رہتے۔ عطاروں کی دوکانوں پر بیٹھ کے دواؤں کی ناپ تول اور دواؤں کی پہچان حاصل کرتے رہے اور کہتے ہیں کہ حکیم علوی خاں دہلوی سے انھوں نے رجوع کیا اور فن کے کامل بنے، جب علم طب سیکھنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ سے یہ عہد بھی کر لیا کہ للہ ہی دوا کروں گا۔ علوی خان نے انھیں بہت سے ذاتی تجربات بتائے، مطب میں ان سے نسخے لکھواتے اور کبھی کبھی فن طب کے علاوہ دوسرے فنون کے درس بھی دیتے۔ بعد حصول طب وطن آ کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور خلق اللہ کو طرح طرح کے فائدے پہونچاتے رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

مترجمہ
وحیدالدین خاں

لبرل اسلام

مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام پر جس نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس کے تعارف کے طور پر الفرقان، اپریل ۱۹۶۵ء میں ایک تحریر "لبرل اسلام" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ دراصل مسٹر آصف فیضی کی کتاب[1] A MODERN APPROACH TO SLAM کا ایک حصہ تھا، ذیل میں اس کتاب کے چوتھے باب اسلام کی تعبیر نو (THE REINTERPRETATION OF ISLAM) کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

اسلام کا مطالعہ، ایک تاریخی منظر کی حیثیت سے، پچھلی دو صدیوں میں نہایت احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے، سولہ یا سترہ ملکوں میں اس کا پھیلاؤ اور اس کے پیرووں کی کثرت، مختلف اقتصادی، مذہبی اور نسلی قوتوں کا نتیجہ تھا۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چار سو ملین ہے۔ اب یہ عام طور پر مان لیا گیا ہے کہ اسلام نے ایک عظیم تہذیب پیدا کی۔ اور یہ کہ ادب، سائنس، فلسفہ، دینیات، تاریخ اور قانون کو ترقی دینے میں اس کے علماء کا اہم حصہ ہے۔ جمالیات کے میدان میں مسلمان تعمیرات کے اعتبار سے سب سے آگے تھے۔ اس کے آرٹسٹوں نے نقاشی اور موسیقی پر گہرا اثر ڈالا، اور دستکاری مثلاً برتن سازی، پچی کاری، خطاطی، جلد سازی، زردوزی، لباس سازی اور طباخی کے فنون کو ترقی دی۔ اور اب تاخیر کے بعد، علماء کے درمیان عام طور پر تسلیم کر لیا

---

[1] ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، ۱۹۶۳، صفحات ۱۲۷۔

گیا ہے کہ اسلام کا پھیلاؤ خون کے پیاسے اور آستین چڑھائے ہوئے عربوں کی تلوار کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ محمد ابن عبداللہ کی تعلیمات اور آپ کی شخصیت کا نتیجہ تھا جن کو ٹائن بی انسانیت کے عظیم محسنوں میں سے ایک شمار کرتا ہے۔[۵]

یہ ایک تازہ ترین خیال ہے۔ ورنہ قدیم یورپ میں محمدؐ کو مرگی زدہ، جعل ساز، تفرقہ انداز اور جھوٹا رسول سمجھا جاتا تھا اور کافرانہ بت پرستی کے موضوع (PAGAN IDOL) سے زیادہ آپ کی حیثیت نہیں تھی۔ رائے کی یہ تبدیلی اسلام اور اس کی زبانوں کے مطالعہ میں اضافہ کی وجہ سے ہے اور صداقت کے اس انکشاف کی وجہ سے ہے جو علمی تحقیق کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ "ایک جھوٹا رسول جو وحشیانہ قوت استعمال کرنے کا عادی تھا"۔۔۔ یہ تاریخ کی اہم ترین تہذیبی قوتوں میں سے ایک (اسلام) کی بالکل سادہ سی توجیہہ بن گئی تھی۔ گاندھی کے ظہور اور ہندوستان کی آزادی کے بعد ثابت ہوگیا کہ انسانی قوت کے مقابلہ میں تلوار ایک کمزور ہتھیار ہے۔ اس طرح علمی دنیا آہستہ آہستہ اسلام کو مطالعہ کا ایک قیمتی موضوع سمجھنے کی طرف آئی اور اب یہ ایک بدیہی مسلّمہ قرار پا چکا ہے کہ اسلام اور اس کی قوتوں کا فہم اس کے مذہب اور قانون کے گہرے مطالعہ کے بغیر ناممکن ہے۔ یورپی مستشرقین نے انیسویں صدی کے دوران میں اس اعتبار سے کافی کام کیا ہے۔ مگر ہمارے اوپر سب سے زیادہ احسان ڈچ مستشرق سی۔ اسناوک ہرگرونجی (C. SNOUCK HURGRONJI) کا ہے جو اسلامی فلسفۂ قانون کے مطالعہ کے جدید اسکول کا بانی ہے۔ اس کے بعد گولڈزیہر (GOLD-ZIHER) ون سنک (WENSINCK) برسٹراسر (BERSTRAESSER) نے اس کی پیروی کی۔ اور اب اس زمرہ میں سین ٹلانا (SANTILLANA) ملیٹ (MILLIOT) شاخت (SCHACHT) اور ٹائن (TYAN) کے نام ہیں۔[۵۸]

اسلام میں قانون (LAW) مذہب (RELIGION) سے الگ نہیں۔ دونوں دھارے ایک ہی نہر میں بہتے ہیں اور ناقابل امتیاز ہیں۔ ان کو شریعت اور فقہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ گویا اسلام کے مذہبی قانون کے دو پہلو ہیں۔ شریعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہے وہ اپنے حلقہ میں

---

[۵] CIVILIZATION ON TRIAL (LONDON 1953), 154

سارے انسانی اعمال کو لے لیتی ہے۔ فقہ نسبتاً محدود ہے اور اسی شعبہ سے بحث کرتی ہے جس کو عام طور پر قانونی اعمال (LEGAL ACTS) کہا جاتا ہے۔ شریعت ہمیشہ ہم کو الہام کی یاد دلاتی ہے۔ یعنی وہ علم جس کو ہم قرآن وحدیث کے سوا کہیں سے حاصل نہیں کر سکتے۔ فقہ میں عقلی قوتوں پر زور ہے اور علم نبوت سے استنباط کیا جاتا ہے۔ شریعت کا راستہ خدا اور اس کے رسول نے مقرر کر دیا ہے، فقہ کی عمارت انسانی کوششوں سے کھڑی ہوتی ہے۔ فقہ میں کوئی عمل قانونی ہوتا ہے یا غیر قانونی، ما یجوز و ما لا یجوز، جائز یا ناجائز۔ اور شریعت میں پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اعتبار سے عمل کے مختلف درجے ہیں۔ فقہ ایک اصطلاح ہے جو قانون کے لیے فنی مفہوم میں استعمال ہوتی ہے، اور شریعت راستبازی کا وہ قانون ہے جو براہ راست خدا نے مقرر کیا ہے۔ تاہم صفائی کے ساتھ یہ اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان امتیازی خط صاف طور پر کھینچا ہوا نہیں ہے اور مسلم علماء خود بھی اکثر اوقات دونوں اصطلاحوں کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ تمام انسانی اعمال کا معیار (CRITERION) خواہ وہ شریعت کے دائرے کا ہو یا فقہ کے دائرے کا، ایک ہی ہے ——— اور وہ ہے ایک معیاری ضابطہ کی پیروی کر کے خدا کی رضا حاصل کرنا ۔ ۸۶

مذہب کا دعویٰ ہے کہ خدا ایک ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں، جمہوریت کا اصرار ہے کہ اسٹیٹ ایک ہے اور اس کے قوانین سب پر یکساں حیثیت سے عائد ہوتے ہیں، قوانین غیر شخصی اور خارجی احکام (OBJECTIVE RULES) ہیں جن کو ریاست اپنے تمام شہریوں پر بلا استثنا نافذ کرتی ہے۔ مگر مذہب کی بنیاد عظیم معلمین کے شخصی تجربات پر ہے۔ اس کی اپیل شخصی، فوری اور وجدانی ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے احکام اور اس کے طور طریقے کسی گروہ میں عمومی حیثیت سے نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا اندرونی عقیدہ مخصوص طور پر شخصی ہے، کوئی ریاست مذہبی وفاداری کو اس طرح بالجبر نافذ نہیں کر سکتی جس طرح وہ اس کے قوانین کو نافذ کر سکتی ہے۔ مذہب اسلام ایک خدا اور اس کے پیغمبروں پر عقیدہ رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر اسلام ایسا نہیں کر سکتا اور نہ اسے کرنا چاہئے کہ وہ متعین کرے کہ کس طرح لوگوں کے اوپر اس عقیدے کی اطاعت کو بزور نافذ کیا جائے۔ بزور نافذ کرنے سے مراد (۱) ایک چیز

کے کرنے کا حکم دینا اور (۲) اس کی عدم تعمیل پر سزا دینا ہے، عقیدے کا ایک معاملہ کس طرح خارجی طاقت کے ذریعہ نفاذ کا معاملہ بن سکتا ہے۔ ایک معلم مجھے تعلیم دے سکتا ہے، وہ اپنے نمونہ سے مجھے متاثر کر سکتا ہے، وہ میرے جذبات کو بھڑکا سکتا ہے، مگر کس طرح ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنے عقیدے پر مجبور کر سکے۔ اس طرح ایک قانونی حکم جو بذریعہ ریاست نافذ کیا جا سکتا ہے اور ایمان وضمیر جو تمام تر ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے، دونوں کے درمیان کھلا ہوا فرق ہے۔ ۸۶

آج اسلام کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ شریعت، قانون اور مذہب دونوں پر مشتمل ہے۔ مذہب کی بنیاد روحانی تجربہ (SPIRITUAL EXPERIENCE) پر ہے۔ قانون کی بنیاد اجتماع کی خواہش ہے جو اسکی مقننہ کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو یا کسی ایسے حاکم کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو جو قانون سازی کا مجاز ہو۔ مذہب اپنے اندرونی مغز کے اعتبار سے ناقابل تغیر ہے۔ یہ اندرونی مغز ہے خدا کی محبت خدا کے لیے جس کے ترانے تمام دنیا کے عارفوں اور صوفیوں نے گائے ہیں۔ اگر شریعت ان دونوں چیزوں کا نام ہے تو ہر ایک دوسرے کو برابر مخالف سمت میں کھینچتی رہیں گی۔ خدا کی معرفت ایک راز ہے اور انسان ہمیشہ اس کی تلاش میں رہے گا۔ اس تلاش میں ہر عقیدے کے لوگ بلا لحاظ مذہب برابر ہیں۔ مگر قوانین میں ملک ملک اور زمانے زمانے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، ان کے لیے ناگزیر ہے کہ سماج کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ عربوں کے قوانین انگلستان پر منطبق نہیں کیے جا سکتے، آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے قوانین اتر پردیش کے زرخیز علاقے کے لیے غیر موزوں ہیں۔ قوانین وقت اور حالات کی کٹھالی میں دھات کی مانند ہیں۔ وہ پگھلتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ مختلف شکلوں میں منجمد ہوتے ہیں۔ وہ دوبارہ پگھلتے ہیں اور مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ ارتقار کا یہ طریقہ انسانی سماج سے ہم رشتہ ہے۔ کوئی بھی چیز ساکن نہیں ہے سوا اس کے جو مردہ اور خالی از حیات ہو۔ قوانین بھی ساکن نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان ہماری آنکھوں کے سامنے بقیہ دنیا کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ تبدیلیاں نتیجہ ہیں فطرت کے اوپر ہمارے کنٹرول کا، زندگی کے بارے میں ہمارے تصورات کا، اور ہماری اس خواہش کا

کہ ہم انسان کے سماجی حالات کو نہ دیں۔ ہماری مقننہ قوانین کا ایک سیلاب بہا رہی ہے اور قانون سازی کی یہ کوشش سماج کے اندر ہمارے عمل کو متعین کر رہی ہے۔ ۸۷

مگر انسان کا ذہن اور اس کا ضمیر آزاد ہیں۔ اس کو اجازت ہونی چاہیے کہ کائنات کی آخری حقیقتوں کے بارے میں جو عقیدہ چاہے رکھے۔ اس کے عقیدہ اور خیال کو بڑی نہیں پہنائی جا سکتی۔ اس طرح اسلام میں ایک اندرونی کشمکش جاری ہے۔ اولاً مذہبی قانون کے غیر فنا تصورات (AGELESS CONCEPTS) جدید تمدنی قانون سے ٹکرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بیمہ یا وہ قرضے جو حکومت جاری کرتی ہے۔ بیمہ اور سود کا لینا یا دینا شریعت کے اعتبار سے ممنوع ہے۔ جبکہ جدید ریاست (MODERN STATE) میں نہ صرف اس کی اجازت ہے بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

ثانیاً۔ پرانے قانون کے تشدد کو ختم کرنے کے لیے اسلام کے قدیم قانون پر ایک نئے نظام کا قلم لگایا جا رہا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک نیا قانونی مجموعہ شریعت کی جگہ لے رہا ہے۔ اول الذکر کی ایک مثال ہندستان کا اسلامی قانون ہبہ (MUHAMMADAN LAW OF GIFTS) ہے جس میں انگلستان کا اصول مساوات فقہ (اصل اسلامی قانون) کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ موخر الذکر کی مثال ہندوستان کا قانون شہادت ہے جس نے اسلام کے قانون شہادت کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں یہ دہرا عمل جاری ہے۔ دنیوی قانون (SECULAR LAW) شریعت کے قانون کو ختم کر رہا ہے اور اس کی جگہ لیتا جا رہا ہے۔ شمالی افریقہ میں فرانسیسی اصول قانون، وسط ایشیا میں روسی قانون، ہندوستان میں انگلش کامن لا، انڈونیشیا میں ڈچ قانون، اور سب سے بڑھ کر بین الاقوامی قانون جو اتنا زیادہ متاثر ہوا ہے کہ نہ صرف قانون کا ظاہری ڈھانچہ بدل گیا ہے، بلکہ اس نے مسلمانوں کے تصور انصاف تک کو بدل دیا ہے۔

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شریعت قانون اور مذہب دونوں ہے، قانون عین اپنی فطرت کے اعتبار سے تبدیلی کو قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا مغز ناقابل تغیر ہے، یا کم از کم خدا کا عقیدہ غیر متبدل آدرش (UNALTERABLE IDEAL) ہے، ایک دوامی تلاش

(PERENNIAL QUEST) ہے۔[1] اگر اسی طرح کی دو مخالف قوتیں ایک ساتھ رکھی جائیں تو ان کے درمیان ٹکراؤ ہونا لازمی ہے۔ یہی وہ ٹکراؤ ہے جو اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔ میرا حل یہ ہے کہ:-

۱۔ مذہب اور قانون کی تشریح بیسویں صدی کی اصطلاحات میں کی جائے

۲۔ اسلام میں مذہب اور قانون کے درمیان فرق کیا جائے۔

۳۔ اس بنیاد پر اسلام کی تعبیر کی جائے اور اسلام کے عقیدے کو ایک نیا مفہوم دیا جائے۔

اگر اس تجزیہ سے بعض ایسے عناصر میں ترمیم واقع ہو جائے جن کو ہم روح اسلام کا جزو سمجھتے رہے ہیں یا انھیں بالکل چھوڑ دینا پڑے تو ہمیں حالات کے اس فیصلے کو قبول کرنا چاہیے۔ اگر اندرونی عقیدہ بچایا جا سکے اور اس کو طاقتور بنایا جا سکے تو اس قسم کا آپریشن، اگرچہ وہ کافی تکلیف دہ ہوگا، وہ ایک ایسے جسم کو صحت اور طاقت دے گا جو خون کی کمی کی وجہ سے سوکھ رہا ہے اور جس کی رہنمائی کے لیے کوئی تازہ آئیڈیل موجود نہیں۔ ۸۸

تعبیر نو کی ضرورت جب ہم مسلمانوں کے عقیدے کا جائزہ لیں تو ہم کو عام طور پر راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ کے درمیان فرق کرنا چاہیے۔ یہ کوئی علمی تقسیم نہیں ہے اور ہم کو اس مفروضہ پر نہیں چلنا چاہیئے کہ ایمان و ضمیر کے معاملات کی بالکل دو ٹوک طریقہ سے تقسیم ممکن ہے۔ لوگوں کے عقائد میں باریک باریک فرق ہیں۔ کوئی لاادریت کا قائل ہو اور کوئی بے اعتقادی میں مبتلا ہے۔ عقیدہ کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ریاضیاتی طرز کی تقسیم غلط نتیجہ تک پہونچائے گی۔ اس لیے ہماری عام اور لچک دار تقسیم یہ ہوگی:

۱۔ راسخ العقیدہ مسلمان۔

۲۔ غیر راسخ العقیدہ یا زیادہ بہتر الفاظ میں غیر مقلد (NON-CONFORMIST)

---

[1] پہلے مذہب کے قانونی احکام دور جدید کے لیے ناموزوں نظر آئے۔ پھر شعائر اور عبادات اور مناسک غیر ضروری روایات قرار دے کر فہرست سے خارج کر دیے گئے۔ اب عقیدہ رہ گیا تھا۔ اگر وہ بھی جدید تصورات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں کسی سنگین شکل میں باقی نہیں رہا بلکہ محض ایک مجہول آئیڈیل بن کر رہ گیا جس کی تلاش میں انسان ہمیشہ سرگرداں رہے گا اور شاید کبھی پا نہ سکے گا۔ وحید الدین

راسخ العقیدہ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو اسلام کے باضابطہ عبادتی رسوم (REGULAR RITUAL) میں اعتقاد رکھتے ہوں، خواہ اس کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں اور وہ اب بھی اس پر مطمئن ہوں کہ بحیثیت مجموعی مذہب کا جو ڈھانچہ ائمہ نے مقرر کیا ہے، وہی اصل مذہب ہے اور عبادت کی جو رسوم ہیں وہ آج کے مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہیں اور اس میں کسی قسم کی انقلابی تبدیلی خطرناک ہوگی۔

یہ ناممکن ہے اور شائد نامناسب بھی کہ ہم اس گروہ کی مزید تفصیلات میں جائیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ سنجیدگی کے ساتھ مخصوص عبادتی رسوم پر عقیدہ رکھتے ہیں اور بڑے پیمانے پر اس کے اوپر عمل کر رہے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ اگر وہ بعض احکام شریعت پر عمل نہ بھی کر پاتے ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی غفلت ہے اور یہ ان کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ عبادتی رسوم کے قدیم ڈھانچہ کو پوری طرح برقرار رکھیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو عبادتی رسوم میں بہت معیاری ہیں مگر عقیدہ اور کردار میں کمزور ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جو کردار میں پختہ ہیں مگر عبادتی رسوم میں پیچھے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو خدا پر اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر زبردست اعتقاد رکھتے ہیں، ان میں کچھ ایسے ہیں جو زندگی کے دھارے کے ساتھ بہہ رہے ہیں، قسمت کی طرف سے بے فکر ہیں، ضمیر کی خلش سے آزاد ہیں۔ مگر بچوں کے سے عقیدے سے ان کا دماغ پُر ہے۔ یہ سب اور دوسرے وہ لوگ جو اسلام پر اس کے قدیم ڈھانچہ اور عقیدہ کے مطابق ایمان رکھتے ہیں، وہ ہماری تقسیم کے مطابق "راسخ العقیدہ" مسلمان ہیں، خواہ عقیدہ، کردار اور عمل کے اعتبار سے وہ کتنے ہی مختلف ہوں اور خواہ وہ عقائد کی پوری فہرست کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ ۸۹

غیر مقلد (NON-CONFORMISTS)، یا اگر آپ چاہیں تو ان کو غیر راسخ العقیدہ (UNORTHODOX) کہہ لیجئے۔ وہ بنیادی طور پر پہلے گروہ سے مختلف ہیں۔ غیر راسخ العقیدہ کی اصطلاح کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ سچ پوچھئے تو اسلام میں راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ کی اصطلاح سرے سے نہیں ہے۔ صرف ایک منظم چرچ ہی راسخ العقیدہ، غیر راسخ العقیدہ اور بدعتی کے معیار مقرر کر سکتا ہے۔ اگر چرچ نہ ہو تو کسی شخص کے بارے میں یہ تصور کرنا ہی مشکل ہوگا کہ فلاں شخص بدعتی ہے اور فلاں راسخ العقیدہ ہے۔ مگر مدعا کی وضاحت کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیر مقلد وہ ہے جو اسلام کے باضابطہ عبادتی رسوم (نماز وغیرہ) پر عقیدہ نہیں رکھتا

اور ائمہ کی مقرر کی ہوئی بنیاد کو قبول نہیں کرتا۔ ایمان کی معیاری تعریف یہ ہے :-

۱۔ زبان سے اقرار۔

۲۔ عقیدے کی سچائی (SINCERITY OF BELIEF)

۳۔ اصول اسلام کے مطابق عمل (جیسا کہ شارع نے مقرر کیا ہو)

غیر مقلد[1] پہلی چیز کو چھوڑ کر مشکل ہی سے کسی اور پر پورے معنی میں عمل کرتا ہے۔ عقیدہ کا مخلصانہ اقرار اسلام کی واحد کسوٹی ہے۔ عقیدہ، بعض معاملات میں غلط فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ جیسے اسلام کے عبادتی رسوم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ناقابل قبول ہیں۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو غیر مقلدیت پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ نظریاتی طور پر متفق ہوں مگر عمل نہ کرتے ہوں جب بھی آپ راسخ العقیدہ ہیں۔ البتہ اگر آپ بعض عقائد یا اصول کا انکار کرتے ہوں۔ سوا خدا و رسول کے عقیدہ کے، تب آپ غیر مقلد ہیں۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک اچھا خاصا تناسب اسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو ائمہ کو سند تسلیم نہیں کرتے، کچھ نماز کو ضروری نہیں سمجھتے۔ کچھ ایسے ہیں جن کا اعتقاد ہے کہ عمل ہی عبادت ہے (WORK IS PRAYER) کچھ ایسے بھی ہیں جو خود مذہب کے خلاف بحث کرتے ہیں مگر جانچ کا اصلی معیار پھر بھی باقی رہتا ہے ـــــ کیا آپ اس اسلام کو جسے ائمہ نے مرتب کیا ہے، بحیثیت مجموعی اور عام طور پر ساری انسانیت کے لیے مفید اور صحیح سمجھتے ہیں۔ ۹۰

میرا عاجزانہ جواب، اسلام کی صداقت کو مانتے ہوئے اور اس کا احترام کرتے ہوئے، نفی میں ہے اور اس لیے میں ایک غیر مقلد ہوں (NON-CONFORMIST) ہوں۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں مذہب کا منکر (NON-BLIEVER) نہیں ہوں، منکر وہ شخص ہے جو بذات خود مذہبیت کی واقعیت یا اسلام کا انکار کرے یا کم از کم مذہبی عقائد کے بعض بنیادی اصولوں کو چیلنج کرے۔ ایک غیر مقلد مذہب کے بعض اعمال یا

---

[1] غیر مقلد کا لفظ یہاں اس مفہوم میں نہیں ہے جس مفہوم میں وہ مذہبی حلقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ مصنف کے اپنے مفہوم میں ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔

تصورات پر معترض ہو سکتا ہے یا اس کا انکار کر سکتا ہے، مگر پھر بھی وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی شخص ہوگا۔ وہ مذہب میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے نہ کہ روایتی تصورات کے مطابق۔ تاریخی شہادتیں بتاتی ہیں کہ غیر مقلد اکثر بہت گہرے عقیدے کے لوگ رہے ہیں اور غیر مقلد وہ اسی لیے تھے کہ مذہب میں وہ غیر متزلزل عقیدہ رکھتے تھے، میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ عقائد کا موجودہ ڈھانچہ ہمارے لیے مفید ہے یا ہمارے آج کے دور میں بھی وہ اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ اپنے عقیدے کی از سر نو تشریح کروں۔ یہ میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں ایک نیا فرقہ بناؤں اور نہ میں کوئی مذہبی معلم ہوں۔ مگر اس تلاش اور اس مہم میں قطعیت کے ساتھ میں یقین رکھتا ہوں کہ اسلام جیسا کہ میں نے اسے سمجھا ہے، وہ بیسویں صدی کے انسان کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ میں اس مروجہ تشریح کو قبول نہیں کر سکتا جو سنی اماموں یا شیعہ مدارس فکر نے پیش کی ہیں۔ پیچیدہ تفصیلات، بے معنی عبادتی رسوم اور بے روح تصورات نے مجھے جمود میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذیل میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر اسلام کی آزادانہ تشریح (LIBERAL INTERPRETATION) کی ایک اسکیم پیش کروں۔

(باقی)

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

آپ

حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا نگرانی کے تابع لکھی گئی ہے) اپنے خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج اور زیارت کے متعلق بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں شوق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ ..... قیمت مجلد ۲/۰/-

آسان حج | یہ "آسان زبان میں حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے اپنے کم تعلیم یافتہ حضرات جو صحت آسان اور عمومی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت سیاہی ..... قیمت ..... صرف ۰/۴/-

کلمہ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے نرالے انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ... ۰/۶/-

زکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے دو اہم رکن "صوم رمضان" اور "ادائے زکات" اور اس کے لوازم، اعمال، وظائف، آداب، فرائض و اخلاقیات اور ان کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی و اخلاقی اثرات کا ایسا بہترین تجزیہ اور شوق انگیز بیان اور حکیمانہ حکمت حضرت شاہ ولی اللہ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی قائل۔ قیمت ۰/۳/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات و دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ۰/۱۲/-

اسلام کیا ہے؟

الیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت آخر عطا فرمائی ہے پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا بندہ بننے کے لیے بھی اس کا سا مختصر اور مکمل انشاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر ہے کتابت طباعت جلی اور سیاری قسم اول کاغذ عمدہ و چکنا مجلد رنگا ہوا قسم دوم کاغذ عمدہ و چکنا سادہ مجلد ۱/۸/-

ہندی ورژن کا غذ اعلیٰ مجلد قیمت تین روپے ۳/-

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ - پونڈ .. شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۴۳ | بابتہ ماہ شعبان ۱۳۸۴ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ ۸

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	ایک مرد مومن کی شہادت	محمد منظور نعمانی	۱۴
۳	معارف الحدیث	" "	۱۷
۴	تجلیات مجدد الف ثانیؒ	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۲۷
۵	شریعت کا جادۂ قویم شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں	مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی	۳۴
۶	روزہ ———	جناب رئیس الدین خاں صاحب	۴۷

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جنوری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: ۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاک خانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: ۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، انکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی بی ایس سی، ایل ایل بی، ایڈیٹر و پبلشر، الفرقان پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ مہینے ہمیں ایک صاحب سے ایک مخلص کا خط موصول ہوا جس میں اس مقصد کی تائید کرتے ہوئے جو دو تین مہینے سے ان صفحات کا موضوع گفتگو ہے، ایک خاص نقطہ الفرقان کی پالیسی کے متعلق دریافت کیا گیا ہے۔ یہ نقطہ چونکہ عام طبیعتوں کے تقاضائے احساسات و خیالات کا نتیجہ نہیں بلکہ ان مخلص لوگوں کے احساسات کا حوالہ بھی ہے جن تک ہمارے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکی ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ الفرقان کے صفحات پر اس امر کے متعلق گفتگو کی جائے تاکہ جو اصحاب کہ ذہن میں بھی اس معاملہ میں کوئی خلش ہو اُن کے سامنے ہمارا نقطۂ نظر بوضاحت کے ساتھ آجائے۔

مکتوب کا ضروری اقتباس یہ ہے

"اس وقت عرض یہ کرنے کا تھا کہ آپ کی یہ کاوش اور جدوجہد جو الفرقان کی شکل میں شروع کی گئی اشاعت میں شائع ہو رہی ہے آپ کی یہ خواہش کہ قدر مبارک ہو کہ اجتماع و میدان میں کام کرنے والی تمام جماعتیں اور ان مسائل سے دلچسپی رکھنے والے تمام [illegible] ایک دوامی نظام میں منسلک ہو کر قیادت کا ایک مشترک پلیٹ فارم ترتیب دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کی کوئی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا واحد شخصیت ہے کہ جس کی آواز پر اسلامیان ہند لبیک کہیں، اس وقت مجلس مشاورت کی شکل میں ایک ایسے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس تجویز کا کہ مجلس مشاورت کو مشترک مسائل میں [illegible] ایک [illegible] ملک میں پیش کیا جائے۔ ....."

میری .....

رائے میں اس تجویز کا پیش مقدم ہر جماعت اور ہر گروہ کی طرف سے ہونا چاہیے اور کوشش یہ کی جائے کہ جماعتیں سرے سے قریب نہ آئیں۔ یہ جماعتیں جس قدر قریب ہوتی جائیں گی اور مجلس مشاورت طاقت پکڑتی جائے گی اسی قدر یہ جماعتیں خود بخود ختم ہوتی جائیں گی اس مجلس کے حق میں دست بردار ہوتی جائیں گی۔ انشاء اللہ.....

اسی سلسلہ میں آپ سے دوسری گزارش یہ ہے کہ الفرقان اور زمانے کے صفحات میں ایسے مباحث اور خبروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونا چاہیے کہ جس سے جماعت اسلامی (پاکستان) کی تنقید یا تنقیص ہوتی ہو۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے ہر شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ بات ہندوستان کا کوئی رہنے والا کسی جماعت سے خواہ پاکستان سے نہیں ہے۔ نام کی مماثلت کی وجہ سے عام قارئین کا ذہن اس شبہ کے ساتھ یا بغیر شبہ کے ہندوستان کی جماعت کے بارے میں کافی متاثر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ پر جماعت کے مخالفین یا موافقین ان سے کافی متاثر ہوتے ہیں۔ جماعت کے مخالفین میں جماعت کے خلاف اور جماعت کے موافقین میں آپ کے اور پھر مجلس کے خلاف تاثر پیدا ہوتے ہیں۔ اب ان حلقوں میں لاکھ کوشش کریں لیکن ذہن ضرور متاثر ہو جاتے ہیں اس وقت آپ صاحبان جس اتحاد اور اشتراک کی کوشش کر رہے ہیں اس مجوزہ میں یہ تاثر مانع آرہا ہے، اور ہم لوگوں کو صوبائی اور ضلعی سطح پر جن نظام اور نامنہاد حلقوں میں کام کرنا پڑ رہا ہے وہاں یہ دشواریاں پیش آرہی ہیں ـــــ مثال کے طور پر الفرقان کی اسی ماہ کی شماعت کو لیجئے امین احسن اصلاحی صاحب کا مضمون جہاں اور جن حلقوں میں پڑھا جارہا ہے وہاں ہندوستان کی یہ جماعت بیچاری طلاق دیے زیر بحث آرہی ہے، یہ لوگ مجھ سے خود کہتے ہیں کہ آپ جس مجلس مشاورت کے رکن ہیں اس کے رکن رکین کے زیر اثر میں مشاورت کی ایک رکن جماعت کے بارے میں امین احسن صاحب کا مضمون چھپا ہے سمجھ لیجئے یہ بھی مضمون نے جو تاثر موافق اور مخالف حلقوں میں پیدا کیا ہے وہ موجود ہے۔ حالانکہ آپ کا اداریہ بھی میں نے لوگوں کو بتلایا اور سنایا۔

اس لیے میری گزارش ہے کہ ملت کے اتحاد کی خاطر اب آپ ان مباحث کو اپنے موقر

جریدہ میں جگہ نہ دیں، ہم ان کوششوں کے لیے سعی کریں جن کا واضح طور پر آپ نے اپنے ادارہ میں نقشہ کھینچا ہے اور پھر پاکستان کی اندرونی سیاست اور وہاں کی جماعت کے آپس کے تنازعات سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں رکھنا چاہیے، عورت صدر بنے یا مرد ہمیں کیا یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ تو آپس کا اتحاد ہے۔ یہ اتحاد ہے تو ملت بھی ایک باعزت زندگی اس ملک میں پالے گی۔

امید ہے کہ میری ان گزارشات پر ہمدردانہ طور پر غور فرمائیں گے۔"

آپ کا خادم

.....

جہاں تک ندائے ملت کا تعلق ہے، راقم سطور اپنی صحت کی بنا پر اس کی ادارت سے اب سبکدوش ہو چکا ہے۔ ویسے بھی الفرقان اور ندائے ملت کو ایک سمجھ کر گفتگو کرنا صحیح نہیں ہے لیکن جب مراسلہ نگار نے اس کا ذکر کر دیا ہے تو اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ اب تک کی بالیسی کے اعتبار سے ندائے ملت اس طرح کے مسائل سے خود ہی دور رہتا ہے۔

لیکن الفرقان کا معاملہ اس سے مختلف ہے اس کا مقصد اشاعت دین حق کی اشاعت اور دینی فتنوں سے مسلمانوں کی حفاظت ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جس بات کو دین میں حق جانے اسے حق لکھے اور جس چیز کو باطل سمجھتا ہے اسے باطل کہہ کر رد کرے۔ اس کا نام ہی (الفرقان) اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس کے اس فرض (حق کو باطل سے جدا کر کے دکھانے) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور وہ اگر کسی مصلحت کی خاطر اپنے اس فرض سے چشم پوشی کرتا ہے تو یہ بات خواہ دوسروں کی نظر میں کیسی ہی بھلی ہو، مگر اس کی اپنی نظر میں ایک جرم ہوگی۔

جہاں تک مشترک خطرات کے مقابلہ میں ملت کے اتحاد و اشتراک کا سوال ہے، الفرقان اسے ہندوستان میں نفس اسلام کی بقا کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس لیے اس کی تائید ہی نہیں اس کی دعوت و تلقین کو بھی اپنا فرض جانتا ہے اور اس فرض کو وہ اپنے امکان بھر انجام بھی دے رہا ہے لیکن اس دعوت اتحاد کا یہ مطلب اس کے لیے ناقابل قبول ہے کہ کہیں دین کی تحریف دیکھے تو

اس پر بھی خاموش رہے اور دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہو اس سے آنکھیں بند کر کے بس اس پر نظریں جمائے رکھے کہ مجلس مشاورت کا قافلۂ اتحاد خیر و عافیت کے ساتھ اپنی منزل مقصود کو پہونچ جائے۔

مجلس مشاورت کی شکل میں وجود میں آنے والا اتحاد بیشک الفرقان کو عزیز ہے مگر الفرقان تو ہرگز یہ مطالبہ بھی نہیں سمجھتا کہ جو لوگ اس اتحاد میں شریک ہیں ان کی بھی کسی بات سے اختلاف نہ کیا جائے کیونکہ مجلس مشاورت کی بنیاد خود اس اصول پر نہیں ہے۔ مجلس مشاورت اپنے دائرے سے باہر اختلافات کے وجود کو تسلیم کرتی ہے، اور اسکے ساتھ اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ مشترک ملی مسائل جن میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے ان میں الگ الگ کام کرنے کے بجائے مل کر کام کیا جائے۔ پس اس لحاظ سے خود ان شرکائے اتحاد کے درمیان بھی اگرچہ اختلافی دائرے ہیں تو یہ بات اس اتحاد کے خلاف نہ ہوگی کہ ان دائروں کے صحیح حدود کا خیال رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے اظہار اختلاف کیا جائے اور جو بات کسی کو غلط نظر آئے تو اس پر اپنے ضمیر کے مطابق تنقید کی جائے!

یہ محض ہمارا خیال نہیں ہے۔ اتفاق سے خود جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا ابو اللیث صاحب کے عمل کی نظیر ہمارے سامنے موجود ہے جو ہمیں پوری تائید بہم پہونچاتی ہے۔ مجلس مشاورت نے اپنی تاسیس کے بعد سب سے پہلا کام ملک کے مختلف فرقوں کے ممتاز لوگوں کے دستخطوں سے ایک بیان جاری کرنے کا کیا تھا جس میں ملک کے سب فرقوں سے اتحاد و یکجہتی اور رواداری کی فضا قائم کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس پر دستخط مولانا ابو اللیث صاحب نے بھی کیے تھے لیکن اسکی اشاعت کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ اسکے بعض فقروں سے وحدت ادیان کی تائید نکلتی ہے۔ معاملہ خود مجلس مشاورت کی اپیل کا تھا، مجلس مشاورت اور اس کے صدر محترم کے وقار کا تھا، جنھوں نے ہندوستان کے نہایت ممتاز غیر مسلموں کے دستخط اس پر کرائے تھے۔ پھر صراحۃً وحدت ادیان کی کوئی تائید ان فقروں میں تھی بھی نہیں۔ لیکن مولانا نے ان سب پہلوؤں کے باوجود اپنی دینی ذمہ داری اور ایمانی ضمیر کا تقاضہ یہی محسوس کیا کہ اس لحاظ سے ان فقروں کو غلط کہیں اور ان کے موہوم مفہوم سے اپنی برأت کا علانیہ اظہار کریں چنانچہ مولانا کا یہ تردیدی بیان، ۷ اکتوبر کے دعوت (دہلی) میں شائع ہوا ــــــ پس جب یہ پوزیشن ہے تو ہمارے لیے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان جس کا نہ مجلس مشاورت سے کوئی واسطہ ہے نہ وہ مسلمانان ہند کی کوئی جماعت ہے، اسکی کسی بات پر تنقید کرنے میں مجلس مشاورت کا اتحاد کیوں مانع آئے؟

بیشک ہم اپنے ملک کے مسلمانوں کی بھی خود اپنی مصلحت میں اس بات سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں عورت صدر مملکت ہوتی ہو یا مرد۔ اور فی الواقع ہمیں مسئلہ کی اس نوعیت سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں کیونکہ یہ مسئلہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ لیکن یہ رویہ ہمارے لیے اس صورت میں کیسے جائز ہو سکتا ہے جب مسئلہ عورت کی صدارت کے شرعی جواز اور عدم جواز کا ہو اور ہم یہ دیکھ رہے ہوں کہ جماعتی سیاست کے مصالح پر اپنی آرا کے ساتھ ساتھ شریعت کی آبرو بھی نثار کی جا رہی ہو! کیا دین اور شریعت کے معاملات پر گفتگو میں بھی ملکوں کی سیاسی اور جغرافیائی حدبندیاں حائل ہوتی ہیں؟ اور کسی مسلمان کے لیے یہ بات روا ہو سکتی ہے کہ وہ شعور و اختیار رکھتے ہوئے بھی دنیا کے کسی حصہ میں شریعت کے نام پر ہونے والی بے حرمتی کا تماشہ خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہے؟ پھر جبکہ یہ تماشہ ہو بھی رہا ہو ایسے لوگوں کے ہاتھوں جن کی شہرت اور دینی کے علمبرداروں کی حیثیت سے ہو، جن کے قول و فعل کے اثرات پاکستان کے اندر تک ہی محدود نہ ہوں۔ بلکہ خود ہمارے ملک کے لحاظ سے تو صورت یہ ہو کہ اُن کے ذہنی حلقہ اثر کے اعتبار سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان کوئی تفریق ہی مشکل ہو! کیونکہ پاکستان کی جماعت اسلامی اول سے آخر تک جس شخصیت کی فکری اور عملی قیادت کی آئینہ دار ہے وہ مولانا مودودی ہیں۔ اور مولانا مودودی صاحب کے فکری اثرات کے بارے میں کون ہندوستان و پاکستان کی تفریق کر سکتا ہے؟ وہ اپنے فکری حلقہ اثر کے اعتبار سے جتنے پاکستانی ہیں بلاشبہ اتنے ہی ہندوستانی بھی ہیں۔

بہرحال جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ خصوصیت ہندوستان کے کسی دینی رسالہ پر اور بھی زیادہ لازم کرتی ہے کہ وہ اگر اپنی سیاسی ضرورتوں کے ماتحت لوگوں کو احکام شریعت کے بارے میں مغالطے دینے لگیں تو سختی کے ساتھ اُس کا نوٹس لیا جائے۔

مولانا مودودی اور اُن کی جماعت کا جو مسلک سیاست میں عورتوں کے حصہ لینے کی قطعی مخالفت کا رہا ہو وہ ہر اُس شخص پر واضح ہے جس کو اُن کے لٹریچر کے مطالعہ سے کچھ بھی دلچسپی رہی ہو۔ لیکن ہم اسکے باوجود ان سے ہرگز کوئی تعرض نہ کرتے اگر صرف اتنی بات ہوتی کہ انھوں نے وقتی یا دائمی طور پر اپنے مسلک کو چھوڑ دیا ہم کوئی خدائی فوجدار نہیں کہ کسی شخص یا جماعت کی عمومی بدید کے راستہ میں حائل ہوں۔ اور جس بات کو خود صحیح سمجھتے ہوں دوسروں کو بھی اس کے اختیار کرنے یا اختیار کیے رہنے پر مجبور کریں، ہر شخص کو اختیار ہے

کہ وہ اگر اپنے کل کے مسلک کو غلط سمجھنے لگا یا اس پر قائم رہنا اُسے مشکل نظر آنے لگا تو آج اس مسلک میں تبدیلی کا اعلان کرنے یا خاموشی سے دوسری راہ اختیار کرلے اسی طرح پاکستان کی جماعت اسلامی بھی مس فاطمہ جناح کی حمایت میں کھڑی ہوجاتی، تو صرف اس بات پر کم از کم ہم اس کا دامن نہ پکڑتے۔ زیادہ سے زیادہ مولانا دریابادی کی طرح اس کے "مرحوم" ہوجانے کا ماتم کرلیتے، لیکن اس کی جو چیز اس معاملے میں تنقید اور محاسبہ پر مجبور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری یا مسلک میں تبدیلی کا اعتراف کرنے کے بجائے اپنے زیر موقف کی حمایت میں ایسے ایسے دلائل تراشنے اور ایسی عوام فریب باتیں کرنے پر تُل گئی ہے کہ ان کو اگر کھلے ہاتھ دیا جائے تو نہ صرف اس مسئلہ میں لوگوں کے ذہن خراب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے بلکہ اور کچھ نہیں تو بڑی اور اصولی و فروعی گمراہیاں لوگوں کے ذہنوں میں جڑ پکڑ کر رہ جائیں گی۔

جو شخص بھی اس مسئلہ میں کسی لاگ لپیٹ اور جنبہ داری کے بغیر گہری نظر سے جماعت اسلامی پاکستان کے موقف کا جائزہ لے گا وہ بلاشبہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جماعت اسلامی کو کوئی بھی شرعی مجبوری مس فاطمہ جناح کی حمایت کے لیے پیش نہیں آئی تھی، وہ مجبوری دراصل اس کی اپنی سیاسی مجبوری تھی جسے اس نے شرعی مجبوری کے افسانے میں چھپایا اور پھر اس کے ماتحت تن من دھن سے مس فاطمہ جناح کی حمایت کا جہاد شروع کرنے کے لیے وہ ایمان سوز حربے، وہ عوام فریب باتیں اور وہ گمراہ کن دلائل اختیار کیے جو کچھ پیش کیے بلکہ ان کو دہرا دہرا کر اس نے اسلام سے آج تک کا ایک متفق علیہ مسئلہ (اس کی آن میں اپنی آبرو کھو بیٹھا اور جتنے منھ اتنی باتیں اس کے متعلق ہونے لگیں۔

بالکل آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بات ہے کہ پاکستان کے متحدہ حزب اختلاف کی طرف سے جب مس فاطمہ جناح کی امیدواری طے کی گئی، تو اس میں ضمناً یہ سوال سامنے نہیں آیا کہ وہ کونسی شرعی مجبوری یا مصلحت ہے جس کی بنا پر باوجود عورت ہونے کے انھیں مملکت کی سربراہی کے لیے کھڑا کرنا جائز ہوگا۔ اس متحدہ محاذ میں جماعت اسلامی پہلے دن سے شریک تھی اور اخبار بین طبقہ جانتا ہے کہ مس فاطمہ جناح کا نام کافی پہلے سے متحدہ محاذ کے امکانی امیدواروں کی فہرست میں آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی نے بھی اس پر غور کیا ہوگا لیکن وہ کوئی شرعی مجبوری یا مصلحت اس نام کی تائید کے لیے اس عرصہ میں دریافت نہ کرسکی حتیٰ کہ جس میٹنگ میں متحدہ محاذ نے یہ فیصلہ کیا اس میں جماعت کے نمائندوں نے اس

فیصلہ پر صاد نہیں کیا۔ بلکہ اپنے شرعی مسلک کا عذر کر کے فوری طور پر رائے دہی سے احتراز کیا کہ اس معاملہ میں اب اتفاق یا عدم اتفاق کا فیصلہ پوری جماعت ہی کر سکتی ہے! اب اس مرحلے کے بعد جماعت کی مجلس شوریٰ طلب ہوئی اور اس نے ایک شرعی فتوے کے ساتھ اس فیصلے کی تائید کا فیصلہ کیا ــــــ

سوال یہ ہے کہ اس فتوے میں جو وجوہ جواز پیش کیے گئے ہیں، کیا کوئی بھی منصف مزاج آدمی یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ پہلے سے جماعت اسلامی کے اہل الرائے کی نظر میں نہیں تھے۔ "دوسرے اہل علم" سے مشورہ کرنے کے بعد ہی اپنے ملک کے یہ حالات اور صدر ایوب کے چھ سالہ دور کے یہ نتائج ان حضرات پر کھلے! یا یہ کوئی غیبی خبریں تھیں کہ کوئی الہام والقاء ہوا تو ان حالات کا پتہ چلا اور پھر یہ اہل علم کی خدمت میں برائے استفسار پیش کیے جا سکے؟ کوئی عقل سے کورا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ جن حالات پر دھواں دھار تقریریں یہ حضرات عرصے سے کر رہے تھے۔ جن کے ذکر اور جن کی مذمت سے ان کے اخبارات و رسائل بھرے چلے آ رہے تھے، کوئی نہیں مان سکتا کہ شروع میں جب فاطمہ جناح کا نام ان کے سامنے آیا تو یہ سب باتیں ان کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں! پس اگر ان حالات کے وجود سے مس فاطمہ جناح کی تائید و حمایت کا جواز نکلتا تھا تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس میں اس وقت کیا تکلف سے کیوں کام لیا گیا۔ جب تک متحدہ محاذ کی باقی سب جماعتوں نے اپنے طور پر فیصلہ کر کے مس فاطمہ جناح کی امیدواری کا اعلان نہ کر دیا؟ اگر یہ ایسی ہی شرعی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی گاڑی پاکستان میں آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ تو پھر اس فیصلہ کی تائید ہی نہیں تحریک کا جماعت اسلامی سے بڑھ کر کس پر حق تھا۔ کیوں نہیں اس نے کہا کہ اس گاڑی کا راستہ چونکہ پاکستان میں صرف قائداعظم کی بہن ہی کے ہاتھوں صاف ہو سکتا ہے، اس لیے ہم ان کا جھنڈا سب سے پہلے اٹھائیں گے اور پاکستان میں اس سعادت کا حقدار ہم سے زیادہ کوئی اور نہیں ہے!

الغرض مس فاطمہ جناح کی شخصیت کا وزن کوئی ڈھکی چھپی چیز تھی اور نہ ہی ایوبی کے حالات کوئی پردہ راز میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی ان کے نام کی تحریک چھوڑ تائید کا فیصلہ بھی متحدہ محاذ کی باقی جماعتوں کے ساتھ نہیں کر سکی، تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کوئی گنجائش شرعاً اسکی نہیں سمجھتی تھی ــــــ اور ہمارے لیے یہ سمجھنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اس نے اندرونی طور پر اس کی مخالفت بھی کی ہو گی۔ کیونکہ اسی دور ایوبی کے اندر ۱۹۶۱ء میں کسی شخص نے مولانا مودودی

کی شرعی تائید مس فاطمہ جناح کی صدارت کے لیے حاصل کرنا چاہی تھی اور مولانا نے اپنے پچھلے موقف کے عین مطابق دلائل کے ساتھ اس پر انکار کر دیا تھا[1] ——— لیکن جب بات اس کے قابو سے نکل گئی اور پوزیشن یہ ہو گئی کہ اب اگر متحدہ محاذ کے فیصلے کی توثیق نہیں کرتے تو گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے، کیونکہ اپنی ساری سیاست کو تو اس متحدہ محاذ سے وابستہ کر دیا تھا تو ناچار اسے اپنی سیاسی مجبوری کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور دوسرے گمنام اہل علم کی گردن پر رکھ کر یہ فتویٰ اس نے راتوں رات تیار کیا کہ عورت کو امیر بنانا ہے تو شرعاً حرام۔ لیکن ایسا حرام نہیں ہے کہ کسی شدید ضرورت سے بھی حلال نہ ہو سکے۔ ادھر ملک کے جو حالات ہیں وہ اس بات کی شدید ضرورت ہی ظاہر کرتے ہیں کہ مس فاطمہ جناح کو بطور صدارتی امیدوار کے قبول کر لیا جائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ یہ سخن سازی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ شدید ضرورت اس وقت کیوں نہیں یاد آئی جب مس جناح کا نام متحدہ محاذ کے زیر غور تھا، اور بعد میں کون سے ایسے حالات ملک میں رونما ہو گئے جو پہلے نہیں تھے؟ سوائے اس کے کہ متحدہ محاذ کے باقی سب شریکوں نے جماعت اسلامی کی رائے کی پرواہ نہیں کی۔ اور جماعت اسلامی اس پوزیشن میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتی تھی کہ متحدہ محاذ کو چھوڑنے کے نتائج کا مقابلہ کر سکے۔ ناچار اس نے اپنی متاع دین بھی اس محاذ کے قدموں میں لا کر رکھ دی۔ اور پھر یہ ظاہر کرنے کی ہمت چوں کہ اس میں نہیں تھی کہ ہم اپنی مجبوری میں اپنے لیے یہ جائز سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس منکر شرعی سے عارضی طور پر سمجھوتہ کر لیں۔ اس لیے اپنی کمزوری کی پردہ پوشی کیلئے اس نے پوری پاکستان قوم کے نام فتویٰ صادر کیا کہ جماعت اسلامی صرف اپنے ہی لیے اپنے مخصوص حالات کے ماتحت مس فاطمہ جناح کی حمایت جائز نہیں سمجھتی ہے بلکہ یہ جواز پوری قوم کے لیے ہے۔ اور جواز بھی ایسا جو وجوب کے معنی رکھتا ہے کہ تن من دھن سے مس فاطمہ جناح کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کرنا چاہیے ——— یعنی

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

---

[1] یہ سوال و جواب معاصر المنبر (لائلپور، پاکستان) نے اپنی ۱۱ دسمبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں مکمل حوالے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہ بے مغز بے دلیل اور سراسر سخن سازانہ فتویٰ بجائے خود کیا کم فتنہ تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کے جس اخبار میں ہم نے یہ فتویٰ پڑھا اس کی اگلی اشاعت کے اداریہ میں یہ الفاظ ہماری نظر سے گزرے کہ

"جب سے محترمہ فاطمہ جناح کا نام صدارتی امیدوار کی حیثیت سے منظر عام پر آیا ہے بعض مذہبی حلقوں نے زور شور سے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے کہ شریعت کی رو سے عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی۔" (ہفتہ وار شہاب ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

یہ جن الفاظ پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس میں ذرا پروپیگنڈے کا لفظ ملاحظہ فرمائیے۔ اسی کو ہم نے ایمان سوز حربے سے تعبیر کیا ہے اور خدا گواہ ہے کہ ان سطروں کا لکھنے والا اس لفظ کو پڑھ کر لرز گیا کہ اللہ اللہ! اب یہ نوبت آگئی کہ جماعت اسلامی مذہبی حلقوں کی اس بات کو پروپیگنڈا قرار دے کہ از روئے شریعت عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی!

پھر اسی اخبار کی اسی اشاعت میں مولانا مودودی کا یہ چیلنج ہماری نظر سے گزرا کہ

"کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شریعت عورت کا سربراہ مملکت ہونا حرام ہے اور اس سلسلے میں استثنا کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔"

ہم چونکہ "حرام" تو سوائے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے (جس میں مولانا مودودی شریک نہیں تھے) کسی نے نہیں کہا پھر یہ چیلنج مولانا کس کو فرما رہے ہیں، لیکن آگے دیکھا تو استثنار کی گنجائش کا سوال بھی لگا ہوا ہے تب سمجھ میں آیا کہ یہ مجلس شوریٰ کی غلطی نباہی جا رہی ہے یعنی ایسا ذو معنی چیلنج کیا ہے کہ آدمی پیٹ ہی نہ کر سکے کہ مولانا کے چیلنج کا متعلقہ حرمت کا ہی انکار ہے یا صرف استثنار کا دعویٰ! خیر اس معمے کو چھوڑ کر آگے بڑھے تو نظر آیا کہ مولانا نے اپنی جماعت کے فیصلے کی حمایت کرتے ہوئے ملکہ سبا کے قرآنی قصہ کے حوالے سے یہ دلیل پیش کی کہ

"جس وقت وہ حضرت سلیمانؑ پر ایمان لے آئیں تو حضرت سلیمانؑ کو وحی نازل نہیں ہوئی کہ عورت کو سربراہ مملکت نہیں رہنا چاہیے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے۔" (شہاب ص۱۶)

یعنی دلیل میں مولانا اوپر والا انجاڑ قائم نہیں رکھ سکے اور یہ بات کھل کر آگئی کہ وہ سرے سے حرمت ہی کا

انکار کرنا چاہتے ہیں۔ یا یوں یہ کہہ لیجئے کہ دلیل حسب مطلب نہ مل سکی کیونکہ یہ دلیل استقصائی نہیں کلی جوازکی ہے! بہرحال یہ وہ چیز ہے جس کے لیے ہم نے گمراہ کن دلائل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

حد ہو گئی اپنی کمزوری کو چھپانے کی کہ اگر استفسار کی کوئی دلیل ہاتھ نہ آسکی تو مکمل جواز ہی نکال کر دکھادیا اور یہ بھی خیال نہ آیا کہ اگر بلکہ سبا کے واقعہ سے یہی بات ثابت ہوتی ہے تو پھر اصل اسلامی حکم کا کیا بنے گا۔ جو جماعت اسلامی کی کتابوں میں بھی پورے دلائل کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور جس کے متعلق آج تک کہا جارہا ہے کہ ہم اب بھی اس پر قائم ہیں۔ لیکن اس دلیل کے بعد وہ حکم اور وہ مسئلہ کہاں رہ گیا؟

بہرحال اس وقت پورے مسئلہ پر کوئی سیر حاصل گفتگو ہمارے پیش نظر نہیں تھی بلکہ ہمیں جو جماعت اسلامی پاکستان کے سلسلہ میں اپنا موقف واضح کرنے کے لیے کچھ سخت الفاظ استعمال کرنا پڑے تھے ضروری تھا کہ اس کے اسباب کی طرف بھی کچھ اشارہ کر دیں۔ یہ تھوڑی سی تفصیل اسی بنا پر کرنا پڑی۔ ہمیں امید ہے کہ محترم مراسلہ نگار نے اور ان کے ساتھ ان کے ہم خیال دوسرے لوگوں نے بھی ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھ لیا ہوگا اور وہ ہمیں اس معاملہ میں معذور جانیں گے کہ جماعت اسلامی پاکستان پر کسی تنقید وغیرہ کو الفرقان کے صفحات میں جگہ نہ دیں۔ ہم اس جماعت پر کوئی تفریحاً تنقید نہیں کرتے اور نہ تفریحاً کسی تنقید کو نقل کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دین کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ مولانا مودودی کی یہ جماعت جب اپنی سیاسی ضرورتوں کی خاطر جن کی انتہا معلوم نہیں) دین کا حلیہ بگاڑ دینے پر تل گئی ہے تو پھر ہندوستان اور پاکستان دونوں کے اندر دین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہو سکتا۔ اور ہم ایسے فتنہ کے معاملہ میں کسی سے نہ مصالحت کر سکتے ہیں نہ کسی کی رعایت۔

ہاں یہ ہم بھی نہیں چاہتے کہ ہماری ان تنقیدوں کا جماعت اسلامی ہند پر اثر پڑے۔ لیکن اگر واقعہ یوں ہی ہے کہ ان تنقیدوں سے یہاں کی جماعت کے خلاف بھی تاثر پیدا ہوتا ہے تو اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں زیادہ قصور ان تاثر لینے والوں کا بھی نہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان اور جماعت اسلامی ہند بے شک ضابطہ میں بالکل ایک

دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ لیکن دونوں کا فکری سرچشمہ تو ایک ہی ہے۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اگرچہ پاکستان کی جماعت اسلامی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی لیکن اس کے ارکان و ہمدردان اور متفقین مولانا مودودی کے افکار سے ذہنی فیض تو آج بھی اسی طرح حاصل کرتے ہیں جیسے تقسیم سے ماقبل، اور نہ بھی وہ پہلے والی بات ہو بلکہ اب کہیں کہیں اختلاف رائے ہونے لگا ہو تب بھی یہ ذمہ داری تو تمام تر جماعت اسلامی ہند کے رسائل و اخبارات ہی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف تو ان کی تمام قابل تائید باتوں کی تائید بالواسطہ یا بلاواسطہ کرتے ہیں، ان سے متعلق قابل ذکر باتوں کو خصوصیت سے پبلسٹی دیتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ایک ہیرو اور آئیڈیل شخصیت کا تصور ان کے بارے میں دیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی جن باتوں کی تائید نہیں کر سکتے ان پر ایسی گہری خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ چاہے ہندو پاکستان کی صحافتی دنیا میں ان پر ایک ہنگامہ برپا رہے مگر ان کی خاموشی کسی پہلو نہیں ٹوٹتی۔ اور لوگ ترس جاتے ہیں کہ کچھ تو لکھیں۔ مثلاً کے طور پر یہ عورت کی صدارت کا مسئلہ ہی لے لیجیے۔ ہندوستان و پاکستان کے سارے پریس کا اس وقت سب سے مہم آرا دینی مسئلہ یہی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی ہند کے اخبارات و رسائل! جیسے کسی اور دنیا میں نکل رہے ہوں۔

ہمارے خیال میں اگر ان باتوں میں جماعت اسلامی ہند کا پریس اپنا رویہ بدل دے تو جماعت کے مخالفوں کا ذہن بھی اس کے بارے میں بدل جائے گا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی کے دوستوں کو اس بات کی تو شکایت پیدا ہو کہ لوگ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کے گناہ ان کے سر کیوں ڈالتے ہیں۔ لیکن اس کی جرأت نہ کی جائے کہ ان گناہوں کو گناہ کہہ کر اپنی برأت کا اظہار کر دیا جائے۔ اور یا اگر ان باتوں کو گناہ نہیں حق و صواب سمجھا جا رہا ہے تو سر اٹھا کر اس کا ساتھ دیا جائے۔ اور اس تائید حق اور شہادت حق کی خاطر ہر ملامت اور ہر نقصان کو گوارا کیا جائے۔

الغرض یہ مخالفوں کا تاثر تو جماعت اسلامی ہند کے پریس اور اہل قلم کی پالیسی کا نتیجہ ہے، یہ نہ الفرقان کا پیدا کردہ ہے اور نہ اس کو رد کرنا الفرقان کے بس کی بات ہے۔ جماعت اسلامی ہند

کی جو پالیسی اپنے کام اور اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں ادھر چند سال سے نمایاں طور سے بدلی ہے اس کا یہ کھلا ہوا نتیجہ ہے کہ ہمیں اس کے اصل نظریات سے اسی اختلاف کے باوجود جو جماعت اسلامی پاکستان یا مولانا مودودی سے ہمیں ہے اس سے کوئی تعرض کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن ہم یہ رویہ پاکستان کی جماعت اسلامی کے بارے میں تو نہیں اختیار کر سکتے۔ کیونکہ وہ بالکل دوسرے حال میں ہے۔ اب یہ جماعت اسلامی ہند کا کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس زد سے نکالے جو اس پر جماعت اسلامی پاکستان کی بدولت پڑ جاتی ہے اور جب تک وہ خود اپنی اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کمربستہ نہ ہو کسی کی بھی مدد اس معاملہ میں اس کے کام نہیں آسکتی۔



آپ کے پاس

الفرقان سنہ ۸۳ھ کے حسب ذیل پرچے ہوں اور آپ کو ان کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو براہ کرم دفتر الفرقان کو قیمتاً یا بلا قیمت جیسے پسند کریں ارسال فرمادیں شدید ضرورت ہے۔

محرم	صفر و ربیع الاول	شعبان	رمضان و شوال
۸۳ھ	۸۳ھ	۸۳ھ	۸۳ھ

منیجر

نوٹ:- اس شمارہ میں مکتوبات الامام کی قسط پر آخری قسط لکھی گئی ہے۔ اس کو نذر قارئین کرنے کی سعادت [illegible]

ایک مردِ مومن کی شہادت

از

محمد منظور نعمانی

الفرقان کے ناظرین کو شاید یاد بھی ہو اب سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے اپنے سفرِ حجاز کے تذکرہ کے سلسلے میں جدہ میں مقیم اپنے ایک بہت خاص اور مخلص دوست ارشد صاحب کا میں نے محرم ۱۳۸۳ھ (جون ۱۹۶۳ء) کے شمارہ میں ذکر کرتے ہوئے ان کے بارہ میں لکھا تھا کہ

ارشد صاحب پہلے پاکستان میں محکمۂ تار و ٹیلیفون کے افسروں میں تھے اب غالباً دو ڈھائی سال سے سعودی حکومت نے مستعار ان کی خدمات حاصل کرلی ہیں جدہ[1] ہی میں قیام رہتا ہے ..... یہ ہمارے ان خوش نصیب دوستوں میں سے ہیں جن پر بڑا ہی رشک آتا ہے، تقریباً ۲۰ سال سے ان سے تعلق ہے، تبلیغی کام سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں، جہاں تک یاد آتا ہے اب سے تقریباً ۲۰ سال پہلے میوات کے ایک تبلیغی اجتماع ہی میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، جہاں رہتے ہیں اپنے منصبی خدمات مثالی طور پر انجام دیتے ہیں لیکن ان کی اصل فکر دین کی فکر کی ہوتی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہو کہ اُن کے ذریعہ اُس کے کتنے بندوں کا تعلق اپنے مالک سے جڑا ہے، اب سے چند سال پہلے حکومت پاکستان کی طرف سے وہ جاپان بھیجے گئے تھے، ان کی دعوت کے نتیجہ میں اور ان کے ہاتھ پر سیکڑوں جاپانی مشرف باسلام ہوئے جن میں بعض بڑے فاضل اور بعض بدھ مذہب کے ممتاز راہب اور درویش بھی تھے۔ آج کل جدہ میں بھی ایک جاپانی نومسلم فاضل (محمد میتا) ان کے پاس مقیم ہیں یہ اُن کو انگریزی کے ذریعہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ پڑھاتے ہیں اور وہ اس کو جاپانی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ تقریباً دس پاروں کا ترجمہ مختصر وضاحتی نوٹوں کے ساتھ ہو چکا ہے[2]"

---

[1] جس وقت یہ سطریں لکھی گئی تھیں اس وقت تک ارشد صاحب کی رہائش جدہ ہی میں تھی اس کے بعد وہ مکۂ معظمہ منتقل ہو گئے تھے۔

[2] الحمدللہ جاپانی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ اور وضاحتی نوٹوں کا یہ کام اب مکمل ہو گیا ہے۔ اس کام کی مالی کفالت "رابطۂ اسلامیہ" (مکۂ معظمہ) نے کی ہے اور اسی کی طرف سے انشاءاللہ اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام ہوگا۔

یہ ارشد صاحب کا بہت ہی مختصر تعارف تھا۔ میں نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ۱۲ر اپریل ۱۹۶۳ء کو جب میرا جہاز جدہ کے ہوائی اڈہ پر اُترا تو ارشد صاحب موجود تھے ـــــ کسٹم وغیرہ کے قانونی مراحل کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھی پر لے گئے جہاں اسی دن یا ایک دن پہلے کے آئے ہوئے کئی پاکستانی اور کئی امریکن حجاج بھی مقیم تھے، ارشد صاحب کے بعض ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ جب سے موسم حج شروع ہوا ہے ان کی کوٹھی اسی طرح ان کے جاننے پہچاننے والے خاصکر تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے حجاج کا مسافر خانہ بنی ہوئی ہے، ہوائی یا بحری جہازوں کی آمد پر اکثر وہ خود جاتے ہیں اور اپنی موٹر پر بٹھا کے ان کو اپنے ہاں لے آتے ہیں، ان کی مہمانداری کرتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہو کہ اخیر شب میں اپنے ہی موٹر پر ان کو مکہ مکرمہ پہونچاتے ہیں اور وہاں مسجد حرام میں تہجد اور فجر پڑھ کے واپس ہوتے ہیں۔ اور صبح جدہ پہونچ کے اُردو اور انگریزی میں قرآن مجید کا درس دیتے ہیں جسکی روشنی میں عمر میتا جاپانی میں ترجمہ کرتے ہیں اور نوٹس لکھتے ہیں ـــــ میں ارشد صاحب سے متاثر تو بہت پہلے سے تھا لیکن اس سفر میں قریباً ۲۰ گھنٹے جو ان کے ہاں ٹھہرنا ہوا اور ان کا روزانہ کا پروگرام اور دینی سرگرمیاں علم میں آئیں تو یہ تاثر کئی گنا بڑھ گیا۔

پھر اب سے ٹھیک ایک سال پہلے آخر دسمبر ۱۹۶۲ء میں وہ جہاز مقدس سے ایک چلہ کا وقت لے کر بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں آئے، اجتماع کے بعد انھوں نے جماعت کے ساتھ ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اس سلسلہ میں لکھنؤ بھی دو دن قیام رہا، یہاں کی ان کی ایک تقریر کا خود مجھ پر اتنا اثر پڑا کہ عمر بھر میں شاید ہی کسی کی تقریر کا اتنا اثر ہوا ہو ـــــ

اب اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد پھر اسی ہفتہ (۲۶، ۲۷، ۲۸ر دسمبر کو) بھوپال میں تبلیغی اجتماع ہوا۔ یہ عاجز ۲۶ر کی صبح کو جب وہاں پہونچا تو تاج المساجد کے صحن میں قدم رکھتے ہی پہلی المناک خبر یہ سُنی کہ ارشد صاحب اسی ہفتہ ایک تبلیغی سفر میں مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ آتے ہوئے موٹر کے ایک حادثہ میں شہید ہو کر واصل بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حادثہ کی تفصیل جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے نام آئے حجاز مقدس کے ایک تبلیغی کارکن کے خط سے اور بھوپال کے اجتماع کے لیے وہاں سے آنے والے ایک دوسرے سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے۔

۱۳، ۱۴ر شعبان (پنجشنبہ و جمعہ) کو مدینہ طیبہ میں تبلیغی اجتماع تھا، یہ حجاز مقدس میں اس طرح کا

پہلا اجتماع تھا جس طرح کے اجتماعات تبلیغی کام کے سلسلہ میں ہندوستان یا پاکستان میں ہوتے ہیں جن کے لیے مہینوں پہلے سے محنتیں کی جاتی ہیں، ارشد صاحب نے اس اجتماع کے لیے بہت پہلے سے بڑی محنت کی تھی۔ پھر جب اجتماع کے دن آئے تو وہ پورے انہماک اور سرگرمی سے اجتماع کے کاموں میں لگے رہے اجتماع کے مختلف حلقوں میں کئی تقریریں خود بھی کیں اس کے لیے خاص طور سے کوشش کرتے رہے کہ کچھ لوگ بھوپال کے اجتماع میں شرکت کے لیے ہوائی جہاز سے فوراً ہندوستان جانے پر آمادہ ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے اس میں ان کو کامیاب بھی کر دیا۔

۱۴ اور ۱۵ کی درمیانی شب میں مسجد نبوی میں تہجد کی نماز پڑھ کے اور روضۂ اقدس پر سلام عرض کر کے ایک جہاز کے ذریعہ وہ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے ان کے ساتھ دو نو مسلم جاپانی رفیق بھی تھے، ایک عمر میتا اور دوسرے محمد مصطفیٰ نامی جو حال ہی میں آئے تھے ـــــ ان کے علاوہ دو پاکستانی مہمان بھی تھے ایک محمد حسن خطیب اور دوسرے شبیر حسین ہاشمی ـــــ یہ شعبان کی پندرھویں شب مبارک تھی، ارشد صاحب نے روزہ کی نیت کر لی تھی اور عمرہ کا احرام بھی باندھ لیا تھا، گاڑی ارشد صاحب خود ہی چلا رہے تھے۔ رابغ پہونچ کر (جو مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ کے تقریباً وسط میں ہے) گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، یہاں سے چلے تو ہاشمی صاحب نے گاڑی چلانا شروع کی۔ ابھی ۱۰-۱۵ منٹ ہی چلے ہوں گے کہ ایک موڑ پر جیپ پھسلی اور الٹ گئی۔ ارشد صاحب اور ہاشمی صاحب دونوں کے شدید ضربیں آئیں، باقی ساتھی بھی زخمی ہوئے مگر بہت زیادہ نہیں، ارشد صاحب تو حادثہ کے ۱۵-۲۰ منٹ بعد ہی روزہ اور احرام کی حالت میں اور ماہ خدا میں جاں بحق ہو گئے، اسی حال میں انھوں نے وصیت کی کہ ان کو مکہ معظمہ لے جا کے جنت المعلیٰ میں دفن کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا مدرسہ صولتیہ میں غسل دیا گیا، بعد عشا حرم شریف میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور اپنی آرزو اور وصیت کے مطابق جنت المعلیٰ میں مرشد العالم حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہم کے پہلو میں دفن کیے گئے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے راستہ کے شہیدوں میں شامل فرمائے اور مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے ـــــ ہاشمی صاحب جدہ کے ہسپتال میں داخل کیے گئے لیکن معلوم ہوا کہ دوسرے یا تیسرے ہی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا، اللہ تعالیٰ ان کی بھی پوری پوری مغفرت فرمائے اور آخرت میں بھی ان کو ارشد صاحب کا رفیق بنائے اور دونوں

* کے پسماندگان کے لیے اس صدمہ کو اپنے قرب کا ذریعہ بنائے اور صبر جمیل عطا فرمائے ـــــ ناظرین کرام سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

معارف الحدیث

(گزشتہ سے پیوستہ)

اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے:-

اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کم و بیش خرچ تو سب ہی کرتے ہیں لیکن اس خرچ کرنے سے لوگوں کو وہ روحانی خوشی حاصل نہیں ہوتی جو اللہ کے نیک بندوں کو دوسرے ضرورتمندوں اور مساکین و فقراء پر صدقہ کرنے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے کو لوگ کار ثواب نہیں سمجھتے بلکہ اس کو مجبوری کا ایک تاوان یا نفس کا ایک تقاضا سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اپنے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب پر بھی لوجہ اللہ اور ثواب کی نیت سے خرچ کرنا چاہئے۔ اس صورت میں جو خرچ اس مد میں ہوگا وہ سب صدقہ کی طرح آخرت کے بنک میں جمع ہوگا بلکہ دوسرے لوگوں پر صدقہ کرنے سے زیادہ اس کا ثواب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم سے ہمارے لیے خیر و سعادت کا ایک بہت بڑا دروازہ کھل جاتا ہے، اب ہم جو کچھ اپنے بیوی بچوں کے کھانے کپڑے پر حتیٰ کہ ان کے جوتوں پر جائز حدود میں خرچ کریں وہ ایک طرح کا "صدقہ" اور کار ثواب ہوگا، بس شرط یہ ہے کہ ہم اس ذہن سے اور اس نیت سے خرچ کریں۔

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَۃً عَلٰی اَھْلِہٖ وَھُوَ یَحْتَسِبُھَا کَانَتْ لَہٗ

صَدَقَةٌ ـــــــــــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی صاحب ایمان بندہ اپنے اہل و عیال پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے تو وہ اس کے حق میں صدقہ ہوگا (اور وہ عند اللہ ثواب کا مستحق ہوگا) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ جُهْدُ الْمُقِلِّ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ ـــــ رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ کون صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا وہ صدقہ افضل ترین صدقہ ہے جو غریب آدمی اپنی محنت کی کمائی سے کرے، اور پہلے اُن پر خرچ کر جن کے تم ذمہ دار ہو (یعنی اپنے بیوی بچوں پر) (سنن ابی داؤد)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدِیْ دِیْنَارٌ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی نَفْسِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی وَلَدِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی اَهْلِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی خَادِمِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْتَ اَعْلَمُ ـــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے (بتائیے کہ میں وہ کہاں خرچ کروں اور کس کو دے دوں) آپ نے فرمایا (سب سے مقدم یہ ہے) کہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے۔ آپ نے فرمایا تو اس کو اپنی اولاد کی ضروریات پر خرچ کرو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے، آپ نے فرمایا تو اس کو اپنی بیوی کی ضروریات پر خرچ کرو،

اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے، تو آپ نے فرمایا کہ پھر اس کو اپنے غلام اور خادم پر صرف کر دو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم زیادہ واقف ہو کہ تمہارے اہل قرابت میں کون زیادہ ضرورتمند اور مستحق ہے) (سنن ابی داؤد، وسنن نسائی)

(تشریح) غالباً ان صاحب کے ظاہری حال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اندازہ کیا تھا کہ یہ خود ضرورتمند اور تنگ حال ہیں اور ان کے پاس بس ایک دینار ہے اور یہ اس کو ثواب آخرت اور اللہ کی رضا کے لیے کہیں خرچ کرنا چاہتے ہیں اور ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ مومن بندہ جو کچھ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرے یا اپنے بیوی بچوں اور غلاموں پر (جن کی اس پر ذمہ داری ہے) خرچ کرے وہ سب بھی صدقہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب کا وسیلہ ہے، اس لیے آپ نے ان کو بالترتیب یہ مشورہ دیا ـــــ عام اصول اور حکم یہی ہے کہ آدمی پہلے اُن حقوق اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرے جن کا وہ ذاتی اور شخصی طور پر ذمہ دار ہے اس کے بعد آگے بڑھے ـــــ ہاں وہ خاصانِ خدا جن کو توکل و اعتماد علی اللہ کا بلند مقام حاصل ہو اور اُن کے اہل و عیال کو بھی اس دولت میں سے حصہ ملا ہو اُن کے لیے یہ صحیح ہے کہ خود فاقہ سے رہیں، پیٹوں پہ پتھر باندھیں اور گھر میں جو کھانا ہو وہ دوسرے اہل حاجت کو کھلا دیں ـــــ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خواص صحابہ کا حال اور طرز عمل یہی تھا ـــــ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (قرآن مجید الحشر)

اہل قرابت پر صدقہ کی خاص فضیلت:-

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَهِيَ عَلٰى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ ـــــ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی

سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی اجنبی مسکین کو اللہ کے لیے کچھ دینا صرف صدقہ ہے اور اپنے کسی

عزیز قریب (ضرورتمند) کو اللہ کے لیے کچھ دینے میں دو پہلو ہیں اور دو طرح کا ثواب ہے، ایک یہ کہ وہ صدقہ ہے اور دوسرے یہ کہ وہ صلہ رحمی ہے (یعنی حق قرابت کی ادائیگی ہے) جو بجائے خود بڑی نیکی ہے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

عَنْ زَيْنَبَ اِمْرَأَةِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ قَالَتْ فَرَجَعْتُ اِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ فَقُلْتُ اِنَّكَ رَجُلٌ خَفِيْفُ ذَاتِ الْيَدِ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَمَرَنَا بِالصَّدَقَةِ فَأْتِهِ فَاسْئَلْهُ فَاِنْ كَانَ ذَالِكَ يُجْزِئُ عَنِّيْ وَاِلَّا صَرَفْتُهَا اِلٰى غَيْرِكُمْ قَالَتْ فَقَالَ لِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بَلْ اِئْتِيْهِ اَنْتِ قَالَتْ فَانْطَلَقْتُ فَاِذَا اِمْرَأَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ بِبَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجَتِيْ حَاجَتُهَا قَالَتْ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اُلْقِيَتْ عَلَيْهِ الْمَهَابَةُ فَقَالَتْ فَخَرَجَ عَلَيْنَا بِلَالٌ فَقُلْنَا لَهُ اِئْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبِرْهُ اَنَّ اِمْرَأَتَيْنِ بِالْبَابِ تَسْأَلَانِكَ اَتُجْزِئُ الصَّدَقَةُ عَنْهُمَا عَلٰى اَزْوَاجِهِمَا وَعَلٰى اَيْتَامٍ فِيْ حُجُوْرِهِمَا وَلَا تُخْبِرْهُ مَنْ نَحْنُ قَالَتْ فَدَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ هُمَا قَالَ اِمْرَأَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ وَزَيْنَبُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الزَّيَانِبِ قَالَ اِمْرَأَةُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ لَهُمَا اَجْرَانِ اَجْرُ الْقَرَابَةِ وَاَجْرُ الصَّدَقَةِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب سے روایت ہو کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک خطبہ میں خاص طور سے عورتوں کو مخاطب کرکے) فرمایا کہ اے خواتین تم کو چاہیے کہ راہ خدا میں صدقہ کیا کرو اگرچہ تم کو اپنے زیورات میں سے دینا پڑے (آگے زینب بیان کرتی ہیں کہ) میں نے جب حضور کا یہ ارشاد سُنا تو میں اپنے شوہر عبداللہ بن مسعود کے پاس آئی اور میں نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم عورتوں کو خاص طور سے صدقہ کی تاکید فرمائی ہے (اور میں چاہتی ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے اُس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے کی سعادت حاصل کروں) اور تم بھی تنگ حال اور خالی ہاتھ ہو، اب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کرو (کہ اگر میں تم کو دے دوں تو کیا میرا صدقہ ادا ہو جائے گا ——— اگر میرا تم کو دینا صحیح ہو تو میں تم ہی کو دے دوں گی ورنہ دوسرے ضرورتمندوں پر خرچ کر دوں گی ———

کہتی ہیں کہ عبداللہ بن مسعود نے مجھ سے کہا کہ تم خود ہی جاکر حضور سے دریافت کرو، تو میں خود گئی، وہاں پہونچی تو دیکھا کہ انصار میں سے ایک عورت آپ کے دروازہ پر کھڑی ہے اور اس کی غرض بھی وہی ہے جو میری غرض ہے (یعنی وہ بھی یہی مسئلہ معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ہیبت دی تھی (جس کی وجہ سے ہر ایک کو آپ سے دو بدو بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اس لیے ہمیں خود آپ کے قریب پہونچ کر پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی) اتنے میں (آپ کے خاص خادم اور مؤذن) بلال باہر نکلے، ہم دونوں نے اُن سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیجئے کہ دو عورتیں دروازہ پر کھڑی ہیں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہیں کہ اگر وہ اپنے ضرورتمند شوہروں اور اُن یتیموں پر جو خود ان کی گود میں پرورش پا رہے ہیں صدقہ کریں تو کیا یہ صدقہ ادا ہو جائے گا (اور ہم کو اس صدقہ کا ثواب ملے گا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہ بتانا کہ ہم کون دو عورتیں ہیں، ——— بلال آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان دونوں

عورتوں کا سوال آپ کی خدمت میں عرض کیا، آپ نے پوچھا کہ وہ کون عورتیں ہیں؟ بلال نے عرض کیا کہ ایک عورت تو انصار میں سے ہے اور دوسری زینب ہے، آپ نے فرمایا کون سی زینب؟ بلال نے عرض کیا عبداللہ بن مسعود کی بیوی زینب! آپ نے فرمایا ہاں (اُن کا صدقہ ادا ہو جائے گا، بلکہ اس صورت میں) ان کو دوہرا ثواب ملے گا ایک صدقہ کا ثواب اور دوسرا صلۂ رحمی کا ثواب۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَبُوْطَلْحَةَ اَکْثَرَ الْاَنْصَارِ بِالْمَدِیْنَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ وَکَانَ اَحَبَّ اَمْوَالِهٖ اِلَیْهِ بَیْرُحَاءَ وَکَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُهَا وَیَشْرَبُ مِنْ مَاءٍ فِیْهَا طَیِّبٍ قَالَ اَنَسٌ فَلَمَّا اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ قَامَ اَبُوْطَلْحَةَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ وَاِنَّ اَحَبَّ مَالِیْ اِلَیَّ بَیْرُحَاءَ وَاِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالٰی اَرْجُوْ بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللّٰهِ فَضَعْهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَیْثُ اَرَاکَ اللّٰهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ وَاِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَجْعَلَهَا فِی الْاَقْرَبِیْنَ فَقَالَ اَبُوْطَلْحَةَ اَفْعَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا اَبُوْطَلْحَةَ فِیْ اَقَارِبِهٖ وَبَنِیْ عَمِّهٖ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کھجور کے باغات کے لحاظ سے مدینہ کے انصار میں سب سے زیادہ دولت مند حضرت ابوطلحہ انصاری تھے اور انھیں اپنے باغات اور جائدادوں میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء تھا (یہ ان کے ایک قیمتی باغ کا نام تھا) اور یہ مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اسی تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کا نفیس پانی شوق سے) نوش فرماتے تھے ـــــ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ـــــ جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (نیکی اور مقبولیت کا مقام تم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی محبوب چیزوں کو تم راہِ خدا میں خرچ نہ کرو) تو حضرت ابوطلحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" اور مجھے اپنی ساری مالیات میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء ہے اس لیے اب وہی میری طرف سے اللہ کے لیے صدقہ ہے، مجھے اُمید ہے کہ آخرت میں مجھے اس کا ثواب ملے گا اور وہ میرے لیے ذخیرہ ہوگا۔ لہٰذا آپ اسکے بارہ میں وہ فیصلہ فرمادیں جو اللہ تعالیٰ آپ کے ذہن میں ڈالے (یعنی جو مصرف اس کا مناسب سمجھیں معین فرمادیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واہ واہ یہ تو بڑی نفع مند اور کارآمد جائداد ہے، میں نے تمہاری بات سن لی اور تمہارا منشا سمجھ لیا) میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اس کو اپنے عزیز و قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کردو، حضرت ابوطلحہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں یہی کروں گا، چنانچہ انھوں نے وہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) بعض روایات میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوطلحہ نے اپنا یہ باغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق اپنے خاص اقارب اُبیّ بن کعبؓ، حسّان بن ثابت، شدّاد بن اوس اور زبید بن جاریہ پر تقسیم کر دیا تھا ـــــ یہ باغ کسقدر قیمتی تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعد میں حضرت معاویہ نے صرف حضرت حسان بن ثابت کا حصہ ایک لاکھ درہم میں خریدا تھا۔

(فائدہ) چونکہ آدمی کا زیادہ واسطہ اپنے عزیزوں قریبوں ہی سے رہتا ہے اور زیادہ تر معاملات انھیں سے پڑتے ہیں اس لیے اختلافات اور تنازعات بھی زیادہ تر اقارب ہی میں

ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس دُنیا کی زندگی بھی عذاب بن جاتی ہے اور آخرت بھی برباد ہوتی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم و ہدایت پر عمل کیا جائے اور لوگ اپنے قرابت داروں پر اپنی کمائی خرچ کرنا اللہ کی رضا کا وسیلہ سمجھیں تو دُنیا اور آخرت کے بڑے عذاب سے محفوظ رہیں، کاش دُنیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کی قدر سمجھے اور اس سے فائدہ اُٹھائے۔

مرنے والوں کی طرف سے صدقہ :-

صدقہ کیا ہے؟ اللہ کے بندوں کے ساتھ اس نیت سے اور اس امید پر احسان کرنا کہ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت اور مہربانی نصیب ہوگی اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا کرم و احسان حاصل کرنے کا خاص الخاص وسیلہ ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح ایک آدمی اپنی طرف سے صدقہ کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ثواب و صلہ کی امید کر سکتا ہے اسی طرح اگر کسی مرنے والے کی طرف سے صدقہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب و صلہ اُس مرنے والے کو عطا فرمائے گا ـــــ پس مرنے والوں کی خدمت اور اُن کے ساتھ ہمدردی و احسان کا ایک طریقہ اُن کے لیے دُعا و استغفار کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے یا اسی طرح ان کی طرف سے دوسرے اعمالِ خیر کرکے ان کو ثواب پہونچایا جائے۔ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث پڑھیے!

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّيْ اُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَاَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَهَلْ لَهَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ نَعَمْ

ـــــــــــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میری والدہ کا بالکل اچانک اور

دفعۃً انتقال ہوگیا اور میرا گمان ہے کہ اگر وہ موت واقع ہونے سے پہلے کچھ بول سکتیں تو وہ ضرور کچھ صدقہ کرتیں تو اب اگر میں اُن کی طرف سے صدقہ کردوں تو کیا اس کا ثواب ان کو پہونچ جائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں پہونچ جائے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ تُوُفِّيَتْ اُمُّهٗ وَ هُوَ غَائِبٌ عَنْهَا فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّيْ تُوُفِّيَتْ وَ اَنَا غَائِبٌ عَنْهَا اَيَنْفَعُهَا شَيْءٌ اَنْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنِّيْ اُشْهِدُكَ اَنَّ حَائِطِي الْمِخْرَافَ صَدَقَةٌ عَلَيْهَا ـــــــــــــــــــ رواہ البخاری

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہ کی والدہ کا انتقال ایسے وقت ہوا کہ خود سعد موجود نہیں تھے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گئے ہوئے تھے، جب ان کی واپسی ہوئی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری عدم موجودگی میں میری والدہ کا انتقال ہوگیا تو اگر میں اُن کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا وہ اُن کے لیے نفعمند ہوگا؟ (اور اُن کو اس کا ثواب پہونچے گا؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں پہونچے گا، انھوں نے عرض کیا تو میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا باغ مخراف اپنی مرحومہ والدہ کے لیے صدقہ کردیا۔ (صحیح بخاری)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ الْعَاصَ بْنَ وَائِلٍ نَذَرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ اَنْ يَّنْحَرَ مِائَةَ بُدْنَةٍ وَاَنَّ هِشَامَ بْنَ الْعَاصِ نَحَرَ حِصَّتَهٗ خَمْسِيْنَ وَاَنَّ عَمْرًا سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَالِكَ فَقَالَ اَمَّا اَبُوْكَ لَوْ اَقَرَّ بِالتَّوْحِيْدِ فَصُمْتَ وَتَصَدَّقْتَ عَنْهُ نَفَعَهٗ ذَالِكَ ـــــــــــــــــــ رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا عاص بن وائل نے زمانۂ جاہلیت میں سو اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی تھی (جسکو وہ پورا نہیں کر سکے تھے) تو اُن کے ایک بیٹے ہشام بن العاص نے تو پچاس اونٹوں کی قربانی (اپنے باپ کی اس نذر کے حساب میں) کر دی اور دوسرے بیٹے عمرو بن العاص نے (جن کو اللہ نے اسلام کی توفیق دے دی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تمھارے باپ ایمان لے آئے ہوتے اور پھر تم ان کی طرف سے روزے رکھتے یا صدقہ کرتے تو وہ ان کے لیے نفعمند ہوتا (اور اس کا ثواب اُن کو پہونچتا۔ لیکن کفر و شرک کی حالت میں مرنے کی وجہ سے اب تمھارا کوئی عمل ان کے کام نہیں آسکتا) (مسند احمد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حدیثوں میں (اور ان کے علاوہ بھی بہت سی حدیثوں میں جو کتب حدیث کے مختلف ابواب میں مروی ہیں) یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ صدقہ وغیرہ جو قابل قبول نیک عمل کسی مرنے والے کی طرف سے کیا جائے یعنی اس کا ثواب اس کو پہونچایا جائے وہ اس کے لیے نفع مند ہوگا اور اس کو اس کا ثواب پہونچے گا، اس راستہ سے ہم اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں قریبوں اور دوستوں محسنوں کی خدمت ان کے مرنے کے بعد بھی کر سکتے ہیں اور اپنے ہدیے اور تحفے انکو برابر بھیج سکتے ہیں۔

مُسند حُمیدی

اہلِ علم کے لیے ایک غیر معمولی تحفہ

امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری کے استاذ خاص امام حُمیدیؒ کا مرتب فرمایا ہوا مجموعہ حدیث جو پہلی مرتبہ ہندوستان کے فاضل استاذ حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مدظلہ کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

بہترین کاغذ پر اعلیٰ درجہ کے ٹائپ سے چھپائی ہے۔ جلد اول = ۹/ ، جلد دوم = ۹/

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

آخری قسط

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ از ـــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب ۹۱ :۔ مولانا طاہر بدخشی کے نام ـــــــــ [معرفت اور ایمانِ حقیقی کا فرق]

بعد الحمد والصلوٰۃ و تبلیغ الدعوات ـــــــــ واضح ہو کہ تمہارا مکتوب جو شیخ سبحان دل کے ہاتھ بھیجا تھا پہونچ گیا ـــــــــ الحمد للہ کہ تم سلامتی اور عافیت کے ساتھ ہو ـــــــــ اس مکتوب میں چند سوال تم نے کیے تھے اُن کا جواب جو کچھ معلوم ہو سکا لکھا جاتا ہے ـــــــــ اچھی طرح غور کرنا۔

ایک سوال یہ تھا کہ درمیان معرفت و ایمان حقیقی کیا فرق ہے؟ ـــــــــ اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت (پہچان) اور چیز ہے اور ایمان، دیگر شے ہے ـــــــــ اس لیے کہ معرفت "شناختن" ہے اور ایمان "گرویدن" (مائل ہونا) ہے ـــــــــ ایک جگہ "شناختن" کا وجود ہوتا ہے مگر "گرویدن" کا وجود نہیں ہوتا ـــــــــ (چنانچہ) اہل کتاب کو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معرفت حاصل تھی اور وہ شناخت کرتے تھے کہ یہ پیغمبر ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (اہل کتاب پیغمبر آخر الزماں کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں) لیکن دشمنی و سرکشی کی وجہ سے چونکہ گرویدگی نہ تھی اس لیے ایمان

متحقق نہ ہوا ـــــ اور جس طرح ایمان کی دو قسمیں ہیں، صورتِ ایمان اور حقیقتِ ایمان اسی طرح معرفت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) صورتِ معرفت (۲) حقیقتِ معرفت ـــــ صورتِ ایمان وہی ہے جس کو حضرت حق سبحانہ نے اپنی کمال رافت اور مہربانی سے شریعت کے اندر نجاتِ اُخروی کے لیے کافی قرار دے دیا ہے۔ یعنی صورتِ ایمان "گرویدنِ قلب" ہے، نفسِ امّارہ کے انکار و سرکشی کے موجود رہتے ہوئے ـــــ اور صورتِ معرفت بھی اسی لطیفۂ قلب تک محدود ہے، نفسِ امّارہ کی جہالت کے ساتھ ساتھ۔ حقیقتِ معرفت یہ ہے کہ امّارہ جہالت جبلی سے باہر نکل آئے اور شناسائی کا مقام پیدا کرلے ـــــ اور حقیقتِ ایمان بھی نام ہے امّارہ کی گرویدگی کا درجۂ شناسائی پر پہونچنے اور اپنی طبعی آمادگی و سرکشی سے نکل کر نفسِ مطمئنہ بننے کے بعد ـــــ اگر سوال کریں کہ شریعت میں تصدیقِ قلبی کا اعتبار کیا گیا ہے ـــ یہ "گرویدن" وہی تصدیقِ قلبی ہے یا اُس کے علاوہ اور کوئی شے ہے؟ اگر یہ علاوہ تصدیق کے کوئی اور چیز ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ ایمان میں تین چیزیں معتبر ضروری ہوں۔ (۱) اقرار (۲) تصدیق (۳) گرویدن ـــــ حالانکہ یہ بات علماء کی مقرر کردہ بات کے خلاف ہے ـــــ اس صورت میں عمل جس کو بعض علماء نے ایمان کے اندر اعتبار کیا ہے ایمان کا جزوِ چہارم ہو جاتا ہے ـــــ جواب یہ ہے کہ "گرویدن" بالکل تصدیق ہی ہے اس لیے کہ تصدیق جو کہ حکم ہے اِذعان و یقین کے معنیٰ میں ہے، اسی کو "گرویدن" سے تعبیر کر لیا گیا ہے ـــــ اگر دریافت کریں کہ جب اہلِ کتاب ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بعنوانِ نبوت جانتے تھے لامحالہ وہ آپ کی نبوت کا حکم بھی کرتے تھے اس طرح اِذعان اور گرویدن کا مقام ان کو بھی حاصل تھا اس لیے کہ اس تقدیر پر حکم، عینِ گرویدن ہے ـــــ پس اُن کے حق میں ایمان کس لیے متحقق نہ ہوگا اور کس وجہ سے وہ دائرۂ کفر سے باہر نہ آئیں گے؟ ـــــ جواب یہ ہے کہ وہ بعنوانِ نبوت تو جانتے پہچانتے تھے لیکن بوجہ تعصب و عناد اُن کے قلب کو اِذعان نہیں حاصل ہوتا تھا کہ وہ آپ کی نبوت پر حکم کریں فقط معرفت و تصور کا حصول تھا۔ اذعان حاصل نہیں ہوا تھا کہ تصدیق بن جاتا نیز ایمان تک پہونچاتا اور کفر سے نکالتا ـــــ باریک فرق ہے۔ سنو اور

اپنے وجدان صحیح کی راہ پر گامزن ہو جاؤ ـــــ

عناد و دشمنی کی موجودگی میں نبیٌّ اللہ فَعَلَ کَذَا (نبی اللہ نے ایسا کیا) تو یہ کہا جا سکتا ہے لیکن جب تک اِذعان پیدا نہ ہو اِنَّہٗ نَبِیٌّ اللہ (بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں) یہ نہیں کہا جا سکتا ـــــ اس لیے کہ پہلی صورت میں فقط تصور ہے اور معرفتِ مشہورہ (جو معرفت لوگوں میں مشہور ہے) کا حوالہ ہے اور دوسری صورت میں تصدیق ہے جو کہ اِذعان و گرویدن پر مبنی ہے۔ جب تک اِذعان نہ ہو تصدیق کہاں سے رونما ہوگی؟ نیز صورتِ اولیٰ میں مقصود، اثباتِ نبوت نہیں ہے۔ بلکہ نبی کے فعل کا اثبات ہے اور صورتِ ثانیہ میں مقصود، اثباتِ نبوت ہے جس کو جذبۂ عناد و دشمنی برداشت نہیں کر سکتا ـــــ پس (پہلی صورت میں) اذعان کس طرح ہو سکتا ہے ـــــ اور اگر فرض کر دیے حصول اِذعان، تصدیق و حکم پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بھی داخلِ تصورات اور محض) صورتِ تصدیق ہے۔ جب تک اذعان نہ ہوگا اس وقت تک حقیقت تصدیق رونما نہ ہوگی اور ایمان حاصل نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ اصولِ مسائلِ کلام میں سے ہے اور بہت باریک مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے علماء اس کے حل کرنے میں عاجز ہو گئے ہیں اُن میں سے بعض نے مجبوراً رکنِ ثالث کو ایمان میں بڑھایا ہے اور "گرویدن" کو زائد بر تصدیق قرار دیا ہے۔ اور ایک دوسری جماعت نے بھی جس نے تصدیق کو عینِ گرویدن کہا ہے اس معمّا کو اچھی طرح حل نہیں کیا ہے اور اجمال پر اکتفا کر لیا ہے ـــــ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ (اللہ کی حمد ہے جس نے ہم کو اس کی ہدایت دی اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا تو ہم راہ یاب نہ ہوتے) ـــــ سُنو سُنو مُرکّبِ اضافی جیسے نبیُّ اللہ اور مُرکّبِ توصیفی جیسے ھٰذَا النَّبِیُّ یہ دونوں مُرکّب ہر چند اس حکم کو متضمن ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں اور مشتمل ہیں عنوانِ نبوت کے ساتھ معرفت پر ـــــ لیکن اس امر کی تصدیق کا حاصل ہونا کہ بیشک آپ نبی ہیں یہ اِذعان پر موقوف ہے جو کہ مُثبتِ ایمان ہے ـــــ غلامُ زَیْدٍ فَعَلَ کَذَا (زید کے غلام نے فلاں کام کیا) اور رَجُلٌ صَالِحٌ حَکَمَ بِکَذَا (نیک مرد نے فلاں حکم لگایا) یہ دونوں

جملے بے اذعان کے ثابت اور صحیح ہیں اور دونوں میں عنوان غلامیت اور عنوان صلاحیت کی معرفت ثابت ہے لیکن ان میں اذعان نہیں ہے کہ ہر ایک کی غلامیت و صلاحیت کی تصدیق حاصل ہو جائے۔

مکتوب (۹۹) - جناب سیادت مآب ارشاد پناہ میر محمد مومن بلخی کے نام۔

[اکابر ماوراء النہر[عہ] کے برکات کے بیان میں]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ (جس نے انسانوں کا شکریہ ادا نہ کیا اُس نے اللہ کا شکر نہیں کیا) حقوق علماء و مشائخ ماوراء النہر ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور کرے ـــــ ہم پسماندگان و دور افتادگان بلکہ تمام اہل اسلام ہندوستان کے اوپر اس قدر ہیں کہ احاطہ تحریر و تقریر میں نہیں آسکتے ـــــ ہم نے اہلسنت و جماعت کے آرائے صحیحہ کے مطابق، درستی اعتقاد کو انھیں (ماوراء النہری) بزرگوں کی تحقیقات سے اخذ کیا ہے۔ مسلک علماء حنفیہ کے موجب صحت عمل کو بھی انھیں بزرگوں کی تدقیقات سے حاصل کیا ہے۔ نیز مسلوک طریقۂ نقشبندیہ بھی اس ملک ہندوستان میں اسی سرزمین ماوراء النہر کی برکات سے ماخوذ ہے ـــــ اور مقام جذبہ و سلوک، فنا و بقا، سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کی تحقیق، کہ ولایت خاصہ اس سے وابستہ ہے ـــــ اسی مقام کے اکابر کے فیوض سے مستفاد ہے ـــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواہ ظاہر کی اصلاح ہو یا باطن کی فلاح ہم کو اسی جگہ سے حاصل ہوئی ہے ؎ ـــــ

شکر فیضِ[عہ] تو چمن چوں کند اے ابرِ بہار
کہ اگر خار و اگر گل ہمہ پروردۂ تست

اللہ تعالیٰ اس علاقے کو اور یہاں کے رہنے والوں کو آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔ بحرمۃ سید السادات صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ

عہ چوں کہ ملک توران جس میں نہر بھی ہے دریائے جیحون سے دوسری طرف واقع ہے اس لیے ایرانی ملک توران کو ماوراء النہر کہتے ہیں۔

عہ اے ابر بہار تیرا شکریہ چمن کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ چمن کے خار ہوں یا گل سب تیرے ہی پرورش کیے ہوئے ہیں۔

اس فضیلت و برتری کے باوجود ـــــ وہ احباب جو اپنی بعض ضروریات کے سلسلے میں اُس دیار سے ہندوستان آتے ہیں وہاں کے بابرکت حضرات کے الطافِ کریمانہ کا تذکرہ خصوصاً آنجناب کی عنایات کا جو اس احقر کے حال پر ہیں ـــــ ذکر کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ آنجناب کو مجھ سے حسنِ ظن ہے اور میرے بعض علوم و معارف کو آنجناب نے مطالعہ کر کے پسند فرمایا ہے۔ بزرگوں کی اس قسم کی بشارت، باعثِ ازدیادِ امیدواری ہو جاتی ہے۔ بعض اذواق و مواجید کے لکھنے کی ہمت دلائی ہے ـــــ ان آیام میں شیخ ابوالمکارم صوفی وہاں سے آئے ہوئے ہیں اُنھوں نے بھی آنجناب کے الطاف اور طرح طرح کی عنایات کا اظہار فرمایا ہے ـــــ بنا بریں جناب عالی کے اخلاقِ عالیہ کو پیشِ نظر رکھ کر چند کلمات کے ذریعے باعثِ دردِ سر بن کر خود کو آپ کی یاد آوری کے حوالے کر رہا ہوں ـــــ اس فقیر کے بعض مسودات کی نقل برادرم خواجہ محمد ہاشم کشمی نے ـــــ جو کہ فقیر کے دوستوں میں سے ہیں ـــــ صوفی ابوالمکارم مذکور کے سپرد کر دی ہے اس لیے اس پر اکتفا کرتا ہوں اور اس عریضے میں از قسم علوم و معارفِ صوفیہ، کوئی بات تحریر نہیں کر رہا ـــــ آپ حضرات کی عنایات و اشفاق سے امید ہے کہ خاص اوقات میں دعائے خیر اور دعائے سلامتی خاتمہ سے فراموش نہیں فرمائیں گے ـــــ رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ـــــ

اس فقیر کی دعاہائے فقیرانہ، جناب پناہ سید میر کرک شاہ، علامۃ الوری مولانا حسن، اور ناصر الشریعۃ حافظ الملۃ قاضی تولک ـــــ ادام اللہ تعالیٰ برکاتہم ـــــ کو پہنچا دیں ـــــ آنجناب کے صاحبزادوں سے بھی فقیر زادے التماسِ دعا کرتے ہیں ـــــ

مکتوب ۱۰۱ ـ شیخ عبداللہ کے نام ـــــ [مذاقِ فلاسفہ کے مطابق آیاتِ قرآن کی تفسیر و تاویل نہ کی جائے]

سلّمکم اللہ سبحانہ وعافاکم عن البلیات ـــــ کتاب تبصیر الرحمٰن[ع۵]

ع۵ یہ کتاب علامہ علی ابن احمد شافعی مہائمی کی تصنیف ہے۔ اس کو تفسیر مہائمی بھی کہتے ہیں۔ علامہ مہائمی اپنے زمانے کے اکابر علماء میں سے تھے اور عارف کامل تھے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ان کی اور بھی کئی تصانیف

(باقی اگلے صفحہ پر)

جو تم نے بھیجی تھی اُس کے بعض مواقع کا مطالعہ کرکے واپس بھیج دیا گیا ــــــ

مکرّما ــــ اس کتاب کے مصنف، مسلک فلاسفہ کی جانب بہت میلان رکھتے ہیں۔ نزدیک ہے کہ وہ حکماء کو انبیاء علیہم السلام کے برابر کردیں ــــ (اس میں) سورۂ ہود کی ایک آیت پر نظر پڑی اس کی تفسیر بطرز حکماء اتمادی کردیا ہے (وہ آیت اور تفسیر یہ ہے) "اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ بِاتفاقِ الانبیاء والحکماء اِلَّا النَّارُ الحسی او العقلی" اخ (آیت کا ترجمہ یہ ہے) یہ (کفار) وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے نار کے کچھ نہیں ــــ (تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ باتفاق انبیاء و حکماء اُن کے لیے آخرت میں کچھ نہیں ہے سوائے حسی یا عقلی آگ کے) ــــ اجماع انبیاء علیہم السلام کے بعد باتفاق حکماء لکھنے کی کیا گنجائش تھی؟ پھر عذاب اُخروی کے سلسلے میں حکماء کے قول کا (کہ نار سے مراد نارِ حسّی نہیں بلکہ نارِ عقلی مراد ہے) کیا اعتبار ہے؟ علی الخصوص جبکہ حکماء کا قول، مخالف قولِ انبیاء علیہم السلام ہو۔ فلاسفہ جو عذاب عقلی ثابت کرتے ہیں اُس سے اُن کا مقصود، عذاب حسّی کا انکار ہے۔ حالانکہ اجماعِ انبیاء، عذاب حسّی کے حق میں منعقد ہوا ہے ــــ (اس کتاب کے) دوسرے مواقع میں بھی آیاتِ قرآنی کی تفسیر موافقِ مذاقِ حکماء کی گئی ہے چاہے وہ اہلِ ملل کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کتاب کا مطالعہ (بغیر امتیازی استعداد کے) ضررہائے خفیہ

ــــ حاشیہ صفحہ گذشتہ ــــ

ہیں۔ غالباً معقولات کی آمیزش کی بنا پر حضرت مجدد کو اس تفسیر پر یہ تبصرہ کرنا پڑا۔ ورنہ اپنے رنگ میں یہ تفسیر ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ ربط آیات میں اس تفسیر کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ مولوی جمال الدین وزیر بھوپال کی مالی اعانت سے یہ کتاب مصر میں دو جلدوں میں چھپ گئی ہے ــــ علامہ بھائی قوم نوائت سے تھے۔ یہ قوم حجاج بن یوسف کے زمانے میں ان کے ظلم سے تنگ آکر عرب سے ہندوستان آگئی تھی اور کوکن کے علاقے میں ساحل بحر پر آباد ہوگئی تھی اسی بنا پر اس کو کوکنی کہا جاتا ہے ــــ علامہ بھائیؒ کی پیدائش ۱۲۷۷ھ میں اور وفات ۲۰ جمادی الآخرہ ۱۳۳۵ھ کو جمعہ کے دن ہوئی۔ آپ کی قبر بھائم علاقہ بمبئی میں ہے ــــ

(نزہۃ الخواطر جلد ۳ ــــ وتذکرۂ علمائے ہند)

بلکہ ضرر ہائے جلیہ سے خالی نہیں ہو ـــــ اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہوئے یہ چند کلمات لکھے گئے

مکتوب (۱۰۲) میر محمد نعمان اکبر آبادیؒ کے نام ـــ [ترغیب مجاہدات و تربیت طالبان حق تعالیٰ کے بیان میں]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ اس طرف کے فقراء کے احوال واوضاع لائق حمد ہیں ـــــ لِلّٰہِ سُبْحَانَہُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃُ دَائِمًا وَعَلیٰ کُلِّ حَالٍ ـــــ عرصہ ہوگیا کہ تم نے اپنے احوال خیر مآل کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ امید ہے کہ اپنی حالت میں (بہتر) تبدیلی کرلی ہوگی اور کاہلی سے عمل کی جانب اور فراغت سے مجاہدہ کی طرف متوجہ ہوگئے ہوں گے ـــ یہ وقت (نیکیوں کی) کاشتکاری کا ہے۔ موسم خورد وخواب نہیں ہے ـــ آدھی رات سونے کے لیے رکھیں اور باقی آدھی رات طاعت و عبادت کے لیے مقرر کریں اگر اس کی ہمت نہیں ہوسکتے تو تہائی رات کی بیداری کو لازم قرار دیں اور کوشش کریں کہ اس دولت کے حصول کی مداومت میں سستی نہ واقع ہو۔ مخلوق کے ساتھ بس اس قدر اختلاط وانبساط رکھیں کہ اُن کے حقوق کی ادائیگی ہوجائے۔ ضرورت کو بقدر ضرورت تک ہی رکھا جاتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ قدر حاجت سے زیادہ تعلق رکھنا فضول بات ہے اور مالا یعنی (لغو) میں داخل ہے۔ بسا اوقات اس پر ضررہائے عظیم مرتب ہوتے ہیں اور یہ بات ممنوعات شریعت وطریقت میں داخل ہوجاتی ہے ـــ مُرشد جب کہ مُریدوں کے ساتھ حد سے زیادہ انبساط واختلاط کا معاملہ رکھے گا یقیناً مُریدوں کو عقیدت وارادت کے دائرے سے باہر نکال دے گا اور اُن کی طلب میں فتور پیدا کرے گا۔ میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ـــ اس امر کی قباحت کو اچھی طرح ذہن نشین کرکے طالبوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک رکھیں کہ ان کے اُنس والفت کا سبب ہو نہ کہ اُن کی نفرت کا باعث ـــ مخلوق سے یکسوئی ضروری ہے کیونکہ بغیر ضرورت مخلوق سے تعلق رکھنا سمّ قاتل ہے۔ تم کو اللہ کی توفیق سے یہ بات بسہولت میسر ہے۔ بجائے عرب وناداری کیا کرسکتے ہیں وہ تو (مجبوراً) برابر ارباب تفرقہ (روٗسار) کے ساتھ جمع ہوتے ہیں ـــ اس نعمت کی قدر جانو اور طالبین کے حالات سے اچھی طرح خبردار رہو اور ظاہر وباطن سے ان کی تربیت کی جانب متوجہ رہو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

شریعت کا "جادہ" قویمہ شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں

(جناب غلام مصطفےٰ صاحب قاسمی)

[حیدرآباد (پاکستان) سے الرحیم نامی ایک ماہوار مجلہ قریب دو سال سے نکل رہا ہے جس کا مقصد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم و معارف کی اشاعت ہے۔

ذیل کا مضمون اس کے فاضل مدیر کے قلم سے ہے رسالہ کی علمی افادیت کی بنا پر ہماری خواہش تھی کہ اس پر الفرقان میں تبصرہ کے ذریعہ اپنے ناظرین کو متعارف کرائیں۔ یہ تو نہ ہو سکا۔ البتہ اس مضمون کی اشاعت سے اس کے فی الجملہ تعارف کی تقریب بن رہی ہے۔

ادارہ]

شریعت کے لغوی معنی اگرچہ راہ، راہ، منہاج اور پانی کا گھاٹ وغیرہ آئے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں شریعت سے مراد وہ الٰہی احکامات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اتارا ہے تاکہ وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ اور ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرے۔

شریعت کے یہ احکامات دو قسم کے ہیں۔

۱۔ معتقدات یہ کیفیتِ اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں علم کلام کی تدوین ان احکام کے لیے ہوئی ہے۔

۲۔ وہ احکام جن کا تعلق کیفیتِ عمل سے ہے۔ احکام کی اس دوسری قسم کا نام فرعی اور عملی ہے۔ علم فقہ میں ان ہی احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ احکام کی ان دو اقسام کی تفصیل میں اگرچہ اسلام کے مختلف طبقوں کا اختلاف رہا ہے لیکن اجمالی طور پر یہ سب فرقے اس

پر متفق ہیں کہ شریعت نام ہے اس قانون الٰہی کا جس کو پیغمبر اسلام انسانیت کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لیے اپنے پروردگار کی طرف سے لائے۔ اس لحاظ سے شریعت کے احکام کی اہمیت مسلم ہے اور اکراہ و اضطرار کے علاوہ اس کے کسی ادنیٰ حکم سے انحراف ناروا ہے۔

ائمہ فقہا کی طرف سے شریعت کے ماخذ اگرچہ چار بیان کیے گئے ہیں یعنی کتاب اللہ سنت، اجماع امت اور قیاس مگر سب نے اصل ماخذ کتاب اللہ کو ہی مانا ہے گویا نص صریح کے ہوتے ہوئے کسی بھی دوسری دلیل کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ علمائے اسلام میں سے بعض محققین کی تو یہ رائے ہے کہ احادیث نبوی کا ایک حصہ خود قرآن مجید سے ہی مستنبط اور اس کے لیے بمنزلہ شرح کے ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ایک جگہ حدیث کے علوم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ومن علومه تفسير القرآن والاستنباط منه وهو اعظم العلوم۔ وسنورد عليك منه كفافا۔	اور حدیث کے علوم میں سے ایک علم قرآن کی تفسیر اور اس سے احکام کا استنباط ہے، اور یہ بہت بڑا علم ہے۔ ہم اس سے یہاں کچھ ذکر کرتے ہیں۔
امر الله سبحانه باشياء مطلقه كالصلوٰة، والزكوة۔ وكقوله: سبح اسم ربك الاعلىٰ وسبح بحمد ربك وغير ذلك فوقتها رسول الله صلى الله عليه وسلم باوقات معينة۔ وامر الله بامور كقوموا وكبروا تل ما اوحي اليك واركعوا واسجدوا فبين رسول الله صلى الله عليه	(مثلاً) اللہ پاک نے چند اشیاء کے متعلق اجمالی حکم فرمایا ہے جیسے نماز زکوٰۃ اور جیسے یہ قول باری تعالیٰ کہ تو اپنے بلند پروردگار کے نام سے تسبیح پڑھ اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کر اسی طرح دوسری کئی آیات ہیں۔ اسکے بعد پیغمبر علیہ السلام نے اسکے لیے اوقات معین فرمائے اللہ تعالیٰ نے قیام تکبیر تلاوت قرآن، رکوع اور سجدہ کا حکم فرمایا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام

وسلم انها ارکان الصلوٰۃ۔ نے ان کو اس طرح بیان فرمایا کہ ان سب احکام کو نماز کے ارکان بتائے۔

اسی جگہ آیات قرآنی کی چند دوسری مثالوں کے ذکر کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

ونحن قد تتبعنا جمیع ما وصل الینا من الاحادیث الواردۃ فی کتاب الصلوۃ فوضح لنا انها مستنبطه کلها من کتاب اللہ سبحانه وتعالیٰ استنباطا حکمیا وعسیٰ ان یخطه فی رسالۃ منفردۃ[1]

اور کتاب الصلوٰۃ میں جتنی احادیث وارد ہیں ہمیں ملی ہیں، ان میں غور وفکر کرنے کے بعد ہمیں یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ سب احادیث حکمی استنباط کے ساتھ کتاب اللہ سے ماخوذ اور مستنبط ہیں اور ہم اس موضوع پر ایک جامع اور مستقل رسالہ لکھنے کا خیال رکھتے ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں جب اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور اس کے ساتھ نئے واقعات ومسائل بھی درپیش آئے تو امت محمدیہ کا ایک طبقہ جن کو "مجتہدین" کہا جاتا ہے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی علمی کوششیں شروع کیں۔ ان کو احکام کی علل تلاش کرنا پڑیں، جنہیں شارع علیہ السلام نے بصراحت یا بدلالت فرمایا تھا۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

ان من جملۃ احکام الشرع انه صلی اللہ علیه وسلم عهد الی امته صریحا او دلالۃ انه متی اختلف علیهم نصوصه او اختلف علیهم معانی نص من نصوصه فهم مامورون بالاجتهاد واستفراغ الطاقۃ

من جملہ احکام شریعت کے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بصراحت یا بدلالت یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب ان میں آپ کے منصوص احکام کے بارے میں اختلاف ہو یا آپ کی نصوص میں سے کسی نص کے معنی میں وہ باہم مختلف ہوں تو ان کو حکم ہے کہ اجتہاد

[1] الخیر الکثیر (عربی) صفحہ ۸۶ مطبوعہ مجلس علمی

فی معرفۃ ما ھو الحق من ذلک [1]	کریں اور ان اختلافی احکام اور معانی میں سے امر حق معلوم کرنے میں خوب طبیعت کا زور لگائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء کی یہ متفقہ رائے ہے کہ جس حکم شرعی کو مجتہد اپنی کوشش اور اجتہاد سے استنباط کرتا ہے، وہ شارع علیہ السلام کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ سے لیا گیا ہو، یا وہ اس علت کی طرف منسوب ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ماخوذ ہے۔

شاہ صاحب کے الفاظ میں اسے یوں زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

کل حکم یتکلم فیہ المجتھد باجتھادہ منسوب الی صاحب الشرع علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات اما الی لفظہ او الی علۃ ماخوذۃ من لفظہ [2]	جس حکم میں مجتہد اپنے اجتہاد سے گفتگو کرتا ہو وہ شارع علیہ الصلوات والتسلیمات کی طرف منسوب ہوتا ہو خواہ آپ کے الفاظ مبارک کی طرف منسوب ہو یا اس علت کی طرف جو آپ کے الفاظ سے لی گئی ہے۔

جب ان مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مساعی جمیلہ سے شریعت کے مسائل اور احکام مدون ہو چکے، تو ان سے بلا ضرورت باہر جا کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ شاہ صاحب نے ان مجتہدین کے مذاہب اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے اور ان سے باہر جانے کی ممانعت کے بارے میں ایک جگہ ایک باب باندھا ہے جس کے شروع میں وہ فرماتے ہیں:۔

اعلم ان فی الاخذ بھذہ المذاھب الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ و فی الاعراض عنھا کلھا مفسدۃ کبیرۃ ولحن نبین ذلک	جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی کرنے میں بڑا فساد ہو اور ہم اس بات

[1] عقد الجید تالیف شاہ ولی اللہ ص ۳ مطبوعہ مجتبائی [2] عقد الجید ص ۲۹

بوجوہ [1] کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے ان وجوہ کی تفصیل کے بعد علامہ ابن حزم اندلسی کے تقلید کو حرام قرار دینے پر مبسوط رد فرمایا ہے۔

اسلام کے اوائل دور سے لے کر تیسری اور چوتھی صدی تک شریعت کے بارے میں بڑا اہتمام رہا اور اس سلسلے میں اجتہادی رنگ کی تعلیم بھی جاری رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے صحابہ کو دینی مسائل کی علمی اور عملی تعلیم فرماتے تھے۔ آپ کے چھ صحابہ تو ایسے عظیم مجتہد اور قانون شریعت کے بڑے عالم نکلے کہ آپ کے عہد مبارک میں بھی وہ فتوے دیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ کو پیارے ہو گئے تو دوسرے صحابہ ان فقہاء صحابہ ہی کی طرف شرعی مسائل میں رجوع کرتے تھے۔ پھر تابعین نے صحابہ سے شریعت کی تعلیم حاصل کی اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

مدینہ منورہ چونکہ مہبط وحی تھا پھر تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے آخری دور تک جمہور صحابہ کا مسکن اور مقر مدینہ طیبہ ہی رہا اس لیے مدینہ منورہ کے کئی تابعی بزرگوں نے فقہ و حدیث کے متعلق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے جو متعدد روایتیں اور اقوال منقول تھے ان کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ مدینہ منورہ میں سات فقہاء ایسے ہوئے جنہوں نے فقہ میں عظیم مرتبہ حاصل کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگرچہ صحابی تھے لیکن اپنے والد بزرگوار فاروق اعظم کے فیصلوں کے متعلق فقہائے سبعہ میں سے ایک فقیہ سعید بن مسیب سے دریافت کرتے تھے کیونکہ سعید بن مسیب کو صحابہ کے فیصلوں پر بڑی دسترس تھی۔ [2] ان سات فقہاء کے علوم اور مسائل امام مالکؒ کے اساتذہ اور مشائخ تک پہونچے، جن کو امام دار الہجرہ مالک نے جمع کیا اور ترتیب دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح یہ مذہب ان کی طرف منسوب ہوا جس کو بڑے بڑے علماء دلائل کی بنا پر قرناً بعد قرن مانتے آئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

لانھا رای المدینۃ (ماوی) اور یہ اس لیے کہ مدینہ طیبہ ہر عہد اور

---

[1] عقد الجید ص۳۱ [2] تعلقات الکوثری ص۱۲۳ مطبوعہ مصر

الفقهاء ومجمع العلماء في	ہر زمانہ میں فقہائے اسلام اور علماء
كل عصر ولذلك ترى	کا مسجد اور مادی اور مرکز رہا ہے اور یہی
مالكا يلازم مجتهم[1]	وجہ ہے کہ امام مالک ان کے طریق کو
	نہیں چھوڑتے۔

باقی مذاہب کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ مثلاً کوفہ جس کی بنیاد حضرت فاروق اعظم نے رکھی اور ان کے ارشاد کے مطابق عرب کے مختلف قبائل وہاں بسائے گئے اور جن کی تعلیم کے لیے فاروق اعظم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کی طرف یہ کہہ کر روانہ فرمایا۔ اے اہل کوفہ! عبداللہ بن مسعود جیسے فقیہہ کی تو مجھے بھی ضرورت تھی لیکن میں اپنے اوپر تمہیں ترجیح دے کر اسے تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔

جملہ کتب حدیث اور کتب طبقات عبداللہ بن مسعود کی عظمت شان سے مملو ہیں۔ آپ کے مخصوص تلامذہ میں سے علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، عمرو بن میمون، ربیع بن خیثم اور مسروق شمار کیے جاتے ہیں۔ ..... یہ سب بالعموم اور علقمہ بالخصوص حضرت ابن مسعود کے فیض صحبت سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔ بقول علامہ ذہبی یہ کسی دوسرے صحابی کو علم میں ان پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود خلافت فاروق اعظم سے لے کر حضرت عثمان کی خلافت کے آخری دور تک کوفہ میں فقہ اور شریعت کی تعلیم دیتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کوفہ فقہاء سے بھر گیا اور جب حضرت علیؓ نے اپنے دارالسلطنت کو کوفہ کی طرف منتقل کیا تو وہ کوفہ میں فقہا کی کثرت کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔

رحم الله ابن ام عبد (ابن	اللہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود)
مسعود) قد ملاء هذه القرية	پر رحمت فرمائے۔ تحقیق اس نے اس
علماً[2]	شہر کو علم سے مالا مال کر دیا۔

اس کے بعد سیدنا علیؓ کے علوم سے بھی اہل کوفہ مستفید ہوتے رہے۔ پھر تو یہ شہر کثرت فقہاء

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۵ طبع مصر [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

محدثین و مفسرین اور علوم لغت عربیہ کے لحاظ سے جملہ بلاد اسلامیہ میں بے مثال شہرت کا مالک بن گیا۔ اور اس کے حضرت علیؓ کے دار الخلافت بننے سے بڑے بڑے فقہا نے اس میں سکونت اختیار کی اور اس شہر کی علمی وقعت بہت بڑھ گئی۔ صرف کوفہ میں بروایت عجلی پندرہ سو صحابہ کرام نے سکونت اختیار فرمائی تھی۔ اور وہ صحابہ ان کے علاوہ ہیں جو کوفہ کے گرد و نواح یا عراق میں سکونت پذیر ہوئے۔

اب اگر سیدنا علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ کی فہرست تیار کی جائے تو اس کے لیے ایک ضخیم دفتر چاہیے۔ یہ تو سب ائمہ حدیث کے ہاں مسلّم ہے کہ صحابہ کرام عبداللہ بن مسعودؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے شباہت رکھنے والے سمجھتے تھے۔ بالکل اسی طرح ابن مسعودؓ کے مخصوص شاگرد علقمہ کے متعلق تابعین کی یہ رائے تھی کہ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کی سیرت کے حامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ان تلامذہ کی تعلیم اور تربیت سے ابراہیم نخعی، ابو اسحاق سبیعی، اعمش اور منصور جیسے ائمہ پیدا ہوئے۔

حافظ ذہبی، ابو داؤد سجستانی کے تذکرے میں بعض ائمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سیرت میں علقمہ سے شباہت رکھتے تھے۔ علقمہ عبداللہ بن مسعود سے اور عبداللہ بن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شباہت رکھتے تھے۔ نقاد ان حدیث نے تو ابراہیم نخعی کے مراسیل کو بھی صحیح مانا ہے۔ امام شعبی کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ رائے بھی سن لیجیے۔

ھو احفظ لھا منی وان کنت	یعنی شعبی مغازی کو مجھ سے زیادہ یاد رکھنے
قد شھدتھا مع رسول اللہ	والا ہے اگرچہ میں ان مغازی میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلّم	صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔

اس جماعت فقہا کی صحبت اور تربیت سے امام ابو حنیفہ پیدا ہوئے۔ ان فقہا کے آثار کو امام ابو حنیفہ کے دو بڑے شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد نے جمع کیا اور کچھ آثار مصنف ابن ابی شیبہ میں مدون ہوئے۔ امام ابو حنیفہ نے اس طریقہ میں ایک اور تحقیقی اضافہ کیا اور وہ یہ کہ ان ائمہ فقہاء کے آراء اور علوم کو چالیس تلامذہ (جو کہ بذات خود بہت بڑے فقہا تھے) کی مجلس شوریٰ کے سامنے بحث و تمحیص کے لیے رکھا اور بحث و تحقیق کے بعد جو رائے متفقہ یا کثرت آراء

سے منظور کی جاتی تھی اس کو مدون کیا جاتا تھا۔ اور پھر یہ سب آراء امام محمدؒ کی کتب ظاہر الروایۃ میں مدون ہو گئیں۔ خطیب بغدادی ابن کرامہ کی سند سے لکھتے ہیں کہ ہم ایک دن وکیع کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے کسی مسئلے کے متعلق یہ کہا کہ ابو حنیفہ نے اس میں خطا کی۔ یہ سن کر وکیع فرمانے لگے کہ ابو حنیفہ کیسے خطا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ابو یوسف اور زفر جیسے قیاس کے ماہر تھے۔ یحییٰ بن ابی زائدہ اور حفص بن غیاث جیسے حفاظ حدیث تھے قاسم بن معن جیسے لغت عربیہ کے ماہر تھے، اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد اور متورع تھے جس شخص کے اس قسم کے ہم نشیں ہوں وہ خطا نہیں کریں گے اور اگر خطا کرتے تو یہ سب اس کی تردید فرماتے[1] امام ابو حنیفہ کے بعد امام شافعیؒ آتے ہیں۔ انھوں نے مدینہ طیبہ اور کوفہ کے علوم کے ساتھ مکہ مکرمہ کے علوم کو ملا دیا۔ امام شافعی نے مکہ کے علوم کو مسلم بن خالد سے حاصل کیا۔ انھوں نے ابن جریج سے اور ابن جریج نے عطاء سے اور عطاء نے ابن عباسؓ سے یہ علوم حاصل کیے۔ یہاں تک تو ائمہ اہل سنت کے مذاہب فقہ کے متعلق مختصر عرض کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جملہ مذاہب فقہ قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہیں اور اجتہادی مسائل میں ہر ایک امام کا طرز استنباط دوسرے سے الگ ہے۔ اس میں طبائع اور خطوں کے اختلاف کو بھی بڑا دخل ہے جس کی علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں تصریح فرمادی ہے لیکن آج کا دور ان اختلافات اور امت کے تشتت و افتراق کا متحمل نہیں ہو سکتا چاہے ہم نئے دور کے تقاضوں سے کتنی ہی چشم پوشی کریں اور ان سے آنکھیں بند کر لیں اور کوشش کریں کہ انھیں نہ دیکھیں لیکن حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہو گی اور ہماری اس چشم پوشی سے قوم کا نوجوان طبقہ کبھی مطمئن نہیں ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ طبقہ علماء میں سے بصیرت اور غائر نظر رکھنے والے علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے، ہمارے بزرگ و دوست اور وقت کے محدث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے اس سلسلے میں پہل فرمائی ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

شاہ ولی اللہ صاحب کی مولفات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اپنے دور میں ان اختلافات سے خوش نظر نہیں آتے اور جیسے موصوف نے تصوف کے مختلف مشارب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش فرمائی۔ اسی طرح فقہی اختلافات کو کم کرنے کے بھی وہ بڑے کوشاں تھے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۴۶

آپ کی تصنیفات میں تطبیق کا یہ پہلو اکثر نظر آئے گا۔ اس لیے آپ کو شریعت کے "جادۂ قویمہ" کے تعین کے لیے بھی سوچنا پڑا اور آپ نے اس سلسلہ میں اپنی مشہور تالیف تفہیمات الٰہیہ میں جو تحقیق فرمائی ہے اس کو ہم قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یہاں طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے اصل عبارت کو چھوڑ کر صرف ترجمہ پر اقتصار کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"دنیا کا مختلف طرق اور مذاہب میں بٹ جانا اور امت کا گروہ در گروہ ہونا ایک ایسا بڑا سانحہ ہے جس نے امت کے عوام اور خواص دونوں کو ڈرا دیا ہے۔ بعض اہل اللہ پر فقہائے اسلام کے ہر قول کا ارتباط شریعت محمدیہ سے منکشف تو ہوا لیکن اس کے لیے اس جادۂ قویمہ کا انکشاف نہ ہوا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے منکشف کیا اور اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوئے۔ (اصل میں) جس کو یہ طریقہ ہاتھ آیا، اس نے حظ وافر پایا اور جس نے اس کو نہ پایا وہ اس حظ وافر کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اگرچہ تکلیف اٹھانے کی وجہ سے وہ بھی ماجور ہوگا۔ اس قسم کے اہل اللہ فقہا کے بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کے بارے میں خاموش رہے اور مختلف اقوال کے درمیان تطبیق دینے کی صورت نکالی کہ اختلاف کو عزیمت اور رخصت پر حمل کیا (اور یہ کہا کہ) جو شخص عزیمت کی ادائیگی پر قوت رکھتا ہے تو عزیمت پر عمل کرے اور جس کی قوت جسمانی یا قوت روحانی اس کا تحمل نہیں کر سکتی تو وہ رخصت کو اختیار کرے۔ شعرانی نے (اپنی کتاب) میزان میں اس کو مفصل بیان کیا ہے اور شعرانی سے پہلے اس اصل اور قاعدے کی طرف شیخ محی الدین محمد بن علی بن عربی نے سبقت فرمائی ہے۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی گزرے ہیں کہ ان کو شریعت کا وہ جادۂ قویمہ نظر آیا جو کہ ظاہر شریعت کی طرف رہنمائی کرتا ہو اور وہ طریقہ جس کو جمہور مسلمانوں نے کبار تابعین سے اور تابعین نے کبار صحابہ سے اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حاصل کیا ہے جیسے کوئی چیز ہاتھ کے ذریعہ لی جائے۔ یا اگرچہ وہ بعینہ متوارث نہ ہو، لیکن متوارث سے قوی مشابہت رکھتی ہو اور ایسے شخص کو اہل الرائے کے مذاہب کنارہ کی طرح نظر آئے پھر اس بحث کنندہ متکلم دین کی نصرت اور اس سے مدافعت کا خیال کرتے ہوئے (اپنے زعم میں) راجح کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ طریقہ اکثر محدثین کا ہے، انھوں نے اس میں بڑی سعی فرمائی۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی ہیں جن کو (مذکورہ) دونوں باتوں پر اطلاع ہوئی۔ انھوں نے سب مذاہب کو اس طرح مانا کہ سب شریعت کے دائرہ میں داخل ہیں اور ان پر عمل کرنے کی دین میں گنجائش ہے مگر ان میں سے فضیلت جادۂ قویمہ کو ہے۔ اور یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کامل طور پر مرضی اور پسندیدہ ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ مجھے اس نے تیسری جماعت میں سے بنایا۔ اور میرے لیے شریعت کی اصل اور تبیان کو منکشف فرمایا۔ یہ تبیان وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لتبین للناس ما نزل الیھم یعنی تم لوگوں سے اس کو بیان کرتے رہو جو کہ لوگوں کی طرف اترا ہے۔

اس کی مثال (اس طرح سمجھیے کہ) اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ یعنی نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اقامت کا لفظ "قامت السوق" کے عربی محاورے سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بازار لگ گیا۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بازار میں خرید و فروخت شروع ہو جائے۔ اس سے یہاں مقصد ہے رواج اور اشاعت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد تروتیج کو اس طرح بیان فرمایا کہ اوقات نماز کی تعیین فرمائی۔ رکعات نماز کے عدد بتلائے صفت (یا ہیئت) نماز کی تعلیم فرمائی۔ اذان کو مشروع فرمایا۔ جماعت سے نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ مساجد کی تعمیر اور ان میں حاضر ہونے کو مستحب قرار دیا۔ یہ تمام چیزیں "اقامت صلوٰۃ" کی تبیان اور تفسیر ہیں۔ اگر اس طرح واضح اور مفصل بیان نہ ہوتا تو ہم اس کو کبھی سمجھ نہ سکتے اسی طرح زکوٰۃ دینے کو اس طرح بیان فرمایا کہ نصاب کی تعیین کی اور مقدار واجب، جنس واجب اور دوسری چیزوں کو واضح فرمایا۔

اس کے بعد پھر اس تبیان اور تفسیر کی وضاحت اور تفسیر صحابہ اور تابعین کی طرف سے ہوئی۔ اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اشارہ بھی فرمایا۔ اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ یعنی میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کریں اور یہ فرمایا: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ میرے صحابہ ستاروں کی طرح (روشن) ہیں جس کسی کی پیروی کرو گے تو راستہ پاؤ گے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

سفر میں نماز کو قصر فرمایا۔ سفر ہمارے ہاں مبہم چیز تھی۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباسؓ کے عمل سے اس کی وضاحت ہوگئی کہ وہ چار برد یا منازل سے عبارت ہے۔

اس کے بعد پھر قدمائے مجتہدین کے ہاتھوں اس کی وضاحت اور اس کے اصول اور فروع کی تدوین ہوئی۔ جس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق الایۃ

اس آیت میں صرف تین اعضاء کے دھونے اور چوتھے کے مسح کا ارشاد ہے۔ یعنی چہرہ ہاتھ کہنیوں تک اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا جائے اور سر کا مسح کیا جائے۔ اب مجتہدین نے اس میں اس طرح بحث کی کہ غسل کے معنی ہیں صرف پانی کا بہانا یا اس میں دلک بھی شرط ہے اور وجہ یا چہرے کی حد فلاں جگہ سے فلاں تک ہے۔ اور "الی المرافق" کے معنی ہیں "مع المرافق" یعنی کہنیوں کے ساتھ۔ اور مسح میں صرف مسح کا نام کافی ہے۔ اگرچہ ایک یا دو بال پر ہی ہو یا رُبع راس (چوتھائی سر) پورے سر کا مسح ضروری ہو۔ (اس طرح یہ مذاہب وجود میں آئے اسکے بعد ہر مذہب کے پیروکار متاخرین فقہا نے ائمہ مذاہب کے قواعد کو سامنے رکھ کر ان سے دوسرے مسائل کی تخریج کی اور ان مذاہب کی شرح بیان فرمائی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ میرے لیے یہ تمام چیزیں جس طرح نفس الامر میں اپنی ترتیب سے واقع ہیں، اس طرح واضح کی گئی ہیں جیسے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اور دین میں جو بھی کچھ کہا گیا ہے اس کو میں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اصل شریعت میں پایا۔ (مذاہب کے) اس اختلاف کے متعلق یہ گفتگو کتنی صادق آتی ہے کہ اس کی مثال ایک درخت کی ہے جس سے بڑی بڑی ٹہنیاں پھوٹیں۔ پھر ان ٹہنیوں سے دوسری چھوٹی ٹہنیاں نکلیں اور ٹہنیوں پر پتے اور پھول نکل آئے۔ یا اس کی مثال ایک ایسے پانی کے چشمے کی ہے جس سے بڑی نہریں نکلیں اور بڑی نہروں سے دوسری چھوٹی چھوٹی نہریں نکلیں اور ان چھوٹی نہروں سے باغوں کو بھرا گیا۔ اور اس سے زمین بھی سیراب ہوگئی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں (کہ جادۂ قویم کے سلسلہ میں) میرے لیے شاہراہ اور وسط طریق کا بھی انکشاف ہوا، جس کی رات (بھی) اس کے دن کی طرح روشن ہے۔ اس کا اوّل آخر کی طرح ہے اور ان مخفی اور مٹے ہوئے آثار کے راستے بھی معلوم ہوئے جن پر چل کر آنحضرت صلعم

اور ان کے صحابہ کے راستے تک کبھی رسائی نہیں ہوتی۔ جب تک رائے سے کام نہ لیا جائے اور اوہام اور ایسے شخص کی تقلید کے بار سے آزاد نہ ہو، جو خطا اور ثواب کا حامل ہے اور اس کے صحیح اور مخطی قول سے تخریج ہوتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جب رائے سے کام لیا جائے اور اوہام اور ایسے شخص کی تقلید کا بوجھ اٹھایا جائے جو خطا اور ثواب کا صاحب ہو اور پھر مصیب اور مخطی کے قول پہ تخریج کا بوجھ اٹھانا پڑے۔

میرے لیے اس رائے کی حقیقت بھی منکشف کی گئی جس کی سلف نے مذمت کی ہے اور چند فقہار کو اس کی طرف منسوب کیا ہے۔

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنیؒ کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابیطس اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے قیمت دس تولہ 3/8 پانچ تولہ 2/

شربت جذام جذام میں یہ دوا بیحد مفید ہے پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض دفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ -/5

شربت کند پتہ کی پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے قیمت ایک پونڈ 3/8

شربت درد گردہ پیشاب میں پتھری ریت آنا اور جلنگ پیدا ہو جانا یا رک رک کر پیشاب آنا یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے جن کی تکالیف پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں بعض کمی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ -/5

مرہم سرخ پھوڑوں، خصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے اسکے استعمال سے علیحدہ کا ذریعہ ہو جاتی ہے اور پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے۔

منیجر حسنی فارمیسی، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



روزہ

ایک تقریر جو گزشتہ رمضان میں کی گئی تھی

از جناب حیدالدین خاں صاحب

رمضان کا مہینہ روزے کا مہینہ ہے۔ اس مہینے کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ "یہ ایک ایسا مہینہ ہے جس کا پہلا حصہ رحمت ہے، اس کا دوسرا حصہ مغفرت ہے اور اس کا آخری حصہ آگ سے نجات دیتا ہے۔" اس وقت ہم اسی مبارک مہینے سے گزر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے لیے موقع ہے کہ وہ اس مہینے کی سعادتوں کو حاصل کرے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کے حق میں حدیث کے یہ الفاظ پورے ہوں۔ اور اس مہینے کی رحمتوں اور برکتوں میں اس کو پورا پورا حصہ ملے۔ ایسا شخص حدیث کی پیشن گوئی کے مطابق عنقریب اُس سے اس طرح نکلے گا کہ وہ دوزخ، اس پر حرام کر دی گئی ہوگی اور جنت اس کے لیے واجب ہو چکی ہوگی۔ اللہ ہم سب کو اپنے ان خوش نصیب بندوں میں شامل فرمائے۔

روزہ کے لیے اسلام میں "صوم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ صوم کے معنی ہیں ٹھہرنا، رک جانا۔ عربی میں کہتے ہیں صامت الریح (ہوا رک گئی)، ماء صائم (ٹھہرا ہوا پانی)۔ لغت کے ایک عالم لکھتے ہیں:۔

الصوم ۔ فی الاصل الامساک عن الفعل	صوم کا اصل مطلب ہے رکنا۔ خواہ یہ رکنا
مطعما کان او کلاما او مشیا ولذلک	طعام سے ہو یا کلام سے یا چلنے پھرنے سے
قیل للفرس الممسک عن السیر او العلف	چنانچہ جس گھوڑے کا چارہ اور سفر
صائم، قال الشاعر	(برائے تربیت) روک دیا جائے تو اس
خیل صیام واخری غیر صائمۃ	کو صائم گھوڑا کہتے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں روزہ ایک ایسے عمل کا نام ہے جب بندہ خدا کے حکم سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانا پینا اور بعض دوسری اپنی خواہشات مطلقاً ترک کر دیتا ہے۔ چھوڑنے اور ترک کرنے کا یہ عمل کس لیے ہے، اس کا مقصد قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے:۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔	اے مسلمانوں تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح وہ پچھلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے۔
بقرہ۔ ۱۸۳	——— تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ کی عبادت اس لیے مقرر کی گئی ہے تاکہ ہم میں تقویٰ کی صفت پیدا کی جائے۔ تقویٰ کے معنی ہیں بچاؤ، پرہیزگاری، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزاری جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں، جو اللہ کو غضبناک کرتے ہیں، جو اللہ سے دور کرنے والے ہیں ایسے اعمال سے پرہیز کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ یہاں میں ایک روایت نقل کروں گا جس سے تقویٰ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے:۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ انہ سأل ابی بن کعب عن التقویٰ فقال لہ اما سلکت طریقا ذا شوک؟ قال بلیٰ، قال فما عملت، قال شمرت واجتهدت، قال ذلک التقویٰ۔	حضرت عمر فرماتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا، تقویٰ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کیا آپ ایسے راستہ سے نہیں گزرے ہیں جہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوں، فرمایا، ہاں گزرا ہوں، انھوں نے پوچھا، پھر اس وقت آپ نے کیا کیا، فرمایا، میں نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے اور اس سے بچتا ہوا گزر گیا۔ انھوں نے کہا۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔
تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۴۰	

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا یہ راستہ جس سے گزر کر ہمیں اپنے رب تک پہونچنا ہے، اس میں ہر طرف ہمارے اتمان کے لیے حرام اور ناجائز چیزوں کی جھاڑیاں اپنے کانٹے اور شاخیں پھیلائے ہوئے ہیں۔ ہماری بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ہم ان جھاڑیوں سے بچتے ہوئے اس راستہ سے گزر جائیں۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو گویا کہ ہم نے تقویٰ کی زندگی پالی۔

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ روزہ ہمیں کس طرح رکھنا چاہیے۔ روزہ رکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کھانا پینا چھوڑنے کے ساتھ ہم نے تمام غلط باتیں بھی چھوڑ دی ہوں جس طرح ہم روزہ توڑنے والی چیزوں سے بچتے ہیں، اسی طرح ہم ان چیزوں سے بچیں جو ایمان خراب کرنے والی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:۔

من صام رمضان وعرف	جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی حدود
حدودہ وتحفظ مما ینبغی لہ	کو پہچانا اور ان باتوں کا لحاظ رکھا جن کا اسے لحاظ
ان یتحفظ کفر ما قبلہ	رکھنا چاہیے، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے
(ترغیب وترہیب)	جائیں گے۔

جس طرح رمضان میں ایک مہینے کے لیے اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ آپ دانہ پانی منہ میں نہ ڈالیں اسی طرح سال بھر اور ساری عمر کے لیے اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ آپ برے کام اور غلط کارروائیاں نہ کریں ——— کچھ الفاظ ہیں جن کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ ان کو اپنی زبان سے نہ نکالیں، کچھ مناظر کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ آوازوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے اپنے کان سے نہ سنیں، کچھ چیزوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ ان کو نہ چھوئیں، کچھ راستوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے پاؤں ان پر نہ چلیں، کچھ باتوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے دل و دماغ میں جگہ نہ پائیں ——— غرض آپ کے ہر عضو اور پورے وجود سے وہ کچھ چیزوں کا روزہ رکھوانا چاہتا ہے۔ اور رمضان میں آپ کا کھانے پینے کا روزہ اسی وقت مکمل ہوگا جب آپ دوسرے مہینوں کے دوسرے روزے بھی رکھ رہے ہوں۔ جو سال بھر "روزہ دار" رہتا ہے وہی رمضان کے روزے کو پاتا ہے، جو دوسری منع کی ہوئی چیزوں سے رکا رہتا ہے، اسی کا کھانے پینے سے رکنا مقبول ہوتا ہے۔

روزہ اولاً اسی قسم کی "بچاؤ" والی زندگی کی تربیت ہے۔ ایک مہینہ کے لیے چند عادی اور ضروری چیزوں کو محدود وقت میں اللہ کی رضا کے لیے چھڑا کر ہمیں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ اسی طرح ہم ساری زندگی میں ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیں جو ہم کو خدا کی ناراضی کی طرف لے جانے والی ہوں۔ وہ تمام چیزیں جن کو خدا نے حرام قرار دیا ہے یا ان سے منع فرمایا ہے، مسلمان کو ان سے عمر بھر کے لیے روزہ رکھ لینا ہے۔ اور کبھی ان کے قریب نہیں جانا ہے۔ ایسا شخص جس نے روزہ رکھ کر کھانا پینا چھوڑ دیا ہو، مگر اسی کے

ساتھ وہ بری عادتیں نہ چھوڑی ہوں جن کے لیے خدا کی شریعت میں کھلی ممانعت موجود ہے، تو اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں۔ حدیث میں آیا ہے:۔

لیس الصیام من الاکل والشرب انما الصیام من اللغو والرفث۔	روزہ صرف کھانا اور پینا چھوڑنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ لغو اور بیہودہ گوئی کو بھی چھوڑنے کا نام ہے۔

دوسری حدیث ہے:۔

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ۔	جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

ایک شخص اگر ایک طرف روزہ رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ جھوٹ، گالی، غیبت، چوری اور دوسرے برے کاموں میں بھی پڑا رہتا ہے تو ایسا شخص حقیقۃً روزہ دار نہیں ہے۔ اس قسم کا روزہ حدیث کے الفاظ میں "خدا کی جائز کی ہوئی چیز سے روزہ رکھنا اور اس کے بعد خدا کی حرام کی ہوئی چیز سے افطار کر لینا ہے۔" چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ روزے کے زمانے میں ایک شخص پچھنے لگانے والے سے پچھنے لگوا رہا ہے۔ دونوں روزہ رکھے ہوئے تھے۔ اور اسی کے ساتھ دونوں کسی کی غیبت کر رہے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا:۔

افطر الحاجم والمحجوم	ان دونوں شخصوں نے اپنا روزہ توڑ دیا۔

ایسے ہی روزوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف بھوک و پیاس کا دوسرا نام ہے۔

رب صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع۔	کتنے روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزہ سے بھوک کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

اگر ہم اپنے روزے کو واقعی روزہ بنانا چاہتے ہیں، وہ روزہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ الصوم لی وانا اجزی بہ (روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔) تو اس کی سب سے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ ہم ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیں جن کے متعلق ہمیں معلوم ہو کہ خدا نے ان سے منع کیا ہے۔ ہم عمر بھر کے لیے ایک ایسی زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں جس میں ہم تمام غلط اور

ناجائز باتوں سے روزہ رکھے ہوئے ہوں۔ اس کے بغیر روزہ رکھنا، اپنے آپ کو صرف بھوک پیاس کی مشقت میں مبتلا کرنا ہے کیونکہ ایسی زندگی کے ساتھ روزہ رکھنے کا وہ فائدہ ہرگز نہیں ہو سکتا جس کے لیے روزہ ہمارے اوپر فرض کیا گیا ہے۔

۲۔ مگر "چھوڑنے" کا یہ عمل صرف انھیں چیزوں تک محدود نہیں رہتا جن سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ ان چیزوں تک پہونچ جاتا ہے جن سے روکا نہیں گیا۔ جس طرح روزہ میں آپ دیکھتے ہیں کہ براہ راست جن چیزوں سے روکا گیا ہے وہ تو صرف تین ہیں ـــــ کھانا پینا، ازدواجی تعلقات۔ اور یہ بھی صرف دن بھر کے لیے۔ مگر دن کا یہ عمل رات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور چند چیزیں چھوڑنے کی وجہ سے بقیہ چیزیں بالواسطہ طور پر اس کی زد میں آجاتی ہیں ـــــ نیند میں فرق پڑ جاتا ہے، معمولات بگڑ جاتے ہیں، آرام لینے کا موقع نہیں ملتا، صحت کمزور ہو جاتی ہے۔ پہلے کی طرح آزادی باقی نہیں رہتی۔ اور اس طرح تقریباً پوری زندگی اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ یہی حال دینی تقاضوں کا ہے۔ خدا کا دین ہم سے دو قسم کی قربانیاں مانگتا ہے۔ ایک حرام چیزوں سے بچنا اور دوسرے خدا کے دین کے مطابق ٹھیک ٹھیک زندگی گزارنے اور خدا کے کام میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے کے لیے اپنے جائز حقوق اور جائز خواہشوں میں کمی کرنا۔ اس دوسرے عمل کے بغیر کسی بھی راہ میں پوری طرح اپنا فرض انجام نہیں دیا جا سکتا۔ روزہ جس طرح پہلی قسم کی چیزوں کے "ترک" کا سبق ہے۔ اسی طرح وہ دوسری قسم کی قربانی کی مشق ہے۔ روزے میں آدمی کو ان چیزوں کے بارے میں مشقت میں ڈالا جو اس کا جائز اور فطری حق ہیں، یہ گویا اسی دوسری طرح کی قربانی کا سبق دینا اور اس کا تجربہ کرانا ہے۔ روزہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی راہ میں آدمی کو صرف ناجائز چیزیں نہیں چھوڑنی ہیں بلکہ اس راہ میں اسے جائز چیزوں سے بھی دست بردار ہونا ہے کھانا پینا، لذت اور آرام، یہ سب انسان کے لیے بالکل جائز چیزیں ہیں مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی خدا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، اس وقت ضروری ہوتا ہے کہ مومن اپنی ان واقعی ضرورتوں کو بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ جیسے ایک کامیاب تاجر بعض اوقات اپنی مصروفیتوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ شیو کرنا بھول جاتا ہے۔ بروقت کھانا کھانے کا اسے موقع نہیں ملتا، بستر پر جانے کی نوبت نہیں آتی، تفریحات چھوٹ جاتی ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔ جو شخص قانونی قسم کی حرام چیزوں کو چھوڑنے کے

بعد یہ سمجھ لے کہ اب جو کچھ ہے وہ سب ہمارے لیے جائز ہی جائز ہے۔ وہ کبھی خدا کے دین پر ٹھیک ٹھیک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھانے کے معاملے میں صرف اس بات کا لحاظ رکھے کہ فلاں چیز زہر ہے، اس کو نہیں کھانا چاہیے۔ اور فلاں چیز انسان کی غذا ہے، اس کو کھانا چاہیے۔ اور یہ بھول جائے کہ چیزوں کی مقدار، ان کی نوعیت، موسم اور مزاج کے ساتھ ان کی مطابقت کا لحاظ بھی ناگزیر طور پر ضروری ہے۔ اگر ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بہترین غذا بھی کسی وقت آدمی کو اسی قسم کا نقصان پہونچا سکتی ہے جو کسی زہر کے کھانے سے اسے پہونچتا۔

روزہ میں اور دین کے اس دوسرے تقاضے میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے روزہ کے مہینہ کو شہر الصبر (صبر کا مہینہ) کہا گیا ہے اور روزہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ الصیام نصف الصبر (روزہ آدھا صبر ہے)۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کرنا، مشکلوں کے باوجود اپنی جگہ جمے رہنا۔ گویا روزہ اس بات کی تربیت ہے کہ حق کی راہ میں کبھی کھانا پینا چھوڑنے کا موقع آئے تو وہ کھانا پینا بھی چھوڑ دے۔ لذت اور آرام کے تقاضے ایک طرف کھینچ رہے ہوں اور خدا کا دین دوسری طرف بلا رہا ہو تو وہ لذت اور آرام کی خواہش کو دبا کر خدا کے دین کی طرف بڑھ جائے دین کا کام ٹھیک طور پر انجام دینے کے لیے اپنے معمولات میں فرق کرنا پڑے تو بخوشی اسے گوارا کرلے نہ کہ عادات و معمولات کے اوپر دین کو قربان کر دے۔ روزہ اس بات کا نام ہے کہ آدمی صبر اور برداشت کے ساتھ ہر اس چیز کو قبول کرلے جو دین کی راہ میں اسے پیش آئیں۔ خواہ وہ اپنی ناگزیر ضرورتوں کو چھوڑنے کا معاملہ ہو یا راحت و آرام کو چھوڑنے کا معاملہ۔

بڑی دکان، اونچی ملازمت، پھیلا ہوا کاروبار ـــــ یہ سب انسان کے لیے بالکل جائز ہیں۔ لیکن ان چیزوں میں پھنسنے کی وجہ سے اگر ایسا ہو کہ آدمی وقت پر دلجمعی کے ساتھ نماز ادا نہ کر سکے، اس کے پاس خدمت دین اور تلاوت قرآن کے لیے وقت نہ رہے تو ایسی حالت میں ضروری ہے کہ وہ قناعت کی راہ اختیار کرے، وہ اپنے دنیوی کام کو گھٹائے اور آخرت کے نقصان کو گوارا نہ کرے۔ عمدہ مکان، بہترین لباس، اعلیٰ فرنیچر اور شاندار سواری، یہ سب جائز چیزیں ہیں، ان میں سے کسی چیز کو بھی اللہ نے حرام نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی موجودگی کے معنی اگر یہ ہوں کہ آدمی کے گھر میں بجائے خدا کے انھیں چیزوں کا چرچا ہونے لگے، وہ خدا کی یاد سے آدمی

کو غافل کر دیں، وہ بڑائی اور کامیابی کا جھوٹا احساس آدمی کے اندر پیدا کرنے لگیں، تو اس وقت یہ جائز سامان بھی بت بن جاتے ہیں اور ضروری ہو جاتا ہے کہ انھیں توڑ کر آدمی اپنے آپ کو ان کے فتنہ سے بچائے۔ دنیا کے علوم حاصل کرنا اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ان کے معاشی مستقبل کو بہتر بنانا بالکل جائز کام ہیں لیکن اگر اس تعلیم کی قیمت یہ ہو کہ بچوں کو سر سے پیر تک "مغربی" بنا دینا پڑے، ان کے عقائد متزلزل ہونے لگیں، ان کی عبادات چھوٹ جائیں۔ اسلامی شعائر اور اسلامی آداب سے وہ عاری ہو جائیں، تو ایسی تعلیم شیطان کی شاگردی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی جس سے مسلمان بچوں کو دور رکھنا ضروری ہے۔ دنیا کی لذتیں اور دنیا کے سازوسامان بالکل جائز ہیں لیکن اگر ان کے درمیان اپنے کو رکھنے کی وجہ سے آدمی کا دل سخت ہونے لگے، وہ وہ رقت اور خشیت سے خالی ہو جائے، تو اس وقت ان چیزوں کی حیثیت آکاس بیل کی ہو جاتی ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ درخت کی زندگی بچانے کے لیے اسے کاٹ دیا جائے۔

یہ دوسرا سبق ہے جو روزے سے ہمیں ملتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر دین کا تقاضا ہو تو تمہیں چاہیے کہ نعمتوں کا دسترخوان سامنے ہوتے ہوئے بھی تم ان سے روزہ رکھ لو۔

۳۔ روزہ کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ دلوں میں نرمی اور گداختگی پیدا کر کے اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ تقویٰ اور تعلق باللہ کی لطیف روحانی کیفیت کا حامل بن سکے۔ انسان کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے۔ مادیت اور روحانیت، مگر وہ خدا جس کو ہمیں پانا ہے وہ ایک خالص غیر مادی وجود ہے۔ اس لیے اس کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے وجود کا مادی حصہ زیادہ سے زیادہ دب گیا ہو اور اس کا روحانی حصہ زیادہ سے زیادہ ابھر آیا ہو۔ روزہ ہماری مادی خوراک کو گھٹا کر ہمارے ساتھ یہی عمل کرتا ہے۔ وہ ہماری روحانیت کو بڑھاتا ہے۔ وہ ہماری مادیت کو کم کر کے ہماری حسی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ وہ ہمارے اندر وہ استعداد پیدا کرتا ہے جس کے بعد ہمارے اوپر خالص روحانی تجلیات کا نزول ہو سکے۔

اسی لیے حدیث میں روزے کو زکوٰۃ الجسد کہا گیا ہے۔ یعنی روزہ وہ عمل ہے جس سے جسم کو پاک کیا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں اسی چیز کو "تیسیر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے نزول قرآن کے مہینے میں روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:۔

یریدالله بکم الیسر ولا یریدبکم العسر (بقرہ) خدا تمہارے لیے یُسر فراہم کرنا چاہتا ہے، تم کو عُسر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

"یُسر" کے معنی آسانی کے ہیں یعنی کسی کام کو سہل الحصول بنا دینا اور "عسر" اس کا ضد ہے۔ روزہ بظاہر ایک سختی کا حکم ہے کیونکہ اس میں آدمی کو بھوک پیاس اور بے آرامی کو برداشت کرنا ہوتا ہے مگر یہ سختیاں در اصل سختیاں نہیں ہیں کیونکہ یہ ہماری حسّی قوتوں کو بیدار کرکے ہم کو اس قابل بناتی ہے کہ ہم تعلق باللہ کی دولت کو پاسکیں۔

نزول قرآن کے مہینے کو روزہ کا مہینہ قرار دینے کی مصلحت بھی یہی ہے۔ قرآن بظاہر آج ایک ایسی کتاب ہے جو لفظوں میں لکھی ہوئی ہر گھر میں موجود ہے اور ہر شخص جب چاہے اسے پڑھ سکتا ہے مگر محض اسی طرح الفاظِ قرآن کو دہرا لینے سے کوئی شخص قرآن کو نہیں پا جاتا۔ قرآن وہ عظیم ترین حقیقت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر اس کو پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ بھی کانپ اٹھتا اور پھٹ جاتا۔ ایسی حقیقت سے آشنا ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ محض ایک کتاب پڑھ کر اس کے مطالب کو جان لینا نہیں، بلکہ یہ خدا کے کلام کا بندے کے دل میں جگہ پانا ہے جو کچھ اللہ کے رسول پر اترا تھا، اس کو دوبارہ اپنے قلب پر اتارنا ہے۔

بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے اوپر اپنے احکام نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا تو انھیں ہدایت کی کہ وہ پہاڑ پر جاکر ایک مہینہ تک روزہ رکھیں اور اور عبادت کریں۔ (بعد کو یہ مدت چالیس روز کر دی گئی) اس کا مقصد در اصل ان کے اندر کلام الٰہی کا حامل بننے کی استعداد پیدا کرنا تھا۔ ٹھیک یہی صورت ہمارے ساتھ بھی اختیار کی گئی ہے۔ قرآن مجید جس مہینے میں اترا، اس کو اللہ تعالیٰ نے تمام امت کے لیے روزے اور عبادت کا مہینہ قرار دے دیا۔ یہ حضرت موسیٰ کی طرح ہماری تیس روزہ عبادت ہے تاکہ ہم قرآن کو اخذ کرنے کے قابل ہوسکیں۔ یہ قرآن کی زبان میں ہمارے لیے "تیسیر" کا انتظام ہے۔ اس میں در اصل اس بات کا اشارہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے اس درجے تعلق قائم کرنا چاہیں کہ ان پر اللہ اپنے کلام کے ساتھ اتر آئے۔ وہ اس سے حقیقی طور پر آشنا ہو جائیں ان کو اپنے جسم کو مشقت اور بے آرامی میں ڈال کر اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا، اپنے وجود کے مادی عنصر کو مغلوب کرنا

اور اس کے روحانی عنصر کو ابھارنا وہ ناگزیر عمل ہے جس کے بعد وہ اپنے کو اس کے قابل بنا سکتے ہیں۔

یہ ہے روزہ کی حقیقت۔ یہ ایک مخصوص عمل ہے جس کے ذریعہ ہم دینی حقیقتوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ روزہ کی حالت اپنے اوپر طاری کر کے ہم اپنے آپ کو اسکے لیے تیار کرتے ہیں کہ ہم دینی تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک انجام دے سکیں۔ اب جو شخص اس سے بے خبر ہے کہ روزہ کی حقیقت کیا ہے اور دین کے تقاضوں سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی کامیاب دکاندار کو دیکھے کہ خرید و فروخت اور حساب کتاب کی مشغولیت میں بعض اوقات اس کا کھانا پانی چھوٹ جاتا ہے، اور یہ سمجھ کر کہ بس "کھانا پانی چھوٹنا" ہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ وہ مصنوعی طور پر بھوکا رہنا شروع کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی نقالی سے کوئی شخص کامیاب دکاندار نہیں بن سکتا۔ ایک کامیاب دکاندار کے لیے فاقہ کی نوبت آنا محض ایک علیحدہ عمل نہیں ہے بلکہ اس کی اصل زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو الگ سے لاکر مصنوعی طور پر اس کے اوپر چپکا دی گئی ہو بلکہ وہ اس کے حقیقی وجود اور اس کی واقعی سرگرمیوں کا براہ راست ظہور ہے۔ اسی طرح روزہ وہی روزہ ہے جو آدمی کی اصل زندگی کے ساتھ پوری طرح متعلق ہو گیا ہو۔ جو اس کی اندرونی حالت کا ایک خارجی اظہار ہو، اس کے بغیر محض صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہنا، روزہ نہیں، بلکہ روزہ کی نقل ہے۔ وہ مصنوعی روزہ ہے نہ کہ حقیقی روزہ۔

آثار السُّنن

کی تائید میں القول الحسن فی الرّد علی ابکار المنن و فی تائید آثار السُّنن بفضلہ تعالیٰ چھپ کر شائع ہو گئی ہے صفحات ۱۸۴ ورق ۹۲ سائز ۲۶×۲۰ قیمت مجلد مع محصول ڈاک چار روپیہ صرف۔ پاکستانی حضرات کارڈ لکھ کر دریافت فرمالیں کہ منی آرڈر کہاں بھیجا جائے۔

المشتہر:- فرقانی بن محدث شوق نیموی
ٹیلہ شاہ پیر محمد، لکھنؤ، یو، پی ۳

معارف الحدیث

جلد سوم

معارف الحدیث کی دو جلدیں پہلے تیار ہو چکی ہیں

اب خدا کے فضل سے تیسری بھی تیار ہو گئی ہے جس کا مدت سے انتظار تھا

معارف الحدیث اردو ترجمہ، تشریح کے ساتھ، حدیث نبویؐ کا ایک جدید مجموعہ ہے جو

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ترتیب پا رہا ہے

اس کی تشریحات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دور حاضر کی ذہنی اور فکری کیفیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے ـــ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف کی خاص کوشش پوری کتاب میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابۂ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے کسی درجہ میں قارئین کے دلوں پر بھی وہی اثرات مرتب ہوں۔

جلد اوّل۔ ایمان اور آخرت کے بیان سے متعلق حدیثیں، صفحات ۲۸۸ قیمت مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/۵۰

جلد دوم۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں، صفحات ۳۴۰ " ۵/۵۰ " ۴/۵۰

جلد سوم۔ طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں، صفحات ۵۰۰ " ۸/- " ۷/-

ناشر:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

حجاج کرام کیلئے ضروری اطلاع

مکۃ المکرمہ پہنچنے پر جب آپکو گھڑی خریدنی ہو تو



سارجنٹ واچ



مضبوط رٹام واچ

خریدیئے

خوبصورت ڈزائن چلنے میں دیرپا قیمت میں کفایت

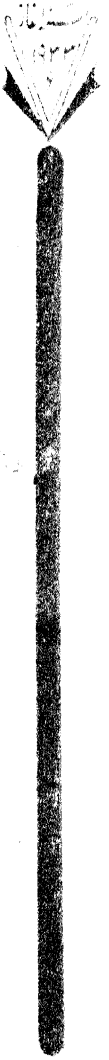
ایک ہی ڈاھر پر

رولیکس، اومیگا، ولیٹ اینڈ، رومر وغیرہ گھڑیاں

خریدنے کیلئے ذیل کے پتہ پر تشریف لاکر اپنا قیمتی وقت بچائیے

المشتھر

باک محل شارع الغزہ مکۃ المکرمۃ



الفرقان لکھنؤ

مرتب

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

(سنبھل)

محمد منظور نعمانی

فی رجسٹر ساٹھ نئے پیسے

معارف الحدیث

جس کا درس انظار الحق (حال مدرس) دارالعلوم [illegible] دیتے ہیں

اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ

حدیث نبوی کا ایک جامع مجموعہ

جلد

مصنف [illegible] کے قلم سے ترتیب پا رہا ہے

اس کا تشریحات کی ایک [illegible] کو [illegible] کی [illegible] کیا گیا ہے

دوسری [illegible] کی [illegible] پورا کرنا [illegible] ہے کہ [illegible]

[illegible] کے [illegible] کے [illegible] پر [illegible] اس [illegible] میں [illegible] کے [illegible]

[illegible] ہوں۔

سائز ۲۰×۳۰ ، روپہ کاغذ ، کتابت ، معیاری طباعت ، نفیس گلیز کاغذ

جلد اوّل — ایمان اور آخرت کے بیان سے متعلق حدیثیں — صفحات ۲۸۸ — قیمت مجلد ۴/- غیر مجلد 4/-

جلد دوم — تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں — صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد ۴/- غیر مجلد 4/-

جلد سوم — طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں — صفحات ۵۰۰ — قیمت مجلد ۷/- غیر مجلد 7/-

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ ۱ — لکھنے کا پتہ — محصول ڈاک علاوہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

فی کاپی ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ مطابق فروری ۱۹۶۵ء | شمارہ ۹

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اوّلیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	دیباچہ معارف الحدیث (جلد سوم)	محمد منظور نعمانی	۹
۳	تجلّیات مجدّد الف ثانیؒ	مولانا نسیم احمد فریدی	۱۷
۴	شریعت کا جادۂ قویمہ	مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی	۲۵
۵	عورت کی سربراہی کی حمایت	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۳۳
۶	انسان۔ جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی	جناب حید الدین خاں صاحب	۴۹-۵۶

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّتِ خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہِ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ فروری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح وتبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہِ کرم خط وکتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے صدارتی انتخاب میں جن لوگوں نے مس فاطمہ جناح کی حمایت یہ کہہ کر کی کہ کم از کم بعض خاص حالات میں تو عورت کو سربراہِ مملکت بنا لینے کا جواز شریعت میں ہے ہی، انھوں نے اپنے اس قول کی تائید میں جتنے معتبر علماء کے بھی فتوے اور فیصلے پیش کئے اُن سب میں کم و بیش یا تو غلط بیانی تھی یا زبردستی کی مطلب برآری۔ سوائے ایک فتوے کے، جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی جناب مولانا سید مہدی حسن نے اسی زمانہ میں بعض لوگوں کے سوال پر دیا تھا ——— اس فتوے میں اگرچہ پردے وغیرہ کی بعض شرطیں ایسے صاف الفاظ میں مذکور تھیں جن کے بعد مس فاطمہ جناح جیسی عورتوں کے مسئلے میں اس فتوے کو دلیل جواز بنانا کسی دیندار آدمی کو زیب نہیں دے سکتا۔ لیکن نفس اس مسئلہ میں کہ کسی عورت کو سربراہِ مملکت بنانے کی شریعت میں اصولی طور پر کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ ——— یہ فتویٰ اُن لوگوں کی پوری تائید کرتا تھا جو گنجائش کے مُدّعی تھے۔ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہمارے نزدیک اس نوعیت کا یہ تنہا فتویٰ تھا۔ اِسکے علاوہ جو فتوے اور عبارتیں قابلِ لحاظ علماء کی اس معاملہ میں پیش کی گئیں وہ محض فنکاری اور سیاسی پروپیگنڈے کا درجہ رکھتی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند ہماری مادرِ علمی ہے، اُسکے دارالافتاء سے ایسے فتوے کا اجرا ہمارے لئے بہت ہی حیرت انگیز اور موجبِ اضطراب تھا۔ اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے طبیعت خط و کتابت کی بھی متحمل نہ تھی۔ انتظار رہا کہ شاید دارالعلوم سے کوئی وضاحت آوے اور معلوم ہو کہ فتوے کی اصل نوعیت

کچھ اور تھی، جسے پاکستان میں کچھ لوگوں کی سیاسی ضرورتوں نے اسی طرح بالکل غلط رنگ دے دیا جیسے دوسرے بہت سے فتووں اور عبارتوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے دفتر سے جو وضاحت اس بارے میں شائع ہوئی وہ کوئی معنی ہی اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ اس وضاحت میں کہا گیا کہ فتوے کے آخر میں یہ شرط بھی درج تھی (جسے اخبارات میں حذف کر دیا گیا ہے) کہ عورت کو (کسی دینی مصلحت کے لئے) صرف اسی وقت سربراہ مملکت بنا لینا جائز ہے جب اس ذریعہ سے اس مصلحت کا حصول یقینی ہو، یعنی ..... ہمارے خیال میں نہ اس شرط کے کوئی معنی تھے اور نہ اس وضاحت کے کوئی معنی! اور جن لوگوں نے اسکے جواب میں یہ کہا کہ پیشگی یقین کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ مستقبل کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ ظن غالب ہی انسان قائم کر سکتا ہے، انھوں نے بالکل ٹھیک کہا۔ بہرحال اس مرحلہ پر ہم نے حضرت مفتی صاحب (مولانا سید مہدی حسن صاحب) کو ایک مفصل خط لکھا، اور ایک طالب علمانہ ذہن سے جو جو اشکالات اس فتوے پر عائد ہوتے تھے پوری صراحت کے ساتھ وہ سب حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

ہمیں بیحد مسرت ہے کہ ہمارے بزرگ مفتی صاحب نے بغیر اس خوف کے کہ اُن کی علمی شان پر کوئی حرف آئے گا، اور بغیر اسکے کہ اس میدان میں اُن کے مخاطب کی کیا حیثیت ہے بلا تاویل و بلا تأمل اپنے فتوے سے رجوع فرما لیا، اور پوری صراحت کے ساتھ رجوع فرمایا ——— حضرت مفتی صاحب کے گرامی نامہ کی نقل حسب ذیل ہے: ———

عزیزی مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ وبارک فی علمکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا کرمنامہ بلکہ ہدایت وسوالنامہ دیوبند سے ہوتا ہوا ۱۰/۹/۸۲ھ کو شاہجہانپور مجھ کو ملا، میں ذوماہ سے بوجہ علالت کے وطن میں ہوں، اُٹھنے بیٹھنے کی دشواری ہے، دعا کا طالب ہوں۔

آپ کی طویل تحریر بدقت پڑھی، اگرچہ میدانِ تحریر وسیع ہے اور کچھ نہ کچھ گوتقلب و توریث ہی کی صورت ہو[1] لکن الحق احق ان یتبع۔ کتابوں کی ورق گردانی اور مطالعہ مفاہیم و

---

[1] اس جملہ کا مطلب سمجھنے میں شاید دقت ہو آگے اس کی شرح کر دی جائے گی۔ ۱۲ مرسل خاطی خلاج کو معاملے میں یہ بات باعث صدمہ تھی۔

صراحت نصوص سے یہی ثابت ہے کہ عورت اسلامی نظریے کے ماتحت صدر مملکت اور سربراہ سلطنت نہیں ہو سکتی، اُس کا حاکم ہونا مردوں پر جائز نہیں ہے۔ اِس بنا پر میں اپنے پہلے جواب سے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے رجوع کرتا ہوں اور اسی کا قائل ہوں کہ شرعاً عورت حکمران با اختیار نہیں ہو سکتی۔ جواب میں بیشک خامی اور کوتاہی مجھ سے واقع ہوئی اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ حق کی طرف رجوع کرنے اور اپنی غلطی کا اقرار کر لینے میں مجھے کوئی باک نہیں۔ مخدومی مولانا منظور صاحب کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد طلب دُعا کی درخواست ہے۔ جواب میں اختصار کا راستہ اختیار کیا ہے طبیعت بھی ناساز ہے اور سوال و جواب کی طوالت سے بھی فریقین کو نجات حاصل ہے۔ والسلام (دستخط)

سید مہدی حسن عفی عنہٗ

جہانتک اصل مسئلہ کا تعلق ہے اُس میں مفتی صاحب کا یہ مکتوب کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں، البتہ شروع میں "تغلّب و توریث" کے الفاظ جس جملہ میں آئے ہیں اُسکے سمجھنے میں شاید عام طور پر قارئین کو دقت ہو۔ اس جملہ کی شرح یہ ہے کہ مفتی صاحب کا جو فتویٰ پاکستان میں استعمال کیا گیا (جو ایک پاکستانی مستفتی کے جواب میں تھا) اسکے علاوہ خود ہندوستان میں بھی کسی صاحب کے جواب میں مفتی صاحب نے جواز ہی کا فتویٰ کچھ مختلف الفاظ میں دیا تھا۔ وہ الفاظ یہ تھے:—

"ایسی عورت جو باپردہ رہتی ہو، نظم و نسق سلطنت اور امور مملکت سے بخوبی واقف ہو، اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہ اور جری ہو، ضرورت اور مجبوری کی صورت میں وہ صدر و زیر بن سکتی ہے۔ ہندوستان میں ایسے نظائر موجود ہیں۔"

ہم نے اس کو بھی سامنے رکھتے ہوئے مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ہندوستان میں جو ایسے نظائر موجود ہیں اُن کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ شریعت میں کس اصول سے معتبر ہوں گے؟ اور پھر دوسری بات یہ کہ وہ نظائر تو پاکستانی مسئلہ سے (جس کے متعلق مستفتی کا سوال تھا) مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ یہاں تو صدر کو اپنی مرضی سے منتخب کرنا ہے جبکہ اُس دور میں حکمراں یا وراثۃً بن جاتا تھا یا تغلّباً (زبردستی قبضے سے) اور ان دونوں صورتوں میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فتنہ و فساد سے بچنے کے لئے فاسق کی طرح عورت کی سربراہی بھی گوارا کر لینا جائز ہے، مگر اُس عورت اور اُسکے معاونین کے فعل کو تو جائز نہیں کہا جا سکتا۔

پھر آخر میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ شاید آپ کے ذہن میں برطانوی عہد کی ویسی ریاستوں کے بعض نظائر رہے ہوں گے، اور اُن کی حد تک آپ کے ارشادمیں کوئی کلام نہیں ہے۔ کیونکہ اوّلاً تو وہ "حکومتیں" نہیں تھیں، چند نمائشی اختیارات اور القاب و آداب کے کھلونے تھے، اور وہ بھی انگریز کے دیئے ہوئے، اور ہر وقت اُسی کے رحم و کرم پر۔ پھر وہاں مجبوری بھی واقعی معنیٰ میں ہوتی تھی کہ ذکور میں سے کوئی بھی وارثِ ریاست نہیں ہے، اور مزید برآں یہ کہ اس صورت میں عورت اگر گدی کو لات ہی مار دے تو صرف اپنا ہی نقصان نہ کرے۔ بلکہ ریاست کے مسلمانوں کو جو تھوڑی بہت آزادی اپنے معاملات میں اس گدی کی بدولت حاصل تھی وہ بھی جائے۔ چنانچہ ان سب باتوں کے لحاظ سے ایسی صورت میں کوئی کلام ہی نہیں ہوسکتا۔

ہماری اس گزارش کے بعد مفتی صاحب کو موقع تھا کہ وہ اپنے فتوے کا محل ایسی ہی نام نہاد حکومت کو قرار دیتے اور اسکے الفاظ میں جو وسعت نظر آتی تھی اُس کی نفی فرما دیتے، یا تغلب و وراثت کی شکل سے مخصوص کرکے اپنے الفاظ کی کوئی تاویل فرما لیتے۔ جملہ ذرا اُلجھا ہوا ہے لیکن ہم اپنے عریضے کی روشنی میں اس کا مطلب یہی سمجھے ہیں کہ مفتی صاحب نے اس جملہ میں ازراہِ حق پرستی تاویل وغیرہ کی گنجائش سے فائدہ اٹھانے اور لوگوں کے لئے کسی غلط فہمی یا حیلہ سازی کی گنجائش چھوڑ جانے سے انکار کیا ہے۔ اللہ اُن کو اس بلند کرداری کی بیش از بیش جزا دے۔ انھوں نے حق کے آگے اپنے کو پست کر دینے کا بہت ہی اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے ——— ہماری حقیر دُعا ہے اور ناظرینِ کرام سے بھی دُعا کی درخواست ہے کہ خداوند موصوف کو علالت کی شکایت سے نجات و دیگر صحت ارزانی فرمائے۔

مفتی صاحب کے فتوے کا وقتی طور پر جو اثر پڑنا تھا وہ تو بیشک پڑ چکا، اور اس لحاظ سے یہ رجوع اور اس کے لئے کوشش کچھ پہلے ہوتی تو بہتر تھا۔ لیکن اس کا دوسرا اچھا پہلو یہ ہے کہ اُس وقت یہ رجوع کسی سیاسی اثر یا مصلحت سے متہم ہوسکتا تھا، اب الحمدللہ اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اسی کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ ہم نے مفتی صاحب کی خدمت میں محض علمی سوالات اور اشکالات پیش کئے تھے کسی خاص جماعت یا کسی خاص گروہ کے فائدہ اُٹھانے کا سوال سامنے رکھ کر نہیں درخواست کی تھی کہ وہ اپنے فتوے پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ مفتی صاحب کے اس رجوع کے بعد کچھ ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اپنا عریضہ بھی سامنے لائیں۔ اب تو اس کی اشاعت نری خود نمائی ہوگی، ورنہ ہم اس کو بھی ناظرین

کے سامنے پیش کر دیتے۔

مفتی دار العلوم دیوبند کے اس فتوے کے علاوہ جو دوسرے علماء اور ائمہ کرام کے اقوال کا حوالہ عورت کی امارت کے جواز میں دیا گیا ہے اُن کا جائزہ ہم اپنے ایک مستقل مضمون میں لے رہے ہیں، جو اسی اشاعت میں شامل ہے، اور اس جائزے سے انشاء اللہ یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہ حوالے یا تو بالکل افتراء اور بہتان ہیں اور یا ان سے زبردستی اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ پورا مضمون اسی اشاعت میں آجائے، لیکن کچھ امکان اس کا بھی ہے کہ دو قسطوں میں کرنا پڑے۔

ناظرین کے علم میں ہے کہ اللہ کے فضل سے "معارف الحدیث" کی تیسری جلد بھی کتابی شکل میں تیار ہو گئی ہے۔ ادارۂ الفرقان کے لئے وہ دن بیحد ہی مسرت اور شکر کا ہوگا جب اس مبارک سلسلے کی تمام جلدیں تکمیل کو پہونچ جائیں گی، اِن شاء اللہ یہ اندازہ ہے اور انشاء اللہ العزیز کتاب کی تکمیل ۱۳۸۳ھ میں ہو جائے گی کہ اللہ نے وقت کے مطابق دین اور اُمت کی ایک بڑی خدمت کی توفیق ادارۂ الفرقان اور اس کے محترم بانی کو عطا فرمائی ہے۔ اس جلد کے پانچ سو صفحات ہیں۔ عمدہ سفید کاغذ اور نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت ——— آئندہ صفحات میں جہاں "معارف الحدیث" کی قسط جایا کرتی تھی اِس دفعہ اس نئی جلد کا دیباچہ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے، تاکہ الفرقان کے صفحات میں بھی اس جلد کی فی الجملہ تکمیل ہو جائے ——— یہ دیباچہ اس جلد کی کتابت و طباعت وغیرہ کا بعینہٖ نمونہ بھی ہے۔

چند قیمتی کتابیں جو خاص کر علماء و طلبۂ علم دین کے کام کی ہیں

لغات القرآن

از مولانا عبدالرشید نعمانی و مولانا عبدالرحیم بلیاوی
قرآنی الفاظ کے معانی و مصداق صرف عام لغت کی کتابوں سے نہیں متعین کیے جاسکتے اسی لیے عربی میں بھی علماء نے صرف لغات القرآن پر مستقل کتابیں لکھی ہیں یہ اردو میں اسی نوعیت کی نہایت مبسوط اور مفصل کتاب ہے۔ چھ ضخیم جلدوں میں مکمل سٹ ۳۷/۵۰ عہ
غیر مجلد ۳۱/۵۰

لغات الحدیث

از مولانا وحید الزماں مرحوم
قرآن پاک کی طرح حدیث کے الفاظ و معانی کا علم بھی علماء اسلام کی توجہ کا مستقل موضوع رہا ہے، یہ کتاب اردو میں اس علم کا ایک قابل اعتماد ذخیرہ ہے۔ طالبان علم حدیث کے لیے ناگزیر۔ مکمل چھ جلدوں میں (مجلد) فی جلد ۱۳/-

مُسند حُمیدی (عربی)

یہ کتاب ہندوستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے اہل علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ امام بخاری کے استاذ امام ابوبکر عبداللہ حمیدی کے مؤلفہ اس مجموعہ حدیث کا پہلا کتابی ایڈیشن ہے جو حرمین کے علمی جہاد دنیا بھر میں نئی چھپنے کتب خانوں کی زینت تھے ہمارے ملک کے نامور عالم حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے مدتوں کی محنت اور جستجو کے بعد ان تمام مزارکو اپنے گرانقدر حواشی کے ساتھ ایک مکمل کتابی شکل دی اور پھر نفیس ٹائپ سے اسکی طباعت کا انتظام کرایا۔ اتنی نایاب علمی دولت صرف اٹھارہ روپے میں۔

جامع ترمذی (اردو)

ترمذی شریف حدیث کی ان چھ کتابوں میں سے ہے جو صحیح ترمانی جاتی ہے۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی حدیث کا مرتبہ بھی بیان کردیتے ہیں کہ کس پائے کی ہے۔ اور جو فقہی مسئلہ حدیث سے نکلتا ہو اس میں ائمہ کا اختلاف بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں ہوا ہے قیمت مکمل ۱۶/-

انتخاب صحاح ستہ

(اردو ترجمہ مع اصل عربی)
صحاح ستہ کا مطلب وہ حدیث کی چھ کتابیں جو سب سے مستند ہیں۔ اس کتاب میں ان کی آٹھ سو حدیثوں کا ایک انتخاب کردیا گیا ہے۔ مجلد ۵/-

فتاویٰ رشیدیہ

علماء دیوبند میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا جو مقام ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ وہ دراصل مسلک دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں اور اس مسلک کی جیسی بہتر ترجمان یہ کتاب آپ ہی کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ غیر مجلد ۹/۵۰-۸/ مجلد ۹/۵۰۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

مکمل مبوب
دارالعلوم دیوبند کی مسند افتاء پر بڑی بڑی علمی ہستیاں رونق افروز رہی ہیں یہ فتاویٰ کے قلم سے سینکڑوں مسائل پر شرعی احکام کا مجموعہ ہے۔ چار جلدیں غیر مجلد ۲۱/-

امام ابوحنیفہ

شیخ محمد ابوزہرہ (مصری) اسوقت عالم اسلام کے مایۂ ناز عالموں میں سے ہیں۔ اسلامی قانون فقہ ان کا خاص موضوع ہے۔ اسلامی فقہ کے ائمہ پر ان کی کتابیں ہر طرف خراج تحسین پا چکی ہیں اردو میں بھی برابر ان کے ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ یہ امام اعظم ابوحنیفہ پر ان کی گرانقدر کتاب کا ترجمہ ہے جو پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ قیمت مجلد -/15

الجمال والکمال

(تفسیر سورۂ یوسف)
(از قاضی محمد سلیمان منصور پوری)
قاضی سلیمان صاحب اردو کے ایک معروف سیرت نگار رہے ہیں۔ ان کی یہ کتاب گویا قرآن کی بیان کردہ سیرت یوسفی کا عکس جمیل ہے۔ یہ بھی پاکستان کی مطبوعہ ہے۔
قیمت مجلد ۶/-

نور الدرایہ شرح ھدایہ

(فقہ حنفی کی مشہور درسی کتاب ہدایہ کی شرح)
ہدایہ کی شرح عین الہدایہ کو سامنے رکھ کر یہ اردو شرح مولانا محمد نعیم صاحب استاذ دیوبند نے لکھی شروع کی ہے۔ فی الحال چھ حصے۔
قیمت فی حصہ -/۲

مصباح اللغات

عربی الفاظ کے اردو ترجمے کے لیے ایک بے نظیر ڈکشنری۔ جو مقبول ہے۔
قیمت مجلد -/۱۶

چند مفید علمی، دینی اور تاریخی کتابیں

وحیِ الٰہی

(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

وحی کی حقیقت پر ایک محققانہ کتاب، جسکے مطالعہ سے وحی کی صداقت کا یقین دل و دماغ پر طاری ہو جاتا ہے۔ اور نئی تعلیم کے پیدا کردہ شکوک ایک ایک کر کے صاف ہو جاتے ہیں۔ قیمت غیر مجلدہ -/۳ مجلدہ -/۴

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور قرآن کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے رسول پاکؐ کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ یہ کتاب اسی طرح کے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ تصنیف مولانا اکبر آبادی۔

قیمت غیر مجلدہ ۲/۲۵ ، مجلدہ ۳/۲۵

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

از مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم

علم اخلاق پر ایک فاضلانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید اخلاقی نظریوں کو سامنے رکھ کر اصول اخلاق اور انواع اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور معاملہ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کا نظام اخلاق سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ قیمت غیر مجلدہ ۲/۵۰ مجلدہ ۳/

اسلام کا نظامِ حکومت

(از مولانا حماد الانصاری غازی)

اسلام کیسی حکومت کا داعی ہے اور اس نے اس شعبۂ زندگی میں دنیا کو کیا خاص پیغام دیا۔ مسئلہ کے تمام علمی اور عملی پہلوؤں پر مفصل کلام قیمت غیر مجلدہ -/۶ ، مجلدہ -/۷

مسلمانوں کا نظمِ مملکت

از ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مصری)

مسلمانوں نے صدیوں دنیا کے اکثر حصے پر جو حکومت کی اس حکومت کا علمی نظام کیا تھا؟ اور حکومت کے جتنے شعبے ہوتے ہیں مسلمانوں نے اُن کی تنظیم کس طرح کی۔ فن سیاست و جہانبانی میں مسلمانوں کے امتیاز و نقوش کا ایک علمی مرقع۔ مترجمہ مولانا علیم اللہ صدیقی۔ قیمت غیر مجلدہ ۴/۵۰ ، مجلدہ ۵/۵۰۔

مسلمانوں کا عروج و زوال

(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

مسلمانوں کے سیاسی عروج کے کیا اسباب تھے؟ اور کن عوامل نے انھیں زوال پذیر کیا۔ ایک علمی اور تاریخی جائزہ جو بصیرت افروز بھی ہے اور عبرت انگیز بھی قیمت غیر مجلدہ ۴/ مجلدہ ۵/

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ نہیں بلکہ ایک بالکل نئے زاویۂ نظر سے اس عروج و زوال کے دنیا پر اثرات کا جائزہ۔ ایک ایمان آفریں اور پیغام عمل دینے والی کتاب۔

قیمت مجلد ۴/۵۰

تاریخ دعوت و عزیمت

یہ کتاب مولانا علی میاں ندوی کی اہم ترین تصنیف ہے جو ان اکابر اسلام کے اٹھ کارناموں کو تفصیل سے سامنے لاتی ہے جنھیں خدا نے ہر ضرورت کے موقع پر اسلام کی صحیح ترجمانی اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے کھڑا کیا۔ تین جلدوں میں مکمل جلد اول -/۶ دوم ۶/۵۰ سوم -/۵

سوانح قاسمی

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے قلم سے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی علمی، عملی اور عرفانی زندگی کی تفصیل تین ضخیم جلدوں میں۔ مکمل -/۱۵

نقشِ حیات

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح حیات جو بتاتی ہے کہ ایسی عظیم شخصیتیں کس طرح بنتی ہیں جو بقول شاعر ؎ در دل کسے حرام شریعت در نگنجد ایمان عشق کے مصداق ہوں۔ مکمل دو جلدوں میں۔ ۸/۵۰

طوفان سے ساحل تک

نومسلم جرمن فاضل محمد اسد صاحب کی قبول اسلام کی مکمل سرگزشت کا مختصر ترجمہ۔ جس کا خاص پیغام یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی لائی ہوئی بلاؤں سے نجات اسلام ہی کی آغوش میں مل سکتی ہے۔ قیمت مجلد -/۵

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

دیباچہ

از مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اسلام میں بلکہ کسی بھی مذہب میں ——— جس کو مذہب کہا جا سکتا ہو ——— نبی اور رسُول کے بغیر ہدایت کا کوئی تصوّر ہی نہیں۔ نبی اور رسُول ہی پر براہ راست ہدایت کا نزول ہوتا ہے، وہی بندوں کو اللہ کی ہدایت پہونچاتا ہے، وہی اسکے اصولوں کی تشریح کرتا اور احکام کی عملی شکلیں بناتا ہے، پھر اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے ضروری سوالات کا وہی جواب دیتا ہے۔ اسلئے ہدایت کے نظام میں رسُول ہی کی حیثیت مرکزی اور بنیادی ہے، اور وہی انسانوں کے لئے ہدایت کا ماخذ ہے، اور اسی لئے اُس پر ایمان لانا اور اُس کو اللہ کا مقرر کیا ہوا راہنما ماننا نجات اور سعادت کی بنیادی شرط ہے ——— ہمارے اس دَور کے لئے بلکہ چھٹی صدی عیسوی سے اِس دُنیا کے آخری دن یعنی قیامت تک کے لئے اور پورے عالم انسانی کے لئے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے نبی و رسُول ہیں۔ اُن کے خاتم النّبیین ہونے کا یہی مطلب ہے کہ اب قیامت تک انہی کی نبوّت و رسالت کا دَور ہے، اب اللہ کی رضا اور اُس کا قرب حاصل کرنے کی راہ صرف وہی ہے جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرمائی ——— قرآن مجید میں خود آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: ———

"قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ" ——— (آل عمران۔ ع ۴)

(اے پیغمبر! تم صاف صاف بتا دو کہ اے لوگو اگر تم خدا کو چاہتے ہو اور اس کی رضا و رحمت اور اُس کے پیار کے طلبگار ہو تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو اور میری بتائی ہوئی

راہ پر چلو، صرف اسی طرح تم اُس کی بخشش اور اُسکے پیار سے حصّہ پا سکو گے ـــــ اے رسُول! تم کہدو کہ اے لوگو اللہ اور اُسکے رسُول کی یعنی میری فرمانبرداری کرو، اگر وہ نہ مانیں تو اللہ کی محبّت اور اس کا پیار کبھی حاصل نہیں ہوگا نہ ماننے والوں کو)۔

جب آپ پر ایمان لانا اور آپ کا اتباع اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کے لئے نجات اور رضائے الٰہی کی شرط قرار دی گئی تو ضروری تھا کہ یا تو آپ کو اس دُنیا کے خاتمہ تک زندہ رکھا جاتا تاکہ ہدایت و رہنمائی کے لئے بہ نفس نفیس آپ کی طرف رجوع کیا جا سکتا، یا آپ کی پوری تعلیم و ہدایت اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اس طرح محفوظ کر دیا جاتا کہ بعد میں آنے والے بھی پورے علمی اعتماد اور قلبی اطمینان کے ساتھ اُسی طرح آپ سے تعلیم و ہدایت لے سکتے جس طرح سے اور جس اعتماد و اطمینان کیساتھ آپ کے زمانہ کے لوگ لیتے تھے۔

قیامت تک آپ کو زندہ و باقی رکھنا حکمتِ الٰہی کے خلاف تھا، اسلئے دوسرا بندوبست فرمایا گیا۔ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کا ایک حصّہ جو اساسی قانون اور بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا ہے جس کے الفاظ بھی آسمانی اور الہامی ہیں یعنی قرآن مجید، اُس کو تو اللہ تعالیٰ نے لفظ بہ لفظ محفوظ کرا دیا۔ تاریخ سے واقفیت رکھنے والے غیر مسلم بھی جانتے ہیں کہ اس کا لفظ لفظ محفوظ ہے ـــــ اسکے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق آپ کی تفصیلی ہدایات، آپ کے راہنما ارشادات و خطبات، آپ کے اعمال و افعال اور اخلاق و عادات گویا آپ کی پوری زندگی جو دراصل قرآن مجید کی تشریح و تفسیر اور اسکی ہدایت و تعلیم کی عملی تصویر ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کی اُمّت سے حدیث کی تدوین اور حفاظت کا معجزانہ کام لیکر ایسا محفوظ کرا دیا کہ قریبًا چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود آپ کی پوری پیغمبرانہ زندگی کا ریکارڈ اس طرح موجود اور محفوظ ہے کہ گویا اپنی خصوصیات کے ساتھ آپ خود اس دُنیا میں رونق افروز ہیں ـــــ اگر کسی باتوفیق بندے کی حدیث کے ذخیرے پر نظر ہو اور اس کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمانی رابطہ بھی نصیب ہو تو وہ محسوس کرے گا کہ گویا حدیث کے آئینہ میں اس کی نظر کے سامنے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی عکسی تصویر ہے، وہ آپ کو اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، نماز پڑھتے، لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے، اللہ کے حضور میں دعا کرتے، اس میں زار زار روتے اور آنسو بہاتے، احرام باندھے حج کرتے، حج میں طواف اور سعی کرتے، قربانی کرتے اور حلق کراتے، مسجد کے صحن میں نزاعات کا تصفیہ کرتے،

مجرموں کے لئے سزاؤں کے احکام جاری فرماتے اور میدانِ جنگ میں مجاہدین کی صفوں کی قیادت کرتے دیکھے گا، اپنے دل کے کانوں سے آپ کے ارشادات سُنے گا۔ جلوت اور عام مجالس کے علاوہ خلوت کی آپ کی ایسی بہت سی باتیں بھی اُسکے علم میں آئیں گی جو اپنے قریب ترین عزیزوں دوستوں حتیٰ کہ اپنے ماں باپ کی بھی وہ نہ جانتا ہوگا۔

ابھی چند دن پہلے کی بات ہے اپنے مُلک کے ایک مشہور و معروف غیر مسلم فاضل سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی زندگی کے محفوظ ہونے ہی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اُن کی بعض غلط فہمیوں اور عقلی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لئے مجھے کہنا پڑا تھا کہ: "میرے والد ماجدؒ کا انتقال جس وقت ہوا اُس وقت میری عُمر قریباً پینتالیس[۴۵] سال کی تھی، گویا میں فہم و شعور کے ساتھ قریباً ۴۰ سال اپنے والد ماجدؒ کے زیرِ سایہ رہا ہوں، لیکن میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ حدیث کے ذریعہ جتنا کچھ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جانتا ہوں اتنا اپنے والد ماجدؒ کے بارے میں نہیں جانتا" ـــــ الحمدللہ مجھے اطمینان ہے کہ یہ بات میں نے غلط نہیں کہی تھی۔

صحابۂ کرامؓ جن کو دولتِ ایمان کے علاوہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق کی نسبت بھی نصیب تھی، جو کچھ آپ سے سُنتے تھے اور جو کچھ آپ کو کرتے دیکھتے تھے اس کو یاد رکھتے تھے اور ذوق و شوق کے ساتھ اُسکے تذکرے کرتے تھے۔ یہ ایمان اور عشق و محبّت کا قدرتی تقاضا بھی تھا اور وہ اس کو اپنی اہم ذمہ داری، بڑی سعادت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا وسیلہ بھی سمجھتے تھے ـــــ بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آپؐ کے ارشادات خود آپؐ کی اجازت سے قلمبند بھی کرتے تھے[۱]

پھر جن لوگوں کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نصیب نہیں ہوا، اور انھوں نے آپ کے فیضیافتہ صحابۂ کرامؓ کو پایا انھوں نے معلومات و محفوظات کا وہ سارا ذخیرہ اُن سے حاصل کیا۔ اس دور میں (یعنی دورِ تابعین میں) خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خاص توجہ اور تحریک سے کتابی شکل میں صحابۂ کرام کی روایت سے احادیث کی جمع و تدوین کا کام شروع ہوا[۲]

---

[۱] صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ بیان موجود ہے کہ عبداللہ بن عمرو حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اور مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں خود عبداللہ بن عمرو بن العاص کا بیان مروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے اس کی اجازت چاہی تھی اور آپ نے مجھے اس کی اجازت دی تھی۔ ۱۲ [۲] عمر بن عبدالعزیزؒ نے مدینۂ طیبہ کے اپنے امیر اور قاضی (بقیہ صـ۱۲ پر)

چنانچہ ابن شہاب زہری اور ہمام بن منبہ جیسے علماء تابعین نے اس کام کا آغاز کیا، پھر ان کے تلامذہ میں اس کا عام رواج ہوگیا۔

اس دور کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں سے امام مالکؒ کی مؤطا آج تک متداول ہے، اسکے علاوہ جو بہت سے مجموعے اس دور میں مرتب ہوئے تھے وہ مستقل صورت میں اگرچہ آج سامنے نہیں ہیں لیکن بعد کے تیار شدہ مجموعوں میں وہ پورا علمی سرمایہ محفوظ ہوگیا ہے۔

اس دور کے بعد امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ، امام احمدؒ اور حافظ الحدیث حُمیدی جیسے سیکڑوں حضرات نے اپنے اپنے انداز پر اس کام کو آگے بڑھایا۔

ان کے بعد امام بخاری، امام مسلم اور اصحاب سنن کا زمانہ آیا، انھوں نے اس سلسلہ میں وہ کام کیا جو اُن کی مرتب کی ہوئی کتب صحاح کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

ان کے بعد انہی کے طرز پر حدیث کے سیکڑوں مجموعے تیار ہوئے اور حدیث کی روایت اور تدوین وحفاظت کا یہ کام کئی صدی مسلسل اسی طرح ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ راویوں کی تنقید اور جرح وتعدیل کا کام بھی خاص اہتمام سے ہوتا رہا، اور اسکے نتیجہ میں چالیس ہزار سے زیادہ راویانِ حدیث کے احوال سے متعلق اسماء الرجال کے عنوان سے ایک مستقل فن اور ایک پورا کتب خانہ تیار ہوگیا۔

اسی کے ساتھ احادیث سے اصول واحکام کے استخراج واستنباط کا کام بھی برابر ہوتا رہا، جس کا ابتدائی نمونہ امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمدؒ اور امام شافعی کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، اور امام بخاری کے تراجم ابواب تو اس کی بہترین مثال ہیں۔

بعد کی صدیوں میں ہر دور کے علماء اُمّت نے احادیث کے ان مجموعوں یا انہی سے مرتب ہونے والی دوسری مؤلفات کو اپنی خدمت اور توجہ کا مرکز بنایا، اور ہر زمانہ میں اس کی ضرورت اور اہلِ زمانہ کے مذاق کے مطابق اُن کی شرحیں لکھی گئیں، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

(صلا کا بقیہ حاشیہ)

ابوبکر بن حزم کو لکھا تھا:۔ انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء۔ (صحیح بخاری)۔

ہمارے اس زمانہ کی غالباً سب سے اہم ایک خصوصیت یہ ہے کہ مغربی علوم و نظریات کی ترقی اور اشاعت نے پوری انسانی دنیا کے طرزِ فکر اور علمی مزاج کو بہت زیادہ متأثر کیا ہے، اسلئے تعلیماتِ محمدیؐ کے آج کے امینوں کی یہ خاص ذمہ داری ہے کہ وہ اس ذہنی و فکری تبدیلی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بیسویں صدی کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کو پیش کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اسکے دو سو سال پہلے ٹھیک اُس وقت جبکہ ان مغربی علوم و افکار کی ترقی کا آغاز ہو رہا تھا اس کام کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں سے رکھوادی تھی۔ اُن کی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس کام کے کرنے والوں اور اس راہ پر چلنے والوں کیلئے پوری روشنی موجود ہے۔ اس عاجز کا خیال ہے کہ حدیث و سنّت کے بارے میں ہمارے اس دَور کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کا جیسا سامان اس کتاب میں ہے ایسا پورے اسلامی کتب خانہ کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔

اِس ناچیز نے چونکہ بیسویں صدی کے ذہن اور اس دَور کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر اردو میں شرح حدیث کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا جس کی یہ تیسری جلد اب شائع ہو رہی ہے اسلئے اس میں دوسری شروحِ حدیث کی بہ نسبت زیادہ استفادہ "حجۃ اللہ البالغہ" ہی سے کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے مقاصد و مطالب کی وضاحت اور اس کی حکمت کے بیان میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ اُس سے اِس دَور کے ذہن بھی پوری طرح مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ دوسری بڑی اور اہم خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کی روشنی میں اُمّت کے فقہاء و مجتہدین کے فقہی و اجتہادی اختلافات کی واقعی نوعیت سامنے آجاتی ہے، اور ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ ان ائمہ کے یہ تمام فقہی مسالک ایک درخت کی قدرتی شاخیں یا ایک بڑے دریا سے نکلنے والی نہریں ہیں، ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اور ان میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری درسگاہوں میں ابھی تک یہ ولی الٰہی طریقہ رواج نہیں پا سکا، حالانکہ ہمارے اِس دَور کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ خاص الخاص نعمت ہے۔

معارف الحدیث کی یہ تیسری جلد ابواب طہارت اور ابواب صلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سی حدیثیں اُن مسائل سے متعلق بھی ناظرین کرام پڑھیں گے جن میں فقہا کے مسالک مختلف ہیں، اِس عاجز نے

ان کی تشریح میں حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے اصولی طریقے کی پیروی کی ہے۔

اِس جلد سے متعلق کچھ ضروری باتیں

معارف الحدیث کی پہلی جلد میں ایمان اور آخرت سے متعلق، اور دوسری میں تزکیۂ قلب و نفس اور اصلاحِ اخلاق سے متعلق احادیث مرتب کرکے پیش کی گئی تھیں، اِس تیسری جلد میں اسلام کے پورے نظامِ عبادت یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اذکار و دعوات کے ابواب کی حدیثیں جمع کرکے نذرِ ناظرین کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف نماز اور طہارت کے ابواب کے صفحات پانچ سو کے قریب ہو گئے اسلئے اِس جلد کو اسی پر تمام کر دینا پڑا، باقی حصہ انشاء اللہ چوتھی جلد میں پیش ہوگا، اندازہ یہ ہے کہ اُس کی ضخامت بھی اتنی ہی ہو جائیگی۔

پہلی جلد ۱۳۷۳ھ میں شائع ہوئی تھی، دوسری اُسکے ۳ سال بعد ۱۳۷۶ھ میں شائع ہوگئی تھی، یہ تیسری جلد بعض خاص رکاوٹوں کی وجہ سے قریباً ۸ سال کے وقفے سے اب شائع ہو رہی ہے، لیکن اسکے بعد والی جلد کے بارے میں اُمید ہے کہ وہ انشاء اللہ آنے والے سال ہی میں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا سکے گی۔

طہارت چونکہ بہت سی عبادات کے لئے خاص کر نماز کے لئے شرط قرار دیگئی ہے، اسلئے عام محدثین کا یہ دستور رہے کہ وہ اپنی مؤلفات میں نماز اور دوسری عبادات کی حدیثوں سے پہلے ابواب طہارت کی حدیثیں ذکر کرتے ہیں، اسی طریقے کی پیروی میں اِس جلد میں بھی پہلے ابواب طہارت کی حدیثیں درج کی گئی ہیں جن کی تعداد صرف ستّر ہے، اُسکے بعد ابواب نماز کی حدیثیں ہیں جن کی تعداد ۳۵۱ ہے ——— ان حدیثوں کے انتخاب اور ترتیب کا کام بہت غور و فکر سے کیا گیا ہے۔ حدیث پر نظر اور دورِ حاضر کے علمی و دینی تقاضوں کی خبر رکھنے والے حضرات اگر غور فرمائیں گے تو محسوس کرینگے کہ ترجمہ اور تشریح سے قطع نظر یہ انتخاب و ترتیب بجائے خود ایک کام ہو گیا ہے۔

اس سے پہلی دو جلدوں کی طرح اِس جلد میں بھی احادیث کے ترجمہ و تشریح میں اصل مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ ہمارے اِس دَور کے ذہن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی عظمت اور

قدر و قیمت کو سمجھیں اور اُن کے اندر اُسکے اتباع کا جذبہ پیدا ہو، اور اُس نور اور روشنی سے وہ بھی حصّہ لے سکیں جس سے آپ کی اس تعلیم و ہدایت کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ کو حصّہ ملا تھا۔ اسلئے خالص علمی و فنی اور درسی بحثوں سے دانستہ بچایا گیا ہے اور اپنی بساط بھر آسان اور مؤثر انداز میں احادیث کا بس مقصد و پیام واضح کرنے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طریقے پر حسبِ ضرورت اس کی رُوح اور حکمت و مصلحت بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

آمین اور رفع یدین جیسے اختلافی مسائل کے بارے میں ناظرین کو ذہنی انتشار اور پریشاں دماغی سے بچانے کے لئے جہاں کچھ لکھنا پڑا ہے تو امکان بھر اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مناظرانہ بحث کی شکل نہ بنے ——— اب اس میں جو صحیح اور صواب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے، اور جو غلط ہے وہ اِس ناقص العلم کے علم و فہم کا قصور ہے۔

پہلی دو جلدوں کی طرح اِس جلد کی حدیثیں بھی زیادہ تر "مشکوٰۃ المصابیح" سے لگی ہیں اور تخریج میں اسی پر اعتماد کیا گیا ہے، نیز اسی کی پیروی میں یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ جو حدیث صحیح بخاری یا صحیح مسلم سے لی گئی ہے وہ حدیث کی اگرچہ دوسری کتابوں میں بھی ہو لیکن حوالہ صرف صحیح بخاری یا صحیح مسلم ہی کا دیا گیا ہے، کیونکہ کسی حدیث کا ان میں سے کسی ایک میں ہونا بھی اس کی صحت کی کافی ضمانت ہے ——— بعض حدیثیں "جمع الفوائد" سے بھی لی گئی ہیں اور چند "کنز العمال" سے بھی، لیکن اُن کے لئے کنز العمال کا حوالہ التزاماً دیا گیا ہے ——— بعض حدیثیں براہِ راست صحاح کی کتابوں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد وغیرہ سے بھی لی گئی ہیں، یہ وہی حدیثیں ہیں جو ان الفاظ کے ساتھ مشکوٰۃ یا جمع الفوائد میں مذکور نہیں ہیں۔

جیسا کہ پہلی دونوں جلدوں کے دیباچہ میں بھی لکھا جا چکا ہے چونکہ اس سلسلہ (معارف الحدیث) کا اصل مقصد دعوت اور تذکیر و تفہیم ہے اسلئے متن حدیث کے ترجمہ میں نحوی ترکیب اور لفظی ترجمہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی ہے، بلکہ حدیث کے مقصد اور پیام کو واضح کرنا پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے کسی حدیث کو مقدم یا مؤخر کیا گیا ہے۔

اپنے باتوفیق ناظرین سے آخری گزارش یا وصیت

پہلی دونوں جلدوں کے دیباچہ میں بھی یہی کی گئی تھی، اور اب بھی یہی ہے ——— کہ

حدیثِ نبویؐ کا مطالعہ صرف اضافۂ معلومات کے لئے اور علمی سیر کے طور پر ہرگز نہ کیا جائے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ کرنے کے لئے اور رشد و ہدایت حاصل کرنے اور عمل کرنے کی نیت سے کیا جائے، نیز درس و مطالعہ کے وقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو دل میں بیدار کیا جائے اور اس طرح ادب اور توجہ سے پڑھا یا سُنا جائے کہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ مُبارک میں ہم حاضر ہیں اور آپ فرما رہے ہیں اور ہم سُن رہے ہیں ——— اگر ایسا کیا گیا تو قلب و رُوح کو ان انوار و برکات اور ایمانی کیفیات کا کچھ نہ کچھ حصّہ انشاء اللہ ضرور نصیب ہوگا جو عہدِ نبویؐ کے اُن خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست رُوحانی و ایمانی استفادہ کی دولت عطا فرمائی تھی ———

آخری کلمہ اللہ کی حمد ہے، اور اس خدمت کے اتمام کیلئے حُسنِ توفیق کی

استدعا ——— اور

غلطیوں اور گناہوں کی معافی کی التجا!

اللہ کی رحمت اور اُسکے بندوں کی دُعاؤں کا محتاج و طلبگار

عاجز و گنہگار بندہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یکم رمضان ۱۳۸۴ھ ——— ۵ جنوری ۱۹۶۵ء

آخری قسط

تجلیاتِ مجددِ الف ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

[الحمدللہ کہ یہ سلسلہ جو صفحہ ۱۳ پر شروع ہوا تھا۔ اس قسط پر بخیر و خوبی تمام ہو رہا ہے۔ گزشتہ اشاعت کی قسط پر غلطی سے آخری قسط لکھ گیا تھا امید ہے کہ ناظرین نے تصحیح فرمالی ہوگی ——— ادارہ]

مکتوب (۱۰۳) ۔ شیخ حمید اجمیری کے نام :-

[تحصیل کمال و تکمیل کی ترغیب میں]

الحمدللہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ——— برادرم شیخ حمید کا مکتوب گرامی پہونچا۔ خوشوقت کیا ——— اس زمانۂ پُرفتن میں یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ کسی شخص کی صحبت سے ایک جماعت و گروہ کو جناب قدس خداوندی جلّ سلطانہٗ سے رغبت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ماسوی سے لوگوں کے دل سرد ہو جائیں اور اس کے باوجود وہ شخص اس دولت پر مغرور نہ ہو اور اپنے کام سے بے فکر نہ رہے ——— کیونکہ مثل مشہور ہے ہنوز دہلی دور است (ابھی دہلی دور ہے) معلوم نہیں کہ ستوؤں سے ایک کام بھی انجام پا گیا ہے یا نہیں؟ اور یہ حالات جو طالبوں کو ابتدا میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور ذوق و لذت بخشتے ہیں یہ تو بالکل ایسے ہیں جیسے بچوں کو الف، ب کا سبق پڑھائیں۔ اصل کام یہ ہے کہ حروفِ تہجی سے آگے درجۂ مولویت (فاضلیت) پر فائز ہوں اور اذواق و اشواق کے ذریعہ درجۂ ولایتِ خاصہ

میں داخل ہو جائیں ۵۔

ہنوز ایوانِ استغنا بلند است ترا فکرِ رسیدن ناپسند است

چاہیئے کہ اپنے اوقات کو آباد رکھیں اور شریعت و طریقت سے ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے آراستہ رہیں ـــ دوسرے کی تکمیل اپنے کمال کی فرع ہے اور کمال، درجۂ ولایتِ خاصہ میں ہے ـــ لیکن جب کہ تمھاری صحبت میں طالبوں کے اندر رشد و ہدایت ظاہر ہوتی ہے اور احوال و مواجید رونما ہوتے ہیں اگرچہ وہ احوال بحدِ فنا و بقا نہ ہوں ـــ غنیمت ہے ـــ اور اس زمانہ میں (اپنی کمیابی کی بنا پر) یہ چیز بھی کبریتِ احمر (اکسیر) کا حکم رکھتی ہے ـــ اس (تعلیم طریقت کے) کام کو بھی کرو لیکن مناسب بلکہ لازم یہ ہے کہ جس کسی کو تعلیم طریقت دو بعد استخارہ و توجہ تعلیم دو ـــ اور اس عمل سے ترساں و لرزاں بھی رہو، ایسا نہ ہو کہ اس (پیری مریدی) کے راستے سے شیطان کا غلبہ تم پر ہو جائے ـــ ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں شیطان کے شر سے ـــ جو تعداد (ذکر کے سلسلے میں) تم کو بتائی تھی اگر اسکو پورا کر دیا ہے تو اُس سے دوگنی تعداد کو پورا کرو اس کے بعد خبر کرو تاکہ مناسب حال ہدایت کی جائے ـ ان شاء اللہ تعالیٰ ـ اُن دوستوں کو جو تم سے وابستہ ہیں میری دُعا پہونچا دو۔ سید یحییٰ نے جو صحیفۂ شریفہ بھیجا تھا وہ بھی پہونچ گیا ـــ اللہ کا شکر ہے کہ اس زمانے میں جو کہ کمال قربِ قیامت اپنے اندر رکھتا ہے اور حدیث میں آیا ہے "قیامت قائم نہ ہوگی مگر بُرے لوگوں پر" (یعنی جب نیک آدمی مر جائیں گے اور صرف بد لوگ باقی رہیں گے اس وقت قیامت ہو جائے گی اور جب تک نیکوں کا وجود دُنیا میں ہے قیامت نہ آئے گی) ـــ ایسے وقت قربِ قیامت میں بھی لوگوں کے دل حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف کھینچ رہے ہیں اور وہ اس درگاہِ اقدس کے والہ و شیدا ہیں ـــ احباب توقع ہے کہ غیبوبت کی حالت میں دُعائے سلامتیٔ خاتمہ کرتے رہیں گے ـــ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ـــ والسلام اوّلاً و آخراً۔

ع۵ ابھی ایوان استغنا بہت اونچا ہے اور تجھے رسائی کی فکر ناپسند ہے۔

مکتوب (۱۰۵) :- شیخ حسن برکی کے نام —— [ترغیب برا حیائے سنت و تہدید از بدعت]

صحیفۂ شریفۂ برادرم شیخ حسن۔ احسن اللہ آمالہ ——— پہونچا ——— خوشوقت کیا ——— اس میں علوم و معارف مندرج تھے اُن کے مطالعے نے فرحت پر فرحت بڑھائی ——— الحمدللہ کہ علوم صحیحہ اور معارف صادقہ ہیں کتاب و سنت کے مطابق اور عقائد فرقۂ ناجیہ (اہلسنت) کے موافق ہیں۔ حضرت حق سبحانہ استقامت نصیب فرمائے اور مقاصد علیہ کی انتہا تک پہونچائے ——— بدعتوں کے دور کرنے اور مٹانے کے بارے میں بھی تم نے کچھ لکھا تھا۔ کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس طرح کی ظلمات بدعت میں کوئی خوش نصیب بدعتوں میں سے کسی ایک بدعت کو مٹانے کی توفیق پائے اور سنتوں میں سے کسی ایک سنت کو زندہ کرنے۔ احادیث صحاح میں آیا ہے کہ جو کوئی ایک سُنّت کو زندہ کرے گا درانحالیکہ اس سنت پر عمل ترک کر دیا گیا ہو تو اس سنت کو زندہ کرنے والے کو سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ اس مقام سے اس عمل کی عظمت کا اندازہ لگائیں ——— لیکن اتنا ملحوظ رکھیں کہ کوئی فتنہ کھڑا نہ ہونے پائے اور ایک حسنہ، ظہور ہزار سیئہ کا باعث نہ بن جائے اس لیے کہ آخر زمانہ ہے اور ضعف اسلام کا وقت ہے ———

رسالہ جو بھیجا تھا اُس کے مطالعے سے بھی مسرتیں حاصل ہوئیں۔ الحمدللہ کہ تم کو علوم میں اس فقیر سے بہت مناسبت ہے اور کشف میں بھی مطابقت ہے، نیز نظر بھی بہت بلند ہے۔ تمہارا خط جو کہ حالات اور علوم و استفسارات پر مشتمل تھا میں نے خواجہ محمد ہاشم کشمی کے سپرد کر دیا تھا کہ جوابات لکھنے کے وقت اس کو میرے سامنے پیش کر دیں اتفاقاً انھوں نے اس کو گم کر دیا اس بنا پر جوابات کی تفصیل میں توقف ہوا جو بات یاد رہ گئی تھی اُس (کے جواب) کو لکھ دیا گیا۔ منجملہ یہ ہے کہ احوال، پسندیدہ ہیں اور صحت علوم، حاصل ہے۔ دوسری بات یہ لکھنا ہے کہ مغفرت مآب مولانا احمد (برکی) کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں سعیٔ بلیغ کو ملحوظ رکھیں اور ان کو آداب ظاہر و باطن کی ہدایت کریں۔ تمام دوستوں کو بلکہ وہاں کے جمیع اہل اسلام کو شریعت اور التزام سنت کی راہ دکھائیں۔

اور بدعت کے ارتکاب سے ڈراتے رہیں اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے۔ مکاتیب جلد ثالث میں سے بعض مکتوبات خواجہ محمد ہاشم نے لکھوا کر تمہیں بھیجے ہیں ان سے نفع حاصل کروگے ـــــ اوقات فقیر مختلف ہیں، بعض اوقات علوم و معارف کی تحریر کی جانب بے اختیار رغبت ہوتی ہے اور بعض دوسرے اوقات میں باوجود یکہ عجیب و غریب اسرار کا ورود ہوتا ہے مگر لکھنے سے طبیعت بھاگتی ہے یہاں تک کہ ہاتھ میں قلم پکڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا ـــــ اسی وجہ سے تمہارے مکتوبات کے جواب کی تفصیل میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے اور تکلف سے کچھ لکھ نہیں سکتا ـــــ باقی حالات مستوجب حمد ہیں ـــــ ہمراہی لشکر سے بہ عنایت خداوندی خلاصی و رہائی نصیب ہو گئی ہے۔ حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ استقامت سے رکھے۔ اس جگہ کے تمام دوستوں کے لیے دعوات مخصوصہ میں۔ والسلام ـــــ

مکتوب ۱۰۶:۔ صاحبزادگان گرامی قدر (حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت خواجہ محمد سعید) کے نام ـــــ [آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں دیکھنا]

فرزندان گرامی کا مکتوب پہونچا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ صحت و عافیت سے ہو ـــــ ایک تازہ منامی بشارت آج نمودار ہوئی ہے لکھتا ہوں۔ غور سے سنیں ـــــ گزشتہ رات جو کہ شنبے کی رات تھی۔ مجلس سلطان جہانگیر میں گیا تھا۔ ایک پہر رات گزرنے کے بعد واپس آگیا۔ تین پارے حافظ سے سنے۔ دو پہر رات گزر گئی تھی کہ نیند میسر آئی ـــــ حلقۂ صبح کے بعد ـــــ چونکہ رات کی ماندگی تھی ـــــ سو گیا ـــــ خواب میں دیکھتا ہوں کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیر کے لیے اجازت نامہ تحریر فرما رہے ہیں جس طرح کہ مشائخ کا طریقہ ہے اپنے خلفاء کو اجازت نامہ لکھا کرتے ہیں ـــــ ایک دوست بھی اس وقت موجود ہے ـــــ اس اثنا میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ گویا اجازت نامے کے اجراء میں کچھ تاخیر ہے ـــــ تاخیر کی وجہ بھی اس وقت تعین کے ساتھ معلوم ہو گئی ہے۔ وہ دوست جو اس کام کے سلسلے میں پیش کار کی حیثیت سے ہے گویا کہ دوسری مرتبہ اس اجازت نامے کو خدمت اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں لے جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجازت نامے کی پشت پر ایک اور اجازت نامہ خود تحریر فرمایا ہے

یا دوسرے کو لکھنے کے لیے حکم فرمایا ہے یہ بات تعین کے ساتھ نہ معلوم ہو سکی ـــ لیکن اس اجازت نامے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہونا معلوم و متعین ہے ـــ لکھنے یا لکھوانے کے بعد اپنی مُہر مبارک سے اس کو مزین فرمایا ہے ـ اس اجازت نامے کا مضمون و مفہوم یہ ہے کہ اجازت نامۂ دُنیا کی جگہ اجازت نامۂ آخرت دیا گیا ہے اور مقام شفاعت سے حصّہ عنایت فرمایا گیا ہے

کاغذ بھی طولانی ہے اور سطریں بھی بہت زیادہ تحریر فرمائی گئی ہیں، میں اس دوست سے دریافت کر رہا ہوں کہ پہلا اجازت نامہ کون سا ہے اور بعد کو جو اجازت نامہ تحریر فرمایا گیا ہے وہ کون سا ہے؟ ـــ میں اس وقت یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ ہیں اور جس طرح بیٹا باپ کے ساتھ گزر بسر کرتا ہے میں بھی اسی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اہلبیت میرے حق میں اجنبی نہیں ہیں (بلکہ مجھ سے واقف ہیں) میں اس کاغذ کو لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے فرزندانِ محرم کی طرح داخلِ حرم شریف ہو گیا ہوں ـ عظیم المرتبت اُمہات المومنین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں مجھ سے بعض خدمات کے متعلق اہتمام کے ساتھ فرما رہی ہیں اور ارشاد فرما رہی ہیں کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے ـ یہ یہ امور انجام دیے جائیں ـــ اسی اثنا میں آنکھ کھل گئی .....

ان ایام میں معارف غریبہ اور علوم عجیبہ ظاہر ہو رہے ہیں ..... لڑکے دور ہیں اور خاتمۂ عمر نزدیک آپہنچا دیکھو کیا ہوتا ہے؟ ـــ "اللہ جو کرتا ہے اسی میں خیر ہے" یہ کہتا ہوں اور صبر کرتا ہوں ـــ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ـــ

مکتوب (۱۰۷) :- خواجہ محمد اشرف کے نام ـــ [نسبت رابطہ اور لذتِ طاعات میں خلل کس طرح واقع ہوتا ہے]

بعد الحمد و الصلوٰۃ و تبلیغ الدعوات ـــ تمہارا مکتوب پہونچا ـــ الحمد للہ کہ صحت و عافیت سے ہو۔ تم نے دریافت کیا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ جب نسبت رابطہ میں خلل واقع ہوتا ہے تو تمام طاعات کی ادائیگی میں لذت محسوس نہیں ہوتی؟ جاننا چاہیے کہ جو چیز نسبت رابطہ میں نقصان و خلل کا باعث ہوئی ہے وہی مانعِ لذتِ طاعات ہے ـــ کبھی ایسا

ہوتا ہے کہ سبب خلل رابطہ، قبض (بسط و کشادگی) قلب کا نہ ہونا) ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لغزشوں کے ارتکاب کے باعث چاہے لغزشیں تھوڑی سی ہوں ـــــ قلب پر کدورت عارض ہو جاتی ہے ـــــ پہلی صورت بُری نہیں ہے بلکہ سلوک کے لوازم میں سے ہے اور دوسری صورت کے عارض ہونے پر توبہ و استغفار کے ذریعے تدارک کرنا چاہیے۔ تاکہ اللہ کے کرم سے اس کا اثر زائل ہو جائے ـــــ چونکہ قبض اور کدورت کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے بہر حال توبہ و استغفار فائدہ مند ہے، حق تعالیٰ استقامت کے ساتھ رکھے ـــــ والسلام۔

مکتوب (۱۱۲) :۔ قاضی اسلم[ع] کے نام ـــ [صفاتِ باری تعالیٰ نہ عینِ ذات ہیں نہ غیرِ ذات]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ علمائے اہلِ سنت وجماعت نے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے ـــــ واجب الوجود کی آٹھوں صفاتِ حقیقیہ کے بارے میں کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ "نہ وہ عینِ ذات ہیں اور نہ غیرِ ذات" ـــــ یہ معرفت عقل کے طور و انداز سے ماورا رہے اس حقیقت کو انھوں نے نورِ فراست سے ـــــ پایا ہے ـــــ عقلاء و حکماء اس قولِ مذکور کو ارتفاعِ نقیضین سمجھ بیٹھے (اور اسی وجہ سے لاعین و لاغیر کو نہیں مانتے) انھوں نے یہ نہیں سمجھا کہ حصولِ تناقض کے لیے اتحادِ مکان اور اتحادِ زمان بھی شرط ہے اور جب اس ذاتِ اقدس کے لیے مکان و زمان کی گنجائش ہی نہیں ہے تو پھر تناقض کس طرح متصور ہوگا؟ ـــــ اور وہ جو (بعض) علماء نے تناقض کو دفع کرنے کے لیے لفظِ غیر

ع۵ میر محمد اسلم ہروی، میرزا ہد صاحب رسالہ کے والد ماجد ہیں۔ خواجہ کو ہی جو کہ مرشدِ مشائخِ خراسان تھے ان کے مورث اعلیٰ تھے۔ ہرات میں پیدا ہوئے لاہور کے علماء سے استفادہ کیا۔ بعد تکمیل علم آگرہ گئے۔ سلطان جہانگیر نے ان کو کابل کا قاضی بنایا۔ بعدہٗ عسکر سلطانی کا قاضی بنایا۔ بعد وفات جہانگیر عہدۂ سابق پر بحال ہوئے شاہ جہاں بھی ان کا بہت اکرام کرتے تھے۔ لیکن بوجہ علالت ۱۰۴۰ھ میں مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے وہیں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے (مہر جہانتاب قلمی مولفہ مولانا حکیم فخرالدین حسنی رائے بریلوی) نزہۃ الخواطر جلد پنجم میں مآثر الامراء کے حوالے سے تاریخ وفات ۱۰۴۱ھ اور مقامِ دفن کابل مندرج ہے۔ سبحۃ المرجان میں علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا مدفن لاہور لکھا ہے۔

میں تاویل کی ہے (کہ غیر کے معنی مُباین اور مُنفک کے ہیں یعنی صفاتِ باری، باری تعالیٰ سے جُدا نہیں ہیں) اور لفظ غیر کے ایک خاص معنیٰ چاہے ہیں ـــ اس تاویل کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ نظر کشفی اس خاص معنیٰ کے نکالنے کو منع کرتی ہے اور غیریت کی نفی کرتی ہے، خواہ غیریت کسی معنیٰ میں ہو..... اور یہ جو کہا گیا کہ یہ معرفت) طورِ عقل کے ماوراء ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ عقل اس معرفت تک راہ یاب نہیں ہوتی اور اس کے ادراک سے عقل، قاصر ہے یہ بات نہیں ہے کہ عقل اس کے برخلاف حکم کرتی ہے ـــ اس کے برخلاف کس طرح حکم کرے گی؟ جب کہ اس کا تصور تک نہیں کرسکتی بلکہ وہ (معرفت) اس کے احاطۂ ادراک سے باہر ہے پھر بھلا (بیچاری عقل) اثبات و نفی کا حکم کیسے لگا سکتی ہے ـــ ربّنا اٰتنا من لّدنک رحمۃً وھیّئ لنا من امرنا رشدا ـــ

مکتوب (۱۱۶) :- خواجہ ابوالمکارم کے نام ـــــ [ترغیب / خدمتِ خلق]

حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ تم کو حدِ اعتدال اور مرکزِ عدالت پر استقامت نصیب فرمائیں ـــ کتنی بڑی دولت ہے یہ کہ خداوند تعالیٰ کسی بندے کو بعض فضائل کے ساتھ مخصوص کرکے اپنے بندوں کے حوائج کی کنجی اس کے دستِ تصرف میں دے دے اور اس شخص کو ان لوگوں کا ملجا و ماویٰ بنا دے ـــ کتنی بڑی نعمت ہے کہ مخلوق کی ایک جماعت کو ـــ کہ اپنے کمالِ کرم سے اس کو اپنا عیال فرمایا ہے ـــ اس شخص سے متعلق کردے اور اس جماعت کی تربیت و پرورش کو اس کے سپرد کردے ـــ وہ سعادت مند ہی ہوگا جو اس دولت پر حمد پروردگار کرے اور وہ دانشمند ہی ہوگا جو اس نعمت پر شکرِ خدا بجا لائے اور حق تعالیٰ کے عیال (مخلوق) کی خدمت گاری کو اپنی سعادت تصور کرے نیز اپنے مولائے حقیقی کے بندوں اور بندیوں کی تربیت کو اپنا شرف سمجھے ـــ الحمدللہ کہ آپ کے علاقے کے لوگ آپ کے ذکرِ خیر سے تر زبان ہیں اور آپ کے کرم و احسان کا تذکرہ کیا کرتے ہیں۔

مکتوب (۱۲۰) :- میر منصور کے نام ـــــ

الحمدللہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــ تمھارے مکتوبات

یکے بعد دیگرے پہونچے ـــــ خوشوقت کیا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ بے مناسبتی فقراء کے اباب موجود ہوتے ہوئے بھی فقراء سے محبت و ارتباط کا جو معاملہ رکھتے تھے ـــــ اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور کسی قسم کی منافات و کوتاہی رونما نہیں ہوئی بلکہ ارتباط سابق میں اور پختگی پیدا ہوگئی ـــــ اللہ تعالیٰ اس طائفۂ صوفیہ کی محبت میں استقامت عطا فرمائے کیونکہ یہ چیز سرمایۂ سعادت ہے ـــــ شفقت شعارا! اس زمانے میں یکسو رہنے کا شوق غالب آگیا ہے اور گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے اور (فی الحال) سوائے جمعہ کے مسجد میں نہیں جاتا ـــ جماعت بہ خوشی خانقاہ ہی میں منعقد ہوتی ہے ـــ (عام طور پر) لوگوں سے ملاقات بھی بند ہے ـــ اوقات، جمعیت قلب کے ساتھ بسر ہو رہے ہیں اور تمام عمر کی آرزو اب میسر آئی ہے ـــ حمداً للّٰہ سبحانہ علیٰ ذٰلک ـــ باقی احوال صوری بھی عافیت سے مقرون ہیں اور" فرزندان و متعلقان بھی جمعیت خاطر کے ساتھ گزر بسر کر رہے ہیں ـــ جناب خواجہ عبداللہ (صاحبزادۂ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ) ماہ مبارک رمضان سے پہلے دہلی تشریف لے گئے ـــ الحمدللہ کہ خواجہ عبداللہ نے یہاں آکر بہت فوائد حاصل کرلیے اور ان کو ترقی تمام میسر ہوئی۔ نیز غلبات توحید سے دریائے تنزیہہ میں غوطہ زن ہوکر دریائے تنزیہہ کی گہرائی کی طرف متوجہ ہیں اور ظاہر سے باطن بلکہ باطن کے باطن کی طرف چل رہے ہیں۔ حافظ بہاء الدین جو کہ وہاں جا رہے ہیں یہاں کے احوال شاید تفصیل سے بیان کریں ـــــ

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۲)

ساری احادیث کو جمع کرنے کی ضرورت ہوگی اور یہ اس دور میں بڑا مشکل ہے۔ اس کے جواب میں میں (شاہ صاحب) کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ دردسری کی ضرورت نہیں ہے، (کتب حدیث میں سے) صرف موطا صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی کی طرف لوٹنا چاہیے۔ یہ کتابیں مشہور و معروف ہیں اور قلیل مدت میں ان پر دسترس ہوسکتی ہے لیکن ان کتابوں میں جادۂ تویمہ کی معرفت نور باطن کی محتاج ہے اور یہ نور اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے، پس اگر تیرے قلب میں یہ نور باطن نہ ہو اور تیرے بھائیوں میں سے کسی نے اس کی طرف سبقت کی ہو اور اس نے تجھے ایسی زبان میں سمجھا دیا جس کو تم سمجھتے ہو تو اس کے بعد (جادۂ تویمہ کے خلاف جانے میں) تجھے معاف نہ کیا جائے گا۔[1]

[1] تفہیمات الٰہیہ۔ ج ۱ ص ۱۵۳-۱۵۶

شریعت کا جادۂ قویمہ شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ انھیں شارع علیہ السلام کی جانب سے امت مرحومہ کے اختلافات دور کرنے کا روحانی القا ہوا تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک فقہی فروعات کا تعلق ہے آپ، آپ کی اولاد اور آپ کے تربیت یافتہ تلامذہ سب کے سب ان امور میں امام ابوحنیفہؒ کے پیرو تھے، لیکن اس ضمن میں ان کے طریقے میں وہ جمود نہیں تھا، جو آج کل پایا جاتا ہے اور یہ کہ شاہ صاحبؒ کے بتائے ہوئے جادۂ قویمہ پر ان کا عمل تھا، میرے اس مدعا کے پہلے جزو کے اثبات کے لیے فیوض الحرمین کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

إن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نفخ الیّ نفخة أخری فبین ان مراد الحق فیك ان تجمع شملا من شمل الامة المرحومة بك وایاك أن تخالف القوم فی الفروع[1]	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے (ایک روحانی سوال کے جواب میں) ایک اور خوشبو آئی اور ظاہر ہوا کہ یہ حق تعالیٰ کی مراد ہے کہ تیرے ذریعہ امت مرحومہ کے تشتت کو دور کرے اور خبردار فروع میں کبھی قوم کا مخالف نہ ہونا۔

شاہ صاحبؒ حنفی مذہب فقہ کی تقلید میں جمود کے امکان کو اپنے تجویز کردہ جادۂ قویمہ کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک مکاشفے میں فقہ حنفی کے

---

[1] فیوض الحرمین صـ ۶۲ طبع احمدیہ متعلق مدرسہ عزیزیہ دہلی۔

ساتھ سنت کی تطبیق کا ایک نمونہ پیش کرکے فقہی تقلید کے حامیوں کے لیے غور و فکر کا دروازہ کھول دیتے ہیں فرماتے ہیں۔

ثم کشف لی أنموذجا ظهر لی منه تطبیق السنة بفقه الحنیفة من الاخذ بقول احد الثلاثة وتخصیص عموماتهم والوقوف علی مقاصدهم والاقتصار علی ما یفهم من لفظ السنة ولیس فیه تاویل بعید والاضرب بعض الاحادیث بعضا والارفضا لحدیث صحیح بقول احد من الائمة وهذه الطریقه ان أتمها الله واکملها فهی الکبریت الاحمر والاکسیر الاعظم[1]

پھر میرے لیے ایک اور نمونے کا انکشاف کیا جس سے فقہ حنفی سے سنت کی تطبیق کا راستہ کھل گیا (جو یہ ہے) کہ ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہ ابو یوسف اور محمد) میں سے کسی ایک کے قول کو اختیار کیا جائے۔ اور ان کے عمومات کی تخصیص، اور ان کے مقاصد پر وقوف کے بعد سنت کے ظاہر الفاظ سے جو مفہوم ہوتا ہے، اس پر اقتصار کیا جائے۔ اس میں نہ تو بعید تاویل کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ بعض احادیث کا بعض سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور نہ کسی ایک امام کے قول کے لیے صحیح حدیث کو چھوڑنا پڑتا ہے اس طریقے کو اگر اللہ تعالیٰ پورا اور کامل کرے تو کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہے۔

اس تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ احناف میں سے جس امام کا قول صحیح حدیث کے موافق ہو، اس کو اختیار کیا جائے، اور اسے اپنا فقہی مذہب قرار دیا جائے۔ اس طرح کسی امام کے قول کے لیے صحیح حدیث نہیں چھوڑنی پڑے گی۔

فقہی تقلید کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ اپنے زمانے کے عوام کی حالت بیان کرتے ہوئے تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں۔

---

[1] فیوض الحرمین صفحہ ۶۲-۶۳

آج کل تمہیں عوام کی یہ حالت دیکھنے میں آئے گی کہ انھوں نے متقدمین کے مذاہب فقہ میں سے کسی ایک امام کے مذہب سے اپنے آپ کو ایسا وابستہ کر رکھا ہے کہ اگر کوئی اس (مخصوص) مذہب کو اس کی تقلید کے بعد چھوڑ دے چاہے وہ چھوڑنا ایک مسئلے ہی میں کیوں نہ ہو، اس کو وہ دین و اسلام سے نکلنے کے مرادف خیال کرتے ہیں! اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کی تقلید کی جا رہی ہے وہ (ان کے خیال میں) ان کی طرف ایک نبی مرسل ہے جس کی اطاعت ان پر فرض کی گئی ہے۔

چوتھی صدی ہجری سے قبل امت کے اندر لوگ (فقہاء میں سے) کسی ایک مذہب کے پابند نہ تھے۔ ابو طالب قوت القلوب میں لکھتے ہیں کہ کتابوں کے مجموعے سب نئی چیزیں ہیں، لوگوں کے اقوال کو (سند میں) پیش کرنا، ان میں سے کسی شخص واحد کے قول پر فتوے دینا ہر شے میں اس کے قول کو حجت جان کر اس کو نقل کرنا، اور اس کے مذہب پر تفقہ حاصل کرنا یہ پہلے لوگوں کا طریقہ نہ تھا۔ پچھلے دور کے عوام کا یہ دستور تھا کہ وضو، غسل، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، نکاح، بیع اور دوسرے روزمرہ کے پیش آنے والے امور کے احکام کو اپنے آباؤ اجداد اور اپنے شہر کے اساتذہ سے سیکھتے تھے، اور جب کوئی نیا واقعہ ان کو پیش آتا تھا تو مفتیوں کی طرف رجوع کرتے تھے، چاہے وہ مدینہ کے مفتی ہوں یا کوفہ کے۔ وہ ان کے فتووں پر عمل کرتے تھے۔ (باقی) ان میں سے خواص لوگ جو کہ حدیث کے اصحاب حال تھے اور جاننے والے تھے، وہ ان مسائل میں جو احادیث اور آثار سے واضح طور پر معلوم ہوتے تھے۔ صرف شارع علیہ السلام کی تقلید کرتے تھے، اور جہاں ان کے بارے میں انھیں واضح حدیث نہ ملتی تھی وہ ان میں دوسرے ائمہ کے اقوال اور آراء کی اس وقت تک پیروی کرتے جب تک ان کو حدیث سے ان کے متعلق کوئی واضح دلیل نہ مل جاتی۔ خواص میں سے جو لوگ تخریج مسائل کے اہل ہوتے تھے، وہ فقہا میں سے کسی فقیہ کے قول منصوص یا بصورت عدم قول منصوص، اس کے بتائے ہوئے قواعد پر مسائل کی تخریج کرتے تھے۔

بعض اہل کشف ایسے بھی گزرے ہیں کہ جب لوگوں نے (فقہا کے) مذاہب کی تقلید کو اختیار کیا تو وہ کسی ایک مذہب کی پابندی کے خلاف تھے، جیسے کہ شیخ ابن عربی، انھوں

نے فتوحات مکیہ اور اپنی دوسری تالیفات میں لکھا ہے کہ بندہ اپنے (فکری) ارتقا کے دوران ان لوگوں کے مقامات سے گزرتا ہے جو فقہا میں سے کسی ایک مذہب کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس ارتقا میں اس منبع اور سرچشمہ کو پالیتا ہے جہاں سے اس مقلد کے امام نے اپنے اقوال حاصل کیے تھے۔ وہاں وہ دیکھتا ہے کہ جمیع ائمہ کے اقوال اس ایک ہی سمندر سے چلو بھرتے ہیں۔ (ایسی حالت میں) اس سے کسی ایک مخصوص مذہب کی پابندی اور تقلید چھوٹ جاتی ہے اور وہ اپنی سابقہ رائے کے خلاف سب مذاہب کو یکساں اور مساوی خیال کرتا ہے (اہل مکاشفہ میں سے) بعض اس لیے (کسی خاص فقہی مذہب کی) پابندی کرتے ہیں تاکہ عوام میں اختلافات پیدا نہ ہو یا انھیں خواب میں بعض مذاہب کے متعلق کچھ جہات مرجح نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ اس کی تقلید کو اختیار کر لیتے ہیں۔

بعض نقاد علماء ایسے بھی گزرے ہیں کہ اپنے عمل میں یا دوسروں کے لیے فتاویٰ دینے میں کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے جیسے کہ ابو محمد جوینی۔ انھوں نے "محیط" نامی ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے کسی ایک مذہب کے اقوال کا التزام نہیں کیا۔ اس روایت کو شیخ جلال الدین سیوطی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ایک ایسی جماعت سے نقل کیا ہے جس کا احصا مشکل ہے۔ لیکن ظاہر اور مشہور یہی ہے کہ اکثر فقہاء کسی ایک مذہب کے پابند ہوتے تھے۔

بہرحال علماء کے اس قسم کے (فقہی) اختلاف نے قوم کو خوف زدہ کر دیا اور بعض کو بعض کے اقوال کے انکار پر اکسایا اور پھر اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صریح حکم بھی مروی نہیں جس کی طرف کہ رجوع کیا جائے۔

یہ لکھنے کے بعد شاہ صاحبؒ تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے ہیں:۔

میرے اوپر اللہ کی بڑی نعمتوں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ شارع علیہ السلام نے ہمیں ایسے دو علم عطا فرمائے ہیں جو احکام کے لحاظ سے ایک دوسرے سے تمایز اور مراتب میں متغایر ہیں۔ ایک علم مصالح و مفاسد اور دوسرا علم شرائع و حدود اور میں ان دونوں کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہ صاحب شرف علم ہے جس کی طرف مجھ سے پہلے کسی نے سبقت نہیں کی اور نہ کسی نے اس کے اصول اور فروع کو بیان کیا، اور نہ

اس پر مسائل کو حل کو کیا۔

میرے اوپر اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ جادۂ قویمہ کے ضبط و ترتیب کے بعد مجھ پر فقہاء کے اختلاف کے اسباب کا بھی انکشاف ہوا۔ جادۂ قویمہ کی طرف، بعض ایسی تفاصیل اور تفریعات میں اشارہ کر چکا ہوں جو کہ مقدمات کلیہ میں محصور اور مضبوط ہیں جس نے ان کو سمجھا اور ان پر یقین کیا، وہ مواضع اختلاف کے سمجھنے میں بیت دلیل نہیں کرے گا اور جادۂ قویمہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے مستقل طور پر متمثل پائے گا۔ وہ تفاصیل کو ایک ضروری امر خیال کرے گا۔ کہ طریقہ نبوت (ملت) کو اس کے ماخذ اور منبع سے لینے والوں کے فہم کے اختلاف سے (تفاصیل کا) یہ اختلاف پیدا ہوا ہے۔

بعد ازاں شاہ صاحبؒ اسی کتاب میں اختلاف کے چار منازل کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ میرے لیے یہ علم منکشف ہوا کہ اختلاف کے چار منازل ہیں۔

۱۔ اختلاف مردود۔ جس کے قائل اور پیروکار کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ فقہ کے مدوّنہ مذاہب اربعہ میں یہ اختلاف قلیل الوجود ہے۔

۲۔ اختلاف ..... اس کے قائل کو تب تک معذور سمجھا جائے گا جب تک کہ اس اختلاف کے خلاف اس کو کوئی صحیح حدیث نہ پہونچی ہو۔ صحیح حدیث پہونچنے کے بعد بھی (اگر وہ اس پر اڑا رہا) وہ معذور نہیں ہے۔

۳۔ اختلاف مقبول، جس میں شارع علیہ السلام نے دونوں باتوں کا اختیار دے رکھا ہو، جیسے قرآن مجید کو سات حروف سے پڑھنا۔

۴۔ ایسا اختلاف جس کے بارے میں ہم نے شارع علیہ السلام کے بعض اقوال سے اجتہاد اور استنباط کے طور پر سمجھ رکھا ہے کہ اس کے دونوں اطراف مقبول ہیں اور انسان کو ان میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کے لیے مکلف بنایا گیا ہے، لیکن یہ بھی اپنے حکم میں مطلق نہیں ہے بلکہ اجتہاد اور ظن تاکیدی اس کی تقلید کے لیے ضروری ہے۔

اس قسم کے کئی علوم پر سے میرے لیے پردہ اٹھایا گیا۔ اور مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ہر ایک (فقہی) مذہب میں ظاہر اور شاذ دونوں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں

ظاہر الروایۃ وہ ہے جس کو اصول خمسہ نے جمع کیا ہو اور امام محمد نے بصراحت یہ کہا ہو کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے یا اس پر ان کا اعتماد رہا ہے۔ امام مالکؒ کے مذہب کا ظاہر الروایۃ ہے جس کی ابن قاسم نے صراحت کی ہو یا مدونہ میں (اس کے متعلق) یہ رائے پائی جائے کہ یہ امام مالکؒ کا وہ قول ہے جس پر ان کا اعتماد رہا ہے۔ امام شافعیؒ کے مذہب کا ظاہر الروایۃ وہ ہے جس پر شیخین یعنی رافعی اور نووی دونوں نے اعتماد ظاہر کیا ہو اور یہ صراحت کی ہو کہ یہ شافعی کا مذہب ہے' اور ان کا مشہور اور معمول بہ قول ہے۔ ان کے سوا اگر کوئی روایت غیر مشہور لوگوں سے یا ایسے لوگوں سے ملے جو ان ائمہ کے مذاہب پر عبور نہیں رکھتے تو وہ شاذ روایت کہلائے گی۔

اسی طرح شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہر اور شاذ۔ ظاہر شریعت کے لیے چند مراتب ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ۱۔ اقویٰ یعنی سب سے قوی تر تو وہ ہے جو قرآن مجید کی نص میں اس طرح پائی جائے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی خفا نہ ہو۔ ۲۔ دوسرے مرتبے پر ظاہر شریعت وہ ہے جو احادیث مستفیضہ صحیحہ سے ماخوذ ہو اور یہ احادیث صحیح بخاری' صحیح مسلم' نیشاپوری اور موطا امام مالک میں اس طرح مروی ہوں کہ ان میں تعارض نہ ہو اور روایات کے الفاظ اختلاف فاحش سے مبرا ہوں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ان میں چار شرائط پائے جائیں۔ وہ اپنے معنی اور مراد میں واضح ہوں۔ اہل لسان پر ان کا مطلب پوشیدہ نہ ہو۔ اور وہ مشہور روایت ہوں جنہیں صحابہؓ میں سے تین یا تین سے زیادہ نے روایت کیا ہو پھر ہر طبقے میں ان کے راوی بڑھتے گئے یہاں تک کہ حفاظ حدیث اور نقاد فقہا کا طبقہ آگیا۔ اور وہ ان سے راضی ہوئے اور ان کے قائل ہوئے اور وہ احادیث ان تین کتابوں میں مروی ہوں' کیونکہ ان تینوں کتابوں کی اسلام میں وہ شان ہے جو دوسری کتابوں کی نہیں ہے اور علمائے حدیث و فقہ کے ہاں ان کتابوں کی وہ مقبولیت ہے۔ جو دوسری کتب کی نہیں اور ان کتابوں کی وہ صحت ہے کہ اس جیسی صحت دوسری کتابوں میں نہیں دیکھی گئی۔

کتب حدیث کی ان تینوں کتابوں کے ساتھ قوم کا جو اہتمام رہا وہ دوسری کتابوں

کے ساتھ نہیں رہا۔ ان کتابوں کی شرح غریب، ضبط مشکل تخریج نقد اور راویوں کے بیان پر خاص زور دیا گیا۔ یہ ایسی بات ہے جس سے صرف وہ ناآشنا ہو سکتا ہے، جو قوم کے مدارک سے اجنبی ہو۔ مزید یہ کہ احادیث نبویہ میں تعارض نہ ہو، ان کتابوں میں خاص طور پر آپس میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو۔ امام مالکؒ سے (کسی مسئلہ میں) اس طرح منقول ہونا کہ یہ بڑے بڑے صحابہ اور تابعین کا مذہب ہے، جس پر زمانہ نبوت سے لے کر ان (امام مالک) کے زمانہ تک اہل مدینہ عمل کرتے آئے ہیں۔ (یہ بھی مذکورہ کتب کی روایت کے حکم میں ہے) پھر اس پر شافعی، احمد بخاری اور ان جیسے حدیث اور فقہ کے (ائمہ) جامعین نے کوئی تعقب نہیں کیا بلکہ اس کو پسند کیا اور اس کے قائل ہوئے۔ اور اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح یا حسن حدیث سے بصراحت تائید ہو، اگرچہ یہ آحاد اخبار سے ہی کیوں نہ ہو، یا اخبار کی دلالت یا اشارت سے تائید ہو۔ یا (اس سلسلے میں) صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کے آثار کو پیش کیا گیا ہو۔ یا کسی واضح قیاس اور صحیح استنباط سے اس کو قوی بنایا گیا ہو۔

سفیان ثوری کی روایت بھی امام مالکؒ سے منقول روایت کے حکم میں ہے لیکن امام مالک سے (کسی روایت کا) منقول اور مروی ہونا بیشتر اوقات ہوتا ہے۔ دوسروں سے منقول روایات کا یہ پایہ نہیں۔ مشہور کتب حدیث میں اگر کوئی صحیح یا حسن حدیث مروی ہو، اور اسے جس طرح روایت کیا گیا ہے، اس سے حجت قائم ہوئی اور فقہا کی ایک جماعت کا اس پر عمل رہا۔ یا وہ حدیث صحیح اور قوی استنباط ہے اور اس کی صحت کی ایک جماعت نے شہادت دی تو یہ بھی اس امام مالک کی روایت کے حکم میں ہے۔

یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر شریعت اور آپؐ کے سنن کا جادۂ قویمہ ہے جس کا صاحب رشد و ہدایت ہونا اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ جو بھی اس کا مخالف ہوگا۔ اس کا قول مردود سمجھا جائیگا۔ پس اگر وہ اس حالت میں نص قرآنی یا مشہور حدیث کی مخالفت کر رہا ہے، یا اجماع اور جلی قیاس کے خلاف جا رہا ہے تو وہ معذور نہ ہوگا اور اگر کسی دوسری دلیل کی مخالفت کر رہا ہے تو وہ اس وقت تک معذور سمجھا جائیگا جب تک کہ اس کو کوئی صحیح حدیث نہ پہونچے اور حجاب نہ اٹھ جائے۔ خفا اور حجاب کے اٹھ جانے کے بعد اس قول کے مقلد اور پیروکار کو معاف نہیں کیا جائیگا۔ اس مقلد کو یہ کہنے کا حق نہیں پہونچتا کہ میں حدیث پر عمل نہیں کرونگا اور اپنے امام کے

قول پر عمل کروں گا چاہو اس کے خلاف کوئی صحیح دلیل ہی کیوں نہ ہو۔

اب تجھ پر لازم ہے کہ جب شریعت کے احکام اس طرح تیرے پاس ثابت ہو کر آجائیں تو تم ان میں اچھی طرح غور کرو تاکہ تم ان کو ان کے غیر سے جدا کر سکو اور وہ تیری آنکھوں کے سامنے متمثل اور تیرے دل میں منقش ہوں پھر تجھے ان کو مضبوطی سے پکڑنا اور اپنے ہاتھوں سے مضبوط تھامنا چاہیے۔ اس میں اگر کوئی مخالف بھی ہو تو اس سے ہوشیار رہیں اور اس کی بات کی طرف کان نہ لگائیں۔ اس جادۂ قویمہ کے اثبات کے بعد بعض اسباب کی بنا پر اگر کبھی اختلاف ہو تو ایسی حالت میں وہ قول جو کہ ماخذ کے قریب ہو اور اس میں ظاہراً کوئی کوتاہی نہ پائی جائے اس کا ہرگز انکار نہ کیا جائے۔ بلکہ ایسا قول قبول کرنا چاہیے۔ اس طرح جادۂ قویمہ کو ایک مذہب بنائیں۔ اس سلسلے میں مختلف اقوال سے چشم پوشی کریں اور شریعت محمدیہ کے جادۂ قویمہ سے ایک رتی بھی باہر نہ جائیں۔ اس جادۂ قویمہ سے نکلنے کی مثال ہے وضو میں پاؤں پر مسح کرنا، نکاح متعہ کو جائز تصور کرنا، مسکر شراب کے قلیل مقدار کو حلال سمجھنا، گدھوں کو حلال جاننا اور یہ کہنا کہ وقت ظہر سایہ اصلی کے نکالنے کے بعد داخل ہے۔

جادۂ قویمہ کو تسلیم کرنے کے بعد اختلاف کرنے کی مثال علماء کا دوزدوں میں زوال کے بعد مسواک کرنے کا اختلاف ہے، یا یہ کہ نماز کو سبحانک اللھم سے شروع کیا جائے۔ یا وجھت وجھی سے یا ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ اور تشہد میں ابن مسعودؓ کی تشہد پڑھنی چاہیے یا ابن عباسؓ کی یا ابن عمرؓ کی۔

پھر اگر تمہاری ہمت بلند ہے اور تم تقوی میں قوی ارادہ رکھتے ہو تو ان تفاصیل کو واضح کتاب، ظاہر سنت اور اہل علم کے عمل اور قیاس قوی پر پیش کرو۔ مختلف احادیث میں تطبیق کرو، محدثین کی کتابوں میں جو اخبار صحیحہ، حسنہ یا ضعیفہ مروی ہیں، ان کا تمہیں تتبع کرنا چاہیے اور ان میں سے اقوی اور احوط کو اختیار کرنا چاہیے۔ ورنہ تمہارا درجہ ایک عام مسلمان سے اوپر نہیں ہوگا۔

اگر یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا۔ وہ بالتحقیق شریعت مصطفویہ کا جادۂ قویمہ ہے لیکن اس کی اس کے غیر سے کیونکر تمیز ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے تو بہت

(باقی صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجئے)

عورت کی سربراہی کی حمایت

دینی محاذ کا ایک حادثہ اور لادینیت کے لیے نوید فتح

از ـــــــــــــــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے صدارتی انتخاب کا ہنگامہ ختم ہوگیا۔ اور یہ جس نتیجہ پر ختم ہوا، ہماری دعا ہے کہ وہی پاکستان کے حق میں بہتر ثابت ہو، لیکن افسوس ہے کہ اس ہنگامہ نے اسلامی نظام سیاست کے ایک ایسے اہم اصول میں انتشار فکر کو جنم دے دیا ہے جس پر اہل دین میں کبھی دو رائیں نہیں تھیں، جس کی قطعیت کے بارے میں مسلم عوام آج تک کبھی تذبذب میں نہیں پڑے اور جس میں انتشار و تذبذب کی کیفیت کا پیدا ہو جانا آج کے خاص حالات میں جبکہ مسلم معاشرہ کے اندر دین اور لادینیت کی ایک شدید کشمکش برپا ہے، دینی محاذ کے لیے ایک ایسی چوٹ کے معنیٰ رکھتا ہے جس کے بعد کامیابی کی امید رکھنے کے کوئی معنیٰ نہیں!

آج مسلم معاشرہ کے اندر دین اور لادینیت کی جو جنگ برپا ہے اس کا اصل میدان ہمارے عقائد نہیں، ہمارے اوضاع و اطوار اور ہمارا معاشرتی نظام ہے۔ عقائد کی جنگ کا زمانہ گزر گیا اور اب اس معاملہ میں دراصل لادینی محاذ کے اندر دم نہیں رہ گیا ہے، گولہ باقی ہیں جو رسمی جل جانے کے بعد بھی رہ جاتے ہیں، اب تو لادینیت کا سارا زور معاشرتی تجدد پر اور زندگی کے نقشے کو مغربیت کے اصولی سانچے میں ڈھال لینے پر ہے، جس کا ایک اہم رکن ہے عورت اور مرد کی مساوات، یعنی کاروبار حیات میں ان دونوں کے درمیان عدم امتیاز اور ہر قید و بند سے آزاد

اختلاط! یہی وہ اصول ہے جس کے بارے میں مسلم معاشرہ کے اندر لادینی محاذ کو اب تک عمومی سطح پر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر اس میدان میں لادینیت نے جنگ جیت لی تو پھر اس نے سب کچھ جیت لیا۔ اس جیت کے بعد اسلام کے نیچے کچھے معاشرتی نظام ہی کی نہیں اخلاقی نظام کی بھی چولیں ہل جائیں گی۔ اور اس کے بعد کیا دین رہ جائے گا؟ وہ ظاہر ہے۔

عورت اور مرد کی کامل مساوات کا کوئی مظاہرہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا کہ کوئی ملک اپنی سیاسی زندگی کی سربراہی کے لیے ایک عورت کا انتخاب کرنے پر آمادہ ہو جائے، کیونکہ اس معاملہ میں دنیا نے ہمیشہ ہی مرد و عورت کے درمیان تفریق کی ہے اور حد یہ ہے کہ مساوات کا یہی وہ نقطہ ہے جس تک پہونچنے کی ہمت وہ مغربی معاشرہ بھی نہیں کر پایا جو اس اصول مساوات کا معلّم ہے۔ عورت کے اس مساوی حق کا قائل وہ صرف نظری حد تک ہے۔ رہا اپنے اختیار سے اس کو عمل میں برتنا تو اس سے وہ بھی اسی طرح دور ہے جس طرح دنیا کے تمام سمجھدار معاشرے آج تک دور ہی رہتے آئے ہیں ـــــ پس اگر کوئی معاشرہ عورت کو اپنی سیاسی سربراہی کا شرف بخشنے پر آمادہ ہو جائے یا کم از کم یہ ماننے ہی لگ جائے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یا اور بھی نیچے اتر آئیے، صرف یہ خیال ہی لوگوں میں پیدا ہو جائے کہ یہ کوئی اس درجہ کی بات نہیں ہے کہ ضرورۃً بھی اس کو جائز نہ رکھا جائے تو مساوات کے اس نقطۂ کمال کے بارے میں یہ ذہن اختیار کر لینے کے بعد وہ معاشرہ کس طرح اس پوزیشن میں رہ سکتا ہے کہ اس سے نیچے کے نقطوں پر لادینیت کی مزاحمت کر سکے!

اب ذرا دیکھئے کہ پاکستان کے اس الیکشنی ہنگامہ میں خود وہاں کے اہل دین کے ہاتھوں، عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں، کیا ذہن عام لوگوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان میں دینی محاذ کے سب سے مقتدر اور نامور لیڈر مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ عبرت انگیز چیلنج تو آپ گزشتہ شمارے میں پڑھ ہی چکے ہیں کہ :-

"کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ ازروئے شریعت عورت کا سربراہ مملکت ہونا حرام ہے۔"

اور پھر اس کے جواز میں مولانا کا یہ استدلال بھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ چونکہ ملکہ سبا کے ایمان لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ وحی نازل نہیں ہوئی کہ عورت کو سربراہ مملکت نہیں رہنا چاہیئے اس لیے یہ ثابت ہوا کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ جماعت اسلامی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک اخبار نے (جس کے مدیر جماعت کے ایک ممتاز رکن اور پاکستان کے ایک ابھرتے ہوئے واعظ اور خطیب بھی ہیں) اپنے ایک اداریے کے اندر صاف لفظوں میں اس کو بعض مذہبی حلقوں کے پروپیگنڈے سے تعبیر کیا کہ "شریعت کی رو سے عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی ہے" ——— لیکن اس اداریے میں ایسا صرف یہ ایک جملہ ہی نہیں تھا بلکہ پورے دو صفحے میں اس "پروپیگنڈے" کی تردید کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ کوئی قطعی مسئلہ نہیں ہے۔ اس میں دوسری رائے کی بھی پوری گنجائش ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ

"یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے اور ایسا متفق علیہ بھی نہیں جس میں علماء سلف یا موجودہ اہل علم کے درمیان اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔"

اور اس کے بعد فرمایا کہ

"جو لوگ اپنی روپہلی اغراض کے تحت عورت کے صدر مملکت بننے یا نہ بننے کو کفر و اسلام کا مسئلہ بنا چلے ہیں اُن کی تو اور بات ہو لیکن جن ثقہ اصحاب علم کو بالغ نظری کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہونچنا ہے ہم سوئے ادب کی معافی چاہتے ہوئے اکابر علماء کے چند حوالے اُن کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے کہ ملکی دنیوی ضروریات کے پیش نظر عورت کی سربراہی کو تسلیم کرلینے سے یہی نہیں کہ آدمی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا بلکہ علم و تقویٰ کے بلند ترین مقامات پر بھی بدستور فائز رہ سکتا ہے۔"

آگے وہ حوالے درج کیے گئے ہیں کہ کن کن اکابر علماء نے اس مسئلہ میں جواز کا حکم فرمایا ہے۔

ان میں دورِ حاضر کے علماء کے نام یہ ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید مہدی حسن مفتی اعظم دیوبند۔

علماء سلف میں سے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اُن کے نام یہ ہیں:۔

علامہ طبریؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور کچھ دوسرے بے نام کے ائمہ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ ان کے بالمقابل ایسے حوالے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں عورت کو سربراہ مملکت بنانے کی پرزور مخالفت کی گئی ہے مگر اس گفتگو سے کم از کم یہ تاثر ضرور پیدا ہونا چاہیے ـــــ اور یہی اس سے ہمارا مقصود بھی تھا ـــــ کہ عورت کا سربراہ مملکت بنایا جانا کفر و ایمان نہیں۔ نہ اس کے قائلین کو کافر و گمراہ ہونے کا طعنہ دیا جا سکتا ہے"۔

اس کے بعد "حقیقت پسندی" کے طور پر مسئلہ کے "عملی پہلو" پر توجہ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یہ بجا اور درست کہ ایک کامل اسلامی معاشرہ میں مرد ہی کو سربراہ مملکت ہونا چاہیے اور جہاں تک خلافتِ راشدہ کا تعلق ہے اس میں بھی یہی نظر آتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس عبوری دور میں بعض اہم مصالح کی بنا پر ایک کامل اسلامی معاشرہ کے مقتضیات سے کم پر رضامند ہو جانا دینی اقدار کی رو سے قابلِ برداشت ہے یا نہیں؟

اور پھر اس "حقیقت پسندی" کی دینی سند کے طور پر ارشاد ہوا ہے کہ

"خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں پر جو مختلف ادوار گزرے ہیں وہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" کے مصداق ہمارے اس عہد سے بہرطور بہتر تھے ان میں جو علماء اور صلحاء ہو گزرے ہیں ہمارے یہاں کے اکابر کسی لحاظ سے ان کے مثیل نہیں قرار دیے جا سکتے، اُن کی غیرتِ دینی بھی

شک وشبہ سے بالاتر ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان بہتر اور ادار میں کئی مواقع پر عورت سربراہ مملکت رہی مگر ان اکابر و اعاظم نے کبھی حکومت کے ساتھ اس وجہ سے عدم تعاون کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔"

اب حرفِ مدّعا سُن لیجئے کہ

"مندرجۂ بالا گزارشات سے دو باتیں صاف ہوگئیں ـــــ ایک یہ کہ اہل علم میں بعض ممتاز ہستیوں کے نزدیک عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی گنجائش ہے ـــــ دوسرے یہ کہ ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی حکمراں خواتین ہو گزری ہیں جنھوں نے کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور اس دور کے علماء و صلحاء نے ان کے ساتھ عدم تعاون نہیں کیا۔"

ہم اس اداریہ کے ضروری اقتباسات کے ذریعہ جو بات مخصوص طور پر سامنے لانا چاہتے تھے وہ آخری اقتباس کے اس فقرہ میں، جسے ہم نے زیر خط کر دیا ہے، اداریہ نگار نے خود ہی بڑی صراحت کے ساتھ کہہ ڈالی ہے کہ ان کا اولین مقصد اس ساری کد و کاوش سے یہ ہے کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی ممانعت کو لوگ کوئی قطعی مسئلہ نہ سمجھیں۔ اس میں سلف سے لے کر خلف تک بڑے بڑے علماء کی اختلافی رائیں موجود ہیں ـــــ ہم اس پر تبصرہ آگے کریں گے بہر دست اتنا ہی ذہن میں رکھئے کہ کیا تاثر لوگوں کو دیا گیا ہے اور پھر اس تاثر نے کیسے کیسے حلقوں کو آن کی آن میں زیر کر لیا؟ کہ ناواقف عوام کی بات چھوڑیئے قال اللہ وقال الرّسُول کی مسندیں تک اس تاثر میں ایسی بہہ نکلیں کہ مارے حیرت کے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا، اللہ و رسول کے جو ارشادات کل تک اس مسئلہ میں جن زبانوں پر فیصلہ بن کر آتے تھے آج یہی زبانیں ان میں تاویل کا سبق پڑھانے لگیں۔ اور پھر اس تاویل کے چکر میں کیسی کیسی تشکیک انگیز نکتہ نوازیاں اور کیسی کیسی خطرناک فلسفہ طرازیاں، کہ اگر انداز گفتگو سے سادہ لوحی نہ ٹپک رہی ہو تو ہم کہیں خود فریب نہیں کھا گئے ہیں کہ بلکہ جان بوجھ کر البہ فریبی مقصود ہے۔

اس فریب خوردگی کی ایک ماتم انگیز مثال ہمارے سامنے پاکستان کی ایک عربی درسگاہ کے ماہنامے کا اداریہ ہے۔ جو یوں تو مسلک دیوبند سے وابستہ ہے مگر پاکستانی سیاست میں کچھ دن سے اس کا رجحان جماعت اسلامی کی حمایت و اعانت کا نظر آتا ہے۔ اس رسالے نے عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر کوئی اٹھارہ صفحے کا اداریہ اپنی ایک حالیہ اشاعت میں لکھا ہے اور اس میں پاکستانی مسئلہ سے الگ بارہ تیرہ صفحے کی جو خالص اصولی بحث کی ہے وہ پوری کی پوری ایک کتابِ عبرت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے کچھ اقتباسات درج کیے جائیں مگر طوالت کے خیال سے ہم اپنے ہی الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس رسالے نے لکھا ہے کہ ـــــ مرد ہونے کی شرط تو کتابوں میں امامت و خلافت کے لیے آئی ہے اور امامت و خلافت نام ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کی واحد مرکزی حکومت کا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ملکوں اور علاقوں کے لیے جو امیر اس مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کیے جاتے تھے اُن میں قرشی ہونے کی شرط ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی، حالانکہ یہ امام اور خلیفہ کے لیے ضروری شرط تھی۔ پس آج جو مختلف اسلامی ملکوں کے صدر و سربراہ ہیں انھیں دورِ خلافت کے علاقائی اُمراء پر قیاس کرنا چاہیئے جن کیلئے خلافت والی شرائط نہیں تھیں اسی لیے مرد ہونے کی شرط بھی آجکل کی صدارت و سربراہی کے لیے ضروری نہ ہوگی۔ ـــــ غور فرمائیے کس قدر خطرناک منطق ہے۔ اس نے اُس وقت تک خدا علیٰ منہاج النبوت کی جڑ ہی کاٹ دی جب تک ساری دنیا کے مسلمان ایک سیاسی مرکز کے تحت جمع نہ ہو جائیں۔ جب تک یہ نہو اُسوقت تک مکمل اسلامی حکومت کے قیام کا مسئلہ ہی ختم ہے!

اچھا اب آگے آیئے!

اس منطق پر یہ اشکال وارد ہو رہا تھا کہ زبانِ نبوت نے تو بلا کسی تفریق کے فرمایا ہے "لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃً" (وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جو اپنی باگ ڈور ایک عورت کے ہاتھ میں دے دے) اس اس حدیث کی موجودگی میں کسی محدود، لیکن خود مختار علاقے کے مسلمانوں کو بھی کیسے یہ بات جائز رکھنی چاہیئے؟ اس اشکال کو دور کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ چونکہ قرآن میں ملکۂ سبا کے قصے سے عورت کی سربراہی کا جواز ملتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت کچھ جمہوری نوعیت کی تھی۔ اور حدیث کا تعلق ایران کی مطلق العنان شخصی حکومت سے ہے۔ اسلیے شخصی حکومت میں تو عورت کی سربراہی ناجائز ہوگی۔ لیکن جمہوری حکومت میں جائز ہوگی! ـــــ لیکن اب پوچھئے کہ کیا اسلامی خلافت بھی کوئی مطلق العنان شخصی حکومت ہوتی ہے

جس میں آپ عورت کی سربراہی کو منع فرماتے ہیں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ لیکن یقین کیجئے کہ اسلامی خلافت کو شخصی بادشاہت ہی کے ہم معنی ان بزرگ نے بتا دیا ہے ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی!

ہم ان باتوں کی باقاعدہ تردید پر کیا اپنا وقت ضائع کریں ان میں سے ہر بات کا نتیجہ خود ہی اسکے باطل ہونے کا ثبوت ہے۔ اور پھر اس فریب خوردگی اور خیرہ نگہی کی انتہا کو کیا کہیئے کہ نتیجہ خود سوال بن کر سامنے آرہا ہے مگر ذہن پر کوئی چوٹ نہیں پڑتی ——— بہرحال ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ نکتے تمام تر سادگی اور اُس پر مستزاد فریب خوردگی کا نتیجہ ہیں ورنہ لوگ اس سے بھی زیادہ غلط باتیں ایسی فنکارانہ شان سے کہتے ہیں کہ تردید میں سر چکرا جائے۔ اگر جان بوجھ کر لوگوں کو مغالطہ دینا اس رسالہ کا مقصود ہوتا تو یقیناً اس کا انداز کچھ اور ہی ہوتا، لیکن یہ بیچارہ خود گمراہ[۵] ہوا ہے دوسروں کو گمراہ کرنے کی نیت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور اس کی گمرہی کی جڑ ہے وہ حسنِ اعتماد اور حسنِ ظن جو اس نے مولانا سید ابوالاعلیٰ اور اُن کے رفقاء کے بارے میں اپنے اندر پیدا کر لیا تھا، اسے کچھ مسائل میں اختلافِ مسلک کے باوجود ان لوگوں کی جو ادائیں بھا گئی تھیں وہ تو یہی تھیں کہ یہ نظام مملکت میں اسلام کی فرمانروائی چاہتے ہیں اور وقت کے سب سے بڑے فتنے آزادیٔ نسواں کے تو پاکستان میں سب سے بڑے حریف یہی ہیں، بھلا وہ ان لوگوں کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ ان کا کوئی قدم غلطی سے بھی آزادیٔ نسواں کے حق میں جا سکتا ہے اور کوئی بات یہ ایسی بھی اپنا سکتے ہیں جو نظامِ حکومت کے اسلامی اُصولوں کے یکسر خلاف ہو! چنانچہ اس نے جو سُنا کہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کہتے ہیں کہ "عورت کے سربراہِ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے اور ان کی جماعت کے اخبارات اور رسائل لکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی متفق علیہ قطعی مسئلہ نہیں ہے، شروع سے آج تک بہت سے علماء و فقہاء جن میں بعض علماء دیوبند بھی شامل ہیں) اس کے قائل رہے ہیں کہ عورت بھی سربراہِ مملکت ہو سکتی ہے تو اسے بلا کسی تامل کے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو مسئلہ یونہی ہے اور پھر ایک ترجمانِ علم و دین کی حیثیت سے اس نے اپنا فرض جانا کہ مسئلے کو اپنے طور پر بھی منقح کرے اور جواز کے جو

---

[۵] یہ لفظ ہم لغوی معنی میں استعمال کر رہے ہیں اصطلاحی معنی میں نہیں۔

دلائل اور اعتراضات کے جو جوابات اس کی اپنی سمجھ میں آسکتے تھے انھیں بھی تائید حق کے لیے پیش کردے ـــــ یہ ہے ہمارے نزدیک اس گمراہی کی کہانی۔ اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے اور اسی حسن ظن اور حسن اعتماد سے گمراہی کا شکار ہوئے ہوں گے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریب عقل کا پردہ چاک کیا جائے اور ان سادہ دل اہل ایمان کو دکھایا جائے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقاء نے آج اس مسئلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ نہ صرف دلائل و حقائق کی روشنی میں غلط ہے بلکہ مولانا مودودی کی اپنی سابقہ تصریحات ہی اس کے تار و پود بکھیر دینے کے لیے کافی ہیں۔

جائزہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب نے جو مسئلہ قرآن کی بنیاد پر ارشاد فرمایا ہے اس پر تو ہم بعد میں گفتگو کریں گے پہلے ان کے حلقے کے اس پروپیگنڈے کا جائزہ لیجئے جس میں سلف سے خلف تک بہت سے ائمہ و علماء کے متعلق یہ خیال پھیلایا گیا ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے قائل تھے۔ اس کا تفصیلی خلاصہ ہم شروع میں دے چکے ہیں اب اس میں سے ایک ایک جزو کو لیجئے۔

(۱)

فرماتے ہیں کہ

"حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (جلد ۸ صفحہ ۹۰) پر علامہ طبری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عورت کی امارت اور قضا کے قائل تھے۔ اسی فتح الباری (باب کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ) میں امام مالک کے متعلق آیا ہے کہ وہ بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ صاحب فتح الباری نے امام ابوحنیفہ کا بھی (ایک روایت کے مطابق) یہی نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ انھوں نے بعض دوسرے ائمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو یہ نظریہ پیش کرتے تھے۔"

علامہ ابن حجر کی تالیف فتح الباری (شرح صحیح البخاری) میں یہ مسئلہ دو مقامات پر آیا ہے مذکورۂ بالا عبارت سے بھی بادی النظر میں دو الگ الگ مقامات ہی کا حوالہ معلوم ہوتا ہے لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ حوالہ ایک ہی مقام کا ہے۔ کیونکہ "باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

الی کسریٰ" اور "جلد ۸ صفحہ ۹۰" دونوں ایک ہی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب بنام کسریٰ کا ذکر فتح الباری کے اس مصری اڈیشن میں جو ۱۳ جلدوں میں شائع ہوا ہے، آٹھویں جلد کے صفحہ ۹۰ پر ہی ہے۔ ہندوستانی فتح الباری مطبوعہ مطبع انصاری دہلی میں اس کو جزو ۱۸ صفحہ ۹۰ پر دیکھا جا سکتا ہے ـــــ بہرحال اس مقام پر فتح الباری کی عبارت یہ ہے۔

والمنع من ان تلی الامارۃ والقضاء قول الجمھور واجازۃ الطبری وھی روایۃ عن مالک وعن ابی حنیفۃ تلی الحکم فیما تجوز فیہ شھادۃ النساء۔

اس عبارت میں علامہ طبریؒ کا ذکر ہے، امام مالکؒ کا ذکر ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا ذکر ہے۔ دوسرے کسی امام کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ جبکہ مدیر شہابؔ فرماتے ہیں کہ علامہ ابن حجرؒ نے بعض دوسرے ائمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو یہ نظریہ پیش کرتے تھے۔" ان دوسرے ائمہ" کا ذکر آپ کو فتح الباری کے دوسرے مقام پر ملے گا۔ یہ دوسرا مقام "کتاب الفتن" میں ہے جس کے لیے فتح الباری کے مذکورہ مصری اڈیشن کی جلد ۱۳ صفحہ ۴۷ دیکھنا چاہیے اور ہندوستانی اڈیشن کا جزو ۲۹ صفحہ ۵۴۸ (۲۸)۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

احتج بحدیث ابی بکرۃ من قال لایجوز ان تولی المرأۃ القضاء وھو قول الجمھور وخالف ابن جریر الطبری وقال یجوز ان تقضی فیما تقبل شھادتھا فیہ واطلق بعض المالکیۃ الجواز۔	وہ لوگ اس حدیث ابوبکرہؓ کو دلیل بناتے ہیں جو کہتے ہیں کہ عورت کا قاضی بنایا (یا بنایا جانا) جائز نہیں اور یہ مذہب جمہور ہے۔ لیکن ابن جریر طبری نے اس میں اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ عورت ان معاملات میں قضا کا فریضہ انجام دے سکتی ہے جن میں اس کی شہادت مانی جاتی ہے۔

اور بعض المالکیہ کا قول (اس سے بھی بڑھ کر) یہ ہے کہ نہیں عورت کی قضا علی الاطلاق جائز ہے (ان امور کی قید نہیں جن میں عورت کی شہادت معتبر ہوتی ہے)"

تو یہ "بعض دوسرے ائمہ" بعض مالکیہ ہوتے ہیں جو بقول مدیر شہاب یہ نظریہ پیش کرتے تھے کہ

عورت سربراہ مملکت ہو سکتی ہے۔

اگر مدیر شہاب "بعض دوسرے ائمہ" کا حوالہ نہ دیتے تو ہم سمجھتے کہ ان کی نظر میں فتح الباری کا یہ دوسرا مقام نہیں ہے۔ لیکن اب یہ سمجھے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ان کی نظر میں یہ دوسرا مقام بھی تھا اگرچہ اس کا متعین حوالہ انھوں نے نہیں دیا۔ سوال یہ ہے کہ فتح الباری کے اس دوسرے مقام پر بھی نظر رکھنے کے بعد کسی ایمان دار آدمی کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نہ سہی علامہ طبری کے بارے میں ہی یہ کہنے کی جرأت کرے کہ وہ عورت کی امارت کے جواز کے قائل تھے؟ اس دوسرے مقام کی عبارت تو صاف بتا رہی ہے کہ اُن کا (ابن جریر طبری کا) اختلاف صرف قضا میں تھا اور وہ بھی صرف اتنا کہ جن معاملات میں عورت شہادت کا حق رکھتی ہے ان میں اُس کو قضا کا حق بھی ہے نہ کہ علی الاطلاق .....

بہر حال اب دیکھئے کہ فتح الباری میں اُس مقام پر کیا کہا گیا ہے جس کا حوالہ مدیر شہاب نے دیا ہے! عبارت ہم نقل کر چکے ہیں لیکن ترجمہ اس کا ہم نے چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ دوسرے مقام کی عبارت سامنے آئے بغیر اس کے ترجمہ میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ دوسرے مقام کی عبارت سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو اُس عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا۔

"اور اس بات کی ممانعت کہ عورت امارت و قضا کی ذمہ داری سنبھالے یہ قول جمہور کا ہے لیکن طبری نے اس کو جائز کہا ہے اور یہی ایک روایت ہے امام مالک سے اور امام ابوحنیفہ سے روایت (محض ایک روایت) یہ ہے کہ عورت ان امور میں فیصلے (قضا) کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت جائز (معتبر) ہوتی ہے"

اس ترجمے کی رو سے بھی ہمیں مدیر شہاب کے بیان میں کئی غلط بیانیاں یا غلط فہمیاں ملتی ہیں۔

۱۔ اس عبارت میں امام مالک کے مذہب کی صرف "ایک روایت" کا بیان ہے۔ جبکہ مدیر شہاب نے بجائے "ایک روایت" کے امام مالک کا مذہب ہی یہ بتایا ہے۔ یہ ایک اہم فرق ہے جسے اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔

۲ اور ۳۔ امام ابوحنیفہ کا قول ایک روایت کے مطابق اس عبارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

وہ ایسے اُمور میں عورت کی قضا کو جائز فرماتے تھے جن میں عورت کی شہادت معتبر ہے۔ لیکن مدیر شہاب نے اول تو قضا کے سلسلے میں امام صاحب کی اس تجدید کو بیان نہیں کیا اور اس سے بڑھ کر غضب یہ کیا کہ قضا کے ساتھ امارت کا جواز بھی امام صاحب کی طرف منسوب کر دیا۔

یہ خلافِ واقعہ باتیں تو محض اس عبارت کو سامنے رکھ کر نکل آتی ہیں لیکن دوسری عبارت کو بھی سامنے رکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس (پہلی) عبارت کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ اول سے آخر تک غلط ہے۔ کیونکہ دوسرے مقام کی عبارت میں جب یہ بات صاف طور سے آرہی ہے کہ امام طبری کا جمہور سے اختلاف صرف قضا کے مسئلہ میں ہوا ہے ـــــ اور وہ بھی صرف ان امور کی قضا میں جن میں عورتوں کی شہادت چلتی ہے نہ کہ امارت کے مسئلہ میں۔ تو پہلے مقام کی عبارت کا یہ آخری جملہ کہ

تلی الحکم فیما تجوز فیہ شہادۃ النساء — ان معاملات میں عورت قضا کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت معتبر ہوتی ہے۔

اس کا تعلق صرف امام ابوحنیفہ کی اختلافی روایت سے نہیں، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا، بلکہ امام مالک کی اختلافی روایت اور امام طبری کے مذہب سب ہی سے ماننا صحیح ہوگا۔ اور اب اس پہلی عبارت کا ترجمہ "واجازۃ الطبری" سے آخری جملے تک یوں ہوگا کہ

"لیکن امام طبری نے اس کو جائز کہا ہے اور یہی ایک روایت ہے امام مالک سے اور امام ابوحنیفہ سے (یعنی یہ تینوں حضرات کہتے ہیں) کہ عورت اُن امور میں قاضی بن سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت معتبر ہوتی ہے"۔

یہ ظاہر عبارت کے ضرور کچھ خلاف ہے، لیکن جب صاحبِ عبارت خود ہی دوسرے مقام پر پوری صراحت کے ساتھ اختلافِ طبری کی یہ حقیقت بیان کر رہا ہے کہ اختلاف صرف قضا میں ہے اور وہ بھی ان معاملات کی حد تک کہ جن میں عورتوں کی شہادت مقبول ہوتی ہے، تو پھر اس کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا کہ ظاہرِ عبارت کی خاطر خلافِ حقیقت اور خلافِ واقعہ مطلب لے لیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس تفصیل و وضاحت کے بعد کسی صاحب علم کو اس بارے میں ہم سے اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض اہل الفضول بھی اس مسئلہ میں در آئے ہیں اور کھلی کھلی حقیقتوں سے کشتی لڑا کر ناواقفوں سے داد طلب ہوتے ہیں کہ ان کے دماغ اور زبان میں کس بلا کا زور ہے۔ اور پھر ان کا یہ زور ایک مسئلہ میں جیتنے کی خاطر دس مسئلوں کی بساط الٹ دینے اور مکھی کو مارنے کے لیے سر بھی پھوڑ لینے ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ صحافتی تہذیب اور تنقید کے جذباتی حدود بھی اس زور میں اس حد تک بہہ جاتے ہیں کہ قلم بے تکلف بازار کی زبان کے نمونے پیش کرنے لگے اور ایک سے ایک خوبصورت لفظ سے معترض کے کام و دہن کی تواضع ہو جائے۔ اس لیے ان ارباب قلم کے منہ بھی نہیں لگا جا سکتا ـــــ پس ایسے ہی لوگوں کے خیال سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پیشگی ہی اپنی تائید میں کچھ قابل لحاظ حوالوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم پانچویں اور چھٹی ہجری (۴۶۸ھ تا ۵۴۳ھ) کے ممتاز مالکی عالم اور مصنف قاضی ابوبکر ابن العربی اندلسی کی مشہور کتاب "احکام القرآن" جلد دوم کا حوالہ دینا چاہتے ہیں جس میں سورۂ نمل کی آیت "اِنِّی وَجَدْتُ اِمْرَاَۃً تَمْلِکُھُمْ" کے ذیل میں قاضی ابن العربی فرماتے ہیں:۔

رُوِی فی الصحیح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال حین بلغہ ان کسریٰ لما مات ولّیٰ قومہ بنتہ لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ وھذا نص فی ان المرأۃ لا تکون خلیفۃ ولا خلاف فیہ ونقل عن محمد بن جریر الطبری امام الدین انہ یجوز ان تکون المرأۃ قاضیۃ ولم یصح ذالک عنہ ولعلہ کما نقل عن ابی حنیفۃ انھا تقضی فیما تشھد

صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب آپ کو یہ بات پہونچی کہ کسریٰ (شاہ ایران) کے مرجانے پر اہل ایران نے اس کی بیٹی کو اس کا جانشین بنا لیا تو آپ نے فرمایا وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو اپنی سیادت ایک عورت کے سپرد کرے۔ اور یہ حدیث نص ہے اس باب میں کہ عورت (اسلام میں) خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ امام دین محمد بن جریر طبری سے یہ بات منقول ہوئی ہے کہ عورت قاضی ہو سکتی ہے

فیہ۔ الخ صـ ۱۳۶ ج ۲ (طبعۂ اولیٰ۔ مطبعۃ السعادۃ مصر)

لیکن اس قول کی نسبت اُن کی طرف صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ لیکن اگر انھوں نے کوئی ایسی بات فرمائی ہے تو وہ بات فرمائی ہوگی جو امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں قضا کی اہل ہے جن میں وہ شہادت کی اہل ہے۔"

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ امام طبری کا جمہور سے اختلاف عورت کی امارت کے مسئلہ میں قطعاً نہیں ہے، اگر ہے تو صرف قضا کے مسئلہ میں ہے، دوسرے یہ کہ قاضی ابن العربی کے نزدیک قضا کے مسئلہ میں بھی علی الاطلاق جواز کا قول امام طبری کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر ان کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے تو اس میں بحث کی ضرورت نہیں۔ اس سے اس بات کی پوری تائید ہو جاتی ہے کہ فتح الباری میں کتاب الفتن والے مقام پر امام طبری کے اختلاف کی جو نوعیت بیان کی گئی ہے وہی اصل حقیقت ہے اور اسی کی روشنی میں فتح الباری کی پہلی عبارت کا مطلب متعین کیا جائے گا۔[۵]

حسن اتفاق سے اس مسئلہ میں جماعت اسلامی کی حمایت میں لکھے گئے ایک مقالہ میں بھی ہمیں فتح الباری کی اس عبارت کا ترجمہ اسی انداز میں ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے آخری جملے کا تعلق صرف امام ابوحنیفہ کے قول سے نہیں ہے بلکہ امام طبری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ تینوں ہی کے قول سے ہے۔ یہ مقالہ "فاران" کراچی کے اداراتی صفحات میں کسی

---

[۵] قاضی ابن العربی کے مذکورۂ بالا بیان سے اس بات کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے کہ انھوں نے اس مقام پر امام مالک یا کسی اور مالکی کی اختلافی روایت کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ امارت کے مسئلے میں تو "لا خلاف فیہ" کہا ہی ہے۔ قضا کے مسئلے میں بھی کسی مالکی کے اختلاف کا تذکرہ نہیں کیا جبکہ امام طبری اور امام ابوحنیفہ تک سے منسوب روایتوں کی تاویل و توجیہ کی انھوں نے ضرورت سمجھی۔ ہمارے خیال میں اس کے بعد یہ بات آسانی سے نہیں کہنی چاہیے کہ امام مالک یا کسی مالکی کا مسئلہ قضا میں بھی اختلاف ہو چہ جائیکہ امارت کے مسئلہ میں ان کا نام لیا جائے۔

"ابن نذیر" صاحب کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں اس عبارت کے زیر بحث حصے کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"اور علامہ طبری نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی امام مالک اور امام ابوحنیفہ سے بھی روایت ہے (یہ تینوں حضرات کہتے ہیں) کہ جن معاملات میں عورتوں کی شہادت قبول کی جائے گی اُن میں وہ صاحب امر بھی بنے گی۔

(فاران نومبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۲)

ہمیں امید ہے کہ "شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ اَهْلِهَا" کے بموجب تائیدی شہادت ضرور تسلیم کرلی جائے گی۔[1]

فاران کے اسی مضمون میں (فتح الباری کے منقولہ بالا حوالے کے بعد متصلاً ہی) المغنی لابن قدامہ کی یہ عبارت بھی نقل کی گئی ہے کہ

وحکی عن ابن جریر انه لاتشترط	اور کہا گیا ہے کہ ابن جریر مرد ہونے کی
الذکوریة لان المرأة یجوزان	شرط عائد نہیں کرتے اس لیے کہ جب کسی
تکون مفتیةً فیجوزان تکون	عورت کو مفتی بنانا جائز ہے تو وہ قاضی
قاضیةً	بھی ہوسکتی ہے۔

اس حوالے سے بھی اس کی تائید ہوئی کہ ابن جریر کا اختلاف صرف قضا کے باب میں ہے۔

بہرحال یہ بات بالکل طے ہو کہ ابن جریر طبریؒ کا اختلاف اگر کچھ ہے تو عورت کی قضا کے جواز و عدم جواز میں ہے، عام اس سے کہ مطلق جواز کے قائل تھے یا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی

---

[1] لیکن اسے تسلیم کرلینے سے بھی ان حضرات کا کیا بگڑے گا اس ترجمے میں ایک اور مصیبت ڈھائی گئی ہے کہ "تولی الحکم" کا ترجمہ "صاحب امر بنے گی" کردیا گیا ہو۔ ہم اگر پہلے سے دیکھ لیتے تو اوپر کی لمبی بحث کے چکر ہی میں نہ پڑتے۔ کیونکہ اس ترجمے سے یہ امکان معلوم ہوا کہ شاید مدیر شہاب نے بھی اپنے حوالے کی بنیاد اسی لفظ پر رکھی ہو۔ لیکن یہ ہے بالکل غلط کیونکہ "حکم" کا ترجمہ "امر" (بمعنی حکومت) عربی میں نہیں ہوتا ہے۔ حکم "فیصلہ کرنے" (قضا) کو کہتے ہیں۔ اور یوں بھی ذرا سی عقل صرف کیجئے تو خود سمجھ میں آجائے گا کہ کسی جج اور قاضی ہی کا دائرۂ سماعت محدود ہوسکتا ہے اور اسی لیے وہ مقرر ہوسکتے ہیں لیکن کیا کسی ملک میں سربراہ و حکمران بھی مقرر ہوسکتے ہیں کہ ایک کے صدود اختیارات کچھ ہوں دوسرے کے اُس سے مختلف کچھ اور؟ مالکم کیف تحکمون!

ایک روایت کی طرح محدود جواز کے۔ لیکن امارت کے مسئلہ میں ان کا مذہب بالکل وہی تھا جو جمہور کا مذہب ہے، کہ عورت کو امیر مملکت بنانے کی اجازت نہیں۔ رہے امام مالک تو ان کی کسی اختلافی روایت کا معاملہ قاضی ابن العربی مالکی کی گفتگو کی روشنی میں سرے ہی سے مشکوک ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی روایت ہے اور فتح الباری کی نقل صحیح ہے تو اس نقل کا جو مطلب امام طبری کے بارے میں لیا جائے گا امام مالک کے بارے میں اس سے مختلف کسی طرح نہیں لیا جا سکتا۔ یعنی یہ کہ اختلافی روایت صرف قضا کے بارے میں ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کا معاملہ تو کسی گفتگو کا محتاج ہی نہیں، اُن کی حد تک تو فتح الباری کی ظاہر عبارت سے بھی یہ بات قطعی ہے کہ ان کی اختلافی روایت کا تعلق صرف قضا کے مسئلے سے ہے، وہاں امارت کے مسئلے کا وہم بھی نہیں ہو سکتا ـــــ اور زیر بحث مسئلہ امارت کا ہے نہ کہ قضا کا!۔

ہماری نظر میں کیا غالباً سبھی کی نظر میں، ان ائمہ کے حوالوں کی جو اہمیت ہو سکتی ہے وہ نہ حضرت تھانویؒ کے کسی حوالے کی، نہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کے، اور نہ مفتی مہدی حسن کے کسی فتوے کی۔ الحمد للہ کہ ان اکابر ائمہ کا دامن کسی ایسے قول کے صحیح انتساب سے بالکل صاف نکلا جس کا حوالہ عورت کو سربراہِ مملکت بنانے کے حامیوں نے دیا تھا۔ ایسی باتیں غلط فہمی سے ہو جائیں تو دوسری بات ہے اور غلط فہمی کی تھوڑی بہت گنجائش فتح الباری کی کتاب المغازی[1] والی عبارت کے لحاظ سے ہم بھی مانتے ہیں لیکن کتاب الفتن والی عبارت پر نظر رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی بات ان ائمہ کی طرف منسوب کر دینا کسی راست باز آدمی کا کام نہیں ہونا چاہیے اور یا پھر ایسے آدمی کو مان لینا چاہیے کہ وہ ان بلند پایہ کتابوں سے استفادہ کی اہلیت نہیں رکھتا! ـــــ یوں بھی ذرا سوچنے کی بات ہے کہ یہ ائمہ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی واضح انتباہی حدیث کے بعد کہ "وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہ ہوگی جو ایک عورت کو اپنی مملکت کا اقتدار سونپ دے!" اور اسی حدیث سے جمہور کے اس فیصلے کے بعد کہ عورت کو مسلمانوں کے درمیان سربراہِ مملکت بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، کیسے یہ جرأت کر سکتے تھے کہ بغیر کوئی مضبوط دلیل یا معقول اعتراض پیش کیے ہوئے جمہور کے اس فیصلے

---

[1] یعنی جلد ۸ ص۹۰ (مصری) یا جز ۱۸ ص۹۰ (ہندوستانی)

روگردانی کریں۔ ہاں یہ بات سمجھ میں آنے کی ہے کہ جمہور نے اسی حدیث سے قیاس و اجتہاد کے طور پر مسئلہ قضا کے بارے میں بھی یہی فیصلہ کیا ہو اور بعض ائمہ کے نزدیک یہ قیاس صحیح نہ ہوتا ہو۔ کیونکہ قیاس اور اجتہاد میں ہر امام دوسرے سے اختلاف کا حق رکھتا ہے۔ فتح الباری کی کتاب الفتن والی عبارت کے شروع کے الفاظ پر توجہ کیجئے تو بہت صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ قضا کے مسئلہ میں جمہور کا اس حدیث سے استدلال دلیل قیاسی کے طور پر ہی ہے اور اختلاف کرنے والوں کا اختلاف بھی اس قیاس ہی میں ہے۔ رہا مسئلہ امارت جس کی بنیاد نفس حدیث ہے وہ کہیں بحث میں ہے ہی نہیں۔ اس میں سب کے سر صادق و مصدوق علیہ السلام کی تنبیہ کے احترام میں ایک صف میں جھکے ہوئے ہیں۔ اور یہی ایمان کی شان ہے۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبدالغنی حسنی کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابیطس۔ اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے، چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر کم ہو جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ 3/5، پانچ تولہ -/2

شربت جذام۔ جذام میں یہ دوا بیحد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے کے بعد یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ -/5

شربت کند۔ یہ کی بیقراریوں کا درد، یرقان، ورم جگر، اقسام تپ حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے قیمت ایک پونڈ -/5

شربت درد گردہ پیشاب میں بھدی ریت آنا اور پتھری پیدا ہو جانا پارک رنگ کر پیشاب آنا یا درد کے دورہ اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجئے۔ جن کی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ -/5

مرہم سرخ۔ پھوڑوں، خصوصاً بیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے۔ اس کے استعمال سے جلن کافور ہو جاتی ہے اور پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے۔

منیجر حسنی فارمیسی، ۳۷، گوئن روڈ لکھنؤ



انسان ۔ جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی

از ۔ جناب وحید الدین خاں صاحب

جدید علمی اور تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ جس طرح ہم بے جان مادہ کے مطالعہ میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح ہم انسان کے متعلق حقائق کو دریافت نہیں کر سکتے۔ جامد مادے کے علوم اور حیاتیاتی علوم کے درمیان یہ فرق ہے کہ جامد مادہ ایک متعین قانون کا پابند ہے۔ جبکہ حیاتیاتی مظاہر گویا "ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں"۔ مادی مظاہر کے برعکس حیاتیاتی مظاہر کو جبر و مقابلہ کی مساواتوں میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مادی دنیا کا علم بھی اب تک صرف وصفی علم (Descriptive Science) کے مقام تک پہونچا ہے جو درحقیقت سائنس کی ایک ادنیٰ شکل ہے۔ کیوں کہ یہ علم چیزوں کی اصل نوعیت کو ہمارے اوپر بے نقاب نہیں کرتا بلکہ یہ اس کے چند ظاہری اوصاف مثلاً وزن اور مکانی ابعاد (SPATIAL DIMENSIONS) وغیرہ کو بیان کرتا ہے تاہم اس علم کی بدولت یہ ہوا ہے کہ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ آئندہ ہونے والے واقعات کے متعلق پیشن گوئی کر سکیں بلکہ اکثر حالات میں ان کے ٹھیک ٹھیک واقع ہونے کی تاریخ کا تعین کر سکیں۔ مادہ کی ترکیب اور اس کی خصوصیات جان لینے کے بعد ہم کو اپنی ذات کے علاوہ تقریباً ہر اس چیز پر قابو حاصل ہو گیا ہے جو زمین کی سطح پر موجود ہے۔ جانداروں کے علم نے بالعموم اور انسان کے علم نے بالخصوص اتنی زیادہ ترقی نہیں کی ہے، یہ علم اب تک صرف وصفی حالت میں ہے جبکہ ذی حیات اشیاء کی اصل حقیقت ان کا غیر وصفی ہونا ہے۔

یہاں میں الکسس کیرل کا اقتباس نقل کروں گا:

"انسان ایک انتہائی پیچیدہ اور ناقابل تقسیم کل ہے۔ کوئی چیز بھی آسانی کے ساتھ اس کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہم بیک وقت اس کی پوری ذات کو اس کے اجزاء اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اپنی ذات کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم کو مختلف فنی مہارتوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور اس طرح مختلف علوم سے کام لینا ہوتا ہے فطری طور پر یہ تمام علوم اپنے کسی عام مقصد کے متعلق کسی ایک متحدہ تصور پر نہیں پہونچتے۔ وہ انسان سے صرف انھیں چیزوں کی تجرید کرتے ہیں جو ان کے خاص طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہیں اور ان مجردات کو ایک دوسرے سے ملا بھی دیا جائے تو وہ ایک ٹھوس حقیقت سے بھی کم قیمتی ہوتے ہیں۔ ان مجردات کے بعد بھی ایک ایسی ذات باقی رہتی ہے جو بہت ہی اہم ہوتی ہے اور اسکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علم تشریح، کیمیا، نفسیات، تعلیمات، تاریخ، سماجیات، سیاسی اقتصادیات اپنے موضوع کو پورے طور پر ختم نہیں کرتے۔ وہ انسان، جس سے خصوصی ماہرین آشنا ہیں، حقیقی انسان سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں جو مختلف مفروضات پر مشتمل ہے اور جن کو ہر ایک علم کی فنی مہارتوں نے پیدا کیا ہے۔

انسان بیک وقت ایک لاش ہے جس کو تشریح کا عالم چیرا پھاڑتا ہے، وہ ایک شعور ہے جس کا ماہرین نفسیات اور بڑے بڑے روحانی اساتذہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ ایک شخصیت ہے جس کے اندر دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اسی کی ذات کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے، وہ کیمیائی مادہ بھی ہے جس سے جسم کی نسیجیں اور غلطیں بنتی ہیں، وہ غلیوں اور قنددیاتی رطوبتوں کا ایک حیرت انگیز گروہ ہے جن کے جسمانی قوانین کا مطالعہ ماہرین فعلیات کرتے ہیں، وہ نسیجوں اور شعور سے مرکب ہے جس کو حفظان صحت اور تعلیمات کے ماہرین، جبکہ وہ زمان کے اندر پھیل رہا ہو، امید افزا ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ایک گھریلو اقتصادیات کا حامل ہے جس کا کام پیدا کی ہوئی چیزوں کو استعمال کرتے رہنا ہے تاکہ مشینیں، جن کا وہ غلام بن گیا ہے، برابر کام کرتی رہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر، سورما اور ولی بھی ہے، وہ نہ صرف ایک انتہائی پیچیدہ ہستی ہے جس کا تجزیہ سائنس کی فنی مہارتوں کے ذریعہ کیا جا رہا ہے بلکہ وہ انسانیت کے رجحانات

قیاسات اور آرزوؤں کا مرکز ہو ..... بلاشبہ انسانیت نے اپنی حقیقت کو معلوم کرنے کی بڑی زبردست کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس تمام زمانوں کے سائنس دانوں فلسفیوں، شاعروں اور بڑے بڑے صوفیوں کے مشاہدات کا ایک انبار موجود ہے مگر ہم اپنی ذات کے صرف چند پہلوؤں کو دریافت کر سکے ہیں۔ ہم انسان کو اس کی کلی حیثیت میں بحیثیت کچھ نہیں سکے ہیں۔ ہم اس کو الگ الگ حصوں سے مرکب جانتے ہیں اور یہ حصے بھی ہمارے اپنے طریقوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایک خیالی پیکر ہے جس کے اندر سے ایک نامعلوم حقیقت جھانک رہی ہے۔

حقیقت میں ہماری ناواقفیت بہت گہری ہے۔ وہ لوگ جو انسانی ہستیوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اپنے آپ سے بہت سے ایسے سوالات کرتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہماری اندرونی دنیا کے وسیع علاقے اب تک نامعلوم ہیں۔ خلیے کے پیچیدہ اور عارضی اعضا کے بنانے کے لیے کس طرح کیمیائی مادوں کے سانچے باہم مل جاتے ہیں، نر و تازہ بیضہ کی نواۃ NUCLEUS کے اندر کے نسلی مادے کس طرح اس فرد کی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں جو اس بیضہ سے پیدا ہوتا ہے، کس طرح خلیے خود اپنی کوششوں سے نسیجوں اور اعضاء کے جیسے گروہوں میں منظم ہو جاتے ہیں۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ان خلیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہو کہ اپنے گروہ کو زندہ رکھنے میں انھیں کیا کام کرنا ہے۔ اور پھیلی ہوئی بناوٹوں کے ذریعہ وہ ایک ایسے نظام جسمانی کے بنانے کے قابل ہوتے ہیں جو سادہ اور پیچیدہ دونوں ہوتا ہے۔ ہماری مدت (DURATION) فعلیاتی وقت (PHYSIOLOGICAL TIME) اور نفسیاتی وقت (PSYCHOLOGICAL TIME) کی نوعیت کیا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم نسیجوں، اعضاء، رطوبتوں اور شعور سے مرکب ہیں۔ لیکن شعور اور دماغ کے درمیانی تعلقات اب تک ایک راز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کو اعصابی خلیوں کے فعلیات کا پورا پورا علم حاصل نہیں ارادی قوت کس حد تک نظام جسمانی میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ کس طرح دماغ اعضا کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، طرز زندگی، غذا کے کیمیائی مادوں، آب و ہوا اور فعلیاتی اور اخلاقی زبردستیوں کے ذریعہ کس طرح جسمانی اور دماغی خصوصیات میں، جو بطور وراثت ہر ایک فرد کو ملتی ہیں، تبدیلیاں

پیدا کی جا سکتی ہیں۔

ہم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ڈھانچہ، عضلات اور اعضا، اور دماغی اور روحانی سرگرمیوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہیں۔ ہم ان اسباب سے ناواقف ہیں جن کی بنا پر اعصابی توازن اور تکان اور بیماریوں کی مدافعت پیدا ہوتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اخلاقی احساس، قوت فیصلہ اور جرأت کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے۔ ذہنی، اخلاقی اور صوفیانہ سرگرمیوں کی اضافی اہمیت کیا ہے۔ جمالیاتی اور مذہبی احساس کی ضرورت کیا ہے، کس قسم کی قوت سے اشراقی تعلقات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض نفسیاتی اور دماغی اسباب خوشی یا تکلیف کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ اسباب کیا ہیں۔ ہم کسی فرد کے اندر مصنوعی طور پر خوشی کا چمک نہیں پیدا کر سکتے۔ اب تک ہم اس کو نہیں جان سکے کہ تمدن آدمی کی امید افزا ترقی کے لیے کس قسم کا ماحول زیادہ مناسب ہے۔ کیا ہماری نفسیاتی اور روحانی ساخت سے کشمکش، محنت اور تکلیف کو دور کرنا ممکن ہے، موجودہ تمدن میں ہم انسان کو زوال پذیر ہونے سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ ان باتوں کے متعلق، جو ہماری انتہائی دلچسپی کا باعث ہیں، بہت سے دوسرے سوالات کیے جا سکتے ہیں، ان کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ انسان کے متعلق تمام علوم کی مہارت بھی ناکافی ہے۔ اور یہ کہ اپنی ذات کے متعلق ہمارا علم اب تک ابتدائی حالت میں ہے۔"

MAN THE UNKNOWN P.P. 16-19

یہ اقتباس یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ "انسان" کا علم ابھی تک انسان کو حاصل نہیں ہوا انسانی وجود کے مادی حصہ کے بارے میں تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ انسان جو اس مادی وجود کو کنٹرول کرتا ہے اس سے ہم قطعاً لاعلم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زندگی اب تک ہمارے لیے ایک راز بنی ہوئی ہے اور جب تک یہ راز نہ کھلے زندگی کی صحیح تعمیر و تشکیل ممکن نہیں الکسس کیرل کی کتاب اسی "انسانِ نامعلوم" کو دریافت کرنے کی ایک سائنٹفک کوشش ہے۔ اس طرح کی کوششیں موجودہ زمانے میں بہت بڑے پیمانے پر جاری ہیں مگر اب تک کا نتیجہ صفر کے سوا اور کچھ نہیں۔

آج کا انسان ایٹم توڑ سکتا ہے۔ برفیلے علاقوں میں آبادیاں قائم کر سکتا ہے۔ وہ خلاء کے دوسرے سیاروں تک سفر کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح انسان نے مادی دنیا سے واقفیت حاصل کر لی ہے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو بھی جان سکتا ہے اور اپنے معاملات کو درست کر سکتا ہے مگر خود ہماری معلوم دنیا کے اندر اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ ہم جس طرح مادے کے اوصاف کو معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح ہم انسان کو سمجھ نہیں سکتے۔

جس وجود کو ہم "انسان" کہتے ہیں وہ پروٹوپلازم کے بنے ہوئے کروڑوں خلیوں پر مشتمل ایک جسم ہے۔ پروٹوپلازم کیا ہے؟ وہ غیر ذی روح اشیاء کا ننھا سا مرکب ہے جس کے اندر روح پذیری کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں میں وہ زندگی کی اکائی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ہم مادی دنیا کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہم پروٹوپلازم کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔

وہ سب کچھ جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ کچھ چیزوں کا مرکب ہی ہوتا ہے۔ اگر وسائل و ذرائع حاصل ہوں تو ہم اس طرح کے تمام مرکبات کو وجود میں لا سکتے ہیں اور اسے ختم بھی کر سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر جرمن فلسفی کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں کہا تھا ——— "مجھے مادہ مہیا کر دو اور میں تم کو بتا دوں گا کہ دنیا اس مادہ سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔" یا ہیکل (HAECKEL) نے دعویٰ کیا کہ "پانی کیمیائی اجزاء اور وقت ملے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کر سکتا ہے۔"

مثلاً پانی کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا ایک سالمہ (MOLECULE) آکسیجن کے ایک ایٹم اور ہائیڈروجن کے دو ایٹم سے مرکب ہوتا ہے۔ یہ بالکل ہمارے بس میں ہے کہ ہم ان گیسوں کو اسی تناسب سے ملا کر پانی کی شکل دیدیں۔ یا پانی کے سالموں کو توڑ کر دوبارہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تبدیل کر دیں۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سائنس نے وہ اجزاء معلوم کر لیے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مخصوص

تناسب بھی دریافت ہو چکے ہیں مگر انسان یہ نہیں کر سکتا کہ ان اجزاء کو اسی مخصوص ترتیب سے ملا کر زندگی پیدا کر دے۔ پروٹوپلازم کے اجزائے ترکیبی کے درمیان جو تناسب ہے، ٹھیک اسی تناسب سے ان اجزاء کو ملایا جاتا ہے۔ لیکن وہ پروٹوپلازم نہیں بنتا جو ذی روح ہو۔ حالاں کہ دوسرے کیمیاوی مرکبات ان کے اجزائے ترکیبی کو اسی نسبت سے ملانے پر بن جاتے ہیں۔ گویا ہم جس طرح مادی اشیاء میں تصرف کر کے مادی واقعات کو وجود میں لاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہم انسان کے اوپر تصرف کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہ انسان کے سلسلے میں ہماری پہلی عاجزی ہے جس کا اعتراف کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ دوسری اس سے بڑی چیز یہ کہ انسان کے سلسلے میں ہمارا تمام طبیعاتی مطالعہ انسانِ مردہ کا مطالعہ ہے، انسانِ زندہ کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہم اپنے اندر نہیں رکھتے۔ سائنس نے وہ اجزاء معلوم کر لیے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مخصوص تناسب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دریافت نہ ہو سکا کہ ان کے درمیان وہ کون سی مخصوص ترتیب ہے جس کے قائم رہنے سے پروٹوپلازم ذی روح بنا رہتا ہے اور جہاں یہ ترتیب بگڑی، ذی روح پروٹوپلازم غیر ذی روح ہو جاتا ہے۔ گویا اصل میں وہ مخصوص ترتیب ہی ہے جو پروٹوپلازم میں روح کی موجودگی کی ذمہ دار ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس مخصوص ترتیب کو باقی رکھتے ہوئے پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ پروٹوپلازم کا تجزیہ کرنے کے لیے لازمی طور پر اس کی کیمیاوی ترتیب کو توڑنا پڑتا ہے اور جوں ہی ہم ایسا کرتے ہیں اس کے اندر سے زندگی رخصت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ وہی وقت ہوتا ہے جبکہ پروٹوپلازم سے اس کی روح نکل چکی ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کیمیاوی تجزیہ کیا جا رہا ہو اور پروٹوپلازم میں روح موجود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک ایسا نہ ہوگا۔ یعنی روح کی موجودگی میں تجزیہ نہ کیا جائے گا، زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کے بارے میں سائنس ہمیشہ اندھیرے میں رہے گی۔

مگر ہماری مشکل یہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔

فرض کیجیے ایک شخص اپنے ذمہ یہ کام لیتا ہے کہ وہ انسانیت کی حقیقت معلوم کرے گا۔

اور انسان کو بتائے گا کہ زندگی کا قانون کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ انسانی آبادیوں سے اپنے مطالعہ کا آغاز کرتا ہے۔ لمبے عرصہ تک مختلف سماجوں کی چھان بین کرنے کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ سماج تو انسانوں کے مجموعے نام ہے۔ اس لیے جب تک ہم فرد کو سمجھ نہ لیں، جماعت کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اب وہ معاشرہ کو چھوڑ کر انسان کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے نفسیات کی طرف رُخ کرتا ہے، یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک فکر نہیں بلکہ اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور سب کے نتائج تحقیق الگ الگ ہیں۔ نفسیات کی ایک شاخ کا دعویٰ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا مرکز اس کا احساس ہے کسی کا کہنا ہے کہ انسان خارجی دنیا سے شعوری یا غیر شعوری طور پر جو تاثر قبول کرتا ہے، اس کا ہر کام اسی کا ردِ عمل ہے، کوئی جنسی خواہشات کو اس کے تمام اعمال کا محرک بتاتا ہے، کسی کا مطالعہ یہ ہے کہ اپنے آئیڈیل کو پالینے کا نامعلوم جذبہ انسان کو متحرک کیے ہوئے ہے۔ کوئی مکتب فکر شعور کو اصل قرار دیتا ہے اور اسی کی روشنی میں انسان کی پوری ہستی کی تشریح کرتا ہے اور کوئی اس بات کا قائل ہے کہ عقل اور ذہن کوئی چیز نہیں۔ انسان کے مختلف اعضاء کی عنان کسی ایک مرکزی قوت کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ انسان جس حصہ جسم پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس کی نشو و نما بہتر طریقہ سے ہو جاتی ہے اسی کے نتیجے میں کوئی اچھا رقاص بن جاتا ہے۔ کوئی اچھا مفکر، نفسیات کا یہ اختلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ بعض لوگ سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اس نام کا کوئی علم (SCIENCE) فی الواقع موجود ہے۔

خیالات کے اس جنگل کو دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ انسانی وجود کے دوسرے حصے حیاتیات کا مطالعہ کرے تاکہ دونوں کے نتائج کو ملا کر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ جب انسان کو وہ اس حیثیت سے دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ انسان، نظام ہضم، نظام تنفس، نظام دورانِ خون وغیرہ کا ایک مجموعہ ہے۔ ان نظاموں کی بنیاد چند کیمیاوی تبدیلیوں پر ہے جو کچھ کیمیاوی اشیاء اور ان کے آپس کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم کا سارا نظام کیمیاوی تحلیل (METOBOLISM) کا ہی ایک پیکر ہے۔

اب وہ غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ جب جسم انسانی کا وجود اور اس کا

نشو و نما کیمیاوی رد و بدل کا مرہون منت ہے۔ تو پہلے کیمیاوی تبدیلیوں کے اصولوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس کے بغیر ارتقاء کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی اظہار خیال نہ کیا جا سکے گی۔ اس لیے اب وہ کیمیا اور طبیعیات کا مطالعہ کرنے لگتا ہے اور اس میں ایک عمر کھپا دیتا ہے۔

کیمیا اور طبیعیات کا مطالعہ کرنے والے کیمیاوی اور ایٹم کے مطالعہ تک پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ ایٹم کے اجزائے ترکیبی ـــــ الکٹران اور پروٹان وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔ جس کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات برقی لہروں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس طرح مطالعہ کرتے کرتے بالآخر وہ جدید سائنس کے آخری شعبے ـــــ نیوکلر سائنس ـــــ میں داخل ہو جاتا ہے ـــــ اس طرح علوم کی تعلیم و تفریح کرنے کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہونچتا۔ اور جو شخص انسان کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کے لیے قانون وضع کرنے چلا تھا۔ وہ ایک ایسی [illegible] کے باوجود نظر نہیں آتی ڈاکٹر جوڈ (JOAD) کے الفاظ میں:۔

"جدید مادہ ایک ایسی بے حقیقت چیز ہے جو ہاتھ میں آ نہیں سکتی۔ یہ فاصلہ اور وقت کے مرکب کا ایک ابھار، برقی رو کا ایک جال۔ یا امکان کی ایک لہر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے خلا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے مادہ کے بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے۔"

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرتناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لیے ناقابل دریافت ہے۔ اب جس طرح ایک بیمار شخص کی یہ معذوری کہ وہ خود اپنا علاج نہیں کر سکتا۔ اس کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کو ایک ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔ اسی طرح نظام فطرت میں انسان کا ایک چیز کے لیے ضرورت مند ہونا اور پھر اس ضرورت کی تکمیل کے لیے کافی صلاحیت نہ رکھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کے لیے وہ اپنے اس رب کا محتاج ہے جس نے اسے موجودہ شکل میں بنایا ہے۔ جس طرح خدا نے اسے آکسیجن کا محتاج بنایا اور پھر آکسیجن بے حساب مقدار میں سارے کرۂ ارض کے گرد پھیلا دی۔ اسی طرح اس نے انسان کو زندگی کی حقیقت جاننے کا محتاج بنایا اور پھر اپنے نبیوں کے ذریعہ زندگی کی حقیقت واضح فرمائی۔

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
(فی کاپی - ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ ..... بارہ ...شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ شوال ۱۳۸۴ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ ۱۰

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اوّلیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	دعوتِ اصلاح	محمد منظور نعمانی	۶
۳	مخالفینِ مذہب کا استدلال	وحید الدین خاں صاحب	۱۶
۴	یہود کا تبرّی نامہ اور انجیل	مولانا عبدالماجد دریابادی	۲۴
۵	عورت کی سربراہی کی حمایت	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۳۸
۶	..... بنام مولانا مودودی	مولانا کوثر نیازی	۴۳

اگر اس دائرے میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۱ مارچ تک آ جائے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کبھی کسی صاحب کے نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ـــــــ عتیق الرحمن سنبھلی

ہم خدا کے اس معجزانہ کرم پر صمیم قلب سے شکر گزار ہیں کہ پاکستان کے صدارتی الیکشن کے سلسلے میں وہاں کی جماعت اسلامی اور اس کے قائدین کی جس روش کو ہم نے برصغیر (ہند و پاک) کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم دینی فتنہ جان کر اس کی خطرناکیوں کو اُجاگر کرنے کی ذمہ داری بہت سے مخلصوں اور محبوں کی ناگواری اور اپنی گرتی پڑتی صحت کے لیے اس کی ضرر رسانی کے قطعی اندیشوں کے باوجود اوڑھی تھی، اس کی صحت اور ضرورت پر گواہی دینے کے لیے خدا نے جماعت اسلامی پاکستان ہی کی صفوں سے ایک "رجل رشید" کو کھڑا کیا اور اس نے پورے بسط و تفصیل کے ساتھ دنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ جماعت اسلامی پاکستان کی یہ روش (جسکی حمایت و مدافعت کے گناہ میں اسکے قلم نے بھی پورا پورا حصہ لیا ہے) ایک جماعتی اور فروعی نوعیت کا مسئلہ نہیں، بلکہ پورے نظامِ دین کے لیے منکرینِ حدیث کے مسلک سے بھی زیادہ خطرناک "اور" دین کی پامالی کے لیے اذنِ عام" کا حکم رکھتی تھی۔ جسے محض سیاست کی خاطر اپنا کر ایک گمراہ کن دینی فلسفہ اس کے لیے تراش دیا گیا۔

یہ شہادت، ہفت روزہ شہاب (لاہور) کے مدیر جناب کوثر نیازی کی ہے جسے انھوں نے سب سے پہلے اپنے محترم امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں پیش کیا اور جب اس کا نتیجہ صرف مولانا کی برہمی کی شکل میں نکلا تو جماعت سے اپنے استعفے کے ساتھ انھوں نے اسے پبلک کے سامنے رکھ دیا۔

ایک طرف توفیق الٰہی کی دستگیری کا یہ منظر ہے کہ جن کو اعترافِ حق میں، جماعت کے ساتھ ساتھ خود اپنی رسوائی کا بھی پورا پورا خیال ہو سکتا تھا اُن کے اس خیال پر خدا کا خوف ہی

غالب ہو کر رہا اور جگ ہنسائی کا شیطانی وسوسہ بھی مواخذۂ آخرت کے یقین کی طاقت کے آگے اپنی نہیں چلا سکا۔ لیکن اسکے روبرو ایک دوسرا منظر یہ ہو کہ جن کا جماعت اسلامی پاکستان کی اس روش کی ذمہ داری سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جن کو اللہ نے اس گناہ میں شرکت کے ابتلاء کی کسی بھی مجبوری سے دور رہنے کا پورا پورا موقع فراہم کر رکھا تھا انھوں نے خالص عصبیت کے جذبے میں آکر نہ صرف اس غلط روش کی نہایت لچر اور حلق میں پھنسی پھنسی علمی مدافعت شروع کر دی، بلکہ ان میں سے بعض کی عصبیت تو یہاں تک زور مار گئی کہ علمی اور استدلالی گرفتوں کے کسی بھی جواب سے بے نیاز ہو کر نہ صرف طعن و طنز کے سہل یا بے جملے ناقدوں کی زبان بندی کے لیے آزمائے بلکہ ان کے باپ دادا تک کو کھلی کھلی گالیاں سنا دیں کہ اگر ایسے نہیں تو ایسے تو اس حرکت سے آئندہ کے لیے توبہ کر ہی لیں گے!

طعن و طنز کے یہ تیر ہم جیسے دوسرے دیوانوں کے بھی حصے میں آئے ہیں مگر گالیاں ہمارا نصیب خاص ہیں۔ ہم بھی پہلو میں دل رکھتے ہیں اور گالیاں نہ سہی طنز ہائے قلم کو بھی تھوڑا بہت آتا ہوا اور بالخصوص ایسی حالت میں تو یہ کچھ بھی مشکل نہیں جبکہ اصل مسئلہ پر ایک حرف بھی سامنے سے کہنے کے بجائے یہ ساری خاک ادھر اُدھر سے اُڑائی جا رہی ہو، بلکہ اپنی اس بشری کمزوری کا اظہار ہمیں کر لینے دیجئے کہ دو چار لفظ تو اس تہذیب گفتار پر کہنے کو جی چاہتا ہی تھا جن سے قلم کو باز رکھنے میں ہم بمشکل کامیاب ہو سکے ہیں۔ اور اس میں اگر کوئی خیر ہو تو اسکی جزا کا پہلا حصہ پروردگار ہماری طرف سے جناب کوثر نیازی کو عطا فرمائے کہ انھیں کی قلندرانہ بازگشت سے ہم نے اپنے آپ کو یہ سمجھایا کہ اگر ان کی جیسی مشکل پوزیشن میں بھی آدمی کو رجوع الی الحق کے لیے اس جرأت کی توفیق مل سکتی ہو تو کیوں نہ امید رکھی جائے کہ جن پر صرف عصبیت کا جادو ہو، اور کوئی مشکل راہ میں نہیں، وہ بھی کل کو ثر نیازی ہی کے نقش قدم پر نظر آئیں، آخر حق کے جادو کو کیوں عصبیت کے جادو سے کم اثر سمجھ لیا جائے؟ اور کیوں ایک کوثر نیازی کے سوا دوسروں پر اس مبارک بازگشت کی راہ کا بند ہونا طے کر لیا جائے؟ آج کوثر نیازی کہہ رہے ہیں کہ

"مجھے اس سے بیشتر آپکے (مولانا مودودی صاحب کے) نظریۂ حکمت عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں

ع۔ اگر کچھ لوگ ناراض ہو کر طنز و تعریض کی مشق نہ کریں تو ہم کوثر صاحب سے شکایت کریں گے کہ انھوں نے اس ذیل میں ہمیں کیوں بھلا دیا؟ اس میدان میں تو صداقت کے ساتھ گرفت کی سعادت ہمیں حاصل ہوا، ہم کسی طرح راضی نہیں ہیں کہ ان اکابر کے

اے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا، مگر صداقتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے نظریئے (یعنی حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم۔ ع) نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریۂ حکمت عملی انہی مضمرات کا حامل تو نہ تھا؟"

تو ہم کیوں نہ امید رکھیں کہ اس قبیلے میں سے اسی طرح "سوچنے لگنے" والے کچھ اور بھی اُٹھ کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور آج مولانا مودودی کے نظریات پر ہماری تنقید کے "پس منظر" میں آبائی مخالفت و تعصب کا گمان کر کے جو لوگ اس پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں وہ کل اپنے ضمیر سے ہم آہنگ پا کر برملا اس کی توثیق پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

پس اسی امید اور اسی خیال پر ہم یہ تمام تلخ گھونٹ گوارا کر کے اپنے ان دوستوں اور بزرگوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری تنقید اور اس کا "جوش و خروش" آبائی مخالفت ہی پر مبنی سہی، اور وہ ہماری نہیں سنتے نہ سُنیں مگر کوثر نیازی کی بات کے لیے تو اپنا دل کھولیں کہ وہاں تو اس بدگمانی کا کوئی موقع نہیں ہے! اور کچھ نہیں تو نیازی صاحب کے اس مکتوب عبرت کے بعد اتنا تو ہو ہی جانا چاہیے کہ مولانا مودودی پر تنقید کرنے والوں کو محض معاند اور نفس زدہ سمجھنے کے بجائے تھوڑے بہت دینی خلوص اور للّٰہیت کا امکان ان کے لیے بھی تسلیم کر لیا جائے۔

ہماری دلی آرزو ہے کہ یہ امید پوری ہو لیکن اگر خدا کا فیصلہ یہ نہیں ہے تو ہم مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے پُرجوش ہمدردوں سے یہ آخری بات کہہ دینا ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ بھی گمان کرتے ہوں ــــ اور ہم مدعی بھی نہیں ہیں کہ ہم نفس کے دعوے میں نہیں آسکتے ــــ مگر اپنی فہم اور اپنی دانست میں مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے خلاف ہمارا "جوش و خروش" صرف اس لیے ہے کہ اس برصغیر میں ہم انھیں ادھر چند برس کی ان کی مسلسل روش کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتنہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح آپ کو حق ہے کہ انھیں دینِ حق کے بہترین خادم سمجھنے کی بنا پر اُن کی حمایت کریں اسی طرح دوسروں کو بھی حق دیجیے کہ وہ اپنے ضمیر کی (صحیح یا غلط) آواز پر چلیں۔ البتہ ان کے وہ محبین جنھیں "ہندستانی جماعت اسلامی" کہنا چاہیے اُن کی توجہ اس حمایت کے مسئلے میں اس بات پر بھی ہونی چاہیے کہ وہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں جماعت اسلامی پاکستان کے معاملات

میں نہ گھسیٹا جائے، اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہم اس کو خود ضروری سمجھتے ہیں (بلکہ خود جماعت اسلامی ہند کی بھی کوئی بات قابل تنقید نظر آئے تو اس کے بارے میں بھی یہی فیصلہ کیے ہوئے ہیں کہ جب تک دینی ضرورت کا سوال نہ ہو اس سے کوئی مناقشہ نہ کیا جائے) لیکن یہ خواہش اس صورت میں سہاوے یا کسی کے لیے کس طرح قابل تعمیل رہ سکے گی جب آپ خود جماعت اسلامی پاکستان کے معاملات میں اپنی ٹانگ پھنسانے لگیں۔ اور یہ بھی محض علمی اور استدلالی حمایت کی حد تک نہ ہو بلکہ پوری حریفانہ جارحیت کا مظاہرہ مخالف تنقیدوں کے مقابلہ میں کیا جائے؟ آپ مختار ہیں کہ اگر اپنے لیے اسی کو صحیح اور ضروری سمجھیں تو کریں مگر پھر اس مصالحانہ خواہش سے دستبرداری کا اعلان ہونا چاہیے ــــ ورنہ یا تو اس خواہش کے اس منطقی تقاضے پر پورا پورا عمل ہو کہ آپ بھی ان معاملات سے اپنے کو بالکل علاحدہ رکھیں یا کم از کم اس حد تک تو نہ جائیں کہ دوسروں کے لیے اس خواہش کے احترام کا (جسے وہ خود بھی ضروری سمجھتے ہیں) کوئی راستہ ہی نہ رہ جائے۔

آخری بات، ہمیں یہ اور عرض کرنا ہے کہ اپنی تنقید پر جس جواب کا حوالہ ہم اوپر کے پیروں میں اشارۃً دیتے آئے ہیں، اور جو جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار بزرگ کے قلم سے ہے اس میں بسلسلۂ برہمی ہی ہم سے یہ فرمائش بھی کی گئی ہے کہ "جماعت اسلامی پاکستان پر تنقید کی ذمہ داری بھی اگر آپ اپنے اوپر سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر یہ ذمہ داری یہاں کی جماعت کے سلسلے میں آپ پر عاید ہوتی ہے پہلے اس کام کو کیجئے" (ملخصاً) اس مضمون کی جماعت کے سرکاری آرگن "دعوت" میں اشاعت سے اگرچہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس فرمائش کو جماعت کی سرکاری توثیق بھی حاصل ہے، مگر ہمارا دل اسے قبول نہیں کرتا اس لیے احتیاطاً ہم جماعت کی قیادت سے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کیا وہ بھی اسے پسند کرتے ہیں؟ ــــ اگر نہیں تو پھر ان صاحب کے بارے میں کچھ ارشاد ہو جنھیں مبارزت طلبی کے شوق میں موقع و محل سے بھی مطلب نہیں ہے! شبہ ہوتا ہے کہ شاید ؎

ان دنوں جوشِ جنوں ہے ترے دیوانے کو؟

دعوتِ اصلاح

(مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو اسی ماہ فروری میں ایک دینی اجتماع میں کی گئی)

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا ما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ علیہم وعلی کل من اتبعھم باحسان۔

دینی بھائیو، اور دوستو!

سب سے پہلے ہم آپ اللہ تعالیٰ کے اس کرم اور احسان کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہم کو ایک ایسے مقصد کے لئے دور دراز سے آکر یہاں جڑنے کی توفیق دی جو اللہ کی نگاہ میں دوسرے تمام مقاصد سے زیادہ عزیز اور قیمتی ہے ——— ہمارا یہ مجمع حاضرین کی کثرتِ تعداد کے لحاظ سے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا۔ آج کی دنیا میں اس سے بہت بڑی تعدادیں ہر منڈی اور ہر بازار میں انسانوں کی بھیڑ جوڑ رہتی ہے۔ کھیل تماشوں میں اور سنیما تھیٹر جیسے شیطانی اڈوں میں اس سے بھی بہت زیادہ تعدادیں لوگ جمع ہوتے ہیں ——— اسی طرح علم وفن اور دولت وثروت یا دنیوی وجاہت کے لحاظ سے بھی ہمارا یہ مجمع کوئی ممتاز مجمع نہیں ہے، بلکہ ظاہر بات ہے کہ اس حیثیت سے یہ بہت کم حیثیت مجمع ہے۔

لیکن اس اعتبار سے انشاء اللہ یہ دنیا کا ایک بہترین مجمع ہے کہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو صحیح کرنا اور اس کی رضا ورحمت حاصل کرنا ہے۔ ایسا مجمع اگر صرف پھٹے ٹوٹے غریبوں مسکینوں کا اور بالکل ناتعلیم یافتہ اور پسماندہ قسم کے بندگانِ خدا کا ہو جب بھی اللہ تعالیٰ کو وہ بہت عزیز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ اللہ کے فرشتے ایسے مجمعوں اور ایسی مجلسوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

الغرض سب سے پہلی بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آپ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی

عظمت کو سمجھیں کہ اس نے ہمارے دلوں کو اس طرف موڑا اور ہمیں اس بہترین مقصد کے لئے جمع ہونے کی توفیق دی۔ اگر اس کی طرف سے یہ توفیق نہ ملتی تو یقیناً ہم اس سعادت سے محروم رہتے۔ میں پھر اپنی اور آپ کی طرف سے قرآن کریم کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں۔

"الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ"

میرے محترم بھائیو!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مبعوث ہوئے اس وقت انسانوں کی اس دنیا میں اس زمانہ اور ماحول کے معیار کے مطابق سب کچھ تھا، ہاں اللہ پر ایمان اور اس سے صحیح تعلق رکھنے والے اور اس کی طرف بلانے والے بندے موجود نہیں تھے، ایسے بندوں کے وجود سے اس وقت یہ دنیا گویا خالی تھی اور اس وجہ سے گویا یہ پوری دنیا بحر ظلمات بنی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے مبعوث ہوئے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے آشنا اور وابستہ کریں اور زندگی کا صحیح طریقہ یعنی دین حق ان کو بتائیں ـــــ آپ جب نبی کی حیثیت سے اس دنیا میں کھڑے ہوئے اور دین حق یعنی زندگی کے صحیح طریقے کی آپ نے دعوت دینی شروع کی تو اس وقت تنہا آپ ہی اس دین اور اس زندگی کے حامل تھے۔ شروع میں آپ کی دعوت کو ایک ایک دو دو آدمیوں نے قبول کیا، اور اور ہدایت کا کام بہت سست رفتاری سے چلا۔ اسی حال میں قریباً تیرہ سال آپ مکہ معظمہ میں رہے۔ اس کے بعد اللہ کے حکم سے آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، وہاں کی زمین دین حق کی دعوت کے لئے زیادہ تیار اور سازگار تھی۔ تھوڑی ہی مدت میں وہاں کی قریب قریب پوری آبادی نے دین حق قبول کر لیا۔ اس وقت دنیا کے بحر ظلمات میں مدینہ طیبہ نور اور ہدایت کا گویا ایک جزیرہ اور مرکز تھا۔

آپ کی دعوت اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں مدینہ طیبہ کی قریب قریب پوری آبادی آپ کے رنگ میں رنگ گئی۔ اس وقت مدینہ طیبہ اس طرز زندگی کا پورا نمونہ تھا جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے، اور جو خود آپ کی زندگی تھی۔

اس زندگی کا اگر تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے چار بنیادی امتیازات تھے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تمام غیبی حقیقتوں

پر کامل یقین ایسا یقین جو اللہ سے اور ان حقیقتوں سے کبھی غافل نہ ہونے دے۔
دوسرے اس بات کا یقین کہ ہر قسم کی فلاح و سعادت اللہ اور رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ہے، اور اس بنا پر پوری اطاعت اور فرمانبرداری اور معصیتوں سے پرہیز۔
تیسری چیز دنیا کی ساری فکروں کے مقابلہ میں آخرت کی فکر کا غلبہ، اور اسکی وجہ سے تنہائیوں میں بھی اللہ کے حضور میں رونا۔
چوتھے اس بات کی فکر کہ یہ ایمان اور ایمان والی زندگی جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں اور جس کی توفیق ہم کو مل گئی ہے ساری دنیا میں پھیل جائے، اور سارے انسان اس سعادت کو اپنا کے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح کر لیں اور پھر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے مستحق ہو جائیں۔
یہ چار باتیں وہ تھیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ اور آپ کی دعوت اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں آپ کے عام صحابہ کرام فرق مراتب کے باوجود ان صفات اور امتیازات کے حامل تھے۔ گویا اسوقت مدینہ طیبہ ایک ایسی بستی تھی جسکے ہر شخص کا یہ حال تھا کہ اس کو اللہ کی ذات و صفات پر اور دوسری ایمانی حقیقتوں پر ایسا یقین تھا جو اس کی پوری زندگی پر حاوی تھا۔ آخرت کی فکر دوسری تمام فکروں پر غالب تھی جو ان کو رات کی اندھیریوں میں بھی رلاتی تھی، نفس کے تقاضوں کے مقابلہ میں اللہ و رسول کے احکام پر چلنا ان کا شعار تھا۔ عام انسانوں کی ہدایت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے صحیح ہونے کا مسئلہ ان کے نزدیک اپنے تمام دنیوی مسئلوں سے مقدم اور اہم تھا۔
یہ تھی وہ زندگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ اور اس زندگی کی حامل امت کا تیار کرنا آپ کا وہ خاص کام تھا جس کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تھا۔
اس زندگی کی دو خاصیتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحمت تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کی جو طاقت سرکشی اور استکبار کے ساتھ اس زندگی سے ٹکرائی اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور پھر اس زندگی کی حامل امت کے قدموں میں ڈال دیا۔ پہلے اللہ کی اس نصرت کا ظہور عرب میں ہوا اور فتح مکہ پر گویا اس کی تکمیل ہو گئی۔ بعد میں روم اور فارس کی حکومتوں کے ساتھ یہی

ہوا۔ اور یہ دونوں حکومتیں اس امت کے قدموں کے نیچے آگئیں ـــــ بہرحال ایک خصوصیت اس زندگی کی یہ تھی کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد تھی۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور قیامت تک کے لئے یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور گویا ازلی ابدی آسمانی منشور ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رسلنا والذین آمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد

یعنی ایمان اور ایمانی زندگی کے داعی اپنے رسولوں کی اور انکی راہ چلنے والے اہل ایمان کی ہم مدد اور حمایت کریں گے۔ اس دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت کے اُس دن بھی جب کہ خداوندی عدالت قائم ہوگی اور اس میں گواہ پیش ہوں گے)

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" (یعنی تمھارے دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلہ میں تم کو بالا اور برتر رکھا جائے گا، بشرطیکہ تم ایمان کی راہ پر قائم رہو گے)

دوسری خصوصیت اس ایمانی زندگی کی یہ ہے کہ اس میں اللہ نے ایک خاص کشش اور تاثیر بلکہ تسخیر کی طاقت رکھی ہے۔ جو شخص اس زندگی کو صحیح صورت میں دیکھے گا اور اس کا تجربہ کرے گا وہ اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ اور اس کا گرویدہ ہو جائے گا

صحابہ کرام جن ملکوں میں گئے۔ اور جن قوموں نے انھیں دیکھا اور ان کی مومنانہ اور خدا پرستانہ زندگی کا تجربہ و مشاہدہ کیا وہ اس کی گرویدہ ہوگئیں۔ اور بہت تھوڑی مدت میں وہ پورے ملک کے ملک دارالاسلام بن گئے۔ یہ شام، یہ عراق، یہ مصر، یہ ایران، یہ سب وہی تو ہیں جنھوں نے شروع میں اسلام کا سخت مقابلہ کیا تھا۔ اب سے کچھ دنوں پہلے تک فتوح الشام اور فتوح العجم اور فتوح المصر وغیرہ کتابیں مسلمانوں میں عام طور سے پڑھی جاتی تھیں۔ آپ میں سے بہت سوں نے یہ کتابیں پڑھی یا سُنی ہوں گی اور آپ کو یاد ہوگا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ سب ملک اور ان کے بسنے والے اسلام کے کیسے سخت دشمن تھے۔ لیکن ان ملکوں پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے کے بعد جب مسلمان ان ملکوں میں رہے بسے اور یہاں کے رہنے والوں نے ان کو دیکھا، برتا تو انھوں نے عام طور پر اُن کے دین اور ان کے طریق زندگی کو اپنا لیا۔

بہت سے لوگ ناواقفیت سے یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ ملک جب فتح ہوگئے تو یہاں کے لوگوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست کھا جانے کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا۔ ایسا سمجھنا تاریخ سے

نادانفی اور جہالت کے علاوہ حماقت بھی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ کے نتیجہ میں جو قوم غالب آجاتی ہے مغلوب اور مفتوح قوم کے دل میں اس کی نفرت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ شام و عراق اور ایران کے لوگوں نے مفتوح ہونے کے بعد فرق مملکت کہا جانے کی وجہ سے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر اسلام کو اختیار کیا ہو ـــــ اور دین کے بارہ میں جبر کرنا خود اسلام کے اصولوں کے خلاف تھا۔ قرآن مجید میں پوری صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ "لا اکراہ فی الدین" (دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا کوئی جواز نہیں) بلکہ قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی کہ جو آدمی اپنے کو مسلمان کہے اور اس کے دل نے پوری طرح اسلام کو قبول نہ کیا ہو وہ منافق ہے اور بدترین قسم کا کافر ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ صحابہ کرام لالچ اور زبردستی سے کس سے کلمہ پڑھواتے ـــــ

بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جو شہر یا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتا تھا اسلامی فوجیں اسکو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی تھیں اور وہاں امن وغیرہ قائم رکھنے کے لئے کوئی چھوٹا سا دستہ چھوڑ دیا جاتا تھا جس کی حیثیت پولیس کے دستہ کی ہوتی تھی۔ اور عوام کے باہمی جھگڑوں کے فیصلے کرنے اور اس طرح کی دوسری حکومتی خدمتیں انجام دینے کے لئے کسی کو شہر کا والی یعنی حاکم اور قاضی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ شہر سے باہر وہاں کے عوام سے الگ تھلگ اُس طرح نہیں رہا کرتے تھے جس طرح ہمارے ملک میں انگریزی دور حکومت میں انگریز حکام آبادیوں سے الگ رہا کرتے تھے، بلکہ یہ اپنے آپ کو عوام کی خدمت اور انکی دیکھ بھال کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے رابطہ رکھتے تھے اور عوام کے ہر طبقہ کے لوگ ان کی زندگی کو کھلی کتاب کی طرح دیکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فاتح قوموں کے سپاہی کیسے فرعون اور بداطوار ہوتے ہیں لیکن وہ ان مسلمانوں کو دیکھتے تھے کہ ان میں کا ہر شخص راہبوں اور درویشوں سے زیادہ پاکباز اور خداترس ہے۔ اسی کے ساتھ یہ مسلمان انتہائی دلسوزی اور سچی دردمندی کیساتھ ان کو دعوت دیتے تھے کہ وہ ایمانی زندگی کے اس طریقہ کو اپنالیں جو اللہ کے سارے پیغمبر لے کر آئے تھے اور سب سے آخر میں مکمل شکل میں اس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور اس طرح خدا سے براہ راست اپنا رشتہ جوڑ کے اُس کی رحمت اور جنت کے مستحق ہو جائیں ـــــ ان مسلمانوں کا حال اور ان کی زندگی اس کی گواہی دیتی تھی کہ یہ سچے اور مخلص بندے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں

بالکل سچائی اور دردمندی سے کہہ رہے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اکا دکا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اس طرح علاقے کے علاقے اور قومیں کی قومیں اسلام میں داخل ہوتی تھیں اور "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کا منظر سامنے آتا تھا۔ یہ سب ملک بہت تھوڑی مدت میں دار الکفر سے دار الاسلام بنے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً ۹۰ برس کے بعد جبکہ صحابہ کا نہیں بلکہ انکے فیضیافتہ تابعین کا زمانہ تھا خلیفۂ راشد حضرت عمر ابن عبد العزیز کی خلافت کے دور میں افریقہ کے ایک علاقہ کے عام لوگوں نے اسلام کو اس طرح قبول کیا کہ وہاں کے مسلمان حاکم کو اس میں شبہ ہوا کہ یہ لوگ واقعۃً دل کی رغبت اور شرح کے صدر کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں یا حکومت کا مذہب ہونے کی وجہ سے دنیوی نفع اٹھانے کے لئے اپنے اسلام کا اعلان کر رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے حضرت عمر ابن عبد العزیز کو لکھا کہ اس علاقہ کے سارے لوگ بڑی تیز رفتاری سے اسلام قبول کر رہے ہیں اور حکومتی کاروبار پر اس کا خاص اثر یہ پڑے گا کہ جزیہ کے مد کی آمدنی بالکل ختم ہو جائیگی اس لئے یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو تو یہ قانون بنا دیا جائے کہ سرکاری طور پر صرف انہی لوگوں کو مسلمان تسلیم کیا جائے گا جو فلاں فلاں طریقوں سے اپنا سچا اور مخلص مسلمان ہونا ثابت کر دیں۔

حضرت عمر ابن عبد العزیز نے اس کا جو جواب دیا تھا وہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے اپنے اس جواب میں انھوں نے اسلام اور اسلامی حکومت کا نصب العین کتنے محکم اور اچھے انداز میں واضح کیا ہے۔ انھوں نے افریقہ کے اپنے اس والی یعنی گورنر کو اس کے خط کے جواب میں لکھا

ویحک، ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم انما بعثہا داعیاً ولم یبعث جابیاً"

اس مختصر سے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمھارا برا ہو، تمھارے سوچنے کا ڈھنگ کتنا غلط ہے تمھیں معلوم ہونا چاہیئے ہمارا کام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو پورا کرنا ہے، اور آپؐ ہدایت کا اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے کا مشن لے کر آئے تھے ٹیکس وصول کر کے خزانے بھرنے نہیں آئے تھے، اس لئے اگر اللہ کے بندے اللہ کا دین قبول کر رہے ہیں تو شکر ادا کرو اور خوش آمدید کہو، ٹیکس اور جزیہ کی اور حکومت کے مالیہ کی کوئی فکر نہ کرو۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تابعین کے زمانہ تک جبکہ مسلمانوں میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی غالب تھی اور عام طور سے لوگ اس کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے تو اللہ کے بندوں کے دل کس طرح ان کی طرف کھنچتے تھے اور وہ اسلام کے کیسے گرویدہ ہوتے تھے ــــ

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو زندگی لے کر آئے اور جس کی آپ دعوت دیتے تھے اور جو صحابہ کرام نے آپ سے حاصل کی تھی ــــ اور اسی زندگی کا نام دراصل اسلام ہے ــــ اس کی دو خاصیتیں تھیں ایک یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت تھی اور غیبی لشکروں سے اس کی مدد کی جاتی تھی۔ اور دوسری یہ کہ انسانی قلوب اور انسانی فطرت کے لئے اس میں کشش تھی، اور سخت سے سخت دشمن بھی تعصب سے خالی ہو کر جب اسکو دیکھتے تھے تو اس کے گرویدہ ہو کر اس کو اپنانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ خاصیتیں اسلام کے نام میں نہیں تھیں بلکہ اُس زندگی میں تھیں جس کا نام اسلام تھا جس طرح شکر کی مٹھاس شکر کے نام میں نہیں ہے بلکہ اُس چیز میں ہے جس کا نام شکر ہے۔

میرے دینی بھائیو! ــــ جس طرح پانی کی ٹھنڈک اور آگ کی گرمی اور سورج کی روشنی دائمی خاصیتیں ہیں اسی طرح اسلام کی یہ دونوں خاصیتیں بھی دائمی اور ابدی خاصیتیں ہیں لیکن یہ اجتماعی اسلام کی خاصیتیں ہیں جب دنیا میں کوئی امت اسلام کی حامل ہوگی تو یقیناً اس کے ساتھ اللہ کی نصرت و حمایت ہوگی اور اس کے مسائل و مشکلات میں غیب سے اُس کی مدد کیجائے گی۔ اور دنیا کی جو قومیں اس امت کو دیکھیں اور برتیں گی وہ یقیناً اس کی گرویدہ اور معتقد ہوں گی۔

آج صورت یہ ہے کہ مسلمان کہلانے والی امت دنیا میں بہت بڑی تعداد میں موجود ہے، ابھی اسی ہفتہ میں نے بعض اخبارات میں پڑھا ہے کہ اسوقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۶۳ کروڑ تک معلوم ہو چکی ہے۔ ۶۳ کروڑ بولنے اور لکھنے میں تو کوئی بہت بڑا ہندسہ نہیں ہے لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی تعداد ہے صحابہ کرام کے کبھی تصور میں بھی نہ ہوگا کہ کسی وقت مسلمان دنیا میں ۶۳ کروڑ ہوں گے لیکن حالت یہ ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی وزن نہیں۔ میں یہ بات ہندوستان ہی کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں جہاں ہم اقلیت میں ہیں، اور حکومتی اقتدار ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ میں ان سب ملکوں کو بھی سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں جو آج اسلامی ممالک کہلاتے ہیں اور جن میں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی میزان میں آج ان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کو امریکہ یا روس کی سرپرستی اور امداد

کی ضرورت ہے۔ یہ خدا کی نصرت و حمایت سے محرومی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ ۶۳ کروڑ کی تعداد میں مسلمان کہلانے والے تو موجود ہیں لیکن دنیا میں ایسی امت موجود نہیں ہے جس کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی ہو۔ بیشک اس گئی گزری حالت میں بھی صحیح اسلامی زندگی کے حامل افراد موجود ہیں۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ یقیناً وہ سب کچھ عطا فرمائے گا جو نیک صالح افراد کے لئے اللہ کا وعدہ ہے۔ لیکن اسلامی زندگی کی جن خاصیتوں کا میں نے ذکر کیا وہ انفرادی زندگی کی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی خاصیتیں ہیں۔

اب ہمارے آپ کے اور سب مسلمانوں کیلئے دو راستے ہیں ایک یہ کہ جس روش پر ہم چل رہے ہیں اسی پر چلتے رہیں، اور اس کے نتیجہ میں اللہ سے اور اس کے دین سے اور زیادہ دور ہوتے چلے جائیں۔ اور پھر خدانہ کردہ ہمارا وہ حشر ہو جو قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا بیان کیا گیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی نعمت سے نوازا اور دنیا میں بھی عزت اور سربلندی عطا فرمائی۔ لیکن جب انھوں نے اپنے نبیوں کا راستہ چھوڑ کر نفس پرستی اور خدا فراموشی کا طریقہ اختیار کیا تو اللہ نے اپنی دی ہوئی ساری نعمتیں ان سے چھین لیں۔ اور پھر اس حد تک اُن پر اللہ کا غضب نازل ہوا کہ ان میں سے بہت سوں کو بندروں اور سوؤروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "وجعل منھم القرود والخنازیر وعبد الطاغوت"

اور سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے نافرمانی اور خدا فراموشی کا طریقہ اختیار کیا اور وہ اس میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انکے نہایت بے رحم اور جلاد صفت دشمنوں کو ان پر مسلط کیا، پھر انھوں نے بنی اسرائیل کو بری طرح پیسا جس کی تفصیل بنی اسرائیل کی تاریخ میں اتنی رلزہ خیز بیان کی گئی ہے کہ آج بھی اُسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرے بھائیو! خدا کا کسی قوم سے اور کسی نسل سے رشتہ نہیں ہے، اس کا قانون بڑا بے لاگ ہے۔ نوح علیہ السلام اس کے پیغمبر تھے، لیکن ان کے بیٹے نے جب کفر کی راہ اختیار کی تو اسوقت کے دوسرے کافروں کے ساتھ وہ بھی خدا کے غضب کا شکار ہوا۔ اور جب نوح علیہ السلام نے ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کے حق میں کچھ عرض کیا تو بڑے جلال کے ساتھ

اُن سے فرمایا گیا " اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ، اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ، فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ "

یعنی تمہارا بیٹا بد کار ہے اس لئے وہ ہمارے قانون کے مطابق تمہارے لوگوں میں نہیں ہے، ہم تمھیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانی کی بات نہ کرو۔

میرے بھائیو اور دوستو! سوچو اور سمجھو! یہ ہے اللہ کی شان اور یہ ہے اس کا جلال! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اللہ کا قانون بڑا بے لاگ ہے۔ ہمیں ڈرنا چاہیے اگر مسلمان قوم یا اس کی غالب اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی سے اسی طرح دور ہوتی گئی جس طرح بنی اسرائیل اپنے پیغمبروں کی لائی ہوئی زندگی سے دور ہوتے چلے گئے تھے تو ہمارا بھی وہی انجام نہ ہو جو بنی اسرائیل کا ہو چکا ہے۔

میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ ہم مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم اپنی دینی اصلاح کی فکر نہ کریں، اور زندگی کی گاڑی جس طرح چل رہی ہے اسکو اسی طرح چلنے دیں، اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں آپ سے صاف صاف کہہ چکا۔ اور میرا کہنا یا نہ کہنا کیا چیز ہے۔ اپنے اس طرز عمل کا نتیجہ تو ہم صدیوں سے بھگت رہے ہیں۔

اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کی فکر کریں، اللہ کی طرف پلٹیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی زندگی کو اپنی زندگی بنائیں اور اسکو امت کی اجتماعی زندگی بنانے کی فکر و کوشش کریں، پھر دنیا اور آخرت میں اللہ کی نصرت و رحمت کے مستحق بنیں، اور پھر " يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا " کا منظر قائم ہو۔

شیطان کا یہ بہت بڑا فریب ہے کہ جب یہ بات سامنے آتی ہے تو وہ ہمارے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ تو اس زمانہ میں ناممکن ہے حالانکہ یہ محض اس دشمن خدا کا فریب ہے۔ آپ خدارا سوچیے کیوں ناممکن ہو کیا خدا کی ذات و صفات اور دوسری ایمانیات پر یقین حاصل ہونا ناممکن ہو کیا آنحضرت کی فکر کا دنیا کی دوسری فکروں پر غالب ہونا ناممکن ہو؟ کیا خدا کے حکموں پر چلنا اور گناہوں سے بچنا ناممکن ہو؟ کیا ان باتوں کو اللہ کے دوسرے بندوں میں عام کرنے کی کوشش کرنا ناممکن ہو؟ ۔ کیا انسانوں میں ان اچھی باتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں رہی؟ پیغمبروں کے لائے ہوئے راستہ پر چلنا کیا اب قانوناً جرم ہو گیا ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ صرف شیطان کا اور اپنے نفس کا فریب ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اس بارہ میں اپنے ذہنوں کو صاف کریں۔ اور جس طرح اپنے دینوی کاموں کے سلسلہ میں عزم کے ساتھ فیصلہ کر کے کام شروع کر دیتے ہیں اسی طرح اپنی پچھلی کوتاہیوں سے اللہ کے حضور میں توبہ اور استغفار کر کے آئندہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ بیعت کی تجدید کریں اور آپ کے طریقہ پر چلنے اور اسی پر چلتے ہوئے جینے اور مرنے کا عہد کریں یا ایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحاً عسی ربکم ان یکفر عنکم سیئاتکم ویدخلکم جنٰت تجری من تحتھا الانھار یوم لا یخزی اللہ النبی والذین اٰمنوا معہ نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا انک علی کل شیئ قدیر۔

الفرقان کی ملکیت اور دیگر تفصیلات

اخباروں کے رجسٹریشن (مرکزی) قواعد ۱۹۵۶ء کے قاعدہ نمبر ۸ فارم نمبر ۴ کے مطابق حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کا مطلوبہ بیان

۱۔ مقام اشاعت ... ... لکھنؤ

۲۔ وقفۂ اشاعت ... ... ماہانہ

۳۔ پرنٹر و پبلشر اڈیٹر اور مالک کا نام ..... محمد منظور نعمانی

۴۔ قومیت ... ... ہندوستانی

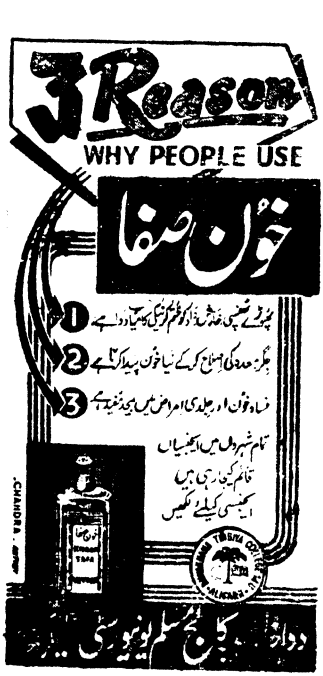
۵۔ پتہ ..... کچہری روڈ لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ یہ بیان میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہے۔

محمد منظور نعمانی

پبلشر

(یکم مارچ ۱۹۶۵ء)



مخالفین مذہب کا استدلال

از ——— جناب سید الدین خاں صاحب

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے اسی طرح پچھلی صدیوں میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (KNOWLEDGE EXPLOSION) ہے جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں[1]"۔ یہ جولین ہکسلے کے الفاظ ہیں۔ جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ وہ انسان کی صرف اس خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہ کرنا چاہتا ہے۔ توجیہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذات خود غلط نہیں ہے۔ مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات تک پہونچا دیا جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے، اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ اسی طرح توجیہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی انتہائی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

اس طریق فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہ ہے، پہلے زمانے میں انسان کا علم چونکہ بہت محدود تھا اس لیے واقعات کی صحیح توجیہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کر لیے مگر ارتقاء کے عالم گیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ

---

[1] ہندستان ٹائمس، سنڈے میگزین، ۲۴ ستمبر ۱۹۶۱ء

ممکن ہو گیا ہے کہ اٹکل پچو عقائد پر ایمان رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیاء کی حقیقت معلوم کی جائے۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کر لی گئی ہے۔ جدید طریق مطالعہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کی کوئی واقعی دریافت نہیں تھی۔ بلکہ یہ محض دور لاعلمی کے قیاسات تھے جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔ جولین ہکسلے لکھتا ہے:

"نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو۔ لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ شمسی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے۔ اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔"

RELIGION WITHOUT REVELATION

N. Y. 1958 P. 58.

طبیعاتی دنیا میں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابل تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کر رہے ہیں۔ بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانون فطرت (LAW OF NATURE) کا نام دیا گیا۔ اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر یہ تصور ختم ہو جاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی ذی شعور اور قادر خدا ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہو سکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتداءً کائنات کو حرکت دی ہو۔ چنانچہ شروع میں لوگ محرک اول کے طور پر خدا کو مانتے رہے۔ والٹیر نے کہا کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا ہے جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کر کے انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے اور اس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس کے

بعد ہیوم نے اس "بے جان اور بے کار خدا" کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے دیکھی ہیں لیکن دنیائیں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں۔ اس لیے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا۔ واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ واقعہ کیوں ہوا۔ وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آجانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے۔ مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور کیسے ڈوبتا ہے۔ اس لیے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے جو سورج کو نکالتا ہے اور اس کو غروب کرتا ہے اس طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا۔ اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے۔ مگر اب جبکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہو گئی جس کے لیے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ "اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے"۔ ——— کیلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

IF EVENTS ARE DUE TO NATURAL CAUSES, THEY ARE NOT DUE TO SUPER NATURAL CAUSES.

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے

پیدا کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

اب اس دلیل کو لیجیے جو طبیعاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں وہ ایک متعین قانون فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان کی توجیہہ کرنے کے لیے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہہ کے لیے موجود ہیں۔ اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا۔ اس نے کہا:

NATURE IS A FACT, NOT AN EXPLANATION.

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے۔ تمہارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لیے ہیں مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے وہ اس مسئلے کا جواب نہیں ہے جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا ہے۔ مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں۔ جبکہ تمہاری دریافت صرف اس مسئلہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے۔ جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہہ۔ سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیا ہے۔" یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیوں ہے" جبکہ توجیہہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے۔ اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے۔ پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ "خدا ایسا کرتا ہے۔" مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا

ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں۔ مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا۔ اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ "سینگ" کے اوپر جا کر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا" واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے۔ واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ بچہ کی چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگالیں جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لیے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین وقت پر ٹھیک ۲۱ روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہو جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے۔ گویا پہلے یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے"۔ اور اب سوال یہ ہو گیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت کی توجیہہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات CECIL BOYCE HAMANN کے الفاظ نقل کروں گا:۔

"غذا ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی۔ آخر وہ کون طاقت ہے جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردعمل ظاہر کریں۔ غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا

ہے جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE P. 221.

اس سے آپ جدید دریافتوں کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے اور جن کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے۔ مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہہ نہیں ہیں۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے۔ وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعویٰ کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکا ہے۔ یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے۔ یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے۔ یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا:۔

Nature does not explain, she is herself in need of an explanation.

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے، تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے سرخ اجزاء ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

"درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں۔"

"ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے جس کا نام ہیموگلوبن (Haemoglobin)

ہے۔ یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آئے۔"

"وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے۔ مگر مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرات، تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کُل کے اندر باہم مربوط ہیں اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں۔"

"یہ قدرت کا قانون ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانونِ قدرت کہتے ہیں۔"

"اس سے مراد ہے ـــــ Blind interplay of Physical and chemical forces ـــ (طبیعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل)۔

"مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت عمل کرتی ہیں جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے۔ کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے۔ ایک مچھلی تیر سکے، ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔"

"میرے دوست، مجھ سے یہ نہ پوچھو۔ سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے، اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔"

یہ سوال و جواب واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے۔ بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں۔ مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں، کھربوں گنا بڑھ جائیں، جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی۔ کیونکہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں اور ان کا آخری سبب کیا ہے۔ اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے۔ یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں جبکہ مذہب کی جگہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کرے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی

ہے۔ اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے۔ اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں۔ مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا۔ کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔ ہیریس (A. Harris) نے یہی بات کہی تھی جب اس نے ڈارون ازم پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

Natural selection may explain The Survival of The fittest, but can not explain The arrival of The fittest.

REVOLT AGAINST REASON by A. LUNN. P. 133

یعنی انتخاب طبیعی کے قانون کا حوالہ صرف زندگی کے بہتر مظاہر باقی رہنے کی توجیہہ کرتا ہے وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

چند نئی کتابیں

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور انکی تعلیمات — قیمت دس روپے

مخدوم جہانیاں جہاں گشت — قیمت ۷/-

حیات امداد حضرت حاجی امداد اللہؒ — قیمت ۴/۶۲

حیات امام ابو حنیفہؒ — قیمت ۱۵/-

انتخاب مکتوبات امام ربانی — قیمت ۳/-

آیات بینات کامل — قیمت ۱۹/-

محصول بذمہ خریداران کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

یہود کا تبری نامہ
اور انجیل

(از افادات مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

ایک عالمی نیوز ایجنسی کی اس خبر نے چند ہفتے ہوئے اُن تمام لوگوں کو چونکا دیا، جو تاریخ مسیحیت سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں کہ حکومت اسرائیل کے توسط سے نائب المسیح جناب پوپ کی خدمت میں قوم یہود کی طرف سے ایک تبری نامہ اس مضمون کا پیش ہوا کہ ہماری قوم کی کوئی بھی ذمہ داری مصلوبیت مسیح میں نہیں، پوپ صاحب نے اس عذرنامے کو قبول کر لیا اور اعلان کر دیا کہ قوم یہود اس جرم تصلیب مسیح سے بری الذمہ ہے ——— خبر میں اس سے زیادہ کوئی تفصیل درج نہ تھی، نہ اور کسی ذریعہ سے اب تک یہ علم ہو سکا کہ قوم یہود نے اپنی تبری پر کون سی شہادتیں پیش کیں اور پوپ صاحب نے بائبل کی مسلّم اور مستند شہادت کے مقابلے میں انھیں کیسے قبول کر لیا!

قرآن مجید سے قطع نظر، جس نے صاف یہود کی زبان سے یہ قول فخر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ	ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو ختم کر دیا۔

واقعہ جس صراحت و وضاحت اور جس تکرار کے ساتھ انجیلوں میں درج چلا آتا ہے اور آج تک مسیحوں میں کسی سے اس کا انکار منقول نہیں۔ ان کے بعد یہ نئی تبری بہت ہی عجیب و غریب ہے ——— لیکن قبل اس کے کہ وہ صراحتیں ملاحظہ ہوں، پہلے نفس واقعہ کو سمجھ

لینے کی ضرورت ہے۔

واقعہ ملک فلسطین کا ہے۔ شہر یروشلم اسی میں واقع ہے جس زمانہ کا (سنہ ۲۰ عیسوی) کا واقعہ ہے۔ ملک کی آبادی اگرچہ یہود کی تھی۔ جو نسلاً بنی اسرائیل تھے لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ حاکم اعلا بھی رومی حکومت تھی لیکن اس کی ماتحتی میں یہود کو بھی آزادی و خود مختاری ایک محدود درجہ میں حاصل تھی۔ یہود کے مقتدر خود انھیں کی عدالتوں میں پیش ہوتے۔ اور ان کی عدالتیں مذہبی عدالتیں تھیں۔ یہ فیصلے فقہا یہود صادر کرتے۔ پھر اگر جرم فوجداری قانون کا ہوتا تو وہی مقدمہ دوبارہ رومیوں کی ملکی عدالت میں پیش ہوتا اور فوجداری کے جرائم میں سزا کے نفاذ کا حق صرف انھیں ملکی عدالتوں کو تھا۔ حضرت مسیح پر مقدمہ قدرۃً پہلے یہود یا اسرائیل کی اپنی عدالت میں پیش ہوا اور آپ پر فرد جرم توہین مذہب یا الحاد و زندقہ کی لگی جس کی سزا دینی عدالت میں موت تھی۔ لیکن اس کا نفاذ بغیر ملکی عدالت سے رجوع کیے ہو نہیں سکتا۔ اس لیے یہود اپنی عدالت میں آپ کو سزائے موت کا حکم سنا کر پھر آپ کا مقدمہ ملکی عدالت میں لائے۔

انجیل کے بیان کے مطابق خود حضرت مسیح کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ انھیں اسرائیلی سرداروں اور فقیہوں کے ہاتھ بہت دکھ جھیلنے ہوں گے! اور بالآخر وہ قتل ہوں گے۔ انجیل متی میں ہے:۔

"اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں"

(۲۱:۱۶)

اور انجیل مرقس میں ہے:۔

"پھر وہ انھیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے۔" (۸:۳۱)

اور پھر انجیل متی میں ہے:۔

"اور یسوع یروشلم جانے میں بارہ شاگردوں کو الگ لے گیا اور راہ میں ان سے یہ کہا، دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں۔ اور ابن آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کو حوالے کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے تاکہ وہ اسے ٹھٹھوں میں

اڑائیں اور کوڑے ماریں اور صلیب پر چڑھائیں۔" (۱۰: ۱۸-۱۹)

اور یہی مضمون انجیل مرقس میں بھی دہرایا گیا ہے:۔

"پس اس نے پھر ان بارہ کو ساتھ لے کر ان سے وہ باتیں کہنی شروع کیں جو ان پر واقع ہونے والی تھیں کہ دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں اور ابن آدم سردار کاہنوں فقیہوں کے حوالے کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے۔ اور وہ اسے ٹھٹھوں میں اڑائیں گے۔ اور اس پر تھوکیں گے۔ اور اسے کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے۔"

(۱۰: ۳۳: ۳۴)

تطویل بیان کے باوجود تیسری عبارت انجیل لوقا کی بھی پڑھ لیجئے:۔

"پھر اس نے ان بارہ کو ساتھ لے کر ان سے کہا کہ دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں اور جتنی باتیں نبیوں کی معرفت لکھی گئی ہیں۔ ابن آدم کے حق میں پوری ہوں گی۔ کیونکہ وہ غیر قوم والوں کے حوالہ کیا جائے گا۔ اور لوگ اس کو ٹھٹھے میں اڑائیں گے۔ اور بے عزت کریں گے اور اس پر تھوکیں گے اور اس کو کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے۔" (۱۸: ۲۱-۲۳)

غیر قوم والوں سے مراد ان سارے حوالوں میں ظاہر ہے کہ رومی حاکم ہیں۔ یہ سب تصریح در تصریح ہے۔ آپ کی اس الہامی پیش خبری کی کہ آپ کو اصلاً دکھ اپنے ہی ہم قوموں سے پہونچے گا۔ اور وہی بالآخر آپ کو رومیوں کے حوالے کر کے ان سے سزائے موت آپ کو دلائیں گے۔

آپ نے اسی دوران میں اپنے معاصر و مخاطب یہودیوں پر پوری ذمہ داری اور وہ بھی سخت لفظوں میں پہلے پیمبروں کے بھی خون ناحق کی ڈالی۔ صرف ایک نمونہ انجیل متی سے ملاحظہ ہو

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے۔ یہ کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے۔ اس لیے دیکھو میں نبیوں اور دانا وں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے۔ اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب

راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا۔ تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس قربان گاہ میں قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔" (۲۳: ۲۹-۳۶)

روایتی مصلوبیت کی بابت تو بڑے ہی واضح لفظوں میں آگاہی مسیح کے کلام میں موجود ہے۔ بلکہ انجیل متی میں یہ تصریح بھی ہے کہ یہود کے دو بڑے لیڈر تو اسی وقت قتل مسیح کی تیاری کرنے لگے تھے:۔

"اور جب یسوع یہ سب باتیں ختم کر چکا، تو ایسا ہوا کہ اس نے اپنے شاگردوں سے کہا تم جانتے ہو کہ دو دن کے بعد عید فسح ہوگی اور ابن آدم مصلوب ہونے کو پکڑوایا جائے گا۔ اس وقت سردار کاہن اور قوم کے بزرگ کائفا نام سردار کاہن کے دیوان خانے میں جمع ہوئے اور صلاح کی کہ یسوع کو فریب سے پکڑ کر قتل کریں۔ مگر کہتے تھے کہ عید کو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوہ ہو جائے۔" (۲۶: ۱-۵)

مرقس اور لوقا اور یوحنا باقی تینوں انجیلوں میں یہ واقعہ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ درج ہے۔ مرقس میں ہے:۔

"دو دن بعد فسح اور عید خمیر ہونے والی تھی۔ اور سردار کاہن اور فقیہہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کے قتل کریں۔ کیوں کہ کہتے تھے کہ عید کو نہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوا ہو جائے۔" (۱۴: ۱-۲)

لوقا کی سنیئے:۔

"اور عید فطیر جس کو عید فسح کہتے ہیں۔ نزدیک تھی اور سردار کاہن اور فقیہہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے مار ڈالیں۔ کیونکہ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ (۲۲: ۱-۲)

اور یوحنا کا بیان ہے:۔

"پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں۔ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے۔ اگر ہم اسے یوں ہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اور رومی آ کر ہماری جگہ اور ہماری قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے۔ ۔ ۔ ۔ پس وہ اسی روز سے اس کے قتل کا مشورہ کرنے لگے۔" (۱۱: ۴۷-۵۳)

اس کے بعد مسیح کے انھیں بارہ رفیقوں یا شاگردوں میں سے ایک یہودی یہوداسکریوتی نامی اس پر بھی تل گیا کہ وہ یہود لیڈروں کے ہاتھ مسیح کو گرفتار کرادے گا۔ اور اس خدمت کے لیے اس نے ۳۰ روپیہ کی رقم بھی وصول کرلی۔ متی میں ہے:۔

"اس وقت ان بارہ میں سے ایک نے جس کا نام یہوداہ اسکریوتی تھا سردار کاہنوں کے پاس جاکر کہا کہ اگر میں اسے تمہارے حوالہ کردوں تو مجھے کیا کروگے؟ انھوں نے اسے تیس روپے تول کردے دیئے۔ اور وہ اس وقت سے اس کے پکڑوانے کا موقع ڈھونڈھنے لگا۔ (۲۶:۱۴-۱۵)

خوب خیال کرلیجئے کہ یہ سارا ذکر یہودہی کا چل رہا ہے۔ اصل دشمن خون کے پیاسے یہودی لیڈر تھے۔ وہی گرفتاری کی فکر میں تھے۔ وہی مسیح مظلوم کی گرفتاری کے لیے سازش کررہے تھے۔ وہی اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہی اسے رومی عدالت تک پہونچانے والے تھے۔ اور وہی مسیح کے ایک یہودی غدار رفیق سے اس کا سودا بھی کرچکے تھے۔

مرقس کی بھی روایت سن لیجئے:۔

"پھر یہوداسکریوتی جو ان بارہ میں سے تھا سردار کاہنوں کے پاس چلا گیا تاکہ اسے ان کے ہاتھ پکڑوادے۔ وہ یہ سن کر خوش ہوئے اور اس کو روپے دینے کا اقرار کیا۔ اور وہ موقع ڈھونڈھنے لگا کہ کسی طرح قابو پاکر اسے پکڑوادے۔" (۱۴: ۱۰-۱۱)

لوقا کی روایت سے بھی بے خبر نہ رہیے۔

"اور شیطان یہوداہ میں سمایا جو اسکریوتی کہلاتا اور ان بارہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے جاکر سردار کاہنوں اور سپاہیوں کے سرداروں سے مسلح کی کہ اس کو کس طرح ان کے حوالے کرے۔ وہ خوش ہوئے اور اسے روپے دینے کا اقرار کیا۔ اس نے مان لیا اور موقع ڈھونڈھنے لگا کہ اسے بغیر ہنگامے کے حوالے کردے۔" (۲۲: ۳-۶)

مسیح کی طرف سے پیشگوئیوں اور اکابر یہود کی طرف سے سازشوں، منصوبوں، تیاریوں کا دور ختم ہوا۔ اور نوبت واقعۂ گرفتاری کی آگئی۔ اکابر یہود کے سپاہیوں کے ہاتھ۔ اور ایک یہودی کنجر غدار کی مدد سے پہلے یہ روائت متی کی زبان سے سنیے:۔

"وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ یہوداہ جو ان بارہ میں سے ایک تھا آیا اور اس کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ

تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے آ پہنچی۔ اور اس کے پکڑوانے والے نے یہ بتادیا تھا کہ جس کا میں بوسہ لوں وہی ہے۔ اسے پکڑ لینا..... اس پر انھوں نے پاس آکر یسوع پر ہاتھ ڈالا اور اسے پکڑ لیا..... اسی گھڑی یسوع نے بھیڑ سے کہا کیا تم تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مجھے ڈاکو کی طرح پکڑنے نکلے ہو؟ میں ہر روز ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا اور تم نے مجھے نہیں پکڑا۔" (۲۶: ۴۷-۵۶)

گرفتاری کا یہی منظر مرقس نے بھی دکھایا ہے (۱۴: ۴۳-۴۹) اور لوقا میں بھی (۲۲: ۴۷-۵۳) اور یوحنا میں تفصیل کچھ زائد ہی ہے مثلاً یہ کہ:-

"پس وہ اسی روز سے اس کے قتل کا مشورہ کرنے لگے۔ پس اس وقت سے مسیح یہودیوں میں علانیہ نہیں پھرا..... اور سردار کاہنوں اور فریسیوں نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر کسی کو خبر ہو کہ وہ کہاں ہے تو اطلاع دے تاکہ اسے پکڑ لیں۔" (۱۱: ۵۳، ۵۴، ۵۷)

یوحنا میں کچھ اور تفصیلات بھی ہیں۔ آخر میں ہے۔

"پس یہوداہ سپاہیوں کی پلٹن اور سردار کاہنوں[1] اور فریسیوں[2] سے پیادے لے کر مشعلوں اور چراغوں اور ہتھیاروں کے ساتھ وہاں آیا۔ (۱۸: ۳)

لیکن اتنے جزو پر سب کا اتفاق ہے کہ مسیح کی گرفتاری یہودی سرداروں کے حکم سے اور انھیں کے سپاہیوں، پیادوں کے ہاتھوں ایک یہودی کی مخبری پر عمل میں آئی

یہودی سپاہی اور پیادے حضرت مسیح کو گرفتار کرکے قدرۃً پہلے اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ انجیل یوحنا میں ہے:-

---

[1] کاہن، یہود اور بابل کی قدیم اصطلاح میں ترجمہ Priest کا ہے۔ عام اردو میں اس کے لیے لفظ "پروہت" یا "پجاری" (پوجا کرانے والے کے معنی میں) موجود ہے۔ سردار کاہن سب سے بڑا اور اعلا پروہت ہوتا تھا۔ جس کا انتخاب ہر سال بہت سی رسوم کے بعد ہوتا تھا۔ یہود کے ہاں یہ سب سے بڑا دینی عہدہ تھا۔ (صدق)

[2] یہ گروہ یہود کے علماء و مشائخ کا تھا۔ انجیلوں میں ان کی ریاکاری و نمائشی دینداری اور سرتاپا پر تصنع زندگی پر بڑی لعنت پھٹکار آئی ہے۔ (صدق)

"بہت سے سپاہیوں اور ان کے صوبہ دار اور یہودیوں کے پیادوں نے یسوع کو پکڑ کر باندھ لیا۔ اور پہلے اسے حنا کے پاس لے گئے کیونکہ وہ اس برس کے سردار کاہن کائفا کا سسرا تھا۔ یہ وہی کائفا تھا جس نے یہودیوں کو صلاح دی تھی کہ امت کے واسطے ایک آدمی کا مرنا بہتر ہے۔"

(۱۸:۱۲-۱۴)

یہ حنا (ANNAS) نہ صرف اس وقت کے بڑے پروہت کائفا کا سسرا تھا۔ بلکہ خود بھی اس عہدہ پر رہ چکا تھا۔ اور اس وقت بھی یہود میں بڑے اقتدار کا مالک تھا۔

یوحنا میں ہے کہ:

"پھر سردار کاہن نے یسوع سے اس کے شاگردوں اور اس کی تعلیم کی بابت پوچھا" (۱۸:۱۹)

اور جب اس پوچھ گچھ، سوال وجواب اور تحقیقات کے وقت مسیح کا لب ولہجہ یہود کے معیار کے مطابق نہ رہا تو ایک بدبخت یہودی پیادہ نے آپ کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اور بالآخر یہ سردار کاہن کائفا کے پاس بھیج دیا گیا۔

روایت ہے کہ:

"پیادوں میں سے ایک شخص نے جو پاس کھڑا تھا یسوع کے طمانچہ مار کر کہا، تو سردار کاہن کو ایسا جواب دیتا ہے؟ یسوع نے اسے جواب دیا۔ اگر میں نے برا کہا تو اس برائی پر گواہی دے اور اگر اچھا کہا تو مجھے کیوں مارتا ہے۔ پس حنا نے اسے بندھا ہوا سردار کاہن کائفا کے پاس بھیج دیا۔" (۱۸:۲۲-۲۴)

یہود کی اپنی عدالت میں مسیح کے پیش ہونے کا منظر انجیل متی کے حوالے سے ملاحظہ ہو:

"اور یسوع کے پکڑنے والے اس کو کائفا نام سردار کاہن کے پاس لے گئے۔ جہاں فقیہہ اور بزرگ جمع ہو گئے تھے ... اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف جھوٹی گواہی ڈھونڈھنے لگے مگر نہ پائی گو کہ بہت سے جھوٹے گواہ آئے۔ لیکن آخر کار دو گواہوں نے آ کر کہا کہ اس نے کہا ہے میں خدا کے مقدس کو ڈھا سکتا

لوقا کی روایت ہے کہ حنا اور کائفا دونوں ہی بڑے پروہت کے منصب پر تھے۔ اور حنا اور کائفا سردار کاہن تھے۔ (۳:۲)

اور تین دن میں اسے بنا سکتا ہوں! اور سردار کاہن نے کھڑے ہو کر اس سے کہا تو جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں! مگر یسوع چپکا ہی رہا۔ سردار کاہن نے اس سے کہا میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہو تو ہم سے کہہ دے۔ تو یسوع نے اس سے کہا تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔ اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر کیا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی۔ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے۔ اس پر انھوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا۔" (۲۶: ۵۹-۶۸)

غرض یہ کہ گرفتاری کی ساری کارروائیاں یہود نے ہی کیں یہودی کی اپنی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا یہودی بطور گواہ پیش ہوئے۔ فیصلہ یہود ہی نے کیا۔ یہودی نے اسے واجب القتل ٹھہرایا یہودی کی صدر عدالت نے مسیح پر کفر کا فتویٰ دیا۔ ہر طرح کی بدتمیزیاں اور بے ہودگیاں یہودی نے کیں ——— تائیدی بیان مرقس کا سنیے:

"پھر وہ یسوع کو سردار کاہن کے پاس لے گئے۔ اور سب سردار کاہن اور بزرگ اور فقیہہ اس کے پاس جمع ہو گئے۔ ... اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کے مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف گواہی ڈھونڈھنے لگے مگر نہ پائی۔ کیوں کہ بہتیروں نے اس پر جھوٹی گواہیاں تو دیں لیکن ان کی گواہیاں متفق نہ تھیں ..... پھر سردار کاہن نے بیچ میں کھڑے ہو کر یسوع سے پوچھا کہ تو کچھ جواب نہیں دیتا! یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ مگر وہ چپکا ہی رہا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ سردار کاہن نے اس سے پھر سوال کیا اور کہا کیا تو اس متبوعہ کا بیٹا مسیح ہے؟ یسوع نے کہا۔ ہاں۔ میں ہوں۔ اور تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔ سردار کاہن نے اپنے کپڑے پھاڑ کے کہا۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی! تم نے یہ کفر سنا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ ان سب نے فتویٰ دیا کہ وہ قتل کے لائق ہے۔ تب بعض اس پر تھوکنے اور اس کا منہ ڈھانپنے اور اس کے مکے لگانے اور اس سے کہنے لگے۔ نبوت کی باتیں سنا۔ اور پیادوں نے اسے طمانچے مار مار کر اپنے قبضہ میں

لیا۔" (۱۴:۵۳-۶۵)

لوقا کا بیان گو مختصر ہے۔ لیکن جامع و واضح ہے۔

"اور جو آدمی یسوع کو پکڑے ہوئے تھے اس کو ٹھٹھے میں اڑاتے اور مارتے تھے۔ اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس سے یہ کہہ کر پوچھتے تھے نبوت سے بتا کس نے تجھکو مارا؟ اور انھوں نے طعنے سے اور بھی بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں۔

جب دن ہوا تو سردار کاہن اور فقیہہ یعنی قوم کے بزرگوں کی مجلس جمع ہوئی اور انھوں نے اسے اپنی صدر عدالت میں لے جا کر کہا۔ اگر تو مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ اس نے ان سے کہا اگر میں تم سے کہوں تو یقین نہ کرو گے! اور اگر پوچھوں تو جواب نہ دو گے لیکن اب سے ابن آدم قادر مطلق خدا کی داہنی طرف بیٹھا رہے گا۔ اس پر ان سب نے کہا پس کیا تو خدا کا بیٹا ہے؟ اس نے ان سے کہا تم خود کہتے ہو کیونکہ میں ہوں! انھوں نے کہا اب ہمیں گواہی کی کیا حاجت رہی؟ کیونکہ ہم نے خود اس کے منہ سے سن لیا ہے (۲۲:۶۶-۷۱)

غرض جب یہ سارے مرحلے مخبری اور گرفتاری سے لے کر طرح طرح کی ذلتوں، اہانتوں اور تکفیر کے بعد واجب القتل قرار پانے کے سب یہود ہی کے ہاتھوں اور یہود کی عدالت میں طے پا چکے تو اب سزائے موت کے نفاذ کے لیے مقدمہ کو قدرۃً رومی حاکم عدالت پیلاطس (PILATE) کی پیشی میں لے جانا ناگزیر ہو گیا۔ چناں چہ آگے کی سرگزشت پہلے متی کی زبان سے سنیے:۔

"جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا تا کہ اسے مار ڈالیں۔ وہ اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا۔

یسوع حاکم کے سامنے کھڑا تھا اور حاکم نے اس سے پوچھا۔ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ یسوع نے اس سے کہا تو خود کہتا ہے اور جب سردار کاہن اور بزرگ اس پر الزام لگا رہے تھے تو اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر پیلاطس نے اس سے کہا کیا تو نہیں سنتا کہ یہ تیرے خلاف کتنی گواہیاں دیتے ہیں۔ اس نے ایک بات کا بھی اس کو جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ حاکم نے بہت تعجب کیا۔ اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطس

نے ان سے کہا۔ تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر اسے چھوڑ دوں۔ برآبا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟ ... لیکن سردار کاہنوں اور بزرگوں نے لوگوں کو ابھارا کہ برآبا کو مانگ لیں اور یسوع کو ہلاک کرائیں .... وہ بولے برابا کو۔ پیلاطس نے ان سے کہا کہ پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے، کیا کروں؟ سب نے کہا کہ اس کو صلیب دی جائے۔ اس نے کہا۔ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا بلکہ اُلٹا بلوا ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے۔" (۲۷: ۱۱-۲۶)

مرقس کا بیان اس سے بہت ملتا جلتا ہوا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے اسے چھوڑ کر لوقا کی روایت پر آجائیے:۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطس کے پاس لے گئی اور انھوں نے اس پر الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا..... پیلاطس نے سرداروں کاہن اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر ابھارتا ہے۔ یہ سن کر پیلاطس نے پوچھا کیا یہ آدمی گلیلی ہے؟ اور یہ معلوم کر کے کہ ہیرودیس کی عملداری کا ہے۔ اسے ہیرودیس کے پاس بھیجا کہ وہ بھی ان دنوں یروشلم میں تھا۔" (۲۳: ۱-۷)

بہ طور جملۂ معترضہ یہ سن لیجئے کہ رومی شہنشاہ کی طرف سے "امیر ملک فلسطین میں مقرر تھے ایک ارض گلیل کے لیے اور وہاں کا حکم اس وقت ہیرودیس تھا اور دوسرا خاص علاقہ یروشلم کے لیے جو پیلاطس کی عملداری میں تھا۔ اب آگے پھر لوقا کا بیان سنئے:۔

"وہ ہیرودیس اس سے بہتیری باتیں پوچھتا رہا۔ مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔ اور سردار کاہن اور فقیہہ کھڑے ہوئے زور شور سے اس پر الزام لگاتے رہے .... پھر پیلاطس

نے سرداروں کاہنوں اور سرداروں اور عام لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ تم اس شخص کو لوگوں کا بہکانے والا ٹھہرا کے میرے پاس لائے ہو اور دیکھو میں نے تمہارے سامنے اس کی تحقیقات کی۔ مگر جن باتوں کا الزام تم اس پر لگاتے ہو۔ ان کی نسبت نہ میں نے اس میں کچھ قصور پایا نہ ہیرودیس نے کیوں کہ اس نے اسے ہمارے پاس واپس بھیجا ہے اور دیکھو اس سے کوئی فعل ایسا نہیں ہوا۔ جس سے وہ قتل کے لائق ٹھہرتا پس میں اس کو پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ سب مل کر چلا اٹھے کہ اسے لے جا اور ہمارے خاطر برابا کو چھوڑ دے (یہ کسی بغاوت کے باعث جو شہر میں ہوئی تھی اور خون کرنے کے سبب قید میں ڈالا گیا تھا۔) مگر پیلاطس نے چھوڑنے کے ارادے سے پھر ان سے کہا۔ لیکن وہ چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دے صلیب۔ اس نے تیسری بار ان سے کہا کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ میں نے اس میں قتل کی کوئی وجہ نہیں پائی۔ پس میں اسے پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ مگر وہ چلا چلا کر سرحوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے۔ اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔ پس پیلاطس نے حکم دیا کہ ان کی درخواست کے موافق ہو۔ اور جو شخص بغاوت اور خون کرنے کے سبب قید میں پڑا تھا اور جسے انھوں نے مانگا تھا اسے چھوڑ دیا۔ مگر یسوع کو ان کی مرضی کے موافق سپاہیوں کے حوالہ کیا۔"

اس کے آگے کیا گزری حضرت مسیحؑ واقعی مصلوب ہوئے یا نہیں، اس سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں دکھانا انجیلی صراحتوں سے اور ان کی تکرار بلکہ کثرت تکرار سے یہ ہے کہ حضرت مسیح سے اصل دشمنی حکمرانِ قوم کو نہیں بلکہ صرف مسیح کے ہم قوم یہود کو تھی۔ انھیں نے ان کو پکڑا، انھیں نے فتوائے قتل سنایا اور رومی حاکم کی ہر نرمی اور سفارش کے باوجود آپ کو سولی گھر تک لے آئے۔

آپ کہیں گے۔ اس کے بعد اب وضاحت و شہادت کا درجہ باقی ہی کون سا رہ گیا ہے؟ لیکن ذرا ٹھہریئے اور ایک شہادت اس سے بھی جلی تر واضح تر، کامل تر ابھی اور سن لیجیے۔ یہ شہادت بھی انجیل ہی کی ہے اور سب سے آخری انجیل یعنی یوحنا کی۔

"پھر وہ یسوع کو کائفا کے پاس سے قلعہ[1] کو لے گئے۔ صبح کا وقت تھا اور وہ خود قلعہ

---

[1] قلعہ یہاں سرکاری کچہری تھی (صدق)

میں نہ گئے تاکہ ناپاک نہ ہوں[1] بلکہ فسح[2] کھا سکیں پس پیلاطس باہر نکل کر ان کے پاس آیا اور کہا کہ تم اس آدمی کی کیا فریاد کرتے ہو[3]۔ انھوں نے جواب میں اس سے کہا کہ اگر یہ بدکار نہ ہوتا[4] تو ہم اسے تیرے حوالہ نہ کرتے۔ پیلاطس نے ان سے کہا کہ اسے لے جا کر تم ہی اپنی شریعت کے موافق اس کا فیصلہ کرو۔ یہودیوں نے کہا کہ ہمیں روا نہیں کہ کسی کو جان سے ماریں[5]..... پس پیلاطس پھر قلعہ میں داخل ہوا اور یسوع کو بلا کر اس سے کہا کہ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ یسوع نے جواب دیا۔ کیا تو یہ بات آپ سے کہتا ہے یا اوروں نے میرے حق میں تجھ سے کہی؟ پیلاطس نے جواب دیا۔ کیا میں یہودی ہوں؟ تیری ہی قوم اور سردار کاہنوں نے تجھ کو میرے حوالہ کیا۔ تو نے کیا کیا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ میری بادشاہت دنیا کی نہیں۔ .... پیلاطس نے اس سے کہا پس کیا تو بادشاہ ہے؟ یسوع نے جواب دیا تو خود کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں۔ میں اس لیے پیدا ہوا اور اسی لیے دنیا میں آیا ہوں کہ حق کی گواہی دوں۔ جو کوئی سچائی کا ہے۔ میری آواز سنتا ہے۔ پیلاطس نے اس سے کہا۔ سچائی ہے کیا؟ یہ کہہ کر وہ یہودیوں کے پاس پھر باہر گیا[6] اور ان سے کہا کہ میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا۔ مگر تمہارا دستور ہے کہ میں فسح[7] کو تمہاری خاطر ایک آدمی چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ پس کیا تمہیں منظور ہے کہ میں تمہاری خاطر یہودیوں کے بادشاہ کو چھوڑ دوں۔ انھوں نے چلا کر پھر کہا کہ اس کو نہیں لیکن برابا کو۔ اور برابا ایک ڈاکو تھا۔ اس پر پیلاطس نے یسوع کو لے کر کوڑے لگوائے..... پیلاطس نے پھر باہر جا کے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں اسے تمہارے پاس پھر لے آتا ہوں تاکہ تم جانو کہ میں اس کا جرم نہیں پاتا۔ یسوع کانٹوں کا تاج رکھے اور ارغوانی پوشاک پہنے باہر آیا۔ پیلاطس نے ان سے کہا۔ دیکھو یہ آدمی جب سردار کاہن اور پیادوں

---

[1] یہودی عقیدہ میں مشرکوں کی کسی عمارت کے اندر داخل ہونا اپنے کو ناپاک کرنا تھا (صدق) [2] ایک قسم کی قربانی (صدق) [3] یعنی تمہارا استغاثہ اس کے خلاف کیا ہے؟ (صدق) [4] یعنی مجرم (صدق) [5] سزائے موت کے نفاذ کا اختیار صرف حکومت (رومی) کو تھا۔ یہود رعایا کی دینی عدالتوں کو اس کا حق نہ تھا (صدق) [6] اوپر کی ساری گفتگو حاکم نے کچہری کی عمارت کے اندر آکر کی تھی تنہائی میں (صدق) [7] یہود کے ایک قربانی کے تہوار کا نام (صدق)

نے اسے دیکھا تو چلّا کے کہا کہ صلیب دے صلیب! پیلاطس نے ان سے کہا کہ تم ہی اسے لے جاؤ اور صلیب دو۔ کیونکہ میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا۔ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ ہم اہل شریعت ہیں اور شریعت کے موافق وہ قتل کے لائق ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بتایا۔ جب پیلاطس نے یہ بات سنی تو اور بھی ڈرا۔ اور پھر قلعہ میں جا کر یسوع سے کہا تو کہاں کا ہے..... پیلاطس اس کے چھوڑ دینے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہودیوں نے چلّا کر کہا اگر تو اسے چھوڑ دیتا ہے۔ تو قیصر کا خیر خواہ نہیں۔ جو کوئی اپنے کو بادشاہ بتاتا ہے وہ قیصر کا مخالف ہے[1]۔ پھر پیلاطس یہ باتیں سن کر یسوع کو باہر لایا اور اس جگہ جو چبوترہ ہے وہ تخت عدالت پر بیٹھا..... پھر اس نے یہودیوں سے کہا۔ دیکھو یہ ہے تمہارا بادشاہ۔ بس وہ چلّائے کہ لے جائے جا، اسے صلیب دے۔ پیلاطس نے ان سے کہا کیا میں تمہارے بادشاہ کو صلیب دوں؟ سردار کاہنوں نے جواب دیا کہ قیصر کے سوا ہمارا کوئی بادشاہ نہیں اس پر اس نے اس کو ان کے حوالے کیا تا کہ صلیب دیا جائے۔" (۱۸ و ۲۸-۱۹: ۱-۱۶)

یہ سارے بیانات انھیں چار انجیلوں سے براہ راست نقل ہوئے جو مسیحیوں کے نزدیک مستند ہیں ہی۔ باقی مجموعہ عہد جدید کے دوسرے حصوں مثلاً اعمال سے بھی اگر بیانات نقل ہوں تو ضخامت اس سے بھی کہیں بڑھ جائے ——— اتنی ساری وضاحتوں، صراحتوں اور ان کی کثرت تکرار کے بعد اب یہود کا قتل مسیحؑ یا اقدام قتل مسیحؑ سے اب تقریباً دو ہزار برس کے بعد یہود کا بری الذمہ قرار پا جانا اور وہ بھی نائب مسیح جناب پاپائے روم کی عدالت سے اگر تاریخ کا ایک عجیب ترین اور ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز فیصلہ نہیں تو اور کیا ہے؟ انجیل ہی کے حوالہ سے اوپر یہ مضمون اکابر یہود کا آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔

"اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر!"

انجیل کے براہ راست حوالوں کے بعد کسی اور حوالہ کی ضرورت یقیناً نہیں باقی رہ جاتی۔

---

[1] قیصر یعنی شہنشاہ روم۔ یہود اور ان کے بڑے بڑے پروہتوں کے ترکش کا آخری تیر یہ تھا کہ انھوں نے خود روی حاکم کو دھمکانا شروع کیا کہ اگر تو یسوع کو چھوڑ دیتا ہے تو خود اپنے بادشاہ کا باغی اور غدار ہے۔ (صدق)

لیکن بے تکلف ایک اور حوالہ یہودی کی ایک بڑی اور تاریخی شخصیت کا مل گیا۔ جوزیفس جو پہلی صدی عیسوی کا آدمی ہے اور جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ کے عہد سے متصل ہی گزرا ہے۔ اس کا شمار اکابر یہود میں ہے! اور اس کی تاریخ ANTIQUITIES OF THE JEWS (آثار یہود) یہود کی مستند اور ایک قدیم ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باب ۱۸ فصل ۳ فقرہ ۳ میں رومی حاکم پیلاطس (PILATE) کے حالات کے ذیل میں لکھتا ہے:۔

"تقریباً اسی زمانہ میں یسوع نامی ایک دانشور شخص کا ظہور ہوا۔ اگر شخص کا استعمال اس کے لیے جائز ہو اس لیے کہ اس سے خوارق صادر ہوتے رہتے تھے اور وہ ان لوگوں کا معلم تھا جو حقیقت کو مسرت سے قبول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے گردیدہ بہت سے لوگ ہو گئے' یہود میں سے بھی اور غیر یہود میں سے بھی وہ مسیح تھا اور جب پیلاطس نے اسے ہماری قوم کے اکابر کی تحریک پر سولی کی سزا دی تو اس کے شیدائیوں نے اسے چھوڑ نہیں دیا ....." (صفحہ ۵۳۰ انگریزی ایڈیشن)

اور جو کچھ لکھا۔ اس سے بحث نہیں۔ بحث سے متعلق جو فقرہ جوزیفس کے قلم سے نکلا ہے اسے یہاں زیر خط کر دیا گیا ہے۔ جوزیفس جیسا کہ اس کی عبارت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مسیحؑ کا منکر و مخالف نہیں بلکہ نیم معتقد سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا صاف اقرار کر رہا ہے کہ آپؑ کو سزائے موت دلانے میں سعی و تحریک اکابر یہود ہی کی رہی۔

(بشکریہ صدق جدید)

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنیؒ کے:۔

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابطیس۔ اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے۔ چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ 3/50 پانچ تولہ 2/-

شربت جذام۔ جذام میں یہ دوا بیحد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض دفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ 5/-

شربت کف۔ پتہ کی پتھریوں کا درد' یرقان' ورم جگر' ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بے حد مفید ہے۔ قیمت ایک پونڈ 5/-

شربت درد گردہ۔ پیشاب میں تھوڑی ریت آنا' اور جلن یا چبھن پیدا ہو جانا یا رک رک کر پیشاب آنا یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے جن کی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ 5/-

مرہم سرخ۔ پھوڑوں' خصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم بہت مفید ہے۔ اس کے استعمال سے جلن کافور ہو جاتی ہے اور پھوڑا جلد صاف ہو جاتا ہے۔ آٹھ اونس 3/50

منیجر حسنی فارمیسی' ۲۷ گوئن روڈ لکھنؤ

عورت کی سربراہی کی حمایت

دینی محاذ کا ایک حادثہ اور لادینیت کے لیے نوید فتح

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

(۲)

اس مضمون کی پہلی قسط میں مدیر شہاب کے صرف ایک جزو پر گفتگو ہوئی ہوئی تھی بقیہ اجزاء پر اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے چیلنج پر گفتگو باقی تھی۔ صرف اشاعت ہی باقی نہ تھی بلکہ یہ سب حصہ مجھے لکھنے کو بھی باقی تھا کیونکہ میری صحت کی ناہمواری نے اس سے زیادہ لکھنے کا موقع مجھے نہیں دیا تھا جو گزشتہ اشاعت میں شائع ہو سکا۔ اسی صحت کے مسئلے نے مجھے مجبور کیا کہ تبدیل ماحول کی خاطر ہفتے دو ہفتے کہیں لکھنؤ سے باہر رہوں چنانچہ ۱۱ فروری سے ۲۵ فروری تک کا وقت اپنے وطن میں گزارا۔ اور اس کی خاطر یہ بھی طے کرنا پڑا کہ مارچ کے الفرقان کی اشاعت میں کچھ تاخیر گوارا کی جائے۔ لیکن اس تاخیر سے میرے نامکمل مضمون کی تکمیل کی جو صورت کچھ لکھنے کی ادنیٰ زحمت کے بغیر پیدا ہوئی ہے، میں یقیناً اس سے بہتر کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

میں ۲۶ کو لکھنؤ واپس آیا اور بحمداللہ صحت کے اس حال میں تھا کہ مضمون کی تکمیل کا کام شروع کر سکوں۔ لیکن ۲۷ کی صبح ہی کو جو اخبار دیکھا تو اس میں مدیر شہاب (مولانا کو ٹرپاٹی) کا جماعت اسلامی سے استعفے کے اعلان کے ساتھ ایک بیان تھا۔ اور آج یکم مارچ کو نیازی صاحب کا وہ مفصل مکتوب بھی اخبار میں آگیا جو انھوں نے اپنے استعفے سے پہلے مولانا مودودی صاحب

کو لکھا تھا۔ یہ مکتوب ہی میسر نامکمل مضمون کی وہ بہترین تکمیل ہے جو اس تاخیر کی بدولت آپ سے آپ ہی حاصل ہوگئی۔

اس مکتوب میں مدیر شہاب عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں اپنی اس تمام تقریری اور تحریری تائید وحمایت کے بارے میں، جو انہوں نے جماعت اسلامی پاکستان کے فیصلے کے مطابق کی، لکھتے ہیں۔

"میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھتا تھا صرف جماعتی قواعد وضوابط کی وجہ سے اس مصیبت پر مجبور ہوگیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں! اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے"۔

واقعہ یہ ہے کہ عتیق سنبھلی یا کوئی اور شخص نیازی صاحب کے مضمون کی تردید میں کتنے ہی مضبوط دلائل فراہم کر دیتا تب بھی یہ بات بہرحال حاصل نہ ہوتی جو انکے مکتوب کے صرف ان چند جملوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی انسان کا علی الاعلان یہ اقرار کہ وہ اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف اللہ کے دین اور اسکی شریعت کے بارے میں کسی غلط بات کی تائید کا ارتکاب کرتا رہا، دنیا کا سب سے مشکل کام اور انسانی زندگی کا سب سے کٹھن مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں اگر آدمی کو تاویل کے لیے تنکے کا سہارا بھی ملتا ہے تو وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ سے لے کر مولینا اشرف علی صاحب تھانویؒ تک کے اقوال کل اپنی تائید میں پیش کرنے والا اگر آج انہیں اپنی غلطی کا ادنیٰ عذر بنانے کو تیار نہیں ہے تو پھر یہ اس بات پر سو دلیلوں کی ایک دلیل ہے کہ یا تو ان اقوال کو غلط طور پر استعمال کیا گیا تھا اور یا اگر ان میں سے کسی قول سے کچھ تائید واقعتہً نکلتی بھی تھی تو اس کے علم اور ضمیر کے مطابق یہ قول قابل تردید تھا نہ کہ قابل استشہاد! اور یہی ہمارا بھی موقف تھا کہ مثلاً مفتی دارالعلوم دیوبند کے (سابق) فتوے میں یقیناً عورت کو سربراہ مملکت بنانے کا جواز ملتا ہے مگر کوئی صاحب علم

آدمی اپنے علمی ضمیر کو دبائے بغیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی تائید نہیں کرسکتا۔ اور رہا مس فاطمہ جناح جیسی عورتوں کے حق میں اس کا استعمال تو یہ اہل علم ہی نہیں ایک صاحب ضمیر عامی کے لیے بھی قابل شرم ہے اس کے برعکس امام مالکؒ امام ابوحنیفہ اور امام طبری کی طرف جو عورت کی امارت کا جواز منسوب کیا گیا ہم بتا چکے ہیں کہ وہ سراسر خلاف واقعہ ہے اسی طرح ہمیں حضرت تھانویؒ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اقوال پر گفتگو کرکے بتانا تھا کہ ان میں سے کس کے استعمال کی کیا حیثیت ہے اور وہ کس تبصرے کا مستحق ہے لیکن مدیر شہاب کے اس مکتوب نے ہمارے لیے اس بحث کی ساری بساط اب لپیٹ دی ہے۔ اب اگر کسی کو ان اقوال سے خلجان ہے تو وہ ہم سے نہیں مدیر شہاب سے پوچھے کہ یہ جو اقوال سب سے پہلے ان ہی کے ذریعہ لوگوں کے سامنے آئے اور انھیں کی آڑ میں جماعت اسلامی کے ہر صاحب قلم نے اپنی جماعت اور مولانا مودودی صاحب کی مدافعت کا مورچہ سنبھالا ان کے باوجود انھیں (مدیر شہاب کو) اپنی تائید وحمایت کا فعل کیوں اس قدر سنگین معصیت نظر آیا کہ اس کی پاداش میں یمان سے محرومی تک کا اندیشہ ان کی زبان پر آگیا، ہمیں تو اب صرف مدیر شہاب کو مبارک باد دینی ہے کہ انھوں نے حق دوستی اور رجوع وانابت الی اللہ کی بڑی ہی قابل شکر اور قابل رشک توفیق خدا کی بارگاہ سے پائی۔ اور اپنے وہ سخت الفاظ واپس لینے ہیں جو کہیں کہیں ان کے مضمون کی تنقید میں ہمارے قلم سے نکلے۔ یقیناً وہ اپنے اس مضمون سے اب اس طرح بری ہیں جیسے کہ وہ کبھی ان کے قلم سے نکلا ہی نہیں تھا۔

اب ہم اس بحث میں خود کچھ لکھنے کے بجائے مدیر شہاب کا مذکورہ بالا مکتوب ہی اپنے ناظرین کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ اس نے جہاں ہمیں مدیر شہاب کے مضمون پر گفتگو سے سبکدوش کردیا ہے وہاں یہ بات بھی اس سے بدرجہ اتم عیاں ہوجاتی ہے کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے اس مسئلہ میں جو موقف مس فاطمہ جناح کی حمایت کی خاطر اختیار کیا وہ ان کے سابقہ موقف کی ایسی ضد ہے جسے بقول مدیر

شہاب دینی دوغلے پن اور نفاق کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالکل کھلی ہوئی تھی اور اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ مولانا مودودی اور انکے رفقاء نے آج جو کچھ اس مسئلے میں کہا ہے اس کا تار و پود بکھیر دینے کے لیے ان کی سابقہ تصریحات ہی کافی ہیں۔ لیکن حیرت ہے ان لوگوں پر جو مدیر شہاب کی طرح جماعتی جبریت کے تحت اس دوغلے پن کی تائید و حمایت کی کوئی مجبوری نہ رکھتے تھے پھر بھی انہوں نے مولانا مودودی سے جوش تعلق میں اپنے اوپر حرج یہ جانا کہ جو لوگ جماعت اسلامی پاکستان کی اس روش کو دینی محاذ کا خطرناک رخنہ جان کر تنقید کر رہے ہیں ان کے مقابلے کا محاذ سنبھال لیں جس میں ایک طرف تو وہ دلائل گڑھ گڑھ کر پیش کیے جائیں جن سے لوگوں کو اسلام میں عورت کی سربراہی کا جواز نظر آنے لگے۔ اور دوسری طرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ مولانا مودودی نے اس سے پہلے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے کسی حال میں بھی عورت کو سربراہ مملکت بنانے کا جواز نہ رہتا ہو اور حد یہ ہے کہ رکھنے والوں نے مولانا کا وہ مضمون بھی سامنے رکھدیا جس میں سیاست و مملکت کے معاملات میں عورتوں کی عملی شرکت کے جواز کی مطلق نفی کرتے ہوئے مولانا اس حد تک گئے تھے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے قصاص کے مطالبے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہنگامی سربراہی تک کے لیے کوئی استثنائی نوعیت کا جواز بھی تجویز نہ فرما سکے بلکہ حضرت علی مرتضیٰؓ کی زبان میں اسی بات پر مصر رہے کہ "حضرت عائشہ کا یہ اقدام حدود شریعت سے متجاوز تھا" لیکن اسکے باوجود بھی کہنے والے پورے طمطراق کے ساتھ یہی کہتے رہے کہ مولانا نے اس مضمون میں یہ کہاں لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی استثناء نہیں ہے؟ ہاں صاحب یہ تو واقعی نہیں لکھا لیکن اگر "امور مملکت" میں فاطمہ جناح کے مملکت پاکستان کی سربراہی کا کوئی استثنائی جواز نکل سکتا ہے تو کیا ام المؤمنین حضرت عائشہ اس قابل بھی نہ تھیں کہ ایک ہنگامی قضیے کی سربراہی کا کوئی جواز ان کے لیے بھی تجویز کر دیا جاتا؟ اور اگر اجازت ہو تو ہم اس سوال کو اسی مضمون کے مولانا کے ان الفاظ میں دریافت کرنے کی جرأت کریں کہ

"آپکے خیال ساوک میں کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جسکی وجہ سے وہ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں کیلئے نا اہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے ان پر کوئی فوقیت حاصل ہو"؟

ہمیں یقین ہے کہ مولانا کی ہر بات کو ڈھونے میں عین سعادت دارین سمجھنے والے اس بات کا بھی جواب دے ہی دینگے اور ہمیں چپ کر کے چھوڑیں گے۔ لیکن اس مضمون کا ایک جملہ اور سن لیجئے حضرت علیؓ کی بات نقل کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ

"اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں"۔

لیکن اب کون حضرت عائشہؓ کو بیسویں صدی کے اس کمال ذہانت و فقاہت کی خبر جا کر پہونچائے کہ جس چیز کی کوئی معمولی سی دلیل بھی آپ کو حضرت علیؓ کے جواب میں نہ مل سکی تھی آج اس کی دلیل قرآن میں دریافت کر لی گئی ہے۔ اور کیسی دریافت! کہ سارے عالم کو چیلنج دیا جا رہا ہے کہ کوئی اس کی نفی میں دلیل لائے!

اسی وقت (اسی مضمون میں) مولانا نے کہا تھا کہ

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھہرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کا دعوے لے کر اٹھیں اور جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اول تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ جس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایت موجود ہو اس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں مگر اس غرض کے لیے نہیں کہ ہم اللہ اور رسول کی ہدایت کو چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں[عہ]۔

اور یہی ان کے متبعین کا بھی غلو کی حد تک شعار تھا۔ مگر کل جنہیں صحابہؓ کی لغزشوں کے اتباع سے بھی عار آتی تھی آج وہ کتابوں اور اخباروں کے پرانے ناموں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے زمانے کے لوگوں تک کی لغزشوں کو مشعل ہدایت بناتے ہوئے نہیں شرما رہے ہیں۔ یہ فلاں کا بیان ہے، یہ فلاں کا فتویٰ ہے یہ فلاں کی تحریر ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت سربراہ مملکت بنائی جا سکتی ہے۔

ع پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

خیر اب چھوڑیئے اس قصہ کو پتہ نہیں کتنی گالیوں کی بارش دادتک کے لیے ان چند سطروں نے مزید سامان کرا دیا ہوگا۔ اب تو مدیر شہاب مولانا کو تو نیازی کا وہ خط پڑھئے جو دراصل اس مضمون کی قسط دوم ہے۔

عہ یہ تمام اقتباسات مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے جس مضمون سے لئے گئے ہیں وہ ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ میں اور اسی کے حوالے سے الفرقان محرم ۱۳۷۲ھ میں بھی شائع ہوا ہے۔

....بنام مولانا مودودی

مولانا کوثر نیازی

محترم امیر جماعت!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پچھلے دنوں میں نے ایک تفصیلی ملاقات کے لیے آپ سے حاضر ہونے کی اجازت چاہی تھی، حاضر بھی ہوا مگر آپ خواجہ عبدالحئی مرحوم کی فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، سرسری سی بات ہوئی اور تفصیلات پھر کسی وقت کے لیے ملتوی ہو گئیں۔ بعد میں مجھے درد گردہ کا دورہ پڑ گیا، اب طبیعت بحال ہے مگر مسلسل نشست رکھوں تو تکلیف ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تحریری طور پر آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔

متحدہ محاذ میں جماعت کی شمولیت پر میرے خیالات آپ سے اور دوسرے رفقاء سے ڈھکے چھپے نہیں۔ جب ۱۹۶۲ء میں مسٹر سہروردی مرحوم سے آپ نے متحدہ محاذ کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز کیا تو میں نے "شہاب" مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں "مسٹر سہروردی سے چند سوالات" کے زیر عنوان ایک اداریہ سپرد قلم کیا تھا مقصود یہی تھا کہ جو لوگ غیر اسلامی نظریات کے علمبردار اور ملک میں جمہوریت کے قاتل ہیں جماعت ان کی طرف دست تعاون بڑھانے سے باز رہے۔ اس پر آپ نے ایک ملاقات میں مجھے اس طرح کی تحریریں لکھنے سے منع کر دیا۔ کیوں کہ آپ کے نزدیک اس سے جماعت کی پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ میں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی مگر اس کے ساتھ میں برابر "شہاب" کے ذریعے ایک اسلامی محاذ کی تشکیل پر زور دیتا رہا۔

متحدہ محاذ کی شرکت

۱۹۶۴ء میں جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس زمانے میں مرکزی دفتر کے باقی ماندہ اصحاب نے محاذ کے قیام کے لیے دوسری پارٹیوں کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر دیئے، میرا خیال یہ تھا کہ جماعت موجود نہیں اور یہ اصحاب اپنی ذاتی حیثیت میں محاذ میں شریک ہو رہے ہیں، اس لیے میں نے ۱۶ فروری ۱۹۶۴ء کے "شہاب" میں ایک مراسلہ بھیجا تفصیل سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا اور دلائل واضح کیا کہ اس طرح کے متضاد اور متصادم عناصر کا اتحاد ملک و ملت دینی اقدار اور خود جماعت کے لیے سخت تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس مضمون کے چھپتے ہی ان رفقاء نے میرے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز تر کر دی، کارکنوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ انھوں نے یہ سب کچھ جیل سے آئی ہوئی ہدایات کے مطابق کیا ہے اور دوسری طرف یہ دھمکی دے کر میرا منھ بند کرنے کی کوشش کی گئی کہ اگر میں اس طرح کے خیالات ظاہر کرنے سے باز نہ آیا تو خلاف قانون قرار دیئے جانے کے باوجود جماعت کا جو ڈھانچہ اپنے طور پر انھوں نے قائم کر رکھا ہے وہ پورے ملک کے متعلقین کو جماعت سے میرے نکل جانے کی اطلاع کر دے گا۔

مایوسی۔ اضمحلال اور جمود

میں پروپیگنڈے کی اس مہم سے متاثر تو نہیں ہوا اس لیے کہ میرے خلاف اس طرح کی کئی مہمیں عرصہ سے بعض ممتاز اصحاب کے زیر سایہ جاری تھیں اور میں زبانی اور تحریری طور پر کئی دفعہ آپ کو ان کی اطلاع بھی دے چکا ہوں اور بطور احتجاج اس سلسلے میں اپنے منصب سے استعفیٰ بھی دے چکا ہوں لیکن اس خیال سے کہ آپکی عدم موجودگی اور جماعت کی بندش کے باوجود اس طرح کے اختلافات جگ ہنسائی کا باعث بنیں گے اور اس سے ہمارے سادہ دل کارکنوں کو بہت صدمہ ہوگا، میں خاموش ہو گیا تا آنکہ جماعت نے صدارتی انتخابات میں اپنے سابقہ موقف کو چھوڑ کر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کو دین اسلام کا تقاضا اور جہاد قرار دے دیا۔ آپ باہر تشریف لے آئے اور جماعت کی پوری طاقت کو آپ نے اس انتخابی مہم میں جھونک دیا، یہ مرحلہ بظاہر اب ختم ہو چکا ہے مگر اس کے خطرناک نتائج و عواقب کارکنان جماعت میں بڑھتی ہوئی مایوسی، اضمحلال اور جمود کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، جماعت جس غلط راستے پر چل پڑی ہے بلکہ اس راستہ کی جس منزل پر جا کر رک گئی ہے۔

اس کی مثال ایک تنگ گلی کی سی ہے جس سے پیچھے ہٹنے یا آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ دوسرے لفظوں میں ہماری تحریک "رہروان پشت بمنزل" کا قافلہ بن چکی ہے، گمان حق ہوگا اگر میں جماعتی خیر خواہی کے لیے آپ کے سامنے اپنے قلبی احساسات کی یہ تصویر نہ رکھوں کہ جن تصورات کے تحت میں جماعت میں شامل ہوا تھا۔ آج وہ تصورات نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور اپنی ذاتی اصلاح و تکمیل کا جو مقصد مجھے جماعت میں لایا تھا جماعت کی پالیسی اور طرز عمل نے دوسرے بہت سے ارکان کی طرح مجھے اس مقصد سے محروم ہی نہیں کیا بہت دور پھینک دیا ہے۔

مذہبی اور سیاسی دیوالیہ پن

صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران جو غلطیاں ہم سب نے کی ہیں وہ اتنی ہولناک ہیں کہ ان کے تذکرے سے بھی دل کانپتا ہے اور چونکہ جماعت کی پالیسی کے تحت مجھے بھی ان غلطیوں کا بار بار ارتکاب کرنا پڑا ہے اس لیے میں ان کی شدت کو بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں، مجلس عاملہ کے حالیہ اجلاس میں اگر اپنی غلطیوں کا احساس و اعتراف کر کے راست روی اختیار کر لی جاتی تو شاید اس احساس میں کمی واقع ہو جاتی مگر عاملہ نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی ہے میں اس پر مسلسل غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس سے جماعت ایک ایسے راستے پر ڈال دی گئی ہے جو دینی اعتبار سے سخت دوغلے پن بلکہ (مجھے اس سخت لفظ کے استعمال کے لیے معاف فرمائیے) نفاق کا راستہ ہے اور سیاسی حیثیت سے فہم و فراست اور حکمت و دانش کے پہلو سے ہمارے دیوالیہ ہو جانے کا اعلان عام ہے۔ اس قرارداد کا تضاد خلق خدا کے ساتھ ساتھ مضطرب ارکان اور کارکنوں کو مغالطے میں ڈالنے کی ایک دردناک مثال پیش کرتا ہے۔

اس قرارداد کے ایک حصہ میں تو کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے کہ۔

"یہ اخلاقی حالت اگر ہماری قوم کی نہ ہوتی تو انتخابات کے یہ نتائج ہرگز برآمد نہ ہو سکتے تھے۔ یہ صورت حال اس امر کی ضرورت کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ خود جمہوریت کی بحالی کے لیے بھی قوم کی اخلاقی اصلاح ناگزیر ہے۔ جب تک ہم طبقات کے اخلاق کو پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کی فکر اور کوشش نہ کریں گے۔ اس وقت تک دھن، دھونس اور دھاندلیوں کے ذریعے سے آمروں کے مسلط ہونے کا دروازہ بند نہ ہو سکے گا۔"

اور اس کے دوسرے حصوں میں یہ کہہ کر مغالطہ دہی کی حد کر دی گئی ہے کہ

"گزشتہ تین ماہ میں قوم جس آزمائش سے گزری ہے اس سے اس کا یہ احساس بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ اب بیدار ہے اور اپنے حقوق کے لیے ہر ممکن جد وجہد کا داعیہ رکھتی ہے۔"

اس کے ساتھ دوسرے فیصلوں میں اس امر کا بھی واشگاف الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ "جماعت اسلامی حتی الوسع دستور ساتھ دیتی رہے گی۔"

الفاظ کا گورکھ دھندا

ان قرار دادوں کا جو مطلب میں سمجھا ہوں اور جو میرے خیال میں ہر پڑھا لکھا آدمی سمجھے گا یہ ہے کہ جماعت اپنے ارکان کے اندر پیدا شدہ بے چینی کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں دبا دینا چاہتی ہے اس میں ان لوگوں کے لیے بھی سامان تسکین موجود ہے جو اصلاح معاشرہ کے طویل اور کٹھن کام کو "مجذوب کی بڑ" سمجھتے اور اس لادینی سیاست کے چکر میں الجھ کر متحدہ محاذ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے ذوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو انقلاب قیادت کے لیے خود معاشرہ کی اصلاح کو ضروری قرار دیتے ہیں، اس طرح کے دو متصادم نظریات کو ایک ہی سانس میں دہرا دینے کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جماعت کی قیادت اب بھی اپنے ارکان اور کارکنوں سے صفائی کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتی اور اسے اپنی سابقہ غلطیوں کا اعتراف کرنے میں شدید تامل ہے۔

"ابدی اور غیر ابدی محرمتیں"

محترم مولانا۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ دوسری بہت سی اصولی غلطیوں کے علاوہ ہم نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جو سزا ملے گی اس کا مسئلہ تو الگ ہے اس دنیا میں بھی اندرون و بیرون ملک ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ اگر ہمیں صدر ایوب کی مخالفت کرنی ہی تھی اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینا ہی تھا تو سیاسی اور جمہوری ضرورتوں کا اظہار کر کے ایسا کیا جا سکتا تھا مگر اس کے لیے ہم نے غریب اسلام پر جو نوازش کی ہے اور جو محرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے اس کے بعد دینی حلقے تو ایک طرف رہے دوسرے غیر جانب دار عناصر حتیٰ کہ الپوزیشن تک کے بعض نمایاں افراد ہمیں ابن الوقت اور سیاست کی خاطر دین میں ترمیم اور تحریف کرنے والا گروہ تصور کرنے لگے ہیں۔ آپ عالم

اسلام کی صفِ اول کے ممتاز عالم دین ہیں اور میں ایک معمولی طالب علم، میں نے کچھ سیکھا بھی ہو تو آپ کے طفیل، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی کی یہ تقسیم مان لینے کے بعد ہمارا موقف منکرین حدیث کے گمراہ کن نظریہ سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے منکرین حدیث کا نظریہ یہی تو ہے کہ وہ فقط قرآن میں بیان کردہ حرمتوں کو ابدی مانتے ہیں۔ حدیث کی حرمتیں ان کے نزدیک غیر ابدی ہیں مگر ہم یہ کہہ کر ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نہیں ساری حرمتیں قرآن کی بھی ابدی نہیں، حرمتیں قرآن کی ہوں یا حدیث کی سب کی سب ابدی اور غیر ابدی کے خانوں میں تقسیم ہیں۔

دین کی پامالی کا اذن عام

محترم مولانا! یقین فرمائیے کہ اس نظریہ کی تاویل میں اب تک آپ نے یا دوسرے حضرات نے جو کچھ لکھا یا کہا ہے وہ میری نظر میں ہے (اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعتی پالیسی کی مجبوریت کے تحت میں خود آپ کے اس نئے نظریہ کا دفاع کرنے والوں میں شامل رہا ہوں) مگر اس کے باوجود اس نظریہ کی صحت مجھ پر واضح نہیں ہو سکی اور آج جب کہ یہ سطور لکھتے وقت میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے میں آپ کا بدترین بدخواہ ہوتا اگر اس مہلک نظریہ کے متعلق اپنے دل کی بات آپ کے سامنے بیان نہ کرتا۔ قرآن اور حدیث میں حرمتوں کے متعلق "ابدی" اور "غیر ابدی" کا تصور ضرور نہ پایا جاتا ہے مگر "ابدی" اور "غیر ابدی" کا نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ دروازہ کھول کر ہم نے تجدد پسندوں کو دین کی پامالی کا اذن عام دے دیا ہے۔ غیر ابدی حرمتوں کی لکھی لکھائی فہرست تو کہیں درج نہیں ہوگی یہی کہ جو شخص یا گروہ اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت چاہے گا کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرا لے گا، آخر کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرانے کا حق ہمیں ہی تو ارزانی نہیں ہوا، دوسرے بھی تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہمیں ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر ہم ایک حرمت کو جائز قرار دے رہے ہیں، یہ ضرورتیں اور مصلحتیں معتبر نہیں مگر اس کا کیا جواب ہوگا جب پلٹ کر کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ مصلحتیں غیر معتبر ہیں۔ ہمارے نزدیک معتبر اور جہاں تک نظریہ کا سوال ہے وہ خود آپ ہی کا عطا کردہ ہے اس لیے ہم نے اپنے غلط اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے بھی

سو حرمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

تو ہم اس لیے ثواب کے امیدوار ہیں کیوں کہ مجتہد کے نامۂ اعمال میں غلط اجتہاد پر بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔ مجھے اس سے بیشتر آپ کے نظریۂ حکمتِ عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا۔ جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں اسے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا مگر صدارتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے نظریہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریہ حکمتِ عملی ان ہی مضمرات کا حامل تو نہ تھا۔؟

انتہائی ندامت کے ساتھ

میں آپ کے ساتھ انتہائی ندامت کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے حقیر سے علم اور مطالعہ کی بنا پر میری رائے یہی تھی کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری روایات کی بات تو دوسری ہے لیکن شرعاً عورت کسی بھی صورت میں صدر مملکت نہیں بنائی جا سکتی اور اس کا تو میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تھا کہ کبھی ہم بھی اسلام کے نام پر ایک خاتون کی حمایت میں ایسی تحریک چلا سکتے ہیں چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے سینکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کی وضاحت کی اور بعد میں بعض اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوا دیا مگر اس دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جماعت اس سے الگ نقطۂ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گیا اور جماعت کے فیصلے کے انتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔

مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزب اختلاف کا ساتھ نہ دیا جائے۔ آپ کی گزشتہ تحریروں کی روشنی میں امید بھی اس بات کی تھی لیکن جب مجلس مشاورت میں جیل سے آئی ہوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلس مشاورت کی قرارداد کی صورت میں اخبارات کو ارسال کر دیا گیا تو میرے حسن ظن کو انتہائی ٹھیس پہونچی شاید آپ کو معلوم نہ ہو میں یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ مجلس مشاورت کے جس اجلاس میں محترمہ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے اس قرارداد کو منظور

کیا گیا۔ میں اس میں اپنی غلط فہمی (یا وقت کے بارے میں غلط اطلاع) کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا جب میں پہونچا تو یہ قرارداد اخبارات کو بھجوائی جا چکی تھی۔ کاش! میں اس وقت موجود ہوتا اور اس غلط نظریہ پر اہل مجلس کو متنبہ کر کے کم از کم قرارداد کے الفاظ تو تبدیل کرا دیتا ـــــ ظاہر ہے کہ اس کے بعد "تیر از کمان رفت" والا معاملہ تھا اب جماعتی دستور کی رو سے میں اس فیصلہ کی تائید پر مجبور تھا اور جس رائے کو میں دلائل کی بنا پر مرجوح بلکہ غلط سمجھتا تھا اب صرف اس لیے کہ وہ بطور قرارداد منظور ہو چکی ہے جماعت اور مجلس مشاورت کا رکن ہونے کی وجہ سے میں تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تائید و توثیق کرنے لگا۔

مولانا! میں بہت گناہ گار ہوں مگر میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے اس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں؟ اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا'

مولانا! میری رائے یہ ہے کہ اب ہماری یہ محبوب جماعت اسلامی ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہے۔

قول و فعل کا تضاد

اس جماعت کی ابتداء کے وقت نظام حکومت کی اصلاح کا جو تصور آپ نے پیش کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ افراد میں ایمان و اسلام اور احسان کا صحیح شعور پیدا کر کے انھیں انفرادی زندگی میں متقی بنایا جائے اور ان افراد کے ذاتی عمل اور شہادت حق کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ اس طریقے سے نظام حکومت کی اصلاح آپ سے آپ یوں ہوگی جیسے سنگترے کے بیج سے سنگترے کا درخت اور پھر اس درخت سے سنگترے کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ اس طبعی عمل کے طور پر اسلامی حکومت اسی اصلاح یافتہ معاشرے سے نمود پذیر ہوگی۔ یہ تصور اگر جماعت کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا تو کسی اہم مرحلے پر اسے اجاگر کرنے کے بعد پھر سے زیر عمل لایا جا سکتا تھا لیکن دوسرے بہت سے اصحاب قلم کے علاوہ خود آپ نے پچھلے آٹھ دس برس میں جماعت کو جو فکری غذا دی ہے اور جس طرح پہلے دوسرے اور تیسرے مرحلے کا تصور دے کر جماعت کے کارکنوں کو یہ باور کرایا ہے کہ جماعت جو بھی پالیسی اختیار کر رہی ہے وہ اسی تصور اقامت دین ہی

کا نتیجہ ہے جو آپ نے شروع میں پیش فرمایا تھا' اس کے بعد جماعت کے کارکنوں کو پھر سے اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ کے کاموں پر لگا دینے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مزید برآں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بالعموم اور صدارتی انتخاب میں بالخصوص جس قسم کی اپوزیشن کا کردار ادا کیا ہے ارباب اقتدار کو اپنا حریف بنایا اور خود جس طرح ان کے حریف بنے ہیں اس کے بعد دائمی دین کی حیثیت سے ہمارے لیے ملک میں کام کرنے کی کوئی صورت موجود نہیں۔ اس پہلو سے میری مایوسی اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کیوں کہ ہم نے ۱۹۶۷ء کی انتخابی پالیسی سے لے کر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لیے جس طرح نصوص قرآن و حدیث کو پیش کیا ہے اس کے بعد اس ملک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

ماضی اور حال

تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' تضادات کا شکار ہوئے جانے کے ہمارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لیے صحابہ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مگر اب ہم اپوزیشن کے ساتھ مل کر امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ سابق نمائندہ پنچایتی سسٹم سے آئے جس جماعت یا گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہو پھر ہم نے صالح نمائندوں کو جماعت کے دائرے میں مخصوص کر دیا۔ پہلے ہم پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہتے تھے اب محاذ کے ساتھ شریک ہو کر "غیر صالحین" کو بھی ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ ہم نوٹ پر قائد اعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے۔ صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کے تصویری دو چرخے گلی گلی فروخت کیے۔ پہلے ہم نے صدارتی سے بھی بڑھ کر امارتی تصور خلافت پیش کیا تھا' اب ہم پارلیمانی نظام جمہوریت کو اسلامی قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم اسمبلیوں میں اراکین کی الگ پارٹیاں بنانے کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے بعد میں ہم نے خود اس پر عمل کیا۔ پہلے ہم مخلوط جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے اب مخلوط جلسوں کی صدارت کرتے اور ان میں تقریریں کرتے ہیں۔ پہلے ہم علماء کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کو ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے اب علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم خواتین کا

کو ووٹ کا حق دینے میں راضی نہ تھے اب ان کی حمایت تک کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ پہلے ہم ایوب کے زبردست ناقد تھے اب ان ہی کا ایک حصہ متحدہ حزب اختلاف کی خواتین کمیٹی کی صورت میں منظم ہوا ہے تو ہمارے اکابرین کی بیگمات ان کے جلسوں سے خطاب فرماتی ہیں، پہلے ہم طلبا کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روکتے تھے۔ اب ان سے عملی سیاست میں شریک ہونے کی اپیلیں کرتے ہیں۔ پہلے ہم جلوسوں اور نعروں کو غیر اسلامی کہتے تھے۔ اب خلاف کعبہ تک کے جلوس نکالتے اور اپنے رہنماؤں کے لیے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ پہلے ہم ان انسانی (غیر اسلامی) قوانین پر چلنے والی عدالتوں میں مقدمات لے جانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اب ان ہی عدالتوں کو ہم عدل و انصاف کا محافظ قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے اب ان ہی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں۔

میں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری ان باتوں میں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانئے انتہائی دکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے کیے ہیں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی اور دینی سمجھ کر چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب "ترک و اختیار" کے ان مظاہروں کے بعد اپنے ارکان کے سوا کون ہمارے دینی فکر پر بھروسہ کرے گا؟

غیر جمہوری نظام

۲۔ اگر ہم دین کے لیے کوئی کام نہ کر سکتے تو ہمارے لیے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام کرنے کا دوسرا میدان باقی تھا۔ مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہماری تنظیم کے قواعد اور اس کی موجودہ ہیئت اس کے لیے سخت غیر موزوں اور نامناسب ہے۔ ہمارے نظام میں ممبر و رکنیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ہمارے ارکان کی تعداد غالباً ابھی تک ڈیڑھ ہزار سے متجاوز نہیں ہو سکی۔ اس میں بھی ہر پندرھواں رکن تنخواہ دار ہمہ وقتی کارکن ہے۔ جماعت کے پورے دو لبسٹ اور قیادت پر ان ہی ہمہ وقتی اصحاب کا قبضہ ہے، یہ ٹھیک ہے کہ ان میں انتہائی مخلص لوگ شامل ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ کی طرف سے قیم حلقہ ہونے کی بالاصرار دعوت پر میں نے عرض کیا تھا ہمہ وقتی ہونے کے بعد تنخواہ اور معاوضہ کی شرح سے کام کی پیمائش ہوتی ہے۔ اس کے لیے غریب کارکنوں

کو اپنے دفاع میں بہت کچھ کارگزاری بیان کرنا پڑتی ہے مستعفی ارکان کا جواب دینے کے لیے حامی ارکان ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے لوث تنخواہ دار قیادت بھی سازشوں کا اور گروپ بندیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں معیار بدقسمتی سے یہ نہیں کہ کون اہل ہے جسے اعزازی طور پر ہی سہی جماعت کی قیادت سونپ دی جائے معیار یہ ہے کہ کون فارغ یا معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہے جسے ہمہ وقتی بنا کر قائد بنا دیا جائے۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ آج جماعت کی ہیئت حاکمہ مجلس عاملہ تک میں ایک آدھ رکن کو چھوڑ کر باقی سب حضرات یعنی تنخواہ پانے والے ہمہ وقتی رفقاء ہیں۔ ان کی سیرتیں بہت بلند سہی مگر ظاہر ہے جماعت سے معاشی وابستگی کے بعد وہ پورے زور اور جرأت سے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں تو یہ بات اور مشکل ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے دستور (بمطابق قرارداد مالی گوٹھ) کی رو سے وہ شخص جماعت کے کسی منصب پر فائز ہو ہی نہیں سکتا جو کبھی جماعت کی طے شدہ پالیسی سے اختلاف رائے کا اظہار کر چکا ہو (خواہ یہ اظہار اختلاف خود آپ کے سامنے ہی کیوں نہ ہو۔)

پھر رائے دہندگی کے معاملہ میں بھی ہم نے لینے اور دینے کے باٹ الگ الگ بنا رکھے ہیں۔ ہم پورے ملک میں تو بالغ رائے دہی چاہتے اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر سخت سے سخت تنقید کرتے اور حقوق کے معاملہ میں درجہ بندیوں کو از روئے اسلام ظلم عظیم سمجھتے ہیں مگر خود اندرون جماعت ہمارا رد یہ یہ ہے کہ ہم نے اس میں متاثر، ہمدرد، متفق اور رکن کی درجہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں اور جماعت کے عہدہ داروں وغیرہ کے انتخاب میں ان کارکنوں کو بھی ووٹ دینے کا حق نہیں دیتے جو سالہا سال سے نہایت اخلاص اور ایثار کے ساتھ جماعت کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ جو اس کی مالی امداد کرتے، اس کے جلسوں میں دریاں بچھاتے۔ اس کی وجہ سے ملازمتوں سے ہاتھ دھوتے اور زمانہ بھر کی مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ووٹ کا حق ہمارے ہاں صرف رکن کو ہے متاثر، ہمدرد کارکن اور متفق اس سے محروم ہیں۔ البتہ ارکان کے ووٹوں سے بنے ہوئے نظم کی سمع و طاعت از روئے اسلام ان کا فرض ہے۔ جماعت کی بنیادی پالیسی ارکان کے اجتماع کے بجائے مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ میں طے ہوتی ہیں اور اب تو ایک عرصہ سے (بالخصوص ۵۷ء میں جماعتی دستور کی ترامیم کے بعد) شوریٰ کو بھی کم ہی زحمت دی جاتی

ہے فیصلے کرنے کے لیے سارا دارومدار آپ کی کیبنٹ یعنی عاملہ پر ہے۔ جو فیصلہ یہ کر دے۔ اس سے کوئی رکن اختلاف نہیں کر سکتا۔ اختلاف کرے تو جماعت اسے باہر کا راستہ دکھا دیتی ہے۔

قیادت و امارت

یہی صورت ہمارے ہاں قیادت و امارت کی ہے۔ ۱۹۴۱ء سے لے کر اب تک ہمارے ہاں کوئی ایک فرد بھی جماعتی تربیت سے ایسا تیار نہیں ہوا جو آپ کے بعد (اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے) جماعت کی قیادت کر سکتا ہو یا جو جماعت کے اندر اور باہر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہو، جس جماعت کی جمہوری اور عددی صورت حال یہ ہو جس کی قیادت اول سے آخر تک تنخواہ دار ہو جس میں اظہار رائے پر قدغن ہو جس میں مٹھی بھر لوگ ووٹ کا حق رکھتے ہوں جس میں آپ کی پیش کردہ علمی اور دینی آراء سے اختلاف کرنا جماعت کی مخالفت کرنے کے مترادف ہو اس میں ایسا آدمی کیسے داخل ہو سکتا ہے جو خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسا شخص تفصیلات معلوم کیے بغیر شامل ہو بھی جائے تو وہ یہاں پنپ نہیں سکے گا۔ آپ کی تو پوری عالم کی وسیع سیاسیات پر نظر ہے۔ آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ جس جماعت میں فقط وہی لوگ چل سکتے ہوں جو آمنا و صدقنا اور احسنت و مرحبا کی صدا بلند کرنے ہی کو سعادت سمجھیں وہ جماعت کبھی ایک زندہ قوم کی راہنمائی نہیں کر سکتی۔

خدمت خلق کے کام

۳۔ تیسری صورت یہ تھی کہ ہم سیاست اور اصلاح و تزکیہ دونوں اہم کاموں سے دست کش ہو کر رفاہ عام کا منصوبہ بنانے اور خدمت خلق کے لیے کام شروع کر دیتے مگر سالہا سال کے غور و فکر و مطالعہ و مشاہدہ سے نظر یہ آتا ہے کہ ہم اس میدان کے بھی مرد نہیں، ہم نے اپنے کارکنوں کو (الا ماشاء اللہ) جو ذہن دیا ہے وہ یہ ہے کہ خدمت خلق کا کام سیاسی نتائج حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ ہم نے ہمیشہ اپنے شفاخانوں اور خدمت خلق کے دوسرے کاموں کو جماعت کے افراد رسوخ اور سیاسی مواقع کے حصول کے پیمانے سے ناپا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی اور ہنگامی مقصد کے بغیر ہم خدمت خلق کا کوئی بھی منصوبہ زیر عمل نہیں لا سکتے۔

ہماری اخلاقی حالت

محترم امیر جماعت! یہ تینوں صورتیں ممکن تھیں مگر میں ان تینوں کا دروازہ جماعت کے لیے بند پاتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ جماعت کی اخلاقی حالت (میں اپنے کو مستثنیٰ قرار نہیں دوں گا) انتہائی حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس پہلو میں حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں تو میری مایوسی اور شدید ہو جاتی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کئی مرتبہ آپ کو توجہ دلائی ہے اور مجھے یاد ہے ہر بار آپ دل گرفتہ ہو کر سر تھام کر بیٹھ جاتے تھے اور اعتراف کر لیتے تھے کہ یہ سب کچھ آپ کو معلوم ہے مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ ۳۱ اکتوبر ۶۳ء کو اپنے منصب سے مستعفی ہوتے وقت میں نے تحریری طور پر عرض کیا تھا کہ

"میں عرصہ سے دیکھ رہا ہوں کہ احیائے دین کا کام کرنے کے لیے جو کم سے کم ضروری صفات ہم میں ہونی چاہئیں۔ ہماری عملی زندگی ان کی شہادت نہیں دیتی۔ جماعت کے دو بہت بڑے قابض بھائی ہماری رہنمائی کے لیے دائے ہمارے بعض رہنما ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے" الزامات عائد کرنے اور چغلی اور غیبت کرنے میں مشغول رہتے ہیں بعضوں کی بول چال تک آپس میں بند ہے۔ یہ ایک دوسرے پر جماعت کے اندر گروپ بندی تک کے الزامات لگاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گیلانی برادران" اور کراچی گروپ" وغیرہ کی اصطلاحیں آپ کے کانوں کے لیے بھی اجنبی نہیں ہوں گی۔ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا" ہاں میں ہاں ملانے والے" علم دین سے کورے اور عربی زبان سے بالکل نابلد افراد کو جماعت کی صف اول میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تقویٰ علم دین اور دوسرے خصائص ہماری نگاہ میں ثانوی بنتے جا رہے ہیں۔ اب "نائب امیر" کے منصب کے لیے بھی ہماری نگاہ یا تو چودھری غلام محمد صاحب جیسے رفیق پر جاتی ہے جو بیچارے علم دین تو بڑی بات ہے اردو کے چند فقرے بھی صحیح نہیں بول سکتے۔ میں چونکہ ایسے لوگوں کی سربراہی سے اختلاف کرنے کا قصوروار ہوں۔ ان خوابیوں کا ناقد ہوں۔ چودھری صاحب کی شائع کردہ ایک کتاب "فقہ السنہ" پر بے لاگ تبصرہ کر چکا ہوں اس لیے مجھے اس جرم کی سزا مرکزی شوریٰ کے ہر اجلاس پر بھگتنی پڑتی ہے۔ جگہ جگہ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ کیا جاتا ہے جس کی صفائی پیش کرتے کرتے اب قریب قریب عاجز آ چکا ہوں۔ یہ صورت حال (جو یقیناً آپ سے بھی مخفی نہیں) سخت

افسوسناک ہے۔ ہماری تنظیم میں یہ رجحانات ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور اس وقت تک میں [illegible] لوگ اگر ہمارے باہمی تعاون اور تعلقات کے مداح ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ دوسری جماعتوں کی طرح ہمارے اندرونی حالات خوش قسمتی سے اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔

اندریں حالات، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جماعت میں اپنے منصب اور ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں، جماعت کے جلسہ ہائے عام سے خطاب نہ کروں، ایک معمولی رکن کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا رہوں تاکہ جماعت میں جو لوگ اپنی بیش قیمت صلاحیتیں خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں، ان کے لیے تسکین دل کا سامان فراہم ہو سکے۔"

یہ ۳۱ اکتوبر ۶۳ء کی تحریر ہے۔ آج تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ان خرابیوں میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی تاہمی حد اور میں ترقی پر ہیں۔ لین دین کے معاملات میں کارکن تو ایک طرف رہے۔ ہمارے رہنما تک افسوسناک کردار رکھتے ہیں، امانتیں ضائع ہو رہی ہیں، عشر اور زکوٰۃ کی رقوم خالص سیاسی اور انتخابی مہمات اور ہمدرد کارکنوں کی تنخواہوں پر صرف کی جا رہی ہیں۔ رائج الوقت سیاسی بحثیں اتنی مرغوب ہو چکی ہیں کہ ہماری مجالس میں خدا اور رسول کا تذکرہ بھی برائے بیت رہ گیا ہے۔ عبادات میں ہم سخت قسم کے تساہل کا شکار ہیں اور شاید یہ بھی ہمارے لٹریچر کا غیر شعوری اثر ہے جس میں عبادات کو مقصود کے لیے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

میں مایوسی کا شکار ہوں

حضرت مولانا! میرا خط طویل ہو گیا۔ اس میں بعض تکلیف دہ باتیں بھی یقیناً ہوں گی اور آپ ہمیشہ مجھ پر جو شفقت فرماتے رہے ہیں اس کے پیش نظر اتنی جرأت کبھی مجھے جسارت نظر آتی ہے لیکن خدا گواہ ہے میں نے یہ سب کچھ معاندانہ جذبہ سے نہیں ایک حقیقی بہی خواہ اور ہمدرد کے جذبہ سے سپرد قلم کیا ہے جماعت سے میرا پندرہ سولہ سالہ تعلق مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کے دوسرے مشیروں کی طرح محض "سب اچھا" کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش نہ کروں بلکہ پوست کندہ حقائق پر آپ کو غور و فکر کرنے کی دعوت دوں۔ اب کیا ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ہمیں کھلم کھلا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم اپنی اسکیموں میں ناکام ہو گئے ہیں، لہٰذا جماعت کے کارکن اور ارکان آزاد ہیں۔ وہ جو راستہ چاہیں اختیار کر لیں۔ کبھی خیال آتا ہے ہمیں ایک بہادر انسان کی طرح مان لینا چاہیے

کہ ہمارا فکر اور عمل دونوں غلط تھے، اب ہم ارکان جماعت کا ایک کل پاکستان اجتماع بلا کر اپنے لیے از سر نو لائحہ عمل ترتیب دیں گے ..... کوثر نیازی ۔ لاہور ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء

مولانا مودودی کا جواب

"محترمی جناب کوثر صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا مفصل خط مجھے ملا۔ اس کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ آپ کو اب بہت پہلے جماعت سے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ نے غلطی کی کہ اتنی طویل مدت سے یہ احساسات رکھنے کے باوجود آپ جماعت کے ساتھ چلتے رہے، بہرحال اب مناسب یہی ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں اس کے بعد آپ کا جو طرز عمل رہے گا اس کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی جا سکے گی کہ آپ نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ للہ واللہ اور حقیقی بہی خواہی و ہمدردی کے جذبے سے لکھا ہے یا نہیں۔ اگر خدانخواستہ اس کے محرکات کچھ دوسرے بھی ہوئے تو آپ اطمینان رکھیں کہ اس سے پہلے جن حضرات نے بڑی مدارات کی کے ساتھ مجھ پر کرم فرمائیاں کی ہیں ان کی باتوں پر جس طرح میں نے صبر کیا، آپ کی عنایات پر بھی کروں گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

---

۱۰ اسلام کیا ہے؟ (انگریزی)

ہندی کے بعد خدا کے فضل سے "اسلام کیا ہے" انگریزی میں بھی تیار ہو گئی ہے

ترجمہ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

قیمت (علاوہ محصول ڈاک) = /۵

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

سنہ آغاز
۱۹۳۳
۶

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

معارف الحدیث

جس کا مدت سے انتظار تھا

جلد سوم

خدا کے فضل سے شائع ہو رہی ہے

معارف الحدیث

اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ

حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ

جو

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ترتیب پا رہا ہے

اس کی تشریحات کی **ایک خصوصیت** یہ ہے کہ دورِ حاضر کی ذہنی اور فکری کیفیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف کی خاص کوشش پوری کتاب میں یہی رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابہ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے کسی درجہ میں اس کے قارئین کے دلوں پر بھی وہی اثرات مرتب ہوں۔

سائز ۲۰×۲۶ دیدہ زیب کتابت، معیاری طباعت، نفیس کلیر کاغذ

جلد اوّل — ایمان اور آخرت کے بیان سے متعلق حدیثیں — صفحات ۲۸۰ — قیمت مجلد 5/- غیر مجلد 4/-

جلد دوم — تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں — صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد 5/50 غیر مجلد 4/50

جلد سوم — طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں — صفحات ۲۰۰ — قیمت مجلد 8/- غیر مجلد 7/-

ملنے کا پتہ

کتب خانۂ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

محصول ڈاک بذمہ خریدار

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ
(فی کاپی ۸۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
.....شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد (۳۲) | بابتہ ماہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ مطابق اپریل ۱۹۶۵ء | شمارہ (۱۱)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ کے والد حضرت شاہ ولی اللہ محمود دھلویؒ اور انکے خاندان	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۶
	.. ..	.. ..	...
۳	سیدنا ابو سفیانؓ	مولانا سراج الحق مچھلی شہری	۱۹
۴	دربار عالمگیری	مولانا مصطفےٰ حسن علوی	۳۲
۵	لبرل اسلام	جناب وحید الدین خاں صاحب	۴۳
۶	مولانا سندھی کے ساتھی ظفر حسن کی آپ بیتی	ادارہ الرحیم حیدر آباد	۵۷

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹر بلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اگر اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور رضانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پرو پرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

نگاہ اوّلیں

عتیق الرحمن سنبھلی

دین کے احیاء کی وہ تحریک جسے تبلیغی کام سے موسوم کیا جاتا ہے جو شخص بھی اسکی جسقدر افادیت کا قائل ہو اسی قدر رنج والم کے ساتھ اُس نے یہ خبر سُنی ہوگی کہ اس کام کے سربراہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اچانک وفات پائی۔ اور احیاء دین کی اس جدوجہد کی وہ نمایاں شخصیت جس کے جذبہ وعمل کے مشاہدے اور جس کے انفاس گرم کی تاثیر سے کتنوں ہی کو ہمہ سوز وہمہ عمل ہو جانے کی توفیق ملی وہ آج راہِ خدا کے ان دیوانوں کے درمیان موجود نہیں ہے۔

بے شک بقاء دوام اللہ ہی کے لیے ہے اور اسکی اس دنیا میں کسی کو موت سے رستگاری نہیں لیکن یہ بھی حق ہے کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام!

مولانا نے جس راہ پر دیوانہ وار چلتے ہوئے جان دی ہے یہ اسی عشق کی راہ ہے جس میں مر کر بھی آدمی مرتا نہیں۔ اسکی صرف یاد زندہ نہیں رہتی بلکہ اس یاد کے اثرات سے دلوں کو زندگی ملتی ہے اور یہی حیات دوام ہے جو صرف عشاق کے نصیب میں آتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں دین سے معمولی تعلق رکھنے والا بھی کوئی مسلمان ہوگا جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام نامی سے آشنا نہ ہو۔ آپ کے عظیم المرتبت والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ۴۰ برس پہلے دین کی عمومی دعوت اور اُس کے احیاء کی جو عظیم مگر سادہ جدوجہد اپنی مؤمنانہ بصیرت اور ایک والہانہ سوز وتڑپ کے اثر سے شروع کی تھی، مولانا کے انتقال پر (یعنی اب سے ۲۰ برس قبل) اس کی گراں بار ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر آئیں جبکہ آپ کا سن ۲۰ برس کے اندر تھا۔ مگر آپ کی خداداد صلاحیتوں نے اس بیس برس کے اندر اس دینی تحریک کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ پہلے جس کام کا دائرۂ عمل غیر منقسم ہندوستان کے اندر محدود تھا اب اسکی پٹریاں روئے زمین کے ہر ہر خطہ میں جا پہونچیں اور خود ہندوستان وپاکستان کے اندر وہ مناظر اس کام کی وسعت ومقبولیت کے

آج کے دن نظر آتے ہیں۔ جو کل صرف آرزوؤں اور تمناؤں کا درجہ رکھتے تھے ـــــ غرض وہ پودا جو تھوڑی سی ہی نشو ونما حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی زندگی میں پا سکا تھا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مجاہدانہ کوششوں اور دینی صلاحیتوں سے ایک قدآور درخت کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے ـــــ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔

افسوس اس ہستی کا چراغ حیات ۲ر اپریل (۲۹ ذی قعدہ) یوم جمعہ کی سہ پہر کو لاہور کی سرزمین پر آناً فاناً گل ہوگیا۔ ایک ہستی کا چراغ نہیں بجھا دین کا ایک روشن چراغ بجھ گیا۔ روشنی کا ایک بلند مینار گر گیا۔ دین کے لیے سوز و تڑپ کی ایک تصویر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، جسے دیکھ دیکھ کر ہر دن اور ہر رات نہ معلوم کتنے دلوں میں اسی تڑپ کی بجلیاں کوندنے لگتی تھیں ـــــ خدا اپنی رحمت بے پایاں کی بارشیں ان کی روح پر فرمائے اور اس عظیم خلا کو اپنی قدرت خاص سے پُر فرمائے جو انکی اچانک وفات سے پیدا ہوگیا ہے ـــــ

مولانا کا لاہور میں قیام اسی دینی دعوت کے سلسلے میں تھا جس کے لیے ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف تھا۔ شوال کے پہلے (اور فروری کے دوسرے) ہفتے میں آپ اپنے رفقاء کے ساتھ پاکستانی احباب کی دعوت پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک لمبے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ لاہور اس سفر کی آخری منزل تھی اور ۲ر اپریل ۲۹ ذی قعدہ ہی کی تاریخ دہلی واپس ہونے کے لیے مقرر تھی۔

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

ـــــ واپسی ٹھیک اسی تاریخ کو ہوئی مگر کس طرح کہ وہ لاہور ہی میں جمعہ و عصر کے مابین ابدی نیند سو چکے تھے اور اسی نیند کے عالم میں شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز انھیں دہلی کے ہوائی اڈہ پر لے کر اترا اور وہ تبلیغی مرکز و مسجد جہاں دوسرے دن صبح کو ان کے ارشادات سننے اور ان کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیے دور دور سے سمٹ کر مشتاقوں کا مجمع ہوتا تھا اُن کے اشکبار سوگواروں سے بھری ہوئی تھی۔ اور مسجد کیا بھری ہوئی تھی دہلی بھری ہوئی تھی۔

افسوس کیسی بجلی ملت کے مشکبار ایوان پر گری اور کیسی نعمت چشم زدن میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ ابھی مولانا کی عمر پچاس سال کی بھی نہ تھی۔ قویٰ مضبوط اور جسم تنومند تھا۔ مگر یہی واقعہ ہے کہ وہ دل سے جتنا کام لیتے تھے اور اعصاب پر جتنی شدید محنت کا بوجھ انھوں نے ڈال رکھا تھا اس میں ظاہری قوت و صحت کے باوجود دل کا جواب دے جانا کوئی بہت حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ دن و رات میں کئی کئی بار طویل طویل خطابات، پھر ان خطابات میں ایک جذبہ و حال۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کام کی فکر و نگہداشت، آرام سے بے نیازی، صحت و مرض کی

تفریق سے لاپروائی، ہر لمحہ محویت کا عالم، یہ ایسی چیزیں نہیں جنھیں قلب اعصاب بڑی مدت تک برداشت کر سکیں۔ بے شک یہ بڑا ہی عظیم خسارہ ہے کہ دین کے احیاء کی جدوجہد کے لحاظ سے ایک نادرۂ روزگار ہستی یوں آن کی آن میں دنیا سے اٹھ گئی۔ مگر انھوں نے ایک نمونہ دیا ہے کہ آدمی کمر باندھے تو دین کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ایسے زندۂ جاوید نمونے جب اٹھتے ہیں تو اپنے پیچھے میدان خالی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ان کی موت سے زندگی کے چشمے اُبلتے ہیں، وہ ایک روح ایک کی جگہ کتنوں ہی میں سرایت کرتی ہے۔ اور جو جذبہ ایک ذات میں محدود تھا وہ موت کے بعد کتنوں ہی کی میراث بن جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس حادثہ کا صرف صدمہ ہی ملت کے حصے میں نہیں آئے گا بلکہ اس کا یہ صلہ بھی خدا کی رحمت سے بھرپور عطا ہوگا۔

کچھ تفصیلات

ان سطروں کی تحریر کے بعد مولانا کے سانحۂ ارتحال کی کچھ تفصیلات علم میں آئی ہیں جن کا اضافہ مناسب ہوگا۔

معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی طبیعت کچھ پہلے سے مضمحل چل رہی تھی۔ چہارشنبہ ۲۱ مارچ کے ایک پروگرام میں مولانا کی تقریر کے اندر نمایاں طور پر کچھ رکاوٹ اور نقاہت محسوس کی گئی اور اس کے بعد مولانا کے تمام پروگرام منسوخ کرنا طے کر دیا گیا۔ جمعرات یکم اپریل کو (غالباً بعد نماز مغرب) ایک عقد نکاح میں مولانا کو تقریر فرمانا تھی۔ یہ ذمہ داری بھی وقت پر مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کے سپرد کر دی گئی اور وہ اس غرض کے لیے تشریف لے گئے۔ لیکن بعض حضرات یہ دیکھ کر کہ بڑا ہی منتخب مجمع آیا ہوا ہے مولانا کی خدمت میں واپس آئے اور بالآخر مشورے سے مولانا ہی کو زحمت دیدی گئی مولانا نے تقریر فرمائی جس میں وہی نقاہت و رکاوٹ تھی۔ حد یہ ہے کہ اپنی عادت کے حیرت انگیز حد تک خلاف صرف ایک منٹ کی دعا فرمائی اور اس طرح تقریب کی تکمیل کر کے فوراً واپس ہو پڑے۔ قیام گاہ چونکہ بالکل ہی متصل تھی اس لیے سواری کا سوال نہ تھا۔ مگر قیام گاہ پہنچنے کے راستے ہی میں بیہوشی طاری ہو گئی۔ پسینے سے تربتر تھے۔ ہاتھوں ہاتھ قیام گاہ پر لائے گئے۔ حکیم ڈاکٹر کی دوڑ ہوئی۔ گھنٹوں کے بعد ہوش آیا۔ عشا کی نماز ساڑھے تین بجے اشاروں سے پڑھی۔ نماز فجر بھی اشاروں ہی سے ادا ہوئی۔ رفیقوں سے معافی مانگی۔ ہر دم کے رفیق اور عزیز قریب مولانا انعام الحسن صاحب کو اپنی کتابوں کی زکوٰۃ نکال دینے کی وصیت کی۔ ڈاکٹروں نے صبح کے معائنہ کے بعد کہا کہ اب خطرے سے باہر ہیں مگر شدید احتیاط کی جائے، دوسرا دورہ ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ دہلی کو واپسی جو اسی جمعہ کے دن طے تھی اس کا تو اب سوال ہی کیا رہا تھا مگر قضا و قدر کے نوشتوں میں واپسی کی یہ تاریخ اٹل ہو چکی تھی۔ ٹھیک جس وقت جمعہ کا خطبہ شروع ہو رہا تھا حالت متغیر ہو گئی۔ قیام گاہ چونکہ بالکل متصل ہی تھی امام نے ہل چل محسوس کر لی۔ ماشاء اللہ فقیہ تھے اور رفیق بھی۔ بحد اختصار سے خطبہ اور نماز پوری کی۔ ڈاکٹر

بلائے گئے۔ سانس اکھڑی ہوئی تھی مگر ہوش و حواس قائم تھے۔ مولانا انعام صاحب سے سانس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی سمجھ تو چکے تھے مگر کہا شاید بلغم پھنس رہی ہے۔ فرمایا نہیں سانس پھنس رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر آگئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اب آکسیجن کی منزل ہے، فوراً اسپتال کا مشورہ دیا۔ مولانا نے اسپتال کی بات سنی تو فرمایا وہاں نرسیں ہوتی ہیں میں نہ جاؤں گا۔ پاکستان کے بااثر اشخاص نیازمندوں میں تھے عرض کیا حضرت ایک نرس بھی پاس نہ آپائے گی آپ اطمینان فرمائیں۔ فرمایا پھر کوئی مضائقہ نہیں، ازراہ عجلت ایک بڑی کار میں جو وہاں بہت سی موجود تھیں مولانا کو لٹایا گیا۔ لا الٰہ الا اللہ کا ورد مولانا کی زبان پر تھا۔ مولانا انعام الحسن صاحب اسی کار میں ساتھ تھے۔ باقی دوست آگے پیچھے دوسری کاروں میں۔ کچھ لوگ پہلے انتظامات کے لیے اسپتال پہونچ چکے تھے۔ راستے میں بس ایک بار دریافت فرمایا کتنی دور اور ہے۔ کہا بس پہونچ رہے ہیں۔ لیکن ابھی مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ کا فاصلہ اور رہا تھا کہ اس بےچین روح کو رحمت حق نے بڑھ کر اپنی آغوش میں لے لیا اور ادھر کار بھی ایک جھپاکے میں اسپتال کے اندر تھی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم دروازہ پر موجود۔ جھٹ پٹ کار کا دروازہ کھلا۔ بتایا گیا کہ ہونی ہو چکی۔ مگر ڈاکٹروں نے اپنا آخری فرض ایک انجکشن دے کر ادا کیا کیونکہ جسم میں گرمی باقی تھی۔

یہ ہے اس داعیِ آخرت کے سفرِ آخرت کی مختصر روداد۔ ۳۰ ذی قعدہ مطابق ۱۷ اپریل یوم شنبہ کو ۹½ بجے صبح اپنے والدِ ماجد کے پہلو میں اسی مسجد کے احاطہ میں تدفین ہوئی جو آپ کا تبلیغی مستقر تھا۔

رہے نام اللہ کا

افسوس ہے کہ اس حادثہ کے وقت والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانی اور مخدومی مولانا علی میاں مدظلہما دونوں ہی ایک ساتھ ہندوستان سے باہر ہیں۔ جبکہ مولانا مرحوم پر لکھنے کا حق انھیں کا تھا۔ کوشش ہے کہ یہ کمی آئندہ اشاعت میں پوری ہو جائے۔ اور ممکن ہو تو آئندہ کی پوری اشاعت ہی مولانا مرحوم سے متعلق ہو۔ اس سلسلے میں مولانا اور اُن کی دعوت سے واقفیت رکھنے والے اہلِ قلم سے بالعموم گزارش ہے کہ مضامین ارسال فرمائیں۔

ذی قعدہ اور ذی الحجہ دونوں مہینوں کا مشترک شمارہ ہے۔

یہ شمارہ:۔ بعض نئے کاتبوں کی وجہ سے بیشتر مضامین کی کتابت زیادہ باریک ہو گئی اس بنا پر صفحات میں کچھ ناگزیر ہوئی۔ (ادارہ)

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور اُن کے خاندان سے

جملہ سلسلات کی روشنی میں

محمد یٰسین ـــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اب سے پانچ سال پیشتر عالی جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مرحوم و مغفور کے زمانۂ حیات میں ان کی اجازت اور مولانا سید ابوالحسن ندوی زید مجدہم کی وساطت سے مجھے ان کے خاندانی نوادر اور مخطوطات دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اب اسی رمضان میں لکھنؤ گیا تو مولانا محمد میاں سلمہم اللہ صاحبزادۂ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مرحوم نے ازراہ کرم فرمائی دوبارہ ان نوادر کے مطالعے کا موقع دیا جن کی مدد سے میں اپنے اس مقالے کو مرتب کر رہا ہوں ـــــ اسی ماہ رمضان میں دوسری مرتبہ حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کے ہمراہ رائے بریلی حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہاں دائرۂ حضرت شاہ علم اللہ حسنی قدس سرہٗ اور اس کے آثار باقیہ نے دونوں مرتبہ میری روح کو پیام سکون اور میرے دل و دماغ کو دعوت کیف و نشاط دے کر تاریخ ماضی کا ایک ذرّیں باب میری تصور کی آنکھوں کے سامنے کھول دیا ـــــ حضرت شاہ علم اللہؒ کی تاریخی مسجد ہے جہاں ہزاروں اہل اللہ سربسجود ہوئے ہیں اور علم و ذکر کے حلقے مدتوں اس میں قائم رہے ہیں ـــــ تقویٰ اور عبادت الٰہی کی بنیادوں پر یہ مسجد کھڑی کی گئی ہے ـــــ آج بھی

اس کے در و دیوار سے دل کی آنکھوں کو خاص کیفیات محسوس ہوتے ہیں ۔ اس کی طرز تعمیر کو دیکھ کر آثار متبرکہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ حضرت شاہ علم اللہؒ نے گریۂ شب اور آہ سحر میں مشغول رہ کر اتباع سنت اور متابعت شریعت کے جذبے کے ساتھ اسی مسجد میں اپنے فیوض و برکات کو تقسیم کیا ہے۔ اُن کی باکمال اولاد اور اولاد کی اولاد نے جن میں ہر ایک آفتاب و ماہتاب اور گوہر شب چراغ تھا اس مسجد کے محراب و منبر اور سقف و بام کو اپنے اپنے زمانے میں روحانیت کی روشنی سے روشن اور منور رکھا ہے اور درس توحید و معرفت اور درس کتاب و سنت سے اس مسجد کی فضاؤں کو معمور کیا ہے انھیں تعلیمی و تذکیری حلقوں کی تاثیر سے حضرت سید احمد شہیدؒ جیسا مرد مجاہد اور غازی علم اللّٰہی خاندان میں نمودار ہوا جس نے اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر ملت اسلامیہ کی سرسبزی و شادابی کے لیے، اُمت مسلمہ کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے ایک نقشہ بنایا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بالاکوٹ کے میدان میں مع اپنے رفقاء کے شہید ہو کر حیات ابدی سے ہمکنار ہوا۔ اور مستقبل کے لیے ایک ایسی فضا قائم کر دی کہ نعرۂ حق و صداقت گوشے گوشے میں بلند ہوتا رہے اور ایمان و یقین کے جھنڈے اونچے رہیں۔

——— یہ ندی ہے، مسجد کے جنوب میں بہ رہی ہے۔ ندیاں تو اور بھی بہت سی ہیں مگر اس میں رونق ہی کچھ اور ہے ۔ سکوت شام کے وقت اس کا سکوت گوش دل کو ایک مستقل داستان سناتا ہے، صبح کے سہانے وقت میں اس کی دل آویزی اور بڑھ جاتی ہے۔ کتنے اولیاء اللہؒ نے اپنے مبارک قدوم سے اس کے کناروں کو سرفرازی بخشی ہوگی، کتنے مجاہدین اور ذاکرین نے اس ندی سے وضو کیا ہوگا؟ شام و سحر میں جب چڑیاں ندی کے کنارے، مسجد کے بام و در پر اور قریب کے ہرے بھرے کھیتوں پر چہچہاتی ہیں تو ایک خاص کیف حاصل ہوتا ہے اور قلب و دماغ میں یاد ماضی کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔

یہ حضرت شاہ علم اللہؒ آغوش لحد میں سو رہے ہیں۔ یہ سادات تنطبیہ کے چشم و چراغ ہیں۔ حضرت شاہ آدم بنوریؒ قدس سرہ کے خلیفہ یعنی صرف ایک واسطے سے حضرت مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہ کے فیض یافتہ ہیں ۔ ان کا تقویٰ اور جذبۂ اتباع سنت اللہ اکبر۔ تاریخیں اور تذکرے ان کے ذکر خیر سے لبریز ہیں۔ ان کی باکمال اولاد کی قبریں ان کے

پہلو میں اور آس پاس ہیں۔ یہیں ہندوستان کا ایک مایۂ ناز عظیم مورخ (جس کو مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنیؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) محوِ آرام ہے، یہیں حکیم صاحبؒ کے والد ماجد حضرت مولانا سید فخرالدین حسنیؒ مدفون ہیں جنھوں نے مہر جہانتاب لکھ کر اپنے محقق صاحبزادے کے لیے تاریخ و تذکرہ کی شاہراہ قائم کی۔ یہیں حکیم صاحب کے لختِ جگر ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ بھی دفن ہیں جنھوں نے اپنے والد ماجد کے جواہر پاروں اور شاہکاروں کو محفوظ رکھا، شائع کرایا اور اپنے خاندان کی ایک ایک روایت کو اپنے سینے اور سفینے میں ثبت کیا، جن کے دینی کارناموں میں ایک زبردست کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنے برادر عزیز (مولانا علی میاں مدظلہ) کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایک خاص نصب العین کے ماتحت کیا جس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان کے تعلیمی و روحانی حلقوں اور عالم اسلامی سے ایک مفید رابطہ قائم ہوا بلکہ یورپ کے مادہ پرستانہ ایوانوں میں بھی غلغلۂ توحید اور نعرۂ صداقت بلند ہو گیا ـــــ آج اس خاندان کی روایات کہن انھیں مولانا علی میاں مدظلہ سے زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے خاندان کو صحت و عافیت سے رکھے اور ملتِ بیضا کو تادیر اُن سے مستفیض رکھے (آمین)

احاطۂ مزار حضرت شاہ علم اللہؒ سے کچھ فاصلے پر ایک عظیم شخصیت سپردِ زمین ہوئی یہ حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا ہیں۔ ان کے مزار پر ولی اللہی فیوض و برکات مجھ جیسے دور از کار کو بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اس باعظمت شخصیت نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے کسقدر فیض حاصل کیا تھا اور اُن کے خاندان سے کسقدر ربط و تعلق تھا اس کو تفصیل سے لکھوں تو مستقل ایک رسالہ ہو جائے مگر مجھے تو ایک مقالہ لکھنا ہے۔ آنے والا مورخ توفیق پائے گا تو ان کے مزید حالات خاندانی مخطوطات اور دستاویزوں سے لکھے گا۔ میں اس مقالے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت شاہ اہل اللہ بہلتیؒ، حضرت شاہ محمد عاشق بہلتیؒ، حضرت شاہ نور اللہ بڈھانویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے مکتوبات بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی کہیں کل کہیں اقتباس اور تلخیص کی شکل میں مع ترجمہ پیش کر رہا ہوں جن سے تاریخ کے طالب خصوصاً ولی اللہی سلسلے کی معلومات کے خواہاں کے لیے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو کسی تاریخ اور تذکرے میں نہیں ہیں۔

خود حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے مکتوبات اور روایات جو انھوں نے اپنے پیر و مرشد اور دیگر حضرات اکابر کو لکھ کر بھیجے ہیں ـــــ اس مقالے میں شامل کروں تو میرا مقالہ شکوہ کوتاہیٔ داماں کرنے لگے ـــــ اس لیے حضرت رائے بریلویؒ کی بعض تحریرات بقدر ضرورت کہیں کہیں بطور تلخیص پیش کروں گا۔ بعض اکابر نے حضرت رائے بریلویؒ کے صاحبزادے میاں سید ابواللیثؒ کو بھی (جو ان مکتوبات اکابر کے جامع ہیں) گرامی نامہ بھیجا ہے اس کو بھی حسب موقع شامل مقالہ کیا جائے گا۔ آخر میں میر محمد نعمان رائے بریلویؒ (حضرت میر ابوسعیدؒ کے برادر عم زاد) کا ایک مفصل مکتوب بھی اس مقالے میں ترجمہ کے ساتھ شامل کیا جائے گا جس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی وفات کے مکمل حالات ہیں۔ اور جس سے آخری وقت میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے اپنے عزیز و محبوب مرید کو یاد کرنے کا پتہ چلتا ہے یہ بھی تاریخ کی ایک نادر چیز ہے۔

اب میں حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے مختصر حالات لکھتا ہوں۔

حضرت شاہ ابوسعید رائے بریلوی کے مختصر حالات

میر شاہ ابوسعید بن سید محمد رضیا جن سید آیت اللہ ابن شیخ الاعظم میر شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی رحمہم اللہ ـــــ

آپ رائے بریلی میں پیدا ہوئے، مولانا عبداللہ[1] امیٹھوی سے تحصیل علم کی، بعدہٗ اپنے چچا سید محمد صابر ابن سید آیت اللہ نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے (جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے صاحبزادے خواجہ محمد صدیقؒ کے خلیفہ تھے) ایک مدت ان کے بتائے ہوئے اشغال میں مشغول رہے۔ اپنے والد کے خلیفہ میر محمد یونسؒ سے بھی اپنے آبائے کرام کی روحانی نسبت حاصل کی، پھر دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے روحانی تعلق پیدا کر کے اُن سے اخذ فیض کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد ان کے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کی طرف رجوع ہوئے اور ان سے باقی سلوک طے کیا۔ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے انکو خلافت نامہ لکھا جسمیں تحریر ہے کہ "حضرت شاہ صاحبؒ کے فیض توجہ سے انکو وہ احوال آشکارا ظاہر ہو چکے تھے جو صوفیا کے نزدیک

---

[1] مولانا عبداللہ حنفی امیٹھوی علامہ نظام الدین فرنگی محلیؒ کے شاگرد رشید تھے۔

انتہائی درجے کے ہیں۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ کا وصال ہوگیا تو انھوں نے قصد کیا کہ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، وغیرہا طرق کے مابقی اشغال فقیر سے حاصل کریں۔ جب میں نے ان کو اس کا شائق پایا تو ان کے مقصد کو پورا کیا اور اس راہ میں اُن کے کمال کا مشاہدہ کرکے اجازت دی جس طرح مجھے میرے شیخ معظم (حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ) نیز میرے والد ماجد شیخ عبید اللہ بیلیؒ نے مجھے اجازت دی تھی ـــــ میں نے ان کو اس کی بھی اجازت دی کہ بعد مطالعہ و مراجعت شروح، تفسیر و حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کا درس بھی دیں" ـــــ علاوہ کمال علم ظاہر و باطن حضرت میر ابو سعیدؒ جلیل الوقار، کریم النفس اور مہمان نواز بزرگ تھے۔ ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ کو مکہ معظمہ پہونچے اور حج سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ حاضر ہوئے وہاں چھ ماہ اقامت کی اور شیخ ابوالحسن سندھی الصغیرؒ کے حلقۂ درس میں مصابیح کی سماعت کی، ایک مرتبہ مواجہہ شریف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا، آپ کے خلیفہ شیخ امین الدین کاکوروی نے اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ خود حضرت شاہ ابو سعیدؒ فرماتے تھے کہ میں نے مدینہ منورہ میں اپنی ان ظاہری آنکھوں سے آقائے نامدار حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ ـــ بعدہٗ مکہ معظمہ واپس ہوئے اور وہاں جزریہ قاری میر داد انصاری سے پڑھی۔ تجدید کے بھی اُستاد معرفت و سلوک میں آپ کے خلیفہ ہوئے ۱۱۸۸ھ میں ہندوستان آئے اور مدراس میں داخل ہوئے وہاں ایک زمانے تک مقبول خواص و عوام ہوکر رہے۔ اس علاقے کے غربا و درویشانے آپ سے آخرت کا نفع حاصل کیا۔ ۹ رمضان ۱۱۹۲ھ کو وفات پائی۔ رائے بریلی تکیۂ حضرت شاہ علم اللہؒ میں دفن ہوئے۔ آپ کے جلیل ممتاز اور جلیل القدر خلفا تھے۔

(۱) میر عبد السلام بدخشانیؒ (۲) قاری شیخ میر داد انصاری مکیؒ (۳) مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطبؒ (۴) مولانا عبد اللہ آفندیؒ (۵) شیخ عبد اللطیف حسینی مصریؒ (۶) حاجی امین الدین کاکوروی (۷) شاہ عبد القادر خالص پوریؒ۔

(ماخوذ از نزہتہ الخواطر جلد (۷) و سیرت سید احمد شہید رسالہ اول طبع چہارم و مجموعۂ نوادر قلمی نزد مولانا محمد میاں صاحب جنرل مدیر المبعث لکھنؤ)

مکتوبات[1] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بنام حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ

(۱) حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر سید ابوسعید سلمہم اللہ تعالیٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد از سلام محبت التزام مطالعہ نمایند ـــــ الحمد للہ رب العلمین علی عافیۃ الطرفین نامہ مشکیں شمامہ متضمن بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفہ خفیہ و اخفیٰ رسید در برابر آں شکر الٰہی بجا آوردہ شد، ایں راہ کہ میروند ہمہ طریق مستقیم است کہ اکابر اہل عرفان رفتہ اند ہیچ دغدغہ خاطر ایشاں را مشوش نسازد..... بالجملہ آنچہ خدائے تعالیٰ عطا کردہ است نعمتے است عظیمہ بر آں از جان و دل شکر کنندہ و متوقع مزید باشند و آنچہ از نور محمدی علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات دیدہ اند نمائش است از نسبت اویسیہ، سابق آمدہ ایں نسبت داشتند الحمد للہ کہ حاصل شد ـــ برائے خفقان خواندن یا حمید مفید خواہد بود۔ متفرق در اوقات صلوٰۃ خمس و خواہ یک ہزار بار ـــ در باب وجہ معاش و آسودگی ایشاں.... متفکر نباشند ہر چہ میکنند و ہمہ حکمت حق است و نافع است بنسبت شما۔ ہر چند نافعیت معلوم نباشد من بعد روشن خواہد شد والسلام۔ فقیر زادہا و والدہ ایشاں سلام می رسانند و متوقع دعائے خیر ہستند کہ دعائے مومن برائے برادر غائب مستجاب است ـــ

ترجمہ ـــ حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ ..... میر سید ابوسعید سلمہم اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ فرمائیں ـــ طرفین کی خیر و

---

[1] مجموعہ نوادر میں حضرت شاہ صاحبؒ کے گیارہ مکتوبات ہیں۔ میں نے اس مقالے میں دس مکتوبات کل یا بعض کے طور پر لیے ہیں ـــ ان مکتوبات کو مولانا سید ابوالقاسم بن سید محمد عبدالعزیز بنھنوی نے ۱۳۰۴ھ میں مکتوب المعارف کے نام سے مع عرضداشت شاہ ابوسعیدؒ مطبع مطلع الانوار سہارن پور میں شائع کرادیا تھا۔ یہ رسالہ اب کمیاب ہے۔ بقیہ دوسرے اکابر کے مکتوبات جو اگلی قسط میں آئیں گے غیر مطبوعہ ہیں۔

عافیت پر اللہ رب العلمین کی حمد ہے ۔ آپ کا نامۂ مشکیں شمامہ جو بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفۂ خفیہ و اخفیٰ کے بارے میں لکھا تھا ۔ پہونچا ۔ شکرِ الٰہی ادا کیا گیا ۔ یہ راستہ جس پر آپ چل رہے ہیں وہ صراط مستقیم ہے جس پر اکابر اہل عرفان گامزن ہوئے ہیں ۔ کسی قسم کا دغدغہ آپ کے دل میں نہیں ہونا چاہیے ..... حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ خداوند کریم نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ ایک عظیم نعمت ہے اس کے حصول پر جان و دل سے شکر کریں اور مزید نعمت کی توقع رکھیں ۔ اور نورِ محمدی صلی اللہ علیٰ صاحبہ وسلم جو دیکھا ہے وہ بھی نسبت اویسیہ کا ظہور ہے ۔ پہلے سے اس نسبت کی آرزو رکھتے تھے الحمد للہ کہ اب حاصل ہو گئی ۔ دل کی گھبراہٹ کے دفع کرنے لیے یا حمید پڑھنا مفید ہوگا ۔ ایک ہزار مرتبہ ۔ خواہ متفرق پانچوں نمازوں کے اوقات میں خواہ ایک جگہ ۔ وجہ معاش اور آسودگی کے بارے میں متفکر نہ ہوں جو صورت گزر رہی ہے وہ عین حکمتِ الٰہی ہے اور آپ کے حق میں نافع ہے ۔ اگرچہ بالفعل اس کی نافعیت معلوم نہ ہو بالآخر اس کا نافع ہونا واضح ہو جائے گا والسّلام ۔ فقیر کے لڑکے اور اُن کی والدہ سلام کہتے ہیں اور دعائے خیر کے متوقع ہیں اس لیے کہ برادر غائب کے حق میں دعائے مومن مستجاب ہوتی ہے ۔

(۲) سیادت و نقابت پناہ حقائق و معارف آگاہ سالانہ الاکابر میر سید ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ ، بعد سلام محبت التیام مطالعہ نمائند ۔ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من فضلہ ان یدیم العافیۃ لنا ولکم ۔ بعد انتظار بسیار رقیمۂ کریمہ متضمن بعض معارف و بعض اسولۂ ضروریہ رسید چوں مشعر بعافیت و سلامت ایشاں بود مع اولاد و اتباع موجب کمال سرور و باعث حمد الٰہی شد ..... والسلام از اندرون خانہ سلام خوانند ہمیشہ خیریت ایشاں مسئول از جناب رب العزت می باشد انچہ از ایذائے برادران نوشتہ بودند معلوم شد خود سعی در ایذائے کسے نکنند خدائے تعالیٰ نصرت فرماید میر محمد معین و میر محمد امام و میاں یونس سلام خوانند برخوردار سعادت اطوار میر ابو اللیث دعوات خوانند فرزند ابو القاسم مبارکباد خدائے تعالیٰ بعافیت دارد ۔ از عبد العزیز سلام نیاز قبول باد ۔

ترجمہ ـــ سیادت پناہ حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہٗ کی طرف سے بعد سلام محبت الیام مطالعہ کریں ـــ خیر و عافیت پہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے فضل سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ وہ مدام ہماری اور آپ کی عافیت کو برقرار رکھے ـ بڑے انتظار کے بعد آپ کا مکتوب جو کہ بعض معارف اور بعض معاملات ضروریہ پر مشتمل تھا ـــ پہونچا ـ چونکہ وہ مکتوب آپ کی اور آپ کی اولاد و متعلقین کی عافیت و سلامتی سے آگاہی دینے والا تھا اس لیے موجب کمال مسرت اور باعث حمد الٰہی ہوا ..... والسلام اندرون خانہ سے (الہیہ کی طرف سے) سلام ـــ آپ کی خیریت ہمیشہ جناب رب العزت سے چاہی جاتی ہے ـ جو کچھ بھائیوں کی ایذا دہی کے متعلق لکھا تھا معلوم ہو گیا خود کسی کو ایذا دینے کی سعی نہ کریں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا ـــ میر محمد مومن، میر محمد امام اور میاں محمد یونس کو سلام ـ برخوردار سعادت اطوار میر ابو للیث کو دعائیں فرزند ابو القاسم مبارک ہو ـــ اللہ تعالیٰ عافیت سے رکھے ـــ عبد العزیز کا سلام نیاز قبول ہو ـــ

(۳) سیادت و نقابت مآب حقائق و معارف آگاہ سلالۃ الکرام میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ۔ بعد سلام مطالعہ نمائند ـــ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من اللہ عزوجل ان یدیم العافیۃ لنا ولکم ـــ اجمالاً ہمیشہ در حق ایشاں طلب کردہ می آید کہ خدائے عزوجل ہم در ظاہر نعمت خود دہد و بغیر خود محتاج نگذارد و ہم در باطن اعانت و انعام فرماید تا بر جادۂ آبائے کرام مستقر ماندہ بہمہ جہت مرضی باشند انہٗ قریب مجیب ـــ اگر نجیب الدولہ در باب آنعزیز القدر خط موثر نویسد و چوبدار ہمراہ کند می باید بآں طرف رفت متوکلاً علی اللہ و معتمداً علیہ ـــ و ایں رایکے از انواع تیسیر الٰہی دانند و اگر گرمی ہوا ہم رسد اینجا تشریف آوردہ رمضان اینجا گزرانیدہ باہستگی قصد وطن مالوف نمائند۔ خدائے عزوجل ہر چہ اوفق و اصلح باشد ہمارا بظہور آرد والسلام۔ خان عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں از فقیر سلام و دعوات خوانند و شیخ غیاث الدین و سادات دیگر

ہر کہ آنجا باشد سلام محبت مشام مطالعہ نمائند ـــ محمد فصیح بخدمت ایشاں می رسد در کار معہود ہر قدر ممکن باشد توجہ خواہند نمود احتیاج ابرام نیست والسلام ـــ

ترجمہ ـــ سیادت مآب حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں ـــ عافیت پر اللہ کا شکر ہے ـــ اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ـــ اجمالی طور پر ہمیشہ آپ کے حق میں یہ دعا کی جاتی ہے کہ خدائے عزوجل آپ کو ظاہر میں بھی اپنی نعمت سے نوازے اور اپنے علاوہ کسی کا محتاج نہ کرے اور باطن میں بھی اعانت و انعام فرمائے تاکہ اپنے آبائے کرام کے راستے پر قائم رہ کر ہر طریقہ سے پسندیدہ ثابت ہوں انہ قریب مجیب ـــ اگر نجیب الدولہ[1] آنعزیز کے سلسلے میں کوئی مؤثر خط لکھ دیں اور چوبدار ہمراہ کر دیں تو اللہ پر توکل اور بھروسہ کر کے اپنے وطن کی طرف جائیں ـــ اور اس سہولت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی آسانی تصور کریں ـــ اگر گرمی شوق بہم پہونچے تو پھر رمضان ہمارے یہاں آکر گزاریں اور اطمینان سے قصد وطن مالوف کریں۔ جو صورت بھی بہتر ہو اللہ تعالیٰ اس کو ظہور میں لائے۔ والسلام خان عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں کو فقیر کی طرف سے سلام و دعا اور شیخ غیاث الدین اور دیگر سادات جو وہاں (لشکر میں) ہوں ـــ سلام محبت مشام مطالعہ کریں ـــ محمد فصیح آپ کی خدمت میں پہونچ رہے ہیں کار معہود میں جس قدر ممکن ہو توجہ کریں۔ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] میر ابو سعید جائداد کے معاملات میں اپنے وطن سے نجیب الدولہ کے پاس تشریف لے گئے تھے غالباً نجیب الدولہ کا لشکر روہیلہ کھنڈ میں ضلع میرٹھ میں کہیں تھا۔ اس وقت مرہٹوں کا شدید خطرہ تھا، وطن کی واپسی میں دشواریاں پیش آئیں۔ بالآخر وقت مآب ابراہیم خلیل خاں کی ہمراہی میں میر ابو سعید اپنے وطن پہونچے جیسا کہ ایک دوسرے مکتوب سے معلوم ہو رہا ہے۔ ابراہیم خلیل خاں کے حالات کی جستجو ہے۔ ابھی تک ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے بکوتر گرامی پر تاریخ بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہو جاتا کہ یہ کس زمانے کا واقعہ ہے ـــ اندازہ یہ ہے کہ جنگ پانی پت سے کچھ پیشتر کی بات ہے ـــ

(۴) ایک مکتوب گرامی کے آخر میں ارقام فرماتے ہیں۔

..... بست ہر آئندہ ایں صوب احوال ظاہر و باطن خود می نوشتہ باشند کہ خاطر نگراں جانب ایشاں می ماند

اس طرف کے ہر آنے والے کے ہاتھ اپنے احوال ظاہر و باطن لکھ کر بھیجتے رہیں اس لیے کہ دل آپ کی طرف نگراں رہتا ہے۔

(۵) حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمائند ـــــ الحمد للہ علی العافیہ ـــ نامہ مشکیں شمامہ رسید احوال باطن کہ نوشتہ بودند ہمہ بر نہج صوابست انچہ سابق واضح شدہ بود از لطیفہ سر بود و انچہ الحال واضح شد از لطیفہ خفیہ است ہمہ خیر است و ہمہ بر نہج صواب است ان شاء اللہ تعالیٰ بتفصیل و با توفیق با شریعت نوشتہ شود الحال وقت تنگ است ۔ دو ٹوکری بھنگی انبہ رسید دیکے بخانۂ میاں اہل اللہ رسید جزاکم اللہ خیر الجزاء از اندرون خانہ و از فقیر زادہا و از خواجہ محمد امین و جمیع اہل مدرسہ سلام خوانند ـــ

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں ـــ الحمد للہ عافیت سے ہوں ـــ نامہ مشکیں شمامہ پہونچا ـــ احوال باطن جو لکھے تھے سب صحیح ہیں جو حال پہلے ظاہر ہوا تھا لطیفۂ سر سے تھا اور جو کچھ اب واضح ہوا ہے لطیفۂ خفیہ سے ہے سب بہتر ہے اور درست ہے اگر اللہ نے چاہا تو شریعت کے تطابق کے ساتھ تفصیل سے (آئندہ) لکھا جائے گا اب وقت تنگ ہے ـــ آموں کی دو بہنگیاں مجھ کو ملیں اور ایک میاں اہل اللہ کے گھر پہونچی ـ اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے ـــ اندرون خانہ فقیر زادوں نیز خواجہ محمد امین اور تمام اہل مدرسہ کی طرف سے سلام پہونچے ـــ

(۶) ..... بالجملہ بخاطر جمع دریں سیر و سلوک سعی نمائند ہمہ موافق سیر صوفیہ است و ہم مطابق شریعت دریں سخن آخر

الغرض دلجمعی کے ساتھ سیر و سلوک میں سعی کریں یہ سب کچھ سیر صوفیہ کے موافق ہے اور مطابق شریعت بھی ہے۔

طول و عرضے دارد کہ بالفعل در نوشتن نمی آید۔

مطابقت شریعت والی بات ذرا طول عرض رکھتی ہے فی الحال نہیں لکھی جا رہی ہے۔

(۷) حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نقابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ، بعد سلام محبت التزام مطالعہ نمائند۔ الحمد للہ علی العافیۃ۔ ازاں باز کہ بسبب ہجوم مرہٹہ انتقال از میرٹھ نمودہ ہمراہ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں آں گزار گنگا رفتند ـــــ مدتے گزشتہ کہ احوال خیریت مآل آں عزیز القدر نشنیدہ بودم ـــ الحمد للہ نامۂ نامی ایشاں رسید۔ موجب تسکین خاطر فاطر گشت مبدر را احوال و عالم را تفصیل نوشتہ بود و از مشاہدۂ انیصورت انس و سرور و از استماع آں تفرقہ و حزن مجانیز ذ ایں ہمہ موافق قاعدہ است راہیکہ سلف رفتہ اند ہمیں راہ راست ہیچ تردد نیست ..... یک تعویذ نواسیر برائے بستن ..... و دیگر برائے شستہ خوردن فرستادہ شد ـــــ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ نمائند۔

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ کریں ـــــ الحمد للہ عافیت سے ہوں ـــــ اس کے بعد سے کہ ہجوم فوج مرہٹہ کی وجہ سے میرٹھ سے منتقل ہو کر ہمراہ ابراہیم خلیل خاں گنگا پار کر کے (وطن) گئے تھے ـــــ ایک مدت گذر گئی تھی کہ آپ کے احوال خیریت مآل سے آگاہ نہ تھا ـــ الحمد للہ نامہ نامی پہونچا۔ موجب تسکین خاطر ہوا ـــ مبدر کو احوال اور کائنات عالم کو تفصیل ـــ تحریر کیا تھا۔ اس صورت کے مشاہدے سے انس و سرور اور غائب ہو جانے سے تفرقہ و حزن ہوتا ہے اور یہ سب موافق قاعدہ ہے۔ سلف جس راستے پر چلے ہیں وہ یہی راستہ ہے، کوئی فکر دل میں نہ رکھیں ..... ایک تعویذ نواسیر کا باندھنے کے لیے اور دوسرا دھو کر پینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ رفعت مآب ابراہیم خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔

(۸) ..... فقیر بحمد جمعیت ظاہر و باطن ایشان و برائے صحت و مزاج

فقیر آپ کی جمعیت ظاہر و باطن نیز صحت مزاج اور کشادگی رزق کے لیے دعاگو ہے

وکشائش رزق، داعی است خدائے عزوجل بفضل وکرم خود قبول فرماید۔ خدائے عزوجل اپنے فضل وکرم سے یہ دعا قبول فرمائے۔

(۹) حقائق ومعارف آگاہ، خلاصۂ دودمانِ سیادت وسلالۂ خاندانِ سعادت میر ابوسعید سلمہ اللہ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمائند ــ الحمد للہ علی العافیۃ ــ رقیمۂ کریمہ مشتمل بر احوالِ خویش نگاشتہ بودند رسید وبمطالعۂ ایشان صدروپیہ بدست آمد خدائے تعالیٰ برکات بسیار نصیب ایشاں کناد ــ اگر سفارش نواب وچوبدار بدست آمدہ است البتہ بوطن باید رفت امید کرز لطف حضرت لطیف آنست کہ وجہے برائے جمعیت ظاہر پیدا شود انہ قریبٌ مجیب ..... والسلام والاکرام عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں سلام اشتیاق تمام مطالعہ نمایند ــ فقیر محمد امین سلام شوق میرساند۔

ترجمہ ــــ حقائق ومعارف آگاہ ..... میر ابوسعید سلمہ اللہ ــــ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام مطالعہ کریں ــ الحمد للہ خیر وعافیت سے ہوں۔ مکتوب گرامی جو احوال پر مشتمل تھا پہونچا ــ اور آپ کی سعی سے سو روپے حاصل ہوئے اللہ تعالیٰ برکات بسیار آپ کو نصیب فرمائے ــ اگر نجیب الدولہ کی سفارش اور چوبدار مل گیا تو اپنے وطن رائے بریلی جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے امید یہ ہے کہ کوئی صورت جمعیت ظاہر کی پیدا ہوگی انہ قریبٌ مجیب ــ ..... والسلام والاکرام۔ عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔ (کاتب تحریر ہذا) فقیر محمد امین سلام شوق پیش کرتا ہے ــ

(۱۰) حقائق ومعارف آگاہ خلاصۂ دودمانِ نجابت میر ابوسعید بعافیت دارین باشد از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام واضح باد ــ از زبانِ بعض مردم شنیدہ شد کہ آں سیادت پناہ را عارضہ گسل (یا گسل؟) پیش آمدہ بود خاطر متردد است احوالِ خیریت مآلِ خود بنویسند ــ واز سرانجام کار یکہ بسبب آں در لشکر توقف شد نیز برنگارند ــ در رجب صدروپیہ از طرف نواب رسیدہ بود آدم را فرستادہ شد اگر صد یا زیادہ کم بدست آید دریں ایام مطلوب است ــ خانِ والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ نمائند۔ میر عتیق اللہ ومیاں غیاث الدین وجمیع یاران آنجا سلام مطالعہ نمایند ــ

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ..... میرا بوسعید عافیت سے رہیں ـ فقیر ولی اللہ عفی عنہٗ کی طرف سے بعد سلام واضح ہو کہ ـــ بعض لوگوں کی زبانی سنا گیا کہ آپ کچھ علیل ہو گئے تھے ـــ دل پریشان ہے ـ اپنے احوال خیریت مآل لکھیں ـ اور جس کام کی وجہ سے لشکر میں ٹھہرنا پڑا ہے وہ انجام پایا یا نہیں اس کو [illegible] ـــ ماہ رجب میں نواب (نجیب الدولہ) کی طرف سے ستور روپے پہونچے تھے ـــ اگر ستور روپے یا اس سے کم و بیش حاصل ہو جائیں تو اس وقت مطلوب ہیں ـــ آدمی کو بھیجا گیا ہے ـــ خان والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ کریں ـــ میر عتیق اللہ، میاں غیاث الدین اور اس جگہ کے تمام دوستوں کو سلام ـــ

(باقی)

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی کے

چند مخصوص مجربات

عفوف ذیابیطس: اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے۔ چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ ۵/- روپے ۲ تولہ ۱/- روپے

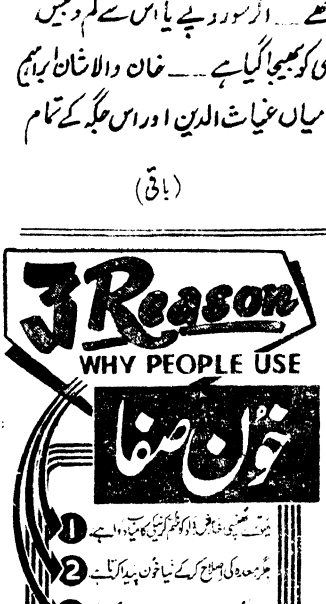
شربت جذام: جذام یا یہ دوا بیحد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کرنے سے یہ مرض دفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ ۱/- روپے

شربت کند: پتھری پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر، ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے قیمت ایک پونڈ ۱/- روپے

شربت دردگردہ: پیشاب میں پھوری ریت آنا اور جھٹکے پیدا ہو جانا یا رک رک کر پیشاب آنا یا درد گردے کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجئے ان کی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں تب بھی کئی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ ۱/- روپے

مرہم سُرخ: پھوڑوں خصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے اس کے استعمال سے جلن کا فور ہو جاتی ہے اور پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے ۵/- روپے

(منیجر) حسنی فارمیسی، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



ایجنسیاں:- بستی، گاندھی نگر
الہ آباد، روشن باغ

سیدنا ابوسفیانؓ

مولانا سراج الحق مچھلی شہری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحیح حدیث مروی ہے "اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ" ترجمہ پوری حدیث کا یہ ہے۔ ذرا اللہ تعالیٰ کی ناخوشی سے ڈرتے رہنا ڈرتے رہنا میرے صحابہ کے بارے میں۔ دیکھو میرے بعد کہیں ان کو (کسی معاملہ میں) نشانۂ ملامت نہ بنانے لگنا۔ جو شخص میرے صحابہ سے محبت کرے گا وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھے گا (وجعلنا اللہ منہم) اور جو شخص میرے صحابہ سے بغض و نفرت کرے گا تو وہ میرے بغض کی وجہ سے اُن سے بغض رکھے گا (واعاذنا اللہ منہم) اور جس نے ان کو ایذا دی اس نے گویا خود مجھے ایذا دی (اعاذنا اللہ منہ) ترمذی مختصراً

اس ارشاد نبوی میں تین لفظ خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ ایک مِنْ بَعْدِیْ (میرے بعد) دوسرے فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ (جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی) اور تیسرے مَنْ آذَاھُمْ فَقَدْ آذَانِیْ (جس نے ان کو ایذا دی اس نے یقیناً مجھے ایذا دی)

چونکہ حضورؐ دیکھ رہے تھے کہ ارشادات قرآنی کے اولین مخاطب۔ میری رسالت و نبوت کے پہلے شاہد اور گواہ۔ قرآن پاک کے پہلے حامل اور عامل یہی صحابہ ہیں اس لئے حضورؐ کو منظور یہ ہوا (اور خدا کی مرضی بھی یہی تھی) کہ صحابہ کی عزت اور حرمت زیادہ سے زیادہ محفوظ اور ان کی عظمت اُمت میں بیش از بیش ملحوظ رہے کیونکہ خود میری عزت اور حرمت اور میری عظمت بھی اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہے حضورؐ کو گوارا نہ ہوا کہ میری ذات پر یا قرآن پاک پر کوئی حرف آئے اس لئے حضورؐ نے اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے چاہا کہ صحابہ کی محترم شخصیتوں پر کسی قسم کا حرف نہ آنے پائے، پس آپ نے نہایت تاکید و اہتمام سے مختلف عنوانات سے ان کے اکرام کا حکم فرمایا، چنانچہ یہیں اگرچہ جملہ خبریہ ارشاد ہو رہا ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ مقصود انشاء و حکم ہے

ان سے محبت کا۔

(۱) مِنْ بَعْدِیْ فرما کر تو حضورؐ اپنا یہ اندیشہ ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ میری حیات اور موجودگی میں تو میرا لحاظ کر کے مخلص اور منافق دونوں ہی قسم کے لوگ صحابہؓ کے ساتھ بھی ضرور محبت کریں گے اور اگر بالفرض کسی کو ان سے کوئی رنجش ہوگی تو میں اسکی اصلاح کر دیا کروں گا اور پھر صلح و سماج کے بعد میری موجودگی کا لحاظ کر کے سب باہم محبت ہی سے رہیں گے۔ غرض میری موجودگی میں سب کو تعلق در اصل مجھ سے ہوگا، اس لئے اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں کہ میری حیات میں کوئی شخص میرے صحابہؓ کے اکرام کے خلاف کوئی قول۔ کوئی فعل۔ کوئی عمل کرے گا۔ البتہ جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تب اس کا اندیشہ زیادہ ہے کہ ان کے احترام میں کمی ہونے لگے کیونکہ میری ذات کے موجود نہ رہ جانے کی وجہ سے سب کی توجہ براہ راست ایک دوسرے کی طرف ہونے لگے گی اور شیرازہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے سب منتشر اوراق کی مانند ہو جائیں گے، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو یا دوسرے لوگ ان کو عام انسان سمجھ کر ان سے عام لوگوں کی طرح معاملہ کرنے لگیں اور ان کی صحابیت فراموش ہونے لگے، اس لئے آپ نے متنبہ فرما دیا کہ میرے بعد بھی ان کا پورا اکرام کرتے رہنا۔ بقول شاعر:

ع: جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا مہمان رہے

(۲) فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ فرما کر حضورؐ نے در اصل صحابہؓ کا درجہ بیان فرمایا ہے یعنی اس ارشاد کے دو پہلو ہیں، ایک کی تعبیر تو بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ "بِسَبَبِ حَتّٰی اِیَّاهُمْ اَحَبَّهُمْ" یعنی اس مسلمان نے ان سے اس وجہ سے محبت کی ہے کہ خود مجھے ان صحابہؓ سے محبت ہے۔ اس میں محبت کی نسبت فاعلی حضورؐ کی جانب اور نسبت مفعولی صحابہ کی جانب ہے اور حضورؐ صحابہؓ کو اپنا محبوب فرما رہے ہیں، اس صورت میں یہ مضمون گویا اَکْرِمُوْا اَصْحَابِیْ کا ہم مضمون ہوگا۔ اور دوسرے پہلو کی تعبیر ان الفاظ میں سمجھئے کہ "بِسَبَبِ حُبِّیْ اِیَّاهُمْ اَحَبَّهُمْ" یعنی اس مسلمان نے میرے صحابہؓ سے اس وجہ سے محبت کی کہ اسے مجھ سے محبت ہے تو میرے دوستوں اور ساتھیوں سے بھی محبت ہونی ہی چاہیئے بقول شاعر ع: وَمَنْ مَذْهَبِیْ حُبُّ الدِّیَارِ لَاَهْلِهَا۔ اس صورت میں حضورؐ گویا اپنی محبت کا واسطہ دے کر ان سے محبت کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

(۳) ثمرہ لفظ "فَقَدْ اٰذَانِیْ" فرما کر حضورؐ نے انتہائی اہم اصل کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی اگر تو یہ رنجش اللہ کے لئے ہو تو آپ کی جگر گوشہ فاطمہؓ جن سے حضورؐ کو طبعی محبت تھی بغایۃً ما ایک موقع پر حضورؐ نے ان کی ایذا کو اپنی ایذا کے برابر فرمایا تھا فَاِنَّمَا هِیَ بَضْعَةٌ مِنِّیْ یُرِیْبُنِیْ مَا اَرَابَهَا وَیُؤْذِیْنِیْ مَا اٰذَاهَا (بخاری)

اسی طرح آپ نے سیدنا عباسؓ کے بارہ میں فرمایا" مَنْ آذٰی عَمِّیْ فَقَدْ آذَانِیْ" جس نے میرے چچا کو ستایا اس نے گویا مجھے ستایا۔ غرض جس طرح حضورؐ نے خون قرابت اور عزیز داری رکھنے والوں کی ایذا کو اپنی ایذا کے برابر بتایا ٹھیک اسی طرح دینی رشتے (شرع و دین) سے یگانگی رکھنے والے صحابہؓ کی ایذا کو بھی حضورؐ نے اپنی ایذا کے برابر بتایا ہے۔

غرض اس اہتمام سے اکرام صحابہؓ کی ترغیب دینے سے میری سمجھ میں دو باتیں یہ آتی ہیں کہ:۔

(۱) اس اہتمام سے حضورؐ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ سے جو محبت رکھی جائے وہ ایسی ہونی چاہیئے جس میں حضورؐ کی محبت واسطہ بنے اور حضورؐ کی صحبت اسکی محرک و باعث ہو یعنی صحابیت کو اولیت تقدم کا درجہ دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی نے کسی ایسے صحابی سے محبت رکھی جن میں خود ذاتی خوبی، شخصی کمال، نسبی کرامت، شجاعت، غنا، تقدم اسلام، ہجرت، شرکت جہاد وغیرہ کی حیثیتیں خود ہی محبت کا تقاضا کرتی ہوں مثلاً سیدنا ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰ، ابن عوف، احمد، حسین وغیرہم رضی اللہ عنہم تو یہ محبت تو طبعی اور ذوقی محبت بھی ہوگی گو یہ بھی فی نفسہ ایک فضیلت ہے مگر یہ محبت اس حکم نبوی کے امتثال و تعمیل میں نہ ہوگی بلکہ ایسی طبعی اور ذوقی محبت کا تو حکم دینے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ پس اس حکم کا اقتضا سوا اس کے کچھ نہیں کہ حضورؐ کا منشا یہ ہے کہ بالفرض میرے کسی صحابی سے قبل اسلام یا بعد اسلام کوئی واقعہ ایسا ہو بھی گیا ہو جس سے کسی مسلمان کے قلب میں ان کے لئے جگہ کشائی نہ معلوم ہوتی ہو تب بھی اسے میرا خیال کرکے ان سے محبت کرنی چاہیئے کیونکہ انھوں نے میری دعوت پر کفر چھوڑ کر اسلام اختیار کیا نور محبت اور نور ایمان کے ساتھ مجھے دیکھا اور میرے ساتھ رنج و راحت۔ میدان جہاد اور اطاعت میں شریک رہے، طبیعت کے موافق اور مخالف احکام کو مانا اور مرتے دم تک اسلام پر قائم رہے۔ دنیا پر آخرت کو ترجیح دی، دکھ جھیلے، جانیں دیں، نور اسلام پھیلایا۔ پس اس حکم محبت کا تو منشا پورا ہوتا ہے، در اصل سیدنا ابوسفیان، معاویہ۔ عمرو بن العاص۔ مغیرہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت کرنے سے۔ اگر کسی مسلمان نے ابوبکر و علی رضی اللہ عنہم سے محبت کی تو کون سا بڑا کمال کیا کیونکہ ان کے ہر ذاتی اور کمالات دینی و روحانی۔ فضائل اخلاقی و عقلی کی طرف اپنے تو اپنے غیر دیگانہ بھی جھکتے ہیں اور ان کی تحسین کرنے پر مجبور ہیں البتہ وہ صحابہؓ جن کو دشمنان دین نے طرح طرح سے ایسا بدنام کر دیا کہ آج بہت سے مسلمانوں کے دلوں سے ان حضرات کی عظمت و حرمت کم آپ کم یا گم پائیں گے۔

ان مظلوم صحابہؓ سے صرف رسول کی محبت کے ناطے محبت کرنا البتہ اس مبارک ارشاد کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

کسی صحابی کے قبل از اسلام حالات کے بیان کرنے میں بھی لازم ہے کہ ان کی صحابیت اور حرمت کو برابر ملحوظ رکھا جائے۔ یعنی اگر کسی مؤرخ کو آج ضرورت ہے کہ وہ مثلاً حضرت ابوسفیان کے قبل اسلام کے واقعات لکھے تو ان الفاظ میں کہ "اُس نے ایسا کیا۔ اُس نے کہا۔ وہ یہ چاہتا تھا" ہرگز ہرگز نہ لکھنا چاہیئے۔ اس کو دوسری مثال سے سمجھئے اگر ان لیجئے آج کوئی مسلمان مکہ کے ابوجہل کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو غور فرمائیے کہ وہ ابوجہل جیسے کسی کافر کے لئے کیا طرز اختیار کریگا؟ وہ یہی تو لکھے گا کہ "ابوجہل یہ چاہتا تھا، ابولہب یہاں گیا"۔ تو آخر آپ نے ایک صحابی کا حال لکھنے میں ارشاد رسول کا کیا حق ادا کیا، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ذکر قبل اسلام میں (جبکہ حضرت ابوسفیان کا خاتمہ یقینی طور پر اسلام پر ہوا) اور ابوجہل کے حالات میں (جب کہ اس کا خاتمہ یقینی طور کفر پر ہوا) آپ نے کیا فرق رکھا؟ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم سیدنا ابوسفیان کے حالات درج کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہت سے مسلمان بھائی ان کی حرمت و عظمت سے تو درکنار خود ان کے حالات سے بھی واقف نہ ہوں گے۔

آپ کا نام و نسب حضرت ابوسفیانؓ کا نام نامی صخرؓ تھا اور کنیت ابوسفیان تھی۔ مگر صخرؓ زیادہ مشہور نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے نام کے سلسلہ میں بعض اہل علم نے بھی غلطی کی ہے ان کے والد کا نام حرب اور دادا کا نام امیہ تھا جو خوصلہ مند اور بہادر ہونے کے باعث اموی خاندان کے مورث اعلیٰ بنے آپ کا نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں چوتھی پشت میں جاکر مل جاتا ہے، نسب نامہ یوں ہے:-

۱۔ حضرت سرور کائنات مفخر موجودات سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابن خواجہ عبداللہ[۲] ذبیح ابن خواجہ شیبہ (عبدالمطلب)[۳] ابن خواجہ ہاشم[۴]، ابن عبد مناف۔

۲۔ سیدنا ابوسفیان صخر رضی اللہ عنہ[۱]، ابن حرب[۲]، ابن امیہ[۳]، ابن عبدالشمس[۴]، ابن عبد مناف

مکہ میں قریش کے چند گھرانے بہت ممتاز اور مشہور تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شریف و مشہور معزز اور مقدس گھرانہ بنو ہاشم کا تھا کیونکہ اہل مکہ بلکہ پورے عرب کی دینی سیادت یعنی کعبہ کی حجابت و سدانت

انھیں میں تھی، ان کے بعد دوسرا معزز گھرانہ بنوامیہ کا تھا کیونکہ اہل مکہ کی دنیاوی سیادت اور فوجی قیادت انھیں میں تھی۔ بنواسد، بنو مخزوم وغیرہ گھرانے ان کے بعد تھے، کیونکہ ان گھرانوں میں جو قومی مناصب تھے مثل سفارت، خطابت وغیرہ ان کی اہمیت قوم میں اتنی زیادہ نہ تھی۔ بنوہاشم اور بنوامیہ میں قرابتیں بھی باہم زیادہ ہوتی تھیں۔

حضرت ابوسفیان صخر اسی بنوامیہ کے گھرانہ سے تھے۔ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دس برس بڑے تھے، یہ قریش کے معززین واشراف میں تھے۔ بہادر، سمجھ دار، خوش خلق تھے قوم نے ان کو بالاتفاق سپہ سالار لشکر بنا دیا۔ حضورؐ میں اور ان میں اعلان نبوت سے قبل باہم وہی محبت تھی جیسی عموماً قریبی رشتہ داروں میں ہوا کرتی ہے۔ اعلان نبوت کے بعد بھی ان کو اور ان کے صاحبزادے سیدنا معاویہؓ کو حضورؐ سے یا اسلام سے ذاتی طور پر کوئی خصومت، کد، کدورت وغیرہ نہ تھی، پوری قوم کو جو مخالفت حضورؐ سے تھی اس میں تو حضرت صخر نے ضرور قوم کا ساتھ دیا اور من حیث القوم حضرتؐ سے جنگ بھی کی مگر اس وقت بھی انھوں نے کوئی ایذا حضورؐ کو نہیں پہنچائی۔ اوقات جنگ میں ضرور حضورؐ سے لڑے مگر جیسی ایذا و شرارت کی حرکات ابوجہل مخزومی اور ابولہب ہاشمی سے ظاہر ہوئیں کہ کبھی حضورؐ کی پشت مبارک پر بحالت سجدہ اونٹ کی بھوجھ رکھ دی، کبھی حضورؐ کی چادر گھسیٹی جس کے نشانات گردن مبارکؐ ظاہر ہوئے، کبھی حضورؐ کے راستہ میں کانٹے بچھائے، ایسی کوئی حرکت کسی تاریخ میں حضرت صخر کی طرف سے منقول نہیں۔ حضرت صخر رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اوقات جنگ کے علاوہ برابر حضورؐ کے ساتھ میل ملاپ۔ رشتہ داری کے لحاظ، آدمیت کے پاس اور شرف آبا کے موافق برتاؤ کرتے تھے۔

قبل اسلام اگرچہ کچھ بددینوں نے آپ کو بہت بدنام کیا ہے اور آپ کے متعلق کچھ غلط باتیں دینی اور تاریخی کتابوں میں شامل کر دی ہیں، مگر آپ کے حسب ذیل واقعات اب بھی کتب سیر و رجال میں ملتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے حسن تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۱) اعلان نبوت کے بعد جب کفار مکہ حضورؐ کو بہت ستانے لگتے تو آپ ان کے ہجوم اور شر سے بچنے کے لئے بعض وقت گھبرا کر انھیں حضرت صخر کے مکان میں چلے جاتے، وہ مکہ کے معززین میں ہونیکے علاوہ فوج کے سپہ سالار بھی تھے، اہل مکہ پر ان کا ایک رعب تھا۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی شرپسندوں کی ایذا سے حضورؐ کو امن مل جاتا۔ گو وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر شرف نسب اور رکم طبع کی یہ خصلت ان میں

بدرجۂ اتم تھی کہ اگر عام دشمن بھی کسی پریشانی میں کسی وقت ہمارے گھر آکر پناہ لینا چاہے تو اس کو امن، راحت دی جائے اور اس کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ اُسے خطرہ سے بچایا جائے اس وقت اُسے ستانے کو شرافت کے خلاف جانتے۔ یہ تو عام دشمن کے ساتھ برتاؤ ہوتا اور حضورؐ جیسے عزیز قریب (مگر مسلک میں مخالف) کیساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ ان کا تھا بلکہ ان کے گھر میں حضورؐ کے پناہ لینے کے وقت ان کے پورے گھرانے ہی کا برتاؤ صلہ رحمی کا تھا۔ چونکہ حضرت صخرؓ نے حضورؐ کے ساتھ خوش خلقی اور صلہ رحمی اس وقت کی جب مکہ میں حضورؐ پریشان تھے، اسی لئے حضورؐ نے بھی آٹھ دس برس بعد موقع ملنے پر ان کی اس نیکی کی قدردانی کی اور فتح مکہ کے وقت یہ اعلان فرمادیا کہ جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے لے گا اُسے بھی امان ملے گی (مفصل قصہ آگے آرہا ہے) (اصابہ ذکر صخر)

(۲) حضورؐ نے مدینہ کے قیام کے زمانہ میں حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعہ کچھ تحفہ کھجور حضرت صخرؓ کے پاس ہدیۃً بھیجی تو انھوں نے بھی جواب میں کوئی چیز (جس کو حدیث میں رقم کہا گیا ہے) حضورؐ کے پاس ہدیۃً بھیجی بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ ہی نے فرمائش کر کے ان سے اوم منگوائی تھی (منتقی از حافظ ذہبی ص۲۵۳ حاشیہ ۲)

(۳) حضورؐ نے مدینہ میں سُنا کہ مکہ میں قحط اور تنگی ہے تو حضورؐ نے کئی سو دینار کسی کے ذریعہ حضرت صخرؓ کے پاس بھیجے کہ یہ رقم مکہ کے اہل حاجت میں تقسیم کردیں۔ حضرت صخرؓ ابوسفیان نے رقم لے تو لی مگر ہنس کر کہا اچھا اب یہ محمدؐ ہمارے نوجوانوں کو شاید خریدنا چاہتے ہیں (حضورؐ نے یہ رقم ابوسفیان ہی کے پاس بھیجی تو اس سے خاص تعلق اور خصوصی قرابت ظاہر ہوتی ہے)

(۴) ۶ھ میں حضورؐ نے حضرت ابوسفیان صخرؓ سے (یا تو بذریعہ قاصد مکہ میں کہلایا۔ یا شاید کسی سفر میں صخرؓ خود مدینہ گئے ہوں جب خود) کہا کہ تمھاری لڑکی ام حبیبہ رملہ بیوہ ہوگئی ہیں۔ میں اُن سے نکاح کرنا چاہتا ہوں تم بھی اجازت دیدو تو بہتر ہے انھوں نے اجازت دیدی چونکہ رملہ اس وقت حبش میں تھیں۔ حضورؐ نے حبش کے نواب نجاشی کے پاس جو مسلمان ہوگئے تھے انھیں صحابی عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعہ کہلایا کہ میں تم کو اپنا وکیل بناتا ہوں کہ تم رملہ بنت ابی سفیان کی عدت گزرنے کے بعد ان سے میرے نکاح کا پیام دو۔ اگر وہ راضی ہوں تو تم وہیں اُن سے میرا عقد نکاح کردو۔ نجاشی نے بی بی رملہ کی عدت گزرتے ہی ایک کنیز سیدہ رملہ کے پاس بھیجی اور حضورؐ کا پیام نکاح ان کو دیا۔ وہ پہلے ہی خواب دیکھ چکی تھیں کہ کسی نے ان کو "ام المومنین" کہہ کر پکارا ہے، اب نجاشی کی کنیز کی زبانی یہ پیام سُن کر سمجھ گئیں کہ خواب کی تعبیر یہی تھی انھوں نے قبول کرلیا تو کنیز نے دوسری

یہ کہی کہ تم کسی کو اپنی طرف سے اپنے نکاح کا وکیل بنا دو جو تمہارا نکاح حضورؐ کے ساتھ کر دیں، انھوں نے خالد بن سعید مہاجر حبشہ کو اپنا وکیل بنا دیا۔ نجاشی نے محفل نکاح ترتیب دی اور حضور کے چچیرے بھائی جعفر بن ابی طالب سے جو حبش میں ہجرت کر کے مقیم تھے کہا کہ نکاح تم پڑھو، چنانچہ حضرت جعفر نے خطبہ پڑھ کر نجاشی وکیل آنحضرتؐ اور حضرت سعید وکیل سیدہ رملہ کی موجودگی میں عقد نکاح باندھ دیا۔ نجاشی نے حضورؐ کا وکیل اور نائب بن کر سیدہ رملہ کا مہر چار سو اشرفی خود تجویز کیا اور اسی مجلس میں حضورؐ کی طرف سے خود ادا بھی کر دیا۔

اس نکاح کی خوشی میں سیدہ رملہ نے چاندی کے دو کنگن نجاشی کی اس کنیز کو دے ڈالے۔ اس کے بعد حضورؐ نے ایک دوسرے صحابی حضرت شرحبیل بن حسنہ کو بھیجا کہ ام المومنین رملہ رضی اللہ عنہا کو حبشہ سے مدینہ لے آئیں۔ حضرت ابوسفیان صخر کو جب نکاح کی اطلاع ملی تو انھوں نے حضورؐ کی ثنا و تحسین ہی کی۔ (منتقی طبع مصر، ص ۲۵۴ حاشیہ)

(فائدے) اول چونکہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو حضورؐ نے کئی بار کئی موقعوں پر حضرت ابوسفیان صخر کے پاس مختلف کاموں سے بھیجا تو کچھ بدظن ہو گئے اور ابوسفیان کی بدگوئی کرنا چاہتے ہیں اور اسی بدگوئی کی نیت سے امیر حمزہ کی جھوٹی کہانیوں میں ان کو انھوں نے معاذ اللہ عیار، مکار، لالچی وغیرہ لکھا ہے یہ صریح مخالفت ہے حکم لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا کی۔

دوم۔ مہر عورت کا حق ہے اور لڑکی والے ہی اسے مقرر کرتے ہیں۔ سیدہ رملہ کا مہر بھی حضرت خالد نے کچھ کہا ہوگا مگر حضورؐ کے اس نکاح میں نجاشی نے جو نائب بن کر چار سو اشرفی مہر مقرر کیا، اسکی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مرد کو حق ہے کہ مقررہ مہر سے بڑھا کر اپنی خوشی سے زیادہ رقم ادا کر دے۔ نجاشی چونکہ نواب تھے اس لئے انھوں نے نیابت میں خود اپنی ریاست کی بھی رعایت کی اور رئیسوں کا سا مہر بخوشی بڑھا کر ادا کیا۔ آیت قرآنی وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں اس حسن خلق کی تعلیم ہے۔

(۵) ان کا اسلام لانا (جس کا مفصل بیان آگے آرہا ہے) بھی حضورؐ ہی کی ایک دعا کی برکت سے تھا۔ امام سیوطی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ حضورؐ کی بعثت کے اوائل میں ایک دن ابوجہل نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک تھپڑ مار دیا تھا، انھوں نے اس کی شکایت جا کر حضورؐ سے کی، آپ نے فرمایا بیٹی جاؤ اور ابوسفیان سے اس کا تذکرہ کرو۔ انھوں نے جا کر ابوسفیان سے کہا۔ انھوں نے سیدہ فاطمہؓ کا ہاتھ پکڑا (کیونکہ بہت چھوٹی تھیں) اور

لے کر وہاں پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا تھا اور کہا کہ بیٹی تم بھی اس کے منہ پر تھپڑ مارو، جیسے اس نے تمہیں مارا تھا (اور اگر کچھ بولے گا تو میں اس سے نپٹ لوں گا) انھوں نے ابوجہل کو تھپڑ مارا۔ اس کے بعد انھوں نے آکر یہ سارا واقعہ حضورؐ سے بیان کیا تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے اور دعا کی "اللّٰھمّ لاتنساھا لابی سفیان" (اے میرے اللہ! ابوسفیان کے اس نیک سلوک کو بھولئے گا نہیں) ابوسفیانؓ کا ایمان لانا حضورؐ کی دُعا ہی کی وجہ سے تھا۔

(دیکھو سیرت نبویہ سید احمد زینی دحلان برحاشیہ سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، صفحہ ۳۰۶ طبع مصر)

(۶) صلح حدیبیہ کے بعد (۶ھ) میں بُصریٰ کے سردار کے پاس حضورؐ نے اسلام کا دعوت نامہ بھیجا جو ہرقل شاہ روم کے نام تھا اُس نے وہ فرمان نبوی ہرقل شاہ روم کی خدمت میں پیش کیا اس نے جب فرمان پڑھا تو اہل دربار سے اہل عرب کے متعلق دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ مکّہ کے قریشیوں کا ایک قافلہ تجارت کے لئے آیا ہوا ہے، اُس نے ان لوگوں کو بُلوایا اور پوچھا کہ عرب کے ان رسول کا سب سے قریبی رشتہ دار تم میں سے کون ہے، ابوسفیان صخر بولے کہ میں ان کا چچیرا بھائی ہوں اس کے بعد اُس نے اُن سے چند سوالات کیے اور جوابات پانے کے بعد ہرقل نے اپنے سوالات کی حکمت بتائی اور کہا کہ جو باتیں تم نے بتائی ہیں اگر وہ سب سچ ہیں تو ان کا قبضہ ایک نہ ایک دن اس جگہ تک ہو کر رہے گا جہاں یہ میرے دونوں قدم ہیں"۔ یہ سُننا تھا کہ دربار کے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا (ان کو محسوس یہ ہوا کہ شاید ہرقل بھی مسلمان ہو گیا یا ہونے والا ہے) تو ہرقل نے ان مکہ والوں کو دربار سے رخصت کر دیا جب ابوسفیان وہاں سے باہر آئے تو انھوں نے ساتھیوں سے کہا۔ خود ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

"لقد أمر امرُ ابن ابی کبشة انه	ارے! ابی کبشہ (شوہر حلیمہ) کے بیٹے
یخافه ملك بنی الاصفر۔ فما	(حضورؐ کا معاملہ اب اس حد تک پہنچ گیا کہ رومی
زلت موقناً انه سیظهر حتی	گوروں کا بادشاہ ہرقل بھی ان سے ڈرنے لگا!
ادخل الله علیّ الاسلام"	بس اُسی دن سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ غالب ان کا

ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اسلام داخل فرما دیا۔ (بخاری باب بدء الوحی)

یعنی مجھے ان کے غلبہ کا یقین ہو گیا اور اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ میں اسلام لایا۔ دعاء نبوی کے بعد ان کا یہ

یقین ان کے اسلام لانے کی طرف پہلا قدم تھا۔

ان کا اسلام لانا حضورؐ نے جب ۸ھ میں مکہ پر چڑھائی کی تو مکہ کے قریب پہنچ کر ایک مقام مرّ الظہران پر رات گزارنے کے لئے پڑاؤ کیا۔ ابوسفیان کو مکہ میں اسکی اطلاع ملی تو دو ایک ساتھیوں کے ساتھ جاسوسی کے لئے اسلامی فوج میں پیچھے پیچھے پہنچے۔ فوج کی شان دیکھ کر سناٹے میں آ گئے۔ دُور تک دس ہزار مجاہدوں کا لشکر اُترا پڑا تھا۔ ہر قبیلہ کے خیمے الگ، ہر پلٹن اور قبیلہ کا جھنڈا الگ، لوگ ہر طرف پھیلے ہوئے، ذکر نماز، تلاوت میں یا کھانے پینے کی ضرورتوں یا فوجی تیاریوں میں مشغول نظر آئے۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ ابوسفیان ابھی اس منظر کے دیکھنے اور تعجب کرنے ہی میں لگے تھے کہ بعض مجاہدین نے ان کو پہچان لیا۔ ان سے تو وہ کچھ نہیں بولے، دوڑے ہوئے سیدھے حضورؐ کے پاس پہنچے کہ حضورؐ سے اجازت مل جائے تو ان کو یہیں ٹھکانے لگا دیں۔ اُدھر قدرت کا انتظام سُنئے اسی وقت ان کو حضرت عباسؓ نے بھی دیکھ لیا ابوسفیانؓ اور حضرت عباسؓ دونوں میں بہت دوستی تھی، حضرت عباسؓ خچر پر سوار تھے، تیزی سے ان کے پاس آئے اور ان کو اپنے پیچھے خچر پر بٹھا کر تیزی سے حضورؐ کے خیمہ کی طرف دوڑے، انھیں خطرہ ہوا کہ کہیں کوئی مسلمان غصہ میں آ کر ان کو قتل نہ کر دے یا کوئی دوسرا حضورؐ کے پاس مجھ سے قبل نہ پہنچ جائے۔ خیمہ کے پاس پہنچ کر ان کو باہر چھوڑا، خود اندر گئے تو دیکھا ایک دوسرے صحابی عمرؓ پہلے سے پہنچکر حضورؐ سے ابوسفیان کی جاسوسی کا ذکر کر کے ان کے قتل کی اجازت مانگ ہی رہے تھے کہ حضرت عباسؓ نے جلدی سے عرض کیا "یا رسول اللہ میں نے ان کو اپنی پناہ میں لیا ہے اور انھیں اپنے ساتھ لایا ہوں، باہر کھڑے ہیں، اجازت ہو تو بلاؤں"، فرمایا بلاؤ۔ جب وہ آئے تو آپ نے اُن سے فرمایا:۔

"ابوسفیان! کیا تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری ذات اس قابل ہے ہی نہیں کہ انسان (اشرف المخلوقات ہو کر) اسکی غلامی یا اُسے سجدہ کرے"؟

یہ سُن کر ابوسفیان صحر بولے "واقعی آپ بڑے حلیم اور نیک ہیں (کہ مجھے آپ نے سزا دینے کی بجائے تبلیغ و نصیحت فرمائی) واقعی اگر کوئی ذات قابل پرستش ہوتی تو اس وقت تیری مدد کرتی (مطلب یہ ہوا کہ خدا کے سوا کوئی ذات معبود و پرستش کے قابل نہیں) جب حضورؐ نے اُن سے یہ اقرار توحید سُن لیا (جو اسلام کی طرف ان کا دوسرا قدم تھا) تو فرمایا:۔

"اور کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا کہ تم مجھے حق تعالیٰ کا رسول مانو"؟

حضرت ابوسفیان نے جواب میں پھر کہا:

"واقعی آپ بڑے حلیم ہیں۔ مگر آپ پر میرے ماں باپ قربان! ابھی اس معاملہ (رسالت) میں میرے دل میں کچھ شک باقی ہے۔"

یہ سیدنا ابوسفیان کی انتہائی دیانت اور سچائی تھی کہ جو بات دل میں تھی اُسے صاف کہہ دیا۔ بہرحال یہ سُن کر حضور سمجھ گئے، ابھی میری اطاعت سے اور تسلیم رسالت سے ان کو انکار ہے۔ سپہ سالار اور سردار قریش ہونے کا غرور اور جاہلیت کا نخوت اور عناد ابھی مزاج میں ہے۔ حضور خاموش ہو رہے۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ:

"حضورؐ! ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہیں ان کے ساتھ کچھ رعایت ہی کی جائے تو مناسب ہے۔"

حضورؐ نے وہیں مرّ الظہران میں یہ اعلان فرما دیا کہ:

"کل جو شخص مسجد حرام[1] میں پناہ لے گا۔ یا جو ابوسفیان[2] کے گھر میں پناہ لے گا۔ یا جو ہتھیار ڈال دے گا۔ یا جو اپنے گھر میں گھس کر اپنا دروازہ بند کر لے گا اور ہم سے نہ لڑے گا۔ ان سب کو امان ہے۔"[3]

یہ فرما کر آپ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا ان کو اس طرح واپس لے جاؤ کہ مسلمانوں کی فوج کی پوری شان دیکھتے ہوئے جائیں، تو حضرت عباسؓ اسی طرح پوری فوج کی سیر کراتے ہوئے ان کو تنگ کے قریب پہنچا کر واپس چلے گئے اور حضرت ابوسفیان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سطوت ظاہری اور فتح اخلاقی کی حیرت افزا داد لیتے ہوئے اپنے گھر پہنچے وہ اگرچہ اسلام نہیں لے آئے تھے مگر مائل بہ اسلام ضرور ہو چلے تھے (ایک روایت تو مرّ الظہران کے روئداد کی یہ بھی لیکن اس روئداد کی ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ) جب مرّ الظہران میں ابوسفیان صخر نے فوج کے مجاہدین کی شان دیکھی پھر حضور کے سامنے پہنچے تو یہ دیکھا کہ سب مجاہدین حضورؐ کے ایسے عاشق ہیں کہ حضورؐ کے قریب پہنچنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اس وقت حضور کا درجہ دیکھ کر ان کے دل میں کچھ حسد سا پیدا ہوا اور دل میں ارادہ کرنے لگے کہ "اچھا تو میں بھی ان کے مقابلہ کے لئے ایک بڑی فوج جمع کر لاؤں گا" بس ادھر ان کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ حضورؐ نے اُن کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا "اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ

تم کو بہت ذلیل کر دیں گے"۔ حضرت ابوسفیانؓ یہ معجزہ دیکھ کر کہ حضورؐ کو خطرۂ قتلی کی اطلاع ہوگئی چونک سے پڑے، ادھر حضرت رسالت پناہؐ کا دست رحمت جو (حضرت عمرؓ کے واقعہ کی طرح) ان کے سینہ سے مس ہوگیا تو یکایک حسد کا وہ شیطانی جذبہ دل سے دور ہوگیا اور آپ کے منہ سے بیساختہ استغفراللہ واتوب الیہ نکل گیا اور کہنے لگے "خدا کی قسم میں نے یہ بات کسی کے سامنے اب تک نہیں کہی تھی بس اسی وقت یہ خیال دل میں آیا تھا کہ آپ کو خدا نے اس سے مطلع فرمایا، اس معجزہ پر مجھے آپ کے رسول برحق ہونے کا بھی پورا یقین ہوگیا"۔ یہ اسلام کی طرف آپ کا چوتھا قدم تھا مگر اب بھی کچھ کسر باقی تھی۔ اپنی سپہ سالاری کا ایک آخری غرور پھر آپ کے دل میں گزرا کہ "نہ جانے یہ محمدؐ کس وجہ سے ہم پر غالب آرہے ہیں"۔ ان کے دل میں یہ خطرہ گزر ہی تھا کہ حضورؐ نے فرمایا "خدائے واحد کی مدد سے غالب ہوں"۔ یہ سن کر ان کے دل و دماغ سے تمام شکوک و شبہات دور و زائل اور سپہ سالاری اور سیادت کا غرور چکنا چور، قلب کا رنگ ہمیشہ کے لئے کافور ہوگیا اور آپ وہیں مرالظہران ہی میں فتح مکہ سے قبل کی رات ہی میں سچے دل سے پکار اٹھے کہ:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" صَلَّى اللّٰهُ علیٰ نبینا و سلم (یہ دونوں روایتیں اصابہ میں ہیں)

(فائدہ) چونکہ سیدنا ابوسفیانؓ کی زندگی اسی سیادت و سپہ سالاری میں گزری تھی بلکہ انکی کئی پشتیں اسی ریاست و سرداری کی حالت اور اسی غرور میں گزری تھیں اسلئے سولہ ۱۶ برس تک حضورؐ سے برسرپیکار رہے اور اسی وجہ سے ہر آخری موقع پر بھی حسد اور مقابلہ کے خیالات ان کے دل میں آرہے تھے مگر اس ذات میں انکی سعادت ازلی اور دولت سرمدی (اسلام) کا وقت آگیا تھا اسلئے یہ حالات پیش آئے اور جیسے ہی حضورؐ کا کیمیا اثر دست مبارک ان کے قلب اور سینہ سے مس ہوا سارا زنگ دور ہوگیا، وہ اب تک منصب سالت کی رفعت و فضیلت سے واقف نہیں تھے نہ وہ حضورؐ کی صحبت میں رہے تھے اس شب کو ان کو اخلاق نبوی کی بلندیوں کا بھی علم ہوا اور اپنے متعلق حضورؐ کے دو معجزے بھی دیکھے تو سچے دل سے اسلام لے آئے۔

بعد اسلام بہرحال ۸ھ میں فتح مکہ سے ایک رات قبل مقام مرالظہران میں آپ بہ عمر ۴۱ سال ایمان لائے اور آپ کا ایمان اچھا اور سچا ثابت ہوا چنانچہ آپ کے کارنامے اسلام میں نمایاں ہیں۔

(۱) حضورؐ نے مشرکین کی ایک مشہور دیوی منات کو گرانے اور توڑنے کا کام انھیں کے سپرد فرمایا۔ آپ اس بستی میں

گئے اور آپنے اسے توڑ کر برباد کر دیا کسی کو ان کے سامنے آنے کی تاب نہ ہو سکی۔ بُت توڑنے کا کام حضورؐ نے بہت ہی خاص خاص صحابہؓ سے لیا ہے اُن میں حضرت ابوسفیانؓ بھی ہیں (فائدہ) کفر و شرک سے انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ کفار عرب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خدا بغیر بیوی کے کیونکر ہو سکتا ہے اسلئے انھوں نے اللہ کے لفظ میں تانیث لگا کر اللات ایک دیبی اور نعوذ باللہ اللہ کی بیوی تجویز کی اسی طرح منّان کے لفظ میں ت لگا کر دوسری دیبی منات تجویز کی اور عزیز کے لفظ میں ت لگا کر تیسری دیبی عزّیٰ بنا لی نعوذ باللہ۔

(۲) غزوۂ حنین میں حضرت صخرؓ نے حضور کے ہمرکاب ہو کر جہاد کیا۔ اس جنگ میں حضورؐ نے آپ کی دلیری جانبازی سے خوش ہو کر ان کو مال غنیمت میں سے سو اونٹ اور چالیس اوقیہ سونا عطا فرمایا۔

(۳) فتح طائف میں بھی آپ نے حضورؐ کے ہمرکاب ہو کر جہاد کیا کہ اچانک ایک تیر آپ کی ایک آنکھ میں آکر لگا اور آپ کی آنکھ جاتی رہی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا "ابوسفیان! کہو تو میں دعا کر دوں اور تمھاری آنکھ اچھی ہو جائے لیکن اگر تم پسند کرو اور صبر کرو تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض تم کو جنت دیں گے"۔ آپنے زبان سے جنت کی بشارت جو سُنی تو تکلیف کا احساس اسکے سامنے جاتا ہی رہا اور آپ نے عرض کیا "میں جنت چاہتا ہوں" آپ نے سوچا ہوگا کہ اگر حضورؐ کو دعا کرنا پسند ہوتا تو از خود دعا فرما دیتے مجھ سے نہ پوچھتے مگر جب مجھ سے پوچھ رہے ہیں تو یقیناً حضورؐ کو پسند یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں آنکھ جانے پر صبر کروں اور اسی میں میرے لئے خدا کی طرف سے مصلحت، خیریت اور رحمت معلوم ہوتی ہے۔

(۴) آپ عہد فاروقی میں ۱۳ھ میں جنگ یرموک میں اپنے بڑے بیٹے یزید کی ماتحتی میں جہاد کر رہے تھے جنگ سخت تھی اسلامی فوج کچھ سُست ہو چلی تھی کہ یکایک ایک آواز خارا شگاف فضا میں گونجی، "لے نصرت خداوندی جلد آ" وہ آواز انھیں کی تھی جس سے مجاہدین کے دل از سر نو گرم ہو گئے، غرض آپ اسی طرح خدا کو یاد کرتے ہوئے دلیری سے لڑ رہے تھے کہ یکایک کسی شقی نے آپ کی اچھی آنکھ پر ایک پتھر مار دیا اور راہِ خدا میں آپ کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی۔ (رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

(۵) ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے آپ کو بنجران کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ یہ روایت اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کیونکہ حضرت ابوسفیانؓ حکومت کی خاص صلاحیتیں رکھتے تھے بلکہ بنو امیہ کے افراد عام طور سے اس صلاحیت میں ممتاز ہوتے تھے، اسی لئے اکثر ان کو آپ حکومتی ذمہ داریاں سپرد کرتے تھے اور اسی سنت کی پیروی میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے بھی ان کو

حکومتی مناصب دیے

(۶) آپ نے حضورؐ سے چند احادیث بھی روایت کی ہیں جن کو آپ سے حضرت معاویہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔

الغرض آپ نے ستانوے برس کی عمر پائی جس میں ۷۰ سال کفر میں اور ۲۶ سال اسلام میں گزارے اور عہد عثمانی میں ۳۳ھ کے اواخر یا ۳۴ھ کے اوائل میں آپ کا وصال ہوا، اور مدینہ شریف کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں مدفون ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

چند منتخب کتابیں

دعوت اسلام :۔ تالیف پروفیسر آرنلڈ، ترجمہ محمد عنایت اللہ دہلوی۔ قیمت -/۹

شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ۔ مولانا عبید اللہ سندھی، مرتبہ محمد سرور صاحب۔ قیمت ۳/۵

افریقہ ایک چیلنج :۔ از احمد عبداللہ المسدوسی۔ افریقہ کے ماضی حال اور مستقبل پر ایک غیر معمولی کتاب۔ قیمت ۱۲/۰

سطعات	لمحات	ہمعات
۱/۵۰	۲/۰	۲/۰

عربی اور فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تین رسالوں کے جدید ایڈیشن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی کی علمی خدمت کے ساتھ۔

مجموعہ وصایا اربعہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ۔ شاہ اہل اللہ، اور قاضی محمد ثناء اللہؒ کے بعض وصیت نصیحت ناموں کا مجموعہ، مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری۔ قیمت ۳/۷۵

ملنے کا پتہ

کتب خانہ "الفرقان" کچہری روڈ۔ لکھنؤ

دربارِ عالمگیری

(از مولانا مصطفےٰ حسن صاحب علوی ایم اے پی ایچ ڈی)

[جناب ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی کا یہ مضمون آپ کی ایک زیر تصنیف کتاب کا سلسلہ ہے، امید ہے ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ——— ادارہ]

عنوان سے متبادر غالباً یہی ہوگا کہ میں عالمگیر جیسی شخصیت کے احوال زندگی قلم بند کروں گا۔ اور اس کی سوانح حیات یا عہد حکومت پر تبصرہ یا تنقید کے درپے ہوں گا حالانکہ میرا مقصد یہ نہیں نہ میرا یہ مطمح نظر ہے کہ اس کے عہد حکومت پر یا اس دور کے حوادث لیل و نہار اور وقائع روزگار پر بحث اور تمحیص کو موضوع سخن بناؤں۔ مختلف پہلوؤں اور کئی کئی عنوانوں کے ساتھ اس کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ لکھا جا چکا۔ تنقیدی ہو چکیں تبصرے ہو چکے اور اس کے اعمال اور کردار پر معاندانہ اور موافقانہ نکتہ چینیاں بھی ہو چکیں اس سلسلہ میں مجھے اگر کچھ لکھنا ہے تو اس قدر کہ فی الجملہ اس کی شخصیت اجاگر ہو جائے اور مختصراً اس کی ذات متعارف ہو سکے۔ اس کا میلان طبع اور اس کے فطری رجحان اور نسلی اور خلقی افتاد اور اس پر مرتب شدہ وقائع اور حوادث کی نشان دہی ہو جائے واقعات سبب ہیں تو سرد کار نہیں اور حوادث لرزہ خیز ہیں تو کچھ مطلب نہیں۔ شخصیت کے ساتھ اگر اس کے نمایاں پہلو سامنے آجائیں گے تو وہ وہی پہلو ہوں گے جو محل نزاع نہیں اور وہی صفات ہوں گی جن پر کوئی حرف نہ آیا ہو۔ اگر کوئی اچھائی اور خوبی عالمگیر میں نہ تھی تو میں نہ کہوں گا کہ یہ خوبی اس میں تھی اور اگر کوئی بدی اور برائی اس میں تھی تو میں نہ کہوں گا کہ یہ بدی اور برائی اس میں نہ تھی۔ اس کے اسلاف اور اخلاف میں بزرگ سے بزرگ تر بادشاہ اور بادشاہیں ہوئیں اور سریر آرائے

حکومت ہوئے۔ قدر مشترک اس میں اور ان میں حکومت اور ریاست تھی۔ کسی حیثیت سے وہ موقر اور اہم تھے اور کسی حیثیت سے یہ موقر اور محترم ہوا کسی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے معنی یہ نہیں کہ صرف اس کے محامد اور صفات حسنہ و فضائل جمیلہ ہی سامنے آجائیں۔ برائیاں اور معائب اور مثالب بھی سامنے آئیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ان معائب کی تاویل کی جائے اور ان نقائص کے مفہم اور غیر مفہم اسباب اور علل لکھیے۔ ان کے اہمیت کو کم یا نیست و نابود کر دیا جائے۔ یا معائب مطلقاً سامنے ہی نہ لائے جائیں اور لائے جائیں تو ان سے اغماض کیا جائے یا دوسروں کے سامنے ان کا دفاع اور دشمنوں کے مواجہہ میں ان کے صحیح یا غلط عمل سامنے رکھ دیے جائیں۔ یا بر خلاف صفات کا حامل بنا اور اس لیے قابل ستائش شاہجہاں میں یہ یہ خوبیاں تھیں اس لیے وہ قابل مدح و ستائش اور اکبر میں یہ اچھائیاں تھیں اور عالمگیر میں یہ اس لیے یہ بادشاہوں میں ممتاز ہوئے اور جہانبانوں اور تاجوروں میں نمایاں۔ اگر ایک شخص میں حفظ و اتقان تیقظ ذہانت ذکاوت اور وسعت نظر ہے لیکن اس میں ادبیت تفقہ اور اجتہاد کی صلاحیت مفقود ہے تو کیا ضرور ہے کہ یہ بات بھی بیان کر ہی دی جائے کسی کے پاس جاگیری زمین ہل بیل اور آلات کشاورزی سب کچھ ہیں جو اس کی ثروت، دولت اور حشمت کی نامی کرتی ہیں اس کو بیان میں لاکے اگر اس کی نقدیات، اثاثہ بیت صنعتی کارخانوں اور حرفتی سازو سامانوں کے ذکر سے بالقصد یا بلا قصد سکوت اختیار کر لیا جائے تو چندان قابل ملامت اور حرف گیری کے نہیں، اس کی ثروت کی نشان دہی کرنا تھی وہ ہو چکی اور اسی پہلو کو لوگوں کے علم میں لانا تھا جو صفات کسی میں مفقود ہوں، اگر ان کو یاد نہ دلایا جائے اور جو صفات موجود ہیں ان کو سامنے رکھ دیا جائے تو کسی خورد گیری کا محل نہیں۔ بے عیب ذات وحدہ لاشریک کی ہے۔ تمام عیوب سے منزہ اور کوئی ہستی نہیں، نہ کوئی ذات ہے۔ بڑوں سے بڑوں میں نقائص صوری اور معنوی موجود ہیں اور وہ عادات اور خصائل ہیں جو قابل صد ملامت اور سرزنش ہوتے ہیں۔ ہاں جو صفت کسی میں نہیں اور تاویلات بعیدہ کے ساتھ اس کو کوئی صفت بنا کے سامنے رکھ دے تو جواب دہی ایسے کرنے والے سے ضرور ہو سکتی ہے اور جا سے کبھی ہے خوبصورتی اور جمال کو اس انداز سے پیش کرنا مناسب ہوتا ہے، جو خوبصورتی اور جمال پیش کرنے کے انداز ہیں۔ ہاں کسی بدصورتی کو مصور کا موئے قلم مناسب رنگ دے کے غیر واقعی اور غیر حقیقی حقیقت اور واقعیت بنا دے

تو اس کی خوش نظری، خوش خیالی اور حسن ظن کی چنداں داد نہیں دی جا سکتی۔ جب حمایت کا موقع ہی نہ ہو تو بے موقع اور بے محل حمایت بھی بے سود ہی ہوتی ہے۔ عظمت اور بڑائی کے پل باندھے تو باندھتے ہی چلے گئے اور نقائص اور کمزوری کے غار کھودے تو کھودتے ہی چلے گئے۔ نہ وہ افراط محمود ہے نہ تفریط اور کسی کے ہنر کے نقوش کو ہی ہنر کی حیثیت سے نہیں بلکہ عیوب کی حیثیت سے غیر ملائم اور نامناسب رنگوں سے بھر دیا گیا تو قابل اور درخور ملامت۔ اگر انسانیت اور آدمیت علم ہنر ثقافت دین و مذہب کو کثرت سے کسی نے فائدہ پہونچایا تو اس کی تعریف زبانوں پر آتی ہے اور اس کی مدح و ستائش لکھنے کے لیے انگلیوں میں قلم دبا لیے جاتے ہیں لیکن شاذ و نادر قتل و غارت نہب و سفاکی کے تذکرے مفصل اور ناقابل اعتنا ہو جاتے ہیں۔ وقتی ماحول اور زمانے کے تقاضوں سے اس وقت اور زمانے کے کسی ممتاز کردار اور اس کے حسن عمل کی داد دینا چاہیے اگرچہ مرور ایام اور امتداد زمانہ کے اثرات، بعد سے وہ معیار کوئی بلند معیار نہ رہے۔ آج اگر کسی علم اور عمل کی قدریں آنکھوں میں نہ آئیں تو اس وقت کی قدروں کو سامنے لانا ضرور چاہیے جب وہ قدریں سمجھی جاتی تھیں۔ اگر کسی زمانہ کی جمہوریت نے مختلف صورتوں سے عوام کو فائدے پہونچائے تو اس جمہوریت کی داد دینا ہوگی۔ اس طرح اگر کسی شخصیت سے عوام و خواص اصاغر اکابر اعالی اسافل کو کل شخصی ذاتی، معاشرتی، دینی مذہبی اور اجتماعی فائدے پہونچے تو ان فائدوں اور شخصیتوں کو ضرور بالضرور سامنے لے آنا چاہیے خواہ آج ان کی افادیت افادیت نہ بھی رہی ہو۔ آج کی سوسائٹی اور سیاست اگر کسی شخص یا فرد کی اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر ایک بدنما اور دھبے پڑی ہوئی تصویر اتار کے سامنے رکھ دے تو برا ہے اسے انصاف کوئی مستحسن عمل ہرگز نہ کہے گا کسی شخص کی تندی مزاج اور اس کی سختی اور جذبات انتقام کو سامنے رکھنا اور ان کے ماتحت سزا دینا تو ذہن میں رہے لیکن جرم اور اس کی نوعیت اور اس کی کیفیت کو فراموش کر دینا تو یہ عدل نہ ہوگا۔ فلاں جرم کی یہ سزا ہونا تھی لیکن سزا دینے والے نے سزا نہیں دی بلکہ اس کے برخلاف اپنے لطف و کرم سے سزا گھٹا دی یا مطلق دی ہی نہیں تو یہ بھی قابل ستائش ہے اگر کوئی ایسی خطا کا مرتکب ہوتا ہے اور کوئی ایسا جرم کرتا ہے جس کے مقابل دوسری خطائیں اور دوسرے جرم بڑھے چڑھے تھے تو اس میں یہی ستائش کا پہلو

نکل سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے لوگ اگر اپنے ہی میں سے کسی بڑے کو اپنی اپنی بصیرت اور سمجھ سے اپنے سے بھی بڑا سمجھنے لگیں تو یہ اس شخص کی بڑائی کی دلیل ہے۔ ایک عالم اور ماہر فن اگر اپنے ہی جیسے ماہر فن کی تعظیم و تکریم غیر معمولی کریں یا ایک بہادر دوسرے بہادر کو اپنے سے زائد بڑا سمجھے یا ایک دولت مند کو اس جیسے دولت مند کسی اور نقطۂ نظر سے معظم و محترم جانیں تو اس سے اس کی عظمت و توقیر میں بیمار چاند لگ جاتے ہیں۔ نپولین جیسے کمانڈر کی دوسرے ہم درجہ کمانڈروں کی نگاہ میں غیر معمولی عزت و توقیر رہی یا ایک طبیب سے دوسرے اطبا جو ہم درجہ ہیں زائد متاثر ہوں تو یہ اس کے لیے خاص امتیاز کا سبب بنے گا۔ اگر ایک بڑا شخص چھوٹوں سے محبت اور پیار سے پیش آئے اور ان کے رکھ رکھاؤ کو ہمہ وقت دل میں رکھے تو یہ اسے دوسرے بڑوں کے مقابلہ میں اور محبوب بنا دے گا۔

بابر شجاعت کا ایک مجسمہ، بہادری کا پیکر کشور کشائی میں ممتاز بلند پایہ بادشاہ تھا اسی کے ساتھ ساتھ علم و ثقافت کا دلدادہ، عارف باللہ صوفیہ اور اولیا و مشائخ، اہل فضل و دانش کا قدردان، علم نواز، ہنر پرور، محبت شفقت اور انس سے لبریز دل رکھنے والا شخص اور پُر شکوہ سخن فہم سخن سنج، شاعر دماغ، شاعر دل اور شاعر پسند اور خوش طبع فرمان روا تھا۔ یا ہمایوں علم ہیئت اور ریاضی کا ماہر، بلند مرتبہ شاعر، نکتہ سنج، دقیق النظری اور معانی آفرینی میں ممتاز تھا۔ ایک سلیم فطرت رکھتا۔ سخن گستر تھا اور آلات رصدی کرہ و اصطرلاب کی شناخت میں ید طولیٰ اور درجہ کمال رکھتا۔ زہاد اور اتقیا کا مرجع، محاسن معنوی اور فضائل صوری سے آراستہ علم نواز، شریعت پرور تھا۔ اس کے ساتھ جدت پسند فواحش و منکرات سے حتی الوسع محترز، صوم و صلوٰۃ کا پابند ایک کشور کشا تاجور تھا۔

اکبر کو علمی اور ادبی ذوق و شوق تھا، علوم و فنون کا قدردان، علم دوست اور ادب پرور تھا۔ علما اور فضلا سے اسے دلچسپی تھی اس کی سرپرستی میں مفید مفید تصانیف کی گئیں اور تالیفات تیار ہوئیں اس میں ایک سیاسی سوجھ بوجھ بھی تھی اور اس کے دور حکومت کو ایک خاص عظمت اور شوکت حاصل رہی۔ اس ذکر کے بعد یہ کیا ضروری ہے کہ یہ بھی کہہ دیا

جائے کہ وہ خود ای محض تھا اور اسے اس توجیہہ کے ساتھ خوبصورت بنایا جائے کہ علوم ظاہری کی جگہ اسے علم لدنی حاصل تھا اور جو کچھ عقل و دانش اور علمی دستگاہ اسے حاصل تھی وہ الہامی اور خداداد تھی۔ جہانگیر ایک انشاپرداز اور ایک بلند پایہ نقاد اور نکتہ چین گزرا ہے۔ خود شاعر تھا اور شاعر دوست بھی۔ اور علماء دین کا سرپرست اور قدردان علم پروردار جوہر شناس تھا درویشوں، پنڈتوں اور غیر مسلموں سے بھی فراخدلی اور عقیدت مندی سے ملنے والا صوفیا کی صحبت کا دلدادہ تھا اور ان کے سرچشمہ علم و فضل سے سیراب ہونے کی دل میں لگن رکھتا لیکن باوجود ان مستحسن اور قابل پذیرائی اعمال اور کردار کے اس سے لغزشیں ہوئی اور خطائیں کا مرتکب ہوا۔ اسی طرح شاہجہاں فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اس کے ذوق طبع کی خوبی اور نفاست مزاج کی اچھائی کی وہ تعمیری یادگاریں ہیں جو آج تک عالم کے نوادر میں شمار ہوتی ہیں۔ تاج محل کا روضہ، تخت طاؤس اور قلعہ معلی کی تعمیر نے اسے شہرت دوام کا طغرائے امتیاز دے دیا۔ دیوان خاص اور دیوان عام کے در و دیوار اس کے حسن ذوق اور ہنرپسندی کی داد دے رہے ہیں۔ اس کی زرپاشیوں اور فیاضیوں سے علماء ادبا شعراء ادبا بہرہ اندوز رہے۔ اس کا صحیفہ حیات کا کوئی صفحہ علمی دلچسپیوں سے خالی نہیں اس نے کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی اور اگر چھوڑی بھی تو اس میں جہانگیر جیسی ادبی رنگینی جزالت اور روانی نہیں نہ عالمگیر کی متقیانہ سلاست اور برجستگی۔ عالمانہ نظر رکھتا محقق تھا۔ حکمت بھری باتیں کرتا اور رائیں قائم کرتا دور اندیش تھا اور محتاط۔ عالمگیر اقلیم ہند کا تاجدار اور ہمالیہ سے لیکے راس کماری تک کے محاصل کا محصل کہ ناٹک کا حاکم اور چاٹگام سے لیکے غزنی تک کا فرمانروا اور مصالح کا نگہداں، گلستان تیموری کا گل سرسبد تاج مغلیہ کا تابندہ گوہر دستار بابری کا طرہ امتیاز، دامن شاہجہاں کا گل تر۔ عمان کرم کا درثمین آسمان سخاوت کا بدر کامل، شبستان ممتاز محل میں ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۶۱۷ء کو شب کو صوبہ گجرات کے دودھ قصبہ میں یہ شمع روشن ہوئی۔ نام اورنگ زیب رکھا گیا۔ قاسم پیدائش نامائم اور ناشنو شگوار تھا۔ اور جین آئے جشن وضیافت شایان شان تزک و احتشام سے منایا گیا۔ شاعر دربار طالع کلیم نے آفتاب عالم تاب اور کسی اور شاعر نے گوہر تاج ملک اورنگ زیب سے تاریخ ولادت نکالی۔ ابوالمعالی محمد معصوم خان جیسے صاحب تقویٰ و ورع کی نگرانی میں پرورش پائی۔ اردو، فارسی، عربی اور فارسی کی تعلیم پائی اور فارسی کتب اپنے

وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے پڑھیں اور یہ جو بعد کو شہنشاہ ابوالظفر محی الدین عالمگیر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ حافظ قرآن بھی تھا' امام غزالی کی احیائے العلوم کیمیائے سعادت اور صوفیا میں سے یحییٰ منیری وغیرہ وغیرہ کے مکتوبات اور ملفوظات اکثر و بیشتر اس کے مطالعہ میں رہتے اور تفسیر حدیث و فقہ کے معیاری فنون اور شروح پڑھتا اور سناتا رہتا فن انشا اور حسن خط میں دستگاہ کامل رکھتا۔ ایام شہزادگی میں باپ کے یہاں سے ایک معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جو تدریجاً بڑھتا گیا جب سن شعور کو پہونچا تو سب سے پہلے باپ نے دکن میں فوج کا کمانڈر بنایا پھر دکن کا ناظم اور گورنر بنا دیا گیا۔ منصب میں ترقی پائی۔ پہلے ایرانی خاندان کی ایک لڑکی دلرس بانو سے شادی ہوئی پھر اور اور بیگمات بھی اس کے حبالۂ نکاح میں آئیں۔ رفتہ رفتہ پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیوں کا باپ بنا۔ اس کے نوشتۂ تقدیر میں یہ بھی تھا کہ خاندانی اور برادرانہ رقابت اور عداوت کا شکار بن کے باپ کی نظروں سے گر جائے معزول ہو۔ اور دکن کی نظامت منصب کے عطیات اور جاگیریں سب سے محروم کر دیا گیا۔ بعد چندے اس نے اپنی ذاتی اہلیت اور طبعی صلاحیت سے باپ کے دل میں پھر جگہ کر لی اور بلخ اور بدخشاں کی مہم اسے تفویض ہوئی اور اس میں کامیابی کا سہرا اس کے سر باندھا گیا۔ ایک وقت وہ آیا کہ پنجاب کے صوبہ ملتان کا صوبہ دار بنایا گیا۔ قندھاری کی کمان بھی اس کے ہاتھ میں آگئی اور سندھ میں بھی اس نے کچھ کم کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے۔ زندگی میں اس کے لیے بڑے بڑے ابتلا کے وقت آئے اور کٹھن سے کٹھن آزمائش کی گھڑیاں پڑیں اس نے طعنے سہے تشنیع اور سب و شتم برداشت کیے۔ حاسدانہ تیروں نے اس کے [illegible] اور دماغ کو نشانہ بنایا اور مخالفت کے تیروں نے اس کے سینے کو چھلنی کیا۔ اس کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے گئے۔ قدم قدم پر اس کی ہلاکت کے لیے [illegible] گئے مگر اس نے صبر و شکیب تحمل اور برداشت کے جادوں سے قدم نہ ہٹائے۔ اور [illegible] نہ آئے۔ اس کی تمنا دل کا خون ہوا۔ اس کو مایوسیوں نے گھیرا۔ یاس اور حرمان سے دوچار رہا لیکن اطاعت اور استقامت کا دامن اس نے نہ چھوڑا۔ باپ کی نظروں میں اسے بے ایمان اور غدار بنایا گیا۔ وقتاً فوقتاً اس کی شکایتیں کی گئیں۔ اس کی کانوں میں پڑتی رہیں۔ دیکھتا رہا' سنتا رہا مگر صبر کرتا رہا۔ اجیروں اور ملازموں کی دلداری اور سفارشیں اور نذر بھینٹوں اور [illegible]

کے وظیفوں کی حمایت کرتا۔ ناکتخداؤں بیواؤں اور رانڈوں کو ٹھکانے لگانے اور ان کے نکاح میں مددگار بنتا۔ اس کے یہاں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ تھی۔ مسلمان جس طرح مستفیض ہوتے ویسے ہی دوسرے مذاہب والے بھی۔ دور بنی امیہ کے برخلاف عہد عباسیہ کی طرح مغلوں میں بھی پوری زمام اختیار تقریباً ایک ہی ہاتھ میں اور سیاست مذہبی اقتدار کے ماتحت تھی عالمگیر نے اپنی عاقبت اندیشی اور دور رس دماغ سے اسے نباہا۔ اور "علیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود" پر عامل رہا۔ ڈپلومیسی اور پرفتنہ و فریب حکمرانی اور سیاست سے دامن بچائے رہا۔ جب شاہجہاں کے بیٹے حکمرانی کے لیے صرف آپس ہی میں نہیں بلکہ باپ تک سے دست و گریباں ہوئے اور ہندوستان کی سرزمین خونیں مناظر پیش کرنے لگی۔ تو اس نازک دور میں اس نے قدم اٹھایا اور اپنی شجاعت بہادری تدبر اور استقلال سے سریر آرائے حکومت ہوا۔ ناموزوں جداگانہ کو اس نے دبایا۔ اور ہندوستان میں اسلام کی ڈوبتی کشتی پھر سطح آب پر لے آیا۔ اس کی طبیعت میں انتہائی خاکساری تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسے اپنے مفاخر اور مکارم کی داستان ناپسند خاطر ہوئی اور اس نے وہ محکمہ ہی ختم کر دیا جو اس کام کو انجام دیتا تھا۔ اسے علم و ہنر سے محبت نہیں بلکہ انتہائی شغف تھا۔ اور اسی کے پیش نظر اس نے قصبوں اور شہروں میں مکاتب اور مدارس قائم کر دیے تھے۔ اور ان میں منتخب اور چیدہ چیدہ اساتذہ مقرر تھے۔ اور طلبہ کی تشویق کے لیے وظائف بھی جاری تھے۔ فصاحت و بلاغت ہمیشہ اہل ذوق سخن سنج اس سے تعلیم و تربیت انشا اور نثر میں حاصل کرتے۔ اللہ نے اسے ایک قادر البیان زبان اور میانہ رو دل دے رکھا تھا۔ میدان سخن میں اس کا شدید قلم خوب خوب چال دکھا گیا۔ اس کی تحریروں کی بندش خواہ اوامر و نواہی پر یا قرامین و عطیات پر مشتمل ہوں ایک عجب تاثیر اور کیف آور ہوتیں۔ سیاسی اور معاشرتی اجتماعی شادی و غم حزن و شادمانی۔ عتاب و تنبیہہ و تہدید احوال نگاری شکوہ و شکایت ایک دلکش اور جاذب نظر طرز بیان سے بھری ہوئی ہوتیں۔ اس کی تحریروں میں واقعات کے انبار تلمیحات کی بہتات اور وسعت معلومات اور اطلاعات کے سرچشمے خوب خوب ملتے ہیں۔ اسے سحر آفریں ادیب کہیں تو بیان واقعہ اور ایک معجز نگار انشا پرداز کہیں تو اظہار حقیقت ہے۔ اس کی انشا میں آیات قرآنیاں درویشوں، فقیروں، بزرگوں اور شائخ

سے اسے خاص دلچسپی رہی۔ مکروہات اور منہیات سے خاص طور پر اجتناب اور حتی المقدور احتراز برتا۔ فرائض مذہبی کی انجام دہی اور ادائے عشر و زکوٰۃ میں خاص اہتمام سے کام لیا۔ شرعی احکام کی پابندی جہاں تک ہوا بے حد کی۔ زبان پر اکثر و بیشتر کلمہ طیبہ اور درود سرے اوراد رہتے۔ نوافل و سنن کی ادائیگی میں بھی عدم تساہل اور تساہل نمایاں ہی رہا۔ حق پرست اور حق پسند تھا۔ فن خطاطی میں بھی یگانۂ عصر ہوا اور یہ حصول دنیا کیلئے یا نام آوری کے لیے نہیں بلکہ آخرت اندوزی کے لیے بھی اور اخروی نجات کے لیے۔ شاہان تیموریہ میں یہ امتیاز صرف اسی کو حاصل ہوا کہ اس نے کلام پاک حفظ کیا۔ اور پھر اپنی عمر کے تینتالیسویں سال میں اس نے سلوک و طریقت کے مختلف مراحل میں قدم رکھے اور تصفیۂ باطن اور تزکیۂ نفس میں جد و جہد کی اور نجات سرمدی اور فلاح ابدی کے حصول میں کوشاں رہا کیا۔ غیر شرعی لباس اور چاندی سونے کے برتنوں کے استعمال اور آلات ملاہی و ملاعب سے محترز رہا۔ بہت علم پرور اور بڑا علم دوست تھا۔ اور اس کا دور حیات بڑے بڑے علماء، بڑے بڑے فضلا ادبا، نامور محققین محدثین اور فقہا کے نقطۂ نظر سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے ان میں وہ تھے جن کا اس سے بالواسطہ تعلق تھا اور وہ تھے جو اس کے عطیات اور نوازشات سے ہی مستفید اور مستفیض ہوتے اور وہ بھی تھے جن کا دربار سے بلاواسطہ الحاق تھا۔ اور وہ بھی تھے جن سے یہ براہ راست استفادہ اور کسب کمال کرتا اور وہ بھی تھے جو اس کی ذات اور شخصیت میں کمال اور امتیاز پیدا کرنے اور کرانے میں ممد اور معاون ہوتے۔ جن کے علوم و فنون کی فراوانی اور وسعت نظر کی بہتات اس کے لیے مایہ دانش و بینش تھی۔ اور جن کے سامنے تلمذانہ آداب اور طور و طریق اور نیاز مندانہ انداز سے پیش آتا رہا۔ منجملہ ان کے ایک شیخ احمد تھے جو ملا جیون کے عرف سے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں اور آج بھی ان کی علمی عظمت اور رفعت لوگوں کے ذہنوں اور دماغوں میں موجود ہے۔ رحمہ اللہ۔

ملا جیون

عالمگیر سے تعلق ان کا اورنگ زیب عالمگیر کا بلاواسطہ شاگردی اور استادی کا تعلق تھا۔ عالمگیر نے ان سے متداول بعض درسیات کے علاوہ دوسری کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ یہ ان کی دینی رتبہ اور علمی منصب کے شایان شان بڑی عظمت اور توقیر کرتا اور شاگردانہ

لحاظ اور آداب سے بخوبی آشنا۔ مسلسل چھ برس تک عالمگیر کی دکھنی فوج میں کسی منصب پر فائز بھی رہے۔

آپ کے والدین آپ کے والد بزرگوار کا نام نامی ملا ابوسعید ہے اور آپ شاہ عالمگیر کے داروغہ مطبخ (میر آتش) عبداللہ عرف نواب عزت خاں سیٹھوی کی ہمشیرہ کے بطن سے پیدا ہوئے آپ دو بھائی تھے۔ بھائی کا نام ملا بڈھن تھا۔

تاریخ ولادت روز سہ شنبہ وقت صبح صادق ۲۵ شعبان ۱۰۲۷ھ آپ کی تاریخ پیدائش ہے۔ ملا سعید اپنے والد ماجد کے سایہ عاطفت میں پلے اور آپ نے سات برس کی عمر میں کلام پاک حفظ کر لیا اور بقول خود اگرچہ قواعد تجوید اور اعراب سے واقف نہ ہوئے

آپ کی تعلیم و تربیت و غیرہ تھے تاہم الفاظ مہملہ اور منقوطہ کو صحت کے ساتھ ادا فرما لیتے۔ صرفی اور نحوی قاعدہ اور اصول کے نہ جانتے ہوئے بھی فاعل اور مفعول کو سمجھ کے ترجمہ کر لیتے۔ درس نظامیہ کا نصاب تھا نہ کتب درسیہ میں تقدیم و تاخیر ملحوظ خاطر تھی پھر بھی ان علوم ظاہریہ متداولہ میں مہارت اور پوری دست رس حاصل کی۔ ۲۲ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ اور درس دینا شروع کر دیا۔ طلبہ کا آپ کے گرد ہجوم رہتا۔ چالیس سال کی عمر تھی کہ آپ نے اجمیر اور دہلی کو اپنی

حج کے لیے روانگی اقامت گاہ بنایا اور ہزاروں کو علوم ظاہریہ سے مستفید کیا۔ ۵۵ سال کی عمر میں پہلی بار حرمین شریفین کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ قدرے دکن میں بھی قیام پذیر رہے۔ ۵ سال حرمین میں اقامت گزیں ہونے کے بعد دکن پھر واپس ہوئے اور یہی وہ زمانہ ہے کہ جب شاہی

دکن میں قیام قلعہ سے آپ کا الحاق رہا اور شاہ عالمگیر کے دربار میں آمد و شد اور تلمذانہ ملاقات کے دوران سیکڑوں اور ہزاروں کے مقاصد دینوی کے حصول کا ذریعہ بنتے رہے۔ اسی دوران میں یہ خیال پیدا ہوا کہ والدین کی طرف سے حج بدل کیا جائے۔ خدا سے دعا کرتے رہے ادھر اپنے والد ملا سعید کو خواب میں دیکھا کہ وہ حج بدل کے طلبگار ہیں۔ ادھر دعا قبول ہوئی اور توفیق الٰہی شامل حال ۱۱۱۲ھ کو عالمگیر کی بادل ناخواستہ اجازت حاصل کر کے حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۶۶ سال تھی اور تین سال واپسی کے بعد دکن میں پھر قیام

مراجعت وطن کر کے ۱۱۱۶ھ میں مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ اب عمر کا ستر واں سال تھا۔

لہ سوانح خود نوشت ملا جیون، بحوالہ تفسیر جیئن (مخطوطہ)

دو سال یہاں رہے محمد معظم بادشاہ خلد منزل کے جلوس کے پہلے سال ۲۵ محرم کو طلبہ اور شاگردوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ شاہجہان آباد کا سفر اختیار کیا صفر کے آخری چہار شنبہ کو دہلی پہونچے معظم بادشاہ اس وقت موجود نہ تھے۔ دکھن سے واپس آتے ہوئے اجمیر میں ان سے ملاقات ہوئی اور بادشاہ ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو باصرار اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ وہاں چند ے قیام رہا کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ نے پھر شاہجہان آباد مراجعت فرمائی اور اپنی عمر کے ۸۳ ویں سال تک وہاں مقیم رہے۔ اسی دوران میں شاہ فرخ سیر بادشاہ غازی ابوالمظفر

آپ کے ہم عصر | معین الدین سے ملاقات ہوئی اور اپنی فیاض طبیعت اور فطرۃً فیض رساں ہونے کے باعث اپنے اہل وطن اور دوسرے ارباب حاجت کی بادشاہ کے دربار سے حاجت روائی میں دل و جان سے مدد کی۔ اور ان کو مرفہ حال بنانے میں معاون ہوئے۔

آپ کا وصال | شروع ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۰ھ سے ہی آپ نے اپنے ارتحال کی خبر دینا شروع کی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح وطن پہونچ کے جان بحق تسلیم ہو۔ بے چین رہتے اور مضطرب کہ کسی طرح اڑ کے وطن پہونچ جائیں لیکن قضا و قدر کا تقاضا اس کے خلاف تھا۔ آپ کی تمنا پوری نہ ہوئی۔ ۸ ذیقعدہ دوشنبہ کے روز سنہ ۱۱۳۰ھ کو حسب معمول اوراد عادت طلبہ کے درس و تعلیم سے فارغ ہوئے نماز مغرب معہ اوابین وارد و وظائف ادا کی۔ رات کا کھانا تناول فرمایا۔ عشا پڑھی اور سنن و نوافل ادا کیں نصف شب گزری تو سینہ میں کچھ سوزش محسوس کی جو بڑھتے بڑھتے پہلو میں بھی ہونے لگی۔ شام کے وقت کوئی ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو فرمایا تھا کہ کوئی عالم کامل دنیا سے رخصت ہونے کو ہے۔ درد کی حالت میں اپنے بیٹے ملا عبدالقادری سے جو موجود تھے فرمایا کہ وقت آخر ہے اور یہ کہہ کے جامع مسجد دہلی کے جنوبی دالان کی طرف ایک کوٹھری میں جا کے لیٹ گئے۔ کلمہ طیبہ ورد زبان تھا کہ روح اطہر جسد عنصری کو چھوڑ راہی جنت ہوئی۔ ۹ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۰ھ کا دن تھا ظہر کے وقت آپ کی میت کو میر محمد شفیع کے تکیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۱۴ محرم سنہ ۱۱۳۱ھ چہار شنبہ کے دن پچاس روز کے بعد آپ کی

لہ تذکرہ ملا جیون مخطوطہ ملا عبدالقادر ابن ملا جیون ۲ تذکرہ ملا جیون از ملا عبدالقادری مخطوطہ

میت کو ایک تابوت میں رکھ کر امیٹھی لایا گیا اور وہاں قدیم مدرسہ اسلامیہ کے ملحق مقبرہ میں دفن کر دیا گیا۔ شیخ تاریخ محمد بن ملا سرکھی نے جو آپکے استاد زادے اور شاگرد بھی تھے، مندرجہ ذیل وفات کی تاریخ لکھی۔

محیط علم آن مولائے اعظم — باحمد عرف جیون شد معلم
جہاں را روشنی زاں شمع دین بود — بعلم ظاہر و باطن مسلم
چو رحلت کرد در ذیقعدہ تاسع — بوصل دوست خود گشتہ مکرم

بتاریخش خرد داد ا گوشم
ندا از کامل و فیاض عالم

۱۱۳۰

مزار مبارک پر ویسیم نعمۃ علیات سنہ ۱۱۳۰ھ کی لوح لگی ہوئی ہے۔ آپ سلسلہ قادریہ میں مرید تھے اور مجازانہ بیعت بھی اور سلسلہ چشتیہ سے بھی آپ کا سلسلہ ملتا تھا۔ (باقی)

کچھ نئی اور پرانی علمی ادبی کتابیں

فلسفہ شریعت اسلام: تالیف:۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی۔ ترجمہ:۔ محمد احمد رضوی قیمت ۵/-
عظماء کے معاشقے (نظریات: ۱ فرجارج سول ترجمہ ڈاکٹر ایس ایم اختر مولانا غلام رسول مہر قیمت ۶/-
مومن۔ (حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر) از کلب علی خاں فائق رام پوری۔ قیمت ۵/۵۰

یہ تینوں کتابیں عمدہ سفید کاغذ پر نفیس ٹائپ سے چھپی ہیں

روزگار فقیر

از فقیر سید وحید الدین

(علامہ اقبال سے چند ملاقاتوں کی یادداشت)

بہترین آرٹ پیپر پر نظر فروز طباعت مصور قیمت ۷/۵۰

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ۔

مطالعہ

لبرل اسلام

وحید الدین خاں

"اگر ہمارے مجوزہ تنقیدی طریقہ کے مطابق شریعت کے پورے ڈھانچے کی جانچ کی جائے تو ظاہر ہو کہ مذہب کے قدیم اور جامد سانچہ کی جگہ ایک نیا پروٹسٹنٹ اسلام (PROTESTANT ISLAM) جنم لے گا۔ جو بیسویں صدی کی زندگی کے حالات سے مطابقت رکھتا ہوگا۔ وہ ماضی کے سوکھے ہوئے درخت کو کاٹ ڈالے گا اور مستقبل کو پر امید شکل میں دیکھ رہا ہوگا۔ اس نئے مذہب کا نام رکھنے کے لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تاہم اگر اس کو کوئی نام دیا جا سکے تو اس کو لبرل (آزاد) اسلام (LIBERAL ISLAM) کہنا صحیح ہوگا۔" صفحہ ۱۰۴

یہ آصف فیضی صاحب کے الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب:

A MODERN APPROACH TO ISLAM

میں تحریر فرمائے ہیں۔ مسٹر آصف فیضی (ASAF A.A. FYZEE) جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی صف میں ایک نمایاں آدمی ہیں۔ وہ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم سینٹ زیویرس کالج بمبئی اور سینٹ جانز کالج کیمبرج میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں ایک قانون داں کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ ۴۷-۱۹۳۸ء کے درمیان وہ گورنمنٹ لا کالج بمبئی میں اصول قانون کے پروفیسر نیز اس کے پرنسپل رہے۔ ۴۹-۱۹۴۷ء میں وہ بمبئی پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے اور ۱۹۴۹ء میں قاہرہ میں ہندستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ دوبارہ

ہندوستان واپس آئے اور یونین پبلک سروس کمیشن نئی دہلی کے ممبر نامزد کیے گئے۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک وہ کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ۱۹۵۵ء میں فیضی صاحب کا انتخاب عرب اکیڈمی دمشق کے نمائندہ ممبر کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں ہندستان کے صدر کی طرف سے پدم وبھوشن کا خطاب عطا کیا گیا۔

فیضی صاحب اس وقت انگلستان میں ہیں اور کیمبرج کے اپنے پرانے کالج میں پروفیسر ہیں۔ وہ متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ موصوف کی مندرجہ بالا کتاب جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، وہ جدید تقاضوں کے مطابق اسلام کی نئی تشریح و تعبیر کے مسئلہ پر لکھی گئی ہے۔ یہاں اس پر کوئی تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ البتہ میں اس کا ایک مختصر تعارف پیش کروں گا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے۔

مصنف کتاب کے آغاز میں سب سے پہلے یہ سوال کرتے ہیں:

WHAT DOES ISLAM STAND FOR?

یعنی اسلام سے کیا مراد ہے؟ (صفحہ ۱) اس کے بعد جواب دیتے ہیں کہ اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہو سکتا۔ اس کا انحصار اس "وقت" پر ہے جب وہ پوچھا گیا، اس ملک پر ہے جہاں اس سوال کا جواب دینا ہو، اور اس "شخص" پر ہے جو یہ جواب دے رہا ہو۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کی چند صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک ہے تاریخی طریقہ (Historical Method) اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو ایک ایسی چیز سمجھا جائے جو تاریخ میں سفر کر رہا ہے۔ اس ڈھنگ سے اگر ہم اسلام کے تاریخی رجحانات کا مطالعہ کریں تو ہم کچھ نتائج تک پہونچ سکتے ہیں۔ (مثلاً ابتدائے اسلام میں مسلم سوسائٹی پردہ کی سختی سے عامل تھی، اب مسلم سوسائٹی میں پردہ تیزی سے اٹھ رہا ہے) دوسرا طریقہ (عقیدتی طریقہ Dogmatic Method) ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی اصل تعلیمات اور شریعت کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس سے جو کچھ ملے بس اسی کو ہمیشہ کے لیے فیصلہ کن قرار دیا جائے۔ اسی طرح اور دوسرے طریقے۔

اس کے بعد کتاب کے پہلے باب میں روح اسلام (THE ESSENCE OF ISLAM) کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلامی خیالات کا تعارف ہے جو گویا آئندہ بحثوں کے

لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف کے نزدیک مولانا آزاد اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ انتخابی (ELECTIC) بھی تھے۔ یعنی وہ تمام بڑے مذاہب کی صداقتوں کو ماننے پر زور دیتے تھے اس تعارف کا ماخذ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ ہے۔

مصنف کی تشریح کے مطابق مولانا آزاد کے افکار کا خلاصہ یہ ہے۔

قرآن جس زمانے میں اترا، مذہب ایک طبقاتی چیز بنا ہوا تھا۔ ہر طبقہ کا مذہب اپنے ساتھ اعمال و رسوم کی ایک فہرست لیے ہوئے تھا۔ یہ فہرست چونکہ ہر ایک کے یہاں مختلف تھی، اس لیے ہر ایک دوسرے کو غلط سمجھتا تھا اور صرف اپنے مقررہ اعمال و رسوم کی بجا آوری کو نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس صورت حال کے فطری نتیجے کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف تعصب اور تشدد کا سلسلہ جاری تھا۔ قرآن نے اس غلطی کو واضح کیا۔ اور مذہب کی آفاقی صداقت (UNIVERSAL TRUTH) کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اسلام نے بتایا کہ یہ اعمال و رسوم جن کو اصل قرار دے کر تم نے گروہ بندیاں کر رکھی ہیں، یہ اصل مذہب نہیں۔ مذہب کی روح تو خدا پر اعتقاد ہے۔ اور وہ سب کے یہاں ہے۔ گویا ہر مذہب یکساں طور پر صداقت کا حامل ہے خواہ ظاہری اعمال و رسوم میں ان کے درمیان کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ اس طرح قرآن مذہب کی روح (ESSENCE OF RELIGION) اور اس کے ظاہری طریقے (RITUAL) کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اصل مذہب ایک ہے اور تمام انسانیت کے لیے یکساں ہے۔ ظاہری طریقے ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے جدا ہوتے ہیں۔ انسان مذہب کی بنیادی وحدت کو بھول جاتا ہے اور ظاہری اعمال کے اختلاف کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ حالانکہ خارجی اعمال اور سماجی طریقے انسان کی روحانی نجات میں کوئی حقیقی موثر کی حیثیت نہیں رکھتے (صفحہ ۳، ۲۲-۲۳)۔

اس طرح مصنف اس نتیجے تک پہونچتے ہیں کہ کسی عملی ڈھانچہ کو لازمی قرار دے کر ہر شخص، ہر ملک اور ہر زمانہ کے لیے اس کی تعمیل پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔ جس چیز کے لیے اصرار کیا جا سکتا ہے، وہ مذہب کی اصل روح ــــ اس کا عقیدہ ــــ ہے۔ ظاہری اعمال نہ ضروری ہیں اور نہ ہمیشہ یکساں رہ سکتے ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ہے قانون اور مذہب اسلام میں (LAW AND RELIGION IN ISLAM)

جدید علمائے قانون کی تحقیق کے مطابق انسانی قانون تین مراحل سے گزرا ہے:

ابتدائی مرحلہ:۔ جبکہ قانونی رواج تھے مگر عدالتیں نہیں تھیں۔

درمیانی مرحلہ:۔ جبکہ عدالتیں وجود میں آگئی تھیں مگر قانون داں نہیں ہوتے تھے۔

ترقی یافتہ مرحلہ:۔ جبکہ قانون کے ساتھ عدالت اور قانون داں بھی موجود ہیں۔

معلوم ہوا کہ قانون کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو زندگی سے الگ ایک چٹان کی طرح کھڑا ہو۔ وہ زندگی کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ماہر قانون جسٹس ہومز (HOLMES) کے الفاظ میں:

"اگر تمہارا موضوع قانون ہے تو جان لو کہ وہ علم الانسان، اقتصادیات، قانونی نظریات، اخلاق اور پھر مختلف راہوں سے گزرتا ہوا آخر تمہارے نظریۂ زندگی تک پہونچتا ہے" صفحہ ۲۸

"ایک اہم قابل لحاظ حقیقت" مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ "ہندوازم کی طرح اسلام میں قانون خدا کا بنایا ہوا (GOD MADE) ہوتا ہے۔ انسانی تقاضے، سیاسی ضروریات، تمدنی زندگی اور ارتقائی تحریکات، علم الانسان کے تاریخ مطالعہ، حتیٰ کہ انسان کے اپنے عادلانہ تصورات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ قانون کا معیاری تصور یہ ہے کہ وہ ایک حکم ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ فقہ کی عمارت انھیں الٰہی الفاظ پر قائم ہوتی ہے۔ اس طرح قانون کا ماخذ اور اس کا آخری مقصد دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ (یعنی قانون عملاً تو نافذ ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی پر مگر انسان اپنی زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر خود قانون بنانے کا حق نہیں رکھتا) جدید یورپی قانون میں عوام کی خواہش قانون کی ماخذ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے معاملات میں ایک نظم کے تحت لوگوں پر عدل قائم کیا جائے۔ اسلام میں اس کے برعکس قانون کے نفاذ کا مقصد خدا کی رضا حاصل کرنا ہے۔ مشہور مستشرق (SNOUCK HURGRONJE) کے الفاظ میں ـــــ یہ ادائگی فرض کا ایک اصول ہے۔ اس میں انسان خدا کے مقابلہ میں خود اپنا کوئی حق نہیں رکھتا۔" (صفحہ ۲۹)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بعض مذاہب مثلاً ہندوازم اور اسلام میں قانون کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنی آخری شکل میں خدا کا حکم ہے۔ یہ نظریہ کہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے، قانون کی زبان میں صرف ایک قانونی من گھڑت (LEGAL FICTION) ہے جس کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ قانون کی مکمل

اطاعت کے لیے اخلاقی فضا پیدا کی جائے۔ اس طرح ایک قانونی معیار (LEGAL NORM) سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ قدیم قومیں جن میں نظم اور سماجی احساس اس حد تک نہیں تھا کہ وہ خود اپنے فائدے کی خاطر قانون کی پیروی کریں، اس وقت یہ خوف دلایا گیا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر خدا کا عذاب ہوگا تاکہ لوگ قانون کی پیروی کریں۔" صفحہ ۳۳

قانون (LAW) اور مذہب (RELIGION) دونوں کا ماخذ ایک ہونے کی وجہ سے مذہبی عقائد کی طرح قانون بھی ایک حالت پر باقی رہ گیا۔ تاریخ کا سبق، سماج کے بدلتے ہوئے حالات، تہذیب کا ہمیشہ بدلتا ہوا ڈھانچہ اور جدید دنیا کے اقتصادی نظام میں ارتقائی عمل شریعت میں کوئی قابل لحاظ توجہ کا مستحق نہیں بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون بالکل پیچھے چلا گیا اور ارتقاء سے محروم رہ گیا۔ صفحہ ۳۶۔۳۷

ارتقاء سے محرومی کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام نے مخصوص حالات میں مردوں کو اجازت دی ہے کہ وہ عورتوں کو اصلاح کی غرض سے مار سکتے ہیں۔ حالانکہ

HARDLY ANY COURT OF LAW WOULD JUSTIFY SUCH CORPORAL CORRECTION IN THE 20TH CENTURY.

(P. 41)

بیسویں صدی میں مشکل ہی سے کوئی عدالت اس طرح کی جسمانی سزا کو حق بجانب قرار دے سکتی ہے۔

"چوں کہ یہ باب قانون اور مذہب پر بحث کرتا ہے۔" اس لیے مصنف نے "اسلام کے طلبہ کے غور وفکر کے لیے تاریخی تجزیہ کا ایک عقلی طریقہ (RATIONALIZED METHOD OF HISTORICAL-CRITICISM) تجویز کیا ہے جو شریعت کے مطالعہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔" صفحہ ۵۴

"بہت سے مصنفین نے اسلامی اصول قانون پر تنقید کی ہے کہ وہ غیر ترقی پذیر، جامد اور متحجر ہے۔ یہ تنقید ایک حد تک صحیح ہے اور اس سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب ——— (H.A.R. GIBB) نے اپنے بصیرت افروز لکچر ——— اسلام میں جدید رجحانات (MODERN TRENDS IN ISLAM) میں نشاندہی کی ہے کہ بہت سے اچھے منطباق اور امید افزا امکانات کے باوجود مسلمانوں کا پرانا ذہنی مرض ابھی ان میں باقی ہے، وہ ماضی کی عظمت کے

ایک رومانی تصور میں مگن ہیں اور فکری حیثیت سے مفلوج رہنے کو پسند کرتے ہیں۔" صفحہ ۵۴

"شرق اوسط کے بارے میں اپنی معلومات اور اسلامی تہذیب اور عربی لٹریچر کے طویل اور وسیع مطالعہ کی بنا پر" مصنف لکھتے ہیں: "اس مستشرق نے موجودہ اسلام کے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس تنقید کے وزن کو تسلیم کرتا ہوں، اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں اور اس کا ایک حل پیش کر رہا ہوں۔" صفحہ ۵۴

وہ حل یہ ہے کہ ـــــ "اسلام کے اصول قانون (اصول) اور قانونی احکام (فروع) کا مطالعہ سماجی حالات کے ذیل میں کرنا چاہیے۔" یعنی ان تاریخی، سیاسی اور تمدنی حقائق کو معلوم کرنا چاہیے جو سابق سماج میں کسی شرعی حکم کے تعین کا سبب بنے۔ اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ کوئی قانون کس طرح کے حالات میں نافذ کیا گیا اور یہ بھی کہ اب بدلے ہوئے حالات میں کیوں ہم اس قانون کو نافذ نہیں کر سکتے۔

اس تاریخی مطالعہ کو مصنف کے نزدیک درج ذیل پانچ مرحلوں سے گزرنا چاہیے۔

۱۔ اسلام کا کوئی حکم جس سماجی معاملے میں نافذ کیا گیا، اس معاملے میں اس سے پہلے کی سماجی حالت کیا تھی۔

۲۔ قانون ابتداءً اپنی اصل حیثیت میں کیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ بعد کے فقہاء نے اس کی کیا تشریح کی۔

۳۔ اب چودہ سو برس گزرنے کے بعد یہ قانون مسلم ممالک میں کس حالت میں ہے۔ وہ ابھی تک رائج ہے یا حالات بدلنے کی وجہ سے متروک ہو گیا۔

۴۔ کیا ہم اسلام کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے قانون کی تعبیر ایسے نئے انداز سے نہیں کر سکتے جو وقت کے تقاضے اور سائنس کی تحقیقات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو۔

کتاب کا میرا باب ہے ـــــ اسلامی قانون اور دینیات ہندستان میں:

ISLAMIC LAW AND THEOLOGY IN INDIA

اس باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا مقصد مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ ـــــ "بیسویں صدی کے قانونی اور تاریخی اصولوں کو اسلام کے ایک بنیادی مسئلہ کے سمجھنے میں استعمال

کیا جائے اور شریعت کی جدید تشریح کے لیے ایک تجربی اور آزمائشی طریقہ (TENATIVE METHOD) پیش کیا جائے۔"

"اسلام میں مذہب اور قانون دونوں کا سرچشمہ خدا ہے۔" اگر ہم جدید انداز سے اس مذہبی مفروضہ (THEOLOGICAL DOGMA) یا قانونی من گھڑت (LEGAL FICTION) کا جائزہ لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سے تاریخی یا فلسفیانہ اسباب تھے جنہوں نے سامی مذاہب خاص طور پر یہودیت اور اسلام میں یہ تصور پیدا کیا کہ خدا ہی قانون وضع کرنے والا ہے اور کیوں اب جدید قانونی نظریات، سیاسی تبدیلیوں، تمدنی ترقیوں اور بین الاقوامی تعلقات کے بعد ضروری ہو گیا ہو کہ اسلامی سماج مقدس شریعت اور دنیوی قانون کے درمیان واضح امتیاز پیدا کرے۔" صفحہ ۵

اس ضمن میں مصنف نے ہندستان کے مسلمانوں کی تین تقسیمیں کی ہیں۔

۱۔ قدامت پسند مدرسۂ فکر

۲۔ وہ لوگ جو خاص طور پر اقبال کی فکر سے متاثر ہیں۔

۳۔ جدید مدرسۂ فکر (MODERN SCHOOL) اس کے رہنما سرسید احمد خاں، شبلی، آزاد اور اجمل خاں ہیں۔ صفحہ ۶۷

قدامت پسند مدرسۂ فکر شریعت کو بالکل اسی شکل میں رائج کرنا چاہتا ہے جیسے کہ وہ ہزار برس پہلے تھی۔ اس کے برعکس دوسرے دونوں مدارس فکر حالات حاضرہ کے مطابق اسلام پر از سر نو غور و فکر کرنے کے قائل ہیں:

"یہ ہر دور کے علماء کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کی تشریح اپنے وقت کے لحاظ سے کریں اس اصول پر شاہ ولی اللہ، سرسید اور اقبال نے زور دیا ہے۔" صفحہ ۱۱۱۔ ۱۱۰

سرسید، مصنف کے الفاظ میں "ہندستان میں اسلامی فکر کے جدید اسکول کے بانی ہیں۔" صفحہ ۱۷ یہی نہیں۔ بلکہ:

"شاہ ولی اللہ اور عبید اللہ سندھی اپنے وقت کے علماء کے درمیان ہراول (VAN GUARD) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ہندستان میں جدید مذہبی اسکول کے لیے ایک نئی تحریک کا سامان تھا۔ مگر قدیم روایت پسندی اس کے بعد پورے زور سے اٹھی اور وہ

تحریک ختم ہوگئی ــــــ" صفحہ ۷۳

اس باب میں ماضی اور حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ مستقبل کے بارے میں لکھتے ہیں:

" مصنف کا یقین ہے کہ بتدریج تمام انفرادی اور پرسنل قوانین جو قدیم اصولوں پر مبنی ہیں، وہ سب کے سب یا تو ختم ہو جائیں گے یا ان میں اس حد تک اصلاح ہو جائے گی کہ وہ ان عام ملکی قوانین کے ڈھانچے میں بیٹھ سکیں جو مذہب کی تفریق کے بغیر سارے باشندوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ تحریک مختلف شکلوں میں اس وقت بھی چل رہی ہے۔ مثلاً منتخ ضوابط، سرکاری شعبے اور خود پرسنل لا مثلاً سول میرج اور طلاق سے متعلق قوانین۔ اس طرح کی تدریجی اصلاح خواہ وہ شرعی قوانین ہی میں کیوں نہ ہو، وہ عقیدہ اسلام کی اصل صداقت ; (ESSENTIAL TRUTH) کو ختم نہیں کرتی۔ مسئلہ کے زیادہ گہرے اور صحیح جائزے سے معلوم ہوگا کہ بہت سے شرعی اجزاء محض بیرونی خول ہیں جو مغز اسلام کے اوپر ہوتے ہیں۔ اور یہ مغز صرف ہر عہد اور ہر دور کی تہذیب کے مطابق نئی تعبیر کے ذریعہ ہی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اب از سر نو یہ طے کرنا کہ اسلام کے اجزاء میں سے کون دوامی (DURABLE ELEMENTS) ہیں۔ اور کون قابل تغیر اجزاء (changable Elements) یہ موجودہ زمانے میں ہماری ذمہ داری ہے۔ علماء کی روایتی ذہنیات موجودہ صدی کے ذہن اور نقطۂ نظر کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کی ایک نئی تحقیق اور نئی تعبیر و تشریح ہمارے دور کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔" صفحہ ۸۲-۸۳

" اگر ہم عالم اسلام کو دیکھیں، خواہ مشرق قریب میں یا مشرق وسطی میں یا مشرق بعید میں تو ہم لوگوں کی زندگیوں میں چند چیزیں عام طور پر پائیں گے۔ ہم سیاسی کمزوری، معاشی عدم استحکام، روحانی دیوالیہ پن کا مشاہدہ کریں گے۔ ان تینوں میں بھی روحانی دیوالیہ پن تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ وہ قومی مرض ــــــ (ENDEMIC CANKER) ہے۔ جو اسلامی سماج کی طاقتوں کو کھائے جا رہا ہے۔ اس کا اعتراف مسلمانوں نے بھی کیا ہے اور مغربی علماء نے بھی، جن کی اسلام سے ہمدردی ہر قسم کے شبہہ سے بالاتر ہے۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے ــــــ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔" صفحہ ۸۲

چوتھا اور آخری باب اسلام کی از سر نو تشریح و تعبیر کے مسئلہ پر ہے اور اس کا عنوان ہے:

THE REINTERPRETATION OF ISLAM

مصنف کے خیالات کو جاننے کے لیے یہی باب سب سے زیادہ اہم ہے اور اس اعتبار سے پچھلے ابواب

گویا اسی آخری باب کی تمہید ہیں۔

"اس وقت اسلام میں ایک اندرونی کش مکش جاری ہے۔ اسلام کے عمر رفتہ قوانین (AGELESS CONCEPTS) جدید تمدنی قوانین سے ٹکرا رہے ہیں۔" (صفحہ ۸۰) یہ مصنف کے مقدمے کی بنیاد ہے۔ مثلاً مذہب کا دعویٰ ہے کہ خدا ایک ہے اور ہم سب اس کے محکوم بندے ہیں۔ اس کے برعکس جدید جمہوریت کا اصرار ہے کہ اسٹیٹ ایک ہے اور اس کے قوانین یکساں طور پر سب کے اوپر نافذ ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۸۶) گویا مذہب میں جو مقام خدا کا تھا وہ جدید علمی ترقی نے اسٹیٹ کو دے دیا ہے۔ اسی طرح مذہب میں عقیدے کا جو جز ہے وہ اندرونی طور پر ماننے کی چیز ہے۔ اس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ قوانین بجبر نافذ کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح عقیدہ ایک ایسی چیز ہے جس کو بدلنے کی ضرورت نہیں وہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور قانون سماجی حالات کے ساتھ ناگزیر طور پر بندھا ہوا ہے۔ وہ مختلف ملکوں اور مختلف اوقات کے لیے مختلف ہوتا ہے' قانون' وقت اور حالات کی کٹھالی میں ڈھلات کی مانند ہوتا ہے۔ وہ پگھلتا ہے' وہ بتدریج مختلف شکلوں میں منجمد ہوتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ پگھلتا ہے اور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ (صفحہ ۸۷)

انسانی سماج ایک مسلسل ارتقائی عمل سے دوچار ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز غیر متحرک نہیں سوا اس کے جو مردہ اور بے روح ہو۔ مذہبی قوانین بھی غیر متحرک (STATIC) نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ مختلف اسلامی ملکوں میں اس طرح کی حیات بخش تبدیلی کا آغاز ہو چکا ہے ــــ "پرانے قانون کی سختیوں کو دور کرنے کی غرض سے قدیم اسلامی اصولوں کے ساتھ ایک نئے نظام کا جوڑ لگایا جا رہا ہے۔ یا ایک نیا قانونی نظام شریعت کی جگہ لے رہا ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں یہ دوہرا عمل جاری ہے۔ انسانی قانون' یا تو شریعت کے احکام کو ختم کر رہا ہے یا اس میں تبدیلی کر رہا ہے ــــ شمالی افریقہ میں فرانسیسی اصول قانون' وسط ایشیا میں سوویت قانون' ہندستان میں انگلش کامن لا' انڈونیشیا میں ڈچ لا' اور ان سب سے بڑھ کر بین الاقوامی قانون۔ جو نہ صرف یہ کہ شریعت کے قانون کو متاثر کر رہا ہے۔ بلکہ اس نے مسلمانوں کے تصور عدالت تک کو بدل دیا ہے۔" (صفحہ ۸۸)

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم مذہب کے بارے میں پرانے تصورات کو بدل دیں اور چند باتیں بطور اصول تسلیم کر لیں۔ مصنف کے نزدیک یہ خاص طور پر تین ہیں:

۱۔ مذہب اور قانون کی تشریح بیسویں صدی کی اصطلاحات کی روشنی میں کی جائے۔
۲۔ اسلام کے دو حصے کرکے مذہب (عقیدہ) اور شریعت (قانون) کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ ۔۔۔ اور یہ مان لیا جائے کہ جہاں تک قانون کا تعلق ہے وہ قابل تغیر ہے۔
۳۔ اس بنیاد پر از سر نو اسلام کی تشریح کی جائے اور اسلام کے عقیدے کو ایک نیا مفہوم دیا جائے۔

"اگر اس تجزیہ سے" مصنف لکھتے ہیں" کچھ ایسے عناصر جن کو ہم روح اسلام کے اجزا سمجھتے رہے ہیں، متاثر ہوں یا سرے سے ترک ہو جائیں تو ہمیں حالات کے اس فیصلے کو قبول کرنا چاہیے۔ اگر اندرونی عقیدہ بچایا جا سکتا ہو اور اس کو طاقتور بنایا جا سکے، تو اس قسم کا آپریشن، اگرچہ وہ کافی تکلیف دہ ہوگا، لیکن وہ ایک ایسے جسم کو صحت اور طاقت دے گا جو خون کی کمی کی وجہ سے سوکھ رہا ہے! اور جس کی رہنمائی کے لیے کوئی دوسرا اصول موجود نہیں۔" صفحہ ۸۸

اس کے بعد مصنف نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ راسخ العقیدہ مسلمان
۲۔ غیر راسخ العقیدہ یا غیر مقلد مسلمان

راسخ العقیدہ سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو اب بھی اس پر مطمئن ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی مذہب کی وہ تفصیلی صورت جو ائمہ اربعہ نے مقرر کی ہے، وہی اصل مذہب ہے اور آج بھی مسلمانوں کے لیے وہی مفید ہے اور اس میں کسی قسم کی انقلابی تبدیلی خطرناک ہوگی۔ یہ لوگ اب بھی سنجیدگی کے ساتھ مخصوص روایات پر یقین رکھتے ہیں اور بڑے پیمانے پر اسی پر عمل کر رہے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ اگر وہ کچھ احکام پر عمل نہ بھی کر پاتے ہوں تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے لیے اچھا ہوگا کہ وہ قدیم روایتی ڈھانچہ کو پوری طرح برقرار رکھیں۔

غیر راسخ العقیدہ یا غیر مقلد وہ ہے جو اسلام کی باضابطہ روایات پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ اور ائمہ کی مقرر کی ہوئی مذہبی بنیاد کو نہیں مانتا۔ عقیدہ کا سنجیدہ اقرار اسلام کی واحد کسوٹی ہے۔ اسلام کے اعمال اپنی تمام تفصیلات میں قبول نہیں کیے جا سکتے۔ اسی طرح اگر آپ خدا اور رسول کے سوا اور کچھ عقائد کو رد کر دیں تو آپ پھر بھی غیر مقلد مسلمان باقی رہیں گے ۔۔۔ ۔۔۔ مصنف کے

نزدیک ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک معقول تعداد اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے صفحہ ۹۰ "میں اسی قسم کا ایک غیر مقلد (NON CONFORMIST) مسلمان ہوں" مصنف لکھتے ہیں۔

یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں مذہب کا منکر نہیں۔ منکر وہ شخص ہے جو سرے سے مذہب یا اسلام کی حیثیت کا انکار کرے یا کم از کم مذہبی عقاید کے بعض بنیادی اصولوں کو چیلنج کرے۔ ایک غیر مقلد مذہب کے بعض اعمال یا تصورات پر معترض ہو سکتا ہے۔ یا اس کا انکار کر سکتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی ہوگا۔ وہ مذہب میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے نہ کہ روایتی تصورات کے مطابق۔ میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ عقائد کا موجودہ ڈھانچہ ہمارے لیے مفید یا ہمارے موجودہ زمانے میں بھی وہ اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ اپنے عقیدے کی از سر نو تشریح کروں۔ میں اس مروجہ تشریح کو قبول نہیں کر سکتا جو سنی امامیہ یا شیعہ مدارس فکر نے پیش کی ہیں۔ پیچیدہ تفصیلات بے معنی رسوم اور بے روح تصورات نے مجھے جمود میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذیل میں میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر اسلام کی آزادانہ تشریح (LIBERAL INTERPRETATION) کی ایک اسکیم پیش کر دوں۔ صفحہ ۹۱

تاریخی طریقہ

(HISTORICAL APPROACH)

اسلام کا پیغام چودہ سال پہلے کے دور میں آیا تھا۔ کیا اب اس کی نئی تشریح کی ضرورت ہے۔ کیا وہ تمام دنیا اور ہر زمانے کے لیے نہیں۔ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ خواہ ایک پیغام سچا ہو اور خواہ وہ ایک مفہوم میں دوامی بھی ہو، پھر بھی اسی مقدمہ کے تحت ضروری ہے کہ اس کو جدید دنیا کی سائنس، فلسفہ، نفسیات، مابعد الطبیعات اور دینیات کے تحت سمجھا جائے ورنہ دنیا کا فکر اور اس کی روشنی اسے ختم کر دے گی۔

انسان کی تاریخ میں یہ تقریباً صرف دس ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ اس کے ذہن میں خدا کا تصور آیا جو اس کی قسمت پر حکمراں ہے۔ آسمان کے ستارے، جنگل کے درندے، ہوا کی چڑیاں، خشکی پر رینگنے والے جانور اور سمندر کی مچھلیاں مافوق الفطرت ہستیاں تصور کی گئیں

جو نقصان پہونچانے کی طاقت رکھتی ہیں اور ساری دنیا میں انسان نے ان خداؤں کو پوجنا شروع کیا۔ اور قربانی، بھجن، مذہبی اعمال و رسوم اور رقص کے ذریعہ اس نے کوشش کی کہ انکی آفتوں سے بچ سکے اس کے تقریباً پانچ ہزار برس بعد یعنی اب سے پانچ ہزار برس پہلے میسوپوٹامیا یا اس کے پاس اور ہندستان میں معلوم تاریخ میں پہلی بار انسان اس عقیدہ تک پہونچا کہ خدا ہزاروں نہیں بلکہ صرف ایک برتر ہستی ہے۔ ایک برہم، ایک وجود مطلق (ABSOLUTE) ایک خالق، رام یا رحیم جس نام سے بھی تم اسے پکارو، وہی ایک عبادت کا مستحق ہے۔ ایک لمبی دکھ بھری تلاش کے بعد انسان اس عظیم دریافت تک پہونچا۔ بلاشبہ انسان کی تاریخ میں واحد عظیم ترین دریافت! جو زیادہ عظیم ہے زیرو کی دریافت سے، آگ کی دریافت سے، لوہے اور نظریہ اضافیت کی دریافت سے یا اور کسی دریافت سے وحدانیت کا تصور نہایت نادر چیز ہے۔ وہ ایک پراسرار طاقت ہے، وہ مایوس روحوں کو زندگی دیتا ہے، وہ زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ وہ آدمی کو وہ کچھ دیکھنے کے قابل بناتا ہے جو وہ نہیں جان سکتا۔ وہ انسانی علوم اور ان کی تبدیلیوں پر منحصر نہیں ہے۔ یہ ایک دوامی تصور ہے جو بدلتا نہیں۔ جس کے لیے نہ زوال ہے نہ نقص۔ یہ پیغام اکثر کسی حساس انسان کی مرتعش روح کی معرفت آیا ہے۔ انھیں منتخب لوگوں میں سے ایک پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ ان کی تلاش کی تاریخ، ان کا ذہنی کرب اور بالآخر روشنی کا حصول قرآن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب سچائی کے اس اندرونی ادراک سے بھری ہوئی ہے جس نے انسانی تاریخ کو خدا کی معرفت بخشی۔ (یہاں مصنف نے مثال کے طور پر سورۂ تکویر کا ترجمہ نقل کیا ہے)

خدا کے وجود کا عقیدہ تجربے پر منحصر ہے۔ وہ نہ ثابت کیا جا سکتا نہ ہی غلط ٹھہرایا جا سکتا۔ انسانی عقل یا معلومات یا سائنس کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ سائنس کے مفروضے، نظریات اور حقائق عین اپنی فطرت کے اعتبار سے قابل تغیر ہیں مگر خدا کا عقیدہ ناقابل تغیر اور وجدانی ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ انسان کی عظیم ترین واحد دریافت ہے۔

مگر اس کامل صداقت کا انتقال ایک ناقص ذریعہ سے ہوتا ہے یعنی زبان کے ذریعہ سے۔ زبان ایک انسانی چیز ہے۔ وہ بدلتی رہتی ہے۔ کوئی زبان پانچ یا دس ہزار برس سے زیادہ پرانی سمجھی نہیں جا سکتی۔ ہماری زمین پر ایسی بہت سی انسانی تحریریں موجود ہیں جن کا مطلب جاننے

والے لوگ آج نہیں۔ عرب کی قدیم زبان میں پچھلے دو ہزار برس کے اندر کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ اور لسانیات کا مطالعہ قطعی طور پر بتاتا ہے کہ الفاظ کے معانی اور ان کے باہمی فرق میں ارتقائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی زبان ٹھہری ہوئی نہیں رہتی۔ جب یہ ظاہر ہے کہ پیغمبر کے زمانہ میں عرب جو زبان استعمال کرتے تھے، اس میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی، یہاں تک کہ وقت گزرنے کے بعد ان کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہو سکتا ہے جتنا کہ موہن جوداڑو کی زبان کا سمجھنا۔ مگر ہم مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ اس کا مرکزی پیغام اس کی زبان سے زیادہ مدت تک باقی رہے گا۔ اور وہ ہے خدا کا عقیدہ ــــــ "آسمان اور زمین فنا ہو جائیں گے مگر میرا کلام فنا نہ ہوگا۔" (انجیل) صفحہ ۹۲

اس لیے میرے نزدیک یہ بالکل واضح ہے کہ ہم قرآن کی طرف واپس نہیں جا سکتے۔ البتہ قرآن کو لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ میں قرآن کو سمجھنا چاہتا ہوں، اس مفہوم میں جیسے کہ پیغمبر کے زمانے کے عربوں نے سمجھا تھا۔ مگر صرف اس کی تعبیر نو کے لیے اور اس کو اپنی زندگی کے حالات پر منطبق کرنے اور اس پر اس حد تک عقیدہ رکھنے کے لیے جس حد تک وہ بیسویں صدی کے انسان کی حیثیت سے مجھے اپیل کرتا ہے۔ مجھ سے صحرا میں رہنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ میں اونٹ پر سواری کروں اور کپڑے مکوڑے کھاؤں۔ قبائلی لڑائیوں میں شریک ہوں اور داڑھی رکھوں اور چغہ پہنوں اور ایک دقیانوسی عرب کی ذہنیت اپنے اندر پیدا کروں۔ مجھے فرق کرنا چاہیے۔ شاعرانہ حقیقت (POETIC TRUTH) اور حقیقی صداقت FACTUAL TRUTH میں۔ میں فرق کروں گا مذہب کے مغز اور اس کے چھلکے میں، قانون میں اور مذہبی افسانہ میں۔ مجھے اسلام کے پیغام کو ایک جدید انسان (MODERN MAN) کے طور پر سمجھنا اور قبول کرنا ہے۔ نہ کہ ایسے شخص کی طرح جو صدیوں پہلے رہتا تھا۔ میں محترم شخصیتوں کا احترام کرتا ہوں مگر شعوری معاملات میں بلا کیف (WITHOUT HOW) کسی بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ اور قرآن کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تشریح تاریخی اصولوں کے مطابق کی جائے۔ سب سے پہلے ہم ماقبل اسلام عیسائیت اور یہودیت کا مطالعہ کریں گے۔ یہودیت اور عیسائیت کو ان کے تاریخی پس منظر میں پوری طرح سمجھنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام

کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔

ہندستان ایک مذہبی ملک ہے۔ ہم ہندستان میں بالخصوص زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہیں کہ مذہب کی تعبیر کر سکیں۔ یہاں ہندو، بدھسٹ، جینی، سکھ، عیسائی، زرتشت کے پیرو، یہودی اور مسلمان ایک سیکولر دستور کے سایہ میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں جو قانونی طور پر ہر عقیدہ کی یکساں ضمانت دیتا ہے۔ یہ دستور ہماری طویل رواداری روایت کے مطابق ہر شہری کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنا عقیدہ رکھے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ اس طرح ہندستان کے مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اپنے عقائد اور مذہبی اعمال کا مقابلہ کر کے اسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہندو مذہبی شخصیتوں کا احترام مسلمانوں کی طرف سے اور مسلم مذہبی شخصیتوں کا احترام ہندوؤں کی طرف سے اس ملک کی عام خصوصیت ہے۔ یہ اسلام کی ایک ہندستانی تعبیر (INDIAN INTERPRETATION OF ISLAM) ہے جو تعصب اور مذہبی دیوانگی کو ختم کرنے والی ہے اور انتخاب (ELECTICISM) اور رواداری کو جنم دیتی ہے۔ (۹۴) (باقی)

بعض مفید کتابیں

فضائل صبر و شکر :- از ارشادات حکیم الامت تھانویؒ قیمتے ۸/-

شمائم امدادیہ :- قیمتے ۲/ حالات مشائخ کاندھلہ قیمتے ۳/۵۰

تذکرہ حسن :- سوانح حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ قیمتے ۲/-

تہذیب النسواں :- نواب شاہ جہاں بیگم (سابق والیہ بھوپال) قیمتے ۴/-

اصول فقہ :- مولانا قاری حبیب الرحمٰن صدیقی قیمتے ۴/۷۵

محمدیہ پاکٹ بک : (ردقادیانیت) قیمتے ۷/۰

ملنے کا پتہ ⇐ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ۔

ایک تاریخی وثیقہ

مولانا سندھی کے ساتھی ظفر حسن صاحب کی "آپ بیتی"

۱۹۱۰ء کے بعد پاک و ہند کے مسلمانوں میں یکے بارگی برطانیہ دشمنی کی ایک لہر اٹھی تھی، جو ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان اور اس کے بعد ۱۹۱۴ء کی جنگ طرابلس کی وجہ سے برابر زور پکڑتی گئی پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہوتی ہے، گو اس جنگ کے دوران برطانوی حکومت کے جبر کے تحت مسلمان خاموش رہے، لیکن جیسے ہی جنگ ختم ہوئی ان کی یہ برطانیہ دشمنی ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئی چنانچہ خلافت تحریک کے سلسلے میں کوئی تیس ہزار مسلمان بڑے جوش و خروش سے جیلوں میں گئے اور اس وقت برطانیہ دشمنی اسلام کا ایک لازمی شعار بن گیا۔

برطانیہ دشمنی کی اس لہر کے اہم مرکز علی گڑھ کا ایم او کالج، لاہور اور بعض دوسرے شہروں کے کالج تھے، یعنی گزشتہ تیس چالیس سالوں سے ان کالجوں میں جن مسلمان نوجوانوں کو حکومتِ وقت کی وفاداری کی تلقین ہو رہی تھی، ان ہی میں سے بعض ایسے نوجوان اٹھتے ہیں جو برصغیر سے برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے جان کی بازی لگاتے ہیں، اور وہ کچھ کر گزرتے ہیں کہ ان کے کارنامے آج ہمیں ایک افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔

ان مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں برطانیہ دشمنی کی اس آگ کو ہوا دینے میں مولانا محمد علی مرحوم کے انگریزی ہفت روزہ "کامریڈ" علامہ اقبال کی ملی نظموں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کا بڑا دخل تھا۔ زیر نظر کتاب "آپ بیتی" کے مصنف محترم ظفر حسن صاحب

اس دور کے ان مسلمان نوجوانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اس سرزمین سے برطانیہ کو نکالنے اور اس سرزمین سے باہر دوسرے مسلمان ملکوں کو اس کے چنگل سے بچانے کی خاطر ۱۹۱۵ء میں اپنے قدیم وطن کو خیرباد کہا۔ اور اب اپنے نئے وطن ترکی میں اپنی اس پچاس سال کی جدوجہد کی ایک مختصر کہانی ہمیں سنا رہے ہیں۔

محترم ظفر حسن صاحب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے معتمد ترین، مخلص ترین اور قابل ترین ساتھیوں یا زیادہ صحیح الفاظ میں جیسے کہ وہ خود بار بار اس کتاب میں اپنا تعارف کراتے ہیں، شاگردوں میں سے فائق ترین ہیں۔ اور ان کی یہ "آپ بیتی" ایک لحاظ سے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ہی کی آپ بیتی کا ایک حصہ ہے۔ اور اس سے نہ صرف ان دونوں بزرگوں کی زندگی اور جدوجہد کی ایک تصویر ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ اس دور کی برصغیر اور اس کے علاوہ بین الاسلامی سیاسیات کی تاریخ سے ہم متعارف ہوتے ہیں۔

ظفر حسن صاحب ۱۸۹۵ء میں کرنال میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان ایک مذہبی خاندان تھا۔ مشہور بزرگ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری جنہیں "وہابیوں" کے لیے خفیہ چندہ کرکے سرحدی علاقے میں بھیجنے کے الزام میں کالا پانی کی سزا دی گئی تھی، آپ کے رشتہ دار تھے چنانچہ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:

"میں نے ان کو کئی دفعہ جب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا، دیکھا تھا اور ان کو چچا جی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔"

ظفر حسن صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ اور اس میں وظیفہ لیا جس کی وجہ سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے، ایف ایس سی میں بھی ان کو وظیفہ ملا۔ اور بی اے میں انھوں نے ریاضی لی۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> جب گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ جنگ بلقان شروع ہو گئی۔ اس کے بعد جنگ طرابلس ہوئی۔ اس سے مسلمانوں میں بہت بے چینی پھیلی۔ ترکوں کی حمایت میں عام جلسے ہونے لگے۔ چندے جمع کیے جانے لگے..... ڈاکٹر اقبال مرحوم ان جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ میں بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ان جلسوں

میں شریک ہوا کرتا تھا۔ طرابلس کے شہیدوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس نظم کا جس کا عنوان "حضور رسالت مآب میں" ہے ہمارے دلوں پر بہت اثر ہوا۔"

اس نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں:۔

مگر میں نذر کو آبگینہ لایا ہوں — یہ چیز وہ ہے کہ جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ترکوں کے خلاف انگریز اور دوسری یورپی قومیں جس طرح برسرپیکار تھیں اور ان کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں اس سے مسلمانان پاک و ہند کے جذبات بڑے مشتعل تھے۔ اس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف انگریزوں سے نفرت بڑھ رہی تھی وہاں دوسری طرف کالجوں میں پڑھنے والے مسلمان نوجوانوں میں اسلامیت کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایم۔ او۔ کالج علی گڑھ کے طلبہ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور اس طرح جو پیسے بچائے وہ ترکوں کی امداد کے لیے بھیجے۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے ایم او کالج کے طلبہ یہ الاپتے سنے جاتے تھے "بلقان چلو" بلقان چلو" مولانا شبلی کی مشہور نظم شہر آشوب اسلام اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کا مشہور شعر ہے:

کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا نشاں کب تک

اسلامی ہند کی یہ فضا تھی، جس سے ظفر حسن صاحب اور ان کے گورنمنٹ کالج لاہور کے بعض دوسرے ساتھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ جہاں وہ پابندی سے نمازیں پڑھنے لگے، وہاں برطانوی حکومت کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنے کے منصوبے بنانے میں لگ گئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

کالج کے باغ کے کمپاؤنڈ میں مسلمان طالب علموں نے نماز کے لیے ایک چبوترہ بنا لیا تھا۔ اسی کے نزدیک کسی بزرگ کی قبر تھی ..... ہم صبح کی نماز اکثر جماعت سے پڑھا کرتے تھے۔

ظفر حسن صاحب کے کئی ایک دوسرے ساتھی تھے، جن میں سے اکثر ان کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں عازم کابل ہوئے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

جنگ بلقان کی خبریں اکثر بحث میں آیا کرتی تھیں۔ اور ہم سب ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ہمارے اس زمانے کے قومی و مذہبی خیالات کی نشوونما میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے انگریزی اخبار کامریڈ اور مولانا ابوالکلام مرحوم کے ہفتہ وار "الہلال" اور البلاغ کا بہت

اثر ہوا۔ ان ہی اخبارات کے مقالوں نے ہمیں ترکوں کا گرویدہ بنا دیا۔ انگریزوں کے برخلاف بھی ہمیں ان ہی تحریروں نے ابھارا اور ہم میں قومی جذبات بھی ان ہی جریدوں نے پیدا کیے۔

موصوف اپنے ایک ساتھی خوشی محمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں کالج کے بورڈنگ میں اس کے کمرے میں پانی لینے گیا، تو دیکھا کہ اس نے صراحی توڑ دی ہے اور وہ مغموم بیٹھا ہے، میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا بلغاریوں کے ترکوں کے شہر اڈریانوپل پر قبضہ کرنے کی خبر آئی ہے، اور میں نے اظہار غم میں صراحی توڑ دی ہے۔ یہ خوشی محمد ظفر حسن صاحب کے ساتھ کابل گئے اور وہاں سے روس چلے گئے۔

یہ تو بہرحال نوجوان تھے، اور ان کی جذباتیت سمجھ میں آتی ہے، لیکن اس دور میں بڑوں کا کیا حال تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے۔

مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی ایک نامکمل تصنیف میں لکھا ہے

"میں بلقان کی پُر مصائب جنگ کے دوران میں ایک وقت شدت جذبات سے اتنا بے تاب ہو گیا تھا، میں آج یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت خودکشی کرنے تک کا سوچا.....

.....اس رات اس مضمون کا لائٹر کا آخری تار مجھے ملا تھا کہ بلغاری فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے صرف ۲۵ میل دور رہ گئی ہیں۔ وہ قسطنطنیہ جو گزشتہ پانچ صدیوں سے ہر مسلمان کے لیے اس کی سب سے اعلیٰ امیدوں کے مرکز ہونے کی وجہ سے مقدس تھا۔"

وہ تو اتفاق سے عین اس وقت ان کا ایک بے تکلف دوست آگیا، جو انھیں زبردستی وہاں سے اٹھا کر لے گیا ورنہ مرحوم کے الفاظ میں "ایک ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور خون سے لت پت جسم کا ہولناک منظر دیکھنا پڑتا، جس کے بارے میں تیسری منزل سے اتفاقیہ گرنے کا حکم لگایا جاتا۔"

ترکوں کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، اس کی وجہ سے ان سے ہمدردی کا جذبہ جس حد تک پہونچ گیا تھا، وہ آپ نے دیکھا۔ اور بقول ظفر حسن صاحب کے خوشی محمد اور ان کے چند دوستوں نے جن میں ہمارا ہم جماعت شجاع اللہ بھی شریک تھا یہ سوچا کہ گورنمنٹ کالج کو آگ لگا کر انگریزوں سے انتقام لیں۔ .. .. شجاع اللہ نے ایک رات کو کالج کے کلرک کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ مکا مار کر توڑا۔ اور ان کے ساتھیوں نے کچھ مٹی کا تیل کمرے میں چھڑک کر مٹی کے تیل میں ڈوبے ہوئے جلتے چیتھڑوں

کو اندر پھینکا اور کمرے کو جلانے کی کوشش کی لیکن آگ زیادہ نہ جلی اور کمرے کے کاغذات وغیرہ کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہونچا ....."

گورنمنٹ کالج لاہور کے ان طالب علموں نے بنگالی ہندوؤں کی طرح بم بنانے کا بھی سوچا چنانچہ" اس لیے فیصلہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے جو اس وقت کلکتہ میں" الہلال" نکالا کرتے تھے، مل کر ان کے ذریعہ سے بم حاصل کریں۔ اس غرض سے ہم نے شیخ عبداللہ کو کلکتہ بھیجا، لیکن وہ وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا کیونکہ مولانا آزاد مرحوم کو ایسی سنسنی کی کارروائی سے اور قتل و غارت سے کوئی تعلق نہ تھا۔"

ان ہی دنوں پہلی جنگ عظیم شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ترکی جرمنی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف شامل ہوتا ہے۔ ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی ایک برطانوی جریدہ میں سلطان ترکی کی ایک تصویر دیکھتے ہیں، جس میں وہ ایک عام جلسے میں جہاد کا فتویٰ پڑھ رہے تھے۔ اس تصویر کے نیچے برطانوی جریدے نے تحقیر آمیز عبارت لکھی تھی۔

۱۹۲۱ء میں بالاکوٹ میں حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں میں سے مجاہدین کی ایک جماعت نے افغانستان اور ہندوستان کی سرحد کے آزاد علاقے میں اپنے مرکز قائم کر لیے تھے اور وہاں سے خفیہ طور پر ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف کام ہوتا تھا۔ ان ہی دنوں اس جماعت کے بعض نمائندوں کا ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی طالب علموں سے ربط پیدا ہوتا ہے۔ ان نمائندوں کو جب" اطمینان ہو گیا تو انھوں نے خلیفۃ المسلمین کے فتویٰ جہاد کی ایک نقل ہمارے پاس بھیج دی۔ اس سے ہم سب میں ترکوں کی صفوں میں شریک ہو کر انگریزوں کے برخلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ہمارے اس قسم کے خیالات کو قوی تر بنانے کے لیے انھوں نے ہمیں ـــــ سپارہ (۱۰) سورہ توبہ رکوع ۲ کی اس آیت کو قل ان کان اٰباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین پڑھنے اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت

کی اور کہا کہ جہاد کے لیے اس دارالکفر سے نکل کر ہمیں ایک دارالاسلام میں چلا جانا چاہیے اور وہاں سے ترکی فوج میں داخل ہونے کے لیے ترکی پہونچنا چاہیے۔ ہم سب اس پر راضی تو ہو گئے لیکن میں نے استخارہ کیے بغیر اس طرح کا فیصلہ کرنا نہ چاہا....."

"صوف کے بی اے کے امتحان میں صرف ایک ماہ باقی تھا۔ اور چونکہ وہ بڑے محنتی تھے اور جماعت میں ہمیشہ اوّل رہتے تھے۔ اس لیے خود ان کے الفاظ میں "مجھ سے یہی توقع کی جاتی تھی کہ میں اسٹیٹ سکالرشپ لے کر ولایت جا سکوں گا۔ چودھری ظفر اللہ صاحب پہلے مسلمان تھے جن کو یہ وظیفہ ملا تھا۔ ان کے بعد کئی سال تک کسی مسلمان کو یہ وظیفہ نہ مل سکا۔ اب سب مسلمانوں کی امیدیں اس پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ وظیفہ پھر ایک مسلمان طالب علم کو ملے گا...."

۵ فروری ۱۹۱۷ء کو جمعہ کی نماز کے بعد ان طالب علموں کا پہلا قافلہ لاہور سے روانہ ہوا سب سے پہلے یہ ہری پور ہزارہ پہونچا، وہاں سے ریاست امب کی حدود میں داخل ہوا۔ نواب امب کے وزیر اعظم جماعت مجاہدین کی خفیہ طور پر حمایت کیا کرتے تھے۔ ہری پور سے یہاں تک پہونچنے میں ان نوجوانوں کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وزیر اعظم مذکور کے ہمدردانہ الفاظ سے ان کی کچھ تلافی ہو گئی۔ یہاں سے اس قافلے نے دریائے سندھ پار کیا۔ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:

> دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اتر کر ہم نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور خدا کا شکر کیا کہ خیریت سے سلامتی کی جگہ پر پہونچ گئے۔ ... ... اب ہمیں ایک ایسی سرزمین کی طرف روانہ ہو رہا تھا جہاں نہ کوئی میرا واقف تھا اور نہ وہاں کی زبان میں جانتا تھا۔ اس سرزمین میں کیسے گزارہ کروں گا۔ وہاں کوئی مفید کام کر سکوں گا یا نہیں، یہ سب کچھ مجہول اور نامعلوم تھا۔ اگر تسلی تھی تو صرف یہ تھی کہ اسلامی احکام کی پابندی کے لیے یہ سب پابندیاں عائد کر رہا ہوں۔

دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد انتہائی کٹھن سفر طے کر کے یہ قافلہ جماعت مجاہدین کے مرکز اسمس واقع علاقہ بنیر میں پہونچا۔ اس مرکز کی اس وقت کیا حالت تھی۔ اس کا مختصر خلاصہ "آپ بیتی" میں یوں دیا گیا ہے۔ "..... جماعت مجاہدین جو ایک مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے ارکان بہت مخلص اور جاں نثار تھے۔ سراپا عمل اور ہر قسم کی مصیبتوں کے سامنے سینہ سپر

ہونے کو تیار تھے۔ ان کو نہ مال و دولت کی آرزو تھی اور نہ دنیاوی جاہ و عزت کی تمنا تھی۔ وہ تو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنی جانیں وقف کر چکے تھے اور اس امید پر کہ ان کو ایک دن کفار سے لڑنے، جہاد کرنے اور میدان جنگ میں جام شہادت پینے کا موقع ملے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کو دنیا کے تبدیل شدہ حالات کے مطابق کوئی تعلیم و تربیت دینے والا اور ان کو نئی فوجی قواعد سکھانے والا نہ تھا۔ ان میں سے بہت سے بالکل ان پڑھ تھے۔ ان کے پاس نئی بندوقیں صرف چند ایک تھیں۔۔۔۔ یہ بندوقیں رئیس مجاہدین کے محافظین کے ہاتھ میں تھیں۔ باقی لوگوں کے پاس چقماقی یا فتیلی بندوقیں تھیں جن کا استعمال اب دنیا میں شاید کہیں بھی نہ رہا تھا۔۔۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جماعت دنیا کی ترقیات اور زمانے کی رفتار سے بالکل بے خبر رہ کر ایک طفیلی اور مسکین سی ٹولی بن گئی تھی جس کا گزارہ یا تو ہندوستانی مسلمانوں کے چندے پر تھا یا حکومت افغانستان کے وظیفہ پر۔

نوجوان طلبہ کا قافلہ چند دن یہاں رہا اور مصنف "آپ بیتی" کے الفاظ میں اس ناگفتہ بہ حالت کا "ہم پر بہت برا اثر ہوا۔ ہم اس نتیجے پر پہونچے کہ یہاں رہ کر ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے کچھ کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں کابل جانا چاہیے تاکہ افغانی حکومت کو جنگ میں شامل ہونے پر راضی کریں۔ اگر کامیابی نہ ہو تو ترکی چلے جائیں اور وہاں ترکی فوجوں میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ اس لیے کابل کو مجاہدین کا ایک وفد بھیجا گیا تاکہ ہمارے کابل جانے کا راستہ صاف کیا جائے اور افغانی حکومت سے ہمارے لیے کابل جانے کی اجازت لی جائے۔"

آخر کابل جانے کی اجازت آگئی۔ بڑی مشکلوں سے اور سخت جاں گداز تکلیفوں کے بعد ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی جلال آباد پہونچے۔ جلال آباد میں انھیں نہایت گندی سرائے میں ٹھہرنا پڑا، لیکن اس کے بعد ان نوجوان طلبہ کے ساتھ جو اسلام اور مسلمان ملکوں کی خدمت کے لیے اپنا گھر بار عزیز و اقارب اور وطن چھوڑ کر اور اپنے مستقبل کی تمام امیدوں کو ختم کر کے ایک آزاد مسلمان ملک میں وارد ہوئے تھے، کیا سلوک کیا گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

ہم رات کو رباط آکر سو رہے لیکن صبح کے قریب جب رحمت علی اور عبدالرشید وضو کے

بے ساختہ باہر نکلنے لگے تو ان کو ایک سپاہی نے جس کی بندوق پر سنگین (برچھی) لگی ہوئی تھی، مدکا اور سنگین کو ان کی طرف پھیر کر بہت غصے سے کہا۔ موقوف است بیرون برآمدہ نمی توانی (یعنی تمہارے لیے باہر جانا منع ہے) یہ بچارے ڈر کر پریشانی کی حالت میں واپس آئے۔ جب ان نکلا تو ہم نے دیکھا کہ ہم سب کے سب نظر بند ہیں اور ہم پر ہتھیار بند سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا ہے۔۔۔۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حالت ہماری وہ نظر بندی شروع ہوئی جو چار سال یعنی ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں کے قتل تک جاری رہی۔

اس نظر بندی کی وجہ یہ تھی کہ ان طلبہ کی ہجرت پر پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر کا اخبارات میں یہ بیان چھپا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی پکڑا گیا تو اس کو ہندوستان کی سرحد پر سب سے پہلے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے پرائیویٹ سکریٹری علی احمد خاں کی نظر سے یہ بیان گزرا، اور اس نے برطانوی حکومت کو خوش کرنے کے لیے نظر بندی کا یہ حکم صادر کر دیا اور جب ایک بار اس طرح کا حکم صادر ہو گیا، تو پھر کون کسی کا پاسبان حال ہو سکتا تھا۔

"آپ بیتی" میں اس وقت افغانستان کی جو حالت تھی اس کا اجمالی خاکہ بھی دیا گیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہاں انتہائی حد تک تو پس ماندگی تھی ہی، لیکن خود افغانی عوام کی دنیا کی ہر چیز سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ مصنف کے الفاظ میں:۔

اس وقت افغانستان میں صرف ایک ہفتہ وار فارسی اخبار نکلتا تھا۔۔۔۔۔
۔۔۔اس اخبار کا نام سراج الاخبار تھا۔۔۔۔ جلال آبادی اکثر ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اور لوگ عام طور پر پشتو گو ہونے کے سبب سے سراج الاخبار کو کوئی زیادہ نہیں پڑھتا تھا اور بازار میں اخبار نہ بکتا تھا۔ اس لیے ہم جنگ کے متعلق کوئی تازہ خبر حاصل نہ کر سکے۔ ہم جب لوگوں سے پوچھتے کہ جنگ کے بارے میں تازہ خبر میں کیا ہیں، تو وہ جواب دیتے تھے "بڑے مقومہ ہست" یعنی جنگ جاری ہے۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ ہم اپنے خیال میں افغانستان کو ایک مہذب ملک تصور کیا کرتے تھے لوگوں کے اس قسم کے جواب سے ہمیں تعجب بھی ہوا اور مایوسی بھی، ہم نے امیدیں باندھ رکھی تھیں کہ افغانستان ہندوستان کی آزادی میں مدد دے گا اور انگریزوں سے لڑے گا۔ یہاں آکر دیکھا کہ کسی کو جنگ عظیم کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں۔ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ ہم نے خط لکھنے کے لیے کاغذ اور لفافے تلاش کیے تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی دکان ہی نہیں جہاں قلم دوات یا پنسل بکتی ہو۔ ہمیں کہا گیا کہ کاغذ قصاب کی دکان پر بکتے ہیں مگر قلم دوات بیچنے والا کوئی نہیں۔

دریائے اٹک سے اس پار کے ان مسلمان عوام اور ان کی حکومت سے یہ امیدیں صرف کالج کے ان نوجوان طلبہ ہی کو نہ تھیں، بلکہ مصنف کے الفاظ میں:

"اس وقت ہم کو اور ہماری طرح ہندوستانی مسلمان لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ افغانستان ایک قوی اسلامی ملک ہے۔ اور اگر وہ لڑائی میں شریک ہو کر ہندوستان پر حملہ کرے تو وہ انگریزوں کو ضرور ہندوستان سے نکال دے گا۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کا افغانستان آنا اسی غرض سے تھا کہ افغانستان کو شامل ہونے پر اور ہندوستان پر چڑھائی کرنے پر آمادہ کیا جائے۔"

اور یہ خوش فہمی صرف ہمارے ان بزرگوں کی نہیں تھی، بلکہ اس سے تقریباً ایک سو سال قبل ہمارے دوسرے بزرگ بھی اس قسم کی خوش فہمیوں کے ساتھ ہندوستان سے نکل کر دور دراز کی مسافتیں طے کر کے اٹک سے اس پار پہونچے تھے اور پھر ان کوششوں کا جو دردناک حشر ہوا معرکہ بالاکوٹ اس کا امٹ نشان ہے۔ افسوس ہے اس معرکے کے بعد بھی مجاہدین کی بعض جماعتیں ان آزاد علاقوں کا رخ کرتی رہیں اور بعد میں ان کے مراکز کی جو افسوسناک حالت ہوئی "آپ بیتی" میں کئی جگہ اس کا ذکر ہے، جسے پڑھکر سخت روحانی اذیت ہوتی ہے اور خلوص اور ملیت کے ضائع جانے کا رنج ہوتا ہے۔

یہ بہادر طالب علم جان جوکھوں میں پڑ کر ایک آزاد مسلمان ملک میں پہونچے لیکن جلال آباد پہونچتے ہی وہ نظر بند کر دیے گئے۔ ان کے سالار قافلہ عبدالمجید خاں جو سارے ساتھیوں کا بھاری سامان لانے کے لیے خفیہ طور پر پشاور سے بھیجا گیا تھا، ڈاک گئے اور جلال آباد واپس آتے انھیں ٹائی فائیڈ ہو گیا، اسی بخار کی حالت میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ "... خچروں پر سوار ہو کر کابل روانہ

ہوئے کابل تک ساتھ گئے تھے عبدالمجید خاں کی علالت بخار کی وجہ سے روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی لیکن راستے میں ٹھہرنے اور رہنے کا امکان نہ تھا۔ ..... کیوں کہ راستہ میں پرائیویٹ کوئی ڈاکٹر موجود تھا اور نہ کوئی دوائی مل سکتی تھی اسلیے ہم چاروناچار سفر کرنے پر مجبور تاکہ جلد کابل پہونچ کر کسی ڈاکٹر سے ان کا معالجہ کرائیں۔

عبدالمجید خاں کابل تک تو زندہ پہونچ گئے اور ایک ہندوستانی ڈاکٹر نے انہیں دوائی بھی دی لیکن وہ جاں بر نہ ہوسکے اور ۱۹۔ اپریل ۱۹۱۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی موت سے ہم کو جتنا صدمہ ہوا، اس کا ذکر یہاں میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔

ان طلبہ کے قافلے کے دو رکن عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں اسی زمانے میں مولوی بشیر صاحب جماعت مجاہدین کے امیر کابل سے رخصت ہو رہے تھے انھوں نے ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تجویز کیا (عبیداللہ) صاحب کو کہا تاکہ اس کی جماعت مجاہدین میں ایک تازہ اور نئی روح پھونکیں، لیکن افسوس ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ان دو نوجوانوں کو وہاں بھیجنے کے باوجود بھی وہ لکیر کے فقیر لوگ ایسے دقیانوسی خیالات کے ثابت ہوئے کہ عبدالرشید تو ان کے رئیس نعمت اللہ کی منافقت سے تنگ آگیا اس کو شبہ ہوا کہ نعمت اللہ انگریزوں سے مل گیا ہے۔

"اس نے ایک روز نعمت اللہ کو قتل کردیا۔ اس کے محافظوں نے عبدالرشید کو زخمی کیا اور ابھی وہ جان ہی توڑ رہا تھا کہ اسے تنور میں ڈال کر جلا دیا۔"

عبدالرشید کا تو یہ انجام ہوا۔ محمد حسن یعقوب مجاہدین کے دوسرے مرکز غلزئی کے گاؤں چرکنہ چلے گئے اور وہاں سے ان کی مدد سے مولوی محمد بشیر صاحب نے سائیکلو اشائل میں انگریزوں کی مخالفت میں ایک ہنگامہ برپا کیا اور بعد میں وزیرستان کے علاقہ میں محمد حسن یعقوب کی سرکردگی میں مجاہدین کی ایک ٹولی بنائی اور اس طرح پر انگریزوں کے برخلاف لوگوں کو اکسانے کی کوششیں کیں لیکن یہ سب جدوجہد بے مائیگی کی وجہ سے ناکام رہی۔

اس زمانے کا شہر کابل کیا تھا؟ امیر کابل کی درباری زندگی کیسی تھی؟ امیر کابل کے شہوانی افعال کس حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ پھر دربار میں کون کون سے سیاسی گروپ تھے۔ ظفر حسن صاحب نے

بڑی وضاحت سے اسے بیان کیا ہے اور اسے پڑھ کر اس زمانے کے کابل اور اس کی سیاست کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

طلبہ کی جماعت نظر بند تھی کہ ۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن کابل پہونچا۔ اس مشن کے لیڈر راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ اور اس کے ایک رکن مولانا برکت اللہ بھوپالی تھے۔ مصنف کے الفاظ میں:۔

> اس وفد کا مقصد امیر افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف اکسا کر افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانے کی تیاریاں کرنا اور اس طرح پر انگریزی فوجوں کے ایک معتدبہ حصے کو یورپین محاذوں کی بجائے ہندوستان میں رہنے پر مجبور کرنا اور جرمنی اور ترکی فوجوں کو اس کے برخلاف زیادہ جنگ کرنے کا موقع دینا اور اگر افغانستان انگریزوں سے لڑ پڑے تو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا تھا۔

۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو یہ وفد کابل پہونچا، اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی کابل پہونچ گئے۔ ظفر حسن صاحب نے بڑی تفصیل سے اس تاریخی وفد کی سرگرمیوں اس کے ساتھ افغان حکومت کی دوغلی پالیسی، اور وفد کی سرگرمیوں میں مولانا سندھی کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا کی وجہ سے ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی نظربندی کی تکلیفیں کچھ کم ہوگئیں اور وہ قدرے آرام سے رہنے لگے۔ حضرت مولانا نے ان بہادر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور انھیں وہ آگے بڑھانے لگے مصنف لکھتے ہیں۔

> قبلہ مولانا مرحوم نے ہمیں مرحوم عبد المجید خاں کی جگہ ایک نیا سردار چننے کو کہا اور ہم نے اتفاق رائے سے عبد الباری[1] صاحب کو اس عہدے کے لیے انتخاب کر لیا۔ اس کے بعد جب مولانا صاحب مرحوم کو ہندوستانی، ترکی، جرمن وفد سے ملنے کی اجازت ہو گئی تو وہ عبد الباری کو اپنے

---

[1] میاں عبد الباری صاحب ایم۔ این۔ اے۔ (مدیر)

ساتھ رہے چاہا کرتے تھے تاکہ وہ ان کی انگریزی میں ترجمانی کرے اور ان کا گفت و شنید سے بھی واقف ہو۔ آئندہ کے لیے جو منصوبے وہ بنائیں۔ انھیں ان کے مشیر کے طور پر کام دے۔

یہ وفد کا نام رہا۔ اور امیر حبیب اللہ خاں نے اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں سے اپنا وظیفہ اور بڑھوا لیا۔ راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی حکومت موقتہ ہند بنا رکھی تھی، جب وہ کابل آئے تو انھوں نے اس میں مولانا عبید اللہ صاحب کو شامل کر لیا اور انھیں وزیر داخلہ کا عہدہ دیا۔ اس حکومت کی طرف سے روس کو ایک وفد بھیجا گیا، جس میں ظفر حسن صاحب کے ایک ساتھی طالب علم خوشی محمد بھی شریک تھے۔ غرض کابل پہونچنے کے بعد مولانا عبید اللہ کی جتنی بھی سرگرمیاں تھیں، ان میں یہ طالب علم برابر حصہ لیتے رہے اور ان کی وجہ سے مولانا کو اور انھیں کافی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔

مصنف نے بڑی شرح و بسط سے یہ تفصیلات بیان کی ہیں، یہ محض ایک تاریخی دستیقہ کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ سیاسی کام کرنے والوں کے لیے بڑی سبق آموز اور عبرت خیز بھی ہیں۔ اسی ضمن میں "ریشمی چٹھی" کا واقعہ بھی آگیا ہے۔

"ریشمی چٹھی" کے واقعہ کے بعد طلبہ اور مولانا کو دوبارہ نظر بند کر دیا گیا۔ ان ہی دنوں کا ظفر حسن صاحب ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں، جو بڑا ہی تکلیف دہ ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

> ہم اسی گھر میں رہتے تھے کہ جون ۱۹۱۷ء میں سید علی عباس بخاری پشاور سے ہجرت کر کے کابل پہونچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ پشاور میں انگریزوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں اپنے قوم پرست جذبات کے سبب سے بہت قابل قدر ہستی مانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا محمد علی جوہر سے ان کا تعلق تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم سے وہ دہلی میں ملے تھے۔ کابل آنے پر امیر حبیب اللہ نے ان کو نظر بند کر دیا۔ ان کی نظر بندی ہماری نظر بندی کی نسبت بہت سخت تھی۔ وہ بالکل اکیلے ایک گھر میں رہتے تھے اور ان کو بازار جانے کی بھی اجازت نہ تھی اور نہ کوئی ان کے گھر جا کر ان سے

نہ سکتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ امیر افغانستان نے انگریزوں کے اشارے پر ان کو سخت نظر بندی میں ڈالا تھا۔

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔ ہم نے ایک دو دفعہ اپنے پہرہ داروں کو رشوت دے کر اور ان کے مہتمم مرزا کو پھسلا کر ان سے ملاقات کی۔ اس تنہائی کی وجہ سے ان کے حواس مختل ہونے لگے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ایک دفعہ ان سے ملنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے انکی بہت تسلی ہوئی تھی۔ ظفر حسن صاحب کے الفاظ ہیں۔

وہ بہت ایماندار، اسلام کے دردمند رشید تھے اور ایک حساس شخصیت رکھتے تھے عالم اسلام کی حالت اور ترکی کی جنگ کی رفتار سے ان کو بہت صدمہ ہوتا تھا۔ ان جیسی قابل قدر ہستی کا اس طرح مخبوط الحواس ہو کر بے کار ہونے کا گناہ امیر حبیب اللہ خاں کی گردن پر رہے گا۔

سردار محمد نادر خاں، جو بعد میں فرمانروائے افغانستان ہوئے، اس وقت فوج کے سپہ سالار تھے ان کا ذکر "آپ بیتی" میں یوں کیا گیا ہے۔

فوج کے سپہ سالار جنرل محمد نادر خاں ولد سردار محمد یوسف خاں معاحب خاص حضور امیر صاحب تھے۔ شاہی رسالے کے بڑے افسران کے دوسرے بھائی مثلاً سردار ہاشم خاں، سردار محمد علیخاں، سردار شاہ ولی خاں اور سردار شاہ محمود خاں تھے۔ ان سب صاحبان کی عمر کا بڑا حصہ ڈیڑھ دو دن میں گزرا تھا۔ کیونکہ ان کا خاندان شاہ شجاع اور امیر دوست محمد خاں کے زمانے میں بادشاہ گردی کی وجہ سے افغانستان سے ہندستان میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ افغانستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اسی خاندان میں سے تھے۔

..... مرحوم سپہ سالار سردار محمد نادر خاں ہندستانی مسلمانوں کے خاص کر حامی اور طرفدار تھے..... انھوں نے ہمارے محترم مرشد قبلہ مولانا عبید اللہ سندھی کی اور ہماری حمایت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اگر سردار محمود بیگ طرزی کو ..... ترکی معاشرت کا دلدادہ کہا جائے تو مرحوم سردار محمد نادر خاں کو ہندستانی معاشرت کا حامی کہنا بجا ہوگا۔ مرحوم سردار سپہ سالار محمد نادر خاں کا خاندان مرحوم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا مرید تھا۔ سردار سپہ سالار مرحوم میرے تو خاص طور محسن تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ان کے

ہمیشہ شکوہ رہے۔ اور ان سے ہر وقت اظہار ممنونیت کیا کرتے تھے۔

اسی سلسلے میں وہ سردار نادر خاں کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں: "ان حضرات کی نظر بندی کے زمانے میں سردار نادر خاں مرحوم نے ان کے لیے شہر کے باہر ایک باغ میں خیمے لگوا دیئے۔ اس عرصہ میں بقرعید بھی آئی اور سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم، قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے ملنے اور عید مبارکی دینے کیلئے آئے۔ اس ملاقات کے دوران میں انھوں نے شیر ببر کی طرف اشارہ کرکے (اس باغ کو چڑیا گھر تھا) قبلہ مولانا مرحوم کو کہا: "اس باغ میں وہ شیر رہتے ہیں۔"

کابل کے پورے دورانِ قیام میں سردار نادر خاں مرحوم مولانا عبید اللہ صاحب اور ظفر حسن صاحب کی ہر ممکن مدد کرتے رہے۔ اور ہمت سے نازک موقعوں پر مرحوم ان کے کام آئے۔ ظفر حسن صاحب تو بعد میں ایک لحاظ سے مرحوم کے دست راست بن گئے تھے اور وہ موصوف پر غایت درجہ اعتماد کرتے تھے "آپ بیتی" میں سردار نادر خاں کی شرافت نفس ہمدردی اور عالی حوصلگی کے بہت سے واقعات درج ہیں۔ راقم السطور کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ سریر آرائے افغانستان ہونے کے بعد بھی سردار نادر خاں مولانا کو نہیں بھولے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دو مرتبہ کہ مظمہ میں مولانا کو ایک خطیر رقم بھجوائی تھی۔

مولانا عبید اللہ صاحب جب کابل پہنچے، تو ان تعارفی خطوط کی وجہ سے جو وہ ساتھ لائے تھے انھیں بآسانی افغان حکومت کے بعض اصحاب اقتدار اور آخر میں امیر حبیب اللہ خاں سے ملنے کا موقع مل گیا۔ مولانا نے میر صاحب کو انگریزوں سے الگ کرنے کے لیے جو لالچ دیا تھا، آپ بیتی میں ان سب واقعات کی تفصیل سے ذکر ہے۔ نیز راجہ مہندر پرتاپ نے جرمنوں کو ہندستان کی جو یک طرفہ تصویر پیش کی تھی، مولانا نے ہندستانی، ترکی، جرمن مشن کے جرمن ارکان سے مل کر اس کا جس طرح توڑ کیا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ خوشی قسمتی سے ان تمام معاملات میں کابل کے یہ نوجوان مولانا کے بہترین مددگار ثابت ہوئے۔

۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں پہلی جنگ عظیم ترکوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ جس سے افغانستان کے انگریز پرست امرا بڑے خوش ہوئے لیکن ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں "قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اس خبر سے جتنا رنج ہوا۔ اسکو یہاں بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔"

۱۹۱۹ء کے موسم سرما میں امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں مارے گئے۔ اور تھوڑی سی

گڑبڑ کے بعد امان اللہ خاں ان کی جگہ امیر بن گئے۔ جنھوں نے تخت پر بیٹھتے ہی فوج اور قوم کے سامنے دو باتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا.... ایک اپنے والد کے قاتل کا پتہ لگا کر وہ اس کو سزائے موت دیں گے۔ دوسری بات یہ تھی کہ انگریزوں سے افغانستان کا استقلال حاصل کریں گے۔ وہ اپنی سب تقریروں میں ان دونوں وعدوں کو ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔

"اپنے دوسرے وعدے کو پورا کرنے کے لیے امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان تیاریوں میں ایک اہم حصہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی کوششوں کا تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم سردار نصر اللہ خاں کے تخت سے دست بردار ہونے کے بعد امیر امان اللہ خاں کے بلانے پر جلال آباد سے کابل آئے اور امیر صاحب سے ملے، اس پر امیر صاحب نے ان سے کہا من ہمون ہستم (یعنی میں تو وہی ہوں) قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے بحیثیت وزیر داخلہ حکومت موقتہ ہند امیر امان اللہ خاں سے وہی معاہدہ کیا، جو ان کے والد سے کیا تھا..... اس زمانے میں ہندستان میں بدامنی تھی۔ اور پنجاب میں جلیانوالہ باغ کے واقعات کی وجہ سے بہت ہل چل مچی ہوئی تھی..... افغانستان کو اپنا استقلال حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ مل سکتا تھا۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ایک رات کو مشین خانہ کابل کے چھاپے خانہ میں جاکر ہندستانیوں کے نام اردو اور انگریزی میں اعلان چھاپے۔ جن میں انھیں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی دعوت دی۔ یہ اعلانات ہندستان پہنچوا دئے گئے اور مولانا کے بھتیجے اور مولانا احمد علی کے بھائی ان اعلانات کو حیدرآباد دکن تک پہنچا کر آئے۔

آخر یہ جنگ ہوئی۔ اس میں افغانستان کی افواج کی ابتری، بدنظمی اور بزدلی کا جو عالم تھا آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے اس کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے کٹھل کے محاذ پر سردار محمد نادر خاں متعین تھے ان کی فراست جنگی تدابیر اور عزم و حوصلہ سے اس محاذ پر افغان افواج کو فتح ہوئی۔ اس طرح محض سردار محمد نادر خاں کے طفیل افغان حکومت کا بھرم رہ گیا۔ اس معرکے میں ظفر حسن صاحب کی ریاضی دانی بڑے کام آئی۔ اور ان کی بتائی ہوئی پیمائش پر جب توپ سے گولہ پھینکا گیا تو وہ قلعہ کے گودام میں پھٹا جس سے وہاں آگ لگ گئی اور اس سے مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے بعد میں سردار

نادر خاں نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور انھیں دربار شاہی میں امان اللہ خاں کے سامنے پیش کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔

اس نوجوان کی عمر کم ہے، لیکن اُس نے ایسی بہادری دکھائی ہے کہ فوج کے بڑے بڑے اور تجربہ کار افسروں کو مات کر دیا ہے۔

اس جنگ میں سردار نادر خاں کا کھُل شہر پر قبضہ ہو گیا۔ گو کھُل قلعہ بستور انگریزی تسلط میں رہا۔ شروع میں تو قبائلیوں نے حسب عادت اس شہر کو لوٹا لیکن بعد میں ان کو روک دیا گیا۔ اس ضمن میں ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں :-

میں نے رات کو شہر میں کرفیو لگایا۔ اور رات کو بغیر اجازت اپنے گھروں سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ تاکہ رات کے اندھیرے میں کہیں پھر فتنہ و فساد اور بلوا گری نہ ہو سکے۔ شہر میں مختلف اور اہم جگہوں پر پہرے لگوا دیئے اور فوجی پٹرول چلانے کا انتظام کیا تاکہ رات کو سپاہی شہر میں گھوم کر دورہ کریں.... ..... اس طرح میں اس پہلے آزاد ہندستانی شہر کا پہلا سول ایڈمنسٹریٹر بنا اس انتظام کی وجہ سے رات کو شہر میں کوئی واردات نہ ہوئی۔

معرکہ کھُل میں ظفر حسن صاحب نے جو کارنامہ سرانجام دیا، اس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس جرمن توپ کو جس سے قلعہ پر گولہ پھینکا گیا تھا، مصنف کے الفاظ میں :- ہاتھی کی پیٹھ پر لاد کر مورچے پر لایا گیا۔ یہاں سردار سپہ سالار مرحوم نے مجھے کہا کہ اس نقشے کی مدد سے جو میں نے ستون میں تیار کیا تھا اس مورچے سے کھُل کے قلعہ تک کا فاصلہ معلوم کروں میں نے نقشہ سے ناپ کر یہ فاصلہ میل اور گز کے حساب سے ان کو بتایا۔ انھوں نے مجھے اس کو میٹر میں تحویل کرنے کو کہا کیونکہ اس توپ کی مار میٹر کے حساب سے تھی۔ توپ کا افسر اس عمل تحویل سے بالکل بے خبر تھا اور نہ ہی وہ نقشے سے دو جگہوں کے درمیانی فاصلے کو ناپ سکتا تھا.... معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صلح میں افغانی سپاہیوں کو فوجی تعلیم خاص کر توپ بازی کی تعلیم اس وقت بالکل نہ دی جاتی تھی یہاں تک کہ افسر بھی اپنے فوجی فرائض کو نہ جانتے تھے۔"

بہر حال ظفر حسن صاحب نے فاصلے کا حساب کر کے بتایا اور سردار سپہ سالار محمد نادر خاں نے خود ہی اس توپ کو

Aiming Post یعنی نشانہ لگانے والے بانس کے ذریعہ قلعہ بھل کی سیدھ میں لگایا اور فیر کیا۔

ظفر حسن صاحب کی کوششوں سے بھل شہر میں امن قائم ہوگیا۔ لوگ اپنے کاروبار میں اطمینان سے مصروف ہوگئے، اور مجاہدین کو کھانے کا سامان بہم پہونچتا رہا۔ اس ضمن میں اسلام کے پرستاران محب الوطن "ہندوستانیوں" کو خود افغانوں کی خدمت کرتے ہوئے قدم قدم پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور ان کے حاسد افغان ان کے خلاف طرح طرح کی جو سازشیں کرتے تھے اس کی ایک مثال ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

اگلے روز صبح کو مجھے سردار سپہ سالار مرحوم کا زبانی پیغام ملا جس میں انھوں نے مجھے پڑاؤ کو لوٹ آنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ میں شہر کا انتظام ایک افغان فوجی افسر کے سپرد کرکے پڑاؤ کو واپس آگیا۔ وہاں آکر مجھے سردار سپہ سالار مرحوم کے چیف پرائیویٹ سیکریٹری مرزا محمد یعقوب خاں سے معلوم ہوا کہ مجھے واپس بلانے کا سبب یہ تھا کہ بعض میرے بد خواہوں نے میرے بارے میں سردار سپہ سالار مرحوم کے کان بھرے اور کہا کہ ظفر انگریزوں سے مل گیا ہے۔ اور اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ امتحاناً مجھے واپس بلایا گیا تھا۔ سیکریٹری نے کہا کہ آپ کی واپسی سے آپ کی صداقت کا ثبوت مل گیا ہے۔ اور آپ کی غلیبت کرنے والے لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔

اگر انگریزوں کو یہ ڈر نہ ہوتا کہ افغانستان سے جنگ نے طول پکڑا تو ہندوستان کے اندر بغاوت ہو جائے گی اور یہ کہ افغانستان میں مقیم محب الوطن ہندوستانی حکومت افغانستان کو ہر طرح کی کمک پہونچا رہے ہیں تو چند دن بعد ہی افغان فوج کی ہوا اکھڑ جاتی اور امیر امان اللہ کو بہت جھک کر صلح کرنا پڑتی۔

افغانستان کی اس جنگ آزادی کی روئداد جو آپ بیتی "میں دیکھی ہے" پڑھنے کے قابل ہے۔ جلال آباد کے محاذ کا کمانڈر ان چیف سپہ سالار محمد صارخ خاں تھا۔ بہترین افغانی پلٹن جن کی بندوقیں نئی اور جن کی توپیں سریع آتش Quick Firing تھیں اس محاذ پر مقرر کی گئی تھیں۔

اس محاذ پر جو کچھ ہوا، وہ ظفر حسن صاحب کی زبان سنئے:۔

"..... صالح محمد خاں نے کابل سے اعلان جنگ کئے جانے سے پہلے تورخم کے مقام پر ایک متنازعہ فیہ چشمہ پر قبضہ کر کے ۸ مئی ۱۹۱۹ء کو انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ایک ہوائی جہاز بھیجکر اسکی فوج پر بم پھینکے، جس سے اس کا پاؤں زخمی ہوگیا۔ اس پر وہ "پائے مرا شہید شد" کہتا ہوا محاذ سے ہٹ کر ڈکہ کی طرف پسپا ہوا۔ فوج اپنے کو بے سردار دیکھ کر میدان جنگ سے پیچھے ہٹی۔ اس کا انگریزی رسالے نے پیچھا کیا اور ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ جلال آباد کے صوبے کے لوگوں نے اس شکست سے یہ سمجھا کہ بس اب حکومت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اس پر انھوں نے آکر شہر جلال آباد کو لوٹ لیا۔ اس سرکاری خبر کے ساتھ امیر صاحب نے سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم کو یہ حکم بھی بھیجا کہ فوراً آگے بڑھ کر ہندوستان پر حملہ کریں تاکہ انگریزی فوجیں ڈکہ سے آگے بڑھ کر جلال آباد پر قبضہ نہ کر سکیں۔"

ٹھل کے محاذ پر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ سردار نادر خاں کو فتح ہوئی تھی اور افغانوں کا ٹھل شہر پر باقاعدہ قبضہ بھی ہوگیا تھا۔ لیکن ٹھل قلعہ وہ فتح نہ کر سکے آخر قلعہ کو انگریزی فوج کی وقت پر کمک پہونچ گئی یہ سنکر فاتح افغان فوج کس طرح بھاگ کھڑی ہوئی، ظفر حسن صاحب بڑی دردمندی سے اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"اس روز ابھی شام بھی نہ ہوئی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ہماری شین گنیں جو قلعہ کی چوکیوں پر گولہ باری کے لئے دریائے کرم کے پار بھیجی گئی تھیں، خچروں پر لدی ہوئی .... واپس لائی جا رہی ہیں۔ میں نے ان کے سپاہیوں کو روک کر واپس محاذ پر بھیجنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں کے تیور راتے بدلے ہوئے تھے کہ اگر میں زیادہ اصرار کرتا تو شاید وہ مجھ پر گولی چلا دیتے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ محاذ سے پسپا ہونے والے سپاہیوں کا تانتا بندھ گیا۔ سردار سپہ سالار مرحوم .... سے معلوم ہوا کہ دریائے کرم کے پار کے تمام پیادہ سپاہیوں، توپوں اور شین گنوں سے مسلح سپاہیوں نے اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور اپنے افسروں کے حکم کے برخلاف سرکشی کر کے خود بخود پڑاؤ کو واپس آگئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر باقی فوج میں بھی ہل چل مچ گئی۔ ہر کوئی اپنی مرضی سے (افغانی) سرحد کی طرف پسپا ہونے کو تیار ہوگیا۔ یہانتک کہ بعض سپاہیوں نے باربرداری کے خچروں پر سوار ہو کر افغانستان کا راستہ لیا اور سامان جنگ اور رسد وغیرہ کو جو ان خچروں پر لدنے والا تھا پیچھے چھوڑ دیا۔"

بغیر لڑے اور بغیر کوئی ہزیمت اٹھائے ان میں یوں بھگدڑ مچ جانے کا باعث صرف یہ تھا۔
"انھوں نے صرف قلعہ کو کمک پہونچ جانے سے ڈر کر پسپائی اختیار کی۔ ان کو شاید خطرہ ہوا کہ اگلے روز انگریزی فوج ضرور قلعہ سے نکل کر ان پر حملہ کرے گی"

اس معرکے میں کئی موقعوں پر ظفر حسن صاحب نے نہایت خطرناک کاموں کے لیے سردار صاحب کو اپنی خدمات پیش کیں، اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے بھی موصوف پر جس طرح اعتماد کیا، ان کی ہر موقع پر عزت افزائی کی۔ اور آخر وقت تک ان کے ساتھ قریبی عزیز اور مخلص رفیق کا سلوک کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔
آپ بیتی میں جہاں بھی سردار محمد نادر خاں کا ذکر آتا ہے۔ اس سے مصنف کی عقیدت اور خلوص ٹپکتا ہے اور واقعی مرحوم اس کے مستحق بھی تھے۔

ٹھل کے محاذ جنگ تک جاتے ہوئے ہر پڑاؤ پر سردار نادر خاں نے ظفر حسن صاحب کو اپنے خیمے میں جگہ دی۔ پھر اپنے جنگی پلان کے بارے میں جن چند ساتھیوں سے وہ مشورہ کرتے تھے ان میں سے ایک موصوف بھی ہوتے تھے۔

سردار سپہ سالار محمد نادر خاں ظفر حسن صاحب کا کس قدر خیال رکھتے تھے، اس ضمن میں ان کی زبان سے ایک واقعہ سُن لیجئے۔

"نومبر ۱۹۲۱ء میں مرحوم انور پاشا بخارا پہونچے انکے پہونچنے پر افغانی حکومت نے ان کو روس کے برخلاف خفیہ مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ اسلیے سردار سپہ سالار مرحوم (محمد نادر خاں) کو قطغن اور بدخشاں کے افغانی صوبوں کا رئیس تنظیمیہ مقرر کر کے خان آباد بھیجا۔ چونکہ وہ پاشا مرحوم کو روسیوں کے برخلاف مدد دینے کو جا رہے تھے اور میں انگریزوں کا دشمن ہونے کی وجہ سے روسیوں کا دوست مانا جاتا تھا، مجھے اس کام پر اپنے ساتھ نہیں لے گئے حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے مجھے نہ جنگ کے دنوں میں اور نہ صلح کے زمانے میں کبھی اپنے سے جدا کیا تھا۔ یہاں تک کہ جب مجھے ایک روز بخار ہوا اور میں وزارت حربیہ کے سرکاری کام پر نہ جا سکا۔ تو وہ شام کو میری بیمار پرسی کے لیے گھر بھی تشریف لائے تھے۔"

اس جنگ کے نتیجے میں جس میں سردار محمد نادر خاں کا حصہ سب سے نمایاں تھا، افغانستان کی آزادی

تسلیم کر لی گئی اور وہ دوسرے ملکوں سے سفارتی تعلقات رکھنے کا مجاز ہو گیا۔ افغان وفد جو انگریزوں سے گفتگو کرنے ہندوستان گیا تھا، اس کے بارے میں لکھا ہے۔

..... یہ وفد (افغان وفد) افغانی استقلال کی تصدیق کے سوا اور کوئی اچھی شرطیں حاصل نہ کر سکا۔ ہمیں امید تھی کہ شاید یہ وفد ہندوستان کو کچھ اختیارات دلوانے اور ہوم رول قائم کرنے میں ضرور مدد دے سکے گا، جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان کی بدامنی سے ڈر کر افغانستان پر پوری طاقت سے حملہ نہ کر سکے .... اور ڈاکہ کو لے کر وہیں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے اور جلال آباد تک بڑھنے کی جرأت نہ دکھلا سکے۔

ظفر حسن صاحب نے بجا طور پر شکایت کی ہے کہ افغانستان کے وفد کی طرف سے ہندوستان میں ہوم رول قائم کرانے کے بارے میں مدد ملنا تو درکنار اس وفد کے قیام ہندوستان کے دوران (۱۹۲۱ کے شروع میں) وہاں ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں اس سے مجھے بہت رنج ہوا، لیکن اس کا سبب اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ افغانی وفد ہندوستان سے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کامیابی حاصل کر کے لوٹ آیا۔"

بعد میں موصوف پر ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی گرفتاریوں کا راز کھلا، جلال آباد سے واپسی پر مولانا عبید اللہ صاحب کو انھیں معلوم ہوا کہ جب یہ افغانی وفد ہندوستان جا رہا تھا تو اسکے صدر سردار محمد طرزی نے مولانا سے ہندوستان کے بعض مسلمان لیڈروں کے نام خط لکھایا تھا "تاکہ اگر انگریز افغانی وفد کے مطالبات کو منظور نہ کریں یا افغانستان کی آزادی کی تصدیق میں لیت و لعل برتیں تو یہ خط ہندوستانی مسلمان لیڈروں کو دے کر انکے ذریعہ انگریزوں کے برخلاف بغاوت کرانے کی کوشش کی جائے۔ افغان وفد نے انگریزوں سے کچھ رعایات حاصل کرنے کے لیے اس خط کو انگریزی حکومت کو دے دیا"... اور اسکی وجہ سے مسلمان لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں نے افغانستان کی طرف ہجرت کی تحریک شروع کی، اس تحریک کا جو حشر ہوا "آپ بیتی" میں بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمانان برصغیر کے چند عظیم تاریخی المیوں کے تحریک ہجرت بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے جس کا ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے افغانستان پر مالی بوجھ پڑا ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اگر

کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا، تو وہ صرف انگریز تھے۔

اگرچہ افغانستان کی طرف ہجرت کرنے کا فتویٰ بقول مصنف مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دیوبند کے علمائے دیوبند نے اس بنا پر دیا تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دارالاسلام میں چلے جائیں لیکن اسکی حوصلہ افزائی خود امیر امان اللہ خان نے بھی کی تھی۔ اس بارے میں ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔

"..... اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان نے اس وقت ایک تقریر کی جس کے یہ الفاظ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ "افغانستان بہ ہمہ وسعت خود آمادہ است کہ مہاجرین ہندی را پناہ بدہد" اس قسم کے بیانات کو قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے کچھ پسند نہ کیا لیکن ان پر اعتراض بھی نہ کیا۔ امیر صاحب کے ان بیانات کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمانان ہند کے لئے زبانی ہمدردی کریں اور اس سے ذرا انگریزوں کو ڈرا کر افغانستان کے لئے کچھ رعایات لے لیں"

ہندوستان کے اندرونی حالات اور مصنف کے الفاظ میں حضرت مولانا حبیب اللہ کے تدبر سے "افغانستان آزاد ہو گیا مگر افسوس ہے کہ ہندوستان ویسا ہی غلام رہا جیسا کہ پہلے تھا۔ افغانستان نے اپنے جنگی حلیف یعنی ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی قدیم روایتی عادت کے بموجب ان کی قسمت پر چھوڑ دیا اس کے بعد انگریزوں نے جو ہندوستانیوں پر ظلم کئے، وہ تو سب دنیا کو معلوم ہی ہیں۔ مگر امیر امان اللہ خان منتقل بادشاہ بن گئے۔ اور اس کامیابی کا سہرا انھوں نے صرف اپنے سر پر رکھ لیا"

انہی سالوں میں برصغیر میں بڑے وسیع پیمانے پر اور زبردست جوش و خروش کے ساتھ تحریک خلافت چلی جس میں کوئی تیس ہزار مسلمان انگریزوں کی جیلوں میں گئے۔ اس تحریک کا مقصد ترکی خلافت کی بحالی تھی۔ مسلمانوں کی ان قربانیوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس ضمن میں ظفر حسن صاحب بالکل صحیح کہتے ہیں:۔

"..... ان کارروائیوں سے ترکوں کو مدد تو نہ ملی لیکن اس سے ہندوستان کی آزادی کا راستہ نہ کھلا۔ صرف انگریزوں کے لئے ذرا ہندوستان میں پریشانی بڑھ گئی۔ مگر ان کو کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا"

اسی زمانے میں سلطنت ترکیہ کے سابق وزیر جمال پاشا کابل گئے۔ پھر انور پاشا نے ان اطراف کا رخ کیا۔ عالم اسلام کی ان دو مشہور شخصیتوں کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے تاریخی اہمیت نہ رکھتا ہو

کیونکہ ہمارے ہاں عرصہ دراز تک خاص طور سے انور پاشاہ کی ایک افسانوی شخصیت رہی ہے۔

انگریزوں سے اپنی آزادی تسلیم کرانے کے بعد حکومت افغانستان کو ایسے ہندوستانیوں کا وجود بار معلوم ہونے لگا، جو انگریزوں کے مخالف تھے، ان میں سے بعض کو تو جیسے کہ لاہور کے ڈاکٹر عبدالحفیظ تھے طریقے سے چلتا کر دیا گیا اور دوسروں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں:۔

"وزیر امینہ شجاع الدولہ سے کہا گیا کہ "میں خفیہ طور پر انگریزی سفیر سے ملتا جلتا رہتا ہوں۔ وزیر امینہ نے یہ بات فوراً امیر صاحب کے کان تک پہنچائی کہ وزیر جریہ سپہ سالار محمد نادر خاں کا اعتماد یافتہ اور نعمت پروردہ ظفر حسن تو انگریزی جاسوس ہے، جو افغانی وزارت حربیہ کے سارے رازوں کو انگریزوں کو دیتا رہتا ہے"

اس پر قدرتاً سردار سپہ سالار بالکل حواس باختہ ہو گئے اور مولانا عبیداللہ صاحب نے جب ایک خط لکھ کر ذاتی ضمانت دی تو یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس کے بعد بھی وزیر امینہ ظفر حسن صاحب کے درپے آزار رہا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس چغلی کے واقعہ کے چند روز بعد میں ایک شام کو ہوا خوری کے لئے شہر سے باہر سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ وزیر امینہ وہاں سے گھوڑے پر گزرا۔ اس نے مجھے دیکھ کر یہ کہا: خیر اس دفعہ تو تمھاری جان بچ گئی، لیکن آئندہ دیکھیں کیا ہوتا ہے"

انہی دنوں مولانا عبیداللہ صاحب نے کابل میں ایک "ہندوستانی اردو یونیورسٹی" قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اسکے لئے حکومت افغانستان سے چارٹر مانگا۔ مولانا نے اس کا نظام نامہ بھی بنالیا تھا اور وزیر خارجہ محمود طرزی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ حکومت افغانستان اور امیر صاحب سے اسکی منظوری لے دیں گے۔

اس کے بعد اس ضمن میں جو کچھ ہوا، وہ "آپ بیتی" میں یوں مذکور ہے:۔

"۱۹۲۱ء میں ڈوبس کے (برطانوی) مشن سے عہد نامہ صلح ہو جانے پر قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنی ساری طاقت کو اس ہندوستانی اردو یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے میں خرچ کرنا شروع کیا"

اس یونیورسٹی کی ابتدا کے طور پر سردار نادر خاں کی مالی امداد سے ایک اسکول بھی قائم ہو گیا لیکن انگریز پرست افغانوں کی شہ پر اس میں اسٹرائک کرائی گئی، اور بعد میں حکومت نے مجوزہ یونیورسٹی

کا چارج دینے سے انکار کر دیا۔

مصنف لکھتے ہیں کہ ان تمام امور سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ "حکومت افغانستان" نے اب انگریزوں سے صلح کر کے ہندوستانی قوم پرستوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا..... قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے لیے صرف دو طریقے باقی رہ گئے۔

(۱) افغانستان میں بالکل خاموش بیٹھ جائیں اور باقی زندگی سیاست سے کنارہ کشی کر کے بالکل بیکار گزاریں۔ یہ طریقہ کار ان کی سیاسی موت کے مرادف تھا۔

(۲) افغانستان چھوڑ کر کسی اور ملک میں رہیں اور وہاں سے انگریزوں کے برخلاف اپنا کام جاری رکھیں۔

آخری فیصلہ کرنے کے لیے قبلہ مولانا نے تقریباً ایک سال غور کیا اور آخر روس کے راستے ترکی پہونچنے کی تجویز طے پائی۔

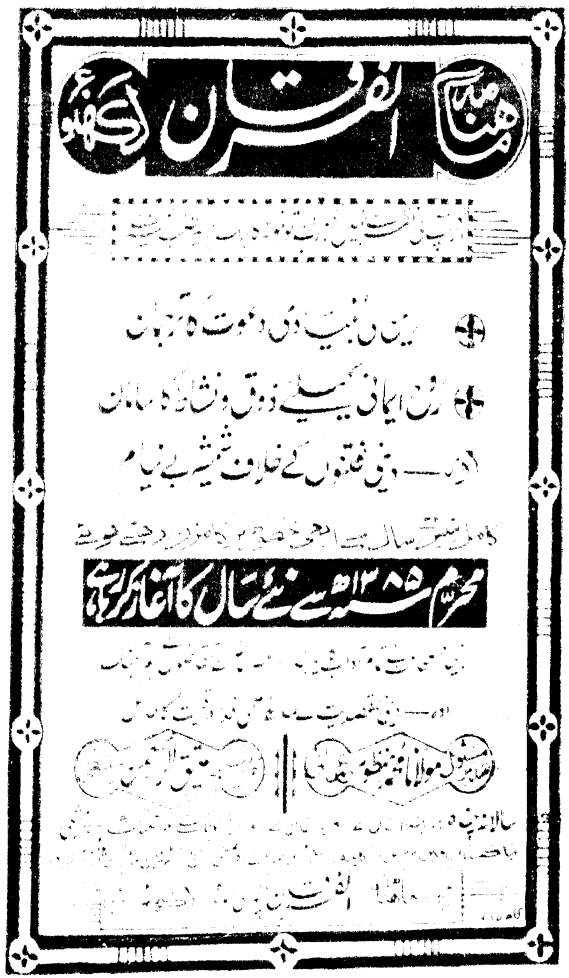
مولانا عبید اللہ صاحب ۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچے تھے۔ اور اس سے چند ماہ پہلے مارچ ۱۹۱۵ء میں ظفر حسن صاحب ادران کے ساتھی افغانستان میں داخل ہوئے تھے۔ سال بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مولانا ظفر حسن صاحب اور بعض دوسرے ہندوستانی نوجوان روسی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں کتاب "آپ بیتی" ختم ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ اس کا پہلا حصہ ہے۔ خدا کرے اسکے دوسرے حصے بھی جلد شائع ہوں۔

محترم ظفر حسن صاحب..... کی "آپ بیتی" (حصہ اول) ایک ایسا تاریخی وثیقہ ہے جسے برصغیر کی اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم اور سیاسیات سے علمی و عملی دلچسپی رکھنے والے ہر چھوٹے کارکن اور ہر بڑے لیڈر کو پڑھنا چاہیے۔ یہ محض گزرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں عبرتیں اور سبق ہیں جو ہمارے لیے آئندہ مشعل کا کام دے سکتے ہیں۔

ظفر حسن صاحب نے "آپ بیتی" لکھ کر مسلمانان برصغیر کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور ملی تاریخ کا وہ باب جو زینت طاق نسیاں بن گیا تھا، اسے انھوں نے دوبارہ ہمارے لیے تازہ کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کوئی مسلمان پڑھا لکھا گھرانا اس کتاب سے خالی نہ رہے گا۔ (م س)

گزارش اس شمارہ میں جن حضرات کو چندہ ختم ہونے کی اطلاع دی جا رہی ہے براہ کرم جلد از جلد اپنا چندہ ارسال فرمائیں ——— مینیجر

ALFURQAN (Regd. No. L. 333) LUCKNOW



Printed & Published by Sarfaraz Printing Press Lucknow

حیاۃ الصحابہؓ اردو عکسی

چہارم پنجم ششم ہفتم

تالیف: حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دامت برکاتہم

ترجمہ: حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب فیض آبادی مدظلہ
شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قدس سرہٗ

مؤلف مدظلہ کی شہرۂ آفاق کتاب حیاۃ الصحابہؓ عربی جو ہند، و پاک کے علاوہ ممالک اسلامیہ میں بھی قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہے۔ اس کی جلد اول کے ترجمہ کے تینوں حصوں کی اشاعت کا عالم یہ ہے کہ ایک ہی سال کے اندر دوسرا ایڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہے اب عربی کی جلد دوم کے اردو ترجمہ کو چار برابر حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اردو ترجمہ کی خصوصیت

اس میں بھی مترجم موصوف نے اصل عربی الفاظ کو ترجمہ میں اس طرح سمویا ہے کہ مطلب واضح بھی ہو جائے اور ترجمہ بامحاورہ سلیس اور دلکش بھی بن جائے اور حضرات علمائے اہل حق کی نظر میں ترجمہ کی خوبی و پسندیدگی نے تو کتاب کا معیار کافی بلند کر دیا ہے۔

کتاب خریدنے کے وقت

فاضل مترجم حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب کا اہم گرامی ضرور دیکھ لیں کیونکہ کتاب کے پہلے تین حصوں کا ترجمہ بھی موصوف ہی کا ہے۔

کاغذ سفید، کتابت واضح، طباعت عکسی ٹائپ سیٹ حسین رنگین۔ ہر حصہ میں تقریباً دو سو (۲۰۰) صفحات۔

ناشر: اخترانیس احمد غفرلہٗ ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳

حصہ اول، دوم، سوم	حصہ چہارم، پنجم، ششم، ہفتم
یکجا مجلد ریگزین ۱۰/-	یکجا مجلد ریگزین ۱۲/-

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224147

UNIVERSAL
LIBRARY

GUP—552—7-7-66—10,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٧٥٢/٨٩١٤٣٠٥ Accession No. ٢٢٧٠٧

Author

Title الزوال

This book should be returned on or before the date last marked below.

کے ـــــ اسلامی لٹریچر میں

دینی روح اور علمی افادات سے بھرپور ـــــ ایک

یعنی اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ ـــــ احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب



جس میں عوام اور خواص سب کے ذوق اور اپنی اپنی سطح کے مطابق بہترین احادیث چنی گئی ہیں

زمانے کی نفسیات کا لحاظ ـــــ ہر طرح کے فہم و فکر کی رعایت ـــــ اور حدیث کی اصل مقصدیت پر زور

یہ اس کتاب کے نمایاں خصوصیات ہیں جو اس کے ہر حصے کے اہم خصوصیات ہیں

اور تشریحات کے علاوہ ہر باب کے شروع کے تمہیدی نوٹ، شریعت کے نظام حکمت پر

"ماقبل و مابعد" کی ایک مثال کہے جاسکتے ہیں

سائز ۲۶×۲۰ ۸

تالیف

مولانا محمد منظور نعمانی

خود ملاحظہ کریں (مفت ارسال کمپنی کے ذمہ)

جلد اول ـــــ ایمان اور آخرت کے بیان کی حدیثیں ـــــ قیمت ـــــ مجلد ۵/ غیر مجلد ۴/

جلد دوم ـــــ تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں ـــــ قیمت ـــــ مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/

جلد سوم ـــــ طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں ـــــ قیمت ـــــ مجلد ۸/ غیر مجلد ۶/

مکتبہ معارف القرآن کی چند دیگر کتابیں

سیرت مصطفیٰ ۲ جلد ۲۰/	آسان نحو ۲ جلد ۲۰/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
قرآن کی آیات ۲۰/	آسان حج گائیڈ ۲۰/	آسان فقہ ۲۰/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
آسان نماز ۲۰/	آسان زکوٰۃ ۱۵/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/
آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/	آسان اردو ۲ جلد ۱۲/

ملنے کا پتہ: مکتبہ معارف القرآن، کھوڑ

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

(فی کاپی ۱۰ پیسے)

سالانہ چندہ
دیگر ممالک سے ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے ایک پونڈ

پوسٹل آرڈر بغیر کراس کئے
کرنا چاہیے

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۵ھ مطابق مئی سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ (۱) ۱۱

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمن سنبھلی	۲
۲	مکتوب حجاز	مولانا محمد منظور نعمانی	۵
۳	حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ اور اُن کے خاندان سے	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۹
۴	تحقیق کے نئے گوشے	جناب وحید الدین خاں صاحب	۲۵
۵	دربار عالمگیری	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی	۳۲
۶	مجاہد کبیر حضرت مولانا محمد یوسفؒ	مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف	۳۹
۷	اللہ والوں کا اجتماع	محمد اسلم صاحب	۴۵
۸	ہندوستان کا لسانی مسئلہ	مدینہ بجنور	۵۲

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ مئی تک [illegible] کا سادہ لفافہ بھیجنا نہ بھولیں ورنہ پرچہ بند کر دیا جائیگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین لاہ کے نام بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں روپیہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیجئے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کوئی صاحب نہ ملے تو فوراً مطلع کریں انکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے نویدیہ میں چھپوا کر دفتر واقع مکان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

سال ۳۳ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — شمارہ نمبر ۱

زکاۃ اوّلین

عتیق الرحمٰن سنبھلی

آج کے ہندوستان میں کوئی مسلمان، خواہ وہ کتنا ہی پکّا اور پرانا مسلمٹ کیوں نہ ہو، اگر وہ عملاً دین سے کچھ بھی تعلق رکھتا ہو یا کم از کم مسلمانوں کے دکھ درد میں ملّی جذبے کے ساتھ شریک ہوتا ہو، وہ اکثریت کے اہل سیاست کی نظر میں بلاشبہ مسلمان "پہلے" ہو اور ہندوستانی "بعد" میں۔ ایسے مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور ان کے مختلف حلقائے فکر سیاسی نظریات کے لحاظ سے آپس میں اگرچہ کتنے ہی مختلف الخیال ہوں لیکن ہیں ایک ہی کشتی میں سوار۔ وہ آپس میں جتنا چاہیں تفریق کریں مگر جن دوسروں کے واسطے سے اُن کی نظر میں کوئی فرق ان سب میں حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے۔

یہ بات کوئی راز نہیں ہے جسے ہم پہلے پہل فاش کر رہے ہوں بلکہ مذکورۂ بالا خصوصیات رکھنے والا جو طبقہ پکّا اور پرانا مسلمٹ ہے اس کا دل اس حقیقت کو سب سے زیادہ جانتا ہے لیکن پھر یہ کونسی ہوشمندی ہے کہ پہلے جس مشترم کی کوئی قیمت نہیں اس میں ایک دوسرے سے فائق تر ہونے کے دعووں کی بساط بچھائیں۔ اور ایک جماعت دوسری جماعت کی طرف انگلی اٹھائے کہ

"فکر و عمل کے لحاظ سے وہ متحدہ قومیت اور سیکولرازم کی مخالف ہے"۔

اور ــــ "آج اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں متحدہ قومیت اور سیکولرازم کا دم بھرنے لگی ہے"۔

ہمیں بہت ہی افسوس ہوا جب ہم نے ایک جماعت کی طرف سے یہ شکایت پڑھی کہ ایک دوسری جماعت کے انتہائی ذمہ دار عہدیدار نے اپنے ایک بیان میں (یہ بتانے کیلئے کہ ان کی جماعت ہی کا راستہ صحیح ہے) اس طرح کے جملے اس جماعت کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ اور پھر یہ سرکلر اپنے اخبار میں بھی شائع کیا گیا ہے البتہ یہ غنیمت ہے کہ سرکلر میں اس جماعت کا صاف نام نہیں لیا گیا تھا جس کے بارے میں یہ باتیں کہی گئیں ملکہ وہ اشاروں پر اکتفا کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اس رجحان کو ہر حال اچھا نہیں کہا جا سکتا ہے ان معاملات میں دبا دبا انداز کی باتیں اشاروں میں بھی کسی طرح مناسب نہیں کسی جماعت کے ذمہ دار

اگر اپنے ارکان کے سامنے یہ باتیں اشارات کی زبان میں [illegible] کے ذہنوں سے اس کی شرح بھی ہو گی اور پھر اس کا نقصان اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ اس ایک جماعت تک محدود رہے گا تو یہ اس کی بھول اور بڑی نادانی ہو ایک جماعت تو بڑی چیز ہو کسی فرد واحد کو بھی اگر آپ ہندستان کے موجودہ حالات کے اندر اس قسم کے خیالات میں مطعون کرتے ہیں تو نتیجۃً آپ سارے مسلمانوں کے مطعون کیے جانے کا سامان کرتے ہیں یہاں تضاد کی فضا نہیں ہو کہ ایک کی بات ایک ہی کے سر ثبت ہو ثبوت سے کسی پیمانہ ایک کے [illegible] سیکڑوں اور ہزاروں کو بھگتنا پڑتا ہو کیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہو دن رات ہم [illegible] دیکھ رہے ہیں آخر کیسی نادان رقابت ہو کہ اتنا خطرناک انجام بھی نظر انداز ہو جائے ایک [illegible] ایک دوسرے کی [illegible] ہونہ یہ کہ ایک دوسرے کیلئے مشکلات پیدا کریں نظریات کا کچھ [illegible] ہو تو ہر ایک شخص کے [illegible] ہوئے ایک دوسرے کو [illegible] کی کوشش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ [illegible] آپ اپنے زعم میں کتنا ہی فرق آپس میں کر لیجئے مگر حالات نے سب کو اس ایک [illegible] کی کوشش و [illegible] کے سوا کچھ نہیں ہے یہ بات ان لوگوں کے لیے ہم سے کہیں زیادہ قابل توجہ ہو جو مسلمانوں کی کسی جماعت کی قیادت کر رہے ہوں

اس ناخوشگوار تقسیم سے قطع نظر، جہاں تک متحدہ قومیت اور سیکولر ازم کا تعلق ہے ملک کے سیاسی حالات میں جو مرتبہ بھی ان چیزوں کا ہو اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں سے کسی بات کا بھی قابل ہونا قابل قبول حالات میں نہیں اور نہ ہی اس دین کی کسی جماعت کیلئے زیبا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو اس باتوں کے قائل ہونے پر مطعون کرے۔ ہندستان کے اہل دین میں جن لوگوں نے بھی ان سیاسی تصورات کی حمایت کی ہو تو صرف اس بنا پر کہ موجودہ دور کے اندر ہندستان جیسے ملک میں شرعاً مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ ان تصورات پر قائم ہونے والے سیاسی نظام پر راضی ہو جائیں۔ نہ یہ کہ اسے کوئی قابل فخر آئیڈیل بنا لیں! اس لحاظ سے ہمیں انتہائی کبیدہ خاطر ہو کہ ان بزرگوں کے جانشین کسی مسلمان گروہ کے اس معاملے میں مختلف خیال ہونے پر اس طرح طعن کریں جیسے یہ کوئی بڑا پاپ ہو اور اسی کے ساتھ اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہو کہ جن لوگوں پر طعن کیا گیا ہو انھیں صمان صمات یہ سمجھنے میں کیا پس و پیش ہو کہ ہندوستان کے سیکولر نظام ریاست کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہو توقف کیا ہے ہمارے نزدیک وہ اگر اور مگر کا انداز اختیار کر کے خواہ مخواہ اپنے آپ کو غلط پوزیشن میں ڈال رہے ہیں۔ رائے دینے

دو ہیں کہ یا تو انھیں جرأت سے کہنا چاہیے کہ ہم بیشک مخالف تھے مگر حالات نے ہماری رائے بدل دی ہے اور یا پھر صفائی سے یہ کہنا چاہیے کہ ہم آج بھی سیکولر ریاست کے تصور کے علی الاطلاق مخالف ہیں۔ سیکولر ریاست کے تصور کی کچھ بھی تعبیر کی جائے" اجتماعی معاملات میں خدائی احکام سے بے نیازی" کے عنصر کو اس کے مفہوم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً ہندوستان کے سیکولرزم کی تعبیر اگر کوئی شخص یہ کرتا ہے کہ "گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے" تو اس میں بھی یہ عنصر پوری صفائی کے ساتھ موجود ہے۔ جس گورنمنٹ کا کوئی مذہب ہی سرے سے نہیں ہوگا اس کے متعلق یہ تصور بھی کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اجتماعی معاملات میں خدائی رہنمائی کی قائل ہوگی۔ پس اس تعبیر پر اگر آپ کا جواب یہ ہو کہ "ہم اس معنی میں سیکولرزم کے ہرگز مخالف نہیں ہیں" تو پھر اس کے بعد یہ کہنا بالکل بے کار ہے کہ

"لیکن اگر اس کے معنی الحاد کے ہوں تو یقیناً ہم اس کے خلاف ہیں"

کیونکہ جب آپ اجتماعی معاملات میں خدائی احکام سے بے نیازی کو بھی "الحاد ہی کی ایک قسم" قرار دے رہے ہیں تو الحاد کی یہ قسم تو مذکورۂ بالا تعبیر میں بھی موجود تھی۔ لہٰذا اقرار ہو تو اقرار ہی ہے اور انکار ہو تو انکار ہی ہونا چاہیے۔ معنی اور حقیقت ایک ہوتے ہوئے محض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اگر اور مگر کا استعمال کوئی بھی معنی نہیں رکھتا، بات صاف ہونی چاہیئے اور اس میں ضرورت ہو کہ مسئلہ کی صحیح نوعیت سامنے رکھی جائے۔ مسئلہ صرف یہ ہو کہ ملک کا دستور ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے یا جو فیصلہ کن پوزیشن رکھتے ہیں (اور وہ غیر مسلم ہیں) وہ کسی بھی مذہب کی رہنمائی سے آزاد رہ کر اگر ریاست کا نظام چلانا چاہیں تو کیا اس پر راضی ہو جانا اور ضرورت کی حد تک اس نظام سے تعاون کرنا کوئی گناہ ہے؟

ہمارا خیال ہو کہ اگر سیکولرزم کے معنی کے ساتھ ساتھ یہ صورت مسئلہ بھی سامنے رکھی جائے تو شاید دو ٹوک جواب کا مرحلہ آسان ہو جائے۔

موتمر عالم اسلام نمبر امسال مکہ معظمہ کی اسلامی کانفرنس بہت غیر معمولی پیمانہ کی تھی۔ جولائی ۱۹۶۵ء کا الفرقان ان شاء اللہ اس کانفرنس کے اہم مقالات اور تقاریر پر مشتمل ہوگا۔ ۔منیجر۔

مکتوب حجاز

از: ـــــــــــــــــــ مولانا محمد منظور نعمانی

(حضرت مولانا اسماں رابطہ عالم اسلامی (حجاز) کی مجلس تاسیسی کے رکن کی حیثیت سے حجاز تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے مناسک حج سے فراغت کے بعد جو پہلا مفصل مکتوب موصول ہوا ہے اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے ـــــــــ حقیق)

یہاں مکہ معظمہ پہنچے آج بیسواں دن ہے، الحمد للہ پوری صحت و سلامتی نصیب ہے ہر سے چلتے وقت دانت کے درد اور بازو کے زخم کی جو تکلیفیں تھیں اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ یہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں رہی، احرام کے زمانہ میں سر کھلے رہنے سے مجھے بڑا خطرہ تھا مگر جیسا کہ ذکر کیا جا چکا اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور کوئی تکلیف نہیں پیدا ہوئی، مکہ معظمہ کے قیام میں ہر قسم کی راحتیں اللہ تعالیٰ نے نصیب فرما رکھی ہیں اگر حج کے ایام بھی انھی راحتوں کے ساتھ گزرتے تو حج کے مجاہدہ کا کوئی حصہ نہ ملتا، اللہ تعالیٰ کے کرم نے اس سے بھی محروم نہیں رکھا اپنی موٹر ساتھ ہوئے اور اسی طرح ضرورت و راحت کے سارے دوسرے سامان موجود ہوتے ہوئے اتفاقی اور اضطراری طور پر مجاہدہ بھی خوب حصہ میں آیا خاص کر مزدلفہ سے منیٰ آتے ہوئے بڑا حصہ تیز دھوپ میں پیدل طے کیا قربانی بھی بہت تعب اٹھا کر اور پہاڑیوں کو عبور کر کے کی جا سکی، پھر کل جب مکہ معظمہ سے واپسی ہونے لگی تو کافی دور پیدل چلنا ہوا اور خاص اسباب کی وجہ سے میں نے اور مولانا نے نہ صبح کو ناشتہ کیا تھا اور نہ دوپہر کو کھانا کھایا تھا، اسی وجہ سے انتہائی ضعف تھا جب حالت

یہ ہوگئی کہ خاص کر مولانا کو خشکی اور ضعف کی وجہ سے ایک ایک قدم اٹھانا مشکل تھا تو ملا ایک موٹر ملی لیکن راستہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے حرم شریف سے قریباً آدھا میل پہلے اس کو بھی چھوڑ کر پیدل حرم شریف آئے۔

الحمد للہ مناسک سے تواب فراغت ہوگئی مؤتمر جو پہلے پروگرام کے مطابق آج ۱۵ اپریل سے شروع ہونے والی تھی دو دن تاخیر سے ۱۷ اپریل شنبہ کے دن سے شروع ہوگی اور ۲۴ اپریل تک چلے گی اس کے بعد دو تین دن رابطہ کی نشستیں ہوں گی، اس حساب سے مدینہ طیبہ روانگی اخیر اپریل میں ہوسکے گی کم از کم ہفتہ عشرہ وہاں قیام رہے گا اس کے بعد انشاء اللہ واپسی۔

اس مرتبہ حجاج کی تعداد سال گزشتہ سے بھی زیادہ ہوگئی ابھی خود سعودی عرب کے حجاج کے اعداد و شمار معلوم نہیں ہوئے، بیرونی ممالک کی تعداد تین لاکھ سے کچھ ہی کم تھی اندازہ یہ ہے کہ سعودی عرب کے حجاج کی تعداد آٹھ دس لاکھ کے لگ بھگ رہی ہوگی معلوم نہیں کیوں ٹریفک وغیرہ کے انتظامات میں بہت ڈھیل دیکھنے میں آئی۔

حجاج کی بے عنوانیاں دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ یہ صحیح اور برحق ہے کہ حج کے موسم بلکہ اسکے ایک ایک دن میں یہاں اللہ کا جتنا نام لیا جاتا ہے اور جتنی اس سے دعائیں کی جاتی ہیں اور جس طرح کی جاتی ہیں اتنی ساری دنیا میں نہ ہوتی ہوں گی۔ مگر حجاج کی عام عملی اور اخلاقی حالت بہت ہی مایوس کن ہے یہ باتیں خواہ مخواہ زبان پر اس وقت آگئیں اس طرح خطوط میں ان باتوں کے لکھنے سے بظاہر کوئی فائدہ نہیں، اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ دل میں اس کا فکر اور درد پیدا ہو، اور اسکی اصلاح کے لئے اخلاص کے ساتھ دعائیں اور امکان بھر کوششیں ہوں۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے حادثہ کی اطلاع

یہاں دوسرے دن یعنی سنیچر کی شام کو ہم لوگوں کو ملی تھی لیکن ذریعہ اس وقت تک قابل وثوق نہیں تھا اور یہاں موسم حج میں اس طرح کی سنسنی خیز خبریں معلوم نہیں کیوں اکثر اڑا کرتی ہیں اس لئے ہم لوگوں نے یقین نہیں کیا، اتوار کے دن ظہر کی نماز کے لئے جب ہم لوگ حرم شریف گئے تو اتفاق سے میری نظر ڈاکٹر اسمٰعیل صاحب پر پڑگئی یہ خبر انہی کے نام کے حوالہ سے گشت کر رہی تھی یہ ہمارے دوستوں میں سے ہیں کراچی کے رہنے والے ہیں کئی سال سے سعودی عرب کے محکمہ صحت سے وابستہ ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر ان سے ملا۔ انھوں نے بتایا کہ میں پرسوں جمعہ کے دن کراچی تھا اور اسی دن مجھے یہاں کے لئے روانہ ہونا تھا، پانچ بجے شام کے مجھے ایک دوست نے فون سے بتایا کہ لاہور میں حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کا اچانک وصال ہوگیا پھر کراچی کے تبلیغی مرکز مکی مسجد سے بھی اسکی تصدیق ہوگئی۔ میں کراچی سے اسی شب میں روانہ ہوکر کل شب میں جدہ پہنچا اور آج ہی مکہ معظمہ پہنچ سکا ہوں، خبر صحیح اور مصدق ہے۔ اس وقت ہم لوگوں کو بھی یقین کرنا پڑا، پورے عالم اسلامی کے لئے اور خاص کر ملت اسلامیہ ہند یہ کے لئے یہ بہت ہی بڑا حادثہ ہے جو لوگ نہیں جانتے وہ شاید مبالغہ سمجھیں گے لیکن یہ بالکل واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت میں دینی حرکت اور فکر آخرت پیدا کرنے کا کام جتنے وسیع پیمانہ پر صرف بیس سال کی مدت میں مولانا مرحوم سے لیا اسکی نظیر قریب کی پچھلی صدیوں میں تلاش کرنے سے بھی مشکل سے ملے گی کم از کم میرے علم میں تو نہیں ہے۔ اللہ کی شان ہے ہندوستان میں اللہ کا ایک بندہ ایک مسجد میں بیٹھکر لاکھوں بندوں کو، حقیقۃً لاکھوں بندوں کو دین کی فکر اور کوشش میں متحرک کئے ہوئے تھا دنیا کے دور دراز ملکوں میں جماعتوں پر جماعتیں بھیج رہا تھا ہزاروں غریب ملک بملک اسکے حکم سے پیدل پھرتے تھے سفروں میں ہر قسم کی تکلیفیں اٹھاتے تھے دین سیکھتے سکھاتے تھے اور دوسروں کو اسی کی دعوت دیتے اور اسی کے لئے اٹھاتے تھے اسی طرح ہزاروں صاحب استطاعت ریلوں اور موٹروں سے اسی مقصد کے لئے جماعتوں کے ساتھ مہینوں اور چلوں کے لئے نکلتے تھے، بہت سے لوگ ہوائی جہازوں

سے دور دراز ملکوں کا سفر اسی کام کے لئے کرتے تھے امت میں ایمان اور ایمانی زندگی پیدا کرنے کے لئے اتنی وسیع حرکت اور جدوجہد صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی اللہ تعالیٰ نے یہ کام ہندوستان سے کرکے دکھایا اور اپنے ایک بندہ کو اس کا ذریعہ بنایا ــــــ

ھوالذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ وھو الولی الحمید۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کے وقت تک کام بہت محدود اور ابتدائی درجہ میں تھا لیکن اس وقت یہ بھی امید نہ تھی کہ جس درجہ میں اب ہو رہا ہے یہ بھی باقی اور جاری رہ سکے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ذریعہ سینکڑوں درجہ آگے بڑھا دیا اسکی رحمت سے کچھ بعید نہیں ہے بلکہ ہمیں یہی امید کرنی چاہیئے کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کے بعد بھی اسکی قدرت و رحمت اسی طرح اپنا کام کرے گی۔

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی کے

چند مخصوص تجربات

سفوف ذیابیطس: اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جیسی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیئے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ 3/8/0 پانچ تولہ 2/-

شربت جدام۔ جذام میں یہ دوا بے حد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ 5/-

شربت کند۔ پتہ کی پتھریوں کا درد بیقرار کر دیتا ہے جگر۔ ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے۔ ایک پونڈ 5/-

شربت درد گردہ۔ پنجاب میں بکثرت کرنا یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے جن کی شکایت پرانی ہو اور پچریاں پڑ چکی ہوں انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ قیمت ایک پونڈ 5/-

مرہم سرخ: پھوڑوں مخصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں کیلئے کارگر ہے۔ اس کے استعمال سے سڑن کافور ہو جاتی ہے۔ پورا پھپھے صاف ہو جاتا ہے۔ قیمت 3/50

(منیجر) حسنی فارمیسی ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



شربت نشاط افروز



گرمیوں کا بہترین تحفہ تازے پھلوں کے رس پھولوں کے جوہر اور قیمتی دواؤں سے تیار کیا جاتا ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دوسری قسط

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ کے روابط

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

از ـــــــــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی مرادابادی

مکتوب حضرت شاہ اہل اللہ[1] پھلتیؒ برادر خرد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بنام شاہ ابوسعید حسنیؒ

بخدمت حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ سیدنا سید ابوسعید جیو سلمہم اللہ والبقاء ہم ـــــ از فقیر اہل اللہ بعد از سلام ملتمس است کہ خط بہجت بخط

---

[1] الشیخ الکبیر اہل اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین العمری الحسنی البھلتی احد علماء ربانیین و عباد اللہ الصالحین آپ نے اپنے بڑے بھائی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے اخذ علوم دین کیا۔ طب بھی پڑھی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ آپ کی کئی تالیفات و تصنیفات ہیں ان میں سے ایک مختصر ہدایۃ الفقہ ہے جو کہ ہدایہ کا انتخاب ہے (۲) مختصر تفسیر قرآن (۳) چہار باب (در فقہ و عقائد) (۴) تکملہ ہندیہ (در علم طب) غالباً ۱۱۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ایک مکتوب (محررہ ۱۱۸۰ھ) سے واضح ہوتا ہے۔ ماخوذ از حصہ اخبار علماء۔ (مزار حیات غیلع مظفر نگر میں ہے۔ احقر نے زیارت کی ہے)

رسید آنچہ از راہ مہربانی و شفقت کہ دربارۂ این فقیر مبذول میدارند عنایات و توجہات ظاہری و باطنی مصروف فرمودند شکر آں بکدام زبان بیان نمودہ آید.....

حضرت سبحانہ و تعالیٰ ترقیات دارین و کمالات کونین نصیب آں باذل نفسہ فی مرضات اللہ گرداند چنانچہ این نیازمند را از فکر معاش نجات بخشید ندا و جل و علا از جمیع حاجات از دین و دنیا ذات سامی را خلاص و نجات عنایت فرماید ــــ توقع آنست کہ این دردکہ بہ بخشی رام حوالہ شدہ است بوضع جریان دادہ شود کہ اینجا یا بردیگر پرگنہ کہ بلا کلفت میسر آمدہ باشد ماہ بماہ بلا دقت بدست می آمدہ باشد زیادہ چہ ۔ دہر چہ صلاح دید صاحب بود بہتر است ۔ بخدمت میاں محمد عتیق جیو سلام رسد ۔ حسب الایمائے خط شکر گذاری بنجان رفعت نشان مرقوم شدہ اگر مناسب دانند بگزرانند ــــ

ترجمہ ــــ حقائق و معارف آگاہ، فضیلت و کمالات دستگاہ سید ناسید ابوسعید صاحب سلمہم اللہ والبقاء ہم ــــ کی خدمت میں فقیر اہل اللہ کی طرف سے بعد از سلام نیاز عرض ہے کہ خط بہجت نمط پہونچا ــــ از راہ مہربانی و شفقت ــــ جو کہ اس فقیر پر مبذول فرماتے رہتے ہیں ــــ جو کچھ ظاہری و باطنی عنایات و توجہات آپ نے کی ہیں اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے ..... اللہ تعالیٰ آپ کو کہ آپ اس کی مرضیات میں اپنی جان کو خرچ کرنے والے انسان ہیں ــــ ترقیات دارین اور کمالات کونین نصیب فرمائے ــــ آپ نے جس طرح اس نیازمند کو فکر معاش سے نجات دی اللہ جل شانہ آپ کو بھی دین و دنیا کی جمیع حاجات سے بے فکر فرمائے ــــ امید یہ ہے کہ یہ وظیفہ جو کہ بخشی رام کے حوالے کیا گیا ہے اس طور پر برابر جاری رہے گا کہ اس جگہ (پہلت) یا کسی دوسرے پرگنے میں ماہ بماہ بلا دقت حاصل ہو جایا کرے گا ــــ زیادہ کیا لکھوں۔ جو بھی آپ کی صوابدید ہو بہتر ہے ــــ میاں محمد عتیق صاحب کی خدمت میں سلام پہونچے۔ آپ کے حسب الایما رخان رفعت نشان (ابراہیم خلیل خاں) کو بھی خط شکر گذاری مرقوم کر دیا گیا ہے اگر مناسب سمجھیں تو (آپ ہی) اس کو وہاں پہونچا دیں۔

ایک مکتوب گرامی میں حضرت شاہ اہل اللہؒ حضرت رائے بریلوی کو تحریر فرماتے ہیں۔

احوال یومیہ کہ از توجہ وجیہہ صورت گرفتہ است بفضل الٰہی تا حال تحریر جاری است و ایں نیازمند باد یگر کس و کوئے خود رطب اللسان شکر گزاری است اللہ تعالیٰ دیر گاہ سلامت دارد فقیر زادہ محمد مقرب اللہ سلام نیاز می رساند ۔ زیادہ چہ نویسد ۔

احوال یومیہ جو آپ کی توجہ سے درست ہو گئے ہیں تا دم تحریر ہذا ٹھیک چل رہے ہیں۔ یہ نیازمند اپنے متعلقین سمیت آپ کی شکر گذاری میں تر زبان ہے۔ اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کو سلامت رکھے فقیر زادہ محمد مقرب اللہ سلام کہتا ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔

مکتوب حضرت شاہ اہل اللہ بنام شاہ ابو اللیث[1] حسنی ملقب بہ ابو العیش فرزند حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ

عزیز القدر سیادت مرتبت سید ابو العیش سلمہ ربہٗ بعد از سلام شوق الیام مطالعہ نمایند کہ شوق دیدار ایشان از استماع سعادت مندی شان زبانی والد بزرگوار بحد کمال است اللہ سبحانہٗ تعالیٰ بعافیت طرفین و خیریت جانبین ملاقات سرت آیات میسر فرماید ۔ یقین است کہ باشتغال علوم ظاہری و تحصیل سلوک باطنی از جناب قبلہ گاہ خود کہ مجمع کمالات دارین اند مشغول خواہید بود کہ بزرگ زادۂ خاندان عالیہ را

---

[1] السید الشریف ابو اللیث بن ابی سعید بن محمد ضیاء بن آیت اللہ بن شیخ الکبیر علم اللہ النقشبندی البریلوی احد الرجال المعروفین بالفضل والصلاح ۔ آپنے اپنے والد سے علم حاصل کیا اور انھیں سے طریقہ اخذ کیا اور ارشاد و تلقین میں اپنے والد ماجد کے جانشین ہوئے۔ سفر حرمین میں اپنے والد کے ہمراہ تھے مدراس میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ ایک زمانہ تک وہاں رہ کر روحانی فیض پہونچایا اسی علاقے میں انتقال ہوا۔ آپ کی قبر بندرگاہ کوڈیال میں ساحل سمندر پر ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) آپ کا لقب ابو العیش تھا۔ ان مکتوبات اکابر کے جامع آپ ہی ہیں۔

ازیں ہر دو چیز ناگزیر است۔ زیادہ بجز شوق و دعا چہ نویسد۔

ترجمہ ـــــ عزیز القدر سیادت مرتبت ..... بعد از سلام شوق مطالعہ کریں۔ مجھے تمہارے دیکھنے کا اشتیاق بحد کمال ہے اس لیے کہ میں نے تمہارے والد بزرگوار کی زبانی تمہاری سعادت مندی کی باتیں سنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ طرفین و جانبین کی خیر و عافیت کے ساتھ ملاقات میسر فرمائے ـــــ یقین ہے کہ تم اپنے والد کی خدمت میں ـــــ جو کہ جمع کمالات دارین ہیں ـــــ اشتغال علوم ظاہری اور تحصیل سلوک باطنی کے اندر مشغول ہوگے اس لیے کہ خاندان عالی کے ایک بزرگ زادے کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ زیادہ بجز شوق و دعا اور کیا لکھوں۔

مکتوب مولانا نور اللہ[1] بڈھانویؒ بنام حضرت شاہ سید ابو سعید حسنیؒ

مجمع حمائد و فضائل معدن محاسن و فواضل، سعادت و کرامت مآب معارف و کمالات انتساب مکرمی مہربان میر سید ابو سعید جیو سلمہ اللہ المجید ـــ ازیں فقیر نور اللہ بعد سلام نیاز مطالعہ فرمایند۔ ملاطفت نامہ وصول فرمودہ ابتہاج و سرور بخشید یاد آوری بزرگان بشارت سعادت است الحمد للہ علیٰ ذلک ـــ اکثر اوقات بذکر اخلاق و اشتیاق

---

[1] الشیخ العالم الکبیر المحدث نور اللہ الصدیقی البرہانوی احد فحول العلماء ـــ آپ قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی بچپن ہی سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے۔ تحصیل علم ہی کے لیے دہلی کا سفر کیا اور شیخ الکبیر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ طویل زمانے تک حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت سے مستفیض ہوئے ـــ آپ کا شمار اپنے استاد معظم کی حیات ہی میں اکابر علماء میں ہونے لگا تھا ـــ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے آپ سے کتب علم فقہ پڑھیں۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ آپ کے داماد تھے۔ غالباً ۱۱۸۶ھ میں انتقال ہوا جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ایک مکتوب گرامی سے اندازہ ہوتا ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۷) حضرت مولانا شاہ عبد الحیٔ ابن عبد اللہ بڈھانویؒ (رفیق حضرت سید احمد شہیدؒ) انھیں مولانا شاہ نور اللہ بڈھانویؒ کے پوتے تھے۔

رطب اللسان است اللہ تعالیٰ بجمعیت قلبی و قالبی محفوظ دارد و از نامرضیات محفوظ ـــ
از مژدۂ عزم قدوم میمنت لزوم اشتیاق دیدار فرحت آثار دوبالا شد ـ او تعالیٰ زود بوجہ احسن مشتاقان را بملاقات سامی مسعود سازد ـ بالجملہ فقیر بدعائے خیر مشغولی دارد انہٗ قریبٌ مجیب ـــ دنام شخصے کہ از اقربائے اینجانب است محمد راجی است اگر آنجا باشد البتہ پیش خود طلبیدہ فرمایند کہ خیر خیریت بنویسد ـ نیازمند عطاء اللہ مع برادران و قاضی جید و میاں سراج الدین و دیگر اعزہ سلام نیاز میرسانند ...
ترجمہ ـــ مجمع حامد و فضائل ..... مکرمی مہربان میر سید ابو سعید صاحب سلمہ اللہ اس فقیر نور اللہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ فرمائیں ـــ الطاف نامہ وصول ہوا۔ مسرت بخشی ۔ بزرگوں کی یاد آوری بشارت سعادت ہوتی ہے ۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ـــ اکثر اوقات آپ کے اخلاق و اشفاق کے ذکر میں رطب اللسان رہتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جمعیت ظاہری و باطنی کے ساتھ محفوظ رکھے اور اپنی نامرضیات سے محفوظ ـــ آپ کی تشریف آوری کے قصد کا مژدہ پڑھ کر اشتیاق دیدار دوبالا ہوگیا ـــ اللہ تعالیٰ بلد بوجہ احسن مشتاقوں کو ملاقات گرامی سے سعادت اندوز فرمائے ـــ بالجملہ فقیر دعائے خیر میں مشغول ہے ـ انہٗ قریب مجیب ـــ اور اس شخص کا نام جو میرے اقربا میں سے ہے محمد راجی ہے اگر وہاں ہو تو اپنے پاس بلا کر فرمائیں کہ (کم از کم) اپنی خیریت تو لکھ کر بھیج دے ـــ عطاء اللہ مع برادران ، قاضی صاحب اور میاں سراج الدین نیز دیگر اعزہ سلام پہونچاتے ہیں .....

مکتوبات حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ[1] بنام حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ

مکتوب (۱) ۔ سیادت و نقابت مرتبت خلاصۂ دودمان (نجابت) حقائق و معارف آگاہ فضائل دستگاہ میر ابو سعید جیو سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ بعد از سلام اشواق التیام از

---

[1] الشیخ العالم الکبیر المحدث محمد عاشق بن عبید اللہ بن محمد الصدیقی البھلتیؒ ـــ بچپن ہی سے آپ نے علم سے
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

فقیر محمد عاشق مشہود ضمیر معارف تحمیر باد کہ الحمد للہ علی العافیۃ ونسئل اللہ تعالیٰ ان یدیم لنا ولکم ایاھا ـــــ اشفاق نامہ کہ بنام میاں شاہ نور اللہ جید و فقیر ارقام فرمودہ بودند ورود تودد نمود ـــــ الحال کہ فقیر بجہت تحصیل شرف ملاقات ملازمت حضرت قبلۂ کونین مدالہ ظلہم العالی رسیدہ عرضی ایشانرا کہ بجناب حضرت ارسال داشتہ بودند مطالعہ نمود و مواجید خاصہ کہ بفضل الٰہی نصیب ایشاں شدہ ملاحظہ کردہ و ایں معنیٰ موجب نہایت خوشی و شادی گردید و حمد الٰہی و شکر وے تعالیٰ بجا آورد اللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ شعر زد ـــ ان شاء اللہ تعالیٰ بعد وصول وطن نیاز نامہ بخدمت خواہد نوشت اُمید کہ بدعائے خیر یاد دارند ـــ زیادہ چہ التماس نماید والسلام ـــ میاں محمد عتیق جید سلام مطالعہ نماید از محمد فائق سلام مطالعہ باد ـــ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اشتغال رکھا اور حضرت شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلویؒ کی خدمت میں تکمیل کی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے ماموں زاد بھائی تھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے آپنے علم و معرفت کو اخذ کیا۔ حرمین شریفین کے سفر (۱۱۴۳ھ تا ۱۱۴۵ھ) میں آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ حرمین کے جو اساتذہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہیں وہ آپکے بھی ہیں جن میں سب سے بڑے حضرت شیخ ابو طاہر محمد ابن ابراہیم کردی مدنیؒ ہیں۔ حضرت شیخ ابو طاہر کردیؒ نے بھی آپ کو اجازت حدیث دی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ اور خلفاء میں سب سے اونچا مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحب السر تھے جیسا کہ شیخ ابو طاہر کردیؒ نے اپنے اجازت نامے میں اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے اور آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کا آئینہ کمال قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اپنے عربی اشعار میں آپ کو کمالات عالیہ کی خوشخبری دی ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ جیسے باکمال مشائخ اور ایک خلق کثیر نے آپ سے اخذ فیض کیا ہے۔ آپکے مصنفات میں سے ایک کتاب سبیل الرشاد ہے جو فارسی زبان میں سلوک کے اندر ایک مبسوط کتاب ہے القول الجلی فی مناقب ولی اللہ بھی آپ کی کتاب ہے جس میں اپنے شیخ و مربی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات و مناقب لکھے ہیں۔ ایک کتاب شرح دعا الاعتصام ہے۔ حبل کتاب پیر و مرشد کی ہے جو حقائق و معارف کے بیان میں ہے۔ اور آپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے مصفیٰ شرح موطا للشیخ ولی اللہ المحدثؒ کا مبیضہ تیار کیا۔ حضرت شاہ صاحب کے علوم و معارف زیادہ تر آپ کے ذریعہ محفوظ اور اشاعت پذیر ہوئے۔ مکتوبات شاہ صاحب کو بھی آپنے اور آپکے صاحبزادے شیخ عبد الرحمٰن مرحوم نے جمع کیا تھا۔ آپ کی وفات غالباً ۱۱۸۶ھ میں ہوئی جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے ایک مکتوب گرامی سے ظاہر ہوتا ہے۔ (ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد ۶)

ترجمہ مکتوب (۱) ـــــ سیادت و نقابت مرتبت ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ بعد از سلام اشواق الیٰ الدوام فقیر محمد عاشق کی طرف سے واضح ہو کہ الحمد للہ عافیت سے ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ـــــ اشفاق نامہ جو میاں شاہ نور اللہ (بڈھانوی) اور فقیر کے نام (مشترکہ طور پر) ارقام فرمایا تھا پہونچ گیا تھا ـــــ اس وقت فقیر شرف ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے حضرت قبلہ کونین مدالہ ظلہم العالی (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کی خدمت میں شاہجہان آباد (دہلی) آیا ہوا ہے ـــ آپ کی وہ عرضداشت جو حضرت والا کو آپ نے بھیجی ہے نظر سے گذری اس میں آپ کے اذواق و مواجید خاصہ جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کو نصیب ہوئے ہیں مطالعہ کیے ـــ اس سے بڑی مسرت حاصل ہوئی اور حمد الٰہی اور اس کا شکر بجا لایا ـــ اے اللہ اس ذوق کو زیادہ اور زیادہ اور زیادہ کر ـــــ اللہ نے چاہا تو وطن (پہلت) پہونچنے کے بعد آپ کی خدمت میں (دوسرا) نیاز نامہ لکھوں گا ـــ امید کہ دعائے خیر میں یاد رکھیں گے ـــ زیادہ کیا لکھوں ـــ والسلام ـــ میاں محمد عتیق صاحب سلام مطالعہ کریں ـــــ محمد فائق کی طرف سے سلام قبول فرمائیں ـــ

مکتوب (۲) ـ فضائل و کمالات دستگاہ میر ابو سعید صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ ـــــ فقیر محمد عاشق کان اللہ لہ بعد سلام نیاز تمام میرساند کہ الحمد للہ تعالیٰ جمیع احوال این نیازمند مستوجب حمد و شکر ایزد متعال است جمعیت صوری و باطنی و استقامت امور ظاہری و باطنی آں کرم فرمائے من از جناب مجیب الدعوات مسئول و مامول است ـــ شوقے کہ بملاقات فیض آیات ایشانست بر عالم الغیب والشہادۃ نیک روشن است آنرا بزبان قلم دادن خلاف طریقۂ اہل دل میداند لہذا ..... بدعائے دیگرمی پردازد ـــ عنایت نامہ مشتمل بر شکایت ایذائے بعض الاقارب کا لعقارب وسعی خلل اندازی دمکار دیدہ کہ بفضل الٰہی تبازگی در تصرف آمدہ رسیدہ ـــ مطالعہ آں موجب تشویش خاطر فاتر گردید دل بے اختیار طبعی است کہ بفضل الٰہی خویش مخالف را آفت ارا ایذا نہ بخشد و توفیق وفاق را

کرامت فرماید و مساعیٔ مخالف را بمراد نرساند۔ بالفصل خطے در باب بذل مساعیٔ جمیلہ درشد و مد خیال ایذاء مخالف در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بسجان ذی شان سید تہور علی خاں کہ بخدمت ایشاں ہم غالب است کہ رابطۂ اخلاص داشتہ باشد۔ نوشتہ ارسال نمودہ است۔ غالب است کہ توفیق ایں امر خیر بیابد۔ و بانجیب الدولہ فقیر را چندان نوشت و خواند نیست مع ہذا از مقدور در یغ نیست۔ دیگر آنکہ از مرحمت نامہ، وعدۂ توجہ بامنصوب قبل رمضان یا بعد آں واضح شدہ بود۔ وعدۂ قبل رمضان خود رفت و بعد بہ قریبۂ رمضان ہم تمام شد باید دید کہ تمنائے وصال کے رو نماید۔ حق سبحانہٗ زود میسر آرد امید از خدمت گرامی آنکہ دعائے در حق ایں نیازمند مبذول شود تا حق سبحانہٗ از آفت ہستی و خود پرستی نجات کرامت فرماید۔ زیادہ بجز شوق ملاقات فیض سمات چہ نگارد والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔ فقیر زادہ محمد فائق سلام نیاز خود فرا باد میدہد۔ حاجی بلال و محمد سلیم سلام نیاز میرسانند۔ دیگر التماس آنکہ خطے کہ حضرت میاں صاحب بایشاں نوشتند نقل آں برداشتہ باں فقیر عنایت فرمایند و ہمچنیں نقل خطوط سابقہ نیز مرحمت فرمایند و دریں باب ہرگز تقاعل تجویز نہ نمایند۔

ترجمہ مکتوب (۲) ـــــ فضائل و کمالات دستگاہ میرا ابو سعید سلمہم اللہ تعالیٰ ـــــ فقیر محمد عاشق کان اللہ لہٗ ـــــ بعد سلام لکھتا ہے کہ الحمد للہ تمام احوال اس نیازمند کے لائق حمد و شکر ایزد تعالیٰ ہیں ـــــ مجیب الدعوات سے آپ کے لیے جمعیت صوری و معنوی اور استقامت امور ظاہری و باطنی کی درخواست ہے۔ شوق ملاقات کا جو عالم ہے اُس کو عالم الغیب والشہادۃ خوب جانتا ہے۔ اس شوق کو زبان و قلم کے حوالے کرنا خلاف طریقۂ اہل دل سمجھتا ہوں لہذا..... دوسری بات لکھتا ہوں ـــــ عنایت نامہ جو بعض اقارب کی تکلیف دہی اور جائداد ـــــ جو آپ کے تصرف میں ابھی آئی ہے ـــــ کے کاموں میں خلل اندازی کی شکایات پر مشتمل تھا۔ پہونچا ـــــ اس کے مطالعے سے دل کو تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے میرا دل بے اختیار التجا کرتا ہے کہ وہ محض اپنے فضل و کرم سے مخالفت کو ایذا کی قدرت نہ دے اور موافقت

کی توفیق عطا فرمائے۔ نیز مخالف کی مساعی کو کامیاب نہ کرے۔ مخالف کی ایذا کا اندیشہ کرتے ہوئے سرکار شجاع الدولہ بہادر میں خان ذی شان سید تہور علی خاں کو ایک خط لکھ دیا ہے غالباً وہ آپ سے بھی رابطۂ اخلاص رکھتے ہوں گے امید کہ وہ امر خیر کی توفیق پائیں گے۔ نجیب الدولہ سے فقیر کی چنداں خط و کتابت نہیں ہے اس کے باوجود ممکن کوشش سے دریغ نہ ہوگا۔ ایک بات یہ لکھنا ہے کہ آپ کے مرحمت نامے سے اس طرف قبل رمضان یا بعد رمضان آنے کا وعدہ واضح ہوا تھا۔ وعدۂ قبل رمضان تو ختم ہوا ہی تھا اب رمضان کی بعدیت قریبہ بھی ختم ہوگئی دیکھا چاہیے کہ تمنائے وصال کب پوری ہو۔ اللہ تعالیٰ جلد ملاقات میسر کرے۔ آپ کی ذات گرامی سے یہ امید ہے کہ اس نیازمند کے حق میں دعا کرتے رہیں گے کہ اللہ تعالیٰ آفت خودی و خودپرستی سے نجات دے۔ زیادہ بجز شوق ملاقات کے اور کیا لکھوں۔ والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً فقیر زادہ محمد فائق بھی اپنا سلام یاد دلا رہا ہے۔ حاجی بلال اور محمد سلیم اپنا سلام پہونچاتے ہیں۔ دیگر التماس یہ ہے کہ وہ خط جو حضرت میاں صاحب (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) نے آپ کو لکھا ہے اس کی نقل کرکے اس فقیر کو عنایت فرمائیں۔ اسی طرح خطوط سابقہ کی بھی نقل مرحمت فرمائیں اس بارے میں تغافل کو ہرگز جائز نہ رکھیں۔

مکتوب (۳) ــــ حق سبحانہٗ ذات مجمع کمالات آں عارف المکاشف صاحب الاذواق والمواجید (را) مصدر فیوض ظاہری و باطنی گرداناد آمین برب العباد ــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہ (بعد از) تبلیغ سلام و اظہار شوق و غرام بملاقات فیض آیات مشہود ضمیر منیر میگرداند کہ مدتے مدید و عہدے بعید برآمدہ کہ سوائے یک مکتوب کہ مشحون حقائق و معارف جلیلہ بود نرسیدہ ــــ بنابرآں دل ایں مہجور بالضرور مشتاق لقائے بہجت افزائے و شوق مند مطالعۂ کلمات معارف سمات می باشد ــــ اللہ تعالیٰ بمحض عنایت خویش لطیفہ انگیزد کہ حجاب بُعد صورت از میاں برخیزد و تمنائے دلی بوجہ احسن میسر آید ــــ معلوم نیست کہ دریں ایام بکدام مقام تمکن دارند ــــ امید کہ بدست آئندہ از اسرار و آثار آں اطلاع بخشند تا مشتاقاں ہم ازاں لحظے و لذتے حاصل نمایم ــــ دیگر آنکہ الحمدللہ کہ

بفضل اللہ سبحانہ فقرائے باب اللہ دریں ایام فتن کہ بخصوصیت دریں ملک از دست رفتہ..... حادثہ رو دادہ کہ تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت و تضع کل ذات حمل حملھا ــــ حکایت ازاں میتواند شد ــــ بہمہ وجوہ محفوظ ماندیم ــــ ۵

گر برتن من زباں شود ہر موئے
یک شکر تواز ہزار نتواں کرد

اُمید کہ ایں فقیر را مع الاولاد والاحباب والاصحاب بدعائے ظہر الغیب یاد فرمائند تا در فتن صوریہ و معنویہ محفوظ مانیم و بر صراط مستقیم ثابت قدم باشیم ــــ زیادہ بحد استدعائے یاد آوری چہ اظہار نماید والسلام علیکم اولاً و آخراً ــــ مخدوم زادہ میر ابو العیش سلمہ اللہ سلام و شوق مطالعہ نمایند ــــ فقیر زادہ محمد فائق و وحید الزماں و محمد احسان و محمد نعمان و ابو الفتح و عبد السلام سلام نیاز میرسانند حاجی بلال نیز ــــ

بخدمت گرامی میاں سید علی[1] جیو صاحب کہ فقیر غائبانہ مشتاق ملاقات فیض آیات ایشان است سلام رسانند و استدعاء دعا نمایند کہ حق سبحانہ بمیمن آں از آفت خودی و خود پرستی نجات کرامت فرماید و حاجی میر محمد نعمان جیو سلمہ اشواقیہ مطالعہ نمایند، میاں آل محمد و میاں محمد ہمام و قائم خاں سلام شوق مطالعہ نمایند ــــ

---

[1] حضرت سید محمد عدل عرف سید علی بن سید محمد بن حضرت شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی آپ نے اپنے بھائی سید محمد مکی سے اخذ علوم کیا پھر اپنے والد سے طریقۂ نقشبندیہ حاصل کیا اور رشد و کمال کو پہونچے اور اپنے والد کے جانشین ہوئے ــــ سرزمین اودھ میں اپنے زمانہ کے یگانۂ روزگار بزرگ تھے آپ سے مولانا انوار الحق فرنگی محلی، مولانا ذوالفقار علی دیوی، قاضی عبد الکریم جورسی، مولانا احمدی بن محمد نعیم کرسوی، شیخ محمد یحییٰ بن محمد ضیاء جائسی، سید محمد نعمان ابن محمد نور نقیر آبادی وغیرہم کثیر التعداد علماء و مشائخ نے فیض حاصل کیا ۱۰۹۲ھ میں انتقال ہوا بگیچۂ شاہ علم اللہ حسنی میں مزار ہے۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) مؤلف آئینۂ اودھ نے صفحہ ۲۹۹ پر آپ کو حضرت شاہ علم اللہ حسنی کی پانچویں پشت میں بتلایا ہے جو غلط ہے ــــ درحقیقت آپ حضرت شاہ علم اللہ قدس سرہٗ کے ابن الابن ہیں ــــ یعنی دوسری پشت میں ہیں۔

ترجمہ مکتوب (۳) ـــــ اللہ تعالیٰ آں عارف مکاشف، صاحب اذواق ومواجید کو مصدر فیوض ظاہری وباطنی بنائے آمین ـــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہ تبلیغ سلام اور اظہار شوق ملاقات کے بعد لکھتا ہے کہ ایک مدت دراز ہوگئی کہ سوائے ایک مکتوب کے جو کہ حقائق ومعارف جلیلہ سے بھرا ہوا تھا اور کوئی مکتوب نہیں پہونچا اس بنا پر اس مہجور کا دل شتاق دیدار اور شوق سند مطالعہ کلمات معارف سمات ہے اللہ تعالیٰ محض اپنے کرم سے ایسی صورت پیدا کرے کہ یہ ظاہری پردہ دوری درمیان سے اٹھ جائے اور تمنائے دلی بوجہ احسن میسر آئے ـــــ معلوم نہیں کہ ان دنوں آپ کون سے مقام سلوک پر فائز ہیں، مجھے امید ہے کہ کسی آنے والے کے ہاتھ اپنے موجودہ احوال وآثار سے اطلاع بخشیں گے تاکہ ہم مشتاق بھی اس سے حظ ولطف حاصل کریں ـــــ دوسری بات یہ ہے کہ الحمدللہ ہم آسانۂ خداوندی کے فقیران ایام فتن میں کہ خصوصیت کے ساتھ اس علاقے میں سکھوں کے ہاتھ سے حادثہ رونما ہوا اور جو قیامت کا نمونہ تھا ـــــ بہمہ وجوہ محفوظ رہے ـــــ اگر جسم کے تمام رونگٹے زبان بن جائیں تب بھی اللہ تعالیٰ کا ہزار میں سے ایک شکر ادا نہیں ہوسکتا ـــــ امید ہے کہ اس فقیر کو اور اس کی اولاد، احباب اور اصحاب کو غائبانہ دعا سے یاد کرتے رہیں گے تاکہ ہم ظاہری وباطنی فتنوں سے محفوظ اور صراط مستقیم پر ثابت قدم رہیں ـــــ زیادہ بجز التماس یاد آوری اور کیا لکھوں ـــــ والسلام علیکم اولاً وآخراً ـــــ مخدوم زادہ ابوالعیش سلمہٗ سلام وشوق مطالعہ کریں، فقیر زادہ محمد فائق کے علاوہ، وحیدالزماں، محمد احسان، محمد نعمان، ابوالفتح، عبدالسلام سلام کہتے ہیں اور حاجی بلال بھی ـــــ میاں سید لعل صاحب کی خدمت گرامی میں ـــــ کہ فقیر غائبانہ ان کا مشتاق ملاقات ہے ـــــ سلام پہونچادیں ـــــ اور دعا کی التماس کریں تاکہ حق تعالیٰ اس دعا کی برکت سے مجھے آفت خودی وخود پرستی سے نجات بخشے ـــــ حاجی میر محمد نعمان سلمہٗ اور میاں محمد ہمام اور قائم خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔

مکتوب (۴) ـ بگرامی خدمت حقائق آگاہ ومعارف دستگاہ سلالۂ سادات عظام

نقاوۂ دودمان سلف کرام میر ابو سعید جیو سلمہم اللہ تعالیٰ ـــــ فقیر محمد عاشق عفی عنہٗ بعد اہدائے سلام و اشواق و طمع میگرداند کہ عنایت نامہ، منبی از قدوم بہجت لزوم در اسعد ساعات ورود نمود بمطالعۂ آں ابواب خوشی و شادی ہر چہ تمام تر بر روئے دل مستہام کشود ـــ از روزیکہ شقۂ شریف مشعر از توجہ بایں دیار و تشریف آوری تا بلشکر رسیدہ بود ہمیشہ انتظار قدوم مسرت لزوم میداشت خصوصاً دریں روزہا کہ لشکر بایں سمت متوجہ شدہ، شب و روز گوش بر آواز مژدہ میداشت ـــ الحمد للہ کہ آں نوید فرحت جاوید رسید اشواق دل مقتضی آں بود کہ بمجرد اصغائے ایں مژدہ بتعجیل ہر چہ تمام تر خود را بخدمت رساند لیکن بعضے مخلصان کہ دلدارئ شاں نیز از اہم مہمات است سد راہ تعجیل شدند پس جہت ضرورت توقف بمیان آمد ـــ ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب میرسم بخاطر جمع در آنجا کہ خانۂ ایشاں است تشریف دارند و در دل صفا منزل، تشویش را راہ ندہند ان شاء اللہ تعالیٰ زود ایں فقیر را رسیدہ دانند و از مژدۂ آنکہ مکاتیب فیض اسالیب حضرت قبلہ ام رضی اللہ عنہٗ ہمراہ شریف آوردہ اند بغایت شادی روئے آورد ـــ شکر ایں عنایت بکدام زبان نمودہ آید کہ از احصائے خارج است ـــ زیادہ بجز التماس اینکہ بخاطر جمع در آنجا تشریف دارند ایں فقیر زود میرسد ـــ چہ اظہار نماید والسلام از فقیر زادہ محمد فاں سلام نیاز مطالعہ نمایند ـــ حاجی ہلال وغیرہ سلام نیازمی رسانند ـــ بعالیجناب شاہ اہل اللہ آداب و تسلیمات ملتمس است، محمد مقرب اللہ و میاں محمد شاہ و رحم علی و ہمہ یاران سلام مطالعہ نمایند ـــ فقط

ترجمہ مکتوب (۴) ـــــ حقائق آگاہ معارف دستگاہ..... میر ابو سعید صاحب سلمہم اللہ کی خدمت میں فقیر محمد عاشق عفی عنہٗ بعد ہدیۂ سلام و شوق فراواں واضح کرتا ہے کہ عنایت نامہ جو قدوم بہجت لزوم کی اطلاع دینے والا تھا سعید ترین ساعت میں وارد ہوا اس کے مطالعے سے مسرت (خوشی) کے دروازے کامل طریقے سے دل پریشاں پر کھل گئے ـــ (اس سے پہلے) اس روز سے جبکہ آپ کا رقعہ اس علاقے کی طرف توجہ فرمانے اور لشکر تک تشریف لانے کا پہونچا تھا ہمیشہ انتظار قدوم

مسرت لزوم تھا ـــ خصوصاً ان ایام میں کہ لشکر اس طرف متوجہ ہوا ہے۔ شب و روز اپنے کانوں کو آپ کی تشریف آوری کی خوشخبری سننے کی طرف متوجہ رکھتا تھا ـــ الحمدللہ کہ وہ نوید فرحت[1] جاوید پہونچی ـــ شوق دل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس خبر کو سنتے ہی ممکن تعجیل کے ساتھ خود کو آپ کی خدمت میں پہونچا دوں لیکن بعض مخلصین کہ اُن کی دلداری بھی بہت ضروری ہے تعجیل سے مانع ہوئے ـــ پس ضرورت کی وجہ سے چند روز کا توقف ہوگیا اللہ نے چاہا تو جلد پہونچ رہا ہوں ـــ اطمینان کے ساتھ وہاں (پہلت میں) تشریف رکھیں وہ گھر آپ ہی کا ہے ـــ دل صفا منزل میں کسی قسم کی تشویش کو راہ نہ دیں ـــ ان شاءاللہ تعالیٰ جلد اس فقیر کو وہاں پہونچا ہوا جانیں ـــ اس خوشخبری سے کہ آپ حضرت قبلہ رضی اللہ عنہ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے مکتوبات بھی اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ بہت ہی خوشی رونما ہوئی آپ کی اس مہربانی کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے کہ احاطۂ بیان سے خارج ہے ـــ زیادہ بجز اس کے کہ ملتماس کے کہ اطمینان کے ساتھ وہاں تشریف رکھیں فقیر جلد پہونچ رہا ہے ـــ اور کیا اظہار کروں ـــ فقیرزادہ محمد فائق کی طرف سے سلام مطالعہ فرمائیں۔ حاجی بلال وغیرہ بھی سلام پیش کرتے ہیں ـــ بعالیخدمت شاہ اہل اللہ (پہلتی) سلام عرض ہے، محمد مقرب اللہ ـ میاں محمد شاہ اور رحم علی نیز (پہلت کے) تمام احباب سلام مطالعہ فرمائیں۔

مکتوب (۵) ..... الحمدللہ تا حالت تحریر کہ بست و دوم شہر ذی قعدہ سن ہشتاد بعد الالف و المأئہ است، احوال ایں فقیر مع صغیر و کبیر موجب شکر و ثنائے حق جل و علا

---

[1] اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ جب پہلت ضلع مظفر نگر پہونچے تو شاہ محمد عاشق پہلتی مع اہل و عیال دہلی میں تھے تشریف آوری حضرت شاہ ابوسعیدؒ کی خوشخبری آپ کو دہلی میں ملی ـــ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا وصال ہو چکا ہے ـــ پچھلے مکتوب میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مکتوبات کا مطالبہ حضرت شاہ محمد عاشقؒ نے کیا تھا اب وہ اس تقاضے کے مطابق مکتوبات ہمراہ لائے ہیں۔ یہ مکتوبات وہی ہیں جن کا پہلی قسط میں اندراج ہو چکا ہے ـــ کتنی خوشی ہو مکتوبات کے ہمراہ لانے کی۔ درحقیقت اسی شوق و ذوق نے بزرگوں کے قلمی تبرکات کو ہم تک پہونچانے میں مدد دی ہے۔

است ..... گاہ گاہ مصحوب آمدگان انیصوب از کوائف عافیت و از اذواق و مواجید خاصۂ خویش شرف اطلاع بخشیدہ باشند ــــ واشتیاق بوصال فیض مالامال چہ نویسد کہ بہ تحریر نمی گنجد ..... ؎

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دلِ من
دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

بعد ازاں آنکہ فقیر بحسب قسمت در موضع نوگانواں سادات کہ قریب بلدۂ امروہہ است رسیدہ بود در آنجا معلوم شد کہ پسر غلام انبیاء کہ عاشق علی نام دارد بے رخصت از خانہ ہمراہ دو یک اطفال دیگر عزم آں دیار کردہ و از مدتے از حال وے خبرے نرسیدہ ازیں جہت پدر و مادر وے اضطراب تمام دارند و پدر وے شنیدہ است کہ مشارٌ الیہ بخدمت شریف رسیدہ بود و چند روز اقامت نمودہ ــ بنابراں ازیں فقیر استدعائے کردہ کہ بخدمت گرانی خطے متضمن استفسار احوال وے نویسد لہذا متصدع اوقات شریف گردیدہ ــ اگر آں سیدزادہ در آنجا بودہ باشد یا از احوال وے اطلاع باشد البتہ اطلاع بخشند زیادہ بجز ذکر دعائے ظہر الغیب چہ التماس نمودہ آید ــ والسلام مع الاکرام ــ میر ابو النعیش سلام شوق مطالعہ نمایند، میر محمد نعمان سلام مطالعہ فرمایند ــ از میاں آل محمد، و میاں رحم علی و میاں غلام امام و محمد قاسم سلام مطالعہ باد ــ دیگر آنکہ صاحبزادہائے مع قبائل باخیر و خوبی در بڈھانہ تشریف می دارند ــ میاں اہل اللہ صاحب و شاہ نور اللہ جیو بخیریت اند ــ محمد فائق و محمد مقرب اللہ و وحید الزماں و محمد احسان و میاں محمد جواد و حاجی بلال و جمیع خورد و کلاں بخیریت اند و بخدمت شریف سلام می رسانند ــ

ترجمہ مکتوب (۵) ..... الحمد للہ اس وقت تک کہ ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ ہے ــ اس فقیر کے حالات مع صغیر و کبیر لائق شکر و ثنائے حضرت حق ہیں ..... کبھی کبھی اس طرف کے آنے والوں کے ہاتھ اپنے کوائف عافیت اور اذواق و مواجید خاصہ سے مطلع فرماتے رہا کریں ــ شوق ملاقات کا سوال کیا لکھوں کہ احاطۂ تحریر میں نہیں سما

سکتا ۵

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و دانند دل من

اس کے بعد تحریر ہے کہ فقیر بحسب قسمت موضع نوگانواں سادات جو کہ شہر امروہہ کے قریب ہے گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ (سید) غلام انبیا کا لڑکا جس کا نام عاشق علی ہے گھر والوں کی اجازت کے بغیر دو ایک لڑکوں کے ساتھ اس طرف (اودھ) کو چلا گیا ہے اور ایک مدت سے اس کے حال کی کوئی خبر نہیں آئی اس وجہ سے اس کے ماں باپ بہت مضطر ہیں۔ اس کے باپ نے کہا ہے کہ عاشق علی مذکور آپ کی خدمت میں بھی ہو چکا تھا اور چند روز (آپ کے پاس) اقامت کی تھی اس بنا پر انھوں نے (سید غلام انبیا نے) مجھ سے استدعا کی کہ میں ایک خط آپ کو اس کے احوال کے استفسار میں لکھوں اسی وجہ سے میں آپ کے اوقات شریف میں مخل انداز ہوا ہوں۔ اگر وہ سیدزادہ وہاں ہو یا اس کے احوال سے اطلاع ہو تو مفصل و مبسوط تحریر فرمائیں ۔ زیادہ بجز عافیت دعائے خیر کے آپ سے اور کیا التماس کیا جائے والسلام مع الاکرام میر ابو العیش سلام شوق مطالعہ کریں اور میر محمد غفران بھی سلام مطالعہ کریں میاں کمال محمد میاں رحم علی میاں غلام امام اور محمد قاسم کی طرف سے آپ سلام مطالعہ فرمائیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ (اس وقت) صاحبزادگان حضرت شاہ صاحب مع متعلقین خیر و عافیت قصبہ

عہ کتنا دلچسپ انگیز اور کیف آور شعر ہے ۔ یہ اُن اشعار میں سے ہے جن کا ترجمہ کرنا اصل کیفیت کا زائل کرنا اور بے ذوقی کا ثبوت دینا ہے ۔

عہ نوگانواں سادات امروہہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود قدس سرہ کے داماد سید بدر الدین اسحٰق کی اولاد میں یہاں کے اکثر باشندے ہیں مگر ایک دو گھر چھوڑ کر سب شیعہ ہو گئے ہیں۔ اب تقریباً دو سال پیشتر سکاس بستی کے اندر اکیس خانقاہیں تھیں آج ایک کا بھی نشان نہیں ۔

عہ اللہ تعالیٰ نے سید غلام انبیا اور ان کے صاحبزادے عاشق علی اور عاشق علی کی نسل کو اہلسنت و جماعت کے مسلک پر قائم رکھا۔ حاجی سعادت علی بن عاشق علی کا ذکر خیر انوار العارفین اور تذکرۃ الکرام میں بحیثیت ایک اہل دل درویش کامل کے موجود ہے۔ عاشق علی کا سفر حج سے واپسی میں انتقال ہوا تھا۔ (انوار العارفین)

بڑھانہ ضلع مظفر نگر میں تشریف رکھتے ہیں۔ میاں اہل اللہ صاحب اور شاہ نور اللہ صاحب بخیریت ہیں۔ محمد فائق، محمد مقرب اللہ، وحید الزماں، محمد احسان، میاں محمد جواد، حاجی بلال اور تمام خرد و کلاں بخیریت ہیں اور آپ کی خدمت میں سلام پہونچاتے ہیں۔

مکتوب (۶) بنام سید ابو اللیث ملقب بخواجہ ابو العیش صاحبزادہ حضرت شاہ سید ابو سعید حسنی رائے بریلوی

سلالۂ سیادت، خلاصۂ نجابت خواجہ ابو العیش عاشق سعید آ و حمید آ از فقیر محمد عاشق عفی عنہ بعد سلام و ادعیۂ درویشاں مطالعہ نمائید کہ اطوار سعادت آں نقاوۂ سفوت و شوق ملاقات ایں فقیر مسموع گردید ازیں معنی نہایت فرح و سرور بدل رسید حق سبحانہ ملاقات باحسن وجوہ میسر کناد و سعادت مند کونین را بترقیات کمالات صوری و معنوی باقصی الغایات رساناد و از علم و فضل بہرۂ وافی بخشاد و در شریعت و طریقت تقویٰ و طہارت رسوخ کمال کہ موروث خاندان حضرت میر صاحب قدس سرہٗ است کناد و در سیر حقیقت باعلیٰ المراتب فائز گرداناد والسلام علیکم اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔ از فقیر زادہ محمد فائق سلام مشتاقانہ مطالعہ نمائید۔

ترجمہ ــــ سلالۂ سیادت خلاصۂ نجابت ..... فقیر محمد عاشق عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام اور درویشانہ دعاؤں کے مطالعہ کریں۔ تمہاری سعادتمندی کا طور طریق اور اس فقیر سے تمہارا شوق ملاقات سننے میں آیا اس بنا پر دل کو بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ باحسن وجوہ تم سے ملاقات میسر کرائے اور سعادتمند کونین کو (یعنی تمھیں) کمالات صوری و معنوی میں ترقی عطا کر کے انتہائی درجے پر پہونچائے نیز علم و فضل سے بہت کچھ حصہ عنایت کرے اور شریعت و طریقت، تقویٰ و طہارت میں ــ جو کہ حضرت شاہ میر علم اللہ قدس سرہٗ کی میراث ہے۔ کمال نصیب کرے اور سیر حقیقت میں اعلیٰ مرتبے پر فائز فرمائے۔

والسلام اولاً و آخراً ظاہراً و باطناً۔

فقیر زادہ محمد فائق کی طرف سے سلام مشتاقانہ مطالعہ کریں۔

(تصحیح متعلق قسط اول۔ ص ۱۶ سطر ۷ میں لفظ "فاطر" کو "فاتر" بنا لیا جائے۔)

تحقیق کے نئے گوشے

(از :- جناب وحید الدین خاں صاحب)

علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "الغزالی" کے دوسرے حصہ میں "معاد یا حالات بعد الموت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں ــــــــ "مذہب کی روح دو روال جو کچھ کہو، معاد کا اعتقاد ہے۔ مذہب میں جو کچھ تاثیر ہے اور افعال انسانی پر مذہب کا جو اثر پڑتا ہے، وہ اسی اعتقاد کی بدولت ہے۔ لیکن جس قدر وہ مہتم بالشان ہے اسی قدر عسیر التصور ہے۔ ایک بدوی شاعر الحاد کے لہجہ میں کہتا ہے :-

أموتُ ثم بعثُ ثم نشرُ	مزا، پھر زندہ ہونا، پھر چلنا پھرنا!
حدیثُ خرافةٍ یا أمّ عمرو	میری بیگم! یہ تو خرافات کی باتیں ہیں

اس مرحلے میں جو مشکلیں ہیں ان میں پہلا اور سب سے مشکل بقائے روح کا مسئلہ ہے۔ یعنی یہ ثابت کرنا کہ روح جسم سے جدا کوئی چیز ہے۔ مادیین کا خیال ہے کہ روح کوئی جداگانہ چیز نہیں، بلکہ جس طرح دواؤں کی ترکیب دینے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے یا تاروں کی خاص ترکیب سے خاص خاص راگ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح عناصر کی خاص طور پر ترکیب پانے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے جو ادراک اور تصور کا سبب ہوتا ہے اور اسی کا نام روح ہے۔

روح کے ثابت کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کی بقا کا ثابت کرنا ہے۔ یعنی یہ کہ جسم کے فانی ہونے پر وہ باقی رہ سکتی ہے۔" (صفحہ ۱۷۰-۱۷۱)

اس کے بعد مفسرون صغیر اور مفسرون کبیر سے امام غزالی کے خیالات ان مباحث

پر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔ " امام صاحب نے روح کی جو حقیقت بیان کی اور اس پر جو دلائل پیش کئے، یونانیوں سے ماخوذ ہیں۔ ارسطو نے اثولوجیا میں بعینہ یہی تقریر کی ہے۔ اور بوعلی سینا نے اس کو مختلف پیرایوں میں آب و رنگ دے کر ادا کیا ہے، لیکن یہ امر بظاہر تعجب انگیز ہے کہ جو سب سے مقدم امر تھا یعنی روح کا اثبات، امام صاحب نے اسی کو چھوڑ دیا۔ روح کا جوہر ہونا، غیر جسمانی ہونا، یہ فرعی امور ہیں۔ پہلے یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ روح کوئی شے بھی ہے یا نہیں" (صفحہ ۱۷۴)

اس کے بعد اپنی طرف سے لکھتے ہیں ـــــ " اصل یہ ہے کہ روح کا وجود ایک وجدانی امر ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک و تعقل محض مادہ کا کام نہیں۔ مادہ ایک بے حس، بے جان اور لایعقل چیز ہے۔ دقیق خیالات اور علوم و فنون مادہ سے انجام نہیں پا سکتے۔ بلکہ کوئی اور جوہر لطیف ہے جس سے یہ کرشمے سرزد ہوتے ہیں اور اسی کا نام روح ہے، لیکن یہ استدلال وجدانی ہے۔ (بوعلی سینا نے روح کے اثبات پر اشارات میں لمبی چوڑی دلیل پیش کی ہے۔ لیکن وہ یونانیوں کے عام دلائل کی طرح صرف لفظوں کا کھیل ہے) اگر کوئی منکر، انکار پر آمادہ ہو اور کہے کہ ـــــ " تم نے جو کچھ کہا محض دعوے کا اعادہ ہے، دلیل نہیں۔ ممکن ہے مادہ ہی ایک خاص ترکیب یا کران نیرنگیوں کا مظہر ہو۔ کلوں سے جو عجیب و غریب حرکتیں ظاہر ہوتی ہیں، ارغنون سے جو دلکش اور موثر نغمے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں روح کا کون سا شائبہ ہے" تو ہم دلیل سے اس کی زبان بند نہیں کر سکتے۔ یہی سبب تھا کہ امام صاحب نے روح کے ثبوت پر کوئی منطقی دلیل نہیں پیش کی" (صفحہ ۱۷۵)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اس بحث کو یہیں ختم کر دیا ہے اور ایک عالم کی ۱۹۰۱ء کی تصنیف میں شاید اتنا ہی کہا بھی جا سکتا تھا۔ مگر میں اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے واقعات و حقائق کے کچھ ایسے نئے گوشے کھولے ہیں جس کے بعد ایک حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ روح کا جسم سے الگ ایک مستقل وجود ہونا یا جسم کے فنا ہونے کے بعد روح کا باقی رہنا محض وجدانی چیز نہیں رہا۔ بلکہ ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جس کو تجرباتی دلیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

جسم کے بارے میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے خلیوں (CELLS) کا مرکب ہے جن کی تعداد ایک متوسط جسم میں ایک ہزار ارب کے قریب ہوتی ہے۔ یہ خلیے ہر آن ٹوٹ کر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ غذا ہضم ہو کر ہمارے جسم کے لئے وہ خلیے مہیا کرتی ہے جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہر روز درکار ہوتے ہیں۔ گویا جسم نام ہے ایک ایسی عمارت کا جو کھربوں اینٹوں سے مل کر بنا ہو اور ہر آن اپنی اینٹوں کو بدلتا رہتا ہو۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک مظہر ہے تو جس طرح مشین کا ایک پرزہ ٹوٹنے سے پوری مشین متاثر ہو جاتی ہے اور باجے کا ایک تار خراب ہونے سے اس کی آواز پر اثر پڑ جاتا ہے اسی طرح جسم کے مرکبات بدلنے یا ضائع ہونے سے روح میں بھی تبدیلیاں ہونی چاہئیں مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح جسم سے الگ ایک چیز ہے جو بذات خود اپنا وجود رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک سائنسداں نے انسانی ہستی کو اس کے جسم کے مقابلے میں ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے جو مسلسل تغیرات کے اندر غیر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:۔

PERSONALITY IS CHANGELESSNESS IN CHANGE

اس خیال کی مزید تصدیق نفسیات کے اس انکشاف سے ہوتی ہے جس کو تحت شعور یا لاشعور کہا جاتا ہے اور جو انسانی ذہن کا نسبتاً زیادہ بڑا حصہ ہے۔ لاشعور کے بارے میں اب یہ تقریباً مسلمہ طور پر مان لیا گیا ہے کہ جو خیالات اس کے اندر جگہ پاتے ہیں وہ تاحیات بالکل یکساں حالت میں باقی رہتے ہیں۔ فرائڈ اپنے اکتیسویں لکچر میں کہتا ہے:۔

"منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور کے اوپر حاوی نہیں ہوتے مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں ..... لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام دماغی افعال وقت اور خاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں۔ لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو۔ لاشعور میں

وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت کے گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسے خیالات (CONATIVE IMPULSES) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے، بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں۔ اور دسیوں سال تک اس طرح سے محفوظ رہتے ہیں گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں۔"

NEW INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS (LONDON 1949) P. 99

لاشعور کے عمل کا وقت کی گرفت سے آزاد ہونا، ظاہر کرتا ہے کہ لاشعور جسم سے الگ اپنا کوئی وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ جسم کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ وہ وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہے اور انھیں حدود کے اندر اسکے تمام مظاہر واقع ہوتے ہیں۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک ظہور خاص ہوتی تو جسم کی طرح اس کو بھی لازماً وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہونا چاہیئے تھا اور جبکہ تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ روح اپنی نوعیت میں جسم سے مختلف ایک چیز ہے جو اس سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ جسم سے روح کا تعلق مشین اور حرکت یا باجے اور راگ کا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح حرکت اور راگ پر بعینہ وہی قوانین مرتب ہوتے ہیں جو مشین اور باجے پر مترتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح روح پر بھی یقیناً انھیں قوانین کا ترتب ہوتا جو جسم کے اوپر اثر انداز ہوتے ہیں۔

دوسری چیز جس کا میں یہاں حوالہ دینا چاہتا ہوں وہ سائیکیکل تحقیقات (PSYCHICAL RESEARCH) کے نتائج ہیں جو خالص تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر موت کے بعد زندگی کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ اس میں ہمارے نقطۂ نظر سے مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ بقائے محض کو ثابت نہیں کرتے بلکہ عین اس شخصیت کی بقا کو ثابت کرتے ہیں جس سے ہم موت سے پہلے واقف تھے۔

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذات خود تو پہلے سے موجود تھیں مگر ان پر سائنسی انداز سے غور و فکر نہیں ہوا تھا۔ مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے۔ مگر جدید دور میں خواب کے مطالعہ سے جو نفسیاتی حقائق معلوم کئے گئے ہیں، ان سے قدیم دور کے لوگ ناآشنا تھے۔ اسی طرح کچھ اور مظاہر ہیں جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعداد و شمار جمع کیے گئے اور سائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا۔ اس طرح جدید مطالعہ کے ذریعہ ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اسی میں سے ایک سائی کیکل ریسرچ ہے جو جدید نفسیات کی ایک شاخ ہے اور جس کا مقصد انسان کی مافوق العادت صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کے لئے سب سے پہلا ادارہ ۱۸۸۲ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور ۱۸۸۹ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کرکے دنیا بھر پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کر دیں۔ یہ اب بھی مطالعۂ نفسیات کا ادارہ (SOCIETY FOR PSYCHICAL RESEARCH) کے نام سے موجود ہے اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے دوسرے ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پراسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکہ) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آرڈر نوٹ کر رہا تھا کہ "یکایک" وہ لکھتا ہے "مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو صاف طور پر مجھے نظر آیا کہ وہ میری بہن ہے"۔ اس کی یہ بہن نو سال پہلے مر چکی تھی۔ کچھ دیر بعد بہن کا یہ پیکر اس کے سامنے سے غائب ہو گیا۔ مگر اس واقعہ سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کے بجائے وہ دوسری ٹرین سے اپنے وطن سینٹ لوئی (ST. LOUIS) واپس ہو گیا۔ گھر آکر اس نے واقعہ کی پوری تفصیل اپنے اعزہ کو بتائی۔ جب وہ کہتے کہتے اس جگہ پر پہنچا کہ "میں نے بہن کے چہرے کے دائیں طرف سُرخ رنگ کی ایک روشن خراش دیکھی"۔ تو اس کی ماں یکایک کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور اس نے بتایا کہ "لڑکی کی موت کے بعد

ایک اتفاقی سبب سے مجھ سے یہ خراش اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی۔ اس بدنمائی کا مجھے سخت احساس ہوا اور فوراً پاؤڈر لگا کر میں نے خراش کے تمام آثار اس کے چہرے سے مٹا دیئے اور پھر کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

HUMAN PERSONALITY AND ITS SURVIVAL OF BODILY DEATH, BY F.W. H. MYERS, N.Y. 1903, VOL. II, 27-30

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو مرنے کے بعد شخصیتوں کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کو وہم و خیال نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چہرے کی خراش کا علم یا تو ماں کو تھا یا مردہ لڑکی کو۔ تیسرا کوئی بھی شخص اس کو قطعاً نہیں جانتا تھا۔

دوسرے قسم کے واقعات جو زندگی بعد موت کا تجرباتی ثبوت فراہم کرتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جن کو خود کار (AUTOMATISTS) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مرد یا عورتیں ہیں جن سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کسی مرنے والے کی روح اس کے اندر رہتی ہے۔ ایسا شخص اپنے تجربہ کرنے والوں کے سامنے چند ایسے جزئی واقعات پیش کرتا ہے جن کو صرف ایک مرا ہوا آدمی جانتا ہے اور جو چند دن بعد صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح مثلاً دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص سے بات کر رہا ہے اور اسی کے ساتھ ہاتھ میں پنسل لئے ہوئے بالکل دوسرے موضوع پر لکھ رہا ہے جس کے مضمون کی اسے خود بھی اس وقت تک اطلاع نہیں ہوتی جب تک وہ لکھنے کے بعد اسے پڑھ نہ لے۔ گویا اس کے اندر اس کے سوا کوئی اور شخصیت ہے جو اس کے ہاتھ سے لکھوا رہی ہے۔

A PHILOSOPHICAL SCRUTINY OF RELIGION, 407-10

اس استدلال کو قبول کرنے میں بہت سے جدید ذہنوں کو تامل ہے۔ سی۔ ڈی براڈ (C. D. BROAD) لکھتا ہے:-

"سائی کیکل ریسرچ کے مشتبہ استثناء کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں سے کوئی شاخ زندگی بعد موت کا ادنیٰ امکان بھی ثابت نہیں کرتی۔"

RELIGION, PHILOSOPHY AND PSYCHICAL RESEARCH

(LONDON 1953) P.236

مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ "سوچنا" ایک شتیہ فعل ہے۔ کیونکہ انسان کے سوا کوئی ایسا وجود اس کائنات میں ہمارے تجربے میں نہیں آیا جو "سوچنے" کے مظہر کی تصدیق کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ زندگی کا باقی رہنا یا باقی نہ رہنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس لئے نفسیات ہی سے اس کا ثبوت یا عدم ثبوت ملے گا۔ کسی اور سائنس میں اسکی تصدیق ڈھونڈنا ایسا ہی ہے جیسے سوچنے کے فطری مظہر کو سمجھنے کے لئے نباتات اور غلریات سے تصدیق طلب کی جائے۔ یہی نہیں، بلکہ خود انسان کے جسمانی حصے کے مطالعہ کو بھی اسکی تصدیق یا تردید کے لئے بنیاد بنایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ جس چیز کی بقا کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہ موجودہ مادی جسم نہیں، بلکہ وہ روح ہے جو جسم سے ماسوا جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ فلسفۂ نفسیات کے بہت سے علماء جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ براؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر سی، جے، ڈوکاس (C. J. DUCASSE) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اُخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کر کے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں وہ سائیکیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں جن میں صرف بقائے روح کا فرضیہ ——— (SURVIVAL HYPOTHESIS) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے۔ ان کی دوسری کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے

چند کے نام یہ ہیں:-

(ALFRED RUSSEL WALLACE)	الفرڈ رسل ولیس
(SIR WILLIAM CROOKES)	سر ولیم کروکس
(F. W. H. MYERS)	ایف، ڈبلیو، ایچ، میرس
(CESARE LOMBROSO)	کیسر لومبراسو
(CAMILLE FLAMMARION)	کیمل فلیمیرین
(SIR OLIVER LODGE)	سر اولیور لاج
(DR. RICHARD HODGSON)	ڈاکٹر رچرڈ ہاگسن
(MRS. HENRY SIDGWICK)	مسز ہنری سڈوک
(PROFESSOR HYSLOP)	پروفیسر ہسلوپ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کو تجرباتی دلیل (EMPIRICAL PROOF) سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو تو قطع نظر اس سے کہ گھڑ ہٹ کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کر لی ہے، قطعی معلومات بالآخر اسکے بارے میں حاصل ہو سکیں گی مگر ایسی صورت میں اسکی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔"

A PHILOSOPHICAL SCRUTINY OF RELIGION: P 412

یہاں تک پہنچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلق مذہبی عقیدے کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں بات کر لیں۔ اس کے بعد اس کے ایک عزیز کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کر کے ریسور اس کے کان پر لگا دیا جائے۔ مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے ــــ "کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو، ہو سکتا ہے کوئی مشین بول رہی ہو۔"

دربارِ عالمگیری

(از مولانا مصطفےٰ حسن علوی۔ ایم اے پی ایچ ڈی)

(۲)

ملا جیون کی تصانیف یوں تو عام طور پر مشہور معلومات یہی ہیں کہ ملا جیون نے نور الانوار اور تفسیر احمدی یہ دو کتابیں لکھی تھیں لیکن یہ واقعہ کے خلاف ہے، غالباً یہ شہرت اس بنیاد پر ہے کہ نور الانوار مطبوع ہو کے درسِ نظامیہ کے نصاب میں عام طور پر مدارسِ عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور عموماً تذکرہ نویس تفسیر احمدی کا بھی ذکر کر دیتے ہیں لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ آپ کی عمر ابھی ۱۲ سال سے قدرے متجاوز ہی تھی کہ آپ نے اسرار و سلوک میں آدابِ احمدی لکھی عیدین اور جمعہ کے خطبات بکمالِ فصاحت و بلاغت ترتیب دیے۔ اپنے جد امجد شیخ عبید اللہ اور شیخ علیم اللہ کی کتابوں کو ایڈٹ کیا اور ایک رسالہ علم تجوید و قرأت میں لکھا۔ بزرگوں کے حالات میں مناقب لاولیا کے نام سے فارسی میں کتاب لکھی۔ غلبۂ سکر و محبت میں مولانا رومی کے طرز پر ایک مثنوی بھی فارسی میں لکھی جس میں چھ دفتر اور ۲۵ ہزار اشعار تھے۔ حافظ شیرازی کے رنگ [illegible] ہزار اشعار لکھے قصیدہ بردہ کی روش پر تقریباً ۲۲۰ اشعار کا ایک قصیدہ اس کے علاوہ ہے۔ اس پر مستزاد جدہ پہونچتے ہی اس کی شرح بھی عربی میں لکھ ڈالی[1]۔ اور غلبۂ شوق و اشتیاق عربی میں تقریباً ۲۹ قصائد مزید لکھے اور علماء حرمین شریفین سے ان کی داد لی۔ مدینہ کے دورانِ قیام میں ایک رسالہ سوانح پر مجازات لوائح جامی علم تصوف میں بھی ان کے قلم سے نکلا۔

---

[1] سوانح خود نوشت ملا جیون۔ قلمی

علم اصول الفقہ اور نور الانوار (ملا جیونؒ)

آج بالخصوص ہندوستان کے مدارس عربیہ کا کون منتہی اور فاضل ہے جو ملا جیونؒ کے اس شاہکار سے واقف نہیں۔ خاصکر جس نے فقہ حنفی پڑھی اور اس کی درسیات میں یہ موضوع داخل تھا درس نظامیہ کے عنوان سے جو نصاب شائع ذائع ہے اس کا پڑھنے والا کتاب الاصول الشاشی پڑھ کے اصول فقہ سے فی الجملہ روشناس ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نور الانوار میں اسے اجنبیت کا شکوہ نہیں ہوتا نہ اسے غیریت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے مختلف مطابع میں چھپی ہے اور اس کے حواشی صاحب قمر الاقمار مولانا عبد الحلیم کی توضیحات اور تشریحات سے مزین ہیں۔ یہ کتاب ایسی کچھ ہر دلعزیز ہوئی کہ اس کا خلاصہ مولانا رستم علی نخودی نے بنایا اور اس کا اردو میں مولانا عبد الجبار نے ہدایۃ الابصار کے نام سے ترجمہ بھی کر دیا۔ نور الانوار در اصل امام ابو البرکات عبد اللہ ابن احمد حافظ الدین نسفی المتوفی ۷۱۰ھ کی کتاب منار الانوار کی شرح ہے ابو البرکات رحمہ اللہ احناف کے ایک جلیل القدر عالم گزرے ہیں اور جن کی کتاب کے متعلق حاجی خلیفہ کشف الظنون میں یوں رقم طراز ہیں۔

متن متین جامع مختصر نافع و	عبارت ٹھوس اور قوی ہے مختصر ہے
هو فی این کتبه المبسوطة و	جامع ہے اور نفع بخش ابو البرکات کی
مختصرة من المضبوطة اکثرها	مختصر اور مطول تمام کتابوں میں یہ
تداولا واقربها تناولا۔	ہی زائد پڑھی جاتی ہے اور سہل الحصول
لکنه مع صغر حجمه وجازة	بھی ہے۔ ہے تو چھوٹا سا رسالہ اور
نظمه بحر محیط بدر الحقائق[1]	عبارت میں مصنف نے ایجاز سے کام
الخ۔	لیا ہے لیکن حقائق کے موتیوں کا ایک بڑا
	سمندر ہے۔

اس منار الانوار کی ایک شرح خود مصنف نے لکھی اور دوسری ہندوستان کے ایک عالم

---

[1] کشف الظنون حاجی خلیفہ جلد دوم صفحہ ۵۱۹

سعدالدین ابوالفضائل دہلوی المتوفی ۸۹۱ھ نے افاضۃ الانوار فی اضاءۃ اصول المنار کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ سید یوسف جمال ملتانی نے کتاب توجیہ الکلام میں بھی اسی کی شرح کی تھی۔ ملا عبدالسلام دیوی مضافات بارہ بنکی اودھ نے بھی ایک شرح لکھی۔ کتاب نورالانوار کیا ترتیب مضامین کیا قوت استدلال کیا استنباط مسائل کتاب سنت اجماع قیاس وغیرہ کے مباحث ضروریہ سے مالا مال ہے۔ طرز بیان دلکش اور اس کے افہام کے طریقے آسان اور سہل تر ہیں۔ عبارت میں ثقل نہیں کہ پڑھنے والے کو بوجھل ہو جائے سطروں میں غموض نہیں کہ الجھن پیدا کرے ادبیت کا وہ رنگ نہیں کہ طالب علم اسی میں کھو جائے اور کتب لغات اور قاموس کی طرف مراجعت کی اسے ضرورت لاحق ہو۔ ایک متوسط استعداد والا دقیق مباحث اور نکات کو سمجھے نہ سمجھے تاہم ترجمہ سمجھ لے گا۔

ملا صاحب نے یہ کتاب مدرسہ نبوی میں بیٹھ بیٹھ کے لکھی تھی اور تائید ایزدی اور مدد غیبی آپ کے شامل حال تھی کہ اس کی تالیف میں صرف دو ماہ ربیع الاول اور ربیع الثانی ۱۱۱۲ھ صرف ہوئے اور جب عرب اور عجم کے حلقۂ علماء میں پہونچی تو مقبول اور نہایت مقبول ہوئی۔

جہاں تک معلومات کا تعلق اور تحقیق کی رسائی ہے ارباب علم و تحقیق امام شافعیؒ کو اصول فقہ کا موجد اور بادا آدم سمجھتے ہیں اور بقول امام رازی رحمہ اللہ امام شافعی نے ہی سب سے پہلی اینٹ اس عمارت کی رکھی تھی چنانچہ فرماتے ہیں۔

اعلم ان نسبۃ الشافعی الی	علم اصول فقہ کا امام شافعیؒ کے ساتھ
علم الاصول کنسبۃ ارسطا	وہی تعلق ہے جو علم منطق کا ارسطا
طالیس الی علم المنطق وکنسبۃ	طالیس اور علم عروض کا خلیل بن احمد
الخلیل بن احمد الی علم العروض	کے ساتھ۔

یہ واقعہ ہے کہ علم منطق کو ارسطا طالیس کی تنظیمی شکل میں لانے سے پہلے لوگ اپنی اپنی سلامتی طبع کو ہی دلائل اور براہین کے لیے کام میں لاتے۔ لیکن شایان شان ترتیب نہ ہوتی اور نتائج نکالنے اور اخذ کرنے میں اضطراب بے ڈھنگا پن ظاہر رہتا اور جب ارسطا طالیس نے

حدود اور مصطلحات قائم کردیں اور غور و فکر کے بعد قوانین وضع کر دیے تو ان کا تتبع آسان ہوگیا۔ ایسے ہی جیسے کہ شعراء عرب و جاہلیت اشعار لکھتے اور وہ موزوں ہوتے۔ لیکن لاقانونیت کے تحت۔ اور جب خلیل نے تتبع اور استقرا سے علم عروض کے نام سے اوزان شعری کے قوانین وضع کر دیے تو شعراء کی طبائع نے فی الجملہ گویا اسی کی تقلید شروع کر دی۔ اور بالکل اسی طرح فقہاء اسلام استدلال لانے اور مخالف کے سامنے معارضہ کرنے میں اپنی طبائع سلیمہ کو کام میں لاتے جو افہام اور تفہیم کے لیے معاون اور مددگار ہوتیں۔ لیکن اللہ جزائے خیر دے امام شافعیؒ کو کہ انھوں نے غور و فکر تتبع استقرا سے ان امور کو ایک قانونی اور آئینی شکل دے کے مدون کر دیا اور ان قوانین کو شرعی دلائل سمجھنے اور سمجھانے میں معاون اور مساعد بنا دیا۔ عام و خاص ناسخ منسوخ اجماع رائے اجتہاد قیاس کی اصطلاحیں قائم کر کے ان کی جامع اور مانع تعریفیں مدون کر دیں۔ اور ان کے دائرے متعین کر دیے بہرکیف بقول علماء اسلام اصول فقہ سے امام شافعی کو وہی نسبت ہے جو علم عروض کو خلیل اور علم منطق کو ارسطاطالیس سے۔ کہتے ہیں کہ امام شافعی نے اس فن پر ایک رسالہ بغداد کے قیام کے دوران لکھا تھا جو گو مختصر تھا مگر اس میں قواعد و قوانین ضروریہ سب ہی آگئے تھے۔ ان سے ہی متاخرین علماء نے اس میں اضافات کیے۔ جو بھی کیے لیکن ابن ندیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن حسن شیبانی نے بھی ایک رسالہ اسی فن پر لکھا تھا۔ لیکن امام شافعی کا رسالہ اب بھی موجود ہے اور امام محمد کے رسالہ کا کہیں بھی کتب خانوں میں سراغ نہیں ملتا واللہ اعلم۔ کاش یہ رسالہ مل جاتا تو اس کو سامنے رکھ کے علماء اور اہل تنقید و تحقیق کو اس کے مواقع حاصل ہوتے کہ معلوم کر لیں کہ امام شافعی نے اس پر کیا کیا اضافات کیے ان سے کیا کیا استفادے اور کہاں تک ان کی خود طبیعت نے معقول اختراعات کیے اس لیے کہ ان اختراعات کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ مخترعہ قواعد کے تحت ہی قرآن حدیث اجماع اور قیاس سے مسائل شرعیہ کا استنباط آسان تھا۔ اور انھیں اصول کے تحت فروع کی تفریع اور استخراج سہل۔ امام شافعی نے ان اصول اور قواعد کو اپنے رسالہ ہی میں لکھ کے انھیں پر اکتفا نہیں کی بلکہ

اپنی کتاب "کتاب الام" میں بھی موقع موقع سے کچھ مزید فصلیں لکھیں اور نئے قواعد تحریر فرمائے[1]

امام شافعیؒ کی اس فن میں اسبقیت کے متعلق سطور بالا میں روشنی ڈالی جا چکی لیکن امام ابوالہلال عسکری نے لکھا ہے[2] کہ اس فن کا بانی اور موجد واصل ابن عطا ہے۔

وھو اول من قال الحق یعرف	واصل ہی پہلا شخص ہے جس نے یہ
من وجوہ اربعۃ کتاب ناطق	بتایا کہ شرعی احکام کے استنباط کے
وخبر مجتمع علیہ وحجۃ عقل	چار ذرائع ہیں۔ کلام اللہ، حدیث صحیح
واجماع من الامۃ۔	اجتہاد اور اجماع امت۔

لیکن ان بیانات میں تطبیق اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ مشہور فقہاء اسلام میں اس فن کو منصۂ تحریر میں لانے کا سہرا اور ایک خاص تنظیم کا امتیاز امام شافعیؒ کو ہی حاصل ہوا، گو اس سے پہلے بھی اس کی بنیادی الحمایہ قائم ہو چکی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مدتوں امام شافعی نے ابوالہذیل العلاف معتزلی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ طریقہ استنباط و استدلال کے انداز انھیں سے سیکھے تھے اور یہ ابوالہذیل عثمان بن خالد الطویل کے شاگرد تھے اور خالد الطویل واصل بن عطاؒ کے بہرکیف شہرت اسی کو ہے کہ امام شافعی اس کے موجد اور مخترع[3] تھے اور وہ بھی اس شکل موجودہ کے ساتھ اور ان کے بعد علماء انھیں کے نقش قدم پر چلے اور شاید ابوالہذیل وغیرہ کے طرز انشاد کی جھلک اس میں کہیں کہیں پائی بھی جاتی ہو، اس لیے کہ اصول فقہ میں علم کلام کے کچھ انداز بیان ملتے جلتے ہیں۔

علماء اصول فقہ نے اپنی کتابوں میں دو مسلک اختیار کیے تھے۔ ایک متکلمانہ اور دوسرا فقیہانہ۔ متکلمانہ مسلک میں زیادہ تر توجہ قواعد، قوت استدلال اور رفع اعتراضات وغیرہ پر

---

[1] الرازی صفحہ ۱۰۔ و ما بعد و کتاب الشافعی و منبع اصول الفقہ" مصنفہ استاد مصطفےٰ عبدالرزاق [2] کتاب الاوائل (مخطوطہ) ندوۃ العلماء [3] المنیۃ والامل فی شرح کتاب الملل والنحل امام مہدی لدین اللہ مرتضیٰ الیمانی مطبوعہ دکن۔ [4] کشف الظنون جلد اول صد ۱۱۴۔

کی جاتی ہے اور فقیہانہ مسلک میں قواعد کے ساتھ امثلہ اور نظائر بھی پیش کردی جاتی ہیں۔ نیز فقہی نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی مسائل کی تصریح کردیتے ہیں۔ انھیں متکلمانہ انداز میں لکھنے والوں کی دو جماعتیں اور دو علیحدہ علیحدہ گروپ ہوئے ہیں۔ ایک تو معتزلہ اور دوسرے اشاعرہ۔ اور چونکہ بقول شخصے کہ اس فن کی عمارت خشت اول معتزلہ ہی نے رکھی یا داغ بیل انھیں نے ہی ڈالی اس لیے معتزلیوں میں اس کا لٹریچر بھی بہت زائد اور خاصی تعداد میں کتابیں بھی لکھی ہوئی ملتی ہیں چنانچہ حاجی خلیفہ بھی اس حقیقت کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوگیا وہ لکھتا ہے

واکثر التصانیف فی اصول الفقہ لاھل الاعتزال[1]	اصول فقہ پر زیادہ تر کتابیں معتزلیوں نے لکھیں۔

انھیں معتزلیوں کی کتابوں میں دو کتابوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی ایک تو کتاب العہد ہے جو قاضی عبدالجبار معتزلی نے اور دوسری کتاب العہد کی شرح ہے جو ابوالحسن بصری نے لکھی تھی۔ اسی طرح اشاعرہ کی دو کتابیں خاص الخاص اہمیت سے متصف ہیں۔ ایک کا نام کتاب البرہان جو امام الحرمین کی تصنیف ہے اور دوسری امام غزالی کی المستصفیٰ۔ امام رازی نے انھیں چار کتابوں کا ایک خلاصہ بنایا تھا جو کتاب المحصول کے نام سے مشہور ہے پھر ان چار کتابوں یعنی کتاب العہد شرح کتاب العہد کتاب البرہان اور مستصفیٰ الاصول کا بھی سیف الدین آمدی کتاب الاحکام کے نام سے تلخیص تیار کیا تھا اسی کتاب المحصول اور آمدی کی کتاب الاحکام کو سامنے رکھ کے امام بیضاوی نے منہاج الاصول ایک کتاب تیار کی۔

علماء احناف میں سے امام ابوزید دبوسی نے تقویم الادلہ اور اس کے کچھ زمانہ بعد امام فخر الاسلام بزدوی نے کشف الاسرار یہ دو کتابیں اصول فقہ میں لکھیں۔

(باقی)

---

[1] کشف الظنون جلد اول صـ۱۱۴

مجاہد کبیر مولانا محمد یوسفؒ

از مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف (مدیر المنبر لائل پور)

آج سے شاید ۳/۴ سال قبل کا ذکر ہے۔ محترمی مختار احمد صاحب انجینیر شیلی خان، لائلپور میں تھے، ایک رات ان کا فون آیا کہ صبح لاہور کا پروگرام ہے، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی تقریر نماز فجر کے بعد ہوگی۔ ہم تین بجے (سحری کے وقت) یہاں سے روانہ ہوں گے اگر آپ ہمارے ساتھ چلیں تو آپ کو گھر سے لیتے جائیں، ہم حسب پروگرام لائلپور سے چلے فجر کی نماز غالباً "بھکی" میں ادا کی، بلال پارک پہونچے تو مولانا کا خطاب ہو رہا تھا حسب معمول مولانا پورے جوش سے خطاب فرما رہے تھے۔ دنیا کی حقیقت کو بے نقاب کرنے اور آخرت کی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے بے پناہ دلائل دیے چلے جا رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک لاوا ہے جو پورے جوش و خروش کے ساتھ پھوٹ رہا ہے۔ اور ماحول کو گرمائے بلکہ پگھلائے جا رہا ہے۔ ۸ بجے خطاب ختم ہوا، حسب حکم مولانا مفتی زین العابدین صاحب کی عنایت خاص سے ناشتہ کرنے کے بہانے حضرت مرحوم مغفور کی معیت کا شرف حاصل ہوا اور قریب سے یہ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا کہ شرق و غرب میں پھیلنے والی اس دعوت کا داعی کس انداز سے سوچتا ہے۔ اسے اپنی دعوت سے کس قدر لگاؤ ہے اور اس کی اپنی ذات پر یہ اجتماعی جدوجہد کس قدر غالب ہے۔

اللہ اللہ! انہماک محیر العقول تھا، اور اللہ کے اس بندے کا دل صحیح معنوں میں اس بات کے لیے تڑپ رہا تھا کہ جو شخص بھی انھیں مل جائے وہ اس کے دل و دماغ

کو دستک دیں، موثر سے موثر انداز میں اپنی دعوت اس کے سامنے رکھیں اور مدلل ترین طریق سے اسے یہ سمجھائیں کہ اسلام کا وہی مفہوم و معنی اور وہی ماحول عنداللہ مقبول اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے جو سید الکونین باباً سنا ہوا اتنا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت میں لوگوں نے سنا اور دیکھا تھا۔

مولانا محمد یوسف نور اللہ مرقدہ نے، باشتہ کے دسترخوان پر بیٹھتے ہی گفتگو شروع فرمادی اور اس انداز سے فرمانے لگے کہ کوئی شخص ان کی گفتگو کے زور، استدلال کی ندرت اور مطالب کی آمد کا مشاہدہ کرکے یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہیں جو ابھی تین گھنٹے کے زوردار خطاب سے فارغ ہوئے ہیں ——— یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک تازہ دم خطیب ہیں، ایک ایسے واقعی مصروف گفتگو ہوئے ہیں تاریخ کے صفحات جن کے سامنے کھلے پڑے ہیں اور وہ ایک ایک واقعہ سے عہد رسالتؐ کی تصویر کشی اس انداز سے کر رہے ہیں کہ سننے والے کا دماغ ہی نہیں دل بھی یقین کر رہا ہے کہ آپ درست فرما رہے ہیں۔

اس یادگار صحبت میں مولانا علیہ الرحمۃ اس عنوان پر گفتگو فرما رہے تھے کہ بعض لوگ اپنے موجودہ ماحول میں رہتے ہوئے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اسلام فلاں مشکل کو کیسے حل کرتا ہے اور فلاں پیچیدگی کو کس طرح دور کرتا ہے۔ مثلاً یہ پوچھا جاتا ہے کہ عہد حاضر کی معاشی مشکلات کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟

مولانا نے فرمایا:-

"جب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو جن چند افراد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ایمان کو قبول کیا۔ حضورؐ نے ان کے معاشی مسئلے کے بارے میں جو رد یہ اختیار فرمایا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے سب سے پہلی بات، توبہ فرمائی کہ تم جتنے اوقات معاش کے لیے وقف کیے ہوئے ہو، ان کا بیشتر حصہ اسلام کے لیے فارغ کردو، دوسرا ارشاد یہ ہوا کہ فلاں ذریعہ کو ترک کردو، یہ ناجائز ہے فلاں معیشت سے دستکش ہو جاؤ، یہ تمہارے رب کو ناپسند ہے ——— معیشت پر ان دو حملوں کے بعد تیسرا وار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیا کہ جو کچھ تم کماتے

ہو۔ یہ صرف تمہارا حق ہی نہیں ہے اس میں تمہارے ان بھائیوں کا بھی حق ہے جو وسائل معیشت سے تہی دامن ہیں اور جو تھی بات آپ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جو کچھ تم کماؤ، اس میں سے بہت سا دین کی خدمت، خدا کے لیے کلمۃ الحق کی سربلندی اور بنی نوع انسان تک اپنی دعوت کو پہونچانے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے میں صرف کرو ——— گویا حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یہ کہ صحابہؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے جو کچھ کماتے تھے اس کا دائرہ محدود کیا، جتنے اوقات کمانے پر صرف کرتے تھے ان کی مقدار کم کر کے ان اوقات کو دین کے لیے وقف فرمانے کا حکم دیا، جو کچھ کماتے تھے اس میں دوسروں کا حصہ مقرر فرما دیا اور اس کے بعد بھی جو بچا اس کے بارے میں بھی یہ حکم دیا کہ اس کا ایک حصہ اسلام پر خرچ کرو ——— یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس زندگی کے مسائل و مشکلات حل کرنے کا۔"

راقم مولانا ممدوح کی یہ گفتگو سن رہا تھا اور محوِ حیرت تھا کہ یہ معاشی فلسفہ ہے کس کتاب میں؟ اور پھر خود ہی اپنے آپ کو جواب دیا کہ بلاشبہ قرآن، سنت اور تاریخ عہد نبوت تو اس فلسفہ معیشت کو پیش کرتے ہیں۔ البتہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

اس کے ساتھ جس بات کا گہرا اثر راقم الحروف نے اس مجلس میں لیا وہ یہ تھی کہ مولانا محمد یوسف تغمدہ اللہ برحمتہ تین گھنٹے کے خطاب کے بعد اس کمرے میں (آہ! یہ وہ کمرہ تھا، جہاں آپ نے اس حیات ناپائیدار کے آخری لمحات گزارے) تشریف تو لائے تھے ناشتے کے لیے مگر آپ اپنی دعوت کے ایک پہلو کی وضاحت میں اس قدر مستغرق تھے کہ نہ صرف یہ کہ انھیں ناشتے کی جانب کوئی توجہ نہیں تھی بلکہ ہوا یہ کہ ایک رفیق نے چائے کی پیالی پیش کی تو آپ نے پکڑ لی۔ دس پندرہ منٹ تک، وہ یونہی پیالی ہاتھ میں پکڑے رہے اور پھر ایک شریک مجلس کے توجہ دلانے پر آپ نے وہ چائے جو اب پانی کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی، حلق میں انڈیل لی۔ دوسری پیالی یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ حضرت یہ گرم ہے، پی لیجیے اور یہ بسکٹ بھی تناول فرمائیے تو اللہ کے اس بندے نے اس پیالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا، گفتگو میں مستغرق رہے اور ۱۰۔ ۱۵ منٹ بعد اسے

بھی پانی کی طرح پی لیا۔

اس کے بعد اٹھے، اور ایک دوسرے اجتماع میں تقریر کے لیے تشریف لے گئے، اور یہ پہلے سے معلوم تھا کہ دوپہر سے قبل ایک تیسرا خطاب بھی آپ کو فرمانا ہے۔

یہ مجاہدہ ـــــ ٹھیک عملی شہادت تھی۔ اس تصور مجاہدہ کی جو حضرت مرحوم مغفور اپنی تقریروں میں پیش فرمایا کرتے تھے ـــــ گویا قول و عمل دونوں میں وہ صادق بھی تھے اور یکساں بھی (رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً)۔

مولانا علیہ الرحمۃ سے ملاقات اور بالمشافہ آپ کے خطابات سننے سے پہلے راقم اس سوءِ فہمی کا شکار تھا کہ تبلیغی جماعت کے اکابرین کا فکر صرف ان ہی چھ باتوں، یا چھ اصولوں تک ہی محدود ہے جو حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ نے پیش فرمائے تھے ـــــ

ـــــ اسی طرح یہ پریشانی بھی اس کو لاحق تھی کہ تبلیغی جماعت تو اپنے کام اور افراد کی تعداد کے اعتبار سے بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کے ذمہ دار حضرات اس جماعت کی ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کا کوئی مداوا نہیں کر رہے ـــــ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خیال تھا کہ وہ ان کمزوریوں کو محسوس ہی نہیں کر رہے ـــــ جو اس قسم کی بڑھنے اور پھیلنے والی جماعتوں میں ہمیشہ پیدا ہوا کرتی ہیں اور جماعتیں ان ہی اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے ہی ختم ہو جایا کرتی ہیں ـــــ اس پریشانی کو بیک وقت دو چیزوں نے بڑی حد تک کم کیا۔ ایک تو محب مکرم مولانا مفتی زین العابدین صاحب کی شخصیت اور اس عنوان پر ان کے احساسات نے اور دوسرا سہارا اس پریشانی کو مغلوب کرنے کے لیے میسر آیا۔ مولانا محمد یوسف (برد اللہ مضجعہ) کی چند مختصر مجلسوں اور چند مفصل خطابات کے [illegible] مولانا علیہ الرحمۃ ان تمام نفسیاتی امراض سے کما حقہ آگاہ تھے جو تبلیغی جماعت کی طرح پھیلنے والی جماعتوں اور داعی و مبلغ کی حیثیت سے دوسروں کو نصیحت اور تبلیغ کرنے والے افراد میں پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ میں نے دیکھا کہ مولانا رائے ونڈ کے اجتماعات میں نفسیت سے، دنیا کی محبت، شہرت کی ہوس، دین کے نام پر کام کرنے والوں کی طمع و حرص اور آپس میں مسابقت منافست اور بالآخر مشاجرت و نفاق اور اسی طرح نمازوں کا اہتمام

کرنے والوں میں، غرور نفس، بے جا زعم، اپنے کام پر فخر اور اسی قسم کے دوسرے عنوانات بڑی وضاحت سے بیان فرماتے، بڑے موثر اور مدلل انداز میں فرماتے اور حق یہ ہے کہ ایک ایسے قائد کی حیثیت سے فرماتے جو ایک جانب تو کام کی توسیع کے لیے اپنی تو انائیوں کو دادوں پر لگانے کا فیصلہ کر چکا ہو اور دوسری طرف وہ اس غم سے پگھلا جا رہا ہو کہ جو قافلہ وہ تیار کر رہا ہے کہیں وہ ان بیماریوں کا شکار نہ ہو جائے، جو اس سے پہلے اس قسم کے قافلوں کو ناکام و نامراد بنانے کا باعث بن چکی ہے۔

اللہ کی راہ میں بے پناہ محنت، اپنی دنیا سے یکسر غافل ہو کر، ہر وقت دین کا فکر اور امت کی بہی خواہی کا کرب رکھنے والا یہ انسان، اس دنیا میں بلاشبہ اللہ کی ایک حجت تھا اور اللہ رب العزت حقیقی نے اپنے اس بندے کو بیک وقت، قول، عمل، قلبی نور، ایمان و یقین اور جہاد و اجتہاد ہر قسم کی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ وہ سفر و حضر میں یکساں رہتا تھا، نوافل، ذکر، دعا، خطاب، گفتگو، غرض ہر کام میں وہ دوسروں پر فائق رہتا تھا اور بیسیوں اہل علم و اصحاب رشد گواہ ہیں کہ جس غیرت و جوش ایمانی سے ہزاروں انسانوں کو اپنے رب کی جانب، دین کی عظمت رفتہ کو واپس لانے اور امت کی اصلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کرنے کی دعوت دیتا تھا، وہ جب خلوت میں اپنے رب سے مناجات کرتا اور جب اسے اپنے رب کے گھر میں حاضری کا موقع ملتا، تو وہ غلاف کعبہ کو ہاتھ میں تھامے، بچوں کی طرح بلبلاتا، روتا، "یارب البیت یارب البیت" کہہ کر ڈھاڑیں مار مار کر روتا اور کفر کے باہمی ٹکراؤ، اسلام کی سربلندی اور خاتم النبیین صلی اللہ وسلم کی امت کی ہدایت و رفعت کی دعائیں اس انداز سے کرتا کہ سننے دیکھنے والوں کو اس کی آہ و زاری پر ترس آنے لگتا۔

آہ! ہم اس عظیم المرتبت، داعی اور رفیع المنزلت مجاہد سے اس کی معرفت بھری تقریروں سے اور اس آہ سحر گاہی اور بیت اللہ کے دروازے پر رو رو کر اس کے دعا کرنے کی برکت و رحمت سے محروم ہو گئے، یقیناً آج مولانا محمد یوسف علیہ الرحمۃ کی والدہ ماجدہ مستحق ہیں کہ ملت کے کروڑوں افراد ان سے اظہار ہمدردی کریں کہ اس

پیرانہ سالی میں انھیں یہ عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ آج حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نفعنا اللہ بطول حیاتہ۔ لائق تعزیت ہیں کہ ان کا قابل فخر داماد اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور آپ کو ضعیفی کے عالم میں ان کی جدائیگی کا زخم سہنا پڑا۔ آج مولانا محمد ہارون بلاشبہ مستحق ہیں کہ ان کے بلند مرتبہ باپ کی رحلت پر ان سے تعزیت کی جائے لیکن حق یہ بھی ہے کہ آج ہر وہ شخص ان تینوں شخصیتوں کی طرح تعزیت کا مستحق ہے جس نے مرحوم کو پہچانا، ان سے محض اللہ کے لیے تگاؤ پیدا ہوا اور اس دور زوال میں اس نے مرحوم و مغفور مولانا محمد یوسف کو اسلام کی خدمت کے لیے قابل اعتماد پایا۔

مولانا کی رحلت اگر صدمہ ہے تو سب مسلمانوں کے لیے اگر نقصان ہے تو پوری امت کا۔ اللھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔ (فقیر ابن الفقیر الکھنوی)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶)

کیا جائے۔ (مغربی بنگال)

۴۔ انگریزی اور ہندی دونوں کو سرکاری زبان بنایا جائے (وزیر اعلیٰ مدراس)

۵۔ ہندوستان کی کوئی بھی زبان ہو مگر انگریزی کو ختم کیا جائے (ڈاکٹر رام منوہر لوہیا)

۶۔ مشترکہ زبان کا درجہ صرف انگریزی کو دیا جائے اور دستور کے سترھویں حصہ کو ختم کیا جائے (راجہ جی)

۷۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان سنسکرت تسلیم کی جائے اور جب تک سنسکرت انگریزی کی جگہ لینے کے قابل ہو انگریزی کو سرکاری زبان رکھا جائے اور اس غرض کے لیے دستور میں تبدیلی کی جائے۔ (اکھل بھارتیہ سنسکرت بھاشا سمیلن کلکتہ)

مرکزی حکومت نے تامل ناڈ کے مظاہرین کو یقین دلایا ہے کہ پنڈت نہرو کی اس یقین دہانی کو لسانی ایکٹ میں ترمیم کر کے قانونی شکل دے دی جائے گی جب تک غیر ہندی علاقوں کے لوگ چاہیں گے اس وقت تک سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندی کے ساتھ انگریزی باقی رہے گی۔ لسانی ایکٹ میں ترمیم کا مسودہ ابھی تک عام نہیں کیا گیا ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اسی لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ مجوزہ ترمیم کا مسئلہ کا حل ثابت ہو سکے گی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی مستقل حل نہیں ہے بلکہ عارضی ہے۔ (باقی)

"اللہ والوں کا اجتماع"

آنکھوں دیکھا حال

از جناب _____ محمد اسلم صاحب

[مندرجہ بالا عنوان کے ساتھ ذیل کا یہ مضمون جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی وفات سے صرف ایک ہفتہ پیشتر کے ایک ایسے تبلیغی اجتماع کے مشاہدات و تاثرات پر مشتمل ہے جس میں حضرت مرحوم نے خطابات فرمائے۔ معاصر شہاب لاہور کے شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے _____ ادارہ]

کافی دنوں سے شہر کی اکثر مساجد میں یہ دیکھنے میں آتا رہا کہ عصر یا مغرب کی نماز کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوتے اور بڑی نرمی سے یوں گویا ہوتے۔

"بھائیو! دعا کے بعد تشریف رکھئے دین کی بات ہوگی"

کہنے والے کی اتنی سی بات میں جو سادگی اور خلوص ہوتا، وہ سب کو مجبور کر دیتا کہ سن کے جائیں۔ اس کے بعد امام صاحب دعا کرتے اور پھر انہی کہنے والوں میں سے کوئی ایک اللہ کا بندہ کھڑا ہو جاتا اور بغیر کسی تصنع کے ۱۰-۱۵ منٹ نہایت سادہ الفاظ میں کچھ بیان کرتا جس کا خلاصہ یہ ہوتا کہ اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، اس طرح کے کام کریں کہ حشر کے میدان میں رسوائی سے بچ جائیں۔ بات واقعی دل کو لگتی اور جی چاہتا کہ یہ اس طرح بولتا رہے تاکہ سنتے سنتے شاید اس دنیا کی بے ثباتی کا یقین آجائے۔ آخر میں یہ کہا جاتا کہ اس مہینہ کی ۲۱، ۲۲، ۲۳ کو لاہور کے قریب رائیونڈ میں ایک اجتماع ہو رہا ہے جس میں آخرت

کی زندگی کے بارے میں باتیں ہوں گی۔ آخر ۲۰ تاریخ بھی آن پہونچی، شوق ابھرا کہ چلو دیکھیں آخرت کی زندگی کے کیا نقشے بنائے جاتے ہیں۔ کچھ دوستوں کو آمادہ کیا، شام کو چلتے وقت کچھ بزرگوں سے تذکرہ کیا انھوں نے بروقت ہی اطلاع دینے کا گلہ کیا۔ ندامت ہوئی کہ اس دنیا کے جھمیلوں میں لگے رہے اور پہلے سے کیوں نہ حاضر ہو سکے۔

رات ۱۰ بجے اسٹیشن پہنچے، ٹکٹ خریدنے لگے دیکھا کہ ہزاروں لوگ کھڑے ٹکٹ لے رہے ہیں۔ اپنی باری آئی ۱۳ آنے نکال کر "بابو" کو دیئے۔ ٹکٹ دیکھا ۹ پیسے کا تھا۔ حساب سے دو پیسے واپس ملنے چاہئیں تھے۔ شاید ان دو پیسوں کی کوئی حیثیت نہ جانتے ہوئے واپس کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ ارد گرد کے لوگوں سے پوچھا سبھی سے ۱۳ آنے (۸۱ پیسے) لیے جا رہے تھے۔ اندازہ لگائیے صرف ان دو تین دنوں میں کیا کچھ جمع ہوا ہوگا۔ اور آخر کیوں نہ ہو ریلوے کے محکمے کو ۹ پیسے دینے کے بعد ان "خدمت" کرنے والوں کو بھی تو دو پیسے بچ جانے چاہئیں۔

کراچی ایکسپریس ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ پر چلی، کوئی ٹوٹہ ایسا نہ تھا جو اندر اور باہر بھرا نہ ہو۔ بڑے اطمینان سے سفر گزرا، کوئی تو تکار نہ ہوئی، کوئی دھکم پیل نہ ہوئی۔ دوسرے کے لیے جگہ خالی کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ سوا گیارہ بجے رائے ونڈ اسٹیشن پر اترے گئے کوئی تین فرلانگ پر اجتماع گاہ تھی، سادہ سی مسجد، باہر صحن میں شامیانے تنے ہوئے اور قنات گھرنے کو جگہ نہیں۔ ایک طرف بیسیوں لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں، دوسری طرف تین چار بسیں، معلوم ہوا کہ بیلی کالج اور چیف کالج کے طالب علم اکٹھے ہو کر بسوں میں آئے ہیں۔ مسجد کے فرش پر، جو جس کے پاس تھا بچھایا گیا اور چند گھنٹے آرام کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

---

۲۱ کی صبح نماز فجر کے بعد دہلی سے تشریف لائے ہوئے مولانا محمد یوسف صاحب کا (جو اس جماعت کے امیر ہیں اور مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے بھی) خطاب ہوا۔ تین گھنٹے تک لوگ ہمہ تن بیٹھے سنتے رہے۔ باتوں میں وزن تھا حقیقت تھی، خلوص تھا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول کی باتوں میں یہ سب کچھ کیوں نہ ہوتا۔ مولانا نے فرمایا۔

"بھائیو! انسان اس دُنیا میں دو چیزوں پر محنت کرتا ہے ایک اس دنیا کی چیزوں پر دوسرے اپنی ذات پر، اس دُنیا کی چیزوں پر ـــــ مثلاً مکان، دوکان، زمین، تجارت، کارخانے، ملازمت، غرضیکہ جس چیز پر بھی محنت کی جائے گی پورا دھیان اس طرف ہوگا۔ دل انہی چیزوں میں اٹکا رہے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنی ذات کی تکمیل رہ جائے گی۔ مرنے پر ان چیزوں پر کی گئی محنت ساری کی ساری دھری رہ جائے گی اور انسان اس دُنیا سے بالکل خالی جائے گا اور جب حشر کے میدان میں اپنی ذات پر محنت کرنے والوں کو دیکھے گا تو اپنے آپ پر روئے گا، اتنا روئے گا کہ آنسوؤں کے دریا بہہ نکلیں گے۔"

پھر فرمایا:۔

"اپنی ذات پر محنت کرنے (یعنی اپنی زبان پر محنت، اپنے کانوں پر محنت، اپنی آنکھوں پر محنت، اپنے دل پر محنت، غرض ہر حصۂ جسم پر محنت کرنے سے) اس درجہ تک پہونچ جائے گا کہ صرف پلک جھپکنے سے اس پوری کائنات سے کروڑوں درجے زیادہ قیمتی جنت عطا کی جائے گی۔ آپ جا رہے ہیں سامنے سے غیر محرم عورت پر نگاہ پڑی، رہا نے کہا بس اب اگر آنکھ اٹھائی تو برباد ہو جاؤ گے [illegible] وہ کچھ عطا فرمائیں گے تصور ناممکن، ان عطا کی جانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اگر اس دُنیا میں آجائے تو پوری دُنیا حاصل کرنے کے لیے لڑ مرے۔"

باتیں دل میں اُترتی چلی گئیں، اپنے آپ ندامت ہوئی کہ زندگی یوں ہی گزر گئی جس طرح اب تک گزری تو کیا ہوگا؟ آٹھ سے دس ہزار کا مجمع، جس طرف نظر اٹھی انسان ہی نظر آئے وہ انسان جو محض اللہ کی خاطر اتنی دور دراز سے سفر کر کے صعوبتیں جھیل کر اس ویرانے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔

مولانا نے فرمایا:۔

"محض اللہ کی خاطر یوں جمع ہونے والوں پر اللہ کے فرشتے آسمان سے زمین تک حلقہ بناتے اور سلامی بھیجتے ہیں، اللہ کرے آج دنیا میں صرف اللہ ہی کی خاطر لوگ جمع ہوا کریں تاکہ اللہ کی رحمتیں اس زمین پر اتریں اور انسان سکون قلب سے ہمکنار ہوں۔"

اس مجمع میں امیر بھی تھے، غریب بھی، چھوٹے بھی تھے، بڑے بھی، بچے بھی تھے، بوڑھے بھی، پنجابی بھی تھے، سندھی بھی، سرحدی بھی تھے بنگالی بھی، عرب سے آئے ہوئے بھی تھے، ہندوستان سے بھی، ملوں ڈلے بھی تھے اور خوانچہ فروش بھی، دینی مدارس کے طلبا بھی تھے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے محض خدا کی خوشنودی کی خاطر جمع ہو گئے تھے۔ جس کو مسجد میں جگہ نہ مل سکی وہ باہر ہی بیٹھ گئے، خواہ امیر تھا یا غریب۔ کوئی نمائش گاہ نہ تھی۔ کوئی تین تین چار چار رنگے بڑے بڑے پوسٹر نہ تھے کوئی پچھلی کارگزاریوں کے بیان نہ ہوئے بس ایک ہی تڑپ تھی کہ ہم سدھر جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کو اپنی ذات کی کوتاہیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کا احساس تھا۔ دوپہر کو الگ الگ حلقوں میں بٹ کر تعلیم ہوئی۔ سنا گیا کہ نماز کیا ہے، دعا کیا ہے، نمازیں پڑھنے سے کیا ملے گا اور جن لوگوں نے یوں پڑھی انھوں نے کیا پایا۔ دعاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ جس طرح دعا مانگنے کا حق ہے اس طرح مانگی جائے تو کیا ملتا ہے۔ اور اس طرح جنھوں نے مانگی کیا پایا۔ پچھلوں کے تذکرے تھے۔ دولت والوں کا تذکرہ آیا تو قارون و ہامان کی دولتوں کے نقشے بتائے گئے، غربت کا ذکر ہوا تو صحابۂ کرام کی زندگیوں کے واقعات بتائے گئے۔

فاقوں کا ذکر چھڑا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بتلائی گئی۔ خدا کو خوش کرنے والوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ معلوم ہوا۔ دو گھنٹے کی تعلیم کے بعد کھانے اور نماز کا وقت ہوا۔ ایک طرف کھانے کا انتظام کیا گیا تھا دوکان داروں نے دوکانیں بھی لگائی ہوئی تھیں۔ جس کا جہاں جی چاہا کھا لیا۔ اجتماع والوں کی طرف سے کھانے کا کوئی پیسہ نہ لیا جاتا۔ عصر کے بعد لائل پور کے مفتی زین العابدین صاحب کا بیان ہوا۔ تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سمجھا دیا گیا۔ خدا نے بولنے کا خوب ملکہ دیا ہے سن کر وجدانی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ بتایا گیا کہ

"انسان جب اپنے آپ سے محنت کرتے کرتے اس درجہ پر پہونچتا ہے جس پر اللہ راضی ہو کر اس کے صرف ہاتھ اٹھنے پر ہی فیصلے فرما دیتے ہیں تو دنیا میں کیا ہوتا ہے دنیا کس طرح اسکے پیچھے آتی ہے۔ آج ہم لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں اور وہ ہے کہ ہاتھ ہی نہیں آتی"۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے واقعات سنائے گئے اور کچھ اس انداز سے کہ ایمان تازہ ہوگیا۔ بتایا گیا کہ

"انسان جب بستر پر ہے تو اس ڈر سے کہ اس کے مرنے کے بعد کہیں فرشتے اسے غسل اور دفن نہ کرنے لگ جائیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عجلت سے غسل دیتے اور جلدی جنازہ لے جاتے ہیں۔ اللہ کے پاک رسول جنازہ کے ساتھ پنجوں کے بل چلتے ہیں اور پوچھنے پر فرمایا جاتا ہے کہ اتنے فرشتے آسمان پر سے اتر کر ساتھ ہولیے ہیں کہ پورا پاؤں رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

مغرب کے بعد عرب سے آئے ہوئے اللہ کے ایک بندے کا بیان شروع ہوا، زبان عربی تھی لہجہ انتہائی خوبصورت، جی چاہتا اللہ اور اس کے پیارے رسول کی زبان بولتا رہے۔ مترجم صاحب ساتھ بیٹھ گئے پون گھنٹہ دین کے مختلف پہلوؤں پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالتے رہے، عدل و انصاف، معاشرت و معیشت اور دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلام کی دعوت کے پھیلاؤ پر معلوماتی تقریر کی۔

رات کے خطاب میں مولانا محمد یوسف صاحب کا بیان ہوا۔ لاہور اور قریب ہر شہر کے مختلف حلقۂ فکر کے علمائے کرام موجود تھے۔ مولانا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔ کھانسی اور نزلہ کا زور رہا لیکن دین کی محبت کچھ اس طرح غالب ہے کہ کسی چیز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسلسل بولتے ہیں۔ عام اجتماع ہو یا خاص، شہری حضرات کے اجتماع میں بولنا ہو یا میواتی حضرات میں، اس بولنے اور پوری قوت سے بولنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی، بتایا جا رہا ہے کہ

"نمرود کی خدائی پوری قوت سے اس کوشش میں لگی رہی کہ آج کی رات کسی بچے کے وجود کی بنیاد نہ پڑنے پائے، تمام ملک کے مرد الگ اور عورتیں الگ کر دی گئیں۔ پہرے دار بٹھا دیے گئے۔ لیکن ہوا کیا۔ خدا کے حکم کے بموجب جو کام ہونا تھا ہو کے رہا۔ دشمن کے گھر ابراہیم علیہ السلام پل رہے ہیں۔ تو خدا جب کرنے پر آتا ہے دنیا کی کوئی طاقت کچھ نہیں کر سکتی۔"

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات بتائے جاتے رہے۔ ایک طرف اس دنیا

اور اس کے اندر کی تمام چیزوں کی بے بسی، دوسری طرف خدائے بزرگ و برتر کی عظمت، دل میں یہ سب کچھ یوں نقش ہوتا رہا جیسے ہونے کا حق ہے۔ زبان کیوں نہ ہو کہنے والا پورے یقین سے کہہ رہا ہے، زبان کے ساتھ دل کی گہرائیوں کی آواز شامل ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ

"اگر کوئی فاسق اور جھوٹا شخص تمہارے پاس اس قسم کی خبر لائے کہ کوئی گروہ یا فرد تمہارے مال اور جان کے بارے میں برے ارادے کر رہے ہیں تو اس امر کے باوجود کہ اس کا جھوٹا ہونا تمہارے نزدیک مسلم ہے تم اپنے مال اور جان کی فکر میں لگو گے۔ لیکن جس اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا یہ ایمان ہے کہ سچے نبی ہیں، اگر اس ایمان میں کچھ بھی کمی ہے تو ہم مسلمان ہی نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اے لوگو! اس دنیا کی حقیقت کچھ نہیں اللہ کے نزدیک اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں، مردہ بکری کے بچے کے برابر بھی نہیں، جو کچھ بھی ہے آخرت کی زندگی ہے۔ اس کے لیے کچھ کرلو ورنہ اس نہ ختم ہونے والی زندگی میں تڑپو گے لیکن یہ سن کر ہمیں یقین نہیں آتا۔ کیوں؟ اس دنیا کے مال و اولاد ہمارے مشاہدے میں ہیں اور آخرت کی زندگی غیب میں۔ بس اسی کا نام ایمان بالغیب ہے۔ جب دیکھ لیا تو غیب کہاں رہا۔"

"رات گیارہ بجے تک یوں ہی دین و ایمان کی باتیں ہوتی رہیں، نماز پڑھی گئی، ایک ہی صف میں ہر درجے، ہر زبان، ہر عمر اور مختلف رنگ و نسل کے دینی بھائی اللہ کے حضور میں یوں کھڑے ہوئے جیسے ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ چاروں طرف ایک سناٹا۔ امام صاحب ان سب کی طرف سے اللہ کے حضور عرض گزار رہے ہیں۔ بارہ بجے کچھ آرام کی فکر میں لگ گئے کچھ اللہ سے باتیں کرنے میں، ۴ بجے آنکھ کھلی، آگے پیچھے دائیں بائیں، بہتوں کو کھڑے پایا۔ اللہ اکبر۔ کیا سرور ہے اس کھڑے ہونے میں۔

۲۲ کی صبح نماز کے بعد پھر تقریر ہوئی، دوپہر کو تعلیمی حلقے بنائے گئے، عصر کے بعد ہندوستان سے آئے ہوئے علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور پھر علم دین سے پورے واقف مولوی محمد عمر صاحب کی تقریر ہوئی۔ خوب سلیقے سے بیان فرماتے ہیں۔ تھوڑے سے وقت میں ہر انداز کا خوب مواد ذہنوں میں لیا، زبان اللہ کی عظمت کے ترانے خود بخود گانے لگی۔

غرض اس طرح یہ تین دن کا روح پرور اجتماع چلتا رہا۔ احساس دلایا جاتا رہا کہ سب بگاڑ اپنی ذات میں ہے اگر یہ درست ہو جائے تو سب درست ہو جائے گا۔

آخری روز اللہ کے راستے میں اپنی ذات پر محنت کرنے کے لیے جن لوگوں نے وقت دیئے اُن کی تشکیل جماعتوں کی شکل میں ہوئی۔ ہر جماعت میں سے بارہ تک اللہ کے بندے جمع کر دیئے گئے۔ سو کے قریب جماعتیں بن گئیں جن کو ملک کے کونے کونے میں بھیجا گیا۔ تاکہ ان فانی چیزوں سے کچھ دیر کے لیے کٹ کر آدمی اپنی ذات پر محنت کر سکے۔ ہر جماعت کا ایک امیر مقرر کر دیا گیا۔ اپنے اپنے بستر، اپنا اپنا خرچ اور اپنی اپنی ذات پر محنت کرنے کا جذبہ اور دوسرے بندگانِ خدا تک اللہ کی بات پہونچانے کی فکر۔ یہ سب نظر اس قدر روح کو بالیدگی بخشتے رہے کہ سینکڑوں وعظ بھی یہ نہ کر سکیں۔ اختتام پر دعا ہوئی۔ مولانا محمد یوسف صاحب نے دعا کی اپنے گناہوں کی توبہ، مغفرت، آخرت کی سرخروئی، دین کی خدمت، تمام انسانوں کے لیے ہدایت طلبی، یہ سب باتیں اللہ سے طلب کی گئیں۔ دعا یوں لگی جیسے طلب لگنے کا حق ہوتا ہے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو روئی نہ ہو، کوئی زبان نہ تھی جو ہلی نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو پھٹ پڑنے پر نہ آیا ہو، بس ایک ہی احساس تھا کہ اتنی زندگی جو گزری ناکامی میں گزری، میں ہی سراپا معصیت ہوں سب برائیاں مجھ ہی میں ہیں، اے اللہ ان سب کوتاہیوں کو معاف فرما اور میری زندگی کو اپنے راستے پر لگا دے۔

اس طرح ۲۲ کی دوپہر کو یہ مبارک اجتماع ختم ہو گیا۔

ضروری بات

۱۔ دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان سے جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر صرف منیجر کے نام سے فرمائیے کسی شخص کا نام نہ لکھئے۔

۲۔ ادارتی امور میں براہ راست اڈیٹر کو لکھئے۔ دفتری خطوط کے اندر ان امور کے بارے میں کچھ نہ لکھا جائے ——— منیجر

حالات حاضرہ

ہندوستان میں زبان کا مسئلہ

ایڈیٹر صاحب "مدینہ" بجنور

ہندوستان کا دستور بننے سے پہلے طے تھا کہ مرکز کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جو ناگری اور فارسی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی۔ ہندوستانی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ جو زبان شمالی ہندوستان کے عوام بولتے ہیں اور جسے اردو اور ہندی دونوں ناموں سے پکارا جاتا ہے وہ ہندوستانی ہے۔ یہ فیصلہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی ہر دوسری زبان کے مقابلہ میں ہندوستانی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور اپنی اس خصوصیت کی بنا پر ہندوستان کی قومی زبان بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہندوستان فی زمانہ قومی زبان کی نعمت سے محروم ہے سوائے ہندوستانی کے یہاں کی سب زبانیں علاقائی ہیں۔ قومی زبان وہی ہو سکتی ہے جسے ہندوستان کی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہو اور جس میں اپنے روزمرہ کے کام انجام دیتی ہو۔ ہندوستان مختلف مذہبوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف کلچروں کا گہوارہ ہے۔ اس لیے یہاں کی قومی زبان میں ان سب کے اظہار کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ جو زبان بھی اس صلاحیت سے محروم ہوگی وہ ہندوستان کی قومی زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کا دستور بننے سے پہلے ہندوستان کے لیڈروں نے اور کانگرس نے ہندوستانی کے حق میں نہ صرف فیصلہ ہی کیا تھا بلکہ اس فیصلہ کی عام اشاعت بھی کی تھی مگر دستور سازی کے وقت یہ فیصلہ طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا اور صرف ہندی دیوناگری رسم الخط میں مرکزی حکومت کی سرکاری زبان تسلیم کی گئی۔ یہ بات جاننے والوں کے لیے انوکھی نہ تھی کیونکہ بقول علامہ دتاتریہ کیفی لوگ جانتے تھے کہ حکومت کے نیتاؤں کو مہاتما جی کے اس فارمولے کی ذرا پروا نہیں ہے کہ ہندوستان

کی سرکاری زبان ہندوستانی ہوگی جو اردو اور ناگری حروف میں لکھی جائے گی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے جب صوبوں میں کانگرسی حکومتیں قائم ہوئی تھیں تو کئی صوبوں میں حکومت کے اطوار سے معلوم ہو گیا تھا کہ پوری آزادی ملنے پر ان کا طرز عمل زبان کے بارے میں کیا ہوگا؟ بہر حال دستور کا سترھواں حصہ سرکاری زبان سے متعلق ہے جس کے دو باب ہیں۔ پہلا باب یونین (مرکز) کی زبان سے متعلق ہے اور دوسرے باب کا تعلق علاقائی زبانوں سے ہے۔ باب اول کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دستور سازوں نے ناگری رسم الخط میں ہندی کو یونین کی سرکاری زبان تسلیم تو کر لیا ہے مگر انھیں اپنے اس فیصلہ کی صحت کا یقین نہیں ہے چنانچہ انھوں نے یہ بات بہت صاف طور پر کہدی ہے کہ آئندہ پندرہ برس تک یونین کی سرکاری زبان انگریزی رہے گی مگر ہندی کے مکمل نفاذ کے لیے کوئی میعاد یا تاریخ مقرر نہیں کی ہے بلکہ اس کے بتدریج نفاذ کی راہ کو بھی طرح طرح کی رکاوٹوں سے ناہموار بنا دیا ہے، یہ صورت حال اس حقیقت کی غماز ہے کہ ہندی کے حق میں جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ بادل نخواستہ کسی مجبوری یا مصلحت کی بنا پر کیا گیا ہے۔

۱۹۳۷ء کی بات ہے کہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی نے اپنے سننے والوں سے پوچھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کریں گے۔ جواب ملاحظہ ہو۔

ہندوستانی (اردو) ۲۵۶۷، انگریزی ۲۲ ۲۵، گجراتی ۲۴۲۱، مرہٹی ۵۹ ۱۵، ہندی صفر۔

احاطۂ بمبئی کے پانچ ہزار ریڈیو سیٹ رکھنے والوں میں سے سات فیصدی اردو کے یعنی ہندوستانی کے حق میں تھے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں براڈ کاسٹ کیا جائے تو کون سی زبان کو ترجیح دی جائے گی۔ جواب ملاحظہ ہو۔

ہندوستانی (اردو) ۲۶۵، انگریزی ۱۷۴، گجراتی ۹۲۰، مرہٹی ۳۵۸، ہندی صفر

یہی سوالات کلکتہ، مدراس اور دہلی والوں سے بھی پوچھے گئے تھے۔ جواب ملاحظہ ہوں۔

کلکتہ:۔ ہندوستانی (اردو) ۳۵۵۹، انگریزی ۱۷۵۴، بنگالی ۳۹۹، ہندی صفر۔

مدراس:۔ ہندوستانی (اردو) ۲۵ ۲۵، انگریزی ۱۸۱۱، تامل ۳۸۴۴، تیلگو ۲۲۹، ہندی صفر۔

دہلی:۔ ہندوستانی (اردو) ۳۸۴۰، انگریزی ۱۷۳۶، ہندی صفر۔

[نوٹ:۔ ابتدائی سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے پیش نظر ہندوستانی کو اردو کا نام دینا اور ہندی کو ہندوستانی سے خارج سمجھ لینا عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن جس زمانے کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں اس زمانے کے ہندوستانی اور آج کے ہندی نشریات کی زبان کے فرق کو اگر سامنے رکھ لیا جائے تو پھر تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہندوستانی نشریات اردو نشریات ہی تھے۔ دوسرے جس زمانے کا ذکر ہے اسی زمانہ میں مسٹر آر ایس۔ شکلانے "آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی" نام کی ایک کتاب لکھی تھی جس میں ہندوستانی نشریات کو اردو کی نشریات بتا کر ہندی کا کیس پیش کیا تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ سمپورنانند جی نے لکھا تھا اور اسے ہندی ساہتیہ سمیلن یوپی نے شائع کیا تھا۔]

مذکورہ بالا اعداد و شمار جہاں ہندی کی کل ہند حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں وہاں اردو کی مقبولیت کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ ان حالات میں ہندی کو یونین کی زبان تسلیم کرتے وقت دستور سازوں کے سامنے اگر کچھ خدشات اور خطرات نمایاں ہونے لگے تھے اور وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ بہرحال ہندی یونین کی سرکاری زبان قرار پا گئی۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندی کو قومی زبان بنانے کی کوشش کا آغاز کیا جاتا لیکن ہوا اس کا بالکل الٹا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندی کو عام فہم بنایا جاتا دوسری علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل کیے جاتے اور بالخصوص ہندوستانی یا اردو کے سرمایہ سے فائدہ اٹھایا جاتا مگر ہوا یہ کہ ہندی کو سنسکرت کے نامانوس اور ثقیل الفاظ سے لادا جانے لگا اور اسے اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ اس کے عوامی زبان بننے کے سارے امکانات ختم ہو گئے۔ مستزاد یہ کہ دوسری علاقائی زبانوں اور خاص کر اردو کے وہ الفاظ نکال کر پھینک دیے گئے جو زبان زد عوام و خواص تھے اور ان کی جگہ سنسکرت کے وہ الفاظ اپنی اصلی شکل میں استعمال ہونے لگے جن سے کسی کے کان آشنا نہ تھے۔ ہندی کا اپنا سرمایہ بہت قلیل تھا اس کی عمر ہی کیا تھی۔ تقریباً سو برس ہوئے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اس کا جنم ہوا تھا۔ سو برس کا زمانہ ایک نئی زبان کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک زبان سو برس میں کیا بنے گی ہزار برس کے بعد بھی اس میں نئے نئے الفاظ، نئی نئی اصطلاحیں، نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے شامل ہوتے رہتے ہیں بلکہ یہ عمل زبان کی زندگی کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ ہندی والوں نے اپنی زبان کو سرکاری حیثیت دلا کر یہ سمجھ لیا کہ ان کی زبان ہندوستان کی اور دنیا کی تمام زندہ زبانوں سے بے نیاز ہے بلکہ اسے ایک مردہ زبان کا سہارا

کافی ہے جیسے سنسکرت کہتے ہیں مگر اس طرح انھوں نے ہندی کو قومی زبان بن جانے سے محروم کر دیا دوسری ایسی ہی غلطی ان سے یہ ہوئی کہ ہندی ریاستوں میں اردو کو نیست و نابود کرنے کی مہم شروع کر دی کبھی ارشاد ہوا کہ اردو کوئی جداگانہ زبان نہیں ہے بلکہ ہندی ہی کا ایک روپ ہے جبکہ اسی دستور نے جس نے ہندی کو سرکاری حیثیت عطا کی ہے اردو کو ہندی سے علیحدہ ایک زبان تسلیم کیا ہے کبھی کہا گیا کہ اردو ملکی زبان نہیں ہے غیر ملکی ہے مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ پاکستان کے علاوہ جو کل تک ہندوستان ہی میں شامل تھا اردو کس ملک کی زبان ہے؟ کبھی فرمایا گیا کہ اردو عوامی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں "ہے" اور "نہیں" کے علاوہ تمام الفاظ عربی اور فارسی کے ہیں جبکہ بقول فراق گورکھپوری اردو میں دو چار ہزار الفاظ عربی اور فارسی کے اور پچاسوں ہزار خود ہندی کے مشامل ہیں مختصر یہ ہے کہ اردو کے خلاف بے سروپا اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور ساتھ ہی ہندی ریاستوں نے اردو کے دستوری حقوق بھی دینے سے انکار کر دیا۔ مثال کے طور پر حکومت ہند نے ۱۴ جولائی ۱۹۵۵ء کو لسانی پالیسی کے متعلق ایک بیان شایع کیا جس پر ہندی ریاستوں نے ہر تصدیق ثبت کر دی۔

اس اعلان میں اردو سے متعلق اکثر غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے ساتھ تسلیم کیا گیا تھا کہ جن علاقوں اور خطوں میں اردو زبان رائج ہے ان میں مندرجہ ذیل سہولتیں مہیا کی جائیں (۱) پرائمری درجوں میں ان طلبا کو جن کے والدین یا سرپرست یہ بیان کریں کہ ان کی مادری زبان اردو ہے۔ اردو میں تعلیم حاصل کرنے اور امتحانات دینے کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ (۲) اردو کے اساتذہ کی تربیت اور اردو میں موزوں نصابی کتابیں مہیا کرنے کے انتظامات کیے جائیں (۳) ثانوی درجوں میں بھی اردو میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں (۴) تمام دفاتر اور عدالتیں اردو میں دستاویز قبول کریں۔ ان کے ترجمہ یا کسی دیگر زبان کے رسم الخط میں ان کو منتقل کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ دفاتر اور عدالتیں اردو میں عرضیاں اور درخواستیں بھی قبول کریں۔ (۵) جن علاقوں میں اردو رائج ہے اور جن کو اس غرض کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ وہاں اہم قوانین، قواعد و ضوابط اور اعلانات اردو میں جاری کیے جائیں۔ اعلانیہ میں اس دفعہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "یہ ضروری نہیں کہ مجالس قانون ساز اردو میں قوانین پاس کریں۔ یا ہر ایک قانون اردو میں جاری کیا جائے بلکہ اہم قوانین، قواعد

وضوابط اور اعلانوں کو مشتہر کرنے کی غرض سے مخصوص علاقوں میں ان کو یا ان کے بعض مضامین کو اردو میں جاری کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اگر دو ریاستوں کے درمیان کوئی سرحدی علاقہ دو زبانوں والا خیال کیا جاتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ حکومت ان اعلانوں کو اردو زبان میں شائع کرے۔" خاص سہولتوں کے ضمن میں مذکورہ بالا دفعات کے بعد چھٹی دفعہ میں تاکید مزید کے طور پر کہا گیا ہے: "ہندی کو نہ صرف ہمارے آئین میں ممتاز مقام حاصل ہے بلکہ یہ اتر پردیش اور بہار نیز ہندوستان کی کچھ دیگر ریاستوں میں بھی سرکاری زبان ہے۔ ہندی اور اردو کے درمیان کسی رقابت کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لازمی طور پر ان ریاستوں میں ہندی کو بلند ترین مقام حاصل ہے لیکن آئین کی دفعات کے منشاء کے مطابق ہندوستان کی ایک زبان کی جسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد بولتی اور استعمال کرتی ہے، حوصلہ افزائی کے خیال سے، جو لوگ اسے استعمال کرنے کے عادی رہے ہیں اور جو اپنی مادری زبان خیال کرتے ہیں ان کو اردو استعمال کرنے میں آسانیاں مہیا کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا مناسب ہے۔ اس کا اطلاق خاص طور پر اتر پردیش اور بہار نیز دہلی پر ہوگا جو سینکڑوں برس سے اردو کے اہم مراکز رہے ہیں۔"

مرکزی حکومت کے اعلانیہ اور اس پر ہندی ریاستوں کی مہر تصدیق کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ چند معمولی احکام جاری ہوئے جن پر عملدرآمد کی ضرورت برائے نام سمجھی گئی اور اردو کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ یہی حال سہ لسانی فارمولے کا ہوا کہ اس کے فائدے سے اردو کو محروم کر دیا گیا۔ یہ تمام حالات غیر ہندی ریاستوں سے بھی پوشیدہ نہ تھے اور نہ آج ہیں ہندی ریاستوں نے اردو کے ساتھ جو غیر منصفانہ برتاؤ کیا ہے وہ ہندوستان کے غیر ہندی علاقوں کی نگاہوں میں ہے۔ ان کے ذہن میں یہ حقیقت رچ بس گئی ہے کہ ہندی نے مسند اقتدار پر بیٹھ کر جو سلوک اردو کے ساتھ کیا ہے اس سے دوسری زبانیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ لسانی مسئلہ از سر نو پیدا ہو گیا ہے اور طرح طرح کی تجویزیں سامنے آ رہی ہیں مثلاً

۱۔ ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنایا جائے (ہندی ریاستیں)

۲۔ انگریزی کو مشترکہ زبان کی حیثیت سے باقی رکھا جائے (مدراس)

۳۔ دستور میں جو ۱۴ زبانیں درج ہیں ان سب کو سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
سمندر شاہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بحری ڈاک سے ..... ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے ..... ایک پونڈ
پوسٹل آرڈر وغیرہ کراس کیے
آنا چاہیے

جلد ۲۳ | بابتہ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۵ھ مطابق جون سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ (۲)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن منعمانی	۲
۲	قرآن پاک کی ابدیت	محمد منظور نعمانی	۵
۳	حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے	... ...	...
۴	کائنات میں خدا کی گواہی	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۱۳
۵	دربار عالمگیری	جناب وحید الدین خان صاحب	۳۲
		ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی	۴۲

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۱۵ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمن اصفہانی

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یونہی کیا کم مسائل تھے کہ ایک مجسم مسئلہ مسٹر جناح لگاتار بن گئے ہیں۔ بمبئی ہائی کورٹ کی چیف جسٹسی سے سبکدوش ہو کر جب وہ برطانیہ میں ہندوستانی ہائی کمشنر کی حیثیت سے متعین ہوئے تھے تو انہی دنوں جلیانوالہ وغیرہ کے دلدوز حادثات پیش آئے اور ایک خاص اتفاق کے ماتحت برطانی اخبارات میں ان حادثات کا ہیت چرچا ہوا۔ اسوقت مسٹر جناح لگاتار نے اپنی زندگی میں ہندوستانیت اور قوم پرستی کا سب سے پہلا ثبوت پیش کرتے ہوئے ایک مراسلہ بعض اخبارات کو دیا جس میں بڑی قطعیت کے ساتھ یہ اعلان تھا کہ ایسے تمام حادثات کے ذمہ دار خود ہندوستانی مسلمان ہیں جو ہمیشہ سے ہندوستان کی قومی زندگی کے دھارے میں ضم ہونے سے انکار کرتے آئے ہیں اور آج بھی علیحدگی پسندی کی راہ پر ہی چلنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں یہ مصائب ان کے سر آتے ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد مسٹر جناح لگاتار مرکزی وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز ہو کر ہند آگئے اور اس عہدے کے ذریعے ہندوستان کی جس سب سے بڑی خدمت کا انھوں نے اپنے دل میں عزم کیا وہ شاید یہی تھی کہ یہاں کے مسلمانوں کی زندگی سے علیحدگی پسندی کا زہر نکال کر انھیں قومی دھارے میں غرق کر کے ہی دم لیں گے۔ ظاہر ہے وہ وزیر اعظم نہیں وزیر تعلیم تھے۔ اس لیے اپنے خاص میدان کار ہی میں اپنے اس عزم کو جامۂ عمل پہنانے میں کوئی موثر دلدار کر سکتے تھے چنانچہ اس میدان میں ان کی نگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف گئی کہ یہ مسلمانان ہند کی "علیحدگی پسندی" کا ایک بہت بڑا مظہر ہی نہیں اس کا سرچشمہ بھی ہے۔ اور پھر یہ نگاہ اپنی تمام توجہات کے ساتھ اس پر مرکوز ہی کیوں نہ ہو گئی۔

سب سے پہلے جو چیز اس نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکی وہ یونیورسٹی کے نام میں "مسلم" کا لفظ تھا۔ اور اس لفظ کو ہٹانے کے لیے مسٹر جناح لگاتار نے اپنے ارادوں کا اظہار شروع کر دیا لیکن یونیورسٹی کی خوش قسمتی تھی کہ ان ایام میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی تھے۔ وہ آئے تھے تو خود ان کی ذات سے اندیشہ تھا کہ وہ یونیورسٹی کے مسلم کیریکٹر کو فنا کر دینے کے خواہش مندوں کا آلۂ کار بنیں گے لیکن وہ اقبال کی زبان میں

یاساں لگے کیے کو صنم خانوں سے

کا مصداق ثابت ہوئے اور اس سستی تیشلزم کے سامنے مضبوطی سے کھڑے ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی نبض ٹوٹتے ہوئے دلوں کی قوت مزاحمت مشل کر دینے کے جس انداز میں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے یہ بات اٹھائی جا رہی تھی چلتے چلاتے بھی نہایت بے باکی سے اس کے بارے میں کہہ گئے کہ

"یونیورسٹی کے نام کے مسئلے پر یہ آنکھ مچولی لب بند ہو جانی چاہیئے"

افسوس ہو کہ طیب جی کو بہت جلد جلا وطن ہونا پڑا ورنہ وہ وزیر تعلیم سے اس کھلے ہوئے اختلاف کے بعد آسانی سے وہ بھی کچھ نہ کر سکتے تھے) اور ابھی وہ نکلے ہی تھے کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ساتھ طلبا کی نہایت نامناسب حرکت کا وہ واقعہ پیش آگیا جسے ۲۶ اپریل کے واقعے سے یاد کیا جا رہا ہے۔ یہ افسوسناک واقعہ گویا ایک سنہرا موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر مسٹر چھاگلا یونیورسٹی کے ساتھ جو چاہیں کر گزریں اور کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو۔ چنانچہ مسٹر چھاگلا جتنا زہر اس یونیورسٹی کے خلاف اگل سکتے تھے وہ سب کا سب اس موقع پر انھوں نے اگل دیا اور پھر اس زہریلی سے ایسی فضا بنانے میں بھی وہ کامیاب ہو گئے کہ یونیورسٹی کی آئینی نوعیت کو صدر جمہوریہ کے ایک آرڈی ننس کے ذریعہ معطل کر کے رکھ دیں۔

ہمیں نہ اس آرڈی ننس پر اس وقت کوئی تبصرہ کرنا ہے اور نہ مسٹر چھاگلا کی زہر چکانی پر۔ ہمارے سامنے اس وقت سوال یہ ہے کہ کیا وہ اقلیت باعزت زندگی کا کوئی حق رکھتی ہے جس کے نام کی دھاریں ایسے لوگوں کو الاٹ ہوں جو اس اقلیت کو بدنام کرنے اور اس کی ہستی کے ایک ایک نشان کو مٹا کر ڈالنے کی دھن میں اکثریت کے تنگ دل عناصر میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے ہوں اور یہ اقلیت ایک آواز ہو کر کھڑی نہ ہو سکتی ہو کہ حکومت میں ہماری نمائندگی کا حصہ ایسے لوگوں کو دیا جانا ناقابل برداشت ہے؟

کہنے کو یہ بات ٹھیک ہے کہ حکومت میں نہ کوئی ہندو ہندوؤں کا نمائندہ ہے اور نہ مسلمان مسلمانوں کا نمائندہ بلکہ سب مشترکہ نمائندگی کا رکھتے ہیں۔ کیونکہ واقعی چھاگلا صاحب یا کسی اور کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر حکومت میں نہیں بھیجا ہے۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلمان یا دوسری اقلیتوں کے افراد کو حکومت میں لیے جانے کا اصل منشا یہی ہوتا ہے کہ حکومت میں ان اقلیتوں کی حصہ داری کا اظہار ہو۔ اور کسی حد تک یہ بھی کہ اقلیتوں کے معاملات میں خود اُن کے افراد کے ذریعے زیادہ بہتر معلومات حاصل ہو سکیں۔ بیرونی ممالک میں ہمارے سفارت خانے مسلم وزرا اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں کی فہرستیں اخبار اور کیا دکھانے کے لیے شائع کرتے ہیں؟ خصوصاً شری چھاگلا کے بارے میں تو یہ خصوصی واقعہ اتنی جلدی ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ گزشتہ سال جب وہ اطلاعِ اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے پر ہندوستان کی پرزور وکالت کر کے آئے اور پھر دہلی میں ایک جلسہ گویا اُن کے اعزاز میں ہوا تو وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے اسی جلسۂ عام میں انھیں یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اپنا پورا نام واضح طور سے محمد علی کریم بھائی چھاگلا لکھا کریں تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ وہ ایک مسلمان ہیں۔

ظاہر ہے کہ شری چھاگلا کے اسلامی نام کی نمائش تنہا اُن کی ذات کی بنیاد پر تو کوئی فائدہ نہیں دے سکتی تھی اس کا فائدہ تو صرف اس نسبت کی بنیاد پر ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ حکومت ہند میں پانچ کروڑ مسلمانوں کے حصے کی نمائندگی کرنے والے ایک وزیر ہیں۔ پس اسی بنیاد پر مسلمانوں کو پورا پورا حق ہے کہ وہ حکومت

میں اپنے حصے کی نمائندگی کرنے کے لیے شری جپا گلا کے وجود پر سخت سے سخت اعتراض اور احتجاج کریں کیونکہ وہ مسلمانوں سے برسرپیکار ہونے کے بعد نہ تو اُن کے نام سے کچھ پانے کا استحقاق رکھتے ہیں اور نہ ایسی صورت میں مسلمانوں کے کسی مسئلے میں اُن سے کوئی متوازن رہنمائی کا مینہ کو مل سکتی ہے۔ وہ اگر مسلمانوں کو برسرغلط سمجھتے ہیں اور اُن کی اصلاح کے لیے اُن سے جنگ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ مسلمانوں کے نام سے پائی ہوئی وزارت کی کرسی نہیں ہے، یہ کام وہ راجیہ سبھا کے محض ایک ممبر کی حیثیت سے راجیہ سبھا میں کریں یا اور زیادہ ہمت ہو تو پبلک میدان میں نکل کر آئیں۔ لیکن وزارت کی کرسی پر رہتے ہوئے نہ صرف اُن کے لیے اس کا کوئی جواز نہیں ہے بلکہ کسی غیر مسلم وزیر کے لیے بھی اس وقت تک اس کا کوئی حق نہیں تسلیم کیا جا سکتا جب تک ہندوستان کی حکومت کو ایک مشترک اور جمہوری حکومت کہا جاتا ہے۔

مسئلے کی یہ نہایت صاف اور واضح تصویر ہمیں اس بات کا سوفی صدی حقدار بناتی ہے کہ وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ ہند سے مسٹر جپا گلا کی حکومت ہی سے علیحدگی کا مطالبہ کریں۔ اور یہی نہیں بلکہ اس تصویر میں ہمارے لیے ہر پہلو سے اس بات کا بھی جواز موجود ہے کہ ہم اس مطالبہ کو حکومت سے تعاون اور عدم تعاون کی شرط بنالیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمہ داری اُن لوگوں کی ہے جو بالفعل بالواسطہ طور پر حکومت یا حکمراں پارٹی کو کسی بھی قسم کا سیاسی تعاون دیتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کے دل ملت کے درد سے بیگانہ نہیں ہو گئے ہیں۔ یقیناً ان لوگوں کا اس وقت کوئی جرأت مندانہ قدم مسلمانوں کے ہاتھ بے حد مضبوط کر سکتا ہے لیکن اگر ہماری بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی اس جرأت قلبی رانہ کا حامل نہیں نکل سکتا، تب بھی مسلمانوں کی ہر چھوٹی بڑی تنظیم کا فرض ہے کہ وہ مسٹر جپا گلا کی حکومت سے علیحدگی کے مطالبے کو منظم کریں اور تمام مؤثر آئینی ذرائع سے چند دن کے لیے اپنی ساری طاقت اس مطالبے پر لگا دیں ۔۔۔

ہم اپنی اس گزارش کو پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ اگر ہم ہندوستانی جمہوریت میں اپنے ایک ایسے صاف اور واضح حق پر بھی اصرار کرنے کے لیے بے تابانہ کھڑے نہیں ہو سکتے جس میں ملک کے کسی دوسرے طبقے سے ٹکراؤ کا سوال نہیں ہے یعنی یہ کہ ہمارے نام سے ان لوگوں کو شو (Show) کیا جائے، وہ کم از کم ہمارے کھلے دشمن نہیں ہونے چاہئیں، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم اس ملک میں کسی ادنیٰ درجہ کی باعزت زندگی کے بھی حقدار نہیں ہیں۔ اور ہمارے وہ حقوق تو اچھی ہی طرح پامال ہونے چاہئیں جن میں اس ملک کے اندر ہمارا کوئی حریف طبقہ بھی پایا جاتا ہے! ۔۔۔ جو لوگ مسٹر جپا گلا سے جانی کے مطالبے پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں ہمارے نزدیک وہ صحیح نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتے کہ خود مسٹر جپا گلا سے استعفے کا مطالبہ کیا جائے۔ ہمارا مقدمہ ایک اصول کو منوانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کو منوانے کی شکل صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم سے مطالبہ ہے۔

حرمین پاک کی حاضری

محمد منظور نعمانی

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمت بائے تو
عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

اب سے دو سال پہلے اللہ تعالیٰ نے حرمین پاک کی حاضری نصیب فرمائی تھی، حج کے متعلق جو قانون ہمارے ملک میں کئی سال سے نافذ ہے اس کے ہوتے ہوئے ہم جیسوں کے لیے پانچ سال تک تو حاضری کا بظاہر کوئی امکان ہی نہیں تھا، لیکن رب کریم نے محض اپنے فضل سے ایک شکل پیدا فرمائی اور اس سال پھر حاضری نصیب فرمائی ـــــ چونکہ اس سفر کے تذکرہ میں ذکر کرنے والے کے لیے بھی لذت و سرور کا سامان ہو اور سننے اور پڑھنے والوں کے لیے بھی اس لیے کچھ باتیں حوالۂ قلم کی جاتی ہیں۔

محمد منظور نعمانی

رمضان مبارک سے چند دن پہلے دسمبر کی آخری تاریخوں میں اچانک مجھے اطلاع ملی کہ "رابطہ عالم اسلامی" (مکہ مکرمہ) نے مجھے اپنی مجلس تاسیسی کا رکن منتخب کر لیا ہے (اس مجلس کا اجلاس سال میں کم از کم ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے) ـــــ انتخاب کی اس اطلاع کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ رابطہ کا اجلاس حج سے کچھ پہلے مکہ مکرمہ میں ہوگا۔ نیز رابطہ ہی کی دعوت پر پورے عالم اسلام کی ایک مؤتمر بھی اس سال حج کے بعد متصلاً مکہ مکرمہ میں منعقد ہوگی اور عنقریب ان دونوں کا دعوت نامہ بھی مجھ کو مل جائے گا۔

میرے پاس چونکہ ہندوستان سے باہر سفر کے لیے پاسپورٹ نہیں تھا اور بعض تجربوں

کی بنا پر آسانی سے اور جلدی ملنے کی امید بھی نہیں تھی اس لیے میرا ارادہ ہوا کہ میں رابطہ کی رکنیت قبول کرنے سے شکریہ کے ساتھ معذرت کر دوں۔ لیکن رفیق محترم مولانا علی میاں نے (جو رابطہ کی تاسیس کے پہلے دن سے اس کے رکن ہیں) اور دوسرے دوستوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا، اور سب کی یہ رائے ہوئی کہ رکنیت قبول کر لینی چاہیے اور پاسپورٹ کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیئے ـــ مجھے چونکہ طبعاً ایسے کاموں سے بہت بُعد ہے جن کے لیے سرکاری دفاتر میں جانا پڑے اور ارباب اقتدار سے عرض معروض کرنی پڑے، اس لیے ان سب باتوں کے بعد بھی میری طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ آخر ایک دوست نے ذمہ داری لی کہ اس سلسلے میں جو کچھ کرنا ہوگا وہ خود کریں گے اور مجھے صرف درخواست پر دستخط کرنے ہوں گے۔ اس بات نے میرا خاص عذر تو ختم کر دیا لیکن رکنیت کے قبول کرنے میں بعض دوسری وجوہ سے بھی مجھے تردد تھا، چنانچہ میں نے کئی دن استخارہ کیا اور بالآخر آخر رمضان میں میں نے رابطہ کو منظوری کی اطلاع دے دی۔

اسی درمیان اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہماری حکومت کی وزارت خارجہ نے یہ طے کیا ہے کہ جن لوگوں کو رابطہ کی طرف سے مدعو کیا جائے گا حکومت اُن کے لیے پاسپورٹ وغیرہ میں سہولت فراہم کرے گی ـــ وسط شوال میں میری طرف سے پاسپورٹ کی درخواست دی گئی اور جن مخلص دوست نے ذمہ داری لی تھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے انھوں نے ہی ساری کوشش اور دوڑ دھوپ کی اور خلاف توقع چند ہفتوں میں مجھے نیا پاسپورٹ مل گیا۔

رابطہ کی مجلس تاسیسی کا اجلاس مکہ مکرمہ میں ۲۷ مارچ سے شروع ہونے والا تھا، ہم لوگ (رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا معین اللہ صاحب ندوی اور یہ عاجز) ۲۲ مارچ کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۲۳ کی صبح دہلی پہونچے، پی فارم کی کارروائی (جس کے بغیر ملک سے باہر کا سفر نہیں کیا جا سکتا) ۲۴ تک اس کی تکمیل ہو سکی اس لیے ہم ۲۵ مارچ کی شام کو دہلی سے جدہ کے لیے روانہ ہو سکے، راستہ کراچی اور بحرین ہو کر اختیار کرنا پڑا اور ان دونوں جگہ ہوائی جہاز بدلنے کے لیے کافی ٹھہرنا پڑا جس کی وجہ سے جدہ ۲۶ اور ۲۷ کی درمیانی شب میں پہونچ سکے۔

ہمارے بہت ہی عزیز دوست ارشد صاحب مرحوم جو ہمارے اس سفر سے ۴ ہی مہینے پہلے ایک تبلیغی سفر میں حالت احرام میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان موٹر کے ایک حادثہ میں شہید ہو گئے تھے، ان کے اہل وعیال جدہ ہی میں مقیم ہیں۔ ۲۰ مارچ کی صبح سب سے پہلے مرحوم کی تعزیت میں اُن کے گھر گئے (ان کے سب گھر والے مولانا علی میاں سے بہت ہی خاص تعلق رکھتے ہیں) پھر ظہر کی نماز جدہ ہی میں پڑھ کے اور اپنے خاص عنایت فرما الحاج عبدالقادر نوروی صاحب کے ہاں کھانا کھا کے اور تھوڑی دیر آرام کر کے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ اور ایسے وقت وہاں پہونچے کہ حرم شریف میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔

اس رب کریم کا شکر کس طرح ادا کیا جائے جس نے پھر اپنے حرم پاک کے در و دیوار دکھائے اور حاضری کی توفیق دی۔ اندر داخل ہونے کے بعد بیت اللہ شریف پر نظر پڑی اور دل و زبان نے کہا

اللّٰھم زد بیتک ھذا تشریفاً	(اے اللہ اپنے اس مقدس بیت کی تشریف
وتعظیماً وتکریماً ومھابۃ وزد	وتکریم اور تعظیم و ہیبت میں اضافہ فرما اور
من شرفہ وکرمہ ممن حجہ او	حج و عمرہ کرنے والے جو بندے اسکی تعظیم و
اعتمرہ تشریفاً وتکریماً وبرّاً	تکریم کریں اُن کی بھی تشریف و تکریم اور ان کے
اللّٰھم انت السلام ومنک السلام	ساتھ احسان میں مزید اضافہ فرما، اے اللہ
فحینا ربنا بالسلام	تو سراپا سلامتی ہے اور سلامتی کا تو ہی
(اس کے علاوہ اور بھی جن دعاؤں کی توفیق ملی۔	سرچشمہ ہے۔ تو ہمیں سلامتی کا تحفہ دے۔)

اللہ کے ہزاروں بندے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے پورا مطاف گویا بھرا ہوا تھا اس لیے حجر اسود کے قریب جانے کا ارادہ بھی نہ کر سکے دور ہی سے استلام پر قناعت کی اور عمرہ کا طواف شروع کیا۔ بار بار اپنے قلم سے لکھنے اور پچاسوں سیکڑوں دفعہ دوسروں کو بتانے کے باوجود طواف شروع کرتے وقت میں خود رمل کرنا بھول گیا۔ مولانا علی میاں یا مولانا معین اللہ صاحب نے یاد دلایا تو رمل شروع کیا ــــ سات چکر پورے کر کے طواف ختم کیا اور رکعتین طواف پڑھیں۔ طائفین کے اس سمندر ہی میں کسی طرح باب کعبہ اور حجر اسود کے درمیان ملتزم تک پہونچنا

بھی نصیب ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے ہاتھ میں بندوں کے قلوب ہیں طواف میں بھی پھر رکعتین طواف میں بھی اور اس کے بعد ملتزم پر بھی دعا نصیب فرمائی۔ اس کے بعد زمزم شریف پر آکر اس کا تازہ تازہ پانی پیا اور الحمدللہ خوب پیا اور دعا کی۔ اس سال دیکھا کہ زمزم شریف کے اوپر والی عمارت ختم کردی گئی ہے اور زمزم شریف میں مشین لگا کے اوپر پائپ کے ذریعہ دور تک اس کا پانی دوڑا کے اور پھر دو طرفہ سیکڑوں ٹونٹیاں لگا کے ایسا انتظام کردیا گیا ہے کہ سیکڑوں حجاج بیک وقت ان ٹونٹیوں کے ذریعہ زمزم کا تازہ تازہ پانی پی سکتے ہیں اور اپنے برتنوں میں بھر سکتے ہیں۔ ایک جانب کی ٹونٹیاں مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور دوسری جانب کی خواتین کے لیے۔ یہ انتظام بلاشبہ بہت اچھا کیا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ حجاج میں جو ایک بڑی تعداد ناتربیت یافتہ اور بے سلیقہ لوگوں کی ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہاں بھی ہر وقت کشمکش کا سماں رہتا ہے۔

اس کے بعد ہم حجر اسود کا استلام کرکے سعی کے لیے صفا پر آئے، پہلے دعا کی، پھر "اَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ" کہہ کے سعی شروع کی اور سات پھیرے پورے کیے، ہر پھیرے کے خاتمہ پر صفا اور مروہ پر دعا کا اہتمام نصیب ہوا۔ آخری شوط کے بعد مروہ پہ دعا کرکے سعی سے فارغ ہوئے اور حلق کے لیے قریب ہی کی حجام کی ایک دکان پر آگئے اور حلق کرایا ——— الحمدللہ عمرہ پورا ہوا۔ جس رب کریم نے یہ عمرہ نصیب فرمایا وہی قبول بھی فرمائے۔

تبلیغی اخوان و احباب حضرت مولانا سعید احمد خاں صاحب، بھائی فضل کریم صاحب اور قاری سلیمان صاحب وغیرہ کو ہماری آمد کی اطلاع ہوگئی تھی وہ حضرات ہماری تلاش میں حجام کی اس دکان ہی پر آگئے ——— برسوں کے بچھڑے ایسے باخدا دوستوں کا ملنا اور اللہ کے ایسے نیک اور مقبول بندوں کی زیارت اور ان کی دعاؤں سے مستفیض ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

رابطہ کے ارکان اور مدعوین کے قیام وغیرہ کا انتظام رابطہ کی طرف سے عام طور سے سرکاری مہمانوں کی طرح ہوٹلوں میں ہوتا ہے لیکن مولانا علی میاں ہمیشہ اپنے طور پر مولانا

عبداللہ عباس ندوی کے یہاں قیام کرتے ہیں اور ان ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ مولانا کی رفاقت اور معیت کی وجہ سے ہم لوگوں نے بھی یہی طے کیا تھا اور بلاشبہ مولانا عبداللہ عباس کے مخلصانہ تعلق کا یہی حق ہے۔ انھوں نے اس سال حرم شریف کے بالکل قریب "عمارۃ الاشراف" میں ایک پورا بلاک قریباً ۵۰ ہزار ریال کرایہ ادا کر کے لے رکھا تھا۔ یہ مکہ معظمہ کی جدید طرز کی نہایت عظیم الشان دس گیارہ منزلہ ایک عمارت ہے اور اپنی وسعت کے لحاظ سے گویا ایک مستقل آبادی ہے۔ مولانا عبداللہ عباس صاحب کے پاس اس کے ۵۰ کمرے تھے ان میں سے پورے دو کمرے انھوں نے ہم لوگوں کے لیے خالی کر رکھے تھے۔ ہمارا سامان وہاں پہنچ چکا تھا۔ عمرہ سے فارغ ہو کر مغرب سے کچھ پہلے ہم لوگ مکان پر پہونچے۔ اسی وقت غسل کیا اور کپڑے پہن کر مغرب کی نماز کے لیے حرم شریف آ گئے۔

رابطہ کا پہلا افتتاحی اجلاس آج بعد مغرب اس کے دفتر "قصر ملکی" میں ہونے والا تھا۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر مولانا علی میاں اور یہ عاجز "قصر ملکی" پہونچے ——— رابطہ کے اجلاس میں شرکت کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا اور میں اس کی نوعیت اور ہیئت ترکیبی سے اسی دن واقف ہوا ——— اس دن تو صرف ابتدائی کارروائی ہوئی۔ پھر اس کے بعد ایک ہفتہ تک رابطہ کی نشستوں کا سلسلہ جاری رہا۔

رابطہ کی ان مجالس، اس کی کارروائیوں اور پھر مؤتمر کے اجلاسوں کے متعلق تو انشاء اللہ مستقلاً "الفرقان" کی ایک مخصوص شناعت میں کسی قدر تفصیل سے آئے گا۔ اس صحبت میں تو اس مبارک سفر کے سلسلے کی کچھ دوسری باتیں ذکر کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

(۲)

اس سفر مبارک کی سب سے بڑی نعمت اور برکت تو حج و زیارت اور بیت اللہ کا طواف ہے، اور اس کے بعد دنوں اور راتوں کے وہ سارے اوقات ہیں جو مسجد حرام اور مسجد نبوی میں اللہ کی عبادت، اس کی کتاب پاک کی تلاوت اور اس کی یاد اور دعا و استغفار میں گزریں، اور بڑے مبارک ہیں وہ بندے جو ان نعمتوں کی قدر شناسی کے ساتھ ان سے بھرپور حصہ لیں۔ لیکن اس کی ضمنی برکات و منافع میں سے ایک بڑی برکت اور منفعت ساری نسلی

و لسانی تفریقوں اور جغرافیائی، سیاسی حد بندیوں کو توڑ کر مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پورے عالم اسلامی کے اہل ایمان خصوصاً ان کے اکابر داعیان اور علماء و صلحاء کا اجتماع اور ان کی باہم ملاقاتیں و صحبتیں ہیں، جو امت مسلمہ کی عالمی برادری کے باہم ربط و تعارف اور ملت اسلامیہ کے بین الاقوامی کردار کی حفاظت و ترقی کا خداوندی انتظام ہے ــــ سوچیے تو ترکی، مصر، شام، الجزائر، مراکش اور مشرق میں چین، جاپان، انڈونیشیا ملایا، دلی اور لکھنؤ سے کس قدر دور ہیں، اور پاکستان اور افغانستان بھی نسبتاً کم دور ہونے کے باوجود درمیان کی سیاسی دیواروں کی وجہ سے کس قدر دور ہو گئے ہیں، اور ان کے رہنے والوں سے ملنا جلنا اور افادہ و استفادہ اب کتنا مشکل ہو گیا ہے لیکن حج کے موقع پر یہ سارے ملک اور ان کے رہنے والے مسلمان بلکہ دنیا بھر کے مسلمان مکہ معظمہ میں بلکہ خاص مسجد حرام میں اس طرح یکجا ہو جاتے ہیں جیسے ایک ماں کے بچے اس کی آغوش میں۔

(۳)

حج کا مجمع اس وقت کی امت محمدیہ کا پورا پورا نمونہ ہوتا ہے۔ اللہ کے ایسے بندے بھی نظر پڑتے ہیں جن کا چہرہ اور جن کی آنکھیں بتا دیتی ہیں کہ ان کا دل اللہ کی خشیت و محبت سے لبریز ہے۔ اور یہ "اینہا می سوزند دمی گدازند" کے پورے مصداق ہیں لیکن جس طرح آج امت محمدیہ میں یہ عنصر کمیاب ہے اسی طرح حج کے مجمع میں بھی اللہ کے ایسے بندے کچھ زیادہ تعداد میں نظر نہیں پڑتے۔ بڑی تعداد ایسوں کی ہوتی ہے جن کو اسلام کا اچھا اور معیاری نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور افسوس ہے کہ خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جن کا حال دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ بے چارے اسلام سے بالکل ناواقف اور حرم پاک کے ابتدائی ادب سے بھی ناآشنا ہیں۔ امت میں اس عنصر کا ہونا اور اچھی خاصی تعداد میں ہونا کوئی نیا انکشاف نہیں ہے لیکن حج کے مجمع میں اور خاص کر حرمین شریفین میں ان نمونوں کو دیکھ کر بڑی دردناک اذیت ہوتی ہے۔ قریب قریب ہر ملک سے آنے والوں میں اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ طبقے ہوتے ہیں جو مسلمان خاندانوں میں پیدا ہوئے لیکن دین کی حقیقت جاننے اور اس کی تربیت حاصل کرنے کا انھیں

کبھی موقع نہیں ملا۔ اور حج کے لیے چلے آئے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے سلسلہ میں بنیادی ضرورت تو اس کی ہے کہ ملک یہ عوامی پیمانہ مسلمانوں میں اسلامیت کا صحیح شعور اور ان کی دینی تربیت کی جدوجہد ہو لیکن خاص موسم حج میں حکومت حجاز یا حکومت کے پورے تعاون سے کوئی دینی و اصلاحی ادارہ اگر صحیح طریقہ پر ایک منصوبہ بنا کر اس کے لیے کام کرے اور معلمین کو اس کے لیے استعمال کرے، اور پہلے خود معلمین کو تربیت کے ذریعہ تیار کیا جائے تو بہت بڑا کام ہو سکتا ہے۔ اور یہ کام پورے عالم اسلامی کی دینی اصلاح کا ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے۔ بعض حضرات نے اس کے لیے ایک مفصل اسکیم بنا کر پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

قادیانی، سعودی حکومت کی نظر میں۔

اب کے ایک قابل ذکر واقعہ یہ پیش آیا کہ کلکتہ کے قادیانیوں کی ایک جماعت نے حج کو جانے کا پروگرام بنایا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس حج کے ذریعہ کلکتہ اور اسکے نواح میں قادیانیت کی تبلیغ کے لیے زمین ہموار کر سکیں گے۔ وہاں سے واپس آکر وہ مسلمان عوام کو بتائیں گے کہ عقائد کی بنیاد پر ہماری مخالفت بس یہ ہندوستان ہی کے مولوی کرتے ہیں۔ مکہ مدینہ میں کسی نے ہماری کوئی مخالفت نہیں کی اور ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو ایمان والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ الغرض وہ اس حج کو اپنے لیے ایک سند اور سرٹیفکیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس کا اچھا خاصا پروپیگنڈا بھی کیا تھا ــــ کلکتہ کے چند حساس اور بیدار مسلمانوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور ایک خط ملک حجاز شاہ فیصل کو لکھا کہ قادیانیوں کی ایک جماعت اس طرح حج کے موقعہ پر حجاز مقدس پہونچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ اپنے کو مسلمان بتا کر سفر کریں گے۔ حالانکہ یہ قادیانی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی اور رسول مانتے ہیں۔ ان کے یہ نام ہیں اس خط کی ایک کاپی مملکت سعودیہ عربیہ کے مفتی اکبر کو، ایک رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری کو اور ایک ہندوستان کے سعودی سفارت خانہ کو بھی بھیجی گئی ــــ

اس کوشش کے نتیجہ میں ان لوگوں کو ویزا نہ دیئے جانے کا حکم آگیا۔ چنانچہ بمبئی کے ویزا آفس نے سو کے آدمیوں کی اس پوری جماعت کو ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ ان کی سیٹیں ہوائی جہازوں میں ریزرو تھیں۔۔۔ لیکن "ہبلی" (جنوبی ہند) کے بعض قادیانی خفیہ طور پر حجاز مقدس پہونچ گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک نوجوان فاضل مولانا ریاض احمد صاحب نیف آبادی (جو جنوبی ہند میں قادیانی فتنہ کا مقابلہ کر رہے ہیں) وہ بھی اس سال حج میں تھے۔ انھوں نے حجاز مقدس میں "ہبلی" کے ان قادیانیوں کا تعاقب کیا، اور حکومت حجاز کو اطلاع دی کہ اس طرح چند قادیانی خفیہ طور پر آگئے ہیں۔ حکومت کی جانب سے ان کی تلاش ہوئی، ان میں سے صرف دو کا پتہ چلا اور وہ گرفتار کیے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ابتدائی بیان میں قادیانی ہونے سے قطعی انکار کیا لیکن جب ان کی ڈائری وغیرہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ واقعۃً یہ قادیانی ہیں تو بعد میں انھوں نے اقرار کر لیا۔ اس کے بعد اتمام حجت کے لیے ان کو تبلیغ کی گئی اور توبہ کے لیے کہا گیا، انھوں نے توبہ کی اور تحریری توبہ نامہ داخل کیا۔

اس سال کے ان واقعات کے بعد یہ بات بالکل صاف ہوگئی ہے کہ حکومت حجاز قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانتی۔ اور اس بنا پر ان کو حج کے لیے حجاز مقدس پہونچنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان میں سے جو لوگ جاتے ہیں وہ چوری چھپے جاتے ہیں۔

اعتذار اور اعلان

الفرقان کا یہ شمارہ وقت پر کاغذ نہ مل سکنے کی وجہ سے ۱۰-۱۲ دن کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔

آئندہ اشاعت، جس میں صرف حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مضامین ہوں گے انشاء اللہ اپنے وقت پر یعنی جولائی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا۔

اس کے بعد

اگست و ستمبر کا مشترک شمارہ "**الرابطہ عالم اسلامی نمبر**" ہوگا جو مکہ مکرمہ کی مؤتمر عالم اسلامی کی کارروائی، قراردادوں اور اہم مقالات اور تقاریر پر مشتمل ہوگا۔

ادارہ

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

از ـــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوبات حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ بنام حضرت شاہ بریلویؒ

مکتوب (۱) بسم اللہ الرحمن الرحیم ـــــ حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ السید الحسیب النسیب نقیب السید ابوسعید حسنی سلمہ اللہ و اوصلہ الی فوق مناہ آمین ـــــ الحمد للہ الذی فتح السنۃ اولیائہ لمعارف لا تعد ولا تحصی و کشف عنہم عوارف لا عدھا یحصی والصلوٰۃ والسلام علی سید الاولیاء محمد ن المصطفیٰ و احمد المجتبیٰ و علی آلہ و اصحابہ بدور الدجیٰ و نجوم الھدیٰ ـــــ امابعد ـــــ از فقیر حقیر عبدالعزیز عفا اللہ عنہ، والحق بسلف الصالحین فی المکارم و المآثر مطالعہ فرمایند ـــــ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من جنابہ الکریم ان یعافینا و ایاکم آمین ـــــ ہرچند بذکر جمیل اشیاء پیوستہ رطب اللسان

بودیم و در پیشِ ارباب بصیرت دفترِ مناقب و احوالِ ایشاں میکشودیم لیکن بحسبتِ عدمِ وصولِ مکاتیب بہجت اسالیب کہ بمنزلۂ نصف الملاقات است بلابل شوق در بساتین ارواح بنغمات یا آسنی علی یوسف چوں ہزار داستان در ترنم می آمد و نیز از ان اشتیاق در کانونِ سراپۂ شعلہ بری زود عساکر اندوہِ فراق بہ ولایاتِ قلوب میتاخت و طائرِ جان را بلجامِ انکار در ریاضت می انداخت ـــــ الحمد للہ کہ صحیفۂ شریفہ متضمن معارفِ حقہ و وجدانیات مطابقِ خاطرِ فاتر را گل گل شگفانید و از قیدِ انتظار رہانید ـــــ

نقلتُ لہ اہلاً وسہلاً و مرحبا بخیر کتاب جاء من خیر کاتب فان کان حسنی فی العیان مغیبا فلیس لدی صدری و قلبی بغائب ـــ ہذا وقد طالعتُ معارفکم المکتوبۃ فی ذیل الصحیفۃ فوجدتہا صحیحۃ المعانی راسخۃ المبانی زاد اللہ فی عرفانکم و رفع شانکم ـــــ الا آنکہ دریں معارف بفصلِ دیگر کہ از مذوقاتِ حضرتِ ولی نعمت قدس اللہ سرہ، داز مدرکات ایں فقیر است نیز فہم باید کرد و آن آنست ..... ایں حالت عجب حالت است کہ بہ سبب غلبۂ ..... سکمہ و مرہٹہ و جٹ بر بلادِ مسلمین و نہب اموالِ ایشاں و انتہاکِ حرمتِ ایشاں دل و جاں آسائش را فراموش نمودہ چنانچہ فقیر نیز مع قبائل بمراد آباد انتقال نمودہ است و تمام میانِ دو آب زیر و زبر بر فعالِ فرسانِ ایں بدکیشاں شد لیکن الحمد للہ کہ ایں فقیر و قریۂ بہجت و برادر صاحب کلاں ہمہ با بردہ و ناموس جان و مال بسلامت ماندیم و السلام ـــ از طرف ہمہ صغار و کبارِ اینجا خصوصاً والدہ صاحبہ و میاں رفیع الدین و عبد القادر و خواجہ محمد امین بجمیع دساکر یاراں سلام شوق خوانند ـــــ

ترجمہ ـــــ بسم اللہ الرحمن الرحیم ـــــ حقائق و معارف آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ ..... السید ابو سعید حسنی ـــ اللہ تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے اور اس درجہ پر پہنچائے جس کی وہ تمنا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبے پر فائز کرے آمین ـــــ

اللہ کی حمد ہے کہ اس نے اپنے اولیاء کی زبانوں کو بے شمار معارف کے ساتھ کھولا اور ان پر وہ عوارف ظاہر فرمائے جن کو گنا نہیں جا سکتا ـــــ صلوٰۃ و سلام سید الانبیاء

والا ولیا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ پر اور ان کے آل و اصحاب پر جن میں سے ہر ایک بدر الدجیٰ اور نجم الہدیٰ تھا ـــــ بعد حمد و صلوٰۃ ـــــ فقیر حقیر عبد العزیز کی طرف سے مطالعہ فرمائیں ـــــ اللہ تعالےٰ اس کے گناہ معاف کرے اور اس کو مکارم و مآثر میں سلفِ صالحین سے لاحق فرمائے ـــــ الحمد للہ عافیت سے ہوں اور ربِ کریم سے یہی درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو عافیت سے رکھے آمین ـــــ چند کہ آپ کے ذکرِ جمیل سے ہم ہمیشہ رطب اللسان رہتے تھے اور ارباب بصیرت کے سامنے آپ کے دفترِ مناقب و احوال کھولتے رہتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ کے مسرت آمیز خطوط نہیں آ رہے تھے جو کہ نصف ملاقات کی مانند ہوتے اس لیے ہم سب کے عنادلِ شوق باغات ارواح کے اندر غم جدائی میں چہچہا رہے تھے اور اشتیاق کی آگ دلوں کی بھٹی میں بھڑک رہی تھی نیز اندوہِ فراق کے نشکر ممالکِ قلوب پر چڑھائی کر رہے تھے اور ہم کو افکار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ الحمد للہ کہ (ایسی حالت میں) صحیفۂ شریفہ پہونچا جو کہ معارفِ حقہ اور وجدانیات مطابقہ پر مشتمل تھا اور جس نے دلِ غمگین کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیا اور قیدِ انتظار سے رہائی دی ـــــ میں نے کہا کہ مرحبا اچھے کاتب کے پاس سے اچھا خط آیا ہے اگرچہ وہ کاتب میری نظر سے غائب ہے مگر میرے سینے اور قلب سے غائب نہیں ہے ـــــ میں نے آپ کے لکھے ہوئے معارف کا مطالعہ کیا جو اس مکتوب کے ذیل میں تھے ـــــ میں نے ان کو معارف کو صحیح اور پختہ پایا۔ اللہ تعالےٰ آپ کے عرفان کو اور بڑھائے اور آپ کی منزلت کو بلند فرمائے ـــــ مگر اتنی بات ہے کہ ان معارف میں ایک اور تفصیل بھی سمجھ لینی چاہیے جو حضرت ولی نعمت قدس اللہ سرہٗ (حضرت شاہ ولی اللہؒ) کے ذوق کی چیز ہے اور اس فقیر کے مدرکات میں سے ہے ـــــ (آگے وہ تفصیل ہے جو یہاں پر رقم ہونے کی بنا پر پیش نہیں کی گئی) .....

اس وقت عجیب عالم ہے کہ بلادِ مسلمین پر غلبۂ سکھ و مرہٹہ و جٹ کے باعث اور ان کے اموالِ مسلمین کو لوٹنے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرنے کی وجہ سے دل و جان نے آسائش و آرام کو فراموش کر دیا ہے چنانچہ فقیر بھی مع تمام اہل و متعلقین مراد آباد

آگیا ہے۔ دوآبے کی تمام سرزمین مذکورہ بالا قوموں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زیر و زبر ہو گئی ہے۔ الحمد للہ فقیر اور قریہ کہلت (کے ساکنین اور بڑے بھائی و شیخ محمد قصبہ بڈھانہ میں) بعزت و آبرو اور جان مال کی سلامتی کے ساتھ ہیں ـــــ والسلام ـــ یہاں کے تمام خرد و کلان کی طرف سے خصوصاً والدہ ماجدہ کی جانب سے اور میاں رفیع الدین، عبدالقادر اور خواجہ محمد[2] امین صاحب نیز تمام دوستوں کی طرف سے سلام پہونچے۔

مکتوب (۲) سلالہ دودمانِ نجابت دخلاصۂ خاندانِ کرامت، مجمع المحاسن میر ابوسعید اسعدہم اللہ تعالیٰ بعد تحیات اشتیاق مرتسمات از فقیر عبدالعزیز واضح باد ـــــ الحمد للہ علی العافیہ والسلامتہ منہ، والمسئول من اللہ سبحانہ، ان یزیدکما فادکم ـــــ قبل ازیں دو مرتبہ مکاتیب محبت اسالیب رسید متضمن دقائق عجیبہ و

---

[1] الشیخ العالم المحدث محمد بن ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی احد رجال العلم والطریقہ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے صاحبزادے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زوجہ اولیٰ کے بطن سے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد بزرگوار سے مکمل تعلیم حاصل کی اور ان کے انتقال کے بعد قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۲۰۱ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔ بڈھانہ کی جامع مسجد میں آپ کا مزار ہے (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

[2] الشیخ العالم الکبیر الخواجہ محمد امین الولی اللہی الکشمیری ـــــ آپ اصل کے لحاظ سے کشمیری اور سکونت کے لحاظ سے دہلوی ہیں۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے خلفاء میں سے ہیں (آپ پہلے وہ شخص ہیں جو حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف نسبت کر کے ولی اللہی کہے جاتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ان سے بھی اخذ علم کیا ہے جیسا کہ عجالۂ نافعہ سے واضح ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان کے لیے بعض رسائل تصنیف فرمائے ہیں۔ ان کی وفات غالباً ۱۱۸۷ھ میں ہوئی ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اگلے مکتوب گرامی سے واضح ہے (نزہۃ الخواطر جلد ۶)

کشوف صحیحہ بود خیلے مسرور گردانید حق تعالےٰ در ترقیات مراتب عالیہ افزائش کناد۔ تو تن کہ ہموارہ یاد فرمودہ بر احوال سعادت مآل مطلع فرمودہ باشند کہ باعث زیادت اطمینان خواہد بود۔ مزاج فقیر از مدت یکساں بلکہ زیادہ بسبب عارضہ بود دت در طوبت [illegible] للہ در ایں ایام اکثر عوارض زائل شدہ طبیعت رو بصحت گلی آورد۔ مگر گاہ گاہ اندک اثرے ظاہر میشود تدارک آں بادویۂ مجربہ نمودہ می آید۔ خاطر جمع دارند۔ برادران عزیز القدر سلمہم اللہ تعالےٰ سلام می رسانند۔ رفیع الدین بفضل الٰہی از تحصیل علوم فارغ شدہ در مجلس ..... کہ مجمع علماء و فقراء بود دستار تبرک بستہ اجازت درس دادہ شد۔ الحمد للہ مردم بسیارے از تعلیم وے مستفید اند۔ عبد القادر ہم اکثر کتب تحصیل را خواندہ است بمرتبۂ فضیلت رسیدہ ان شاء اللہ ببرکت ارواح طیبہ عنقریب فارغ التحصیل خواہد شد۔ عبد الغنی قرآن را ختم نمودہ در رمضان مبارک گزشتہ در محراب استادہ شد باہتمام تمام در حفظ قرآن شریف اہتمام نمود۔ الحال کتب فارسی شروع کردہ است بعد ماہ مبارک آئندہ قصد ہست کہ شروع در صرف نحو کنائندہ خواہد شد والسلام۔ میر ابو اللیث و دیگر فرزندان را سلام ہمہ ہا رسانند برادر صاحب بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق می رسانند۔ والدہ صاحبہ نیز سلام و دعا گفتہ اند فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلام شوق ابلاغ می نماید۔

ترجمہ ـــــ سلالۂ دودمان نجابت، خلاصۂ خاندان کرامت، مجمع المحاسن میر ابو سعید اسعد ہم اللہ تعالےٰ فقیر عبد العزیز کی طرف سے بعد سلام واضح ہو کہ میں عافیت و سلامتی کے ساتھ ہوں اور اللہ تعالےٰ سے درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ـــــ اس سے پہلے دو محبت آمیز مکتوب ملے جو دقائق عجیبہ اور کشوف صحیحہ پر مشتمل تھے، انھوں نے بہت مسرور کیا۔ حق تعالےٰ مراتب عالیہ میں مزید ترقی عطا فرمائے ـــــ امید ہے کہ (اسی طرح) ہمیشہ یاد فرمارہ کر احوال سعادت مآل سے مطلع فرماتے رہیں گے تاکہ زیادت اطمینان کا موقع ملے ـــــ فقیر کا مزاج ایک سال سے بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے عارضۂ بردوت

و رطوبت کے سبب کسلمند رہتا ہے۔ الحمد للہ ان ایام میں اکثر عوارض زائل ہو گئے ہیں اور طبیعت صوبِ کلی کی طرف متوجہ ہے مگر کبھی کبھی تھوڑا بہت (بیماری کا) اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس کا تدارک مجرب دواؤں سے کیا جاتا ہے۔ خاطر جمع رکھیں ـــــ رفیع الدین بفضلِ الٰہی تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے ہیں ..... مجمع علماء و فقراء میں دستار تبرک ان کے سر پر باندھ کر اجازت درس دے دی گئی ہے۔ الحمد للہ بہت سے لوگ ان کی تعلیم سے مستفید ہوئے ہیں۔ عبدالقادر نے بھی اکثر کتب درسیہ کو پڑھ لیا ہے اور وہ بھی فضیلت و مولویت کے درجے کو پہونچ گئے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو اوراد و اوراد طیبہ کی برکت سے عنقریب وہ بھی فارغ التحصیل ہوں گے ـــــ عبدالغنی نے قرآن شریف ختم کر لیا ہے۔ گزشتہ رمضان المبارک میں انھوں نے پہلی محراب سنائی۔ کامل استعداد کے ساتھ حفظ قرآن میں انھوں نے اہتمام کیا ہے ـــــ اب انھوں نے کتب فارسی پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ اگلے ماہ مبارک (رمضان) کے بعد قصد ہے کہ صرف و نحو شروع کرا دی جائے۔ والسلام ـــ میر ابو اللیث اور دیگر فرزندوں کو سب کا سلام پہونچائیں۔ برادر بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق پہونچاتے ہیں۔ والدہ صاحبہ بھی سلام و دعا فرماتی ہیں۔ فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلام شوق پہونچاتا ہے۔

مکتوب (۳) بہ زبان عربی ..... السید الجید والشریف الاید طُرّۃ ناصیۃ السیادۃ غُرّۃ جبہۃ السعادۃ۔ بنوی الاخلاق والمآثر علوی الاعراق والمفاخر سید ابوسعید اکرمہ اللہ بشہودہ وافاض علیہ برکات ابائہ وجدودہ الفقیر عبدالعزیز یرفع علیکم التحیات الوافیہ والدعوات الذاکیہ بکرۃً وعشیًا ویذکرہمکارمکم السنیہ و مناقبکم العلیہ اناء الصباح واطراف المساء ..... هذا وقد مضیٰ زمانٌ طویل لم نطّلع علیٰ خبرٍ من اخبارکم ولم نعرف اثرًا من آثارکم ولا اکرمتمونا فی هذہ المدۃ المدیدۃ بصحیفۃ وما کان ذلک ظنّنا بکم فالمرجو منکم ان لا تنسونا من لطیف مکاتیبکم فانّ

المکاتیب نوع مواصلۃ۔ والسلام

الشیخ الکبیر محمد و رفیع الدین و عبدالقادر و عبدالغنی و شیخ محمد عاشق و مولانا نوراللہ و بابا فضل اللہ و خواجہ محمد امین و شیخ محمد جواد و شیخ محمد فائق کلہم یُسلّمون علیکم ویُقبّلون یدیکم والسلام۔

ترجمہ ـــــ ..... السید المجید والشریف الاید ... سید ابوسعید اللہ تعالےٰ ان کو اپنے شہود سے مکرم کرے اور ان پر ان کے آباد اجداد والے فیوض و برکات برسائے

فقیر عبدالعزیز صبح و شام آپ کے لیے دعاہائے فراواں اور رات دن آپ کے مکارم اخلاق اور مناقب عالیہ کا تذکرہ کرتا رہتا ہے ..... ایک طویل زمانہ گزر گیا کہ آپ کی کوئی خیر خبر نہیں ملی اور آپ کے آثار میں سے کوئی اثر معلوم نہ ہوسکا اور نہ آپ نے اس مدتِ مدیدہ میں اپنے مکتوب گرامی سے سرفراز فرمایا۔ آپ سے ایسی امید نہ تھی آپ سے تو یہ امید ہے کہ ہمیں اپنے مکاتیب سے فراموش نہ فرمائیں گے اس لیے کہ مکاتیب ایک قسم کی ملاقات ہوتے ہیں ـــ والسلام ـــ برادر بزرگ شیخ محمد، رفیع الدین، عبدالقادر، عبدالغنی، شیخ محمد عاشق، مولانا نوراللہ، بابا فضل اللہ، خواجہ محمد امین، شیخ محمد جواد اور شیخ محمد فائق (ابن شیخ محمد عاشق) یہ سب کے سب آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی دست بوسی کرتے ہیں۔ والسلام۔

مکتوب ۔ میر ابوسعید رائے بریلوی بنام صاحبزادگان شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

(بہ زبان عربی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــــ الحمد للہ الذی جعل المحدثین المجتبین والعلماء ورثۃ الانبیاء وعلمہم اسرار شیوناتہ وتنزلاتہ فی مدرستہ الازلیہ..... وعزّزہم بالعزّۃ القدسیۃ حیث قال ذوالعظمۃ والکبریاء انما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ والصّلوٰۃ والسّلام علی افضل الرُّسُل والانبیاء وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ الّذین ھُم نجوم الاھتداء وعلیٰ مشایخنا الکرام والنقباء ـــ امّا بعد فتح الکلام بمفاتح التحفۃ التحیر والاکرام فیسلم

علیکم ویسئل احوالکم الکریمہ المحب المخلص الداعی الی جناب العالی ابوسعید ..... مولانا ومخدومنا الشیخ عبد العزیز وشیخ محمد وشیخ رفیع الدین وشیخ عبد القادر وشیخ عبد الغنی سلمکم اللہ تعالی بالبرکات واممکث اللہ وجودکم فی الدنیا بالحفظ والامان ویسرکم فی الدار الآخرۃ باعلی الجنان وصانکم اللہ من الآفات والعاھات بحرمۃ النبی آخر الزمان وبعد فان سألتم عن احوالی فللہ الحمد والمنۃ شرفنا اللہ تعالی بزیارۃ الحرمین الشریفین زادھما اللہ شرفا وتعظیما ودخلنا فی شھر ربیع الثانی فی مکۃ الشریفۃ فی آخر ثلث اللیل وکان الوقت مبارکا منورا بجذبا الیھا حتی دخلنا من باب السلام مع ابنی ورفقائی بین یدی الکعبۃ المبارکۃ وشفنا ھا ودعونا فی حقنا وفی حق مشایخنا واصولنا وفروعنا وجمیع المؤمنین والمؤمنات ما کان ینبغی لھم وادینا العمرۃ وسعینا بین الصفا والمروۃ ولثنا فیھا ..... واعطانا اللہ فیھا برکۃ معنویۃ ـــــ یوما کنت فی منزلی مضطجعا متیقظا متفکرا فی سر الکعبۃ الشریفۃ وطوافھا وخصوصیتھا فی ھذا المکان المخصوص دون مکان آخر ـ تبادر الی اللہ تعالی حقیقۃ الکعبۃ وسر طوافھا وھی الخ ..... والملتمس من حضرتکم اذا وصل ھذا الورق الی جنابکم الاعلی ان تلاحظوا مضمونھا وتدعون ما کان الخیر فی حقنا ان اللہ لا یضیع اجرکم کتبت عجلۃ لا تنظروا الی قصورنا فی العلم ـ العاقبۃ بالعافیۃ والسلام والاکرام ـ

ترجمہ مکتوب شاہ ابوسعید حسنی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ..... بعد الحمد والصلوٰۃ ..... دعا گو ابوسعید آپ حضرات کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے ..... "آپ حضرات" سے میری مراد .....

مولانا و مخدومنا شیخ عبدالعزیز، شیخ محمد، شیخ رفیع الدین، شیخ عبدالقادر اور شیخ عبدالغنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو برکات کے ساتھ سلامت رکھے اور دنیا میں آپ کا وجود حفظ و امان کے ساتھ قائم رکھے نیز آخرت میں اعلیٰ جنت نصیب فرمائے اور (اس جہان میں) آفات و بلیات سے محفوظ رکھے بحرمۃ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ....

... اللہ کی حمد ہے اور اس کا احسان ہے کہ اس نے ہم کو حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف فرمایا۔ زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً۔ ہم مکہ معظمہ میں ربیع الثانی کے مہینے میں رات کے آخری ثلث میں پہونچے تھے۔ وہ وقت بڑا ہی مبارک اور منور تھا اور اس وقت ایک خاص کشش خانۂ کعبہ کی طرف تھی ـــــ چنانچہ ہم اپنے لڑکے (میر ابواللیث) اور اپنے رفقاء کے ساتھ باب السلام سے (مسجد الحرام میں) داخل ہوئے اور کعبۂ مبارکہ کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی اور اپنے حق میں اور اپنے مشائخ، اصول و فروع اور جمیع مومنین و مومنات کے حق میں دعائے خیر کی۔ پھر ہم نے عمرہ ادا کیا اور (طواف کے بعد) صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ـــــ مکہ معظمہ میں ہم کئی دن عمرے اللہ تعالیٰ نے ہم کو مکہ معظمہ میں برکتِ معنویہ عطا فرمائی ـــــ وہاں ایک دن میں اپنی قیام گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ جاگ رہا تھا اور کعبۂ شریفہ کی حقیقت کے سلسلے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے طواف میں کیا مصلحت ہے اور دوسرے مقامات کو چھوڑ کر اسی مکان مخصوص کی کیا خصوصیت ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مجھے حقیقتِ کعبہ اور اس کے طواف کی مصلحت و خصوصیت سے آگاہ فرمایا اور وہ یہ ہے ..... [یہ ایک دقیق اور خالص الہامی مضمون ہے اس لیے اس کو یہاں درج نہیں کیا گیا] (آخر میں ہوا) آپ حضرات سے التماس ہے کہ جب یہ رقعہ آپ کی خدمت عالی میں پہونچے تو اس کے مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمالیں اور ہمارے حق میں جو خیر ہو اس کی دعا فرمائیں ـــ اللہ تعالیٰ آپ کا اجر ضائع نہیں فرمائے گا ـــــ میں نے یہ خط عجلت میں لکھا ہے ـــــ ہمارے قصور علمی پر نظر نہ فرمائیے گا ـــــ انجام عافیت کے ساتھ ہو ـــ والسلام والاکرام ـــــ

جواب از طرف حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (بہ زبان عربی)

مکتوب (۴) ـــــ بسم اللہ الرحمن الرحیم ـــــ الحمد للہ الذی کشف اسرار العوالم صغیرھا وکبیرھا وکلھا وجزءھا وغیبتھا وشھادتھا وارواحھا ومثالھا علی من یشاءُ ـــــ لاسیماً النبی الأمّی الھاشمی البالغ الغایۃ القصوی فی الاعتلاءِ صلّی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ ما دامت الارض والسماء ـــــ الی السیّدِ الحسیبِ النسیبِ العارف اللبیبِ صاحب الکمالاتِ العالیہ والمعارف السنیّہ ـــ حاج الحرمین الشریفین زائر المکانین المحترمین وارث الاسرار بالاستحقاق، مصداق السعید من سعد فی بطنِ اُمّہ بلاخلاف وشقاق سلمہ اللہ تعالیٰ وعجّل لنا بالخیر والسلامۃ لُقیاہُ من الفقیر عبد العزیز وسائر اخوانہ المشتاقین الی لقائکم الراغبین الی اللہ فی طولِ بقائکم ـــ امابعد ـــ فقد وصلتِ الرقیمہ الکریمہ منبئۃً عن سلامۃِ ذاتکم مخبرۃً عن تفاصیل حالاتکم مُبشّرۃً بحصول الحج الشریف والزیارۃ المنیف لکم ولولدکم الارشد ورفقائکم وانکم قد دعوتُم فی ذلک المکان المعظم والمکرم المجسم فی تلک الساعۃ المیمونۃ المبارکۃ المفخمۃ لجمیع المومنین والمومنات ولذوی الحقوق منکم علی التخصیص المرجوانّ دعائکم ان شاء اللہ مستجابٌ بلاشکٍّ ولاارتیاب جزاکم اللہُ تعالیٰ احسن الجزاء ورزقکم حُسن المآب ـــــ فحمدنا اللہ تعالیٰ علی کُلّ ذلک وشکرناہ وغبطنا لانفسنا وتمنیناہُ إنّ اللہَ تعالیٰ علی تحصیلہ لنا قدیر ..... وامّاما اشرتم الیہ مِن حصول البرکات المعنویہ فی تلک الاماکن العالیہ فذلک ھو الیقین والصّواب وقرّۃُ عین الاحباب ادام اللہ لکم الترقیات وشرّفکم العوالی التجلیات وامّاما کتبتُم

فی سرّ الکعبۃ وطوافھا فھو امر مطابق لکشف الکبار من الاولیاء رضوان اللہ علیھم اجمعین ..... وبالجملۃ تمکشوفکم حق وصواب ھنیئاً لکم امثال ھذہ المعارف الحقّیہ والعلوم العمیقۃ الدقیقۃ واما ما التمستم من الدعاء فنحن نلتمس منکم اضعافہ ولا نغفل عن الدعاء فی حقّکم وفی حق ولدکم وکل من توسّل بکم طرفۃ عین ــ تقبّل اللہ منّا ومنکم ورزقنا وایّاکم سعادۃ الدارین والسّلام۔ وقد توفّی الی رحمتہ من اصحاب سیّدنا وشیخنا قُدّس سرّہٗ الشیخ اھل اللہ والشیخ محمّد عاشق والشیخ نور اللہ وخواجہ محمد امین وحاجی محمّد سعید البریلوی فادعوا اللہ تعالیٰ فی حقّھم ــــ

ترجمہ ــــ یہ خط عبدالعزیز اور اس کے تمام بھائیوں کی طرف سے ہے ــــ جو مکتوب الیہ کی ملاقات کے مشتاق اور ان کی طول عمر کے اللہ تعالےٰ سے خواہاں ہیں۔ ــــ اور حبیب ونسیب عارف لبیب صاحب کمالات ومعارف عالیہ حاجی حرمین شریفین زائر مکانین محترمین ..... (میر ابوسعید) کی طرف لکھا جارہا ہے ــــ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور خیر وعافیت کے ساتھ ہم کو جلد ان کی ملاقات میسر کرائے ــــ ــــ بعد حمد وصلوٰۃ واضح ہو کہ مکتوب گرامی ملا جو آپ کی سلامتی کی اطلاع اور آپ کے تفصیلی حالات کی خبر دینے والا تھا ــــ اس میں حصول حج وزیارت کی خوشخبری بھی تھی اس خط سے معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے (میر ابواللیث) اور آپ کے رفقاء کو بھی یہ سعادت حج وزیارت نصیب ہوئی ــــ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے اس مقام معظم ومکرم (مسجد الحرام) میں ساعت سعید کے اندر تمام مومنین ومومنات کے لیے عموماً اور اہل حقوق کے لیے خصوصاً دعا فرمائی۔ امید تو یہی ہے کہ آپ کی دعا ان شاء اللہ تعالےٰ بے شک وشبہ مستجاب ہوگی ــــ اللہ تعالےٰ آپ کو بہترین جزا دے اور آخرت کی بھلائی عطا کرے ــــ ہم نے آپ کا خط پڑھ کر مندرجہ مکتوب باتوں پر اللہ کی حمد کی اور اس کا شکر ادا کیا۔ ہم کو آپ کی اس کامیابی پر غبطہ ورشک ہوا اور اس

کامیابی کی اپنے لیے بھی تمنا کی ـــــ اللہ تعالیٰ اس سعادت و کامیابی کے حاصل کرانے پر قادر ہے ..... آپ نے ان مقامات مقدسہ میں حصولِ برکاتِ معنویہ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ بالکل حق و صواب اور احباب کی آنکھوں کا نور ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ترقیات کو دائماً برقرار رکھے اور آپ کو تجلیات سے مشرف فرمائے ـــــ آپ نے کعبہ اور طوافِ کعبہ کی حقیقت پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی صحیح اور کبار ادلیاء رحمہم اللہ کے مکشف کے مطابق ہے ـــــ ..... حاصل کلام یہ ہے کہ آپ کا مکشوف بالکل صحیح و درست ہے۔ آپ کو اس طرح کے معارفِ حقیہ اور علوم دقیقہ مبارک ہوں ـــــ اور آپ نے دعا کا جو التماس کیا ہے تو ہم بھی آپ سے زیادہ سے زیادہ دعا کی درخواست کرتے ہیں اور آپ کے اور آپ کے صاحبزادے اور آپ کے متوسلین کے حق میں دعا کرنے سے ایک لمحہ غافل بھی نہیں ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی دعا قبول کرے اور ہمیں اور آپ کو سعادتِ دارین نصیب فرمائے ـــــ سیدنا و شیخنا قدس سرہٗ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے اصحاب میں سے یہ حضرات وفات پاکر جوارِ رحمتِ خداوندی میں پہونچ گئے ہیں ـــــ

(۱) شیخ اہل اللہ (۲) شیخ محمد عاشق (۳) شیخ نور اللہ (۴) خواجہ محمد امین (۵) حاجی محمد سعید بریلوی ـــــ ان حضرات مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت فرمائیں ـــــ

لہ الشیخ العالم الصالح محمد سعید بن محمد شریف بن خان محمد بن یار محمد ابن خواجہ احمد الافغانی الدہلوی ـــــ آپ افغانستان میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ تحصیل علم کے لیے دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر کمالاتِ علمیہ سے مالا مال ہوئے۔ آپ بھی سفرِ حجاز میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ اپنے شیخ کی حیات میں برابر خدمتِ اقدس میں رہے۔ بعد وفاتِ شاہ صاحبؒ آپ دہلی سے بانس بریلی تشریف لے آئے۔ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں نے آپ کو اپنے صاحبزادے عنایت خاں کا معلم مقرر کیا۔ چنانچہ آپ نے بریلی ہی میں اقامت کر لی۔ اور وہیں ۱۲۸۵ھ سے کچھ پہلے انتقال فرمایا۔ آپ کے پوتے مولانا نجم الغنی نے صاحب نزہۃ الخواطر

(باقی بر صفحہ ۳۵)

مکتوب سید محمد نعمان حسنی بنام حضرت شاہ ابوسعید حسنی رح

[جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کے آخری حالات اور دیگر نادر معلومات پر مشتمل ہے۔]

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ شانہٗ۔ الحمد للہ علی النعماء والرضا علی القضا والصبر علی المصیبۃ والبلا۔ والصلوٰۃ والسلام علی سید الشاکرین وزبدۃ الراضین وقدوۃ الصابرین شفیع المذنبین ورحمۃ للعلمین محمدٍ وآلہٖ وصحبہ الطیبین الطاہرین وعلی ورثتہ علماء الراسخین واولیاء المرشدین الی یوم الدین بعد ھذا۔ اگر شرح سوگواری ... واقعۂ ارتحال امام سنت وجماعت ومقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زماں سرآمد اولیائے جہاں، قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا ومرشدنا ولی اللہ فاروقی مجددی ثانی دوم الف ثانی رضی اللہ عنہ ازیں عالم پُر ملال بصوب دار الافضال بوصال ذوالجلال بر صفحہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴)
کو یہی سن وفات بتایا ہے مکتوب حضرت شاہ عبدالعزیز رح سے بھی قریب قریب یہی سن وفات معلوم ہوتا ہے ــــ
ــــ (نزہۃ الخواطر جلد ۶) ــــ تاریخ کا یہ زبردست سانحہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رح سے کامل رکھنے والی پانچ اہم اور باکمال شخصیتیں ایک سال کے اندر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اس کا انکشاف حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے مکتوب گرامی سے ہوا ــــ حضرت شاہ ابوسعید حسنی ۱۱۷۳ھ میں حجاز کو روانہ ہوئے اور ۱۱۷۴ھ میں واپس آئے ہیں۔ واپسی پر ۱۱۷۵ھ میں حضرت شاہ عبدالعزیز رح نے ان کو یہ مکتوب لکھا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۷۵ھ میں ان سب حضرات کا انتقال ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۱۷۴ھ سب کا سال وفات ہو یا بعض کا ۱۱۷۴ھ میں اور بعض کا ۱۱۷۵ھ میں وصال ہوا ہو لیکن مولانا نجم الغنی نے اپنے دادا کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ ۱۱۷۴ھ سے کچھ پہلے یعنی ۱۱۷۳ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے جس سے حاجی محمد سعید رح کے لیے ۱۱۷۴ھ متعین ہے۔ مگر دوسرے چار حضرات کے متعلق پھر احتمال ۱۱۷۵ھ کا بھی ہے۔ اسی وجہ سے صاحب نزہۃ نے احتیاطاً ان بقیہ چار بزرگوں کی تاریخ وفات کو ان الفاظ میں لکھا ہے "قد توفی الخ وسنۃ سبع وثمانین ومائۃ والف" نزہۃ الخواطر جلد ۶ میں حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے جس مکتوب گرامی کا کئی جگہ ذکر ہے وہ یہی مکتوب (۴) ہے ــــ

لہ مولانا سید محمد نعمان بن سید محمد ابن سید محمد ہدی ابن عارف باللہ سید محمد علم اللہ حسنی رائے بریلوی قدس سرہم۔

روزگار شبت یادبہر آئینہ ماند حال ما غریباں سر دسے

چہ خاطر رسید باد مرا کہ بہجراں کشید کار مرا

وا مصیبتاہ ـــــ ایں چہ بے نیازی ..... است کہ ہمچیں روح مقتدائے ما در کمتر وقت بعر شصت و دو سالگی نداء ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیہ دادند و اصحاب بدع و ضلال را عشرت آگیں نمودند و اصحاب دین را اندوہگیں کردند یعنی بتاریخ سلخ محرم الحرام ۱۳۱۶ھ یک ہزار و یکصد و ہفتاد و شش یوم السبت وقت الظہر بامر داعی برحق روح مطہر آنحضرت از قالب عنصری مفارقت نمودہ باوج علیین نشیمن ساختہ ..... حالت تمام اصحاب احباب از مفارقت آنجناب چناں تباہ و خراب بود کہ از حیز تحریر بیرون ست ..... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔ رحمۃ اللہ علیہ وعلی من یجنازتہ یتوصلون آمدیم بر اینکہ از فضل الٰہی و تصدق جناب حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم جاذبہ حضرت ایشاں علیہ الرحمۃ ایں عاصی را بسوئے خود کشید بشہر ذی قعدہ در بڑھانہ رفتہ بتقبیل آستانہ منیر کہ استعداد یافتہ و ملازمت جناب قدسی القاب مشرف گردید و بہ حالات خود و توجہات عالیات بیش از بیش یافتہ از انجا کہ حضرت ایشاں بہت تمادی و تدابیر در راہ ذی حجہ تا رسیدن بشہر دہلی بمکان با فضل اللہ در مسجد روشن الدولہ بمحلہ سعد اللہ خاں نزول فرمودند از فرزندان گرامی میاں محمد صاحب و میاں عبد العزیز و میاں رفیع الدین مدظلہم العالی ـــــ و میاں محمد عاشق صاحب و میاں اہل اللہ صاحب و میاں محمد فائق و میاں محمد جواد و محمد امین وغیرہ یاران حاضر خدمت بودند و این غلام و میر محمد عتیق و میر قاسم علی کہ در وقت آخرین شرف انتساب بیعت یافتہ ـــ ہر روز بشرف حضور پر نور خدمت گاری وسیلہ حضور و حضور سعادت اندوز میشدیم۔ مشفقانہ ایں مجلس آخرین عجب مجلسے بود پر فیض و انما مہبط ملائکہ ملکوت و نزول ارواح علیہ ارکان عالم ناسوت میگردید و نفحات انس و رحمت و رشحات قدس و برکت بمثال نزول غیث می بارید۔ اکثر یاران اہل نسبت بوجدان صحو خود می دریافتند ـــ و احسرتا اہل اللہ و عرفا لازال در ہر زمان می باشند اما ایں چنیں مرد با جمعیت اوصاف حمیدہ اعلم بکتاب و سنت با اجتہاد مطلق و در حقائق و

و معارف بحر مواج و دریٔ علوم دیگر محض فیاض پس از صدہا سال می آید ؎

دور ما باید کہ تا یکدم صاحبدل شود باز بیند در خراسان یا سمیل اندر یمن

یاراں می باید کہ مصاحبت و شکیبائی ورزیدہ نسبت رابطۂ حضرت شیخ را بمجامع ہمت و تصور نہادہ بمراقبات معلومہ مشغول باشند ان شاء اللہ تعالیٰ فیض صحبت در رابطہ برابر خواہد بود کما یفیض من بعض رسالاتہ رحمۃ اللہ علیہ ــــ والحمد للہ رضامندیٔ حضرت صاحب قدس سرہ از انصاحب و توجہات عالیات بر حال ایشاں زیادہ از حد بیان یافتہ اکثر اوقات استفسار احوال سامی می فرمودند ما جرائے غارتگریٔ ابدالیاں و رسیدن آنصاحب در عین ریزیدن و انطفاء یافتن التہاب نہیب بسبب قدوم گرامی از زبان دُرفشاں موذی ساختند و شاید کہ نشنود ۔ لقائے آخرین بضمیر منیر بودہ باشد مرۃً فرمودند کہ "میر ابو سعید ارادۂ آمدن دارند اگر زود بروند بہتر باشد" صاحب من ظاہر صحبت ایشاں را دریاستہ کشیدہ تصنیفات آنحضرتؒ قریب تموّل زیادہ در علوم دین از تفسیر و اصول و فقہ و کلام و حدیث مثل حجۃ اللہ البالغہ و اسرار فقہ و منصور و ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا و ترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب ہشتاد و نود جزو کلاں بحجم خواہد بود و دیگر رسائل در حقائق و معارف مثل الطاف القدس و نہجات و فیوض الحرمین و انفاس العارفین وغیرہم کہ نشان از صحبت و برکت خدمت می دہند می باید کہ عزیمت بر ایں آرند کہ ہمہ را نویسانیدہ رائج نمایند تا ندک توجہات سرانجام خواہد یافت و مثل ایں تصنیفات واللہ اعلم در اسلام تصنیف شدہ باشد یا نہ ۔ چنانچہ ارباب بصیرت عبرت یافتہ اعتراف دارند در کلام ایشاں و ہر باب کہ نوشتہ اند اصول است ..... و یقین این فقیر و دیگر صاحبزادہا و یارانِ حضرت بملاحظۂ فرط محبت سامی بجناب حضرت ۔ انیست کہ بحضور و شنیدن ایں حادثۂ عظیمہ ہمت فاتحۂ ردحانیت و زیارت مرقد مطہر راہی انیعوب خواہند شد ــــ لہٰذا منتظر قدوم ہستم اگر زود تشریف بیارند بارے بملاقات سامی مسرور الوقت شوم و اگر توقف در آمدن باشد اعلام نمایند کہ فقیر ہم عزم مراجعت وطن دارد ــــ و دیگر آنکہ میاں محمد عاشق صاحب بعد سلام فرمودہ اند کہ میر ابو سعید جیو را بنویسید کہ ہر مکاتیب

حضرتِ ایشان کہ بجانب آنصاحب شرف صدور یافتہ باشد نقل آنہا البتہ بفرستند کہ داخلِ مکاتیب نمودہ شود از حضرت میاں اہل اللہ صاحب و دیگر یاراں و صاحبزادہا سلام اسم باسم مطالعہ فرمائید ــــ و کیفیت ارتحال و وصالِ مرحوم و مغفور غفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ..... بجناب عالی حضرت صاحبؒ قبلہ در مقام بڈھانہ عرض کردم فاتحہ برو حاینت خواندند و تاسفہا نمودند ــــــ

ترجمہ ــــ باسمہ سبحانہ و تعالیٰ شانہٗ ــــ اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اس کی نعمتوں پر نیز جذبۂ رضا بالقضا کے حصول پر اور مصیبت و بلا میں صبر کے حاصل ہونے پر اور درود و سلام سید الشاکرین، زبدۃ الراضین، قدوۃ الصابرین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ پر اور (آپ کے ضمن میں) آپ کے آل و اصحاب پر جو کہ طیب و طاہر تھے اور آپ کے وارثین یعنی علماء راسخین اور اولیاء مرشدین پر تا قیام قیامت ــــــ

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ امام سنت و جماعت، مقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زمان، مرکزِ اولیاء جہان، قطبِ زمانی، محبوبِ سبحانی سیدنا و مرشدنا ولی اللہ فاروقی مجددی قدس اللہ سرہ کے انتقالِ پُر ملال کا واقعہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہم جیسے غمزدہ لوگوں کے مناسب حال ہے ــــ ہمارے دوست کے دل میں کیا آیا کہ ہمیں فراق و مہجوری میں مبتلا کر گیا ــــ وامصیبتاہ ــــ اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا عجیب نمونہ ہے کہ ایسے مقتدا کی روح کو صرف ۶۲ سال کی عمر میں ارجعی الیٰ ربکِ راضیۃ مرضیہ (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہو کر رجوع ہو جا) کی ندا دے دی گئی اور بدعت و ضلالت والوں کو خوش اور اصحاب دین کو اندوہگین کر دیا گیا ــــ یعنی محرم الحرام ۱۳۸۶ھ کی آخری تاریخ میں ہفتے کے دن ظہر کے وقت حکم خداوندی کے مطابق حضرتِ اقدس کے طائر روحِ مطہر نے اوج علیین پر اپنا نشیمن بنالیا .....

اصحاب و احباب کی حالت، آنجنابؒ کی مفارقت سے ایسی خراب و خستہ تھی کہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتی ..... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ــــــ

اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ پر اور آپ کے متوسلین پر نازل ہو ــــــ

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں ــــ فضلِ الٰہی سے اور درگاہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم کے صدقے میں اس عاصی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کشش نے اپنی طرف کھینچا چنانچہ ذی قعدہ (۱۱۷۵ھ) کے مہینے میں بڈھانہ ضلع مظفر نگر جاکر آستاں بوسی کی سعادت حاصل ہوئی اور جناب قدسی القاب (حضرت شاہ صاحبؒ) کی صحبتِ اقدس سے مشرف ہوا۔ بڈھانہ سے حضرتِ ایشاں ۹ ذی الحجہ (۱۱۷۵ھ) کو بغرض علاج شہر دہلی تشریف لے آئے اور وہاں بابا فضل اللہ کے مکان پر مسجد[1] روشن الدولہ کے احاطے میں جو چوک سعد اللہ خاں میں واقع ہے ــ فروکش ہوئے ــــ فرزندانِ گرامی قدر میں سے میاں محمد میاں عبد العزیز، میاں رفیع الدین مدظلہم العالی (اور اقربا و متوسلین میں سے) میاں محمد عاشق صاحب، میاں اہل اللہ صاحب، میاں محمد خالق، میاں محمد جواد (پہلتی) اور خواجہ محمد امین وغیرہ حاضرِ خدمت تھے۔

یہ غلام اور میر محمد عتیق نیز میر قاسم علی (ساکنانِ رائے بریلی) جو کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے آخری ایام میں شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے تھے۔ ہر روز حاضری اور خدمتگاری سے سعادت اندوز ہوتے رہتے تھے ــــــ

مشفقِ من! یہ آخری مجلسیں بھی عجیب پُر کیف اور پُر فیض تھیں ..... نفحاتِ اُنس و رحمت اور رشحاتِ قدس و برکت بارش کی طرح برستے تھے۔ اکثر اہل نسبت حضرات اپنے وجدانِ صحیح سے اس کو محسوس کرتے تھے ــــ ..... اہل اللہ اور عارف تو ہمیشہ ہر زمانے میں ہوتے ہیں مگر ایسا مردِ حقانی جو جمیع اوصافِ حمیدہ کا حامل ہو اور جو

---

[1] مسجد و مدرسہ روشن الدولہ ــــ شاہجہاں آباد (دہلی) میں یہ عمارتیں دریبے کے اندر نواب؟ روشن الدولہ کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ۱۷۲۲ء میں نواب موصوف نے بنوائی تھیں ــــ مسجد کے برج سنگ مرمر زرد کے بنے ہوئے ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں۔ بڑے در کی پیشانی پر کتبہ کندہ ہے مدرسہ کا مکان ۱۸۵۷ء سے کوتوالی کے متعلق ہو گیا ہے (مزارات نگار مولفہ عبد الحق دہلوی)

کتاب وسنت کا اجتہادی شان سے بہترین عالم ہونیز حقائق ومعارف میں بحر مواج ہو اور دیگر علوم میں دریائے زخار ہو ـــــ صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہو (مگر بڑی مشکل سے ہوتا ہو جہاں میں دیدہ ور پیدا) ..... دوستوں کو چاہیے کہ صبر وشکیبائی کو اختیار کر کے حضرت شیخ کی نسبت رابطہ کو ہمت کے ساتھ تصور میں لاکر مراقبات معلومہ میں مشغول رہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو فیض صحبت در رابطہ برابر باقی رہے گا جیسا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض رسائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے ـــــ یہ امر بھی لائق حمد ہے کہ حضرت صاحب قدس سرہ کی آپ سے رضامندی اور آپ پر ان کی توجہات عالیہ کو میں نے حد بیان سے زیادہ پایا۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے ـــــ ابدالیوں کی جنگ کا واقعہ اور آپ کا عین اس ہنگامۂ قیامت خیز میں پہونچنا اور آپ کے قدوم گرامی سے آتش فتنہ کا فرو ہو جانا۔ ان باتوں کو حضرت قدس سرہ اپنی زبان دُرفشاں سے بیان فرمایا کرتے تھے ـــــ شاید آپ سے آخری ملاقات کی تمنا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تھی چنانچہ ایک مرتبہ یوں فرمایا "میر ابوسعید آنے کا ارادہ کر رہے ہیں اگر وہ جلدی آجائیں تو اچھا ہو" ـــــ

صاحب من! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آسکتی البتہ علوم دینیہ میں ان کی تصنیفات نو[1] کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں ـــــ تفسیر، اصول فقہ، کلام اور حدیث میں ـــــ جیسے حجۃ اللہ البالغہ، اسرار فقہ، منصور، ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفا جن میں سے ہر ایک کی کافی بڑی ضخامت ہے ـــــ ان کے علاوہ دیگر رسائل ہیں جو حقائق ومعارف پر مشتمل ہیں۔ جیسے الطاف القدس، لمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہا۔ یہ کتابیں آپ کے فیوض وبرکات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ قصد اس امر کا کریں کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج فرمائیں۔ یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پاسکتا ہے ـــــ معلوم نہیں کہ ایسی تصنیفات گزشتہ دور میں ہوئی ہیں یا نہیں؟ واللہ اعلم ـــــ ارباب بصیرت ان کتابوں کی افادیت کا اقرار کرتے ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] یہ دونوں کتابیں ان کی کی فہرست تصانیف میں موجود نہیں ہیں۔

کا کلام ہر باب میں اصولی حیثیت رکھتا ہے۔ ..... اس فقیر کو اور صاحبزادگان نیز تمام یارانِ حضرتؒ کو آپ کی محبت کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ جیسے ہی آپ اس حادثۂ عظیمہ (وفات حضرت شاہ صاحبؒ) کی خبر سنیں گے (فوراً) فاتحہ پڑھنے اور مرقد منور کی زیارت کرنے کے لیے دہلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں منتظر قدوم ہوں اگر جلدی تشریف لائیں تو میں ملاقاتِ سابق سے مسرور الوقت ہو جاؤں ــــ اگر تشریف لانے میں کچھ دیر ہو تو مطلع فرما دیں کیونکہ فقیر بھی وطن کو واپس جانے کا قصد رکھتا ہے ــــ دوسری بات یہ ہے کہ میاں محمد عاشق صاحب (جو آپ کے) بعد سلام فرماتے ہیں کہ میر ابو سعید کو لکھو کہ حضرت اقدسؒ کے جتنے مکتوبات بھی ان کے نام صادر ہوئے ہیں ان کی نقول ضرور بھیجیں تاکہ ان کو داخلِ مکاتیب کیا جائے۔ حضرت میاں اہل اللہ صاحب اور دیگر متوسلین نیز صاحبزادگان کی طرف سے نام بنام سلام صادر فرمائیں۔ میں نے بدھانہ میں حضرت اقدسؒ کی خدمت میں مرحوم و مغفور غفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روح کو ایصال ثواب کیا تھا اور بڑا افسوس ظاہر فرمایا تھا۔

دارالعلوم دیوبند سے ایک عربی مجلے کا اجراء

سہ ماہی مجلّہ "دعوۃ الحق" دیوبند

دارالعلوم دیوبند ملت کا وہ عظیم الشان مذہبی علمی اور ثقافتی مرکز ہے جس پر برصغیر کے مسلمانوں کو بجا طور پر ناز ہے مدت سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اس مرکز کی آواز عالم اسلام تک پہونچائی جائے اور اس کے فکر و مسلک کو اس کی اپنی روایات کی روشنی میں عرب ممالک سے متعارف کرایا جائے۔

چنانچہ "دعوۃ الحق" کے نام سے ایک سہ ماہی عربی مجلے کا اجراء کیا گیا ہے جس میں اکابر علماء دیوبند کے علوم اور انکی تحقیقات عربی کے قالب میں پیش کی جائیں گی، نیز وقت کے اہم موضوعات پر بصیرت افروز مقالات کے علاوہ دنیائے اسلام کے ممتاز اہل قلم کے علمی و دینی مقالات بھی شامل اشاعت ہوں گے۔

شوال ۱۳۸۴ھ میں پہلا شمارہ منظر عام پر آچکا ہے جس نے ملک کے ارباب علم و اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ــــ سال کے چار شماروں کے لیے زر اشتراک مبلغ چار روپے اس پتہ پر روانہ فرمائیں۔

منیجر مجلّہ "دعوۃ الحق" دارالعلوم دیوبند

کائنات میں خدا کی گواہی

(جناب وحیدالدین خاں صاحب)

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لیے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہو کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہو جائیں۔ اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔

زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کے باوجود وہ ہمارے تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجیے۔ اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی۔ مثلاً یہ کرہ زمین اگر چاند اتنا چھوٹا یعنی اس کا قطر موجودہ کی نسبت سے ½ ہوتا تو اس کی کشش ثقل زمین کی موجودہ کشش کا ¼ رہ جاتی۔ کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہو جاتا کہ وہ پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے۔ چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے۔ ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے اور دن کے وقت تنور کی مانند جلنے لگتا ہے۔ اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اسی بنا پر ایک سائنسداں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ GREAT BALANCE WHEEL[1] کہا ہے۔

[1] MAN DOES NOT STAND ALONE P. 28

کا نام دیا ہے۔ اور ہوا کا موجودہ غلاف اٹھ کر فضا میں گم ہو جاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا۔ اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی۔ کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی۔ اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہو جاتا جس کا ردِ عمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوتا۔ اور اگر زمین سورج سے اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی۔ ہوا کے غلاف کی بازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہونچتا۔ اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشو و نما ممکن نہ رہتا۔ ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو جاتا۔ انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہو جاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ کیوں کہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لیے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں۔ زمین گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں۔ کوئی شخص ہندستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے اور امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندستان اس کے نیچے ہوگا۔ پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہوا کا انجام وہی ہونا چاہیے جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھما دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ زمین کے اندر غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے۔ اس دو طرفہ

عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے۔ ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے۔ یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ۔ آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے۔ دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے اسی لیے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا۔ جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا۔

وائٹ ہیڈ (A. N. WHITEHEAD) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے تو وہ ہم کو توجیہہ نہیں دے سکتی۔ ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا۔ تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں۔ جبکہ مردہ کائنات میں کسی مقصد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔"

THE AGE OF ANALYSIS P. 85.

وائٹ ہیڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحب شعور کے زیر انتظام نہیں ہے تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے۔ فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے ایسی صورت میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے۔ گرمیوں کا سخت سورج ہر دن تمام نباتات کو جلا دیگا۔ اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا۔ سورج جو اس وقت

ہمارے لیے زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے۔ اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کہ زندگی باقی نہ رہے۔ یہی صورت اس وقت پیدا ہوگی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے۔ مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہو جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آباد کاری کے قابل ہو گیا ہے اور مختلف قسم کی نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا۔ سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان۔ اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا۔

اگر سائنسدانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداءً زمین کا درجہ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے۔ یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ۔ اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجہ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے۔ اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا۔ اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ غالباً ایک بلین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی۔ زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا

ایک بڑا حصہ خلا میں چلا گیا، ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے۔ یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے ——— کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جاتیں۔ یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار زیادہ ہوتی۔ دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشو و نما پا سکے۔

زمین کی دوہری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں۔ اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے۔ یہ شہابیے چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں۔ وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے۔ شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نو گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی۔ مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیاوی اہمیت رکھنے والی شعاعیں (ACTINIC RAYS) اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہونچتی ہیں جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لیے ضرورت ہے۔ جس سے مضر بکٹیریا مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن ہے۔ باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں۔ اس

فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے۔ موجود آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے اور وہ دنیا کے تمام پانی کا ۸/۹ حصہ بناتا ہے۔ آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لیے سانس لینے کا ذریعہ ہے اور اس مقصد کے لیے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لیے ضروری تھا۔ مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲۱ فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جزو ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا۔ اسی طرح اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہو زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر زندگی قائم ہے۔ اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں۔ ایک عالم طبیعات کے الفاظ میں:

SCIENCE HAS NO EXPLANATIONS TO OFFER FOR THE FACTS, AND TO SAY IT IS ACCIDENTAL IS TO DEFY MATHEMATICS (P. 33)

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہہ کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (DENSITY) پانی سے کم ہوتی ہے۔ پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ چیز بقائے حیات کے لیے زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے اور دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کی تہہ میں بیٹھ نہیں جاتا۔ ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے۔ یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے۔ اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے برف فوراً پگھل جاتا ہے۔ اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب امریکہ میں انڈوتھیا (ENDOTHIA) نام کی بیماری شاہ بلوط (CHESTNUT) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا "یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے۔" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا۔ اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لیے خاص تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا۔ اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پُر ہو گئے۔ کچھ دوسرے درخت (TWIN TREES) اپنی نشوونما کے لیے شاید انہیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے۔ شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی جزو تھے اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے۔ لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں۔ یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں۔ اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تختوں کے کام آسکتی ہے ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے۔ ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لیے بوئی گئی ہے۔ آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی۔ وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کر دیا۔ اور زراعت کو ناممکن بنا دیا۔ کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی۔ ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لیے نکلے۔ یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی۔ وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پا لیا اور اب وہاں سے اس معیبت کا خاتمہ ہو گیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط و توازن (CHECKS AND BALANCES) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہے۔

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی تعلیت پائی جاتی ہے۔ یہ جامد بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے۔ "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہوگا ——— ایک ایسا مرکب جس میں ۱۱ فیصد ہائیڈروجن اور ۸۸ فیصد آکسیجن۔

ایک سائنسداں جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ ہے جبتک ہوا کا دباؤ (ATMOSPHERIC PRESSURE) ۷۶۰ ایم۔ ایم رہے۔ اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لیے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے۔ اس طرح نقطۂ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر ہوا کا دباؤ ۷۶۰ ایم ایم سے زیادہ ہو تو نقطۂ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو جائے گا۔ یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جا سکتا ہے کہ

پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے۔ اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لیے کوئی بنیاد نہ ہوتی۔ کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعات کے لیے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریقِ عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نو وارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے وہ عناصر میں نظم اور دوریت ہے۔ سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا مینڈلیف (MENDELEEV) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دوری نقشہ (PERIODIC CHART) کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پُر ہو گئے۔ ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کیے جاتے ہیں۔ جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں PROTONS کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے۔ یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے، اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے۔ ہیلیم میں دو اور یورینیم میں تین۔ مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لیے ممکن ہو سکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے۔ نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر ۱ کی شناخت محض اس کے ۱ پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی۔

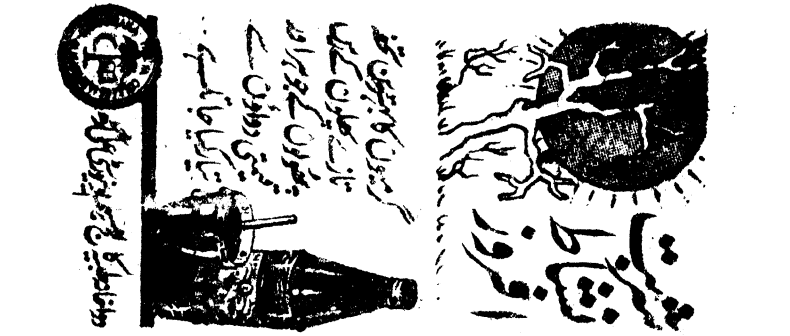
قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (PERIODIC CHANCE) نہیں کہتے بلکہ اس کو دوری ضابطہ (PERIODIC LAW) کہتے ہیں۔ مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کر یگی۔

"۱۱ اگست ۱۹۹۹ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا۔ جو کارنوال (CORNWALL) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا" ——— یہ محض ایک قیاسی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ

علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے۔ جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جارہی ہے۔ وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جانے، وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک متعین المثال نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریہ کشش فلکیاتی گردش کی توجیہ کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں (J. C. ADAMS) اور لاویریے (U. LEVERRIER) کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کرسکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۸۴۶ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے جس کو اب ہم نپچون (NEPTUNE) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں بیرریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہوگئی ہے



دربارِ عالمگیری

(از جناب مولانا مصطفےٰ احسن صاحب ملیحی ایم اے پی ایچ ڈی)

(۳)

تفسیر احمدی۔ ان چند الفاظ کو چھوڑ کے جو دوسری زبانوں کے ہیں یہ واقعہ ہے کہ پورا قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو الفاظ عربی نہیں ان کو معرب کر کے اُن پر بھی عربی کے ہی قاعدے اور قوانین کا عمل درآمد ہوا۔ اس کا اسلوب بیان سب عربی کنایہ، تشبیہ، استعارہ، مجاز حقیقت کے مفاہیم سب عربوں کے نہج اور طریقے کے۔ اور پھر باوجود عربی ہونے کے یہ ضروری نہیں کہ اہل عرب ان کو سب کا سب سمجھتے ہی ہوں شیکسپیر کے ڈرامے، ملٹن کی نظمیں انگریزی میں ہیں مگر ایسا نہیں کہ انگریزی جن کی مادری زبان ہے وہ اس کے مفہوم اور معنی سمجھ ہی لیتے ہوں غالب کا کلام اردو میں ہے اور سودا کے قصائد بھی اُردو میں ہیں مگر یہ اردو دانوں کو بھی سبقاً سبقاً پڑھائے ہی جاتے ہیں۔ جب وہ اسے سمجھ پاتے ہیں۔ اگر کسی کو الفاظ کے معنی آتے ہیں یا وہ لغت دیکھ کے معنی معلوم کر لے تب بھی اس کا مطلب ہاتھ نہیں لگتا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ صحابۂ کرامؓ باوجود عرب ہونے کے پھر بھی اکثر قرآن کے مفاہیم اور معانی ان کی سمجھ سے باہر نہ ہوتے "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" میں فجر کے معنی ان کو معلوم تھے لیال کے معنی بھی ان کو معلوم تھے اور عشر کے بھی لیکن اس محل پر اس کا مفہوم بغیر پوچھے ان کے ہاتھ نہ لگا۔ سورۃ انعام کی آیات بیشتر مکی ہیں اور ان میں اصول دین اور اصول احکام بتلائے گئے ہیں۔ ان کے مفاہیم میں غموض نہیں ان کو سب سمجھتے تھے لیکن

قرآن میں وہ آیات بھی ہیں جن میں ابہام ہے جن میں غموض ہے اور جنھیں آیات متشابہات کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ ہر زبان میں بعض جملوں اور فقروں کے مفہوم قرائن سے معلوم ہوتے ہیں اگر قرائن نہوں تو انکے مفاہیم ہاتھ نہیں لگتے۔ ایک شخص کسی سے ملنے آتا ہے کواڑوں پر دستک دیتا ہے اندر سے آواز آتی ہے "آجایئے پڑھ ہے" دوسرا شخص آکے یہی عمل کرتا ہے اندر سے آواز آتی ہے "نہ آیئے پڑھ ہے" یہ پڑھ ہے کی دونوں مرادیں قرائن ہی سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ صحابہ سفر حضر جلوت و خلوت میں ساتھ رہتے اور سبب نزول اُن کے علم میں ہوتا اس لیے مفہوم قرآنی کو بھی آسانی سے سمجھ جاتے لیکن پھر بھی تفاوت فہم کی وجہ سے بہتوں کے ہاتھ صحیح مراد نہ لگتی۔ ایک شخص عبداللہ بن مسعود کے پاس آکے خبر دیتا ہے کہ ایک شخص مسجد میں بیٹھا قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے بتا رہا ہے "اور یوم تاتی السماء بدخان مبین" کے معنی اور مفہوم یہ بتاتا ہے کہ قیامت میں ایک دھواں سا اُٹھے گا اور لوگوں کے نفس پر اس کا اثر پڑے گا انھیں زکام ہوجائے گا یہ سُن کے عبداللہ بن مسعود نے فرمایا جسے رسالتمآب کے ذریعہ معنی کا پتہ چل گیا ہو وہ تو بیان کردیا کرے ورنہ اللہ کے علم پر چھوڑ دے۔

من علم علما فلیقل بہ ومن لم	جسے اگر معلوم ہو تو بیان کردے ورنہ یہ
یعلم فلیقل اللہ اعلم	کہدے کہ اس کا مفہوم اللہ جانے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کو وہ ماحول معلوم تھا جب یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ اپنی بدکرداری کی بدولت قریش ایک بار سخت قحط سے دوچار ہوئے تھے کہ انھوں نے اس حالت میں ہڈیاں تک چبا کے بسر کی۔ پریشان ہو ہو کے آسمان کی طرف دیکھتے تو انھیں دھواں سا ہی نظر آتا۔[1]

وہ صحابہ جو عادات اور رسوم سے بخوبی واقف تھے کہ ایام جاہلیت میں عرب کس کس طرح حج کرتے اور کیا کیا رسمیں ان میں شائع ذائع تھیں۔ بتوں کو کس طرح پوجتے اور اُن سے کس کس انداز سے مرادیں مانگتے وہ اس صنف کی قرآنی آیات کو خوب خوب سمجھ لیتے جن میں ان ان چیزوں اور ان کے ان ان کرداروں کا ذکر آیا ہے۔ مرور ایام کے ساتھ واعظوں اور قصہ گوؤں نے آیات قرآنی کی عجیب عجیب تفسیریں اور توضیحیں اپنے دل سے پیدا کرکے بیان کردیں ورنہ صحیح تفسیریں وہی ہیں جن کو صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کے بیان کیا

[1] موافقات شاطبی

اور شاید یہی وجہ ہو کہ امام احمد بن حنبل جیسی باخبر ہستی نے یہاں تک فرما دیا۔

ثلثة ليس لها اصل التفسير والملاحم والمغازي	تین موضوع ایسے ہیں تفسیر ملاحم اور مغازی کہ جن کی کوئی اصلیں نہیں۔

اور اس قول کی ان کے شاگردوں کو یوں توجیہ اور تاویل کرنا پڑی کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ

ان الغالب ان ليس له اسانيد صحاح متصلة[1]	اس صنف کی اکثر حدیثوں کی سند متصل اور صحیح نہیں ہیں

ہاں بہت سے الفاظ اور آیات ان کے سامنے ایسی بھی آئیں جن کے مفاہیم کو صحابہ اپنی قوت اجتہاد سے حل کرنے سے عاجز ہوئے اور فوق کل ذی علم علیم حضرت ابن عباس ایک مخصوص پیاڑ لیتے اور کوئی بکھرے ہوئے اور منتشر پہلو بیان کرتے ہیں، اسی کے ساتھ تابعین کیا بلکہ صحابہ تک جہاں تک ہوتا رائے اور اجتہاد سے گریز ہی اختیار کرتے تھے۔

قرآنی تفسیر خاص کر بنی اسرائیل اور پچھلی اقوام کے حالات میں مفسرین کو ان نو مسلم یہود و نصاریٰ سے جو تورات اور انجیل کے عالم تھے بہت کچھ سرمایہ ہاتھ لگے اور واقعات معلوم ہوئے لیکن ان کے بیانوں میں اختلافات تھے انھیں کی جھلکیاں تفسیروں میں بھی دکھائی دینے لگیں، احکام شرعیہ کی تفسیروں اور مدلولات کو چھوڑ کر جن میں انھوں نے غیر معمولی احتیاط سے کام لیا۔ باقی امور کی تفسیروں میں اختلافات موجود ہیں۔ تفسیر قرآن کے بارے میں ایسے صحابہ کی جن کے اقوال نے شہرت حاصل کی تعداد تھوڑی ہی ہو حضرت علی کرم اللہ وجہہ عبداللہ بن مسعود عبداللہ بن عباس وغیرہ وغیرہ یہ چند ہستیاں ایسی تھیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جلوت و خلوت میں اختلاط اور اپنی عربیت کی قوت حوادث اور واقعات سے واقفیت اور فہم ذاتی کی بدولت آیات قرآنیہ کو بہت کچھ حل کیا ان میں بھی عبداللہ بن عباس کو امتیت حاصل ہے اور بہت کچھ مشکلات انھیں سے حل ہوتی رہیں اس لیے کہ کاشانۂ نبوت کے یہ ایک فرد رہے تھے اور اسی کا نتیجہ ہو کہ ارباب غرض کو ان کی طرف منسوب کرنے کے بہت کچھ مواقع ہاتھ لگے، حضرت علی بھی

[1] اتقان جلد ۲ صفحہ ۲

فرد خاندان تھے وہاں بھی شیعیان علی کو ان کے مراتب کی بلندی کے لیے اس کی ضرورت داعی ہوتی رہی تاکہ ان کی علمی پوزیشن کو غیر معمولی انداز سے بڑھاتے ہی رہیں، عباسیوں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو حضرت عباس کی اولاد اور اخلاف میں تھے ہی اُن کو خوش کرنے اور ان کے خلفاء کی خوشنودی کے لیے کیا کچھ انتساب ان کی طرف نہ ہوا، اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ اگر حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس کی طرف ان تشریحوں اور تفسیروں کا انتساب صحیح نہ تھا تو وہ علمی نقطۂ نظر سے بھی گری ہوئی تھیں۔

عہد تابعین آیا تو اسرائیلیات اور نصرانیات کا تفسیروں میں اور بھی اضافہ ہو گیا ابن جریر کی تفسیر ایسے زاد سے کیا کچھ کم مالا مال ہے۔ انھیں اسرائیلیات کے بیان کرنے والوں میں ابن جُرَیج کا نام بار بار آتا ہے اور کیوں نہ آتا اس لیے کہ یہ نسلاً نصرانی ہی تھے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جس جس عہد میں جن جن علمی تحریکات اور جن مذاہب اور شاخوں کے چرچے رہے اس عہد کی تفسیروں پر بھی رنگ غالب ہے۔

عہد صحابہ اور پچھلے تابعین کے وقت کی تفسیروں میں آیات کے لغوی مفاہیم کا رنگ زائد نظر آتا ہے زائد از زائد اسباب نزول پر بھی بڑی ہوئی رد و قبول ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کے دور میں یہود و نصاریٰ کے واقعات اور حوادث لیتے ہیں۔ پھر قضا و قدر کی بحثیں چھڑیں اور صفات کے ازلی اور ابدی ہونے کی باتیں نکلیں جبر و اختیار کے مباحث زبانوں پر آئے پھر اس کے بعد جب فقہ اور فقہا کا دور آیا اور فقہی احکام نکالنے کی ضرورتیں لاحق ہوئیں تو فقہا نے ان آیات کی تفاسیر پر زور دیا جن سے فقہی احکام و قوانین کا استنباط ہوتا ہے۔ ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ جب قواعد نحوی اور صرفی بلاغت اور اخلاقیات وغیرہ وغیرہ پر توجہات رہی ہیں تو اس عہد کی تفاسیر میں بھی یہی رنگ غالب رہا ہے۔

یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خواہ موضوع دینی کچھ بھی ہو خواہ تاریخ ہو خواہ احکام دینی ہوں اور خواہ تفسیرات اور توضیحات قرآنیہ سب کا منبع اور سرچشمہ حدیث ہی رہا ہے۔ ایک محدث حدیث کے ذریعہ فقہی حکم ہی نہیں پہونچاتا، غزوات اور حروب اسلامیہ کا ہی ذکر نہیں کرتا، تاریخ ہی بیان نہیں کرتا، بلکہ اس زمانہ کی معاشرت، اجتماعی حالات

اور دوسرے واقعات بھی بیان کرتا رہا ہے اور اس زمانے کے ذخائر احادیث میں سب کچھ ایک مخلوط شکل میں ملتا ہے، پھر ایک دور آیا جب احکام دینیہ کی احادیث کو الگ کیا گیا سیرت کو الگ فقہ کو الگ چنانچہ محمد بن اسحاق نے وہ احادیث الگ کرلیں جن کا تعلق سیرت سے تھا۔ امام مالک نے مؤطا میں وہ حدیثیں جمع کردیں جن کا تعلق احکام دینیہ اور فقہ سے تھا وغیرہ وغیرہ۔ فنون گو الگ الگ مدون ہوگئے اور ہر فن سے متعلق احادیث الگ الگ بیان کی جانے لگیں پھر بھی محدثین نے اگر کتابیں ترتیب دیں تو عام احادیث کے ساتھ تفسیر کو بھی شامل رکھا۔ بخاری اور مسلم میں تفاسیر کے مستقل ابواب ملتے ہیں جن میں تفسیری حدیثیں شان اور آن کے ساتھ منسوب نظر آتی ہیں۔ سورتوں کے فضائل، آیات اور الفاظ کی تفسیریں سلسلوں اور اسناد کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ ملتی ہیں۔ یہ بات ذہن سے نہ جائے کہ ابن جریج کی بیان کردہ تفسیری احادیث سب کی سب صحیح ہی ہیں نہیں بلکہ ان میں سقیم اور صحیح دونوں ہیں۔

ان ابن جریج لم یقصد الصحة	ابن جریج نے اسکا ارادہ ہی نہیں کیا کہ وہ تفسیر کے
وانما روی ما ذکر فی کل ایة	باب میں صحیح حدیثیں ہی بیان کریں بلکہ ہر آیت کے
من الصحیح والسقیم[1]	بارہ میں جو صحیح اور سقیم چیزیں ذکر کی گئی ہیں انھوں نے
	وہ سب روایت کردی ہیں۔

سدی اور اسباط ابن نصر کے واسطوں کا تو کہنا ہی کیا ان پر اکثر محدثین کو اعتماد ہی نہ تھا[2] بعض مفسرین کے یہاں یہ اہتمام ملتا ہے کہ سب کی نہیں بلکہ مشکل الفاظ اور جملوں کی تفسیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ سے ملیں اُن کو لکھتے گئے۔ مرور زمانہ کیساتھ ساتھ کل تک جن الفاظ میں غموض نہ تھا ان میں بھی غموض معلوم ہونے لگا، لوگوں میں وہ عربیت نہ رہی نہ وہ ادبیت۔ انکو آگے چل کر تابعین نے حل کیا اور ان کے آسان کرنے میں بڑی بڑی محنتیں صرف کیں۔ یہ کام بڑی ہی ذمہ داری کا تھا۔ شعبی نے تو یہاں تک احتیاط برتی کہ کہدیا۔

ثلاث لا اقول فیھن حتی اموت	تین موضوع وہ ہیں کہ میں تاحیات

---

[1] الاتقان جلد ۲ صفحہ ۲۲۴ [2] تذہیب التہذیب ابن حجر

القرآن الروح والرای[1] ان کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہوں گا قرآن روح اور رائے۔

اصمعی نے باوجود اتنے بڑے لغوی ہونے کے یہ ہی کہا

العرب تقول معنی ھذا کذا اولا اعلم المراد منہ فی الکتاب والسنۃ ای شی ھو[2]

اہل عرب اس لفظ کے یہ معنی کہتے ہیں لیکن میں جزماً نہیں کہہ سکتا کتاب اللہ اور سنت میں کیا مراد لی گئی ہے۔

تفسیر پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ نحوی اور صرفی بحثوں غیر مانوس لفظوں، بلاغت اور فصاحت کے معیاروں کو متعین کرنے میں لوگوں کا مستدل صرف قرآن کریم ہی رہ گیا تھا۔

پھر بعض کی توجہ اس کی طرف ہوئی کہ وہ آیات لکھیں اور ان کی تفسیر ظاہر کریں جن کا تعلق مسائل فقہیہ سے ہے چنانچہ فقہ حنفی کے مسلک کو ظاہر کرنے اور آیات قرآنیہ سے تطبیق دینے میں امام ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی، امام شافعی نے لکھی اور داؤد ظاہری نے بھی۔ ادھر امام مالک کے مسلک پر بھی احکام قرآنیہ کے نام سے کتاب تیار ہوئی۔ متکلم مفسروں کی تفسیروں میں عقلی اور فلسفی توحید، عدل، صفات باری تعالیٰ جبر و اختیار کے عناصر تو ممیز و ممتاز شکلوں میں ملتے ہیں لیکن احادیث تفسیر میں حدیثوں کی ایک معمولی سی جھلک ہی ہیں۔ معتزلیوں نے تفسیریں لکھیں تو اپنے مسلک کے مطابق اور شیعوں اور دوسرے فرقوں نے لکھیں تو اپنے مذہب کی تقویت کی نظر سے۔ "طلعھا کانہ رؤس الشیاطین" کی تفسیر ایک بدشکل گھاس سے کی گئی جو یمن میں پیدا ہوتی تھی کسی نے سانپ کے پھن سے کی لیکن حاظ نے یوں کی۔

لیس ان الناس راٰوا شیطانا قط علی صورۃ ولکن لما کان اللہ قد جعل فی طبائع جمیع الامم استقباح جمیع صور الشیاطین... وکراھتہ

ایسا نہیں ہے کہ لوگوں نے شیطان کو کسی شکل میں دیکھا ہو بلکہ جب باری تعالیٰ نے تمام قوموں کی طبائع میں شیطان کو ہر پہلو سے نہایت ہی مکروہ شکل ہی میں

---

[1] ابن جریر [2] ابن خلکان جلد ۱ صفحہ ۴۰۹

واجری علی السنۃ الناس جمیعہم	ظاہر کیا اور بدشکلی میں اس کو سب کے لیے
ضرب المثل فی ذلک ورجع بالایحاش	ضرب المثل بنا دیا تو اسی بنیاد پر اس سے ڈرانے
.... والاخافۃ [1]	اور وحشت دلانے کا کام لیا۔

چنانچہ عربوں میں دیو بھوت کا تصور بھی ایک ڈراؤنی حقیقت رکھتا اور خوف و دہشت دلانے اور ہراساں کرنے کے لیے اس کو حقیقت واقعیہ کے انداز سے پیش کرتے اور تہدید کے موقعوں پر اس سے کام لیتے ایام جاہلیت کا شاعر دشمن کو ڈراتا دھمکاتا ہے تو اس رنگ سے کہ اس کا مجھ پر بس نہیں چل سکتا اور وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے شمشیر براں میرے پاس ہے اور بھوتوں جیسے ڈراؤنے دانتوں کی شکل کے نیزے میرے پہلو میں۔

ایقتلنی والمشرفی مضاجعی	ومسنونۃ زرق کانیاب اغوال

ابن جریر طبری کی تفسیر کا یہ ممتاز رنگ ہے کہ وہ پچھلے مفسروں کے اقوال اور تفسیریں نقل کرنے کے بعد جو قول ان کے نزدیک مرجح ہے اس کو ظاہر کر دیتے ہیں اور مزید وجوہ سے اس کی تائید بھی اور توثیق بھی۔ (باقی)

[1] کتاب الحیوان جاحظ جلد ۴ ص ۱۳

لکھنؤ کے مشہور مسائح و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابطیس: اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتہ کے استعمال سے خون میں اتنی شکر وہ جاتی ہے جیسی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑنے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت: دس تولہ ۵/- یا پانچ تولہ ۳/-

شربت جذام: جذام میں یہ دوا بے حد مفید ہے پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ ۵/-

شربت کمند: پتھر کی پتھریوں کا درد، یرقان، درد جگر ان تینوں مقاموں میں اس شربت کا استعمال بے حد مفید ہے۔ ایک پونڈ ۵/-

شربت درد گردہ: پیشاب میں جلن، پیشاب کا رکنا یا درد کے دورے اٹھنا یہ شربت استعمال کیجیے جتنی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں اتنے کئی ماہ پینا چاہیے ——— قیمت ... ایک پونڈ ۵/-

مرہم سرخ: پھوڑوں خصوصاً ہیضہ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کارنکل میں یہ مرہم بے حد مفید ہے اس کے استعمال سے جلن کافور ہو جاتی ہے۔ پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے ——— قیمت ... ۳/۵۰

منیجر حسنی فارمیسی، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ

جلد ۹۶ ماہ ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ جولائی سنہ ۱۹۶۵ء عدد ۱

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲ - ۴/۲

مقالات

انسانی عظمت و شرف اور مرد مومن کی ذمہ داریاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	۵ - ۲۸
ہندوستان میں فارسی کا مطالعہ اور اس کا مستقبل	جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی	۲۹ - ۴۱
ادب کی تاریخی لغوی اور اصطلاحی ماہیت	جناب وقار احمد صاحب رضوی ایم اے	۴۲ - ۶۰
ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ	جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۶۱ - ۷۰

باب التقریظ والانتقاد

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ	جناب حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی	۷۱ -

مطبوعات جدیدہ

"م ج"		۷۵ - ۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے خلاف جو آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے وہ طاقت کا نہایت غلط استعمال ہے، اس لیے اس کے خلاف جس قدر بھی احتجاج کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن آرڈیننس بہرحال عارضی ہے، یونیورسٹی کے مستقل نظام پر اس کا اثر نہیں پڑتا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیندہ حکومت اس کے دستور میں کیا تبدیلی کرتی ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے، دوسرے اس حیثیت سے وہ اسلامی بھی ہے کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ اسلامی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تربیت کیجائے جس کو موجودہ بحث میں اسلامی کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو لوگ اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں وہ قلبیتی کردار سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کردار مسلمانوں کا مسلمہ دستوری حق ہے، اس لیے حکومت کو یونیورسٹی میں کسی ایسی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے جس سے اس کے کردار اور خود مختاری میں فرق آئے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی کردار سے مراد کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں؟ چھاگلہ صاحب کے نزدیک جیسا کہ ان کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مراد اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات ہے یعنی مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات کو اہمیت دیجائے، لیکن یہ اسلامی کردار نہیں بلکہ ریسرچ یا علمی تحقیق ہے جس کو یورپ کی بہت سی یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں اور انھوں نے اسلامیات پر جتنا کام کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کو ایک مدت درکار ہوگی،

اگر اسلامی کردار اسی کا نام ہے تو پھر یہ ساری یونیورسٹیاں مسلم ہیں، ان میں اور مسلم یونیورسٹی میں فرق کیا ہوا؟

اصل میں جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں یا انکی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ اس کو نام نہاد ترقی پسندی اور قومی وحدت کے انضمامی تصور کے منافی سمجھتے ہیں ان کو اسلامی کردار کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے، ان کو اس کا تو حق ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے اسلامی کردار کی ضرورت اور اہمیت ہی سے علانیہ انکار کردیں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں، اس لیے وہ اس کو فرقہ پروری، رجعت اور علیحدگی پسندگی کی آڑ لے کر مسخ کرتے رہتے ہیں، اس کی تعبیر و تعیین کا حق ان ہی لوگوں کو ہے جو اسلامی کردار کو مسلمانوں کا سرچشمۂ حیات اور تعمیر ملت کی بنیاد سمجھتے ہیں،

اس کے لئے تنہا اسلام کے بعض ظاہری مظاہر مثلاً دینیات کی رسمی تعلیم، ہوسٹلوں میں نماز کا انتظام، رمضان میں ڈائننگ ہال کی نمائشی بندش، اسلامی تقریبات کا انعقاد، میلاد کے جلسے، اور اسی قبیل کی دوسری ظاہری چیزیں کافی نہیں ہیں، بلکہ اس سے وہ اسلامی روح مراد ہے جس سے مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، ان کی عظمت، اور ملی غیرت و حمیت کا جذبہ بیدار رہے، یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر اس کے کسی متوسل کو اسلامی عقائد و تصورات کی علانیہ مخالفت کی اجازت نہ دی جائے، اسلامی علوم و فنون کی تحقیقات اور دینی تعلیم کو خاص اہمیت دی جائے، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں، یا انتظامی مسلمانوں کی نمایاں اکثریت ہو، اور ان کا اقتدار ہو، انتظامی مجالس کے ارکان کی اکثریت کا انتخاب جمہوری طریقہ پر کیا جائے، حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کئے جائیں، جو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے واقف اور یونیورسٹی کے ہمدرد و خواہ ہوں، ایسے غیر مسلموں کی آج بھی کمی نہیں ہے، اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار قائم نہیں رہ سکتا،

یہ چیز نہ رجعت پسندی ہے، اور نہ فرقہ پروری، اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف ہے، بلکہ اقلیتوں کا ایک تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو نہ حکومت سلب کر سکتی ہے، اور نہ کسی ترقی پسند کو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے، خود ہندوستان میں ہندو یونیورسٹی ہندو کردار کا اور عیسائی مشنریوں کے بعض کالج عیسائی کردار کا نمونہ موجود ہیں، درحقیقت اُن کو ان کے کردار کے ساتھ قائم رکھنا ہی سیکولرزم اور جمہوریت ہے، مسلم یونیورسٹی اس معنی میں یقیناً سیکولر اور قومی ہے، کہ اس کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت سب فرقوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، اور آج سے نہیں، بلکہ علی گڑھ کالج کے قیام کے زمانہ سے لے کر اب تک ہر زمانہ میں یہاں غیر مسلم طلبہ کی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں بعض نامور لوگ بھی ہیں، لیکن اس معنی میں یقیناً مسلم ہے کہ اس کی فضا اور اس کا کردار اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور اس کا اقتدار ہونا ضروری ہے، یہی حقوق ہندو یونیورسٹی کو بھی حاصل ہیں،

اسلامی کردار کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں، یہ چیز قومی وحدت وہمدردی کے قطعاً منافی نہیں، علیحدگی پسند گی مسلمانوں کے قومی مزاج کے خلاف ہے، انھوں نے کبھی کسی قوم اور کسی تہذیب سے چھوت نہیں کی، جہاں گئے ملکی باشندوں میں گھل مل گئے، اور اُن کی اور اپنی تہذیب کو ملا کر تہذیبی یکرنگی پیدا کرنے کی کوشش کی، خود ہندوستان میں ایک مشترک تہذیب اور مشترک زبان پیدا کی جس میں دونوں تہذیبوں کے یکساں عناصر ہیں، اور ہندوستان کی احیائی ذہنیت سے پہلے یہ زبان اور یہ تہذیب ہندو مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی مشترک تہذیب وزبان سمجھی جاتی تھی، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحدہ ملک بنایا، قومی وحدت کا تصور پیدا کیا، ان سے پہلے ہندوستان مختلف طبقوں اور

فرقوں میں بٹا ہوا تھا، اور اُن میں باہم اتنا ہی بغض و عناد تھا، جتنا دشمنوں میں ہو سکتا ہے، اس لئے ہندوستان کی وحدت اور قومی یکجہتی کے پہلے معمار مسلمان ہی ہیں۔ اور علیحدگی پسندی کے وہ لوگ مجرم ہیں، جو وحدت کے ان آثار کو مٹانے کے درپے ہیں۔

آزاد مشرب ترقی پسندوں بلکہ تخریب پسندوں کا ایک طبقہ عرصہ سے مسلم یونیورسٹی کے روایات اور خصوصیات کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن وائس چانسلر صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو پشتہا پشت سے اسلامی تہذیب و روایات کا حامل رہا ہے، اور وہ خود اسی تہذیب کے پروردہ ہیں، ان سے بڑھ کر ان کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، اس لئے ان سے توقع یہی ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اُن کے سامنے اُن کے پیشرو بدرالدین طیب جی کی مثال موجود ہے، جن کو اسلامی تہذیب و روایات سے اتنا گہرا تعلق نہ تھا، جتنا موجودہ وائس چانسلر صاحب کو ہے، اس لئے ان پر اُن سے زیادہ اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ابھی حال میں معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کے ایک صاحب احسان بی اے نے سیرۃ النبی کی پہلی اور دوسری جلد کا خلاصہ کیا ہے، اور دبستان لاہور نے اس کو شائع کیا ہے، پاکستان کے لوگوں کو معلوم ہو گا کہ دارالمصنفین کی واردِ مدار کتابوں کی تجارت پر ہے، اس کو نہ حکومت سے کوئی مستقل ملتی ہے اور نہ اُس نے کبھی چندہ کیا، اب اگر ارض پاک والوں نے اس کی تجارتی آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا، تو وہ کس طرح چل سکتا ہے، اُن کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اس کی مشکلات میں مدد کرتے نہ کہ اُلٹے وہ اس کے ذرائع آمدنی پر قبضہ کر کے اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، جو پاکستان کے لئے انتہائی شرم و غیرت

کی بات ہے بعض اور کتابیں بھی پاکستانی ناشروں نے چھاپ لی ہیں، مگر وہ چنداں اہم نہ تھیں، اس لئے ہم نے خاموشی سے کام لیا لیکن سیرۃ النبی دارالمصنفین کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کو کسی صورت میں بھی چھاپنا اس کو نقصان پہونچانا ہے، اس سے پہلے بھی ایک ناشر نے سیرۃ النبی جلد اول شائع کی تھی، اس وقت سردار عبدالرب نشتر مرحوم زندہ تھے ان نے دباؤ ڈال کر اس کی اشاعت رکوا دی تھی، پاکستان کے اخبارات نے بھی اس ناشر کو آڑے ہاتھوں لے لیا، اس لئے اس نے مجبور ہو کر طباعت کے معاہدہ نامہ کو کتابیں دارالمصنفین کے حوالے کر دی تھیں، ہم یہاں سے متفکر کیا کر سکتے ہیں؟ فرض پاکستانی اخبارات کا ہے کہ وہ خود غرض ناشروں کو ایسا سبق دیں کہ آئندہ کوئی اس قسم کی جرأت نہ کر سکے، نوائے وقت اور چٹان سے ہم کو خاص طور سے اسکی توقع ہے،

ہمارے رفیق سید صباح الدین عبدالرحمن کی دو کتابوں پر اس سے پہلے یو پی گورنمنٹ سے انعام مل چکا ہے، اس سال بھی اُن کی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تمدنی جلوے" پر انعام ملا ہے، اس سال انشاء اللہ چھ نئی کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے، دین رحمت، محدثین اسلام، تبع تابعین جلد دوم، صاحب مثنوی، مقالات سلیمانی جلد اول، عہد مغلیہ ہندوستانی مورخین کی نظر میں، دارالمصنفین کی جبلی کی روداد کے لئے شائقین کا بڑا تقاضہ ہے، اس کی مختصر روداد معارف میں لکھی جا چکی ہے تفصیلی روداد بھی انشاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے،

مقالات

انسانی عظمت و شرف
اور
مرد مومن کی ذمہ داریاں

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

انسانی عظمت و شرف | اسلام سے پہلے انسانیت کا تصور بہت پست تھا، انسان پیدائشی گنہگار اور اپنے اعمال کے لحاظ سے ادنیٰ ترین مخلوق سمجھا جاتا تھا، وہ ہر طاقت کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا، اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کا درجہ تمام مخلوق میں بلند کیا اور اسکو اشرف المخلوقات قرار دیا، وہ خالق عالم کی صناعی کا شاہکار ہے، خدا نے اس کو حسین ترین خلقت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم (تین) — اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا

حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی شکل میں پیدا کیا،

خلق اللہ آدم علی صورتہ (بخاری کتاب الاستیذان) — خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اس کو پیدائشی طور پر بے داغ ہر نقش سے پاک اور دین فطرت پر قرار دیا، پیدائش کے بعد ماحول

اور سوسائٹی اس پر اچھے برے نقش و نگار بناتی ہے۔

ان الانسان یولد علی الفطرۃ	انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسکے
فابواہ یھودانہ او ینصرانہ	والدین اسکو یہودی یا نصرانی بناتے ہیں

حسن ظاہری کے ساتھ جمال معنوی یعنی علم و ادراک اور عقل و دانش کی دولت عطا فرمائی،

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق)	انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنکو وہ نہیں جانتا تھا،
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (بقرہ)	اور خدا نے آدم کو سارے اسماء (حقایق اشیاء) سکھائے،

اس کو خیر و شر کی تمیز عطا فرمائی،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا	اور قسم انسان کی اور اس ذات کی جس نے
وَتَقْوٰھَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا	اس کو درست بنایا پھر اس کو بدکاری اور نیکوکاری
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا	کی باتیں سمجھائیں جس نے اپنی روح کو پاک کیا؟
(شمس)	کامیاب ہوا اور جس نے اسکو دبایا وہ گھاٹے میں رہا
وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ (بلد)	اور ہم نے (اسکو نیکی اور بدی) دونوں کے راستے دکھائے۔

اعلیٰ درجہ کی عقلی و ذہنی قوتوں سے آراستہ کیا، چنانچہ کلام مجید میں بکثرت انسانی عقل سے خطاب کیا گیا ہے، اور اس کو کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، (افلا یتدبرون۔ افلا یتفکرون اور افلا یعقلون) اتنی آیتوں میں آیا ہے کہ انکا شمار مشکل ہے،

اس کو ساری مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ	اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری عطا فرمائی
فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ	اور اس کو دریا اور خشکی میں سوار کیا اور پاکیزہ
الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی	چیزیں اس کو کھانے کو دیں اور اس کو بہت سی

كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل) مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس کے سر پر خلافت اور نیابت الٰہی کا تاج رکھا، وہ مسجود ملائکہ قرار پایا اور اس کی عظمت سے انکار پر ابلیس ہمیشہ کے لیے مردود قرار دیا گیا،

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰئِكَةِ إِنِّي	اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا	کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا
أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا	ہوں تو فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے شخص
وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ	کو نائب بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ	اور خونریزی کرے اور ہم تیری حمد و ثنا
إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَّمَ	کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں
آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ	خدا نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے
عَلَى الْمَلَٰئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي	اور آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے،
بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ	پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش
قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا	کر کے فرمایا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو
إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ	ان چیزوں کے نام بتاؤ، فرشتے بولے تیری
الْحَكِيمُ ۔ قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم	ذات پاک ہے جو تو نے ہم کو بتایا ہے
بِأَسْمَائِهِمْ، فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ	اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک
قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ	تو ہی جاننے والا اور مصلحت کا پہچاننے والا
غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ	ہے، تب خدا نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں
مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ	کو ان چیزوں کے نام بتاؤ پھر جب آدم نے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ	فرشتوں کو ان کے نام بتاؤ تو خدا نے فرشتوں سے فرمایا کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کی سب مخفی چیزیں ہم کو معلوم ہیں، اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب ہم کو معلوم ہے اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے جھکو تو شیطان کے سوا سب جھک پڑے، اس نے نہ مانا اور غرور میں آگیا اور نافرمان بن گیا۔
(بقرہ ۴)	

اقبال نے تخلیق آدم کے واقعہ سے انسانی عظمت کے بڑے لطیف پہلو پیدا کیے ہیں لکھتے ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد	حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل	حذرائے پردگیاں پردہ دری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور	خودگرے خود شکنے خودنگرے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوش حیات	چشم وا کرد و جہانے دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر	تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

اس سے بڑھ کر انسانی عظمت تصور میں نہیں آسکتی، اس سے پہلے انسان بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا تھا، وہ چاند، سورج، سمندر، پہاڑ، شجر و حجر بلکہ ادنیٰ ادنیٰ جانوروں تک کی پوجا کرتا تھا، اسلام نے بتایا کہ یہ چیزیں اس کی پرستش کے لیے نہیں بلکہ اس کی خدمت اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا	زمین میں جو کچھ ہے سب خدا نے تمہارے لیے بنایا،
(بقرہ)	

پوری کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی	کیا تم نہیں دیکھتے کہ روئے زمین میں جو کچھ ہے
الْاَرْضِ (ج)	سب کو تمھارے لیے مسخر کر دیا۔

حتی کہ آفتاب و ماہتاب بھی جس کی انسان پوجا کرتا ہے، اس کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَ	اور خدا نے رات اور دن، چاند اور سورج
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ	کو تمھارے کام میں لگا دیا اور ستارے اسکے
بِاَمْرِہٖ (نحل)	حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اقبال نے اس کو بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں نظم کیا ہے

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کیلئے	جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلئے
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں	یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں	تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ	

اسلام سے پہلے مادی طاقت و قوت، دولت و وجاہت اور نسلی و قومی برتری کی پرستش ہوتی تھی، ہر کمزور طاقتور کا اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام نے یہ سارے امتیازات ختم کر کے حسن عمل اور حسن کردار کو عزت و شرف کا معیار قرار دیا،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ	تم میں خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے
	جو سب سے زیادہ پاکباز ہے۔

آزادی و مساوات کا مسئلہ جو انسانی عظمت کا ایک اہم پہلو ہے، اسلام کی نگاہ میں اس درجہ اہم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو آخری خطبہ دیا تھا، اس میں انسانی مساوات

یہ بھی زور دیا تھا آپ کے الفاظ یہ ہیں :

ایھا الناس ان ربکم واحد	لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے تمہارا باپ بھی
وان اباکم واحد کلکم لآدم واٰدم	ایک ہے تم سب اولاد آدم ہو اور آدم
من تراب ان اکرمکم عند اللہ	مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں
اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی	سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے،
فضل الا بالتقویٰ	کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

ایک دوسری روایت ہے جس میں تصریح کے ساتھ نسل و قومیت اور حسب و نسب پر فخر و غرور کو مٹایا گیا ہے،

ان اللہ اذھب عنکم عبیۃ	اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے غرور اور آباء و
الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء	اجداد پر فخر کو ختم کر دیا، انسان یا مومن
انما ھو مومن تقی او فاجر شقی	پاکباز ہے یا بدکار شقی تم سب اولاد
الناس کلکم بنو آدم وآدم	آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔
خلق من تراب (ابو داؤد)	

یہ اعلان، آزادی و مساوات کا وہ چارٹر ہے جس نے انسانوں کو انسانی غلامی سے آزاد کر کے، ملک و ملوک، نسل و قومیت، حسب و نسب، دولت و وجاہت اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا اور کوئی انسان کسی انسان کا بندہ و غلام باقی نہیں رہ گیا۔

عظمت و شرف کی ذمہ داریاں لیکن اس عظمت و شرف کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی بڑی کٹھن ہیں، یہ فطری قانون ہے جس پر ساری دنیا کا عمل ہے کہ منصب جس قدر جلیل ہوتا ہے اسی قدر اس کی

ذمہ داریاں بھی عظیم اور پابندیاں بھی سخت ہوتی ہیں، صاحب منصب کی ذاتی حیثیت بہت کم باقی رہتی ہے، اس کے اعمال و افعال اور زبان تک پر پابندی عائد ہوجاتی ہے، وہ محض اپنے عہدے اور منصب کے فرائض کا نقیب اور ترجمان بنجاتا ہے، اس کے خلاف ایک لفظ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا، چنانچہ دنیاوی حکومتوں کے سربراہ، وزراء اور سفراء وغیرہ بھی صرف اپنی حکومت کے ترجمان ہوتے ہیں، ان کی ہدایات اور پالیسی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔

مرد مومن کا مقام اور اس کے فرائض اسی طرح ایک مومن جو خلیفۃ اللہ فی الارض[1] اور دنیا میں احکام الٰہی کا مبلغ اور ترجمان ہے، خود مختار نہیں، بلکہ احکام خداوندی کا پابند ہے، اس کے خلاف ایک قدم

---

[1] انسانی عظمت و شرف میں پیدائشی طور پر سارے انسان برابر ہیں، اور خلیفۃ اللہ فی الارض بننے کی صلاحیت تمام انسانوں میں مشترک ہے لیکن اس کا وعدہ انہی انسانوں کیلئے ہے جنھوں نے اپنے ایمان و عمل سے انسانی شرف و عظمت کو قائم رکھا ہے اور اپنے کردار سے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مستحق ہونے کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ کلام مجید میں ارشاد ہے

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ	میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	ہوں گے تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور
لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ	نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو وہ زمین کی
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	خلافت ضرور عطا کرے گا۔

یہی وہ مرد مومن ہے جس کو دنیا میں سربلندی کی بشارت دی گئی ہے،

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ	اور (عارضی حالات سے) تم ہمت نہ ہارو اور غمزدہ
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ	نہ ہو اگر تم سچے مومن ہو تو تمھارا بول بالا ہوگا۔

غیر مومن اور بے کار خدا کا باغی ہے، وہ کس طرح نیابت الٰہی کا فرض انجام دے سکتا ہے، اس لیے وہ اس منصب جلیل کا اہل نہیں۔

نہیں اٹھا سکتا، اسلام کے معنی ہی اپنے کو مکمل طور پر خدا کے حوالے کر دینے کے ہیں، اس کی بڑی اچھی تمثیل حدیثوں میں ہے کہ "دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ اس حدیث کے مختلف معنی بیان کیے جاتے ہیں لیکن سب سے دلنشین معنی یہ ہیں کہ قید کی زندگی میں انسان کو اپنے افعال کا مختار نہیں بلکہ دوسرے کا پابند ہو کر رہنا پڑتا ہے، اور ایک مومن اپنے ہر عمل میں احکام الٰہی کا پابند ہے، اس لیے دنیا گویا اس کے لیے قید خانہ ہے، اس کے مقابلہ میں جنت میں کوئی پابندی نہ ہوگی، ہر شخص اپنے عمل میں خود مختار ہوگا، اور کافر بھی احکام الٰہی کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ اپنے افعال و اعمال میں آزاد ہوتا ہے، اس لیے دنیا اس کے لیے جنت ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت ایک مومن نہ صرف خود احکام الٰہی کا پابند ہے، بلکہ وہ دنیا میں اس کا مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری سے گرانبار ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جس قدر امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے
(آل عمران)	کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى	اور تم میں ایک جماعت ایسی رہنی چاہیے
الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	جو لوگوں کو نیک کاموں کی طرف بلائیں
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ	اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے
هُمُ الْمُفْلِحُونَ	منع کریں۔

حدیثوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہاں تک تاکید ہے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
بالمعروف ولتنھون عن المنکر	تم لوگ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے رہو اور برے
اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم	کاموں سے روکتے رہو، ورنہ خدا اپنا عذا
عذابا من عندہ ثم تدعوا	تم پر نازل کرے گا، اور پھر تم دعا کرو گے
ولا یستجاب لکم (ترمذی)	اور تمھاری دعا قبول نہ کیجائے گی
ایک دوسری روایت میں ہے	
قال من رای منکم منکرا فلیغیرہ	تم میں سے جو شخص کوئی بری بات دیکھے تو اس کو
بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ	چاہیے کہ اپنی قوت سے مٹادے، اگر اسکی
فان لم یستطع فبقلبہ وذلک	طاقت نہ ہو تو زبان سے کہکر مٹائے، اگر
اضعف الایمان (مسلم)	اسکی طاقت بھی نہ ہو تو کم سے کم دل سے
	اسکو برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے

نیکی اور خیر کی تبلیغ اور اس کے قیام ونفاذ اور بدی اور شر کے انسداد پر دنیا کا سارا نظام قائم ہے، اس کے بغیر سارا کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے گا، انبیاء علیہم السلام بھی اسی کی تبلیغ اور قیام کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اور دنیاوی حکومتوں کے قوانین کا مقصد وہ بھی وہ حقیقت خیر کا قیام اور شر کا انسداد ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنیاوی قانون کا دائرہ انسانوں کے مادی معاملات تک محدود ہوتا ہے، ان کو انسانوں کے اخلاقی اور روحانی معاملات سے صرف اسی حد تک علاقہ رہتا ہے جس حد تک عوام کے نفع ونقصان سے ان کا تعلق ہوتا ہے لیکن احکام الٰہی اور حکومت الٰہیہ کا دائرہ انسانوں کے دینی و دنیاوی اور مادی و روحانی جملہ ضروریات تک وسیع ہے، اس لیے خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریاں دنیاوی حکومتوں سے زیادہ اہم ہیں۔

وہ انسانوں کے جملہ معاملات میں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اخلاقی ہوں یا روحانی، احکام الٰہی کا ترجمان و مبلغ بھی ہے، اور اس کے قیام و نفاذ کا بھی ذمہ دار ہے، اس اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن کا فریضہ ہے۔

اس راہ کے شدائد | درحقیقت یہی وہ بار امانت ہے جس کے اٹھانے کی ہمت زمین و آسمان نہ کر سکے اور انسان کی ہمت مردانہ نے ان کو اٹھا لیا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمینوں
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ	اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب اس بار امانت
اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ	اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ
ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب - ۹)	اپنے حق میں بڑا ظالم اور نادان ہے۔

ع آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا

کہ اس بار امانت کے اٹھانے کے معنی خدا کی راہ میں جان و مال کی بازی لگا دینے کے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ	ان کا مال خرید لیا ہے کہ اس کے بدلے میں
لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ)	ان کو جنت ملے گی۔

اس راہ میں طرح طرح کے شدائد سے آزمایش ہوتی ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ	اور ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور
وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ	بھوک سے اور جان و مال اور پیداوار کی
وَالثَّمَرٰتِ (بقرہ ۱۹)	کمی سے آزمائیں گے۔

چنانچہ بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کو ایسی سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا کہ وہ بھی بعض اوقات تقاضائے بشریت سے گھبرا اٹھے۔ مسلمانوں کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ بس جنت میں
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ	داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم کو ان لوگوں کے
مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ	جیسے حالات نہیں پیش آئے جو تم سے پہلے
وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ	گذر چکے ہیں کہ ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور
وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ	تکلیفیں بھی پہنچیں اور جھڑ جھڑائے بھی گئے
أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ	یہاں تک کہ پیغمبر اور جو ایمان والے ان کے
	ساتھ تھے پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئیگی
	(اور ہم نے ان کو تسلی دی) کہ بس خدا کی
(بقرہ - ۲۶)	مدد قریب آگئی۔

اس کے نتائج | خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور دوسرے ارباب عزیمت مومنوں کو کیسے کیسے صبر آزما حالات سے گذرنا پڑا مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، ان کی قربانیوں اور جانکاہیوں نے خفتہ انسانیت کو بیدار، مری ہوئی قوموں کو زندہ اور گم کردہ راہ قافلوں کو راہ راست پر لگا دیا، اور ایک ایسی امت پیدا کردی جو اپنے اعمال و اخلاق میں دنیا کے لیے نمونہ تھی، اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہا

"میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث ہوں گے، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو روئے زمین کی خلافت (حکومت) ضرور عطا کرے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت دی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

اور مسلمانوں کو روے زمین کی سب سے زیادہ وسیع اور طاقتور سلطنت عطا کی گئی جس کا ایک سرا سندھ تھا اور دوسرا فرانس کی سرحد سے ملتا تھا، اس زمانہ میں انھوں نے اقوام عالم کی قیادت اور رہنمائی کی اور ان کے ذریعے دنیا میں دین و ایمان، علم و عرفان اور اخلاق و روحانیت، اور تہذیب و ثقافت کی روشنی پھیلی، وہ جس صحرا میں نکل گئے اس کو گلشن بنا دیا، دوسری قومیں ان کے علوم اور تہذیب فخریہ سیکھتیں اور اختیار کرتی تھیں، مگر یہ اسی وقت تک تھا جب تک وہ پیغام الٰہی کے علمبردار رہے، اور اعلاء کلمۃ اللہ ان کا شعار رہا، جب سے اس کا سررشتہ انکے ہاتھ سے چھوٹا، اس وقت سے وہ خود ان قوموں کی غلامی میں مبتلا ہو گئے جن کے وہ حاکم و رہنما اور مربی و معلم تھے، اور آج تک ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا اور افراد سے لیکر جماعتیں اور حکومتیں تک مغربی تہذیب کے سحر میں گرفتار اور اس کے نقش قدم پر گامزن ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی اور نصرت نے بھی ان سے منہ پھیر لیا اور وہ اس قوت سے محروم ہو گئے جس پر ان کی توانائی کا دار و مدار تھا۔

مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ساٹھ کروڑ کے درمیان ہے، اور ان کی بیس پچیس حکومتیں ہیں، اس کے باوجود ان کی کوئی آواز نہیں، اور وہ ایک پس ماندہ قوم بنکر رہ گئے ہیں، ان کی حکومتوں تک میں کوئی جان باقی نہیں ہے، چنانچہ پوری عرب دنیا ملکر بھی اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے اوپر ہے لیکن ان کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے کہ وہ زندگی کی اس قوت سے محروم ہیں جس کے بغیر انسانوں کی حیثیت جانوروں کے گلے اور خس و خاشاک سے زیادہ نہیں، جس کو ایک معمولی چنگاری جلا کر خاکستر کر سکتی ہے،

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

ایک مغالطہ کا ازالہ مغربی قوموں کی تقلید اور اس کے فوائد کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ مذہبی قیود سے آزادی اور مادی نظام حیات ہی کی بدولت بام عروج پر پہنچی ہیں، اگر مذہب ترقی میں مانع نہ ہوتا تو مسلمان جو مغربی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی ہیں، کیوں پستی اور تنزل کا شکار ہوتے، لیکن یہ سراسر مغالطہ ہے۔ نہ مغربی قوموں نے محض مذہبی آزادی اور مادی تصور حیات کے بدولت ترقی کی اور نہ مسلمان مذہب کی پابندی سے تنزل میں مبتلا ہیں، اور نہ یہی قابل بحث ہے کہ جس مادی ترقی کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے کیا وہ واقعی انسانیت کی صحیح اور متوازن ترقی ہے؟ اور اس سے انسانیت کی ضروریات اور اس کے مطالبات پورے ہو جاتے ہیں، اور کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں؟

مغربی قوموں کی ترقی کے حقیقی اسباب مغربی قوموں کی ترقی کا سبب محض مذہب سے آزادی اور مادی تصور حیات نہیں، بلکہ قوموں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بھی کچھ اصول مقرر کیے ہیں، جو قوم بھی ان پر عمل کرے گی وہ ضرور دنیا میں سربلندی حاصل کرے گی، خواہ وہ مومن ہو یا کافر اور جو قوم ان کو چھوڑے گی خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو تنزل کا شکار ہوگی، فطرت کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں، ان میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں، جس طرح صحت اور تندرستی کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جو بھی ان کی پابندی کرے گا وہ بیماری سے محفوظ اور تندرست رہے گا، اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ امراض کا شکار ہوگا اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جائے گی، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک کافر صحت کے اصولوں کی پابندی کے باوجود محض اپنے کفر کی بنا پر تندرست نہ رہے، اور ایک مومن ان اصولوں کی خلاف ورزی کے باوجود محض اسلام سے انتساب کی بنا پر امراض و ہلاکت سے محفوظ رہے، یہی حال قوموں کی صحت اور توانائی اور بیماری اور ہلاکت کے اصولوں کا ہے،

قوموں کی موت وحیات اور ترقی وتنزل کے عناصر

قوموں کی موت وحیات قوموں کی ترقی اور تنزل اور موت وحیات کے بہت سے عناصر ہیں، مثلاً نصب العین کا تعین، ان کی صحت پر ایمان اور یقین واثق، اس کے حصول کی جد وجہد، اس کے لیے جانبازی وجانفروشی، قومی وحدت، اجتماعی مفاد کے لیے ایثار و قربانی، ہمدردی ومواسات وغیرہ، جن قوموں میں بھی یہ اوصاف ہوں گے وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، اگر اس معیار سے مسلمانوں اور مغربی قوموں کا موازنہ کیا جائے تو مسلمان ان کے مقابلہ میں ہیچ نظر آئیں گے، مغربی قومیں اپنے بعض اخلاقی عیوب اور مادی تصورات کے باوجود ان اصولوں پر سختی سے عامل ہیں، انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین، مادی ترقی، سیاسی سربلندی اور دنیاوی عیش وتنعم کو بنالیا ہے، اور اس کے لیے ان کو مال کیا جان تک دینے میں باک نہیں ہوتا، یورپ کے بڑے بڑے فضلا، اور سائنٹسٹ اس راہ میں اپنی جانیں قربان کرچکے ہیں، جب قومی اور اجتماعی مفاد کا سوال آتا ہے تو ہر فرد اپنا پورا خانماں قومی مفاد کے لیے لٹا دیتا ہے، سلاطین اور امراء اپنے لڑکوں کو بلا تامل میدان جنگ میں بھیجدیتے ہیں، وہ مادی ترقی اور محدود قومی مفاد کے لیے جتنی قربانیاں کرتے ہیں، آج کے مسلمان اپنے دین وملت کے لیے اتنی قربانی نہیں کرسکتے، انھوں نے اپنی زندگی کے لیے جو اصول بنالیے ہیں ان پر سختی سے ان کا عمل ہے، اور ان کی پابندی ان کی فطرت میں داخل ہوگئی ہے، اس لیے ان کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی نہیں بلکہ مادی اور قومی ترقی کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اور یہ بھی کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہب سے مطلق آزاد ہیں، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

محض مادی ترقی انسانیت کی ترقی نہیں ہے

لیکن یہ ترقی درحقیقت انسانیت کی نہیں بلکہ صرف مادی ترقی ہے، جس سے انسانیت کے مطالبات پورے نہیں ہوتے، انسانوں کو صرف مادی سرسامان ہی کی احتیاج نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس کو اخلاق، روحانیت کی بھی ضرورت ہے۔

اس کے بغیر محض مادی طاقت انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔ جو طاقت بھی اخلاق اور انسانیت کے اصولوں کی پابند نہ ہوگی وہ انسانیت کے لیے وبال جان بنجائے گی، اسی لیے آج مغربی قوموں کی ساری طاقتیں اور علم و سائنس کی تمام ترقیاں انسانوں کے لیے سکون و راحت کا سامان فراہم کرنے سے زیادہ اس کی ہلاکت اور تباہی و بربادی کے سامان فراہم کرنے میں صرف ہو رہی ہیں، ان میں اقتدار اور سیاسی برتری کی ایک جنگ برپا ہے، ایسے ایسے اسلحے ایجاد ہو رہے ہیں کہ اگر ان کے استعمال کی نوبت آگئی تو عالم انسانیت کا خاتمہ یقینی ہے، اس ہلاکت آفرینی کو دیکھکر خود یورپ کے بڑے بڑے مفکرین مضطرب ہیں اور انسانیت کے نام پر اخلاق و روحانیت اور عالمگیر انسانی اخوت و ہمدردی کی صدا بلند کر رہے ہیں،

اگر انسان نے فلک شگاف راکٹ ایجاد کر لیے، چاند پر پہنچکر اپنا جھنڈا گاڑ دیا، بلکہ اس سے بھی اونچا اڑا تو اس سے مادی طاقت کے اظہار کے سوا کیا حاصل ہوا۔ انسانیت کی ترقی اور اس کی صحیح خدمت تو یہ ہوتی کہ اس ترقی کے ساتھ قوموں میں خدا شناسی، اخلاق فاضلہ اور انسانی ہمدردی و مواسات پیدا کیجاتی، اس کے بغیر محض مادی طاقت ایک شتر بے مہار اور مست ہاتھی ہے جو انسانیت کو کچل کر رکھ دیگی اس لیے یہ ترقی درحقیقت انسانیت ترقی نہیں بلکہ صرف مہلک مادیت کی ترقی ہے۔

کیا مسلمان مذہب کے پابند ہیں اب دوسرے سوال کو لیجئے، کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں، اور انکی مذہبیت ہی ان کے تنزل و پستی کا سبب ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ مسلمانوں میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں مذہب کے ظاہری رسوم کی پابندی زیادہ ہے، لیکن وہ مذہب کی اصل روح یعنی اخلاص، خشیت الٰہی، رجوع الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اس کے لیے ایثار و قربانی کے جذبہ سے خالی ہیں اور ان کی مذہبیت مذہب کا محض ظاہری خول ہے، اس لیے اس سے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں، جن کا خدا نے وعدہ کیا ہے، اور وہ اخلاق فاضلہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جو دنیا و دی سربلندی کے لیے

ضروری ہیں۔

مسلمانوں نے مذہب کے ایک اہم پہلو یعنی قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے اصولوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، اسلام محض روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کا نام نہیں ہے، اور اس کے بھی کتنے مسلمان پابند ہیں، بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور شوکت و عظمت کے لیے جد و جہد ایثار و قربانی، انفاق فی سبیل اللہ، قومی وحدت، اسلامی اخوت اور اس قبیل کے دوسرے اصول کو بالکل فراموش کر دیا ہے، جو عبادات ہی کی طرح ضروری ہیں اور جن پر قوموں کی موت و حیات کا دارومدار ہے، بلکہ جہاد یعنی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی افضل العبادات ہیں، اس جد و جہد میں سائنسی علوم کی تحصیل، ان کی ایجادات و اختراعات، مضبوط نظام حکومت فوجی قوت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو موجودہ دور میں کسی قوم کی بقا و استحکام کے لیے ضروری ہیں۔ خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے، اور خلفائے راشدین کا اس پر عمل رہا ہے، علم و فن کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے، کلام مجید کی جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کی عظمت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

اسلام میں علم و سائنس کی اہمیت

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، قرآن پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہیں۔

هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (زمر)

کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے دونوں برابر ہیں (ایسا نہیں ہے)

بلکہ علما اور اصحاب علم کا درجہ بلند ہے

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ) — تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنکو علم دیا گیا ہے اللہ انکے درجے کو بلند کرے گا۔

علم ہی کی ایک قسم حکمت ہے اور حکمت کو قرآن مجید میں خیر کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ) — اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دیگئی اس نے بڑی دولت پائی۔

حکمت کے جو معنی بھی لیے جائیں اس میں علم و تجربہ اور عقل و دانش کی باتیں ضرور داخل ہونگی۔

دینی نقطۂ نظر سے دنیاوی علوم کی ضرورت اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے علم و حکمت کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، عام طور پر علم و حکمت سے مراد وحی الٰہی، علم دین اور دین کی سمجھ لیجاتی ہے لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں جب کہ اس کے الفاظ میں عموم ہے، یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ سب سے مقدم دینی علوم اور تفقہ فی الدین ہے، اور ان کو دوسرے تمام علوم پر اولیت اور فضیلت حاصل ہے، لیکن دوسرے علوم خصوصاً ان علوم کو خارج کر دینے کوئی وجہ نہیں جو دین کی خدمت اور اسلام اور مسلمانوں کی شوکت و عظمت کے قیام کے لیے اس زمانہ میں ضروری ہیں، اور جن کے بغیر کوئی قوم طاقتور نہیں ہوسکتی بلکہ زندہ نہیں رہ سکتی، خود قرآن مجید کی آیات اس پر شاہد ہیں کہ دنیاوی علوم نہ صرف دنیاوی طاقت کے حصول کے لیے ضروری بلکہ عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں، مثلاً کلام مجید میں جا بجا کائنات کی تخلیق، اس کے مظاہر، آسمان و زمین، چاند، سورج، پہاڑ اور سمندر، بارش اور ہوا، زمین کی روئیدگی اور انسان کی خلقت پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک مومن کے عرفان کے لیے تو ان کی خلقت اور اس کے ظاہری فوائد ہی کافی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا کمال، اس کی صناعیاں اور اس کے اسرار و حکم ایک محقق اور سائنٹسٹ پر زیادہ منکشف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ظاہر بین کے لیے انسان کا ظاہری

حسن و جمال، اللہ تعالیٰ کے کمال تخلیق کے ثبوت کے لیے کافی ہے لیکن تشریح الاعضاء کے ماہر ڈاکٹروں کو انسانی جسم کے ہر عضو میں اللہ تعالیٰ کی بے نظیر صناعی کی ایک پوری کائنات نظر آتی ہے، اسی طریقہ سے آسمان کی رفعت، سیاروں کی گردش، آفتاب کی حرارت اور روشنی، چاند کی ٹھنڈی چاندنی کو ایک عامی بھی دیکھتا اور خدا کی قدرت کو محسوس کرتا ہے، لیکن ایک ہیئت داں کو خلا کی لامحدود وسعتوں، سیاروں کے عظیم الشان نظام اور محیر العقول عجائبات میں خدا کی حقیقی عظمت اور اس کا جلال نظر آتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ امام غزالی کا مقولہ ہے کہ جو شخص ہیئت سے واقف نہیں وہ معرفت الٰہی میں عنین ہے، اس لیے سائنسی علوم عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں۔

خلافت ارضی کے لیے مادی طاقت ضروری ہے | اس مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیے، حکومت اور دنیاوی اقتدار کے لیے خود قرآن مجید نے علم کی طاقت اور مادی قوت کو ضروری قرار دیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل نے اس وقت کے موجود پیغمبر سے کسی کو بادشاہ بنانے کی درخواست کی تو انھوں نے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا، بنی اسرائیل نے عذر کیا کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے، وہ ہم پر کس طرح حکومت کر سکتے ہیں، ہم ان کے مقابلہ میں حکومت کے زیادہ اہل ہیں، پیغمبر نے طالوت کے استحقاق حکومت کی یہ دلیل دی

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ	اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ	انکو علم اور جسم میں زیادہ وسعت عطا کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت و اقتدار کے لیے علم کی قوت اور جسمانی یا مادی طاقت ضروری ہے اس طرح مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے حکم دیا گیا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ (انفال)

اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت اور پلے ہوئے گھوڑے جمع کر سکتے ہو، ان سے پوری طرح تیار رہو تاکہ انکے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر اپنی دھاک بٹھا سکو

یہ آیات اس کا ثبوت ہیں کہ اُس زمانہ میں حکومت کے استحکام اور دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جس قسم کی طاقت کی ضرورت تھی اس کی تیاری کا حکم دیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں جس قسم کی طاقت کی ضرورت ہے، اس کے لیے بھی وہی حکم ہے، اور اس میں علم و سائنس کی ایجادات، فوجی قوت اور ہر قسم کے جدید اسلحہ سب داخل ہیں، اور ان کے لیے مغربی علوم خصوصاً سائنس کی تحصیل اور اس میں کمال پیدا کرنا ضروری ہے

مسلمانوں کی علم دوستی اور خدمت علم مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے دور عروج میں دوسری قوموں کے علوم سے پورا استفادہ کیا، ان کو ترقی دی، سیکڑوں نئے علوم ایجاد کیے، اور علمی میدان میں پوری دنیا کی امامت کی، اگر اس زمانہ میں انھوں نے علم کا پایہ نہ سنبھالا ہوتا تو بہت سے پرانے علوم جن پر موجودہ علمی ترقی کی بنیاد قائم ہے، مٹ گئے ہوتے، اور آج دنیا علم کی روشنی سے محروم رہتی، انہی نے مغربی قوموں کو یونانی علوم سے آشنا کیا۔ طب، فلسفہ، ہیئت، ریاضیات وغیرہ میں مسلمانوں کی تصانیف کے لاطینی تراجم صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہے، یورپ کی نشاۃ ثانیہ انہی کی رہین منت ہے، انہی علوم کی بنیاد پر اس نے علوم و فنون کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا، اس لیے مفید علوم کی تحصیل اور ان کی خدمت و اشاعت خواہ وہ کسی قوم کے ہوں مسلمانوں کا خاص ورثہ رہا ہے، جدید علوم خصوصاً سائنسی فنون کی تحصیل نہ صرف مسلمانوں کی دنیاوی ترقی

اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہیں، بلکہ ان کے بغیر اس زمانہ میں دین کی پوری خدمت بھی نہیں ہوسکتی، لیکن اس بارہ میں نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت ہے، علم و سائنس کی قوت کے لیے اخلاقی حدود کی پابندی ضروری ہے، اس کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت ہونا چاہیے۔ محض مادی طاقت کا حصول، سیاسی اقتدار، قومی افتخار اور سربلندی اور سامان تعیش کی فراہمی نہیں اگر سائنسی علوم کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ سراسر خیر ہیں، ورنہ سراپا شر، مولانا روم آج سے صدیوں پہلے کہہ گئے

علم را بر تن زنی مارے بود علم را بر دل زنی یارے بود

اور اس کے لیے سب سے مقدم شرط خداشناسی، خشیت الٰہی اور مواخذہ کا خوف ہے، اس کے بغیر یہ دیو قابو میں نہیں آسکتا۔

مغربی قوموں اور مغربی تہذیب کی خوبیاں | مغربی قومیں اور ان کی تہذیب محض برائیوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں قابل تقلید خوبیاں بھی ہیں، ان کی مادہ پرستی کے باوجود ان میں مذہب کا بھی اثر باقی ہے، چرچ اور مشنری کا پورا نظام قائم ہے، جس پر حکومتیں کروروں روپئے صرف کرتی ہیں، مذہب کی تبلیغ، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت اور رفاہ عام کے کاموں اور انسانوں کی خدمت کے سیکڑوں ادارے قائم ہیں، عیسائی مبلغین اخلاق و انسانیت کا پیکر ہوتے ہیں، اور انسانی ہمدردی اور انسانیت کی خدمت میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سی چیزوں میں مذہب کی روح اور اس کے مقصد پر ہم سے زیادہ انکا عمل ہے، ان کی دوسری نمایاں خوبی ان کی اصول پرستی اور ان کا ضبط و نظم ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے، سیاست کو چھوڑ کر جس میں وہ چنگیز و ہلاکو بنجاتے ہیں، عام زندگی میں اخلاقی اوصاف میں ان کا قدم مسلمانوں سے بہت آگے ہے۔

مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی لیکن ان کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی جس نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، ان کا مادی تصور حیات ہے، اس کی بنیاد تمام تر مادیت اور لادینیت پر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اثر ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہے، ایک طرف مذہب کا پورا نظام قائم ہے، دوسری طرف مادی ترقی اور عیش و تنعم مقصد زندگی بن گیا ہے، اور مغرب کی تمام قومیں عیش و تنعم کی سرمستی میں اور حکومتیں مادی ترقی، سیاسی اقتدار اور قومی برتری کے جنون میں مبتلا ہیں، سیاست میں دین و اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، اور عیش پرستی حد سے گذر کر بدمستی تک پہنچ گئی ہے، اس کے نتائج سے خود یورپ کا سنجیدہ طبقہ اور بڑے بڑے مفکرین جن میں اخلاقی احساس باقی ہے، مضطرب ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں نے صرف انکی برائیوں کی تقلید کی مسلمانوں نے مغربی تہذیب کی تقلید بھی کی تو انکی برائیوں میں، مغربی قوموں کے اچھے اوصاف اور کمالات میں ان کی تقلید کی توفیق ان کو بہت کم ہوئی، زیادہ تر ان کے عیوب اور ان کی برائیاں ان کے حصہ میں آئیں، اس لیے وہ ان دنیاوی فوائد سے بھی محروم رہے جو مغربی قوموں کے اوصاف کا نتیجہ ہیں، اس طرح دین بھی ان کے ہاتھ سے گیا اور دنیا بھی ان کو حاصل نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے اپنے عقائد و تصورات ہیں، اپنا نظام حیات ہے اپنی تہذیب و روایات ہیں، ان کی زندگی کا خاص نصب العین اور مقصد حیات ہے، اس کے مطالبات اور ذمہ داریاں ہیں، اگر وہ ان سب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر مادی ترقی کے اوج کمال پر بھی پہنچ گئے تو وہ خیر امت کہاں باقی رہے، جن کو نیابت الٰہی اور اقوام عالم کی ہدایت و رہنمائی کا منصب سپرد کیا گیا تھا، اس کے بجائے وہ خود انہی کی برائیوں میں مبتلا ہو کر دوسری مادہ پرست قوموں کی طرح ایک قوم بن گئے، جن کی دنیا میں کمی نہیں ہے،

مسلمانوں کا منصب اور اس کی ذمہ داری

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آج پوری دنیا ہدایت الٰہی کو فراموش اور انسانیت کا اصل مقام کھو چکی ہے، ہر قوم مادیت کے سیلاب میں غرق اور مادی ترقی کے جنون میں مبتلا ہے مسلمان بھی اسی سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ خیر امت ہیں، جن کو اقوام عالم کی ہدایت کا منصب سپرد کیا گیا تھا،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جتنی امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں
(آل عمران)	سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،

وہ اس منصب کو فراموش کر کے "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بن گئے ہیں، لیکن اب بھی من حیث القوم انکا تصور حیات نہیں بدلا ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں موجود ہے، اس لیے اس بجھے ہوئے خاکستر میں بھی ابھی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اس لیے آج بھی ان پر حق کا پیغام پہنچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے عمل سے خیر امت ہونے کا ثبوت دیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت، ان کے ہاتھوں میں ہدایت الٰہی کی مشعل، ان کے اعمال و اخلاق میں اسلام کی تصویر، ان کی نگاہ میں حقیقت بینی اور ان کے بازوؤں میں علم و سائنس کی طاقت ہو، اس وقت دنیا ان کی طرف توجہ کرنے اور ان کی باتیں سننے پر مجبور ہوگی، ورنہ محض کھوکھلی نقالی سے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور ان کی داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں،

ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل

ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مادیت اور لادینیت کے علاوہ ایک بڑا خطرہ اکثریت میں ضم ہو جانے یا کم سے کم انکی تہذیب کے رنگ میں

رنگ جانے کا ہے، گو ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، اور مسلمانوں کو بھی دستور میں وہی حقوق حاصل ہیں جو دوسری قوموں کے ہیں لیکن جمہوریت میں اقتدار ہمیشہ اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے، اور اسکی فطرت جارحانہ ہوتی ہے، ہر اکثریت اقلیت کو اپنے میں ضم یا کم سے کم اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتی ہے جس کی کوشش ہندوستان میں بھی جاری ہے، اس سے بچنے کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ اپنے دلوں میں ایمان کی حرارت اور عمل میں اسلامی کردار پیدا کریں، ایک طرف ان کے ایمان میں آتش رسوخ اور دین میں اس قدر صلابت ہو کہ وہ کسی ایسے اثر کو قبول نہ کریں جو انکے مذہب اور انکی تہذیب و روایات کے خلاف ہو، دوسری طرف اپنے اعمال و اخلاق سے دلوں کو تسخیر کریں، اور ہندوستان کی تعمیر میں ایسا موثر حصہ لیں کہ دوسری قومیں انکی اہمیت ماننے پر مجبور ہوں ہندوستان کو مسلمانوں نے محض تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کیا تھا، ورنہ اتنی طویل مدت تک انکی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا اور ہندوستانیوں کے دلوں پر اپنے عدل، مساوات اور ملک کی محبت و خدمت کا سکہ جمایا اور اپنی ساری دماغی و ذہنی صلاحیتیں ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں صرف کردیں، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحدہ ملک اور علم و فن، تہذیب و تمدن، ہر لحاظ سے اس صحرا کو گلشن بنادیا، اسلام کی تازہ دم قوت نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں ایک نئی روح پھونکی، اس کو توحید خالص سے آشنا کیا، انسانی مساوات کا سبق دیا، بوسیدہ رسوم و روایات اور اوہام و خرافات سے آزاد کرکے حقیقت شناس بنایا، اسلام کے اثر سے ہندو مذہب اور ہندو معاشرہ میں تجدید و اصلاح ہوئی، مسلمانوں نے ہندوستانی علوم سے جسقدر استفادہ کیا اس سے زیادہ انکی خدمت کی، ان کو پنڈتوں کے سینوں اور ہندوستان کی چہار دیواری سے نکال کر دنیا میں ان کا تعارف کرایا، نئے علوم سکھائے، ہر شعبۂ زندگی میں نفاست اور ایک ایسی مشترک تہذیب

پیدا کی جو اپنے حسن و لطافت اور خوبی و پاکیزگی میں مشرق کی تہذیبوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔

مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں آج بھی رہنمائی کی طاقت ہے، اور وہ دنیا کو بہت کچھ دے سکتا ہے، ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے، مگر آج اس کے وہ نتائج نہیں نکلتے جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حاملین اسلام خود اسلام کے محاسن سے تہی دامن ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ دوسروں پر کیا اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان کے اسلاف اپنے عمل سے اسلام کی تصویر پیش کرتے تھے، اس کو دیکھکر دوسری قومیں اس کی طرف کھنچتی تھیں، اگر سلاطین تلوار سے ملک کو فتح کرتے تو اپنے عدل و مساوات سے اس کو مضبوط کرتے تھے، مبلغین اسلام اور صوفیائے کرام اپنے اخلاق و کردار سے دلوں کو تسخیر کرتے تھے، مختلف اصناف کے اصحاب علم و کمال اپنے علوم و کمالات اور اپنی تخلیقی قوت اور تعمیری صلاحیتوں سے ملک کو سنوارتے تھے، اس لیے مفتوحہ قومیں ان کی قابلیت اور ضرورت ماننے پر مجبور ہو جاتی تھیں، اگر آج بھی مسلمان اس کا عملی نمونہ پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے وہی نتائج نہ نکلیں جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، اور نہ محض زبانی دعویٰ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں دینی صلابت و پختگی نہ ہوگی تو وہ رفتہ رفتہ اکثریت میں ضم ہو جائیں گے، اور اگر وہ ہندوستان میں اجنبی بن کر رہے، اپنے عمل و کردار سے دلوں کو مائل نہ کیا، اور ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ نہ لیا تو ملک کا اعتماد حاصل نہ کر سکیں گے اور احساس کمتری کا شکار ہو کر پسماندہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستان میں فارسی کا مطالعہ اور اس کا مستقبل

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

(یہ مقالہ دارالمصنفین کو لڈن جبلی کیلئے لکھا گیا تھا)

اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی اور فارسی دونوں نے اس ملک میں جگہ لی، مگر ان زبانوں کے مصرف الگ الگ رہے ہیں۔ مذہبی تعلیم و تدریس اور دینی علوم کیلئے زیادہ تر عربی سے کام لیا گیا۔ اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے ارتقا میں جن زبانوں کو سب سے زیادہ دخل ہے، ان میں سے ایک فارسی بھی ہے، جو سینکڑوں برس تک اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے، اور بغیر تفریق مذہب و ملت سب نے اس کو اپنایا، چنانچہ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ بغیر فارسی ماخذوں کے ناممکن ہے۔ اس طویل اور صدیوں کی مدت میں فارسی زبان و ادب نے ہندوستان میں جو ترقی کی اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایرانی محققین نے فارسی ادب کو جن تین سبکوں میں تقسیم کیا ہے، ان میں سے ایک کا نام سبک ہندی ہے۔

شعر، نثر، تاریخ، تذکرہ، انشا، سلوک، منطق، فلسفہ، اخلاق، سیاست، طب، قصص، ترجمہ، تفسیر، جغرافیہ، قواعد، لغت، بلاغت، عروض و قافیہ، ریاضی، حدیث، کلام، فقہ، قرأت و تجوید، سفرنامہ، ملفوظات، ہیئت، مناظرہ، فتاوی، زیج، ہندسہ، معادن، موسیقی، علم الحیوان، کیمیا، نجوم، رمل، جفر، شعبدہ بازی و طلسمات، ادعیہ، اسمائے تیراندازی، صید، شروع، فال، شطرنج، گنجفہ، خطاطی، تعبیر الرویا، صنعت و حرفت،

طبابت، مواعظ، نحو، کشکول، قانون و دستور العمل، فرامین، کتبہ جات، آداب الحرب وغیرہ فنون میں ہندوستان میں جس قدر کتابیں اور رسالے فارسی میں لکھے گئے، ان کا شمار کرنا اور ان کی فہرست بنانا مشکل ہے، ان میں سے جو کتابیں چھپ گئی ہیں ان کا بھی احصا نہیں کیا جا سکتا، اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ایران کے مقابلہ میں یہاں فارسی کتابیں زیادہ شائع ہوئی ہیں، تو غالباً غلط نہ ہوگا۔

گذشتہ زمانہ میں فارسی زبان و ادب میں جو کچھ کام انجام پایا، اس میں ہمارے تخلیقی آرٹ کو بہت زیادہ دخل ہے، اب ہندوستان میں فارسی کے مستقبل کا سوال ہے، اس میں تحقیق و انتقاد کو سب سے زیادہ جگہ ملنی چاہیے، اس دور کا آغاز علامہ شبلی سے ہوتا ہے، ان ہی جیسی ہستیوں کے لیے حافظ نے کہا ہے

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ ارباب جہاں خواہد بود

اس سرزمین کو فخر ہے کہ اس نے علامہ شبلی جیسی شخصیت کو جنم دے کر صرف ہندوستان کے ادب کو دولت مند نہیں بنایا، بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اس نے استفادہ کا موقع دیا، فارسی کا کونسا ایسا عالم ہوگا جو اس بلند ہستی کو نظر انداز کر سکے اور اس سے واقف نہ ہو، فارسی ادبیات میں نہ صرف ہندوستان بلکہ اس سے باہر ایران، افغانستان، تاجیکستان، وغیرہ کے لوگ اور یورپ کے مستشرقین تک ان کے آثار سے برابر استفادہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اور کوئی فارسی ادب پر کام کرنے والا انکی تصانیف سے مستغنی نہیں ہو سکتا، ایران میں شعر العجم کی پانچوں جلدوں کا فارسی ترجمہ شائع ہو چکا ہے، سب سے پہلے چوتھی جلد شائع ہوئی اور سب سے آخر میں تیسری، اس وقت میں خود وہاں موجود تھا اور مجھے

فخر ہے کہ گو میں علامہ شبلی کی زیارت نہ کر سکا، مگر ان کی کتابوں کے مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی سے مل چکا ہوں جن کی عمر ۱۹۵۵ء میں اسی برس کے قریب تھی، فخر داعی تیسری جلد کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "چونکہ میں اس ترجمہ کے وقت درد کمر اور وجع مفاصل میں مبتلا تھا، اس لیے اس کام میں کافی زحمت اٹھانی پڑی"۔ استاد سعید نفیسی اس جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "اس مفید اور پُر مغز کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جسے ایک دانشمند اور روشن بین انسان نے ادبیات فارسی جیسے لافانی خزانہ کے قیمتی موتیوں کے تجزیہ اور تحلیل میں لکھا ہے اور "الفضل للمتقدم" کی بنا پر شبلی کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سے قبل افغانستان میں بھی شعر العجم کی جلدوں کے ترجمے ہوئے تھے، مگر یہ ترجمہ ایرانیوں کے ذوق کے موافق نہ تھا"۔

چونکہ میں بھی علامہ شبلی کے وطن کا ایک حقیر ذرہ ہوں، اس لیے مجھے اس بلند شخصیت سے جذباتی لگاؤ بھی ہے لیکن میرے جیسے انسانوں کا مطالعہ، جن کا نقطۂ نظر محدود ہے، حضرت شبلی کے مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے، اگر مختلف مذاق کے لوگ ملکر ان کا مطالعہ کریں تو شاید اس کا احاطہ کر سکیں، ہمیں چاہیے کہ علامہ شبلی کے نقش قدم پر چل کر اپنی دیرینہ روایات اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ فارسی کی تمام مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی مکمل فہرست بنائی جائے اور ان میں سے اہم چیزوں کو پھر سے ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں اور اس سے باہر فارسی کی بیشمار اہم قلمی کتابیں جو اب تک منظر عام پر نہ آ سکیں، اور نفائس المآثر، مجمع النفائس، نظم گزیدہ، باغ معانی، گلدستۂ معانی، ریاض الشعراء، ریاض الافکار، ہمیشہ بہار، نشتر عشق،

طبقات شاہجہانی، جہانگیر نامۂ طالب آملی، پنجاکیانہ، سیر المنازل، فتحنامۂ نور جہاں بیگم، رزم نامۂ حسرت، حکایت پادشاہاں، شاہجہاں نامۂ امین قزوینی، یحییٰ کاشی، عنایت خاں، ابوطالب کلیم، جلال الدین طباطبائی، قدسی مشہدی، چارچمن برہمن، جنگ نامۂ اسلام خاں، آثار شاہجہانی، شش فتح کانگڑہ، تاریخ شاہ شجاع، عرفات عاشقین، خلاصۃ الاشعار، خلاصۃ الکلام، تذکرۃ الشعراء، تذکرۂ کاتب، تکملۃ الشعراء، سفینۂ عشرت، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب، ید بیضا اور صبح صادق جیسی اہم کتابیں اور تذکرے ابھی تک چند قلمی نسخوں تک محدود ہیں جن تک عام طور سے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی، ضرورت ہے کہ یہ مآخذ ایڈٹ کرکے شائع کیے جائیں، تاکہ محققین تک آسانی سے پہنچ سکیں،

ہمارے ملک میں کثرت پبلک اور شخصی کتبخانے ہیں جن میں سے اکثر کتب خانوں کو عام طور سے لوگ نہیں جانتے اور نہ ان تک آسانی سے ان کی رسائی ہوتی ہے، مثلاً مہاراجہ بنارس کا کتب خانہ، بنارس یونیورسٹی کا سرسیرام کلکشن، لکھنؤ میں آغا ابو صاحب اور تقی صاحب کے کتب خانے، لکھنؤ کے ایک کتب خانہ کو گورنمنٹ سے ہر طرح کی امداد ملتی ہے، اور ابن حبیب بغدادی کی المنمق کا واحد قلمی نسخہ اسی کتب خانہ میں ہے، چونکہ نظام حیدرآباد کے یہاں سے اس خاندان کو وظیفہ ملتا تھا، اس لیے اس قلمی نسخہ کی نقل دائرۃ المعارف کو مل گئی تھی، مگر ابھی حال میں جب ایک صاحب دائرۃ المعارف کی جانب سے اس کتاب کو ایڈٹ کرنے کے سلسلہ میں لکھنؤ گئے تو کتب خانہ کے مالکوں نے ان کو اصل نسخہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی، جو بڑا علمی اور اخلاقی جرم تھا، اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے اداروں کو مجبور کرے کہ وہ علمی کاموں میں رکاوٹ پیدا نہ کرسکیں۔

ایسے کتب خانے بھی ہیں جو مشہور ہیں، اور اس میں استفادہ کرنے والوں کو ہر طرح کی

سہولت ملتی ہے، مگر بدقسمتی سے ان کی فہرستیں ابھی تک نہیں چھپ سکیں، رضا لائبریری جیسے اہم کتب خانہ کی مکمل فہرست ابھی تک رامپور سے باہر دستیاب نہیں ہوسکتی۔

اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے تمام رسمی اور غیر رسمی کتب خانوں کی مکمل فہرست تیار کیجائے، تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان سے روشناس ہوسکیں، پھران کی محققانہ فہرستیں مرتب کیجائیں تاکہ محققین غلطیوں کا شکار نہ ہوسکیں، ابھی الورمیوزیم کی فہرست چھپی ہے، جس میں دیوان سرمد کا ذکر ہے لیکن درحقیقت یہ سرمد کا دیوان نہیں ہے، جب میں نے ۱۹۶۱ء میں الورمیوزیم کو دیکھا تھا، اس وقت بھی وہاں کی قلمی فہرست میں یہ غلطی موجود تھی، جو مطبوعہ فہرست میں منتقل ہوگئی ہے، مجھکو وہاں ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو فارسی کا کیا ذکر اردو سے بھی واقف ہو، اس لیے یہ کام بھی اہم ہے، اس قسم کے خزانوں کی نگرانی ایسے لوگوں کے سپرد کی جائے جو علمی طریقہ سے ان کی نگرانی اور خود بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہوں۔

کتب خانوں کی تنظیم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام مخطوطات کا مطالعہ کیا جائے جو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ و تہذیب اور آثار قدیمہ کے مطالعہ میں مدد دے سکتے ہوں، ان کے مطالعہ سے بہت سے ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن سے ابتک لوگ ناواقف ہیں، رفتہ رفتہ کئی نامور کتابیں تلاش سے نکل رہی ہیں۔

پنچتنتر کا تقریباً دنیا کے تمام متمدن ممالک میں بار بار ترجمہ ہوچکا ہے، اس کے تقریباً ساٹھ زبانوں میں دو سو ترجمے موجود ہیں، اور جاوا سے لیکر آئس لینڈ تک اس کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، علماء و محققین نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے، اور تقریباً تمام ترجموں کا پتہ لگایا ہے، پھر بھی ایک بیحد اہم ترجمہ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ گیا، ابھی حال میں اس ترجمہ کا پتہ چلا ہے جس کا نام ہنچا کیانہ ہے، اور جسے مصطفیٰ خالقداد عباسی نے شہنشاہ اکبر

کے حکم سے براہ راست سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کا واحد قلمی نسخہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی میں موجود ہے۔ (نمبر ۶۲.۱۰۰۵)

ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے تاریخی اور تہذیبی مطالعہ کے لیے کچھ محدود کتابیں جنکو لوگ پہلے اصل زبان میں پڑھا کرتے تھے، لیکن اب زیادہ تر ان کے ترجموں سے کام نکالا جاتا ہے، اس سے مطالعہ کرنے والے کتاب کی اصل روح سے دور ہوتے جارہے ہیں، ترجموں میں غلطیوں کے امکانات بھی ہوتے ہیں، جسنے غلط نتیجے نکل سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیشمار ایسی کتابیں اور تذکرے ہیں، جن کا ابتک کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے، اور ان کے ماخذ سے عام طور پر لوگ محروم رہتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی اہم کتابوں کا زیادہ سے زیادہ ترجمہ کیا جائے، اور ان کے متن کو معیاری طریقہ سے شائع کیا جائے اور لوگ اصل متن کے پڑھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

پھر یہ غلط خیال ہے کہ صرف تاریخ کی کتابوں سے مورخین کے لیے مواد مل سکتا ہے، مجھے ڈاکٹر اشرف مرحوم کا کہنا کبھی نہیں بھولتا کہ تاریخ و تہذیب کے مطالعہ کے لیے ادبیات کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس سے بڑا مواد مل سکتا ہے۔

چندائن یا داستان مینا و لورک کو مولانا داؤد نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندی میں نظم کیا تھا، اور مخدوم شیخ تقی الدین واعظ، بانی دہلی میں اس کے بعض حصوں کو منبر پر پڑھا کرتے تھے جس سے سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی، اس زمانہ کے بعض علما نے اس نظم کے پڑھنے کا سبب پوچھا، تو جواب دیا کہ یہ کتاب صاحبان عشق کے وجدان اور آیات قرآنی کے مطابق ہے، مولانا داؤد کی چندائن سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ فارسی نظم میں اس کا ترجمہ کر دیا، بدقسمتی سے اب اس فارسی مثنوی کے صرف سات شعر لطائف قدوسی

میں محفوظ رہ گئے ہیں، عہد جہانگیری میں یہ داستان "عصمت نامہ" کے نام سے منظوم ہوئی ہے۔

اسی طرح نوعی خبوشانی کی ایک مختصر مثنوی "سوز و گداز" ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک حسین و لعبن کا شوہر بارات آتے آتے ایک کہنہ مکان کے گرنے سے مرجاتا ہے، وہ ستی ہونا چاہتی ہے، شہنشاہ اکبر کو معلوم ہوتا ہے، تو اسے بلاکر اپنے تخت پر بٹھاتا ہے، اسے رانی کا خطاب دیتا ہے، اور سوائے تخت شاہی کے دنیا کی ہر نعمت اس کے سامنے پیش کردیتا ہے، مگر وہ کسی طرح ستی ہونے سے باز نہیں آتی، اس وقت بادشاہ شہزادہ دانیال کو حکم دیتا ہے کہ وہ خود جاکر شاہزادیوں کی طرح اس کی ستی کا انتظام کرے، اور جب وہ پیسی کرب و بیچینی کے ستی ہوجاتی ہے تو شاہزادہ روتے روتے غش کھا جاتا ہے، اکبر بھی اس واقعہ سے بیحد متاثر ہوتا ہے، اور نوعی کو بلاکر کہتا ہے کہ تم لوگ کب تک گل و بلبل کے پارینہ افسانے دہراتے رہوگے، اور اس سچے واقعہ کو نظم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دیوان ہجری کا ایک عمدہ نسخہ انڈیا آفس میں ہے، خواجہ ہجری ہمایوں کے ہمعصر مداح اور درباری شاعر تھے، جب اکبر تخت نشین ہوا تو ہجری نے اس نوجوان بادشاہ کو قصیدوں میں نصیحتیں کرنا شروع کیں، ایک قصیدہ میں اکبر کو غلہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی طرف متوجہ کیا ہے، ایک قصیدہ میں اس کی تزلیدہ باتوں پر متنبہ کیا ہے، اور ان کو سلیقہ سے رکھنے کی تعلیم دی ہے، دیوان ہجری میں بہت سے مطالب و جزئیات میں جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ ہیں۔[1]

ہندوستان کی بہت سی داستانیں دنیا کے ادب کا حصہ بن چکی ہیں، بلوہر و بوذاسف کا قصہ جو اصل میں بھگوان بدھ کی ستوا ہے، دوسری زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی

---

[1] معارف۔ ہجری پر مضمون نگار نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جو آئندہ کسی نمبر میں شائع ہوگا۔

کئی مرتبہ ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس قصہ کو "اخوان الصفا" جیسی اہم کتاب میں جگہ ملی ہے، ملا محمد باقر مجلسی نے عین الحیات میں اس قصہ کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

فارسی نے خاص طور سے اس قسم کے قصوں کی مقبولیت میں مدد پہنچائی ہے۔ اور اس زبان میں ہمارے بیشمار ملکی قصے لکھے جا چکے ہیں، جن میں سے نل دمن، مہا بھارت، رامائن، طوطی نامہ، سنگھاسن بتیسی، ہیر رانجھا، پدماوت، کام روپ کام لتا، سسی پنوں، منوہر و مدھومالتی، مدھانل و کام کندلا، سوہنی مہیوال، منکا و منوہر، مہیار و چندر بدن، چترکرن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح سے بہت سے ہندوستانی قصے مولانا روم کی مثنوی اور دوسری کتابوں میں ملتے ہیں، ہمارے محققین کے لیے ان میں بڑا خزانہ موجود ہے، جس سے علمی اور تہذیبی دقتائق گرانبہا اضافہ ہو سکتا ہے، اور بہت سے ایسے واقعات اور نکتے ہیں جو صرف ادبیات کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

شعر کی مناسبت سے فارسی شعراء کے تذکروں میں ہمیں بہت سے حظاطوں، عمارتوں، موسیقی دانوں، جامہ بافوں، مہر کنوں، قصہ خانوں، تاجروں، کلالوں، اقوکشوں، کلچہ پزوں، زعفران فروشوں، مصوروں، طبیبوں، دلالوں، سماروں، حکاکوں، بیشمازوں، خشت پزوں، روغن گروں، زرکشوں، سپاہیوں، مدرسوں، خیاطوں، جوہریوں، نقاشوں، دلالوں، طباخوں، عطاروں، کیمیاگروں، رباب نوازوں، معماروں، نقارچیوں، بقالوں، رفوگروں، واعظوں، حلوہ فروشوں، درویشوں، تعزیہ خوانوں، سیاحوں، کاسہ گروں، منشیوں، حجاموں، حلاجوں، کمانگروں، شاہنامہ خوانوں، تبلہ بانوں، حافظوں، متصدیوں، شطرنج بازوں، مہندسوں، تاجروں، ابریشم کشوں، منجموں، مفردہ نویسوں، سجادہ نشینوں، دلگیریزوں، بتخانہ پرستوں وغیرہ کے بھی حالات معلوم ہو جاتے ہیں جن میں سے بعض کو اس لیے کہ وہ

معمولی پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہم کسی اور ماخذ سے معلوم نہیں کر سکتے۔

فارسی کی فرہنگیں اور گرامر وغیرہ زیادہ تر ہندوستان میں لکھی گئیں، اور آج ایرانیوں کو ضرورت ہوئی کہ ان کو شائع کریں۔ برہان قاطع، فرہنگ آنند راج وغیرہ ایڈٹ کر کے شائع اور ہماری چیزیں ایران کے مطبعوں میں چھپکر وہاں کے بازاروں میں فروخت کی جارہی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی بنیادی چیزیں بھی زیادہ سے زیادہ ایڈٹ کر کے شائع کیجائیں، جن کی ہمیں اور دوسروں کو ضرورت ہے۔

فارسی کا رشتہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی بڑا گہرا ہے۔ ان زبانوں کے مطالعہ کے لیے بھی فارسی میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بیشتر بڑے کلاسیکی اردو کے شعراء کا یہ اہم پہلو اپنی کمزوری اور کم علمی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ مستقل فارسی کے شاعر اور نثر نویس تھے، غالب نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فارسی بیں تا ببیں نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

نظیر اکبر آبادی کی علمیت میں لوگوں کو شک تھا، اور جب باطن نے کہا کہ انھوں نے فارسی میں نو رسالے لکھے اور صاحب دیوان تھے، تو لوگوں کو اس کا یقین نہیں آیا تھا، یہ رسالے اسقدر نایاب تھے کہ خود باطن سات بتا سکے۔ شہباز کو ان میں سے صرف پانچ اور نیاز صاحب کو تین رسالے مل سکے، ابھی حال میں مجھے آٹھ رسالے مل گئے ہیں، جن میں سے دو رسالے "مجمع مضامین" اور "انشای محفل" بھی ہیں جن کا نام بھی آجتک کسی کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال اردو کا صحیح مطالعہ بغیر فارسی کے ناممکن ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موجودہ فارسی شاعری اور ادب تھی ایہ ہے، جس کی شکایت اکثر حضرات کرتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ نئے سانچے سے ایوس نہیں ہیں، اگر ہمارے

اسلاف سعدی و حافظ، عرفی و نظیری وغیرہ سے استفادہ کر سکتے تھے، تو آج کے شعرا نیما یوشیج اور شہریار جیسی عظیم شخصیتوں سے استفادہ کر کے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر سکتے ہیں،

کچھ دنوں پہلے فارسی کو زیادہ تر ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا، اب گو اسکے طلبا کی تعداد کم ہو گئی ہے، مگر تحقیق و انتقاد کے لحاظ سے فارسی میں جو کام ہو رہا ہے اس سے کافی ہمت افزائی ہو رہی ہے، آزادی کے بعد ہندوستان کے پرانے اداروں میں توسیع ہوتی جا رہی ہے، اور نئے نئے تحقیقی ادارے قائم ہوتے جا رہے ہیں، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز علی گڈھ، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، ادارۂ مخطوطات حیدر آباد، ریسرچ اینڈ پبلک ڈویژن سرینگر وغیرہ جیسے ادارے روز بروز ترقی کرتے جا رہے ہیں، جن میں نہایت مفید کام ہو رہا ہے۔

ایران و افغانستان وغیرہ سے ہمارے روحانی اور معنوی رشتے قدیم زمانہ سے بڑے مستحکم رہے ہیں، ہمیں ان قدیم اور جدید دونوں رشتوں کو استوار کرنا ہے۔

ایران کو ہندوستانی فلسفہ سے اتنا گہرا لگاؤ رہا ہے کہ ستر ہویں صدی عیسوی میں وہاں کے ایک بڑے فلسفی میر ابوالقاسم فندرسکی "جوگ بشست" کا فارسی ترجمہ یہاں سے لے گئے اور اس پر حاشیہ لکھا، فرہنگ درست کی اور اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس میں فرماتے ہیں

چوں ز قرآں گذشتی و اخبار
نیست کس را بدیں نمط گفتار

سمرقند و بخارا وغیرہ کو بھی ہندوستان سے بڑا تعلق رہا ہے، ابھی حال ہی میں تاجکستان میں "منتخبات ملا عبد الرحمٰن مشفقی" شائع ہوئی ہے۔ صدالدین عینی، عبد الغنی میرزا یف، ترسون زادہ اور دوسرے تاجکستانی محققین اور علمائے مشفقی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، جن کا یہ مصرع

ضرب المثل ہے:

از بام خانہ تا بثریا از ان تو

مشفقی دو مرتبہ ہندوستان آئے اور جب ۱۵۷۸ء میں شہنشاہ اکبر پاک پٹن شریف شیخ فرید گنج شکر کے مزار مبارک کی زیارت کو گئے تو مشفقی کی رسائی ان تک ہوئی۔ وہاں کے محققین نے صرف اپنے یہاں کے منابع سے کام لیکر مشفقی کا تعارف کرایا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ آئین اکبری، اکبرنامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ وغیرہ کی مدد سے اس شاعر کا تعارف کرایا جائے جو ہندوستان اور تاجیکستان کو جوڑنے والی ایک بڑی کڑی ہے۔

افغانستان اور ہندوستان قدیم زمانہ سے ایک رہے ہیں، اس زمانہ میں ان دونوں ملکوں کی وحدت کا پتہ اصل سنسکریت کی کتابوں کے علاوہ ان کے ترجموں سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جوگ بشست کے فارسی ترجمہ میں جہاں بہت سی فلسفیانہ، روحانی اور اخلاقی داستانیں ہیں، وہاں ہندوستان کے راجہ سورگھ (Suraghha) کا بھی قصہ ہے، جو کبھا (Kubha) یعنی کابل کے راجہ پرگھ (Praghha) یا پرناد (Pranada) کا دوست تھا، اور جب راجہ پرگھ کے ملک میں قحط پڑا تو یہاں کا راجہ اس سے ملنے گیا تھا، رگ ویدا (Rig - Vada) کے سات دریاؤں میں سے ایک کا نام کبھا (Kubha) ہے۔

مہاتما بدھ کے دو عظیم مجسمے سرخ بدھ اور خاکستری بدھ ابتک بامیان میں پرانی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

بلخ کو زرتشت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی بلخ میں بدھ مذہب کا بہت بڑا مندر نوبہار (Nau Vihara) تھا۔ جہاں کابل، ہندوستان اور چین کے زائر جایا کرتے تھے۔ برمک جو اصل میں پرمکھ (Pramukh) ہے، یہاں کا سب سے بڑا پجاری تھا جس کے

خاندان کا اسلامی تہذیب کے سنوارنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ کنشکا اور یونانی بادشاہ مینندر (Menander) دونوں بدھ مذہب کے پیرو تھے، ایران و ہندوستان کے تصوف نے خصوصیت سے بودائی اور ہندی فلسفہ کے زیر اثر نشو ونما پائی ہے۔ اور یہاں کے فنا (Nirvana) نے وہاں فنا کی شکل اختیار کی ہے، یہ تصوف مدتوں سرزمین بلخ میں پروان چڑھا جو صدیوں بدھ مذہب کا مرکز رہ چکا تھا، نیز ایرانی تصوف کے بڑے بڑے پیشوا ابو اسحٰق ابراہیم بلخی، ابو علی شقیق بلخی اور عبدالرحمٰن بلخی جیسی شخصیتیں رہی ہیں، سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا رومی اسی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے۔

مغل مصوری کا اصل مسکن ہرات ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں خواجہ عبداللہ انصاری اور ملا عبدالرحمٰن جامی جیسی ہستیاں آرام کر رہی ہیں، غرض ان تمام گوشوں پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے، جن میں فارسی ادب کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

اب فارسی کو صرف ایک مردہ یا کلچرل زبان کی حیثیت سے نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اس لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ زندہ ملکوں کی زبان ہے، جن سے ہمارے تعلقات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، اس لیے اگر ایک طرف ہمیں گذشتہ تاریخ و تمدن کے مطالعہ کے لیے کلاسیکی ادب کی ضرورت ہے تو دوسری طرف ہمیں ایسی فارسی بھی سیکھنی ہے جو ہمیں ہمسایہ اور دوست ملکوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دے سکے۔

دہلی یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کلاسوں کے علاوہ جدید فارسی کے ایسے سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس بھی کھولے گئے ہیں جن سے لوگوں کو فارسی بولنے، لکھنے اور جدید لب ولہجہ کے سمجھنے میں مدد مل سکے اور وہ ریڈیو، وزارت، سفارت وغیرہ میں بغیر غیر ملکی امداد کے اپنا کام خود چلا سکیں، آل انڈیا ریڈیو کے فارسی شعبہ میں پہلے بیرونی لوگ کام

کہتے تھے اور انھیں پر ہمارا دار و مدار تھا، مگر اب رفتہ رفتہ ہندوستانی ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں فارسی کے لسانی مطالعہ کا رواج نہیں تھا، فارسی زبان دوسری زبانوں سے نکلی ہے، اس لیے فارسی کا صحیح مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان زبانوں کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے جنھوں نے اس زبان کے بننے اور سنورنے میں مدد دی ہے، سنسکرت اور اوستا کی ماں ایک اور زبان تھی جس کا اب وجود نہیں ہے لیکن ان کی مشابہت اور یگانگت بتلاتی ہے کہ ان کی ماں کیسی رہی ہوگی، اسی طرح فارسی باستان، پہلوی، سغدی وغیرہ بھی اوستا اور سنسکرت سے بہت قریب اور آریائی زبانیں ہیں، اس لیے فارسی کے سائنٹفک مطالعہ کے لیے سنسکرت اور اوستا وغیرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں ابتک سنسکرت اور فارسی کو ساتھ ساتھ نہیں پڑھایا جاتا حالانکہ ان دونوں کے ساتھ تعلیم دینے سے دونوں کے مطالعہ میں مدد ملے گی، پارسیوں کے یہاں اوستا اور پہلوی کا مطالعہ مذہبی حیثیت سے ضروری ہے، اس لیے بمبئی کے اطراف میں ان زبانوں کا رواج تھا لیکن اب شمال میں بھی ان کی طرف توجہ کی جا رہی ہے، دہلی یونیورسٹی میں چند برسوں سے فارسی باستان، اوستا اور پہلوی کو بھی نصاب میں داخل اور ان کے پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندوستانی محققین اس نکتہ سے غافل نہیں ہیں۔ S.K. Sam کی کتاب Old Persian اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مگر اب اس کی طرف باقاعدہ اور منظم طریقہ سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ادب کی تاریخی لغوی اور اصطلاحی ماہیت

از جناب وقار احمد صاحب رضوی، ایم، اے

ادب کائنات کا علم بھی ہے اور اس کا عرفان تمام بھی، وہ علم اور تہذیب کی دولت کو عام کرتا ہے، مادی اور جسمانی دنیا میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ اور زندگی کی مادی جدلیت کو اقدار اعلیٰ سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ فنی تجربات کی نفسیاتی تشریح کرتا ہے۔ ماورائیت کی لاشعوری توجیہ بھی ہے اور تاریخی روایت پرستی اور انفرادیت کا شعوری امتزاج بھی۔ حیاتیاتی تصور ادب کی نوعیت کو قدر و قیمت کا اندازہ عطا کرتا ہے۔ ادب تحلیل نفسی میں، جبلتوں کے سہارے عمل اور زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ ماضی بعید سے بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم راستے سے سفر کرتا ہے اور اپنے خوش آیند نغموں سے فضا کو ترنم کر دیتا ہے۔

ادب ایک ایسا عمل ترکیب ہے جو ہیت نامیہ کے منتشر رجحانات میں، ربط قائم کرتا ہے، سماجی قدروں اور انسان کی فطری خواہشوں کا تصادم فنکار کو فنی اظہار و ابلاغ کی طرف لیجاتا ہے۔ ابلاغ تخلیقی ادب کا ایک شعبہ ہے، ادب، اظہار کا ایک ڈھنگ ہے۔ وہ ادیب کے احساس کی نمایندگی بھی کرتا ہے اور حسن، لطافت اور رنگینی کو اثر اندازی کی طاقت بھی دیتا ہے۔ وہ فطرت کا اظہار بھی ہے اور خارجی حقایق کے شعور و ادراک کا نتیجہ بھی ہے۔

ادب نفس انسانی میں شائستگی، افکار و خیالات میں روشنی، احساسات میں نزاکت، زبان میں سلاست اور زور پیدا کرتا ہے۔ ادب کا اطلاق ان تصانیف پر بھی ہوتا ہے

جو کسی علمی یا ادبی تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ اور ان کتابوں پر بھی جو فکر و فن میں باہمی تاثر اور انشاء و اسلوب نگارش کی بہترین مثال تصور کیجاتی ہیں۔

ادب کی ابتدائی تاریخ اور آغاز کے بارے میں کوئی نص صریح یا برہان قاطع ایسی نہیں ہو جو اس کلمے کی تاریخی حیثیت سے بحث کرے۔ یہ ایک ایسی خبر ہے جس کی ابتدا کا سرا غ نہیں ملتا۔ اس لفظ کا وجود نہ سامی زبانوں میں ملتا ہے اور نہ عربوں کی جاہلی شاعری میں۔ عہد جاہلی کی تاریخوں میں کچھ اقوال ایسے ضرور ملتے ہیں، جن کے مطالعہ سے اس سلسلے میں مدد ملتی ہے۔

اس ذیل کا ایک قول تو وہ ہے جو حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر نے کسریٰ کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

وقد اوفدت ایها الملک	اے بادشاہ! میں عرب کے ایک گروہ کو آپ کے
وفدا من العرب لهم فضل	پاس وفد بنا کر بھیج رہا ہوں۔ جو حسب و نسب
فی احسابهم واسنابهم و	میں فضیلت رکھتے ہیں، یہ لوگ دانشور ہیں
عقولهم وآدابهم[1]	اور صاحب اخلاق و آداب ہیں۔

اور دوسرا قول وہ ہے جو علقمہ بن علاثہ نے کسریٰ کے سامنے کہا:

فلیس من حضرک منا بافضل	ہم میں جو لوگ آپ کے پاس آئے ان کو
ممن غرب عنک، بل لو قست	ان لوگوں پر فضیلت حاصل نہیں ہے جو
کل رجل منهم وعلمت منهم	نہیں آئے، اگر آپ ان کا باہم موازنہ
ما علمنا لوجدت له فی آبائهم	کریں اور جتنا ہم کو ان کے بارہ میں
ابتداءً واکفاءً کلهم الی الفضل	علم ہے، اتنا آپ بھی جان لیں تو آپ انکو

---

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۷ (۱۹۴۳ء)

منسوب بالشرف والسؤدد	ہمارے ہم سر ہم مرتبہ پائیں گے، وہ سب
موصوف بالرای الفاضل	صاحب فضل و شرف ہیں، ان میں سیادت ہے
والادب معروف[1]	اور وہ اصابت رائے سے موصوف اور ادب سے آراستہ ہیں۔

یہ روایات اور اقوال ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے بعد میں وضع کیگئی ہوں، ان روایات سے جہاں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جاہلی عربوں کا تصور، ادبی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے متعلق کیا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ عرب نژاد ہے، دخیل نہیں ہے۔ اس لفظ کے عربی الاصل ہونے کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جو حروف مادہ میں کلمۂ ادب سے مناسبت رکھتے ہیں اور صوتی اعتبار سے قریب المخرج اور قریب المعنی ہیں، جیسے بَدَأَ، أَبْدَ، دَأَبَ۔ ان الفاظ میں جنسی معنی سب میں مشترک ہیں، کیونکہ تعلق بالشی اور ارتکاب عادت کا مفہوم سب میں پایا جاتا ہے۔

بعض محققین (جرجی زیدان اور زیات وغیرہما) کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی اور دوسری سامی زبانوں میں سُمیریوں کی زبان سے آیا، جو قدیم زمانے میں جنوبی عراق میں آباد تھے۔ ان سے حملہ آوروں (سامیوں) نے اس لفظ کو اڑا لیا۔ سُمیریوں کے یہاں اس لفظ کے معنی انسان تھے۔ سامی زبانوں میں یہ لفظ ادب سے أُدم اور ادم سے آدم ہو گیا۔ لیکن عربوں نے اس لفظ کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھا۔ عرب صحرائی زندگی بسر کرتے تھے، ان کی زبان دوسری زبانوں سے خلط ملط نہیں تھی، انھوں نے اس لفظ کو آدمیت یا انسانیت کے معنی میں استعمال کیا۔ اور لازم بول کر ملزوم مراد لیا۔ اس میں

---

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۸ (۱۹۳۵ء)

فضائل حمیدہ اور شرافت کا مفہوم پیدا کیا، مگر یہ ایک مفروضہ ہے، حقیقت علمیہ نہیں۔

قریش کی زبان اسلام کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زبان ہے۔ قریش کی زبان نے عرب کی دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا اور خود بھی ان سے متاثر ہوئی۔ قرآن مجید اسی زبان میں نازل ہوا ہے ادب کے معنی تہذیب و تادیب کے لیے جاتے ہیں، یہ کلمہ سبک اور فصیح ہونے کے باوجود اگرچہ قرآن شریف میں بعینہ نہیں آیا ہے لیکن ادب کا معنوی وجود قرآن میں ملتا ہے، قرآن معلم اخلاق ہے، تہذیب نفس اور اخلاق کا مبلغ ہے، اس اعتبار سے قرآن مجید میں الفاظ کی بلاغت یعنی ادب کا لفظی مفہوم اور تہذیب اخلاق کی تعلیم یعنی ادب کا معنوی مفہوم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ سے عربی زبان میں، لفظ ادب کے وجود کی تائید ہوتی ہے، مشہور حدیث ہے:

ادّبنی ربّی فاحسن تادیبی	میرے پروردگار نے میری تربیت کی اور خوبی کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان ھذا القرآن مادبۃ اللہ فی	بیشک قرآن اس دنیا میں ایک خوان الٰہی ہے
الارض فتعلموا من مادبتہ[1]	پس اس خوان سے تم لوگ استفادہ کرو۔

مادبۃ: ادب سے بطور تشبیہ اسم مکان ہے۔

حضرت علیؓ کا قول روایت میں آیا ہے:

اما اخوانا بنی امیۃ فقادۃ	ہمارے بھائی بنی امیہ دسترخوان والے
ادبۃ[2]	لیڈر ہیں۔

اس روایت میں اَدَبَۃ، آدِبٌ کی جمع ہے، جیسے کاتب کی جمع کَتَبَۃٌ۔ آدب:

---

[1] ابن الاثیر: النہایۃ، مادۂ ادب۔ [2] ایضاً

اس شخص کو کہتے ہیں جو دسترخوان کی طرف بلاتا ہے، مادۂ مأدبۃ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دعوت کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس تشریح سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی کھانا" ہیں، جیسا کہ بعض علمائے لغت کا خیال ہے، ان احادیث اور اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عہد رسالتؐ، عہد صحابہ اور خود ایام جاہلیت میں جانا پہچانا تھا، صدر اسلام میں اس کے جو معنی تھے، اس میں وسعت پیدا ہوئی، اور وہ اخلاق کریمہ اور ان سے زندگی پر پڑنے والے اثرات کے معنی میں بولا جانے لگا، دعوتِ طعام ہو یا دعوتِ تہذیب جنس بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔

ادب کے لغوی معنی دعوتِ ولیمہ اور اصطلاحی معنی دعوتِ تہذیب نفس ہے، جنس کے اشتراک اور فصل کے امتیاز سے دونوعیں بنیں۔ چونکہ یہ لفظ عہد جاہلیت اور صدر اسلام میں کھانے اور تہذیب و تربیت کے مفہوم میں تھا، اور اب بھی یہی معنی ہیں، اس لیے یہ لفظ منقول ہے، مُرتجل[1] نہیں ہے۔

"لسان العرب" میں ادب کے لغوی معنی دعوت: بلانا ہے، وہ کھانا جس کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے، اس کو مدعاۃ اور مأدبۃ کہتے ہیں، وہ لٹریچر جس سے ادیب، متأدب ہوتا ہے اس کو ادب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

"المحیط" میں الأدُبُ (متحرک الاوسط) کے معنی لطافتِ طبع اور خوش اطواری کے ہیں۔ ادّبہ: علمہ۔ سکھایا۔ تأدّبَ بہ: تعلّمہ۔ سیکھا۔ الأدُب (بسکون العین) کے معنی تعجب کے ہیں۔ جیسا کہ الأدبۃ (بالضم) کے معنی تعجب اور پسندیدگی کے ہیں۔ اور ادب (البحر کے معنی پانی کی زیادتی ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لغوی اور مستعمل فیہ معنی میں جنسی اشتراک ہے، کیونکہ ادب محامد و محاسن کی طرف بلاتا ہے۔

---

[1] معنی موضوع لہ اور مستعمل فیہ میں مناسبت ہو تو منقول ہے، جیسے صلوٰۃ اور اگر مناسبت نہیں ہے تو مرتجل ہے

اس کے علاوہ مادۂ ادب کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے، اس کو اٹلی کے مشہور مستشرق کارلونالینو (متوفی ۱۹۳۸ء) نے بیان کیا ہے، مستشرق مذکور کی رائے یہ ہے کہ ادب، دأب سے نکلا ہے، جس کے معنی عادت ہے، یہ لفظ مفرد سے نہیں بنا بلکہ جمع سے مشتق ہے، دأب کی جمع ادأب تھی، قلب مکانی سے آداب ہوگیا، جیسے بئر اور رئم کی جمع أبآر سے اور آءر تھی، قلب مکانی کے بعد آبار اور آرام ہوگئی۔ پروفیسر نالینو نے اس سے آگے لکھا ہے:

وکثر استعمال الآداب جمعا للدأب	واب کی جمع آداب کا استعمال اسقدر زیادہ
حتی نسی العرب اصل هذا الجمع و	ہوا کہ عرب اس کی اصل ہی کو بھول گئے، نہ انکو
ما کان فیه من قلب فخیل الیهم	یہ یاد رہا کہ اس میں قلب مکانی ہوا ہے،
انه جمع لا قلب فیه۔ فاخذوا منه	ان کو اس بات کا خیال رہا کہ یہ لفظ جمع ہے
مفردا ادبا لا دأبا وجری	اس میں قلب مکانی نہیں ہوا ہے، انھوں نے
استعمال هذه الکلمة بمعنی	اس کا مفرد داب کے بجائے ادب سمجھا
العادة ثم انتقل من هذا	داب کا استعمال عادت کے معنی ہی میں
المعنی الطبیعی القدیم الی معانیه	رہا، پھر وہ اس قدیم طبعی معنی سے دوسرے
الاخری المختلفة[1]	مختلف معنی کی طرف منتقل ہوا ہے۔

لفظ ادب کی اصل تاریخ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے، یہ لفظ بنی امیہ ہی کے زمانے میں رائج اور شائع ہوا، اسی زمانے سے اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے تعلیم و تربیت کے معنی میں ہوا عہد بنی امیہ میں اساتذہ کی ایک ایسی جماعت تھی جو امراء کے لڑکوں کو تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھی، اس جماعت اور اشعار کے راویوں اور تاریخی واقعات بیان کرنے والوں کو "مؤدب"

---

[1] تاریخ الادب العربیہ تالیف کارلونالینو، ص ۱۱

کہا جاتا تھا۔ اس جماعت "مؤدبین" میں سے کچھ نام یہ ہیں: (۱) ابو عبید الجہنی (۲) عامر الشعبی۔

(۱) ابو عبید الجہنی (۲) عامر الشعبی۔ یہ دونوں خلیفہ عبد الملک بن مروان کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔

(۳) صالح بن کیسان: خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے لڑکوں کا مؤدب تھا۔

(۴) حمید بن درہم: آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کا مؤدب تھا۔

اس دور کی تحریروں میں جا بجا لفظ ادب کا تذکرہ ملتا ہے، زیاد بن ابیہ اپنے خطبہ "البتراء"[1] میں کہتا ہے:

فادعوا اللہ بالصلاح لائمتکم	تم خدا سے اپنے ائمہ کیلئے راستی اور خیر کی
فانھما ستکوا المودبون لکم	دعا کرو، کیونکہ وہ تمہارا انتظام کرنیوالے
اما واللہ لاؤدّ بنکم غیر	اور ادب سکھانے والے ہیں، خدا کی قسم
ھذا الأدب اولتستقیمن	میں تم کو اس طرز ادب کے سوا ادب
	سکھاؤں گا، ورنہ تم اپنی روش درست کر لو۔

کسی فراری شاعر نے لفظ ادب کو اپنے اشعار میں اس طرح استعمال کیا ہے،

اکنیہ حین اناديہ لاکرمہ	ولا اُلقبہ والسوءۃ اللقبا

میں اس کو از راہ احترام اسکی کنیت سے پکارتا ہوں، لقب سے یاد نہیں کرتا کیونکہ لقب بری چیز ہے۔

کذاک اُدّبت حتی صار من خلقی	انی وجدت ملاک الشیمۃ الادبا

میری تادیب و تربیت اس طور پر کیگئی ہو کہ ادب میری سرشت بن گئی ہو اور میں نے اپنی خصلت کا مدار ادب کو بنا لیا ہے

---

[1] جس خطبے کو حمد و ثنا سے شروع نہ کیا جائے اور جس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے نہ ہو اس کو "البتراء" کہتے ہیں، بتر کے معنی دم کٹے، لاولد کے ہیں، اور جس خطبے کو قرآن مجید کی آیات اور درود سے مزین نہ کیا جائے اسکو "شوھاء" کہتے ہیں، شوھاء کے لغوی معنی بدصورت عورت کے ہیں ۲ حماسہ: باب الادب۔

بنی امیہ کے زمانے میں اس لفظ کا اطلاق اس قسم کے علوم پر ہوتا تھا جن کا مذہب اور دینیات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے شاعری، کہانی، انساب، ایام عرب، اخبار و احوال، شرافت اور حسن اخلاق بھی اس سے مراد لیے جاتے تھے۔ پھر جب لغت مدون ہوا تو وہ بھی ادب میں شامل ہو گیا۔

لفظ ادب کا مادہ نہ قریشی زبان میں ملتا ہے، نہ عبرانی اور سریانی میں۔ قرآن مجید نے تمام لغات قرشیہ کا استیعاب نہیں کیا تھا، اس لیے یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ عہد بنی امیہ میں قریش کی زبان میں کسی ایسی عربی زبان سے منتقل ہو کر آیا ہو جو خود برباد ہو چکی تھی۔

"لسان العرب" نے مادۂ ادب سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الادب ادبان: ادب النفس وادب الدرس۔ ادب دو ہی چیزوں کا نام ہے۔ ایک تہذیب نفسی اور دوسرے تعلیم شعر و نثر۔ تہذیب نفس۔ بردباری، عالی ظرفی، شجاعت، سچائی جیسی خصائل حمیدہ اور اجتماعی خوبیاں پیدا کرنے کی تلقین کو کہتے ہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ابن مقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے اپنی کتاب کا نام "الادب الصغیر والادب الکبیر" رکھا، ادب کے دوسرے معنی تعلیم کے ہیں، اس کا تعلق شعر اور نثر سے ہے، پہلی صدی ہجری سے اب تک مادۂ ادب انہی دو معنوں پر دلالت کرتا رہا ہے۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکوں کے مودب سے کہا:

علّمهم الشعر يمجدوا وينجدوا[1] انکو اشعار کی تعلیم دو تاکہ یہ شرف حاصل کریں اور دلیر بنیں

یہاں تادیب کے معنی تعلیم و تہذیب یا درست کرنے کے ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے مؤدب سے پوچھا

---

[1] نقد النثر ص ۷۰

کیف کانت طاعتی ایاک و	جب آپ مجھے تعلیم دیتے تھے تو میں آپ کی
انت تؤدّبنی؟ قال: احسن	کس طرح اطاعت کرتا تھا، مودب نے جواب دیا
طاعة، قال: فالمعنی الآن	بہترین اطاعت، عمر بن عبدالعزیز نے کہا
کنت اطیعک[1]	تو اب تم میری ویسی ہی اطاعت کرو
	جیسی میں تمھاری اطاعت کرتا تھا،

بنی امیہ ہی کے عہد سے ادیب یا مودب، شاعر اور نثر نگار کے درمیان فرق قائم ہوا۔ جس شخص پر ادب اور اس کی تعلیم کا غلبہ ہوتا تھا، اس کو ادیب کہتے تھے، اور جس کا رجحان شاعری کی طرف ہوتا تھا، وہ شاعر کہا جاتا تھا، اور نثر کا مطالعہ کرنے والے کو نثر نگار کہا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں جب عربی علوم، لغت، نحو، صرف کا نشو و نما ہوا تو ان ناموں نے اصطلاحی شکل اختیار کرلی، اور یہ علوم "ادب تعلیمی" میں داخل ہوگئے، ادب تعلیمی کا مفہوم وسیع ہوگیا۔ لفظ ادب کا اطلاق۔ نثر و نظم، انساب، اخبار، لغت، نحو، صرف اور نقد پر ہونے لگا۔ یہ حالت زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، کیونکہ یہ عباسیوں کے زمانے میں سوسائٹی کے اجتماعی ہیئت میں تغیر اور ثقافتی گوشوں میں تنوع پیدا ہوا۔ عباسی تمدن کے ساتھ ساتھ علوم عربی کی ایک ایسی طاقت آئی جس نے مادۂ ادب کو متاثر کیا۔

تیسری صدی ہجری میں ادب پھر اپنے اسی مفہوم کی طرف واپس لوٹا جو پہلی صدی ہجری میں تھا، یعنی ادب فنی اور تہذیب نفس کے معنی دینے لگا۔ اس تعریف میں شعر و نثر اور ان سے متعلقہ علوم۔ اخبار، انساب، ایام عرب اور احکام نقد داخل ہیں، البتہ اس میں فنی نثر اور ادبی تنقید کا اضافہ ہوگیا۔

---

[1] عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ۱ ص ۳۰۱ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

اس صدی میں اعلیٰ ادب تصنیف ہوا، جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی "البیان والتبیین" ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی "الشعر والشعراء" اور "کامل" للمبرد (متوفی ۲۸۵ھ) جو عربی ادب کی امہات الکتب تسلیم کیجاتی ہیں، اسی صدی میں لکھی گئیں۔

اس صدی میں لفظ ادب کے تہذیب نفس والے معنی میں وسعت پیدا ہوئی، اور اس موضوع پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، امام ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) کی "ادب القاضی" ابن قتیبہ کی "ادب القراۃ"۔ ابو العباس سرخسی (متوفی ۲۸۶ھ) کی "ادب النفس" اور کتاب جمل نشاع (متوفی ۲۵۰ھ) کی "آداب الندیم" اس سلسلے کی اہم کتابیں ہیں۔ صحیح بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کا "باب الادب" اور حماسۂ ابی تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کا "باب الادب" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۲ھ) کی مشہور کتاب "طبقات الشعراء الجاہلیین والاسلامیین" ابو الحسن الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی "ادب الدنیا والدین" اور نیشاپوری (متوفی ۴۴۵ھ) کی "آداب الصوفیہ" اور "آداب البحث والمناظرہ" کا ذکر بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

جاحظ نے لفظ ادب کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

قال عتبۃ بن ابی سفیان لعبد الصمد۔ مودب ولدک: لکن اول ما تبدأ بہ من اصلاح بنی، اصلاح نفسک[1]	عتبہ بن ابی سفیان نے اپنے لڑکے کے مؤدب سے کہا کہ پہلی چیز جس سے تم میرے لڑکوں کی اصلاح کرو، خود تمھارے اپنے نفس کی اصلاح ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے:

وزدنی فی تادیبھم، ازدک فی برہم انشاء اللہ تعالیٰ[2]	ان کو ادب سکھانے میں زیادتی کرو میں حسن سلوک میں زیادتی کرونگا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

---

[1] البیان والتبیین ج ۲ ص ۵، [2] ایضاً

چوتھی صدی ہجری میں لغت، نحو اور صرف ادب سے الگ ہو گئے، نقد، بلاغت، اور بدیع ادب میں شامل رہے، لیکن اس ادب میں تنقیدی اور فنی زاویۂ نگاہ سے بحثیں ہوئیں۔ اس صدی میں بحتری (متوفی ۲۸۴ھ) اور ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کے ادبی معرکوں اور بعد میں متنبی (متوفی ۳۵۴ھ) کے مخالفین اور موافقین کے مباحث نے فن نقد کو فائدہ پہنچایا، آمدی (متوفی ۳۷۰ھ) نے اپنی "الموازنہ بین الطائیین" اور ابو الحسن جرجانی (متوفی ۳۹۲ھ) نے "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" انہی واقعات سے متاثر ہو کر تصنیف کیں، اس طرح تنقید نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنا شروع کی۔ اور اس کا شمار علیحدہ ایک علم اور ادبی فن میں ہونے لگا۔

چوتھی صدی ہجری میں جن کتابوں نے فن نقد کو فروغ دیا، اور اس کو مستقل ایک فن کا درجہ دیا، ان میں قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۳۱ھ) کی "نقد الشعر" اور "نقد النثر" کے نام سرفہرست ہیں، قدامہ نے سب سے پہلے عربی نقد کے اصول استخراج کیے، ان کے بعد ابو ہلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) نے "الصناعتین"[1] میں اور ابن رشیق القیروانی (متوفی ۴۵۶ھ) نے "کتاب العمدہ" میں انہی کے نقش قدم کی پیروی کی۔ ابو الفرج الاصبہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کی "الاغانی" اور ابن عبد ربہ (متوفی ۳۲۸ھ) کی "العقد الفرید" کے نام بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں، "رسائل اخوان الصفا" نے بھی تنقید اور علوم بلاغت کے لیے راستہ ہموار کیا۔

کہا جاتا ہے کہ فن نقد نے علم بلاغت کے ضمن میں مستقل فن کی شکل اختیار کی، اس استقلال کی مظہر شیخ عبد القاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) کی دونوں کتابیں "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغت" ہیں۔

---

[1] اس کتاب میں مصنف نے شعر و نثر سے بحث کی ہے، اور جگہ جگہ ان محاسن کی نشاندہی کی ہے جن سے فنی حسن میں اضافہ ہوتا ہے، اس میں فنی تجزیے کے علاوہ تنقیدی بحث بھی ہے۔ مصنف کی دوسری کتاب "دیوان المعانی" بھی اسی طرز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس میں روایتی انداز غالب ہے۔

ان کتابوں کا اثر یہ ہوا کہ ادب بمعنی الخاص سے نقد اور بلاغت کا تعلق نہیں رہا۔ اور ادب محض نثر و نظم کے سرمایہ کو کہنے لگے۔

اس استقلال سے فن تنقید کو یہ نقصان پہنچا کہ اس کے بعد فن تنقید یا علم بلاغت میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی، اگرچہ ابن رشیق القیروانی کی "العمدۃ" اور "قراضۃ الذہب فی نقد اشعار العرب" شیخ کے زمانۂ حیات ہی میں تصنیف کی گئیں۔

پانچویں صدی ہجری کے اختتام تک اہم ادبی علوم نے مستقل علوم کی حیثیت اختیار کر لی، شاید اسی وجہ سے زیات نے لکھا ہے کہ عہد اخوان الصفا کے بعد لفظ ادب کا اطلاق فنون، صنعت و حرفت اور تمام غیر شرعی علوم پر نہیں رہا، لیکن عربی زبان کے علوم جیسے معانی، بیان، صرف، نحو اسکے دائرے میں داخل رہے لیکن اس قسم کی کوئی تجدید نہیں کی گئی۔[1]

غرض اس صدی میں ادب بمعنی الخاص کی تعریف کو مقبولیت حاصل ہوئی، یہ تجدید اس معنی سے قریب ہے جو قرن اول میں مستعمل تھے۔ اس تعریف سے وہ علوم الگ ہیں جو قرن ثانی میں ادبی تعریف کے جزو تھے۔ اس صدی میں علماء کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی، جس نے قرن ثانی سے زیادہ ان ادبی علوم کی طرف توجہ دی جو ادبی ثقافت کی تعمیر کرتے ہیں۔ ادبی علوم سے مراد کیا ہے؟ وہ کون سے علوم ہیں جو ادب کی تعریف میں شامل ہیں؟ اس بارے میں علماء کا سخت اختلاف ہے۔ گذشتہ صدیوں سے اب تک ان ادبی علوم کے حصر و تحدید میں بڑے بڑے علماء نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کے نزدیک علم بارہ ہیں۔[12] سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "مفتاح العلوم"، یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "معجم الادباء" اور شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ)

---

[1] اصول الادب ص ۱۱

نے "مقدمۂ شرح المفتاح" میں ان ادبی علوم سے بحث کی ہے، ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی رائے زنی کی ہے لیکن اس بارے میں ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کی رائے کو اہمیت حاصل ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمے میں ایک "فصل" فی علوم اللسان العربی" کے عنوان سے قائم کی ہے، اس میں علوم بلاغت۔ بیان، لغت، نحو پھر ادب سے بحث کی ہے۔ اور ادب کو زبان عربی کے علوم میں ایک مستقل علم تسلیم کیا ہے، اور اس کو نحو، لغت، معانی، بیان اور بدیع کا حریف ٹھہرایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے جس میں اس کے عوارضِ ذاتیہ کے سلب وثبوت سے بحث کی جاتی ہے جیسے طب کا موضوع جسم انسانی ہے، اس حیثیت سے کہ امراض، جسم انسانی کو لاحق ہوتے ہیں اور علاج کے ذریعہ ان کا تدارک کیا جاتا ہے، اسی طرح نحو کا موضوع کلمہ ہے، علم نحو، کلمے کے ان عوارض واحوال سے بحث کرتا ہے جو اس کو باعتبار معرب ومبنی پیش آتے ہیں، اسی ضمن میں نواسخ (عوامل) ضمیر عائد پر فتحہ یا کسرہ کے مقامات کا ذکر آتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ ابن خلدون ادب کو علم تو مانتا ہے، مگر اس کا موضوع نہیں بتاتا، اور اس کی غرض وغایت سے بحث کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ ہر علم کی ایک تعریف، ایک موضوع، اور ایک مقصد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے، ادب کے موضوع سے انکار کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

هذا العلم لا موضوع له ينظر	علم ادب کا کوئی موضوع نہیں جس کے
فی اثبات عوارضه او نفیها	عوارض واحوال سے اثبات ونفی میں
وانما المقصود منه عند	بحث کی جائے۔ اہل زبان کے نزدیک

اهل اللسان ثمرته و هی	ادب کا مقصد ادبی صلاحیت ہے، وہ
الاجادة فی فنی المنظوم والمنثور	یہ کہ نثر و نظم کے ذریعہ مافی الضمیر کا اظہار
علی اسالیب العرب و مناحیهم[1]	عرب کے اسلوب اور طریقوں پر کیا جائے،

جب ابن خلدون نے علوم لسانی کی طرح ادب کا کوئی موضوع نہیں پایا تو اس کے موضوع ہی سے انکار کر دیا اگر وہ ادبی نسبت کا اطلاق تمام علوم لسانی پر کرتا تو بات آسان ہو جاتی اور وہ اس اضطراب میں مبتلا نہ ہوتا، جو اس کی حیرانی کا باعث ہوا، اس کا یہ فیصلہ منفرد رائے کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے تحیر و اضطراب کا سبب یہ ہے کہ اس نے ادب کو علوم لسانی ہی میں سے ایک علم سمجھا، جو دراصل ادب کوئی علم نہیں ہے، بلکہ ایک کلامی فن ہے، جو ادیب سے صادر ہوتا ہے۔

ابن خلدون کا ادب کو علوم نظری میں شمار کرنا، اس کو طبیعت یا فطرت سے خارج کرنا ہے۔ ادب کا ایک موہبت فنیہ ہے، اس کا براہ راست تعلق طبیعت سے ہے، اس فن کی تحصیل، ادب پاروں، اشعار، نثر، لغوی اور نحوی مسائل کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ادب کا بھی ایک موضوع ہے، اور وہ ہے طبیعت یا فطرت، طبیعت یا فطرت سے مراد و ارادات (داخلیت) اور تاثرات (خارجیت) ہیں جن سے انسان اس مادی دنیا میں متصادم ہوتا ہے، انسان خارجی حقایق کا مظہر ہے، اور طبیعت داخلی کیفیات کی، ان پر تنقید و تبصرہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے، داخلی یا خارجی عوامل کی ترجمانی کا نام طبیعت یا فطرت ہے، یہی ادب کا موضوع ہے،

داخلیت اور خارجیت میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ خارجی اشیا یا مدرکات حسیہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۷ مطبوعہ مصر

کا تعلق انسان کے حواس ظاہری سے ہے، وجدان سے نہیں۔ انسان خارجی دنیا میں ان کا تجربہ کرتا ہے، اور ان حسیات کو اپنے وجدانی تاثرات یا وجدان سے الگ رکھتا ہے، اس کے برخلاف باطنی اشیا کے کہ وہ تجربوں، ضابطوں اور قاعدے قانون کی پابند نہیں، اندرونی احساسات بدلتے رہتے ہیں، ان کا تعلق طبیعت انسانی اور وجدانی تاثرات و انفعالات سے بلاواسطہ ہے، آج ایک چیز کو دیکھکر دل پر خوشی کا اثر ہوتا ہے، کل اسی چیز کو دیکھکر خوشی نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ داخلیت (قلبی کیفیات) بھی تغیر پذیر ہے۔

ادب کی تعریف کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

ثم انهم اذا اراد واحدّ هذا	جب انھوں نے اس فن کی تعریف
الفن قالوا: الادب هو حفظ	کرنا چاہی تو کہا کہ ادب نام ہے اشعار
اشعار العرب واخبارها	اور ادبی تاریخ کے حفظ اور ہر علم سے
والاخذ من كل علم بطرف	تھوڑا تھوڑا حصہ حاصل کرنے کا، وہ
يريدون من علوم اللسان	لوگ علم سے مراد لسانی یا شرعی
او العلوم الشرعية [1]	علوم لیتے ہیں۔

اس عبارت میں ابن خلدون ادب کو فن تسلیم کرتا ہے، اس سے پہلے اسی ادب کو علم سے تعبیر کرچکا ہے، قطع نظر اس بات کے کہ ابن خلدون کے نزدیک ادب علم ہے یا فن۔

اس عبارت پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ ادب کی مذکورۂ بالا تعریف جسکو ابن خلدون نے اس طرح لکھا ہے، جیسے وہ کسی سے نقل کررہا ہے، ثم انهم اذا اراد واحدّ هذا الفن قالوا: ادب کی ہے یا آدب کی۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۱

اگر اس سے مراد ادب اور ادبی کتابیں ہیں، جو ہم پڑھتے ہیں اور ادیبوں اور شاعروں سے سنتے ہیں تو یہ تعریف مکمل نہیں، اور اگر اس تعریف سے ان وسائل کا ذکر کرنا مقصود ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے ذوق ادبی کی جلا کرتا، انشاء پردازی کی طاقت کو اجاگر کرتا اور تنقید و تبصرہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، تو یہ تعریف تادب کی ہے۔ ادب کی نہیں۔ کیونکہ تادب ادب سیکھنے کو کہتے ہیں، جس کا بہترین وسیلہ کتاب ہے، ادب سیکھنے والا، لازمی ثقافت کی تحصیل جن وسائل سے کرتا ہے۔ انکا ذکر ابن خلدون نے اس تعریف میں کیا ہے۔ یہ ثقافت متادب کی زبان درست کرتی ہے اور اس کے ذوق ادبی کو نکھارتی ہے، اس لحاظ سے یہ تعریف ادب کے بجائے تحصیل ادب کی ہوئی۔

آرٹ (جمال)، شعر، خیال اور ادب ایسی اصطلاحات ہیں کہ انکی صحیح منطقی تعریف اسوقت تک نہیں کیجا سکتی، جب تک ذہن میں ان کا مفہوم واضح نہ ہو، اسکے برعکس اشیائے حسیہ جیسے مثلث (جیومیٹری)، جزیرہ (جغرافیہ)، ٹھوس یا سیال اجسام کی تعریف ممکن ہوتی ہے، ابن خلدون کے تحیر اور اضطرابی کیفیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے ذہن میں ادب کا مفہوم واضح نہیں، یہی وجہ ہے کہ ادب کی کوئی منطقی حد قائم نہیں کر سکا، اور نہ تعریف بالعوارض کرنے میں کامیاب ہوا، جس سے ادب کی وضعی شکل سامنے آجاتی۔ اس نے جو کچھ تعریف کی ہے وہ جزئی ہے کلی نہیں۔

حاصل اس بحث کا یہ ہے کہ ادب ایک فن کلامی ہے۔ جو عقل کی تعبیر اور ادراک و شعور انسانی کی ترجمانی کرتا ہے، وہ ایک مدلول عرضی ہے، اس کا تعلق تہذیب نفس اور انسانی خصائل سے بھی ہے، اور انفرادی اور سماجی زندگی سے بھی۔

ادب کی بنا جذبہ ہے، جو ادب میں خلود پیدا کرتا ہے، اس جذبہ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک کا تعلق خلود ادب سے ہے، دوسری کا شخصیت ادیب کی ترجمانی سے۔ مادی اجسام کے مقابلہ میں ادبی عبارتیں قائم بالذات ہوتی ہیں، ان میں باقی رہنے کی ایک ایسی صفت خلود ہوتی ہے کہ زمانہ فنا کر سکتا ہے اور نہ وہ

تحریریں جو بعد میں اس موضوع پر لکھی جاتی ہیں، پڑھنے والے ہر عہد میں ان کو پڑھتے ہیں، ان سے کبھی مستغنی نہیں ہوسکتے، عقل انسانی ترقی پذیر اور دیدنے والی شے ہے، تغیرات، جذبات کی ابدیت میں تبدیلی پیدا نہیں کرسکے، اس لیے ادب فی نفسہ بقائے دوام کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جذبہ جلد زائل ہونے والی چیز ہے، اس لیے وہ ادب کی بقا کا باعث نہیں ہوسکتا، لیکن یہ تناقض وہمی ہے، دراصل جذبے کا زوال ہی ادب کی بقا ہے، وہ عاطفہ ہی کی سرعتِ زوال ہے، جو ادبی اثر کو خلود اور انفعالاتِ ادبی کو دوام بخشتی ہے،

اس بات کو کلی کے جذبۂ شگفتگی سے سمجھا جاسکتا ہے، جو ایک سادہ خارجی مثال ہے، غنچہ، جذبۂ شگفتگی ہے، وہ ایک لمحۂ مختصر جس میں کلی مسکرائی، کلی کے بقائے دوام کا سبب بنا، اثارتِ جذبہ نے کلی کو پھول بننے پر مجبور کیا، کلی پھول بنکر کھلکھلائی، پھول زینت انجمن اور محو چمن آرائی ہوا، اگر کلی پھول نہ بنتی تو ہزار تنگیٔ داماں کی شاکی ہوتی، کلی کا کلی رہنا اس کی موت تھا، جذبۂ شگفتگی نے اسکو جمال آگہی دیا لو جہانِ آب وخاک و باد میں لباسِ زندگی سے مزین کیا۔

تاثرات کی تعبیر کے وقت ہی ادیب کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ادب، فن کی شکل اختیار کرتا ہے، اور ادیب کی مزاجی ہیئت اور طرز ادا کی بھی ترجمانی کرتا ہے، تاثر نفسی کو ادبی خلود اور ادیب کی شخصیت کی ترجمانی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس سے ادب اور زندگی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے، جو جذبات و واردات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو اشعار میں منظوم کرتا ہے، وہ جذبات ہم کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح خود شاعر نے محسوس کیے، اس تعریف کا اطلاق صرف شاعری پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ تمام ادب کا یہی حال ہے، ادب تنقید حیات ہے، وہ زندگی کا شعور بھی ہے اور تفسیر حیات بھی، ادیب کے لیے سماجی شعور کے بغیر تفسیر حیات مشکل ہے، ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیات و کائنات کا مشاہدہ کرکے اپنے اندر سماجی شعور پیدا کرے۔

ادبی تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب خارجی یا داخلی حسیات جمال کی عکاسی اس طور پر کرے کہ تصویر کا حقیقی رخ پڑھنے والے کے سامنے آجائے، اس سے دل متاثر ہو اور ایسا ہی محسوس ہو جیسا کہ اصل تصویر میں ہے۔ وہ قوت جو اس تصویر کشی کی تکمیل کرتی ہے، اسکو قوتِ خیالیہ کہتے ہیں۔

جذبہ اور خیال کی طرح فکر بھی ادب کا ضروری عنصر ہے، ادبی موسیقی، جذبہ و فکر کی آمیزش سے نغمے جنم دیتی ہے، اور سروں کو لفظ و معنی کا لباس پہناتی ہے، جو عبارت دل پر اثر کرے وہ ادب ہے اور وہ افکار و حقایق جو ممتزج بالعواطف ہوں وہ بھی ادب ہیں۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخی کتابیں کب ادب بنتی ہیں۔

صحیح افکار، جذبے کو خلود دیتے ہیں، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم تنقید کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، جذبہ نام ہے تاثیر عملی کا۔ شعور، وجدان جس علم جزئی ہیں تمام جزئیات سے ایک مشترک مفہوم اخذ کرنے کا نام فکر ہے، شعور جزئی ہے اور فکر کلی۔ اس لیے شعور اور فکر کے درمیان اتصال عین حقیقت ہے، خواہ یہ اتصال کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔

جذبہ، فکر اور خیال کی طرح اسلوب بھی عناصر ادبی میں داخل ہے، اسلوب ایک حقیقت خارجیہ ہے جو مواد اور صورت کے امتزاج سے ادب کے خوبصورت مرقعے تیار کرتا ہے، وہ تخیل کو حقیقت اور واقعیت کی طرف لے جاتا ہے، ادب میں صورت و معنی کی ہم آہنگی ہی سے مرحلۂ شوق کی دشوار گذار راہ آسان بنجاتی ہے۔

اسلوب، جذبات کو برانگیختہ کرنے کا کام دیتا اور افکار کو لباس جمیل سے آراستہ کرتا ہے۔ اگر معانی متوسط اور خیالات فرسودہ ہوں لیکن اسلوب جاندار ہو تو عبارت میں موسیقی اور دلکشی آجاتی ہے، اسلوب ہی عبارت کو موثر اور خوبصورت بناتا ہے، اسلوب عارضی یا اتفاقی چیز نہیں فطری چیز ہے، جو ذوق سے حاصل ہوتا ہے۔

ہیئت۔ غایتِ ادبی نہیں۔ وہ ادائے معانی یا حقایق کی تعبیر کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے نہ تنہا مواد سے کام چل سکتا ہے اور نہ شکل وصورت سے۔ ان دونوں میں تناسب ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے۔ اسلوب ایک سماجی عمل ہے۔ اچھا اسلوب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہیئت اور اظہار کی سماجی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادیب اور قاری کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے۔ جمالیاتی اسلوب۔ نثر میں خیال کا آہنگ اور شعر میں جذبے کا ترنم بن جاتا ہے۔ فنکار اپنے جمالیاتی تجربے یا جذبے کے اظہار میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔

انسان لاشعور، علامتوں اور تمثالوں کا سرچشمہ ہے۔ علامتی اظہار، حسن کاری کو وجدان اور لاشعور سے قریب کرتا ہے۔ لاشعور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، جسے اشاریت کہتے ہیں، دروں بینی اور اشاریت اظہار کو ماحول کا داغ اور تہذیب وتمدن کی زبان دیتی ہے، مادی کشمکش سے فنکار کا احساس جمال متاثر ہوتا ہے۔

اشاریت ایک بے ساختہ ذریعۂ اظہار ہے۔ جو رسمی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس اعتبار سے ایمائی طرزِ فکر ایک فطری طریقہ ہے۔ وہ نفس کی گہرائیوں سے امنڈ کر نمودار ہوتا ہے۔ اشاریت، احساس کی ارتقائی منزل ہے، وہ الفاظ کو تصورزائی کی طرف لے جاتی ہے۔ تصورزائی ایک لازوال عطیۂ فطرت یا ناقابلِ اعتبار انتقال اسلوب ہے، جو کتاب یا ادبی عبارت کو قیمتِ خالدہ عطا کرتا ہے۔

شعر الہند حصہ اوّل

اسمیں قدماء کے دور سے لیکر دورِ جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل کیگئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ ومقابلہ کیا گیا ہے۔

(مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم) ضخامت ۴۹۴ صفحے۔ قیمت :- ۸ عہ

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۸)

چنتامن | چنتامن (चिंतामन) تکوان پور (کانپور) کے باشندہ رتناک ترپاٹھی کے بیٹے تھے، بھوشن ست رام اور جٹا شنکر ان کے بھائیوں کے نام تھے، علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد است و دو برادر او بھوکن و مترام نیز شاعر خوش فکر مشہور اند ..... در علم سنسکرت سرآمد اقران بود و در سرکار شاہ شجاع بن شاہ جہان بادشاہ باعزت بسری بردہ"[1]

یہ غالباً عرصہ تک ناگپور میں سوارج بنسی بھونسلہ راجہ کرند شاہ کے یہاں مقیم رہے، اور ان ہی کے حکم پر انھوں نے اپنی تصنیف پنگل تلمبند کی جیسا کہ ان کی تحریر سے واضح ہے۔

سوارج بنسی بھوسلہ سست ساہ مکرند — مہاراج دگپال جم بھال سمد سبھ چند
چنتامن کو کہ حکم کیو ساہ مکرند — کرو کچھ پچھ پھن سہت بھاشا پنگل چھند

چنتامن کا سنہ پیدائش ۱۶۰۹ء تسلیم کیا جاتا ہے، ان کی چھ تصانیف کا پتہ چلتا ہے جن کے نام کاویہ وبیک، کوی کل کلپترو، کاویہ پرکاش، رس منجری، پنگل اور رامائن ہیں، انکے علاوہ کتب خانہ دتیہ میں نمرگ منجری نام کی ان کی ایک اور تصنیف ملی ہے لیکن یہ کتاب دراصل شاہ اکبر

---

[1] علامہ آزاد بلگرامی - سرو آزاد، ص ۶۶ - ۶۵

کی آندھرا بھاشا میں لکھی ہوئی تصنیف ہے، جس کا ترجمہ سنسکرت سے ہو کر ہندی میں چنتامن کے ذریعہ ہوا، رامائن کو چھوڑ کر بقیہ سبھی تصانیف کا بیہ شاستر سے متعلق ہیں، ان کا سب سے زیادہ مشہور ومقبول گرنتھ کوی کل کلپترو (कविकल कल्पतरु) ہے۔

چنتامن کا شمار شرنگار کال کے اساتذہ میں ہوتا ہے، انھوں نے کیشو کی طرح بھامہ اور دنڈی کی تقلید نہیں کی، بلکہ ممٹ اور وشوناتھ کے راستے پر چلے، اور اس کے بعد ریتی کال کے مختلف آچاریوں نے چنتامن کی تقلید کی، رام چندر شکل ایک مقام پر رقم طراز ہیں:

"ہندی ریتی گرنتھوں کا سلسلہ چنتامن ترپاٹھی سے چلتا ہے۔ اسلیے ریتی کال کی ابتدا ان سے سمجھنی چاہیے"[1]

لیکن ڈاکٹر نگیندر شکل جی کے اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"چنتامن کو بھی یہ فضیلت عطا کرنا ظلم ہے، کیونکہ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے بعد ریتی کال کا دھارا بغیر کسی رکاوٹ کے بہہ نکلا" (ڈاکٹر نگیندر۔ ریتی کاویہ سنگرہ، صفحہ ۲۲-۱۹)

چنتامن کے کلام کے بارے میں ڈاکٹر جگدیش گپت کا یہ خیال ہے کہ آچاریہ ہونے کے باوجود شعریت کے لحاظ سے چنتامن کا مقام کافی بلند ہے، رس وادی شاعر ہونے کی بنا پر ان کے کلام میں شرنگار رس کا بیان تفصیل سے ہے، لیکن اس میں مترام اور دیو جیسے شعرائے متاخرین کی جیسی معنویت نہیں پائی جاتی، البتہ تخئیل کی سادگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے یہ مترام کے مقابلہ میں ضرور لائے جاسکتے ہیں، ان کا کلام مجموعی طور سے نہایت صاف ستھرا ہے، اس میں ایک ترنم اور نغمگی پائی جاتی ہے، (ڈاکٹر جگدیش گپت، ہندی ساہتہ کوش صفحہ ۱۷۳)

نمونہ کلام یہ ہے:

کیسر بارہ بار اتارت کیسر انگ لگاون لاگی — آئی ہو نین نچلاتا درگ نچل آپ چھپاون لاگی
دولھ کے اولکن کو واٹ ان جھوکن آون لاگی — دوس دو تنیک تھے بتیا من بھاون کی من بھاون لاگی

---

[1] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۵۹

دیو | دیو کا پورا نام دیودت تھا، سنہ پیدائش ۱۶۷۳ء ہے، یہ اٹاوہ کے باشندے تھے جس کا ذکر انھوں نے بھاو ولاس میں کیا ہے،

دیو سریا کوی دیو کو نگر اٹاوا باس جو دن نول سبھاو رس کیھو بھاو ولاس

اس دوہے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کانیہ کبج (कान्यकुब्ज) برہمن تھے کیونکہ دیو سرما کانیہ کبج برہمنوں کو کہتے ہیں۔ دیو کی زندگی کا ابتدائی حصہ مالی اعتبار سے اچھا نہیں تھا، ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والا یہ فنکار فکر معاش میں مختلف درباروں کی خاک چھانتا پھرا، کبھی اس نے اعظم شاہ کے سنگ در پر سجدہ کے لیے جہین نیازنامہ کی اور بھاو ولاس اور راشٹ بام جیسی تصانیف حصول انعام کے خاطر نذر کیں، کبھی راجہ سیتا رام کے بھتیجے سیٹھ بھوانی دت کے لیے بھوانی ولاس لکھی کبھی ریاست پھپھوند کے راجہ کشل سنگھ کی دلجوئی کے لیے کشل ولاس تصنیف کی کبھی سیٹھ بھوگ لال کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور کبھی راجہ ادیوت سنگھ کے نام پر پریم چندر کا پیش کی، کبھی ولی کے رئیس پالی رام کے بیٹے سجان من کیلئے سجان دنود لکھی اور کبھی بہانی کے حاکم اکبر علی خاں کی خدمت میں سکھ ساگر ترنگ پیش کیا،

دیو کی تصانیف کا دائرہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، ان کی تعداد کوئی ۵۲ بتاتا ہے اور کوئی ۷۲۔ ان میں سے ۱۸ کتابوں کے قلمی نسخے حاصل ہو چکے ہیں۔ شعر و نگار کا کے کسی اور شاعر نے اتنی تعداد میں اور اس قدر وسعت نظر کے ساتھ تصنیف نہیں کی، دیو در اصل ایک رومان پرور اور عاشق مزاج شاعر تھے، رومانیت اور تعشق ان کے کلام کا نمایاں حصہ ہے، ان کی منظومات میں سے جس شعر کو بھی اٹھا لیجئے وہ محبت کی چاشنی، رومان کی لذت سے خالی نہ ہوگی۔

دیو کے کلام میں تخیل کو بڑا دخل ہے، وہ تخیل کے سہارے ایسے مجسمے تراشتے ہیں جو حسن کے اعتبار سے بے نظیر ہیں، دیو کی شاعری تاثراتی ہے، اس لیے پرکشش اور پرکیف بھی ہے، جذبات کے مطابق زبان میں لوچ پیدا کرنا دیو کا خاص حصہ ہے، قواعد کے اعتبار سے دیو کی زبان میں کچھ کمی ضرور نظر آتی ہے لیکن کسی محبوبہ

کے تحت ایسا کیا ہے، اس سے اس کی صلاحیتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نمونۂ کلام یہ ہے،

دیو میں سیس بسا یو سنیہ کے بھال مرگمی بنھی کے بھاکھیو کنچکی میں چر پوکر چر دا لگائی لیو ارسوں اجلا کھیو
کے مکھنول گئے گئے رس موتی دن سنگار کے چاکھیو سانورے لال کو ساتوں دروپ میں کو کجرا کر راکھیو

مترام | مترام کی پیدائش سمبت ۱۹۲۳ء میں ضلع کانپور کے ایک گاؤں تکوان پور میں ہوئی، ڈاکٹر بھگیرتھ مصر نے اس گاؤں کا نام ٹیکا پور لکھا ہے جو صحیح ہے، مترام، چنتامن اور بھوشن کے بھائی تھے، ان کا کلام شیرینی اور حسن کے لحاظ سے بہت خوبصورت ہے، مترام کی طبیعت کا جھکاؤ رس کی طرف زیادہ ہے ان کی مشہور تصانیف میں للت للام، رس راج، پھول منجری، چھند سار سنگل، ست سئی، ساہتیہ سار لکچھن سرنگار اور النکار پنچاشکا ہیں، ان تصانیف میں للت للام اور رس راج زیادہ مقبول ہیں

للت للام (ललित ललाम) النکار سے متعلق ہے، اور بوندی کے حاکم بھاؤ سنگھ کی تعریف میں ہے، اس میں چتر کے علاوہ باقی سب النکاروں کو صنعت معنوی یا آرتھ النکار تسلیم کیا گیا ہے۔ انھیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صنعتوں کی تعریف میں شاعر نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اس کی پیش کردہ مثالیں بیشتر مقامات پر صنعتوں کی تعریف سے میل نہیں کھاتیں۔ اہم بعض مقامات پر شاعر نے صنعت کی تعریف اور اس کی مثالیں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہیں، مثلاً اپہ نکار یا صنعت تشبیہ کی تعریف وہ یوں کرتا ہے۔

جا کو ورڑن کیجئے سوا پمیئہ پرمان جا کی سمتا دیجئے تاہ کہت پرمان
جہاں برنئے دھن کو سم چھپ کو اللاس پنڈت کب مترام تہہ اپا کہت پرکاس

اور اس کی مثال پیش کرکے اس کو اور واضح کر دیا ہے۔

مترام کی دوسری مقبول تصنیف رس راج ہے جس میں تشبیہ کے ذیل میں نائیکاؤں کے اقسام پر تفصیل سے لکھا ہے، مترام کے نزدیک نائیکا وہ ہے جس کو دیکھکر قلب کی گہرائیوں میں انبساط یا

رس پیدا ہو ؎

ایکت جاہ ولوک کے چت بیچ رس بھاو

لیکن یہ تعریف ناقص ہے، حریف کو دیکھکر اگر دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو تو حریف کو نائیکا نہیں کہہ سکتے، رس راج اصلاً کا یہ گرنتھ ہے، شاستر گرنتھ نہیں، شاستریہ کی کسوٹی پر اس میں کمی پائی جاسکتی ہے، شرنگار اور نائیکا بھید کے بیشتر گرنتھ اسی نوعیت کے ہیں، سکھ دیو مصرکا 'رسارنو' بھی نائیکا بھید کا ہی گرنتھ ہے، اس کے علاوہ رام جی کا نائیکا بھید گوپال رام کا رس ساگر لبراہم کا رس ویویک کلیان داس کا رس چند وغیرہ گرنتھ بھی اسی طرح کے ہیں۔

نائیکا کے بیان میں مترام کا ذیل کا سوپا بہت مقبول ہے،

کندن کو رنگ پھیکو لگے جھلکے ات انگن چار گرائی — آنکھن میں السان چتونی میں نیچ ولاس کی سرسائی
کوبن مونی بکات نہیں مترام لہے مسکان مٹھائی — جیوں جیوں نہارے تیرے ہوت تیوں تیوں کھری کرے سی کمائی

مترام کے نائیکا بھید میں اکبر شاہ کی رس منجری کی ہی تقلید کی گئی ہو، سو کیا یعنی عنیفہ کی تین قسمیں مگدھا (صغیرہ) مدھیا (متوسط) اور پرودھا (کبیرہ)۔ صغیرہ کی قسموں میں نوودھا یعنی نازہ اور نشرنہ نوودھا یعنی راغبہ، مدھیا یا متوسطہ کی قسموں میں دھیرا (صابرہ) ادھیرہ (غیر صابرہ) اور دھیرادھیرا (صابرہ غیر صابرہ) اولاسی طرح پرودھا کی بھی دھیرا، ادھیرا۔ اور دھیرا دھیرا قسمیں۔ اور پرکیا یعنی بتیہ کی قسموں میں گپتا (مخفیہ) بدگدھا (فاطنہ) کلٹا (فاسقہ) انوشیانا (فاحشہ) لکچھتا (مسترہ) متا (معلنہ) انوڑھا (باکرہ) اور اوڑھا (ثیبہ) کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ پریم گرہتا، روپ گرہتا اور مان گرہتا نائیکاؤں کا بیان مترام نے کیا ہے۔ اس کے بعد پرشت پتکا، کھنڈتا، کلہنترتا، پریپھا، اکنٹھتا، واسک سجا سوادھین پتکا، ابھسارکا پروتسیت پرسی اور آگت پتکا کا بیان ہے۔ نایک کے اقسام میں مترام نے پتی، اپ پتی،

اور ویسک تین قسمیں درج کی ہیں، اس کے بعد چار طرح کے نایک۔ انوکول، دکھن، شٹھ اور دھرشٹ کا بیان ہے، یہ اقسام پتی بھید کے ذیل میں ہیں، اُپ پتی اور ویسک کی قسمیں علٰحدہ بیان کی گئی ہیں۔

مدھنایک | مدھنایک کا ذکر بھکتی کال کے شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے لیکن مدھنایک چونکہ اصلاً ریتی اور شرنگار کے شاعر ہیں، اسی لیے یہاں ان کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے، بلگرام کے ہندی شعراء میں مدھنایک کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے، کابیہ شاستر اور موسیقی کے آچاریہ مدھنایک شرنگار کال کے ہندی شعراء کی محفل کا ایک بیش قیمت جوہر ہیں، مدھنایک ایک ہی وقت میں ایک بے مثال موسیقار، ایک کامیاب شاعر، ایک عظیم آچاریہ اور ایک سچے عاشق ہیں۔

مدھنایک (मधुनायक) کے تخلص کو ہندی کے محققین نے مختلف انداز سے لکھا ہے، ڈاکٹر بھگیرتھ مصرا سے مدنایک (मदनायक) لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر برج کشور مصر کے یہاں یہ لفظ میرزا مدنایک ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر شتو لعل جوشی نے اسے مدھونایک (मधुनायक) لکھا ہے اور شری گوپال چند رستگھ اسے مدھنایک لکھتے ہیں۔ مدھنایک کا تخلص در اصل مدھنایک ہی تھا، مدھونایک یا مدھنایک نہیں، چنانچہ شاعر بلگرامی خلف میر عبدالجلیل بلگرامی تبصرۃ الناظرین میں لکھتے ہیں:

"اما مدھنایک لفظے است ہندی معنی آں واسطۃ العلاوہ یعنی جوہر میانہ جمیل کہ بسیار خوب دگذیدہ تر می باشد، چوں سید مشار الیہ تخلص در شعر ہندی ہمی لفظ می کرد ند لہذا بہ ایں نام اشتہار یافتند۔" (قلمی جیب گنج فارسی ۳۳ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مدھنایک نے بھی ایک دوھے میں اپنے اس تخلص کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مکٹ ھول مَن لال دُتِ ادے ٹیک مَن جوت برن چنی جم اردھی مدھنایک مدھ ہوت

مدھنایک نے اپنی پوری شاعری میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ پڑھنے والا انکی نغمگی میں کھو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، مدھنایک کے اشعار موسیقی کو ساتھ لیکر چلتے ہیں، ذیل میں شاعر نے دھیمار ٹیکا

کو خوبصورت سیج پر محو خواب دکھایا ہے، شاعر کے انداز بیان اور منظر کشی میں کتنی دلکشی ہے۔

سووت سروج کھی سکھ سمیپ سیج ہت اتھکارن سدن سکھ پالی کے

ڈھانکی پٹ آنچر لپیٹ نکھ سکھ ہوتیں پت پیاری نرکھ للچا تی کے

پڑھ ڈھگ سم بھرم سکچ آن ہت جان پاوے نہ چپل چھل چھدن چھپاتی کے

چھاتی لائی لائی ہانتی بھانوتی اپندی کینھیں جیئی پیہ چاہیں لیس سوت جگائی کے

سرے پاؤں تک باریک ڈوپٹہ میں لپٹی ہوئی نائیکا کو دیکھکر اس کا محب مچل اٹھتا ہے، اور آہستہ آہستہ جگاوتا ہے، جگانے کا انداز بھی خوب ہے، ذیل کے چھند میں نایک کرشن کو زرد رنگ کی پچھوری لپیٹے ہوئے آتا ہوا دیکھکر نائیکا کی آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کی زبانی شاعر نے جانے کیا کچھ کہدینا چاہا ہے

چندن چیر نوتن سانورے کا چھن ھو ہت آوت سو ہن

پیت پچھوری پچھا ہن چھاجت نیہن رنگ رچیورت چھو ہن

کنڈل منڈت منچل منجری نوتن نوت لتا کری جو ہن

آنسن کی اولی اچھے مدھنا یک بال بلوکت مو ہن

مدھنا یک جی نے اپنی تصنیف مدھنا یک شتکار میں رس کے بیان اور نائیکا بھید کو اپنا موضوع قرار دیا ہے، مدھنا یک جی کا نائیکا بھید قدیم روایتوں کی تقلید کے باوجود انوکھا اور نرالا ہے، انکی شاعری میں کہیں کہیں فطرت کے خوبصورت مناظر بھی ہیں لیکن فطرت کا آزاد تصور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ برسات کا ایک منظر یہ ہے:

برکھت بوندن اکھنڈ دھارا دھارا دھر جھوں دھان دمنی لیٹ دام دامنی

بھرے نیر ساگر امنڈ چلے ندی ندا ری کھوری سیت کھیت پنک پانی جامنی

اور ٹھور لبسکو نیم امیو پریم کہا موسے آن بھونن نہ بھائے بھوری جامنی

آیئے ہیں جو پریمی تو کھی کالی نیمی سجنی لے ہوئی ہیں نئی ناگ نولی کام کامنی

رسلین بلگرامی رسلین ہندی کے ایک مقبول شاعر ہیں، ان کا اصل نام سید غلام علی اور تخلص رسلین تھا، انھوں نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن ہندی کے شاعر کی حیثیت سے ان کا جو مقام ہے وہ فارسی میں نہیں ہے، ہندی کا ایک مشہور دوہا جسے اکثر حضرات بہاری کا سمجھتے ہیں، درحقیقت رسلین جی کا نتیجۂ فکر ہے، وہ دوہا یہ ہے

امی ہلاہل مدبھرے سیت سیام رتنار — جیت مرت جھک جھک پرت جو چوت اک بار

اس کا اردو منظوم ترجمہ یہ ہے

آب حیات زہر ہلاہل شراب ناب — چھلکے ہے چشم سرخ و سیاہ و سپید سے
جی اٹھے جاں ہلاک کرے کھوئے عقل و ہوش — اک بار جو بھی تیری نگاہوں میں دیکھ لے

رسلین جی سید باقر بلگرامی کے بیٹے تھے، ان کی ولادت بلگرام میں ۱۱۱۱ھ میں ہوئی تھی، ان کی تاریخ ولادت علامہ عبدالجلیل بلگرامی نے یہ تحریر کی ہے

نور چشم میر باقر گفت با من — چوں گل خورشید در عالم دمیدم
سال تاریخ تولد خود بگفتم — نور چشم باقر عبدالحمیدم ۱۱۱۱ھ

رسلین کی تصانیف میں رس پُرلودھ، انگ ورپن اور متفرق کتابیں ہیں، رس پرلودھ ۱۱۵۴ھ میں اور انگ ورپن ۱۱۹۰ھ میں ہے، میر آزاد بلگرامی نے انگ ورپن کے دوہوں کی تعداد ۷۷ اکھی ہے، غالباً انھوں نے آخر کے تین دوہے جو تصنیف کے خاتمہ سے متعلق ہیں، شمار نہیں کیے ہیں، ان کی کتابوں کی ابتدا شاعر نے حمد و نعت سے کی ہے، اسکے بعد بغیر کسی ترتیب کے نائکاؤں کا بیان ہے۔

رسلین سے متعلق عام ہندی محققین کی طرح ڈاکٹر محمد حسن حقانی لکھتے ہیں:

"رسلین نے اپنے کو صرف دوہوں تک ہی محدود رکھا ہے اور اس میں بھی انکی توجہ لفظی صناعی اور اظہار کمال پر زیادہ رہی ہے، داخلی جوش اور سوز و گداز پر نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے غالباً سروآزاد کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اگر وہ اس کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو یہ غلط فہمی نہ ہوتی کہ رسلین کی شاعری صرف دو ہوں تک محدود ہے، میرآزاد و ملگرامی نے سروآزاد میں رسلین کے کئی کتب درج کیے ہیں، البتہ لفظی صناعی اور اظہار کمال پر ان کی زیادہ توجہ کا خیال ایک حد تک درست ہے، لیکن یہ کہنا کہ ان کی توجہ داخلی جوش اور سوز و گداز پر نہیں تھی، بے بنیاد ہے۔ رسلین کے داخلی جوش اور سوز و گداز کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے: نایک نے پردیس جاتے وقت نائیکا سے اپنے واپس آنے کا ایک وقت معین کر دیا تھا، جو گذر چکا ہے، اور نائیکا بالکل مایوس ہو چکی ہے کہ اچانک نایک آجاتا ہے اور رات بھر نائیکا کے ساتھ رہنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے علی الصباح چلا جاتا ہے، اس موقع پر رسین جی نائیکا کی قلبی کیفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں کہ جیسے مشعل ایک مرتبہ روشن ہو کر گل ہو گئی اور دوبارہ اس کو کسی نے تیل میں ڈبو کر روشن کر دیا ہو۔

اودھ گئے ہر کے رسلین سو بیتے ہیئے دھن آک نئی ہے
تا سمے ہر آئی اچانک دیکھت ہیں سیراتی گئی ہے
بھور ہیں پھیر چلے تن کے اب تو گت ایسی بچا لئی ہے
نو مسال بھی بر کے پھر نیہ میں بور چڑھائی دلی ہے

ویل کے کبت میں مجبور نائیکا کہتی ہے کہ جب وقت سے پیتم پردیس گئے ہوئے ہیں ایک پل کیلئے بھی خوشی میسر نہیں ہوئی، جدائی کے لمحات قصاب کی طرح جان لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں، ایسی حالت میں درد دل کس سے بیان کیا جائے، اس وقت کام دیو بھی کمان میں تیر چڑھا کر مسلسل حملہ کر رہا ہے، اے راہ گیر تیرا بڑا احسان ہوگا اگر تو نول کشور یعنی کرشن جی سے صرف اتنا جا کر کہہ دے کہ ان کی عدم موجودگی میں جو مظالم مجھ پر ڈھائے جا رہے ہیں انھیں میں کس طرح برداشت کر سکوں گی۔

جب تیں سدھارے پردیس رسلیں پائے تب تیں تنک اس سکھ کو نہ لہے
برہ کسائی دکھدائی بھیو آوے نت میرو پران لین یہ کا سوبھا کہے
ایتے پر پنچ بان بان میں گھے کمان مارے تک تک بان کیسے کے نبہے
پتھک نہور کھو نول کسور جو سوں تم بن جور کون کون کون سہے

ریتی عہد کے عظم شاعروں کا سلسلہ رسلین پر ختم ہو جاتا ہے۔

شر نگار کال کے ساتھ سیاسی اور سماجی حیثیت سے ہندوستان کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آچکا تھا، نئی سیاسی قوتیں پرانے نظام حیات اور قدیم طرز تمدن کی بساط تہہ کر رہی تھیں، ہندی ادب بڑی تیزی کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا، وہ ایک ایسے باب میں داخل ہو رہا تھا جسے بہت وسیع معنوں میں دور جدید کہا جا سکتا ہے۔

(باقی)

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتداء، عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے،

ضخامت ۳۶۸ صفحے قیمت للعہ

منیجر

باب التقریظ والانتقاد

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری

از سید محمد الحسنی، صفحات ۲۴۴، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، قیمت ۷ر

جناب مولوی حافظ محبوب اللہ صاحب ندوی

تحریک ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن اور اسکے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری کی مفصل سوانحعمری ہے، جسے دارالعلوم ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے، اس میں مولانا کی ابتدائی زندگی سے لیکر وفات تک کے حالات بڑے شستہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی پاکیزہ زندگی کے واقعات پڑھنے سے آج بھی اللہ کی محبت، اتباع سنت کا جذبہ اور دردمندی اور دلسوزی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مولانا محمد علی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے اجل خلفاء اور ہمعصر علماء وصلحاء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، انکے ذریعہ ہزاروں آدمیوں کو توبہ وانابت کی سعادت نصیب ہوئی، زہد واتقاء کے ساتھ وہ ایک وسیع النظر داعی، مفکر اور کامیاب مصنف بھی تھے، انھوں نے چھوٹی بڑی پچاس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، خاص طور پر روعیسائیت اور قادیانیت پر انکی کتابیں بہت ہی مقبول ہوئیں، ان ہی خصوصیات کی بنا پر تحریک ندوۃ العلماء کے محرکوں نے جن میں مولانا خود بھی شامل تھے، ان کو اسکا پہلا ناظم مقرر کیا، جس پر وہ عرصہ تک رہے کئی برس بعد بعض داخلی اور خارجی حالات کی وجہ سے وہ اس سے مستعفی ہوگئے، اسلیے ضرورت تھی کہ مولانا کی ایک مفصل اور پُرمعلومات سوانحعمری شائع کیجاتی، اس کتاب سے یہ ضرورت بدرجۂ اتم پوری ہوگئی، کتاب میں کل سات ابواب ہیں، جن میں مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر کئی وجوہ سے کتاب کا سب سے زیادہ قابل توجہ اور جاذب نظر تیسرا اور چوتھا باب ہے، خصوصیت کے ساتھ اہل ندوہ کے لیے۔

مولانا کی زندگی اور اسکے مختلف گوشوں کے بارے میں بعض جزئیات کو چھوڑکر دوسرا مشکل سے ہوسکتی ہیں، مگر ان دونوں ابواب میں جن مسائل کو چھیڑا گیا ہے، ان سے نہ صرف کتاب کے بارے میں بلکہ ان سے متعلق جو افراد بھی

زیر بحث آگئے ہیں حتی کہ خود مولانا کی ذات کے بارے میں بھی دو رائے کا ہونا یقینی ہے، ان ابواب میں جن زاویوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ندوہ کی وسیع النظری اور واقعیت ہی نہیں بلکہ خود مولانا کی سیرت کی افادیت بھی قدرے مجروح ہوجاتی ہے، ان ابواب میں واقعات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دیکر تحریک ندوۃ العلما اور تاریخ دارالعلوم ندوۃ العلما کے سلسلے میں بعض ایسے نئے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کیگئی ہے جو نہ حیات شبلی کے مصنف کے علم میں تھے اور نہ ندوہ کے سالانہ جلسوں کی رُوداد میں ہی ان کا ذکر ملتا ہے، ان ابواب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص مزعومات و احساسات کو واقعات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ سازی ہے، اس بدعت کی ابتدا انگریزوں نے کی تھی، جسے سیاسی تاریخ نویسوں نے اپنالیا، اور اب مذہبی حلقے بھی ان ہی نقش قدم پر چل رہے ہیں، تاریخ سازی کی سب سے بڑی خصوصیت مبالغہ آمیزی (تعریف و مدح میں یا قدح میں) اور جذباتیت ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے حقیقت اور واقعیت مسخ ہوجاتی ہے، خوب، ناخوب اور ناخوب خوب بنجاتا ہے، ادھر ندوہ سے جتنا لٹریچر نکل رہا ہے اس میں اس طرح کے عناصر کی کارفرمائی بہت نظر آتی ہے، اور اسی کا ایک مظہر اس کتاب کے دو ابواب بھی ہیں،

تحریک ندوۃ العلما کے کارفرماؤں نے اردو کے افسانوی ہمہ گیر اور جذباتی لٹریچر میں الندوہ اور دوسرے ذرائع سے جو انقلاب برپا کیا تھا، اس سے علم و ادب اور فکر و نظر کے تمام گوشے متاثر ہوئے تھے، الندوہ کی روش کو چھوڑنا تحریک ندوہ کی علمی حیثیت اور تاریخیت کی طرف سے ایک گمانی کی فضا پیدا کرنے کے مرادف ہے، یوں تو ان ابواب میں بہت سی باتیں قابل بحث ہیں لیکن بخصوصیت سے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان ابواب کے مطالعہ کے دوران میں سب سے پہلی بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ تحریک ندوۃ العلما کو ایک مخصوص ذہن کی پیداوار قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ یہ تحریک کسی ایک ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ایک اجتماعی احساس زیاں تھا، جو انفرادی طور پر بہت سے دلوں میں پیدا ہوا، اور اس نے مدرسہ فیض عام کے جلسۂ دستار بندی میں ایک اجتماعی شکل اختیار کرلی، سید صاحب حیات شبلی میں مدرسہ فیض عام کے جلسہ میں شریک علماء کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مشرق و مغرب کے بھی دونوں مطلع تھے جس سے ندوۃ العلما کا آفتاب طلوع ہوا۔" (ص ۳۰۷)

پھر آگے لکھتے ہیں:- "اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ ابھی مشورہ سے علما کی ایک مجلس قائم کیجائے۔" (ص ۳۰۸)

پہلی روداد میں مولانا محمد علی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔

"جب بہت سے نامور علما، بسبب فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اس وقت "بعض دوراندیش" علما نے تحریک کی کہ ایک انجمن علما کی قائم کیجائے، اس تحریک کو تمام علما موجودین نے پسند فرمایا۔" (ص)

مولانا خود دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ یہ کسی ایک یا دو چار مخصوص ذہن کی پیداوار نہیں ہے

"ندوۃ العلما، ایسی انجمن نہیں جو کسی ایک شخص کے خیال سے یا دو چار آدمیوں کے مشورہ سے بغیر سمجھے بوجھے قائم کر لی گئی ہو۔" (ص ۳۰۸)

"بعض دوراندیش" سے ظاہر ہے کہ مولانا نے اپنی ذات تو مراد نہیں لی ہوگی، بلکہ صورت یہ ہوئی کہ موجود علما میں بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا، چونکہ یہ سب کے دل کی آواز تھی اور بہت سے دلوں میں پہلے سے اس کے لیے اضطراب موجود تھا، اسلیے اس پر اتفاق ہو گیا، اور وہ مجلس قائم ہو گئی، مولانا محمد علی اسکے صف اول کے موسسین میں تھے، اس کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے، پھر دوسرے سال جلسۂ دستار بندی کے موقع پر تشریف لائے، اور اسی کے ساتھ ندوہ کا اجلاس بھی کیا، مولانا نے روداد میں یہ بھی لکھا ہے کہ بہت دنوں تک واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر مدرسہ فیض عام کے جلسہ کی وجہ سے آنا پڑا۔

اس حصہ کو مصنف کتاب بالکل نظر انداز کر گئے ہیں

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ تحریک کسی ایک شخص کے جیسا کہ خود مولانا محمد علی نے تحریر فرمایا ہے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ بہت سے دردمند اور مضطرب دلوں کی آواز تھی جس نے ایک اجتماعی تحریک کی صورت اختیار کر لی،

مولانا اسکے پہلے ناظم ضرور مقرر ہوئے، مگر اس سلسلہ میں مولانا کا کوئی ایسا انقلابی اور انفرادی کارنامہ نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ندوہ کا ان کو بانی قرار دیا جائے، اسلیے کہ کسی تحریک یا ادارہ کے بانی کا طرز عمل ایک داعی کا سا ہوتا ہے، وہ ایسے کام کرنے والے کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسکو اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، وہ اسکی ساری دلچسپیوں کا مرکز ہوتا ہے، وہ اسی کی خاطر سوتا اور اسی کی خاطر جاگتا ہے، علم و تقویٰ کے تمام امتیازات کے باوجود یہ چیزیں ہمیں مولانا کی عملی زندگی میں نظر نہیں آتیں، اور نہ کتاب میں کوئی واقعی دلیل فراہم کی گئی ہے، بلکہ مولانا کا بار بار استعفیٰ پیش کرنا اس دعویٰ کے خلاف دلیل ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خط کا جو جملہ نقل کیا گیا ہے اسکی تردید خود مولانا کے مذکورۂ بالا بیان ہی سے ہوتی ہے پھر یہ بات خود قابل بحث ہے کہ کسی تحریک یا ادارہ کا بانی قرار دینے کے لیے اسکے انفرادی کارناموں اور بنیادی لٹریچر کے بجائے دستاویزوں کے ذاتی خطوط سے دلیل فراہم کیجائے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم دیوبند کے بانی نہیں ہیں، مگر انھوں نے جب اسکا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو بس اسی کے ہو رہے، اس سلسلہ میں انھیں بہت کچھ سرد و گرم سہنا پڑا مگر اس سے کسی آن جدا نہیں ہوئے، اسلیے انھیں بانی قرار دیا گیا، اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بزرگوں سے کسی ادارہ کی نسبت اس کے اعتماد کی بڑی سند ہے، مگر اس کو کسی مخصوص طبقہ کے اعتماد کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا نفسیاتی کمزوری ہے۔

دوسری بات جو ان ابواب میں پڑھنے والے کو کھٹکی ہے وہ یہ کہ کتاب میں قصداً علامہ شبلی کی خدمات کو نظر انداز کرنے اور انکی ذات کو دینی اعتبار سے مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، زہد و اتقا کے اعتبار سے دونوں میں تفاوت ضرور تھا مگر وہ درجہ دونوں میں تھا جسے ہر اور گوہر لتماشاکن اور خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہوا تھا کہنے والا بھی خدا کے یہاں کچھ کم مرتبہ نہ ہوگا۔ جہاں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کی طبیعتوں میں موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں انکے خاندانی اثرات کا ذکر کرکے انکی سیمابیت اور انتہا پسندی کا جو بھیانک نقشہ پیش کیا گیا، اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ شائستگی قلم کے بھی منافی ہے، غیرت و حمیت کے نتیجہ میں ان کے دادا کا قبول اسلام اگر ایسا عیب ہے کہ کئی پشت تک اسکا اثر نہیں گیا، تو پھر بعض صحابہ جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، کے اسلام کے بارے میں کیا رائے قائم کیجائے گی۔

ندوہ کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا جسمیں علامہ شبلی نے ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فعال اور سرگرم عنصر کی حیثیت سے حصہ لیا، انھوں نے مدرسہ کے اجلاس کی صدارت کی تحریک کی، پھر ندوہ کے جلسہ کی تحریک صدارت کی بلکہ روداد کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "کارروائی کا کاغذ پڑھکر سنایا"۔ آخر میں ندوۃ العلماء کیلئے دستور کا مسودہ پیش کیا، روداد میں ہے:

"اسکے بعد شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے جناب صدر سے اجازت لیکر دستور العمل پیش کیا اور مولوی فتح محمد صاحب نے تائید کی"

اس اجلاس میں نصاب تعلیم کی کمیٹی بنی، اس میں ان کا نام موجود ہے، دستور کے مطابق انہی نے مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی

تجویز رکھی، غرض اس اجلاس کے سارے اہم کاموں میں انھوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ متعدد کام انہی کی وجہ سے انجام پائے، اس اجلاس کی جو رُوداد اس کتاب میں بیان کیگئی ہے، وہ "حیات شبلی" اور ندوہ کی رُوداد سے جو خود مولانا محمد علی مونگیری کی مرتب کردہ ہے مختلف ہے، علامہ شبلی کا صرف اتنا ذکر ہے کہ وہ اس جلسہ میں شریک تھے انکی کارروائیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتے رہے (ص ۱۲۷) دستور کے سلسلہ میں حیات شبلی اور رُوداد کے بیان کے خلاف لکھا گیا ہے کہ دستور پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی نے مولوی عبدالحق حقانی کے سپرد کیا تھا لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لاسکے، چنانچہ مولانا شبلی نے صدر جلسہ کی اجازت سے پیش کیا (ص ۱۲۸) معلوم نہیں کہ ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے، پھر مولانا حقانی کا نہ آنا اور علامہ شبلی کا بروقت دستور پیش کر دینا بالکل سمجھ میں نہیں آتا، اگر مولانا حقانی نے اپنا مسودہ پہلے سے بھیج دیا تھا تو اس کا ذکر روداد میں کیوں موجود نہیں ہے،

مولانا شبلی کو نظر انداز کرنے اور ان کو مجروح کرنے کا جو منصوبہ نوجوان مصنف نے بنایا تھا، اسکی تکمیل کی یہی صورت تھی، کہ ندوہ کے سلسلہ میں ان کی تصویر کا صحیح رخ سامنے نہ آنے پائے۔

ندوہ کی پہلے سال کی رُوداد اور حیات شبلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن مقاصد کی تکمیل اور جن علمی، تعلیمی اور معاشرتی تبدیلیوں کیلئے تحریک ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا تھا ان میں سے کسی ایک کی تکمیل کو لانا محمد علی کے عہد نظامت اور مولانا عبدالحی صاحب کی نیابت یعنی ۱۸۹۶ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک نہیں ہوسکی، ان حضرات کے دلوں میں یہ خواہش ضرور تھی جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، مگر ان سب کی تکمیل اور ندوہ کو اسکے علمی و تعلیمی معیار مطلوب سے قریب تر قریب کرنے میں جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ علامہ شبلی کی ذات ہے، بلکہ آٹھ برس تک قریب قریب حالت تنہائی ندوہ کا دفتر تک گردش میں رہا، وہ کبھی لکھنؤ میں تھا اور کبھی شاہجہانپور میں، اور کبھی کسی اور جگہ اسکے لیے امن تلاش کرنے کی کوشش کیگئی، مولانا محمد علی کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ

> ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانہ پر ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی اور مولانا نے اسکا ایک واضح خاکہ تیار کرکے ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں پیش کیا اور اسکے بعد یہ خاکہ "مسودہ دارالعلوم" کے نام سے شائع کرکے اسکو اصلاح و استصواب کیلئے ممتاز علماء اکابرین اور اہل علم حضرات کو ارسال کیا گیا، (ص ۱۴۷)

اس بیان کے مقابلہ میں آپ حیات شبلی کے مصنف کا بیان جو اس تاریخ کے بڑا راست چشم دید راوی ہیں ملاحظہ کیجئے، اس سے پہلے ندوہ کے دستور کا ذکر آچکا ہے کہ اسے مولانا شبلی نے پیش کیا، اب نصاب تعلیم کی تبدیلی، دارالعلوم کی تجویز اور دوسرے امور کے

بارے میں سید صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

"اسکے بعد بارہ علماء کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لیے مقرر کیگئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے رسالے لکھے، اور مولانا نے دارالعلوم کے نصاب کے بجائے دارالعلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے"۔ (حیات شبلی ص ۳۰۱)

سید صاحب آخری جملہ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم کے وسیع تصور کے مطابق اگر اسکا نصاب کوئی تجویز کرسکتا تھا تو وہ مولانا شبلی کی ذات ہی جو عرب و ترکی کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لے چکے تھے، اور جنھوں نے حیدرآباد اور دوسرے کئی اداروں کا دینی نصاب تیار کیا تھا۔

مصنف کتاب نے لکھا ہے کہ ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو سب سے پہلے مولانا محمد علی نے دارالعلوم کی تجویز مجلس انتظامیہ میں رکھی، اور سید صاحب کا بیان ہے کہ اس سے دو سال پہلے مولانا شبلی نے دارالعلوم کا خاکہ مرتب کر دیا تھا۔

مجوزہ نصاب کے مطابق ایک الگ دارالعلوم کی تجویز کے بارے میں مصنف کتاب نے یہ اثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا محمد علی کا پیش کردہ ہی مگر روداد اور حیات شبلی کے بیان سے اسکی تردید ہوتی ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب کا پورا بیان ملاحظہ ہو:۔

"۱۰ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کانپور میں نصاب کا جلسہ ہوا .... اور مولانا شبلی نے شرکت کی اور کئی روز کے مباحثہ کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا" (حیات شبلی ص ۳۶۱)

روداد میں مولانا محمد علی اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھکو بھی اس میں حاضر ہونے کی عزت حاصل تھی"۔ (ص ۴۲)

یہی مسودہ ہے جس کو علماء کی مخصوص کمیٹی نے طے کیا تھا جو اجلاس بریلی سے پہلے دوسرے علماء کے یہاں بھیجا گیا تھا، اور اس کو پھر اجلاس خاص نے تجویز کی شکل دی، پھر وہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی، اس اجلاس کی تفصیل کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا (شبلی) نے اسکے پہلے ہی اجلاس میں حاضرین کے اصرار سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دارالعلوم کی تجویز منظور ہوئی"۔

"دوسرے دن ۲ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۸۹۶ء کو ندوہ کے اجلاس عام میں مولانا عبدالحی حقانی نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی (وہی تجویز جو جلسۂ خاص میں منظور ہو چکی تھی جس کا خاکہ علامہ شبلی نے دو سال پہلے بنایا تھا) اور مولانا شبلی مرحوم نے اسکی تائید کی اور اس سلسلہ میں دارالعلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی، یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دارالعلوم کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کیجائے، اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے" (حیات شبلی ص ۳۱۲)

ندوہ کے بنیادی مقاصد دو تھے، ایک موجودہ نصاب تعلیم کی تبدیلی، دوسرے نزاع باہمی خاتمہ پہلے مقصد کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ایک درسگاہ کا قیام تھا، اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لیے جدید و قدیم دونوں طبقوں میں اعتماد کی ضرورت تھی، نئی درسگاہ کے قیام کا مقصد محض ایک نئی عربی درسگاہ کا اضافہ نہیں تھا، بلکہ اس میں نئے نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم تھی، درسگاہ تو ۱۸۹۶ء میں قائم ہوگئی، مگر اس کے قیام کے آٹھ برس یعنی ۱۹۰۴ء تک اس میں وہی نصاب تعلیم پڑھایا جاتا رہا جو عام درسگاہوں میں پڑھایا جاتا تھا، نصاب میں جدید علوم کے ساتھ انگریزی کا داخلہ بھی پیش نظر تھا جیسا کہ مولانا محمد علی کے سیرت نگار نے لکھا ہے، مولانا بھی اسکے حامی اور موید تھے، مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اور انکے رفقاء کار اپنے عہد نظامت و نیابت یعنی ۱۹۰۰ء کی مدت میں کسی ایک جز میں نہ کوئی تغیر فرما سکے اور نہ کوئی تجویز عملی صورت اختیار کر سکی، مولانا شبلی نے انگریزی کی تجویز کوئی بار مجلس انتظامیہ اور مجلس عام میں رکھا، وہ منظور ہوئی، مگر اس پر عمل نہ ہو سکا، مولانا شبلی اس کو نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انکو کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہیں تھی، اسلیے وہ بار بار ارکان ندوہ کو اسکی طرف توجہ دلاتے تھے، مگر اس وقت جو لوگ دارالعلوم ندوہ میں داخل تھے وہ اس کیلئے آمادہ نہیں تھے، بلکہ یہ حضرات تو دارالعلوم کی ایک الگ مجلس بھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھے، اسی وجہ سے مولانا شبلی کی شرکت انکو اور زیادہ گراں تھی، غرض یہ کہ مولانا شبلی کی آمد سے پہلے تک ندوہ کے قائم کردہ دارالعلوم اور دوسرے عربی مدارس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، علامہ شبلی نے اس کے بارے میں سیکڑوں خطوط دوستوں، بزرگوں اور اپنے خوردوں کو لکھے جو آج بھی مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں :-

"آج ایک نقشۂ نصاب جاریہ دارالعلوم ندوہ آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں: ملا جلال، شرح جامی، فصولی اکبری، میبذی، شافیہ، مکری! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا.....

پھر انھوں نے مولانا شروانی کو دوسرا خط لکھا کہ میں (یعنی مولانا شبلی نے) اسی کے متعلق مدرس اول کو لکھا تھا، انکا جواب آیا ہے:

"جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھایا تک نہیں گیا۔" (ص ۳۹۳)

جب عربی کتابوں میں تبدیلی کا یہ حال تھا تو انگریزی کے اجرا میں انکو کیا کیا قیمتیں نہ اٹھانی پڑی ہونگی، اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے، دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں،

"جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کیجائے.... لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے۔"

اس کے جواب میں مولانا شروانی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو لکھتے ہیں:

"بات تو کچھ نہیں لیکن مولوی عبدالحی کی بہانہ جوئی اور آپکے خارق العادۃ بھولنے پر تعجب آتا ہے جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی سے کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپنے فرمایا کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا، میں ہوں، اور میرا نام لکھا جائے، مولوی لیاقت خاں نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔"

ان کوششوں کے باوجود دو سال تک پھر یہ معاملہ ملتوی رہا، مولانا شبلی نے بار بار اسکی طرف توجہ دلائی، ایک خط میں مولانا شروانی کو دوستانہ انداز میں لکھتے ہیں: "ایک ہمارے روشن خیال مولانا شروانی ہیں..... انکا حال یہ ہے کہ انگریزی کے نام سے انکو لرزہ آتا ہے۔ بڑی مشکل سے مسلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں۔" (ص ۴۱۷)

غرض یہ کہ عربی نصاب کی طرح جدید علوم اور انگریزی کا اجرا بھی باقاعدہ اس وقت ہوا جب مولانا شبلی ۱۹۰۹ء میں دارالعلوم کے مہتمم تعلیم ہوکر آئے، انھوں نے شدید موانع اور رکاوٹوں کے باوجود اس نصاب کو جاری کیا جس کیلئے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔ اس تفصیل کا مقصود یہ ہرگز نہ تھا کہ دارالعلوم کے اجرا کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ مولانا شبلی کا حصہ دوسرے حضرات سے کم نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ شبلی نے جو نمونے بھی پیش کیے اگر ان میں انکی روح کارفرما نہ ہوتی تو اسکو اور اسکے مضمار عمل پر کوئی تفوق نہ ہوتا، خصوصیت سے دارالعلوم کے معاملات میں تو دوسرے حضرات کا طرز عمل نہ تو ندوہ کے مقصد سے میل کھاتا اور نہ اس میں کوئی ایسی بلندی نظر آتی کہ علامہ شبلی کو ندوہ کی تاریخ میں کوئی درجہ نہ دیا جائے، اور دوسرے حضرات سارے امتیازات کے مستحق گردانے جائیں، اس دعوے کے علاوہ اس کے بعض اور مندرجات اور بعض دوسرے ایسے واقعات ہیں جو قابل بحث ہیں، مگر مقصود انکا احاطہ نہیں ہے بلکہ تاریخ سازی و ہیئت کی نشاندہی ہے۔

مطبوعات جدیدہ

علاجِ خوف و حزن ۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دینیہ، دیوبند، قیمت ؟

رنج و غم اور حزن ملال انسانی زندگی کا لازمہ ہیں، آج کوئی انسان خالی نہیں ہے، ان سے نجات کی بہت سی صورتیں فلاسفہ، حکماء اور نفسیات کے ماہرین نے بتائی ہیں، مگر اس کا ایک علاج توبہ و انابت اور دعا و عبادت بھی ہے، امام غزالی نے صحیح لکھا ہے کہ جس طرح جسمانی امراض کے لیے معالجات ہوتے ہیں، اسی طرح اس روحانی مرض کا عام علاج بھی دعا و عبادت کے ذریعہ کیا جائے تو اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے"، اس موضوع پر بہت سے علماء نے کتابیں لکھی ہیں، ان ہی میں امام ابن ابی الدنیا کا رسالہ الفرج بعد الشدۃ بھی ہے، اسی رسالہ کو ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اور جا بجا اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں حواشی لکھے اور اضافے بھی کیے ہیں، اس کتاب کے بعض مندرجات سے اختلاف کی گنجائش ضرور ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے۔

روحِ اسلام اقبال کی نظر میں ۔ از ڈاکٹر غلام عمر خاں، صفحات ۱۱۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد، آندھرا۔

علامہ اقبال نے اسلامی تہذیب کے بارہ میں اپنے کلام اور بعض دوسری تصانیف میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کی روشنی میں ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب میں کل پانچ مباحث ہیں، جس میں بدھ مت، عیسائیت، اسلام، مغرب جدید اور اسلام اور مسلک تصوف

کے مابین جو اختلاف ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے، اقبال تصوف کے مخالف نہیں ہیں، مگر انھوں نے رہبانیت اور بدھ مت کے سنیاس سے جو اختلاف کیا ہے اس سے بعض لوگ ان کو تصوف کا مخالف سمجھ جاتے ہیں، خود مصنف بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں، ان کے بعض اشعار میں رہبانیت اور تصوف وغیرہ کا جو تقابل اور توافق نظر آتا ہے اس سے وہ تصوف مراد ہے جس کی تمام صوفیائے محققین نے مخالفت کی ہے جس کا پنجاب اور سندھ میں رواج عام ہے، ان جزئیات کو چھوڑ کر کتاب میں اقبال کے نقطۂ نظر سے قریب پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تھوڑی ویر اہل حق کیساتھ - از یونس نگرامی ندوی، صفحات ۸۴، کتابت وطباعت بہتر، ناشر مکتبہ طیبہ سی ۲۰۵/۳ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنو۔

اس کتابچہ میں بہت سے اہل حق کے سبق آموز واقعات مختلف کتابوں سے جمع کر دیے گئے ہیں، ان میں موضوع کے اعتبار سے کوئی ترتیب نہیں ہے، مگر ان واقعات کو پڑھکر عبرت وبصیرت دونوں پیدا ہوتی ہے، ان ہی بزرگوں کا طفیل ہے کہ دین اپنی اصلی صورت میں آجتک زندہ ہے، یہ کتاب کا دوسرا حصہ ہے پہلا حصہ اس سے پہلے شائع ہوکر مقبول ہوچکا ہے اگر جناب مصنف اس میں کچھ اپنا درد وسوز بھی شامل کرلیتے تو اس کی افادیت میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا۔

صور اسرافیل - از حبیب پانپوری، صفحات ۲۹۸، کتابت وطباعت عمدہ، پتہ ادارہ اشاعت دینیات، نظام الدین اولیاء، نئی دہلی ۱۳، قیمت ۳ے

یہ ایک گجراتی شاعر حبیب پانپوری کا مجموعہ کلام ہے جسمیں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں، غالباً پہلی بار ان کا مجموعہ کلام سامنے آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں قدرت نے شاعری کی تمام صلاحیتیں جمع کر دی ہیں، انکے کلام میں علامہ اقبال کے ذوق تکمیلیانہ اور عندلیب عاشقانہ کی جھلک ملتی ہے، امید ہے کہ مجموعہ اہل ذوق میں ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔

م ۔ ح

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

بابتہ ماہ ربیع الاولیٰ، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ

(جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۶۵ء)

اشاعتِ خاص

بیادِ حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۸۴ھ)

قیمت -/۲

فہرست

(۱) افتتاحیہ ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی (۳)

(۲) خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۹)

(۳) حضرت مولانا محمد یوسف / چند تجربے اور مشاہدے ——— محمد منظور نعمانی (۱۹)

(۴) کان مملوکی فاضحی مالکی ——— شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہم (۳۵)

(۵) حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی چند خصوصیات ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی (۴۱)

(۶) حضرت جیؒ ارشادات کی روشنی میں ——— مولانا مفتی زین العابدین لائلپوری (۵۳)

(۷) صدیق وقت و یوسف اقلیم دین و دعوت ——— مولانا محمد اشرف ایم۔اے (پٹنہ) (۵۹)

(۸) مہد سے لحد تک ——— مولانا محمد ثانی حسنی (۸۱)

(۹) مکتوبات ——— حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ (۹۷)

تقریریں

(۱۰) کامیابی اور ناکامی کی حقیقی بنیاد ——— " " " " " (۱۳۹)

(۱۱) مدینہ کی محنت کا نقشہ ——— " " " " " (۱۴۵)

(۱۲) راہِ خدا میں نکلنے والوں کو ہدایات ——— " " " " " (۱۵۲)

(۱۳) دعا ——— " " " " " (۱۶۱)

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا

افتتاحیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عتیق الرحمن سنبھلی

"حضرت مولانا محمد یوسف نمبر" آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا کی شخصیت، انکے مجاہدات و کمالات علوم و معارف اور بیس سالہ دعوتی زندگی پر نظر کی جائے تو یہ مجموعہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن جن حالات میں یہ نکلا ہے اور جس انداز سے اس شکل تک پہنچا ہے اس سب کو دیکھتے ہوئے اسے مولانا کی کرامت یا مرضی الٰہی کا ظہور کہنا بھی شاید بجا ہو۔

حضرت مولانا کا وصال ہوا تو اس خاص تعلق کی بنا پر جو الفرقان کو اس سلسلۂ دعوت سے رہا ہے راقم سطور کے دل میں تقاضہ ہوا کہ اس موقع پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جائے جیسا کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر ایک خاص اشاعت الفرقان نے پیش کی تھی، اور وہ آج تک بھی اس تحریک سے الفرقان کے تعلق کی ایک زندہ علامت ہے۔ لیکن یہ فیصلہ میرے کرنے کا نہیں تھا، اُن دو بزرگوں کے کرنے کا تھا جن کے اس تحریک کے ساتھ تعلق پر الفرقان کے اس خاص تعلق کا انحصار رہا ہے۔ یعنی والد ماجد اور مخدومنا مولانا علی میاں مدظلہم۔ اور یہ دونوں بزرگ اس وقت حجاز مقدس میں تھے۔ چنانچہ اپنا یہ خیال وہاں کو اس طرح لکھ بھیجا کہ وہیں سے کچھ لکھ کر بھیجدیجئے اس لئے کہ واپسی میں تو ابھی بہت دیر ہے اور اُمید تھی کہ جواب تحسین و تائید میں ہوگا، اس بنا پر ناظرین الفرقان کو بھی کچھ ملکی سی اُمید دلادی گئی۔ مگر وہاں مولانا کے سانحہ ارتحال کی اچانک خبر نے کچھ اس طرح کا اثر کیا تھا کہ جیسے دونوں

اوس پڑ گئی ہو اور طبیعتیں لکھنے لکھانے پر اُٹھائے نہ اُٹھتی ہوں۔ چنانچہ جو جواب آیا اُسکے بعد یہ خیال ذہن سے نکال دینا پڑا حتیٰ کہ ہر دو بزرگوں کی واپسی ہو گئی۔ اور وہاں سے مؤتمر اسلامی نمبر کا خیال ساتھ آیا، جس کی بنیاد وہ اہم مقالات تھے جو اس مؤتمر میں عالم اسلام کے منتخب فضلا نے پیش کئے تھے۔ اور اس نمبر کا اعلان بھی کر دیا گیا ——— مگر اس سے پہلے ربیع الاول (مطابق جون ۱۹۶۵ء) کا جو شمارہ نکلنا تھا اُسکے لئے والد ماجد نے ایک مضمون مولانا مرحوم پر قلمبند فرمایا اور قریب تھا کہ یہ شمارہ اس مضمون کے ساتھ نکل جائے کہ بعض معاصر اہنامون میں مولانا کی شخصیت اور اُن کی دعوت سے متعلق ایسے مضامین سامنے آئے جنھوں نے ایک بار پھر تقاضہ پیدا کیا کہ مولانا کی دعوت اور اُن کی شخصیت کو اُسکی صحیح صورت میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ پوری طرح واقفیت کا موقع نہ پانے والے نہ تو خود اپنی ناواقفی یا غلط فہمی سے مولانا اور انکی دعوت کی غلط اور ناقص صورتیں سامنے رکھ کر گفتگو کریں اور نہ اُنکی غلط فہمیاں دوسروں کو اس دعوت کے بارے میں غلط تصورات دیں۔ کیونکہ معاملہ صرف مولانا کی ذات کا نہیں ایک عالمگیر دعوت اور دینی جد وجہد کا ہے جس کے بارے میں لوگوں کا صحیح یا غلط فیصلہ بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مگر اب ایک طرف تو مسئلہ یہ تھا کہ "مؤتمر اسلامی نمبر" کا اعلان کیا جا چکا تھا اور دوسری طرف جن حضرات کا تعاون اس کوشش کی تکمیل کے سلسلے میں ناگزیر محسوس ہوتا تھا اُن سے تعاون ملنے کے آثار نہیں تھے۔ چنانچہ ایک درمیانی راستے کے طور پر صرف ایک ماہ کی اشاعت کو حضرت مولانا مرحوم کیلئے خاص کر دینے کا فیصلہ کیا گیا، اور جو ایک مضمون اس سلسلے میں تیار ہوا تھا وہ اسی اشاعت کے لئے روک لیا گیا۔

یہ اشاعت جولائی میں نکلنا تھی اور کتابت مکمل ہو کر طباعت کا مرحلہ بھی شروع ہونے لگا تھا کہ دل نے کہا کہ یہ تو دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش ہو گئی۔ مگر کامیاب نہیں۔ یہ چند قطرے تو اہل طلب کی پیاس بھڑکائیں گے، اور پھر تشنہ لبی کا شکوہ بجا ہوگا۔ دیر بھلے ہی ہو جائے مگر اس ظرف کی وسعت میں اضافہ چاہیئے۔ چنانچہ اب جو جو کمی محسوس کی گئی اس کی تکمیل کے لئے پھر سے جد وجہد شروع ہوئی۔ بعض پہلو اب بھی چھوٹ گئے جن کی بڑی اہمیت نظر میں تھی۔

مگران کے ماسوا بالکل تائید غیبی کا سا سماں ہوا۔ مولانا کے مکاتیب کے لئے خصوصی جد وجہد تھی اور کسی طرح کامیابی نہیں ہو رہی تھی کہ بالکل مایوسی کے مرحلہ پر جناب افتخار فریدی صاحب نے یکایک نشاندہی کی کہ مکاتیب کا بڑا وسیع ذخیرہ اُن کا جمع کیا ہوا ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اُسے جا کے دیکھا تو ساری پریشانی دور ہوگئی۔ بہت سے خط ملے اور اُن میں سے کئی ایک دیئے جا رہے ہیں۔ مگر سب سے نادر چیز مولانا کا وہ خط ملا جس کا حوالہ مرکز نظام الدین سے ملا تھا کہ مولانا نے ایک دفعہ ایک بہت ہی مبسوط خط اس تبلیغی کام کی اہمیت اور اسکے اصول وضوابط پر بعض رفقاء کو لکھا تھا جو اس سلسلے میں تفصیل و جامعیت کے لحاظ سے مولانا کی واحد تحریر ہے۔ اس خط کو پاکر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سب کچھ ملگیا اور اس نمبر میں اور کچھ بھی نہ ہوتا تو مقصد کے لحاظ سے یہ تنہا کافی تھا۔

خطوط کے علاوہ ایک خاص ضرورت کسی ایسے مضمون کی تھی جو اس کام سے گہرا علمی تعلق رکھنے والے کسی صاحب کے قلم سے ہو۔ اور وہ مضمون سیر حاصل بھی ہو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو لوگ فکری اور عملی اعتبار سے اس تبلیغی کام میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کے یہاں مضمون نگاری کا کوئی خانہ نہیں۔ کیونکہ اس کام ہی میں اس کا کوئی خانہ نہیں ہے۔ ہمارے علم میں صرف ایک صاحب ہیں جو اس عموم سے مستثنیٰ ہیں (یعنی محترم مولانا محمد اشرف صاحب ایم۔اے۔ صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور) ہماری خواہش تھی کہ اُن کا مضمون ضرور اس نمبر کے لئے مل جاتا اور یہ کوئی مشکل بات نہ تھی، چنانچہ اُن سے درخواست کی گئی۔ مگر کوئی جواب نہ آیا، پھر لکھا گیا پھر جواب ندارد حتیٰ کہ تار دیا گیا اور پھر مایوسی ہوگئی۔ کہ یکایک ایک دوسرے مقام سے اُن کا تار ملا اور پھر خط آیا کہ وہ ایک ماہ سے تبلیغی دورے میں تھے رائے ونڈ (لاہور) میں اُن کو ہمارا تار پشاور سے اہل خانہ نے بھیجا ہے اور اب ہمارا دیا ہوا وقت ختم ہوگیا ہے، ورنہ وہ ضرور لکھتے بلکہ اُن کو افسوس رہے گا کہ وہ اس بزم یوسفی میں شریک نہ ہوسکے۔ چنانچہ اُن کو وقت بڑھانے کا تار دیا گیا اور اس طرح ان کا مضمون بھی آگیا۔ جو بلاشبہ قلم برداشتہ ہے مگر ہماری توقع کے مطابق۔

بہرحال جن جن مراحل سے یہ نمبر گزر کر اپنی موجودہ شکل میں آیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے

ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام اللہ ہی کو کرانا منظور تھا ورنہ اس کی بات تو شروع ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ اور اس احساس کے ماتحت اُمید یہی ہے کہ خدا نے چاہا تو اس سے مرتب کرنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں ہی کو فائدہ پہنچے گا۔

اوپر جو کہانی اس نمبر کی بیان کی گئی اُسکے بعد اسکے مقصد و مدعا کے بارے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش تو نہیں رہتی، پھر بھی اچھا ہے کہ صراحت کے ساتھ یہ بات کہدی جائے کہ اس نمبر کا مقصد خراج عقیدت پیش کرنا یا مولانا کی شخصیت کو منوانا نہیں، کہ یہ کام اگر کسی کے کرنے کا تھا تو اس کے حقدار مولانا کے وہ رفقاء کار ہو سکتے ہیں جنھوں نے اپنا دامن مولانا کے دامن سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ صرف موت ہی انھیں جدا کر سکی۔ لیکن یہ مولانا سے جتنے زیادہ قریب تھے اتنے ہی دنیا کی اس عام ریت سے دور ثابت ہوئے کہ اپنے محبوب و مقتدا کی وفات کے بعد کچھ وقت اسکی مدح و ثنا اور اُسکے تذکرہ و توصیف کی نذر کریں۔ اور حق یہ ہے کہ یہ اُن کے ایک نادرۂ روزگار امتیاز کا سخت ترین امتحان تھا جس میں وہ کامیاب ثابت ہوئے۔ تبلیغی تحریک جہاں اور بہت سی باتوں میں زمانے سے جُدا انداز رکھتی ہے وہاں اُس کا ایک اہم امتیاز یہ بھی ہے کہ رہنما شخصیتوں کی اہمیت اگرچہ عملاً سب جگہ سے زیادہ، مگر اندرونی وابستگی تمام تر دعوت کے ساتھ۔ اور اس کا اندازہ صرف اس چھوٹی سی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی تبلیغی اجتماع میں کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی آرہی ہو تو نہ اُسکے نام سے لوگوں کو بلایا جاتا ہے اور نہ اسکی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ کہ خطاب سے پہلے اُسے مجمع سے متعارف کرا دیا جائے۔ بس دعوت ہی سے اجتماع کا آغاز اور دعوت ہی پر ختم۔ کس نے دعوت دی اور کس نے تقریر کی اسکو اگر کوئی جاننا چاہے تو اپنے آپ جانے۔ اس تحریک کا یہی وہ خالص دینی اور مقصدی مزاج ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مولٰنا جیسی شخصیت گزر گئی اور اپنی عملی اہمیت کے لحاظ سے دلوں میں زخم چھوڑ گئی، مگر عین اس وقت بھی جبکہ اُن کا جنازہ لاہور سے آیا ہوا ان رفقاء کے بیچ میں رکھا تھا ذکر و فکر صرف اُس دعوت کا تھا جس پر مولٰنا نے اپنی زندگی نثار کی، نہ کہ مولٰنا کے

کمالات و مجاہدات کا!۔

رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ
فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ
وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝

آیندہ اشاعت

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی بعض تقریریں وغیرہ وقت اور صفحات کی تنگی کی وجہ سے اس نمبر میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ جنھیں اسی نمبر کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں انشاء اللہ الفرقان کی آیندہ اشاعت (اکتوبر) میں دی جائیں گی۔ اور اس طرح آیندہ اشاعت کی حیثیت اس نمبر کے ضمیمہ کی ہوگی۔

مدیر

پاکستان و ہندوستان کے نامی گرامی مطابع کے

اعلیٰ، دیدہ زیب ــــ معرّیٰ و مترجم

قرآنِ مجید

اور

مستند و معیاری، مذہبی، علمی، ادبی، درسی اور غیر درسی

کتابوں کا بہت بڑا مرکز

علوی بک ڈپو - محمد علی روڈ - بمبئی ۳

فہرست کتب مفت طلب فرمائیے



دورِ جدید کا بھاتر ین تحفہ

عطرِ مجموعہ

جو ہر موسم میں استعمال کیا جاتا ہے اس کی
خوشبو نہایت روح پرور اور دیرپا ہوتی ہے

تین ماشہ کا پیکنگ - دو روپے
چھ ماشہ کا پیکنگ - چار روپے
فی تولہ
آٹھ روپے

فہرست مفت طلب فرمائیے

حافظ محمد زکریا برادرس پرفیومرس، بمبئی ۳

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

آنچہ قدر ایشاں ما مردم می دانیم شما چہ دانید، احوال مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است و بلاد عرب را نیز دیدہ ایم، و سیر نمودہ، احوال مردم ولایت از ثقات آنجا شنیدہ ایم، و تحقیق کردہ کہ عزیزی کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہمچنیں استوار و مستقیم باشد، و در ارشاد طالبان شانی عظیم و نفس قوی دارد، دریں جزو زمان مثل ایشاں در بلاد مذکور یافتہ نمی شود مگر در گذشتگان، بلکہ در ہر جزو زمان وجود ایں چنیں عزیزان کمتر بودہ است، چہ جائے ایں زمان کہ پر فتنہ و فساد است[1]۔

ہم لوگوں کی نگاہ میں ان کی جو قدر و منزلت ہے، اس کو تم کیا جانو؟ ہندوستان کے لوگوں کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں، کہ ہمیں کی پیدائش ہے، اور یہیں عمر بسر ہوئی، ملک عرب کو خود دیکھا ہے، اور اس کی سیاحت کی ہے، افغانستان اور ایران کے لوگوں کے حالات وہاں کے معتبر لوگوں کی زبانی سنے، اس سب کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوا کہ کوئی ایسا بزرگ جو جادۂ شریعت اور طریقت پر، اور کتاب و سنت کی پیروی میں انکی طرح استوار و مستقیم ہو، اور طالبین کی رہنمائی میں اس کا پایہ اتنا بلند، اور اس کی توجہ اتنی قوی ہو، ہمارے اس دور میں ان ملکوں میں سے کسی ملک میں جن کا اوپر ہم نے

---

[1] کلمات طیبات ص ۱۶۴-۱۶۵

تذکرہ کیا، پایا نہیں جاتا، دور ماضی اور بزرگان
سلف میں جھانک ہو سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھئے
تو ہر زمانہ میں ایسے باکمال بزرگ زیادہ تعداد
میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ
میں جو فتنوں اور فساد سے پُر ہے۔

ان الفاظ میں حکیم الامت، امام وقت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نامور معاصر حضرت میرزا مظہر جان جاناں کے متعلق شہادت دی ہے، جس وقت یہ الفاظ کہے گئے ہوں گے، کتنے اہل علم اور واقفین حال کو استعجاب ہوا ہوگا، اور کتنے ابنائے زمانہ نے اس کو مبالغہ اور غلو پر محمول کیا ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ معاصرت بہت بڑا حجاب ہے اور جب ذوق اور طریق کار کا اختلاف بھی شامل ہو جائے، اور وضعی و رواجی طریقوں کے حجابات بھی درمیان میں حائل ہوں تو پھر حجاب نہیں بلکہ ایک سنگین دیوار بیچ میں آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس شخصیت کے متعلق کتنے ہی خلوص و صداقت اور کتنے ہی احتیاط اور احساس ذمہ داری سے کہا جائے، اس کو مبالغہ یا خوش عقیدگی پر محمول کیا جاتا ہے۔

راقم سطور کو اپنی بے بضاعتی اور کم فہمی کا پورا احساس ہے، لیکن یہ ایک تقدیری بات ہے کہ اس کو ممالک اسلامیہ کی سیاحت اور عالم اسلامی سے واقفیت کے ایسے ذرائع اور مواقع میسر آئے جو (بلا کسی تنقیص و تحقیر کے) اس کے ہم وطنوں اور ہم عمروں میں سے بہت کم اشخاص کو میسر آئے ہوں گے، دنیائے اسلام اور بالخصوص ممالک عربیہ کے دینی، علمی اور روحانی حلقوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور برتنے کا اتفاق ہوا۔ دور حاضر کی مشکل سے کوئی تحریک اور کوئی عظیم شخصیت ہوگی جس سے ملنے اور تعارف حاصل کرنے کی سعادت نہ حاصل ہوئی ہو۔ اس وسیع واقفیت کی بنا پر (جو کسی کا ذاتی کمال اور سرمایۂ فخر نہیں) یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ ایمان بالغیب کی دعوت، دعوت کے شغف اور انہماک اور تاثیر کی وسعت و قوت میں اس ناکارہ نے اس دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا کوئی ہمسر اور مقابل نہیں دیکھا، یوں ان کی نادرۂ روزگار شخصیت میں بہت سے ایسے

کمالات پائے جاتے تھے، جن میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، ان کی ایمانی قوت، ان کا اعتماد و توکل، ان کی ہمت و جرأت، ان کی نماز اور دعا، صحابۂ کرام کی زندگی سے ان کی گہری واقفیت اور ان کے حالات کا استحضار، اتباعِ سنت کا اہتمام، فہم قرآن اور واقعات انبیاء سے عظیم نتائج کا استخراج، دعوت و تصنیف کے متضاد مشاغل کو جمع کرنے کی قوت، اور آخر میں ان کی غیر معمولی محبوبیت اور مقبولیت، یہ سب ان کی زندگی کے وہ پہلو اور نمایاں صفات ہیں جن کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور جس کے لفظ لفظ کی تصدیق وہ سب لوگ کریں گے جن کو ان کی خدمت میں کچھ دن رہنے کی سعادت، یا کسی سفر میں رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہے اور ان کی تعداد ہزاروں کی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب اور ان کے ماسوا اور بہت سے پہلو اُن کی سوانح اور سیرت کا موضوع ہیں، اور ان میں سے بعض کمالات و امتیازات وہ ہیں جن میں ان کے سہیم و شریک مل سکتے ہیں، اور بعض تخصیصیں ان میں ان سے فائق بھی ہو سکتی ہیں، لیکن راقم نے ان کے جن امتیازات کا یہاں انتخاب کیا ہے اُن میں اپنے محدود واقفیت و علم میں) ان کا کوئی سہیم و شریک، اور ان کا کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔ والغیب عند اللہ۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے ہم نے غیبی حقائق، اللہ کے وعدوں اور انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی اطلاعات پر ایمان لانے اور ان کے اعتماد و یقین پر اپنی زندگی کی کشتی کو چھوڑ دینے کی ایسی داستانیں طاقتور اور بے لاگ دعوت کسی دوسری جگہ نہیں دیکھی، جس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی قدرت کن فیکون اس کے بلاشرکت غیرے پورے نظام عالم کو چلانے، اسباب کی بے حقیقتی، خواص اشیاء اور انسانی تجربات کی بے اعتباری، محسوسات و مشاہدات کی تحقیر و نفی، احکام الٰہی اور نظام تشریعی کے سامنے نظام تکوینی کی سپر اندازی و مغلوبیت، ایمانی صفات و اخلاق اور اطاعت و عبودیت کے سامنے وسائل و ذخائر کی بے حقیقتی، حاملینِ نبوت، اور اہل ایمان و دعوت کا ارباب اقتدار، اہل حکومت اور سرمایہ داروں کے مقابلہ میں فتح و غلبہ، خدا کے وعدوں کی ابدی صداقت اور سنۃ اللہ کی ہمہ گیری کا مضمون اپنی پوری ایمانی قوت اور اپنے والہانہ انداز بیان میں بیان فرماتے تو سننے والے اتنی دیر کے لیے اس حواس و مادہ پرستی کی دُنیا سے منتقل ہو کر ایمان بالغیب کی دُنیا میں پہونچ جاتے

اور اسباب و مسببات کا سلسلہ اور مقدمات و نتائج کا ربط و تعلق اتنا بے کار و بے حقیقت نظر آنے لگتا تھا کہ ہم جیسے مدرسی لوگوں کو بعض اوقات اس کی فکر پیدا ہو جاتی تھی کہ کہیں یہ دعوت سننے والوں میں ترک اسباب اور تجرد و رہبانیت کا رجحان نہ پیدا کر دے، لیکن اس دور ہدایت میں جہاں "اسباب" نے "ارباب" کی شکل اختیار کر لی ہے اور ایک عالم کا عالم اپنی قسمت کو مادی اسباب، اور اپنی ذاتی کوشش و قابلیت کے ساتھ وابستہ کر چکا ہے، اور کسی دینی دعوت و تحریک کو وہ قلندر صفت افراد نہیں مل رہے ہیں جن کا عشق "آتش نمرود" میں بے خطر کود کر عقل کو "محو تماشائے لب بام" کر دے، بلکہ اس تھوڑے سے ایثار و قربانی کی جنس بھی نایاب ہو گئی ہے، جس کے اندوختہ کے بغیر کسی تحریک کی گاڑی دو قدم بھی نہیں چل سکتی مادی ترقی اور مادی اقدار کی اہمیت و تقدیس کی مسلسل اور پرجوش تبلیغ و تلقین نے خود اس امت کو متاثر کر لیا ہے جس کی ساری طاقت، اور جس کی فتح کا راز ایمان بالغیب کی قوت رضائے الٰہی کی طلب اور جنت کے شوق میں مضمر تھا، مسلمان نے ذرائع معاش کو اپنا رزاق سمجھ لیا ہے، مادیت کی اس وبائے عام کے دور میں مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایمان بالغیب کی اس دعوت سے بعض اوقات سینکڑوں سامعین کے دل ایمان کے جذبہ سے معمور اور قربانی کی لذت سے مخمور ہو جاتے تھے اور وہ اس کے اثر سے ایثار و قربانی کے ایسے نمونے پیش کرنے لگتے تھے جن کو عقل و دلائل حکمت و مصلحت، اور علم و خطابت کی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جن کی بنیاد پر یہ تحریک دنیا کے دور دراز گوشوں میں پہونچ گئی، ہزاروں آدمیوں نے جن میں ہر طبقہ کے لوگ تھے مہینوں کے لیے گھر بار چھوڑ کر دوسرے براعظموں کا سفر کیا، اور دعوت و تبلیغ کے راستہ میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کیں، انھوں نے بڑی دریا دلی اور عالی ہمتی کے ساتھ اپنا وقت اور اپنا مال راہ خدا میں خرچ کیا، اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کی زندگی وفا کرتی، تو وہ ایمان بالغیب کی اس طاقت سے (جو اس دور میں مشکل سے کسی اور جماعت کو میسر آئی ہوگی) معاشرہ کی اصلاح و انقلاب اور دنیا کے حالات میں تبدیلی کا اور زیادہ وسیع و عمیق کام لیتے، اور افراد کی یہ قوت ایمانی اجتماعی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی، ان کی ان مجالس میں کبھی کبھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

کے مجالس وعظ کی جھلک نظر آنے لگتی تھی جن کی (غیر اللہ کی نفی سے لبریز) تقریروں نے ہزاروں دلوں اور دماغوں پر گہری چوٹ لگائی، جس وقت آدمی ان کے ان مواعظ کو جو فتوح الغیب اور دوسرے مجموعوں میں محفوظ ہیں پڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص پوری بے باکی اور قوت کے ساتھ گرج چلا رہا ہے اور اس کی ضرب سے مادیت کے ہزاروں بت پاش پاش ہو رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جیسے لوگ جن کا دماغ اسباب و مسببات کے باہمی تعلق سے کبھی آزاد نہیں ہونے پاتا، اور جو مادی سعی و جہد کو بھی دین و شریعت میں ایک مقام دیتے ہیں اور انسان کو اپنی سعی کا مکلف و ماموں سمجھتے ہیں، اور جو اس عالم اسباب میں مسلمانوں کی پست ہمتی اور بے عملی کو ان کے زوال کا ایک سبب قرار دیتے ہیں، وہ کبھی مولانا کے اس طرز کی کامیابی کے ساتھ نقل نہیں اتار سکے اور ان کے ذہن نے عین ان مجالس وعظ میں بھی اپنا کام کرنا نہیں چھوڑا لیکن ہم کو اس کا صاف اعتراف ہے کہ ان کی اس دعوت ایمانی نے وہ نتائج پیدا کیے جن سے ہماری "متوازن و معتدل" دعوتیں (جن کی عصر حاضر کے حقائق پر نظر ہے) قاصر رہیں، اور صاف اندازہ ہوا کہ

لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

ان کا دوسرا امتیاز اپنی دعوت کے ساتھ ان کا ایسا شغف و انہماک تھا جس کی مثال نہ صرف یہ کہ دینی دعوتوں اور تحریکوں کے میدان میں نظر نہیں آتی بلکہ جہاں تک اس کوتاہ نظر کی نظر (واقفیت) کا تعلق ہے کسی مادی و سیاسی تحریک کے داعیوں میں بھی وہ استغراق، خود فراموشی والہیت، اور جذب کی کیفیت نظر نہیں آئی، ان کا یہ پہلو اتنا نمایاں اور اتنا حیرت انگیز تھا کہ جب تک کسی شخص کو کچھ عرصہ ان کی خدمت میں رہنے اور کسی سفر میں ان کی معیت کا موقع نہ ملا ہو وہ بہتر سے بہتر تصویر کشی اور واقعہ نگاری کے بعد بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، چند دن رہ کر آدمی ان کی مشغولیت و انہماک اور ان کے جذب و استغراق کو دیکھ کر بہوت رہ جاتا تھا، اور اس کی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی قوت و تازگی کہاں سے آتی ہے، اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ عام حالات میں "عشق" اور خاص حالات میں تائید الٰہی اور نصرت غیبی

کے سوا اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی، معمولی بات یہ ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد سال کے بارہ مہینے اور مہینہ کے تیس دن تقریر فرماتے، یہ تقریر ڈھائی تین گھنٹے سے کم نہ ہوتی، اس میں موسم کی سختی، دھوپ کی گرمی، صحت کی خرابی، مجمع کی کمی و زیادتی قطعاً اثر انداز نہ ہوتی، یہ مجاہدہ رمضان مبارک میں بہت بڑھ جاتا، جبکہ فجر کے بعد لوگوں کے سونے کا عام معمول ہے، رمضان میں ان کی رات کا بڑا حصہ شب بیداری اور دعوت کے کام میں صرف ہوتا۔ اس کے باوجود وہ فجر کی نماز کے بعد پوری قوت، تازگی اور نشاط کے ساتھ تقریر فرماتے، اور اسی قوت کے ساتھ آخر میں دعوت دیتے، عام دنوں میں چائے کے دوران اور چائے کے بعد پھر گفتگو اور تقریر کا سلسلہ شروع ہو جاتا، عام طور پر وہ جاعتوں کو رخصت کرنے کا وقت ہوتا، وہاں تشریف لے جا کر پھر اسی طرح تقریر فرماتے اور ہدایات دیتے کہ معلوم ہوتا کہ ابھی تک خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی، اور وہ اب ٹوٹی ہے، پھر اسی جذبہ اور طاقت کے ساتھ دعا کرتے کہ معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے نہ اس کے بعد کریں گے، سب کچھ اسی دعا میں مانگ لینا ہے، اور سب کچھ اسی دعا میں کہہ دینا ہے، اس کے بعد بھی مختلف تقریبوں سے گفتگو اور خطاب کرنے کا سلسلہ جاری رہتا، پھر کچھ دیر تصنیف و تالیف کا کام کرتے، پھر کھانے کا وقت ہو جاتا، ظہر کے بعد پھر کوئی سبق پڑھاتے یا تصنیف و تالیف کا کام کرتے، ملنے جلنے اور ڈاک دیکھنے کا بھی سلسلہ جاری رہتا، کبھی بعد عصر اور بعد مغرب بھی کوئی تقریر ہو جاتی، اور اس میں بھی تازگی اور جوش کا وہی عالم ہوتا، عشاء کے بعد (جو اکثر بڑی تاخیر سے ہوتی) سیرت کی کوئی کتاب یا صحابۂ کرام کے حالات کا کوئی مجموعہ سنانے کا معمول تھا، کتنا ہی تھکے اور جگے ہوئے ہوں اور کیسی خستہ اور شکستہ حالت ہو، اس معمول میں حتی الامکان فرق نہ ہوتا، دیر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا، سننے والے کو محسوس ہوتا کہ اس شخص نے دن بھر آرام کیا ہے، ہم جیسے پست ہمتوں کے لیے نظام الدین کا دو روز کا قیام بھی سخت آزمائش اور مجاہدہ تھا، میرا خود حال یہ تھا کہ اکثر اپنے دل سے خطاب کر کے کہتا کہ بے ہمت! مولانا کے لیے ساری زندگی کا معاملہ ہے، تیرے لیے صرف دو دن کا معاملہ ہے، لیکن بہانہ جو اور سہولت پسند طبیعت اپنی صحت کی کمزوری اور مولانا کی عالی ظرفی کا سہارا لے کر کوئی گوشۂ عافیت تلاش کر لیتی، اس وقت اگر کوئی تلاش کرنے والا تلاش کرتا تو خود زبانِ حال سے اس کو اپنا پتہ نشان اس طرح دیتا کہ

لہ جہاں تک اس عاجز کو معلوم ہے رمضان مبارک کی راتوں میں مولانا بالکل نہیں سوتے تھے ۱۲ قمانی

ہو گا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

سفر میں تو یہ انہماک اور استغراق بہت بڑھ جاتا، پھر تقریروں کی تعداد، ان کی مقدار اور ان کے اوقات کی کوئی تحدید نہیں تھی، بعض دوستوں نے اندازہ لگایا ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے بولنے کی نوبت آتی اس میں بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا اسی وقت بولنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا اب اسی موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے، یہی ہر وقت کی دعا کی کیفیت ہوتی، مجھے حجاز کے آخری سفر میں حاضری کا موقع نہیں ملا لیکن میں نے بالتواتر سنا ہے کہ وہاں یہ جوش و خروش اور یہ جذبہ و انہماک اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ چکا تھا، مسجد نبوی میں صحن مسجد میں فجر کی نماز کے بعد تقریر شروع ہو جاتی اور دن چڑھ آتا، اور جن خوش قسمت آنکھوں نے تقریر کے آغاز میں گنبد خضرا پر چاندنی دیکھی ہوگی وہ دھوپ چڑھی ہوئی دیکھتے، مجھے یاد ہے، کہ بھوپال کے ایک اجتماع میں مولانا نے مغرب کے بعد پوری قوت اور اپنی تقریر کے عام پیمانہ کے مطابق بسیط تقریر کی، تقریر کے بعد تشکیل ہوئی پھر دعا ہوئی، مجھے اطمینان تھا کہ اب اس تقریر کے بعد آرام فرمائیں گے، کہ خدا جانے کہ کیا کی تقریب ہوا کسی اور تقریب سے پھر کچھ بولنا شروع کیا، طبیعت مطمئن تھی کہ چند منٹ میں اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوا کہ مولانا میں نئی تازگی اور جوش آگیا، پھر اس طرح تقریر فرمائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ دن بھر خاموش رہے ہیں اور طبیعت جوش پر ہے۔

یہی حال دعا کا تھا، مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور جوش و خروش، اس کی رقت انگیزی، اور اس کی تاثیر، مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آئی، جب دعا کرتے حاضرین کا عجیب حال ہوتا، خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا، دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں، اس کی مثال ماضی قریب میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور اُن کے ایک جانشین مولانا سید نصیر الدینؒ کے حالات میں نظر آئی۔ کہ بیان کرنے والوں نے

لہ یہ اندازہ صرف تقریروں کا ہے مجلسی گفتگوؤں کے اوقات اسکے علاوہ ہیں ۱۲۔ نعمانی

بیان کیا کہ دعا کے وقت رحمت الٰہی جوش میں آتی نظر آتی، لوگوں پر ایک وارفتگی اور بے خودی کی کیفیت ہوتی، اور بعض لوگ دیوانہ وار جنگل کو نکل جاتے، واقعہ یہ ہے کہ دعا کے وقت جو کیفیت لوگوں پر طاری ہوتی اور جو اثرات اُن کے دلوں پر ہوتے، اگر کچھ دیر بھی باقی رہ جاتے تو لوگ دنیا کے کام کے نہ رہتے، اور معلوم نہیں حالات میں کیا تبدیلی ہوتی، لیکن نظام عالم اسی طرح سے چل رہا ہے، اور ہم ضعیف البنیان ہر چیز کا اثر وقتی طور پر لیتے ہیں۔

ان کی تیسری امتیازی خصوصیت جس میں ان کی تنظیم طبعی مشکل ہے ان کی تقریروں اور صحبت کا وہ اثر ہے جو سامعین و حاضرین پر پڑتا، خاص طور پر ان سلیم طبیعتوں پر جن کا دل و دماغ دوسرے اثرات سے آزاد اور ان کی طبیعتوں میں تسلیم و انقیاد کا مادہ غالب ہوتا، ان کی کیمیا اثر صحبت اور ان کی انقلاب انگیز تقریروں نے اتنی زندگیوں میں تبدیلیاں پیدا کیں، اور اتنے دلوں اور دماغوں کو متاثر کیا جن کا شمار کرنا ممکن نہیں، ان صحبتوں اور تقریروں کے اثرات اتنے گہرے ہوتے کہ صورت سیرت زندگی معاشرت یہاں تک کہ چلنے اور بولنے کا طریقہ بھی بدل جاتا۔ سینکڑوں آدمی ہیں جو ان کی زبان بولنے لگے اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور جملے ان کو حفظ ہو گئے۔ کتنے اشخاص ہیں کہ جن کی دعاؤں میں ان کی دعاؤں کا رنگ آگیا، کتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امیرانہ زندگی رکھنے والے لوگ ہیں جن کی زندگی اور معاشرت سرتاپا مغربی اور رئیسانہ تھی اور وہ اب ایک درویش صفت مبلغ اور ایک فقیر منش، اور جفاکش مجاہد نظر آتے ہیں۔ اور جن کی گرانقدر تنخواہوں اور آمدنیوں کا بڑا حصہ تبلیغ و دعوت، رفقاء کی امداد و اعانت، اور جماعت کی نصرت پر خرچ ہوتا ہے، اور ان میں ان کے گھر والوں کا اور ان کا اپنا بھی حصہ ہے، ایک متوسط ملازم یا ایک اوسط درجہ کے تاجر کا ہے، کتنی بڑی تعداد ان رفقاء اور نیازمندوں کی ہے جن کی زندگی، جن کا ذوق عبادت، جن کا جذبہ خدمت اور جن کی خشیت و انابت، اور جن کی بے نفسی اور تواضع دیکھ کر اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے۔ حقیقی علم تو علام الغیوب کو ہے، لیکن ان کے خلوص و اخلاق کو دیکھ کر ان کی دینی ترقی اور بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، جو زندہ ہیں (خدا ان کی زندگی میں برکت دے) ان کے متعلق کچھ کہنا خلاف احتیاط ہے فان الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ[1] لیکن جانے والوں میں سے

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

متعدد اصحاب کے نام لیے جا سکتے ہیں، جو ہمارے دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہونچ گئے، اور ان کے حالات اتنے رفیع ہو گئے جن کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان میں سے میں یہاں صرف اپنے محبوب و عزیز دوست حاجی ارشد صاحب مرحوم کا ذکر کروں گا جن کا زمانے اعلیٰ عہدہ اور ذمہ داریوں کے ساتھ، اخلاص و للّٰہیت، تعلق مع اللہ، دعوت کے کاموں میں انہماک و استغراق، ایثار و قربانی کی کیفیت، تواضع و انکسار، خدمت کا جذبہ، اور پھر اسی راہ کی قابل رشک موت اور شہادت، برسوں دل کو تڑپاتی اور ان کی یاد تازہ کرتی رہے گی جاپان میں اشاعت اسلام کے کام کا افتتاح اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر فرمایا تھا، اہل حجاز ان کو عرصہ تک یاد رکھیں گے، دنیا کے دور دراز ملکوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو مولانا کی چند روزہ صحبت اور دو ایک تقریروں کے سننے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی بدل گئی اور ان کے اندر ایک خاص طرح کے ایمان و یقین کی کیفیت، دعوت کی سرگرمی، دعا کا سلیقہ، نمازوں میں کیفیت، اور ایثار کی عادت پیدا ہو گئی، ایسے لوگ ہندوستان اور پاکستان کے باہر امریکہ، یورپ اور افریقہ کے براعظموں میں بھی ملیں گے[۵]

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

مولانا کی دعوت اور شخصیت اپنے پورے شباب اور عروج پر تھی، ان کی ہمت کا طائر بلند پرواز کسی بلند سے بلند شاخ پر بھی آشیانہ بنانے کے لیے تیار نہ تھا، کوئی دور سے دور جگہ ان کو دور اور کوئی مشکل سے مشکل کام ان کو مشکل نہیں معلوم ہوتا تھا، انھوں نے اپنی تیز رفتاری، بلکہ برق رفتاری اور اپنی طبیعت کی بے چینی اور بیتابی سے برسوں کا کام مہینوں میں اور مہینوں کا کام ہفتوں میں اور دنوں میں کر لیا، اپنے والد بزرگوار کے بعد نئے ملکوں میں جماعتوں کے جانے کا افتتاح کیا اور ساری دنیا کو گھر کا آنگن بنا لیا، حج کا مسئلہ اٹھایا[۵] اور اس میں ایک نئی روح پھونک

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے الفاظ ہیں۔ فرمایا کہ دنیا سے چلے جانے والوں کی اقتدا کرو۔ اس لیے کہ جو زندہ ہے اس کے بارہ میں فتنہ سے اطمینان نہیں۔

۵۔ فریضۂ حج میں روح پیدا کرنے اور اس کو تبلیغ و دعوت کا ذریعہ بنانے کا مسئلہ۔

دی، اور دیکھتے دیکھتے حجاج کی تعداد، اور ان کی کیفیات میں عظیم فرق پیدا ہو گیا، اجتماعات، میوات کے محدود پیمانے سے نکل کر اتنے عظیم و وسیع بن گئے کہ بڑی بڑی سیاسی کانفرنسیں اور بڑے بڑے پبلک جلسے (مجمع کی کثرت میں بھی) ان کے سامنے ماند پڑ گئے، اور ان کی وہ کثرت ہوئی کہ مولانا کے لیے نظام الدین کا قیام مشکل ہو گیا، تبلیغی تقریروں میں غیر مسلموں سے خطاب، حالات حاضرہ پر تبصرہ، موجودہ مادی زندگی پر تنقید اور فساد کے سرچشمے کی نشاندہی کے باب کا افتتاح کیا، اور ان میں ایسی کشش پیدا کر دی کہ سینکڑوں کی تعداد میں غیر مسلم شریک ہونے لگے، اور متاثر ہوئے، یہ سب کام بڑی طویل عمر چاہتے تھے، لیکن مولانا نے پچاس برس سے کم عمر، اور اپنی ذمہ داری اور دعوت کے صرف بیس سال کے اندر انجام دیئے، اور یہ سب منزلیں طے کر کے اپنے خالق سے جا ملے۔

کام تھے عشق میں بہت، پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

امت پر جو قحط الرجال کا دور طاری ہے، اس میں اس کی کیا امید ہے کہ جلد ان کی سی شخصیت اور تاثیر کا کوئی داعی الی اللہ پیدا ہو گا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟

غفر اللہ لہ و رفع درجاتہ۔

انیسِ نسواں ـــــ فیصلہ کن مناظرہ

کتب خانۂ الفرقان کی یہ دو کتابیں جو عرصہ سے نایاب تھیں بحمد اللہ اسی مہینے میں دوبارہ طبع ہو گئی ہیں ـــــ قیمت انیس نسواں ۷۵/- مناظر ۱/۷۵

منیجر کتب خانۂ الفرقان (کچہری روڈ) لکھنؤ

حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

چند تجربے اور مشاہدے

محمد منظور نعمانی

(۱)

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی حیات میں :-

طلب و استفادہ کی نیت سے اور عقیدت مندی کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں اس عاجز کی پہلی حاضری ان کے وصال سے تقریباً ۱۴، ۱۵ مہینے پہلے ہوئی تھی اس کے بعد بعض تبلیغی سفروں میں حضرت کی رفاقت بھی نصیب ہوئی تھی اور نظام الدین آمد و رفت کی توفیق بھی ملتی رہی، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت کی شخصیت کی عظمت اور محبت بھی نصیب فرمائی، اور انکی دینی دعوت کے ساتھ دل کو کچھ تعلق بھی نصیب ہوا۔

چند ہی مہینے کے بعد آپ کی آخری علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس علالت کے آخری چار مہینوں میں یہ عاجز زیادہ تر حضرت کی خدمت میں نظام الدین ہی مقیم رہا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کے دیباچہ میں میں اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت کی خدمت میں میں نے قیام مخدومی و مرشدی حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے ایما و بلکہ ارشاد سے کیا تھا۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ابتدائی واقفیت اس قیام کے زمانہ میں ہوئی اس وقت مولانا موصوف کی زیادہ توجہ کتابی مطالعہ اور تصنیف و تالیف کی طرف تھی،

فن حدیث کی معرکۃ الآرا کتاب امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کی شرح لکھنے کا کام وہ شروع کر چکے تھے[1] ان کے اوقات کا بڑا حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا۔ اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی سراسر علمی اس دینی دعوت سے جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی روح کو تحلیل کر دیا تھا اس زمانہ میں زیادہ دلچسپی ان کو نہیں تھی، گویا ان دنوں ان کا ذوق وہ تھا جو ان کے دوسرے مربی اور استاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ، کا تھا اور ہے ——— دعوت و تبلیغ کے کام میں بھی وہ کچھ حصہ تو لیتے تھے لیکن یہ ان کے لئے دوسرے درجہ کا کام تھا۔ اصل شغف اور انہماک حدیث نبوی کی علمی اور تصنیفی خدمت سے تھا ——— بعد میں خود حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے اس عاجز سے بارہا اس واقعہ کا ذکر کیا کہ اس زمانہ میں تبلیغی کام اور اس سلسلہ کی بے پناہ نقل و حرکت کے بارہ میں ان کو ذہنی طور پر بھی پورا شرح صدر نہیں تھا، وہ جتنا کچھ ان دنوں اس سلسلہ میں کرتے اور حصہ لیتے تھے وہ اپنے والد ماجد اور شیخ و استاذ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے حکم کی تعمیل میں اور ان کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے ——— تقویٰ اور تعلق باللہ تو ان کو باپ دادا سے میراث میں ملا تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ انکی فطرت میں تھا۔ اس ناچیز کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ تبلیغی کام کے سلسلہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جو ہر طرح کے آدمیوں سے اکرام کے ساتھ ملتے تھے، جن میں بہت سے غیر متشرع بھی ہوتے تھے اور اسی طرح کے بعض معتقدین و محبین کی کار وغیرہ بھی استعمال فرما لیتے تھے، مولانا محمد یوسف صاحب کو اس سے انقباض ہوتا تھا اس زمانہ میں کبھی کبھی انھوں نے ادب کے ساتھ تنہائی میں حضرت سے عرض بھی کیا کہ آپ اس پر غور فرمائیں کہ یہ رویہ کہاں تک صحیح اور اکابر کے طریقہ کے مطابق ہے ——— بہرحال اس زمانہ میں مولانا موصوف کا طرز عمل اور طرز فکر یہ تھا، لیکن حضرت والد ماجد کی علالت کے بالکل آخری ایام میں ان کے حال میں کچھ تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی اور پھر تو اس ابتدا کی وہ انتہا ہوئی جس کو

---

[1] اسکی دو جلدیں چھپ بھی چکی ہیں اور اہل علم اس کے مطالعہ سے مولانا کے علمی مقام کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔

ایک دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

(۲)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد :-

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی علالت وصال سے دو تین مہینے پہلے سے اگرچہ بہت نازک شکل اختیار کر چکی تھی، لیکن حضرت کے بعض خاص حالات کی وجہ سے خدام کو انکی زندگی اور صحت کے بارہ میں اچھی اُمیدیں تھیں، مگر دو ہفتہ پہلے سے حالت اتنی نازک اور سقیم ہوگئی کہ بظاہر اسباب صحت کی اُمید کے لئے گنجائش نہیں رہی۔ یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا علی میاں بھی حضرت کے دوسرے بیسیوں خدام اور محبین کی طرح وہیں مقیم تھے۔ ہم لوگوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ حضرت کی دینی دعوت سے بھی اچھا خاصا تعلق ہوگیا تھا اس لئے قدرتی طور پر حضرت کی زندگی کے مسئلہ کے ساتھ ہم ان کے بعد انکی دعوت کے انجام کے بارہ میں بھی فکرمند تھے۔ ہمارا احساس یہ تھا کہ جتنے لوگ اس وقت اس دعوت کے کام سے جڑے ہوئے ہیں ان کا تعلق اور انکی نسبت دراصل حضرت کی شخصیت سے ہے۔ دعوت سے ان کا تعلق آپ کی اس ذاتی محبت کی وجہ سے ہے۔ اس لئے یہ امید نہیں ہے کہ حضرت کے بعد بھی یہ کام اسی طرح چلتا رہے اور جس طرح لوگ حضرت کے سامنے اس کام کے لئے قربانیاں دے رہے ہیں وہ آپ کے بعد بھی اسی طرح دیتے رہیں گے۔

ایک رات کو اس ناچیز اور رفیق محترم مولانا علی میاں نے اس بارہ میں دیر تک غور و فکر اور باہم مشورہ کیا۔ اور ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر حضرت کے بعد یہاں اس دعوتی کام کے مرکز نظام الدین میں کسی ایسی شخصیت کا قیام رہے جس کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور انکی دعوت سے تعلق و محبت رکھنے والے پورے حلقہ کو عقیدت و محبت ہو تو پھر انشاء اللہ یہ کام اسی طرح چلتا رہے گا، اور ایسی شخصیت اس وقت ہماری نظر میں صرف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کی تھی اور ممدوح کی بے انتہا عنایت و شفقت نے ہم لوگوں کو انتہائی محبت و عقیدت کے

باوجود کسی قدر بے تکلف بھی کر دیا تھا، اس لئے ہم نے یہ طے کیا کہ ہم اس بارہ میں حضرت موصوف سے صاف صاف بات کریں، اور اصرار کریں کہ وہ ابھی یہ فیصلہ فرمالیں اور ہمیں اس بارہ میں مطمئن کر دیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد اُن کے جانشین کی حیثیت سے وہ نظام الدین میں مستقل قیام فرمائیں گے۔ ہم نے طے کیا کہ آج صبح ہی حضرت ممدوح سے وقت لے کر ہم تنہائی میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔

صبح صادق ہوئی، فجر کی اذان ہوتے ہی میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ نماز کے بعد آپ سے ایک خاص معاملہ میں کچھ عرض کرنا ہے، اسکے لئے وقت مقرر فرما دیجئے، فرمایا کہ نماز کے بعد متصلاً قاری سید رضا حسن (مرحوم) کی درسگاہ میں بیٹھ جائیں گے۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت شیخ وہاں تشریف لے آئے اور یہ عاجز بھی حاضر ہو گیا، اور اس ناچیز نے مختصر تمہید کے بعد اپنی اور مولانا علی میاں کی طرف سے وہ بات عرض کی جو رات کے مشورہ میں ہم دونوں نے طے کی تھی، میں نے عرض کیا کہ حضرت مولانا کے مرض و ضعف کی رفتار دیکھتے ہوئے اب اُمید ٹوٹتی جاتی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ دل میں یہ فکر اُبھر رہی ہے کہ حضرت کے بعد اس دینی کام کا کیا ہوگا۔ ہم لوگوں کا اندازہ ہے اور غالباً جناب والا کو بھی اس سے اتفاق ہوگا کہ اس وقت جتنے عناصر کام میں لگے ہوئے ہیں ان سب کا اصل تعلق حضرت کی ذات سے ہے، اور اس ذاتی تعلق کی وجہ سے وہ اس کام میں جڑے ہوئے ہیں، اس کا کافی اندیشہ ہے کہ حضرت کے بعد آہستہ آہستہ یہ شیرازہ منتشر ہو جائے گا، اور یہ امت کا بہت بڑا خسارہ ہوگا، ہمارے نزدیک اس کا صرف ایک حل ہے اور وہ یہ کہ حضرت کے بعد جناب یہاں قیام کا فیصلہ فرمالیں اور یہ کام جناب کی رہنمائی اور سرپرستی میں ہو، ہمارا اندازہ ہے اور اپنے اس اندازہ پر ہمیں پورا اعتماد ہے کہ اگر ایسا ہوا تو یہ سب عناصر اسی طرح جڑے رہیں گے، کیونکہ ان سب کو جناب کے ساتھ

بھی الحمد للہ عقیدت و محبت کا خاص تعلق ہے ـــــ اسی کے ساتھ ہم نے یہ بھی عرض کیا کہ اور اگر ایسا نہ ہوا تو تھوڑے دنوں کے بعد یہ سارا مجمع منتشر ہو جائے گا اور ہم خود اپنے بارے میں بھی صفائی سے عرض کرتے ہیں کہ ہم بڑے سخت "وہابی" ہیں ہمارے لئے اس بات میں کوئی خاص کشش نہیں ہو گی کہ یہاں حضرت کی قبر مبارک ہے، یہ مسجد ہے جس میں حضرت نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ حجرہ ہے جس میں حضرت رہا کرتے تھے ـــ اور اگر جناب نے یہاں قیام فرمایا تو انشاء اللہ ہم سب کا تعلق اس کام سے اور اس جگہ سے ایسا ہی رہے گا جیسا آج ہے۔

حضرت شیخ الحدیث نے میری یہ بات پوری خاموشی سے سُنی، اور جب میں اپنی بات عرض کر چکا تو فرمایا:۔

مولوی صاحب! حضرت چچا جان کی حالت دیکھ کر جو فکر آپ کو ہو رہی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ وہ یہاں سب کو ہو رہی ہے، اور سب اس سوچ میں ہیں، لیکن یہ بات ایسی نہیں ہے کہ ہم اور آپ اس کا کوئی انتظام کر لیں اور وہ ہو جائے ـــ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے ان خاص بندوں کے ساتھ جو اس کے لئے مرتے مٹتے ہیں یہ ہے کہ وہ انکی چیز کو ضائع نہیں فرماتا، ان کے بعد بھی ان کے کام اور ان کے فیض کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اکثر و بیشتر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں کچھ لوگ ان کی محنت اور تربیت سے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں، اور ان سے امید ہوتی ہے کہ اس بندہ کے بعد انشاء اللہ اس کا سلسلہ اور فیض ان کے ذریعہ جاری رہے گا ـــــ مشائخ کے ہاں خلافت و اجازت کا سلسلہ دراصل اسی کی ایک علمی اور انتظامی شکل ہے خلافت اور اجازت کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کو شیخ کی نسبت کچھ حاصل ہو گئی ہے اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملانے کا جو کام شیخ سے لیا جا رہا ہے وہ انشاء اللہ ان سے بھی لیا جائے گا۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بندہ کی عمر بھر کی محنت اور تربیت سے ایک آدمی بھی ایسا بنتا ہوا نظر نہیں آتا جس سے توقع کی جاسکے کہ اس کے ذریعہ اس بندہ کا جلایا ہوا چراغ روشن رہے گا، لیکن اس بندہ کا وصال ہوتے ہی چانک اسکے لوگوں میں سے کسی ایک میں غیر معمولی تبدیلی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جانے والے کی نسبت دفعۃً اس کی طرف منتقل ہوگئی ـــــ ایسا بہت کم اور شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، لیکن جب ہوتا ہے تو نسبت کا یہ انتقال بہت غیر معمولی خارق عادت قسم کا ہوتا ہے ـــ حضرت چچا جان کے لوگوں میں میں کسی کے متعلق نہیں سمجھتا کہ وہ تیار ہو چکا ہے، وہ ان کے اس کام کو وہ جاری رکھ سکے گا، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے اسکی پوری امید ہے کہ وہ ان کے کام کو ضائع نہیں فرمائے گا، اسلئے مجھے توقع ہے کہ غالباً یہاں دوسری شکل واقع ہونے والی ہے، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو کسی کو یہ دولت مل جائے گی، پھر اسکو تم بھی دیکھ لوگے اور میں بھی دیکھ لوں گا، اور پھر انشاء اللہ یہ کام اسی سے لیا جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ میرے بارہ میں ہوا تو مجھ سے کسی کے کہنے کی ضرورت نہیں، پھر میں خود یہاں رہوں گا بلکہ اگر تم سب مل کر مجھے نکالنا چاہو گے جب بھی نہیں ہوں گا، اور اگر کسی اور کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا تو تم بھی اسکو دیکھ لوگے اور میں بھی دیکھ لوں گا، پھر اللہ تعالیٰ اسی سے یہ کام لے گا بس انتظار کرو اور اللہ سے دعا کرو ـــــ اور اگر دیکھو کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی تو مولوی صاحب! میں خود تم سے بڑا "وہابی" ہوں، میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ حضرت چچا جان کی قبر اور حضرت کے حجرہ کے در و دیوار کی وجہ سے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس عاجز کو اب دن تاریخ تو یاد نہیں، لیکن اتنی بات یقین کے ساتھ یاد ہے کہ حضرت شیخ الحدیث سے یہ گفتگو حضرت کے وصال سے ٹھیک بارہ دن پہلے ہوئی تھی اور یہ بھی یاد ہے کہ حضرت شیخ کا جواب سننے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اطمینان نصیب فرما دیا تھا اور فکر کا سارا بوجھ دل و دماغ سے اتر گیا تھا۔

بارہ دن بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا۔ وصال سے چند گھنٹے پہلے مخدومنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کے آنے اور توجہ دلانے پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چند خاص متوسلین پر اپنے اعتماد کا اظہار فرمایا اور ان کو اجازت دی اور حضرت رائے پوری نیز حضرت شیخ الحدیث کے مشورہ ہی پر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے لئے خلافت کا فیصلہ فرمایا جیسا کہ حضرتؒ کی تاریخ میں تفصیل سے اسکا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

حضرت کا وصال صبح صادق کے وقت ہوا اور فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی خلافت اور جانشینی کا باقاعدہ اعلان ہوا۔

میں بدقسمتی سے دو دن پہلے ایک خاص ضرورت سے اسوقت کے اپنے مستقر بریلی آگیا تھا اور وہیں اس وقت واپس پہونچا جب لوگ حضرت کے دفن سے فارغ ہوکر واپس ہو رہے تھے، خلافت و جانشینی کا واقعہ میں نے وہاں پہونچ کر سنا۔ چونکہ اس وقت اپنی ناقص نگاہ میں مولانا محمد یوسف صاحب میں کوئی خاص امتیاز سوائے صاحبزادگی کے نہیں تھا، اور اپنے علم و اندازہ کے مطابق تبلیغی کام سے تو اُن کو گہری دلچسپی بھی نہیں تھی بلکہ اس لحاظ سے قاری داؤد صاحب وغیرہ حضرت کے بعض پرانے خادم اور رفیق ان سے بہت آگے تھے، اس لئے مجھے اس واقعہ کو سُنکر کوئی خوشی نہیں ہوئی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے بارہ میں بھی دل میں طرح طرح کے وسوسے آئے، اور میں ان وساوس سے اتنا مغلوب ہوا کہ انکی تاریکی میں بارہ دن پہلے کی حضرت شیخ الحدیث والی عارفانہ بات بھی بالکل یاد نہیں آئی، دن کا باقی حصہ اور پوری رات اسی حالت میں گزری، اگلے دن صبح کو جب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے فجر کی نماز پڑھائی اور نماز کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معمول کے مطابق تقریر شروع فرمائی تو تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ یہ تو مولانا محمد یوسف صاحب کی زبان سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ بول رہے ہیں۔ اس وقت حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی وہ بات یاد آئی، اور اس تقریر کے ختم ہونے سے پہلے یہ یقین ہوگیا کہ حضرت شیخ نے جو کچھ فرمایا تھا یہ اس کا ظہور ہے، اور اللہ تعالیٰ نے وہ دولت مولانا محمد یوسف صاحب کی طرف منتقل فرمادی ہے ——— "وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَاءُ"

"انتقال نسبت" کا لفظ تو بھی تھا اور کتابوں میں بھی پڑھا تھا، لیکن اس کا

مشاہدہ اس دن پہلی دفعہ ہوا۔

(۳)

اس عاجز نے اور غالباً ہر دیکھنے والے نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں تین باتیں بہت غیر معمولی درجہ میں دیکھیں ـــــ ایک دین کا درد و فکر ـــــ دوسرے اللہ تعالیٰ پر اعتماد و یقین ـــــ تیسرے معارف و حقائق کا فیضان۔

دین کے درد و فکر کے لحاظ سے اُن کا حال بلا مبالغہ اس باپ کا سا تھا جس کا اکلوتا باکمال بیٹا جس سے اس کی بڑی امیدیں اور آرزوئیں وابستہ ہوں سخت بیمار اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو، اور اسکی زندگی اور صحت کی فکر نے تمام دوسری فکروں اور ذاتی مسئلوں کو بالکل دبا دیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اور اسکی مدد پر ان کو ایسا اعتماد و یقین تھا گویا قضا و قدر کے فیصلوں کو انھوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بارہ میں آخرت کے بارہ میں، دین کے بارہ میں جب باتیں فرماتے تو اہل علم اور اصحاب درس بھی محسوس کرتے تھے کہ ان کے قلب پر حکمت کا فیضان ہوتا ہے۔ اور "وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" کی تفسیر سامنے آجاتی۔

پھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہر دیکھنے والے نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ یہ تینوں باتیں دفعۃً حضرت مولانا محمد یوسف صاحب میں آگئیں، اور ان تینوں میدانوں میں وہ بہت تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری سے بڑھتے رہے ـــــ آگے درج ہونے والے بعض واقعات سے کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں تک پہونچایا۔

(۴)

آخر ۱۳۴۶ھ یا شروع ۱۳۴۷ھ کا واقعہ ہے، یہ عاجز ہفتہ عشرہ کے قیام کی نیت سے نظام الدین حاضر ہوا۔ اہلیہ بھی اس سفر میں میرے ساتھ تھیں۔ ان دنوں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی پہلی اہلیہ محترمہ حضرت شیخ الحدیث کی بڑی صاحبزادی اور مولوی محمد ہارون کی والدہ مرحومہ مرض دق میں مبتلا تھیں۔ ان کے علاج، دوا کے اہتمام کی ذمہ داری حضرت

حافظ فخر الدین صاحب[1] نے لے رکھی تھی (رحمۃ اللہ علیہ) وہ روزانہ شہر دہلی سے اسی ضرورت سے تشریف لاتے ـــــ میں نے ایک دن حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ان کا حال پوچھا اور مرض کی نوعیت کی تفصیل معلوم کرنی چاہی، ان کے جواب سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ زیادہ باخبر نہیں ہیں۔ مجھے تعجب سا ہوا لیکن میں نے کچھ کہا نہیں ـــــ چار پانچ دن کے قیام کے بعد میری اہلیہ نے مجھ سے کہا کہ مولانا کی بیوی اس درجہ کی مریض ہیں کہ مجھے ان کے بچنے کی بھی امید نہیں ہے اور میں چار پانچ دن سے دیکھ رہی ہوں کہ حضرت مولانا ان کا حال پوچھنے کے لئے بھی کسی وقت ان کے پاس نہیں آتے، وہ عورت ذات ہیں ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، ان کا بھی تو کچھ حق ہے۔ میں نے پوچھا کیا انھوں نے تم سے خود بھی اسکی شکایت کی ہے؟۔ انھوں نے کہا نہیں، انھوں نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا لیکن ان کے دل پر اس کا اثر ضرور ہوگا، آپ اسکے لئے مولانا سے ضرور کہیں۔ میں نے اگلے دن مولانا سے تنہائی میں گفتگو کی اور عرض کیا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کی اہلیہ ایسی مریض ہیں اور آپ کئی کئی دن مزاج پرسی کے لئے بھی ان کے پاس نہیں جاتے۔ رشتۂ زوجیت کے علاوہ وہ حضرت شیخ کی صاحبزادی بھی ہیں، ہماری سمجھ میں آپ کی یہ بات بالکل نہیں آئی، آپ کو روزانہ کچھ وقت ان کے پاس ضرور صرف کرنا چاہیئے۔

مولانا نے بڑی معصومیت سے فرمایا کہ "ہاں یہ بات تو بالکل صحیح ہے، اور میں نے خود اُن سے اس بارہ میں بات کی تھی، مگر انھوں نے میرے حال اور میری مصروفیت کو دیکھکر خود ہی مجھ سے یہ کہہ دیا ہے کہ آپ اپنے کاموں میں مشغول رہیں، میری فکر بالکل نہ کریں، دوا علاج ہو رہا ہے، اگر زندگی ہے تو اچھی ہو جاؤں گی اور اگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ جلدی اٹھانے

---

[1] حضرت حافظ فخر الدین صاحبؒ اس عہد کے ہمارے اکابر مشائخ میں سے تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے خلیفۂ مجاز یعنی حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے پیر بھائی تھے اور ان حضرات سے بڑا گہرا تعلق رکھتے تھے، علاوہ دوسرے معمولات کے روزانہ ایک قرآن مجید ختم کرنا ان کا مستقل معمول تھا ـــ ۱۲

کا ہے "ان شاء اللہ جنت میں اطمینان سے ملاقات ہوگی"۔ ــــ میں نے کہا مجھے تو یہ شبہ ہے کہ انھوں نے یہ بات آپ کی بے فکری اور بے پروائی دیکھ کر کہی ہوگی ۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ تحقیق کریں اگر ایسی بات ہوگی تو میں ان کے لئے وقت نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تم ان سے اس بارہ میں اس طرح کی جذباتی باتیں کرو کہ ان کے دل کی بات زبان پر آجائے ــــ چنانچہ میری اہلیہ نے مرحومہ سے بات کی انھوں نے مولانا کی طرف سے خود مراجعت کی اور کہا کہ وہ دن رات دین کی فکر اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں اپنا بھی ہوش نہیں ہے، میں نے ہی خود اُن سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری فکر نہ کریں، وہ اصلاح ہو ہی رہا ہے، اگر اللہ نے جنت میں جمع فرما دیا تو وہاں اطمینان سے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا ــــــــ چند مہینوں کے بعد اسی علالت میں خاص نماز کی حالت میں مرحومہ کا انتقال ہوگیا۔ اللھم اغفرلہا وارحمہا

(۵)

تبلیغی کام کے مرکز نظام الدین میں جس پیمانہ پر کھانے کا لنگر جاری رہتا ہے اور روزانہ سیکڑوں آدمی دونوں وقت جس طرح دسترخوان پر وہاں کھاتے ہیں وہ بلاشبہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں عجائب اور خوراق میں سے ہے، ہمیشہ سے وہاں کا دستور یہ ہے کہ جب پیسے پاس نہیں ہوتے تو سارا غذائی سامان قرض، ادھار آتا رہتا ہے، جب پیسے آتے ہیں ادا کر دیا جاتا ہے ــ بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے ــــــ تقریباً چودہ پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قرض کی رقم کچھ زیادہ دنوں تک ادا نہیں کی جاسکی، غلہ وغیرہ جس دکاندار کے یہاں سے آتا تھا اس نے ان صاحب سے تقاضا کیا جو سامان لینے جایا کرتے تھے اور باورچی خانہ کا انتظام جن کے سپرد تھا، اور آگے کے لئے مزید سامان قرض دینے سے معذرت کر دی۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے اس سلسلہ میں کوئی تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور ہمیشہ پیش آسکنے والی اس مشکل کو مستقل طور سے حل کرنے کے لئے یہ تجویز سوچی کہ وہ چار اپنے مخلص صاحب استطاعت حباب راز دارانہ طریقہ پر ایک مناسب رقم امانت کے طور پر آپس میں جمع کریں تاکہ جب ایسی ضرورت پیش آئے تو اس میں سے

لنگر خانہ کے سلسلہ کا قرضہ ادا کر دیا جایا کرے اور جب رقم اپنے پاس آئے تو وہ امانت فنڈ میں واپس کر دی جایا کرے۔ اور چونکہ یہ اندازہ تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب اس کو کبھی پسند نہیں فرمائیں گے اس لئے پوری رازداری کے ساتھ انھوں نے بالا بالا اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ دہلی کے پانچ باتوفیق دوستوں نے پانچ پانچ ہزار روپیہ دیکر پچیس ہزار کی رقم اپنے ہی میں سے ایک کے پاس جمع کر دی اور آپس میں عہد معاہدہ ہو گیا کہ حضرت مولانا سے کوئی اس کا ذکر نہ کرے بلکہ بات بالکل راز میں رہے اور ہم چھ آدمیوں کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔

معلوم نہیں کس طرح دوسرے یا تیسرے ہی دن مولانا کو اسکی اطلاع ہو گئی۔ انھوں مطبخ کے ان منتظم صاحب اور اپنے ان پانچوں مخلصوں کو جنھوں نے وہ رقم جمع کی تھی بلوایا اور تنہائی میں بٹھا کر پوچھا کہ مجھے اس طرح کی اطلاع ملی ہے سچ سچ بتائیے کیا آپ لوگوں نے ایسا کیا ہے؟ ان بیچاروں کو اقرار کرنا پڑا۔ اس کے بعد مولانا نے ان کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں فرمایا کہ آپ لوگوں نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا ہے لیکن ہمارے ساتھ یہ ایک طرح کا ظلم ہے۔ جب اس طرح کے انتظام آپ لوگ کریں گے تو پھر ہم اللہ کی مدد کے قابل نہیں رہیں گے۔ اللہ کی مدد کے قابل ہم اسی وقت تک ہیں جب تک دنیا میں ہمارا کوئی سہارا نہ ہو اور ہماری نظر بس اسکے خزانہ اور اسکی مدد پر ہو اور ہم مضطر ہوں ——— اس کے بعد مولانا نے حکم دیا کہ ہر ایک اپنی اپنی رقم واپس لے لے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ——— یہ واقعہ اسی زمانہ میں مجھ سے حسن صاحب نے بیان کیا وہ خود اسکے شرکا میں سے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ اس دن کی تقریر میں حضرت مولانا خود بھی روئے اور ہم سب کو بھی خوب رُلایا۔ اور ہم سب نے توبہ کی اور معافی مانگی۔

(۶)

اب سے ۷۰ سال پہلے مولانا کی اہم تصنیف "حیاۃ الصحابہ" جب مکمل ہوئی اور اسکی طباعت کے بارہ میں طے ہوا کہ "دائرۃ المعارف حیدرآباد" میں چھپوائی جائے۔

توحیدرآباد کے مخلص دوستوں نے طباعت کے اہتمام وانصرام کی ذمہ داری لے لی، اور بالا بالا اپنے طور پر یہ بھی کوشش کی کہ اسکے مصارف کا انتظام بھی وہ خود ہی کرلیں، اس مقصد کے لئے انھوں نے بمبئی وغیرہ کے حضرت مولانا کے بعض مخلصین اور معتقدین سے بات بھی کی۔ اور اس رقم کا بڑا حصہ (غالباً ۸۔ ۱۰ ہزار کے قریب) فراہم بھی کرلیا ـــــ حضرت مولانا کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپنے وہ ساری رقم واپس کرادی، اور کاغذ وطباعت وغیرہ کے لئے جتنی رقم درکار تھی وہ خود ہی بھیجی۔

(۷)

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے غالباً چند ہی مہینے بعد مراد آباد میں پہلا بڑا تبلیغی اجتماع ہوا۔ اس وقت تک تبلیغی کام کے سلسلہ میں بڑے اجتماعات اور جلسے میوات میں تو ہوتے تھے لیکن میوات سے باہر بڑے اجتماعات کا رواج ابھی نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک اس ناچیز کو یاد ہے مراد آباد کا یہ اجتماع اپنی قسم کا پہلا بڑا اجتماع تھا۔ باہر کے قریباً سات سو آدمیوں نے اس میں شرکت کی تھی۔ تبلیغ کے لئے اوقات دینے کا رواج بھی اس وقت تک میوات سے باہر بہت ہی کم ہوا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے تقریر شروع فرمائی اور حسب عادت تقریر میں گویا کلیجہ نکال کے رکھدیا۔ اسکے بعد اوقات کا مطالبہ شروع ہوا، بہت ہی کم نام آئے۔ حد یہ ہے کہ بجنور، چاندپور اور رامپور جیسے بالکل قریبی مقامات کے لئے دس دس آدمیوں کی جماعتیں بھی نہیں بن سکی تھیں۔ ہم کئی آدمی لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے۔ اور اپنا پورا زور لگا رہے تھے۔ لیکن نامیں اضافہ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب جو تقریر فرمانے کے بعد مسجد کی اندرونی محراب میں تشریف فرما تھے، لوگوں کی یہ سرد مہری دیکھ کر ان کو جلال آگیا۔ ایکدم اٹھکر تشریف لائے اور میکروفون میرے ہاتھ سے لے کر فرمانا شروع کیا آج تم بجنور، چاندپور اور رامپور جیسے قریبی مقامات کے لئے اور صرف تین تین دن کا وقت دینے کے لئے تیار

تیار نہیں ہو رہے ہو، ایک وقت آئے گا جب تم شام جاؤ گے، مصر جاؤ گے، عراق جاؤ گے لیکن اس وقت اس کام کا عام رواج ہو چکا ہوگا اس لئے اجر گھٹ جائے گا۔ مولانا کی اس پُرجلال دعوت پر چند نئے نام اور آگئے۔ لیکن میرا خام اور ظواہر کا اسیر ذہن چونکہ ماحول سے اثر لینے کا عادی ہے، اس لئے مولانا کی شام و عراق اور مصر جانے والی بات کا مجھ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا، میں محسوس کر رہا تھا کہ جب لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ چاندپور اور رامپور کے لئے تیار نہیں ہو رہے ہیں تو اس حالت میں شام و عراق اور مصر جانے والی بات بہت بے موقع ہے۔ مگر اللہ کی شان تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا کی وہ بات واقعہ بن کر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اور ان ممالک عربیہ میں غالباً پہلی جماعت مراد آباد ہی سے گئی۔

۸

اس عاجز نے پڑھنے کے زمانہ میں خدا کے فضل سے محنت سے پڑھا اور پڑھانے کے زمانہ میں محنت سے پڑھایا۔ ذہن اور حافظہ کی نعمت سے بھی اللہ تعالیٰ نے محروم نہیں رکھا تھا، لکھنا پڑھنا اور مطالعہ ہی اصل مشغلہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے اتنا ذ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کبھی کسی کے علم سے مرعوب و متاثر نہ ہو سکا۔ لیکن حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جب حاضری نصیب ہوئی تو محسوس ہوا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک علم عطا ہوا ہے (جو مدرسہ اور کتب خانہ کا علم نہیں ہے) اس لئے حسب توفیق ان کے بہت سے ارشادات اپنے لئے قلمبند بھی کئے۔ بعد میں ان کا ایک حصہ کتابی شکل میں بھی مرتب کیا (جو شائع ہو چکا ہے) ــــ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی تقریروں میں بھی صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہی علم ان کو بھی عطا ہوا ہے، اور قوت بیان مزید برآں ہے۔ اس لئے ان کی تقریر لکھنے کو بھی جی چاہتا تھا، مگر دیکھتا تھا کہ اللہ کی توفیق سے بہت سے حضرات انکی تقریریں لفظ بہ لفظ قلمبند کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اس لئے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ پھر بھی اپنے لئے انکے خاص خاص معارف اشاروں میں نوٹ کیا کرتا تھا۔ اس عاجز کو پوری بصیرت کے ساتھ یقین

ہے کہ یہی وہ علم ہے جس کے بارہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ " وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا "

ان کی تقریر کے پھیلاؤ میں بعض وقت ایسی باتیں بھی آجاتی تھیں جو ہمارے زمانہ کے بعض طبقوں کے ایمان کے لئے آزمائش بن سکتی تھی۔ یہ اسی قسم کی چیزیں ہوتی تھیں جن کے بارہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے زمانہ کے بعض علماء کو تنبیہ فرمائی تھی کہ " أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللهُ وَرَسُولُهُ " لیکن مولانا کی اندرونی ایمانی قوت اور بنیادی دعوت کی طاقت اس طبقہ کو بھی تھام لیتی تھی ——— لیکن ہر ایک کے پاس تو یہ اکسیر اور تریاق نہیں ہے۔

۹

جن خوش نصیبوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں اور ان کو اس دولت سے کچھ مناسبت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اہل ایمان کو ملتی ہے ان سب کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ مولانا کی تقریر سے ایمان میں جان پڑتی تھی اور کھلی ترقی محسوس ہوتی تھی اور قرآن مجید کی جن آیتوں میں ایمان کی زیادتی اور اضافہ کا ذکر کیا گیا ہے ان کی صحیح تفسیر سمجھ میں آتی تھی ———

——— زمانہ اور ماحول کے فرق کے ساتھ ان کی تقریروں کو بے ساختہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے مواعظ سے بڑی قریبی مشابہت تھی۔

۱۰

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے اللہ کے لئے اور اس کے دین کے لئے اپنے کو کلی طور پر وقف کر دیا تھا۔ اپنی ساری توانائیاں اور اپنی ہر چیز اسکی راہ میں اس طرح لگا دی تھی کہ اس میں سے کچھ بھی اپنی ذات کے لئے بچا کے نہیں رکھا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے ہزاروں بلکہ لاکھوں بندوں کو ان کے لئے مسخر کر دیا۔ اس کے کہنے میں انشاء اللہ کچھ بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کی دنیا کے کسی بڑے سے بڑے سرمایہ دار، بڑے سے بڑے مقبول اور با اثر لیڈر یا ڈکٹیٹر، کسی جمہوریہ کے محبوب صدر یا وزیر اعظم کی حکومت اتنے دلوں پر نہ

ہوگی۔ جتنے دلوں پر مولانا مرحوم کی حکومت تھی۔ انھوں نے کوئی پارٹی نہیں بنائی۔ اپنے کام یا پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے کوئی اخبار یا رسالہ جاری نہیں کیا (بلکہ دوسروں سے چاہتے اور امکان بھر اسکی کوشش کرتے تھے کہ دوسرے اخبارات ان کا اور ان کے کام کا کوئی ذکر نہ کریں۔ وہ اپنے مقصد کے لئے اسی کو مفید سمجھتے تھے) انھوں نے کبھی کوئی فنڈ جمع نہیں کیا۔ بس خود قربانی دی اور اللہ کے بندوں کو قربانی کے لئے پکارا، اللہ تعالیٰ نے پہلے ہزاروں پھر لاکھوں بندوں کو اُن کے گرد جمع کر دیا اور اسلام کی اس غربت کے دور میں چشم فلک نے یہ تماشا دیکھا کہ چٹائی پر بیٹھنے والے ایک درویش عالم دین اور اللہ کے داعی کی ترغیب دعوت اور محنت کے نتیجہ میں اللہ کے ہزاروں لاکھوں بندے یورپ۔ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور جزیروں میں شہروں اور قصبوں میں اور دیہاتی آبادیوں میں ہر وقت پھر رہے ہیں۔ ان میں اُردو بولنے والے بھی ہیں اور عربی بولنے والے بھی، فارسی بولنے والے بھی ہیں اور ترکی بولنے والے بھی، بنگالی بولنے والے بھی ہیں اور پنجابی یا پشتو بولنے والے بھی، انگریزی بولنے والے بھی اور فرانسیسی اور جرمنی بولنے والے بھی۔

ـــــــ ان فی ذالک لعبرۃ لاولی الابصار

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اور ان سے بھی پہلے خادمان دین اور داعیان حق کی طرح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بھی اٹھائے گئے۔ لیکن جو اللہ سب کچھ کرنے والا ہے وہ حی قیوم ہے، اور ازل سے اس کا ایک ہی قانون و دستور ہے۔ اگر اسی خلوص وللہیت کے ساتھ اور انہی اوصاف اور اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے قربانیاں دی جاتی رہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہی تعلق رہا جس کا نمونہ ہمارے اس زمانہ میں ان دونوں باپ بیٹوں نے پیش کیا تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی ہوتا رہے گا جو اب تک ہوتا رہا ہے۔

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً۔

تاریخ و سوانح پر عمدہ کتابیں

مخدوم جہانیاں جہاں گشت :-
محمد ایوب قادری 7-00

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات :-
اعجاز الحق قدوسی 10-00

سید عطاء اللہ شاہ بخاری :-
شورش کاشمیری 3-00

حیات امام ابن حزمؒ :- پروفیسر ابوزہرہ (مصر)
ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری 16-00

حیات وحید الزماں :-
مولانا محمد عبدالحلیم چشتی 4-00

تجلیات عثمانی :- (علامہ شبیر احمد عثمانی)
پروفیسر محمد انوار الحسن (انور) 10-50

حیات امداد (شرح حاجی امداد اللہ صاحبؒ)
پروفیسر محمد انوار الحسن انور شیر کوٹی 4-00

شمائم امدادیہ (از حضرت تھانویؒ) قیمت -/-/2

تذکرہ علمائے ہند :- تالیف مولانا رحمن علی صاحب
ترجمہ محمد ایوب قادری 15-00

حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی :-
سید علی احمد عباسی 10-00

حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی :-
از علامہ مناظر احسن گیلانی 12-00

حیات حضرت امام ابوحنیفہؒ :- تالیف
محمد ابوزہرہ (مصر) ترجمہ غلام احمد حریری 15-

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ :- تالیف
محمد ابوزہرہ (مصر) ترجمہ سید رئیس احمد جعفری 21-00

امام مالکؒ :- تالیف محمد ابوزہرہ (مصر)
ترجمہ عبیداللہ قدسی 10-00

الغزالی :-
از علامہ شبلی نعمانی 5-25

الفاروق :-
از علامہ شبلی نعمانی 6-00

بزم تیموریہ :-
سید صباح الدین عبدالرحمن 7-00

بزم مملوکیہ :-
سید صباح الدین عبدالرحمن 5-50

محل دور حکومت :-
از خانی خان نظام الملک (کامل) 39-50

عبرت دنیا :-
نجف عزالدین ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین 12-00

تاریخ غرناطہ (کامل) لسان الدین ابن الخطیب
ترجمہ سید احمد اللہ ندوی 21-75

تاریخ فاطمیین مصر (کامل) :-
ڈاکٹر زاہد علی بی اے ڈی فل (آکسن) 17-50

اقبال نامہ جہانگیری :-
از مرزا محمد عرف معتمد خاں 6-75

مختصر تاریخ ہند :-
مولانا سید ابوظفر ندوی 3-00

مولانا محمد علی (بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے)
محمد سرور صاحب 8-00

سفینۃ الاولیاء :- از شہزادہ دارا شکوہ 6-75

کان مملوکی فاضحی مالکی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ کے

دو گرامی نامے

(۱)

ہفتہ وار رسالہ "خدام الدین لاہور" نے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ان کے تذکرہ پر مشتمل ایک مستقل نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی سے بھی مضمون کی درخواست کی اور چند متعین باتیں بھی دریافت کیں ــ حضرت ممدوح نے حسب معمول مضمون لکھنے سے تو معذرت کر دی لیکن سوالات کے جواب لکھا دیے ـــــ سہارنپور کی حاضری کے موقع پر اس گرامی نامہ کی نقل حضرت کے بعض خدام سے حاصل ہو گئی تھی ــــ اس میں مولانا مرحوم کے حال اور مقام کے بارہ میں جو چند سطریں ہیں در حقیقت وہ بجائے خود ایک دفتر ہیں ـــــ رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے مقالہ میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اور اس عاجز نے سابقہ اوراق میں اپنے جن تجربوں اور مشاہدوں کا ذکر کیا ہے ان کے پڑھنے کے بعد حضرت شیخ مدظلہ کے اشارات کو سمجھنا انشاء اللہ آسان ہو گا ـــــــــــــ محمد منظور نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عنایت فرمائم سلمہٗ ـ بعد سلام مسنون ... ...

اس ناکارہ کو اس قسم کے مضامین لکھنے کی بالکل عادت نہیں، اور نہ اس قسم کے

مضامین سے مناسبت ہو حضرت اقدس مدنی اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہما کے وصال پر بہت سے احباب کے اصرار ہوئے اسی طرح دوسرے اکابر کے انتقال پر احباب کے اصرار ہوتے رہے مگر یہ ناکارہ انکار کرتا رہا۔ اس ناکارہ کے حوالے سے ان اکابر کی سوانحوں میں جہاں کہیں مضامین چھپے ہیں اس کی صورت یہ رہی کہ تالیف کرنے والے احباب آکر ان کے احوال دریافت کرتے رہے۔ اور یہ ناکارہ اپنی معلومات سے جواب عرض کرتا رہا۔ عزیز مولانا محمد یوسف مرحوم کی ولادت ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ ۲ مارچ ۱۹۱۷ء شنبہ کو ہوئی تھی۔ ۲ جمادی الثانی دوشنبہ کو عقیقہ ہوا تھا اس کے بعد اس کے سوا کیا لکھوں۔

کان ھذا من اعاجیب الزمن ان ھذا

ابتدا میں وہ میرا چچیرا بھائی تھا، شاگرد تھا، زیر تربیت تھا۔ وہ میری نالائقی سخت مزاجی کی وجہ سے اپنے اللہ صاحب یعنی میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی بہ نسبت اس ناکارہ سے بہت زیادہ ڈرتا تھا چچا جان کے احکام کو وہ پدرانہ ناز کی وجہ سے اور اپنے بچپن کی وجہ سے کبھی ٹال دیتا تھا لیکن اس ناکارہ کی سخت مزاجی کی وجہ سے میرے کہنے کو نہیں ٹالتا تھا چچا جان کو بسا اوقات یہ فرمانا پڑتا کہ یوسف سے خلاں کام لینا ہے تمہارے کہنے سے جلدی کر دے گا۔ دہلی کے حضرات کا چچا جان پر بہت اصرار ہوتا کہ صاحبزادے سلمہٗ کو شادی میں ضرور ساتھ لاویں۔ مگر مرحوم اپنے طلب علم میں اس قدر منہمک تھا کہ اس کو یہ حرج بہت ناگوار ہوتا بسا اوقات اس کی نوبت آئی کہ ان اوقات میں اگر اس ناکارہ کا دہلی جانا ہوا تو عزیز مرحوم مجھ سے جاتے ہی وعدہ لے لیتا کہ بھائی جی فلاں جگہ جانے کو آپ نہ کہیں۔ اور جب چچا جان مجھ سے یہ ارشاد فرماتے کہ یوسف کو بھی ساتھ لے لو۔ تو میں یہی معذرت کرتا کہ اس نے آتے ہی مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ میں نہ کہوں۔ یہ تو ابتدا تھی۔ اس کے بعد مرحوم نے ہوائی جہاز سے وہ پرواز کی کہ وہ آسمان پر پہونچ گیا اور یہ ناکارہ زمین ہی پر پڑا رہا۔ اس کی بلندی کو دیکھتا رہا چچا جان کے وصال کے بعد بھی ایک پرواز اس نے کی جس کے متعلق اس ناکارہ کا اور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا یہ خیال ہوا کہ چچا جان نور اللہ مرقدہ کی نسبت خاصہ منتقل ہوئی ہے اور ہر بات میں اس کا خوب مشاہدہ ہوتا۔ اس کے بعد اس کی ترقیات

کو دیکھتا رہا۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد سے مرحوم میں ایک جوش کی کیفیت پیدا ہوئی اور کسی بڑے سے بڑے ذی وجاہت شخص کے سامنے بھی اپنی بات کو نہایت جرأت اور بے خوفی سے کہنے کا ظہور ہوا اور وہ بڑھتا ہی رہا۔ اسکے بعد حضرت اقدس نے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد انکی گفتگو اور تقاریر میں انوار اور تجلیات کا ظہور پیدا ہوا۔ کیا عجیب ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی خصوصی توجہات اور مرحوم کے ساتھ شفقت اور محبت کا یہ ثمرہ ہوا نہیں چیزوں کا یہ اثر ہوا جو اس ناکارہ نے شروع میں شعر میں ظاہر کیا کہ پھر یہ ناکارہ اس سے محروم ہونے لگا کہ اس کے اصرار پر مجھے حج کی تکلیف دشوار ہو گئی اس کا اثر تھا کہ گزشتہ سال اپنی انتہائی معذوری اور مجبوریوں امراض کی شدت کے باوجود جب مرحوم نے اس پر اصرار کیا کہ تمہیں حج کو میرے ساتھ ضرور چلنا ہے تو میری انکار کی ہمت نہ پڑی اور جب میں نے اپنے امراض کا اظہار کیا اور کہا کہ میرے اعذار کو نہیں دیکھتے ہو تو مرحوم نے کہا کہ خوب دیکھ رہا ہوں مگر میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ضرور چلیں۔ اخیر میں اللہ جل شانہ نے اپنے لطف و کرم کی وہ بارش فرمائی کہ مجھ جیسے بے بصیرت کو بہت سی چیزیں کھلی محسوس ہوتی تھیں۔ اس قسم کی باتیں نہ کہنے میں آتی ہیں اور نہ لکھنے کو دل چاہتا ہے صرف ایک عورت کے خواب پر اس عریضے کو ختم کرتا ہوں۔ خواب تو مرحوم کے حادثہ کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب دیکھے اور لکھے لیکن یہ خواب چونکہ اس ناکارہ کے نزدیک لفظ بلفظ واقعہ ہے۔ اس لیے لکھوا رہا ہوں۔ اس حادثہ پر اپنے تعلقات کے موافق نیز اپنے قلبی ضعف و تحمل کے موافق اثرات تو بہت ہی عام ہوئے لیکن ایک عورت کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ کسی وقت بھی چین نہ لیتی تھی۔ ہر وقت روتی تھی بار بار وضو کرتی تھی اور تسبیح لے کر بیٹھ جاتی۔ وہ اسی حالت میں ایک دفعہ وضو کر کے تسبیح لے کر بیٹھی تھی کہ اس کو غنودگی ہو گئی سنے عزیز مرحوم کو دیکھا وہ فرما رہے ہیں کہ کیوں پاگل ہو گئی؟ مرنا تو سب ہی کو ہے تعلق مالک سے پیدا کیا کریں بندے سے نہیں۔ اس پر اس نے والہانہ انداز سے یوں کہا حضرت جی آخر یہ ایک دم ہی ہو گیا کیا؟ مرحوم نے کہا کہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ دنوں سے جب میں تقریر کیا کرتا تھا تو مجھ پر تجلیات الٰہیہ کا خاص ظہور ہوتا تھا۔ اس مرتبہ جب میں رات کو تقریر کر رہا تھا تو ان کا اتنا زیادہ ظہور ہوا کہ میرا قلب ان کا تحمل نہ کر سکا اور دورہ

پڑ گیا اس کے بعد ایک بہت بڑا گلاب کا پھول سنگھایا گیا اسکے ساتھ میری رخ کل گئی بس اتنی ہی سی بات ہوئی فقط۔

عزیز مرحوم کی پہلی شادی میری سب سے بڑی لڑکی سے ۳ محرم ۵۴ھ کو بظاہر علوم کے سالانہ جلسے میں ہوئی تھی حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ نے نکاح پڑھا تھا چونکہ پہلے سے کوئی تجویز نہ تھی عین وقت پر چچا جان نے فرمایا کہ نکاح پڑھانے کا ارادہ ہے اس لیے اس وقت رخصت نہ ہوئی تقریباً ایک سال بعد چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی ایک آمد پر اسی طرح فوری طور پر بغیر سابقہ تجویز کے رخصت ہو گئی ۲۳، ۲۴ رمضان ۵۸ھ دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب میں۔ ۱ بجکر ۴۰ منٹ پر عزیز ہارون سلمہٗ کی ولادت ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل و کرم سے اس کو اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ فقط والسلام۔

زکریا

محرم الحرام ۱۳۸۵ھ تعلم محمد عاقل غفرلہٗ

(۲)

مندرجہ بالا گرامی نامہ میں مولانا مرحوم کی پہلی اہلیہ مولوی محمد ہارون کی والدہ مرحومہ کا انتقال اور عبد الحی کی دوسری بہن کے ساتھ مولانا مرحوم کے دوسرے عقد کا تذکرہ نہیں تھا، ناچیز (محمد منظور نعمانی) نے ایک عریضہ لکھ کر دونوں کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت شیخ مدظلہ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

بعد سلام مسنون .....

عزیز یوسف کی پہلی اہلیہ یعنی والدہ ہارون تقریباً ایک سال تک تپ دق میں مبتلا رہ کر ۵۴ھ کے ہنگامہ میں نظام الدین ۲۹ شوال ۵۴ھ شب دوشنبہ کی مغرب کی نماز کے سجدہ میں جبکہ وہ اشارہ سے نماز پڑھ رہی تھی اور سجدہ کے لیے اشارہ سے سر جھکا رکھا تھا دفعۃً انتقال کر گئی ــــ اس کے انتقال کے بعد میں نے عزیز مرحوم کو حکماً منع کر دیا تھا کہ تم دوسرا نکاح نہ کرو کیونکہ اس لیے کہ تمہارے شمائل کا، جو تمہیں حقوق کی ادائیگی کی اجازت نہیں دیتا ہے اس وقت تو اس نے بڑی خوشی سے قبول کیا مگر چند سال بعد اس نے ضرورت کا اظہار کیا تو میں نے کہا بڑے شوق سے جہاں تمہاری رائے ہو وہاں تحریک کروں مرحوم نے کہا اگر کروں گا

تو آپ کے ہاں کر دیں گے اور گنگا کہیں اور گئے کا ارادہ نہیں ہے اس پر اس ناکارہ نے بڑے شوق سے قبول کیا اور نکاح ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ بروز چہارشنبہ بعد نماز عصر مدرسہ کی مسجد میں اس ناکارہ کی دوسری لڑکی سے ہوا جو بیوہ تھی اور اس کا پہلا نکاح مولوی لطیف الرحمٰن کاندھلوی مرحوم کے لڑکے سعید الرحمٰن مرحوم سے ہوا تھا جس کا انتقال ۱۳۶۷ھ کے ہنگامہ ہی کے زمانہ میں ایک طویل علالت کے بعد ہو گیا تھا ــــ اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

ان واقعات کے ساتھ طویل قصے ہیں جو زبانی تو سنائے جا سکتے ہیں تحریر میں ان چیزوں کا آنا معلوم نہیں مناسب ہوگا یا نہیں .....

پہلا نکاح والدہ بارون سے ۳۲ محرم ۱۳۵۲ھ مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ میں چچا جان کے ارشاد پر بلا کسی سابقہ تجویز کے فوری ہو گیا تھا اسی طرح رخصتی بھی ایک سال بعد جب چچا جان جو مظاہر علوم کے سرپرست بھی تھے جلسہ سرپرستان میں تشریف لائے اس وقت عزیزان یوسف و انعام ابوداؤد دوبارہ پڑھنے کے لیے سہارنپور آئے ہوئے تھے یہاں موجود تھے جلسہ سرپرستان میں جس میں حضرت اقدس رائے پوری بھی تشریف فرما تھے چچا جان نے فرمایا کہ ان بچوں کی رخصتی بھی کر دو اسی دن رات کو میرے ہی گھر میں عزیزان یوسف انعام کی رخصتی بھی کر دی اور دوسرے دن صبح کو مختصر دعوت ولیمہ ہو گئی۔

گفتگو آئین درویشی نبود ورنہ با تو ماجرا ہا داشتیم

والسلام

زکریا عفی عنہ سہارنپور

قلم احسان ۲۳ صفر ۱۳۸۵ھ

ایک ضروری بات یہ ہے کہ بعض اخبارات میں مولوی یوسف کی پیدائش نظام الدین میں لکھ دی گئی ہے ان کی پیدائش کاندھلہ میں اپنے جدی مکان میں ہوئی تھی اس وقت چچا جان نور اللہ مرقدہ مظاہر علوم میں مدرس تھے۔



ایجنسیاں (۱) لکھنؤ - اودھ جنرل اسٹورس اسٹور امین آباد - (۲) کانپور - چمن گنج (۳) کوپاگنج - دیسی دواخانہ (۴) گھوسی - حافظ نذیر احمد (۶) امراوتی بندوق والا شاب جوہر گیٹ (۷) اعظم گڑھ - محلہ گرد ٹولہ محمد ولی اللہ (۸) بہرائچ چوک بازار جمال بہ آئیل کمپنی - (۹) بنارس - دال منڈی (۱۰) مئوناتھ بھنجن - صدر بازار

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی
اور
اُن کی چند خصوصیات

(مولانا نسیم احمد فریدی امروہا)

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی مگر نظر میں سما رہے ہیں

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی جن کے نام کے بعد چند ماہ پہلے ہم مدظلہ لکھتے اور بولتے تھے آج رحمۃ اللہ علیہ اور نور اللہ مرقدہٗ کہہ اور لکھ رہے ہیں۔ دُنیا سے گزرنا سب کو ہے، موت سب کو آنی ہے، سب کو اس عالم فانی سے رخصت ہونا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

اس عالم ناپائدار میں جو بھی آیا ہے یہاں سے مقررہ مدت کے بعد ضرور جائے گا، موت کا آہنی چنگل سب کو اپنی گرفت میں لے گا ؎

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی
جان ٹھہری جانے والی جائے گی (نشتر سندیلوی)

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اپنی حیات مستعار میں ایسے کارنامے چھوڑ جاتی ہیں جن سے اُن کا نام نیک باقی رہتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسفؒ بھی اُن مبارک شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے زندہ و پائندہ علمی و دینی کارناموں کے ذریعے جریدۂ عالم پر اپنی نیک نامی کو ثبت کرا دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس نصیب فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے معمور کرے (آمین)

مجھے اکیس سال سے حضرت مولانا مرحوم سے یک گونہ تعلق و ربط تھا۔ وہ اپنے اخلاق عالیہ کے تقاضے سے احقر کا بڑا اکرام فرماتے تھے جس سے بعض اوقات اپنی بے عملی اور کم حیثیتی کے پیش نظر مجھے شرمندگی محسوس ہوتی تھی ـــــ میں بھی ان سے جذبۂ عقیدت مندی سے ملتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ان کی شخصیت میں اکابر ملت کے اخلاق کی جھلکیاں اور مشائخ کاندھلہ کی اداؤں کا عکس نظر آتا تھا۔ یہ حقیقت تو بعد کو معلوم ہوئی کہ حضرت مولاناؒ عمر کے لحاظ سے مجھ سے چار پانچ سال چھوٹے تھے ـــــ میں ان کی حیات میں اپنے تقابلے میں عمر کے لحاظ سے بھی ان کو بڑا سمجھتا تھا ـــــ سچ پوچھیے تو وہ ہر حیثیت سے بڑے ہی تھے۔ ان کی تھوڑی عمر میں بھی کام کے لحاظ سے بڑی برکت ہوئی۔ ہم جیسوں نے سو سال میں بھی وہ اہم کام انجام نہیں پا سکتے جو انھوں نے ۴۹ سال کی عمر پاکر صرف اکیس سال میں انجام دے لیے۔ یہ محض انعام ربانی تھا کہ ان کے کارکردگی کے مختصر سے زمانے کا ہر دن دینی اعتبار سے کامیاب تھا اور ہر رات نور در آغوش تھی۔

حضرت مولانا محمد الیاس نور اللہ مرقدہٗ کو میں نے جہاں تک یاد پڑتا ہے صرف دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ ریل میں جب وہ سہارنپور سے دہلی جا رہے تھے اور میں دیوبند سے سہارنپور جا رہا تھا ـــــ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا ـــــ دوسری مرتبہ ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے بھرا ہی حضرت مولانا نعمانی مدظلہٗ دہلی جاکر ـــــ غرضیکہ میں اپنی محرومی کی بنا پر حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی شخصیت سے ان کی زندگی میں کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اور نہ مجھے کوئی موقع ملا کہ ان کے کارناموں اور مساعیٔ حسنہ سے واقفیت پیدا کرتا ـــــ فائدہ تو اپنے زمانے کے کسی بزرگ سے بھی آج تک نہ اٹھا سکا، اپنی سیہ بختی کی یہ داستان چھیڑنی مقصود نہیں مجھے تو عرض یہ کرنا ہے کہ میں نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے جانشین اور اکلوتے باکمال صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسفؒ کو قریب سے دیکھا، دور سے دیکھا، سفر

میں دیکھا حضر میں دیکھا خلوت میں دیکھا جلوت میں دیکھا، عمومی اجتماعوں میں دیکھا، خصوصی محافل و مجالس میں دیکھا، ان کی روح پرور باتیں سنیں، ان کی پرشکوہ تقریریں سنیں ان کے کچھ مکتوبات بھی احقر کے نام صادر ہوئے جو عرائض کے جواب میں تھے یا از خود ازراہ کرم فرمائی تبلیغی نقل و حرکت کے سلسلے میں ارسال فرمائے گئے تھے۔ وہ تین مرتبہ امروہہ بھی تشریف لائے۔ ایک مرتبہ تبلیغی اجتماع میں اور دو مرتبہ مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ کے جلسۂ دستار بندی اور اجتماع ختم بخاری کے موقع پر ـــــ امروہہ کے متعلق فرماتے تھے کہ "یہ ہمارے بزرگوں کی بستی ہے" ـــــ سلسلہ صابریہ امدادیہ رشیدیہ کے تین اکابر طریقت اس سرزمین پر ابدی نیند سو رہے ہیں ـــــ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے بعض خدام سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس زمانے میں جبکہ ان کا یہاں کوئی تعارف نہ تھا اپنے ان اکابر طریقت کے مزاروں پر حاضری دینے تشریف لایا کرتے تھے۔

الغرض حضرت مولانا محمد یوسفؒ سے واقفیت کے اسباب مجھے حاصل ہوئے میں ان کی شخصیت سے متاثر تھا، اس اکیس سال کے عرصے میں میرے قلب کا تعلق ان سے بڑھتا ہی رہا ـــــ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ منجملہ دیگر اکابر کے میں نے اپنے عہد میں حضرت مولانا محمد یوسفؒ جیسی یادگار سلف و جانشین شخصیت کو بھی دیکھا ہے اور ان سے واقفیت پیدا کی ہے ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی زیادہ قربت حاصل نہ کر سکا اور فیض صحبت سے زیادہ مستفیض نہ ہو سکا۔ مولانا اپنے بعض خطوط میں تو کبھی کبھی مجھے میری عدم نقل و حرکت پر اشارۃً تنبیہ بھی فرما دیتے تھے مگر جب کبھی حاضر ہوا تو اس "کوتاہی ذوق عمل" کو نظر انداز فرمایا۔ اگر کبھی فرمایا تو مرکز میں کچھ دنوں قیام کرنے کے لیے اور اس کا عنوان بھی اس قدر دلربا ہوتا تھا کہ جی چاہنے لگتا تھا کہ کچھ عرصہ مرکز میں قیام کروں۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم ایک کتاب صحابہ کے حالات پر لکھ رہے ہیں۔ آپ نے اس کو دیکھ لیا ہوتا۔ یہ عنوان میرے ذوق و شوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اختیار فرمایا گیا تھا جس سے اپنی نا قابلیت کو سامنے رکھ کر شرمندگی ہوئی اور اس سے مسرت

ہوئی کہ اس نااہل کو اس قابل سمجھا گیا کہ وہ ان کے افادات سے استفادہ کر سکے گا۔ بعد کو جب حیات صحابہ جلد اول شائع ہو گئی تو ازراہ لطف و کرم اس کا ایک نسخہ ہدیۃً میرے حاضر ہونے پر عطا فرمایا۔ ایک مرتبہ حاضر ہو کر ایک دو دن کے بعد رخصت ہونے لگا تو بڑی محبت کے ساتھ فرمایا کہ میوات میں ایک اجتماع ہو رہا ہے آپ اس کو دیکھ کر جائیں۔ تمام عمر میں میوات کا وہی ایک اجتماع دیکھ سکا تھا۔ اس اجتماع کی یاد بھی عمر بھر دل سے نہ جائے گی ـــــ وہ اجتماع میواتیوں کے دینی شعور اور دینی احساس کا آئینہ دار تھا۔ میواتیوں کا جوق در جوق ایک بڑی تعداد میں یہ نیت ثواب اور بارادۂ تفریغ وقت اجتماع میں شرکت کرنا، مہمانوں کی مدارات اور خاطر تواضع، سینکڑے کے ساتھ جلسے کا نظم و نسق، توجہ کے ساتھ ارشاداتِ یوسفی کا سننا اور سادگی کے ساتھ اسی اجتماع کے موقع پر اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کا نکاح کرانا، یہ تمام مناظر دینی نقطۂ نظر سے انتہائی مسرت انگیز تھے۔ مجھے رہ رہ کر مولانا کی یاد آتی ہے ـــ افسوس کہ وہ اتنے جلد ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی تقریریں کانوں میں گونج رہی ہیں ـــ مرادآباد، رحیم آباد، علی گڑھ، لکھنؤ، ڈاسنہ اور نہٹور ضلع بجنور کے اجتماعات کے پرکیف روحانی جلوے آنکھوں میں گھوم رہے ہیں جہاں مولانا اپنے رفقاء مرکز کے ہمراہ شریک ہوئے تھے۔ جہاں ایمان و یقین کی باتیں مولانا کی زبان سے ایمان و یقین کی فضاؤں میں احقر کو بھی سننی نصیب ہوئیں اجتماعوں میں ان کی اندرونی کیفیات کی تاثیر کے اور اضافہ ہو جاتا۔ مصروفیات بڑھ جاتی تھیں۔ ارشادات و کلمات طیبات کا سلسلہ دراز ہو جاتا تھا۔

یوں مرکز کی مصروفیات بھی کچھ کم نہ تھیں نماز فجر کے بعد سے لے کر رات کے بارہ بجے تک (قبل ظہر کے ایک دو گھنٹہ چھوڑ کر) عمومی و خصوصی مجالس میں برابر رشد و ہدایت کے دریا بہاتے اور حکمت و معرفت کے دُرِ نایاب تقسیم کرتے رہتے تھے۔ نماز فجر کے بعد سے اشراق تک تقریر، چائے پینے اور کھانا کھانے کے وقت تقریر اور بڑے دلچسپ انداز میں۔ اس کے بعد تھوڑا سا آرام کر کے ظہر کی نماز کے لیے مولانا مرکز کے حجرے سے باہر تشریف لے آتے، کھڑے کھڑے دینی گفتگو فرما رہے ہیں۔ اب تکبیر ہو گئی۔

صفوں کو درست فرما رہے ہیں۔ اب نماز پڑھا رہے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر تقریر فرما رہے ہیں۔ تقریر سے فارغ ہو کر دعا میں مشغول ہیں۔ اب حجرے کے اندر تشریف لے گئے۔ باہر کے آئے ہوئے وفود کے نمائندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سکوت کا عالم طاری ہے۔ ہمہ گوش ہمہ آنکھ ہیں۔ مولانا نے ان کے سامنے توحید و معرفت، ایمان و یقین کی تقریر شروع فرما دی ہے ——— دین کی نصرت پر نصرت خداوندی کو بیان فرمایا جا رہا ہے۔ عصر کی نماز کے بعد آکر کے حاضرین اور آنے والے وفود کے سامنے پھر تقریر فرما رہے ہیں۔ مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہتا مغرب کے بعد خصوصی مجلس میں اپنے ارشادات خصوصی سے فیض فرما رہے ہیں۔ عشاء کے بعد کتاب سنا رہے ہیں۔ احادیث و آثار کی تشریح فرما رہے ہیں۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہو رہی ہے۔ سیرت کے نازک نازک گوشے واضح فرمائے جا رہے ہیں۔ صحابہ کرام کے ایمان و یقین کی پیدا ہو رہی ہے [illegible] کے نقوش [illegible] ہیں بعض کا [illegible] واضح ہو رہی ہیں [illegible] کی [illegible]

صبح سے رات تک پورے وقت [illegible] کہ [illegible] بیحد سادگی تھی، پسینے پر پسینے آتے تھے سیدھا [illegible] کے عالم میں [illegible] پیغام دیے چلے جاتے تھے۔ آواز کی خستگی میں ایک عجیب دلکشی ہوتی تھی۔ ان کا تکلف میں بسا اوقات ایک ہی دن میں آدمی کا کایا پلٹ ہو جاتی تھی۔ علم سے تعلق رکھنے والوں کو بہت ہی فائدہ محسوس ہوتا تھا۔ ان کے یہاں کی ایک دن کی حاضری کا کیف و سرور مہینوں باقی رہتا تھا۔ نماز بڑے سوز و گداز اور تعلیم کی تڑپ کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ الحاکا اللہ اکبر کہنا جو فضا کو مرتعش کر دیتا تھا کانوں میں گونج رہا ہے ——— ان کا دعا کے وقت سراپا تضرع بن جانا اور دل کی پوری توجہ سے اللہ تعالیٰ سے مانگنا امت مسلمہ کو دعا مانگنے کا سلیقہ سکھاتا تھا اور دعا کے اہتمام کی طرف متوجہ کرتا تھا

میں جب کبھی حاضر خدمت ہوتا اپنا غم غلط کرنے اور اپنے جذبات پژمردہ میں تازگی پیدا کرنے اور دعاؤں کی برکات حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتا۔ مجھے مولانا کے

مستجاب الدعوات ہونے کا تجربہ اور پورا یقین تھا۔

مولانا کے بعض وہ ارشادات بھی یاد آرہے ہیں جو احقر کی موجودگی میں احقر کو خطاب کرتے ہوئے فرمائے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں حاضر ہوا تو پورے وثوق اور یقین کامل کے ساتھ فرمایا:

"یہ حالات باقی نہیں رہیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اس ہندوستان میں پردۂ غیب سے کوئی نہ کوئی ایسا انتظام ہوگا جس سے دین حق کو ترقی ہو اور مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ ہو۔"

ایک مرتبہ حاضر ہوا تو فرمایا — "آج خیر و شر، نیکی و بدی کا امتیاز تک باقی نہیں رہا۔ اگر آج کے دور میں ہم سب مل کر یہ کام انجام دے لیں کہ امت، خیر و شر میں امتیاز کرنے لگے تو بڑا کام ہو جائے — نمازوں کی تشکیل، زکوٰۃ کا نظام، روزۂ رمضان کا اہتمام، فریضۂ حج کے آداب کی تکمیل اور تمام اخلاقی اور معاشی سدھار کا مسئلہ آگے کا مرحلہ ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ "ہم یہ چاہتے ہیں کہ بازار سے مسجد تک کا نظام اور مسجد سے بیت اللہ تک کا نظام درست ہو جائے۔ پھر اس کی تشریح فرمائی اور — نماز و حج کو صحیح ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی۔

ایک مرتبہ نظام مسجد اور مسجد کے ذریعے امت مسلمہ کے اجتماعی مسائل کی تشکیل پر سیر حاصل گفتگو فرمائی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور صحابہ کے زمانۂ پُر سعادت کے واقعات عجیب ترتیب کے ساتھ بیان فرمائے —

ضلع بجنور کا گزشتہ سال کا اجتماع یو۔پی کے اجتماعوں میں ایک بڑا اجتماع تھا اس میں حضرت مولانا اپنے تمام رفقاء کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ عقیدت مندوں کے ہجوم نے بڑی دشواری پیدا کر دی تھی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مولانا سے مصافحہ کر لوں۔ انتظامی قیام گاہ پر بعض میواتیوں کا پہرہ لگانا پڑا پھر بھی قیام گاہ کے دروازے کی چوکھٹ، داخلے کی بے محابا کوشش کرنے والوں کے ہاتھوں اکھڑ گئی تھی۔ جب مولانا قیام گاہ سے جلسہ گاہ میں تشریف لاتے تھے مجمع آپ کے ارد گرد سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا نظر آتا تھا جس سے انتشار پیدا ہو جاتا تھا اور ضعیفوں کو تکلیف پہونچنے بلکہ کچل جانے

کا بھی اندیشہ ہوتا تھا۔ اجتماع کے دوسرے دن حضرت مولانا رات کے جلسے میں بہزار دقت اسٹیج تک تشریف لائے تو بعد خطبہ مسنونہ تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ "کیا تم مجھ ... (بخار کا ٹمپریچر بندی تربیہ) کو دیکھنے کے لیے آئے ہو؟ دیکھو میں یہ کھڑا ہوں۔ اگر میری بات سننے آئے ہو تو میری بات سنو۔" پھر جو تقریر فرمائی تو مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ بیس پچیس ہزار کا مجمع خاموشی سے مولانا کی تقریر سن رہا تھا۔ غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں آپ کی تقریر سننے آئے تھے۔ مولانا نے خالص انسانیت کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ جس سے ہر ایک متاثر ہوا۔ انصاف و عدل کی صفت پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ انصاف و عدل کے سلسلے میں مذہب یا پارٹی کا سوال پیدا کر کے ناحق کسی کی جنبہ داری اور طرفداری نہیں کی جائے گی۔ بڑی تفصیل سے اس موضوع پر تقریر فرمائی۔

مراد آباد میں آخری تشریف آوری کے موقع پر وہاں مدارس میں پہونچ کر علماء و طلباء کو جو پیغامات دیئے وہ بھی یاد رہیں گے۔ مدرسہ شاہی کا اجتماع عوام اور علماء و فضلاء کے مجمع کے لحاظ سے اتنا عظیم تھا کہ حضرت شیخ الاسلام (مولانا سید حسین احمد مدنی) رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے آج تک وہاں اتنا بڑا اجتماع نہ ہوا تھا۔ حضرت مولانا سید فخر الدین محدث مدظلہ نے بخاری شریف ختم کرائی اس کے بعد مولانا نے تقریر فرمائی اس تقریر میں علماء و طلباء کو بصد احترام ان کے فرائض منصبی کی طرف متوجہ فرمایا اور درس و تدریس کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہاں کی تقریر اس قدر جامع اور بصیرت افروز تھی کہ اگر ہمارے مدارس عربیہ اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو ان میں دوبارہ بہار تازہ آجائے۔ اس موقع پر مولانا نے ان بعض شبہات اور اشکالات کا جواب بھی دیا جو بعض اصحاب مدارس کی زبان پر نیک نیتی کے ساتھ تبلیغی کام کی نقل و حرکت کے سلسلے میں آتے رہتے ہیں۔

مراد آباد سے امروہہ تشریف لائے وہاں مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد میں ختم بخاری کے بعد علماء و طلباء اور شہر کے باشندوں کے سامنے موضوع علم پر سیر حاصل تقریر فرمائی۔ آغاز کلام میں جو بات فرمائی۔ اس کا مفہوم تقریباً یہ تھا کہ ایک علم کا صحیح ہونا ہے اور ایک صحیح علم کا استعمال صحیح ہونا ہے۔ اگر علم صحیح ہوا اور اس کا استعمال صحیح

نہ ہو تو یہ بھی خسارے کی بات ہے۔ یہ ایک الہامی اور معرکۃ الآرا تقریر تھی جس نے تمام حاضرین کو بڑا فائدہ پہونچایا۔ یہ آخری تقریر تھی جو میں نے حضرت مولانا کی زبان سے سنی تھی۔ پھر اس کے بعد موقع ہی نہ ملا کہ حضرت مولانا کے ارشادات سے مستفیض ہوتا۔

باتیں تو بہت سی یاد آتی ہیں مگر میں انتخاب ہی پر اکتفا کرتے ہوئے آخر میں چاہتا ہوں کہ حضرت مولانا کی چند صفات کا ذکر کرکے اپنے اس مقالے کو ختم کردوں۔

۱۔ بغیر کسی [illegible] مخالفت کے ساتھ [illegible] فرماتے تھے۔ اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔ بار بار فرماتے تھے کہ [illegible] ہوتا ہے چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ چیزیں نفع و نقصان پہونچانے میں [illegible] اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ کلمہ طیبہ کی تفسیر و تشریح و اجاگر انداز میں بیان فرماتے تھے ـــــ اتباع رسولؐ کی اور نقش قدم صحابہؓ پر چلنے کی پرزور ہدایت دیتے تھے۔ ان کی تقریر میں ایک مدت دعسر ایک صوفی درویش ایک متکلم مورخ کا حسین انداز ہوتا تھا۔

۲۔ مایوسی کو کبھی اپنے اندر نہیں آنے دیا۔ عالی حوصلگی اور [illegible] اسمین کی بلندی کی طرف رہنمائی فرماتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی دھارس بڑھانے والے چند اکابر میں حضرت مولانا کی ذات عالی بھی تھی۔

۳۔ دعاؤں کا خاص اہتمام تھا ـــــ دعا مانگتے وقت گم دعا بن جاتے تھے۔ مولانا نے اپنے اہتمام دعا سے دعا کی اہمیت و عظمت کی بے شمار دلوں میں قائم کرنے کی صورت پیدا کی حضرت مولانا کے دعا مانگتے وقت قلب پر عجیب سکون طاری ہو جاتا تھا۔

۴۔ مولانا قدیم و جدید دونوں حلقوں میں مقبول تھے۔ ان کی معلومات کا حلقہ بہت وسیع تھا ـــ ان کی تقریر سے ایک عالم اور عامی کا شتکار و دستکار اور ایک سائنس داں اور انجینیر مساوی مستفیض ہوتے تھے۔ آپ نہ صرف مذہبی و روحانی تقریر کرتے تھے بلکہ سیاسی موقع خصوصی مجلسوں میں اقتصادیات، معاشیات تعلیمات اور سیاسیات کے مسائل بھی حل فرماتے تھے اور اس کے نقشے اور خاکے بتلاتے جاتے تھے۔ مگر یہ سب مضامین اسلام کی تعلیمات سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور

کر دارِ صحابہؓ کی روشنی میں بیان ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور ذہنی اعتبار سے علوم جدیدہ سے متاثر اشخاص آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ اور بالآخر دلی اطمینان کے ساتھ دینی کام میں نمایاں حصہ لینے لگتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بہت سے طلبا کی اخلاقی و روحانی ترقی میں مولانا کے اس کمال کا بہت بڑا دخل ہے۔

۵۔ مولانا دوسروں ہی سے دینی نقل و حرکت کرنے اور باہر نکلنے کے لیے نہیں فرماتے تھے خود بھی حسب ضرورت مرکز سے باہر رہتے تھے اور مہینوں باہر گزارتے تھے حالانکہ مرکز میں ان کی موجودگی کی ضرورت کچھ کم نہ تھی۔ ہندوستان و پاکستان کے متعدد شہروں، قصبوں دیہاتوں میں عام اجتماعوں اور مدارس و مراکز کے خصوصی مجمعوں میں اپنا دینی پیغام پہونچاتے رہے۔ چنانچہ مسافرت اور غریب الوطنی کے عالم ہی میں دین کی جدوجہد کرتے ہوئے ان کی روح اعلیٰ علیین کو سدھاری ــــ حج کا فرض کئی بار ادا کر چکنے کے بعد نفلی حج اور عمرے کے لیے جماعتیں لے کر کئی مرتبہ حجاز مقدس پہونچے اور وہاں عالم اسلامی کے اجتماع سے دینی فائدہ اٹھایا۔ ملکوں کے لیے جماعتیں وہاں سے روانہ کیں۔ مقدس مقامات میں دنیا کے مسلمانوں کے لیے عموماً اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے خصوصاً خیر و عافیت اور دینی و روحانی ترقی کے لیے دعائیں کیں۔ اپنی جدوجہد کے ذریعہ عالم اسلامی سے ایک خاص رابطہ پیدا کیا۔

(۶) اپنے اکابر کے ساتھ والہانہ اور خادمانہ انداز رکھتے تھے۔ بالخصوص حضرت شیخ الاسلامؒ حضرت اقدس رائے پوریؒ سے انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی جدائی سے مولانا کو جو صدمہ ہوا تھا اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ سلامت رکھے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کو ان سے قریبی رشتے داری کے علاوہ جو قلبی اور روحانی تعلق تھا۔ اس کی نظیر موجودہ زمانے میں مشکل سے ملتی ہے۔ آج کے دور میں بزرگوں کے ساتھی یہ محبت، یہ سعادت مندی، یہ خلوص اور یہ جذبۂ تعظیم و تکریم بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

(۷) مولانا اپنے والد ماجد سے تعلق رکھنے والے تمام حضرات کا اور پرانے کارکنوں

کا بڑا احترام اور اعزاز فرماتے تھے۔ نیز مرکز کے تمام رفقاء اور بیرون مرکز کے تمام کام کرنے والوں سے جن میں امیر بھی تھے غریب بھی۔ عالم بھی تھے عوام بھی۔ تاجر بھی تھے کاشتکار بھی۔ یونیورسٹی، کالج اور اسکولوں کے اساتذہ بھی تھے اور طلباء بھی اسلامی مدارس کے معلمین بھی تھے اور متعلمین بھی۔ دفتر کے ملازمین بھی تھے اور ڈاکٹر انجینیر بھی۔ سب سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ سب کام کرنے والوں کی طرف سے اپنا سینہ اور دل صاف رکھتے تھے۔ اور اس کا اہتمام کرتے تھے، اگر کسی کی کوتاہی معلوم بھی ہوگئی تو حکمت عملی سے اس کا تدارک فرماتے تھے۔

مختلف مزاج اور مختلف کاروبار کے لوگوں کو یوں جوڑے رکھنا بغیر روحانیت اور نفسیات کی مہارت کے مشکل ہے۔

(۸) مولانا نے تبلیغی کام چلانے کے لیے کبھی مادی ذرائع اور روپے پیسے کا سہارا تلاش نہیں کیا۔ بزرگان ملت کے طریقے اور اپنے خاندانی متوکلانہ درویشانہ روایات پر قائم رہے۔ فتوحات کے طور پر بھی جو کچھ آیا اس میں سے اپنے اور اپنے اہل وعیال پر بہت کم اور صرف بقدر کفاف اور دینی جدوجہد کی ضروریات اور تحقین پر بہت زیادہ صرف کیا۔ ان کے لنگر کا خرچ اتنا تھا کہ کسی ریاست کا خزانہ بھی اس کے لیے کفایت نہ کرتا سب کام غیب سے ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے۔

(۹) سیاسی اور فروعی اختلافات کی وجہ سے اہل سنت وجماعت میں جو تفریق ہو گئی ہے اس کو اپنی حکمت عملی سے کم سے کم کرنے کی کوشش فرمائی۔ تبلیغی کام پر معاندین نے سخت سے سخت تنقیدیں کیں۔ اور چھوٹے بڑے رسالے لکھے مگر مولانا نے ان پر کبھی توجہ نہ کی نہ جواب دینے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ بلکہ اختلافات کی وسیع خلیج کو پاٹنے کی متواتر کوشش فرماتے رہے جس میں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔

(۱۰) ہند اور بیرون ہند میں کام کی اتنی اشاعت ہو جانے اور آپ کی شخصیت اتنی معروف ومشہور ہو جانے کے بعد بھی کبھی آپ نے خود تو کیا کسی دوسرے کو بھی اجازت نہ دی کہ ان کی شخصیت کی طرف دعوت دی جائے اور لوگوں کو ان کے حلقۂ بیعت میں

داخل کیا جائے۔ آپ نے سب حلقوں کا اکرام کیا سب مشائخ کا اعزاز کیا سب مدارس کو اپنا سمجھا سب علماء کی تعظیم و تکریم کی اپنے معاصرین سے چاہے وہ دین کے کسی شعبے میں کام کر رہے ہیں اچھے تعلقات رکھے اپنے طرز عمل سے کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ عام و خاص مسلمانوں کے حسن اکرام کی اور امت کے مختلف طبقات کو باہم قریب کرنے کی وہ مسلمانوں کو جو تعلیم دیتے تھے خود ان کی ذات اس کا بہترین نمونہ تھی۔

دعا ہو کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور ان کے صاحبزادے میاں محمد ہارون سلمہٗ اور ان کے جانشین حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی مدظلہ اور دیگر رفقاء کو صحت و عافیت کے ساتھ دینی کام کرنے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ کو نیز تمام اکابر کو تا دیر ہمارے سروں پر قائم رکھے (آمین)

درس قرآن

گھر بیٹھے بغیر استاد کے قرآن حکیم کے معنی اور مطالب سمجھنے اور سمجھانے کے لیے درس قرآن کا سلسلہ حاصل کریں۔ درس قرآن سات منزلوں میں چھپ رہا ہے۔ اس کی پہلی پانچ منزلیں تیار ہو چکی ہیں۔

ہدیہ: منزل اول (سوا پانچ پارے) مجلد دس روپے، منزل دوم (۵½ سے ۹ پاروں تک) مجلد دس روپے منزل سوم (۹½ سے ۱۴ پاروں تک) مجلد نو روپے (۱۴ سے ۱۸½ پاروں تک) منزل چہارم مجلد نو روپے۔ منزل پنجم (۱۸½ سے ۲۲½ پاروں تک) مجلد آٹھ روپے۔ چھٹی اور ساتویں منزلیں عنقریب تیار ہو رہی ہیں۔ درس قرآن کی زبان نہایت سادہ اور آسان ہے۔ درس قرآن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر روز کے لیے ایک صفحہ پر ایک سبق اور ہر سبق کا ایک علیحدہ عنوان ہے۔

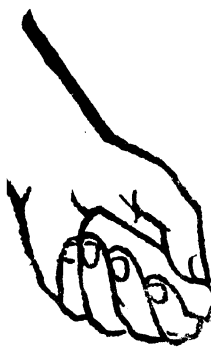
دائیں جانب تحت اللفظ ترجمہ، بائیں جانب بامحاورہ ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نیچے مشکل الفاظ کی تشریح، اس کے بعد آیت کی مختصر جامع تفسیر

مذکورۂ بالا ہدیہ کے علاوہ محصول ڈاک بذمۂ خریدار، نمونے کے صفحات مفت طلب فرما سکتے ہیں۔

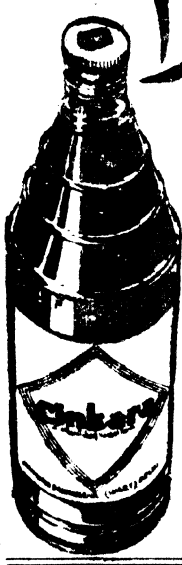
سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور

نوٹ:۔ ہندوستان میں درس قرآن کی جلدیں کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

صحت مند
اور
توانا جسم
کی
مضبوط تعمیر کے لیے



سنکارا
استعمال کیجیے



زندگی کو صحت مند بنیادوں پر استوار کیجیے۔ صحت مند اور خوش و خرم رہنے کے لیے سنکارا استعمال کیجیے سنکارا روزمرہ کے کاموں میں صرف ہونے والی توانائی کو بحال کرتا ہے اور چست بناتا ہے۔ سب کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔

ہمدرد دہلی ، کانپور ، پٹنہ

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ
ارشادات کے آئینے میں

از حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب (الٰہ آباد)

[ہمارے بہت سے ناظرین حضرت مفتی صاحب سے شاید واقف نہ ہوں، آپ پاکستان کے معروف علما، و اصحاب فتویٰ میں سے ہیں، تبلیغی کام سے آپ کا تعلق بہت عمیق اور قدیم ہے، اس کام ہی کے سلسلہ میں چند سال آپ کا قیام حجاز مقدس میں بھی رہا ہے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص معتمدین میں سے تھے اور حجاز مقدس کے سفروں اور پاکستان کے دوروں میں عموماً حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ رہتے تھے۔]

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ۔

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ "کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کا اُس ذات پر یقین قائم ہو جائے جس کے کرنے سے کام ہوگا، یعنی اللہ جل جلالہٗ کی ذات پر اور اس کی حیثیت کام کرنے والے پر ایسی منکشف ہو کہ اپنی ذات اور کوئی دوسری ذات دکھائی نہ دے دوسرا یقین یہ ہو کہ جب میں ظاہر و باطن سے حضورؐ کے طریقوں پر آجاؤں گا تو رب العزت دُنیا و آخرت میں اچھے حالات لائے گا۔"

حضرت جی رحمۃ اللہ کی ذات میں یہی یقین اتنا نمایاں نظر آتا تھا کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی محسوس کر لیتا تھا کہ اس خدا کے بندے کے نزدیک حکومت، مال و دولت، اکثریت اور کسی بھی طاقت سے قطعاً کچھ نہیں ہوتا۔

ایک دن ڈھاکہ میں وہاں کے خواص کے ایک اجتماع میں فرمانے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں اتنا فرمایا تھا کہ کل بتاؤں گا۔ اس پر وحی آئی "وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ" (۱) اور تمہاری زبان پر ہر وقت یہی رہتا ہے کہ ہم نے یہ کیا، ہم یہ کر رہے ہیں اور ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تم اگر مرنا چاہو تو اپنے ارادے سے مر بھی نہیں سکتے۔ خَلْقٌ کی صفت صرف خالق میں ہے، پوری مخلوق اپنی پیدائش، تربیت اور بقا میں ہر ہر مرحلہ پر خالق کی محتاج ہے۔

ایک دفعہ تقریر کے بعد ایک صاحب نے کہا حضرت یہ کام تو اچھا ہے مگر عالم میں پھیلا ہوا بگاڑ اس سے کیسے درست ہوگا؟ اس پر فرمایا، اگر میرے آپ کے یا جماعت کے کرنے پر ہوتا تو سوچنے کی بات تھی۔ جب خدا کے کرنے سے ہونا کہہ رہا ہوں تو پھر اشکال کیا ہے، کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام خدا کیسے کرے گا؟۔

ایک دفعہ فرمایا تم حضورؐ کے نمونہ پر بننا شروع کر دو جتنا بننا ہوگا بن جائے گا، اور جو بننے والا نہیں ہوگا اور بننے والوں کے لیے رکاوٹ بنے گا خدا اسے اس طرح توڑ دے گا جیسے انڈے کے چھلکے کو توڑ دیتا ہے، تم جن کو بڑی طاقتیں کہتے ہو خدا کے نزدیک اُن کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس دُنیا میں پاکیزہ انسانوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لگ گئے تھے جب حضورؐ کی سعی سے پاکیزہ انسان بن گئے تو خدا نے عذاب کی ایک جھاڑو سے روم و فارس کے جالے صاف کر دیئے تھے، بالکل یہی صورت روس و امریکہ کی ہوگی۔

ایک دفعہ فرمایا ایٹم سے ڈرنا ایسا ہی ہے جیسے مشرکین اپنے پتھر کے بُتوں سے ڈرتے اور امید رکھتے تھے، ایٹم اور ایٹم والوں کی گردنیں قدرت کے ہاتھ میں ہیں، ایٹم سے وہ ہوگا جو خدا چاہے گا، فرعون بھی "وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ" کہا کرتا تھا، مگر خدا نے اسی پانی کو اُس کے غرق و بربادی کا سامان بنا دیا۔

---

(۱) ترجمہ۔ اور کسی چیز کے لیے ہرگز یہ نہ کہو کہ میں یہ کل کروں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ یعنی یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ نے چاہا تو کروں گا۔ الفرقان

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے دل کی گہرائیوں میں خدائے ذوالجلال کی صمدیت کا یقین اتنا بھرپور معلوم ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک ہر زمانے کے کائناتی اسباب کا وجود و عدم برابر تھا۔ فرماتے تھے جب کچھ نہ تھا خدا نے سب کچھ بنا دیا اور آخر میں کچھ نہیں رہے گا اور پھر سب کچھ بنائے گا۔ وہ پیدا کرنے میں ماں باپ کا محتاج نہیں ہے۔ آدم علیہ السلام، حوا علیہا السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اس کی دلیلیں ہیں۔ نیز قیامت کے دن بارش ہوگی اور انسان زمین سے انگوریوں کی طرح نکلتے چلے آئینگے۔ وہ چاہے تو سامان ہلاکت و ذلت کو ہی سامان تربیت و عزت بنا دے۔ ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو، یونس علیہ السلام کے لیے مچھلی کے پیٹ کو، اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے زندگی کے اسباب سے خالی تنگ و دق بیابان کو، یوسف علیہ السلام کے لیے جیل کو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غار ثور کو حفاظت، عزت اور تربیت کا سامان فرما دیا۔

فرماتے تھے، میں دنیا کو دارالاسباب مانتا ہوں مگر انسانوں کی اجتماعی انفرادی کامیابی، سکون، تمکن، محبوبیت، مرجعیت، قوت اور تمام اچھے حالات کا واحد سبب حضور کی آمد کے بعد صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود اطہر سے صادر ہونے والے اعمال ہیں۔ جب کسی فرد، خاندان، طبقہ، جماعت، قوم یا ملک میں حضور والے اعمال آجائیں گے خدا ان کو دارین میں کامیاب کرے گا چاہے ان کے پاس کائناتی اسباب ہوں یا نہ ہوں۔

برہمن بڑیا میں مدرسہ میں بخاری کے ختم پر فرمایا۔ "بھائیو آپ نے بخاری ختم کی، علم حاصل ہوا، اب اسی علم پر تین مقصدوں کے لیے محنت ضروری ہے۔ اس علم کے مطابق اپنے اندر کا یقین، اس علم کے مطابق عمل۔ اور اس یقین و عمل کو عالم میں پھیلانا۔ حضور کے لائے ہوئے علم پر ان تین پہلوؤں پر ابتدا میں محنت کی گئی تو اس زمانہ کے کائناتی نقشوں پر چلنے والا باطل ردم و فارس پاش پاش ہوگیا اور آخر میں دجال اپنی ذات سے اتنی بڑی طاقت کا مظاہرہ کرے گا کہ اس کے مقابلہ میں موجودہ طاقتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اس وقت مہدی علیہ السلام زمین سے اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے آئیں گے اور من و عن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق اس علم پر محنت کریں گے اس پر اللہ جل جلالہ اس دجالی طاقت کو ہلاک کردے گا۔ اور جب پہلے یہ ہو چکا اور آخر میں بھی یہ ہوگا تو پھر یہ وسوسہ کیوں ہو کہ درمیان میں کیسے ہو سکے گا، آج بھی وہ سب کچھ ہو سکتا ہے،

بشرطیکہ ایک معتدبہ طبقہ اس علم پر حضورؐ اور صحابہ کی طرح محنت کرڈالے، حضورؐ سے صادر ہونے والے اعمال کو خدا نے اتنم سے زیادہ طاقتور بنایا ہے اور ایک ایک عمل کو عالم میں تغیر کا ذریعہ بنایا ہے۔ صلوٰۃ الاستسقاء زمین کے حالات میں تغیر کا ذریعہ ہے۔ صلوٰۃ الکسوف اور صلوٰۃ الخسوف چاند و سورج کے حالات بدلنے کے لیے ہے۔ دعا اور صلوٰۃ الحاجہ ہر قسم کے انفرادی اجتماعی ناموافق حالات بدلنے کے لیے ہے۔ حضورؐ کی انگلی کے اشارہ سے چاند کو دو ٹکڑے کرکے یہی ظاہر کیا گیا کہ حضورؐ سے صادر ہونے والا عمل اتنا طاقتور ہے اور یہ اشارہ حضورؐ کا تکوینی عمل تھا۔ تشریعی عمل اس سے بھی طاقتور ہیں۔ اس وقت حکومتی نقشوں والوں کی منت خوشامد ہو رہی ہے کہ ہمارا علم چلا دو، میں کہتا ہوں قرآن و حدیث ان کی تثبیت کرنے نہیں آیا، قرآن تو ان نقشوں والوں کے وجود و عدم اور ذلت و عزت کے فیصلے کرنے آیا ہے۔

اسی کے ساتھ حضرت جیؒ کی ایک ایک بات سے اس کامل یقین کا بھی ظہور ہوتا تھا کہ حضورؐ والے اعمال کے بغیر کبھی بھی دنیا و آخرت میں کامرانی نصیب نہیں ہو سکتی چاہے کائناتی اسباب کتنے ہی ہاتھ آجائیں، بلکہ کائناتی اسباب حکومت، تجارت، زراعت وغیرہ میں جب تک حضور والے اعمال کی روح نہ آجائے یہ اسباب مردہ ہیں۔ اور یہ بھی فرماتے تھے کہ جو انسان خالق کائنات اور اصل کائنات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جانے اور مانے بغیر کائنات کی چیزوں میں گھستے ہیں اُن کی حیثیت چوروں اور ڈاکوؤں کی ہے انھیں مال و دولت تو مل سکتے ہیں۔ مگر سکون و محبوبیت ہرگز ہرگز نہیں مل سکتی ——— اور یہ بھی فرماتے تھے کہ خود کائنات کی بقا صرف اسی وقت تک ہے جب تک اس میں حضورؐ کے اعمال موجود ہیں۔ جب اُن کے اعمال میں سے کوئی بھی عمل نہ رہے گا اُس وقت اس مُردہ کو دفن کر دیا جائے گا اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ۔ الآیہ

اور اسی بنیادی یقین کی بنا پر فرماتے تھے کہ نماز صرف اعمالِ نبوت کا مجموعہ ہے اسے تمام کائناتی اعمال کو چھوڑ کر بلکہ ان سے دور ہو کر مسجد میں ادا کرنے کا حکم ہے اور نماز میں کائناتی اعمال تجارت وغیرہ کو صرف چھوڑنے کا حکم نہیں، بلکہ نماز میں ان کا خیال کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا اور پوری کائنات سے یکسوئی والے عمل کی طرف "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحْ" سے پکارا گیا، یہ عمل گویا اس یقین کی مسلسل مشق کراتا ہے کہ کامیابی کا دارومدار صرف اعمالِ نبوت پر ہے اور اعمالِ نبویؐ کے

ساتھ اس درجہ یقین رکھنے والے کو جو شغف اور اہتمام علوم نبویؐ کے ساتھ ہو سکتا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔

ایک دفعہ علماء کے تعلیمی حلقے کے ختم پر فرمایا جس میں حضرت مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ بھی موجود تھے، کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ بخاری پڑھانے والوں کو التحیات یاد کرانے پر لگا دیں، مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ التحیات یاد کرانے کی بخاری پڑھانے والوں کے نزدیک بھی انتہائی اہمیت ہو۔ اسلیے کہ یہ بھی حضورؐ کے علوم میں سے ایک علم ہے۔ اسے غیر اہم سمجھنے والا کہیں کا نہ رہے گا۔ اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ تعلیم کا یہ درجہ بھی ماہرین بخاری کی نگرانی میں ہو۔ اسی بنا پر حضرت جیؒ انتہائی اہتمام سے تمام چھوٹوں بڑوں سے چاہتے تھے کہ تعلیم کے حلقوں میں بیٹھیں، اور انتہائی احترام و توجہ سے سنیں۔

ایک دفعہ فرمایا کہ جب قرآن پڑھنے یا سننے بیٹھو تو یوں سمجھو خدا مجھ سے مخاطب ہے اور جب حدیث پڑھنے یا سننے بیٹھو تو یوں سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے مخاطب ہیں۔

ایک یہ بات بھی حضرت جیؒ کے لیے آفتاب نیمروز کی طرح ظاہر اور بدیہی اور ناقابل شک تھی کہ جب تک مذکورۂ بالا یقین اور علم نبوت کے مطابق عبادات درست نہ ہو جائیں اخلاق نہیں آتے اور جب تک ہم میں اخلاق نہیں آئیں گے دوسروں میں دین نہیں پھیلے گا۔ اور فرماتے تھے اغراض کے لیے کسی سے کوئی سلوک کرنا اخلاق نہیں ہے، بلکہ کوئی کام بھی جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اس کی قطعاً کوئی قیمت نہیں ہے۔ ایک دن ایک مجلس سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا، نفسی صاحب عمل اخلاص کے بغیر مُردا ہی تو ہے اور دیکھو گھروں، بازاروں، دفتروں، یہانتک کہ مدارس و مساجد میں کیسے مردادوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔

۱۴ مارچ ۶۵ء (چہارشنبہ) کی صبح وصال سے صرف دو دن پہلے فرمایا۔ اللہ کی رضا کے علاوہ کسی بھی نیت سے کرنا نفسانیت ہے۔ مال مل جائے، مال بڑھ جائے، لوگ تعریفیں کریں، بڑا بن جاؤں، شہرت مل جائے، عہدہ مل جائے، مرجع بن جاؤں، میری بات چلنے لگے، میری حیثیت مانی جائے، میری رائے پوچھی جائے، ان اغراض کے لیے عمل کرنا ہرگز اخلاص اور للّٰہیت نہیں ہے، یہانتک کہ مخلصین خدا کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے اس موعود کے لیے بھی عمل نہیں کرتے اس لیے کہ یہ موعود موعود ضرور ہے مگر مقصود نہیں، اور جو موعود کو مقصود بنا کر کرتے ہیں وہ موعود ہی میں

پھنس جاتے ہیں اور جو لوگ صرف رضاء الٰہی کو مقصود بنا کر چلتے ہیں اُن پر جب خدا کے مواعید پورے ہوتے ہیں اور مال و ملک کی نعمتیں ملتی ہیں تو وہ اُن کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے دین کی اشاعت اور مخلوق خدا پر محض رضاء الٰہی کے لیے خرچ کر دیتے ہیں۔ جیسے صحابۂ کرام نے کیا تھا۔

ادھر کئی سال سے حضورؒ کی معاشرت پر نہایت اچھوتے اور محبت بھرے انداز میں تفصیلی گفتگو فرماتے تھے اور اس کے مقابل جب موجودہ معاشرت کا ذکر آتا تو معلوم ہوتا کہ اس معاشرت کی ایک ایک چیز میں انھیں کھلے مفاسد نظر آتے ہیں۔ اور بعض چیزیں ایسی غلاظت ہیں کہ ان سے انھیں گھن آ رہی ہے۔

ایک دفعہ فرمایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کی بنیاد پاکیزگی، سادگی اور حیا پر ہے اور یہود و نصاریٰ کی لائی ہوئی معاشرت کی بنیاد بیحیائی، اسراف اور تعیش پر ہے۔ تمھیں ان کی معاشرت پسند آنے لگی جنھوں نے تمھارے اسلاف کے خون بہائے، عصمتیں لوٹیں، ملک چھینے، اور اب بھی تمھیں امداد دیکر اسطرح پال رہے ہیں جسطرح تم مرغیاں پالتے ہو (یعنی ذبح کرنے کیلئے) اور جنھوں نے تمھارے لیے خون بہایا، دانت شہید کرائے، حمزہ جیسے چچا شہید کرائے، تمھارے لیے راتیں جاگتے گزاریں اُنکی معاشرت تمھیں پسند نہ آئی۔ دیکھو حضورؐ کی معاشرت بھی قیامت تک کیلئے ہے جیسے انکی نبوت قیامت تک کیلئے ہے۔ جب تم میں نور ایمان آئے گا تو تمھیں حضورؐ کی معاشرت کی ایک ایک چیز پیاری لگے گی۔

دعوت کے عمل کو حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ تمام اعمالِ نبویؐ میں زیادہ طاقتور اور انبیاء کا مقصدِ حیات یقین کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ انبیاء کا خاص الخاص عمل ہے، انبیاء والی مدد میں اسی عمل کے ساتھ ہیں، بشرطیکہ یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو۔

حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ اس عمل کیلئے ہر طرح کی انتہائی قربانیاں چاہتے تھے اور تدریجاً بڑھنے کی دعوت دیتے تھے اسوقت عام دعوت یہ تھی کہ وقت کا تہائی حصہ یعنی ہر سال میں چار مہینے بیرونی نقل و حرکت میں صرف کیے جائیں۔ باقی آٹھ مہینے اپنے مقام پر اسطرح گزارے جائیں کہ آدھا وقت مسجد اور اسکے اعمال میں صرف ہو اور باقی آدھا وقت گھر اور اسکی ضروریات کو دیا جائے ـــــ ایک دفعہ برازوں سے فرمایا اس کام کو اصل کام بناؤ، اور بقیہ کاموں کو اسکی سلوٹوں میں کرنا سکھلوا دیا چاہتے تھے کہ ہر گھر، ہر محلہ، ہر شہر، ہر ملک اس دعوت کا میدان بنے۔ خدا کا احسان ہے انکی دعوت کے کچھ حصوں پر کچھ لوگوں نے لبیک کہا، رب کریم مرحوم و مغفور کی وہ ساری آرزوئیں پوری فرمائے جو ان کے پاکیزہ دماغ میں آئیں۔ آمین وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

صدّیق وقت یُوسفِ اقلیمِ دین و دعوتؒ

(نوّر اللہ مرقدہ)

(از جناب مولانا محمد اشرف خاں صاحب ایم۔اے، صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور)

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں ترکش ما را خدنگ آفریں

عالم کی سب سے بڑی متاع انسان ہے، لیکن ہر زمانہ میں "انسان" کی یافت و معرفت ہی بنی آدم کے لیے سب سے مشکل مسئلہ بنی رہی ہے۔ وہ مخلوق جو انسان کے نام سے موسوم ہے لیکن انسان کے جواہر اصلیہ سے محروم ہے، انکا تذکرہ نہیں، بات اس انسان کی ہے۔ جو خلیفہ الٰہی، نائب حق، مظہر صفاتِ الٰہیہ، عبدیت و اخلاق کا پیکر، احکام ربانی کا حامل اور اپنی ذات و صفات و اعمال کے لحاظ سے عالم کے لیے سراپا رحمت و ہدایت، باعثِ برکت و خیر ہو، جس کی زندگی عالم کی حیات اور جس کی موت عالم کی موت ہو، جو خدا کا ہو، جس کا دل جمال و کمال الٰہی کے نور سے روشن اور جس کی پیشانی تلہیت، انابت الی اللہ اور معیتِ ربانی سے منور ہو جس کی صحبت ہدایت کا نور بکھیرتی ہو، جس کا دل دلوں کو زندگی بخشتا ہو جس کی روح سے روحیں زندہ ہوتی ہوں، جس کا اُسوہ اپنے اندر صحبت نبوت کا پرتو لئے ہوئے ہو جس کی زندگی "ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذالک امرتُ وانا اول المسلمین" کا عملی ثبوت ہو، جو مخلوق کا نہ ہو، خالق کا ہو، خلوق کا طالب نہ ہو، مخلوق سے اپنے نفع و ضرر کو حقیقتاً

لہ یہ عجالہ، ناگزیر حالات کی بنا پر انتہائی رواروی میں قلم برداشتہ املا کرایا گیا ہے اس لیے جیسے لکھنا چاہتا تھا، وہ صورت نہ ہو سکی تاہم جو ہوا۔ خدا کی توفیق سے ہوا والحمد للہ علی ذالک ؎

طوفان اشک لانے سے اے چشم فائدہ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

متعلق نہ سمجھتا ہو، وہ ہر غیر سے قطعاً بے نیاز اور صرف ایک ذاتِ الٰہی کا نیاز مند ہو، اس کی امنگیں، امیدیں، تمنائیں، آرزوئیں، آہیں، نالے، سوز و گداز، بے چینیاں اور بے قراریاں کوشش و محنت، سعی و جستجو، سوچ و فکر، سکوت و تکلم، قول و عمل، صرف ایک ذاتِ پاک و بے ہمتا خالق و مالک کے لیے ہو کر رہ گئی ہو، اس کا حال لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کی عملی تصویر ہو، اور اس کا دل ابراہیم خلیلؑ کی طرح خلعتِ ربانی کا ذوق آشنا، اس کا یقینِ محکم و ایمانِ کامل شک و ریب، بے یقینی اور نفاق کے تو بر تو پردوں کو چاک کرنے والا، بے یقینوں کو یقین دلانے والا، بے راہوں کو راہ بین بنانے والا اور دلوں کی ظلمتوں کو کافور کرنے والا ہو وہ اپنی راہ نبوت کی بتائی ہوئی روشنی میں طے کرتا ہو، زمان و مکان اسے متاثر نہ کرتا ہو۔ وہ تفرید و تجرید کے اس مقام پر فائز ہو، جہاں غیر کلی طور پر مضمحل و محجوب ہو جاتا ہے اور جہاں ہر چیز اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہوتی نظر آتی ہے۔ اس کے لیے مخلوق اور مخلوق پر وارد ہونے والے احوال و تصرفات ایک ہی مصرّف الامور اور مکوّن السمٰوٰت والارض کی مختلف تجلیات و افعال کا ظہور و صدور ہوں، وہ عالم کے ہر تصرف اور کائنات کی ہر حرکت و سکون میں خالق و آمر حقیقی کا غیر مرئی ہاتھ کارفرما پاتا ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کے نظام تشریعی و تکوینی کی مصلحتیں اور حقیقتیں اس پر (بقدر عطاء رب) کھل چکی ہوں، نظام تشریعی کی حقیقت نے اس پر واضح کر دیا ہو، کہ تکوینیات کے اوامر تشریعات کے متعلقہ امور کے نتائج و ثمرات ہوتے ہیں، اس لیے شریعت مطہرہ کی عظمت اور انبیاء علیہم السلام خصوصاً افضل الانبیا سید الرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اعمال کے جزو کل کی قیمت و اہمیت اس پر اس طرح منکشف ہو چکی ہو، کہ چھوٹی سے چھوٹی سنت اور حیات نبوی کے معمولی سے معمولی عمل کو وہ پوری کائنات سے زیادہ وقیع و قیمتی سمجھتا ہو، جس کے لیے ایک سنت کا ٹوٹنا قیامت ہو، جان دینا گوارا ہو لیکن طریقۂ نبوت کا اضمحلال برداشت نہ ہو سکے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح وہ قولاً و عملاً پکار رہا ہو "اینقص الدین وانا حیّ" ایسی شخصیت کا ملنا (بقول شاہ ولی اللہؒ) کبریت احمر اور اکسیر اعظم سے کم نہیں، ایسے انسان کی جستجو کے متعلق عارف رومی نے کہا ہے ؎

کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

ایسے انسان کامل کی یافت دل کا چین، روح کا سکون، اور سربیماری کا علاج ہے اس کا ملنا ہی شکوک وریب کے اندھیروں کو اُجالے سے بدل دیتا ہے اور دل میں یقین وایمان کی قندیل روشن کردیتا ہے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال — مشکل از تو حل شود بے قیل و قال
در علاجش سحر مطلق را ببین — در مزاجش قدرتِ حق را ببین

ایسے "انسان" کی یافت وحصول میں تو بڑے حجابات حائل ہوجاتے ہیں، اور اس سے استفادہ واستفاضہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں وہ خود شہرت ونمود کا طالب نہیں ہوتا ومعاصرت کے حجاب اکبر کے علاوہ اعمال کا ظاہری تشابہ، اس کی اپنی بے نفسی، فنائیت، تواضع، خلق کی مدح وذم سے بے پروائی وغیرہ اس کے جمال وکمال کو چھپائے رکھتی ہے۔ بے بصر اشخاص اسے اپنے پر قیاس کرلیتے ہیں اور اس کے فیض وبرکت سے بے پروا اور محروم ہوجاتے ہیں اسی کی طرف عارف رومیؒ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر
شیر آں باشد کہ انسان می خورد — شیر آں باشد کہ انسان را درد
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے زابدال حق آگاہ شد
اشقیارا دیدۂ بینا نبود — نیک وبد در دیدہ شان یکساں نمود
ہمسری با انبیاؑ برداشتند — اولیارا ہمچو خود پنداشتند
گفتہ اینک ابشر انیاں بشر — ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور
ایں ندانشتند ایشاں از عمی — ہست فرقے درمیاں بے منتہی
ہر دو صورت گر بہم ماند رواست — آبِ تلخ و شیریں را صفا است

جو اشخاص اور جو طبقہ ایسے انسان تک پہنچ بھی جاتا ہے، تو اس کی معرفت وپہچان اور ان سے استفادہ اپنے احوال وظروف کے مطابق کرپاتا ہے۔ اور اس جہل مرکب میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ میں نے اسے جان لیا، پہچان لیا، اور جو میں نے اس سے اخذ کیا، گویا اس انسان کامل اور

عبقری شخصیت کا وہی سرمایہ اور فضل و کمال تھا، حالانکہ بقول سید الملۃ قدس سرہٗ

فیضِ ساقی ہے باندازۂ ظرف میخوار دل حریفِ مے بسیار کہاں سے لاؤں

افادہ بقدر صلاحیتِ استفادہ ہوتا ہے، علوم خاصہ بھی اپنا محرم تلاش کرتے ہیں نسبت باطنی بھی اپنے محل و جائے استقرار کی طلب میں ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے کامل انسان ہم جیسے مستفید دل کو ہمیشہ یوں ہی کہتے رہے،

من بہر جمعیتے نالاں شدم جفتِ بدحالاں و خوش حالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یار من از درونِ من نجست اسرار من
محرم ایں ہوش جز بیہوش نیست ہم زباں را مشتری جز گوش نیست
ہیچ کس را زہرہ ایں جوش نیست باکہ گویم در جہاں یک گوش نیست

پچھلے دور کے ایک حکیم شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جو رختِ خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت با کہ گفت و از کجا بود

غرض 'انسان' کا ملنا مشکل، اس کا جاننا و پہچاننا، اور اس کی صفات و کمالات، فضائل و مزایا کی معرفت مزید دقت طلب اور گراں ہوتی ہے، اب ایسے انسانوں کے پہچاننے کا کیا دعویٰ و اظہار کیا جائے کہ

خود ثنا گفتن زمن ترکِ ثنا است کیں دلیل ہستی و ہستی خطا است

بہرحال ہر شخص اپنے ظرف و استعداد، فہم و دانش، علم و بصیرت کے بقدر جانتا اور تعارف کرا سکتا ہے لیکن ناواقفوں کے لیے یہ تعارف بھی اکثر 'باور کرانے' کے مرادف نہیں ہو سکتا۔ مبالغہ اور عقیدت کی اس دنیا میں حقیقت کو بھی افسانہ سمجھ لیا جاتا ہے اور شخصیت نگاری کو شاعری قرار دیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ایسے باکمال انسانوں کے خد و خال اور جمال و کمال کو کسی حد تک پیش کرنا افادیت سے خالی نہیں، کہ

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب بوئے گل را از کہ جویم، از گلاب

اللہ تبارک و تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے کہ اس عالم میں انسانوں کی ہدایت کے لیے

نفوسِ کاملین کو پیدا فرماتا رہتا ہے اور انھیں اپنی ہدایت کا آلہ بنا کر اس عالم کے انسانوں پر اپنی ذات تک پہنچنے کی راہیں کشادہ اور اپنی ذات عالی سے استفادہ کی صورتوں کو استوار فرماتا رہتا ہے۔ یہ نفوس کاملین اصلاً انبیاء علیہم السلام کی ذوات عالیہ ہوتی ہیں اب جبکہ ہمارے آقا امام الرسل سید الانبیا خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دائمی نبوت اور ابدی رسالت کے ساتھ تشریف لے آئے اور حکمت الٰہیہ نے یہ مقدر فرما دیا کہ دورۂ نبوت محمدیہ اعلان نبوت محمدیہ سے لے کر تا قیام ساعت مستمر رہے گا۔ اس عہد میں جتنے اصحاب دعوت و ارشاد اور نفوسِ قدسیہ پیدا ہوں گے وہ رسالت محمدیہ کے آب زلال سے سیراب، آپ کے علوم و انوار سے فیضیاب آپ کے یقین و ایمان، توکل و تفویض، تلہیت و انابت، درد و سوز اور غافلوں، ناواقفوں پر ترس و ترحم اور آپ کی دیگر باطنی صفاتِ کمال سے متصف ہوں گے ایسی ذواتِ قدسیہ عالم کی ہدایت کا سبب اور نظام ہدایت کی اس عالم میں ظاہری کڑیاں ہوتی ہیں۔ ان کے مجاہدات اور دعاؤں کی برکت سے دین کے فروغ کی غیبی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

غربت کدۂ ہند میں اسلام کا قافلہ صحابہ کے عصر سعادت ہی میں پہنچ گیا تھا، اس عہد سے لیکر دسویں صدی ہجری تک علماء و دعاۃ، صلحاء و صوفیہ کی ایک کثیر جماعت کفرستانِ ہند و پاک کو اسلام کے نور سے منور کرتی رہی لیکن سیدنا امام ربانی مجدد سرہندیؒ کے دورۂ تجدید سے اس سرزمین کے لیے وہ عہدِ برکت شروع ہوتا ہے جب ہدایت و ارشاد کا خاص مرکز اس سرزمین کو قرار دیا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے زمانہ سے لیکر آج تک علماء و محدثین، اکابر صوفیہ و اصحاب دعوت و عزیمت جس قدر ہندوستان خصوصاً مضافات دہلی و دوآبہ کی سرزمین سے اٹھے، اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی اور ان سے جو خیر پھیلا اس کے اثرات و نقوش عالمگیر ہیں، اسی سلسلۃ الذہب کی آخری سنہری کڑی

العارف باللہ، المجاہد فی اللہ، الداعی الی اللہ، المؤید من اللہ، معدن الیقین والایمان، لسان الحق والدعوۃ، وارث علوم النبوۃ، قطب الارشاد صدیق وقتہ خلیل عصرہ العلامۃ الشاہ محمد یوسف الکاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی ہے۔

حضرت جیؒ قدس سرہ معرفت و نسبت، ایمان و یقین، دعوت و عزیمت، مجاہدہ و فنائیت کے جس مقام پر فائز تھے اس کا ادراک بھی مجھ جیسوں کی پرِ پرواز سے بالا ہے تاہم یہ بات بے محابا اور برملا کہی جاسکتی ہے کہ حضرت جیؒ اس دور میں ایمان و یقین کے امام، دعوت الی اللہ کے سب سے بڑے قائد، حکمت تشریعی کے رمز آشنا، اور علوم و معارفِ نبوت کے وارث کامل تھے مادیت کے اس دور میں جس کا خاصہ روحانی اقدار اور غیبی حقائق سے انکار ہے آپ کا وجود روحانیت کی سب سے بڑی قندیل تھا، روحانیت اور ایمانی حقائق آپ کے لیے ایک نظری و فکری عقیدہ نہیں تھا بلکہ صدیقیت کا وہ مقام آپ کو عطا فرمایا گیا۔ جہاں حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ مغیبات پر یقین شہود کی کیفیت حاصل کر لیتا ہے اور معاملہ عین الیقین سے گزر کر حق الیقین تک پہنچ جاتا ہے جس کے بعد دلائل کی ضرورت نہیں رہتی کہ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

بات یہ ہے، کہ اللہ تبارک و تعالیٰ عز اسمہ و عم نوالہ کی حکمت بالغہ جن اشخاص کو صدیقیت کے مقام سے نوازنا چاہتی ہے ان کے قلوب پر اپنے بعض خاص اسماء کی خصوصی تجلی اس شان سے فرماتی ہے کہ ان کا قلب متجلی و مزکی ہو کر غیر سے غافل اور ملاءِ اعلیٰ کے فیضان کے لینے کے قابل ہو جاتا ہے، اس وقت اسم ہادی کی وہ تجلی (جس کا سب سے بڑا مظہر اس عالم میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی ہے) ان قلوب کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور نظام تشریعی کے وہ حقائق و معارف جسے اللہ تبارک و تعالیٰ اس بندہ پر کھولنا چاہتے ہیں کھل جاتے ہیں اس وقت نسبت الٰہیہ کا ایک خاص القا ان قلوب پر ہوتا ہے۔ اور اس عالی نسبت کی برکت سے انھیں اپنے نبیؐ سے مناسبتِ تامہ نصیب ہو جاتی ہے اب جو علوم و احوال نبیؐ کی ذات لے کر آتی ہے، صدیق کا قلب بغیر کسی دلیل کے وجدانی طور پر اس کی اسی طرح تصدیق کرتا ہے جس طرح ایک انتہائی فاقہ زدہ شخص اپنی بھوک کو محسوس کرتا ہے اور اس وجدان و احساس کے خلاف کسی دلیل سے قائل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے شنید دید، اور قال حال ہو جاتا ہے، نبوت کی ہر قول و فعل، پر عمل اس کے لیے الٰہی روشنی ہوتا ہے اس کا ماننا اس کا فطری خاصہ طبعی جذبہ اور قلبی داعیہ بن جاتا ہے اسے نبوت سے ایسی مناسبت بخشی جاتی ہے کہ نبوت کا باطنی فیضان اس کے قلب

منور اور حقائق سے آشنا کر کے شریعت کو اس کی فطرت بنا دیتا ہے اس کے لیے نبیؐ کی ہر ادا حقیقت و نور، ہر قول و فعل دلیل و روشنی بن جاتا ہے۔ اس بنا پر اس کا دل یقین کا مستقر اور حقائق و معارفِ ایمانیہ کا مہبط بن جاتا ہے ایمان کا یہی درجہ اس میں تفویض و توکل علی اللہ تفرید و تجرید، اخلاص و رضا، تسلیم و قربانی صبر و شکر اور توحید کے جملہ مظاہر کا سبب بن جاتا ہے۔ حضرت حی قدس سرہ خود ایک جگہ اپنے خاص انداز میں ارقام فرماتے ہیں:

"مبدأ فیض تو خدا کی ذات ہے اور ضابطہائے فیوض حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور صفات ہیں، لیکن کاغذ کے نقوش سے حقیقت تک پہونچکر اس کو اپنے میں حاصل ہونے کے لیے محنت کر لینا اور اس حقیقت کا حامل بن جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اس لیے حق تعالیٰ شانہ اپنے فیوض کے فیضان کے لیے کچھ ہستیاں اس عالم میں وقتاً فوقتاً ایسے عام انسانوں کے سلوک و محنت کے لیے کھڑی کر دیتے ہیں کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کی حامل ہوتی ہیں، اور ذات باری تعالیٰ سے اکتساب فیوض اور اور ان کی رحمت و انعامات کے حصول کے لیے ان صفات کا اختیار کرنا سبب و ذریعہ بن جاتا ہے ..... ایسے ہی انسانوں میں دربارِ الٰہی و دربارِ رسالتؐ سے انوارات و روحانیت کا فیضان ہو کر عام مخلوق کی فیضیابی کا ذریعہ بنتا ہے ایسے ہی انسانوں کا وجود انبیاء کرام اور سلف صالحین کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبتِ عالیہ ایسے مبارک انسانوں کی ریاضات و مجاہدات کے ذریعہ وقتاً فوقتاً اس عالم میں اپنی برکات و انوارات کے ساتھ ظہور پذیر ہو کر بندگان خداوند قدوس جلّ و علیٰ مجدہ کے اللہ رب العزت کی طرف رجوع کا ذریعہ بن کر عمومی رحمت و انعامات کے دروازے کھلوانے کے ذریعہ اس عالی نسبت کی عظمت و وقعت و محبت کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ اللہ رب العزت کے ساتھ تعلق رکھنے والے سعادت مند انسان اس عالی نسبت کے حصول کی طرف متوجہ ہو کر بے نہایت دارین کی ترقیات حاصل کریں ..... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نسبت عظیمہ و عالیہ، روحانیہ و نورانیہ اپنے دونوں مظاہر (انفرادی و اجتماعی) کے ساتھ اس عالم میں ظاہر ہوتی رہی، محنت کرنے والے مبارک انسانوں کے ذریعہ اس نسبت عالیہ کا ظہور بھی ہوتا رہا۔" (الجمعیۃ دہلی شیخ السلام نمبر تقدیم و تاخیر)

اس درازِ نفسی کا مقصد یہ ہے، کہ فقیر کے نزدیک حضرت جی قدس سرہ کا مقام صدیقیت، ان کے باقی کمالات و جواہر کا منبع و منشأ تھا، آپ کے یقین کی دولت، آپ کی ایمانی قوت، آپ کا سوز دروں، آپ کی ربانیت و للہیت، آپ کی خشیت و محبت الٰہی، آپ کا زہد و ورع، آپ کا تقویٰ، آپ کی انابت الی اللہ، و التجا و دعا کی کیفیت، یہ جملہ صفات اسی مقام صدیقیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جامعہ و کاملہ اپنے مختلف الوان میں اشخاص متعلقہ کے ظرف و استعداد کے لحاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت جی قدس سرہ کی نسبت باطنی کے متعلق کلام تو کوئی دیدہ ور ہی کر سکتا ہے اس بے بصر کے نزدیک تو آخری دور میں نسبت یوسفیؒ مختلف الوان نسبت کا ایک عجیب اور نہایت ہی جامع گلدستہ بن چکی تھی جو جمال و جلال ربی کی تجلیاتِ خاصہ کا بوقلموں مرقع تھا جن کا پورا ادراک و بیان اس کوردنگاہ کا مقام نہیں لیکن ایک بات زبان قلم پر آئے بغیر نہیں رہتی، فقیر نے قلب یوسفیؒ پر نسبت شیخین رضی اللہ عنہما کا ترشح پایا ہے اپنے آخری سفر میں جب ٹل میں حضرتؒ نے ازراہ عنایت صافحہ فرمایا تو حضرت جی قدس سرہ کی قوتِ باطنی اور نسبت عالیہ کا ادراک کچھ اس شدت سے محسوس ہوا۔ کہ کئی دن تک یہ کیفیت رہی،

نگاہوں سے بھر دی رگ و پے میں بجلی نظر کردہ برق تپاں ہو رہا ہوں

بہرحال عرض یہ کر رہا تھا کہ نسبت شیخینؓ سے مناسبت بھی اسی صدیقی نسبت کا نتیجہ تھی جس سے حضرت جیؒ کو نوازا گیا تھا،

موجودہ دور جس کا سب سے بڑا مرض بے یقینی، ارتیاب و شک، مغیبات کا انکار، الٰہی حقائق اور نبویؐ معارف کا اتخفاف ہے۔ ضرورت تھی کہ حکمت الٰہیہ اس دور کے "قائد دعوت" کو حقائق ایمانیہ کے اس غیر متزلزل یقین سے نوازتی جو نبوت کی خاص میراث اور صدیقین کا خاصہ ہے بلکہ صدیقیت اسی کا عنوان ہے۔

"صدیقیت" کا یہ مرتبہ بلند اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات عالیہ کے کمال عرفان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حضرت جیؒ پر صفات الٰہیہ جس تفصیل و وضوح سے کھلی تھیں اس کی مثال کم دیکھنے میں آئی ہے اور وہ یقیناً صوفیا، کاملین اور محقق عارفین ہی کا حصہ ہے، توحید افعالی آپ کا مقام بن چکی

تھی۔ اور توحید کامل کا رسوخ دل کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ چکا تھا، نتیجہ ہر غیر سے برأت اور خلت کا وہ مقام تھا، جہاں کسی دوئی کا ادنیٰ شائبہ نہیں برداشت کیا جا سکتا اور یہ مقام سید الانبیا حضرت محمد رسول اللہ علی اللہ علیہ وسلم کے اس مقام کا ظل ہے جس کا اظہار لسان رسالت نے ان الفاظ میں فرمایا تھا،

لو کنت متخذا خلیلا من الناس	اگر میں اپنی امت میں کسی کو اپنا خلیل بناتا
لاتخذت ابا بکر۔	تو ابوبکر کو بناتا (لیکن اس لیے نہیں بنا سکتا کہ
(جامع ترمذی ابواب المناقب)	خلت کے تعلق میں اللہ کے سوا کسی کی گنجائش
	نہیں رہی۔)

حضرت جی نور اللہ مرقدہٗ کا وصال سے کچھ لمحات پیشتر یہ فرمانا کہ "میرے ساتھ کون ہے" اور ساتھیوں کے جواب پر یہ ارشاد کہ "میرے ساتھ کوئی نہیں میرے ساتھ میرا اللہ ہے" اسی مقام خلت کا عکس تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

توحید کے اس ارفع و اعلیٰ مقام کی بنا پر حضرت جیؒ دعوت بھی توحید افعالی کی ہی دیتے تھے، جن خوش نصیبوں کو حضرت جیؒ کے قریب رہنا نصیب ہوا اور جنھوں نے حضرت کی تقریریں اور مجلسی ارشادات سنے اور اللہ نے ان کا فہم بھی نصیب فرمایا ان کو بقدر اپنی استعداد کے اس کا ضرور اندازہ ہوا ہوگا کہ اس باب میں ان کا کیا مقام اور حال تھا۔ حق یہ ہے کہ ان کا وجود "لا الٰہ الا اللہ" کی مجسم تفسیر اور تصویر تھا۔

نسبت محمدی اور اتباع نبوی

توحید کامل، تعلق مع اللہ اور رضا و قرب حق کا واحد ذریعہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت و عظمت، محبت و اتباع (ظاہری و باطنی) ہے حضرت جی قدس سرہٗ جس طرح عظمت و محبت نبوی میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کا اندازہ ان کے ہر قول و عمل سے ہوتا تھا۔ آپ کی معرفت و عظمت کا نتیجہ تھا، کہ آپ کی ذات، آپ والے اعمال اور آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز انتہائی عزیز تھی، اور آپ کے طریقۂ عالیہ ہی کو دارین کی فلاح و کامیابی کا واحد و یکتا ذریعہ اور آپ کے والے

اعمال کو خداوندی خزائن سے استفادہ کی الٰہی جا بیاں یقین کرتے تھے، اسی بنا پر چھوٹی سے چھوٹی سنت چھوٹ جانے کو خداوند قدوس کے خزائن رحمت سے محرومی کا باعث سمجھتے تھے۔ آپ یہاں تک فرماتے تھے کہ محقق صوفیہ نے کہا ہے کہ سنت کے مطابق بیت الخلا یعنی فراغت واستنجا میں جو انوارات ہیں، وہ بعد میں دین کی خدمت کے لیے پیدا ہونے والے بڑے بڑے شعبوں میں نہیں یہی مفہوم ملا علی قاری نے مرقاۃ میں حدیث نبوی "فعلیك بسنة خیر من احداث بدعة" کی شرح میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے "ای (سنة) صغیرة او قلیلة کاحیاء ادب الخلاء مثلاً علی ما ورد فی السنة خیر من احداث بدعة ای افضل من سنة عظیمة کبناء رباط ومدرسة (حاشیہ مشکوٰۃ ص۳۱)

حضورؐ کی سنتوں کے مٹنے کا غم آپ کے سینہ کا مستقل ناسور تھا، آپ کی جگر دوز اور پُرسوز آہوں میں نہ معلوم کس قدر حصہ اعمال محمدیہ کے مٹ جانے کا تھا، آخری حج کے بعد ایک دعاء انتہائی سوز ورقت کی کیفیت میں اکثر فرمایا کرتے تھے "اللّٰھم اخرج الیھود والنصاریٰ والمشرکین من جزیرۃ الحبیب صلی اللہ علیہ جزیرۃ العرب" غرض حب نبوی اتباع نبوی حضرت جیؒ کا نفس ناطقہ بن چکا تھا، اسی طور پر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی محبت ان کا اتباع اور ان کی پاکیزہ زندگیوں کے حالات سے شغف حضرت جی کی زندگی کا حاصل تھا، اور اگر کہا جائے تو بالکل صحیح ہوگا کہ وہ اپنے انداز فکر ونظر احساسات وجذبات، عواطف ومیلانات میں صحابہ کا نمونہ تھے، ؏

صحابی گو نہیں لیکن نمونہ تھا صحابی کا،

مخدومی المکرم حضرت علی میاں نے خوب لکھا ہے اور حق لکھا ہے کہ

قد خالط حب الصحابة لحمه ودمه واستولى على مشاعره وتفكيره، وقد عاش فى اخبارهم واحاديثهم زمناً طويلا..... (حیاۃ الصحابہ کا پیش لفظ ص۱)

علومی امتیاز اور اس کا سرچشمہ

حضرت جیؒ کے علوم پر گفتگو کرنا مستقل وقت چاہتا ہے، صرف حیاۃ الصحابہ کی تین ضخیم مجلدات مصنف کے وسعت مطالعہ، کتب حدیث ورجال پر نظر اور احوال صحابہ کے مختلف گوشوں پر گہری نگاہ کا بیّن

ثبوت ہیں، گو عربی میں مستقل کتابیں اس فن میں لکھی گئی ہیں، جن میں سے متداول اُسد الغابہ، اصابہ و استیعاب وغیرہ ہیں ابن کثیر نے البدایہ میں بھی وفیات الاعیان کے ذیل میں التزاماً صحابہ کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ لیکن حضرت جیؒ کی حیاۃ الصحابہ محدثانہ ترتیب اور داعیانہ طرزِ فکر کے لحاظ سے صحابہ کی زندگی و کردار، سوانح و اخلاق کا نہایت مؤثر اور اچھوتا مجموعہ ہے۔

"أما فی الاحیاء" حضرت کی فقاہت و معرفتِ حدیث کی شاہد ہے لیکن ان علمی و تحریری دینی خدمات کے علاوہ جو کہ ایک مشغول ترین زندگی کی زندہ کرامت ہیں، فقیر کے نزدیک حضرت جیؒ کے وہبی علوم خاصہ حضرت جیؒ کے بیانات و ملفوظات ہی میں بکھرے ہوئے ہیں جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت جیؒ گھنٹوں مسلسل بیان کرتے رہتے تھے، بندہ نے خود ایک دن میں حضرت کے پانچ بیان سنے ہیں جن میں ایک ساڑھے پانچ گھنٹے کا تھا، یہاں علوم اندر سے پھوٹ کر نکلتے تھے، صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہیں کہہ رہے ہیں کہلوایا جا رہا ہے، علوم الٰہیہ کا فیضان موسلا دھار بارش کی طرح حضرت کے قلب پر ہوتا رہتا تھا اور فقیر کا گمان غالب یہ ہے کہ ذکر دائم کی طرح حضرتؒ کا یہ حال بن چکا تھا کہ ہر وقت و ہر حال میں سوتے جاگتے، بیٹھتے اُٹھتے علوم کا القا جاری رہتا تھا، ملاءِ اعلیٰ کی توجہات خاصہ کا مرکز آپ کی ذات بن چکی تھی، اور معارف ربانیہ، دقائق احسانیہ، اور سب سے بڑھ کر حقائقِ نظامِ تشریعی کا ورود و فیضان ہوتا رہتا تھا۔ حضرت حکیم الامۃ امام تھانوی قدس سرہ کا ملفوظ ہے کہ "بعض بزرگ جن کے علوم کی اشاعت ان سے کما حقہ نہیں ہو پاتی اللہ تعالیٰ انھیں 'لسان' عطا فرما دیتے ہیں، جیسے شمس تبریزؒ کی زبان مولانا رومؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی زبان حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ ہیں" (او کما قال) فقیر سمجھتا ہے کہ مامور من اللہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ان کی ذات سے کما حقہ اشاعت پذیر نہ ہو سکے، کام اجمال کی صورت میں رہا اور حضرت اشاروں پر قناعت فرماتے رہے، حضرت جی مولانا محمد یوسف قدس سرہٗ کی طرف جب حضرت مولانا الیاسؒ کی کامل نسبت منتقل ہوئی تو وہ علوم جو اجمالاً حضرت مولانا الیاسؒ کے سینہ میں تھے ان کی "زبان" حضرت جیؒ کو بنا دیا گیا۔ اور مفیضِ حقیقی نے آپ کی باطنی ترقیات کے ساتھ ان علوم کو خوب وضاحت و تفصیل سے آپ سے کہلوایا، یہاں تک کہ حضرت مولانا الیاسؒ کے زمانہ میں جو باتیں محض

اشارات تھیں، وہ تفصیلی رنگ میں سامنے آگئیں اور الیاسیؒ علوم کا چشمہ بڑھ کر نکرنا پیدا کنار ہوگیا۔ یہاں یہ بات واضح کردینی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کہ اہل اللہ پر جن علوم و معارف کا فیضان ہوتا ہے وہ کتاب و سنت کی ہی تبیین و تشریح ہوتی ہے، جسے ذات الٰہی اہل زمانہ کی سہولت کے لیے ان کی زبان سے کھول کھول کر بیان کروا دیتی ہے۔

حضرت جیؒ اور بیعت طریقت

حضرت جیؒ نور اللہ مرقدہٗ شیخ طریقت بھی تھے، بیعت چاروں سلسلوں میں اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے واسطے سے کرتے تھے، پہلے بیعت کی حقیقت و اہمیت اور اس کے آداب و ذمہ داریاں تفصیل سے بیان فرماتے اس کے بعد سلسلہ امدادیہ کے معروف طریقہ سے بیعت لیتے تھے اور بیعت میں خاص طور پر دین سیکھنے سکھانے اور دین کی دعوت کے لیے جان و مال کی قربانی دینے کا عہد بھی لیتے تھے، حضرتؒ کی بیعت کا منظر عجب رقت انگیز اور پر اثر ہوتا تھا، ایک مرتبہ رائے ونڈ میں ایک کثیر مجمع نے بیعت کی، بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں میں پگڑیاں اور چادریں وغیرہ تھیں اور اتنا کثیر مجمع تھا، کہ کئی حضرات مکبر کی طرح پکار پکار کر الفاظ بیعت کو بیعت کرنے والوں تک پہنچا رہے تھے عجیب دلکش منظر تھا، میرے ایک عزیز کہنے لگے کہ آج تو حضرت جیؒ نے امام شہید (سید احمد صاحب رائے بریلویؒ) کی یاد تازہ کردی،

یہ تو بیعت سلوک کے عام طرز کا تذکرہ تھا، لیکن ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ تبلیغی طریقۂ دعوت، خود ایک مستقل "سلوک" کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے جس میں سلوک صحابہ اور قرب بالفرائض کے طرز کو خاص اہمیت حاصل ہے،

حضرت جیؒ کا اصل امتیاز اور کارنامہ

خیر یہ تو حضرت جیؒ کے بعض کمالات کا سرسری تذکرہ تھا، حقیقتاً آپ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے، حافظ، قاری، مدرس، محدث، فقیہ، صوفی، مصنف، مبلغ سب ہی کچھ تھے لیکن سب سے زیادہ جس عمل پر آپ نے جان کھپائی اور جو عمل آپ کی زندگی کا مقصد بنا وہ اللہ کی طرف دعوت تھی، گویا اللہ تعالیٰ نے یہ تمام علمی و عملی صلاحیتیں انھیں اسی لیے ودیعت کی تھیں کہ دعوت علی منہاج النبوۃ کا جو طریقہ مندرس ہوچکا تھا، اسے اپنی وہبی صلاحیتوں سے

پوری طرح سمجھیں، سنبھالیں، زندہ کریں اور آگے بڑھائیں۔ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ پر دعوت کا یہ طریقہ جسے وہ 'قرن اول کا ہیرا' کہا کرتے تھے موجودہ دور میں اولاً کھلا، اور انھوں نے اپنے مجاہدات، مقبولیت عند اللہ اور توفیق ربانی سے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا فَبَلَّغَ اَحْسَنَ الْبَلَاغ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً، ہمارے حضرت سید الملۃ قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا الیاسؒ تو مامور من اللہ تھے، ایک مرتبہ اُن کے فضائل و کمالات کا تذکرہ فرما کر عجب وجد آفریں انداز میں دو تین مرتبہ فرمایا "سلام علیٰ الیاسین" حضرت مولانا الیاسؒ کی یہ دعوت موجودہ دور کی تمام دعوتوں اور دینی تحریکوں میں منہاج نبوت سے زیادہ قریب و اشبہ ہے، حضرت مولانا الیاسؒ کی زندگی اور دعوت پر حضرت مولانا ابوالحسن علی نے اپنی کتاب "حضرت مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت" میں جو لکھا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ ان سے جو لکھا یا گیا ہے۔ دعوت کے طریق کو سمجھنے کے لیے اس کا اور اس کے مقدمہ کا سمجھنا بنیاد کا درجہ رکھتا ہے، حضرت سید الملۃؒ کا مولانا مرحوم کے متعلق مضمون بھی خاص چیز ہے۔

بہرحال حضرت جیؒ نے اپنے والد ماجد قدس سرہٗ کے جانشین کی حیثیت سے اس کام کو سنبھالا اور اس پر اپنی جملہ صلاحیتوں اور استعدادوں کو اس طرح کھپایا، گویا یہ دعوت ہی ان کی زندگی کا مقصد تھی، وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے تھے، کسی مقصد میں اپنے آپ کو فنا کر دینے کی ایسی مثالیں تاریخ میں بھی شاذ و نادر ہی ملتی ہیں، شب و روز میں شاید مشکل چار پانچ گھنٹے آرام کے ملتے ہوں، دیکھنے والوں کو رحم آجاتا تھا، لیکن اللہ کا یہ مقبول اور فنا فی الدعوۃ بندہ دینی تقاضوں پر مجاہدات کی چکی میں مسلسل اپنے کو پیستا رہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو اسی محنت و دعوت کے لیے پیدا کیا تھا، حضرت امام ربانی مجدد سرہندیؒ کا یہ قول ان پر بھی اس کام کے بارے میں صادق آتا تھا کہ

"اے فرزند باوجود این معاملہ کہ تعلقت من مربوط بودہ است، کار خانہ دیگر عظیم بمن حوالہ فرمودہ اند، برائے پیری و مریدی مرا نیاوردہ اند، مقصود از خلقت کمن تکمیل وارشاد خلق نیست معاملہ دیگر است، و کار خانہ دیگر، درین ضمن ہر کہ مناسبت دارد فیض خواہد گرفت والا لا، معاملہ تکمیل وارشاد نسبت باآں کار خانہ امرے است بچوں مضروح

فی الطریق، دعوت انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات نسبت بمعاملات باطنیہ ایشاں ہمیں حکم دارد، ہرچند منصب نبوت ختم یافتہ است اما از کمالات نبوت و خصائص آں بطریق تبعیت و وراثت کمل تابعان انبیاء را نصیب است"

(مکتوب ۷۶ دفتر دوم حصہ ششم ص ۲۲)

حضرت جیؒ کے اخلاص عمل، مسلسل مجاہدات، طریق دعوت کی درستگی اور دعاؤں کا یہ اثر تھا کہ وہ کام جو حضرت مولانا الیاسؒ کے وصال کے وقت ہندو پاک کے صرف چند خاص خاص مقامات تک محدود تھا، وہ بڑھا، پھیلا اور دیکھتے دیکھتے یورپ و امریکہ جاپان و افریقہ، اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک پہنچ گیا۔ جماعتوں اور دینی قافلوں کی ہندو پاک اور بیرونی ممالک میں نقل و حرکت سے لاکھوں فیضیاب ہوئے، ہزاروں نے راہ پائی، سینکڑوں متقی کامل بنے، سوتے جاگے، بے طلبوں میں طلب پیدا ہوئی، بے دینوں میں احساس دین آیا، سونی مسجدیں آباد ہوئیں، اللہ کے دین کی آواز گلی گلی کوچہ کوچہ، قریہ قریہ ملک بہ ملک گونجی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنوں نے اس دعوت و محنت سے فیض پایا، اور کتنے بھٹکے ہوئے انسان راہ پر آئے کتنی مردہ سنتیں زندہ ہوئیں، کتنے فرائض میں جان پڑی، کتنی نئی مساجد تعمیر ہوئیں، کتنے غافل و بے بہرہ دینی علوم کے طالب بنے، کتنے ذاکر و شاغل بنے، کتنوں میں دین کا درد و فکر پیدا ہوا کتنے لذت و حقیقت دعا سے آشنا ہوئے، اس کام کے ثمرات عاجلہ کا بھی سچی بات یہ ہے کہ احاطہ نہیں کیا جا سکتا، آخرت ہی میں معلوم ہوگا، کہ اس کام کے چالو ہو جانے سے عالم میں کتنی خیر کی صورتیں پھیلیں،

دعوت تبلیغ کی فکری اساس (یا بنیادی ایمان و یقین)

دینی دعوت کے اس طرز کے متعلق جو نہیں جانتے اور جاننا نہیں چاہتے انھیں تو جانے دیجیے خود بہت سے تعلق رکھنے والے اور اس کی افادیت کے قائل حضرات بھی اس کی اصل حقیقت کو بہت کم جانتے ہیں۔

حضرت جیؒ کے سامنے یہ دعوت اپنی پوری ترتیب کے ساتھ منکشف تھی اور اس کا نقشہ بالکل مرتب تھا، اور یہ ترتیب و خاکہ ان کا کوئی ذہنی اختراع یا کسی انسانی دماغ کی کاوش

کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اٹل قوانین تشریعی اور نظام ہدایت کی معرفت و یافت سے حاصل ہوا تھا، اس وجہ سے یہ نظام حضرت حقؒ کے عقیدہ کا لاینفک جزو بن چکا تھا اس اجمال کی تفصیل کے سمجھنے کے لیے چند باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت نے جیسے اس کائنات کے نظام کو قائم فرمایا ہے اور گو اس کی قدرت اسباب کی قطعاً پابند نہیں تاہم اس کی حکمت نے اس کی قدرت کو عادی طور پر اسباب وعلل سے اس عالم میں ظاہر فرمایا ہے۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے نظام تشریعی میں بھی اسباب وعلل رکھے ہیں، نظام تشریعی مقصود ہے، نظام تکوینی نظام تشریعی کے بعض مقاصد کی تکمیل کے لیے پیدا فرمایا گیا، گویا نظام تشریعی اصل ومقصد ہے، اور نظام تکوینی اس کا ذریعہ اس وجہ سے نظام تشریعی کے قوانین میں انفکاک وتغیر وتبدل نہیں ہوتا لیکن نظام تکوینی کے عادی علل واسباب کو نظام تشریعی کی حکمتوں ومصالح کی بنا پر جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ چاہتی ہے توڑ دیتی ہے اور ان علل واسباب تکوینیہ کے ارادۂ الٰہیہ سے توڑ دینے کا نام معجزہ، خرق عادات یا کرامت ہے۔ حضرت سید الملۃ قدس سرہ نے سیرت النبی (۳۷۹/۳ وما بعد) میں اس پر قابل دید بحث فرمائی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل واسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے۔ اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے۔ کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضان نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو کس طرح پیش کرتا ہے انکار ومزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے۔ اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام وخاسر اور اہل ایمان فلاح یاب وکامیاب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنۃ اللہ کا لفظ آیا ہے، لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام وترتیب کی

طرف اشارہ ہے۔

فلسفۂ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار کے اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے۔ بعینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصول و قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں (سیرت النبی جلد پنجم ص ۲۸۹)

دوسری جگہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں سنت الٰہی کا ایک خاص مفہوم ہے اور اس اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند و موعظت ان کے لیے موثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اُن قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔ اور وہ بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلہ کی تھرتھراہٹ آندھی کی گھڑگھڑاہٹ دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک اور برباد ہو جاتی ہیں، یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی، اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے، اسی مفہوم میں آیا ہے ..... (اس کے بعد سید صاحبؒ نے وہ تمام آیتیں لکھ دی ہیں تاکہ کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے ہم نمونۃً صرف ایک آیت نقل کرتے ہیں) حدیبیہ کے موقع پر کفار قریش کو تنبیہ اور مسلمانوں کو تسکین دی جاتی ہے۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا. سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فتح ۳)	اور اگر یہ کافر تم سے لڑتے، تو پیٹھ پھیر دیتے، پھر وہ کوئی حامی نہ پاتے، اور نہ مددگار، اللہ کا دستور یہ پہلے سے چلا آتا ہے۔ اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پاؤ گے (تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت النبی ج ۳ ص ۲۷۹ تا ۲۸۱)

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت میں اس کا ایک اٹل قانون اور سنۃ اللہ جاری ہے کہ نبیؑ آتا ہے۔ اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے، جو خوش نصیب اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں وہ دارین کی فوز و فلاح اور کامیابی پاتے ہیں اور جو اس بات کو نہیں مانتے، اور نبیؑ کی امکانی کوششوں کے باوجود ایمان نہیں لاتے، بلکہ اس کے دشمن بن کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں وہ آخر اللہ تعالیٰ کی قدرت خاصہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایسا قانون ہے جس میں تغیر کا کوئی امکان نہیں، ہر زمانے میں یوں ہی ہوا اور ہمیشہ یوں ہی ہوگا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا یہ غیر متبدل دستور اور اٹل قانون انبیاء علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں (مومنین) کے لیے عام ہے۔ کہ ان کی کامیابی اور نجات ہوگی۔ اور اُن سے ٹکرانے والے ہلاک ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ (یونس - ۱۰)

کیا یہ کافر گذشتہ قوموں کی طرح واقعہ ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں، کہدے کہ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں، پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں، اور ایسے ہی ایمان لانے والوں کو۔ ہم پر فرض ہے ہم نجات دیں گے ایمان والوں کو،

خدا تعالیٰ کا قطعی وعدہ ہے کہ وہ مومنین کی مدد فرمائے گا۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ

اور ایمان والوں کی مدد ہم پر فرض ہے۔

(روم)

اسی قاعدہ کے تحت سورۃ المومن میں ارشاد ہے:

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ (المومن ع ۶)

یقیناً ہم ضرور بالضرور مدد فرمائیں گے اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جس طرح امم ماضیہ میں جاری اور سارئی تھی۔ اسی طرح اب جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین بن کے تشریف لے آئے اور آپ کی امت تمام اُمتوں کی جانشین بن کر اس عالم میں آئی ارشاد رسالت ہے۔

نحن اٰخر الامم (کنز ج ۱ ص ۲۳۳ بحوالہ ابن ماجہ) ہم آخری امت ہیں۔

تو جیسے پہلی امتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ چلن اور سنۃ اللہ جاری تھی اس اُمت میں بھی تا قیامت جاری رہے گی۔ کیونکہ ختم نبوت نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے زمانہ کو قیامت تک مستمر کر دیا ہے۔ اب اس زمانہ میں (یعنی بعثت محمدیہ سے لے کر تا قیام ساعت) اللہ کی وہ تمام نصرتیں اور مددیں جو طریقۂ محمدیہ اور دین حق اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص ہیں، باقی اور قائم ودائم ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ فرما لیا لیکن آپ کے فیوض وبرکات باقی اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت لینے کے طریقے اور قدرت خاصہ سے استفادہ کی صورتیں اُمت میں آپ کے احکام اور سنن کی شکل میں موجود ہیں۔ امت اپنی ذات میں مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ اپنے نبیؐ کی نائب اور خلیفہ ہے اور اس عالم میں اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوارح کی حیثیت سے کام کرنا ہے، اب اس میں جتنے جواہر نیابت وخلافت موجود ہوں گے اور اپنے نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ دعوت اور طریقوں میں جس قدر یہ ان کی شریک ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مددوں سے نوازی جائے گی اور اس کے اعمال پر قوموں کے لیے خیر وشر کا فیصلہ ہوگا۔

(۴) اُمت محمدیہ مرحومہ یوں تو امم سابقہ کی طرح جملہ احکام واعمال میں اپنے نبی کے طریقے پر ہوگی لیکن اس کا خصوصی امتیاز اس کی داعیانہ حیثیت ہے، جس کی وجہ سے اسے دوسری امتوں پر فوقیت اور فضیلت بخشی گئی۔ اور حقیقتاً یہ دعوت ہی اصلاً انبیا علیہم السلام کے زمانے میں خدا کی خصوصی مددوں کو متوجہ فرماتی تھی، اسی وجہ سے انبیاء کی دعوت کے ماننے والے کامیاب اور نہ ماننے والے ناکام اور خاسر وخائب ہوتے تھے۔ اسی بنا پر اس اُمت کی نصرت کو دین کی نصرت کے ساتھ مشروط کر دیا۔ اور دین کی نصرت کرنے والوں کو اپنی مدد کا پختہ یقین دلایا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد-۷)
وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحج-۶)

اے ایمان والو اگر تم مدد کرو گے اللہ کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور جمادے گا تمہارے قدم،
اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور مدد کرے گا اس کی جو اس کے (دین کی) مدد کرے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے زور والا ہے۔

اس بنا پر جب اُمت اپنے فریضہ دعوت الی الحق والخیر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں غفلت برتے گی تو اللہ تعالیٰ کی مدد سے محروم ہو جائے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے (مدد کی) جو دعائیں مانگیں گی وہ بھی قبول نہیں ہوں گی جیسا کہ احادیث میں آتا ہے (دیکھو کنز العمال ص۴۲۶ ج۲ ومشکوٰۃ باب الامر بالمعروف)

اُمت کی اس خاص داعیانہ حیثیت اور نیابت نبوت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی نصرتوں کے آنے اور دارین میں عافیت و فوز و فلاح کے پانے کا طریقہ اپنے اس فریضہ (دینی دعوت) کو مقصد قرار دے کر اس کی راہ میں اپنی جانوں کا کھپانا اور مال کا انفاق ہے۔ باقی اعمال ذاتی اور اخروی نجات تو دلادیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی وہ نصرتیں جو عالم کو ہدایت کی طرف پلٹادیں اور دشمنانِ ہدایت کو تباہی کے گھاٹ اتاردیں وہ دین کی دعوت کی محنت پر منحصر ہیں۔

(۵) پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دعوت بالکل منہاج نبوت کے مطابق ہو، کتاب اللہ صحیفۂ نظام ہدایت اور راہنمائے طریقۂ دعوت بھی ہے، یعنی قرآن پاک صرف دعوت ہی نہیں بلکہ طریق دعوت بھی سکھاتا ہے۔ اسی طرح اسوۂ نبوی صرف شخصی اور انفرادی اعمال کے لیے ہی نمونہ نہیں ہے بلکہ آپ کا طرز دعوت و تربیت بھی تا قیام الساعۃ ہدایت رسانی خلق کا افضل و اکمل اور موثر ترین طریقہ ہے۔

(۶) امت جب منہاج نبوت کے مطابق دعوت کو مقصد بنا کر احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے محنت و کوشش اور جہد و مشقت اور ایثار و قربانی کو پیش کرے گی تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت خاصہ سے سعید روحوں کو ہدایت کی طرف پلٹادیں گے، اور دعوت کے مقابل میں

آنے والی طاقتوں کو خود پاش پاش کر دیں گے۔ کہ سنۃ اللہ اسی طرح ہی جاری ہے لیکن خداوند قدوس کی یہ نصرت مختلف کی ایک خاص سطح پر آتی ہے۔

(۷) اُمّت مسلمہ پورے عالم کی طرف مبعوث ہے۔ یہ قعود و عزلت کی زندگی نہیں بسر کر سکتی، اس کی رہبانیت اور درویشی دین کی محنت ہے۔ اس لیے اُمّت کو مختلف احوال و ظروف میں ہجرت و نصرت اور نفر و جہاد کے احکام دیے گئے۔

ان اساسی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ان کے خلف الصدق اور خلیفۂ ارشد حضرت جی نور اللہ مرقدہٗ کی دعوت پر غور کریں گے تو کسی درجہ میں یہ بات سمجھ سکیں گے کہ یہ خاصانِ خدا اس کام کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے تھے، وہ یقین کے ساتھ سمجھتے تھے بلکہ گویا آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ یہ غیر متبدل سنۃ اللہ اور اللہ تعالیٰ کا اٹل دستور اور فیصلہ ہے کہ اس اُمّت کے لیے بلکہ سارے عالم انسانی کے لیے خیر و شر کے فیصلہ کا انحصار اب اُمّت محمدیہ کے عملِ دعوت اور اس راہ کی محنت و قربانی پر ہے اگر اس نے دعوت کے کام کو اور اس کی راہ میں ٹھوکریں کھانے کو نہیں اپنایا تو وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور مددوں سے محروم ہوگی اور سارے انسانی عالم کی بھی ہدایت و رحمت سے محرومی کا باعث بنے گی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور سینوں کو اس یقین سے بھر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے امت کے لیے اور عالم کے لیے خیر اور ہدایت کے فیصلے کرانے کا راستہ یہی ہے کہ اُمّت میں منہاج نبوی پر دعوت اور قربانی زندہ ہو اس کے سوا سب دروازے بند ہیں۔

حضرت جی قدس سرہٗ پر اللہ تعالیٰ نے ان تمام حقیقتوں اور سنۃ اللہ کے ان جملہ پہلوؤں اور نظام ہدایت کے دقیق رخوں کو پوری طرح منکشف کر دیا تھا اس وجہ سے وہ سمجھتے تھے، کہ امت محمدیہ، اگر آج حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم والے مقصد کو اپنا کر اور اپنے کو صفات نبویہ سے مزین کرتے ہوئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے میدانِ دعوت میں (جو کہ پورا عالم اور ساری نسل انسانی ہے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والے طریقوں اور صحابہ والی قربانیوں کے ساتھ اُتر آئے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، رحمت واسعہ اور ان کے تشریعی اٹل قوانین کی بنا پر اللہ تعالیٰ ہدایت کا فیضان فرما دیں گے، ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار اور قبضہ میں ہے، اور ہدایت لینے کا ضابطہ

اعمال محمدیہ کو اپناتے ہوئے منہاج نبویہ کے مطابق دعوت کے میدان میں ابراہیمی اور محمدی قربانیوں کو پیش کرنا ہے۔ امت محمدیہ کا جب ایک معتد بہ طبقہ صحیح رُخ سے دین کے لیے قربانی پیش کردے گا، اور وہ قربانی عند اللہ مقبول ہوجائے گی تو اللہ تبارک وتعالیٰ عالم کے لیے ہدایت کا فیصلہ فرمادینگے ہدایت کے لیے ایمان واعمال صالحہ اور دعوت اور قربانی اور دعائیں شرط ہیں ملک ومال شرط نہیں، اس لیے جس وقت اُمّت صحیح رُخ سے ہدایت کی محنت کرنے والی بن جائیگی اور اس کی قربانیاں اور دعائیں اللہ تعالیٰ سے مدد کا فیصلہ کروالیں گی، اُس وقت باطل کی قوتیں اللہ کی غیبی طاقت سے پارہ پارہ کردی جائیں گی۔ یہ محنت جس قدر نسبت محمدیہ کو اپنے اندر لیے ہوئے ہوگی اسی قدر اس کے اثرات عالمگیر ہوں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت عالمی ہے آپ والے اعمال کا اثر پورے عالم پر پڑتا ہے۔ آپ والے اعمال اگر اپنی حقیقت کے ساتھ ایک طبقہ میں بھی زندہ ہوجائیں اور وہ طبقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم والی محنت کو اخلاص اور جملہ اصولوں کے ساتھ اپنالے تو ان کی دعوت و دعاء پر اللہ تعالیٰ کی قدرت خاصہ پورے عالم کے باطل نظاموں کو توڑ دے گی جیسے امم ماضیہ میں فرعون ونمرود وشداد، وقوم عاد وقوم ثمود، اصحاب الایکہ اور دوسری متمرد اور باغی اقوام کو اپنی قدرت کاملہ سے ختم فرمایا تھا، ـــــ بات یقین کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین ہو، اور اس کے قوانین تشریعی پر ایمان ہو، تو یہ بات بعید نہیں دکھائی دے گی،

بہرحال حضرت جی رحمہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اللہ تعالیٰ کے نظام ہدایت کے اٹل قوانین اور غیر متبدل سنۃ اللہ کی بنا پر دعوت وہدایت کا ایک خاص خاکہ ونقشہ تھا، جس پر ان کا ویسا ہی ایمان ویقین تھا جیسا کسی بدیہی سے بدیہی چیز پر ہوسکتا ہے۔ اس خاکہ ونقشہ کا ہر خط وخال انبیاء علیہم السلام کے قصص، قرآن حکیم کی ہدایات، سنن نبویہ اور صحابہؓ کے احوال سے مرتب کیا گیا تھا۔ ان کے سامنے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی تھی، اور وہ ہر قدم خدا کی توفیق سے اسے دیکھ دیکھ کر اُٹھاتے تھے، یہ دعوت محض چند اعمال کی دعوت نہ تھی، بلکہ پورے دین کے احیاء کی پورے عالم میں کوشش تھی بعض ناواقف جو صورت حال سے واقف نہیں اسے سطحی دعوت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کی کم نگہی اور سطحیت

کی دلیل ہے، کاش وہ حضرات جنھیں اللہ تعالیٰ نے علمی وعملی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس کام کو سمجھتے اور اپنا لیتے، چند اعمال کے احیاء کا سوال نہیں، بلکہ ایک نئی قوم پیدا کرنی ہے، جو اپنے مقصد، عقائد وایمان، احوال واعمال، عبادات وللّٰہیت، افکار واحساسات، اخلاق ومعاشرت میں صحابہ کا نمونہ ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمت وقدرت سے امید ہے کہ جس طرح اس نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں اسے اُٹھایا، بڑھایا، چمکایا، اور اس سطح پر پہنچا دیا، آئندہ بھی اس کے فروغ کی صورتیں پیدا فرمائے گا وما ذلک علی اللہ بعزیز، ممکن ہے حضرت جی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وصال سے پیشتر بار بار ان کلمات کو پڑھنا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ صَدَقَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ" اسی طرف اشارہ ہو، (واللہ اعلم وعلمہ اتم)

حضرت جیؒ کی شخصیت سازی

کسی کامل شخصیت کا صرف یہی کمال نہیں ہوتا کہ وہ خود کامل ہے بلکہ شخصیت کے کمال کا ایک بڑا ثبوت شخصیت سازی میں اس کا کمال اور اس کی تاثیر ہوتی ہے حضرت مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی تاثیر قلبی، فیض صحبت اور باطنی اثر نے ہزاروں اشخاص کو تقویٰ اور دینی زندگی کا قابل رشک مقام عطا کر دیا، آج ہمیں ایسے سینکڑوں اشخاص معلوم ہیں جن کی زندگی کی کایا یکسر پلٹ گئی، کل جو ناز ونعمت اور تعیش کی گودوں میں پلے تھے آج ان کے زہد وقربانی کو دیکھ کر مصعب ابن عمیرؓ کی قربانی کی یاد تازہ ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ زندگی کے ظاہری وباطنی خاکے پلٹے بلکہ حضرت جیؒ کی یہ بڑی کرامت ہے کہ گئی ایسے اشخاص جن کا دین سے خاص تعلق نہ تھا حضرتؒ کے کام کو ایسا اپنا چکے ہیں، اور حضرتؒ کے علوم ومعارف ان کی زبانوں سے اس طرح جاری ہیں، گویا حضرت جیؒ ہی بول رہے ہیں گویا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یہ اللہ تعالیٰ کی خاص موہبت اور انعام تھا، جو اس دور کے یوسفؑ کو عطا ہوا، یہ بے بصر یوسفؑ زمانہ کے کون کون سے جمال وکمال کو بیان کرے ؎ دامن نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار

وہ مجموعہ کمال تھے، دین کا ایسا ہمدرد وغمخوار قرنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دعوتِ حق کا ایسا شیدائی اور اس کی راہ میں مرمٹنے والا صدیوں میں وجود میں آتا ہے ؎

سالہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

مہد سے لحد تک

از مولانا سید محمد ثانی حسنی ایڈیٹر ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ

ولادت حضرت مولانا محمد یوسفؒ کاندھلہ میں سہ شنبہ ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاسؒ اس وقت مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) میں مدرس تھے۔

۲ جمادی الثانی دوشنبہ کے دن عقیقہ ہوا اور نام محمد یوسف رکھا گیا۔

ماحول اور بچپن مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی اس میں مرد تو مرد عورتیں تک دین داری اور تقوے میں ممتاز تھیں، خاندان میں قرآن مجید کا حفظ کرنا معمول سا بن گیا تھا، بچے، بوڑھے، مرد و عورت عام طور پر حافظ ہوتے تھے، گھر کی بیویاں تلاوت، ذکر و تسبیح اور نوافل وغیرہ کا بڑا اہتمام کرتیں، ہر طرف علم و تقویٰ کا چرچا تھا، خاندان اور خاندان کے باہر کئی بزرگ ہستیاں موجود تھیں جن کی دعائیں اور شفقتیں مولانا محمد یوسفؒ کے ساتھ تھیں

اسی کا نتیجہ تھا کہ سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا، اس وقت بستی نظام الدین اولیاءؒ میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں تھے۔

والدین کی تربیت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ ایک معزز اور صالح بزرگ مولانا رؤف الحسن صاحب کی بیٹی تھیں اور والد ماجد خود ایک بڑے بزرگ اور شیخ طریقت نرم و گرم پر نظر رکھنے والے تھے، اس لیے ان دونوں نے اپنے ہونے والے نامور فرزند کی خوب اچھی طرح تربیت کی، اور چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا خیال رکھا مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے ایک مجلس میں خود فرمایا۔ "ہماری اماں جی نے ہماری تربیت اس طرح کی کہ کوئی مہمان بیوی مٹھائی

یا کیلے وغیرہ تحفہ میں، لاتیں اور میں ان کی طرف دیکھ لیتا تو مہمان کے جانے کے بعد اماں جی میری پٹائی کر دیتیں کہ تم نے مٹھائی کی طرف گھور کر کیوں دیکھا"۔۔۔ ایک بار فرمایا "میں نے سوا ایک دفعہ کے بازار سے ایک آنہ کی بھی مٹھائی خرید کر نہیں کھائی، یہ وجہ نہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہ ہوتے تھے بلکہ بات یہ تھی کہ میں نے پیسے جمع کرنے کا ایک ڈبہ بنا لیا تھا اور اس میں جو پیسے مجھ کو ملتے ڈال دیا کرتا تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں خریدوں گا۔ (۱)

بستی نظام الدین میں مہمانوں کی کثرت رہتی۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ مہمانوں ہی کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تھے۔ مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۱۲-۱۳ سال کی رہی ہوگی۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے مہمانوں کو ناشتہ کرانے، کھانا کھلانے اور اس سلسلہ کی اور دوسری خدمتیں اسی کم عمری میں مولانا محمد یوسفؒ صاحب کے سپرد کر دی تھیں۔ مولانا روزانہ اندر سے کھانا لاتے اور فارغ ہونے کے بعد برتن لے جاتے۔

مدرسہ کاشف العلوم (بستی نظام الدین) میں پڑھنے والے طلباء کے وظائف اور کھانے پینے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، طلباء کی ٹولیاں باری باری سارے طلباء کا کھانا پکاتیں اور اس سلسلہ کے چھوٹے بڑے سارے کام خود ہی کرتیں۔ مولانا محمد یوسفؒ ان کے ان کاموں میں بھی شریک رہتے، ان کے ساتھ آٹا گوندھتے، مسالہ پیستے اور جنگل سے جلانے کے لیے جھاڑ جھنکاڑ گھسیٹ کر لاتے۔

تربیت کا اثر والدین کی اسی تربیت کا اثر تھا کہ عام لڑکوں کی طرح وہ اپنے فرائض سے غافل نہیں رہتے تھے، لہو ولعب میں اور بیکار وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے تعلیم کا شوق تھا صحابہ کرامؓ کے تذکرے اور خدا کی راہ میں ان کی جانبازی اور قربانی کے واقعات سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ فتوح الشام کا اردو منظوم ترجمہ صمصام الاسلام جس میں صحابہ کرام کے جہاد اور فتوحات کا تذکرہ ہے، بچپن ہی میں ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ (۲)

ابتدائی تعلیم ابتدائی تعلیم میں قاری معین الدین صاحب نے تجوید کھائی۔ گیارہ سال کی

(۱) روایت مولوی شبیر احمد حیدرآبادی (۲) روایت حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ

عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے مدرسہ کاشف العلوم (بستی نظام الدین) میں عربی شروع کی۔ سب سے پہلے میزان الصرف پڑھی اور ۱۵ - ۲۰ دن میں ختم کردی، اس وقت مولانا مرحوم کے ساتھی قاری سید رضا حسن صاحب مرحوم اور مولانا محمد ادریس صاحب انصاری اور بعض دوسرے حضرات تھے، طلباء کی یہ مختصر جماعت تھی جو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے پڑھ رہی تھی۔ میزان الصرف کے بعد منشعب، اس کے بعد صرف میر پڑھی پھر پنج گنج دوسرے استاد سے پڑھی۔ پنج گنج کے بعد پھر خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے نحو میر پڑھائی۔ اس کے بعد قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی چہل حدیث حفظ کرائی۔ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تعلیم میں حافظ منیر الدین صاحب نے بھی حصہ لیا اور متعدد کتابیں پڑھائیں فقہ کی کتابیں کنز الدقائق تک حافظ مقبول حسن گنگوہی سے پڑھیں۔

اعلیٰ تعلیم اوپر کی کتابیں زیادہ تر خود حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ سے پڑھیں، ۱۳۵۱ھ میں حضرت مولاناؒ سفر حج پر تشریف لے جانے لگے تو مولانا محمد یوسف کو مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخل کردیا۔ وہاں اس سال آپ نے ہدایہ اولین اور میبذی وغیرہ پڑھیں۔ حضرت مولاناؒ کی حج سے واپسی کے کچھ مدت بعد مولانا محمد یوسف صاحب پھر بستی نظام الدین میں آگئے اور آگے کی کتابیں مشکوٰۃ جلالین وغیرہ وہیں پڑھیں۔ ایک سال کے بعد ۱۳۵۴ھ میں دوبارہ مدرسہ مظاہر علوم میں آکر صحاح اربعہ پڑھیں۔ صحیح بخاری شریف حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے، صحیح مسلم مولانا منظور احمد خاں صاحب مرظلہ سے، سنن ابوداؤد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ سے جامع ترمذی حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کیملپوری سے، مولانا انعام الحسن صاحب بھی ساتھ اور ہم سبق تھے۔ مولانا ممدوح ہی نے ذکر فرمایا کہ ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کرلیا تھا کہ رات کے ابتدائی آدھے حصہ میں ہم میں سے ایک مطالعہ کرے گا اور دوسرا سوئے گا، اور آدھی رات ہوجانے پر مطالعہ کرنے والا چائے بنائے گا اور دوسرے ساتھی کو اٹھا کر اور اس کے ساتھ چائے پی پا کر سو جائے گا اور اس دوسرے کے ذمہ ہوگا کہ فجر کی جماعت کے لیے سونے والے ساتھی کو اٹھائے۔ ایک دن

حضرت مولانا مرحوم شروع رات میں مطالعہ کرتے تھے اور میں سوتا تھا اور دوسرے دن اسکے برعکس ترتیب رہتی تھی، لیکن تعلیمی سال ختم ہونے سے پہلے ہی مولانا مرحوم کی علالت کی وجہ سے مظاہر علوم سے نظام الدین آجانا پڑا۔ مولانا انعام الحسن صاحب بھی ساتھ ہی آئے اور صحاح اربعہ کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا وہ اور صحاح ستہ کی باقی دو کتابیں ابن ماجہ، نسائی اور انہی کے ساتھ شرح معانی الآثار طحاوی اور مستدرک حاکم بھی اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے نظام الدین میں پڑھیں۔

نکاح ۲ محرم ۱۳۵۴ھ کو جس دن کہ مدرسہ مظاہر علوم کا سالانہ جلسہ تھا، شیخ الحدیث مدظلہ کی بڑی صاحبزادی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کا اور اُن سے چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ مولانا انعام الحسن صاحب کا نکاح ہوا۔ مجلس نکاح میں مظاہر علوم اور دار العلوم دیوبند کے اکابر علماء اور دوسرے مشائخ شریک تھے۔ نکاح حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا۔

صاحبزادہ مولانا محمد ہارون کی پیدائش ۲۳-۲۴ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ دوشنبہ و سہ شنبہ کی درمیانی شب میں اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایک فرزند عنایت فرمایا، محمد ہارون نام رکھا گیا جو الحمد للہ اس وقت ۲۸ سال کے ہیں اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر ہیں۔

پہلی اہلیہ کا انتقال اور دوسرا نکاح پہلی اہلیہ محترمہ مولانا محمد ہارون کی والدہ مرحومہ نے طویل علالت کے بعد ۲۹ شوال ۱۳۶۶ھ (ستمبر ۱۹۴۷ء) بروز دوشنبہ ایسی حالت میں کہ مغرب کی نماز اشارہ سے ادا کر رہی تھیں اور سجدہ کا اشارہ کر کے گویا سجدہ میں جا چکی تھیں، جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اللّٰھم اغفر لھا وارحمھا۔

تقریباً تین سال کے بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ہی کی دوسری صاحبزادی کے ساتھ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ کو عقد ہوا۔ یہ اہلیہ محترمہ بحمد اللہ بقید حیات ہیں، لیکن ان سے اولاد کوئی نہیں ہوئی۔

بیعت و ارادت حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مدظلہ جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ہم زلف بھی ہیں اور بچپن اور تعلیم کے ساتھی بھی اور آخر تک مشیر کار و دست راست رہے

اور اس وقت حضرت مرحوم کے جانشین اور تبلیغی کام کے نگراں و امیر ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ مدظلہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگ ابھی تک حضرت سے بیعت نہیں ہوئے ہیں تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ تم لوگ چچا جان (مولانا محمد الیاسؒ) سے بیعت ہو چکے ہو، بہر حال اب دیر نہ کرو۔ ہم لوگوں نے حضرت مولانا سے بیعت کی درخواست کی حضرت نے منظور فرمایا۔ خود غسل فرمایا اور بڑا اہتمام فرمایا اور پھر خوشی کے ساتھ بیعت فرمایا اور فرمایا اللہ مبارک کرے اور انشاء اللہ مبارک ہی ہے۔

پہلا حج اور دعوت کا کام حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دیرینہ خواہش تھی کہ تبلیغ و دعوت کا جو کام ہندستان میں چل چکا ہے اور کچھ علاقوں میں اللہ کے فضل سے جم بھی گیا ہے وہ اب باہر بھی پہنچنا چاہیئے، خصوصاً دیارِ عرب میں جہاں سے یہ کام چلا تھا، ۱۳۵۶ھ میں آپ کے دل میں اس کا داعیہ بڑی شدت سے پیدا ہوا۔ آخر کار ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ میں حج کیلئے روانہ ہو گئے۔ ہمراہی میں مولانا احتشام الحسن صاحب (۲) حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ (۳) مولانا انعام الحسن صاحب (۴) مولانا نور محمد صاحب میواتی (۵) حاجی عبدالرحمٰن صاحب (۶) مولانا ادریس صاحب اور دوسرے حضرات بھی تھے۔ حجاز میں تبلیغی کام کی ابتدا ہوئی، عربوں کے ایک اجتماع میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے عربی میں ایک تقریر بھی فرمائی جس کا سامعین پر اچھا اثر پڑا۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی عمر اس وقت تقریباً اکیس ۲۱ سال تھی، یہ حج مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا آخری حج تھا اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا پہلا حج۔ دوسرا حج بیس ۲۰ سال کے بعد ۱۳۷۶ھ میں کیا۔ اور تیسرا آخری حج ۱۳۸۴ھ

خلافت و نیابت ۱۲ر جولائی ۱۹۴۴ء کو بروز چہار شنبہ جب کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سفر آخرت کی تیاری فرما رہے تھے گویا کہ زندگی کا یہ آخری دن تھا نظام الدین میں علماء اور مشائخ جمع تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی اور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کو یہ پیام پہنچا کہ مجھے اپنے آدمیوں میں سے ان چند پر اعتماد ہے آپ لوگ جسے مناسب سمجھیں اس کے ہاتھ پر ان لوگوں کو بیعت کرا دیں، جو مجھ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں (۱) حافظ مقبول حسن صاحب (۲) قاری داؤد صاحب (۳)

مولوی احتشام الحسن صاحب کاندھلوی (۴) مولوی یوسف صاحب (۵) مولوی انعام الحسن صاحب (۶) مولوی سید رضا حسن صاحب۔

ان حضرات نے دوبارہ مشورہ کرکے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ مولوی یوسف صاحب ماشاءاللہ ہر طرح اہل ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے خلافت کے لیے "القول الجمیل" میں جو شرائط لکھے ہیں وہ سب بحمداللہ ان میں پائے جاتے ہیں، عالم ہیں، متورع ہیں اور علوم دینیہ سے اشتغال رکھتے ہیں۔ فرمایا — اگر تم نے یہی انتخاب کیا ہے تو اللہ اسی میں خیر و برکت فرمائے گا مجھے منظور ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ پہلے مجھے بڑا کھٹکا اور بے اطمینانی تھی اب بہت اطمینان ہوگیا ہے امید ہے کہ انشاءاللہ میرے بعد کام چلے گا۔

رات کے پچھلے پہر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا اکرام الحسن صاحب کو یاد فرمایا۔ مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا "یوسف آ مل لے ہم تو چلے" اور صبح کی اذان سے پہلے جان، جاں آفریں کے سپرد کردی اور عمر بھر کا تھکا مسافر جو شاید کبھی اطمینان کی نیند سویا ہو منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سو گیا ؎

رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

صبح کی نماز کے بعد بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی جانشینی عمل میں آئی اور مولانا کا عمامہ ان کے سر پر باندھا گیا۔

اب دعوت و تبلیغ کا پورا بوجھ حضرت مولانا محمد یوسف کے کاندھوں پر آگیا اور دعوت و تبلیغ کے قافلہ کے سالار بن کر دنیا کے سامنے آئے۔

نظام الدین کے شب و روز حضرت مولانا محمد یوسف صاحب جب تک بستی نظام الدین میں قیام کرتے تو شب و روز کا نظام اس طرح رہتا، صبح کی نماز اکثر خود پڑھاتے بعد نماز دعا فرماتے عموماً نماز خوب اسفار میں ہوتی، دعا کے بعد تقریر فرماتے جو تقریباً دو گھنٹہ تک رہتی۔ بعض اوقات دھوپ کافی نکل آتی اور لوگ دھوپ میں بصد شوق تقریر سنتے، مولانا کبھی بیٹھ جاتے اور جوش آتا تو کھڑے ہوجاتے۔ دھوپ کی تیزی کی بنا پر کوئی خادم یا طالب علم چھت سے لمبائی کی طرف سے دری (جس پر نماز پڑھی جاتی تھی) لٹکا دیتا تاکہ حضرت مولانا کو دھوپ سے

تکلیف نہ ہو۔ اس کے بعد جماعتوں کی تشکیل ہوتی۔ اس کے بعد حضرت مولانا اپنے حجرہ میں آنے والے مہمانوں کو ناشتہ کراتے اور یہاں بھی مولانا کی گفتگو جاری رہتی اور موضوع اور مرکزی نقطہ اس گفتگو کا بھی دین کے لیے محنت و قربانی ہی ہوتی، کبھی جماعتوں کی سرگزشت اور مختلف علاقوں سے آنے والے مہمانوں سے کام کے متعلق دریافت حال، اکثر اسی مجلس میں اجتماعات کی تاریخیں بھی طے ہوتیں، پھر مہمان رخصت ہوتے تو ان کو ہدایات دیتے، اس کے بعد ۱۱ بجے کے قریب جماعتوں کی روانگی کے وقت حضرت مولانا رخصتی تقریر فرماتے جس میں اصول، طریقہ کار اور نظام الاوقات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے، پھر تمام مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اس کے بعد ظہر تک قیلولہ، نماز ظہر کے بعد مطالعہ اور درس حدیث جو قریب عصر تک جاری رہتا، بعد عصر خطوط کے جوابات لکھاتے، مہمانوں سے ملتے، اور کبھی کبھی اس وقت بھی تقریر فرماتے، بعد نماز مغرب سورہ یٰسین کا ختم ہونا ختم پر دعا ہوتی، کبھی خود دعا کراتے، کبھی صرف شرکت فرماتے، کبھی کسی کی تقریر بھی ہوتی، اس کے بعد مہمانوں کو کھانا کھایا جاتا جن کی تعداد عموماً سیکڑوں ہوتی، اسکے بعد نماز عشاء ہوتی۔ عشاء کی نماز کے بعد عہد نبوی اور عہد صحابہؓ کے واقعات کا کتابی درس ہوتا پہلے تو یہ کام اکثر البدایہ والنہایہ سے لیا جاتا تھا لیکن جب سے خود مولانا کی ترتیب دی ہوئی حیات الصحابہ تیار ہوگئی تھی وہی سامنے رہتی، ادھر چند سالوں سے بعد نماز عشا کا یہ درس دوسرے حضرات کے سپرد ہوگیا تھا۔

دین کے لیے محنت و قربانی کی دعوت مولانا کی روح بن گئی تھی، ہر تقریر اور گفتگو کا موضوع یہی ہوتا تھا، شروع میں تو تین چلوں اور سات چلوں کی دعوت دی جاتی تھی لیکن آخر زمانے میں عمر اور ہر سال ۸-۸ مہینے کی دعوت دیتے تھے۔ مولانا کی دعوت اور اس کی کیفیت میں مسلسل ارتقا جاری تھا اور گزشتہ سال جب مولانا نے اپنے رفقاء کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ آخری حج کیا اس حج میں اور حج کے بعد مولانا پر اپنے کام اور اپنی دعوت کا اور زیادہ غلبہ ہوگیا تھا۔

آخری حج آپ نے ذیقعدہ ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۶۴ء ذریعہ ہوائی جہاز اپنی زندگی کا آخری حج کیا، اس حج کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس سفر میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ بھی ہمراہ تشریف لے گئے تھے اور تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے خواص کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی

خود حضرت مولانا اور حضرت شیخ الحدیث اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب اور مولانا محمد ہارون صاحب اور چند اور رفقا تو ہوائی جہاز سے گئے تھے۔ باقی حضرات بحری جہازوں سے گئے تھے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر صبح و شام حضرت مولانا کی تقریریں شروع ہوگئیں حرم شریف میں اور اُس کے علاوہ بھی مختلف مقامات کے خصوصی اجتماعات میں خطاب فرماتے۔

۲۷ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے، نصف یوم اور ایک شب راستہ میں بدر ٹھہرے۔ ۲۸ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ پہنچے، مدینہ منورہ میں بھی صبح و شام اجتماعات ہوتے۔ ہر ہر طبقہ میں خطاب فرمایا۔ ہندستانی مجمع، بخاری مجمع، عربی مجمع، الغرض کوئی وقت ایسا نہ تھا جس میں مولانا کا خطاب نہ ہوتا ہو۔ حرمین پاک میں عموماً فجر کی نماز غلس میں (یعنی اندھیرے میں) ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کا خطاب نماز کے جلد ہی شروع ہو جاتا اور سورج خوب بلند ہونے تک جاری رہتا، لوگ ہمہ تن گوش ہو کر خطاب سُنتے اور پہلو نہ بدلتے، اس مبارک سفر میں طالبین حق کا ایسا رجوع عام ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مولانا کی دعوت پر لمبی لمبی مدت کے لیے ۲۶ جماعتیں نکلیں، جن میں سے اٹھارہ[۱۸] یورپ وغیرہ کے دُور دراز ممالک فرانس، مغربی جرمنی، انگلستان وغیرہ کے لیے، اور آٹھ جماعتیں مختلف ممالک عربیہ کے لیے۔

مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ واپسی ہوئی اور سولہ[۱۶] دن وہاں پھر قیام فرمایا۔ پھر وہاں سے کراچی تشریف لائے اور پہونچتے ہی وہاں کے تبلیغی مرکز کی مسجد میں تقریباً تین گھنٹے تقریر کی، تین دن کراچی میں قیام رہا اور عادت و معمول کے مطابق دعوتی تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا ــــ کراچی سے لائل پور تشریف لائے راستہ کے قریب قریب ہر اسٹیشن پر اللہ کے لیے محبت کرنے والے زائرین کا مجمع ہوتا تھا۔ جہاں وقت میں گنجائش ہوتی آپ اپنی کچھ بات فرماتے اور دعا ہوتی۔ لائل پور سے سرگودھا۔ سرگودھے سے ڈھڈیاں (جہاں حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ آرام فرما ہیں)

اس کے بعد راولپنڈی، رائے ونڈ، لاہور۔ ان تمام مقامات پر کم وبیش قیام فرمایا، ہر جگہ صبح وشام گھنٹوں خطاب فرماتے رہے، بولتے بولتے گلے میں سوجن ہوگئی، ڈاکٹروں نے اصرار سے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے بولنا چھوڑ دیا جائے۔ مگر حضرت مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے حسب عادت تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا اور مرض ترقی کرتا گیا۔

پاکستان کا آخری سفر حضرت مولانا فروری ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتہ میں براستہ لاہور ڈھاکہ کے اجتماع میں تشریف لے گئے، وہاں کے اجتماع سے فارغ ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کے اہم مقامات پر اجتماعات ہوئے اور تقریروں کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد پھر مغربی پاکستان تشریف لائے۔ کراچی، میرپور خاص، ملتان، کنگن پور، ٹل (کوہاٹ) اور راولپنڈی کے اجتماعات ہوئے، جن میں حسب معمول حضرت مولانا تقریریں فرماتے رہے، اسکے بعد رائے ونڈ کے اجتماع میں رونق افروز ہوئے، یہاں آخری دن (۲۳ مارچ کو) تقریباً ستر جماعتیں رخصت کیں، اس پورے دورہ کے اجتماعات میں دو مستقل تقریریں صبح اور شام کو ضرور فرماتے، اس کے علاوہ عصر سے مغرب تک خصوصی مجلس میں بیان ہوتا، ناشتہ اور کھانے کے وقت بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ——

رائے ونڈ کے اجتماع کے بعد لاہور تشریف لے آئے، پھر وہاں سے نارووال کے اجتماع میں تشریف لے گئے، اندرونی طور پر کچھ تکلیف محسوس کرتے رہے مگر ان کے بے مثل ضبط و تحمل نے اس کو ظاہر نہ ہونے دیا، احباب کو وقت آخر جاکر علم ہوا کہ وہ کتنی تکلیف میں مبتلا رہے ہیں، وہاں دو دن کے بعد جمعۃ المبارک کی ادائگی کے لیے گوجرانوالہ رُک گئے اور اس تکلیف کے باوجود جمعہ سے قبل اور اس کے بعد وہاں تقریر بھی فرمائی، عصر کے قریب لاہور بلال پارک چلے آئے اور یہاں بھی اُس تکلیف کے باوجود بیانات برابر جاری رہے۔ ہفتہ کی شام کو دو گھنٹہ تک تقریر فرمائی اور اگلی صبح اتوار کو جماعتوں کو رخصت کرنے سے پہلے ہدایات سے نوازا، پونے دس بجے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ مولانا ٹیلیفون کمپاؤنڈ میں چلے گئے وہاں دس بجے عورتوں کا اجتماع تھا اور مولانا کا بیان ہونا تھا۔ (۱)

دوشنبہ کو پھر رائے ونڈ تشریف لے آئے تین دن یعنی جمعرات تک پھر قیام فرمایا روزانہ صبح کو خواص سے خطاب فرماتے، ان تینوں دنوں میں بڑی اہم ہدایتیں اور نصیحتیں کام کرنے والوں کو فرمائیں۔

---

(۱) سید ذوالفقار حسین بخاری، حضرت جی نمبر غلام الدین لاہور

لاہور کا ورود اور انتقال ۲ اپریل جمعہ کے دن ٹرین سے سہارن پور کے لیے روانگی طے تھی، جمعرات کے دن رائے ونڈ سے فارغ ہو کر لاہور تشریف لے آئے، ایک دن پہلے (بدھ کے دن) گلے سے معدے تک سانس کی نالی میں چبھن محسوس فرماتے تھے، لاہور پہنچکر طبیعت میں تقریر کے لیے آمادگی نہیں تھی۔ حضرت مولانا کے لیے یہ بالکل غیر معمولی اور نئی بات تھی اور طبیعت کے اس حال کا اظہار بھی فرما دیا تھا، بلال پارک میں (جہاں لاہور کا تبلیغی مرکز ہے اور وہیں مولانا کا قیام تھا) حسب معمول بعد مغرب جمعرات والا اجتماع شروع ہوا اور چونکہ عام طور سے یہ اطلاع تھی کہ حضرت مولانا کل جمعہ کو ہندستان تشریف لے جائیں گے اور لوگوں کا خیال تھا کہ آج کے اجتماع میں مولانا کے اس سفر پاکستان کی آخری تقریر ہوگی اس لیے مجمع زیادہ آگیا اور کچھ ایسے حضرات بھی آگئے جو عام طور سے تبلیغی اجتماعات میں آیا نہیں کرتے، اس لیے بعض مخلصین نے عرض کیا کہ کچھ ضرور فرماویں، مولانا نے ارادہ فرمالیا اور طبیعت کے انتہائی احساس ضعف کے باوجود ہمت اور قوت ارادی استعمال کر کے کھڑے ہوگئے اور سوا گھنٹے تک تقریر فرمائی، صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مولانا زبردستی تقریر فرما رہے ہیں، پیشانی تک سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور آواز میں بہت نقاہت تھی، تقریر کے بعد تشکیل شروع ہوئی، اس وقت بھی طبیعت پر جبر کر کے بیٹھے رہے، اس کے بعد ایک نکاح پڑھانا تھا وہ بھی پڑھایا لیکن اس موقع پر تقریر نہیں فرمائی اور دعا بھی مختصر فرمائی جو ان کے عمر بھر کے معمول اور طریقہ کے لحاظ سے بالکل نرالی بات تھی، اس لیے خاص ساتھیوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے، مجلس نکاح سے اٹھ کر قیام گاہ کی طرف چلے جو بالکل برابر میں تھی، چلتے ہوئے فرمایا مجھ کو سنبھالو، سعید ابن صدیق صاحب اور ریاض لاہوری نے گلے اور کمر کو ہاتھوں سے سہارا دیا۔ چند قدم بڑھتے ہی لڑکھڑا گئے اور غشی طاری ہوگئی، اٹھا کر کمرہ میں لایا گیا اور اسی بیہوشی کی حالت میں لٹا دیا گیا، ایک حکیم صاحب جو سفر میں ساتھ تھے اُن کے پاس جواہر مہرہ تھا انھوں نے دودھ میں گھول کر چمچہ سے پلایا، چند منٹ کے بعد کچھ ہوش آگیا، ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے تھے، نبض بہت ہی ضعیف تھی، لاہور کے نامور ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب کو بلایا گیا، انھوں نے دیکھ کر کہا کہ قلب پر ایسا شدید حملہ ہوا تھا کہ اس سے بچ جانا بس ایک کرامت ہے انھوں نے مشورہ دیا

کہ مولانا کو اسی وقت ہسپتال میں داخل کر دیا جائے لیکن اس پر عمل نہیں ہو سکا اور ڈاکٹر صاحب کی تجویز کردہ دواؤں کا استعمال شروع ہوا۔ آدھی رات گزرنے کے کافی بعد حضرت مولانا نے عشاء کی نماز ادا کی، صبح تک طبیعت ایسی سنبھل گئی کہ کرنل ضیاء اللہ صاحب نے جب آکر دیکھا تو انھیں سخت حیرت ہوئی، سب لوگ ایک دم جیسے مطمئن ہو گئے۔ اسی اثناء میں مولانا نے کچھ ضروری باتیں بھی کیں۔ اس سلسلہ میں مولانا انعام الحسن صاحب سے یہ بھی فرمایا کہ میری کتابوں کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ بہر حال دوپہر تک طبیعت بہت قابل اطمینان رہی۔ لیکن جمعہ کی نماز کے وقت پھر ایک دم طبیعت بگڑی اور سانس بے قابو سا ہو گیا، فرمایا مجھے مختصر سی نماز پڑھا دو۔ مولانا انعام الحسن صاحب نے بہت مختصر نماز پڑھا دی۔ مسجد میں جمعہ کی نماز بھی مولانا مفتی زین العابدین صاحب نے بہت مختصر پڑھائی، ڈاکٹر اسلم صاحب نے آکر دیکھا تو کہا مرض کا دوبارہ حملہ ہو گیا ہے فوراً ہسپتال لیجانا چاہئے تاکہ وہاں آکسیجن دیا جائے۔ حضرت مولانا نے سنا تو فرمایا وہاں نرسیں بھی ہونگی مفتی زین العابدین صاحب نے فرمایا کہ اسکا پورا انتظام کر لیا جائے گا کہ کوئی نرس اور عورت قریب نہ آئے تو لے چلنے کی اجازت دے دی۔

آخری وقت موٹر میں حضرت مولانا کو لٹا دیا گیا اور وہ ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ حضرت مولانا انعام الحسن، مولوی الیاس میواتی اور ڈاکٹر اسلم ساتھ بیٹھے، اس وقت سانس زیادہ اکھڑنے لگی اس وقت زبان پر تھا رَبِّیَ اللّٰہُ رَبِّیَ اللّٰہُ۔ مولوی الیاس صاحب میواتی کا بیان ہے کہ اسی کے ساتھ حضرت مولانا نے شام کے وقت کی ماثورہ دعائیں پڑھنی شروع کر دیں اور کلمہ شریف پڑھنے لگے، گڑھی شاہو کے چوک کے قریب جب موٹر پہنچی تو دریافت فرمایا کہ ہسپتال کتنی دور ہے؟ عرض کیا گیا ابھی آدھا فاصلہ ہے۔ اس کے بعد زبان صحیح طور سے اپنا کام کرنے کے لائق نہیں رہی، آنکھوں میں بھی تغیر آگیا۔ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے یٰسین شریف شروع کر دی اور بس چند لمحوں میں حضرت مولانا نے کلمہ شریف پڑھتے ہوئے متبسم چہرہ کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کر دی، یعنی ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲ اپریل ۱۹۶۵ء جمعہ کے دن، دو بجے کے قریب، ۲۱ برس تک مسلسل اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے جان کھپانے والی یہ بابرکت ہستی اس فانی دنیا سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰ یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ۰

نماز جنازہ نعش مبارک بلال پارک واپس لائی گئی، جو سنتا تھا حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا

تھا، جیسے جیسے خبر پھیلتی گئی، مجمع بڑھتا گیا، عشا ہوتے ہوتے ہزاروں کا مجمع ہوگیا۔ نماز جنازہ ہوئی، جو حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے پڑھائی، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی (خلیفہ خاص حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہ) سرگودھا سے ایک قافلہ کے ساتھ اس وقت پہنچے جب نماز جنازہ ہوچکی تھی۔ حضرت ممدوح نے دوسری دفعہ نماز جنازہ پڑھائی۔

اگرچہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ کی رائے یہ تھی کہ حضرت مولانا کو وہیں دفن کردیا جائے لیکن حافظ صدیق صاحب وغیرہ میواتی حضرات کے شدید اصرار پر اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے فون کے ذریعہ استصواب کے بعد ہوائی جہاز سے دہلی جنازہ لانے کا فیصلہ ہوا۔ جنازہ کے ساتھ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری، حافظ صدیق صاحب تاری رشید صاحب، مولوی الیاس صاحب میواتی، میاں جی اسحاق صاحب اور حاجی اسمٰعیل صاحب پالن پوری بھی ساتھ بیٹھے، جنازہ ڈیڑھ بجے رات لاہور سے روانہ ہوکر ۳ بجے دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترا، اور ساڑھے تین بجے کے قریب نظام الدین لے آیا گیا، تھوڑی دیر کے بعد سہارنپور سے حضرت شیخ الحدیث تشریف لے آئے۔ خبر دہلی اور اطراف میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی اقتدا میں نماز جنازہ صبح ۹ بجے پڑھی گئی، جس میں دہلی اور اس کے قریبی علاقوں اور میوات کے قریباً اسی ہزار مسلمانوں نے شرکت کی اور حضرت مولانا مرحوم اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں دفن کردیے گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پسماندگان حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کی جو خاص نوعیت تھی اس کی بنا پر بلاشبہ ساری امت مسلمہ اور بالخصوص ان کے لاکھوں عقیدت مند اور محبین جن کو ان کے ذریعہ دین اور ایمان ویقین کی دولت ملی ان کے پسماندگان میں ہیں، لیکن شرف عام اور قرابت و عزیزداری کے لحاظ سے ان کے پسماندگان میں ایک[1] صاحبزادہ مولانا محمد ہارون صاحب ہیں جو الحمدللہ مولانا کے نقش قدم پر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو خاص خاص ترقیات سے نوازے

دوسری حضرت کی والدہ ماجدہ اماں جی ہیں، جن کے بارہ میں اپنی معلومات کی بنا پر لکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اپنے وقت کی رابعہ ہیں۔ تیسری حضرت مرحوم کی اہلیہ محترمہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی صاحبزادی ہیں۔ چوتھے محترمہ ہمشیرہ صاحبہ ہیں جو حضرت شیخ الحدیث کی اہلیہ محترمہ ہیں جن کے صاحبزادے مولوی محمد طلحہ ہیں۔ پانچویں حضرت مولانا انعام الحسن صاحب ہیں جو خاندانی قرابت کے علاوہ ہم زلف بھی ہیں اور ساری عمر حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ دو قالب ایک جان ہو کر رہے، عام طور سے محسوس کیا جاتا تھا کہ تبلیغ کے نام سے جو دینی جد وجہد چل رہی ہے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد سے حضرت مولانا مرحوم اس کا قلب ہیں اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب اس کا دماغ۔ حضرت مولانا کے وصال کے بعد ان کے جانشین خاص کی حیثیت سے اس دینی جد وجہد کی سب سے بڑی ذمہ داری اب انھیں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی پوری مدد فرمائے اور امت کو ان سے ویسا ہی نفع پہنچائے جیسا کہ حضرت مرحوم سے پہنچا یا وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

چھٹے ان کے برادر معظم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم ہیں جو چچا زاد بھائی اور خسر ہونے کے علاوہ والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے بعد ان کے استاد اور مربی بھی ہیں۔ حضرت شیخ کو حضرت مولانا مرحوم سے جو مشفقانہ تعلق تھا اور حضرت مولانا مرحوم حضرت شیخ کے ساتھ عقیدت و نیازمندی کا جو رابطہ رکھتے تھے اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ حضرت شیخ کے لیے یہ حادثہ کسی باکمال اور صاحب فیض سگے بیٹے کے حادثہ سے کم نہیں ہے۔ حضرت شیخ اس دور کے شیخ المشائخ اور مرجع خلائق ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ دیر تک قائم رکھے اور امت کو استفادہ کی توفیق دے۔ ان حضرات کے علاوہ کاندھلہ میں پورا خاندان ہے۔ جن میں حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب بھی ہیں جو حضرت مولانا مرحوم کے حقیقی ماموں ہیں، بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے علاوہ مولانا انعام الحسن صاحب کے والد ماجد مولانا اکرام الحسن صاحب، مولانا صوفی افتخار الحسن صاحب، مولانا اظہار الحسن صاحب، مصباح الحسن صاحب وغیرہ قریبی اعزہ اور متعلقین ہیں اللہ تعالیٰ

ان تمام حضرات کو اپنی رضا و محبت کے اونچے مقام تک پہنچائے۔

وما مات من کانت بقایاہ مثلھم
شباب تسامی للعلیٰ وکھول

حضرت مولانا کی دو اہم تصنیفیں

اس کو حضرت مولانا کی صرف کرامت ہی کہا جا سکتا ہے کہ دن رات اپنی دعوت میں منہمک رہنے کے باوجود مولانا مرحوم نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ان سیکڑوں مکاتیب کے علاوہ جن کی حیثیت مستقل رسائل و مقالات کی ہے۔ دو ضخیم تصنیفیں چھوڑیں، ذیل کی سطروں میں ان کا بہت مختصر اور اجمالی تعارف کرایا جا رہا ہے۔

اماني الاحبار مولانا مرحوم نے ۱۳۵۵ھ میں اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی دوسری کتابوں مستدرک حاکم وغیرہ کے علاوہ امام طحاوی کی معرکۃ الآرا کتاب شرح معانی الآثار بھی پڑھنی شروع کی، پڑھنے کے ساتھ ساتھ مولانا نے اس کی شرح بھی لکھنی شروع کی جس کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اس کی دو جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، پہلی جلد بڑے سائز کے ۳۷۶ صفحات پر ختم ہے۔ ہر صفحہ میں ۳۵-۳۶ سطریں ہیں ـــــ دوسری جلد ۴۴۲ صفحہ پر ختم ہوئی ہے ـــــ تیسری جلد کی تصنیف معلوم ہوا ہے کہ مکمل ہو چکی تھی لیکن چھپنے کی نوبت ابھی نہیں آئی پہلی جلد کے شروع میں طحاوی کے اسماء الرجال کی فہرست اور قریباً چالیس صفحے کا مقدمہ فن حدیث میں مولانا کے علمی مقام کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

حیات الصحابہؓ اس کا نام تو حیات الصحابہ ہے لیکن دراصل یہ عہد نبوت اور دور صحابہؓ کا عربی زبان میں ایک مستند اور مکمل مرقع ہے، اس کی تین ضخیم جلدیں ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد میں اس کی طباعت ہوئی ہے، پہلی جلد کے شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ ہے۔ پہلی جلد ۶۱۲ صفحات پر ختم ہوئی ہے، دوسری جلد ۷۱۴ صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ تیسری جلد کی ضخامت بھی اتنی ہے وہ بھی چھپ چکی ہے لیکن ابھی پریس سے مکمل کرشائقین کے ہاتھوں تک نہیں پہونچ سکی ہے راقم الحروف نے بھی نہیں دیکھی ہے۔ گویا پوری کتاب کے صفحات دو ہزار سے زیادہ ہیں، محدثین کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ پہلی

دونوں جلدیں جو چھپ کر شائع ہو چکی ہیں ان کا اردو ترجمہ بھی ادارۂ اشاعت دینیات دہلی سے شائع ہو چکا ہے، مولانا کی ان دونوں کتابوں کو دیکھ کر ان لوگوں کو انتہائی حیرت ہوگی جو مولانا کے نظام الاوقات اور دن رات کی مصروفیات کو آنکھوں سے دیکھتے تھے، مولانا کی یہ دونوں کتابیں اس لائق ہیں کہ پوری تفصیل کے ساتھ ان پر تبصرہ کیا جائے اور اہل علم سے ان کا تعارف کرایا جائے لیکن "الفرقان" کی اس خاص اشاعت کے لیے مجھے جو سوانحی مقالہ لکھنا ہے اس میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت تو مقصد صرف ان دونوں کتابوں کا اجمالی تعارف تھا، راقم الحروف اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان خوش نصیبوں میں ہے جنھوں نے حضرت مولانا مرحوم کی دن رات کی مصروفیتوں کو سفر و حضر میں بار بار دیکھا ہے ان مصروفیات میں ایسی ضخیم کتابوں کی تصنیف کو حضرت مولانا مرحوم کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل علم کو ان کتابوں سے وہ فائدہ پہنچائے جس کی امید پر مولانا مرحوم نے یہ کتابیں لکھی تھیں، اور ان کو پوری طرح قبول فرمائے۔

سراپا میانہ قد، خوش رو، رنگ کھلتا ہوا، بدن دوہرا، گھنی سیاہ ڈاڑھی بھرا ہوا چہرہ، آنکھوں میں بلا کی چمک اور کشش، خندہ پیشانی، سر پر عام طور سے رومال باندھتے اور دوپلی ٹوپی بھی پہنا کرتے، تہبند اور لانبا کرتا عام لباس ہوتا کبھی کبھی پاجامہ بھی پہنتے پہلی نظر ڈالو تو معلوم ہو کسی گہری سوچ میں ہیں۔ اول اول ہیبت طاری ہوتی لیکن ذرا ہی دیر میں اُنس پیدا ہو جاتا، ہر ایک سمجھتا کہ سب سے زیادہ تعلق اس سے ہے۔ دین کے علاوہ نہ کچھ کہتے اور نہ سُننا گوارا کرتے، ذہن صاف، سینہ یقین سے بھرا ہوا، معلومات خاص کر عہد نبوی اور قرن صحابہؓ و تابعین سے متعلق وسیع سے وسیع تر لبوں پر مُسکراہٹ، مگر دل میں آگ لگی ہوئی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے ایسے ہی مردانِ خدا کے لیے کہا ہے ؎

تو اے افسردہ دل زاہد کجے در بزم رنداں شو،
کہ بینی خندہ بر لب ہا و آتش پارہ در دلہا

بات کرتے کرتے آستین چڑھاتے پھر اُتارتے، تھوڑی دیر بعد ایک آہ بھرتے

جو درد و اثر میں ڈوبی ہوتی، اضطراب و بے کلی نے ایک سیمابی کیفیت پیدا کر دی تھی جنھوں نے قریب سے نہیں دیکھا، ان کے لیے سمجھنا مشکل ہے اور جنھوں نے دیکھا انھوں نے یقین کیا کہ وہ اس دور میں اللہ کی ایک نشانی تھے۔ انھیں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے درد و فکر کو سمجھنا آسان ہو جاتا تھا۔

سوانح یوسفی کی تیاری

مولانا سید محمد ثانی حسنی ایڈیٹر "رضوان" لکھنؤ اور مولانا سید محمد حسنی ایڈیٹر "تعمیر حیات" لکھنؤ نے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی رہنمائی اور نگرانی میں حضرت جیؒ کی سوانح مرتب کرنے کی ذمہ داری لے لی ہے اور ابتدائی کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ جو حضرات مستند معلومات اور مفید مشوروں سے مدد دے سکتے ہوں وہ پتہ ذیل پر مراسلت فرمائیں:-

۳۷ گوئن روڈ - لکھنؤ - یو - پی

حیات امام اعظم ابو حنیفہ رح

آج کی دنیا میں تین چوتھائی مسلم آبادی امام اعظم ابو حنیفہؒ کے فقہ کی مقلد ہے، دنیا کی دستور ساز اسمبلیوں میں آج بھی امام صاحبؒ کے دستور سے روشنی حاصل کی جاتی ہے آخر کیوں؟ اگر آپ امام صاحبؒ کے کمالات اور ان کے مستند تاریخی حالات، ان کے فقہ، حدیث، کلام اور تمام علوم سے واقف ہونا چاہتے ہیں، اگر آپ موجودہ دستوری پریشانیوں کا حل چاہتے ہیں تو ہماری کتاب حیات امام اعظم ابو حنیفہؒ ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے محصول ڈاک بذمہ خریدار

ایک مرد مومن کی داستان حیات
تذکرہ شیخ الہندؒ

حضرت شیخ الہندؒ اسی دور کے اولیاء اللہ اور مجاہدین میں سے ہیں، ان کی زندگی سے ہندستان کی آزادی کی تاریخ وابستہ ہے۔ وہ تحریک ریشمی خطوط سے کیا چاہتے تھے؟ اسکا تفصیلی جواب اس کتاب میں موجود ہے حضرت شیخ الہندؒ کے غیر مطبوعہ خطوط، تاریخ ترجمہ قرآن، اسارت مالٹا کے اسباب، حضرت کو کس نے گرفتار کرایا، دار العلوم دیوبند کا بانی کون ہے، غرضکہ وہ ابتدائے سلسلہ اس کتاب میں آگئے ہیں جو کبھی منظر عام پر نہیں ہوئے تھے۔ قیمت چار روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ:- مدنی دار التالیف بجنور (یو-پی)

مکتوبات

حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے اہم دعوتی مکاتیب اور ہدایت نامے
جو مختلف اوقات میں دینی کام کرنے والی جماعتوں کو اور
اس کام کے ذمہ دار افراد کو لکھے گئے۔

ہم نے جب اس خاص اشاعت کا ارادہ کیا تو ہماری سب سے بڑی خواہش اور فکر یہ تھی کہ ہم کو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب مل جائیں کیونکہ ان کی دعوت اور ان کے درد و سوز اور اُن کے یقین کے جاننے سمجھنے کا سب سے مستند ذریعہ اُن کے بعد اُن کے خطوط ہی ہو سکتے ہیں ـــــ اسکے لئے ہم نے دہلی کا ایک سفر بھی کیا لیکن وہاں ایک مکتوب کی نقل بھی محفوظ نہیں مل سکی ـــــ اسکے بعد اللہ نے مدد فرمائی اور ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مرحوم کے خطوط کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ خود ہمارے پاس یعنی دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جس کو اب سے کئی سال پہلے ہمارے محترم دوست افتخار فریدی صاحب نے مختلف علاقوں کے حضرات سے حاصل کر کے اور ایک باقاعدہ فائل بنا کے حفاظت ہی کی نیت سے یہاں محفوظ کرا دیا ہے۔ ہم نے اس کو جا کر دیکھا اور اسے بڑا قیمتی ذخیرہ پایا ـــــ اگلے صفحات میں حضرت مولانا مرحوم کے جو مکاتیب قارئین کرام پڑھیں گے اُن میں کے پہلے چھ مکتوب اسی ذخیرہ سے انتخاب کئے گئے ہیں ـــــ اس کے بعد ایک مکتوب جناب مولانا عبد العزیز صاحب کھلنوی سے حاصل ہوا، مکتوب نمبر ۱۲ ہی ہے ـــــ اسکے بعد میاں محمد عیسیٰ کی عنایت سے اُنکی مجلد بیاض ہم کو مل گئی جس میں انھوں نے حضرت مولانا مرحوم کے بہت سے اہم مکاتیب اور ہدایت نامے محفوظ کر رکھے ہیں نمبر ۱۳ کے بعد جو مکاتیب درج کئے گئے ہیں وہ اس بیاض سے لئے گئے، البتہ مکتوب نمبر ۱۲ گجرات کے ایک مولوی صاحب کا بھیجا ہوا ہے۔ ان مکاتیب کی دستیابی کو ہم اس فقیر کی تیاری کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم سمجھتے ہیں فلہ الحمد ولہ الشکر ـــــ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے ان کو محفوظ رکھا اور جنکی عنایت سے یہ ہم کو ملے۔

حضرت مولانا مرحوم کے حال و کیف کی طرح انکی زبان اور تعبیر بھی بالکل نرالی تھی، جو حضرات اُن کی دعوت، اُن کے درد اور اُن کی خاص زبان سے واقف و آشنا ہیں وہ انشاء اللہ ان مکاتیب کی قدر و قیمت سمجھیں گے۔

صفحات میں مزید گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے کچھ مکاتیب ہم اس میں شامل نہیں کر سکے انشاء اللہ وہ آئندہ وقتاً فوقتاً الفرقان کی عام اشاعتوں میں شائع کئے جاتے رہیں گے۔

(ادارہ)

(۱)

[ذیل میں سب سے پہلے جو مکتوب درج کیا جا رہا ہے، یہ تبلیغ کے مقصد، اصول، طریق کار، متوقع منافع و برکات اور اس راہ کی ضروری ہدایات پر بہت جامع ہے، حضرت مولانا مرحوم نے اس قدر تفصیل اور وضاحت سے شاید ہی کبھی کوئی مکتوب اس موضوع پر لکھا یا لکھایا ہو۔

تبلیغی کام سے خاص تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے بتلایا (اور خود خط کے بعض اجزاء سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے) کہ یہ مکتوب عمرہ کے لئے حجاز مقدس جانے والی ایک جماعت کیلئے حضرت مولانا مرحوم نے لکھا تھا جس کا ارادہ حجاز مقدس سے بعض دوسرے ممالک میں جانے کا بھی تھا تاکہ اسکی روشنی میں دوسرے ملکوں میں کام کی بنیاد صحیح پڑے۔]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمین و مکرمین بندہ زادنا اللہ وایاکم جھداً وسعیاً فی سبیلہ والھمنا وایاکم مراشد امورنا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خداوند کریم سے امید ہے کہ آپ حضرات بعافیت ہوں گے۔ آپ حضرات کی دینی ساعی کی اطلاعات باعث مسرت اور باعث تقویت ہوتی ہیں۔ اللہ جل شانہٗ قبول فرماویں۔ بارآور فرماویں، ترقیات عطا فرماویں۔ صحیح نہج پر آپ حضرات کی حفاظت فرماویں اور پوری ترکیب و ترتیب کی سمجھ عطا فرماویں۔ آمین۔

اللہ رب العزت جل جلالہٗ وعم نوالہٗ نے انسانوں کی تمام کامیابیوں کا دارومدار انسان کے اندر دفنی مایہ پر رکھا ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے۔ باہر کی چیزوں کے نقشے کا نام کامیابی و ناکامی نہیں، عزت، ذلت، آرام، تکلیف، سکون و پریشانی، صحت و بیماری انسان کے اندر کے حالات کا نام ہے ان حالات کے بننے یا بگڑنے کا باہر کے نقشوں سے تعلق بھی نہیں، اللہ جل شانہٗ ملک و مال کے ساتھ انسان کو ذلیل کرکے دکھا دیں اور فقر کے نقشے میں عزت دے کر دکھا دیں۔ انسان کے اندر کی مایہ اس کا یقین اور اس کے اعمال ہیں۔ انسان کے اندر کا یقین اور اندر سے نکلنے والے عمل اگر ٹھیک ہوں گے تو اللہ جل شانہٗ اندر کا کامیابی کی حالت پیدا فرما دینگے خواہ چیزوں کا نقشہ کتنا ہی پست ہو۔ اللہ جل شانہٗ تمام کائنات کے ہر ذرّے کے اور ہر فرد کے خالق و مالک ہیں۔ ہر چیز کو اپنی قدرت سے بنایا ہے، سب کچھ ان کے بنانے سے بنا ہے وہ بنانے

والے ہیں خود بنے نہیں اور جو بنا ہوا ہے اس سے کچھ بنتا نہیں۔ جو کچھ قدرت سے بنا ہے وہ قدرت کے ماتحت ہے۔ ہر چیز پر ان کا قبضہ ہے۔ وہ ہی ہر چیز کو استعمال فرماتے ہیں۔ وہ اپنی قدرت سے ان چیزوں کی شکلوں کو بھی بدل سکتے ہیں اور شکلوں کو قائم رکھ کر صفات کو بدل سکتے ہیں۔ لکڑی کو اژدھا بنا سکتے ہیں اور اژدھے کو لکڑی بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر شکل پر خواہ ملک کی ہو یا مال کی، برق کی ہو یا بھاپ کی ان کا ہی قبضہ ہے اور وہ ہی تصرف فرماتے ہیں۔ جہاں سے انسان کو تعمیر نظر آتی ہے وہاں سے تخریب لاکر دکھا دیں اور جہاں سے تخریب نظر آتی ہے وہاں سے تعمیر لاکر دکھا دیں۔ تربیت کا نظام وہی چلاتے ہیں۔ ساری چیزوں کے بغیر ریت پر ڈال کر پال دیں اور سارے ساز و سامان میں پرورش بگاڑ دیں۔

اللہ جل شانہٗ کی ذات عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور انکی قدرت سے براہ راست استفادہ ہو اسکے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے طریقے لے کر آئے ہیں جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہٗ ہر نقشے میں کامیابی دیکر دکھائیں گے، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں اپنے یقین اور اپنے جذبے اور اپنے طریقے بدلنے کا مطالبہ ہے۔ صرف یقین کی تبدیلی پر ہی اللہ پاک اس زمین و آسمان سے کئی گنا زیادہ بڑی جنت عطا فرمائیں گے۔ جن چیزوں میں سے یقین نکل کر اللہ کی ذات میں آئے گا۔ ان ساری چیزوں کو اللہ پاک مسخر فرما دیں گے۔ اس یقین کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے ایک تو اس یقین کی دعوت دینی ہے۔ اللہ کی بڑائی سمجھانی ہے، ان کی ربوبیت سمجھانی ہے۔ انکی قدرت سمجھانی ہے۔ انبیاء اور صحابہ کے واقعات سنانے ہیں۔ خود تنہائیوں میں بیٹھ کر سوچنا ہے دل میں اسی یقین کو اتارنا ہے جس کی مجمع میں دعوت دی ہے یہی حق ہے اور پھر رو رو کر دعا مانگنی ہے کہ اے اللہ اس یقین کی حقیقت سے نواز دے۔

اللہ جل شانہٗ کی قدرت سے براہ راست فائدے حاصل کرنے کے لئے نماز کا عمل دیا گیا ہے۔ سر سے لے کر پیر تک اللہ کی رضا والے مخصوص طریقے پر پابندیوں کے ساتھ اپنے کو استعمال کرو۔ آنکھوں کا، کانوں کا، ہاتھوں کا، زبان کا، پیروں کا استعمال ٹھیک ہو۔ دل میں اللہ کا دھیان ہو، اللہ کا خوف ہو۔ یقین ہو کہ نماز میں اللہ کے حکم کے

مطابق میرا ہر استعمال تکبیر و تسبیح، رکوع و سجدہ ساری کائنات سے زیادہ انعامات دلانے والا ہے۔ اسی یقین کے ساتھ نماز پڑھ کر ہاتھ پھیلا کر مانگا جائے تو اللہ جل شانہٗ اپنی قدرت سے ہر ضرورت پوری کریں گے۔ ایسی نماز پر اللہ پاک گناہوں کو معاف بھی فرمادیں گے۔ رزق میں برکت بھی دیں گے۔ طاعت کی توفیق بھی ملے گی۔ ایسی نماز سیکھنے کے لئے دوسروں کو خشوع خضوع والی نماز کی ترغیب و دعوت دی جائے۔ اس پر آخرت اور دنیا کے نفع سمجھائے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کی نماز کو سنا سنا کر خود اپنی نماز کو اچھا کرنے کی مشق کرنا۔ اہتمام سے وضو کرنا۔ دھیان جمانا، قیام میں، قعدہ میں، رکوع میں، سجدے میں بھی دھیان کم از کم تین مرتبہ جمایا جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ نماز کے بعد سوچا جائے کہ اللہ کی شان کے مطابق نماز نہ ہوئی۔ اس پر رونا اور کہنا کہ اے اللہ ہماری نماز میں حقیقت پیدا فرما۔

علم سے مراد یہ ہے کہ ہم میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ میرے اللہ مجھ سے اس حال میں کیا چاہتے ہیں، اور پھر اللہ کے دھیان کے ساتھ اپنے آپ کو اس عمل میں لگا دینا یہ ذکر ہے۔ جو آدمی دین سیکھنے کے لئے سفر کرتا ہے اس کا یہ سفر عبادت میں لکھا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے چلنے والوں کے پیروں کے نیچے ستر ہزار فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ زمین و آسمان کی ساری مخلوق ان کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہے۔ شیطان پر ایک عالم ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ دوسروں میں علم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ فضائل سنائے جائیں۔ خود تعلیم کے حلقوں میں منجھا جائے۔ علماء کی خدمت میں حاضری دی جائے۔ اس کو بھی عبادت یقین کیا جائے اور رو رو کر مانگا جائے کہ اے اللہ جل شانہٗ علم کی حقیقت عطا فرمادیں ہر عمل میں اللہ جل شانہٗ کا دھیان پیدا کرنے کے لئے اللہ کا ذکر ہے۔ جو آدمی اللہ جل شانہٗ کو یاد کرتا ہے اللہ جل شانہٗ اس کو یاد فرماتے ہیں جب تک آدمی کے ہونٹ اللہ کے ذکر میں ہلتے رہتے ہیں اللہ جل شانہٗ اسکے ساتھ ہوتے ہیں۔ اللہ پاک اپنی محبت و معرفت عطا فرماتے ہیں۔ اللہ کا ذکر شیطان سے حفاظت کا قلعہ ہے۔ خود اللہ جل شانہٗ کا دھیان پیدا کرنے کے لئے دوسروں کو اللہ کے ذکر پر آمادہ کرنا۔ ترغیب دینا۔ خود دھیان

جاکر کہ میرے اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ذکر کرنا اور رو رو کر دعا مانگنا کہ اے اللہ مجھے ذکر کی حقیقت عطا فرما۔

ہر مسلمان کا بحیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی ہونے کے اکرام بھی کرنا ہے، ہر امتی کے آگے بچھ جانا۔ ہر شخص کے حقوق کو ادا کرنا اور اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرنا جو آدمی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ جل شانہٗ اسکی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ جب تک آدمی اپنے مسلمان بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے اللہ جل شانہٗ اسکے کام میں لگے رہتے ہیں جو اپنے حق کو معاف کردے گا اللہ جل شانہٗ اس کو جنت کے بیچ میں محل عطا فرمائیں گے۔ جو اللہ کے لئے دوسروں کے آگے تذلل اختیار کرے گا اللہ جل شانہٗ اس کو رفعت و بلندی عطا فرمائیں گے اسکے لئے دوسروں میں ترغیب کے ذریعہ اکرام مسلم کا شوق پیدا کرنا ہے مسلمان کی قیمت بتانی ہے حضورؐ اکرم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق، ہمدردی اور ایثار کے واقعات سنانے ہیں۔ خود اسکی مشق کرنی ہے اور رو رو کر اللہ جل شانہٗ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی توفیق مانگنی ہے۔

ہر عمل میں اللہ جل شانہٗ کی رضا کا جذبہ ہو، کسی عمل سے دنیا کی طلب یا اپنی حیثیت بنانا مقصود نہ ہو۔ اللہ کی رضا کے جذبے سے تھوڑا سا عمل بھی بہت انعامات دلوائے گا اور اسکے بغیر بہت بڑے بڑے عمل بھی گرفت کا سبب بنیں گے۔ اپنی نیت کو درست کرنے کے لئے دوسروں میں دعوت کے ذریعہ تصحیح نیت کا فکر و شوق پیدا کیا جائے۔ اپنے آپ پر عمل سے پہلے اور ہر عمل کے دوران نیت کو درست کرنے کی مشق کی جائے۔ میں اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ عمل کر رہا ہوں، اور عمل کی تکمیل پر اپنی نیت کو ناقص قرار دیکر توبہ و استغفار کی جائے اور رو رو کر اللہ جل شانہٗ سے اخلاص مانگا جائے۔

آج امت میں کسی حد تک انفرادی اعمال کا رواج ہے گو ان کی حقیقت نکلی ہوئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے طفیل پوری امت کو دعوت والی محنت ملی تھی اسکے بندوں کا تعلق اللہ جل شانہٗ سے قائم ہو جائے اسکے لئے انبیاء علیہم السلام والے طرز پر اپنی جان و مال کو جھونک دینا اور جن میں محنت کر رہے ہیں ان سے کسی

چیز کا طالب نہ بنا اسکے لئے محبت بھی کرنا اور نصرت بھی کرنا۔ جو زمین والوں پر رحم کرتا ہے آسمان والا ان پر رحم کرتا ہے جو دوسروں کا تعلق اللہ جل شانہ سے جوڑنے کے لئے ایمان و عمل صالح کی محنت کریں گے اللہ جل شانہ ان کو سب سے پہلے ایمان و عمل صالح کی حقیقتوں سے نواز کر اپنا تعلق عطا فرمائیں گے، اس راستے میں ایک صبح یا ایک شام کا نکلنا پوری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے (باعتبار اعمال کے بھی اور باعتبار چیزوں کے بھی) اس سب سے بہتر ہے۔ اس راستے میں ہر مال کے خرچ اور ہر اللہ کے ذکر و تسبیح اور ہر نماز کا ثواب، لاکھ گنا ہو جاتا ہے۔ اس راستے میں محنت کرنے والوں کی دعائیں بنی اسرائیل کے انبیاء علیہ السلام کی دعاؤں کی طرح قبول ہوتی ہیں یعنی جس طرح ان کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ نے ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کو استعمال فرما کر ان کو کامیاب فرمایا اور باطل خاکوں کو توڑ دیا اسی طرح اس محنت کے کرنے والوں کی دعاؤں پر اللہ جل شانہ ظواہر کے خلاف اپنی قدرت کے مظاہرے فرمائیں گے اور اگر عالمی بنیاد پر محنت کی گئی تو تمام اہل عالم کے قلوب میں انکی محنت کے اثر سے تبدیلیاں لائیں گے۔ دین کے دوسرے اعمال کی طرح ہمیں یہ محنت بھی کرنی نہیں آتی۔ دوسروں کو اس محنت کے لئے آمادہ کرنا ہے اسکی اہمیت اور قیمت بتانی ہے، انبیاء اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات سنانے ہیں، خود اپنے آپ کو قربانی کی شکلوں اور ہجرت و نصرت والے اعمال میں لگانا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہر حال میں اللہ کی راہ میں نکلے ہیں، نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت، گھر میں ولادت کے موقع پر اور وفات کے موقعہ پر، سردی میں، گرمی میں، بھوک میں، فاقے میں، صحت میں، بیماری میں، قوت میں، ضعف میں، جوانی میں، بڑھاپے میں بھی نکلے ہیں اور رو رو کر اللہ جل شانہ سے مانگا ہے کہ ہمیں اس عالی محنت کے لئے قبول فرمالے۔

ان چیزوں سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ہر شخص سے خواہ کسی شعبہ سے متعلق ہو چار ماہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اپنے مشاغل ساز و سامان اور گھر بار سے نکل کر ان چیزوں کی دعوت دیتے ہوئے اور خود مشق کرتے ہوئے ملک بہ ملک اقلیم بہ اقلیم قوم بہ قوم قریہ بہ قریہ پھریں گے۔ حضور اقدس صلعم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال

دئے تھے۔ ان اعمال سے مسلمانوں کا زندگی میں امتیاز تھا، مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں۔ اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں۔ عملوں کے ٹھیک کرنے کے لئے تعلیمیں ہوتی تھیں۔ ایمان و عمل صالح کی دعوت کے لئے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیلیں بھی مسجد سے ہی ہوتی تھیں۔ اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ یہاں تعاون، ایثار، ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے۔ ہر شخص حاکم محکوم، مالدار غریب، تاجر، زارع، مزدور، مسجد میں آکر زندگی سیکھتا تھا اور باہر جاکر اپنے اپنے شعبہ میں مسجد والے تاثر سے چلتا تھا آج ہم دھوکے میں پڑ گئے کہ ہمارے پیسے سے مسجد چلتی ہے۔ مسجدیں اعمال سے خالی ہوگئیں اور چیزوں سے بھر گئیں حضور صلعم نے مسجد کو بازار والوں کے تابع نہیں کیا۔ حضور صلعم کی مسجد میں نہ تجلی تھی نہ پانی تھا نہ غسل خانے تھے، خرچ کی کوئی شکل نہ تھی۔ مسجد میں آکر داعی بنتا تھا۔ معلم اور متعلم بنتا تھا۔ ذاکر بنتا تھا، نمازی بنتا تھا مطیع بنتا تھا۔ متقی زاہد بنتا تھا۔ خلیق بنتا تھا، باہر جاکر ٹھیک زندگی گزارتا تھا۔ مسجد بازار والوں کو چلاتی تھی۔ ان چار ماہ میں ہر جگہ جاکر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں مسجد والے اعمال کو سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لئے تین چلوں کے واسطے آمادہ کریں۔

واپس اپنے مقام پر آکر اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ گشت کے ذریعہ بستی والوں کو جمع کرکے انہی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا اور مشق کے لئے فی گھر ایک نفر تین چلوں کے لئے باہر نکلنا ہے۔ ایک گشت اپنی مسجد کے ماحول میں اور دوسرا گشت دوسری مسجد کے ماحول میں کریں۔ ہر مسجد میں مقامی جماعت بھی بنائیں۔ ہر مسجد کے احباب روزانہ فضائل کی تعلیم کریں۔ اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے اسکے لئے ہر مسجد سے تین یوم کے لئے جماعتیں پانچ کوس کے علاقے میں جائیں، ہر دوست مہینے میں تین یوم پابندی سے لگائے۔ "اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا" کے مصداق تین دن پر حکماً تیس دن کا ثواب ملے گا پورے سال ہر مہینے تین دن لگائے تو سارا سال اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔ اندرون

ملک کے تقاضے پورے ہوتے رہیں اور اپنی مشق قائم رہے اور جاری رہے اسکے لئے ہر سال اہتمام سے چلہ لگایا جائے عمر میں کم از کم تین چلے، سال میں چلہ، مہینے میں تین یوم ہفتہ میں دو گشت، روزانہ تعلیم، تسبیحات، تلاوت یہ کم سے کم نصاب ہے کہ ہماری زندگی دین والی بنتی رہے، اگر ہم یوں چاہیں کہ ہم سب بنیں اجتماعی طور پر پوری انسانیت کی زندگی کے صحیح رُخ پر آنے اور باطل کے ٹوٹنے کا تو اسکے لئے اس نصاب سے بھی آگے بڑھنا ہوگا۔ ہمارے وقت اور ہماری آمدنی کا نصف اللہ کی راہ میں لگے اور نصف کاروبار اور گھر کے مسائل میں یا کم از کم یہ کہ ایک تہائی وقت و آمدنی اللہ کی راہ میں اور دو تہائی اپنے مشاغل میں۔ یعنی ہر سال چار ماہ کی ترتیب بٹھائی جائے۔

آپ حضرات عمر میں کم از کم تین چلوں کی دعوت خوب جم کر دیں، اس میں بالکل نہ گھبرائیں اسکے بغیر زندگیوں کے رُخ نہ بدلیں گے۔ جن احباب نے خود ابھی تین چلے نہ دیئے ہوں وہ بھی اس نیت سے خوب جم کر دعوت دیں کہ اللہ جل شانہ اسکے لئے ہمیں قبول فرمالے۔

گشت کا عمل اس کام میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر یہ عمل صحیح ہوگا قبول ہوگا تو دعوت قبول ہوگی۔ دعوت قبول ہوگی دعا قبول ہوگی۔ دعا قبول ہوگی ... ... ہدایت آئے گی۔ اور گشت قبول نہ ہوا تو دعوت قبول نہ ہوگی۔ دعوت قبول نہ ہوئی دعا قبول نہ ہوگی۔ دعا قبول نہ ہوئی ہدایت نہیں آئے گی۔

گشت کا موضوع یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہماری دنیا اور آخرت کے مسائل کا حل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر زندگی گزارنے میں رکھا ہے۔ ان کے طریقے ہماری زندگیوں میں آجائیں اسکے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اس محنت پر بستی والوں کو آمادہ کرنے کے لئے گشت کے لئے مسجد میں جمع کرنا ہے۔ نماز کے بعد اعلان کرکے لوگوں کو روکا جائے، اعلان کوئی بستی کا باثر آدمی یا امام صاحب کریں تو زیادہ مناسب ہے، وہ ہم کو کہیں تو ہمارے ساتھی کر دیں۔ پھر گشت کی اہمیت ضرورت اور قیمت بتائی جائے اسکے لئے آمادہ کیا جائے جو تیار ہوں ان کو اچھی طرح آداب سمجھائیں۔ اللہ کا ذکر کرتے

ہوئے چلنا ہے۔ نگاہیں نیچی ہوں۔ ہمارے تمام مسائل کا تعلق اللہ جل شانہٗ کی ذات سے ہے، ان بازار میں پھیلی ہوئی چیزوں سے کسی مسئلے کا تعلق نہیں۔ چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، دھیان نہ جائے۔ اگر نگاہ پڑ جائے تو مٹی کے ڈلے معلوم ہوں۔ ہمارا دل اگر ان چیزوں کی طرف پھر گیا تو پھر ہم جن کے پاس جا رہے ہیں ان کا دل ان چیزوں سے اللہ کی طرف کیسے پھرے گا۔ قبر کا داخلہ سامنے ہو۔ اسی زمین کے نیچے جانا ہے۔ مل جل کر چلیں۔ ایک آدمی بات کرے۔ کامیاب ہے وہ بات کرنے والا جو مختصر بات کرکے آدمی کو مسجد میں بھیجدے۔" بھائی ہم مسلمان ہیں۔ ہم نے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا ہے۔ ہمارا یقین ہے اللہ پالنے والے ہیں۔ نفع و نقصان۔ عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے اگر ہم اللہ کے حکم پر حضرت محمدؐ کے طریقے پر زندگی گزاریں گے اللہ راضی ہو کر ہماری زندگی بنا دیں گے۔ ہم سب کی زندگی اللہ جل شانہٗ کے حکم کے مطابق حضرت محمدؐ کے طریقے پر آجائے اسکے لئے بھائی مسجد میں کچھ فکر کی بات ہو رہی ہے۔

نماز پڑھ چکے ہوں تو بھی اٹھا کر مسجد میں بھیجدیں۔ ضرورت ہو تو آگے نماز کو بھی مسجد میں فوری جانے کا عنوان بنالیں۔" اللہ کا سب سے بڑا حکم نماز ہے نماز پڑھیں گے اللہ روزی میں برکت دیں گے، گناہوں کو معاف کردیں گے۔ دعاؤں کو قبول فرمالیں گے۔ بشارتیں سنائی جائیں وعیدیں نہیں۔

نماز کا وقت جا رہا ہے مسجد میں چلئے۔

امیر کی اطاعت کرنی ہے۔ واپسی میں استغفار کرتے ہوئے آنا ہے۔ اب آداب کا مذاکرہ کرنے کے بعد دعا مانگ کر چل دیں۔ گشت میں دس آدمی جائیں۔ مسجد کے قریب مکانات پر گشت کرلیں، مکانات نہ ہوں تو بازار میں کرلیں۔ جماعت میں زیادہ آدمی ایسے ہوں جو گشت میں اصولوں کی پابندی کرلیں۔ مسجد میں دو تین آدمی چھوڑ دیں نئے آدمی زیادہ تیار ہو جائیں تو ان کو بھی سمجھا کر مسجد میں مشغول کردیں۔ نئے آدمی تین چار ساتھ ہوں۔ مسجد میں ایک ساتھی اللہ جل شانہٗ کی طرف متوجہ ہو کر ذکر و دعا میں مشغول رہے۔ ایک آنے والوں کا استقبال کرے۔ ضرورت ہو تو وضو کروا کر نماز پڑھوا دے اور ایک ساتھی

آنے والوں کو نماز تک مشغول رکھے۔ اپنی زندگی کا مقصد سمجھائے۔ پونے گھنٹے گشت ہو۔ نماز سے سات آٹھ منٹ پہلے گشت ختم کر دیں۔ سب تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔ جس ساتھی کے بارے میں مشورہ ہو جائے وہ دعوت دے۔ یہ سمجھائے کہ اللہ جل شانہ کی ذات عالی سے تعلق قائم ہوا تو دنیا اور آخرت میں کیا نفع ہوگا۔ اور اگر اللہ جل شانہ کی ذات عالی سے تعلق قائم نہ ہوا تو دنیا اور آخرت میں کیا نقصان ہوگا۔ جیسے اس خط کے شروع میں چھ نمبروں کا تذکرہ کیا ہے اس طرز پر ہر نمبر کا مقصد اس کا نفع اور قیمت اور حاصل کرنے کا طریقہ بتایا جائے۔ سادے انداز میں بیان ہو۔ اس سے انشاء اللہ مجمع کی سمجھ میں کام آئے گا اور اسکی ضرورت بھی محسوس کرے گا اور سمجھے گا کہ ہم بھی سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ساتھی بھی دعوت میں اہتمام سے جم کر بیٹھیں۔ متوجہ ہو کر محتاج بن کر سنیں جو بات کہہ رہے ہیں اپنے دل میں کہیں کہ حق ہے اس سے دل میں ایمان کی لہریں اٹھیں گی اور عمل کا جذبہ بنے گا۔ تین چلوں کی بات جم کر رکھی جائے نقد نام لئے جائیں اسکے بعد چلوں کے لئے وقت لکھوائے جائیں اور پھر جو جس وقت کے لئے تیار ہو اسکو قبول کر لیا جائے۔ مطالبہ اور تشکیل کے وقت محنت ساری دعوت کا مغز بنتا ہے۔ اگر مطالبوں پر جم کر محنت نہ ہوئی تو پھر کام کی باتیں رہ جائیں گی اور قربانی وجود میں نہ آئے گی تو کام کی جان نکل جائے گی۔ دعوت دینے والا ہی مطالبہ کرے۔ ایک آدمی کھڑے ہو کر نام لکھے۔ نام لکھنے والا مستقل تقریر شروع نہ کرے، ایک دو جملے ترغیبی کہہ سکتا ہے۔ پھر آپس میں ایک دوسرے کو آمادہ کرنے کو کہا جائے فکر کے ساتھ اپنے قریب بیٹھنے والوں کو تیار کریں۔ اعذار کا دل جوئی اور ترغیب کے ساتھ حل بتائیں۔ نبیوں اور صحابہ کی قربانیوں کے قصوں کی طرف اشارے کریں اور پھر آمادہ کریں۔ آخر میں مقامی جماعت بنا کر ان کے ہفتے کے دو گشت روزانہ تعلیم، تسبیحات، مہینے کے تین یوم وغیرہ کا نظم طے کرائیں۔

دعوت میں انبیاءؑ اور صحابہؓ کے ساتھ اللہ جل شانہ نے جو مدد میں فرمائی ہیں وہ تو بیان کی جائیں اور جو ہمارے ساتھ مدد میں ہوئیں ان کو بیان نہ کیا جائے۔ دعوت میں فضاء حاضرہ کی باتیں نہ کی جائیں۔ امت میں جو ایمانی، عملی، اخلاقی کمزوریاں آچکیں

ان کے تذکرے سے بہتر ہے کہ اصلی خوبیوں کی طرف یعنی جو بات پیدا ہونی چاہیئے اسکی طرف متوجہ کریں۔

تعلیم میں دھیان عظمت، محبت، ادب اور توجہ کے ساتھ بیٹھنے کی مشق کی جائے۔ سہارا نہ لگایا جائے۔ باوضو بیٹھنے کی کوشش ہو۔ طبیعت کے بہانوں کی وجہ سے تعلیم کے دوران نہ اٹھا جائے، باتیں نہ کی جائیں اگر اس طرح بیٹھیں گے تو فرشتے اس مجلس کو ڈھانک لیں گے۔ اہل مجلس میں طاعت کا مادہ پیدا ہوگا۔ عظمت کی مشق سے حدیث پاک کا وہ نور دل میں آئے گا جس پر عمل کی ہدایت ملتی ہے۔ بیٹھتے ہی آداب اور مقصد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارے اندر دین کی طلب پیدا ہو جائے۔ فضائل قرآن مجید پڑھ کر تھوڑی دیر کلام پاک کی ان سورتوں کی تجوید کی مشق کی جائے جو عموماً نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ التحیات، دعائے قنوت وغیرہ کا مذاکرہ و تصحیح اجتماعی تعلیم میں نہ ہو۔ انفرادی سیکھنے سکھانے میں ان کی تصحیح کریں۔ اللہ پاک توفیق دیں تو ہر کتاب میں سے تین چار صفحے پڑھے جائیں۔ تعلیم میں اپنی طرف سے تقریر نہ ہو۔ حدیث شریف پڑھنے کے بعد دو تین جملے ایسے کہہ دیئے جائیں کہ اس عمل کا جذبہ و شوق ابھر آئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی تالیف فرمودہ فضائل قرآن مجید، فضائل نماز، فضائل تبلیغ فضائل ذکر، فضائل صدقات حصہ اول دوم، فضائل رمضان، فضائل حج (ایام حج و رمضان میں) اور مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی دام مجدہ کی (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) صرف یہ کتابیں ہیں جن کو اجتماعی تعلیم میں پڑھنا اور سننا ہے اور تنہائیوں میں بیٹھ کر بھی ان کو پڑھنا ہے۔ کتابوں کے بعد چھ نمبروں کا مذاکرہ ہو۔ ساتھیوں سے نمبر بیان کرائے جائیں۔ جب تعلیم شروع کی جائے تو اپنے میں سے دو ساتھیوں کو تعلیم کے گشت کیلئے بھیج دیا جائے۔ ۱۵۔۲۰ منٹ بعد وہ آجائیں تو دوسرے دو ساتھی چلے جائیں۔ اسطرح بستی والوں کو تعلیم میں شریک کرنے کی کوشش ہوتی رہے۔ باہر نکلنے کے زمانے میں روزانہ صبح اور بعد ظہر دونوں وقت تعلیم دو تین گھنٹے کی جائے اور اپنے مقام پر روزانہ اسی ترتیب سے ایک گھنٹے تعلیم ہو یا ابتداءً جتنی دیر احباب جڑ سکیں۔ کام کے تقاضوں کو سوچنے انکی ترتیب

قائم کرنے، ان تقاضوں کو پورا کرنے کی شکلیں بنانے میں اور جو احباب اوقات فارغ کریں انکی مناسب تشکیل میں اور جو مسائل ہوں احباب کو مشورہ میں جوڑا جائے۔ اللہ جل شانہ کے دھیان اور فکر کے ساتھ دعائیں مانگ کر مشورہ میں بیٹھیں۔ مشورہ میں اپنی رائے پر اصرار اور عمل کرانے کا جذبہ نہ ہو اس سے اللہ کی مدد یں ہٹ جاتی ہیں جب رائے طلب کی جائے امانت سمجھ کر جو بات اپنے دل میں ہو کہہ دی جائے۔ رائے رکھنے میں نرمی ہو۔ کسی ساتھی کی رائے سے تقابل کا طرز نہ ہو میری رائے میں میرے نفس کے شرور شامل ہیں یہ دل کے اندر خیال ہو۔ اگر فیصلہ کسی دوسری رائے پر ہو گیا تو اس کی خوشی ہو کہ میرے شرور سے حفاظت ہو گئی اور اگر اپنی رائے پر فیصلہ ہو جائے تو خوف ہو اور زیادہ دعائیں مانگی جائیں۔ ہمارے ہاں فیصلے کی بنیاد کثرت رائے نہیں ہے، اور ہر معاملہ میں ہر ایک سے رائے لینا بھی ضروری نہیں ہے۔ دلجوئی سب کی ضروری ہے۔ امیر کو اس بات کا یقین ہو کہ ان احباب کے فکر اور مل کر بیٹھنے کی برکت سے اللہ جل شانہ صحیح بات کھول دیں گے امیر اپنے آپ کو مشورہ کا محتاج سمجھے رائے لینے کے بعد غور و فکر سے جو مناسب سمجھ میں آتا ہو وہ کہہ دے بات اس طرح رکھے کہ کسی کی رائے کا استخفاف نہ ہو۔ اگر طبیعتیں مختلف ہوں تو اس بات پر شوق و رغبت کے ساتھ آمادہ کرلے، اور ساتھی امیر کی بات پر ایسے شوق سے چلیں جیسے کہ ان کی ہی رائے طے پائی ہے، اسی میں تربیت ہے اگر اسکے بعد عملاً ایسی شکل نظر آئے کہ ہماری رائے زیادہ مناسب تھی پھر بھی ہرگز طعنہ نہ دیا جائے یا اشارہ کنایہ بھی نہ کیا جائے اسی میں خیر کا یقین کیا جائے جو امیروں کو طعنہ دے اسکے لئے سخت وعید آئی ہے۔

جب محلوں کی مساجد میں ہفتوں کی دو گشتوں کے ذریعہ فی گھر ایک آدمی تین چلے کے لئے نکلنے کی آواز لگ رہی ہوگی، تعلیموں اور تسبیحات پر احباب جڑ رہے ہوں گے، ہر مسجد سے تین دن کے لئے جماعتیں نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہوں گی تو شب جمعہ کا اجتماع صحیح نہج پر ہوگا اور کام کے بڑھنے کی صورتیں بنیں گی۔ جمعرات کو عصر کے وقت سے محلوں کی مساجد کے احباب اپنی اپنی جماعتوں کی صورت میں بستر

اور کھانا ساتھ لے کر اجتماع کی جگہ پر پہنچیں۔ مشورے سے ایسے احباب سے عموماً دعوت دلوائی جائے جو محنت کے میدان میں ہوں اور جن کی طبیعت پر کام کے تقاضے غالب ہوں بہت ہی فکر و اہتمام سے تشکیلیں کی جائیں۔ اگر اوقات وصول نہوں تو رات کو بھی محنت کی جائے، رو رو کر مانگا جائے، صبح کو جماعتوں کی تشکیل کر کے ہدایات دیکر روانہ کیا جائے تین دن کی محلوں سے تیار ہو کر آئی ہوئی جماعتیں عموماً سات آٹھ میل تک بھیجی جائیں۔ ہر شب جمعہ سے تین چلوں اور چلوں کی جماعتوں کے نکلنے کا رُخ پڑنا چاہیئے اگر شب جمعہ میں خدانخواستہ سب تقاضے پورے نہوسکے تو سارے ہفتے اپنے محلوں میں پھر اسکے لئے کوشش کی جائے اور آئندہ شب جمعہ میں محلوں سے تقاضوں کے لئے لوگوں کو تیار کر کے لایا جائے۔

بھائی دوستو یہ کام بہت نازک ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک محنت فرمائی۔ اس محنت سے سارے انسانوں کی ساری زندگی کے کمانے، کھانے، بیاہ شادی میں ملاقات عبادات معاملات وغیرہ کے طریقوں میں مکمل تبدیلیاں آئیں تو آپ نے خود اس محنت کے کتنے طریقے تبلائے ہوں گے، ہمیں ابھی یہ کام کرنا نہیں آتا اور نہ ابھی حقیقی کام شروع ہوا ہے۔ کام اس دن شروع ہوگا جب ایمان و یقین، اللہ کی محبت، اللہ کے دھیان، آخرت کی فکر، اللہ کے خوف و خشیۃ، زہد و تقویٰ سے بھرے ہوئے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی اخلاق سے مزین ہو کر اللہ کی رضا کے جذبے سے مخمور ہو کر اللہ کی راہ میں جان دینے کے شوق سے کھنچے کھنچے پھریں گے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "اللہ رحم کرے خالدؓ پر اسکے دل کی تمنا صرف یہ تھی کہ حق اور حق والے چمک جائیں اور باطل اور باطل والے مٹ جائیں اور کوئی تمنا ہی نہ تھی"۔ ابھی جو ہم کو کام کی برکتیں نظر آرہی ہیں وہ کام شروع ہونے سے پہلے کی برکتیں ہیں۔ جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت سے ہی برکتوں کا ظہور شروع ہوا تھا لیکن اصل کام اور اصل برکتیں چالیس سال بعد شروع ہوئیں۔ ابھی تو اس کے لئے محنت ہو رہی ہے کہ کام کرنے والے تیار ہو جائیں۔ اللہ جل شانہٗ کام ان سے لیں گے اور ہدایت پھیلنے کا ذریعہ ان کو بنائیں گے جن کی زندگی اپنی دعوت کے مطابق بدلے گی۔

جن کی زندگیوں میں تبدیلی نہ آئے گی اللہ جل شانہٗ ان سے اپنے دین کا کام نہ لیں گے، یہ نبیوں والا کام ہے۔

اس کام میں اگر اپنے آپ کو اصول سیکھنے کا محتاج نہ سمجھا گیا اور اصولوں کے مطابق کام نہ ہوا تو سخت فتنوں کا خطرہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب باہر ملکوں میں کام شروع کرنے کا ارادہ فرمایا تو پہلے تمام صحابہ کو تین دن تک ترغیب دی اور پھر فرمایا کہ جس طرز پر یہاں کام ہوا ہے بالکل اسی طرز پر باہر جا کر بھی کرنا ہے اس کام کی نوعیت یہی ہے مقام زبان معاشرت موسم وغیرہ کے اعتبار سے اس کام کے اصول نہیں بدلتے اس کام کی نہج اور اصولوں کو سیکھنے اور ان پر قائم رہنے کے لئے اُس فضا میں آنا اور بار بار آتے رہنا انتہائی ضروری ہے جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جان کھپائی تھی اور ان کے ساتھ اختلاط بھی بہت ضروری ہے جو اس جد و جہد میں حضرتؒ کے ساتھ تھے اور جب سے اب تک اس فضا میں اور کام میں مسلسل لگے ہوئے ہیں اسکے بغیر کام کا اپنے نہج اور اصولوں پر قائم رہنا بظاہر ممکن نہیں۔ اس لئے اپنے کام کرنے والے احباب کو ایسی فضا میں اہتمام سے نوبت بہ نوبت بھیجتے رہیں۔

تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں کسی نہ کسی نقشے کے مقابلہ پر آئے اور بتایا کہ کامیابی کا اس نقشے سے بالکل تعلق نہیں ہے۔ کامیابی کا تعلق براہ راست اللہ جل شانہٗ کی ذات عالی سے ہے۔ اگر عمل ٹھیک ہوں گے اللہ جل شانہٗ چھوٹے نقشے میں بھی کامیاب کر دیں گے اور عمل خراب ہوں گے اللہ جل شانہٗ بڑے سے بڑے نقشے کو توڑ کر نا کام کر کے دکھائیں گے۔ کامیاب ہونے کے لئے اس نقشے میں عمل ٹھیک کرو۔ ہر نبی نے اپنے رائج الوقت نقشے کے مقابلے پر محنت کی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام اکثریت، حکومت، مال، زراعت اور صنعت کے نقشوں کے مقابلہ پر تشریف لائے۔ آپکی محنت ان نقشوں سے نہیں چلی آپکی محنت مجاہدوں اور قربانیوں سے چلی ہے۔ باطل تعیش کے نقشے سے پھیلتا ہے تو حق تکلیفیں اٹھانے سے پھیلتا ہے، باطل ملک و مال سے چمکتا ہے تو حق فقر و غربت کی مشقتوں میں چمکتا ہے جتنے فتنے ملک و مال اور تعیش کی بنیاد پر لائے جا رہے ہیں ان کا توڑ حق کے لئے فقر و غربت

اور تکالیف برداشت کرنے میں ہے۔ اب اس کام کے ذریعہ امت میں مجاہدہ اور قربانی کی استعداد پیدا کرنی ہے۔ اس کام کے لئے بہت بڑا خطرہ یہ ہے کہ اس کو نقشوں پر منحصر کر دیا جائے۔ اس سے کام کی جان نکل جائے گی اس کام کی حفاظت اس میں ہے کہ کام کرنے والے اس کام کے لئے تمام میسر نقشوں کو بھی قربان کرتے ہوئے مجاہدے والی شکلوں کو قائم رکھیں اور کسی صورت میں مجاہدے والی شکلوں کو ختم نہونے دیں۔ غریبوں میں اپنی محنت کو بڑھایا جائے۔ پیدل جماعتیں چلائی جائیں۔ لوگ آئیں گے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہمارا پیسہ دین کے کام میں خرچ کر لیجئے، پھر نقشہ کی قربانی دینی ہو گی۔ کہہ دیجئے کہ جناب یہاں اس کام میں خرچ کرنے کا صحیح اور پاک طریقہ وجذبہ سکھایا جاتا ہے پھر محل تلاش کر کے خود خرچ کر دیجئے گا۔ یہاں تو طریقہ سیکھ لیجئے۔

اس کام کی تعمیم کے لئے رواجی طریقوں اخبار اشتہار پریس وغیرہ اور رواجی الفاظ سے بھی پورے پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ کام سارا غیر رواجی ہے۔ رواجی طریقوں سے رواج کو تقویت پہنچے گی اس کام کو نہیں۔

اس کام کی شکلیں دعوت، گشت، تعلیم، تشکیل وغیرہ ہیں۔ مشوروں کی ضرورت ہو مناسب دوستوں کو الگ کر کے مشورہ کر لیا جائے ایسا نہو کہ مشورہ کرنے والوں کا کسی موقعہ پر عمومی اعمال سے جوڑ نہ رہے۔

کالجوں کے طلبا میں اس کام کو اٹھایا جائے۔ ہاسٹلوں میں مقامی کام کے لئے جماعتیں بنائی جائیں۔ ایک گشت ہوسٹل والے اپنے ہوسٹل میں کریں اور ہفتہ کا دوسرا گشت باہر کسی محلہ میں یا کسی دوسرے ہوسٹل میں کریں۔ قریب کے محلوں کی جماعتیں بھی ہوسٹلوں میں جا کر گشت کریں۔ ہاسٹل والے احباب اپنی روزانہ تعلیم اور مہینہ میں تین یوم کی بھی ترتیب اٹھائیں۔

مستورات میں کام کی نزاکتیں اور بھی زیادہ ہیں۔ جب کہ بے پردگی کا احتمال ہو، عام اجتماعات میں مستورات کو بالکل نہ لایا جائے۔ اپنے اپنے محلہ میں کسی پردہ دار مکان میں قریب قریب کے مکانات سے عورتیں کسی روز جمع ہو کر تعلیم کر لیا کریں۔ اسکی ابتدا اس

طرح کریں کہ مرد جو بات اجتماعات، دعوت، تعلیم وغیرہ سے سُن کر جائیں اپنے گھر والوں کو سُنائیں۔ اس سے انشاء اللہ تھوڑے عرصہ میں ذہن بننا شروع ہو جائے گا پھر محلوں میں تعلیم شروع ہونے کے بعد ایسا ہو سکتا ہے کہ سارے شہر کی مستورات کا ہفتہ میں ایک ایسی جگہ اجتماع ہو جہاں پردہ کا اہتمام ہو۔ وہاں تعلیم کے بعد پھر کوئی آدمی پردے کے ساتھ بیان کرے۔ کبھی کبھی ایک یوم یا تین یوم کے لئے قرب وجوار کے لئے جماعتیں بنائی جائیں۔ مستورات کی جماعت کے ساتھ ان کے خاوند ہوں ورنہ ہر عورت کے ساتھ اس کا شرعی محرم ساتھ ہو۔ پردے کے ساتھ جائیں۔ پردہ دار مکان میں ٹھہریں۔ مرد مسجد میں ٹھہر کر کام کریں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مقامات سے محنت اٹھائی تھی انہی مقامات کے لوگوں کو اس محنت پر اٹھانے اور انہی راستوں سے اللہ کی راہ کی ملکوں والی نقل و حرکت کے زندہ ہونے کا ذریعہ یہ عمرے کا سفر بن سکتا ہے۔ ہر جگہ کے پرانوں سے اختلاط اور اس کام میں پختگی پیدا ہونے اور اصولوں کے تفصیل سے سامنے آنے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔ محترمی حاجی حنیفہ صاحب اور بھائی محمد ادریس صاحب کی عمرے کے سفر کی تیاری کا حال معلوم کر کے بہت زیادہ مسرت ہوئی۔ اللہ جل شانہٗ قبول فرمائے۔ دگر پرانے احباب کو بھی ہمراہ لانے کی سعی فرمائیں۔

یہ خط کچھ اصول لکھنے کی کوشش میں طویل ہو گیا آپ حضرات اس کے ہر جز اور ہر لفظ کو غور سے پڑھنے کی کوشش فرمائیں گے تو انشاء اللہ بہت زیادہ نفع کی توقع ہے آپ حضرات اپنے یہاں کے حالات سے ہر پندرھویں روز مطلع فرما دیا کریں تو ہمیں تقویت ہوتی رہے۔ تمام احباب کو سلام مسنون۔

فقط والسّلام

بندہ محمد یوسف غفرلہ

(۲)

(ایمان کی جدوجہد کے لیے دن کے اوقات میں ٹھوکریں کھانا اور رات کی اندھیریوں میں رونا عالم کے احوال کی درستی کا وسیلہ ہے)

(ذیل کا مکتوب تبلیغی کام کے ایک ذمہ دار کو "مکی مسجد" کراچی کے پتہ پر لکھا گیا تھا۔)

مکرم و محترم بندہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط کے ذریعہ احوال خیر و مساعی مبارکہ کی خبروں سے مسرت ہوئی حق تعالیٰ شانہٗ مساعی کو قبول اور بارآور فرمادیں۔

میرے عزیز! اس عالم کے احوال کی سرسبزی و فروغ کا تعلق براہ راست اللہ رب العزت کے احکامات سے ہے اور تمام احکامات الٰہیہ کی سرسبزی و فروغ کا تعلق ایمان کے لیے جانیں کھپانے اور عالم میں ٹھوکریں کھانے کے ساتھ ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے احباب کو ان عالی احکامات کی تعمیل کی صورت مرحمت فرمائی جس میں ایک طرف اللہ رب العزت کے تمام احکامات کی سرسبزی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو عامۂ مخلوق کی بے انتہا پریشانیوں اور مصائب و بلایا کے وقت اپنی زندگیوں کے جذبات کو قربان کرکے اللہ رب العزت کی رضا کے جذبہ پر اپنے کو نثار کردیں اور خوشنودی باری تعالیٰ کے حصول کے ذریعہ اس عالم کے احوال کی درستگی کا ذریعہ بنیں۔

میرے عزیز! دین جیسی عظیم امانت کی سرسبزی کے لیے چلوں جیسے حقیر وقت کے فارغ کرنے کا رواج ایک معمولی سی بات ہے اور اس کا وجود جبکہ حق تعالیٰ شانہٗ کے قبضہ میں ہے اور ان سے وجود چاہنے کا طریق انبیا انبیاء کرام کے ذریعہ ہمیں بتادیا گیا تو پھر یہ بھی مشکل نہیں۔ البتہ عمل کے صحیح رخ کے ساتھ انہاک کو بڑھاتے ہوئے ان سے اس کا وجود حاصل کرنے کے لیے راتوں کی بے قراری والی دعائیں اور دنوں کو راتوں کو رُلا دینے والے مساعی کا انہاک مطلوب ہے۔ آپ احباب کو اس طرف پوری طرح متوجہ فرمادیں۔

بندہ محمد یوسف غفرلہ

۱۴ ربیع الاول ۸۳ھ

(۳)

[ایک جماعت جو مرکز سے گئی ہوئی تھی اور ایک علاقہ میں کام کر رہی تھی اس کے ذمہ داروں کے ایک خط

کے جواب میں ذیل کا اہم مکتوب لکھا گیا جو بہت اہم ہدایات اور انتباہات پر مشتمل ہے۔]

مکرمین ومحترمین۔ وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

خط کے ذریعہ احوال معلوم ہوئے اور آنے والوں کی زبانی بھی تفصیل معلوم ہوئی حق تعالیٰ شانہٗ آپ کی مساعی کو قبول اور بارآور فرمادیں میرے عزیز دوستو! شیطان کی طاقت حق ہے اور اللہ رب العزت نے اس کو بنایا ہے اور صرف اس لیے بنایا ہے کہ ان کی طرف بڑھنے والوں کے راستہ میں ابتلاء و امتحان و آزمائش کی گھاٹیں کھڑی کر کے کچے اور پکوں کا امتحان لیا جائے اور جو لوگ ان گھاٹیوں کو پار کر جائیں اور ان میں نہ الجھیں ان کو اپنی ذات کے تقرب و رضا سے عالی عالی انعامات و درجات سے ہمیشہ کے لیے نوازیں۔

شیطان کی بھرپور مسلسل کوشش ہو کہ اس راہ پر چلنے سے بچلایا جائے اور اگر اس رخ پر پڑ ہی جائے تو پھر اس کی پوری کوشش ان اصولوں سے بچلانے کی ہو جس سے رحمت و نصرت تائید خداوندی یہ متوجہ ہو کر ترقیات پر پہونچنے کے بجائے خذلان و محرومی کی شکلیں قائم ہوں میرے دوستو! آپ کے لیے بڑی زبردست گھاٹیں ہیں اور شیطان ان میں پچلانے کے لیے تجربہ کار و پرانا گھاگ مستعدی کے ساتھ اپنی تدابیر میں مشغول ہے۔ اس کے مکر سے تحفظ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ جتنی بھی عالی صورتیں اللہ رب العزت اپنے فضل سے پیدا فرمادیں اپنے انکسار و تواضع کی مشق کو بڑھایا جائے۔ ایک دوسرے کی قدردانی و اکرام و اعزاز کی پوری پابندی کی جائے۔ اپنے کو خادم اور دوسروں کو اصل کرنے والا یقین کر کے ہر عزت کے موقع پر دوسرے کو اور ذلت کے موقع پر اپنے کو بڑھایا جائے اور آپس میں مشوروں کا اہتمام اور ایک دوسرے کو مشورہ کی دعوت دی جائے اور ایک دوسرے کی دلجوئی کی پوری پوری سعی کی جائے۔ اس راہ کی تکالیف کو بالذات محبوب یقین کیا جائے۔ غیر باکے انتظاط اور ان میں کام کی شکل کو قوت عمل یقین کیا جائے۔ ذکر تعلیم و دعوات کا پورا اہتمام کیا جائے۔ بڑوں سے چھوٹا بننے کی مشق کے لیے ملا جائے اپنے عیوب پر ہر وقت نگاہیں ڈالی جائیں۔ اگر آپ احباب نے ہمتیں کر کے اللہ رب العزت کے لیے اپنے کو جوڑ کر جما لیا تو دوسروں کے لیے بھی انشاء اللہ العزیز اٹھنے کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ مولانا ضیاء الدین میں نفر کی جماعت کے ساتھ آج ہی آئے ہیں۔ مولوی عبد العزیز ابھی مقیم ہیں۔ دو آبہ کے دوسرے شہروں اور قصبات میں پھر کی ضرورت ہے۔

بندہ محمد یوسف غفرلہ یکشنبہ ۲۱ محرم ۷۳ھ

(۴)

۱۹۴۵ء میں ایک جماعت مراد آباد سے مرکز نظام الدین ہو کر پنجاب اور اس وقت کے صوبہ سرحد کی طرف گئی تھی اس کے ذمہ دار نے لدھیانہ سے کارگزاری کا خط حضرت مولانا کو لکھا جس میں دعا کی بھی درخواست کی گئی تھی۔ حضرت مولانا نے اس کے جواب میں ذیل کا مکتوب لکھوایا۔

..... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ۱۰ مارچ شنبہ کو کارگزاری لدھیانہ سے مطلع فرما کر مسرور فرمایا، آپ ایسے کام کے لیے نکلے ہوئے ہیں جس کے اندر اسلام کی سرسبزی ہو اور بڑے خیر کی توقعات ہیں اس لیے آپ کے لیے ہر چیز دعا کو ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خانقاہوں اور علمی مراکز میں اپنے کام کی بہت مختصر سی کیفیت کے بعد دعا کی درخواست خط کے ذریعہ کرتے رہیے اس کا ضرور اہتمام کیا جائے۔ آپ کی جماعت میں جو افراد مراد آبادی یا غیر مراد آبادی اپنا وقت ختم کر کے واپس جائیں۔ ان سے ترغیب کے بعد یہ ضرور کہا جائے کہ باہر نکل کر جن چیزوں کی تم سے مشق کرائی گئی ہے اور جو ایک طرز کی زندگی تم نے دیکھی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اب اسی زندگی کو اپنے گھر رہتے ہوئے اختیار اور پیدا کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ گھر جا کر اپنے مشاغل میں پہلے ہی کی طرح الجھ کر رہ جاؤ اور مقامی کام اور اس زندگی کو بالکل بھول جاؤ اور جو تاثرات ان میں پیدا ہوئے ہیں ان سے فائدہ اس طرح اٹھایا جائے کہ جانے والے کے ذہن میں یہ خوب بٹھا دیا جائے کہ اس نے جو وقت دیا وہ بہت کم ہے، اب اس کے بدل میں اور تاثر کو باقی رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ افراد کو تیار کر کے بھیجیے۔

..... والسلام بندہ محمد یوسف غفرلہ

(۵)

(رمضان ۱۳۶۱ھ میں ایک جماعت حجاج میں دینی کام کرنے کے لیے بھیجی گئی ہوئی تھی اس کے ذمہ داروں کو حضرت مولاناؒ نے ایک خط لکھا تھا، ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جا رہا ہے)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ..... آپ حضرات کے خطوط موصول ہوئے۔ آج کل طبیعت پر بہت زیادہ فکر اس بات کی غالب ہے کہ یہ ہزاروں عازمین حج جو اپنی بنیادی اور ابتدائی زندگی سے بھی خالی ہیں اگر ان کے اندر دینی جذبات کی پیداوار نہ کی گئی تو بلاشبہ سفر تو ہو جائے گا لیکن یہ ایک نادر موقع تھا کہ بیت اللہ کی طرف عاشقانہ طور پر جانے کی صورت پیدا ہوتی مگر وہ ہماری

کم ہمتی اور بے بضاعتی کی وجہ سے نہ ہوگی۔ اس کے لیے آپ جتنے بھی اس مقام پر پہنچ گئے ہیں اپنی انتہائی کوششوں میں کمی نہ کریں قلوب تو اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہیں نہ جانے کون سی ساعت کی محنت اللہ رب العزت کو پسند آجائے اور وہ اپنے الطاف سے کوئی رُخ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے زندہ ہونے کا پیدا فرمادیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۶)

[بمبئی میں مقیم حجاج میں کام کرنے والی ایک جماعت کی طرف سے حضرت مولانا کو صورت حال اور کارگذاری کی اطلاع دی گئی جس میں یہ بھی تھا کہ کچھ حجاج الحمد للہ اس پر آمادہ ہوگئے ہیں کہ وہ حجاز مقدس میں دین سیکھنے کے لیے دو دین کی نکر لے کر پیدل پھریں گے۔ حضرت مولانا نے اس کے جواب میں ذیل کا مکتوب لکھایا۔]

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خطوط کے ذریعہ مساعی خیر وصلاح کی خبریں موصول ہو کر باعث مسرت ہوئیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے لطف وکرم سے ان حقیر کوششوں کو اس اجتماعی طرز کے ایمان کے لیے جدوجہد اور نقل وحرکت کے منہاج محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پورے عالم میں سرسبز ہوجانے کا ذریعہ فرمائیں جس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو چھوڑا تھا۔ سابقہ عملی کو اس کے مقابلہ میں ایک گناہ تصور کرتے ہوئے اس پر توبہ استغفار کی مقدار کا حق ادا کر کے آئندہ کے لیے اس سے زیادہ اونچی شکلوں کو سامنے رکھ کر اپنی بساط کے مطابق جہد وحمت بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ جن حجاج کرام کو دین کی شکلوں کے سیکھنے پر اور صحابہ کرام کے طرز پر پیدل پھرنے پر آمادہ کر کے آپ حضرات نے بھیجا ہے سبب کے طور پر اگر ان سے خط وکتابت کے ذریعہ تحریض وترغیب وتاکید کا اجراء ہوسکے تو اس کو اختیار کرتے ہوئے ورنہ بغیر اس کے پوری طرح حق تعالیٰ شانہٗ سے گڑگڑا کر اور بلبلا کر ان کی راہ کے جو وعدے ہوچکے ہیں ان کے وجود میں آنے کے لیے حد سے زیادہ دعائیں کی جائیں اور مخصوص اکابر کی خدمات میں اس کی دعاؤں کے لیے لکھا جائے ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہمارے کام کرنے والوں کی اتنی زیادہ غیبوبت مناسب نہیں معلوم ہوتی، حافظ مسکین صاحب کو بمبئی گئے بہت دن ہو گئے۔ کچھ دن کے واسطے ضرور بالضرور انھیں یہاں بھیجدیا جائے۔

فقط والسلام

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

بقلم بشیر احمد عفی عنہ ۲۵ر شوال ۶۹ھ

(۷)

[مندرجہ ذیل مکتوب پاکستان کے تبلیغی احباب نقا کے نام چند سال پہلے ماہ رمضان میں لکھا گیا تھا یہ ہم کو جناب مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی سے حاصل ہوا جس کے لیے ہم مولانا موصوف کے بہت ممنون ہیں]

مکرمی و محترمی بندہ ادام اللہ مجدکم و وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حق تعالیٰ شانہ کا بہ ہی لطف وکرم ہے اپنے احباب پر کہ اس دور انحطاط میں جبکہ اللہ رب العزت کے اعمال کے ذریعہ ان کی ذات عالی سے استفادہ کی راہیں بند ہوتی جارہی ہیں اور اس حقیر و فانی دنیا پر جانیں کھپا کر اس کے ذریعہ وقتی زندگی بنانے پر قناعت کا رواج پڑ چکا ہے ایسے عالی و افضل طریق گشت و مجاہدہ کی طرف رہبری فرمائی جس کی قدر دانی کر لینے پر اور جان و مال کی حقیر سی پونجی جھونک دینے پر صرف محنت و مجاہدہ کرنے والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ عام امت مسلمہ محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و تحیۃ اور عام انسانوں تک کے لیے ہدایت کے دروازے کھل جانے کی پوری توقعات اور امیدیں ہیں۔ میرے عزیز دوستو! دونوں جہان کی ساری نعمتوں اور کامل کامیابیوں کے حاصل کرنے کے لیے حق تعالیٰ شانہ جل جلالہ وعم نوالہ نے پورا دین عطا فرمایا ہے جس کا تعلق ہماری پوری زندگی کے سارے اعمال سے ہے اب اگر حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف وکرم سے ہدایت سے نوازدیں اور یہ بات جی میں پیوست ہو جائے کہ پرورش کرنے والے حالات میں تغیر و تبدل کرنے والے صرف رب العزت ہیں اور اس دنیا میں پھیلا ہوا سارا نقشہ اور

چیزوں کی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی شکلیں ان کے استعمال کرنے سے استعمال ہوتی ہیں وہ اُن سب سے جو چاہے کرکے دکھلادیں اور اُن سب کے بغیر بھی جو چاہیں اپنی قدرت سے کرکے دکھلادیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو سیکھ کر کے اس کے مطابق اپنی زندگی گذارنے پر اللہ رب العزت اپنی قدرت سے جس طرح چاہیں گے زندگی کے حالات کو درست فرما دینگے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے خلاف زندگی گزارنے پر جو بھی چاہے حاصل کر لیا جائے اللہ رب العزت زندگی کے حالات کو بگاڑ دیں گے اور جس طرح چاہیں گے بگاڑ دیں گے سو اگر یہ ہدایت نصیب ہو جائے تو پورا دین بہت ہی آسان اور محبوب بن جاتا ہے اور تھوڑی سی محنت سے زندگی میں چالو ہو جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ اس ہدایت سے انسان کا دل خالی ہو جائے اور اپنی محنت اور مساعی اور اس دنیا کے دھوکے کے نقشوں اور شکل وصورت سے زندگی کے حالات کے سدھر جانے کا غلط اور بے بنیاد تصور دل میں بیٹھ جائے تو پھر دین پر چلنا اور اس کا سیکھنا مشکل ترین بن جاتا ہے اب حق تعالیٰ شانہ نے اس عالی دولت کے حاصل کرنے کے لیے محنت بھی عطا فرمائی اور دعائیں بھی عطا فرمائیں اور ان اعمال کی محنت کے لیے جن کی حیات پر دعائیں قبول ہو کر ہدایت کی دولت نصیب ہوا اور سارا دین آسان بنے مساجد بنائی گئیں اور بازاری نقشوں کے اختیار کرنے کو وہاں کے تذکروں کو وہاں کے تصورات کو یہاں ممنوع قرار دیا گیا اور مساجد کی آبادی وتعمیر بازاری نقش ونگار اور ساز وسامان میں قرار نہیں دی گئی بلکہ گھنٹوں ایمان بالغیب والی مجالس میں بیٹھنا اور علم الٰہی کے حلقوں کا پابند بننا اور ذکر ودعا کی نفائیں قائم کرنا نماز وعبادت کی فضا قائم کرنا اور امور آخرویہ پر رونا پیٹنا اور ایک دوسرے کی زندگی بنانے میں ہاتھ بٹانا وغیرہ امور کے مساجد میں وجود میں آجانے کو ان کی تعمیر قرار دیا گیا اور مساجد کو ان اعمال سے آباد کرنے والوں کے مومن ہونے کی خوشخبریاں سنائی گئیں اور انھیں کی دعاؤں کے قبول کرنے کے وعدے کیے گئے اور انہی مبارک انسانوں کے لیے ہدایت دینے کے فیصلے کیے گئے، اب جو مبارک انسان اپنی جان ومال لیکر اٹھیں اور ان اعمال کے امت مرحومہ محمدیہ میں رواج پا جانے کے لیے ملک بملک اقلیم بہ اقلیم مارے مارے پھریں

اپنی کمائی اور پرورش کے ظاہری نظام میں تغیر و تبدل گوارا کریں اور ہر طرح کی تکالیف اپنی جان پر برداشت کریں سو ایسے مبارک انسان اس راہ کے خواص میں ہیں ان کی دعائیں اپنے حق میں، اپنے متعلقین کے حق میں، عام امت محمدیہ کے حق میں اور سارے انسانوں کے حق میں اس طرح قبول ہوتی ہیں جس طرح انبیاء علیہم السلام کی عالم کے حالات میں اس طرح تغیر و تبدل آتا ہے جس طرح انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں، اس مبارک راستہ کی ہر زمانہ میں بہت زیادہ قیمت ہے مگر بعض حالات اور زمانے ایسے ہوتے ہیں کہ اس راہ کی قیمت مالک الملک کی طرف سے بہت ہی زیادہ بڑھادی جاتی ہے اور کام کرنے والوں کے لیے ترقیات کے بہت زیادہ دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جن حالات انحطاط دین سے ہم گزر رہے ہیں اس میں محنت کی قیمت دین کے استقبال کے زمانہ کی محنت سے لاکھوں گنی زیادہ ہے خصوصاً رمضان المبارک کے زمانہ میں جس زمانہ میں حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہدایت کی تقسیم کا غیبی نظام قائم کیا جاتا ہے، شیاطین بند کر دیے جاتے ہیں جو ہدایت سے ہٹانے والی غیبی طاقتیں ہیں، فرشتے بھیلا دیے جاتے ہیں جو ہدایت کی طرف بلانے والی غیبی طاقتیں ہیں، وہ مبارک روحانیت و نور والی وحی لانے والا فرشتہ جبرئیل علیہ السلام جس کے گھوڑے کی ٹاپ تک کی روحانیت سے ریت پر سبزہ پیدا ہو جائے جن کی اس عالم میں آمد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بند ہو گئی اور ان کی والی برکت سے اہل عالم محروم ہو گئے اس مبارک مہینے میں ان کی آمد بھی اس زمین پر کی جاتی ہے گویا ان کی نسبت والی برکات کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور حور و کو بجایا جاتا ہے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں خیر کی طرف پکار اور شر سے روکنے کی آوازیں ہر طرف بلند کرائی جاتی ہیں اور تھوڑا سا بھی متوجہ ہونے والوں کو بھی ہدایت سے نواز دیا جاتا ہے اب اگر اس محنت کے میدان کو جس پر ہدایت کا فیضان ہادی کی ذات عالی سے اپنی مخلوق کے لیے عمومی طور پر ہوتا ہے ایسے مبارک مہینے میں قائم کیا جائے جس میں ساری ہی امت محمدیہ مرحومہ کے لیے ہدایت کی تقسیم کا عام نظام قائم کیا جاتا ہے اور امت میں دین کی طرف رجوع کی عمومی شکلیں قائم کی جاتی ہیں تو معلوم نہیں کہ ہدایت والے اعمال کے ہدایت والے مکانات یعنی مساجد میں

زندہ کرنے کے لیے ہدایت دلانے والی نقل وحرکت وریاضت ومجاہدہ پر ہدایت والے مہینے میں کتنی ہدایت کا فیضان کتنی دین کی سرسبزی اور حالات دارین کی سرسبزی وفلاح کتنی مخلوق خدا کے لیے قائم ہوجائے اور یہ محنت کرنے والے کتنی خصوصیت کے حامل اور کتنے نہ تصور میں آنے والے درجات واجور وانعامات کے حاصل کرنے والے بن جائیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیارے صحابہ کرام کی مساعی مبارکہ پر قدسی وغیبی طاقتوں کا نزول اسی مہینہ کی مبارک مساعی پر شروع ہوا یعنی غزوۂ بدر والی ریاضت ومجاہدہ والا سفر اور اس پر اللہ رب العزت کی مدد یں اس مہینہ میں ہوئیں اور آپ کی مساعی والے اسفار کی انتہا یعنی سارے عرب کے سارے قبائل کا اسلام میں داخلہ کرنے والا سفر یعنی فتح فتح مکہ اسی مبارک مہینہ میں ہوا اس مبارک ماہ میں اللہ رب العزت کی راہ کی نقل وحرکت اور صحیح اصول کے اتباع تمام کے ساتھ محنت ومجاہدہ، راتوں کی دردبھری دعائیں عام قلوب کے حق وہدایت کی طرف پلٹ جانے اور دین متین کے سرسبز ہوجانے کا اعلیٰ ترین سبب اور اکمل ترین ذریعہ ہے۔ آپ حضرات ہمت فرما کر اللہ رب العزت کے راستہ میں شوق وحوصلہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے زیادہ سے زیادہ خرچ کے ساتھ دور سے دور کے لیے اپنی ذاتوں سے نکل کھڑے ہوں، دوسروں کو تیار کریں اور ہر طرف قریب وبعید میں چلوں اور تین چلوں کے لیے جماعتوں کو نکالیں کیا ہی اچھا ہو کہ اس مبارک زمانہ میں تین تین چلوں کے لیے نشکیلیں کرکے جماعتیں روانہ کی جائیں تاکہ ارکان اسلام کی حیات والی محنت کا حساب اس ماہ میں قائم ہو اور اس ماہ میں چلہ کے لیے نکلنے کی برکت سے زیادہ وقت کے لیے اللہ رب العزت کے راستہ میں رواج پڑ جائے کیونکہ جو خیر کا عمل اس مبارک ماہ میں شروع کردیا جاتا ہے وہ اس ماہ کی برکات سے چل پڑتا ہے، مقامی گشتوں کو بڑھائیں۔ روزانہ کی تعلیم کے حلقوں کو بڑھائیں اور ذکر ودعا کی مقدار بڑھائیں، حق تعالیٰ شانہ ہم کو آپ کو سب احباب کو اس راہ کی ترقیات حاصل کرنے کے لیے قبول فرمائے اور اپنے دین کو اپنی قدرت اور فضل وکرم سے چمکائیں اور اس کی برکات سے دارین میں ہمیں نوازیں آمین یارب العالمین آمین

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۸)

[حج کو جانے والوں میں دینی محنت کی ضرورت و اہمیت اور اس کا نظام]

۱۰ شوال ۱۳۸۵ھ

مکرمین و محترمین بندہ ادام اللہ سعیکم و زاد کم اللہ جداً فی سبیلہ
و تقبل عنا و عنکم و تجاوز عن سیئاتنا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ انسانی زندگی کی دارین کی کامیابی یہاں حاصل کرنے کے لیے حق تعالیٰ شانہ نے طریقۂ زندگی عطا فرمایا جس کا تعلق انسان کی ۲۴ گھنٹہ کی زندگی سے ہے۔ اس کے لیے یقین بھی خاص تجویز فرمایا، علم بھی خاص عطا فرمایا، نیت بھی خاص عطا فرمائی، تأثرات بھی خاص تجویز کیے، جان خرچ کرنے کے لیے خاص طریقے بتلائے اور مال خرچ کرنے کے لیے بھی تفصیل تجویز کی۔ ان خصوصیات کو اپنی زندگی کے طریقوں میں حاصل کرنے کے لیے نماز عطا فرمائی اور مساجد میں حاضری کا حکم دیا۔ تاکہ مساجد میں مجالس ایمانیہ کے ذریعہ یقین کی خصوصیت حاصل کریں، اور مجالس علمیہ کے ذریعہ جان و مال کے خرچ کرنے کے طریقوں کو اپنی زندگی کے شعبوں میں داخل کریں، اور ذکر کی مجالس کے ذریعہ اپنے تاثرات اور توجہات کو کائنات سے خالق کائنات کی طرف اور بازاری یقینوں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اعمال کی طرف جوڑ لیں انہی خصوصیات کے حاصل کرنے کے لیے رمضان المبارک کا مہینہ عطا فرما کر رات دن اسی محنت کا مطالبہ فرمایا اسی کی مشق کے لیے زکوٰۃ کا فریضہ عطا فرمایا اور ان خصوصیات کی تکمیل کے لیے حج کا مبارک ترین عمل عطا فرمایا۔ اب جو انسان اعمال کے انہماک کے ذریعہ اپنی زندگی گذارتے ہیں ان خصوصیات کو حاصل کرلیں تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات عالی کے لامحدود بے نہایت خزانوں کے ہمیشہ کے لیے عطایات اور انعامات کے دروازے کھل جاتے ہیں اور بازار کے نقشوں سے اساس زندگی ہٹ کر دعاؤں پر آجاتی ہے اور بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل مرحلہ خداوند قدوس کی قدرت کاملہ سے آسان سے آسان بن جاتا ہے اور دونوں جہاں کی کامیابیوں سے نوازدیا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے

جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خاص طرح کی عبادات عطا فرمائیں وہاں ان خصوصیات کے زندگیوں میں پیدا ہونے کے لیے محنت کے بھی خاص طریقے عطا فرمائے۔ جن کے اختیار کرنے پر اعمال کی خصوصیات زندہ ہو کر دعاؤں کی قبولیت کے عام دروازے کھل جاتے ہیں اور ان خاص محنت کرنے والوں کو دارین کی اعلیٰ نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ اور ان کی دعاؤں کی قبولیت میں انبیاء علیہم السلام کی دعوات کی قبولیت کی جھلک حق تعالیٰ شانہٗ نصیب فرما دیتے ہیں۔

میرے عزیز دوستو! فرائض خداوندیہ میں جو سا بھی فریضہ اُمت کی طرف متوجہ ہوتا ہے دو لائن کی محنت اُمت پر عائد ہوتی ہے۔ ایک اس فریضہ کو اپنی خصوصیات کے ساتھ اپنی ذات سے ادا کرنا۔ دوسرے اس فریضہ کے صحیح نوعیت کے ساتھ قائم ہونے کے لیے محنت کے میدان قائم کرنا فریضہ کی صحیح نوعیت کے ساتھ ادائیگی ثمرہ کا درجہ رکھتی ہے ۔ اور وہ محنت و مجاہدہ جس سے فریضہ کی صحیح نوعیت قائم ہو جڑ اور بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر جڑ وجود میں نہیں آئے گی ثمرہ کا ترتب نہیں ہوگا۔ اور بقدر جڑ کے وجود میں آنے کے ثمرات کا ترتب ہوگا ۔ حج کا فریضہ اور اس کی صحیح نوعیت قائم کرنے کے لیے محنت کا فریضہ امت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اب اگر محنت کر کے جانے والے حجاج میں ان خصوصیات اعمال کے زندہ ہونے کی محنت کر لی جائے جو حج کے ثمرات کے مرتب ہونے کے لیے شرائط کا درجہ رکھتی ہیں تو جانے والے حجاج کی اور ان محنت کرنے والوں کی دعائیں اپنے اپنے درجہ کے مطابق قبول ہو کر رحمتہائے خداوندیہ اور نصرتہائے الٰہیہ کے دروازے کھلنے کی صورتیں پیدا ہوں۔ حج کے فریضہ کا تعلق صرف حج کرنے والوں سے نہیں بلکہ پوری امت کے دین اور محنت کا جائزہ خداوند قدوس اپنے اس گھر پر لیتے ہیں جس کے اثرات پورے نظام عالم پر پڑتے ہیں۔ وہاں کی زندگی میں پاک طریقوں کے اختیار کرنے پر سارے عالم پر رحمت و انعامات کے اثرات پڑتے ہیں اور وہاں کی زندگیوں کی خرابیں سارے عالم پر پریشانیوں کے اثرات ڈلواتی ہیں۔ آپ حضرات ہمت فرما کر جانے والے حجاج کا تفقد کر کے ان کو نمازوں کا عادی بنائیں ،

مساجد میں ایمان کی مجلسوں میں بیٹھنے کی عادت ڈلوائیں، علم کے حلقوں میں کتابوں کے سننے اور سیکھنے سکھانے کا مزاج پیدا کریں، گشتوں کی اور دعوت دینے کی مشق کرائیں، اللہ رب العزت کے راستہ میں نکلنے اور دین کے لیے محنت کرنے پر آمادہ کریں اور اس کی عملی مشق جتنی کرا سکیں ضرور کرائیں خدمت گذاری کی، تواضع کی، اکرام مسلم کی، ذکر و دعوت کے اہتمام کی پابندی پر خوب ابھاریں اور عملی مشق بھی جتنی کرا سکیں ضرور کرائیں اپنے مقام پر بھی اس کی محنت کریں، ماحول میں بھی اس کے لیے جماعتیں بھیجیں، بیرونگاہوں پر جماعتیں روانہ کرنے کی سعی کریں اور جہاں جہاں حجاج جمع ہو کر روانہ ہوتے ہیں ان سب جگہوں کے لیے جماعتیں روانہ کریں تاکہ حجاج میں عمومی محنت کے ذریعہ حرمین مبارکین اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ عظام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اولیائے امت رحمہم اللہ کے پھرے ہوئے علاقوں کے فیوض و برکات امت میں عام ہوں، مساجد والے اعمال سرسبز ہوں اور امت کی روحانی و نورانی، ایمانی و اخلاقی ترقیات زندہ ہوں اور بازاری پھسلنوں اور دھوکوں سے امت کی حفاظت ہو اور آپ حضرات کے لیے اس کے صلہ میں قرب خداوندی کے وہ درجات حاصل ہوں جو تصور میں نہ آسکیں۔

اللھم وفقنا لما تحب وترضیٰ من القول والعمل والجد والنیۃ والھدیٰ آمین یا رب العالمین۔

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۹)

[حرمین پاک میں حجاج کو دین کی محنت پر لگانے کی اہمیت و ترغیب اور اس کا نظام]

۷۸۶

مکرم و محترم بندہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ — آپ حضرات کے خطوط موصول ہو کر کاشف احوال ہوئے — حجاج میں دینی زندگی کے زندہ ہو جانے کی جد و جہد کی شکلوں سے بہت مسرت ہوئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کو پورے عالم میں دین کی سرسبزی

کے لیے جان کھپاتے ہوئے آنے اور جانے کے زندہ ہو جانے کا ذریعہ فرمائیں تاکہ آتے ہوئے دین کے لیے جان کھپانے کے ذریعہ حرمین کے فیوض سے استفادہ کی استعداد پیدا ہو۔ اور واپسی کی جد و جہد میں حرمین کے افادہ کی شکلیں زندہ اور سرسبز ہوں۔

میرے عزیزو! اس عالی مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے جتنے بھی اس عمل کے جذبات پیدا کر کے اس کی اجتماعی شکلوں پر قابو پا لیا جائے اتنا ہی آنے والے دور میں حج کا معیار بلند ہو کر نہ معلوم اس وقت کے جان کھپانے والوں کے لیے کتنے بے نہایت اجر و درجات کے حصول کا ذریعہ ہو گا۔ جانے والے حجاج خصوصاً میوات کے حجاج میں اس بات کی پوری سعی ہو کہ مروجہ طریقہ پر جانے کے انتشار سے اپنی پوری طرح حفاظت کرتے ہوئے اس طریق سے حجاز میں سفر اختیار کیا جائے جس سے وہاں کے علاقہ میں دین کا شیوع و فروغ ہو اور جانے والوں کو وہاں کی ترقیات ایمانیہ و روحانیہ میں سے پورا حصہ نصیب ہو، پیدل اسفار کی عملی شکلیں قائم ہونے پر ابھی سے قابو پانے کی کوشش کی جائے۔ اپنے احباب پیدل کے لیے متعین کر کے ان کے رفقاء کے بڑھانے کی ابھی سے سعی ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں بھی تشریف لے گئے ان سب جگہوں کے لیے جماعتوں کے جانے کی تشکیلوں پر قابو پایا جائے، اور صحابہ کرامؓ نے جہاں دین کی حیات کے لیے ٹھوکریں کھائیں وہاں کے لیے بھی پوری طرح جماعتوں کے روانہ کرنے کی سعی کی جائے۔ تعلیم و تعلّم و اذکار کے اہتمام پر پوری طرح آمادہ کیا جائے۔ حجاج کرام و اہل عرب کے حقوق کی ادائیگی کی طرف پوری طرح متوجہ کیا جائے۔ ایک گروہ اللہ رب العزت کا مہمان ہے اور مہمان کے ساتھ کی ذرا سی بھی بے عنوانی ناگواری کا باعث بن جاتی ہے۔ اور دوسرا گروہ حرمین کا پڑوسی ہے ان کے ساتھ کی بے عنوانی بھی غضب الٰہی کی داعی ہے ـــــ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کی تخریب و بربادی و موت کا منظر سارے عالم میں بکھرا ہوا ہے مگر حج کے موقعہ پر ساری اُمت محمدیہ کی زندگیوں کا طریقہ سمٹ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ حیات کی موت کا (عالمی) منظر سب کے سامنے آجاتا ہے۔ اب دردمند اور اللہ اور ان کے محبوب رسول کے

ساتھ ذرا سا بھی تعلق رکھنے والوں کا اعلیٰ ترین تقرب و محبوبیت اور اطاعت و عبدیت کا عمل یہ ہے کہ اس منظر کی تبدیلی کے لیے اپنی جانوں کو پوری طرح جھونک دیں۔ دین کے لیے جان کھپانے کے اعمال پر ان کے ڈالنے کے لیے پوری طرح سعی کی جائے۔ ان کو اپنے ساتھ لیکر اس مبارک علاقہ میں ٹھوکریں کھانے کے ذریعہ اس کے اصولوں کے اخذ کی کوشش پوری طرح کی جائے۔ جزیرہ عرب کو دین کی حیات کے لیے جان کھپانے کا مرکز قرار دے کر اس میں طریقہ جہد کے سیکھنے اور سکھانے کا رواج ڈال کر ہر طرف دین کی حیات کے لیے ٹھوکریں کھانے کے لیے مقامی احباب کے ساتھ مل کر روانہ کرنے کا رخ ڈالا جائے، اگر میواتی حجاج میں سعی کے ذریعہ ان میں ان شکلوں پر عمل میں مسابقت پیدا کر لی جائے تو انشاء اللہ العزیز دوسرے علاقہ والے بھی ان شکلوں کو اختیار کرنے لگیں گے۔ اپنے احباب کو اس معاملہ میں پوری سعی کرنا انتہائی ضروری ہے۔ الحمد للہ یہاں تھوڑی سی عملی اجتماعی صورتیں پیدا کر لینے پر ان میں بہت ہی عالی جذبات پائے جا رہے ہیں خدا کرے آپ کی مساعی اس کے ازدیاد و ترقی کا ذریعہ بنیں۔

میرے عزیز دوستو! اس وقت کے احوال کی درستگی کے لیے پوری طرح اس عمل کے لیے جانیں کھپاتے ہوئے گڑگڑا کر بلبلا کر مواقع اجابت میں دعاؤں کا پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ حق تعالیٰ شانہ نے طبعی اعمال کی فضاؤں سے آپ حضرات کو نکال کر عبدیت کے اعلیٰ ترین عمل کے لیے اعلیٰ ترین عمل کے موقعہ پر جمع فرما دیا اب استعانت باللہ کی قوت کے بقدر ہی رحمت و انعامات و نصرت کے دروازے انشاء العزیز کھلیں گے، جس کے سارے ہی اہل عالم خصوصاً امت محمدیہ مرحومہ اور اہل ہند آج پوری طرح محتاج ہیں۔ آپ حضرات خصوصیت کے ساتھ عمل کے پورے انہماک کے ساتھ انتہائی دعوات کا اہتمام فرمائیں۔ مولوی داؤد و حافظ نصیب خاں و حاجی حنیف بھی انشاء اللہ آ رہے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں بھی گفتگوئیں اور مشورے جاری ہیں البتہ اپنی آمد کے بارہ میں موجودہ احوال کی بنا پر اشکال ہے اور بظاہر امسال ناممکن ہے۔

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ الرشوال ۸۵ھ

(۱۰)

[اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل اور اصول کی پابندی کی تلقین]

۱۸ر شوال ۵۶ھ ۲۹ر مئی ۵۶ء

مکرمین ومحترمین زادکم اللہ وایانا جداً وسعیاً فی سبیلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ — آپ حضرات کے خطوط مسرت کے باعث ہوئے۔ حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف وکرم سے آپ کی اپنی ترقیات کے ساتھ دین کی سرسبزی وفروغ کا آپ کی مساعی اور اس سفر کو ذریعہ فرما دیں اور ہر طرح کی مدد دیں اور نصرتیں دونوں جہان میں شامل حال فرماویں اور ہر موقع وحال کی حوائج کا اپنے فضل وکرم سے بندوبست فرماویں۔

میرے عزیزا کرنے والے صرف اللہ رب العزت ہیں اور ان کے لیے کوئی سی بھی حالت سخت نہیں ہے۔ جونسی حالت ضلالت کو، جونسی حالت ہدایت کے ساتھ جس وقت چاہیں بدل دیں۔ بندوں کی محنت ومساعی صرف اختیارِ سبب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اب سبب میں جتنی صفات قبولیت ہوں گی خداوند قدوس کی رحمت متوجہ ہوکر سخت سے سخت خراب احوال بہتر سے بہتر احوال سے منجانب اللہ تعالیٰ ان کے تصرفات خاص سے مبدل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اپنے کام کرنے والے احباب کو ان احوال سے نہ متاثر ہونا چاہیے نہ ناامید ہونا چاہیے بلکہ اللہ رب العزت کی عظمت وقدرت وقوت کو سامنے رکھ کر ان سے مدد میں حاصل کرنے کے لیے دین کی حیات وسرسبزی کے لیے جہد ونفر کے عالی اوامر کی تعمیل ان کی اعلیٰ شکلوں کے ساتھ کرتے ہوئے بارگاہ الٰہیہ میں گڑگڑا کر اور بلبلا کر دعاؤں کا اہتمام کرتے رہتے ہیں ہی ان سب احوال کی تبدیلی مضمر ہے حق تعالیٰ شانہ محنت کی صحیح شکل اپنے کو اور اپنے سب احباب کو نصیب فرمائیں۔ جماعت کے لانے کی بہت سعی فرماویں۔ تین تین چلّہ کی جم کر دعوت دیں۔ تعلیم وتعلم کے حلقوں کے قیام کا پورا پورا اہتمام فرمائیں اگرچہ تھوڑی ہی مقدار میں ہو سکے۔ اللہ کے ذکر کی کثرت کریں، اصول کا مذاکرہ رکھیں، دنیا کے تعیش کی رغبت پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ زندگی کی اپنے میں رغبت پیدا کرنے کی سعی کریں، ایک دوسرے کی خدمت گذاری کی عادت

ڈالیں۔ اخلاق کے سیکھنے کو بہت اہم سمجھیں اور دعاؤں کا اپنے لیے اور ہمارے لیے بہت اہتمام فرمائیں اور غرباء و کس مپرس طبقات میں کام کا ضرور بھیر ڈالیں کہ ان میں کا کام بہت سے رذائل سے حفاظت کا اہم سبب ہے۔ سب احباب کی خدمت میں سلام مسنون عرض کر دیں۔

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۱۱)

[اصولوں کو مضبوطی سے پکڑنے اور رواجی طریقوں سے بچنے کی تاکید]

مکرم و محترم بندہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ـــــ آپ صاحبان کے خطوط یکے بعد دیگرے تقریباً روزانہ ہی موصول ہوئے۔ وہاں کے کام سے جتنی خوشی حاصل ہوئی اسی قدر بے انتہا فکر بھی ہوئی جس کا اندازہ آپ حضرات کے خطوط سے بھی ہوتا رہا کہ آپ حضرات کو بھی حق تعالیٰ شانہٗ نے فکر عطا فرمائی ہے۔ حقیقت میں یہ کام رواج کے بالکل خلاف ہونے کی بنا پر مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑی سی محنت اور مجاہدہ کے بعد اس کے سارے اصولوں کی رعایت کرنے پر بہت ہی آسان ہے بلکہ رواجی طریقوں سے کرنے پر بے انتہا مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اگرچہ بظاہر رواجی طریق میں سہولت نظر آتی ہے۔ اس بنا پر اس بات کی اجتماعی طریق سے پوری کوشش فرمائی جائے کہ کام منہاج نبوت سے ہٹنے نہ پائے اور اپنی سادگی کے ساتھ دن کی محنتوں اور رات کی دعاؤں کی مقدار بڑھتی چلی جائے۔ اس کام میں اجتماعات نہ بنیاد ہیں نہ مقصود۔ بلکہ اپنے نہج سے نہ ہونے کی بنا پر مضر ہیں اس لیے ماہانہ اجتماعات بالکل ختم کیے جائیں ہر جگہ مقامی اجتماعات ہفتہ واری اجتماعات اپنی نوعیت کے ساتھ یعنی پوری شب گذارتے ہوئے اوراد و اوقات کا مطالبہ کرتے ہوئے کیے جائیں۔ اور جتنے آدمی اس وقت موجود ہیں ہر کام کو اجتماعی کریں حتیٰ کہ سفر میں بھی یکجا رہنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ جو لوگ ادھر (دہلی) ہو کر جا چکے ہیں ان سب کو جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ غرباء و مساکین میں کام کی مقدار بڑھائی جائے اگرچہ شروع میں مشکلات سامنے آئیں اور محنتیں کرنی پڑیں۔ ڈیڈیگل میں زیادہ نہ ٹھہرا جائے بلکہ پوری جماعت خود نمبروں کی پابندی کرتے

ہوئے غربا کی بستیوں کا سفر کرے۔

فقط بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

۲ رجب ۷۱ھ

(۱۲)

[مندرجہ ذیل مکتوب تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے علاقہ گجرات کے ایک مولوی صاحب کو ان کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے خط میں اپنے یہاں کے کام کے بارہ میں کچھ لکھا تھا، یہ ہم کو خود مکتوب الیہ نے بھیجا جس کے لیے ہم اُن کے ممنون ہیں]

مکرم بندہ وفقنا اللہ وایاکم لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خط سے حالات دکو الف معلوم ہوئے جس سے از حد مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ شانہ قبول فرمائے۔

میرے بھائی یہ کام بہت اونچا اور گہرا ہے اس میں ہزاروں اصول و قواعد ہیں اور اس کا ایک خاص نہج اور خاص مزاج ہے۔ اگر ان کو اپنا کر اس کام کو کیا گیا تو بہت زیادہ خیروں کی اُمید ہے اور دوسری صورت میں شرور و فتن کا خطرہ ہے اس لیے آپ جیسے کام کرنے والے حضرات کے لیے بہت زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علاقوں سے جماعتیں لے کر یہاں آئیں اور پرانوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کے ذریعہ اس کام کو صحیح نہج کے ساتھ اپنائیں، اس سے آپ حضرات کے علاقہ میں صحیح اصولوں کے ساتھ کام چلے گا اور چمکے گا اور کام کرنے والے احباب خطرہ سے محفوظ امن میں رہیں گے اور لوگوں میں عمومی طور پر تواضع، کسر نفسی، دوسروں کے محاسن دیکھنا، اپنے عیوب پر نظر ڈالنا پیدا ہوگا، جس سے دل جُڑیں گے اور محبت و اتفاق پیدا ہوگا۔ جب تک یہاں نہ آسکیں اپنے حالات سے تفصیلاً اطلاع دیتے رہیں۔۔۔۔۔

تمام احباب کو سلام مسنون، خدا تمام مدارس دینیہ کو ترقی نصیب فرمائے۔ والسلام

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ

(۱۳)

[شادیاں کس طرح کی جائیں اور زندگی کا یہ شعبہ دین کے فروغ کے لیے کس طرح استعمال ہو ذیل کا مکتوب ایک صاحب کو لکھا گیا جنھوں نے اللہ کی توفیق سے سنت کے مطابق شادی کی تھی۔]

مکرم و محترم بندہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ — آپ کے اس مبارک جذبہ کو معلوم کر کے حد سے زیادہ مسرت ہوئی کہ آپ کے ہاں شادی سنت کے مطابق وجود میں آئی۔ حق تعالیٰ شانہٗ آپ کے اس مبارک عالی جذبہ کو پوری طرح قبول فرماتے ہوئے اپنے لطف و کرم و فضل سے اس میں برکتیں و رحمتیں پوری طرح شامل حال فرمائیں — میرے بزرگ! اس شعبہ کا سنت کے مطابق ہونا بس اسی پر موقوف ہے کہ اس فعل پر جو پیسوں کے خرچ اور کھانے پینے کی مجلس پر اجتماع ختم ہو جاتا ہے۔ اور مجالس کا موضوع کھانے پینے کی دلچسپیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ان آنے والوں کو دین پر جان و مال خرچ کرنے اور تبلیغ کے ذریعہ دین سیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہونے پر آمادہ کیا جائے۔ اور اپنی جتنی رقم نکاح کی فضولیات پر آج خرچ کرنے کا رواج ہے اتنی مقدار مال کو لیکر لڑکا لڑکی کے والد وغیرہ اللہ رب العزت کے راستہ میں دین کی سرسبزی کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ اور اپنے اس جذبہ و شوق کو جس کو وہ شادی پر خرچ کرتے اللہ کے دین کی سرسبزی کے لیے جد و جہد پر صرف کریں اور دوسرے شادی میں شریک ہونے والوں کو بھی اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ مسلم کی جان و مال کا موضوع و مقصد خواہشات پر خرچ ہونا نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی حیات و سرسبزی پر خرچ ہونا ہے۔ جتنا ہماری جانوں اور مال کا خرچ دین کی حیات کے درد و فکر و جہد و سعی پر آنا چلا آئے گا دین کے سارے شعبے سنت کی شکل پر زندہ ہوتے چلے جائیں گے

آپ کے اس اقدام کو حق تعالیٰ شانہٗ پوری طرح قبول فرمائیں اور اس شعبہ کی اصلاح کا اس شادی کو ذریعہ فرما کر اس شعبہ سے متعلق رحمت و نصرت، انعامات و برکات کے دروازے جمیع اہل عالم کے لیے پوری طرح کشادہ فرمائیں۔ بندہ اس شادی کے مقبول با برکت ہونے کے لیے پوری طرح دعا گو ہے.....

بندہ محمد یوسف غفرلہٗ ۱۸ رجب ۱۳۸۵ھ

تاج آفس — بمبئی ۳

کا

تیار کردہ

قرآن مجید حوالہ نمبر ۹۹۹

بچوں کی

ابتدائی تعلیم کے لیے نہایت مفید ہے

خریدار حضرات

"حوالہ نمبر ۹۹۹ — اور — تاج آفس بمبئی ۳"

قرآن مجید کی جلد ہی پر سنہری، سفید یا روپہلی ڈائی میں لکھا ہوا پائیں گے

اطمینان کرلیں — اور خریدیں

نمونہ کا صفحہ طلب کرنے پر بذریعہ ڈاک بھجوایا جائے گا

تاج آفس، محمد علی روڈ، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۵۸ بمبئی ۳

زیارتِ حج بیت اللہ پر دو اہم کتابیں

تجلیاتِ کعبہ

مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی

تجلیاتِ مدینہ

ان کتابوں کے پڑھنے سے حج کا روح درست ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قلب و روح میں وہ جذبات و کیفیات و تاثرات پیدا ہوتے ہیں جو دراصل حج کی روح ہے، حاجی حضرات کو ان کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے، اور جو حضرات گھر بیٹھے ان کا مطالعہ کریں گے انھیں بالکل ایسا محسوس ہوگا کہ حج و زیارت کے روح افزا مناظر اور مکہ معظمہ مدینہ منورہ کے روحانی جلوے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

تجلیاتِ کعبہ صفحات ۳۱۲، سائز ۲۰×۳۰ کاغذ طباعت گلیز سفید رنگین ٹائیٹل قیمت -/۳

تجلیاتِ مدینہ صفحات ۲۵۰، سائز ۲۰×۲ کاغذ گلیز سفید " " قیمت ۲/۵۰

مسنون دعائیں

مؤلفہ مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری

بارگاہ خداوندی میں پیش کرنے کے لیے رحمۃ للعالمین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریباً ہر وقت اور ہر موقع کی مقبول دعائیں جن کا ورد رکھنا دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ ان کے معانی میں غور و فکر سے توحید کے بلند مقامات پر رسائی ہو سکتی ہے ان دعاؤں کے پڑھنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے جو خدا تعالیٰ کا محبوب و مقبول اور مقرب بارگاہ بندہ بننے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس ایڈیشن میں آخر میں خاص دعائیں کے نام سے حضرت شاہ مولانا محمد الیاسؒ نور اللہ مرقدہٗ کا اہم ملفوظ دعا مانگنے کا طریقہ درج کیا گیا ہے۔ کتابت و کاغذ اعلیٰ، طباعت عکسی بذریعہ آفسٹ مشین، ضخامت ۱۶۸ صفحات خوشنما ٹائیٹل سہ رنگا، جیبی سائز قیمت ۶۰/- ساٹھ پیسے

مکاتیب حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ ۱/۵۰، اسلام تلوار سے نہیں پھیلا ۷۵/-، مفتاح التبلیغ مولانا احسن خاں میواتی ۱/۵۰، اسلامی زندگی ۲۵/- اسلامی نام ۲۵/- ارشاد الملکین۔ مولانا عبدالباطن جونپوری ۱/۵۰، حرکت آفاق، مولانا حبیب اللہ پالن پوری ۲/۵۰، تبلیغی کام کرنے والوں کے لیے چالیس سبق مولانا سعید الدینؒ ۲۵/-

پتہ:- کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ۶

تقریریں

قارئین کرام آئندہ صفحات میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی تقریریں پڑھیں گے ـــــ اجتماعات میں حضرت مولانا کی تقریریں سننے والوں نے خود آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ جب وہ تقریر فرماتے تھے تو اُن کی تقریروں کو قلمبند کرنے کے لئے بہت سے قلم چلتے رہتے تھے ـــ جو تین تقریریں الفرقان کی اس اشاعت خاص میں درج کی جارہی ہیں ان میں سے آخری تو خود اچیز مدیر الفرقان کی لکھی ہوئی ہے، پہلی دو تبلیغی کام سے خصوصی تعلق رکھنے والے ایسے حضرات کی لکھی ہوئی ہیں جن پر اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

الفرقان کی یہ خاص اشاعت جن حضرات تک پہنچے گی ان میں شاید ہی کچھ ایسے اصحاب ہوں جنھیں کبھی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سننے کا اتفاق نہ ہوا ہو ـــــ حضرت مرحوم کا طریق بیان بالکل نرالا تھا بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ انکی تقریر کی ایک مستقل زبان تھی اور خاص اصطلاحی الفاظ تھے جن کے گویا وہ خود ہی موجد تھے۔ پچھلے صفحات میں ناظرین نے انکے مکاتیب پڑھے ہیں بس جو زبان ان کے مکاتیب کی ہے قریب قریب یہی زبان انکی تقریر و بیان کی تھی۔

یہ واقعہ ہے کہ زبان و بیان کی جن خوبیوں کی وجہ سے کسی مقرر کی تقریر کامیاب سمجھی جاتی ہے مولانا مرحوم کی تقریروں میں ان میں سے ایک بات بھی نہیں ہوتی تھی بلکہ سامعین کے بڑے طبقہ کے لئے انکی تقریروں کا کافی حصہ نامفہوم ہوتا تھا اور اچھے پڑھے لکھوں اور سمجھنے والوں کے لئے بھی ان کے الفاظ اور انکی ترکیبیں بالکل نامانوس ہوتی تھیں لیکن کشش اور تاثیر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ پچاس پچاس ہزار کا مجمع اس طرح ہمہ تن گوش ہو کر ان کا بیان سنتا تھا کہ گویا ہر لفظ ہر سننے والے کے دل میں اتر رہا ہے اور وہ اس سے بھرپور مستفید ہو رہا ہے۔ یہ کشش اور یہ تاثیر دراصل اس قلبی کیفیت اور توجہ الی اللہ کی ہوتی تھی جس کے ساتھ وہ تقریر فرماتے تھے۔

خود راقم سطور نے اکثر محسوس کیا کہ وہ تقریر شروع فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور مراقب ہوتے تھے اور اسکے بعد تقریر شروع فرماتے تھے۔ اور پھر ان کو خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی تھی ـــــ ایسے تقریباً ۴۰ ـــ سال پہلے کا واقعہ ہے بھوپال میں اجتماع تھا ان دنوں حضرت مولانا مرحوم کی ران میں ایک بہت بڑا زخم تھا جس حال یہ تھا کہ حرکت کرنے سے اور زور سے تقریر کرنے سے اس میں سے خون جاری ہو جاتا تھا، مولانا اسی حال میں بھوپال تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق اجتماع میں تقریریں بھی فرمائیں ـــــ زخم کی تکلیف کافی بڑھ گئی، بھوپال سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے ۴۰ ـــ ۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور اجتماع طے تھا حضرت مولانا وہاں

بھی تشریف لے گئے، لیکن طے یہ ہوا کہ یہاں مولانا تقریر نہیں فرمائیں گے بلکہ فلاں ساتھی کی تقریر ہوگی۔ مگر ساتھی کی تقریر کے بعد جب مولانا نے دیکھا کہ دعوت قوت سے نہیں دی گئی تو اپنے اندرونی داعیہ سے مغلوب ہوکر خود تقریر کے لئے اصرار فرمایا، اُس دن بیٹھنے کے لائق بھی نہیں تھے لیٹ، کے فرمانا شروع کیا، زخم میں سے خون جاری ہوگیا اور حالت یہ ہوگئی کہ ایک کپڑا لگا دیا جاتا جب وہ بالکل تر بتر ہو جاتا تو دوسرا کپڑا لگا دیا جاتا اس طرح کئی کپڑے خون سے بھر گئے اور مولانا نے عادت کے مطابق پوری تقریر فرمائی۔ اس ناچیز کا اندازہ ہے کہ اس تقریر کے دوران کم از کم آدھا سیر خون مولانا کے زخم سے ضرور نکل گیا ہوگا۔ لیکن اللہ کے اُس بندے کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال اس عاجز کے نزدیک اُن کی تقریروں کی تاثیر کا راز ان کی اس قلبی کیفیت اور فنائیت میں تھا۔

آئندہ صفحات میں حضرت مولاناؒ کی صرف تین تقریریں درج کی جارہی ہیں، دو تقریروں کی کتابت اور بھی ہو چکی تھی لیکن صفحات میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے ان کو روک لینا پڑا، وہ انشاء اللہ آئندہ الفرقان کی عام اشاعتوں میں شائع ہوسکیں گی ——— جو تین تقریریں اس اشاعت میں شائع ہو رہی ہیں ان میں ناظرین کی سہولت فہم کے لئے وہ لفظی تبدیلیاں کرلی گئی ہیں جو اس قسم کی تقریروں کو کاغذ پر لانے کے لئے ضروری اور ناگزیر ہوتی ہیں اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مقصد و مضمون میں ذرا بھی فرق نہ پڑے۔

محمد منظور نعمانی

(۱)

کامیابی اور ناکامی کی حقیقی بنیاد

ذیل کی تقریر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آخری سفر میں خواص کے ایک اجتماع میں فرمائی تھی، جس کو حضرت کے ایک خاص رفیق سفر نے قلمبند کیا تھا، انہی کی عنایت سے یہ ہم کو حاصل ہوئی ہے — ہم نے ناظرین کی سہولت فہم کے لیے کہیں کہیں لفظی تبدیلیاں کی ہیں۔ (ادارہ)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

بھائیو دوستو! کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوتا ہے اُس کے دو رُخ ہیں ایک رُخ ظاہر کا ہے اور وہ یہ ہے کہ چیزوں میں سے چیزیں نکل رہی ہیں اور چیزوں میں سے اثرات اور خواص ظاہر ہو رہے ہیں جیسے مٹی سے غلّہ، غلّہ سے غذا، غذا سے پیٹ کا بھرنا پھر اس کا خون بننا، خون سے منی کا یعنی نطفہ کا بننا، پھر اُس سے خون کا لوتھڑا بننا پھر اُس میں اعضا کا اور شکل انسانی کا بننا (اور اسی پر قیاس کر لیجیے دنیا کی ساری چیزوں کو) — یہ وہ رخ ہے جو انسان پر بحیثیت انسان ہونے کے کھولا گیا ہے یعنی ہر انسان اس کو دیکھ رہا ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے — دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے اور اُس کے حکم سے ہو رہا ہے اور یہ سب اللہ کا نظر نہ آنے والا ہاتھ کر رہا ہے — یہ رُخ انسانوں پر بحیثیت انسان ہونے کے نہیں کھولا گیا اس لیے ہر انسان اس کو دیکھ نہیں پاتا۔ بلکہ یہ رُخ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انسانوں پر کھولا گیا ہے، یعنی یہ بات انبیاء علیہم السلام نے بتائی ہے کہ جو کچھ چیزوں سے بنتا ہوا اور ظاہر ہوتا ہوا نظر آتا ہے یہ چیزوں سے نہیں بنتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور امر سے بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر ہیں کہ جس شکل سے جو چیز چاہیں بنا دیں یا بلا کسی شکل کے محض قدرت اور حکم سے چیز بنا دیں اسی طرح وہ قادر ہیں کہ جس چیز سے جو اثر چاہیں ظاہر کر دیں۔ پانی سے چاہیں تو ڈبا دیں اور چاہیں تو تیرا دیں، آگ سے چاہیں تو جلا دیں اور چاہیں تو

نہ جلائیں، غذا سے چاہیں تو پیٹ بھریں اور چاہیں نہ بھریں، موت کی جگہ سے چاہیں تو زندگی نکالدیں اور زندگی کی جگہ سے چاہیں تو موت نکالدیں ـــ معجزوں سے یہی بات ظاہر کی جاتی ہے کہ چیزوں میں کچھ نہیں ہے، اللہ جس چیز سے جو چاہے نکال سکتا ہے۔ وہ چاہے تو حکومتوں کی اسکیموں (اور منصوبوں) کو فیل کردے اور محکوموں کی اسکیمیں چلادے، اُس نے نمرود کی اسکیم کو فیل کردیا اور ابراہیم علیہ السلام کی اسکیم چلادی ـــ فرعون کے ارادۂ قتل کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کو خود اس کے گھر میں پلوادیا اور اُس کو سارے لاؤلشکر سمیت سمندر میں ڈبادیا۔ ابراہیم علیہم السلام سے بیوی بچہ کو ایسے میدان میں ڈلوا کر جہاں کوئی آبادی نہیں تھی، زندگی کا کوئی سامان نہیں تھا، پینے کے لیے پانی تک بھی نہیں تھا اُن کی یہ اسکیم چلادی کہ اس بچے کی اولاد یہاں دالی ہدایت (کی دعوت) لیکر سارے عالم میں جاوے اور سارے عالم سے لوگ یہاں حج کو آویں۔ خود اسکیم والا وہاں تھا بھی نہیں ملک شام میں تھا لیکن اس کی اسکیم چل گئی اور جس بچہ کے کھانے پینے کا اور حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں تھا اس کی اولاد اقیموا الصلوٰۃ کو لے کر دنیا میں جانے لگی اور ساری دنیا سے لوگ آج تک حج کو وہاں آرہے ہیں۔ سارے حکومتیں حج میں کتنے روڑے اٹکا رہی ہیں لیکن حج کی حرکت برابر بڑھ رہی ہے اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی چلائی ہوئی اسکیم اب تک کیسے زور سے چل رہی ہے۔

آدمی سمجھتے ہیں کہ کھیتی اور باغات سے زندگی بنتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے قوم سبا کو کھیتی اور باغات کے باوجود ہلاک کردیا اور اسماعیل علیہ السلام کو ایسے جنگل میں جہاں کھیتی اور باغات کا نشان بھی نہ تھا پال دیا ـــ آج دنیا کا یقین فوج پر ہے اللہ تعالیٰ نے ابرھہ کی فوج کو حقیر پرندوں سے ہلاک کرا کے اس یقین کو غلط ثابت کردیا۔ الغرض معجزات سے ظواہر کے عام انسانوں والے یقین کی پوری نفی ہوتی ہے۔ معجزات ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ میں یہ قدرت ہے کہ وہ عصا کو اژدہا بنادیں، نار کو باغ بنادیں، ہاتھ میں روشنی اور چمک کی صفت پیدا کردیں ـــ دنیا کی ساری چیزیں اور ساری شکلیں گھاس کے تنکوں سے لیکر ایٹم اور راکٹ تک اور اسی طرح ساری طاقتیں اور ساری حکومتیں قدرت خداوندی کے تحت ہیں ـــ یہ چیزیں خود قدرت نہیں ہیں بلکہ قدرت ان پر تصرف کرتی ہے یہ سب چیزیں فانی ہیں اور قدرت غیر متبدل اور غیر فانی ہے۔ اللہ تعالیٰ چیزوں

سے زندگی بناتے بھی ہیں اور بگاڑتے بھی ہیں۔ کامیاب بھی کرتے ہیں اور ناکام بھی کرتے ہیں، غرض جو کچھ بھی ہوتا ہے چیزوں سے نہیں ہوتا اللہ کے حکم اور اس کی قدرت سے ہوتا ہے۔

کائنات کا یہ وہ رخ ہے جو انبیاء علیہم السلام پر کھولا جاتا ہے اور انہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور وہی قدرت کے اعتبار سے استفادے کے طریقے لے کر آتے ہیں۔

عالم کی چیزوں پر نظر رکھ کر اور ان میں نفع نقصان سمجھ کر ان کو استعمال کرنے یا ان میں اپنے کو لگانے کا طریقہ ہر شخص خود تجویز کر سکتا ہے کیونکہ چیزیں نظر آتی ہیں اور ہر شخص ان کو دیکھتا ہے لیکن اللہ کا حکم اور اس کی قدرت جو چیزوں میں کام کرتی ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتی اس لیے اس سے استفادہ کا طریقہ انسان خود تجویز نہیں کر سکتا، یہ علم اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام پر کھولتے ہیں اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے انہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے انسانوں کو نکموں اور چیزوں سے ہٹایا نہیں بلکہ یہ بتایا کہ اللہ کی قدرت اور اس کے حکم کو اصل سمجھتے ہوئے ان چیزوں میں لگو اور یہ یقین بنا لو کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے تشریعی اوامر کی تابعداری کرتے ہوئے ان شعبوں میں لگو گے اور ان چیزوں کو استعمال کرو گے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے انہی چیزوں سے تم کو نفع پہنچائے گا اور یہ نفع آخرت تک چلے گا بلکہ وہیں بھرپور حاصل ہوگا یہی ہے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا منشا کہ اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں ہوگا اور کچھ نہیں ملے گا سب اللہ ہی کے کرنے سے ہوگا اور ملے گا اور ان کا فضل و کرم جب ہوگا جب ہماری زندگی اور چیزوں میں ہمارا لگنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہوگا۔

اب دو کام ہیں ایک اپنے میں لا الٰہ الا اللہ والے یقین کا پیدا کرنا اور دوسرا ہر عمل اور ہر شعبہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنے کا عادی بننا اور اس کی مشق کرنا — یہ دونوں باتیں پیدا کرنے کے لیے نماز دی گئی اور ایک محنت دی گئی اور مسجد کو ان دونوں کا مرکز بنا دیا گیا۔

مسجد سے دن رات میں پانچ دفعہ اعلان کرایا جاتا ہے جس میں سب سے پہلے چار دفعہ کہلوایا جاتا ہے — اللہ اکبر اللہ اکبر — اللہ اکبر اللہ اکبر — اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ عناصر اربعہ سے یعنی مٹی، پانی، ہوا اور آگ سے بنا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا یہ حال کہ ان میں سے ایک ایک ساری دنیا کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔ مٹی یعنی زمین اگر آدھے

دن کے لیے زلزلہ سے ہلادی جائے تو ساری دنیا ختم ہوجائے ـــ اسی طرح اگر پانی چھوڑ دیا جائے تو نوح علیہ السلام کے زمانہ کی طرح ساری دنیا غرق ہوکر فنا ہوجائے ـــ اسی طرح اگر قوم عاد کی طرح آندھی چھوڑ دی جائے تو ساری دنیا کا خاتمہ ہوجائے ـــ اسی طرح اگر آگ کو جلاڈالنے کا حکم ہوجائے تو ساری دنیا راکھ کا ڈھیر بن جائے۔ تو اذان میں سب سے پہلے چار دفعہ کہا جاتا ہے "اللہ اکبر اللہ اکبر" اللہ سب سے بڑا ہے آسمان وزمین اللہ کے سامنے کچھ بھی نہیں، عناصر اربعہ اور اُن سے جو کچھ بنا ہے وہ سب اللہ کی مخلوق ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، خدا کی ہستی کے سامنے ہر چیز حقیر اور بے حقیقت ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ روس وامریکہ اور دنیا کی ساری طاقتوں اور حکومتوں کی اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں اللہ کی ہستی سب سے بڑی ہے "اللہ اکبر اللہ اکبر

اس کے بعد دوسری بات یہ کہلوائی جاتی ہے "اشہدان لا الٰہ الا اللہ" بناؤ بگاڑ والا اللہ کے سوا کوئی نہیں، بتکلوں اور چیزوں سے کچھ نہیں ہوگا اللہ ہی کے کرنے سے ہوگا "اشہدان لا الٰہ الا اللہ" اس کے بعد کہلوایا جاتا ہے "اشہدان محمداً رسول اللہ" اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑے ہیں اور جن کے ہاتھ میں بناؤ وبگاڑ اور کامیابی وناکامیابی ہے اُن کی قدرت سے استفادہ کا طریقہ ہم خود نہیں جانتے، ہم اس راستہ میں نابینا ہیں، اس کے راہ نما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ اللہ کے رسول ہیں، اُن کے طریقے پر چل کر ہی اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم حاصل کیا جاسکتا ہے "اشہدان محمداً رسول اللہ"

اس کے بعد کہلوایا جاتا ہے "حَیَّ علی الصلوٰۃ، حَیَّ علی الفلاح" یہ باتیں اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے نماز کے لیے یہاں آؤ۔ کامیابی یہاں والے اعمال سے ملے گی۔

اللہ والے اعمال میں (یعنی عبادات میں) کچھ تو وہ ہیں جن کے ساتھ چیزوں میں بھی لگ سکتے ہیں، چیزوں سے کلی انقطاع ضروری نہیں۔ حج روزہ، زکوٰۃ کا حال یہی ہے روزہ میں کھانا کھا تو نہیں سکتے مگر کھانا پکا سکتے ہیں، دوسروں کو کھلا سکتے ہیں تجارت اور زراعت وغیرہ کے کام کرسکتے ہیں ان کی باتیں کرسکتے ہیں اسی طرح زکوٰۃ دیتے وقت کھانا پینا دوسرے کاموں میں لگنا منع نہیں ہے۔ حج میں بھی دوسرے کاموں کی ممانعت نہیں ہے، یہاں تک کہ سلا کپڑا پہننے کی ممانعت ہے لیکن پہننے

کے لیے کپڑا سینے کی ممانعت نہیں ہے ـــــ لیکن نماز وہ عبادت ہے جس میں آدمی تمام چیزوں سے کٹ کر لگتا ہے۔ نہ کھانا کھائیں گے، نہ کھلائیں گے، نہ پکائیں گے، نہ کپڑا سئیں گے، نہ کسی سے کوئی بات کریں گے، دھیان بھی ہر چیز سے ہٹا کر اللہ پر لگانے کی کوشش کریں گے ـــــ تو اذان کے ذریعہ مسجد سے پہلے تو "اللہ اکبر اللہ اکبر" اور اشہد ان لا الٰہ الا اللہ اور اشہد ان محمداً رسول اللہ کی آواز لگوا کر یقین درست کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اس کے بعد نماز کے عمل کے لیے بلایا جاتا ہے جس میں چیزوں سے کٹ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر اللہ تعالیٰ سے وابستگی کی مشق کی جاتی ہے اور اس میں کامیابی بتائی جاتی ہے۔

بھائی دوستو! جو کوئی مشین بناتا ہے وہی اُس کے چلانے کا طریقہ اور بناؤ بگاڑ کی بات بھی جانتا ہے جو مشینیں باہر سے آتی ہیں اُن کے ساتھ بنانے والوں کی طرف سے چلانے کے طریقہ کے بارے میں ہدایات بھی آتی ہیں ـــ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے بنایا ہے ماں کے پیٹ میں رکھ کر بنایا ہے جہاں کسی دوسرے کا ہاتھ بھی نہیں لگ سکتا بلکہ نظر بھی نہیں جا سکتی، وہی اللہ جانتا ہے کہ انسان کی مشین کس طرح استعمال ہونے میں اس کا بناؤ اور تعمیر ہے اور کس طرح استعمال ہونے میں اس کا بگاڑ اور تخریب ہے۔ اُس نے پیغمبروں کو یہی بتانے کے لیے بھیجا اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، اب جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق اپنے کو استعمال کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو اُن کے طریقہ کے خلاف اپنے کو استعمال کرے گا وہ ناکام ہوگا اور اس کی یہ ناکامی پوری طرح آخرت میں ظاہر ہوگی۔ جو انسانوں کے لیے اصلی اور دائمی عالم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف طبقوں میں بانٹ دیا ہے حاکم، محکوم، امیر، غریب، کالے، گورے وغیرہ وغیرہ۔ اب ان کی تعمیر اور کامیابی ان مختلف طبقات کے جوڑ میں ہے، جوڑ والے طریقے قرآن مجید نے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ اگر ساری دنیا کے خزانے خرچ کر کے کوئی جوڑ پیدا کرنا چاہے تو پیدا نہیں ہو سکتا اللہ والے اعمال میں لگنے سے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے جوڑ پیدا کر دیتے ہیں لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (اے محمد آپ ساری

دنیا کے خزانے خرچ کر کے ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، ہم نے اپنی قدرت سے جوڑ دیا ہے)
انسان کا مزاج ہے جو اُس سے فائدہ کھینچے اُس سے کٹتا ہے اور جو اُس کو فائدہ پہنچائے اُس سے جُڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اور اس کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ طریقہ بتایا جس پر چل کر ہر ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والا بنے کوئی کسی سے فائدہ کھینچنے والا نہ بنے۔ غریبوں کو بتایا کہ مال والوں کے پاس جو کچھ ہو اس سے فائدہ اُٹھانے کا خیال دل سے نکال دیں اور خود اپنی ذات سے ہر غریب، امیر کو فائدہ پہنچانے والے بن جاویں۔ مثلاً وہ راستہ نہ جانتے ہوں تو خود چل کر اور تکلیف اُٹھا کر ان کو راستہ بتا دیں، میت ہو جائے تو اُس کے اُٹھانے اور دفن وغیرہ میں مدد دیں خود قبر کھودنے میں لگ جائیں، بیمار پڑ جائیں تو عیادت کریں محض اللہ کے لیے ان کا بوجھ اٹھا دیں اور اگر ان کے پڑے ہوئے پیسے کہیں مل جائیں تو پتہ چلا کر اُن تک پہنچا دیں، کوئی خطرہ ہو تو ان کی حفاظت کریں، پہرہ دیں، راستہ میں اگر ان کی موٹر کہیں پھنس جائے تو نکالنے میں مدد کریں اور ضرورت ہو تو اپنے جھونپڑے میں ان کو ٹھہرائیں اور جو میسر ہو کھلائیں۔ اور جب وہ ان خدمتوں کے عوض میں پیسے دینے لگیں تو کہدیں کہ میں نے جو کچھ کیا تھا خدا کے راضی کرنے کے لیے اور اُس سے ثواب لینے کے لیے کیا تم سے کچھ لینے کے لیے نہیں کیا تمہارے پیسے تم کو مبارک ـــــ یہ غریبوں کو بتایا گیا ـــــ اور مال والوں کو بتایا گیا کہ اپنے مال کی ہر جنس اور ہر قسم غریبوں پر لگائیں، پیسے بھی خرچ کریں کھانے میں بھی ان کو شریک کریں کپڑے بھی ان کو لا کر دیں۔ اپنی موٹر اور سواری بھی ان کے استعمال کے لیے دیں اور جب اس کے عوض میں غریب اپنی جانی خدمت کے لیے پیش کریں تو یہ مالدار اُن سے کہدیں کہ ہم تم سے کوئی جزا نہیں چاہتے خدا سے لے لیں گے۔ جب یہ طریقہ چالو ہوگا تو غریبوں سے امیر اور امیروں سے غریب جڑ جائیں گے۔

ایسے ہی حاکموں اور محکوموں کو بتایا گیا کہ وہ ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے والے بنیں فائدہ کھینچنے والے نہ بنیں۔ حاکموں سے کہا گیا کہ حکومت کے جو اختیارات اور جو وسائل اُن کے پاس ہوں وہ اُن سے محکوموں کو فائدہ پہنچائیں اور اُن کو سہولتیں پہنچانے کی کوشش کریں، ان کی تجارتوں اور زراعتوں میں ان کی مدد کریں اُن کے لیے قانونی مشکلیں پیدا نہ کریں، اُن سے لینے

اور کھینچنے والے نہیں بلکہ اُن کو دینے والے اور نفع پہنچانے والے بنیں ۔ جب اہل حکومت ایسا کریں گے تو پبلک کے عوام اُن کو بدلنا ہی نہ چاہیں گے الیکشن کے ہنگاموں کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اسی طرح محکوم عوام سے کہا گیا کہ وہ حکومت والوں سے لینے کی نہ سوچیں بلکہ ان کو اپنے جان و مال سے فائدہ پہنچانے والے بنیں اور اُن کے مسائل میں ان کی مدد کریں اُن کے لیے مشکلات پیدا نہ کریں، اُن سے اگر کوتاہیاں ہوں تو درگزر کریں اور اللہ کے حوالہ کریں۔

الغرض ہر طبقہ کو دوسروں کی نفع رسانی کے طریقہ پر لگایا گیا اور بتایا گیا کہ اپنے جان و مال اور درد و فکر کا زیادہ حصہ دوسروں کے بنانے پر لگاؤ ـــــ یہ اسلام کا بتایا ہوا طریقہ ہے اگر اس پر چلا جائے تو ہر طبقہ کا دوسرے سے پورا جوڑ ہوگا اور ہر کام دیانت داری سے اور ٹھیک ٹھیک ہوگا، کوئی بے ایمانی سے روپیہ اور جائداد پیدا کرنے کی فکر نہیں کرے گا اور اگر اس کے برعکس ذہن فائدہ اُٹھانے کا ہوا تو پھوٹ ہی پھوٹ ہوگی اور لوگوں کی نیتیں خراب ہوں گی۔ پھر یہ ہوگا کہ پچاس لاکھ کے ٹھیکے والے پل پر صرف دس لاکھ کی لاگت لگائی جائے گی جس کی وجہ سے پل کمزور بنے گا، کوئی سڑک ٹھیک نہیں بنے گی، کوئی کام ٹھیک نہ ہوگا ـــــ خوب سمجھ لو لینے والے ذہن سے کوئی تعمیر نہیں ہوسکتی، تعمیر نفع رسانی اور دوسروں کو دینے والے طریقہ سے ہوسکتی ہے ـــــ اور نفع رسانی کا ذہن جب ہی بن سکتا ہے اور اپنے پاس والی چیز دوسروں پر لگانے کا طریقہ جب ہی چالو ہوسکتا ہے جب یہ یقین دل میں اتر جائے کہ دینے والے تو بس اللہ ہیں، چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے اور میں جب اس کی رضا کے مطابق استعمال ہونگا تو اللہ میرے سب کام بنا دیں گے اور نعمتوں کے دروازے کھول دیں گے ـــــ اس کی مشق نماز میں ہوگی۔

آج کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام چلنے والا نہیں ہے، صحیح ہے! لینے کا ذہن رکھنے والوں میں دینے کا طریقہ کیسے چلے، اسلام کو اپنی خواہش اور اپنی حالت کے مطابق بنا کے چلاؤ گے تو وہ اسلام رہے گا ہی نہیں وہ تو تمہاری بنائی ہوئی ایک نئی چیز ہو جائے گی۔

کسی نے اپنے بدن پر گودنے والے سے شیر کی تصویر بنوانی چاہی جب وہ سوئی سے گودنے لگا اور تکلیف ہوئی تو گودنے والے سے کہا کہ کیا بنا رہے ہو؟ اُس نے کہا کہ پہلے شیر کی

دُم بنا رہا ہوں، اس آدمی نے کہا کہ دُم چھوڑ دو بے دُم کے تو بھی شیر کی تصویر بن سکتی ہے، اُس نے دُم چھوڑ دی اور دوسری طرف سے بنانا شروع کیا۔ اب اُس نے کہا کہ اب کیا بنا رہے ہو، اُس نے کہا کہ کان بنا رہا ہوں اُس نے کہا کہ بے کان کے بھی شیر بن سکتا ہے تم کان نہ بناؤ بے کان کا شیر بنا دو ـــــ تو بھائی دوستو! یہی اسلام کے ساتھ ہو رہا ہے کہ اپنے مزاج کے بدل جانے کی وجہ سے اسلام پر چلنا مشکل ہو رہا ہے تو اسلام کی قطع برید کی جا رہی ہے اور اُس کو اپنی خواہش کے مطابق بنایا جا رہا ہے اس لیے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے مزاج کو اسلام کے مطابق بنا لیا جائے اور یہ جب بنے گا جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائے کہ کسی مخلوق سے کچھ نہیں ہوتا سب اللہ سے ہوتا ہے اور حالات کا بناؤ بگاڑ اور تعمیر و تخریب اور کامیابی ناکامی چیزوں کے ہونے نہ ہونے سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بنانے اور جھکانے کا فیصلہ جب کریں گے جب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر آجاؤں گا ـــــ تو اس راستہ پر چلنے کے لیے خارجی نہیں بلکہ داخلی دولتیں چاہئیں، خدا کا یقین ہو، خدا کا دھیان ہو، خدا کا خوف ہو ـــــ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر خدا کے خزانوں سے ملنے کا اور نعمتوں کے دروازے کھلنے کا یقین ہو ـــــ اِن اندرونی تبدیلیوں کے لیے کچھ کرنا پڑے گا، چیزوں سے کامیابی کا یقین ہٹانے کے لیے اور اللہ سے کامیابی کا یقین جمانے کے لیے کچھ مدت کے لیے چیزوں میں سے نکلنا ہوگا، ایمان کی مجلسوں میں بیٹھکر ایمان کی باتیں سننا سنانا ہوگا، نماز کے فضائل اور اُس کے برکات معلوم کر کے اس یقین کے ساتھ نماز میں لگنا ہوگا۔ کہ ہم خدا میں لگیں گے تو خدا ہم کو نوازیں گے، اسی طرح اذکار و تسبیحات کے فضائل معلوم کر کے اُن کے یقین کے ساتھ اُن میں لگنا ہوگا۔ دوسروں کے ساتھ اچھے سلوک اور خدمت کی مشق اس یقین کے ساتھ کرنی ہوگی کہ ہم جتنا اچھا سلوک اللہ کے بندوں کے ساتھ کریں گے ویسا ہی اچھا سلوک اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق ہمارے ساتھ کریں گے۔ خلاصہ ایمان کی نسبت سے ہر مسلم کے اکرام کی اور اپنے کو حقیر و کمتر سمجھنے کی مشق کرنی ہوگی ـــــ اِن باتوں کی دوسروں کو بھی دعوت اپنی حاجت سمجھکر اس یقین کے ساتھ دینی ہوگی کہ جب میں اللہ کے دوسرے بندوں میں اس کے لیے کوشش اور محنت کروں گا اور اس راستہ میں تکلیفیں اور ذلتیں اُٹھاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اِن چیزوں سے

محروم نہ رکھیں گے ـــ اس کی بھی مشق کرنی ہوگی کہ یہ سارے کام صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوں ـــ اس طرح کچھ مشق کر لینے سے انشاء اللہ سب طبقوں میں جوڑ کی شکل پیدا ہو جائے گی۔

امریکہ والوں نے سب کچھ بنا لیا لیکن کالوں اور گوروں کو جوڑنے میں وہ بالکل ناکام رہے۔ اس طرح انھوں نے شراب بند کرنے کے لیے کروروں روپیہ خرچ ڈالا اور ساری کوششیں کر لیں لیکن بجائے کمی کے اُس میں اور زیادتی ہوئی، الحمد للہ اس تبلیغ کے عمل سے لاکھوں ایسے آدمیوں کے جرائم چھوٹ گئے جن کا جرائم چھوڑنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

الحمد للہ اس کام میں سارے ہی طبقات لگ رہے ہیں، جو طبقہ اس پر محنت کرے گا اور یہ باتیں اپنے اندر پیدا کر لے گا اُس سے سب نوک جڑ جائیں گے، ہم اگر اپنے ہی ساتھ جوڑنا چاہتے تو جوڑنے کی یہ ترکیب آپ کو نہ بتاتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اب اس طریقہ پر کچھ محنت کر لیں پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ ہی کے ذریعہ کتنی آسانی سے سب طبقوں کو جوڑتا ہے۔

آج ہر طبقہ میں ہر جگہ جوتا چل رہا ہے اور مسائل بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ میں ہے ـــ جو جتنا کرے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اتنا پالے گا۔

ہم نے اس کام کے لیے کوئی انجمن نہیں بنائی نہ اس کا کوئی دفتر ہے نہ رجسٹر ہے نہ فنڈ ہے۔ یہ سارے ہی مسلمانوں کا کام ہے، ہم نے مروجہ طریقہ پر کوئی علیحدہ جماعت بھی نہیں بنائی ہے ـــ جس طرح مسجد میں نماز کے عمل پر مختلف طبقوں اور مشغلوں والے مسلمان آکر جڑ جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں اور مشغلوں میں چلے جاتے ہیں، اس طرح ہم آپ سب سے کہتے ہیں کہ کچھ وقت کے لیے اپنے گھروں اور مشغلوں سے نکل کر یہ محنت اور مشق کر لیجیے اور پھر اپنے گھروں اور مشغلوں میں آکر ان اصولوں کے مطابق لگ جائیے ـــ آپ نے اگر یہ چیز محنت کر کے حاصل کر لی تو دنیا بھر کے سائنس والے آپ سے یہ طریقہ سیکھنے آئیں گے اور خدا نے چاہا تو آپ دنیا کے امام ہوں گے۔

عہدِ نبوی میں دینی محنت کا نقشہ

دینی محنت کرنے والے رفقاء سے حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خطاب

عطیۂ افتخار فریدی صاحب (مراد آباد)

یوں سمجھیے کہ ایک دینی محنت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے ایک خاص نقشے کے ساتھ کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس محنت کو ان کے طریقے پر سیکھیں اور کریں۔

الحمد للہ احباب نے چند مقامات میں تھوڑا تھوڑا اس محنت کو سیکھنا شروع کیا ہے لیکن کسی جگہ کی محنت کامل نہیں ہے بلکہ ابتدائی درجوں میں ہے۔ اب اگر ہر جگہ کے محنت کرنے والے یہ سمجھیں کہ پوری محنت یہی ہے جو ہو رہی ہے تو پھر اصل شکل پر کوئی نہیں پہونچ پائے گا۔ اب جو انسان بھی محنت شروع کرے وہ یوں سمجھے کہ میری محنت ابتدائی شکل پر ہے اس کو کرتے کرتے اس شکل پر پہونچنا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے ساتھیوں نے کی تھی۔ جب وہ اصل محنت ہے تو انسان اپنی محنت کو اس کے مقابلے میں بالکل ادنیٰ سمجھے۔ لہٰذا اصل محنت کو سامنے رکھ کر نیت کرے کہ انشاء اللہ مجھے ترقی کر کے انتہا تک پہونچانا ہے۔

اب ایک تو یہ سوچنا ہے کہ اس محنت کا فائدہ کیا ہے؟ دوسرے یہ سمجھنا ہے کہ وہ محنت کیا ہے؟ اس محنت کا فائدہ یہ ہے کہ محنت کرنے والوں کو اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے انسانوں کو ہدایت مل جائے اور انسان دین پر اتنا ہی چلیں گے جتنی خدا کی طرف سے ہدایت ملے گی۔

تو اب محنت کی سطح جتنی بلند ہوتی جائے گی اتنی ہی خدا کی طرف سے ہدایت کی تقسیم عام ہوتی جائے گی وہ محنت جب ختم ہو جاتی ہے تو ہدایت مسلمانوں میں سے نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے ہدایت کاروبار اور معاشرت میں سے نکلتی ہے کہ کاروبار میں جو دین کے احکامات ہیں ان کو چھوڑ کر دوسرے طریقوں سے کاروبار چلانے لگتے ہیں پھر فرائض نکلتے ہیں اور پھر مختلف برائیاں داخل ہونے لگتی ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان دین سے نکلنے لگتے ہیں اور جب یہ دین کی محنت کی جاتی ہے تو ہدایت خدا کی طرف سے آنی شروع ہوتی ہے۔ پھر جس درجے میں محنت ترقی کرتی جائے گی ہدایت پھیلتی جائے گی۔

ہدایت کی ایک سطح یہ ہے کہ نماز پڑھنے لگیں۔ دوسری یہ ہے کہ روزے زکوٰۃ حج ادا کرنے لگیں تیسرے یہ کہ مال کمانے اور خرچ کرنے میں احکامات شرعیہ کی تعمیل ہونے لگے۔ اس سے آگے یہ ہوتا ہے کہ خدا تمام انسانوں کو ہدایت دینے لگے۔ ہدایت کے بقدر دین زندہ ہوگا اور ہدایت محنت کے بقدر آئے گی۔ تو اب ہم جو یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ دین پر نہیں چل رہے ہیں بلکہ اس سے نکل کر بے دینی میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ محنت نکل چکی ہے۔ اب جتنی جہاں کے بندوں نے دین کی محنت شروع کر دی ہے اتنی خدائے پاک نے ہدایت دینی شروع کر دی ہے اور بقدر ہدایت کے دین زندہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جہاں نمازی نہیں تھے وہاں کچھ نمازی ہو گئے جہاں روزے نہیں تھے وہاں کچھ روزے زندہ ہو گئے۔ جہاں حج نہیں تھا وہاں کچھ حج قائم ہو گیا۔ جہاں تعلیم کا رواج نہ تھا وہاں تعلیم ہونے لگی۔ لیکن ہدایت اس سطح کی ابھی نہیں ملی کہ کمائیوں کے اندر کے احکام پورے کریں اور کھانے پینے، کمان بنانے میں اور لین دین میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والی راہ اختیار کریں تو ابھی ہم مسلمان بھی اس کے محتاج ہیں کہ محنت کی سطح بلند ہو تاکہ پوری زندگی میں اسلام پر چلنے کی سعادت حاصل ہو اور دوسرے انسانوں کو بھی اسلام کے سمجھنے کی ہدایت ملے۔ اب اس محنت میں دو نوعیتیں ہیں۔ ایک تو محنت کرنے والوں کی تعداد بڑھانا، دوسرے یہ محنت جو لوگ کر رہے ہیں ان کا مقدار محنت کی شکلوں میں بڑھنا۔ یہ دو علیحدہ لائنیں ہیں۔ اگر لاکھوں محنت کرنے والے بن جائیں مگر محنت تھوڑی تھوڑی کریں تو ہدایت تھوڑی تھوڑی آئے گی۔ اگر خدا ایسی صورت کر دے کہ جو محنت کر رہے ہیں ان کی مقدار محنت بڑھ جائے تو مسلمانوں کو بھی ہدایت ملے گی اور تمام انسانوں

کو بھی ملے گی۔

ابھی تک جو ہماری محنت کی نوعیت ہے وہ یہ ہے کہ مشغول لوگ اپنی مشغولیتوں میں سے تھوڑا تھوڑا وقت اس طرح نکال رہے ہیں کہ ان کے دنیوی مشاغل میں فرق نہ پڑے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں سے دین کے لیے قربانیاں دلوائیں ہیں تو اب محنت کرنے والوں میں جتنی حضورؐ والی قربانی پیدا ہوں گی۔ محنت کی سطح بلند ہوگی۔ اب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی محنت بتلانا چاہتا ہوں جس سے ابھی ہم بہت دور ہیں۔ لیکن اگر اس محنت کو سامنے رکھ کر چلتے رہیں گے تو خدا وہاں تک پہونچا دیگا۔ تو ہر کام کرنے والے کو محنت کے اس انتہائی نقشہ کو سامنے رکھ کر وہاں تک پہونچنے کی نیت کرنی چاہیے یہ بات تو آپ لوگ جانتے ہیں کہ سارے عرب میں مدینہ والوں کی محنت سے دین پھیلا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا عرب کا رتبہ چھوٹا نہیں تھا۔ ہندوستان کے برابر نہیں تو اس سے بہت کم بھی نہ تھا۔ اس وقت دنیا میں کمائیوں کے جو طریقے رواج پذیر تھے وہ بھی نہ تھے۔ پورے ملک میں کوئی حکومت قائم نہ تھی جس کے دفاتر وغیرہ کی نوکریوں کے ذریعہ بھی رزق کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ اس زمانے میں بیت اللہ پر آنے والے حجاج سے بھی وہاں کچھ وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حجاج کی مدارات میں ہر ایک کچھ خرچ کرتا تھا۔ لہٰذا حج کا شعبہ بھی اس زمانے میں کمائی کا شعبہ نہیں تھا۔ کھیت اور باغات بھی گویا نہیں تھے۔ تجارتی نظام بھی مکہ معظمہ وغیرہ کے علاوہ نہ تھا۔ کہیں کہیں کھجور انگور اور انار کے کچھ باغات تھے۔ چند مقامات تھے جہاں چھوٹے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ غرض کہ پورا عرب عام طور سے ننگا بھوکا پیاسا عرب تھا۔ نہ سب کے پاس کپڑے تھے نہ مکانات تھے۔ پانی اور کھانا بھی پورے عرب کو نہیں ملتا تھا۔ بھوک کی شدت میں کیڑے مکوڑے بھی کھا جاتے تھے۔ یہاں تک کہ زمین پر پڑا ہوا خون بغیر تحقیق کے کہ کس چیز کا ہے کس جگہ کا ہے چاٹ جاتے تھے۔ اکثر علاقے کمائی سے خالی اور بھوک سے بھرے ہوئے تھے۔ بادشاہوں تک کی ہمت نہیں تھی کہ اس ملک پر حکومت کریں۔ حکومت کرنے کے لیے بھی اخراجات کی ضرورت ہے اس وقت نہ پٹرول تھا نہ سونا۔ عرب کے کنارے پر قیصر و کسریٰ کی حکومتیں فوجی نظام رکھتی تھیں کہ عرب ان پر کسی وقت بھی چڑھائی نہ کر دیں۔ ورنہ کوئی نظام حکومت پورے عرب بھر میں نہ تھا۔ تو جس ملک میں نظام چلانے کے لیے حکومتوں تک کی ہمت نہ پڑتی ہو اس ملک میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کی

یہ جو مقامات تجارت و زراعت کے مراکز تھے وہ سب ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آگئے سوائے مدینہ پاک کے آدمیوں کے سارے ملک کے خوشحال قبائل مخالف تھے۔ سارا عرب منتظر تھا کہ مکے والے اسلام لائیں تو ہم بھی لائیں اور مکہ والوں نے آپ کی زندگی کے آخری دو تک مقابلہ کیا۔ اب ایسے حالات میں جتنا کام ہوا تمام کا تمام مدینہ کی بستی سے ہوا۔ جہاں بھی کوئی ایمان لاتا اسے مدینہ بلا لیا جاتا۔ تو مدینہ ایسی بستی بن گیا۔ جہاں لوگ خاندان اور برادریاں چھوڑ چھوڑ کر آکر بستے رہے۔ اور جب قوم سے نکل کر آتے تھے تو اپنا مال بھی لے کر نہیں آسکتے تھے۔ مدینہ والوں کو ان کے رہنے کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اب یہ ایسی بستی بن گئی جہاں مہاجر اور مقامی برابر ہو گئے۔

آنے والوں میں کچھ تو تھے ہی فقیر، کچھ کے روزگار لٹ گئے، کچھ کے اموال مقام والوں نے چھین لیے غرضیکہ مدینہ میں آنے والے سب ہی فقیر بن کر آئے۔ ان فقیروں اور مدینہ کے انصار کو لے کر آپ نے دین کی محنت کا کام شروع کیا۔ باہر سے آنے والوں کو کاروبار کرنے سے نہیں روکا گیا جب تک کمائی کی شکلیں وجود میں آئیں مقامیوں نے سب کی ضروریات مہیا کیں، غرض کہ مدینہ میں بسنے والوں پر اتنا بوجھ پڑ گیا تھا اور ان کے حالات ایسے ہو گئے تھے کہ کم از کم دس سال تک اپنے کاروبار جمانے یا زیادہ اخراجات مہیا کرنے کے سبب ان کو کہیں باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ کمائی والے نظام کا یہی تقاضا تھا، انصار پر چونکہ سب آنے والوں کا خرچ بھی پڑ گیا تھا۔ اس لیے کھیتوں اور باغات کے کام میں بھی زیادہ انہماک کی اور زیادہ وقت لگانے کی ضرورت تھی تاکہ آنے والوں کے اخراجات پورے کر سکیں کیونکہ مدینہ کے انصار کے بہت سے گھروں پر کئی کئی خاندان ٹھہرے ہوئے تھے۔ الغرض ان ضرورتوں کے اعتبار سے باہر نکلنے کا بالکل موقع نہیں تھا۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ والوں کو کمائی کی چھٹی دینے کی بجائے دین کی پوری محنت اسی دس سال میں کی اور کمائی اور دین کی محنت کا ایک ایسا تفقہ قائم کیا کہ انسانی زندگی میں جو تقاضے ہیں گھر والوں کی پرورش (دیکھ بھال)، مال و دولت کمانے کا عمل ان دونوں عملوں کو بار بار چھوڑ کر دین کی محنت کے عمل کو آگے بڑھایا اور صحابہ کرام کو ایسی تربیت دی کہ جس وقت اللہ کے راستے میں نکلنے کو کہا جائے اور جتنوں کو کہا جائے اور جہاں کے لیے کہا جائے سب تقاضوں کو چھوڑ کر نکل جائیں۔ یہاں تک کہ جن کو مغرب کے وقت نکلنے کو کہا انھیں مدینہ میں سونے نہیں دیا، جس طرح پکے نمازی اذان کی آواز سن کر تمام کام چھوڑ

کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مدینہ والے خدا کے راستے میں نکلنے کی آواز پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جس وقت اللہ کے راستے میں ایمان و دین کے تقاضوں پر آواز لگتی۔ یہ آواز سودے خریدتے وقت سنیں یا دوکان کھولتے وقت کان میں آئے یا خرید و فروخت کے انتہائی انہماک کے وقت سنی جائے۔ یہ آواز کھجور کے باغوں میں کھجوروں کے توڑنے کے وقت لگے نکاح ہونے کے وقت لگے یا رخصتی ہونے کے وقت لگے۔ عورتوں کے بچہ پیدا ہونے کے وقت لگے یا بیماری کے وقت لگے یا عزیزوں اور گھر والوں کی موت کے وقت لگے۔ اس کی مشق کرلی تھی کہ جس وقت آواز سنیں سب چھوڑ چھاڑ کر نکل جائیں جو پاس ہو لیں۔ جہاں ضرورت ہو چلے جائیں جتنے وقت کا تقاضا ہو وہاں گزار دیں جو جان پر بیتے اسے جھیلیں۔ یہ مزاج بن گیا تھا خدا کے راستے میں نکلنے والوں کا ــــ مدینہ پاک کے دس سال کے قیام میں ڈیڑھ سو جماعتیں نکالیں جن میں سے ۲۵ سفروں میں آپ خود تشریف لے گئے۔ کسی میں دس ہزار آدمی نکلے کسی میں پچاس نکلے کسی میں تیس یا چالیس ہزار نکلے کسی میں تین سو یا سو نکلے کسی میں دس کسی میں پندرہ کسی میں سات یا آٹھ نکلے۔ مدت کے اعتبار سے کسی میں دو ماہ خرچ ہوئے کسی میں تین ماہ کسی میں بیس دن کسی میں پندرہ دن خرچ ہوئے۔ بقیہ جو سو اسو جماعتیں نکالیں ان میں بھی ہزار نکلے، پانچسو اور چھ سو بھی کم و بیش سب طرح کے نکلتے رہے۔ مدت بھی چھ ماہ چار ماہ سب طرح کا وقت لگا۔ اب حساب لگاؤ کہ ہر آدمی کے حصے میں باہر گزارنے کا کتنا وقت پڑا۔ اور سال میں کتنے سفر کیے اگر سب سفروں کو جوڑ کر تخمینہ کر دگے تو سال میں چھ ماہ یا سات ماہ ہر آدمی کے حصہ میں آئیں گے اب اس نقل و حرکت کی کوشش سے مختلف مقامات کے انسانوں کو مدینہ آنے کی دعوت میں ملیں کہ اسلام مدینہ میں آکر سیکھو۔ چوں کہ اسلامی زندگی ماحول سے آئے گی۔ اس زندگی کا ماحول صرف مدینہ میں تھا۔ تو باہر نکلنے والوں کو مدینہ منورہ کے قیام کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کو دین سکھانا پڑتا تھا۔ پھر مدینہ والوں کو اپنے لیے بھی علم حاصل کرنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا تھا۔ مدینہ کے قیام کے زمانہ میں مسجدوں کے لیے وقت مانگا جاتا تھا۔ تاکہ سیکھنے سکھانے کا نظام مسجدوں میں قائم رہے اور آنے والوں کو سنبھالا جا سکے جب ان لوگوں نے روزانہ کی زندگی ایسی بنالی کہ اگر دو آدمیوں نے مل کر تجارت شروع کی تو باری لگالی ایک دن کی کوئی کسی وقت کوئی کسی وقت، کوئی کما کر پہونچ جاتا۔ کوئی شام کو پہونچتا اور رات کو رہتا، عشاء بعد سے عبادت میں لگا رہتا پھر سوتا۔ کچھ عشاء پڑھتے ہی سو جاتے اور پچھلے وقت میں تہجد ادا کرتے۔ اس طرح چوبیس گھنٹے مسجد میں مقامی مسلمان موجود رہتے۔ اب جو باہر سے جس

وقت پہونچتے آدمی مسجد میں ان کو سنبھالنے کو موجود ملتے، کبھی تعلیم کے حلقہ ہو رہے ہیں۔ تو آنے والوں کو اس میں بٹھاتے۔ نماز ہو رہی ہے تو اس میں شامل کر رہے ہیں۔ ذکر اذکار جس وقت ہو رہا ہے اس میں جوڑ رہے ہیں اس طرح آنے والے بھی اپنے کو خالی کسی وقت نہیں سمجھیں گے۔ اب حساب لگاؤ چھ سات ماہ تو باہر خرچ ہوئے مسجدوں کی باری میں بھی دو ڈھائی ماہ نکل گئے۔ اب دنیاوی ضرورتوں کے لیے کتنا وقت رہ گیا ہر شخص کا وقت بیرونی نقل و حرکت میں بہت سا لگ گیا اور کافی وقت مدینہ آنے والوں کے سنبھالنے میں لگ گیا۔ ذرائع آمدنی تو عام حالات سے بھی کم ہو گئے اور اخراجات کئی گنا زیادہ بڑھ گئے۔ باہر کی نقل و حرکت کا خرچ، اپنا اور گھر والوں کا خرچ جو دوسرے باہر سے مدینہ میں آئیں تو ان کا خرچ جو مدینہ کے غربا باہر نکل رہے ہیں ان کا سفر خرچ، سواری، لباس، کھانا، باہر والے نجھ شمال آئیں ان کی بھی دعوتیں کرنا، پھر جن علاقوں میں قحط ہوتا وہ بھی مدینہ پاک آتے انکی بھی مدد کرنا غرضیکہ خرچ تو نقل و حرکت کے زمانے میں بھی اور قیام کے زمانہ میں بھی بہت بڑھ گیا اور کمائی کی شکلیں ٹوٹ گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ باہر بھی اور مقام پر بھی فاقے جھیلنے پڑے سردی بھی سہنی پڑی، گرمی بھی برداشت کرنی پڑی۔ غرض کہ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر مقامی اور بیرونی خاکوں کو چلایا۔ تو جب ایمان کا کام کرنے والوں نے ایمان کے تقاضوں کو کمائیوں اور گھر کے تقاضوں پر مقدم کر دیا تو حق تعالیٰ شانہٗ نے اس نقشہ سے خوش ہو کر تمام عرب کی بسنے والی قوموں کو اسلام میں داخل کر دیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی قربانی کی برکت سے ان تمام انسانوں کی تربیت ہو گئی جن کی تربیت کی حکومتوں کو بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آپ ایسی حالت میں دنیا سے تشریف لے گئے۔ جب سارا عرب اسلام سے منور ہو چکا تھا اور مدینہ کا ایک ایک گھر مال سے خالی ہو چکا تھا۔ پھر حق تعالیٰ شانہٗ نے قیامت تک کے آنے والوں کو یہ دکھانے کے لیے کہ اسلام ذات محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی محنت سے پھیلا ہے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد اکثر عرب قبائل کو پھر مرتد بنا دیا تاکہ قیامت تک کے آنے والوں کو پتہ چل جائے کہ جب بھی ہم اس محنت کو لے کر اٹھیں گے تو سارے عالم کے خاکے درست ہو جائیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوتے ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو بیٹھنے نہیں دیا بلکہ ایک دم سب کو خدا کے راستے میں نکال دیا۔ اسی بھوک اور پیاس میں اسی غم کی حالت میں نکالا۔ یہاں تک کہ تین دن اور تین راتیں مدینہ پر ایسی گزریں کہ ہر وقت حملے کا خطرہ تھا اور مدینہ

پاک بالغ مردوں سے گویا بالکل خالی تھا۔ اکثر تو ملک شام کے رخ پر جہاد میں بھیج گئے۔ بقیہ ڈیڑھ سو قریب دیہات میں نکلے ظاہر کے اعتبار سے نکلنے کا موقع بالکل نہ تھا محض حکم کی تعمیل کے جذبے سے نکل گئے۔ اللہ رب العزت نے اس محنت کی پوری دنیا کو قیمت دکھائی! ایک قلیل عرصہ میں سارا عرب اسی نقشہ پر آگیا ایک عرب گھرانہ بھی اسلام سے باہر نہیں رہا اور اسمیں صرف ایک ماہ لگا۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمان بن گئے بلکہ ایمان کی پوری محنت پر لوٹ آئے۔

تو اصل ایمان کی محنت کا نقشہ یہ ہے کہ ایسی فضا پیدا ہو جائے کہ جس کو جس وقت جہاں کے لیے کہا جائے سب مشاغل چھوڑ کر راہِ خدا میں چلا جائے اور جب باہر کے آدمی دین سیکھنے کی لیے اس کے مقام پر آئیں تو یہاں بھی ان کے ساتھ لگ جائے تو اب آپ غور کیجیے کہ آج کی محنتوں میں اور اس محنت میں کتنا فرق ہے۔ تو اصل سمجھو اس نقشے کو اور یہ سمجھو کہ ہماری والی محنتیں ابتدائی ہیں اور یہیں ان جیسی محنت کرنے والا بننا ہے۔ پوری پوری جان لگانے والا بننا ہے۔

مختصر سی زندگی ہے اس میں سے تھوڑا سا وقت ضروریات کے لیے کمانے پر لگائیں گے اور بقیہ تمام وقت دین کی محنت پر صرف کریں گے۔ اب ذہن میں یہ رکھیں کہ چونکہ یہ قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے اندر دن سے نکلی ہے اس لیے ان کے بدن اور روح کے انوار اس قربانی میں موجود ہیں لہٰذا جتنی یہ قربانیاں کام کرنے والوں میں بڑھیں گی اتنی ہی ہدایت حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے آئیگی۔

دین مالوں سے نہیں پھیلے گا بلکہ دین کی محنت سے کمیوں کے نقطے میں جو نقصانات اور کمیاں آئیں گی اس قربانی سے پھیلے گا اور جب یہ قربانیاں کمال تک پہونچیں گی تو ان قوموں کو آپ کے ذریعہ ہدایت ملے گی جو آسمان پر اڑ رہی ہیں اور ہم غریبوں کی طرف دیکھتی بھی نہیں اور وہ مسلمان جو زندگی کے کسی شعبے میں اسلام کی بات سننے کو تیار نہیں وہ اپنے تمام کاموں کو اسلام کے احکامات کے موافق بنانے لگا۔ اور آپ حضرات کی قربانیوں کا بدلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر پر کھڑے ہو کر دلوائیں گے جہاں آپ نے انصار سے ملنے اور ان کی قربانیوں کا صلہ دلوانے کا وعدہ فرمایا ہے بشرطیکہ سیٹے کر لو کہ خدا جو کچھ ان محنتوں کے بعد دے گا۔ وہ حاصل کر کے دوسروں کو دیں گے اور خود نہ لیں گے ایسا کرنے میں حضورؐ کی جھلک پائی جائیگی کیونکہ آپ قربانیوں کے دور میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ تھے اور جب نعمتیں ملنے کا وقت آیا تو آپ تشریف لے گئے۔ اس طرح جو حضرات اپنی جان و مال کی قربانی کریں گے اور دنیا میں کچھ لینا نہیں چاہیں گے اور صرف آخرت پر نگاہ رکھیں گے وہی حضرات آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ قریب ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

راہِ خدا میں نکلنے والے قافلوں کے لیے حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ہدایات

محمد منظور نعمانی

[تبلیغی اجتماعات کا پروگرام عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک دو دن پورے زور و قوت کے ساتھ حاضرین کو اس کی دعوت اور ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ ایمان و یقین اور ایمان والے اعمال اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے کچھ مدت کے لیے اپنے ماحول اور روزمرہ کے مشاغل سے نکلیں اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی ان کی دعوت دینے کے لیے ایک خاص پروگرام کے مطابق وہ محنت و مجاہدہ کریں ــــ اللہ کے جو بندے اس دعوت کو قبول کرلیتے ہیں اُن کی جماعتیں ترتیب دے دی جاتی ہیں اور اجتماع کے اختتام پر ان کو ہدایات دے کر اور دعا کر کے رخصت کر دیا جاتا ہے ــــ اپریل ۱۹۶۲ء میں کلکتہ کے قریب گراہاٹ میں ایک اجتماع ہوا تھا، راقم سطور بھی اس میں شریک تھا، پہلے دو دن کی دعوت و ترغیب کے نتیجہ میں ایک ہزار سے کچھ اوپر بندگانِ خدا نے اپنے نام لکھائے جن کو قریباً سو جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا، آخری دن حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے جماعتوں کو رخصت کرتے وقت جو تقریر فرمائی تھی وہ اس عاجز نے اشارات میں قلمبند کر لی تھی۔ وہی ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ اس میں جو کچھ ہے وہ مضمون کی حد تک حضرت مولانا مرحوم کا ہے، لیکن الفاظ کے بارہ میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی]

خطبۂ مسنونہ کے بعد مولانا نے فرمایا۔

آفتاب نورانی ہے۔ اس کے اندر نور ہے۔ وہ اپنے اس نور کے ساتھ چمکتا ہے تو دُنیا میں نور پھیلاتا ہے۔ اگر بجائے نورانی کے وہ خود ظلمانی ہوتا اور اس میں نور کے بجائے ظلمت ہوتی تو وہ دنیا میں ظلمت پھیلنے کا ذریعہ بنتا ـــــ آپ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور دور قریب کی دنیا میں پھریں گے۔ اگر آپ میں نور ہوگا تو آپ کے ذریعہ نور پھیلے گا۔ اور اگر آپ کے اندر ظلمت ہوگی تو وہی ظلمت پھیلے گی، اس لیے آپ کو کوشش کرنی ہے کہ آپ کے اندر نور ہو اور آپ خود نورانی بنیں ـــــ کسی انسان کی ذات میں نور نہیں ہے۔ نور والے اعمال سے انسان میں نور آتا ہے اس لیے آپ لوگوں کو نور والے اعمال کرتے ہیں تاکہ آپ کے اندر نور آئے اور آپ کے ذریعہ نور پھیلے، اور ظلمت والے اعمال سے اپنے آپ کو بچانا ہے تاکہ آپ ظلمت پھیلنے کا ذریعہ نہ بنیں۔

نور والے اعمال وہ محمدی اعمال ہیں جو اللہ کی رضا کے لیے کیے جائیں، ان اعمال کو اتنی کثرت سے اور تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے کہ آپ ان کے نورانی رنگ میں رنگ جائیں ـــــ وہ نورانی اعمال یہ ہیں:۔

(۱) اخلاص کے ساتھ ایمان و یقین حاصل کرنے کی دعوت جو انبیاء علیہم السلام کی خاص میراث اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔

(۲) نماز اور جملہ عبادات جس میں ذکر و تلاوت، دعا و استغفار سب شامل ہیں۔

(۳) علم میں مشغولیت۔ خاص کر وہ علم جس میں انسانوں کے اعمال و افعال کے آخرت میں ظاہر ہونے والے نتائج کا بیان ہو۔ یعنی ترغیب و ترہیب۔

(۴) اچھے اخلاق جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق تھے اور جن کی آپ نے تعلیم دی۔ جس کا خلاصہ اور حاصل ہے اللہ کی رضا کے لیے اس کی مخلوق کی خدمت اور اس کے ساتھ اچھا برتاؤ۔

یہ ہیں وہ نورانی اعمال جن کے مسلسل اور کثرت سے کرنے سے نور پیدا ہوتا ہے اور زندگی نورانی بنتی ہے، آپ کو انہی اعمال میں مشغول رہتے ہوئے پھرنا ہے۔

یاد رکھیے آپ صرف اپنے گھر اپنے گھر والوں، اور اپنے خاص ماحول کو چھوڑ کر جا رہے ہیں نفس اور شیطان کو چھوڑ کر نہیں جا رہے ہیں۔ یہ دونوں دشمن ہر قدم پر اور دن رات آپ کے ساتھ رہیں گے۔ آپ کی بُری عادتیں بھی آپ کے ساتھ جا رہی ہیں، یہ سب چیزیں آپ کو ان اعمال کی طرف کھینچیں گی جن سے آپ میں ظلمت آئے اور آپ خدا سے دور اور اس کی رضا سے محروم ہوں، آپ ان دشمنوں کے شر سے صرف اس طرح بچ سکتے ہیں کہ اس بات کا پورا اہتمام کریں کہ سونے کے چھ سات گھنٹوں کے علاوہ دن رات کے تمام اوقات میں اپنے کو ان نورانی اعمال میں مشغول رکھیں ـــــ یا آپ ایمان کی اور ایمان والے اعمال کی دعوت دیتے ہوں، یا نماز اور ذکر و تلاوت وغیرہ کسی عبادت میں مشغول ہوں، یا تعلیم اور تعلّم میں لگے ہوں، یا کوئی خدمت والا کام انجام دے رہے ہوں۔

نفس اور شیطان کے شر سے بچنے کی صرف یہی صورت ہے کہ آپ کا وقت ان کاموں سے فارغ اور خالی نہ ہو۔ "خانۂ خالی را دیو می گیرد"

پھر یہ اعمال بھی نور حاصل ہونے کا ذریعہ اسی صورت میں بنیں گے جبکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے اور آخرت کے ثواب پر نگاہ رکھتے ہوئے کیے جائیں۔ اگر خدانخواستہ نیت خالص نہ رہی تو یہی اعمال جہنم میں کھینچ لے جائیں گے ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں سب سے پہلے تین آدمیوں کے بارے میں جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور جہنم میں سب سے پہلے انہی کو پھونکا جائے گا، ان میں ایک وہ عالم دین اور عالم قرآن ہوگا جو عمر بھر قرآن سیکھنے سکھانے میں مشغول رہا۔ دوسرا ایک دولت مند سخی ہوگا جس کو دنیا میں اللہ نے خوب دولت سے نوازا تھا، اور وہ اللہ کی دی ہوئی دولت نیکی کے کاموں میں خوب کشادہ دستی سے خرچ کرتا تھا اور تیسرا شخص ایک شہید ہوگا جو جہاد کے میدان میں دشمن کی تلواروں سے شہید ہوا ہوگا ـــــ لیکن ان تینوں آدمیوں نے یہ اعمال خالصاً لوجہ اللہ نہیں کیے تھے، بلکہ دنیا میں ناموری اور شہرت و عزت حاصل کرنے کے لیے کیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب یہ تینوں قسم کے آدمی اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے

تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہم دلوں اور نیتوں کا حال جانتے ہیں۔ تم لوگوں نے یہ اچھے اور نورانی اعمال ہماری رضا کے لیے نہیں کیے تھے، بلکہ دُنیا میں ناموری اور شہرت کے لیے کیے تھے اور یہ چیز تمھیں دُنیا میں مل چکی، اب تمھارے لیے یہاں کچھ نہیں۔ اس کے بعد ان کو ان کے انہی اعمال کی وجہ سے گھسیٹ کے جہنم میں پھینکوا دیا جائے گا۔ بلکہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ یہ پہلے وہ جہنمی ہوں گے جن کے لیے سب سے پہلے جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ (العیاذ باللہ)

سوچیے تو کس قدر لرزا دینے والی ہے یہ حدیث، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو روایت فرماتے تو کبھی کبھی مارے خوف کے ان کی چیخیں نکل جائیں اور ان پر بیہوشی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ اور ایک دفعہ جب ایک تابعی نے یہی حدیث حضرت ابوہریرہ سے سُن کر حضرت معاویہ کے سامنے نقل کی تو حضرت معاویہ اتنے روئے کہ لوگوں کو ان کی جان کا خطرہ ہو گیا۔ بہت دیر کے بعد ان کی حالت ٹھیک ہوئی اور انھوں نے فرمایا۔

صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سچ فرمایا ہے اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی بات بالکل صحیح پہنچایا ہے کہ جو کوئی اپنے اعمال سے دنیا اور دنیا کی زیب و زینت چاہے گا اسکو اسکے اعمال کا پورا نتیجہ دنیا میں ہم دے دینگے اور ان کیلئے اسمیں بالکل کمی نہیں کیجائیگی۔ ان لوگوں کیلئے آخرت میں سوائے دوزخ کی آگ کے اور کچھ نہ ہوگا اور جو عمل انھوں نے کیے تھے وہ ضائع جائیں گے اور بے کار و لاحاصل ہوں گے ان کے اعمال۔

بہرحال نورانی اعمال نور پیدا کرنے کا ذریعہ اسی صورت میں ہو سکتے ہیں جبکہ وہ خالصتاً اللہ کی رضا کیلئے اور آخرت کیلئے کیے جائیں، اسلیے آپ کو ایک طرف تو اپنے تمام اوقات انہی اعمال میں مشغول رکھنے ہیں اور دوسری طرف اس کا بھی اہتمام کرنا ہو کہ نیت صحیح رہے شیطان جب کسی بندہ کو اچھے عمل سے ہٹا نہیں سکتا تو اسکی نیت میں فساد ڈالنے کی کوشش کرتا ہو۔ اللہ والے اعمال اگر غیر اللہ کیلئے کیے جائیں تو ان میں اللہ والی نسبت نہیں رہتی۔

اور اگر اللہ کی رضا کیلئے وہ اعمال کیے جائیں جو درحقیقت رضا والے اعمال نہیں ہیں تو ان میں اللہ کی نسبت نہیں آتی اور وہ رضائے الٰہی کا وسیلہ نہیں بنتے۔ اس لیے دونوں کوششیں ضروری ہیں۔ ایک اللہ کی رضا والے اعمال میں مشغولیت، ہمہ دم ایسی مشغولیت کہ ان کا رنگ چڑھ جائے اور نیت کی صحت کا اہتمام، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل سے مقصد اللہ کی رضا ہو۔ ساری کامیابی بس اللہ کی رضا میں ہے، اور اس کی ناراضی میں تمام ناکامی اور نامرادی ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ اس نکلنے کے زمانہ میں بس چار کاموں میں اپنے آپ کو مشغول رکھنا ہے۔ سب سے پہلی چیز ہے۔ ایمان و یقین کی اور ایمان والے اعمال کی دعوت۔ اس دعوت کے لیے عمومی گشت ہوں گے خصوصی گشت ہوں گے۔ جن کے اصول و آداب گشت کے لیے نکلنے وقت بتلائے جائیں گے ان کو دھیان سے سنا جائے۔ پھر جب آپ دعوت کے لیے گلیوں اور بازاروں میں نکلیں گے تو شیطان آپ کو وہاں کے نقشوں کی طرف متوجہ کرے گا۔ اس لیے سب سے پہلے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ شیطان و نفس کے شر سے بچائے، اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی توفیق دے پورے گشت میں اس کا اہتمام رہے کہ بس اللہ کے جلال اور جمال پر اور اس کی صفات عالیہ پر نظر رہے۔ نگاہیں نیچی رہیں اور اپنا مقصد نگاہ کے سامنے رہے جس طرح جب کسی مریض کو اسپتال لے کر جاتے ہیں تو خود مریض اور اس کے ساتھی اسپتال کی عالی شان عمارتوں کو اور وہاں کے نقشوں کو دلچسپی سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کے سامنے بس مریض کا علاج ہوتا ہے۔

خصوصی گشت میں اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب جن سے آپ ملنے گئے ہیں اس وقت توجہ سے بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو مناسب طریقہ سے جلدی بات ختم کر کے ان کے پاس سے اٹھ آنا چاہیے، اور ان کے لیے دعا کرنی چاہیے اور اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب متوجہ ہیں تو پھر پوری بات ان کے سامنے رکھنی چاہیے اور وقت فارغ کرنے کے لیے بھی کہنا چاہیے

خصوصی گشت میں جب دینی اکابر کی خدمت میں حاضری ہو تو ان سے صرف دعا کی درخواست کی جائے۔ اور ان کی توجہ دیکھی جائے تو کام کا کچھ ذکر دیا جائے۔ عمومی گشت کر کے لوگوں کو مسجد میں جمع کیا جائے۔ اور ان کے سامنے ایمان و یقین، نماز، ذکر اللہ، علم دین، اخلاق اور دینی جدوجہد کی بات رکھی جائے اور تشکیل کی کوشش کی جائے۔ پھر تشکیل کر کے مطمئن

نہ ہو جائیں بلکہ جن لوگوں نے وعدے کیے ہیں اور نام لکھائے ہیں ان کو اللہ کے راستہ میں نکال دینے کی اور وعدوں کو عمل میں لے آنے کی پوری کوشش کریں اور اپنے امکان بھر اس کا انتظام کریں کہ ان کا وقت اچھی طرح گزرے ـــ جو لوگ اسوقت نکلنے کا فیصلہ نہ کر سکیں ان کو مقامی گشت مقامی اجتماع، تعلیم، نماز، ذکر کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اور ان کاموں کا نظام بنا دیا جائے۔

جب دعوت کے سلسلہ کی یہ ساری محنت کر چکیں تو اس کسان کی طرح جو زمین میں بیج بکھیر دیتا ہے اور پھر اللہ سے لو لگاتا ہے پورے الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں وہی تقلب القلوب ہے، وہی جس کو چاہے ایمان اور ایمان والے اعمال دیتا ہے۔ اور جس کے لیے نہیں چاہتا اس کو محروم رکھتا ہے۔

دعوت کے بعد دوسرا کام تعلیم کا ہے جب تعلیم کیلئے بیٹھیں تو ادب سے بیٹھیں، دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے علم کی عظمت سے دبا ہوا ہو، فضائل کا مذاکرہ ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمائی ہوئی دعائیں یاد کی جائیں۔

جو وقت دعوت اور تعلیم سے خالی ہو اور کوئی دوسرا ضروری کام بھی اس وقت نہ ہو اس میں نوافل پڑھے جائیں، یا قرآن مجید کی تلاوت کی جائے یا ذکر و تسبیح میں مشغول کیا جائے۔ یا اللہ کے کسی بندہ کی خدمت کی جائے۔

جس طرح نماز میں آدمی یا قیام میں ہوتا ہے، یا رکوع میں یا سجدہ میں یا قعدہ میں اسی طرح اللہ کے راستہ میں نکلنے کے بعد آدمی یا دعوت میں لگا ہو، یا تعلیم اور تعلم میں، یا ذکر عبادت میں، یا اللہ کی کسی مخلوق کی خدمت میں ـــــ یہ چار کام اس پورے زمانے میں بطور اصل مقصد کے کیے جائیں گے اور اتنے کیے جائیں گے کہ یہی عادت و مزاج بن جائے۔ یہ اجتماعی بھی کیے جائیں گے اور انفرادی بھی۔ اجتماعی سے مطلب وہ ہے جو جماعتی نظام کے تحت ہو، جیسے خصوصی گشت اور عمومی گشت میں دعوت اور جماعت کی تعلیم کے وقت میں تعلیم اور جماعت کے ساتھ فرض نمازیں اور ان کے آگے پیچھے کی سنتیں اور جماعتی تقسیم کار کے مطابق کھانے وغیرہ کے انتظامات کی دوڑ دھوپ، یہ سب اعمال اجتماعی ہیں۔ انفرادی دعوت، انفرادی تعلیم، انفرادی عبادت، انفرادی خدمت وہ ہوگی جو جماعتی پروگرام کے

کے علاوہ کوئی شخص اپنے اس خالی وقت میں کرے جس میں کوئی اجتماعی کام نہیں ہے۔ مثلاً دوپہر کے کھانے کے بعد ظہر تک کوئی جماعتی کام دعوت یا تعلیم وغیرہ کا نہیں ہے۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اس میں آرام کرے۔ اب اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے اس وقت میں آرام کرنے کے بجائے کسی شخص کے پاس جاکر دعوتِ ایمان کی باتیں کرے یا کسی اللہ کے بندہ کو کوئی دعا یاد کرائے یا اس کی نماز صحیح کرائے یا مسجد کے کسی کونہ میں کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے لگے یا کسی ساتھی کی کوئی خدمت کرنے لگے تو یہ سب صورتیں انفرادی عمل کی ہوں گی۔

بہرحال اللہ کے راستہ میں نکلنے کے زمانہ میں یہ چار کام اصل مقصد کے طور پر کیے جائیں۔ اور حاجات بشری کے علاوہ اپنے کل اوقات ان ہی کاموں میں مشغول رکھے جائیں، تب ان کے ذریعہ زندگی میں نور آئے گا اور پھر انشاء اللہ وہ نور متعدی ہوگا اور پھیلے گا۔

ان چار کاموں کے علاوہ چار ہی کام ناگزیر ضرورت کے طور پر کیے جائیں گے اور صرف بقدر ضرورت ہی کیے جائیں گے۔ وہ چار یہ ہیں۔

۱۔ کھانا پینا ۲۔ قضاء حاجت ۳۔ سونا ۴۔ باہم بات چیت کرنا۔

یہ ناگزیر ضرورتیں ہیں ان کو بس اتنا ہی وقت دیا جائے جتنا ضروری اور ناگزیر ہو، سونے کے لیے دن رات میں بس چھ گھنٹے کافی ہیں۔

۴ باتیں وہ ہیں جن سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے۔

۱۔ کسی سے سوال نہ کیا جائے بلکہ کسی کے سامنے اپنی کوئی ضرورت ظاہر بھی نہ کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا سوال ہی ہے۔ ۲۔ اشراف سے بھی بچا جائے۔ اشراف یہ ہے کہ زبان سے تو سوال نہ کرے لیکن دل میں کسی بندہ سے کچھ حاصل ہونے کی طمع ہو، گویا بجائے زبان کے دل میں سوال ہو۔ ۳۔ اسراف سے بچا جائے۔ اسراف یعنی فضول خرچی ہر حال میں معیوب اور مضر ہے، لیکن اللہ کے راستہ میں نکلنے کے زمانہ میں اس کے نتیجے اپنے حق میں بھی بہت برے ہوتے ہیں اور دوسرے ساتھیوں کے حق میں بھی۔ ۴۔ بغیر اجازت کسی ساتھی کی بھی کوئی چیز استعمال نہ کی جائے۔ بعض اوقات دوسرے آدمی کو اس سے بڑی ایذا پہونچتی ہے۔ اور شرعاً یہ قطعاً حرام ہے۔ ہاں اجازت لے کر استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

بس یہ ہیں ضروری ضروری باتیں جن کی پابندی اس راستہ میں نکلنے والوں کے لیے ضروری ہے۔ آپ لوگوں کے ۲۴ گھنٹے ان پابندیوں کے ساتھ گزرنے چاہئیں۔ ان اعمال کی پوری پابندی کرتے ہوئے آپ اللہ کی زمین میں اور اللہ کی مخلوق میں پھریں اور اپنے لیے اور پوری امت مسلمہ کے لیے اور عام انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگیں۔ بس یہی آپ کا عمل اور آپ کا وظیفہ ہو۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ جو ارحم الراحمین ہے ہرگز محروم نہیں رکھے گا۔

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابیطس اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے۔ چند ہفتہ کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جیسی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے۔ چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت سے دس تولہ کی ایک یا پانچ تولہ

شربت جذام۔ جذام میں یہ دوا بے حد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ -/5

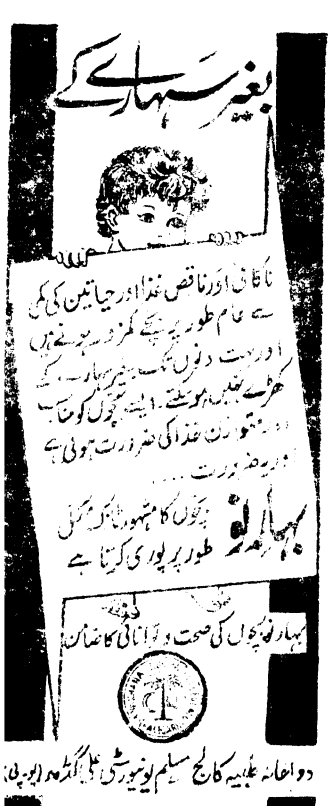
شربت کنر۔ پتہ کی پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر، ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے۔ ایک پونڈ -/5

شربت درد گردہ۔ پیشاب میں کھبری ریت آنا یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے جن کی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ قیمت ایک پونڈ -/5

مرہم سرج۔ پھوڑوں مخصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے۔ اس کے استعمال سے ملین کافور ہو جاتی ہے۔ قیمت 3/50

منیجر **حسنی فارمیسی**

۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



فون نمبر
332280

تار کا پتہ
CUBCATLLE



بہترین چائے
کے لیے
یہ ٹریڈ مارک
یاد رکھیے



ہوٹلوں میں
ہماری چائے استعمال کیجیے تاکہ گاہک خوش ہوں

ہمارے یہاں
نیل گری سے لے کر آسام تک کے تمام مشہور باغات کی چائے
مناسب نرخ پر فراہم کی جاتی ہے ، تجربہ شرط ہے



عباس علاء الدین اینڈ کمپنی
۱۴۴ ، حاجی بلڈنگس ، ایس ، ڈی پٹیل روڈ
نل بازار ، بمبئی ۳

چائے کے تھوک اور خوردہ بیوپاری

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی

دُعا

جن لوگوں نے حضرت مولانا مرحوم کو دُعا کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہیں سُنا وہ بالکل اندازہ نہیں کر سکتے کہ کسی کا دُعا میں یہ حال بھی ہوتا ہے اور کوئی اس طرح مجسم دُعا بن کے بھی، اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو جن نعمتوں سے نوازا تھا اُن میں سے ایک عظیم ترین نعمت حقیقتِ دعا تھی ——— ہماری بڑی آرزو تھی کہ اللہ کے کسی بندہ نے کسی اجتماع میں مولانا کی دعا کو لفظ بلفظ لکھا ہو اور وہ ہم کو مل جائے لیکن اس کی امید اس لیے نہ تھی کہ اُن کی دعا کے وقت ہر شخص اپنے امکان کی حد تک ظاہر و باطن سے ان کی دعا میں شریک ہونا چاہتا تھا اس لیے جو حضرات تقریروں کا لفظ لفظ لکھنا چاہتے تھے وہ دعا کا ایک لفظ بھی نہیں لکھتے تھے ——— لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ آرزو اس طرح پوری فرمائی کہ ہمیں معلوم ہوا کہ مراد آباد کے آخری اجتماع میں آپ کی دعا کے وقت ایک صاحب نے خفیہ طور پر ریکارڈ نعیں لگا کر آپ کی دعا کا ریکارڈ کر لی تھی، اُس کی مدد سے آپ کی دعا لفظ بلفظ قلمبند کر لی گئی اور وہ بالکل حضرت مولانا مرحوم کے الفاظ میں ایک لفظ کی کمی بیشی کے بغیر ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مراد آباد کے ان احباب کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے اس کو اہتمام اور محنت سے قلمبند کر کے مرحمت فرمایا۔ دعا میں جو الفاظ مکرر سہ کرر ہیں وہ اصل دعا میں اسی طرح تھے۔ (درود شریف کے بعد بالجہر دعا اس طرح شروع فرمائی)

اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم، الم اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم وعنت الوجوہ للحی القیوم لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظٰلمین، یا احد الصمد الذی لم یلد ولم یولد

ولم یکن لہ کفوا احد۔ یا ارحم الرحمین، یا ارحم الراحمین، یا ذا الجلال والاکرام یا ربنا یا سیدنا یا مولانا و یا غایۃ رغبتنا یا خالق انفسنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔ ربنا اغفر لنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔ رب اغفر وارحم وتجاوز عما تعلم انک انت الاعز الاکرم۔ اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک۔ اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک، اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک، یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک یا مقلب القلوب ثبت قلوبنا علی دینک اللھم ان قلوبنا ونواصینا وجوارحنا بیدک لم تملک منہا شیئا فاذا فعلت ذلک بنا فکن انت ولینا واھدنا الی سواء السبیل، اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ اللھم ارزقنا حبک وحب رسولک وحب من ینفعنا حبہ عندک والعمل الذی یبلغنا حبک اللھم اجعل حبک احب الاشیاء الی واجعل خشیتک اخوف الاشیاء عندی۔ اللھم لا سھل الا ما جعلتہ سھلا وانت تجعل الحزن سھلا اذا شئت لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب العرش العظیم الحمد للہ رب العلمین اسئلک موجبات رحمتک وعزائم۔ مغفرتک والغنیمۃ من کل ذنب والغنیمۃ من کل بر والسلامۃ من کل اثم لا تدع لی ذنبا الا غفرتہ ولا ھما الا فرجتہ ولا کربا الا نفستہ ولا ضرا الا کشفتہ ولا حاجۃ ھی لک رضی الا قضیتہا یا ارحم الراحمین۔ الیک رب تحببنا وفی النفسنا فذللنا وفی اعین الناس فعظمنا ومن سیئ الاخلاق فجنبنا وعلی صالح الاخلاق فقومنا وعلی الصراط المستقیم فثبتنا وعلی الاعداء اعداء ائک اعداء الاسلام فانصرنا اللھم انصرنا ولا تنصر علینا اللھم اکرمنا ولا تھنا اللھم آثرنا ولا تؤثر علینا اللھم زدنا ولا تنقصنا اللھم امکر لنا ولا تمکر علینا اللھم ارحمنا ولا تسلط علینا من لا یرحمنا اللھم اشرح صدورنا للاسلام اللھم حبب الینا الایمان وزینہ فی قلوبنا وکرہ الینا الکفر والفسوق والعصیان، اللھم اجعلنا من الراشدین اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء

والصالحین وحسن اولئک رفیقا۔ اللھم اھد امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللھم سلمھم الکتاب والحکمۃ اللھم افھمھم مراشد امورھم، اللھم اجعلھم دعاۃ الیک وال رسولک اللھم ثبتھم علی ملۃ رسولک اللھم اوزعھم ان یشکروا نعمتک التی انعمت علیھم وان یوفوا بعھدک الذی عاھدتھم علیہ اللھم افرغ علیھم صبرا وثبت اقدامھم علی عدوک وعدوھم الہ الحق امین اللھم اھد ھذہ البلدۃ اللھم اھد ھذا الملک اللھم اھد ھذہ الحکومۃ اللھم اھد الناس جمیعا اللھم اھد الناس جمیعا اللھم اھد الناس جمیعا۔ اللھم علیک بصنادید الیھود والنصاری والمشرکین اللھم علیک باشداءھم علی الاسلام والمسلمین اللھم اقطع دابرھم اللھم خذ ملکھم واموالھم اللھم مزق اسلحتھم اللھم اھلکھم کما اھلکت عادا وثمود اللھم فذھم اخذ عزیز مقتدر اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھود والنصاری والمشرکین من جزیرۃ الحبیب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم من جزیرۃ العرب۔ اللھم اخرج الیھودیۃ والنصرانیۃ والمجوسیۃ والشیوعیۃ والشرک عن قلوب المسلمین یا مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شئ قدیر اللھم ایّد المسلمین فی مشارق الارض ومغاربھا یا الامام العادل والخیر والطاعات واتباع سنن سید الموجودات اللھم وفقھم لما تحب وترضی واجعل اٰخرتھم خیرا من الاولی۔ اللھم انصر الاسلام والمسلمین فی مشارق الارض ومغاربھا اللھم اعز الاسلام والمسلمین فی العرب والعجم اللھم اعل کلمۃ الاسلام والمسلمین فی المملکۃ الھندیہ وغیرھا من الممالک المحققۃ اللھم ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار اللھم انا نسئلک العفو والعافیۃ والفوز فی الدنیا والاخرۃ اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاخرۃ اللھم ارحمنا بترک المعاصی ابدا ما ابقیتنا اللھم اعنا علی تلاوۃ القرآن وذکرک

وشکرك وحسن عبادتك اللّٰھمّ جنّبنا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن اللّٰھمّ جنّبنا واولادنا و احبابنا واقاربنا وجمیع المبلغین والمعلمین والمتعلمین عن الفواحش ما ظھر منھا وما بطن وجنّبنا الحرام حیث کان واین کان وعند من کان وحُل بیننا وبین اھلہ۔ اللّٰھمّ انا نسئلك من خیر ما سئلك منہ نبیّك محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونعوذ بك من شر ما استعاذ بك منہ نبیّك محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھمّ انا نسئلك رضاك والجنۃ اللّٰھمّ انا نسئلك الجنۃ وما قرب الیھا من القول والعمل۔ اللّٰھمّ انا نعوذ بك من عذاب جھنم ونعوذ بك من عذاب القبر ونعوذ بك من فتنۃ المسیح الدجال۔ ونعوذ بك من فتنۃ المسیح الدجال و نعوذ بك من فتنۃ المسیح الدجال ونعوذ بك من فتنۃ المحیا والممات ونعوذ بك من الماثم والمغرم ونعوذ بك من ان نموت فی سبیلك مدبرا اللّٰھمّ تثبیتاً کتثبیت موسیٰ علیہ السلام اللّٰھمّ تثبیتاً کتثبیت موسیٰ علیہ السلام اللّٰھمّ تثبیتاً کتثبیت موسیٰ علیہ السلام اللّٰھمّ واقیۃ کواقیہ الولید اللّٰھمّ واقیۃ کواقیہ الولید اللّٰھمّ نصراکما نُصِرَ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونصر اصحابہ اللّٰھمّ نصراکما نُصِرَ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونصر اصحابہ اللّٰھمّ نصراکما نُصِرَ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ونصر اصحابہ اللّٰھمّ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔

اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما یا اللہ ہماری لغزشوں کو معاف فرما۔ اے اللہ ہم قصوروار ہیں ہم خطاکار ہیں ہم گنہ گار ہیں ہم مجرم ہیں۔ ہماری ساری زندگی خواہشات کی اتباع میں گذر گئی اے خداوند قدوس ہم دنیا کو سامنے رکھ کر اس سے متاثر ہوئے اور اسی کے یقین میں جذب ہو گئے اور اسی کے طالب بن گئے اور اسی کے اندر اپنی ساری صلاحیتوں کو ہم نے ضائع کر دیا۔ اے خدا ہماری محنت کے بگڑ جانے کے اس جرم عظیم کو معاف فرما جس جرم عظیم سے ہزاروں خرابیاں ہم میں پیدا ہو گئیں اور ہزاروں ہمارے اندر کی دولتیں لٹیں اے خدا اس محنت کا بدلنا یہ ہمارا جرم عظیم ہے ساری اُمّت کے اس جرم عظیم کو معاف فرما اے خدا ساری اُمّت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جرم کو معاف فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس محنت پر ڈال کر گئے اس محنت کو چھوڑ کر ان محنتوں میں الجھ گئے جن محنتوں سے

نکال کر وہ گئے تھے اے خدا اس محنت کا بدلنا یہ ہمارا سب سے بڑا جرم ہے اس کو خصوصیت کے ساتھ معاف فرما اور اس محنت کو چھوڑ دینے کی بنا پر پھر جتنے جرائم میں ہم مبتلا ہوئے ایک ایک جرم کو اپنے کرم سے معاف فرما اور ایک ایک عصیاں کو معاف فرما ایک ایک گناہ کو معاف فرما اے اللہ کمائیوں کی لائن کی ہماری عصیاں اور خرچ کی لائن کی ہماری عصیاں اور معاشرت کی لائن کی ہماری عصیاں اے اللہ ہر لائن میں ہم عصیاں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں اے اللہ نکلنے کی ہمارے لیے کوئی صورت نہیں ڈوبا ہوا خود کہاں نکل سکتا ہے جو ڈوبا نہیں ہے وہی نکال سکتا ہے، اے خدا ہم سب ڈوبے ہوئے ہیں اور تو ہی نکالنے والا ہے، اے اللہ عصیاں کے دریاؤں میں سے ہم کو نکال لے اپنے فضل سے نکال دے اپنے کرم سے نکال دے اے کریم نافرمانیوں کے دریاؤں میں سے اپنے کرم سے نکال دے اے اللہ اپنی رحمت کی رسی ڈال اور ہمیں کھینچ لے اور ہمیں عصیاں کی دریاؤں میں سے نکال دے اور ہمیں طاعت کی سڑکوں پر ڈال دے اے اللہ ہمیں قربانیوں کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پہونچا دے۔ اے اللہ ہمیں دین کی محنت کے لیے قبول فرما، ہم سب کو دین کی محنت کے لیے قبول فرما۔ اور اے اللہ سو فیصد اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کی محنت کے لیے قبول فرما لے۔ علم کی محنت کے لیے ایمان کی محنت کے لیے عبادت کی محنت کے لیے ذکر کی محنت کے لیے اخلاق کی محنت کے لیے نمازوں کی محنت کے لیے حج کی محنت کے لیے روزوں کی محنت کے لیے زکوٰۃ کی محنت کے لیے ان سارے فرائض و عبادات کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے پر آجانے کے لیے ہم سب کو اس کی پوری پوری توفیق و محنت نصیب فرما۔ اے اللہ اے اللہ ہماری زندگی کے شعبوں کی بدعملیوں کو بھی دور فرما کمائی کی بدعملیوں کو دور فرما اور کمائی کے اعمال صالحہ کو زندہ فرما، گھر کی زندگیوں کی بدعملیوں کو دور فرما اور اعمال صالحہ کو گھریلو زندگیوں میں زندہ فرما، معاشرت کی بدعملیوں کو ختم فرما، اے اللہ عدل و انصاف والے اعمال کو ہماری معاشرت میں زندہ فرما، اے اللہ ہمیں نیک اعمال سے آراستہ فرمادے اور بُرے اعمال سے ہم کو نکال دے، اے خداوند قدوس جس قسم کے زمانے میں تو نے اس تبلیغ کے ذریعہ اس کلمہ و نماز و محنت کی صورت پیدا فرمادی اور ہمارے تمام دوستوں کو اس پر جمع ہونے کی اور کہنے سننے کی اور اپنی راہ میں نکلنے کی توفیق دی۔ اے اللہ جب تو نے اپنا کرم فرما کر اس کام کے کہنے سننے کا رخ پیدا فرمادیا، اور اس کی کام کی نقل و حرکت کا رخ پیدا فرمادیا اے کریم اپنے کرم سے سب کو قبول فرمالے اور ان سب کی ایسی تربیت فرما کہ یہ نقل و حرکت تجھے پسند آجائے تو ہی اپنے کرم سے اس ترتیب کی اور نقل و حرکت کی تربیت فرما تو ہی مربی ہے

تو ہی تربیت کرنے والا ہے تو ہی تزکیہ کرنے والا ہے اور تو ہی پاک وصاف کرنے والا ہے، اے اللہ اس نقل وحرکت کو قبول فرما اے اللہ اس نقل وحرکت کو قبول فرما اے اللہ اس نقل وحرکت کو قبول فرما انتہائی رقت کے ساتھ) اے خدا ان کو اخلاص نصیب فرما، اے اللہ ان کو اخلاص نصیب فرما، اے اللہ ہم سب کو اخلاص نصیب فرما، اے اللہ ہم سب کو اپنی قدرت پر یقین نصیب فرما، ہم سب کو یقین نصیب فرما ہم سب کو اپنے وعدوں پر یقین نصیب فرما، یا اللہ ہمارے عقیدوں کو درست فرمادے اور اس محنت کے لیے ہمارے اندر وہ جذبات پیدا فرمادے، اے خدا جن قربانیوں سے اے اللہ یہ مٹی کے گندے قطرے کا بنا ہوا انسان تیرا دوست بن جاتا ہے اور جن قربانیوں سے تیرا محبوب بن جاتا ہے اے خدا ان قربانیوں کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے! اے اللہ جس کرم سے تو نے یہ کام اٹھایا اب اس کام کو تکمیل کو پہونچادے[1]، اس کام میں لگنے والوں میں دنیا کی رغبت ان کے دلوں سے نکال دے، ملک ومال کی رغبت ان کے دلوں سے نکال دے، اقتدار کی ہوس ان کے دلوں سے نکال دے، دنیا کے نقشے کے بارے میں بے رغبتی ان کے دلوں میں پیدا فرمادے، موت کی حقیقت ان کو عطا فرما، قناعت کی دولت ان کو نصیب فرما، اے اللہ صبر واخلاص، مجاہدے کی طاقت ان کو نصیب فرما، اے خدا جس مجاہدے پر انسان اندر سے تیرے انوارات سے جگمگا جاتا ہے اور تیرے صفات اخلاق ان اعلیٰ مجاہدوں پر اے اللہ ترقیات کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اخلاق کی چوٹیوں پر انسان پہونچ جاتا ہے اے اللہ وہ مجاہدے کی دولت ہم سب کو نصیب فرما۔ اے اللہ جس طرح تو نے یہ کام اٹھایا اس کام کو ہدایت کے پوری دنیا میں آجانے کا اس کام کو سو فیصد ذریعہ قرار دیدے اے اللہ سارے انسانوں کے لیے اور سارے ملکوں کے لیے اور سارے مسلمانوں کے لیے ہدایت ملنے کا سبب اس کو قرار دیدے، سارے زمانوں قوموں ملکوں میں اس محنت کے پہونچنے کے لیے قبول فرمالے! اور یا اللہ ہدایت عام فرما، ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو ہمارے رشتہ داروں کو اور اس کام میں لگنے والوں کو ان کے متعلقین اور رشتہ داروں کو اور ان سے تعلق ومحنت رکھنے والوں کو اس ہدایت میں سے نصیب فرما جو تو مجاہدین کو ہدایت دیا کرتا ہے اور تو داعیوں کو ہدایت دیا کرتا ہے اور جو تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو ہدایت نصیب فرمائی تھی اور تو نے انبیاء سابقین کو اور اولیاء اللہ کو ہدایت وقربانی عطا فرمائی تھی، اے اللہ اس ہدایت سے ہم سب کو بھرپور حصہ نصیب فرما۔ اے اللہ ان خالی ہاتھوں کو اپنے کرم سے بھردے اور ان خالی دلوں کو اپنے کرم سے بھردے، اپنے عشق سے اور اپنی محبت سے ہدایت کا فرمان ہمارے لیے فرمادے۔ یا اللہ پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اے اللہ، اے اللہ جو انھیں ضلالت کی طرف کھینچے ان کے ہاتھوں سے

---

[1] یہ جملہ تین دفعہ فرمایا۔

انھیں چھوڑ دے اور جو انھیں ہدایت کی طرف کھینچے ان کے ہاتھوں کی طرف ان کو منتقل کر دے، اے خدا اس امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود و نصاریٰ مشرکین و ملحدین کے ہاتھوں سے چھڑا دے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادوں پر ان کو کھڑا کر دے، اے اللہ ان کے یقینوں کو ٹھیک کر، ان کو ہدایت نصیب فرما، ان کو ایمان کی قوت نصیب فرما، ان کو علوم نبویہ کا استقبال نصیب فرما، اسلام کی دولت ان کے سینوں میں اتار دے اور انہیں ذکر ان کے دلوں کو نصیب فرما دے اور دنیا کی بے رغبتی نصیب فرما کر علم دین سیکھنے کے مطابق زندگی گذارنے کی ہدایت نصیب فرما عام انسانوں کو ہدایت نصیب فرما، اس ملک کے بسنے والوں کو ہدایت نصیب فرما، اے اللہ اس ملک کے حاکم و محکوم کو یہاں کی اقلیت و اکثریت کو، اے اللہ اس راستے کی ہدایت نصیب فرما! اے اللہ درندوں کی اور انسانوں کی قسم سے جتنے انسان اور درندے انسان ہیں اور جن کو تجھے انسانیت سے نوازنا ہی نہیں اے خدا ایسے ایسوں کو چن چن کر ہلاک فرما، ایسوں کو زمینوں کو اس کے لیے پھاڑ دے ایسوں کے مکانوں کو ان پر توڑ دے، ایسوں سے نعمتوں کو اپنی چھین لے، ایسی عبرت ناک سزائیں عطا فرما کہ دنیا دیکھ لے کہ جو اپنی انسانیت کو بگاڑتا ہے خدا اس کی صورتوں کو اس طرح بدلتا ہے اے خدا ظالم ترین مفسد ترین انسانوں کو چن چن کر ہلاک فرما، جن ناکوں کی ہدایت سے قوموں اور ملکوں میں ہدایت آجائے ان کو ہدایت نصیب فرما، اور جن ناکوں کی اے اللہ ہلاکت سے قوموں اور ملکوں کے ضلالت و فساد ختم ہو جائیں اے اللہ اس کو چن چن کر ہلاک فرما دے اے خدا لوٹ و کھسوٹ کے ماحول کو ختم کر، ظلم و ستم کے ماحول کو ختم کر، عدل و انصاف کے ماحول کو قائم کر، علم و ذکر کے ماحول کو قائم کر، خدمت خلق کے ماحول کو قائم کر۔ تعاون و ہمدردی و محبت کے ماحول کو قائم کر، اے اللہ ہماری دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما، ہمارے مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی فرما ہمارے محتاجوں کی حاجتوں کو پورا فرما، ہمارے بیماروں کو تندرستی عطا فرما۔ جو آنکھ کے بیمار ہیں ان کو آنکھ کی شفا عطا فرما، اے اللہ جو معدے کے بیمار ہیں ان کو معدے کی شفا عطا فرما اور بقیہ جتنے آدمیوں نے اس جلسے میں ہم سے دعاؤں کے لیے کہا یا آج تک اس سے پہلے ہم سے دعاؤں کو کہا یا آئندہ ہم سے وہ دعاؤں کو کہیں اے اللہ سب کی حاجتوں کو پورا فرما اور سب کی پریشانیوں کو ختم فرما اے اللہ اس جلسے کو سارے ہی انسانوں کے لیے اور سارے ہی مسلمانوں کے لیے اس جلسے کو انتہائی باعث خیر و برکت باعث رشد و ہدایت، باعث لطف و رفعت اور باعث فلاح و فوز اپنے لطف و کرم سے فرما ہماری دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔ ان نکلنے والوں کو اپنے کرم سے قبول فرما۔ آمین

MISWAK

مسواک

ٹوتھ برش
استعمال کیجئے

اس میں کسی جانور کے بال نہیں ہیں

دینی نظر سے درست

دنیوی نقطۂ نظر سے تندرست

ہر جگہ ملتا ہے



ہم آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ آئندہ صفحات میں

کتب خانۂ الفرقان کی مختصر فہرست

پر ایک نظر ضرور ڈال لیں!

کتب خانۂ الفرقان

ایک مقصدی ادارہ ہے

اس سے جو کتاب شائع کی جاتی ہے وہ وقت کے تقاضے، دورِ حاضر کی دینی ضرورت اور لوگوں کے دینی فائدہ ہی کی غرض سے ——— شائع کی جاتی ہے ———

کتابیں طلب کرنے والے حضرات

(۱) اپنا پتہ صاف اُردو میں لکھیں اور ہو سکے تو انگریزی میں بھی۔

(۲) اگر کسی کتاب کے بھیجنے میں یا بل میں ہم سے غلطی ہو جائے تو فوراً اطلاع دیجائے تلافی کی جائے گی۔

(۳) پاکستان کے حضرات کتابیں منگوانا چاہیں تو پہلے خط لکھ کر ہم سے دریافت کر لیں کہ ان کی مطلوبہ کتابیں ہم بھیج سکیں گے یا نہیں، اور طریقۂ کار کیا ہوگا۔

منیجر کتب خانۂ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ، یوپی

کتب خانۂ الفرقان کی مطبوعات

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے

قیمت ۳۷/-

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

دوسری دفعہ نظر ثانی اور معتدبہ اضافہ و ترمیم کے بعد بھلا نیا اڈیشن

(انگریزی اور ہندی اڈیشن بھی تیار ہو چکا ہے)

اس کتابچے کو دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسکو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے۔ اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل انشاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر، کتابت و طباعت اعلیٰ اور معیاری مجلد ۲/۵۰

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد -/۳، انگریزی ایڈیشن ۵/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اور اپنی نماز میں خشوع کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

کلمۂ طیبہ کی حقیقت کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ..... -/۱

معارف الحدیث

یعنی احادیث نبویؐ کا ایک جدید مجموعہ مع ترجمہ و تشریح

جو دور حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری حالت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے، احادیث نبویؐ کی جو اصل غرض و غایت اور روح ہے یعنی اصلاح و ہدایت اور تزکیہ و تربیت مؤلف نے پوری کوشش کی ہے کہ یہی غایت و روح اس کتاب کی بھی رہے، اور ارشادات نبویؐ کے جو اثرات صحابۂ کرامؓ پر پڑتے تھے ان کا کوئی عکس اس کتاب کے ناظرین پر بھی پڑے اسی کے ساتھ ہر حدیث سے متعلق سوالات کے علمی و تحقیقی جوابات عام فہم انداز میں۔

ابھی تک تین جلدیں تیار ہوئی ہیں۔

جلد اوّل۔ ایمان اور آخرت کے بیان کی حدیثیں

قیمت مجلد -/۵ غیر مجلد -/۴

جلد دوم۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں

قیمت مجلد ۵/۵۰، غیر مجلد ۴/۵۰

جلد سوم۔ طہارت اور نماز کے ابواب کی حدیثیں

قیمت مجلد -/۸، غیر مجلد -/۷

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن صوم رمضان اور ماہ رمضان اور اسکے خاص اعمال و وظائف، تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور انکی مدلل تاریخ کا نہایت مؤثر و شوق انگیز بیان اور حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن

قیمت ..... -/۷۵

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اسکے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔

شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے

قیمت ..... -/۷۵

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

از مولانا محمد منظور نعمانی

قرآن پاک نے نوع انسانی کو جن چیزوں کی طرف خاص طور سے دعوت دی ہے یہ کتاب قرآن پاک کی اس دعوت و پکار کی ترجمان ہے ۳۰ ابواب میں متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے

مجلد ..... -/۴

دین و شریعت

از: مولانا محمد منظور نعمانی

یہ "اسلام کیا ہے؟" سے اونچی سطح کی کتاب ہے جس میں توحید، آخرت اور رسالت، نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر اسی تحقیقانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان، ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں، بڑے بڑے ارباب نظر نے اسکو اسلام پر ایک علمی بحث اور جامع و مانع کتاب قرار دیا ہے۔ کتابت و طباعت معیاری قیمت مجلد -/۳

دین و شریعت کا انگریزی اڈیشن بھی تیار ہو گیا ہے مجلد -/۵

آپ حج کیسے کریں؟

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

(مفید اضافات کے ساتھ حدید اڈیشن)

حج و زیارت کے موضوع پر اب تک اردو میں بیشمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب پچھلی تمام کتابوں سے اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اس کا پورا طریقہ بھی بہت آسان اور دلنشین طریقہ پر بتایا ہے اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی روح اور جان ہے قیمت مجلد -/۲

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت

تالیف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت مجلد -/۳

غیر مجلد ۲/۵۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی ۱/۵۰

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ قیمت -/۱

آسان حج

اسے آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ سمجھئے۔ کم تعلیمیافتہ حضرات کیلئے حج کا بہترین معلم اور رہنما ہے۔ جیبی سائز آفسٹ کی بہترین طباعت۔ حدید اڈیشن قیمت -/۶۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ان الزامات کا تحقیقی جواب

قیمت -/۷۵

تذکرہ مجدد الف ثانیؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے اس عظیم تجدیدی کارنامہ کی تعیین و تفصیل جس کی وجہ سے امت نے آپ کو بجا طور ایک صدی کے بعد ایک ہزارے کا مجدد مانا۔ اس کے علاوہ آپ کی سوانح حیات اور دین کی راہ میں قربانیاں اور اسلام میں مقام تجدید کی حقیقت (یہ الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کا کتابی اڈیشن ہے)

قیمت مجلد -/۴

ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ حجاز

آج سے ایک سو پچاسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد، ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی مرزا الدین صاحب مراد آبادیؒ نے حرمین شریفین کا سفر تڑپتے ہوئے عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفر عشق کی مکمل روئداد قلم بند کر کے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی، تاریخی اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفر کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہندوستان کے بہت ہی نادر حالات اور معلومات اسکے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی روحانی کیفیات کا تو یہ عجیب و غریب ہی مرقع ہے۔

قیمت: ۱/۷۵

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد آپ کی مسند اصلاح و ہدایت کو آپکے خلیفہ اور صاحبزادہ خواجہ محمد معصومؒ نے سنبھالا اور آپکے کام کو تکمیل تک پہونچایا۔ آپ ہی کی تربیت نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کو تخت حکومت پر مجاہدانہ سہیل اللہ اور زاہدانہ زندگی اور معاشرہ میں فقیرانہ بسر کرنے والا بنایا۔ آپکے مکتوبات کا جو ذخیرہ فارسی میں تھا اس کو تلخیص کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد -/۴

معرکۃ القلم

اکابر علماء دیوبند پر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب، مولانا نعمانی کے قلم سے

قیمت ۱/۵۰

اسلام و کفر کے حدود اور قادیانیت

از مولانا نعمانی قیمت /۵۰

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

از مولانا نعمانی قیمت /۵۰

دوسرے اداروں کی قابل مطالعہ کتابیں

قرآن پاک سے متعلق

درس قرآن
قرآن پاک کی عام فہم تفسیر ایک ایک صفحے کے درس کی شکل میں مع ترجمہ تحت اللفظ و با محاورہ ۴ جلدیں تیار ہو چکی ہیں جلد اول (منزل اول) مجلد ۱/ جلد دوم (منزل دوم) مجلد ۱/ جلد سوم (منزل سوم) مجلد ۸/ جلد چہارم (منزل چہارم) مجلد ۸/ ہر گھر میں رہنے کے قابل شائع کردہ ادارہ صلاح و تبلیغ، لاہور۔

قصص القرآن
از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم قرآن مجید میں جیا علیہم السلام اور انکی قوموں کے جو عبرت آموز واقعات بیان ہوئے ہیں علمی تاریخی اور جغرافیائی بحث کے ساتھ انکی پوری تحقیق۔ مکمل چار جلدوں میں جلد اول ۸/ جلد دوم ۸/ جلد سوم ۵/ جلد چہارم ۸/ مجلد کے لئے فی جلد ۱/ کا اضافہ

قرآنی شخصیتیں
از مولانا عبدالماجد دریابادی قرآن مجید میں جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں انکا تحقیقی تعارف ۱/۴

حیوانات قرآنی
از، مولانا دریابادی۔ قرآن پاک میں مذکورہ حیوانات کا تذکرہ اور ضروری معلومات۔ ۲/

جغرافیہ قرآنی
قرآن مجید میں مذکور مقامات و بلاد کا جغرافیائی تعارف قیمت ۱/۴۵

بشریت انبیاء
قرآن مجید سے بشریت انبیاء ۴ کا قابل دید اثبات۔ از مولانا دریابادی قیمت ۲/۴۵

قصص و مسائل
از مولانا دریابادی۔ قیمت ۲/

فہم قرآن
از مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ جس میں مایل طور سے بتایا گیا ہے کہ تفسیر حدیث کے قرآن پاک کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ قیمت ۲/۲۵

وحی الٰہی
از مولانا اکبرآبادی قیمت ۱/۲

قرآن اور تعمیر سیرت
از ڈاکٹر سید ولی الدین ایم اے پی ایچ ڈی حدیث تعلیمیات حضرات ضرور مطالعہ کریں۔ مجلد ۸/ غیر مجلد ۵/

قرآن اور تصوف
از ڈاکٹر ولی الدین قیمت ۳/

لغات القرآن
اردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی مفصل تشریح۔ جلد اول ۵/ دوم ۵/ سوم ۵/ چہارم ۵/ (مجلد کے لئے فی جلد ۱/ کا اضافہ)

المفوز الکبیر
اصول تفسیر پر شاہ ولی اللہ کے بے نظیر محققانہ رسالہ کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۱/

حدیث پاک سے متعلق

بخاری شریف کامل (اردو)
تین جلدوں میں۔ مجلد ۲۵/

زبدۃ البخاری
اسانید اور مکررات حذف کر کے بخاری شریف کی احادیث کا ترجمہ ۱۲/

ترمذی شریف (اردو)
دو جلدوں میں۔ مجلد ۱۶/

مشکوٰۃ شریف (اردو)
دو جلدوں میں۔ مجلد ۱۷/

مؤطا امام مالک
(اردو ترجمہ مع متن عربی) متداول کتابوں میں یہ حدیث نبوی کا سب سے قدیم مستند مجموعہ ہے قیمت۔ مجلد ۸/

انتخاب صحاح ستہ
(اردو ترجمہ مع متن عربی) قیمت ۵/

مشارق الانوار
بخاری و مسلم کی ۲۲۰۲ قولی حدیثوں کا اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ از مولانا حشم علی خان مجلد ۱۲/

حصن حصین
(عربی متن کے ساتھ اردو ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول متعدد مقبول دعاؤں کا مجموعہ مجلد ۸/

مختصر شعب الایمان
از امام بیہقی۔ ترجمہ اردو قیمت ۱/

بستان المحدثین
کتب حدیث کا تعارف اور آئمہ حدیث کا تذکرہ۔ از شاہ عبدالعزیز صاحب۔ قابل دید کتاب ہے مجلد ۵/

شرح شمائل ترمذی
از، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا ظلہ علی، تحقیقی ہونے کے ساتھ بڑی تبحر انگیز کتاب ہے۔ قیمت ۶/

ترجمان السنہ
از حضرت مولانا بدر عالم صاحب مہتمم مدینہ طیبہ اردو میں حدیث کی نہایت محققانہ شرح ہو ابھی صرف ۳ جلدیں تیار ہوئی ہیں جلد اول ۱۰/ جلد دوم ۹/ جلد سوم ۱۰/ مجلد کے لئے فی جلد ۲/ کا اضافہ

تدوین حدیث
از مولانا سید مناظر احسن گیلانی تدوین حدیث کی نہایت مفصل اور محققانہ تاریخ جس کے مطالعہ کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ حدیث نبوی کا جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے وہ اس درجہ اطمینان بخش طریقہ پر پہنچا ہے کہ اس سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ عالم امکان میں نہیں ہے۔ قیمت مجلد ۶/۵۰

لغات الحدیث
(اردو) مشہور خادم حدیث مولانا وحید الزماں خاں صاحب کی مرتب کردہ لغات حدیث جو اپنے موضوع پر اپنا سا تہ اور طلبہ کیلئے بالکل کافی وافی ہے۔ چھ ضخیم جلدوں میں۔ قیمت مکمل ۷۲/

مختصر خصائل نبوی
قیمت ۱/

تاریخ و سیرت

رحمۃ للعالمین (کامل) ۳ جلد
از قاضی سلیمان منصور پوری رح
سیرت پر بے نظیر مقبول اور بہت آخر میں
کتاب ہو تعارف سے بے نیاز ہے۔
قیمت کامل ۷/۰

اسلام (آغاز دارتقا)
(از حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)
قیمت ۶/

اصح السیر
مولانا عبدالرؤف دانا پوری مرحوم
کی تالیف کردہ نہایت محققانہ اور
مستند سیرت نبوی۔ قیمت ۱۰/-

خطبات مدراس
حیات نبوی کے مختلف پہلوؤں
پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خطبات
جو مرحوم کی علم و تحقیق کا نچوڑ
ہیں ——— قیمت ۳/-

رحمت عالم
از مولانا سید سلیمان ندوی رح
یہ کتاب خاص طور سے مدارس
اور سکولوں کے طلبہ کیلئے لکھی گئی
تھی ——— قیمت ۱/۷۵

سیرت محمدیہ
از، سر سید احمد خاں مرحوم
صوبہ یوپی کے ایک انگریز گورنر نے سر ولیم
میور نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک
کتاب "لائف آف محمد" لکھی تھی جو
زہر افشانیوں اور افترا پردازیوں
سے بھری تھی، سر سید مرحوم نے لندن
میں بیٹھ کر اسکے جواب میں "سیرت محمدیہ"
لکھی "تاریخی و معرکۃ الآرا کتاب ہے"
قیمت مجلد ۱۲/-

زاد المعاد (اردو)
از حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات
طیبہ پر جو کتابیں گزشتہ صدیوں
میں لکھی گئی ہیں ان میں علم و تحقیق
کے لحاظ سے زاد المعاد کا خاص
مقام ہے یہ ۴ جلدوں میں ہو اس کا
اردو ترجمہ اردو داں طبقہ کے لئے
بڑی نعمت ہے۔ ترجمہ بھی ۴ جلدوں
میں ہے۔ قیمت مکمل مجلد ۸/۴

ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم
از، ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری۔
ترجمہ۔ از شاہ حسن عطا ایم اے
حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا زمانہ
خلافت دراصل عہد نبوی کا نتیجہ تھا
ان ۱۲ سالوں میں وہ ہوا جس نے
دنیا کا رخ بدل دیا، اور جو بلاشبہ
تاریخ انسانی کا ایک معجزہ ہے پوری
تفصیل اس کتاب میں دیکھی جاسکتی
ہے۔ قیمت مجلد ۶/۷۵

صدیق اکبر
از، مولانا سعید احمد اکبر آبادی
مولانا شبلی مرحوم کے "الفاروق"
کے بعد اردو زبان میں سیرت صدیق اکبر
کا جو خلا محسوس ہوتا تھا اسکو اس
کتاب کی حد تک پر کر دیا ہے ندوۃ المصنفین
کی شائع کردہ ہے۔ قیمت ۷/-

حضرت ابوبکر کے سرکاری خطوط
بڑی فاضلانہ قابل مطالعہ
کتاب ہے۔
قیمت ——— ۵/-

فاتح خیبر
از، رئیس احمد جعفری ندوی
قیمت مجلد ۵/۵۰

فاتح مصر
فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ
کی شخصیت اسلام لانے سے پہلے بھی
اور بعد میں بھی سیاسی بصیرت و کردار
کے لحاظ سے بہت ممتاز تھی، وہ
کامیاب ترین جنگی قائد اور غیر معمولی
قسم کے سیاستدان تھے۔ انکی مفصل
سوانح مصر کے ایک فاضل استاد
محمود زہران نے لکھی ہے اس کا کامیاب
اردو ترجمہ شیخ محمد احمد نے کیا ہے۔
قیمت ۷/۵ ۱۰/

تاریخ اسلام
(مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)
کامل تین حصوں میں
حصہ اوّل۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ
حصہ دوم۔ خوانین و بنو عباس کا عہد
حصہ سوم۔ اندلس، دولت معاویہ،
سلجوقیہ، عثمانیہ، خوارزم شاہیہ،
اور اس وقت کی تمام مسلمان حکومتوں
کے تفصیلی حالات جو اپنے اندر بڑی عبرتیں
اور بصیرتیں لئے ہوئے ہیں۔
قیمت مکمل ہر سہ حصہ ۳۶/-

تاریخ ملت
شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی
عہد رسالت سے سلاطین ہند تک
گیارہ حصوں میں
قیمت ——— مکمل ۔/سٹ
غیر مجلد ۳۱/۵ مجلد ۳۴/

ترجمہ تاریخ الخلفاء (سیوطی)
خلافت راشدہ سے مصر کے فاطمی
خلفاء تک کی تاریخ قیمت ۱۲/-

خلافت بنو امیہ
امام ابن الاثیر جزری کی تاریخ کامل کا
اردو ترجمہ از سید اطہر ندوی خلافت
بنو امیہ کے بارہ میں سوچنے والوں کے
لئے اس کا مطالعہ ضروری ہو دور بینی
امیہ کا سا رایا و سعید آپ کو اس
میں ملے گا حصہ اوّل سنہ ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ
تک قیمت ۹/۷۵ حصہ دوم سنہ ۱۳۲ھ
سے ۱۳۲ھ تک۔ قیمت ۱۰/۷۵

فتوح البلدان (اردو)
احمد بن یحیی البلاذری متوفی ۲۷۹ھ
کی فتوح البلدان تاریخ اسلام
کی قدیم مستند کتابوں میں سے ہے اردو ترجمہ
از ذبیر احمد صدیقی۔ قیمت ۱۵/-

تاریخ فاطمیین مصر
از، ڈاکٹر زاہد علی (اکسفورڈ) مصنف
نے یہ کتاب خود فاطمی مصنفین کی قلمی
کتابوں سے اخذ کر کے لکھی ہے۔
حصہ اوّل ۸/۷۵ حصہ دوم ۸/۷۵

تاریخ فیروز شاہی
آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستانی
بادشاہ فیروز شاہ تغلق کی مکمل
سوانح حیات اور اسکے پرشکوہ عہد
حکومت (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) کا
قابل اعتماد تذکرہ جو اسی دور کے
ایک مصنف نے قلمبند کیا۔
(اردو ترجمہ)
قیمت ——— ۸/۲۵

خلفائے راشدین اور اہلبیت کے باہمی تعلقات

مترجمہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی
قیمت ۱/۷۵

دعوت اسلام

مصنفہ سر تھامس آرنلڈ
ترجمہ از مولوی عنایت اللہ دہلوی
سر تھامس علامہ اقبال کے استاد تھے ان کی کتاب سرپیچ آف اسلام کا یہ ترجمہ سید احمد خاں مرحوم نے کرایا تھا۔ پڑھنے کے قابل کتاب ہے ۹/

تاریخ فلاسفۃ الاسلام

تصنیف محمد لطفی جمعہ
ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین پی ایچ ڈی کنڈی، فارابی، بوعلی سینا، امام غزالی ابن رشد، ابن خلدون جیسے فلاسفہ اسلام کے حالات اور انکے خاص افکار و نظریات اور دنیا پر انکے اثرات قیمت ۶/۷۵

ہزار سال پہلے

از، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا احسن گیلانی، چچ پھپھی اور ہارپر ایچ صدی ہجری کے سیاحوں نے جو کچھ اپنے سفرنامہ میں لکھا مولانا گیلانی مرحوم نے ان سے اخذ کر کے یہ مرتب کیا تھا۔ قیمت ۲/۲۵

البرامکہ

مصنفہ مولانا عبدالرزاق کانپوری ۱/۲

نظام الملک طوسی

قیمت ۱/۲

حیات انور

سوانح حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری — قیمت ۲/

مغلیہ دور حکومت

چار حصوں میں
یعنی خافی خان نظام الملک کی "منتخب اللباب" کا اردو ترجمہ
از محمود احمد فاروقی
حصہ اول۔ بابر سے جہانگیر تک ۷/۵
حصہ دوم۔ دور شاہجہانی ۸/۲۵
حصہ سوم۔ دور عالمگیری ۱۱/-
حصہ چہارم۔ شاہ عالم سے محمد شاہ تک ۱۲/

اقبال نامہ جہانگیری

جہانگیر کے دور حکومت کی مکمل تصویر
تصنیف معتمد خاں بخشی ترجمہ محمد کریم
مائل۔ قیمت مجلد ۶/۷۵

شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب

مصنفہ ڈاکٹر برنیر (فرانسیسی)
ترجمہ خلیفہ محمد حسین۔ قیمت ۱۲/-

مآثر عالمگیری

اس کا مصنف ساقی خاں وقائع نگار کی حیثیت سے زندگی بھر اورنگ زیب کے ساتھ رہا۔ اسکے مطالعہ سے حیات عالمگیری کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے
ترجمہ۔ مولوی فدا علی طالب قیمت ۹/۷۵

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

از۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔
قیمت مجلد ۹/ غیر مجلد ۸/

سفینۃ الاولیاء

از۔ دارا شکوہ، ترجمہ اردو ۶/۷۵

مقدمہ ابن خلدون

فلسفۂ تاریخ پر قدیم انتظیر کتاب کا اردو ترجمہ
متعلقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین۔ قیمت ۱۵/-

تاریخ غزنا طہ

یہ کتاب لسان الدین محمد الخطیب الغرناطی کی کتاب "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ یہ ایک شہر کی ایک سلطنت کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک دور کی اور اسکے پورے تمدن کی تاریخ بھی ہے۔ ترجمہ از حکیم احمد اللہ مدنی۔ قیمت ۱۱/-

خلیفہ عبدالرحمن الناصر

اندلس میں اسلامی حکومت کی صحیح درخشاں طارق اور موسیٰ ابن نصیر سے طلوع ہوئی تو عبدالرحمن الناصر اس صبح کا نصف النہار تھا ۵/

سفرنامہ ابن بطوطہ

ترجمہ، رئیس احمد جعفری ابن بطوطہ نے جب دنیا کی سیاحت کے لئے مکہ معظمہ سے باندھی تو وہ ۲۵ سال کا نوجوان تھا اور جب یہ سیاحت ختم کی تو ۵۰ سال کا بوڑھا ہو چکا تھا۔ محمد تغلق کے زمانہ میں وہ ہندوستان بھی آیا اور اس کا سفیر بن کر چین بھی گیا۔ ہر تعلیمیافتہ کو یہ سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ ترجمہ کی تہذیب و ترتیب نے اس کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ قیمت ۱۵/-

آئینہ حقیقت نما

از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ انگریزوں کے سیاسی اغراض کے تحت مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم کی جو داستانیں تاریخ کا جزو بنا دی گئیں جنھوں نے ہندوؤں کو آج تک مسلمانوں کا دشمن بنا رکھا ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ان سب پر پردہ چاک کیا ہے ۱۲/

امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی

(از، مولانا گیلانی)
قیمت مجلد ۱۲/-

سیرۃ النعمان

(از، علامہ شبلی نعمانی)
قیمت مجلد ۴/ غیر مجلد ۳/

امام اعظم ابوحنیفہ

از، مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری
قیمت ۱/۷۵

تاریخ دعوت و عزیمت

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مشہور کتاب جو مجدد دین و مصلحین امت کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ جلد اول پہلی صدی ہجری سے ساتویں صدی تک جلد دوم آٹھویں صدی کے جلیل القدر مجدد امام ابن تیمیہ نیز ان کے تلامذہ کی خدمات و حالات جلد سوم حضرت نظام الدین اولیاء و خواجہ نصیر الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات و اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی تفصیل میں قیمت جلد اول ۹/ جلد دوم ۵/۵۰ جلد سوم ۵/

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی

از پروفیسر خلیق نظامی۔ مجلد ۷/-

تذکرہ مسیح محمد طاہر پنی

قیمت ۱/۵۰

تذکرۃ الرشید

(کامل ۲ جلد) از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ قیمت ۸/-

سوانح قاسمی

(کامل ۳ جلد) از مولانا گیلانی۔ قیمت ۱۵/-

تذکرہ شیخ الہند

از مفتی عزیز الرحمن بجنوری قیمت ۲/۵۰

حیات امام ابن القیمؒ

بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبدالعظیم شرف الدین کے قلم سے۔ مترجم پروفیسر رشید احمد ارشد۔ قیمت -/۱۲

سوانح حضرت رائے پوری

امام ارشاد و معرفت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی سوانح حیات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے قیمت مجلد -/۵

سوانح حضرت مولانا محمد الیاسؒ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قیمت مجلد -/۳ غیر مجلد -/۲/۵

تذکرہ حضرت شاہ فضل رحمنؒ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قیمت -/۲/۵۰

سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ

مولانا مونگیریؒ کی سیرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رہنمائی میں مولانا سید محمد حسنی اڈیٹر "تعمیر حیات" نے لکھی ہے۔ قیمت مجلد -/۶

علمائے ہند کا شاندار ماضی

مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند کی شہرہ آفاق کتاب کا آخری اڈیشن۔ قیمت -/۶/۵۰

علمائے صادقپور

از، مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ قیمت -/۲

مسلمانوں کا عروج و زوال

از مولانا سعید احمد اکبر آبادی قیمت مجلد -/۵

تذکرہ شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ صاحبؒ کا سیاسی ماحول اور اُن کی علمی و تجدیدی خدمات مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ -/۴/۵

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

مصنفہ سید خورشید مصطفےٰ رضوی ایم اے اس میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں اہل وطن کا جذبۂ ایثار و قربانی اور اسکی عملی تصویر پیش کرنے میں یہ کتاب بے نظیر ہے۔ قیمت -/۷

۱۸۵۷ء کا تاریخی و زنامچہ

قیمت مجلد -/۴/۵ غیر مجلد -/۵/۵

نقش حیات

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح عمری جو حضرت شیخ الہندؒ کی مجاہدانہ سرگزشت کا بھی آئینہ ہے۔

جلد اوّل -/۵ جلد دوم -/۵۰

مکتوبات شیخ الاسلام

حضرت مولانا مدنیؒ کے مکاتیب جلد اوّل -/۶ دوم -/۶ سوم -/۵۰

ارشادات

حضرت مولانا مدنیؒ کے اہم مضامین و خطبات کا مجموعہ۔ قیمت -/۵۰

مختلف موضوعات پر

قابل مطالعہ کتابیں

مقالات احسانی

تصوف و سلوک کے موضوع پر مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے مقالات کا ضخیم مجموعہ، ہر مقالہ قیمتی علمی تحقیق ہے۔ قیمت مجلد -/۶/۵

فقہ الاسلام

تصنیف حسن احمد الخطیب ترجمہ سید رشید احمد ارشد ایم اے اس میں اسلامی شریعت کے اصول اور فقہی قوانین کو جدید انداز میں پیش کیا گیا ہے اور قرآن و حدیث اور آئمہ مجتہدین کے اصول اور طرز عمل کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی قوانین میں اس قدر وسعت و لچک ہے کہ وہ ہر زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ نیز اسلامی قوانین کا مغربی قوانین سے مقابلہ کر کے انکی برتری ثابت کی گئی ہے۔ قیمت مجلد -/۱۲

اسلام کا نظام حکومت

قیمت غیر مجلد -/۶ مجلد -/۷

مسلمانوں کا نظم مملکت

قیمت غیر مجلد -/۶/۵۰ مجلد -/۵/۵۰

اسلام کا اقتصادی نظام

از مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم۔ مجلد -/۷/۵

اسلام کا زرعی نظام

قیمت غیر مجلد -/۴/۵ مجلد -/۵/۵

اسلام کا نظام عفت و عصمت

قیمت -/۴/۵

اسلام کا نظام مساجد -/۲/۵

اسلام کا نظام اراضی -/۵/۵۰

دو اہم کتابیں

"الطبقات الکبریٰ" کا ترجمہ "طبقات الاولیاء"

امت محمدیہ کے اولیاء کرام کے حالات میں سولہویں صدی ہجری کے عارف شیخ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب "طبقات کبریٰ" مستند اور جامع ترین کتاب ہے جس میں مصنف نے حضرت صدیق اکبرؓ سے لیکر اس کتاب کے زمانہ تصنیف (۹۵۸ھ) تک کے اولیاء کا کافی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، ترجمہ مولوی عبدالغنی صاحب ارشدی مرحوم نے کیا ہے جو دولت آصفیہ حیدرآباد کے سابق اکاؤنٹنٹ جنرل تھے۔ قیمت مجلد -/۱۶

انسان کامل

تصنیف سید عبدالکریم الجیلی، ترجمہ مولانا فضل میراں تصوف کے حقائق و معارف اور اسرار و رموز پر معرفت انگیز اہم تصنیف ہے عام اُردو داں حضرات اس سے مستفید ہو سکیں گے صرف خواص کے لئے قابل استفادہ ہے۔ قیمت -/۱۰

بچوں کے لئے سیرت و تاریخ کی درسی کتابیں

از، مولانا سید ابوالوحید

رسول عربی۔ قیمت -/۱۲ خلافت و شیدہ اول -/۱ خلافت راشدہ دوم -/۱

مختلف موضوعات پر مختلف اداروں کی مطبوعات

حدیث نبویؐ

الادب المفرد (ترجمہ اردو)
امام بخاریؒ کا مرتب کردہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کا قابل دید مجموعہ ۱۲/-

کتاب الآثار (مترجم اردو) ۸/-
موضوعات کبیر۔ موضوع حدیثوں کے بیان میں ملا علی قاریؒ کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ۸/-

فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ
حدیث سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ ۱۵/-

فتاویٰ

فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ کامل ۱۵/-

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل مرتبہ حضرت مولانا محمد تنقیع صاحب مدظلہ، ۴ ضخیم جلدوں میں۔
قیمت کامل مجلد ۲۰/-

فتاویٰ رشیدیہ کامل ۸/-

تصوف

الرسائل القشیریہ (عربی) ۱۰/-

عبقات (عربی) از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ
قیمت ۴/۵۰

ترجمہ عبقات (اردو) از مولانا گیلانیؒ
قیمت ۱۰/۵۰

انتخاب مکتوبات امام ربانی ۴/-
شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات۔ قیمت ۱۰/-

تاریخ وسوانح

محسن اعظم اور محسنین ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے تذکرہ میں قابل دید کتاب ہے ۵/-

سیرت ائمہ اربعہ ۷/۵۰

حیات طیبہ۔ (سوانح حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) ۵/۵۰

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۴/-

آپ بیتی (از ظفر حسن ایبک)
مولانا سندھی مرحوم اور ان کے جانباز رفقاء کی ہجرت کابل کی انتہائی سبق آموز سرگذشت ۵/-

حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہؒ مع ترجمہ اردو از مولانا عبدالحق حقانیؒ مجلد دو جلدوں میں ۲۴
تبلیغ دین امام غزالیؒ کی اہم تصنیف کا ترجمہ ۳/۵۰

مجلس تحقیقات ونشریات کی مطبوعات

اسلام اور مغربیت کی کشمکش
مولانا علی میاں کی معرکۃ الآرا کتاب ۵/-

ہندوستانی مسلمان ۳/۵۰

طوفان سے ساحل تک ۵/-

جزیرۃ العرب (جغرافیہ) ۵/-

تصانیف شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مدظلہ

فضائل درود شریف۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی بالکل جدید تصنیف ہے مطالعہ کرکے عشق ومحبت کا ذائقہ حاصل کیجئے ..... قیمت ... ۱/۷۵

حکایات صحابہ ۱/۵۰ فضائل نماز ۷۰/-
فضائل قرآن مجید ۶۰/-
فضائل رمضان شریف ۵۵/-
فضائل تبلیغ ۲۰/- فضائل حج ۲/۵۰
فضائل صدقات (مکمل مجلد) ۷/۵۰
خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی ۶/-

بعض تصانیف حضرت حکیم الامتؒ

تعلیم الدین مجلد ۱/۷۵
حیات المسلمین مجلد ۱/۷۵
اصلاح الرسوم مجلد ۱/۷۵
اعمال قرآنی ۱/۶۰
صبر وشکر (مواعظ اشرفیہ) ۱/۵۰
کرامات صحابہ ۱/۵۰
بہشتی زیور ۱۲/۵۰

تصانیف مولانا عبدالباری ندوی

تجدید دین کامل ۶/- تجدید معاشیات ۵/-
تجدید تصوف وسلوک ۵/-
تجدید تعلیم وتبلیغ ۳/-

اردو دینیات کا کامیاب نصاب تیار کردہ :- مکتبۃ دین ودانش لکھنؤ
اچھا قاعدہ ۱۹/- اچھی باتیں کامل (۵ حصے) ۲/۹۴، اللہ کے رسول ۲۲/- حضرت ابوبکرؓ ۴۴/- حضرت عمرؓ ۴۴/- حضرت عثمانؓ ۴۴/- حضرت علیؓ ۴۴/- اچھے قصے ۲۴/- حضرت خدیجہؓ ۵۰/- حضرت سمیہؓ ۲۵/- حضرت عائشہؓ ۶۲/- آسان فقہ ۴۴/-

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

تالیف ۔ مولانا محمد منظور نعمانی

بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دُنیا اس سے ناآشنا ہے، یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے

یہ کتاب

اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔

- یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
- جس میں ۳۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور موقع پر شرحیات کیساتھ جمع کیا گیا ہے۔
- خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجاز بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔

نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۔/۴

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

ہندوستان سے سالانہ چندہ ۷ روپے
" " ششماہی ۴ "
پاکستان سے سالانہ چندہ ۹ روپے
" " ششماہی للعہ ۴ "

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ۶۰ نئے پیسے

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد (۴۳)	بابتہ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۵ء	شمارہ (۶)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اوّلیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	جدید عصری رجحانات کے مقابلہ میں دعوت اسلامی کا صحیح طریق کار	[illegible] ابوالحسن علی ندوی	۶
۳	سلسلۂ ولی اللہی کا ایک گمنام متبع شریعت درویش	مولانا نسیم احمد صاحب فریدی	۱۶
۴	ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا واحد حل (حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی ایک تقریر)		۲۷
۵	مسلمانوں کو "امت" بننے کی دعوت (ایک تقریر)	تتمہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ نمبر	۱۰۱ (۱۲)
۶	مولانا کا طرز فکر (چند جھلکیاں)	[illegible] منظور نعمانی	۴۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی، پی ارسال کیا جائے گا۔

چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۱ تاریخ تک پہونچ جانی چاہئے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے اپنی تالیف "تذکرۃ الخلیل" میں ایک جگہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تذکرہ کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

"ایک مرتبہ بندہ حاضر تھا آپنے سر اٹھایا اور فرمایا، مولوی عاشق الٰہی ایک بات کہوں! ہم نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ ہندوستان میں علم کی اتنی کمی تھی کہ دور کیوں جاؤ خود ہمارے اجتماع میں بھی جنازہ کی نماز پڑھانے والا مشکل سے ملتا تھا۔ اور آج علم کی کثرت کا یہ حال ہو کہ شہر تو شہر کوئی قصبہ بلکہ شاید کوئی گاؤں بھی ایسا نہو جہاں کوئی مولوی نہ مل جائے۔ اسکے بعد ذرا دوسرا پہلو دیکھو کہ عندر کا زمانہ گزرے کچھ مدت نہیں ہوئی، کہ ابھی اسکے دیکھنے والے بھی زندہ ہیں۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہو کہ پھانسی گڑی ہوئی تھی اور ان ناکردہ قصوروں کا پابندھا ہوا تھا جن کو پھانسی کا حکم دیا جا چکا تھا وہ لوگ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ایک نعش کو اتارا جا رہا ہو اور دوسرے زندہ کو چڑھایا جا رہا ہے۔ اس طرح پر موت اُن کی نظر کے سامنے تھی اور ان کو عین الیقین تھا کہ چند منٹ بعد یہ اسی مُردوں میں ہوا چاہتا ہو۔ باایں ہمہ کوئی جھوٹوں بھی ان کے متعلق ضعفِ ایمان کا یہ الزام نہیں لگا سکتا ہو کہ کسی نے بھی موت سے ڈر کر اسلام سے انحراف یا تبدیل مذہب کا خیال کیا ہو۔ باوجود قلتِ علم اور غلبۂ جہالت کے اُن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ مرنا قبول تھا مگر مذہب پر حرف آنا قبول نہ تھا۔ اور آج باایں کثرتِ علم ضعفِ ایمان کا یہ حال ہو کہ ذرا ڈنڈے کا خوف یا روپے بلکہ دو حرف انگریزی کے عطیہ کی طمع دلا کر جو چاہے کہلا لو اور جو چاہے کرا لو۔ عجیب بات ہو کہ قلتِ علم کے وقت ایمان میں

اتنی قوت اور کثرتِ علم کے زمانے میں ایمان کی اتنی کمزوری! ـــــ اسکے بعد فرمایا سچ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ایک جگہ علامت قیامت بیان کیا علم کا کم ہونا اور دوسری جگہ فرمایا کہ قیامت کے قریب علم زیادہ ہو جائے گا۔ اہل باطن نے بغیر دیکھے تو یہ فراست سے تطبیق دی تھی۔ مگر ہم بدنصیبوں نے اس وقت کو آنکھوں سے دیکھ لیا کہ صورتِ علم کثیر ہو گئی مگر حقیقتِ علم قلیل ہو گئی، اور یہی خاص علامت ہے قربِ قیامت کی۔"

(تذکرۃ الخلیل ص۱۱۴، مطبوعہ الخلیل مشین پریس، میرٹھ)

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ ارشادِ گرامی یوں تو ہر مسلمان کے لیے قابلِ توجہ ہے کیونکہ اس میں کسی خاص مسلک کی نقطۂ نظر کی بات نہیں ایمان و اسلام کی ایک عمومی بات ہے لیکن اُن لوگوں کے لئے تو یہ خصوصی طور پر توجہ طلب ہے جو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے انتساب کو فخر اور آپ کے عقیدت کو سرمایہ سعادت سمجھتے ہیں۔ اور پھر جو اس سلسلۂ علم دین و اشاعت دین کے وارث بھی ہوں جس کی ایک تابناک کڑی اپنے وقت میں شیخ الہندؒ کی ذاتِ گرامی تھی، اُن کے لئے تو یہ ارشاد گویا ایک مستقل تنبیہ ہے اور سب سے زیادہ اسکے مخاطب وہی ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے اس ارشاد میں اس مغالطے کی کوئی گنجائش نہیں ہو کہ مصائب اور آزمائشوں سے ڈر کر مکمل تبدیل مذہب کر لینا اور اسلام کو چھوڑ جانا ہی ایمان کی کمزوری ہے۔ یہ درجہ ایمان کی کمزوری کا نہیں ایمان کے خاتمے کا ہے۔ ایمان کی کمزوری کا اطلاق تو اس سے کم درجے ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اسلام سے کلیتہً انحراف تو نہو بلکہ کسی معمولی خوف یا معمولی لالچ سے آدمی اسلام کی مکمل پیروی اور اسکے ساتھ کامل وابستگی میں کمزوری دکھائے۔ اور کسی معاملے میں اسلام کی تعلیمات کے خلاف کرنے یا کسی مسئلے میں شریعت کے حکم کے خلاف کہنے پر تیار ہو جائے۔ یہی وہ ایمانی کمزوری ہے جس کا ذکر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے بارے میں فرما رہے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس کمزوری کا ذکر اور اس پر افسوس کا اظہار صرف دینی اور ایمانی خسارے کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ اور کم از کم علماء دین کی نظر میں تو اس کمزوری کا یہی پہلو سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ دینی خسارے کا سودا اگر آدمی اپنی کسی ذاتی منفعت یا شخصی تحفظ و عافیت کے لئے نہیں کرتا بلکہ ملی مفاد و مصلحت کے خیال سے کرتا ہے اور قوم و ملت کو بھی اسی راستے پر چلنے کی دعوت دیتا ہے

تو اس سے دنیا میں کبھی کم از کم قوم کی کوئی بات بننے والی نہیں ہے۔ یہ قوم کے اندر اس بدترین بزدلی اور اخلاقی پستی کی تخم ریزی ہو جس کے تحت کسی دباؤ کے موقع پر قوم اپنے دین و ایمان کا سودا کرنے پر بھی تیار ہو جائے۔ یہ کسی قوم یا جماعت کی بزدلی اور اخلاقی کمزوری کا آخری درجہ ہے کہ وہ کسی دباؤ کے موقع پر نہ صرف یہ کہ اپنے اصول و معتقدات کے اظہار سے کترانے لگے بلکہ انکے بالکل برعکس اصولوں پر اپنے اعتقاد کا اطمینان دنیا کو دلانے لگے۔ ایسی قوم اور ایسے لوگ درحقیقت صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں دنیا ان کے بارے میں کسی دھوکے میں نہیں آتی۔ ہاں صرف ایک بات اس سے دنیا پر ظاہر ہو جاتی ہو کہ یہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں اور انھیں جب اور جس طرح چاہے دبایا جا سکتا ہے۔

اپنے اصول و نظریات میں پختگی کسے کہتے ہیں، یہ بات مسلمانوں کے لئے کہیں اور سے سیکھنے کی نہیں ہے۔ خود حضرت شیخ الہندؒ نے دور غدر کے جس عام ابتلا کا حوالہ دیا ہو وہی اس لحاظ سے مسلمانان ہند کی تاریخ کی ایک حیات آفریں مثال ہے۔ لیکن ایک بالکل اس وقت کی مثال ہمارے سامنے ہے جو اگرچہ اصطلاحی "ایمان والوں" کی نہیں بلکہ دہریوں اور منکرین خدا کی ہو۔ وہ اگرچہ ہمارے لئے قابل تقلید نہو لیکن سبق آموز تو ہو ہی سکتی ہے۔

یہ مثال ہندوستان کی بائیں کمیونسٹ پارٹی کی ہے جو چین سے ہندوستان دشمن سازباز کے الزام میں پورے ہندوستان میں معتوب ہو۔ سوائے ایک بڑے لیڈر کے اسکے تمام اہم افراد جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ لیکن اس تنہا لیڈر (مسٹر نمبودری پد) نے عین اس موقع پر جبکہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ کی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ اور پاکستان سے چین کا گٹھ جوڑ بالکل کھلا ہوا تھا، وزیر اعظم ہند مسٹر لال بہادر شاستری کی اس اپیل کے جواب میں کہ اس وقت تمام ہندوستانی بلا کسی اختلاف کے حکومت ہند کی حمایت کریں ذرا بھی لچک اپنے نظریات کے معاملے میں نہیں دکھائی اور پوری صفائی کے ساتھ یہ چند باتیں کہیں کہ

(۱) اگر وزیر اعظم سنجیدگی کے ساتھ مخالف پارٹیوں کا تعاون چاہتے ہیں تو وہ مخالف پارٹیوں کو کچلنے کی پالیسی مدلیس ڈیفنس آف انڈیا رولز کو ختم کریں اور شہری آزادیاں مکمل طور پر بحال کریں۔

(۲) ملک کے دفاع اور خارجہ پالیسی کے بارے میں ہمارے اپنے نظریات ہیں۔ ہم اس

طریق کار کے خلاف ہیں جو چین اور پاکستان سے ہمارے تنازعات کے بارے میں حکومت اختیار کئے ہوئے ہے۔ حکومت کی پالیسی سے متعلق ہم اپنے اس موقف کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

(۳) داخلی پالیسیوں کے سلسلے میں بھی حکومت کا موقف ایسا نہیں ہے جو تمام لوگوں کو پوری طرح حکومت کی پشت پر لا سکے اسکے برخلاف بعض طبقات اور درجات کے عوام اس طرح کی فکروں میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ حکومت کے لئے اُن کے قومی جوش کو اُبھارنا ناممکن ہوگا۔ حکمراں پارٹی کا یہ سوچنا غلط ہے کہ عوام کی یہ بے چینی مخالف پارٹیوں کے شرارت پسندانہ اقدامات کا نتیجہ ہے ..... اس بے چینی کی ایک خاص وجہ، جس کا تعلق کشمیر سے خاص طور پر ہے۔ یہ ہے کہ ملک میں آباد مختلف لسانی و ثقافتی گروہوں کو متحد کرنے کے سلسلے میں حکومت ناکام رہی ہے۔ ہمارے ملک کا مطمح نظر "تنوع میں اتحاد" ہونا چاہیئے اس بات کو محسوس کرنے میں ناکامی کے نتیجے میں حکومت نے ایسی پالیسیاں بنائیں جن کی وجہ سے مختلف لسانی و ثقافتی اکائیوں میں جن میں کشمیر کے عوام بھی شامل ہیں بے اطمینانی پیدا ہوگئی۔

مسٹر نبودری پد کا بیان طویل ہے۔ ہم نے صرف چند نقاط لئے ہیں۔ ان سے اتفاق اور عدم اتفاق ایک الگ بات ہے۔ دیکھنے کی چیز اپنے موقف پر پختگی اور بے لوثی ہے اور اس لحاظ سے اپنا مسلسل حال دیکھتے ہوئے یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

حضرت مولانا محمد یوسف رح نمبر

کا پہلا ایڈیشن شائع ہوتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ دوسرے ایڈیشن کی طباعت تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ رکی ہوئی فرمائشوں کی تعمیل فوراً شروع کی جارہی ہے۔ (مینیجر)

جدید فکری رجحانات کے مقابلہ میں
دعوت اسلامی کا صحیح طریقۂ کار

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

[یہ مقالہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور سال گزشتہ کی موتمر اسلامی کے شعبۂ دعوت اسلامی میں پڑھا گیا۔ ذیل میں اس کا ترجمہ مولانا عبدالماجد صاحب ندوی استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے پیش کیا جا رہا ہے۔ الفرقان]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام ایک عرصۂ دراز سے اپنی ان خصوصیات کی بنا پر جو اللہ تعالیٰ نے اسکے اندر ودیعت فرمائی ہیں زندہ اور پائندہ ہے۔ اسلام خود اپنے اندر دوام کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسکے اندر کشش اور جاذبیت کی بے نظیر طاقت ہے، یہ اپنے بلند ترین نصب العین اور اعلیٰ پیغام کے سہارے ہی جی رہا ہے اور جیتا رہے گا سلیم الفطرت طبیعتوں کو اپیل کرنے کی جو صلاحیت اسکے اندر ہو اسکی بنا پر یہ اپنا راستہ خود نکالتا ہے بغیر اسکے کہ کوئی حکومت اسکی سرپرستی کرے یا کوئی معاشرہ اس کا کامل نمونہ اور نمائندہ ہو، ماضی میں جس طرح یہ انفرادی کوششوں شخصی اور متفرق جدوجہد سے پھیلتا اور بڑھتا رہا ہے

وہ آج بھی مورخین کے لئے حیرت و استعجاب کا موجب بنا ہوا ہے۔ پھر حال میں افریقہ امریکا اور ایشیا کے اندر نئے منطقوں میں جس طرح یہ اثر و نفوذ کر رہا ہے اس سے اسکی اثر انگیزی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی اور جاپان کے نئے ملکوں میں بھی اس کے لئے نیا میدان کھل سکتا ہے اور اسکی رگ حیات کے لئے ان قوموں سے نیا اور تازہ خون فراہم ہو سکتا ہے اور اسکی غیر معمولی صلاحیتوں میں جس کی بنا پر علم و تمدن کا قافلہ کبھی آگے بڑھا تھا، مزید اضافہ ممکن ہے، بشرطیکہ اسے اپنی دعوت و پیام کے لئے ایسے افراد اور جماعتیں مل جائیں جو اسلاف کی صفات کی حامل ہیں اور اپنے اندر اسکی صلاحیت بھی رکھتے ہوں کہ وہ مذکورہ بالا دونوں قوموں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان کے فکری انتشار کو جس سے یہ دونوں قومیں دوچار ہیں اچھی طرح سمجھ سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جرمنی اور جاپان کی پھر سے ابھرتی ہوئی یہ دونوں قومیں زندگی سے بھرپور اور عظیم صلاحیتوں کی حامل ہیں۔ اگر اسلام کی روشنی انھیں مل جائے تو یہ اپنی بلند حوصلگیوں اور غیر معمولی صلاحیتوں سے تاریخ کا دھارا بدل دیں اور یہ کوئی مستبعد امر نہیں۔ تاتاریوں اور ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے اور پھر اسی طرح سے اپنے اپنے زمانہ میں ایرانیوں اور افغانیوں نے اسلام قبول کیا۔ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

اسلام اس حیثیت سے کہ وہ ایک دین اور شریعت ہے واقعہ یہ ہے کہ اب کوئی دین اور مذہب اس کا مدمقابل نہیں رہا، تمام ادیان اس سے علمی مقابلہ میں میدان ہار چکے ہیں اور مصاف زندگی سے اب دور جا پڑے ہیں۔ اسکے اور دوسرے ادیان و مذاہب کے مابین علمی اور کلامی کشمکش اور نزاع کی کہانی پرانی ہو چکی ہے، اسلام اور دوسرے مذاہب کے موازنہ کا دور گذر چکا۔ اب اس قسم کے موازنوں سے بہت کم لوگوں کو دلچسپی رہ گئی ہے۔ چند مستشرقین کو چھوڑ کر جو اپنی تحریروں میں یا ان کے مبلغین جو اپنی تقریروں میں اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مہم انجام دیتے رہتے ہیں اور جن کا دائرہ علمی حلقوں تک محدود ہے اب کسی کو ان کلامی اور مناظرانہ مباحث سے دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک میں اب کوئی مذہب بحیثیت مذہب کے علمی میدان میں اسلام کے خلاف صف آرا نہیں۔ اب اسلام وہ واحد مذہب ہے جو مادہ پرستی اور الحاد کے مقابلہ میں نبرد آزما ہے اور

جس کے پیروؤں میں تبلیغی جوش ہے اور جس کو معاشرہ پر اپنا اقتدار قائم رکھنے اور زندگی کی رہنمائی پر اصرار ہے۔ اس میدان میں کوئی مذہب اور کوئی دینی دعوت اسکی حریف اور مدمقابل نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ دوسرے ادیان کو اسلامی معاشرہ پر کتنی فتوحات حاصل ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کی کتنی تعداد کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں وہ کامیاب ہو رہے ہیں تو یہ محض افسانہ ہی ہے۔ اس میں اگر ایک طرف بہت زیادہ مبالغہ ہے تو دوسری طرف کچھ قنوطیت اور فریب خوردگی کو بھی دخل ہے۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت پر پورا یقین ہے کہ اندلس کا المیہ اب کبھی دہرایا نہیں جاسکے گا اور نہ کوئی مسلم معاشرہ مجموعی طور پر اعتقادی ارتداد کا شکار ہوگا اور کسی دین و مذہب کو قبول کرے گا اس اعتماد کا باعث صرف یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی اور مخالف دھاروں کے مقابلہ میں اپنی جگہ جمے رہنے کی صلاحیت کچھ زیادہ ہوگئی ہے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان مخالف مذاہب کے علمبردار اب عقائد کے میدان کو چھوڑ کر دوسرے میدانوں کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں اور انھوں نے جنگ کی حکمت عملی بدل دی ہے۔ لیکن خطرہ کی بات دراصل یہی ہے اور اسی کی طرف ہم آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

امت مسلمہ کے لئے اس وقت سب سے بڑا خطرہ ذہنی وفکری ارتداد کا ہے جس کا بیج جدید فکری رجحانات اور فلسفے پھیلا رہے ہیں اور مسلم معاشرہ میں پوری آزادی کے ساتھ اس کی آبیاری کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ جدید فلسفے مخالف مذاہب کے کسی درجہ میں بھی کم خطرناک نہیں۔ امت مسلمہ کو اسکے اپنے اسلامی عقیدہ اسلامی زندگی اور اسلامی مزاج سے برگشتہ کرنے میں یہ تحریکیں اور فلسفے بہت اہم اور مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں اس لئے کہ جو بھی ان کے دام میں آتا ہے وہ اس کو دین کا باغی اور اخلاقی قدروں کا دشمن بنا دیتے ہیں۔ اسکی بغاوت میں شدت اور دشمنی میں جوش وخروش پیدا کرتے رہتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ارتداد پر اسلامی معاشرہ میں کسی قسم کی بے چینی اور اضطراب اب بھی نہیں پیدا ہونے پایا بلکہ لوگ اس کا نوٹس تک نہیں لیتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اسلام سے نکل کر کسی دوسرے

مذہب کو اختیار کر لینے کا اعلان نہیں کرتا اور نہ وہ کسی گرجا اور کسی مندر میں داخل ہوتا ہے اور نہ مسلم معاشرہ سے کٹ کر وہ کسی دوسری برادری میں ضم ہو جاتا ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اسکی طرف ہو۔

ارتداد کا یہ فتنہ مسلم معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے، اور ہر طرف سے اس پر حملہ آور ہے، پورا عالم اسلام اس فتنہ کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ اس دین کی بقا اور اس کے ابدی اور سرمدی پیغام اور امت مسلمہ کی نصرت کے سلسلہ میں ہے اگر اس پر پورا اعتماد اور بھروسہ نہ ہوتا تو ان حالات کو دیکھ کر یہ پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ آئندہ چل کر اس امت پر بھی مغربی اقوام یا جاپانیوں کی طرح مادیت، ایسکولرزم کی چھاپ غالب آجائے گی، اور اسلام کا اثر معاشرہ، حکومت، ادب و ثقافت، فکر و فلسفہ سے زائل ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں یہ امت خدانخواستہ زندگی اور تاریخ میں اپنی قدر و قیمت اور مرکزی حیثیت کھو بیٹھے گی اور اس طرح ایمان و روحانیت کا آخری چراغ بھی گل ہو جائے گا اور انسانیت اپنی اصلاح کی آخری امید سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی، اور یہ انسانیت کے تمام المیوں میں سے سب سے بڑا المیہ ہوگا۔

دعوت اسلامی کو ان تمام تحریکات سے جنگ کرنے کے لئے سب سے پہلے تعلیم و ثقافت کا میدان منتخب کرنا چاہیئے کہ یہیں سے ان کو غلبہ و سیادت کے لئے جادو کی وہ کنجی بھی ملتی ہے جس سے ہر طلسم کا قفل کھلتا ہے، اور پھر اس طرح سیادت و فرمانروائی کی وہ کرسی ملتی ہے جہاں قوموں اور جماعتوں کے افکار اور نظریات پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔

اسکے بعد دوسرا میدان ادب، لٹریچر، پریس، صحافت، علم و فلسفہ اور سیاسیات و معاشیات کا ہے جن پر یہ تحریکات قابض ہیں اور ان پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے، دوسری طرف دینی دعوتوں اور دینی تحریکات کے قائدین اپنی کمزوری کوتاہ ہمتی اور غلط اندیشی کی بنا پر اس سے دست بردار ہو چکے ہیں حالانکہ اسکے برعکس اس سے پہلے ان کی زمام کار دینی تحریکوں کے قائدین ہی کے ہاتھوں میں تھی اور وہی اس میدان کے شہسوار تھے انھیں کی قیادت میں علمی اور ادبی تحریکات چل رہی تھیں اور

انہی کی رہنمائی میں علوم و ادب پھل پھول رہے تھے، نئی نسل کی رہنمائی دینی قائدین کے ہاتھ میں اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک فکری قیادت کی زمام کار ان کے ہاتھوں میں نہیں آجاتی۔ اس لئے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ علمی ادبی اور فکری میدانوں میں اس عہد کے مجتہدانہ کمالات کا اظہار ہو اور جدید اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان میں اترا جائے، زندگی کے میدان میں اسلام کوئی اہم پارٹ نہیں ادا کرسکتا اور نہ دور جدید میں وہ اپنی مرکزی حیثیت کی نمائندگی کرسکتا ہے جب تک کہ مدارس اور نظام تعلیم کا ڈھانچہ از سر نو بدل کر اسکو پورے اسلامی رنگ میں نہ رنگا جائے اسکی بنیاد اگر ایک طرف ایمان و عقیدہ روحانیت اور اسکے اعلیٰ پیغام اور دعوت پر ہو تو دوسری طرف ان ترقیات اور تبدیلیوں کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا جائے جو حالات و زمانہ تاریخی عوامل اور فکر انسانی کے ارتقاء اور زندگی کی پیچیدگیوں سے پیدا ہو چکی ہیں۔

ان تحریکات کا مقابلہ خالص علمی انداز میں کیا جانا چاہیئے۔ علم و عقل تجربہ اور واقعات کی روشنی میں ان کا توڑ کیا جائے۔ اسلام کے داعیوں دین کے علماء اور اسلامی محققین کو اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے اس طرح کھڑا ہو جانا چاہیئے جس طرح امام ابوالحسن اشعری امام غزالی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے اپنے دور میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے لئے انھوں نے اپنے دور کے فکری رجحانات کا مطالعہ کیا اور نقد و تحقیق سے کام لے کر ان سب پر اسلام کی برتری ثابت کی۔ ضروری ہے کہ اس کام کے لئے علمی مجالس (اکیڈیمیز) قائم ہوں جن میں ہمارے علماء و محققین اور ماہرین فن (اسپشلسٹ) جمع ہو کر بحث و تحقیق کا کام کریں اور ان موضوعات پر اس انداز کی محققانہ کتابیں اور علمی مقالے لکھیں جن میں مطالعہ کی گہرائی بحث کی پختگی رائے کا وزن، استدلال کی قوت اور ادب کا حسن موجود ہو اور جو مخالف کیمپ کی کتابوں اور لائبریریوں کا مقابلہ کرسکیں۔ ساتھ ہی ان کی نشر و اشاعت کا کام جدید وسائل کے ذریعہ اعلیٰ پیمانہ پر ہونا چاہیئے ورنہ اگر کام اس ڈھنگ اور انداز سے نہیں ہوا تو نئی نسل کو ہم اضطراب اور پراگندگی کے اس گرداب سے نہیں نکال سکتے جس میں

موجودہ ثقافتی دھاروں یا صلیبی تھپیڑوں نے ان کو ڈال دیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری نظر رابطہ عالم اسلامی پر جاتی ہے رابطہ اگر چاہے تو نہایت عمدگی کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکتا ہے، اسکے اس کام کی ایک حیثیت اور قدر و قیمت بھی ہوگی۔ رابطہ اس غرض کے لئے ایک اعلیٰ علمی اکیڈمی قائم کرسکتا ہے اور اس میں عالم اسلام کی چیدہ اور منتخب شخصیتوں کو مناسب موقعوں پر جمع کرسکتا ہے پھر ان کی علمی تصنیفات اور تحقیقی مقالات کو عالم اسلام کی مختلف زبانوں اور بعض یورپین زبانوں میں ترجمے کراکے شائع کرسکتا ہے۔ رابطہ کو ان خطوط پر کام کرنے کے لئے غور و فکر کرکے ایک طریقۂ کار متعین کرنا چاہیئے اسکے بعد اس کے لئے ایجابی اور عملی اقدام کرنا چاہیئے۔

دعوت اسلامی کی دوسری اہم ضرورت ان تحریکات کے مقابلہ کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اسے کچھ ایسے مخلص داعی میسر آجائیں جو دعوت کے تمام ضروری صفات سے متصف ہوں۔ دعوت اسلامی کو سیاسی طریقۂ کار اور مسیحی انجمنوں کے نقشۂ عمل پر قیاس نہ کیا جانا چاہیئے کہ ان کا انحصار زیادہ تر علمی نقشے، سوچے سمجھے اور لگے بندھے پروگرام اور مالیات پر ہوتا ہے۔ اسکے برعکس اسلامی دعوت کا دارومدار ہر جگہ اور ہر دور میں جس چیز پر رہا وہ اخلاص عمل، انسانیت کے لئے سچی ہمدردی، دنیا کی دلفریبیوں سے بے رغبتی، گہری روحانیت اور پختہ للّٰہیت ہے۔ اس وقت دنیا میں اگر کوئی خلا ہے تو یہی ہے کہ ایسے ربانیین کی غیر معمولی کمی ہے۔ مادیت کے کچلے ہوئے بیمار دلوں کا اگر کوئی مداوا بن سکتا ہے تو وہ یہی ربانیین ہیں یہ دلوں کی اس گہرائی تک پہونچ جاتے ہیں جہاں ایکسرے اور باریک سے باریک خوردبینوں کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ ربانی ان گہرائیوں میں اتر کر اپنی انگلیوں سے مرہم کا پھایہ رکھ دیتے ہیں، یہ ربانی اس بات کی استطاعت رکھتے ہیں کہ باطل کے ہر پرفریب داؤں اور مسحور کن کشش سے دامن بچالے جائیں اور اہل اقتدار کے دام برنگ زمین سے کترا کر دنیا پر یہ ثابت کردیں کہ یہاں ایک دوسری دنیا بھی ہے جو اس مادی دنیا سے رونق جمال حسن اور دلفریبی میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے یہاں کچھ ایسی حقیقتیں اور غایتیں بھی ہیں جو اپنے اندر دنیوی لذات سے کہیں زیادہ کشش رکھتی ہیں

اور اگر بات ایسی نہ ہوئی تو آجل کو عاجل پر اور راہ دھار کو نقد پر وہ کبھی ترجیح نہ دیتے۔

یہی وہ امر ہے جس نے جبار بن سلمی کو اس دین کے بارے میں تحقیق و سوال پر آمادہ کیا اور بالآخر ایمان لانے پر مجبور کر دیا، انھوں نے ایک مسلمان پر نیزہ کا وار کیا، نیزہ سینہ سے پار ہو گیا۔ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا اور خاک و خون میں تڑپنے لگا اور اسی عالم میں بیاختگی کے ساتھ اسکی زبان سے نکلا "فزت ورب الکعبہ" کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا جبار بن سلمی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ بھلا یہ کون سی کامیابی ہے؟ جب اس کا رشتہ حیات منقطع ہو چکا تو وہ خسارہ ہی خسارہ میں رہا پھر وہ اپنی کس کامیابی پر مسرور ہو رہا ہو اس سوال اور جستجو کے نتیجہ میں جبار بن سلمی پر یہ راز کھلا کہ فوز و فلاح کے اس شعور کا اصلی سرچشمہ کیا ہے چنانچہ وہ اسلام لے آئے اور پھر ان کا اسلام معیاری ثابت ہوا۔

عالم اسلام کے جس خلا کا ہم ذکر کر رہے تھے اسے پُر ہونا چاہیئے اسی ایمان اور انہی پاکیزہ صفات کے ساتھ جن میں حرص و طمع کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ ہو ہم ان دھاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ دھارے دراصل اسی حرص و طمع اور اسی حب مال اور حب جاہ اور ہوس اقتدار کی پیداوار ہیں ان مادی تحریکوں کے رہنما پرلے درجے کے موقع پرست اور خود غرض ہیں۔

تیسری چیز جس کی دعوت اسلامی کو بڑی ضرورت ہے وہ ایک ایسے اسلامی معاشرہ کا قیام ہے جہاں اسلام مجسم شکل میں نظر آئے اور چلتا پھرتا جیتا جاگتا دکھائی دے۔ ماضی میں اسلام کی تبلیغ اور اسکی اشاعت کا سب سے قوی ذریعہ ایسے ہی معاشرہ کا وجود تھا۔ مضطرب اور پریشان دل اور حقیقت کی جویا روحیں اسی کے سایہ میں پناہ لیتی تھیں جس طرح کوئی ڈوبنے والا شخص ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کا سہارا لیتا ہے۔ اسلام کی طرف دعوت دینے والے اور روحانی اور اخلاقی قدروں کی طرف بلانے والے اپنی دعوت و پیام میں اثر آفرینی اور سحر بیانی میں طاقت اسی معاشرہ سے حاصل کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی پشت پر ایک جیتا جاگتا اور مثالی معاشرہ موجود تھا جس سے ان کی ہر اس بات کی تصدیق ہوتی تھی جس کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے تھے۔ اور جس کی عظمت کے وہ گیت

گاتے تھے۔ جسے انسانی سعادت اور خوش بختیوں کا وہ ضامن قرار دیتے تھے چنانچہ ہر وہ شخص جس کو اسلام کی دعوت پہونچتی یا جو اس کے نام اور صفت سے آشنا ہوتا وہ اس معاشرہ کے آئینہ میں اسلام کی اصلی اور واضح شکل وصورت دیکھ سکتا تھا۔

پس ان باطل دھاروں کا مقابلہ کرنے کی سب سے بہتر صورت ایک ایسے اسلامی معاشرہ کا قیام ہے خواہ وہ مختصر پیمانہ پر اور ایک محدود دائرہ کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ دعوتی کام کے لئے ایک ایسے اسلامی معاشرہ کو وجود میں لانے کی سخت ضرورت ہے جہاں اسلامی تعلیمات عملی شکل میں پائی جائیں، جہاں اسلام کا اخلاقی روحانی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام قائم ہو، جہاں اسلامی تعلیمات پر عمل کے نتیجہ میں ان اجتماعی اور اقتصادی مشکلات کا وجود تک نہ ہو جن کی گتھیاں سلجھانے میں یورپ کے مفکرین اور اسکے دانشور ناکام رہے ہیں۔

پھر جب دنیا دیکھے گی کہ ان مشکلات کا جو حل اسلام پیش کرتا ہے اس سے کس طرح ساری گتھیاں خود بخود سلجھتی چلی جاتی ہیں اور کس طرح اس معاشرہ میں تقوی وطہارت، پاکیزگی و امانت، محنت ومردانگی، ہمدردی وغمخواری، محبت وغمگساری اور عدل وانصاف کی روح جاری وساری ہے جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے اور جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اور آپ کے بعد خلفائے راشدین اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین عمل کرتے آئے جب لوگ یہ سب کچھ دیکھیں گے تو یہی امر اسلام کی طرف متوجہ کرنے اور اسکے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ بنے گا اور ہم کو پروپگنڈے کے ہر اس ذریعہ سے بے نیاز کرے گا جس میں خرچ تو بہت زیادہ کرنا پڑتا ہے مگر فائدہ کم حاصل ہوتا ہے۔

اس اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے جو سب سے بہتر جگہ ہوسکتی ہے وہ یہی ملک (حجاز مقدس) ہے جہاں ہم لوگ اس وقت جمع ہیں اس مقام اور ملک کو جسے قرآن مجید میں "البلد الامین" کہا گیا ہے ایک ایسا مثالی اور اسلامی شہر بننا چاہیئے جو ہر دور میں حیات اسلامی کی صحیح تصویر کشی کرے اور اس کے تمام خدوخال کو نمایاں اور اسکی ساری خوبیوں کو اُجاگر کرکے دکھائے۔ یہاں تک کہ ہر آنے والا خواہ اس کی مدت قیام کتنی ہی مختصر

کیوں نہ ہو پہلی ہی نظر میں اسکی خوبیاں محسوس کرلے اور اسکی حلاوت سے لذت آشنا ہوجائے۔ اس شہر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا ہے کہ آخر زمانہ تک یہ حج کا مرکز رہے گا اور عالم اسلامی کے مسلمان سمٹ سمٹ کر ہر سال اسکی طرف آئیں گے۔ چنانچہ آنے والے وفود اس بات کے یقین کرنے میں بڑی حد تک حق بجانب ہوں گے کہ وہ ایک ایسے شہر کا رُخ کر رہے ہیں جہاں ہر طرح پاکیزگی ہی پاکیزگی ہے جو دین کا مولد اور اسلام کا روحانی دارالسلطنت ہے اس لئے ہر وہ چیز جس کا یہاں رواج ہو اور ہر وہ بات جس کا یہاں مشاہدہ کریں اس کو اسلامی سمجھیں اور اسکو حجت مانیں چونکہ وہ خود گہوارۂ اسلام سے دور رہتے ہیں اس لئے ان کو حق ہے کہ یہاں کی ہر چیز کو اپنے عمل کے لئے حجت قرار دے لیں۔ عامۃ المسلمین کے نزدیک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا عمل آخری درجہ رکھتا ہے۔ اگر خدانخواستہ اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی یہیں سے ہونے لگی تو پھر اسلام کی کہاں امید کی جاسکتی ہے۔ ع چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

یہ کچھ انسانی طبیعتوں کا خاصہ ہے کہ مرکز میں رہنے والوں کے عمل کو دلیل بناتے ہیں، ان کے اس طرز استدلال کے خلاف آپ کتنا بھی زور خطابت صرف کردیں آپ ان کو مطمئن کرنے سے قاصر رہیں گے یہی عُرف تہذیب و آداب، زبان و محاورے اور فقہ کے بارے میں رہا ہے چنانچہ عربی زبان کے سلسلہ میں قریش کی زبان کو ہمیشہ ٹکسالی سمجھا جاتا رہا ہے اسی طرح فقہ کے معاملہ میں اہل مدینہ کا عمل مذاہب اربعہ میں ایک جلیل القدر مذہب (مذہب مالکی) میں حجت اور مستند سمجھا جاتا رہا ہے اور قرطبہ والوں کا عمل ان کے دور عروج میں مغرب کے بہت سے فقہا مالکیہ کے نزدیک حجت رہا ہے اسی طرح آداب و تہذیب کے معاملہ میں بھی لوگ دارالسلطنت اور مرکزی مقامات کے طور طریقوں کو سند مانتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دینی مصلحین اور دعوتی کام کرنے والوں کو بسا اوقات بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ بعض حجاج یہاں کے بعض ان مشاہدات کو جو شریعت اسلامی سے میل نہیں کھاتے بطور حجت اور دلیل کے پیش کرنے لگتے ہیں۔

پورے عالم اسلام کے طویل و عریض رقبہ میں اسلامی معاشرہ کا عملی قیام ایک ناگزیر ضرورت

ہے۔ کمیونزم کی اپنی ایک دعوت ہے اور اسکی اپنی ایک سوسائٹی ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام کی بھی ایک دعوت اور اپنا ایک معاشرہ ہے بلکہ مادیت بھی اپنے وسیع معنوں اور متنوع شکلوں میں اپنی ایک دعوت اور اپنا معاشرہ رکھتی ہے پھر کیا اسلام ہی ایک ایسا مسلک زندگی ہے جس کی اپنی دعوت تو ہے مگر اسکے مطابق کوئی معاشرہ دنیا میں موجود نہیں۔ ہمارے لئے یہ بڑے ننگ و عار کی بات ہو۔ اگر ہم کوئی ایسا معیاری اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ تاریخ کے واقعات میں سے ایک اہم اور غیر معمولی واقعہ ہوگا اور یہ اسلام اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ جو ملک بھی اس آرزو کی تکمیل کرے گا اسے دنیا کے موجودہ نقشہ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہوگا۔ اس ملک کو اتنی اہمیت حاصل ہوگی جو کسی بڑے سے بڑے اور طاقتور سے طاقتور ملک کو میسر نہیں۔ اقصائے عالم کے بڑے بڑے علما، محققین اور مفکرین اس ملک کو دیکھنے کے لئے شد رحال کرینگے اور وہاں کے قیام کو اپنی بڑی سعادت سمجھیں گے۔ محققین کو تحقیق کے لئے سب سے بڑا موضوع ہاتھ لگے گا پھر اس حکومت کو جو ان بنیادوں پر قائم ہوگی اسے دوسری بڑی حکومتوں کے مقابلہ میں وہ عظمت کا مقام حاصل ہوگا کہ اس کا دسواں حصہ بھی سفارتی تعلقات اطلاعات و نشریات اور پروپگنڈے کے دیگر ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ مغربی کی اندھی تقلید سے یہ عزت حاصل ہوسکتی ہے۔

یہ چند کلمات ہیں جو اس رابطہ عالم اسلامی کی فرمائش کی تعمیل میں وقت کی کمی، سفر کی صعوبت اور اپنی معذوری کی حالت میں املا کرائے گئے ہیں۔ یہ چند معروضات جن کے پیچھے ایک درد مند دل، فکر مند دماغ اور بے تاب روح ہے اگر آپ کی توجہ کو وقت کی اس اہم ترین ضرورت پر مبذول کرا سکیں اور عظیم الشان فرض منصبی کی ادائیگی پر آپ کو آمادہ کر سکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش کامیاب ہے اور میری یہ دراز نفسی رائیگاں نہیں گئی۔

سلسلۂ ولی اللہی کا ایک گمنام متبع شریعت درویش

حضرت شاہ عبدالقادر خالصپوریؒ

(از: مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

حضرت شاہ ابوسعید حسنی قطبی رائے بریلویؒ کے مختصر حالات اور اُن کے تعلقات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور اُن کے خاندان سے ـــــ مراسلات کی روشنی میں ـــــ ناظرین الفرقان ملاحظہ فرما چکے ہیں ـــــ اب میں اُن کے ایک خلیفہ مجاز کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ بہت کم مشہور بلکہ گمنام ہیں اور علمی حیثیت سے بھی معروف نہیں لیکن اتباع شریعت اور روحانیت میں اُن کا مقام بہت اونچا ہے ـــــ اُن کی یہ خصوصیت ہی کیا کم ہے کہ وہ صرف دو واسطوں سے (بلکہ ایک حیثیت سے ایک واسطے سے) حضرت محدث دہلویؒ کے حلقۂ طریقت میں شامل ہیں حضرت سید احمد شہیدؒ نے اُن کی پابندیٔ اوقات کی خاص طور پر اپنی زبان مبارک سے تعریف فرمائی ہے ـــــ میں نے یہ حالات ایک قلمی رسالے سے اخذ کئے ہیں جو حضرت شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ کی مختصر سوانح پر مشتمل ہے اور جس کے مطالعہ کا موقع مجھے لکھنؤ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم کی عنایت سے ملا ـــــ یہ رسالہ حضرت خالص پوریؒ کے صاحبزادے مولوی عبدالغفار خانؒ نے ۱۲۷۷ھ میں مرتب کیا ہے اور غالباً ان کے ہاتھ

کا ہی لکھا ہوا ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون کے اندر اس رسالے کے مضامین میں سے اپنے ذوق کے مطابق ضروری مضامین اختصار کے ساتھ لئے ہیں اور حسب ضرورت مولف کے مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے ترتیب اور انداز نگارش میں تبدیلی کی ہے۔ کہیں کہیں مولف کے الفاظ بھی نقل کر دیئے ہیں۔ رسالے کی زبان اُردو ہے اور قدیم طرز تحریر کا نمونہ ہے۔ میرے نزدیک یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ کسی اور تاریخ یا تذکرے میں مجھے حضرت خالصپوریؒ کے حالات نہیں ملے۔ البتہ مولانا حاجی محمد احسن صاحب نگرامی مرحوم نے وفیات الاخیار میں آپ کا نام تاریخ وفات اور مقام مزار درج کیا ہے۔ اور خالصپور کے کے متعلق لکھا ہے "ضلع لکھنؤ میں بڑا موضع ہے اور پٹھانوں کی بستی ہے۔"

خاندان اور آبائی وطن

حضرت شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ خورجہ میں پیدا ہوئے والد کا نام غازی خاں تھا آپکے پردادا نعمت اللہ خاں نے سب سے پہلے خورجے میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ عبداللہ خاں رئیس خورجہ کے یہاں رہتے تھے نعمت اللہ خاں کے پانچ لڑکے تھے جن میں سب سے بڑے حاتم خاں رسالدار تھے جو شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ کے دادا تھے۔ حاتم خاں الہ آباد میں سکونت پذیر ہوگئے وہاں انھوں نے ایک پختہ سرائے بنوائی تھی جو بعد میں ایک سڑک کی تعمیر میں کھُد گئی۔ حاتم خاں شہید ہوئے تھے ان کو الہ آباد ہی میں دفن کیا گیا۔ حاتم خاں کے بعد ان کے اہل وعیال پریشان حال ہوگئے۔ الہ آباد سے فرخ آباد پھر علی گنج آگئے ذوالفقار خاں نے ان کی کفالت کی۔ غالباً شاہ صاحب کے والد نے خورجہ ہی میں اپنی سکونت کا تعلق باقی رکھا۔ شاہ صاحب قوم سے ترین پٹھان تھے آپ کی والدہ سیدانی تھیں۔

عہد طفولیت

آپنے بچپن میں کچھ نہیں پڑھا، بس نماز سیکھ لی تھی۔ ہوش سنبھالا تو جنگل میں بکریاں چرانے لگے۔ جو تنخواہ دار معلم آپکے بھائیوں کے پڑھانے پر مقرر تھا وہ آپکے گھر کی مالی حالت کمزور ہوجانے کی وجہ سے دوسرے محلے میں ملازم ہوگیا۔ آپ اتنا کرتے تھے کہ اپنے بھائیوں کو اپنی نگرانی میں معلم کے پاس لے جاتے اور واپس لاتے تھے۔ خود نہیں پڑھتے تھے ایک دن آپنے معلم سے دریافت کیا کہ اگر میں پڑھنا شروع

کروں تو کیا مجھے پڑھنا آجائے گا؟ معلّم نے کہا کیوں نہیں۔ اچھی طرح پڑھنا آجائے گا، شوق ہوگا تو خوب پڑھ لوگے ـــــ بعدازاں آپ نے اپنے چچا شاہ نور صاحبؒ (جو شاہ حبیب اللہ قنوجیؒ کے مرید تھے) عرض کیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کچھ پڑھ لوں۔ چچا نے فرمایا کہ اس سے اچھی کیا بات ہے؟ چنانچہ آپ نے بکریاں چرانا موقوف کرکے پڑھنا شروع کر دیا۔ اوّل کلام اللہ ختم کیا پھر کریما بامعنی پڑھا ـــــ اسکے پڑھنے سے جذبۂ شوق بیدار ہوا ـــــ دو شعر بامعنی پڑھتے اور جنگل میں جاکر اُن شعروں کو یاد کرتے اور رویا کرتے تھے ـــــ اس کے بعد کچھ کتابیں فارسی کی اور مسائل دین کی پڑھیں ـــــ اس زمانے میں تو اتنی ہی تحصیل علم کا پتہ چلتا ہے۔ پھر مرشد کامل سے تعلق ہونے کے بعد بلکہ مرشد کے وصال کے بعد چالیس سال کی عمر میں مشکوٰۃ شریف پڑھنے کا ذکر آپکے صاحبزادے نے کیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

درمیان میں عربی کس سے پڑھی کون کون سی کتابیں پڑھیں اس کا کچھ علم نہ ہوسکا۔

اکل حلال اور مرشد کامل کی تلاش

آپ فارسی کی تعلیم حاصل کرکے مرشد کامل کی تلاش اور اکل حلال کی فکر میں مصروف ہوگئے۔ اکل حلال حاصل کرنے کی غرض سے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ معلّمی اس انداز سے کی کہ کسی سے کچھ تنخواہ نہیں ٹھہرائی۔ جو دیدیا وہ لے لیا۔ تنخواہ کا تقاضہ بھی نہیں کرتے تھے بہت دنوں تک معلّمی کی پھر کچھ عرصے سپاہ گری اختیار کرلی اور اس میں بہت سی مشقتیں برداشت کیں ـــــ پیر کامل کی تلاش برابر جاری رہی جہاں کہیں کسی بزرگ کو سنا اس سے جاکر ملاقات کی ـــــ طبیعت میں شریعت کی پابندی بے انتہا تھی جب کسی کو ذرا خلاف شریعت دیکھا اس سے اعتقاد ہٹ گیا۔

حضرت شاہ ابوسعیدؒ سے تعلق بیعت

رائے بریلی کے کچھ لوگوں نے آپکے حضرات تکیہ کی تعریف و توصیف کی اور یہ بتایا کہ وہ پابندیٔ شریعت میں ممتاز ہیں وہاں اُس وقت حضرت شاہ علم اللہ قدس سرہٗ کی اولاد میں یہ چار بزرگ شریعت و طریقت میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

(۱) حضرت سید محمد عدل عرف سید شاہ بعلؒ

(۲) حضرت سیّد شاہ ابوسعیدؒ
(۳) حضرت مولانا سیّد محمد واضحؒ
(۴) حضرت میر محمد نعمانؒ

ان میں سب سے زیادہ تعریف حضرت شاہ ابوسعیدؒ کی لوگوں کی زبانی سُنی وہ اس وقت حج بیت اللہ کے سفر میں تھے۔ جب سفرِ حج و زیارت سے واپس آئے تو آپ رائے بریلی حاضر ہوئے ــــ پہلے حاجی مراد خاں کے تکیے میں اُترے وہاں حضرت شاہ ابوسعیدؒ کا حال سُنا کہ اُن کا ہزاروں روپے کا خرچ ہے۔ داد و دہش کا بازار گرم ہے ایک زبردست لنگر خانہ ہے اور ایک عجیب رئیسانہ شان ہے۔ یہ باتیں سُن کر آپ کو خیال ہوا کہ یہاں تو بظاہر درویشی کا کارخانہ معلوم نہیں ہوتا بنا بریں اُن کا قصد بغیر ملاقات واپس جانے کا ہوا ــــ حاجی مراد خاں نے جو حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے فیض یافتہ تھے آپ کو سمجھایا کہ میاں اتنی دور سے آئے اور بغیر ملاقات جا رہے ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے ــــ جاکر ملاقات تو کر لو پھر جیسا تمھارا جی چاہے ویسا کرنا۔ اور یہ بھی کہا کہ حضرت کو اللہ تعالےٰ نے دین و دنیا دونوں بھرپور دیئے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ میں ہزارہا روپیہ خرچ کیا ہے للّٰہ فی اللّٰہ خرچ کرتے ہیں، غرض حاجی صاحب کے کہنے سننے سے آپ خدمتِ شاہ ابوسعیدؒ میں حاضر ہوئے چند روز رہ کر بھی حضرت رائے بریلویؒ کی شانِ امارت دیکھ کر ان کا اعتقاد نہ جما۔ واپس جانے کا ارادہ کیا۔ حضرتؒ نے اپنی روشن ضمیری سے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا اور فرمایا ــــ میاں عبدالقادر! تم کو پیر کی تلاش کرتے کرتے پچیس سال ہو گئے ابھی تک تمھیں موافق طبیعت پیر نہیں ملا! سن لو قیامت تک تم کو تمھاری طبیعت کے موافق پیر نہیں ملے گا اس لئے کہ تم بے عیب پیر ڈھونڈھ رہے ہو حالانکہ بے عیب ذات اللہ تعالیٰ کی ہے تم اس طرزِ عمل سے راہِ سلوک کی برکات سے محروم رہ جاؤ گے۔ بہتر یہ ہے کہ جس میں دس نیکیاں اور دو برائیاں ہوں اُسی کو غنیمت جان لو ــــ یہ طریقہ بغیر پیر کے حاصل نہیں ہوتا اگر پیر کامل نہ بھی ہو اور شوق، کامل ہو تو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو پیرانِ طریقت کا سلسلہ ہے وہ ذریعۂ فیض بن جائے گا۔ حضرتؒ کی یہ بات آپ کے دل میں*

* نوٹ:- آگے کے دو صفحوں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ ناظرین پہلے صفحہ ۲۱-۱ کے بعد صفحہ ۱۲ اور اس کے بعد صفحہ ۲۲ پڑھیں (مرتبہ)

ہی کے سلسلے میں ہوگا۔ خیر دار تم لوگ ان سے کچھ نہ بولنا چاہے وہ مجھے زدوکوب ہی کیوں نہ کریں۔ یہ سُن کر ہم سب مجبور ہوگئے اور تشویش تھی کہ کیا صورت بنے گی۔ اتنے میں میاں صاحب ظہر کے وقت تشریف لے آئے۔ آپ نے ان کو اپنے مصلے پر بٹھایا: وہ مصلے پر نہ بیٹھے، پھر آپ نے فرمایا میاں صاحب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے انھوں نے فرمایا حضرت میں سب سمجھ گیا اور میں نے مان لیا۔ آپ کی خدمت میں توبہ کرکے آیا ہوں اور اس امر کی دعا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ مجھ کو توفیق نیک دے اور اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلائے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی آپکے بارے میں رائے

امام المسلمین حضرت سید احمد شہیدؒ جب حج بیت اللہ سے واپس ہوئے تو اپنی محفل میں فرمایا کہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گیا راستے میں اور ان مقامات مقدسہ میں بہت سے بزرگوں سے ملاقات کی مگر میں نے شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ جیسا پابند اوقات اور سید محمد جامع جیسا کلام اللہ پڑھنے والا نہیں پایا ــــ حضرت سید شہیدؒ خالص پور تشریف لائے تو وہاں بھی یہی فرمایا کہ آپ کی سی پابندی اوقات میں نے کسی میں نہیں پائی اس کو سن کر ازراہ تواضع آپ نے فرمایا کہ "میاں مجھ جیسا ناکارہ تم نے نہ دیکھا ہوگا"۔

حضرت سیّد احمد شہیدؒ خالص پور میں

آپکے صاحبزادے لکھتے ہیں کہ جب امام المسلمین حضرت سید احمد شہیدؒ سفر حج سے واپس آئے تو یہ عاصی ملاقات کو گیا سید صاحبؒ نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ خان جی! ہمارے حضرت کا کچھ حال بیان کرو، میں نے عرض کیا حضرت ان کا عجیب حال ہوگیا ہے کبھی ہنستے ہیں کبھی روتے ہیں اور اشعار بھی بہت پڑھتے ہیں ــــ سید صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے ان کی ملاقات کا بہت اشتیاق تھا اور یہ حال سن کر اور زیادہ اشتیاق ہوگیا مگر اس وقت چونکہ دہلی کے چند علماء میرے یہاں مہمان ہیں اسلئے ابھی نہیں جاسکتا ان حضرات کے تشریف لے جانے کے بعد جلد حاضر ہوں گا۔ فی الحال میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ میں نے اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے صدہا آدمیوں کے ساتھ حج کیا، اللہ تعالےٰ نے بہت سی ایسی ظاہری و باطنی نعمتیں مجھے عنایت فرمائیں کہ میں اُن کو بیان نہیں کرسکتا۔ میاں عبدالغفار خاں بیان کرتے ہیں کہ میں نے

چم گئی۔ اسکے بعد آپ نے عرض کیا کہ اب میں آپ ہی سے بیعت کرتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ خلاف شریعت کوئی عمل نہ کروں گا۔ خدمت آپ مجھ سے جو چاہیں لیں حتیٰ کہ بیت الخلا کی صفائی پر متعین فرمادیں اس خدمت سے بھی گریز نہیں ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا "بھائی میں تم سے کیا خدمت لوں گا میں تو خود ہی تمھاری خدمت کروں گا" شاہ عبدالقادر فرمایا کرتے تھے کہ عنایت الٰہی اور حضرت مرشدؒ کی توجہ سے میرا مطلب آٹھ دن میں حاصل ہوگیا۔ بعد حصول مقصود آپنے وطن جانے کی اجازت چاہی تو حضرتؒ نے اور حضرت کے صاحبزادے میاں سید ابواللیث صاحبؒ نے روک لیا، چنانچہ آپ آستانۂ مرشد پر عرصہ تک رہے۔

شادی

آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ پیر و مرشد کی وفات کے بعد چالیس سال کی عمر میں جب کہ مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے اس میں نکاح نہ کرنے پر تہدید کی حدیث آئی تو خوف کھا کر قصد نکاح کیا۔ نکاح کے لئے یہ شرط لگائی کہ کوئی رسم خلاف شرع نہ ہونے پائے اور عورت کا سب خاندان نمازی ہو ——— حضرت مولانا سید محمد واضحؒ نے ان شرطوں کو ملحوظ رکھ کر اپنے ایک مرید لعل خاں سے فرمایا کہ وہ اپنی لڑکی شاہ عبدالقادر کو منسوب کردیں، چنانچہ لعل خاں کی صاحبزادی سے آپکا نکاح ہوگیا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ

مولوی عبدالغفار خاں صاحب نے لکھا ہے کہ پیرزادہ میاں کلّم صاحب جو بانس بریلی کے رہنے والے اور حضرت سید محمد معصوم قدس سرہٗ کی اولاد میں تھے بڑے صاحب جلال اور غصہ ور تھے۔ ان کا مزاج تو درویشانہ تھا مگر ظاہری شکل وصورت بالکل خلاف شرع تھی ——— میاں صاحب موصوف والد صاحب کے اوصاف سن کر باشتیاق تمام ملاقات کے لئے لکھنؤ سے خالص پور آئے۔ میں نے والد صاحب سے از راہ احتیاط عرض کیا کہ میاں کلّم صاحب آپ سے ملاقات کرنے تشریف لا رہے ہیں ان کی ظاہری شکل وصورت خلاف شرع ہے آپ ان سے باخلاق پیش آئیے اور کچھ نصیحت نہ فرمائیے ان کے مزاج میں غصہ بہت ہے۔ آپنے فرمایا۔ میاں کہہ چکے؟ سنو ان شاء اللہ تعالےٰ میرا پہلا کلام نصیحت

خالصپور آکر سلام و پیام عرض کر دیا مگر اتفاق کی بات اسکے چند روز بعد آپ کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ بالکل خاموش رہتے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد امام المسلمین حضرت سید احمد شہیدؒ کثیر التعداد رفقاء کے ہمراہ خالص پور بغرض ملاقات تشریف لائے، مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ میں نے اس وقت والد صاحب کا جو حال بیان کیا تھا اب وہ حال نہیں اب تو خاموش رہتے ہیں کسی سے کلام نہیں فرماتے اور جو کوئی عرض کرتا ہے تو اس سے یہ فرما دیتے ہیں "میاں چپ رہو"۔ میاں تم نے سنا نہیں کہ "جو بولا سو مارا گیا" جب سید صاحبؒ نے آپ کو سلام کیا آپ نے وعلیکم السلام کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور یہ مشہور عارفانہ رباعی پڑھی۔

ہنگس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

پھر فرمایا اے سیدؒ!

خدا دارم، ہمہ دارم دگر ہیچ نباید

پھر یہ پڑھا ــــ رب بن مجھ کو کچھ نہ سہائے ؛ آگ لگے سب جل بل جائے

ایک سو چالیس آدمی حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمراہ آئے تھے اور ان کے علاوہ خالصپور کے باشندے بھی اس وقت موجود تھے ان کلمات کو سن کر سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لکھنؤ کے ایک پیرزادے بھی ہمراہی میں تھے انھوں نے فرمایا سید صاحب آپ پر قربان جائیے آپنے ایسے اچھے بزرگ سے ملاقات کرادی۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی درخواست دعا اور استفادۂ باطنی

اسکے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ نے سب صاحبوں کو وہاں سے رخصت کیا صرف میاں عبد الغفار خاں سے فرمایا کہ تم یہاں رہو۔ پھر فرمایا کہ حضرت میرے تین مقاصد ہیں ایک تو میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا جان و مال، اسباب، تن بدن اور جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف ہو اور اللہ تعالیٰ مجھ کو قبول فرمالے ــــ آپ کے اس کے لئے دعا کا طالب ہوں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے کچھ وصیت کریں تاکہ میں اس پر عمل کروں آپ نے فرمایا میاں میری وصیت کی کیا ضرورت ہے تم پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے سید صاحبؒ نے فرمایا حضرت کچھ تبرکاً ہی فرما دیجئے اس وقت حضرت سید شہیدؒ آپ کی چارپائی کے نیچے آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، آپ از راہ شفقت و محبت سید شہیدؒ کے سر مبارک پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور اُن کی داڑھی میں خلال کر رہے تھے ۔ یکایک آپ نے مشرق کی طرف ٹکٹکی لگائی پھر تھوڑی دیر بعد سید صاحبؒ کی طرف منھ کر کے نصیحت و وصیت کے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"میاں! استقامت اور پر شریعت کے"

ان الفاظ کو تین مرتبہ فرمایا:۔

تیسرا مقصد سید صاحب نے یہ پیش کیا کہ آپ مجھے توجہ دیجئے۔ آپ نے فرمایا میاں میں اس لائق نہیں ہوں ۔ آپ کے صاحبزادے لکھتے ہیں کہ حضرت سید صاحبؒ نے مجھ کو اشارہ کیا کہ میں اس سلسلے میں سفارش کروں میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ تو صاحبزادوں کو بہت مانتے ہیں اور سب سے زیادہ محبت آپ کو سید صاحب سے ہے لہٰذا آپ اگر کسی کو توجہ نہ بھی دی ہو تب بھی سید صاحب کو توجہ دیجئے اور توجہ تو آپ اوروں کو دیتے رہے ہیں۔ اس کو سن کر آپ نے اپنے صاحبزادے کو ڈانٹا اور فرمایا "ارے تو کیوں بولتا ہے"۔ اور سید صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا "میاں گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے"۔ پھر فرمایا اچھا میاں تمھاری خوشی یہی ہے تو بیٹھو چنانچہ گھڑی بھر توجہ دی ۔ توجہ سے فراغت کے بعد حضرت سید صاحبؒ نے فرمایا کہ اس وقت نسبت قادریہ تھی میں نسبت نقشبندیہ کا بھی مشتاق ہوں فرمایا کل فجر کو ۔ دوسرے روز حسب وعدہ نسبت نقشبندیہ کی توجہ دی ۔ اس موقع پر میاں عبدالغفار صاحب یہ لکھنے کے بعد کہ سید صاحب والد صاحب کے پیر و مرشد کے نواسے تھے اور والد صاحب کے شاگرد بھی تھے ۔ یوں رقمطراز ہیں۔

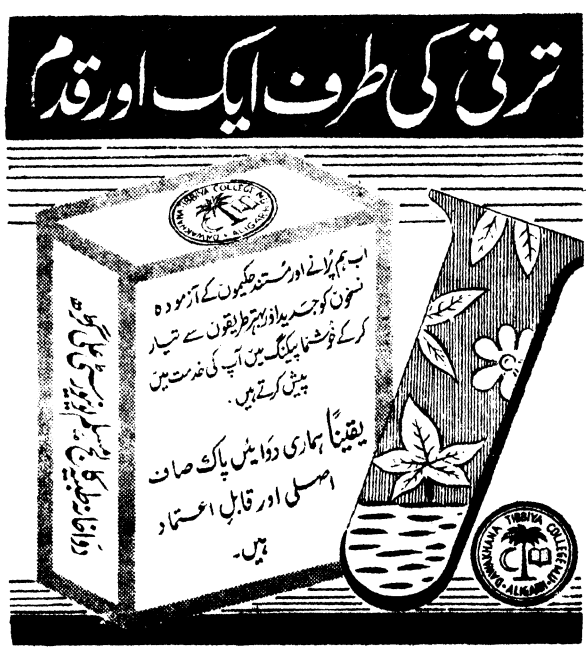
"سبحان اللہ سید صاحبؒ کیا عاشق اللہ کے تھے ۔ کچھ اپنی غرض نہ تھی نہ فتح کی نہ ملک کی فقط رضامندیٔ مالک حقیقی (مطلوب تھی) ویسے ہی مقبول ہوئے کہ

لاش بھی تصدیق ہوگئی اس کا بھی پتہ نہ لگا اور ہزار ہا آدمی دین اسلام سے فیض یاب ہوئے اس حاصی نے سید صاحب سے عرض کی تھی کہ آپ جہاد کو..... تشریف لیے جاتے ہیں یہاں پہلے مسلمانوں کو اسلام پر پکا کیجئے پھر تشریف لیجائیے آپ کی ذات سے ہزاروں کلمہ گو (پکا) مسلمان ہوا ہے ۔ غرض ان کو شوق، جہاد کا ایسا تھا، اور شہادت (بھی) جلد منظور الٰہی ہوئی ۔"

وفات حضرت شاہ عبدالقادر خالصپوریؒ نے ۱۴ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۰ھ بروز یکشنبہ قریب صبح صادق وفات پائی۔ خالصپور میں مزار ہے۔ مولوی محمد علی صاحب کوئی بزرگ ہیں انھوں نے تاریخ وفات اس طرح لکھی۔

چو جستم سال تاریخ وفاتش
خرد گفتا، "بجنت شد مقامش"

سنہ ۱۲۴۰ھ



ضمیمہ

حضرت مولانا محمد یوسف نمبر

سنہ ۱۳۸۵ھ
۱۹۶۵ء



"حضرت مولانا محمد یوسفؒ نمبر میں وعدہ کیا گیا تھا کہ حضرت مولانا مرحوم کی بعض تقریریں وغیرہ جن کو "نمبر" ہی میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مگر وقت اور صفحات میں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے وہ اس میں شامل نہیں کی جاسکیں، آئندہ شمارہ میں ہدیۂ ناظرین کی جائیں گی ـــــ اسی وعدہ کے مطابق آئندہ صفحات میں حضرت مولانا مرحوم کی دو اہم تقریریں اور متعدد تقریروں کے منتخب اجزاء اور اقتباسات درج کیے جارہے ہیں ـ ان میں سے پہلی تقریر میاں جی عیسیٰ کی اُس بیاض سے لفظ بہ لفظ لی گئی ہے جس کا ذکر "نمبر" میں کیا جاچکا ہے ـــــ دوسری تقریر حضرت مولانا مرحوم کی زندگی کی آخری اہم تقریر ہے جو بعض خاص محرکات کی بنا پر تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے خواص کے ایک مجمع میں، وصال سے تین ہی دن پہلے آپ نے فرمائی تھی ـــــ مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور حلقوں میں شعوری اور غیر شعوری طور پر جو طبقہ وار یا علاقائی عصبیت پیدا ہو رہی ہے جو مسلمانوں کے "اُمت واحدہ" ہونے کی صفت کے لیے سمِ قاتل ہے ـ مولاناؒ کی یہ اہم تقریر اسی خطرناک مرض سے متعلق تھی اور جن لوگوں نے یہ تقریر سُنی تھی انھوں نے بتایا کہ اس تقریر کے وقت حضرت مولانا مرحوم پر تأثر اور رنج والم کی عجیب کیفیت طاری تھی ـ

ان دو تقریروں کے بعد چند مختلف تقریروں کے اہم اجزاء اور اقتباسات ہیں جن سے حضرت مولانا مرحوم کے مخصوص طرزِ فکر اور اس کی خاص بنیاد کو سمجھا جاسکتا ہے"۔

ادارہ

سارے انفرادی و اجتماعی مسائل کا ایک حل

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایک تقریر

{یہ تقریر میاں جی محمد عیسیٰ کی اس بیاض سے لفظ بہ لفظ نقل کی گئی ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے}

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

بھائی دوستو! بڑی دقت کی بات یہ ہے کہ اپنی غلط کاری کی بنا پر ہمارا ذہن انفرادی بن چکا، دین کے بارہ میں بھی اور دنیا کے بارہ میں بھی، یہاں کے بارہ میں بھی اور آخرت کے بارہ میں بھی۔ ذہن یہ بن گیا کہ بس اپنی ذات والے حال میں لگا رہے، خواہ دین کا حال ہے یا دنیا کا کام اس سے اپنا مسئلہ درست ہو جائے گا، حالانکہ شخصی احوال پر طاقت خرچ کرنے سے بلا مصیبت کم نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہی ہوتا ہے، اجتماعی احوال کو جب تک ٹھیک نہ بنایا جاوے اسوقت تک شخصی حالات درست ہونا مشکل ہے۔ اگر اجتماعی زندگی کی خرابی پر کوئی اجتماعی مصیبت آپڑے تو پھر ہر کسی کی شخصی بھی بگڑتی چلی جاوے گی، اور اس کے برعکس اگر اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کی سعی کی جا رہی ہو گی، تو ایک ایک شخص کا انفرادی مسئلہ بھی بہتر ہوتا چلا آوے گا، جب کسی قوم، ملک یا امت کا اجتماعی مسئلہ بگڑا ہوا اور طاقت اسکی درستگی پر لگائی جائے تو وہ اجتماعی بھی درست ہو جاتا ہے اور ہر کسی کا شخصی بھی درست ہو جاتا ہے۔ ہمیں غلط فہمی ہوتی ہے کہ فلاں تدبیر کے نہ کرنے کی وجہ سے معاملہ بگڑا ہے، حالانکہ ہمارے ایک ایک مسئلہ کا بگڑنا اور بننا اجتماعی مسئلہ کے ساتھ ہے۔ ہاں اگر تھوڑے سے آدمی اجتماعی مسئلہ پر طاقت لگا دیں تو سب کے مسائل اجتماعی اور انفرادی درست ہو جاویں گے اور

اگر کچھ لوگ بھی پوری قوم میں سے اس کا فکر رکھنے والے نہ ہوئے تو اجتماعی کے ساتھ ہر کسی کا شخصی مسئلہ بھی بگڑ جائے گا اور سوائے حسرت و یاس کے کچھ حاصل نہ ہوگا ـــــ اجتماعی مسئلہ کے بگڑنے کی صورت میں اگر قوم کے اولیاء اللہ اس کے سدھار کے لیے راتوں کو رو رو کر بھی دعائیں کریں گے تو ان کی دعائیں بھی حالات کو بہتر نہیں بنا سکتیں ـــ اگر خدا تعالیٰ کے ہاں سے فیصلہ ہو جاوے کہ کسی ملک کے انسان بھوکے مریں تو اگر بھوک سے بچنے کے لیے ایک ایک شخص پوری طرح جان بھی کھپا رہا ہوگا تب بھی ایک ایک کر کے بھوک سے ہلاک ہو جاویں گے اپنی ذات کے مسئلہ میں لگ جانا ہی تو اجتماعی کے بگاڑ کا ذریعہ ہے۔ جوں جوں اپنی ذات کیلئے جان کھپاوے گا اسی قدر اجتماعی حالات بگڑتے جائیں گے اور یہاں تک بگڑیں گے کہ احادیث میں آتا ہے کہ لوگ قبروں پر سے گزرتے ہوئے حسرت کریں گے کہ کاش ہم بھی قبروں میں ہوتے، آدمی آدمی کو کاٹ کر کھا جاوے گا، یہ جب ہوگا کہ ہر کسی کا جذبہ جانوروں کی طرح صرف اپنی ہی ذات کے لیے ہو، ایسے انسان انسانوں کے جامہ میں درندے ہوتے ہیں، ساری پریشانی اس وجہ سے ہے کہ وقت تو اجتماعی مسائل کے لیے قربانی دینے کا ہے اور کوشش اس بات کی کر رہے ہیں کہ اچھا جب تک دوکان چلتی رہے چلاؤ یا زمین میں لگا جاوے لگے رہو۔ محض اپنے لگنے سے مسائل درست نہیں ہوتے بلکہ اللہ پاک ہی بگاڑتے ہیں اور وہ ہی بناتے ہیں۔

یقین اس بات پر جمانا ہے کہ جس چیز پر اللہ پاک طاقت لگوانا چاہتے ہیں اس میں لگنے سے تو مسائل ٹھیک ہوتے ہیں اور جن مخلوقات پر انسان از خود طاقت خرچ کرتا ہے اس سے مسائل بگڑتے ہیں۔ انفرادی بھی بگڑتے ہیں اور اجتماعی بھی۔ طاقتیں جب مخلوق پر خرچ ہونے لگیں تو خدا کا غضب نازل ہوتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو ایک دوسرے کے ہمدرد ہوتے ہیں وہ جان لیوا ہو جاتے ہیں، جس طرح چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں اسی طرح حالات بھی اللہ کی مخلوق ہیں، سورج مخلوق ہے، چاند مخلوق ہے، زمین و آسمان مخلوق ہیں، اور سارے جانور بھی مخلوق ہیں، حالات چیزوں کی مخلوق نہیں ہیں، حالات مستقل طور پر اللہ کی مخلوق ہیں، یہ بات نہیں کہ اگر کسی نے چاہا تو امن کر دیا اور چاہا تو فساد کر دیا۔ نہیں بلکہ یہ احوال

اللہ پاک کے لانے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جس طرح سورج اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح وہ روشنی جو اس میں سے نکل رہی ہے وہ بھی اسکی مخلوق ہے۔ جب چاہتے ہیں سورج سے روشنی نکالتے ہیں اور جب چاہتے ہیں سلب فرما لیتے ہیں کسی متحیر سے آدمی نہیں مرجاتا بلکہ جس طرح وہ آدمی اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح اس کی موت بھی اللہ کی مخلوق ہے، جب اللہ پاک مارنا چاہتے ہیں تو موت وقوع میں آتی ہے، اسی طرح عزت و ذلت، فقر وفاقہ وغیرہ سب اللہ پاک ہی کی مخلوق ہیں، ہمیں غلہ سے پیٹ کا بھرنا نظر آتا ہے اور اسی طرح سے دوسری چیزوں میں ہم غلط طور پر احوال کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور غلط تخیل قائم کرتے ہیں حالانکہ قرآن پاک میں صاف صاف ارشاد ہے کہ پانی ہم اُتارتے ہیں، کھیتی ہم اُگاتے ہیں، ایک عورت اگر خدا کی مخلوق ہے تو اس کے اندر میں جو بچہ ہے وہ بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے، مخلوق کسی وقت خالق نہیں بن جاتی، جو اوّل چیز کو بنانے والا ہے دوسری کو بھی وہی بناوے گا، کسی مخلوق کو مخلوق میں (سے ظاہر ہوتا) دیکھ کر (اس مخلوق پر) طاقت خرچ ہو گی تو مسئلہ بگڑے گا۔ روٹی کھانے میں پیٹ بھرنا (یعنی پیٹ بھرنے کی لازمی خاصیت) نہیں ہے۔ حضرت معاویہؓ فرماتے تھے کہ کبھی میری یہ حالت تھی کہ روٹی کھاتے کھاتے میرا جبڑا دُکھ جاتا تھا اور پیٹ نہیں بھرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جو کچھ بھی ہے زمین سے لے کر آسمان تک اور جو اس وقت موجود ہے اور جو آگے آنے والا ہے ساری ہی چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں اور سارے احوال بھی اس کے مخلوق ہیں تو بس جب کچھ لینا ہو اس کے لینے کے لیے اللہ ہی پر طاقت صرف کی جائے، اگر خوف سے گھبراہٹ ہے تو بھی رابطہ اللہ پاک سے ہی پیدا کیا جاوے، جس خوف کو اللہ پاک سے ہٹواؤ گے وہ ہمیشہ کے لیے ہٹ جاوے گا۔ اگر مخلوق پر طاقت صرف کر کے کوئی چیز حاصل کی تو وجود تو اس کا بھی اللہ ہی کے پیدا کرنے سے ہوگا تاہم مخلوق کے واسطہ سے آنے کی صورت میں وہ فانی ہوگی، جو شخص اللہ سے نہ لے بلکہ مخلوق سے لے تو بہت ہی پچھتانا پڑے گا اس لیے کہ جو مخلوق مخلوق میں سے آئے گی وہ فانی ہوگی اور اسکے فنا پر حسرت وافسوس ہوگا اور جو چیز اللہ سے آئے گی وہ ہمیشہ کے لیے ہو گی۔ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہی ہے کہ تمام مسائل کو ایک ذات باری تعالیٰ سے ہی حل کرانا ہے، لہٰذا وہ تدبیر اختیار کرو جو اس سے لینے کی ہیں۔ اگر

خدا تعالیٰ سے لینے کی تدابیر اختیار کی جائیں گی تو دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ غیر خدا پر طاقت لگا کر ہم جو سمجھ رہے ہیں کہ چیزوں سے کچھ پیدا ہو رہا ہے تو اسمیں شرک کی بُو آتی ہے۔ کوئی مخلوق اللہ پاک کے حکم کے بغیر کچھ دے نہیں سکتی۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ بتلایا گیا ہے کہ مخلوقات میں کچھ نہ سمجھے بلکہ عقیدہ رکھے کہ اللہ ہی کرنے والے ہیں۔ اسی کو توحید کہتے ہیں جس طرح مخلوق سے فائدہ اٹھانے کی تدابیر ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ سے لینے کی بھی تدابیر ہیں سارے احکامات بعد کو آتے ہیں۔ پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ پاک پر یقین پیدا ہو جائے اور اسی کے پیدا کرنے کے لئے افسانوں میں کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں اگر تھوڑا سا یہاں خوف برداشت کر لیا جائے گا تو ہمیشہ کے خوف سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ تھوڑی سی بھوک و پیاس برداشت کر لی جائے گی تو ہمیشہ کی بھوک سے نجات مل جاوے گی، تھوڑا وقت بیوی بچوں کی جدائی میں گزر گیا تو ہمیشہ کا ساتھ نصیب ہوگا۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے تھوڑے دن بھوک پیاس برداشت کی تو اس دنیا میں بھی بڑی بڑی سلطنتوں کے دبے ہوئے خزانے تک ان کے پیروں میں آپڑے، ضرورت ہے کہ ذاتی تاثر کسی چیز کا نہ رہے تب ہی ملک مال کے فتنوں سے بچاؤ ہو سکتا ہے اور اللہ کے لیے ہر کسی سے معاملہ کرنا آجاوے۔ جب روپیہ نہ ہو تو بھی متاثر نہ ہو اور جب روپیہ آجائے تو اس سے بھی متاثر نہ ہو۔ ایسے ہی لوگ مسائح ہیں جو مخلوق کا تاثر ختم کر دیں۔ غرض یہ کہ اسوقت کے بگاڑ کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم سب جو اللہ پاک کے حکموں پر جان کھپانے والے ہوتے۔ وہ مخلوق پر جان کھپانے اور اسی سے لینے کے غلط تصور کے عادی ہو گئے، اللہ پاک کے حکموں پر جان کھپانے پر جس قدر اللہ کی مددوں کا یقین ہوگا اسی قدر غیب سے دروازے کھلتے جاویں گے، اگر خدا کے دین کے لیے جان کھپانے والوں کی مقدار بڑھے اور اس پر یقین ہو تو چونکہ ساری مخلوقات اللہ کی ذات سے وابستہ ہے۔ ہماری مرغوبات ہوں یا مکروہات اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو دنوں کو پوری طرح مخلوق میں اللہ پاک کا یقین پیدا کرنے کے لیے ٹھوکریں کھائیں اور راتوں کو اس کی جناب میں پوری طرح گریہ وزاری سے دعائیں مانگیں تو انشاء اللہ ہر طرح اجتماعی وانفرادی احوال درست اور موافق ہو جائیں گے۔

مُسلمانوں کو اُمّت بننے کی دعوت

{ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وصال سے تین دن پہلے یعنی ۲۶ ذیقعدہ (مطابق ۳۰ مارچ) منگل کے دن، بعد نماز فجر رائیونڈ (ضلع لاہور) میں ایک اہم تقریر فرمائی تھی (یہ آپ کی زندگی کی اہم آخری تقریر تھی۔) ہمیں یہ تقریر مولانا عبدالعزیز صاحب کھلنوی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے ـــــ یہ پوری تقریر ۲۶ صفحہ کی تھی، صفحات میں گنجائش کی کمی اور ناظرین کی سہولت فہم کے لیے ہم کسی قدر اختصار اور لفظی ترمیم کے ساتھ اس کو ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ ہم نے اسکی کوشش کی ہے کہ اس کا کوئی اہم حصہ چھوٹنے نہ پائے۔ حضرت مولانا مرحوم نے حمد و صلوٰۃ کے بعد خلاف عادت تقریر اس طرح شروع فرمائی }

"دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ اس کے باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں، جو سمجھ کے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اسے نپکائے گا ورنہ اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارے گا"

اس کے بعد فرمایا:-

"یہ اُمت بڑی مشقت سے بنی ہے اس کو امت بنانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے بڑی مشقتیں اُٹھائی ہیں اور ان کے دشمنوں یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اسکی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک اُمت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اب مسلمان اپنا امت بنا (یعنی اُمت ہونے کی صفت) کھو چکے ہیں، جب تک یہ اُمت بنے ہوئے تھے چند لاکھ ساری دنیا پر بھاری تھے، ایک پکا مکان نہیں تھا، مسجد تک پکی نہیں تھی، مسجد میں چراغ تک نہیں جلتا تھا، مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے۔ سب سے پہلا چراغ جلانے والے تمیم داریؓ

ہیں وہ ۹ سنہ ھ میں اسلام لائے ہیں ـــ اور ۹ سنہ ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک اُمت بن چکے تھے تو جب یہ سب کچھ ہو گیا۔ اس وقت مسجد نبوی میں چراغ جلا، لیکن حضور جو نور ہدایت لیکر تشریف لائے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور امت بن چکی تھی، پھر یہ امت دنیا میں اُٹھی جدھر کو نکلی ملک کے ملک پیروں میں گرے .... یہ امت اسطرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا، مال و جائداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ و رسول کیا فرماتے ہیں، امت جب ہی بنتی ہے جب اللہ و رسول کے حکم کے مقابلہ میں سارے رشتے اور سارے تعلقات کٹ جائیں۔ جب مسلمان ایک اُمت تھے تو ایک مسلمان کے کہیں قتل ہو جانے سے ساری اُمت ہل جاتی تھی اب ہزاروں لاکھوں کے گلے کٹتے ہیں اور کانوں پہ جوں نہیں رینگتی۔

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے آگے آپ نے فرمایا۔

اُمت کسی ایک قوم اور ایک علاقہ کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سیکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جُڑ کر اُمت بنتی ہے جو کوئی کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ اُمت کو ذبح کرتا ہے اور اُس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ کی اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے ـــ امت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی اُمت کو کاٹا ہے ـــ اگر مسلمان اب پھر امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم اُمت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے آگے آپ نے فرمایا:۔

مسلمان ساری دنیا میں اس لیے پٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اُس نے امت پنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے میں یہ دل کے غم کی باتیں کہہ رہا ہوں، ساری تباہی اس

جیسے ہے کہ اُمت اُمت نہ رہی بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ اُمت کیا ہے اور حضورؐ نے کس طرح امت بنائی تھی۔

اُمت ہونے کے لیے اور مسلمانوں کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو، ذکر ہو، مدرسہ ہو، مدرسہ کی تعلیم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ابن ملجم ایسا نمازی اور ایسا ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اسکی زبان کاٹنی چاہی تو اس نے کہا سب کچھ کر لو لیکن میری زبان مت کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا ہے کہ علی کا قاتل میری اُمت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہوگا، اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھ دی، حالانکہ انھوں نے ہی اکبر کو گمراہ کرکے دین کو برباد کیا تھا۔ تو جو باتیں ابن ملجم اور ابوالفضل فیضی میں تھیں وہ اُمت بننے کے لیے اور خدا کی غیبی نصرت کے لیے کیسے کافی ہوسکتی ہیں۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے آگے حضرت مولانا نے فرمایا:۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھی دینداری کے لحاظ سے بہترین مجموعہ تھے، وہ جب سرحدی علاقے میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنالیا تو شیطان نے وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ یہ دوسرے علاقے کے لوگ اپنی بات یہاں کیوں چلائے۔ انھوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی، ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کردیے گئے اور اس طرح خود مسلمانوں نے علاقائی بنیاد پر امت بننے کو توڑ دیا، اللہ نے اسکی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا ــــ

یاد رکھو میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب امت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارہ میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجہ میں انصار اور مہاجرین میں تفریق ہوجاتی۔) اُس کا نتیجہ حضرت سعد کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑا۔ روایات میں یہ ہے کہ ان کو جنات نے قتل کردیا اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی اور بولنے والا کوئی نظر نہ آیا۔

قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہ (۱)

رمیناہ بسہم فلم یخط فؤادہ

اس واقعہ نے مثال قائم کردی اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقہ کی بنیاد پر اُمت بننے کو توڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا۔

اُمت جب بنے گی جب اُمت کے سب طبقے بلا تفریق اُس کام میں لگ جائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے کے گئے ہیں۔ اور یاد رکھو اُمت بننے کو توڑنے والی چیز ہیں معاملات اور معاشرت کی خرابیاں۔ ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرتا ہے اور اُس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف پہنچاتا ہے یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور اُمت بنا ٹوٹتا ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے اُمت نہیں بنے گی، امت معاملات اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لیے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کرکے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اس اُمت کو امت بنایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپے آئے اُن کی تقسیم کا مشورہ ہوا، اس وقت اُمت بنی ہوئی تھی، یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلہ یا ایک ہی طبقہ کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے جو حضور کی صحبت کے اعتبار سے بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے، انھوں نے مشورہ سے باہم طے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضورؐ کے قبیلہ والوں کو دیا جائے۔ اسکے بعد حضرت ابوبکرؓ کے قبیلہ والوں کو، پھر حضرت عمرؓ کے قبیلہ والوں کو۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آتے ــــ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپ کے صدقے میں مل رہا ہے، اس لیے بس حضورؐ ہی کے تعلق کو معیار بنایا جائے جو نسب میں آپ سے زیادہ قریب ہوں ان کو زیادہ دیا جائے

(۱) ہم نے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو ہلاک کردیا ہم نے اس کو تیر کا نشانہ بنایا جو ٹھیک اس کے دل پر لگا۔

جو دوم سوم چہارم نمبر پر ہیں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے، اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے اس کے بعد بنی عبد مناف کو پھر قصی کی اولاد کو، پھر کلاب کی، پھر کعب کو، پھر مرہ کی اولاد کو، اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑ جاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہو جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلہ کو اتنے پیچھے ڈال دیا ــــ اس طرح بنی تھی یہ اُمت!

اسی سلسلہ میں آگے فرمایا:

اُمت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو پھوٹ نہ پڑے ــــ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج، تبلیغ سب کچھ کیا ہوگا مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا کیونکہ اسکی کسی بات نے اُمت میں تفریق ڈالی ہوگی، اُس سے کہا جائے گا پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا بھگت لے جس کی وجہ سے اُمت کو نقصان پہنچا، اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس نماز روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور وہ خدا کے عذاب سے بہت ڈرتا ہوگا، مگر اسکو بہت ثواب سے نوازا جائے گا، وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے اسکو بتایا جائے گا کہ تو نے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے اُمت میں پیدا ہونے والا ایک فساد رُک گیا اور رجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہو گیا۔ یہ سب تیرے اسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

اُمت کے بنانے اور بگاڑنے میں جوڑنے اور توڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے، یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے زبان سے ایک بات غلط اور فساد کی نکل جاتی ہے اور اس پر لاٹھی چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کر دیتی ہے اور پھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے ــــ اس لیے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبانوں پر قابو ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے جب بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اور اسکی ہر بات کو سُن رہا ہے۔

اسی سلسلہ میں آگے فرمایا کہ:

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج ان میں پشتوں سے عداوت اور

لڑائی چلی آرہی تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے اور انصار کو اسلام کی توفیق ملی تو حضور کی اور اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہوگئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اسکیم بنائی کہ کسی طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں دونوں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے اُن کی پرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کر دیا۔ پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ حضورؐ سے کسی نے جا کر کہا، آپ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کرو گے، آپ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا، دونوں فریقوں نے محسوس کر لیا کہ ہمیں شیطان نے ورغلایا، دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں " یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ..... الخ

اے مسلمانو خدا سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنا چاہیئے اور مرتے دم تک پورے پورے مُسلم اور خدا کے فرمانبردار بندے بنے رہو ـــــ جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا اس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اسکی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اُسے نہیں بہکا سکے گا ـــــ اور اُمت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔

آگے فرمایا:-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ـــــ اور اللہ کی رسّی کو یعنی اسکی کتاب کو اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رہو یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور اُمت ہونے کی صفت کے ساتھ سب مل جُل کر دین کی رسّی کو تھامے رہو اور اُس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقہ کی بُنیاد پر یا زبان کی بنیاد پر، یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو اور اللہ کے اس احسان کو نہ بھولو کہ اُس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پُشتوں سے تم میں چلی آرہی تھی تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی

بنا دیا اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے بس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچا لیا۔

اس کے آگے فرمایا کہ :-

شیطان تمہارے ساتھ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی کی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر برائی اور فساد سے روکنا ہو۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

اُمت میں ایک گروہ وہ ہو جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلائے۔ ایمان کے لیے اور خیر اور نیکی کے راستہ پر چلنے کے لیے محنت کرتا رہے، نمازوں پر محنت کرے، ذکر پر محنت کرے، حضورؐ کے لائے ہوئے علم پر محنت کرے، برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لیے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے اُمت ایک اُمت بنی رہے ——— آگے فرمایا :

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ ——— جو لوگ ان ہدایتوں کے بعد بھی شیطان کی پیروی کر کے اور الگ الگ راہوں پہ چل کے اختلاف پیدا کریں گے اور اُمت کے امت پنے کو توڑیں گے تو ان پر خدا کی سخت مار پڑے گی (أُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ)

دین کی ساری تعلیم اور ساری چیزیں جوڑنے والی اور جوڑنے کے لیے ہیں نماز میں جوڑ ہے روزہ میں جوڑ ہے، حج میں قوموں اور ملکوں اور مختلف زبان والوں کا جوڑ ہے تعلیم کے حلقے جوڑنے والے ہیں، مسلمانوں کا اکرام اور باہم محبت اور تحائف کا لین دین یہ سب جوڑنے والی اور جنت میں لے جانے والی چیزیں ہیں اور قیامت میں ان اعمال کے لیے محنتیں کرنے والوں کے چہرے نورانی ہوں گے اور ان کے برخلاف باہم بغض، حسد، غیبت، چغل خوری، توہین تحقیر اور دل آزاری یہ سب پھوٹ ڈالنے والے اور توڑنے والے اور دوزخ میں لیجانیوالے اعمال ہیں اور ان اعمال والے آخرت میں روسیاہ ہوں گے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ

اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝
وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جنھوں نے پھوٹ ڈال کے اور پھوٹ ڈالنے والے اعمال کر کے اُمت کو توڑا ہوگا وہ قیامت کے دن تیروں سے کالے منھ اُٹھیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان و اسلام کے بعد کفر والوں کا طریقہ اختیار کیا، اب تم یہاں دوزخ کا عذاب چکھو اور جو ٹھیک راستہ پر چلتے رہے ہوں گے، ان کے چہرے نورانی اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں اور جنت میں رہیں گے۔

میرے بھائیو دوستو! یہ سب آیتیں اس وقت اُتری تھیں۔ جب یہود نے انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی، اور ان کے دو قبیلوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ ان آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی پھوٹ اور لڑائی کو کفر کی بات کہا گیا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے ——— آج ساری دنیا میں امت بنا توڑنے کی محنت چل رہی ہے اس کا علاج اور توڑ یہی ہے کہ تم اپنے کو حضورؐ والی محنت میں لگا دو، مسلمانوں کو مسجدوں میں لاؤ، وہاں ایمان کی باتیں ہوں۔ تعلیم اور ذکر کے حلقے ہوں۔ دین کی محنت کے مشورے ہوں۔ مختلف طبقوں کے اور مختلف برادریوں کے اور مختلف زبانوں والے لوگ مسجد نبوی کے طریقہ پر ان کاموں میں جُڑیں۔ جب امت بنا آئے گا۔ ان باتوں سے نجیب جن سے شیطان کو پھوٹ ڈالنے کا موقع ملے جب تین بیٹھیں تو اس کا خیال رکھیں کہ چوتھا ہمارے ساتھ اللہ ہے، چار پانچ بیٹھیں تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ پانچواں یا چھٹواں اللہ ہمارے ساتھ ہی موجود ہے، اور وہ ہماری ہر بات سُن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ ہم امت بنانے کی بات کر رہے ہیں یا امت پنا توڑنے کی۔ ہم کسی کی غیبت اور چغلخوری تو نہیں کر رہے، کسی کے خلاف سازش تو نہیں کر رہے۔

——— یہ امت حضورؐ کے خون اور خاکوں سے بنی تھی، اب ہم اپنی معمولی معمولی باتوں پر امت کو توڑ رہے ہیں، یاد رکھو نماز جمعہ چھوڑنے پر بھی اتنی پکڑ نہیں ہوگی جتنی امت کے توڑنے پر ہوگی ——— اگر مسلمانوں میں امت پنا آجائے تو وہ دنیا میں ہرگز ذلیل نہ ہوں گے، روس اور امریکہ کی طاقتیں بھی ان کے سامنے جھکیں گی، اور اُمت پنا جب آئے گا جب اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ پر مسلمانوں کا

عمل ہو یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں چھوٹا بننے اور ذلت و تواضع اختیار کرنے کو اپنائے تبلیغ میں اسی کی مشق کرتی ہے۔ جب مسلمانوں میں "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ" والی صفت آجائے گی تو وہ دنیا میں "اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" یعنی کافروں کے مقابلہ میں زبردست اور غالب ضرور ہوں گے چاہے وہ کافر یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔

میرے بھائیو دوستو! اللہ و رسول نے ان باتوں سے شدت اور سختی سے منع فرمایا ہے جن سے دلوں میں فرق پڑے اور پھوٹ کا خطرہ بھی ہو، دو دو چار چار الگ کانا پوسی کریں اس سے شیطان دلوں میں بدگمانی پیدا کرسکتا ہے اس سے منع فرمایا گیا اور اس کو شیطانی کام بتایا گیا۔ "اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" اسی طرح تحقیر اور استہزاء اور تمسخر سے منع فرمایا گیا "لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ" اس سے بھی منع فرمایا گیا کہ دوسرے کی کوئی برائی جو معلوم نہ ہو اس کو تجسس کرکے معلوم کیا جائے اور جو برائی کسی کی معلوم ہوگئی ہو اس کو دوسروں کے سامنے ذکر کرنے سے منع فرمایا گیا، اور غیبت کو حرام کیا گیا، غیبت اس کا نام ہے کہ جو واقعی برائی کسی کی معلوم ہو اس کا ذکر کسی سے کیا جائے "وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا" یہ تحقیر اور تمسخر اور تجسس اور غیبت سب وہ چیزیں ہیں جو آپس میں تفرقہ پیدا کرکے اُمت بننے کو توڑتی ہیں، ان سب کو حرام قرار دیا گیا ــــ اور ایک دوسرے کا اکرام و احترام کرنا جس سے اُمت جڑتی بنتی ہے اس کی تاکید فرمائی گئی اور دوسروں سے اپنا اکرام چاہنے سے منع کیا گیا، کیونکہ اس سے امت بنتی نہیں بگڑتی ہے۔ امت جب بنے گی جب ہر آدمی یہ طے کرے کہ میں عزت کے قابل نہیں ہوں اس لیے مجھے عزت لینی نہیں، بلکہ دوسروں کی عزت کرنی ہے اور دوسرے سب لوگ اس قابل ہیں کہ میں ان کی عزت کروں، ان کا اکرام کروں۔

اپنے نفسوں اور اپنی ذاتوں کو قربان کیا جائے گا تو امت بنے گی اور امت بنے گی تو عزت ملے گی، عزت اور ذلت روس اور امریکہ کے نقشوں میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور اُس کے ہاں اُصول اور ضابطہ ہے۔ جو شخص یا قوم، خاندان طبقہ جمکانیوالے اصول اور اعمال لاوے گا اس کو چمکا دیں گے جو مٹنے والے کام کرے گا اس کو مٹا دیں گے۔ یہود

نبیوں کی اولاد ہیں اصول توڑے تو اللہ نے ٹھوکر مار کے اُن کو توڑ دیا۔ صحابہ کرامؓ بُت پرستوں کی اولاد تھے، انھوں نے چمکانے والے اصول اختیار کیے تو اللہ نے ان کو چمکا دیا، اللہ کی خانہ زادی کسی سے نہیں ہے اس کے ہاں اصول اور ضابطہ ہے۔

دوستو! اپنے کو اس محنت پر جھونک دو، حضور کی امت میں امت بنا آجائے۔ امیں ایمان ویقین آجائے، یہ ذکر و تسبیح اور تعلیم والی، خدا کے سامنے جھکنے والی، خدمت کرنیوالی، برداشت کرنے والی، دوسروں کا اعزاز واکرام کرنے والی امت بن جائے، بخوبی نہ کرنے والی، نافرمانی نہ کرنے والی، اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کی تحقیر و تمسخر اور تجسس و غیبت نہ کرنے والی امت بن جائے ـــــ اگر کسی ایک علاقہ میں بھی یہ محنت اس طرح ہونے لگے جس طرح ہونی چاہیے تو ساری دنیا میں بات چل پڑے۔

اب اس کا اہتمام کرو کہ مختلف قوموں، علاقوں اور طبقوں اور مختلف زبان والوں کو جوڑ جوڑ کر جماعتوں میں بھیجو اور اصول کی پابندی کراؤ۔ پھر انشاء اللہ امت بننے والا کام ہوگا اور شیطان اور نفس خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے

اس کے بعد حضرت مولانا نے دیہات میں محنت کرنے اور فضا بنانے پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ـــ اور سب معمول دُعا پر تقریر ختم ہوئی۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ

اور

اُن کی دینی دعوت

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

اس کتاب میں حضرت مولاناؒ کے ذاتی حالات، کمالات اور سوانح کے علاوہ اُنکی اس دینی دعوت کے اُصول اور فکری بنیادوں کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو ہمارے اس عہد کی بلا شبہ سب سے وسیع و عمیق دینی و اصلاحی دعوت ہے، شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کا فاضلانہ اور عارفانہ مقدمہ ہے۔

قیمت ۲/۵۰ ـــــ مجلد ۳/۰

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ۔ لکھنؤ

مولانا کا طرزِ فکر

چند جھلکیاں

[اس عاجز کے پاس حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مختلف تقریروں کے کچھ منتشر نوٹس تھے۔ یہ سارے نوٹس صرف اشارات میں تھے جو دراصل خود اپنے استفادہ اور اپنی یادداشت کے لیے نوٹ کیے گئے تھے۔ ان میں سے چند ٹکڑے مرتب کرکے ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ ہر ٹکڑے کے مضمون کے متعلق پورا اطمینان ہے کہ وہ حضرت مولانا ہی کا ہے لیکن الفاظ کی ذمہ داری ناقابل اس عاجز پر ہے۔ اسی طرح آیات قرآنی کے جو ترجمے کیے گئے ہیں ان کا ذمہ دار بھی یہ ناچیز ہی ہے۔

یہ مختلف تقریروں کے الگ الگ اجزاء ہیں، اب یہ بھی پتہ نہیں کہ ان میں سے کون تقریر کس زمانہ میں کی گئی تھی۔ بعض لوگوں نے مولانا کی تقریریں سنی ہیں اور ان کی دینی دعوت کو بنیادی طور پر سمجھا ہے۔ امید ہے کہ یہ ٹکڑے انھیں بہت کچھ یاد دلائیں گے اور وہ ان میں اپنے لیے رہنمائی کا کافی سامان پائیں گے۔

محمد منظور نعمانی]

---

(۱)

یہ خیال غلط ہے کہ ملک و مال ہاتھ میں آجانے سے اسلام چمکے گا۔ ملک و مال والے تو اسلام کو زندہ درگور کر رہے ہیں۔ آج جن کے ہاتھوں میں حکومت اور اس کے خزانے ہیں وہ ابوبکر و عمر کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ قیصر و کسریٰ اور شداد و قارون کے نمائندے ہیں۔ ان سے حیات اسلامی کی توقع بالکل غلط ہے ان کے ہاتھوں اسلام کا جو حال ہے اس کو دیکھ کے تو دل کہتا ہے۔

"اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" ——— (اللہ اس مردے میں اب کیسے جان ڈالیگا)

اسلام جب بھی چمکا ہے قربانیوں سے چمکا ہے آج بھی قربانیوں ہی سے چمکے گا۔ اسلام کے لیے اگر قربانیاں ہوں تو یہ دشمنوں کے گھیرے میں بھی چمکتا ہے اور جب قربانیاں نہ ہوں تو اپنی بادشاہت میں مٹ جاتا ہے۔

جو لوگ اخلاص کے ساتھ قربانیاں دیتے رہیں گے۔ ان کی طرف ملک و مال والے ایک دن خود رجوع ہوں گے، وہ وقت بڑی آزمائش کا ہوگا۔ اگر نظر ان کی حکومت اور دولت پر ہوگئی اور یہ سمجھا گیا کہ اب ان کی دولت اور حکومت سے دین کا کام چلے گا تو سب کیا دھرا برباد ہو جائے گا اور اگر ان کے ملک و مال سے نظر ہٹا کے ان کو بھی قربانی کے راستہ پر لگایا گیا تو پھر ان سے بھی بڑے آئیں گے۔ ان کے ساتھ بھی یہی کرنا ہوگا یہاں تک کہ حکومتوں کے صدور اور وزرائے اعظم آئیں گے ان کو بھی اسی راستہ پر لگانا ہوگا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ دعوت اور قربانی کا راستہ ہے ملک و مال کا راستہ نہیں ہے۔

ایسوں کی ضرورت ہے جو روس اور امریکہ کی مادی فضاؤں میں بھی اسی یقین پر جمے رہیں کہ دین صرف دعوت کے راستہ کی قربانیوں سے اور قربانیوں کے بعد کی دعاؤں سے چمکے گا اور اس یقین پر دعوت کے راستہ میں قربانیاں دیتے رہیں، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہر اور کن فیکونی شان پر نگاہ رکھتے ہوئے امید و یقین کے ساتھ ہدایت کی اور جن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور ان کی وجہ سے ہدایت کا راستہ رک رہا ہے ان کی بربادی کی دعائیں کریں۔ پھر یا تو ہدایت کے دروازے کھلیں گے یا وہ ہوگا جو شداد و نمرود اور فرعون و ہامان کے ساتھ ہوا۔

(۲)

تم دنیا میں سورج کی طرح نور کے ساتھ پھرو گے تو تم سے دنیا میں نور پھیلے گا اور نور تمہارے اندر ایمان سے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم والے اعمال و اخلاق سے اور اخلاص کے ساتھ دین کی دعوت سے آئے گا ——— سورج میں تین باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نور کے ساتھ پھرتا ہے، دوسرے مسلسل پھرتا ہے، تیسرے یہ کہ جن کو روشنی پہونچاتا ہے ان سے خود کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ تمہارا حال بھی یہی ہونا چاہیے، نور کے ساتھ پھرو، مسلسل پھرو

اور "لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا" کو اپنا اصول بناؤ، دعوت کے عمل سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ

(۳)

آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو ترقیاں نظر آ رہی ہیں وہ مادہ پر محنت کا نتیجہ ہے انبیاء علیہم السلام کا راستہ روح پر محنت اور روحانی ترقی کا راستہ تھا۔ وہ اللہ کی رضا والے اعمال پر محنت کر کے اور قربانیاں دے کے اللہ کی طاقت سے اپنے مسائل حل کراتے تھے ـــــ فرعون کے پاس فوج تھی، لشکر تھا اور ہر قسم کی مادی طاقت تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بس روح کی ترقی والے اور اللہ کی رضا والے اعمال کے لیے تیار کیا ان سے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم نے ایمان والا راستہ اختیار کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ کرو اور پورے ایمان و یقین اور اعتماد کے ساتھ اس سے مدد مانگو۔ (یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝)

قوم نے کہا ہم نے آپ کی بات مان لی اور اللہ پر یقین و توکل کا راستہ اختیار کر لیا اور ہم اپنے اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ فرعون اور فرعونی حکومت کے ظلم و ستم سے ہماری حفاظت فرمائے اور اس کافر قوم کی غلامی کی مصیبت سے ہمیں نجات دلائے۔ (رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝)

اس کے بعد قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون کو حکم دیا کہ اپنی قوم کی ایمانی تربیت کے لیے مصر میں خاص مرکز اور عبادت خانے قائم کرو اور اقامت صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق جوڑو اور ان کی زندگی کو اللہ کی فرمانبرداری والی زندگی بناؤ اور ساتھ ہی فرمایا گیا کہ جب یہ باتیں عمل میں آجائیں تو قوم کو بشارت سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور اللہ کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ (وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝)

حضرت موسیٰ اور ہارون اللہ کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کی تربیت میں لگ گئے اور بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ کا عمل اور تبلیغ کی محنت شروع کر دی تو حضرت موسیٰ اور ہارون نے دعا کی کہ خداوندا تو نے فرعون اور

فرعونیوں کو دنیا کے جو ساز و سامان دے رکھے ہیں وہ ان کے ذریعہ تیرے بندوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اے مالک تو ان کے مال و دولت کو ملیامیٹ کر دے۔ اور بھاڑ پھیرے (وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ دہاروں کی دعا قبول فرمائی۔ ان کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ وہ نکل گئے۔ اللہ نے ان کیلئے سمندر میں راستہ بنا دیا جس سے وہ صحیح سلامت پار ہو گئے۔ فرعون نے اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور وہ اپنے پورے لشکر کے ساتھ اسی میں غرق کر دیا گیا۔ یہ جو کچھ ہوا براہ راست اللہ کی طاقت سے ہوا۔

انبیاء علیہم السلام کا راستہ یہی ہے۔ وہ اپنے کو اور اپنے ساتھیوں کو بس اللہ کے حکموں پر ڈال دیتے ہیں اور اللہ کے راستے میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں، قربانیاں دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی طاقت سے ان کے مسائل حل کرتا ہے ـــــ قرآن پاک میں اس کو "سنۃ اللہ" کہا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ازلی ابدی قانون ہے۔

فلن تجد لسنة الله تبديلا ولن تجد لسنة الله تحويلا

(۴)

آج کل اس دنیا میں چیزوں کے حاصل کرنے کے لیے براہ راست چیزوں پر محنت کرنے کا رواج ہے، کھیت والے کھیت سے غلہ حاصل کرنے کے لیے بس کھیت ہی پر محنت کرتے ہیں، تجارت اور سوداگری والے اور کارخانوں والے بس دوکانوں اور کارخانوں پر محنت کرتے ہیں، یہی محنت آج کل عام ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ محنت و مجاہدہ کر کے اپنے اندر تقویٰ پیدا کیا جائے اور پھر اللہ تعالیٰ انعام کے طور پر اپنے خزانۂ غیب سے چیزیں نصیب فرمائے اور برکت فرمائے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ"

اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اسکے واسطے راستے پیدا کریں گے اس کو وہاں سے روزی عطا فرمائیں گے جہاں سوائے وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

اور فرمایا گیا ہے۔

"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا"

اور جو تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے کاموں کو آسان کر دیں گے۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ"

اور اگر ان لوگوں میں ایمان اور تقویٰ کی صفات ہوتیں تو ہم ان پر زمین و آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

ان آیتوں میں تقویٰ پر جو کچھ وعدہ فرمایا گیا ہے اس کا تعلق اسی دنیا سے ہے۔

اور یہ بات کہ تقویٰ کیا ہے اس کی تفصیل اس آیت سے معلوم ہوگی۔ اس آیت میں تقویٰ کی ساری شرطیں بیان کر دی گئی ہیں۔

"لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ

نیکی کا معیار یہ نہیں ہے کہ تم مشرق کی طرف رخ کر دیا مغرب کی طرف بلکہ اصل نیکی ان کی ہے (اور اللہ کی نگاہ میں نیکوکار ہیں) جو ایمان رکھتے ہوں اللہ پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر اور اس کے نبیوں پر اور دیویں اپنا مال اس کی چاہت کے باوجود اہل قرابت کو اور یتیموں مسکینوں کو اور (ضرورتمند) مسافروں کو اور سائلوں کو اور غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ اور وفا کرنے والے اپنے عہد کے جب عہد کریں اور صبر و برداشت سے کام لینے والے تنگی اور تکلیف میں اور ثابت قدم رہنے

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

والے، جنگ کے وقت یہی بندے ہیں سچے اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کے متقی ہونے کے لیے یہ چند باتیں ضروری ہیں۔

ایک ایمان باللہ۔ یعنی اس حقیقت کا پورا یقین کہ سب کچھ اللہ کی ذات سے ہوتا ہے اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے بس اسی کو راضی کرنے کی فکر کرنی چاہیے اور اسی کے لیے مرنا مٹنا چاہیے۔

دوسرے ایمان بالیوم الآخر۔ یعنی اس حقیقت کا یقین کہ یہ زندگی اصل زندگی نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے خاتمہ کے بعد ایک دوسری زندگی اور دوسرا عالم ہے اور وہی اصل عالم اور اصل زندگی ہے اور یہ چند روزہ زندگی بس اس کی تیاری کے لیے ہے اور انسان کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار اسی اخروی زندگی کی کامیابی اور ناکامی پر ہے۔

تیسرے ایمان بالملٰئکہ یعنی اس بات کا یقین کہ یہ عالم جن ظاہری اسباب سے چلتا ہوا نظر آتا ہے دراصل ان اسباب سے نہیں چل رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے باطنی نظام کے ذریعہ اس سارے ظاہری نظام کو چلا رہا ہے۔ مثلاً ہمیں نظر آتا ہے کہ بارش بادلوں سے اور ہواؤں سے ہوتی ہے اور زمین کی چیزیں بارش کے پانی سے اگتی ہیں۔ ملائکہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بات کا یقین کریں کہ اللہ تعالیٰ یہ سارے کام دراصل فرشتوں سے کرا رہا ہے۔ گویا ان ظاہری اسباب کے پیچھے فرشتوں کا نظر نہ آنے والا نظام ہے، اور اس کے پیچھے اللہ کی ذات اور اس کا حکم اور اس کی مشیت ہے۔

چوتھے ایمان بالکتاب والنبیین۔ یعنی اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں کے بارہ میں یقین کہ یقینی علم وہی ہے جو اللہ کی کتابوں میں ہے اور جو نبیوں کے ذریعہ انسانوں کو ملا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ غیر یقینی ہے اور ناقص ہے مثلاً انسانوں کی فلاح اور کامیابی کا راستہ وہی ہے جو اللہ کے نبیوں نے اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں نے بتایا ہے، اگر دنیا بھر کے فلسفی اور دنیا بھر کے لیڈر اس کے خلاف کہتے ہیں اور سوچتے ہیں تو غلط ہے اور ان کا جہل ہے۔

یہ چار باتیں ایمان و یقین کی لائن کی تھیں یعنی متقی ہونے کی پہلی شرط یہ بتلائی گئی کہ ان چار باتوں کے بارہ میں یقین صحیح ہو۔ اس کے بعد فرمایا گیا "وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ" یعنی ایمان و یقین کی درستی کے ساتھ وہ مالیات کو بھی اس یقین کے مطابق بنائیں، مال کی طبعی چاہت اور اس سے دل چسپی اور محبت کے باوجود اپنا کمایا ہوا مال وہ اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے نبیوں اور کتابوں کی تعلیم کے مطابق اپنے ماحول کے ضرورت مندوں پر خرچ کریں، قرابت داروں پر خرچ کریں، یتیموں مسکینوں پر خرچ کریں بے چارے پردیسیوں کا بندوبست کریں، حاجت مند سائلوں کو دیں، غلاموں کو آزاد کرانے پر خرچ کریں۔ غرض اپنی کمائی دوسروں پر لگائیں اور اس سے دوسروں کو آرام اور نفع پہونچائیں۔

اس کے بعد تیسری شرط تقویٰ کی یہ بتائی گئی کہ نماز قائم کریں جس کا مطلب یہ ہے کہ پورے اہتمام سے اچھی سے اچھی نماز پڑھنے کی کوشش کریں۔

چوتھی شرط یہ بتائی گئی کہ زکوٰۃ بھی اہتمام سے ادا کریں۔

آخر میں اخلاقیات کی درستی کی شرط بیان کی گئی "وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ" یعنی ان میں وفائے عہد ہو، اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا کریں اور تنگیوں اور تکلیفوں میں اور جنگ اور قربانی کے میدانوں میں صبر اور برداشت سے کام لینے والے ہوں، حالات کیسے ہی مخالف ہوں مگر ان کے پاؤں میں لغزش نہ آئے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ "أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ" کہ یہی اللہ کے سچے بندے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ان سب رخوں پر محنت کرنی ہوگی۔ ایمان و یقین کے لیے محنت، مالیات کے درست کرنے پر محنت، نماز پر محنت، زکوٰۃ پر محنت، اخلاق کی درستی پر محنت، جب یہ سب چیزیں صحیح ہو جائیں گی اس وقت آدمی متقی ہوگا اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ

غریب اس کے مسائل حل کرے گا، اس کے لیے پر کتوں کے دروازے کھلیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقویٰ پر جو انعامات اس دنیا میں ہوتے ہیں اور متقی بندوں کے مسائل جو حل کیے جاتے ہیں ان کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔

اکثر تو ایسا ہوتا ہے کسی متقی بندے کو کسی چیز کی ضرورت پیش آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندہ کے دل میں ڈالا اور اس نے وہی چیز ہدیہ کے طور پر پیش کر دی یہ بہت عام اور متعارف طریقہ ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ضرورت پیش آئی اور اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی واسطہ سے اپنے فضل سے اس کو حل فرما دیا۔ مثلاً ایک بندہ بیمار ہوا، اسے بیماری کی تکلیف شروع ہوئی اس نے اللہ سے شفا کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر حکیم، ڈاکٹر اور بغیر دوا کے شفا عطا فرما دی۔

کبھی کسی بندہ کی ضرورت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ اپنے کسی دوسرے بندہ کو خواب میں بھی مطلع فرماتے ہیں۔ حسن ابن سفیان ایک بزرگ ہیں، ان کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ اور ان کے دو ساتھی علم حدیث اور دین کی طلب میں نکلے ایک شہر میں قیام کیا، جو تھوڑا بہت اپنے پاس تھا سب ختم ہو گیا اس کے بعد جب فاقوں پر فاقے آنے لگے تو انھوں نے طے کیا کہ اب ہم ایسی حالت میں ہیں کہ ہمارے لیے سوال جائز ہے۔ مشورہ سے طے ہوا کہ حسن ابن سفیان جائیں اور کسی سے کچھ مانگ کے لائیں، یہ بے چارے نکلے لیکن انہیں شرم آئی کہ کسی مخلوق سے سوال کریں، تنہائی کا کونا گوشہ تلاش کیا اور صلوٰۃ حاجت پڑھ کر اللہ سے دعا کی۔ اور واپس آگئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میں تو کسی سے سوال نہیں کر سکا۔ میں نے بھی دعا کی ہے اور تم بھی بس اللہ سے دعا کرو۔ اسی رات کو شہر کے امیر نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص اس کو آسمان کی طرف سے بڑے جلال کے انداز میں پکار رہا ہے، نگاہ اٹھا کے دیکھا تو نظر آیا کہ ایک شخص غصہ میں بھرا ہوا ہے اور نیزہ اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ نیزے کا رخ امیر کی طرف کر کے ڈانٹ کے کہہ رہا ہے

ادرك الحسن سفيان واصحابه قبل ان يموتوا۔

حسن ابن سفیان اور ان کے ساتھیوں کی خبر لے قبل اس کے کہ ان بیچاروں کا خاتمہ ہو جائے

خواب ہی میں یہ بھی اشارہ ملا کہ وہ شہر کی کسی مسجد میں ہیں۔ امیر نے اٹھتے ہی شہر میں ان کی تلاش شروع کرائی اور جب حکومت کے بعض کارندوں نے ان لوگوں کو تلاش کر لیا اور پا لیا اور امیر کی طرف سے کچھ اشرفیاں ان کو پہونچائیں اور ان سے کہا کہ امیر آپ سے ملنا چاہتے ہیں تو یہ اللہ کے بندے خاموشی کے ساتھ شہر سے غائب ہو گئے تاکہ لوگوں پر ان کا راز نہ کھلے ——— تو اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کے مسائل کبھی اس طرح بھی حل کرا تا ہے۔

اور سب سے زیادہ عجیب واقعہ تو مشہور صحابی حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کا ہے جو حدیث کی کتابوں میں مروی ہے۔ واقعہ یوں روایت کیا گیا ہے کہ وہ اور ان کے گھر والے سخت فقر و فاقہ کی حالت میں تھے گھر میں کچھ نہ تھا بس اللہ سے دعائیں کرتے تھے اسی حال میں ایک چوہا حضرت مقداد کے سامنے سے گزرا آپ نے اس پر اپنی چادر ڈال کر یا کسی طرح اس کو پکڑ کر بند کر لیا تھوڑی دیر میں اس کا جوڑا آیا اس نے اپنے ساتھی کو گرفتار دیکھا وہ اپنے بل میں گیا اور ایک دینار اپنے منھ میں لے کر آیا اور حضرت مقداد کے سامنے ڈال دیا اور دور بیٹھا دیکھتا رہا کچھ دیر کے بعد پھر بل میں گیا اور ایک دینار اور اسی طرح لا کر اس نے سامنے ڈال دیا اس طرح یکے بعد دیگرے سو دینار اس نے بل سے نکال کے حضرت مقداد کے سامنے ڈال دیئے وہ گویا اپنے اس طرز عمل سے اور زبان حال سے حضرت مقداد سے عرض کرتا تھا کہ یہ اشرفیاں بطور فدیہ کے قبول کر لو اور میرے ساتھی کو چھوڑ دو۔ آخر میں وہ ایک دینار اور لایا اور اس کے ساتھ ایک بیٹھا ہوا کپڑا ابھی بل میں سے لایا۔ اس طرح گویا اس نے حضرت مقداد کو بتایا کہ اب کچھ نہیں رہا جو کچھ تھا وہ سب میں نے حاضر کر دیا حضرت مقداد نے اس چوہے کو چھوڑ دیا اور دونوں چوہے خوشی خوشی اچھلتے کودتے اپنے بل میں چلے گئے۔ اور ان سترہ اشرفیوں کو حضرت مقداد نے اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھا۔ اور اپنی ضرورتوں میں ان کو استعمال کیا ——— تو کبھی ایسے غیر معمولی اور حیرت انگیز طریقوں سے بھی متقی بندوں کی مدد کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے فضل کے طریقے بے شمار ہیں۔ اللہ کے سوا ان کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

اب دنیا میں صرف مادہ پرستی اور مادی چیزوں پر محنت کا رواج ہے۔ تقویٰ پیدا کر کے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق قائم کر کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے لینے کا راستہ لوگ

بالکل بھول گئے ہیں۔ حالانکہ یہی راستہ ہے جس کی دعا ہر نماز کی ہر رکعت میں کی جاتی ہے۔

ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، اس میں سب سے پہلے اس یقین کو تازہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے، وہی سب کا پروردگار اور کارساز ہے، وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ دنیا کے علاوہ عالم آخرت کا مالک بھی وہی ہے، اور اس کی ذات وصفات سے اور اس کی ربوبیت اور رحمت سے استفادہ کا طریقہ یہ ہے کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کو بس اس کی عبادت ہو اور اس سے دعا ہو، یہی صراط مستقیم ہے جو انبیاء اور صدیقین، شہداء اور صالحین کا راستہ ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنے دشمنوں کی بے پناہ اکثریت کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل کی اسی راستہ سے حاصل کی، حضرت ابراہیمؑ کو جو کامیابی نمرود کی حکومت کے مقابلے میں حاصل ہوئی اسی راستہ سے حاصل ہوئی، حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو فرعون اور اس کی فوج کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ اسی "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے راستہ سے حاصل ہوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا راستہ بھی یہی تھا، اسی راستہ کی ہدایت کی دعا ہر نماز کی ہر رکعت میں اس طرح کی جاتی ہے "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ہ"

بہر حال اللہ کے سارے نبیوں، رسولوں اور ان کی راہ پر چلنے والے سب مقبول بندوں کا راستہ یہی ہے۔ اور اس کے برعکس جو لوگ اللہ کی ہدایت سے محروم ہیں اور جن پر خدا کا غضب ہے ان کا راستہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی ذات وصفات کے یقین اور عبادت واستعانت سے بالکل بے پروا اور بے فکر ہو کر صرف مادی اسبابوں پر محنت کرتے ہیں۔

(۵)

انبیاء علیہم السلام کا پیغام اور تجربہ یہ ہے کہ مسئلوں کا حل اور کامیابی نہ مال میں ہے، نہ حکومت میں، نہ اکثریت میں، بلکہ اللہ کے امر سے وابستہ ہو جانے میں اور اس کی راہ میں مجاہدہ کرنے میں ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو واقعات بیان فرمائے گئے ہیں ان سب کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا واقعہ، حضرت ابراہیمؑ اور ان کی قوم اور نمرود کا واقعہ، اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور فرعون وقارون کا واقعہ قرآن مجید میں پڑھیے اور غور

کیجئے۔ ان سب واقعات کی روح یہی ہے کہ اکثریت اور دولت اور حکومت کچھ نہیں اصل چیز اللہ کا فیصلہ اور اس کی مدد ہے اور وہ ان بندوں کے ساتھ ہے جو اس کے ہو جائیں اور اس کی راہ میں قربانیاں دیں۔

(۶)

اللہ تعالیٰ کی مدد ذاتوں اور شخصیتوں کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ ان کے اعمال اور اخلاق اور اوصاف کی وجہ سے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مدد فرمائی اسی طرح آپ کے صحابہ کرام اور بعد میں اولیاء کرام پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات ہوئے اور ان کی جو مدد کی فرمائی گئیں وہ ان کی شخصیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے اعمال اور خاص کر اللہ کے لیے ان کی قربانیوں اور دین کے راستہ کی ان کی محنتوں کی وجہ سے فرمائی گئیں آج بھی جو کوئی اللہ کی وہ مدد چاہے وہ ان کے والے اعمال اور ان کی والی قربانی اور محنتوں کے راستہ پر پڑ جائے۔ وہ اللہ کی مدد کو آتا ہوا خود آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

اللہ کی نصرت اور غیبی مدد کا استحقاق اسی وقت تک رہتا ہے جب تک نظر بس اللہ پر ہو اور یقین ہو کہ ہم سے یا کسی سے کچھ نہ ہو سکے گا، جو کچھ ہوگا صرف اللہ کی مدد اور اس کے کرم سے ہوگا ـــــ غزوہ بدر اور خندق میں مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ اللہ کے سوا کوئی سہارا اور کوئی پناہ کی جگہ ان کے سامنے نہیں تھی، اپنی کسی چیز پر ذرا بھی اعتماد نہیں تھا اس لیے نظر صرف اللہ کے کرم اور اس کی نصرت پر تھی، تو پوری نصرت اور بھرپور مدد ہوئی۔ اور اس کے برخلاف غزوۂ احد اور غزوۂ حنین میں جب اپنی تعداد اور تیاریوں پر بھی کچھ اعتماد پیدا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا ہاتھ کھینچ لیا گیا۔

(۷)

مسلمانوں میں دین کی رسم اور صورت موجود ہے۔ اس تبلیغی جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ ان میں دین کی روح اور حقیقت آجائے۔ ان میں دین کے منتشر اجزاء موجود ہیں تبلیغ کا مقصد یہ ہے کہ ان میں پورا دین اپنی صحیح ترتیب کے ساتھ آجائے ـــــ یہ چھ نمبر جن پر تبلیغ میں زور دیا جاتا ہے اور جن کی مشق کرائی جاتی ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان صحیح ترتیب کے ساتھ

دین پر پڑ جائیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور آخرت کے ثواب و عذاب پر نظر رکھ کے زندگی گزارنا ان کا مزاج بن جائے۔

(۸)

آج دین کے جن احکام پر مسلمان عمل نہیں کر رہے ہیں خواہ وہ احکام کسی شعبہ کے ہوں ان پر عمل کرنے سے یا تو مسلمانوں کے مال پر زد پڑتی ہے یا جان و جسم پر یا خواہشات پر اس لیے ان احکام پر عمل کرنا ان کے لیے سخت مشکل ہو رہا ہے اور وہ اسلام کے ماننے کے باوجود اس کے احکام کے خلاف زندگیاں گزار رہے ہیں ـــــ ہماری یہ جدوجہد جس کا نام تبلیغ ہے اور اس کے چھ نمبر اس مشکل کو حل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ ان نمبروں میں مسلسل مشغولیت اور ان کی مشق کے ذریعہ مسلمانوں کی زندگی کا رخ ان چیزوں کی طرف سے مڑ کر جن کی طرف پڑ گیا ہے اللہ کے اوامر اور احکام کی طرف ہو جائے اور پھر وہ اس کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں تکلیفیں اور نقصانات برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔

(۹)

ہمارے اس تبلیغی کام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے احکام کی پابندی والی زندگی گزارنے لگیں۔ چھ نمبروں کی پابندی اور مشق سے ان میں یہ بات آسکتی ہے ـــــ لیکن ان نمبروں کے الفاظ سے جو مطلب عام لوگ سمجھتے ہیں اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کا جو مطلب ہم سمجھتے ہیں اور بتاتے ہیں اس کے مطابق کرنے اور لگنے سے ان شاء اللہ وہ بات پیدا ہو جائے گی کہ جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصانوں کے باوجود اور نفس کی خواہشات کے خلاف ہونے کے باوجود لوگ اللہ کے احکام پر چلیں گے۔

(۱۰)

اسلام میں جن اعمال کا حکم دیا گیا ہے اور جن کے عوض ثواب کا اور جنت کا وعدہ کیا گیا ہے یہ وہ چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ کی نیابت ہو مثلاً رحم کا حکم ہے، احسان کا حکم ہے، سخاوت اور فیاضی کا حکم ہے، عدل و انصاف کا حکم ہے، مجرموں کو سزا دینے کا حکم ہے۔ ان اعمال اور اخلاق کی حیثیت یہ ہے کہ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی صفات

اور اس کے افعال ہیں اور بندوں کو یہی حکم ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق یہ اعمال کریں اور یہ صفات پیدا کریں (تخلقوا باخلاق اللہ)

دوسری قسم کے وہ اعمال ہیں جو دراصل نبیوں کے کرنے کے ہیں اور امتی ان کو نبیوں کی نیابت میں کرتے ہیں، جیسے دین کی دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اعلاء کلمۃ اللہ کی کوششیں اور اس کے راستہ میں قربانی وغیرہ وغیرہ۔ یہ دراصل نبیوں والے اعمال ہیں اور نبی ان ہی کے کاموں کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ امتی ان کے کاموں کو کر کے نبی کے مقصد کی خدمت کرتے ہیں اور ان نبی کی نصرت اور نیابت میں ان راستوں پر محنت کرتے ہیں۔

تیسری قسم وہ اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی عبدیت اور بندگی ظاہر کرنے کے لیے اور اس کے ذریعہ اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ یہ شان عبادات کی ہے۔ نماز، روزہ، حج، قربانی، ذکر و تلاوت وغیرہ عبادات اس قسم کے اعمال ہیں۔

چوتھی قسم وہ اعمال ہیں جو دراصل اپنی خواہشات اور بشری تقاضوں کے لیے کیے جاتے ہیں لیکن ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے احکام دیے ہیں کہ ان کو اس طرح کرو اس لیے یہ بھی دینی اعمال ہو گئے، مثلاً نکاح کرنا، بیوی بچوں کو کھلانا، پلانا، کپڑے پہنانا ان کو پیار کرنا، یا خرید و فروخت، اسی طرح کا شتکاری یا کارخانہ داری یا محنت مزدوری یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق دراصل ہماری خواہشات اور بشری ضروریات سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق احکام دیے کہ ان کو اس طرح کیا جائے اور ان میں بھی ثواب رکھ دیا، اب یہ بھی دینی اعمال ہو گئے، لیکن ان کے دینی اعمال اور قابل ثواب ہونے کی ایک شرط تو یہ ہے کہ یہ اللہ کے دیے ہوئے احکام اور اس کے مقرر کیے ہوئے ضابطوں کے مطابق ہوں اور دوسری شرط یہ ہے کہ ان کی وجہ سے وہ اعمال ضایع نہ ہوں جو ان سے مقدم اور زیادہ اہم ہیں، اب اگر ایک شخص اپنے کاروبار میں اور بیوی بچوں میں اس طرح مشغول ہوتا ہے کہ اس مشغولیت کی وجہ سے دین سیکھنے

کے لیے اور ایمان و یقین حاصل کرنے کے لیے اور اپنی نماز کو حقیقی نماز بنانے کے لیے اور خدا سے اپنے تعلق کو صحیح کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا، تو اس کا بیوی بچوں کو پالنا اور کاروبار میں مشغول رہنا ہرگز دینی عمل نہیں ہے بلکہ سراسر وبال ہے اور "اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" کا مصداق ہے۔

(۱۱)

محنت کے دو میدان ہیں۔ ایک زمین اور زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں، دوسرے ایمان اور ایمان والے اعمال۔

پہلی محنت کا معاوضہ دنیا میں ملتا ہے، لیکن ایسا نہیں ملتا کہ محنت کرنے والے اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔

دوسری محنت کا معاوضہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ بھرپور دے گا۔

یہاں جو کچھ نظر آتا ہے وہ بہت ناقص ہے، بیچاری آنکھ کا حال یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی صرف صورت کو دیکھ سکتی ہے حقیقت کو نہیں، کسی جسمانی چیز کی صرف اوپر سے نظر آنے والی سطح اور شکل کو دیکھ سکتی ہے اس کی روح کو نہیں دیکھ سکتی، حد یہ ہے کہ خود اپنے کو نہیں دیکھ سکتی، اللہ کا غیبی نظام جو نظر نہیں آتا وہ لاکھوں کروروں درجہ زیادہ وسیع ہے، — پھر آنکھ نہ کسی چیز کا اول دیکھتی ہے نہ آخر، صرف اس کا حال دیکھتی ہے، ہر چیز شروع میں مٹی تھی، آخر میں پھر اسکو مٹی ہونا ہے۔ آنکھ نے نہ اسوقت دیکھا جبکہ وہ پہلے مٹی تھی نہ وہ اسوقت کو دیکھ رہی ہے جب وہ پھر مٹی ہوگی، بلکہ صرف اس کو موجودہ شکل میں دیکھا ہے جب کسی چیز کو دیکھو تو سوچو کہ کچھ نہیں، یہ پہلے مٹی تھی اللہ کی قدرت سے اس کی یہ شکل بن گئی ہے، اور پھر ایک دن اس کو مٹی ہو جانا ہے۔ اپنے بارہ میں بھی یہی سوچو۔

قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے "مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى"

نماز کی ہر رکعت میں دو سجدے رکھے گئے ہیں، اس کی یہ بھی ایک حکمت ہے کہ جب پہلے سجدے میں جائے تو یاد کرے کہ میں اسی زمین کی مٹی سے بنایا گیا ہوں، پھر دوسرے سجدے میں یاد کرے کہ زندگی کی میعاد ختم کرکے مجھے پھر اسی زمین کا پیوند ہو جانا ہے اور پھر اس سے اٹھ کر اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور اپنی زندگی کا حساب دینا ہے۔

مولانا محمد یوسف نمبر کا پہلا ایڈیشن ستمبر کے پہلے ہی ہفتے میں ختم ہو گیا تھا۔ اب دوسرا ایڈیشن ہو گیا ہے۔ (منیجر)

ان اہم کتابوں کے صرف دو دو تین تین نسخے ہمارے ہاں ہیں

تاریخ عالم کا انسائیکلو پیڈیا

مشہور مغربی فاضل ولیم لینگر کے زیر اہتمام دنیا کے ستر مشہور و معتمد مؤرخوں نے تاریخ عالم کی یہ انسائیکلوپیڈیا مرتب کی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے نئی ترتیب اور تہذیب کے ساتھ اس کو اردو میں منتقل کیا اور بڑی عالمانہ عرق ریزی سے نہایت اہم معلومات کا حواشی میں مستقل اضافہ بھی کیا ـــــ ماضی اور حال سے پوری طرح باخبر رہنے کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ہے کہ تھوڑی سی مدت میں امریکہ میں اس کے تین ایڈیشن قریباً دس لاکھ کے نکل چکے ہیں تین ضخیم جلدیں ہیں

جلد اوّل ـــ تاریخ اسلام

جو ابتداء اسلام سے ہمارے اس زمانہ تک کے مسلمانوں کے مدوجزر اور دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں کے احوال کا نہایت جامع مرقع ہے۔ گویا پوری چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کا خلاصہ

جلد دوم ـــ ابتداء سے عہد نپولین کے آخر تک کی پوری دنیا کی عام تاریخ۔

جلد سوم ـــ عہد نپولین کے بعد سے ۱۹۵۹ء تک

قیمت مکمل مجلد ۳۶/-

سیرۃ الرسول

تصنیف محمد حسین ہیکل (مصر) ترجمہ محمد عارف کامل

سیرۃ نبوی کے موضوع پر ہمارے اس دور کی نہایت اہم اور معرکۃ الآراء تصنیف ہے

قیمت ۱۲/-

کرامات صحابہؓ

حدیث و سیرت کی مستند روایات میں صحابہ کرامؓ کی کرامات کے جو واقعات منقول ہیں اس کتاب میں ان کو اردو ترجمہ کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ ایمان تازہ کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے ـــ قیمت ۱/۵۰

حیات امام ابو حنیفہؒ

تالیف شیخ ابو زہرہ (مصر)

ترجمہ غلام احمد حریری ـــ قیمت ۱۵/-

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی معرکۃ الآراء فاضلانہ تصنیف ـــ قیمت ۱۲/-

حیات امام مالکؒ

تالیف محمد ابو زہرہ (مصر)

ترجمہ عبید اللہ قدسی ـــ قیمت ۱۰/-

امام شافعیؒ

تالیف محمد ابو زہرہ (مصر) ترجمہ رئیس احمد جعفری قیمت ۱۲/-

حیات امام ابن حزمؒ

از پروفیسر ابو زہرہ (مصر)

ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری قیمت ۱۸/-

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

تالیف استاد ابو زہرہ (مصر) ترجمہ رئیس احمد جعفری ۲۱/-

حیات امام ابن القیمؒ

بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب، قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ محمد العظیم شرف الدین کے قلم سے۔

ترجمہ سید رشید احمد ارشد ـــ قیمت ۱۲/-

تذکرہ شاہ ولی اللہؒ

شاہ صاحبؒ کا سیاسی ماحول اور ان کی تجدیدی خدمات، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے قلم سے۔ ۴/۵۰

حیات طیبہ

سوانح حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ـــ قیمت ۵/۵۰

مولانا محمد علیؒ (بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے)

از: محمد سرور صاحب ـــ قیمت ۸/-

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

از شورش کشمیری ـــ قیمت ۳/-

آپ بیتی

(از ظفر حسن ایبک) اب سے پچاس سال پہلے (پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور ان کے چند جانباز رفیقوں نے مجاہدانہ جذبہ سے اور منصوبہ کے تحت ہندوستان سے کابل ہجرت کی تھی یہ آپ بیتی اسی بڑی بیش بہا مہم سرگزشت ہے۔ قیمت ۵/-

کتب خانہ الفرقان بحری روڈ۔ لکھنؤ

مغلیہ دورِ حکومت

چار حصوں میں

یعنی خافی خاں نظام الملک کی "منتخب اللباب" کا اردو ترجمہ

از محمود احمد غازی

حصہ اول - بابر سے جہانگیر تک ۶/

حصہ دوم - دورِ شاہجہانی ۷۵/

حصہ سوم - دورِ عالمگیری ۸/

حصہ چہارم - شاہ عالم سے محمد شاہ تک ۱۲/

اقبال نامہ جہانگیری

جہانگیر کے دورِ حکومت کی مکمل تصویر

تصنیف محمد خاں کشمی ترجمہ محمد زکریا

اول - قیمت مجلد ۷۵، ۶

شاہجہاں کے ایام سیری اور عہد اورنگ زیب

مصنفہ ڈاکٹر برنیر (فرانسیسی)

ترجمہ خلیفہ محمد حسین - قیمت ۱۲/

آثار عالمگیری

اس کا مصنف ساقی خاں کتابخانہ کار کی حیثیت سے زندہ بھی اور رنگ ریب کے ساتھ رہا، اسکے مطالعہ سے جہانگیری کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے - ترجمہ مولوی فدا علی طالب - قیمت ۹/۵

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

از پروفیسر خلیق احمد نظامی

قیمت مجلد ۹/ غیر مجلد ۸/

سفینۃ الاولیاء

از داراشکوہ، ترجمہ اردو ۶/۵

مقدمہ ابن خلدون

فلسفۂ تاریخ پر عدیم النظیر کتاب اردو ترجمہ، تعلیقہ نقشوں اور تصویروں سے مزین - قیمت ۱۵/

تاریخ غرناطہ

یہ کتاب لسان الدین محمد الخطیب الغرناطی کی کتاب "الاحاطۃ فی اخبار غرناطۃ" کا سلیس اردو ترجمہ ہے - یہ ایک شہر کی ایک سلطنت کی تاریخ نہیں ہے بلکہ ایک دور کی اور ایک پورے تمدن کی تاریخ بھی ہے -

ترجمہ از علیم احمد منشی ندوی - قیمت ۱۱/

عبرت نامہ اندلس

مکمل ۴ جلد

تصنیف - پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی

ترجمہ - مولوی عنایت اللہ دہلوی مرحوم

مرحوم اسپین پر انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں تو ایک درجن کتابیں ہیں عربی میں بھی کافی لکھا گیا ہے اور ان دونوں زبانوں سے خلاصہ یا ترجمہ کے طور پر اردو میں بھی بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں لیکن مغربی مصنفین میں پروفیسر ڈوزی کی یہ کتاب عالمانہ تحقیق و جامعیت کے علاوہ اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ اس سے بہت سی ان غلط اور شرمناک باتوں کی پوری تردید ہوجاتی ہے جو اس سے پہلے اکثر مغربی مصنفین نے اندلس ہی کے سلسلہ میں مسلمانوں اور مسلمانوں کے خلاف لکھی ہیں اور جنھوں نے اہل مغرب کی ذہنیتوں کو مسموم کر رکھا ہے -

اسکے مطالعہ سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں مغربی مصنفین اور مستشرقین کی غلط فکری کی خاص وجہ کیا ہے؟

قیمت کامل مجلد ۳۰/

خلیفہ عبدالرحمن الناصر

اندلس میں اسلامی حکومت کی صبح درخشاں طارق اور موسیٰ ابن نصیر سے طلوع ہوئی تو عبدالرحمن الناصر اس کا نصف النہار تھا

قیمت ۵/۵۰

سفرنامہ ابن بطوطہ

ترجمہ مسیو احمد جبرئی، ابن بطوطہ نے جب دنیا کی سیاحت کے لیے کمر ہمت باندھی تو وہ ۲۵ سال کا نوجوان تھا اور جب یہ سیاحت ختم کی تو پچاس سال کا بوڑھا ہوچکا تھا محمد تغلق کے زمانہ میں وہ ہندوستان بھی آیا اور اس کا سفیر بن کر چین بھی گیا - ہر تعلیم یافتہ کو یہ سفرنامہ ضرور پڑھنا چاہیئے - ترجمہ بہت عمدہ و ترتیب سے اسکو اور زیادہ دلچسپ بنادیا ہے - قیمت ۱۵/

آئینۂ حقیقت نما

از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

انگریزوں نے سیاسی اغراض کے تحت مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم کی جو داستانیں تاریخ کا جزء بنادی تھیں جنھوں نے ہندوؤں کو آج تک مسلمانوں کا دشمن بنا رکھا ہے مولانا نے اس کتاب میں ان سرکاری پردہ پاک کیا ہے - بڑی محققانہ کتاب ہے - قیمت ۱۲/

عروسِ دنیا

(مصنفہ نسیمہ تاج الدین -

ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین -

اس کے آئینہ میں پوری عرب دنیا دیکھی جاسکتی ہے قیمت مجلد ۱۲/

المنجد (اردو)

عربی لغت کی معروف کتاب اضافات کے ساتھ اردو قالب میں قیمت ۴/

تہذیب و تمدن اسلامی

از رشید احمد ندوی مسلمانوں نے انسانی دنیا کو کیا دیا، اسکی تفصیل اس کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے ۶/



الفرقان لکھنؤ

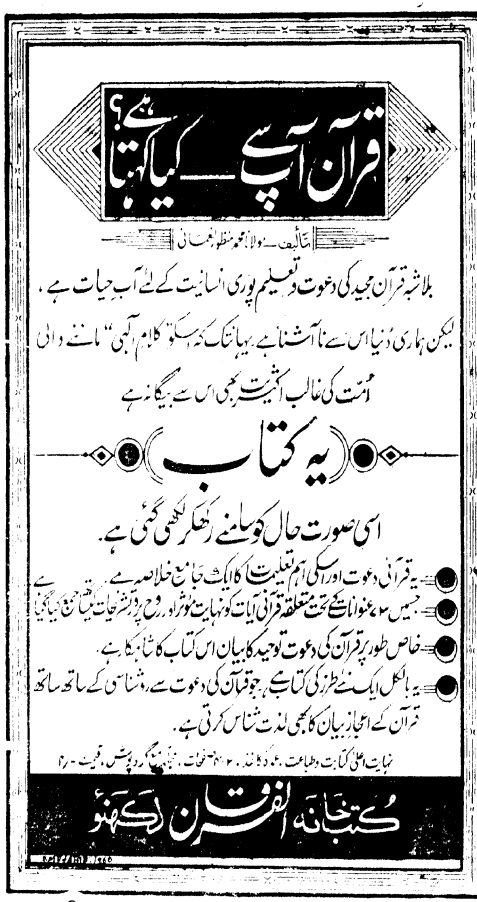
مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے



مولانا محمد یوسف صاحب [illegible]

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲..... شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق فروری ۱۹۶۶ء | شمارہ ۵

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	نگاہ اوّلین	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	کائنات کا خالق ۔ خدا یا اتفاق ؟	جناب وحید الدین خاں صاحب	۵
۳	مقالات طریقت	جناب محمد عضد الدین خاں ایم اے	۱۳
۴	اسلام میں اور مسلمانوں کے مسائل	شیخ محمد العبودی رجسٹرار مدینہ یونیورسٹی	۳۰
۵	دربار عالمگیری	جناب ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی	۴۰
۶	حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی	محمد منظور نعمانی	۵۵

تصحیح :- گزشتہ شمارہ پر غلطی سے ستمبر کا مہینہ اور نمبر ۶ چھپ گیا ہے، اسکو اکتوبر اور نمبر ۷ پڑھا جائے۔

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو، تو

اسکا مطلب ہوگا کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری :- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت :- الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمن سنبھلی

یہ محض خدا کا فضل ہے کہ وہ خطرات جو ہندوستان و پاکستان کے کسی تصادم کی شکل میں مسلمانانِ ہند کے لئے مضمر تھے وہ تین ہفتے کے بھرپور تصادم کے باوجود واقعات کی صورت نہ اختیار کر سکے، لیکن پھر بھی ان حالات میں مسلمانوں کے لئے جو نزاکت پیدا ہو گئی ہے اس سے شاید کوئی دیوانہ ہی انکار کر سکے، اور کم از کم ان لوگوں کو تو اس سے انکار ہو ہی نہ چاہیئے جو اگرچہ اپنی نسبتوں کے لحاظ سے تخمۂ وارِ پر حق [illegible] اور اس پر فخر ان کا سب سے بڑا سرمایہ ہو، مگر اس نزاکت احساس نے انھیں مجبور کیا کہ اس جنگ میں اپنے وطن کی حمایت کو مسلمانانِ ہند کا وطنی اور سیاسی فریضہ قرار دینے ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ ایک مذہبی فریضہ اور شریعت مقدسہ کا تقاضا بھی قرار دیں، اور اسکے باوجود قرار دادیں کہ ملک کے لیڈر بار بار مسلمانوں سے کہہ رہے ہوں کہ یہ کوئی مذہبی جنگ نہیں خالص سیاسی جنگ ہے، لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ مذہبی لوگ جن کے موجودہ حالات کی نزاکتوں کے احساس کا ایک طرف یہ عالم ہے دوسری طرف وہ ان نزاکتوں سے اس قدر بیگانہ بھی ہیں کہ اپنی جماعتی مصلحتوں کے تحت کسی مشترک قومی پلیٹ فارم کو چھوڑنا ہو تو اسکے اعلان کے لئے بھی انھیں حالات کو منتخب کریں! اور پھر اعلان بھی بجز قطع تعلق کا نہ ہو بلکہ اور بہت سی جدال انگیز باتوں کے ساتھ ساتھ یہ فروگزاشت بھی اس اعلان کا جزو ہے، کہ اس قومی پلیٹ فارم نے ہندوستان و پاکستان کی جنگ کے دوران نہایت بے تعلقی اور سرد مہری کا رویہ رکھا حتیٰ کہ اس کی کوئی میٹنگ تک اس سلسلے میں نہیں بلائی گئی، جبکہ پہلے ذرا ذرا سی باتوں پر اسکی میٹنگیں ہوتی رہیں!۔

ہم یہ سطریں بہت ہی ناخوشگواری کے احساس کے ساتھ جمعیۃ علما ہند کے جنرل سکریٹری جناب مولانا اسعد مدنی کے اس بیان پر لکھ رہے ہیں جو مسلم مجلس مشاورت سے استعفے کے طور پر اخبارات میں شائع ہوا ہے اور جس میں ڈاکٹر سید محمود صاحب (صدر مجلس) کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :-

"ہند و پاکستان کی جنگ کے دوران آپ نے اگرچہ ذاتی طور پر اپنی خدمات محاذ جنگ کے لئے پیش فرمائیں، مگر مجھے تعجب اور حیرت ہے کہ اس سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت نے معمولی توجہ دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اور اس اہم اور نازک موقع پر مجلس کا کوئی اجلاس بھی طلب نہیں کیا گیا، حالاں کہ اس سے پہلے معمولی معمولی باتوں پر اجلاس طلب کئے گئے ہیں"

الجمعیۃ (دہلی ایڈیشن) ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۵ء

راقم حروف کو مولانا اسعد صاحب سے بہر حال نسبت ہے، اور شاید ہمعصری کی بھی تعلق بھی ان کی محبت و عنایت سے برادرانہ رہا ہے لیکن وہ جس عظیم ہستی کی یادگار ہیں اس کے اٹھ جانے کے بعد سے برابری کے بجائے ان کو بڑائی کے مقام پر رکھ کر دیکھنا ہی دل کو پسند رہا۔ علاوہ ازیں وہ جس جماعت کے جنرل سکریٹری ہیں وہ ہمارے بزرگوں کی جماعت ہے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی ذات عالی نے اسکی بنیادوں کو عظمت بخشی، حضرت مولانا انور شاہؒ کے تقدس اور پاک نفسی سے بھی اس نے فیض پایا، حضرت علامہ مفتی کفایت اللہؒ کی سرپرستی میں ایک طویل مدت اس نے گزاری اور پھر شیخ عرب و عجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی مدتوں سربراہی کا طغرائے امتیاز بھی اسکے حصے میں آیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اگرچہ اس خاص صف کے نہ تھے مگر انھوں نے جمعیۃ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۶۲ء تک کے پرآشوب دور میں مسلمانان ہند کی جس قدر وسیع پیمانے پر خدمت کی اور جس بجا و بانہ انداز میں وہ ہر موقع پر اس ستم زدہ ملت کے لئے سینہ سپر ہوئے، یہ چیز ان کی شخصیت کو بھی جمعیۃ کے لئے ان بزرگوں ہی کی طرح موجب احترام اور باعث اکرام بنا دیتی ہے۔ اس لئے مولانا اسعد صاحب کی ذاتی حیثیت کا سوال ہو یا جمعیۃ کے جنرل سکریٹری ہونے کی حیثیت کا طبعی طور پر دونوں ہی صورتوں میں بڑا مشکل کام ہے کہ ان پر کسی بیباک تنقید کا مرحلہ

سر کیا جائے۔ اور مرحلہ بھی ایسا جس میں اُن کے نازک جذبات کی رعایت بھی ممکن نہ ہو! ــــــ ــــــ لیکن افسوس ہو کہ زیر نظر بیان پر کسی بھی نسبت اور کسی بھی حیثیت کا لحاظ کر کے خاموشی کی گنجائش نہیں، یہ جماعتی اور قیادتی رقابت کا رفرمائیوں کا ایسا نمونہ ہو جو محترم اسعد میاں کی بلند و بالا نسبتوں کے لحاظ سے ہی افسوسناک نہیں پوری ملت کے مفاد اور مستقبل کے لحاظ سے بھی بے پناہ خطرناک ہو۔

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں کہ نیشنلزم اور سیکولرزم کے نام پر مسلمانوں کی ایک جماعت کو (جس سے ہمیں بھی سخت اختلاف رہتا ہو) مولانا اسعد میاں کی طرف سے مطعون کئے جانے پر ہم نے بلا نام لئے انھیں ٹوکا تھا کہ یہ باتیں ان کے شایان شان نہیں۔ نہ تو دینی لحاظ سے یہ دونوں ازم کسی فخر و مباہات کا میدان بننے کے لائق ہیں اور نہ ملی مصلحت کے لحاظ سے ہندوستان کے موجودہ حالات اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ مسلمان علی الاعلان ایک دوسرے کے سیکولرزم اور نیشنلزم کی پیمائش کریں، لیکن یہ گزارش رائیگاں ہی گئی۔ اور اب اس سے بھی آگے بڑھ کر آرچ کے جیسے نازک حالات میں مولانا اسعد میاں کسی ایک جماعت نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کے برسر اقتدار گروہ کے سوا مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں اور مختلف حلقوں کے مشترک پلیٹ فارم کی حب الوطنی کو پیمائش میں لاتے ہوئے اظہار حیرت فرما رہے ہیں کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران کرونٹ بھی نہیں لی! ــــــ لیکن اسعد میاں کو یہ بات بھولنی نہ چاہیئے کہ انھیں ابھی وطن کی راہ میں کچھ جھیل کر دکھانے کا موقع نہیں ملا ہو جبکہ جس شخص (ڈاکٹر سید محمود صاحب) کو وہ حب الوطنی کا سبق پڑھا رہے ہیں، اسکے بال ہی اس راہ میں وہ سب کچھ جھیلتے ہوئے سفید ہوئے ہیں، جو پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اس صف کے دوسرے اشخاص نے جھیلا تھا جمعیۃ علماء کی قیادت بیشک بڑا مرتبہ ہو مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہونا چاہیئے کہ آدمی فرق مراتب کو بھی یکسر بھول جائے! مولانا اسعد صاحب اگر جمعیۃ علماء کے بزرگوں کی روایات کا پاس فرماتے تو اُن کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر کسی مسلمان میں کوئی واقعی کمزوری بھی ہوتی تو وہ اُسکی پردہ پوشی فرماتے نہ یہ کہ ڈاکٹر سید محمود جیسے بزرگ محب وطن کی حب الوطنی کو بھی مشکوک قرار دینے کی سعی کی جائے۔ کاش! اسعد میاں محسوس کر سکیں کہ وہ کدھر جا رہے ہیں!

کائنات کا خالق ـــــ خدا یا اتفاق

(از جناب وحید الدین خاں صاحب)

کائنات کے اندر جو حیرت انگیز نظم اور جو غیر معمولی حکمت و معنویت پائی جاتی ہے، مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں مگر اس میں انھیں کسی ناظم و مدبر خدا کا اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اس کی دوسری توجیہہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ محض "اتفاق" سے ہو گیا ہے۔ ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروڑوں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کیے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیر کی ایک نظم (SONNET) نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کی اندھا دھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی۔

THE MYSTERIOUS UNIVERSE, 3-4.

یہ بیان اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے۔ کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور ایسا مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے۔ بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں۔ مثلاً ہوا کا ایک جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (POLLEN) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزوی اور اتفاقی واقعہ کی توجیہہ کرتا ہے۔ وہ گلاب کے پورے وجود، کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جا سکتا۔ "اتفاقی واقعہ" کے لفظ میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے۔ پروفیسر

ایڈون کانکلن (EDWIN CONKLIN) کے الفاظ میں "زندگی کا بذریعہ حادثہ (ACCIDENT) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پریس میں دھماکہ ہوجانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P.174.

کہا جاتا ہے کہ اتفاق کے حوالے سے کائنات کی توجیہہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے، بلکہ سر جیمز جینز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (PURELY MATHEMATICAL LAWS OF CHANCE) پر مبنی ہے[1]۔ ایک مصنف لکھتا ہے:۔

"اتفاق (CHANCE) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کسی حد تک ممکن ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P.23

اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہو گیا اور پھر یہ بھی فرض کر لیں کہ اس میں عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہو گیا ـــــ اگرچہ ان مفروضات کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے ـــــ جب بھی کائنات کی توجیہہ حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذہب کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانون اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کر رہی ہے کہ قانون اتفاق موجودہ کائنات کا خالق ہو سکتا ہے، کیونکہ سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر زیادہ سے زیادہ کیا ہے اور جو عمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔

---

[1] THE MYSTERIOUS UNIVERSE, P.3

"اگر تم دس سکے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگا دو۔ اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دو۔ اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ کو نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو ــــ یہ امکان کہ نمبر ایک کا سکہ پہلی بار تمھارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمھارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں، دس ہزار میں ایک ہے۔ یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے۔"

یہ مثال نقل کرنے کے بعد کریسی مارسن (ACRESSY MORRISON) لکھتا ہے:۔

THE OBJECT IN DEALING WITH SO SIMPLE A PROBLEM IS TO SHOW HOW ENORMOUSLY FIGURES MULTIPLY AGAINST CHANCE.

MAN DOES NOT STAND ALONE, P.17

یعنی یہ سادہ مثال اس لیے دی گئی تاکہ یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہو گیا ہے تو اس کے لیے کتنی مدت درکار ہو گی۔ ذی حیات اشیاء کی ترکیب زندہ خلیوں (LIVING CELLS) سے ہوتی ہے۔ خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم خلیہ (CYTOLOGY) میں کیا جاتا ہے۔ ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں ان میں سے ایک پروٹین ہے۔ پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے ــــ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک۔ پروٹینی سالمہ (MOLECULE) ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جوہر (AT IMS) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سب سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔

اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے، جو مادے کی وہ مقدار ہے۔ مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، اب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے ایک ریاضی داں، پروفیسر چارلس ایوجین گائی (CHARLES EUGENE GUYE) نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۰^۱ کے مقابلہ میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے (۱۰^۱ کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ایک کے آگے ایک سو ساٹھ صفر، ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔[1]

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ۱۰^۱ سال بعد ہے۔

پروٹین، امینو ایسڈ (AMINO ACIDS) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے باہم ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے۔ بی۔ لیدز (J.B. LEATHES) نے حساب لگایا کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں (۱۰^۱) طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے محض اتفاق سے اکٹھا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایسا ہو جائے۔ دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے باوجود کبھی بھی کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے

---

[1] واضح ہو کہ ۱۰^۱ کے انتہائی عدد۔ ۱۰ سکے۔ میں ایک کے آگے ۱۹ صفر لگتے ہیں۔

کے خلیہ کا جزو بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت کیسے پیدا ہوئی۔ اس کا جواب اس توجیہ میں نہیں ہے پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جزو۔ پروٹین ــــ کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہ ہو جبکہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہاسنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامنٹے ڈونوائے (LECOMTE DU NOUY) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لیے جس وقت جس مقدار مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابل یقین حد تک زیادہ ہو۔ اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی ۱۰ہزار سال نور (ایک کے آگے ۲۲ صفر) سفر کرکے اس کو پار کرسکتی ہو۔ یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن کے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے وہ اس عمل کے لیے قطعاً ناکافی ہے پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سو ترپن حرکت فی سکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ اور اس سارے عمل کے لیے جس مدت کی ضرورت ہے وہ ۱۰،۳۲۰،۰۰۰ (ایک کے آگے ۲۴۳ صفر) بلین سال ہے ــــ مگر ہمیں بھولنا نہیں چاہیئے" ڈونوائے لکھتا ہے کہ "زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جبکہ زمین ٹھنڈی ہوئی"

HUMAN DESTINY, 30-34

سائنس نے اگرچہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لیے ناکافی ہے۔ مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی، اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کرلی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازہ کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی بڑے ستارے کی کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا۔ اس وقت زمین سورج کی مانند ایک مجسم

شعاعیں جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی۔ اس انجماد کے بعد ہی یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر، جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی، مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے، ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (RADIO-ACTIVE ELEMENTS) کی دریافت سے حاصل ہوا ہے۔ تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں اور اسی لیے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں۔ اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یورنیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے۔ وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی۔ ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔ یورنیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں، اور بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزو ہیں جبکہ یہ چٹان منجمد ہوئی۔ یورنیم کے ساتھ ہم سیسہ پاتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورنیم کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ یورنیم کے انتشار (DISINTEGRATION OF-URANIUM) سے وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ یورنیم سے بنا ہوا سیسہ، عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے۔ اس لیے سیسے کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورنیم سے بنا ہے یا نہیں۔ اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورنیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے اور چونکہ یورنیم چٹان میں اس وقت سے ہے جبکہ چٹان منجمد ہوئی اس لیے ہم اس کے ذریعہ سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں۔ یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قدیم ترین چٹانیں ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا اور تگنا ہو۔ مگر ارضیاتی مطالعہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ جے۔ ڈبلیو۔ این سولیوان نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے[1]۔ اب ظاہر ہے کہ جب صرف

[1] LIMITATIONS OF SCIENCE, P. 78

ایک غیر ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لیے سنکھ مہاسنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آگئیں۔ اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات پیدا ہو کر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے۔ اور پھر انھیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیاء سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کیسے وجود میں آگئی جبکہ نظریۂ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے۔ ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہے کہ ماہر ریاضی پاچو (PATAU) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے۔[1] اس سے اندازہ کیجئے کہ اگر محض اتفاق کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے بداعجوبہ کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہو، تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔ بی۔ کریڈر (MARLIN BOOKS KREIDER) کے یہ الفاظ کس قدر صحیح ہیں:-

THE MATHEMATICAL PROBABILITY OF A CHANCE OCCURRENCE OF ALL THE NECESSARY FACTORS IN THE RIGHT PROPORTION IS ALMOST NIL.

THE EVIDENCE OF GOD, P. 67

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہو جانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کی لغویت واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "اتفاق" سے نہ کوئی ایٹم یا مالیکیول وجود میں آسکتا ہے اور نہ وہ ذہن پیدا ہو سکتا جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ خواہ اس کے لیے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے۔ یہ نظریہ نہ صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ یہ ایسی ہی لغو بات ہے جیسے

---

[1] THE EVIDENCE OF GOD, P. 71

کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہو سکتا ہے ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لیے فرش، کشش ارضی، گلاس اور پانی کہاں سے وجود میں آ گئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (HAECKEL) نے کہا تھا: "مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا۔" مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لیے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ بہت خوب کہا ہے مارٹین نے:۔

"ہیکل نے یہ کہتے ہوئے کہ ہیین (GENES) اور خود زندگی کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا۔ انسان کو وجود میں لانے کیلئے اسکو سب سے پہلے ناقابل مشاہدہ ٹیم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر ہیین بنانا ہوگا اور اسکو زندگی دینی ہوگی۔ پھر بھی اسکی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروڑوں میں ایک کا ہے۔ اور بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہو جائے تو اسکو وہ اتفاق (ACCIDENT) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (INTELLIGENCE) کا نتیجہ قرار دے گا۔"

MAN DOES NOT STAND ALONE, P. 87

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبیعیات جارج ارل ڈیوس (EARL DAVIS) کے الفاظ پر ختم کروں گا:۔

"اگر ایک کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے۔ اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی۔ میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزو نہیں۔ بلکہ اس کا فرماں روا اور ناظم و مدبر ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD, P. 71

مقالات طریقت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حالات میں ایک نامانوس تذکرہ

از، محمد عضدالدین خانصاحب ایم اے ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محمد شاہ کی دلی ہے، لوٹ مار، قتل وغارتگری کا دور دورہ ہے، رکھ، جاٹ اور مرہٹے ہر طرف تباہی مچائے ہوئے ہیں، نادر شاہ کا قتل عام اسی سرزمین میں ہو چکا ہے، ابدالی و تورانی امراء نے بادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں کھلونا بنا لیا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے جس دور کی ابتدا محمود غزنوی، ایبک اور التمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی آج وہ بہادر شاہ اول اور محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے ناؤ نوش میں ختم ہو رہا ہے اور فلسفۂ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اس سیاسی بدامنی اور معاشرتی پستی کا اثر مذہبی زندگی پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ اگر اللہ کے چند برگزیدہ بندے اس ضلالت اور توہم پرستی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے کمربستہ نہ ہو جاتے اور ان تیز و تند ہواؤں میں مذہب و ثقافت کے چراغوں کو نہ بچاتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا۔

ان جواں مرد سپاہیوں میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اسلام کی وہی خدمت کی جو قرون اولیٰ

کے اکابر نے پوری دنیائے اسلام کی انجام دی تھی، افسوس کہ اسلامی ہند کے اس عظیم فرزند کا صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ ابتک نہ کیا جا سکا، کسی نے ان کو اپنے ذاتی فلسفے کے لئے آلۂ کار بنایا، کسی نے ان پر صرف عقیدت و محبت کے باسی پھول چڑھائے، کسی نے سب و شتم کی بارش کی، کسی نے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے، آجکل بعض اشخاص اور اداروں نے کام شروع کیا تو وہ بھی ان کی کتابوں کے ترجمے یا ان ہی پرانی ٹیڑھی ترچھی تصویروں کو دوبارہ سامنے لانے تک محدود رہے۔

متقدمین نے شاہ صاحب کے جتنے بھی تذکرے لکھے، ان میں سے اکثر کا یہی حال ہے، نہ ان میں واقعیت ہے نہ تاریخیت، اس لئے ان کے اکثر بیانات دل کو نہیں لگتے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے نہیں آتا، ان تذکروں میں ایک تذکرہ "مقالات طریقت" معروف بہ فضائل عزیزیہ ہے، جسے عبدالرحیم ضیا حیدرآبادی نے لکھا ہے، یہ کتاب طبع تو آج سے تقریباً سو سال پہلے ہوئی تھی، مگر ایک طویل عرصے سے نایاب تھی، اور اس کے والے بھی بہت کم ملتے تھے، اسلئے اسکے متعلق کسی طرح کا خیال نہیں ظاہر کیا جا سکتا تھا، اتفاق سے یہ کتاب راقم کو حیدرآباد کے ایک ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہو گئی، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ تذکرہ قدیم ہونے کے باوجود کسی بھی جدید، مفصل اور محققانہ تذکرے سے کم نہیں ہے۔

یہ کتاب تین سو بیس صفحات پر مشتمل شاہ صاحب کے انتقال کے باون سال بعد ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد میں لکھی گئی اور اس کے دو سال یعنی ۱۲۹۳ھ میں حیدرآباد ہی سے شائع ہوئی، تذکرے کے مصنف محمد عبدالرحیم ضیا حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے خلفاء سے قریبی تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ اسحٰق صاحب (خلیفہ و نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب) کے خلیفہ اور شاگرد سید شاہ محی الدین صاحب قادری ٹیلوری کے مرید بھی تھے، فاضل تذکرہ نگار اسکے علاوہ اور کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر بھی ہیں وہ اس کتاب کے ماخذ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اکثر روایات اہل ہند ثقات سے کہ بعض ان میں صحبت یافتہ حضرت کے ہیں جمع کر کے جو الجواب کہ اس طریق سے حاصل نہ ہوئے، ان کو بذریعہ تحریر جناب فضیلت مآب....

.....مولانا حافظ حاجی محمد عبدالقیوم صاحب دہلوی سلمہ اللہ العزیز القوی داماد و شاگرد حضرت مولانا محمد اسحاق علیہ الرحمہ سے بعد دیافت و تحقیق کے اس کتاب میں لکھا ہے[۵]

یہ کتاب چھ مقالات (ابواب) اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالے میں مصنف نے شاہ صاحب کے مفصل حالات از ولادت تا وفات درج کئے ہیں، یہ باب چوالیس[۴۴] صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا سب سے اہم اور پر از معلومات باب ہے۔ دوسرا باب امور متعلق بعلوم ظاہر و باطن اٹھاون صفحات میں ہے تیسرا باب شاہ صاحب کی "تعبیر رویا" سے متعلق سترہ صفحات میں ہے، چوتھا باب جو تیس صفحات کا ہے۔ شاہ صاحب کے "اجوبہ مسائل" سے متعلق ہے، پانچویں باب میں ان کے مختلف سلاسل طریقت کا ذکر بہ تفصیل ہے پینتالیس[۴۵] صفحات میں کیا گیا ہے، آخری باب میں شاہ صاحب کے اجل و ارشد خلفاء کے تفصیلی حالات ساٹھ صفحات میں ہیں، خاتمے میں اپنے پیر و مرشد سید شاہ محی الدین قادری دلپوری کے حالات چوالیس صفحات میں لکھے ہیں، کتاب کے ضمیمے میں مولانا محمد زمان شہید کا تذکرہ جو شاہ صاحب کے خاندان کے مشہور خلفاء میں ہیں، ۲۴ صفحات میں ہے۔

اس اجمالی تعارف کے بعد اس پر تفصیلی نگاہ ڈالی جاتی ہے، تاکہ اسکی افادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے سلسلۂ نسب اور آبا و اجداد کے مولد و مسکن وغیرہ کا حال لکھا ہے، اسکے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے حالات کسی قدر تفصیل سے دیے ہیں، اسکے بعد رقمطراز ہیں:۔

"حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اول اپنے ماموں کی دختر سے نکاح کیا تھا ان سے مولوی محمد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، آپ بڑے ولی کامل تھے، آپ پر جذب بہت غالب تھا..... مزار آپ کا مع دونوں فرزند کے بوڈھانہ کی مسجد میں واقع ہے، بعد انتقال والدہ ماجدہ مولوی محمد صاحب کے شاہ صاحب موصوف

---

[۵] مقالات طریقت ص ۴

نے دختر نیک اختر سید ثناء اللہ صاحب ساکن قصبہ سونی پت مسماۃ بی بی ارادہ رحمۃ اللہ علیہا سے شادی کی۔ ان سے چار فرزند پیدا ہوئے، اولین مولانا شاہ عبدالعزیز دوم میں شاہ رفیع الدین، سوم شاہ عبدالقادر، چہارم مولوی عبدالغنی اور ایک دختر مسماۃ بی بی امۃ العزیز، دختر مذکورہ کو مولوی محمد خالق بن مولوی محمد عاشق ابن شاہ عبداللہ بن شیخ محمد بھلتیؒ سے شادی کردی، ان کا سلسلہ ابتک باقی ہے۔"

اس کے بعد شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب کی زندگی کے اہم واقعات لکھے ہیں، جو دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں، مگر اس مضمون میں اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات سے بحث ہے، اس لئے طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے، مگر اس سلسلہ میں ایک اہم بات فاضل مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بیعت کے معاملہ میں عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے وقت شاہ عبدالعزیز کے تینوں بھائی کم عمر تھے، اس لئے جس طرح شاہ عبدالعزیز صاحب ان حضرات کے ظاہری مربی تھے، اسی طرح باطنی مرشد بھی وہی ہوں گے، مگر عبدالرحیم ضیاء کے بیان کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب شاہ محمد عاشق پھلتی صاحب سے بیعت و اجازت رکھتے تھے اور شاہ عبدالقادر صاحب شاہ عبدالعدل دہلوی سے بیعت تھے، جن کا مزار حضرت خواجہ باقی باللہ کے احاطے میں ہے۔

کتاب کا اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات بیان کرنا ہے، ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ ..... دراز قد، لاغر اندام گندم رنگ، کھلتا ہوا شگفتہ، صاف بشرہ تھے، گو داڑھی چہرے کے لحیہ مبارک خوشنما باعتدال تھی، اکثر چغہ اس کے نیچے انگرکھہ اور پائجامہ شرعی، دستار کشمیری کلاہ پنجہ دار رومال بڑی پاک نیلا اور پاپوش نری اور ہاتھ میں عصائے زبردست رکھتے تھے، اخلاق میں تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق تھے، مزاج میں نہایت خوش طبعی

اور ہر ایک بات کا مذاق تھا۔"

"ولادت آپ کی شب جمعہ بست و پنجم ماہ رمضان ۱۱۵۹ھ میں ہے، اور نام تاریخی آپ کا غلام حلیم ہے، کہتے ہیں کہ اسی شب شب قدر بھی تھی، اور آپ ختم قرآن شریف بھی اسی شب کو کرتے تھے، اور ختم میں شیرینی قسم ریوڑی سے تقسیم فرماتے تھے، آپ کی عمر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے وقت سولہ برس چھ مہینے کی تھی، فاتحۂ سوم شاہ ولی اللہ صاحب کا خاں دوران خاں کے محل کلاں میں ہوا۔"

"رسم دستار بندی میں تین چار چیچ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے سر مبارک پر باندھے۔ جناب مرزا مظہر جانجاناں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے، آپ نے علوم ظاہر و باطن اپنے پدر والا قدر سے پڑھا، اور مولوی شاہ عاشق صاحب پھلتی سے اسکی تکمیل کی۔ اور بابا فضل کشمیری سے جو منجملہ ارشد تلامذۂ شاہ ولی اللہ صاحب تھے، بعض کتب حدیث کی سند لی، اور علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ صاحب جد مولوی محمد عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے پڑھا، اور اکثر فیوض ظاہر و باطن مزار پر انوار پدر بزرگوار سے حاصل کرتے تھے، تھوڑے وقت انکی قبر شریف پر مراقب رہتے تھے، کوئی علم و فن ایسا نہ تھا کہ جس میں آپ کو دستگاہ کامل نہ ہو۔ خط نسخ و شکستہ خوب لکھتے تھے، علم موسیقی میں ملکہ راسخ تھا کہ استاد ان فن زانوے ادب تہہ کرتے تھے، تیر اندازی خلیفہ محمد شاکر سے گھوڑے کی سواری ملک بیرا افسر چابک سواران محمد شاہ بادشاہ سے سیکھی، تمام ہنروں میں برتر اور شاہوری میں سب سے بڑھ کر، غرض آپ کی ذات جامع کمالات معاصرین پر فائق بلکہ یکتائے روزگار تھی، اور فیض باطن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آپنے پایا ہے....."

"اور تین موضع آپ کی جاگیر تھی، ان کی سند عالم بادشاہ اور دولت، اوندیہ نے گزارنی تھی حسن پور اور مراد آباد پرگنہ سکندرآباد سے چاروں بھائیوں میں مشترک اور ایک موضع یعنی محل جنہ پرگنہ بوڈھانہ سے بلا شرکت آپ کے تصرف میں تھا،

چنانچہ وہ موضع اپنے دونوں نواسے مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کو عطا کیا تھا، ابتک جاری ہے، مولوی نصر اللہ خاں صاحب کہتے ہیں کہ میری عملداری میں محل جنہ کے سالانہ بارہ سو روپئے کلدار ہوتے تھے اور اب بھی وہی ہے سوا اسکے اکثر جاے فتوحات بلا قید سال وماہ اللہ تعالیٰ پہنچاتا تھا، جو شخص کچھ گذرانتا تو قبول فرماتے اور نہ دیتا تو ذکر تک بھی نہ لاتے۔ خدمت طلبا اور فقرا وغیرہ کی بہت کرتے تھے، گویا جود وکرم آپ کا سرشت تھا، جو سائل آتا تھا بے نیل مرام نہ جاتا تھا"

اس کے بعد شاہ صاحب کے درس وتدریس، تربیت باطن اور تصنیف کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"جاننا چاہئیے کہ دنیا میں فیض بخشی کے بہت طریقے ہیں، مگر ان میں تین طریقے مشہور معروف ہیں، ایک تدریس دوسرا تربیت باطن جسے مریدی کہتے ہیں، تیسرا تصنیف اور یہ ابواب سنجمہ بہترین باقیات الصالحات ہیں۔ ان امور میں حضرت کا پایہ بلند اور رتبہ ارجمند تھا، تدریس کا یہ حال کہ ہندوستان وغیرہ میں کوئی عالم کم نکلے گا جس کو حضرت سے واسطہ نہ ہو، کہتے ہیں کہ ایک بدایوں کے عالم نے حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ کیا، مگر اس کو نادانی سے یہ خیال آیا کہ اس شخص سے پڑھے کہ جس کے سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نہ ہوں، تمام ہندوستان پھرتے پھرتے حیران ہوا، جہاں گیا وہاں حضرت ہی کا فیض پایا، کوئی ایک واسطے سے کوئی دو یا تین واسطے سے حضرت کا شاگرد نکلا، یہ بات ایسی ہے کہ جیسے کسی نے انسانوں میں اپنی نسبت کرنی چاہی مگر یہ قید لگائی کہ اس خاندان میں ہو جس میں حضرت آدم علیہ السلام نہ ہوں"

"مگر آپ نے متقل بجز چار پانچ شخص کے اور دن کو بہت کم پڑھایا ہے یعنی اپنے تینوں بھائیوں کو کہ رفیع الدین صاحب والد کے انتقال کے وقت میندی اور عبدالقادر صاحب صرف میر پڑھتے تھے، اور عبدالغنی صاحب قرآن شریف

حفظ کرتے تھے، تمام علوم پڑھایا اور اپنے داماد مولوی عبدالحی صاحب کو، مولوی عبدالقیوم صاحب، مولانا اسحٰق صاحب علیہ الرحمہ سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا صاحب مجھ سے فرماتے تھے، میں نے کسی کو نہ دیکھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ بعد غلبۂ آشوب چشم کے بھی پڑھائے ہوں مگر تمھارے والد مولانا عبدالحی صاحب کو اور جناب غلام علی شاہ صاحب نقشبندی علیہ الرحمہ بھی شاگرد ہیں، بخاری شریف پڑھی ہے[1]۔ ان حضرات کے سوا اگر کسی کو پڑھایا ہے تو تین چار سبق سے زیادہ نہیں پڑھایا۔

"اور صبح کو جو ایک رکوع قرآن شریف کا قریب طلوع آفتاب ہر روز ایک تقریر کے ساتھ سنا کرتے تھے، یہاں تک کہ بروز وفات بھی سنا ہے، اسکے قاری خاص مولانا اسحٰق صاحب ہوتے تھے، ..... اور آپ کے برادروں کے ساتھ مولوی مفتی الٰہی بخش صاحب ساکن کاندھلہ اور مولوی قمرالدین صاحب منت تخلص وغیرہ سامع تھے، اسی طریق سے انھوں نے تحصیل کی۔"

شاہ صاحب کے درس اور شاگردوں سے متعلق اس کتاب کی روایت انوکھی اور عجیب سی ہے، مصنف لکھتے ہیں:۔

"مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں، میں نے مولانا اسحٰق صاحب سے پوچھا کہ حضرت اکثر لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، شاہ صاحب نے ہمیں تعلیم کی ہے، اسکی کیا حقیقت ہے، آپنے فرمایا کہ بعد نابینا ہونے کے شاہ صاحب پڑھنے کی دو صورتیں تھیں، ایک تو میں صبح کو قرآن شریف کا رکوع پڑھتا تھا، اس میں لوگ سامع رہتے تھے، دوسرے یہ کہ علماء و فضلاء اور بڑے بڑے بزرگوار اطراف سے حاضر ہو کر حصول اجازت تبرکاً چاہتے تو حضرت شاہ صاحب فرماتے کہ چہل قدمی کے وقت پڑھیں میں سنوں گا، اس وقت کچھ بیان بھی کرتے تھے، اس قسم کے شاگرد بے شمار ہیں۔ سوا اسکے جمعہ اور منگل کو قرآن شریف کا درس

---

[1] ان حضرات کے علاوہ تذکرہ نگار نے شاہ ابوسعید صاحب کو بھی شاہ صاحب کا شاگرد بتلایا ہے۔

بطور وعظ کے ہوتا تھا، اسکی کیفیت مرزا اعلیٰ شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرحوم کی زبانی جو حضرت کے شاگردوں میں سے تھے، یوں بیان کرتے ہیں کہ آپکے وعظ میں ہزارہا آدمی رہتے تھے، ان میں جو پڑھے لکھے تھے وہ لوگ ایک ایک تفسیر اپنی اپنی استعداد کے موافق عربی ہو یا فارسی لے کر بیٹھے رہتے، جب کوئی آیت شروع کرتے تو حضرت ہر ایک سے پوچھتے کہ امام رازی کیا معنی کرتے ہیں، اور شیخ محی الدین ابن عربی کیا فرماتے ہیں اور قاضی بیضاوی کیا لکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس کے پاس جو تفسیر ہوتی وہ اپنا بیان کرتا، جب سب تفسیریں ہو جاتیں تب آپ فرماتے، خیر یہ سب بیان ہو چکا، اب جو خدائے تعالیٰ نے اس فقیر کے دل پر القا کیا ہے بیان کرتا ہوں، پھر وہ وہ معنی بیان فرماتے کہ کسی مفسر کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ سب لوگ کتابیں بند کر کے حضرت کا منہ تکتے رہتے اور ششدر رہ جاتے ..... مولوی یار محمد صاحب علیہ الرحمہ مدتوں خدمت فیض درجت میں رہے ہیں اور کئی دورے قرآن مجید کے ان کے روبرو ہوئے ہیں، ان دوروں کا قرآن مجید شروع سے آخر تک محشیٰ ان کے فرزند مولوی محمد اسحٰق صاحب کے پاس موجود ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی طرح درس فرماتے تھے۔ اخیر درس ان کا اعلم واھو اقرب التقویٰ تھا، وہاں سے حضرت نے شروع کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور حضرت کا آخری درس آیۃ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم تھا، حضرت کے بعد وہاں سے مولانا اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا۔"

شاہ صاحب کے درس و تدریس کی کیفیت سننے کے بعد ان کے تصوف اور طریقہ تربیت باطن کا بھی کچھ حال تذکرہ نگار کی زبانی سنیئے، یوں تو انھوں نے اس کا ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے مگر اس باب میں بھی مختصراً رقمطراز ہیں۔

"تربیت باطن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ کو تمامی آداب سلوک اور اشتغال طریقت میں دستگاہ کامل اور ملکۂ راسخہ تھا، جیسا چاہتے ویسا طالبوں کو خدا تک

پہنچاتے تھے، کوئی طریقے کے مقید نہ تھے، کیونکہ اپنے عزیز و اقارب برادروں کی اولاد یعنی مولوی محمد اللہ صاحب اور مولوی اسمٰعیل[1] صاحب اور مولوی یعقوب صاحب اور مولانا اسحٰق صاحب وغیرہ سے قادریہ طریقہ میں بیعت لی تھی، اور امراؤ کو سلسلۂ چشتیہ میں اور دوسروں کو سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید کرتے تھے، چنانچہ جناب سید احمد صاحب طریقۂ نقشبندیہ میں مرید تھے مگر مولانا عبدالحی صاحب کو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت تھی، اور شاہ صاحب خود صاحب طریقہ ہیں، کیونکہ آپ نے بعد تکمیل سلوک راہ ولایت اور سلوک راہ نبوت کے خاص ایک طریقہ سلوک راہ ولایت کا برعایت طبائع ابنائے روزگار استخراج کیا ہے، وصول الی اللہ کے واسطے نہایت آسان و سہل ہے، اس نیچریز نے اس خاص سلوک طریقہ علیہ عزیزیہ کو مقالۂ پنجم میں..... لکھا ہے..... اور حضرت کی توجہ وغیرہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، اگر کوئی خواہاں ہوتا تو فرماتے کہ تم غلام علی شاہ صاحب کے پاس جاؤ کہ وہ صاحب طریقہ ..... اور اس کام کے ذمہ دار ہیں، یہ فقیر طریقۂ تعلیم علوم ظاہری رکھتا ہے، اس پر بھی کوئی بہت خواہش اور الحاح کرتا اور آپ کے ذہن عالی میں آتا تو اس کے واسطے ایک وقت معین فرماتے اور جائے مقرر کرتے، مثلاً کسی کو بعد نماز مغرب اور کسی کو بعد نماز ظہر یا دوسرے وقت جو مناسب جانتے تعین کرتے، جیسے جناب سید احمد صاحب اور سید اللہ دیا صاحب برہان پوری اور مولانا یعقوب صاحب اور شیخ غلام جیلانی صاحب باغ پتی اور حافظ قطب الدین صاحب پھلتی، یہ اکابر حضرت سے توجہ لئے ہیں اور تکمیل کو پہنچے ہیں.....“

---

[1] مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی صاحب کے شاہ صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت ہونے میں راقم کو اختلاف ہے۔ عام روایت کے مطابق یہ بزرگ سید احمد شہید سے بیعت تھے ممکن ہے ان میں سے کسی ایک نے تبرکاً بیعت کی ہو اور باقاعدہ تعلیم بعد میں سید احمد شہید سے حاصل کی ہو، بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں بھی اس کتاب کی دو باتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں اس سے ان کی بہت سی تصانیف کے بارے میں شبہات اور ابہام دور ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:۔

"خود تصانیف کی تمام زمانے پر ظاہر و باہر ہے، بیان کی احتیاج نہیں، تفسیر فتح العزیز، عجالہ اثنا عشریہ، سر الشہادتین، بستان المحدثین، عجالہ النافعہ، حواشی قول الجمیل، یہ تمام کتابیں مشہور و مطبوع ہیں، سوا ان کے علم معانی میں ایک رسالہ ہے، سوانح کے حصہ دوم میں اس کا بھی حواشی ہیں، حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ، مولوی نور اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر فارسی تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ بھی نہیں، تفسیر فتح العزیز کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ آپ کی ایام جوانی میں عادت تھی کہ بعد نماز عصر تشریف رکھتے، اخبار دیار و امصار کے گوش زد ہوتے، دوسرے سخن و قصص بھی درمیان آتے اور اشخاص اسی قسم کے جمع ہوتے تھے، چنانچہ ایک کابستھ بھی درباریوں سے بادشاہ عالم کے اسی وقت حاضر ہو کر قصص دیار عرض کرتا، آخر کار وہ کابستھ فیض صحبت سے مسلمان ہو کر شیخ مصدق الدین نام پایا، اور کمال کو پہنچا، ان ہی کے سبب استدعا ۱۲۰۸ھ میں تفسیر شروع ہوئی، چنانچہ خود بدولت فرماتے ہیں تفسیر کی یہ کیفیت مفصل تحریر فرمائے ہیں، شیخ مصدق الدین کے فرزند مولوی کرم اللہ صاحب بڑے فاضل اور ولی کامل خلف سے غلام علی شاہ صاحب کے ہوئے ہیں۔"

"مرزا علم علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرقوم الصدر سے روایت کرتے ہیں، تفسیر کے ناتمام رہنے کی یہ وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے خواب میں جناب شاہ صاحب کو فرمایا کہ تم تفسیر لکھنا موقوف رکھو، اگر تمام کرو گے تو اور تمام مفسروں کی محنت بے فائدہ ہو گی، کوئی کسی کی تفسیر نہ دیکھے گا، تمہاری اتنی ہی تفسیر کوئی سمجھے تو تمام قرآن کے مضامین پر حاوی ہو گا۔"

آپنے حسب الحکم موقوف کیا، سورۂ بقرہ ناتمام رہا، واقعی ایسی ہی تفسیر نادر ہے کہ اسکے وصف میں زبان قاصر ہے، باوجود ضوابط علم تفسیر کے صحت روایات، و آداب سلوک و اسرار حقایق و نکات معارف ایسے ہیں کہ اور تفاسیر میں کم ہونگے۔ جناب امام رازی قدس سرہٗ نے آیت کا ربط آیت سے دیا ہے، حضرت نے سوا اس کے سورہ کو سورہ سے مربوط کیا ہے، اسکی تحریر کا یہ حال تھا کہ مسودہ کا اتفاق نہ ہوا، اور جو لفظ فرمایا پھر دوبارہ وہ زبان پر نہ آیا، مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت کے آخر وقت کے مستفیضوں میں سے ہیں، حسب خواہش سکندر بیگم مغفورہ والیۂ بھوپال تفسیر مذکور کا تکملہ تا میں جلدوں میں کیا ہے، راقم نے دیکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے، اس عصر میں ایسی استعداد و لیاقت کی فرد نایاب ہے دوسرے کا منہ نہیں جو یہ ہمت کر سکے، مگر دونوں کا فرق کرنے والا اپنے حوصلے کے مطابق سمجھ سکتا ہے[۱]

"تحفہ اثنا عشریہ بھی آپ کی زندگی میں یعنی ۱۲۱۵ھ میں طبع ہو کر مشہور ہوئی اور وہ بھی ایسی ہی بے ساختہ لکھی گئی[۲]، کہتے ہیں کہ جب تحفہ اثنا عشریہ چھپ کر شہرت پائی تو ایک کلکتہ کا کوئی نواب شیعہ مذہب تھا، اس کو نہایت شاق گذرا، اس نے وہ کتاب اور بہت سے روپے ایران کو روانہ کر کے وہاں کے فضلاء اور بلغا کو لکھا کہ یہاں سینوں کو اس کتاب کی عبارت اور مضمون پر ناز ہو۔ چاہیے کہ دونوں کا رد ہو دے۔ ایران میں تمام فضلاء اور ارباب انشا نے جمع ہو کر مدت دراز

---

[۱] شاہ صاحب کی تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں بہت سے شواہد اور نادر و معتبر روایات راقم کو فراہم ہوئے ہیں جنکی روشنی میں مختلف اور حیرت انگیز نتائج برآمد ہوتے ہیں، چونکہ یہ بحث طویل ہے اس لئے اسے الگ مقالے کی شکل میں عنقریب پیش کیا جائے گا۔

[۲] تحفہ کا یہ نسخہ بہت ہی اہم ہے، یہ پہلی بار تین سو کی تعداد میں ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا، راقم کی نظر سے اسکے دو نسخے گذرے ہیں۔

تک تمام کتاب بکرات ومرات دیکھی، کچھ نہ ہو سکا، آخر کو وہ روپے سب چکھ چکھا کر اس کے جواب میں ایک نامہ لکھ کر روانہ کیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ صاحب تحفہ نے جو اپنے مذہب کی قدیم کتابوں کا حوالہ دیا ہے، اس ملک میں وہ مذہب صدہا سال سے اٹھ جانے کے سبب سے وہ کتابیں ہدست نہیں ہو سکتیں اور جو ہمارے مذہب کی قدیم کتابیں اس میں مذکور ہیں ہم نے ابتک دیکھا نہیں، مضمون کا رد تو کتابوں کی قدرت پر موقوف ہے، رہی عبارت ایسی صاف اور بے تعقید کس منشی کا منہ ہے جو لکھ سکے، سبحان اللہ"

"آپ سے نظم ونثر بھی بہت یادگار ہے، اس محل پر برکتاً فقط ایک بیت ایک قطعہ اور ایک قصیدے پر اکتفا کیا"[1]

فاضل تذکرہ نگار نے شاہ صاحب کی وفات کے بھی جو کیفیت بیان کی ہے، اسکی تفصیلات موجودہ روایات میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ ان سے اصل واقعات کی تمام کڑیاں مل جاتی ہیں، مصنف رقمطراز ہیں:۔

"آپ بہت قلیل الغذا اور کثیر الامراض تھے، جب وقت قریب آیا تو چند روز سے غذا ترک کی، مرض کی شدت تھی، وعظ کا دن آیا، آپنے فرمایا مجھ کو کپڑے پہنو، جب بیان شروع کروں تو چھوڑ دینا، ویسا ہی کیا، یعنی قوت روحانی اور فیض ربانی کا غلبہ ہوا، آپ کو چھوڑ دیا، وعظ فرمانے لگے، ہزاروں آدمی جمع تھے اس حال میں بھی جیسا دور والے سنتے تھے ویسا ہی نزدیک والے بھی سنتے تھے، بعد ازاں آیۂ شریفہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل کا بیان کیا، اسکے مطابق نقد اور اسباب سب تقسیم فرمایا، من بعد قریب لاکھ روپئے کے نقد اور

---

[1] اس کتاب میں جو اشعار ہیں وہ اور ان کے علاوہ دیگر مخطوطات ومطبوعات سے جو اشعار مل سکے ہیں، انکی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے جو راقم کے پاس موجود ہیں۔ اسکے علاوہ بعض نادر ادبی مرقعے وتشریحات ایک الگ مضمون کی شکل میں پیش خدمت ہوں گے۔

نوٹ:- اوپر کے مضمون کی ترتیب غلط ہوئی ہے، براہ کرم مرتب کو بھیج کر پڑھ لیجئے۔

اصل میں کوشک انور اس جائے کا نام تھا، اب زبان زد عوام خوش نرد کا چھتہ مشہور ہے، اور شیخ عبدالرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب مولوی عبدالغنی صاحب اور مولوی مخصوص اللہ صاحب وغیرہ قدس اللہ اسرارہم، ان سب کے مزار وہیں ایک ہی احاطے میں ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب کی تاریخ وفات کے شاہ رؤف احمد مجددی، ارتضا علیخاں صاحب گویا موی اور حکیم مومن خاں مومن وغیرہ کے قطعات تاریخ درج کئے ہیں، جس سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا تھا، نہ کہ ۱۲۴۰ھ میں، اصل میں موخرالذکر سال سب سے پہلے مرید نے شاہ صاحب کے تذکرے میں آثار الصنادید میں غالباً غلطی سے لکھ دیا تھا، اسکے بعد سے متعدد تذکرہ نویسوں، مثلاً رحمان علی[1]، رحیم بخش[2] دہلوی اور اسماعیل گودھروی وغیرہ نے، یہی سنہ سرسید سے نقل کر کے لکھا ہے، حالاں کہ سرسید کی اس روایت کے خلاف بہت سارے شواہد قلمی خطوط اور تذکرے کی شکل میں موجود ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ قدیم تذکرہ اور اس کے ساتھ مختلف معصروں کے قطعات تاریخ وفات سرسید اور ان سے نقل کرنے والے حضرات کی تردید ہوتی ہے۔

تذکرہ نگار نے اسکے علاوہ اور بہت ساری باتیں اس کتاب میں ایسی درج کی ہیں جو کسی اور تذکرے میں اب تک نہیں ملتیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے اور صرف انکی موسیقی کے سلسلے کی چند روایتیں ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں[3]

"روایت ہے حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سے وہ روایت کرتے ہیں مولوی وحیدالدین صاحب پھلتی سے کہ "وہ شاگرد ہیں مولانا اسمٰعیل شہید کے اور خلیفہ ہیں سید احمد صاحب قدس سرہٗ کے اور تیرہ سال حضرت شاہ صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲ [2] حیات ولی ص ۶۲۴ [3] شاہ عبدالعزیز صاحبؒ موسیقی کے بہت اچھے عالم تھے، تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ایک نایاب تصنیف" معارف، دسمبر ۱۹۶۴ء۔

قدس سرہ کی خدمت میں رہے ہیں، کہا انھوں نے کہ نواب نصراللہ خاں والئی رامپور کے یہاں ایک قوال مسمی ہمت خاں بڑا صاحب کمال تین سو روپے ماہوار کا نوکر تھا، تمام گویئے اسکو مانتے تھے، ثانی تان سین جانتے تھے، ایک دن اسکو خیال آیا کہ اگر مجھ کو تمام لوگ بڑا کمال والا جانتے ہیں، اس کا کچھ اعتبار نہیں، میں اپنے ہنر کو جب تک حضرت کے محک امتحان پر عرض نہ کروں اور ان کی زبان سے سند نہ لوں تو کیونکر اپنے کو کچھ چیز سمجھوں کس لئے کہ اس زمانے میں اس ذات جامع الکمالات کی جیسی کوئی ذات نہیں اور کمال وہی معتبر ہے جو اہل کمال پسند کریں اور داد دیں ..... اسی آرزو میں دلی کو آیا وہ حضرت کا آخر زمانہ تھا کہ بنیائی سلب ہوگئی تھی اور تمام حواس میں ضعف طاری تھا، روبرو حاضر ہو کر سلام کیا، آپنے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ آؤ ہمت خاں اچھے تو ہو، سنتے ہی نہایت حیران و ششدر ہوا، اور تمام حضار متعجب ہوئے کہ یہ شخص تو کبھی یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی حضرت نے اسکی آواز سنی اور نہ صورت دیکھی، یہ کیا بات ہے کہ اس کا نام لے کر پکارا، اس نے بھی استفسار کیا تو فرمایا کہ تمھارے گانے کا لوگ ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کی آواز میں یہ بات ہے اور اس طرح کا اتار چڑھاؤ ہے، وہ بات صاف تمھارے تکلم سے پائی گئی تو میں نے جانا کہ اس انداز کا تمھارے سوا کوئی نہیں ہے، جب اس نے اپنا مدعا عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں اپنا جوہر حضرت کے روبرو عرض کروں، ارشاد ہوا کہ مناسب، پھر حضرت نے ایک دن حضرت شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب وغیرہ بڑے بڑے کملاء کو جمع کیا اور کوئی اغیار سے نہ رہا تب اسکی یاد ہوئی، اور وہ گانے لگا، جو جو چیزیں اس کو یاد تھیں سب سنا دیں، تمام حضار کو رقت ہوئی، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کہ نہایت مستغل مزاج تھے، ان کے بھی اشک جاری ہوئے، چادر منہ پر ڈالے ہوئے بیٹھے رہے، اور حضرت بھی کھنڈولے پر جبناں تھے، جب وہ سب گا چکا

دوسرا اسباب بیش قیمت جو رہا تھا اس میں سے چند ہزار روپے واسطے زادِ راہ سفر حجاز اور ادائے مناسک حج وعمرہ وغیرہ کے اپنے نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہما کو عنایت کئے اور چند ہزار روپے مصارف مراسم وفات وتعزیت کے لئے دیئے، بعد ازاں کچھ اشعار عربی اور فارسی پڑھے، اور بہت شعر ایسے کہ ایک مصرع دوسروں کا اور ایک مصرع اپنا، چنانچہ یہ شعر مشہور قدسی علیہ الرحمہ کا[1]

روز قیامت چوں شود ہر کس بگیرد دامنے
من نیز حاضر میشوم تصویر جاناں در بغل

بجائے مصرع ثانی آپ نے فرمایا:-

من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآں در بغل

پھر فرمایا کہ میرا کفن ایسے کپڑے کا ہو جو میں پہنے ہوں، کرتا آپ کا ادھوتر کا اور پائجامہ گاڑھے کا ہوتا تھا اور فرمایا کہ جنازے کی نماز باہر شہر کے ہو، اور بادشاہ میرے جنازے پر نہ آوے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ساتویں تاریخ ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ وقت طلوع آفتاب کے روح پرفتوح اس عالم گذران سے جانب عالم جاوداں روانہ ہوئی، جس جائے آپ کو غسل دیا گیا تھا وہ خاک معطر ہوئی تھی، بہت لوگوں نے اپنے مکان میں اس کو رکھا تھا، اول بار دروازہ ترکمان دہلی کے باہر مولانا محمد اسحٰق صاحب نے امام ہو کر نماز پڑھائی، بعد ازاں نصیر الدین صاحب لکھنوی شافعی کے مقبرے میں جماعت سے نماز ہوئی، یہانتک کہ پچپن[55] بار جنازے کی نماز پڑھی گئی جوق در جوق آتے تھے اور پڑھتے تھے، بعض مقامات میں غائبانہ بھی نماز ہوئی ہے، مزار پر انوار آپ کا شاہجہاں آباد کے باہر دہلی دروازے کی سمت ہندوؤں کے قریب خوش زدہ کے چھتے میں واقع ہے[1]

---

[1] یہ جگہ میرور دہ وڈ کے سامنے جیل خانہ اور مولانا آزاد میڈیکل کالج کے پیچھے واقع ہے اور اب قبرستان ہندوؤں کے نام سے مشہور ہے، اسی قبرستان میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم کو بھی دفن کیا گیا ہے۔

نے بیان کئے ہیں جن کو نقل کرنے کی گنجائش اس مقالے میں نہیں ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے بہت سے تلامذہ کے تفصیلی حالات جواب بالکل نایاب ہیں، اس تذکرے میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسحٰق، مولانا یعقوب اور مولانا سراج احمد خورجوی کے حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس مختصر سے تعارف سے ناظرین اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی

آپ حج کیسے کریں؟

مفید اضافات کے ساتھ جدید ایڈیشن

حج و زیارت کے موضوع پر اب تک اردو میں بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اسکا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے اور ذوق و شوق اور عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی رُوح اور جان ہے۔ مجلد ۲/

آسان حج

اسے آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا مکمل خلاصہ سمجھئے۔ کم تعلیم یافتہ حضرات کے لئے حج کا بہترین معلم اور رہنما ہے۔ جیبی سائز آفسٹ کی بہترین طباعت۔ جدید ایڈیشن ـــــ قیمت ۶۰/-

ہندوستان کا سب سے پہلا

سفرنامۂ حجاز

آج سے ایک سو پچاسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد، ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی رفیع الدین صاحب حیدرآبادیؒ نے حرمین شریفین کا سفر بڑے ہی عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفر عشق کی مکمل روئداد قلم بند کر کے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی، تاریخ کے اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفر کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہندو حجاز کے بہت ہی نادر حالات اور معلومات اسکے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی ایمانی کیفیات کا تو یہ عجیب غریب ہی مرقع ہے۔

قیمت :- ۷۵/

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان۔ کچہری روڈ، لکھنؤ

نے بیان کئے ہیں جن کو نقل کرنے کی گنجائش اس مقالے میں نہیں ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے بہت سے تلامذہ کے تفصیلی حالات جواب بالکل نایاب ہیں، اس تذکرے میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسحٰق، مولانا یعقوب اور مولانا سراج احمد خورجوی کے حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس مختصر سے تعارف سے ناظرین اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مرتبہ
مولانا محمد منظور نعمانی

آپ حج کیسے کریں؟

مفید اضافات کے ساتھ
جدید ایڈیشن

حج و زیارت کے موضوع پر اب تک اردو میں بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی اس خصوصیت میں اب بھی ممتاز اور منفرد ہے کہ حج کے احکام اور اسکا پورا طریقہ بھی یہ بہت آسان اور دلنشین طریقے پر بتاتی ہے اور ذوق و شوق و عشق کا وہ جذبہ بھی پیدا کرتی ہے جو حج کی روح اور جان ہے۔ مجلد ۲/

آسان حج

اے آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں؟" کا مکمل خلاصہ سمجھئے۔ کم تعلیم یافتہ حضرات کے لئے حج کا بہترین معلم اور رہنما ہے۔ جیبی سائز آفسٹ کی بہترین طباعت۔ جدید ایڈیشن ——— قیمت ۶۰/-

ہندوستان کا سب سے پہلا

سفرنامۂ حجاز

آج سے ایک سو پچاسی برس پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد، ایک فاضل اور اہل دل بزرگ مولانا حاجی رفیع الدین صاحب مراد آبادیؒ نے حرمین شریفین کا سفر پورے ہی عاشقانہ انداز میں کیا تھا۔ سوا دو سال کے اس پورے سفر عشق کی مکمل روداد قلم بند کر کے انھوں نے یادگار چھوڑی تھی، تاریخ کے اعتبار سے یہ غالباً ہندوستان یا کم از کم شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا سفرنامہ ہے۔ صاحب سفر کے وسیع علمی ذوق کی بنا پر اس عہد کے ہندو حجاز کے بہت ہی نادر حالات اور معلومات اسکے اندر آگئے ہیں اور سفر حجاز کی ایمانی کیفیات کا تو پھر کہنا ہی مرجع ہے۔

قیمت :- ۷۵/

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مؤتمر اسلامی ؎

افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل

از شیخ محمد ابن الصبوری ، رجسٹرار جامعہ اسلامیہ ، مدینہ منورہ
(ترجمہ: مولانا سعید الرحمن اعظمی ، ندوۃ العلماء ، لکھنؤ)

جناب صدر ، اور معزز دوستو!

آپ کی اس موقر کانفرنس کے جنرل سکریٹریٹ نے مجھ سے ایک ایسا تفصیلی مضمون لکھنے کی فرمائش کی جس کا موضوع ہو "براعظم افریقہ میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کی سیاسی و سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز" تاکہ کانفرنس اس مسئلے پر غور کرکے کوئی عملی قدم اٹھا سکے۔ میں یہ مختصر مضمون اس فرمائش کی تعمیل میں پیش کر رہا ہوں جو حسب ذیل مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔
۲۔ اسلام اور مسلمانوں کی مخالف طاقتیں
۳۔ مسلمانوں کی بہبودی میں رکاوٹ ڈالنے والے حالات
۴۔ موجودہ سیاسی مسائل اور ہمارا موقف۔
۵۔ اسلامی عنصر کو تقویت پہونچانے کے لیے ضروری اقدامات۔

۱۔ براعظم افریقہ میں مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن

براعظم افریقہ کی مجموعی آبادی میں مسلمان ایک بڑی اکثریت ہیں۔ اس لیے کہ وہاں کی پوری آبادی (۲۵ کروڑ) میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ کروڑ سے بھی متجاوز ہے۔ مسلمانوں کے اس مجموعہ کی

؎ مؤتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں پڑھے گئے مقالات میں سے پہلا مقالہ اکتوبر کے الفرقان میں دیا جا چکا ہے یہ دوسرا ہے۔ یہ تمام اب اسی طرح الفرقان میں شائع ہوتے رہیں گے۔ مرتب۔

اہمیت جو دینی اور ثقافتی اعتبار سے متحد ہے اس لیے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ افریقہ کے غیر مسلم باشندوں کی اکثریت بت پرست قبائل سے تعلق رکھتی ہے جہاں ابھی تک کسی آسمانی مذہب کی رسائی نہیں ہو سکی ہے اور اس لیے ان کے اندر اسلامی دعوت کو پیش کرنے کے لیے ایک بڑا میدان موجود ہے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس براعظم میں اسلامی دعوت کے پھلنے پھولنے کے جتنے مواقع ہیں سارے عالم میں شاید کہیں نہ ہوں، لیکن افسوس یہ مواقع بھی محدود ہوتے جا رہے ہیں، اسلام دشمن طاقتیں ان کو ختم کرنے کے لیے اڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں اور جب تک ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسلامی اور عربی کوششیں وسیع پیمانہ پر ایک دوسرے کا ہاتھ نہ بٹائیں اس وقت تک ان سے فائدہ اٹھانے کا امکان نہیں ہو بلکہ بہت ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہ مواقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں..... اس بنا پر یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ آئندہ بیس سال اس براعظم میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن مدت ہوگی اور اگر مطلوبہ کوششیں وسیع پیمانہ پر وجود میں آجائیں تو یہ امید ذرا بھی خوش فہمی پر مبنی نہیں ہوگی کہ افریقہ ایک اسلامی براعظم بن جائے۔

اس براعظم میں مسلم اکثریت کی کوششوں کے باوجود (جو بعض علاقوں میں ۹۰ فی صدی سے بھی اوپر ہے) یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان عام طور پر غیر مسلم اقلیتوں کے زیر حکومت ہیں۔ جن کی سیاسی پالیسیاں اسلامی اخوت سے ٹکراتی ہیں۔ یہ غیر مسلم اقلیتیں مسلمانوں پر ایسے نظام عائد کرتی ہیں جو نہ صرف اسلامی فکر کے منافی ہیں بلکہ دعوت اسلامی کی کامیابی کے مواقع کو بھی پوری طرح ختم کر دیتے ہیں۔

یہ حالات کئی باتوں کا نتیجہ ہیں:-

۱۔ جدید تعلیم سے مسلمانوں کی بالعموم محرومی اور دوری، جس میں کچھ تو نوآبادیاتی سیاست کے قصد و ارادہ کو دخل تھا تاکہ مسلمان حکمرانی کے قابل نہ ہو سکیں۔ دوسرے خود مسلمانوں نے اپنی اولاد کو بے دینی کے اندیشے سے عیسائی اسکولوں میں داخل ہو کر تعلیم پانے سے باز رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام کلیدی عہدوں اور زندگی کے اہم شعبوں پر غیر مسلموں کو چھا جانے کا موقع مل گیا ــــ مزید برآں یہ کہ نوآبادیاتی تسلط نے جب ان ممالک کو آزادی دینے کا

ارادہ کیا تو اس کی مخصوص طور پر کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے زمام حکومت غیر مسلم لیڈر شپ کے حوالے کی جائے اور پھر مختلف معاہدوں اور اقتصادی امداد کے ذریعہ ان کی پشت پناہی کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اس کی مثال سنغال، تشاد، تنجانیکا، یوگنڈا، اور جابیا ہیں جن میں مسلمانوں کا تناسب ۷۰ سے لے کر ۹۸ کے درمیان ہے لیکن اس کے باوجود ان تمام ملکوں میں حکومت عیسائی اقلیت کے ہاتھوں میں ہے جس کے دل میں اسلام سے بغض و عناد بھرا ہوا ہے اگرچہ انتہائی عیاری کے ساتھ اس کو چھپانے کی کم و بیش کوشش کی جاتی ہے۔

۲۔ اسلامی بنیاد پر اسلامی جماعتوں کے متحد ہونے کا تصور اب تک غیر واضح ہے جس کی وجہ سے مسلمان مختلف سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں بلکہ کچھ اس بنیاد پر بھی آپس میں اختلافات کھڑا کرتے ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں سے دین کا کوئی تعلق ہی نہیں، حالانکہ یہ اختلاف اس کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ مسلمان بحیثیت اکثریت کے جن حقوق کے حقدار ہیں عملاً وہ ان سے فائدہ نہ اٹھائیں اور ایک بے اثر اکثریت بن کر رہیں۔ اس اختلاف و انتشار کے افسوسناک نتائج کی مثالیں افریقہ کے ان ممالک میں بکثرت ہیں۔

۳۔ بعض اسلامی جماعتیں اسلام کا ایسا غلط تصور اور اس کی ایسی بگڑی ہوئی تصویر پیش کرتی ہیں جو باطل اور خرافات کا مرقع ہوتی ہے۔ اور جس کی وجہ سے نئی نسلیں اسلامی رشتہ سے ٹوٹ کر عصر حاضر کے نئے فلسفوں اور نئے نظریوں کی طرف دیکھتی ہیں اور اس میں زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھتی ہیں، اسلامی اکثریت کی طاقتوں کو یہی چیز قدیم و جدید کے دو مکاتب فکر میں تقسیم کرتی ہے، قدیم مکتب فکر عصر حاضر کی روح اور زندگی کے تقاضوں سے بالکل الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو جدید مکتب فکر قدیم کو ناقابل اعتناء تصور کرتا ہے۔ اور خالص جدید افکار کو اپنی ترقیوں کا ذریعہ اور اسی کو اپنے مسائل کا حل تصور کرتا ہے۔ گو یہ دونوں مکتب فکر ہر جگہ حتیٰ کہ بلاد عربیہ میں بھی موجود ہیں، لیکن افریقہ میں جہاں اسلام کے خلاف زبردست معرکہ آرائی ہے اور جہاں اسلام کا مستقبل ایک مضبوط متحدہ اسلامی محاذ پر موقوف ہے، یہ تقسیم بہت خطرناک ہو جاتی ہے۔

۴۔ افریقہ میں بہت سی آزاد مسلم حکومتیں موجود ہیں جن میں اس بات کی پوری صلاحیت

ہو کہ اس برِ اعظم میں اسلامی لہر کو مضبوط کرنے میں ایک مؤثر رول ادا کریں لیکن وہ اپنے داخلی مسائل میں اس طرح پھنسی ہوئی ہیں کہ اس اہم کام کی طرف کوئی توجہ نہیں کر پاتیں۔ یہ مسائل بیرونی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہوں یا اندرونی اختلافات کا بہرحال ان حکومتوں کی اس میدان میں سرگرمی اور اثر اندازی کے لیے سمِ قاتل ہیں۔ مثال کے طور پر سوڈان کے لیے جنوبی سوڈان کا مسئلہ، زنجبار کا اندرونی جھگڑا اور مراکش و الجزائر کا سرحدی قضیہ۔ اسی طرح سلم افریقہ میں وہ تمام عیوب و اختلافات موجود ہیں جو عام طور پر عربی اور اسلامی ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور جو اسلامی تربیت کی کمزوری اور سامراج کے پیدا کردہ سیاسی اور اقتصادی احوال کا نتیجہ ہیں، جیسے کہ قومیت و وطنیت اور اشتراکیت وغیرہ کے نعرے بھی افریقہ میں ابھر رہے ہیں اور سب سے زیادہ خطرناک صورت حال یہ ہے کہ ان لیڈروں کے اردگرد اسلامی ذہن رکھنے والے ایسے افراد یا جماعتوں کا بھی فقدان ہے جو انھیں صحیح رہنمائی دیں اور اس غلط بہاؤ کو روکنے یا کم سے کم اس کو سست کرنے کا راستہ انھیں بتائیں۔ بعض جگہ اگر خوش قسمتی سے ایسے حکمراں پائے جاتے ہیں جو اپنے ملکوں کی سیاست و معیشت کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنا اور اسلامی دنیا سے خود کو مربوط رکھنا چاہتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ سامراج نے ایک طرف ان کو ایسے حالات میں چھوڑا ہے کہ بیرونی امداد کے بغیر ان کا کام کسی طرح نہیں چل سکتا اور دوسری طرف تخریب کاری کے ایسے جال پھیلا دیے گئے ہیں جو وقت ضرورت سامراج کے ادنیٰ اشارے سے اس کے کام آسکتے ہیں۔

افریقہ کے ایک ایک ملک کے تفصیلی حالات کو نظر انداز کر کے اگر پورے برِ اعظم پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ افریقہ کے بارے میں بڑی طاقتوں کی پالیسی بھی اس کی وحدت کے تصور ہی پر مبنی ہے اور اس نقطۂ نظر سے وہ افریقہ کی غیر مسلم قیادتوں کو ہر ممکن طریقے پر اس رجحان کو مضبوط اور مؤثر بنانے کے لیے کوشاں ہیں کہ دنیا کی نظر میں یہی قیادتیں افریقہ کی ترجمان اور اس کے سیاہ و سفید کی مختار بن جائیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان بڑی طاقتوں نے افریقیوں کے اندر اتحاد و یکجہتی کے رجحان کا اندازہ کر کے اس بات کا مکمل منصوبہ بنایا ہے کہ کس طرح اس متحدہ افریقہ کی حکمرانی غیر مسلم عناصر کے

ہاتھ میں آجائے۔ اور اس کا تقاضہ ہے کہ ہم ہر افریقی ملک کے حالات کا جدا جدا جائزہ لینے کے ساتھ عملی پالیسی کا مدار اس کی وحدت کے تصور ہی پر رکھیں، جہاں جہاں اسلامی قیادتیں موجود ہیں اُن سے واقفیت حاصل کریں اور جہاں یہ قیادت مفقود ہے وہاں اسے وجود میں لانے کی کوشش کریں تاکہ افریقہ کے مسلمان پورے براعظم میں اپنا صحیح رول ادا کر سکیں۔

۲۔ اسلام اور مسلمانوں کی مخالف طاقتیں

۱۔ عیسائی مشنریاں۔ آج سے قریباً ڈیڑھ صدی پیشتر جب عیسائی مشنریوں نے افریقہ کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اُن کے سامنے صرف ایک مقصد تھا کہ افریقیوں کو عیسائی بنائیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا بت پرست۔ مسلمانوں کے معاملے میں ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے عقائد گاڑ دینا اور سیاسی و اجتماعی لحاظ سے ان کو کمزور کر دینا، اسلام کے آغوش سے ان کو نکالنے ورنہ کم سے کم ان پر سے اسلام کی گرفت کو کمزور کر دینے کی طرف ایک مؤثر قدم ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ اپنی اجتماعی زندگی کی اساس کمزور پڑ جانے پر وہ بے وزن اور بے اثر گروہوں کی شکل میں رہ جائیں جن کے ہاتھ میں کوئی طاقت نہ ہو۔

ہم اگر یہ سمجھ لیں کہ عیسائی مشنریوں کا یہ حملہ بالکل ناکام رہا تو یہ بڑی غلطی ہوگی کیونکہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ عیسائی اقلیتیں کس طرح بعض اُن افریقی ملکوں تک پر قابض ہیں جن کی غالب اکثریت مسلمان ہے۔ مشنریوں کے کچھ خاص طریقے اور بھی ہیں جو افریقیوں کے لیے بڑے مؤثر ہیں اور اُن سے کام لینے میں یہ برابر لگی رہتی ہیں۔ وہ طریقے کیا ہیں۔ اسکول، شفاخانے اور پناہ گزیں کیمپوں جیسے رفاہی کاموں کے ذریعے عوام میں نفوذ۔ اور پھر انھیں اڈوں سے وقت ضرورت اسلامی ممالک میں بغاوت کی آگ بھڑکانے اور اندرونی کشمکشوں کو ہوا دینے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن اب جبکہ افریقہ آزادی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے عیسائی مبلغین کو یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ان کے مشن کا گزشتہ سامراج سے تعلق آزاد افریقہ میں ان کے لیے بڑی پریشانیوں اور دشواریوں کا باعث بن گیا ہے اور افریقہ کے عوام مسیحت کو اُن سفید فاموں کے مذہب کی نظر سے دیکھتے ہیں جنھوں نے صدیوں ان کا

خون چوسا ہے۔ اس صورت حال نے ان مشنریوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ جگہ جگہ کانفرنسیں کرکے اپنے اور سفید سامراج کے تعلق کو دبا دینے کی اسکیمیں تیار کریں۔ اور جو افریقی ملک ابھی تک سامراج کے شکنجے میں ہیں اُن کی آزادی کے مطالبات کی تائید کریں، بلکہ مختصر یہ کہ ہر ممکن کوشش سے مسیحیت کو سیاہ فاموں کا مذہب بنا کر پیش کریں۔

اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ اور جنوبی رھوڈیشیا کے کلیسا کا رویہ ایک مثال کی حیثیت سے دیکھنے کے قابل ہے جہاں کانفرنسیں منعقد کرکے نسلی امتیاز کی مخالفت کی گئی اس طرح اب یہ بھی مشاہدہ میں آنے لگا کہ کلیسا کے عہدے بھی افریقی عیسائیوں کو دیے جانے لگے ہیں۔ یہ تمام باتیں اس وسیع منصوبے کا ایک جزو ہیں جو افریقہ کی آزادی سے پیدا شدہ نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت اونچی سطح پر تیار ہو رہا ہے اور جس کا ایک اشارہ عیسائی دنیا کے موجودہ پوپ کی ایک حالیہ تقریر سے بھی ملتا ہے جس میں موصوف نے افریقہ کو "مسیح کی نئی سرزمین" کے نام سے یاد فرمایا۔

اس بات کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عیسائیت کی تبلیغ کو سامراج سے الگ کرنے کے اقدامات محض دکھاوا ہیں جس سے ایک زوال پذیر طاقت اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتی ہے، اور یہی کیا سامراج اس وقت اپنی پالیسیوں کو ہر پہلو سے بدلنے اور نئی شکلیں اختیار کرنے میں لگا ہوا ہے جس سے افریقی دھوکے میں آسکیں۔ جیسے کہ اقتصادی اور ثقافتی تعاون جس کا مقصد ایک نئے انداز سے تسلط برقرار رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ٹھیک جس طرح استعمار اور سامراج اپنا لبادہ بدل رہا ہے اس طرح اس کی دست راست عیسائی مشنریاں بھی ایک نیا روپ دھارنا چاہتی ہیں۔ اگرچہ دونوں کا مقصد بدستور ایک ہے اور دونوں ایک دوسرے کے معاون و مددگار!

عیسائیت کا تبلیغی نظام اپنے ان نئے طور طریقوں کے ساتھ ساتھ افریقہ میں اپنی کچھ مددگار طاقتیں بھی رکھتا ہے اور وہ وہاں کی وہ حکومتیں ہیں جن میں عیسائیت کا پورا غلبہ ہے۔ اس چیز نے عیسائیت کو افریقہ میں کامیابی کا پورا موقع فراہم کر دیا ہے۔ اور اسی چیز نے ہم پر یہ لازم کر دیا ہے کہ افریقہ میں دعوتِ اسلامی کے مضبوط مرکز قائم کریں۔ ورنہ

ہم اگر اس بارے میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت کے اس منصوبے کو کامیابی کی پوری آزادی دے رہے ہیں کہ وہ افریقہ میں اسلام کو باہر سے لاکر تھوپے ہوئے مذہب کی شکل میں پیش کرے اور یہ وہ شکل ہوگی جسے آزاد افریقہ کا ذہن قبول کرنا کبھی گوارا نہیں کرسکتا۔ ہمیں اس خطرہ کی پیش بندی کے لیے پوری حکمت سے کام لینا ہے۔ منجملہ اس کے یہ بھی ہے کہ یہاں اسلامی دعوت کا کام اہل افریقہ ہی کے ذریعہ سے ہو جن میں خود اسلام کی گہری جڑیں موجود ہیں۔

۲۔ سامراج۔ عیسائی مشن اور سامراج جس طرح ساتھ ہی ساتھ افریقہ میں داخل ہوئے تھے اسی طرح ان کی سرگرمیوں میں بھی حالات کے مطابق کہیں کھلے طور پر اور کہیں چھپے طور پر اتحاد قائم رہا۔ ایک طرف مشن کا کام یہ تھا کہ وہ اہل افریقہ کے دین و مذہب اور ثقافت و روایات کی بیخ کنی کرے اور ان کی قومی خودداری کے سوتے خشک کردے، دوسری طرف سامراج کا کام یہ تھا کہ وہ اس خلا سے فائدہ اٹھاکر ان قوموں کو غلام بنائے اور یہاں کی دولت سے اپنی قوم کو مالا مال کرے۔ یہ افریقہ کے دور غلامی کی بات تھی۔ اور اب جبکہ افریقہ آزاد ہو رہا ہے تو سامراج عیسائی مشنریوں کے کام سے ایک دوسرے انداز میں فائدہ اٹھا رہا ہے۔ افریقہ جب آزادی کے مرحلہ تک پہونچا تو عیسائی مشن کی وسیع جدوجہد کی بدولت قیادت و حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے ان کے رنگ میں رنگا ہوا ایک طبقہ تیار ہو چکا تھا۔ اب سامراجی طاقتیں ہر ممکن طریقے سے اس طبقہ کو اپنی جگہ دلا رہی ہیں اور امداد کی جو صورت بھی ان کے بس میں ہے (حتیٰ کہ بعض وقت فوجی مداخلت بھی) اس کے ذریعہ اس نوخیز طاقت کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ قریب ہی کے گزشتہ سالوں میں دیکھئے کہ مشرقی اور مغربی افریقہ کی ریاستوں کینیا، یوگنڈا، تنجانیکا، جابون، تشاد اور داہومی میں حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لیے کس تیزی سے بیرونی فوجیں اتاری گئیں اور اس کے مقابلہ میں زنجبار کی بغاوت کو کس لاپروائی کے ساتھ نظر انداز کیا گیا اسلیے کہ یہاں بغاوت اسلامی قیادت کے خلاف تھی۔

آج سامراجی طاقتیں اپنے اثر کی چھوٹی چھوٹی افریقی ریاستوں کے ذریعے افریقی اتحاد کے نام پر عیسائی قیادت کو مضبوط کرنے اور اسلامی قیادتوں کو ابھرنے سے روکنے میں انتہائی سرگرمی کے ساتھ منہمک ہیں اور اسلیے اسوقت انتہائی افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مسلم حکومتیں بھی ان کے جال میں پھنس گئی ہیں۔

اور سیاسی تعاون کی راہوں سے دانستہ یا نادانستہ اسلامی تیاریوں کیخلاف عیسائی تیاریوں کی مددگار بن رہی ہیں۔

۳۔ اسرائیل۔ تیسری اہم طاقت جو افریقہ میں سرگرم عمل ہے وہ اسرائیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل سامراج اور عیسائی مشنریوں سے الگ رہ کر کوئی کام نہیں انجام دے رہا ہے بلکہ انھیں کے دوش بدوش ایک ہی اسکیم کے ماتحت عمل پیرا ہے۔ افریقہ میں اسرائیلی سرگرمیوں کا موضوع ایک مستقل بحث چاہتا ہے جسکو ہم مختصراً درج ذیل نقاط میں بیان کر رہے ہیں۔

(الف) تاریخی پہلو۔ (ب) دینی پہلو۔ (ج) سیاسی پہلو۔ (د) اقتصادی پہلو۔ (ہ) پروپیگنڈا۔

(الف) اسرائیلی سرگرمیوں کا تاریخی پہلو۔

سامراج نے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلی ہے کہ عرب ہی وہ قوم ہے جس نے اسلام کو براعظم افریقہ تک پہونچایا اور وہ اب بھی اپنے افریقی بھائیوں کی قوت کا سرچشمہ اور ان کیلئے مرکز تقویت ہیں۔ نیز یہ بھی کہ افریقی براعظم کا مستقبل اور سامراج کے علی الرغم اسکی ترقی کے امکانات بڑی حد تک عرب افریقہ کے ہم آہنگ تعلقات پر موقوف ہیں اسلیے سامراج کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ افریقیوں کو عربوں سے متنفر کرنے کے تمام وسائل استعمال کرے چنانچہ اُسنے عربوں کو غلاموں کی تجارت اور ان کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیلئے مطعون کیا اور اس سلسلہ میں بعض ایسی انفرادی اور شاذ مثالوں کا پروپگنڈہ کیا گیا جن سے کسی بھی معاشرہ کا دامن پاک نہیں کہا جاسکتا۔ یہ پروپگنڈہ اگرچہ افریقی مسلمانوں میں کامیاب نہیں ہوسکا، لیکن یہاں کے غیر مسلم لیڈروں اور قائدین پر اس نے برا اثر ڈالا اور عربوں کی نسبت مخالفانہ فضا پیدا کرنے کا سبب بن کر رہا ہی وہ فضا تھی جس کو اسرائیل نے اپنے پروپگنڈے کے لیے استعمال کیا، چنانچہ آج افریقہ میں غلامی کا موضوع اسرائیلی پروپگنڈے کا ایک اہم باب بن چکا ہے، اسی طرح اسرائیلی پروپگنڈہ اس "ظلم ونا انصافی" کی تصویر کشی میں بہت حد تک کامیاب رہا جس سے اسرائیل کو اپنا فطری حق واپس لینے اور اپنے "اصلی وطن" واپس جانے میں دوچار ہونا پڑا پھر اسرائیل نے اپنے بارے میں اس نام نہاد ظلم ونا انصافی" کی تصویر کو اس ظلم ونا انصافی کے ساتھ ملا کر پیش کیا جسمیں خود افریقی ایک عرصہ تک استعمار پسند قوموں کے ہاتھوں مبتلا رہے ہیں اور اسکے بعد یہ نعرہ بلند کیا کہ اسرائیلی اور افریقی دونوں نسلی اور مذہبی امتیاز کے سبب مظلوم قومیں ہیں اسلئے انکو دنیا سے ظلم ونا انصافی کا قلع قمع کرنے کیلئے متحد ہوجانا چاہیئے۔

یہ دلائل حد درجہ بودے اور ناقابل اعتنا ہیں اور تاریخی اعتبار سے ان کا رد کرنا بالکل آسان ہے لیکن عربی و اسلامی ذرائع نے اس کا اہتمام بالکل نہیں کیا اور اسکو ایک بدیہی اور آسان چیز سمجھ کر چھوڑ دیا، حالانکہ یہ پروپگنڈہ تمام افریقی ممالک میں زہر کی طرح سرایت کر رہا ہے اور عربی افریقی تعاون و اتحاد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔

(ب) اسرائیلی سرگرمیوں کا دینی رُخ

افریقہ کے اندر اسرائیلی سرگرمیوں میں ایک دینی عنصر بھی شامل ہے اور وہ یہ ہے کہ یہودی وہاں کے عیسائیوں کے مذہبی جذبہ کی تائید حاصل کرنے کے لیے اپنے معاملہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اسرائیلی حکومت کا قیام دراصل ان پیشین گوئیوں کا ظہور ہے جو تمام عیسائی فرقوں کے مقدس صحیفوں "عہد نامہ قدیم" اور "عہد نامہ جدید" میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اس بنیاد پر عربوں کے ہاتھوں اس حکومت کا سقوط خود مسیحی عقیدے کے لیے ایک چیلنج اور حکم الٰہی کی شکست ہے۔ اسرائیل کے لیے ایک بڑی پریشانی یہ تھی کہ عیسائیوں کی مقدس کتابوں میں صاف صاف مذکور تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھوانے کے تمام تر ذمہ دار یہودی تھے اور اس لیے یہ کتابیں یہودیوں پر لعنت سے بھری ہوئی بھی ہیں۔ یہ چیز عیسائی اور اسرائیلی اتحاد کی راہ میں، بالخصوص عوامی سطح پر اتحاد و مفاہمت کی راہ میں ایک سخت رُکاوٹ تھی اور عرب یا کسی بھی یہود دشمن طاقت کو اسرائیل پر حملہ آور ہونے اور اس کے قلع قمع کر دینے کا بہترین موقع فراہم کرتی تھی۔ لیکن اسرائیل کی یہ مصیبت دنیائے عیسائیت کے مرکزی ادارے کے اس حالیہ فیصلے نے دور کر دی کہ یہودی من حیث القوم حضرت مسیح کے خون سے بری ہیں۔ اور اس لیے اسرائیلی پروپیگنڈا اس فتوے کا اب جتنا بھی سہارا لے وہ کم ہے۔ اس کے ساتھ اسرائیل کو ایک اور چیز سے بھی فائدہ پہنچ رہا ہے اور وہ یہ کہ افریقہ کے عیسائی بالخصوص اور دنیا بھر کے ارباب کلیسا بالعموم افریقہ میں اشاعت اسلام کے اندیشے سے بہت خائف ہیں اور اس لیے کسی ایسے تیسرے فریق کے خواہاں ہیں جو اس میدان میں عرب مسلمانوں کے ایک ازلی دشمن کی حیثیت سے ان کا حلیف بن کر رونما ہو۔

اسرائیل ایک طرف ان بنیادوں پر عیسائیوں کا تعاون حاصل کر رہا ہے اور دوسری طرف اُس کی یہ کوشش بھی ہے کہ فلسطین کے معاملہ میں مسلمانوں کی یکجہتی کو توڑ کر ایک بالواسطہ تائید حاصل کر لے۔ اس سلسلے میں اس کے پروپیگنڈے کا رُخ یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں، خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ یہ پانی کی تقسیم یا سرحدوں کی تعیین کا معمولی جھگڑا ہے وغیرہ وغیرہ افسوس ہے کہ افریقہ کی بعض اسلامی قیادتیں اپنی کم نظری اور اسلامی شعور کی خامی کی بنا پر اسرائیل کی اس چال سے متاثر بھی ہو رہی ہیں اور اسی کے ساتھ ہم اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ

بعض عرب سیاسی قیادتیں بھی اپنی جہالت یا حماقت سے اس اسرائیلی فریب کو مدد پہنچا رہی ہیں۔ وہ بار بار یہ آواز بلند کرتی ہیں کہ فلسطین کا مسئلہ عرب قومیت کا مسئلہ ہے نہ کوئی اسلامی مسئلہ۔ اور پھر اس پر مستزاد اُن کا طرزِ عمل ہے کہ ایسے ہی متعدد مسئلوں میں وہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی ہمنوائی کرتی نظر آتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ افریقہ میں اگر کمیونسٹ دنیا یا سیاسی مسلم لیڈرشپ کو اسرائیل کی تائید پر مطعون کیا جاتا ہے تو وہ فوراً ان عرب مملکتوں اور اُن کے قائدین کے بیانات و طرزِ عمل ہی سے اپنے حق میں دلیل لاتے ہیں اور پھر برملا کہہ دیتے ہیں کہ قوم و وطن کا مفاد ہر چیز پر مقدم ہے۔

(ج) اسرائیلی سرگرمیوں کا سیاسی پہلو

افریقہ میں اسرائیلی سرگرمیوں کے پس پشت در اصل سامراجیوں کی شاطرانہ سیاست بھی کارفرما ہے۔ اس سیاست کا خلاصہ یہ ہے کہ افریقہ میں اسرائیل کے نفوذ کی سرپرستی کرکے اس علاقے میں عرب سیاست کا بہت اچھا توڑ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس شکل میں جو افریقی ریاستیں اسرائیل سے تعلقات استوار کریں گی ان سے عرب حکومتیں دشمنی مول لے لیتی ہیں تو اس طرح عرب افریقی اتحاد کے امکانات میں وہ زبردست رخنہ پڑ جائے گا جو عین مطلوب ہے اور اگر یہ حکومتیں اس مسئلہ پر سمجھوتے کی روش اختیار کرتی ہیں اور افریقی ریاستوں کو اسرائیل کے وجود کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے کی اجازت دیتی ہیں تو اسرائیل کا کام پھر یہ ہوگا کہ عرب افریقی تعلقات میں مستقل زہر چکانی کرے اور سامراج کا آلۂ کار بن کر ان ریاستوں کو سامراجیوں کے حلقۂ اثر میں لائے۔ اور اس سلسلے میں جو طریقے مفید مقصد ہو سکتے ہیں مثلاً اقتصادی اور فنی امداد یا پروپیگنڈہ اور اُس سے بھی آگے رشوت و فریب دہی ان سب میں یہ مانی ہوئی بات ہے کہ یہودی اپنا جواب نہیں رکھتے اور خود بھی انھیں بڑا شوق ہے کہ اس میدان میں شہسوار دہی ہوں گے۔

اسی طرح خود افریقی سیاست کا ایک پہلو بھی اسرائیل کے لیے مددگار ہو رہا ہے اور وہ ہے افریقی اتحاد کے سلسلے میں افریقہ کی عرب اور غیر عرب قیادتوں میں رقابت کا جذبہ۔ کچھ خاص افریقی قیادتیں جن کی سامراج دشمنی شک و شبہ سے بالاتر ہے وہ اس خلوص کے باوجود اسرائیل کی پشت پناہ بھی ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ وہ بعض طاقتور عرب قیادتوں کے

اثر و رسوخ سے خائف ہیں اور افریقہ میں عربی اور اسلامی اثرات کے نفوذ کے فرضی خطرہ کے مقابلہ کے لیے اسرائیل کو ایک مؤثر رکاوٹ سمجھتی ہیں۔

(د) اسرائیلی سرگرمیوں کا اقتصادی پہلو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ افریقہ کی اکثر نوآزاد ریاستیں سامراج کی چھوڑی ہوئی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بیرونی اقتصادی امداد اور فنی تعاون کی سخت محتاج ہیں۔ ان ریاستوں کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسرائیل اپنا بھرپور تعاون پیش کرتا ہے اور کچھ خاص اسباب ہیں جن کی بدولت اسرائیل کو اس مہم میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

(۱) یہ کہ قومی لحاظ سے دنیا کی کوئی قوم اقتصادی فراست اور فنی مہارت میں یہودیوں کا مقابلہ نہیں کرتی اور اسی طرح دنیا بھر میں یہودی سرمایے کا تسلط بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہ دوہری طاقت اسرائیل کو پورا موقع فراہم کرتی ہے کہ افریقہ پر چھا جائے۔

(۲) یہودیوں کی عالمی کمپنیاں غیر یہودی کمپنیوں میں بھی مختلف طریقوں سے دخیل ہیں اور اس طرح بین الاقوامی تجارت و صنعت پر اُن کا پورا اثر ہے

(۳) اقوام متحدہ کے ماتحت بین الاقوامی اداروں مثلاً یونسکو اور یونیسیف یا بڑی طاقتوں کے قائم کردہ ایسے اداروں کے اکثر ارکان یہودی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ افریقی ریاستوں میں اپنے فرائض اسرائیلی پالیسی کے ماتحت انجام دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک مزید بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ افریقہ میں اسرائیل کے اقتصادی نفوذ میں ایک بڑی حد تک ان حالات کا بھی دخل ہے جو مسئلۂ فلسطین کے سلسلے میں رونما ہو چکے ہیں، مثلاً خلیج عقبہ اور آبنائے تیران پر۔ اسرائیل کے قبضے نے مشرقی اور وسطی افریقہ میں اسرائیل کے حق میں بڑا نفسیاتی اثر ڈالا ہے۔

(ہ) اسرائیلی سرگرمیوں میں پروپیگنڈے کا عنصر

گزشتہ اوراق میں اسرائیلی سرگرمیوں کے دینی، تاریخی یا اقتصادی پہلوؤں کی جو تفصیل پیش کی گئی ان سب سے مل کر اسرائیلی پروپیگنڈہ مشینری کی تکمیل ہوتی ہے جو براعظم افریقہ پر چھائی ہوئی ہے اور مزید برآں ہر شہر میں اسرائیل افریقہ دوستی کی انجمنیں قائم کی

جارہی ہیں جو اسرائیل سے آنے والے مہمانوں کے لیے لیکچروں کا انتظام کرتی ہیں اور یہودی کارندوں اور اہم افریقی شخصیتوں کے درمیان تعارف کے لیے جلسے منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تحفے تحائف پیش کرنے اور صحافتی نمائندوں، ریڈیو کے نامہ نگاروں اور کالجوں یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے لیے سفروں کا انتظام کرنے میں گراں قدر رقمیں خرچ کی جاتی ہیں اور اسرائیل کے تعلیمی اور فوجی اداروں میں تعلیم پانے والے افریقی طلباء کی خبریں افریقی اخبارات میں نمایاں طور سے شائع کرا کے یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسرائیل ہر علم و فن کا مرکز اور افریقہ کا بہترین دوست ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ بھی کہنا چاہیئے کہ اسرائیلی پروپیگنڈے کو ماضی میں جس چیز نے بیحد فائدہ پہنچایا ہے وہ عرب ملکوں کے باہمی اختلافات تھے۔ اسرائیلی ذرائع بڑی پابندی سے اُن الزامات کو نشر کرتے تھے جو ایک عرب فریق دوسرے کے خلاف عائد کرتا تھا۔ ان باتوں کی مدد سے اُس نے افریقیوں کے سامنے عربوں کی یہ تصویر پیش کی کہ وہ ایک منتشر اور باہم متحارب قوم ہیں جن میں کوئی کلمہ اشتراک یا اتحاد رائے نہیں اور اس لیے ان سے تعاون اُن پر تکیہ بالکل فضول ہے۔ اسی کے ساتھ اسرائیلی پروپیگنڈہ عربوں اور یہودیوں کے نزاع کی حقیقت سے ناواقف افریقیوں کو یہ باور کرانے میں بھی کامیاب ہوتا رہا کہ اسرائیل ہر مناسب قیمت پر عربوں سے اپنا جھگڑا طے کرنے اور اُن سے مصالحت کرنے پر راضی ہے مگر عرب اُسے مٹا کر دم لینے کے سوا کسی بات پر راضی نہیں۔

(۴) بین الاقوامی کمیونزم

کمیونزم کا تمام مذاہب کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے اُسکے اتحت اسلام کے بارے میں بھی کوئی اور متصور ہو سکتا کہ اس کو نیست و نابود کر دیا جائے اور حقیقت اس بات سے نہیں بدل سکتی کہ بعض جگہ وہ سامراج کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موجودہ حالات میں کمیونزم اسلام کے لیے براہ راست کوئی خطرہ نہیں ہے اسلیے

کہ اس وقت اسے خود اپنے موجودہ دشمنوں سے فرصت نہیں ہے۔ لیکن واقعات و حالات کا طبعی انقلاب کسی سخت ٹکراؤ کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ آج کمیونسٹ کوشاں ہیں کہ مزدوروں اور طالب علموں کی تحریکوں اور کسانوں اور مختلف پیشے وروں کی نمائندہ انجمنوں پر قابض ہو جائیں اگر ان کو اس مہم میں کامیابی ہو جاتی ہے تو لازماً یہ طبقے اسلام کے ہاتھ سے نکل جائیں گے جیسا کہ روسی اور چینی درسگاہوں سے تعلیم پاکر آنے والے طلباء کا حال یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی روایات کا ادنیٰ احترام تک اپنے دل میں نہیں رکھتے۔

افریقہ میں اسلام کے لیے کمیونزم کا خطرہ اس لیے اور زیادہ قابل فکر ہے کہ وہاں دینی تنظیمیں اور اسلامی شعور کمزور ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ وہاں کی اسلامی جماعتیں بین الاقوامی کمیونزم سے کافی قریب بھی ہیں۔

(۳) مسلمانوں اور عربوں کے لیے موافق حالات

افریقہ میں مسلمانوں اور عربوں کے لیے صرف ناموافق اور مخالف حالات ہی نہیں ہیں بلکہ کچھ موافق اور سازگار حالات بھی پائے جاتے ہیں اور بشرط کوشش ان سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مثلاً (الف) جنوبی افریقہ اور رہوڈیشیا میں افریقی عوام اور وہاں کی نسل پرست اقلیتی حکومتوں کے درمیان جو کشمکش برپا ہے اسکی وجہ سے افریقیوں میں ایک بڑی جماعت عرب اور اسلامی حکومتوں کی طرف دیکھتی ہے اور ان کو ہر جگہ ایک طاقتور عنصر تصور کرتی ہے۔ خواہ اقوام متحدہ کا دائرہ ہو یا اس کے باہر یہ صورت حال عربی اور اسلامی مسائل میں اہل افریقہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا بہترین موقع فراہم کرتی ہے اور افریقہ میں اسلامی اخوت کو مضبوط کرکے وہاں کے مسائل میں سرگرم کرنے کا بھی!

(ب) عیسائی مذہب افریقہ میں اب تک اس تہمت سے بری نہیں ہو سکا کہ وہ سفید فام سامراج کا دین ہے۔ کلیسا نے اس الزام کی تردید میں ہر طرح کی کوشش کر ڈالی مگر وہ لوگوں کے ذہن سے اس تصور کو ختم کرنے میں ناکام رہا۔ اس لیے ابھی کچھ وقت تک ضرور عیسائی مذہب کے پھیلنے اور مقبول ہونے میں یہ تصور آڑے آتا رہے گا۔ اس زریں موقع سے اگر مسلمانوں نے

فائدہ نہ اُٹھایا تو وہ ہمیشہ اپنی اس غلطی پر کفِ افسوس ملتے رہیں گے۔

(ج) تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بُت پرست آبادیاں افریقہ میں اسلامی دعوت کو قبول کرنے میں سب سے آگے ہیں اور اس سلسلہ میں کوئی بھی منظم کوشش کی جائے تو ان کی بہت بڑی تعداد کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا جاسکتا ہے۔

(د) اسلامی ملکوں کی آزادی کے ساتھ ہی عربوں اور دوسرے مسلمانوں سے بہتر تعلق قائم کرنے کا طبعی رجحان، ان حکومتوں کا تعاون حاصل کرنے اور انکی جغرافیائی پوزیشن سے فائدہ اُٹھاکر کسی بھی وسیع اسلامی منصوبے کو بروئے کار لانے کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔

(ہ) افریقہ میں بھی حسب فطرت اسرائیل سے ایسی حرکتیں سرزد ہونا شروع ہوگئی ہیں جن سے ہمیشہ ہی دوسری قوموں میں نفرت کا جذبہ بھڑا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ جذبہ اُبھر رہا ہے اور یہودیوں کے دھوکے، فریب اور رشوت کے ذریعہ لوگوں کو ہمنوا بنانے کی مذموم عادتیں جوں جوں ظاہر ہو رہی ہیں۔ افریقہ میں ان سے نفرت پیدا ہوتی جارہی ہے اور وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

(۴) ضروری اقدامات

(الف) سیاسی میدان میں:۔

سیاسی پہلو سے عرب اور دیگر اسلامی حکومتوں کے درمیان ایک مشترک لائحہ عمل تیار ہونا چاہیے جس میں تمام حالات اور تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے اور اس میں اسرائیل سمیت تمام سامراجی اور نسلی طاقتوں کے خلاف افریقی حکومتوں سے تعاون کے امکانات کا سنجیدہ جائزہ بھی شامل ہو۔ اس سیاسی لائحہ عمل کو تیار کرنے میں زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ہمارے سیاسی موقف میں اگر کوئی خامی رہ گئی تو اس کے نتیجہ میں ہمارا بڑے سے بڑا پروپگنڈہ اور موثر سے موثر اقتصادی تعاون بھی بے کار جاسکتا ہے

(ب) پروپیگنڈے کے میدان میں۔

ایک ایسی پروپگنڈہ تنظیم جس کا تعلق صرف افریقہ سے ہو، ناگزیر ہے، اس کے ذریعہ

ان تمام الزامات کی تردید کی جائے جو سامراج نے عربوں پر لگائے ہیں اور جن کی نشر و اشاعت برابر مشنریوں اور صیہونی مرکزوں کی طرف سے ہوتی رہتی ہے، اسی طرح کچھ ملکوں میں مسلم صحافت (پریس) قائم کرنے کے متعلق غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں نوجوان طبقہ کو صحافت اور نشر و اشاعت کے کاموں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پورا تعاون دیا جائے تاکہ وہ تدریجی طور پر نشر و اشاعت کے ذرائع سے سامراجیوں کی اجارہ داری کو ختم کر سکیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس عداوت کو کم کرنے کی کوشش بھی کی جائے جو عرب اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے دل میں موجود ہے۔

(ج) ثقافتی میدان میں

ثقافت کی راہ سے افریقی حکومتوں کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنانے کے لیے عرب اور دیگر مسلمانوں کے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں مسلمانوں کی موجودہ تعداد اور اسلامی عربی ثقافت کی طرف ان کا طبعی رجحان اس مہم کو بہت زیادہ سہل بنا دیتا ہے۔ بشرطیکہ منظم اور مسلسل طور پر اس کیلئے کوشش کی جائے۔ ہم اس کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں:۔

(۱) جس علاقے میں بھی مدرسین اور واعظین کی ضرورت ہو برابر اور فوراً فراہم کیے جائیں۔

(۲) عربی اور اسلامی تعلیم کے لیے ایسا نصاب تیار کیا جائے جو افریقی ماحول اور حالات سے میل کھا سکے، نیز اس کے لیے نصاب کی کتابیں طبع کرائی جائیں۔

(۳) عرب اور دیگر اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے افریقی طلباء کے لیے تعلیمی وظائف جاری کیے جائیں اور مذہب و زبان کی تعلیم کے ساتھ دوسرے علوم کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا جائے۔

(۴) افریقہ کے تمام موجودہ مدارس اور کالجوں کو ہر ممکن امداد کے ذریعہ مستحکم بنایا جائے اور حسب ضرورت مزید مدارس کھولے جائیں۔

(د) اقتصادی میدان میں۔

گزشتہ سطور میں ہم نے تفصیل کے ساتھ افریقہ کے لیے اقتصادی امداد اور فنی تعاون کی کی ضرورت کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ یہی وہ خلا ہے جس سے سامراج اور صیہونیت کو فائدہ

اٹھانے کا موقع مل رہا ہے، اس لیے عرب اور دیگر مسلم حکومتوں پر لازم ہے کہ وہ اس مقصد کے پیش نظر کوئی خاص پروگرام تیار کریں۔ مثال کے طور پر ہماری یہ تجویز ہے:۔

(۱) قرض دینے کے لیے ایک مالی ادارہ کا قیام، اور افریقی ممالک میں مسلمانوں کے سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی، اور ان تمام سرکاری اور پرائیوٹ کمپنیوں کا استحکام جن کے مالک مسلمان ہیں۔

(۲) ایک سرمایہ کار کمپنی کا قیام، جس میں افریقی اور غیر افریقی لوگ شریک ہوں۔

(۳) مسلمان اور عرب مدرسوں، انجینیروں اور ڈاکٹروں کے افریقہ جانے کی حوصلہ افزائی، اور ترقی و خوشحالی کے تمام منصوبوں میں افریقیوں کے ساتھ تعاون۔

(۴) ان تمام مسلمان اور عرب حکومتوں کو جو افریقہ کی مسلم نو آزاد حکومتوں کی مالی امداد کر سکیں اسکی ترغیب دی جائے

(۵) افریقہ میں غیر افریقی اسلامی ملکوں کے جو باشندے آباد ہیں اُن کی متعلقہ حکومتوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ان باشندوں میں تنظیم کی صورت پیدا کریں۔ نیز کوشش کریں کہ یہ لوگ افریقہ کی اسلامی جماعتوں سے قریب ہوں اور اسرائیلی سرگرمیوں پر خصوصی نظر رکھیں۔



دربارِ عالمگیری

(گذشتہ سے پیوستہ)[1]

(جناب ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی ایم اے)

عربی اُصول و قواعد کے مطابق قرآن پاک کے مطالب اور مفاہیم کے بیان کرنے کا نام علم تفسیر ہے۔ ایسی استعداد اور مشق و مہارت پیدا ہونا جس کے واسطے سے احکام شرعیہ کا باحسن وجوہ اور صحیح طریقہ پر استنباط ہو سکے اور معانی قرآن تک رسائی۔ اس فن کی غرض و غایت سمجھی جاتی ہے، کلام الٰہی اس کا موضوع ہے جو بلاشبہ سراسر حکمتوں اور اسرار سے مالا مال ہے۔

پچھلے اوراق اُلٹئے اس میں گزر چکا ہے کہ عہد صحابہ میں تفسیر اور آیات قرآنیہ کے افہام و تفہیم کا خاصا رواج تھا اور وہ اجلۂ علماء اور صحابہ جن کو مفسرین کا شیوخ کہا جائے حضرت علی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، ابی بن کعب اور زید بن ثابت سمجھے گئے اور سمجھے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کی مرویات کا شمار حضرت علی کی مرویات سے زائد ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کو ترجمان القرآن، حبر الامۃ اور رئیس المفسرین کے القاب سے یاد رکھا گیا۔ اور یہ ان کا ایک امتیازی وصف گن گیا۔ ابی بن کعب کو سید القراء کا لقب دیا گیا۔

یہ دور ختم ہوا ہی تھا کہ تابعین کا دور آیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ میں حضرت مجاہد بن جبیر، سعید بن جبیر، عکرمہ، طاؤس بن کیسان، حضرت عطاء علماء مکہ میں آتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں علماء کوفہ زائد ہیں اور ان میں علقمہ بن قیس اور ابراہیم نخعی

---

[1] سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الفرقان بابت ماہ صفر ۱۳۸۵ھ۔

ممتاز ہوئے۔ حسن بصری، عطاء بن ابی سلمہ ضحاک بن مزاحم اور قتادہ بن دعامہ بھی فن تفسیر میں پیشوا ہی سمجھے گئے۔ علاوہ ازیں عہد تابعین کے بعد مفسرین کے ایک طبقہ نے صحابہ اور تابعین کے اقوال پر مشتمل تفسیریں لکھیں اور سفیان بن عیینہ، وکیع، شعبہ بن حجاج اور اسحٰق بن راہویہ کا شمار اسی طبقہ میں کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک طبقہ اور پیدا ہوا اور اس نے تفسیری احادیث و اقوال سے اسناد کا حذف کرنا شروع کیا ابو اسحٰق زجاج ابو علی فارسی ابو بکر نقاش اور جعفر بن نحاس اسی میں مشہور ہوئے اور واقعہ یہ ہے کہ تفسیر میں خارجی اور نامانوس عناصر کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اسناد کے حذف کے ساتھ ساتھ مفسروں نے سلف کے ناتمام اور مختصر اقوال بیان کرنا شروع کر دیے۔ اس پر مستزاد آگے چل کے علماء سلف کے اقوال نقل یا ترک ہوئے اور رطب و یابس سے تفسیریں پر ہوئیں، اپنے اپنے ذوق کے مطابق اگر اقوال نقل ہوئے تو خوش فہمی کے شعور کے ساتھ یہ پھیلوں کی باتیں آنکھیں بند کر کے صحیح سمجھی جانے لگیں اور اسی طرح نقل ہوئیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تک جو کچھ بھی تفسیری سلسلہ میں کام ہوا اور تصانیف کی گئیں ان میں نقل کو زائد دخل رہا۔ لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں جب مختلف علمی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ صرف و نحو بلاغت معانی بیان فقہ منطق فلسفہ کلام تصوف کے موضوعوں نے رواج پایا اور ان میں سے ہر فن کے ماہرین نے تفسیریں لکھیں تو اپنے فن کا پورا مظاہرہ کر دیا۔ کلام پاک کے الفاظ اور آیات کو اپنے فن کے زاویۂ نظر سے دیکھا اور اسی اعتبار سے اس کی توضیح اور تفسیر پر زائد زور دیا۔ زجاج واحدی ابو حیان وغیرہم نے اپنی تفسیروں میں لفظی تناسب اور وجوہ اعراب کی بحثیں کیں۔ ثعلبی نے مورخ کی شان سے قصص و حکایات کا اضافہ کیا اور قرطبی نے فقہی نقطۂ نظر کو بالاتر رکھا۔ امام رازی نے متکلمانہ بحثیں جس شان سے چھیڑیں اور اس طوالت کے ساتھ کہ تفسیر رازی کے مطالعہ کرنے والے یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ تفسیر رازی میں تفسیر کے سوا سب کچھ موجود ہے۔

سلسلۂ کلام یوں ہی دراز ہو گیا اب اگر تمام اقسام و انواع تفسیر کو روشنی میں لایا جائے تو بات کہاں تک پہونچے اس لیے علماء احناف کی تفسیروں ہی کے اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں

امام زمخشری نے تفسیر کشاف لکھی اور اس کے متعلق خود فرمایا

ان التفاسیر فی الدنیا بلا عدد	تفسیروں کا اگرچہ کوئی شمار نہیں ہے لیکن
ولیس فیھا لعمری مثل کشاف	ان میں میرے نزدیک کشاف جیسی کوئی نہیں
ان کنت تبغی الھدیٰ فالزم قرأتہ	اگر تم ہدایت کے جویا ہو تو اس کا مطالعہ
فالجھل کالداء والکشاف کشاف	رکھو، جہالت بیماری ہے اور کشاف
	اس کا علاج۔

وہ ممتاز علماء احناف جنھوں نے تفسیریں لکھیں ان کے اسماء گرامی بہ ترتیب سنہ یہ ہیں:۔

(۱) تفسیر وکیع۔ امام وکیع بن جراح کوفی شاگرد امام اعظم المتوفی ۱۹۷ھ
(۲) تفسیر النسفی۔ قاضی امام حافظ ابراہیم بن معقل المتوفی ۲۹۵ھ
(۳) تفسیر الماتریدی۔ امام محمد بن محمد بن محمود امام المتکلمین المتوفی ۳۳۳ھ
(۴) تفسیر ابی اللیث۔ نصر بن محمد فقیہ سمرقندی المتوفی ۳۸۳ھ
(۵) تفسیر کشاف۔ ۲ جلد۔ علامہ ابو القاسم محمود بن عمر زمخشری المتوفی ۵۲۸ھ
(۶) تفسیر الخوارزمی۔ ابو الحسن علی بن عمران المتوفی ۵۳۹ھ
(۷) تفسیر العلائی۔ ۱۰ مجلدات۔ علامہ محمد بن عبد الرحمن بخاری زاہد المتوفی ۵۴۶ھ
(۸) تفسیر العتابی۔ امام ابو نصر احمد صاحب فتاویٰ عتابیہ المتوفی ۵۸۶ھ
(۹) تفسیر الکبیر۔ ۳۰ مجلدات۔ شمس الدین ابو المظفر یوسف سبط بن جوزی المتوفی ۶۵۴ھ
(۱۰) تفسیر ابو المعالی۔ ۷ مجلدات۔ برہان الدین بن ناصر حسین المتوفی ۶۸۹ھ
(۱۱) تفسیر البیری۔ سعید الدین عبد العزیز بن احمد المتوفی ۶۹۳ھ
(۱۲) تفسیر مدارک التنزیل۔ ۴ مجلدات حافظ الدین نسفی صاحب کنز الدقائق و منار المتوفی ۷۱۰ھ
(۱۳) تفسیر سراج الدین۔ علامہ ابو حفص عمر بن اسحاق محدث ہندی المتوفی ۷۷۳ھ
(۱۴) تفسیر البابرتی۔ علامہ اکمل الدین محمد صاحب عنایہ المتوفی ۷۸۶ھ
(۱۵) کشف التنزیل۔ ۲ جلد ابو بکر بن علی مصری فقیہ المتوفی ۸۰۰ھ
(۱۶) تفسیر الزھراوین۔ علامہ سید شرف الدین علی بن محمد جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ

ھ۔ زھراوین سے مراد سورۂ البقرہ اور آل عمران لی جاتی ہے۔

(۱۷) تفسیر تیسیر الرحمٰن۔ ۲ جلد۔ علی بن احمد گجراتی المتوفی ۸۳۵ھ

(۱۸) تفسیر بحر مواج۔ ملک العلماء قاضی شہاب الدین جون پوری المتوفی ۸۴۸ھ

(۱۹) تفسیر ابن الصفیار۔ علامہ شیخ محمد بن احمد مکی المتوفی ۸۵۴ھ

(۲۰) تفسیر ذخیرۃ الفقہ۔ شمس الدین محمد حلبی بن امیر حاج شارح منیہ المتوفی ۸۷۶ھ

(۲۱) تفسیر الجانی۔ فی تفسیر سورۃ العصر نور الدین عبد الرحمٰن المتوفی ۸۹۸ھ

(۲۲) تفسیر سورۃ الفاتحہ۔ مولانا معین الدین صاحب معارج النبوۃ المتوفی ۹۰۰ھ

(۲۳) تفسیر ابن کمال پاشا۔ علامہ شمس الدین احمد بن سلیمان رومی المتوفی ۹۴۰ھ

(۲۴) تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم۔ شیخ الاسلام مفتی ابو السعود عمادی۔ المتوفی ۹۸۲ھ

(۲۵) تفسیر سواطع الالہام شیخ فیض اللہ حنفی شاعر دربار اکبری المتوفی ۱۰۰۱ھ

(۲۶) تفسیر القرآن جامی ثانی۔ علامہ یعقوب المتوفی ۱۰۰۳ھ

(۲۷) تفسیر عقد الجواہر، تفسیر سورۂ کوثر۔ شیخ عمر بن نجیم صاحب بحر الرائق المتوفی ۱۰۰۵ھ

(۲۸) تفسیر القاری۔ ملا علی قاری علی بن سلطان محمد مکی المتوفی ۱۰۱۴ھ

(۲۹) تفسیر روح البیان۔ ۹ مجلدات۔ علامہ شیخ اسماعیل آفندی المتوفی ۱۱۱۷ھ

(۳۰) تفسیر لاجیون، یعنی تفسیر احمدی جس کا پورا نام ہے التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیۃ۔

لاجیون ابھی علوم متداولہ کی تحصیل سے تمام فارغ نہیں ہوئے، عمر کا صرف سولھواں سال تھا جب اس کو لکھنا شروع کیا اور اکیسویں سال میں پہونچے تھے کہ اس سے فراغت حاصل کرلی اور بقول ملا صاحب یہ زمانہ وہ تھا جب کہ علوم عقلیہ کی طرف لوگوں کی توجہ عام تھی اور منقولات سے ان کو کم کم ہی سروکار تھا۔ زمانہ محی الدین محمد اورنگ زیب کا تھا ہی۔ شرع اور احکام شرعیہ کا دور دورہ تھا، حدود شرعیہ کا قیام اور رسوم کفریہ کا زوال ہو رہا تھا۔ باوجود مصنف کی کم عمری کے پھر بھی یہ کتاب ایک معیاری کتاب تیار ہو کے سامنے آگئی۔

ع۔ یہ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کے حاشیہ پر مصر میں طبع ہو گئی ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ ملّا صاحب کی اس طرف باوجود صغر سنی توجہ کیوں ہوئی، باوجودیکہ مال وزر کی تمنا تھی نہ شاہی انعام واکرام کی آرزو دل میں، اس کا عہد عالمگیری کے ذکر اور عالمگیر کی واجبی مدح و ستائش کے بعد ایک موقع پر اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

ولیس هذا المدح مناطمعا للدنیا	میں نے جو ستائش کی وہ دنیا کی لالچ میں
وطلبا للاثمان والتمین بل	نہیں کی نہ گراں قدر انعام کی تمنا میں
حسبة لله وحرصا لازدیاد	بلکہ خدا واسطے اور دین کی بڑھوتری کی
الدین اذ لم اکن من اهل	لالچ میں اس لیے کہ میں اس طرح کے
هذا الشان ولا من فرسان	لوگوں میں نہیں ہوں اور نہ اس میدان کا
هذ المیدان۔	سوار ہوں۔

اور اس موضوع پر قلم اٹھانے کی توجیہ ملّا صاحب نے اپنے قلم سے یہ کی ہے۔

وقد کنت قدیما اسمع من	عرصہ سے میں بڑے لوگوں کی زبانی سنتا
افواہ الرجال الکرام ان الامام	آیا تھا کہ امام غزالی نے جو اسلام کے
الغزالی الذی هو من اجلة	بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں انھوں نے
علماء الاسلام قد جمع آیات	اپنی طاقت اور استعداد بھر وہ آیتیں
الاحکام بحسب الطاقة والامکان	ایک جا کر لی تھیں جن سے احکام شرعیہ کا
حتی بلغت خمس مأة بلا زیادة	استنباط ہوتا ہے، ایسی آیات کا شمار
ولا نقصان	پانچ سو سے متجاوز نہیں نہ کم ہے۔

اور شاید انھیں اس کتاب تک رسائی نہ ہوئی چنانچہ نفس موضوع کا اشارہ وہاں سے ملتے ہی خود کمر ہمت باندھی اور یکام شروع کر دیا۔

فامرت بلسان الالهام.....	لسان غیبی کے حکم پر میں نے اللہ کی مدد اور
ان استنبطها بعون الله تعالی و	توفیق کو سہارا بنا کے احکام کا استنباط
توفیقه..... فاخذت اجمع	کرنا شروع کر دیا۔ میں نے وہ آیات جمع
الآیات التی استنبطت عنها	کرنا شروع کر دیں جن سے میں نے قواعد

الاحکام الفقهیه والقواعد الاصولیة والمسائل الکلامیة ..... ثم شرحتها باحسن وجه من التقریر وشرحتها بالکل جهة من التحریر۔

اصول عقائد اور مسائل فقہیہ کا استنباط کیا پھر میں نے بہترین طریقہ پر ان کی تقریر اور شرح لکھی تو مکمل طرز بیان کے ساتھ۔

تفسیر احمدی لکھتے وقت ملا صاحب کے پیش نظر مختلف فنون وعلوم کی کتابیں تھیں مثلاً تفسیروں میں انوار التنزیل اور مدارک التاویل۔ اس کے علاوہ اتقان فی علوم القرآن، شرح وقایہ ہدایہ معہ شرح فتاوی حمادیہ۔ حسامی، توضیح تلویح، شرح عقائد تفتازانی اور حاشیہ خیالی وغیرہ وغیرہ، اپنی تفسیر میں ملا صاحب نے یہی نہیں کیا کہ جو کچھ ان کتابوں میں لکھا ہے اسی کو نقل کر دیا، بلکہ ان میں اپنی طرف سے اور اضافے بھی کیے۔

وقد الحقت الیها بعض ما ذکر فی کتب السیر والمحدثین فضلا علی ما اورده بعض المفسرین وضممت الیها من الابحاث الشریفة والنکت اللطیفة ما لم اظفر فی کلامهم بالتصریح بها ولم اجد الاشارة الیها۔

بعض مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اس کے علاوہ سیر کی کتابوں اور محدثین کی لکھی باتوں میں سے بھی میں نے اس میں اضافے کیے ہیں اور بعض اونچی اونچی بحثیں اور لطیف لطیف نکتے بھی میں نے بڑھا دیے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ میں نے دوسروں کے بیان میں اس طرح کھل کر لکھے ہوئے نہ پائے اور میں نے ان کے اشارے بھی نہ دیکھے۔

علوم قرآنیہ اور ما یتعلق بالقرآن پر مقدمہ میں اجمالی بحث کی ہے اور بہت ہی جامع ہے۔ احکام قرآنیہ کے استنباط میں ترتیب قرآنی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں ان کی رائے میں مسائل کی تخصیص اور تعیین نہیں ملتی، ہاں اس میں کچھ احکام فقہیہ مسائل کلامیہ اور توحید وغیرہ وغیرہ کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے بعد سورۂ بقرہ ہے۔ اس سے یہ مسائل مستنبط ہوتے ہیں کہ تمام اشیاء میں اصل اباحت ہے، نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا پتہ ملتا ہے عصمت انبیاء

عدم امامت کفار اور اجماع کی حجیت فضائل شہدا، ایمان مفصل، وجوب قصاص یا عفو وغیرہ کے مسائل کا مختلف آیتوں سے استخراج کیا جاتا ہے

ایک آیت ملا صاحب سامنے لاکے اس پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں، حالانکہ بظاہر عنوان کا آیت سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا لیکن اپنے انداز بیان اور فکر رغوہ سے اپنا مدعا ظاہر کر لے جاتے ہیں اور سننے اور سمجھنے والا مطمئن ہو جاتا ہے۔ بیشتر مسائل میں علماء کے اختلافات کی پہلے تصریح کرتے ہیں ان کی آرا نقل کرتے ہیں۔ ان پر عالمانہ بحث کے بعد مرجح بات کو شرح وبسط کے ساتھ مدلل اور مبرہن کر دیتے ہیں۔ کہیں پہلے آیت اور اس کا شان نزول بیان کیا پھر مختصر الفاظ میں اس کی تفسیر کی اور دوسری آیات کو سامنے لاکے اس کے مطلب کی وضاحت کہیں نسخ اور انسا کے معانی کی وضاحت کی، پھر دونوں میں فرق ظاہر کیا، پھر کتاب کے سنت سے منسوخ ہونے یا نہ ہونے کی بحث کی پھر حنفیہ کا مسلک کہ سنت سے کتاب کا نسخ جائز ہے اور شوافع کے نزدیک نہیں اس کی تصریح کی اور آخر میں لکھ دیا۔

ولحن نقول ان النسخ ليس	ہم کہتے ہیں کہ واقعۃً نسخ سے تبدیل
بتبديل في الواقع بل هو	نہیں ہوتی بلکہ وہ محض بیان ہوتا ہے
بيان محض فجاز ان يبين الله	اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے کلام کی انتہا
مدة انتهاء كلام رسوله او رسوله	بیان کرے اور اس کا رسول اپنے رب کے کلام
مدة انتهاء كلام ربه	کی انتہا ظاہر کر دے اس میں کیا حرج ہے۔

نور الانوار اصول فقہ کی کتاب ہے اس میں حنفیت کو جس طرح مستحکم اور مضبوط کیا گیا ہے اسی طرح تفسیر احمدی میں بھی احناف سے قیاس ہی قیاس کی سکمرانی کا اعتراض رفع کر کے قرآن اور سنت رسولؐ کو حنفیت کا نشا اور مولد بنانے کی پوری پوری مساعی جمیلہ شامل ہیں۔

تفسیر احمدی میں کئی مقامات پر ملا جیون علیہ الرحمہ کے کچھ تفردات بھی ہیں۔

تفسیر میں آیات

وقالوا هذه انعام وحرث حجر لا يطعمها الا من نشاء بزعمهم وانعام حرمت ظهورها وانعام لا يذكرون اسم الله عليها افتراء

علیہ سیجزیھم بما کانوا یفترون"

کی مکمل لفظی تحقیق اور تفسیر کے بعد عام علماء نے جن جن مسائل کا ان سے استخراج کیا ہے اس کو ظاہر کرنے کے بعد خصوصی اور اور مسائل کا ملا صاحب استنباط کر کے لکھتے ہیں۔

ولعمری ان ما اخبر اللہ تعالیٰ بشناعۃ حال الکفار فی ذلک اصدق دلیل علی بطلان ھذہ الرسوم التی اشتھرت بین بعض الانام وتفرد بھذا خاطری و ھو اعلم بحقیقۃ الحال۔

بقسم کہتا ہوں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کفار کی بدحالی اور بدکرداری کا ذکر کیا ہے اُن سے کفار کی ان مروجہ رسوم کا بالکل ٹھیک ٹھیک ابطال ہو جاتا ہے جن کا بعض لوگوں میں چلن اور رواج ہے اور اس بات کے بیان میں عمر میرے ہی ذہن کی رسائی ہوئی ہے اور اللہ حقیقت حال سے زیادہ واقف ہے۔

مُلّا عبدالسّلام

قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ وہاں ہی پیدا ہوئے لیکن تحصیل علوم متداولہ کی اپنے نانا ملا عبدالکریم کے پاس قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں رہ کے کی۔ ان کا سلسلۂ نسب امام زین العابدین بن امام حسین بن علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تحصیل علوم کا کچھ زمانہ ملا عبدالسلام لاہوری تلمیذ فتح اللہ شیرازی ملقب بہ عضد الملک کے پاس بھی گذرا ہے۔ عہد شاہجہانی میں مؤخر الذکر مدرسۂ شاہجہانی میں مدرس تھے۔ اپنے استاد کی وفات کے بعد ان کی جگہ انھوں نے لی۔ ملا عبدالحکیم والد ملا قطب الدین سہالوی ملا دانیال چوربہی اور ملا عبدالقادر فاروقی ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہوئے ہیں اور شاید مبالغہ نہ ہو کہ اس عہد میں ہندوستان بھر کا سلسلۂ تلمذ انھیں شخصیتوں پر منتہی سمجھا گیا ہے۔ شاہ تراب علی کشف المتواری میں لکھتے ہیں:۔

ملا عبدالسلام مرحوم کہ شاگرد مخدوم شیخ عبدالکریم و پرورش کردۂ آنحضرت

بودند در عہد سلطنت شاہجہان اولاً مدرس مدرسہ لاہور بعدہٗ مفتی لشکر بادشاہی گشتند از علمائے قول آں وقت بودند ..... در قصبہ دیوہ حویلی کہ واقع محلہ ست محل سکونت شان بود نیز صبیہ خود را بہ کردہ بودند مع قدرے زمین مزروع چک بستہ از موضع ادھیا سو دیہ معافی و زمینداری خود چنانچہ نوشتہ اولاد بر آن قابض اند۔[1]

ان کو عہد عالمگیری میں فخر علما سمجھا گیا۔

در عہد خویش نظیر نہ داشت بادشاہ بسبب استعداد بیش و تبحر علوم بسیار اکرام او میکرد و نزد خود می نشاند و اقتدائے او در وے معلّٰی بنام ملا بود چنانچہ تا عرصۂ محمد خدمت مذکور از و تعلق میداشت۔[2]

یہ صاحب تصانیف بھی تھے، تہذیب اور منار الاصول کی شرحیں انھوں نے لکھیں اور ایک کتاب فن حکمت و منطق میں بھی انشراحات معالیہ کے نام سے کتب خانۂ انوریہ کاکوری میں قلمی موجود ہے۔ یہ کتاب آپ نے اپنے فرزند شاہ ابو المعالی کے لیے ان کے زمانۂ درس میں لکھی تھی۔ ان کا مزار قصبہ دیوہ میں ہے۔ راقم السطور کو اس کی زیارت کا موقعہ ملا ہے۔

(باقی)

---

[1] کشف المتواری صفحہ ۱۳۶۔ [2] رسالہ باغ و بہار شیخ خیر الزماں صدیقی لکھنوی۔

الفرقان کی اشاعت خاص

بیاد حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

جو

حضرت مولانا مرحوم کی تبلیغی دعوت کے فکری اور عملی پہلوؤں کو سمجھنے

کا ایک مستند ذریعہ ہے۔

دوسروں کے مضامین کے علاوہ خود مولانا کی تقریروں اور مکتوبات سے مزین۔

دوسرا ایڈیشن۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک -/۲ روپیہ

ایک سانحہ

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مقیم مدینہ طیبہ کی وفات

آج ہی ۳ر نومبر کو عصر و مغرب کے درمیان اس عظیم سانحہ کی خبر ملی کہ شیخ وقت اور جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم مدینہ طیبہ) کا وصال ہو گیا ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ـــــ اللھم اغفرلہ وارحمہ واکرم نزلہ والحقہ بسلفہ الصالحین من عبادک الذین رضیت عنھم ورضوا عنک۔

اس دنیا میں کسی آدمی کا پیدا ہونا اور اٹھ جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ روزانہ ہزاروں انسان اس دنیا میں آتے ہیں اور اسی طرح ہزاروں موت کے راستے سے چلے جاتے ہیں لیکن وہ بندے جو اپنے احوال و اوصاف اور فیوض و برکات کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں اُن میں سے کسی کا اٹھ جانا بلاشبہ انسانی دنیا کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے جس سے زمین و آسمان بھی متاثر ہوتے ہیں۔

صحیح بخاری شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے۔

یذھب الصالحون الاول فالاول وتبقی حفالۃ کحفالۃ الشعیر والتمر لایبالیھم اللہ بالۃ۔

اللہ کے نیک بندے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے اور ایسے لوگ رہ جائیں گے جو اُن کی نسبت ایسے ہوں گے جیسے جَو کی بھوسی یا سوکھی کھجوروں کے چھلکے جن کی اللہ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

یہ گنہگار راقم السطور اپنے شعور کے گزشتہ قریباً چالیس سالوں میں یہ منظر برابر دیکھتا رہا ہے۔ حضرت شیخ العند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہما کی تو صرف زیارت نصیب ہوئی، ان کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی، حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد الیاس اور مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری (قدس اللہ اسرارہم) کا کچھ قرب تعلق بھی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا۔ ان سب کی وفات پر بھی محسوس ہوا کہ دین اور علم و معرفت کا بڑا ذخیرہ دنیا سے اٹھتا جا رہا ہے اور ظلمت اسکی جگہ لے رہی ہے۔ ہمارے ان اکابر و مشائخ کی کچھ یادگاریں باقی تھیں اور باقی ہیں ان میں ایک بڑی صاحب فیض شخصیت حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی تھی جس کو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ نے اسی سال ہم میں سے اٹھا لیا اور وہ ہمارے اس سال کا بہت بڑا دینی سانحہ تھا، حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کی وفات بھی ہماری دینی دنیا کا بڑا عظیم سانحہ ہے۔

مولانا موصوف شیخ وقت بھی تھے اور اس دور کے جلیل القدر عالم دین بھی، عصر حاضر کی خصوصیات اور اسکے تقاضوں کو سمجھنا اور علوم نبوت کی تشریح اس طرز سے کرنا جس سے اس دور کے پیدا شدہ مسائل بھی حل ہوں ان کا خاص امتیاز تھا۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "ترجمان السنہ" ان کے اس کمال کی آئینہ دار ہے۔ افسوس کہ ابھی صرف ۴ جلدیں مولانا لکھ سکے جو شائع بھی ہوگئی ہیں۔ (چوتھی جلد حال ہی میں پاکستان میں شائع ہوئی ہے۔)

مولانا مرحوم حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، پہلے دورۂ حدیث مظاہر العلوم میں پڑھ چکے تھے، اسکے بعد صرف حضرت شاہ صاحب سے علمی استفادہ کی غرض سے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیکر دوبارہ دورۂ حدیث یہاں پڑھا، پھر چند سال تک دار العلوم میں مدرس بھی رہے۔ بعد میں حسب قضا و قدر کے ایک فیصلہ نے حضرت شاہ صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ کو جامعہ اسلامیہ (ڈابھیل، سورت) بھیجا تو مولانا بدر عالم صاحب بھی جامعہ کے ایک استاذ کی حیثیت سے ان حضرات کے ساتھ یہاں آگئے اور یہاں کئی سال تک مسلسل حضرت شاہ صاحبؒ کے درس بخاری میں بیٹھ کر حضرت کے دری افادات تقلیند کرتے رہے جنکو بعد میں عربی میں مرتب کیا اور فیض الباری کے نام سے وہ چار جلدوں میں مصر میں چھپ کر شائع ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں مولانا مہاجر ہندوستان سے پاکستان چلے گئے اور ۴ سال کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہاں سے حجاز مقدس آگئے اور جنت البقیع میں دفن ہونے کی آرزو کے ساتھ مدینہ طیبہ میں قیام کرلیا۔

کئی سال ہوئے موٹر کے ایک ایکسیڈنٹ میں ایسے مجروح ہوگئے تھے کہ بچنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ابھی زندہ رکھنے کا تھا، زندہ رہے لیکن اسکے بعد صرف لیٹے رہ سکتے تھے بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھے مگر دینی و علمی افادہ و افاضہ کا سلسلہ الحمد للہ جاری رہا۔ لیٹے لیٹے درسی اور اصلاحی گفتگو ہر وقت فرماتے رہتے تھے۔

عام مسلمانوں کے افکار و خیالات اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کیلئے "جواہر الحکم" کے نام سے آسان زبان میں احادیث نبویہ کی شرح کا ایک سلسلہ جاری فرما رکھا تھا، اسے ۲ مہینے پہلے جب یہ عاجز مدینہ طیبہ حاضر ہوا، تو اس کا دوسرا حصہ عنایت فرمایا تھا، آج خبر وفات ملنے پر اسکو اٹھا کر دیکھا تو بسم اللہ اور حمد و صلوٰۃ کے بعد مولانا نے اس میں لکھا تھا:۔

"اسوقت عالم کے انقلابات کا ہولناک نقشہ اور علماء و صالحین کا بڑی تیزی سے اٹھتے چلے جانے کا عبرتناک سماں میری آنکھوں کے سامنے ہے اس لیے اس سلسلہ کی چند احادیث اس حصہ میں بے اختیار درج ہوگئی ہیں تاکہ اہل فہم و سعادت اپنی قلیل فرصت کو بے کار ضائع نہ کریں اور جتنی جلد ممکن ہو اعمال خیر میں ہمت سے کام لیں"۔

عجب نہیں کہ مولانا پر اپنی وفات کا قرب منکشف ہوا ہو، اور یہی اُن کے لیے اس سلسلہ کا باعث اور محرک ہوا ہو۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کے دینی و علمی فیض کو تا قیامت جاری رکھے اور مسلسل ترقیات اور رفع درجات کا اس کو ذریعہ بنائے اور اپنی رحمت و رضا سے ان کو نوازے اور پسماندگان و متعلقین کو صبر جمیل اور احتساب کی توفیق بخشے اور ان کی پوری سرپرستی و نگرانی فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

سنہ آغاز
۱۹۳۶ء

الفرقان لکھنؤ

Maulana Azad Library
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

مرتبہ

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی

بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دُنیا اس سے ناآشنا ہے۔ یہانتک کہ اسکو "کلام الٰہی" ماننے والی
اُمت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے

یہ کتاب

اسی صورت حال کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔

- یہ قرآنی دعوت اور اسکی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
- جسمیں ۳۰ عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور موثر پر تشریحات کیساتھ جمع کیا گیا ہے
- خاص طور پر قرآن کی دعوت توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے۔
- یہ بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ
قرآن کے اعجازِ بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔

طباعت اعلیٰ، کتابت وطباعت عمدہ، کاغذ، ۲۰۰ صفحات، مجلد، سرورق دلکش، قیمت -/۴۰

کتب خانہ انوار القرآن، کھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۳ | بابتہ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۵ء | شمارہ ۸

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولین	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	معارف الحدیث	محمد منظور نعمانی	۹
۳	اسلام اور اجتماعی انصاف	استاذ احمد زکی یمانی	۱۹
۴	حضرت شاہ ابو الرضا دہلویؒ	مولانا نسیم احمد فریدی	۳۲
۵	دربار عالمگیری	ڈاکٹر مصطفےٰ احسن علوی	۴۲
۶	لبرل اسلام (ترجمہ)	جناب وحید الدین خاں	۴۸

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو تو

اسکا مطلب ہو کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک کبھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر، الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

۱۹ اگست ۱۹۶۴ء کو مسلمانانِ ہند کی مختلف جماعتوں اور مختلف حلقوں کے نمائندوں میں ملت کے مشترک مسائل اور مشترک مقاصد کے لئے اشتراکِ عمل کی جو ہلکی سی شکل رونما ہوئی تھی، افسوس ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں اس میں پہلا شگاف بھی نمودار ہو گیا!

اتحاد و اشتراک کی یہ شکل "آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت" کے قیام سے بنی تھی جس میں ذاتی طور سے ملت کا اعتماد کا رکھنے والی متعدد نمایاں شخصیتوں کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی ہند، اور مسلم لیگ وغیرہ کے اعلیٰ عہدیداران شامل تھے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ شکل کچھ بہت پائیدار بنیادوں پر قائم نہیں تھی۔ اور ایسے جھول موجود تھے جن سے نہ صرف اسکی معنویت بہت کچھ متاثر ہو سکتی تھی بلکہ اس کا وجود تک خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ مثلاً اس کا بنیادی نقص تو یہ تھا کہ مختلف جماعتوں اور کارکن حلقوں کا ایک وفاق بنے اور ملک کے مخصوص حالات سے پیدا ہونے والے مشترک ملی مسائل جو مشترک جد و جہد اور متحد نمائندگی چاہتے ہیں ان میں سارا کام اسی کے ماتحت یا کم از کم اس سے مربوط ہو کر ہو۔ لیکن مجلس کی تاسیسی قرارداد میں اس تخیل کی بالکل وضاحت نہیں آئی، بلکہ اسکے برعکس مجلس میں بعض جماعتی حضرات کی شرکت اس مفروضے کے ماتحت ہوئی کہ اس سے کسی جماعت کے سر کوئی پابندی نہیں آتی، چنانچہ انھوں نے مجلس کی تاسیس میں اس صراحت ہی کے ساتھ حصہ لیا کہ اُن کی شرکت ذاتی اور انفرادی حیثیت میں ہے، جماعتی حیثیت میں نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات مجلس کا قیام بالکل بے معنی کر دیتی تھی اور کم سے کم مدت ہی

میں مجلس کو انتشار کا حادثہ پیش آسکتا تھا، کیونکہ مجلس کسی ایسے کام کے لئے قائم نہیں کی جارہی تھی جو ان جماعتوں کے دائرہ کار سے باہر ہو۔ اس کا تو بنیادی کام وہی مسائل تھے جن میں یہ سب جماعتیں الگ الگ کم و بیش کام کر رہی تھیں۔ مجلس کا کام یہ تھا کہ ان میں مشترک لائحہ عمل اور مشترک جد و جہد وجود میں لائے۔ اور یہ کام جماعتوں کے پابندی قبول کئے بغیر ایک دن بھی کیونکر ہو سکتا تھا؟ ——— اس لئے اس ناقص شکل میں مجلس کا قیام کوئی بہت امید افزا چیز نہیں تھی ——— مگر جمعیۃ علماء کے حضرات اسی ذہن کے ساتھ آئے تھے کہ وہ ذاتی حیثیت میں شریک ہو رہے ہیں اس لئے جماعتی حیثیت سے کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، لہٰذا اس ناقص شکل ہی کو غالباً اس اندیشے سے گوارا کیا گیا کہ ۱۵ اگست ۱۹۶۴ء کا نمائندہ مشاورتی اجتماع اگر اتحاد و اشتراک کی کسی ظاہری شکل سے بھی خالی ہاتھ اٹھا تو یہ مضطرب قوم کی امیدوں کے لئے ایسا دھچکا ہوگا جس کی پھر شاید تلافی نہ ہو سکے۔ دوسری طرف شاید یہ امید بھی کارفرما تھی کہ جب مرحلہ اطمینان سے بیٹھ کر عملی تفصیلات طے کرنے کا آئے گا تو ان حضرات پر خود ہی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مجلس اپنے اصل مقاصد میں کوئی ایک قدم بھی ان لوگوں کی شرکت کے ساتھ اس وقت تک نہیں اٹھا سکتی جب تک یہ جماعتی طور پر مجلس کے قیام کو منظور نہ کرلیں۔ اس لئے جو نقص اور جھول تاسیسی قرارداد میں رہا جا رہا ہے وہ آگے خود ہی دور ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور مجلس کا جو دستور پاس ہوا اس میں بھی تاسیسی قرارداد کا یہ نقص دور نہیں ہو سکا، جس میں مجلس کو ٹوٹ پھوٹ کا حادثہ پیش آجانے یا بے معنی و بے مصرف ہو کر رہ جانے کے امکانات پوشیدہ تھے۔

ہمارے یہ خیالات آج نکات بعد الوقوع کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے الفرقان اکتوبر ۱۹۶۴ء کے انہی صفحات میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور پھر دسمبر ۱۹۶۴ء کے اداریہ میں بہت کھول کر یہ بات لکھی تھی کہ اگر مجلس کو باقاعدہ جماعتی وفاق کی حیثیت نہیں دی جاتی تو پھر یہ انتشار کے حادثے سے نہیں بچ سکتی۔ بہرحال یہ مسئلہ دستور سازی کے مرحلے میں بھی صاف نہیں ہو سکا۔ اور اسی اثنا میں مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ خیز مسئلہ آکھڑا ہوا۔ مجلس نے اس پر ایک

اہم قرارداد منظور کی جس میں مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کا اعلان کرتے ہوئے دیگر ضروری اقدامات کے علاوہ قانونی چارہ جوئی کا بھی فیصلہ کیا۔ اور اس کے لئے ایک سب کمیٹی نامزد کر دی۔

منطقی اعتبار سے مجلس کی اس قرارداد کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جن جماعتوں کے ذمہ دار مجلس میں شریک تھے وہ جماعتیں اس مسئلے میں جداگانہ اقدامات سے پرہیز کرتیں۔ مگر قانونی اعتبار سے ان جماعتوں پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں تھی، کیونکہ ان کے ذمہ داروں نے اپنے جماعتی حقوق مجلس کو تفویض نہیں کئے تھے۔ یہی وہ مبہم اور جھول دار پوزیشن تھی جس میں ایک طرف جمعیتہ علماء نے جائز سمجھا کہ وہ مجلس کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر مسلم یونیورسٹی کے لئے قانونی چارہ جوئی کرے۔ اور دوسری طرف مجلس سے تعلق رکھنے والے کچھ دوسرے افراد کو یہ بات سخت قابل اعتراض معلوم ہوئی کہ جمعیتہ کے ذمہ دار مجلس میں بھی شریک ہیں اور اُسے نظر انداز بھی کر رہے ہیں۔

جمعیتہ کا اقدام قابل اعتراض ضرور تھا۔ مگر صرف منطقی طور پر تھا، دستور مجلس کے اعتبار سے قانونی طور پر اس میں کوئی گرفت کی بات نہیں تھی۔ اس لئے مجلس کے ذمہ داروں کو تو حق تھا کہ وہ معاملے کے منطقی پہلو کو اٹھائیں اور اندرونی طور پر ارباب جمعیتہ سے یہ دریافت کریں کہ اس طرح مجلس کے کیا معنی رہ جائیں گے؟ مگر مجلس کی طرف سے کسی دوسرے فرد کو نہ تو اندرونی طور سے اس پر اعتراض کا حق تھا اور نہ علانیہ، لیکن معاملے کے الجھاؤ نے جس طرح جمعیتہ کو اس غلط اقدام کا موقع دیا اسی طرح کچھ دوسرے افراد سے اس دوسری غلطی کا ارتکاب کرا دیا۔ اور بجائے اسکے کہ مجلس کے یہ شرکاء مجلس کے کسی جلسے میں بیٹھ کر اس مسئلہ پر بات چیت کرتے باہر ہی باہر دست و گریباں ہو گئے۔ اور اس کا انجام ہوا مجلس سے جمعیتہ کا اظہار بیزاری اور جنرل سکریٹری جمعیتہ کا استعفےٰ۔

ہمارے اس نقطۂ نظر سے، اس بد انجامی کی بنیادی طور پر ذمہ دار، مجلس کی وہ تاسیسی قرارداد ہے جس کے ابہام نے اس بات کی اجازت دی کہ جماعتی ارکان اگر چاہیں تو کسی بھی مسئلے پر مجلس کو نظر انداز کر کے اپنی جماعت کے پلیٹ فارم سے آزادانہ کام کریں۔ اور خود مجلس

ہی کو ایک حریف اور رقیب کی جگہ پر رکھ لیں ۔۔ اس شکل میں یہ بات ناگزیر ہی تھی کہ جو لوگ معاملے کے اس الجھاؤ سے فائدہ اٹھانا چاہیں وہ بالآخر ایک دن الگ ہی ہو جائیں۔ کیونکہ یہ واسطہ علٰحدگی ہی کا واسطہ تھا۔ مگر ارباب جمعیتہ نے اس طرز عمل کے ساتھ جس طریقے سے علٰحدگی اختیار کی[1] ——— وہ بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ مجلس کو اُن سے شکایت ہوتی کہ یہ آپ حضرات کیا کر رہے ہیں اور اس طرح مجلس میں آپ کی شرکت کی کیا معنویت رہتی ہے؟ مگر ہوا یہ کہ مجلس نے تو اس طرح کی کوئی شکایت نہ کر کے ان حضرات کو باقاعدہ علیحدگی کا سرے موقع ہی نہ دیا۔ البتہ ان حضرات نے اُلٹی کچھ شکایات مجلس ہی پر قائم کر دیں۔ اور پھر مجلس کو صفائی کا کوئی موقع دئے بغیر اس سے علٰحدگی اختیار کر لی۔ اور اس طرح یہ ثابت کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ مجلس ان کے لئے ایک نہایت کڑوی گولی تھی جسے پتہ نہیں انھوں نے کس طرح اب تک نگلے رکھا تھا۔

کم از کم راقم سطور کو تو اس ہونے والی بات کا اس طرح انتظار تھا جیسے شام کے بعد صبح کا اور صبح کے بعد شام کا۔ اور اسکی ایک وجہ تو وہ تھی جس کا اظہار دسمبر ۶۴ء کے اس اداریہ میں کیا گیا تھا جس کا ابھی حوالہ گزرا ہے، اس اداریہ میں اس بات سے بحث کرتے ہوئے کہ مجلس مشاورت جس تخیل اتحاد و اشتراک پر قائم کی گئی ہے وہ کس قدر مشکل ہے، یہ چیز سامنے لائی گئی تھی کہ برسہا برس گزر گئے، سب اس تخیل کے مطابق کام کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور اُدھر پوری قوم بیچین ہے کہ یہ چیز ہو، مگر ہو کسی طرح نہیں پاتی۔ اور پھر اسکی وجہ یہ عرض کی گئی تھی کہ :-

"ہمارے نزدیک اس عجیب و غریب صورت حال کا، کہ سب اشتراک و اتحاد چاہتے ہیں، کوئی عذر بھی کسی کی زبان پر نہیں اور پھر بھی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھتی، خاص سبب یہ ہے کہ جن مسائل کو آج مشترک مسائل کہا جاتا ہے جن جماعتوں

---

[1] ہمارے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ جمعیتہ کے صرف ایک صاحب علیحدہ ہوئے ہیں دوسرے (جناب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی) اس سے متفق نہیں ہیں مگر پھر بھی ہم نے اس مضمون میں اس علٰحدگی کو جمعیتہ ہی کی علٰحدگی سے تعبیر کیا ہے آخر مضمون میں اسکی وجہ سے بھی سامنے آجائے گی۔

کا اصل دائرہ کار یہی مسائل ہیں، اور انہی میں اپنی سرگرمیوں کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو تھوڑا بہت اپیل کرتی ہیں، یہ جماعتیں اگر انہی مسائل میں اپنی جداگانہ سرگرمیاں ترک کر کے سارا کام مشترک پلیٹ فارم سے کریں تو اپنے انفرادی وجود کے لیے عام مسلمانوں کی ہمدردیاں آخر کس بنیاد پر حاصل کر سکیں گی؟ یہ ہے وہ نفسیاتی گرہ جو آج تک مشترک پلیٹ فارم کے قیام کا راستہ روکے رہی ہے اور جب تک یہ گرہ نہیں کھلے گی صحیح معنی میں کوئی مشترک پلیٹ فارم وجود میں نہیں آسکے گا۔"

(الفرقان دسمبر ۶۴ء۔ نگاہ اولیں)

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ وجہ موجودہ جماعتوں میں سے جمعیۃ علماء پر سب سے زیادہ چسپاں ہوتی تھی۔ اور اسی وجہ سے مجلس کے ساتھ شروع دن سے اس کا طرز عمل دیکھ کر ہمارے لئے یہ بات گویا بالکل یقینی تھی کہ وہ زیادہ دن مجلس کے ساتھ ظاہر داری بھی نہیں نبھا سکے گی۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ جمعیۃ علماء مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے ساتھ ہندو مسلم یا مسلمان اور حکومت سے متعلق سوالات میں اشتراک عمل کر کے، اپنا کیریر خراب کرلے، یہ بہت اہونی بات تھی۔ پتہ نہیں کیسے یہ بات ہوگئی تھی کہ اسکے ذمہ داروں نے ان دو جماعتوں کے ساتھ مجلس میں شرکت منظور کرلی، ورنہ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی نہیں۔ جون ۶۷ء کا مسلم کنونشن جو دہلی میں جمعیۃ کے زیر اہتمام ہوا تھا اس میں یہ دونوں جماعتیں اسی لئے شریک نہیں کی جاسکیں، اور پھر مجلس مشاورت میں شرکت منظور کرنے والے ارباب جمعیۃ نے دو یا تین مہینے بعد جو جمہوری کنونشن منعقد کیا اس میں بھی ان دونوں جماعتوں کو دعوت بہرحال نہیں مل سکی پس یہ بات واقعی بڑی حیرت انگیز تھی کہ ان دو کنونشنوں کے درمیان میں ایک وقت ارباب جمعیۃ کیسے ان دونوں جماعتوں کے ساتھ معاہدہ اشتراک کرنے پر تیار ہوگئے۔ اور اسکے برعکس یہ بات ذرا بھی حیرت انگیز نہیں کہ مجلس سے استعفے میں ان دونوں جماعتوں سے اپنے نظریاتی بُعد کے سوال پر بہت زور دیا گیا۔ واقعہ دراصل یونہی ہے اور ہم اس میں جمعیۃ کو ذرا بھی خطاوار نہیں گردانتے۔ حیرت انگیز بلکہ قابل اعتراض جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ جو کام بعد میں کرنا ہی تھا وہ پہلے ہی کیوں نہ کیا گیا۔ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے نظریات کے بارے میں چند دن کے لئے کوئی ذہول ہوجانے

کا تو سوال تھا نہیں اور نہ ہی ایسا تھا کہ ان کے اندر کسی تبدیلی کا یقین حاصل کیا گیا ہو، پھر اس بنیاد پر شروع ہی میں مجلس کے اندر آنے سے معذرت کیوں نہ کر دی گئی؟ اس میں کوئی برائی نہ تھی، ایک نظریاتی بات تھی! لیکن اس وقت شرکت کرنے کے بعد آج یہ کہہ کر الگ ہونا کہ جمعیتہ کے اور ان دو جماعتوں کے درمیان سیکولرزم وغیرہ کے مسائل پر ہم آہنگی نہیں ہے، بڑی ستم ظریفی کی بات ہے۔ اسی طرح اگر مسلم یونیورسٹی کی رٹ کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے اخبارات سے کچھ مناقشہ ہو گیا تھا تو وہ اسکی شکایت مجلس سے کر سکتے تھے، کوئی الیکشن لڑے جانے کا معاملہ کر سکتے تھے، مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ شکایت ہوئی جماعت اسلامی سے اور استعفیٰ دے دیا گیا مجلس سے .....

..... جماعت اسلامی کا تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا البتہ مجلس کو نقصان پہونچ گیا۔ خود مجلس سے اگر کوئی شکایت کی گئی ہے تو وہ یہ ہے کہ مستقل دستور اور تنظیم اُس وعدے کے خلاف ہے جو صدر مجلس نے ان حضرات سے کیا تھا! لیکن یہ جاننے کے بعد کہ جو دستور بنا ہے اور اس میں جو تنظیمی اصول منظور کئے گئے ہیں وہ ان حضرات کی رضامندی سے اور ان کی ترمیمات قبول کر کے بنا ہے، کون اس شکایت کو کوئی وزن دے سکتا ہے؟

اس سارے تجزیے کو مختصر کیا جائے اور بات چند لفظوں میں کہی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ارباب جمعیتہ پتہ نہیں کیسے مجلس میں شامل ہونے کی غلطی کر بیٹھے تھے۔ اور پھر اسکی تلافی کے لئے انھوں نے پہلے ہی دن سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ خود مجلس ہی انھیں علیحدگی کا کوئی موقع دیدے۔ لیکن جب مجلس نے انھیں اس طرف سے بالکل ہی مایوس کر دیا تو مجبوراً خود ہی پیش قدمی کرنا پڑی اور جیسے تیسے اس غلطی کی تلافی کر لی ـــــ ہمارا یہ تجزیہ یقیناً ان حضرات کو بہت ناگوار گزرے گا۔ مگر ہم ایمانداری کے ساتھ اسکے علاوہ کوئی دوسری رائے قائم نہیں کر سکے ـــــ مجلس نے اس استعفے پر اپنے ۱۶، ۱۷ نومبر کے جلسے میں منظوری کی جو قرارداد پاس کی ہے وہ یقیناً اسکے ابتک کے رویہ سے بہت مختلف ہے، مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی، اگر اس استعفے میں غیر ضروری طور پر "حب الوطنی" کی نمائش کے لئے مجلس کی وطن دوستی کو ناپنے کی کوشش نہ کی جاتی۔ یقیناً یہ ایک ناقابل فہم بات تھی اور اس پر نرمی غلط فہمیوں کا دروازہ

معارف الحدیث

نفلی روزے

[معارف الحدیث کے اس سلسلہ میں "کتاب الصوم" کی احادیث کی تشریح اب سے دو سال پہلے الفرقان کی چند اشاعتوں میں کی گئی تھی اس میں وہ حدیثیں درج ہونے سے رہ گئی تھیں جن کو محدثین "صیام التطوع" (نفلی روزے) کے زیر عنوان درج کرتے ہیں اور جن میں مختلف مہینوں اور مختلف دنوں میں نفلی روزے رکھنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے یا نفلی روزوں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خاص ہدایت مروی ہے۔ آج کی صحبت میں وہی حدیثیں پیش کی جا رہی ہیں۔]

نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزوں کا ایک نصاب اور کورس تو اسلام کا رکن اور گویا شرط لازم قرار دی گئی ہے جس کے بغیر کسی مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی اور وہ رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت اسلام میں روحانی تربیت اور تزکیہ کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا خاص تقرب حاصل کرنے کے لیے دوسری نفلی عبادات کی طرح نفلی روزوں کی بھی تعلیم دی گئی ہے، اور بعض خاص دنوں اور تاریخوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان فرما کے ان کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبانی تعلیم و تلقین کے علاوہ اپنے عمل سے بھی امت کو ان نفلی روزوں کی ترغیب دیتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ اس کی بھی پوری

معارف الحدیث

نفلی روزے

[معارف الحدیث کے اس سلسلہ میں "کتاب الصوم" کی احادیث کی تشریح اب سے دو سال پہلے الفرقان کی چند اشاعتوں میں کی گئی تھی اس میں وہ حدیثیں درج ہونے سے رہ گئی تھیں جن کو محدثین "صیام التطوع" (نفلی روزے) کے زیر عنوان درج کرتے ہیں اور جن میں مختلف مہینوں اور مختلف دنوں میں نفلی روزے رکھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے یا نفلی روزوں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خاص ہدایت مروی ہے۔ آج کی صحبت میں وہی حدیثیں پیش کی جارہی ہیں۔]

نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزوں کا ایک نصاب اور کورس تو اسلام کا رکن اور گویا شرط لازم قرار دی گئی ہے جس کے بغیر کسی مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی۔ اور وہ رمضان کے پورے مہینے کے روزے ہیں۔ اس کے علاوہ شریعت اسلام میں روحانی تربیت اور تزکیہ کے لیے اور اللہ تعالیٰ کا خاص تقرب حاصل کرنے کے لیے دوسری نفلی عبادات کی طرح نفلی روزوں کی بھی تعلیم دی گئی ہے، اور بعض خاص دنوں اور تاریخوں کی خاص فضیلتیں اور برکتیں بیان فرما کے ان کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبانی تعلیم و تلقین کے علاوہ اپنے عمل سے بھی امت کو ان نفلی روزوں کی ترغیب دیتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ اس کی بھی پوری

احتیاط فرماتے تھے کہ لوگ نفلی روزوں میں حد اعتدال سے آگے نہ بڑھیں اور ان کا اہتمام اور پابندی فرض روزوں کی طرح نہ کریں بلکہ حدود اللہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو فرائض کی طرح ادا کریں اور نوافل کو نوافل کے درجہ میں رکھیں ـــــ اس مختصر تمہید کے بعد اس سلسلہ کی حدیثیں ذیل میں پڑھئے!۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِکُلِّ شَیْءٍ زَکٰوةٌ وَ زَکٰوةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ۔

ـــــــــ ـــــــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر چیز کی کوئی زکوٰۃ ہے (جس کے نکالنے سے وہ چیز پاک ہو جاتی ہے) اور جسم کی زکوٰۃ روزے ہیں۔ (سنن ابن ماجہ)

ماہ شعبان میں نفلی روزوں کی کثرت:۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَصُوْمُ حَتّٰی نَقُوْلَ لَا یُفْطِرُ وَیُفْطِرُ حَتّٰی نَقُوْلَ لَا یَصُوْمُ وَمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَکْمَلَ صِیَامَ شَهْرٍ قَطُّ اِلَّا رَمَضَانَ وَمَا رَاَیْتُهُ فِیْ شَهْرٍ اَکْثَرَ مِنْهُ صِیَامًا فِیْ شَعْبَانَ ـــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور (نفلی روزوں کے بارہ میں) یہ تھا کہ آپ کبھی کبھی) مسلسل بلا ناغہ روزے رکھنے شروع کرتے یہاں تک کہ ہمیں خیال ہوتا کہ اب ناغہ ہی نہیں کریں گے، اور (کبھی اس کے برعکس ایسا ہوتا کہ) آپ روزے نہ رکھتے اور مسلسل بغیر روزے کے دن گزارتے یہاں تک کہ ہمیں خیال ہوتا کہ اب آپ بلا روزے کے ہی رہا کریں گے۔ ـــــ اور فرماتی ہیں حضرت صدیقہ رضؓ کہ ـــــ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے علاوہ کسی پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں، اور میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کسی مہینے میں شعبان سے زیادہ نفلی روزے رکھتے ہوں۔ (اسی حدیث کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آپ شعبان کے (قریباً) پورے مہینے ہی کے روزے رکھتے تھے)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کے پہلے جزء کا مطلب تو یہ ہے کہ نفلی روزوں کے بارے میں آپ کا کوئی لگا بندھا دستور و معمول نہیں تھا، بلکہ کبھی آپ مسلسل بلاناغہ روزے رکھتے تھے اور کبھی مسلسل بغیر روزے کے رہتے تھے، مقصد یہ تھا کہ اُمت کے لیے آپ کی پیروی میں مشکل اور تنگی نہ ہو، بلکہ وسعت کا راستہ کھلا رہے۔ اور ہر شخص اپنے حالات اور اپنی ہمت کے مطابق آپ کے کسی رویہ کی پیروی کر سکے۔ دوسرے جزء کا مطلب یہ ہے کہ آپ پورے اہتمام سے پورے مہینے کے روزے صرف رمضان کے رکھتے تھے (جو اللہ نے فرض کیے ہیں) ہاں شعبان میں دوسرے مہینوں کی بہ نسبت زیادہ روزے رکھتے تھے ـــــ بلکہ اسی حدیث کی ایک روایت میں ہے کہ قریب قریب پورے مہینے شعبان کے روزے رکھتے تھے اور بہت کم دن ناغہ فرماتے تھے۔

ماہ شعبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ نفلی روزے رکھنے کے کئی سبب اور کئی حکمتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے بعض وہ ہیں جن کی طرف بعض حدیثوں میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت اسامہ بن زید کی ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارہ میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اسی مہینے میں بارگاہ الٰہی میں بندوں کے اعمال کی پیشی ہوتی ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ جب میرے اعمال کی پیشی ہو تو میں روزہ سے ہوں۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان میں بہت زیادہ روزے اس لیے رکھتے تھے کہ پورے سال میں مرنے والوں کی فہرست اسی مہینے میں ملک الموت کے حوالہ کی جاتی ہے۔

آپ چاہتے تھے کہ جب آپ کی وفات کے بارہ میں ملک الموت کو احکام دیئے جارہے ہوں تو اس وقت آپ روزے سے ہوں۔

اس کے علاوہ رمضان کا قرب اور اس کے خاص انوار و برکات سے مزید مناسبت پیدا کرنے کا شوق اور داعیہ بھی غالباً اس کا سبب اور محرک ہوگا۔ اور شعبان کے ان روزوں کو رمضان کے روزوں سے وہی نسبت ہوگی جو فرض نمازوں سے پہلے پڑھے جانے والے نوافل کو فرضوں سے ہوتی ہے، اور اسی طرح رمضان کے بعد شوال میں چھ نفلی روزوں کی تعلیم و ترغیب جو آگے درج ہونے والی حدیث میں آرہی ہے۔ اس کو رمضان کے روزوں سے وہی نسبت ہوگی جو فرض نمازوں کے بعد والی سنتوں اور نفلوں کو فرضوں سے ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے:۔

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَہٗ سِتًّا مِّنْ شَوَّالٍ کَانَ کَصِیَامِ الدَّھْرِ ——— رواہ مسلم

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد ماہ شوال میں چھ نفلی روزے رکھے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہوگا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) رمضان کا مہینہ اگر ۲۹ ہی دن کا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ۳۰ روزوں کا ثواب دیتے ہیں اور شوال کے ۶ نفلی روزے شامل کرنے کے بعد روزوں کی تعداد ۳۶ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے کریمانہ قانون "الحسنۃ بعشر امثالھا" (ایک نیکی کا ثواب دس گنا) کے مطابق ۳۶ کا دس گنا ۳۶۰ ہو جاتا ہے اور پورے سال کے دن ۳۶۰ سے کم ہی ہوتے ہیں ——— پس جس نے پورے رمضان مبارک کے روزے

رکھنے کے بعد شوال میں ۶ نفلی روزے رکھے وہ اس حساب سے ۳۶۰ روزوں کے ثواب کا مستحق ہوگا پس اجر و ثواب کے لحاظ سے یہ ایسا ہی ہوا جیسے کوئی سبزہ سال کے ۳۶۰ دن برابر روزے رکھے۔

ہر مہینے میں تین نفلی روزے کافی ہیں:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا عَبْدَ اللّٰهِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَصُوْمُ النَّهَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ فَقُلْتُ بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِعَیْنِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَّاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَیْكَ حَقًّا۔ لَاصَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ صَوْمُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهٖ صُمْ كُلَّ شَهْرٍ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ وَاقْرَءِ الْقُرْاٰنَ فِیْ كُلِّ شَهْرٍ قُلْتُ اِنِّیْ اُطِیْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ قَالَ صُمْ اَفْضَلَ الصَّوْمِ صَوْمَ دَاوٗدَ صِیَامُ یَوْمٍ وَاِفْطَارُ یَوْمٍ وَاقْرَءْ فِیْ كُلِّ سَبْعِ لَیَالٍ مَرَّةً وَلَا تَزِدْ عَلٰی ذَالِكَ ——— رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ تم ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نوافل پڑھتے ہو (کیا واقعہ ایسا ہی ہے؟) میں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت! میں ایسا ہی کرتا ہوں، آپ نے فرمایا یہ طریقہ چھوڑ دو، روزے بھی رکھا کرو اور ناغہ بھی کیا کرو، اسی طرح رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو، کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے (تمہیں اسکی اجازت نہیں ہے کہ جسم پر حد سے زیادہ بوجھ ڈالو اور اس کے ضروری تقاضے بھی پورے نہ کرو) اسی طرح تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے (کہ تم اس کو سونے اور آرام لینے کا موقع دو) اسی طرح تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتیوں مہمانوں کا بھی تم پر

حق ہو، (تم کو جائز نہیں کہ ان کی حق تلفی کر کے اللہ کی عبادت کرو، سنو) جو ہمیشہ ناغہ روزہ رکھے اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں، ہر مہینے میں تین دن کے نفلی روزے رکھ لینا ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے اس لیے تم ہر مہینے میں تین روزے رکھ لیا کرو اور مہینے میں ایک قرآن پاک (تہجد میں) ختم کر لیا کرو۔ (عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں) میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں (اس لیے مجھے زیادہ کی اجازت مرحمت فرمائیے۔) آپ نے فرمایا تو پھر تم داؤد علیہ السلام کے روزوں کا طریقہ اختیار کر لو اور وہ یہ کہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار یعنی روزہ کا ناغہ، اور تہجد میں سات راتوں میں ایک قرآن ختم کر لیا کرو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا ذوق عبادت بہت بڑھا ہوا تھا، وہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے اور رات بھر نوافل پڑھتے اور اس میں روزانہ پورا قرآن مجید ختم کر لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کو وہ ہدایت فرمائی جو حدیث میں مذکور ہوئی اور ان کو عبادت میں اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم پر اپنے جسم و جان اور اپنے اہل تعلق کی بھی ذمہ داریاں ہیں اور ان کی بھی رعایت اور ادائیگی ضروری ہے۔ آپ نے پہلے انہیں مہینے میں تین نفلی روزے رکھنے اور تہجد میں پورے مہینہ میں ایک قرآن پڑھنے کے لیے فرمایا، اور جب انھوں نے عرض کیا کہ میں بآسانی اس سے زیادہ کر سکتا ہوں لہٰذا کچھ زیادہ کی مجھے اجازت دیدی جائے تو آپ نے ان کو صوم داؤدی (یعنی ہمیشہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کی) اور ہفتہ میں ایک قرآن مجید رات کے نوافل میں پورا کر لینے کی اجازت مرحمت فرمادی اور اس سے زیادہ کے لیے منع فرمادیا۔ لیکن اس حدیث ہی سے یہ بات ظاہر ہو کہ آپ کی ممانعت کا منشاء یہ نہیں تھا کہ زیادہ عبادت کرنا کوئی بری بات ہے، بلکہ یہ ممانعت بربنائے مشقت تھی (جس طرح چھوٹے بچوں کو زیادہ بوجھ اٹھانے سے منع کیا جاتا ہے) یہی وجہ ہو کہ ان کے یہ عرض کرنے پر کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں آپ نے ان کو مہینہ میں صرف تین روزوں کے بجائے صوم داؤدی یعنی ۱۵ دن روزہ اور ۱۵ دن افطار کی اور مہینہ میں قرآن ختم کرنے کے بجائے ہفتہ میں قرآن ختم کرنے کی اجازت دیدی، بلکہ ترمذی کی روایت کے مطابق بعد میں صرف پانچ دن میں قرآن پاک ختم کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔ اور بعض صحابہ کو حضورؐ نے

تین دن میں قرآن ختم کرنے کی بھی اجازت دی ہے[1]

عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ اَنَّ رَجُلاً اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ کَیْفَ تَصُوْمُ؟ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِہٖ فَلَمَّا رَاٰی عُمَرُ غَضَبَہٗ قَالَ رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُوْلِہٖ فَجَعَلَ عُمَرُ یُرَدِّدُ ھٰذَا الْکَلَامَ حَتّٰی سَکَنَ غَضَبُہٗ فَقَالَ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ الدَّھْرَ کُلَّہٗ قَالَ لَاصَامَ وَلَا اَفْطَرَ اَوْ قَالَ لَمْ یَصُمْ وَلَمْ یُفْطِرْ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمَیْنِ وَیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ وَیُطِیْقُ ذَالِکَ اَحَدٌ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمًا وَیُفْطِرُ یَوْمًا قَالَ ذَالِکَ صَوْمُ دَاوٗدَ قَالَ کَیْفَ مَنْ یَّصُوْمُ یَوْمًا وَیُفْطِرُ یَوْمَیْنِ قَالَ وَدِدْتُ اَنِّیْ طُوِّقْتُ ذَالِکَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مِّنْ کُلِّ شَھْرٍ وَرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ فَھٰذَا صِیَامُ الدَّھْرِ کُلِّہٖ وَصِیَامُ یَوْمِ عَرَفَۃَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَۃَ الَّتِیْ قَبْلَہٗ وَالسَّنَۃَ الَّتِیْ بَعْدَہٗ وَصِیَامُ یَوْمِ عَاشُوْرَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُّکَفِّرَ السَّنَۃَ الَّتِیْ قَبْلَہٗ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپ روزے کس طرح رکھتے ہیں؟ (یعنی نفلی روزے رکھنے کے بارے میں آپ کا کیا معمول و دستور ہے؟) اسکے اس سوال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوئی (یعنی چہرۂ مبارک پر تکدر اور برہمی کے آثار ظاہر ہوئے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (جو حاضر تھے) جب آپ کی ناگواری کی کیفیت کو محسوس کیا تو کہا۔

رضینا باللہ ربًّا وبالاسلام دینا و بمحمّد نبیًّا نعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسولہ۔	ہم راضی ہیں اللہ کو اپنا رب مان کر اور اسلام کو اپنا دین بنا کر اور محمد علیہ السلام کو نبی مان کر اللہ کی پناہ اسکی ناراضی سے اور اسکے رسول کی ناراضی سے۔

حضرت عمر بار بار اپنی یہی بات دُہراتے رہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] مجمع الزوائد میں احمد اور کبیر طبرانی کے حوالے سے سعید بن مسند الانصاری رضؓ کو اس کی اجازت مروی ہے ۱۲۔ (مجمع الزوائد ص ۲۶۹ جلد دوم)

مزاج مبارک میں جو ناگواری پیدا ہوگئی تھی اس کا اثر زائل ہوگیا، تو حضرت عمر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ شخص کیسا ہو جو ہمیشہ بلاناغہ روزہ رکھے اور اسکے بارہ میں کیا ارشاد ہے؟ آپ نے فرمایا نہ اُسنے روزہ رکھا نہ افطار کیا، پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا اور اس آدمی کے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو دو دن روزے رکھے اور ایک دن ناغہ کرے یعنی بغیر روزہ کے رہے؟ آپ نے فرمایا کیا کسی میں اسکی طاقت ہے؟ (یعنی یہ بہت مشکل ہے ہمیشہ روزہ رکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے اسلئے اس کا ارادہ نہ کرنا چاہئے) حضرت عمرؓ نے عرض کیا اور اسکے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو ہمیشہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن ناغہ کرے؟ آپ نے فرمایا یہ صوم داؤد ہے، یعنی حضرت داؤد علیہ السلام جن کو اللہ نے غیر معمولی جسمانی قوت بخشی تھی اُن کا معمول یہی تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن ناغہ کرتے تھے) حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اس آدمی کے بارہ میں کیا ارشاد ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن ناغہ کرے؟ (اور اس طرح اوسطاً ہر مہینہ میں دس دن روزہ رکھے) آپ نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھے اسکی طاقت عطا فرمائی جائے۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر مہینے کے تین نفلی روزے اور رمضان تا رمضان یہ (اجر و ثواب کے لحاظ سے) ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہے (لہٰذا جو صوم دہر کا ثواب حاصل کرنا چاہے وہ اس کو اپنا معمول بنالے) اور یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) کے روزہ کے بارہ میں میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے کرم سے کہ وہ صفائی کردے گا اس سے پہلے سال کی اور بعد کے سال کی (یعنی اسکی برکت سے ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کی گندگیاں دھل جائیں گی) اور یوم عاشوراء (۱۰ محرم) کے روزے کے بارہ میں میں امید کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے کہ وہ صفائی کردے گا اس سے پہلے سال کی۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا اصل مضمون و مقصد تو ظاہر ہے لیکن چند ضمنی باتیں وضاحت طلب ہیں انہی کے بارہ میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

حدیث کے بالکل شروع میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ کس طرح روزے رکھتے ہیں، یعنی نفلی روزوں کے بارہ میں خود آپ کا معمول اور طریقہ کیا ہے؟ آپ کو اس سوال پر ناراضی اور ناگواری ہوئی ـــــ یہ ناراضی اور ناگواری ایسی ہی تھی جیسی تعنیف استاذ اور

مربی کو کسی شاگرد اور زیر تربیت طالب و مرید کے غلط اور نامناسب سوال سے ہوتی ہے۔ سوال کرنے والے کو اصل بات دریافت کرنی چاہیئے تھی یا یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ میرے لیے نفلی روزوں کے بارے میں کیا طرز عمل مناسب ہے؟ اُس نے بجائے اس کے حضورؐ کا معمول دریافت کیا تھا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے بہت سے شعبوں میں اُن بہت سے اسباب کی بنا پر جو آپ کے منصب نبوت اور مصالح امت سے تعلق رکھتے تھے ایسا طرز عمل بھی اختیار فرماتے تھے جس کی تقلید ہر ایک کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس لیے سائل کو آپ کا معمول دریافت کرنے کے بجائے اصل مسئلہ دریافت کرنا چاہیئے تھا، ـــــ استاذ اور مربی کی اس طرح کی ناگواری بھی دراصل تربیت ہی کا ایک جزو ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سوال سے حضور کی ناگواری کو محسوس کر کے کل مسلمانوں کی طرف سے عرض کیا "رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُوْلِہٖ" ـــــ اس کے بعد آپ نے نفلی روزوں ہی کے بارہ میں سب طرزیہ سوالات کئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات مرحمت فرمائے۔

جو شخص ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھے اس کے بارے میں آپ نے جو یہ فرمایا کہ "لَا صَامَ وَلَا اَفْطَرَ" (نہ اس نے روزہ رکھا نہ افطار کیا) اس سے آپ کا مقصد ناپسندیدگی کا اظہار ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ غلط ہے، نہ صوم ہے نہ افطار ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوالات کے جوابات کے بعد آپ نے اپنی طرف سے جو مزید فرمایا اُس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کے باب میں عام مسلمین کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ رمضان کے فرض روزے رکھا کریں، اس کے علاوہ ہر مہینے میں تین نفلی روزے رکھ لیا کریں جو "الحسنۃ بعشر امثالہا" کے حساب سے ثواب میں تیس روزوں کے برابر ہوں گے اور اس طرح ان کو "صوم دہر" کا ثواب مل جائے گا ـــــ مزید نفع مندی اور کمائی کے لئے یوم عرفہ اور یوم عاشورا کے دو روزے بھی رکھ لیا کریں، حضور نے امید ظاہر فرمائی کہ رب کریم کے کرم سے مجھے امید ہے کہ یوم عرفہ کا روزہ ایک سال پہلی اور ایک سال بعد کی خطا کاریوں کا اور یوم عاشورا کا روزہ پہلے سال کی غلط کاریوں کا کفارہ بن جائے گا۔

واضح رہے کہ عرفہ کے دن جو در اصل حج کا دن ہے روزہ کی یہ فضیلت اور ترغیب غیر حاجیوں کے لئے ہے، حاجیوں کی اس دن کی خاص الخاص اور مقبول ترین عبادت میدان عرفات کا وقوف ہے جس کے لئے ظہر و عصر کی نماز مختصر اور ایک ساتھ پڑھ لینے کا حکم ہے اور ظہر کی سنتیں بھی اس دن چھوڑ دینے کا حکم ہے اگر حاجی لوگ اُس دن روزہ رکھیں گے تو اُن کے لئے عرفات میں وقوف اور آفتاب غروب ہوتے ہی مزدلفہ

کو چل دنا مشکل ہو گا اس لئے حاجیوں کے لئے عرفہ کے دن روزہ رکھنا پسندیدہ نہیں ہے (بلکہ ایک حدیث میں ممانعت بھی وارد ہوئی ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے عمل سے اس (۱) کی تعلیم امت کر دی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے عرفہ کے دن ٹھیک اس وقت جب کہ آپ میدان عرفات میں اپنے اونٹ پر تھے اور وقوف فرما رہے تھے سب کے سامنے دودھ نوش فرمایا تاکہ سب دیکھ لیں کہ آج آپ روزہ سے نہیں ہیں۔

غیر حاجیوں کے لئے یوم عرفہ کا روزہ دراصل اس دن کی ان رحمتوں اور برکتوں میں شریک اور حصہ دار ہونے ہی کے لئے ہے جو عرفات میں حجاج پر نازل ہوتی ہیں اور اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اللہ کے جو صاحب ایمان بندے حج میں شریک نہیں ہیں وہ اس پورے دن روزہ رکھ کر اس دن کی خاص رحمتوں اور برکتوں میں کسی درجہ کا حصہ لے لیں، اسی طرح یوم النحر یعنی بقرعید کے دن غیر حاجیوں کو قربانی کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا راز بھی یہی ہے، واللہ اعلم۔

یوم عاشوراء کا روزہ نفلی روزوں میں اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ رمضان مبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے وہی فرض تھا، جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی اور صرف نفلی درجہ رہ گیا۔ اس کے بارہ میں احادیث آگے مستقل عنوان کے تحت انشاء اللہ درج ہوں گی۔



مؤتمر اسلامی

مقالہ سوم

اسلام اور اجتماعی انصاف

جناب احمد ذکی یمانی

(وزیر پٹرول و معدنیات مملکت سعودی عرب)

آج سے چودہ سو سال پہلے عالم بشریت پر خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا، جس میں انسان کا نہ کوئی احترام تھا اور نہ اسے آزادی کی نعمت میسر تھی۔ جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا اور نفسانی خواہشات اور استبداد کا سکہ چلتا تھا۔ عین اس وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی بہتری منظور ہوئی اور اس نے اس خطۂ ارض کو جو سب سے زیادہ تاریک تھا، اس غرض کے لیے منتخب فرمایا کہ وہاں ایک ایسی شمع ہدایت روشن کرے، جس سے ساری دنیا نور حاصل کرے اور اس طرح وہ انسان کو اس کی عزت و آزادی واپس لوٹائے اور عدل و انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر ایک اچھا معاشرہ وجود میں لائے۔

غرض ایک معجزہ بروئے کار آیا۔ سرزمین مکہ اور اس کے گرد و پیش کے معاشرے، جہاں نسب پر عزت و شرافت کا مدار تھا اور عیش و عشرت میں غرق آقاؤں کی خدمت میں غلام مشقتیں اٹھاتے تھے، ایک نئے معاشرہ کی شکل اختیار کرلی جس میں انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر تھے۔ اور وہ سب مل کر اس طرح ایک جسم بن گئے کہ اگر اس کے ایک حصے کو کوئی شکایت ہوتی تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا۔

ہماری آج کی دنیا ایک مہلک حیرت و اضطراب اور گھپ اندھیرے میں زندگی گزار رہی ہے، صنعت و حرفت کی تمام روشنیاں ان اندھیروں کو دور کرنے سے عاجز اور اہل دنیا کو اطمینان قلب اور حقیقی آزادی واپس دلانے سے قاصر ہیں۔ کینہ ور شیوعیت (کمیونزم) کی افراط اور

مستبد سرمایہ داری کی تفریط کے درمیان انسان اپنا احترام کھو چکا ہے۔ اور اقوام عالم اصلاح احوال کے لیے جو بھی تجربے کرتی ہیں، ان سے حالات اور بھی خراب اور بدتر ہو جاتے ہیں، آج عقلا اور دانش مند اسی نازک صورت حال پر غور کرنے میں مصروف ہیں۔ اور ان کے سامنے معاشرے کے ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے اور متضاد گروہوں کی باہمی طبقاتی کشمکش کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اجتماعی ظلم کا ہمہ گیر مسئلہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے فرض کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اس ضمن میں لوگ اپنے منافع دیکھیں اور باہم مل کر اپنے مشکلات کے بارے میں صلاح و مشورہ کریں۔ ہم سب کے سب اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں کہ اس اجتماعی ظلم کے مسئلے پر غور کریں جس کی جڑوں نے ہر جگہ پھیل کر سرطان کی شکل اختیار کر لی ہے، اور اس کی جو بھی دوا کی جاتی ہے اس سے مرض اور بڑھتا ہے۔

ہم یہاں مکہ میں ہیں جو منبع ہدایت اور مصدر نور ہے۔ اس لیے یہاں ہم سے یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ ہم دوسروں کی طرح ان تجربوں کی طرف رجوع کریں جو ناکام ہو چکے ہیں۔ یا کم از کم ان کی کامیابی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی۔ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے کہ انہی چیزوں کو باہر سے درآمد کریں اور ان کے اجنبی ہونے اور ان کے نقصانات کے باوجود یہاں انھیں نافذ کرنے لگ جائیں۔ دراں حالیکہ ہمارے پاس ایک کامیاب تجربہ موجود ہے جس کا ہم سے قریب ترین تعلق ہے۔ یعنی ہم اس کے ہیں اور وہ ہمارا ہے "کِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ مِنْ لَّدُنْ عَزِيْزٍ حَكِيْمٍ (یہ کتاب ہے جس کی محکم آیات ہیں اور زبردست اور حکمت والے کی طرف سے نازل ہوئی ہے) اور وہ شریعت ہے جس نے ایسا نظام عدل و انصاف قائم کیا جو فرد کے احترام و آزادی کا محافظ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسے جماعت کا سرگرم خادم بناتا ہے۔ اس نظام میں نہ فرد جماعت پر مسلط ہوتا ہے اور نہ جماعت میں اس کی ذات فنا ہوتی ہے۔ البتہ جب جماعت کی مصلحتوں سے اس کی ٹکر ہو تو اس وقت بے شک فرد کے حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک آج ہمارے لئے اس مسئلہ سے بڑھ کر جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے کوئی اور مسئلہ نہیں اور کسی دوسرے مسئلے کا حل تلاش کرنا اس سے زیادہ ضروری نہیں۔ لیکن یہ حل ہمارے دین اور ہماری تاریخ سے اخذ ہونا چاہیے۔ ہم نے اگر یہ نہ کیا تو جو امانت ہمیں دی گئی ہے وہ گویا ہم نے ضائع کردی اور مسلمان اقوام کو طوفان کے حوالے کردیا کہ وہ انھیں بہا کرلے جائے۔ اور مچھلیاں ان کو نگل جائیں۔

مگر اس سلسلے میں صرف اتنا کافی نہیں کہ ہم لوگوں سے یہ کہہ کر کہ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اسلام کو عملی جامہ پہنایا جائے اور اس کے اوامر و احکام کی پیروی کی جائے، اپنے ملکوں کو لوٹ جائیں۔ جہاں پریشاں حال انسانوں کی چیخیں اور بھوکوں کی آہیں ہمارے کانوں سے آآ کر ٹکرائیں اور ہمارے پاس کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہ ہو جسے ہم اپنی قوموں کی مشکلات کے حل کے طور پر پیش کرسکیں۔ ان حالات میں ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام سے ایسے احکام کا استنباط کریں، جن سے موجودہ مشکلات کا علاج ہوسکے۔ اس کے بعد احکام کی تطبیق کے لئے عملی نظر سے غور و فکر کیا جائے پھر ہم خود کو ان احکام الٰہی پر عملدرآمد کے لئے کمربستہ کریں۔ اور اس راہ میں نہ ہمیں جانوں کی پروا ہو اور نہ مال کی۔

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ اسلام نے اجتماعی ظلم دفع کرنے اور عدل کو وجود میں لانے کے لئے، جو وسائل تجویز کئے ہیں میں ان پر اس قدر سیر حاصل بحث کرسکتا ہوں کہ جس سے آپ کے سامنے ان مشکلات کا پورا حل اپنی عملی شکل میں سامنے آسکے یہ چیز میری وسعت سے باہر ہے اور میری حقیر معلومات اس سطح تک پہونچنے سے قاصر ہیں۔ لیکن مجھے جب اس اہم موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو یہ بھی پسند نہ ہوا کہ اسے قبول نہ کروں۔ میں شاید اس میں حصہ لے کر اتنا تو کرہی سکتا ہوں کہ جن حضرات کو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم اور لوگوں کی مشکلات کا تجربہ ہے ان کے سامنے غور و فکر کا ایک دروازہ کھول دوں۔ تاکہ ان امور پر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ گفتگو ہوسکے۔ پس میں مسئلہ کو اور صرف اس کے بنیادی پہلوؤں کو پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں اور اس کے بعد عمل کی طویل گفتگو آپ کے لئے چھوڑتا ہوں

زیر بحث موضوع

اجتماعی ظلم کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک ظلم تو وہ ہے، جس کا نشانہ فرد بنتا ہے یہ ظلم فرد کی شخصیت کو ختم اور اس کی آزادی و احترام کی نفی کردیتا ہے۔ اور یہ سب جماعت کے نام اور مصلحت عامّہ کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرد کی طاقت

مل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں مردہ اور اس کا جوش پژمردہ ہو جاتا ہے اور وہ جماعت کے لئے سی کام کا نہیں رہتا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو آج انتہا پسند اشتراکی نظاموں کے زیر سایہ پائی جاتی ہے اسی طرح غیر اشتراکی نظاموں میں بھی فرد کو رنگ، مذہب اور قومیت کی بنیاد پر عزت و آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور جماعت اپنے ایک جزو کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے، اس کی صلاحیتوں اور نوتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور فرد اس امتیازی سلوک اور محرومی کے مصائب اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کے برعکس یہ صورت بھی ہوتی ہے کہ جب فرد کی ہوسناکیاں جماعتی مصالح سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں تو خود جماعت ہی ظلم کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس نظام میں اجارہ داری کا دور دورہ ہوتا ہے مزدوروں کا خون چوسا جاتا ہے۔ لوگوں سے ان کی روزی چھین لی جاتی۔ اور یوں دولت چند افراد کے ہاتھ میں جمع ہو جاتی ہے۔ غالب اکثریت مصیبتیں اٹھاتی اور اقلیت عیش کرتی ہے۔ معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور آئے دن کی شورشوں اور انقلابوں کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو استحصال پسند اور غیر متوازن سرمایہ دارانہ نظاموں میں سامنے آتے ہیں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں ہی بیک وقت اجتماعی ظلم کا نشانہ بن جاتے ہیں جبکہ جماعت پر کوئی ایسا فرد مسلط ہو جاتا ہے جو اپنی ہوا و ہوس پر جماعتی مصلحتوں کو قربان کرے اور اس کی خاطر لوگوں کی عزت و آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اجتماعی ظلم کا مبدا و مصدر مال ہے۔ اور یہ کیفیت اس وقت رونما ہوتی ہے جب فرد اور جماعت حریف ہو کر تراز و کے دو پلڑوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور پلڑا کسی ایک طرف جھک جاتا ہے۔ اس مفروضہ پر جو جو علاج بھی اس سلسلے میں تجویز کئے جاتے ہیں وہ نہایت تنگ اور خالص مادی نقطۂ نظر پر مبنی ہوتے ہیں۔ انھیں علاج نہیں بلکہ ہنگامی عمل کہنا چاہیے کہ علم کا تو طوفانی ظلم سے اور حرص و طمع کا علاج کینہ پروری سے کیا جاتا ہے۔

اس بارے میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے بھی بے شک مال و دولت کو خاص اہمیت دی ہے۔ اور اس پہلو سے اپنی خصوصی توجہ اس پر مبذول کی ہے کہ اجتماعی ظلم کا ایک بڑا سبب مال ہی ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ سے مختلف طریقوں سے نمٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے پیش نظر سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ فرد اور جماعت کے یہ جو دو پلڑے ہوتے ہیں، ان کو برابر رکھا جائے۔ اور اگر دونوں

کسی ایک کا جھکنا ناگزیر ہو، تو وہ پلڑا اجماعت کا ہو۔ اسلام کے نزدیک اجتماعی عدل و انصاف کے معنی صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو مساوی حیثیتیں ملیں اور اس طرح اقتصادی ناہمواری نہ پیدا ہو سکے، جیسا کہ کمیونزم کا تصور ہے، اور جو اس تصور کی تطبیق میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام ایک ایسی انسانی مساوات چاہتا ہے، جو بہت سی قدروں کی جامع ہو۔ اور ظاہر ہے ان قدروں میں سے یقیناً ایک قدر خالص اقتصادی بھی ہوگی۔ جس کے مطابق سب کو ایک سے مواقع حاصل ہوں اور سب افراد اپنی عملی صلاحیتوں کے اظہار میں آزاد ہوں۔

اسلامی عدل اجتماعی کے اسی وسیع نقطۂ نظر کی بنا پر صرف جماعت اور افراد کے حقوق کی حفاظت کرنے والے قوانین کا نافذ کر دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے پہلے اور پھر اس کے ساتھ اس پرجوش اسلامی دعوت کی ضرورت ہے، جس سے معاشرہ کا انداز فکر عادلانہ بنے اور محبت و اخوت کی گرمی جاری و ساری ہو جائے۔ کیوں کہ ہمہ جہت عدل و انصاف صرف اسی طاقت سے وجود میں آسکتا ہے۔

بہر حال میں اس مقالے میں اولاً "حق ملکیت" سے بحث کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ عدل اجتماعی کی بحث میں یہ سب سے پہلا اہم مسئلہ ہے۔ پھر "مساوات" کے بارے میں اسلام کا موقف پیش کروں گا۔ اس کے بعد تیسری بحث "اجتماعی کفالت" کی ہوگی اور پھر "خاتمہ" میں اس بحث کے نتائج آپ کے غور و فکر کے لئے پیش کرنا چاہوں گا۔

۱۔ مال

حق ملکیت اور افراد کے حقوق دولت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بڑا عادلانہ اور دانش مندانہ ہے۔ سب سے پہلے تو وہ انفرادی ملکیت کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اس ملکیت کو اتنا ہی قابل احترام سمجھتا ہے، جتنا انسانی جان کو (۱)۔ وہ صاحب مال کو مال کی حفاظت کا ہر طریقہ سے حق دیتا ہے جس میں قتال بھی شامل ہے۔ اگر مال کا مالک اس کی حفاظت کرتا ہوا جان دے دے، تو شہید ہوگا (۲)، اگر اس کے مال پر چور دست درازی کرے، تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا (۳)، یا اگر کوئی شخص اس کے مال کو غصب کرے تو وہ

اللہ کے غضب کا مستحق ہوگا (۴)۔

ایک فرد اگر شرعاً جائز طریقوں سے مال حاصل کرتا ہے۔ تو وہ اسے بلا کسی روک ٹوک کے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے (۵) تاکہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے آثار ظاہر ہوں (۶) بلکہ اس بارے میں کنجوسی ممنوع ہے اسی قدر جس قدر فضول خرچی (۷)، وہ اس مال کو شرعاً جائز طریقوں سے افزائش مال کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے جماعت کے مفادات و مصالح پر زد نہ پڑے جب صاحب مال کا انتقال ہو جائے تو اس کی متروکہ ثروت اس کے عزیزوں اور وارثوں پر تقسیم ہوگی۔ اور دولت کو ایک جگہ جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (۸)

اسلام میں ملکیت کا تصور اسلام کی نگاہ میں "ملکیت" ایک نیابت، اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اسلام نے انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور اسے ہر طرح کی ضمانت دی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس نے مال کے مالک کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس دینی اساس کو اچھی طرح سے سمجھ لے، جس پر کہ اس کی ملکیت قائم ہے اور اس اہم مقصد کو جانے جس کی بنا پر اسے ملکیت میں تصرف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ صاحب مال کے اندر ایسی نفسیاتی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ طمع و حرص سے بچ کر اس اجتماعی فریضہ کو ادا کر سکے، جو بحیثیت مال کے مالک کے اس پر عائد ہوتا ہے۔

قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ مال کا اصلاً مالک اس کا دنیاوی مالک نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت تو محض ایک نائب اور وکیل کی ہے اصل مالک تو اللہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے للہ ما فی السموات وما فی الارض (۹) (جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، وہ سب اللہ کا ہے) اللہ نے اپنے بندوں کو اس ملکیت کے استعمال کے لئے نائب بنایا ہے۔ "امنوا باللہ و رسولہ و انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ" (۱۰) (ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جس مال میں اس نے تم کو نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو) قرآن مجید میں جہاں غلاموں کی مکاتبت کا ذکر ہے، وہاں فرمایا گیا ہے۔ "واتوھم من مال اللہ الذی اتاکم" (۱۱) (اللہ کے مال میں سے جو اس نے تمہیں دیا ہے، انہیں دو) گویا جن کے پاس مال ہے ..... وہ محض واسطہ ہیں۔ مال تو اللہ کا ہے۔ اور انہیں اللہ نے اس مال پر اپنا نائب و وکیل بنایا ہے

یہ ہے اسلام کے نزدیک ملکیت کی دینی اساس۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چیز مالک کے حق تصرف میں عملاً کوئی رکاوٹ بنے۔ ہاں اس حالت میں یہ چیز ضرور رکاوٹ ہے جبکہ فرد شرائط وکالت کی خلاف ورزی کرنا چاہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ملکیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ملکیت شئے اور ایک ملکیت منفعت۔ اب مذکورۂ بالا اصول پر شئے کا مالک تو حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ ہوگا۔ اور منفعت کی ملکیت مالک کو حاصل ہوگی یعنی وہ مال و دولت میں آزادی کے ساتھ تصرف کرے جیسے کہ وقف کے متولی کو اختیار ہوتا ہے الا یہ کہ وہ واقف کے شرائط کی خلاف ورزی کرنے لگے۔

حق ملکیت کے استعمال پر پابندیاں شریعت اسلامی پہلا قانون ہے جس نے انفرادی حقوق کے استعمال پر ایسی پابندیاں عائد کی ہیں کہ اس سے دوسروں کو نقصان نہ پہونچے اور اس طرح صاحب مال کے اختیار کو محدود کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے بہت سے مقامات میں اس سلسلے میں اور دیگر حقوق کے معاملات میں زیادتیوں کے ارتکاب سے بچا ہے۔ خاص طور سے وصیت، طلاق اور دوسروں سے اپنا حق طلب کرنے جیسے معاملات میں زیادتی کرنے کی سخت ممانعت آئی ہے (۱۲)

حنفی اور مالکی مذہب اس سلسلے میں فقہ اسلامی کے دو مذہبوں (حنفی اور مالکی) نے جو احکام و قواعد بیان کئے ہیں ان سے ظلم و زیادتی اور عدل و انصاف کے درمیان ایسی واضح حد بندی ہو جاتی ہے جو دوسرے قانونی نظام میں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی دور حاضر کی قانونی فکر کو اس کی باریکی تک رسائی ہوئی ہے۔ ان دونوں مذہبوں میں حسب ذیل تین اصولوں کو بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔

۱۔ نہ خود نقصان اٹھایا جائے نہ دوسرے کو پہونچایا جائے۔

۲۔ دو برائیوں میں ایک برائی اختیار کرنا ناگزیر ہو تو کمتر برائی کو اختیار کیا جائے۔

۳۔ جماعتی مصلحت کو انفرادی مصلحت پر مقدم رکھا جائے۔

ہم دونوں مذہبوں کے احکام کی روشنی میں انفرادی حقوق پر تین پابندیاں ضروری قرار دے سکتے ہیں

۱۔ کسی حق کو صرف اسی غرض کے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہے جس غرض کے لئے وہ حق ملا ہے۔ امام مالک نے اسی اصول کو احوال شخصی کے مسائل پر منطبق کیا ہے۔ خاص کر نابالغ اولاد

کے مال پر باپ کی تولیت کے مسئلے میں (۱۴) اور باپ کے اس حق میں کہ وہ نابالغ لڑکی کا نکاح اسکی اجازت کے بغیر کرسکتا ہے (۱۵) نیز اس حق میں کہ وہ بالغ لڑکی کے نکاح پر معترض ہوسکتا ہے (۱۶) امام مالک کا نظریہ یہ ہے کہ ولی کے ان حقوق سے زیر ولایت افراد کی مصالح کا تحفظ مقصود ہے پس اگر ولی ان کی مصلحت کے خلاف کام کرتا ہے تو وہ قابل رد ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) نے اسی بنیادی اصول کو نابالغ پر حق ولایت اور نکاح کے لئے کسی وکیل کی ولایت عامہ کو محدود کرنے میں بھی استعمال کیا ہے۔ اگرچہ اس ذیل میں نکاح کے لئے وکالت عامہ کی بعض شکلوں میں امام صاحب اور صاحبین کے درمیان اس اصول کے انطباق میں اختلاف بھی واقع ہوا ہے۔ جیسے امیر کسی شخص کو حکم دے کہ کسی (غیر متعین) عورت سے اس کا (امیر کا) نکاح کردیا جائے اور وہ شخص اس حکم سے فائدہ اٹھاکر کسی کی باندی کو امیر کے عقد میں دیدے تو امام صاحب کے نزدیک یہ جائز ہوگا۔ لیکن صاحبین کے نزدیک عورت کا کفو ہونا ضروری ہے (۱۷)

۲۔ کسی حق کا استعمال اگر عام عادت کے خلاف دوسروں کے لئے باعث ضرر ثابت ہو تو اُسے غیر قانونی قرار دیا جائے گا۔

امام مالک نے اس اصول کو عمومی حیثیت سے پڑوس کے تعلقات کی تنظیم (۱۸) مکانوں کی کھڑکیاں کھولنے سے پیدا ہونے والے مخصوص تنازعات کی بندش (۱۹) مشترک اموال کی تقسیم (۲۰) اور غیر آباد زمینوں پر قبضہ گیری (۲۱) کے مسائل میں استعمال کرتے ہوئے فیصلہ دیا ہے کہ ان معاملات میں جائز حقوق کے استعمال سے اگر عام عادت کے خلاف کسی کو ضرر پہونچے تو صاحب حق کو اپنے حق کے استعمال سے روکنا واجب ہوگا۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین نے اسی اصول سے کئی منزلہ مکانات کے مالکوں کے حقوق و فرائض کی تعیین، موکل کی غیر موجودگی میں وکیل کو اس کی وکالت سے دست بردار ہوجانے کی ممانعت اور کسی آجر کے اس حق کو مشروط کردینے میں کام لیا ہے کہ وہ اجیر سے کیا ہوا معاملہ فسخ کرسکتا ہے (۲۲) ان کے نزدیک یہ حق کسی عذر ہی پر مبنی ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی معقول عذر نہیں ہے تو اس حق کا استعمال ظلم قرار دیا جائے گا۔

۳۔ کسی ایسے حق کے استعمال کی اجازت نہیں دی جا سکتی جس کا مقصد خود کوئی فائدہ اٹھانا نہ ہو بلکہ دوسرے کو نقصان پہونچانا ہو۔

امام مالک نے اس اصول کو خاص طور پر پڑوسیوں کو اپنی ملکیت کے کسی ایسے استعمال سے باز رکھنے میں استعمال کیا ہے جس سے محض دوسرے پڑوسی کو ضرر ہو خود کو کوئی نفع نہ ہو (۲۳)، امام ابو حنیفہ نے بھی اس سے ایسے ہی مسائل میں کام لیا ہے۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، اس اصول کی تطبیقات (مثالوں) سے بھری ہوئی ہے جن میں سب سے اہم چیز یہ ملتی ہے کہ امام ابو یوسف غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کے معاملے میں عام افراد کے علاوہ حکومت کو بھی اس شرط کا پابند کرتے ہیں کہ اس حق کے استعمال سے کسی دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ (۲۴)

اوپر جو کچھ مذکور ہوا، اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حقوق اور ان کے استعمال کے متعلق حنفیہ اور مالکیہ کا نقطۂ نظر آپس میں ملتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر حق سے ایک غرض اور مقصد وابستہ ہوتا ہے جسے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر صاحب حق اس مقصد کی خلاف ورزی کرتا ہے اور وہ اپنے اس حق کو دوسروں کی ضرر رسانی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا ایسا کرنا ظلم اور زیادتی سمجھا جائے گا اور اس حق کا کوئی قانونی جواز نہیں رہے گا۔ مگر امام شافعی اس نظریہ کے کلی الاطلاق حامی نہیں ہیں۔

امام شافعی کا مسلک امام شافعی کے نزدیک صاحب حق اپنے حقوق میں علی الاطلاق مختار ہے وہ جیسے چاہے، اسے استعمال کر سکتا ہے خواہ اس میں اسے کوئی فائدہ نہ ہو، یا دوسروں کو اس سے نقصان پہونچے۔ لیکن بعض قرآنی احکام اور مستقل عادات کے آگے وہ بھی مجبور ہوئے کہ اپنے اس اصول کو مطلق نہ رہنے دیں (۲۵)، اور ان کے بعد انکے جو شاگرد آئے، انھوں نے امام صاحب کی اس رائے سے بہت زیادہ اختلاف کیا اور اس بارے میں حنفیہ اور مالکیہ کے مسلک پر چلے۔ امام شافعی کی اس رائے کے خلاف جو افراد ہیں سے جن حضرات نے لکھا ہے ان میں اہم ترین شخصیت امام غزالی ہیں۔ انھوں نے نکاح، طلاق، معاہدہ اور پڑوسی غیرہ کے حقوق پر ان کے اجتماعی مقاصد کی روشنی ہی میں بحث کی ہے۔ (۲۶) متاخرین میں سے اس نظریہ کے قواعد وضوابط کے اثبات میں ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے

امام شافعی کی رائے کی مخالفت کی کیونکہ یہ رائے ظلم کی موجب اور عدل وانصاف کے منافی ہے (۲۷) چنانچہ نویں صدی ہجری کے فقہاء کے ہاں تقریباً یہ رائے عام طور پر تسلیم کی جانے لگی کہ حق کے استعمال میں دوسروں پر ظلم وزیادتی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے (۲۸)۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ کی اکثر دفعات میں اس نظریہ کی تطبیقات ملتی ہیں (دفعات ۱۱۹۸ - ۱۲۱۲)۔ اسی طرح قدری پاشا مرحوم نے اپنی کتاب الاحوال العینیہ میں اس نظریہ کی بعض تطبیقات بیان کی ہیں (دفعات ۵۷-۵۹)۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے حق کے استعمال میں ظلم وزیادتی کے ارتکاب کے اس نظریہ کو جیسا کہ وہ شریعت میں ہے، مصر میں داخل کیا گیا ہے

اسلام کا نظریہ ملکیت اور یورپی ماہرین قانون

یورپ کے ماہرین قانون میں سے جو لوگ اسلام کے نظریہ ملکیت، اس کے مقاصد اور انفرادی حقوق کے استعمال پر اس کے عائد کردہ قیود سے متاثر ہوئے، ان میں سے ایک، فرانسیسی پروفیسر دوجی ہیں۔ موصوف ایک عرصہ تک قاہرہ میں لا کالج کے پرنسپل رہے تھے۔ اور ظاہر ہے اس دوران میں ان کا مصر کے علماء وفقہاء سے ملنا جلنا رہا۔ پروفیسر دوجی نے اپنا "تکافل اجتماعی" (اجتماعی کفالت) کا مشہور نظریہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ملکیت کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ وہ ایک اجتماعی عمل ہے۔ بعد ازاں انھوں نے اس کی بالکل اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تشریح کی ہے۔ پروفیسر موصوف کا یہ نظریہ مغرب میں خوب مقبول ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں "انقلاب اکتوبر" ہوا، تو ملکیت کے بارے میں بالشویکوں کے اپنے جو نظریے تھے، وہ حقیقت واقعی کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور وہ انھیں روس کے اس وقت کے حالات میں منطبق کرنے میں ناکام رہے۔ انقلاب کے پانچ سال بعد لینن مجبور ہو گیا کہ وہ بعض بورژوائی قوانین ملکیت کو بحال کرے تاکہ ان کو شیوعت کی منزل تک پہونچنے سے پہلے کے عبوری دور میں نافذ کیا جائے۔ اسے N.E.P. (نیو اکنامک پالیسی) کا نام دیا گیا۔ لینن نے اپنی اس پالیسی کی تشکیل میں پروفیسر دوجی کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ اس کا خود بہت سے روسی ماہرین قانون نے اعتراف کیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ اپنے ان تحریروں سے پھر گئے ہیں (۲۹)۔ لینن کے اس قانون کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ یہ قانون شہری حقوق کی حفاظت کرتا ہے، سوائے ان حالات کے جب کہ انھیں اجتماعی واقتصادی اغراض کے خلاف استعمال کیا جائے

لیکن اس سب سے قطع نظر جس کی بنا پر اسلامی شریعت اور سوویت روس کے قانون کی اس دفعہ میں مشابہت پائی جاتی ہے اس سے جو نتائج نکلے وہ ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کی بالشویک سرزمین اسلامی فکر کے لئے سازگار نہیں ہے جیسے کہ وہ زاویۂ نظر جس سے روس معاملے کو دیکھتا ہے، شریعت اسلامی کے زاویۂ نظر سے مختلف ہے مسلمانوں کے ہاں اصل نقطۂ نظر یہ ہے کہ ملکیت کی کامل حفاظت کی جائے جبکہ بالشویک نظریہ بالکل علی العکس ہے۔ وہ سرے سے ملکیت کا ہی انکار کرتے اور اسے اصلاً باطل قرار دیتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب انھیں حقائق واقعی مجبور کرتے ہیں، تب وہ ملکیت کو اس شرط کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا استعمال اجتماعی و اقتصادی اغراض کے لئے ہو۔

بہرحال یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۲۳ء میں پیش کی ہوئی لینن کی عارضی اسکیم اب ایک مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ لینن کے بعد روسی لیڈروں نے اس میں اور بھی توسیع سے کام لیا ہے اور اس طرح ہر نئے سال میں بالشویک نظام کی ناکامیوں سے پردہ جلد اٹھتا جا رہا ہے۔ آج ایک شخص پورے وثوق کے ساتھ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ اس وقت کا عملی روسی نظام مارکس کے بالشوزم سے بے حد جدا ہے۔ اور وہ وقت دور نہیں ہے جب شیوعیت کے خواب کو آخری شکست نصیب ہوگی کیسے خبر ہے کہ یہ بعید ترین راہ سے گزرتا ہوا قافلہ ان ناکامیوں کے نتیجے میں اس اسلامی طرز فکر ہی کو نہ اپنا لے جس کا بیج بہرحال اس کے ذہن میں پڑ چکا ہے اگر ایسا ہوا تو یہ اسلام کے معجزوں میں سے کوئی انوکھا معجزہ نہ ہوگا۔ ——— باقی

حوالے

مضمون میں حاشیوں کے نشانات (ہندسے) حوالوں کیلئے ہیں۔ اس قسط کے حوالے درج ذیل ہیں

۱۔ ایھا الناس ان دماءکم واموالکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم ھذا وکحرمۃ شھرکم ھذا۔ (اے لوگو بے شک تمھارے خون اور تمھارے اموال تم پر تا قیامت حرمت ہیں یہاں تک کہ تم اپنے رب سے ملو ایسے ہی قابل حرمت جیسے یہ دن اور جیسے یہ مہینہ) ۲۔ من قتل دون مالہ فھو شھید (اخرجہ النسائی) (جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے) ۳۔ والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا۔ نکالا من اللہ (القرآن: المائدۃ) (چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دو یہ سزا ہے اللہ کی طرف سے ان کے اس فعل کی جو انھوں نے کیا)

۴۔ من اقتطع مال امری مسلم بغیر حق لقی اللہ عزوجل وھو علیہ غضبان۔ (مسند امام احمد) (جس نے

کسی مسلمان کا بغیر حق کے مال لے لیا تو وہ اللہ تعالیٰ کو اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس پر ناراض ہوگا ۵۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق (القرآن الاعراف) (اے نبی کہہ دو کس نے اللہ کی قائم کردہ زینت چیزوں کو جو اس نے بندوں کیلئے پیدا کیں اور روزی کی اچھی چیزوں کو حرام ٹھہرایا) یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد (القرآن الاعراف) اے بنی آدم ہر نماز کے وقت زینت اختیار کرو۔ ۶۔ اذا اتاک اللہ مالا فلیرا ثرتہ اللہ علیک وکرامتہ (ابوداؤد ونسائی) جب اللہ تعالیٰ تمہیں مال دے تو اللہ کی نعمت اور تکریم کا تم پر اثر دیکھا جانا چاہیے۔ ۷۔ ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا (القرآن، الاسراء) اور نہ اپنا ہاتھ گردن سے ہی باندھ لینا چاہیے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے ورنہ الزام خوردہ اتھی دست ہو کر بیٹھ رہو گے ۸۔ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔ (القرآن: النساء) ماں باپ اور قرابت دار جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں سے مردوں کیلئے حصہ ہے اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے جو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں ۹۔ للہ ما فی السموات وما فی الارض (القرآن) اللہ ہی کیلئے ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمینوں میں ۱۰۔ القرآن سورۃ الحدید ۷۔ ۱۱۔ القرآن سورۃ النور ۳۳۔ ۱۲۔ .....

۱۳۔ وصیت کے بارے میں آیت ہے:۔ من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین غیر مضار وصیۃ من اللہ واللہ علیم حلیم۔ (البقرہ) طلاق کے حق کے بارے میں آیت ہے:۔ الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسریح باحسان، (ناحق طلب کرنے کے بارے میں آیت ہے:۔ ولا تاکلوا اموالکم بالباطل وتدلوا بہا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ۱۴۔ المدونۃ الکبریٰ للامام مالک (امام عبدالرحمن بن القاسم سے امام سحنون کی روایت۔ جزو ۱۴ ص ۱۹۹) ۱۵۔ المدونۃ الکبریٰ جزو ۴ ص ۵۔ ۱۶۔ ایضاً ص ۱۴۔ ۱۷۔ کتاب الخراج، امام ابو یوسف وہامشہ الجامع الصغیر محمد حاشیہ ص ۳۳۔ ۱۸۔ المدونۃ الکبریٰ جزو ۴ ص ۲۳۵۔ ۱۹۔ ایضاً جزو ۱۵ ص ۱۹۷۔ ۲۰۔ ایضاً جزو ۴ ص ۲۳۱ ۲۱۔ ایضاً جزو ۱۵ ص ۱۹۵۔ ۲۲۔ کتاب الخراج حاشیہ ۱۰۲، ۱۰۳۔ ۲۳۔ المدونۃ الکبریٰ جزو ۱۵ ص ۱۹۴، ۱۹۵ ۲۴۔ کتاب الخراج ص ۵۳۔ ۲۵۔ کتاب الام، امام شافعی جزو ۵ ص ۱۸۹، ۲۰۱، ۲۱۱۔ ۲۶۔ احیاء علوم الدین، امام غزالی، جزو ۲ ص ۱۴، ۲۵، ۳۵، ۳۶، ۴۸، ۲۱۳۔ ۲۷۔ اعلام الموقعین، امام ابن القیم جزو ۳ ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ ۲۸۔ ابن عابدین۔ رد المحتار علی الدر المختار پر حاشیہ الزیلعی (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق)

صرف مسائل کا مشترک ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان مسائل کے لئے جدوجہد کے بارے میں سب کا انداز فکر بھی ہم آہنگ ہونا چاہیئے تو یہ ایک معقول بات ہوتی، اور اس بنا پر جمعیۃ اگر عہدہ کر دیتی تو اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس نے اس جرأت اور صاف گوئی کے بجائے یا اس لئے کہ رہنمایان جمعیۃ کے ذہن میں یہ نظریاتی بات اس وقت مضبوط شکل میں تھی ہی نہیں (اس صاف گوئی کے لئے معاف رکھا جائے) ایک مذموم شکل اختیار کی۔ اس نے دل میں عدم اشتراک کا تہیہ رکھا اور اس پر عمل کیا، لیکن اوپر سے اشتراک پر رضامندی کا لبادہ بھی اوڑھ لیا اور کوشش یہ کی کہ اس لبادے کو اس پر اتارنے کی ذمہ داری دوسرے اپنے سر لے لیں، لیکن جب یہ نہوا تو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے یا اسے نباہنے کے بجائے اس انداز سے اپنا دامن چھڑایا کہ نہ تو ملت کے اندرونی مصالح کی کوئی پرواہ کی اور نہ خارجی نزاکتوں کا کوئی لحاظ!

بہرحال جمعیۃ نے مجلس سے علیحدگی اختیار کرلی، اور چاہے اسے صرف برسراقتدار گروہ کی علیحدگی کہا جائے لیکن جب تک وہ گروہ برسراقتدار ہے، جو آج ہے، یہ جمعیۃ ہی کی علیحدگی کہلائے گی اور اس صورت میں مجلس کی وہ "کل ملت نمائندہ" حیثیت باقی نہیں رہ جائے گی جو اس کا بنیادی تخیل تھی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ارکان مجلس معاملہ پر از سر نو غور کریں۔ مجلس جو تمام مسلم جماعتوں میں اشتراک عمل کا پلیٹ فارم بننے کے عنوان سے قائم ہوئی تھی، اس کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہوگا کہ کوئی جماعت اسے حریف کی نظر سے دیکھے، جیسا کہ جمعیۃ کی طرف سے یہ صورت پیدا ہو چکی ہے اب یا تو مجلس اپنے بنیادی تخیل میں ترمیم کر کے اسے محض اپنی موجودہ محدود حیثیت کے مطابق بنانے پر اکتفا کرے۔ یا بالکل کسی نئے تخیل پر اسکی از سر نو تنظیم کی جائے۔ یہ تخیل کیا ہو؟ یقیناً یہ مسئلہ بہت قابل غور ہے۔ مگر دونوں میں سے ایک بات بہرحال ہونا ضروری ہے۔

حضرت شاہ ابوالرضا محمد فاروقی دہلوی رح

حالات ـــ ملفوظات ـــ مکتوبات

(از ـــــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

پچھلے دنوں مجھے مکتوباتِ شاہ ابوالرضا محمد کا ایک قلمی نسخہ برائے مطالعہ دستیاب ہوا ـــ اس مجموعہ میں ۱۴۵ مکتوبات ہیں ـــ ان میں سے اکثر مکتوبات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میرا اولاً ارادہ تو یہ تھا کہ ان مکتوبات پر ہی ایک مقالہ لکھوں، بعدہٗ مناسب یہ معلوم ہوا کہ پہلے حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے حالات لکھوں ـــ حالات کے بیان کرنے میں اختصار کا لحاظ رکھنے کے باوجود اتنے صفحات ہو گئے جتنے صفحات میں مکتوبات پر تبصرہ کرنے کا قصد تھا ـــ اچھا ہوا کہ اس بہانے اس عظیم شخصیت کے ذکرِ خیر کی سعادت نصیب ہو گئی جس نے میدانِ تسلیم و رضا میں گامزن ہو کر اور راہِ فقر و درویشی اختیار کر کے ایک مثالی نمونہ قائم کیا۔ جس نے اپنے نفسِ گرم سے محفلِ فقر اور بزمِ تصوف کو گرما دیا، جس نے اپنی تمام عمر، توکل و استقامت کے ساتھ ساتھ اتباعِ سنت میں گزار دی جس نے دہلی اور اطرافِ دہلی کے تشنگانِ معرفت کو مسجد فیروز شاہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر سیراب کیا ـــ سچ پوچھئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی بزرگانہ روایات اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر بالواسطہ اس ذاتِ ستودہ صفات کے فیوض و برکات کا نمایاں اثر پڑا اور ان دونوں شخصیتوں کی تعمیر میں اس درویشِ حق آگاہ کی سیرت کو بھی بہت کچھ دخل ہے ـــ میں نے یہ حالات انفاس العارفین، نزہۃ الخواطر جلد (۷) حیاتِ ولی اور مقاماتِ اولیاء دہلی سے اخذ کر کے

ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔

حضرت شاہ ابوالرضا محمد دہلویؒ، حضرت شیخ وجیہ الدین فاروقی شہیدؒ کے صاحبزادے اور حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے برادر کلاں تھے۔ آپ غالباً ۱۰۴۵ھ یا ۱۰۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ایک مستقل رسالہ شوارق المعرفۃ اپنے عم بزرگوار کے حالات میں لکھا ہے جو باریک قلم سے ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور انفاس العارفین میں شامل ہے۔ اس میں حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کے حالات، ملفوظات، کرامات، کچھ مکتوبات اور بعض مسودات درج ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے عم محترم کا زمانہ نہیں پایا، اس لیے کہ وہ آپ کی پیدائش سے بارہ سال پہلے اس عالم فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے عم مکرم کے سوانح و ملفوظات لکھنے سے پہلے تصریح فرما دی ہے کہ مجھے یہ واقعات ایک دو واسطوں سے پہونچے ہیں، چنانچہ شوارق المعرفۃ کو اس عنوان سے شروع فرمایا ہے۔

"قسم ثانی در احوال معارف مآب امام الطریقۃ والحقیقۃ ..... مخدومنا مولنا الشیخ ابوالرضا محمدؒ"

قسم اول میں اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے وہ احوال و ملفوظات تحریر فرمائے ہیں جن کو اکثر و بیشتر براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔

تعلیم شوارق المعرفۃ میں شیخ ابوالرضا محمدؒ کی تعلیم کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ہے۔ جس سے ان کے تمام اساتذہ اور تمام کتب درسیہ کا پتہ چلتا، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حافظ بصیر دہلویؒ سے (جو عہد شاہجہانی کے بڑے جید عالم تھے) اور حضرت خواجہ عبیداللہ عرف خواجہ خردؒ ابن حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے تعلیم حاصل کی۔

اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

"فی الحقیقۃ علوم ایشان ہمہ وہبیہ بودند" یعنی درحقیقت ان کے تمام علوم وہبی اور لدنی تھے۔

تجرید و توکل تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصے اپنے والد ماجد شیخ وجیہ الدین شہیدؒ کے حکم سے ایک امیر کبیر کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ وہاں آتے جاتے رہے۔ آخر کار تجرید تام اور توکل کلی کا غلبہ ہوا اور یہ ملازمت چھوڑ دی۔ بعد ازاں مسجد فیروز آباد کے ایک حجرے میں رہ کر پوری زندگی گزار دی۔

رفیقۂ حیات کی بے نظیر قربانی حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے شہرت و تواتر کے ساتھ یہ بات پہونچی ہے کہ عم بزرگوار نے جب راہ فقر کو اختیار کیا تو اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا کہ "اے رفیقۂ حیات ہم نے جس راستہ کو اختیار کیا ہے وہ ایک دشوار گزار راستہ ہے، یقیناً اس راہ میں جو تکالیف جھیلنی پڑیں گی وہ سخت جگر خراش اور جاں گسل ہوں گی۔ مگر ہم نے تو اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس راہ کو مصائب و تکالیف کی وجہ سے نہیں چھوڑیں گے ــــ اب تمہارا مسئلہ رہ جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ ہماری حالت فقر و درویشی کے باوجود، لذیذ غذاؤں اور عمدہ لباسوں سے قطع نظر کر کے اگر ہماری رفاقت منظور کرو تو بہتر، ورنہ تمہیں اختیار ہے"۔ اس نیک بخت دیندار اور وفا شعار بیوی نے یہ سن کر اپنے تمام زیورات اتار دیئے اور معمولی لباس پہن کر اپنے شوہر کی رفاقت کا عہد کیا۔

پیر و مرشد آپ نے راہ سلوک کو کس کی رہنمائی میں طے کیا؟ اور آپ کے پیر و مرشد کون تھے؟ اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان سے جو معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اویسی المشرب تھے، براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی فیوض حاصل کیے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ عم بزرگوار خود یہ بات فرمایا کرتے تھے کہ ایک درویش تھے جو حضرت شیخ تاج الدین سنبھلیؒ کے خلیفہ تھے اور حضرت خواجہ خردؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ان کے حالات بہت اونچے تھے، ایک دن حضرت خواجہ خردؒ نے اپنی ایک مجلس میں یہ فرمایا تھا کہ جو شخص طالب معرفت ہو اسے چاہیے کہ اس درویش سے تعلق بیعت پیدا کرے میں بھی اس مجلس میں موجود تھا جب میں نے یہ بات سنی تو میرے دل میں ان بزرگ سے

بیعت ہونے کا تقاضہ پیدا ہوا ــــ مگر میں نے ان سے بیعت نہیں کی۔

عسر کے بعد یسر جیسا کہ لکھا جا چکا مسجد فیروز آباد کے ایک تنگ حجرے میں آپ کی رہائش تھی۔ ابتدا میں اکثر ایسا ہوا کہ دو دو تین تین فاقے متواتر آئے۔ فاقوں کے بعد جو کی چند روٹیاں میسر آجاتیں تھیں اور کچھ چھاچھ نصیب ہو جاتی وہ روٹیاں محمد جان طحان اور دوسرے غریب معتقدین لے آتے تھے۔ ان روٹیوں کو آپ فقراء اور مستحقین پر مساوی تقسیم فرما دیتے اور بطور رسد رزق خود بھی کچھ تناول فرما لیتے تھے۔

کچھ عرصے تک آپ کے گھر میں چولھا، ہنڈیا، چکی وغیرہ کچھ نہ تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ برکت تمام ظاہر فرمائی اور اپنے بندوں کے قلوب کو آپ کی طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ ایک وسیع حویلی آپ کے اہل و عیال کے لئے تعمیر کرائی گئی اور منجانب اللہ توسیع رزق کا انتظام بھی ہو گیا۔

استغناء اُمراء و سلاطین سے کنارہ کش رہتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عالمگیرؒ جیسے دیندار بادشاہ کو بھی باوجود اُن کی درخواست کے اپنی ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ غرضکہ اُمراء و رؤسا کی طرف اُن کو بالکل التفات نہ تھا ان کے ہدایا بھی بڑی مشکل سے قبول فرماتے تھے۔ البتہ مخلص غرباء کے معمولی ہدایا جلد شرف قبولیت حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ کفش دوزی کرنے والے اور آٹا پیسنے کی محنت کرنے والے یا اسی قسم کی محنت مزدوری کرنے والے غریبوں کے چار یا پانچ پیسے بھی بڑی خوشی سے قبول فرما لیتے تھے۔

سیرت و صورت حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر کے مطابق آپ قوی العلم، فصیح اللسان عظیم الورع، وسیع المعرفۃ اور نرم زبان بزرگ تھے ــ آپ کا قد لانبا، بدن بھرا ہوا تھا، رنگ میں سرخی و سپیدی کے ساتھ ایک قسم کی ملاحت بھی تھی۔ ڈاڑھی گنجان نہیں تھی۔ رخساروں پر گوشت اس قدر کم تھا کہ چہرے کی تمام رگیں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔

وعظ و درس آپ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ وعظ فرمایا کرتے تھے وعظ کا طریقہ یہ تھا کہ شروع میں تین حدیثیں زبانی پڑھتے تھے۔ خوب ٹھہر ٹھہر کر ــــ

اُن احادیث کے پڑھتے وقت مجلس و مجمع کی ہر جانب نگاہ رکھتے تھے، پھر ان حدیثوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ بعدہٗ اس زمانہ کی اردو میں بھی ترجمہ فرماتے تھے اور ان احادیث سے متعلق جو مناسب اور ضروری تشریحات ہوتی تھیں ان کو بھی بیان فرماتے تھے مگر اعتدال کے ساتھ۔ یعنی تشریحات میں نہ زیادہ طوالت ہوتی تھی اور نہ بہت زیادہ اختصار و ایجاز ہوتا تھا۔ (حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ تصریح نہیں فرمائی مگر قرینے کی دلالت سے گمان غالب یہ ہے کہ کل تقریر اردو ہی میں ہوتی ہوگی)

شروع شروع میں ہر علم کا درس دیتے تھے اور طالبانِ علوم حوق در حوق آپکی اعلیٰ استعداد اور خوبیٔ تقریر کی وجہ سے آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے تھے ــــ آخر میں فقط دو کتابوں کا درس دیتے تھے بیضاوی اور مشکوٰۃ المصابیح۔ باقی زیادہ وقت توجہ الی اللہ اور خاص مریدین سے معارف بیان کرنے میں گزرتا تھا ــــ وحدت وجود کے قائل تھے اور اس مضمون میں بقول حضرت شاہ صاحبؒ "تحقیق عظیم" رکھتے تھے ــــ اپنی مجالس میں صوفیائے کرام کی باریک باریک باتوں کی تشریح و وضاحت بھی فرمایا کرتے تھے۔

جذبۂ اتباع سنت غلبۂ عشق اور مسلک توحید وجودی کے ساتھ ساتھ اتباع سنت کا بھی انتہائی خیال رکھتے تھے ــــ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جب آپ مسجد میں داخل ہونے کا ارادہ کرتے مسجد کے باہر کھڑے ہو جاتے پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالتے اور دائیں جوتے پر بایاں پاؤں رکھ کر پھر دایاں پاؤں مسجد میں رکھتے تھے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ ان دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے جن سے یہ طریقہ ثابت ہوتا ہے ــــ ایک مقام پر حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں "حضرت ایشانؒ چنداں مقید بودند کہ ہیچ ادب و سنت از ایشاں ترک نمی شد الیٰ آخر العمر" یعنی آپ شریعت کے اتنے پابند تھے کہ آخر عمر تک کوئی مستحب عمل اور سنت طریقہ آپ سے ترک نہیں ہوا۔

غلبۂ ورع و احتیاط حضرت شاہ صاحبؒ، شیخ مظفر بہکیؒ کی زبانی بیان فرماتے

ہیں کہ اوائل میں جب میں رہتک سے حضرتؒ کی خدمت میں آتا تھا تو مصری کے کچھ کوزے ہدیے کے طور پر لے آتا تھا۔ حضرتؒ ان کو قبول نہیں فرماتے تھے صرف اس احتیاط کی بنا پر کہ دیہات وقصبات کے رؤسا کی بیع وشرا قانون شرعی کے مطابق نہیں ہوتی ـــــ اسکے بعد میں نے یہ کیا کہ یہ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا موقوف کر دیا، البتہ آپ کے بچوں کو مصری کے کوزے لاکر دے دیتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے حسب معمول بچوں کو کوزے دیئے بچے ان کوزوں کو لے کر آپ کی خدمت میں چلے گئے، آپ نے ان میں سے کچھ تناول فرمالیا، پھر ایک دن میری طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے تمھاری لائی ہوئی مصری کھالی تھی۔ اب ہم نے تورعات زائدہ سے دست کشی کر لی ہے آئندہ جو ظاہر شرع کا حکم ہوگا اسی پر عمل کریں گے۔

کرامات روشن ضمیری حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کی کرامات بڑی تفصیل سے لکھی ہیں اور روشن ضمیری کے بھی کئی واقعے بیان فرمائے ہیں۔ یہاں ان سب کا احاطہ مقصود نہیں، صرف ایک واقعہ اس سلسلے میں لکھا جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ عنایت اللہ نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک شخص ـــــ جو بڑا جید فاضل تھا اور مجادلہ ومناظرہ میں بھی پوری مہارت رکھتا تھا۔ (اور جس کی سکونت غالباً دہلی کے باہر کہیں کی تھی) ـــــ مجھ سے ایک دن کہنے لگا کہ میں نے شہر دہلی کے علماء وفضلاء کو آزما لیا، یہاں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس پر میں غالب نہ آیا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ کبھی تم مجلس شیخ ابوالرضا محمد میں بھی حاضر ہوئے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ میں نے سنا ہے کہ شیخ ابوالرضا محمد عوام کے سامنے تفسیر حسینی کا وعظ بیان کیا کرتے ہیں اور اس سے زیادہ ان کا مبلغ علم نہیں ہے۔ میں نے کہا ایسی بات نہ کہو ان سے ملاقات تو کر لو، چنانچہ وہ جمعہ کے دن مجلس وعظ میں آیا، وعظ کے بعد اس کے دل میں یہ آیا کہ ان سے مناظرہ کروں، حضرت نے اس وقت اس کی جانب ایک خاص توجہ فرمائی، اس توجہ کا ہونا تھا کہ اس کا عجیب حال ہو گیا، صرف ونحو کا کوئی قاعدہ تک اس کے حافظے میں نہ رہا دیگر علوم کا تو کیا ذکر ہے ـــــ اس نے جب اپنا یہ حال دیکھا تو ندامت کے ساتھ اظہار نیازمندی

کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا بھائی میں عالم نہیں ہوں میں تو صرف تفسیر حسینی کا وعظ عوام کے سامنے بیان کیا کرتا ہوں اس نے کہا کہ اب میں اپنے قول و اعتقاد سے توبہ کرتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہو جاؤں۔ حضرتؒ نے اس کو بیعت نہیں کیا اور یوں فرمایا کہ جن تختیوں پر نقوش قائم ہو جاتے ہیں پھر وہ کام میں نہیں آتی ہیں۔

ملفوظات آپکے بہت سے ملفوظات حضرت شاہ صاحبؒ نے نقل فرمائے ہیں جو آپ کی علمی و روحانی بلندی کو ظاہر کرتے ہیں ان میں سے چند ملفوظات یہاں لکھتا ہوں۔

(۱) فرمایا ـــــ سب سے اچھی ریاضت، کھانے پینے میں توسط و اعتدال اختیار کرنا ہے ـــــ دوام توجہ کے ساتھ ـــــ یہاں تک کہ دوام توجہ ملکہ بن جائے۔

(۲) فرمایا ـــــ جب حضوری کی کیفیت جاگزیں ہو جاتی ہے تو پھر وہ گفتگو کرنے یا اسی طرح کے مشاغل سے زائل نہیں ہوتی ہاں اگر علوم دقیقہ کی تعلیم و تعلم میں مشغول ہوگا تو ایک خفیف سا حجاب ضرور واقع ہو جائے گا۔

(۳) فرمایا ـــــ ایک عارف کو یہ بات نہ چاہیے کہ دوسرے عارف کے مرید کو اپنی طرف مائل کرے اور اس کی توجہ اپنے شیخ کی طرف سے پراگندہ کرے، وہ مرید خوشامد و اصرار کرے تب بھی اسکو اپنے شیخ کے سپرد کر دے۔ لیکن اگر اس کا شیخ وفات پا چکا ہو یا کہیں (دور دراز علاقے میں) چلا گیا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۴) فرمایا ـــــ کہ ائمہ اہل بیت کی طرف سے اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی انکار اور رد ثابت نہیں ہے، یہ بات (کہ اہل بیتؓ نے صحابہؓ کا انکار کیا ہے) محض (بدعقیدہ) لوگوں کا) افترا ہے۔

(۵) فرمایا ـــــ نجات، تقلید انبیاء علیہم السلام میں مضمر ہے۔ انبیاءؑ کی تقلید عقائد کے اندر بغیر زیادت و نقصان کے ہونی چاہیے ـــــ جیسا کہ قدماء اہل سنت کا مذہب ہے ـــــ ہاں اگر کوئی کسی صاحب کشف سے فیض پائے ہوئے ہو اور وہ ان عقائد کی تفصیل و تحقیق کر کے دوسروں کو آگاہ کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۶) فرمایا ــــ اگر کسی کو امرِ منکر کا مرتکب دیکھو تو جان لو کہ یہ بھی ارادۂ الٰہی کے بغیر نہیں ہے۔ ــــ لیکن اُس شخص کو نصیحت و تذکیر بھی ضرور کرنی چاہیے۔ فانّ الذکریٰ تنفع المومنین اس لیے کہ نصیحت و تذکیر مومنین کو نفع پہونچاتی ہے۔ اب چاہے سو میں سے ایک کو نفع پہونچے ــــ بالکل ایسا سمجھو کہ کسی کی کنیز کھو جائے اور وہ ہر کوچہ و بازار میں آواز لگائے ــــ اگرچہ کنیز کسی ایک جگہ موجود ہو اور اس کی خبر بھی ہزاروں سننے والوں میں سے کوئی ایک ہی لائے

(۷) فرمایا ــــ ایک فاضل نے ایک صوفی سے دریافت کیا کہ صوفیاء اتنی ریاضات اور اتنے مجاہدات کیوں کرتے ہیں؟ صوفی نے جواب دیا کہ اگر تجھ سے کہا جائے کہ اتنی محنت کرے گا تو تجھے سلطنت مل جائے گی یا بادشاہ تیرے پاس آئے گا ــــ پھر تو محنت و مجاہدہ کرے گا یا نہیں؟ فاضل نے کہا کہ ایسی صورت میں تو ہر کوئی محنت و مجاہدہ کرے گا۔ صوفی نے کہا کہ بسبب ریاضات و مجاہدات حضرت حق باعظمت الوہیت خانۂ قلوب صوفیاء میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں، پھر وہ ریاضات و مجاہدات کیوں نہ کریں؟ ــــ

(۸) اذا تحیّرتم فی الامورِ فاستعینوا باصحاب القبور۔ (یعنی جب تم امورِ دنیا میں متحیر و پریشان ہو جاؤ تو اصحاب قبور سے استعانت کرو) اس مقولے کے بارے میں فرمایا کہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ احوال موتیٰ کو یاد کرنا اور اُن سے عبرت حاصل کرنا ــــ امورِ دنیا سے توجہ کو ہٹا دیتا ہے اور فکرِ معاش کو مضمحل کر دیتا ہے (لہذا قبر کا دھیان فکرِ دنیا کو کمزور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے) ــــ

(۹) فرمایا ــــ لوگوں کے اولیاء سے انکار کا ایک بڑا سبب شرکتِ مکان ہے کہ ایک محلے میں یا ایک شہر میں سکونت رکھتے ہوں اور شرکتِ زمان بھی ایک سبب ہے کہ ہمعصر و معاصر ہوں ــــ اور شرکتِ نسبت بھی ایک سبب ہے کہ وہ ولی عزیزوں میں سے ہو ــــ عوام اکثر اُس شخص کے معتقد ہوتے ہیں جو خدام بہت رکھتا ہو اور عبادت بھی بہت کرتا ہو اگرچہ وہ عبادت ریا و عُجب کے ساتھ ہو۔

(۱۰) فرمایا ــــ علم الیقین ــــ دھواں دیکھ کر آگ کے وجود پر استدلال کرنا ہے۔

عین الیقین براہ راست آگ کو دیکھنا ہے۔ اور حق الیقین اپنے اندر آگ کا علم ہونا ہے۔ مشاہدہ، عین الیقین میں ہوتا ہے اور وصول و شہود، حق الیقین میں ——

تالیفات علاوہ مجموعہ مکتوبات کے آپ کا ایک رسالہ ہے جس کا نام اصول الولایۃ لاھل العنایۃ ۔ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ احقر کے مطالعہ سے گزرا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے انفاس العارفین میں اس رسالے کے بھی کچھ اقتباسات درج فرمائے ہیں۔

وفات حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ مظفر رہتکی ذکر کرتے تھے کہ حضرت ایشانؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہوگی۔ جب حضرتؒ کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہوگئی تو مجھے برابر آپ کی وفات کا اندیشہ لگا رہا۔ جب آپ کی عمر پچپن سال کی ہوگئی تو مجھے ایک تقریب میں شرکت کے لیے رہتک جانا ہوگیا۔ چلتے وقت میں نے ہمت کر کے اپنا اندیشہ ظاہر کیا اور اس سلسلے میں استفسار کیا۔ حضرتؒ نے تبسم فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تم کو وطن جانا چاہیئے۔ اس فکر میں مت پڑو۔ میں رہتک چلا گیا، میرے پیچھے حضرت کا انتقال ہوا۔ جب رہتک سے واپس آیا تو شاہ سعداللہ گلشن دہلویؒ نے (جو حضرت شیخ عبدالاحدؒ کے مشہور خلیفہ اور ہندوستان کے معروف شاعر ہیں) مجھے حضرتؒ کے اواخر ایام حیات کا ایک واقعہ سنایا جس میں حضرت شیخ عبدالاحدؒ نبیرہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا وفات سے کچھ دن پہلے ملاقات کے لیے تشریف لانا اور دیگر تمام باتیں تفصیل سے بیان کیں[1]

پیر بھائیوں نے اس طرح بیان کیا کہ حضرت چند روز پیشتر کچھ کسل اور کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ دو ایک دن پیشتر سے کھانے کی طرف بالکل رغبت نہیں رہی تھی، نیز چیزوں سے پہلے سے بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی۔ کسی چیز کی طرف التفات نہیں فرماتے تھے۔ وفات کے دن جب، نماز عصر کے لیے مسجد میں جانا چاہتے تھے تو اہل خانہ سے ملنے گئے اور

---

[1] شوارق المعرفۃ (مندرجہ انفاس العارفین) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ابوالرضا محمدؒ کی اہلیہ محترمہ حضرت شیخ عبدالاحدؒ کی قریبی رشتے دار تھیں۔

وہاں سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے کہیں سفر پر جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ نماز عصر پڑھنے کے بعد مقامات حضرت خواجہ نقشبند کو مطالعے کے لیے طلب کیا۔ ایک مرید نے اُس وقت حضرت کے سامنے (تھالی میں) پان پیش کئے۔ ایک دو پان اس میں سے لے کر کھائے۔ پھر خنداں و شاداں اپنے تکیہ سے ٹیک لگائی بس اتنی ہی دیر میں دیکھتے دیکھتے آپ کی روح مائل پرواز ہو گئی ——

نزع کے عالم میں اپنے بھائی سیدنا حضرت شیخ عبدالرحیمؒ کی طرف اشارہ کیا کہ ان کو بلاؤ۔ کچھ لوگ ان کو بلانے کے لیے کھڑے ہو گئے اور کچھ لوگ یہ گمان کر کے کہ آپ پر غشی طاری ہو گئی آپ کو اُٹھا کر گھر تک لائے اس وقت حضرت شیخ عبدالرحیمؒ آ گئے۔ دریافت فرمایا کیا بات ہے؟ جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ رُوح مبارک پرواز کر چکی ہے —— یہ واقعہ ۱۷ محرم الحرام ۱۱۰۱ھ[1] کا ہے۔

مزار مزارات اولیاء دہلی میں ہے کہ آپ کا مزار بی بی فاطمہؒ کے مزار سے آگے جو نو محلہ کو راستہ جاتا ہے وہاں ہے اور بی بی فاطمہؒ کا مزار قلعہ کہنہ کے سامنے سڑک سے دائیں طرف جو مسجد و مدرسہ سنگ سُرخ سے بنا ہوا ہے اُس کے برابر سے کچے راستے جا کر تھوڑی دور گنجان درختوں میں ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ (مزارات اولیاء دہلی صفحہ ۲۲ و ۲۳)

اولاد ملفوظات کے ضمن میں شیخ مظفر وہتکیؒ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کئی صاحبزادے تھے۔ مگر نام صرف ایک صاحبزادے شیخ محمد فخر العالم کا ملتا ہے جو سب سے بڑے تھے اور جنھوں نے اپنے والد ماجد کے مکتوبات کو جمع کیا ہے ——

—— (باقی)

---

[1] انفاس العارفین ہی میں ہے کہ بعض مریدین نے آپ کی تاریخ وفات، آفتاب حقیقت —— سے نکالی ہے۔ مگر اس مادے سے ۱۱۰۱ھ برآمد ہوتے ہیں —— واللہ اعلم بالصواب

دربارِ عالمگیری

(از جناب ڈاکٹر سید مصطفےٰ حسن علوی ایم اے (پی ایچ ڈی)

(۵)

ملا عبدالسلام دیوی مذبور الذکر کو تلمذ اپنے والد بزرگوار سے بھی تھا اور دربارِ عالمگیری سے الحاق کے قبل دربار شاہجہانی سے ان کے تعلقات رہے ہیں، اور وہی زمانہ تھا کہ جب غالباً منار وغیرہ کی شرح کے قبل یا اس کے ہی دوران میں افضل الدین خاقانی شروانی کی کتاب تحفۃ العراقین کی شرح لکھی تھی، اسی میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد وجہ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے نام سے پہلے

خوشہ چین خرمن دانائی عبدالسلام و شیخ کبیر

لکھنے کے بعد یوں رقمطراز ہوئے ہیں کہ بعضے

دوستان و یاران ارجمند

کے پیہم اصرار سے

دریں اوان فرخندہ زمان سعید کہ ہزار و پنجاہ و ہفت ہجری است موافق سنہ جلوس بست میمنت مانوس سلطان سلاطین جہان خاقان خواقین قطب سپہر سلطنت آفتاب آسمان خلافت شہنشاہ دیں پناہ شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ در مدت پانزدہ روز از مکمن بطون بمعرض ظہور جلوہ داد۔

تھے تو عالم بڑے پائے کے اور ان کی موت "موت العالم موت العالم" کی مصداق بنی ہوگی لیکن تذکرہ نویسوں نے سنہ وفات کہیں لکھا نہیں، مآثر الکرام میں علامہ سید غلام علی بلگرامی نے بس صرف یہ لکھ دیا کہ دیوی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، لاہور تشریف لے گئے تو اپنے ہم نام ملا عبدالسلام لاہوری سے علمی استفادے کیے اس کے بعد بہ عہد شاہجہانی

چندے بہ منصب افتا عسکر نامور گردید

عہد عالمگیری سے اتصال اور مشاغل کا تذکرہ نہیں کیا۔

شیخ عظمت اللہ کاکوروی

ملا عظمت اللہ ان کے والد ملا عزیز اللہ یہ قصبہ کاکوری مضافات لکھنؤ کے رہنے والے تھے، ان کو دربار عالمگیری میں خاص تقرب حاصل رہا، یہ اپنے عہد کے ممتاز علما میں شمار ہوتے رہے۔ خداداد ذہانت اور قوت حافظہ میں ان کی نظیر کم ہی تھی، علوم دینیہ اور خاص کر فقہ اور جزئیات فقہ میں ایسے حاوی تھے کہ عالمگیر نے اپنی بیٹی زیب النساء کو فقہ کی تعلیم انھیں سے دلائی۔ کتاب چشمہ فیض میں منشی فیض بخش ان کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

ملا عظمت اللہ کہ فضیلت برجستہ می داشت نواب زیب النساء بیگم بنت عالمگیر را مسائل فقہی تعلیم می فرمود ایں حویلی موسومہ بہ پرانی حویلی کہ سابق از خشت پختہ بود جانی خان در عہد آصف الدولہ خشتہائے آں را بردہ بعد ازاں شیخ طفیل علی آنرا خام درست کردند و بلا شرکت در تصرف فرزندان شیخ غلام نبی مرحوم ست احداث کردۂ ملا عظمت اللہ بود۔

اس کے علاوہ جواہر الانشا میں شیخ غلام مرتضیٰ کے ان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:۔

" ملا عظمت اللہ توسل از سرکار زیب النساء صبیۂ عالمگیر بادشاہ گرفتہ بود نواب محمد یار خاں پسر بہمن یار کہ از عظماء دربار شاہی بود بس شفقتہا و عطوفت بملا مرحوم می کرد چنانچہ خدمت فوج داری و امانت سرکار خیر آباد و معاملات دیگر تو جہاتش بنام پسر شان جاراللہ مقرر و معوض گشت"۔

ملا جار اللہ

ان کی تعلیم و تربیت علاوہ دیگر سرآمد روزگار علما و فضلا کے اپنے والد بزرگوار ملا عظمت اللہ استاد زیب النساء دختر عالمگیر سے ہوئی اور ان کی نشو و نما شاہان دہلی کی درباری فضاؤں کی منت کش ہے، قسمت کے بڑے یاور تھے سن رشد ہی سے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انھیں منتظم الملک کا خطاب عالمگیر نے دیا اور شاہی مصالح کی دیکھ بھال کے صلہ میں ہفت ہزاری کے منصب پر فائز رہے، ان کو ترخانی پوزیشن بھی حاصل ہوئی اور اس پوزیشن کی بدولت یہ مختلف ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے اور انھیں خلعت اور طرح طرح کے انعام اور ایک وافر سالانہ رقم برابر خزانۂ شاہی سے ملتی رہی "ترخان" قدیم ترکوں کا ایک اعزازی لقب تھا۔ ترکو کے لفظی معنی امان نامہ یا سند امارت کے تھے[1] یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عالمگیر اپنے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف خطابات دینے میں بہت ہی سخت اور محتاط تھا اور چھان بین کی جائے تو پتہ چل سکتا ہے کہ اس کے زمانے میں سوائے غیر معمولی خدمات والوں کے دوسروں کے لیے یہ عنایتیں خال خال ہی ہوئی ہیں لیکن ملا جار اللہ کی رفعت شان کی یہ ایک دلیل ہے کہ ان کو سب طرح کے خطابات و انعامات سے نوازا گیا، کشف المتواری میں میر شاہ تراب علی لکھتے ہیں:-

"شیخ جار اللہ منصب دار بادشاہی و رسالہ دار صاحب فیل و سوار شدند۔ و زیادہ تر از پدر خود صاحب اقتدار و نامدار شدند"۔

انھیں جاگیر میں قصبۂ مہونہ ملا تھا اور وہاں ہی جار اللہ نگر نام سے ایک بستی بسائی تھی جب چلتے اور سفر کرتے تھے تو توپوں کی سلامی دی جاتی اور ایک بڑی تعداد خدم و حشم کی ہوتی تھی، چنانچہ "چشمۂ فیض" میں منشی فیض بخش کا بیان ان کے متعلق یہ ہے۔

قصبۂ مہونہ کہ متصل باڑی ست در جاگیر او بود..... حالا ویران ست..... چہار

---

[1] تاریخ تجارا دیمیری

زنجیر فیل و چہار ضرب توپ باخود می داشت و دہ ہزار سوار و پیادہ ملازم رکاب او بودند ..... افاغنۂ ملیح آباد..... کہ نواب می گویانیدند و افاغنۂ روسا رام نگر و عالم نگر ہمیشہ رفیق و نوکر او بودند۔

اثاث البیت کی وہ فراوانی تھی کہ اپنے گھر پر اس کے رکھنے کی گنجائش نہ پاکے دوسری حویلی تعمیر کرائی۔

چوں در حویلی گنجائش خود و سامان خویش نیافت حویلی دیگر در مقابل آں معہ برج ارجمند و اندرون آں حویلی و دیوان خانۂ وسیع و رفیع مشتمل بر امکنۂ متعددہ و دروازۂ بزرگ کہ فیل باعماری در آید و بالائے آں بارہ دری خوبصورت خوش ترکیب و پائین آں طویلہ اسپان و بیرون آں جلو خانہ و بازار بادو کا نہائے پختہ بکمال استحکام بنا نہادہ۔

یہ بڑے صاحب دل مخیر اور فیاض تھے جواہر الانشا میں منشی غلام مرتضیٰ سے ان کی فیاضی پر یہ ریمارک ہیں۔

شیخ فیاضے بود کہ باخویشان و اقارب علی قدر مراتب سلوک و مراعات می نمود اسپان و زرہا بر قوم و مردم برادری تقسیم می نمود..... و مردم برادرانش از کوچک و بزرگ محروم نگذاشت..... مردم بفیاضیش منصبہا برداشتند و خوش زندگانی کردند۔

اس صاحب حشمت شخصیت اور اس ذات پر شکوہ کی یاد چند زبانوں پر ہے یا چند صحیفوں میں، اس کے علاوہ ان کے بنا کردہ قلعہ کے کچھ حصے بارہ دری محل اور ایک مسجد سے باقی ہے، باقی رہے نام اللہ کا۔ اس کے علاوہ ایک قبر دلی جس کے دستہ پر جواہرات جڑے ہیں اور میان پر اعلیٰ قسم کی میناکاری موجود ہے۔ ان کی قبر قصبۂ کاکوری کے تکیہ بے نواشاہ میں اسپتال کی عمارت کے مضافات میں اب تک ہے اور زبان حال سے اپنی ویرانی کا مرثیہ پڑھ رہی ہے اور گویا گزرنے والوں سے کہہ رہی ہے ؎

فاتحہ پڑھتے چلیں تربت ترخاں پہ ذرا ان سے عقدہ بھی ہو فرصت بھی ہو دستور بھی ہو

لیکن بایں ہمہ لوگ پاس سے گزرتے ہیں اور کسی کو توفیق نہیں ہوتی، یہی شخصیت وہ شخصیت تھی کہ بقول صاحب جواہر الانشا۔

"در عہد عالمگیر بادشاہ ہیچ کار بے ضابطہ از خطاب وسواری فیل و پالکی جھالردار وعطائے سرپیچ مرصع نمی شد واحدے را مجال دیارائے نہ کہ از مرکز اعتدال و مرتبہ خود پا بیروں گذارد وکارے خلاف ضابطہ نماید لیکن شیخ (جیارالله) از حضور بادشاہ بہ منصب وجاگیر سرفرازی می داشت وعطائے پالکی جھالردار وسرپیچ مرصع شدہ ماموریہ سواری فیل بود وہم ہفت ہزار سوار و پیادہ بدستخط خود نوکر گرفتہ عمل محالات متعلقہ می نمود وسامان کاری داد

مولوی حکیم عبداللہ

عہد عالمگیر کی نامور شخصیتوں میں سے ہوئے ہیں، دربار سے تعلق بھی ان کا رہا انھوں نے عمر سو سال سے بھی زائد پائی اور عالمگیر کے بعد کے دربار بھی انھوں نے دیکھے کہتے ہیں کہ ان کے مزار پر پانی چھڑک کے دعائیں لوگ لیتے اور باران رحمت کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو بارش ہو جاتی۔ ان کا مزار قصبہ کاکوری کے ایک محلہ ولی نگر میں ہے۔ اہل قصبہ ان کے دوران قیام وطن میں آئے اور ان کے ملفوظات سے مستفید ہوتے یہی جواہر الانشا کے مصنف جن کا ذکر صفحات ماقبل میں ہوا ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہوئے ہیں۔ فن طب میں کمال رکھتے اور ریاضی میں شہرہ آفاق انھیں حاصل ہوا، بڑے بڑے امراء اور نواب زادے مزمن اور مہلک بیماریوں میں ان کا علاج کر کے فائدے اٹھاتے اور انھیں جاگیروں سے نوازتے، یہ اکیس سال محض علم طب کے حصول میں وطن سے باہر رہے اور جب وطن اس مدت مدید کے بعد آئے تو اعزہ واقربا کو ان کی شناخت کرنے میں دشواری ہوئی، ان کی فراست اور رسائی دماغ کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص ان کے سامنے سے گزرا جو بظاہر اچھا خاصا تھا آپ پاس والوں سے اس کو دیکھ کے کہنے لگے کہ آپ لوگ اس متحرک مردے کو دیکھ لیں اس میں قوت اور سکت نہیں مگر چل پھر رہا ہے، اس کے مرنے کے دن قریب ہی ہیں، چنانچہ ایسا ہوا کہ ایک ہی ہفتہ میں

مرض کا بحران ہوا اور وہ چل بسا، اکثر تشخیص مرض کے لیے نبض اور قارورہ بھی نہ دیکھتے اور صورت دیکھ کے مرض کو تاڑ لیتے۔ ان کا بیشتر وقت یاد الٰہی اور کتب حکمت کے مطالعہ میں گزرتا۔ ذات الجنب تپ دق اور اسہال کبدی کے بڑے بڑے پیچیدہ علاج کیے اور مریضوں کو شفا ہوئی، ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ خواہ کیسے ہی ذی ثروت لوگ ان کو علاج کے لیے گھر پر بلاتے مگر وہ کہیں نہ جاتے، ان کے تحفہ تحائف قبول کرنے سے بھی احتراز کرتے، بڑے قانع اور بڑے صابر و ضابط تھے۔ شروع شروع شیخ ثناء اللہ لکھنوی کی ہمراہی میں دلی گئے اور بعد چندے منصب دار شاہی ہو گئے۔ زمانہ طفولیت ان کا اپنے والد امجد کی نگرانی میں گزرا خوش نویسی کی مشق حاصل کی اور وقت کے بڑے بڑے خوش نویسوں پر فوقیت حاصل کر لی۔ فارسی پڑھی تو ایسی کہ اس میں ید طولیٰ انھیں حاصل ہو گیا۔ نیز نثر نویسی اور شعر گوئی میں انھیں پورا پورا امتیاز حاصل تھا ان کے اکثر معاصرین ان کی شاگردی کا دم بھرتے، دست کاری میں بھی امتیاز حاصل تھا۔ لوگ ان کی دست کاری کا لوہا مانتے۔ جب یہ سب کچھ حاصل کر چکے والد امجد کے حکم سے علوم عربیہ کی تحصیل میں لگ گئے۔ ابھی متوسطات تک پہونچے تھے کہ والد ماجد کا سایہ اٹھ گیا۔ انھیں کے مضافات میں کسی راجہ کے یہاں نوکری کر لی اور ۱۲ برس تک اس راجہ کی مصاحبت میں عیش و عشرت سے گزرا وقات کی۔ اتفاق سے راجہ علم موسیقی کا بڑا شائق تھا اس فن سے خود تو واقف تھا ہی اسکے دربار میں بڑے بڑے موسیقی کے ماہر جمع رہتے ان کی دیکھا دیکھی مولوی حکیم عبداللہ کو بھی شوق دامنگیر ہوا اور ۱۴ سو روپے جمع کر کے آلات موسیقی خریدے، خود نہایت ہی خوش گلو، خوش لحن اور خوش آواز تھے یہ اس کے بعد ہوا کہ ملازمت سے برداشتہ خاطر ہو کے گل سامان عیش اٹھا نہ اور گھوڑا بیچ ڈالا اور اس کو بیچ کے فن طب کی کتابیں خرید لیں کبھی کبھی اس عہد کے حکماء سے درس لیتے اور ادھر ادھر کچھ پڑھتے رہتے۔ عطاروں کی دوکانوں پر بیٹھ کے دواؤں کی ناپ تول اور دواؤں کی پہچان حاصل کرتے رہے اور کہتے ہیں کہ حکیم علوی خاں دہلوی سے انھوں نے رجوع کیا اور فن کے کامل بنے، جب علم طب سیکھنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ سے یہ عہد بھی کر لیا کہ للہ ہی دوا کروں گا۔ علوی خان نے انھیں بہت سے ذاتی تجربات بتائے، مطب میں ان سے نسخے لکھواتے اور کبھی کبھی فن طب کے علاوہ دوسرے فنون کے درس بھی دیتے۔ بعد حصول طب وطن آ کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور خلق اللہ کو طرح طرح کے فائدے پہونچاتے رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

مترجمہ
وحیدالدین خاں

لبرل اسلام

مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام پر جس نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس کے تعارف کے طور پر الفرقان، اپریل ۱۹۶۵ء میں ایک تحریر "لبرل اسلام" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ یہ دراصل مسٹر آصف فیضی کی کتاب[1] A MODERN APPROACH TO SLAM کا ایک حصہ تھا، ذیل میں اس کتاب کے چوتھے باب اسلام کی تعبیر نو (THE REINTERPRETATION OF ISLAM) کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

اسلام کا مطالعہ، ایک تاریخی منظر کی حیثیت سے، پچھلی دو صدیوں میں نہایت احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے، سولہ یا سترہ ملکوں میں اس کا پھیلاؤ اور اس کے پیرووں کی کثرت، مختلف اقتصادی، مذہبی اور نسلی قوتوں کا نتیجہ تھا۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چار سو ملین ہے۔ اب یہ عام طور پر مان لیا گیا ہے کہ اسلام نے ایک عظیم تہذیب پیدا کی۔ اور یہ کہ ادب، سائنس، فلسفہ، دینیات، تاریخ اور قانون کو ترقی دینے میں اس کے علماء کا اہم حصہ ہے۔ جمالیات کے میدان میں مسلمان تعمیرات کے اعتبار سے سب سے آگے تھے۔ اس کے آرٹسٹوں نے نقاشی اور موسیقی پر گہرا اثر ڈالا، اور دستکاری مثلاً برتن سازی، پچی کاری، خطاطی، جلد سازی، زردوزی، لباس سازی اور طباخی کے فنون کو ترقی دی۔ اور اب تاخیر کے بعد، علماء کے درمیان عام طور پر تسلیم کر لیا

---

[1] ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، ۱۹۶۳، صفحات ۱۲۷۔

گیا ہے کہ اسلام کا پھیلاؤ خون کے پیاسے اور آستین چڑھائے ہوئے عربوں کی تلوار کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ محمد ابن عبداللہ کی تعلیمات اور آپ کی شخصیت کا نتیجہ تھا جن کو ٹائن بی انسانیت کے عظیم محسنوں میں سے ایک شمار کرتا ہے۔[۵]

یہ ایک تازہ ترین خیال ہے۔ ورنہ قدیم یورپ میں محمدؐ کو مرگی زدہ، جعل ساز، تفرقہ انداز اور جھوٹا رسول سمجھا جاتا تھا اور کافرانہ بت پرستی کے موضوع (PAGAN IDOL) سے زیادہ آپ کی حیثیت نہیں تھی۔ رائے کی یہ تبدیلی اسلام اور اس کی زبانوں کے مطالعہ میں اضافہ کی وجہ سے ہے اور صداقت کے اس انکشاف کی وجہ سے ہے جو علمی تحقیق کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ "ایک جھوٹا رسول جو وحشیانہ قوت استعمال کرنے کا عادی تھا"۔۔۔ یہ تاریخ کی اہم ترین تہذیبی قوتوں میں سے ایک (اسلام) کی بالکل سادہ سی توجیہہ بن گئی تھی۔ گاندھی کے ظہور اور ہندوستان کی آزادی کے بعد ثابت ہوگیا کہ انسانی قوت کے مقابلہ میں تلوار ایک کمزور ہتھیار ہے۔ اس طرح علمی دنیا آہستہ آہستہ اسلام کو مطالعہ کا ایک قیمتی موضوع سمجھنے کی طرف آئی اور اب یہ ایک بدیہی مسلّمہ قرار پا چکا ہے کہ اسلام اور اس کی قوتوں کا فہم اس کے مذہب اور قانون کے گہرے مطالعہ کے بغیر ناممکن ہے۔ یورپی مستشرقین نے انیسویں صدی کے دوران میں اس اعتبار سے کافی کام کیا ہے۔ مگر ہمارے اوپر سب سے زیادہ احسان ڈچ مستشرق سی۔ اسناوک ہرگرونجی (C. SNOUCK HURGRONJI) کا ہے جو اسلامی فلسفۂ قانون کے مطالعہ کے جدید اسکول کا بانی ہے۔ اس کے بعد گولڈزیہر (GOLD-ZIHER) ون سنک (WENSINCK) برسٹراسر (BERSTRAESSER) نے اس کی پیروی کی۔ اور اب اس زمرہ میں سین ٹلانا (SANTILLANA) ملیٹ (MILLIOT) شاخت (SCHACHT) اور ٹائن (TYAN) کے نام ہیں۔[۵۸]

اسلام میں قانون (LAW) مذہب (RELIGION) سے الگ نہیں۔ دونوں دھارے ایک ہی نہر میں بہتے ہیں اور ناقابل امتیاز ہیں۔ ان کو شریعت اور فقہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ گویا اسلام کے مذہبی قانون کے دو پہلو ہیں۔ شریعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہے وہ اپنے حلقہ میں

---

[۵] CIVILIZATION ON TRIAL (LONDON 1953), 154

سارے انسانی اعمال کو لے لیتی ہے۔ فقہ نسبتاً محدود ہے اور اسی شعبہ سے بحث کرتی ہے جس کو عام طور پر قانونی اعمال (LEGAL ACTS) کہا جاتا ہے۔ شریعت ہمیشہ ہم کو الہام کی یاد دلاتی ہے۔ یعنی وہ علم جس کو ہم قرآن وحدیث کے سوا کہیں سے حاصل نہیں کر سکتے۔ فقہ میں عقلی قوتوں پر زور ہے اور علم نبوت سے استنباط کیا جاتا ہے۔ شریعت کا راستہ خدا اور اس کے رسول نے مقرر کر دیا ہے، فقہ کی عمارت انسانی کوششوں سے کھڑی ہوتی ہے۔ فقہ میں کوئی عمل قانونی ہوتا ہے یا غیر قانونی، ما یجوز و ما لا یجوز، جائز یا ناجائز۔ اور شریعت میں پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اعتبار سے عمل کے مختلف درجے ہیں۔ فقہ ایک اصطلاح ہے جو قانون کے لیے فنی مفہوم میں استعمال ہوتی ہے، اور شریعت راستبازی کا وہ قانون ہے جو براہ راست خدا نے مقرر کیا ہے۔ تاہم صفائی کے ساتھ یہ اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان امتیازی خط صاف طور پر کھینچا ہوا نہیں ہے اور مسلم علماء خود بھی اکثر اوقات دونوں اصطلاحوں کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ تمام انسانی اعمال کا معیار (CRITERION) خواہ وہ شریعت کے دائرے کا ہو یا فقہ کے دائرے کا، ایک ہی ہے ——— اور وہ ہے ایک معیاری ضابطہ کی پیروی کر کے خدا کی رضا حاصل کرنا ۔ ۸۶

مذہب کا دعویٰ ہے کہ خدا ایک ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں، جمہوریت کا اصرار ہے کہ اسٹیٹ ایک ہے اور اس کے قوانین سب پر یکساں حیثیت سے عائد ہوتے ہیں، قوانین غیر شخصی اور خارجی احکام (OBJECTIVE RULES) ہیں جن کو ریاست اپنے تمام شہریوں پر بلا استثنا نافذ کرتی ہے۔ مگر مذہب کی بنیاد عظیم معلمین کے شخصی تجربات پر ہے۔ اس کی اپیل شخصی، فوری اور وجدانی ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے احکام اور اس کے طور طریقے کسی گروہ میں عمومی حیثیت سے نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا اندرونی عقیدہ مخصوص طور پر شخصی ہے، کوئی ریاست مذہبی وفاداری کو اس طرح بالجبر نافذ نہیں کر سکتی جس طرح وہ اس کے قوانین کو نافذ کر سکتی ہے۔ مذہب اسلام ایک خدا اور اس کے پیغمبروں پر عقیدہ رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر اسلام ایسا نہیں کر سکتا اور نہ اسے کرنا چاہئے کہ وہ متعین کرے کہ کس طرح لوگوں کے اوپر اس عقیدے کی اطاعت کو بزور نافذ کیا جائے۔ بزور نافذ کرنے سے مراد (۱) ایک چیز

کے کرنے کا حکم دینا اور (۲) اس کی عدم تعمیل پر سزا دینا ہے، عقیدے کا ایک معاملہ کس طرح خارجی طاقت کے ذریعہ نفاذ کا معاملہ بن سکتا ہے۔ ایک معلم مجھے تعلیم دے سکتا ہے، وہ اپنے نمونہ سے مجھے متاثر کر سکتا ہے، وہ میرے جذبات کو بھڑکا سکتا ہے، مگر کس طرح ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنے عقیدے پر مجبور کر سکے۔ اس طرح ایک قانونی حکم جو بذریعہ ریاست نافذ کیا جا سکتا ہے اور ایمان وضمیر جو تمام تر ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے، دونوں کے درمیان کھلا ہوا فرق ہے۔ ۸۶

آج اسلام کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ شریعت، قانون اور مذہب دونوں پر مشتمل ہے۔ مذہب کی بنیاد روحانی تجربہ (SPIRITUAL EXPERIENCE) پر ہے۔ قانون کی بنیاد اجتماع کی خواہش ہے جو اسکی مقننہ کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو یا کسی ایسے حاکم کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہو جو قانون سازی کا مجاز ہو۔ مذہب اپنے اندرونی مغز کے اعتبار سے ناقابل تغیر ہے۔ یہ اندرونی مغز ہے خدا کی محبت خدا کے لیے جس کے ترانے تمام دنیا کے عارفوں اور صوفیوں نے گائے ہیں۔ اگر شریعت ان دونوں چیزوں کا نام ہے تو ہر ایک دوسرے کو برابر مخالف سمت میں کھینچتی رہیں گی۔ خدا کی معرفت ایک راز ہے اور انسان ہمیشہ اس کی تلاش میں رہے گا۔ اس تلاش میں ہر عقیدے کے لوگ بلا لحاظ مذہب برابر ہیں۔ مگر قوانین میں ملک ملک اور زمانے زمانے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے، ان کے لیے ناگزیر ہے کہ سماج کے بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ عربوں کے قوانین انگلستان پر منطبق نہیں کیے جا سکتے، آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے قوانین اتر پردیش کے زرخیز علاقے کے لیے غیر موزوں ہیں۔ قوانین وقت اور حالات کی کٹھالی میں دھات کی مانند ہیں۔ وہ پگھلتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ مختلف شکلوں میں منجمد ہوتے ہیں۔ وہ دوبارہ پگھلتے ہیں اور مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ ارتقار کا یہ طریقہ انسانی سماج سے ہم رشتہ ہے۔ کوئی بھی چیز ساکن نہیں ہے سوا اس کے جو مردہ اور خالی از حیات ہو۔ قوانین بھی ساکن نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان ہماری آنکھوں کے سامنے بقیہ دنیا کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ تبدیلیاں نتیجہ ہیں فطرت کے اوپر ہمارے کنٹرول کا، زندگی کے بارے میں ہمارے تصورات کا، اور ہماری اس خواہش کا

کہ ہم انسان کے سماجی حالات کو نہ دیں۔ ہماری مقننہ قوانین کا ایک سیلاب بہا رہی ہے اور قانون سازی کی یہ کوشش سماج کے اندر ہمارے عمل کو متعین کر رہی ہے۔ ۸۷

مگر انسان کا ذہن اور اس کا ضمیر آزاد ہیں۔ اس کو اجازت ہونی چاہیے کہ کائنات کی آخری حقیقتوں کے بارے میں جو عقیدہ چاہے رکھے۔ اس کے عقیدہ اور خیال کو بڑی نہیں پہنائی جا سکتی۔ اس طرح اسلام میں ایک اندرونی کشمکش جاری ہے۔ اولاً مذہبی قانون کے غیر فنا تصورات (AGELESS CONCEPTS) جدید تمدنی قانون سے ٹکرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بیمہ یا وہ قرضے جو حکومت جاری کرتی ہے۔ بیمہ اور سود کا لینا یا دینا شریعت کے اعتبار سے ممنوع ہے۔ جبکہ جدید ریاست (MODERN STATE) میں نہ صرف اس کی اجازت ہے بلکہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

ثانیاً۔ پرانے قانون کے تشدد کو ختم کرنے کے لیے اسلام کے قدیم قانون پر ایک نئے نظام کا قلم لگایا جا رہا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک نیا قانونی مجموعہ شریعت کی جگہ لے رہا ہے۔ اول الذکر کی ایک مثال ہندستان کا اسلامی قانون ہبہ (MUHAMMADAN LAW OF GIFTS) ہے جس میں انگلستان کا اصول مساوات فقہ (اصل اسلامی قانون) کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ موخر الذکر کی مثال ہندوستان کا قانون شہادت ہے جس نے اسلام کے قانون شہادت کو مکمل طور پر بدل دیا ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں یہ دہرا عمل جاری ہے۔ دنیوی قانون (SECULAR LAW) شریعت کے قانون کو ختم کر رہا ہے اور اس کی جگہ لیتا جا رہا ہے۔ شمالی افریقہ میں فرانسیسی اصول قانون، وسط ایشیا میں روسی قانون، ہندوستان میں انگلش کامن لا، انڈونیشیا میں ڈچ قانون، اور سب سے بڑھ کر بین الاقوامی قانون جو اتنا زیادہ متاثر ہوا ہے کہ نہ صرف قانون کا ظاہری ڈھانچہ بدل گیا ہے، بلکہ اس نے مسلمانوں کے تصور انصاف تک کو بدل دیا ہے۔

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شریعت قانون اور مذہب دونوں ہے، قانون عین اپنی فطرت کے اعتبار سے تبدیلی کو قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا مغز ناقابل تغیر ہے، یا کم از کم خدا کا عقیدہ غیر متبدل آدرش (UNALTERABLE IDEAL) ہے، ایک دوامی تلاش

(PERENNIAL QUEST) ہے۔[1] اگر اسی طرح کی دو مخالف قوتیں ایک ساتھ رکھی جائیں تو ان کے درمیان ٹکراؤ ہونا لازمی ہے۔ یہی وہ ٹکراؤ ہے جو اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔ میرا حل یہ ہے کہ:-

۱۔ مذہب اور قانون کی تشریح بیسویں صدی کی اصطلاحات میں کی جائے

۲۔ اسلام میں مذہب اور قانون کے درمیان فرق کیا جائے۔

۳۔ اس بنیاد پر اسلام کی تعبیر کی جائے اور اسلام کے عقیدے کو ایک نیا مفہوم دیا جائے۔

اگر اس تجزیہ سے بعض ایسے عناصر میں ترمیم واقع ہو جائے جن کو ہم روح اسلام کا جزو سمجھتے رہے ہیں یا انھیں بالکل چھوڑ دینا پڑے تو ہمیں حالات کے اس فیصلے کو قبول کرنا چاہیے۔ اگر اندرونی عقیدہ بچایا جا سکے اور اس کو طاقتور بنایا جا سکے تو اس قسم کا آپریشن، اگرچہ وہ کافی تکلیف دہ ہوگا، وہ ایک ایسے جسم کو صحت اور طاقت دے گا جو خون کی کمی کی وجہ سے سوکھ رہا ہے اور جس کی رہنمائی کے لیے کوئی تازہ آئیڈیل موجود نہیں۔ ۸۸

تعبیر نو کی ضرورت جب ہم مسلمانوں کے عقیدے کا جائزہ لیں تو ہم کو عام طور پر راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ کے درمیان فرق کرنا چاہیے۔ یہ کوئی علمی تقسیم نہیں ہے اور ہم کو اس مفروضہ پر نہیں چلنا چاہیئے کہ ایمان و ضمیر کے معاملات کی بالکل دو ٹوک طریقہ سے تقسیم ممکن ہے۔ لوگوں کے عقائد میں باریک باریک فرق ہیں۔ کوئی لاادریت کا قائل ہو اور کوئی بے اعتقادی میں مبتلا ہے۔ عقیدہ کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ریاضیاتی طرز کی تقسیم غلط نتیجہ تک پہونچائے گی۔ اس لیے ہماری عام اور لچک دار تقسیم یہ ہوگی:

۱۔ راسخ العقیدہ مسلمان۔

۲۔ غیر راسخ العقیدہ یا زیادہ بہتر الفاظ میں غیر مقلد (NON-CONFORMIST)

---

[1] پہلے مذہب کے قانونی احکام دور جدید کے لیے ناموزوں نظر آئے۔ پھر شعائر اور عبادات اور مناسک غیر ضروری روایات قرار دے کر فہرست سے خارج کر دیے گئے۔ اب عقیدہ رہ گیا تھا۔ اگر وہ بھی جدید تصورات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں کسی سنگین شکل میں باقی نہیں رہا بلکہ محض ایک مجہول آئیڈیل بن کر رہ گیا جس کی تلاش میں انسان ہمیشہ سرگرداں رہے گا اور شاید کبھی پا نہ سکے گا۔ وحید الدین

راسخ العقیدہ سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو اسلام کے باضابطہ عبادتی رسوم (REGULAR RITUAL) میں اعتقاد رکھتے ہوں، خواہ اس کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں اور وہ اب بھی اس پر مطمئن ہوں کہ بحیثیت مجموعی مذہب کا جو ڈھانچہ ائمہ نے مقرر کیا ہے، وہی اصل مذہب ہے اور عبادت کی جو رسوم ہیں وہ آج کے مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہیں اور اس میں کسی قسم کی انقلابی تبدیلی خطرناک ہوگی۔

یہ ناممکن ہے اور شائد نامناسب بھی کہ ہم اس گروہ کی مزید تفصیلات میں جائیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ سنجیدگی کے ساتھ مخصوص عبادتی رسوم پر عقیدہ رکھتے ہیں اور بڑے پیمانے پر اس کے اوپر عمل کر رہے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ اگر وہ بعض احکام شریعت پر عمل نہ بھی کر پاتے ہوں تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی غفلت ہے اور یہ ان کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ عبادتی رسوم کے قدیم ڈھانچہ کو پوری طرح برقرار رکھیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو عبادتی رسوم میں بہت معیاری ہیں مگر عقیدہ اور کردار میں کمزور ہیں۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جو کردار میں پختہ ہیں مگر عبادتی رسوم میں پیچھے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو خدا پر اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر زبردست اعتقاد رکھتے ہیں، ان میں کچھ ایسے ہیں جو زندگی کے دھارے کے ساتھ بہہ رہے ہیں، قسمت کی طرف سے بے فکر ہیں، ضمیر کی خلش سے آزاد ہیں۔ مگر بچوں کے سے عقیدے سے ان کا دماغ پُر ہے۔ یہ سب اور دوسرے وہ لوگ جو اسلام پر اس کے قدیم ڈھانچہ اور عقیدہ کے مطابق ایمان رکھتے ہیں، وہ ہماری تقسیم کے مطابق "راسخ العقیدہ" مسلمان ہیں، خواہ عقیدہ، کردار اور عمل کے اعتبار سے وہ کتنے ہی مختلف ہوں اور خواہ وہ عقائد کی پوری فہرست کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ ۸۹

غیر مقلد (NON-CONFORMISTS)، یا اگر آپ چاہیں تو ان کو غیر راسخ العقیدہ (UNORTHODOX) کہہ لیجئے۔ وہ بنیادی طور پر پہلے گروہ سے مختلف ہیں۔ غیر راسخ العقیدہ کی اصطلاح کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ سچ پوچھئے تو اسلام میں راسخ العقیدہ اور غیر راسخ العقیدہ کی اصطلاح سرے سے نہیں ہے۔ صرف ایک منظم چرچ ہی راسخ العقیدہ، غیر راسخ العقیدہ اور بدعتی کے معیار مقرر کر سکتا ہے۔ اگر چرچ نہ ہو تو کسی شخص کے بارے میں یہ تصور کرنا ہی مشکل ہوگا کہ فلاں شخص بدعتی ہے اور فلاں راسخ العقیدہ ہے۔ مگر مدعا کی وضاحت کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیر مقلد وہ ہے جو اسلام کے باضابطہ عبادتی رسوم (نماز وغیرہ) پر عقیدہ نہیں رکھتا

اور ائمہ کی مقرر کی ہوئی بنیاد کو قبول نہیں کرتا۔ ایمان کی معیاری تعریف یہ ہے :-

۱۔ زبان سے اقرار۔

۲۔ عقیدے کی سچائی (SINCERITY OF BELIEF)

۳۔ اصول اسلام کے مطابق عمل (جیسا کہ شارع نے مقرر کیا ہو)

غیر مقلد[1] پہلی چیز کو چھوڑ کر مشکل ہی سے کسی اور پر پورے معنی میں عمل کرتا ہے۔ عقیدہ کا مخلصانہ اقرار اسلام کی واحد کسوٹی ہے۔ عقیدہ، بعض معاملات میں غلط فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ جیسے اسلام کے عبادتی رسوم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ناقابل قبول ہیں۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو غیر مقلدیت پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ نظریاتی طور پر متفق ہوں مگر عمل نہ کرتے ہوں جب بھی آپ راسخ العقیدہ ہیں۔ البتہ اگر آپ بعض عقائد یا اصول کا انکار کرتے ہوں۔ سوا خدا و رسول کے عقیدہ کے، تب آپ غیر مقلد ہیں۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک اچھا خاصا تناسب اسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو ائمہ کو سند تسلیم نہیں کرتے، کچھ نماز کو ضروری نہیں سمجھتے۔ کچھ ایسے ہیں جن کا اعتقاد ہے کہ عمل ہی عبادت ہے (WORK IS PRAYER) کچھ ایسے بھی ہیں جو خود مذہب کے خلاف بحث کرتے ہیں مگر جانچ کا اصلی معیار پھر بھی باقی رہتا ہے ـــــ کیا آپ اس اسلام کو جسے ائمہ نے مرتب کیا ہے، بحیثیت مجموعی اور عام طور پر ساری انسانیت کے لیے مفید اور صحیح سمجھتے ہیں۔ ۹۰

میرا عاجزانہ جواب، اسلام کی صداقت کو مانتے ہوئے اور اس کا احترام کرتے ہوئے، نفی میں ہے اور اس لیے میں ایک غیر مقلد ہوں (NON-CONFORMIST) ہوں۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں مذہب کا منکر (NON-BLIEVER) نہیں ہوں، منکر وہ شخص ہے جو بذات خود مذہبیت کی واقعیت یا اسلام کا انکار کرے یا کم از کم مذہبی عقائد کے بعض بنیادی اصولوں کو چیلنج کرے۔ ایک غیر مقلد مذہب کے بعض اعمال یا

---

[1] غیر مقلد کا لفظ یہاں اس مفہوم میں نہیں ہے جس مفہوم میں وہ مذہبی حلقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ مصنف کے اپنے مفہوم میں ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔

تصورات پر معترض ہو سکتا ہے یا اس کا انکار کر سکتا ہے، مگر پھر بھی وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی شخص ہوگا۔ وہ مذہب میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے نہ کہ روایتی تصورات کے مطابق۔ تاریخی شہادتیں بتاتی ہیں کہ غیر مقلد اکثر بہت گہرے عقیدے کے لوگ رہے ہیں اور غیر مقلد وہ اسی لیے تھے کہ مذہب میں وہ غیر متزلزل عقیدہ رکھتے تھے، میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ عقائد کا موجودہ ڈھانچہ ہمارے لیے مفید ہے یا ہمارے آج کے دور میں بھی وہ اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ اپنے عقیدے کی از سر نو تشریح کروں۔ یہ میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں ایک نیا فرقہ بناؤں اور نہ میں کوئی مذہبی معلم ہوں۔ مگر اس تلاش اور اس مہم میں قطعیت کے ساتھ میں یقین رکھتا ہوں کہ اسلام جیسا کہ میں نے اسے سمجھا ہے، وہ بیسویں صدی کے انسان کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ میں اس مروجہ تشریح کو قبول نہیں کر سکتا جو سنی اماموں یا شیعہ مدارس فکر نے پیش کی ہیں۔ پیچیدہ تفصیلات، بے معنی عبادتی رسوم اور بے روح تصورات نے مجھے جمود میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذیل میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر اسلام کی آزادانہ تشریح (LIBERAL INTERPRETATION) کی ایک اسکیم پیش کروں۔

(باقی)

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

آپ

حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب (جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا نگرانی کے تابع لکھی گئی ہے) اپنے خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج اور زیارت کے متعلق بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں شوق و جذب اور ذوق و شوق کی وہ کیفیتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو در اصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ ..... قیمت مجلد ۲/۰/-

آسان حج | یہ "آسان زبان میں حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے اپنے کم تعلیم یافتہ حضرات جو صحت آسان اور عمومی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طباعت سیاہی ..... قیمت ..... صرف ۰/۴/-

کلمہ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے نرالے انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ... ۰/۶/-

زکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے دو اہم رکن "صوم رمضان" اور "ادائے زکات" اور اس کے لوازم، اعمال، وظائف، آداب، فرائض و اخلاقیات اور ان کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی و اخلاقی اثرات کا ایسا بہترین تجزیہ اور شوق انگیز بیان اور حکیمانہ حکمت حضرت شاہ ولی اللہ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی قائل۔ قیمت ۰/۳/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات و دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

قیمت ۰/۱۲/-

اسلام کیا ہے؟

الیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت آخر عطا فرمائی ہے پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا بندہ بننے کے لیے بھی اس کا سا مختصر اور مکمل انشاء اللہ کافی ہے۔

زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پر تاثیر ہے کتابت طباعت جلی اور سیاری قسم اول کاغذ عمدہ و چکنا مجلد رنگا ہوا قسم دوم کاغذ عمدہ و چکنا سادہ مجلد ۱/۸/-

ہندی ورژن کا غذ اعلیٰ مجلد قیمت تین روپے ۳/-

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
(فی کاپی ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ - پونڈ .. شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۴۳ | بابتہ ماہ شعبان ۱۳۸۴ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ ۸

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	ایک مرد مومن کی شہادت	محمد منظور نعمانی	۱۴
۳	معارف الحدیث	" "	۱۷
۴	تجلیات مجدد الف ثانیؒ	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۲۷
۵	شریعت کا جادۂ قویم شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں	مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی	۳۴
۶	روزہ ———	جناب رئیس الدین خاں صاحب	۴۷

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جنوری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: ۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاک خانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: ۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، انکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی بی ایس سی، ایل ایل بی، ایڈیٹر و پبلشر، الفرقان پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ مہینے ہمیں ایک صاحب سے ایک مخلص کا خط موصول ہوا جس میں اس مقصد کی تائید کرتے ہوئے جو دو تین مہینے سے ان صفحات کا موضوع گفتگو ہے، ایک خاص نقطہ الفرقان کی پالیسی کے متعلق دریافت کیا گیا ہے۔ یہ نقطہ چونکہ عام طبیعتوں کے تقاضائے احساسات و خیالات کا نتیجہ نہیں بلکہ ان مخلص لوگوں کے احساسات کا حوالہ بھی ہے جن تک ہمارے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکی ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ الفرقان کے صفحات پر اس امر کے متعلق گفتگو کی جائے تاکہ جو اصحاب کہ ذہن میں بھی اس معاملہ میں کوئی خلش ہو اُن کے سامنے ہمارا نقطۂ نظر بوضاحت کے ساتھ آجائے۔

مکتوب کا ضروری اقتباس یہ ہے

"اس وقت عرض یہ کرنے کا تھا کہ آپ کی یہ کاوش اور جدوجہد جو الفرقان کی شکل میں شروع کی گئی اشاعت میں شائع ہو رہی ہے آپ کی یہ خواہش کہ قدر مبارک ہو کہ اجتماع و میدان میں کام کرنے والی تمام جماعتیں اور ان مسائل سے دلچسپی رکھنے والے تمام [illegible] ایک دوامی نظام میں منسلک ہو کر قیادت کا ایک مشترک پلیٹ فارم ترتیب دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کی کوئی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا واحد شخصیت ہے کہ جس کی آواز پر اسلامیان ہند لبیک کہیں، اس وقت مجلس مشاورت کی شکل میں ایک ایسے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس تجویز کا کہ مجلس مشاورت کو مشترک مسائل میں [illegible] ایک [illegible] ملک میں پیش کیا جائے۔ ....."

میری .....

رائے میں اس تجویز کا پیش مقدم ہر جماعت اور ہر گروہ کی طرف سے ہونا چاہیے اور کوشش یہ کی جائے کہ جماعتیں سرے سے قریب نہ آئیں۔ یہ جماعتیں جس قدر قریب ہوتی جائیں گی اور مجلس مشاورت طاقت پکڑتی جائے گی اسی قدر یہ جماعتیں خود بخود ختم ہوتی جائیں گی اس مجلس کے حق میں دست بردار ہوتی جائیں گی۔ انشاء اللہ.....

اسی سلسلہ میں آپ سے دوسری گزارش یہ ہے کہ الفرقان اور زمانے کے صفحات میں ایسے مباحث اور خبروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونا چاہیے کہ جس سے جماعت اسلامی (پاکستان) کی تنقید یا تنقیص ہوتی ہو۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے ہر شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ بات ہندوستان کا کوئی رہنے والا کسی جماعت سے خواہ پاکستان سے نہیں ہے۔ نام کی مماثلت کی وجہ سے عام قارئین کا ذہن اس شبہ کے ساتھ یا بغیر شبہ کے ہندوستان کی جماعت کے بارے میں کافی متاثر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ پر جماعت کے مخالفین یا موافقین ان سے کافی متاثر ہوتے ہیں۔ جماعت کے مخالفین میں جماعت کے خلاف اور جماعت کے موافقین میں آپ کے اور پھر مجلس کے خلاف تاثر پیدا ہوتے ہیں۔ اب ان حلقوں میں لاکھ کوشش کریں لیکن ذہن ضرور متاثر ہو جاتے ہیں اس وقت آپ صاحبان جس اتحاد اور اشتراک کی کوشش کر رہے ہیں اس مجوزہ میں یہ تاثر مانع آرہا ہے، اور ہم لوگوں کو صوبائی اور ضلعی سطح پر جن نظام اور نامنہاد حلقوں میں کام کرنا پڑ رہا ہے وہاں یہ دشواریاں پیش آرہی ہیں ـــــ مثال کے طور پر الفرقان کی اسی ماہ کی شماعت کو لیجئے امین احسن اصلاحی صاحب کا مضمون جہاں اور جن حلقوں میں پڑھا جارہا ہے وہاں ہندوستان کی یہ جماعت بیچاری طلاق دیے زیر بحث آرہی ہے، یہ لوگ مجھ سے خود کہتے ہیں کہ آپ جس مجلس مشاورت کے رکن ہیں اس کے رکن رکین کے زیر اثر میں مشاورت کی ایک رکن جماعت کے بارے میں امین احسن صاحب کا مضمون چھپا ہے سمجھ لیجئے یہ بھی مضمون نے جو تاثر موافق اور مخالف حلقوں میں پیدا کیا ہے وہ موجود ہے۔ حالانکہ آپ کا اداریہ بھی میں نے لوگوں کو بتلایا اور سنایا۔

اس لیے میری گزارش ہے کہ ملت کے اتحاد کی خاطر اب آپ ان مباحث کو اپنے موقر

جریدہ میں جگہ نہ دیں، ہم ان کوششوں کے لیے سعی کریں جن کا واضح طور پر آپ نے اپنے ادارہ میں نقشہ کھینچا ہے اور پھر پاکستان کی اندرونی سیاست اور وہاں کی جماعت کے آپس کے تنازعات سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں رکھنا چاہیے، عورت صدر بنے یا مرد ہمیں کیا یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ تو آپس کا اتحاد ہے۔ یہ اتحاد ہے تو ملت بھی ایک باعزت زندگی اس ملک میں پالے گی۔

امید ہے کہ میری ان گزارشات پر ہمدردانہ طور پر غور فرمائیں گے۔"

آپ کا خادم

.....

جہاں تک ندائے ملت کا تعلق ہے، راقم سطور اپنی صحت کی بنا پر اس کی ادارت سے اب سبکدوش ہو چکا ہے۔ ویسے بھی الفرقان اور ندائے ملت کو ایک سمجھ کر گفتگو کرنا صحیح نہیں ہے لیکن جب مراسلہ نگار نے اس کا ذکر کر دیا ہے تو اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ اب تک کی بالیسی کے اعتبار سے ندائے ملت اس طرح کے مسائل سے خود ہی دور رہتا ہے۔

لیکن الفرقان کا معاملہ اس سے مختلف ہے اس کا مقصد اشاعت دین حق کی اشاعت اور دینی فتنوں سے مسلمانوں کی حفاظت ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جس بات کو دین میں حق جانے اسے حق لکھے اور جس چیز کو باطل سمجھتا ہے اسے باطل کہہ کر رد کرے۔ اس کا نام ہی (الفرقان) اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس کے اس فرض (حق کو باطل سے جدا کر کے دکھانے) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور وہ اگر کسی مصلحت کی خاطر اپنے اس فرض سے چشم پوشی کرتا ہے تو یہ بات خواہ دوسروں کی نظر میں کیسی ہی بھلی ہو، مگر اس کی اپنی نظر میں ایک جرم ہوگی۔

جہاں تک مشترک خطرات کے مقابلہ میں ملت کے اتحاد و اشتراک کا سوال ہے، الفرقان اسے ہندوستان میں نفس اسلام کی بقا کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس لیے اس کی تائید ہی نہیں اس کی دعوت و تلقین کو بھی اپنا فرض جانتا ہے اور اس فرض کو وہ اپنے امکان بھر انجام بھی دے رہا ہے لیکن اس دعوت اتحاد کا یہ مطلب اس کے لیے ناقابل قبول ہے کہ کہیں دین کی تحریف دیکھے تو

اس پر بھی خاموش رہے اور دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہو اس سے آنکھیں بند کر کے بس اس پر نظریں جمائے رکھے کہ مجلس مشاورت کا قافلۂ اتحاد خیر و عافیت کے ساتھ اپنی منزل مقصود کو پہونچ جائے۔

مجلس مشاورت کی شکل میں وجود میں آنے والا اتحاد بیشک الفرقان کو عزیز ہے مگر الفرقان تو ہرگز یہ مطالبہ بھی نہیں سمجھتا کہ جو لوگ اس اتحاد میں شریک ہیں ان کی بھی کسی بات سے اختلاف نہ کیا جائے کیونکہ مجلس مشاورت کی بنیاد خود اس اصول پر نہیں ہے۔ مجلس مشاورت اپنے دائرے سے باہر اختلافات کے وجود کو تسلیم کرتی ہے، اور اسکے ساتھ اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ مشترک ملی مسائل جن میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے ان میں الگ الگ کام کرنے کے بجائے مل کر کام کیا جائے۔ پس اس لحاظ سے خود ان شرکائے اتحاد کے درمیان بھی اگرچہ اختلافی دائرے ہیں تو یہ بات اس اتحاد کے خلاف نہ ہوگی کہ ان دائروں کے صحیح حدود کا خیال رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے اظہار اختلاف کیا جائے اور جو بات کسی کو غلط نظر آئے تو اس پر اپنے ضمیر کے مطابق تنقید کی جائے!

یہ محض ہمارا خیال نہیں ہے۔ اتفاق سے خود جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا ابو اللیث صاحب کے عمل کی نظیر ہمارے سامنے موجود ہے جو ہمیں پوری تائید بہم پہونچاتی ہے۔ مجلس مشاورت نے اپنی تاسیس کے بعد سب سے پہلا کام ملک کے مختلف فرقوں کے ممتاز لوگوں کے دستخطوں سے ایک بیان جاری کرنے کا کیا تھا جس میں ملک کے سب فرقوں سے اتحاد و یکجہتی اور رواداری کی فضا قائم کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس پر دستخط مولانا ابو اللیث صاحب نے بھی کیے تھے لیکن اسکی اشاعت کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ اسکے بعض فقروں سے وحدت ادیان کی تائید نکلتی ہے۔ معاملہ خود مجلس مشاورت کی اپیل کا تھا، مجلس مشاورت اور اس کے صدر محترم کے وقار کا تھا، جنھوں نے ہندوستان کے نہایت ممتاز غیر مسلموں کے دستخط اس پر کرائے تھے۔ پھر صراحۃً وحدت ادیان کی کوئی تائید ان فقروں میں تھی بھی نہیں۔ لیکن مولانا نے ان سب پہلوؤں کے باوجود اپنی دینی ذمہ داری اور ایمانی ضمیر کا تقاضہ یہی محسوس کیا کہ اس لحاظ سے ان فقروں کو غلط کہیں اور ان کے موہوم مفہوم سے اپنی برأت کا علانیہ اظہار کریں چنانچہ مولانا کا یہ تردیدی بیان، ۷ اکتوبر کے دعوت (دہلی) میں شائع ہوا ــــــ پس جب یہ پوزیشن ہے تو ہمارے لیے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان جس کا نہ مجلس مشاورت سے کوئی واسطہ ہے نہ وہ مسلمانان ہند کی کوئی جماعت ہے، اسکی کسی بات پر تنقید کرنے میں مجلس مشاورت کا اتحاد کیوں مانع آئے؟

بیشک ہم اپنے ملک کے مسلمانوں کی بھی خود اپنی مصلحت میں اس بات سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں عورت صدر مملکت ہوتی ہو یا مرد۔ اور فی الواقع ہمیں مسئلہ کی اس نوعیت سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں کیونکہ یہ مسئلہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ لیکن یہ رویہ ہمارے لیے اس صورت میں کیسے جائز ہو سکتا ہے جب مسئلہ عورت کی صدارت کے شرعی جواز اور عدم جواز کا ہو اور ہم یہ دیکھ رہے ہوں کہ جماعتی سیاست کے مصالح پر اپنی آرا کے ساتھ ساتھ شریعت کی آبرو بھی نثار کی جا رہی ہو! کیا دین اور شریعت کے معاملات پر گفتگو میں بھی ملکوں کی سیاسی اور جغرافیائی حدبندیاں حائل ہوتی ہیں؟ اور کسی مسلمان کے لیے یہ بات روا ہو سکتی ہے کہ وہ شعور و اختیار رکھتے ہوئے بھی دنیا کے کسی حصہ میں شریعت کے نام پر ہونے والی بے حرمتی کا تماشہ خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہے؟ پھر جبکہ یہ تماشہ ہو بھی رہا ہو ایسے لوگوں کے ہاتھوں جن کی شہرت اور دینی کے علمبرداروں کی حیثیت سے ہو، جن کے قول و فعل کے اثرات پاکستان کے اندر تک ہی محدود نہ ہوں۔ بلکہ خود ہمارے ملک کے لحاظ سے تو صورت یہ ہو کہ اُن کے ذہنی حلقہ اثر کے اعتبار سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان کوئی تفریق ہی مشکل ہو! کیونکہ پاکستان کی جماعت اسلامی اول سے آخر تک جس شخصیت کی فکری اور عملی قیادت کی آئینہ دار ہے وہ مولانا مودودی ہیں۔ اور مولانا مودودی صاحب کے فکری اثرات کے بارے میں کون ہندوستان و پاکستان کی تفریق کر سکتا ہے؟ وہ اپنے فکری حلقہ اثر کے اعتبار سے جتنے پاکستانی ہیں بلاشبہ اتنے ہی ہندوستانی بھی ہیں۔

بہرحال جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ خصوصیت ہندوستان کے کسی دینی رسالہ پر اور بھی زیادہ لازم کرتی ہے کہ وہ اگر اپنی سیاسی ضرورتوں کے ماتحت لوگوں کو احکام شریعت کے بارے میں مغالطے دینے لگیں تو سختی کے ساتھ اُس کا نوٹس لیا جائے۔

مولانا مودودی اور اُن کی جماعت کا جو مسلک سیاست میں عورتوں کے حصہ لینے کی قطعی مخالفت کا رہا ہو وہ ہر اُس شخص پر واضح ہے جس کو اُن کے لٹریچر کے مطالعہ سے کچھ بھی دلچسپی رہی ہو۔ لیکن ہم اسکے باوجود ان سے ہرگز کوئی تعرض نہ کرتے اگر صرف اتنی بات ہوتی کہ انھوں نے وقتی یا دائمی طور پر اپنے مسلک کو چھوڑ دیا ہم کوئی خدائی فوجدار نہیں کہ کسی شخص یا جماعت کی عمومی بدید کے راستہ میں حائل ہوں۔ اور جس بات کو خود صحیح سمجھتے ہوں دوسروں کو بھی اس کے اختیار کرنے یا اختیار کیے رہنے پر مجبور کریں، ہر شخص کو اختیار ہے

کہ وہ اگر اپنے کل کے مسلک کو غلط سمجھنے لگا یا اس پر قائم رہنا اُسے مشکل نظر آنے لگا تو آج اس مسلک میں تبدیلی کا اعلان کرنے یا خاموشی سے دوسری راہ اختیار کرلے اسی طرح پاکستان کی جماعت اسلامی بھی مس فاطمہ جناح کی حمایت میں کھڑی ہوجاتی، تو صرف اس بات پر کم از کم ہم اس کا دامن نہ پکڑتے۔ زیادہ سے زیادہ مولانا دریابادی کی طرح اس کے "مرحوم" ہوجانے کا ماتم کرلیتے، لیکن اس کی جو چیز اس معاملے میں تنقید اور محاسبہ پر مجبور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری یا مسلک میں تبدیلی کا اعتراف کرنے کے بجائے اپنے زیر موقف کی حمایت میں ایسے ایسے دلائل تراشنے اور ایسی عوام فریب باتیں کرنے پر تُل گئی ہے کہ ان کو اگر کھلے ہاتھ دیا جائے تو نہ صرف اس مسئلہ میں لوگوں کے ذہن خراب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے بلکہ اور کچھ نہیں تو بڑی اور اصولی و فروعی گمراہیاں لوگوں کے ذہنوں میں جڑ پکڑ کر رہ جائیں گی۔

جو شخص بھی اس مسئلہ میں کسی لاگ لپیٹ اور جنبہ داری کے بغیر گہری نظر سے جماعت اسلامی پاکستان کے موقف کا جائزہ لے گا وہ بلاشبہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جماعت اسلامی کو کوئی بھی شرعی مجبوری مس فاطمہ جناح کی حمایت کے لیے پیش نہیں آئی تھی، وہ مجبوری دراصل اس کی اپنی سیاسی مجبوری تھی جسے اس نے شرعی مجبوری کے افسانے میں چھپایا اور پھر اس کے ماتحت تن من دھن سے مس فاطمہ جناح کی حمایت کا جہاد شروع کرنے کے لیے وہ ایمان سوز حربے، وہ عوام فریب باتیں اور وہ گمراہ کن دلائل اختیار کیے جو کچھ پیش کیے بلکہ ان کو دہرا دہرا کر اس نے اسلام سے آج تک کا ایک متفق علیہ مسئلہ (اس کی آن میں اپنی آبرو کھو بیٹھا اور جتنے منھ اتنی باتیں اس کے متعلق ہونے لگیں۔

بالکل آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بات ہے کہ پاکستان کے متحدہ حزب اختلاف کی طرف سے جب مس فاطمہ جناح کی امیدواری طے کی گئی، تو اس میں ضمناً یہ سوال سامنے نہیں آیا کہ وہ کونسی شرعی مجبوری یا مصلحت ہے جس کی بنا پر باوجود عورت ہونے کے انھیں مملکت کی سربراہی کے لیے کھڑا کرنا جائز ہوگا۔ اس متحدہ محاذ میں جماعت اسلامی پہلے دن سے شریک تھی اور اخبار بین طبقہ جانتا ہے کہ مس فاطمہ جناح کا نام کافی پہلے سے متحدہ محاذ کے امکانی امیدواروں کی فہرست میں آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی نے بھی اس پر غور کیا ہوگا لیکن وہ کوئی شرعی مجبوری یا مصلحت اس نام کی تائید کے لیے اس عرصہ میں دریافت نہ کرسکی حتیٰ کہ جس میٹنگ میں متحدہ محاذ نے یہ فیصلہ کیا اس میں جماعت کے نمائندوں نے اس

فیصلہ پر صاد نہیں کیا۔ بلکہ اپنے شرعی مسلک کا عذر کر کے فوری طور پر رائے دہی سے احتراز کیا کہ اس معاملہ میں اب اتفاق یا عدم اتفاق کا فیصلہ پوری جماعت ہی کر سکتی ہے! اب اس مرحلے کے بعد جماعت کی مجلس شوریٰ طلب ہوئی اور اس نے ایک شرعی فتوے کے ساتھ اس فیصلے کی تائید کا فیصلہ کیا ــــــ

سوال یہ ہے کہ اس فتوے میں جو وجوہ جواز پیش کیے گئے ہیں، کیا کوئی بھی منصف مزاج آدمی یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ پہلے سے جماعت اسلامی کے اہل الرائے کی نظر میں نہیں تھے۔ "دوسرے اہل علم" سے مشورہ کرنے کے بعد ہی اپنے ملک کے یہ حالات اور صدر ایوب کے چھ سالہ دور کے یہ نتائج ان حضرات پر کھلے! یا یہ کوئی غیبی خبریں تھیں کہ کوئی الہام والقاء ہوا تو ان حالات کا پتہ چلا اور پھر یہ اہل علم کی خدمت میں برائے استفسار پیش کیے جا سکے؟ کوئی عقل سے کورا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ جن حالات پر دھواں دھار تقریریں یہ حضرات عرصے سے کر رہے تھے۔ جن کے ذکر اور جن کی مذمت سے ان کے اخبارات و رسائل بھرے چلے آ رہے تھے، کوئی نہیں مان سکتا کہ شروع میں جب فاطمہ جناح کا نام ان کے سامنے آیا تو یہ سب باتیں ان کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں! پس اگر ان حالات کے وجود سے مس فاطمہ جناح کی تائید و حمایت کا جواز نکلتا تھا تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس میں اس وقت کیا تکلف سے کیوں کام لیا گیا۔ جب تک متحدہ محاذ کی باقی سب جماعتوں نے اپنے طور پر فیصلہ کر کے مس فاطمہ جناح کی امیدواری کا اعلان نہ کر دیا؟ اگر یہ ایسی ہی شرعی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی گاڑی پاکستان میں آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ تو پھر اس فیصلہ کی تائید ہی نہیں تحریک کا جماعت اسلامی سے بڑھ کر کس پر حق تھا۔ کیوں نہیں اس نے کہا کہ اس گاڑی کا راستہ چونکہ پاکستان میں صرف قائداعظم کی بہن ہی کے ہاتھوں صاف ہو سکتا ہے، اس لیے ہم ان کا جھنڈا سب سے پہلے اٹھائیں گے اور پاکستان میں اس سعادت کا حقدار ہم سے زیادہ کوئی اور نہیں ہے!

الغرض مس فاطمہ جناح کی شخصیت کا وزن کوئی ڈھکی چھپی چیز تھی اور نہ ہی ایوبی کے حالات کوئی پردہ راز میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی ان کے نام کی تحریک چھوڑ تائید کا فیصلہ بھی متحدہ محاذ کی باقی جماعتوں کے ساتھ نہیں کر سکی، تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کوئی گنجائش شرعاً اسکی نہیں سمجھتی تھی ــــــ اور ہمارے لیے یہ سمجھنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اس نے اندرونی طور پر اس کی مخالفت بھی کی ہو گی۔ کیونکہ اسی دور ایوبی کے اندر ۱۹۶۱ء میں کسی شخص نے مولانا مودودی

کی شرعی تائید مس فاطمہ جناح کی صدارت کے لیے حاصل کرنا چاہی تھی اور مولانا نے اپنے پچھلے موقف کے عین مطابق دلائل کے ساتھ اس پر انکار کر دیا تھا[1] ——— لیکن جب بات اس کے قابو سے نکل گئی اور پوزیشن یہ ہو گئی کہ اب اگر متحدہ محاذ کے فیصلے کی توثیق نہیں کرتے تو گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے، کیونکہ اپنی ساری سیاست کو تو اس متحدہ محاذ سے وابستہ کر دیا تھا تو ناچار اسے اپنی سیاسی مجبوری کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور دوسرے گمنام اہل علم کی گردن پر رکھ کر یہ فتویٰ اس نے راتوں رات تیار کیا کہ عورت کو امیر بنانا ہے تو شرعاً حرام۔ لیکن ایسا حرام نہیں ہے کہ کسی شدید ضرورت سے بھی حلال نہ ہو سکے۔ ادھر ملک کے جو حالات ہیں وہ اس بات کی شدید ضرورت ہی ظاہر کرتے ہیں کہ مس فاطمہ جناح کو بطور صدارتی امیدوار کے قبول کر لیا جائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ یہ سخن سازی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ شدید ضرورت اس وقت کیوں نہیں یاد آئی جب مس جناح کا نام متحدہ محاذ کے زیر غور تھا، اور بعد میں کون سے ایسے حالات ملک میں رونما ہو گئے جو پہلے نہیں تھے؟ سوائے اس کے کہ متحدہ محاذ کے باقی سب شریکوں نے جماعت اسلامی کی رائے کی پرواہ نہیں کی۔ اور جماعت اسلامی اس پوزیشن میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتی تھی کہ متحدہ محاذ کو چھوڑنے کے نتائج کا مقابلہ کر سکے۔ ناچار اس نے اپنی متاع دین بھی اس محاذ کے قدموں میں لا کر رکھ دی۔ اور پھر یہ ظاہر کرنے کی ہمت چوں کہ اس میں نہیں تھی کہ ہم اپنی مجبوری میں اپنے لیے یہ جائز سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس منکر شرعی سے عارضی طور پر سمجھوتہ کر لیں۔ اس لیے اپنی کمزوری کی پردہ پوشی کیلئے اس نے پوری پاکستان قوم کے نام فتویٰ صادر کیا کہ جماعت اسلامی صرف اپنے ہی لیے اپنے مخصوص حالات کے ماتحت مس فاطمہ جناح کی حمایت جائز نہیں سمجھتی ہے بلکہ یہ جواز پوری قوم کے لیے ہے۔ اور جواز بھی ایسا جو وجوب کے معنی رکھتا ہے کہ تن من دھن سے مس فاطمہ جناح کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کرنا چاہیے ——— یعنی

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

---

[1] یہ سوال و جواب معاصر المنبر (لائلپور، پاکستان) نے اپنی ۱۱ دسمبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں مکمل حوالے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہ بے مغز بے دلیل اور سراسر سخن سازانہ فتویٰ بجائے خود کیا کم فتنہ تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کے جس اخبار میں ہم نے یہ فتویٰ پڑھا اس کی اگلی اشاعت کے اداریہ میں یہ الفاظ ہماری نظر سے گزرے کہ

"جب سے محترمہ فاطمہ جناح کا نام صدارتی امیدوار کی حیثیت سے منظر عام پر آیا ہے بعض مذہبی حلقوں نے زور شور سے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے کہ شریعت کی رو سے عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی۔" (ہفتہ وار شہاب ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

یہ جن الفاظ پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس میں ذرا پروپیگنڈے کا لفظ ملاحظہ فرمائیے۔ اسی کو ہم نے ایمان سوز حربے سے تعبیر کیا ہے اور خدا گواہ ہے کہ ان سطروں کا لکھنے والا اس لفظ کو پڑھ کر لرز گیا کہ اللہ اللہ! اب یہ نوبت آگئی کہ جماعت اسلامی مذہبی حلقوں کی اس بات کو پروپیگنڈا قرار دے کہ از روئے شریعت عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی!

پھر اسی اخبار کی اسی اشاعت میں مولانا مودودی کا یہ چیلنج ہماری نظر سے گزرا کہ

"کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شریعت عورت کا سربراہ مملکت ہونا حرام ہے اور اس سلسلے میں استثنا کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔"

ہم چونکہ "حرام" تو سوائے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے (جس میں مولانا مودودی شریک نہیں تھے) کسی نے نہیں کہا پھر یہ چیلنج مولانا کس کو فرما رہے ہیں، لیکن آگے دیکھا تو استثنار کی گنجائش کا سوال بھی لگا ہوا ہے تب سمجھ میں آیا کہ یہ مجلس شوریٰ کی غلطی نباہی جا رہی ہے یعنی ایسا ذو معنی چیلنج کیا ہے کہ آدمی پیٹ ہی نہ کر سکے کہ مولانا کے چیلنج کا متعلقہ حرمت کا ہی انکار ہے یا صرف استثنار کا دعویٰ! خیر اس معمے کو چھوڑ کر آگے بڑھے تو نظر آیا کہ مولانا نے اپنی جماعت کے فیصلے کی حمایت کرتے ہوئے ملکہ سبا کے قرآنی قصہ کے حوالے سے یہ دلیل پیش کی کہ

"جس وقت وہ حضرت سلیمانؑ پر ایمان لے آئیں تو حضرت سلیمانؑ کو وحی نازل نہیں ہوئی کہ عورت کو سربراہ مملکت نہیں رہنا چاہیے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے۔" (شہاب ص۱۶)

یعنی دلیل میں مولانا اوپر والا انجاڑ قائم نہیں رکھ سکے اور یہ بات کھل کر آگئی کہ وہ سرے سے حرمت ہی کا

انکار کرنا چاہتے ہیں۔ یا یوں یہ کہہ لیجئے کہ دلیل حسب مطلب نہ مل سکی کیونکہ یہ دلیل استقصائی نہیں کلی جوازکی ہے! بہرحال یہ وہ چیز ہے جس کے لیے ہم نے گمراہ کن دلائل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

حد ہو گئی اپنی کمزوری کو چھپانے کی کہ اگر استفسار کی کوئی دلیل ہاتھ نہ آسکی تو مکمل جواز ہی نکال کر دکھادیا اور یہ بھی خیال نہ آیا کہ اگر بلکہ سبا کے واقعہ سے یہی بات ثابت ہوتی ہے تو پھر اصل اسلامی حکم کا کیا بنے گا۔ جو جماعت اسلامی کی کتابوں میں بھی پورے دلائل کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور جس کے متعلق آج تک کہا جارہا ہے کہ ہم اب بھی اس پر قائم ہیں۔ لیکن اس دلیل کے بعد وہ حکم اور وہ مسئلہ کہاں رہ گیا؟

بہرحال اس وقت پورے مسئلہ پر کوئی سیر حاصل گفتگو ہمارے پیش نظر نہیں تھی بلکہ ہمیں جو جماعت اسلامی پاکستان کے سلسلہ میں اپنا موقف واضح کرنے کے لیے کچھ سخت الفاظ استعمال کرنا پڑے تھے ضروری تھا کہ اس کے اسباب کی طرف بھی کچھ اشارہ کر دیں۔ یہ تھوڑی سی تفصیل اسی بنا پر کرنا پڑی۔ ہمیں امید ہے کہ محترم مراسلہ نگار نے اور ان کے ساتھ ان کے ہم خیال دوسرے لوگوں نے بھی ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھ لیا ہوگا اور وہ ہمیں اس معاملہ میں معذور جانیں گے کہ جماعت اسلامی پاکستان پر کسی تنقید وغیرہ کو الفرقان کے صفحات میں جگہ نہ دیں۔ ہم اس جماعت پر کوئی تفریحاً تنقید نہیں کرتے اور نہ تفریحاً کسی تنقید کو نقل کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دین کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ مولانا مودودی کی یہ جماعت جب اپنی سیاسی ضرورتوں کی خاطر جن کی انتہا معلوم نہیں) دین کا حلیہ بگاڑ دینے پر تل گئی ہے تو پھر ہندوستان اور پاکستان دونوں کے اندر دین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہو سکتا۔ اور ہم ایسے فتنہ کے معاملہ میں کسی سے نہ مصالحت کر سکتے ہیں نہ کسی کی رعایت۔

ہاں یہ ہم بھی نہیں چاہتے کہ ہماری ان تنقیدوں کا جماعت اسلامی ہند پر اثر پڑے۔ لیکن اگر واقعہ یوں ہی ہے کہ ان تنقیدوں سے یہاں کی جماعت کے خلاف بھی تاثر پیدا ہوتا ہے تو اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں زیادہ قصور ان تاثر لینے والوں کا بھی نہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان اور جماعت اسلامی ہند بے شک ضابطہ میں بالکل ایک

دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ لیکن دونوں کا فکری سرچشمہ تو ایک ہی ہے۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اگرچہ پاکستان کی جماعت اسلامی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی لیکن اس کے ارکان و ہمدردان اور متفقین مولانا مودودی کے افکار سے ذہنی فیض تو آج بھی اسی طرح حاصل کرتے ہیں جیسے تقسیم سے ماقبل، اور نہ بھی وہ پہلے والی بات ہو بلکہ اب کہیں کہیں اختلاف رائے ہونے لگا ہو تب بھی یہ ذمہ داری تو تمام تر جماعت اسلامی ہند کے رسائل و اخبارات ہی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف تو ان کی تمام قابل تائید باتوں کی تائید بالواسطہ یا بلاواسطہ کرتے ہیں، ان سے متعلق قابل ذکر باتوں کو خصوصیت سے پبلسٹی دیتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ایک ہیرو اور آئیڈیل شخصیت کا تصور ان کے بارے میں دیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی جن باتوں کی تائید نہیں کر سکتے ان پر ایسی گہری خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ چاہے ہندو پاکستان کی صحافتی دنیا میں ان پر ایک ہنگامہ برپا رہے مگر ان کی خاموشی کسی پہلو نہیں ٹوٹتی۔ اور لوگ ترس جاتے ہیں کہ کچھ تو لکھیں۔ مثلاً کے طور پر یہ عورت کی صدارت کا مسئلہ ہی لے لیجیے۔ ہندوستان و پاکستان کے سارے پریس کا اس وقت سب سے مہم آرا دینی مسئلہ یہی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی ہند کے اخبارات و رسائل! جیسے کسی اور دنیا میں نکل رہے ہوں۔

ہمارے خیال میں اگر ان باتوں میں جماعت اسلامی ہند کا پریس اپنا رویہ بدل دے تو جماعت کے مخالفوں کا ذہن بھی اس کے بارے میں بدل جائے گا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی کے دوستوں کو اس بات کی تو شکایت پیدا ہو کہ لوگ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کے گناہ ان کے سر کیوں ڈالتے ہیں۔ لیکن اس کی جرأت نہ کی جائے کہ ان گناہوں کو گناہ کہہ کر اپنی برأت کا اظہار کر دیا جائے۔ اور یا اگر ان باتوں کو گناہ نہیں حق و صواب سمجھا جا رہا ہے تو سر اٹھا کر اس کا ساتھ دیا جائے۔ اور اس تائید حق اور شہادت حق کی خاطر ہر ملامت اور ہر نقصان کو گوارا کیا جائے۔

الغرض یہ مخالفوں کا تاثر تو جماعت اسلامی ہند کے پریس اور اہل قلم کی پالیسی کا نتیجہ ہے، یہ نہ الفرقان کا پیدا کردہ ہے اور نہ اس کو رد کرنا الفرقان کے بس کی بات ہے۔ جماعت اسلامی ہند

کی جو پالیسی اپنے کام اور اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں ادھر چند سال سے نمایاں طور سے بدلی ہے اس کا یہ کھلا ہوا نتیجہ ہے کہ ہمیں اس کے اصل نظریات سے اسی اختلاف کے باوجود جو جماعت اسلامی پاکستان یا مولانا مودودی سے ہمیں ہے اس سے کوئی تعرض کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن ہم یہ رویہ پاکستان کی جماعت اسلامی کے بارے میں تو نہیں اختیار کر سکتے۔ کیونکہ وہ بالکل دوسرے حال میں ہے۔ اب یہ جماعت اسلامی ہند کا کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس زد سے نکالے جو اس پر جماعت اسلامی پاکستان کی بدولت پڑ جاتی ہے اور جب تک وہ خود اپنی اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کمربستہ نہ ہو کسی کی بھی مدد اس معاملہ میں اس کے کام نہیں آسکتی۔



آپ کے پاس

الفرقان سنہ ۸۳ھ کے حسب ذیل پرچے ہوں اور آپ کو ان کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو براہ کرم دفتر الفرقان کو قیمتاً یا بلا قیمت جیسے پسند کریں ارسال فرمادیں شدید ضرورت ہے۔

محرم	صفر و ربیع الاول	شعبان	رمضان و شوال
۸۳ھ	۸۳ھ	۸۳ھ	۸۳ھ

منیجر

نوٹ:- اس شمارہ میں مکتوبات الامام کی قسط پر آخری قسط لکھی گئی ہے۔ اس کو نذر قارئین کرنے کی سعادت [illegible]

ایک مردِ مومن کی شہادت

از

محمد منظور نعمانی

الفرقان کے ناظرین کو شاید یاد بھی ہو اب سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے اپنے سفرِ حجاز کے تذکرہ کے سلسلے میں جدہ میں مقیم اپنے ایک بہت خاص اور مخلص دوست ارشد صاحب کا میں نے محرم ۱۳۸۳ھ (جون ۱۹۶۳ء) کے شمارہ میں ذکر کرتے ہوئے ان کے بارہ میں لکھا تھا کہ

ارشد صاحب پہلے پاکستان میں محکمۂ تار و ٹیلیفون کے افسروں میں تھے اب غالباً دو ڈھائی سال سے سعودی حکومت نے مستعار ان کی خدمات حاصل کرلی ہیں جدہ[1] ہی میں قیام رہتا ہے ..... یہ ہمارے ان خوش نصیب دوستوں میں سے ہیں جن پر بڑا ہی رشک آتا ہے، تقریباً ۲۰ سال سے ان سے تعلق ہے، تبلیغی کام سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں، جہاں تک یاد آتا ہے اب سے تقریباً ۲۰ سال پہلے میوات کے ایک تبلیغی اجتماع ہی میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، جہاں رہتے ہیں اپنے منصبی خدمات مثالی طور پر انجام دیتے ہیں لیکن ان کی اصل فکر دین کی فکر کی ہوتی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہو کہ اُن کے ذریعہ اُس کے کتنے بندوں کا تعلق اپنے مالک سے جڑا ہے، اب سے چند سال پہلے حکومت پاکستان کی طرف سے وہ جاپان بھیجے گئے تھے، ان کی دعوت کے نتیجہ میں اور ان کے ہاتھ پر سیکڑوں جاپانی مشرف باسلام ہوئے جن میں بعض بڑے فاضل اور بعض بدھ مذہب کے ممتاز راہب اور درویش بھی تھے۔ آج کل جدہ میں بھی ایک جاپانی نومسلم فاضل (محمد میتا) ان کے پاس مقیم ہیں یہ اُن کو انگریزی کے ذریعہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ پڑھاتے ہیں اور وہ اس کو جاپانی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ تقریباً دس پاروں کا ترجمہ مختصر وضاحتی نوٹوں کے ساتھ ہو چکا ہے[2]"

---

[1] جس وقت یہ سطریں لکھی گئی تھیں اس وقت تک ارشد صاحب کی رہائش جدہ ہی میں تھی اس کے بعد وہ مکۂ معظمہ منتقل ہو گئے تھے۔

[2] الحمدللہ جاپانی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ اور وضاحتی نوٹوں کا یہ کام اب مکمل ہو گیا ہے۔ اس کام کی مالی کفالت "رابطۂ اسلامیہ" (مکۂ معظمہ) نے کی ہے اور اسی کی طرف سے انشاءاللہ اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام ہوگا۔

یہ ارشد صاحب کا بہت ہی مختصر تعارف تھا۔ میں نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ۱۲ر اپریل ۱۹۶۳ء کو جب میرا جہاز جدہ کے ہوائی اڈہ پر اُترا تو ارشد صاحب موجود تھے ـــــ کسٹم وغیرہ کے قانونی مراحل کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھی پر لے گئے جہاں اسی دن یا ایک دن پہلے کے آئے ہوئے کئی پاکستانی اور کئی امریکن حجاج بھی مقیم تھے، ارشد صاحب کے بعض ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ جب سے موسم حج شروع ہوا ہے ان کی کوٹھی اسی طرح ان کے جاننے پہچاننے والے خاصکر تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے حجاج کا مسافر خانہ بنی ہوئی ہے، ہوائی یا بحری جہازوں کی آمد پر اکثر وہ خود جاتے ہیں اور اپنی موٹر پر بٹھا کے ان کو اپنے ہاں لے آتے ہیں، ان کی مہمانداری کرتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہو کہ اخیر شب میں اپنے ہی موٹر پر ان کو مکہ مکرمہ پہونچاتے ہیں اور وہاں مسجد حرام میں تہجد اور فجر پڑھ کے واپس ہوتے ہیں۔ اور صبح جدہ پہونچ کے اُردو اور انگریزی میں قرآن مجید کا درس دیتے ہیں جسکی روشنی میں عمر میتا جاپانی میں ترجمہ کرتے ہیں اور نوٹس لکھتے ہیں ـــــ میں ارشد صاحب سے متاثر تو بہت پہلے سے تھا لیکن اس سفر میں قریباً ۲۰ گھنٹے جو ان کے ہاں ٹھہرنا ہوا اور ان کا روزانہ کا پروگرام اور دینی سرگرمیاں علم میں آئیں تو یہ تاثر کئی گنا بڑھ گیا۔

پھر اب سے ٹھیک ایک سال پہلے آخر دسمبر ۱۹۶۲ء میں وہ جہاز مقدس سے ایک چلہ کا وقت لے کر بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں آئے، اجتماع کے بعد انھوں نے جماعت کے ساتھ ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اس سلسلہ میں لکھنؤ بھی دو دن قیام رہا، یہاں کی ان کی ایک تقریر کا خود مجھ پر اتنا اثر پڑا کہ عمر بھر میں شاید ہی کسی کی تقریر کا اتنا اثر ہوا ہو ـــــ

اب اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد پھر اسی ہفتہ (۲۶، ۲۷، ۲۸ر دسمبر کو) بھوپال میں تبلیغی اجتماع ہوا۔ یہ عاجز ۲۶ر کی صبح کو جب وہاں پہونچا تو تاج المساجد کے صحن میں قدم رکھتے ہی پہلی المناک خبر یہ سُنی کہ ارشد صاحب اسی ہفتہ ایک تبلیغی سفر میں مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ آتے ہوئے موٹر کے ایک حادثہ میں شہید ہو کر واصل بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حادثہ کی تفصیل جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے نام آئے حجاز مقدس کے ایک تبلیغی کارکن کے خط سے اور بھوپال کے اجتماع کے لیے وہاں سے آنے والے ایک دوسرے سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے۔

۱۳، ۱۴ر شعبان (پنجشنبہ و جمعہ) کو مدینہ طیبہ میں تبلیغی اجتماع تھا، یہ حجاز مقدس میں اس طرح کا

پہلا اجتماع تھا جس طرح کے اجتماعات تبلیغی کام کے سلسلہ میں ہندوستان یا پاکستان میں ہوتے ہیں جن کے لیے مہینوں پہلے سے محنتیں کی جاتی ہیں، ارشد صاحب نے اس اجتماع کے لیے بہت پہلے سے بڑی محنت کی تھی۔ پھر جب اجتماع کے دن آئے تو وہ پورے انہماک اور سرگرمی سے اجتماع کے کاموں میں لگے رہے اجتماع کے مختلف حلقوں میں کئی تقریریں خود بھی کیں اس کے لیے خاص طور سے کوشش کرتے رہے کہ کچھ لوگ بھوپال کے اجتماع میں شرکت کے لیے ہوائی جہاز سے فوراً ہندوستان جانے پر آمادہ ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے اس میں ان کو کامیاب بھی کر دیا۔

۱۴ اور ۱۵ کی درمیانی شب میں مسجد نبوی میں تہجد کی نماز پڑھ کے اور روضۂ اقدس پر سلام عرض کر کے ایک جہاز کے ذریعہ وہ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے ان کے ساتھ دو نو مسلم جاپانی رفیق بھی تھے، ایک عمر میتا اور دوسرے محمد مصطفیٰ نامی جو حال ہی میں آئے تھے ـــــ ان کے علاوہ دو پاکستانی مہمان بھی تھے ایک محمد حسن خطیب اور دوسرے شبیر حسین ہاشمی ـــــ یہ شعبان کی پندرھویں شب مبارک تھی، ارشد صاحب نے روزہ کی نیت کر لی تھی اور عمرہ کا احرام بھی باندھ لیا تھا، گاڑی ارشد صاحب خود ہی چلا رہے تھے۔ رابغ پہونچ کر (جو مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ کے تقریباً وسط میں ہے) گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، یہاں سے چلے تو ہاشمی صاحب نے گاڑی چلانا شروع کی۔ ابھی ۱۰-۱۵ منٹ ہی چلے ہوں گے کہ ایک موڑ پر جیپ پھسلی اور الٹ گئی۔ ارشد صاحب اور ہاشمی صاحب دونوں کے شدید ضربیں آئیں، باقی ساتھی بھی زخمی ہوئے مگر بہت زیادہ نہیں، ارشد صاحب تو حادثہ کے ۱۵-۲۰ منٹ بعد ہی روزہ اور احرام کی حالت میں اور ماہ خدا میں جاں بحق ہو گئے، اسی حال میں انھوں نے وصیت کی کہ ان کو مکہ معظمہ لے جا کے جنت المعلیٰ میں دفن کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا مدرسہ صولتیہ میں غسل دیا گیا، بعد عشا حرم شریف میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور اپنی آرزو اور وصیت کے مطابق جنت المعلیٰ میں مرشد العالم حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہم کے پہلو میں دفن کیے گئے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے راستہ کے شہیدوں میں شامل فرمائے اور مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے ـــــ ہاشمی صاحب جدہ کے ہسپتال میں داخل کیے گئے لیکن معلوم ہوا کہ دوسرے یا تیسرے ہی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا، اللہ تعالیٰ ان کی بھی پوری پوری مغفرت فرمائے اور آخرت میں بھی ان کو ارشد صاحب کا رفیق بنائے اور دونوں

* کے پسماندگان کے لیے اس صدمہ کو اپنے قرب کا ذریعہ بنائے اور صبر جمیل عطا فرمائے ـــــ ناظرین کرام سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

معارف الحدیث

(گزشتہ سے پیوستہ)

اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے:-

اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کم و بیش خرچ تو سب ہی کرتے ہیں لیکن اس خرچ کرنے سے لوگوں کو وہ روحانی خوشی حاصل نہیں ہوتی جو اللہ کے نیک بندوں کو دوسرے ضرورتمندوں اور مساکین و فقراء پر صدقہ کرنے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے کو لوگ کار ثواب نہیں سمجھتے بلکہ اس کو مجبوری کا ایک تاوان یا نفس کا ایک تقاضا سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اپنے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب پر بھی لوجہ اللہ اور ثواب کی نیت سے خرچ کرنا چاہئے۔ اس صورت میں جو خرچ اس مد میں ہوگا وہ سب صدقہ کی طرح آخرت کے بنک میں جمع ہوگا بلکہ دوسرے لوگوں پر صدقہ کرنے سے زیادہ اس کا ثواب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم سے ہمارے لیے خیر و سعادت کا ایک بہت بڑا دروازہ کھل جاتا ہے، اب ہم جو کچھ اپنے بیوی بچوں کے کھانے کپڑے پر حتیٰ کہ ان کے جوتوں پر جائز حدود میں خرچ کریں وہ ایک طرح کا "صدقہ" اور کار ثواب ہوگا، بس شرط یہ ہے کہ ہم اس ذہن سے اور اس نیت سے خرچ کریں۔

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَۃً عَلٰی اَھْلِہٖ وَھُوَ یَحْتَسِبُھَا کَانَتْ لَہٗ

صَدَقَةٌ ـــــــــــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی صاحب ایمان بندہ اپنے اہل و عیال پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے تو وہ اس کے حق میں صدقہ ہوگا (اور وہ عند اللہ ثواب کا مستحق ہوگا) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ جُهْدُ الْمُقِلِّ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ ـــــ رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ کون صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا وہ صدقہ افضل ترین صدقہ ہے جو غریب آدمی اپنی محنت کی کمائی سے کرے، اور پہلے اُن پر خرچ کر جن کے تم ذمہ دار ہو (یعنی اپنے بیوی بچوں پر) (سنن ابی داؤد)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدِیْ دِیْنَارٌ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی نَفْسِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی وَلَدِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی اَهْلِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی خَادِمِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْتَ اَعْلَمُ ـــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے (بتائیے کہ میں وہ کہاں خرچ کروں اور کس کو دے دوں) آپ نے فرمایا (سب سے مقدم یہ ہے) کہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے۔ آپ نے فرمایا تو اس کو اپنی اولاد کی ضروریات پر خرچ کرو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے، آپ نے فرمایا تو اس کو اپنی بیوی کی ضروریات پر خرچ کرو،

اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے، تو آپ نے فرمایا کہ پھر اس کو اپنے غلام اور خادم پر صرف کر دو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم زیادہ واقف ہو کہ تمہارے اہل قرابت میں کون زیادہ ضرورتمند اور مستحق ہے) (سنن ابی داؤد، وسنن نسائی)

(تشریح) غالباً ان صاحب کے ظاہری حال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اندازہ کیا تھا کہ یہ خود ضرورتمند اور تنگ حال ہیں اور ان کے پاس بس ایک دینار ہے اور یہ اس کو ثواب آخرت اور اللہ کی رضا کے لیے کہیں خرچ کرنا چاہتے ہیں اور ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ مومن بندہ جو کچھ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرے یا اپنے بیوی بچوں اور غلاموں پر (جن کی اس پر ذمہ داری ہے) خرچ کرے وہ سب بھی صدقہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب کا وسیلہ ہے، اس لیے آپ نے ان کو بالترتیب یہ مشورہ دیا ـــــ عام اصول اور حکم یہی ہے کہ آدمی پہلے اُن حقوق اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرے جن کا وہ ذاتی اور شخصی طور پر ذمہ دار ہے اس کے بعد آگے بڑھے ـــــ ہاں وہ خاصانِ خدا جن کو توکل و اعتماد علی اللہ کا بلند مقام حاصل ہو اور اُن کے اہل و عیال کو بھی اس دولت میں سے حصہ ملا ہو اُن کے لیے یہ صحیح ہے کہ خود فاقہ سے رہیں، پیٹوں پہ پتھر باندھیں اور گھر میں جو کھانا ہو وہ دوسرے اہل حاجت کو کھلا دیں ـــــ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خواص صحابہ کا حال اور طرز عمل یہی تھا ـــــ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (قرآن مجید الحشر)

اہل قرابت پر صدقہ کی خاص فضیلت:-

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَهِيَ عَلٰى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ ـــــ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی

سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی اجنبی مسکین کو اللہ کے لیے کچھ دینا صرف صدقہ ہے اور اپنے کسی

عزیز قریب (ضرورتمند) کو اللہ کے لیے کچھ دینے میں دو پہلو ہیں اور دو طرح کا ثواب ہے، ایک یہ کہ وہ صدقہ ہے اور دوسرے یہ کہ وہ صلہ رحمی ہے (یعنی حق قرابت کی ادائیگی ہے) جو بجائے خود بڑی نیکی ہے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

عَنْ زَيْنَبَ اِمْرَأَةِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ قَالَتْ فَرَجَعْتُ اِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ فَقُلْتُ اِنَّكَ رَجُلٌ خَفِيْفُ ذَاتِ الْيَدِ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَمَرَنَا بِالصَّدَقَةِ فَأْتِهِ فَاسْئَلْهُ فَاِنْ كَانَ ذَالِكَ يُجْزِئُ عَنِّيْ وَاِلَّا صَرَفْتُهَا اِلٰى غَيْرِكُمْ قَالَتْ فَقَالَ لِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بَلْ اِئْتِيْهِ اَنْتِ قَالَتْ فَانْطَلَقْتُ فَاِذَا اِمْرَأَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ بِبَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجَتِيْ حَاجَتُهَا قَالَتْ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اُلْقِيَتْ عَلَيْهِ الْمَهَابَةُ فَقَالَتْ فَخَرَجَ عَلَيْنَا بِلَالٌ فَقُلْنَا لَهُ اِئْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبِرْهُ اَنَّ اِمْرَأَتَيْنِ بِالْبَابِ تَسْأَلَانِكَ اَتُجْزِئُ الصَّدَقَةُ عَنْهُمَا عَلٰى اَزْوَاجِهِمَا وَعَلٰى اَيْتَامٍ فِيْ حُجُوْرِهِمَا وَلَا تُخْبِرْهُ مَنْ نَحْنُ قَالَتْ فَدَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ هُمَا قَالَ اِمْرَأَةٌ مِنَ الْاَنْصَارِ وَزَيْنَبُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الزَّيَانِبِ قَالَ اِمْرَأَةُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ لَهُمَا اَجْرَانِ اَجْرُ الْقَرَابَةِ وَاَجْرُ الصَّدَقَةِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب سے روایت ہو کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک خطبہ میں خاص طور سے عورتوں کو مخاطب کرکے) فرمایا کہ اے خواتین تم کو چاہیے کہ راہ خدا میں صدقہ کیا کرو اگرچہ تم کو اپنے زیورات میں سے دینا پڑے (آگے زینب بیان کرتی ہیں کہ) میں نے جب حضور کا یہ ارشاد سُنا تو میں اپنے شوہر عبداللہ بن مسعود کے پاس آئی اور میں نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم عورتوں کو خاص طور سے صدقہ کی تاکید فرمائی ہے (اور میں چاہتی ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے اُس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے کی سعادت حاصل کروں) اور تم بھی تنگ حال اور خالی ہاتھ ہو، اب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کرو (کہ اگر میں تم کو دے دوں تو کیا میرا صدقہ ادا ہو جائے گا ——— اگر میرا تم کو دینا صحیح ہو تو میں تم ہی کو دے دوں گی ورنہ دوسرے ضرورتمندوں پر خرچ کر دوں گی ———

کہتی ہیں کہ عبداللہ بن مسعود نے مجھ سے کہا کہ تم خود ہی جاکر حضور سے دریافت کرو، تو میں خود گئی، وہاں پہونچی تو دیکھا کہ انصار میں سے ایک عورت آپ کے دروازہ پر کھڑی ہے اور اس کی غرض بھی وہی ہے جو میری غرض ہے (یعنی وہ بھی یہی مسئلہ معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ہیبت دی تھی (جس کی وجہ سے ہر ایک کو آپ سے دو بدو بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اس لیے ہمیں خود آپ کے قریب پہونچ کر پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی) اتنے میں (آپ کے خاص خادم اور مؤذن) بلال باہر نکلے، ہم دونوں نے اُن سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیجئے کہ دو عورتیں دروازہ پر کھڑی ہیں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہیں کہ اگر وہ اپنے ضرورتمند شوہروں اور اُن یتیموں پر جو خود ان کی گود میں پرورش پا رہے ہیں صدقہ کریں تو کیا یہ صدقہ ادا ہو جائے گا (اور ہم کو اس صدقہ کا ثواب ملے گا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہ بتانا کہ ہم کون دو عورتیں ہیں، ——— بلال آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان دونوں

عورتوں کا سوال آپ کی خدمت میں عرض کیا، آپ نے پوچھا کہ وہ کون عورتیں ہیں؟ بلال نے عرض کیا کہ ایک عورت تو انصار میں سے ہے اور دوسری زینب ہے، آپ نے فرمایا کون سی زینب؟ بلال نے عرض کیا عبداللہ بن مسعود کی بیوی زینب! آپ نے فرمایا ہاں (اُن کا صدقہ ادا ہو جائے گا، بلکہ اس صورت میں) ان کو دوہرا ثواب ملے گا ایک صدقہ کا ثواب اور دوسرا صلۂ رحمی کا ثواب۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَبُوْطَلْحَةَ اَکْثَرَ الْاَنْصَارِ بِالْمَدِیْنَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ وَکَانَ اَحَبَّ اَمْوَالِهٖ اِلَیْهِ بَیْرُحَاءَ وَکَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَدْخُلُهَا وَیَشْرَبُ مِنْ مَاءٍ فِیْهَا طَیِّبٍ قَالَ اَنَسٌ فَلَمَّا اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ قَامَ اَبُوْطَلْحَةَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ وَاِنَّ اَحَبَّ مَالِیْ اِلَیَّ بَیْرُحَاءَ وَاِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالٰی اَرْجُوْ بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللّٰهِ فَضَعْهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَیْثُ اَرَاکَ اللّٰهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ وَاِنِّیْ اَرٰی اَنْ تَجْعَلَهَا فِی الْاَقْرَبِیْنَ فَقَالَ اَبُوْطَلْحَةَ اَفْعَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا اَبُوْطَلْحَةَ فِیْ اَقَارِبِهٖ وَبَنِیْ عَمِّهٖ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کھجور کے باغات کے لحاظ سے مدینہ کے انصار میں سب سے زیادہ دولت مند حضرت ابوطلحہ انصاری تھے اور انھیں اپنے باغات اور جائدادوں میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء تھا (یہ ان کے ایک قیمتی باغ کا نام تھا) اور یہ مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اسی تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کا نفیس پانی شوق سے) نوش فرماتے تھے ـــــ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ـــــ جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (نیکی اور مقبولیت کا مقام تم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی محبوب چیزوں کو تم راہِ خدا میں خرچ نہ کرو) تو حضرت ابوطلحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" اور مجھے اپنی ساری مالیات میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء ہے اس لیے اب وہی میری طرف سے اللہ کے لیے صدقہ ہے، مجھے اُمید ہے کہ آخرت میں مجھے اس کا ثواب ملے گا اور وہ میرے لیے ذخیرہ ہوگا۔ لہٰذا آپ اسکے بارہ میں وہ فیصلہ فرمادیں جو اللہ تعالیٰ آپ کے ذہن میں ڈالے (یعنی جو مصرف اس کا مناسب سمجھیں معین فرمادیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واہ واہ یہ تو بڑی نفع مند اور کارآمد جائداد ہے، میں نے تمہاری بات سن لی اور تمہارا منشا سمجھ لیا) میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اس کو اپنے عزیز و قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کردو، حضرت ابوطلحہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں یہی کروں گا، چنانچہ انھوں نے وہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) بعض روایات میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوطلحہ نے اپنا یہ باغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق اپنے خاص اقارب اُبیّ بن کعبؓ، حسّان بن ثابت، شدّاد بن اوس اور زبید بن جاریہ پر تقسیم کر دیا تھا ـــــ یہ باغ کسقدر قیمتی تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعد میں حضرت معاویہ نے صرف حضرت حسان بن ثابت کا حصہ ایک لاکھ درہم میں خریدا تھا۔

(فائدہ) چونکہ آدمی کا زیادہ واسطہ اپنے عزیزوں قریبوں ہی سے رہتا ہے اور زیادہ تر معاملات انھیں سے پڑتے ہیں اس لیے اختلافات اور تنازعات بھی زیادہ تر اقارب ہی میں

ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس دُنیا کی زندگی بھی عذاب بن جاتی ہے اور آخرت بھی برباد ہوتی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم و ہدایت پر عمل کیا جائے اور لوگ اپنے قرابت داروں پر اپنی کمائی خرچ کرنا اللہ کی رضا کا وسیلہ سمجھیں تو دُنیا اور آخرت کے بڑے عذاب سے محفوظ رہیں، کاش دُنیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کی قدر سمجھے اور اس سے فائدہ اُٹھائے۔

مرنے والوں کی طرف سے صدقہ :-

صدقہ کیا ہے؟ اللہ کے بندوں کے ساتھ اس نیت سے اور اس امید پر احسان کرنا کہ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت اور مہربانی نصیب ہوگی اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا کرم و احسان حاصل کرنے کا خاص الخاص وسیلہ ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح ایک آدمی اپنی طرف سے صدقہ کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ثواب و صلہ کی امید کر سکتا ہے اسی طرح اگر کسی مرنے والے کی طرف سے صدقہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب و صلہ اُس مرنے والے کو عطا فرمائے گا ـــــ پس مرنے والوں کی خدمت اور اُن کے ساتھ ہمدردی و احسان کا ایک طریقہ اُن کے لیے دُعا و استغفار کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے یا اسی طرح ان کی طرف سے دوسرے اعمالِ خیر کرکے ان کو ثواب پہونچایا جائے۔ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث پڑھیے!

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اُمِّيْ اُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَاَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَهَلْ لَهَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ نَعَمْ

ـــــــــــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میری والدہ کا بالکل اچانک اور

دفعۃً انتقال ہوگیا اور میرا گمان ہے کہ اگر وہ موت واقع ہونے سے پہلے کچھ بول سکتیں تو وہ ضرور کچھ صدقہ کرتیں تو اب اگر میں اُن کی طرف سے صدقہ کردوں تو کیا اس کا ثواب ان کو پہونچ جائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں پہونچ جائے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ تُوُفِّيَتْ اُمُّهٗ وَ هُوَ غَائِبٌ عَنْهَا فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّيْ تُوُفِّيَتْ وَ اَنَا غَائِبٌ عَنْهَا اَيَنْفَعُهَا شَيْءٌ اَنْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنِّيْ اُشْهِدُكَ اَنَّ حَائِطِي الْمِخْرَافَ صَدَقَةٌ عَلَيْهَا ـــــــــــــــــــ رواہ البخاری

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہ کی والدہ کا انتقال ایسے وقت ہوا کہ خود سعد موجود نہیں تھے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گئے ہوئے تھے، جب ان کی واپسی ہوئی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری عدم موجودگی میں میری والدہ کا انتقال ہوگیا تو اگر میں اُن کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا وہ اُن کے لیے نفعمند ہوگا؟ (اور اُن کو اس کا ثواب پہونچے گا؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں پہونچے گا، انھوں نے عرض کیا تو میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا باغ مخراف اپنی مرحومہ والدہ کے لیے صدقہ کردیا۔ (صحیح بخاری)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ الْعَاصَ بْنَ وَائِلٍ نَذَرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ اَنْ يَّنْحَرَ مِائَةَ بُدْنَةٍ وَاَنَّ هِشَامَ بْنَ الْعَاصِ نَحَرَ حِصَّتَهٗ خَمْسِيْنَ وَاَنَّ عَمْرًا سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَالِكَ فَقَالَ اَمَّا اَبُوْكَ لَوْ اَقَرَّ بِالتَّوْحِيْدِ فَصُمْتَ وَتَصَدَّقْتَ عَنْهُ نَفَعَهٗ ذَالِكَ ـــــــــــــــــــ رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا عاص بن وائل نے زمانۂ جاہلیت میں سو اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی تھی (جسکو وہ پورا نہیں کر سکے تھے) تو اُن کے ایک بیٹے ہشام بن العاص نے تو پچاس اونٹوں کی قربانی (اپنے باپ کی اس نذر کے حساب میں) کر دی اور دوسرے بیٹے عمرو بن العاص نے (جن کو اللہ نے اسلام کی توفیق دے دی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تمھارے باپ ایمان لے آئے ہوتے اور پھر تم ان کی طرف سے روزے رکھتے یا صدقہ کرتے تو وہ ان کے لیے نفعمند ہوتا (اور اس کا ثواب اُن کو پہونچتا۔ لیکن کفر و شرک کی حالت میں مرنے کی وجہ سے اب تمھارا کوئی عمل ان کے کام نہیں آسکتا) (مسند احمد)

تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حدیثوں میں (اور ان کے علاوہ بھی بہت سی حدیثوں میں جو کتب حدیث کے مختلف ابواب میں مروی ہیں) یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ صدقہ وغیرہ جو قابل قبول نیک عمل کسی مرنے والے کی طرف سے کیا جائے یعنی اس کا ثواب اس کو پہونچایا جائے وہ اس کے لیے نفع مند ہوگا اور اس کو اس کا ثواب پہونچے گا، اس راستہ سے ہم اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں قریبوں اور دوستوں محسنوں کی خدمت ان کے مرنے کے بعد بھی کر سکتے ہیں اور اپنے ہدیے اور تحفے انکو برابر بھیج سکتے ہیں۔

مُسنَد حُمَیدی

اہلِ علم کے لیے ایک غیر معمولی تحفہ

امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری کے استاذ خاص امام حُمَیدیؒ کا مرتب فرمایا ہوا مجموعہ حدیث جو پہلی مرتبہ ہندوستان کے فاضل استاذ حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مدظلہ کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

بہترین کاغذ پر اعلیٰ درجہ کے ٹائپ سے چھپائی ہے۔ جلد اول = ۹/ ، جلد دوم = ۹/

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

آخری قسط

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ از ـــــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب ۹۱ :۔ مولانا طاہر بدخشی کے نام ـــــــــ [معرفت اور ایمانِ حقیقی کا فرق]

بعد الحمد والصلوٰۃ و تبلیغ الدعوات ـــــــــ واضح ہو کہ تمہارا مکتوب جو شیخ سبحان دل کے ہاتھ بھیجا تھا پہونچ گیا ـــــــــ الحمد للہ کہ تم سلامتی اور عافیت کے ساتھ ہو ـــــــــ اس مکتوب میں چند سوال تم نے کیے تھے اُن کا جواب جو کچھ معلوم ہو سکا لکھا جاتا ہے ـــــــــ اچھی طرح غور کرنا۔

ایک سوال یہ تھا کہ درمیان معرفت و ایمان حقیقی کیا فرق ہے؟ ـــــــــ اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت (پہچان) اور چیز ہے اور ایمان، دیگر شے ہے ـــــــــ اس لیے کہ معرفت "شناختن" ہے اور ایمان "گرویدن" (مائل ہونا) ہے ـــــــــ ایک جگہ "شناختن" کا وجود ہوتا ہے مگر "گرویدن" کا وجود نہیں ہوتا ـــــــــ (چنانچہ) اہل کتاب کو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معرفت حاصل تھی اور وہ شناخت کرتے تھے کہ یہ پیغمبر ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (اہل کتاب پیغمبر آخر الزماں کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں) لیکن دشمنی و سرکشی کی وجہ سے چونکہ گرویدگی نہ تھی اس لیے ایمان

متحقق نہ ہوا ـــــ اور جس طرح ایمان کی دو قسمیں ہیں، صورتِ ایمان اور حقیقتِ ایمان اسی طرح معرفت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) صورتِ معرفت (۲) حقیقتِ معرفت ـــــ صورتِ ایمان وہی ہے جس کو حضرت حق سبحانہ نے اپنی کمال رافت اور مہربانی سے شریعت کے اندر نجاتِ اُخروی کے لیے کافی قرار دے دیا ہے۔ یعنی صورتِ ایمان "گرویدنِ قلب" ہے، نفسِ امّارہ کے انکار و سرکشی کے موجود رہتے ہوئے ـــــ اور صورتِ معرفت بھی اسی لطیفۂ قلب تک محدود ہے، نفسِ امّارہ کی جہالت کے ساتھ ساتھ۔ حقیقتِ معرفت یہ ہے کہ امّارہ جہالت جبلی سے باہر نکل آئے اور شناسائی کا مقام پیدا کرلے ـــــ اور حقیقتِ ایمان بھی نام ہے امّارہ کی گرویدگی کا درجۂ شناسائی پر پہونچنے اور اپنی طبعی آمادگی و سرکشی سے نکل کر نفسِ مطمئنہ بننے کے بعد ـــــ اگر سوال کریں کہ شریعت میں تصدیقِ قلبی کا اعتبار کیا گیا ہے ـــ یہ "گرویدن" وہی تصدیقِ قلبی ہے یا اُس کے علاوہ اور کوئی شے ہے؟ اگر یہ علاوہ تصدیق کے کوئی اور چیز ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ ایمان میں تین چیزیں معتبر ضروری ہوں۔ (۱) اقرار (۲) تصدیق (۳) گرویدن ـــــ حالانکہ یہ بات علماء کی مقرر کردہ بات کے خلاف ہے ـــــ اس صورت میں عمل جس کو بعض علماء نے ایمان کے اندر اعتبار کیا ہے ایمان کا جزوِ چہارم ہو جاتا ہے ـــــ جواب یہ ہے کہ "گرویدن" بالکل تصدیق ہی ہے اس لیے کہ تصدیق جو کہ حکم ہے اِذعان و یقین کے معنیٰ میں ہے، اسی کو "گرویدن" سے تعبیر کر لیا گیا ہے ـــــ اگر دریافت کریں کہ جب اہلِ کتاب ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بعنوانِ نبوت جانتے تھے لامحالہ وہ آپ کی نبوت کا حکم بھی کرتے تھے اس طرح اِذعان اور گرویدن کا مقام ان کو بھی حاصل تھا اس لیے کہ اس تقدیر پر حکم، عینِ گرویدن ہے ـــــ پس اُن کے حق میں ایمان کس لیے متحقق نہ ہوگا اور کس وجہ سے وہ دائرۂ کفر سے باہر نہ آئیں گے؟ ـــــ جواب یہ ہے کہ وہ بعنوانِ نبوت تو جانتے پہچانتے تھے لیکن بوجہ تعصب و عناد اُن کے قلب کو اِذعان نہیں حاصل ہوتا تھا کہ وہ آپ کی نبوت پر حکم کریں فقط معرفت و تصور کا حصول تھا۔ اذعان حاصل نہیں ہوا تھا کہ تصدیق بن جاتا نیز ایمان تک پہونچاتا اور کفر سے نکالتا ـــــ باریک فرق ہے۔ سنو اور

اپنے وجدان صحیح کی راہ پر گامزن ہو جاؤ ـــــ

عناد و دشمنی کی موجودگی میں نبیٌّ اللہ فَعَلَ کَذَا (نبی اللہ نے ایسا کیا) تو یہ کہا جا سکتا ہے لیکن جب تک اِذعان پیدا نہ ہو اِنَّہٗ نَبِیٌّ اللہ (بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں) یہ نہیں کہا جا سکتا ـــــ اس لیے کہ پہلی صورت میں فقط تصور ہے اور معرفتِ مشہورہ (جو معرفت لوگوں میں مشہور ہے) کا حوالہ ہے اور دوسری صورت میں تصدیق ہے جو کہ اِذعان و گرویدن پر مبنی ہے۔ جب تک اِذعان نہ ہو تصدیق کہاں سے رونما ہوگی؟ نیز صورتِ اولیٰ میں مقصود، اثباتِ نبوت نہیں ہے۔ بلکہ نبی کے فعل کا اثبات ہے اور صورتِ ثانیہ میں مقصود، اثباتِ نبوت ہے جس کو جذبۂ عناد و دشمنی برداشت نہیں کر سکتا ـــــ پس (پہلی صورت میں) اذعان کس طرح ہو سکتا ہے ـــــ اور اگر فرض کر دیے حصول اِذعان، تصدیق و حکم پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بھی داخلِ تصورات اور محض) صورتِ تصدیق ہے۔ جب تک اذعان نہ ہوگا اس وقت تک حقیقت تصدیق رونما نہ ہوگی اور ایمان حاصل نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ اصولِ مسائلِ کلام میں سے ہے اور بہت باریک مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے علماء اس کے حل کرنے میں عاجز ہو گئے ہیں اُن میں سے بعض نے مجبوراً رکنِ ثالث کو ایمان میں بڑھایا ہے اور "گرویدن" کو زائد بر تصدیق قرار دیا ہے۔ اور ایک دوسری جماعت نے بھی جس نے تصدیق کو عینِ گرویدن کہا ہے اس معمّا کو اچھی طرح حل نہیں کیا ہے اور اجمال پر اکتفا کر لیا ہے ـــــ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ (اللہ کی حمد ہے جس نے ہم کو اس کی ہدایت دی اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا تو ہم راہ یاب نہ ہوتے) ـــــ سُنو سُنو مُرکّبِ اضافی جیسے نبیُّ اللہ اور مُرکّبِ توصیفی جیسے ھٰذَا النَّبِیُّ یہ دونوں مُرکّب ہر چند اس حکم کو متضمن ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں اور مشتمل ہیں عنوانِ نبوت کے ساتھ معرفت پر ـــــ لیکن اس امر کی تصدیق کا حاصل ہونا کہ بیشک آپ نبی ہیں یہ اِذعان پر موقوف ہے جو کہ مُثبتِ ایمان ہے ـــــ غلامُ زَیْدٍ فَعَلَ کَذَا (زید کے غلام نے فلاں کام کیا) اور رَجُلٌ صَالِحٌ حَکَمَ بِکَذَا (نیک مرد نے فلاں حکم لگایا) یہ دونوں

جملے بے اذعان کے ثابت اور صحیح ہیں اور دونوں میں عنوان غلامیت اور عنوان صلاحیت کی معرفت ثابت ہے لیکن ان میں اذعان نہیں ہے کہ ہر ایک کی غلامیت و صلاحیت کی تصدیق حاصل ہو جائے۔

مکتوب (۹۹) - جناب سیادت مآب ارشاد پناہ میر محمد مومن بلخی کے نام۔

[اکابر ماوراء النہر[عہ] کے برکات کے بیان میں]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ (جس نے انسانوں کا شکریہ ادا نہ کیا اُس نے اللہ کا شکر نہیں کیا) حقوق علماء و مشائخ ماوراء النہر ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور کرے ـــــ ہم پسماندگان و دور افتادگان بلکہ تمام اہل اسلام ہندوستان کے اوپر اس قدر ہیں کہ احاطہ تحریر و تقریر میں نہیں آسکتے ـــــ ہم نے اہلسنت و جماعت کے آرائے صحیحہ کے مطابق، درستی اعتقاد کو انھیں (ماوراء النہری) بزرگوں کی تحقیقات سے اخذ کیا ہے۔ مسلک علماء حنفیہ کے موجب صحت عمل کو بھی انھیں بزرگوں کی تدقیقات سے حاصل کیا ہے۔ نیز مسلوک طریقۂ نقشبندیہ بھی اس ملک ہندوستان میں اسی سرزمین ماوراء النہر کی برکات سے ماخوذ ہے ـــــ اور مقام جذبہ و سلوک، فنا و بقا، سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کی تحقیق، کہ ولایت خاصہ اس سے وابستہ ہے ـــــ اسی مقام کے اکابر کے فیوض سے مستفاد ہے ـــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواہ ظاہر کی اصلاح ہو یا باطن کی فلاح ہم کو اسی جگہ سے حاصل ہوئی ہے ؎ ـــــ

شکر فیضِ[عہ] تو چمن چوں کند اے ابرِ بہار
کہ اگر خار و اگر گل ہمہ پروردۂ تست

اللہ تعالیٰ اس علاقے کو اور یہاں کے رہنے والوں کو آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔ بحرمۃ سید السادات صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ

عہ چوں کہ ملک توران جس میں نہر بھی ہے دریائے جیحون سے دوسری طرف واقع ہے اس لیے ایرانی ملک توران کو ماوراء النہر کہتے ہیں۔

عہ اے ابر بہار تیرا شکریہ چمن کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ چمن کے خار ہوں یا گل سب تیرے ہی پرورش کیے ہوئے ہیں۔

اس فضیلت و برتری کے باوجود ـــــ وہ احباب جو اپنی بعض ضروریات کے سلسلے میں اُس دیار سے ہندوستان آتے ہیں وہاں کے بابرکت حضرات کے الطافِ کریمانہ کا تذکرہ خصوصاً آنجناب کی عنایات کا جو اس احقر کے حال پر ہیں ـــــ ذکر کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ آنجناب کو مجھ سے حسنِ ظن ہے اور میرے بعض علوم و معارف کو آنجناب نے مطالعہ کر کے پسند فرمایا ہے۔ بزرگوں کی اس قسم کی بشارت، باعثِ ازدیادِ امیدواری ہو جاتی ہے۔ بعض اذواق و مواجید کے لکھنے کی ہمت دلائی ہے ـــــ ان آیام میں شیخ ابوالمکارم صوفی وہاں سے آئے ہوئے ہیں اُنھوں نے بھی آنجناب کے الطاف اور طرح طرح کی عنایات کا اظہار فرمایا ہے ـــــ بنا بریں جناب عالی کے اخلاقِ عالیہ کو پیشِ نظر رکھ کر چند کلمات کے ذریعے باعثِ دردِ سر بن کر خود کو آپ کی یاد آوری کے حوالے کر رہا ہوں ـــــ اس فقیر کے بعض مسودات کی نقل برادرم خواجہ محمد ہاشم کشمی نے ـــــ جو کہ فقیر کے دوستوں میں سے ہیں ـــــ صوفی ابوالمکارم مذکور کے سپرد کر دی ہے اس لیے اس پر اکتفا کرتا ہوں اور اس عریضے میں از قسم علوم و معارفِ صوفیہ، کوئی بات تحریر نہیں کر رہا ـــــ آپ حضرات کی عنایات و اشفاق سے امید ہے کہ خاص اوقات میں دعائے خیر اور دعائے سلامتی خاتمہ سے فراموش نہیں فرمائیں گے ـــــ رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ـــــ

اس فقیر کی دعاہائے فقیرانہ، جناب پناہ سید میر کرک شاہ، علامۃ الوری مولانا حسن، اور ناصر الشریعۃ حافظ الملۃ قاضی تولک ـــــ ادام اللہ تعالیٰ برکاتہم ـــــ کو پہنچا دیں ـــــ آنجناب کے صاحبزادوں سے بھی فقیر زادے التماسِ دعا کرتے ہیں ـــــ

مکتوب ۱۰۱ ـ شیخ عبداللہ کے نام ـــــ [مذاقِ فلاسفہ کے مطابق آیاتِ قرآن کی تفسیر و تاویل نہ کی جائے]

سلّمکم اللہ سبحانہ وعافاکم عن البلیات ـــــ کتاب تبصیر الرحمٰن[ع۵]

ع۵ یہ کتاب علامہ علی ابن احمد شافعی مہائمی کی تصنیف ہے۔ اس کو تفسیر مہائمی بھی کہتے ہیں۔ علامہ مہائمی اپنے زمانے کے اکابر علماء میں سے تھے اور عارف کامل تھے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ان کی اور بھی کئی تصانیف

(باقی اگلے صفحہ پر)

جو تم نے بھیجی تھی اُس کے بعض مواقع کا مطالعہ کرکے واپس بھیج دیا گیا ــــــ

مکرّما ــــ اس کتاب کے مصنف، مسلک فلاسفہ کی جانب بہت میلان رکھتے ہیں۔ نزدیک ہے کہ وہ حکماء کو انبیاء علیہم السلام کے برابر کردیں ــــ (اس میں) سورۂ ہود کی ایک آیت پر نظر پڑی اس کی تفسیر بطرز حکماء اتمادی کردیا ہے (وہ آیت اور تفسیر یہ ہے) "اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ بِاتفاقِ الانبیاء والحکماء اِلَّا النَّارُ الحسی او العقلی" اخ (آیت کا ترجمہ یہ ہے) یہ (کفار) وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے نار کے کچھ نہیں ــــ (تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ باتفاق انبیاء و حکماء اُن کے لیے آخرت میں کچھ نہیں ہے سوائے حسی یا عقلی آگ کے) ــــ اجماع انبیاء علیہم السلام کے بعد باتفاق حکماء لکھنے کی کیا گنجائش تھی؟ پھر عذاب اُخروی کے سلسلے میں حکماء کے قول کا (کہ نار سے مراد نارِ حسّی نہیں بلکہ نارِ عقلی مراد ہے) کیا اعتبار ہے؟ علی الخصوص جبکہ حکماء کا قول، مخالف قولِ انبیاء علیہم السلام ہو۔ فلاسفہ جو عذاب عقلی ثابت کرتے ہیں اُس سے اُن کا مقصود، عذاب حسّی کا انکار ہے۔ حالانکہ اجماعِ انبیاء، عذاب حسّی کے حق میں منعقد ہوا ہے ــــ (اس کتاب کے) دوسرے مواقع میں بھی آیاتِ قرآنی کی تفسیر موافقِ مذاقِ حکماء کی گئی ہے چاہے وہ اہلِ ملل کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کتاب کا مطالعہ (بغیر امتیازی استعداد کے) ضررہائے خفیہ

ــــ حاشیہ صفحہ گذشتہ ــــ

ہیں۔ غالباً معقولات کی آمیزش کی بنا پر حضرت مجدد کو اس تفسیر پر یہ تبصرہ کرنا پڑا۔ ورنہ اپنے رنگ میں یہ تفسیر ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ ربط آیات میں اس تفسیر کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ مولوی جمال الدین وزیر بھوپال کی مالی اعانت سے یہ کتاب مصر میں دو جلدوں میں چھپ گئی ہے ــــ علامہ بھائی قوم نوائت سے تھے۔ یہ قوم حجاج بن یوسف کے زمانے میں ان کے ظلم سے تنگ آکر عرب سے ہندوستان آگئی تھی اور کوکن کے علاقے میں ساحل بحر پر آباد ہوگئی تھی اسی بنا پر اس کو کوکنی کہا جاتا ہے ــــ علامہ بھائیؒ کی پیدائش ۱۲۷۷ھ میں اور وفات ۲۰ جمادی الآخرہ ۱۳۳۵ھ کو جمعہ کے دن ہوئی۔ آپ کی قبر بھائم علاقہ بمبئی میں ہے ــــ

(نزہۃ الخواطر جلد ۳ ــــ وتذکرۂ علمائے ہند)

بلکہ ضرر ہائے جلیہ سے خالی نہیں ہو ـــــ اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہوئے یہ چند کلمات لکھے گئے

مکتوب (۱۰۲) میر محمد نعمان اکبر آبادیؒ کے نام ـــ [ترغیب مجاہدات و تربیت طالبان حق تعالیٰ کے بیان میں]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ اس طرف کے فقراء کے احوال واوضاع لائق حمد ہیں ـــــ لِلّٰہِ سُبْحَانَہُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃُ دَائِمًا وَعَلیٰ کُلِّ حَالٍ ـــــ عرصہ ہوگیا کہ تم نے اپنے احوال خیر مآل کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ امید ہے کہ اپنی حالت میں (بہتر) تبدیلی کرلی ہوگی اور کاہلی سے عمل کی جانب اور فراغت سے مجاہدہ کی طرف متوجہ ہوگئے ہوں گے ـــ یہ وقت (نیکیوں کی) کاشتکاری کا ہے۔ موسم خورد وخواب نہیں ہے ـــ آدھی رات سونے کے لیے رکھیں اور باقی آدھی رات طاعت و عبادت کے لیے مقرر کریں اگر اس کی ہمت نہیں ہوسکتے تو تہائی رات کی بیداری کو لازم قرار دیں اور کوشش کریں کہ اس دولت کے حصول کی مداومت میں سستی نہ واقع ہو۔ مخلوق کے ساتھ بس اس قدر اختلاط وانبساط رکھیں کہ اُن کے حقوق کی ادائیگی ہوجائے۔ ضرورت کو بقدر ضرورت تک ہی رکھا جاتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ قدر حاجت سے زیادہ تعلق رکھنا فضول بات ہے اور مالا یعنی (لغو) میں داخل ہے۔ بسا اوقات اس پر ضررہائے عظیم مرتب ہوتے ہیں اور یہ بات ممنوعات شریعت وطریقت میں داخل ہوجاتی ہے ـــ مُرشد جب کہ مُریدوں کے ساتھ حد سے زیادہ انبساط واختلاط کا معاملہ رکھے گا یقیناً مُریدوں کو عقیدت وارادت کے دائرے سے باہر نکال دے گا اور اُن کی طلب میں فتور پیدا کرے گا۔ میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ـــ اس امر کی قباحت کو اچھی طرح ذہن نشین کرکے طالبوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک رکھیں کہ ان کے اُنس والفت کا سبب ہو نہ کہ اُن کی نفرت کا باعث ـــ مخلوق سے یکسوئی ضروری ہے کیونکہ بغیر ضرورت مخلوق سے تعلق رکھنا سمّ قاتل ہے۔ تم کو اللہ کی توفیق سے یہ بات بسہولت میسر ہے۔ بجائے عرب وناداری کیا کرسکتے ہیں وہ تو (مجبوراً) برابر ارباب تفرقہ (روٗسار) کے ساتھ جمع ہوتے ہیں ـــ اس نعمت کی قدر جانو اور طالبین کے حالات سے اچھی طرح خبردار رہو اور ظاہر وباطن سے ان کی تربیت کی جانب متوجہ رہو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

شریعت کا "جادہ" قویمہ شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں

(جناب غلام مصطفےٰ صاحب قاسمی)

[حیدرآباد (پاکستان) سے الرحیم نامی ایک ماہوار مجلہ قریب دو سال سے نکل رہا ہے جس کا مقصد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم و معارف کی اشاعت ہے۔

ذیل کا مضمون اس کے فاضل مدیر کے قلم سے ہے رسالہ کی علمی افادیت کی بنا پر ہماری خواہش تھی کہ اس پر الفرقان میں تبصرہ کے ذریعہ اپنے ناظرین کو متعارف کرائیں۔ یہ تو نہ ہو سکا۔ البتہ اس مضمون کی اشاعت سے اس کے فی الجملہ تعارف کی تقریب بن رہی ہے۔

ادارہ]

شریعت کے لغوی معنی اگرچہ راہ، راہ، منہاج اور پانی کا گھاٹ وغیرہ آئے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں شریعت سے مراد وہ الٰہی احکامات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اتارا ہے تاکہ وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ اور ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرے۔

شریعت کے یہ احکامات دو قسم کے ہیں۔

۱۔ معتقدات یہ کیفیتِ اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں علم کلام کی تدوین ان احکام کے لیے ہوئی ہے۔

۲۔ وہ احکام جن کا تعلق کیفیتِ عمل سے ہے۔ احکام کی اس دوسری قسم کا نام فرعی اور عملی ہے۔ علم فقہ میں ان ہی احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ احکام کی ان دو اقسام کی تفصیل میں اگرچہ اسلام کے مختلف طبقوں کا اختلاف رہا ہے لیکن اجمالی طور پر یہ سب فرقے اس

پر متفق ہیں کہ شریعت نام ہے اس قانون الٰہی کا جس کو پیغمبر اسلام انسانیت کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لیے اپنے پروردگار کی طرف سے لائے۔ اس لحاظ سے شریعت کے احکام کی اہمیت مسلم ہے اور اکراہ و اضطرار کے علاوہ اس کے کسی ادنیٰ حکم سے انحراف ناروا ہے۔

ائمہ فقہا کی طرف سے شریعت کے ماخذ اگرچہ چار بیان کیے گئے ہیں یعنی کتاب اللہ سنت، اجماع امت اور قیاس مگر سب نے اصل ماخذ کتاب اللہ کو ہی مانا ہے گویا نص صریح کے ہوتے ہوئے کسی بھی دوسری دلیل کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ علمائے اسلام میں سے بعض محققین کی تو یہ رائے ہے کہ احادیث نبوی کا ایک حصہ خود قرآن مجید سے ہی مستنبط اور اس کے لیے بمنزلہ شرح کے ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ایک جگہ حدیث کے علوم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ومن علومه تفسير القرآن والاستنباط منه وهو اعظم العلوم۔ وسنورد عليك منه كفافا۔	اور حدیث کے علوم میں سے ایک علم قرآن کی تفسیر اور اس سے احکام کا استنباط ہے، اور یہ بہت بڑا علم ہے۔ ہم اس سے یہاں کچھ ذکر کرتے ہیں۔
امر الله سبحانه باشياء مطلقه كالصلوٰة، والزكوة۔ وكقوله: سبح اسم ربك الاعلىٰ وسبح بحمد ربك وغير ذلك فوقتها رسول الله صلى الله عليه وسلم باوقات معينة۔ وامر الله بامور كقوموا وكبروا تل ما اوحي اليك واركعوا واسجدوا فبين رسول الله صلى الله عليه	(مثلاً) اللہ پاک نے چند اشیاء کے متعلق اجمالی حکم فرمایا ہے جیسے نماز زکوٰۃ اور جیسے یہ قول باری تعالیٰ کہ تو اپنے بلند پروردگار کے نام سے تسبیح پڑھ اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کر اسی طرح دوسری کئی آیات ہیں۔ اسکے بعد پیغمبر علیہ السلام نے اسکے لیے اوقات معین فرمائے اللہ تعالیٰ نے قیام تکبیر تلاوت قرآن، رکوع اور سجدہ کا حکم فرمایا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام

وسلم انها ارکان الصلوٰۃ۔ نے ان کو اس طرح بیان فرمایا کہ ان سب احکام کو نماز کے ارکان بتائے۔

اسی جگہ آیات قرآنی کی چند دوسری مثالوں کے ذکر کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

ونحن قد تتبعنا جمیع ما وصل الینا من الاحادیث الواردۃ فی کتاب الصلوۃ فوضح لنا انها مستنبطه کلها من کتاب اللہ سبحانه وتعالیٰ استنباطا حکمیا وعسیٰ ان یخطه فی رسالۃ منفردۃ[1]

اور کتاب الصلوٰۃ میں جتنی احادیث وارد ہیں ہمیں ملی ہیں، ان میں غور وفکر کرنے کے بعد ہمیں یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ سب احادیث حکمی استنباط کے ساتھ کتاب اللہ سے ماخوذ اور مستنبط ہیں اور ہم اس موضوع پر ایک جامع اور مستقل رسالہ لکھنے کا خیال رکھتے ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں جب اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور اس کے ساتھ نئے واقعات ومسائل بھی درپیش آئے تو امت محمدیہ کا ایک طبقہ جن کو "مجتہدین" کہا جاتا ہے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی علمی کوششیں شروع کیں۔ ان کو احکام کی علل تلاش کرنا پڑیں، جنہیں شارع علیہ السلام نے بصراحت یا بدلالت فرمایا تھا۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

ان من جملۃ احکام الشرع انه صلی اللہ علیه وسلم عهد الی امته صریحا او دلالۃ انه متی اختلف علیهم نصوصه او اختلف علیهم معانی نص من نصوصه فهم مامورون بالاجتهاد واستفراغ الطاقۃ

من جملہ احکام شریعت کے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بصراحت یا بدلالت یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب ان میں آپ کے منصوص احکام کے بارے میں اختلاف ہو یا آپ کی نصوص میں سے کسی نص کے معنی میں وہ باہم مختلف ہوں تو ان کو حکم ہے کہ اجتہاد

[1] الخیر الکثیر (عربی) صفحہ ۸۶ مطبوعہ مجلس علمی

فی معرفۃ ما ھو الحق من ذلک [1]	کریں اور ان اختلافی احکام اور معانی میں سے امر حق معلوم کرنے میں خوب طبیعت کا زور لگائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء کی یہ متفقہ رائے ہے کہ جس حکم شرعی کو مجتہد اپنی کوشش اور اجتہاد سے استنباط کرتا ہے، وہ شارع علیہ السلام کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ سے لیا گیا ہو، یا وہ اس علت کی طرف منسوب ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ماخوذ ہے۔

شاہ صاحب کے الفاظ میں اسے یوں زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

کل حکم یتکلم فیہ المجتھد باجتھادہ منسوب الی صاحب الشرع علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات اما الی لفظہ او الی علۃ ماخوذۃ من لفظہ [2]	جس حکم میں مجتہد اپنے اجتہاد سے گفتگو کرتا ہو وہ شارع علیہ الصلوات والتسلیمات کی طرف منسوب ہوتا ہو خواہ آپ کے الفاظ مبارک کی طرف منسوب ہو یا اس علت کی طرف جو آپ کے الفاظ سے لی گئی ہے۔

جب ان مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مساعی جمیلہ سے شریعت کے مسائل اور احکام مدون ہو چکے، تو ان سے بلا ضرورت باہر جا کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ شاہ صاحب نے ان مجتہدین کے مذاہب اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے اور ان سے باہر جانے کی ممانعت کے بارے میں ایک جگہ ایک باب باندھا ہے جس کے شروع میں وہ فرماتے ہیں:۔

اعلم ان فی الاخذ بھذہ المذاھب الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ و فی الاعراض عنھا کلھا مفسدۃ کبیرۃ ولحن نبین ذلک	جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی کرنے میں بڑا فساد ہو اور ہم اس بات

[1] عقد الجید تالیف شاہ ولی اللہ ص ۳ مطبوعہ مجتبائی [2] عقد الجید ص ۲۹

بوجوہ [1] کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے ان وجوہ کی تفصیل کے بعد علامہ ابن حزم اندلسی کے تقلید کو حرام قرار دینے پر مبسوط رد فرمایا ہے۔

اسلام کے اوائل دور سے لے کر تیسری اور چوتھی صدی تک شریعت کے بارے میں بڑا اہتمام رہا اور اس سلسلے میں اجتہادی رنگ کی تعلیم بھی جاری رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے صحابہ کو دینی مسائل کی علمی اور عملی تعلیم فرماتے تھے۔ آپ کے چھ صحابہ تو ایسے عظیم مجتہد اور قانون شریعت کے بڑے عالم نکلے کہ آپ کے عہد مبارک میں بھی وہ فتوے دیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ کو پیارے ہو گئے تو دوسرے صحابہ ان فقہاء صحابہ ہی کی طرف شرعی مسائل میں رجوع کرتے تھے۔ پھر تابعین نے صحابہ سے شریعت کی تعلیم حاصل کی اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

مدینہ منورہ چونکہ مہبط وحی تھا پھر تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے آخری دور تک جمہور صحابہ کا مسکن اور مقر مدینہ طیبہ ہی رہا اس لیے مدینہ منورہ کے کئی تابعی بزرگوں نے فقہ و حدیث کے متعلق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے جو متعدد روایتیں اور اقوال منقول تھے ان کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ مدینہ منورہ میں سات فقہاء ایسے ہوئے جنہوں نے فقہ میں عظیم مرتبہ حاصل کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگرچہ صحابی تھے لیکن اپنے والد بزرگوار فاروق اعظم کے فیصلوں کے متعلق فقہائے سبعہ میں سے ایک فقیہ سعید بن مسیب سے دریافت کرتے تھے کیونکہ سعید بن مسیب کو صحابہ کے فیصلوں پر بڑی دسترس تھی۔ [2] ان سات فقہاء کے علوم اور مسائل امام مالکؒ کے اساتذہ اور مشائخ تک پہونچے، جن کو امام دار الہجرہ مالک نے جمع کیا اور ترتیب دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح یہ مذہب ان کی طرف منسوب ہوا جس کو بڑے بڑے علماء دلائل کی بنا پر قرناً بعد قرن مانتے آئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

لانھا رای المدینۃ (ماوی) اور یہ اس لیے کہ مدینہ طیبہ ہر عہد اور

---

[1] عقد الجید ص۳۱ [2] تعلقات الکوثری ص۱۲۳ مطبوعہ مصر

الفقهاء ومجمع العلماء في	ہر زمانہ میں فقہائے اسلام اور علماء
كل عصر ولذلك ترى	کا مسجد اور مادی اور مرکز رہا ہے اور یہی
مالكا يلازم مجتهم[1]	وجہ ہے کہ امام مالک ان کے طریق کو
	نہیں چھوڑتے۔

باقی مذاہب کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ مثلاً کوفہ جس کی بنیاد حضرت فاروق اعظم نے رکھی اور ان کے ارشاد کے مطابق عرب کے مختلف قبائل وہاں بسائے گئے اور جن کی تعلیم کے لیے فاروق اعظم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کی طرف یہ کہہ کر روانہ فرمایا۔ اے اہل کوفہ! عبداللہ بن مسعود جیسے فقیہہ کی تو مجھے بھی ضرورت تھی لیکن میں اپنے اوپر تمہیں ترجیح دے کر اسے تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔

جملہ کتب حدیث اور کتب طبقات عبداللہ بن مسعود کی عظمت شان سے مملو ہیں۔ آپ کے مخصوص تلامذہ میں سے علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، عمرو بن میمون، ربیع بن خیثم اور مسروق شمار کیے جاتے ہیں۔ ..... یہ سب بالعموم اور علقمہ بالخصوص حضرت ابن مسعود کے فیض صحبت سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔ بقول علامہ ذہبی یہ کسی دوسرے صحابی کو علم میں ان پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود خلافت فاروق اعظم سے لے کر حضرت عثمان کی خلافت کے آخری دور تک کوفہ میں فقہ اور شریعت کی تعلیم دیتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کوفہ فقہاء سے بھر گیا اور جب حضرت علیؓ نے اپنے دارالسلطنت کو کوفہ کی طرف منتقل کیا تو وہ کوفہ میں فقہا کی کثرت کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔

رحم الله ابن ام عبد (ابن	اللہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود)
مسعود) قد ملاء هذه القرية	پر رحمت فرمائے۔ تحقیق اس نے اس
علماً[2]	شہر کو علم سے مالا مال کر دیا۔

اس کے بعد سیدنا علیؓ کے علوم سے بھی اہل کوفہ مستفید ہوتے رہے۔ پھر تو یہ شہر کثرت فقہاء

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۵ طبع مصر [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

محدثین و مفسرین اور علوم لغت عربیہ کے لحاظ سے جملہ بلاد اسلامیہ میں بے مثال شہرت کا مالک بن گیا۔ اور اس کے حضرت علیؓ کے دار الخلافت بننے سے بڑے بڑے فقہا نے اس میں سکونت اختیار کی اور اس شہر کی علمی وقعت بہت بڑھ گئی۔ صرف کوفہ میں بروایت عجلی پندرہ سو صحابہ کرام نے سکونت اختیار فرمائی تھی۔ اور وہ صحابہ ان کے علاوہ ہیں جو کوفہ کے گرد و نواح یا عراق میں سکونت پذیر ہوئے۔

اب اگر سیدنا علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ کی فہرست تیار کی جائے تو اس کے لیے ایک ضخیم دفتر چاہیے۔ یہ تو سب ائمہ حدیث کے ہاں مسلّم ہے کہ صحابہ کرام عبداللہ بن مسعودؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے شباہت رکھنے والے سمجھتے تھے۔ بالکل اسی طرح ابن مسعودؓ کے مخصوص شاگرد علقمہ کے متعلق تابعین کی یہ رائے تھی کہ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کی سیرت کے حامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ان تلامذہ کی تعلیم اور تربیت سے ابراہیم نخعی، ابو اسحاق سبیعی، اعمش اور منصور جیسے ائمہ پیدا ہوئے۔

حافظ ذہبی، ابو داؤد سجستانی کے تذکرے میں بعض ائمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سیرت میں علقمہ سے شباہت رکھتے تھے۔ علقمہ عبداللہ بن مسعود سے اور عبداللہ بن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شباہت رکھتے تھے۔ نقاد ان حدیث نے تو ابراہیم نخعی کے مراسیل کو بھی صحیح مانا ہے۔ امام شعبی کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ رائے بھی سن لیجیے۔

ھو احفظ لھا منی وان کنت	یعنی شعبی مغازی کو مجھ سے زیادہ یاد رکھنے
قد شھدتھا مع رسول اللہ	والا ہے اگرچہ میں ان مغازی میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلّم	صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔

اس جماعت فقہا کی صحبت اور تربیت سے امام ابو حنیفہ پیدا ہوئے۔ ان فقہا کے آثار کو امام ابو حنیفہ کے دو بڑے شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد نے جمع کیا اور کچھ آثار مصنف ابن ابی شیبہ میں مدون ہوئے۔ امام ابو حنیفہ نے اس طریقہ میں ایک اور تحقیقی اضافہ کیا اور وہ یہ کہ ان ائمہ فقہاء کے آراء اور علوم کو چالیس تلامذہ (جو کہ بذات خود بہت بڑے فقہا تھے) کی مجلس شوریٰ کے سامنے بحث و تمحیص کے لیے رکھا اور بحث و تحقیق کے بعد جو رائے متفقہ یا کثرت آراء

سے منظور کی جاتی تھی اس کو مدون کیا جاتا تھا۔ اور پھر یہ سب آراء امام محمدؒ کی کتب ظاہر الروایۃ میں مدون ہو گئیں۔ خطیب بغدادی ابن کرامہ کی سند سے لکھتے ہیں کہ ہم ایک دن وکیع کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے کسی مسئلے کے متعلق یہ کہا کہ ابو حنیفہ نے اس میں خطا کی۔ یہ سن کر وکیع فرمانے لگے کہ ابو حنیفہ کیسے خطا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ابو یوسف اور زفر جیسے قیاس کے ماہر تھے۔ یحییٰ بن ابی زائدہ اور حفص بن غیاث جیسے حفاظ حدیث تھے قاسم بن معن جیسے لغت عربیہ کے ماہر تھے، اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد اور متورع تھے جس شخص کے اس قسم کے ہم نشیں ہوں وہ خطا نہیں کریں گے اور اگر خطا کرتے تو یہ سب اس کی تردید فرماتے[1] امام ابو حنیفہ کے بعد امام شافعیؒ آتے ہیں۔ انھوں نے مدینہ طیبہ اور کوفہ کے علوم کے ساتھ مکہ مکرمہ کے علوم کو ملا دیا۔ امام شافعی نے مکہ کے علوم کو مسلم بن خالد سے حاصل کیا۔ انھوں نے ابن جریج سے اور ابن جریج نے عطاء سے اور عطاء نے ابن عباسؓ سے یہ علوم حاصل کیے۔ یہاں تک تو ائمہ اہل سنت کے مذاہب فقہ کے متعلق مختصر عرض کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جملہ مذاہب فقہ قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہیں اور اجتہادی مسائل میں ہر ایک امام کا طرز استنباط دوسرے سے الگ ہے۔ اس میں طبائع اور خطوں کے اختلاف کو بھی بڑا دخل ہے جس کی علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں تصریح فرمادی ہے لیکن آج کا دور ان اختلافات اور امت کے تشتت و افتراق کا متحمل نہیں ہو سکتا چاہے ہم نئے دور کے تقاضوں سے کتنی ہی چشم پوشی کریں اور ان سے آنکھیں بند کر لیں اور کوشش کریں کہ انھیں نہ دیکھیں لیکن حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہو گی اور ہماری اس چشم پوشی سے قوم کا نوجوان طبقہ کبھی مطمئن نہیں ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ طبقہ علماء میں سے بصیرت اور غائر نظر رکھنے والے علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے، ہمارے بزرگ و دوست اور وقت کے محدث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے اس سلسلے میں پہل فرمائی ہے۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء

شاہ ولی اللہ صاحب کی مولفات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اپنے دور میں ان اختلافات سے خوش نظر نہیں آتے اور جیسے موصوف نے تصوف کے مختلف مشارب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش فرمائی۔ اسی طرح فقہی اختلافات کو کم کرنے کے بھی وہ بڑے کوشاں تھے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۴۶

آپ کی تصنیفات میں تطبیق کا یہ پہلو اکثر نظر آئے گا۔ اس لیے آپ کو شریعت کے "جادۂ قویمہ" کے تعین کے لیے بھی سوچنا پڑا اور آپ نے اس سلسلہ میں اپنی مشہور تالیف تفہیمات الٰہیہ میں جو تحقیق فرمائی ہے اس کو ہم قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یہاں طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے اصل عبارت کو چھوڑ کر صرف ترجمہ پر اقتصار کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"دنیا کا مختلف طرق اور مذاہب میں بٹ جانا اور امت کا گروہ در گروہ ہونا ایک ایسا بڑا سانحہ ہے جس نے امت کے عوام اور خواص دونوں کو ڈرا دیا ہے۔ بعض اہل اللہ پر فقہائے اسلام کے ہر قول کا ارتباط شریعت محمدیہ سے منکشف تو ہوا لیکن اس کے لیے اس جادۂ قویمہ کا انکشاف نہ ہوا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے منکشف کیا اور اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوئے۔ (اصل میں) جس کو یہ طریقہ ہاتھ آیا، اس نے حظ وافر پایا اور جس نے اس کو نہ پایا وہ اس حظ وافر کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اگرچہ تکلیف اٹھانے کی وجہ سے وہ بھی ماجور ہوگا۔ اس قسم کے اہل اللہ فقہا کے بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کے بارے میں خاموش رہے اور مختلف اقوال کے درمیان تطبیق دینے کی صورت نکالی کہ اختلاف کو عزیمت اور رخصت پر حمل کیا (اور یہ کہا کہ) جو شخص عزیمت کی ادائیگی پر قوت رکھتا ہے تو عزیمت پر عمل کرے اور جس کی قوت جسمانی یا قوت روحانی اس کا تحمل نہیں کر سکتی تو وہ رخصت کو اختیار کرے۔ شعرانی نے (اپنی کتاب) میزان میں اس کو مفصل بیان کیا ہے اور شعرانی سے پہلے اس اصل اور قاعدے کی طرف شیخ محی الدین محمد بن علی بن عربی نے سبقت فرمائی ہے۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی گزرے ہیں کہ ان کو شریعت کا وہ جادۂ قویمہ نظر آیا جو کہ ظاہر شریعت کی طرف رہنمائی کرتا ہو اور وہ طریقہ جس کو جمہور مسلمانوں نے کبار تابعین سے اور تابعین نے کبار صحابہ سے اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حاصل کیا ہے جیسے کوئی چیز ہاتھ کے ذریعہ لی جائے۔ یا اگرچہ وہ بعینہ متوارث نہ ہو، لیکن متوارث سے قوی مشابہت رکھتی ہو اور ایسے شخص کو اہل الرائے کے مذاہب کنارہ کی طرح نظر آئے پھر اس بحث کنندہ متکلم دین کی نصرت اور اس سے مدافعت کا خیال کرتے ہوئے (اپنے زعم میں) راجح کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ طریقہ اکثر محدثین کا ہے، انھوں نے اس میں بڑی سعی فرمائی۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی ہیں جن کو (مذکورہ) دونوں باتوں پر اطلاع ہوئی۔ انھوں نے سب مذاہب کو اس طرح مانا کہ سب شریعت کے دائرہ میں داخل ہیں اور ان پر عمل کرنے کی دین میں گنجائش ہے مگر ان میں سے فضیلت جادۂ قویمہ کو ہے۔ اور یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کامل طور پر مرضی اور پسندیدہ ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ مجھے اس نے تیسری جماعت میں سے بنایا۔ اور میرے لیے شریعت کی اصل اور تبیان کو منکشف فرمایا۔ یہ تبیان وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لتبین للناس ما نزل الیھم یعنی تم لوگوں سے اس کو بیان کرتے رہو جو کہ لوگوں کی طرف اترا ہے۔

اس کی مثال (اس طرح سمجھیے کہ) اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ یعنی نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اقامت کا لفظ "قامت السوق" کے عربی محاورے سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بازار لگ گیا۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بازار میں خرید و فروخت شروع ہو جائے۔ اس سے یہاں مقصد ہے رواج اور اشاعت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد تروتیج کو اس طرح بیان فرمایا کہ اوقات نماز کی تعیین فرمائی۔ رکعات نماز کے عدد بتلائے صفت (یا ہیئت) نماز کی تعلیم فرمائی۔ اذان کو مشروع فرمایا۔ جماعت سے نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ مساجد کی تعمیر اور ان میں حاضر ہونے کو مستحب قرار دیا۔ یہ تمام چیزیں "اقامت صلوٰۃ" کی تبیان اور تفسیر ہیں۔ اگر اس طرح واضح اور مفصل بیان نہ ہوتا تو ہم اس کو کبھی سمجھ نہ سکتے اسی طرح زکوٰۃ دینے کو اس طرح بیان فرمایا کہ نصاب کی تعیین کی اور مقدار واجب، جنس واجب اور دوسری چیزوں کو واضح فرمایا۔

اس کے بعد پھر اس تبیان اور تفسیر کی وضاحت اور تفسیر صحابہ اور تابعین کی طرف سے ہوئی۔ اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اشارہ بھی فرمایا۔ اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ یعنی میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کریں اور یہ فرمایا: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ میرے صحابہ ستاروں کی طرح (روشن) ہیں جس کسی کی پیروی کرو گے تو راستہ پاؤ گے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

سفر میں نماز کو قصر فرمایا۔ سفر ہمارے ہاں مبہم چیز تھی۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباسؓ کے عمل سے اس کی وضاحت ہوگئی کہ وہ چار برد یا منازل سے عبارت ہے۔

اس کے بعد پھر قدمائے مجتہدین کے ہاتھوں اس کی وضاحت اور اس کے اصول اور فروع کی تدوین ہوئی۔ جس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق الایۃ

اس آیت میں صرف تین اعضاء کے دھونے اور چوتھے کے مسح کا ارشاد ہے۔ یعنی چہرہ ہاتھ کہنیوں تک اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا جائے اور سر کا مسح کیا جائے۔ اب مجتہدین نے اس میں اس طرح بحث کی کہ غسل کے معنی ہیں صرف پانی کا بہانا یا اس میں دلک بھی شرط ہے اور وجہ یا چہرے کی حد فلاں جگہ سے فلاں تک ہے۔ اور "الی المرافق" کے معنی ہیں "مع المرافق" یعنی کہنیوں کے ساتھ۔ اور مسح میں صرف مسح کا نام کافی ہے۔ اگرچہ ایک یا دو بال پر ہی ہو یا رُبع راس (چوتھائی سر) پورے سر کا مسح ضروری ہو۔ (اس طرح یہ مذاہب وجود میں آئے اسکے بعد ہر مذہب کے پیروکار متاخرین فقہا نے ائمہ مذاہب کے قواعد کو سامنے رکھ کر ان سے دوسرے مسائل کی تخریج کی اور ان مذاہب کی شرح بیان فرمائی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ میرے لیے یہ تمام چیزیں جس طرح نفس الامر میں اپنی ترتیب سے واقع ہیں، اس طرح واضح کی گئی ہیں جیسے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اور دین میں جو بھی کچھ کہا گیا ہے اس کو میں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اصل شریعت میں پایا۔ (مذاہب کے) اس اختلاف کے متعلق یہ گفتگو کتنی صادق آتی ہے کہ اس کی مثال ایک درخت کی ہے جس سے بڑی بڑی ٹہنیاں پھوٹیں۔ پھر ان ٹہنیوں سے دوسری چھوٹی ٹہنیاں نکلیں اور ٹہنیوں پر پتے اور پھول نکل آئے۔ یا اس کی مثال ایک ایسے پانی کے چشمے کی ہے جس سے بڑی نہریں نکلیں اور بڑی نہروں سے دوسری چھوٹی چھوٹی نہریں نکلیں اور ان چھوٹی نہروں سے باغوں کو بھرا گیا۔ اور اس سے زمین بھی سیراب ہوگئی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں (کہ جادۂ قویم کے سلسلہ میں) میرے لیے شاہراہ اور وسط طریق کا بھی انکشاف ہوا، جس کی رات (بھی) اس کے دن کی طرح روشن ہے۔ اس کا اوّل آخر کی طرح ہے اور ان مخفی اور مٹے ہوئے آثار کے راستے بھی معلوم ہوئے جن پر چل کر آنحضرت صلعم

اور ان کے صحابہ کے راستے تک کبھی رسائی نہیں ہوتی۔ جب تک رائے سے کام نہ لیا جائے اور اوہام اور ایسے شخص کی تقلید کے بار سے آزاد نہ ہو، جو خطا اور ثواب کا حامل ہے اور اس کے صحیح اور مخطی قول سے تخریج ہوتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جب رائے سے کام لیا جائے اور اوہام اور ایسے شخص کی تقلید کا بوجھ اٹھایا جائے جو خطا اور ثواب کا صاحب ہو اور پھر مصیب اور مخطی کے قول پہ تخریج کا بوجھ اٹھانا پڑے۔

میرے لیے اس رائے کی حقیقت بھی منکشف کی گئی جس کی سلف نے مذمت کی ہے اور چند فقہار کو اس کی طرف منسوب کیا ہے۔

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنیؒ کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابیطس اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے قیمت دس تولہ 3/8 پانچ تولہ 2/

شربت جذام جذام میں یہ دوا بیحد مفید ہے پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے سے یہ مرض دفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ -/5

شربت کند پتہ کی پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے قیمت ایک پونڈ 3/8

شربت درد گردہ پیشاب میں پتھری ریت آنا اور جلنگ پیدا ہو جانا یا رک رک کر پیشاب آنا یا درد کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجیے جن کی تکالیف پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں بعض کمی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ -/5

مرہم سرخ پھوڑوں، خصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے اسکے استعمال سے علیحدہ کا ذریعہ ہو جاتی ہے اور پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے۔

منیجر حسنی فارمیسی، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



روزہ

ایک تقریر جو گزشتہ رمضان میں کی گئی تھی

از جناب حیدالدین خاں صاحب

رمضان کا مہینہ روزے کا مہینہ ہے۔ اس مہینے کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ "یہ ایک ایسا مہینہ ہے جس کا پہلا حصہ رحمت ہے، اس کا دوسرا حصہ مغفرت ہے اور اس کا آخری حصہ آگ سے نجات دیتا ہے۔" اس وقت ہم اسی مبارک مہینے سے گزر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے لیے موقع ہے کہ وہ اس مہینے کی سعادتوں کو حاصل کرے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کے حق میں حدیث کے یہ الفاظ پورے ہوں۔ اور اس مہینے کی رحمتوں اور برکتوں میں اس کو پورا پورا حصہ ملے۔ ایسا شخص حدیث کی پیشن گوئی کے مطابق عنقریب اُس سے اس طرح نکلے گا کہ وہ دوزخ، اس پر حرام کر دی گئی ہوگی اور جنت اس کے لیے واجب ہو چکی ہوگی۔ اللہ ہم سب کو اپنے ان خوش نصیب بندوں میں شامل فرمائے۔

روزہ کے لیے اسلام میں "صوم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ صوم کے معنی ہیں ٹھہرنا، رک جانا۔ عربی میں کہتے ہیں صامت الریح (ہوا رک گئی)، ماء صائم (ٹھہرا ہوا پانی)۔ لغت کے ایک عالم لکھتے ہیں:۔

الصوم ۔ فی الاصل الامساک عن الفعل	صوم کا اصل مطلب ہے رکنا۔ خواہ یہ رکنا
مطعما کان او کلاما او مشیا ولذلک	طعام سے ہو یا کلام سے یا چلنے پھرنے سے
قیل للفرس الممسک عن السیر او العلف	چنانچہ جس گھوڑے کا چارہ اور سفر
صائم، قال الشاعر	(برائے تربیت) روک دیا جائے تو اس
خیل صیام واخری غیر صائمۃ	کو صائم گھوڑا کہتے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں روزہ ایک ایسے عمل کا نام ہے جب بندہ خدا کے حکم سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانا پینا اور بعض دوسری اپنی خواہشات مطلقاً ترک کر دیتا ہے۔ چھوڑنے اور ترک کرنے کا یہ عمل کس لیے ہے، اس کا مقصد قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے:۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔	اے مسلمانوں تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح وہ پچھلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے۔
بقرہ۔ ۱۸۳	——— تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ کی عبادت اس لیے مقرر کی گئی ہے تاکہ ہم میں تقویٰ کی صفت پیدا کی جائے۔ تقویٰ کے معنی ہیں بچاؤ، پرہیزگاری، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزاری جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں، جو اللہ کو غضبناک کرتے ہیں، جو اللہ سے دور کرنے والے ہیں ایسے اعمال سے پرہیز کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ یہاں میں ایک روایت نقل کروں گا جس سے تقویٰ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے:۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ انہ سأل ابی بن کعب عن التقویٰ فقال لہ اما سلکت طریقا ذا شوک؟ قال بلیٰ، قال فما عملت، قال شمرت واجتهدت، قال ذلک التقویٰ۔	حضرت عمر فرماتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابی بن کعب سے پوچھا، تقویٰ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کیا آپ ایسے راستہ سے نہیں گزرے ہیں جہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوں، فرمایا، ہاں گزرا ہوں، انھوں نے پوچھا، پھر اس وقت آپ نے کیا کیا، فرمایا، میں نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے اور اس سے بچتا ہوا گزر گیا۔ انھوں نے کہا۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔
تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۴۰	

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا یہ راستہ جس سے گزر کر ہمیں اپنے رب تک پہونچنا ہے، اس میں ہر طرف ہمارے اتمان کے لیے حرام اور ناجائز چیزوں کی جھاڑیاں اپنے کانٹے اور شاخیں پھیلائے ہوئے ہیں۔ ہماری بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ہم ان جھاڑیوں سے بچتے ہوئے اس راستہ سے گزر جائیں۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو گویا کہ ہم نے تقویٰ کی زندگی پالی۔

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ روزہ ہمیں کس طرح رکھنا چاہیے۔ روزہ رکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کھانا پینا چھوڑنے کے ساتھ ہم نے تمام غلط باتیں بھی چھوڑ دی ہوں جس طرح ہم روزہ توڑنے والی چیزوں سے بچتے ہیں، اسی طرح ہم ان چیزوں سے بچیں جو ایمان خراب کرنے والی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:۔

من صام رمضان وعرف	جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی حدود
حدودہ وتحفظ مما ینبغی لہ	کو پہچانا اور ان باتوں کا لحاظ رکھا جن کا اسے لحاظ
ان یتحفظ کفر ما قبلہ	رکھنا چاہیے، اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے
(ترغیب وترہیب)	جائیں گے۔

جس طرح رمضان میں ایک مہینے کے لیے اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ آپ دانہ پانی منہ میں نہ ڈالیں اسی طرح سال بھر اور ساری عمر کے لیے اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ آپ برے کام اور غلط کارروائیاں نہ کریں ——— کچھ الفاظ ہیں جن کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ ان کو اپنی زبان سے نہ نکالیں، کچھ مناظر کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ آوازوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے اپنے کان سے نہ سنیں، کچھ چیزوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ ان کو نہ چھوئیں، کچھ راستوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے پاؤں ان پر نہ چلیں، کچھ باتوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے دل و دماغ میں جگہ نہ پائیں ——— غرض آپ کے ہر عضو اور پورے وجود سے وہ کچھ چیزوں کا روزہ رکھوانا چاہتا ہے۔ اور رمضان میں آپ کا کھانے پینے کا روزہ اسی وقت مکمل ہوگا جب آپ دوسرے مہینوں کے دوسرے روزے بھی رکھ رہے ہوں۔ جو سال بھر "روزہ دار" رہتا ہے وہی رمضان کے روزے کو پاتا ہے، جو دوسری منع کی ہوئی چیزوں سے رکا رہتا ہے، اسی کا کھانے پینے سے رکنا مقبول ہوتا ہے۔

روزہ اولاً اسی قسم کی "بچاؤ" والی زندگی کی تربیت ہے۔ ایک مہینہ کے لیے چند عادی اور ضروری چیزوں کو محدود وقت میں اللہ کی رضا کے لیے چھڑا کر ہمیں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ اسی طرح ہم ساری زندگی میں ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیں جو ہم کو خدا کی ناراضی کی طرف لے جانے والی ہوں۔ وہ تمام چیزیں جن کو خدا نے حرام قرار دیا ہے یا ان سے منع فرمایا ہے، مسلمان کو ان سے عمر بھر کے لیے روزہ رکھ لینا ہے۔ اور کبھی ان کے قریب نہیں جانا ہے۔ ایسا شخص جس نے روزہ رکھ کر کھانا پینا چھوڑ دیا ہو، مگر اسی کے

ساتھ وہ بری عادتیں نہ چھوڑی ہوں جن کے لیے خدا کی شریعت میں کھلی ممانعت موجود ہے، تو اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں۔ حدیث میں آیا ہے:۔

لیس الصیام من الاکل والشرب انما الصیام من اللغو والرفث۔	روزہ صرف کھانا اور پینا چھوڑنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ لغو اور بیہودہ گوئی کو بھی چھوڑنے کا نام ہے۔

دوسری حدیث ہے:۔

من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ۔	جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

ایک شخص اگر ایک طرف روزہ رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ جھوٹ، گالی، غیبت، چوری اور دوسرے برے کاموں میں بھی پڑا رہتا ہے تو ایسا شخص حقیقۃً روزہ دار نہیں ہے۔ اس قسم کا روزہ حدیث کے الفاظ میں "خدا کی جائز کی ہوئی چیز سے روزہ رکھنا اور اس کے بعد خدا کی حرام کی ہوئی چیز سے افطار کر لینا ہے۔" چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ روزے کے زمانے میں ایک شخص پچھنے لگانے والے سے پچھنے لگوا رہا ہے۔ دونوں روزہ رکھے ہوئے تھے۔ اور اسی کے ساتھ دونوں کسی کی غیبت کر رہے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا:۔

افطر الحاجم والمحجوم	ان دونوں شخصوں نے اپنا روزہ توڑ دیا۔

ایسے ہی روزوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف بھوک و پیاس کا دوسرا نام ہے۔

رب صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع۔	کتنے روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزہ سے بھوک کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

اگر ہم اپنے روزے کو واقعی روزہ بنانا چاہتے ہیں، وہ روزہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ الصوم لی وانا اجزی بہ (روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔) تو اس کی سب سے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ ہم ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیں جن کے متعلق ہمیں معلوم ہو کہ خدا نے ان سے منع کیا ہے۔ ہم عمر بھر کے لیے ایک ایسی زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں جس میں ہم تمام غلط اور

ناجائز باتوں سے روزہ رکھے ہوئے ہوں۔ اس کے بغیر روزہ رکھنا، اپنے آپ کو صرف بھوک پیاس کی مشقت میں مبتلا کرنا ہے کیونکہ ایسی زندگی کے ساتھ روزہ رکھنے کا وہ فائدہ ہرگز نہیں ہو سکتا جس کے لیے روزہ ہمارے اوپر فرض کیا گیا ہے۔

۲۔ مگر "چھوڑنے" کا یہ عمل صرف انھیں چیزوں تک محدود نہیں رہتا جن سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ ان چیزوں تک پہونچ جاتا ہے جن سے روکا نہیں گیا۔ جس طرح روزہ میں آپ دیکھتے ہیں کہ براہ راست جن چیزوں سے روکا گیا ہے وہ تو صرف تین ہیں ـــــ کھانا پینا، ازدواجی تعلقات۔ اور یہ بھی صرف دن بھر کے لیے۔ مگر دن کا یہ عمل رات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور چند چیزیں چھوڑنے کی وجہ سے بقیہ چیزیں بالواسطہ طور پر اس کی زد میں آجاتی ہیں ـــــ نیند میں فرق پڑ جاتا ہے، معمولات بگڑ جاتے ہیں، آرام لینے کا موقع نہیں ملتا، صحت کمزور ہو جاتی ہے۔ پہلے کی طرح آزادی باقی نہیں رہتی۔ اور اس طرح تقریباً پوری زندگی اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ یہی حال دینی تقاضوں کا ہے۔ خدا کا دین ہم سے دو قسم کی قربانیاں مانگتا ہے۔ ایک حرام چیزوں سے بچنا اور دوسرے خدا کے دین کے مطابق ٹھیک ٹھیک زندگی گزارنے اور خدا کے کام میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے کے لیے اپنے جائز حقوق اور جائز خواہشوں میں کمی کرنا۔ اس دوسرے عمل کے بغیر کسی بھی راہ میں پوری طرح اپنا فرض انجام نہیں دیا جا سکتا۔ روزہ جس طرح پہلی قسم کی چیزوں کے "ترک" کا سبق ہے۔ اسی طرح وہ دوسری قسم کی قربانی کی مشق ہے۔ روزے میں آدمی کو ان چیزوں کے بارے میں مشقت میں ڈالا جو اس کا جائز اور فطری حق ہیں، یہ گویا اسی دوسری طرح کی قربانی کا سبق دینا اور اس کا تجربہ کرانا ہے۔ روزہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی راہ میں آدمی کو صرف ناجائز چیزیں نہیں چھوڑنی ہیں بلکہ اس راہ میں اسے جائز چیزوں سے بھی دست بردار ہونا ہے کھانا پینا، لذت اور آرام، یہ سب انسان کے لیے بالکل جائز چیزیں ہیں مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی خدا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، اس وقت ضروری ہوتا ہے کہ مومن اپنی ان واقعی ضرورتوں کو بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ جیسے ایک کامیاب تاجر بعض اوقات اپنی مصروفیتوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ شیو کرنا بھول جاتا ہے۔ بروقت کھانا کھانے کا اسے موقع نہیں ملتا، بستر پر جانے کی نوبت نہیں آتی، تفریحات چھوٹ جاتی ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔ جو شخص قانونی قسم کی حرام چیزوں کو چھوڑنے کے

بعد یہ سمجھ لے کہ اب جو کچھ ہے وہ سب ہمارے لیے جائز ہی جائز ہے۔ وہ کبھی خدا کے دین پر ٹھیک ٹھیک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھانے کے معاملے میں صرف اس بات کا لحاظ رکھے کہ فلاں چیز زہر ہے، اس کو نہیں کھانا چاہیے۔ اور فلاں چیز انسان کی غذا ہے، اس کو کھانا چاہیے۔ اور یہ بھول جائے کہ چیزوں کی مقدار، ان کی نوعیت، موسم اور مزاج کے ساتھ ان کی مطابقت کا لحاظ بھی ناگزیر طور پر ضروری ہے۔ اگر ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بہترین غذا بھی کسی وقت آدمی کو اسی قسم کا نقصان پہونچا سکتی ہے جو کسی زہر کے کھانے سے اسے پہونچتا۔

روزہ میں اور دین کے اس دوسرے تقاضے میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے روزہ کے مہینہ کو شہر الصبر (صبر کا مہینہ) کہا گیا ہے اور روزہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ الصیام نصف الصبر (روزہ آدھا صبر ہے)۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کرنا، مشکلوں کے باوجود اپنی جگہ جمے رہنا۔ گویا روزہ اس بات کی تربیت ہے کہ حق کی راہ میں کبھی کھانا پینا چھوڑنے کا موقع آئے تو وہ کھانا پینا بھی چھوڑ دے۔ لذت اور آرام کے تقاضے ایک طرف کھینچ رہے ہوں اور خدا کا دین دوسری طرف بلا رہا ہو تو وہ لذت اور آرام کی خواہش کو دبا کر خدا کے دین کی طرف بڑھ جائے دین کا کام ٹھیک طور پر انجام دینے کے لیے اپنے معمولات میں فرق کرنا پڑے تو بخوشی اسے گوارا کرلے نہ کہ عادات و معمولات کے اوپر دین کو قربان کر دے۔ روزہ اس بات کا نام ہے کہ آدمی صبر اور برداشت کے ساتھ ہر اس چیز کو قبول کرلے جو دین کی راہ میں اسے پیش آئیں۔ خواہ وہ اپنی ناگزیر ضرورتوں کو چھوڑنے کا معاملہ ہو یا راحت و آرام کو چھوڑنے کا معاملہ۔

بڑی دکان، اونچی ملازمت، پھیلا ہوا کاروبار ـــــ یہ سب انسان کے لیے بالکل جائز ہیں۔ لیکن ان چیزوں میں پھنسنے کی وجہ سے اگر ایسا ہو کہ آدمی وقت پر دلجمعی کے ساتھ نماز ادا نہ کر سکے، اس کے پاس خدمت دین اور تلاوت قرآن کے لیے وقت نہ رہے تو ایسی حالت میں ضروری ہے کہ وہ قناعت کی راہ اختیار کرے، وہ اپنے دنیوی کام کو گھٹائے اور آخرت کے نقصان کو گوارا نہ کرے۔ عمدہ مکان، بہترین لباس، اعلیٰ فرنیچر اور شاندار سواری، یہ سب جائز چیزیں ہیں، ان میں سے کسی چیز کو بھی اللہ نے حرام نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی موجودگی کے معنی اگر یہ ہوں کہ آدمی کے گھر میں بجائے خدا کے انھیں چیزوں کا چرچا ہونے لگے، وہ خدا کی یاد سے آدمی

کو غافل کر دیں، وہ بڑائی اور کامیابی کا جھوٹا احساس آدمی کے اندر پیدا کرنے لگیں، تو اس وقت یہ جائز سامان بھی بت بن جاتے ہیں اور ضروری ہو جاتا ہے کہ انھیں توڑ کر آدمی اپنے آپ کو ان کے فتنہ سے بچائے۔ دنیا کے علوم حاصل کرنا اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ان کے معاشی مستقبل کو بہتر بنانا بالکل جائز کام ہیں لیکن اگر اس تعلیم کی قیمت یہ ہو کہ بچوں کو سر سے پیر تک "مغربی" بنا دینا پڑے، ان کے عقائد متزلزل ہونے لگیں، ان کی عبادات چھوٹ جائیں۔ اسلامی شعائر اور اسلامی آداب سے وہ عاری ہو جائیں، تو ایسی تعلیم شیطان کی شاگردی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی جس سے مسلمان بچوں کو دور رکھنا ضروری ہے۔ دنیا کی لذتیں اور دنیا کے سازوسامان بالکل جائز ہیں لیکن اگر ان کے درمیان اپنے کو رکھنے کی وجہ سے آدمی کا دل سخت ہونے لگے، وہ وہ رقت اور خشیت سے خالی ہو جائے، تو اس وقت ان چیزوں کی حیثیت آکاس بیل کی ہو جاتی ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ درخت کی زندگی بچانے کے لیے اسے کاٹ دیا جائے۔

یہ دوسرا سبق ہے جو روزے سے ہمیں ملتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر دین کا تقاضا ہو تو تمہیں چاہیے کہ نعمتوں کا دسترخوان سامنے ہوتے ہوئے بھی تم ان سے روزہ رکھ لو۔

۳۔ روزہ کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ دلوں میں نرمی اور گداختگی پیدا کر کے اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ تقویٰ اور تعلق باللہ کی لطیف روحانی کیفیت کا حامل بن سکے۔ انسان کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے۔ مادیت اور روحانیت، مگر وہ خدا جس کو ہمیں پانا ہے وہ ایک خالص غیر مادی وجود ہے۔ اس لیے اس کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے وجود کا مادی حصہ زیادہ سے زیادہ دب گیا ہو اور اس کا روحانی حصہ زیادہ سے زیادہ ابھر آیا ہو۔ روزہ ہماری مادی خوراک کو گھٹا کر ہمارے ساتھ یہی عمل کرتا ہے۔ وہ ہماری روحانیت کو بڑھاتا ہے۔ وہ ہماری مادیت کو کم کر کے ہماری حسی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ وہ ہمارے اندر وہ استعداد پیدا کرتا ہے جس کے بعد ہمارے اوپر خالص روحانی تجلیات کا نزول ہو سکے۔

اسی لیے حدیث میں روزے کو زکوٰۃ الجسد کہا گیا ہے۔ یعنی روزہ وہ عمل ہے جس سے جسم کو پاک کیا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں اسی چیز کو "تیسیر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے نزول قرآن کے مہینے میں روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:۔

یریدالله بکم الیسر ولا یریدبکم العسر (بقرہ) خدا تمہارے لیے یُسر فراہم کرنا چاہتا ہے، تم کو عُسر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

"یُسر" کے معنی آسانی کے ہیں یعنی کسی کام کو سہل الحصول بنا دینا اور "عسر" اس کا ضد ہے۔ روزہ بظاہر ایک سختی کا حکم ہے کیونکہ اس میں آدمی کو بھوک پیاس اور بے آرامی کو برداشت کرنا ہوتا ہے مگر یہ سختیاں در اصل سختیاں نہیں ہیں کیونکہ یہ ہماری حسّی قوتوں کو بیدار کرکے ہم کو اس قابل بناتی ہے کہ ہم تعلق باللہ کی دولت کو پاسکیں۔

نزول قرآن کے مہینے کو روزہ کا مہینہ قرار دینے کی مصلحت بھی یہی ہے۔ قرآن بظاہر آج ایک ایسی کتاب ہے جو لفظوں میں لکھی ہوئی ہر گھر میں موجود ہے اور ہر شخص جب چاہے اسے پڑھ سکتا ہے مگر محض اسی طرح الفاظِ قرآن کو دہرا لینے سے کوئی شخص قرآن کو نہیں پا جاتا۔ قرآن وہ عظیم ترین حقیقت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر اس کو پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ بھی کانپ اٹھتا اور پھٹ جاتا۔ ایسی حقیقت سے آشنا ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ محض ایک کتاب پڑھ کر اس کے مطالب کو جان لینا نہیں، بلکہ یہ خدا کے کلام کا بندے کے دل میں جگہ پانا ہے جو کچھ اللہ کے رسول پر اترا تھا، اس کو دوبارہ اپنے قلب پر اتارنا ہے۔

بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے اوپر اپنے احکام نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا تو انھیں ہدایت کی کہ وہ پہاڑ پر جاکر ایک مہینہ تک روزہ رکھیں اور اور عبادت کریں۔ (بعد کو یہ مدت چالیس روز کر دی گئی) اس کا مقصد در اصل ان کے اندر کلام الٰہی کا حامل بننے کی استعداد پیدا کرنا تھا۔ ٹھیک یہی صورت ہمارے ساتھ بھی اختیار کی گئی ہے۔ قرآن مجید جس مہینے میں اترا، اس کو اللہ تعالیٰ نے تمام امت کے لیے روزے اور عبادت کا مہینہ قرار دے دیا۔ یہ حضرت موسیٰ کی طرح ہماری تیس روزہ عبادت ہے تاکہ ہم قرآن کو اخذ کرنے کے قابل ہوسکیں۔ یہ قرآن کی زبان میں ہمارے لیے "تیسیر" کا انتظام ہے۔ اس میں در اصل اس بات کا اشارہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے اس درجے تعلق قائم کرنا چاہیں کہ ان پر اللہ اپنے کلام کے ساتھ اتر آئے۔ وہ اس سے حقیقی طور پر آشنا ہو جائیں ان کو اپنے جسم کو مشقت اور بے آرامی میں ڈال کر اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا، اپنے وجود کے مادی عنصر کو مغلوب کرنا

اور اس کے روحانی عنصر کو ابھارنا وہ ناگزیر عمل ہے جس کے بعد وہ اپنے کو اس کے قابل بنا سکتے ہیں۔

یہ ہے روزہ کی حقیقت۔ یہ ایک مخصوص عمل ہے جس کے ذریعہ ہم دینی حقیقتوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ روزہ کی حالت اپنے اوپر طاری کر کے ہم اپنے آپ کو اسکے لیے تیار کرتے ہیں کہ ہم دینی تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک انجام دے سکیں۔ اب جو شخص اس سے بے خبر ہے کہ روزہ کی حقیقت کیا ہے اور دین کے تقاضوں سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی کامیاب دکاندار کو دیکھے کہ خرید و فروخت اور حساب کتاب کی مشغولیت میں بعض اوقات اس کا کھانا پانی چھوٹ جاتا ہے، اور یہ سمجھ کر کہ بس "کھانا پانی چھوٹنا" ہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ وہ مصنوعی طور پر بھوکا رہنا شروع کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی نقالی سے کوئی شخص کامیاب دکاندار نہیں بن سکتا۔ ایک کامیاب دکاندار کے لیے فاقہ کی نوبت آنا محض ایک علیحدہ عمل نہیں ہے بلکہ اس کی اصل زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو الگ سے لاکر مصنوعی طور پر اس کے اوپر چپکا دی گئی ہو بلکہ وہ اس کے حقیقی وجود اور اس کی واقعی سرگرمیوں کا براہ راست ظہور ہے۔ اسی طرح روزہ وہی روزہ ہے جو آدمی کی اصل زندگی کے ساتھ پوری طرح متعلق ہو گیا ہو۔ جو اس کی اندرونی حالت کا ایک خارجی اظہار ہو، اس کے بغیر محض صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہنا، روزہ نہیں، بلکہ روزہ کی نقل ہے۔ وہ مصنوعی روزہ ہے نہ کہ حقیقی روزہ۔

آثار السُّنن

کی تائید میں القول الحسن فی الرّد علی ابکار المنن و فی تائید آثار السُّنن بفضلہ تعالیٰ چھپ کر شائع ہو گئی ہے صفحات ۱۸۴ ورق ۹۲ سائز ۲۶×۲۰ قیمت مجلد مع محصول ڈاک چار روپیہ صرف۔ پاکستانی حضرات کارڈ لکھ کر دریافت فرمالیں کہ منی آرڈر کہاں بھیجا جائے۔

المشتہر:- فرقانی بن محدث شوق نیموی
ٹیلہ شاہ پیر محمد، لکھنؤ، یو، پی ۳

معارف الحدیث

جلد سوم

معارف الحدیث کی دو جلدیں پہلے تیار ہو چکی ہیں

اب خدا کے فضل سے تیسری بھی تیار ہو گئی ہے جس کا مدت سے انتظار تھا

معارف الحدیث اردو ترجمہ، تشریح کے ساتھ، حدیث نبویؐ کا ایک جدید مجموعہ ہے جو

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ترتیب پا رہا ہے

اس کی تشریحات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دور حاضر کی ذہنی اور فکری کیفیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے ـــ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف کی خاص کوشش پوری کتاب میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابۂ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے کسی درجہ میں قارئین کے دلوں پر بھی وہی اثرات مرتب ہوں۔

جلد اوّل۔ ایمان اور آخرت کے بیان سے متعلق حدیثیں، صفحات ۲۸۸ قیمت مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/۵۰

جلد دوم۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں، صفحات ۳۴۰ " ۵/۵۰ " ۴/۵۰

جلد سوم۔ طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں، صفحات ۵۰۰ " ۸/- " ۷/-

ناشر:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

حجاج کرام کیلئے ضروری اطلاع

مکۃ المکرمہ پہنچنے پر جب آپکو گھڑی خریدنی ہو تو



سارجنٹ واچ



مضبوط رٹام واچ

خریدیئے

خوبصورت ڈزائن چلنے میں دیرپا قیمت میں کفایت

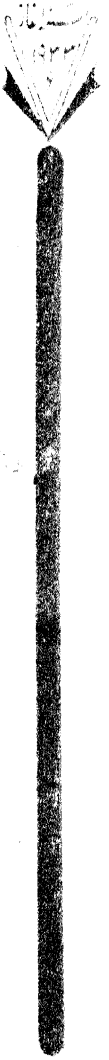
ایک ہی ڈاھر پر

رولیکس، اومیگا، ولیٹ اینڈ، رومر وغیرہ گھڑیاں

خریدنے کیلئے ذیل کے پتہ پر تشریف لاکر اپنا قیمتی وقت بچائیے

المشتھر

باک محل شارع الغزہ مکۃ المکرمۃ



الفرقان لکھنؤ

مرتب

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

(سنبھل)

محمد منظور نعمانی

فی رجسٹر ساٹھ نئے پیسے

معارف الحدیث

جس کا درس انظار الحق (حال مدرس) دارالعلوم [illegible] دیتے ہیں

اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ

حدیث نبوی کا ایک جامع مجموعہ

جلد

مصنف [illegible] کے قلم سے ترتیب پا رہا ہے

اس کا تشریحات کی ایک [illegible] کو [illegible] کی [illegible] کیا گیا ہے

دوسری [illegible] کی [illegible] پورا کرنا [illegible] ہے کہ [illegible]

[illegible] کے [illegible] کے [illegible] پر [illegible] اس [illegible] میں [illegible] کے [illegible]

[illegible] ہوں۔

سائز ۲۰×۳۰ ، روپہ کاغذ ، کتابت ، معیاری طباعت ، نفیس گلیز کاغذ

جلد اوّل — ایمان اور آخرت کے بیان سے متعلق حدیثیں — صفحات ۲۸۸ — قیمت مجلد ۴/- غیر مجلد 4/-

جلد دوم — تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں — صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد ۴/- غیر مجلد 4/-

جلد سوم — طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں — صفحات ۵۰۰ — قیمت مجلد ۷/- غیر مجلد 7/-

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ ۱ — لکھنے کا پتہ — محصول ڈاک علاوہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

فی کاپی ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ مطابق فروری ۱۹۶۵ء | شمارہ ۹

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اوّلیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	دیباچہ معارف الحدیث (جلد سوم)	محمد منظور نعمانی	۹
۳	تجلّیات مجدّد الف ثانیؒ	مولانا نسیم احمد فریدی	۱۷
۴	شریعت کا جادۂ قویمہ	مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی	۲۵
۵	عورت کی سربراہی کی حمایت	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۳۳
۶	انسان۔ جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی	جناب حید الدین خاں صاحب	۴۹-۵۶

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّتِ خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہِ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ فروری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح وتبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہِ کرم خط وکتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے صدارتی انتخاب میں جن لوگوں نے مس فاطمہ جناح کی حمایت یہ کہہ کر کی کہ کم از کم بعض خاص حالات میں تو عورت کو سربراہِ مملکت بنا لینے کا جواز شریعت میں ہے ہی، انھوں نے اپنے اس قول کی تائید میں جتنے معتبر علماء کے بھی فتوے اور فیصلے پیش کئے اُن سب میں کم و بیش یا تو غلط بیانی تھی یا زبردستی کی مطلب برآری۔ سوائے ایک فتوے کے، جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی جناب مولانا سید مہدی حسن نے اسی زمانہ میں بعض لوگوں کے سوال پر دیا تھا ——— اس فتوے میں اگرچہ پردے وغیرہ کی بعض شرطیں ایسے صاف الفاظ میں مذکور تھیں جن کے بعد مس فاطمہ جناح جیسی عورتوں کے مسئلے میں اس فتوے کو دلیل جواز بنانا کسی دیندار آدمی کو زیب نہیں دے سکتا۔ لیکن نفس اس مسئلہ میں کہ کسی عورت کو سربراہِ مملکت بنانے کی شریعت میں اصولی طور پر کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ ——— یہ فتویٰ اُن لوگوں کی پوری تائید کرتا تھا جو گنجائش کے مُدّعی تھے۔ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہمارے نزدیک اس نوعیت کا یہ تنہا فتویٰ تھا۔ اِسکے علاوہ جو فتوے اور عبارتیں قابلِ لحاظ علماء کی اس معاملہ میں پیش کی گئیں وہ محض فنکاری اور سیاسی پروپیگنڈے کا درجہ رکھتی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند ہماری مادرِ علمی ہے، اُسکے دارالافتاء سے ایسے فتوے کا اجرا ہمارے لئے بہت ہی حیرت انگیز اور موجبِ اضطراب تھا۔ اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے طبیعت خط و کتابت کی بھی متحمل نہ تھی۔ انتظار رہا کہ شاید دارالعلوم سے کوئی وضاحت آوے اور معلوم ہو کہ فتوے کی اصل نوعیت

کچھ اور تھی، جسے پاکستان میں کچھ لوگوں کی سیاسی ضرورتوں نے اسی طرح بالکل غلط رنگ دے دیا جیسے دوسرے بہت سے فتووں اور عبارتوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے دفتر سے جو وضاحت اس بارے میں شائع ہوئی وہ کوئی معنی ہی اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ اس وضاحت میں کہا گیا کہ فتوے کے آخر میں یہ شرط بھی درج تھی (جسے اخبارات میں حذف کر دیا گیا ہے) کہ عورت کو (کسی دینی مصلحت کے لئے) صرف اسی وقت سربراہ مملکت بنا لینا جائز ہے جب اس ذریعہ سے اس مصلحت کا حصول یقینی ہو، یعنی ..... ہمارے خیال میں نہ اس شرط کے کوئی معنی تھے اور نہ اس وضاحت کے کوئی معنی! اور جن لوگوں نے اسکے جواب میں یہ کہا کہ پیشگی یقین کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ مستقبل کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ ظن غالب ہی انسان قائم کر سکتا ہے، انھوں نے بالکل ٹھیک کہا۔ بہرحال اس مرحلہ پر ہم نے حضرت مفتی صاحب (مولانا سید مہدی حسن صاحب) کو ایک مفصل خط لکھا، اور ایک طالب علمانہ ذہن سے جو جو اشکالات اس فتوے پر عائد ہوتے تھے پوری صراحت کے ساتھ وہ سب حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

ہمیں بیحد مسرت ہے کہ ہمارے بزرگ مفتی صاحب نے بغیر اس خوف کے کہ اُن کی علمی شان پر کوئی حرف آئے گا، اور بغیر اسکے کہ اس میدان میں اُن کے مخاطب کی کیا حیثیت ہے بلا تاویل و بلا تأمل اپنے فتوے سے رجوع فرما لیا، اور پوری صراحت کے ساتھ رجوع فرمایا ——— حضرت مفتی صاحب کے گرامی نامہ کی نقل حسب ذیل ہے: ———

عزیزی مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ وبارک فی علمکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا کرمنامہ بلکہ ہدایت وسوالنامہ دیوبند سے ہوتا ہوا ۱۰/۹/۸۲ھ کو شاہجہانپور مجھ کو ملا، میں ذوماہ سے بوجہ علالت کے وطن میں ہوں، اُٹھنے بیٹھنے کی دشواری ہے، دعا کا طالب ہوں۔

آپ کی طویل تحریر بدقت پڑھی، اگرچہ میدانِ تحریر وسیع ہے اور کچھ نہ کچھ گوتقلب و توریث ہی کی صورت ہو[1] لکن الحق احق ان یتبع۔ کتابوں کی ورق گردانی اور مطالعہ مفاہیم و

---

[1] اس جملہ کا مطلب سمجھنے میں شاید دقت ہو آگے اس کی شرح کر دی جائے گی۔ ۱۲ مرسل خاطی خلاج کو معاملے میں یہ بات باعث صدمہ تھی۔

صراحت نصوص سے یہی ثابت ہے کہ عورت اسلامی نظریے کے ماتحت صدر مملکت اور سربراہ سلطنت نہیں ہو سکتی، اُس کا حاکم ہونا مردوں پر جائز نہیں ہے۔ اِس بنا پر میں اپنے پہلے جواب سے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے رجوع کرتا ہوں اور اسی کا قائل ہوں کہ شرعاً عورت حکمران با اختیار نہیں ہو سکتی۔ جواب میں بیشک خامی اور کوتاہی مجھ سے واقع ہوئی اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ حق کی طرف رجوع کرنے اور اپنی غلطی کا اقرار کر لینے میں مجھے کوئی باک نہیں۔ مخدومی مولانا منظور صاحب کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد طلب دُعا کی درخواست ہے۔ جواب میں اختصار کا راستہ اختیار کیا ہے طبیعت بھی ناساز ہے اور سوال و جواب کی طوالت سے بھی فریقین کو نجات حاصل ہے۔ والسلام (دستخط)

سید مہدی حسن عفی عنہٗ

جہانتک اصل مسئلہ کا تعلق ہے اُس میں مفتی صاحب کا یہ مکتوب کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں، البتہ شروع میں "تغلّب و توریث" کے الفاظ جس جملہ میں آئے ہیں اُسکے سمجھنے میں شاید عام طور پر قارئین کو دقت ہو۔ اس جملہ کی شرح یہ ہے کہ مفتی صاحب کا جو فتویٰ پاکستان میں استعمال کیا گیا (جو ایک پاکستانی مستفتی کے جواب میں تھا) اسکے علاوہ خود ہندوستان میں بھی کسی صاحب کے جواب میں مفتی صاحب نے جواز ہی کا فتویٰ کچھ مختلف الفاظ میں دیا تھا۔ وہ الفاظ یہ تھے:—

"ایسی عورت جو باپردہ رہتی ہو، نظم و نسق سلطنت اور امور مملکت سے بخوبی واقف ہو، اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہ اور جری ہو، ضرورت اور مجبوری کی صورت میں وہ صدر و زیر بن سکتی ہے۔ ہندوستان میں ایسے نظائر موجود ہیں۔"

ہم نے اس کو بھی سامنے رکھتے ہوئے مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ہندوستان میں جو ایسے نظائر موجود ہیں اُن کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ شریعت میں کس اصول سے معتبر ہوں گے؟ اور پھر دوسری بات یہ کہ وہ نظائر تو پاکستانی مسئلہ سے (جس کے متعلق مستفتی کا سوال تھا) مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ یہاں تو صدر کو اپنی مرضی سے منتخب کرنا ہے جبکہ اُس دور میں حکمراں یا وراثۃً بن جاتا تھا یا تغلّباً (زبردستی قبضے سے) اور ان دونوں صورتوں میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فتنہ و فساد سے بچنے کے لئے فاسق کی طرح عورت کی سربراہی بھی گوارا کر لینا جائز ہے، مگر اُس عورت اور اُسکے معاونین کے فعل کو تو جائز نہیں کہا جا سکتا۔

پھر آخر میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ شاید آپ کے ذہن میں برطانوی عہد کی ویسی ریاستوں کے بعض نظائر رہے ہوں گے، اور اُن کی حد تک آپ کے ارشادمیں کوئی کلام نہیں ہے۔ کیونکہ اوّلاً تو وہ "حکومتیں" نہیں تھیں، چند نمائشی اختیارات اور القاب و آداب کے کھلونے تھے، اور وہ بھی انگریز کے دیئے ہوئے، اور ہر وقت اُسی کے رحم و کرم پر۔ پھر وہاں مجبوری بھی واقعی معنیٰ میں ہوتی تھی کہ ذکور میں سے کوئی بھی وارثِ ریاست نہیں ہے، اور مزید برآں یہ کہ اس صورت میں عورت اگر گدی کو لات ہی مار دے تو صرف اپنا ہی نقصان نہ کرے۔ بلکہ ریاست کے مسلمانوں کو جو تھوڑی بہت آزادی اپنے معاملات میں اس گدی کی بدولت حاصل تھی وہ بھی جائے۔ چنانچہ ان سب باتوں کے لحاظ سے ایسی صورت میں کوئی کلام ہی نہیں ہوسکتا۔

ہماری اس گزارش کے بعد مفتی صاحب کو موقع تھا کہ وہ اپنے فتوے کا محل ایسی ہی نام نہاد حکومت کو قرار دیتے اور اسکے الفاظ میں جو وسعت نظر آتی تھی اُس کی نفی فرما دیتے، یا تغلب و وراثت کی شکل سے مخصوص کرکے اپنے الفاظ کی کوئی تاویل فرما لیتے۔ جملہ ذرا اُلجھا ہوا ہے لیکن ہم اپنے عریضے کی روشنی میں اس کا مطلب یہی سمجھے ہیں کہ مفتی صاحب نے اس جملہ میں ازراہِ حق پرستی تاویل وغیرہ کی گنجائش سے فائدہ اٹھانے اور لوگوں کے لئے کسی غلط فہمی یا حیلہ سازی کی گنجائش چھوڑ جانے سے انکار کیا ہے۔ اللہ اُن کو اس بلند کرداری کی بیش از بیش جزا دے۔ انھوں نے حق کے آگے اپنے کو پست کر دینے کا بہت ہی اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے ——— ہماری حقیر دُعا ہے اور ناظرینِ کرام سے بھی دُعا کی درخواست ہے کہ خداوند موصوف کو علالت کی شکایت سے نجات و دیگر صحت ارزانی فرمائے۔

مفتی صاحب کے فتوے کا وقتی طور پر جو اثر پڑنا تھا وہ تو بیشک پڑ چکا، اور اس لحاظ سے یہ رجوع اور اس کے لئے کوشش کچھ پہلے ہوتی تو بہتر تھا۔ لیکن اس کا دوسرا اچھا پہلو یہ ہے کہ اُس وقت یہ رجوع کسی سیاسی اثر یا مصلحت سے متہم ہوسکتا تھا، اب الحمدللہ اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اسی کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ ہم نے مفتی صاحب کی خدمت میں محض علمی سوالات اور اشکالات پیش کئے تھے کسی خاص جماعت یا کسی خاص گروہ کے فائدہ اُٹھانے کا سوال سامنے رکھ کر نہیں درخواست کی تھی کہ وہ اپنے فتوے پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ مفتی صاحب کے اس رجوع کے بعد کچھ ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اپنا عریضہ بھی سامنے لائیں۔ اب تو اس کی اشاعت نری خود نمائی ہوگی، ورنہ ہم اس کو بھی ناظرین

کے سامنے پیش کر دیتے۔

مفتی دار العلوم دیوبند کے اس فتوے کے علاوہ جو دوسرے علماء اور ائمہ کرام کے اقوال کا حوالہ عورت کی امارت کے جواز میں دیا گیا ہے اُن کا جائزہ ہم اپنے ایک مستقل مضمون میں لے رہے ہیں، جو اسی اشاعت میں شامل ہے، اور اس جائزے سے انشاء اللہ یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہ حوالے یا تو بالکل افتراء اور بہتان ہیں اور یا ان سے زبردستی اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ یہ پورا مضمون اسی اشاعت میں آجائے، لیکن کچھ امکان اس کا بھی ہے کہ دو قسطوں میں کرنا پڑے۔

ناظرین کے علم میں ہے کہ اللہ کے فضل سے "معارف الحدیث" کی تیسری جلد بھی کتابی شکل میں تیار ہو گئی ہے۔ ادارۂ الفرقان کے لئے وہ دن بیحد ہی مسرت اور شکر کا ہوگا جب اس مبارک سلسلے کی تمام جلدیں تکمیل کو پہونچ جائیں گی، اِن شاء اللہ یہ اندازہ ہے اور انشاء اللہ العزیز کتاب کی تکمیل ۱۳۸۳ھ میں ہو جائے گی کہ اللہ نے وقت کے مطابق دین اور اُمت کی ایک بڑی خدمت کی توفیق ادارۂ الفرقان اور اس کے محترم بانی کو عطا فرمائی ہے۔ اس جلد کے پانچ سو صفحات ہیں۔ عمدہ سفید کاغذ اور نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت ——— آئندہ صفحات میں جہاں "معارف الحدیث" کی قسط جایا کرتی تھی اِس دفعہ اس نئی جلد کا دیباچہ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے، تاکہ الفرقان کے صفحات میں بھی اس جلد کی فی الجملہ تکمیل ہو جائے ——— یہ دیباچہ اس جلد کی کتابت و طباعت وغیرہ کا بعینہٖ نمونہ بھی ہے۔

چند قیمتی کتابیں جو خاص کر علماء و طلبۂ علم دین کے کام کی ہیں

لغات القرآن

از مولانا عبدالرشید نعمانی و مولانا عبدالرحیم بلیاوی
قرآنی الفاظ کے معانی و مصداق صرف عام لغت کی کتابوں سے نہیں متعین کیے جاسکتے اسی لیے عربی میں بھی علماء نے صرف لغات القرآن پر مستقل کتابیں لکھی ہیں یہ اردو میں اسی نوعیت کی نہایت مبسوط اور مفصل کتاب ہے۔ چھ ضخیم جلدوں میں مکمل سٹ ۳۷/۵۰ عہ
غیر مجلد ۳۱/۵۰

لغات الحدیث

از مولانا وحید الزماں مرحوم
قرآن پاک کی طرح حدیث کے الفاظ و معانی کا علم بھی علماء اسلام کی توجہ کا مستقل موضوع رہا ہے، یہ کتاب اردو میں اس علم کا ایک قابل اعتماد ذخیرہ ہے۔ طالبان علم حدیث کے لیے ناگزیر۔ مکمل چھ جلدوں میں (مجلد) فی جلد ۱۳/-

مُسند حُمیدی (عربی)

یہ کتاب ہندوستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے اہل علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ امام بخاری کے استاذ امام ابوبکر عبداللہ حمیدی کے مؤلفہ اس مجموعہ حدیث کا پہلا کتابی ایڈیشن ہے جو حرمین کے علمی جہاد دنیا بھر میں نئی چھپنے کتب خانوں کی زینت تھے ہمارے ملک کے نامور عالم حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے مدتوں کی محنت اور جستجو کے بعد ان تمام مزارکو اپنے گرانقدر حواشی کے ساتھ ایک مکمل کتابی شکل دی اور پھر نفیس ٹائپ سے اسکی طباعت کا انتظام کرایا۔ اتنی نایاب علمی دولت صرف اٹھارہ روپے میں۔

جامع ترمذی (اردو)

ترمذی شریف حدیث کی ان چھ کتابوں میں سے ہے جو صحیح ترمانی جاتی ہے۔ اسکی خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی حدیث کا مرتبہ بھی بیان کردیتے ہیں کہ کس پائے کی ہے۔ اور جو فقہی مسئلہ حدیث سے نکلتا ہو اس میں ائمہ کا اختلاف بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں ہوا ہے قیمت مکمل ۱۶/-

انتخاب صحاح ستہ

(اردو ترجمہ مع اصل عربی)
صحاح ستہ کا مطلب وہ حدیث کی چھ کتابیں جو سب سے مستند ہیں۔ اس کتاب میں ان کی آٹھ سو حدیثوں کا ایک انتخاب کردیا گیا ہے۔ مجلد ۵/-

فتاویٰ رشیدیہ

علماء دیوبند میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا جو مقام ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ وہ دراصل مسلک دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں اور اس مسلک کی جیسی بہتر ترجمان یہ کتاب آپ ہی کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ غیر مجلد ۹/۵۰-۸/ مجلد ۹/۵۰۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

مکمل مبوب
دارالعلوم دیوبند کی مسند افتاء پر بڑی بڑی علمی ہستیاں رونق افروز رہی ہیں یہ فتاویٰ کے قلم سے سینکڑوں مسائل پر شرعی احکام کا مجموعہ ہے۔ چار جلدیں غیر مجلد ۲۱/-

امام ابوحنیفہ

شیخ محمد ابوزہرہ (مصری) اسوقت عالم اسلام کے مایۂ ناز عالموں میں سے ہیں۔ اسلامی قانون فقہ ان کا خاص موضوع ہے۔ اسلامی فقہ کے ائمہ پر ان کی کتابیں ہر طرف خراج تحسین پا چکی ہیں اردو میں بھی برابر ان کے ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ یہ امام اعظم ابوحنیفہ پر ان کی گرانقدر کتاب کا ترجمہ ہے جو پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ قیمت مجلد -/15

الجمال والکمال

(تفسیر سورۂ یوسف)
(از قاضی محمد سلیمان منصور پوری)
قاضی سلیمان صاحب اردو کے ایک معروف سیرت نگار رہے ہیں۔ ان کی یہ کتاب گویا قرآن کی بیان کردہ سیرت یوسفی کا عکس جمیل ہے۔ یہ بھی پاکستان کی مطبوعہ ہے۔
قیمت مجلد ۶/-

نور الدرایہ شرح ھدایہ

(فقہ حنفی کی مشہور درسی کتاب ہدایہ کی شرح)
ہدایہ کی شرح عین الہدایہ کو سامنے رکھ کر یہ اردو شرح مولانا محمد نعیم صاحب استاذ دیوبند نے لکھی شروع کی ہے۔ فی الحال چھ حصے۔
قیمت فی حصہ -/۲

مصباح اللغات

عربی الفاظ کے اردو ترجمے کے لیے ایک بے نظیر ڈکشنری۔ جو مقبول ہے۔
قیمت مجلد -/۱۶

چند مفید علمی، دینی اور تاریخی کتابیں

وحیِ الٰہی

(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

وحی کی حقیقت پر ایک محققانہ کتاب، جسکے مطالعہ سے وحی کی صداقت کا یقین دل و دماغ پر طاری ہو جاتا ہے۔ اور نئی تعلیم کے پیدا کردہ شکوک ایک ایک کر کے صاف ہو جاتے ہیں۔ قیمت غیر مجلدہ -/۳ مجلدہ -/۴

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور قرآن کا صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے رسول پاکؐ کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ یہ کتاب اسی طرح کے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ تصنیف مولانا اکبر آبادی۔

قیمت غیر مجلدہ ۲/۲۵ ، مجلدہ ۳/۲۵

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

از مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم

علم اخلاق پر ایک فاضلانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید اخلاقی نظریوں کو سامنے رکھ کر اصول اخلاق اور انواع اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور معاملہ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کا نظام اخلاق سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ قیمت غیر مجلدہ ۲/۵۰ مجلدہ ۳/

اسلام کا نظامِ حکومت

(از مولانا حماد الانصاری غازی)

اسلام کیسی حکومت کا داعی ہے اور اس نے اس شعبۂ زندگی میں دنیا کو کیا خاص پیغام دیا۔ مسئلہ کے تمام علمی اور عملی پہلوؤں پر مفصل کلام قیمت غیر مجلدہ -/۶ ، مجلدہ -/۷

مسلمانوں کا نظمِ مملکت

از ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مصری)

مسلمانوں نے صدیوں دنیا کے اکثر حصے پر جو حکومت کی اس حکومت کا علمی نظام کیا تھا؟ اور حکومت کے جتنے شعبے ہوتے ہیں مسلمانوں نے اُن کی تنظیم کس طرح کی۔ فن سیاست و جہانبانی میں مسلمانوں کے امتیاز و نقوش کا ایک علمی مرقع۔ مترجمہ مولانا علیم اللہ صدیقی۔ قیمت غیر مجلدہ ۴/۵۰ ، مجلدہ ۵/۵۰۔

مسلمانوں کا عروج و زوال

(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی)

مسلمانوں کے سیاسی عروج کے کیا اسباب تھے؟ اور کن عوامل نے انھیں زوال پذیر کیا۔ ایک علمی اور تاریخی جائزہ جو بصیرت افروز بھی ہے اور عبرت انگیز بھی قیمت غیر مجلدہ ۴/ مجلدہ ۵/

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ نہیں بلکہ ایک بالکل نئے زاویۂ نظر سے اس عروج و زوال کے دنیا پر اثرات کا جائزہ۔ ایک ایمان آفریں اور پیغام عمل دینے والی کتاب۔

قیمت مجلد ۴/۵۰

تاریخ دعوت و عزیمت

یہ کتاب مولانا علی میاں ندوی کی اہم ترین تصنیف ہے جو ان اکابر اسلام کے اٹھ کارناموں کو تفصیل سے سامنے لاتی ہے جنھیں خدا نے ہر ضرورت کے موقع پر اسلام کی صحیح ترجمانی اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے کھڑا کیا۔ تین جلدوں میں مکمل جلد اول -/۶ دوم ۶/۵۰ سوم -/۵

سوانح قاسمی

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے قلم سے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی علمی، عملی اور عرفانی زندگی کی تفصیل تین ضخیم جلدوں میں۔ مکمل -/۱۵

نقشِ حیات

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح حیات جو بتاتی ہے کہ ایسی عظیم شخصیتیں کس طرح بنتی ہیں جو بقول شاعر ؎ در دل کسے حرام شریعت در نگنجد ایمان عشق کے مصداق ہوں۔ مکمل دو جلدوں میں۔ ۸/۵۰

طوفان سے ساحل تک

نومسلم جرمن فاضل محمد اسد صاحب کی قبول اسلام کی مکمل سرگزشت کا مختصر ترجمہ۔ جس کا خاص پیغام یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی لائی ہوئی بلاؤں سے نجات اسلام ہی کی آغوش میں مل سکتی ہے۔ قیمت مجلد -/۵

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

دیباچہ

از مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اسلام میں بلکہ کسی بھی مذہب میں ——— جس کو مذہب کہا جا سکتا ہو ——— نبی اور رسُول کے بغیر ہدایت کا کوئی تصوّر ہی نہیں۔ نبی اور رسُول ہی پر براہ راست ہدایت کا نزول ہوتا ہے، وہی بندوں کو اللہ کی ہدایت پہونچاتا ہے، وہی اسکے اصولوں کی تشریح کرتا اور احکام کی عملی شکلیں بناتا ہے، پھر اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے ضروری سوالات کا وہی جواب دیتا ہے۔ اسلئے ہدایت کے نظام میں رسُول ہی کی حیثیت مرکزی اور بنیادی ہے، اور وہی انسانوں کے لئے ہدایت کا ماخذ ہے، اور اسی لئے اُس پر ایمان لانا اور اُس کو اللہ کا مقرر کیا ہوا راہنما ماننا نجات اور سعادت کی بنیادی شرط ہے ——— ہمارے اس دَور کے لئے بلکہ چھٹی صدی عیسوی سے اِس دُنیا کے آخری دن یعنی قیامت تک کے لئے اور پورے عالم انسانی کے لئے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے نبی و رسُول ہیں۔ اُن کے خاتم النّبیین ہونے کا یہی مطلب ہے کہ اب قیامت تک انہی کی نبوّت و رسالت کا دَور ہے، اب اللہ کی رضا اور اُس کا قرب حاصل کرنے کی راہ صرف وہی ہے جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرمائی ——— قرآن مجید میں خود آپؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: ———

"قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ" ——— (آل عمران۔ ع ۴)

(اے پیغمبر! تم صاف صاف بتا دو کہ اے لوگو اگر تم خدا کو چاہتے ہو اور اس کی رضا و رحمت اور اُس کے پیار کے طلبگار ہو تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو اور میری بتائی ہوئی

راہ پر چلو، صرف اسی طرح تم اُس کی بخشش اور اُسکے پیار سے حصّہ پا سکو گے ـــــ اے رسُول! تم کہدو کہ اے لوگو اللہ اور اُسکے رسُول کی یعنی میری فرمانبرداری کرو، اگر وہ نہ مانیں تو اللہ کی محبّت اور اس کا پیار کبھی حاصل نہیں ہوگا نہ ماننے والوں کو)۔

جب آپ پر ایمان لانا اور آپ کا اتباع اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کے لئے نجات اور رضائے الٰہی کی شرط قرار دی گئی تو ضروری تھا کہ یا تو آپ کو اس دُنیا کے خاتمہ تک زندہ رکھا جاتا تاکہ ہدایت و رہنمائی کے لئے بہ نفس نفیس آپ کی طرف رجوع کیا جا سکتا، یا آپ کی پوری تعلیم و ہدایت اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اس طرح محفوظ کر دیا جاتا کہ بعد میں آنے والے بھی پورے علمی اعتماد اور قلبی اطمینان کے ساتھ اُسی طرح آپ سے تعلیم و ہدایت لے سکتے جس طرح سے اور جس اعتماد و اطمینان کیساتھ آپ کے زمانہ کے لوگ لیتے تھے۔

قیامت تک آپ کو زندہ و باقی رکھنا حکمتِ الٰہی کے خلاف تھا، اسلئے دوسرا بندوبست فرمایا گیا۔ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کا ایک حصّہ جو اساسی قانون اور بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا ہے جس کے الفاظ بھی آسمانی اور الہامی ہیں یعنی قرآن مجید، اُس کو تو اللہ تعالیٰ نے لفظ بہ لفظ محفوظ کرا دیا۔ تاریخ سے واقفیت رکھنے والے غیر مسلم بھی جانتے ہیں کہ اس کا لفظ لفظ محفوظ ہے ـــــ اسکے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق آپ کی تفصیلی ہدایات، آپ کے راہنما ارشادات و خطبات، آپ کے اعمال و افعال اور اخلاق و عادات گویا آپ کی پوری زندگی جو دراصل قرآن مجید کی تشریح و تفسیر اور اسکی ہدایت و تعلیم کی عملی تصویر ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کی اُمّت سے حدیث کی تدوین اور حفاظت کا معجزانہ کام لیکر ایسا محفوظ کرا دیا کہ قریبًا چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود آپ کی پوری پیغمبرانہ زندگی کا ریکارڈ اس طرح موجود اور محفوظ ہے کہ گویا اپنی خصوصیات کے ساتھ آپ خود اس دُنیا میں رونق افروز ہیں ـــــ اگر کسی باتوفیق بندے کی حدیث کے ذخیرے پر نظر ہو اور اس کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمانی رابطہ بھی نصیب ہو تو وہ محسوس کرے گا کہ گویا حدیث کے آئینہ میں اس کی نظر کے سامنے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی عکسی تصویر ہے، وہ آپ کو اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، نماز پڑھتے، لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے، اللہ کے حضور میں دعا کرتے، اس میں زار زار روتے اور آنسو بہاتے، احرام باندھے حج کرتے، حج میں طواف اور سعی کرتے، قربانی کرتے اور حلق کراتے، مسجد کے صحن میں نزاعات کا تصفیہ کرتے،

مجرموں کے لئے سزاؤں کے احکام جاری فرماتے اور میدانِ جنگ میں مجاہدین کی صفوں کی قیادت کرتے دیکھے گا، اپنے دل کے کانوں سے آپ کے ارشادات سُنے گا۔ جلوت اور عام مجالس کے علاوہ خلوت کی آپ کی ایسی بہت سی باتیں بھی اُسکے علم میں آئیں گی جو اپنے قریب ترین عزیزوں دوستوں حتیٰ کہ اپنے ماں باپ کی بھی وہ نہ جانتا ہوگا۔

ابھی چند دن پہلے کی بات ہے اپنے مُلک کے ایک مشہور و معروف غیر مسلم فاضل سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی زندگی کے محفوظ ہونے ہی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اُن کی بعض غلط فہمیوں اور عقلی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لئے مجھے کہنا پڑا تھا کہ: "میرے والد ماجدؒ کا انتقال جس وقت ہوا اُس وقت میری عُمر قریباً پینتالیس[۴۵] سال کی تھی، گویا میں فہم و شعور کے ساتھ قریباً ۴۰ سال اپنے والد ماجدؒ کے زیرِ سایہ رہا ہوں، لیکن میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ حدیث کے ذریعہ جتنا کچھ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جانتا ہوں اتنا اپنے والد ماجدؒ کے بارے میں نہیں جانتا" ـــــ الحمدللہ مجھے اطمینان ہے کہ یہ بات میں نے غلط نہیں کہی تھی۔

صحابۂ کرامؓ جن کو دولتِ ایمان کے علاوہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق کی نسبت بھی نصیب تھی، جو کچھ آپ سے سُنتے تھے اور جو کچھ آپ کو کرتے دیکھتے تھے اس کو یاد رکھتے تھے اور ذوق و شوق کے ساتھ اُسکے تذکرے کرتے تھے۔ یہ ایمان اور عشق و محبّت کا قدرتی تقاضا بھی تھا اور وہ اس کو اپنی اہم ذمہ داری، بڑی سعادت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا وسیلہ بھی سمجھتے تھے ـــــ بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آپؐ کے ارشادات خود آپؐ کی اجازت سے قلمبند بھی کرتے تھے[۱]

پھر جن لوگوں کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نصیب نہیں ہوا، اور انھوں نے آپ کے فیضیافتہ صحابۂ کرامؓ کو پایا انھوں نے معلومات و محفوظات کا وہ سارا ذخیرہ اُن سے حاصل کیا۔ اس دور میں (یعنی دورِ تابعین میں) خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خاص توجہ اور تحریک سے کتابی شکل میں صحابۂ کرام کی روایت سے احادیث کی جمع و تدوین کا کام شروع ہوا[۲]

---

[۱] صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ بیان موجود ہے کہ عبداللہ بن عمرو حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اور مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں خود عبداللہ بن عمرو بن العاص کا بیان مروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے اس کی اجازت چاہی تھی اور آپ نے مجھے اس کی اجازت دی تھی۔ ۱۲ [۲] عمر بن عبدالعزیزؒ نے مدینۂ طیبہ کے اپنے امیر اور قاضی (بقیہ صـ۱۲ پر)

چنانچہ ابن شہاب زہری اور ہمام بن منبہ جیسے علماء تابعین نے اس کام کا آغاز کیا، پھر ان کے تلامذہ میں اس کا عام رواج ہوگیا۔

اس دور کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں سے امام مالکؒ کی مؤطا آج تک متداول ہے، اسکے علاوہ جو بہت سے مجموعے اس دور میں مرتب ہوئے تھے وہ مستقل صورت میں اگرچہ آج سامنے نہیں ہیں لیکن بعد کے تیار شدہ مجموعوں میں وہ پورا علمی سرمایہ محفوظ ہوگیا ہے۔

اس دور کے بعد امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ، امام احمدؒ اور حافظ الحدیث حُمیدی جیسے سیکڑوں حضرات نے اپنے اپنے انداز پر اس کام کو آگے بڑھایا۔

ان کے بعد امام بخاری، امام مسلم اور اصحاب سنن کا زمانہ آیا، انھوں نے اس سلسلہ میں وہ کام کیا جو اُن کی مرتب کی ہوئی کتب صحاح کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

ان کے بعد انہی کے طرز پر حدیث کے سیکڑوں مجموعے تیار ہوئے اور حدیث کی روایت اور تدوین وحفاظت کا یہ کام کئی صدی مسلسل اسی طرح ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ راویوں کی تنقید اور جرح وتعدیل کا کام بھی خاص اہتمام سے ہوتا رہا، اور اسکے نتیجہ میں چالیس ہزار سے زیادہ راویانِ حدیث کے احوال سے متعلق اسماء الرجال کے عنوان سے ایک مستقل فن اور ایک پورا کتب خانہ تیار ہوگیا۔

اسی کے ساتھ احادیث سے اصول واحکام کے استخراج واستنباط کا کام بھی برابر ہوتا رہا، جس کا ابتدائی نمونہ امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمدؒ اور امام شافعی کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، اور امام بخاری کے تراجم ابواب تو اس کی بہترین مثال ہیں۔

بعد کی صدیوں میں ہر دور کے علماء اُمّت نے احادیث کے ان مجموعوں یا انہی سے مرتب ہونے والی دوسری مؤلفات کو اپنی خدمت اور توجہ کا مرکز بنایا، اور ہر زمانہ میں اس کی ضرورت اور اہلِ زمانہ کے مذاق کے مطابق اُن کی شرحیں لکھی گئیں، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

(صلا کا بقیہ حاشیہ)

ابوبکر بن حزم کو لکھا تھا:۔ انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء۔ (صحیح بخاری)۔

ہمارے اس زمانہ کی غالباً سب سے اہم ایک خصوصیت یہ ہے کہ مغربی علوم و نظریات کی ترقی اور اشاعت نے پوری انسانی دنیا کے طرزِ فکر اور علمی مزاج کو بہت زیادہ متأثر کیا ہے، اسلئے تعلیماتِ محمدیؐ کے آج کے امینوں کی یہ خاص ذمہ داری ہے کہ وہ اس ذہنی و فکری تبدیلی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بیسویں صدی کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کو پیش کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اسکے دو سو سال پہلے ٹھیک اُس وقت جبکہ ان مغربی علوم و افکار کی ترقی کا آغاز ہو رہا تھا اس کام کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں سے رکھوادی تھی۔ اُن کی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس کام کے کرنے والوں اور اس راہ پر چلنے والوں کیلئے پوری روشنی موجود ہے۔ اس عاجز کا خیال ہے کہ حدیث و سنّت کے بارے میں ہمارے اس دَور کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کا جیسا سامان اس کتاب میں ہے ایسا پورے اسلامی کتب خانہ کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔

اِس ناچیز نے چونکہ بیسویں صدی کے ذہن اور اس دَور کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر اردو میں شرح حدیث کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا جس کی یہ تیسری جلد اب شائع ہو رہی ہے اسلئے اس میں دوسری شروحِ حدیث کی بہ نسبت زیادہ استفادہ "حجۃ اللہ البالغہ" ہی سے کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے مقاصد و مطالب کی وضاحت اور اس کی حکمت کے بیان میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ اُس سے اِس دَور کے ذہن بھی پوری طرح مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ دوسری بڑی اور اہم خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کی روشنی میں اُمّت کے فقہاء و مجتہدین کے فقہی و اجتہادی اختلافات کی واقعی نوعیت سامنے آجاتی ہے، اور ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ ان ائمہ کے یہ تمام فقہی مسالک ایک درخت کی قدرتی شاخیں یا ایک بڑے دریا سے نکلنے والی نہریں ہیں، ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اور ان میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری درسگاہوں میں ابھی تک یہ ولی الٰہی طریقہ رواج نہیں پا سکا، حالانکہ ہمارے اِس دَور کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ خاص الخاص نعمت ہے۔

معارف الحدیث کی یہ تیسری جلد ابواب طہارت اور ابواب صلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سی حدیثیں اُن مسائل سے متعلق بھی ناظرین کرام پڑھیں گے جن میں فقہا کے مسالک مختلف ہیں، اِس عاجز نے

ان کی تشریح میں حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے اصولی طریقے کی پیروی کی ہے۔

اِس جلد سے متعلق کچھ ضروری باتیں

معارف الحدیث کی پہلی جلد میں ایمان اور آخرت سے متعلق، اور دوسری میں تزکیۂ قلب و نفس اور اصلاحِ اخلاق سے متعلق احادیث مرتب کرکے پیش کی گئی تھیں، اِس تیسری جلد میں اسلام کے پورے نظامِ عبادت یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اذکار و دعوات کے ابواب کی حدیثیں جمع کرکے نذرِ ناظرین کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف نماز اور طہارت کے ابواب کے صفحات پانچ سو کے قریب ہو گئے اسلئے اِس جلد کو اسی پر تمام کر دینا پڑا، باقی حصہ انشاء اللہ چوتھی جلد میں پیش ہوگا، اندازہ یہ ہے کہ اُس کی ضخامت بھی اتنی ہی ہو جائیگی۔

پہلی جلد ۱۳۷۳ھ میں شائع ہوئی تھی، دوسری اُسکے ۳ سال بعد ۱۳۷۶ھ میں شائع ہوگئی تھی، یہ تیسری جلد بعض خاص رکاوٹوں کی وجہ سے قریباً ۸ سال کے وقفے سے اب شائع ہو رہی ہے، لیکن اسکے بعد والی جلد کے بارے میں اُمید ہے کہ وہ انشاء اللہ آنے والے سال ہی میں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا سکے گی۔

طہارت چونکہ بہت سی عبادات کے لئے خاص کر نماز کے لئے شرط قرار دیگئی ہے، اسلئے عام محدثین کا یہ دستور رہے کہ وہ اپنی مؤلفات میں نماز اور دوسری عبادات کی حدیثوں سے پہلے ابواب طہارت کی حدیثیں ذکر کرتے ہیں، اسی طریقے کی پیروی میں اِس جلد میں بھی پہلے ابواب طہارت کی حدیثیں درج کی گئی ہیں جن کی تعداد صرف ستّر ہے، اُسکے بعد ابواب نماز کی حدیثیں ہیں جن کی تعداد ۳۵۱ ہے ——— ان حدیثوں کے انتخاب اور ترتیب کا کام بہت غور و فکر سے کیا گیا ہے۔ حدیث پر نظر اور دورِ حاضر کے علمی و دینی تقاضوں کی خبر رکھنے والے حضرات اگر غور فرمائیں گے تو محسوس کرینگے کہ ترجمہ اور تشریح سے قطع نظر یہ انتخاب و ترتیب بجائے خود ایک کام ہو گیا ہے۔

اس سے پہلی دو جلدوں کی طرح اِس جلد میں بھی احادیث کے ترجمہ و تشریح میں اصل مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ ہمارے اِس دَور کے ذہن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی عظمت اور

قدر و قیمت کو سمجھیں اور اُن کے اندر اُسکے اتباع کا جذبہ پیدا ہو، اور اُس نور اور روشنی سے وہ بھی حصّہ لے سکیں جس سے آپ کی اس تعلیم و ہدایت کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ کو حصّہ ملا تھا۔ اسلئے خالص علمی و فنی اور درسی بحثوں سے دانستہ بچایا گیا ہے اور اپنی بساط بھر آسان اور مؤثر انداز میں احادیث کا بس مقصد و پیام واضح کرنے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طریقے پر حسبِ ضرورت اس کی رُوح اور حکمت و مصلحت بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

آمین اور رفع یدین جیسے اختلافی مسائل کے بارے میں ناظرین کو ذہنی انتشار اور پریشاں دماغی سے بچانے کے لئے جہاں کچھ لکھنا پڑا ہے تو امکان بھر اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مناظرانہ بحث کی شکل نہ بنے ——— اب اس میں جو صحیح اور صواب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے، اور جو غلط ہے وہ اِس ناقص العلم کے علم و فہم کا قصور ہے۔

پہلی دو جلدوں کی طرح اِس جلد کی حدیثیں بھی زیادہ تر "مشکوٰۃ المصابیح" سے لگی ہیں اور تخریج میں اسی پر اعتماد کیا گیا ہے، نیز اسی کی پیروی میں یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ جو حدیث صحیح بخاری یا صحیح مسلم سے لی گئی ہے وہ حدیث کی اگرچہ دوسری کتابوں میں بھی ہو لیکن حوالہ صرف صحیح بخاری یا صحیح مسلم ہی کا دیا گیا ہے، کیونکہ کسی حدیث کا ان میں سے کسی ایک میں ہونا بھی اس کی صحت کی کافی ضمانت ہے ——— بعض حدیثیں "جمع الفوائد" سے بھی لی گئی ہیں اور چند "کنز العمال" سے بھی، لیکن اُن کے لئے کنز العمال کا حوالہ التزاماً دیا گیا ہے ——— بعض حدیثیں براہِ راست صحاح کی کتابوں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد وغیرہ سے بھی لی گئی ہیں، یہ وہی حدیثیں ہیں جو ان الفاظ کے ساتھ مشکوٰۃ یا جمع الفوائد میں مذکور نہیں ہیں۔

جیسا کہ پہلی دونوں جلدوں کے دیباچہ میں بھی لکھا جا چکا ہے چونکہ اس سلسلہ (معارف الحدیث) کا اصل مقصد دعوت اور تذکیر و تفہیم ہے اسلئے متن حدیث کے ترجمہ میں نحوی ترکیب اور لفظی ترجمہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی ہے، بلکہ حدیث کے مقصد اور پیام کو واضح کرنا پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے کسی حدیث کو مقدم یا مؤخر کیا گیا ہے۔

اپنے باتوفیق ناظرین سے آخری گزارش یا وصیت

پہلی دونوں جلدوں کے دیباچہ میں بھی یہی کی گئی تھی، اور اب بھی یہی ہے ——— کہ

حدیثِ نبویؐ کا مطالعہ صرف اضافۂ معلومات کے لئے اور علمی سیر کے طور پر ہرگز نہ کیا جائے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ کرنے کے لئے اور رشد و ہدایت حاصل کرنے اور عمل کرنے کی نیت سے کیا جائے، نیز درس و مطالعہ کے وقت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو دل میں بیدار کیا جائے اور اس طرح ادب اور توجہ سے پڑھا یا سُنا جائے کہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ مُبارک میں ہم حاضر ہیں اور آپ فرما رہے ہیں اور ہم سُن رہے ہیں ——— اگر ایسا کیا گیا تو قلب و رُوح کو ان انوار و برکات اور ایمانی کیفیات کا کچھ نہ کچھ حصّہ انشاء اللہ ضرور نصیب ہوگا جو عہدِ نبویؐ کے اُن خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست رُوحانی و ایمانی استفادہ کی دولت عطا فرمائی تھی ———

آخری کلمہ اللہ کی حمد ہے، اور اس خدمت کے اتمام کیلئے حُسنِ توفیق کی

استدعا ——— اور

غلطیوں اور گناہوں کی معافی کی التجا!

اللہ کی رحمت اور اُسکے بندوں کی دُعاؤں کا محتاج و طلبگار

عاجز و گنہگار بندہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یکم رمضان ۱۳۸۴ھ ——— ۵ جنوری ۱۹۶۵ء

آخری قسط

تجلیاتِ مجددِ الف ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

[الحمدللہ کہ یہ سلسلہ جو صفحہ ۱۳ پر شروع ہوا تھا۔ اس قسط پر بخیر و خوبی تمام ہو رہا ہے۔ گزشتہ اشاعت کی قسط پر غلطی سے آخری قسط لکھ گیا تھا امید ہے کہ ناظرین نے تصحیح فرمالی ہوگی ——— ادارہ]

مکتوب (۱۰۳) ۔ شیخ حمید اجمیری کے نام :-

[تحصیل کمال و تکمیل کی ترغیب میں]

الحمدللہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ——— برادرم شیخ حمید کا مکتوب گرامی پہونچا۔ خوشوقت کیا ——— اس زمانۂ پُرفتن میں یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ کسی شخص کی صحبت سے ایک جماعت و گروہ کو جناب قدس خداوندی جلّ سلطانہٗ سے رغبت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ماسوی سے لوگوں کے دل سرد ہو جائیں اور اس کے باوجود وہ شخص اس دولت پر مغرور نہ ہو اور اپنے کام سے بے فکر نہ رہے ——— کیونکہ مثل مشہور ہے ہنوز دہلی دور است (ابھی دہلی دور ہے) معلوم نہیں کہ ستوؤں سے ایک کام بھی انجام پا گیا ہے یا نہیں؟ اور یہ حالات جو طالبوں کو ابتدا میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور ذوق و لذت بخشتے ہیں یہ تو بالکل ایسے ہیں جیسے بچوں کو الف، ب کا سبق پڑھائیں۔ اصل کام یہ ہے کہ حروفِ تہجی سے آگے درجۂ مولویت (فاضلیت) پر فائز ہوں اور اذواق و اشواق کے ذریعہ درجۂ ولایتِ خاصہ

میں داخل ہو جائیں ۵۔

ہنوز ایوانِ استغنا بلند است ترا فکرِ رسیدن ناپسند است

چاہیئے کہ اپنے اوقات کو آباد رکھیں اور شریعت و طریقت سے ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے آراستہ رہیں ـــ دوسرے کی تکمیل اپنے کمال کی فرع ہے اور کمال، درجۂ ولایتِ خاصہ میں ہے ـــ لیکن جب کہ تمھاری صحبت میں طالبوں کے اندر رشد و ہدایت ظاہر ہوتی ہے اور احوال و مواجید رونما ہوتے ہیں اگرچہ وہ احوال بحدِ فنا و بقا نہ ہوں ـــ غنیمت ہے ـــ اور اس زمانہ میں (اپنی کمیابی کی بنا پر) یہ چیز بھی کبریتِ احمر (اکسیر) کا حکم رکھتی ہے ـــ اس (تعلیم طریقت کے) کام کو بھی کرو لیکن مناسب بلکہ لازم یہ ہے کہ جس کسی کو تعلیم طریقت دو بعد استخارہ و توجہ تعلیم دو ـــ اور اس عمل سے ترساں و لرزاں بھی رہو، ایسا نہ ہو کہ اس (پیری مریدی) کے راستے سے شیطان کا غلبہ تم پر ہو جائے ـــ ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں شیطان کے شر سے ـــ جو تعداد (ذکر کے سلسلے میں) تم کو بتائی تھی اگر اسکو پورا کر دیا ہے تو اُس سے دوگنی تعداد کو پورا کرو اس کے بعد خبر کرو تاکہ مناسب حال ہدایت کی جائے ـ ان شاء اللہ تعالیٰ ـ اُن دوستوں کو جو تم سے وابستہ ہیں میری دُعا پہونچا دو۔ سید یحییٰ نے جو صحیفۂ شریفہ بھیجا تھا وہ بھی پہونچ گیا ـــ اللہ کا شکر ہے کہ اس زمانے میں جو کہ کمال قربِ قیامت اپنے اندر رکھتا ہے اور حدیث میں آیا ہے "قیامت قائم نہ ہوگی مگر بُرے لوگوں پر" (یعنی جب نیک آدمی مر جائیں گے اور صرف بد لوگ باقی رہیں گے اس وقت قیامت ہو جائے گی اور جب تک نیکوں کا وجود دُنیا میں ہے قیامت نہ آئے گی) ـــ ایسے وقت قربِ قیامت میں بھی لوگوں کے دل حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف کھینچ رہے ہیں اور وہ اس درگاہِ اقدس کے والہ و شیدا ہیں ـــ احباب توقع ہے کہ غیبوبت کی حالت میں دُعائے سلامتیٔ خاتمہ کرتے رہیں گے ـــ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ـــ والسلام اوّلاً و آخراً۔

ع۵ ابھی ایوان استغنا بہت اونچا ہے اور تجھے رسائی کی فکر ناپسند ہے۔

مکتوب (۱۰۵) :- شیخ حسن برکی کے نام —— [ترغیب برا حیائے سنت و تہدید از بدعت]

صحیفۂ شریفۂ برادرم شیخ حسن۔ احسن اللہ آمالہ ——— پہونچا ——— خوشوقت کیا ——— اس میں علوم و معارف مندرج تھے اُن کے مطالعے نے فرحت پر فرحت بڑھائی ——— الحمدللہ کہ علوم صحیحہ اور معارف صادقہ ہیں کتاب و سنت کے مطابق اور عقائد فرقۂ ناجیہ (اہلسنت) کے موافق ہیں۔ حضرت حق سبحانہ استقامت نصیب فرمائے اور مقاصد علیہ کی انتہا تک پہونچائے ——— بدعتوں کے دور کرنے اور مٹانے کے بارے میں بھی تم نے کچھ لکھا تھا۔ کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس طرح کی ظلمات بدعت میں کوئی خوش نصیب بدعتوں میں سے کسی ایک بدعت کو مٹانے کی توفیق پائے اور سنتوں میں سے کسی ایک سنت کو زندہ کرنے۔ احادیث صحاح میں آیا ہے کہ جو کوئی ایک سُنّت کو زندہ کرے گا درانحالیکہ اس سنت پر عمل ترک کر دیا گیا ہو تو اس سنت کو زندہ کرنے والے کو سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ اس مقام سے اس عمل کی عظمت کا اندازہ لگائیں ——— لیکن اتنا ملحوظ رکھیں کہ کوئی فتنہ کھڑا نہ ہونے پائے اور ایک حسنہ، ظہور ہزار سیئہ کا باعث نہ بن جائے اس لیے کہ آخر زمانہ ہے اور ضعف اسلام کا وقت ہے ———

رسالہ جو بھیجا تھا اُس کے مطالعے سے بھی مسرتیں حاصل ہوئیں۔ الحمدللہ کہ تم کو علوم میں اس فقیر سے بہت مناسبت ہے اور کشف میں بھی مطابقت ہے، نیز نظر بھی بہت بلند ہے۔ تمہارا خط جو کہ حالات اور علوم و استفسارات پر مشتمل تھا میں نے خواجہ محمد ہاشم کشمی کے سپرد کر دیا تھا کہ جوابات لکھنے کے وقت اس کو میرے سامنے پیش کر دیں اتفاقاً انھوں نے اس کو گم کر دیا اس بنا پر جوابات کی تفصیل میں توقف ہوا جو بات یاد رہ گئی تھی اُس (کے جواب) کو لکھ دیا گیا۔ منجملہ یہ ہے کہ احوال، پسندیدہ ہیں اور صحت علوم، حاصل ہے۔ دوسری بات یہ لکھنا ہے کہ مغفرت مآب مولانا احمد (برکی) کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں سعیٔ بلیغ کو ملحوظ رکھیں اور ان کو آداب ظاہر و باطن کی ہدایت کریں۔ تمام دوستوں کو بلکہ وہاں کے جمیع اہل اسلام کو شریعت اور التزام سنت کی راہ دکھائیں۔

اور بدعت کے ارتکاب سے ڈراتے رہیں اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے۔ مکاتیب جلد ثالث میں سے بعض مکتوبات خواجہ محمد ہاشم نے لکھوا کر تمہیں بھیجے ہیں ان سے نفع حاصل کروگے ـــــ اوقات فقیر مختلف ہیں، بعض اوقات علوم و معارف کی تحریر کی جانب بے اختیار رغبت ہوتی ہے اور بعض دوسرے اوقات میں باوجود یکہ عجیب و غریب اسرار کا ورود ہوتا ہے مگر لکھنے سے طبیعت بھاگتی ہے یہاں تک کہ ہاتھ میں قلم پکڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا ـــــ اسی وجہ سے تمہارے مکتوبات کے جواب کی تفصیل میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے اور تکلف سے کچھ لکھ نہیں سکتا ـــــ باقی حالات مستوجب حمد ہیں ـــــ ہمراہی لشکر سے بہ عنایت خداوندی خلاصی و رہائی نصیب ہو گئی ہے۔ حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ استقامت سے رکھے۔ اس جگہ کے تمام دوستوں کے لیے دعوات مخصوصہ میں۔ والسلام ـــــ

مکتوب ۱۰۶:۔ صاحبزادگان گرامی قدر (حضرت خواجہ محمد معصوم اور حضرت خواجہ محمد سعید) کے نام ـــــ [آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں دیکھنا]

فرزندان گرامی کا مکتوب پہونچا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ صحت و عافیت سے ہو ـــــ ایک تازہ منامی بشارت آج نمودار ہوئی ہے لکھتا ہوں۔ غور سے سنیں ـــــ گزشتہ رات جو کہ شنبے کی رات تھی۔ مجلس سلطان جہانگیر میں گیا تھا۔ ایک پہر رات گزرنے کے بعد واپس آگیا۔ تین پارے حافظ سے سنے۔ دو پہر رات گزر گئی تھی کہ نیند میسر آئی ـــــ حلقۂ صبح کے بعد ـــــ چونکہ رات کی ماندگی تھی ـــــ سو گیا ـــــ خواب میں دیکھتا ہوں کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیر کے لیے اجازت نامہ تحریر فرما رہے ہیں جس طرح کہ مشائخ کا طریقہ ہے اپنے خلفاء کو اجازت نامہ لکھا کرتے ہیں ـــــ ایک دوست بھی اس وقت موجود ہے ـــــ اس اثنا میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ گویا اجازت نامے کے اجراء میں کچھ تاخیر ہے ـــــ تاخیر کی وجہ بھی اس وقت تعین کے ساتھ معلوم ہو گئی ہے۔ وہ دوست جو اس کام کے سلسلے میں پیش کار کی حیثیت سے ہے گویا کہ دوسری مرتبہ اس اجازت نامے کو خدمت اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں لے جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجازت نامے کی پشت پر ایک اور اجازت نامہ خود تحریر فرمایا ہے

یا دوسرے کو لکھنے کے لیے حکم فرمایا ہے یہ بات تعین کے ساتھ نہ معلوم ہو سکی ـــ لیکن اس اجازت نامے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہونا معلوم و متعین ہے ـــ لکھنے یا لکھوانے کے بعد اپنی مُہر مبارک سے اس کو مزین فرمایا ہے ـ اس اجازت نامے کا مضمون و مفہوم یہ ہے کہ اجازت نامۂ دُنیا کی جگہ اجازت نامۂ آخرت دیا گیا ہے اور مقام شفاعت سے حصّہ عنایت فرمایا گیا ہے

کاغذ بھی طولانی ہے اور سطریں بھی بہت زیادہ تحریر فرمائی گئی ہیں، میں اس دوست سے دریافت کر رہا ہوں کہ پہلا اجازت نامہ کون سا ہے اور بعد کو جو اجازت نامہ تحریر فرمایا گیا ہے وہ کون سا ہے؟ ـــ میں اس وقت یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ ہیں اور جس طرح بیٹا باپ کے ساتھ گزر بسر کرتا ہے میں بھی اسی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اہلبیت میرے حق میں اجنبی نہیں ہیں (بلکہ مجھ سے واقف ہیں) میں اس کاغذ کو لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے فرزندانِ محرم کی طرح داخلِ حرم شریف ہو گیا ہوں ـ عظیم المرتبت اُمہات المومنین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں مجھ سے بعض خدمات کے متعلق اہتمام کے ساتھ فرما رہی ہیں اور ارشاد فرما رہی ہیں کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے ـ یہ یہ امور انجام دیے جائیں ـــ اسی اثنا میں آنکھ کھل گئی .....

ان ایام میں معارف غریبہ اور علوم عجیبہ ظاہر ہو رہے ہیں ..... لڑکے دور ہیں اور خاتمۂ عمر نزدیک آپہنچا دیکھو کیا ہوتا ہے؟ ـــ "اللہ جو کرتا ہے اسی میں خیر ہے" یہ کہتا ہوں اور صبر کرتا ہوں ـــ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ـــ

مکتوب (۱۰۷) :- خواجہ محمد اشرف کے نام ـــ [نسبت رابطہ اور لذتِ طاعات میں خلل کس طرح واقع ہوتا ہے]

بعد الحمد و الصلوٰۃ و تبلیغ الدعوات ـــ تمہارا مکتوب پہونچا ـــ الحمد للہ کہ صحت و عافیت سے ہو۔ تم نے دریافت کیا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ جب نسبت رابطہ میں خلل واقع ہوتا ہے تو تمام طاعات کی ادائیگی میں لذت محسوس نہیں ہوتی؟ جاننا چاہیے کہ جو چیز نسبت رابطہ میں نقصان و خلل کا باعث ہوئی ہے وہی مانعِ لذتِ طاعات ہے ـــ کبھی ایسا

ہوتا ہے کہ سبب خلل رابطہ، قبض (بسط و کشادگی) قلب کا نہ ہونا) ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لغزشوں کے ارتکاب کے باعث چاہے لغزشیں تھوڑی سی ہوں ـــــ قلب پر کدورت عارض ہو جاتی ہے ـــــ پہلی صورت بُری نہیں ہے بلکہ سلوک کے لوازم میں سے ہے اور دوسری صورت کے عارض ہونے پر توبہ و استغفار کے ذریعے تدارک کرنا چاہیے۔ تاکہ اللہ کے کرم سے اس کا اثر زائل ہو جائے ـــــ چونکہ قبض اور کدورت کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے بہر حال توبہ و استغفار فائدہ مند ہے، حق تعالیٰ استقامت کے ساتھ رکھے ـــــ والسلام۔

مکتوب (۱۱۲) :۔ قاضی اسلم[ع] کے نام ـــ [صفاتِ باری تعالیٰ نہ عینِ ذات ہیں نہ غیرِ ذات]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ علمائے اہلِ سنت وجماعت نے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے ـــــ واجب الوجود کی آٹھوں صفاتِ حقیقیہ کے بارے میں کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ "نہ وہ عینِ ذات ہیں اور نہ غیرِ ذات" ـــــ یہ معرفت عقل کے طور و انداز سے ماورا رہے اس حقیقت کو انھوں نے نورِ فراست سے ـــــ پایا ہے ـــــ عقلاء و حکماء اس قولِ مذکور کو ارتفاعِ نقیضین سمجھ بیٹھے (اور اسی وجہ سے لاعین و لاغیر کو نہیں مانتے) انھوں نے یہ نہیں سمجھا کہ حصولِ تناقض کے لیے اتحادِ مکان اور اتحادِ زمان بھی شرط ہے اور جب اس ذاتِ اقدس کے لیے مکان و زمان کی گنجائش ہی نہیں ہے تو پھر تناقض کس طرح متصور ہوگا؟ ـــــ اور وہ جو (بعض) علماء نے تناقض کو دفع کرنے کے لیے لفظِ غیر

ع۵ میر محمد اسلم ہروی، میرزا ہد صاحب رسالہ کے والد ماجد ہیں۔ خواجہ کو ہی جو کہ مرشدِ مشائخِ خراسان تھے ان کے مورث اعلیٰ تھے۔ ہرات میں پیدا ہوئے لاہور کے علماء سے استفادہ کیا۔ بعد تکمیل علم آگرہ گئے۔ سلطان جہانگیر نے ان کو کابل کا قاضی بنایا۔ بعدہٗ عسکر سلطانی کا قاضی بنایا۔ بعد وفات جہانگیر عہدۂ سابق پر بحال ہوئے شاہ جہاں بھی ان کا بہت اکرام کرتے تھے۔ لیکن بوجہ علالت ۱۰۴۰ھ میں مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے وہیں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے (مہر جہانتاب قلمی مولفہ مولانا حکیم فخرالدین حسنی رائے بریلوی) نزہۃ الخواطر جلد پنجم میں مآثر الامراء کے حوالے سے تاریخ وفات ۱۰۴۱ھ اور مقامِ دفن کابل مندرج ہے۔ سبحۃ المرجان میں علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا مدفن لاہور لکھا ہے۔

میں تاویل کی ہے (کہ غیر کے معنی مُباین اور مُنفک کے ہیں یعنی صفاتِ باری، باری تعالیٰ سے جُدا نہیں ہیں) اور لفظ غیر کے ایک خاص معنیٰ چاہے ہیں ـــ اس تاویل کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ نظر کشفی اس خاص معنیٰ کے نکالنے کو منع کرتی ہے اور غیریت کی نفی کرتی ہے، خواہ غیریت کسی معنیٰ میں ہو..... اور یہ جو کہا گیا کہ یہ معرفت) طورِ عقل کے ماوراء ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ عقل اس معرفت تک راہ یاب نہیں ہوتی اور اس کے ادراک سے عقل، قاصر ہے یہ بات نہیں ہے کہ عقل اس کے برخلاف حکم کرتی ہے ـــ اس کے برخلاف کس طرح حکم کرے گی؟ جب کہ اس کا تصور تک نہیں کرسکتی بلکہ وہ (معرفت) اس کے احاطۂ ادراک سے باہر ہے پھر بھلا (بیچاری عقل) اثبات و نفی کا حکم کیسے لگا سکتی ہے ـــ ربّنا اٰتنا من لّدنک رحمۃً وھیّئ لنا من امرنا رشدا ـــ

مکتوب (۱۱۶) :- خواجہ ابوالمکارم کے نام ـــــ [ترغیب / خدمتِ خلق]

حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ تم کو حدِ اعتدال اور مرکزِ عدالت پر استقامت نصیب فرمائیں ـــ کتنی بڑی دولت ہے یہ کہ خداوند تعالیٰ کسی بندے کو بعض فضائل کے ساتھ مخصوص کرکے اپنے بندوں کے حوائج کی کنجی اس کے دستِ تصرف میں دے دے اور اس شخص کو ان لوگوں کا ملجا و ماویٰ بنا دے ـــ کتنی بڑی نعمت ہے کہ مخلوق کی ایک جماعت کو ـــ کہ اپنے کمالِ کرم سے اس کو اپنا عیال فرمایا ہے ـــ اس شخص سے متعلق کردے اور اس جماعت کی تربیت و پرورش کو اس کے سپرد کردے ـــ وہ سعادت مند ہی ہوگا جو اس دولت پر حمد پروردگار کرے اور وہ دانشمند ہی ہوگا جو اس نعمت پر شکرِ خدا بجا لائے اور حق تعالیٰ کے عیال (مخلوق) کی خدمت گاری کو اپنی سعادت تصور کرے نیز اپنے مولائے حقیقی کے بندوں اور بندیوں کی تربیت کو اپنا شرف سمجھے ـــ الحمدللہ کہ آپ کے علاقے کے لوگ آپ کے ذکرِ خیر سے تر زبان ہیں اور آپ کے کرم و احسان کا تذکرہ کیا کرتے ہیں۔

مکتوب (۱۲۰) :- میر منصور کے نام ـــــ

الحمدللہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــ تمھارے مکتوبات

یکے بعد دیگرے پہونچے ـــــ خوشوقت کیا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ بے مناسبتی فقراء کے اباب موجود ہوتے ہوئے بھی فقراء سے محبت و ارتباط کا جو معاملہ رکھتے تھے ـــــ اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور کسی قسم کی منافات و کوتاہی رونما نہیں ہوئی بلکہ ارتباط سابق میں اور پختگی پیدا ہوگئی ـــــ اللہ تعالیٰ اس طائفۂ صوفیہ کی محبت میں استقامت عطا فرمائے کیونکہ یہ چیز سرمایۂ سعادت ہے ـــــ شفقت شعارا! اس زمانے میں یکسو رہنے کا شوق غالب آگیا ہے اور گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے اور (فی الحال) سوائے جمعہ کے مسجد میں نہیں جاتا ـــ جماعت بہ خوشی خانقاہ ہی میں منعقد ہوتی ہے ـــ (عام طور پر) لوگوں سے ملاقات بھی بند ہے ـــ اوقات، جمعیت قلب کے ساتھ بسر ہو رہے ہیں اور تمام عمر کی آرزو اب میسر آئی ہے ـــ حمداً للّٰہ سبحانہ علیٰ ذٰلک ـــ باقی احوال صوری بھی عافیت سے مقرون ہیں اور" فرزندان و متعلقان بھی جمعیت خاطر کے ساتھ گزر بسر کر رہے ہیں ـــ جناب خواجہ عبداللہ (صاحبزادۂ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ) ماہ مبارک رمضان سے پہلے دہلی تشریف لے گئے ـــ الحمدللہ کہ خواجہ عبداللہ نے یہاں آکر بہت فوائد حاصل کرلیے اور ان کو ترقی تمام میسر ہوئی۔ نیز غلبات توحید سے دریائے تنزیہہ میں غوطہ زن ہوکر دریائے تنزیہہ کی گہرائی کی طرف متوجہ ہیں اور ظاہر سے باطن بلکہ باطن کے باطن کی طرف چل رہے ہیں۔ حافظ بہاء الدین جو کہ وہاں جا رہے ہیں یہاں کے احوال شاید تفصیل سے بیان کریں ـــــ

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۲)

ساری احادیث کو جمع کرنے کی ضرورت ہوگی اور یہ اس دور میں بڑا مشکل ہے۔ اس کے جواب میں میں (شاہ صاحب) کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ دردسری کی ضرورت نہیں ہے، (کتب حدیث میں سے) صرف موطا صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی کی طرف لوٹنا چاہیے۔ یہ کتابیں مشہور و معروف ہیں اور قلیل مدت میں ان پر دسترس ہوسکتی ہے لیکن ان کتابوں میں جادۂ تویمہ کی معرفت نور باطن کی محتاج ہے اور یہ نور اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے، پس اگر تیرے قلب میں یہ نور باطن نہ ہو اور تیرے بھائیوں میں سے کسی نے اس کی طرف سبقت کی ہو اور اس نے تجھے ایسی زبان میں سمجھا دیا جس کو تم سمجھتے ہو تو اس کے بعد (جادۂ تویمہ کے خلاف جانے میں) تجھے معاف نہ کیا جائے گا۔[1]

[1] تفہیمات الٰہیہ۔ ج ۱ ص ۱۵۳-۱۵۶

شریعت کا جادۂ قویمہ شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ انھیں شارع علیہ السلام کی جانب سے امت مرحومہ کے اختلافات دور کرنے کا روحانی القا ہوا تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک فقہی فروعات کا تعلق ہے آپ، آپ کی اولاد اور آپ کے تربیت یافتہ تلامذہ سب کے سب ان امور میں امام ابوحنیفہؒ کے پیرو تھے، لیکن اس ضمن میں ان کے طریقے میں وہ جمود نہیں تھا، جو آج کل پایا جاتا ہے اور یہ کہ شاہ صاحبؒ کے بتائے ہوئے جادۂ قویمہ پر ان کا عمل تھا، میرے اس مدعا کے پہلے جزو کے اثبات کے لیے فیوض الحرمین کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

إن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نفخ الیّ نفخة أخری فبین ان مراد الحق فیك ان تجمع شملا من شمل الامة المرحومة بك وایاك أن تخالف القوم فی الفروع[1]	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے (ایک روحانی سوال کے جواب میں) ایک اور خوشبو آئی اور ظاہر ہوا کہ یہ حق تعالیٰ کی مراد ہے کہ تیرے ذریعہ امت مرحومہ کے تشتت کو دور کرے اور خبردار فروع میں کبھی قوم کا مخالف نہ ہونا۔

شاہ صاحبؒ حنفی مذہب فقہ کی تقلید میں جمود کے امکان کو اپنے تجویز کردہ جادۂ قویمہ کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک مکاشفے میں فقہ حنفی کے

---

[1] فیوض الحرمین صـ ۶۲ طبع احمدیہ متعلق مدرسہ عزیزیہ دہلی۔

ساتھ سنت کی تطبیق کا ایک نمونہ پیش کرکے فقہی تقلید کے حامیوں کے لیے غور و فکر کا دروازہ کھول دیتے ہیں فرماتے ہیں۔

ثم کشف لی أنموذجا ظهر لی منه تطبیق السنة بفقه الحنیفة من الاخذ بقول احد الثلاثة وتخصیص عموماتهم والوقوف علی مقاصدهم والاقتصار علی ما یفهم من لفظ السنة ولیس فیه تاویل بعید والاضرب بعض الاحادیث بعضا والارفضا لحدیث صحیح بقول احد من الائمة وهذه الطریقه ان أتمها الله واکملها فهی الکبریت الاحمر والاکسیر الاعظم[1]

پھر میرے لیے ایک اور نمونے کا انکشاف کیا جس سے فقہ حنفی سے سنت کی تطبیق کا راستہ کھل گیا (جو یہ ہے) کہ ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہ ابو یوسف اور محمد) میں سے کسی ایک کے قول کو اختیار کیا جائے۔ اور ان کے عمومات کی تخصیص، اور ان کے مقاصد پر وقوف کے بعد سنت کے ظاہر الفاظ سے جو مفہوم ہوتا ہے، اس پر اقتصار کیا جائے۔ اس میں نہ تو بعید تاویل کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ بعض احادیث کا بعض سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور نہ کسی ایک امام کے قول کے لیے صحیح حدیث کو چھوڑنا پڑتا ہے اس طریقے کو اگر اللہ تعالیٰ پورا اور کامل کرے تو کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہے۔

اس تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ احناف میں سے جس امام کا قول صحیح حدیث کے موافق ہو، اس کو اختیار کیا جائے، اور اسے اپنا فقہی مذہب قرار دیا جائے۔ اس طرح کسی امام کے قول کے لیے صحیح حدیث نہیں چھوڑنی پڑے گی۔

فقہی تقلید کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ اپنے زمانے کے عوام کی حالت بیان کرتے ہوئے تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں۔

---

[1] فیوض الحرمین صفحہ ۶۲-۶۳

آج کل تمہیں عوام کی یہ حالت دیکھنے میں آئے گی کہ انھوں نے متقدمین کے مذاہب فقہ میں سے کسی ایک امام کے مذہب سے اپنے آپ کو ایسا وابستہ کر رکھا ہے کہ اگر کوئی اس (مخصوص) مذہب کو اس کی تقلید کے بعد چھوڑ دے چاہے وہ چھوڑنا ایک مسئلے ہی میں کیوں نہ ہو، اس کو وہ دین و اسلام سے نکلنے کے مرادف خیال کرتے ہیں! اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کی تقلید کی جا رہی ہے وہ (ان کے خیال میں) ان کی طرف ایک نبی مرسل ہے جس کی اطاعت ان پر فرض کی گئی ہے۔

چوتھی صدی ہجری سے قبل امت کے اندر لوگ (فقہاء میں سے) کسی ایک مذہب کے پابند نہ تھے۔ ابو طالب قوت القلوب میں لکھتے ہیں کہ کتابوں کے مجموعے سب نئی چیزیں ہیں، لوگوں کے اقوال کو (سند میں) پیش کرنا، ان میں سے کسی شخص واحد کے قول پر فتوے دینا ہر شے میں اس کے قول کو حجت جان کر اس کو نقل کرنا، اور اس کے مذہب پر تفقہ حاصل کرنا یہ پہلے لوگوں کا طریقہ نہ تھا۔ پچھلے دور کے عوام کا یہ دستور تھا کہ وضو، غسل، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، نکاح، بیع اور دوسرے روزمرہ کے پیش آنے والے امور کے احکام کو اپنے آباؤ اجداد اور اپنے شہر کے اساتذہ سے سیکھتے تھے، اور جب کوئی نیا واقعہ ان کو پیش آتا تھا تو مفتیوں کی طرف رجوع کرتے تھے، چاہے وہ مدینہ کے مفتی ہوں یا کوفہ کے۔ وہ ان کے فتووں پر عمل کرتے تھے۔ (باقی) ان میں سے خواص لوگ جو کہ حدیث کے اصحاب حال تھے اور جاننے والے تھے، وہ ان مسائل میں جو احادیث اور آثار سے واضح طور پر معلوم ہوتے تھے۔ صرف شارع علیہ السلام کی تقلید کرتے تھے، اور جہاں ان کے بارے میں انھیں واضح حدیث نہ ملتی تھی وہ ان میں دوسرے ائمہ کے اقوال اور آراء کی اس وقت تک پیروی کرتے جب تک ان کو حدیث سے ان کے متعلق کوئی واضح دلیل نہ مل جاتی۔ خواص میں سے جو لوگ تخریج مسائل کے اہل ہوتے تھے، وہ فقہا میں سے کسی فقیہ کے قول منصوص یا بصورت عدم قول منصوص، اس کے بتائے ہوئے قواعد پر مسائل کی تخریج کرتے تھے۔

بعض اہل کشف ایسے بھی گزرے ہیں کہ جب لوگوں نے (فقہا کے) مذاہب کی تقلید کو اختیار کیا تو وہ کسی ایک مذہب کی پابندی کے خلاف تھے، جیسے کہ شیخ ابن عربی، انھوں

نے فتوحات مکیہ اور اپنی دوسری تالیفات میں لکھا ہے کہ بندہ اپنے (فکری) ارتقا کے دوران ان لوگوں کے مقامات سے گزرتا ہے جو فقہا میں سے کسی ایک مذہب کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس ارتقا میں اس منبع اور سرچشمہ کو پالیتا ہے جہاں سے اس مقلد کے امام نے اپنے اقوال حاصل کیے تھے۔ وہاں وہ دیکھتا ہے کہ جمیع ائمہ کے اقوال اس ایک ہی سمندر سے چلو بھرتے ہیں۔ (ایسی حالت میں) اس سے کسی ایک مخصوص مذہب کی پابندی اور تقلید چھوٹ جاتی ہے اور وہ اپنی سابقہ رائے کے خلاف سب مذاہب کو یکساں اور مساوی خیال کرتا ہے (اہل مکاشفہ میں سے) بعض اس لیے (کسی خاص فقہی مذہب کی) پابندی کرتے ہیں تاکہ عوام میں اختلافات پیدا نہ ہو یا انھیں خواب میں بعض مذاہب کے متعلق کچھ جہات مرجح نظر آتے ہیں۔ اس لیے وہ اس کی تقلید کو اختیار کر لیتے ہیں۔

بعض نقاد علماء ایسے بھی گزرے ہیں کہ اپنے عمل میں یا دوسروں کے لیے فتاویٰ دینے میں کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے جیسے کہ ابو محمد جوینی۔ انھوں نے "محیط" نامی ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے کسی ایک مذہب کے اقوال کا التزام نہیں کیا۔ اس روایت کو شیخ جلال الدین سیوطی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ایک ایسی جماعت سے نقل کیا ہے جس کا احصا مشکل ہے۔ لیکن ظاہر اور مشہور یہی ہے کہ اکثر فقہاء کسی ایک مذہب کے پابند ہوتے تھے۔

بہرحال علماء کے اس قسم کے (فقہی) اختلاف نے قوم کو خوف زدہ کر دیا اور بعض کو بعض کے اقوال کے انکار پر اکسایا اور پھر اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صریح حکم بھی مروی نہیں جس کی طرف کہ رجوع کیا جائے۔

یہ لکھنے کے بعد شاہ صاحبؒ تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے ہیں:۔

میرے اوپر اللہ کی بڑی نعمتوں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ شارع علیہ السلام نے ہمیں ایسے دو علم عطا فرمائے ہیں جو احکام کے لحاظ سے ایک دوسرے سے تمایز اور مراتب میں متغایر ہیں۔ ایک علم مصالح و مفاسد اور دوسرا علم شرائع و حدود اور میں ان دونوں کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہ صاحب شرف علم ہے جس کی طرف مجھ سے پہلے کسی نے سبقت نہیں کی اور نہ کسی نے اس کے اصول اور فروع کو بیان کیا، اور نہ

اس پر مسائل کو حل کو کیا۔

میرے اوپر اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ جادۂ قویمہ کے ضبط و ترتیب کے بعد مجھ پر فقہاء کے اختلاف کے اسباب کا بھی انکشاف ہوا۔ جادۂ قویمہ کی طرف، بعض ایسی تفاصیل اور تفریعات میں اشارہ کر چکا ہوں جو کہ مقدمات کلیہ میں محصور اور مضبوط ہیں جس نے ان کو سمجھا اور ان پر یقین کیا، وہ مواضع اختلاف کے سمجھنے میں بیت دلیل نہیں کرے گا اور جادۂ قویمہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے مستقل طور پر متمثل پائے گا۔ وہ تفاصیل کو ایک ضروری امر خیال کرے گا۔ کہ طریقہ نبوت (ملت) کو اس کے ماخذ اور منبع سے لینے والوں کے فہم کے اختلاف سے (تفاصیل کا) یہ اختلاف پیدا ہوا ہے۔

بعد ازاں شاہ صاحبؒ اسی کتاب میں اختلاف کے چار منازل کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ میرے لیے یہ علم منکشف ہوا کہ اختلاف کے چار منازل ہیں۔

۱۔ اختلاف مردود۔ جس کے قائل اور پیروکار کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ فقہ کے مدوّنہ مذاہب اربعہ میں یہ اختلاف قلیل الوجود ہے۔

۲۔ اختلاف ..... اس کے قائل کو تب تک معذور سمجھا جائے گا جب تک کہ اس اختلاف کے خلاف اس کو کوئی صحیح حدیث نہ پہونچی ہو۔ صحیح حدیث پہونچنے کے بعد بھی (اگر وہ اس پر اڑا رہا) وہ معذور نہیں ہے۔

۳۔ اختلاف مقبول، جس میں شارع علیہ السلام نے دونوں باتوں کا اختیار دے رکھا ہو، جیسے قرآن مجید کو سات حروف سے پڑھنا۔

۴۔ ایسا اختلاف جس کے بارے میں ہم نے شارع علیہ السلام کے بعض اقوال سے اجتہاد اور استنباط کے طور پر سمجھ رکھا ہے کہ اس کے دونوں اطراف مقبول ہیں اور انسان کو ان میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کے لیے مکلف بنایا گیا ہے، لیکن یہ بھی اپنے حکم میں مطلق نہیں ہے بلکہ اجتہاد اور ظن تاکیدی اس کی تقلید کے لیے ضروری ہے۔

اس قسم کے کئی علوم پر سے میرے لیے پردہ اٹھایا گیا۔ اور مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ہر ایک (فقہی) مذہب میں ظاہر اور شاذ دونوں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں

ظاہر الروایۃ وہ ہے جس کو اصول خمسہ نے جمع کیا ہو اور امام محمد نے بصراحت یہ کہا ہو کہ یہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے یا اس پر ان کا اعتماد رہا ہے۔ امام مالکؒ کے مذہب کا ظاہر الروایۃ ہے جس کی ابن قاسم نے صراحت کی ہو یا مدونہ میں (اس کے متعلق) یہ رائے پائی جائے کہ یہ امام مالکؒ کا وہ قول ہے جس پر ان کا اعتماد رہا ہے۔ امام شافعیؒ کے مذہب کا ظاہر الروایۃ وہ ہے جس پر شیخین یعنی رافعی اور نووی دونوں نے اعتماد ظاہر کیا ہو اور یہ صراحت کی ہو کہ یہ شافعی کا مذہب ہے' اور ان کا مشہور اور معمول بہ قول ہے۔ ان کے سوا اگر کوئی روایت غیر مشہور لوگوں سے یا ایسے لوگوں سے ملے جو ان ائمہ کے مذاہب پر عبور نہیں رکھتے تو وہ شاذ روایت کہلائے گی۔

اسی طرح شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہر اور شاذ۔ ظاہر شریعت کے لیے چند مراتب ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ۱۔ اقویٰ یعنی سب سے قوی تر تو وہ ہے جو قرآن مجید کی نص میں اس طرح پائی جائے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی خفا نہ ہو۔ ۲۔ دوسرے مرتبے پر ظاہر شریعت وہ ہے جو احادیث مستفیضہ صحیحہ سے ماخوذ ہو اور یہ احادیث صحیح بخاری' صحیح مسلم' نیشاپوری اور موطا امام مالک میں اس طرح مروی ہوں کہ ان میں تعارض نہ ہو اور روایات کے الفاظ اختلاف فاحش سے مبرا ہوں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ان میں چار شرائط پائے جائیں۔ وہ اپنے معنی اور مراد میں واضح ہوں۔ اہل لسان پر ان کا مطلب پوشیدہ نہ ہو۔ اور وہ مشہور روایت ہوں جنہیں صحابہؓ میں سے تین یا تین سے زیادہ نے روایت کیا ہو پھر ہر طبقے میں ان کے راوی بڑھتے گئے یہاں تک کہ حفاظ حدیث اور نقاد فقہا کا طبقہ آگیا۔ اور وہ ان سے راضی ہوئے اور ان کے قائل ہوئے اور وہ احادیث ان تین کتابوں میں مروی ہوں' کیونکہ ان تینوں کتابوں کی اسلام میں وہ شان ہے جو دوسری کتابوں کی نہیں ہے اور علمائے حدیث و فقہ کے ہاں ان کتابوں کی وہ مقبولیت ہے۔ جو دوسری کتب کی نہیں اور ان کتابوں کی وہ صحت ہے کہ اس جیسی صحت دوسری کتابوں میں نہیں دیکھی گئی۔

کتب حدیث کی ان تینوں کتابوں کے ساتھ قوم کا جو اہتمام رہا وہ دوسری کتابوں

کے ساتھ نہیں رہا۔ ان کتابوں کی شرح غریب، ضبط مشکل تخریج نقد اور راویوں کے بیان پر خاص زور دیا گیا۔ یہ ایسی بات ہے جس سے صرف وہ ناآشنا ہو سکتا ہے، جو قوم کے مدارک سے اجنبی ہو۔ مزید یہ کہ احادیث نبویہ میں تعارض نہ ہو، ان کتابوں میں خاص طور پر آپس میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو۔ امام مالکؒ سے (کسی مسئلہ میں) اس طرح منقول ہونا کہ یہ بڑے بڑے صحابہ اور تابعین کا مذہب ہے، جس پر زمانہ نبوت سے لے کر ان (امام مالک) کے زمانہ تک اہل مدینہ عمل کرتے آئے ہیں۔ (یہ بھی مذکورہ کتب کی روایت کے حکم میں ہے) پھر اس پر شافعی، احمد بخاری اور ان جیسے حدیث اور فقہ کے (ائمہ) جامعین نے کوئی تعقب نہیں کیا بلکہ اس کو پسند کیا اور اس کے قائل ہوئے۔ اور اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح یا حسن حدیث سے بصراحت تائید ہو، اگرچہ یہ آحاد اخبار سے ہی کیوں نہ ہو، یا اخبار کی دلالت یا اشارت سے تائید ہو۔ یا (اس سلسلے میں) صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کے آثار کو پیش کیا گیا ہو۔ یا کسی واضح قیاس اور صحیح استنباط سے اس کو قوی بنایا گیا ہو۔

سفیان ثوری کی روایت بھی امام مالکؒ سے منقول روایت کے حکم میں ہے لیکن امام مالک سے (کسی روایت کا) منقول اور مروی ہونا بیشتر اوقات ہوتا ہے۔ دوسروں سے منقول روایات کا یہ پایہ نہیں۔ مشہور کتب حدیث میں اگر کوئی صحیح یا حسن حدیث مروی ہو، اور اسے جس طرح روایت کیا گیا ہے، اس سے حجت قائم ہوئی اور فقہا کی ایک جماعت کا اس پر عمل رہا۔ یا وہ حدیث صحیح اور قوی استنباط ہے اور اس کی صحت کی ایک جماعت نے شہادت دی تو یہ بھی اس امام مالک کی روایت کے حکم میں ہے۔

یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر شریعت اور آپؐ کے سنن کا جادۂ قویمہ ہے جس کا صاحب رشد و ہدایت ہونا اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ جو بھی اس کا مخالف ہوگا۔ اس کا قول مردود سمجھا جائیگا۔ پس اگر وہ اس حالت میں نص قرآنی یا مشہور حدیث کی مخالفت کر رہا ہے، یا اجماع اور جلی قیاس کے خلاف جا رہا ہے تو وہ معذور نہ ہوگا اور اگر کسی دوسری دلیل کی مخالفت کر رہا ہے تو وہ اس وقت تک معذور سمجھا جائیگا جب تک کہ اس کو کوئی صحیح حدیث نہ پہونچے اور حجاب نہ اٹھ جائے۔ خفا اور حجاب کے اٹھ جانے کے بعد اس قول کے مقلد اور پیروکار کو معاف نہیں کیا جائیگا۔ اس مقلد کو یہ کہنے کا حق نہیں پہونچتا کہ میں حدیث پر عمل نہیں کرونگا اور اپنے امام کے

قول پر عمل کروں گا چاہو اس کے خلاف کوئی صحیح دلیل ہی کیوں نہ ہو۔

اب تجھ پر لازم ہے کہ جب شریعت کے احکام اس طرح تیرے پاس ثابت ہو کر آجائیں تو تم ان میں اچھی طرح غور کرو تاکہ تم ان کو ان کے غیر سے جدا کر سکو اور وہ تیری آنکھوں کے سامنے متمثل اور تیرے دل میں منقش ہوں پھر تجھے ان کو مضبوطی سے پکڑنا اور اپنے ہاتھوں سے مضبوط تھامنا چاہیے۔ اس میں اگر کوئی مخالف بھی ہو تو اس سے ہوشیار رہیں اور اس کی بات کی طرف کان نہ لگائیں۔ اس جادۂ قویمہ کے اثبات کے بعد بعض اسباب کی بنا پر اگر کبھی اختلاف ہو تو ایسی حالت میں وہ قول جو کہ ماخذ کے قریب ہو اور اس میں ظاہراً کوئی کوتاہی نہ پائی جائے اس کا ہرگز انکار نہ کیا جائے۔ بلکہ ایسا قول قبول کرنا چاہیے۔ اس طرح جادۂ قویمہ کو ایک مذہب بنائیں۔ اس سلسلے میں مختلف اقوال سے چشم پوشی کریں اور شریعت محمدیہ کے جادۂ قویمہ سے ایک رتی بھی باہر نہ جائیں۔ اس جادۂ قویمہ سے نکلنے کی مثال ہے وضو میں پاؤں پر مسح کرنا، نکاح متعہ کو جائز تصور کرنا، مسکر شراب کے قلیل مقدار کو حلال سمجھنا، گدھوں کو حلال جاننا اور یہ کہنا کہ وقت ظہر سایہ اصلی کے نکالنے کے بعد داخل ہے۔

جادۂ قویمہ کو تسلیم کرنے کے بعد اختلاف کرنے کی مثال علماء کا دوزدوں میں زوال کے بعد مسواک کرنے کا اختلاف ہے، یا یہ کہ نماز کو سبحانک اللھم سے شروع کیا جائے۔ یا وجھت وجھی سے یا ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ اور تشہد میں ابن مسعودؓ کی تشہد پڑھنی چاہیے یا ابن عباسؓ کی یا ابن عمرؓ کی۔

پھر اگر تمہاری ہمت بلند ہے اور تم تقوی میں قوی ارادہ رکھتے ہو تو ان تفاصیل کو واضح کتاب، ظاہر سنت اور اہل علم کے عمل اور قیاس قوی پر پیش کرو۔ مختلف احادیث میں تطبیق کرو، محدثین کی کتابوں میں جو اخبار صحیحہ، حسنہ یا ضعیفہ مروی ہیں، ان کا تمہیں تتبع کرنا چاہیے اور ان میں سے اقوی اور احوط کو اختیار کرنا چاہیے۔ ورنہ تمہارا درجہ ایک عام مسلمان سے اوپر نہیں ہوگا۔

اگر یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا۔ وہ بالتحقیق شریعت مصطفویہ کا جادۂ قویمہ ہے لیکن اس کی اس کے غیر سے کیونکر تمیز ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے تو بہت

(باقی صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجئے)

عورت کی سربراہی کی حمایت

دینی محاذ کا ایک حادثہ اور لادینیت کے لیے نوید فتح

از ـــــــــــــــــــ عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے صدارتی انتخاب کا ہنگامہ ختم ہوگیا۔ اور یہ جس نتیجہ پر ختم ہوا، ہماری دعا ہے کہ وہی پاکستان کے حق میں بہتر ثابت ہو، لیکن افسوس ہے کہ اس ہنگامہ نے اسلامی نظام سیاست کے ایک ایسے اہم اصول میں انتشار فکر کو جنم دے دیا ہے جس پر اہل دین میں کبھی دو رائیں نہیں تھیں، جس کی قطعیت کے بارے میں مسلم عوام آج تک کبھی تذبذب میں نہیں پڑے اور جس میں انتشار و تذبذب کی کیفیت کا پیدا ہو جانا آج کے خاص حالات میں جبکہ مسلم معاشرہ کے اندر دین اور لادینیت کی ایک شدید کشمکش برپا ہے، دینی محاذ کے لیے ایک ایسی چوٹ کے معنیٰ رکھتا ہے جس کے بعد کامیابی کی امید رکھنے کے کوئی معنیٰ نہیں!

آج مسلم معاشرہ کے اندر دین اور لادینیت کی جو جنگ برپا ہے اس کا اصل میدان ہمارے عقائد نہیں، ہمارے اوضاع و اطوار اور ہمارا معاشرتی نظام ہے۔ عقائد کی جنگ کا زمانہ گزر گیا اور اب اس معاملہ میں دراصل لادینی محاذ کے اندر دم نہیں رہ گیا ہے، گولہ باقی ہیں جو رسمی جل جانے کے بعد بھی رہ جاتے ہیں، اب تو لادینیت کا سارا زور معاشرتی تجدد پر اور زندگی کے نقشے کو مغربیت کے اصولی سانچے میں ڈھال لینے پر ہے، جس کا ایک اہم رکن ہے عورت اور مرد کی مساوات، یعنی کاروبار حیات میں ان دونوں کے درمیان عدم امتیاز اور ہر قید و بند سے آزاد

اختلاط! یہی وہ اصول ہے جس کے بارے میں مسلم معاشرہ کے اندر لادینی محاذ کو اب تک عمومی سطح پر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر اس میدان میں لادینیت نے جنگ جیت لی تو پھر اس نے سب کچھ جیت لیا۔ اس جیت کے بعد اسلام کے نیچے کچھے معاشرتی نظام ہی کی نہیں اخلاقی نظام کی بھی چولیں ہل جائیں گی۔ اور اس کے بعد کیا دین رہ جائے گا؟ وہ ظاہر ہے۔

عورت اور مرد کی کامل مساوات کا کوئی مظاہرہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا کہ کوئی ملک اپنی سیاسی زندگی کی سربراہی کے لیے ایک عورت کا انتخاب کرنے پر آمادہ ہو جائے، کیونکہ اس معاملہ میں دنیا نے ہمیشہ ہی مرد و عورت کے درمیان تفریق کی ہے اور حد یہ ہے کہ مساوات کا یہی وہ نقطہ ہے جس تک پہونچنے کی ہمت وہ مغربی معاشرہ بھی نہیں کر پایا جو اس اصول مساوات کا معلّم ہے۔ عورت کے اس مساوی حق کا قائل وہ صرف نظری حد تک ہے۔ رہا اپنے اختیار سے اس کو عمل میں برتنا تو اس سے وہ بھی اسی طرح دور ہے جس طرح دنیا کے تمام سمجھدار معاشرے آج تک دور ہی رہتے آئے ہیں ـــــ پس اگر کوئی معاشرہ عورت کو اپنی سیاسی سربراہی کا شرف بخشنے پر آمادہ ہو جائے یا کم از کم یہ ماننے ہی لگ جائے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یا اور بھی نیچے اتر آئیے، صرف یہ خیال ہی لوگوں میں پیدا ہو جائے کہ یہ کوئی اس درجہ کی بات نہیں ہے کہ ضرورۃً بھی اس کو جائز نہ رکھا جائے تو مساوات کے اس نقطۂ کمال کے بارے میں یہ ذہن اختیار کر لینے کے بعد وہ معاشرہ کس طرح اس پوزیشن میں رہ سکتا ہے کہ اس سے نیچے کے نقطوں پر لادینیت کی مزاحمت کر سکے!

اب ذرا دیکھئے کہ پاکستان کے اس الیکشنی ہنگامہ میں خود وہاں کے اہل دین کے ہاتھوں، عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں، کیا ذہن عام لوگوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان میں دینی محاذ کے سب سے مقتدر اور نامور لیڈر مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ عبرت انگیز چیلنج تو آپ گزشتہ شمارے میں پڑھ ہی چکے ہیں کہ :-

"کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ ازروئے شریعت عورت کا سربراہ مملکت ہونا حرام ہے۔"

اور پھر اس کے جواز میں مولانا کا یہ استدلال بھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ چونکہ ملکہ سبا کے ایمان لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ وحی نازل نہیں ہوئی کہ عورت کو سربراہ مملکت نہیں رہنا چاہیئے اس لیے یہ ثابت ہوا کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ جماعت اسلامی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک اخبار نے (جس کے مدیر جماعت کے ایک ممتاز رکن اور پاکستان کے ایک ابھرتے ہوئے واعظ اور خطیب بھی ہیں) اپنے ایک اداریے کے اندر صاف لفظوں میں اس کو بعض مذہبی حلقوں کے پروپیگنڈے سے تعبیر کیا کہ "شریعت کی رو سے عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی ہے" ——— لیکن اس اداریے میں ایسا صرف یہ ایک جملہ ہی نہیں تھا بلکہ پورے دو صفحے میں اس "پروپیگنڈے" کی تردید کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ کوئی قطعی مسئلہ نہیں ہے۔ اس میں دوسری رائے کی بھی پوری گنجائش ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ

"یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے اور ایسا متفق علیہ بھی نہیں جس میں علماء سلف یا موجودہ اہل علم کے درمیان اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔"

اور اس کے بعد فرمایا کہ

"جو لوگ اپنی روپہلی اغراض کے تحت عورت کے صدر مملکت بننے یا نہ بننے کو کفر و اسلام کا مسئلہ بنا چلے ہیں اُن کی تو اور بات ہو لیکن جن ثقہ اصحاب علم کو بالغ نظری کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہونچنا ہے ہم سوئے ادب کی معافی چاہتے ہوئے اکابر علماء کے چند حوالے اُن کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے کہ ملکی دنیوی ضروریات کے پیش نظر عورت کی سربراہی کو تسلیم کرلینے سے یہی نہیں کہ آدمی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا بلکہ علم و تقویٰ کے بلند ترین مقامات پر بھی بدستور فائز رہ سکتا ہے۔"

آگے وہ حوالے درج کیے گئے ہیں کہ کن کن اکابر علماء نے اس مسئلہ میں جواز کا حکم فرمایا ہے۔

ان میں دورِ حاضر کے علماء کے نام یہ ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید مہدی حسن مفتی اعظم دیوبند۔

علماء سلف میں سے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اُن کے نام یہ ہیں:۔

علامہ طبریؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور کچھ دوسرے بے نام کے ائمہ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ ان کے بالمقابل ایسے حوالے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں عورت کو سربراہ مملکت بنانے کی پرزور مخالفت کی گئی ہے مگر اس گفتگو سے کم از کم یہ تاثر ضرور پیدا ہونا چاہیے ـــــ اور یہی اس سے ہمارا مقصود بھی تھا ـــــ کہ عورت کا سربراہ مملکت بنایا جانا کفر و ایمان نہیں۔ نہ اس کے قائلین کو کافر و گمراہ ہونے کا طعنہ دیا جا سکتا ہے"۔

اس کے بعد "حقیقت پسندی" کے طور پر مسئلہ کے "عملی پہلو" پر توجہ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یہ بجا اور درست کہ ایک کامل اسلامی معاشرہ میں مرد ہی کو سربراہ مملکت ہونا چاہیے اور جہاں تک خلافتِ راشدہ کا تعلق ہے اس میں بھی یہی نظر آتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس عبوری دور میں بعض اہم مصالح کی بنا پر ایک کامل اسلامی معاشرہ کے مقتضیات سے کم پر رضامند ہو جانا دینی اقدار کی رو سے قابلِ برداشت ہے یا نہیں؟

اور پھر اس "حقیقت پسندی" کی دینی سند کے طور پر ارشاد ہوا ہے کہ

"خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں پر جو مختلف ادوار گزرے ہیں وہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" کے مصداق ہمارے اس عہد سے بہرطور بہتر تھے ان میں جو علماء اور صلحاء ہو گزرے ہیں ہمارے یہاں کے اکابر کسی لحاظ سے ان کے مثیل نہیں قرار دیے جا سکتے، اُن کی غیرتِ دینی بھی

شک وشبہ سے بالاتر ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان بہتر اور ادار میں کئی مواقع پر عورت سربراہ مملکت رہی مگر ان اکابر و اعاظم نے کبھی حکومت کے ساتھ اس وجہ سے عدم تعاون کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔"

اب حرفِ مدّعا سُن لیجئے کہ

"مندرجۂ بالا گزارشات سے دو باتیں صاف ہوگئیں ـــــ ایک یہ کہ اہل علم میں بعض ممتاز ہستیوں کے نزدیک عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی گنجائش ہے ـــــ دوسرے یہ کہ ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی حکمراں خواتین ہو گزری ہیں جنھوں نے کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور اس دور کے علماء و صلحاء نے ان کے ساتھ عدم تعاون نہیں کیا۔"

ہم اس اداریہ کے ضروری اقتباسات کے ذریعہ جو بات مخصوص طور پر سامنے لانا چاہتے تھے وہ آخری اقتباس کے اس فقرہ میں، جسے ہم نے زیر خط کر دیا ہے، اداریہ نگار نے خود ہی بڑی صراحت کے ساتھ کہہ ڈالی ہے کہ ان کا اولین مقصد اس ساری کد و کاوش سے یہ ہے کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی ممانعت کو لوگ کوئی قطعی مسئلہ نہ سمجھیں۔ اس میں سلف سے لے کر خلف تک بڑے بڑے علماء کی اختلافی رائیں موجود ہیں ـــــ ہم اس پر تبصرہ آگے کریں گے بہر دست اتنا ہی ذہن میں رکھئے کہ کیا تاثر لوگوں کو دیا گیا ہے اور پھر اس تاثر نے کیسے کیسے حلقوں کو آن کی آن میں زیر کر لیا؟ کہ ناواقف عوام کی بات چھوڑیئے قال اللہ وقال الرّسُول کی مسندیں تک اس تاثر میں ایسی بہہ نکلیں کہ مارے حیرت کے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا، اللہ و رسول کے جو ارشادات کل تک اس مسئلہ میں جن زبانوں پر فیصلہ بن کر آتے تھے آج یہی زبانیں ان میں تاویل کا سبق پڑھانے لگیں۔ اور پھر اس تاویل کے چکر میں کیسی کیسی تشکیک انگیز نکتہ نوازیاں اور کیسی کیسی خطرناک فلسفہ طرازیاں، کہ اگر انداز گفتگو سے سادہ لوحی نہ ٹپک رہی ہو تو ہم کہیں خود فریب نہیں کھا گئے ہیں کہ بلکہ جان بوجھ کر البہ فریبی مقصود ہے۔

اس فریب خوردگی کی ایک ماتم انگیز مثال ہمارے سامنے پاکستان کی ایک عربی درسگاہ کے ماہنامے کا اداریہ ہے۔ جو یوں تو مسلک دیوبند سے وابستہ ہے مگر پاکستانی سیاست میں کچھ دن سے اس کا رجحان جماعت اسلامی کی حمایت و اعانت کا نظر آتا ہے۔ اس رسالے نے عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر کوئی اٹھارہ صفحے کا اداریہ اپنی ایک حالیہ اشاعت میں لکھا ہے اور اس میں پاکستانی مسئلہ سے الگ بارہ تیرہ صفحے کی جو خالص اصولی بحث کی ہے وہ پوری کی پوری ایک کتابِ عبرت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے کچھ اقتباسات درج کیے جائیں مگر طوالت کے خیال سے ہم اپنے ہی الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس رسالے نے لکھا ہے کہ ـــــ مرد ہونے کی شرط تو کتابوں میں امامت و خلافت کے لیے آئی ہے اور امامت و خلافت نام ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کی واحد مرکزی حکومت کا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ملکوں اور علاقوں کے لیے جو امیر اس مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کیے جاتے تھے اُن میں قرشی ہونے کی شرط ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی، حالانکہ یہ امام اور خلیفہ کے لیے ضروری شرط تھی۔ پس آج جو مختلف اسلامی ملکوں کے صدر و سربراہ ہیں انھیں دورِ خلافت کے علاقائی اُمراء پر قیاس کرنا چاہیئے جن کیلئے خلافت والی شرائط نہیں تھیں اسی لیے مرد ہونے کی شرط بھی آجکل کی صدارت و سربراہی کے لیے ضروری نہ ہوگی۔ ـــــ غور فرمائیے کس قدر خطرناک منطق ہے۔ اس نے اُس وقت تک خدا علیٰ منہاج النبوت کی جڑ ہی کاٹ دی جب تک ساری دنیا کے مسلمان ایک سیاسی مرکز کے تحت جمع نہ ہو جائیں۔ جب تک یہ نہو اُسوقت تک مکمل اسلامی حکومت کے قیام کا مسئلہ ہی ختم ہے!

اچھا اب آگے آیئے!

اس منطق پر یہ اشکال وارد ہو رہا تھا کہ زبانِ نبوت نے تو بلا کسی تفریق کے فرمایا ہے "لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃً" (وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جو اپنی باگ ڈور ایک عورت کے ہاتھ میں دے دے) اس اس حدیث کی موجودگی میں کسی محدود، لیکن خود مختار علاقے کے مسلمانوں کو بھی کیسے یہ بات جائز رکھنی چاہیئے؟ اس اشکال کو دور کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ چونکہ قرآن میں ملکۂ سبا کے قصے سے عورت کی سربراہی کا جواز ملتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت کچھ جمہوری نوعیت کی تھی۔ اور حدیث کا تعلق ایران کی مطلق العنان شخصی حکومت سے ہے۔ اسلیے شخصی حکومت میں تو عورت کی سربراہی ناجائز ہوگی۔ لیکن جمہوری حکومت میں جائز ہوگی! ـــــ لیکن اب پوچھئے کہ کیا اسلامی خلافت بھی کوئی مطلق العنان شخصی حکومت ہوتی ہے

جس میں آپ عورت کی سربراہی کو منع فرماتے ہیں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ لیکن یقین کیجئے کہ اسلامی خلافت کو شخصی بادشاہت ہی کے ہم معنی ان بزرگ نے بتا دیا ہے ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی!

ہم ان باتوں کی باقاعدہ تردید پر کیا اپنا وقت ضائع کریں ان میں سے ہر بات کا نتیجہ خود ہی اسکے باطل ہونے کا ثبوت ہے۔ اور پھر اس فریب خوردگی اور خیرہ نگہی کی انتہا کو کیا کہیئے کہ نتیجہ خود سوال بن کر سامنے آرہا ہے مگر ذہن پر کوئی چوٹ نہیں پڑتی ——— بہرحال ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ نکتے تمام تر سادگی اور اُس پر مستزاد فریب خوردگی کا نتیجہ ہیں ورنہ لوگ اس سے بھی زیادہ غلط باتیں ایسی فنکارانہ شان سے کہتے ہیں کہ تردید میں سر چکرا جائے۔ اگر جان بوجھ کر لوگوں کو مغالطہ دینا اس رسالہ کا مقصود ہوتا تو یقیناً اس کا انداز کچھ اور ہی ہوتا، لیکن یہ بیچارہ خود گمراہ[۵] ہوا ہے دوسروں کو گمراہ کرنے کی نیت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور اس کی گمرہی کی جڑ ہے وہ حسنِ اعتماد اور حسنِ ظن جو اس نے مولانا سید ابوالاعلیٰ اور اُن کے رفقاء کے بارے میں اپنے اندر پیدا کر لیا تھا، اسے کچھ مسائل میں اختلافِ مسلک کے باوجود ان لوگوں کی جو ادائیں بھا گئی تھیں وہ تو یہی تھیں کہ یہ نظام مملکت میں اسلام کی فرمانروائی چاہتے ہیں اور وقت کے سب سے بڑے فتنے آزادیٔ نسواں کے تو پاکستان میں سب سے بڑے حریف یہی ہیں، بھلا وہ ان لوگوں کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ ان کا کوئی قدم غلطی سے بھی آزادیٔ نسواں کے حق میں جا سکتا ہے اور کوئی بات یہ ایسی بھی اپنا سکتے ہیں جو نظامِ حکومت کے اسلامی اُصولوں کے یکسر خلاف ہو! چنانچہ اس نے جو سُنا کہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کہتے ہیں کہ "عورت کے سربراہِ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے اور ان کی جماعت کے اخبارات اور رسائل لکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی متفق علیہ قطعی مسئلہ نہیں ہے، شروع سے آج تک بہت سے علماء و فقہاء جن میں بعض علماء دیوبند بھی شامل ہیں) اس کے قائل رہے ہیں کہ عورت بھی سربراہِ مملکت ہو سکتی ہے تو اسے بلا کسی تامل کے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو مسئلہ یونہی ہے اور پھر ایک ترجمانِ علم و دین کی حیثیت سے اس نے اپنا فرض جانا کہ مسئلے کو اپنے طور پر بھی منقح کرے اور جواز کے جو

---

[۵] یہ لفظ ہم لغوی معنی میں استعمال کر رہے ہیں اصطلاحی معنی میں نہیں۔

دلائل اور اعتراضات کے جو جوابات اس کی اپنی سمجھ میں آسکتے تھے انھیں بھی تائید حق کے لیے پیش کردے ـــــ یہ ہے ہمارے نزدیک اس گمراہی کی کہانی۔ اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے اور اسی حسن ظن اور حسن اعتماد سے گمراہی کا شکار ہوئے ہوں گے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریب عقل کا پردہ چاک کیا جائے اور ان سادہ دل اہل ایمان کو دکھایا جائے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقاء نے آج اس مسئلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ نہ صرف دلائل و حقائق کی روشنی میں غلط ہے بلکہ مولانا مودودی کی اپنی سابقہ تصریحات ہی اس کے تار و پود بکھیر دینے کے لیے کافی ہیں۔

جائزہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب نے جو مسئلہ قرآن کی بنیاد پر ارشاد فرمایا ہے اس پر تو ہم بعد میں گفتگو کریں گے پہلے ان کے حلقے کے اس پروپیگنڈے کا جائزہ لیجئے جس میں سلف سے خلف تک بہت سے ائمہ و علماء کے متعلق یہ خیال پھیلایا گیا ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے قائل تھے۔ اس کا تفصیلی خلاصہ ہم شروع میں دے چکے ہیں اب اس میں سے ایک ایک جزو کو لیجئے۔

(۱)

فرماتے ہیں کہ

"حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (جلد ۸ صفحہ ۹۰) پر علامہ طبری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عورت کی امارت اور قضا کے قائل تھے۔ اسی فتح الباری (باب کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ) میں امام مالک کے متعلق آیا ہے کہ وہ بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ صاحب فتح الباری نے امام ابوحنیفہ کا بھی (ایک روایت کے مطابق) یہی نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ انھوں نے بعض دوسرے ائمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو یہ نظریہ پیش کرتے تھے۔"

علامہ ابن حجر کی تالیف فتح الباری (شرح صحیح البخاری) میں یہ مسئلہ دو مقامات پر آیا ہے مذکورۂ بالا عبارت سے بھی بادی النظر میں دو الگ الگ مقامات ہی کا حوالہ معلوم ہوتا ہے لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ حوالہ ایک ہی مقام کا ہے۔ کیونکہ "باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

الی کسریٰ" اور "جلد ۸ صفحہ ۹۰" دونوں ایک ہی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب بنام کسریٰ کا ذکر فتح الباری کے اس مصری اڈیشن میں جو ۱۳ جلدوں میں شائع ہوا ہے، آٹھویں جلد کے صفحہ ۹۰ پر ہی ہے۔ ہندوستانی فتح الباری مطبوعہ مطبع انصاری دہلی میں اس کو جزو ۱۸ صفحہ ۹۰ پر دیکھا جا سکتا ہے ـــــ بہرحال اس مقام پر فتح الباری کی عبارت یہ ہے۔

والمنع من ان تلی الامارۃ والقضاء قول الجمھور واجازۃ الطبری وھی روایۃ عن مالک وعن ابی حنیفۃ تلی الحکم فیما تجوز فیہ شھادۃ النساء۔

اس عبارت میں علامہ طبریؒ کا ذکر ہے، امام مالکؒ کا ذکر ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا ذکر ہے۔ دوسرے کسی امام کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ جبکہ مدیر شہابؔ فرماتے ہیں کہ علامہ ابن حجرؒ نے بعض دوسرے ائمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو یہ نظریہ پیش کرتے تھے۔" ان دوسرے ائمہ" کا ذکر آپ کو فتح الباری کے دوسرے مقام پر ملے گا۔ یہ دوسرا مقام "کتاب الفتن" میں ہے جس کے لیے فتح الباری کے مذکورہ مصری اڈیشن کی جلد ۱۳ صفحہ ۴۷ دیکھنا چاہیے اور ہندوستانی اڈیشن کا جزو ۲۹ صفحہ ۵۴۸ (۲۸)۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

احتج بحدیث ابی بکرۃ من قال لایجوز ان تولی المرأۃ القضاء وھو قول الجمھور وخالف ابن جریر الطبری وقال یجوز ان تقضی فیما تقبل شھادتھا فیہ واطلق بعض المالکیۃ الجواز۔	وہ لوگ اس حدیث ابوبکرہؓ کو دلیل بناتے ہیں جو کہتے ہیں کہ عورت کا قاضی بنایا (یا بنایا جانا) جائز نہیں اور یہ مذہب جمہور ہے۔ لیکن ابن جریر طبری نے اس میں اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ عورت ان معاملات میں قضا کا فریضہ انجام دے سکتی ہے جن میں اس کی شہادت مانی جاتی ہے۔

اور بعض المالکیہ کا قول (اس سے بھی بڑھ کر) یہ ہے کہ نہیں عورت کی قضا علی الاطلاق جائز ہے (ان امور کی قید نہیں جن میں عورت کی شہادت معتبر ہوتی ہے)"

تو یہ "بعض دوسرے ائمہ" بعض مالکیہ ہوتے ہیں جو بقول مدیر شہاب یہ نظریہ پیش کرتے تھے کہ

عورت سربراہ مملکت ہو سکتی ہے۔

اگر مدیر شہاب "بعض دوسرے ائمہ" کا حوالہ نہ دیتے تو ہم سمجھتے کہ ان کی نظر میں فتح الباری کا یہ دوسرا مقام نہیں ہے۔ لیکن اب یہ سمجھے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ان کی نظر میں یہ دوسرا مقام بھی تھا اگرچہ اس کا متعین حوالہ انھوں نے نہیں دیا۔ سوال یہ ہے کہ فتح الباری کے اس دوسرے مقام پر بھی نظر رکھنے کے بعد کسی ایمان دار آدمی کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نہ سہی علامہ طبری کے بارے میں ہی یہ کہنے کی جرأت کرے کہ وہ عورت کی امارت کے جواز کے قائل تھے؟ اس دوسرے مقام کی عبارت تو صاف بتا رہی ہے کہ اُن کا (ابن جریر طبری کا) اختلاف صرف قضا میں تھا اور وہ بھی صرف اتنا کہ جن معاملات میں عورت شہادت کا حق رکھتی ہے ان میں اُس کو قضا کا حق بھی ہے نہ کہ علی الاطلاق .....

بہر حال اب دیکھئے کہ فتح الباری میں اُس مقام پر کیا کہا گیا ہے جس کا حوالہ مدیر شہاب نے دیا ہے! عبارت ہم نقل کر چکے ہیں لیکن ترجمہ اس کا ہم نے چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ دوسرے مقام کی عبارت سامنے آئے بغیر اس کے ترجمہ میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ دوسرے مقام کی عبارت سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو اُس عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا۔

"اور اس بات کی ممانعت کہ عورت امارت و قضا کی ذمہ داری سنبھالے یہ قول جمہور کا ہے لیکن طبری نے اس کو جائز کہا ہے اور یہی ایک روایت ہے امام مالک سے اور امام ابوحنیفہ سے روایت (محض ایک روایت) یہ ہے کہ عورت ان امور میں فیصلے (قضا) کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت جائز (معتبر) ہوتی ہے"

اس ترجمے کی رو سے بھی ہمیں مدیر شہاب کے بیان میں کئی غلط بیانیاں یا غلط فہمیاں ملتی ہیں۔

۱۔ اس عبارت میں امام مالک کے مذہب کی صرف "ایک روایت" کا بیان ہے۔ جبکہ مدیر شہاب نے بجائے "ایک روایت" کے امام مالک کا مذہب ہی یہ بتایا ہے۔ یہ ایک اہم فرق ہے جسے اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔

۲ اور ۳۔ امام ابوحنیفہ کا قول ایک روایت کے مطابق اس عبارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

وہ ایسے اُمور میں عورت کی قضا کو جائز فرماتے تھے جن میں عورت کی شہادت معتبر ہے۔ لیکن مدیر شہاب نے اول تو قضا کے سلسلے میں امام صاحب کی اس تجدید کو بیان نہیں کیا اور اس سے بڑھ کر غضب یہ کیا کہ قضا کے ساتھ امارت کا جواز بھی امام صاحب کی طرف منسوب کر دیا۔

یہ خلافِ واقعہ باتیں تو محض اس عبارت کو سامنے رکھ کر نکل آتی ہیں لیکن دوسری عبارت کو بھی سامنے رکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس (پہلی) عبارت کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ اول سے آخر تک غلط ہے۔ کیونکہ دوسرے مقام کی عبارت میں جب یہ بات صاف طور سے آرہی ہے کہ امام طبری کا جمہور سے اختلاف صرف قضا کے مسئلہ میں ہوا ہے ـــــ اور وہ بھی صرف ان امور کی قضا میں جن میں عورتوں کی شہادت چلتی ہے نہ کہ امارت کے مسئلہ میں۔ تو پہلے مقام کی عبارت کا یہ آخری جملہ کہ

تلی الحکم فیما تجوز فیہ شہادۃ النساء — ان معاملات میں عورت قضا کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت معتبر ہوتی ہے۔

اس کا تعلق صرف امام ابوحنیفہ کی اختلافی روایت سے نہیں، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا، بلکہ امام مالک کی اختلافی روایت اور امام طبری کے مذہب سب ہی سے ماننا صحیح ہوگا۔ اور اب اس پہلی عبارت کا ترجمہ "واجازۃ الطبری" سے آخری جملے تک یوں ہوگا کہ

"لیکن امام طبری نے اس کو جائز کہا ہے اور یہی ایک روایت ہے امام مالک سے اور امام ابوحنیفہ سے (یعنی یہ تینوں حضرات کہتے ہیں) کہ عورت اُن امور میں قاضی بن سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت معتبر ہوتی ہے"۔

یہ ظاہر عبارت کے ضرور کچھ خلاف ہے، لیکن جب صاحبِ عبارت خود ہی دوسرے مقام پر پوری صراحت کے ساتھ اختلافِ طبری کی یہ حقیقت بیان کر رہا ہے کہ اختلاف صرف قضا میں ہے اور وہ بھی ان معاملات کی حد تک کہ جن میں عورتوں کی شہادت مقبول ہوتی ہے، تو پھر اس کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا کہ ظاہرِ عبارت کی خاطر خلافِ حقیقت اور خلافِ واقعہ مطلب لے لیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس تفصیل و وضاحت کے بعد کسی صاحب علم کو اس بارے میں ہم سے اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض اہل الفضول بھی اس مسئلہ میں در آئے ہیں اور کھلی کھلی حقیقتوں سے کشتی لڑا کر ناواقفوں سے داد طلب ہوتے ہیں کہ ان کے دماغ اور زبان میں کس بلا کا زور ہے۔ اور پھر ان کا یہ زور ایک مسئلہ میں جیتنے کی خاطر دس مسئلوں کی بساط الٹ دینے اور مکھی کو مارنے کے لیے سر بھی پھوڑ لینے ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ صحافتی تہذیب اور تنقید کے جذباتی حدود بھی اس زور میں اس حد تک بہہ جاتے ہیں کہ قلم بے تکلف بازار کی زبان کے نمونے پیش کرنے لگے اور ایک سے ایک خوبصورت لفظ سے معترض کے کام و دہن کی تواضع ہو جائے۔ اس لیے ان ارباب قلم کے منہ بھی نہیں لگا جا سکتا ـــــ پس ایسے ہی لوگوں کے خیال سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پیشگی ہی اپنی تائید میں کچھ قابل لحاظ حوالوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم پانچویں اور چھٹی ہجری (۴۶۸ھ تا ۵۴۳ھ) کے ممتاز مالکی عالم اور مصنف قاضی ابوبکر ابن العربی اندلسی کی مشہور کتاب "احکام القرآن" جلد دوم کا حوالہ دینا چاہتے ہیں جس میں سورۂ نمل کی آیت "اِنِّی وَجَدْتُ اِمْرَاَۃً تَمْلِکُھُمْ" کے ذیل میں قاضی ابن العربی فرماتے ہیں:۔

رُوِی فی الصحیح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال حین بلغہ ان کسریٰ لما مات ولّیٰ قومہ بنتہ لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ وھذا نص فی ان المرأۃ لا تکون خلیفۃ ولا خلاف فیہ ونقل عن محمد بن جریر الطبری امام الدین انہ یجوز ان تکون المرأۃ قاضیۃ ولم یصح ذالک عنہ ولعلہ کما نقل عن ابی حنیفۃ انھا تقضی فیما تشھد

صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب آپ کو یہ بات پہونچی کہ کسریٰ (شاہ ایران) کے مرجانے پر اہل ایران نے اس کی بیٹی کو اس کا جانشین بنا لیا تو آپ نے فرمایا وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو اپنی سیادت ایک عورت کے سپرد کرے۔ اور یہ حدیث نص ہے اس باب میں کہ عورت (اسلام میں) خلیفہ نہیں ہو سکتی اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ امام دین محمد بن جریر طبری سے یہ بات منقول ہوئی ہے کہ عورت قاضی ہو سکتی ہے

فیہ۔ الخ صـ ۱۳۶ ج ۲ (طبعۂ اولیٰ۔ مطبعۃ السعادۃ مصر)

لیکن اس قول کی نسبت اُن کی طرف صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ لیکن اگر انھوں نے کوئی ایسی بات فرمائی ہے تو وہ بات فرمائی ہوگی جو امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں قضا کی اہل ہے جن میں وہ شہادت کی اہل ہے۔"

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ امام طبری کا جمہور سے اختلاف عورت کی امارت کے مسئلہ میں قطعاً نہیں ہے، اگر ہے تو صرف قضا کے مسئلہ میں ہے، دوسرے یہ کہ قاضی ابن العربی کے نزدیک قضا کے مسئلہ میں بھی علی الاطلاق جواز کا قول امام طبری کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر ان کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے تو اس میں بحث کی ضرورت نہیں۔ اس سے اس بات کی پوری تائید ہو جاتی ہے کہ فتح الباری میں کتاب الفتن والے مقام پر امام طبری کے اختلاف کی جو نوعیت بیان کی گئی ہے وہی اصل حقیقت ہے اور اسی کی روشنی میں فتح الباری کی پہلی عبارت کا مطلب متعین کیا جائے گا۔[۵]

حسن اتفاق سے اس مسئلہ میں جماعت اسلامی کی حمایت میں لکھے گئے ایک مقالہ میں بھی ہمیں فتح الباری کی اس عبارت کا ترجمہ اسی انداز میں ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے آخری جملے کا تعلق صرف امام ابوحنیفہ کے قول سے نہیں ہے بلکہ امام طبری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ تینوں ہی کے قول سے ہے۔ یہ مقالہ "فاران" کراچی کے اداراتی صفحات میں کسی

---

[۵] قاضی ابن العربی کے مذکورۂ بالا بیان سے اس بات کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے کہ انھوں نے اس مقام پر امام مالک یا کسی اور مالکی کی اختلافی روایت کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ امارت کے مسئلے میں تو "لا خلاف فیہ" کہا ہی ہے۔ قضا کے مسئلے میں بھی کسی مالکی کے اختلاف کا تذکرہ نہیں کیا جبکہ امام طبری اور امام ابوحنیفہ تک سے منسوب روایتوں کی تاویل و توجیہ کی انھوں نے ضرورت سمجھی۔ ہمارے خیال میں اس کے بعد یہ بات آسانی سے نہیں کہنی چاہیے کہ امام مالک یا کسی مالکی کا مسئلہ قضا میں بھی اختلاف ہو چہ جائیکہ امارت کے مسئلہ میں ان کا نام لیا جائے۔

"ابن نذیر" صاحب کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں اس عبارت کے زیر بحث حصے کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"اور علامہ طبری نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی امام مالک اور امام ابوحنیفہ سے بھی روایت ہے (یہ تینوں حضرات کہتے ہیں) کہ جن معاملات میں عورتوں کی شہادت قبول کی جائے گی اُن میں وہ صاحب امر بھی بنے گی۔

(فاران نومبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۲)

ہمیں امید ہے کہ "شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ اَهْلِهَا" کے بموجب تائیدی شہادت ضرور تسلیم کرلی جائے گی۔[1]

فاران کے اسی مضمون میں (فتح الباری کے منقولہ بالا حوالے کے بعد متصلاً ہی) المغنی لابن قدامہ کی یہ عبارت بھی نقل کی گئی ہے کہ

وحکی عن ابن جریر انه لاتشترط	اور کہا گیا ہے کہ ابن جریر مرد ہونے کی
الذکوریة لان المرأة یجوزان	شرط عائد نہیں کرتے اس لیے کہ جب کسی
تکون مفتیةً فیجوزان تکون	عورت کو مفتی بنانا جائز ہے تو وہ قاضی
قاضیةً	بھی ہوسکتی ہے۔

اس حوالے سے بھی اس کی تائید ہوئی کہ ابن جریر کا اختلاف صرف قضا کے باب میں ہے۔

بہرحال یہ بات بالکل طے ہو کہ ابن جریر طبریؒ کا اختلاف اگر کچھ ہے تو عورت کی قضا کے جواز و عدم جواز میں ہے، عام اس سے کہ مطلق جواز کے قائل تھے یا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی

---

[1] لیکن اسے تسلیم کرلینے سے بھی ان حضرات کا کیا بگڑے گا اس ترجمے میں ایک اور مصیبت ڈھائی گئی ہے کہ "تولی الحکم" کا ترجمہ "صاحب امر بنے گی" کردیا گیا ہو۔ ہم اگر پہلے سے دیکھ لیتے تو اوپر کی لمبی بحث کے چکر ہی میں نہ پڑتے۔ کیونکہ اس ترجمے سے یہ امکان معلوم ہوا کہ شاید مدیر شہاب نے بھی اپنے حوالے کی بنیاد اسی لفظ پر رکھی ہو۔ لیکن یہ ہے بالکل غلط کیونکہ "حکم" کا ترجمہ "امر" (بمعنی حکومت) عربی میں نہیں ہوتا ہے۔ حکم "فیصلہ کرنے" (قضا) کو کہتے ہیں۔ اور یوں بھی ذرا سی عقل صرف کیجئے تو خود سمجھ میں آجائے گا کہ کسی جج اور قاضی ہی کا دائرۂ سماعت محدود ہوسکتا ہے اور اسی لیے وہ مقرر ہوسکتے ہیں لیکن کیا کسی ملک میں سربراہ و حکمران بھی مقرر ہوسکتے ہیں کہ ایک کے صدود اختیارات کچھ ہوں دوسرے کے اُس سے مختلف کچھ اور؟ مالکم کیف تحکمون!

ایک روایت کی طرح محدود جواز کے۔ لیکن امارت کے مسئلہ میں ان کا مذہب بالکل وہی تھا جو جمہور کا مذہب ہے، کہ عورت کو امیر مملکت بنانے کی اجازت نہیں۔ رہے امام مالک تو ان کی کسی اختلافی روایت کا معاملہ قاضی ابن العربی مالکی کی گفتگو کی روشنی میں سرے ہی سے مشکوک ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی روایت ہے اور فتح الباری کی نقل صحیح ہے تو اس نقل کا جو مطلب امام طبری کے بارے میں لیا جائے گا امام مالک کے بارے میں اس سے مختلف کسی طرح نہیں لیا جا سکتا۔ یعنی یہ کہ اختلافی روایت صرف قضا کے بارے میں ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کا معاملہ تو کسی گفتگو کا محتاج ہی نہیں، اُن کی حد تک تو فتح الباری کی ظاہر عبارت سے بھی یہ بات قطعی ہے کہ ان کی اختلافی روایت کا تعلق صرف قضا کے مسئلے سے ہے، وہاں امارت کے مسئلے کا وہم بھی نہیں ہو سکتا ـــــ اور زیر بحث مسئلہ امارت کا ہے نہ کہ قضا کا!۔

ہماری نظر میں کیا غالباً سبھی کی نظر میں، ان ائمہ کے حوالوں کی جو اہمیت ہو سکتی ہے وہ نہ حضرت تھانویؒ کے کسی حوالے کی، نہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کے، اور نہ مفتی مہدی حسن کے کسی فتوے کی۔ الحمد للہ کہ ان اکابر ائمہ کا دامن کسی ایسے قول کے صحیح انتساب سے بالکل صاف نکلا جس کا حوالہ عورت کو سربراہِ مملکت بنانے کے حامیوں نے دیا تھا۔ ایسی باتیں غلط فہمی سے ہو جائیں تو دوسری بات ہے اور غلط فہمی کی تھوڑی بہت گنجائش فتح الباری کی کتاب المغازی[1] والی عبارت کے لحاظ سے ہم بھی مانتے ہیں لیکن کتاب الفتن والی عبارت پر نظر رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی بات ان ائمہ کی طرف منسوب کر دینا کسی راست باز آدمی کا کام نہیں ہونا چاہیے اور یا پھر ایسے آدمی کو مان لینا چاہیے کہ وہ ان بلند پایہ کتابوں سے استفادہ کی اہلیت نہیں رکھتا! ـــــ یوں بھی ذرا سوچنے کی بات ہے کہ یہ ائمہ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی واضح انتباہی حدیث کے بعد کہ "وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہ ہوگی جو ایک عورت کو اپنی مملکت کا اقتدار سونپ دے!" اور اسی حدیث سے جمہور کے اس فیصلے کے بعد کہ عورت کو مسلمانوں کے درمیان سربراہِ مملکت بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، کیسے یہ جرأت کر سکتے تھے کہ بغیر کوئی مضبوط دلیل یا معقول اعتراض پیش کیے ہوئے جمہور کے اس فیصلے

---

[1] یعنی جلد ۸ ص۹۰ (مصری) یا جز ۱۸ ص۹۰ (ہندوستانی)

روگردانی کریں۔ ہاں یہ بات سمجھ میں آنے کی ہے کہ جمہور نے اسی حدیث سے قیاس و اجتہاد کے طور پر مسئلہ قضا کے بارے میں بھی یہی فیصلہ کیا ہو اور بعض ائمہ کے نزدیک یہ قیاس صحیح نہ ہوتا ہو۔ کیونکہ قیاس اور اجتہاد میں ہر امام دوسرے سے اختلاف کا حق رکھتا ہے۔ فتح الباری کی کتاب الفتن والی عبارت کے شروع کے الفاظ پر توجہ کیجئے تو بہت صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ قضا کے مسئلہ میں جمہور کا اس حدیث سے استدلال دلیل قیاسی کے طور پر ہی ہے اور اختلاف کرنے والوں کا اختلاف بھی اس قیاس ہی میں ہے۔ رہا مسئلہ امارت جس کی بنیاد نفس حدیث ہے وہ کہیں بحث میں ہے ہی نہیں۔ اس میں سب کے سر صادق و مصدوق علیہ السلام کی تنبیہ کے احترام میں ایک صف میں جھکے ہوئے ہیں۔ اور یہی ایمان کی شان ہے۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبدالغنی حسنی کے

چند مخصوص مجربات

سفوف ذیابیطس۔ اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے، چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر کم ہو جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ 3/5، پانچ تولہ -/2

شربت جذام۔ جذام میں یہ دوا بیحد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کر لینے کے بعد یہ مرض رفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ -/5

شربت کند۔ یہ کی بیقراریوں کا درد، یرقان، ورم جگر، اقسام تپ حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے قیمت ایک پونڈ -/5

شربت درد گردہ پیشاب میں بھدی ریت آنا اور پتھری پیدا ہو جانا پارک رنگ کر پیشاب آنا یا درد کے دورہ اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجئے۔ جن کی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں انھیں کئی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ -/5

مرہم سرخ۔ پھوڑوں، خصوصاً بیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے۔ اس کے استعمال سے جلن کافور ہو جاتی ہے اور پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے۔

منیجر حسنی فارمیسی، ۳۷، گوئن روڈ لکھنؤ



انسان ۔ جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی

از ۔ جناب وحید الدین خاں صاحب

جدید علمی اور تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ جس طرح ہم بے جان مادہ کے مطالعہ میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح ہم انسان کے متعلق حقائق کو دریافت نہیں کر سکتے۔ جامد مادے کے علوم اور حیاتیاتی علوم کے درمیان یہ فرق ہے کہ جامد مادہ ایک متعین قانون کا پابند ہے۔ جبکہ حیاتیاتی مظاہر گویا "ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں"۔ مادی مظاہر کے برعکس حیاتیاتی مظاہر کو جبر و مقابلہ کی مساواتوں میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مادی دنیا کا علم بھی اب تک صرف وصفی علم (Descriptive Science) کے مقام تک پہونچا ہے جو درحقیقت سائنس کی ایک ادنیٰ شکل ہے۔ کیوں کہ یہ علم چیزوں کی اصل نوعیت کو ہمارے اوپر بے نقاب نہیں کرتا بلکہ یہ اس کے چند ظاہری اوصاف مثلاً وزن اور مکانی ابعاد (SPATIAL DIMENSIONS) وغیرہ کو بیان کرتا ہے تاہم اس علم کی بدولت یہ ہوا ہے کہ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ آئندہ ہونے والے واقعات کے متعلق پیشن گوئی کر سکیں بلکہ اکثر حالات میں ان کے ٹھیک ٹھیک واقع ہونے کی تاریخ کا تعین کر سکیں۔ مادہ کی ترکیب اور اس کی خصوصیات جان لینے کے بعد ہم کو اپنی ذات کے علاوہ تقریباً ہر اس چیز پر قابو حاصل ہو گیا ہے جو زمین کی سطح پر موجود ہے۔ جانداروں کے علم نے بالعموم اور انسان کے علم نے بالخصوص اتنی زیادہ ترقی نہیں کی ہے، یہ علم اب تک صرف وصفی حالت میں ہے جبکہ ذی حیات اشیاء کی اصل حقیقت ان کا غیر وصفی ہونا ہے۔

یہاں میں الکسس کیرل کا اقتباس نقل کروں گا:

"انسان ایک انتہائی پیچیدہ اور ناقابل تقسیم کل ہے۔ کوئی چیز بھی آسانی کے ساتھ اس کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہم بیک وقت اس کی پوری ذات کو اس کے اجزاء اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اپنی ذات کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم کو مختلف فنی مہارتوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور اس طرح مختلف علوم سے کام لینا ہوتا ہے فطری طور پر یہ تمام علوم اپنے کسی عام مقصد کے متعلق کسی ایک متحدہ تصور پر نہیں پہونچتے۔ وہ انسان سے صرف انھیں چیزوں کی تجرید کرتے ہیں جو ان کے خاص طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہیں اور ان مجردات کو ایک دوسرے سے ملا بھی دیا جائے تو وہ ایک ٹھوس حقیقت سے بھی کم قیمتی ہوتے ہیں۔ ان مجردات کے بعد بھی ایک ایسی ذات باقی رہتی ہے جو بہت ہی اہم ہوتی ہے اور اسکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علم تشریح، کیمیا، نفسیات، تعلیمات، تاریخ، سماجیات، سیاسی اقتصادیات اپنے موضوع کو پورے طور پر ختم نہیں کرتے۔ وہ انسان، جس سے خصوصی ماہرین آشنا ہیں، حقیقی انسان سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں جو مختلف مفروضات پر مشتمل ہے اور جن کو ہر ایک علم کی فنی مہارتوں نے پیدا کیا ہے۔

انسان بیک وقت ایک لاش ہے جس کو تشریح کا عالم چیرا پھاڑتا ہے، وہ ایک شعور ہے جس کا ماہرین نفسیات اور بڑے بڑے روحانی اساتذہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ ایک شخصیت ہے جس کے اندر دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اسی کی ذات کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے، وہ کیمیائی مادہ بھی ہے جس سے جسم کی نسیجیں اور غلطیں بنتی ہیں، وہ غلیوں اور قنددیاتی رطوبتوں کا ایک حیرت انگیز گروہ ہے جن کے جسمانی قوانین کا مطالعہ ماہرین فعلیات کرتے ہیں، وہ نسیجوں اور شعور سے مرکب ہے جس کو حفظان صحت اور تعلیمات کے ماہرین، جبکہ وہ زمان کے اندر پھیل رہا ہو، امید افزا ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ایک گھریلو اقتصادیات کا حامل ہے جس کا کام پیدا کی ہوئی چیزوں کو استعمال کرتے رہنا ہے تاکہ مشینیں، جن کا وہ غلام بن گیا ہے، برابر کام کرتی رہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر، سورما اور ولی بھی ہے، وہ نہ صرف ایک انتہائی پیچیدہ ہستی ہے جس کا تجزیہ سائنس کی فنی مہارتوں کے ذریعہ کیا جا رہا ہے بلکہ وہ انسانیت کے رجحانات

قیاسات اور آرزوؤں کا مرکز ہو ..... بلاشبہ انسانیت نے اپنی حقیقت کو معلوم کرنے کی بڑی زبردست کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس تمام زمانوں کے سائنس دانوں فلسفیوں، شاعروں اور بڑے بڑے صوفیوں کے مشاہدات کا ایک انبار موجود ہے مگر ہم اپنی ذات کے صرف چند پہلوؤں کو دریافت کر سکے ہیں۔ ہم انسان کو اس کی کلی حیثیت میں بحیثیت کچھ نہیں سکے ہیں۔ ہم اس کو الگ الگ حصوں سے مرکب جانتے ہیں اور یہ حصے بھی ہمارے اپنے طریقوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایک خیالی پیکر ہے جس کے اندر سے ایک نامعلوم حقیقت جھانک رہی ہے۔

حقیقت میں ہماری ناواقفیت بہت گہری ہے۔ وہ لوگ جو انسانی ہستیوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اپنے آپ سے بہت سے ایسے سوالات کرتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہماری اندرونی دنیا کے وسیع علاقے اب تک نامعلوم ہیں۔ خلیے کے پیچیدہ اور عارضی اعضا کے بنانے کے لیے کس طرح کیمیائی مادوں کے سانچے باہم مل جاتے ہیں، نر و تازہ بیضہ کی نواۃ NUCLEUS کے اندر کے نسلی مادے کس طرح اس فرد کی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں جو اس بیضہ سے پیدا ہوتا ہے، کس طرح خلیے خود اپنی کوششوں سے نسیجوں اور اعضاء کے جیسے گروہوں میں منظم ہو جاتے ہیں۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ان خلیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہو کہ اپنے گروہ کو زندہ رکھنے میں انھیں کیا کام کرنا ہے۔ اور پھیلی ہوئی بناوٹوں کے ذریعہ وہ ایک ایسے نظام جسمانی کے بنانے کے قابل ہوتے ہیں جو سادہ اور پیچیدہ دونوں ہوتا ہے۔ ہماری مدت (DURATION) فعلیاتی وقت (PHYSIOLOGICAL TIME) اور نفسیاتی وقت (PSYCHOLOGICAL TIME) کی نوعیت کیا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم نسیجوں، اعضاء، رطوبتوں اور شعور سے مرکب ہیں۔ لیکن شعور اور دماغ کے درمیانی تعلقات اب تک ایک راز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کو اعصابی خلیوں کے فعلیات کا پورا پورا علم حاصل نہیں ارادی قوت کس حد تک نظام جسمانی میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ کس طرح دماغ اعضا کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، طرز زندگی، غذا کے کیمیائی مادوں، آب و ہوا اور فعلیاتی اور اخلاقی زبردستیوں کے ذریعہ کس طرح جسمانی اور دماغی خصوصیات میں، جو بطور وراثت ہر ایک فرد کو ملتی ہیں، تبدیلیاں

پیدا کی جا سکتی ہیں۔

ہم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ڈھانچہ، عضلات اور اعضا، اور دماغی اور روحانی سرگرمیوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہیں۔ ہم ان اسباب سے ناواقف ہیں جن کی بنا پر اعصابی توازن اور تکان اور بیماریوں کی مدافعت پیدا ہوتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اخلاقی احساس، قوت فیصلہ اور جرأت کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے۔ ذہنی، اخلاقی اور صوفیانہ سرگرمیوں کی اضافی اہمیت کیا ہے۔ جمالیاتی اور مذہبی احساس کی ضرورت کیا ہے، کس قسم کی قوت سے اشراقی تعلقات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض نفسیاتی اور دماغی اسباب خوشی یا تکلیف کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ اسباب کیا ہیں۔ ہم کسی فرد کے اندر مصنوعی طور پر خوشی کا چمک نہیں پیدا کر سکتے۔ اب تک ہم اس کو نہیں جان سکے کہ تمدن آدمی کی امید افزا ترقی کے لیے کس قسم کا ماحول زیادہ مناسب ہے۔ کیا ہماری نفسیاتی اور روحانی ساخت سے کشمکش، محنت اور تکلیف کو دور کرنا ممکن ہے، موجودہ تمدن میں ہم انسان کو زوال پذیر ہونے سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ ان باتوں کے متعلق، جو ہماری انتہائی دلچسپی کا باعث ہیں، بہت سے دوسرے سوالات کیے جا سکتے ہیں، ان کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ انسان کے متعلق تمام علوم کی مہارت بھی ناکافی ہے۔ اور یہ کہ اپنی ذات کے متعلق ہمارا علم اب تک ابتدائی حالت میں ہے۔"

MAN THE UNKNOWN P.P. 16-19

یہ اقتباس یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ "انسان" کا علم ابھی تک انسان کو حاصل نہیں ہوا انسانی وجود کے مادی حصہ کے بارے میں تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ انسان جو اس مادی وجود کو کنٹرول کرتا ہے اس سے ہم قطعاً لاعلم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زندگی اب تک ہمارے لیے ایک راز بنی ہوئی ہے اور جب تک یہ راز نہ کھلے زندگی کی صحیح تعمیر و تشکیل ممکن نہیں الکسس کیرل کی کتاب اسی "انسانِ نامعلوم" کو دریافت کرنے کی ایک سائنٹفک کوشش ہے۔ اس طرح کی کوششیں موجودہ زمانے میں بہت بڑے پیمانے پر جاری ہیں مگر اب تک کا نتیجہ صفر کے سوا اور کچھ نہیں۔

آج کا انسان ایٹم توڑ سکتا ہے۔ برفیلے علاقوں میں آبادیاں قائم کر سکتا ہے۔ وہ خلاء کے دوسرے سیاروں تک سفر کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح انسان نے مادی دنیا سے واقفیت حاصل کر لی ہے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو بھی جان سکتا ہے اور اپنے معاملات کو درست کر سکتا ہے مگر خود ہماری معلوم دنیا کے اندر اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ ہم جس طرح مادے کے اوصاف کو معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح ہم انسان کو سمجھ نہیں سکتے۔

جس وجود کو ہم "انسان" کہتے ہیں وہ پروٹوپلازم کے بنے ہوئے کروڑوں خلیوں پر مشتمل ایک جسم ہے۔ پروٹوپلازم کیا ہے؟ وہ غیر ذی روح اشیاء کا ننھا سا مرکب ہے جس کے اندر روح پذیری کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں میں وہ زندگی کی اکائی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ہم مادی دنیا کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہم پروٹوپلازم کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔

وہ سب کچھ جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ کچھ چیزوں کا مرکب ہی ہوتا ہے۔ اگر وسائل و ذرائع حاصل ہوں تو ہم اس طرح کے تمام مرکبات کو وجود میں لا سکتے ہیں اور اسے ختم بھی کر سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر جرمن فلسفی کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں کہا تھا ——— "مجھے مادہ مہیا کر دو اور میں تم کو بتا دوں گا کہ دنیا اس مادہ سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔" یا ہیکل (HAECKEL) نے دعویٰ کیا کہ "پانی کیمیائی اجزاء اور وقت ملے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کر سکتا ہے۔"

مثلاً پانی کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا ایک سالمہ (MOLECULE) آکسیجن کے ایک ایٹم اور ہائیڈروجن کے دو ایٹم سے مرکب ہوتا ہے۔ یہ بالکل ہمارے بس میں ہے کہ ہم ان گیسوں کو اسی تناسب سے ملا کر پانی کی شکل دیدیں۔ یا پانی کے سالموں کو توڑ کر دوبارہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تبدیل کر دیں۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سائنس نے وہ اجزاء معلوم کر لیے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مخصوص

تناسب بھی دریافت ہو چکے ہیں مگر انسان یہ نہیں کر سکتا کہ ان اجزاء کو اسی مخصوص ترتیب سے ملا کر زندگی پیدا کر دے۔ پروٹوپلازم کے اجزائے ترکیبی کے درمیان جو تناسب ہے، ٹھیک اسی تناسب سے ان اجزاء کو ملایا جاتا ہے۔ لیکن وہ پروٹوپلازم نہیں بنتا جو ذی روح ہو۔ حالاں کہ دوسرے کیمیاوی مرکبات ان کے اجزائے ترکیبی کو اسی نسبت سے ملانے پر بن جاتے ہیں۔ گویا ہم جس طرح مادی اشیاء میں تصرف کر کے مادی واقعات کو وجود میں لاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہم انسان کے اوپر تصرف کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہ انسان کے سلسلے میں ہماری پہلی عاجزی ہے جس کا اعتراف کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ دوسری اس سے بڑی چیز یہ کہ انسان کے سلسلے میں ہمارا تمام طبیعاتی مطالعہ انسانِ مردہ کا مطالعہ ہے، انسانِ زندہ کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہم اپنے اندر نہیں رکھتے۔ سائنس نے وہ اجزاء معلوم کر لیے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مخصوص تناسب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دریافت نہ ہو سکا کہ ان کے درمیان وہ کون سی مخصوص ترتیب ہے جس کے قائم رہنے سے پروٹوپلازم ذی روح بنا رہتا ہے اور جہاں یہ ترتیب بگڑی، ذی روح پروٹوپلازم غیر ذی روح ہو جاتا ہے۔ گویا اصل میں وہ مخصوص ترتیب ہی ہے جو پروٹوپلازم میں روح کی موجودگی کی ذمہ دار ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس مخصوص ترتیب کو باقی رکھتے ہوئے پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ پروٹوپلازم کا تجزیہ کرنے کے لیے لازمی طور پر اس کی کیمیاوی ترتیب کو توڑنا پڑتا ہے اور جوں ہی ہم ایسا کرتے ہیں اس کے اندر سے زندگی رخصت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ وہی وقت ہوتا ہے جبکہ پروٹوپلازم سے اس کی روح نکل چکی ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کیمیاوی تجزیہ کیا جا رہا ہو اور پروٹوپلازم میں روح موجود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک ایسا نہ ہوگا۔ یعنی روح کی موجودگی میں تجزیہ نہ کیا جائے گا، زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کے بارے میں سائنس ہمیشہ اندھیرے میں رہے گی۔

مگر ہماری مشکل یہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔

فرض کیجیے ایک شخص اپنے ذمہ یہ کام لیتا ہے کہ وہ انسانیت کی حقیقت معلوم کرے گا۔

اور انسان کو بتائے گا کہ زندگی کا قانون کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ انسانی آبادیوں سے اپنے مطالعہ کا آغاز کرتا ہے۔ لمبے عرصہ تک مختلف سماجوں کی چھان بین کرنے کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ سماج تو انسانوں کے مجموعے نام ہے۔ اس لیے جب تک ہم فرد کو سمجھ نہ لیں، جماعت کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اب وہ معاشرہ کو چھوڑ کر انسان کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے نفسیات کی طرف رُخ کرتا ہے، یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک فکر نہیں بلکہ اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور سب کے نتائج تحقیق الگ الگ ہیں۔ نفسیات کی ایک شاخ کا دعویٰ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا مرکز اس کا احساس ہے کسی کا کہنا ہے کہ انسان خارجی دنیا سے شعوری یا غیر شعوری طور پر جو تاثر قبول کرتا ہے، اس کا ہر کام اسی کا ردِ عمل ہے، کوئی جنسی خواہشات کو اس کے تمام اعمال کا محرک بتاتا ہے، کسی کا مطالعہ یہ ہے کہ اپنے آئیڈیل کو پالینے کا نامعلوم جذبہ انسان کو متحرک کیے ہوئے ہے۔ کوئی مکتب فکر شعور کو اصل قرار دیتا ہے اور اسی کی روشنی میں انسان کی پوری ہستی کی تشریح کرتا ہے اور کوئی اس بات کا قائل ہے کہ عقل اور ذہن کوئی چیز نہیں۔ انسان کے مختلف اعضاء کی عنان کسی ایک مرکزی قوت کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ انسان جس حصہ جسم پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس کی نشو و نما بہتر طریقہ سے ہو جاتی ہے اسی کے نتیجے میں کوئی اچھا رقاص بن جاتا ہے۔ کوئی اچھا مفکر، نفسیات کا یہ اختلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ بعض لوگ سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اس نام کا کوئی علم (SCIENCE) فی الواقع موجود ہے۔

خیالات کے اس جنگل کو دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ انسانی وجود کے دوسرے حصے حیاتیات کا مطالعہ کرے تاکہ دونوں کے نتائج کو ملا کر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ جب انسان کو وہ اس حیثیت سے دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ انسان، نظام ہضم، نظام تنفس، نظام دورانِ خون وغیرہ کا ایک مجموعہ ہے۔ ان نظاموں کی بنیاد چند کیمیاوی تبدیلیوں پر ہے جو کچھ کیمیاوی اشیاء اور ان کے آپس کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم کا سارا نظام کیمیاوی تحلیل (METOBOLISM) کا ہی ایک پیکر ہے۔

اب وہ غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ جب جسم انسانی کا وجود اور اس کا

نشو و نما کیمیاوی رد و بدل کا مرہون منت ہے۔ تو پہلے کیمیاوی تبدیلیوں کے اصولوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس کے بغیر ارتقاء کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی اظہار خیال نہ کیا جا سکے گی۔ اس لیے اب وہ کیمیا اور طبیعیات کا مطالعہ کرنے لگتا ہے اور اس میں ایک عمر کھپا دیتا ہے۔

کیمیا اور طبیعیات کا مطالعہ کرنے والے کیمیاوی اور ایٹم کے مطالعہ تک پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ ایٹم کے اجزائے ترکیبی ـــــ الکٹران اور پروٹان وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔ جس کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات برقی لہروں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس طرح مطالعہ کرتے کرتے بالآخر وہ جدید سائنس کے آخری شعبے ـــــ نیوکلر سائنس ـــــ میں داخل ہو جاتا ہے ـــــ اس طرح علوم کی تعلیم و تفریح کرنے کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہونچتا۔ اور جو شخص انسان کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کے لیے قانون وضع کرنے چلا تھا۔ وہ ایک ایسی [illegible] کے باوجود نظر نہیں آتی ڈاکٹر جوڈ (JOAD) کے الفاظ میں:۔

"جدید مادہ ایک ایسی بے حقیقت چیز ہے جو ہاتھ میں آ نہیں سکتی۔ یہ فاصلہ اور وقت کے مرکب کا ایک ابھار، برقی رو کا ایک جال۔ یا امکان کی ایک لہر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے خلا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے مادہ کے بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے۔"

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرتناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لیے ناقابل دریافت ہے۔ اب جس طرح ایک بیمار شخص کی یہ معذوری کہ وہ خود اپنا علاج نہیں کر سکتا۔ اس کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کو ایک ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔ اسی طرح نظام فطرت میں انسان کا ایک چیز کے لیے ضرورت مند ہونا اور پھر اس ضرورت کی تکمیل کے لیے کافی صلاحیت نہ رکھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کے لیے وہ اپنے اس رب کا محتاج ہے جس نے اسے موجودہ شکل میں بنایا ہے۔ جس طرح خدا نے اسے آکسیجن کا محتاج بنایا اور پھر آکسیجن بے حساب مقدار میں سارے کرۂ ارض کے گرد پھیلا دی۔ اسی طرح اس نے انسان کو زندگی کی حقیقت جاننے کا محتاج بنایا اور پھر اپنے نبیوں کے ذریعہ زندگی کی حقیقت واضح فرمائی۔

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان
لکھنؤ
(فی کاپی - ۶۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ ..... بارہ ...شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ شوال ۱۳۸۴ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۶۵ء | شمارہ ۱۰

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اوّلیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	دعوتِ اصلاح	محمد منظور نعمانی	۶
۳	مخالفینِ مذہب کا استدلال	وحید الدین خاں صاحب	۱۶
۴	یہود کا تبرّی نامہ اور انجیل	مولانا عبدالماجد دریابادی	۲۴
۵	عورت کی سربراہی کی حمایت	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۳۸
۶	..... بنام مولانا مودودی	مولانا کوثر نیازی	۴۳

اگر اس دائرے میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۱ مارچ تک آ جائے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک کبھی کسی صاحب کے نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ـــــــ عتیق الرحمن سنبھلی

ہم خدا کے اس معجزانہ کرم پر صمیم قلب سے شکر گزار ہیں کہ پاکستان کے صدارتی الیکشن کے سلسلے میں وہاں کی جماعت اسلامی اور اس کے قائدین کی جس روش کو ہم نے برصغیر (ہند و پاک) کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم دینی فتنہ جان کر اس کی خطرناکیوں کو اُجاگر کرنے کی ذمہ داری بہت سے مخلصوں اور محبوں کی ناگواری اور اپنی گرتی پڑتی صحت کے لیے اس کی ضرر رسانی کے قطعی اندیشوں کے باوجود اوڑھی تھی، اس کی صحت اور ضرورت پر گواہی دینے کے لیے خدا نے جماعت اسلامی پاکستان ہی کی صفوں سے ایک "رجل رشید" کو کھڑا کیا اور اس نے پورے بسط و تفصیل کے ساتھ دنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ جماعت اسلامی پاکستان کی یہ روش (جسکی حمایت و مدافعت کے گناہ میں اسکے قلم نے بھی پورا پورا حصہ لیا ہے) ایک جماعتی اور فروعی نوعیت کا مسئلہ نہیں، بلکہ پورے نظامِ دین کے لیے منکرینِ حدیث کے مسلک سے بھی زیادہ خطرناک "اور" دین کی پامالی کے لیے اذنِ عام" کا حکم رکھتی تھی۔ جسے محض سیاست کی خاطر اپنا کر ایک گمراہ کن دینی فلسفہ اس کے لیے تراش دیا گیا۔

یہ شہادت، ہفت روزہ شہاب (لاہور) کے مدیر جناب کوثر نیازی کی ہے جسے انھوں نے سب سے پہلے اپنے محترم امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں پیش کیا اور جب اس کا نتیجہ صرف مولانا کی برہمی کی شکل میں نکلا تو جماعت سے اپنے استعفے کے ساتھ انھوں نے اسے پبلک کے سامنے رکھ دیا۔

ایک طرف توفیق الٰہی کی دستگیری کا یہ منظر ہے کہ جن کو اعترافِ حق میں، جماعت کے ساتھ ساتھ خود اپنی رسوائی کا بھی پورا پورا خیال ہو سکتا تھا اُن کے اس خیال پر خدا کا خوف ہی

غالب ہو کر رہا اور جگ ہنسائی کا شیطانی وسوسہ بھی مواخذۂ آخرت کے یقین کی طاقت کے آگے اپنی نہیں چلا سکا۔ لیکن اسکے روبرو ایک دوسرا منظر یہ ہو کہ جن کا جماعت اسلامی پاکستان کی اس روش کی ذمہ داری سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جن کو اللہ نے اس گناہ میں شرکت کے ابتلاء کی کسی بھی مجبوری سے دور رہنے کا پورا پورا موقع فراہم کر رکھا تھا انھوں نے خالص عصبیت کے جذبے میں آکر نہ صرف اس غلط روش کی نہایت لچر اور حلق میں پھنسی پھنسی علمی مدافعت شروع کر دی، بلکہ ان میں سے بعض کی عصبیت تو یہاں تک زور مار گئی کہ علمی اور استدلالی گرفتوں کے کسی بھی جواب سے بے نیاز ہو کر نہ صرف طعن و طنز کے سہل یا بے جملے ناقدوں کی زبان بندی کے لیے آزمائے بلکہ ان کے باپ دادا تک کو کھلی کھلی گالیاں سنا دیں کہ اگر ایسے نہیں تو ایسے تو اس حرکت سے آئندہ کے لیے توبہ کر ہی لیں گے!

طعن و طنز کے یہ تیر ہم جیسے دوسرے دیوانوں کے بھی حصے میں آئے ہیں مگر گالیاں ہمارا نصیب خاص ہیں۔ ہم بھی پہلو میں دل رکھتے ہیں اور گالیاں نہ سہی طنز ہائے قلم کو بھی تھوڑا بہت آتا ہوا اور بالخصوص ایسی حالت میں تو یہ کچھ بھی مشکل نہیں جبکہ اصل مسئلہ پر ایک حرف بھی سامنے سے کہنے کے بجائے یہ ساری خاک ادھر اُدھر سے اُڑائی جا رہی ہو، بلکہ اپنی اس بشری کمزوری کا اظہار ہمیں کر لینے دیجئے کہ دو چار لفظ تو اس تہذیب گفتار پر کہنے کو جی چاہتا ہی تھا جن سے قلم کو باز رکھنے میں ہم بمشکل کامیاب ہو سکے ہیں۔ اور اس میں اگر کوئی خیر ہو تو اسکی جزا کا پہلا حصہ پروردگار ہماری طرف سے جناب کوثر نیازی کو عطا فرمائے کہ انھیں کی قلندرانہ بازگشت سے ہم نے اپنے آپ کو یہ سمجھایا کہ اگر ان کی جیسی مشکل پوزیشن میں بھی آدمی کو رجوع الی الحق کے لیے اس جرأت کی توفیق مل سکتی ہو تو کیوں نہ امید رکھی جائے کہ جن پر صرف عصبیت کا جادو ہو، اور کوئی مشکل راہ میں نہیں، وہ بھی کل کو ثر نیازی ہی کے نقش قدم پر نظر آئیں، آخر حق کے جادو کو کیوں عصبیت کے جادو سے کم اثر سمجھ لیا جائے؟ اور کیوں ایک کوثر نیازی کے سوا دوسروں پر اس مبارک بازگشت کی راہ کا بند ہونا طے کر لیا جائے؟ آج کوثر نیازی کہہ رہے ہیں کہ

"مجھے اس سے بیشتر آپکے (مولانا مودودی صاحب کے) نظریۂ حکمت عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں

ع۔ اگر کچھ لوگ ناراض ہو کر طنز و تعریض کی مشق نہ کریں تو ہم کوثر صاحب سے شکایت کریں گے کہ انھوں نے اس ذیل میں ہمیں کیوں بھلا دیا؟ اس میدان میں تو صداقت کے ساتھ گرفت کی سعادت ہمیں حاصل ہوا، ہم کسی طرح راضی نہیں ہیں کہ ان اکابر کے

اے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا، مگر صداقتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے نظریئے (یعنی حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم۔ ع) نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریۂ حکمت عملی انہی مضمرات کا حامل تو نہ تھا؟"

تو ہم کیوں نہ امید رکھیں کہ اس قبیلے میں سے اسی طرح "سوچنے لگنے" والے کچھ اور بھی اُٹھ کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور آج مولانا مودودی کے نظریات پر ہماری تنقید کے "پس منظر" میں آبائی مخالفت و تعصب کا گمان کر کے جو لوگ اس پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں وہ کل اپنے ضمیر سے ہم آہنگ پا کر برملا اس کی توثیق پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

پس اسی امید اور اسی خیال پر ہم یہ تمام تلخ گھونٹ گوارا کر کے اپنے ان دوستوں اور بزرگوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری تنقید اور اس کا "جوش و خروش" آبائی مخالفت ہی پر مبنی سہی، اور وہ ہماری نہیں سنتے نہ سُنیں مگر کوثر نیازی کی بات کے لیے تو اپنا دل کھولیں کہ وہاں تو اس بدگمانی کا کوئی موقع نہیں ہے! اور کچھ نہیں تو نیازی صاحب کے اس مکتوب عبرت کے بعد اتنا تو ہو ہی جانا چاہیے کہ مولانا مودودی پر تنقید کرنے والوں کو محض معاند اور نفس زدہ سمجھنے کے بجائے تھوڑے بہت دینی خلوص اور للّٰہیت کا امکان ان کے لیے بھی تسلیم کر لیا جائے۔

ہماری دلی آرزو ہے کہ یہ امید پوری ہو لیکن اگر خدا کا فیصلہ یہ نہیں ہے تو ہم مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے پُرجوش ہمدردوں سے یہ آخری بات کہہ دینا ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ بھی گمان کرتے ہوں ــــ اور ہم مدعی بھی نہیں ہیں کہ ہم نفس کے دعوے میں نہیں آسکتے ــــ مگر اپنی فہم اور اپنی دانست میں مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے خلاف ہمارا "جوش و خروش" صرف اس لیے ہے کہ اس برصغیر میں ہم انھیں ادھر چند برس کی ان کی مسلسل روش کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتنہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح آپ کو حق ہے کہ انھیں دینِ حق کے بہترین خادم سمجھنے کی بنا پر اُن کی حمایت کریں اسی طرح دوسروں کو بھی حق دیجیے کہ وہ اپنے ضمیر کی (صحیح یا غلط) آواز پر چلیں۔ البتہ ان کے وہ محبین جنھیں "ہندستانی جماعت اسلامی" کہنا چاہیے اُن کی توجہ اس حمایت کے مسئلے میں اس بات پر بھی ہونی چاہیے کہ وہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں جماعت اسلامی پاکستان کے معاملات

میں نہ گھسیٹا جائے، اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہم اس کو خود ضروری سمجھتے ہیں (بلکہ خود جماعت اسلامی ہند کی بھی کوئی بات قابل تنقید نظر آئے تو اس کے بارے میں بھی یہی فیصلہ کیے ہوئے ہیں کہ جب تک دینی ضرورت کا سوال نہ ہو اس سے کوئی مناقشہ نہ کیا جائے) لیکن یہ خواہش اس صورت میں سہاوے یا کسی کے لیے کس طرح قابل تعمیل رہ سکے گی جب آپ خود جماعت اسلامی پاکستان کے معاملات میں اپنی ٹانگ پھنسانے لگیں۔ اور یہ بھی محض علمی اور استدلالی حمایت کی حد تک نہ ہو بلکہ پوری حریفانہ جارحیت کا مظاہرہ مخالف تنقیدوں کے مقابلہ میں کیا جائے؟ آپ مختار ہیں کہ اگر اپنے لیے اسی کو صحیح اور ضروری سمجھیں تو کریں مگر پھر اس مصالحانہ خواہش سے دستبرداری کا اعلان ہونا چاہیے ــــ ورنہ یا تو اس خواہش کے اس منطقی تقاضے پر پورا پورا عمل ہو کہ آپ بھی ان معاملات سے اپنے کو بالکل علاحدہ رکھیں یا کم از کم اس حد تک تو نہ جائیں کہ دوسروں کے لیے اس خواہش کے احترام کا (جسے وہ خود بھی ضروری سمجھتے ہیں) کوئی راستہ ہی نہ رہ جائے۔

آخری بات، ہمیں یہ اور عرض کرنا ہے کہ اپنی تنقید پر جس جواب کا حوالہ ہم اوپر کے پیروں میں اشارۃً دیتے آئے ہیں، اور جو جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار بزرگ کے قلم سے ہے اس میں بسلسلۂ برہمی ہی ہم سے یہ فرمائش بھی کی گئی ہے کہ "جماعت اسلامی پاکستان پر تنقید کی ذمہ داری بھی اگر آپ اپنے اوپر سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر یہ ذمہ داری یہاں کی جماعت کے سلسلے میں آپ پر عاید ہوتی ہے پہلے اس کام کو کیجئے" (ملخصاً) اس مضمون کی جماعت کے سرکاری آرگن "دعوت" میں اشاعت سے اگرچہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس فرمائش کو جماعت کی سرکاری توثیق بھی حاصل ہے، مگر ہمارا دل اسے قبول نہیں کرتا اس لیے احتیاطاً ہم جماعت کی قیادت سے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کیا وہ بھی اسے پسند کرتے ہیں؟ ــــ اگر نہیں تو پھر ان صاحب کے بارے میں کچھ ارشاد ہو جنھیں مبارزت طلبی کے شوق میں موقع و محل سے بھی مطلب نہیں ہے! شبہ ہوتا ہے کہ شاید ؎

ان دنوں جوشِ جنوں ہے ترے دیوانے کو؟

دعوتِ اصلاح

(مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو اسی ماہ فروری میں ایک دینی اجتماع میں کی گئی)

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا ما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ علیہم وعلی کل من اتبعھم باحسان۔

دینی بھائیو، اور دوستو!

سب سے پہلے ہم آپ اللہ تعالیٰ کے اس کرم اور احسان کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہم کو ایک ایسے مقصد کے لئے دور دراز سے آکر یہاں جڑنے کی توفیق دی جو اللہ کی نگاہ میں دوسرے تمام مقاصد سے زیادہ عزیز اور قیمتی ہے ——— ہمارا یہ مجمع حاضرین کی کثرتِ تعداد کے لحاظ سے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا۔ آج کی دنیا میں اس سے بہت بڑی تعدادیں ہر منڈی اور ہر بازار میں انسانوں کی بھیڑ جوڑ رہتی ہے۔ کھیل تماشوں میں اور سنیما تھیٹر جیسے شیطانی اڈوں میں اس سے بھی بہت زیادہ تعدادیں لوگ جمع ہوتے ہیں ——— اسی طرح علم وفن اور دولت وثروت یا دنیوی وجاہت کے لحاظ سے بھی ہمارا یہ مجمع کوئی ممتاز مجمع نہیں ہے، بلکہ ظاہر بات ہے کہ اس حیثیت سے یہ بہت کم حیثیت مجمع ہے۔

لیکن اس اعتبار سے انشاء اللہ یہ دنیا کا ایک بہترین مجمع ہے کہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو صحیح کرنا اور اس کی رضا ورحمت حاصل کرنا ہے۔ ایسا مجمع اگر صرف پھٹے ٹوٹے غریبوں مسکینوں کا اور بالکل ناتعلیم یافتہ اور پسماندہ قسم کے بندگانِ خدا کا ہو جب بھی اللہ تعالیٰ کو وہ بہت عزیز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ اللہ کے فرشتے ایسے مجمعوں اور ایسی مجلسوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

الغرض سب سے پہلی بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آپ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی

عظمت کو سمجھیں کہ اس نے ہمارے دلوں کو اس طرف موڑا اور ہمیں اس بہترین مقصد کے لئے جمع ہونے کی توفیق دی۔ اگر اس کی طرف سے یہ توفیق نہ ملتی تو یقیناً ہم اس سعادت سے محروم رہتے۔ میں پھر اپنی اور آپ کی طرف سے قرآن کریم کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں۔

"الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ"

میرے محترم بھائیو!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مبعوث ہوئے اس وقت انسانوں کی اس دنیا میں اس زمانہ اور ماحول کے معیار کے مطابق سب کچھ تھا، ہاں اللہ پر ایمان اور اس سے صحیح تعلق رکھنے والے اور اس کی طرف بلانے والے بندے موجود نہیں تھے، ایسے بندوں کے وجود سے اس وقت یہ دنیا گویا خالی تھی اور اس وجہ سے گویا یہ پوری دنیا بحر ظلمات بنی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے مبعوث ہوئے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے آشنا اور وابستہ کریں اور زندگی کا صحیح طریقہ یعنی دین حق ان کو بتائیں ـــــ آپ جب نبی کی حیثیت سے اس دنیا میں کھڑے ہوئے اور دین حق یعنی زندگی کے صحیح طریقے کی آپ نے دعوت دینی شروع کی تو اس وقت تنہا آپ ہی اس دین اور اس زندگی کے حامل تھے۔ شروع میں آپ کی دعوت کو ایک ایک دو دو آدمیوں نے قبول کیا، اور اور ہدایت کا کام بہت سست رفتاری سے چلا۔ اسی حال میں قریباً تیرہ سال آپ مکہ معظمہ میں رہے۔ اس کے بعد اللہ کے حکم سے آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، وہاں کی زمین دین حق کی دعوت کے لئے زیادہ تیار اور سازگار تھی۔ تھوڑی ہی مدت میں وہاں کی قریب قریب پوری آبادی نے دین حق قبول کر لیا۔ اس وقت دنیا کے بحر ظلمات میں مدینہ طیبہ نور اور ہدایت کا گویا ایک جزیرہ اور مرکز تھا۔

آپ کی دعوت اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں مدینہ طیبہ کی قریب قریب پوری آبادی آپ کے رنگ میں رنگ گئی۔ اس وقت مدینہ طیبہ اس طرز زندگی کا پورا نمونہ تھا جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے، اور جو خود آپ کی زندگی تھی۔

اس زندگی کا اگر تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے چار بنیادی امتیازات تھے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تمام غیبی حقیقتوں

پر کامل یقین ایسا یقین جو اللہ سے اور ان حقیقتوں سے کبھی غافل نہ ہونے دے۔
دوسرے اس بات کا یقین کہ ہر قسم کی فلاح و سعادت اللہ اور رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ہے، اور اس بنا پر پوری اطاعت اور فرمانبرداری اور معصیتوں سے پرہیز۔
تیسری چیز دنیا کی ساری فکروں کے مقابلہ میں آخرت کی فکر کا غلبہ، اور اسکی وجہ سے تنہائیوں میں بھی اللہ کے حضور میں رونا۔
چوتھے اس بات کی فکر کہ یہ ایمان اور ایمان والی زندگی جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں اور جس کی توفیق ہم کو مل گئی ہے ساری دنیا میں پھیل جائے، اور سارے انسان اس سعادت کو اپنا کے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح کر لیں اور پھر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے مستحق ہو جائیں۔
یہ چار باتیں وہ تھیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ اور آپ کی دعوت اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں آپ کے عام صحابہ کرام فرق مراتب کے باوجود ان صفات اور امتیازات کے حامل تھے۔ گویا اسوقت مدینہ طیبہ ایک ایسی بستی تھی جسکے ہر شخص کا یہ حال تھا کہ اس کو اللہ کی ذات و صفات پر اور دوسری ایمانی حقیقتوں پر ایسا یقین تھا جو اس کی پوری زندگی پر حاوی تھا۔ آخرت کی فکر دوسری تمام فکروں پر غالب تھی جو ان کو رات کی اندھیریوں میں بھی رلاتی تھی، نفس کے تقاضوں کے مقابلہ میں اللہ و رسول کے احکام پر چلنا ان کا شعار تھا۔ عام انسانوں کی ہدایت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے صحیح ہونے کا مسئلہ ان کے نزدیک اپنے تمام دنیوی مسئلوں سے مقدم اور اہم تھا۔
یہ تھی وہ زندگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ اور اس زندگی کی حامل امت کا تیار کرنا آپ کا وہ خاص کام تھا جس کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تھا۔
اس زندگی کی دو خاصیتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحمت تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کی جو طاقت سرکشی اور استکبار کے ساتھ اس زندگی سے ٹکرائی اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور پھر اس زندگی کی حامل امت کے قدموں میں ڈال دیا۔ پہلے اللہ کی اس نصرت کا ظہور عرب میں ہوا اور فتح مکہ پر گویا اس کی تکمیل ہو گئی۔ بعد میں روم اور فارس کی حکومتوں کے ساتھ یہی

ہوا۔ اور یہ دونوں حکومتیں اس امت کے قدموں کے نیچے آگئیں ـــــ بہرحال ایک خصوصیت اس زندگی کی یہ تھی کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد تھی۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور قیامت تک کے لئے یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور گویا ازلی ابدی آسمانی منشور ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رسلنا والذین آمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد

یعنی ایمان اور ایمانی زندگی کے داعی اپنے رسولوں کی اور انکی راہ چلنے والے اہل ایمان کی ہم مدد اور حمایت کریں گے۔ اس دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت کے اُس دن بھی جب کہ خداوندی عدالت قائم ہوگی اور اس میں گواہ پیش ہوں گے)

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" (یعنی تمھارے دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلہ میں تم کو بالا اور برتر رکھا جائے گا، بشرطیکہ تم ایمان کی راہ پر قائم رہو گے)

دوسری خصوصیت اس ایمانی زندگی کی یہ ہے کہ اس میں اللہ نے ایک خاص کشش اور تاثیر بلکہ تسخیر کی طاقت رکھی ہے۔ جو شخص اس زندگی کو صحیح صورت میں دیکھے گا اور اس کا تجربہ کرے گا وہ اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ اور اس کا گرویدہ ہو جائے گا

صحابہ کرام جن ملکوں میں گئے۔ اور جن قوموں نے انھیں دیکھا اور ان کی مومنانہ اور خدا پرستانہ زندگی کا تجربہ و مشاہدہ کیا وہ اس کی گرویدہ ہوگئیں۔ اور بہت تھوڑی مدت میں وہ پورے ملک کے ملک دارالاسلام بن گئے۔ یہ شام، یہ عراق، یہ مصر، یہ ایران، یہ سب وہی تو ہیں جنھوں نے شروع میں اسلام کا سخت مقابلہ کیا تھا۔ اب سے کچھ دنوں پہلے تک فتوح الشام اور فتوح العجم اور فتوح المصر وغیرہ کتابیں مسلمانوں میں عام طور سے پڑھی جاتی تھیں۔ آپ میں سے بہت سوں نے یہ کتابیں پڑھی یا سُنی ہوں گی اور آپ کو یاد ہوگا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ سب ملک اور ان کے بسنے والے اسلام کے کیسے سخت دشمن تھے۔ لیکن ان ملکوں پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے کے بعد جب مسلمان ان ملکوں میں رہے بسے اور یہاں کے رہنے والوں نے ان کو دیکھا، برتا تو انھوں نے عام طور پر اُن کے دین اور ان کے طریق زندگی کو اپنا لیا۔

بہت سے لوگ ناواقفیت سے یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ ملک جب فتح ہوگئے تو یہاں کے لوگوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست کھا جانے کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا۔ ایسا سمجھنا تاریخ سے

نادانفی اور جہالت کے علاوہ حماقت بھی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ کے نتیجہ میں جو قوم غالب آجاتی ہے مغلوب اور مفتوح قوم کے دل میں اس کی نفرت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ شام و عراق اور ایران کے لوگوں نے مفتوح ہونے کے بعد فرق مملکت کہا جانے کی وجہ سے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر اسلام کو اختیار کیا ہو ـــــ اور دین کے بارہ میں جبر کرنا خود اسلام کے اصولوں کے خلاف تھا۔ قرآن مجید میں پوری صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ "لا اکراہ فی الدین" (دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا کوئی جواز نہیں) بلکہ قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی کہ جو آدمی اپنے کو مسلمان کہے اور اس کے دل نے پوری طرح اسلام کو قبول نہ کیا ہو وہ منافق ہے اور بدترین قسم کا کافر ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ صحابہ کرام لالچ اور زبردستی سے کس سے کلمہ پڑھواتے ـــــ

بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جو شہر یا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتا تھا اسلامی فوجیں اسکو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی تھیں اور وہاں امن وغیرہ قائم رکھنے کے لئے کوئی چھوٹا سا دستہ چھوڑ دیا جاتا تھا جس کی حیثیت پولیس کے دستہ کی ہوتی تھی۔ اور عوام کے باہمی جھگڑوں کے فیصلے کرنے اور اس طرح کی دوسری حکومتی خدمتیں انجام دینے کے لئے کسی کو شہر کا والی یعنی حاکم اور قاضی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ شہر سے باہر وہاں کے عوام سے الگ تھلگ اُس طرح نہیں رہا کرتے تھے جس طرح ہمارے ملک میں انگریزی دور حکومت میں انگریز حکام آبادیوں سے الگ رہا کرتے تھے، بلکہ یہ اپنے آپ کو عوام کی خدمت اور انکی دیکھ بھال کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے رابطہ رکھتے تھے اور عوام کے ہر طبقہ کے لوگ ان کی زندگی کو کھلی کتاب کی طرح دیکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فاتح قوموں کے سپاہی کیسے فرعون اور بداطوار ہوتے ہیں لیکن وہ ان مسلمانوں کو دیکھتے تھے کہ ان میں کا ہر شخص راہبوں اور درویشوں سے زیادہ پاکباز اور خداترس ہے۔ اسی کے ساتھ یہ مسلمان انتہائی دلسوزی اور سچی دردمندی کیساتھ ان کو دعوت دیتے تھے کہ وہ ایمانی زندگی کے اس طریقہ کو اپنالیں جو اللہ کے سارے پیغمبر لے کر آئے تھے اور سب سے آخر میں مکمل شکل میں اس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور اس طرح خدا سے براہ راست اپنا رشتہ جوڑ کے اُس کی رحمت اور جنت کے مستحق ہو جائیں ـــــ ان مسلمانوں کا حال اور ان کی زندگی اس کی گواہی دیتی تھی کہ یہ سچے اور مخلص بندے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں

بالکل سچائی اور دردمندی سے کہہ رہے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اکا دکا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اس طرح علاقے کے علاقے اور قومیں کی قومیں اسلام میں داخل ہوتی تھیں اور "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کا منظر سامنے آتا تھا۔ یہ سب ملک بہت تھوڑی مدت میں دار الکفر سے دار الاسلام بنے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً ۹۰ برس کے بعد جبکہ صحابہ کا نہیں بلکہ انکے فیضیافتہ تابعین کا زمانہ تھا خلیفۂ راشد حضرت عمر ابن عبد العزیز کی خلافت کے دور میں افریقہ کے ایک علاقہ کے عام لوگوں نے اسلام کو اس طرح قبول کیا کہ وہاں کے مسلمان حاکم کو اس میں شبہ ہوا کہ یہ لوگ واقعۃً دل کی رغبت اور شرح کے صدر کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں یا حکومت کا مذہب ہونے کی وجہ سے دنیوی نفع اٹھانے کے لئے اپنے اسلام کا اعلان کر رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے حضرت عمر ابن عبد العزیز کو لکھا کہ اس علاقہ کے سارے لوگ بڑی تیز رفتاری سے اسلام قبول کر رہے ہیں اور حکومتی کاروبار پر اس کا خاص اثر یہ پڑے گا کہ جزیہ کے مد کی آمدنی بالکل ختم ہو جائیگی اس لئے یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو تو یہ قانون بنا دیا جائے کہ سرکاری طور پر صرف انہی لوگوں کو مسلمان تسلیم کیا جائے گا جو فلاں فلاں طریقوں سے اپنا سچا اور مخلص مسلمان ہونا ثابت کر دیں۔

حضرت عمر ابن عبد العزیز نے اس کا جو جواب دیا تھا وہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے اپنے اس جواب میں انھوں نے اسلام اور اسلامی حکومت کا نصب العین کتنے محکم اور اچھے انداز میں واضح کیا ہے۔ انھوں نے افریقہ کے اپنے اس والی یعنی گورنر کو اس کے خط کے جواب میں لکھا

ویحک، ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم انما بعثہا داعیاً ولم یبعث جابیاً"

اس مختصر سے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمھارا برا ہو، تمھارے سوچنے کا ڈھنگ کتنا غلط ہے تمھیں معلوم ہونا چاہیئے ہمارا کام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو پورا کرنا ہے، اور آپؐ ہدایت کا اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے کا مشن لے کر آئے تھے ٹیکس وصول کر کے خزانے بھرنے نہیں آئے تھے، اس لئے اگر اللہ کے بندے اللہ کا دین قبول کر رہے ہیں تو شکر ادا کرو اور خوش آمدید کہو، ٹیکس اور جزیہ کی اور حکومت کے مالیہ کی کوئی فکر نہ کرو۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تابعین کے زمانہ تک جبکہ مسلمانوں میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی غالب تھی اور عام طور سے لوگ اس کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے تو اللہ کے بندوں کے دل کس طرح ان کی طرف کھنچتے تھے اور وہ اسلام کے کیسے گرویدہ ہوتے تھے ــــ

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو زندگی لے کر آئے اور جس کی آپ دعوت دیتے تھے اور جو صحابہ کرام نے آپ سے حاصل کی تھی ــــ اور اسی زندگی کا نام دراصل اسلام ہے ــــ اس کی دو خاصیتیں تھیں ایک یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت تھی اور غیبی لشکروں سے اس کی مدد کی جاتی تھی۔ اور دوسری یہ کہ انسانی قلوب اور انسانی فطرت کے لئے اس میں کشش تھی، اور سخت سے سخت دشمن بھی تعصب سے خالی ہو کر جب اسکو دیکھتے تھے تو اس کے گرویدہ ہو کر اس کو اپنانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ خاصیتیں اسلام کے نام میں نہیں تھیں بلکہ اُس زندگی میں تھیں جس کا نام اسلام تھا جس طرح شکر کی مٹھاس شکر کے نام میں نہیں ہے بلکہ اُس چیز میں ہے جس کا نام شکر ہے۔

میرے دینی بھائیو! ــــ جس طرح پانی کی ٹھنڈک اور آگ کی گرمی اور سورج کی روشنی دائمی خاصیتیں ہیں اسی طرح اسلام کی یہ دونوں خاصیتیں بھی دائمی اور ابدی خاصیتیں ہیں لیکن یہ اجتماعی اسلام کی خاصیتیں ہیں جب دنیا میں کوئی امت اسلام کی حامل ہوگی تو یقیناً اس کے ساتھ اللہ کی نصرت و حمایت ہوگی اور اس کے مسائل و مشکلات میں غیب سے اُس کی مدد کیجائے گی۔ اور دنیا کی جو قومیں اس امت کو دیکھیں اور برتیں گی وہ یقیناً اس کی گرویدہ اور معتقد ہوں گی۔

آج صورت یہ ہے کہ مسلمان کہلانے والی امت دنیا میں بہت بڑی تعداد میں موجود ہے، ابھی اسی ہفتہ میں نے بعض اخبارات میں پڑھا ہے کہ اسوقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۶۳ کروڑ تک معلوم ہو چکی ہے۔ ۶۳ کروڑ بولنے اور لکھنے میں تو کوئی بہت بڑا ہندسہ نہیں ہے لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی تعداد ہے صحابہ کرام کے کبھی تصور میں بھی نہ ہوگا کہ کسی وقت مسلمان دنیا میں ۶۳ کروڑ ہوں گے لیکن حالت یہ ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی وزن نہیں۔ میں یہ بات ہندوستان ہی کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں جہاں ہم اقلیت میں ہیں، اور حکومتی اقتدار ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ میں ان سب ملکوں کو بھی سامنے رکھ کر کہہ رہا ہوں جو آج اسلامی ممالک کہلاتے ہیں اور جن میں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی میزان میں آج ان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کو امریکہ یا روس کی سرپرستی اور امداد

کی ضرورت ہے۔ یہ خدا کی نصرت و حمایت سے محرومی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ ۶۳ کروڑ کی تعداد میں مسلمان کہلانے والے تو موجود ہیں لیکن دنیا میں ایسی امت موجود نہیں ہے جس کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی ہو۔ بیشک اس گئی گزری حالت میں بھی صحیح اسلامی زندگی کے حامل افراد موجود ہیں۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ یقیناً وہ سب کچھ عطا فرمائے گا جو نیک صالح افراد کے لئے اللہ کا وعدہ ہے۔ لیکن اسلامی زندگی کی جن خاصیتوں کا میں نے ذکر کیا وہ انفرادی زندگی کی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی خاصیتیں ہیں۔

اب ہمارے آپ کے اور سب مسلمانوں کیلئے دو راستے ہیں ایک یہ کہ جس روش پر ہم چل رہے ہیں اسی پر چلتے رہیں، اور اس کے نتیجہ میں اللہ سے اور اس کے دین سے اور زیادہ دور ہوتے چلے جائیں۔ اور پھر خدانہ کردہ ہمارا وہ حشر ہو جو قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا بیان کیا گیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی نعمت سے نوازا اور دنیا میں بھی عزت اور سربلندی عطا فرمائی۔ لیکن جب انھوں نے اپنے نبیوں کا راستہ چھوڑ کر نفس پرستی اور خدا فراموشی کا طریقہ اختیار کیا تو اللہ نے اپنی دی ہوئی ساری نعمتیں ان سے چھین لیں۔ اور پھر اس حد تک اُن پر اللہ کا غضب نازل ہوا کہ ان میں سے بہت سوں کو بندروں اور سوؤروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "وجعل منھم القرود والخنازیر وعبد الطاغوت"

اور سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے نافرمانی اور خدا فراموشی کا طریقہ اختیار کیا اور وہ اس میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انکے نہایت بے رحم اور جلاد صفت دشمنوں کو ان پر مسلط کیا، پھر انھوں نے بنی اسرائیل کو بری طرح پیسا جس کی تفصیل بنی اسرائیل کی تاریخ میں اتنی رلزہ خیز بیان کی گئی ہے کہ آج بھی اُسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرے بھائیو! خدا کا کسی قوم سے اور کسی نسل سے رشتہ نہیں ہے، اس کا قانون بڑا بے لاگ ہے۔ نوح علیہ السلام اس کے پیغمبر تھے، لیکن ان کے بیٹے نے جب کفر کی راہ اختیار کی تو اسوقت کے دوسرے کافروں کے ساتھ وہ بھی خدا کے غضب کا شکار ہوا۔ اور جب نوح علیہ السلام نے ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کے حق میں کچھ عرض کیا تو بڑے جلال کے ساتھ

اُن سے فرمایا گیا " اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ، اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ، فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ "

یعنی تمہارا بیٹا بد کار ہے اس لئے وہ ہمارے قانون کے مطابق تمہارے لوگوں میں نہیں ہے، ہم تمھیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانی کی بات نہ کرو۔

میرے بھائیو اور دوستو! سوچو اور سمجھو! یہ ہے اللہ کی شان اور یہ ہے اس کا جلال! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اللہ کا قانون بڑا بے لاگ ہے۔ ہمیں ڈرنا چاہیے اگر مسلمان قوم یا اس کی غالب اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی سے اسی طرح دور ہوتی گئی جس طرح بنی اسرائیل اپنے پیغمبروں کی لائی ہوئی زندگی سے دور ہوتے چلے گئے تھے تو ہمارا بھی وہی انجام نہ ہو جو بنی اسرائیل کا ہو چکا ہے۔

میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ ہم مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم اپنی دینی اصلاح کی فکر نہ کریں، اور زندگی کی گاڑی جس طرح چل رہی ہے اسکو اسی طرح چلنے دیں، اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں آپ سے صاف صاف کہہ چکا۔ اور میرا کہنا یا نہ کہنا کیا چیز ہے۔ اپنے اس طرز عمل کا نتیجہ تو ہم صدیوں سے بھگت رہے ہیں۔

اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کی فکر کریں، اللہ کی طرف پلٹیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی زندگی کو اپنی زندگی بنائیں اور اسکو امت کی اجتماعی زندگی بنانے کی فکر و کوشش کریں، پھر دنیا اور آخرت میں اللہ کی نصرت و رحمت کے مستحق بنیں، اور پھر " يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا " کا منظر قائم ہو۔

شیطان کا یہ بہت بڑا فریب ہے کہ جب یہ بات سامنے آتی ہے تو وہ ہمارے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ تو اس زمانہ میں ناممکن ہے حالانکہ یہ محض اس دشمن خدا کا فریب ہے۔ آپ خدارا سوچیے کیوں ناممکن ہو کیا خدا کی ذات و صفات اور دوسری ایمانیات پر یقین حاصل ہونا ناممکن ہو کیا آنحضرت کی فکر کا دنیا کی دوسری فکروں پر غالب ہونا ناممکن ہو؟ کیا خدا کے حکموں پر چلنا اور گناہوں سے بچنا ناممکن ہو؟ کیا ان باتوں کو اللہ کے دوسرے بندوں میں عام کرنے کی کوشش کرنا ناممکن ہو؟ ۔ کیا انسانوں میں ان اچھی باتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں رہی؟ پیغمبروں کے لائے ہوئے راستہ پر چلنا کیا اب قانوناً جرم ہو گیا ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ صرف شیطان کا اور اپنے نفس کا فریب ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اس بارہ میں اپنے ذہنوں کو صاف کریں۔ اور جس طرح اپنے دینوی کاموں کے سلسلہ میں عزم کے ساتھ فیصلہ کر کے کام شروع کر دیتے ہیں اسی طرح اپنی پچھلی کوتاہیوں سے اللہ کے حضور میں توبہ اور استغفار کر کے آئندہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ بیعت کی تجدید کریں اور آپ کے طریقہ پر چلنے اور اسی پر چلتے ہوئے جینے اور مرنے کا عہد کریں یا ایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحاً عسی ربکم ان یکفر عنکم سیئاتکم ویدخلکم جنٰت تجری من تحتھا الانھار یوم لا یخزی اللہ النبی والذین اٰمنوا معہ نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا انک علی کل شیئ قدیر۔

الفرقان کی ملکیت اور دیگر تفصیلات

اخباروں کے رجسٹریشن (مرکزی) قواعد ۱۹۵۶ء کے قاعدہ نمبر ۸ فارم نمبر ۴ کے مطابق حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کا مطلوبہ بیان

۱۔ مقام اشاعت ... ... لکھنؤ

۲۔ وقفۂ اشاعت ... ... ماہانہ

۳۔ پرنٹر و پبلشر اڈیٹر اور مالک کا نام ..... محمد منظور نعمانی

۴۔ قومیت ... ... ہندوستانی

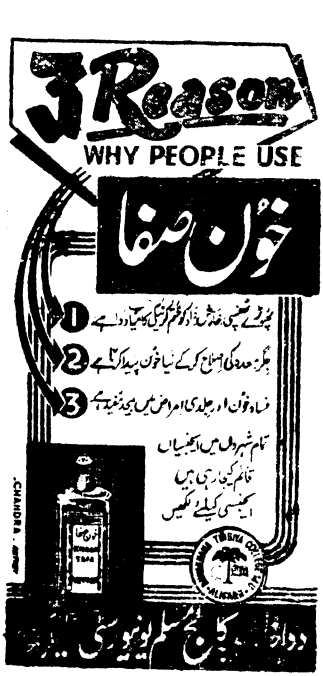
۵۔ پتہ ..... کچہری روڈ لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ یہ بیان میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہے۔

محمد منظور نعمانی

پبلشر

(یکم مارچ ۱۹۶۵ء)



مخالفین مذہب کا استدلال

از ——— جناب سید الدین خاں صاحب

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے اسی طرح پچھلی صدیوں میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (KNOWLEDGE EXPLOSION) ہے جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں[1]"۔ یہ جولین ہکسلے کے الفاظ ہیں۔ جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ وہ انسان کی صرف اس خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہ کرنا چاہتا ہے۔ توجیہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذات خود غلط نہیں ہے۔ مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات تک پہونچا دیا جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے، اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ اسی طرح توجیہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی انتہائی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

اس طریق فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہ ہے، پہلے زمانے میں انسان کا علم چونکہ بہت محدود تھا اس لیے واقعات کی صحیح توجیہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کر لیے مگر ارتقاء کے عالم گیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ

---

[1] ہندستان ٹائمس، سنڈے میگزین، ۲۴ ستمبر ۱۹۶۱ء

ممکن ہو گیا ہے کہ اٹکل پچو عقائد پر ایمان رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیاء کی حقیقت معلوم کی جائے۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کر لی گئی ہے۔ جدید طریق مطالعہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کی کوئی واقعی دریافت نہیں تھی۔ بلکہ یہ محض دور لاعلمی کے قیاسات تھے جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔ جولین ہکسلے لکھتا ہے:

"نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو۔ لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ شمسی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے۔ اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔"

RELIGION WITHOUT REVELATION

N. Y. 1958 P. 58.

طبیعاتی دنیا میں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابل تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کر رہے ہیں۔ بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانون فطرت (LAW OF NATURE) کا نام دیا گیا۔ اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر یہ تصور ختم ہو جاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی ذی شعور اور قادر خدا ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہو سکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتداءً کائنات کو حرکت دی ہو۔ چنانچہ شروع میں لوگ محرک اول کے طور پر خدا کو مانتے رہے۔ والٹیر نے کہا کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا ہے جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کر کے انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے اور اس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس کے

بعد ہیوم نے اس "بے جان اور بے کار خدا" کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے دیکھی ہیں لیکن دنیائیں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں۔ اس لیے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا۔ واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ واقعہ کیوں ہوا۔ وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آجانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے۔ مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور کیسے ڈوبتا ہے۔ اس لیے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے جو سورج کو نکالتا ہے اور اس کو غروب کرتا ہے اس طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا۔ اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے۔ مگر اب جبکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہو گئی جس کے لیے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ "اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے"۔ ——— کیلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

IF EVENTS ARE DUE TO NATURAL CAUSES, THEY ARE NOT DUE TO SUPER NATURAL CAUSES.

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے

پیدا کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

اب اس دلیل کو لیجیے جو طبیعاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں وہ ایک متعین قانون فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان کی توجیہہ کرنے کے لیے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہہ کے لیے موجود ہیں۔ اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا۔ اس نے کہا:

NATURE IS A FACT, NOT AN EXPLANATION.

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے۔ تمہارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لیے ہیں مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے وہ اس مسئلے کا جواب نہیں ہے جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا ہے۔ مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں۔ جبکہ تمہاری دریافت صرف اس مسئلہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے۔ جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہہ۔ سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیا ہے۔" یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیوں ہے" جبکہ توجیہہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے۔ اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے۔ پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ "خدا ایسا کرتا ہے۔" مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا

ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں۔ مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا۔ اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ "سینگ" کے اوپر جا کر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا" واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے۔ واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ بچہ کی چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگالیں جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لیے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین وقت پر ٹھیک ۲۱ روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہو جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے۔ گویا پہلے یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے"۔ اور اب سوال یہ ہو گیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت کی توجیہہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات CECIL BOYCE HAMANN کے الفاظ نقل کروں گا:۔

"غذا ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی۔ آخر وہ کون طاقت ہے جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردعمل ظاہر کریں۔ غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا

ہے جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔"

THE EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE P. 221.

اس سے آپ جدید دریافتوں کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے اور جن کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے۔ مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہہ نہیں ہیں۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے۔ وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعویٰ کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکا ہے۔ یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے۔ یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے۔ یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا:۔

Nature does not explain, she is herself in need of an explanation.

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے، تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے سرخ اجزاء ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

"درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں۔"

"ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے جس کا نام ہیموگلوبن (Haemoglobin)

ہے۔ یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آئے۔"

"وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے۔ مگر مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرات، تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کُل کے اندر باہم مربوط ہیں اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں۔"

"یہ قدرت کا قانون ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانونِ قدرت کہتے ہیں۔"

"اس سے مراد ہے ـــــ Blind interplay of Physical and chemical forces ـــ (طبیعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل)۔

"مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت عمل کرتی ہیں جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے۔ کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے۔ ایک مچھلی تیر سکے، ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔"

"میرے دوست، مجھ سے یہ نہ پوچھو۔ سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے، اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔"

یہ سوال و جواب واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے۔ بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں۔ مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں، کھربوں گنا بڑھ جائیں، جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی۔ کیونکہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں اور ان کا آخری سبب کیا ہے۔ اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے۔ یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں جبکہ مذہب کی جگہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کرے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی

ہے۔ اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے۔ اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں۔ مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا۔ کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔ ہیریس (A. Harris) نے یہی بات کہی تھی جب اس نے ڈارون ازم پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

Natural selection may explain The Survival of The fittest, but can not explain The arrival of The fittest.

REVOLT AGAINST REASON by A. LUNN. P. 133

یعنی انتخاب طبیعی کے قانون کا حوالہ صرف زندگی کے بہتر مظاہر باقی رہنے کی توجیہہ کرتا ہے وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

چند نئی کتابیں

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور انکی تعلیمات — قیمت دس روپے

مخدوم جہانیاں جہاں گشت — قیمت ۷/-

حیات امداد حضرت حاجی امداد اللہؒ — قیمت ۴/۶۲

حیات امام ابو حنیفہؒ — قیمت ۱۵/-

انتخاب مکتوبات امام ربانی — قیمت ۳/-

آیات بینات کامل — قیمت ۱۹/-

محصول بذمہ خریداران کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

یہود کا تبری نامہ
اور انجیل

(از افادات مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

ایک عالمی نیوز ایجنسی کی اس خبر نے چند ہفتے ہوئے اُن تمام لوگوں کو چونکا دیا، جو تاریخ مسیحیت سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں کہ حکومت اسرائیل کے توسط سے نائب المسیح جناب پوپ کی خدمت میں قوم یہود کی طرف سے ایک تبری نامہ اس مضمون کا پیش ہوا کہ ہماری قوم کی کوئی بھی ذمہ داری مصلوبیت مسیح میں نہیں، پوپ صاحب نے اس عذرنامے کو قبول کر لیا اور اعلان کر دیا کہ قوم یہود اس جرم تصلیب مسیح سے بری الذمہ ہے ——— خبر میں اس سے زیادہ کوئی تفصیل درج نہ تھی، نہ اور کسی ذریعہ سے اب تک یہ علم ہو سکا کہ قوم یہود نے اپنی تبری پر کون سی شہادتیں پیش کیں اور پوپ صاحب نے بائبل کی مسلّم اور مستند شہادت کے مقابلے میں انھیں کیسے قبول کر لیا!

قرآن مجید سے قطع نظر، جس نے صاف یہود کی زبان سے یہ قول فخر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ	ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو ختم کر دیا۔

واقعہ جس صراحت و وضاحت اور جس تکرار کے ساتھ انجیلوں میں درج چلا آتا ہے اور آج تک مسیحوں میں کسی سے اس کا انکار منقول نہیں۔ ان کے بعد یہ نئی تبری بہت ہی عجیب و غریب ہے ——— لیکن قبل اس کے کہ وہ صراحتیں ملاحظہ ہوں، پہلے نفس واقعہ کو سمجھ

لینے کی ضرورت ہے۔

واقعہ ملک فلسطین کا ہے۔ شہر یروشلم اسی میں واقع ہے جس زمانہ کا (سنہ ۲۰ عیسوی) کا واقعہ ہے۔ ملک کی آبادی اگرچہ یہود کی تھی۔ جو نسلاً بنی اسرائیل تھے لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ حاکم اعلا بھی رومی حکومت تھی لیکن اس کی ماتحتی میں یہود کو بھی آزادی و خود مختاری ایک محدود درجہ میں حاصل تھی۔ یہود کے مقتدر خود انھیں کی عدالتوں میں پیش ہوتے۔ اور ان کی عدالتیں مذہبی عدالتیں تھیں۔ یہ فیصلے فقہا یہود صادر کرتے۔ پھر اگر جرم فوجداری قانون کا ہوتا تو وہی مقدمہ دوبارہ رومیوں کی ملکی عدالت میں پیش ہوتا اور فوجداری کے جرائم میں سزا کے نفاذ کا حق صرف انھیں ملکی عدالتوں کو تھا۔ حضرت مسیح پر مقدمہ قدرۃً پہلے یہود یا اسرائیل کی اپنی عدالت میں پیش ہوا اور آپ پر فرد جرم توہین مذہب یا الحاد و زندقہ کی لگی جس کی سزا دینی عدالت میں موت تھی۔ لیکن اس کا نفاذ بغیر ملکی عدالت سے رجوع کیے ہو نہیں سکتا۔ اس لیے یہود اپنی عدالت میں آپ کو سزائے موت کا حکم سنا کر پھر آپ کا مقدمہ ملکی عدالت میں لائے۔

انجیل کے بیان کے مطابق خود حضرت مسیح کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ انھیں اسرائیلی سرداروں اور فقیہوں کے ہاتھ بہت دکھ جھیلنے ہوں گے! اور بالآخر وہ قتل ہوں گے۔ انجیل متی میں ہے:۔

"اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں"

(۲۱:۱۶)

اور انجیل مرقس میں ہے:۔

"پھر وہ انھیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے۔" (۸:۳۱)

اور پھر انجیل متی میں ہے:۔

"اور یسوع یروشلم جانے میں بارہ شاگردوں کو الگ لے گیا اور راہ میں ان سے یہ کہا، دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں۔ اور ابن آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کو حوالے کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے تاکہ وہ اسے ٹھٹھوں میں

اڑائیں اور کوڑے ماریں اور صلیب پر چڑھائیں۔" (۱۰: ۱۸-۱۹)

اور یہی مضمون انجیل مرقس میں بھی دہرایا گیا ہے:۔

"پس اس نے پھر ان بارہ کو ساتھ لے کر ان سے وہ باتیں کہنی شروع کیں جو ان پر واقع ہونے والی تھیں کہ دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں اور ابن آدم سردار کاہنوں فقیہوں کے حوالے کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے۔ اور وہ اسے ٹھٹھوں میں اڑائیں گے۔ اور اس پر تھوکیں گے۔ اور اسے کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے۔"

(۱۰: ۳۳: ۳۴)

تطویل بیان کے باوجود تیسری عبارت انجیل لوقا کی بھی پڑھ لیجئے:۔

"پھر اس نے ان بارہ کو ساتھ لے کر ان سے کہا کہ دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں اور جتنی باتیں نبیوں کی معرفت لکھی گئی ہیں۔ ابن آدم کے حق میں پوری ہوں گی۔ کیونکہ وہ غیر قوم والوں کے حوالہ کیا جائے گا۔ اور لوگ اس کو ٹھٹھے میں اڑائیں گے۔ اور بے عزت کریں گے اور اس پر تھوکیں گے اور اس کو کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے۔" (۱۸: ۲۱-۲۳)

غیر قوم والوں سے مراد ان سارے حوالوں میں ظاہر ہے کہ رومی حاکم ہیں۔ یہ سب تصریح در تصریح ہے۔ آپ کی اس الہامی پیش خبری کی کہ آپ کو اصلاً دکھ اپنے ہی ہم قوموں سے پہونچے گا۔ اور وہی بالآخر آپ کو رومیوں کے حوالے کر کے ان سے سزائے موت آپ کو دلائیں گے۔

آپ نے اسی دوران میں اپنے معاصر و مخاطب یہودیوں پر پوری ذمہ داری اور وہ بھی سخت لفظوں میں پہلے پیمبروں کے بھی خون ناحق کی ڈالی۔ صرف ایک نمونہ انجیل متی سے ملاحظہ ہو

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے۔ یہ کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے۔ اس لیے دیکھو میں نبیوں اور دانا وں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے۔ اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے تاکہ سب

راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا۔ تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس قربان گاہ میں قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب اس زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔" (۲۳: ۲۹-۳۶)

روایتی مصلوبیت کی بابت تو بڑے ہی واضح لفظوں میں آگاہی مسیح کے کلام میں موجود ہے۔ بلکہ انجیل متی میں یہ تصریح بھی ہے کہ یہود کے دو بڑے لیڈر تو اسی وقت قتل مسیح کی تیاری کرنے لگے تھے:۔

"اور جب یسوع یہ سب باتیں ختم کر چکا، تو ایسا ہوا کہ اس نے اپنے شاگردوں سے کہا تم جانتے ہو کہ دو دن کے بعد عید فسح ہوگی اور ابن آدم مصلوب ہونے کو پکڑوایا جائے گا۔ اس وقت سردار کاہن اور قوم کے بزرگ کائفا نام سردار کاہن کے دیوان خانے میں جمع ہوئے اور صلاح کی کہ یسوع کو فریب سے پکڑ کر قتل کریں۔ مگر کہتے تھے کہ عید کو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوہ ہو جائے۔" (۲۶: ۱-۵)

مرقس اور لوقا اور یوحنا باقی تینوں انجیلوں میں یہ واقعہ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ درج ہے۔ مرقس میں ہے:۔

"دو دن بعد فسح اور عید خمیر ہونے والی تھی۔ اور سردار کاہن اور فقیہہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کے قتل کریں۔ کیوں کہ کہتے تھے کہ عید کو نہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوا ہو جائے۔" (۱۴: ۱-۲)

لوقا کی سنیئے:۔

"اور عید فطیر جس کو عید فسح کہتے ہیں۔ نزدیک تھی اور سردار کاہن اور فقیہہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے مار ڈالیں۔ کیونکہ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ (۲۲: ۱-۲)

اور یوحنا کا بیان ہے:۔

"پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں۔ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے۔ اگر ہم اسے یوں ہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اور رومی آ کر ہماری جگہ اور ہماری قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے۔ ۔ ۔ ۔ پس وہ اسی روز سے اس کے قتل کا مشورہ کرنے لگے۔" (۱۱: ۴۷-۵۳)

اس کے بعد مسیح کے انھیں بارہ رفیقوں یا شاگردوں میں سے ایک یہودی یہوداسکریوتی نامی اس پر بھی تل گیا کہ وہ یہود لیڈروں کے ہاتھ مسیح کو گرفتار کرادے گا۔ اور اس خدمت کے لیے اس نے ۳۰ روپیہ کی رقم بھی وصول کرلی۔ متی میں ہے:۔

"اس وقت ان بارہ میں سے ایک نے جس کا نام یہوداہ اسکریوتی تھا سردار کاہنوں کے پاس جاکر کہا کہ اگر میں اسے تمہارے حوالہ کردوں تو مجھے کیا کروگے؟ انھوں نے اسے تیس روپے تول کردے دیئے۔ اور وہ اس وقت سے اس کے پکڑوانے کا موقع ڈھونڈھنے لگا۔ (۲۶:۱۴-۱۵)

خوب خیال کرلیجئے کہ یہ سارا ذکر یہودہی کا چل رہا ہے۔ اصل دشمن خون کے پیاسے یہودی لیڈر تھے۔ وہی گرفتاری کی فکر میں تھے۔ وہی مسیح مظلوم کی گرفتاری کے لیے سازش کررہے تھے۔ وہی اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہی اسے رومی عدالت تک پہونچانے والے تھے۔ اور وہی مسیح کے ایک یہودی غدار رفیق سے اس کا سودا بھی کرچکے تھے۔

مرقس کی بھی روایت سن لیجئے:۔

"پھر یہوداسکریوتی جو ان بارہ میں سے تھا سردار کاہنوں کے پاس چلا گیا تاکہ اسے ان کے ہاتھ پکڑوادے۔ وہ یہ سن کر خوش ہوئے اور اس کو روپے دینے کا اقرار کیا۔ اور وہ موقع ڈھونڈھنے لگا کہ کسی طرح قابو پاکر اسے پکڑوادے۔" (۱۴: ۱۰-۱۱)

لوقا کی روایت سے بھی بے خبر نہ رہیے۔

"اور شیطان یہوداہ میں سمایا جو اسکریوتی کہلاتا اور ان بارہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے جاکر سردار کاہنوں اور سپاہیوں کے سرداروں سے مسلح کی کہ اس کو کس طرح ان کے حوالے کرے۔ وہ خوش ہوئے اور اسے روپے دینے کا اقرار کیا۔ اس نے مان لیا اور موقع ڈھونڈھنے لگا کہ اسے بغیر ہنگامے کے حوالے کردے۔" (۲۲: ۳-۶)

مسیح کی طرف سے پیشگوئیوں اور اکابر یہود کی طرف سے سازشوں، منصوبوں، تیاریوں کا دور ختم ہوا۔ اور نوبت واقعۂ گرفتاری کی آگئی۔ اکابر یہود کے سپاہیوں کے ہاتھ۔ اور ایک یہودی کنجر غدار کی مدد سے پہلے یہ روائت متی کی زبان سے سنیے:۔

"وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ یہوداہ جو ان بارہ میں سے ایک تھا آیا اور اس کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ

تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے آ پہنچی۔ اور اس کے پکڑوانے والے نے یہ بتادیا تھا کہ جس کا میں بوسہ لوں وہی ہے۔ اسے پکڑ لینا..... اس پر انھوں نے پاس آکر یسوع پر ہاتھ ڈالا اور اسے پکڑ لیا..... اسی گھڑی یسوع نے بھیڑ سے کہا کیا تم تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مجھے ڈاکو کی طرح پکڑنے نکلے ہو؟ میں ہر روز ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا اور تم نے مجھے نہیں پکڑا۔" (۲۶: ۴۷-۵۶)

گرفتاری کا یہی منظر مرقس نے بھی دکھایا ہے (۱۴: ۴۳-۴۹) اور لوقا میں بھی (۲۲: ۴۷-۵۳) اور یوحنا میں تفصیل کچھ زائد ہی ہے مثلاً یہ کہ:-

"پس وہ اسی روز سے اس کے قتل کا مشورہ کرنے لگے۔ پس اس وقت سے مسیح یہودیوں میں علانیہ نہیں پھرا..... اور سردار کاہنوں اور فریسیوں نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر کسی کو خبر ہو کہ وہ کہاں ہے تو اطلاع دے تاکہ اسے پکڑ لیں۔" (۱۱: ۵۳، ۵۴، ۵۷)

یوحنا میں کچھ اور تفصیلات بھی ہیں۔ آخر میں ہے۔

"پس یہوداہ سپاہیوں کی پلٹن اور سردار کاہنوں[1] اور فریسیوں[2] سے پیادے لے کر مشعلوں اور چراغوں اور ہتھیاروں کے ساتھ وہاں آیا۔ (۱۸: ۳)

لیکن اتنے جزو پر سب کا اتفاق ہے کہ مسیح کی گرفتاری یہودی سرداروں کے حکم سے اور انھیں کے سپاہیوں، پیادوں کے ہاتھوں ایک یہودی کی مخبری پر عمل میں آئی

یہودی سپاہی اور پیادے حضرت مسیح کو گرفتار کرکے قدرۃً پہلے اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ انجیل یوحنا میں ہے:-

---

[1] کاہن، یہود اور بابل کی قدیم اصطلاح میں ترجمہ Priest کا ہے۔ عام اردو میں اس کے لیے لفظ "پروہت" یا "پجاری" (پوجا کرانے والے کے معنی میں) موجود ہے۔ سردار کاہن سب سے بڑا اور اعلا پروہت ہوتا تھا۔ جس کا انتخاب ہر سال بہت سی رسوم کے بعد ہوتا تھا۔ یہود کے ہاں یہ سب سے بڑا دینی عہدہ تھا۔ (صدق)

[2] یہ گروہ یہود کے علماء و مشائخ کا تھا۔ انجیلوں میں ان کی ریاکاری و نمائشی دینداری اور سرتاپا پر تصنع زندگی پر بڑی لعنت پھٹکار آئی ہے۔ (صدق)

"بہت سے سپاہیوں اور ان کے صوبہ دار اور یہودیوں کے پیادوں نے یسوع کو پکڑ کر باندھ لیا۔ اور پہلے اسے حنا کے پاس لے گئے کیونکہ وہ اس برس کے سردار کاہن کائفا کا سسرا تھا۔ یہ وہی کائفا تھا جس نے یہودیوں کو صلاح دی تھی کہ امت کے واسطے ایک آدمی کا مرنا بہتر ہے۔"

(۱۸:۱۲-۱۴)

یہ حنا (ANNAS) نہ صرف اس وقت کے بڑے پروہت کائفا کا سسرا تھا۔ بلکہ خود بھی اس عہدہ پر رہ چکا تھا۔ اور اس وقت بھی یہود میں بڑے اقتدار کا مالک تھا۔

یوحنا میں ہے کہ:

"پھر سردار کاہن نے یسوع سے اس کے شاگردوں اور اس کی تعلیم کی بابت پوچھا" (۱۸:۱۹)

اور جب اس پوچھ گچھ، سوال وجواب اور تحقیقات کے وقت مسیح کا لب ولہجہ یہود کے معیار کے مطابق نہ رہا تو ایک بدبخت یہودی پیادہ نے آپ کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اور بالآخر یہ سردار کاہن کائفا کے پاس بھیج دیا گیا۔

روایت ہے کہ:

"پیادوں میں سے ایک شخص نے جو پاس کھڑا تھا یسوع کے طمانچہ مار کر کہا، تو سردار کاہن کو ایسا جواب دیتا ہے؟ یسوع نے اسے جواب دیا۔ اگر میں نے برا کہا تو اس برائی پر گواہی دے اور اگر اچھا کہا تو مجھے کیوں مارتا ہے۔ پس حنا نے اسے بندھا ہوا سردار کاہن کائفا کے پاس بھیج دیا۔" (۱۸:۲۲-۲۴)

یہود کی اپنی عدالت میں مسیح کے پیش ہونے کا منظر انجیل متی کے حوالے سے ملاحظہ ہو:

"اور یسوع کے پکڑنے والے اس کو کائفا نام سردار کاہن کے پاس لے گئے۔ جہاں فقیہہ اور بزرگ جمع ہو گئے تھے ... اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف جھوٹی گواہی ڈھونڈھنے لگے مگر نہ پائی گو کہ بہت سے جھوٹے گواہ آئے۔ لیکن آخر کار دو گواہوں نے آ کر کہا کہ اس نے کہا ہے میں خدا کے مقدس کو ڈھا سکتا

لوقا کی روایت ہے کہ حنا اور کائفا دونوں ہی بڑے پروہت کے منصب پر تھے۔ اور حنا اور کائفا سردار کاہن تھے۔ (۳:۲)

اور تین دن میں اسے بنا سکتا ہوں! اور سردار کاہن نے کھڑے ہو کر اس سے کہا تو جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں! مگر یسوع چپکا ہی رہا۔ سردار کاہن نے اس سے کہا میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہو تو ہم سے کہہ دے۔ تو یسوع نے اس سے کہا تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔ اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر کیا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی۔ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے۔ اس پر انھوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا۔" (۲۶: ۵۹-۶۸)

غرض یہ کہ گرفتاری کی ساری کارروائیاں یہود نے ہی کیں یہودی کی اپنی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا یہودی بطور گواہ پیش ہوئے۔ فیصلہ یہود ہی نے کیا۔ یہودی نے اسے واجب القتل ٹھہرایا یہودی کی صدر عدالت نے مسیح پر کفر کا فتویٰ دیا۔ ہر طرح کی بدتمیزیاں اور بے ہودگیاں یہودی نے کیں ——— تائیدی بیان مرقس کا سنیے:

"پھر وہ یسوع کو سردار کاہن کے پاس لے گئے۔ اور سب سردار کاہن اور بزرگ اور فقیہہ اس کے پاس جمع ہو گئے۔ ... اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کے مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف گواہی ڈھونڈھنے لگے مگر نہ پائی۔ کیوں کہ بہتیروں نے اس پر جھوٹی گواہیاں تو دیں لیکن ان کی گواہیاں متفق نہ تھیں ..... پھر سردار کاہن نے بیچ میں کھڑے ہو کر یسوع سے پوچھا کہ تو کچھ جواب نہیں دیتا! یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ مگر وہ چپکا ہی رہا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ سردار کاہن نے اس سے پھر سوال کیا اور کہا کیا تو اس متبرک کا بیٹا مسیح ہے؟ یسوع نے کہا۔ ہاں۔ میں ہوں۔ اور تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔ سردار کاہن نے اپنے کپڑے پھاڑ کے کہا۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی! تم نے یہ کفر سنا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ ان سب نے فتویٰ دیا کہ وہ قتل کے لائق ہے۔ تب بعض اس پر تھوکنے اور اس کا منہ ڈھانپنے اور اس کے مکے لگانے اور اس سے کہنے لگے۔ نبوت کی باتیں سنا۔ اور پیادوں نے اسے طمانچے مار مار کر اپنے قبضہ میں

لیا۔" (۱۴:۵۳-۶۵)

لوقا کا بیان گو مختصر ہے۔ لیکن جامع و واضح ہے۔

"اور جو آدمی یسوع کو پکڑے ہوئے تھے اس کو ٹھٹھے میں اڑاتے اور مارتے تھے۔ اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس سے یہ کہہ کر پوچھتے تھے نبوت سے بتا کس نے تجھکو مارا؟ اور انھوں نے طعنے سے اور بھی بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں۔

جب دن ہوا تو سردار کاہن اور فقیہہ یعنی قوم کے بزرگوں کی مجلس جمع ہوئی اور انھوں نے اسے اپنی صدر عدالت میں لے جا کر کہا۔ اگر تو مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ اس نے ان سے کہا اگر میں تم سے کہوں تو یقین نہ کرو گے! اور اگر پوچھوں تو جواب نہ دو گے لیکن اب سے ابن آدم قادر مطلق خدا کی داہنی طرف بیٹھا رہے گا۔ اس پر ان سب نے کہا پس کیا تو خدا کا بیٹا ہے؟ اس نے ان سے کہا تم خود کہتے ہو کیونکہ میں ہوں! انھوں نے کہا اب ہمیں گواہی کی کیا حاجت رہی؟ کیونکہ ہم نے خود اس کے منہ سے سن لیا ہے (۲۲:۶۶-۷۱)

غرض جب یہ سارے مرحلے مخبری اور گرفتاری سے لے کر طرح طرح کی ذلتوں، اہانتوں اور تکفیر کے بعد واجب القتل قرار پانے کے سب یہود ہی کے ہاتھوں اور یہود کی عدالت میں طے پا چکے تو اب سزائے موت کے نفاذ کے لیے مقدمہ کو قدرۃً رومی حاکم عدالت پیلاطس (PILATE) کی پیشی میں لے جانا ناگزیر ہو گیا۔ چناں چہ آگے کی سرگزشت پہلے متی کی زبان سے سنیے:۔

"جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا تا کہ اسے مار ڈالیں۔ وہ اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا۔

یسوع حاکم کے سامنے کھڑا تھا اور حاکم نے اس سے پوچھا۔ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ یسوع نے اس سے کہا تو خود کہتا ہے اور جب سردار کاہن اور بزرگ اس پر الزام لگا رہے تھے تو اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر پیلاطس نے اس سے کہا کیا تو نہیں سنتا کہ یہ تیرے خلاف کتنی گواہیاں دیتے ہیں۔ اس نے ایک بات کا بھی اس کو جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ حاکم نے بہت تعجب کیا۔ اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطس

نے ان سے کہا۔ تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر اسے چھوڑ دوں۔ برآبا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟ ... لیکن سردار کاہنوں اور بزرگوں نے لوگوں کو ابھارا کہ برآبا کو مانگ لیں اور یسوع کو ہلاک کرائیں .... وہ بولے برابا کو۔ پیلاطس نے ان سے کہا کہ پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے، کیا کروں؟ سب نے کہا کہ اس کو صلیب دی جائے۔ اس نے کہا۔ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا بلکہ اُلٹا بلوا ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے۔" (۲۷: ۱۱-۲۶)

مرقس کا بیان اس سے بہت ملتا جلتا ہوا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے اسے چھوڑ کر لوقا کی روایت پر آجائیے:۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطس کے پاس لے گئی اور انھوں نے اس پر الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا..... پیلاطس نے سرداروں کاہن اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر ابھارتا ہے۔ یہ سن کر پیلاطس نے پوچھا کیا یہ آدمی گلیلی ہے؟ اور یہ معلوم کر کے کہ ہیرودیس کی عملداری کا ہے۔ اسے ہیرودیس کے پاس بھیجا کہ وہ بھی ان دنوں یروشلم میں تھا۔" (۲۳: ۱-۷)

بہ طور جملۂ معترضہ یہ سن لیجئے کہ رومی شہنشاہ کی طرف سے "امیر ملک فلسطین میں مقرر تھے ایک ارض گلیل کے لیے اور وہاں کا حکم اس وقت ہیرودیس تھا اور دوسرا خاص علاقہ یروشلم کے لیے جو پیلاطس کی عملداری میں تھا۔ اب آگے پھر لوقا کا بیان سنئے:۔

"وہ ہیرودیس اس سے بہتیری باتیں پوچھتا رہا۔ مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔ اور سردار کاہن اور فقیہہ کھڑے ہوئے زور شور سے اس پر الزام لگاتے رہے .... پھر پیلاطس

نے سرداروں کاہنوں اور سرداروں اور عام لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ تم اس شخص کو لوگوں کا بہکانے والا ٹھہرا کے میرے پاس لائے ہو اور دیکھو میں نے تمہارے سامنے اس کی تحقیقات کی۔ مگر جن باتوں کا الزام تم اس پر لگاتے ہو۔ ان کی نسبت نہ میں نے اس میں کچھ قصور پایا نہ ہیرودیس نے کیوں کہ اس نے اسے ہمارے پاس واپس بھیجا ہے اور دیکھو اس سے کوئی فعل ایسا نہیں ہوا۔ جس سے وہ قتل کے لائق ٹھہرتا پس میں اس کو پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ سب مل کر چلا اٹھے کہ اسے لے جا اور ہمارے خاطر برابا کو چھوڑ دے (یہ کسی بغاوت کے باعث جو شہر میں ہوئی تھی اور خون کرنے کے سبب قید میں ڈالا گیا تھا۔) مگر پیلاطس نے چھوڑنے کے ارادے سے پھر ان سے کہا۔ لیکن وہ چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دے صلیب۔ اس نے تیسری بار ان سے کہا کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ میں نے اس میں قتل کی کوئی وجہ نہیں پائی۔ پس میں اسے پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ مگر وہ چلا چلا کر سرحوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے۔ اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔ پس پیلاطس نے حکم دیا کہ ان کی درخواست کے موافق ہو۔ اور جو شخص بغاوت اور خون کرنے کے سبب قید میں پڑا تھا اور جسے انھوں نے مانگا تھا اسے چھوڑ دیا۔ مگر یسوع کو ان کی مرضی کے موافق سپاہیوں کے حوالہ کیا۔"

اس کے آگے کیا گزری حضرت مسیحؑ واقعی مصلوب ہوئے یا نہیں، اس سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں دکھانا انجیلی صراحتوں سے اور ان کی تکرار بلکہ کثرت تکرار سے یہ ہے کہ حضرت مسیح سے اصل دشمنی حکمرانِ قوم کو نہیں بلکہ صرف مسیح کے ہم قوم یہود کو تھی۔ انھیں نے ان کو پکڑا، انھیں نے فتوائے قتل سنایا اور رومی حاکم کی ہر نرمی اور سفارش کے باوجود آپ کو سولی گھر تک لے آئے۔

آپ کہیں گے۔ اس کے بعد اب وضاحت و شہادت کا درجہ باقی ہی کون سا رہ گیا ہے؟ لیکن ذرا ٹھہریئے اور ایک شہادت اس سے بھی جلی تر واضح تر، کامل تر ابھی اور سن لیجیے۔ یہ شہادت بھی انجیل ہی کی ہے اور سب سے آخری انجیل یعنی یوحنا کی۔

"پھر وہ یسوع کو کائفا کے پاس سے قلعہ[1] کو لے گئے۔ صبح کا وقت تھا اور وہ خود قلعہ

---

[1] قلعہ یہاں سرکاری کچہری تھی (صدق)

میں نہ گئے تاکہ ناپاک نہ ہوں[1] بلکہ فسح[2] کھا سکیں پس پیلاطس باہر نکل کر ان کے پاس آیا اور کہا کہ تم اس آدمی کی کیا فریاد کرتے ہو[3]۔ انھوں نے جواب میں اس سے کہا کہ اگر یہ بدکار نہ ہوتا[4] تو ہم اسے تیرے حوالہ نہ کرتے۔ پیلاطس نے ان سے کہا کہ اسے لے جا کر تم ہی اپنی شریعت کے موافق اس کا فیصلہ کرو۔ یہودیوں نے کہا کہ ہمیں روا نہیں کہ کسی کو جان سے ماریں[5]..... پس پیلاطس پھر قلعہ میں داخل ہوا اور یسوع کو بلا کر اس سے کہا کہ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ یسوع نے جواب دیا۔ کیا تو یہ بات آپ سے کہتا ہے یا اوروں نے میرے حق میں تجھ سے کہی؟ پیلاطس نے جواب دیا۔ کیا میں یہودی ہوں؟ تیری ہی قوم اور سردار کاہنوں نے تجھ کو میرے حوالہ کیا۔ تو نے کیا کیا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ میری بادشاہت دنیا کی نہیں۔ .... پیلاطس نے اس سے کہا پس کیا تو بادشاہ ہے؟ یسوع نے جواب دیا تو خود کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں۔ میں اس لیے پیدا ہوا اور اسی لیے دنیا میں آیا ہوں کہ حق کی گواہی دوں۔ جو کوئی سچائی کا ہے۔ میری آواز سنتا ہے۔ پیلاطس نے اس سے کہا۔ سچائی ہے کیا؟ یہ کہہ کر وہ یہودیوں کے پاس پھر باہر گیا[6] اور ان سے کہا کہ میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا۔ مگر تمہارا دستور ہے کہ میں فسح[7] کو تمہاری خاطر ایک آدمی چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ پس کیا تمہیں منظور ہے کہ میں تمہاری خاطر یہودیوں کے بادشاہ کو چھوڑ دوں۔ انھوں نے چلا کر پھر کہا کہ اس کو نہیں لیکن برابا کو۔ اور برابا ایک ڈاکو تھا۔ اس پر پیلاطس نے یسوع کو لے کر کوڑے لگوائے..... پیلاطس نے پھر باہر جا کے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں اسے تمہارے پاس پھر لے آتا ہوں تاکہ تم جانو کہ میں اس کا جرم نہیں پاتا۔ یسوع کانٹوں کا تاج رکھے اور ارغوانی پوشاک پہنے باہر آیا۔ پیلاطس نے ان سے کہا۔ دیکھو یہ آدمی جب سردار کاہن اور پیادوں

---

[1] یہودی عقیدہ میں مشرکوں کی کسی عمارت کے اندر داخل ہونا اپنے کو ناپاک کرنا تھا (صدق) [2] ایک قسم کی قربانی (صدق) [3] یعنی تمہارا استغاثہ اس کے خلاف کیا ہے؟ (صدق) [4] یعنی مجرم (صدق) [5] سزائے موت کے نفاذ کا اختیار صرف حکومت (رومی) کو تھا۔ یہود رعایا کی دینی عدالتوں کو اس کا حق نہ تھا (صدق) [6] اوپر کی ساری گفتگو حاکم نے کچہری کی عمارت کے اندر آکر کی تھی تنہائی میں (صدق) [7] یہود کے ایک قربانی کے تہوار کا نام (صدق)

نے اسے دیکھا تو چلّا کے کہا کہ صلیب دے صلیب! پیلاطس نے ان سے کہا کہ تم ہی اسے لے جاؤ اور صلیب دو۔ کیونکہ میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا۔ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ ہم اہل شریعت ہیں اور شریعت کے موافق وہ قتل کے لائق ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بتایا۔ جب پیلاطس نے یہ بات سنی تو اور بھی ڈرا۔ اور پھر قلعہ میں جا کر یسوع سے کہا تو کہاں کا ہے..... پیلاطس اس کے چھوڑ دینے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہودیوں نے چلّا کر کہا اگر تو اسے چھوڑ دیتا ہے۔ تو قیصر کا خیر خواہ نہیں۔ جو کوئی اپنے کو بادشاہ بتاتا ہے وہ قیصر کا مخالف ہے[1]۔ پھر پیلاطس یہ باتیں سن کر یسوع کو باہر لایا اور اس جگہ جو چبوترہ ہے وہ تخت عدالت پر بیٹھا..... پھر اس نے یہودیوں سے کہا۔ دیکھو یہ ہے تمہارا بادشاہ۔ بس وہ چلّائے کہ لے جائے جا، اسے صلیب دے۔ پیلاطس نے ان سے کہا کیا میں تمہارے بادشاہ کو صلیب دوں؟ سردار کاہنوں نے جواب دیا کہ قیصر کے سوا ہمارا کوئی بادشاہ نہیں اس پر اس نے اس کو ان کے حوالے کیا تا کہ صلیب دیا جائے۔" (۱۸ و ۲۸-۱۹: ۱-۱۶)

یہ سارے بیانات انھیں چار انجیلوں سے براہ راست نقل ہوئے جو مسیحیوں کے نزدیک مستند ہیں ہی۔ باقی مجموعہ عہد جدید کے دوسرے حصوں مثلاً اعمال سے بھی اگر بیانات نقل ہوں تو ضخامت اس سے بھی کہیں بڑھ جائے ——— اتنی ساری وضاحتوں، صراحتوں اور ان کی کثرت تکرار کے بعد اب یہود کا قتل مسیحؑ یا اقدام قتل مسیحؑ سے اب تقریباً دو ہزار برس کے بعد یہود کا بری الذمہ قرار پا جانا اور وہ بھی نائب مسیح جناب پاپائے روم کی عدالت سے اگر تاریخ کا ایک عجیب ترین اور ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز فیصلہ نہیں تو اور کیا ہے؟ انجیل ہی کے حوالہ سے اوپر یہ مضمون اکابر یہود کا آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔

"اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر!"

انجیل کے براہ راست حوالوں کے بعد کسی اور حوالہ کی ضرورت یقیناً نہیں باقی رہ جاتی۔

---

[1] قیصر یعنی شہنشاہ روم۔ یہود اور ان کے بڑے بڑے پروہتوں کے ترکش کا آخری تیر یہ تھا کہ انھوں نے خود روی حاکم کو دھمکانا شروع کیا کہ اگر تو یسوع کو چھوڑ دیتا ہے تو خود اپنے بادشاہ کا باغی اور غدار ہے۔ (صدق)

لیکن بے تکلف ایک اور حوالہ یہودی کی ایک بڑی اور تاریخی شخصیت کا مل گیا۔ جوزیفس جو پہلی صدی عیسوی کا آدمی ہے اور جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ کے عہد سے متصل ہی گزرا ہے۔ اس کا شمار اکابر یہود میں ہے! اور اس کی تاریخ ANTIQUITIES OF THE JEWS (آثار یہود) یہود کی مستند اور ایک قدیم ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باب ۱۸ فصل ۳ فقرہ ۳ میں رومی حاکم پیلاطس (PILATE) کے حالات کے ذیل میں لکھتا ہے:۔

"تقریباً اسی زمانہ میں یسوع نامی ایک دانشور شخص کا ظہور ہوا۔ اگر شخص کا استعمال اسکے لیے جائز ہو اس لیے کہ اس سے خوارق صادر ہوتے رہتے تھے اور وہ ان لوگوں کا معلم تھا جو حقیقت کو مسرت سے قبول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے گردیدہ بہت سے لوگ ہو گئے، یہود میں سے بھی اور غیر یہود میں سے بھی وہ مسیح تھا اور جب پیلاطس نے اسے ہماری قوم کے اکابر کی تحریک پر سولی کی سزا دی تو اس کے شیدائیوں نے اسے چھوڑ نہیں دیا ...." (صنہ ۵۳۰ انگریزی ایڈیشن)

اور جو کچھ لکھا۔ اس سے بحث نہیں۔ بحث سے متعلق جو فقرہ جوزیفس کے قلم سے نکلا ہے اسے یہاں زیر خط کر دیا گیا ہے۔ جوزیفس جیسا کہ اس کی عبارت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مسیحؑ کا منکر و مخالف نہیں بلکہ نیم معتقد سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا صاف اقرار کر رہا ہے کہ آپؑ کو سزائے موت دلانے میں سعی و تحریک اکابر یہود ہی کی رہی۔

(بشکریہ صدق جدید)

چند مخصوص تحفہ جات

عورت کی سربراہی کی حمایت

دینی محاذ کا ایک حادثہ اور لادینیت کے لیے نوید فتح

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

(۲)

اس مضمون کی پہلی قسط میں مدیر شہاب کے صرف ایک جزو پر گفتگو ہوئی ہوئی تھی بقیہ اجزاء پر اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے چیلنج پر گفتگو باقی تھی۔ صرف اشاعت ہی باقی نہ تھی بلکہ یہ سب حصہ مجھے لکھنے کو بھی باقی تھا کیونکہ میری صحت کی ناہمواری نے اس سے زیادہ لکھنے کا موقع مجھے نہیں دیا تھا جو گزشتہ اشاعت میں شائع ہو سکا۔ اسی صحت کے مسئلے نے مجھے مجبور کیا کہ تبدیل ماحول کی خاطر ہفتے دو ہفتے کہیں لکھنؤ سے باہر رہوں چنانچہ ۱۱ فروری سے ۲۵ فروری تک کا وقت اپنے وطن میں گزارا۔ اور اس کی خاطر یہ بھی طے کرنا پڑا کہ مارچ کے الفرقان کی اشاعت میں کچھ تاخیر گوارا کی جائے۔ لیکن اس تاخیر سے میرے نامکمل مضمون کی تکمیل کی جو صورت کچھ لکھنے کی ادنیٰ زحمت کے بغیر پیدا ہوئی ہے، میں یقیناً اس سے بہتر کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

میں ۲۶ کو لکھنؤ واپس آیا اور بحمداللہ صحت کے اس حال میں تھا کہ مضمون کی تکمیل کا کام شروع کر سکوں۔ لیکن ۲۷ کی صبح ہی کو جو اخبار دیکھا تو اس میں مدیر شہاب (مولانا کو ٹرپاٹی) کا جماعت اسلامی سے استعفے کے اعلان کے ساتھ ایک بیان تھا۔ اور آج یکم مارچ کو نیازی صاحب کا وہ مفصل مکتوب بھی اخبار میں آگیا جو انھوں نے اپنے استعفے سے پہلے مولانا مودودی صاحب

کو لکھا تھا۔ یہ مکتوب ہی میسر نامکمل مضمون کی وہ بہترین تکمیل ہے جو اس تاخیر کی بدولت آپ سے آپ ہی حاصل ہوگئی۔

اس مکتوب میں مدیر شہاب عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں اپنی اس تمام تقریری اور تحریری تائید وحمایت کے بارے میں، جو انہوں نے جماعت اسلامی پاکستان کے فیصلے کے مطابق کی، لکھتے ہیں۔

"میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھتا تھا صرف جماعتی قواعد وضوابط کی وجہ سے اس مصیبت پر مجبور ہوگیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں! اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے"۔

واقعہ یہ ہے کہ عتیق سنبھلی یا کوئی اور شخص نیازی صاحب کے مضمون کی تردید میں کتنے ہی مضبوط دلائل فراہم کر دیتا تب بھی یہ بات بہرحال حاصل نہ ہوتی جو انکے مکتوب کے صرف ان چند جملوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی انسان کا علی الاعلان یہ اقرار کہ وہ اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف اللہ کے دین اور اسکی شریعت کے بارے میں کسی غلط بات کی تائید کا ارتکاب کرتا رہا، دنیا کا سب سے مشکل کام اور انسانی زندگی کا سب سے کٹھن مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں اگر آدمی کو تاویل کے لیے تنکے کا سہارا بھی ملتا ہے تو وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ سے لے کر مولینا اشرف علی صاحب تھانویؒ تک کے اقوال کل اپنی تائید میں پیش کرنے والا اگر آج انہیں اپنی غلطی کا ادنیٰ عذر بنانے کو تیار نہیں ہے تو پھر یہ اس بات پر سو دلیلوں کی ایک دلیل ہے کہ یا تو ان اقوال کو غلط طور پر استعمال کیا گیا تھا اور یا اگر ان میں سے کسی قول سے کچھ تائید واقعتہً نکلتی بھی تھی تو اس کے علم اور ضمیر کے مطابق یہ قول قابل تردید تھا نہ کہ قابل استشہاد! اور یہی ہمارا بھی موقف تھا کہ مثلاً مفتی دارالعلوم دیوبند کے (سابق) فتوے میں یقیناً عورت کو سربراہ مملکت بنانے کا جواز ملتا ہے مگر کوئی صاحب علم

آدمی اپنے علمی ضمیر کو دبائے بغیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی تائید نہیں کرسکتا۔ اور رہا مس فاطمہ جناح جیسی عورتوں کے حق میں اس کا استعمال تو یہ اہل علم ہی نہیں ایک صاحب ضمیر عامی کے لیے بھی قابل شرم ہے اس کے برعکس امام مالکؒ امام ابوحنیفہ اور امام طبری کی طرف جو عورت کی امارت کا جواز منسوب کیا گیا ہم بتا چکے ہیں کہ وہ سراسر خلاف واقعہ ہے اسی طرح ہمیں حضرت تھانویؒ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اقوال پر گفتگو کرکے بتانا تھا کہ ان میں سے کس کے استعمال کی کیا حیثیت ہے اور وہ کس تبصرے کا مستحق ہے لیکن مدیر شہاب کے اس مکتوب نے ہمارے لیے اس بحث کی ساری بساط اب لپیٹ دی ہے۔ اب اگر کسی کو ان اقوال سے خلجان ہے تو وہ ہم سے نہیں مدیر شہاب سے پوچھے کہ یہ جو اقوال سب سے پہلے ان ہی کے ذریعہ لوگوں کے سامنے آئے اور انھیں کی آڑ میں جماعت اسلامی کے ہر صاحب قلم نے اپنی جماعت اور مولانا مودودی صاحب کی مدافعت کا مورچہ سنبھالا ان کے باوجود انھیں (مدیر شہاب کو) اپنی تائید وحمایت کا فعل کیوں اس قدر سنگین معصیت نظر آیا کہ اس کی پاداش میں یمان سے محرومی تک کا اندیشہ ان کی زبان پر آگیا، ہمیں تو اب صرف مدیر شہاب کو مبارک باد دینی ہے کہ انھوں نے حق دوستی اور رجوع وانابت الی اللہ کی بڑی ہی قابل شکر اور قابل رشک توفیق خدا کی بارگاہ سے پائی۔ اور اپنے وہ سخت الفاظ واپس لینے ہیں جو کہیں کہیں ان کے مضمون کی تنقید میں ہمارے قلم سے نکلے۔ یقیناً وہ اپنے اس مضمون سے اب اس طرح بری ہیں جیسے کہ وہ کبھی ان کے قلم سے نکلا ہی نہیں تھا۔

اب ہم اس بحث میں خود کچھ لکھنے کے بجائے مدیر شہاب کا مذکورہ بالا مکتوب ہی اپنے ناظرین کے سامنے پیش کررہے ہیں۔ اس نے جہاں ہمیں مدیر شہاب کے مضمون پر گفتگو سے سبکدوش کردیا ہے وہاں یہ بات بھی اس سے بدرجہ اتم عیاں ہوجاتی ہے کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے اس مسئلہ میں جو موقف مس فاطمہ جناح کی حمایت کی خاطر اختیار کیا وہ ان کے سابقہ موقف کی ایسی ضد ہے جسے بقول مدیر

شہاب دینی دوغلے پن اور نفاق کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالکل کھلی ہوئی تھی اور اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ مولانا مودودی اور انکے رفقاء نے آج جو کچھ اس مسئلے میں کہا ہے اس کا تار و پود بکھیر دینے کے لیے ان کی سابقہ تصریحات ہی کافی ہیں۔ لیکن حیرت ہے ان لوگوں پر جو مدیر شہاب کی طرح جماعتی جبریت کے تحت اس دوغلے پن کی تائید و حمایت کی کوئی مجبوری نہ رکھتے تھے پھر بھی انہوں نے مولانا مودودی سے جوش تعلق میں اپنے اوپر حرج یہ جانا کہ جو لوگ جماعت اسلامی پاکستان کی اس روش کو دینی محاذ کا خطرناک رخنہ جان کر تنقید کر رہے ہیں ان کے مقابلے کا محاذ سنبھال لیں جس میں ایک طرف تو وہ دلائل گڑھ گڑھ کر پیش کیے جائیں جن سے لوگوں کو اسلام میں عورت کی سربراہی کا جواز نظر آنے لگے۔ اور دوسری طرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ مولانا مودودی نے اس سے پہلے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے کسی حال میں بھی عورت کو سربراہ مملکت بنانے کا جواز نہ رہتا ہو اور حد یہ ہے کہ رکھنے والوں نے مولانا کا وہ مضمون بھی سامنے رکھدیا جس میں سیاست و مملکت کے معاملات میں عورتوں کی عملی شرکت کے جواز کی مطلق نفی کرتے ہوئے مولانا اس حد تک گئے تھے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے قصاص کے مطالبے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہنگامی سربراہی تک کے لیے کوئی استثنائی نوعیت کا جواز بھی تجویز نہ فرما سکے بلکہ حضرت علی مرتضیٰؓ کی زبان میں اسی بات پر مصر رہے کہ "حضرت عائشہ کا یہ اقدام حدود شریعت سے متجاوز تھا" لیکن اسکے باوجود بھی کہنے والے پورے طمطراق کے ساتھ یہی کہتے رہے کہ مولانا نے اس مضمون میں یہ کہاں لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی استثناء نہیں ہے؟ ہاں صاحب یہ تو واقعی نہیں لکھا لیکن اگر "امور مملکت" میں فاطمہ جناح کے مملکت پاکستان کی سربراہی کا کوئی استثنائی جواز نکل سکتا ہے تو کیا ام المؤمنین حضرت عائشہ اس قابل بھی نہ تھیں کہ ایک ہنگامی قضیے کی سربراہی کا کوئی جواز ان کے لیے بھی تجویز کر دیا جاتا؟ اور اگر اجازت ہو تو ہم اس سوال کو اسی مضمون کے مولانا کے ان الفاظ میں دریافت کرنے کی جرأت کریں کہ

"آپکے خیال ساوک میں کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جسکی وجہ سے وہ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں کیلئے نا اہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے ان پر کوئی فوقیت حاصل ہو"؟

ہمیں یقین ہے کہ مولانا کی ہر بات کو ڈھونے میں عین سعادت دارین سمجھنے والے اس بات کا بھی جواب دے ہی دینگے اور ہمیں چپ کر کے چھوڑیں گے۔ لیکن اس مضمون کا ایک جملہ اور سن لیجئے حضرت علیؓ کی بات نقل کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ

"اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں"۔

لیکن اب کون حضرت عائشہؓ کو بیسویں صدی کے اس کمال ذہانت و فقاہت کی خبر جا کر پہونچائے کہ جس چیز کی کوئی معمولی سی دلیل بھی آپ کو حضرت علیؓ کے جواب میں نہ مل سکی تھی آج اس کی دلیل قرآن میں دریافت کر لی گئی ہے۔ اور کیسی دریافت! کہ سارے عالم کو چیلنج دیا جا رہا ہے کہ کوئی اس کی نفی میں دلیل لائے!

اسی وقت (اسی مضمون میں) مولانا نے کہا تھا کہ

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھہرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کا دعوے لے کر اٹھیں اور جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اول تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ جس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایت موجود ہو اس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں مگر اس غرض کے لیے نہیں کہ ہم اللہ اور رسول کی ہدایت کو چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں[عہ]۔

اور یہی ان کے متبعین کا بھی غلو کی حد تک شعار تھا۔ مگر کل جنہیں صحابہؓ کی لغزشوں کے اتباع سے بھی عار آتی تھی آج وہ کتابوں اور اخباروں کے پرانے ناموں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے زمانے کے لوگوں تک کی لغزشوں کو مشعل ہدایت بناتے ہوئے نہیں شرما رہے ہیں۔ یہ فلاں کا بیان ہے، یہ فلاں کا فتویٰ ہے یہ فلاں کی تحریر ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت سربراہ مملکت بنائی جا سکتی ہے۔

ع پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

خیر اب چھوڑیئے اس قصہ کو پتہ نہیں کتنی گالیوں کی بارش دادتک کے لیے ان چند سطروں نے مزید سامان کرا دیا ہوگا۔ اب تو مدیر شہاب مولانا کو تو نیازی کا وہ خط پڑھئے جو دراصل اس مضمون کی قسط دوم ہے۔

عہ یہ تمام اقتباسات مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے جس مضمون سے لئے گئے ہیں وہ ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ میں اور اسی کے حوالے سے الفرقان محرم ۱۳۷۲ھ میں بھی شائع ہوا ہے۔

....بنام مولانا مودودی

مولانا کوثر نیازی

محترم امیر جماعت!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پچھلے دنوں میں نے ایک تفصیلی ملاقات کے لیے آپ سے حاضر ہونے کی اجازت چاہی تھی، حاضر بھی ہوا مگر آپ خواجہ عبدالحئی مرحوم کی فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، سرسری سی بات ہوئی اور تفصیلات پھر کسی وقت کے لیے ملتوی ہو گئیں۔ بعد میں مجھے درد گردہ کا دورہ پڑ گیا، اب طبیعت بحال ہے مگر مسلسل نشست رکھوں تو تکلیف ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تحریری طور پر آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔

متحدہ محاذ میں جماعت کی شمولیت پر میرے خیالات آپ سے اور دوسرے رفقاء سے ڈھکے چھپے نہیں۔ جب ۱۹۶۲ء میں مسٹر سہروردی مرحوم سے آپ نے متحدہ محاذ کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز کیا تو میں نے "شہاب" مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں "مسٹر سہروردی سے چند سوالات" کے زیر عنوان ایک اداریہ سپرد قلم کیا تھا مقصود یہی تھا کہ جو لوگ غیر اسلامی نظریات کے علمبردار اور ملک میں جمہوریت کے قاتل ہیں جماعت ان کی طرف دست تعاون بڑھانے سے باز رہے۔ اس پر آپ نے ایک ملاقات میں مجھے اس طرح کی تحریریں لکھنے سے منع کر دیا۔ کیوں کہ آپ کے نزدیک اس سے جماعت کی پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ میں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی مگر اس کے ساتھ میں برابر "شہاب" کے ذریعے ایک اسلامی محاذ کی تشکیل پر زور دیتا رہا۔

متحدہ محاذ کی شرکت

۱۹۶۴ء میں جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس زمانے میں مرکزی دفتر کے باقی ماندہ اصحاب نے محاذ کے قیام کے لیے دوسری پارٹیوں کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر دیئے، میرا خیال یہ تھا کہ جماعت موجود نہیں اور یہ اصحاب اپنی ذاتی حیثیت میں محاذ میں شریک ہو رہے ہیں، اس لیے میں نے ۱۶ فروری ۱۹۶۴ء کے "شہاب" میں ایک مراسلہ بھیجا تفصیل سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا اور دلائل واضح کیا کہ اس طرح کے متضاد اور متصادم عناصر کا اتحاد ملک و ملت دینی اقدار اور خود جماعت کے لیے سخت تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس مضمون کے چھپتے ہی ان رفقاء نے میرے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز تر کر دی، کارکنوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ انھوں نے یہ سب کچھ جیل سے آئی ہوئی ہدایات کے مطابق کیا ہے اور دوسری طرف یہ دھمکی دے کر میرا منھ بند کرنے کی کوشش کی گئی کہ اگر میں اس طرح کے خیالات ظاہر کرنے سے باز نہ آیا تو خلاف قانون قرار دیئے جانے کے باوجود جماعت کا جو ڈھانچہ اپنے طور پر انھوں نے قائم کر رکھا ہے وہ پورے ملک کے متعلقین کو جماعت سے میرے نکل جانے کی اطلاع کر دے گا۔

مایوسی۔ اضمحلال اور جمود

میں پروپیگنڈے کی اس مہم سے متاثر تو نہیں ہوا اس لیے کہ میرے خلاف اس طرح کی کئی مہمیں عرصہ سے بعض ممتاز اصحاب کے زیر سایہ جاری تھیں اور میں زبانی اور تحریری طور پر کئی دفعہ آپ کو ان کی اطلاع بھی دے چکا ہوں اور بطور احتجاج اس سلسلے میں اپنے منصب سے استعفیٰ بھی دے چکا ہوں لیکن اس خیال سے کہ آپکی عدم موجودگی اور جماعت کی بندش کے باوجود اس طرح کے اختلافات جگ ہنسائی کا باعث بنیں گے اور اس سے ہمارے سادہ دل کارکنوں کو بہت صدمہ ہوگا، میں خاموش ہو گیا تا آنکہ جماعت نے صدارتی انتخابات میں اپنے سابقہ موقف کو چھوڑ کر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کو دین اسلام کا تقاضا اور جہاد قرار دے دیا۔ آپ باہر تشریف لے آئے اور جماعت کی پوری طاقت کو آپ نے اس انتخابی مہم میں جھونک دیا، یہ مرحلہ بظاہر اب ختم ہو چکا ہے مگر اس کے خطرناک نتائج و عواقب کارکنان جماعت میں بڑھتی ہوئی مایوسی، اضمحلال اور جمود کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، جماعت جس غلط راستے پر چل پڑی ہے بلکہ اس راستہ کی جس منزل پر جا کر رک گئی ہے۔

اس کی مثال ایک تنگ گلی کی سی ہے جس سے پیچھے ہٹنے یا آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ دوسرے لفظوں میں ہماری تحریک "رہروان پشت بمنزل" کا قافلہ بن چکی ہے، گمان حق ہوگا اگر میں جماعتی خیر خواہی کے لیے آپ کے سامنے اپنے قلبی احساسات کی یہ تصویر نہ رکھوں کہ جن تصورات کے تحت میں جماعت میں شامل ہوا تھا۔ آج وہ تصورات نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور اپنی ذاتی اصلاح و تکمیل کا جو مقصد مجھے جماعت میں لایا تھا جماعت کی پالیسی اور طرز عمل نے دوسرے بہت سے ارکان کی طرح مجھے اس مقصد سے محروم ہی نہیں کیا بہت دور پھینک دیا ہے۔

مذہبی اور سیاسی دیوالیہ پن

صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران جو غلطیاں ہم سب نے کی ہیں وہ اتنی ہولناک ہیں کہ ان کے تذکرے سے بھی دل کانپتا ہے اور چونکہ جماعت کی پالیسی کے تحت مجھے بھی ان غلطیوں کا بار بار ارتکاب کرنا پڑا ہے اس لیے میں ان کی شدت کو بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں، مجلس عاملہ کے حالیہ اجلاس میں اگر اپنی غلطیوں کا احساس و اعتراف کر کے راست روی اختیار کر لی جاتی تو شاید اس احساس میں کمی واقع ہو جاتی مگر عاملہ نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی ہے میں اس پر مسلسل غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس سے جماعت ایک ایسے راستے پر ڈال دی گئی ہے جو دینی اعتبار سے سخت دوغلے پن بلکہ (مجھے اس سخت لفظ کے استعمال کے لیے معاف فرمائیے) نفاق کا راستہ ہے اور سیاسی حیثیت سے فہم و فراست اور حکمت و دانش کے پہلو سے ہمارے دیوالیہ ہو جانے کا اعلان عام ہے۔ اس قرارداد کا تضاد خلق خدا کے ساتھ ساتھ مضطرب ارکان اور کارکنوں کو مغالطے میں ڈالنے کی ایک دردناک مثال پیش کرتا ہے۔

اس قرارداد کے ایک حصہ میں تو کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے کہ۔

"یہ اخلاقی حالت اگر ہماری قوم کی نہ ہوتی تو انتخابات کے یہ نتائج ہرگز برآمد نہ ہو سکتے تھے۔ یہ صورت حال اس امر کی ضرورت کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ خود جمہوریت کی بحالی کے لیے بھی قوم کی اخلاقی اصلاح ناگزیر ہے۔ جب تک ہم طبقات کے اخلاق کو پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کی فکر اور کوشش نہ کریں گے۔ اس وقت تک دھن، دھونس اور دھاندلیوں کے ذریعے سے آمروں کے مسلط ہونے کا دروازہ بند نہ ہو سکے گا۔"

اور اس کے دوسرے حصوں میں یہ کہہ کر مغالطہ دہی کی حد کر دی گئی ہے کہ

"گزشتہ تین ماہ میں قوم جس آزمائش سے گزری ہے اس سے اس کا یہ احساس بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ اب بیدار ہے اور اپنے حقوق کے لیے ہر ممکن جد وجہد کا داعیہ رکھتی ہے۔"

اس کے ساتھ دوسرے فیصلوں میں اس امر کا بھی واشگاف الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ "جماعت اسلامی حتی الوسع دستور ساتھ دیتی رہے گی۔"

الفاظ کا گورکھ دھندا

ان قرار دادوں کا جو مطلب میں سمجھا ہوں اور جو میرے خیال میں ہر پڑھا لکھا آدمی سمجھے گا یہ ہے کہ جماعت اپنے ارکان کے اندر پیدا شدہ بے چینی کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں دبا دینا چاہتی ہے اس میں ان لوگوں کے لیے بھی سامان تسکین موجود ہے جو اصلاح معاشرہ کے طویل اور کٹھن کام کو "مجذوب کی بڑ" سمجھتے اور اس لادینی سیاست کے چکر میں الجھ کر متحدہ محاذ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے ذوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو انقلاب قیادت کے لیے خود معاشرہ کی اصلاح کو ضروری قرار دیتے ہیں، اس طرح کے دو متصادم نظریات کو ایک ہی سانس میں دہرا دینے کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جماعت کی قیادت اب بھی اپنے ارکان اور کارکنوں سے صفائی کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتی اور اسے اپنی سابقہ غلطیوں کا اعتراف کرنے میں شدید تامل ہے۔

"ابدی اور غیر ابدی محرمتیں"

محترم مولانا۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ دوسری بہت سی اصولی غلطیوں کے علاوہ ہم نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جو سزا ملے گی اس کا مسئلہ تو الگ ہے اس دنیا میں بھی اندرون و بیرون ملک ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ اگر ہمیں صدر ایوب کی مخالفت کرنی ہی تھی اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینا ہی تھا تو سیاسی اور جمہوری ضرورتوں کا اظہار کر کے ایسا کیا جا سکتا تھا مگر اس کے لیے ہم نے غریب اسلام پر جو نوازش کی ہے اور جو محرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے اس کے بعد دینی حلقے تو ایک طرف رہے دوسرے غیر جانب دار عناصر حتیٰ کہ الپوزیشن تک کے بعض نمایاں افراد ہمیں ابن الوقت اور سیاست کی خاطر دین میں ترمیم اور تحریف کرنے والا گروہ تصور کرنے لگے ہیں۔ آپ عالم

اسلام کی صفِ اول کے ممتاز عالم دین ہیں اور میں ایک معمولی طالب علم، میں نے کچھ سیکھا بھی ہو تو آپ کے طفیل، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی کی یہ تقسیم مان لینے کے بعد ہمارا موقف منکرین حدیث کے گمراہ کن نظریہ سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے منکرین حدیث کا نظریہ یہی تو ہے کہ وہ فقط قرآن میں بیان کردہ حرمتوں کو ابدی مانتے ہیں۔ حدیث کی حرمتیں ان کے نزدیک غیر ابدی ہیں مگر ہم یہ کہہ کر ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نہیں ساری حرمتیں قرآن کی بھی ابدی نہیں، حرمتیں قرآن کی ہوں یا حدیث کی سب کی سب ابدی اور غیر ابدی کے خانوں میں تقسیم ہیں۔

دین کی پامالی کا اذن عام

محترم مولانا! یقین فرمائیے کہ اس نظریہ کی تاویل میں اب تک آپ نے یا دوسرے حضرات نے جو کچھ لکھا یا کہا ہے وہ میری نظر میں ہے (اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعتی پالیسی کی مجبوریت کے تحت میں خود آپ کے اس نئے نظریہ کا دفاع کرنے والوں میں شامل رہا ہوں) مگر اس کے باوجود اس نظریہ کی صحت مجھ پر واضح نہیں ہو سکی اور آج جب کہ یہ سطور لکھتے وقت میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے میں آپ کا بدترین بدخواہ ہوتا اگر اس مہلک نظریہ کے متعلق اپنے دل کی بات آپ کے سامنے بیان نہ کرتا۔ قرآن اور حدیث میں حرمتوں کے متعلق "ابدی" اور "غیر ابدی" کا تصور ضرور نہ پایا جاتا ہے مگر "ابدی" اور "غیر ابدی" کا نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ دروازہ کھول کر ہم نے تجدد پسندوں کو دین کی پامالی کا اذن عام دے دیا ہے۔ غیر ابدی حرمتوں کی لکھی لکھائی فہرست تو کہیں درج نہیں ہوگی یہی کہ جو شخص یا گروہ اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت چاہے گا کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرا لے گا، آخر کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرانے کا حق ہمیں ہی تو ارزانی نہیں ہوا، دوسرے بھی تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہمیں ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر ہم ایک حرمت کو جائز قرار دے رہے ہیں، یہ ضرورتیں اور مصلحتیں معتبر نہیں مگر اس کا کیا جواب ہوگا جب پلٹ کر کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ مصلحتیں غیر معتبر ہیں۔ ہمارے نزدیک معتبر اور جہاں تک نظریہ کا سوال ہے وہ خود آپ ہی کا عطا کردہ ہے اس لیے ہم نے اپنے غلط اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے بھی

سو حرمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

تو ہم اس لیے ثواب کے امیدوار ہیں کیوں کہ مجتہد کے نامۂ اعمال میں غلط اجتہاد پر بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔ مجھے اس سے بیشتر آپ کے نظریۂ حکمتِ عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا۔ جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں اسے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا مگر صدارتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے نظریہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریہ حکمتِ عملی ان ہی مضمرات کا حامل تو نہ تھا۔؟

انتہائی ندامت کے ساتھ

میں آپ کے ساتھ انتہائی ندامت کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے حقیر سے علم اور مطالعہ کی بنا پر میری رائے یہی تھی کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری روایات کی بات تو دوسری ہے لیکن شرعاً عورت کسی بھی صورت میں صدر مملکت نہیں بنائی جا سکتی اور اس کا تو میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تھا کہ کبھی ہم بھی اسلام کے نام پر ایک خاتون کی حمایت میں ایسی تحریک چلا سکتے ہیں چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے سینکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کی وضاحت کی اور بعد میں بعض اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوا دیا مگر اس دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جماعت اس سے الگ نقطۂ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گیا اور جماعت کے فیصلے کے انتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔

مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزب اختلاف کا ساتھ نہ دیا جائے۔ آپ کی گزشتہ تحریروں کی روشنی میں امید بھی اس بات کی تھی لیکن جب مجلس مشاورت میں جیل سے آئی ہوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلس مشاورت کی قرارداد کی صورت میں اخبارات کو ارسال کر دیا گیا تو میرے حسن ظن کو انتہائی ٹھیس پہونچی شاید آپ کو معلوم نہ ہو میں یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ مجلس مشاورت کے جس اجلاس میں محترمہ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے اس قرارداد کو منظور

کیا گیا۔ میں اس میں اپنی غلط فہمی (یا وقت کے بارے میں غلط اطلاع) کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا جب میں پہونچا تو یہ قرارداد اخبارات کو بھجوائی جا چکی تھی۔ کاش! میں اس وقت موجود ہوتا اور اس غلط نظریہ پر اہل مجلس کو متنبہ کر کے کم از کم قرارداد کے الفاظ تو تبدیل کرا دیتا ـــــ ظاہر ہے کہ اس کے بعد "تیر از کمان رفت" والا معاملہ تھا اب جماعتی دستور کی رو سے میں اس فیصلہ کی تائید پر مجبور تھا اور جس رائے کو میں دلائل کی بنا پر مرجوح بلکہ غلط سمجھتا تھا اب صرف اس لیے کہ وہ بطور قرارداد منظور ہو چکی ہے جماعت اور مجلس مشاورت کا رکن ہونے کی وجہ سے میں تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تائید و توثیق کرنے لگا۔

مولانا! میں بہت گناہ گار ہوں مگر میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے اس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں؟ اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا'

مولانا! میری رائے یہ ہے کہ اب ہماری یہ محبوب جماعت اسلامی ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہے۔

قول و فعل کا تضاد

اس جماعت کی ابتداء کے وقت نظام حکومت کی اصلاح کا جو تصور آپ نے پیش کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ افراد میں ایمان و اسلام اور احسان کا صحیح شعور پیدا کر کے انھیں انفرادی زندگی میں متقی بنایا جائے اور ان افراد کے ذاتی عمل اور شہادت حق کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ اس طریقے سے نظام حکومت کی اصلاح آپ سے آپ یوں ہوگی جیسے سنگترے کے بیج سے سنگترے کا درخت اور پھر اس درخت سے سنگترے کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ اس طبعی عمل کے طور پر اسلامی حکومت اسی اصلاح یافتہ معاشرے سے نمود پذیر ہوگی۔ یہ تصور اگر جماعت کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا تو کسی اہم مرحلے پر اسے اجاگر کرنے کے بعد پھر سے زیر عمل لایا جا سکتا تھا لیکن دوسرے بہت سے اصحاب قلم کے علاوہ خود آپ نے پچھلے آٹھ دس برس میں جماعت کو جو فکری غذا دی ہے اور جس طرح پہلے دوسرے اور تیسرے مرحلے کا تصور دے کر جماعت کے کارکنوں کو یہ باور کرایا ہے کہ جماعت جو بھی پالیسی اختیار کر رہی ہے وہ اسی تصور اقامت دین ہی

کا نتیجہ ہے جو آپ نے شروع میں پیش فرمایا تھا' اس کے بعد جماعت کے کارکنوں کو پھر سے اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ کے کاموں پر لگا دینے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مزید برآں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بالعموم اور صدارتی انتخاب میں بالخصوص جس قسم کی اپوزیشن کا کردار ادا کیا ہے ارباب اقتدار کو اپنا حریف بنایا اور خود جس طرح ان کے حریف بنے ہیں اس کے بعد دائمی دین کی حیثیت سے ہمارے لیے ملک میں کام کرنے کی کوئی صورت موجود نہیں۔ اس پہلو سے میری مایوسی اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کیوں کہ ہم نے ۱۹۶۷ء کی انتخابی پالیسی سے لے کر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لیے جس طرح نصوص قرآن و حدیث کو پیش کیا ہے اس کے بعد اس ملک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

ماضی اور حال

تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' تضادات کا شکار ہوئے جانے کے ہمارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لیے صحابہ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مگر اب ہم اپوزیشن کے ساتھ مل کر امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ سابق نمائندہ پنچایتی سسٹم سے آئے جس جماعت یا گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہو پھر ہم نے صالح نمائندوں کو جماعت کے دائرے میں مخصوص کر دیا۔ پہلے ہم پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہتے تھے اب محاذ کے ساتھ شریک ہو کر "غیر صالحین" کو بھی ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ ہم نوٹ پر قائد اعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے۔ صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کے تصویری دو چرخے گلی گلی فروخت کیے۔ پہلے ہم نے صدارتی سے بھی بڑھ کر امارتی تصور خلافت پیش کیا تھا' اب ہم پارلیمانی نظام جمہوریت کو اسلامی قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم اسمبلیوں میں اراکین کی الگ پارٹیاں بنانے کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے بعد میں ہم نے خود اس پر عمل کیا۔ پہلے ہم مخلوط جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے اب مخلوط جلسوں کی صدارت کرتے اور ان میں تقریریں کرتے ہیں۔ پہلے ہم علماء کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کو ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے اب علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم خواتین کا

کو ووٹ کا حق دینے میں راضی نہ تھے اب ان کی حمایت تک کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ پہلے ہم ایوب کے زبردست ناقد تھے اب ان ہی کا ایک حصہ متحدہ حزب اختلاف کی خواتین کمیٹی کی صورت میں منظم ہوا ہے تو ہمارے اکابرین کی بیگمات ان کے جلسوں سے خطاب فرماتی ہیں، پہلے ہم طلبا کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روکتے تھے۔ اب ان سے عملی سیاست میں شریک ہونے کی اپیلیں کرتے ہیں۔ پہلے ہم جلوسوں اور نعروں کو غیر اسلامی کہتے تھے۔ اب خلاف کعبہ تک کے جلوس نکالتے اور اپنے رہنماؤں کے لیے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ پہلے ہم ان انسانی (غیر اسلامی) قوانین پر چلنے والی عدالتوں میں مقدمات لے جانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اب ان ہی عدالتوں کو ہم عدل و انصاف کا محافظ قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے اب ان ہی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں۔

میں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری ان باتوں میں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانئے انتہائی دکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے کیے ہیں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی اور دینی سمجھ کر چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب "ترک و اختیار" کے ان مظاہروں کے بعد اپنے ارکان کے سوا کون ہمارے دینی فکر پر بھروسہ کرے گا؟

غیر جمہوری نظام

۲۔ اگر ہم دین کے لیے کوئی کام نہ کر سکتے تو ہمارے لیے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام کرنے کا دوسرا میدان باقی تھا۔ مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہماری تنظیم کے قواعد اور اس کی موجودہ ہیئت اس کے لیے سخت غیر موزوں اور نامناسب ہے۔ ہمارے نظام میں ممبر و رکنیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ہمارے ارکان کی تعداد غالباً ابھی تک ڈیڑھ ہزار سے متجاوز نہیں ہو سکی۔ اس میں بھی ہر پندرھواں رکن تنخواہ دار ہمہ وقتی کارکن ہے۔ جماعت کے پورے دو لبسٹ اور قیادت پر ان ہی ہمہ وقتی اصحاب کا قبضہ ہے، یہ ٹھیک ہے کہ ان میں انتہائی مخلص لوگ شامل ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ کی طرف سے قیم حلقہ ہونے کی بالاصرار دعوت پر میں نے عرض کیا تھا ہمہ وقتی ہونے کے بعد تنخواہ اور معاوضہ کی شرح سے کام کی پیمائش ہوتی ہے۔ اس کے لیے غریب کارکنوں

کو اپنے دفاع میں بہت کچھ کارگزاری بیان کرنا پڑتی ہے مستعفی ارکان کا جواب دینے کے لیے حامی ارکان ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے لوث تنخواہ دار قیادت بھی سازشوں کا اور گروپ بندیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں معیار بدقسمتی سے یہ نہیں کہ کون اہل ہے جسے اعزازی طور پر ہی سہی جماعت کی قیادت سونپ دی جائے معیار یہ ہے کہ کون فارغ یا معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہے جسے ہمہ وقتی بنا کر قائد بنا دیا جائے۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ آج جماعت کی ہیئت حاکمہ مجلس عاملہ تک میں ایک آدھ رکن کو چھوڑ کر باقی سب حضرات یعنی تنخواہ پانے والے ہمہ وقتی رفقاء ہیں۔ ان کی سیرتیں بہت بلند سہی مگر ظاہر ہے جماعت سے معاشی وابستگی کے بعد وہ پورے زور اور جرأت سے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں تو یہ بات اور مشکل ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے دستور (بمطابق قرارداد مالی گوٹھ) کی رو سے وہ شخص جماعت کے کسی منصب پر فائز ہو ہی نہیں سکتا جو کبھی جماعت کی طے شدہ پالیسی سے اختلاف رائے کا اظہار کر چکا ہو (خواہ یہ اظہار اختلاف خود آپ کے سامنے ہی کیوں نہ ہو۔)

پھر رائے دہندگی کے معاملہ میں بھی ہم نے لینے اور دینے کے باٹ الگ الگ بنا رکھے ہیں۔ ہم پورے ملک میں تو بالغ رائے دہی چاہتے اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر سخت سے سخت تنقید کرتے اور حقوق کے معاملہ میں درجہ بندیوں کو از روئے اسلام ظلم عظیم سمجھتے ہیں مگر خود اندرون جماعت ہمارا رد یہ یہ ہے کہ ہم نے اس میں متاثر، ہمدرد، متفق اور رکن کی درجہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں اور جماعت کے عہدہ داروں وغیرہ کے انتخاب میں ان کارکنوں کو بھی ووٹ دینے کا حق نہیں دیتے جو سالہا سال سے نہایت اخلاص اور ایثار کے ساتھ جماعت کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ جو اس کی مالی امداد کرتے، اس کے جلسوں میں دریاں بچھاتے۔ اس کی وجہ سے ملازمتوں سے ہاتھ دھوتے اور زمانہ بھر کی مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ووٹ کا حق ہمارے ہاں صرف رکن کو ہے متاثر، ہمدرد کارکن اور متفق اس سے محروم ہیں۔ البتہ ارکان کے ووٹوں سے بنے ہوئے نظم کی سمع و طاعت از روئے اسلام ان کا فرض ہے۔ جماعت کی بنیادی پالیسی ارکان کے اجتماع کے بجائے مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ میں طے ہوتی ہیں اور اب تو ایک عرصہ سے (بالخصوص ۵۷ء میں جماعتی دستور کی ترامیم کے بعد) شوریٰ کو بھی کم ہی زحمت دی جاتی

ہے فیصلے کرنے کے لیے سارا دارومدار آپ کی کیبنٹ یعنی عاملہ پر ہے۔ جو فیصلہ یہ کر دے۔ اس سے کوئی رکن اختلاف نہیں کر سکتا۔ اختلاف کرے تو جماعت اسے باہر کا راستہ دکھا دیتی ہے۔

قیادت و امارت

یہی صورت ہمارے ہاں قیادت و امارت کی ہے۔ ۱۹۴۱ء سے لے کر اب تک ہمارے ہاں کوئی ایک فرد بھی جماعتی تربیت سے ایسا تیار نہیں ہوا جو آپ کے بعد (اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے) جماعت کی قیادت کر سکتا ہو یا جو جماعت کے اندر اور باہر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہو، جس جماعت کی جمہوری اور عددی صورت حال یہ ہو جس کی قیادت اول سے آخر تک تنخواہ دار ہو جس میں اظہار رائے پر قدغن ہو جس میں مٹھی بھر لوگ ووٹ کا حق رکھتے ہوں جس میں آپ کی پیش کردہ علمی اور دینی آراء سے اختلاف کرنا جماعت کی مخالفت کرنے کے مترادف ہو اس میں ایسا آدمی کیسے داخل ہو سکتا ہے جو خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسا شخص تفصیلات معلوم کیے بغیر شامل ہو بھی جائے تو وہ یہاں پنپ نہیں سکے گا۔ آپ کی تو پوری عالم کی وسیع سیاسیات پر نظر ہے۔ آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ جس جماعت میں فقط وہی لوگ چل سکتے ہوں جو آمنا و صدقنا اور احسنت و مرحبا کی صدا بلند کرنے ہی کو سعادت سمجھیں وہ جماعت کبھی ایک زندہ قوم کی راہنمائی نہیں کر سکتی۔

خدمت خلق کے کام

۳۔ تیسری صورت یہ تھی کہ ہم سیاست اور اصلاح و تزکیہ دونوں اہم کاموں سے دست کش ہو کر رفاہ عام کا منصوبہ بنانے اور خدمت خلق کے لیے کام شروع کر دیتے مگر سالہا سال کے غور و فکر و مطالعہ و مشاہدہ سے نظر یہ آتا ہے کہ ہم اس میدان کے بھی مرد نہیں، ہم نے اپنے کارکنوں کو (الا ماشاء اللہ) جو ذہن دیا ہے وہ یہ ہے کہ خدمت خلق کا کام سیاسی نتائج حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ ہم نے ہمیشہ اپنے شفاخانوں اور خدمت خلق کے دوسرے کاموں کو جماعت کے افراد رسوخ اور سیاسی مواقع کے حصول کے پیمانے سے ناپا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی اور ہنگامی مقصد کے بغیر ہم خدمت خلق کا کوئی بھی منصوبہ زیر عمل نہیں لا سکتے۔

ہماری اخلاقی حالت

محترم امیر جماعت! یہ تینوں صورتیں ممکن تھیں مگر میں ان تینوں کا دروازہ جماعت کے لیے بند پاتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ جماعت کی اخلاقی حالت (میں اپنے کو مستثنیٰ قرار نہیں دوں گا) انتہائی حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس پہلو میں حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں تو میری مایوسی اور شدید ہو جاتی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کئی مرتبہ آپ کو توجہ دلائی ہے اور مجھے یاد ہے ہر بار آپ دل گرفتہ ہو کر سر تھام کر بیٹھ جاتے تھے اور اعتراف کر لیتے تھے کہ یہ سب کچھ آپ کو معلوم ہے مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ ۳۱ اکتوبر ۶۳ء کو اپنے منصب سے مستعفی ہوتے وقت میں نے تحریری طور پر عرض کیا تھا کہ

"میں عرصہ سے دیکھ رہا ہوں کہ احیائے دین کا کام کرنے کے لیے جو کم سے کم ضروری صفات ہم میں ہونی چاہئیں۔ ہماری عملی زندگی ان کی شہادت نہیں دیتی۔ جماعت کے دو بہت بڑے قابض بھائی ہماری رہنمائی کے لیے دائے ہمارے بعض رہنما ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے" الزامات عائد کرنے اور چغلی اور غیبت کرنے میں مشغول رہتے ہیں بعضوں کی بول چال تک آپس میں بند ہے۔ یہ ایک دوسرے پر جماعت کے اندر گروپ بندی تک کے الزامات لگاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گیلانی برادران" اور کراچی گروپ" وغیرہ کی اصطلاحیں آپ کے کانوں کے لیے بھی اجنبی نہیں ہوں گی۔ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا" ہاں میں ہاں ملانے والے" علم دین سے کورے اور عربی زبان سے بالکل نابلد افراد کو جماعت کی صف اول میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تقویٰ علم دین اور دوسرے خصائص ہماری نگاہ میں ثانوی بنتے جا رہے ہیں۔ اب "نائب امیر" کے منصب کے لیے بھی ہماری نگاہ یا تو چودھری غلام محمد صاحب جیسے رفیق پر جاتی ہے جو بیچارے علم دین تو بڑی بات ہے اردو کے چند فقرے بھی صحیح نہیں بول سکتے۔ میں چونکہ ایسے لوگوں کی سربراہی سے اختلاف کرنے کا قصوروار ہوں۔ ان خوابیوں کا ناقد ہوں۔ چودھری صاحب کی شائع کردہ ایک کتاب "فقہ السنہ" پر بے لاگ تبصرہ کر چکا ہوں اس لیے مجھے اس جرم کی سزا مرکزی شوریٰ کے ہر اجلاس پر بھگتنی پڑتی ہے۔ جگہ جگہ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ کیا جاتا ہے جس کی صفائی پیش کرتے کرتے اب قریب قریب عاجز آ چکا ہوں۔ یہ صورت حال (جو یقیناً آپ سے بھی مخفی نہیں) سخت

افسوسناک ہے۔ ہماری تنظیم میں یہ رجحانات ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور اس وقت تک میں [illegible] لوگ اگر ہمارے باہمی تعاون اور تعلقات کے مداح ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ دوسری جماعتوں کی طرح ہمارے اندرونی حالات خوش قسمتی سے اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔

اندریں حالات، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جماعت میں اپنے منصب اور ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں، جماعت کے جلسہ ہائے عام سے خطاب نہ کروں، ایک معمولی رکن کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا رہوں تاکہ جماعت میں جو لوگ اپنی بیش قیمت صلاحیتیں خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں، ان کے لیے تسکین دل کا سامان فراہم ہو سکے۔"

یہ ۳۱ اکتوبر ۶۳ء کی تحریر ہے۔ آج تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ان خرابیوں میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی تاہمی حد اور میں ترقی پر ہیں۔ لین دین کے معاملات میں کارکن تو ایک طرف رہے۔ ہمارے رہنما تک افسوسناک کردار رکھتے ہیں، امانتیں ضائع ہو رہی ہیں، عشر اور زکوٰۃ کی رقوم خالص سیاسی اور انتخابی مہمات اور ہمدرد کارکنوں کی تنخواہوں پر صرف کی جا رہی ہیں۔ رائج الوقت سیاسی بحثیں اتنی مرغوب ہو چکی ہیں کہ ہماری مجالس میں خدا اور رسول کا تذکرہ بھی برائے بیت رہ گیا ہے۔ عبادات میں ہم سخت قسم کے تساہل کا شکار ہیں اور شاید یہ بھی ہمارے لٹریچر کا غیر شعوری اثر ہے جس میں عبادات کو مقصود کے لیے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

میں مایوسی کا شکار ہوں

حضرت مولانا! میرا خط طویل ہو گیا۔ اس میں بعض تکلیف دہ باتیں بھی یقیناً ہوں گی اور آپ ہمیشہ مجھ پر جو شفقت فرماتے رہے ہیں اس کے پیش نظر اتنی جرأت کبھی مجھے جسارت نظر آتی ہے لیکن خدا گواہ ہے میں نے یہ سب کچھ معاندانہ جذبہ سے نہیں ایک حقیقی بہی خواہ اور ہمدرد کے جذبہ سے سپرد قلم کیا ہے جماعت سے میرا پندرہ سولہ سالہ تعلق مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کے دوسرے مشیروں کی طرح محض "سب اچھا" کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش نہ کروں بلکہ پوست کندہ حقائق پر آپ کو غور و فکر کرنے کی دعوت دوں۔ اب کیا ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ہمیں کھلم کھلا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم اپنی اسکیموں میں ناکام ہو گئے ہیں، لہٰذا جماعت کے کارکن اور ارکان آزاد ہیں۔ وہ جو راستہ چاہیں اختیار کر لیں۔ کبھی خیال آتا ہے ہمیں ایک بہادر انسان کی طرح مان لینا چاہیے

کہ ہمارا فکر اور عمل دونوں غلط تھے، اب ہم ارکان جماعت کا ایک کل پاکستان اجتماع بلا کر اپنے لیے از سر نو لائحہ عمل ترتیب دیں گے ..... کوثر نیازی ۔ لاہور ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء

مولانا مودودی کا جواب

"محترمی جناب کوثر صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا مفصل خط مجھے ملا۔ اس کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ آپ کو اب بہت پہلے جماعت سے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ نے غلطی کی کہ اتنی طویل مدت سے یہ احساسات رکھنے کے باوجود آپ جماعت کے ساتھ چلتے رہے، بہرحال اب مناسب یہی ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں اس کے بعد آپ کا جو طرز عمل رہے گا اس کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی جا سکے گی کہ آپ نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ للہ واللہ اور حقیقی بہی خواہی و ہمدردی کے جذبے سے لکھا ہے یا نہیں۔ اگر خدانخواستہ اس کے محرکات کچھ دوسرے بھی ہوئے تو آپ اطمینان رکھیں کہ اس سے پہلے جن حضرات نے بڑی مدارات کی کے ساتھ مجھ پر کرم فرمائیاں کی ہیں ان کی باتوں پر جس طرح میں نے صبر کیا، آپ کی عنایات پر بھی کروں گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

---

۱۰ اسلام کیا ہے؟ (انگریزی)

ہندی کے بعد خدا کے فضل سے "اسلام کیا ہے" انگریزی میں بھی تیار ہو گئی ہے

ترجمہ از ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

قیمت (علاوہ محصول ڈاک) = /۵

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

سنہ آغاز
۱۹۳۳
۶

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

معارف الحدیث

جس کا مدت سے انتظار تھا

جلد سوم

خدا کے فضل سے شائع ہو رہی ہے

معارف الحدیث

اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ

حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ

جو

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ترتیب پا رہا ہے

اس کی تشریحات کی **ایک خصوصیت** یہ ہے کہ دورِ حاضر کی ذہنی اور فکری کیفیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف کی خاص کوشش پوری کتاب میں یہی رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابہ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے کسی درجہ میں اس کے قارئین کے دلوں پر بھی وہی اثرات مرتب ہوں۔

سائز ۲۰×۲۶ دیدہ زیب کتابت، معیاری طباعت، نفیس کلیر کاغذ

جلد اوّل — ایمان اور آخرت کے بیان سے متعلق حدیثیں — صفحات ۲۸۰ — قیمت مجلد 5/- غیر مجلد 4/-

جلد دوم — تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں — صفحات ۲۴۰ — قیمت مجلد 5/50 غیر مجلد 4/50

جلد سوم — طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں — صفحات ۲۰۰ — قیمت مجلد 8/- غیر مجلد 7/-

ملنے کا پتہ

کتب خانۂ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

محصول ڈاک بذمہ خریدار

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ
(فی کاپی ۸۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
.....شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد (۳۲) | بابتہ ماہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ مطابق اپریل ۱۹۶۵ء | شمارہ (۱۱)

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ کے والد حضرت شاہ ولی اللہ محمود دھلویؒ اور انکے خاندان	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۶
	.. ..	.. ..	...
۳	سیدنا ابو سفیانؓ	مولانا سراج الحق مچھلی شہری	۱۹
۴	دربار عالمگیری	مولانا مصطفےٰ حسن علوی	۳۲
۵	لبرل اسلام	جناب وحید الدین خاں صاحب	۴۳
۶	مولانا سندھی کے ساتھی ظفر حسن کی آپ بیتی	ادارہ الرحیم حیدر آباد	۵۷

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹر بلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اگر اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور رضانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پرو پرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

نگاہ اوّلیں

عتیق الرحمن سنبھلی

دین کے احیاء کی وہ تحریک جسے تبلیغی کام سے موسوم کیا جاتا ہے جو شخص بھی اسکی جسقدر افادیت کا قائل ہو اسی قدر رنج والم کے ساتھ اُس نے یہ خبر سُنی ہوگی کہ اس کام کے سربراہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اچانک وفات پائی۔ اور احیاء دین کی اس جدوجہد کی وہ نمایاں شخصیت جس کے جذبہ وعمل کے مشاہدے اور جس کے انفاس گرم کی تاثیر سے کتنوں ہی کو ہمہ سوز وہمہ عمل ہو جانے کی توفیق ملی وہ آج راہِ خدا کے ان دیوانوں کے درمیان موجود نہیں ہے۔

بے شک بقاء دوام اللہ ہی کے لیے ہے اور اسکی اس دنیا میں کسی کو موت سے رستگاری نہیں لیکن یہ بھی حق ہے کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام!

مولانا نے جس راہ پر دیوانہ وار چلتے ہوئے جان دی ہے یہ اسی عشق کی راہ ہے جس میں مر کر بھی آدمی مرتا نہیں۔ اسکی صرف یاد زندہ نہیں رہتی بلکہ اس یاد کے اثرات سے دلوں کو زندگی ملتی ہے اور یہی حیات دوام ہے جو صرف عشاق کے نصیب میں آتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں دین سے معمولی تعلق رکھنے والا بھی کوئی مسلمان ہوگا جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام نامی سے آشنا نہ ہو۔ آپ کے عظیم المرتبت والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ۴۰ برس پہلے دین کی عمومی دعوت اور اُس کے احیاء کی جو عظیم مگر سادہ جدوجہد اپنی مؤمنانہ بصیرت اور ایک والہانہ سوز وتڑپ کے اثر سے شروع کی تھی، مولانا کے انتقال پر (یعنی اب سے ۲۰ برس قبل) اس کی گراں بار ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر آئیں جبکہ آپ کا سن ۲۰ برس کے اندر تھا۔ مگر آپ کی خداداد صلاحیتوں نے اس بیس برس کے اندر اس دینی تحریک کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ پہلے جس کام کا دائرۂ عمل غیر منقسم ہندوستان کے اندر محدود تھا اب اسکی پٹریاں روئے زمین کے ہر ہر خطہ میں جا پہونچیں اور خود ہندوستان وپاکستان کے اندر وہ مناظر اس کام کی وسعت ومقبولیت کے

آج کے دن نظر آتے ہیں۔ جو کل صرف آرزوؤں اور تمناؤں کا درجہ رکھتے تھے ـــــ غرض وہ پودا جو تھوڑی سی ہی نشو ونما حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی زندگی میں پا سکا تھا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مجاہدانہ کوششوں اور دینی صلاحیتوں سے ایک قدآور درخت کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے ـــــ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔

افسوس اس ہستی کا چراغ حیات ۲ر اپریل (۲۹ ذی قعدہ) یوم جمعہ کی سہ پہر کو لاہور کی سرزمین پر آناً فاناً گل ہوگیا۔ ایک ہستی کا چراغ نہیں بجھا دین کا ایک روشن چراغ بجھ گیا۔ روشنی کا ایک بلند مینار گر گیا۔ دین کے لیے سوز و تڑپ کی ایک تصویر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی، جسے دیکھ دیکھ کر ہر دن اور ہر رات نہ معلوم کتنے دلوں میں اسی تڑپ کی بجلیاں کوندنے لگتی تھیں ـــــ خدا اپنی رحمت بے پایاں کی بارشیں ان کی روح پر فرمائے اور اس عظیم خلا کو اپنی قدرت خاص سے پُر فرمائے جو انکی اچانک وفات سے پیدا ہوگیا ہے ـــــ

مولانا کا لاہور میں قیام اسی دینی دعوت کے سلسلے میں تھا جس کے لیے ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف تھا۔ شوال کے پہلے (اور فروری کے دوسرے) ہفتے میں آپ اپنے رفقاء کے ساتھ پاکستانی احباب کی دعوت پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک لمبے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ لاہور اس سفر کی آخری منزل تھی اور ۲ر اپریل ۲۹ ذی قعدہ ہی کی تاریخ دہلی واپس ہونے کے لیے مقرر تھی۔

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

ـــــ واپسی ٹھیک اسی تاریخ کو ہوئی مگر کس طرح کہ وہ لاہور ہی میں جمعہ و عصر کے مابین ابدی نیند سو چکے تھے اور اسی نیند کے عالم میں شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز انھیں دہلی کے ہوائی اڈہ پر لے کر اترا اور وہ تبلیغی مرکز و مسجد جہاں دوسرے دن صبح کو ان کے ارشادات سننے اور ان کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیے دور دور سے سمٹ کر مشتاقوں کا مجمع ہوتا تھا اُن کے اشکبار سوگواروں سے بھری ہوئی تھی۔ اور مسجد کیا بھری ہوئی تھی دہلی بھری ہوئی تھی۔

افسوس کیسی بجلی ملت کے مشکبار ایوان پر گری اور کیسی نعمت چشم زدن میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ ابھی مولانا کی عمر پچاس سال کی بھی نہ تھی۔ قویٰ مضبوط اور جسم تنومند تھا۔ مگر یہی واقعہ ہے کہ وہ دل سے جتنا کام لیتے تھے اور اعصاب پر جتنی شدید محنت کا بوجھ انھوں نے ڈال رکھا تھا اس میں ظاہری قوت و صحت کے باوجود دل کا جواب دے جانا کوئی بہت حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ دن و رات میں کئی کئی بار طویل طویل خطابات، پھر ان خطابات میں ایک جذبہ و حال۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کام کی فکر و نگہداشت، آرام سے بے نیازی، صحت و مرض کی

تفریق سے لاپروائی، ہر لمحہ محویت کا عالم، یہ ایسی چیزیں نہیں جنھیں قلب اعصاب بڑی مدت تک برداشت کر سکیں۔ بے شک یہ بڑا ہی عظیم خسارہ ہے کہ دین کے احیاء کی جدوجہد کے لحاظ سے ایک نادرۂ روزگار ہستی یوں آن کی آن میں دنیا سے اٹھ گئی۔ مگر انھوں نے ایک نمونہ دیا ہے کہ آدمی کمر باندھے تو دین کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ایسے زندۂ جاوید نمونے جب اٹھتے ہیں تو اپنے پیچھے میدان خالی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ان کی موت سے زندگی کے چشمے اُبلتے ہیں، وہ ایک روح ایک کی جگہ کتنوں ہی میں سرایت کرتی ہے۔ اور جو جذبہ ایک ذات میں محدود تھا وہ موت کے بعد کتنوں ہی کی میراث بن جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس حادثہ کا صرف صدمہ ہی ملت کے حصے میں نہیں آئے گا بلکہ اس کا یہ صلہ بھی خدا کی رحمت سے بھرپور عطا ہوگا۔

کچھ تفصیلات

ان سطروں کی تحریر کے بعد مولانا کے سانحۂ ارتحال کی کچھ تفصیلات علم میں آئی ہیں جن کا اضافہ مناسب ہوگا۔

معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی طبیعت کچھ پہلے سے مضمحل چل رہی تھی۔ چہارشنبہ ۲۱ مارچ کے ایک پروگرام میں مولانا کی تقریر کے اندر نمایاں طور پر کچھ رکاوٹ اور نقاہت محسوس کی گئی اور اس کے بعد مولانا کے تمام پروگرام منسوخ کرنا طے کر دیا گیا۔ جمعرات یکم اپریل کو (غالباً بعد نماز مغرب) ایک عقد نکاح میں مولانا کو تقریر فرمانا تھی۔ یہ ذمہ داری بھی وقت پر مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کے سپرد کر دی گئی اور وہ اس غرض کے لیے تشریف لے گئے۔ لیکن بعض حضرات یہ دیکھ کر کہ بڑا ہی منتخب مجمع آیا ہوا ہے مولانا کی خدمت میں واپس آئے اور بالآخر مشورے سے مولانا ہی کو زحمت دیدی گئی مولانا نے تقریر فرمائی جس میں وہی نقاہت و رکاوٹ تھی۔ حد یہ ہے کہ اپنی عادت کے حیرت انگیز حد تک خلاف صرف ایک منٹ کی دعا فرمائی اور اس طرح تقریب کی تکمیل کر کے فوراً واپس ہو پڑے۔ قیام گاہ چونکہ بالکل ہی متصل تھی اس لیے سواری کا سوال نہ تھا۔ مگر قیام گاہ پہنچنے کے راستے ہی میں بیہوشی طاری ہو گئی۔ پسینے سے تربتر تھے۔ ہاتھوں ہاتھ قیام گاہ پر لائے گئے۔ حکیم ڈاکٹر کی دوڑ ہوئی۔ گھنٹوں کے بعد ہوش آیا۔ عشا کی نماز ساڑھے تین بجے اشاروں سے پڑھی۔ نماز فجر بھی اشاروں ہی سے ادا ہوئی۔ رفیقوں سے معافی مانگی۔ ہر دم کے رفیق اور عزیز قریب مولانا انعام الحسن صاحب کو اپنی کتابوں کی زکوٰۃ نکال دینے کی وصیت کی۔ ڈاکٹروں نے صبح کے معائنہ کے بعد کہا کہ اب خطرے سے باہر ہیں مگر شدید احتیاط کی جائے، دوسرا دورہ ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ دہلی کو واپسی جو اسی جمعہ کے دن طے تھی اس کا تو اب سوال ہی کیا رہا تھا مگر قضا و قدر کے نوشتوں میں واپسی کی یہ تاریخ اٹل ہو چکی تھی۔ ٹھیک جس وقت جمعہ کا خطبہ شروع ہو رہا تھا حالت متغیر ہو گئی۔ قیام گاہ چونکہ بالکل متصل ہی تھی امام نے ہل چل محسوس کر لی۔ ماشاء اللہ فقیہ تھے اور رفیق بھی۔ بحد اختصار سے خطبہ اور نماز پوری کی۔ ڈاکٹر

بلائے گئے۔ سانس اکھڑی ہوئی تھی مگر ہوش و حواس قائم تھے۔ مولانا انعام صاحب سے سانس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی سمجھ تو چکے تھے مگر کہا شاید بلغم پھنس رہی ہے۔ فرمایا نہیں سانس پھنس رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر آگئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اب آکسیجن کی منزل ہے، فوراً اسپتال کا مشورہ دیا۔ مولانا نے اسپتال کی بات سنی تو فرمایا وہاں نرسیں ہوتی ہیں میں نہ جاؤں گا۔ پاکستان کے بااثر اشخاص نیازمندوں میں تھے عرض کیا حضرت ایک نرس بھی پاس نہ آپائے گی آپ اطمینان فرمائیں۔ فرمایا پھر کوئی مضائقہ نہیں، ازراہ عجلت ایک بڑی کار میں جو وہاں بہت سی موجود تھیں مولانا کو لٹایا گیا۔ لا الٰہ الا اللہ کا ورد مولانا کی زبان پر تھا۔ مولانا انعام الحسن صاحب اسی کار میں ساتھ تھے۔ باقی دوست آگے پیچھے دوسری کاروں میں۔ کچھ لوگ پہلے انتظامات کے لیے اسپتال پہونچ چکے تھے۔ راستے میں بس ایک بار دریافت فرمایا کتنی دور اور ہے۔ کہا بس پہونچ رہے ہیں۔ لیکن ابھی مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ کا فاصلہ اور رہا تھا کہ اس بےچین روح کو رحمت حق نے بڑھ کر اپنی آغوش میں لے لیا اور ادھر کار بھی ایک جھپاکے میں اسپتال کے اندر تھی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم دروازہ پر موجود۔ جھٹ پٹ کار کا دروازہ کھلا۔ بتایا گیا کہ ہونی ہو چکی۔ مگر ڈاکٹروں نے اپنا آخری فرض ایک انجکشن دے کر ادا کیا کیونکہ جسم میں گرمی باقی تھی۔

یہ ہے اس داعیِ آخرت کے سفرِ آخرت کی مختصر روداد۔ ۳۰ ذی قعدہ مطابق ۱۷ اپریل یوم شنبہ کو ۹½ بجے صبح اپنے والدِ ماجد کے پہلو میں اسی مسجد کے احاطہ میں تدفین ہوئی جو آپ کا تبلیغی مستقر تھا۔

رہے نام اللہ کا

افسوس ہے کہ اس حادثہ کے وقت والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانی اور مخدومی مولانا علی میاں مدظلہما دونوں ہی ایک ساتھ ہندوستان سے باہر ہیں۔ جبکہ مولانا مرحوم پر لکھنے کا حق انھیں کا تھا۔ کوشش ہے کہ یہ کمی آئندہ اشاعت میں پوری ہو جائے۔ اور ممکن ہو تو آئندہ کی پوری اشاعت ہی مولانا مرحوم سے متعلق ہو۔ اس سلسلے میں مولانا اور اُن کی دعوت سے واقفیت رکھنے والے اہلِ قلم سے بالعموم گزارش ہے کہ مضامین ارسال فرمائیں۔

ذی قعدہ اور ذی الحجہ دونوں مہینوں کا مشترک شمارہ ہے۔

یہ شمارہ:۔ بعض نئے کاتبوں کی وجہ سے بیشتر مضامین کی کتابت زیادہ باریک ہو گئی اس بنا پر صفحات میں کچھ ناگزیر ہوئی۔ (ادارہ)

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور اُن کے خاندان سے

جملہ سلسلات کی روشنی میں

محمد یٰسین ـــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اب سے پانچ سال پیشتر عالی جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مرحوم و مغفور کے زمانۂ حیات میں ان کی اجازت اور مولانا سید ابوالحسن ندوی زید مجدہم کی وساطت سے مجھے ان کے خاندانی نوادر اور مخطوطات دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اب اسی رمضان میں لکھنؤ گیا تو مولانا محمد میاں سلمہم اللہ صاحبزادۂ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مرحوم نے ازراہ کرم فرمائی دوبارہ ان نوادر کے مطالعے کا موقع دیا جن کی مدد سے میں اپنے اس مقالے کو مرتب کر رہا ہوں ـــــ اسی ماہ رمضان میں دوسری مرتبہ حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کے ہمراہ رائے بریلی حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہاں دائرۂ حضرت شاہ علم اللہ حسنی قدس سرہٗ اور اس کے آثار باقیہ نے دونوں مرتبہ میری روح کو پیام سکون اور میرے دل و دماغ کو دعوت کیف و نشاط دے کر تاریخ ماضی کا ایک ذرّیں باب میری تصور کی آنکھوں کے سامنے کھول دیا ـــــ حضرت شاہ علم اللہؒ کی تاریخی مسجد ہے جہاں ہزاروں اہل اللہ سربسجود ہوئے ہیں اور علم و ذکر کے حلقے مدتوں اس میں قائم رہے ہیں ـــــ تقویٰ اور عبادت الٰہی کی بنیادوں پر یہ مسجد کھڑی کی گئی ہے ـــــ آج بھی

اس کے در و دیوار سے دل کی آنکھوں کو خاص کیفیات محسوس ہوتے ہیں ۔ اس کی طرز تعمیر کو دیکھ کر آثار متبرکہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ حضرت شاہ علم اللہؒ نے گریۂ شب اور آہ سحر میں مشغول رہ کر اتباع سنت اور متابعت شریعت کے جذبے کے ساتھ اسی مسجد میں اپنے فیوض و برکات کو تقسیم کیا ہے۔ اُن کی باکمال اولاد اور اولاد کی اولاد نے جن میں ہر ایک آفتاب و ماہتاب اور گوہر شب چراغ تھا اس مسجد کے محراب و منبر اور سقف و بام کو اپنے اپنے زمانے میں روحانیت کی روشنی سے روشن اور منور رکھا ہے اور درس توحید و معرفت اور درس کتاب و سنت سے اس مسجد کی فضاؤں کو معمور کیا ہے انھیں تعلیمی و تذکیری حلقوں کی تاثیر سے حضرت سید احمد شہیدؒ جیسا مرد مجاہد اور غازی علم اللّٰہی خاندان میں نمودار ہوا جس نے اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر ملت اسلامیہ کی سرسبزی و شادابی کے لیے، اُمت مسلمہ کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے ایک نقشہ بنایا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بالاکوٹ کے میدان میں مع اپنے رفقاء کے شہید ہو کر حیات ابدی سے ہمکنار ہوا۔ اور مستقبل کے لیے ایک ایسی فضا قائم کر دی کہ نعرۂ حق و صداقت گوشے گوشے میں بلند ہوتا رہے اور ایمان و یقین کے جھنڈے اونچے رہیں۔

——— یہ ندی ہے، مسجد کے جنوب میں بہ رہی ہے۔ ندیاں تو اور بھی بہت سی ہیں مگر اس میں رونق ہی کچھ اور ہے ۔ سکوت شام کے وقت اس کا سکوت گوش دل کو ایک مستقل داستان سناتا ہے، صبح کے سہانے وقت میں اس کی دل آویزی اور بڑھ جاتی ہے۔ کتنے اولیاء اللہؒ نے اپنے مبارک قدوم سے اس کے کناروں کو سرفرازی بخشی ہوگی، کتنے مجاہدین اور ذاکرین نے اس ندی سے وضو کیا ہوگا؟ شام و سحر میں جب چڑیاں ندی کے کنارے، مسجد کے بام و در پر اور قریب کے ہرے بھرے کھیتوں پر چہچہاتی ہیں تو ایک خاص کیف حاصل ہوتا ہے اور قلب و دماغ میں یاد ماضی کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔

یہ حضرت شاہ علم اللہؒ آغوش لحد میں سو رہے ہیں۔ یہ سادات تنطبیہ کے چشم و چراغ ہیں۔ حضرت شاہ آدم بنوریؒ قدس سرہ کے خلیفہ یعنی صرف ایک واسطے سے حضرت مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہ کے فیض یافتہ ہیں ۔ ان کا تقویٰ اور جذبۂ اتباع سنت اللہ اکبر۔ تاریخیں اور تذکرے ان کے ذکر خیر سے لبریز ہیں۔ ان کی باکمال اولاد کی قبریں ان کے

پہلو میں اور آس پاس ہیں۔ یہیں ہندوستان کا ایک مایۂ ناز عظیم مورخ (جس کو مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنیؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) محوِ آرام ہے، یہیں حکیم صاحبؒ کے والد ماجد حضرت مولانا سید فخرالدین حسنیؒ مدفون ہیں جنھوں نے مہر جہانتاب لکھ کر اپنے محقق صاحبزادے کے لیے تاریخ و تذکرہ کی شاہراہ قائم کی۔ یہیں حکیم صاحب کے لختِ جگر ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ بھی دفن ہیں جنھوں نے اپنے والد ماجد کے جواہر پاروں اور شاہکاروں کو محفوظ رکھا، شائع کرایا اور اپنے خاندان کی ایک ایک روایت کو اپنے سینے اور سفینے میں ثبت کیا، جن کے دینی کارناموں میں ایک زبردست کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنے برادر عزیز (مولانا علی میاں مدظلہ) کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایک خاص نصب العین کے ماتحت کیا جس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان کے تعلیمی و روحانی حلقوں اور عالم اسلامی سے ایک مفید رابطہ قائم ہوا بلکہ یورپ کے مادہ پرستانہ ایوانوں میں بھی غلغلۂ توحید اور نعرۂ صداقت بلند ہو گیا ـــــ آج اس خاندان کی روایات کہن انھیں مولانا علی میاں مدظلہ سے زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے خاندان کو صحت و عافیت سے رکھے اور ملتِ بیضا کو تادیر اُن سے مستفیض رکھے (آمین)

احاطۂ مزار حضرت شاہ علم اللہؒ سے کچھ فاصلے پر ایک عظیم شخصیت سپردِ زمین ہوئی یہ حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا ہیں۔ ان کے مزار پر ولی اللہی فیوض و برکات مجھ جیسے دور از کار کو بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اس باعظمت شخصیت نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے کسقدر فیض حاصل کیا تھا اور اُن کے خاندان سے کسقدر ربط و تعلق تھا اس کو تفصیل سے لکھوں تو مستقل ایک رسالہ ہو جائے مگر مجھے تو ایک مقالہ لکھنا ہے۔ آنے والا مورخ توفیق پائے گا تو ان کے مزید حالات خاندانی مخطوطات اور دستاویزوں سے لکھے گا۔ میں اس مقالے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت شاہ اہل اللہ بہلتیؒ، حضرت شاہ محمد عاشق بہلتیؒ، حضرت شاہ نور اللہ بڈھانویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے مکتوبات بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی کہیں کل کہیں اقتباس اور تلخیص کی شکل میں مع ترجمہ پیش کر رہا ہوں جن سے تاریخ کے طالب خصوصاً ولی اللہی سلسلے کی معلومات کے خواہاں کے لیے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو کسی تاریخ اور تذکرے میں نہیں ہیں۔

خود حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے مکتوبات اور روایات جو انھوں نے اپنے پیر و مرشد اور دیگر حضرات اکابر کو لکھ کر بھیجے ہیں ـــــ اس مقالے میں شامل کروں تو میرا مقالہ شکوہ کوتاہیٔ داماں کرنے لگے ـــــ اس لیے حضرت رائے بریلویؒ کی بعض تحریرات بقدر ضرورت کہیں کہیں بطور تلخیص پیش کروں گا۔ بعض اکابر نے حضرت رائے بریلویؒ کے صاحبزادے میاں سید ابواللیثؒ کو بھی (جو ان مکتوبات اکابر کے جامع ہیں) گرامی نامہ بھیجا ہے اس کو بھی حسب موقع شامل مقالہ کیا جائے گا۔ آخر میں میر محمد نعمان رائے بریلویؒ (حضرت میر ابوسعیدؒ کے برادر عم زاد) کا ایک مفصل مکتوب بھی اس مقالے میں ترجمہ کے ساتھ شامل کیا جائے گا جس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی وفات کے مکمل حالات ہیں۔ اور جس سے آخری وقت میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے اپنے عزیز و محبوب مرید کو یاد کرنے کا پتہ چلتا ہے یہ بھی تاریخ کی ایک نادر چیز ہے۔

اب میں حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے مختصر حالات لکھتا ہوں۔

حضرت شاہ ابوسعید رائے بریلوی کے مختصر حالات

میر شاہ ابوسعید بن سید محمد رضیا جن سید آیت اللہ ابن شیخ الاعظم میر شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی رحمہم اللہ ـــــ

آپ رائے بریلی میں پیدا ہوئے، مولانا عبداللہ[1] امیٹھوی سے تحصیل علم کی، بعدہٗ اپنے چچا سید محمد صابر ابن سید آیت اللہ نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے (جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے صاحبزادے خواجہ محمد صدیقؒ کے خلیفہ تھے) ایک مدت ان کے بتائے ہوئے اشغال میں مشغول رہے۔ اپنے والد کے خلیفہ میر محمد یونسؒ سے بھی اپنے آبائے کرام کی روحانی نسبت حاصل کی، پھر دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے روحانی تعلق پیدا کر کے اُن سے اخذ فیض کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد ان کے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ کی طرف رجوع ہوئے اور ان سے باقی سلوک طے کیا۔ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ نے انکو خلافت نامہ لکھا جسمیں تحریر ہے کہ "حضرت شاہ صاحبؒ کے فیض توجہ سے انکو وہ احوال آشکارا ظاہر ہو چکے تھے جو صوفیا کے نزدیک

---

[1] مولانا عبداللہ حنفی امیٹھوی علامہ نظام الدین فرنگی محلیؒ کے شاگرد رشید تھے۔

انتہائی درجے کے ہیں۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ کا وصال ہوگیا تو انھوں نے قصد کیا کہ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، وغیرہا طرق کے مابقی اشغال فقیر سے حاصل کریں۔ جب میں نے ان کو اس کا شائق پایا تو ان کے مقصد کو پورا کیا اور اس راہ میں اُن کے کمال کا مشاہدہ کرکے اجازت دی جس طرح مجھے میرے شیخ معظم (حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ) نیز میرے والد ماجد شیخ عبید اللہ بیلیؒ نے مجھے اجازت دی تھی ـــــ میں نے ان کو اس کی بھی اجازت دی کہ بعد مطالعہ و مراجعت شروح، تفسیر و حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کا درس بھی دیں" ـــــ علاوہ کمال علم ظاہر و باطن حضرت میر ابو سعیدؒ جلیل الوقار، کریم النفس اور مہمان نواز بزرگ تھے۔ ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ کو مکہ معظمہ پہونچے اور حج سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ حاضر ہوئے وہاں چھ ماہ اقامت کی اور شیخ ابوالحسن سندھی الصغیرؒ کے حلقۂ درس میں مصابیح کی سماعت کی، ایک مرتبہ مواجہہ شریف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا، آپ کے خلیفہ شیخ امین الدین کاکوروی نے اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ خود حضرت شاہ ابو سعیدؒ فرماتے تھے کہ میں نے مدینہ منورہ میں اپنی ان ظاہری آنکھوں سے آقائے نامدار حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ ـــ بعدہٗ مکہ معظمہ واپس ہوئے اور وہاں جزریہ قاری میر داد انصاری سے پڑھی۔ تجدید کے بھی اُستاد معرفت و سلوک میں آپ کے خلیفہ ہوئے ۱۱۸۸ھ میں ہندوستان آئے اور مدراس میں داخل ہوئے وہاں ایک زمانے تک مقبول خواص و عوام ہوکر رہے۔ اس علاقے کے غربا و درویشانے آپ سے آخرت کا نفع حاصل کیا۔ ۹ رمضان ۱۱۹۲ھ کو وفات پائی۔ رائے بریلی تکیۂ حضرت شاہ علم اللہؒ میں دفن ہوئے۔ آپ کے جلیل ممتاز اور جلیل القدر خلفا تھے۔

(۱) میر عبد السلام بدخشانیؒ (۲) قاری شیخ میر داد انصاری مکیؒ (۳) مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطبؒ (۴) مولانا عبد اللہ آفندیؒ (۵) شیخ عبد اللطیف حسینی مصریؒ (۶) حاجی امین الدین کاکوروی (۷) شاہ عبد القادر خالص پوریؒ۔

(ماخوذ از نزہتہ الخواطر جلد (۷) و سیرت سید احمد شہید رسالہ اول طبع چہارم و مجموعۂ نوادر قلمی نزد مولانا محمد میاں صاحب جنرل مدیر المبعث لکھنؤ)

مکتوبات[1] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بنام حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ

(۱) حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر سید ابوسعید سلمہم اللہ تعالیٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد از سلام محبت التزام مطالعہ نمایند ـــــ الحمد للہ رب العلمین علی عافیۃ الطرفین نامہ مشکیں شمامہ متضمن بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفہ خفیہ و اخفیٰ رسید در برابر آں شکر الٰہی بجا آوردہ شد، ایں راہ کہ میروند ہمہ طریق مستقیم است کہ اکابر اہل عرفان رفتہ اند ہیچ دغدغہ خاطر ایشاں را مشوش نسازد..... بالجملہ آنچہ خدائے تعالیٰ عطا کردہ است نعمتے است عظیمہ بر آں از جان و دل شکر کنندہ و متوقع مزید باشند و آنچہ از نور محمدی علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات دیدہ اند نمائش است از نسبت اویسیہ، سابق آمدہ ایں نسبت داشتند الحمد للہ کہ حاصل شد ـــ برائے خفقان خواندن یا حمید مفید خواہد بود۔ متفرق در اوقات صلوٰۃ خمس و خواہ یک ہزار بار ـــ در باب وجہ معاش و آسودگی ایشاں.... متفکر نباشند ہر چہ میکنند و ہمہ حکمت حق است و نافع است بنسبت شما۔ ہر چند نافعیت معلوم نباشد من بعد روشن خواہد شد والسلام۔ فقیر زادہا و والدہ ایشاں سلام می رسانند و متوقع دعائے خیر ہستند کہ دعائے مومن برائے برادر غائب مستجاب است ـــ

ترجمہ ـــ حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ ..... میر سید ابوسعید سلمہم اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ فرمائیں ـــ طرفین کی خیر و

---

[1] مجموعہ نوادر میں حضرت شاہ صاحبؒ کے گیارہ مکتوبات ہیں۔ میں نے اس مقالے میں دس مکتوبات کل یا بعض کے طور پر لیے ہیں ـــ ان مکتوبات کو مولانا سید ابوالقاسم بن سید محمد عبدالعزیز بنھنوی نے ۱۳۰۴ھ میں مکتوب المعارف کے نام سے مع عرضداشت شاہ ابوسعیدؒ مطبع مطلع الانوار سہارن پور میں شائع کرادیا تھا۔ یہ رسالہ اب کمیاب ہے۔ بقیہ دوسرے اکابر کے مکتوبات جو اگلی قسط میں آئیں گے غیر مطبوعہ ہیں۔

عافیت پر اللہ رب العلمین کی حمد ہے ۔ آپ کا نامۂ مشکیں شمامہ جو بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفۂ خفیہ و اخفیٰ کے بارے میں لکھا تھا ۔ پہونچا ۔ شکرِ الٰہی ادا کیا گیا ۔ یہ راستہ جس پر آپ چل رہے ہیں وہ صراط مستقیم ہے جس پر اکابر اہل عرفان گامزن ہوئے ہیں ۔ کسی قسم کا دغدغہ آپ کے دل میں نہیں ہونا چاہیے ..... حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ خداوند کریم نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ ایک عظیم نعمت ہے اس کے حصول پر جان و دل سے شکر کریں اور مزید نعمت کی توقع رکھیں ۔ اور نورِ محمدی صلی اللہ علیٰ صاحبہ وسلم جو دیکھا ہے وہ بھی نسبت اویسیہ کا ظہور ہے ۔ پہلے سے اس نسبت کی آرزو رکھتے تھے الحمد للہ کہ اب حاصل ہو گئی ۔ دل کی گھبراہٹ کے دفع کرنے لیے یا حمید پڑھنا مفید ہوگا ۔ ایک ہزار مرتبہ ۔ خواہ متفرق پانچوں نمازوں کے اوقات میں خواہ ایک جگہ ۔ وجہ معاش اور آسودگی کے بارے میں متفکر نہ ہوں جو صورت گزر رہی ہے وہ عین حکمتِ الٰہی ہے اور آپ کے حق میں نافع ہے ۔ اگرچہ بالفعل اس کی نافعیت معلوم نہ ہو بالآخر اس کا نافع ہونا واضح ہو جائے گا والسّلام ۔ فقیر کے لڑکے اور اُن کی والدہ سلام کہتے ہیں اور دعائے خیر کے متوقع ہیں اس لیے کہ برادر غائب کے حق میں دعائے مومن مستجاب ہوتی ہے ۔

(۲) سیادت و نقابت پناہ حقائق و معارف آگاہ سالانہ الاکابر میر سید ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ ، بعد سلام محبت التیام مطالعہ نمائند ۔ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من فضلہ ان یدیم العافیۃ لنا ولکم ۔ بعد انتظار بسیار رقیمۂ کریمہ متضمن بعض معارف و بعض اسولۂ ضروریہ رسید چوں مشعر بعافیت و سلامت ایشاں بود مع اولاد و اتباع موجب کمال سرور و باعث حمد الٰہی شد ..... والسلام از اندرون خانہ سلام خوانند ہمیشہ خیریت ایشاں مسئول از جناب رب العزت می باشد انچہ از ایذائے برادران نوشتہ بودند معلوم شد خود سعی در ایذائے کسے نکنند خدائے تعالیٰ نصرت فرماید میر محمد معین و میر محمد امام و میاں یونس سلام خوانند برخوردار سعادت اطوار میر ابو اللیث دعوات خوانند فرزند ابو القاسم مبارکباد خدائے تعالیٰ بعافیت دارد ۔ از عبد العزیز سلام نیاز قبول باد ۔

ترجمہ ـــ سیادت پناہ حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہٗ کی طرف سے بعد سلام محبت الیام مطالعہ کریں ـــ خیر و عافیت پہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے فضل سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ وہ مدام ہماری اور آپ کی عافیت کو برقرار رکھے ـ بڑے انتظار کے بعد آپ کا مکتوب جو کہ بعض معارف اور بعض معاملات ضروریہ پر مشتمل تھا ـــ پہونچا ـ چونکہ وہ مکتوب آپ کی اور آپ کی اولاد و متعلقین کی عافیت و سلامتی سے آگاہی دینے والا تھا اس لیے موجب کمال مسرت اور باعث حمد الٰہی ہوا ..... والسلام اندرون خانہ سے (الہیہ کی طرف سے) سلام ـــ آپ کی خیریت ہمیشہ جناب رب العزت سے چاہی جاتی ہے ـ جو کچھ بھائیوں کی ایذا دہی کے متعلق لکھا تھا معلوم ہو گیا خود کسی کو ایذا دینے کی سعی نہ کریں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا ـــ میر محمد مومن، میر محمد امام اور میاں محمد یونس کو سلام ـ برخوردار سعادت اطوار میر ابو للیث کو دعائیں فرزند ابو القاسم مبارک ہو ـــ اللہ تعالیٰ عافیت سے رکھے ـــ عبد العزیز کا سلام نیاز قبول ہو ـــ

(۳) سیادت و نقابت مآب حقائق و معارف آگاہ سلالۃ الکرام میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ۔ بعد سلام مطالعہ نمائند ـــ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من اللہ عزوجل ان یدیم العافیۃ لنا ولکم ـــ اجمالاً ہمیشہ در حق ایشاں طلب کردہ می آید کہ خدائے عزوجل ہم در ظاہر نعمت خود دہد و بغیر خود محتاج نگذارد و ہم در باطن اعانت و انعام فرماید تا بر جادۂ آبائے کرام مستقر ماندہ بہمہ جہت مرضی باشند انہٗ قریب مجیب ـــ اگر نجیب الدولہ در باب آنعزیز القدر خط موثر نویسد و چوبدار ہمراہ کند می باید بآں طرف رفت متوکلاً علی اللہ و معتمداً علیہ ـــ و ایں رایکے از انواع تیسیر الٰہی دانند و اگر گرمی ہوا ہم رسد اینجا تشریف آوردہ رمضان اینجا گزرانیدہ باہستگی قصد وطن مالوف نمائند۔ خدائے عزوجل ہر چہ اوفق و اصلح باشد ہمارا بظہور آرد والسلام۔ خان عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں از فقیر سلام و دعوات خوانند و شیخ غیاث الدین و سادات دیگر

ہر کہ آنجا باشد سلام محبت مشام مطالعہ نمائند ـــ محمد فصیح بخدمت ایشاں می رسد در کار معہود ہر قدر ممکن باشد توجہ خواہند نمود احتیاج ابرام نیست والسلام ـــ

ترجمہ ـــ سیادت مآب حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں ـــ عافیت پر اللہ کا شکر ہے ـــ اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ـــ اجمالی طور پر ہمیشہ آپ کے حق میں یہ دعا کی جاتی ہے کہ خدائے عزوجل آپ کو ظاہر میں بھی اپنی نعمت سے نوازے اور اپنے علاوہ کسی کا محتاج نہ کرے اور باطن میں بھی اعانت و انعام فرمائے تاکہ اپنے آبائے کرام کے راستے پر قائم رہ کر ہر طریقہ سے پسندیدہ ثابت ہوں انہ قریب مجیب ـــ اگر نجیب الدولہ[1] آنعزیز کے سلسلے میں کوئی مؤثر خط لکھ دیں اور چوبدار ہمراہ کر دیں تو اللہ پر توکل اور بھروسہ کر کے اپنے وطن کی طرف جائیں ـــ اور اس سہولت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی آسانی تصور کریں ـــ اگر گرمی شوق بہم پہونچے تو پھر رمضان ہمارے یہاں آکر گزاریں اور اطمینان سے قصد وطن مالوف کریں۔ جو صورت بھی بہتر ہو اللہ تعالیٰ اس کو ظہور میں لائے۔ والسلام خان عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں کو فقیر کی طرف سے سلام و دعا اور شیخ غیاث الدین اور دیگر سادات جو وہاں (لشکر میں) ہوں ـــ سلام محبت مشام مطالعہ کریں ـــ محمد فصیح آپ کی خدمت میں پہونچ رہے ہیں کار معہود میں جس قدر ممکن ہو توجہ کریں۔ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] میر ابو سعید جائداد کے معاملات میں اپنے وطن سے نجیب الدولہ کے پاس تشریف لے گئے تھے غالباً نجیب الدولہ کا لشکر روہیلہ کھنڈ میں ضلع میرٹھ میں کہیں تھا۔ اس وقت مرہٹوں کا شدید خطرہ تھا، وطن کی واپسی میں دشواریاں پیش آئیں۔ بالآخر وقت مآب ابراہیم خلیل خاں کی ہمراہی میں میر ابو سعید اپنے وطن پہونچے جیسا کہ ایک دوسرے مکتوب سے معلوم ہو رہا ہے۔ ابراہیم خلیل خاں کے حالات کی جستجو ہے۔ ابھی تک ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے بکوتر گرامی پر تاریخ بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہو جاتا کہ یہ کس زمانے کا واقعہ ہے ـــ اندازہ یہ ہے کہ جنگ پانی پت سے کچھ پیشتر کی بات ہے ـــ

(۴) ایک مکتوب گرامی کے آخر میں ارقام فرماتے ہیں۔

..... بست ہر آئندہ ایں صوب احوال ظاہر و باطن خود می نوشتہ باشند کہ خاطر نگراں جانب ایشاں می ماند

اس طرف کے ہر آنے والے کے ہاتھ اپنے احوال ظاہر و باطن لکھ کر بھیجتے رہیں اس لیے کہ دل آپ کی طرف نگراں رہتا ہے۔

(۵) حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمائند ـــــ الحمد للہ علی العافیہ ـــ نامہ مشکیں شمامہ رسید احوال باطن کہ نوشتہ بودند ہمہ بر نہج صوابست انچہ سابق واضح شدہ بود از لطیفہ سر بود و انچہ الحال واضح شد از لطیفہ خفیہ است ہمہ خیر است و ہمہ بر نہج صواب است ان شاء اللہ تعالیٰ بتفصیل و با توفیق با شریعت نوشتہ شود الحال وقت تنگ است ۔ دو ٹوکری بھنگی انبہ رسید دیکے بخانۂ میاں اہل اللہ رسید جزاکم اللہ خیر الجزاء از اندرون خانہ و از فقیر زادہا و از خواجہ محمد امین و جمیع اہل مدرسہ سلام خوانند ـــ

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں ـــ الحمد للہ عافیت سے ہوں ـــ نامہ مشکیں شمامہ پہونچا ـــ احوال باطن جو لکھے تھے سب صحیح ہیں جو حال پہلے ظاہر ہوا تھا لطیفۂ سر سے تھا اور جو کچھ اب واضح ہوا ہے لطیفۂ خفیہ سے ہے سب بہتر ہے اور درست ہے اگر اللہ نے چاہا تو شریعت کے تطابق کے ساتھ تفصیل سے (آئندہ) لکھا جائے گا اب وقت تنگ ہے ـــ آموں کی دو بہنگیاں مجھ کو ملیں اور ایک میاں اہل اللہ کے گھر پہونچی ـ اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے ـــ اندرون خانہ فقیر زادوں نیز خواجہ محمد امین اور تمام اہل مدرسہ کی طرف سے سلام پہونچے ـــ

(۶) ..... بالجملہ بخاطر جمع دریں سیر و سلوک سعی نمائند ہمہ موافق سیر صوفیہ است و ہم مطابق شریعت دریں سخن آخر

الغرض دلجمعی کے ساتھ سیر و سلوک میں سعی کریں یہ سب کچھ سیر صوفیہ کے موافق ہے اور مطابق شریعت بھی ہے۔

طول و عرضے دارد کہ بالفعل در نوشتن نمی آید۔

مطابقت شریعت والی بات ذرا طول عرض رکھتی ہے فی الحال نہیں لکھی جا رہی ہے۔

(۷) حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نقابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ، بعد سلام محبت التزام مطالعہ نمائند۔ الحمد للہ علی العافیۃ۔ ازاں باز کہ بسبب ہجوم مرہٹہ انتقال از میرٹھ نمودہ ہمراہ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں آں گزار گنگا رفتند ـــــ مدتے گزشتہ کہ احوال خیریت مآل آں عزیز القدر نشنیدہ بودم ـــ الحمد للہ نامۂ نامی ایشاں رسید۔ موجب تسکین خاطر فاطر گشت مبدر را احوال و عالم را تفصیل نوشتہ بود و از مشاہدۂ انیصورت انس و سرور و از استماع آں تفرقہ و حزن مجانیز ذ ایں ہمہ موافق قاعدہ است راہیکہ سلف رفتہ اند ہمیں راہ راست ہیچ تردد نیست ..... یک تعویذ نواسیر برائے بستن ..... و دیگر برائے شستہ خوردن فرستادہ شد ـــــ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ نمائند۔

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ کریں ـــــ الحمد للہ عافیت سے ہوں ـــــ اس کے بعد سے کہ ہجوم فوج مرہٹہ کی وجہ سے میرٹھ سے منتقل ہو کر ہمراہ ابراہیم خلیل خاں گنگا پار کر کے (وطن) گئے تھے ـــــ ایک مدت گذر گئی تھی کہ آپ کے احوال خیریت مآل سے آگاہ نہ تھا ـــ الحمد للہ نامہ نامی پہونچا۔ موجب تسکین خاطر ہوا ـــ مبدر کو احوال اور کائنات عالم کو تفصیل ـــ تحریر کیا تھا۔ اس صورت کے مشاہدے سے انس و سرور اور غائب ہو جانے سے تفرقہ و حزن ہوتا ہے اور یہ سب موافق قاعدہ ہے۔ سلف جس راستے پر چلے ہیں وہ یہی راستہ ہے، کوئی فکر دل میں نہ رکھیں ..... ایک تعویذ نواسیر کا باندھنے کے لیے اور دوسرا دھو کر پینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ رفعت مآب ابراہیم خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔

(۸) ..... فقیر بحمد جمعیت ظاہر و باطن ایشان و برائے صحت و مزاج

فقیر آپ کی جمعیت ظاہر و باطن نیز صحت مزاج اور کشادگی رزق کے لیے دعاگو ہے

وکشائش رزق، داعی است خدائے عزوجل بفضل وکرم خود قبول فرماید۔ خدائے عزوجل اپنے فضل وکرم سے یہ دعا قبول فرمائے۔

(۹) حقائق ومعارف آگاہ، خلاصۂ دودمانِ سیادت وسلالۂ خاندانِ سعادت میر ابوسعید سلمہ اللہ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمائند ــ الحمد للہ علی العافیۃ ــ رقیمۂ کریمہ مشتمل بر احوالِ خویش نگاشتہ بودند رسید وبمطالعۂ ایشان صدروپیہ بدست آمد خدائے تعالیٰ برکات بسیار نصیب ایشاں کناد ــ اگر سفارش نواب وچوبدار بدست آمدہ است البتہ بوطن باید رفت امید کرز لطف حضرت لطیف آنست کہ وجہے برائے جمعیت ظاہر پیدا شود انہ قریبٌ مجیب ..... والسلام والاکرام عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں سلام اشتیاق تمام مطالعہ نمایند ــ فقیر محمد امین سلام شوق میرساند۔

ترجمہ ــــ حقائق ومعارف آگاہ ..... میر ابوسعید سلمہ اللہ ــــ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام مطالعہ کریں ــ الحمد للہ خیر وعافیت سے ہوں۔ مکتوب گرامی جو احوال پر مشتمل تھا پہونچا ــ اور آپ کی سعی سے سو روپے حاصل ہوئے اللہ تعالیٰ برکات بسیار آپ کو نصیب فرمائے ــ اگر نجیب الدولہ کی سفارش اور چوبدار مل گیا تو اپنے وطن رائے بریلی جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے امید یہ ہے کہ کوئی صورت جمعیت ظاہر کی پیدا ہوگی انہ قریبٌ مجیب ــ ..... والسلام والاکرام۔ عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔ (کاتب تحریر ہذا) فقیر محمد امین سلام شوق پیش کرتا ہے ــ

(۱۰) حقائق ومعارف آگاہ خلاصۂ دودمانِ نجابت میر ابوسعید بعافیت دارین باشد از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام واضح باد ــ از زبانِ بعض مردم شنیدہ شد کہ آں سیادت پناہ را عارضہ گسل (یا گسل؟) پیش آمدہ بود خاطر متردد است احوالِ خیریت مآلِ خود بنویسند ــ واز سرانجام کار یکہ بسبب آں در لشکر توقف شد نیز برنگارند ــ در رجب صدروپیہ از طرف نواب رسیدہ بود آدم را فرستادہ شد اگر صد یا زیادہ کم بدست آید دریں ایام مطلوب است ــ خانِ والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ نمائند۔ میر عتیق اللہ ومیاں غیاث الدین وجمیع یاران آنجا سلام مطالعہ نمایند ــ

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ..... میرا بوسعید عافیت سے رہیں ـ فقیر ولی اللہ عفی عنہٗ کی طرف سے بعد سلام واضح ہو کہ ـــ بعض لوگوں کی زبانی سنا گیا کہ آپ کچھ علیل ہو گئے تھے ـــ دل پریشان ہے ـ اپنے احوال خیریت مآل لکھیں ـ اور جس کام کی وجہ سے لشکر میں ٹھہرنا پڑا ہے وہ انجام پایا یا نہیں اس کو [illegible] ـــ ماہ رجب میں نواب (نجیب الدولہ) کی طرف سے ستور روپے پہونچے تھے ـــ اگر ستور روپے یا اس سے کم و بیش حاصل ہو جائیں تو اس وقت مطلوب ہیں ـــ آدمی کو بھیجا گیا ہے ـــ خان والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ کریں ـــ میر عتیق اللہ، میاں غیاث الدین اور اس جگہ کے تمام دوستوں کو سلام ـــ

(باقی)

لکھنؤ کے مشہور معالج و طبیب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی کے

چند مخصوص مجربات

عفوف ذیابیطس: اس دوا کے استعمال کے چند ہی روز بعد شکر میں کمی ہونے لگتی ہے چند ہفتے کے استعمال سے خون میں اتنی شکر رہ جاتی ہے جتنی تندرست آدمی کے خون میں ہونی چاہیے۔ چند مہینے استعمال کر لیا جائے تو دوا چھوڑ دینے کے بعد بھی فائدہ قائم رہتا ہے۔ قیمت دس تولہ ۵/- روپے ۲ تولہ ۱/- روپے

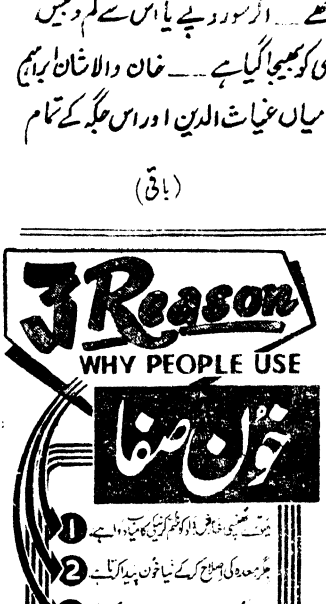
شربت جذام: جذام یا یہ دوا بیحد مفید ہے۔ پانچ چھ ماہ استعمال کرنے سے یہ مرض دفع ہو جاتا ہے۔ ایک پونڈ ۱/- روپے

شربت کند: پتھری پتھریوں کا درد، یرقان، ورم جگر، ان تینوں حالتوں میں اس شربت کا استعمال بیحد مفید ہے قیمت ایک پونڈ ۱/- روپے

شربت دردگردہ: پیشاب میں پھوری ریت آنا اور جھٹکے پیدا ہو جانا یا رک رک کر پیشاب آنا یا درد گردے کے دورے اٹھیں تو یہ شربت استعمال کیجئے ان کی شکایت پرانی ہو اور پتھریاں پڑ گئی ہوں تب بھی کئی ماہ پینا چاہیے۔ ایک پونڈ ۱/- روپے

مرہم سُرخ: پھوڑوں خصوصاً پیٹھ اور گردن کے پھوڑوں یعنی کاربنکل میں یہ مرہم مفید ہے اس کے استعمال سے جلن کا فور ہو جاتی ہے اور پورا اچھا صاف ہو جاتا ہے ۵/- روپے

(منیجر) حسنی فارمیسی، ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ



ایجنسیاں:- بستی، گاندھی نگر
الہ آباد، روشن باغ

سیدنا ابوسفیانؓ

مولانا سراج الحق مچھلی شہری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحیح حدیث مروی ہے "اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ" ترجمہ پوری حدیث کا یہ ہے۔ ذرا اللہ تعالیٰ کی ناخوشی سے ڈرتے رہنا ڈرتے رہنا میرے صحابہ کے بارے میں۔ دیکھو میرے بعد کہیں ان کو (کسی معاملہ میں) نشانۂ ملامت نہ بنانے لگنا۔ جو شخص میرے صحابہ سے محبت کرے گا وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھے گا (وجعلنا اللہ منہم) اور جو شخص میرے صحابہ سے بغض و نفرت کرے گا تو وہ میرے بغض کی وجہ سے اُن سے بغض رکھے گا (واعاذنا اللہ منہم) اور جس نے ان کو ایذا دی اس نے گویا خود مجھے ایذا دی (اعاذنا اللہ منہ) ترمذی مختصراً

اس ارشاد نبوی میں تین لفظ خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ ایک مِنْ بَعْدِیْ (میرے بعد) دوسرے فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ (جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی) اور تیسرے مَنْ آذَاھُمْ فَقَدْ آذَانِیْ (جس نے ان کو ایذا دی اس نے یقیناً مجھے ایذا دی)

چونکہ حضورؐ دیکھ رہے تھے کہ ارشادات قرآنی کے اولین مخاطب۔ میری رسالت و نبوت کے پہلے شاہد اور گواہ۔ قرآن پاک کے پہلے حامل اور عامل یہی صحابہ ہیں اس لئے حضورؐ کو منظور یہ ہوا (اور خدا کی مرضی بھی یہی تھی) کہ صحابہ کی عزت اور حرمت زیادہ سے زیادہ محفوظ اور ان کی عظمت اُمت میں بیش از بیش ملحوظ رہے کیونکہ خود میری عزت اور حرمت اور میری عظمت بھی اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہے حضورؐ کو گوارا نہ ہوا کہ میری ذات پر یا قرآن پاک پر کوئی حرف آئے اس لئے حضورؐ نے اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے چاہا کہ صحابہ کی محترم شخصیتوں پر کسی قسم کا حرف نہ آنے پائے، پس آپ نے نہایت تاکید و اہتمام سے مختلف عنوانات سے ان کے اکرام کا حکم فرمایا، چنانچہ یہیں اگرچہ جملہ خبریہ ارشاد ہو رہا ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ مقصود انشاء و حکم ہے

ان سے محبت کا۔

(۱) مِنْ بَعْدِیْ فرما کر تو حضورؐ اپنا یہ اندیشہ ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ میری حیات اور موجودگی میں تو میرا لحاظ کر کے مخلص اور منافق دونوں ہی قسم کے لوگ صحابہؓ کے ساتھ بھی ضرور محبت کریں گے اور اگر بالفرض کسی کو ان سے کوئی رنجش ہوگی تو میں اسکی اصلاح کر دیا کروں گا اور پھر صلح و سماج کے بعد میری موجودگی کا لحاظ کر کے سب باہم محبت ہی سے رہیں گے۔ غرض میری موجودگی میں سب کو تعلق در اصل مجھ سے ہوگا، اس لئے اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں کہ میری حیات میں کوئی شخص میرے صحابہؓ کے اکرام کے خلاف کوئی قول۔ کوئی فعل۔ کوئی عمل کرے گا۔ البتہ جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تب اس کا اندیشہ زیادہ ہے کہ ان کے احترام میں کمی ہونے لگے کیونکہ میری ذات کے موجود نہ رہ جانے کی وجہ سے سب کی توجہ براہ راست ایک دوسرے کی طرف ہونے لگے گی اور شیرازہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے سب منتشر اوراق کی مانند ہو جائیں گے، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو یا دوسرے لوگ ان کو عام انسان سمجھ کر ان سے عام لوگوں کی طرح معاملہ کرنے لگیں اور ان کی صحابیت فراموش ہونے لگے، اس لئے آپ نے متنبہ فرما دیا کہ میرے بعد بھی ان کا پورا اکرام کرتے رہنا۔ بقول شاعر:

ع: جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا مہمان رہے

(۲) فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ فرما کر حضورؐ نے در اصل صحابہؓ کا درجہ بیان فرمایا ہے یعنی اس ارشاد کے دو پہلو ہیں، ایک کی تعبیر تو بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ "بِسَبَبِ حَتّٰی اِیَّاهُمْ اَحَبَّهُمْ" یعنی اس مسلمان نے ان سے اس وجہ سے محبت کی ہے کہ خود مجھے ان صحابہؓ سے محبت ہے۔ اس میں محبت کی نسبت فاعلی حضورؐ کی جانب اور نسبت مفعولی صحابہ کی جانب ہے اور حضورؐ صحابہؓ کو اپنا محبوب فرما رہے ہیں، اس صورت میں یہ مضمون گویا اَکْرِمُوْا اَصْحَابِیْ کا ہم مضمون ہوگا۔ اور دوسرے پہلو کی تعبیر ان الفاظ میں سمجھئے کہ "بِسَبَبِ حُبِّیْ اِیَّاهُمْ اَحَبَّهُمْ" یعنی اس مسلمان نے میرے صحابہؓ سے اس وجہ سے محبت کی کہ اسے مجھ سے محبت ہے تو میرے دوستوں اور ساتھیوں سے بھی محبت ہونی ہی چاہیئے بقول شاعر ع: وَمَنْ مَذْهَبِیْ حُبُّ الدِّیَارِ لَاَهْلِهَا۔ اس صورت میں حضورؐ گویا اپنی محبت کا واسطہ دے کر ان سے محبت کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

(۳) ثمرہ لفظ "فَقَدْ اٰذَانِیْ" فرما کر حضورؐ نے انتہائی اہم اصل کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی اگر تو یہ رنجش اللہ کے لئے ہو تو آپ کی جگر گوشہ فاطمہؓ جن سے حضورؐ کو طبعی محبت تھی بغایۃً ما ایک موقع پر حضورؐ نے ان کی ایذا کو اپنی ایذا کے برابر فرمایا تھا فَاِنَّمَا هِیَ بَضْعَةٌ مِنِّیْ یُرِیْبُنِیْ مَا اَرَابَهَا وَیُؤْذِیْنِیْ مَا اٰذَاهَا (بخاری)

اسی طرح آپ نے سیدنا عباسؓ کے بارہ میں فرمایا" مَنْ آذٰی عَمِّیْ فَقَدْ آذَانِیْ" جس نے میرے چچا کو ستایا اس نے گویا مجھے ستایا۔ غرض جس طرح حضورؐ نے خون قرابت اور عزیز داری رکھنے والوں کی ایذا کو اپنی ایذا کے برابر بتایا ٹھیک اسی طرح دینی رشتے (شرع و دین) سے یگانگی رکھنے والے صحابہؓ کی ایذا کو بھی حضورؐ نے اپنی ایذا کے برابر بتایا ہے۔

غرض اس اہتمام سے اکرام صحابہؓ کی ترغیب دینے سے میری سمجھ میں دو باتیں یہ آتی ہیں کہ:۔

(۱) اس اہتمام سے حضورؐ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ سے جو محبت رکھی جائے وہ ایسی ہونی چاہیئے جس میں حضورؐ کی محبت واسطہ بنے اور حضورؐ کی صحبت اسکی محرک و باعث ہو یعنی صحابیت کو اولیت تقدم کا درجہ دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی نے کسی ایسے صحابی سے محبت رکھی جن میں خود ذاتی خوبی، شخصی کمال، نسبی کرامت، شجاعت، غنا، تقدم اسلام، ہجرت، شرکت جہاد وغیرہ کی حیثیتیں خود ہی محبت کا تقاضا کرتی ہوں مثلاً سیدنا ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰ، ابن عوف، احمد، حسین وغیرہم رضی اللہ عنہم تو یہ محبت تو طبعی اور ذوقی محبت بھی ہوگی گو یہ بھی فی نفسہ ایک فضیلت ہے مگر یہ محبت اس حکم نبوی کے امتثال و تعمیل میں نہ ہوگی بلکہ ایسی طبعی اور ذوقی محبت کا تو حکم دینے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ پس اس حکم کا اقتضا سوا اس کے کچھ نہیں کہ حضورؐ کا منشا یہ ہے کہ بالفرض میرے کسی صحابی سے قبل اسلام یا بعد اسلام کوئی واقعہ ایسا ہو بھی گیا ہو جس سے کسی مسلمان کے قلب میں ان کے لئے جگہ کشائی نہ معلوم ہوتی ہو تب بھی اسے میرا خیال کرکے ان سے محبت کرنی چاہیئے کیونکہ انھوں نے میری دعوت پر کفر چھوڑ کر اسلام اختیار کیا نور محبت اور نور ایمان کے ساتھ مجھے دیکھا اور میرے ساتھ رنج و راحت۔ میدان جہاد اور اطاعت میں شریک رہے، طبیعت کے موافق اور مخالف احکام کو مانا اور مرتے دم تک اسلام پر قائم رہے۔ دنیا پر آخرت کو ترجیح دی، دکھ جھیلے، جانیں دیں، نور اسلام پھیلایا۔ پس اس حکم محبت کا تو منشا پورا ہوتا ہے، در اصل سیدنا ابوسفیان، معاویہ۔ عمرو بن العاص۔ مغیرہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت کرنے سے۔ اگر کسی مسلمان نے ابوبکر و علی رضی اللہ عنہم سے محبت کی تو کون سا بڑا کمال کیا کیونکہ ان کے ہر ذاتی اور کمالات دینی و روحانی۔ فضائل اخلاقی و عقلی کی طرف اپنے تو اپنے غیر دیگانہ بھی جھکتے ہیں اور ان کی تحسین کرنے پر مجبور ہیں البتہ وہ صحابہؓ جن کو دشمنان دین نے طرح طرح سے ایسا بدنام کر دیا کہ آج بہت سے مسلمانوں کے دلوں سے ان حضرات کی عظمت و حرمت کم آپ کم یا گم پائیں گے۔

ان مظلوم صحابہؓ سے صرف رسول کی محبت کے ناطے محبت کرنا البتہ اس مبارک ارشاد کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

کسی صحابی کے قبل از اسلام حالات کے بیان کرنے میں بھی لازم ہے کہ ان کی صحابیت اور حرمت کو برابر ملحوظ رکھا جائے۔ یعنی اگر کسی مؤرخ کو آج ضرورت ہے کہ وہ مثلاً حضرت ابوسفیان کے قبل اسلام کے واقعات لکھے تو ان الفاظ میں کہ "اُس نے ایسا کیا۔ اُس نے کہا۔ وہ یہ چاہتا تھا" ہرگز ہرگز نہ لکھنا چاہیئے۔ اس کو دوسری مثال سے سمجھئے اگر ان لیجئے آج کوئی مسلمان مکہ کے ابوجہل کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو غور فرمائیے کہ وہ ابوجہل جیسے کسی کافر کے لئے کیا طرز اختیار کریگا؟ وہ یہی تو لکھے گا کہ "ابوجہل یہ چاہتا تھا، ابولہب یہاں گیا"۔ تو آخر آپ نے ایک صحابی کا حال لکھنے میں ارشاد رسول کا کیا حق ادا کیا، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ذکر قبل اسلام میں (جبکہ حضرت ابوسفیان کا خاتمہ یقینی طور پر اسلام پر ہوا) اور ابوجہل کے حالات میں (جب کہ اس کا خاتمہ یقینی طور کفر پر ہوا) آپ نے کیا فرق رکھا؟ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم سیدنا ابوسفیان کے حالات درج کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہت سے مسلمان بھائی ان کی حرمت و عظمت سے تو درکنار خود ان کے حالات سے بھی واقف نہ ہوں گے۔

آپ کا نام و نسب حضرت ابوسفیانؓ کا نام نامی صخرؓ تھا اور کنیت ابوسفیان تھی۔ مگر صخرؓ زیادہ مشہور نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے نام کے سلسلہ میں بعض اہل علم نے بھی غلطی کی ہے ان کے والد کا نام حرب اور دادا کا نام امیہ تھا جو خوصلہ مند اور بہادر ہونے کے باعث اموی خاندان کے مورث اعلیٰ بنے آپ کا نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں چوتھی پشت میں جاکر مل جاتا ہے، نسب نامہ یوں ہے:-

۱۔ حضرت سرور کائنات مفخر موجودات سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابن خواجہ عبداللہ[۲] ذبیح ابن خواجہ شیبہ (عبدالمطلب)[۳] ابن خواجہ ہاشم[۴]، ابن عبد مناف۔

۲۔ سیدنا ابوسفیان صخر رضی اللہ عنہ[۱]، ابن حرب[۲]، ابن امیہ[۳]، ابن عبدالشمس[۴]، ابن عبد مناف

مکہ میں قریش کے چند گھرانے بہت ممتاز اور مشہور تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شریف و مشہور معزز اور مقدس گھرانہ بنو ہاشم کا تھا کیونکہ اہل مکہ بلکہ پورے عرب کی دینی سیادت یعنی کعبہ کی حجابت و سدانت

انھیں میں تھی، ان کے بعد دوسرا معزز گھرانہ بنوامیہ کا تھا کیونکہ اہل مکہ کی دنیاوی سیادت اور فوجی قیادت انھیں میں تھی۔ بنواسد، بنو مخزوم وغیرہ گھرانے ان کے بعد تھے، کیونکہ ان گھرانوں میں جو قومی مناصب تھے مثل سفارت، خطابت وغیرہ ان کی اہمیت قوم میں اتنی زیادہ نہ تھی۔ بنوہاشم اور بنوامیہ میں قرابتیں بھی باہم زیادہ ہوتی تھیں۔

حضرت ابوسفیان صخر اسی بنوامیہ کے گھرانہ سے تھے۔ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دس برس بڑے تھے، یہ قریش کے معززین واشراف میں تھے۔ بہادر، سمجھ دار، خوش خلق تھے قوم نے ان کو بالاتفاق سپہ سالار لشکر بنا دیا۔ حضورؐ میں اور ان میں اعلان نبوت سے قبل باہم وہی محبت تھی جیسی عموماً قریبی رشتہ داروں میں ہوا کرتی ہے۔ اعلان نبوت کے بعد بھی ان کو اور ان کے صاحبزادے سیدنا معاویہؓ کو حضورؐ سے یا اسلام سے ذاتی طور پر کوئی خصومت، کد، کدورت وغیرہ نہ تھی، پوری قوم کو جو مخالفت حضورؐ سے تھی اس میں تو حضرت صخر نے ضرور قوم کا ساتھ دیا اور من حیث القوم حضرتؐ سے جنگ بھی کی مگر اس وقت بھی انھوں نے کوئی ایذا حضورؐ کو نہیں پہنچائی۔ اوقات جنگ میں ضرور حضورؐ سے لڑے مگر جیسی ایذا و شرارت کی حرکات ابوجہل مخزومی اور ابولہب ہاشمی سے ظاہر ہوئیں کہ کبھی حضورؐ کی پشت مبارک پر بحالت سجدہ اونٹ کی بھوجھ رکھ دی، کبھی حضورؐ کی چادر گھسیٹی جس کے نشانات گردن مبارکؐ ظاہر ہوئے، کبھی حضورؐ کے راستہ میں کانٹے بچھائے، ایسی کوئی حرکت کسی تاریخ میں حضرت صخر کی طرف سے منقول نہیں۔ حضرت صخر رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اوقات جنگ کے علاوہ برابر حضورؐ کے ساتھ میل ملاپ۔ رشتہ داری کے لحاظ، آدمیت کے پاس اور شرف آبا کے موافق برتاؤ کرتے تھے۔

قبل اسلام اگرچہ کچھ بددینوں نے آپ کو بہت بدنام کیا ہے اور آپ کے متعلق کچھ غلط باتیں دینی اور تاریخی کتابوں میں شامل کر دی ہیں، مگر آپ کے حسب ذیل واقعات اب بھی کتب سیر و رجال میں ملتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے حسن تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۱) اعلان نبوت کے بعد جب کفار مکہ حضورؐ کو بہت ستانے لگتے تو آپ ان کے ہجوم اور شر سے بچنے کے لئے بعض وقت گھبرا کر انھیں حضرت صخر کے مکان میں چلے جاتے، وہ مکہ کے معززین میں ہونیکے علاوہ فوج کے سپہ سالار بھی تھے، اہل مکہ پر ان کا ایک رعب تھا۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی شرپسندوں کی ایذا سے حضورؐ کو امن مل جاتا۔ گو وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر شرف نسب اور رکم طبع کی یہ خصلت ان میں

بدرجۂ اتم تھی کہ اگر عام دشمن بھی کسی پریشانی میں کسی وقت ہمارے گھر آکر پناہ لینا چاہے تو اس کو امن، راحت دی جائے اور اس کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ اُسے خطرہ سے بچایا جائے اس وقت اُسے ستانے کو شرافت کے خلاف جانتے۔ یہ تو عام دشمن کے ساتھ برتاؤ ہوتا اور حضورؐ جیسے عزیز قریب (مگر مسلک میں مخالف) کیساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ ان کا تھا بلکہ ان کے گھر میں حضورؐ کے پناہ لینے کے وقت ان کے پورے گھرانے ہی کا برتاؤ صلہ رحمی کا تھا۔ چونکہ حضرت صخرؓ نے حضورؐ کے ساتھ خوش خلقی اور صلہ رحمی اس وقت کی جب مکہ میں حضورؐ پریشان تھے، اسی لئے حضورؐ نے بھی آٹھ دس برس بعد موقع ملنے پر ان کی اس نیکی کی قدردانی کی اور فتح مکہ کے وقت یہ اعلان فرمادیا کہ جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے لے گا اُسے بھی امان ملے گی (مفصل قصہ آگے آرہا ہے) (اصابہ ذکر صخر)

(۲) حضورؐ نے مدینہ کے قیام کے زمانہ میں حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعہ کچھ تحفہ کھجور حضرت صخرؓ کے پاس ہدیۃً بھیجی تو انھوں نے بھی جواب میں کوئی چیز (جس کو حدیث میں رقم کہا گیا ہے) حضورؐ کے پاس ہدیۃً بھیجی بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ ہی نے فرمائش کر کے ان سے اوم منگوائی تھی (منتقی از حافظ ذہبی ص۲۵۳ حاشیہ ۲)

(۳) حضورؐ نے مدینہ میں سُنا کہ مکہ میں قحط اور تنگی ہے تو حضورؐ نے کئی سو دینار کسی کے ذریعہ حضرت صخرؓ کے پاس بھیجے کہ یہ رقم مکہ کے اہل حاجت میں تقسیم کردیں۔ حضرت صخرؓ ابوسفیان نے رقم لے تو لی مگر ہنس کر کہا اچھا اب یہ محمدؐ ہمارے نوجوانوں کو شاید خریدنا چاہتے ہیں (حضورؐ نے یہ رقم ابوسفیان ہی کے پاس بھیجی تو اس سے خاص تعلق اور خصوصی قرابت ظاہر ہوتی ہے)

(۴) ۶ھ میں حضورؐ نے حضرت ابوسفیان صخرؓ سے (یا تو بذریعہ قاصد مکہ میں کہلایا۔ یا شاید کسی سفر میں صخرؓ خود مدینہ گئے ہوں جب خود) کہا کہ تمھاری لڑکی ام حبیبہ رملہ بیوہ ہوگئی ہیں۔ میں اُن سے نکاح کرنا چاہتا ہوں تم بھی اجازت دیدو تو بہتر ہے انھوں نے اجازت دیدی چونکہ رملہ اس وقت حبش میں تھیں۔ حضورؐ نے حبش کے نواب نجاشی کے پاس جو مسلمان ہوگئے تھے انھیں صحابی عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعہ کہلایا کہ میں تم کو اپنا وکیل بناتا ہوں کہ تم رملہ بنت ابی سفیان کی عدت گزرنے کے بعد ان سے میرے نکاح کا پیام دو۔ اگر وہ راضی ہوں تو تم وہیں اُن سے میرا عقد نکاح کردو۔ نجاشی نے بی بی رملہ کی عدت گزرتے ہی ایک کنیز سیدہ رملہ کے پاس بھیجی اور حضورؐ کا پیام نکاح ان کو دیا۔ وہ پہلے ہی خواب دیکھ چکی تھیں کہ کسی نے ان کو "ام المومنین" کہہ کر پکارا ہے، اب نجاشی کی کنیز کی زبانی یہ پیام سُن کر سمجھ گئیں کہ خواب کی تعبیر یہی تھی انھوں نے قبول کرلیا تو کنیز نے دوسری

یہ کہی کہ تم کسی کو اپنی طرف سے اپنے نکاح کا وکیل بنا دو جو تمہارا نکاح حضورؐ کے ساتھ کر دیں، انھوں نے خالد بن سعید مہاجر حبشہ کو اپنا وکیل بنا دیا۔ نجاشی نے محفل نکاح ترتیب دی اور حضور کے چچیرے بھائی جعفر بن ابی طالب سے جو حبش میں ہجرت کر کے مقیم تھے کہا کہ نکاح تم پڑھو، چنانچہ حضرت جعفر نے خطبہ پڑھ کر نجاشی وکیل آنحضرتؐ اور حضرت سعید وکیل سیدہ رملہ کی موجودگی میں عقد نکاح باندھ دیا۔ نجاشی نے حضورؐ کا وکیل اور نائب بن کر سیدہ رملہ کا مہر چار سو اشرفی خود تجویز کیا اور اسی مجلس میں حضورؐ کی طرف سے خود ادا بھی کر دیا۔

اس نکاح کی خوشی میں سیدہ رملہ نے چاندی کے دو کنگن نجاشی کی اس کنیز کو دے ڈالے۔ اس کے بعد حضورؐ نے ایک دوسرے صحابی حضرت شرحبیل بن حسنہ کو بھیجا کہ ام المومنین رملہ رضی اللہ عنہا کو حبشہ سے مدینہ لے آئیں۔ حضرت ابوسفیان صخر کو جب نکاح کی اطلاع ملی تو انھوں نے حضورؐ کی ثنا و تحسین ہی کی۔ (منتقی طبع مصر، ص ۲۵۴ حاشیہ)

(فائدے) اول چونکہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو حضورؐ نے کئی بار کئی موقعوں پر حضرت ابوسفیان صخر کے پاس مختلف کاموں سے بھیجا تو کچھ بدظن ہو گئے اور ابوسفیان کی بدگوئی کرنا چاہتے ہیں اور اسی بدگوئی کی نیت سے امیر حمزہ کی جھوٹی کہانیوں میں ان کو انھوں نے معاذ اللہ عیار، مکار، لالچی وغیرہ لکھا ہے یہ صریح مخالفت ہے حکم لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا کی۔

دوم۔ مہر عورت کا حق ہے اور لڑکی والے ہی اسے مقرر کرتے ہیں۔ سیدہ رملہ کا مہر بھی حضرت خالد نے کچھ کہا ہوگا مگر حضورؐ کے اس نکاح میں نجاشی نے جو نائب بن کر چار سو اشرفی مہر مقرر کیا، اسکی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مرد کو حق ہے کہ مقررہ مہر سے بڑھا کر اپنی خوشی سے زیادہ رقم ادا کر دے۔ نجاشی چونکہ نواب تھے اس لئے انھوں نے نیابت میں خود اپنی ریاست کی بھی رعایت کی اور رئیسوں کا سا مہر بخوشی بڑھا کر ادا کیا۔ آیت قرآنی وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں اس حسن خلق کی تعلیم ہے۔

(۵) ان کا اسلام لانا (جس کا مفصل بیان آگے آرہا ہے) بھی حضورؐ ہی کی ایک دعا کی برکت سے تھا۔ امام سیوطی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ حضورؐ کی بعثت کے اوائل میں ایک دن ابوجہل نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک تھپڑ مار دیا تھا، انھوں نے اس کی شکایت جا کر حضورؐ سے کی، آپ نے فرمایا بیٹی جاؤ اور ابوسفیان سے اس کا تذکرہ کرو۔ انھوں نے جا کر ابوسفیان سے کہا۔ انھوں نے سیدہ فاطمہؓ کا ہاتھ پکڑا (کیونکہ بہت چھوٹی تھیں) اور

لے کر وہاں پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا تھا اور کہا کہ بیٹی تم بھی اس کے منہ پر تھپڑ مارو، جیسے اس نے تمہیں مارا تھا (اور اگر کچھ بولے گا تو میں اس سے نپٹ لوں گا) انھوں نے ابوجہل کو تھپڑ مارا۔ اس کے بعد انھوں نے آکر یہ سارا واقعہ حضورؐ سے بیان کیا تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے اور دعا کی "اللّٰھمّ لاتنساھا لابی سفیان" (اے میرے اللہ! ابوسفیان کے اس نیک سلوک کو بھولئے گا نہیں) ابوسفیانؓ کا ایمان لانا حضورؐ کی دُعا ہی کی وجہ سے تھا۔

(دیکھو سیرت نبویہ سید احمد زینی دحلان برحاشیہ سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، صفحہ ۳۰۶ طبع مصر)

(۶) صلح حدیبیہ کے بعد (۶ھ) میں بُصریٰ کے سردار کے پاس حضورؐ نے اسلام کا دعوت نامہ بھیجا جو ہرقل شاہ روم کے نام تھا اُس نے وہ فرمان نبوی ہرقل شاہ روم کی خدمت میں پیش کیا اس نے جب فرمان پڑھا تو اہل دربار سے اہل عرب کے متعلق دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ مکّہ کے قریشیوں کا ایک قافلہ تجارت کے لئے آیا ہوا ہے، اُس نے ان لوگوں کو بُلوایا اور پوچھا کہ عرب کے ان رسول کا سب سے قریبی رشتہ دار تم میں سے کون ہے، ابوسفیان صخر بولے کہ میں ان کا چچیرا بھائی ہوں اس کے بعد اُس نے اُن سے چند سوالات کیے اور جوابات پانے کے بعد ہرقل نے اپنے سوالات کی حکمت بتائی اور کہا کہ جو باتیں تم نے بتائی ہیں اگر وہ سب سچ ہیں تو ان کا قبضہ ایک نہ ایک دن اس جگہ تک ہو کر رہے گا جہاں یہ میرے دونوں قدم ہیں"۔ یہ سُننا تھا کہ دربار کے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا (ان کو محسوس یہ ہوا کہ شاید ہرقل بھی مسلمان ہو گیا یا ہونے والا ہے) تو ہرقل نے ان مکہ والوں کو دربار سے رخصت کر دیا جب ابوسفیان وہاں سے باہر آئے تو انھوں نے ساتھیوں سے کہا۔ خود ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

"لقد أمر امرُ ابن ابی کبشة انه	ارے! ابی کبشہ (شوہر حلیمہ) کے بیٹے
یخافه ملك بنی الاصفر۔ فما	(حضورؐ کا معاملہ اب اس حد تک پہنچ گیا کہ رومی
زلت موقناً انه سیظهر حتی	گوروں کا بادشاہ ہرقل بھی ان سے ڈرنے لگا!
ادخل الله علیّ الاسلام"	بس اُسی دن سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ غالب ان کا

ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اسلام داخل فرما دیا۔ (بخاری باب بدء الوحی)

یعنی مجھے ان کے غلبہ کا یقین ہو گیا اور اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ میں اسلام لایا۔ دعاء نبوی کے بعد ان کا یہ

یقین ان کے اسلام لانے کی طرف پہلا قدم تھا۔

ان کا اسلام لانا حضورؐ نے جب ۸ھ میں مکہ پر چڑھائی کی تو مکہ کے قریب پہنچ کر ایک مقام مرّ الظہران پر رات گزارنے کے لئے پڑاؤ کیا۔ ابوسفیان کو مکہ میں اسکی اطلاع ملی تو دو ایک ساتھیوں کے ساتھ جاسوسی کے لئے اسلامی فوج میں پیچھے پیچھے پہنچے۔ فوج کی شان دیکھ کر سناٹے میں آ گئے۔ دُور تک دس ہزار مجاہدوں کا لشکر اُترا پڑا تھا۔ ہر قبیلہ کے خیمے الگ، ہر پلٹن اور قبیلہ کا جھنڈا الگ، لوگ ہر طرف پھیلے ہوئے، ذکر نماز، تلاوت میں یا کھانے پینے کی ضرورتوں یا فوجی تیاریوں میں مشغول نظر آئے۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ ابوسفیان ابھی اس منظر کے دیکھنے اور تعجب کرنے ہی میں لگے تھے کہ بعض مجاہدین نے ان کو پہچان لیا۔ ان سے تو وہ کچھ نہیں بولے، دوڑے ہوئے سیدھے حضورؐ کے پاس پہنچے کہ حضورؐ سے اجازت مل جائے تو ان کو یہیں ٹھکانے لگا دیں۔ اُدھر قدرت کا انتظام سُنئے اسی وقت ان کو حضرت عباسؓ نے بھی دیکھ لیا ابوسفیانؓ اور حضرت عباسؓ دونوں میں بہت دوستی تھی، حضرت عباسؓ خچر پر سوار تھے، تیزی سے ان کے پاس آئے اور ان کو اپنے پیچھے خچر پر بٹھا کر تیزی سے حضورؐ کے خیمہ کی طرف دوڑے، انھیں خطرہ ہوا کہ کہیں کوئی مسلمان غصہ میں آ کر ان کو قتل نہ کر دے یا کوئی دوسرا حضورؐ کے پاس مجھ سے قبل نہ پہنچ جائے۔ خیمہ کے پاس پہنچ کر ان کو باہر چھوڑا، خود اندر گئے تو دیکھا ایک دوسرے صحابی عمرؓ پہلے سے پہنچکر حضورؐ سے ابوسفیان کی جاسوسی کا ذکر کر کے ان کے قتل کی اجازت مانگ ہی رہے تھے کہ حضرت عباسؓ نے جلدی سے عرض کیا "یا رسول اللہ میں نے ان کو اپنی پناہ میں لیا ہے اور انھیں اپنے ساتھ لایا ہوں، باہر کھڑے ہیں، اجازت ہو تو بلاؤں"، فرمایا بلاؤ۔ جب وہ آئے تو آپ نے اُن سے فرمایا:۔

"ابوسفیان! کیا تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری ذات اس قابل ہے ہی نہیں کہ انسان (اشرف المخلوقات ہو کر) اسکی غلامی یا اُسے سجدہ کرے"؟

یہ سُن کر ابوسفیان صحر بولے "واقعی آپ بڑے حلیم اور نیک ہیں (کہ مجھے آپ نے سزا دینے کی بجائے تبلیغ و نصیحت فرمائی) واقعی اگر کوئی ذات قابل پرستش ہوتی تو اس وقت تیری مدد کرتی (مطلب یہ ہوا کہ خدا کے سوا کوئی ذات معبود و پرستش کے قابل نہیں) جب حضورؐ نے اُن سے یہ اقرار توحید سُن لیا (جو اسلام کی طرف ان کا دوسرا قدم تھا) تو فرمایا:۔

"اور کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا کہ تم مجھے حق تعالیٰ کا رسول مانو"؟

حضرت ابوسفیان نے جواب میں پھر کہا:

"واقعی آپ بڑے حلیم ہیں۔ مگر آپ پر میرے ماں باپ قربان! ابھی اس معاملہ (رسالت) میں میرے دل میں کچھ شک باقی ہے۔"

یہ سیدنا ابوسفیان کی انتہائی دیانت اور سچائی تھی کہ جو بات دل میں تھی اُسے صاف کہہ دیا۔ بہرحال یہ سُن کر حضور سمجھ گئے، ابھی میری اطاعت سے اور تسلیم رسالت سے ان کو انکار ہے۔ سپہ سالار اور سردار قریش ہونے کا غرور اور جاہلیت کا نخوت اور عناد ابھی مزاج میں ہے۔ حضور خاموش ہو رہے۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ:

"حضورؐ! ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہیں ان کے ساتھ کچھ رعایت ہی کی جائے تو مناسب ہے۔"

حضورؐ نے وہیں مرّ الظہران میں یہ اعلان فرما دیا کہ:

"کل جو شخص مسجد حرام[1] میں پناہ لے گا۔ یا جو ابوسفیان[2] کے گھر میں پناہ لے گا۔ یا جو ہتھیار ڈال دے گا۔ یا جو اپنے گھر میں گھس کر اپنا دروازہ بند کر لے گا اور ہم سے نہ لڑے گا۔ ان سب کو امان ہے۔"[3]

یہ فرما کر آپ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا ان کو اس طرح واپس لے جاؤ کہ مسلمانوں کی فوج کی پوری شان دیکھتے ہوئے جائیں، تو حضرت عباسؓ اسی طرح پوری فوج کی سیر کراتے ہوئے ان کو تنگ کے قریب پہنچا کر واپس چلے گئے اور حضرت ابوسفیان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سطوت ظاہری اور فتح اخلاقی کی حیرت افزا داد لیتے ہوئے اپنے گھر پہنچے وہ اگرچہ اسلام نہیں لے آئے تھے مگر مائل بہ اسلام ضرور ہو چلے تھے (ایک روایت تو مرّ الظہران کے روئداد کی یہ بھی لیکن اس روئداد کی ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ) جب مرّ الظہران میں ابوسفیان صخر نے فوج کے مجاہدین کی شان دیکھی پھر حضور کے سامنے پہنچے تو یہ دیکھا کہ سب مجاہدین حضورؐ کے ایسے عاشق ہیں کہ حضورؐ کے قریب پہنچنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اس وقت حضور کا درجہ دیکھ کر ان کے دل میں کچھ حسد سا پیدا ہوا اور دل میں ارادہ کرنے لگے کہ "اچھا تو میں بھی ان کے مقابلہ کے لئے ایک بڑی فوج جمع کر لاؤں گا" بس ادھر ان کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ حضورؐ نے اُن کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا "اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ

تم کو بہت ذلیل کر دیں گے"۔ حضرت ابوسفیانؓ یہ معجزہ دیکھ کر کہ حضورؐ کو خطرۂ قتلی کی اطلاع ہوگئی چونک سے پڑے، ادھر حضرت رسالت پناہؐ کا دست رحمت جو (حضرت عمرؓ کے واقعہ کی طرح) ان کے سینہ سے مس ہوگیا تو یکایک حسد کا وہ شیطانی جذبہ دل سے دور ہوگیا اور آپ کے منہ سے بیساختہ استغفراللہ واتوب الیہ نکل گیا اور کہنے لگے "خدا کی قسم میں نے یہ بات کسی کے سامنے اب تک نہیں کہی تھی بس اسی وقت یہ خیال دل میں آیا تھا کہ آپ کو خدا نے اس سے مطلع فرمایا، اس معجزہ پر مجھے آپ کے رسول برحق ہونے کا بھی پورا یقین ہوگیا"۔ یہ اسلام کی طرف آپ کا چوتھا قدم تھا مگر اب بھی کچھ کسر باقی تھی۔ اپنی سپہ سالاری کا ایک آخری غرور پھر آپ کے دل میں گزرا کہ "نہ جانے یہ محمدؐ کس وجہ سے ہم پر غالب آرہے ہیں"۔ ان کے دل میں یہ خطرہ گزر ہی تھا کہ حضورؐ نے فرمایا "خدائے واحد کی مدد سے غالب ہوں"۔ یہ سن کر ان کے دل و دماغ سے تمام شکوک و شبہات دور و زائل اور سپہ سالاری اور سیادت کا غرور چکنا چور، قلب کا رنگ ہمیشہ کے لئے کافور ہوگیا اور آپ وہیں مرالظہران ہی میں فتح مکہ سے قبل کی رات ہی میں سچے دل سے پکار اٹھے کہ:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" صَلَّى اللّٰهُ علیٰ نبینا و سلم (یہ دونوں روایتیں اصابہ میں ہیں)

(فائدہ) چونکہ سیدنا ابوسفیانؓ کی زندگی اسی سیادت و سپہ سالاری میں گزری تھی بلکہ انکی کئی پشتیں اسی ریاست و سرداری کی حالت اور اسی غرور میں گزری تھیں اسلئے سولہ ۱۶ برس تک حضورؐ سے برسرپیکار رہے اور اسی وجہ سے ہر آخری موقع پر بھی حسد اور مقابلہ کے خیالات ان کے دل میں آرہے تھے مگر اس ذات میں انکی سعادت ازلی اور دولت سرمدی (اسلام) کا وقت آگیا تھا اسلئے یہ حالات پیش آئے اور جیسے ہی حضورؐ کا کیمیا اثر دست مبارک ان کے قلب اور سینہ سے مس ہوا سارا زنگ دور ہوگیا، وہ اب تک منصب سالت کی رفعت و فضیلت سے واقف نہیں تھے نہ وہ حضورؐ کی صحبت میں رہے تھے اس شب کو ان کو اخلاق نبوی کی بلندیوں کا بھی علم ہوا اور اپنے متعلق حضورؐ کے دو معجزے بھی دیکھے تو سچے دل سے اسلام لے آئے۔

بعد اسلام بہرحال ۸ھ میں فتح مکہ سے ایک رات قبل مقام مرالظہران میں آپ بہ عمر ۴۱ سال ایمان لائے اور آپ کا ایمان اچھا اور سچا ثابت ہوا چنانچہ آپ کے کارنامے اسلام میں نمایاں ہیں۔

(۱) حضورؐ نے مشرکین کی ایک مشہور دیوی منات کو گرانے اور توڑنے کا کام انھیں کے سپرد فرمایا۔ آپ اس بستی میں

گئے اور آپنے اسے توڑ کر برباد کر دیا کسی کو ان کے سامنے آنے کی تاب نہ ہو سکی۔ بُت توڑنے کا کام حضورؐ نے بہت ہی خاص خاص صحابہؓ سے لیا ہے اُن میں حضرت ابوسفیانؓ بھی ہیں (فائدہ) کفر و شرک سے انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ کفار عرب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خدا بغیر بیوی کے کیونکر ہو سکتا ہے اسلئے انھوں نے اللہ کے لفظ میں تانیث لگا کر اللات ایک دیبی اور نعوذ باللہ اللہ کی بیوی تجویز کی اسی طرح منّان کے لفظ میں ت لگا کر دوسری دیبی منات تجویز کی اور عزیز کے لفظ میں ت لگا کر تیسری دیبی عزّیٰ بنا لی نعوذ باللہ۔

(۲) غزوۂ حنین میں حضرت صخرؓ نے حضور کے ہمرکاب ہو کر جہاد کیا۔ اس جنگ میں حضورؐ نے آپ کی دلیری جانبازی سے خوش ہو کر ان کو مال غنیمت میں سے سو اونٹ اور چالیس اوقیہ سونا عطا فرمایا۔

(۳) فتح طائف میں بھی آپ نے حضورؐ کے ہمرکاب ہو کر جہاد کیا کہ اچانک ایک تیر آپ کی ایک آنکھ میں آکر لگا اور آپ کی آنکھ جاتی رہی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا "ابوسفیان! کہو تو میں دعا کر دوں اور تمھاری آنکھ اچھی ہو جائے لیکن اگر تم پسند کرو اور صبر کرو تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض تم کو جنت دیں گے"۔ آپنے زبان سے جنت کی بشارت جو سُنی تو تکلیف کا احساس اسکے سامنے جاتا ہی رہا اور آپ نے عرض کیا "میں جنت چاہتا ہوں" آپ نے سوچا ہوگا کہ اگر حضورؐ کو دعا کرنا پسند ہوتا تو از خود دعا فرما دیتے مجھ سے نہ پوچھتے مگر جب مجھ سے پوچھ رہے ہیں تو یقیناً حضورؐ کو پسند یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں آنکھ جانے پر صبر کروں اور اسی میں میرے لئے خدا کی طرف سے مصلحت، خیریت اور رحمت معلوم ہوتی ہے۔

(۴) آپ عہد فاروقی میں ۱۳ھ میں جنگ یرموک میں اپنے بڑے بیٹے یزید کی ماتحتی میں جہاد کر رہے تھے جنگ سخت تھی اسلامی فوج کچھ سُست ہو چلی تھی کہ یکایک ایک آواز خارا شگاف فضا میں گونجی، "لے نصرت خداوندی جلد آ" وہ آواز انھیں کی تھی جس سے مجاہدین کے دل از سر نو گرم ہو گئے، غرض آپ اسی طرح خدا کو یاد کرتے ہوئے دلیری سے لڑ رہے تھے کہ یکایک کسی شقی نے آپ کی اچھی آنکھ پر ایک پتھر مار دیا اور راہِ خدا میں آپ کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی۔ (رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

(۵) ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے آپ کو بنجران کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ یہ روایت اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کیونکہ حضرت ابوسفیانؓ حکومت کی خاص صلاحیتیں رکھتے تھے بلکہ بنو امیہ کے افراد عام طور سے اس صلاحیت میں ممتاز ہوتے تھے، اسی لئے اکثر ان کو آپ حکومتی ذمہ داریاں سپرد کرتے تھے اور اسی سنت کی پیروی میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے بھی ان کو

حکومتی مناصب دیے

(۶) آپ نے حضورؐ سے چند احادیث بھی روایت کی ہیں جن کو آپ سے حضرت معاویہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔

الغرض آپ نے ستانوے برس کی عمر پائی جس میں ۷۰ سال کفر میں اور ۲۶ سال اسلام میں گزارے اور عہد عثمانی میں ۳۳ھ کے اواخر یا ۳۴ھ کے اوائل میں آپ کا وصال ہوا، اور مدینہ شریف کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں مدفون ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

چند منتخب کتابیں

دعوت اسلام :۔ تالیف پروفیسر آرنلڈ، ترجمہ محمد عنایت اللہ دہلوی۔ قیمت -/۹

شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ۔ مولانا عبید اللہ سندھی، مرتبہ محمد سرور صاحب۔ قیمت ۳/۵

افریقہ ایک چیلنج :۔ از احمد عبداللہ المسدوسی۔ افریقہ کے ماضی حال اور مستقبل پر ایک غیر معمولی کتاب۔ قیمت ۱۲/۰

سطعات	لمحات	ہمعات
۱/۵۰	۲/۰	۲/۰

عربی اور فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تین رسالوں کے جدید ایڈیشن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی کی علمی خدمت کے ساتھ۔

مجموعہ وصایا اربعہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ۔ شاہ اہل اللہ، اور قاضی محمد ثناء اللہؒ کے بعض وصیت نصیحت ناموں کا مجموعہ، مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری۔ قیمت ۳/۷۵

ملنے کا پتہ

کتب خانہ "الفرقان" کچہری روڈ۔ لکھنؤ

دربارِ عالمگیری

(از مولانا مصطفےٰ حسن صاحب علوی ایم اے پی ایچ ڈی)

[جناب ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی کا یہ مضمون آپ کی ایک زیر تصنیف کتاب کا سلسلہ ہے، امید ہے ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ——— ادارہ]

عنوان سے متبادر غالباً یہی ہوگا کہ میں عالمگیر جیسی شخصیت کے احوال زندگی قلم بند کروں گا۔ اور اس کی سوانح حیات یا عہد حکومت پر تبصرہ یا تنقید کے درپے ہوں گا حالانکہ میرا مقصد یہ نہیں نہ میرا یہ مطمح نظر ہے کہ اس کے عہد حکومت پر یا اس دور کے حوادث لیل و نہار اور وقائع روزگار پر بحث اور تمحیص کو موضوع سخن بناؤں۔ مختلف پہلوؤں اور کئی کئی عنوانوں کے ساتھ اس کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ لکھا جا چکا۔ تنقیدی ہو چکیں تبصرے ہو چکے اور اس کے اعمال اور کردار پر معاندانہ اور موافقانہ نکتہ چینیاں بھی ہو چکیں اس سلسلہ میں مجھے اگر کچھ لکھنا ہے تو اس قدر کہ فی الجملہ اس کی شخصیت اجاگر ہو جائے اور مختصراً اس کی ذات متعارف ہو سکے۔ اس کا میلان طبع اور اس کے فطری رجحان اور نسلی اور خلقی افتاد اور اس پر مرتب شدہ وقائع اور حوادث کی نشان دہی ہو جائے واقعات سبب ہیں تو سرد کار نہیں اور حوادث لرزہ خیز ہیں تو کچھ مطلب نہیں۔ شخصیت کے ساتھ اگر اس کے نمایاں پہلو سامنے آجائیں گے تو وہ وہی پہلو ہوں گے جو محل نزاع نہیں اور وہی صفات ہوں گی جن پر کوئی حرف نہ آیا ہو۔ اگر کوئی اچھائی اور خوبی عالمگیر میں نہ تھی تو میں نہ کہوں گا کہ یہ خوبی اس میں تھی اور اگر کوئی بدی اور برائی اس میں تھی تو میں نہ کہوں گا کہ یہ بدی اور برائی اس میں نہ تھی۔ اس کے اسلاف اور اخلاف میں بزرگ سے بزرگ تر بادشاہ اور بادشاہیں ہوئیں اور سریر آرائے

حکومت ہوئے۔ قدر مشترک اس میں اور ان میں حکومت اور ریاست تھی۔ کسی حیثیت سے وہ موقر اور اہم تھے اور کسی حیثیت سے یہ موقر اور محترم ہوا کسی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے معنی یہ نہیں کہ صرف اس کے محامد اور صفات حسنہ و فضائل جمیلہ ہی سامنے آجائیں۔ برائیاں اور معائب اور مثالب بھی سامنے آئیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ان معائب کی تاویل کی جائے اور ان نقائص کے مفہم اور غیر مفہم اسباب اور علل لکھیے۔ ان کے اہمیت کو کم یا نیست و نابود کر دیا جائے۔ یا معائب مطلقاً سامنے ہی نہ لائے جائیں اور لائے جائیں تو ان سے اغماض کیا جائے یا دوسروں کے سامنے ان کا دفاع اور دشمنوں کے مواجہہ میں ان کے صحیح یا غلط عمل سامنے رکھ دیے جائیں۔ یا بر خلاف صفات کا حامل بنا اور اس لیے قابل ستائش شاہجہاں میں یہ یہ خوبیاں تھیں اس لیے وہ قابل مدح و ستائش اور اکبر میں یہ اچھائیاں تھیں اور عالمگیر میں یہ اس لیے یہ بادشاہوں میں ممتاز ہوئے اور جہانبانوں اور تاجوروں میں نمایاں۔ اگر ایک شخص میں حفظ و اتقان تیقظ ذہانت ذکاوت اور وسعت نظر ہے لیکن اس میں ادبیت تفقہ اور اجتہاد کی صلاحیت مفقود ہے تو کیا ضرور ہے کہ یہ بات بھی بیان کر ہی دی جائے کسی کے پاس جاگیری زمین ہل بیل اور آلات کشاورزی سب کچھ ہیں جو اس کی ثروت، دولت اور حشمت کی نامی کرتی ہیں اس کو بیان میں لاکے اگر اس کی نقدیات، اثاثہ بیت صنعتی کارخانوں اور حرفتی سازو سامانوں کے ذکر سے بالقصد یا بلا قصد سکوت اختیار کر لیا جائے تو چندان قابل ملامت اور حرف گیری کے نہیں، اس کی ثروت کی نشان دہی کرنا تھی وہ ہو چکی اور اسی پہلو کو لوگوں کے علم میں لانا تھا جو صفات کسی میں مفقود ہوں، اگر ان کو یاد نہ دلایا جائے اور جو صفات موجود ہیں ان کو سامنے رکھ دیا جائے تو کسی خورد گیری کا محل نہیں۔ بے عیب ذات وحدہ لاشریک کی ہے۔ تمام عیوب سے منزہ اور کوئی ہستی نہیں، نہ کوئی ذات ہے۔ بڑوں سے بڑوں میں نقائص صوری اور معنوی موجود ہیں اور وہ عادات اور خصائل ہیں جو قابل صد ملامت اور سرزنش ہوتے ہیں۔ ہاں جو صفت کسی میں نہیں اور تاویلات بعیدہ کے ساتھ اس کو کوئی صفت بنا کے سامنے رکھ دے تو جواب دہی ایسے کرنے والے سے ضرور ہو سکتی ہے اور جا سے کبھی ہے خوبصورتی اور جمال کو اس انداز سے پیش کرنا مناسب ہوتا ہے، جو خوبصورتی اور جمال پیش کرنے کے انداز ہیں۔ ہاں کسی بدصورتی کو مصور کا موئے قلم مناسب رنگ دے کے غیر واقعی اور غیر حقیقی حقیقت اور واقعیت بنا دے

تو اس کی خوش نظری، خوش خیالی اور حسن ظن کی چنداں داد نہیں دی جا سکتی۔ جب حمایت کا موقع ہی نہ ہو تو بے موقع اور بے محل حمایت بھی بے سود ہی ہوتی ہے۔ عظمت اور بڑائی کے پل باندھے تو باندھتے ہی چلے گئے اور نقائص اور کمزوری کے غار کھودے تو کھودتے ہی چلے گئے۔ نہ وہ افراط محمود ہے نہ تفریط اور کسی کے ہنر کے نقوش کو ہی ہنر کی حیثیت سے نہیں بلکہ عیوب کی حیثیت سے غیر ملائم اور نامناسب رنگوں سے بھر دیا گیا تو قابل اور درخور ملامت۔ اگر انسانیت اور آدمیت علم ہنر ثقافت دین و مذہب کو کثرت سے کسی نے فائدہ پہونچایا تو اس کی تعریف زبانوں پر آتی ہے اور اس کی مدح و ستائش لکھنے کے لیے انگلیوں میں قلم دبا لیے جاتے ہیں لیکن شاذ و نادر قتل و غارت نہب و سفاکی کے تذکرے مفصل اور ناقابل اعتنا ہو جاتے ہیں۔ وقتی ماحول اور زمانے کے تقاضوں سے اس وقت اور زمانے کے کسی ممتاز کردار اور اس کے حسن عمل کی داد دینا چاہیے اگرچہ مرور ایام اور امتداد زمانہ کے اثرات، بعد سے وہ معیار کوئی بلند معیار نہ رہے۔ آج اگر کسی علم اور عمل کی قدریں آنکھوں میں نہ آئیں تو اس وقت کی قدروں کو سامنے لانا ضرور چاہیے جب وہ قدریں سمجھی جاتی تھیں۔ اگر کسی زمانہ کی جمہوریت نے مختلف صورتوں سے عوام کو فائدے پہونچائے تو اس جمہوریت کی داد دینا ہوگی۔ اس طرح اگر کسی شخصیت سے عوام و خواص اصاغر اکابر اعالی اسافل کو کل شخصی ذاتی، معاشرتی، دینی مذہبی اور اجتماعی فائدے پہونچے تو ان فائدوں اور شخصیتوں کو ضرور بالضرور سامنے لے آنا چاہیے خواہ آج ان کی افادیت افادیت نہ بھی رہی ہو۔ آج کی سوسائٹی اور سیاست اگر کسی شخص یا فرد کی اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر ایک بدنما اور دھبے پڑی ہوئی تصویر اتار کے سامنے رکھ دے تو برا ہے اسے انصاف کوئی مستحسن عمل ہرگز نہ کہے گا کسی شخص کی تندی مزاج اور اس کی سختی اور جذبات انتقام کو سامنے رکھنا اور ان کے ماتحت سزا دینا تو ذہن میں رہے لیکن جرم اور اس کی نوعیت اور اس کی کیفیت کو فراموش کر دینا تو یہ عدل نہ ہوگا۔ فلاں جرم کی یہ سزا ہونا تھی لیکن سزا دینے والے نے سزا نہیں دی بلکہ اس کے برخلاف اپنے لطف و کرم سے سزا گھٹا دی یا مطلق دی ہی نہیں تو یہ بھی قابل ستائش ہے اگر کوئی ایسی خطا کا مرتکب ہوتا ہے اور کوئی ایسا جرم کرتا ہے جس کے مقابل دوسری خطائیں اور دوسرے جرم بڑھے چڑھے تھے تو اس میں یہی ستائش کا پہلو

نکل سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے لوگ اگر اپنے ہی میں سے کسی بڑے کو اپنی اپنی بصیرت اور سمجھ سے اپنے سے بھی بڑا سمجھنے لگیں تو یہ اس شخص کی بڑائی کی دلیل ہے۔ ایک عالم اور ماہر فن اگر اپنے ہی جیسے ماہر فن کی تعظیم و تکریم غیر معمولی کریں یا ایک بہادر دوسرے بہادر کو اپنے سے زائد بڑا سمجھے یا ایک دولت مند کو اس جیسے دولت مند کسی اور نقطۂ نظر سے معظم و محترم جانیں تو اس سے اس کی عظمت و توقیر میں بیمار چاند لگ جاتے ہیں۔ نپولین جیسے کمانڈر کی دوسرے ہم درجہ کمانڈروں کی نگاہ میں غیر معمولی عزت و توقیر رہی یا ایک طبیب سے دوسرے اطبا جو ہم درجہ ہیں زائد متاثر ہوں تو یہ اس کے لیے خاص امتیاز کا سبب بنے گا۔ اگر ایک بڑا شخص چھوٹوں سے محبت اور پیار سے پیش آئے اور ان کے رکھ رکھاؤ کو ہمہ وقت دل میں رکھے تو یہ اسے دوسرے بڑوں کے مقابلہ میں اور محبوب بنا دے گا۔

بابر شجاعت کا ایک مجسمہ، بہادری کا پیکر کشور کشائی میں ممتاز بلند پایہ بادشاہ تھا اسی کے ساتھ ساتھ علم و ثقافت کا دلدادہ، عارف باللہ صوفیہ اور اولیا و مشائخ، اہل فضل و دانش کا قدردان، علم نواز، ہنر پرور، محبت شفقت اور انس سے لبریز دل رکھنے والا شخص اور پُر شکوہ سخن فہم سخن سنج، شاعر دماغ، شاعر دل اور شاعر پسند اور خوش طبع فرمان روا تھا۔ یا ہمایوں علم ہیئت اور ریاضی کا ماہر، بلند مرتبہ شاعر، نکتہ سنج، دقیق النظری اور معانی آفرینی میں ممتاز تھا۔ ایک سلیم فطرت رکھتا۔ سخن گستر تھا اور آلات رصدی کرہ و اصطرلاب کی شناخت میں ید طولیٰ اور درجہ کمال رکھتا۔ زہاد اور اتقیا کا مرجع، محاسن معنوی اور فضائل صوری سے آراستہ علم نواز، شریعت پرور تھا۔ اس کے ساتھ جدت پسند فواحش و منکرات سے حتی الوسع محترز، صوم و صلوٰۃ کا پابند ایک کشور کشا تاجور تھا۔

اکبر کو علمی اور ادبی ذوق و شوق تھا، علوم و فنون کا قدردان، علم دوست اور ادب پرور تھا۔ علما اور فضلا سے اسے دلچسپی تھی اس کی سرپرستی میں مفید مفید تصانیف کی گئیں اور تالیفات تیار ہوئیں اس میں ایک سیاسی سوجھ بوجھ بھی تھی اور اس کے دور حکومت کو ایک خاص عظمت اور شوکت حاصل رہی۔ اس ذکر کے بعد یہ کیا ضروری ہے کہ یہ بھی کہہ دیا

جائے کہ وہ خود ای محض تھا اور اسے اس توجیہہ کے ساتھ خوبصورت بنایا جائے کہ علوم ظاہری کی جگہ اسے علم لدنی حاصل تھا اور جو کچھ عقل و دانش اور علمی دستگاہ اسے حاصل تھی وہ الہامی اور خداداد تھی۔ جہانگیر ایک انشاپرداز اور ایک بلند پایہ نقاد اور نکتہ چین گزرا ہے۔ خود شاعر تھا اور شاعر دوست بھی۔ اور علماء دین کا سرپرست اور قدردان علم پروردار جوہر شناس تھا درویشوں، پنڈتوں اور غیر مسلموں سے بھی فراخدلی اور عقیدت مندی سے ملنے والا صوفیا کی صحبت کا دلدادہ تھا اور ان کے سرچشمہ علم و فضل سے سیراب ہونے کی دل میں لگن رکھتا لیکن باوجود ان مستحسن اور قابل پذیرائی اعمال اور کردار کے اس سے لغزشیں ہوئی اور خطائیں کا مرتکب ہوا۔ اسی طرح شاہجہاں فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اس کے ذوق طبع کی خوبی اور نفاست مزاج کی اچھائی کی وہ تعمیری یادگاریں ہیں جو آج تک عالم کے نوادر میں شمار ہوتی ہیں۔ تاج محل کا روضہ، تخت طاؤس اور قلعہ معلی کی تعمیر نے اسے شہرت دوام کا طغرائے امتیاز دے دیا۔ دیوان خاص اور دیوان عام کے در و دیوار اس کے حسن ذوق اور ہنرپسندی کی داد دے رہے ہیں۔ اس کی زرپاشیوں اور فیاضیوں سے علماء ادبا شعراء ادبا بہرہ اندوز رہے۔ اس کا صحیفہ حیات کا کوئی صفحہ علمی دلچسپیوں سے خالی نہیں اس نے کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی اور اگر چھوڑی بھی تو اس میں جہانگیر جیسی ادبی رنگینی جزالت اور روانی نہیں نہ عالمگیر کی متقیانہ سلاست اور برجستگی۔ عالمانہ نظر رکھتا محقق تھا۔ حکمت بھری باتیں کرتا اور رائیں قائم کرتا دور اندیش تھا اور محتاط۔ عالمگیر اقلیم ہند کا تاجدار اور ہمالیہ سے لیکے راس کماری تک کے محاصل کا محصل کہ ناٹک کا حاکم اور چاٹگام سے لیکے غزنی تک کا فرمانروا اور مصالح کا نگہداں، گلستان تیموری کا گل سرسبد تاج مغلیہ کا تابندہ گوہر دستار بابری کا طرہ امتیاز، دامن شاہجہاں کا گل تر۔ عمان کرم کا درثمین آسمان سخاوت کا بدر کامل، شبستان ممتاز محل میں ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۶۱۷ء کو شب کو صوبہ گجرات کے دودھ قصبہ میں یہ شمع روشن ہوئی۔ نام اورنگ زیب رکھا گیا۔ قاسم پیدائش نامائم اور ناشنو شگوار تھا۔ اور جین آئے جشن وضیافت شایان شان تزک و احتشام سے منایا گیا۔ شاعر دربار طالع کلیم نے آفتاب عالم تاب اور کسی اور شاعر نے گوہر تاج ملک اورنگ زیب سے تاریخ ولادت نکالی۔ ابوالمعالی محمد معصوم خان جیسے صاحب تقویٰ و ورع کی نگرانی میں پرورش پائی۔ اردو، فارسی، عربی اور فارسی کی تعلیم پائی اور فارسی کتب اپنے

وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے پڑھیں اور یہ جو بعد کو شہنشاہ ابوالظفر محی الدین عالمگیر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ حافظ قرآن بھی تھا' امام غزالی کی احیائے العلوم کیمیائے سعادت اور صوفیا میں سے یحییٰ منیری وغیرہ وغیرہ کے مکتوبات اور ملفوظات اکثر و بیشتر اس کے مطالعہ میں رہتے اور تفسیر حدیث و فقہ کے معیاری فنون اور شروح پڑھتا اور سناتا رہتا فن انشا اور حسن خط میں دستگاہ کامل رکھتا۔ ایام شہزادگی میں باپ کے یہاں سے ایک معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جو تدریجاً بڑھتا گیا جب سن شعور کو پہونچا تو سب سے پہلے باپ نے دکن میں فوج کا کمانڈر بنایا پھر دکن کا ناظم اور گورنر بنا دیا گیا۔ منصب میں ترقی پائی۔ پہلے ایرانی خاندان کی ایک لڑکی دلرس بانو سے شادی ہوئی پھر اور اور بیگمات بھی اس کے حبالۂ نکاح میں آئیں۔ رفتہ رفتہ پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیوں کا باپ بنا۔ اس کے نوشتۂ تقدیر میں یہ بھی تھا کہ خاندانی اور برادرانہ رقابت اور عداوت کا شکار بن کے باپ کی نظروں سے گر جائے معزول ہو۔ اور دکن کی نظامت منصب کے عطیات اور جاگیریں سب سے محروم کر دیا گیا۔ بعد چندے اس نے اپنی ذاتی اہلیت اور طبعی صلاحیت سے باپ کے دل میں پھر جگہ کر لی اور بلخ اور بدخشاں کی مہم اسے تفویض ہوئی اور اس میں کامیابی کا سہرا اس کے سر باندھا گیا۔ ایک وقت وہ آیا کہ پنجاب کے صوبہ ملتان کا صوبہ دار بنایا گیا۔ قندھاری کی کمان بھی اس کے ہاتھ میں آگئی اور سندھ میں بھی اس نے کچھ کم کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے۔ زندگی میں اس کے لیے بڑے بڑے ابتلا کے وقت آئے اور کٹھن سے کٹھن آزمائش کی گھڑیاں پڑیں اس نے طعنے سہے تشنیع اور سب و شتم برداشت کیے۔ حاسدانہ تیروں نے اس کے [illegible] اور دماغ کو نشانہ بنایا اور مخالفت کے تیروں نے اس کے سینے کو چھلنی کیا۔ اس کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے گئے۔ قدم قدم پر اس کی ہلاکت کے لیے [illegible] گئے مگر اس نے صبر و شکیب تحمل اور برداشت کے جادوں سے قدم نہ ہٹائے۔ اور [illegible] نہ آئے۔ اس کی تمنا دل کا خون ہوا۔ اس کو مایوسیوں نے گھیرا۔ یاس اور حرمان سے دوچار رہا لیکن اطاعت اور استقامت کا دامن اس نے نہ چھوڑا۔ باپ کی نظروں میں اسے بے ایمان اور غدار بنایا گیا۔ وقتاً فوقتاً اس کی شکایتیں کی گئیں۔ اس کی کانوں میں پڑتی رہیں۔ دیکھتا رہا' سنتا رہا مگر صبر کرتا رہا۔ اجیروں اور ملازموں کی دلداری اور سفارشیں اور نذر بھینٹوں اور [illegible]

کے وظیفوں کی حمایت کرتا۔ ناکتخداؤں بیواؤں اور رانڈوں کو ٹھکانے لگانے اور ان کے نکاح میں مددگار بنتا۔ اس کے یہاں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ تھی۔ مسلمان جس طرح مستفیض ہوتے ویسے ہی دوسرے مذاہب والے بھی۔ دور بنی امیہ کے برخلاف عہد عباسیہ کی طرح مغلوں میں بھی پوری زمام اختیار تقریباً ایک ہی ہاتھ میں اور سیاست مذہبی اقتدار کے ماتحت تھی عالمگیر نے اپنی عاقبت اندیشی اور دور رس دماغ سے اسے نباہا۔ اور "علیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود" پر عامل رہا۔ ڈپلومیسی اور پرفتنہ و فریب حکمرانی اور سیاست سے دامن بچائے رہا۔ جب شاہجہاں کے بیٹے حکمرانی کے لیے صرف آپس ہی میں نہیں بلکہ باپ تک سے دست و گریباں ہوئے اور ہندوستان کی سرزمین خونیں مناظر پیش کرنے لگی۔ تو اس نازک دور میں اس نے قدم اٹھایا اور اپنی شجاعت بہادری تدبر اور استقلال سے سریر آرائے حکومت ہوا۔ ناموزوں جداگانہ کو اس نے دبایا۔ اور ہندوستان میں اسلام کی ڈوبتی کشتی پھر سطح آب پر لے آیا۔ اس کی طبیعت میں انتہائی خاکساری تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسے اپنے مفاخر اور مکارم کی داستان ناپسند خاطر ہوئی اور اس نے وہ محکمہ ہی ختم کر دیا جو اس کام کو انجام دیتا تھا۔ اسے علم و ہنر سے محبت نہیں بلکہ انتہائی شغف تھا۔ اور اسی کے پیش نظر اس نے قصبوں اور شہروں میں مکاتب اور مدارس قائم کر دیے تھے۔ اور ان میں منتخب اور چیدہ چیدہ اساتذہ مقرر تھے۔ اور طلبہ کی تشویق کے لیے وظائف بھی جاری تھے۔ فصاحت و بلاغت ہمیشہ اہل ذوق سخن سنج اس سے تعلیم و تربیت انشا اور نثر میں حاصل کرتے۔ اللہ نے اسے ایک قادر البیان زبان اور میانہ رو دل دے رکھا تھا۔ میدان سخن میں اس کا شدید قلم خوب خوب چال دکھا گیا۔ اس کی تحریروں کی بندش خواہ اوامر و نواہی پر یا قرامین و عطیات پر مشتمل ہوں ایک عجب تاثیر اور کیف آور ہوتیں۔ سیاسی اور معاشرتی اجتماعی شادی و غم حزن و شادمانی۔ عتاب و تنبیہہ و تہدید احوال نگاری شکوہ و شکایت ایک دلکش اور جاذب نظر طرز بیان سے بھری ہوئی ہوتیں۔ اس کی تحریروں میں واقعات کے انبار تلمیحات کی بہتات اور وسعت معلومات اور اطلاعات کے سرچشمے خوب خوب ملتے ہیں۔ اسے سحر آفریں ادیب کہیں تو بیان واقعہ اور ایک معجز نگار انشا پرداز کہیں تو اظہار حقیقت ہے۔ اس کی انشا میں آیات قرآنیاں درویشوں، فقیروں، بزرگوں اور شائخ

سے اسے خاص دلچسپی رہی۔ مکروہات اور منہیات سے خاص طور پر اجتناب اور حتی المقدور احتراز برتا۔ فرائض مذہبی کی انجام دہی اور ادائے عشر و زکوٰۃ میں خاص اہتمام سے کام لیا۔ شرعی احکام کی پابندی جہاں تک ہوا بے حد کی۔ زبان پر اکثر و بیشتر کلمہ طیبہ اور درود سرے اوراد رہتے۔ نوافل و سنن کی ادائیگی میں بھی عدم تساہل اور تساہل نمایاں ہی رہا۔ حق پرست اور حق پسند تھا۔ فن خطاطی میں بھی یگانۂ عصر ہوا اور یہ حصول دنیا کیلئے یا نام آوری کے لیے نہیں بلکہ آخرت اندوزی کے لیے بھی اور اخروی نجات کے لیے۔ شاہان تیموریہ میں یہ امتیاز صرف اسی کو حاصل ہوا کہ اس نے کلام پاک حفظ کیا۔ اور پھر اپنی عمر کے تینتالیسویں سال میں اس نے سلوک و طریقت کے مختلف مراحل میں قدم رکھے اور تصفیۂ باطن اور تزکیۂ نفس میں جد و جہد کی اور نجات سرمدی اور فلاح ابدی کے حصول میں کوشاں رہا کیا۔ غیر شرعی لباس اور چاندی سونے کے برتنوں کے استعمال اور آلات ملاہی و ملاعب سے محترز رہا۔ بہت علم پرور اور بڑا علم دوست تھا۔ اور اس کا دور حیات بڑے بڑے علماء، بڑے بڑے فضلا ادبا، نامور محققین محدثین اور فقہا کے نقطۂ نظر سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے ان میں وہ تھے جن کا اس سے بالواسطہ تعلق تھا اور وہ تھے جو اس کے عطیات اور نوازشات سے ہی مستفید اور مستفیض ہوتے اور وہ بھی تھے جن کا دربار سے بلاواسطہ الحاق تھا۔ اور وہ بھی تھے جن سے یہ براہ راست استفادہ اور کسب کمال کرتا اور وہ بھی تھے جو اس کی ذات اور شخصیت میں کمال اور امتیاز پیدا کرنے اور کرانے میں ممد اور معاون ہوتے۔ جن کے علوم و فنون کی فراوانی اور وسعت نظر کی بہتات اس کے لیے مایہ دانش و بینش تھی۔ اور جن کے سامنے تلمذانہ آداب اور طور و طریق اور نیاز مندانہ انداز سے پیش آتا رہا۔ منجملہ ان کے ایک شیخ احمد تھے جو ملا جیون کے عرف سے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں اور آج بھی ان کی علمی عظمت اور رفعت لوگوں کے ذہنوں اور دماغوں میں موجود ہے۔ رحمہ اللہ۔

ملا جیون

عالمگیر سے تعلق ان کا اورنگ زیب عالمگیر کا بلاواسطہ شاگردی اور استادی کا تعلق تھا۔ عالمگیر نے ان سے متداول بعض درسیات کے علاوہ دوسری کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ یہ ان کی دینی رتبہ اور علمی منصب کے شایان شان بڑی عظمت اور توقیر کرتا اور شاگردانہ

لحاظ اور آداب سے بخوبی آشنا۔ مسلسل چھ برس تک عالمگیر کی دکھنی فوج میں کسی منصب پر فائز بھی رہے۔

آپ کے والدین آپ کے والد بزرگوار کا نام نامی ملا ابوسعید ہے اور آپ شاہ عالمگیر کے داروغہ مطبخ (میر آتش) عبداللہ عرف نواب عزت خاں سیٹھوی کی ہمشیرہ کے بطن سے پیدا ہوئے آپ دو بھائی تھے۔ بھائی کا نام ملا بڈھن تھا۔

تاریخ ولادت روز سہ شنبہ وقت صبح صادق ۲۵ شعبان ۱۰۲۷ھ آپ کی تاریخ پیدائش ہے۔ ملا سعید اپنے والد ماجد کے سایہ عاطفت میں پلے اور آپ نے سات برس کی عمر میں کلام پاک حفظ کر لیا اور بقول خود[1] اگرچہ قواعد تجوید اور اعراب سے واقف نہ ہوئے

آپ کی تعلیم و تربیت و غیرہ تھے تاہم الفاظ مہملہ اور منقوطہ کو صحت کے ساتھ ادا فرما لیتے۔ صرفی اور نحوی قاعدہ اور اصول کے نہ جانتے ہوئے بھی فاعل اور مفعول کو سمجھ کے ترجمہ کر لیتے۔ درس نظامیہ کا نصاب تھا نہ کتب درسیہ میں تقدیم و تاخیر ملحوظ خاطر تھی پھر بھی ان علوم ظاہریہ متداولہ میں مہارت اور پوری دست رس حاصل کی۔ ۲۲ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ اور درس دینا شروع کر دیا۔ طلبہ کا آپ کے گرد ہجوم رہتا۔ چالیس سال کی عمر تھی کہ آپ نے اجمیر اور دہلی کو اپنی

حج کے لیے روانگی اقامت گاہ بنایا اور ہزاروں کو علوم ظاہریہ سے مستفید کیا۔ ۵۵ سال کی عمر میں پہلی بار حرمین شریفین کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ قدرے دکن میں بھی قیام پذیر رہے۔ ۵ سال حرمین میں اقامت گزیں ہونے کے بعد دکن پھر واپس ہوئے اور یہی وہ زمانہ ہے کہ جب شاہی

دکن میں قیام قلعوں سے آپ کا الحاق رہا اور شاہ عالمگیر کے دربار میں آمد و شد اور تلمذانہ ملاقات کے دوران سیکڑوں اور ہزاروں کے مقاصد دینوی کے حصول کا ذریعہ بنتے رہے۔ اسی دوران میں یہ خیال پیدا ہوا کہ والدین کی طرف سے حج بدل کیا جائے۔ خدا سے دعا کرتے رہے ادھر اپنے والد ملا سعید کو خواب میں دیکھا کہ وہ حج بدل کے طلبگار ہیں۔ ادھر دعا قبول ہوئی اور توفیق الٰہی شامل حال ۱۱۱۲ھ کو عالمگیر کی بادل ناخواستہ اجازت حاصل کر کے حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۶۶ سال تھی اور تین سال واپسی کے بعد دکن میں پھر قیام

مراجعت وطن کر کے ۱۱۱۶ھ میں مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ اب عمر کا ستر واں سال تھا۔

---

[1] سوانح خود نوشت ملا جیون، بحوالہ تفسیر جیئن (مخطوطہ)

دو سال یہاں رہے محمد معظم بادشاہ خلد منزل کے جلوس کے پہلے سال ۲۵ محرم کو طلبہ اور شاگردوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ شاہجہان آباد کا سفر اختیار کیا صفر کے آخری چہار شنبہ کو دہلی پہونچے معظم بادشاہ اس وقت موجود نہ تھے۔ دکھن سے واپس آتے ہوئے اجمیر میں ان سے ملاقات ہوئی اور بادشاہ ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو باصرار اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ وہاں چند ے قیام رہا کہ بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ نے پھر شاہجہان آباد مراجعت فرمائی اور اپنی عمر کے ۸۳ ویں سال تک وہاں مقیم رہے۔ اسی دوران میں شاہ فرخ سیر بادشاہ غازی ابوالمظفر

آپ کے ہم عصر | معین الدین سے ملاقات ہوئی اور اپنی فیاض طبیعت اور فطرۃً فیض رساں ہونے کے باعث اپنے اہل وطن اور دوسرے ارباب حاجت کی بادشاہ کے دربار سے حاجت روائی میں دل و جان سے مدد کی۔ اور ان کو مرفہ حال بنانے میں معاون ہوئے۔

آپ کا وصال | شروع ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۰ھ سے ہی آپ نے اپنے ارتحال کی خبر دینا شروع کی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح وطن پہونچ کے جان بحق تسلیم ہو۔ بے چین رہتے اور مضطرب کہ کسی طرح اڑ کے وطن پہونچ جائیں لیکن قضا و قدر کا تقاضا اس کے خلاف تھا۔ آپ کی تمنا پوری نہ ہوئی۔ ۸ ذیقعدہ دوشنبہ کے روز سنہ ۱۱۳۰ھ کو حسب معمول اوراد عادت طلبہ کے درس و تعلیم سے فارغ ہوئے نماز مغرب معہ اوابین وارد و وظائف ادا کی۔ رات کا کھانا تناول فرمایا۔ عشا پڑھی اور سنن و نوافل ادا کیں نصف شب گزری تو سینہ میں کچھ سوزش محسوس کی جو بڑھتے بڑھتے پہلو میں بھی ہونے لگی۔ شام کے وقت کوئی ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو فرمایا تھا کہ کوئی عالم کامل دنیا سے رخصت ہونے کو ہے۔ درد کی حالت میں اپنے بیٹے ملا عبدالقادری سے جو موجود تھے فرمایا کہ وقت آخر ہے اور یہ کہہ کے جامع مسجد دہلی کے جنوبی دالان کی طرف ایک کوٹھری میں جا کے لیٹ گئے۔ کلمہ طیبہ ورد زبان تھا کہ روح اطہر جسد عنصری کو چھوڑ راہی جنت ہوئی۔ ۹ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۰ھ کا دن تھا ظہر کے وقت آپ کی میت کو میر محمد شفیع کے تکیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۱۴ محرم سنہ ۱۱۳۱ھ چہار شنبہ کے دن پچاس روز کے بعد آپ کی

لہ تذکرہ ملا جیون مخطوطہ ملا عبدالقادر ابن ملا جیون ۲ تذکرہ ملا جیون از ملا عبدالقادری مخطوطہ

میت کو ایک تابوت میں رکھ کر امیٹھی لایا گیا اور وہاں قدیم مدرسہ اسلامیہ کے ملحق مقبرہ میں دفن کر دیا گیا۔ شیخ تاریخ محمد بن ملا سرکھی نے جو آپکے استاد زادے اور شاگرد بھی تھے، مندرجہ ذیل وفات کی تاریخ لکھی۔

محیط علم آن مولائے اعظم — باحمد عرف جیون شد معلم
جہاں را روشنی زاں شمع دین بود — بعلم ظاہر و باطن مسلم
چو رحلت کرد در ذیقعدہ تاسع — بوصل دوست خود گشتہ مکرم

بتاریخش خرد داد ا گوشم
ندا از کامل و فیاض عالم

۱۱۳۰

مزار مبارک پر ویسیم نعمۃ علیات سنہ ۱۱۳۰ھ کی لوح لگی ہوئی ہے۔ آپ سلسلہ قادریہ میں مرید تھے اور مجازانہ بیعت بھی اور سلسلہ چشتیہ سے بھی آپ کا سلسلہ ملتا تھا۔ (باقی)

کچھ نئی اور پرانی علمی ادبی کتابیں

فلسفہ شریعت اسلام: تالیف:۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی۔ ترجمہ:۔ محمد احمد رضوی قیمت ۵/-
عظماء کے معاشقے (نظریات: ۱ فرجارج سول ترجمہ ڈاکٹر ایس ایم اختر مولانا غلام رسول مہر قیمت ۶/-
مومن۔ (حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر) از کلب علی خاں فائق رام پوری۔ قیمت ۵/۵۰

یہ تینوں کتابیں عمدہ سفید کاغذ پر نفیس ٹائپ سے چھپی ہیں

روزگار فقیر

از فقیر سید وحید الدین

(علامہ اقبال سے چند ملاقاتوں کی یادداشت)

بہترین آرٹ پیپر پر نظر فروز طباعت مصور قیمت ۷/۵۰

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ۔

مطالعہ

لبرل اسلام

وحید الدین خاں

"اگر ہمارے مجوزہ تنقیدی طریقہ کے مطابق شریعت کے پورے ڈھانچے کی جانچ کی جائے تو ظاہر ہو کہ مذہب کے قدیم اور جامد سانچہ کی جگہ ایک نیا پروٹسٹنٹ اسلام (PROTESTANT ISLAM) جنم لے گا۔ جو بیسویں صدی کی زندگی کے حالات سے مطابقت رکھتا ہوگا۔ وہ ماضی کے سوکھے ہوئے درخت کو کاٹ ڈالے گا اور مستقبل کو پر امید شکل میں دیکھ رہا ہوگا۔ اس نئے مذہب کا نام رکھنے کے لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تاہم اگر اس کو کوئی نام دیا جا سکے تو اس کو لبرل (آزاد) اسلام (LIBERAL ISLAM) کہنا صحیح ہوگا۔" صفحہ ۱۰۴

یہ آصف فیضی صاحب کے الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب:

A MODERN APPROACH TO ISLAM

میں تحریر فرمائے ہیں۔ مسٹر آصف فیضی (ASAF A.A. FYZEE) جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی صف میں ایک نمایاں آدمی ہیں۔ وہ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم سینٹ زیویرس کالج بمبئی اور سینٹ جانز کالج کیمبرج میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں ایک قانون داں کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ ۴۷-۱۹۳۸ء کے درمیان وہ گورنمنٹ لا کالج بمبئی میں اصول قانون کے پروفیسر نیز اس کے پرنسپل رہے۔ ۴۹-۱۹۴۷ء میں وہ بمبئی پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے اور ۱۹۴۹ء میں قاہرہ میں ہندستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ دوبارہ

ہندوستان واپس آئے اور یونین پبلک سروس کمیشن نئی دہلی کے ممبر نامزد کیے گئے۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک وہ کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ۱۹۵۵ء میں فیضی صاحب کا انتخاب عرب اکیڈمی دمشق کے نمائندہ ممبر کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں ہندستان کے صدر کی طرف سے پدم وبھوشن کا خطاب عطا کیا گیا۔

فیضی صاحب اس وقت انگلستان میں ہیں اور کیمبرج کے اپنے پرانے کالج میں پروفیسر ہیں۔ وہ متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ موصوف کی مندرجہ بالا کتاب جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، وہ جدید تقاضوں کے مطابق اسلام کی نئی تشریح و تعبیر کے مسئلہ پر لکھی گئی ہے۔ یہاں اس پر کوئی تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ البتہ میں اس کا ایک مختصر تعارف پیش کروں گا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے۔

مصنف کتاب کے آغاز میں سب سے پہلے یہ سوال کرتے ہیں:

WHAT DOES ISLAM STAND FOR?

یعنی اسلام سے کیا مراد ہے؟ (صفحہ ۱) اس کے بعد جواب دیتے ہیں کہ اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہو سکتا۔ اس کا انحصار اس "وقت" پر ہے جب وہ پوچھا گیا، اس ملک پر ہے جہاں اس سوال کا جواب دینا ہو، اور اس "شخص" پر ہے جو یہ جواب دے رہا ہو۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کی چند صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک ہے تاریخی طریقہ (Historical Method) اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو ایک ایسی چیز سمجھا جائے جو تاریخ میں سفر کر رہا ہے۔ اس ڈھنگ سے اگر ہم اسلام کے تاریخی رجحانات کا مطالعہ کریں تو ہم کچھ نتائج تک پہونچ سکتے ہیں۔ (مثلاً ابتدائے اسلام میں مسلم سوسائٹی پردہ کی سختی سے عامل تھی، اب مسلم سوسائٹی میں پردہ تیزی سے اٹھ رہا ہے) دوسرا طریقہ (عقیدتی طریقہ Dogmatic Method) ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی اصل تعلیمات اور شریعت کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس سے جو کچھ ملے بس اسی کو ہمیشہ کے لیے فیصلہ کن قرار دیا جائے۔ اسی طرح اور دوسرے طریقے۔

اس کے بعد کتاب کے پہلے باب میں روح اسلام (THE ESSENCE OF ISLAM) کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلامی خیالات کا تعارف ہے جو گویا آئندہ بحثوں کے

لیے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف کے نزدیک مولانا آزاد اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ انتخابی (ELECTIC) بھی تھے۔ یعنی وہ تمام بڑے مذاہب کی صداقتوں کو ماننے پر زور دیتے تھے اس تعارف کا ماخذ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ ہے۔

مصنف کی تشریح کے مطابق مولانا آزاد کے افکار کا خلاصہ یہ ہے۔

قرآن جس زمانے میں اترا، مذہب ایک طبقاتی چیز بنا ہوا تھا۔ ہر طبقہ کا مذہب اپنے ساتھ اعمال و رسوم کی ایک فہرست لیے ہوئے تھا۔ یہ فہرست چونکہ ہر ایک کے یہاں مختلف تھی، اس لیے ہر ایک دوسرے کو غلط سمجھتا تھا اور صرف اپنے مقررہ اعمال و رسوم کی بجا آوری کو نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس صورت حال کے فطری نتیجے کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف تعصب اور تشدد کا سلسلہ جاری تھا۔ قرآن نے اس غلطی کو واضح کیا۔ اور مذہب کی آفاقی صداقت (UNIVERSAL TRUTH) کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اسلام نے بتایا کہ یہ اعمال و رسوم جن کو اصل قرار دے کر تم نے گروہ بندیاں کر رکھی ہیں، یہ اصل مذہب نہیں۔ مذہب کی روح تو خدا پر اعتقاد ہے۔ اور وہ سب کے یہاں ہے۔ گویا ہر مذہب یکساں طور پر صداقت کا حامل ہے خواہ ظاہری اعمال و رسوم میں ان کے درمیان کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ اس طرح قرآن مذہب کی روح (ESSENCE OF RELIGION) اور اس کے ظاہری طریقے (RITUAL) کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اصل مذہب ایک ہے اور تمام انسانیت کے لیے یکساں ہے۔ ظاہری طریقے ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے جدا ہوتے ہیں۔ انسان مذہب کی بنیادی وحدت کو بھول جاتا ہے اور ظاہری اعمال کے اختلاف کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ حالانکہ خارجی اعمال اور سماجی طریقے انسان کی روحانی نجات میں کوئی حقیقی موثر کی حیثیت نہیں رکھتے (صفحہ ۳، ۲۲-۲۳)۔

اس طرح مصنف اس نتیجے تک پہونچتے ہیں کہ کسی عملی ڈھانچہ کو لازمی قرار دے کر ہر شخص، ہر ملک اور ہر زمانہ کے لیے اس کی تعمیل پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔ جس چیز کے لیے اصرار کیا جا سکتا ہے، وہ مذہب کی اصل روح ــــ اس کا عقیدہ ــــ ہے۔ ظاہری اعمال نہ ضروری ہیں اور نہ ہمیشہ یکساں رہ سکتے ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ہے قانون اور مذہب اسلام میں (LAW AND RELIGION IN ISLAM)

جدید علمائے قانون کی تحقیق کے مطابق انسانی قانون تین مراحل سے گزرا ہے:

ابتدائی مرحلہ:۔ جبکہ قانونی رواج تھے مگر عدالتیں نہیں تھیں۔

درمیانی مرحلہ:۔ جبکہ عدالتیں وجود میں آگئی تھیں مگر قانون داں نہیں ہوتے تھے۔

ترقی یافتہ مرحلہ:۔ جبکہ قانون کے ساتھ عدالت اور قانون داں بھی موجود ہیں۔

معلوم ہوا کہ قانون کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو زندگی سے الگ ایک چٹان کی طرح کھڑا ہو۔ وہ زندگی کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ماہر قانون جسٹس ہومز (HOLMES) کے الفاظ میں:

"اگر تمہارا موضوع قانون ہے تو جان لو کہ وہ علم الانسان، اقتصادیات، قانونی نظریات، اخلاق اور پھر مختلف راہوں سے گزرتا ہوا آخر تمہارے نظریۂ زندگی تک پہونچتا ہے" صفحہ ۲۸

"ایک اہم قابل لحاظ حقیقت" مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ "ہندوازم کی طرح اسلام میں قانون خدا کا بنایا ہوا (GOD MADE) ہوتا ہے۔ انسانی تقاضے، سیاسی ضروریات، تمدنی زندگی اور ارتقائی تحریکات، علم الانسان کے تاریخ مطالعہ، حتیٰ کہ انسان کے اپنے عادلانہ تصورات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ قانون کا معیاری تصور یہ ہے کہ وہ ایک حکم ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ فقہ کی عمارت انھیں الٰہی الفاظ پر قائم ہوتی ہے۔ اس طرح قانون کا ماخذ اور اس کا آخری مقصد دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ (یعنی قانون عملاً تو نافذ ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی پر مگر انسان اپنی زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر خود قانون بنانے کا حق نہیں رکھتا) جدید یورپی قانون میں عوام کی خواہش قانون کی ماخذ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے معاملات میں ایک نظم کے تحت لوگوں پر عدل قائم کیا جائے۔ اسلام میں اس کے برعکس قانون کے نفاذ کا مقصد خدا کی رضا حاصل کرنا ہے۔ مشہور مستشرق (SNOUCK HURGRONJE) کے الفاظ میں ـــــ یہ ادائگی فرض کا ایک اصول ہے۔ اس میں انسان خدا کے مقابلہ میں خود اپنا کوئی حق نہیں رکھتا۔" (صفحہ ۲۹)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بعض مذاہب مثلاً ہندوازم اور اسلام میں قانون کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنی آخری شکل میں خدا کا حکم ہے۔ یہ نظریہ کہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے، قانون کی زبان میں صرف ایک قانونی من گھڑت (LEGAL FICTION) ہے جس کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ قانون کی مکمل

اطاعت کے لیے اخلاقی فضا پیدا کی جائے۔ اس طرح ایک قانونی معیار (LEGAL NORM) سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ قدیم قومیں جن میں نظم اور سماجی احساس اس حد تک نہیں تھا کہ وہ خود اپنے فائدے کی خاطر قانون کی پیروی کریں، اس وقت یہ خوف دلایا گیا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر خدا کا عذاب ہوگا تاکہ لوگ قانون کی پیروی کریں۔" صفحہ ۳۳

قانون (LAW) اور مذہب (RELIGION) دونوں کا ماخذ ایک ہونے کی وجہ سے مذہبی عقائد کی طرح قانون بھی ایک حالت پر باقی رہ گیا۔ تاریخ کا سبق، سماج کے بدلتے ہوئے حالات، تہذیب کا ہمیشہ بدلتا ہوا ڈھانچہ اور جدید دنیا کے اقتصادی نظام میں ارتقائی عمل شریعت میں کوئی قابل لحاظ توجہ کا مستحق نہیں بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون بالکل پیچھے چلا گیا اور ارتقاء سے محروم رہ گیا۔ صفحہ ۳۶۔۳۷

ارتقاء سے محرومی کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام نے مخصوص حالات میں مردوں کو اجازت دی ہے کہ وہ عورتوں کو اصلاح کی غرض سے مار سکتے ہیں۔ حالانکہ

HARDLY ANY COURT OF LAW WOULD JUSTIFY SUCH CORPORAL CORRECTION IN THE 20TH CENTURY.

(P. 41)

بیسویں صدی میں مشکل ہی سے کوئی عدالت اس طرح کی جسمانی سزا کو حق بجانب قرار دے سکتی ہے۔

"چوں کہ یہ باب قانون اور مذہب پر بحث کرتا ہے۔" اس لیے مصنف نے "اسلام کے طلبہ کے غور وفکر کے لیے تاریخی تجزیہ کا ایک عقلی طریقہ (RATIONALIZED METHOD OF HISTORICAL-CRITICISM) تجویز کیا ہے جو شریعت کے مطالعہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔" صفحہ ۵۴

"بہت سے مصنفین نے اسلامی اصول قانون پر تنقید کی ہے کہ وہ غیر ترقی پذیر، جامد اور متحجر ہے۔ یہ تنقید ایک حد تک صحیح ہے اور اس سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب ——— (H.A.R. GIBB) نے اپنے بصیرت افروز لکچر ——— اسلام میں جدید رجحانات (MODERN TRENDS IN ISLAM) میں نشاندہی کی ہے کہ بہت سے اچھے منطباق اور امید افزا امکانات کے باوجود مسلمانوں کا پرانا ذہنی مرض ابھی ان میں باقی ہے، وہ ماضی کی عظمت کے

ایک رومانی تصور میں مگن ہیں اور فکری حیثیت سے مفلوج رہنے کو پسند کرتے ہیں۔" صفحہ ۵۴

"شرق اوسط کے بارے میں اپنی معلومات اور اسلامی تہذیب اور عربی لٹریچر کے طویل اور وسیع مطالعہ کی بنا پر" مصنف لکھتے ہیں: "اس مستشرق نے موجودہ اسلام کے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس تنقید کے وزن کو تسلیم کرتا ہوں، اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں اور اس کا ایک حل پیش کر رہا ہوں۔" صفحہ ۵۴

وہ حل یہ ہے کہ ـــــ "اسلام کے اصول قانون (اصول) اور قانونی احکام (فروع) کا مطالعہ سماجی حالات کے ذیل میں کرنا چاہیے۔" یعنی ان تاریخی، سیاسی اور تمدنی حقائق کو معلوم کرنا چاہیے جو سابق سماج میں کسی شرعی حکم کے تعین کا سبب بنے۔ اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ کوئی قانون کس طرح کے حالات میں نافذ کیا گیا اور یہ بھی کہ اب بدلے ہوئے حالات میں کیوں ہم اس قانون کو نافذ نہیں کر سکتے۔

اس تاریخی مطالعہ کو مصنف کے نزدیک درج ذیل پانچ مرحلوں سے گزرنا چاہیے۔

۱۔ اسلام کا کوئی حکم جس سماجی معاملے میں نافذ کیا گیا، اس معاملے میں اس سے پہلے کی سماجی حالت کیا تھی۔

۲۔ قانون ابتداءً اپنی اصل حیثیت میں کیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ بعد کے فقہاء نے اس کی کیا تشریح کی۔

۳۔ اب چودہ سو برس گزرنے کے بعد یہ قانون مسلم ممالک میں کس حالت میں ہے۔ وہ ابھی تک رائج ہے یا حالات بدلنے کی وجہ سے متروک ہو گیا۔

۴۔ کیا ہم اسلام کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے قانون کی تعبیر ایسے نئے انداز سے نہیں کر سکتے جو وقت کے تقاضے اور سائنس کی تحقیقات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو۔

کتاب کا میرا باب ہے ـــــ اسلامی قانون اور دینیات ہندستان میں:

ISLAMIC LAW AND THEOLOGY IN INDIA

اس باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا مقصد مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ ـــــ "بیسویں صدی کے قانونی اور تاریخی اصولوں کو اسلام کے ایک بنیادی مسئلہ کے سمجھنے میں استعمال

کیا جائے اور شریعت کی جدید تشریح کے لیے ایک تجربی اور آزمائشی طریقہ (TENATIVE METHOD) پیش کیا جائے۔"

"اسلام میں مذہب اور قانون دونوں کا سرچشمہ خدا ہے۔" اگر ہم جدید انداز سے اس مذہبی مفروضہ (THEOLOGICAL DOGMA) یا قانونی من گھڑت (LEGAL FICTION) کا جائزہ لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سے تاریخی یا فلسفیانہ اسباب تھے جنہوں نے سامی مذاہب خاص طور پر یہودیت اور اسلام میں یہ تصور پیدا کیا کہ خدا ہی قانون وضع کرنے والا ہے اور کیوں اب جدید قانونی نظریات، سیاسی تبدیلیوں، تمدنی ترقیوں اور بین الاقوامی تعلقات کے بعد ضروری ہو گیا ہو کہ اسلامی سماج مقدس شریعت اور دنیوی قانون کے درمیان واضح امتیاز پیدا کرے۔" صفحہ ۵

اس ضمن میں مصنف نے ہندستان کے مسلمانوں کی تین تقسیمیں کی ہیں۔

۱۔ قدامت پسند مدرسۂ فکر

۲۔ وہ لوگ جو خاص طور پر اقبال کی فکر سے متاثر ہیں۔

۳۔ جدید مدرسۂ فکر (MODERN SCHOOL) اس کے رہنما سرسید احمد خاں، شبلی، آزاد اور اجمل خاں ہیں۔ صفحہ ۶۷

قدامت پسند مدرسۂ فکر شریعت کو بالکل اسی شکل میں رائج کرنا چاہتا ہے جیسے کہ وہ ہزار برس پہلے تھی۔ اس کے برعکس دوسرے دونوں مدارس فکر حالات حاضرہ کے مطابق اسلام پر از سر نو غور و فکر کرنے کے قائل ہیں:

"یہ ہر دور کے علماء کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کی تشریح اپنے وقت کے لحاظ سے کریں اس اصول پر شاہ ولی اللہ، سرسید اور اقبال نے زور دیا ہے۔" صفحہ ۱۱۱۔ ۱۱۰

سرسید، مصنف کے الفاظ میں "ہندستان میں اسلامی فکر کے جدید اسکول کے بانی ہیں۔" صفحہ ۱۷ یہی نہیں۔ بلکہ:

"شاہ ولی اللہ اور عبید اللہ سندھی اپنے وقت کے علماء کے درمیان ہراول (VAN GUARD) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ہندستان میں جدید مذہبی اسکول کے لیے ایک نئی تحریک کا سامان تھا۔ مگر قدیم روایت پسندی اس کے بعد پورے زور سے اٹھی اور وہ

تحریک ختم ہوگئی ــــــ" صفحہ ۷۳

اس باب میں ماضی اور حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ مستقبل کے بارے میں لکھتے ہیں:

" مصنف کا یقین ہے کہ بتدریج تمام انفرادی اور پرسنل قوانین جو قدیم اصولوں پر مبنی ہیں، وہ سب کے سب یا تو ختم ہو جائیں گے یا ان میں اس حد تک اصلاح ہو جائے گی کہ وہ ان عام ملکی قوانین کے ڈھانچے میں بیٹھ سکیں جو مذہب کی تفریق کے بغیر سارے باشندوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ تحریک مختلف شکلوں میں اس وقت بھی چل رہی ہے۔ مثلاً منتخ ضوابط، سرکاری شعبے اور خود پرسنل لا مثلاً سول میرج اور طلاق سے متعلق قوانین۔ اس طرح کی تدریجی اصلاح خواہ وہ شرعی قوانین ہی میں کیوں نہ ہو، وہ عقیدہ اسلام کی اصل صداقت ; (ESSENTIAL TRUTH) کو ختم نہیں کرتی۔ مسئلہ کے زیادہ گہرے اور صحیح جائزے سے معلوم ہوگا کہ بہت سے شرعی اجزاء محض بیرونی خول ہیں جو مغز اسلام کے اوپر ہوتے ہیں۔ اور یہ مغز صرف ہر عہد اور ہر دور کی تہذیب کے مطابق نئی تعبیر کے ذریعہ ہی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اب از سر نو یہ طے کرنا کہ اسلام کے اجزاء میں سے کون دوامی (DURABLE ELEMENTS) ہیں۔ اور کون قابل تغیر اجزاء (changable Elements) یہ موجودہ زمانے میں ہماری ذمہ داری ہے۔ علماء کی روایتی ذہنیات موجودہ صدی کے ذہن اور نقطۂ نظر کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کی ایک نئی تحقیق اور نئی تعبیر و تشریح ہمارے دور کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔" صفحہ ۸۲-۸۳

" اگر ہم عالم اسلام کو دیکھیں، خواہ مشرق قریب میں یا مشرق وسطی میں یا مشرق بعید میں تو ہم لوگوں کی زندگیوں میں چند چیزیں عام طور پر پائیں گے۔ ہم سیاسی کمزوری، معاشی عدم استحکام، روحانی دیوالیہ پن کا مشاہدہ کریں گے۔ ان تینوں میں بھی روحانی دیوالیہ پن تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ وہ قومی مرض ــــــ (ENDEMIC CANKER) ہے۔ جو اسلامی سماج کی طاقتوں کو کھائے جا رہا ہے۔ اس کا اعتراف مسلمانوں نے بھی کیا ہے اور مغربی علماء نے بھی، جن کی اسلام سے ہمدردی ہر قسم کے شبہہ سے بالاتر ہے۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے ــــــ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔" صفحہ ۸۲

چوتھا اور آخری باب اسلام کی از سر نو تشریح و تعبیر کے مسئلہ پر ہے اور اس کا عنوان ہے:

THE REINTERPRETATION OF ISLAM

مصنف کے خیالات کو جاننے کے لیے یہی باب سب سے زیادہ اہم ہے اور اس اعتبار سے پچھلے ابواب

گویا اسی آخری باب کی تمہید ہیں۔

"اس وقت اسلام میں ایک اندرونی کش مکش جاری ہے۔ اسلام کے عمر رفتہ قوانین (AGELESS CONCEPTS) جدید تمدنی قوانین سے ٹکرا رہے ہیں۔" (صفحہ ۸۰) یہ مصنف کے مقدمے کی بنیاد ہے۔ مثلاً مذہب کا دعویٰ ہے کہ خدا ایک ہے اور ہم سب اس کے محکوم بندے ہیں۔ اس کے برعکس جدید جمہوریت کا اصرار ہے کہ اسٹیٹ ایک ہے اور اس کے قوانین یکساں طور پر سب کے اوپر نافذ ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۸۶) گویا مذہب میں جو مقام خدا کا تھا وہ جدید علمی ترقی نے اسٹیٹ کو دے دیا ہے۔ اسی طرح مذہب میں عقیدے کا جو جز ہے وہ اندرونی طور پر ماننے کی چیز ہے۔ اس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ قوانین بجبر نافذ کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح عقیدہ ایک ایسی چیز ہے جس کو بدلنے کی ضرورت نہیں وہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور قانون سماجی حالات کے ساتھ ناگزیر طور پر بندھا ہوا ہے۔ وہ مختلف ملکوں اور مختلف اوقات کے لیے مختلف ہوتا ہے' قانون' وقت اور حالات کی کٹھالی میں ڈھلات کی مانند ہوتا ہے۔ وہ پگھلتا ہے' وہ بتدریج مختلف شکلوں میں منجمد ہوتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ پگھلتا ہے اور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ (صفحہ ۸۷)

انسانی سماج ایک مسلسل ارتقائی عمل سے دوچار ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز غیر متحرک نہیں سوا اس کے جو مردہ اور بے روح ہو۔ مذہبی قوانین بھی غیر متحرک (STATIC) نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ مختلف اسلامی ملکوں میں اس طرح کی حیات بخش تبدیلی کا آغاز ہو چکا ہے ــــ "پرانے قانون کی سختیوں کو دور کرنے کی غرض سے قدیم اسلامی اصولوں کے ساتھ ایک نئے نظام کا جوڑ لگایا جا رہا ہے۔ یا ایک نیا قانونی نظام شریعت کی جگہ لے رہا ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں یہ دوہرا عمل جاری ہے۔ انسانی قانون' یا تو شریعت کے احکام کو ختم کر رہا ہے یا اس میں تبدیلی کر رہا ہے ــــ شمالی افریقہ میں فرانسیسی اصول قانون' وسط ایشیا میں سوویت قانون' ہندستان میں انگلش کامن لا' انڈونیشیا میں ڈچ لا' اور ان سب سے بڑھ کر بین الاقوامی قانون۔ جو نہ صرف یہ کہ شریعت کے قانون کو متاثر کر رہا ہے۔ بلکہ اس نے مسلمانوں کے تصور عدالت تک کو بدل دیا ہے۔" (صفحہ ۸۸)

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم مذہب کے بارے میں پرانے تصورات کو بدل دیں اور چند باتیں بطور اصول تسلیم کر لیں۔ مصنف کے نزدیک یہ خاص طور پر تین ہیں:

۱۔ مذہب اور قانون کی تشریح بیسویں صدی کی اصطلاحات کی روشنی میں کی جائے۔
۲۔ اسلام کے دو حصے کرکے مذہب (عقیدہ) اور شریعت (قانون) کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ ۔۔۔ اور یہ مان لیا جائے کہ جہاں تک قانون کا تعلق ہے وہ قابل تغیر ہے۔
۳۔ اس بنیاد پر از سر نو اسلام کی تشریح کی جائے اور اسلام کے عقیدے کو ایک نیا مفہوم دیا جائے۔

"اگر اس تجزیہ سے" مصنف لکھتے ہیں" کچھ ایسے عناصر جن کو ہم روح اسلام کے اجزا سمجھتے رہے ہیں، متاثر ہوں یا سرے سے ترک ہو جائیں تو ہمیں حالات کے اس فیصلے کو قبول کرنا چاہیے۔ اگر اندرونی عقیدہ بچایا جا سکتا ہو اور اس کو طاقتور بنایا جا سکے، تو اس قسم کا آپریشن، اگرچہ وہ کافی تکلیف دہ ہوگا، لیکن وہ ایک ایسے جسم کو صحت اور طاقت دے گا جو خون کی کمی کی وجہ سے سوکھ رہا ہے! اور جس کی رہنمائی کے لیے کوئی دوسرا اصول موجود نہیں۔" صفحہ ۸۸

اس کے بعد مصنف نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ راسخ العقیدہ مسلمان
۲۔ غیر راسخ العقیدہ یا غیر مقلد مسلمان

راسخ العقیدہ سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو اب بھی اس پر مطمئن ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی مذہب کی وہ تفصیلی صورت جو ائمہ اربعہ نے مقرر کی ہے، وہی اصل مذہب ہے اور آج بھی مسلمانوں کے لیے وہی مفید ہے اور اس میں کسی قسم کی انقلابی تبدیلی خطرناک ہوگی۔ یہ لوگ اب بھی سنجیدگی کے ساتھ مخصوص روایات پر یقین رکھتے ہیں اور بڑے پیمانے پر اسی پر عمل کر رہے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ اگر وہ کچھ احکام پر عمل نہ بھی کر پاتے ہوں تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے لیے اچھا ہوگا کہ وہ قدیم روایتی ڈھانچہ کو پوری طرح برقرار رکھیں۔

غیر راسخ العقیدہ یا غیر مقلد وہ ہے جو اسلام کی باضابطہ روایات پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ اور ائمہ کی مقرر کی ہوئی مذہبی بنیاد کو نہیں مانتا۔ عقیدہ کا سنجیدہ اقرار اسلام کی واحد کسوٹی ہے۔ اسلام کے اعمال اپنی تمام تفصیلات میں قبول نہیں کیے جا سکتے۔ اسی طرح اگر آپ خدا اور رسول کے سوا اور کچھ عقائد کو رد کر دیں تو آپ پھر بھی غیر مقلد مسلمان باقی رہیں گے ۔۔۔ ۔۔۔ مصنف کے

نزدیک ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک معقول تعداد اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے صفحہ ۹۰ "میں اسی قسم کا ایک غیر مقلد (NON CONFORMIST) مسلمان ہوں" مصنف لکھتے ہیں۔

یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں مذہب کا منکر نہیں۔ منکر وہ شخص ہے جو سرے سے مذہب یا اسلام کی حیثیت کا انکار کرے یا کم از کم مذہبی عقاید کے بعض بنیادی اصولوں کو چیلنج کرے۔ ایک غیر مقلد مذہب کے بعض اعمال یا تصورات پر معترض ہو سکتا ہے۔ یا اس کا انکار کر سکتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی ہوگا۔ وہ مذہب میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے نہ کہ روایتی تصورات کے مطابق۔ میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ عقائد کا موجودہ ڈھانچہ ہمارے لیے مفید یا ہمارے موجودہ زمانے میں بھی وہ اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ اپنے عقیدے کی از سر نو تشریح کروں۔ میں اس مروجہ تشریح کو قبول نہیں کر سکتا جو سنی امامیہ یا شیعہ مدارس فکر نے پیش کی ہیں۔ پیچیدہ تفصیلات بے معنی رسوم اور بے روح تصورات نے مجھے جمود میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذیل میں میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر اسلام کی آزادانہ تشریح (LIBERAL INTERPRETATION) کی ایک اسکیم پیش کر دوں۔ صفحہ ۹۱

تاریخی طریقہ

(HISTORICAL APPROACH)

اسلام کا پیغام چودہ سال پہلے کے دور میں آیا تھا۔ کیا اب اس کی نئی تشریح کی ضرورت ہے۔ کیا وہ تمام دنیا اور ہر زمانے کے لیے نہیں۔ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ خواہ ایک پیغام سچا ہو اور خواہ وہ ایک مفہوم میں دوامی بھی ہو، پھر بھی اسی مقدمہ کے تحت ضروری ہے کہ اس کو جدید دنیا کی سائنس، فلسفہ، نفسیات، مابعد الطبیعات اور دینیات کے تحت سمجھا جائے ورنہ دنیا کا فکر اور اس کی روشنی اسے ختم کر دے گی۔

انسان کی تاریخ میں یہ تقریباً صرف دس ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ اس کے ذہن میں خدا کا تصور آیا جو اس کی قسمت پر حکمراں ہے۔ آسمان کے ستارے، جنگل کے درندے، ہوا کی چڑیاں، خشکی پر رینگنے والے جانور اور سمندر کی مچھلیاں مافوق الفطرت ہستیاں تصور کی گئیں

جو نقصان پہونچانے کی طاقت رکھتی ہیں اور ساری دنیا میں انسان نے ان خداؤں کو پوجنا شروع کیا۔ اور قربانی، بھجن، مذہبی اعمال و رسوم اور رقص کے ذریعہ اس نے کوشش کی کہ انکی آفتوں سے بچ سکے اس کے تقریباً پانچ ہزار برس بعد یعنی اب سے پانچ ہزار برس پہلے میسوپوٹامیا یا اس کے پاس اور ہندستان میں معلوم تاریخ میں پہلی بار انسان اس عقیدہ تک پہونچا کہ خدا ہزاروں نہیں بلکہ صرف ایک برتر ہستی ہے۔ ایک برہم، ایک وجود مطلق (ABSOLUTE) ایک خالق، رام یا رحیم جس نام سے بھی تم اسے پکارو، وہی ایک عبادت کا مستحق ہے۔ ایک لمبی دکھ بھری تلاش کے بعد انسان اس عظیم دریافت تک پہونچا۔ بلاشبہ انسان کی تاریخ میں واحد عظیم ترین دریافت! جو زیادہ عظیم ہے زیرو کی دریافت سے، آگ کی دریافت سے، لوہے اور نظریہ اضافیت کی دریافت سے یا اور کسی دریافت سے وحدانیت کا تصور نہایت نادر چیز ہے۔ وہ ایک پراسرار طاقت ہے، وہ مایوس روحوں کو زندگی دیتا ہے، وہ زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ وہ آدمی کو وہ کچھ دیکھنے کے قابل بناتا ہے جو وہ نہیں جان سکتا۔ وہ انسانی علوم اور ان کی تبدیلیوں پر منحصر نہیں ہے۔ یہ ایک دوامی تصور ہے جو بدلتا نہیں۔ جس کے لیے نہ زوال ہے نہ نقص۔ یہ پیغام اکثر کسی حساس انسان کی مرتعش روح کی معرفت آیا ہے۔ انھیں منتخب لوگوں میں سے ایک پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ ان کی تلاش کی تاریخ، ان کا ذہنی کرب اور بالآخر روشنی کا حصول قرآن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب سچائی کے اس اندرونی ادراک سے بھری ہوئی ہے جس نے انسانی تاریخ کو خدا کی معرفت بخشی۔ (یہاں مصنف نے مثال کے طور پر سورۂ تکویر کا ترجمہ نقل کیا ہے)

خدا کے وجود کا عقیدہ تجربے پر منحصر ہے۔ وہ نہ ثابت کیا جا سکتا نہ ہی غلط ٹھہرایا جا سکتا۔ انسانی عقل یا معلومات یا سائنس کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ سائنس کے مفروضے، نظریات اور حقائق عین اپنی فطرت کے اعتبار سے قابل تغیر ہیں مگر خدا کا عقیدہ ناقابل تغیر اور وجدانی ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ انسان کی عظیم ترین واحد دریافت ہے۔

مگر اس کامل صداقت کا انتقال ایک ناقص ذریعہ سے ہوتا ہے یعنی زبان کے ذریعہ سے۔ زبان ایک انسانی چیز ہے۔ وہ بدلتی رہتی ہے۔ کوئی زبان پانچ یا دس ہزار برس سے زیادہ پرانی سمجھی نہیں جا سکتی۔ ہماری زمین پر ایسی بہت سی انسانی تحریریں موجود ہیں جن کا مطلب جاننے

والے لوگ آج نہیں۔ عرب کی قدیم زبان میں پچھلے دو ہزار برس کے اندر کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ اور لسانیات کا مطالعہ قطعی طور پر بتاتا ہے کہ الفاظ کے معانی اور ان کے باہمی فرق میں ارتقائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی زبان ٹھہری ہوئی نہیں رہتی۔ جب یہ ظاہر ہے کہ پیغمبر کے زمانہ میں عرب جو زبان استعمال کرتے تھے، اس میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی، یہاں تک کہ وقت گزرنے کے بعد ان کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہو سکتا ہے جتنا کہ موہن جوداڑو کی زبان کا سمجھنا۔ مگر ہم مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ اس کا مرکزی پیغام اس کی زبان سے زیادہ مدت تک باقی رہے گا۔ اور وہ ہے خدا کا عقیدہ ــــــ "آسمان اور زمین فنا ہو جائیں گے مگر میرا کلام فنا نہ ہوگا۔" (انجیل) صفحہ ۹۲

اس لیے میرے نزدیک یہ بالکل واضح ہے کہ ہم قرآن کی طرف واپس نہیں جا سکتے۔ البتہ قرآن کو لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ میں قرآن کو سمجھنا چاہتا ہوں، اس مفہوم میں جیسے کہ پیغمبر کے زمانے کے عربوں نے سمجھا تھا۔ مگر صرف اس کی تعبیر نو کے لیے اور اس کو اپنی زندگی کے حالات پر منطبق کرنے اور اس پر اس حد تک عقیدہ رکھنے کے لیے جس حد تک وہ بیسویں صدی کے انسان کی حیثیت سے مجھے اپیل کرتا ہے۔ مجھ سے صحرا میں رہنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ میں اونٹ پر سواری کروں اور کپڑے مکوڑے کھاؤں۔ قبائلی لڑائیوں میں شریک ہوں اور داڑھی رکھوں اور چغہ پہنوں اور ایک دقیانوسی عرب کی ذہنیت اپنے اندر پیدا کروں۔ مجھے فرق کرنا چاہیے۔ شاعرانہ حقیقت (POETIC TRUTH) اور حقیقی صداقت FACTUAL TRUTH میں۔ میں فرق کروں گا مذہب کے مغز اور اس کے چھلکے میں، قانون میں اور مذہبی افسانہ میں۔ مجھے اسلام کے پیغام کو ایک جدید انسان (MODERN MAN) کے طور پر سمجھنا اور قبول کرنا ہے۔ نہ کہ ایسے شخص کی طرح جو صدیوں پہلے رہتا تھا۔ میں محترم شخصیتوں کا احترام کرتا ہوں مگر شعوری معاملات میں بلا کیف (WITHOUT HOW) کسی بات کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ اور قرآن کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تشریح تاریخی اصولوں کے مطابق کی جائے۔ سب سے پہلے ہم ماقبل اسلام عیسائیت اور یہودیت کا مطالعہ کریں گے۔ یہودیت اور عیسائیت کو ان کے تاریخی پس منظر میں پوری طرح سمجھنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام

کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔

ہندستان ایک مذہبی ملک ہے۔ ہم ہندستان میں بالخصوص زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہیں کہ مذہب کی تعبیر کر سکیں۔ یہاں ہندو، بدھسٹ، جینی، سکھ، عیسائی، زرتشت کے پیرو، یہودی اور مسلمان ایک سیکولر دستور کے سایہ میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں جو قانونی طور پر ہر عقیدہ کی یکساں ضمانت دیتا ہے۔ یہ دستور ہماری طویل رواداری روایت کے مطابق ہر شہری کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنا عقیدہ رکھے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ اس طرح ہندستان کے مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اپنے عقائد اور مذہبی اعمال کا مقابلہ کر کے اسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہندو مذہبی شخصیتوں کا احترام مسلمانوں کی طرف سے اور مسلم مذہبی شخصیتوں کا احترام ہندوؤں کی طرف سے اس ملک کی عام خصوصیت ہے۔ یہ اسلام کی ایک ہندستانی تعبیر (INDIAN INTERPRETATION OF ISLAM) ہے جو تعصب اور مذہبی دیوانگی کو ختم کرنے والی ہے اور انتخاب (ELECTICISM) اور رواداری کو جنم دیتی ہے۔ (۹۴) (باقی)

بعض مفید کتابیں

فضائل صبر و شکر :- از ارشادات حکیم الامت تھانویؒ قیمتے ۸/-

شمائم امدادیہ :- قیمتے ۲/ حالات مشائخ کاندھلہ قیمتے ۳/۵۰

تذکرہ حسن :- سوانح حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ قیمتے ۲/-

تہذیب النسواں :- نواب شاہ جہاں بیگم (سابق والیہ بھوپال) قیمتے ۴/-

اصول فقہ :- مولانا قاری حبیب الرحمٰن صدیقی قیمتے ۴/۷۵

محمدیہ پاکٹ بک : (ردقادیانیت) قیمتے ۷/۰

ملنے کا پتہ ⇐ کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ۔

ایک تاریخی وثیقہ

مولانا سندھی کے ساتھی ظفر حسن صاحب کی "آپ بیتی"

۱۹۱۰ء کے بعد پاک و ہند کے مسلمانوں میں یکے بارگی برطانیہ دشمنی کی ایک لہر اٹھی تھی، جو ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان اور اس کے بعد ۱۹۱۴ء کی جنگ طرابلس کی وجہ سے برابر زور پکڑتی گئی پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہوتی ہے، گو اس جنگ کے دوران برطانوی حکومت کے جبر کے تحت مسلمان خاموش رہے، لیکن جیسے ہی جنگ ختم ہوئی ان کی یہ برطانیہ دشمنی ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئی چنانچہ خلافت تحریک کے سلسلے میں کوئی تیس ہزار مسلمان بڑے جوش و خروش سے جیلوں میں گئے اور اس وقت برطانیہ دشمنی اسلام کا ایک لازمی شعار بن گیا۔

برطانیہ دشمنی کی اس لہر کے اہم مرکز علی گڑھ کا ایم او کالج، لاہور اور بعض دوسرے شہروں کے کالج تھے، یعنی گزشتہ تیس چالیس سالوں سے ان کالجوں میں جن مسلمان نوجوانوں کو حکومتِ وقت کی وفاداری کی تلقین ہو رہی تھی، ان ہی میں سے بعض ایسے نوجوان اٹھتے ہیں جو برصغیر سے برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے جان کی بازی لگاتے ہیں، اور وہ کچھ کر گزرتے ہیں کہ ان کے کارنامے آج ہمیں ایک افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔

ان مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں برطانیہ دشمنی کی اس آگ کو ہوا دینے میں مولانا محمد علی مرحوم کے انگریزی ہفت روزہ "کامریڈ" علامہ اقبال کی ملی نظموں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کا بڑا دخل تھا۔ زیر نظر کتاب "آپ بیتی" کے مصنف محترم ظفر حسن صاحب

اس دور کے ان مسلمان نوجوانوں میں سے ایک تھے جنھوں نے اس سرزمین سے برطانیہ کو نکالنے اور اس سرزمین سے باہر دوسرے مسلمان ملکوں کو اس کے چنگل سے بچانے کی خاطر ۱۹۱۵ء میں اپنے قدیم وطن کو خیرباد کہا۔ اور اب اپنے نئے وطن ترکی میں اپنی اس پچاس سال کی جدوجہد کی ایک مختصر کہانی ہمیں سنا رہے ہیں۔

محترم ظفر حسن صاحب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے معتمد ترین، مخلص ترین اور قابل ترین ساتھیوں یا زیادہ صحیح الفاظ میں جیسے کہ وہ خود بار بار اس کتاب میں اپنا تعارف کراتے ہیں، شاگردوں میں سے فائق ترین ہیں۔ اور ان کی یہ "آپ بیتی" ایک لحاظ سے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ہی کی آپ بیتی کا ایک حصہ ہے۔ اور اس سے نہ صرف ان دونوں بزرگوں کی زندگی اور جدوجہد کی ایک تصویر ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ اس دور کی برصغیر اور اس کے علاوہ بین الاسلامی سیاسیات کی تاریخ سے ہم متعارف ہوتے ہیں۔

ظفر حسن صاحب ۱۸۹۵ء میں کرنال میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان ایک مذہبی خاندان تھا۔ مشہور بزرگ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری جنہیں "وہابیوں" کے لیے خفیہ چندہ کرکے سرحدی علاقے میں بھیجنے کے الزام میں کالا پانی کی سزا دی گئی تھی، آپ کے رشتہ دار تھے چنانچہ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:

"میں نے ان کو کئی دفعہ جب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا، دیکھا تھا اور ان کو چچا جی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔"

ظفر حسن صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ اور اس میں وظیفہ لیا جس کی وجہ سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے، ایف ایس سی میں بھی ان کو وظیفہ ملا۔ اور بی اے میں انھوں نے ریاضی لی۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> جب گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ جنگ بلقان شروع ہو گئی۔ اس کے بعد جنگ طرابلس ہوئی۔ اس سے مسلمانوں میں بہت بے چینی پھیلی۔ ترکوں کی حمایت میں عام جلسے ہونے لگے۔ چندے جمع کیے جانے لگے..... ڈاکٹر اقبال مرحوم ان جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ میں بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ان جلسوں

میں شریک ہوا کرتا تھا۔ طرابلس کے شہیدوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس نظم کا جس کا عنوان "حضور رسالت مآب میں" ہے ہمارے دلوں پر بہت اثر ہوا۔"

اس نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں:۔

مگر میں نذر کو آبگینہ لایا ہوں — یہ چیز وہ ہے کہ جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ترکوں کے خلاف انگریز اور دوسری یورپی قومیں جس طرح برسرپیکار تھیں اور ان کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں اس سے مسلمانان پاک و ہند کے جذبات بڑے مشتعل تھے۔ اس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف انگریزوں سے نفرت بڑھ رہی تھی وہاں دوسری طرف کالجوں میں پڑھنے والے مسلمان نوجوانوں میں اسلامیت کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایم۔ او۔ کالج علی گڑھ کے طلبہ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور اس طرح جو پیسے بچائے وہ ترکوں کی امداد کے لیے بھیجے۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے ایم او کالج کے طلبہ یہ الاپتے سنے جاتے تھے "بلقان چلو" بلقان چلو" مولانا شبلی کی مشہور نظم شہر آشوب اسلام اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کا مشہور شعر ہے:

کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا نشاں کب تک

اسلامی ہند کی یہ فضا تھی، جس سے ظفر حسن صاحب اور ان کے گورنمنٹ کالج لاہور کے بعض دوسرے ساتھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ جہاں وہ پابندی سے نمازیں پڑھنے لگے، وہاں برطانوی حکومت کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنے کے منصوبے بنانے میں لگ گئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

کالج کے باغ کے کمپاؤنڈ میں مسلمان طالب علموں نے نماز کے لیے ایک چبوترہ بنا لیا تھا۔ اسی کے نزدیک کسی بزرگ کی قبر تھی ..... ہم صبح کی نماز اکثر جماعت سے پڑھا کرتے تھے۔

ظفر حسن صاحب کے کئی ایک دوسرے ساتھی تھے، جن میں سے اکثر ان کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں عازم کابل ہوئے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

جنگ بلقان کی خبریں اکثر بحث میں آیا کرتی تھیں۔ اور ہم سب ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ہمارے اس زمانے کے قومی و مذہبی خیالات کی نشوونما میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے انگریزی اخبار کامریڈ اور مولانا ابوالکلام مرحوم کے ہفتہ وار "الہلال" اور البلاغ کا بہت

اثر ہوا۔ ان ہی اخبارات کے مقالوں نے ہمیں ترکوں کا گرویدہ بنا دیا۔ انگریزوں کے برخلاف بھی ہمیں ان ہی تحریروں نے ابھارا اور ہم میں قومی جذبات بھی ان ہی جریدوں نے پیدا کیے۔

موصوف اپنے ایک ساتھی خوشی محمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں کالج کے بورڈنگ میں اس کے کمرے میں پانی لینے گیا، تو دیکھا کہ اس نے صراحی توڑ دی ہے اور وہ مغموم بیٹھا ہے، میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا بلغاریوں کے ترکوں کے شہر اڈریانوپل پر قبضہ کرنے کی خبر آئی ہے، اور میں نے اظہار غم میں صراحی توڑ دی ہے۔ یہ خوشی محمد ظفر حسن صاحب کے ساتھ کابل گئے اور وہاں سے روس چلے گئے۔

یہ تو بہرحال نوجوان تھے، اور ان کی جذباتیت سمجھ میں آتی ہے، لیکن اس دور میں بڑوں کا کیا حال تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے۔

مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی ایک نامکمل تصنیف میں لکھا ہے

"میں بلقان کی پُر مصائب جنگ کے دوران میں ایک وقت شدت جذبات سے اتنا بے تاب ہو گیا تھا، میں آج یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت خودکشی کرنے تک کا سوچا.....

.....اس رات اس مضمون کا لائٹر کا آخری تار مجھے ملا تھا کہ بلغاری فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے صرف ۲۵ میل دور رہ گئی ہیں۔ وہ قسطنطنیہ جو گزشتہ پانچ صدیوں سے ہر مسلمان کے لیے اس کی سب سے اعلیٰ امیدوں کے مرکز ہونے کی وجہ سے مقدس تھا۔"

وہ تو اتفاق سے عین اس وقت ان کا ایک بے تکلف دوست آگیا، جو انھیں زبردستی وہاں سے اٹھا کر لے گیا ورنہ مرحوم کے الفاظ میں "ایک ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور خون سے لت پت جسم کا ہولناک منظر دیکھنا پڑتا، جس کے بارے میں تیسری منزل سے اتفاقیہ گرنے کا حکم لگایا جاتا۔"

ترکوں کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، اس کی وجہ سے ان سے ہمدردی کا جذبہ جس حد تک پہونچ گیا تھا، وہ آپ نے دیکھا۔ اور بقول ظفر حسن صاحب کے خوشی محمد اور ان کے چند دوستوں نے جن میں ہمارا ہم جماعت شجاع اللہ بھی شریک تھا یہ سوچا کہ گورنمنٹ کالج کو آگ لگا کر انگریزوں سے انتقام لیں۔ .. .. شجاع اللہ نے ایک رات کو کالج کے کلرک کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ مکا مار کر توڑا۔ اور ان کے ساتھیوں نے کچھ مٹی کا تیل کمرے میں چھڑک کر مٹی کے تیل میں ڈوبے ہوئے جلتے چیتھڑوں

کو اندر پھینکا اور کمرے کو جلانے کی کوشش کی لیکن آگ زیادہ نہ جلی اور کمرے کے کاغذات وغیرہ کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہونچا ....."

گورنمنٹ کالج لاہور کے ان طالب علموں نے بنگالی ہندوؤں کی طرح بم بنانے کا بھی سوچا چنانچہ" اس لیے فیصلہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے جو اس وقت کلکتہ میں" الہلال" نکالا کرتے تھے، مل کر ان کے ذریعہ سے بم حاصل کریں۔ اس غرض سے ہم نے شیخ عبداللہ کو کلکتہ بھیجا، لیکن وہ وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا کیونکہ مولانا آزاد مرحوم کو ایسی سنسنی کی کارروائی سے اور قتل و غارت سے کوئی تعلق نہ تھا۔"

ان ہی دنوں پہلی جنگ عظیم شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ترکی جرمنی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف شامل ہوتا ہے۔ ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی ایک برطانوی جریدہ میں سلطان ترکی کی ایک تصویر دیکھتے ہیں، جس میں وہ ایک عام جلسے میں جہاد کا فتویٰ پڑھ رہے تھے۔ اس تصویر کے نیچے برطانوی جریدے نے تحقیر آمیز عبارت لکھی تھی۔

۱۹۲۱ء میں بالاکوٹ میں حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں میں سے مجاہدین کی ایک جماعت نے افغانستان اور ہندوستان کی سرحد کے آزاد علاقے میں اپنے مرکز قائم کر لیے تھے اور وہاں سے خفیہ طور پر ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف کام ہوتا تھا۔ ان ہی دنوں اس جماعت کے بعض نمائندوں کا ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی طالب علموں سے ربط پیدا ہوتا ہے۔ ان نمائندوں کو جب" اطمینان ہو گیا تو انھوں نے خلیفۃ المسلمین کے فتویٰ جہاد کی ایک نقل ہمارے پاس بھیج دی۔ اس سے ہم سب میں ترکوں کی صفوں میں شریک ہو کر انگریزوں کے برخلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ہمارے اس قسم کے خیالات کو قوی تر بنانے کے لیے انھوں نے ہمیں ـــــ سپارہ (۱۰) سورہ توبہ رکوع ۲ کی اس آیت کو قل ان کان اٰباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین پڑھنے اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت

کی اور کہا کہ جہاد کے لیے اس دارالکفر سے نکل کر ہمیں ایک دارالاسلام میں چلا جانا چاہیے اور وہاں سے ترکی فوج میں داخل ہونے کے لیے ترکی پہونچنا چاہیے۔ ہم سب اس پر راضی تو ہو گئے لیکن میں نے استخارہ کیے بغیر اس طرح کا فیصلہ کرنا نہ چاہا....."

"صوف کے بی اے کے امتحان میں صرف ایک ماہ باقی تھا۔ اور چونکہ وہ بڑے محنتی تھے اور جماعت میں ہمیشہ اوّل رہتے تھے۔ اس لیے خود ان کے الفاظ میں "مجھ سے یہی توقع کی جاتی تھی کہ میں اسٹیٹ سکالرشپ لے کر ولایت جا سکوں گا۔ چودھری ظفر اللہ صاحب پہلے مسلمان تھے جن کو یہ وظیفہ ملا تھا۔ ان کے بعد کئی سال تک کسی مسلمان کو یہ وظیفہ نہ مل سکا۔ اب سب مسلمانوں کی امیدیں اس پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ وظیفہ پھر ایک مسلمان طالب علم کو ملے گا...."

۵ فروری ۱۹۱۷ء کو جمعہ کی نماز کے بعد ان طالب علموں کا پہلا قافلہ لاہور سے روانہ ہوا سب سے پہلے یہ ہری پور ہزارہ پہونچا، وہاں سے ریاست امب کی حدود میں داخل ہوا۔ نواب امب کے وزیر اعظم جماعت مجاہدین کی خفیہ طور پر حمایت کیا کرتے تھے۔ ہری پور سے یہاں تک پہونچنے میں ان نوجوانوں کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وزیر اعظم مذکور کے ہمدردانہ الفاظ سے ان کی کچھ تلافی ہو گئی۔ یہاں سے اس قافلے نے دریائے سندھ پار کیا۔ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:

> دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اتر کر ہم نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور خدا کا شکر کیا کہ خیریت سے سلامتی کی جگہ پر پہونچ گئے۔ ... ... اب ہمیں ایک ایسی سرزمین کی طرف روانہ ہو رہا تھا جہاں نہ کوئی میرا واقف تھا اور نہ وہاں کی زبان میں جانتا تھا۔ اس سرزمین میں کیسے گزارہ کروں گا۔ وہاں کوئی مفید کام کر سکوں گا یا نہیں، یہ سب کچھ مجہول اور نامعلوم تھا۔ اگر تسلی تھی تو صرف یہ تھی کہ اسلامی احکام کی پابندی کے لیے یہ سب پابندیاں عائد کر رہا ہوں۔

دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد انتہائی کٹھن سفر طے کر کے یہ قافلہ جماعت مجاہدین کے مرکز اسمس واقع علاقہ بنیر میں پہونچا۔ اس مرکز کی اس وقت کیا حالت تھی۔ اس کا مختصر خلاصہ "آپ بیتی" میں یوں دیا گیا ہے۔ "..... جماعت مجاہدین جو ایک مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے ارکان بہت مخلص اور جاں نثار تھے۔ سراپا عمل اور ہر قسم کی مصیبتوں کے سامنے سینہ سپر

ہونے کو تیار تھے۔ ان کو نہ مال و دولت کی آرزو تھی اور نہ دنیاوی جاہ و عزت کی تمنا تھی۔ وہ تو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنی جانیں وقف کر چکے تھے اور اس امید پر کہ ان کو ایک دن کفار سے لڑنے، جہاد کرنے اور میدان جنگ میں جام شہادت پینے کا موقع ملے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کو دنیا کے تبدیل شدہ حالات کے مطابق کوئی تعلیم و تربیت دینے والا اور ان کو نئی فوجی قواعد سکھانے والا نہ تھا۔ ان میں سے بہت سے بالکل ان پڑھ تھے۔ ان کے پاس نئی بندوقیں صرف چند ایک تھیں۔۔۔۔ یہ بندوقیں رئیس مجاہدین کے محافظین کے ہاتھ میں تھیں۔ باقی لوگوں کے پاس چقماقی یا فتیلی بندوقیں تھیں جن کا استعمال اب دنیا میں شاید کہیں بھی نہ رہا تھا۔۔۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جماعت دنیا کی ترقیات اور زمانے کی رفتار سے بالکل بے خبر رہ کر ایک طفیلی اور مسکین سی ٹولی بن گئی تھی جس کا گزارہ یا تو ہندوستانی مسلمانوں کے چندے پر تھا یا حکومت افغانستان کے وظیفہ پر۔

نوجوان طلبہ کا قافلہ چند دن یہاں رہا اور مصنف "آپ بیتی" کے الفاظ میں اس ناگفتہ بہ حالت کا "ہم پر بہت برا اثر ہوا۔ ہم اس نتیجے پر پہونچے کہ یہاں رہ کر ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے کچھ کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں کابل جانا چاہیے تاکہ افغانی حکومت کو جنگ میں شامل ہونے پر راضی کریں۔ اگر کامیابی نہ ہو تو ترکی چلے جائیں اور وہاں ترکی فوجوں میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ اس لیے کابل کو مجاہدین کا ایک وفد بھیجا گیا تاکہ ہمارے کابل جانے کا راستہ صاف کیا جائے اور افغانی حکومت سے ہمارے لیے کابل جانے کی اجازت لی جائے۔"

آخر کابل جانے کی اجازت آگئی۔ بڑی مشکلوں سے اور سخت جاں گداز تکلیفوں کے بعد ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی جلال آباد پہونچے۔ جلال آباد میں انھیں نہایت گندی سرائے میں ٹھہرنا پڑا، لیکن اس کے بعد ان نوجوان طلبہ کے ساتھ جو اسلام اور مسلمان ملکوں کی خدمت کے لیے اپنا گھر بار عزیز و اقارب اور وطن چھوڑ کر اور اپنے مستقبل کی تمام امیدوں کو ختم کر کے ایک آزاد مسلمان ملک میں وارد ہوئے تھے، کیا سلوک کیا گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

ہم رات کو رباط آکر سو رہے لیکن صبح کے قریب جب رحمت علی اور عبدالرشید وضو کے

بے ساختہ باہر نکلنے لگے تو ان کو ایک سپاہی نے جس کی بندوق پر سنگین (برچھی) لگی ہوئی تھی، مدکا اور سنگین کو ان کی طرف پھیر کر بہت غصے سے کہا۔ موقوف است بیرون برآمدہ نمی توانی (یعنی تمہارے لیے باہر جانا منع ہے) یہ بچارے ڈر کر پریشانی کی حالت میں واپس آئے۔ جب ان نکلا تو ہم نے دیکھا کہ ہم سب کے سب نظر بند ہیں اور ہم پر ہتھیار بند سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا ہے۔۔۔۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حالت ہماری وہ نظر بندی شروع ہوئی جو چار سال یعنی ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں کے قتل تک جاری رہی۔

اس نظر بندی کی وجہ یہ تھی کہ ان طلبہ کی ہجرت پر پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر کا اخبارات میں یہ بیان چھپا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی پکڑا گیا تو اس کو ہندوستان کی سرحد پر سب سے پہلے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے پرائیویٹ سکریٹری علی احمد خاں کی نظر سے یہ بیان گزرا، اور اس نے برطانوی حکومت کو خوش کرنے کے لیے نظر بندی کا یہ حکم صادر کر دیا اور جب ایک بار اس طرح کا حکم صادر ہو گیا، تو پھر کون کسی کا پاسبان حال ہو سکتا تھا۔

"آپ بیتی" میں اس وقت افغانستان کی جو حالت تھی اس کا اجمالی خاکہ بھی دیا گیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہاں انتہائی حد تک تو پس ماندگی تھی ہی، لیکن خود افغانی عوام کی دنیا کی ہر چیز سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ مصنف کے الفاظ میں:۔

اس وقت افغانستان میں صرف ایک ہفتہ وار فارسی اخبار نکلتا تھا۔۔۔۔۔
۔۔۔اس اخبار کا نام سراج الاخبار تھا۔۔۔۔ جلال آبادی اکثر ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اور لوگ عام طور پر پشتو گو ہونے کے سبب سے سراج الاخبار کو کوئی زیادہ نہیں پڑھتا تھا اور بازار میں اخبار نہ بکتا تھا۔ اس لیے ہم جنگ کے متعلق کوئی تازہ خبر حاصل نہ کر سکے۔ ہم جب لوگوں سے پوچھتے کہ جنگ کے بارے میں تازہ خبر میں کیا ہیں، تو وہ جواب دیتے تھے "بڑے مقومہ ہست" یعنی جنگ جاری ہے۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ ہم اپنے خیال میں افغانستان کو ایک مہذب ملک تصور کیا کرتے تھے لوگوں کے اس قسم کے جواب سے ہمیں تعجب بھی ہوا اور مایوسی بھی، ہم نے امیدیں باندھ رکھی تھیں کہ افغانستان ہندوستان کی آزادی میں مدد دے گا اور انگریزوں سے لڑے گا۔ یہاں آکر دیکھا کہ کسی کو جنگ عظیم کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں۔ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ ہم نے خط لکھنے کے لیے کاغذ اور لفافے تلاش کیے تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی دکان ہی نہیں جہاں قلم دوات یا پنسل بکتی ہو۔ ہمیں کہا گیا کہ کاغذ قصاب کی دکان پر بکتے ہیں مگر قلم دوات بیچنے والا کوئی نہیں۔

دریائے اٹک سے اس پار کے ان مسلمان عوام اور ان کی حکومت سے یہ امیدیں صرف کالج کے ان نوجوان طلبہ ہی کو نہ تھیں، بلکہ مصنف کے الفاظ میں:

"اس وقت ہم کو اور ہماری طرح ہندوستانی مسلمان لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ افغانستان ایک قوی اسلامی ملک ہے۔ اور اگر وہ لڑائی میں شریک ہو کر ہندوستان پر حملہ کرے تو وہ انگریزوں کو ضرور ہندوستان سے نکال دے گا۔ مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کا افغانستان آنا اسی غرض سے تھا کہ افغانستان کو شامل ہونے پر اور ہندوستان پر چڑھائی کرنے پر آمادہ کیا جائے۔"

اور یہ خوش فہمی صرف ہمارے ان بزرگوں کی نہیں تھی، بلکہ اس سے تقریباً ایک سو سال قبل ہمارے دوسرے بزرگ بھی اس قسم کی خوش فہمیوں کے ساتھ ہندوستان سے نکل کر دور دراز کی مسافتیں طے کر کے اٹک سے اس پار پہونچے تھے اور پھر ان کوششوں کا جو دردناک حشر ہوا معرکہ بالاکوٹ اس کا امٹ نشان ہے۔ افسوس ہے اس معرکے کے بعد بھی مجاہدین کی بعض جماعتیں ان آزاد علاقوں کا رخ کرتی رہیں اور بعد میں ان کے مراکز کی جو افسوسناک حالت ہوئی "آپ بیتی" میں کئی جگہ اس کا ذکر ہے، جسے پڑھکر سخت روحانی اذیت ہوتی ہے اور خلوص اور ملیت کے ضائع جانے کا رنج ہوتا ہے۔

یہ بہادر طالب علم جان جوکھوں میں پڑ کر ایک آزاد مسلمان ملک میں پہونچے لیکن جلال آباد پہونچتے ہی وہ نظر بند کر دیے گئے۔ ان کے سالار قافلہ عبدالمجید خاں جو سارے ساتھیوں کا بھاری سامان لانے کے لیے خفیہ طور پر پشاور سے بھیجا گیا تھا، ڈاک گئے اور جلال آباد واپس آتے انھیں ٹائی فائیڈ ہو گیا، اسی بخار کی حالت میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ "... خچروں پر سوار ہو کر کابل روانہ

ہوئے کابل تک ساتھ گئے تھے عبدالمجید خاں کی علالت بخار کی وجہ سے روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی لیکن راستے میں ٹھہرنے اور رہنے کا امکان نہ تھا۔ ..... کیوں کہ راستہ میں پرائیویٹ کوئی ڈاکٹر موجود تھا اور نہ کوئی دوائی مل سکتی تھی اسلیے ہم چاروناچار سفر کرنے پر مجبور تاکہ جلد کابل پہونچ کر کسی ڈاکٹر سے ان کا معالجہ کرائیں۔

عبدالمجید خاں کابل تک تو زندہ پہونچ گئے اور ایک ہندوستانی ڈاکٹر نے انہیں دوائی بھی دی لیکن وہ جاں بر نہ ہوسکے اور ۱۹۔ اپریل ۱۹۱۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی موت سے ہم کو جتنا صدمہ ہوا، اس کا ذکر یہاں میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔

ان طلبہ کے قافلے کے دو رکن عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں اسی زمانے میں مولوی بشیر صاحب جماعت مجاہدین کے امیر کابل سے رخصت ہو رہے تھے انھوں نے ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تجویز کیا (عبیداللہ) صاحب کو کہا تاکہ اس کی جماعت مجاہدین میں ایک تازہ اور نئی روح پھونکیں، لیکن افسوس ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ان دو نوجوانوں کو وہاں بھیجنے کے باوجود بھی وہ لکیر کے فقیر لوگ ایسے دقیانوسی خیالات کے ثابت ہوئے کہ عبدالرشید تو ان کے رئیس نعمت اللہ کی منافقت سے تنگ آگیا اس کو شبہ ہوا کہ نعمت اللہ انگریزوں سے مل گیا ہے۔

"اس نے ایک روز نعمت اللہ کو قتل کردیا۔ اس کے محافظوں نے عبدالرشید کو زخمی کیا اور ابھی وہ جان ہی توڑ رہا تھا کہ اسے تنور میں ڈال کر جلا دیا۔"

عبدالرشید کا تو یہ انجام ہوا۔ محمد حسن یعقوب مجاہدین کے دوسرے مرکز غلزئی کے گاؤں چرکنہ چلے گئے اور وہاں سے ان کی مدد سے مولوی محمد بشیر صاحب نے سائیکلو اشائل میں انگریزوں کی مخالفت میں ایک ہنگامہ برپا کیا اور بعد میں وزیرستان کے علاقہ میں محمد حسن یعقوب کی سرکردگی میں مجاہدین کی ایک ٹولی بنائی اور اس طرح پر انگریزوں کے برخلاف لوگوں کو اکسانے کی کوششیں کیں لیکن یہ سب جدوجہد بے مائیگی کی وجہ سے ناکام رہی۔

اس زمانے کا شہر کابل کیا تھا؟ امیر کابل کی درباری زندگی کیسی تھی؟ امیر کابل کے شہوانی افعال کس حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ پھر دربار میں کون کون سے سیاسی گروپ تھے۔ ظفر حسن صاحب نے

بڑی وضاحت سے اسے بیان کیا ہے اور اسے پڑھ کر اس زمانے کے کابل اور اس کی سیاست کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

طلبہ کی جماعت نظر بند تھی کہ ۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن کابل پہونچا۔ اس مشن کے لیڈر راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ اور اس کے ایک رکن مولانا برکت اللہ بھوپالی تھے۔ مصنف کے الفاظ میں:۔

> اس وفد کا مقصد امیر افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف اکسا کر افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانے کی تیاریاں کرنا اور اس طرح پر انگریزی فوجوں کے ایک معتدبہ حصے کو یورپین محاذوں کی بجائے ہندوستان میں رہنے پر مجبور کرنا اور جرمنی اور ترکی فوجوں کو اس کے برخلاف زیادہ جنگ کرنے کا موقع دینا اور اگر افغانستان انگریزوں سے لڑ پڑے تو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا تھا۔

۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو یہ وفد کابل پہونچا، اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی کابل پہونچ گئے۔ ظفر حسن صاحب نے بڑی تفصیل سے اس تاریخی وفد کی سرگرمیوں اس کے ساتھ افغان حکومت کی دوغلی پالیسی، اور وفد کی سرگرمیوں میں مولانا سندھی کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا کی وجہ سے ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی نظربندی کی تکلیفیں کچھ کم ہوگئیں اور وہ قدرے آرام سے رہنے لگے۔ حضرت مولانا نے ان بہادر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور انھیں وہ آگے بڑھانے لگے مصنف لکھتے ہیں۔

> قبلہ مولانا مرحوم نے ہمیں مرحوم عبد المجید خاں کی جگہ ایک نیا سردار چننے کو کہا اور ہم نے اتفاق رائے سے عبد الباری[1] صاحب کو اس عہدے کے لیے انتخاب کر لیا۔ اس کے بعد جب مولانا صاحب مرحوم کو ہندوستانی، ترکی، جرمن وفد سے ملنے کی اجازت ہو گئی تو وہ عبد الباری کو اپنے

---

[1] میاں عبد الباری صاحب ایم۔ این۔ اے۔ (مدیر)

ساتھ رہے چاہا کرتے تھے تاکہ وہ ان کی انگریزی میں ترجمانی کرے اور ان کا گفت و شنید سے بھی واقف ہو۔ آئندہ کے لیے جو منصوبے وہ بنائیں۔ انھیں ان کے مشیر کے طور پر کام دے۔

یہ وفد کا نام رہا۔ اور امیر حبیب اللہ خاں نے اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں سے اپنا وظیفہ اور بڑھوا لیا۔ راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی حکومت موقتہ ہند بنا رکھی تھی، جب وہ کابل آئے تو انھوں نے اس میں مولانا عبید اللہ صاحب کو شامل کر لیا اور انھیں وزیر داخلہ کا عہدہ دیا۔ اس حکومت کی طرف سے روس کو ایک وفد بھیجا گیا، جس میں ظفر حسن صاحب کے ایک ساتھی طالب علم خوشی محمد بھی شریک تھے۔ غرض کابل پہونچنے کے بعد مولانا عبید اللہ کی جتنی بھی سرگرمیاں تھیں، ان میں یہ طالب علم برابر حصہ لیتے رہے اور ان کی وجہ سے مولانا کو اور انھیں کافی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔

مصنف نے بڑی شرح و بسط سے یہ تفصیلات بیان کی ہیں، یہ محض ایک تاریخی دستیقہ کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ سیاسی کام کرنے والوں کے لیے بڑی سبق آموز اور عبرت خیز بھی ہیں۔ اسی ضمن میں "ریشمی چٹھی" کا واقعہ بھی آگیا ہے۔

"ریشمی چٹھی" کے واقعہ کے بعد طلبہ اور مولانا کو دوبارہ نظر بند کر دیا گیا۔ ان ہی دنوں کا ظفر حسن صاحب ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں، جو بڑا ہی تکلیف دہ ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

> ہم اسی گھر میں رہتے تھے کہ جون ۱۹۱۷ء میں سید علی عباس بخاری پشاور سے ہجرت کر کے کابل پہونچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ پشاور میں انگریزوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں اپنے قوم پرست جذبات کے سبب سے بہت قابل قدر ہستی مانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا محمد علی جوہر سے ان کا تعلق تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم سے وہ دہلی میں ملے تھے۔ کابل آنے پر امیر حبیب اللہ نے ان کو نظر بند کر دیا۔ ان کی نظر بندی ہماری نظر بندی کی نسبت بہت سخت تھی۔ وہ بالکل اکیلے ایک گھر میں رہتے تھے اور ان کو بازار جانے کی بھی اجازت نہ تھی اور نہ کوئی ان کے گھر جا کر ان سے

نہ سکتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ امیر افغانستان نے انگریزوں کے اشارے پر ان کو سخت نظر بندی میں ڈالا تھا۔

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔ ہم نے ایک دو دفعہ اپنے پہرہ داروں کو رشوت دے کر اور ان کے مہتمم مرزا کو پھسلا کر ان سے ملاقات کی۔ اس تنہائی کی وجہ سے ان کے حواس مختل ہونے لگے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ایک دفعہ ان سے ملنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے انکی بہت تسلی ہوئی تھی۔ ظفر حسن صاحب کے الفاظ ہیں۔

وہ بہت ایماندار، اسلام کے دردمند رشید تھے اور ایک حساس شخصیت رکھتے تھے عالم اسلام کی حالت اور ترکی کی جنگ کی رفتار سے ان کو بہت صدمہ ہوتا تھا۔ ان جیسی قابل قدر ہستی کا اس طرح مخبوط الحواس ہو کر بے کار ہونے کا گناہ امیر حبیب اللہ خاں کی گردن پر رہے گا۔

سردار محمد نادر خاں، جو بعد میں فرمانروائے افغانستان ہوئے، اس وقت فوج کے سپہ سالار تھے ان کا ذکر "آپ بیتی" میں یوں کیا گیا ہے۔

فوج کے سپہ سالار جنرل محمد نادر خاں ولد سردار محمد یوسف خاں معاحب خاص حضور امیر صاحب تھے۔ شاہی رسالے کے بڑے افسران کے دوسرے بھائی مثلاً سردار ہاشم خاں، سردار محمد علیخاں، سردار شاہ ولی خاں اور سردار شاہ محمود خاں تھے۔ ان سب صاحبان کی عمر کا بڑا حصہ ڈیڑھ دو دن میں گزرا تھا۔ کیونکہ ان کا خاندان شاہ شجاع اور امیر دوست محمد خاں کے زمانے میں بادشاہ گردی کی وجہ سے افغانستان سے ہندستان میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ افغانستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اسی خاندان میں سے تھے۔

..... مرحوم سپہ سالار سردار محمد نادر خاں ہندستانی مسلمانوں کے خاص کر حامی اور طرفدار تھے..... انھوں نے ہمارے محترم مرشد قبلہ مولانا عبید اللہ سندھی کی اور ہماری حمایت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اگر سردار محمود بیگ طرزی کو ..... ترکی معاشرت کا دلدادہ کہا جائے تو مرحوم سردار محمد نادر خاں کو ہندستانی معاشرت کا حامی کہنا بجا ہوگا۔ مرحوم سردار سپہ سالار محمد نادر خاں کا خاندان مرحوم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا مرید تھا۔ سردار سپہ سالار مرحوم میرے تو خاص طور محسن تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ان کے

ہمیشہ شکوہ رہے۔ اور ان سے ہر وقت اظہار ممنونیت کیا کرتے تھے۔

اسی سلسلے میں وہ سردار نادر خاں کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں: "ان حضرات کی نظر بندی کے زمانے میں سردار نادر خاں مرحوم نے ان کے لیے شہر کے باہر ایک باغ میں خیمے لگوا دیئے۔ اس عرصہ میں بقرعید بھی آئی اور سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم، قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے ملنے اور عید مبارکی دینے کیلئے آئے۔ اس ملاقات کے دوران میں انھوں نے شیر ببر کی طرف اشارہ کرکے (اس باغ کو چڑیا گھر تھا) قبلہ مولانا مرحوم کو کہا: "اس باغ میں وہ شیر رہتے ہیں۔"

کابل کے پورے دورانِ قیام میں سردار نادر خاں مرحوم مولانا عبید اللہ صاحب اور ظفر حسن صاحب کی ہر ممکن مدد کرتے رہے۔ اور ہمت سے نازک موقعوں پر مرحوم ان کے کام آئے۔ ظفر حسن صاحب تو بعد میں ایک لحاظ سے مرحوم کے دست راست بن گئے تھے اور وہ موصوف پر غایت درجہ اعتماد کرتے تھے "آپ بیتی" میں سردار نادر خاں کی شرافت نفس ہمدردی اور عالی حوصلگی کے بہت سے واقعات درج ہیں۔ راقم السطور کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ سریر آرائے افغانستان ہونے کے بعد بھی سردار نادر خاں مولانا کو نہیں بھولے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دو مرتبہ کہ مظمہ میں مولانا کو ایک خطیر رقم بھجوائی تھی۔

مولانا عبید اللہ صاحب جب کابل پہنچے، تو ان تعارفی خطوط کی وجہ سے جو وہ ساتھ لائے تھے انھیں بآسانی افغان حکومت کے بعض اصحاب اقتدار اور آخر میں امیر حبیب اللہ خاں سے ملنے کا موقع مل گیا۔ مولانا نے میر صاحب کو انگریزوں سے الگ کرنے کے لیے جو لالچ دیا تھا، آپ بیتی میں ان سب واقعات کی تفصیل سے ذکر ہے۔ نیز راجہ مہندر پرتاپ نے جرمنوں کو ہندستان کی جو یک طرفہ تصویر پیش کی تھی، مولانا نے ہندستانی، ترکی، جرمن مشن کے جرمن ارکان سے مل کر اس کا جس طرح توڑ کیا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ خوشی قسمتی سے ان تمام معاملات میں کابل کے یہ نوجوان مولانا کے بہترین مددگار ثابت ہوئے۔

۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں پہلی جنگ عظیم ترکوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ جس سے افغانستان کے انگریز پرست امرا بڑے خوش ہوئے لیکن ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں "قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اس خبر سے جتنا رنج ہوا۔ اسکو یہاں بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔"

۱۹۱۹ء کے موسم سرما میں امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں مارے گئے۔ اور تھوڑی سی

گڑبڑ کے بعد امان اللہ خاں ان کی جگہ امیر بن گئے۔ جنھوں نے تخت پر بیٹھتے ہی فوج اور قوم کے سامنے دو باتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا.... ایک اپنے والد کے قاتل کا پتہ لگا کر وہ اس کو سزائے موت دیں گے۔ دوسری بات یہ تھی کہ انگریزوں سے افغانستان کا استقلال حاصل کریں گے۔ وہ اپنی سب تقریروں میں ان دونوں وعدوں کو ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔

"اپنے دوسرے وعدے کو پورا کرنے کے لیے امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان تیاریوں میں ایک اہم حصہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی کوششوں کا تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم سردار نصر اللہ خاں کے تخت سے دست بردار ہونے کے بعد امیر امان اللہ خاں کے بلانے پر جلال آباد سے کابل آئے اور امیر صاحب سے ملے، اس پر امیر صاحب نے ان سے کہا من ہمون ہستم (یعنی میں تو وہی ہوں) قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے بحیثیت وزیر داخلہ حکومت موقتہ ہند امیر امان اللہ خاں سے وہی معاہدہ کیا، جو ان کے والد سے کیا تھا..... اس زمانے میں ہندستان میں بدامنی تھی۔ اور پنجاب میں جلیانوالہ باغ کے واقعات کی وجہ سے بہت ہل چل مچی ہوئی تھی..... افغانستان کو اپنا استقلال حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ مل سکتا تھا۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ایک رات کو مشین خانہ کابل کے چھاپے خانہ میں جاکر ہندستانیوں کے نام اردو اور انگریزی میں اعلان چھاپے۔ جن میں انھیں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی دعوت دی۔ یہ اعلانات ہندستان پہنچوا دئے گئے اور مولانا کے بھتیجے اور مولانا احمد علی کے بھائی ان اعلانات کو حیدرآباد دکن تک پہنچا کر آئے۔

آخر یہ جنگ ہوئی۔ اس میں افغانستان کی افواج کی ابتری، بدنظمی اور بزدلی کا جو عالم تھا آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے اس کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے کٹھل کے محاذ پر سردار محمد نادر خاں متعین تھے ان کی فراست جنگی تدابیر اور عزم و حوصلہ سے اس محاذ پر افغان افواج کو فتح ہوئی۔ اس طرح محض سردار محمد نادر خاں کے طفیل افغان حکومت کا بھرم رہ گیا۔ اس معرکے میں ظفر حسن صاحب کی ریاضی دانی بڑے کام آئی۔ اور ان کی بتائی ہوئی پیمائش پر جب توپ سے گولہ پھینکا گیا تو وہ قلعہ کے گودام میں پھٹا جس سے وہاں آگ لگ گئی اور اس سے مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے بعد میں سردار

نادر خاں نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور انھیں دربار شاہی میں امان اللہ خاں کے سامنے پیش کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔

اس نوجوان کی عمر کم ہے، لیکن اُس نے ایسی بہادری دکھائی ہے کہ فوج کے بڑے بڑے اور تجربہ کار افسروں کو مات کر دیا ہے۔

اس جنگ میں سردار نادر خاں کا کھُل شہر پر قبضہ ہو گیا۔ گو کھُل قلعہ بستور انگریزی تسلط میں رہا۔ شروع میں تو قبائلیوں نے حسب عادت اس شہر کو لوٹا لیکن بعد میں ان کو روک دیا گیا۔ اس ضمن میں ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں :-

میں نے رات کو شہر میں کرفیو لگایا۔ اور رات کو بغیر اجازت اپنے گھروں سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ تاکہ رات کے اندھیرے میں کہیں پھر فتنہ و فساد اور بلوا گری نہ ہو سکے۔ شہر میں مختلف اور اہم جگہوں پر پہرے لگوا دیئے اور فوجی پٹرول چلانے کا انتظام کیا تاکہ رات کو سپاہی شہر میں گھوم کر دورہ کریں.... ..... اس طرح میں اس پہلے آزاد ہندستانی شہر کا پہلا سول ایڈمنسٹریٹر بنا اس انتظام کی وجہ سے رات کو شہر میں کوئی واردات نہ ہوئی۔

معرکہ کھُل میں ظفر حسن صاحب نے جو کارنامہ سرانجام دیا، اس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس جرمن توپ کو جس سے قلعہ پر گولہ پھینکا گیا تھا، مصنف کے الفاظ میں :- ہاتھی کی پیٹھ پر لاد کر مورچے پر لایا گیا۔ یہاں سردار سپہ سالار مرحوم نے مجھے کہا کہ اس نقشے کی مدد سے جو میں نے ستون میں تیار کیا تھا اس مورچے سے کھُل کے قلعہ تک کا فاصلہ معلوم کروں میں نے نقشہ سے ناپ کر یہ فاصلہ میل اور گز کے حساب سے ان کو بتایا۔ انھوں نے مجھے اس کو میٹر میں تحویل کرنے کو کہا کیونکہ اس توپ کی مار میٹر کے حساب سے تھی۔ توپ کا افسر اس عمل تحویل سے بالکل بے خبر تھا اور نہ ہی وہ نقشے سے دو جگہوں کے درمیانی فاصلے کو ناپ سکتا تھا.... معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صلح میں افغانی سپاہیوں کو فوجی تعلیم خاص کر توپ بازی کی تعلیم اس وقت بالکل نہ دی جاتی تھی یہاں تک کہ افسر بھی اپنے فوجی فرائض کو نہ جانتے تھے۔"

بہر حال ظفر حسن صاحب نے فاصلے کا حساب کر کے بتایا اور سردار سپہ سالار محمد نادر خاں نے خود ہی اس توپ کو

Aiming Post یعنی نشانہ لگانے والے بانس کے ذریعہ قلعہ بھل کی سیدھ میں لگایا اور فیر کیا۔

ظفر حسن صاحب کی کوششوں سے بھل شہر میں امن قائم ہوگیا۔ لوگ اپنے کاروبار میں اطمینان سے مصروف ہوگئے، اور مجاہدین کو کھانے کا سامان بہم پہونچتا رہا۔ اس ضمن میں اسلام کے پرستاران محب الوطن "ہندوستانیوں" کو خود افغانوں کی خدمت کرتے ہوئے قدم قدم پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور ان کے حاسد افغان ان کے خلاف طرح طرح کی جو سازشیں کرتے تھے اس کی ایک مثال ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

اگلے روز صبح کو مجھے سردار سپہ سالار مرحوم کا زبانی پیغام ملا جس میں انھوں نے مجھے پڑاؤ کو لوٹ آنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ میں شہر کا انتظام ایک افغان فوجی افسر کے سپرد کرکے پڑاؤ کو واپس آگیا۔ وہاں آکر مجھے سردار سپہ سالار مرحوم کے چیف پرائیویٹ سیکریٹری مرزا محمد یعقوب خاں سے معلوم ہوا کہ مجھے واپس بلانے کا سبب یہ تھا کہ بعض میرے بد خواہوں نے میرے بارے میں سردار سپہ سالار مرحوم کے کان بھرے اور کہا کہ ظفر انگریزوں سے مل گیا ہے۔ اور اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ امتحاناً مجھے واپس بلایا گیا تھا۔ سیکریٹری نے کہا کہ آپ کی واپسی سے آپ کی صداقت کا ثبوت مل گیا ہے۔ اور آپ کی غلیبت کرنے والے لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔

اگر انگریزوں کو یہ ڈر نہ ہوتا کہ افغانستان سے جنگ نے طول پکڑا تو ہندوستان کے اندر بغاوت ہو جائے گی اور یہ کہ افغانستان میں مقیم محب الوطن ہندوستانی حکومت افغانستان کو ہر طرح کی کمک پہونچا رہے ہیں تو چند دن بعد ہی افغان فوج کی ہوا اکھڑ جاتی اور امیر امان اللہ کو بہت جھک کر صلح کرنا پڑتی۔

افغانستان کی اس جنگ آزادی کی روئداد جو آپ بیتی "میں دیکھی ہے" پڑھنے کے قابل ہے۔ جلال آباد کے محاذ کا کمانڈر ان چیف سپہ سالار محمد صارخ خاں تھا۔ بہترین افغانی پلٹن جن کی بندوقیں نئی اور جن کی توپیں سریع آتش Quick Firing تھیں اس محاذ پر مقرر کی گئی تھیں۔

اس محاذ پر جو کچھ ہوا، وہ ظفر حسن صاحب کی زبان سنئے:۔

"..... صالح محمد خاں نے کابل سے اعلان جنگ کئے جانے سے پہلے تورخم کے مقام پر ایک متنازعہ فیہ چشمہ پر قبضہ کر کے ۸ مئی ۱۹۱۹ء کو انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ایک ہوائی جہاز بھیجکر اسکی فوج پر بم پھینکے، جس سے اس کا پاؤں زخمی ہوگیا۔ اس پر وہ "پائے مرا شہید شد" کہتا ہوا محاذ سے ہٹ کر ڈکہ کی طرف پسپا ہوا۔ فوج اپنے کو بے سردار دیکھ کر میدان جنگ سے پیچھے ہٹی۔ اس کا انگریزی رسالے نے پیچھا کیا اور ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ جلال آباد کے صوبے کے لوگوں نے اس شکست سے یہ سمجھا کہ بس اب حکومت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ اس پر انھوں نے آکر شہر جلال آباد کو لوٹ لیا۔ اس سرکاری خبر کے ساتھ امیر صاحب نے سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم کو یہ حکم بھی بھیجا کہ فوراً آگے بڑھ کر ہندوستان پر حملہ کریں تاکہ انگریزی فوجیں ڈکہ سے آگے بڑھ کر جلال آباد پر قبضہ نہ کر سکیں۔"

ٹھل کے محاذ پر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ سردار نادر خاں کو فتح ہوئی تھی اور افغانوں کا ٹھل شہر پر باقاعدہ قبضہ بھی ہوگیا تھا۔ لیکن ٹھل قلعہ وہ فتح نہ کر سکے آخر قلعہ کو انگریزی فوج کی وقت پر کمک پہونچ گئی یہ سنکر فاتح افغان فوج کس طرح بھاگ کھڑی ہوئی، ظفر حسن صاحب بڑی دردمندی سے اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"اس روز ابھی شام بھی نہ ہوئی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ہماری شین گنیں جو قلعہ کی چوکیوں پر گولہ باری کے لئے دریائے کرم کے پار بھیجی گئی تھیں، خچروں پر لدی ہوئی .... واپس لائی جا رہی ہیں۔ میں نے ان کے سپاہیوں کو روک کر واپس محاذ پر بھیجنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں کے تیور راتے بدلے ہوئے تھے کہ اگر میں زیادہ اصرار کرتا تو شاید وہ مجھ پر گولی چلا دیتے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ محاذ سے پسپا ہونے والے سپاہیوں کا تانتا بندھ گیا۔ سردار سپہ سالار مرحوم .... سے معلوم ہوا کہ دریائے کرم کے پار کے تمام پیادہ سپاہیوں، توپوں اور شین گنوں سے مسلح سپاہیوں نے اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور اپنے افسروں کے حکم کے برخلاف سرکشی کر کے خود بخود پڑاؤ کو واپس آگئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر باقی فوج میں بھی ہل چل مچ گئی۔ ہر کوئی اپنی مرضی سے (افغانی) سرحد کی طرف پسپا ہونے کو تیار ہوگیا۔ یہانتک کہ بعض سپاہیوں نے باربرداری کے خچروں پر سوار ہو کر افغانستان کا راستہ لیا اور سامان جنگ اور رسد وغیرہ کو جو ان خچروں پر لدنے والا تھا پیچھے چھوڑ دیا۔"

بغیر لڑے اور بغیر کوئی ہزیمت اٹھائے ان میں یوں بھگدڑ مچ جانے کا باعث صرف یہ تھا۔
"انھوں نے صرف قلعہ کو کمک پہونچ جانے سے ڈر کر پسپائی اختیار کی۔ ان کو شاید خطرہ ہوا کہ اگلے روز انگریزی فوج ضرور قلعہ سے نکل کر ان پر حملہ کرے گی"

اس معرکے میں کئی موقعوں پر ظفر حسن صاحب نے نہایت خطرناک کاموں کے لیے سردار صاحب کو اپنی خدمات پیش کیں، اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے بھی موصوف پر جس طرح اعتماد کیا، ان کی ہر موقع پر عزت افزائی کی۔ اور آخر وقت تک ان کے ساتھ قریبی عزیز اور مخلص رفیق کا سلوک کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔
آپ بیتی میں جہاں بھی سردار محمد نادر خاں کا ذکر آتا ہے۔ اس سے مصنف کی عقیدت اور خلوص ٹپکتا ہے اور واقعی مرحوم اس کے مستحق بھی تھے۔

ٹھل کے محاذ جنگ تک جاتے ہوئے ہر پڑاؤ پر سردار نادر خاں نے ظفر حسن صاحب کو اپنے خیمے میں جگہ دی۔ پھر اپنے جنگی پلان کے بارے میں جن چند ساتھیوں سے وہ مشورہ کرتے تھے ان میں سے ایک موصوف بھی ہوتے تھے۔

سردار سپہ سالار محمد نادر خاں ظفر حسن صاحب کا کس قدر خیال رکھتے تھے، اس ضمن میں ان کی زبان سے ایک واقعہ سُن لیجئے۔

"نومبر ۱۹۲۱ء میں مرحوم انور پاشا بخارا پہونچے انکے پہونچنے پر افغانی حکومت نے ان کو روس کے برخلاف خفیہ مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ اسلیے سردار سپہ سالار مرحوم (محمد نادر خاں) کو قطغن اور بدخشاں کے افغانی صوبوں کا رئیس تنظیمیہ مقرر کر کے خان آباد بھیجا۔ چونکہ وہ پاشا مرحوم کو روسیوں کے برخلاف مدد دینے کو جا رہے تھے اور میں انگریزوں کا دشمن ہونے کی وجہ سے روسیوں کا دوست مانا جاتا تھا، مجھے اس کام پر اپنے ساتھ نہیں لے گئے حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے مجھے نہ جنگ کے دنوں میں اور نہ صلح کے زمانے میں کبھی اپنے سے جدا کیا تھا۔ یہاں تک کہ جب مجھے ایک روز بخار ہوا اور میں وزارت حربیہ کے سرکاری کام پر نہ جا سکا۔ تو وہ شام کو میری بیمار پرسی کے لیے گھر بھی تشریف لائے تھے۔"

اس جنگ کے نتیجے میں جس میں سردار محمد نادر خاں کا حصہ سب سے نمایاں تھا، افغانستان کی آزادی

تسلیم کر لی گئی اور وہ دوسرے ملکوں سے سفارتی تعلقات رکھنے کا مجاز ہو گیا۔ افغان وفد جو انگریزوں سے گفتگو کرنے ہندوستان گیا تھا، اس کے بارے میں لکھا ہے۔

..... یہ وفد (افغان وفد) افغانی استقلال کی تصدیق کے سوا اور کوئی اچھی شرطیں حاصل نہ کر سکا۔ ہمیں امید تھی کہ شاید یہ وفد ہندوستان کو کچھ اختیارات دلوانے اور ہوم رول قائم کرنے میں ضرور مدد دے سکے گا، جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان کی بدامنی سے ڈر کر افغانستان پر پوری طاقت سے حملہ نہ کر سکے .... اور ڈاکہ کو لے کر وہیں ٹھہرنے پر مجبور ہوئے اور جلال آباد تک بڑھنے کی جرأت نہ دکھلا سکے۔

ظفر حسن صاحب نے بجا طور پر شکایت کی ہے کہ افغانستان کے وفد کی طرف سے ہندوستان میں ہوم رول قائم کرانے کے بارے میں مدد ملنا تو درکنار اس وفد کے قیام ہندوستان کے دوران (۱۹۲۱ کے شروع میں) وہاں ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں اس سے مجھے بہت رنج ہوا، لیکن اس کا سبب اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ افغانی وفد ہندوستان سے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کامیابی حاصل کر کے لوٹ آیا۔"

بعد میں موصوف پر ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی گرفتاریوں کا راز کھلا، جلال آباد سے واپسی پر مولانا عبید اللہ صاحب کو انھیں معلوم ہوا کہ جب یہ افغانی وفد ہندوستان جا رہا تھا تو اسکے صدر سردار محمد طرزی نے مولانا سے ہندوستان کے بعض مسلمان لیڈروں کے نام خط لکھایا تھا "تاکہ اگر انگریز افغانی وفد کے مطالبات کو منظور نہ کریں یا افغانستان کی آزادی کی تصدیق میں لیت و لعل برتیں تو یہ خط ہندوستانی مسلمان لیڈروں کو دے کر انکے ذریعہ انگریزوں کے برخلاف بغاوت کرانے کی کوشش کی جائے۔ افغان وفد نے انگریزوں سے کچھ رعایات حاصل کرنے کے لیے اس خط کو انگریزی حکومت کو دے دیا"... اور اسکی وجہ سے مسلمان لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں نے افغانستان کی طرف ہجرت کی تحریک شروع کی، اس تحریک کا جو حشر ہوا "آپ بیتی" میں بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمانان برصغیر کے چند عظیم تاریخی المیوں کے تحریک ہجرت بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے جس کا ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے افغانستان پر مالی بوجھ پڑا ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اگر

کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا، تو وہ صرف انگریز تھے۔

اگرچہ افغانستان کی طرف ہجرت کرنے کا فتویٰ بقول مصنف مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دیوبند کے علمائے دیوبند نے اس بنا پر دیا تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دارالاسلام میں چلے جائیں لیکن اسکی حوصلہ افزائی خود امیر امان اللہ خان نے بھی کی تھی۔ اس بارے میں ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔

"..... اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان نے اس وقت ایک تقریر کی جس کے یہ الفاظ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ "افغانستان بہ ہمہ وسعت خود آمادہ است کہ مہاجرین ہندی را پناہ بدہد" اس قسم کے بیانات کو قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے کچھ پسند نہ کیا لیکن ان پر اعتراض بھی نہ کیا۔ امیر صاحب کے ان بیانات کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمانان ہند کے لئے زبانی ہمدردی کریں اور اس سے ذرا انگریزوں کو ڈرا کر افغانستان کے لئے کچھ رعایات لے لیں"

ہندوستان کے اندرونی حالات اور مصنف کے الفاظ میں حضرت مولانا حبیب اللہ کے تدبر سے "افغانستان آزاد ہو گیا مگر افسوس ہے کہ ہندوستان ویسا ہی غلام رہا جیسا کہ پہلے تھا۔ افغانستان نے اپنے جنگی حلیف یعنی ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی قدیم روایتی عادت کے بموجب ان کی قسمت پر چھوڑ دیا اس کے بعد انگریزوں نے جو ہندوستانیوں پر ظلم کئے، وہ تو سب دنیا کو معلوم ہی ہیں۔ مگر امیر امان اللہ خان منتقل بادشاہ بن گئے۔ اور اس کامیابی کا سہرا انھوں نے صرف اپنے سر پر رکھ لیا"

انہی سالوں میں برصغیر میں بڑے وسیع پیمانے پر اور زبردست جوش و خروش کے ساتھ تحریک خلافت چلی جس میں کوئی تیس ہزار مسلمان انگریزوں کی جیلوں میں گئے۔ اس تحریک کا مقصد ترکی خلافت کی بحالی تھی۔ مسلمانوں کی ان قربانیوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس ضمن میں ظفر حسن صاحب بالکل صحیح کہتے ہیں:۔

"..... ان کارروائیوں سے ترکوں کو مدد تو نہ ملی لیکن اس سے ہندوستان کی آزادی کا راستہ نہ کھلا۔ صرف انگریزوں کے لئے ذرا ہندوستان میں پریشانی بڑھ گئی۔ مگر ان کو کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا"

اسی زمانے میں سلطنت ترکیہ کے سابق وزیر جمال پاشا کابل گئے۔ پھر انور پاشا نے ان اطراف کا رخ کیا۔ عالم اسلام کی ان دو مشہور شخصیتوں کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے تاریخی اہمیت نہ رکھتا ہو

کیونکہ ہمارے ہاں عرصہ دراز تک خاص طور سے انور پاشاہ کی ایک افسانوی شخصیت رہی ہے۔

انگریزوں سے اپنی آزادی تسلیم کرانے کے بعد حکومت افغانستان کو ایسے ہندوستانیوں کا وجود بار معلوم ہونے لگا، جو انگریزوں کے مخالف تھے، ان میں سے بعض کو تو جیسے کہ لاہور کے ڈاکٹر عبدالحفیظ تھے طریقے سے چلتا کر دیا گیا اور دوسروں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں:۔

"وزیر امینہ شجاع الدولہ سے کہا گیا کہ "میں خفیہ طور پر انگریزی سفیر سے ملتا جلتا رہتا ہوں۔ وزیر امینہ نے یہ بات فوراً امیر صاحب کے کان تک پہنچائی کہ وزیر جریہ سپہ سالار محمد نادر خاں کا اعتماد یافتہ اور نعمت پروردہ ظفر حسن تو انگریزی جاسوس ہے، جو افغانی وزارت حربیہ کے سارے رازوں کو انگریزوں کو دیتا رہتا ہے"

اس پر قدرتاً سردار سپہ سالار بالکل حواس باختہ ہو گئے اور مولانا عبیداللہ صاحب نے جب ایک خط لکھ کر ذاتی ضمانت دی تو یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس کے بعد بھی وزیر امینہ ظفر حسن صاحب کے درپے آزار رہا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس چغلی کے واقعہ کے چند روز بعد میں ایک شام کو ہوا خوری کے لئے شہر سے باہر سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ وزیر امینہ وہاں سے گھوڑے پر گزرا۔ اس نے مجھے دیکھ کر یہ کہا: خیر اس دفعہ تو تمھاری جان بچ گئی، لیکن آئندہ دیکھیں کیا ہوتا ہے"

انہی دنوں مولانا عبیداللہ صاحب نے کابل میں ایک "ہندوستانی اردو یونیورسٹی" قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اسکے لئے حکومت افغانستان سے چارٹر مانگا۔ مولانا نے اس کا نظام نامہ بھی بنالیا تھا اور وزیر خارجہ محمود طرزی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ حکومت افغانستان اور امیر صاحب سے اسکی منظوری لے دیں گے۔

اس کے بعد اس ضمن میں جو کچھ ہوا، وہ "آپ بیتی" میں یوں مذکور ہے:۔

"۱۹۲۱ء میں ڈوبس کے (برطانوی) مشن سے عہد نامہ صلح ہو جانے پر قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے اپنی ساری طاقت کو اس ہندوستانی اردو یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے میں خرچ کرنا شروع کیا"

اس یونیورسٹی کی ابتدا کے طور پر سردار نادر خاں کی مالی امداد سے ایک اسکول بھی قائم ہو گیا لیکن انگریز پرست افغانوں کی شہ پر اس میں اسٹرائک کرائی گئی، اور بعد میں حکومت نے مجوزہ یونیورسٹی

کا چارج دینے سے انکار کر دیا۔

مصنف لکھتے ہیں کہ ان تمام امور سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ "حکومت افغانستان" نے اب انگریزوں سے صلح کر کے ہندوستانی قوم پرستوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا..... قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے لیے صرف دو طریقے باقی رہ گئے۔

(۱) افغانستان میں بالکل خاموش بیٹھ جائیں اور باقی زندگی سیاست سے کنارہ کشی کر کے بالکل بیکار گزاریں۔ یہ طریقہ کار ان کی سیاسی موت کے مرادف تھا۔

(۲) افغانستان چھوڑ کر کسی اور ملک میں رہیں اور وہاں سے انگریزوں کے برخلاف اپنا کام جاری رکھیں۔

آخری فیصلہ کرنے کے لیے قبلہ مولانا نے تقریباً ایک سال غور کیا اور آخر روس کے راستے ترکی پہونچنے کی تجویز طے پائی۔

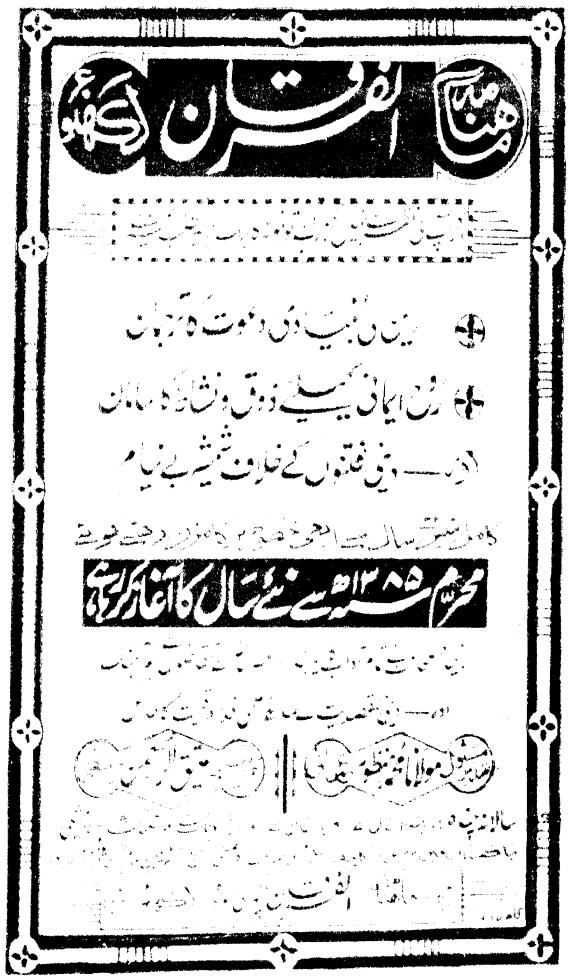
مولانا عبید اللہ صاحب ۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچے تھے۔ اور اس سے چند ماہ پہلے مارچ ۱۹۱۵ء میں ظفر حسن صاحب ادران کے ساتھی افغانستان میں داخل ہوئے تھے۔ سال بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مولانا ظفر حسن صاحب اور بعض دوسرے ہندوستانی نوجوان روسی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں کتاب "آپ بیتی" ختم ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ اس کا پہلا حصہ ہے۔ خدا کرے اسکے دوسرے حصے بھی جلد شائع ہوں۔

محترم ظفر حسن صاحب..... کی "آپ بیتی" (حصہ اول) ایک ایسا تاریخی وثیقہ ہے جسے برصغیر کی اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم اور سیاسیات سے علمی و عملی دلچسپی رکھنے والے ہر چھوٹے کارکن اور ہر بڑے لیڈر کو پڑھنا چاہیے۔ یہ محض گزرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں عبرتیں اور سبق ہیں جو ہمارے لیے آئندہ مشعل کا کام دے سکتے ہیں۔

ظفر حسن صاحب نے "آپ بیتی" لکھ کر مسلمانان برصغیر کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور ملی تاریخ کا وہ باب جو زینت طاق نسیاں بن گیا تھا، اسے انھوں نے دوبارہ ہمارے لیے تازہ کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کوئی مسلمان پڑھا لکھا گھرانا اس کتاب سے خالی نہ رہے گا۔ (م س)

گزارش اس شمارہ میں جن حضرات کو چندہ ختم ہونے کی اطلاع دی جا رہی ہے براہ کرم جلد از جلد اپنا چندہ ارسال فرمائیں ——— مینیجر

ALFURQAN (Regd. No. L. 333) LUCKNOW



Printed & Published by Sarfaraz Printing Press Lucknow

حیاۃ الصحابہؓ اردو عکسی

چہارم پنجم ششم ہفتم

تالیف: حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دامت برکاتہم

ترجمہ: حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب فیض آبادی مدظلہ
شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قدس سرہٗ

مؤلف مدظلہ کی شہرۂ آفاق کتاب حیاۃ الصحابہؓ عربی جو ہند، و پاک کے علاوہ ممالک اسلامیہ میں بھی قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہے۔ اس کی جلد اول کے ترجمہ کے تینوں حصوں کی اشاعت کا عالم یہ ہے کہ ایک ہی سال کے اندر دوسرا ایڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہے اب عربی کی جلد دوم کے اردو ترجمہ کو چار برابر حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اردو ترجمہ کی خصوصیت

اس میں بھی مترجم موصوف نے اصل عربی الفاظ کو ترجمہ میں اس طرح سمویا ہے کہ مطلب واضح بھی ہو جائے اور ترجمہ بامحاورہ سلیس اور دلکش بھی بن جائے اور حضرات علمائے اہل حق کی نظر میں ترجمہ کی خوبی و پسندیدگی نے تو کتاب کا معیار کافی بلند کر دیا ہے۔

کتاب خریدنے کے وقت

فاضل مترجم حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب کا اہم گرامی ضرور دیکھ لیں کیونکہ کتاب کے پہلے تین حصوں کا ترجمہ بھی موصوف ہی کا ہے۔

کاغذ سفید، کتابت واضح، طباعت عکسی ٹائپ سیٹ حسین رنگین۔ ہر حصہ میں تقریباً دو سو (۲۰۰) صفحات۔

ناشر: اخترانیس احمد غفرلہٗ ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳

حصہ اول، دوم، سوم	حصہ چہارم، پنجم، ششم، ہفتم
یکجا مجلد ریگزین ۱۰/-	یکجا مجلد ریگزین ۱۲/-